تبیان الفرقان
فی
تفسیر القرآن
جلد ٦
خلیفہ مجاز
شیخ المحدثین حکیم العصر
حضرت مولانا عبد المجید لدھیانوی
شیخ الحدیث والتفسیر جامعہ اسلامیہ باب العلوم کہروڑ پکا
سابق امیر مرکزیہ
عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت
قطب الاقطاب سلطان الاولیاء
شیخ المشائخ سید نفیس الحسینی شاہ صاحب
سابق امیر مرکزیہ
عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت
نفیس قرآن کمپنی (رجسٹرڈ)
بیسمنٹ مکہ سنٹر ٥ اردو بازار ٥ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تِبیانُ الفُرقان
فی
تفسیرِ القُرآن

شیخ المحدثین حکیم العصر
حضرت مولانا عبد المجید لدھیانوی نور اللہ مرقدہ
شیخ الحدیث والتفسیر جامعہ اسلامیہ باب العلوم کہروڑ پکا
سابق امیر مرکزیہ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت

خلیفہ مجاز

قطب الاقطاب سلطان الاولیاء
شیخ المشائخ سید نفیس الحسینی شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ
سابق نائب امیر مرکزیہ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت

نفیس قرآن کمپنی (رجسٹرڈ)
۵-لوئر مال ٥ بیسمنٹ مکہ سنٹر ٥ اردو بازار ٥ لاہور
فون: 042-37361460, 0321-320-9464017

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نام کتاب ---------- تبیان الفرقان فی تفسیر القرآن

---------- شیخ المحدثین حکیم العصر حضرت مولانا عبدالمجید لدھیانوی نوراللہ مرقدہ

باہتمام ---------- شیخ الحدیث حضرت مولانا منیر احمد صاحب دامت برکاتہم

سنِ اشاعت ---------- ۱۴۴۲ھ-۲۰۲۰ء

تعداد ---------- ۱۱۰۰

ناشر ---------- نفیس قرآن کمپنی (رجسٹرڈ) ۵-لوئرمال ۰ بیسمنٹ مکہ سنٹر ۰ اردو بازار ۰ لاہور

جامعہ اسلامیہ باب العلوم
کہروڑپکا۔ضلع لودھراں فون نمبر: 0608-342983

مکتبہ عثمانِ غنی
جامعہ دارالقرآن مسلم ٹاؤن فیصل آباد
فون نمبر: 0300-7203324

جامعہ حسینیہ باب العلوم
جڑانوالہ روڈ۔فیصل آباد
فون نمبر: 0321-6670225

مکتبہ رحمانیہ اُردو بازار۔لاہور

اسلامی کتب خانہ
بالمقابل جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی

مکتبہ لدھیانوی
سلام کتب مارکیٹ بنوری ٹاؤن۔کراچی
021-34130020
021-24125590

بیت الکتب
بالمقابل اشرف المدارس گلشن اقبال، کراچی

دارالاشاعت اُردو بازار۔کراچی

ادارہ تالیفات اشرفیہ۔ملتان

فہرستِ مضامین

***

سُورَةُ النُّورِ

اٰیاتُها ۶۴ ۲۴ سُوْرَةُ النُّوْرِ مَدَنِيَّةٌ ۱۰۲ رکوعاتُها ۹

سورۂ نور مدینہ میں نازل ہوئی اس میں چونسٹھ آیتیں اور نو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے

سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا وَاَنْزَلْنَا فِيْهَآ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ①

یہ ایک سورت ہے جس کو ہم نے اتارا اور ہم نے اس کو متعین کیا اور اتاریں ہم نے اس سورت کے اندر واضح واضح آیتیں تاکہ تم یاد رکھو ①

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا

وہ عورت جو زنا کرے اور وہ آدمی جو زنا کرے پس مارا کرو ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے، اور نہ پکڑے تمہیں ان دونوں کے ساتھ

رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا

شفقت اللہ کے قانون میں اگر تم ایمان لاتے ہو اللہ پر اور یوم آخر پر، اور چاہیے کہ حاضر ہو ان کی سزا کے موقع پر

طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ② اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً ۙ وَّالزَّانِيَةُ

مؤمنین میں سے ایک گروہ ② زانی مرد نہیں نکاح کرتا مگر زنا کرنے والی عورت سے یا شرک کرنے والی عورت سے، اور زانیہ عورت

لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ③ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ

نہیں نکاح کرتا اس کے ساتھ مگر زانی یا مشرک، اور حرام کیا گیا ہے یہ مؤمنین پر ③ اور وہ لوگ جو کہ تہمت لگاتے ہیں

الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا

پاک دامن عورتوں پر پھر نہیں لاتے چار گواہ تو ان کو کوڑے لگاؤ اسی کوڑے، اور نہ قبول کرو

لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ④ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ

ان کے لئے گواہی کبھی بھی، اور یہ لوگ بدکار ہیں ④ مگر وہ لوگ جو توبہ کرلیں اس (تہمت لگانے) کے بعد اور اپنے حال کی

وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ⑤ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ

اصلاح کرلیں پس بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے ⑤ اور وہ لوگ جو تہمت لگاتے ہیں اپنی بیویوں پر اور نہیں ہیں ان کے لئے

شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ

گواہ سوائے اپنے آپ کے تو پھر ان میں سے ایک کی گواہی چار گواہیاں ہیں اللہ کی قسم کھاتے ہوئے کہ بے شک وہ آدمی البتہ

الصّٰدِقِیْنَ ۝۶ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَیْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ ۝۷ وَ

سچے لوگوں میں سے ہے ۝۶ اور پانچویں شہادت یہ ہے کہ بے شک اللہ کی لعنت ہو اس آدمی پر اگر وہ جھوٹوں میں سے ہو ۝۷ اور

یَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ

دفع کرے گا اس عورت سے عذاب کو اس عورت کا چار گواہیاں دینا اللہ کی قسم کھا کر کہ بے شک اس کا شوہر البتہ

الْكٰذِبِیْنَ ۝۸ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَیْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۝۹

جھوٹوں میں سے ہے ۝۸ اور اس کا پانچویں گواہی دینا کہ اللہ کا غضب ہو اس عورت پر کہ اگر وہ خاوند سچوں میں سے ہو ۝۹

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِیْمٌ ۝۱۰

اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور اس کی رحمت، اور اگر نہ ہوتی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ تواب اور حکیم ہے (تو تم برباد ہو جاتے) ۝۱۰

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا: مبتدا محذوف نکالیں گے اَیْ هٰذِهٖ سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا۔ یہ ایک سورت ہے جس کو ہم نے اتارا، وَفَرَضْنٰهَا: اور ہم نے اس کو متعین کیا، مقرر کیا، یہاں فرض کا لفظ لغوی معنی میں ہے، اَنْزَلْنٰهَا کا معنی یہ ہوگا کہ اس کے الفاظ ہم نے اتارے، اور فَرَضْنٰهَا کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس میں جو احکام ہیں وہ ہم نے متعین کیے، یہ فرض اصطلاحی نہیں، کیونکہ جتنے احکام اس سورت میں ذکر کیے جائیں گے وہ سارے کے سارے فرض نہیں ہیں، بعض ان میں سے اصطلاحی فرض بھی ہیں، بعض مستحب ہیں، تو یہاں فرض اصطلاحی مراد نہیں۔ ہم نے اس کو متعین کیا یعنی اس کے احکام ہم نے متعین کیے، وَاَنْزَلْنَا فِیْهَآ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ: اور اتاریں ہم نے اس سورت کے اندر واضح واضح آیتیں یعنی ان احکام پر دلالت کرنے کے لئے واضح واضح آیتیں اتاریں، لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ: تاکہ تم یاد رکھو۔ اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ: اَلزَّانِیَةُ چونکہ صفت کا صیغہ ہے، اس لیے اس کے اوپر جو الف لام آیا ہوا ہے وہ الذی کے معنی میں ہے، اَیْ اَلَّتِیْ تَزْنِیْ وَالَّذِیْ یَزْنِیْ، وہ عورت جو زنا کرے اور وہ آدمی جو زنا کرے، فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا پس تم مارا کرو ان میں سے ہر ایک کو مِائَةَ جَلْدَةٍ سو کوڑا مارنا، جَلَدَ یَجْلِدُ: کوڑا مارنا۔ ان دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارا کرو، وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ: اور نہ پکڑے تمہیں ان دونوں کے ساتھ شفقت اللہ کے قانون میں، یا اللہ کے دین میں، اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ: اگر تم ایمان لاتے ہو اللہ پر اور یومِ آخر پر یعنی اللہ کے قانون کو نافذ کرتے ہوئے، اللہ کے

دین کے تقاضے کو پورا کرتے ہوئے تمہیں ان کے اوپر ترس نہ آئے، تمہیں ان کے اوپر شفقت نہ آئے، بلکہ اسی طرح سے سزا دو جس طرح اللہ کے قانون کا تقاضا ہے، رحم کرتے ہوئے شفقت کرتے ہوئے انہیں چھوڑ دو نہیں۔ نہ پکڑے تمہیں ان دونوں کے ساتھ شفقت، ترس، مہربانی، نرمی اللہ کے دین میں یعنی اللہ کے دین کے چلانے کے بارے میں، اللہ کے دین کے نافذ کرنے کے بارے میں تمہیں ان دونوں کے اوپر شفقت نہ آئے، اگر تم ایمان لاتے ہو اللہ پر اور یوم آخر پر۔ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ: اور چاہیے کہ حاضر ہو ان کی سزا کے موقع پر (یعنی جب ان کو سزا دی جارہی ہو) مؤمنین میں سے ایک گروہ، اس کا مطلب یہ ہے کہ سب کے سامنے سزا دو، ایک طائفہ موجود ہونا چاہیے جو ان کی سزا کا مشاہدہ کریں، آنکھوں کے سامنے سزا دی جائے، شَهِدَ يَشْهَدُ: حاضر ہونا مشاہدہ کرنا دیکھنا، یہ سب اس کا مفہوم ہوتا ہے، ان کی سزا کو دیکھے مؤمنین کا ایک گروہ، یا سزا کے موقع پر حاضر ہو۔ اَلزَّانِي لَا يَنْكِحُ: وہی بات ہے کہ یہ اَلَّذِي يَزْنِي کے معنی میں ہے، جو شخص زنا کرتا ہے، جو زانی ہے وہ نہیں نکاح کرتا اِلَّا زَانِيَةً مگر زنا کرنے والی عورت سے، اَوْ مُشْرِكَةً یا شرک کرنے والی عورت سے۔ وَالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ: اور زانی عورت، نہیں نکاح کرے گا اس زانیہ کے ساتھ مگر زانی مرد یا مشرک۔ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ: اور حرام کیا گیا ہے یہ مؤمنین پر، ذٰلِكَ کا اشارہ زنا کی طرف ہے کہ یہ زنا مؤمنین پر حرام کیا گیا، یا مطلب یہ ہے کہ زانیہ عورت کے ساتھ یا مشرکہ کے ساتھ نکاح کرنا حرام کیا گیا ہے مؤمنین پر۔ وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنٰتِ: مُحْصَنٰت مُحْصَنَةٌ کی جمع ہے۔ اور وہ لوگ جو کہ تہمت لگاتے ہیں پاک دامن عورتوں پر، ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ: اَتٰى يَاْتِي آنے کے معنی میں ہے، لیکن باء تعدیہ کی آگئی تو "لانے" کے معنی میں ہو گیا۔ پھر نہیں لاتے چار گواہ، فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً: تو ان تہمت لگانے والوں کو کوڑے لگاؤ اَسّی (۸۰) کوڑے، یعنی اَسّی (۸۰) دفعہ ان کے کوڑے مارو، وَلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا: اور نہ قبول کرو ان کے لئے گواہی کبھی بھی، وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ: اور یہ تہمت لگانے والے لوگ بدکار ہیں، فاسق ہیں، اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا: مگر وہ لوگ جو توبہ کرلیں اس تہمت لگانے کے بعد اور اپنے حال کی اصلاح کرلیں، فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: پس بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے یعنی ان کی توبہ قبول کرے گا۔ اِلَّا کا استثناء احناف رحمہم اللہ کے نزدیک اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ سے ہے جس کا مطلب یہ ہو گا وہ توبہ کرنے کے بعد فاسق نہیں رہیں گے، اور یہ حکم ہمیشہ رہے گا کہ ان کی گواہی قبول نہیں چاہے وہ توبہ ہی کرلیں۔ اور بعض ائمہ کے نزدیک لَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا، اور اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ، دونوں کے ساتھ تعلق ہے۔ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا، اس لیے اگر وہ صدق دل سے توبہ کرلیں اور اپنے حالات درست کرلیں تو ان کی گواہی بھی قبول ہے، اور وہ فاسق بھی نہیں رہیں گے۔ لیکن یہ مسلک احناف کا نہیں ہے، جو محدود فی القذف ہو جائے، تہمت لگانے کی بنا پر جس کے اوپر حد لگ جائے، ہمیشہ کے لیے اس کی گواہی مردود ہو جاتی ہے۔ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ: وہ لوگ جو تہمت لگاتے ہیں اپنی بیویوں پر، وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ: اور ان کے لئے گواہ نہیں ہیں سوائے اپنی ذاتوں کے، ان کے پاس گواہ نہیں ہیں سوائے اپنے آپ کے، یعنی خاوند ہی ہیں جنہوں نے اپنی بیوی کو زنا کرتے ہوئے دیکھا ہے، اور کوئی گواہ نہیں ہیں۔ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۢ بِاللّٰهِ: پھر ان میں سے ایک کی گواہی چار گواہیاں ہیں اللہ کے ساتھ، اللہ کی قسم کھاتے ہوئے، اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ کہ بے شک وہ آدمی البتہ سچے لوگوں میں سے ہے، یعنی خاوند اللہ کی قسم کھاتا ہوا چار دفعہ گواہی دے گا کہ وہ سچ

کہہ رہا ہے، جھوٹ نہیں کہہ رہا۔وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ: اور پانچویں شہادت یہ ہے کہ وہ یوں کہے گا کہ بے شک اللہ کی لعنت ہو اس آدمی پر اگر وہ جھوٹوں میں سے ہو۔ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ: اَنْ تَشْهَدَ یہ مصدر کی تاویل میں ہو کے ''يَدْرَؤُا'' کا فاعل ہے، دَرَءَ، يَدْرَءُ: دُور ہٹانا۔ دفع کرے گا اس عورت سے عذاب کو اس عورت کا گواہی دینا چار گواہیاں، یعنی وہ عورت اگر اسی طرح سے قسمیں اٹھا لے اور شہادت دے دے تو یہ شہادت دینا اس سے عذاب کو اور زِنا کی سزا کو دُور ہٹا دے گا، پھر اس کے اوپر حد جاری نہیں ہوگی۔ دفع کرے گا اس عورت سے عذاب کو گواہی دینا اس عورت کا چار گواہیاں اللہ کی قسم کھا کر کہ بے شک اس کا شوہر، اس کا خاوند البتہ جھوٹوں میں سے ہے، وَالْخَامِسَةَ: اور اس کا پانچویں گواہی دینا ان الفاظ کے ساتھ کہ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَاۤ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ: اللہ کا غضب ہو اس عورت پر اگر وہ خاوند سچوں میں سے ہو۔ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ: اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور اس کی رحمت، وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ: اور اگر نہ ہوتی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ تواب اور حکیم ہے۔ جزا اس کی محذوف نکالی جائے گی ''تم مشقت میں پڑ جاتے، تم سختی میں پڑ جاتے، تم برباد ہو جاتے'' یہ لَوْلَا کا جواب نکلے گا۔

تفسیر

مضامینِ سورت اور ماقبل سے ربط

اس سورت کا نام ''النُّور'' یہ تو ماخوذ ہے آگے آنے والی ایک آیت اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ، اس سورت کا نام وہیں سے لیا گیا ہے، اور اس سورت میں جو اَحکام دیے جا رہے ہیں ان کا زیادہ تر تعلق عفت کے ساتھ ہے، پاک دامنی، عزت وعفت کی حفاظت، یعنی بدکاری، زِنا، بدمعاشی سے روکنے کے اَحکام ہیں۔ پچھلی سورت جو آپ کے سامنے آئی تھی سورۂ مؤمنون، اس میں مؤمنین کی صفات ذِکر کرتے ہوئے یہ ذِکر کیا تھا: وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ، جو اپنے فرجوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، اب حفظِ فرج کی تفصیل اور اسی کے متعلق ہدایات اور اَحکام اس سورت میں دیے جا رہے ہیں۔

شانِ نزول

پس منظر اس سورت کا یہ ہے، اور خصوصیت کے ساتھ اس میں جو بات ذِکر کی جا رہی ہے وہ ہے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طہارت نزاہت، ان کی پاک دامنی اور ان کی عالی شان۔ کیونکہ منافقین نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائی تھی اور آپ کے دامن کو داغ دار کرنے کی کوشش کی تھی تو اس کی صفائی آنے والے دو رُکوع میں دی گئی ہے، اس پہلے رکوع کے بعد اگلے جو دو رُکوع آئیں گے وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی شان سے ہی متعلق ہیں، اور پس منظر اس کا یہ ہے کہ مشرکینِ مکہ کے ساتھ تصادم تو چلا آ ہی رہا تھا، اور متعدد لڑائیاں ہوئیں، سب سے پہلے بدر کا معرکہ ہوا، اور اس کے بعد اُحد کا ہوا، اور چھوٹی چھوٹی جھڑپیں متعدد بار ہوئیں، اور پھر غزوۂ اَحزاب یعنی غزوۂ خندق پیش آیا، جس میں مشرکین اور عرب کے تمام قبائل جن کو یہود کی حمایت بھی حاصل تھی،

اکٹھے ہو کر مدینہ منورہ پہ چڑھ آئے تھے، اور اس عزم کے ساتھ آئے تھے کہ اب ہم اس جماعت کا نام ونشان مٹا دیں گے، لیکن تقریباً ایک مہینے تک مدینہ کا محاصرہ کر کے بیٹھے رہے، اور ان کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی، آخر وہ ذلیل وخوار ہو کر واپس چلے گئے۔ جس وقت وہ واپس گئے ہیں تو سرور کائنات ﷺ نے فرمایا کہ آج کے بعد ہم تو ان کی طرف لڑنے کے لئے جائیں گے، اور یہ ہماری طرف لڑنے کے لئے نہیں آئیں گے،[1] اس اعلان کا مطلب یہ تھا کہ سرور کائنات ﷺ نے حالات کا اندازہ لگا لیا کہ مشرکین کی قوت اب ٹوٹ گئی، اب یہ جارحانہ جنگ نہیں کر سکتے، اب یہ اِقدامی جنگ نہیں کر سکیں گے، اب ان کی جنگ دفاعی ہوگی، جس طرح سے پہلے مسلمان اِقدامی جنگ نہیں کر سکتے تھے اپنی قوت کے کمزور ہونے کی وجہ سے، تعداد کے کم ہونے کی وجہ سے، حالات کے تقاضے سے، یہ جو کچھ ہوا، دفاعی جنگ کے طور پر ہوا تھا۔ اور اَب موقع آ گیا تھا کہ مسلمانوں کی طرف سے اِقدام ہو، اور مشرک اپنے دفاع پہ مجبور ہو جائیں۔

مسلمانوں کی ترقی کا راز اور مشرکین کی ناکامی کی وجہ

مشرکین نے بھی اندازہ کر لیا کہ چاہے مسلمان تعداد میں تھوڑے ہیں، اور ان کے پاس اسلحہ زیادہ نہیں لیکن جنگ میں، میدان میں مقابلہ کر کے اس جماعت کو شکست نہیں دی جا سکتی۔ وجہ بھی ان کے سامنے آ رہی تھی، مسلمانوں کا عالی اخلاق آپس میں محبت اتفاق، اپنے امیر اور مقتدیٰ کی اطاعت، جاں بازی، اپنے مقصد کے ساتھ عشق، یہ چیزیں تھی جن کی وجہ سے اس جماعت نے اللہ تعالیٰ کی نصرت کو حاصل کیا، اور اللہ تعالیٰ کی نصرت کے شامل ہو جانے کی وجہ سے یہ جماعت ہر محاذ کے اوپر کامیابی حاصل کر رہی تھی، یہ سارے لوگ سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح تھے، مقصد کے ساتھ ان کو لگن تھی، عشق تھا، اللہ کے راستے میں جان دینا ان کا ایک اعلیٰ مقصد تھا، جس کی وجہ سے مشرکین سمجھتے تھے کہ یہ جماعت مغلوب نہیں ہو سکتی۔ بخلاف اس کے مشرکین اور یہود ہر قسم کی کمزوریوں میں مبتلا تھے، اخلاقی کمزوریاں ان میں تھیں، اجتماعی کمزوریاں ان میں تھیں، اور ہر کسی کے دل میں اپنی اپنی خواہش اور اپنا مقصد تھا، ظاہری طور پر اگرچہ ان میں اتفاق نظر آتا تھا لیکن ان کے قلوب آپس میں مختلف تھے، یہ ان کی کمزوریاں تھی۔

شکست خوردہ ذہنیت فریقِ مخالف کو بدنام کرنے کی کوشش کرتی ہے

اور ہمیشہ یہ قاعدہ ہوا کرتا ہے کہ جب ایک فریق اپنی کمزوریوں کی بنا پر شکست کھا رہا ہو، اور دوسرا فریق اپنی خوبیوں کی بنا پر برتری حاصل کر رہا ہو، تو یہ کمزوریوں والا فریق جو ہوا کرتا ہے، میدان میں اگر اس کو شکست نہ دے سکے تو اس کا انداز یہ ہوا کرتا ہے کہ پھر دوسری جماعت کو بدنام کیا جائے، رسوا کیا جائے، اور ان کے اندر بھی وہ کمزوریاں پیدا کرنے کی کوشش کی جائے جس قسم کی کمزوریاں اپنے اندر ہیں، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ بدنام ہو جائیں گے، ان کی اخلاقی برتری نہیں رہے گی، اور آپس میں اس قسم کے شوشے چھوٹ جانے کی وجہ سے اختلاف ہو جائے گا، آپس میں لڑیں گے، ان میں اتفاق نہیں رہے گا، تو جس قسم کی

---

(۱) الآن نغزوهم ولا يغزوننا نحن نسير إليهم بخاری ۲/۵۹۰ باب غزوۃ الخندق۔ مشکوۃ ۲/۵۳۲ باب فی المعجزات

کمزوریوں میں ہم مبتلا ہیں ویسی کمزوریاں ان میں ہو جائیں گی، یہ شکست خوردہ ذہنیت ہوا کرتی ہے کہ اپنے فریق مخالف کو بدنام کرنے کی کوشش کرو، اور ان میں انتشار برپا کرو۔

منہ بولے بیٹے کی بیوی سے نکاح، اور اس پر منافقین کا پروپیگنڈا

اسی پس منظر میں غزوۂ خندق کے بعد دو تین واقعات مسلسل پیش آئے، پہلا واقعہ تو یہ ہوا کہ سرورِ کائنات ﷺ نے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو اپنا متبنّٰی بنایا ہوا تھا، جس کو ''منہ بولا بیٹا'' کہتے ہیں، اور اس زمانے میں رواج یہ تھا کہ جس کو اپنے منہ سے بیٹا کہہ دیا جائے اور اسے اپنا بیٹا بنالیا جائے تو وہ لوگ اسے حقیقی بیٹے کی طرح سمجھتے تھے، وہ وارث بھی ہوتا تھا اور اس کی بیوی ایسے ہی حرام ہوتی تھی جس طرح حقیقی بیٹے کی بیوی حرام ہوتی ہے۔ سرورِ کائنات ﷺ کی وساطت سے اللہ تعالیٰ نے اس رسمِ جاہلیت کا خاتمہ کرنا تھا، تو زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ جو آپ ﷺ کے متبنّٰی تھے، ان کی شادی آپ ﷺ نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے کی جو بعد میں آپ ﷺ کے عقد میں آئیں، اُمّ المؤمنین بنیں۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ چونکہ غلام رہ چکے تھے اور ان کو غلامی کے بعد آزادی ملی تھی تو زینب رضی اللہ عنہا کا دِل نہیں آتا تھا، کیونکہ قریش بہت عالی خاندان تھا، اور ایسے شخص کے نکاح میں ان کی لڑکی چلی جائے جو غلام رہ چکا ہو، یہ بات ان کی اس عزّت مقام اور وقار کے خلاف تھی۔ لیکن حضور ﷺ نے اس جذبے کو مٹانے کے لئے اور یہ سمجھانے کے لئے کہ اللہ کے ہاں برتری رفعت اور عزّت تقویٰ اور اسلام کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے، خاندانی نخوت اچھی چیز نہیں ہے، آپ نے مجبور کر کے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے ان کا نکاح کروایا...... اور اللہ کی طرف سے بعد میں ہدایت آگئی کہ منہ بولا بیٹا ''بیٹا'' نہیں ہوا کرتا، اس لیے جو منہ بولے بیٹے ہیں ان کے اصل باپوں کی طرف نسبت کر کے پکارا کرو، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ ہم پہلے ان کو ''زید بن محمد'' کہہ کر بلاتے تھے، لیکن جب یہ آیات اُتریں تو پھر ہم نے ان کو ''زید بن حارثہ'' کہہ کے پکارنا شروع کیا، تو یہ ممانعت آگئی کہ یہ حقیقی بیٹے کی طرح نہیں ہوتے، نہ تم ان کے باپ بن سکتے ہو، اس لیے ان کی نسبت اصل باپ کی طرف ہونی چاہیے...... اللہ کی طرف سے واقعہ یوں پیش آیا کہ زید اور زینب کا آپس میں نباہ نہ ہو سکا، آخر زید نے طلاق دے دی، طلاق دینے کے بعد سرورِ کائنات ﷺ نے زینب رضی اللہ عنہا کی دِلجوئی کے لئے یہی مناسب سمجھا کہ میں اس سے نکاح کرلوں، کیونکہ پھوپھی زاد تھیں، اپنے خانداں کی تھیں، پھر ان کو یہ صدمہ بھی پہنچ گیا کہ یہ نکاح ان کی مرضی کے خلاف ہوا تھا، پھر نباہ بھی نہ ہو سکا اور طلاق ہو گئی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے زینب کے ساتھ خود نکاح کرلیا...... پہلے تو اس بات کو منافقین نے جو کہ مدینہ منورہ میں مشرکین اور یہود کے ایجنٹ تھے، ظاہری طور پر وہ کلمہ پڑھے ہوئے تھے لیکن ان کا سارے کا سارا رابطہ انہی گروہوں کے ساتھ تھا، تو ان کی وساطت سے پہلے تو یہ فتنہ اٹھایا گیا کہ لوجی! بیٹے کی بیوی سے نکاح کرلیا، یہ اچھا دین لے کے آئے ہیں کہ اپنے بیٹے کی بیوی کو اپنے لیے حلال کرلیا۔ یہ پروپیگنڈا ہوا جس کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ اَحزاب میں آئے گی۔

غزوۂ بنی مُصطلِق کے موقع پر مہاجرین وانصار کے جھگڑے کا واقعہ

اور اس کے بعد دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ غزوۂ بنی مصطلق میں...... بنی مصطلق ایک قبیلہ ہے، غزوۂ خندق کے بعد

سرورِکائنات ﷺ کو اطلاع ملی کہ وہ لوگ مدینہ منورہ پہ حملہ کرنے کی تیاری کررہے ہیں، آپ ﷺ نے ارادہ فرمالیا کہ اب ان کو حملے کا موقع نہ دیا جائے، آپ ﷺ کی طرف سے اقدام ہوا، کہ آپ ﷺ جماعت لے کے گئے، ان پر حملہ کیا اور ان کو سنبھلنے کا موقع بھی نہیں ملا کہ حضور ﷺ نے غلبہ حاصل کرلیا، ان کی عورتیں اور بچے قید کرلیے، اور ان میں سے کچھ لوگ قتل ہوئے جیسے کہ جنگ کے موقع پر ہوا کرتا ہے، کچھ ویسے پکڑ لیے گئے، وہ قبیلہ مغلوب ہوگیا۔ ابھی حضور ﷺ اور صحابہ کرام ﷺ کی جماعت وہیں بنی مصطلق کے علاقے میں ٹھہری ہوئی تھی، ان کا چشمہ جہاں سے وہ پانی لیتے تھے مُرَیْسِیْع کہلاتا ہے، اس لیے اس غزوے کے دونوں نام آتے ہیں، ''غزوۂ بنی مصطلق'' اور ''غزوۂ مریسیع''۔ مہاجرین اور انصار آپ ﷺ کے ساتھ تھے، جیسے کہ انسانی فطرت ہے کہ جہاں کچھ برابر کے ساتھی ہوا کرتے ہیں تو معمولی معمولی باتوں پر جھگڑا بھی ہوجاتا ہے، آپس میں اُلجھ بھی جاتے ہیں، تُوتُو مَیں مَیں بھی ہوجاتی ہے، یہ بات ہوتی رہتی ہے، آخر انسان، انسان ہی ہے۔ تو ایک مہاجر اور ایک انصاری کی پانی لینے میں آپس میں کچھ لڑائی سی ہوگئی، اختلاف سا ہوگیا، تُوتُو مَیں مَیں تک نوبت آگئی، مہاجر نے اپنے ساتھی مہاجرین کو پکارلیا، انصاری نے اپنے ساتھی انصاریوں کو پکارا، دونوں گروہ اکٹھے ہوگئے، گفتگو کچھ تیز ہونے لگی، سرورِکائنات ﷺ کو اطلاع ملی تو آپ ﷺ موقع پہ تشریف لے گئے، دونوں گروہوں کو ملامت کی، اور ملامت کرنے کے بعد اس فتنے کو دبادیا۔[1]

رئیس المنافقین کی سازش

اب یہ تھوڑی سی بات عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین کے ہاتھ میں بھی آگئی، یہ بنی خزرج کا حلیف تھا، اور وہ آدمی جس کے ساتھ اس مہاجر کا جھگڑا ہوا تھا وہ بھی بنی خزرج میں سے تھا، اور اس جنگ کے موقع پر منافقین کثیر تعداد میں ساتھ تھے، اب اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا، فائدہ اٹھا کے اپنے قبیلے کے آدمیوں کو بہکانے لگا، اور کہتا ہے کہ دیکھو! ان کو جرأت ہوگئی؟ کہ یہ تمہارے سامنے بولتے ہیں، تمہاری روٹیوں پہ پلنے والے، تم ان کو اپنے گھروں میں لے آئے، تم انہیں خرچ دیتے ہو، اپنی جائیدادوں میں سے حصے دیے، آج یہ اتنے دلیر ہوگئے کہ ہمارے ساتھ اس طرح سے سلوک کرتے ہیں اور ہمارے سامنے یہ بولتے ہیں۔ اب مدینہ منورہ واپس جاکر ان کے اوپر خرچ کرنا چھوڑ دو، انہیں جائیدادوں میں سے حصے نہ دو، یہ خود بکھر جائیں گے، اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ اور اس نے یہ لفظ استعمال کیے کہ ہم عزت والے ہیں اور یہ لوگ ذلیل بے قدرے، مدینہ منورہ میں آگئے، اب ہم جائیں گے تو سب کو وہاں سے نکال دیں گے، اس طرح سے اپنی جماعت کو بہکایا، یہ ساری باتیں قرآنِ کریم میں سورۂ منافقون کے اندر نقل کی گئی ہیں، یہ واقعہ بھی اسی غزوے میں پیش آیا، اور بعد میں جو حالات بھی ہوئے...... بہرحال اس طرح سے اس نے انصار اور مہاجرین کو آپس میں لڑانے اور بہکانے کی کوشش کی تاکہ یہ اختلاف پیدا ہوجائے، اور اختلاف پیدا ہونے کے بعد مہاجرین مدینہ منورہ چھوڑ کر چلے جائیں، جس طرح سے میں پہلے بنی خزرج کا سردار بننے والا تھا، مدینہ منورہ میں سرداری مجھے ملنے والی تھی، یہ پھر مجھے مل جائے گی...... اسی قسم کی اغراض ہوا کرتی ہیں ان لوگوں کی جو اس طرح سے درمیان میں فساد برپا کرتے ہیں،

---

(۱) دیکھیں بخاری ۲/۷۲۸، کتاب التفسیر، سورہ منافقون۔

یہ مشرکین کے ایجنٹ تھے اور یہود ان کے دوست تھے، اور انہی سے یہ ذہنیت اختیار کرتے تھے گڑبڑ کرنے کی اور اختلاف کرانے کی، یہ واقعہ بھی اسی غزوے میں پیش آیا۔

اس پر بھی بعد میں کنٹرول کرلیا گیا، سرورِ کائنات ﷺ کی تربیت اور تعلیم صحابہ ﷡ کو ایسی تھی کہ اگر چہ شیطان کے خلل انداز ہونے سے کبھی کسی کا قدم پھسلنے لگتا، لیکن حضور ﷺ کی تعلیم سے، تربیت سے، وعظ سے، نصیحت سے فوراً معاملے کو سنبھال لیا جاتا تھا۔ اس واقعے کی تفصیل عرض کرنا مقصود نہیں ہے، سورۂ منافقون میں آئے گی (ان شاء اللہ!)۔

سیّدہ عائشہ صدّیقہ ﷵ کا واقعہ

تیسرا واقعہ اسی غزوے میں یہ پیش آیا کہ سرورِ کائنات ﷺ سفر کرتے آرہے تھے، رات کو ایک جگہ پڑاؤ کیا، اور صبح کوچ کا اعلان کردیا، حضرت عائشہ صدیقہ ﷵ فرماتی ہیں کہ جب کوچ کا اعلان ہوا تو میں جلدی سے فارغ ہونے کے لئے قضائے حاجت کے لئے چلی گئی، کیونکہ یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ جب سفر شروع ہوجائے تو درمیان میں پیشاب وغیرہ کی تکلیف ہوتی ہے، آپ جس وقت سفر پہ جانے لگتے ہیں تو طریقہ یہی ہے کہ جانے سے پہلے قضائے حاجت سے فارغ ہونے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ بعد میں سفر میں رُکنا نہ پڑے اور تکلیف نہ ہو۔ حضرت عائشہ ﷵ چلی گئیں، تھیں اس وقت چھوٹی عمر کی، ہلکا پھلکا وجود تھا، اور پردے کے اَحکام آچکے تھے، اور ''ہودج'' جس میں حضرت عائشہ ﷵ سوار ہوا کرتی تھیں، اس کے سنبھالنے پر چار آدمی متعین تھے (''ہودج'' پردہ دار ڈولی کی شکل میں ہوتا ہے) پردے لٹکے ہوتے، حضرت عائشہ ﷵ اندر بیٹھی ہوتیں، چار آدمی اُٹھاتے، اُونٹ پہ رکھ کے باندھ کے اُونٹ کو اُٹھا کے چلتا کردیتے۔ حضرت عائشہ ﷵ کہتی ہیں کہ جب میں قضائے حاجت سے فارغ ہوئی تو میں نے اپنے گلے کو ہاتھ لگا کے دیکھا تو میرا ایک ہار تھا، وہ کہیں ٹوٹ کے گر گیا، تو میں کچھ اس کے تلاش کرنے میں مشغول ہوگئی، اتنے میں وہ آدمی آئے، انہوں نے ہودج اُونٹ پہ رکھا، باندھا اور قافلہ چل دیا، ان کو یہ خیال ہی نہ آیا کہ یہ خالی ہے، کیونکہ میں ہلکی پھلکی تھی، میرا کوئی وزن خاص محسوس نہیں ہوتا تھا، وہ یہ سمجھے کہ اندر بیٹھی ہیں اور اُٹھا کے اُونٹ کے اُوپر رکھ کے چل دیے...... اب آپ اس بات کا اندازہ نہیں کرسکتے کہ جہاں سفر پہاڑوں میں ہوتا ہے، جہاں نشیب وفراز زیادہ ہوا کرتا ہے، تو رات کو ایک دو آدمیوں کا چلنا وہاں مشکل ہوتا ہے، چند قدم چلے، پہاڑ کی گھاٹی آئی، کہیں اُترے، کہیں چل پڑے۔ تو یہ بہت مشکل معاملہ ہوا کرتا ہے، چند منٹوں کے بعد آدمی ایک دوسرے سے اس طرح غائب ہوجاتا ہے کہ پیچھا کرنا بسا اوقات مشکل ہوجاتا ہے پھر ہو بھی رات کا وقت عائشہ صدیقہ ﷵ کی عقل میں یہی بات آئی کہ میں پیچھے بھاگنے کی بجائے یہیں بیٹھی رہوں، آخر روشنی ہوگی، حضور جب ہودج کو خالی دیکھیں گے تو پیچھے دیکھنے کے لیے ہی آئیں گے، تو کوئی آئے گا اور مجھے ساتھ لے جائے گا، میں اکیلی ان کے پیچھے نہ جاؤں، ذہن میں کچھ اس طرح سے ہی بات آئی، اللہ کو کچھ ایسے ہی منظور تھا، چنانچہ وہ اپنی جگہ جا کر بیٹھ گئیں جہاں وہ پہلے ٹھہری ہوئی تھیں، اور رات کا وقت تھا، اور کچھ نیند کا غلبہ ہوگیا، تو وہیں پڑے پڑے سوگئیں ایک صحابی ہیں صفوان بن معطل ﷛، سرورِ کائنات ﷺ نے ان کی ڈیوٹی لگائی ہوئی تھی کہ یہ قافلے کے روانہ ہوجانے کے بعد جس وقت روشنی ہوجائے، دن چڑھ آئے تو

قافلے والی جگہ کو دیکھ بھال کے پھر پیچھے آیا کریں، تا کہ اگر کسی کو کوئی چیز بھول گئی ہو، اور رات کے کوچ کے وقت کوئی چیز رہ گئی ہو، تو وہ پیچھے سے سنبھالتے چلے آئیں، ان کی ڈیوٹی اس طرح سے لگی ہوئی تھی۔[1] اور بعض حضرات نے یہ بھی کہا کہ ان کو عادت تھی رات کے آخری حصے میں یہ سوتے تھے تو جلدی اُٹھ نہیں سکتے تھے، دیر سے اُٹھا کرتے تھے، تو ہوسکتا ہے قافلے میں یہ بھی کسی کونے میں سوئے پڑے رہ گئے ہوں، اور قافلے کی روانگی کے وقت نہ اُٹھ سکے ہوں، اور اپنی عادت کے مطابق دیر سے اُٹھے جب روشنی ہوچکی تھی، جب دیر سے اُٹھے اور جا رہے تھے تو دیکھا کہ ایک شخص پڑا ہوا ہے کوئی وجود پڑا ہوا دیکھا...... یا تو اس جگہ کو تلاش کرتے پھر رہے تھے کہ کسی کی کوئی چیز پڑی ہوئی ہو تو اس کو اُٹھا لیا جائے، یا ویسے گزرتے ہوئے نظر پڑ گئی، تو جس وقت ادھر کو بڑھے، تو اس وقت حضرت عائشہ ؓ کا نیند کی حالت میں منہ کھلا ہوا تھا، اور پردے کے اَحکام ابھی نئے نئے آئے تھے، اور اس نے پردے سے پہلے حضرت عائشہ صدیقہ ؓ کو دیکھا ہوا تھا، تو اس نے نظر ڈالتے ہی پہچان لیا کہ یہ تو اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ ؓ ہیں، تو فوراً زبان سے نکلا: ''اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ!'' یعنی افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہ یہ یہاں کیسے رہ گئیں۔ حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ اس کے اِسترجاع سے، ''اناللہ!'' پڑھنے سے میری آنکھ کھل گئی اور میں نے فوراً اپنا کپڑا ٹھیک کرلیا، اور وہ آیا، اور اس نے اُونٹ لا کے میرے پاس بٹھا دیا، اس کے گھٹنے کے اُوپر پاؤں رکھا، میں اُونٹ پر سوار ہوگئی، اس نے اُونٹ کی نکیل پکڑی، اور لے کے چل دیا، اور دوپہر کے وقت جس وقت کہ صحابہ کرام ؓ نزول کا ارادہ کر رہے تھے اس وقت ہم وہاں پہنچ گئے، اور حضرت عائشہ ؓ کہتی ہیں کہ اس سارے سفر میں میں نے سوائے اس کلمے کے جو اس نے ''اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ'' پڑھا تھا، میرے کان میں اس کی آواز تک نہیں آئی۔

رئیس المنافقین کی ایک اور سازش

جب وہاں پہنچے تو پہنچتے ہی وہ عبداللہ بن اُبَی پیچھے سے چڑا ہوا تو آ ہی رہا تھا، آپس میں جذبات تو بھڑکے ہوئے ہی تھے، تو اس نے یہ شوشہ چھوڑ دیا، کہنے لگا: لو جی! دیکھو! ان کا یہ حال ہے، یہ پیچھے رہ گئیں کسی نہ کسی بہانے سے، وہ بھی پیچھے رہ گیا، اور رات انہوں نے آپس میں اکٹھے گزاری ہے، اس طرح سے کرکرا کے اس نے ایک افسانہ بنالیا، افسانہ بنا کے شوشہ چھوڑ دیا۔ اور اس انداز کے ساتھ یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ بعض مخلص مؤمن بھی متاثر ہوگئے، جیسے طریقہ ہوتا ہے کہ ایک آدمی جس وقت جھوٹ بناتا ہے، اور اس کو خوب اچھی طرح سے سجا کر مزین کر کے پھیلاتا ہے، تو بعض لوگ جن کے دل دماغ کے اندر دوسرے کی بات کو قبول کرنے کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے وہ بسااوقات متاثر ہوجاتے ہیں۔ تو ان میں ایک حضرت مِسْطَح ؓ بھی تھے جو حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے رشتہ داروں میں سے تھے وہ بھی متاثر ہوگئے، یہ بدری صحابی ہیں مخلصین میں سے ہیں۔ حضرت حسان بن ثابت ؓ بھی تھے، حضور ﷺ کے درباری شاعر، جو حضور ﷺ کے دفاع میں شعر پڑھا کرتے تھے، نظمیں بنایا کرتے تھے یہ بھی متاثر

---

(1) یہ ڈیوٹی خود لگوائی تھی۔ دیکھیں: فتح الباری ۸/۳۶۱۔ سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ أَنْ يَجْعَلَهُ عَلَى السَّاقَةِ فَكَانَ إِذَا رَحَلَ النَّاسُ قَامَ يُصَلِّي ثُمَّ اتَّبَعَهُمْ فَمَنْ سَقَطَ لَهُ شَيْءٌ أَتَاهُ بِهِ.

ہو گئے۔ اور زینب بنتِ جحش ﷞ کی بہن حمنہ بنتِ جحش بھی متاثر ہو گئیں، اور ان باتوں کے پھیلانے میں انہوں نے بھی حصہ لیا، اور باقی صحابہ ﷡ جو تھے ان میں سے بعض تو بالکل ہی خاموش رہے اور بعض ایسے تھے جنہوں نے ان کے شدت کے ساتھ تردید کی، اور سرورِ کائنات ﷺ کے سامنے جس وقت یہ بات آئی تو آپ ﷺ نے اس کی پوری تحقیق شروع کی، اللہ کی طرف سے وحی نہیں آئی، کچھ دیر ہو گئی۔ حضرت عائشہ صدیقہ ﷞ کو کوئی خبر نہیں کہ میرے متعلق کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ مدینہ منورہ میں پہنچنے کے بعد حضرت عائشہ ﷞ کی طبیعت خراب ہو گئی، بیمار ہو گئیں۔

سیّدہ عائشہ صدّیقہ ﷞ کا واقعہ ان کی زبانی

خود اپنا واقعہ بیان کرتی ہیں کہ مجھے کوئی خبر نہیں تھی کہ باہر کیا آندھی چلی ہوئی ہے؟ اور کیا گرد اُڑی ہوئی ہے؟ بس میں ایک بات محسوس کرتی تھی کہ حضور ﷺ گھر میں تشریف لاتے ہیں تو جیسے پہلے محبت کی عادت تھی، پیار سے باتیں کرنے کی عادت تھی، خاص طور پر میرے بیمار ہونے کے زمانے میں جیسے حضور ﷺ دلچسپی لیا کرتے تھے اب وہ دلچسپی نہیں تھی، آتے، اور جو میرے پاس خدام ہوتے میری خدمت کرنے والے، ان سے پوچھ لیتے کہ اس کا کیا حال ہے؟ بس حال چال پوچھ کے چلے جاتے تھے، میرے پاس بیٹھتے نہیں تھے اور باتیں نہیں کرتے تھے۔ ایک مہینہ اسی طرح سے گزر گیا، بعد میں حضرت عائشہ ﷞ کہتی ہیں کہ میں ایک دفعہ رات کو عام عادت کے مطابق قضائے حاجت کے لئے باہر گئی، کیونکہ اس وقت تک ہمارا وہی پُرانا طریقہ تھا کہ رات کو عورتیں قضائے حاجت کے لئے باہر جاتی تھیں۔ تو میرے ساتھ مسطح کی ماں بھی تھی اُمِّ مسطح، چلتے چلتے اُمِ مسطح کا پاؤں کہیں اکھڑا، اور وہ گرنے لگیں، ٹھوکر لگی، تو ان کی زبان سے نکلا: "تَعِسَ مِسْطَحٌ!" مسطح برباد ہو جائے! مسطح غارت ہو جائے! اس قسم کے لفظ اس کی زبان سے نکلے تو حضرت عائشہ صدیقہ ﷞ نے فوراً انکار کیا کہ تُو نے بہت بُری بات کہی، ایسے شخص کو کوستی ہے جو بدر میں شریک ہوا؟ اور وہ اچھا آدمی ہے۔ تو ماں کی بات پر حضرت عائشہ ﷞ نے گرفت کی، اب ماں نے کہا کہ تجھے نہیں پتا کہ تیرے متعلق کیا باتیں ہو رہی ہیں؟ وہ کہنے لگیں کہ مجھے تو کوئی خبر نہیں ہے! تب اُمِّ مسطح نے خبر دی تو حضرت عائشہ صدیقہ ﷞ فرماتی ہیں کہ میرا تو خون ہی خشک ہو گیا، میں جو قضائے حاجت کے لئے جا رہی تھی میری تو حاجت بھی ختم ہو گئی، واپس آئی تو سوائے رونے کے کوئی کام نہیں تھا، حضور ﷺ گھر میں تشریف لائے، حسبِ عادت پوچھا کہ اس کا کیا حال ہے؟ تو حضرت عائشہ ﷞ پھر بولیں کہ یا رسول اللہ! مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنے والدین کے گھر چلی جاؤں، آپ ﷺ نے اجازت دے دی۔ حضرت عائشہ ﷞ فرماتی ہیں کہ والدین کے گھر میرے جانے کا مقصد یہ تھا کہ میں ان سے تحقیق کروں کہ یہ کیا بات ہے؟ وہاں گئیں، وہاں سے کچھ حالات کا پتا چلا تو سوائے رونے کے کوئی کام نہیں تھا، کتنی مدت گزر گئی وحی نہیں آئی، پھر آخر سرورِ کائنات ﷺ حضرت عائشہ ﷞ کے پاس جاتے ہیں، اور ہر طرح سے انہیں سمجھاتے ہیں کہ اگر اس قسم کی غلطی ہوئی ہے تو تُو بتا دے، اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا ہے، اور اگر نہیں ہوئی تو اللہ تعالیٰ تجھے بے گناہ قرار دے دے گا۔ تو حضرت عائشہ صدیقہ ﷞ نے اس وقت ایک ناز میں آ کر یہ کہا تھا کہ اب مجھ سے کیا پوچھتے ہو، تمہارے دلوں میں وسوسے تو اس بارے میں آ گئے، اب اگر میں کہہ دُوں کہ میں نے یہ کام کیا ہے،

اللہ جانتا ہے کہ میں جھوٹ بولوں گی، لیکن تم یقین کر لو گے، اور اگر میں کہوں کہ میں نے یہ کام نہیں کیا، تو تم کسی طرح یقین کرنے والے نہیں، اس لئے میں تو اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتی ہوں، اور اللہ تعالیٰ اس بارے میں ضرور کوئی نہ کوئی فیصلہ فرما دیں گے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس قول کا حوالہ دیا (''بخاری شریف'' میں یہ تین صفحے کی لمبی روایت ہے، سارا واقعہ اس میں مفصل ذکر کیا ہوا ہے) کہ میرا حال تو وہی ہے جو یوسف علیہ السلام کے اَبا کا تھا، جنہوں نے یہ کہا تھا کہ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ (سورۂ یوسف: ۱۸) جو کچھ تم کہتے ہو، اس کے خلاف اللہ سے ہی مدد طلب کی ہوئی ہے، فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ، میں تو صبرِ جمیل اختیار کروں گی، فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ اس آیت کا حوالہ دیا۔ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ابھی اسی گھر میں ہی تھے، باہر تشریف نہیں لائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُوپر وحی کے آثار شروع ہو گئے، جس وقت وحی کے آثار شروع ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جیسے حال ہوا کرتا تھا وہی ہوا، اس کے بعد انکشاف ہوا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مبارک باد دی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو، اور یہ آیات پڑھ کر سنائیں کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے بَری الذمہ قرار دے دیا، اور تیری پاک دامنی بیان کر دی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: ''وَاللّٰهِ مَا كُنْتُ اَظُنُّ اَنَّ اللّٰهَ مُنْزِلٌ فِيْ شَاْنِيْ وَحْيًا يُتْلٰى'' کہ میں اپنی شان اس لائق نہیں سمجھتی تھی کہ اللہ تعالیٰ کوئی ایسی آیات اُتار دے گا جو قیامت تک اس کتاب میں پڑھی جائیں گی، وحی جو متلو ہے، پڑھی جاتی ہے، کوئی ایسی وحی اُتاریں گے۔ میں زیادہ سے زیادہ یہ سمجھتی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی خواب آ جائے گا جس میں میری طہارت ان کے سامنے آ جائے گی، تو یہ اللہ نے احسان فرمایا۔ جب یہ آیات سامنے آئیں، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ماں نے کہا کہ اُٹھو! حضور کا شکریہ ادا کرو۔ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے کہا: میں ان کا کیوں شکریہ ادا کروں؟ میں تو اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کروں گی جس نے میرا یہ معاملہ صاف کیا۔[1] تو یہ واقعہ پیش آیا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق، اور یہ آیتیں جو اگلے دو رکوع کے اندر رکھی ہوئی ہیں، یہ اسی واقعے میں اُتری تھیں۔

اب اسی مناسبت سے یہاں زِنا کے اَحکام، اس کی سزا، اور اس کی افواہیں پھیلانے والے، یہ جتنے واقعات ہوا کرتے ہیں ان کے متعلق ہدایات ابتدائی آیات میں دی گئی ہیں، جن کا ترجمہ کل آپ کے سامنے کر دیا گیا تھا...... اب ان کو دوبارہ دیکھئے...... پہلے تو اس سورت کی عظمت کو ذِکر کیا کہ اس کو اُتارنے والے ہم ہیں۔ پھر ان کی حیثیت سفارشات کی نہیں بلکہ اَحکام کی ہے، ہم نے ہی ان کو متعین کیا، ان لفظوں کا مفہوم آپ کے سامنے ذکر کر دیا گیا تھا، اور پھر یہ کوئی پیچیدہ باتیں نہیں ہیں جو سمجھ میں نہ آئیں، بلکہ ان پر دلالت کرنے کے لیے واضح واضح آیات اُتار دیں، تا کہ کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا، یا اس میں کوئی پیچیدگی ہے، واضح آیات کے تحت اللہ نے ان کو بیان فرمایا ہے تا کہ تم یاد رکھو۔

زانی مرد اور زانیہ عورت کی شرعی سزا

آگے پہلے زانی کی سزا ذِکر کی ہے، کہ عورت ہو زِنا کرنے والی، یا مرد ہو زِنا کرنے والا، ان میں سے ہر ایک کے سو کوڑے لگایا کرو۔ قرآنِ کریم میں یہ آیت اسی طرح سے آئی ہے لیکن سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح فرمائی کہ اس سے

(۱) تفصیلِ واقعہ دیکھیں: بخاری ۱/ ۳۶۳ باب تعدیل النساء۔ ۲/ ۵۹۳ باب حدیث الافک۔ ۲/ ۷۲۶ کتاب التفسیر سورۃ المنافقون۔

غیر شادی شدہ مرد اور عورت مراد ہیں، شادی شدہ مرد اور عورت یعنی جن کا آپس میں نکاح ہوا ہو، نکاح ہونے کے بعد خاوند اور بیوی کو آپس میں ملنے کا موقع بھی مل گیا ہو، مباشرت کا ارتکاب ہو گیا ہو، اس کے بعد اگر کوئی شخص اس قسم کے فعل میں مبتلا پایا جائے تو اس کی سزا تواتر کے ساتھ قطعی طور پر ثابت ہے رَجم، جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو پتھر مار مار کر مار دیا جائے۔ اور حضور ﷺ کی وضاحت سے یہ ثابت ہوا کہ یہ سزا اس جوڑے کی ہے جو غیر شادی شدہ ہو، دونوں غیر شادی شدہ ہوں تو دونوں کی یہ سزا، دونوں شادی شدہ ہوں تو دونوں کی وہ سزا یعنی رَجم، اور اگر ان میں سے ایک شادی شدہ اور ایک غیر شادی شدہ ہو تو جو شادی شدہ ہے اس کی سزا رَجم، جو غیر شادی شدہ ہے اس کو سزا میں جَلد یعنی کوڑے مارے جائیں گے، یہ تفصیل احادیث میں آ گئی، اس لئے اس آیت کو خاص کیا جائے گا ان لوگوں کے ساتھ جو کہ شادی شدہ نہیں ہیں، ان کے سو کوڑے مارا کرو۔

مجرم پر ترس کھانا گویا جرم کی پرورش کرنا ہے

وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللهِ: اور اللہ کا قانون جاری کرنے کے لئے تمہارے دل میں ان کے اوپر کوئی شفقت یا رحم نہ آئے، یعنی سزا پوری پوری دو۔ کیونکہ یہ سزا دینا بھی عالمین کے لئے رحمت ہے، معاشرے کے لئے اللہ کی طرف سے ایک مہربانی ہے، کیونکہ اگر مجرم سے درگزر کیا جائے تو وہ جرم پھیلا کرتا ہے، مجرم کے اوپر ترس کھانے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس جرم کی پرورش کرتے ہیں، آج کل لوگ ان سزاؤں کو کہتے ہیں کہ یہ سزائیں نعوذ باللہ! وحشیانہ ہیں، لیکن ان کو یہ سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک مجرم کو یہ سزا دینے سے ان کو ترس آتا ہے، کہتے ہیں یہ سزا بہت سخت ہے، وحشیانہ ہے، لیکن جن لوگوں کی عزتیں لٹتی ہیں، جن کی بچیاں اِغوا ہوتی ہیں، جن کے گھروں میں یہ فساد برپا ہوتے ہیں، ان پر کوئی رحم نہیں آتا اور ان پر کوئی ترس نہیں آتا؟ چور کا ہاتھ کاٹنے سے لوگ کہتے ہیں کہ ڈر لگتا ہے، یہ تو بڑا ظلم ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹ دیا جائے، لیکن وہ یہ نہیں دیکھتے کہ جن کے مال لٹتے ہیں، جن کی زندگی بھر کی کمائی چور اُڑا کر لے جاتے ہیں، جن کا سونا رات کو ان چوروں نے حرام کر دیا ہے، ان پر کسی قسم کا ترس نہیں آتا؟ یہ تو وہی بات ہے جس طرح سے شیخ سعدی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''رحم کردن بر اَفعیٰ ظلم است بر بنی آدم'' جس شخص کو سانپ پر رحم آتا ہے کہ سانپ کو نہ مارو، آخر جان دار ہے، وہ سانپ پہ رحم کر رہا ہے اور بنی آدم پہ ظلم کر رہا ہے، تو بنی آدم پر ظلم تو گوارہ ہے لیکن سانپ پر رحم ہے سانپ پر شفقت ہے۔ یہی بات یہاں ہے کہ چور پر تو شفقت ہے لیکن جو شرفاء، اچھے لوگ، جو دِن رات ایک کر کے کماتے ہیں اور ان کے خون پسینے کی کمائی یہ رات کو جو مفت اُڑا کے لے جاتے ہیں، اور ان کو پیچھے روتا ہوا، چلاتا ہوا چھوڑ جاتے ہیں، ڈاکے ڈالتے ہیں، جان خطرے میں ڈالتے ہیں، ان پر کسی قسم کا رحم نہیں آتا؟ تو ساری مخلوق پر شفقت اسی میں ہے کہ مجرم کو معاف نہ کیا جائے، جتنی شفقت مجرم کے اوپر کی جائے گی اتنا معاشرہ زیادہ برباد ہوگا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ تاکید فرما دی کہ اس قانون کے جاری کرنے میں تمہارے دل میں کوئی کسی قسم کا رحم نہ آئے، بلکہ اللہ کی طرف سے رحمت یہی ہے کہ مجرم کو یہ سزا دی جائے، پھر چھپ چھپا کے نہ دی جائے، در پردہ نہ دی جائے، کیونکہ وہ سزا بھی اَخف ہو جاتی ہے جو علیحدگی میں دی جائے، علیحدگی میں کسی کے جوتے مار لو تو اتنا اثر نہیں ہوتا، اور مجمعِ عام میں ایک تھپڑ مار دو تو اثر بہت ہوتا ہے، اس لئے فرمایا کہ یہ سزا علی الاعلان دینی ہے، وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا

طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ان کی سزا کے وقت میں مومنوں کا ایک گروہ موجود ہونا چاہیے، اور سزا ان لوگوں کے سامنے دی جائے، تا کہ اس کی خوب اچھی طرح سے تشہیر ہو، اور تشہیر ہونے کے ساتھ باقی لوگوں کو عبرت حاصل ہو۔

زانی کو معاشرے میں کوئی مقام نہیں دینا چاہیے

آگے زنا کی مذمت ہے، کہ زانی مرد ہو یا زانیہ عورت، یہ معاشرے میں عزت کا مقام نہیں پا سکتے، شرفاء کو چاہیے کہ ان کے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہ رکھیں، ان کو نفرت کی نگاہ سے دیکھیں، معاشرے میں ان کو گرا دیا جائے، تا کہ ذہنی طور پر یہ بھی ایک سزا ہو، ہمارے ہاں مجرم لوگوں کو چونکہ اسی طرح سے عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، ہم ایک آدمی کو جانتے ہیں کہ یہ زانی ہے، پھر بھی ہم اس سے کوئی نفرت نہیں کرتے، ہم ایک آدمی کو جانتے ہیں کہ یہ آدمی شرابی ہے پھر بھی ہم اس سے اسی طرح احترام سے پیش آتے ہیں، اور ان کا اکرام احترام معاشرے میں ویسے ہی جاری رہتا ہے تو اس سے ان کی حوصلہ شکنی نہیں ہوتی۔ اور اگر مجرم کے ساتھ معاشرے میں حوصلہ شکنی کا معاملہ کیا جائے تب بھی بیماری کسی درجے تک بند ہو جایا کرتی ہے، آگے نہیں پھیلتی، اور یہاں یہی بات کہی جا رہی ہے کہ زانی مرد ہو یا عورت، یہ پرلے درجے کے کمینے اور رذیل ہیں، شریف لوگوں کو ان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہیے۔

زانیہ سے نکاح کا شرعی حکم

اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ: زانی نہیں نکاح کرے گا مگر زانیہ کے ساتھ یا مشرکہ کے ساتھ۔ اور زانیہ عورت، نہیں نکاح کرے گا اس زانیہ کے ساتھ مگر زانی یا مشرک۔ کیا مطلب؟ کہ یہ گندے لوگ گندے لوگوں کے لائق ہیں، کسی شریف آدمی کے لائق نہیں کہ کسی زانیہ عورت سے نکاح کرے، اور نہ کسی زانی آدمی کے ساتھ کسی شریف لڑکی کا نکاح کیا جائے۔ یہاں لَا يَنْكِحُ صورۃً خبر ہے، "زانی نہیں نکاح کرے گا" یعنی جب کرے گا زانیہ عورت سے کرے گا یا مشرکہ سے کرے گا، لیکن یہاں قابلیتِ فعل کو فعل کے درجے میں رکھ کے نفی کی جا رہی ہے، جیسے کہتے ہیں: "اَلسُّلْطَانُ لَا يَكْذِبُ" بادشاہ جھوٹ نہیں بولا کرتا، اس کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ کی شان اس لائق نہیں کہ وہ جھوٹ بولے، اس بات کو کہہ یوں ہی دیا کرتے ہیں کہ بادشاہ جھوٹ نہیں بولا کرتا۔ جس طرح سے آپ طالب علم کوئی گھٹیا قسم کی حرکت کریں، ہم سمجھاتے ہوئے کہیں کہ بھئی دیکھو! طالب علم ایسی حرکت نہیں کیا کرتے۔ تو اس میں واقعہ بیان کرنا مقصود نہیں ہوتا، کہ جو طالب علم ہوں واقعہ یہ ہے کہ وہ ایسی حرکت نہیں کرتے، حرکت تو آپ کیے بیٹھے ہیں، تبھی تو ہم آپ کو سمجھا رہے ہیں، لیکن یہ جو کہا جاتا ہے کہ "طالب علم ایسی حرکت نہیں کیا کرتے، دین حاصل کرنے والے ایسی حرکت نہیں کیا کرتے" اس کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ یہ ان کی شان کے لائق نہیں ہے، ان کو ایسی حرکت نہیں کرنی چاہیے، "نہیں کرنی چاہیے" اس قابلیتِ فعل کی نفی کو فعل کی نفی کے انداز میں ذکر کر دیا۔ جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ: "لَا يُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ وَاحِدٍ مَرَّتَيْنِ" "مومن ایک سوراخ سے دو دفعہ ڈنگ نہیں کھایا کرتا،"[1] جہاں سے ایک دفعہ وہ ڈسا جائے، ایک دفعہ کاٹا جائے، وہ دوبارہ

---

(۱) بخاری ۲/۹۰۵، باب لا یلدغ المؤمن۔ مشکوٰۃ ۲/۴۲۹، باب الحذر

وہاں اُنگلی نہیں ڈالا کرتا کہ دوبارہ کاٹا جائے، تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ مؤمن کو اتنا ہوشیار ہونا چاہیے کہ جہاں سے ایک دفعہ دھوکا کھالے، دوبارہ وہاں سے دھوکا نہ کھائے۔ تو یہ بات اسی انداز کی ہے کہ زانی، اگر اس کو نکاح کی ضرورت پیش آجائے تو یہ اس قابل نہیں ہے کہ کوئی شریف آدمی اپنی شریف بچی اسے دے، یہ جائے کسی زانیہ کے متھے لگے یا کسی مشرکہ کے متھے لگے، یہ ایک شریف گھرانے میں نکاح کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اور اگر کوئی عورت بدکارہ ہوجائے تو وہ بھی اس قابل ہے کہ کوئی شریف آدمی اس کے ساتھ تعلق پیدا نہ کرے، وہ کسی ایسے بدکار کے پاس یا کسی مشرک کے پاس جائے، یہ ان کی ذِلّت اور تحقیر کرنے کے لئے انداز اختیار کیا گیا ہے...... یہ علیحدہ بات ہے کہ مسلمان چاہے برائے نام ہی کیوں نہ ہو، مشرکہ سے اس کا نکاح نہیں ہوسکتا، اور مسلمان اگر زانیہ عورت سے نکاح کرلے، خود شریف ہی کیوں نہ ہو، اچھا ہی کیوں نہ ہو، نکاح ہوجاتا ہے۔ اسی طرح مشرکہ عورت اس قابل نہیں کہ کوئی مؤمن اس سے نکاح کرے، مؤمن کرے گا تو ہوگا ہی نہیں، لیکن زانیہ عورت کے ساتھ کوئی مسلمان نکاح کرلیتا ہے تو ہوجائے گا۔ شریف عورت کا نکاح کسی زانی سے کردیا جائے تو ہوجائے گا، اس مسئلے کی تفصیل علیحدہ ہے، یہاں وہ مسئلہ بیان کرنا مقصود نہیں، ان کی ذِلّت اور تحقیر کے لیے یہ انداز اختیار کیا گیا ہے کہ اگر کوئی مرد اس فعل کے اندر مبتلا ہوا اور اس نے زناکاری کی عادت بنالی، تمہیں پتا چل جائے کہ یہ بدکار ہے، تو کوئی شریف لڑکی اس کو نہیں دینی چاہیے، اس کو چاہیے کہ پھر ایسی ہی بدمعاش عورت کو اختیار کرے جیسے یہ خود ہے یعنی اس قابل ہے کہ اس کے متھے یا زانیہ عورت لگے یا مشرکہ۔ اور اگر کوئی عورت بدکار ہوجائے تو کوئی شریف آدمی اس کی طرف رجحان نہ کرے بلکہ یہ اگر لائق ہے تو ایسے لوگوں کے لائق ہے جو خود ایسے ہیں یا مشرک ہیں۔ یہ علیحدہ مسئلہ ہے کہ مشرک کے ساتھ نکاح نہیں ہوتا، زانی اور زانیہ کے ساتھ نکاح ہوسکتا ہے۔

زِنا اور شرک کو اکٹھا کیوں ذِکر کیا؟

باقی! ان دو کو یعنی زانی اور مشرک کو یہاں اکٹھا کردیا، اسی طرح زانیہ اور مشرکہ کو، ان دونوں کی بھی مناسبت آپ کے سامنے ہے، کہ مشرکہ اور مشرک شریعت کی نظر میں نہایت حقیر اور ذلیل لوگ ہیں، ایسے ہی زانی اور زانیہ، اور مزاج دونوں کا مشترک ہے، کہ ایک پر اِکتفاء کرنا ان کا مزاج نہیں ہے، جیسے زانیہ ہے وہ بھی ایک پر اِکتفاء نہیں کرتی، اور جس طرح سے زانی آدمی، وہ بھی حلال بیوی پہ اِکتفاء نہیں کرتا، تو مشرک کی عادت بھی یہی ہے کہ اللہ کا دروازہ چھوڑ کے کبھی کہیں دھکے کھاتا ہے، کبھی کہیں دھکے کھاتا ہے، تو زنا میں اور شرک میں ''بھی'' والا اشتراک ہے۔ اس کی بھی، اور اس کی بھی، اور اس کی بھی۔ اور توحید میں آپ جانتے ہیں کہ ''ہی'' ہے، وہ ایک ہی کا ہو کے رہ جاتا ہے، کسی دوسرے کا نہیں ہوتا۔ تو پاک دامن عورت ایسے ہے جیسے کوئی موحد ہو، اور زانیہ عورت ایسے ہے جیسے مشرکہ ہو، جیسے وہ ایک پر نہیں ٹکتے، جگہ بہ جگہ دھکے کھاتے ہیں، اسی طرح سے زانیہ بھی ایسے ہی ہے، تو شرک اور زنا دونوں کا مزاج ایک جیسا ہونے کی وجہ سے دونوں کو اکٹھا ذکر کردیا، اور مقصد دونوں کی تحقیر ہے۔ تو ''لا ینکح'' کا معنی ہے کہ اس لائق نہیں کہ یہ نکاح کرے، زانیہ عورت اس لائق نہیں کہ اس کے ساتھ کوئی شریف آدمی نکاح کرے۔

’’حُرِّمَ ذٰلِكَ‘‘ میں کون سی حُرمت مراد ہے؟

وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ: اس نکاح کو مؤمنین پر حرام کر دیا گیا ہے، یہاں حرام کرنے سے ممنوع ٹھہرانا مراد ہے، یعنی یہ مناسب نہیں ہے، ممنوع ہے، اس کی طرف رغبت نہیں ہونی چاہیے، یہ علیحدہ بات ہے کہ مشرکہ کے ساتھ نکاح کریں گے تو سرے سے ہوگا ہی نہیں، اور زانی سے نکاح کرے تو ہو جائے گا لیکن یہ پسندیدہ نہیں ہے، شریف آدمیوں کو کبھی ایسی چیزوں کی طرف رغبت نہیں ہوسکتی۔ ’’حرام‘‘ کا یہاں معنی ہے ’’ممنوع ہونا‘‘، یہ حرام شرعی نہیں ہے، حرام طبعی ہے، جس طرح سورۂ قصص (آیت:۱۲) کے اندر آئے گا: وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ، ہم نے موسیٰ علیہ السلام پر دودھ پلانے والی عورتوں کو حرام ٹھہرا دیا تھا، یعنی ان کی طرف موسیٰ علیہ السلام کی رغبت نہیں ہوتی تھی، یہ مطلب نہیں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اگر دودھ پی لیتے تو شرعی طور پر حرام تھا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی طبیعت ادھر مائل نہیں ہوتی تھی، ہم نے اس کو ممنوع ٹھہرا دیا تھا۔ اسی طرح جو مؤمنین کاملین ہیں وہ اس قسم کے نکاح کی طرف رغبت نہیں کر سکتے، یہ نکاح ان کے اوپر حرام کر دیا گیا، اس میں قباحت آ گئی کہ معاشرے میں زانی مرد اور زانیہ عورت دونوں کا مقام گرا ہوا ہونا چاہیے، اور کسی شریفانہ ماحول میں ان کی گنجائش نہ ہو، ان کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے، جب یہ معاملہ کیا جائے گا تو آپ جانتے ہیں کہ مرض کو ختم کرنے کے لئے اور جرم کو مٹانے کے لئے یہ طریقہ بھی کارگر ہے۔

’’حدِ قذف‘‘

آگے یہ بات آ گئی کہ زنا ہے تو بہت بڑا جرم، سزا بھی اس کے اوپر سخت ہونی چاہیے، لیکن بلا وجہ کسی کے اُوپر تہمت لگانا جب کہ ثبوت نہ ہو تو یہ بھی اسی طرح سے جرم ہے، کیونکہ جرم صادر نہ ہوا ہو، اور اپنی طرف سے اس کے اُوپر تہمت لگا دی جائے، اور اس کی نشر و اشاعت کی جائے، اس کے ساتھ بھی جرم بڑھتا ہے، اس لیے آگے تہمت لگانے کو جرم قرار دیا گیا۔ جو لوگ پاک دامن عورتوں پہ تہمت لگاتے ہیں اور پھر چار گواہ نہیں لاتے، انہیں اَسّی (۸۰) دُرّے لگایا کرو، اور آئندہ کبھی بھی ان کی شہادت قبول نہ کیا کرو، اور یہ لوگ فاسق ہیں، مگر جو توبہ کر لیں اس کے بعد اور اپنے حالات کی اصلاح کر لیں، تو بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے۔ ان مسائل کی تفصیل فقہ میں ہے، سارے مسئلے یہاں ذکر نہیں کیے جا سکتے، تہمت لگانے سے یہاں زنا کی تہمت لگانا مراد ہے، محصنت سے مراد ہیں پاک دامن عورتیں جو اس فعل میں بدنام نہیں۔ جو اس فعل میں بدنام ہوں، جن کے اُوپر کبھی زنا کی سزا جاری ہو چکی ہو، رُسوا قسم کی عورتیں ہوں، ان پر اگر کوئی تہمت لگائے تو اس پر حدِ قذف نہیں لگا کرتی، کوئی اور سزا جو چاہے ہو جائے......اور پھر جس پر تہمت لگائی جائے اس کی طرف سے مطالبہ ضروری ہے، قاضی کی عدالت میں جا کے دعویٰ کرے، قاضی اس تہمت لگانے والے سے ثبوت مانگے گا، اگر وہ ثبوت نہ دے سکے، تو اس پر حدِ قذف جاری ہو جائے گی، جسے تہمت کی حد کہا جاتا ہے یہ اَسّی (۸۰) دُرّے ہیں۔ اور اس سزا کے جاری ہونے کے بعد پھر دو چیزیں اور ذکر کی گئی ہیں کہ ہمیشہ کے لئے مردود الشہادۃ ہیں، اور یہ لوگ فاسق ہیں۔

''محدود فی القذف'' کی گواہی کا حکم

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا جس طرح کل آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ اَحناف کے نزدیک اس کا تعلق اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ کے ساتھ ہے، فسق مرتفع ہو جائے گا، قبولیتِ شہادت کی نفی ہمیشہ کے لیے ہے، ان کی گواہی کبھی بھی نہیں قبول کی جائے گی چاہے توبہ بھی کیوں نہ کرلیں، اور بعض ائمہ کے نزدیک اس کا تعلق دونوں سے ہے کہ جب یہ توبہ کرلیں اور توبہ کے بعد اپنے حالات کی اصلاح کرلیں تو پھر ان کی شہادت بھی قبول کی جاسکتی ہے۔

''لعان'' کی تفصیل

آگے اسی تہمت کے سلسلے میں خصوصی جزئیہ ذکر کیا کہ عام آدمی کسی عام عورت پر تہمت لگائے تو مسئلہ وہی ہے جو اُوپر ذکر کردیا گیا، لیکن خاوند بیوی کا معاملہ اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ عام آدمی کسی عورت کو اس فعل میں مبتلا دیکھ لے تو خاموش بھی رہ جائے تو کوئی حرج نہیں ہے، لیکن خاوند کے لئے بیوی کا معاملہ برداشت کرنا بہت مشکل ہوتا ہے، پھر چار گواہ دستیاب ہونے بہت مشکل ہیں، اس لئے ان میں اتنی رعایت رکھی گئی ہے کہ اگر تہمت لگانے والا اس عورت کا خاوند ہے تو پھر یہ عورت اور مرد دونوں قاضی کے سامنے پیش ہوں گے، پیش ہونے کے بعد پھر یہ لعان کریں گے، یہ جو آگے عمل ذکر کیا گیا ہے اس کو فقہی اِصطلاح میں ''لعان'' کہتے ہیں، ''لعان'' کا معنی ہے ایک دوسرے کے مقابلے میں لعنت کرنا۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ قاضی پہلے تو خاوند سے پوچھے گا کہ تُو جو اپنی بیوی پر تہمت لگاتا ہے، تو تیرے پاس چار گواہ ہیں؟ وہ کہے گا کہ نہیں۔ تو پھر اس کو پانچ قسمیں دی جائیں گی، اللہ تعالیٰ کا نام لے کر قسم اُٹھا کے اپنے متعلق وہ کہے گا کہ اللہ گواہ ہے کہ میں سچوں میں سے ہوں، چار قسمیں تو اس طرح اُٹھائے گا، پانچویں قسم میں کہے گا کہ اللہ کی لعنت ہو مجھ پہ اگر میں جھوٹ بولنے والوں میں سے ہوں۔ یہ پانچ قسمیں جو اس نے اُٹھائی ہیں، یہ حدِ قذف کے قائم مقام ہیں، ان پانچ قسموں کے اُٹھانے کے بعد اس خاوند پر حدِ قذف نہیں آئے گی۔ اب اس کے قسموں کے کھانے کے بعد پھر بیوی سے مطالبہ کیا جائے گا، یا تو وہ اِقرار کرلے، اِقرار کرلے گی تو معاملہ صاف ہوگیا، اور اگر وہ انکار کرے تو انکار کرنے کے بعد اسے بھی پانچ قسمیں اُٹھانے کے لیے کہا جائے گا، اور وہ پانچ قسمیں جو اُٹھائے گی وہ حدِ زنا کے قائم مقام ہو جائیں گی، اس لئے یہ لفظ آیا کہ یہ پانچ قسمیں اُٹھانا اس سے عذاب دُور ہٹ جائے گا۔ اور وہ پانچ قسمیں اس طرح سے اُٹھائے گی، پہلے تو وہ چار قسمیں اُٹھائے گی کہ یہ جھوٹا ہے، میرے اُوپر تہمت لگا رہا ہے، میں نے یہ فعل نہیں کیا، اور پانچویں قسم اس طرح اُٹھائے گی کہ اللہ کا غضب ہو اس عورت پر (یعنی مجھ پر) اگر یہ خاوند سچوں میں سے ہو۔ جب پانچ قسمیں اُٹھالے گی تو اَب نہ تو خاوند کے اُوپر حدِ قذف آئے گی، اور نہ ہی بیوی کے اُوپر حدِ زنا آئے گی، معاملہ اسی طرح سے خلط ملط سا ہوگیا۔

نتیجہ اس کا یہ نکلے گا کہ یہ خاوند بیوی آپس میں اکٹھے نہیں رہ سکتے، یا تو خاوند طلاق دے دے، ورنہ حاکم تفریق کردے گا، یہ دونوں بعد میں اکٹھے نہیں رہ سکتے، ہمیشہ کے لئے ان میں انقطاع ہوگیا۔ البتہ جو بچہ پیدا ہوگا وہ عورت کی طرف منسوب ہوگا، باپ کی طرف منسوب نہیں ہوگا، اس کی نسبت ماں کی طرف ہوگی، لیکن ہم اس کو حرام زادہ بھی نہیں کہہ سکیں گے، کیونکہ اس میں نہ تو یہ

پتا چلا ہے کہ خاوند جھوٹا ہے اور نہ یہ پتا چلا ہے کہ بیوی جھوٹی ہے، اس میں دونوں احتمال ہیں۔ باپ کی طرف بچے کی نسبت اس لیے نہیں کریں گے، کیونکہ اس نے کہہ دیا ہے یہ دوسرے کا فعل ہے۔ لیکن ہم اس کو حرام زادہ بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ ماں نے قسمیں کھالیں کہ میں نے کوئی اور حرکت نہیں کی، تو نسبت اس کی ماں کی طرف کریں گے لیکن اس کو حرام زادہ کہنا ٹھیک نہیں، اور اس عورت کو زانیہ کہنا بھی ٹھیک نہیں، کیونکہ معاملہ صاف نہیں ہوا بلکہ یہ اندھیر میں رہ گیا۔ لیکن یہ ہوا کہ خاوند کی پانچ قسمیں حدِ قذف کے قائم مقام ہوگئیں، اور بیوی کی پانچ قسمیں حدِ زنا کے قائم مقام ہوگئیں، اس طرح سے دونوں کا معاملہ طے کر دیا گیا، آخری آیات میں یہی مسئلہ ذکر کیا گیا ہے؛ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ أَنْ تَشْهَدَ أَرْبَعَ شَهٰدٰتٍ بِاللّٰهِ: أَنْ تَشْهَدَ یہ يَدْرَؤُا کا فاعل ہے، دُور ہٹادے گا اس عورت سے عذاب کو اس عورت کا گواہیاں دینا، تو چار گواہیاں اللہ کے نام کے ساتھ دے کہ یہ خاوند جھوٹوں میں سے ہے اور پانچویں میں یوں کہے کہ اللہ کا غضب ہو اس عورت پر (یعنی مجھ پر) اگر یہ خاوند سچوں میں سے ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ جو قانون بنادیا ہے، اس میں دونوں فریقوں کی رعایت رکھ لی، اگر خاوند پہ اعتبار کرلیا جاتا تو ممکن ہے کہ خاوند جھوٹ بول دیتا اور بلاوجہ عورت پہ سختی ہوجاتی، اور اگر عورت پر اعتبار کرلیا جاتا تو ہوسکتا ہے خاوند سچا ہو، بلاوجہ اس پر حدِ قذف لگ جاتی، لیکن یہاں اللہ نے قاعدہ اور قانون ایسا بنادیا جس میں دونوں کی رعایت رہے گی، اسی کو آخری الفاظ میں ذکر کیا کہ اگر اللہ کا فضل تم پر نہ ہوتا اور اس کی رحمت نہ ہوتی، اور اللہ توّاب رحیم نہ ہوتا تو تم سختی میں پڑ جاتے، یا تمہارے ساتھ معاملہ سختی کا ہوتا۔ اس طرح سے اس معاملے کو صاف کر دیا گیا...... آگے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا وہ واقعہ شروع ہو رہا ہے جو آپ کی خدمت میں ذکر کیا گیا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ؕ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ؕ بَلْ هُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ ؕ
بے شک وہ لوگ جو جھوٹ لائے وہ تم میں سے ایک چھوٹی سی جماعت ہے، اس کو اپنے لئے تم بُرا نہ سمجھو بلکہ یہ تمہارے لئے بہتر ہے،
لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ وَالَّذِیْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ
ان میں سے ہر شخص کے لئے وہ گناہ ہے جو اس نے کمایا اور وہ شخص جو اس کے بڑے حصے کا متولی ہوا ان میں سے، اس کے لئے
عَذَابٌ عَظِیْمٌ ⑪ لَوْلَاۤ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَیْرًا ۙ
بڑا عذاب ہے ⑪ جب تم نے یہ بات سنی تھی تو کیوں نہ گمان کیا مؤمن مردوں نے اور مؤمن عورتوں نے اپنے لوگوں کے متعلق بھلائی کا؟
وَّقَالُوْا هٰذَاۤ اِفْكٌ مُّبِیْنٌ ⑫ لَوْلَا جَآءُوْ عَلَیْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ یَاْتُوْا
اور کیوں نہ کہا کہ یہ صریح جھوٹ ہے ⑫ کیوں نہیں لائے یہ لوگ اس بات کے اوپر چار گواہ؟ پھر جب یہ نہیں لائے

بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ

گواہ پس اللہ کے نزدیک یہ لوگ جھوٹے ہیں ﴿۱۳﴾ اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور اس کی رحمت

فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِیْ مَآ اَفَضْتُمْ فِیْهِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۴﴾ اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ

دنیا اور آخرت میں، البتہ پہنچتا تمہیں عذابِ عظیم ان باتوں کی وجہ سے جن میں تم لگ گئے تھے ﴿۱۴﴾ جبکہ تم لے رہے تھے اس بات کو

بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَیْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَیِّنًا ۖ

اپنی زبانوں کے ساتھ، اور بول رہے تھے تم اپنے مونہوں کے ساتھ ایسی باتیں جن کے متعلق تمہیں کوئی علم نہیں، اور تم سمجھتے تھے اسے ہلکی بات

وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِیْمٌ ﴿۱۵﴾ وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا یَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ

اور وہ اللہ کے نزدیک بہت بڑی ہے ﴿۱۵﴾ جب تم نے یہ بات سنی تھی تو تم نے کیوں نہ کہا کہ نہیں ہے ہمارے لئے کہ ہم کلام کریں

بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۶﴾ یَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا

اس بات کے ساتھ، سبحان اللہ! یہ تو بہت بڑا بہتان ہے ﴿۱۶﴾ اللہ تعالیٰ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نہ لوٹو اس قسم کی بات کی طرف کبھی بھی

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۷﴾ وَیُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ ﴿۱۸﴾ اِنَّ

اگر تم ایمان والے ہو ﴿۱۷﴾ اور بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آیات اور اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے ﴿۱۸﴾ بے شک

الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۙ فِی

وہ لوگ جو پسند کرتے ہیں کہ فاحشہ پھیل جائے ان لوگوں میں جو ایمان لائے، ان کے لئے عذابِ الیم ہے

الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ

دنیا میں اور آخرت میں، اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ﴿۱۹﴾ اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر

وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۲۰﴾

اور نہ ہوتی اللہ کی رحمت، اور یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ رؤف رحیم ہے (تو تم عذاب میں مبتلا ہو جاتے) ﴿۲۰﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق بعض الالفاظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ: بے شک وہ لوگ جو جھوٹ لائے، تم میں سے ایک

چھوٹی سی جماعت ہے، لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ اس کو اپنے لئے تم برا نہ سمجھو، بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ بلکہ یہ تمہارے لئے بہتر ہے یعنی اس افک کا لگنا نتیجۃً تمہارے لئے بہتر ثابت ہوا، قطعی طور پر صفائی آ گئی، اللہ تعالیٰ نے ہدایات دے دیں، خفیہ قسم کے دشمن پہچان لیے گئے، اور اس صدمہ پہنچنے کی وجہ سے آخرت میں اللہ تعالیٰ ثواب دے گا۔ اور نتیجۃً برا یہ انہی کے حق میں ہوا جو اس قسم کا جھوٹ لائے ہیں۔ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ: ان میں سے ہر شخص کے لئے وہ گناہ ہے جو اس نے کمایا، مِنَ الْاِثْمِ یہ مَا کا بیان ہے یعنی ان بہتان لگانے والوں میں سے جس شخص نے جتنا گناہ کمایا وہ اس کے حصے میں آیا۔ وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ: اور وہ شخص جو اس کے بڑے حصے کا متولی ہوا ان میں سے، اس کے لیے بڑا عذاب ہے۔ لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ: لَوْلَآ کا تعلق ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ کے ساتھ ہے۔ جب تم نے یہ بات سنی تھی تو کیوں نہ گمان کیا مؤمن مردوں نے اور مؤمن عورتوں نے اپنے لوگوں کے متعلق بھلائی کا، اور کیوں نہ کہا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ یہ صریح جھوٹ ہے یعنی سنتے ہی تم یوں کہہ دیتے هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ، اور اپنے لوگ یعنی مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، ان کے متعلق تمہیں اچھا سوچنا چاہیے تھا، اچھا گمان رکھنا چاہیے تھا۔ لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ: کیوں نہیں لائے یہ لوگ اس بات کے اوپر چار گواہ۔ جس طرح سے آپ کے سامنے پہلے رکوع میں گزرا کہ کسی پر زنا کا ثبوت دینے کے لئے چار گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے، فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ پھر جب یہ نہیں لائے گواہ، فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ پس اللہ کے نزدیک یہ لوگ جھوٹے ہیں، اللہ کے نزدیک جھوٹے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے قانون میں جھوٹے ہیں۔ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ: اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور اس کی رحمت دنیا اور آخرت میں لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ: عَذَابٌ عَظِيْمٌ یہ "مَسّ" کا فاعل ہے، البتہ پہنچتا تمہیں عذاب عظیم ان باتوں کی وجہ سے جن میں تم لگ گئے تھے، جن میں تم شروع ہو گئے تھے، اَفَاضَ فِی الحدیث کا معنی ہوتا ہے کسی بات میں دلچسپی لے کے اس میں مشغول ہو جانا۔ جن باتوں میں تم مشغول ہو گئے تھے ان کی وجہ سے تمہیں عذاب عظیم پہنچتا۔ اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ: جبکہ تم لے رہے تھے اس بات کو اپنی زبانوں کے ساتھ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ: اور بول رہے تھے تم اپنے مونہوں کے ساتھ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ: ایسی باتیں جن کے متعلق تمہیں کوئی کسی قسم کا علم نہیں، وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا اور تم سمجھتے تھے اسے آسان بات، ہلکی بات، وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ: اور وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بڑی ہے۔ وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ یہاں بھی لَوْلَآ کا تعلق قُلْتُمْ کے ساتھ ہے۔ جب تم نے یہ بات سنی تھی تو تم نے کیوں نہ کہا مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا: نہیں ہے ہمارے لئے کہ ہم کلام کریں اس بات کے ساتھ، تکلم کریں اس کے ساتھ، بولیں اس کے ساتھ یعنی یہ بات ہم اپنی زبان پر لائیں ہمارے لیے یہ مناسب نہیں، سُبْحٰنَكَ یہ تعجب کی جگہ میں ہے، اس موقع پر سبحان اللہ جو کہا جاتا ہے وہاں کوئی لفظی معنی مراد نہیں ہوا کرتا، مقام تعجب میں انسان تعجب کا اظہار سبحان اللہ کہہ کے کرتا ہے، هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ: سبحان اللہ یہ تو صریح بہتان ہے، تمہیں یوں کہنا چاہیے تھا کہ بہت بڑا بہتان ہے، بہتان جھوٹی بات کو بھی کہتے ہیں۔ يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ: اَنْ تَعُوْدُوْا اَیْ لِئَلَّا تَعُوْدُوْا، اللہ تعالیٰ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نہ لوٹو اس قسم کی بات کی طرف کبھی بھی، اگر تم ایمان والے ہو تو ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ مؤمنین کے متعلق حسن ظن رکھا کرو، اور مؤمنین کے متعلق بدگمانی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے، جس وقت تک کوئی صریح

دلیل نہ آجائے اس وقت تک لوگوں کے متعلق اچھا خیال رکھو۔ وَيُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ الخ: اور بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آیات اور اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: بے شک وہ لوگ جو پسند کرتے ہیں کہ فاحشہ پھیل جائے ان لوگوں میں جو ایمان لائے، جو مومنوں میں فاحشہ کی اشاعت چاہتے ہیں، فاحشہ کی اشاعت چاہنے کا مطلب یہ ہے کہ بے حیائی کی خبریں مشہور کرتے ہیں، کیونکہ بے حیائی کی خبروں کا مشہور کرنا بے حیائی کو عام کرنے کا ایک ذریعہ بنتا ہے، جس وقت اس قسم کی خبریں عام ہو جائیں تو گناہ کی نفرت دل ودماغ سے نکل جاتی ہے، اور باتیں سنتے سنتے خود انسان کی طبیعت میں اس قسم کے کاموں کی رغبت پیدا ہوتی ہے۔ بے شک جو لوگ چاہتے ہیں کہ پھیل جائے بے حیائی ان لوگوں میں جو ایمان لائے، لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ: ان کے لئے عذابِ الیم ہے دنیا میں اور آخرت میں۔ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الخ: اللہ تعالیٰ جانتا ہے ان لوگوں کے بے گناہ ہونے کو وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ: اور تم نہیں جانتے ان کے گناہ گار ہونے کو (جلالین)، یعنی اللہ تعالیٰ ان کے بے گناہ ہونے کو جانتا ہے اور تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، یا مطلب یہ ہے کہ اس قسم کی باتیں مشہور کرنے میں جو خرابیاں ہیں تم ان کو تفصیل کے ساتھ نہیں جانتے، اللہ جانتا ہے۔ اور اس قسم کی باتیں مشہور کرنے پر جو آخرت میں عذاب ہوگا اس کی تفصیل تم نہیں جانتے، اللہ جانتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے بیان پر اعتماد کرتے ہوئے تمہیں اس قسم کی بے حیائی کی باتیں مشہور کرنے سے بچنا چاہیے۔ اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور نہ ہوتی اللہ کی رحمت اور یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ رؤف رحیم ہے تو تم عذاب میں مبتلا ہو جاتے، سختی میں پڑ جاتے، یا اللہ تعالیٰ تمہیں جلدی عذاب دیتا ان باتوں کی وجہ سے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ

اے ایمان والو! شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو، جو کوئی شیطان کے نقشِ قدم کی اتباع کرے گا پس بے شک وہ شیطان

يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ

حکم دیتا ہے بے حیائی اور منکر کا، اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تو تم میں سے کوئی بھی کبھی

مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۱﴾ وَلَا يَاْتَلِ

پاک نہ ہوتا لیکن اللہ پاک کرتا ہے جس کو چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے ﴿۲۱﴾ اور تم میں سے فضل والے

اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْۤا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ

وسعت والے قسم نہ کھائیں اس بات سے کہ دیں وہ رشتہ داروں کو اور مسکینوں کو اور اللہ کے راستے میں ہجرت

فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ

کرنے والوں کو، چاہیے کہ وہ معاف کریں اور درگزر کریں، کیا تم چاہتے نہیں ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بخش دے؟ اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا

رَّحِيمٌ ﴿۲۲﴾ إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ لُعِنُوا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ

رحم کرنے والا ہے ﴿۲۲﴾ بے شک وہ لوگ جو تہمتیں لگاتے ہیں پاک دامن بھولی بھالی ایمان والی عورتوں پر، ان پر لعنت ہے دنیا اور آخرت میں

وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۲۳﴾ يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم بِمَا كَانُوا

اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے ﴿۲۳﴾ جس دن کہ گواہی دیں گی ان پر ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان کاموں کی جو

يَعْمَلُونَ ﴿۲۴﴾ يَوْمَئِذٍ يُوَفِّيهِمُ اللَّهُ دِينَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِينُ ﴿۲۵﴾

یہ کیا کرتے تھے ﴿۲۴﴾ اس دن اللہ پورا پورا دے گا ان کو ان کا ٹھیک ٹھیک بدلہ، اور یہ لوگ جان لیں گے کہ بے شک اللہ ہی سچا ہے، واضح کرنے والا ہے ﴿۲۵﴾

الْخَبِيثَاتُ لِلْخَبِيثِينَ وَالْخَبِيثُونَ لِلْخَبِيثَاتِ ۖ وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ وَ

خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لائق ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لائق ہیں، پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لائق ہیں اور

الطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ ۚ أُولَٰئِكَ مُبَرَّءُونَ مِمَّا يَقُولُونَ ۖ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿۲۶﴾

پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لائق ہیں، یہ لوگ لاتعلق ہیں ان باتوں سے جو یہ بولتے ہیں، ان کے لئے بخشش ہے اور عزت کی روزی ہے ﴿۲۶﴾

تفسیر

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ: اے ایمان والو! شیطان کے خطوات کی اتباع نہ کرو، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو، شیطان کے قدم بقدم نہ چلو، کیونکہ خطوۃ اس مقدار کو کہتے ہیں جو دو قدموں کے درمیان میں ہوتی ہے، آپ اپنے قدموں میں اتنی ہی مقدار رکھیں، جتنی آپ سے آگے چلنے والا قدموں میں فاصلہ رکھتا ہے، تو اس کا مطلب ہوگا کہ آپ کی چال اس کی چال کے مطابق ہوگئی، یہ کنایہ ہوتا ہے کامل اتباع سے، شیطان کی اتباع نہ کرو، اس کے قدم بہ قدم نہ چلو، اس کے نقش قدم پر نہ چلو۔ جو کوئی شیطان کے نقش قدم کی اتباع کرے گا پس بے شک وہ شیطان حکم دیتا ہے بے حیائی کا اور منکر کا۔ اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور اس کی رحمت تو تم میں سے کوئی بھی کبھی پاک نہ ہوتا، یعنی اگر کسی سے کوئی گناہ صادر ہو جاتا تو اس کے ازالے کی کوئی صورت نہ ہوتی لیکن یہ اللہ کا فضل اور رحمت ہے کہ اس نے توبہ کا دروازہ کھول دیا،

توبہ کا طریقہ متعین کر دیا، اس لیے اگر کسی سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے، وہ توبہ کرلے تو پاک صاف ہو جائے گا۔ لیکن اللہ پاک کرتا ہے جس کو چاہتا ہے، اور اللہ تعالیٰ سننے والا ہے جاننے والا ہے۔

''وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ'' کا شانِ نزول

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ: یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اس قسم کی وجہ سے اتری تھی کہ انہوں نے قسم کھائی تھی کہ میں مسطح پر خرچ نہیں کروں گا، اور مسطح حضرت ابوبکر کے قریبی رشتہ دار بھی تھے، مہاجر بھی تھے، مسکین بھی تھے، اور حضرت مسطح رضی اللہ عنہ بدری ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہاں تلقین کی کہ فضیلت والوں کو اور وسعت والوں کو یہ قسم نہیں کھانی چاہیے، تم میں سے فضل والے اور وسعت والے قسم نہ کھائیں، یعنی قسم کھانی ہی نہیں چاہیے جس میں اشارہ ہے کہ اگر کھالی ہو تو توڑ دی جائے، اس بات سے قسم نہیں کھانی چاہیے کہ دیں وہ رشتہ داروں کو اور مسکینوں کو اور اللہ کے راستے میں ہجرت کرنے والوں کو، چاہیے کہ وہ معاف کریں اور درگزر کریں۔ کیا تم چاہتے نہیں ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بخش دے؟ اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ آیت سُن کر کہا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ مجھے بخش دیا جائے، تو جس سے پھر یہی جذبہ ان کے دِل میں اُبھرا کہ مسطح کی غلطی بھی معاف کر دی،[1] اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وظیفہ بھی دوگنا کر دیا (آلوسی)۔

جھوٹی تہمت لگانے والوں کا انجام

اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ: بے شک وہ لوگ جو تہمتیں لگاتے ہیں پاک دامن عورتوں پر الْغٰفِلٰتِ: بھولی بھالی، جو اس قسم کے بُرے کاموں سے غافل ہیں، ان کے دل دماغ میں اس قسم کے تعیش کا کبھی تصور بھی نہیں آتا الْمُؤْمِنٰتِ: ایمان لانے والی ہیں، ایسے لوگ دنیا اور آخرت میں ملعون ہوئے، ان کے اوپر لعنت ہے دنیا اور آخرت میں۔ ''لعنت'' کا معنی ہوتا ہے اللہ کی رحمت سے محرومی، تو یہ لوگ دنیا میں بھی اللہ کی رحمت سے محروم اور آخرت میں بھی محروم، وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ: ان کے لئے بڑا عذاب ہے، يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ: جس دِن کہ گواہی دیں گی ان پر ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان کاموں کی جو یہ کیا کرتے تھے، جس دِن ایسا ہوگا اللہ تعالیٰ پورا پورا دے گا ان کو ان کا ٹھیک ٹھیک بدلہ، دِيْنَهُمُ الْحَقَّ دین یہاں بدلے اور جزا کے معنی میں ہے، وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ اور یہ لوگ جان لیں گے کہ بے شک اللہ ہی سچا ہے، اور حق اور باطل کو خوب اچھی طرح سے واضح کرنے والا ہے۔

نبی کی بیوی کافرہ ہوسکتی ہے، زانیہ نہیں ہوسکتی

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ: خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لائق ہیں وہ کسی شریف آدمی کے لائق نہیں ہوتیں، اور خبیث مرد

(۱) قَالَ اَبُوْبَكْرٍ الصِّدِّيْقُ بَلٰى وَاللّٰهِ اِنِّيْ لَاُحِبُّ اَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ لِيْ فَرَجَعَ اِلٰى مِسْطَحٍ النَّفَقَةَ الَّتِيْ كَانَ يُنْفِقُ عَلَيْهِ. بخاری ۵۹۶/۲، باب حدیث الافک

خبیث عورتوں کے لائق ہیں وہ کسی شریف عورت کے قابل نہیں ہوتے، پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لائق ہیں، اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لائق ہیں، ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ دوسرا مقدمہ یہ ہوا کہ حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ہر وہ چیز دی ہے جو ان کی شان کے لائق ہے، تو جب آپ طیب ہیں تو آپ کی شان کے لائق بھی طیبہ ہی ہے، لہٰذا جو بیوی آپ کے لئے تجویز کی گئی وہ خبیثہ نہیں ہوسکتی، وہ طیبہ ہی ہے۔ اسی طرح سے انبیاء ﷺ کا پورا گروہ طیبین کا مصداق ہوتا ہے، تو ان کی ازواج کبھی خبیثہ نہیں ہوسکتیں، یعنی بدکارہ نہیں ہوسکتیں، زانیہ نہیں ہوسکتیں۔ نبی کی بیوی سے کفر صادر ہوسکتا ہے، جیسا کہ میں نے وضاحت کی، شرک صادر ہوسکتا ہے، کافرہ ہوسکتی ہیں، مشرکہ ہوسکتی ہیں، جیسا کہ حضرت نوح اور حضرت لوط ﷺ کی بیویوں کا ذکر آتا ہے، لیکن وہ زانیہ نہیں ہوسکتیں، بدکارہ نہیں ہوسکتیں۔ وجہ یہ ہے کہ کفر اور شرک بعض لوگوں کے معاشرے میں قابل نفرت نہیں سمجھا جاتا، البتہ زنا اور بدکاری ہر معاشرے میں قابل نفرت ہے، نبی کا گھرانہ ایسی چیزوں میں مبتلا نہیں ہوسکتا جس سے لوگ اپنے معاشرے میں نفرت کرتے ہوں۔ تو کفر اور شرک یہ دنیا کے اندر بے عزتی اور ذلت کا باعث نہیں ہیں، بڑے بڑے لوگ جو اپنے آپ کو معزز قرار دیتے ہیں اور بڑے بڑے اپنے آپ کو صاحب علم قرار دینے والے، وہ بھی کفر اور شرک میں مبتلا ہوتے ہیں، اور اس کو کوئی ذلت نہیں سمجھتے۔ اس لئے نبی کے گھرانے میں یہ خباثت نہیں آسکتی...... نبی کو اللہ تعالیٰ طیب بیوی دیتا ہے، تو اس میں دوسری بیویوں کے متعلق بھی اشارہ ہوگیا کہ صرف حضرت عائشہ صدیقہ ؓ ہی نہیں، بلکہ سرور کائنات ﷺ کی جتنی ازواج مطہرات ہیں وہ سب طیبات کا مصداق ہیں، ان میں سے کسی کے متعلق بھی بدگمانی نہیں کی جاسکتی۔

سیدہ عائشہ صدیقہ ؓ پر تہمت لگانے والوں کا حکم

اس لئے ان آیات کے اتر آنے کے بعد بھی جو شخص حضرت عائشہ صدیقہ ؓ کے متعلق اِفترا کرے اور اس قسم کی بات کو زبان پر لائے، جس طرح سے بعض رافضیوں اور شیعوں کے متعلق سنا جاتا ہے کہ وہ اب تک اس قسم کی باتیں کرتے ہیں، وہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک بالاتفاق کافر ہیں، جیسے کہ تحریف قرآن کا قول کرنے والے اور یہ کہنے والے کہ یہ بیاضِ عثمانی ہے، حضرت عثمان ؓ نے اس میں کمی بیشی کردی، وہ بھی کافر ہیں۔ تو رافضیوں کا یہ گروہ بھی کافر ہے جو حضرت عائشہ صدیقہ ؓ کے متعلق بدگمانی کرتا ہے...... اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ: یہ لوگ (جس کا مصداق حضرت عائشہ صدیقہ ؓ اور صفوان ؓ ہیں، یہ اوّل نمبر میں ہوئے) یہ لوگ صاف ستھرے ہیں، لاتعلق ہیں ان باتوں سے جو یہ بولتے ہیں يَقُوْلُوْنَ کی ضمیر ان اِفترا کرنے والوں کی طرف راجع ہے یعنی یہ اِفک لگانے والے، بہتان لگانے والے جو باتیں کہتے ہیں، یہ لوگ اس سے مبرّا اور پاک ہیں، ان کے لئے بخشش ہے اور عزت کی روزی ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا

اے ایمان والو! نہ داخل ہوا کرو اپنے گھروں کے علاوہ اور گھروں میں جب تک کہ تم اُنس نہ حاصل کرلو اور سلام نہ کرلو

عَلٰۤى اَهْلِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَاۤ اَحَدًا

گھر والوں پر، یہ بہتر ہے تمہارے لئے تا کہ تم نصیحت حاصل کرو ﴿۲۷﴾ پھر اگر تم ان گھروں میں کسی کو نہ پاؤ تو داخل نہ ہوا کرو

فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى

ان میں جب تک کہ تمہیں اجازت نہ دے دی جائے، اور اگر تمہیں یہ کہہ دیا جائے کہ واپس لوٹ جاؤ تو واپس لوٹ جایا کرو، یہ تمہارے لئے

لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸﴾ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ

زیادہ پاکیزگی کا ذریعہ ہے، اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو جاننے والا ہے ﴿۲۸﴾ تم پر کوئی گناہ نہیں کہ داخل ہو جاؤ ایسے گھروں میں جن میں

مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۲۹﴾

رہائش نہیں، ان میں تمہارے لئے کوئی نفع کی چیز ہے، اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو ﴿۲۹﴾

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ

مؤمن مردوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی فرجوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے لئے زیادہ پاکیزگی کا ذریعہ ہے،

اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَ

بے شک اللہ خبر رکھنے والا ہے ان کاموں کی جو وہ کرتے ہیں ﴿۳۰﴾ اور مؤمن عورتوں سے بھی کہہ دیجئے کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور

يَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ

اپنی فرجوں کی حفاظت کریں اور ظاہر نہ کریں اپنی زینت کو مگر وہی جو کہ ان میں سے خود ظاہر ہو جاتا ہے، اور ڈال کے رکھیں اپنی

عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۖ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ

اوڑھنیوں کو اپنے گریبانوں پر، اور نہ ظاہر کریں اپنی زینت کو، مگر اپنے شوہروں کے لئے یا اپنے آباء کے لئے، یا اپنے شوہروں کے باپوں کے لئے

اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْۤ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْۤ اَخَوٰتِهِنَّ

یا اپنے بیٹوں کے لئے یا اپنے خاوندوں کے بیٹوں کے لئے یا اپنے بھائیوں کے لئے یا اپنے بھائیوں کے بیٹوں کے لئے، یا اپنی بہنوں کے بیٹوں کے لئے

اَوْ نِسَآىِٕهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِیْنَ غَیْرِ اُولِی الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ

یا اپنی عورتوں کے لئے، یا ان کے لئے جن کے مالک ہیں ان کے دائیں ہاتھ، یا ان مردوں کے لئے جو کہ تابع ہیں اور خواہش والے نہیں ہیں

اَوِ الطِّفْلِ الَّذِیْنَ لَمْ یَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۪ وَ لَا یَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِیُعْلَمَ

یا ان بچوں کے لئے جو مطلع نہیں ہیں عورتوں کے پردے کی باتوں پر، اور نہ ماریں عورتیں اپنے پاؤں کو تا کہ جان لیا جائے

مَا یُخْفِیْنَ مِنْ زِیْنَتِهِنَّ ؕ وَ تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ جَمِیْعًا اَیُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۱﴾

اس زینت کو جس کو چھپاتی ہیں، اور توبہ کرو اللہ کی طرف سارے کے سارے اے ایمان والو! تا کہ تم فلاح پا جاؤ ﴿۳۱﴾

وَ اَنْكِحُوا الْاَیَامٰى مِنْكُمْ وَ الصّٰلِحِیْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآىِٕكُمْ ؕ اِنْ یَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ

اور تم میں سے جو بے نکاح ہوں اور تمہارے غلام اور باندیوں میں سے جو نیک ہوں ان کا نکاح کر دیا کرو، اگر وہ تنگدست ہوں تو

یُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۳۲﴾ وَ لْیَسْتَعْفِفِ الَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ نِكَاحًا

اللہ انہیں اپنے فضل سے غنی فرما دے گا، اور اللہ وسعت والا ہے جاننے والا ہے ﴿۳۲﴾ اور جو لوگ نکاح کی وسعت نہ رکھتے ہوں (وہ پاک دامن

حَتّٰى یُغْنِیَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ الَّذِیْنَ یَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ

رہیں) یہاں تک کہ اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے، اور تمہاری ملکیت میں جو لوگ ہیں ان میں سے جو مکاتب ہونے کی خواہش رکھتے ہوں

فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِیْهِمْ خَیْرًا ۖۗ وَّ اٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِیْۤ اٰتٰىكُمْ ؕ وَ لَا تُكْرِهُوْا

انہیں مکاتب بنا دو اگر تم ان میں بہتری پاؤ اور تم انہیں اللہ کے مال میں سے دے دو جو اس نے تمہیں دیا ہے، اور اپنی باندیوں کو

فَتَیٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ؕ وَ مَنْ

زنا کرنے پر مجبور نہ کرو جبکہ وہ پاک دامن رہنا چاہیں تا کہ تم کو دنیاوی زندگی کا کوئی مال مل جائے اور جو شخص ان پر

یُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۳۳﴾ وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ

زبردستی کرے تو اللہ انہیں مجبور کرنے کے بعد بخشنے والا ہے مہربان ہے ﴿۳۳﴾ اور البتہ تحقیق ہم نے تمہاری طرف

اِلَیْكُمْ اٰیٰتٍ مُّبَیِّنٰتٍ وَّ مَثَلًا مِّنَ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ ﴿۳۴﴾

کھلے کھلے احکام نازل کئے ہیں اور جو لوگ تم سے پہلے تھے ان کی بعض حکایات اور متقیوں کے لئے نصیحت نازل کی ہیں ﴿۳۴﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ - يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ: اے ایمان والو! نہ داخل ہوا کرو اپنے گھروں کے علاوہ اور گھروں میں، غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ یہ بُيُوْتًا کی صفت ہے۔ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَهْلِهَا: تَسْتَاْنِسُوْا یہ استیناس سے ہے بمعنی اُنس حاصل کرنا۔ اور حتّٰی کے بعد مضارع آئے تو محاورتاً ترجمہ نفی کے ساتھ کردیا جاتا ہے۔ جب تک کہ تم اُنس نہ حاصل کرلو اور سلام نہ کرلو گھر والوں پر۔ اور استیناس سے یہاں مراد ہے اِستیذان یعنی اجازت طلب کرنا، جب تک کہ اجازت نہ لے لو اور گھر والوں پر سلام نہ کرلو۔ یہاں استیناس کا ذکر پہلے ہے اور تسلیم کا ذکر بعد میں ہے، درمیان میں ہے واؤ، اور آپ نے اُصول فقہ کے اندر پڑھا ہے کہ واؤ ترتیب پر دلالت نہیں کرتی، اس لئے حدیث شریف میں سرورِ کائنات ﷺ نے جو طریقہ بیان فرمایا اس میں تسلیم پہلے ہے اور استیذان بعد میں ہے، جب کسی کے ہاں جائیں تو پہلے کہنا پڑتا ہے السلام علیکم، اور پھر پوچھا جاتا ہے کہ ءَاَدْخُلُ؟ کیا میں اندر آجاؤں؟ سلام پہلے،[1] اور ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص پہلے سلام نہ کرے اسے اندر آنے کی اجازت نہ دیا کرو،[2] تو ترتیب کے لحاظ سے تسلیم پہلے ہے اور اِستیذان بعد میں ہے۔ اَهْلِهَا کی ضمیر بیوت کی طرف لوٹ گئی، گھر والوں پر جب تک تم سلام نہ کرلو اور اِذن نہ لے لو، اس وقت تک اپنے گھروں کے علاوہ کسی دوسرے گھر میں نہ جایا کرو۔ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ یہ بہتر ہے تمہارے لئے لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ تاکہ تم یاد رکھو، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَاۤ اَحَدًا: پھر اگر تم ان گھروں میں کسی کو نہ پاؤ، یعنی اپنے گھروں کے علاوہ جو دوسرے گھر ہیں ان میں اگر تم کسی کو نہ پاؤ، فَلَا تَدْخُلُوْهَا تو داخل نہ ہوا کرو ان گھروں میں حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ جب تک کہ تمہیں اجازت نہ دے دی جائے، وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا: اور اگر تمہیں یہ کہہ دیا جائے کہ واپس لوٹ جاؤ فَارْجِعُوْا تو واپس لوٹ جایا کرو، هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ یہ تمہارے لئے زیادہ پاکیزگی کا ذریعہ ہے، وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو جاننے والا ہے۔ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ: تم پر کوئی گناہ نہیں کہ داخل ہوجاؤ تم ایسے گھروں میں جن میں رہائش نہیں، جن کے اندر متعین طور پر کسی کی سکونت نہیں ہے، جس میں کوئی رہتا نہیں ہے، جیسے مسافر خانے ہوتے ہیں، ہوٹل ہوتے ہیں، ہسپتال ہوگئے، عام آمد ورفت کی جگہ جس میں کسی کی خصوصیت سے رہائش نہیں ہوتی۔ کوئی حرج نہیں تم پر، کوئی گناہ نہیں تم پر کہ تم داخل ہوجاؤ ایسے گھروں میں جن میں سکونت نہیں، فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ان گھروں میں تمہارے لئے کوئی استعمال کی چیز ہے، نفع کی چیز ہے، متاع: فائدہ اُٹھانے کی چیز، وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے مَا تُبْدُوْنَ جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو وَمَا تَكْتُمُوْنَ اور جو کچھ تم چھپاتے ہو۔

---

(۱) فَقُلِ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ ءَاَدْخُلُ، (ترمذی ۱۰۰/۲ باب ما جاء فی التسلیم۔ مشکوۃ ۴۰۱/۲ باب الاستئذان)

(۲) لَا تَأْذَنُوا لِمَنْ لَمْ يَبْدَأْ بِالسَّلَامِ. (مشکوۃ ۴۰۱/۲ باب الاستئذان۔ شعب الایمان، رقم ۸۴۳۳)

تفسیر

اس آیت تک اللہ تبارک وتعالیٰ نے استیذان کے مسائل ذکر فرمائے ہیں، چونکہ اس رکوع میں زیادہ تر احکام کا ہی ذکر ہے، اس لیے ساتھ ساتھ ان کی تفصیل سنتے جایئے۔

ماقبل سے ربط اور سورت کے پہلے تین رُکوع کا خلاصہ

شروع سورت سے جو احکام دیے جارہے ہیں، ان کا تعلق ہے عفت اور عصمت کی حفاظت کے ساتھ، اور اِنسدادِ زنا، اِنسدادِ فواحش کے ساتھ، بے حیائی کے طریقے ختم کرنے کے لئے زنا کی سزا ذکر کی گئی تھی، اور زنا کی بُرائی بیان کی گئی تھی، اور تہمت لگانے والوں کی حد ذکر کی گئی تھی کہ بلاوجہ جو لوگوں کو ملوث کرتے ہیں اور لوگوں کی طرف اس قسم کی بُری باتوں کی نسبت کرتے ہیں ان کی سزا ذکر کی گئی تھی، اور پھر خصوصیت کے ساتھ خاوند اور بیوی کا معاملہ اگر اس قسم کا ہوجائے تو اس کی وضاحت کی گئی تھی کہ لِعان کے ساتھ اس کا فیصلہ کیا جائے گا، اور پچھلے دو رکوع میں ایک واقعہ بیان کیا گیا تھا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا، کہ بعض بد باطن لوگوں نے آپ رضی اللہ عنہا کی طرف اس قسم کی نسبت کی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کی صفائی بھی دے دی اور اس کے درمیان میں بہت ساری وضاحتیں بھی کردیں، کہ اشاعتِ فاحشہ بُری بات ہے، اور جہاں تک ہوسکے ان خبروں کو بجھانا مٹانا چاہیے، جب تک دلیل نہ ہو کسی کے متعلق منہ سے بات نہیں نکالنی چاہیے، اور اگر کسی شریف آدمی کے متعلق کوئی بدزبان یا بدگمان شخص کوئی لفظ بول بھی دے تو تم سنتے ہی اس کا انکار کیا کرو، اور کہا کرو سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ، ہمارے لیے لائق ہی نہیں ہے کہ ہم زبانوں پر اس قسم کی باتیں لائیں، تو یہ ہدایات اس واقعہ کے ضمن میں دے دی گئی تھیں۔ اب یہاں سے جو مسائل ذکر کیے جارہے ہیں ان کا تعلق بھی انسدادِ فواحش کے ساتھ ہی ہے، فواحش کے اِنسداد کے لیے یہ اَحکام دیے جارہے ہیں، یعنی وہ تمام سوراخ بند کیے جارہے ہیں کہ جن سے اس قسم کی بے حیائی پھوٹتی ہے۔

جن میں سے پہلا مسئلہ یہ ذکر کیا گیا کہ جاہلیت میں جو طریقہ چلا آتا تھا کہ بلا پوچھے، بغیر اجازت کے لوگ ایک دوسرے کے گھروں میں چلے جاتے تھے، اس طرح سے جانے میں بسا اوقات انسان کی نگاہ ایسی چیز پر پڑ جاتی ہے جہاں مناسب نہیں، اور آپ جانتے ہیں کہ زیادہ تر تعلق اسی نظر سے شروع ہوتا ہے، آنکھیں لڑنے سے شروع ہوتا ہے، ''اَلنَّظْرَةُ سَهْمٌ مِّنْ سِهَامِ اِبْلِيْسَ'' ''شیطان کے تیروں میں سے یہ بھی ایک تیر ہے،''[1] اور اگر کوئی شخص اپنی نظر کی حفاظت کرے تو بہت ساری بُرائیوں سے بچ جاتا ہے، جیسے کہ اس ''استئذان'' کے مسئلے کے بعد متصل غضِ بصر کی بات آرہی ہے، یعنی نگاہ نیچی رکھنا، تو معلوم ہوتا ہے کہ زنا سے بچنے کے لئے، بدمعاشی اور فواحش سے بچنے کے لئے نگاہ کی حفاظت بہت ضروری ہے۔ اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ استیذان یعنی اجازت طلب کرنا ''مِنْ اَجْلِ الْبَصَرِ'' یہ بھی نگاہ سے بچنے کے لیے ہے۔[2]

---

(۱) تفسیر ابن کثیر، قرطبی، سورۂ نور آیت ۳۰ کے تحت۔ نیز مستدرک حاکم ۴/۳۴۹، رقم ۷۸۷۵، ولفظہ: ان النظرۃ سھم من سھام ابلیس مسموم

(۲) بخاری ۲/۹۲۲ باب الاستئذان من اجل البصر۔ مشکوۃ ۲/۳۰۵ باب مالا یضمن من الجنایات، فصل اول۔

سوراخ سے اندر جھانکنے کی ممانعت

اس لیے ایک شخص جو کہ دروازے کے سوراخ میں سے جھانک رہا تھا، آپ ﷺ نے تنبیہ فرمائی اور یہ کہا کہ اگر مجھے پہلے پتا چل جاتا کہ تو اس طرح سے جھانک رہا ہے تو میں تیری آنکھ اندر سے پھوڑ دیتا،[1] اور فرمایا کہ جو کوئی بغیر کسی اجازت کے سوراخوں میں سے کمرے کے اندر جھانکے، اور اندر سے بیٹھا ہوا شخص کوئی چیز اُٹھا کر اسے مار دے جس سے اس کی آنکھ پھوٹ جائے تو اس مارنے والے پر کوئی گناہ نہیں ہے،[2] اور تنبیہ یہی فرمائی کہ استیذان کا تو مسئلہ ہی اسی لیے ہے تا کہ نظر غلط نہ پڑے، اور اگر تم پہلے اندر جھانکنا شروع کر دو پھر اجازت لینے کا کیا فائدہ؟ جس سے معلوم ہو گیا کہ استیذان یہ بھی اصل کے اعتبار سے کسی غلط چیز پر نظر پڑنے سے بچانے کے لئے ہی ہے۔

دروازے کے سامنے نہیں کھڑا ہونا چاہیے

حتیٰ کہ اگر آپ نے اجازت لینی ہے تو بھی دروازے کے سامنے کھڑے ہو کے نہیں، جیسے حدیث شریف میں ہدایات دی گئی ہیں، دروازے پر دستک دیں یا آواز دیں تو ایک طرف ہٹ کے کھڑے ہو جائیں تا کہ اتفاقاً اگر پردہ اٹھے یا دروازہ کھلے، یا آگے سے بات کرنے والی کوئی عورت ہو، یا کسی وجہ سے بھی اندر نظر نہ جائے، اور آمنا سامنا نہ ہو، تو حدیث شریف میں آتا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ کی عادت شریفہ یہی تھی کہ جب کسی کے ہاں جاتے تھے اور استیذان کرتے تھے، تو یا دروازے کے دائیں طرف کھڑے ہوتے تھے یا بائیں طرف کھڑے ہوتے تھے، بالکل سامنے کھڑے نہیں ہوتے تھے،[3] تو آنکھ کی حفاظت کے لئے ہی یہ ہدایات دی جا رہی ہیں۔

اپنے گھر میں اِستیذان کے مسائل

اب یہ مختلف قسم کے مکانات ہیں، مختلف قسم کے گھر، جن کے متعلق یہاں ہدایات دی گئیں۔ پہلی بات جو کہی گئی وہ یہ ہے کہ صرف اپنا گھر ہے جس میں انسان بغیر اجازت جا سکتا ہے۔ اور اپنے گھر سے کیا مراد؟ کہ جہاں انسان خود اکیلا رہتا ہو، یا زیادہ سے زیادہ بیوی۔ بیوی کے علاوہ اگر اس گھر میں کوئی دوسرا رہتا ہے، چاہے وہ گھر آپ کا مملوک ہے، چاہے آپ اس گھر کے اندر خود رہتے ہیں، آپ کی رہائش اسی میں ہے تو بھی آپ بلا اجازت نہ جائیں۔ ہاں! البتہ اگر یقین ہے کہ بیوی کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں، ایسی صورت میں اگر انسان بلا اجازت چلا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے، ایک شخص سرورِ کائنات ﷺ کے پاس آیا اور آ کے پوچھتا ہے: یا رسول اللہ! میں اپنے گھر اجازت لے کے جایا کروں؟ اس گھر میں میری ماں بھی رہتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ

---

(۱) لَوْ اَعْلَمُ اَنَّكَ تَنظُرُنِي لَطَعَنْتُ بِهٖ فِي عَيْنَيْكَ. بخاری ۲/۱۰۲۰ باب من اطلع فی بیت. مشکوٰۃ ۲/۳۰۵ باب مالا یضمن من الجنایات.

(۲) لَوِ اطَّلَعَ فِي بَيْتِكَ اَحَدٌ وَلَمْ تَأْذَنْ لَهٗ خَذَفْتَهٗ بِحَصَاةٍ فَفَقَأْتَ عَيْنَهٗ مَا كَانَ عَلَيْكَ مِنْ جُنَاحٍ بخاری ۲/۱۰۱۷ باب من اخذ حقه مشکوٰۃ ۲/۳۰۵

(۳) اِذَا اَتٰى بَابَ قَوْمٍ لَمْ يَسْتَقْبِلِ الْبَابَ مِنْ تِلْقَاءِ وَجْهِهٖ وَلٰكِنْ مِنْ رُكْنِهِ الْاَيْمَنِ اَوِ الْاَيْسَرِ (ابوداؤد ۲/۳۴۹، باب کم مرۃ یسلم مشکوٰۃ ۲/۴۰۱، باب الاستئذان)

ہاں اجازت لے کر جایا کرو؟ کہنے لگا: یارسول اللہ! میں بھی اسی گھر میں رہتا ہوں جس گھر میں میری ماں ہے۔ آپ نے فرمایا: پھر بھی اجازت لے کے جایا کرو۔ پھر وہ کہتا ہے: یارسول اللہ! میں تو اس کا خادم ہوں، مطلب یہ ہے کہ اس کی وجہ سے مجھے کثرت سے آنا جانا پڑتا ہے، آپ نے فرمایا کہ پھر بھی اجازت لے کے جایا کرو، اور اس کے بعد حکمت واضح فرمائی کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنی ماں کو ننگا دیکھ لو؟ وہ کہنے لگا کہ نہیں، تو فرمایا کہ اجازت لے کے جایا کرو۔[1] مطلب کیا ہوا؟ کہ عورتیں گھر میں بے تکلف ہوتی ہیں، کبھی اپنے کپڑے بدلنے کے لئے کپڑے اُتار لیتی ہیں، اور اس زمانے میں آپ جانتے ہیں کہ گھروں میں اس طرح سے غسل خانے اور اس قسم کی چیزیں نہیں ہوتی تھیں، اور اب بھی جیسے دیہاتوں میں ہے کہ بسا اوقات غسل وغیرہ کی ضرورت کے لیے بھی عورت کپڑے اُتارتی ہے، کپڑے بدلنے کے لئے بھی کپڑے اُتارتی ہے، اور تم اچانک بغیر اطلاع کے چلے جاؤ، تو ایسا اتفاق ہو سکتا ہے کہ تمہاری ماں ننگی ہو اور اس کے اوپر تمہاری نظر پڑ جائے، تمہاری بہن ننگی ہو اور اس کے اوپر تمہاری نظر پڑ جائے، پھر دونوں طرف شرمساری ہوتی ہے، اس لیے بہتر یہ ہے کہ جب بھی گھر جاؤ تو اطلاع دے کے جاؤ۔ البتہ بیوی ایک ایسی چیز ہے کہ اگر اس پر عریاں نظر بھی پڑ جائے تو کوئی ایسی قباحت نہیں، لیکن پھر بھی بہتر یہ ہے، اگر یہ احتمال ہو کہ شاید بیوی کے پاس کوئی دوسری عورت ملنے کے لیے آئی ہوئی ہو، اگر یہ احتمال ہو کہ ممکن ہے محلے کی کوئی عورت ملنے کے لیے آ گئی ہو اور بیوی کے پاس بیٹھی ہو تو ایسی صورت میں بھی اطلاع دے کے اندر جانا چاہیے...... اتنی تاکید سرورِ کائنات ﷺ نے فرمائی اپنے گھروں کے متعلق بھی، اور اپنی ماں کے گھر کے متعلق بھی، تو ماں کے علاوہ اور کون ہے؟ کہ جس میں انسان بے احتیاطی کرے۔

اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں ہم لوگ کلیتاً بے احتیاطی کرتے ہیں، یعنی قرآن کریم نے اس کے بارے میں کتنی تاکید فرمائی ہے، لیکن ہمارے ہاں اس کا کوئی اہتمام نہیں۔

دُوسروں کے مسکونہ گھر میں اِستیذان کے مسائل

یہ تو ہو گئی اپنے گھر کی بات! اپنے گھروں کے علاوہ کسی دوسرے کے گھر میں جاؤ تو سب سے پہلے السلام علیکم کہو، پھر پوچھو کہ میں اندر آ جاؤں؟ اور اگر وہ دُور بیٹھے ہوں جہاں تک سلام کی آواز نہیں پہنچ سکتی، تو دستک دینا، گھنٹی بجانا بھی اسی اطلاع میں داخل ہے۔ تو صراحتاً پوچھو، پوچھنے کے بعد پھر اگر اجازت ملے تو اندر جاؤ، اور اگر تمہیں کہہ دیا جائے کہ اس وقت ملاقات کا موقع نہیں ہے تو چپ کر کے واپس آ جایا کرو، وہاں اڑ کے کھڑے نہیں ہونا چاہیے۔ اور پھر تفصیل حدیث شریف میں آئی کہ استیذان تین دفعہ ہونا چاہیے، پہلی دفعہ کہا: السلام علیکم، جواب نہیں آیا، پھر دوبارہ کہا: السلام علیکم، جواب نہیں آیا، پھر تیسری دفعہ کہا: السلام علیکم، جواب نہیں آیا، اسی کے حکم میں ہے دستک دینا یا گھنٹی بجانا۔ تین دفعہ کے بعد پھر نہیں، پھر واپس آ جاؤ، اور سمجھ جاؤ کہ گھر میں کوئی نہیں ہے، یا اس وقت جو کوئی گھر میں ہے وہ ملاقات کرنے کے لئے فارغ نہیں ہے، تین دفعہ سے زیادہ نہیں،[2] لیکن تین دفعہ سلام کہنا ہے، یا دستک دینی ہے، یا گھنٹی بجانی ہے، تو یہ نہیں کہ ایک دفعہ دستک دی، اور متصل ہی دوبارہ دے دی، متصل ہی

---

(۱) موطا مالک، کتاب الجامع باب الاستئذان۔ مشکوٰۃ ۲/۴۰۱ باب الاستئذان۔

(۲) اِذَا اسْتَأْذَنَ أَحَدُكُمْ ثَلَاثًا فَلَمْ يُؤْذَنْ لَهُ فَلْيَرْجِعْ۔ بخاری ۲/۹۲۳ باب التسلیم والاستئذان ثلاثاً۔ مشکوٰۃ ۲/۴۰۰ باب الاستئذان۔

سہ بارہ دے دی، اور مسلسل کھڑکاتے چلے جائیں، یا مسلسل گھنٹی بجاتے چلے جائیں، یہ طریقہ نہیں ہے، بلکہ پہلی دفعہ دستک دو، دستک دینے کے بعد اتنا انتظار کرو کہ اگر اس شخص نے ابھی نماز کی نیت باندھی ہو تو چار رکعت پڑھ کے فارغ ہو کے باہر آ سکے، اور اگر وہ شخص جس سے آپ ملنے کے لئے گئے ہیں وہ ابھی ابھی لوٹا لے کے بیت الخلا میں گیا ہے تو اپنی ضرورت سے فارغ ہو کے باہر آ سکے، یا اس طرح سے کسی اور کام میں مشغول ہے تو فارغ ہو کے باہر آ سکے، پھر دوبارہ آپ دستک دیں، ورنہ آپ نے دستک دی، ایک لحظے کے بعد پھر دوبارہ دے دی، اور اسی ایک لحظے کے بعد پھر تیسری بار دے دی، تو یہ کوئی ضروری نہیں کہ اندر جو شخص بیٹھا ہے وہ آپ کے انتظار میں تھا اور فارغ بیٹھا تھا کہ کب دروازہ کھٹکھٹائے اور میں باہر جاؤں، آخر انسان گھر میں جب ہوتا ہے تو مختلف ضرورتوں میں مشغول ہوتا ہے، تو اس ضرورت کا خیال کر کے انسان کو وقفے وقفے کے ساتھ دستک دینی چاہیے۔ اور تین دفعہ کے بعد پھر آگے نہیں، پھر سمجھ لینا چاہیے کہ یہ موقع ملاقات کا نہیں ہے، یا وہ گھر میں نہیں ہے، یا ملنا نہیں چاہتے، یا فارغ نہیں ہیں، تو ایسی صورت میں پھر واپس ہو جانا چاہیے۔

غیر مسکونہ جگہوں میں استیذان کا حکم

ہاں البتہ ایسا مکان کہ جو مردانہ ہے، جہاں انسان ملاقات کے لیے ہی بیٹھا ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ محض بیٹھے ہی اس لیے ہیں تا کہ لوگ آئیں اور ملیں، ایسی جگہ میں اگر انسان بلا اجازت چلا جائے تو بھی ٹھیک ہے، یا رفاہِ عامہ کی جگہیں، ہسپتال ہے، مسافر خانہ ہے، اسٹیشن کا ویٹنگ روم ہے جہاں مسافر جا کے ٹھہرتے ہیں، اور وہاں فائدہ اٹھانے کی کوئی چیز ہے، آپ بیٹھنا چاہتے ہیں، سامان رکھنا چاہتے ہیں، تو ان جگہوں کے اندر بھی بلا اجازت جا سکتے ہیں، البتہ ان جگہوں میں جو دفتر ہوتے ہیں، جو عام لوگوں کے آنے جانے کی جگہ نہیں ہے تو وہاں بھی اجازت لے کے جانا چاہیے، اور اگر آپ کو پتا ہے کہ ایک شخص اکیلا بیٹھا ہے لیکن یہ ملاقات کا وقت نہیں ہے، پھر بھی باہر سے اجازت لے کے اندر آنا چاہیے، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی ایسے کام میں مشغول ہو کہ ایسے موقع پر کسی دوسرے کا آنا پسند نہ ہو، تو باہر کھڑے ہو کے پہلے اجازت لیجئے، اجازت لینے کے بعد پھر اندر آئیے۔ اور اجازت لینے کا اسلامی طریقہ یہی ہے کہ پہلے السلام علیکم کہو، اس کے بعد پوچھو کہ میں اندر آ جاؤں؟ اس سے انسان میں شائستگی آتی ہے، تہذیب آتی ہے، اور بہت ساری ایسی چیزوں سے انسان بچتا ہے کہ جن کے اوپر بعد میں پچھتانا پڑتا ہے۔ اس لیے یہ احکام دیے گئے ہیں، مقصد ان سے صرف نظر کا بچانا ہے تا کہ کسی ایسی چیز پر نظر نہ پڑ جائے کہ جس کا دیکھنا دکھانا گھر والے کو پسند نہیں ہے۔

آیاتِ بالا پر ایک نظر دوبارہ

ان آیات کو دوبارہ دیکھ لیجئے..... اے ایمان والو! داخل نہ ہوا کرو اپنے گھروں کے علاوہ دوسرے گھروں میں جب تک کہ تم اُنس نہ حاصل کر لو یعنی اجازت نہ لے لو، اور سلام نہ کہہ لو گھر والوں پر، یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ تمہیں یہ کہا جا رہا ہے، بتایا جا رہا ہے تا کہ تم یاد رکھو۔ اور اگر وہاں کوئی موجود نہیں یعنی کسی کے گھر آپ گئے، دستک آپ نے دی، اندر سے کوئی آہٹ محسوس نہیں ہوئی، ہے وہ پرایا گھر، آپ کا نہیں ہے، مسکونہ گھر ہے، اور اندر کوئی محسوس نہیں ہوا تو بھی اندر نہ جائیے، جب تک کہ

مالک مکان کی طرف سے اجازت نہ ہو، یعنی اگر آپ یہ محسوس کریں کہ مکان خالی ہے تو پھر بھی اندر نہ جائیں۔ اگر وہ پرایا مکان ہے اور اس میں کسی کی رہائش ہے، اس میں اس کا سامان پڑا ہے تو جب تک مالکِ مکان کی طرف سے اجازت نہ ہو، اس وقت تک اندر نہ جاؤ، جب تک کہ تمہیں اجازت نہ دے دی جائے۔ اور اگر تمہیں کہہ دیا جائے کہ واپس لوٹ جاؤ تو اس کو اپنی شان کے خلاف نہ سمجھا کرو، اندر سے کسی نے کہہ دیا کہ یہ ملاقات کا وقت نہیں ہے، واپس جاؤ، تو اس میں اَڑنے اور ضد کرنے کی بات نہیں، نہ اس کو اپنی شان کے خلاف سمجھو، دوسرے شخص کو اپنے حالات میں آزادی ہونی چاہیے، یہ ضروری نہیں کہ جب آپ ملاقات کرنے جائیں وہ ملاقات کے لیے تیار بیٹھا ہو، دوسرے کے اوقات کا خیال رکھیں، دوسرے کی راحت اور آرام کا خیال رکھیں، اگر کسی مشغولیت کی بنا پر یا کسی مصلحت کی بنا پر صاحبِ مکان کہہ دے کہ اب جاؤ، یہ ملنے کا وقت نہیں ہے، تو ''فَارْجِعُوا'' لوٹ جایا کرو۔ یہی تمہارے لئے پاکیزگی کا ذریعہ ہے، وہاں اَڑ کے کھڑے ہو جانا مناسب نہیں ہے۔

اور اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو جاننے والا ہے۔ یہ بار بار اللہ تعالیٰ اپنی صفات کا حوالہ دیتے ہیں تاکہ آپ لوگ اچھی طرح سے ان اَحکام کی رعایت رکھیں۔ آگے وہ بات بتادی کہ جس میں متعین طور پر کسی کی سکونت نہیں، اور اس میں کوئی فائدہ اُٹھانے کی چیز ہے جیسے رفاہِ عامہ کے مکانات ہوا کرتے ہیں، عام لوگوں کے استعمال کے لئے فائدہ اُٹھانے کے لیے، تو ان میں اگر چلے جاؤ تو کوئی گناہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے اس چیز کو جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو۔ یہ تو اِستیذان کے مسائل ہو گئے۔

نگاہوں کو نیچا رکھنے کا حکم

آگے غَضِّ بصر آ گیا۔ غضِ بصر میں یہ بات ضروری ہے کہ اگر آپ اجازت لے کے ہی اندر چلے گئے ہیں، اور آپ کو کسی وجہ سے اندر بلا لیا گیا، اور وہ مکان ایسا ہے جس میں مردانہ بیٹھک نہیں ہے، جس طرح سے عام غرباء کے گھروں میں ہوتا ہے، ہر شخص کے ہاں مردانہ مکان علیحدہ اور زنانہ مکان علیحدہ نہیں ہوا کرتا، آپ کسی کے ہاں مہمان چلے گئے اور وہ آپ کے رشتہ دار ہیں، اور انہوں نے آپ کو اجازت دے کر اندر بلا لیا اور اندر گھر کی عورتیں بھی ہوتی ہیں جن کے متعلق حکم ہے کہ پردہ رکھیں لیکن بقدرِ ضرورت ان کو منہ بھی کھولنا پڑتا ہے، کام کاج کے لیے ہاتھ بھی ظاہر کرنے پڑتے ہیں، چلنا پھرنا پڑتا ہے، اگر اس طرح سے انسان اندر چلا جائے تو بھی نظر نیچی رکھے، نظر اُٹھا اُٹھا کے اِدھر اُدھر دیکھنا ٹھیک نہیں ہے۔ اس لئے یہاں غَضِّ بصر کا حکم ذکر کیا جا رہا ہے، اس کے بعد پھر آگے پردے کے اَحکام ذکر کیے جا رہے ہیں۔

مرد و عورت کو ''غَضِّ بَصَر'' کا حکم

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ: مؤمنوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نظروں کو نیچا رکھا کریں، غَضِّ بصر، نظر کو نیچا رکھنا، دوسرے کی طرف تاڑ تاڑ کے نہ دیکھیں، نظر اٹھا اٹھا کے نہ دیکھیں، وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ اور اپنی فرجوں کی حفاظت کریں، جس سے معلوم ہو گیا کہ غضِ بصر کو حفظِ فرج میں بہت دخل ہے، مؤمنوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی فرجوں کی حفاظت کریں، ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ: یہ ان کے لئے زیادہ پاکیزگی کا ذریعہ ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ بے شک اللہ تعالیٰ خبر رکھنے والا ہے ان

کاموں کی جودہ کرتے ہیں۔ دیکھو! بار بار اللہ تعالیٰ اپنے علم کو ذکر فرمارہے ہیں، اس لئے اگر کوئی شخص دزدیدہ نگاہ سے، چور آنکھوں سے بھی اِدھر اُدھر دیکھے گا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں مجھ سے وہ بھی چھپا ہوا نہیں ہے، جیسے دوسری جگہ قرآن کریم میں ذکر کیا یَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ (سورۂ مؤمن:۱۹) کہ اللہ تعالیٰ آنکھوں کی خیانت بھی جانتا ہے، دلوں کے اندر جس قسم کے خیالات چھپے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں بھی جانتا ہے۔ تو یہاں غَضِّ بصر وہی ہے جو حفظِ فرج کے لئے ہے یعنی جس نگاہ اُٹھنے کا نتیجہ یہ ہو کہ فرج پہ اثرات پڑتے ہیں اور فتنے میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے، وہاں نظر نیچی رکھنی ضروری ہے، ورنہ چلتے پھرتے اگر آپ نظر اُٹھا کے کسی چیز کی طرف دیکھ لیں تو یہ ممنوع نہیں ہے سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا (سورۂ روم:۴۲، وغیرہ) زمین میں چلو پھرو، اِدھر اُدھر دیکھو، اللہ کی قدرت کے نظارے دیکھو، چاند دیکھنا ہے تو آسمان کی طرف آپ نظر اُٹھائیں گے، ویسے بھی اللہ تعالیٰ نے تفکر اور تدبر کے لئے آسمان کی طرف کتنا متوجہ کیا، تو آسمان کی طرف بھی آپ نگاہ اُٹھا سکتے ہیں، دائیں بائیں آگے پیچھے سب آپ دیکھ سکتے ہیں، لیکن وہاں نظر نیچی رکھنی ضروری ہے جہاں اس قسم کے فتنے کا اندیشہ ہو کہ نظر اُٹھ جانے کے ساتھ حفظِ فرج میں خلل آئے، یہ ایک موقع ہے جس میں نظر کا نیچا رکھنا ضروری ہے، کہ جس میں کسی فتنے کا اندیشہ ہے اور غلط چیز پر نظر پڑنے سے عفت پر داغ دھبّا آتا ہے۔

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ: اور مؤمن عورتوں سے بھی کہہ دیجئے کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں، جس طرح سے مردوں کو حکم ہے نظر نیچی رکھنے کا، عورتوں کو بھی حکم ہے کہ نظر نیچے رکھیں، وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ: اور اپنی فرجوں کی حفاظت کریں، یہاں بھی وہی دونوں باتیں ہیں کہ نظر نیچی رکھیں اور اپنی فرجوں کی حفاظت کریں۔

مواضعِ زینت کو ظاہر کرنا ممنوع ہے

وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا: اور ظاہر نہ کریں اپنی زینت کو۔ زینت: سجاوٹ۔ اور یہاں مواقعِ زینت مراد ہیں یعنی بدن کے وہ حصے جن میں زیب و زینت کی جاتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ زیب و زینت کے حصے بدن میں سے چہرہ ہے، آنکھوں میں سرمہ لگاتی ہیں، اور اسی طرح ہونٹوں پر جیسے آج کل رواج ہے سرخی وغیرہ کا، اور کانوں میں زیورات، گلے میں زیورات ڈالتی ہیں، بازوؤں میں زیورات ہوتے ہیں، اور اسی طرح سے پاؤں وغیرہ میں پازیب وغیرہ کا پُرانا رواج تھا، آج کل تو رواج رہا نہیں، پنڈلیوں میں بھی زیور پہنتی ہیں، یہ ہیں مواقع بدن کے زیب و زینت کے، یہ مواقع کسی کے سامنے ظاہر نہیں کرنے چاہئیں۔ ''زینت ظاہر نہ کریں'' اس سے مراد ہے کہ وہ مواقع ظاہر نہ کریں جن میں زینت ہوتی ہے، اور اسی طرح سے ہاتھ بھی ہے، اس میں انگوٹھیاں ہوتی ہیں، مہندی ہوتی ہے، چھلّے وغیرہ پہنتی ہیں، تو یہ بھی زینت کی جگہ ہے، اسی طرح بازو ہو گئے، یہ بدن کے حصے ہیں جن میں عورتیں زیب و زینت کرتی ہیں، ان مواقع کے ظاہر کرنے کی ممانعت ہے، ورنہ فی حدِ ذاتہٖ زیور جب پہنا ہوا نہ ہو، وہ اگر کسی کے سامنے نمایاں ہو جائے تو کوئی حرج نہیں، جیسے چوڑیاں اُتری ہوئی ہیں کسی نے دیکھ لیں، اور اسی طرح دوسرا کوئی زیور اُترا ہوا ہے کسی کو دکھا دیا، اس میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن جب بدن میں پہنے ہوئے ہوں تو ایسے وقت میں اس زینت کو ظاہر نہیں کرنا چاہیے، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان مواقع کو ظاہر نہیں کرنا چاہیے، پھر چاہے زینت کی ہوئی ہو یا نہ کی ہوئی ہو، ان مواقع کا چھپانا

ضروری ہے، یعنی اگر عورت نے گلے میں کوئی زیور نہیں پہنا ہوا تو بھی اس کے لیے سینہ کھولنا ٹھیک نہیں ہے، بازو میں اگر زیور نہیں پہنے ہوئے تو بھی کھولنے ٹھیک نہیں ہیں، یہاں زینت سے مواضعِ زینت مراد ہیں...... نہ ظاہر کریں وہ اپنی زینت کے مواقع کو اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا مگر وہی جو کہ ان میں سے خود ظاہر ہو جاتا ہے، اس کی تفصیل عرض کروں گا۔

سر پر اوڑھنی لینے کا شرعی طریقہ

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ اور چاہیے کہ مار کے رکھیں اپنی اوڑھنیاں، خمر خمار کی جمع ہے خمار اس کپڑے کو کہتے ہیں جو سر پر اوڑھا جاتا ہے، مار کے رکھیں اپنی اوڑھنیوں کو، عَلٰى جُيُوبِهِنَّ جیوب جیب کی جمع ہے بمعنی گریبان، اپنے سر والے کپڑوں کو اپنے گریبان کے اُوپر ڈال کے رکھیں، یعنی سر پر لیں اور اس کو اپنے سینے کے اوپر لٹکا کر رکھیں، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ سینہ بھی چھپ گیا اور کان وغیرہ بھی چھپ جائیں گے، جاہلیت میں عورتیں یا تو ننگے سر رہتی تھیں، اور اگر کپڑا لیتی بھی تھیں تو اس کے دونوں پلّے (کنارے) پیچھے کو پھینک لیتیں جس کی بنا پر رُخسارے، کان، سینہ سارے کا سارا کھلا رہ جاتا، جیسے اب بھی آپ نے پُرانے فیشن کی دیہاتی عورتوں کو دیکھا ہوگا کہ سر پر کپڑا لیا ہو تو پیچھے کو لٹکا ہوا ہوتا ہے، ایسے نہیں کرنا چاہیے، بلکہ سر پہ کپڑا لیں اور سینے کے اوپر مار کے رکھیں، تا کہ سینہ بھی چھپ جائے کیونکہ قمیص پہنی ہوئی ہو تو بھی عورت کا سینہ بہت حد تک نمایاں ہوتا ہے، اور اوپر سے جس وقت چادر لے لی جائے تو پھر وہ چھپ جاتا ہے، تو اس میں کان بھی چھپ جائیں گے، گردن بھی چھپ جائے گی، اور رخساروں کے بھی اکثر حصے چھپ جاتے ہیں۔ ڈال کے رکھیں اپنی اوڑھنیوں کو اپنے گریبانوں پر۔

کن لوگوں سے پردہ نہیں

وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ: اور نہ ظاہر کریں اپنی زینت کو یعنی زینت کے مواقع کو جس طرح پہلے ترجمہ کیا، اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ: بعولة بَعل کی جمع ہے بمعنی خاوند، شوہر۔ قرآنِ کریم میں دوسری جگہ لفظ گزرا ہے هٰذَا بَعْلِىْ شَيْخًا (سورۂ ہود: ۷۲) مگر اپنے شوہروں کے لئے، اَوْ اٰبَآئِهِنَّ یا اپنے آباء کے لئے، آباء، اَب کی جمع بمعنی باپ، اسی میں دادا آ گیا، دادا، پردادا اصول جتنے بھی ہیں وہ اس میں آ گئے۔ اور آباء کے حکم میں ہیں چچے وغیرہ، چچوں سے بھی پردہ نہیں ہے، جیسے تفصیل آپ کی خدمت میں عرض کروں گا، اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ: یا اپنے شوہروں کے باپوں کے لئے، شوہر کا باپ بھی اپنے باپ کے حکم میں ہے، اس طرح آگے شوہر کے دادے وغیرہ جو اُصول میں داخل ہیں، اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ یا اپنے بیٹوں کے لئے، اپنے حقیقی بیٹے پوتے نواسے سب اس میں داخل ہو جائیں گے، اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ یا اپنے خاوندوں کے بیٹے جو دوسری بیویوں سے ہیں، ان کے لئے بھی چونکہ یہ عورت ماں کے حکم میں ہوتی ہے ان سے بھی حجاب نہیں، اَوْ اِخْوَانِهِنَّ: یا اپنے بھائیوں کے لئے، اِخوان اَخ کی جمع ہے، بھائی سے یہاں مراد ہوں گے حقیقی بھائی، اخیافی بھائی، علاتی بھائی، تینوں قسم کے بھائی مراد ہیں، یعنی جو ماں باپ کی طرف سے ہیں، یا صرف ماں کی طرف سے ہیں یا صرف باپ کی طرف سے ہیں۔ البتہ چچازاد بھائی، ماموں زاد بھائی، خالہ زاد بھائی، پھوپھی زاد بھائی، خالہ زاد بھائی ان کو ہم ”بھائی“ کہتے ہیں، لیکن وہ اس میں شامل نہیں ہیں، وہ غیر محرم ہیں، ان کے لیے بالکل اجنبیوں کی طرح پردہ ہے، تو یہ بھائی اس میں شامل نہیں جن کو ہم عرف میں

''بھائی'' سمجھتے ہیں، اَوْ بَنِیْٓ اِخْوَانِهِنَّ: یا اپنے بھائیوں کے بیٹے، جن کو ہم اپنے ''بھتیجے'' کہتے ہیں، تینوں قسم کے بھائیوں کی اولاد، ان سے بھی پردہ نہیں ہے، حقیقی بھائی کے بیٹے ہو گئے، علاتی بھائی کے بیٹے، اور اخیافی بھائی کے بیٹے۔ اَوْ بَنِیْٓ اَخَوٰتِهِنَّ: اپنی بہنوں کے بیٹے، جن کو ہم ''بھانجے'' کہتے ہیں، اَوْ نِسَآئِهِنَّ یا اپنی عورتیں، ''اپنی عورتوں'' سے مراد ہیں ملنے جلنے والی عورتیں جن کے حال احوال جانتی ہیں۔ اجنبی عورتیں جن کے اخلاق وغیرہ کا پتا نہ ہو، پرائی عورتیں، ایسوں سے بھی عورتوں کو احتیاط کرنی چاہیے، اور جو محلے کی عورتیں ہیں، ملنے جلنے والی ہیں، جن کے حال احوال سے واقف ہیں تو ان کے لئے بھی اپنی زینت کو ظاہر کرسکتی ہیں۔ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ: یا ان کے لئے جن کے مالک ہیں ان کے دائیں ہاتھ یعنی مملوک، اس میں اکثر فقہاء کے نزدیک باندی اور غلام دونوں داخل ہیں، اَحناف کے نزدیک اس میں صرف باندی شامل ہے، غلام شامل نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اپنی باندیوں کے سامنے، یا دوسرے فقہاء کے نزدیک مطلب یہ ہوگا کہ اپنے مملوک کے سامنے، چاہے وہ غلام ہیں چاہے وہ باندیاں ہیں۔ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ: یا وہ لوگ جو تابع ہیں، نہ ظاہر کریں اپنی زینت کو مگر ان لوگوں کے لئے جو تابع ہیں، غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ جو حاجت والے نہیں ہیں، خواہش والے نہیں ہیں یعنی جن کے دِلوں میں عورتوں کی کوئی خواہش نہیں، بچھلگ قسم کے لوگ جو گھروں میں کھانے پینے کے لئے محتاج قسم کے پڑے ہوئے ہوتے ہیں، اور حالات سے اندازہ یہی ہوتا ہے کہ ان کو عورتوں کی کوئی رغبت، کوئی کسی قسم کی خواہش نہیں، پاگل قسم کے، مست قسم کے لوگ جن میں کوئی کسی قسم کی صلاحیت نہیں ہوتی، نہ ان کے اندر کوئی شہوانی جذبات ہیں، کھانے پینے کے لئے گھروں میں پڑے رہتے ہیں، تو ان لوگوں کے لئے۔ تابعین سے وہی مراد ہیں مِنَ الرِّجَالِ اس کا بیان آ گیا، یا وہ مرد جو کہ تابع ہیں اور خواہش والے نہیں ہیں، غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ غرض والے نہیں ہیں، یعنی عورتوں سے ان کو کوئی غرض مطلب نہیں، ان کے دِل میں کوئی خواہشات نہیں ہیں، اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ: طفل جمع کے معنی میں ہے (مظہری)، اس لئے الَّذِيْنَ آگے صفت آ گئی۔ یا ان بچوں کے لئے جو مطّلع نہیں ہیں عورتوں کی پردوں کی باتوں پر۔ عورات عورۃ کی جمع ہے، عورۃ: قابلِ ستر چیز، چھپانے کی چیز، یعنی جو عورتوں کے معاملات پر ابھی مطّلع نہیں، اتنے سمجھدار نہیں ہوئے ان بچوں کے لئے۔

عورتیں زمین پر اپنے پاؤں آہستہ سے رکھیں

وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ اور نہ ماریں عورتیں اپنے پاؤں کو، لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ تا کہ جان لیا جائے اس چیز کو جس کو چھپاتی ہیں یہ اپنی زینت سے، یعنی چلتی پھرتی پاؤں بھی زمین پر زور سے نہ مارے کہ اگر پنڈلیوں میں کوئی زیور پہنا ہوا ہے تو وہ بجے، کھڑکے، جس کی وجہ سے دوسرے کو پتا چل جائے کہ اس نے زیور پہنے ہوئے ہیں، چلتے وقت زمین پر پاؤں آہستگی سے رکھیں، اس لئے ٹانگیں اگر ننگی نہ ہوں لیکن چلنے کے ساتھ زیور کی آواز پیدا ہوتی ہے تو یہ بھی مناسب نہیں ہے، اس کا چھپانا بھی ضروری ہے، یعنی گھر میں چلتے پھرتے پاؤں ایسے طور پر زمین پہ نہ رکھیں کہ وہ پاؤں کا زیور بجے، وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ نہ ماریں اپنے پاؤں کو تا کہ جان لیا جائے اس زینت کو جس کو یہ چھپاتی ہیں، مِنْ زِيْنَتِهِنَّ یہ ''ما'' کا بیان ہے۔ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا توبہ

کرو اللہ کی طرف سارے کے سارے، رجوع کرو اللہ کی طرف سارے کے سارے اے ایمان والو! لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ: تا کہ تم فلاح پا جاؤ۔ اس آیت میں پردے کے اَحکام ذکر کیے گئے ہیں، اس کو دوبارہ دیکھئے۔ غضِ بصر کا حکم ذکر کرنے کے بعد یہ بتایا کہ عورتوں کو چاہیے کہ وہ اپنی زینت کا اِخفاء کریں یعنی مواقع زینت کا اِخفاء کریں۔ اب عورت کے رشتہ دار دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک تو شوہر ہے خاوند ہے.........[1]

نکاح کے بعد نفس، نظر پاک رہتے ہیں

[2] وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ: ان آیات میں ان لوگوں کا نکاح کر دینے کا حکم ہے جو بانکاح نہ ہوں، جس کی دونوں صورتیں ہیں ایک یہ کہ اب تک نکاح ہوا ہی نہ ہو، دوسری یہ کہ نکاح ہو کر چھوٹ چھڑاؤ ہو گیا ہو، یا میاں بیوی میں سے کسی کی وفات ہو گئی ہو۔ آیت شریفہ میں جو لفظ الْأَيَامَىٰ وارد ہوا ہے یہ اَیِّم کی جمع ہے۔ عربی میں اَیِّم اس مرد کو کہتے ہیں جس کا جوڑا نہ ہو، چونکہ نکاح ہو جانے سے مرد اور عورت کے نفسانی ابھار کا انتظام ہو جاتا ہے اور نکاح پاک دامن رہنے کا ذریعہ بن جاتا ہے اس لئے شریعت اسلامیہ میں اپنا نکاح کرنے اور دوسروں کا نکاح کرا دینے کی بڑی اہمیت اور فضیلت ہے۔ نکاح ہو جانے سے نفس ونظر پاک رہتے ہیں گناہ کی طرف دھیان چلا جائے تو اپنے نفس کی خواہش پورا کرنے کے لئے انتظام ہوتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب بندہ نے نکاح کر لیا اس نے آدھے دین کو کامل کر لیا لہٰذا وہ باقی آدھے دین کے بارے میں اللہ سے ڈرے۔ (مشکوٰۃ، ص ۲۶۸) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اے نوجوانو! تم میں سے جسے نکاح کا مقدور ہو وہ نکاح کرلے کیونکہ نکاح نظروں کو نیچی رکھنے اور شرمگاہ کو پاک رکھنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اور جسے نکاح کا مقدور نہ ہو، وہ روزے رکھے۔ کیونکہ روزے رکھنے سے اس کی شہوت دب جائے گی، (بخاری ج ۲ ص ۷۵۸)۔

تمہاری کثرت پر فخر کروں گا

مستقل طور پر قوت مردانہ زائل کرنے کی اجازت نہیں ہے کیونکہ نسل بڑھانا مقصود ہے اور مسلمان کی جو اولاد ہوتی ہے وہ عموماً مسلمان ہی ہوتی ہے اور اس طرح سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت بڑھتی ہے آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ایسی عورت سے نکاح کرو جس سے دل لگے اور جس سے اولاد زیادہ ہو کیونکہ میں دوسری امتوں کے مقابلوں میں تمہاری کثرت پر فخر کروں گا۔ (سنن ابی داؤد ج ۱ ص ۲۸۰)۔

---

(۱) اس کے بعد ریکارڈنگ دستیاب نہیں ہوئی۔ اس لیے اسی پر اکتفاء کیا گیا ہے۔

(۲) آیت نمبر ۳۲ تا آیت نمبر ۵۰ ترجمہ تفسیر ریکارڈنگ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے "انوار البیان" از مولانا محمد عاشق الٰہی رحمۃ اللہ علیہ سے ماخوذ ہے۔

خصی ہونے کی ممانعت

اگر مردانہ قوت زائل نہ کی جائے پھر کبھی نکاح کا مقدور ہو جائے تو اس میں اولاد سے محروم نہ ہوگا۔ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہمیں خصی ہونے کی اجازت دیجئے! آپ نے فرمایا: "لَيْسَ مِنَّا مَنْ خَصٰى وَلَا اخْتَصٰى إِنَّ خِصَاءَ أُمَّتِي الصِّيَامُ" (مشکوٰۃ، ص ۱۲۹) یعنی وہ شخص ہم میں سے نہیں جو کسی کو خصی کرے یا خود خصی بنے، بے شک میری اُمت کا خصی ہونا یہ ہے کہ روزے رکھے جائیں۔

نکاح کا شرعی حکم

عام حالات میں نکاح کرنا سنت ہے حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کا طریقہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چار چیزیں ایسی ہیں جنہیں انبیائے کرام علیہم السلام نے اختیار فرمایا تھا: ۱۔ شرم کرنا، ۲۔ عطر لگانا، ۳۔ مسواک کرنا، ۴۔ نکاح کرنا، (ترمذی من ابواب النکاح)۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی کی شہوت کا غلبہ ہو اور اسے غالب گمان ہو کہ حدود شریعت پر قائم نہ رہ سکے گا نفس و نظر کو محفوظ نہ رکھ سکے گا اور اس کے پاس نکاح کرنے کے وسائل بھی موجود ہوں تو ایسے شخص پر نکاح کرنا واجب ہے۔ اگر شہوت کا غلبہ ہے اور نکاح کے وسائل نہیں یا کوئی عورت اس سے نکاح کرنے پر راضی نہیں تو گناہ میں مبتلا ہونا پھر بھی حلال نہیں، شہوت دبانے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے رکھنے کا نسخہ بتایا ہے اس پر عمل کریں۔ پھر جب اللہ تعالیٰ توفیق دے دے تو نکاح کر لیں۔

والدین کی بے پروائی کے نتائج

چونکہ عام طور پر اپنے نکاح کی کوشش خود نہیں کی جاتی اور خاص کر عورتیں اور ان میں بھی کنواری لڑکیاں اپنے نکاح کی خود بات چلانے سے شرماتی ہیں، اور یہ شرم ان کے لئے بہترین ہے جو ایمان کے تقاضوں کی وجہ سے ہے، اس لئے اولیاء کو لڑکوں اور لڑکیوں کے نکاح کرنے کے لئے متفکر رہنا لازم ہے، اسی طرح بڑی عمر کے بے شادی شدہ مردوں اور عورتوں کے نکاح کے لئے فکر مند رہنا چاہیے۔ آیتِ شریفہ میں جو "وَأَنْكِحُوا الْأَيَامٰى" فرمایا ہے، آج کل لوگوں نے نکاح کو ایک مصیبت بنا رکھا ہے، دین دار جوڑا نہیں ڈھونڈتے اور دُنیاداری، ریاکاری کے دھندے پیچھے لگے ہوئے ہیں، جن کی وجہ سے بڑی بڑی عمروں کے مرد اور عورت بے نکاح کے بیٹھے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکیاں بے شرم ہو کر خود سے اپنا جوڑا ڈھونڈ لیتی ہیں اور کورٹ میں جا کر قانونی نکاح کر لیتی ہیں، اب ماں باپ چونکتے ہیں کہ ہائے ہائے یہ کیا ہوا! اور بعض مرتبہ یہ نکاح شرعاً دُرست نہیں ہوتا۔ اولاد کے نکاح کے سلسلے میں لوگوں کی بے دھیانی اور بے راہی کی وجہ سے بڑے بُرے نتائج سامنے آرہے ہیں۔

بابرکت نکاح

دین داری کی بجائے دوسری چیزوں کو دیکھا جاتا ہے۔ بڑے بڑے خرچوں کے انتظام میں دیر لگنے کی وجہ سے لڑکیاں بیٹھی رہتی ہیں، ریاکاری کے جذبات سادہ شادی نہیں کرنے دیتے۔ ہیں تو سید صاحب لیکن اپنی ماں فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مطابق بیٹا

بیٹی کے نکاح کرنے کو عار سمجھتے ہیں، اگر کوئی توجہ دلاتا ہے تو کہتے ہیں یہ آج کل کا دور ہی ایسا ہے، لیکن یہ نہیں سوچتے کہ اس دور کا لانے والا کون ہے؟ خود ہی ریا کاری کا رواج ڈالا اور اب کہہ رہے ہیں کہ بڑے بڑے اخراجات نہ ہوں تو لڑکی کا نکاح کیسے کریں اور کس سے کریں؟ مسلمانو! ایسی باتیں چھوڑ دو، سادگی میں آ جاؤ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ برکت کے اعتبار سے سب سے بڑا نکاح وہ ہے جس میں خرچہ کم سے کم ہو (مشکوٰۃ ص ۲۶۸)۔

غلام اور باندیوں کے نکاح کے متعلق اَحکام

غیر شادی شدہ آزاد مرد اور عورتوں کے نکاح کا حکم دینے کے بعد فرمایا: وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآىِٕكُمْ: یعنی اپنے غلاموں میں سے ان غلاموں اور باندیوں کا نکاح کرو جو صالح ہوں۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ صالحین سے وہ غلام اور باندیاں مراد ہیں جن میں نکاح کی صلاحیت ہو اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس سے صالح کے معروف معنی یعنی نیک ہونا مراد ہے۔ جو معنی بھی مراد لیا جائے غلام اور باندی کے آقا کے لئے مستحب ہے کہ ان میں نکاح اور صلاحیت دیکھے تو نکاح کر دے۔ غلاموں اور باندیوں کے نکاحوں اور ان سے پیدا شدہ اولاد کے مسائل کُتبِ فقہ میں مذکور ہیں۔ آزاد مرد اور عورت اور مملوک مرد اور عورت کے نکاح کا حکم دینے کے بعد فرمایا: اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ: اگر یہ لوگ مفلس ہوں گے تو اللہ انہیں اپنی فضل سے غنی فرمادے گا۔ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ: اور اللہ وسعت والا ہے جاننے والا ہے۔

تین شخصوں کی مدد کا ذمہ اللہ نے لے لیا ہے

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نکاح کرنے والے کی مالی امداد فرمائے گا۔ اور اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ تنگدستی کی وجہ سے نکاح کرنے سے باز نہ رہیں۔ اگر کوئی مناسب عورت مل جائے تو نکاح کر لیں۔ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تین شخص ایسے ہیں جن کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے کر لیا ہے: ۱۔ وہ مکاتب جو ادائیگی کی نیت رکھتا ہے، (عنقریب ہی ''مکاتب'' کا معنی معلوم ہو جائے گا ان شاء اللہ تعالیٰ!)۔ ۲۔ وہ نکاح کرنے والا جو پاک دامن رہنے کی نیت سے نکاح کرے۔ ۳۔ وہ مجاہد جو اللہ کی راہ میں جہاد کرے، (نسائی، وکتاب النکاح)۔

پھر فرمایا وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ کہ جو لوگ نکاح پر قدرت نہ رکھتے ہوں ان کے پاس مال و اسباب نہیں، گھر در نہیں تو وہ عذر بنا کر اپنی عفت اور عصمت کو داغ دار نہ کر لیں۔ نظر اور شرم گاہ کی حفاظت کا اہتمام کریں۔ یوں نہ سمجھ لیں کہ جب میں نکاح نہیں کر سکتا تو نفس کے ابھار دخواہشات کو زنا کے ذریعے پورا کر لوں۔ زنا بہرحال حرام ہے اس کے حلال ہونے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل کا انتظار کریں، جب مقدور ہو جائے تو نکاح کریں اور صبر سے کام لیں اور نفس کے جذبات کو دبانے کی تدبیر حدیث شریف میں گزر چکی ہے کہ روزے رکھا کریں۔

غلاموں اور باندیوں کو ’’مکاتب‘‘ بنانے کے متعلق اَحکام

وَالَّذِیْنَ یَبْتَغُوْنَ الْکِتٰبَ مِمَّا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ فَکَاتِبُوْهُمْ: غلام اور باندیوں کے بارے میں شریعتِ مطہرہ میں بہت سے احکام ہیں جو حدیث وفقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ انہی اَحکام میں سے ایک ’’مکاتبت‘‘ بھی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ آقا اپنے غلام یا باندی سے کہے کہ اگر تُو مجھے اتنی رقم دے دے تو آزاد ہے۔ اگر غلام باندی اسے منظور کرلے تو پھر وہ آقا کی خدمت سے آزاد ہوجاتا ہے۔ غلام تو رہتا ہے لیکن کسب میں آزاد ہوجاتا ہے، جب بھی مقررہ پوری رقم دے دے گا آزاد ہوجائے گا۔ جب غلام کا آقا سے ’’مکاتبت‘‘ کا معاملہ ہوجائے جسے ’’کتابت‘‘ بھی کہتے ہیں تو غلام ’’مکاتب‘‘ ہوگیا، اگر غلام سے یہ طے ہوا ہے کہ ابھی لاکر رقم دے دے تو آزاد ہے، اور وہ کسی سے اُدھار، قرض لے کر اپنے آقا کو رقم دے دے تو اسی وقت آزاد ہوجائے گا۔ اور اگر یہ طے ہوا کہ اتنے عرصے میں، اتنی قسطوں میں رقم ادا کرتے رہنا، جب آخری قسط دے دوگے تو آزاد ہوجائے گے، تو اس صورتِ حال میں ’’مکاتب‘‘ اَموال کا کسب کرتا رہے اور آقا کو دیتا رہے، جب آخری قسط ادا کرے گا تو آزاد ہوجائے گا۔ اگر وہ کسب سے عاجز ہوجائے یا یوں کہہ دے کہ میں آگے قسط نہیں دے سکتا، تو دوبارہ اسی طرح سے غلام ہوجائے گا جیسے غلام ہوا کرتے ہیں۔ یعنی پوری طرح آقا کے اختیارات اس پر محکم ومسلط ہوجائیں گے۔

’’صبیح‘‘ نامی ایک غلام نے اپنے آقا حویطب بن عبدالعزیٰ سے کہا مجھے ’’مکاتب‘‘ بنادو، انہوں نے انکار کردیا، تو آیتِ کریمہ وَالَّذِیْنَ یَبْتَغُوْنَ الْکِتٰبَ نازل ہوئی (درمنثور)۔ اس میں یہ بھی اضافہ ہے کہ آیت نازل ہونے کے بعد صبیح کے آقا نے سو دینار پر ’’مکاتب‘‘ بنادیا اور اس میں سے بیس دینار اپنے ’’مکاتب‘‘ کو بخش دیئے، یہ ’’مکاتب‘‘ بھی مسلمان تھا جو غزوۂ حنین میں شہید ہوا، اس کے آقا حضرت حویطب رضی اللہ عنہ بھی صحابی تھے (معالم التنزیل)، چونکہ آیت میں لفظ ’’فَکَاتِبُوْهُمْ‘‘ اَمر کا صیغہ وارد ہوا ہے اس لئے حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ اور عمرو بن دینار رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اگر غلام اپنی قیمت یا اس سے زیادہ کتابت کا معاملہ کرنا چاہے اور اپنے آقا سے درخواست کرے تو آقا پر واجب ہے کہ اسے ’’مکاتب‘‘ بنادے اور اپنی قیمت سے کم پر ’’مکاتب‘‘ بنانے کا مطالبہ کرے تو آقا کے ذِمّے ’’مکاتب‘‘ بنانا واجب نہیں ہے، لیکن اکثر اہلِ علم نے یوں فرمایا ہے کہ یہ حکم ایجابی نہیں ہے، اِستحباب کے لئے ہے، یعنی غلام کے کہنے پر اگر آقا اسے ’’مکاتب‘‘ بنادے تو بہتر ہے، اگر نہ بنائے گا تو گنہگار نہ ہوگا۔

’’فَکَاتِبُوْهُمْ‘‘ کے ساتھ اِنْ عَلِمْتُمْ فِیْهِمْ خَیْرًا بھی فرمایا ہے، یعنی اگر تم ان کے اندر خیر پاؤ تو انہیں ’’مکاتب‘‘ بنادو، ’’خیر‘‘ سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں ’’درمنثور‘‘ میں ’’ابوداؤد‘‘ اور ’’سنن بیہقی‘‘ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ اگر تم ان میں حرفہ یعنی کمائی کا ڈھنگ دیکھو تو انہیں ’’مکاتب‘‘ بنادو، انہیں اس حال میں نہ چھوڑو کہ لوگوں پر بوجھ بن جائیں مطلب یہ ہے کہ ان کے اندر اگر مال کمانے کی طاقت اور طریقہ محسوس کرو تو ’’مکاتب‘‘ بنادو، ایسا نہ ہو کہ وہ لوگوں سے مانگ کر مال جمع کرتے پھریں اور اس سے تمہیں بدل کتابت ادا کریں۔ ’’درمنثور‘‘ میں یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما اپنے کسی غلام کو ’’مکاتب‘‘ نہیں بناتے تھے، جب تک یہ نہ دیکھ لیتے تھے کہ یہ کما کر دے سکے گا، اور یوں فرماتے تھے کہ اگر یہ کمانے کا اہل نہ ہوا تو مجھے لوگوں کے میل

کچیل کھلائے گا یعنی مانگ مانگ کر لائے گا۔ جب آقا کسی غلام کو ''مکاتب'' بنادے تو اب وہ حلال طریقوں پر مال کسب کر کے اپنے آقا کو قسطیں دیتا رہے، دو تین صفحات پہلے حدیث گزر چکی ہے کہ تین شخصوں کی مدد اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے لے لی ہے۔ ان میں سے ایک وہ ''مکاتب'' بھی ہے جس کا ادائیگی کا ارادہ ہو۔ بعض حضرات نے ''خیر'' سے نماز قائم کرنا مراد لیا ہے، یعنی اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ نماز قائم کریں گے تو تم انہیں ''مکاتب'' بنادو، لیکن اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ کافر کو ''مکاتب'' بنانا جائز نہ ہو، حالانکہ وہ بھی جائز ہے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ ''خیر'' سے یہ مراد ہے کہ آزاد ہو جانے کے بعد وہ مسلمانوں کے لئے مصیبت اور ضرر کا باعث نہ بنے، اگر کسی غلام کے بارے میں یہ محسوس ہوتا ہو کہ آزاد ہونے کی بعد مسلمانوں کو تکلیف دے گا تو ایسے غیر مسلم کو ''مکاتب'' نہ بنانا افضل ہے (روح المعانی)۔

اس کے بعد فرمایا: وَّاٰتُوۡهُمۡ مِّنۡ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِىۡۤ اٰتٰٮكُمۡ، اور انہیں اس مال سے دے دو جو اللہ نے تمہیں عطا فرمایا ہے۔ اس کے بارے میں صاحب ''معالم التنزیل'' نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور حضرت امام شافعی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آقا کو خطاب ہے کہ جسے ''مکاتب'' بنانا ہے اس کے بدل کتابت میں سے ایک حصہ معاف کر دے اور یہ ان حضرات کے نزدیک واجب ہے، بعض حضرات نے فرمایا ہے ۱/۴ معاف کر دے، یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ ۱/۳ معاف کر دے۔ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ اور دیگر حضرات نے فرمایا ہے کہ اس کی کوئی حد نہیں ہے جتنا چاہے معاف کر دے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک غلام کو پینتیس ہزار درہم کے عوض ''مکاتب'' بنایا، پھر آخر میں پانچ ہزار درہم چھوڑ دیئے۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ طریقہ تھا کہ جب کسی غلام کو ''مکاتب'' بناتے تھے تو شروع کی قسطوں میں سے کچھ معاف نہیں کرتے تھے، پھر آخری قسط میں سے جتنا چاہتے تھے چھوڑ دیتے تھے۔

آیت بالا کی تفسیر میں دوسرا قول یہ ہے کہ اس کا خطاب عام مسلمانوں کو ہے اور مطلب یہ ہے کہ عامۃ المسلمین ''مکاتب'' کی مدد کریں اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے ''مکاتب'' کو زکوٰۃ کی رقم دینا مراد ہے، کیونکہ سورۂ توبہ میں مصارف زکوٰۃ بیان کرتے ہوئے ''وَفِی الرِّقَابِ'' بھی فرمایا ہے (معالم التنزیل)۔

غلام اور باندی کو آزاد کرنے کا عظیم اَجر

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک دیہات کا آدمی آیا اور اس نے عرض کیا کہ مجھے ایسا عمل بتا دیجئے! جو مجھے جنت میں داخل کرا دے آپ نے فرمایا کہ جان کو آزاد کر دے اور گردن کو چھڑا دے۔ اس نے عرض کیا کہ کیا یہ دونوں ایک نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا: نہیں! پھر فرمایا کہ جان کا آزاد کرنا یہ ہے کہ تُو کسی جان کو (غلام ہو یا باندی) پورا پورا اپنی ملکیت سے آزاد کر دے، اور فَكُّ رَقَبَةٍ اور گردن کا چھڑانا یہ ہے کہ تُو اس کی قیمت میں مدد کرے (مشکوٰۃ ص ۲۹۳)۔ حضرت امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف، امام زُفر، امام محمد، امام مالک، امام ثوری نے فرمایا ہے کہ آقا کے ذمے یہ واجب نہیں کہ ہے کہ مال کتابت میں سے کچھ وضع کرے، اس پر مجبور نہیں کیا جائے گا، ہاں! اگر وہ کچھ رقم خود سے کم کر دے تو یہ مستحسن

ہے۔ پھر چند وجوہ سے ان حضرات کے قول کی تردید کی ہے جنہوں نے یوں فرمایا ہے کہ آقا پر بدلِ کتابت کا کچھ حصہ معاف کر دینا واجب ہے (احکام القرآن للجصاص)۔

زِنا کاری اور اُجرتِ زِنا حرام ہے

اس کے بعد فرمایا وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا: اور اپنی باندیوں کو زنا کرنے پر مجبور نہ کرو جب کہ وہ پاک دامن رہنا چاہیں، تاکہ تم کو دُنیاوی زندگی کا کوئی مال مل جائے۔ زمانۂ جاہلیت میں لوگ زِنا کاری کے خوگر تھے، عورتیں اس پیشے کو اِختیار کر کے مال دار بنی رہتی تھیں، زِنا کاری کے اڈوں پر جھنڈے لگے رہتے تھے، جس سے لوگ پہچان لیتے تھے کہ یہاں زِنا کار عورت رہتی ہے۔ جب آزاد عورتیں ہی زنا کاری کے پیشے سے مال حاصل کرتی تھیں تو اس کے لئے باندیاں اور زیادہ استعمال کی جاتی تھیں۔ لوگوں کا یہ طریقہ تھا کہ اپنی اپنی باندیوں سے کہتے تھے کہ جاؤ زِنا کرو، پیسے کما کر لاؤ۔ اور وہ زِنا کار مردوں کو ڈھونڈتی پھرتی تھیں اور زِنا کاری کی اُجرت میں جو پیسے ملتے تھے وہ اپنے آقاؤں کو لا کر دے دیتی تھیں۔ جب اسلام کے اَحکام نازل ہوئے تو زِنا کاری کو حرام قرار دے دیا، اور زِنا کی اُجرت کو بھی حرام قرار دے دیا، لیکن جن لوگوں کی باندیوں کو زِنا کاری کے لئے بھیج کر پیسہ کمانے کی عادت تھی انہیں اسلام کا فیصلہ اچھا نہ لگا، کتبِ حدیث سے ایسی متعدّد روایات نقل کی ہیں جن میں یہ بیان کیا ہے کہ رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبَیّ بن سلول کی باندیاں تھیں، وہ زمانۂ جاہلیت میں ان سے زِنا کرا کر پیسے کماتا تھا، جب اسلام کا زمانہ آیا تو انہیں زِنا کرنے پر مجبور کیا، جب انہوں نے انکار کیا تو بعض کو اس نے مارا بھی، اللہ جل شانہٗ نے آیتِ بالا نازل فرمائی: وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کہ دُنیاوی مال حاصل کرنے کے لئے اپنی باندیوں کو زِنا پر مجبور نہ کرو اگر وہ پاک دامن رہنے کا ارادہ کریں (درمنثور)۔

آخر میں جو الفاظ ہیں: اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا ''اگر وہ پاک دامن رہنے کا ارادہ کریں'' اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ باندیاں پاک دامن نہ رہنا چاہیں تو انہیں پر مجبور کرنا جائز ہے، بلکہ آقاؤں کو زجر و تنبیہ اور غیرت دِلانا مقصود ہے کہ باندی تو پاک دامن رہنا چاہتی ہے اور تم بے غیرتی کے ساتھ انہیں زِنا کے لئے مجبور کر کے زِنا کی اُجرت لینا چاہتے ہو، اب جاہلیت والی بات نہیں رہی اب تو زِنا بھی حرام ہے اور خوشی اور رضامندی سے ہو یا کسی کی زبردستی سے، اور زِنا کا حکم دینا اور اس پر مجبور کرنا بھی حرام ہے اور اس کی اُجرت بھی حرام ہے، چونکہ عبداللہ بن اُبَی مسلمان ہونے کا دعویدار تھا، اس لئے آیتِ شریف میں لفظ: اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا، بڑھا دیا کہ باندی زِنا سے بچ رہی ہے اور تُو اسے زِنا کے لئے مجبور کر رہا ہے، یہ کیسا دعوائے مسلمانی ہے؟

پھر فرمایا: وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ، اور جو شخص ان پر زبردستی کرے تو انہیں مجبور کرنے کے بعد اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لونڈیوں کو زِنا پر مجبور کرنا حرام ہے اگر کسی نے ایسا کیا اور وہ آقا کے جبر و اکراہ سے مغلوب ہو کر زِنا کر بیٹھی تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف فرما دے گا اور اس کا گناہ مجبور کرنے والے پر ہوگا۔

پھر فرمایا وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ اٰیٰتٍ مُّبَیِّنٰتٍ: مطلب یہ ہے کہ ہم نے تمہارے پاس کھلے کھلے احکام بھیجے ہیں جنہیں واضح طور پر بیان کردیا ہے، اور جو اُمتیں تم سے پہلے گزری ہیں ان کے لئے بھی بعض احوال اور واقعات بیان کردیئے ہیں جن میں تمہارے لئے عبرت ہے، ایسی چیزیں نازل کی ہیں جن میں متقیوں کے لئے نصیحت ہے، نصیحت تو سب کے لئے ہے، لیکن جن کا گناہوں سے بچنے کا ارادہ ہے وہی اس سے مستفید ہوتے ہیں، اس لئے اہلِ تقویٰ کے لئے مفید ہونے کا خصوصی تذکرہ فرمایا۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ

اللہ آسمانوں اور زمین کا نُور ہے، اس کے نُور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاقچہ ہے، اس میں ایک چراغ ہے، وہ چراغ ایک شیشہ

فِیْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ

قندیل میں ہے، وہ قندیل ایسا ہے جیسے ایک چمک دار ستارہ ہو، وہ چراغ بابرکت درخت سے روشن کیا جاتا ہو

زَیْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِیَّةٍ وَّلَا غَرْبِیَّةٍ ۙ یَّكَادُ زَیْتُهَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ

جو زیتون ہے، یہ درخت نہ مشرق کی طرف ہے اور نہ مغرب کی طرف قریب ہے کہ اس کا تیل خود بخود روشن ہوجائے اگرچہ اس کو آگ نہ چھوئے،

نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ ؕ یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَیَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ

نُور علیٰ نُور ہے، اللہ جسے چاہتا ہے اپنے نُور کی ہدایت دیتا ہے، اور لوگوں کے لئے اللہ مثالیں بیان فرماتا ہے،

وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۙ﴿۳۵﴾ فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ ۙ

اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے ﴿۳۵﴾ ایسے گھروں میں جن کے بارے میں اللہ نے حکم دیا ہے کہ ان کا ادب کیا جائے اور ان میں اللہ کا نام لیا جائے۔

یُسَبِّحُ لَهٗ فِیْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۙ﴿۳۶﴾ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِیْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ

ان میں ایسے لوگ صبح شام اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں ﴿۳۶﴾ جنہیں سوداگری اور خرید و فروخت کرنا غفلت میں نہیں ڈالتا اللہ کی

ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِیْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْهِ الْقُلُوْبُ

یاد سے، اور نماز پڑھنے سے اور زکوٰۃ دینے سے، وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس میں دل اور آنکھیں

وَالْاَبْصَارُ ۙ﴿۳۷﴾ لِیَجْزِیَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَیَزِیْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ

اُلٹ جائیں گی ﴿۳۷﴾ تاکہ اللہ انہیں ان کے اعمال کا اچھے سے اچھا بدلہ دے اور اپنے فضل سے انہیں اور بھی زیادہ دے اور اللہ

يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ

جسے چاہتا ہے بلاحساب رزق دیتا ہے ﴿۳۸﴾ اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے چٹیل میدان میں چمکتا ہوا ریت ہو

يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔـا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ

جسے پیاسا آدمی پانی سمجھ رہا ہو، یہاں تک کہ جب اس کے پاس آیا تو اس کو کچھ بھی نہ پایا اور اس نے وہاں اللہ کی قضا کو پالیا،

فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۳۹﴾ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِىْ بَحْرٍ لُّجِّىٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ

سو اللہ نے اس کا حساب پورا کر دیا، اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے ﴿۳۹﴾ یا جیسے کسی گہرے سمندر کے اندرونی حصے میں اندھیریاں ہوں جسے موج نے ڈھانک رکھا ہو،

مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَآ اَخْرَجَ

اس کے اُوپر ایک موج ہو، اس کے اُوپر بادل ہو، اندھیریاں ہیں بعض بعض کے اُوپر ہیں، جب اپنے ہاتھ کو

يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴿۴۰﴾

نکالے تو اسے نہ دیکھ پائے، اور جس کے لئے اللہ نور مقرر نہ فرمائے اس کے لئے کوئی نور نہیں ﴿۴۰﴾

تفسیر

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: اس آیت کریمہ میں اوّل تو یوں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں کا اور زمین کا نُور ہے، حضرات مفسرین نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ لفظ نُور، مُنَوِّر کے معنی میں ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین کو روشن فرما دیا ہے۔ یہ روشنی آسمانوں اور زمین کے لئے زینت ہے اور زینت صرف ظاہری روشنی تک محدود نہیں۔

آسمان اور زمین کی بقاء ایمان کی وجہ سے ہے

حضراتِ ملائکہ آسمانوں میں رہتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس میں مشغول ہیں، اس سے بھی عالمِ بالا میں نُورانیت ہے، اور زمین میں حضرات انبیائے کرام علیہم السلام تشریف لائے انہوں نے ہدایت کا نُور پھیلایا اس سے اہل زمین کو نُورانیت حاصل ہے، اور چونکہ ایمان کی وجہ سے آسمان اور زمین کا بقاء ہے، ایمان والے نہ ہوں گے تو قیامت آجائے گی، اس لئے ایمان کی نُورانیت سے آسمان اور زمین سب منور ہیں۔ اسی معنی کو لے کر حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''هَادِی اَهْلِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَهُمْ بِنُوْرِهٖ اِلَى الْحَقِّ يَهْتَدُوْنَ وَبِهُدَاهُ مِنَ الضَّلَالَةِ يَنْجُوْنَ'' (معالم التنزیل، روح المعانی)۔

اللہ کے نور کی مثال

پھر فرمایا: مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ: اللہ کے نور کی ایسی مثال ہے جیسے ایک طاقچہ ہے، جس میں ایک چراغ رکھا ہوا ہے، اور وہ چراغ ایسے قندیل میں ہے جو شیشے کا بنا ہوا ہے، اور وہ قندیل ایسا صاف شفاف ہے جیسے چمکدار ستارہ ہو، چراغ تو خود ہی روشن ہوتا ہے، پھر وہ ایسے قندیل میں جل رہا ہے جو شیشے کا ہے، اور شیشہ بھی معمولی نہیں اپنی چمک دمک میں ایک چمکدار ستارے کی طرح ہے، پھر وہ چراغ بھی جل رہا ہے ایک بابرکت درخت کے تیل سے جسے "زیتون" کہا جاتا ہے۔ زیتون جس کے درخت سے تیل لیا گیا ہے وہ درخت بھی ایسا عام درخت نہیں بلکہ وہ ایسا درخت ہے جو مشرق کے رُخ پر ہے نہ مغرب کے رُخ پر۔ یعنی اس پر دُھوپ پڑتی ہے نہ تو مشرق کی جانب کوئی آڑ ہے جو اس کی دُھوپ کو روکے، اور نہ مغرب کی طرف کوئی آڑ ہے جو اس جانب سے آنے والی دُھوپ کو روکے، یہ درخت کھلے میدان میں ہے، جہاں اس پر دُھوپ پڑتی رہتی ہے، ایسے درخت کا تیل بہت صاف روشن اور لطیف ہوتا ہے، کمال یہ ہے کہ اگر اسے آگ بھی نہ چھوئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی خود بخود جل اُٹھے گا۔ چراغ روشن ہے، پھر اس میں کئی طرح سے روشنی بڑھنے کے اسباب موجود ہیں۔ یہ سب چیزیں جمع ہو کر نُور علیٰ نُور (روشنی پر روشنی) کی شان پیدا ہو گئی ہے، تشبیہ ہے اور ایک مثال ہے۔

"نُور" سے کیا مراد ہے؟

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کے نُور کو مثال مذکور میں بیان فرمایا ہے، اس سے کیا مراد ہے؟ حضرت حسن اور زید بن اسلم نے فرمایا کہ اس سے قرآنِ کریم مراد ہے، اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ اس سے سیدنا محمد ﷺ کی ذاتِ گرامی مراد ہے، اور حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس سے وہ نُور مراد ہے جو مؤمن بندوں کے دلوں میں ہے، وہ اسی نُور کے ذریعے ہدایت پاتے ہیں جسے سورۂ زُمر (آیت: ۲۲) میں یوں بیان فرمایا: اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ "نُور" سے فرماں برداری مراد ہے۔

نُورِ ہدایت کا اثر

صاحبِ "بیان القرآن" نے اس مقام پر تشبیہ کو واضح کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ اسی طرح مؤمن کے قلب میں اللہ تعالیٰ جب نُورِ ہدایت ڈالتا ہے تو روز بروز اس کا انشراح قبولِ حق کے لئے بڑھتا چلا جاتا ہے اور ہر وقت احکام پر عمل کرنے کے لئے تیار رہتا ہے گو بالفعل بعض احکام کا علم بھی نہ ہوا ہو، کیونکہ علم تدریجاً حاصل ہوتا ہے، جیسے وہ روغنِ زیتون آگ لگنے سے پہلے ہی روشنی کے لئے مستعد تھا، مؤمن بھی علمِ اَحکام سے پہلے ہی ان پر عمل کے لئے مستعد ہوتا ہے، اور جب اس کو علم حاصل ہوتا ہے تو نورِ عمل یعنی عمل کے پختہ ارادہ کے ساتھ نُورِ علم بھی مل جاتا ہے، جسے وہ فوراً ہی قبول کر لیتا ہے۔ پس عمل و علم جمع ہو کر نُور علیٰ نُور صادق آ جاتا ہے۔ اور یہ نہیں ہوتا کہ علمِ اَحکام کے بعد اس کو کچھ عمل میں تامل و تردد ہو کہ اگر موافقِ نفس کے پایا قبول کر لیا، ورنہ رَد کر دیا۔

اسی اِنشراح اور نُور کو دُوسری آیت میں اس طرح بیان فرمایا ہے: اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ یعنی جس شخص کا سینہ اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیا تو وہ اپنے رَبّ کی طرف سے ایک نُور پر ہوتا ہے۔ اور ایک جگہ فرمایا: فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ (الانعام:۱۲۵)۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آیت کریمہ: فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ تلاوت فرمائی۔ پھر فرمایا بلاشبہ جب نُور سینہ میں داخل کر دیا جاتا ہے تو پھیل جاتا ہے۔ عرض کیا گیا: یارسول اللہ! کیا اس کی کوئی نشانی ہے جس کے ذریعے اس کو پہچان لیا جائے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں "دارالغرور" دھوکے کے گھر یعنی دنیا سے دُور رہنا، اور "دارالخلود" ہمیشگی والے گھر کی طرف متوجہ ہونا، اور موت آنے سے پہلے اس کے لئے تیاری کرنا، یہ اس نُور کی علامت ہے۔ (مشکوٰۃ ص۴۴۶) پھر فرمایا: يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ: اللہ جسے چاہتا ہے اپنے نُور کی ہدایت دیتا ہے۔ اللہ کی ہدایت ہی سے ایمان نصیب ہوتا ہے اور اَعمالِ صالحہ کی بھی توفیق ہوتی ہے اور نفس کو ترکِ ممنوعات اور اعمالِ صالحہ کرنے کی آسانی ہوجاتی ہے، نفس بھی دل کے نیک جذبات کا تابع ہوجاتا ہے اور دونوں کو اَعمالِ صالحہ میں لذّت محسوس ہونے لگتی ہے۔ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ: اور اللہ لوگوں کے لئے مثالیں بیان فرماتا ہے تاکہ ان کے ذریعے مضامین عقلیہ محسوس چیزوں کی طرح سمجھ میں آجائیں۔ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ: اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ سب کے اعمال واحوال اسے معلوم ہیں اپنے علم وحکمت کے موافق جزاسزا دے گا۔

مساجد اور اہلِ مساجد کی فضیلت

فِىْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ: ان آیات میں مساجد اور اہلِ مساجد کی فضیلت بیان فرمائی ہے لفظ فِىْ بُيُوْتٍ جو جار مجرور ہے کس سے متعلق ہے؟ اس میں مختلف قول ہیں "تفسیر جلالین" میں ہے کہ یہ يُسَبِّحُ سے متعلق ہے جو اس سے متاخر ہے، اور مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ جنہیں اللہ کے ذِکر سے، نماز قائم کرنے سے، اور زکوٰۃ ادا کرنے سے، تجارت اور مال کی فروختگی غفلت میں نہیں ڈالتی، ایسے گھروں میں صبح شام اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں جن کے بارے میں اللہ نے حکم دیا ہے کہ ان کا ادب کیا جائے اور ان میں اللہ کا ذکر کیا جائے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان گھروں سے مسجدیں مراد ہیں۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ "معالم التنزیل" میں لکھتے ہیں کہ صبح وشام کا ذکر کرنے سے پانچوں نمازیں مراد ہیں، کیونکہ نمازِ فجر صبح کے وقت ادا کی جاتی ہے، باقی نمازیں دِن ڈھلنے کے بعد ادا کی جاتی ہیں۔ لفظ آصال اصیل کی جمع ہے، جو ظہر، عصر، مغرب اور عشاء چاروں نمازوں پر صادق آتا ہے۔ اور بعض علماء نے فرمایا: اس سے فجر اور عصر کی نمازیں مراد ہیں۔ صاحب "جلالین" نے پہلے قول کو لیا ہے، انہوں نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: العشایا من بعد الزوال۔ خواہ پانچ نمازیں مراد لی جائیں یا صرف فجر اور عصر مراد لی جائے، بہرصورت آیت کریمہ میں نمازیوں کی تعریف فرمائی ہے، اور فرمایا ہے کہ مسجدوں میں وہ لوگ اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں جنہیں تجارت اور خرید وفروخت اللہ کی یاد سے اور نماز قائم کرنے سے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے نہیں روکتی، دنیا کی ضرورت کے لئے تجارت میں مشغول تو ہوجاتے ہیں لیکن بازار میں ہوتے ہوئے تجارت کی مشغولیت کو پیچھے ڈال کر نماز کے لئے مسجد میں حاضر ہوجاتے ہیں۔ "معالم التنزیل" میں

ہے کہ حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما ایک مرتبہ بازار میں موجود تھے نماز کا وقت ہو گیا تو لوگ کھڑے ہوئے اور اپنی دُکانیں بند کر کے مسجد میں داخل ہو گئے۔ حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما نے یہ منظر دیکھ کر فرمایا کہ انہیں لوگوں کے بارے میں آیت کریمہ: رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ، نازل ہوئی۔

نیک تاجروں کی اچھی صفات

تجارت اور خرید و فروخت کے اوقات میں نمازوں کے اوقات آ ہی جاتے ہیں، اس موقع پر خصوصاً عصر کے وقت جب کہ کہیں ہفت روزہ بازار لگا ہوا ہو، یا خوب چالو مارکیٹ میں بیٹھے ہوں اور گاہک پر گاہک آ رہے ہوں، کاروبار چھوڑ کر نماز کے لئے اُٹھنا اور پھر مسجد میں جا کر جماعت کے ساتھ اَدا کرنا تاجر کے لئے بڑے سخت امتحان کا وقت ہوتا ہے، بہت کم ایسے لوگ ہوتے ہیں جو مال کی محبت سے مغلوب نہ ہوں اور نماز کی محبت انہیں دُکان سے اُٹھا کر مسجد میں حاضر کر دے۔

اِقَامِ الصَّلٰوةِ کے ساتھ اِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ بھی فرمایا ہے اس میں نیک تاجروں کی دوسری صفت بیان فرمائی اور وہ یہ کہ یہ لوگ تجارت تو کرتے ہیں جس سے مال حاصل ہوتا ہے اور عموماً یہ مال اتنا ہوتا ہے کہ اس پر زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ مال کی محبت انہیں زکوٰۃ کی ادائیگی سے مانع نہیں ہوتی، جتنی بھی زکوٰۃ فرض ہو جائے حساب کر کے ہر سال اُصولِ شریعت کی مطابق مصارفِ زکوٰۃ میں خرچ کر دیتے ہیں۔ درحقیقت پوری طرح صحیح حساب کر کے زکوٰۃ ادا کرنا بہت اہم کام ہے جس میں اکثر پیسے والے فیل ہو جاتے ہیں، بہت سے لوگ زکوٰۃ دیتے ہی نہیں، اور بعض لوگ دیتے ہیں لیکن حساب کر کے نہیں دیتے، اور بہت سے لوگ اس وقت تک زکوٰۃ دیتے ہیں جب تک تھوڑا مال واجب ہو، لیکن زیادہ مال کی زکوٰۃ فرض ہو جائے تو پوری زکوٰۃ پر نفس کو آمادہ کرنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ ایک ہزار سے پچیس روپیہ نکال دیں، چار ہزار سے سو روپیہ دے دیں۔ لیکن جب لاکھوں ہو جاتے ہیں تو نفس سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔ اس وقت سوچتے ہیں کہ ارے اتنا زیادہ کیسے نکالوں......؟ مگر یہ نہیں سوچتے کہ جس ذاتِ پاک نے یہ مال دیا ہے اسی نے زکوٰۃ دینے کا حکم دیا ہے اور ہے بھی کتنا کم......؟ سو روپیہ پر ڈھائی روپیہ۔ جس نے حکم دیا وہ خالق اور مالک ہے اور اسے یہ بھی اختیار دیا ہے کہ پورا مال خرچ کر دینے کا حکم فرما دے اور وہ چھیننے پر اور مال کو ہلاک کرنے پر بھی قادر ہے، پھر زکوٰۃ ادا کرنے میں ثواب بھی ہے اور مال کی حفاظت بھی ہے، یہ سب باتیں مؤمنینِ مخلصین کو ہی سمجھ میں آتی ہیں۔

نیک لوگ اپنے اعمال پر غرور و گھمنڈ نہیں کرتے

يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ: یہ لوگ اس دن سے ڈرتے ہیں جس دن دل اور آنکھیں الٹ پلٹ ہوں گے۔ اوپر جن حضرات کی تعریف فرمائی کہ انہیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے نہیں روکتی ان کا ایک اور وصف بیان فرمایا جس پر تمام اعمالِ صالحہ کا اور منکرات و محرکات کے چھوڑنے کا مدار ہے۔ بات یہ ہے کہ جب لوگوں کا آخرت پر ایمان ہے اور وہاں کے حساب کی پیشی کا یقین ہے وہ لوگ نیکیاں بھی اختیار کرتے ہیں گناہوں سے بھی بچتے ہیں، انہیں اپنے اعمال پر غرور اور گھمنڈ نہیں ہوتا، وہ اچھے سے اچھا عمل کرتے ہیں، پھر بھی ڈرتے ہیں کہ ٹھیک طرح ادا ہوا یا

نہیں؟ عمل بھی کرتے ہیں اور آخرت کے مؤاخذے اور محاسبے سے بھی ڈرتے ہیں۔ قیامت کا دن بہت سخت ہوگا، اس میں آنکھیں بھی چکرا جائیں گی اور ہوش وحواس بھی ٹھکانے نہ ہوں گے۔

سورۂ ابراہیم میں فرمایا: اِنَّمَا یُؤَخِّرُهُمْ لِیَوْمٍ تَشْخَصُ فِیْهِ الْاَبْصَارُ ۙ مُهْطِعِیْنَ مُقْنِعِیْ رُءُوْسِهِمْ لَا یَرْتَدُّ اِلَیْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ۝ اللہ انہیں اسی دن کے لئے مہلت دیتا ہے جس دن آنکھیں اُوپر کو اُٹھی ہوئی رہ جائیں گی، جلدی جلدی چل رہے ہوں گے، اُوپر کو سر اُٹھائے ہوں گے، ان کی آنکھیں ان کی طرف واپس نہ لوٹیں گی اور ان کے دِل ہوا ہوں گے۔ جس نے اس دن کے مؤاخذے اور محاسبے کا خیال کیا اور وہاں کی پیشی کا مراقبہ کیا، اور خوف کھاتا رہا اور ڈرتا رہا کہ وہاں میرا کیا بنے گا؟ ایسا شخص دنیا میں فرائض اور واجبات بھی صحیح طریقے پر انجام دے گا اور گناہوں سے بھی بچے گا اور اسے آخرت کی فلاح اور کامیابی نصیب ہوگی۔

سورۂ مؤمنون میں جو فرمایا ہے: وَالَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰی رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ۝ اس کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: کیا ان ڈرنے والوں سے وہ لوگ مراد ہیں جو شراب پیتے ہیں، چوری کرتے ہیں....؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے صدیق کی بیٹی! اس سے یہ لوگ مراد نہیں، بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جو روزے رکھتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں اور صدقہ دیتے ہیں، اور حال ان کا یہ ہے کہ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ ان سے ان کا عمل قبول نہ کیا جائے، ان لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اُولٰٓئِكَ یُسٰرِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ۝ یہ وہ لوگ ہیں جو اچھے کاموں میں آگے بڑھتے ہیں۔ درحقیقت آخرت کا فکر اور وہاں کا خوف گناہوں کے چھڑانے اور نیکیوں پر لگانے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے (مشکوٰۃ ج ۱ ص ۴۵۷)۔

مساجد کے بارے میں جو فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ فرمایا ہے، اس بارے میں بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ تُرْفَعَ بمعنی تبنی ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ان کی تعمیر کرنے کا حکم دیا ہے، یہ حضرت مجاہد تابعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تُرْفَعَ بمعنی تُعَظَّمَ ہے کہ ان مساجد کی تعظیم کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، یعنی ان کا ادب کیا جائے، ان میں وہ کام اور وہ باتیں نہ کی جائیں جو مسجد کے بلند مقام کے خلاف ہیں۔

مساجد کی تعظیم میں داخل چند چیزیں

مساجد کی تعمیر بھی مامور بہ ہے اور مبارک ہے، جس کا بڑا اجر وثواب ہے، اور ان کا ادب کرنے کا بھی حکم فرمایا ہے۔ مسجدوں کو پاک وصاف رکھنا، ان میں بُرے اشعار نہ پڑھنا، بیع وشراء نہ کرنا، اپنی گمشدہ چیز تلاش نہ کرنا، پیاز لہسن کھا کر، یا کسی بھی طرح کی بدبو منہ میں، یا جسم میں، یا کپڑے میں، لے کر آنے سے پرہیز کرنا، ان میں دنیا والی باتیں نہ کرنا، بہت چھوٹے بچوں کو ساتھ نہ لے جانا، یہ سب چیزیں مسجد کی تعظیم میں داخل ہیں۔ مساجد کی اصل آبادی یہ ہے کہ اذانیں دے کر مسلمانوں کو نماز کے لئے بلایا جائے اور داخل ہونے کے بعد تحیۃ المسجد پڑھی جائے، اور جماعت سے نمازیں پڑھی جائیں، اور ان میں اللہ کا ذکر کیا جائے، قرآن مجید کی تعلیم ہو، دینی باتیں سکھائی اور پڑھائی جائیں، ایک نماز پڑھنے کے بعد مسجد میں بیٹھ کر دوسری نماز کا انتظار کیا جائے، ان میں اعتکاف کیا جائے، نماز پڑھ کر مسجد سے نکلے تو مسجد ہی میں دِل اٹکا رہے۔ احادیث شریفہ میں ان اُمور کا اہتمام کرنے کا

حکم فرمایا ہے، حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ مساجد کا دھیان رکھتا ہے تو اس کے مؤمن ہونے کی گواہی دے دو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (مشکوٰۃ ص ۶۹)۔

عورتوں کے لئے نماز پڑھنے کی مناسب جگہ

آیت شریفہ میں جو لفظ "رِجَالٌ لَّا تُلْهِیْهِمْ" وارد ہوا ہے، اس سے بعض حضرات نے یہ استنباط کیا ہے کہ رجال یعنی مرد مسجدوں میں آئیں، ان میں نماز پڑھیں اور ذکر و تلاوت کریں اور درس میں مشغول ہوں، یہ مردوں ہی کے لئے مناسب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کو بعض شرطوں کے ساتھ مسجد میں آنے کی اجازت تو دی ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ "بُیُوْتُهُنَّ خَیْرٌ لَّهُنَّ" اور ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ عورت کی نماز اس کے گھر یعنی اندر کے حصے میں اس نماز سے بہتر ہے جو صحن میں پڑھی، اور خوب اندر کے کمرے میں نماز پڑھے یہ اس سے بہتر ہے کہ اپنے گھر کے ابتدائی حصہ میں نماز پڑھے، (ابوداؤد ج ۱ ص ۸۴)۔

لِیَجْزِیَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا: تا کہ اللہ ان کو ان کے اعمال کا اچھے سے اچھا بدلہ دے۔ وَیَزِیْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ اور انہیں اپنے فضل سے اور بھی زیادہ دے۔ وَاللّٰهُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ۔ اور اللہ جسے چاہتا ہے بلاحساب رزق عطا فرماتا ہے۔ ایمان اور اعمال صالحہ والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں اچھے سے اچھا اجر ہے اور زیادہ سے زیادہ ثواب ہے، بلاحساب رزق ہے۔

کافروں کے اعمال کی پہلی مثال

وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ: اہل ایمان کے اعمال کی جزا بتانے کے بعد کافروں کے اعمال کا تذکرہ فرمایا، آخرت میں ان کے منافع سے محرومی ظاہر کرنے کے لئے دو مثالیں ظاہر فرمائیں۔ کافر لوگ دنیا میں بہت اعمال کرتے ہیں، مثلاً صلہ رحمی بھی کرتے ہیں، جانوروں کو کھلاتے ہیں، چیونٹیوں کے بلوں میں آٹا ڈالتے ہیں، مسافر خانے بناتے ہیں، کنویں کھدواتے ہیں اور پانی کی سبیلیں لگاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے ہمیں موت کے بعد فائدہ پہنچے گا، ان کی اس غلط فہمی کو واضح کرنے کے لئے دو مثالیں ذکر فرمائیں۔ پہلی مثال یہ ہے کہ ایک شخص پیاسا ہو، وہ دور سے سراب یعنی ریت کو دیکھے اور اسے یہ سمجھے یہ پانی ہے، سخت دوپہر کے وقت جنگلوں کے چٹیل میدانوں میں دور سے ریت پانی معلوم ہوتا ہے، اب وہ جلدی جلدی اپنے خیال میں پانی کی طرف چلا وہاں پہنچا تو جو کچھ اس کا خیال تھا اس کے مطابق کچھ بھی نہ پایا وہاں تو ریت نکلی جو سخت گرم تھی نہ اسے کھا سکتا ہے، نہ اس سے پیاس بجھ سکتی ہے، جس طرح اس پیاسے کا گمان جھوٹا نکلا، اسی طرح کافروں کا یہ خیال کہ ظاہری صورت میں جو اچھے اعمال کرتے ہیں یہ موت کے بعد نفع بخش ہوں گے، غلط ہے، کیونکہ اعمال صالحہ کے اخروی ثواب کے لئے ایمان شرط ہے، وہاں پہنچیں گے تو کسی عمل کا جسے نیک سمجھ کر کیا تھا کچھ بھی فائدہ نہ پہنچے گا، کما قال تعالیٰ: وَقَدِمْنَاۤ اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً

مَّنْثُوْرًا (سورۂ فرقان: ۲۳) اور ہم ان کے اعمال کی طرف متوجہ ہوں گے سوان کو ایسا کر دیں گے جیسے پریشان غبار۔ لیکن اللہ تعالیٰ کافروں کے اعمال جو بظاہر نیک ہوں، بالکل ضائع نہیں فرماتا، ان کا بدلہ دنیا ہی میں دے دیتا ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ اللہ کسی مؤمن پر ایک نیکی کے بارے میں بھی ظلم نہیں فرمائے گا، دنیا میں بھی اس کا بدلہ دے گا اور آخرت میں بھی اس کی جزا دے گا، لیکن کافر جو نیکیاں اللہ کے لئے کرتا ہے، دنیا میں اس کا بدلہ دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ جب آخرت میں پہنچے گا اس کی کوئی بھی نیکی نہ بچی ہوگی جس کا اسے بدلہ دیا جائے۔ وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ: اور اس نے اللہ کو اپنے عمل کے پاس پایا، سواس نے اس کا حساب پورا کر دیا۔ یعنی دنیا میں اس کے اعمال کا بدلہ دیا جا چکا ہوگا۔ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ: اور اللہ جلدی حساب لینے والا ہے۔ یعنی اسے حساب لینے میں دیر نہیں لگتی اور ایک حساب کرنا دوسرے کا حساب لینے سے مانع نہیں ہوتا۔

دُوسری مثال

کافروں کے اعمال کی دُوسری مثال بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ: یا یوں سمجھو جیسے بہت سے اندھیرے بڑے گہرے سمندر کے اندرونی حصے میں ہوں، اور اس سمندر کو ایک بڑی موج نے ڈھانک لیا ہو، پھر اس موج کے اُوپر دُوسری موج ہو، پھر اس کے اُوپر بادل ہو، نیچے اُوپر اندھیریاں ہیں، اگر کوئی شخص دریا کی تہہ میں ہو جہاں مذکورہ اندھیریوں پر اندھیریاں ہوں اور اپنا ہاتھ نکال کر دیکھنا چاہے تو وہاں اس کے اپنے ہاتھ کے دیکھنے کا ذرا بھی احتمال نہیں۔ اسی طرح کافر بھی گھٹاٹوپ اندھیریوں میں ہیں، وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہمارے اعمال کا اچھا نتیجہ نکلے گا، حالانکہ اس کا کچھ بھی اچھا نتیجہ نکلنے والا نہیں۔

مفسر ابنِ کثیر (ص ۲۹۶ ج ۳) فرماتے ہیں کہ پہلی مثال ان کافروں کی ہے جو جہلِ مرکب میں مبتلا ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے اعمال ہمارے لئے نفع مند ہوں گے۔ اور دُوسری مثال ان لوگوں کی ہے جو جہلِ بسیط میں مبتلا ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کُفر کے سرغنوں کے مقلد ہونے کی وجہ سے کافر ہیں، انہیں کچھ پتا نہیں کہ ہمارے قائد کا کیا حال ہے اور وہ ہمیں کہاں لے جائے گا؟ جب ان سے پوچھا جائے کہ تم کہاں جا رہے ہو؟ تو کہتے ہیں کہ ہم اپنے سرداروں کے ساتھ ہیں! پھر جب پوچھا جاتا ہے کہ وہ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟ تو کہتے ہیں کہ ہمیں پتا نہیں! اور بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ پہلی مثال ان کافروں کی ہے جو موت کے بعد ثواب ملنے کے قائل ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ ہمارے نیک اعمال ہمارے لئے نفع مند ہوں گے۔ اور دُوسری مثال ان کافروں کی ہے جو قیامت اور آخرت کو مانتے ہی نہیں اور وہ اعمال کی جزا سزا کے منکر ہیں۔ ان کے پاس وہمی نُور بھی نہیں جب کہ پہلی قسم کے کافروں کے پاس ایک وہمی اور خیالی نُور تھا، سوجن لوگوں نے آخرت کے لئے کوئی عمل کیا ہی نہیں ان کے لئے تو بس ظلمت ہی ظلمت ہے۔

مفسر ابنِ کثیر نے: ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت اُبَیّ بن کعب رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ کافر

پانچ اندھیریوں میں ہے، اس کی بات ظلمت ہے، اس کا عمل ظلمت ہے، اس کا اندر جانا عمارت میں داخل ہونا ظلمت ہے، اور اس کا نکلنا ظلمت ہے، اور قیامت کے دن وہ دوزخ کی اندھیریوں میں داخل ہوجائے گا۔ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ اور اللہ جس کے لئے نُور مقرر نہ فرمائے اس کے لئے کوئی نُور نہیں۔ یہ يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ کے مقابلے میں فرمایا مؤمن کو اللہ نے نُور دیا، فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ (سورۂ زُمر: ۲۲) اور کافر کے لئے اللہ نے نُور مقرر نہیں فرمایا لہٰذا وہ کُفر کی ظلمتوں میں ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدْ

کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ وہ سب اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور پرندے جو پَر پھیلائے ہوئے ہیں۔ ہر ایک نے

عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۝۴۱ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ

اپنی نماز اور تسبیح کو جان لیا ہے اور جن کاموں کو لوگ کرتے ہیں اللہ انہیں جانتا ہے ۝۴۱ اور اللہ ہی کے لئے ملک ہے آسمانوں

وَالْاَرْضِ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۝۴۲ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِىْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ

اور زمین کا اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے ۝۴۲ اے مخاطب! کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ اللہ بادل کو چلاتا ہے پھر بادلوں کو باہم

بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ

ملادیتا ہے پھر اس کو تہہ بہ تہہ بنادیتا ہے، پھر اے مخاطب تُو بارش کو دیکھتا ہے کہ اس کے درمیان سے نکل رہی ہے اور بادل سے یعنی بادل کے

مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ ؕ

بڑے بڑے ٹکڑوں میں سے جو پہاڑ کی طرح ہیں اُولے برساتا ہے پھر ان کو جس پر چاہتا ہے گرادیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ان کو ہٹادیتا ہے،

يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ۝۴۳ يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً

قریب ہے کہ اس کی بجلی کی روشنی آنکھوں کو ختم کردے ۝۴۳ اور اللہ رات اور دن کو بدلتا ہے، بے شک اس میں ضرور عبرت ہے

لِّاُولِى الْاَبْصَارِ ۝۴۴ وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِىْ عَلٰى

آنکھ والوں کے لئے ۝۴۴ اور اللہ نے ہر چلنے والے جاندار کو پانی سے پیدا فرمایا، پھر ان میں بعض وہ ہیں جو پیٹ کے بل

بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِىْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِىْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ ؕ

چلتے ہیں اور بعض وہ ہیں جو دو پیروں پر چلتے ہیں اور بعض وہ ہیں جو چار پاؤں پر چلتے ہیں،

يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۵﴾ لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ ؕ

اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ بلاشبہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے ﴿۴۵﴾ واقعی بات یہ ہے کہ ہم نے ایسی آیات نازل کی ہیں جو بیان کرنے والی ہیں

وَاللّٰهُ يَهْدِیْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴۶﴾ وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ

اور اللہ جسے چاہے صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت دیتا ہے ﴿۴۶﴾ اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور رسول پر ایمان لائے

وَاَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَمَاۤ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَ

اور ہم فرماں بردار ہیں، پھر اس کے بعد ان میں سے ایک فریق روگردانی کرلیتا ہے، اور یہ لوگ مؤمن نہیں ہیں ﴿۴۷﴾ اور

اِذَا دُعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۸﴾

جب انہیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ فرمادے تو ان میں سے ایک فریق اسی وقت پہلوتہی کرلیتا ہے ﴿۴۸﴾

وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْۤا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ﴿۴۹﴾ اَفِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْۤا

اور اگر ان کا کوئی حق ہو تو اس کی طرف فرماں بردار بنے ہوئے چلے آتے ہیں ﴿۴۹﴾ کیا ان کے دلوں میں مرض ہے یا انہیں شک ہے

اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ ؕ بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۵۰﴾

یا انہیں اس بات کا خوف ہے کہ ان پر اللہ اور اس کا رسول ظلم کریں گے؟ بلکہ بات یہ ہے کہ یہی لوگ ظالم ہیں ﴿۵۰﴾

تفسیر

ان آیات میں اللہ عزوجل شانہ کی قدرت کے بعض مظاہر بیان فرمائے ہیں اور مخلوق میں جو اس کے تصرفات ہیں ان میں سے بعض تصرفات کا تذکرہ فرمایا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ آسمانوں اور زمینوں میں جو رہنے والے ہیں وہ سب اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتے ہیں وہ ہر عیب اور ہر نقص سے پاک ہے۔ اس مخلوق میں پرندے بھی ہیں جو پر پھیلائے ہوئے فضا میں اڑتے ہیں یہ بھی اللہ کی تسبیح و تقدیس میں مشغول رہتے ہیں ان کا فضاء میں اڑنا اور زمین پر نہ گرنا ان کے پروں کی حرکتوں کو اس قابل بنانا کہ ان سے اڑیں اور زمین پر نہ گریں ان سب میں اللہ کی قدرت کا مظاہرہ ہے یہ مضمون کہ آسمانوں میں اور زمین میں جو بھی کچھ ہے سب اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں پہلے بھی گزر چکا ہے اور قرآن مجید میں بہت سی جگہ مذکور ہے۔

اللہ کی تسبیح و تقدیس زبانِ حال سے بھی اور زبانِ قال سے بھی

اللہ کی تسبیح و تقدیس میں مشغول ہونا زبانِ قال سے بھی اور زبانِ حال سے بھی ہے۔ جو لوگ اہل زبان ہیں وہ زبان سے

اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور جن چیزوں کو قوت گویائی عطا نہیں فرمائی گئی، وہ بھی اپنے حال کے مطابق اللہ کی تسبیح میں مشغول ہیں، اوّل تو ہر چیز کا وجود ہی اس بات کو بتاتا ہے کہ اس کا خالق، مالک، قادر مطلق اور حاکم متصرف اللہ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے جس کو جو فہم اور شعور عطا فرمایا ہے، اپنے اس شعور سے اللہ کی تسبیح میں اور اس کی عبادت میں مشغول ہے۔ فرشتوں اور انسانوں اور جنات میں زیادہ عقل وفہم ہے۔ اس سے کم حیوانات میں (وہ بھی مختلف ہے)، اور اس سے کم نباتات میں، اور اس سے کم جمادات میں ہے، جمادات میں بظاہر فہم وادراک اور شعور ہے، اسی لئے سورۂ بقرہ (آیت: ۷۴) میں پتھروں کے بارے میں فرمایا ہے: وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ۔

کائنات کی ہر چیز اللہ کے ذِکر میں مشغول ہے

آیت بالا میں جو: كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ فرمایا ہے، اس میں یہ بتایا ہے کہ جو آسمانوں اور زمین کے رہنے اور بسنے والے ہیں انہیں معلوم ہے کہ ہمیں اپنے خالق جل مجدہٗ کی تسبیح میں اور نماز میں کس طرح مشغول رہنا چاہیے۔ بعض حضرات نے صلاۃ بمعنی ''دُعا'' لیا ہے، یہ معنی مراد لینا بھی دُرست ہے، لیکن صلاۃ کا معروف معنی لیا جائے تو اس میں بھی اِشکال نہیں، جس طرح بنی آدم دوسری مخلوق کی تسبیح کو نہیں سمجھتے، جیسے سورۂ اِسراء (آیت: ۴۴) میں ہے: وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ اسی طرح اگر دوسری مخلوق کی نماز کو نہ جانیں، اس میں اِشکال کی کوئی بات نہیں ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ تسبیح اور صلاۃ سے اطاعت اور انقیاد مراد ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو جس کام کے میں لگا دیا وہ اس میں لگی ہوئی ہے، اور جس کو جو اِلہام فرمادیا، وہ اسی کے مطابق اپنی ڈیوٹی پوری کرنے میں مشغول ہے۔

ایک اہم اِشکال کا جواب

یہاں یہ جو اِشکال ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ اللہ کے وجود ہی کو نہیں مانتے ان کے بارے میں یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ وہ اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ باعتبار ان کی خلقت کے ان کا اپنا وجود ہی اللہ کی تنزیہ بیان کرنے کے لئے کافی ہے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ ان نالائقوں کو تنبیہ کرنے کے لئے ارشاد فرمایا ہے کہ ساری مخلوق اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہیں، تم ایسے نابنجار ہو کہ جس نے تمہیں پیدا کیا ہے اس کو نہیں مانتے اور اس کی تسبیح وتقدیس میں مشغول نہیں ہوتے۔ اسی لئے آیت کے آخر میں: وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ فرمایا ہے (اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو لوگ کرتے ہیں)، اسے اہل ایمان کے اعمال کا بھی علم ہے اور وہ اہل کفر کو بھی جانتا ہے، وہ سب کی جزا سزا اپنے علم وحکمت کے موافق نافذ فرمادے گا۔ اس کے بعد فرمایا: وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور اللہ ہی کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کا ملک۔ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ: اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ وہ خالق ومالک ہے حقیقی متصرف ہے یہاں جو برائے نام کوئی مجازی حکومت ہے وہاں یہ بھی نہ رہے گی۔ سارے فیصلے اللہ تعالیٰ ہی کے ہوں گے۔

عالمِ علوی کے بعض تصرفات

اس کے بعد ارشاد فرمایا: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُزْجِیْ سَحَابًا: اس میں عالمِ علوی کے بعض تصرفات کا تذکرہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک بادل کو دوسرے بادل کی طرف چلاتا ہے، پھر ان کو آپس میں ملا دیتا ہے پھر ان کو تہہ بہ تہہ جمانے کے بعد اس میں سے بارش نازل فرماتا ہے، اے مخاطب! تُو دیکھتا ہے کہ اس کے درمیان سے بارش نکلتی رہی ہے اور جب اس کی مشیت ہوتی ہے تو انہیں بادلوں کے بڑے بڑے حصوں میں سے جو پہاڑوں کی مانند ہیں اولے برسا دیتا ہے۔ یہ اولے بڑے خطرناک ہوتے ہیں جس کی جان یا مال کو محفوظ رکھنا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بچا دیتا ہے، اور جسے مالی جانی نقصان پہنچانا ہو تو وہ ان اولوں کو اس کی ہلاکت یا کثیر قلیل ضرر کا سبب بنا دیتا ہے۔ بعض مرتبہ بادلوں میں بجلی پیدا ہوتی ہے جس کی چمک بہت تیز ہوتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی آنکھوں کی بینائی کو اُچک لے گی، اس کا پیدا فرمانا بھی اللہ تعالیٰ کے تصرفات میں سے ہے۔ اس کے ذریعے اموات بھی ہو جاتی ہیں اللہ تعالیٰ ہی جس کو چاہتا ہے، بچا لیتا ہے۔

دلائل میں غور نہ کرنا گمراہی کا سبب ہے

انہیں تصرفات میں سے رات اور دن کا پلٹنا بھی ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہوتا ہے اسی کو فرمایا: یُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ، اور اللہ تعالیٰ رات اور دن کو پلٹتا ہے۔ رات اور دن کا تعلق ظاہری اعتبار سے آفتاب کے طلوع وغروب ہونے سے ہے، لیکن آفتاب بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے، اللہ نے جو طلوع وغروب کا نظام مقرر فرما دیا ہے، اسی کے مطابق چلتا ہے۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ: بلاشبہ اس میں آنکھوں والوں کے لئے عبرت ہے، جو شخص اپنی عقل وفہم اور بصیرت سے کام لے گا اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور تکوین کے مظاہروں پر غور کرے گا، اسے ضرور اللہ تعالیٰ کی توحید واضح طور سے سمجھ میں آ جائے گی، اور جس نے اپنے لئے یہ طے کر لیا کہ مجھے دلائل میں غور نہیں کرنا اور حق کو نہیں ماننا تو وہ گمراہ ہی رہے گا۔

عالمِ سفلی کے بعض تصرفات

اس کے بعد بعض سفلی تصرفات کا تذکرہ فرمایا، ارشاد ہے: وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین پر چلنے پھرنے والی چیز کو پانی سے پیدا فرمایا، اس سے حیوانات مراد ہیں جو نطفے سے پیدا ہوتے ہیں، پھر ان جانوروں میں بعض وہ ہیں جو اپنے پیٹ کے بَل چلتے ہیں، جیسے سانپ وغیرہ، اور بعض وہ ہیں جو دو پیروں پر چلتے ہیں، جیسے انسان اور پرندے (جب کہ خشکی میں ہوں)، اور بعض وہ ہیں جو چار پاؤں پر چلتے ہیں، جیسے اُونٹ، بھینس، گائے، بکری وغیرہ، یَخْلُقُ اللّٰهُ مَا یَشَآءُ: وہ جو چاہتا ہے پیدا فرماتا ہے، اسے پورا اختیار ہے، جیسے، جس حال میں، اور جس شکل وصورت میں پیدا فرمائے، اور جس کو جس طرح چاہے قوت وقدرت عطا فرمائے، دیکھو! پیٹ کے بَل چلنے والے جانوروں کو جس طرح چلنے اور بھاگنے کی قوت عطا فرمائی ہے، ان میں

سے بہت سی دو اور چار ٹانگوں والی چیزوں کو عطا نہیں فرمائی۔ چھپکلی کو دیکھ لو وہ چھت سے اُلٹی لٹک کر بھی دوڑ لیتی ہے، دُوسری مخلوق ایسا کرے تو گر پڑے، چھپکلی چل بھی رہی ہے اور چپک بھی رہی ہے۔

ایک اِشکال کا جواب

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ: بلاشبہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس کو جیسا چاہا بنایا، وَمَا شَاءَ اللّٰهُ كَانَ وَمَا لَمْ یَشَأْ لَمْ یَكُنْ۔ یہاں یہ جو اشکال پیدا ہوتا ہے کہ بعض چیزوں کے بارے میں دیکھا جاتا ہے کہ ان کا توالد و تناسل نطفے سے نہیں ہے، اور حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا فرمایا، ان کا تو کوئی ماں باپ ہی نہیں، اس کا جواب تو یہ ہے کہ یہاں لفظ ''کل دابۃ'' بطور تغلیب کے استعمال فرمایا ہے، مطلب یہ ہے کہ عام طور سے جو تم انسان اور چوپاؤں کو دیکھتے ہو، ان کی تخلیق نطفے سے ہے، اور بعض حضرات نے دوسرا جواب دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پانی کو پیدا فرمایا، پھر اس میں سے بعض کو آگ بنا دیا جس سے جنات پیدا فرمائے، اور بعض کو مٹی بنا دیا اور اس سے انسان پیدا فرمایا، اور بعض حصے کو نُور بنا دیا اس سے فرشتے پیدا فرمائے۔ اور جتنی مخلوق وجود میں آئی اس کے وجود میں کسی نہ کسی طرح پانی کے جوہر کا وجود ہے (معالم التنزیل، روح المعانی)۔

عقل و فہم سے کام نہ لینے والا دلائل سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا

لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اٰیٰتٍ مُّبَیِّنٰتٍ تا بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ: یہ پانچ آیات ہیں ان میں سے پہلی آیت میں ارشاد فرمایا ہے کہ ہم نے واضح آیات کھلی کھلی نشانیاں نازل فرمائی ہیں، جو حق اور حقیقت کو واضح کرنے والی ہیں، جو عقل و فہم سے کام نہیں لیتا وہ دلائل سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا، اور گمراہی کے راستے ہی اختیار کئے ہوئے رہتا ہے، اور اللہ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی ہدایت دے دیتا ہے۔ اس کے بعد آیات ہیں ان کو سمجھنے کے لئے منافقین کے بعض واقعات کو سمجھنا چاہیے، ایک واقعہ ہم سورۂ نساء (آیت: ۶۰) کی آیت: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ کی تفسیر کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں، وہ بشر نامی منافق کا قصہ ہے۔ ایک واقعہ بعض مفسرین نے ان آیات کے ذیل میں لکھا ہے۔ صاحب ''رُوح المعانی'' کہتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مغیرہ بن وائل سے ایک زمین کے بارے میں جھگڑا تھا، دونوں نے آپس میں بخوشی اس زمین کو تقسیم کر لیا، اس کے بعد مغیرہ نے کہا کہ تم اپنی زمین مجھے بیچ دو، حضرت علی رضی اللہ عنہ اس پر راضی ہو گئے، بیع مکمل ہو گئی، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قیمت پر اور مغیرہ نے زمین پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد کسی نے مغیرہ کو سمجھایا کہ تُو نے یہ نقصان کا سودا کیا ہے، یہ شور والی زمین ہے، اس پر اس نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کہا کہ آپ اپنی زمین واپس لے لیں کیونکہ میں اس سودے پر راضی نہیں تھا، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ تُو نے اپنی خوشی سے یہ معاملہ کیا ہے، اس زمین کا حال جانتے ہوئے تُو نے خریدا ہے، مجھے اس کا واپس کرنا منظور نہیں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ چل ہم دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنا مقدمہ پیش کریں۔ اس پر وہ کہنے لگا کہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس نہیں جاتا وہ تو مجھ سے بغض رکھتے ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ وہ فیصلہ کرنے میں مجھ پر ظلم کر دیں گے۔ اس پر آیت نازل ہوئی، چونکہ وہ شخص منافق تھا اس لئے اس

نے مذکورہ بالا بے ہودہ گستاخی والی بات کہی، اور چونکہ منافقین آپس میں اندرونی طور پر ایک ہی تھے اور گھل مل کر رہتے تھے، نیز ایک دوسرے کا تعاون بھی کرتے تھے، اس لئے آیت شریفہ میں طرزِ بیان اس طرح اختیار فرمایا کہ سب منافقین کو شامل فرمالیا۔ مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ نے حضرت حسن رحمہ اللہ سے یہ بھی نقل کیا کہ جب منافقین میں سے کسی سے جھگڑا ہوتا اور وہ جھگڑا نمٹانے کے لئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بلایا جاتا اور اسے یقین ہوتا کہ آپ میرے ہی حق میں فیصلہ فرمائیں گے تو حاضرِ خدمت ہو جاتا، اور اگر ارادہ ہوتا کہ کسی پر ظلم کرے اور اسے خصومت کا فیصلہ کرانے کے لئے آپ کی خدمت میں حاضری کے لئے کہا جاتا تو اعراض کرتا تھا اور کسی دوسرے شخص کے پاس چلنے کو کہتا تھا، منافقین نے اپنا یہ طریقہ بنا رکھا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ شانہٗ نے آیت نازل فرمائی۔ سببِ نزول سمجھنے کے بعد اب آیات کا ترجمہ اور مطلب سمجھئے! ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ (یعنی منافقین) ظاہری طور پر زبان سے یوں کہتے ہیں کہ ہم اللہ اس کے رسول ﷺ پر ایمان لائے اور ہم فرماں بردار ہیں۔ اس ظاہری قول وقرار کے بعد عملی طور پر ان میں سے ایک جماعت منحرف ہو جاتی ہے، چونکہ حقیقت میں مؤمن نہیں ہیں، اس لئے انہوں نے طرزِ عمل یہ اپنا رکھا ہے جب ان سے کہا جاتا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف آؤ تاکہ تمہارے درمیان فیصلہ کر دیا جائے تو ان کی ایک جماعت اس سے اعراض کرتی ہے، کیونکہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے ظلم کر رکھا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوں گے تو فیصلہ ہمارے خلاف جائے گا، اور اگر ان کا حق کسی پر آتا ہو تو اس حق کے وصول کرنے کے لئے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بڑی ہی فرماں برداری کے ساتھ حاضر ہو جاتے ہیں۔ مقصد ان کا صرف دنیا ہے، ایمان کا اقرار اور فرماں برداری کا قول وقرار دنیاوی منافع ہی کے لئے ہے۔ خدمتِ عالی میں حاضر ہونے کی صورت میں بھی طالبِ دنیا ہی ہیں، اور حاضری دینے سے اعراض کرنے میں بھی دنیا ہی پیشِ نظر ہوتی ہے۔

منافقین کے قلوب مریض ہیں

أَفِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ: کیا ان کے دِلوں میں مرض ہے؟ یعنی اس کا یقین ہے؟ کہ آپ اللہ کے رسول نہیں ہیں، أَمِ ارْتَابُوا: یا انہیں شک ہے کہ آپ نبی ہیں یا نہیں؟ أَمْ يَخَافُونَ أَن يَحِيفَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُولُهُ: یا وہ خوف کھاتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے ان پر ظلم ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ ان تین باتوں میں سے کوئی چیز نہیں ہے، انہیں یہ بھی یقین ہے کہ آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں، اور وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر جو فیصلہ ہوگا اس میں ظلم نہیں ہوگا، جب یہ بات ہے تو اعراض کا سبب صرف یہی رہ جاتا ہے کہ خود وہ ظالم ہیں، بَلْ أُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ: وہ چاہتے ہیں کہ دوسروں کا مال تو ہمیں مل جائے لیکن ہم پر جو کسی کا حق ہے وہ دینا نہ پڑے۔ اگر انہیں ڈر ہوتا کہ آپ کا فیصلہ انصاف کے خلاف ہوگا تو جب اپنا حق کسی پر ہوتا ہے اس کے لئے دوڑے ہوئے نہ آتے، وہ جانتے تھے کہ آپ کا فیصلہ صاحبِ حق کے حق میں ہوگا، لیکن جب یہ سمجھتے تھے کہ ہمارے خلاف ہوگا تو اعراض کرتے تھے۔ ان کا مقصود انصاف کرانا نہیں بلکہ دوسروں کا مال مارنا ہے۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ

مؤمنین کی بات تو یہ ہوتی ہے کہ جس وقت وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بُلائے جائیں تاکہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کرے تو

يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ

وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے حکم سُن لیا اور مان لیا اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں ﴿۵۱﴾ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے

وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ

اور اللہ سے ڈرے اور بچ بچ کر چلے پس یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں ﴿۵۲﴾ اور منافقین اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں پکّی پکّی

لَئِنْ اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ؕ قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا

کہ اگر آپ انہیں حکم دیں گے تو البتہ ضرور نکلیں گے، آپ کہہ دیجئے کہ تم قسمیں نہ کھاؤ، تمہاری فرماں برداری جانی پہچانی ہوئی ہے، بے شک اللہ خبر

تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۳﴾ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا

رکھنے والا ہے ان کاموں کی جو تم کرتے ہو ﴿۵۳﴾ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر یہ لوگ پیٹھ پھیریں

فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ؕ وَاِنْ

تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کے رسول کے ذِمّے وہ بات ہے جو اس پر ڈالی گئی ہے اور تم پر وہ چیز ہے جو تم پر ڈالی گئی، اگر

تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۵۴﴾

تم اللہ کے رسول کی اطاعت کرو گے تو تم نے سیدھا راستہ پالیا، اور نہیں ہے رسول کے ذِمّے مگر پہنچا دینا خوب اچھی طرح سے کھول کر ﴿۵۴﴾

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ

اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ان لوگوں سے جو ایمان لائے تم میں سے اور انہوں نے نیک عمل کیے، البتہ ضرور خلیفہ بنائے گا اللہ تعالیٰ انہیں

فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ

زمین میں جس طرح اس نے خلیفہ بنایا ان لوگوں کو جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ اور البتہ ضرور جما دے گا ان کے لئے

دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ

ان کے اس دین کو جو اللہ نے ان کے لئے پسند کیا ہے، اور البتہ ضرور بدل دے گا اللہ تعالیٰ ان کو ان کے خوف کے بعد امن، بشرطیکہ یہ لوگ

يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۵۵﴾

میری عبادت کرتے رہیں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور جو کوئی اس کے بعد ناشکری کرے گا پس یہی لوگ حد سے نکلنے والے ہیں ﴿۵۵﴾

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۵۶﴾ لَا تَحْسَبَنَّ

اور نماز قائم رکھو، زکوۃ دیتے رہو، اور رسول کی اطاعت کرتے رہو تاکہ تم رحم کیے جاؤ ﴿۵۶﴾ ہرگز نہ گمان کیجئے

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۵۷﴾

ان لوگوں کو جو کہ کافر ہیں زمین میں عاجز کرنے والے، ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے ﴿۵۷﴾

مؤمنین اور منافقین کے کردار میں فرق

(۱) اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا: اَنْ يَّقُوْلُوْا مضارع پر جس وقت اَنْ آ جائے تو آپ ''نحو'' میں پڑھتے رہتے ہیں کہ یہ مصدر کی تاویل میں ہو جاتا ہے، تو یہ مصدر کی تاویل میں ہو کر بن جائے گا قولهم اور یہ ''كَانَ'' کا اسم ہے، اور قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ كَانَ کی خبر مقدم ہے، تو معنی یہ ہو گیا کہ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہہ دینا یہ مؤمنین کا قول ہے جس وقت کہ وہ اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف بلائے جائیں، جب اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف بلائے جائیں تو یوں کہہ دینا کہ ہم نے سن لیا اور تسلیم کر لیا، یہ مؤمنین کی بات ہے۔ منافق تو دیکھتے تھے کہ اللہ اور اس کے رسول سے فیصلہ کروانے میں ہمارا فائدہ ہو گا یا نہیں۔ فائدہ ہو تو فیصلہ کرواتے ہیں، نہیں تو چاہتے ہیں کہ کسی اور عدالت میں لے جائیں۔ لیکن مؤمنین مخلصین کا حال یہ ہے کہ جب بھی ان کو بلایا جائے کہ یہ جو ہمارے درمیان میں جھگڑا ہو گیا اس کا فیصلہ اللہ سے کروالیں اللہ کے رسول سے کروالیں ......اور آج اس کا مطلب یہ ہے کہ شریعت سے فیصلہ کروالیں، ہم اپنے اس اختلاف کو لکھ کے دارالافتاء میں بھیج دیتے ہیں جو فیصلہ وہاں سے آئے دونوں فریق تسلیم کر لیں گے، مؤمنین کا کام یہ ہے کہ کہیں سمعنا واطعنا، اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں...... تو منافقین کے مقابلے میں مؤمنین کا کردار نمایاں کیا گیا، کہ مؤمن صرف اس وقت شریعت کی طرف نہیں آتا جب اپنا فائدہ دیکھتا ہے، بلکہ جب اپنا نقصان نظر آئے تو بھی وہ شریعت کا فیصلہ قبول کرتا ہے، اور اپنا فائدہ دیکھ کے شریعت کا فیصلہ قبول کرنا اور جب اپنا نقصان نظر آتا ہو تو پھر شریعت کا فیصلہ قبول نہ کرنا یہ منافقین کی علامت ہے، مؤمنین مخلصین کی علامت نہیں ہے۔

فلاح حاصل کرنے کا طریقہ

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ: اور جو اللہ کی اطاعت کرے اور اس کے رسول کی اطاعت کرے، اور اللہ سے ڈرے، وَيَتَّقْهِ تقویٰ اور خشیت یہاں دو لفظ آ گئے، يَتَّقْهِ کا ترجمہ ہے کہ بچ بچ کے چلے، پس یہی لوگ

(۱) یہاں سے حضرت حکیم العصر رحمہ اللہ کی تقریر ہے۔ اور ترجمہ بھی آپ کا ہی ہے۔

کامیاب ہونے والے ہیں۔ مفہوم یہ نکل آئے گا کہ فوز وفلاح حاصل کرنے کے لئے اللہ کی اطاعت ضروری ہے، اللہ کے رسول کی اطاعت ضروری ہے۔ ''اللہ کی اطاعت ضروری ہے'' یہ تو کتاب اللہ کی اتباع آ گئی۔ ''اللہ کے رسول کی اطاعت ضروری ہے'' یہ اتباع سنت آ گئی۔ فوز وفلاح حاصل کرنے کے لیے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ دونوں کی اطاعت ضروری ہے۔ اور ''اللہ سے ڈرے'' کا مطلب یہ ہے کہ پہلی کوتاہیوں سے توبہ کرے، استغفار کرے، اپنی پچھلی کوتاہیوں کی تلافی کرے، اور یتقہ کا مفہوم یہ ہے کہ آئندہ بھی بچ بچ کر چلے، اللہ کی نافرمانی نہ کرے، جب یہ چار کام ہو جائیں گے تو اس وقت فوز اور فلاح حاصل ہو جائے گی۔

کردار صحیح ہو تو قسموں کی ضرورت نہیں ہوتی

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ: یہ پھر وہی منافقین کی بات ہے، ضمیر انہی کی طرف لوٹ رہی ہے جس طرح پچھلی آیت وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ میں ضمیر انہی کی طرف لوٹی تھی، یہ ضمیر بھی اسی فریق کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں، جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ اس کا مفہوم ہوا کرتا ہے مجتہدین فی توکید ایمانہم اپنی قسموں کو پکا کرنے میں کوشش کرتے ہوئے۔ مطلب کیا ہوا؟ کہ پکی پکی قسمیں کھاتے ہیں، بڑا زور لگا کے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں، کیا کہتے ہیں؟ لَئِنْ اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ: اگر آپ انہیں حکم دیں گے تو البتہ ضرور نکلیں گے، یعنی اگر آپ ان کو جہاد پر جانے کے لئے حکم دیں تو اللہ کی قسمیں کھا کے بڑا زور لگا کے کہتے ہیں کہ وہ ضرور نکلیں گے اپنے گھر بار سے، جہاد کے لیے چلیں گے۔ قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا: آپ کہہ دیجئے کہ تم قسمیں نہ کھاؤ، طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ: یہ موصوف صفت ہیں، ای طاعتکم طاعۃ معروفۃ، تمہاری فرماں برداری جانی پہچانی ہوئی ہے، قسمیں کھا کھا کے ہمیں کیا یقین دلاتے ہو، جس قسم کی طاعت تمہاری ہے اس کا ہمیں پتا ہے، قسمیں کھا کے تم یقین نہ دلاؤ۔ اصل بات یہی ہے کہ جب کسی شخص کے پاس کردار کی قوت نہیں ہوتی، اور وہ اپنے عمل کے ساتھ اور کردار کے ساتھ اپنے قول کو سچا نہ ثابت کر سکے، تو پھر طریقہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ قسمیں کھا کھا کے اپنی بات کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس آدمی کو ثقاہت حاصل ہوتی ہے صداقت حاصل ہوتی ہے، کردار کا وہ ٹھیک ہوتا ہے، تو اس کا کردار ہی اس کے قول کے صحیح ہونے کی دلیل ہوتا ہے۔ جہاد کے لئے اللہ کا حکم آیا، اللہ کے رسول نے اعلان کیا، اور لوگ اٹھ کے چل دیے، انہیں کیا ضرورت ہے کہ قسمیں کھا کھا کے یقین دلائیں کہ ہم ضرور جہاد کریں گے، ان کا عمل ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ صحیح طور پر ایمان لائے ہوئے ہیں، اللہ اور اس کے رسول کی بات کو مانتے ہیں۔ لیکن جن کے پاس کردار کی قوت نہیں ہوتی وہ کوشش کیا کرتے ہیں کہ قسمیں کھا کھا کے دوسرے کو یقین دلائیں کہ ہم بڑے اچھے آدمی ہیں، اس لیے کہہ دیا گیا کہ تم ان سے کہہ دو کہ تمہاری طاعت جانی پہچانی ہوئی ہے طاعتکم طاعۃ معروفۃ، یا المطلوب منکم طاعۃ معروفۃ (مظہری)، قاعدے کے مطابق طاعت تم سے مطلوب ہے، قسمیں کھانے کی ضرورت نہیں، جس وقت ضرورت پیش آئے گی کہنا ماننے کی، تو جس طرح سے دوسرے لوگ مانیں گے اسی جانے پہچانے طریقے سے تم بھی اطاعت کرنا، صرف باتیں بنانے کا کیا فائدہ؟ بے شک اللہ تعالیٰ خبر رکھنے والا ہے ان کاموں کی جو تم کرتے ہو۔

اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو

قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ: آپ کہہ دیجئے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو اللہ کے رسول کی، کہنا مانو اللہ کا اور کہنا مانو اللہ کے رسول کا۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا: پھر اگر یہ لوگ پیٹھ پھیریں، فَاِنَّمَا عَلَیْهِ مَا حُمِّلَ: یہ ضمیر اللہ کے رسول کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کے رسول کے ذِمّے وہ بات ہے جو اس پر ڈالی گئی ہے، یعنی جو ذمہ داری اس پر ڈالی گئی ہے وہ اس کے ذِمّے ہے، وہ ہے تبلیغ کی، انہوں نے اپنی ذمہ داری ادا کردی، وَعَلَیْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ: اور تم پر وہ چیز ہے جو تم پر ڈالی گئی، تم پہ ذمہ داری اس چیز کی ہے جو تم پہ ڈالی گئی، وہ ہے اطاعت۔ اللہ کے رسول نے اپنی ذمہ داری ادا کردی، جو بات اس پہ ڈالی گئی وہ اس نے پوری کردی، اب آگے تمہاری ذمہ داری باقی ہے، اگر تم اس ذمہ داری کو ادا نہیں کرو گے کوتاہی کرو گے، تو اس میں اللہ کے رسول کا کوئی نقصان نہیں۔ اللہ کے رسول کے ذمے وہ چیز ہے جو ان پہ ڈالی گئی، اور تمہارے ذِمّے وہ چیز ہے جو تم پہ ڈالی گئی۔ وَاِنْ تُطِیْعُوْهُ تَهْتَدُوْا: اگر تم اللہ کے رسول کی اطاعت کرو گے تو تم نے سیدھا راستہ پالیا، تم ہدایت یافتہ ہوگئے، اهتداء: ہدایت یافتہ ہونا۔ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ: اور نہیں ہے رسول کے ذِمّے مگر پہنچا دینا خوب اچھی طرح سے کھول کر۔ بلاغ مبین کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایسے طور پر پہنچا دینا جو حقیقت کو واضح کردے اور اس میں کسی قسم کا شک شبہ اور اشتباہ باقی نہ رہے، اچھی طرح کھول کھول کے بیان کر کے حق کو پہنچا دینا۔ تو بلاغِ مبین اللہ کا رسول کر چکا۔

مخلصینِ مؤمنین کے ساتھ وعدۂ اِستخلاف

آگے مخلصین کے لئے اس دنیا کے اندر کامیابی کا وعدہ ہے۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ: اس کو ''آیتِ استخلاف'' کہا جاتا ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے خلافت کا ذِکر فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ان لوگوں سے جو ایمان لائے تم میں سے، اور انہوں نے نیک عمل کیے، لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ: البتہ ضرور خلیفہ بنائے گا اللہ تعالیٰ انہیں زمین میں، اللہ تعالیٰ انہیں زمین میں خلافت دے گا، كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے خلیفہ بنایا ان لوگوں کو جو ان سے پہلے گزرے ہیں، وَلَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰى لَهُمْ: اور البتہ ضرور ٹھکانا دے گا، جما دے گا، قائم کر دے گا، تمکین: مضبوط کرنا، ٹھکانا دینا، جما دینا۔ البتہ ضرور جما دے گا ان کے لیے ان کے اس دِین کو جو اللہ نے ان کے لئے پسند کیا ہے۔ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا: اور البتہ ضرور بدل دے گا اللہ تعالیٰ ان کو ان کے خوف کے بعد امن۔ یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِكُوْنَ بِیْ شَیْئًا: یہ حال واقع ہے۔ حال یہ ہے کہ یہ لوگ (جس کو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''بشرطیکہ'' کے لفظ کے ساتھ ذکر فرمایا ہے، یہ حال مقامِ شرط میں ہے) بشرطیکہ یہ لوگ میری عبادت کرتے رہیں اور میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ: اور جو کوئی اس نعمتِ اِستخلاف کے بعد ناشکری کرے گا پس یہی لوگ حدِ طاعت سے نکلنے والے ہیں۔

منافقین کی بے اطمینانی

مطلب اس کا یہ ہوا، پیچھے جو ذکر کیا تھا کہ منافقین ارتیاب میں پڑے ہوئے ہیں، تردّد میں پڑے ہوئے ہیں، تو منافقین کے نفاق کی ایک وجہ یہ بھی تھی، ان کے دل میں جو کفر چھپا ہوا تھا اور ایمان ظاہر کرتے تھے، اور یہود کے ساتھ تعلقات قائم رکھنے کی ضرورت محسوس کرتے تھے تو اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کو تردّد تھا کہ معلوم نہیں، مستقبل میں مسلمان غالب آئیں گے یا کافر ہی دوبارہ غالب آجائیں گے؟ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ، جیسے کہتے ہیں کہ ''نیم دروں نیم بروں'' کہ ایک ٹانگ ادھر بھی رکھ لو، ایک ٹانگ ادھر بھی رکھ لو، اگر کل کو مسلمان غالب آگئے تو ہم کہیں گے کہ ہم تمہارے ساتھ تھے، ہماری دوستی تمہارے ساتھ تھی، ہم کلمہ گو ہیں، اور اگر کل کو کافر غالب آگئے تو ہم کہیں گے کہ تمہیں پتہ تو ہے کہ اندر اندر سے ہماری ہمدردی تمہارے ساتھ تھی، تو جو بھی غالب آجائے گا ہم اس کے ساتھ مل کر اپنے مستقبل کو محفوظ کرلیں گے، گویا کہ مستقبل کے بارے میں وہ مطمئن نہیں تھے کہ آنے والا زمانہ کس کے غلبے کا ہے؟ کفر کے غلبے کا ہے یا ایمان کے غلبے کا ہے؟ اس لیے وہ دونوں طرف ہی جھانکتے رہتے تھے، کافروں کی طرف بھی اور اہل ایمان کی طرف بھی۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیش گوئی اور اس کا ظہور

اللہ تعالیٰ نے یہاں ان کے اس تردّد کو دُور فرمایا کہ ایمان اور عملِ صالح کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس اُمت کو آئندہ خلافت دے گا۔ اس طرح سے جس طرح سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ بعض نبیوں کی امتوں کو دنیا کے اندر حکومت دیتا رہا، جو دین پسند ہے اللہ کو یعنی اسلام، رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (سورۂ مائدہ: ۳) میں جس طرح ذکر کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ اس دین کو ٹھکانا دے گا، جما دے گا اس دنیا کے اندر، دینی ماحول بن جائے گا اور دین کی حکومت آجائے گی، اور آج اگر دشمنوں کی طرف سے کچھ خوف اور خطرہ ہے بھی، تو یہ سارا ٹل جائے گا، اللہ تعالیٰ اس کی جگہ امن وامان دے دیں گے، اور یہ نعمت حاصل رہے گی جب تک اللہ کی عبادت کرتے رہیں اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور اس نعمت کے حاصل ہوجانے کے بعد ناشکری کرنے والے نافرمان ہوں گے، حدِ طاعت سے نکلنے والے ہوں گے۔ یہ ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے باتیں جو کہ بطور وعدے کے کی گئی ہیں لیکن ان کی صداقت سرورِ کائنات ﷺ کے زمانے میں ہی پیش آگئی، جس وقت یہ آیات اتر رہی تھیں، اس وقت ٹھیک ہے کہ چاروں طرف دشمنوں کی طرف سے خوف وخطرہ ہی تھا، لیکن حضور ﷺ کے زمانے میں ہی سارا عرب علاقہ اور یمن، یہ سارے کے سارے فتح ہوگئے، حضور ﷺ کے زمانے میں دین کی حکومت آگئی، امن وامان قائم ہوگیا۔ اور آگے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اور اس کے بعد پھر حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اور اس کے بعد پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں۔ تو یہ دین کی حکومت پورے عروج پر پہنچ گئی، اور دنیا کا معتد بہ حصہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں فتح ہوگیا۔

آیتِ اِستخلاف کا اَوّلین مصداق خلفائے راشدین ہیں

تو خلافتِ راشدہ، حضور ﷺ کے بعد یہ جو خلفاء آئے ہیں، ان کی صداقت پر یہ آیت دلالت کرتی ہے، اگر ان لوگوں کی خلافت کو خلافتِ صحیحہ نہ سمجھا جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ آج تک قرآنِ کریم کا یہ وعدہ کسی وقت میں پورا ہی نہیں ہوا، کیونکہ جو امن وامان اس دور میں تھا، اور جس طرح سے دِین کی تمکین اس دور میں تھی، اِس طرح سے دِین کی تمکین اور امن وامان کسی دوسرے دور میں نہیں آیا، تو اگر ان کی خلافت کو اللہ تعالیٰ کے وعدے کا مصداق نہ بنایا جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ ان آیات کا مصداق دنیا میں متحقق ہوا ہی نہیں، اور یہ کہنا کہ آخر آخر میں جا کر حضرت مہدی کے زمانے میں ایسا ہوگا، یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب آئیں گے تو پھر ایسا ہوگا، یہ واقعہ ہے کہ اس وقت بھی ایسا ہوگا، لیکن یہ وعدہ تو کیا جا رہا ہے سرورِ کائنات ﷺ کی زبانی آپ کے مخاطبین سے، اور یہ وعدہ پورا ہو کہیں دواڑھائی ہزار سال کے بعد جا کے، یہ بات کوئی جوڑ نہیں کھاتی، اللہ تعالیٰ کی باتیں ایسی کچی نہیں ہوا کرتیں، مخاطب اس کے وہی لوگ ہیں جو حضور ﷺ کے زمانے میں موجود تھے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ایمان اور عملِ صالح کی برکت سے خلیفہ بنایا، دنیا میں حکومت دی، اور اس دِینِ اسلام کو دنیا میں قائم فرمایا، اور خوف امن سے بدلا، اس لیے وہ خلافت بالکل برحق خلافت تھی۔ اسی طرح سے گاہے بگاہے اللہ تعالیٰ ایمان وعمل کی برکت سے اور خلافتیں بھی قائم کرتے رہیں گے، اگرچہ درمیان میں کچھ غلط خلافتیں بھی ہوئیں جن میں دِین کی وہ بات پوری نہ رہی کہ دِین کی حکومت ہو، لیکن گاہے گاہے آج تک اسی طرح سے مختلف اوقات میں اللہ تعالیٰ نے اس دِین کو برتری دی، اور حضرت مہدی کے زمانے میں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں اور زیادہ کامل طریقے سے برتری ہو جائے گی، اس لیے اہلِ سُنّت والجماعت ہمیشہ اس آیت کو خلفائے راشدین کی حقّانیت کے لئے بطورِ دلیل کے ذِکر فرمایا کرتے ہیں۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ بلاشک وشبہ یہ آیت اُن کی خلافت کے خلافتِ حقہ ہونے پر دلالت کرتی ہے، کہ اللہ کے وعدے کے تحت یہی حکومت تھی جو سرورِ کائنات ﷺ کے آخری دور سے شروع ہوئی، اور بعد میں خلفاء اس کا اوّلین مصداق ہیں، اور آگے عدل وانصاف کا دور دورہ جب بھی آیا وہ سب کے سب اس میں داخل ہو سکتے ہیں کہ جب اُمتِ مسلمہ، سرورِ کائنات ﷺ کی اُمت عملِ صالح کی حامل ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو درجہ بدرجہ اسی طرح سے خوف وخطرہ سے امن دیا، اور ان کی حکومتیں صحیح طور پر قائم ہوئیں۔

اللہ کی رحمت کے حصول کے ذرائع

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ: یہ تاکید کی جارہی ہے کہ یہ وعدہ اللہ تعالیٰ کا پورا ہوگا، تم اپنے طور پر نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ اللہ کے رسول کی اطاعت کرو، لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ تاکہ تم رحم کیے جاؤ۔ اللہ کی رحمت تبھی حاصل ہوگی جب کہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ اور اِطاعتِ رسول، ان صفتوں کے تم حامل ہو جاؤ گے۔

کفار کے مغلوب ہونے کی پیش گوئی

اور کافر جو اس وقت مخالفت کر رہے ہیں، یہ اللہ کے بس سے باہر نہیں، یہ دشمنوں کے سرکوٹنے کی طرف اشارہ کر دیا کہ تمہارے دشمن عنقریب عاجز آجائیں گے، یہ اللہ کی قدرت سے باہر نہیں ہیں، عنقریب ان کا رگڑا نکل جائے گا، لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ: آج ان کے زور کو دیکھ کے تم یہ نہ سمجھو، ہرگز نہ گمان کیجئے ان لوگوں کو جو کہ کافر ہیں زمین میں عاجز کرنے والے، کہ ہماری پکڑ سے یہ چھوٹ جائیں گے، ہمیں ہرا دیں گے، ہمیں عاجز کر دیں گے، ہم ان کو کچھ کہہ نہیں سکتے، ایسا گمان نہ کرنا، یہ سب ہمارے بس میں ہیں، ہماری قدرت کے تحت ہیں، جب ہم چاہیں گے ان کو مغلوب کر دیں گے، تو اپنے دوستوں کے لئے کامیابی کا وعدہ کیا تو دشمنوں کی شکست کی طرف اشارہ کر دیا، ہرگز نہ گمان کر تو ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا زمین کے اندر عاجز کر دینے والے، وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ: ان کا ٹھکانا جہنم ہے، وَلَبِئْسَ الْمَصِيْرُ: اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ

اے ایمان والو! چاہیے کہ اجازت طلب کیا کریں تم سے وہ لوگ جن کے مالک ہیں تمہارے دائیں ہاتھ، اور وہ جو نہیں پہنچے بلوغ کو

مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ

تم میں سے تین مرتبہ، فجر کی نماز سے پہلے، اور جب تم اپنے کپڑے اُتار دیتے ہو دوپہر کے وقت،

وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ۟ؕ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ

اور عشاء کی نماز کے بعد، تمہارے لئے یہ تین وقت بے پردگی کے ہیں، نہیں ہے تم پر اور نہ ان پر کوئی حرج

بَعْدَهُنَّ ؕ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ

ان تین وقتوں کے بعد، وہ تم پر آنے جانے والے ہیں یعنی تمہارا بعض بعض پر آنے جانے والا ہے، ایسے ہی بیان کرتا ہے اللہ

لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۵۸ وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ

تمہارے لئے آیات، اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے ۝۵۸ جب تم میں سے نابالغ بچے حُلم کو پہنچ جائیں

فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ

پھر چاہیے کہ وہ اجازت طلب کیا کریں جیسے کہ اجازت طلب کرتے ہیں وہ لوگ جو ان سے پہلے بالغ ہو چکے ہیں، ایسے ہی بیان کرتا ہے اللہ

لَكُمُ الْاٰيٰتِؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۹﴾ وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا يَرْجُوْنَ

تمہارے لیے اپنی باتیں، اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے ﴿۵۹﴾ عورتوں میں سے وہ عورتیں جو بیٹھ رہنے والی ہیں جو نہیں اُمید رکھتیں

نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۢ بِزِيْنَةٍؕ وَ

نکاح کی ان پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ اپنے زائد کپڑے اُتار دیا کریں، نہ ظاہر کرنے والی ہوں اپنی زینت کو، اور

اَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۶۰﴾ لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا

ان عورتوں کا بچ کے رہنا بہتر ہے ان کے لئے، اللہ تعالیٰ سننے والا ہے جاننے والا ہے ﴿۶۰﴾ نابینے پر کوئی حرج نہیں،

عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ

لنگڑے پر کوئی تنگی نہیں، بیمار پر کوئی حرج نہیں، اور خود تم پر کوئی حرج نہیں کہ تم کھالیا کرو اپنے گھروں سے،

اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ

یا اپنے آباء کے گھروں سے، یا اپنی ماؤں کے گھروں سے، یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے، یا اپنی بہنوں کے گھروں سے، یا

بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا

اپنے چچوں کے گھروں سے، یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے، یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے، یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے، یا ان

مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗۤ اَوْ صَدِيْقِكُمْؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا

گھروں سے جن کی چابیوں کے تم مالک ہو، یا اپنے دوستوں کے گھروں سے، تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم کھا لیا کرو

جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًاؕ فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ

اکٹھے مل کر یا اکیلے اکیلے، پھر جس وقت تم داخل ہو گھروں میں تو اپنے لوگوں پر سلام کہا کرو سلام کہنا، جو مشروع ہے اللہ کی جانب سے

مُبٰرَكَةً طَيِّبَةًؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۱﴾

یہ سلام برکت والا ہے، پاکیزگی کا ذریعہ ہے، ایسے ہی بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آیات تا کہ تم سوچو ﴿۶۱﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ: اے ایمان والو! چاہیے کہ اجازت

طلب کیا کریں تم سے وہ لوگ جن کے مالک ہیں تمہارے دائیں ہاتھ، وَالَّذِیْنَ لَمْ یَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ: اور وہ جو نہیں پہنچے بلوغ کو تم میں سے، حُلم اصل کے اعتبار سے رات کو جو انسان خواب دیکھتا ہے اسے کہا جاتا ہے، اور اسی خواب کے نتیجے میں بسا اوقات غسل کی حاجت ہوجاتی ہے، اس لیے لفظ ''اِحتلام'' اسی سے لیا گیا ہے، تو بلوغ حُلم سے مراد ہے بالغ ہوجانا، لَمْ یَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ تم میں سے جو حُلم کو نہیں پہنچے، یعنی نابالغ بچے، اور مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ سے مملوکین مراد ہوگئے، یعنی تمہارے مملوکین اور تم میں سے نابالغ بچے تم سے اجازت طلب کیا کریں، یہ اجازت طلب کرنا ضروری ہے جیسا کہ اَمر کا تقاضا ہے، ثَلٰثَ مَرّٰتٍ: تین مرتبہ، مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ فجر کی نماز سے پہلے، وَحِیْنَ تَضَعُوْنَ ثِیَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِیْرَةِ: ظہیرہ دوپہر کو کہتے ہیں۔ اور جب تم اپنے کپڑے اُتار دیتے ہو دوپہر کے وقت، وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ اور عشاء کی نماز کے بعد۔ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ: عَوْرٰتٍ یہ جمع ہے عورۃ کی، اور عورۃ کہتے ہیں قابلِ ستر چیز کو، یعنی جس چیز میں خلل ہوتا ہے، جس کو چھپانے کی ضرورت ہوتی ہے اس کو عورت کہتے ہیں، سورۂ احزاب (آیت: ۱۳) میں یہ لفظ آئے گا اِنَّ بُیُوْتَنَا عَوْرَةٌ ہمارے گھر عورت ہیں، یعنی قابلِ حفاظت ہیں، اور ان میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے۔ تمہارے لیے تین عورتیں ہیں، اَیْ هٰذِهٖ اوقاتُ ثلاثِ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ لفظی معنی یہ بنا (آلوسی)، اور مفہوم اس کا یہ ہوگا کہ تمہارے لئے یہ تین وقت بے پردگی کے ہیں، جن میں ستر مطلوب ہے، لَیْسَ عَلَیْكُمْ وَلَا عَلَیْهِمْ جُنَاحٌ نہیں ہے تم پر اور نہ ان پر کوئی حرج، بَعْدَهُنَّ، ان تین وقتوں کے بعد، طَوّٰفُوْنَ عَلَیْكُمْ، وہ تم پر گھومنے والے ہیں، طوّاف مبالغے کا صیغہ ہے طاف یطوف سے۔ وہ تم پر آنے جانے والے ہیں، یعنی بعض تمہارا البعض پر آنے جانے والا ہے، كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ: ایسے ہی بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آیات، ایسے ہی واضح کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی باتیں، اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے۔

وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ: جب تم میں سے (مِنْكُمْ کا خطاب اَحرار کو ہے) یعنی آزاد لوگوں میں سے نابالغ بچے جس وقت حُلم کو پہنچ جائیں یعنی احتلام کی عمر کو پہنچ جائیں، بالغ ہوجائیں، فَلْیَسْتَاْذِنُوْا: پھر چاہیے کہ وہ اجازت طلب کیا کریں كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ: جیسے کہ اجازت طلب کرتے ہیں وہ لوگ جوان سے پہلے بالغ ہوچکے ہیں، یعنی جوان نئے بالغ ہونے والوں سے پہلے بالغ ہوچکے ہیں جس طرح سے وہ اجازت لیتے ہیں تو ان کو چاہیے کہ یہ بھی اجازت طلب کریں، كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ: ایسے ہی بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنی باتیں، اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے۔

وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ: قواعد مؤنث کا صیغہ ہے، اور قاعدے کے لحاظ سے یہ جمع ہونی چاہیے ''قاعِدَۃٌ'' کی، اور وہ صفت جو کہ مختص بالنساء ہو بسا اوقات اس کو ذکر کرتے وقت آخر میں ۃ نہیں لگائی جاتی، جس طرح سے طَالِقٌ یہ بظاہر مذکر کا صیغہ ہے لیکن یہ صفت عورت کی ہے، طلاق پانے والی عورت، اور آتی ہے یہ مذکر کے وزن پر، اسی طرح حَائِضٌ: حیض والی عورت، مراد اس سے مؤنث ہے، لیکن صیغہ بظاہر مذکر کا ہے ''تا'' سے خالی ہے، اسی طرح حَامِلٌ حاملہ عورت کو حامل کہتے ہیں یہ بھی ''تا'' سے خالی ہے، اور مُرْضِعٌ دودھ پلانے والی، یہ بھی ''تا'' سے خالی ہے۔ تو اصل بات یہ ہے کہ جو صفت مختص بالنساء ہو، جو مردوں میں نہیں پائی جاتی عورتوں میں پائی جاتی ہے، اس کو ذکر کرتے وقت بسا اوقات ''تا'' سے خالی کردیا کرتے ہیں، تو یہ طالق، موضع، حامل، حائض یہ ساری صفتیں ایسی ہیں جو عورتوں کے ساتھ مختص ہیں، یہاں بھی قواعد سے بوڑھی عورتیں مراد ہیں اس لئے اس کا مفرد

قاعد ذکر کر دیا جائے تو بھی گنجائش ہے (مظہری، آلوسی)، ایسی عورتیں جو بیٹھ رہنے والی ہیں، الّٰتِیْ لَا یَرْجُوْنَ نِکَاحًا: جو نکاح کی اُمید نہیں رکھتیں یعنی اتنی بوڑھی ہوگئیں کہ نکاح کی عمر سے گزر گئیں، اور عورتوں میں سے وہ عورتیں جو بیٹھ رہنے والی ہیں جو نہیں امید رکھتیں نکاح کی، فَلَیْسَ عَلَیْهِنَّ جُنَاحٌ ان پر کوئی گناہ نہیں اَنْ یَّضَعْنَ ثِیَابَهُنَّ کہ وہ اپنے زائد کپڑے اُتار دیا کریں، غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍ بِزِیْنَةٍ: نہ ظاہر کرنے والی ہوں اپنی زینت کو، یعنی زیب وزینت کو ظاہر نہ کریں تو جس طرح سے جوان عورتیں اپنے سینے کو، اعضا کو چھپانے کے لئے بڑی چادریں اوپر لیتی ہیں تو اگر بوڑھی عورتیں یہ چادریں اُتار دیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ وَاَنْ یَّسْتَعْفِفْنَ خَیْرٌ لَّهُنَّ: اَنْ یَّسْتَعْفِفْنَ یہ مصدر کی تاویل میں ہو جائے گا۔ ان عورتوں کا بچ کے رہنا بہتر ہے ان کے لئے۔ اللہ تعالیٰ سننے والا ہے جاننے والا ہے۔

تفسیر

ماقبل سے ربط

شروع رکوع سے یہاں تک جو آیات آپ کے سامنے ذکر کی گئیں، ان کا تعلق مسئلہ استیذان کے ساتھ اور مسئلہ حجاب کے ساتھ ہے، جن کی وضاحت پہلے آپ کے سامنے اسی سورت میں ہو چکی۔ عورتوں کے لئے جو ذکر کیا گیا تھا کہ لَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا، تو اس میں کچھ تھوڑی سی آگے ترمیم کی جارہی ہے کہ یہ حکم سب عورتوں کے لئے نہیں بلکہ بوڑھی عورتوں کے لئے اس معاملے میں کچھ سہولت ہے۔ اور اِستیذان کا مسئلہ جو ذِکر کیا گیا تھا کہ کسی کے گھر بغیر اجازت کے نہ جایا کرو، اس مسئلے کی بھی کچھ تھوڑی سی وضاحت کی جارہی ہے۔ جہاں اِستثناء ذکر کیا گیا تھا کہ کون سے لوگ ہیں جن کے سامنے حجاب نہیں، ان میں آپ کو معلوم ہے مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُهُنَّ کا ذِکر بھی آیا تھا، اور اسی طرح سے اَوِ الطِّفْلِ الَّذِیْنَ لَمْ یَظْهَرُوْا عَلٰی عَوْرٰتِ النِّسَآءِ کا ذکر بھی آیا تھا، یعنی اپنے مملوکوں کے لیے اور نابالغ بچوں کے اِبدائے زینت کی اجازت آئی تھی، اس کا مطلب یہ تھا کہ ان سے حجاب نہیں ہے، عورت ان کے سامنے اپنے بدن کے بعض حصے جن کی تفصیل آپ کے سامنے اس وقت عرض کر دی گئی تھی، ان کے سامنے کرسکتی ہے، یہ محارِم کے حکم میں ہوتے ہیں، جس طرح سے اپنے محرَم ہیں اسی طرح سے نابالغ بچے ہیں، جس طرح سے محرَم ہیں اسی طرح سے مملوک ہیں...... اب اس حکم میں کچھ اضافہ کیا جارہا ہے کہ مملوکوں کو اور نابالغ بچوں کو گھروں میں آنے جانے کی اجازت ہے، اور چونکہ یہ کثرت کے ساتھ آتے جاتے ہیں، کبھی باہر آگئے، کبھی اندر چلے گئے، کبھی خدمت کے لئے آنا جانا پڑا، ہر دفعہ اگر یہ اجازت لیں تو اجازت لینے میں تنگی ہے۔ اس لیے عام اوقات میں اگر یہ آئیں جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے، کوئی گناہ نہیں، کوئی نقصان نہیں۔

تین اوقات میں بچوں پر بھی اندر جانے پر پابندی ہے

لیکن تین وقتوں میں ان کو بھی پابند کردو، کہ جو تمہارے خلوت خانے ہوا کرتے ہیں، ان میں بلا اجازت، بغیر اطلاع کے چھوٹے بچے بھی اندر نہ آئیں، اور تمہارے مملوک اور تمہارے خادم بھی اندر نہ آئیں۔ ایک وقت عشاء کے بعد کا، اور دوسرا وقت فجر سے قبل کا، جس کا مطلب ہوگیا کہ عشاء سے لے کے فجر تک، اور تیسرا وقت دوپہر کا۔ دوپہر کو آرام کرتے ہیں، تو عادت ہے کہ

انسان اپنے کپڑے اُتار لیتا ہے، کوئی معمولی سے کپڑے پہن کے لیٹتا ہے، اور پھر وہ سونے کا وقت ہوتا ہے، تو سونے کی حالت میں بھی آپ جانتے ہیں کہ انسان کو اپنے بدن کی خبر نہیں ہوتی، بسا اوقات کپڑا ادھر اُدھر ہو جاتا ہے تو انسان ننگا بھی ہو جاتا ہے، اور اسی طرح سے عشاء کے بعد جب لیٹتے ہیں تو اس وقت بھی انسان کپڑے اُتار لیتا ہے، فجر سے قبل انسان سویا ہوا ہوتا ہے تو کپڑے اُترے ہوئے ہوتے ہیں، اپنے بدن کے بھی عریاں ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، اور پھر عموماً یہی اوقات ہیں جن میں انسان اپنے اہل سے رابطہ قائم کرتا ہے، اپنی بیوی کے ساتھ محبت پیار کے معاملات ہوتے ہیں، تو ان اوقات میں چاہیے کہ چھوٹے بچے بھی اس کمرے میں جس میں آپ خلوت میں ہیں، چاہے آپ اکیلے ہوں، چاہے اپنی بیوی کے ساتھ ہوں، اس تفصیل کا مطلب یہ ہوا۔ کیونکہ اکیلے ہونے کی صورت میں بدن کھلا ہوا ہو تو ایسے وقت میں بچے آ جائیں یہ بھی ٹھیک نہیں، اور اگر اس کمرے میں بیوی کے ساتھ ہو تو بھی بلا اجازت بچوں کا آ گھسنا اچھا نہیں ہے، کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کو ایسے حال میں دیکھ لیں جس میں دیکھنا مناسب نہیں، اس میں آپ کے لئے شرمساری ہوگی، بچوں کے ذہن پر غلط اثر پڑے گا، تو اس لئے ان تین اوقات میں ان کو پابند کر دو، یہ تین اوقات تمہاری بے پردگی کے ہیں، اس میں تمہیں کچھ پردے کی ضرورت ہے، ان اوقات میں یہ بغیر اجازت کے نہ آیا کریں۔ ہاں! البتہ ان اوقات کے علاوہ دوسرے اوقات میں اگر وہ بغیر اجازت کے آئیں تو کوئی حرج نہیں، کیونکہ باقی اوقات کام کاج کے ہوتے ہیں، مشغولیت کے ہوتے ہیں، اس میں اس قسم کے خلل کا اندیشہ نہیں ہوتا۔

بالغ ہونے کے بعد ہر وقت اجازت ضروری ہے

البتہ جس وقت یہ چھوٹے بچے بالغ ہو جائیں تو پھر ان کو بالغین کی طرح پابند کر دو، کہ جس طرح سے بڑے آدمی پہلے سے اجازت کے پابند ہیں، چونکہ ان کے لئے حکم پہلے آ چکا ہے، بڑے لوگ جس طرح سے پہلے اجازت کے پابند ہیں تو اسی طرح چھوٹے بچے جب بالغ ہو جائیں تو ان کو بھی بالغین میں شمار کر کے اسی طرح پابند کر دینا چاہیے۔ یہ نہیں خیال کرنا چاہیے کہ جب یہ بچپن سے گھر میں آتے جاتے ہیں، تو اب بھی کیا ضرورت ہے؟ یوں نہیں! بلکہ بالغ ہونے کے بعد بالغین کی طرح ان کے اوپر پابندی لگا دو۔ پہلی آیات کے اندر تو یہ حکم واضح کیا گیا، اور طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ: یہ اس تسہیل کی وجہ بیان کی گئی ہے، کہ چونکہ کثرت سے آنا جانا ہوتا ہے، اس لئے ہر دفعہ اجازت لینے میں حرج لازم آئے گا، تو تمہیں اجازت دے دی گئی کہ آگے پیچھے اجازت لینے کی ضرورت نہیں، البتہ ان تین اوقات میں ان کو پابند ضرور کرو۔ پہلے حصے کے اندر تو اس مسئلے کی وضاحت آئی ہے، تو كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ اللہ تعالیٰ اسی طرح سے اپنی باتیں تمہارے لیے واضح کرتا ہے، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہو گیا کہ جو حکم پہلے آیا تھا استیذان میں، یہ آیات اسی کی وضاحت کے لئے ہی اتری ہیں۔

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ اس مسئلہ استیذان میں یہ لفظ دو دفعہ آیا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے علم و حکمت کا حوالہ دیا، جس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ احکام بہت حکمت پر مبنی ہیں، تم نہیں جانتے کہ اس میں کیا کیا مصلحتیں ہیں، اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ اس میں کیا مصلحتیں ہیں، تو اللہ تعالیٰ کے علم و حکمت سے یہ احکام آ رہے ہیں، تو تمہیں ان کی پابندی کرنی چاہیے، اسی میں ہی تمہارے حق میں بہتری ہے،

تمہارا علم ناقص ہے، تم اس کی مصلحتیں نہیں سمجھتے، اور اسی طرح ان میں جو حکمتیں ہیں وہ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے تم نہیں جانتے، تو صفات کے حوالے دینے کا یہ مطلب ہوا۔ ایک بات کی وضاحت ہوگئی۔

چھوٹی بچیوں کے لئے پردے کا مسئلہ

اور دوسرا حکم، اس کا تعلق بھی اسی حجاب کے مسئلے سے ہے، پہلے ذکر کیا گیا تھا کہ عورتیں اپنی زینت ظاہر نہ کریں مگر ان لوگوں پر، جو فہرست آگے دے دی گئی تھی، وہ محارم تھے، بدن کے حصے ان کے سامنے ظاہر کیے جاسکتے ہیں۔ پھر خاص طور پر یہ حکم آیا تھا کہ سر کی اوڑھنی سینے پہ ڈال کر رکھیں، تاکہ سر بھی چھپے، کان بھی چھپیں، گلا بھی چھپے اور سینے کی ہیئت بھی مخفی رہے، اب اس کی بھی یہاں کچھ وضاحت کی جارہی ہے کہ یہ حکم جوان عورتوں کے لئے ہے۔ آپ جانتے ہیں بچیاں جو بالکل چھوٹی ہوتی ہیں جو محل شہوت نہیں، ان کے متعلق بھی تاکید نہیں، وہ بھی باہر دوسروں کے سامنے آجاسکتی ہیں، جس طرح گھر میں محارم کے سامنے ہوتی ہیں تو دوسروں کے سامنے بھی آجاسکتی ہیں، جس وقت محلِ شہوت ہوجائیں تو اس وقت ان کے لئے بھی حجاب ضروری ہوگا۔

بوڑھی عورتوں کے لئے پردے کے مسائل

اسی طرح سے عورت آخر عمر میں جاکر بھی محلِ شہوت نہیں رہتی، جس وقت اتنی بوڑھی ہوجائے کہ اٹھنے بیٹھنے سے عاجز آگئی، بیٹھ رہنے والی ہے، اس کی بدن کی صلاحتیں ختم ہوگئیں، اور جس کی وضاحت آگے ذکر کردی گئی کہ وہ نکاح کی امید نہیں رکھتی، یعنی نکاح کی عمر سے گزر گئی، اور اشارہ اسی بات کی طرف ہے کہ اب وہ محل شہوت نہیں ہے، اس عمر کو پہنچ گئی کہ اب اس کی طرف نکاح کے لئے کوئی شخص توجہ نہیں کرتا، یہ بھی بچیوں کے حکم میں آجایا کرتی ہیں، یہ بھی زائد کپڑے جو پردے کے لئے لئے جاتے ہیں وہ اگر اُتار دیں تو ان کے لئے بھی گنجائش ہے، تو بوڑھی عورت کے لئے غیر محرم مرد بھی محرم کے حکم میں ہوجاتے ہیں، جس طرح سے اپنے محرموں کے سامنے سر ننگا ہوجائے تو کوئی حرج نہیں، اور اسی طرح سے یہ تفصیل آپ کے سامنے آئی تھی کہ گلا ہوگیا، کندھے، بازو، گھٹنے کے نیچے کے حصے ہوگئے جن کو محارم کے سامنے ظاہر کیا جاسکتا ہے، تو بوڑھی عورت کے لئے جتنے بھی غیر محرم ہیں وہ سارے کے سارے محرموں کی طرح ہی ہیں.... ہاں! البتہ اس کو بھی احتیاط کرنی چاہیے کہ بن سنور کر، زیب وزینت کے ساتھ یہ لوگوں کو سامنے ظاہر نہ ہو، جس طرح سے آپ کبھی بڑے شہروں میں جائیں تو آپ کو یہ دیکھنے کی نوبت آئے گی کہ ایسی عورتیں جن کے منہ میں دانت نہیں ہوتے لیکن وہ بھی سرخی لگا کے، پاؤڈر لگا کے، خوب اچھی طرح سے بن سنور کر بازار کی طرف نکلتی ہیں، تو یہ مناسب نہیں ہے، اس کی ممانعت آگئی، غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۢ بِزِيْنَةٍ، بڑھاپے میں جا کے اگر یہ چیزیں ختم ہوگئیں، زیب وزینت کا شوق نہیں رہا، اور اسی طرح سے زیورات کی طرف بھی آپ جانتے ہیں کہ بڑھاپے میں رغبت نہیں رہتی، تو سیدھی سادی عورت ہو بڑھاپے میں، تو اس کے لئے باہر نکلنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس کے لئے یہ حجاب ضروری نہیں ہے، لیکن اگر وہ زیب وزینت کرے تو اس کا نتیجہ تو آپ جانتے ہیں کہ اگر اصل کے اعتبار سے نہ صحیح، تو اس بناوٹ کے ساتھ بھی مرغوب فیہ ہوسکتی ہے۔ بوڑھی بھینس کے گوشت کو بھی قصائی پنے ونے لگا کے ذرا خوبصورت کر کے لوگوں کے سامنے پیش کردیتے ہیں تو لوگ اس کی طرف رغبت کر لیتے ہیں، تو اسی طرح

سے یہ بوڑھی مائیں بھی اگر بن سنور کے نکلیں گی، سرخی لگائیں گی، پاؤڈر لگائیں گی، خوشبو لگائیں گی، بال بنائیں گی، اچھے اچھے کپڑوں میں زیور پہن کے نکلیں گی، تو آخر عارضی طور پر ہی سہی، بناوٹ ہی سہی، ملمع کے ساتھ ہی سہی، وہ کسی درجے میں مرغوب فیہ ہوسکتی ہے، جس کی بنا پر یہ ممانعت کردی کہ ان کو زیب وزینت کا اظہار نہیں کرنا چاہیے، ویسے ان کے لیے یہ تخفیف کردی گئی کہ جوان عورتوں کی طرح ان کا پردہ ضروری نہیں ہے، دوسرے حکم کا حاصل یہ تھا...... اس کے آخر میں بھی اللہ تعالیٰ نے ذکر کردیا کہ اگرچہ اجازت ان کو دے دی گئی ہے، ان کے اوپر پابندی نہیں ہے، لیکن یہ بھی بچ کے رہیں تو بہتر ہے، یہ بھی زیادہ تر گھروں میں بیٹھنے کی اور پردہ کرنے کی کوشش کریں، کیونکہ ان کا اثر بسا اوقات جوان لڑکیوں پر بھی پڑسکتا ہے، بوڑھی مائیں اگر گھروں کے اندر محتاط رہیں گی تو جوان عورتیں اور زیادہ محتاط ہوں گی، اور ان بوڑھیوں کے نکلنے کے ساتھ بسا اوقات دوسروں پر بھی اثر پڑسکتا ہے، اس لئے بہتر یہی ہے کہ یہ بھی بچیں، لیکن اگر نکلیں تو اجازت ہے، سج دھج کے نہ نکلیں، زیب وزینت کے ساتھ نہ نکلیں...... اس کے آخر میں بھی اللہ تعالیٰ نے سمیع علیم کی صفت ذکر کردی کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا ہے، سب کچھ جاننے والا ہے، جس قسم کے حالات کیفیات قلوب میں ہیں، یا زبان سے باتیں ہوتی ہیں وہ بھی اللہ سے مخفی نہیں ہیں، اس لئے آنے جانے میں ملنے جلنے میں بس یہ خیال رکھا کرو کہ کوئی بات اللہ سے مخفی نہیں، ہر بات کو اللہ سنتا ہے، ہر حال کو اللہ جانتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی صفات کا اگر تصور رکھا جائے تو پھر اَحکام کی پابندی آسان ہوجاتی ہے، دوسرے حکم کی یہ وضاحت تھی۔

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ: نابینے پر کوئی حرج نہیں، وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ، لنگڑے پر کوئی تنگی نہیں، حرج تنگی کو کہتے ہیں، وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ، بیمار پر کوئی حرج نہیں، وَّلَا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اور خود تم پر کوئی حرج نہیں، اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ کہ تم کھالیا کرو اپنے گھروں سے اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ، یا اپنے آباء کے گھروں سے یعنی باپ دادے کے گھر سے، اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ، یا اپنی ماؤں کے گھروں سے، اُمَّهٰت یہ اُمّ کی جمع ہے، اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ، یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے، اِخوان اَخ کی جمع ہے، اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ، یا اپنی بہنوں کے گھر سے، اخوات اُخت کی جمع ہے، اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ، یا اپنے چچوں کے گھروں سے، اعمام عمّ کی جمع ہے، اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ، یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے، عمات عمّۃ کی جمع ہے، اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ، یا اپنے ماموؤں کے گھر سے اَخوال خال کی جمع ہے، اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ، یا اپنی خالاؤں کے گھر سے۔ خالات یہ خالۃ کی جمع ہے، جو ماں کی بہن ہوتی ہے، اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗۤ یہاں بھی ''ما'' سے بیوت مراد ہیں۔ یا ان گھروں سے جن کی چابیوں کے تم مالک ہو۔ مَفَاتِحَهٗ میں ''ہ'' ضمیر ''ما'' کی طرف لوٹ گئی لفظوں میں مفرد ہونے کی وجہ سے، ورنہ ''ما'' سے مراد یہاں بیوت ہی ہیں، یا ان گھروں سے جن کی چابیوں کے تم مالک ہو، اَوْ صَدِيْقِكُمْ یا اپنے دوستوں کے گھروں سے، لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم کھالیا کرو اکٹھے مل کر اَوْ اَشْتَاتًا، یا اکیلے اکیلے۔ اکیلے اکیلے بھی کھا سکتے ہو اور اکٹھے مل کر بھی کھا سکتے ہو۔ فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا: پھر جس وقت تم داخل ہو گھروں میں فَسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ، تو اپنے لوگوں پر سلام کہا کرو، اَنْفُسِكُمْ سے مراد اپنے لوگ یعنی مسلمان جو گھروں میں ہیں، تَحِيَّةً مِّنْ

عِنْدِ اللهِ یہ سَلِّمُوْا کا مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، اور یہ مفعول مطلق ہے من غیر لفظہ جیسے جَلَسْتُ قُعُوْدًا۔ سلام کہا کرو اپنے نفسوں پر سلام کہنا۔ تحیۃً اصل میں ہے تَحْيِيَةً باب تفعیل کا مصدر ہے حَيّٰى يُحَيِّيْ، سَمّٰى يُسَمِّيْ کی طرح، اس کا لفظی معنی یہ ہوتا ہے کہ کسی دوسرے کو زندگی کی دُعا دینا، یوں کہنا: حَيَّاكَ اللهُ، اللہ تعالیٰ تجھے زندہ رکھے، بعد میں سلام والی دُعا کے لئے تحیہ کا لفظ بولا جاتا ہے، تو اب یہاں یہی معنی ہوگا کہ سلام کہا کرو اپنے لوگوں پر سلام کہنا، جو مشروع ہے اللہ کی جانب سے، متعین ہے مقرر کیا ہوا ہے اللہ کی جانب سے، مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً یہ سلام برکت والا ہے، پاکیزہ ہے، پاکیزگی کا ذریعہ ہے۔ ایسے ہی بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آیات تا کہ تم سوچو۔

کسی کا مال اس کی خوشی کے بغیر اِستعمال کرنے کا حکم

ان آیات میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک وضاحت ہے۔ جب حجاب کے اَحکام نازل ہوئے تو بظاہر ایک دوسرے کے گھر میں آنے جانے کی پابندی لگ گئی، جس طرح سے پہلے آزادانہ آتے جاتے تھے اب اس طرح سے آزادانہ آنا جانا نہ رہا۔ اور اسی طرح اللہ کی طرف سے خاص تاکید آ گئی کہ کسی کی چیز اس کی اجازت کے بغیر نہ کھایا کرو، لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (سورۂ نساء:۲۹) رضامندی کے ساتھ خرید و فروخت ہو، اس طریقے سے تم ایک دوسرے کے مال حاصل کر کے کھا سکتے ہو۔ اور اسی طرح یتیموں کے بارے میں ہے لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ (سورۂ نساء:۲) یتیموں کے مال نہ کھایا کرو۔ اور اگر کوئی کسی کا مال بغیر اجازت کے کھاتا ہے تو شریعت نے پابندی لگا دی کہ یہ اس کے لئے حلال نہیں، لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُّسْلِمٍ اِلَّا بِطِيْبِ نَفْسِهٖ، کسی مسلمان کا مال حلال نہیں مگر اس کی دل کی خوشی کے ساتھ[1] تو یہ نئی نئی پابندی جو لگی، تو پہلے جو آزادانہ اختلاط تھا وہ ختم ہو گیا، تو عرب کے اندر اس بارے میں بھی بہت بے تکلفی تھی کہ لوگ بلا اجازت ایک دوسرے کے گھر چلے جاتے تھے، اور جا کے ایک دوسرے کی چیز بھی اُٹھا کے کھا لیتے تھے، عرف تھا، اور اس کو وہ لوگ بُرا نہیں سمجھتے تھے، کھانے پینے کے معاملے میں، مہمان نوازی میں عرب کا معاشرہ بہت اچھا تھا، مہمان نوازی تو ان لوگوں پر ختم تھی، اس لئے کوئی کسی کے گھر جا کے اُٹھا کے کھا لے تو کوئی بُرا محسوس نہیں کرتا تھا، بلکہ بسا اوقات یوں ہوتا کہ ایک آدمی کو اگر راستے میں کوئی محتاج مل جاتا تو اس کو بھی اپنے ساتھ لے جاتا، اور جا کے اپنے بھائی کے گھر کھانا کھلا دیتا، بہن کے گھر کھانا کھلا دیتا، اور محتاج لوگ بھی اسی طرح سے لوگوں کے گھر کھانے پینے کے لیے آتے جاتے رہتے تھے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کا بہت زیادہ اِحتیاط کرنا

جس وقت اللہ کی طرف سے یہ احکام آئے اس وقت پھر ذہنوں کے اندر آپ جانتے ہیں کہ ایک ہیجان سا ہوتا ہے، مختلف قسم کے شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں، معذور لوگ بھی بچنے لگ گئے کہ اب ہمیں کسی کے گھر جا کے نہیں کھانا چاہیے، اور اسی طرح دوسرے لوگ بھی کچھ احتیاط کرنے لگ گئے کہ ہم بھی کسی کے گھر جا کے نہ کھائیں، اور اسی طرح کسی معذور کو ہم اپنے ساتھ

(۱) سنن دار قطنی ۳/ ۴۲۴، رقم ۲۸۸۵۔ نیز مشکوٰۃ ۱/ ۲۵۵ باب الغصب والعاریۃ، فصل ثانی۔ ولفظہ: اَلَا لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ اِلَّا بِطِيْبِ نَفْسٍ مِّنْهُ

لے جائیں یہ بھی مناسب نہیں ہے۔اور پھر اکٹھے کھانے میں بھی احتیاط بایں معنی شروع ہوئی کہ مشترکہ چیز جس وقت ہوتی ہے تو اس میں حق تو سب کا برابر ہے، لیکن جب ہم مل کے کھائیں گے تو پتا نہیں کون زیادہ کھا جائے اور کون کم کھا جائے؟ اس میں بھی ایک دوسرے کی حق تلفی کا اندیشہ ہے، تو یہ مختلف چیزیں جو تھیں اس قسم کے احکام کے آنے کے بعد انسان کے ذہن میں بطور سوال کے اُبھرتی ہیں، کہ معلوم نہیں کہ کہاں تک ہمارا کردار درست ہے؟ اور کہاں تک درست نہیں ہے؟ ہمارے ہاں گھریلو ماحول جو ہے، ہماری معاشرت، وہ ہے خاندان میں اشتراک کی صورت، ہمارے باپ کا گھر علیحدہ نہیں، ماں کا گھر علیحدہ نہیں، اور اسی طرح دوسرے رشتہ دار بسا اوقات ایک ہی مکان میں رہتے ہیں، سب کی ملکیت مشترکہ ہوتی ہے، لیکن عرب میں یہ معاشرہ نہیں تھا، عرب میں ہر کسی کی ملکیت علیحدہ تھی، ماں کا گھر علیحدہ، باپ کا گھر علیحدہ، اپنا گھر علیحدہ، اپنے بیٹوں کا گھر علیحدہ، بیٹیوں کا علیحدہ، جیسے جیسے انسان بالغ ہوتا جاتا ہے، اس کا مکان اور سامان علیحدہ کر کے اس کو جدا کر دیا جاتا ہے، اور وہ اپنی زندگی علیحدہ گزارتے ہیں۔ بیوی اور خاوند کی املاک بھی بسا اوقات علیحدہ ہوتی ہیں، بیوی کا مال علیحدہ شمار ہوتا ہے اور خاوند کا مال علیحدہ شمار ہوتا ہے۔ ہاں! البتہ کھانے پینے کے لئے کوئی مشترکہ چیز رکھ لی تو بیوی اور خاوند کی مشترکہ بھی ہوتی ہے، کیونکہ ان کا کھانا اکٹھا ہے، خاوند کے ذمے بیوی کا نفقہ ہے تو یہ اکٹھے بھی کھا سکتے ہیں، لیکن بیوی کی جو جائیداد ہے اس کا حساب علیحدہ ہوگا، ماں باپ کی طرف اس کو جو ملتا ہے اس کا حساب علیحدہ ہوگا، مہر وغیرہ کی رقم جو اس نے وصول کی ہوئی ہے اس کا حساب علیحدہ ہے، بہن بھائیوں کی طرف سے اس کو کوئی تحفہ ہدیہ ملتا ہے تو اس کا حساب علیحدہ ہے، تو بیوی کی املاک بھی علیحدہ ہوتی ہیں، عرب کے اندر معاشرہ اس طرح سے تھا، اور اسی میں حکمت ہے تاکہ کسی کی حق تلفی کی نوبت نہ آئے، رضامندی کے ساتھ خوشی سے رل مل کر جو چاہیں کریں لیکن جہاں تک حقوق کا سوال ہے، حقوق ممتاز ہیں۔

اِختلاط کی اِجازت

تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے اندر جو آپ کے سامنے پڑھی گئی یہ وضاحت کی ہے کہ مروّت، احسان، محبت، پیار اور ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا۔ تو اس میں جو قواعد بتائے گئے ہیں ان کا یہ مطلب نہیں کہ تم ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا ہی چھوڑ دو، اور کسی کے گھر سے کچھ کھایا پیا نہ کرو، جس طرح پہلے تمہارا آنا جانا تھا، تم آ جا سکتے ہو، لیکن سلام کہہ کر جاؤ، اجازت طلب کر کے جاؤ، کھانے پینے کی ممانعت نہیں، اسی طرح اگر بے تکلفی کے ساتھ کسی محتاج کو ساتھ لے جاؤ تو بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ موقع ملے تو تم اکٹھے بیٹھ کر کھا سکتے ہو، علیحدہ علیحدہ بھی کھا سکتے ہو، وہ معاشرہ اسی طرح سے ہے، اُس کی ممانعت نہیں کی گئی، تمہارا آنا جانا ہونا چاہیے، لیکن یہ تمہیں بتا دیا گیا کہ اجازت لے کے جاؤ، اور جہاں غیر محرمیت کا تعلق آ جاتا ہے وہاں بے حجابی نہیں ہونی چاہیے، باقی! جا سکتے ہو، بلا اجازت بھی کھا سکتے ہو، جس طرح سے تمہارا پہلے معاشرہ ہے۔

اور آج بھی مسئلہ یہی ہے کہ اگر آپ کا کسی کے ساتھ ایسا تعلق ہے رشتہ داری کی بنا پر یا محبت اور دوستی کی بنا پر کہ آپ اس کے گھر جائیں اور جا کے کسی چیز کو اٹھا کر کھا لیں تو وہ برا نہ محسوس کرے، بلکہ وہ خوش ہو کہ دیکھو! میرے ساتھ بے تکلفی کی، اور میرے

گھر آ گئے اور آ کے اس طرح سے کھا گئے، وہاں اجازت لینے کی ضرورت نہیں، بلا اجازت بھی انسان کھا سکتا ہے۔ لیکن اگر ماحول ایسا ہو جیسا کہ اب اکثر ہوتا جا رہا ہے کہ کوئی کسی کے ساتھ اس قسم کا بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کرتا، ہر کوئی ایک دوسرے کے حق میں بخیل ہوتا جا رہا ہے، کوئی شخص اجازت نہیں دیتا کہ میری چیز کو بغیر اجازت کے کوئی آ کے اٹھا کے کھا لے، چاہے کوئی رشتہ دار ہو، چاہے کوئی دوست ہو، تو جہاں اس قسم کی ناگواری محسوس ہو وہاں اجازت نہیں ہے۔ تو اگر دلالت حال کے ساتھ رضا معلوم ہو جائے تو ان گھروں میں جا کے انسان ان سے پوچھے بغیر بھی کھا پی سکتا ہے، اور اگر دلالۃً معلوم ہو کہ اجازت نہیں ہے تو ایسی صورت میں پھر صراحۃً اجازت لئے بغیر انسان کو دوسرے کے گھر میں جا کے کوئی تصرف نہیں کرنا چاہیے۔

مذکورہ آیات پر ایک نظر دوبارہ

ان آیات پر دوبارہ نظر ڈال لیجئے...... اعمیٰ: اندھا۔ اعرج: لنگڑا۔ مریض: بیمار۔ ان کا ذکر کر دیا گیا کہ یہ لوگ دوسروں کے ساتھ مل کر کھانے سے احتیاط کرنے لگ گئے تھے، یا دوسرے لوگ ان کے ساتھ مل کر کھانے سے احتیاط کرنے لگ گئے تھے، اس خیال سے کہ جب مشترکہ چیز ہو، اور مل کر بیٹھیں گے، تو ممکن ہے کہ یہ اس طرح سے نہ کھا سکیں جس طرح ہم کھاتے ہیں، اندھے کو اچھی اچھی چیز نظر نہیں آتی، ہم اچھی اچھی چیز اٹھا کر کھا جائیں گے، لنگڑے کو بیٹھنے میں تکلف ہوتا ہے، مریض بھی پوری طرح سے نہیں کھا سکتا۔ اور ان لوگوں کے دلوں میں بھی خیال آ سکتا تھا کہ ہم لوگوں کے ساتھ مل کر نہ کھائیں، شاید لوگ برا محسوس کرتے ہوں، یا ہمیں جو محتاج سمجھ کے لوگ گھروں میں لے جاتے تھے تو شاید اب گھر والے اچھا نہ سمجھیں، تو یہ بھی اپنی جگہ کچھ محتاط سے ہو گئے تھے، اس لئے صراحتاً انکا ذکر کر دیا گیا، کہ ان پر بھی کوئی حرج نہیں ہے اور خود تم پر بھی کوئی حرج نہیں کہ تم اپنے گھروں سے جا کے کھا سکتے ہو، اپنے گھروں میں بیویوں کے گھر میں بھی شامل ہیں، اور اپنے آباء کے گھروں سے جا کر کھا سکتے ہو کیونکہ باپ کی ملکیت تمہاری ملکیت سے علیحدہ ہو سکتی ہے کہ باپ کا مکان علیحدہ ہے، تمہارا مکان علیحدہ ہے، اور ماؤں کے گھروں سے، بھائیوں کے گھروں سے، بہنوں کے گھروں سے، چچوں کے گھروں سے، پھوپھیوں کے گھروں سے، ماموؤں کے گھروں سے، خالاؤں کے گھروں سے، اسی طرح جن کی چابیاں تمہارے پاس ہیں، کوئی شخص جاتے ہوئے بے تکلفی کے ساتھ اپنے مکان کی چابی آپ کو دے گیا، یہ اعتماد کی علامت ہے، تو اس لیے اگر کوئی استعمال کی چیز پڑی ہوئی ہو تو بوقت ضرورت آپ پوچھے بغیر استعمال کر لیں تو جائز ہے، کیونکہ اس وقت اس کی وسعت تھی۔ لیکن اگر دلالت سے معلوم ہو کہ چابی اگرچہ دے گئے ہیں لیکن بعد میں آ کے دیکھا کہ چینی غائب، چائے کی پتی غائب، فلاں چیز غائب، تو آتے ہی ناراضگی ہوگی کہ یہ کیوں استعمال کی ہے؟ تو ایسی صورت میں استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ اگر دلالۃً معلوم ہو کہ اس کا استعمال ان کو ناگوار نہیں تو وہ چیز اُٹھا کے استعمال کر سکتے ہو۔

غریب و یتیم کے مال کے کا حکم

مَامَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗ کے اندر یہ بھی آ سکتا ہے کہ جن کی تولیت تمہیں حاصل ہے، جیسے کوئی غریب بچے، یتیم بچے آپ کی تولیت میں ہیں، اور ان کے گھروں کی چابیاں آپ کے پاس ہیں، قرآن کریم میں یہ مسئلہ صراحتاً ذکر کیا گیا سورۂ نساء (آیت: ۶)

میں مَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ کہ اگر کوئی یتیم تمہاری تولیت میں ہے اور تمہارا اپنا گزارہ ہو رہا ہے، ضرورت کی چیز تمہارے پاس موجود ہے، پھر تو تم اس سے خدمت کے معاوضے کے طور پر بھی کچھ نہ لو۔ جو کوئی غنی ہے تو اسے بچ کے رہنا چاہیے، یتیم کے مال سے کچھ نہ کھائے، خدمت کا معاوضہ بھی نہ لے، لیکن اگر کوئی ضرورت مند ہے، اس صورت میں بقدرِ ضرورت وہ لے سکتا ہے، اس مسئلے کی وضاحت آپ کے سامنے اس آیت کے تحت آ گئی تھی، تو مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗ میں یہ بھی شامل ہو سکتا ہے کہ جو تمہاری تولیت میں ہیں، جن کی چابیاں تمہارے قبضے میں ہیں، اور تم ان کی خدمت کرتے ہو ان کے ولی ہو، تو اس خدمت اور ولایت کے معاوضے میں تمہیں کھانے کی اجازت ہے۔ اور وہ بات تو ہے ہی کہ آپ کا کوئی تعلق والا اعتماد کر کے مکان کی چابی آپ کو دے گیا تو اس کی عدم موجودگی میں کوئی قابلِ استعمال چیز پڑی ہو، اور آپ سمجھتے ہیں کہ اس کے استعمال کرنے سے اس کو ناگواری نہیں ہوگی، وہ بھی لے سکتے ہو۔ اور اسی طرح دوستوں کے گھروں سے بھی کھا سکتے ہو۔

اکٹھے مل کر کھانے کے مسائل

اور پھر اکٹھے مل کر کھاؤ تو بھی کوئی حرج نہیں، اور علیحدہ علیحدہ کھا لو تو بھی کوئی حرج نہیں، یعنی اس قسم کے وہم میں مبتلا نہ ہو کہ مشترکہ چیز ہے، اکٹھے کھائیں گے تو پتا نہیں کون زیادہ کھا جائے اور کون کم؟ لیکن اس بارے میں دیکھیے! انسان کے اندر قلبی طور پر اتنی غناء ہونی چاہیے کہ دل میں یہ وسعت ہو کہ دوسرا شخص اگر زیادہ کھا گیا تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن اگر طبیعت میں تنگی ہے اور انسان یہ جھانکتا ہے کہ دوسرا شخص زیادہ کھا رہا ہے تو مجھے ناگوار گزر رہا ہے تو ایسی صورت میں پھر مشترکہ چیز اکٹھے نہیں کھانی چاہیے، پھر تقسیم کر کے علیحدہ علیحدہ برتن میں لے کے کھاؤ، اگر دِلوں میں تنگی ہے۔ اور اگر دِل میں یہ خیال آئے کہ اکٹھے کھائیں تو میں کوشش کروں تاکہ زیادہ کھاؤں، اور دوسرا زیادہ نہ کھا سکے، تو ایسی صورت میں بھی پھر دوسرے کے ساتھ شریک ہو کر نہیں کھانا چاہیے، کیونکہ آپ زیادہ کھائیں یا نہ کھائیں، قصد کے اعتبار سے آپ ظالم بن گئے کہ آپ کا جذبہ یہ ہے کہ میں اچھی چیز کھا لوں اور زیادہ کھا لوں، جلدی جلدی کھا لوں۔ اگر یہ جذبات نہیں اور دِلوں کے اندر وسعت ہے کہ کوئی زیادہ کھا جائے تو کوئی حرج نہیں، کوئی اچھی چیز اُٹھا کے کھا جائے تو کوئی حرج نہیں، اگر دِلوں کے اندر اس طرح سے وسعت ہو تو پھر مشترکہ کھانے میں کوئی حرج نہیں۔ اور اگر دِلوں میں اس طرح سے ناگواری ہے کہ انسان کُڑھے کہ دیکھو! ہم اکٹھے تو کھاتے ہیں لیکن دوسرا جلدی جلدی کھا جاتا ہے، اسی لیے حدیث شریف میں آتا ہے، سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ جب اکٹھے بیٹھ کر کھاؤ، مثلاً کھجور ہے تو ایک ایک کھجور اُٹھاؤ، باقی ساتھی ایک ایک کھجور اُٹھا رہے ہوں اور تم دو دو اُٹھا کے منہ میں ڈالنا شروع کر دو، یہ جائز نہیں ہے، یہ صراحتاً حدیث شریف میں آتا ہے،[1] اسی طرح مثلاً انگور ہیں تو ہر شخص ایک ایک دانہ اُٹھائے، دو دانے اُٹھانے ہوں تو اپنے رُفقاء سے اجازت لینی چاہیے، یا دلالۃً اِذن ہو کہ دوسرا بُرا نہ منائے تو ایسی صورت میں بھی گنجائش ہے۔

اور جب گھروں میں جاؤ تو سلام کہہ کے جایا کرو، اپنے لوگوں کو سلام کہو، یہ تحیہ ہے، یہ دُعا ہے۔ تحیۃ کا لفظ مفعول مطلق

---

(۱) نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ يُقْرِنَ بَيْنَ التَّمْرَ تَيْنِ حَتّٰى يَسْتَاْذِنَ صَاحِبَه (بخاری ۱/ ۳۳۸، باب القران فی التمر مشکوٰۃ ۲/ ۳۶۴، کتاب الاطعمۃ)

ہو تو معنی ہو گا سلام کہو، سلام کہنا، اللہ کی طرف سے یہ مشروع کیا گیا، بڑی برکت والی چیز ہے، بڑی پاکیزہ چیز ہے، اس لیے گھروں میں جاتے ہوئے اپنے لوگوں کو سلام کہا کرو۔ کذٰلک یبیّن اللہ، یہاں بھی تبیین کا ذکر آ گیا، معلوم ہو گیا کہ یہ وہی معاشرتی احکام ہیں جن کا ذکر استیذان میں آیا تھا، انہی کی یہاں وضاحت کی جا رہی ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ
سوائے اس کے نہیں کامل ایمان والے وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اللہ کے رسول پر ایمان لاتے ہیں اور جس وقت یہ لوگ اللہ کے رسول کے ساتھ
عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
ہوتے ہیں کسی امر جامع پر تو وہ نہیں جاتے جب تک کہ وہ اللہ کے رسول سے اجازت نہ لے لیں، بے شک جو تجھ سے اجازت طلب کرتے ہیں
يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ
وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں، جب یہ لوگ آپ سے اجازت طلب کریں اپنے کسی کام کے لئے تو آپ اجازت دے دیا کیجئے
لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۲﴾ لَا تَجْعَلُوْا
جس کے لئے آپ چاہیں ان میں سے، اور ان کے لئے اللہ سے استغفار کیجئے، بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ﴿۶۲﴾ نہ بنایا کرو تم
دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ؕ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ
رسول کے بلانے کو آپس میں مثل بلانے تم میں سے بعض بعض کو، اللہ تعالیٰ جانتا ہے تم میں سے ان لوگوں کو جو ایک دوسرے کی اوٹ
يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ
لے کر کھسک جاتے ہیں، جو لوگ حضور ﷺ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں ان کو ڈرنا چاہیے اس بات سے کہ انہیں کوئی فتنہ پیش آ جائے
اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾ اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قَدْ يَعْلَمُ
یا ان کو کوئی دردناک عذاب پہنچ جائے ﴿۶۳﴾ خبردار! اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے، اللہ تعالیٰ جانتا ہے
مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ ؕ وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۶۴﴾
ہر اس حال کو جس پر تم ہو، اور جس دن یہ لوگ لوٹائے جائیں گے اللہ کی طرف پھر اللہ ان کو خبر دے گا ان کاموں کی جو یہ کرتے ہیں، اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والے ہیں ﴿۶۴﴾

خلاصۂ آیات

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ: سوائے اس کے نہیں کہ کامل ایمان والے وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اللہ کے رسول پر ایمان لاتے ہیں، وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ: اور جس وقت یہ لوگ اللہ کے رسول کے ساتھ ہوتے ہیں کسی امر جامع پر، کسی ایسے کام پر جو لوگوں کو اکٹھا کرنے والا ہے، جمع کرنے کی نسبت امر کی طرف کردی گئی، یعنی کسی ایسے کام پر ہیں جن کے لئے لوگوں کو اکٹھا کیا گیا ہے، امر جامع کا یہ معنی ہوگیا، اللہ کے رسول کے ساتھ ہوتے ہیں کسی ایسے کام پر جس کے لئے لوگوں کو اکٹھا کیا گیا، چونکہ وہ امر سبب بنا ہے اکٹھا کرنے کا اس لئے اس امر کو جامع کہہ دیا گیا۔ لَّمْ يَذْهَبُوْا: وہ لوگ نہیں جاتے، حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ: حتی کے بعد نفی کا ترجمہ محاورۃً ہمیشہ ہوتا رہتا ہے، جب تک کہ وہ اللہ کے رسول سے اجازت نہ لے لیں، اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ: بے شک جو تجھ سے اجازت طلب کرتے ہیں وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں، فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ، جب یہ لوگ آپ سے اجازت طلب کریں، لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ، اپنے کسی کام کے لئے، فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ: آپ اجازت دے دیا کیجئے جس کے لئے آپ چاہیں ان میں سے، ان میں سے جس کے لئے آپ مناسب سمجھیں اس کو اجازت دے دیا کریں، وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ اور ان کے لئے اللہ سے استغفار کیجئے۔ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر

سرورِ کائنات ﷺ کے کچھ آداب

اس میں سرورِ کائنات ﷺ کے کچھ آداب ذکر کیے گئے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ بعض منافقین کو تنبیہ کرنا مقصود ہے۔ مدینہ منورہ میں رہتے ہوئے ایسی نوبت آتی تھی کہ قومی ضرورت کے تحت کوئی مشترکہ کام پیش آ گیا، جیسا کہ مثال کے طور پر خندق کھودنی تھی، تو رسول اللہ ﷺ نے سب لوگوں کو بلایا اور اکٹھا کرلیا تو یہ ہوگیا امر جامع، جس کے لیے لوگوں کو ضرورت کے مطابق اکٹھا کیا گیا۔ ''جب آپ بلائیں'' اگلی آیت میں وضاحت آئے گی کہ جب اللہ کا رسول بلائے تو اِن کے بلانے کو تم عام آدمی کے بلانے کی طرح نہ سمجھا کرو، عام آدمی اگر بلاتا ہے تو تمہاری مرضی ہے، چاہے آؤ یا نہ آؤ، لیکن اگر اللہ کا رسول بلائے تو آنا ضروری ہے۔ اور پھر جب اللہ کے رسول کے بلائے ہوئے تم آئے ہو کسی مشترکہ کام کے لئے تو بغیر اجازت کے جایا کرو۔ منافقین کیا کرتے تھے؟ کہ اول تو آنے میں دیر کرتے، اور اگر بلائے ہوئے آ ہی جاتے تو پھر اگر کوئی شخص حضور ﷺ کی اجازت سے اٹھ کے جاتا تو اس کے ساتھ ہی اس کی آڑ میں یہ بھی کھسک جاتے۔ جیسا کہ آپ نے دیکھا ہوگا، یہیں آپ کے سامنے مثال ہے کہ کسی کام کے لئے طلبہ کو اکٹھا کرلیا، مثال کے طور پر کہا جائے کہ آؤ یہ لکڑیاں یہاں سے اُٹھانی ہیں، یا یہ اینٹیں اُٹھانی ہیں، تو اکٹھا کرنے میں بعض اوقات تو بلانے پر آنے میں کچھ طلبہ سستی کرتے ہیں، اور جس وقت آ گئے اور کام شروع ہوا تو پھر آہستہ آہستہ آنکھ بچا کے ایک دوسرے کی اوٹ میں نکل جاتے ہیں، تھوڑی دیر کے بعد دیکھو تو تھوڑے سے کھڑے رہ جاتے ہیں، باقی سب کوئی ادھر کو منتشر

ہو گئے، کوئی ادھر کو منتشر ہو گئے۔ یہ واقعہ ہوتا ہے یا نہیں ہوتا؟ یوں ہی سمجھئے کہ اللہ کا رسول اگر کسی کام کے لیے بلاتا تو منافق لوگ کچھ آنے میں سستی کرتے، اور اگر آ ہی جاتے تو پھر ایک دوسرے کی اوٹ میں کھسکنے کی کوشش کرتے، تو اللہ تعالیٰ نے یہاں ان کو تنبیہ فرمائی کہ اول تو اللہ کا رسول جس وقت بلائے تو اس کے بلانے کو عام لوگوں کے بلانے کی طرح نہ سمجھا کرو، عام لوگوں میں سے کوئی بلائے تو مرضی ہے آ ؤ یا نہ آ ؤ، لیکن اگر اللہ کا رسول بلائے تو تم پر آنا واجب ہے، پھر اگر کسی امر جامع کے لئے تمہیں اکٹھا کیا گیا ہے، کوئی مشترکہ کام ہے جس کے لئے اکٹھا کیا گیا ہے، تو بغیر اجازت کے جایا نہ کرو۔

یہاں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کامل مؤمن وہی ہیں کہ جب اس قسم کے کام کے لئے آتے ہیں تو بغیر اجازت کے جاتے نہیں، اور جس وقت وہ اجازت طلب کریں تو آپ کی مرضی جس کو اجازت دیں اور جس کو اجازت نہ دیں، اور اگر اجازت دے ہی دیں تو بھی ان کے لئے استغفار کیجئے، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ ایک آدمی اپنے لئے ایک کام کو ضروری سمجھتا ہے، حقیقت میں ضروری نہ ہو، اور اس کے مقابلے میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مل کر اس کام کو کرنا زیادہ ضروری تھا، تو یہ ایک کوتاہی ہوسکتی ہے، تو اس کوتاہی کے لئے آپ ان کے واسطے استغفار کیجئے، اور اپنے کام کے لئے حضور ﷺ کی مجلس کو چھوڑ کر چلے جانا یہ بھی بظاہر ایک قسم کی کمی اور کوتاہی ہے تو ان کے لئے آپ استغفار کیجئے، جس میں بتا دیا گیا کہ جن کا یہ کردار ہے جو بلانے پر دوڑے ہوئے آتے ہیں، اور پھر کسی طرف کھسکنے کی کوشش نہیں کرتے، ضرورت پیش آ جائے تو صراحتاً اجازت لیتے ہیں یہ تو ہیں کامل مؤمن، اور اس کے مقابلے میں دوسرا فریق کہ جو آنے میں سستی کرتا ہے، یا آ جاتا ہے تو دلچسپی سے کام نہیں کرتے، بغیر اجازت کے ایک دوسرے کی اوٹ میں کھسکتے ہیں، تو معلوم ہوگیا کہ یہ کامل مؤمن نہیں ہیں، یا منافق ہیں یا کچے ایمان والے ہیں، اور یہ اکثر عادت منافقین کی تھی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی مجلس سے یوں ایک دوسرے کی آڑ لے کر، ایک دوسرے کی اوٹ میں کھسک جایا کرتے تھے۔ یہ دونوں فریق یہاں آ گئے، تو اجازت طلب کرنا اور اجازت طلب کرنے کے بعد جانا، یہ گویا کمالِ ایمان کی علامت قرار دے دی گئی۔

یہیں مفسرین نے لکھا ہے کہ یہی حکم ہے وقت کے حاکم کا، وقت کے امیر کا، جو بھی مسلمانوں کے معاشرے کے اندر ایسی شخصیت ہو جو منتظم قسم کی ہوا کرتی ہے، اگر وہ قومی ضرورت کے لئے کسی کو بلائے، ورثاء انبیاء کا بھی یہی درجہ ہے اور وقت کے حکام اور اُمراء کا بھی یہی درجہ ہے، کہ اگر قومی ضرورت کے لئے بلائیں تو آنا پڑے گا، اور پھر بغیر اجازت کے کھسکنا نہیں چاہیے، ورنہ اس طرح سے پھر وہ کام درمیان میں رہ جائے گا، پورا نہیں ہو سکے گا۔ تو بلائے ہوئے آ ؤ، اور آنے کے بعد اگر کسی کو ضرورت ہے تو اجازت لے کے جائے، اور ایک دوسرے کے پیچھے اوٹ میں آ کے کھسک جانا اچھی علامت نہیں ہے۔ اس میں وضاحت کی گئی ہے سرورِ کائنات ﷺ کے مقام اور مرتبے کی۔

''لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ'' کے دو مفہوم

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ: اس کا ایک ترجمہ تو یوں ہوگا کہ دعاء مصدر ہے اور رسول کی طرف اس کی اضافت، مصدر کی اضافت فاعل کی طرف ہے، اسی کے مطابق میں نے آپ کے سامنے تقریر کی، رسول کے بلانے کو آپس میں ایسے نہ بنایا کرو جس

طرح تم میں سے بعض کا بعض کو بلانا ہے، یعنی رسول تمہیں بلائے تو تم ایسے نہ سمجھا کرو جیسے تم ایک دوسرے کو بلا لیتے ہو کہ مرضی آؤ، مرضی نہ آؤ، بلکہ رسول کے بلانے پہ آنا ضروری ہے۔ تو یہاں بلانے والا رسول ہوا، اور دعاء مصدر کی اضافت فاعل کی طرف ہوگئی۔ ترجمہ اس طرح سے ہوا "نہ کیا کرو تم رسول کے بلانے کو آپس میں مثل بلانے بعض کے بعض کو۔"

اور دُوسرا ترجمہ بھی کیا گیا ہے کہ دعاء مصدر ہے، اور اس کی اضافت رسول کی طرف یہ اضافت الی المفعول ہے، یعنی جب تمہیں نوبت آئے کہ تم اللہ کے رسول کو بلاؤ (اب بلانے والے تم ہو، اور اللہ کا رسول مدعو ہے) تو اللہ کے رسول کو تمہارا بلانا ایسا نہیں ہونا چاہیے جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہو۔ ہم آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہیں تو بے تکلفی کے ساتھ اس کا نام لے کر تڑاخ تڑاخ آواز دینا شروع کر دیتے ہیں، اللہ کے رسول کو اگر بلانے کی نوبت آ جائے تو ادب سے بولا کرو، دھیمی آواز سے بولا کرو، آواز زیادہ اونچی نہ کیا کرو، اس میں شوخی اور گستاخی کا شائبہ نہیں ہونا چاہیے، جس طرح سے سورۂ حجرات میں آپ کے سامنے آئے گا: وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ، اللہ کے رسول کے لئے تم جہر کے ساتھ نہ بولا کرو، جس طرح تم ایک دوسرے کے سامنے تڑاخ تڑاخ بولتے ہو، اللہ کے رسول کے سامنے ایسا نہ بولا کرو، اپنی آواز کو پست رکھا کرو، جو لوگ اللہ کے رسول کے سامنے اپنی آواز کو پست رکھتے ہیں انہی لوگوں کے دل ایمان والے ہیں، سورت حجرات میں تفصیل آئے گی، وہاں یہ آداب ذکر کیے جائیں گے کہ اگر اللہ کا رسول گھر میں موجود ہو تو باہر سے آواز نہ دیا کرو، بلکہ انتظار میں رہا کرو، جس وقت وہ خود باہر تشریف آئیں اس وقت بات کیا کرو، اور جو حجرات کے باہر کھڑے ہو کے آوازیں دینے لگ جاتے ہیں یہ بے عقل لوگ ہیں، سورت حجرات میں تفصیل آئے گی۔ تو پھر دوسرے ترجمے کے مطابق اس میں یہ ادب بتایا گیا کہ آپس میں جس طرح تم ایک دوسرے کو آوازیں دینے لگ جاتے ہو، اللہ کے رسول کو اس طرح آواز نہ دیا کرو۔ تم ایک دوسرے کو نام لے کر بلاتے ہو یا عمر، یا عثمان، اللہ کے رسول کو "یا محمد!" کہہ کے نہ بلاؤ، "یا رسول اللہ!"، "یا نبی اللہ!" اس طرح سے کسی لقب کے ساتھ خطاب کرنا چاہیے، نام لے کر خطاب نہیں کرنا چاہیے۔ بہرحال لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ میں یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ مصدر کی اضافت مفعول کی طرف ہے، یعنی رسول کو تمہارا بلانا ایسا نہیں ہونا چاہیے جس طرح تم ایک دوسرے کو بلاتے ہو۔

"یا محمد" کہنا، یا دیواروں پر لکھنا

تو یہاں "یا محمد" کہہ کر بلانے کی ممانعت ہوگئی، ادب کے ساتھ بلایا جائے، یا رسول اللہ! کہو، یا نبی اللہ! کہو، اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جو دیواروں پر "یا محمد" لکھ دیتے ہیں، یہ بھی ادب نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کو "یا محمد" کا لفظ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زبان پر پسند نہیں آیا اور اس کو ادب کے خلاف قرار دیا گیا، تو دیواروں پر لکھا ہوا کس طرح سے پسند آ سکتا ہے؟ اس لئے یہ نظموں والے نعتوں والے، یہ شاعر اکثر "یا محمد، یا محمد" اس قسم کے لفظ جو بولنے لگ جایا کرتے ہیں یہ مناسب نہیں۔ خطاب کی صورت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نہیں لینا چاہیے، بلکہ "یا رسول اللہ!"، "یا نبی اللہ!" اس قسم کے لفظوں کے ساتھ خطاب کرنا چاہیے......

جب مصدر کی اضافت مفعول کی طرف ہو تو یہ ترجمہ ہو جائے گا" نہ بناؤ تم اللہ کے رسول کے بلانے کو" اور مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ کے رسول کو تم بلاؤ تو تمہارا بلانا ایسے طور پر نہیں ہونا چاہیے جس طرح سے تم میں سے بعض بعض کو بلاتے ہیں۔

منافقین کو تنبیہ

قَدْ یَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ یَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا: تَسَلُّل: کھسک جانا۔ اصل میں یہ لفظ سَلّ سے لیا گیا ہے سلّ السیف: آہستہ آہستہ نیام سے تلوار کو کھسکانا، تلوار کو جو نیام سے نکالا جاتا ہے اور کھینچا جاتا ہے تو اس کو سلّ کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں، اور تسلل کا معنی ہوگا آہستہ آہستہ کھسک جانا۔ اور لِوَاذًا یہ لفظ لَاذَ یَلُوْذُ مجرد سے آتا ہے، اَلُوذُ، اَعُوذُ کے معنی میں، کسی کی پناہ لے لینا، کسی کی اوٹ میں آ جانا، لَاذَ بِالشَّجَرِ، درخت کی اوٹ میں آ گیا، تو لِوَاذًا یہ باب مفاعلہ ہو گیا، لَاوَذَ، مُلَاوَذَةً ایک دوسرے کی اوٹ میں آ جانا۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے ان لوگوں کو جو تم میں سے ایک دوسرے کی اوٹ لے کر کھسک جاتے ہیں۔ یَتَسَلَّلُوْنَ: کھسک جاتے ہیں۔ لِوَاذًا اَیْ مُلَاوِذِیْنَ۔ ایک دوسرے کی اوٹ لیتے ہوئے جو لوگ تم میں سے کھسک جاتے ہیں اللہ انہیں جانتا ہے۔ اب یہ لوگ بھی معلوم تھے جیسے میں نے آپ کے سامنے بارہا عرض کیا کہ قرآنِ کریم کی ضمیریں لوٹانے میں ہمیں تو اِشکال ہوتا ہے کہ یہ ضمیر کدھر لوٹ رہی ہے، لیکن جس معاشرے میں یہ آیات اُتر رہی ہیں، تو لوگوں کو پتا ہوتا ہے کہ اس قسم کے کون سے لوگ ہیں، بغیر اجازت کون نہیں جاتے، شوق سے کون آتے ہیں، شوق سے کون کام کرتے ہیں وہ بھی معلوم ہوتے ہیں، اور جن کی عادت ہے کہ اوّل تو آتے نہیں، اگر آتے ہیں تو آہستہ آہستہ کھسک جاتے ہیں تو وہ بھی لوگوں کو معلوم ہوتے ہیں، تو اس میں ان کی مذمّت ہو جائے گی۔

فَلْیَحْذَرِ الَّذِیْنَ یُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖ: ڈرنا چاہیے ان لوگوں کو جو حضور ﷺ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں۔ فَلْیَحْذَرِ امر کا صیغہ ہے۔ ڈرنا چاہیے ان لوگوں کو۔ مخالفت کا صلہ یہاں "عن" آ گیا، اس لئے مخالفت میں یہاں فِرار والا معنی ہے، جو اللہ کے رسول کے حکم کی مخالفت کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں، بھاگ جاتے ہیں، انہیں ڈرنا چاہیے اس بات سے کہ اَنْ تُصِیْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ یُصِیْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ انہیں کوئی فتنہ پیش آ جائے یا ان کو کوئی دردناک عذاب پہنچ جائے۔ یعنی کسی خرابی میں یہ پڑ جائیں، کسی فتنے میں پڑ جائیں، اسی مخالفت کے اندیشے میں ان کے دِلوں کی حالت خراب ہو جائے، فتنے میں سب داخل ہو سکتا ہے۔ یا پہنچ جائے ان کو عذابِ الیم ...... اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: خبردار! اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے، قَدْ یَعْلَمُ مَاۤ اَنْتُمْ عَلَیْهِ: اللہ تعالیٰ جانتا ہے ہر اس حال کو جس پر تم ہو، وَیَوْمَ یُرْجَعُوْنَ اِلَیْهِ: اور جس دِن یہ لوگ لوٹائے جائیں گے اللہ کی طرف فَیُنَبِّئُهُمْ پھر اللہ تعالیٰ ان کو خبر دے گا بِمَا عَمِلُوْا، ان کاموں کی جو یہ کرتے ہیں، وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ: اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والے ہیں ...... سورت میں بہت سارے اَحکام ذِکر کیے گئے تھے تو آخر میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ملکیت ذِکر کر دی، اپنی صفتِ علم ذِکر کر دی، کیونکہ انہی چیزوں کو مدِنظر رکھنے سے اللہ تعالیٰ کے اَحکام پر عمل کرنا آسان ہوتا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ
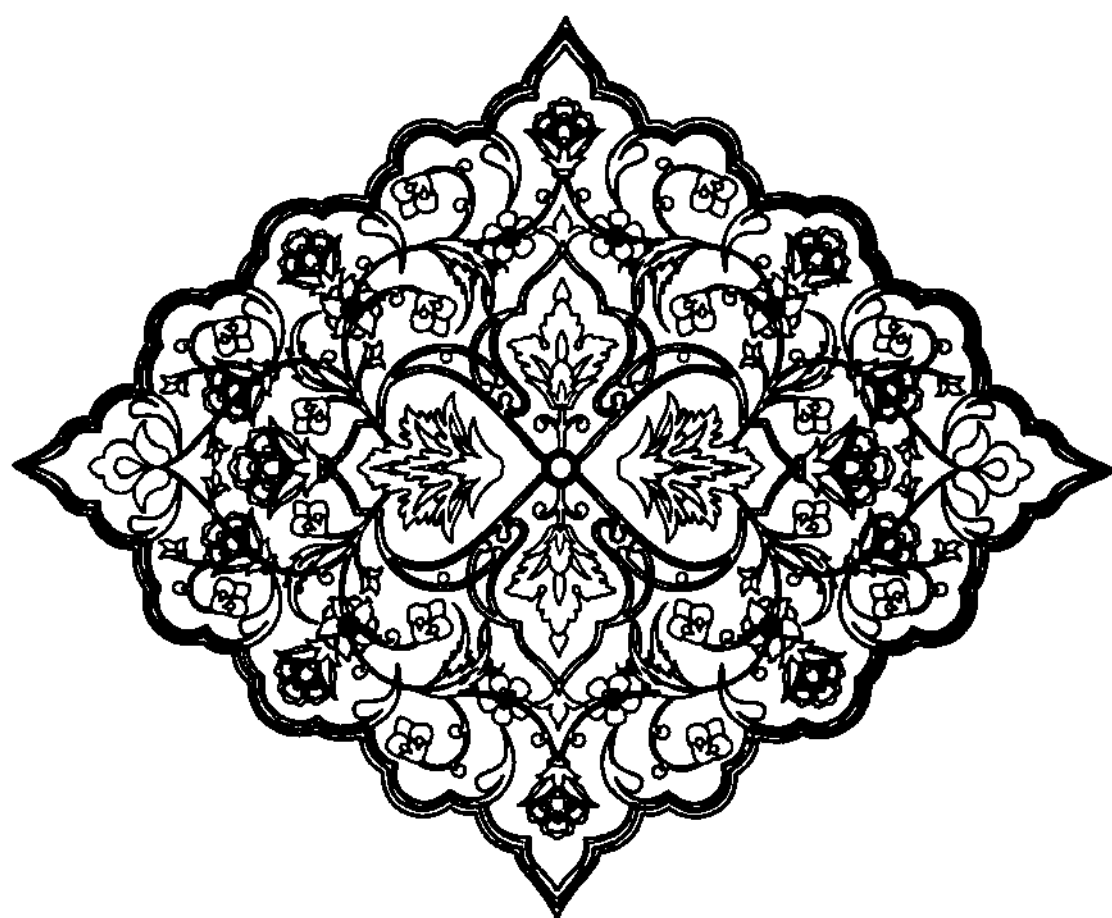
سورة الفرقان

آیاتها ۷۷ ۲۵ سورۃ الفرقان مکیۃ ۴۲ رکوعاتها ۶

سورۂ فرقان مکہ میں نازل ہوئی، اس میں ستتر (۷۷) آیتیں اور چھ رکوع ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۝۱ الَّذِيْ لَهٗ

برکت والا ہے وہ جس نے اُتارا فرقان کو اپنے بندے پر تاکہ ہو جائے وہ بندہ تمام جہانوں کے لئے ڈرانے والا ① جس کے لئے

مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ

سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی اور نہیں اختیار کی اس نے اولاد، اور نہیں ہے اس کے لئے کوئی شریک سلطنت میں

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ۝۲ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ

اور پیدا کیا اس نے ہر شئی کو پھر اس کا اندازہ کیا ایک خاص اندازہ کرنا ② اختیار کئے ان لوگوں نے اس اللہ کے علاوہ اور معبود، نہیں پیدا کر سکتے

شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا

وہ کسی شئی کو اور وہ خود پیدا کئے جاتے ہیں، اور وہ اپنے نفسوں کے لئے نفع نقصان کا اختیار نہیں رکھتے، اور نہیں اختیار رکھتے وہ موت کا،

وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ۝۳ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ِۨافْتَرٰىهُ

نہ زندگی کا اور نہ دوبارہ جی اُٹھنے کا ③ اور کہتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کہ نہیں ہے یہ قرآن مگر جھوٹ، گھڑ لیا ہے اس رسول نے اس کو

وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ۝۴ وَقَالُوْٓا

اور مدد کی ہے اس رسول کی اس قرآن کے بنانے پر کچھ اور لوگوں نے، پس تحقیق انہوں نے ظلم اور جھوٹ کا ارتکاب کیا ④ اور یہ لوگ کہتے ہیں

اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى

کہ یہ تو پہلے لوگوں کی حکایتیں ہیں جو منقول چلی آرہی ہیں، اس بندے نے ان حکایات کو لکھوا لیا ہے، اور اور پس وہی حکایتیں پڑھی جاتی ہیں

عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝۵ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ

اس کے سامنے صبح شام ⑤ آپ کہہ دیجئے کہ اُتارا اس قرآن کو اس نے جو آسمانوں میں اور زمین میں چھپی ہوئی چیز کو جانتا ہے، بے شک وہ

غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝٦ وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ لَوْلَآ

بخشنے والا رحم کرنے والا ہے⑥ اور یہ مشرک کہتے ہیں اس رسول کو کیا ہو گیا، کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا ہے، کیوں نہیں

اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۝٧ۙ اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ

اُتارا گیا اس کی طرف فرشتہ پس ہوتا وہ اس کے ساتھ مل کے ڈرانے والا⑦ یا کیوں نہیں ڈالا جاتا اس کی طرف خزانہ یا کیوں نہیں ہوتا

لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ۭ وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۝٨ اُنْظُرْ كَيْفَ

اس کے لئے کوئی باغ، یہ اس سے کھاتا رہتا، اور یہ ظالم کہتے ہیں کہ نہیں پیروی کرتے ہو تم مگر اس آدمی کی جو کہ مخبوط الحواس ہے⑧ دیکھ تو کیسے

ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ۝٩ۧ تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَاۗءَ جَعَلَ

بیان کرتے ہیں تیرے لیے مثالیں، پس وہ بھٹک گئے پس نہیں طاقت رکھتے وہ راستے کی⑨ برکت والا ہے جو اگر چاہے تو بنادے

لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَيَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ۝١٠ بَلْ

تیرے لیے بہتر اس سے جو کچھ یہ کہتے ہیں، یعنی باغات جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں، اور بنادے تیرے لیے محلات⑩ بلکہ

كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ ۣ وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا ۝١١ۚ اِذَا

ان لوگوں نے قیامت کی تکذیب کی، اور ہم نے تیار کیا اس شخص کے لئے جس نے قیامت کو جھٹلایا بھڑکتی ہوئی آگ کو⑪ جس وقت

رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا ۝١٢ وَاِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا

وہ آگ انہیں دیکھے گی دُور کی جگہ سے تو سنیں گے یہ اس جہنم کے لئے جوش وخروش⑫ اور جب ڈال دیے جائیں گے

مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ۝١٣ۭ لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا

اس جہنم سے ایک تنگ جگہ میں اس حال میں کہ وہ جکڑے ہوئے ہوں گے پکاریں گے وہ وہاں ہلاکت کو⑬ آج ایک موت کو نہ پکارو

وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا ۝١٤ قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ

بلکہ پکارو بہت سی ہلاکت کو⑭ آپ انہیں کہہ دیجئے کیا یہ بہتر ہے یا ہمیشگی کا باغ جس کا وعدہ کیے گئے ہیں متقی لوگ

كَانَتْ لَهُمْ جَزَاۗءً وَّمَصِيْرًا ۝١٥ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَاۗءُوْنَ خٰلِدِيْنَ ۭ

وہ باغ ان کے لئے بدلہ ہے اور لوٹنے کی جگہ ہے⑮ ان کے لئے اس باغ میں وہ چیز ہوگی جس کو وہ چاہیں گے، ہمیشہ رہنے والے ہوں گے

كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْـُٔوْلًا ﴿۱۶﴾ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ

یہ تیرے رب کے ذمے وعدہ ہے جو اس قابل ہے کہ مانگا جائے ﴿۱۶﴾ اور جس دن اللہ جمع کرے گا ان کو اور ان چیزوں کو جن کی یہ عبادت کرتے ہیں اللہ

اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰٓؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۱۷﴾ قَالُوْا

کے علاوہ، پھر کہے گا: کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا تھا یا وہ خود ہی راستے سے بھٹک گئے؟ ﴿۱۷﴾ وہ معبود کہیں گے اے اللہ!

سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ

تُو پاک ہے، ہمارے لئے یہ مناسب نہیں تھا کہ ہم تیرے علاوہ کارساز بناتے لیکن تُو نے فائدہ پہنچایا ان کو اور ان کے آباء و اجداد

وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَكَانُوْا قَوْمًۢا بُوْرًا ﴿۱۸﴾ فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ

کو حتّٰی کہ یہ بھول گئے تجھے یاد کرنا، اور یہ لوگ ہلاک ہونے والے ہیں ﴿۱۸﴾ پھر (اللہ کہے گا کہ) ان معبودوں نے تمہاری تکذیب کر دی

بِمَا تَقُوْلُوْنَ ۙ فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا ۚ وَمَنْ يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ

ان باتوں میں جو تم کہتے تھے، پس نہیں طاقت رکھو گے تم عذاب ہٹانے کی اور نہ مدد کرنے کی، اور جس شخص نے تم میں سے ظلم کا ارتکاب کیا ہم

نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيْرًا ﴿۱۹﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ

اسے بڑا عذاب چکھائیں گے ﴿۱۹﴾ نہیں بھیجا ہم نے آپ سے قبل رسولوں کو مگر وہ سارے کے سارے کھانا کھاتے تھے

وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ۗ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ۗ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ﴿۲۰﴾

اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے، اور ہم نے تم میں سے بعض کو بعض کے لئے آزمائش کا ذریعہ بنایا، کیا تم صبر کرتے ہو؟ اور تیرا رب دیکھنے والا ہے ﴿۲۰﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ: تبارک یہ لفظ برکت سے لیا گیا ہے، اور برکت کہتے ہیں "خیرِ کثیر" کو، آپ جو کہا کرتے ہیں کہ "فلاں چیز بڑی بابرکت ہے!" تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس سے ہمیں بہت فائدہ پہنچ رہا ہے، ہمارے لئے خیرِ کثیر کا باعث ہے۔ تَبٰرَكَ الَّذِيْ برکت والا ہے وہ جس نے اُتارا فرقان اپنے بندے پر۔ فرقان سے مراد قرآن کریم ہے، اور فرقان کا معنی ہوتا ہے: فارق بین الحق والباطل، جو حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والا ہے۔ تو ایسی کتاب اُتاری جو حق اور باطل میں فرق کرنے والی ہے اپنے بندے پر۔ "بندے" سے یہاں مراد سرورِ کائنات ﷺ ہیں۔ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا تا کہ ہو جائے وہ بندہ تمام جہانوں کے لئے ڈرانے والا۔ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اس کا تعلق تبارک کے

ساتھ ہے،[1] برکت والا ہے وہ جس کے لئے سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی۔ اور نہیں اختیار کی اس نے اولاد، اور نہیں ہے اس کے لئے کوئی شریک سلطنت میں، اور پیدا کیا اس نے ہر شی کو، فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا پھر اس کا اندازہ کیا ایک خاص اندازہ کرنا۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اختیار کئے ان لوگوں نے اس اللہ کے علاوہ اور معبود۔ اٰلِهَةً اِلٰہ کی جمع ہے۔ لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا نہیں پیدا کرتے وہ آلہہ کسی شے کو۔ وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ اور وہ خود پیدا کئے جاتے ہیں، خود مخلوق ہیں۔ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ اور نہیں وہ اختیار رکھتے اپنے نفسوں کے لئے ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا نقصان دُور ہٹانے کا اور نہ نفع کے حاصل کرنے کا۔ ضَرًّا کے اوپر مضاف محذوف نکلے گا دَفْعَ ضَرٍّ، اور نَفْعًا کے اوپر مضاف محذوف ہوگا جَلْبَ نَفْعٍ (نسفی، مظہری)، نہ وہ اپنے نفسوں کے لئے نقصان دُور ہٹانے کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ نفع کے حاصل کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ ویسے حاصل ترجمہ اس طرح سے بھی ٹھیک ہے کہ اپنے نفسوں کے لیے وہ نفع نقصان کا اختیار نہیں رکھتے۔ وَلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا: اور نہیں اختیار رکھتے وہ، نہیں مالک وہ موت کے، نہ زندگی کے، اور نہ دوبارہ جی اُٹھنے کے، نشور لازم بھی ہوتا ہے، اور اگر متعدی کے طور پر ترجمہ کیا جائے تو پھر معنی یہ ہوگا کہ دوبارہ زندہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتے۔ نہ موت پر ان کا کوئی اختیار ہے، نہ زندگی پر، نہ اپنی پر، نہ پرائی پر، نہ ان کا اپنا مرنا جینا ان کے اختیار میں، نہ کسی دوسرے کی موت وحیات ان کے اختیار میں، اور نہ مرنے کے بعد دوبارہ جی اُٹھنا ان کے اختیار میں، نہ کسی دوسرے کو اُٹھا لینا ان کے اختیار میں۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا: اور کہتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا: اِنْ هٰذَآ: هٰذا کا اشارہ فرقان کی طرف ہے۔ نہیں ہے یہ (یعنی یہ قرآن، یہ فرقان، یہ اُتاری ہوئی چیز، جو اللہ نے اُتاری اپنے بندے پر، جس کو بندہ پڑھ کر سناتا ہے) نہیں ہے یہ مگر جھوٹ، گھڑ لیا اس رسول نے اس کو، وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ: اور مدد کی ہے اس رسول کی اس قرآن کے بنانے پر کچھ اور لوگوں نے، فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا: جاء یجیئ آنا، اور جاء فَعَلَ کے اور اِرتکاب کے معنی میں بھی ہوتا ہے، یہاں یہی ترجمہ کریں گے۔ قد تاکید کے لئے ہے۔ پس تحقیق انہوں نے ظلم اور جھوٹ کا ارتکاب کیا۔ زُور جھوٹ کو کہتے ہیں، ظلم شرک کے معنی میں ہے، گویا کہ یہ اپنے ان نظریات میں مشرک بھی ہیں اور اپنے ان اقوال میں جھوٹے بھی ہیں۔ وَقَالُوْٓا اور یہ لوگ کہتے ہیں اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ: کہ یہ جو کچھ پڑھ کر سنا رہا ہے، جس کے متعلق کہتا ہے کہ اللہ کی کتاب ہے، قرآن ہے، یہ تو پہلے لوگوں کی حکایتیں ہیں جو منقول چلی آرہی ہیں، اساطیر اُسْطُوْرَةٌ کی جمع ہے، اُسْطُوْرَةٌ اس بات کو کہتے ہیں جو منقول ہوتی چلی آرہی ہو۔ اِكْتَتَبَهَا اس بندے نے ان حکایات کو لکھوالیا ہے۔ اِكْتَتَبَ: دوسرے سے کہنا کہ مجھے تُو لکھ دے۔ لکھوالیا ہے اس نے ان حکایتوں کو، فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ پس وہی حکایتیں املا کی جاتی ہیں اس پر۔ ''اِملا'' لکھوانے کو کہتے ہیں، لکھوائی جاتی ہیں اس پر یعنی اس کے سامنے پڑھی جاتی ہیں، اور اس کے سامنے لوگوں کو لکھوائی جاتی ہیں، بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا صبح وشام۔ ''اِملا'' لکھوانے کو کہتے ہیں، اور یہاں تُلْقٰى عَلَيْهِ کے معنی میں بھی آ سکتا ہے کہ وہی حکایات اس پر ڈالی جاتی ہیں صبح وشام، یعنی اس کے سامنے لکھوائی جاتی ہیں پڑھی جاتی ہیں۔ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: آپ کہہ دیجئے کہ اُتارا اس قرآن کو اس نے جو آسمانوں میں اور زمین میں چھپی ہوئی چیز کو جانتا ہے، اِنَّهٗ كَانَ

(1) کیونکہ یہ پہلے الذی سے بدل ہے۔ اور پہلا الذی، تبارک کا فاعل ہے (مظہری وغیرہ)۔

غَفُوْرًا رَّحِیْمًا: بے شک وہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ وَقَالُوْا: اور یہ مشرک کہتے ہیں، مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ؟ اس رسول کو کیا ہوگیا؟ یہ تحقیر کا عنوان ہے۔ اس رسول کو کیا ہوگیا؟ یہ کیسا رسول ہے؟ یَاْكُلُ الطَّعَامَ: کھانا کھاتا ہے، وَیَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ، اور بازاروں میں چلتا ہے۔ اَسواق یہ سُوق کی جمع ہے۔ لَوْلَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مَلَكٌ: کیوں نہیں اُتارا گیا اس کی طرف فرشتہ؟ فَیَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِیْرًا، پس ہوتا وہ اس کے ساتھ مل کے ڈرانے والا۔ اَوْ یُلْقٰۤى اِلَیْهِ كَنْزٌ: یہ بھی ''لَوْلَا'' کے نیچے داخل ہے۔ یا کیوں نہیں ڈالا جاتا اس کی طرف خزانہ، اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ، یا کیوں نہیں ہوتا اس کے لئے کوئی باغ، یَّاْكُلُ مِنْهَا، یہ اس سے کھاتا رہتا۔ وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ، اور یہ ظالم لوگ کہتے ہیں: اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا: تَتَّبِعُوْنَ کا خطاب اہلِ ایمان کو ہے۔ یہ ظالم کہتے ہیں کہ نہیں پیروی کرتے ہو تم مگر اس آدمی کی جو کہ مخبوط الحواس ہے۔ مسحور کا لفظ سِحر سے لیا گیا ہے، سحر کہتے ہیں جادو کو، مسحور کہتے ہیں جس پر جادو کیا گیا ہو۔ مطلب ان کا ہے: مجنون، یعنی کسی نے اس کے اُوپر جادو کر کے اس کی عقل کو خراب کردیا، یہ مخبوط الحواس ہوگیا ہے اس لئے ایسی باتیں کرتا ہے، تو تم ایسے مخبوط الحواس کے پیچھے کیوں لگتے ہو جس کی اپنی عقل ہی ٹھکانے نہیں، اور بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔ اُنْظُرْ كَیْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ: دیکھ تو! کیسے بیان کرتے ہیں تیرے لئے مثالیں؟ فَضَلُّوْا، پس وہ بھٹک گئے، فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ سَبِیْلًا: پس نہیں طاقت رکھتے وہ راستے کی۔ تَبٰرَكَ الَّذِیْۤ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَیْرًا مِّنْ ذٰلِكَ: برکت والا ہے جو اگر چاہے تو بنادے تیرے لئے بہتر اس سے، جو کچھ یہ کہتے ہیں کہ اس کے لئے باغ ہو، تو تیرے لئے اس سے بھی بہتر بنادے، جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ: یعنی باغات جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں، خَیْرًا یہ جَعَلَ کا مفعول ہے اور جَنّٰتٍ اس سے بدل ہے، وَیَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا: اور بنادے تیرے لئے محلات۔ قصور قصر کی جمع ہے۔ بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِیْرًا: بلکہ ان لوگوں نے قیامت کی تکذیب کی۔ وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِیْرًا: اور ہم نے تیار کیا اس شخص کے لئے جس نے قیامت کو جھٹلایا بھڑکتی ہوئی آگ کو، ہم نے بھڑکتی ہوئی آگ تیار کی اس شخص کے لیے جس نے قیامت کی تکذیب کی، سعیر آگ کو کہتے ہیں، اِذَا رَاَتْهُمْ جس وقت وہ آگ انہیں دیکھے گی مِّنْ مَّكَانٍۭ بَعِیْدٍ دُور کی جگہ سے، سَمِعُوْا لَهَا تَغَیُّظًا وَّزَفِیْرًا: تغیُّظ: غصّے میں آنا، اور زفیر: چیخنے چلّانے کو کہتے ہیں۔ جیسے سورۂ ہود (آیت ۱۰۶) میں لفظ آیا تھا: لَهُمْ فِیْهَا زَفِیْرٌ وَّشَهِیْقٌ۔ یہ اصل میں گدھے کی طرح آواز نکالنے کو کہتے ہیں، جیسے گدھا پورا زور لگا کر چیختا چلّاتا ہے، اور تغیُّظ غصّے میں آنے کو کہتے ہیں، دونوں کا حاصل یہ ہے کہ سنیں گے یہ اس جہنم کے لئے جوش وخروش، یہ اس کا حاصل ترجمہ ہوجائے گا، مطلب یہ ہے کہ جیسے ایک چیز غصّے میں آکر بھرتی ہے تو اس کے بھرنے سے بھی ایک آواز پیدا ہوتی ہے۔ جس طرح سے سانپ خراٹے مارتا ہے، تو صوتِ تغیظ مراد ہے، یعنی غصّے اور جوش میں آنے کے ساتھ جو آواز پیدا ہوا کرتی ہے، تو حاصل ترجمہ یہ ہوجائے گا کہ سنیں گے اس کے لئے جوش وخروش، اس کے جوش سے بھی ایک آواز پیدا ہوگی، آپ نے کبھی دیکھا ہوگا، جس وقت آپ تندور کو جلاتے ہیں اور اس میں لکڑی اور ایندھن ڈال دیتے ہیں، وہ پورے جوش کے ساتھ جلتا ہے تو کس طرح آواز پیدا ہوتی ہے، وہی اس کے جوش کی آواز ہوتی ہے، تو یہاں وہی تغیظ مراد ہے۔ وَاِذَاۤ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَیِّقًا: اور جب ڈال دیے جائیں گے یہ لوگ اس جہنم سے ایک تنگ جگہ میں، یعنی خود جہنم تو بہت بڑی ہے جس طرح سے جیل بڑی ہوتی ہے، لیکن جس قیدی کو سزا دینی مقصود ہوتی ہے اس کو ایک تنگ کوٹھڑی میں ڈال دیتے ہیں، تو یہاں مکانِ ضیق سے وہی جہنم

کی تنگ کوٹھڑی مراد ہے، بذاتِ خود جہنم بہت فراخ ہے، لیکن ہر کافر اور مشرک کے لئے وہاں تنگ کوٹھڑی ہوگی، جس وقت ڈال دیے جائیں گے وہ اس جہنم سے تنگ مکان میں، مُقَرَّنِیْنَ، اس حال میں کہ وہ جکڑے ہوئے ہوں گے، دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا: پکاریں گے وہ وہاں ہلاکت کو، موت کو پکاریں گے، موت کی دہائیاں دیں گے، ہائے! ہم مرجائیں، ہائے ہمیں موت ہی آجائے۔ لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا: لَا تَدْعُوا سے پہلے ''يُقَالُ'' محذوف نکالا جائے گا۔ انہیں کہا جائے گا کہ آج ایک موت کو نہ پکارو، وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا: بلکہ پکارو بہت سی ہلاکت کو، بہت سی موت کو۔ قُلْ: آپ انہیں کہہ دیجئے اَذٰلِكَ خَيْرٌ: یہ مصیبت جس کی نشاندہی کی گئی ہے، کیا یہ بہتر ہے، اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ، یا ہمیشگی کا باغ، الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ، جس کا وعدہ کیے گئے ہیں متقی لوگ، كَانَتْ لَهُمْ جَزَآءً وَّمَصِيْرًا: وہ باغ ان کے لئے بدلہ ہے، اور لوٹنے کی جگہ ہے، لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ: ان متقی لوگوں کے لئے اس باغ میں وہ چیز ہوگی جس کو وہ چاہیں گے، خٰلِدِيْنَ ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا: یہ تیرے رَبّ کے ذِمے وعدہ ہے، مَّسْئُوْلًا، جس کے متعلق سوال کیا جائے گا، اللہ سے یہ وعدہ پورا کرنے کے لئے کہا جائے گا، جو مانگنے کے قابل ہے، جس کے متعلق سوال کرنا چاہیے، یہ وعدہ مسئول ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم کے ساتھ یہ وعدہ کیا، اور اپنے فضل وکرم کے ساتھ ہی اپنے آپ کو اس وعدے کا مسئول ٹھہرایا کہ تم مجھ سے مانگو، جو میں نے تم سے وعدہ کیا ہے اس کا سوال کرو کہ وعدہ پورا کردوں، جیسے کہ آل عمران کے آخری رکوع میں الفاظ آئے تھے: رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ، اے اللہ! تُو دے دے ہمیں وہ چیز جس کا تُو نے ہم سے وعدہ کیا ہے اپنے رسولوں کی زبان پر۔ یہی اس کے مسئول ہونے کا مطلب ہے، اللہ سے سوال کرو کہ اللہ اس وعدے کو تمہارے لیے پورا کردے، اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا، یہ وعدہ مسئول ہے، جس کے متعلق سوال کیا جائے گا، جو اس قابل ہے کہ مانگا جائے، اس کے متعلق سوال کیا جائے۔ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ، اور جس دن کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو جمع کرے گا، وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ، اور ان چیزوں کو جمع کرے گا جن کی یہ عبادت کرتے ہیں اللہ کے علاوہ، فَيَقُوْلُ: پھر اللہ تعالیٰ کہے گا ان معبودوں کو خطاب کر کے، ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰٓؤُلَآءِ، کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا تھا؟ یہ معبودوں کو خطاب ہے، اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ، یا وہ خود ہی راستے سے بھٹک گئے؟ قَالُوْا: وہ معبود کہیں گے سُبْحٰنَكَ: اے اللہ! تُو تو ہر قسم کے شریک سے پاک ہے! مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ: ہمارے لئے یہ مناسب نہیں تھا کہ ہم تیرے علاوہ کارساز بناتے، ہم کسی اور کو کارساز سمجھتے تیری یہ شان نہیں ہے، تو ہم ان کو کس طرح سے کہہ سکتے تھے کہ ہم کارساز ہیں، یا ہمیں کارساز سمجھو، یہ ہے حاصل اس کا۔ پاک ہے تُو اس بات سے کہ ہم اختیار کرتے تیرے علاوہ کوئی اور کارساز، وَلٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَاٰبَآءَهُمْ، لیکن تُو نے انہیں فائدہ پہنچایا اور ان کے آباؤ اجداد کو، اتنا فائدہ پہنچایا، اتنا خوش حال کیا، حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ: کہ یہ تیری یاد ہی بھول گئے، بھول گئے تجھے یاد کرنا، نَسُوا الذِّكْرَ، نصیحت کو بھول گئے، تجھے یاد کرنا بھول گئے، یعنی چاہیے تو یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ عیش وعشرت میں مبتلا ہو کے شکر ادا کرتے، لیکن یہ عیش وعشرت ان کے لئے تجھ سے غفلت کا باعث بن گئی، وَكَانُوْا قَوْمًا ۢبُوْرًا: بُوْرًا یہ بائر کی جمع ہے (نسفی)، بَارَ، يَبُوْرُ: ہلاک ہونا۔ اور یہ لوگ ہلاک ہونے والے ہیں، دوسری جگہ ہے يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ (سورۂ فاطر: ۲۹) ایسی تجارت جو کبھی ٹوٹے میں نہیں جائے گی، گھاٹے میں نہیں جائے گی، برباد نہیں ہوگی۔ فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ، پھر اللہ تعالیٰ کہے گا کہ ان معبودوں نے تمہاری تکذیب کردی، بِمَا تَقُوْلُوْنَ ان باتوں میں جو تم کہتے تھے،

فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا: پس نہیں طاقت رکھو گے تم صرف کی اور نہ نصر کی، صرف کا معنیٰ اپنے آپ سے عذاب پھیر دینا، نصر کا معنیٰ مدد کرنا، نہ تم عذاب کو ہٹانے کی طاقت رکھتے ہو اور نہ ہی ایک دوسرے کی مدد کرنے کی طاقت رکھتے ہو۔ وَمَنْ يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ: اور جس شخص نے تم میں سے ظلم کا ارتکاب کیا، ظلم سے مراد شرک ہے، نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيْرًا: ہم انہیں بڑا عذاب چکھائیں گے۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ: نہیں بھیجا ہم نے آپ سے قبل رسولوں کو، اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ: مگر وہ سارے کے سارے کھانا کھاتے تھے، وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ: اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے، وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً: اور ہم نے تم میں سے بعض کو بعض کے لئے آزمائش کا ذریعہ بنایا۔ فتنہ آزمائش کو کہتے ہیں، اَتَصْبِرُوْنَ کیا تم صبر کرتے ہو؟ یعنی تمہیں صبر کرنا چاہیے، وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا: اور تیرا رب دیکھنے والا ہے۔

تفسیر

''مکی'' سورتوں کے مضامین

یہ سورۂ فرقان ''مکی'' ہے، اور بارہا آپ کی خدمت میں عرض کیا جاچکا کہ ''مکی'' سورتوں میں اُصول کا ذکر ہوتا ہے، فروعی اَحکام نہیں ہوتے، اور اُصول میں اِثباتِ توحید، اِثباتِ رسالت، اِثباتِ معاد یہ تین چیزیں ہیں، اور ان کے ساتھ مناسبت رکھتے ہوئے رَدِّ شرک، اور رسالت کے متعلق ان کے جو شبہات تھے ان کا جواب، اور معاد کے متعلق جو شبہات تھے ان کا جواب بھی دیا جاتا ہے۔ ترجمے سے آپ کو معلوم ہوگیا کہ ان آیات میں بھی یہی مضامین ہیں۔

''عبدیت'' بہت اعلیٰ مقام ہے

سب سے پہلے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی ذات کو بابرکت ٹھہرایا کہ خیرِ کثیر کا منبع وہی ہے، جو بھلائی بھی کسی کو حاصل ہوتی ہے اسی کی ذات سے حاصل ہوتی ہے، اور یہ بندوں کو بھلائی پہنچانے کی ایک صورت ہے کہ حق اور باطل کے درمیان امتیاز کرنے والی چیز اس نے اُتاردی، اور اپنے ایک خاص بندے پر اُتاری۔ متعدّد آیات میں اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کے اُتارنے کا ذکر کیا تو سرورِ کائنات ﷺ کو ''عبد'' کے عنوان سے ذکر فرمایا، وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا، (سورۂ بقرہ: ۲۳)[1] جس سے معلوم ہوگیا کہ ''عبدیت'' ہی ایک اعلیٰ مقام ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیض حاصل ہوتا ہے، سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ (پ ۱۵) پاک ہے وہ جو لے گیا اپنے بندے کو۔ معراج والا کمال عطا کیا تو وہاں بھی ''عبد'' کے ساتھ ہی تذکرہ فرمایا، قرآنِ کریم کا کمال عطا کیا تو اس کو بھی ''عبد'' کے ساتھ ہی ذکر فرمایا۔ ''اپنے بندے کو لے گیا'' تو اللہ تعالیٰ کا بندہ ہونا یہ بہت بڑا کمال ہے۔

---

(۱) وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ (الانفال: ۴۱)، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ (الکہف)، فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى (النجم: ۱۰)، هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ (الحدید: ۹)۔

سَرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تعریف کی حدود

اس لئے سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ میری ایسے طور پر تعریف نہ کیجیو، جس طرح سے عیسائیوں نے ابنِ مریم کی تعریف کی تھی: ''لَا تُطْرُوْنِیْ کَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰی ابْنَ مَرْیَمَ. اِنَّمَا اَنَا عَبْدُہٗ فَقُوْلُوْا عَبْدُاللہِ وَرَسُوْلُہٗ ''(1) میں تو اللہ کا بندہ ہوں، میری ایسی تعریف نہ کرنا کہ مجھے حد سے بڑھا کے تم مجھے اُلوہیت میں لے جانا، پس یہ کہا کرو کہ میں اللہ کا بندہ بھی ہوں اور اس کا رسول بھی ہوں۔ یہ تعریف کرنے کی دو حدیں متعین کردیں رسول اللہ ﷺ نے کہ حد اس طرح ہے تعریف کرنے کی کہ نہ تو ایسی کوئی بات کہو جو ''عبدیت'' کے منافی ہے اور اُلوہیت کی طرف لے جانے والی ہو، اور نہ کوئی ایسی بات کہو جو ''شانِ رسالت'' کے منافی ہو، ان دونوں باتوں کی رعایت رکھو۔ دونوں کی رعایت رکھنے کے بعد آپ جو چاہیں سرورِ کائنات ﷺ کی تعریف کرسکتے ہیں، ''عبدیت'' اور ''رِسالت'' کے منافی کوئی بات منسوب نہیں کرنی چاہیے..... اور اُتارا اس لئے تاکہ تمام جہانوں کے لئے ڈرانے والا ہوجائے، جس سے معلوم ہوگیا کہ سرورِ کائنات ﷺ کی نبوّت، رِسالت کسی ایک طبقے یا کسی ایک مُلک سے تعلق نہیں رکھتی، بلکہ آپ ﷺ تمام جہانوں کے لیے رسول ہیں۔

''توحید'' کا تذکرہ اور صفاتِ اِلٰہیہ: ''خلق'' اور ''تقدیر''

آگے پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی یہی صفت ذکر فرمائی کہ زمین و آسمان کی سلطنت اسی کے لیے ہے اور وہ اس سلطنت میں وحدہٗ لاشریک ہے، اسی کا قبضہ ہے، کوئی دوسرا اس کے ساتھ شریک نہیں، نہ تو اس کی کوئی اولاد ہے، کہ جس طرح سے انسان کی اولاد بھی اس مملکت کے اندر کچھ نہ کچھ اختیار رکھا کرتی ہے، یا کم از کم اپنے باپ سے کوئی بات منوا ہی لیتی ہے، تو اللہ تعالیٰ کی اولاد بھی کوئی نہیں، اور برابر کا دوسرا کوئی شریک بھی نہیں، وہی اکیلا خالق ہے، اور پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ وہی ہر چیز کے متعلق صحیح اندازہ کرنے والا ہے کہ یہ چیز کیسی ہونی چاہیے، اس میں کیسی کیسی حکمتیں ہونی چاہئیں، جس مقصد کے لئے اس کو بنایا جارہا ہے اس مقصد کے لئے اس کی صورت اس کی شکل اس کی اِستعداد کیسی مناسب ہے، ہر چیز کا مناسب اندازہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ''خلق'' کا مفہوم تو یہ ہے کہ کسی معدوم کو موجود کردیا، اور ''تقدیر'' کا مطلب یہ ہے کہ پھر اس میں ہر چیز کی مناسبت کی رعایت رکھی کہ جس مقصد کے لیے اس کو بنایا جارہا ہے، اس مقصد کے لیے اس کی صورت کیسی موزوں ہے، اس کی صلاحیتیں کیسی ہونی چاہئیں، اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا اندازہ کیا۔

''نفع نقصان'' اور ''موت حیات'' اللہ کے علاوہ کسی کے اختیار میں نہیں!

تو ان آیات میں رسالت کا ذکر بھی آگیا، اور دلیلِ رسالت یہی قرآنِ کریم کا نزول ہوگیا، اور توحید کا تذکرہ بھی آگیا..... آگے مشرکین کے اُوپر رَدّ ہے کہ ان مشرکوں نے اللہ کے علاوہ اور معبود بنالیے، ان میں خالق کوئی نہیں، پیدا کرنے کی صلاحیت کسی میں نہیں، بلکہ اُلٹا ان میں نقص ہے کہ وہ مخلوق ہیں، جب خالق نہیں بلکہ مخلوق ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کے شریک کس طرح

---

(1) بخاری ۱/ ۴۹۰ باب واذکر فی الکتاب مریم۔ مشکوۃ ۲/ ۴۱۷، باب المفاخرۃ

سے ہو گئے؟ اور وہ آلہہ کس طرح سے ہو گئے؟ پھر اللہ تعالیٰ تو (تبارک کے لفظ میں جس طرح سے ذکر ہوا) ہر قسم کی خیر کا مالک ہے، ہر قسم کے اختیارات اور تصرفات اس کو حاصل ہیں، جن کو یہ معبود بنائے بیٹھے ہیں وہ تو اپنے نفسوں کے لئے بھی نفع نقصان کا اختیار نہیں رکھتے، کسی دوسرے کے لئے تو کیا ہوگا؟...... جیسے کہ سرورِ کائنات ﷺ سے خود اعلان کروایا گیا، سورۂ یونس میں بھی ہے، اور دُوسری جگہ بھی مذکور ہے: قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ[1] کہ میں تو اپنے نفس کے لئے بھی نفع نقصان کا اختیار نہیں رکھتا سوائے اس کے جو اللہ چاہے، یعنی جتنا اللہ کی طرف سے مجھے حاصل ہو، اتنا ہی حاصل ہوتا ہے، میں اپنی ذات کے لیے بھی نفع نقصان کا اللہ کی مشیت کے بغیر کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ تو اسی طرح یہاں فرمایا کہ یہ بھی اپنے نفسوں کے لیے نفع نقصان کا اختیار نہیں رکھتے، نہ یہ موت وحیات کے مالک ہیں، نہ جی اُٹھنے کے مالک ہیں، موت وحیات اپنی بھی ان کے اپنے اختیار میں نہیں، اللہ نے پیدا کیا تو پیدا ہو گئے، اللہ نے مار دیا تو مر گئے، اور اسی طرح دوبارہ زندہ ہونا بھی ان کے اختیار میں نہیں، ایسے ہی ان کے لئے کسی دوسرے کی موت حیات پہ کوئی اختیار نہیں ہے کہ جس کو چاہیں مار دیں جس کو چاہیں زندہ کر دیں، جس کو چاہیں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر کے اٹھا دیں، کسی کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے، تو پھر ان میں اُلوہیت کس طرح سے ہوئی، اور ان کو الٰہ کس طرح سے قرار دے دیا گیا؟ جس طرح تم اللہ کے محتاج ہو اسی طرح یہ بھی ہر معاملے میں اللہ کے محتاج ہیں۔ تو یہ رَدِّ شرک ہو گیا۔

قرآنِ کریم کے متعلق مشرکین کے اِعتراضات اور جوابات

آگے قرآنِ کریم کے متعلق وہ جو بکتے تھے اور بُرے بُرے لفظ بولتے تھے اس کا حاصل ہے۔ کافر کہتے ہیں کہ یہ قرآن نہیں ہے مگر جھوٹ جس کو اس نے گھڑ لیا ہے، یعنی صرف ایک جھوٹ ہے جس کو اس نے بنا لیا ہے، اب جب وہ سرورِ کائنات ﷺ کی طرف اس بات کی نسبت کرتے کہ یہ اس نے بنایا ہے تو پھر ان کو خود بخود اشکال ہوتا، ان کے ضمیر ان کے سامنے ایک بات لاتے کہ اس میں تو گزشتہ اُمتوں کے بڑے حالات اور پھر صحیح حالات، اور انبیاء ﷺ کے تذکرے بھی آ گئے ہیں، اور یہ محمد (ﷺ) جو اس بات کو ہمارے سامنے پیش کرنے والے ہیں یہ تو نہ تو پڑھے نہ لکھے، نہ کسی علمی مجلس میں رہے، تو ایسا آدمی اُمّی، اَن پڑھ، جو کسی علمی ماحول میں بھی نہیں رہا، وہ ایسی باتیں خود کیسے بنا سکتا ہے؟ تو اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لئے ساتھ یہ شوشہ چھوڑ دیا کہ کچھ اور لوگ بھی اس کتاب کے بنانے میں اس کے مددگار ہیں، معلومات وہ دیتے ہیں اور یہ اچھے اچھے الفاظ میں ان کو بیان کر دیتا ہے۔ اب وہ دوسرے لوگ کون تھے؟ ہوسکتا ہے کہ مکہ معظمہ کے اندر اہلِ کتاب میں سے بعض لوگ ہوں، یا بعض غلام تھے جو حضور ﷺ پر ایمان لائے، یا آپ کے ساتھ مانوس ہو گئے، یا جن کے ساتھ آپ کا ملنا جلنا تھا، کہتے تھے کہ یہ سب اکٹھے ہو کے مل ملا کے ایسا کرتے ہیں۔ حالانکہ ان جاہلوں کو یہ پتا ہونا چاہیے کہ جہاں تک سرورِ کائنات ﷺ کا تعلق ہے تو آپ اُمّی ہیں، اور پہلے آپ کوئی خطیب نہیں رہے، کوئی لچھے دار تقریر کرنے کی عادت نہیں تھی، اور تم بڑے بڑے خطیب اور بڑے فصیح وبلیغ ہو۔ اور جس قسم کے یار دوست ان کے ہیں، اس سے بڑھ کے تمہارے ہیں، جتنے وسائل اِن کو حاصل ہیں، ان سے بڑھ کے وسائل تمہیں بھی حاصل

---

(۱) سورۂ یونس: ۴۹۔ نیز: قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا (سورۃ الجن: ۲۱)، قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ (سورۃ الاعراف: ۱۸۸)۔

ہیں، تو تم ان لوگوں کے ساتھ مل ملا کے ان سے مدد حاصل کر کے تم ایسی کتاب کیوں نہیں بنا لیتے؟ جیسے کہتے ہیں کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے جس کے ساتھ وہ چلے، بات بنتی ہے آگے چلتی نہیں، اگر ان کو کچھ معاون مل گئے اور انہوں نے معاونوں اور مددگاروں کے ساتھ مل کر یہ کتاب بنالی، تو قرآن تو کہتا ہے کہ تم سارے جن و انس اکٹھے ہو جاؤ، تمہیں وہ اسباب بھی حاصل ہیں، تمہارے یار دوست بھی ہیں تو تم ان کے ساتھ مل کر یہ کام کیوں نہیں کر لیتے؟ یہ جو انہوں نے کہا: اَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ تو یہ بہت ظلم اور زُور کا انہوں نے ارتکاب کیا، اپنے نظریات میں ظالم ہیں، مشرک ہیں، اور اپنے اس قول کے اندر بالکل جھوٹے ہیں...... اور کہتے ہیں کہ یہ پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں جو اس نے لکھوا کے رکھ لیے اور وہی اس کے سامنے صبح شام پڑھے جاتے ہیں، اس کے اوپر ڈالے جاتے ہیں، اس کی مجلس میں لکھوائے جاتے ہیں، اور لوگ ان کو لکھ لکھ کے لے جاتے ہیں، اصل یہ ہے کہ یہی قصے کہانیاں ہیں، اس نے دوسرے لوگوں سے لکھوا کے رکھ لی ہیں۔ آگے اس کا مختصر سا جواب دیا گیا کہ یہ لکھوائی ہوئی حکایات نہیں، لوگوں کی جوڑی ہوئی نہیں، بلکہ اس کو اتارا اس نے جو زمین اور آسمان کے بھیدوں کو جانتا ہے، گویا کہ اس میں ایک بہت جامع اشارہ کر دیا گیا کہ اگر تم اس کتاب کو دیکھو گے تو معلوم ہوگا کہ اس میں تو زمین و آسمان کے ایسے راز کھولے گئے ہیں جن کو اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا جانتا ہی نہیں، اس میں ایسی باتیں بیان کی گئی ہیں جو بھید کے درجے کی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی بندے کے بس میں ہی نہیں کہ ان باتوں کو معلوم کر لے، تو بندے بیٹھ کے جوڑ کے کس طرح سے بیان کر سکتے ہیں۔ اور وہ غفور رحیم ہے کہ اس کی کتاب کے متعلق تم ایسی زبانیں کھولتے ہو، اور اس کے رسول کے متعلق تم ایسی زبان استعمال کرتے ہو، لیکن یہ صرف اس کے غفور رحیم ہونے کی شان ہے جس کی بنا پر وہ تم پہ جلدی گرفت نہیں کرتا۔

مادّہ پرست مشرکین کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر اعتراضات

اور پھر سرورِ کائنات ﷺ کے متعلق وہ کہتے تھے، اس بات کا حاصل یہ ہے کہ اگر اللہ نے کوئی رسول بنا کے بھیجنا تھا تو فرشتے کو کیوں نہ بھیج دیا؟ یہ عجیب رسول ہے، مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ: یہ تعجب کے طور پر ہے، یہ کیسا رسول ہے؟ اس رسول کو کیا ہو گیا کہ یہ کھانا کھاتا ہے؟ اگر اللہ کا رسول ہوتا تو فرشتہ ہوتا جس کو کھانے کی ضرورت ہی نہ ہوتی، اور پھر اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، اپنی ضرورت کی چیز خریدنے کے لیے جیسے حضور ﷺ بازار میں تشریف لے جایا کرتے تھے، تو وہ کہتے تھے کہ یہ کیسا رسول ہے؟ کھاتا ہے اور اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے اس کو بازار میں آنا جانا پڑتا ہے، مطلب یہ تھا کہ یہ خود فرشتہ ہوتا جو ان ضروریات سے مستغنی ہوتا، اس کو کھانے کی ضرورت نہ ہوتی، یا اتنا خوش حال ہوتا کہ اس کو اپنی ضروریات کے لیے خود چلنا پھرنا نہ پڑتا، اس کے ساتھ کوئی فرشتہ آتا جو اس کے ساتھ مل کے لوگوں کو ڈراتا کہ یہ اللہ کا رسول ہے، اگر اس کی بات نہیں مانو گے تو عذاب آجائے گا، یا غیب سے اس کے اوپر کوئی خزانہ ڈالا جاتا جس سے اس کی ضروریات پوری ہوتیں، یا اس کے پاس کوئی باغ ہی ہوتا جس سے یہ کھاتا رہتا، آخر کوئی امتیاز تو اس کو حاصل ہوتا، جس کی بناء پر ہم سمجھتے کہ واقعی یہ اللہ کا رسول ہے، اللہ کا نمائندہ ہے۔ بیٹو! ان سب باتوں میں غور کرو گے تو یہ بات تمہاری سمجھ میں آئے گی کہ وہ مادّہ پرست لوگ تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ

اللہ کا مقبول اور اللہ کا محبوب بندہ وہی ہوسکتا ہے جس کے پاس دنیا کا ساز و سامان کم از کم دوسروں سے زائد ہو، اس کو معاشی خوش حالی حاصل ہو، اور اس معاشی خوش حالی کی بنا پر وہ لوگوں میں ممتاز ہو، جس طرح سے سورۂ زُخرف میں لفظ آئے گا: لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (سورۂ زُخرف: ۳۱) قریتین سے مکہ اور طائف دو شہر مراد ہیں، یہ قرآن ان دونوں شہروں میں سے کسی بڑے آدمی پہ کیوں نہیں اتارا گیا؟ رجل عظیم پہ کیوں نہیں اُتارا گیا؟ رجل عظیم سے مراد ہیں وہاں کے رئیس اور جو بڑے لوگ ہوا کرتے ہیں، مال دار، سرمایہ دار قسم کے، وہ کہتے تھے قرآن آتا تو ایسے آدمی کے پاس آتا جس کے پاس غیب کا کوئی خزانہ ہوتا، باغ ہوتا جس سے کھاتا پیتا، یہ کیا کہ کھانے پینے کی کوئی چیز ہے نہیں، رہنے سہنے کی سہولت حاصل نہیں، ضرورتیں پوری کرنے کے لیے بازاروں میں آنا جانا پڑتا ہے، کبھی روٹی ملتی ہے، کبھی نہیں ملتی، اور کہتا ہے میں اللہ کا رسول ہوں، یعنی یہ فقر و فاقہ کو، مال و دولت نہ ہونے کو دلیل بناتے تھے کہ یہ اللہ کا مقبول بندہ نہیں ہوسکتا۔

دینی فیضان ہمیشہ فاقہ مست اور عیش وعشرت سے دُور رہنے والوں سے آیا ہے

یہی ذہنیت ہمیشہ دنیا میں رہی ہے، دنیادار لوگ عزت اور عظمت اسی کی محسوس کرتے ہیں جس کے پاس دنیا وافر مقدار میں موجود ہو، اور اللہ تعالیٰ کی عادت اس کے برعکس ہے کہ وہ اپنے مقبول بندوں کو دنیا کے اندر ساز و سامان سے تقریباً خالی رکھتا ہے، اور اگر آپ تاریخ اُٹھا کے دیکھیں گے، چاہے قریب کی چاہے دُور کی، لوگوں کو دینی فائدہ انہی شخصیات سے پہنچا ہے جو دنیا کے اندر زیادہ خوش حال اور عیش وعشرت میں مبتلا نہیں ہوتے۔ اور جو لوگ دنیا میں خوش حال ہوتے ہیں، عیش وعشرت میں مبتلا ہوتے ہیں وہ کسی دوسرے کو دینی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ اس لیے اولیاء اللہ جن کی برکت سے ان علاقوں میں ایمان پھیلا، اسلام پھیلا، وہ علماء جنہوں نے اس علم کو محفوظ رکھا اور یہ وراثت آپ تک پہنچائی، سب فقر و فاقہ میں مست لوگ تھے، جنہوں نے کبھی دنیا کی عیش وعشرت کی طرف دھیان نہیں کیا...... ان کی مثال اس طرح سے ہے جس طرح درخت کی جڑ ہوتی ہے، مٹی کے اندر گھس کے، تاریکی کے اندر گھس کے، میلے کچیلے رہ کے ان لوگوں نے مخلوق تک فیض پہنچایا، اور شجرۂ ملّت (ملّت کا درخت) سرسبز ہوا، لوگ اس کے پھولوں کو سونگھتے ہیں، اس کے پھلوں کو دیکھتے ہیں، لیکن یہ معلوم نہیں کہ یہ فیض اس جڑ کا ہے جو مٹی میں ملی ہوئی ہے اور اندھیرے میں گھسی ہوئی ہے...... تو اللہ تعالیٰ کی عادت یہی ہے کہ یہ فیضان انہی لوگوں سے ہوتا ہے، اس لیے انبیاء علیہم السلام کو بھی عموماً اس قسم کے عیش وعشرت سے دُور رکھا جاتا ہے، اور وَرَثۂ انبیاء بھی اکثر و بیشتر اسی طرح سے ہوتے ہیں، اور حقیقت یہی ہے کہ جن کو مال و دولت کے اسباب زیادہ حاصل ہوجائیں، ہر قسم کی عیش وعشرت حاصل ہوجائے، وہ کبھی دِین کی خدمت نہیں کرسکتے اور دِین کا فیض ان سے کبھی نہیں ہوتا، دِین کا فیض انہی سے ہوتا ہے جن کی حالت انبیاء علیہم السلام کی طرح ہو، کہ تھوڑے پہ کفایت کریں، کچھ مل گیا تو کھالیا، نہ ہوا تو کبھی فاقہ بھی برداشت کرنا پڑ جائے تو اللہ تعالیٰ کے سامنے صابر اور شاکر بن کے رہیں، اور عیش وعشرت میں مبتلا نہ ہوں، سادہ سی ان کی زندگی ہو، ان لوگوں سے یہ فیض پہنچتا ہے، اور عیش وعشرت والے لوگ کبھی لوگوں کو دِینی فائدہ نہیں پہنچا سکتے...... اور اُن (مشرکین) کے ذہن میں چونکہ اس مادّیت کی قدر تھی، وہ کہتے تھے کہ رسول اگر ہو تو اس میں اسی قسم کی

ساری مادی شان ہونی چاہیے، جب یہ باتیں ان کو نظر نہیں آتی تھیں اور پھر سرورِ کائنات ﷺ اللہ کے رسول ہونے کا دعویٰ کرتے، تو وہ تکذیب کر دیتے تھے۔

''فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ سَبِیْلًا'' کے دو مفہوم

اُنْظُرْ کَیْفَ ضَرَبُوْا لَکَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ سَبِیْلًا: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آپ دیکھیں! کہ آپ کے لئے کیسی کیسی مثالیں بیان کرتے ہیں، کیسے کیسے عجیب مضمون آپ کے لیے بیان کرتے ہیں، بھٹکے پھرتے ہیں، ان کو راستہ نہیں ملتا...... فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ سَبِیْلًا کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ راستہ نہیں ملتا، گمراہ ہوئے پھرتے ہیں، کیونکہ راستہ ملتا ہے رسول کے وسیلے سے، رسول کی وساطت سے، اور رسول کے متعلق ان کے ایسے عقیدے ہیں، تو یہ سیدھا راستہ کیسے پالیں؟ تو یہ بھٹکتے رہیں گے، ان کو راستہ نہیں مل سکے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف جو ہدایت نصیب ہوتی ہے تو اس ہدایت کے لیے اللہ کی طرف سے واسطہ یہ رجال بنا کرتے ہیں، جو اللہ کے بندے ہوتے ہیں، اور جب کوئی شخص اللہ کے ان بندوں سے تعلق نہیں رکھے گا اور ان کے متعلق اس کی عقیدت صحیح نہیں ہوگی تو اس کو راستہ نہیں ملتا، یہ بھٹکتا ہی رہے گا......اور یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ آپ کے متعلق بھٹکے پھرتے ہیں، ان کو قرار نہیں آتا، کبھی کچھ کہتے ہیں کبھی کچھ کہتے ہیں، یعنی ان کا دل بھی نہیں مانتا کہ جو کچھ آپ کے متعلق کہتے ہیں وہ باتیں صحیح ہیں، کبھی شاعر کہتے ہیں کبھی جادوگر کہتے ہیں کبھی جادو کا مارا ہوا کہتے ہیں، کبھی کچھ کہتے ہیں کبھی کچھ کہتے ہیں، آپ پر چسپاں کرنے کے لئے بھی کوئی صحیح بات ان کو نہیں ملتی، بھٹکے پھرتے ہیں اور آپ پر الزام قائم کرنے کے لئے ان کو کوئی راستہ نہیں ملتا، اس لئے ایک بات پر پکے نہیں رہتے، کبھی کچھ کہہ دیتے ہیں کبھی کچھ کہہ دیتے ہیں۔

انبیاء ﷨ کے ساتھ رُوحانی قوّت ہوا کرتی ہے

باقی رہی یہ بات کہ جو کہتے ہیں باغ ہونا چاہیے، یہ ہونا چاہیے، وہ ہونا چاہیے، اگر اللہ چاہے تو اس سے بھی بہتر آپ کو دے سکتا ہے، یہ تو ایک باغ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ ایسے باغات دے دے جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں، اور تیرے لئے محلات بنا دے، آج کل کے محاورے میں مطلب یہ ہوگا کہ مکان بھی اچھے سے اچھا میسّر آجائے، اور ذریعۂ معاش بھی اچھے سے اچھا میسّر آجائے، ایسا ہوسکتا ہے، لیکن اللہ کی یہ حکمت نہیں ہے۔ دنیا کے اندر انبیاء ﷨ کو اس طرح سے خوش حال کرنا یا اس خوش حال کرنے کے ساتھ لوگوں کے سامنے برتری ثابت کرنا یہ اللہ کی مشیت نہیں ہے، کیونکہ انبیاء ﷨ جس کام کے لئے بھیجے جاتے ہیں اس کام کے ساتھ قوّت رُوحانی ہوا کرتی ہے، اور اللہ کی طرف سے وحی جو آتی ہے، کتاب جو ملتی ہے، یہ اصل دولت ہے جو انبیاء ﷨ کے پاس ہوا کرتی ہے، انبیاء ﷨ کے ہتھیار یہی ہیں۔ پیسوں کی کثرت کے ساتھ، اچھے مکانات کے ساتھ، اچھی جائیداد کے ساتھ، دوسروں کو متاثر کرنا یہ انبیاء ﷨ کا منصب نہیں ہے۔ ورنہ یہ نہیں کہ اللہ دے نہیں سکتا، بلکہ دے سکتا ہے۔

کافر دُنیا کی چمک دمک میں کامیابی سمجھتے ہیں

بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ: ان کے نظریات کی بنیاد، ان باتوں کی بنیاد اس بات پر نہیں کہ یہ حق چاہتے ہیں لیکن حق کی ان کو دلیل نہیں ملتی، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ قیامت کے منکر ہیں، اگر ان کا قیامت پر ایمان ہوتا تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ کامیابی کا مدار دُنیا میں باغات ملنے پر نہیں ہے، یا ناکام آدمی وہ نہیں جس کے پاس دُنیا میں باغات اور محلات نہیں ہیں، بلکہ کامیاب وہ ہے جس کو آخرت میں اللہ تعالیٰ باغات اور محلات دے دے، اگر ان کا آخرت پر ایمان ہوتا تو پھر یہ نیکی اور تقویٰ کی قدر کرتے، چونکہ یہ آخرت کی تکذیب کرتے ہیں اس لئے کامیابی اسی کو سمجھتے ہیں کہ دُنیا میں رہتے ہوئے اچھا کھانے پہننے کو مل جائے۔ بلکہ انہوں نے تکذیب کی قیامت کی، اور تیار کیا ہم نے اس شخص کے لئے جو قیامت کی تکذیب کرے بھڑکتی ہوئی آگ کو، بھڑکتی ہوئی آگ ہم نے اس شخص کے لئے تیار کی، تو یہ لوگ آخرت میں ناکام ہیں، آخرت میں جہنّم کے اندر جائیں گے، دنیا کے اندر چندروزہ اگر ان کو مالی برتری حاصل ہے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

جہنّم میں نہ موت ہوگی نہ زندگی

آگے اس سعیر یعنی بھڑکتی ہوئی آگ کا کچھ تعارف کرا دیا کہ جب وہ آگ انہیں دیکھے گی یعنی ان کے سامنے آئے گی تو اس کا جوش وخروش سنیں گے، اور جب یہ جکڑ کر اس جہنّم میں سے کسی تنگ جگہ میں ڈال دیے جائیں گے تو پھر وہاں یہ ہلاکت کو پکاریں گے، موت کو دعوت دیں گے، پھر کہا جائے گا کہ ایک موت کو نہ پکارو کیونکہ اب مصیبت ایک نہیں ہے، جیسے سورۂ ابراہیم میں آپ کے سامنے گزرا تھا وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ (آیت:۱۷) اس قسم کی مصیبتوں میں مبتلا ہوں گے کہ ہر طرف سے موت کے اسباب ان کو مہیا ہوں گے لیکن مریں گے نہیں، لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيٰى (پارہ ۳۰، سورۂ اعلیٰ) نہ ان کی زندگی زندگی کہلانے کی حق دار ہوگی، نہ ان کو موت آئے گی۔ ایک ہلاکت کو نہ پکارو، بہت ہلاکتوں کو پکارو۔

ہر خواہش کی تکمیل کا محل دُنیا نہیں، جنّت ہے

تو یہ ذکر کر کے ان سے پوچھئے کہ یہ مصیبت بہتر ہے، یا جو نیکوں کو آخرت میں اللہ تعالیٰ ہمیشگی کا باغ دے گا وہ بہتر ہے؟ اس باغ کا متقین سے وعدہ کیا گیا، تو اس کے حصول کا طریقہ بھی بتا دیا کہ اس باغ کو حاصل کرنے کا ذریعہ تقویٰ ہے، اور ان متقین کو بطور جزا کے ملے گا، اور یہ ان کے لئے لوٹنے کی جگہ ہوگا، اور وہاں ان کو ایسی خوش حالی ہوگی کہ جو چاہیں گے اس باغ میں ان کے لئے وہی چیز ہوگی...... دنیا کے اندر رہتے ہوئے کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں جو چاہتا ہوں کر لیتا ہوں، جو چاہتا ہوں ہو جاتا ہے، اور میں اپنی منشا کے مطابق اور اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارتا ہوں، دنیا میں یہ ممکن نہیں ہے، انسان کی بہت ساری خواہشات پوری نہیں ہوتیں، دل چاہتا ہے یوں ہو جائے لیکن اس کے الٹ ہو جاتا ہے، یہ زندگی کہ ہم جو چاہیں وہی ہو جائے اور ہم اپنی مرضی کے مطابق رہیں یہ جنت والی زندگی ہے، جو اللہ تعالیٰ مرنے کے بعد نیکوں کو دے گا، اس لیے اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ

کی ہر خواہش پوری ہو جائے تو اس کا محل دنیا نہیں ہے، اس کا محل آخرت ہے۔ ان کے لئے اس باغ میں ہر وہ چیز ہوگی جس کو وہ چاہیں گے، ہمیشہ رہنے والے ہونگے، اور یہ بات وعدے کے طور پر اللہ نے اپنے ذِمّے لازم کر لی ہے، اور یہ اللہ سے سوال کیا جانا چاہیے، وہ وعدِ مسئول ہے، جیسے رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ (سورۂ آل عمران: ۱۹۴) یہ ہم اللہ سے سوال کرتے ہیں، کہ جو تُو نے اپنے رسولوں کی زبانی ہم سے وعدہ کیا ہے، وہ وعدہ ہمیں دے دے، پورا کردے، مسئول ہونے کا یہی معنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو اس میں اپنے فضل کے ساتھ مسئول ٹھہرایا ہے کہ اللہ سے مانگا جائے کہ تُو نے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کردے۔

قیامت کے دِن مشرکین کے معبودان سے لاتعلق ہو جائیں گے

آگے پھر وہی رَدِّ شرک ہے کہ جس دِن اللہ ان کو جمع کرے گا اور ان کے معبودوں کو جمع کرے گا تو اللہ تعالیٰ معبودوں کو خطاب کر کے پوچھے گا، یہاں سے مراد ملائکہ ہوں گے، انبیاء علیہم السلام ہوں گے، اولیاء ہوں گے، جن کو لوگوں نے اللہ کا شریک ٹھہرایا، اور بے جان چیزیں بُت وغیرہ ان کو بھی اللہ گویائی دے دے تو اس میں بھی کوئی ایسی بات نہیں ہے، تو اللہ تعالیٰ ان سے خطاب کر کے پوچھے گا ان بندوں کو تم نے گمراہ کیا ہے یا خود یہ بھٹکے ہیں؟ تو وہ مقبولین جن کو لوگوں نے اللہ کا شریک ٹھہرایا، اولیاء اللہ، انبیاء، ملائکہ وہ سارے کہیں گے کہ یا اللہ! ہم تو تیرے علاوہ کسی دوسرے کو کارساز نہیں سمجھتے، تو خود ہم کیسے ان کو کہہ دیتے کہ ہم کارساز ہیں اور ہمیں کارساز سمجھو؟ ہم تو تجھے شرک سے پاک سمجھتے ہیں، اور ہم تیرے علاوہ کسی دوسرے کو کارساز نہیں سمجھتے، جب ہم کسی دوسرے کو کارساز نہیں سمجھتے تو ہم اپنے متعلق ان کو کیسے کہہ دیتے کہ تم ہمیں کارساز سمجھو اور ہم سے مرادیں مانگا کرو؟ ہم نے ایسی بات نہیں کی۔ اصل بات یہ ہے کہ تُو نے ان کو خوش حالی دی اور یہ کھاتے پیتے مست گئے اور ان کو تیری یاد بھول گئی، تجھے یاد کرنا بھول گئے، گویا کہ شکر گزاری کے لئے جو سامان تھا وہی ناشکری کا ذریعہ بن گیا، کھانے پینے اور عیش و عشرت کی وجہ سے انہوں نے تجھے یاد نہیں رکھا، اور یہ ہلاک اور برباد ہونے والے لوگ ہیں۔ جب ان شرکاء کی طرف سے جن کو انہوں نے تجویز کیا ہوگا یہ جواب ملے گا تو پھر اللہ تعالیٰ ان کو کہیں گے کہ لو! جو باتیں تم کہتے تھے تمہارے شرکاء نے تو تمہیں جھوٹا بتلایا، جن کو تم نے آلِہہ بنا رکھا تھا، اپنے اولیاء بنا رکھا تھا، انہوں نے تو تمہاری تکذیب کر دی، اب تمہارا حال یہ ہے کہ نہ تو تم اپنے سے عذاب کو ہٹا سکو گے اور نہ ایک دوسرے کی مدد کر سکو گے، اور تم میں سے جس جس نے شرک کا ارتکاب کیا ہے ہم اس کو عذابِ کبیر چکھائیں گے، اور ہوں گے وہ سارے ہی مشرک، اس میں اشارہ اس بات کی طرف کر دیا کہ اصل کے اعتبار سے عذابِ کبیر شرک کی وجہ سے ہے۔

بازار میں جانا، اور کھانا کھانا منصبِ رِسالت کے منافی نہیں

آگے اس شبہ کا جواب دیا جو وہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہتے تھے کہ یہ کیسا رسول ہے؟ بازاروں میں چلتا پھرتا ہے اور کھاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان جاہلوں کو یہ پتا نہیں؟ کہ رسالت اور بشریت میں کوئی منافات نہیں، رسول بشر ہوتا ہے اور اس کی ضروریات بشروں جیسی ہوتی ہیں، اور پہلے جتنے بھی رسول آئے ہیں سب کی یہی کیفیات تھیں، ہم نے فرشتوں کو رسول بنا کے کبھی نہیں بھیجا لوگوں کے لئے، اگر یہاں فرشتے آباد ہوتے تو ان کی طرف فرشتہ رسول بنا کر بھیجا جاتا، جب انسانوں کی تعلیم

کے لئے رسول بھیجا جا رہا ہے تو وہ انسان ہی ہے، اس کی ضروریات وہی ہوا کرتی ہیں جو عام انسانوں کی ہیں، تو ضروریات کے لیے بازاروں میں چلنا، یا کھانا کھانا یہ منصب رسالت کے منافی نہیں ہے۔ نہیں بھیجا ہم نے آپ سے قبل رسولوں کو مگر وہ بھی کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے تھے، تو اگر آپ بازار میں چلتے ہیں یا کھانا کھاتے ہیں، اس میں کیا حرج ہے؟...... اس سے معلوم ہو گیا کہ اپنی ضروریات کے لئے بازار میں آنا جانا یہ بھی انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے، سرورِ کائنات ﷺ بازار میں خود جا کے خرید فروخت کر لیا کرتے تھے کہ اپنی ضرورت کی چیز خریدی، لے آئے، تو یہ چیز منصب رسالت کے یا کمال کے منافی نہیں ہے، بلکہ اس تکبر کی بنا پر بازار میں نہ جانا کہ لوگ کیا کہیں گے کہ یہ خود خریدتے پھر رہے ہیں اور خود چیزوں کو اُٹھائے پھرتے ہیں، تو تکبر کی بنا پر بازار میں نہ جانا یہ مذموم ہے۔ اور اپنی ضروریات کے لیے جانا اس خیال کے ساتھ کہ انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے، انبیاء علیہم السلام بھی اپنی ضروریات خود پوری کر لیتے تھے، کسی قسم کی قباحت نہیں ہے، بلکہ یہ تواضع کی علامت ہے۔ جس طرح سے حضرت شیخ الاسلام رحمہ اللہ یہاں لکھتے ہیں: ”آپ سے پہلے جتنے پیغمبر دُنیا میں آئے سب آدمی تھی، آدمیوں کی طرح کھاتے پیتے، اور معاشی ضروریات کے لیے بازار بھی جاتے تھے، ان کو فرشتہ بنا کر نہیں بھیجا جو کھانے پینے اور حوائج بشریہ سے مستغنی ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ضرورت کے لیے بازاروں میں پھرنا شانِ تقدس اور بزرگی کے منافی نہیں، بلکہ اگر بازار نہ جانے کا منشا کبر وخود بینی ہو تو یہ بزرگی کے خلاف ہے“ (تفسیر عثمانی)۔

آپس کا اِختلاف صبر کا اِمتحان ہے

وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ اور ہم نے تم میں سے بعض کو بعض کے لئے آزمائش کا ذریعہ بنایا۔ یہ خطاب اہلِ ایمان کو ہے۔ اَتَصْبِرُوْنَ: کیا تم صبر کرتے ہو؟ یعنی تمہیں صبر کرنا چاہیے، کسی کو خوش حالی دے دی، کسی کو تنگی میں مبتلا کر دیا، مختلف حالات جس طرح سے انسانوں پر ہیں، اسی طرح رسول لوگوں کے لئے آزمائش کا ذریعہ ہیں، اور کفار رسول کے لئے آزمائش کا ذریعہ ہیں کہ تکلیفیں پہنچائیں گے، تکذیب کریں گے تو یہ رسول کے صبر کا امتحان ہے، اور اسی طرح اہلِ ایمان کے بھی صبر کا امتحان ہے، کسی کے لئے تنگی آ گئی، کسی کے لئے خوش حالی ہوئی، اور کسی کو کوئی تکلیف ہو گئی، کسی کو کوئی راحت پہنچی، یہ آپس میں جو اختلاف ہے، معاشی اونچ نیچ ہو یا کسی دوسرے اعتبار سے، یہ سب آزمائش کا ذریعہ ہے۔ کیا تم صبر کرتے ہو؟ یعنی تمہیں صبر کرنا چاہیے، حق کے راستے میں اگر کوئی تکلیفیں پیش آ جائیں، اور حق کے لیے اگر تکلیفیں برداشت کرنی پڑ جائیں تو ان کو صبر واستقامت کے ساتھ برداشت کیا کرو۔ یہ استفہام ترغیب کے لئے ہے۔

صبر کرنے والوں کی قدر

وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا: اور تیرا رَبّ دیکھنے والا ہے، اس میں بہت بڑی بات ہے کہ جب تم اس کے لئے تکلیف اُٹھاؤ گے اور وہ دیکھ بھی رہا ہے کہ میرا بندہ میرے لئے تکلیف اُٹھا رہا ہے، تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی کتنی قدر ہو گی اور اللہ تعالیٰ اس پر کتنے خوش ہوں گے۔ آپ کے لئے اگر کوئی تکلیف اُٹھا رہا ہو، آپ کی وجہ سے کوئی مصیبت سہہ رہا ہو، اور آپ کو پتا چل جائے کہ فلاں

شخص نے میری وجہ سے یہ مصیبت اُٹھائی ہے، تو آپ اپنے دِل میں غور کر کے دیکھیں کہ اس کی کتنی قدر ہوا کرتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے، اس کے سامنے کوئی چیز مخفی نہیں، تو اگر تم اس کے لئے تکلیف اُٹھاؤ گے، اس کے لئے مشکلات برداشت کرو گے، تو اللہ تعالیٰ خوش ہوگا اور اسی طرح سے تمہیں جزا دے گا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا

کہا ان لوگوں نے جن کو ہماری ملاقات کی اُمید نہیں، کیوں نہیں اُتارے گئے ہم پر فرشتے یا ہم دیکھ لیتے اپنے رَبّ کو؟

لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿۲۱﴾ يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى

بے شک انہوں نے تکبر کیا اپنے دِلوں میں اور سرکشی اختیار کی بہت بڑی سرکشی ﴿۲۱﴾ جس دِن کہ دیکھیں گے وہ فرشتوں کو تو کوئی خوش خبری نہیں ہوگی

يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۲۲﴾ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ

اس دِن مجرموں کے لئے، اور وہ کہیں گے پناہ پناہ ﴿۲۲﴾ اور ہم متوجہ ہوں گے ان اعمال کی طرف جو انہوں نے کیے،

فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴿۲۳﴾ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ

پس کر دیں گے ہم اُن اعمال کو بکھیری ہوئی گرد و غبار ﴿۲۳﴾ جنت والے اس دِن بہتر ہوں گے از روئے ٹھکانے کے اور اچھے ہوں گے

مَقِيْلًا ﴿۲۴﴾ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ﴿۲۵﴾ اَلْمُلْكُ

از روئے آرام گاہ کے ﴿۲۴﴾ اور جس دِن کہ آسمان پھٹے گا بادل کے ساتھ اور اُتارے جائیں گے فرشتے اُتارا جانا ﴿۲۵﴾ سچی حکومت

يَوْمَئِذِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ۭ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ﴿۲۶﴾ وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ

اس دِن رحمٰن کے لئے ہوگی، اور وہ دِن کافروں پر بڑا سخت ہوگا ﴿۲۶﴾ اور جس دِن کاٹے گا ظالم

عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ﴿۲۷﴾ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ

اپنے ہاتھوں کو، کہے گا: ہائے کاش! میں رسول کے ساتھ راستہ اختیار کرلیتا ﴿۲۷﴾ ہائے میری بربادی! کاش کہ میں نہ

اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿۲۸﴾ لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ ۭ وَكَانَ

بناتا فلاں کو دوست ﴿۲۸﴾ البتہ تحقیق اس نے بھٹکا دیا مجھ کو نصیحت سے بعد اس کے کہ وہ نصیحت میرے پاس آئی تھی، اور

الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ﴿٢٩﴾ وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ

شیطان انسان کی مدد چھوڑ دینے والا ہے﴿٢٩﴾ اور کہا رسول نے: اے میرے رب! بے شک میری قوم نے اس قرآن کو

مَهْجُوْرًا ﴿٣٠﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ

متروک قرار دیا﴿٣٠﴾ ایسے ہی بنائے ہم نے ہر نبی کے لئے مجرموں میں سے دشمن، اور تیرا رب کافی ہے

هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ﴿٣١﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً

راستہ دکھانے والا اور مدد کرنے والا﴿٣١﴾ اور کہا کافروں نے کیوں نہیں اُتارا گیا اس پر قرآن پورے کا پورا،

وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿٣٢﴾ وَلَا يَاْتُوْنَكَ

ہم ایسے ہی اُتارتے ہیں، تاکہ ثابت رکھیں اس کے ذریعے سے آپ کے دل کو اور پڑھا ہم نے اس کو تھوڑا تھوڑا کر کے پڑھنا﴿٣٢﴾ اور یہ نہیں لاتے آپ کے پاس

بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ﴿٣٣﴾ اَلَّذِيْنَ يُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ

کوئی مثال مگر ہم آپ کے پاس لے آتے ہیں حق اور زیادہ اچھی بات از روئے تفصیل کے﴿٣٣﴾ جو لوگ جمع کئے جائیں گے اپنے چہروں کے بل

اِلٰى جَهَنَّمَ ۙ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿٣٤﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ

جہنم کی طرف یہی لوگ بدتر ہیں از روئے ٹھکانے کے اور زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں از روئے راستے کے﴿٣٤﴾ اور البتہ تحقیق ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور

جَعَلْنَا مَعَهٗٓ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا ﴿٣٥﴾ فَقُلْنَا اذْهَبَآ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا

ہم نے ان کے ساتھ ان کے بھائی ہارون کو وزیر بنایا﴿٣٥﴾ پھر ہم نے کہا کہ جاؤ تم دونوں ان لوگوں کی طرف جنہوں نے جھٹلایا

بِاٰيٰتِنَا ؕ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ﴿٣٦﴾ وَقَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ

ہماری آیات کو پس ہم نے ان کو بالکل نیست و نابود کر دیا﴿٣٦﴾ اور ہلاک کیا ہم نے نوح کی قوم کو جب انہوں نے رسولوں کی تکذیب کی

اَغْرَقْنٰهُمْ وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿٣٧﴾ وَّعَادًا

تو ہم نے انہیں ڈبو دیا اور ہم نے ان کو لوگوں کے لئے نشانی بنا دیا اور تیار کیا ہم نے ظالموں کے لئے دردناک عذاب﴿٣٧﴾ اور ہلاک کیا ہم نے عاد کو

وَّثَمُوْدَا۟ وَاَصْحٰبَ الرَّسِّ وَقُرُوْنًا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ﴿٣٨﴾ وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ

اور ثمود کو اور کنویں والوں کو اور اس کے درمیان اور بھی بہت ساری جماعتوں کو﴿٣٨﴾ اور ان میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے بیان کیں

الْاَمْثَالَ ۫ وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ﴿۳۹﴾ وَلَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْٓ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ

مثالیں، اور ان میں سے ہر ایک کو ہم نے برباد کیا، برباد کرنا ﴿۳۹﴾ اور البتہ تحقیق آئے ہیں یہ لوگ اس بستی پر جو کہ بُری بارش برسائی گئی تھی،

اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ﴿۴۰﴾ وَاِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ

کیا پھر انہوں نے اس بستی کو دیکھا نہیں؟ بلکہ یہ لوگ جی اُٹھنے کی اُمید نہیں رکھتے ﴿۴۰﴾ اور جب یہ لوگ آپ کو دیکھتے ہیں تو نہیں بناتے آپ کو

اِلَّا هُزُوًا ۭ اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ﴿۴۱﴾ اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَآ

مگر ٹھٹھا کیا ہوا، کیا یہی ہے جس کو اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے؟ ﴿۴۱﴾ قریب تھا کہ یہ بھٹکا دے ہمیں ہمارے معبودوں سے اگر ہم

اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ۭ وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾

ان کے اُوپر جم کر نہ بیٹھتے۔ اور عنقریب یہ جان لیں گے جب عذاب دیکھیں گے کہ کون زیادہ بھٹکا ہوا ہے از روئے راستے کے ﴿۴۲﴾

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ۭ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ﴿۴۳﴾ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ

کیا آپ نے دیکھا اس شخص کو جس نے بنالیا اپنا الٰہ اپنی خواہش کو، کیا پھر آپ ان لوگوں پر کارساز ہیں؟ ﴿۴۳﴾ یا تُو سمجھتا ہے کہ

اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ۭ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۴۴﴾

ان میں سے اکثر سُنتے ہیں یا سمجھتے ہیں؟ نہیں ہیں یہ مگر چوپایوں کی طرح بلکہ چوپایوں سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں از روئے راستے کے ﴿۴۴﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا: يَرْجُوْنَ، رَجاء سے لیا گیا ہے، رَجاء کا معنی ہے اُمید کرنا، اور اکثر تو اس کا استعمال ہوتا ہے اچھی چیز کے متعلق اُمید کرنے میں، اور کبھی کبھی شر کے متعلق بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے تو پھر اس کا مفہوم ہوا کرتا ہے ڈرنا۔ جیسے متوقع خیر کی اُمید ہوا کرتی ہے اسی طرح متوقع شر سے ڈر ہوا کرتا ہے۔ جس طرح وَعد میں بھی دونوں معنی ہوا کرتے ہیں، خیر کا وعدہ ہو تو ہم اس کو اپنی زبان سے "وَعد" سے تعبیر کرتے ہیں، اور اگر کوئی بُرائی پہنچانے کا وعدہ کرلیا جائے تو اس کو "وعید" سے تعبیر کیا جاتا ہے، باب ایک ہی استعمال ہوتا ہے وَعَدَ يَعِدُ، معنی دونوں طرح سے کر دیا جاتا ہے، وعدہ کرتا ہے، ڈراتا ہے، اسی طرح سے یہاں بھی رَجاء کے اندر خوف والا معنی ہے، تو ترجمہ یوں کریں گے "کہاں لوگوں نے جو ہماری ملاقات سے نہیں ڈرتے، جن کو ہماری ملاقات کی اُمید نہیں، لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا: یہ قالَ کا مقولہ ہے۔ کیوں نہیں اتارے گئے ہم پر فرشتے، یا ہم دیکھ لیتے اپنے رَبّ کو، لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ: لام اور قد دونوں لفظ تاکید کے لئے ہیں۔ بے شک انہوں نے تکبر کیا اپنے دلوں میں، یعنی اپنے دلوں میں اپنے آپ کو بڑا جانا، وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا: اور سرکشی اختیار کی بہت بڑی سرکشی۔ يَوْمَ

يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ: جس دن کہ دیکھیں گے وہ فرشتوں کو، لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ: يَوْمَئِذٍ اَیْ یومَ اِذْ کَانَ کذا، جس دن فرشتوں کو دیکھنے کا واقعہ پیش آئے گا اس دن مجرموں کے لئے کوئی بشارت نہیں ہوگی، کوئی خوشی کی خبر نہیں ہوگی، بشارت کا مفہوم ہوتا ہے ایسی خبر جس کو سن کے انسان خوش ہو جائے۔ اس دن مجرموں کے لیے کوئی خوشخبری نہیں ہوگی، وَيَقُوْلُوْنَ: اور کہیں گے، حِجْرًا مَّحْجُوْرًا: حِجر یہ مصدر ہے، حَجَرَ مَنَعَ کے معنی میں، روکنا۔ اس لیے بیت اللہ کے ساتھ جو جگہ گھیری ہوئی ہے اس کو بھی حِجر کے ساتھ تعبیر کر دیتے ہیں، محجور کے معنی میں، گھیری ہوئی۔ اور لفظ محجور یہ حِجر کی تاکید ہے۔ تو یہاں اس کا مفہوم یہ ہے (يَقُوْلُوْنَ کی ضمیر کافروں کی طرف لوٹ رہی ہے) جس دِن فرشتوں کو دیکھیں گے تو کافر کہیں گے: پناہ پناہ۔ یہ اس کا حاصل ترجمہ ہے، مطلب یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس مصیبت کو ہم پر سے روک لے، اصل مفہوم اس کا یہ ہوا کرتا ہے۔ لیکن اب یہ لفظ چونکہ بطور محاورے کے استعمال ہوتا ہے، اور اس کے عامل کو بھی ظاہر نہیں کیا جاتا، عامل اس کا محذوف ہے تو جس وقت کوئی دشمن کسی پر حملہ کرنا چاہے تو اس سے بچنے کے لئے انسان جس طرح سے ''پناہ پناہ'' بولتا ہے۔ اے اللہ! مجھے پناہ دے، اے اللہ! مجھے بچا لے، تو ایسے موقع پر چونکہ طویل کلام نہیں ہوا کرتی، مختصر سے لفظ میں انسان اپنے مفہوم کو ادا کیا کرتا ہے، تو اس لیے حِجْرًا مَّحْجُوْرًا یا ایسے ہی ہے جیسے معاذ اللہ، معاذ اللہ، یوں انسان کہتا ہے، تو ''بیان القرآن'' میں اس کا ترجمہ کیا گیا ہے ''پناہ پناہ'' یعنی کافر کہیں گے پناہ پناہ۔ یہ تو يَقُوْلُوْنَ کی ضمیر ہم نے کُفار کی طرف لوٹا دی، مطلب یہ ہوا کہ اب تم فرشتے دیکھنے کی تمنا کر رہے ہو جس دِن فرشتے سامنے آئے تمہیں پتا چل جائے گا کہ تمہارے لئے کیا مصیبت آنے والی ہے پھر تم کہو گے ''ہمیں بچالو ہمیں بچالو'' پھر تم اس طرح سے چیخو گے...... اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے کہ وہ يَقُوْلُوْنَ کی ضمیر مجرمین کی طرف لوٹانے کی بجائے فرشتوں کی طرف لوٹاتے ہیں، تو پھر حِجْرًا مَّحْجُوْرًا کا معنی ہوگا حراماً مُحَرَّمًا عَلَيْكُمُ الْبُشْرٰى (آلوسی، نسفی)۔ یعنی جس دِن یہ کافر، یہ مجرم فرشتوں کو دیکھیں گے تو اس دِن ان کے لئے کوئی بشارت نہیں ہوگی، فرشتے کہیں گے کہ یہ بشارت تمہارے لئے حرام ہے، ممنوع ہے، تمہارے لیے کوئی بشارت نہیں ہے، اس طرح سے بھی اس کا معنی کیا گیا ہے...... تو حِجر رُکاوٹ کو بھی کہتے ہیں اور مَّحْجُوْرًا اس کی تاکید ہے، آگے اسی سورت میں لفظ آئے گا: وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا تو وہاں شدید رُکاوٹ والا مفہوم ہوگا۔

وَيَقُوْلُوْنَ مجرم کہیں گے ہمیں بچا لیا جائے، ہمیں بچا لیا جائے، یہ اس کا مفہوم محاورۃً ہے، معاذ اللہ، معاذ اللہ، ہم اللہ کی پناہ پکڑتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم تک اس مکروہ کو پہنچنے سے بچا لے، اس مکروہ کو ہم سے روک دیا جائے۔ ویسے حَجَرَ مَنَعَ کے معنی میں ہوتا ہے، اس لیے چھت کے اوپر جو پردہ کھڑا کیا ہوتا ہے اس کو بھی حِجر کہتے ہیں۔ اور سقفِ محجور کا معنی یہی ہوتا ہے کہ ایسی چھت جس کے اوپر پردہ کھڑا کیا ہوا ہو، تو یہ پردہ اور آڑ کے مفہوم میں ہے۔ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ: قَدِمَ: آنا۔ اور ہم آئیں گے ان کے اعمال کی طرف یعنی متوجہ ہوں گے، ہم متوجہ ہوں گے ان کاموں کی طرف جو انہوں نے کیے، مِنْ عَمَلٍ یہ ''مَا'' کا بیان ہے۔ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا: هَباء کہتے ہیں گرد و غبار کو۔ منثور: بکھیری ہوئی۔ کر دیں گے ہم اس کو بکھیری ہوئی گرد و غبار، ان کے اعمال کو ہم گرد و غبار کی طرح اڑا دیں گے، ایسا گرد و غبار جو اڑا دیا گیا ہو۔ جیسا کہ سورۂ ابراہیم میں الفاظ ہیں اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ِاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ (سورۂ ابراہیم: ۱۸) تو وہاں بھی یہی مثال دی گئی تھی کہ ان کے اعمال ایسے ہوں گے جس طرح سے راکھ ہو، اور آندھی والے

دن میں اس کے اُوپر سخت ہوا چل جائے، تو راکھ بہت ہلکی چیز ہوا کرتی ہے، جب اس کے اوپر جھکڑ ہوا چلے تو اس کا نام ونشان نہیں رہتا، گرد و غبار کی طرح بکھر جاتی ہے۔ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ یَوْمَىِٕذٍ خَیْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّ اَحْسَنُ مَقِیْلًا: جنّت والے اس دن بہتر ہوں گے ازروئے مستقر کے اور اچھے ہوں گے ازروئے مقیل کے۔ مستقر: قرار پانے کی جگہ، ٹھہرنے کی جگہ۔ مقیل: آرام کرنے کی جگہ۔ مقیل کا لفظ قیلوله سے لیا گیا ہے، قیلولہ دو پہر کے وقت آرام کرنے کو کہتے ہیں، قَالَ یقیلُ: دوپہر کے وقت آرام کرنا۔ تو مقیل کا معنی ہے آرام گاہ۔ جنّت والے اس دن بہتر ہوں گے ازروئے ٹھکانے کے اور ازروئے آرام گاہ کے۔ وَیَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ: اور جس دن کہ آسمان پھٹے گا بادل کے ساتھ، وَنُزِّلَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ تَنْزِیْلًا: تَنْزِیْلًا مصدر ہے، چونکہ پیچھے فعل مجہول آ گیا تو اس مصدر کا ترجمہ بھی مجہول کے طور پر ہی کیا جائے گا۔ اور اتارے جائیں گے فرشتے اتارا جانا۔ تو تَنْزِیْلًا مصدر مجہول ہے، فعل مجہول کا مصدر ہے، اور یہ مفعول مطلق کثرت پیدا کرنے کے لیے ہے، بہت کثرت کے ساتھ فرشتے اتارے جائیں گے، ٹولیاں ٹولیاں، گروہ در گروہ، لگا تار، تو مفعول مطلق کے ساتھ جو تاکید آ گئی تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ بہت کثرت کے ساتھ فرشتے اُتارے جائیں گے، گروہوں کے گروہ اُتارے جائیں گے، جماعت در جماعت اُتارے جائیں گے، لگا تار اُتارے جائیں گے۔ اَلْمُلْكُ یَوْمَىِٕذِ اِلْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ: یَوْمَىِٕذٍ آپ ''نحو'' میں پڑھتے رہتے ہیں کہ یہ ''یوم اذ کان کذا'' کے معنی میں ہوتا ہے۔ جب یہ واقعہ پیش آئے گا، برحق حکومت، سچی حکومت اس دن رحمٰن کے لئے ہوگی، وَكَانَ یَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِیْنَ عَسِیْرًا: اور وہ دن کافروں پر بڑا سخت دن ہوگا۔ یوماً عسیراً یہ ''کَانَ'' کی خبر ہے، اور ''کَانَ'' کی ضمیر پچھلے مذکور دن کی طرف لوٹ رہی ہے۔ جس دن یہ واقعہ پیش آئے گا وہ دن کافروں کے اُوپر بہت سخت ہوگا۔ وَیَوْمَ یَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى یَدَیْهِ: عَضَّ یَعَضُّ کا معنی ہوتا ہے منہ کے ساتھ کاٹنا، جس کو چَک مارنا کہتے ہیں، پنجابی میں اس کو ''دَندی وَڈنا'' کہتے ہیں، منہ کے ساتھ دانتوں کے ساتھ کسی چیز کو کاٹنا۔ اور جس دن کاٹے گا ظالم اپنے ہاتھوں کو، یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِی اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِیْلًا: کہے گا ہائے کاش! میں رسول کے ساتھ راستہ اختیار کر لیتا، یعنی اس کی معیت اختیار کر لیتا، جو کچھ رسول مجھے کہتا تھا میں اس کے ساتھ مل کے چلتا۔ یٰوَیْلَتٰى لَیْتَنِیْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِیْلًا: ہائے میری بربادی! کاش کہ میں نہ اختیار کرتا فلاں کو دوست، نہ بناتا میں فلاں کو دوست، لَقَدْ اَضَلَّنِیْ عَنِ الذِّكْرِ: اَضَلَّ کی ضمیر فُلَانًا کی طرف لوٹ رہی ہے۔ البتہ تحقیق اس فلاں نے بھٹکا دیا مجھ کو نصیحت سے، گمراہی میں ڈال دیا مجھ کو نصیحت سے۔ یہاں صلہ ''عَنْ'' آ گیا جس میں اعراض والا معنی ہے، یعنی اس نے مجھے بہکایا جس کی بنا پر میں نے نصیحت سے اعراض کیا، نصیحت سے منہ موڑ لیا۔ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِیْ: بعد اس کے کہ وہ نصیحت میرے پاس آئی تھی وَكَانَ الشَّیْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا: خَذَلَ یَخْذُلُ: بوقت ضرورت، بوقت احتیاج مدد چھوڑ دینا۔ اور شیطان انسان کے لئے خذول ہے، شیطان انسان کو وقت پہ صاف جواب دینے والا ہے، وقت پر یہ کام نہیں آتا، جب مدد کی ضرورت ہوتی ہے اس وقت ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ خطبے میں یہ لفظ آپ سنا کرتے ہیں: ''اَللّٰهُمَّ اخْذُلْ مَنْ خَذَلَ دِیْنَ مُحَمَّدٍ ﷺ'' اے اللہ! اس شخص کی مدد چھوڑ دے جو بوقت ضرورت دین کی مدد نہیں کرتا، جو دین کی مدد کو چھوڑے ہوئے ہے تو اس کی مدد کو چھوڑ دے۔ خُذلان کا یہی معنی ہوتا ہے۔ وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا: اور کہا رسول نے اے میرے رَبّ! بے شک میری قوم نے اس قرآن کو مہجور قرار دیا، بنایا اس قرآن کو مہجور۔ مھجور کا لفظ اگر ھجر سے لیا جائے تو ھجر چھوڑنے کو کہتے

ہیں تو مھجور بمعنی متروک ہوگا۔ میری قوم نے اس قرآن کو متروک قرار دے دیا، چھوڑ دیا۔ اور اگر هُجر سے لیا جائے تو هُجر کا معنی ہوتا ہے بک بک کرنا، بیہودہ بولنا، آپ کو یاد ہوگا یہ لفظ سورۂ مؤمنون میں بھی آیا تھا مُسْتَكْبِرِیْنَ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ (سورۂ مؤمنون: ۶۷) تم چھوڑ جاتے تھے، تم بکتے تھے، تو وہاں هَجر اور هُجر دونوں سے لے کے معنی کیا گیا تھا۔ تو اسی طرح مھجور کا معنی ہوگا وہ بات جس میں بک بک لگادی جائے۔ انہوں نے قرآن کریم کو مھجور قرار دے رکھا ہے، یعنی جس وقت قرآن پڑھا جاتا ہے تو اس میں بک بک کرنے لگ جاتے ہیں۔ یا اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ قرآنِ کریم کو تیرا قول نہیں سمجھتے، قولِ مبارک نہیں سمجھتے، اپنے لیے مفید نہیں سمجھتے، بلکہ یوں سمجھتے ہیں جس طرح کسی نے بُڑبُڑ کی ہوئی ہو، بیہودہ بات کی ہوئی ہو، یہ قرآنِ کریم کو ہجور سمجھتے ہیں۔ دونوں طرح سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ''بیان القرآن'' میں هَجر سے لے کے ترجمہ کیا ہے چھوڑنے کے معنی میں، مہجور یعنی متروک۔ اور حضرتِ شیخ (الہند رحمہ اللہ) نے هُجر سے لے کے ترجمہ کیا ہے، اس لیے یہ لفظ بولتے ہیں کہ ''میری قوم نے ٹھہرایا ہے اس قرآن کو جھک جھک''، ''جھک جھک'' اور ''بک بک'' ایک ہی چیز ہے۔ جسے سرائیکی میں کہتے ہیں ''کیا جھک مریندا ہے'' (کیا جھک مارتا ہے) تو جھک مارنا اور بکواس مارنا ایک ہی بات ہوتی ہے۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِیْنَ: ایسے ہی بنایا ہم نے ہر نبی کے لئے مجرموں میں سے دشمن۔ عدوّ کا لفظ مفرد جمع سب پہ بولا جاتا ہے۔ ہم نے مجرمین میں سے ہر نبی کے لئے ایسے ہی دشمن بنائے۔ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِیًا وَّنَصِیْرًا: اور تیرا ربّ کافی ہے ہادی اور نصیر ہونے کے اعتبار سے، ہادی: راستہ دکھانے والا۔ نصیر: مدد کرنے والا۔ وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَیْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً: اور کہا کافروں نے، کیوں نہیں اتارا گیا اس پر قرآن پورے کا پورا، یعنی یکبارگی سارے کا سارا قرآن کیوں نہیں اُتار دیا گیا؟ كَذٰلِكَ: ہم ایسے ہی اُتارتے ہیں تھوڑا تھوڑا کر کے، لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ: تا کہ ثابت رکھیں اس کے ذریعے سے ہم آپ کے دِل کو، قوت پہنچائیں، تثبیت: ثابت کرنا، وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِیْلًا: اور پڑھا ہم نے اس کو تھوڑا تھوڑا کر کے پڑھنا۔ وَلَا یَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ: اور نہیں لاتے یہ آپ کے پاس کوئی مثال یعنی بطورِ اعتراض کے کوئی بات بیان نہیں کرتے، اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ: مگر ہم آپ کے پاس حق لے آتے ہیں، وَاَحْسَنَ تَفْسِیْرًا: اور زیادہ اچھی بات لے آتے ہیں ازروئے تفصیل کے۔ ''تفسیر'' اور ''تفصیل'' ایک ہی چیز ہوتی ہے۔ فصل کا معنی ہوتا ہے کشف، کسی چیز کو کھول دینا۔ یعنی یہ کوئی بات آپ کے سامنے بطورِ اعتراض کے لائیں تو ہم اس کا بہترین جواب دیتے ہیں، اس جواب میں دو صفتیں ہوتی ہیں، ایک تو واقع کے مطابق ہوتا ہے، سچا ہوتا ہے، شبہ کے لیے قاطع ہوتا ہے، اور دوسرا یہ کہ واضح ہوتا ہے، جس کا سمجھنا آسان ہوتا ہے۔ اَلَّذِیْنَ یُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اِلٰى جَهَنَّمَ: جو لوگ جمع کیے جائیں گے اپنے چہروں کے بل جہنم کی طرف، اُولٰٓىِٕكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ سَبِیْلًا: یہی لوگ بدتر ہیں ازروئے ٹھکانے کے اور زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں ازروئے راستے کے۔ وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ: اور البتہ تحقیق ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی، وَجَعَلْنَا مَعَهٗۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِیْرًا: اور ہم نے ان کے ساتھ ان کے بھائی ہارون کو وزیر بنایا۔ فَقُلْنَا اذْهَبَاۤ: پھر ہم نے کہا کہ جاؤ تم دونوں، اِلَى الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا: ان لوگوں کی طرف جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِیْرًا: (واقعے کو سمیٹ لیا گیا) موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام دونوں گئے، اور دونوں کے جانے کے بعد وہ لوگ نہیں سمجھے، مخالفت کرتے رہے، تو نتیجہ یہ نکلا فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِیْرًا: دَمَّرَ کا معنی ہوتا ہے کسی چیز کو اس طرح سے توڑ پھوڑ دینا کہ جس کے بعد اس کی اصلاح

ممکن نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں آپ کہہ لیجئے نیست ونابود کردینا۔ اور تَتْبِيْرًا یہ بطور تاکید کے ہے۔ ہم نے ان کو بالکل نیست ونابود کردیا، ہم نے ان کو پیس ڈالا، ریزہ ریزہ کردیا، جس کے بعد پھر ان کا سنبھلنا ممکن ہی نہیں رہا۔ برباد کردیا ہم نے ان کو خوب اچھی طرح سے برباد کرنا، غارت کردیا ہم نے ان کو خوب اچھی طرح سے غارت کرنا۔ ہم نے ان کو پیس ڈالا، ذرّے ذرّے کرکے ان کو اُڑا دیا۔ تدمیر کا لفظ بہت زوردار ہے۔ ہم نے ان کو بالکل پیس ڈالا، ریزہ ریزہ کردیا، ٹکڑے ٹکڑے کردیا، ایسے طور پر توڑ پھوڑ دیا کہ جس کے بعد ان کے لیے سنبھلنا ممکن ہی نہیں رہا، کَسْرُ الشَّیْءِ علی وجہٍ لا یُمْکِنُ إصلاحُہ، یہ ہے اصل میں تدمیر کا مفہوم، چیز کو ایسے طور پر توڑ دینا جس کے بعد اس کا جوڑا جانا ممکن نہ ہو، یعنی اس کو بالکل ریزہ ریزہ کردینا۔ وَقَوْمَ نُوْحٍ: اور ہلاک کیا ہم نے نوح علیہ السلام کی قوم کو، لَمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ: جس وقت کہ انہوں نے رسولوں کی تکذیب کی، کیونکہ نوح علیہ السلام چاہے ایک ہی رسول ان کی طرف آئے تھے، لیکن سب رسولوں کی بات چونکہ ایک ہی ہوا کرتی ہے تو ایک کی تکذیب سب کی تکذیب ہے، تو جمع کے ساتھ اس لیے تعبیر کردیا۔ اور نوح علیہ السلام کی قوم کو ہم نے ہلاک کیا جبکہ انہوں نے رسولوں کی تکذیب کی، اَغْرَقْنٰهُمْ یہ "قومَ نوحٍ" کا عامل ہے، یعنی قَوْمَ نُوْحٍ منصوب علیٰ شریطۃ التفسیر ہے، اس لیے اس (اَغْرَقْنٰهُمْ) کے مناسب معنی ہم نے نکالا کہ ہلاک کیا ہم نے نوح علیہ السلام کی قوم کو، جب انہوں نے رسول کو جھٹلایا تو ہم نے انہیں ڈبو دیا۔ قَوْمَ نُوْحٍ کو مفعول مقدم نہیں بنا سکتے کیونکہ اَغْرَقْنٰهُمْ میں "ھم" ضمیر مفعول موجود ہے، یہ ترکیب زیدًا ضربتُہ والی ہے۔ ہم نے ان کو ڈبو دیا، وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً: اور ہم نے ان کو لوگوں کے لئے نشانی بنادیا، یعنی عبرت کی نشانی، وَاَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا: اور تیار کیا ہم نے ظالموں کے لئے دردناک عذاب، وَّعَادًا وَّثَمُوْدَا۟ وَاَصْحٰبَ الرَّسِّ: اور ہلاک کیا ہم نے عاد کو، ثمود کو اور کنویں والوں کو۔ رَسّ کہتے ہیں کنویں کو، کچا کنواں جس کی پکّی مَن بنی ہوئی نہ ہو، اور یہ اصحاب رَسّ کون تھے؟ ان کے حالات تاریخ میں مذکور نہیں ہیں، مفسرین نے یہاں یہی لکھا ہے، قرآنِ کریم کے ذکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی قبیلہ تھا یا قوم تھی جو کسی کنویں پر آباد تھی، اور کسی رسول کی تکذیب کے نتیجے میں ان کو ہلاک کردیا گیا، تو یہ اقوام بائرہ میں سے ہے، یعنی ہلاک ہونے والی قوموں میں سے، باقی! اس کی زیادہ تفصیل معلوم نہیں کہ یہ کہاں آباد تھے، اور ان کی طرف کون رسول آیا تھا، قرآنِ کریم نے ان کا ذکر اَقوامِ بائرہ کے سلسلے میں کیا ہے، یعنی ہلاک ہونے والی قوموں کے سلسلے میں۔ وَقُرُوْنًا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا: اور اس کے درمیان اور بھی بہت ساری جماعتیں، جن کا ذکر نام بنام نہیں کیا گیا، جیسے چند رسولوں کو ذکر کیا گیا تو قومیں بھی چند ہی مذکور ہیں، ورنہ بہت رسول آئے اور بہت قومیں برباد ہوئیں، وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ: كُلًّا کی تنوین مضاف الیہ کے عوض ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے مثالیں بیان کیں، وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا: اور ان میں سے ہر ایک کو ہم نے برباد کیا برباد کرنا۔ تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا بھی اسی طرح سے ہے جس طرح فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا آیا تھا۔ وَلَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْٓ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ: اَتَوْا کی ضمیر مشرکینِ مکہ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ البتہ تحقیق آئے ہیں یہ لوگ اس بستی پر جو کہ بُری بارش برسائی گئی تھی، جس کے اُوپر بدتر بارش برسائی گئی تھی، یعنی پتھروں کی بارش برسائی گئی تھی۔ اس سے اشارہ ہے لوط علیہ السلام کی بستیوں کی طرف۔ شام کی طرف سفر کرکے جس وقت یہ لوگ جایا کرتے تھے تو وہ بستیاں راستے میں آتی تھیں۔ البتہ تحقیق آئے ہیں یہ لوگ (یعنی آتے رہتے ہیں، یہ وہاں پہنچے ہیں، انہوں نے بستیاں دیکھی ہیں) اس بستی پر جو کہ بُری بارش برسائی گئی تھی۔ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا: کیا پھر

انہوں نے اس بستی کو دیکھا نہیں؟ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا: بلکہ یہ لوگ نشور سے ڈرتے نہیں، نشور کی اُمید نہیں رکھتے جس طرح سے پہلے لَا يَرْجُوْنَ کا معنی ذکر کیا تھا۔ نشور کا معنی ہے مرکر جی اُٹھنا، یہ لوگ مرکر جی اُٹھنے کی اُمید نہیں رکھتے، اس لیے دیکھنے کے باوجود ان باتوں میں یہ غور اور تدبر نہیں کرتے۔ وَاِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا: اور جب یہ لوگ آپ کو دیکھتے ہیں تو نہیں بناتے آپ کو مگر ٹھٹھا کیا ہوا۔ هُزُوًا: مَهْزُوًّا بِهٖ کے معنی میں ہے۔ آپ کو دیکھتے ہیں تو آپ کا مذاق اڑاتے ہیں۔ مذاق اڑانے کی ایک یہ صورت ہے اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا: کیا یہی ہے جس کو اللہ نے رسول بنا کر بھیجا؟ یہی صاحب ہیں جن کو اللہ نے رسول بنا کے بھیجا ہے؟ یہ بطور استہزا کے کہتے تھے، مطلب یہ ہے کہ ان میں کون سا امتیاز ہے؟ نہ ان کے پاس مال، نہ ان کے پاس دولت، نہ ان کے پاس جائیداد، نہ ان کے پاس باغ، نہ کوئی محل، نہ کوئی خزانہ۔ یہی ہیں جن کو اللہ نے رسول بنا کے بھیجا ہے؟ جیسے شروع سورت میں اسی قسم کے اشکالات ذکر کیے گئے تھے، اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَاۤ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا: یہ بھی ان کی باتوں میں شامل ہے۔ قریب تھا کہ یہ بھٹکا دے ہمیں ہمارے معبودوں سے اگر ہم ان کے اوپر جم کے نہ بیٹھتے، اگر ہم مستقل مزاج نہ ہوتے اور ان معبودوں کے اوپر جم کے نہ بیٹھتے تو اس کی تو کوشش ایسی تھی کہ ہمیں بھٹکا ہی دیتا، لیکن ہم جمے رہے ہم نے صبر کیا، استقامت اختیار کی، ثابت قدم رہے، ورنہ اس نے تو کمی نہیں چھوڑی۔ قریب تھا کہ یہ بھٹکا دے ہمیں (یہ اِنْ مخففه من المثقله ہے، اِنْ شرطیہ نہیں) ہمارے معبودوں سے اگر ہم ان کے اوپر جم کے نہ بیٹھتے۔ وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا: عنقریب یہ جان لیں گے جب کہ عذاب دیکھیں گے کہ کون زیادہ بھٹکا ہوا ہے از روئے راستے کے۔ اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ: کیا آپ نے دیکھا اس شخص کو جس نے بنا لیا اپنا اِلٰہ اپنی خواہش کو، ھویٰ خواہش کو کہتے ہیں، جس نے اپنی خواہش نفس کو ہی اپنا معبود ٹھہرا لیا، جو دل میں آتا ہے بس یہ اسی کی اطاعت کرتا ہے، اپنی خواہش کے اوپر چلتا ہے یہ نہیں دیکھتا کہ اللہ کا حکم کیا ہے کیا نہیں، تو جیسے معبود کی بات بلاچوں چراں مانی جاتی ہے اسی طرح سے یہ اپنی خواہش کی اتباع بلاچوں چراں کرتے ہیں تو یوں سمجھو کہ ان کی خواہش جو ہے وہی ان کا خدا ہے۔ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا: کیا پھر آپ ان لوگوں پر کارساز ہیں؟ وکیل: مو کول الیه الأمر، جس کے معاملہ سپرد کر دیا جائے، آپ ان کے اوپر کوئی ذمے دار ٹھہرائے ہوئے ہیں؟ ان کا معاملہ کوئی آپ کے سپرد ہے؟ کہ آپ نے ان کو سیدھے راستے پہ ضرور لگانا ہے۔ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ: یا تو سمجھتا ہے کہ ان میں سے اکثر سنتے ہیں یا سمجھتے ہیں۔ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ: نہ یہ سنتے ہیں نہ یہ سمجھتے ہیں، یہ تو جانوروں کی طرح ہیں۔ نہیں ہیں یہ مگر چوپایوں کی طرح، بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا: بلکہ چوپایوں سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں از روئے راستے کے، راستے کے اعتبار سے یہ زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔

تفسیر

کُفّار کے اعتراضات کی اصل وجہ آخرت سے بےفکری ہے

شروع سورت میں کُفّار و مشرکین کے مختلف اشکالات اور ان کے سوالات ذکر کئے گئے تھے اور ان کا ساتھ ساتھ جواب دیا گیا تھا، کہ رسول کے متعلق یہ کہتے ہیں، قرآن کے متعلق یہ کہتے ہیں۔ اب ان ابتدائی آیات میں ان کا ایک قول نقل کیا ہے جس کو

وہ ذکر کرتے تھے، الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا یہ عنوان اختیار کیا گیا، اس لیے کہ بےفکری کی باتیں، لایعنی گفتگو اور لایعنی اعتراضات وہی شخص کیا کرتا ہے جس کو انجام کی فکر نہ ہو۔ اور اگر کسی شخص کو اپنے انجام کی فکر ہو، اللہ کے سامنے پیش ہونے کا اس کو ڈر ہو، تو پھر وہ اس قسم کی لایعنی گفتگو نہیں کیا کرتا، پھر تدبر کر کے بات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، ان کو چونکہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کی امید نہیں، ڈر نہیں، اس لیے جو منہ میں آتا ہے بکتے رہتے ہیں۔

کفارِ مکہ کی طرف سے فرشتوں کے اُترنے اور ربّ کو دیکھنے کا مطالبہ اور اس کا جواب

لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا یہ دو باتیں نقل کیں، جن کا حاصل یہ ہے کہ یہ کافر کہتے ہیں جو آخرت سے ڈرتے نہیں کہ یہ رسول جو کہتا ہے کہ اس کے پاس فرشتے آتے ہیں، تو ہم پر کیوں نہیں آتے؟ اگر ہم پر فرشتے اتار دیے جائیں تو پھر ہم مان جائیں کہ واقعی اس پر بھی آتے ہوں گے، یا ہم اپنے ربّ کو ہی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور ربّ ہمیں براہِ راست کہہ دے کہ واقعی یہ میرا رسول ہے، تب ہم مان جائیں گے۔ اب آپ جانتے ہیں کہ یہ ایک بیہودہ بات ہے، اللہ تعالیٰ ہر کسی پر فرشتے نہیں اُتارا کرتا، نہ اللہ تعالیٰ کی یہ شان ہے کہ ہر کسی کے سامنے آ کر خود کہتا پھرے۔ اس لیے اسکا یہاں تفصیلی جواب دینے کی بجائے اتنی بات کہہ دی گئی کہ یہ متکبر ہیں اور سرکش ہیں جو اس قسم کی باتیں کرتے ہیں، انہوں نے اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھ لیا، اپنے آپ کو اس قابل سمجھتے ہیں کہ فرشتے ان پر بھی اتریں۔ اور ربّ کو دیکھنے کا قول کر کے تو یہ بالکل ہی حدِ انسانیت سے نکل گئے، جیسے ''بیان القرآن'' میں مفہوم بیان کیا گیا کہ یہ قول کر کے کہ ہم اپنے ربّ کو دیکھیں یہ بالکل ہی حدِ انسانیت سے نکل گئے۔ کیونکہ فرشتوں کا اترنا انسانوں پر یہ تو واقعہ ہے، جہاں اللہ کو منظور ہوتا ہے اُترتے ہیں، باقی! اس دنیا کے اندر رہتے ہوئے رُویت ربّ تو ممکن ہی نہیں، تو پہلا مطالبہ ان کا کہ ہمارے اُوپر فرشتے اُتارے جائیں یہ بھی تکبر ہے، اور یہ مطالبہ کہ ہم اپنے ربّ کو دیکھیں یہ تو بالکل ہی حدِ انسانیت سے خروج ہے۔ اجمالی طور پر اس کی تردید یونہی کر دی گئی کہ یہ ان کی متکبرانہ بات ہے، اور سرکشوں جیسا قول ہے، اگر یہ متواضع ہوتے اور ان کو انجام کی فکر ہوتی تو اس قسم کی باتیں ان کے منہ سے نہ نکلتیں۔

مجرمین پر جب فرشتے اُتریں گے تو ان کے ہوش اُڑ جائیں گے

ہاں! فرشتے ان پر اُتریں گے، یہ انتظار کریں، جس دن فرشتے اُتریں گے پھر ان کے ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔ آگے اسی عذاب کا ذکر کیا کہ آئیں گے فرشتے، کوئی بات نہیں، ذرا انتظار کرو، اور جب وہ آ جائیں گے پھر تمہیں پتا چل جائے گا، پھر چیخو گے کہ ہمیں بچالو، ہمیں بچالو، پھر تمہیں وہ مصیبت نظر آئے گی۔ تو فرشتوں کا اُترنا بطور عذاب کے ہوگا، ایسے نہیں ہوگا جس طرح رسولوں کے پاس آتے ہیں، یہ تمہارا تکبر ہے اور تمہاری بڑائی ہے جو اس قسم کی تمنا ظاہر کرتے ہو، آگے وہی عذاب کا وقت ذکر کیا کہ جب یہ فرشتوں کو دیکھیں گے تو اس دن مجرموں کے لئے کوئی خوشخبری نہیں ہوگی، اور پھر یہ چیخیں گے ''پناہ پناہ، ہمیں بچالیا جائے، ہمیں بچالیا جائے'' جیسا کہ اس لفظ کا مفہوم آپ کی خدمت میں عرض کر دیا گیا۔

ایمان کے بغیر عمل کے بے حقیقت ہونے پر تین مثالیں

اوران کی جتنی کارروائیاں ہیں، جتنے اعمال ہیں، چاہے وہ اپنے طور پران کو اچھے عمل سمجھتے ہیں، لیکن ہم اس دن ان کو گردوغبار کی طرح اڑادیں گے۔ وجہ آپ کے سامنے بارہاذکر کردی گئی کہ جس عمل کے اندر ایمان کی روح نہ ہو وہ بظاہر کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہولیکن اس کی حقیقت ''سراب'' کی طرح ہے جیسا کہ سورۂ نور میں مثال آئی تھی، یا ''رماد'' کی طرح ہے جس طرح سے سورۂ ابراہیم میں مثال آئی تھی[1] یا ھَبَآءً مَّنْثُوْرًا ہے جیسا کہ یہاں مثال ذکر کردی گئی۔ عمل کے اندر وزن اور جان جو پیدا ہوتی ہے وہ ایمان کے ساتھ آتی ہے، جب وہ عمل ایمان سے خالی ہو تو چمکتی ہوئی ریت ہے، اور اس کا کوئی وزن نہیں، وہ اس طرح سے ہلکا پھلکا ہے جس طرح سے راکھ ہوتی ہے، تو اللہ تعالیٰ ان سب کو اس طرح سے اُڑادیں گے جس طرح سے گردوغبار ہوتا ہے، تو ان کے اعمال ان کے کام نہیں آئیں گے، وہ اعمال جن کو بظاہر یہ سمجھتے ہیں کہ یہ نیک ہیں اور ان کے اُوپر کوئی اچھا نتیجہ مرتب ہوگا۔

اہلِ جنّت کی خوش حالی

ہاں! البتہ ان کے مقابلے میں جو جنّت میں چلے جائیں گے ان کا حال یہ ہے جو ذکر کردیا گیا۔ مستقر اور مقیل دونوں کا مفہوم (خلاصے میں) آگیا، ٹھکانا اور آرام کرنے کی جگہ، تو جنّت ٹھکانا بھی ہے، اور آرام کرنے کی جگہ بھی ہے، اور خیر اور احسن یہ دونوں تفضیل کے صیغے ہیں لیکن تفضیل سے خالی ہیں، جس طرح سے ہم کہا کرتے ہیں کہ ''فلاں چیز بہترین ہے'' تو ہمارے ذہن میں یہ نہیں ہوتا کہ کس کے مقابلے میں بہترین ہے، فی حد ذاتہٖ اس کو بہتر قرار دینا مقصود ہوتا ہے۔ تو یہاں بھی کسی چیز کے ساتھ مقابلہ مقصود نہیں، بلکہ فی حد ذاتہٖ اس کو ''خیر'' اور ''احسن'' قرار دیا گیا ہے۔ تو یہ مقابلے والے مفہوم سے خالی ہے۔

قیامت کے دِن فرشتوں کا نزول اور اللہ تعالیٰ کی تجلی

وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ: یہ آیت ویسی ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ (آیت ۲۱۰) میں آپ کے سامنے پہلے گزری تھی: هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ، تو وہاں بھی ذکر کیا تھا کہ یہ بادل کا آنا یہ متشابہات میں سے ہے، وہ ایسے ہوگا جس طرح سے کوئی تخت شاہی آتا ہے، چتر شاہی (شاہی سائبان) نمایاں ہوتا ہے، اسی میں اللہ کی تجلی ہوگی، حساب وکتاب کے لئے اللہ تعالیٰ اپنی شان کے مطابق تشریف لائیں گے، اور پھر اس کے ساتھ فرشتوں کی صفوں کی صفیں ہوں گی، یہ اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے، حساب وکتاب کے لئے اللہ تعالیٰ کا جو نزول ہوگا اپنی شان کے مطابق، دیکھنے والوں کو بظاہر اس طرح سے معلوم ہوگا جیسا کہ آسمان کی طرف سے کوئی بدلی اتر رہی ہے، اور اس کے ساتھ فرشتے ہوں گے اور اسی میں اللہ تعالیٰ کی تجلی ہوگی جیسے اس کی شان کے لائق ہے، یہ باتیں متشابہات میں سے ہوا کرتی ہیں جن کو مثال کے ساتھ پوری طرح سے واضح نہیں کیا جاسکتا۔ اور یہ آسمان کا پھٹنا کھلنے کے معنی میں ہے، تباہ وبرباد ہونے کے معنی میں نہیں جیسے نفخۂ اُولیٰ کے موقع پہ ہوگا۔ جس دن آسمان پھٹے گا بادل

---

(۱) مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ِاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ۔ (ابراہیم:۱۸)، وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً... الخ (النور:۳۹)

کے ساتھ یعنی آسمان کھلے گا اور اس میں سے بادل اُترے گا، اور فرشتے کثرت کے ساتھ اُتارے جائیں گے، اس دِن پوری سچی واقعی حکومت رحمٰن کے لئے ہوگی، برائے نام بھی کسی دوسرے کا دخل نہیں ہوگا، اور وہ کافروں پر بہت سخت دِن ہوگا۔

بُرا دوست سانپ سے بھی بُرا ہے

اب اس دِن یہ کافر لوگ جو دنیا میں بُری رفاقت اختیار کرنے کی بنا پر گمراہ ہوئے تھے، وہ چیخیں گے، چلّائیں گے، اللہ تعالیٰ نے یہاں ان کی چیخیں نقل کی ہیں۔ اچھی صحبت اور بُری صحبت کے لئے یہ آیات بہت واضح ہیں کہ دنیا کے اندر اچھی صحبت آخرت میں انسان کے سامنے اچھا نتیجہ لائے گی، اور بُری صحبت بُرا نتیجہ لائے گی۔ حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ جس طرح فرماتے ہیں کہ ''یارِ بد بدتر بود زِ مارِ بد'' کہ بُرا دوست بُرے سانپ سے بھی زیادہ بُرا ہے..... اس کی وجہ کیا ہے؟ کہ اگر سانپ کسی کو کاٹ لے تو کیا ہوگا؟ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ انسان مرجائے گا، اور مرنا تو اس نے ہے ہی چاہے سانپ نہ کاٹے، یعنی اگر سانپ نہیں کاٹے گا تو کوئی انسان بچا تو نہیں رہتا، اس نے تو بہرحال مرنا ہے، وہ مرجائے گا، سانپ کے کاٹنے سے زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ زندگی ختم ہوجائے گی، اور یہ ختم ہونے والی چیز ہے، باقی رہنے والی چیز نہیں ہے، لیکن سانپ کا کاٹا آخرت میں نہیں روئے گا، آخرت میں نہیں چیخے گا۔ اور اگر اس دنیا کے اندر رہتے ہوئے کوئی یارِ بد سے کاٹا جائے، اور یارِ بد کی زہر اس کے اوپر اثر انداز ہوجائے، تو نہ صرف یہ کہ اس کی دنیا برباد ہوتی ہے، دنیا میں عزت جاتی ہے، انسان ذلیل ہوتا ہے، بُری صحبتوں کے نتیجے میں جائیدادیں برباد ہوجاتی ہیں، گھر بار برباد ہوجاتے ہیں، انسان اپنا خاندانی وقار بھی ضائع کر بیٹھتا ہے، تو بُری عادتوں میں مبتلا ہونے کی بنا پر دنیا میں بھی ذلیل ہوا، مختلف سزائیں بھگتیں، اور آخرت میں بھی چیخے گا، اور یہاں قرآنِ کریم نے ان لوگوں کی چیخیں نقل کی ہیں جو بُری صحبت کے نتیجے میں حق اور ہدایت سے محروم ہوجاتے ہیں۔

''وَیَوْمَ یَعَضُّ الظَّالِمُ'' کا شانِ نزول

شانِ نزول میں ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے، اور آپ کی خدمت میں تفسیری اُصول کے تحت کئی دفعہ ذکر کیا گیا کہ آیات شانِ نزول کے ساتھ خاص نہیں ہوتیں، اس جیسے جتنے واقعات ہوں گے سب پر یہ بات صادق آجاتی ہے، عُقبۃ بن أبی مُعَیط یہ ایک مشرک ہے، اس نے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی، اور دوسرے لوگوں کی بھی دعوت کی، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے گھر تشریف لے گئے، جب کھانا سامنے آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا کھانا کھانے سے انکار کردیا، اور فرمایا جب تک تو کلمہ نہیں پڑھتا اور توحید و رسالت کی گواہی نہیں دیتا اس وقت تک میں تیرا کھانا نہیں کھاؤں گا، عرب چونکہ بہت مہمان نواز تھے، اب بلایا ہوا ایک آدمی گھر آئے اور پھر کھانا نہ کھائے، بغیر کھانا کھائے چلا جائے، اس کو وہ اپنے لیے بہت بڑی ذلّت کی بات سمجھتے تھے، تو اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش کرنے کے لئے کلمہ پڑھ دیا، اور اس بات کی خبر اُبَیّ بن خلف کو پہنچی، وہ بھی اس کا دوست تھا، تو وہ آیا، اور آکر اس کو بہت ملامت کی، جب ملامت کی، تو اس نے کہا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر آگئے، میرے معزز مہمان تھے، میں کیسے گوارا کرسکتا تھا کہ میں ان کو خوش نہ کروں، وہ تو میں نے ان کو خوش کرنے کے لئے کہہ دیا تھا۔ اُبَیّ ابن خلف نے اسے کہا کہ میں تیرا اس وقت تک

اعتبار نہیں کرتا، میری تیری دوستی نہیں ہے، جب تک کہ تو ان کے سامنے جا کے انکار نہ کر کے آئے۔ بلکہ ایک روایت میں تو لفظ ہے کہ جب تک کہ تو ان کے سامنے جا کے ان کے منہ پہ تھوک کے نہ آئے۔ تو عقبہ چونکہ اُبیّ کا دوست تھا، تو وہ اُبیّ کے بہکانے کے ساتھ گیا، اور جا کر حضور ﷺ کے سامنے گستاخی کی، اور انکار کر دیا (مظہری)۔ اصل تو یہ آیات اُتریں اس کے متعلق کہ یہ شخص آخرت میں چیخے گا اور کہے گا کہ ہائے کاش! میں رسول کے ساتھ رفاقت اختیار کر لیتا، اور فلاں شخص کو دوست نہ بناتا، فلاں کا مصداق یہاں ہو گا اُبیّ ابن خلف۔ تو میرے پاس نصیحت آ گئی تھی لیکن اس نے مجھے بھٹکا دیا۔

قیامت کے دن بُرے دوست کے متعلق کیا نظریہ ہو گا؟

لیکن جو بھی واقعہ اس قسم کا پیش آ جائے سب کے اوپر اب یہ آیات صادق آئیں گی (واقعہ اگرچہ شانِ نزول میں یہ ایک ہی مذکور ہے)، تو جو شخص کسی دوست کے ساتھ مل کر کسی نیکی سے محروم رہے اور کسی دوست کی رفاقت میں کسی بُرائی میں مبتلا ہو جائے، جیسے ایک دوسرے کو بہکا کے لوگ سینما میں لے جاتے ہیں، نشے کا عادی بنا دیتے ہیں اور اچھے کاموں سے روک دیتے ہیں، یاری دوستی میں آ کے لوگ غلط کاموں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، تو ایسی صورت میں وہ سارے کے سارے ہی پچھتائیں گے، کہ ہائے کاش! ہم فلاں کو دوست نہ بناتے، ان دوستوں کے متعلق یہ تمنا ہو گی کہ یٰلَیۡتَ بَیۡنِیۡ وَبَیۡنَکَ بُعۡدَ الۡمَشۡرِقَیۡنِ (سورۂ زُخرف: ۳۸) ہائے کاش! میرے اور اس کے درمیان بُعد المشرقین ہوتا کہ وہ مشرق میں ہوتا، میں مغرب میں ہوتا، اتنا فاصلہ ہمارے درمیان ہوتا۔ جب کہ دُنیا میں رہتے ہوئے جذبات یہ تھے کہ:

''خاک ایسی زندگی پہ، تم کہاں اور ہم کہاں!''

اور چند منٹ کی بھی جدائی انسان کو گوارہ نہیں ہوتی۔ اُس وقت یہ چاہیں گے کہ مشرق اور مغرب کا فاصلہ ہوتا۔ تو بُری صحبت کے نتیجے کو دکھانے کے لئے یہ آیات بہت ہی واضح ہیں...... ظالم سے مراد وہی بدکردار ہوا، بدکردار آدمی اپنے ہاتھوں کو کاٹے گا، یہ حسرت اور افسوس کے اظہار کے لیے ہماری زبان میں بھی محاورہ ہے۔ کہے گا کہ ہائے کاش! میں رسول کی رفاقت اختیار کر لیتا، اس کے ساتھ مل کے راستہ اختیار کرتا، ہائے میری بربادی! ہائے کاش! میں فلاں کو دوست نہ بناتا۔ ''فلاں'' سے وہی دوست مراد ہے جو بُرا اثر ڈالتا ہے اور انسان کو بُرائی کی طرف لے جاتا ہے۔ تحقیق اس فلاں نے (یعنی میرے اس دوست نے) مجھے بھٹکا دیا نصیحت سے، نصیحت سے محروم کر دیا، مجھے اس نصیحت کے مطابق عمل نہیں کرنے دیا، چلنے نہیں دیا، بعد اس کے کہ وہ نصیحت میرے پاس آ گئی تھی۔

شیطان وقت پہ کام نہیں آتا

وَکَانَ الشَّیۡطٰنُ لِلۡاِنۡسَانِ خَذُوۡلًا: یہ اللہ تعالیٰ کا براہِ راست قول بھی ہو سکتا ہے اور اسی حسرت و افسوس کرنے والے کا قول بھی ہو سکتا ہے، مفسرین کی دونوں رائے ہیں، کوئی کہے گا کہ فلاں تو شیطان تھا جس نے مجھے بہکایا، اب دیکھو! میں عذاب میں مبتلا ہو رہا ہوں اور وہ میرے کچھ کام نہیں آتا، شیطان واقعی وقت پہ صاف جواب دے جاتا ہے...... یا اللہ تعالیٰ اس بات کو نقل کرنے کے بعد یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے ان شیطانوں پر اعتماد کر کے نصیحت کو چھوڑا، اور شیطان وقت پہ جواب دے جاتا ہے، کسی کے کام نہیں

آ تا۔ تو جو شخص بھی بُرائی کی تلقین کرنے والا ہے وہ شیطان کا مصداق ہے، چاہے وہ انس میں سے ہو، چاہے جِن میں سے ہو، تو ایسے دوست جو بُرائی کی طرف لے جاتے ہیں وہ بھی شیطان کا مصداق ہیں۔

رسول کی اپنے رَبّ کے حضور شکایت

اور رسول نے کہا کہ اے میرے رَبّ! (یہ اللہ تعالیٰ کے سامنے رسول کی شکایت ہے اس زندگی میں رہتے ہوئے بھی اور قیامت کے دِن بھی) کہ میری قوم نے اس قرآن کو مہجور قرار دیا، متروک قرار دیا۔ اب متروک قرار دینے میں اگرچہ یہاں مراد کافر ہی ہیں لیکن درجہ بدرجہ یہ بات صادق آ سکتی ہے، اس پر ایمان نہ لانا یہ بھی اس کو مہجور قرار دینا ہے، اور اس میں تدبر نہ کرنا اور اس کے مطابق عمل نہ کرنا، اس کی تلاوت نہ کرنا، یہ سب درجہ بدرجہ مہجور قرار دینے کے مترادف ہے، کیونکہ قرآنِ کریم کا حق یہی ہے کہ اس کے اُوپر ایمان لایا جائے اور اس کی تلاوت کی جائے، اس کو سمجھا جائے، سمجھنے کے بعد اس کے مطابق عمل کیا جائے، یہ سب قرآنِ کریم کے حقوق ہیں۔ اور جتنا کوئی شخص اس کے جس حق میں کوتاہی کرے گا گویا کہ اس نے قرآنِ کریم کو اس درجے میں مہجور قرار دے دیا۔ جیسے حضرت شیخ الاسلام نے اسی طرح سے عموم کا قول کیا ہے کہ ''آیت میں اگرچہ مذکور صرف کافروں کا قول ہے، تاہم قرآن کی تصدیق نہ کرنا، اس میں تدبر نہ کرنا، اس پر عمل نہ کرنا، اس کی تلاوت نہ کرنا، اس کی تصحیح قراءت کی طرف توجہ نہ کرنا، اس سے اعراض کر کے دوسری لغویات یا حقیر چیزوں کی طرف متوجہ ہونا، یہ سب صورتیں درجہ بدرجہ ہجرانِ قرآن کے تحت داخل ہوسکتی ہیں۔'' یہ اسی عموم کی طرف اشارہ کیا، کہ کافر تو سرے سے مانتا ہی نہیں، لیکن مؤمن مان لیتا ہے اور ماننے کے بعد اس کے باقی حقوق ادا نہیں کرتا۔

''مہجور'' کا دُوسرا معنی

اور ''مہجور'' کا دُوسرا مفہوم آپ کے سامنے ذِکر کیا تھا کہ یہ جھک جھک کرنے اور بکنے کے معنی میں بھی یہ لفظ آتا ہے، تو اس کے مطابق حضرت شیخ الاسلام ﷫ بیان کرتے ہیں ''میری قوم نہیں سنتی، انہوں نے قرآنِ کریم جیسی عظیم الشان کتاب کو (العیاذ باللہ) بکواس قرار دیا ہے، جب قرآن پڑھا جاتا ہے تو خوب شور مچاتے اور بک بک جھک جھک کرتے ہیں، تا کہ کوئی شخص سُن اور سمجھ نہ سکے۔'' یہ تو ہو گیا وہ مفہوم جو مترجم نے اختیار کیا، اور دوسرا چھوڑنے کا جو معنی ہے اس کی طرف یوں اشارہ کیا ''اس طرح ان اشقیاء نے قرآن جیسی قابلِ قدر کتاب کو بالکل متروک و مہجور کر چھوڑا ہے'' تو دونوں مفہوم اس میں واضح ہو گئے۔

تسلیٔ رسول

اگلے الفاظ میں حضور ﷺ کے لئے تسلی ہے کہ اگر یہ لوگ آپ کے ساتھ دُشمنی کرتے ہیں تو پہلے بھی انبیاء ﷩ کے ساتھ اسی قسم کے دُشمن ہوئے، ایسے ہی ہم نے مجرمین میں سے ہر نبی کے لیے دُشمن بنائے۔ تیرا رَبّ ہادی اور نصیر کافی ہے۔

قرآنِ کریم اکٹھا نازل کیوں نہیں ہوا؟

آگے پھر کافروں کا ایک قول نقل کیا بطور اعتراض کے، کہ اگر یہ اللہ کی کتاب ہے تو ساری اکٹھی کیوں نہیں اتری؟ تھوڑی تھوڑی جو سناتے ہیں تو اس میں خواہ مخواہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید یہ بنا بنا کے لا رہے ہیں، تو ساری اکٹھی اتار دی جاتی...... اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اکٹھی نہیں اتاری گئی، بلکہ ہم تھوڑی تھوڑی اتارتے ہیں، کیونکہ اس میں حکمت ہے، کہ آپ کے دل کے لئے تثبیت ہے، جب کوئی اعتراض ہوتا ہے ہم فوراً جواب دیتے ہیں، اور بار بار جبریل علیہ السلام آتے ہیں، جس سے اللہ کی مدد اور نصرت نکلتی ہے، اور بار بار ضرورت پیش آتی ہے ہدایات دی جاتی ہیں، تو اس طرح سے سمجھنا بھی آسان، یاد کرنا بھی آسان، آگے اس کی تبلیغ بھی آسان، اور ہر آیت موقع محل کے مطابق اترتی ہے، تو اس کی تفسیر بھی واضح ہوتی چلی جارہی ہے، کہ اس موقع پر یہ اتری تھی، اس سے مطلب واضح ہوگیا۔ اس قسم کے کثیر فوائد ہیں، جن کی بنا پر ہم نے اس کو تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا ہے، اور تھوڑا تھوڑا آپ کے سامنے پڑھا ہے، اکٹھا نہیں اتارا گیا...... اور آپ کے سامنے یہ کوئی مثال بطور اعتراض کے لے آئیں تو ہم اس کے بعد اس کا جواب واقعہ کے مطابق بہت واضح دے دیا کرتے ہیں، تو یہ بھی بار بار نازل کرنے میں ایک حکمت ہے۔

آگے پھر ان کے لئے وعید ہے کہ جو لوگ چہروں کے بل جہنم کی طرف جمع کیے جائیں گے، یہ مرتبے کے لحاظ سے بہت بُرے ہیں اور بہت زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔

گزشتہ اُمتوں کے واقعات کا اِجمالی تذکرہ

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ: قرآنِ کریم کی جس طرح سے عادت ہے، آپ کے سامنے بارہا اس کی تفصیل کی گئی، کہ اُصول کو ذکر کرنے کے بعد پھر کچھ واقعات بیان کیے جایا کرتے ہیں، جن سے ان اُصول کی صداقت ثابت ہوتی ہے کہ توحید و رسالت کو قبول کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے اس کی باتوں کو قبول کر کے چلنے والوں کا انجام دنیا میں کیا سامنے آتا ہے، اور دوسرے فریق کا انجام کیا سامنے آتا ہے، واقعات کے ساتھ یہ باتیں زیادہ واضح ہوتی ہیں، اس لیے اگلی آیات میں واقعات کی طرف اشارہ ہے۔ پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا واقعہ ہے، بہت ہی مختصر ساذکر کیا اور یہی کہا کہ جب انہوں نے آیات کی تکذیب کی تو ہم نے ان کو ریزہ ریزہ کر دیا، نیست و نابود کر دیا۔ دوسرے نمبر پر قومِ نوح کے واقعے کی طرف اشارہ کیا کہ جب انہوں نے تکذیب کی تو ہم نے انہیں ڈُبو دیا اور ان کو لوگوں کے لیے عبرت بنا دیا، اور یہ تو دُنیا کی بات ہے اور آخرت میں ہم نے ظالموں کے لیے عذابِ الیم تیار کر رکھا ہے۔ اور آگے پھر عاد، ثمود، اصحابِ رَس ان کا بھی اجمالاً ذکر کر دیا، وَقُرُوْنًا بَیْنَ ذٰلِکَ کَثِیْرًا: اس کے درمیان میں اور بہت سی جماعتیں گزری ہیں جن کے ساتھ یہی واقعہ پیش آیا۔ ہر کسی کے سامنے ہم نے مثالیں پیش کیں ان کو سمجھانے کے لئے، لیکن نتیجتاً جب وہ نہیں سمجھے تو سب کو توڑ پھوڑ دیا۔ اور آگے قومِ لُوط کے واقعے کی طرف اشارہ ہے کہ اس بستی پر تو یہ آتے رہتے ہیں جس کے اُوپر بُری بارش کی گئی تھی، بُری بارش سے پتھروں کی بارش مراد ہے۔ تو یہ اس کو دیکھتے نہیں؟ اس میں کوئی

تدبر نہیں کرتے؟ اصل بات یہی ہے کہ یہ آخرت سے نہیں ڈرتے، ان کو جی اُٹھنے کی اُمید نہیں۔ کیا انہوں نے اسی بستی کو دیکھا نہیں؟ یعنی دیکھتے تو ہیں، لیکن متاثر نہیں ہوتے، چونکہ آخرت کے متعلق ان کا عقیدہ نہیں ہے۔

کافروں کا اِستہزا

وَاِذَا رَاَوۡكَ اِنۡ يَّتَّخِذُوۡنَكَ اِلَّا هُزُوًا: آگے پھر وہی کافروں کی طرف سے اِستہزا کی بات ہے کہ جب آپ کو دیکھتے ہیں تو مذاق کرتے ہیں، اِستہزا کرتے ہیں، دیکھ لو جی! یہ ہیں اللہ کے رسول، ان کو اللہ نے رسول بنا کے بھیجا ہے۔ مطلب یہ کہ ان کی کیا حیثیت ہے؟ کیا امتیاز ان کو حاصل ہے ہمارے مقابلے میں؟ جو اللہ نے ان کو رسول بنا دیا، یوں کہہ کہہ کے مذاق اُڑاتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ اگر ہم ثابت قدم نہ ہوتے اور اپنے آپ کو خوب اچھی طرح سے جما کر نہ رکھتے، اور مضبوط نہ رہتے تو یہ تو ہمیں بہکا ہی دیتا، ایسی باتیں کر کے وہ مذاق اُڑاتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جب عذاب سامنے آئے گا تو ان کو پتا چلے گا کہ بھٹکا ہوا کون ہے؟

کافر خواہشات کے پجاری ہیں

اَرَءَيۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ: پھر ان کی گمراہی کی ایک وجہ ذکر کر دی کہ یہ جو بھٹکے پھرتے ہیں اور گمراہ ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ خواہشات کے پیچھے چلتے ہیں، یہ اپنے خالق کو اپنا خدا نہیں سمجھتے، اپنی خواہش کو اپنا خدا سمجھتے ہیں، اِلٰہ سمجھنے کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ اس کی بِلا چوں چراں اطاعت کی جائے کہ جو اس کا حکم آ جائے سر آنکھوں پر۔ تو جس کا حکم آپ اس طرح سے مانیں، بِلا چون و چراں اس کے پیچھے لگ جائیں، تو عملاً آپ نے اس کو اِلٰہ قرار دے دیا۔ تو یہ شخص اپنی خواہشات کو اس درجے میں لائے ہوئے ہے کہ جو دِل میں آ جائے وہ کرنا ہے، اپنی خواہش کے خلاف برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ تو یہ لوگ ایسے ہیں جو اپنی خواہشات کے پجاری ہیں، اپنی خواہشات کے متبع ہیں، ایسا شخص کسی کے سمجھائے سمجھا نہیں کرتا، ہدایت اس شخص کو ملا کرتی ہے جو اپنی خواہشات کو مٹائے، اَحکام کو مقدم رکھے، اپنے دِل کی آرزو کے پیچھے نہ چلے۔

جنّت کے گرد مکارِہ کی، اور جہنّم کے گرد خواہشات کی باڑ

کیونکہ انسان کے دل میں خواہشات تو اس قسم کی ابھرتی ہیں جو اس کو فسق و فجور کی طرف لے جاتی ہیں، عیش وعشرت کی طرف لے جاتی ہیں، اور یہی راستہ غلط ہے جو ہلاکت کی طرف انسان کو لے جاتا ہے، اور احکام جتنے ہوا کرتے ہیں وہ خواہشات کے خلاف ہوتے ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس وقت جنّت کو پیدا کیا تو جبریل علیہ السلام کو فرمایا کہ جاؤ جنّت کی سیر کر کے آؤ، تو جس وقت جبریل علیہ السلام گئے اور جنّت کی سیر کی، تو کہنے لگے یا اللہ! تُو نے تو اس میں اتنی نعمتیں اور اتنی عیش وعشرت رکھی ہے کہ جو شخص بھی اس کے متعلق تذکرہ سنے گا وہ تو ضرور جنّت میں چلا جائے گا، یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ جنّت میں نہ جائے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے اردگرد باڑ کر دی مَکَارِہ کی، ناگوار چیزوں کی، جو خواہشات کے خلاف ہیں، کہ جب تک کوئی شخص ان ناگواریوں کو برداشت نہیں کرے گا اس وقت تک جنّت میں نہیں جائے گا۔ یہ مکارہ وہی باتیں ہیں جو خواہشات کے خلاف ہیں،

ہمارا سونے کو جی چاہتا ہے لیکن جاگنے کا حکم ہے، ہمارا کھانے کو جی چاہتا ہے لیکن روزے کا حکم ہے، ہمارا پیسے جمع کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن خرچ کرنے کا حکم ہے، یہ سب انسان کو ناگوار گزرتی ہیں، سردی میں وضو کرنا ناگوار ہے، گرمی میں روزہ رکھنا ناگوار ہے، اور صبح کے وقت اُٹھنا ناگوار ہے، تو شریعت کے جتنے احکام ہیں وہ خواہشات کے خلاف ہی ہیں۔ تو جب جبرئیل علیہ السلام نے دوبارہ جا کے دیکھا تو آ کے کہتے ہیں یا اللہ! مجھے تو اُمید نہیں کہ کوئی جنت تک پہنچ سکے، اتنی ناگواریاں کون برداشت کرے گا؟ اور ایسے ہی جب جہنم کو پیدا کیا تو اللہ تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا تو جبرئیل علیہ السلام کہنے لگے کہ اس میں تو اتنا سخت عذاب آپ نے پیدا کر دیا کہ جو شخص بھی سن لے گا وہ کوئی بھی ادھر آنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ تو پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے اردگرد باڑ شہوات کی کر دی، کہ خواہشات کے مطابق چلنے والے گویا کہ جہنم کا سفر طے کر رہے ہیں۔ تو جب جبرئیل علیہ السلام نے دوبارہ جا کر دیکھا تو کہنے لگے یا اللہ! کوئی نہیں بچے گا، سب ادھر ہی آئیں گے،[1] کیونکہ زندگی میں ہر شخص اپنی خواہش کے پیچھے چلنے کی کوشش کرتا ہے۔ خواہش کے پیچھے چلنا یہ جہنم کے راستہ کو طے کرنے والی بات ہے، تو جب خواہشات کے پیچھے چلیں گے، جہنم میں چلے جائیں گے، تو انہوں نے اپنا معبود اپنی خواہش کو بنا لیا۔

کیا آپ ان کے اوپر کوئی وکیل ہیں، کارساز ہیں، ذمے دار ہیں؟ کہ آپ نے ان کو راستہ ضرور دکھانا ہے۔ اور بظاہر یہ جو آپ کی باتیں سنتے ہیں تو آپ سمجھتے ہوں گے کہ یہ سن بھی رہے ہیں اور سمجھ بھی رہے ہیں، یہ کچھ نہیں سنتے سمجھتے، یہ تو جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ راستے سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ اس مضمون کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ اعراف میں کر دی گئی تھی۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ

أَلَمْ تَرَ إِلَىٰ رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَاءَ لَجَعَلَهُ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا
اے مخاطب! کیا تُو نے نہیں دیکھا اپنے رب کی طرف کہ اس نے کیسے پھیلایا سائے کو، اور اگر وہ چاہتا تو اس کو ٹھہرا ہوا رکھتا، پھر بنایا ہم نے
الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيلًا ﴿٤٥﴾ ثُمَّ قَبَضْنَاهُ إِلَيْنَا قَبْضًا يَسِيرًا ﴿٤٦﴾ وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ
سورج کو اس کے اُوپر دلیل ﴿٤٥﴾ پھر سمیٹ لیا ہم نے اس سائے کو اپنی طرف آہستہ آہستہ سمیٹنا ﴿٤٦﴾ اور اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے
لَكُمُ اللَّيْلَ لِبَاسًا وَالنَّوْمَ سُبَاتًا وَجَعَلَ النَّهَارَ نُشُورًا ﴿٤٧﴾ وَهُوَ الَّذِي أَرْسَلَ
رات کو لباس بنایا اور نیند کو راحت بنایا، اور اس نے دن کو اُٹھنے کا وقت بنایا ﴿٤٧﴾ اور اللہ وہ ہے جس نے بھیجا ہواؤں کو

(۱) ترمذی ۸۳/۲ باب ماجاء حفت الجنة۔ ابو داؤد ۲۹۶/۲ باب خلق الجنة والنار۔ مشکوٰۃ ۵۰۵/۲ باب خلق الجنة۔ نیز دیکھیں: بخاری ۹۶۰/۲ باب حجبت النار بالشهوات۔

الرِّیٰحَ بُشْرًا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ﴿۴۸﴾ لِّنُحْیِۦَ بِهٖ

بشارت دینے والی اس کی رحمت سے پہلے، اور اُتارا ہم نے آسمان سے پاک کرنے والا پانی ﴿۴۸﴾ تاکہ آباد کریں ہم اس کے ذریعے

بَلْدَةً مَّیْتًا وَّنُسْقِیَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِیَّ كَثِیْرًا ﴿۴۹﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ

بنجر علاقے کو، اور تاکہ پلائیں ہم وہ پانی اپنی مخلوق میں سے بہت سے چوپایوں اور بہت سے انسانوں کو ﴿۴۹﴾ بے شک ہم اس پانی کو پھیرتے ہیں

بَیْنَهُمْ لِیَذَّكَّرُوْا ۖ فَاَبٰۤی اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۵۰﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِیْ كُلِّ

ان کے درمیان تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں، لیکن اکثر لوگ ناشکری کیے بغیر نہ رہے ﴿۵۰﴾ اور اگر ہم چاہتے تو البتہ اُٹھا دیتے ہر

قَرْیَةٍ نَّذِیْرًا ﴿۵۱﴾ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِیْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِیْرًا ﴿۵۲﴾ وَهُوَ

بستی میں ڈرانے والا ﴿۵۱﴾ پس تو کافروں کی اطاعت نہ کر، اور جہاد کر ان کافروں کے ساتھ اس قرآن کے ذریعے سے بڑا جہاد ﴿۵۲﴾ اللہ

الَّذِیْ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَجَعَلَ بَیْنَهُمَا

جس نے چلائے دو دریا، یہ میٹھا خوشگوار ہے اور یہ نمکین کڑوا ہے، اور بنادی اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے درمیان

بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۵۳﴾ وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّ

ایک آڑ اور ایک بہت بڑی محفوظ رُکاوٹ ﴿۵۳﴾ اللہ وہ ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا، پھر بنایا اس انسان کو نسب والا اور

صِهْرًا ؕ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِیْرًا ﴿۵۴﴾ وَیَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُهُمْ وَلَا

سسرال والا اور تیرا رَبّ قدرت رکھنے والا ہے ﴿۵۴﴾ اور عبادت کرتے ہیں یہ اللہ کے علاوہ ایسی چیزوں کی جو ان کو نفع نہیں دیتیں اور نہ

یَضُرُّهُمْ ؕ وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰی رَبِّهٖ ظَهِیْرًا ﴿۵۵﴾ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ

ان کو نقصان دیتی ہیں، اور کافر اپنے رَبّ کے خلاف مددگار ہے ﴿۵۵﴾ اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر بشارت دینے والا اور

نَذِیْرًا ﴿۵۶﴾ قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ یَّتَّخِذَ اِلٰی رَبِّهٖ

ڈرانے والا بنا کر ﴿۵۶﴾ آپ کہہ دیجئے کہ میں نہیں مانگتا تم سے اس تبلیغ پر کوئی اُجرت، مگر جو شخص چاہے کہ اختیار کرے اپنے رَبّ کی طرف

سَبِیْلًا ﴿۵۷﴾ وَتَوَكَّلْ عَلَی الْحَیِّ الَّذِیْ لَا یَمُوْتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ؕ وَكَفٰی بِهٖ

راستہ ﴿۵۷﴾ بھروسا کیجئے اس پر جو دائماً زندہ ہے جس کو موت نہیں آئے گی، اور تسبیح بیان کیجئے اس کی حمد کے ساتھ، اور کافی ہے وہ

بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِیْرَا ۚ﴿۵۸﴾ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ

اپنے بندوں کے گناہوں کی خبر رکھنے والا ﴿۵۸﴾ جس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو اور ان چیزوں کو جو ان دونوں کے درمیان میں ہیں

سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ۚ اَلرَّحْمٰنُ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِیْرًا ﴿۵۹﴾ وَاِذَا قِیْلَ

چھ دن میں پھر اس نے قرار پکڑا عرش پر، وہ رحمٰن ہے پس پوچھ تو اس کے متعلق خبر رکھنے والے سے ﴿۵۹﴾ اور جب ان سے کہا جاتا ہے

لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ۗ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ﴿۶۰﴾

کہ سجدہ کرو رحمٰن کو! تو یہ کہتے ہیں کہ رحمٰن کیا ہوتا ہے؟ کیا ہم سجدہ کریں اس چیز کو جس کے متعلق تُو ہمیں حکم دیتا ہے؟، اور زیادہ کرتی ہے یہ بات ان کو از روئے نفرت کے ﴿۶۰﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ: اَلَمْ تَرَ کا خطاب ہر مخاطب کو ہے۔اے مخاطب! کیا تُو نے نہیں دیکھا اپنے رَبّ کی طرف کہ اس نے کیسے پھیلایا سائے کو۔ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاکِنًا: اور اگر وہ (تیرا رَبّ) چاہتا تو البتہ کر دیتا اس سائے کو ساکن، ٹھہرا ہوا، ٹھہرنے والا۔ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَیْهِ دَلِیْلًا: پھر بنایا ہم نے سورج کو اس کے اوپر دلیل۔ دلیل یہ دَلَّ یَدُلُّ سے ہے، راہنمائی کرنا۔ دلیل: راہنمائی کرنے والا، ایک چیز جو دوسرے کو سمجھنے کا ذریعہ بنتی ہے تو اس کو دلیل کہا جاتا ہے۔ باقی! دلالت کی چھ قسمیں آپ منطق میں پڑھتے رہتے ہیں۔ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَیْنَا قَبْضًا یَّسِیْرًا: پھر ہم نے قبض کیا اس سائے کو اپنی طرف قبض کرنا آہستہ آہستہ، سمیٹ لیا ہم نے اس سائے کو اپنی طرف آہستہ آہستہ سمیٹنا۔ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الَّیْلَ لِبَاسًا: اور اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لیے رات کو لباس بنایا، یعنی جس طرح سے لباس انسان کے بدن کو چھپالیتا ہے اسی طرح سے رات بھی اپنے اندھیرے میں ہم سب کو چھپالیتی ہے۔ وَالنَّوْمَ سُبَاتًا: اور نیند کو راحت بنایا، سُبات کا معنی راحت اس طرح سے بن گیا کہ سَبَتَ اصل میں کہتے ہیں قطع کرنے کو، سبت قطع کے معنی میں ہے، اور نیند ہمارے اعمال اور ہمارے خیالات کو قطع کرنے کا ذریعہ بنتی ہے، کام کاج بھی ختم ہو جاتا ہے، دماغ سے خیالات بھی ختم ہو جاتے ہیں، اس کے نتیجے میں پھر ہمیں راحت حاصل ہوتی ہے، بدنی بھی اور ذہنی بھی، اس کا مفہوم ہے قطعًا لاعمالکم وراحةً لابدانکم (غرائب التفسیر)، حاصل ترجمہ اس کا ہوتا ہے کہ ہم نے نیند کو راحت بنایا، آرام بنایا، یہ حاصل ترجمہ ہے، ورنہ اصل ہے تمہارے اعمال اور تمہارے خیالات اور تمہاری حرکات کو قطع کرنے والی چیز جس کے ساتھ تمہارے کام بھی ختم ہو جاتے ہیں اور ذہنی خیالات بھی ختم ہو جاتے ہیں، پھر تمہیں ذہنی سکون اور بدن کی راحت حاصل ہوتی ہے۔ وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا: نشور: اُٹھنا یا اُٹھانا دونوں معنوں میں آتا ہے، اور یہاں معنی ہے جَعَلَ النَّهَارَ وَقْتَ نُشُوْرٍ: اور اس نے بنایا دن کو تمہارے اٹھنے کا وقت۔ اکثر و بیشتر موت کے بعد ''نشور'' کا لفظ آیا کرتا ہے، مرنا اور جی اٹھنا، جس طرح اسی

سورت کے شروع میں آیا تھا: لَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا۔ تو سو کر اٹھنا یہ بھی ایسے ہی ہے جیسے مرلے کے بعد دوبارہ جینا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اکثر و بیشتر آخرت میں جو بعثِ اَموات ہوگی، مُردوں کو جو زندہ کرنا ہوگا، اس کو نیند کے مسئلے کے ساتھ ہی سمجھایا ہے، جس طرح انسان سوتا ہے تو ایسے ہے جیسے مرگیا، بعد میں جاگتا ہے تو ایسے ہے جیسے جی اٹھا، اور حضور ﷺ سو کر اٹھنے کے بعد جو دُعا پڑھا کرتے تھے تو اس میں بھی ایسے ہی الفاظ ہیں: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَحْيَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ''[1] اسی سے ذہن آخرت کی طرف منتقل ہوتا ہے، اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں زندہ کیا ہمیں موت دینے کے بعد، اسی کی طرف ہی اٹھ کے جانا ہے آخرت میں، یعنی اسی سونے اور جاگنے کو رسول اللہ ﷺ نے موت و حیات کے ساتھ تعبیر کیا۔ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ: اور اللہ وہ ہے جس نے بھیجا ہواؤں کو۔ ریاح، ریح کی جمع ہے، اور بُشْرًا یہ بشیر کی جمع بھی ہوسکتی ہے اور بَشُور کی جمع بھی ہوسکتی ہے، ''جلالین'' میں بشیر کی جمع بنایا گیا ہے، اور ''مدارک'' میں بَشُور کی جمع بنایا گیا ہے، فعیل کے وزن پر یا فعول کے وزن پر، بات ایک ہی ہے، رحمت سے یہاں بارش مراد ہے، اللہ وہ ہے جس نے بھیجا ہواؤں کو بشارت دینے والی اس کی رحمت سے پہلے۔ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا: اور اُتارا ہم نے آسمان سے پانی طہور۔ طہور کہتے ہیں جو خود پاک ہو اور پاک کرنے والا ہو، پاک کرنے والا پانی، مُطَهِّر کے معنی میں، لِنُحْيِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا: تاکہ زندہ کریں ہم اس پانی کے ذریعہ سے مُردہ علاقے کو، بلدۃ: شہر کو کہتے ہیں یہاں علاقہ مراد ہے، تاکہ ہم اس پانی کے ذریعے سے بنجر علاقے کو آباد کریں۔ زمین کی موت ہوتی ہے اس کا بنجر ہو جانا، اور زمین کا زندہ ہونا ہوتا ہے اس کا آباد ہو جانا، جب زمین میں نباتات اُگتی ہے تو گویا کہ وہ زندہ ہوگئی، آخرت کے بعث اور نشر پر اللہ تعالیٰ نے زمین کے اِحیاء سے بھی استدلال کیا ہے، کہ جس طرح زمین بنجر ہوتی ہے، بعد میں اللہ تعالیٰ اسے آباد کر دیتا ہے، اسی طرح مرنے کے تم دوبارہ جی اٹھو گے، مختلف آیات کے اندر اس سے بھی استدلال کیا گیا ہے۔ تاکہ زندہ کریں ہم اس کے ذریعے سے بنجر علاقے کو، وَّنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِيَّ كَثِيْرًا: اَناسی انسان کی جمع ہے، اصل میں اناسین تھا، آخر میں نون تھا، نون کو یاء کر کے یاء کو یاء میں ادغام کر دیا، اَناسی بن گیا، یا اِنسی کا جمع ہے (جلالین وغیرہ)، وَّنُسْقِيَهٗ اور تاکہ پلائیں ہم وہ پانی اَنْعَامًا وَّاَنَاسِيَّ كَثِيْرًا چوپایوں کو اور بہت سے انسانوں کو، مِمَّا خَلَقْنَآ اپنی مخلوق میں سے، اپنی مخلوق میں سے بہت سے چوپایوں اور بہت سے انسانوں کو ہم وہ پانی پلائیں، اس لیے ہم وہ پانی اتارتے ہیں، وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ: ہٗ ضمیر پانی کی طرف لوٹ رہی ہے۔ بے شک ہم اس پانی کو پھیرتے ہیں ان کے درمیان یعنی کبھی کسی جگہ اتار دیا کبھی کسی جگہ اتار دیا، کسی جگہ تھوڑا اتار دیا کسی جگہ زیادہ اتار دیا، لِيَذَّكَّرُوْا، تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا: اَبیٰ یابیٰ: انکار کرنا۔ لفظی معنی بنتا ہے، انکار کیا اکثر لوگوں نے مگر ناشکری کا۔ اور اس قسم کی ترکیب آپ کے سامنے سورۂ بنی اسرائیل میں بھی گزری تھی۔ حاصل ترجمہ اس کا کر دیا جاتا ہے کہ اکثر لوگ ناشکری کیے بغیر نہ رہے۔ لفظی ترجمہ ہے اکثر لوگ رک گئے ہر چیز سے سوائے ناشکری کے، یعنی ایک ناشکری سے نہیں رکے، باقی ہر چیز سے رک گئے، لفظی معنی تو یہی ہے، اور محاورۃً اس کا ترجمہ یوں ہوگیا کہ ناشکری کیے بغیر نہ رہے۔ وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا: اور اگر ہم چاہتے تو البتہ اُٹھا دیتے ہر بستی میں ڈرانے والا۔ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا: پس تو کافروں

(۱) بخاری ۲/ ۹۳۴ باب ما یقول اذا اصبح۔ مشکوٰۃ ۱/ ۲۰۸ باب ما یقول عند الصباح والمساء فصل اول

کی اطاعت نہ کر، اور جہاد کر ان کافروں کے ساتھ اس قرآن کے ذریعے سے بڑا جہاد۔ بِهٖ کی ضمیر قرآن کی طرف لوٹ گئی (عام تفاسیر)، یعنی قرآن کریم کے ذریعے سے ان کافروں کے ساتھ پورے زور شور سے جہاد کیجئے، اور بِهٖ کی ضمیر بعض مفسرین نے اللہ کی طرف بھی لوٹائی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے، جاھدھم باللہ ای بتوفیق اللہ (نسفی، مظہری)، لیکن پہلا معنیٰ زیادہ راجح ہے۔ وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ: مَرَجَ کا معنیٰ ہوتا ہے کسی چیز کو آزاد چھوڑ دینا۔ مَرَجَ الدابۃ: دابہ کو آزاد چھوڑ دیا، اس لیے مَرج چراگاہ کو بھی کہتے ہیں جس میں جانوروں کو چرنے کے لیے آزاد چھوڑا جاتا ہے، بحرین: دو دریا۔ اللہ وہ ہے جس نے چلائے دو دریا، دو دریا بہادیے، آزادانہ چھوڑ دیے، هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ: عذب: میٹھا۔ فرات: پیاس بجھانے والا، خوشگوار، لذیذ۔ یہ میٹھا خوشگوار ہے پیاس بجھانے والا ہے۔ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ: اور یہ نمکین کڑوا ہے، ملح: نمک کو کہتے ہیں، اور اُجاج: کڑوے کو۔ یہ نمکین ہے اور کڑوا ہے۔ هٰذَا اور هٰذَا سے مراد یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ایک عَذْبٌ فُرَاتٌ ہے، اور ان دونوں میں سے ایک مِلْحٌ اُجَاجٌ ہے۔ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا: اور بنادیا اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے درمیان ایک آڑ، وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا: اور ایک بہت بڑی محفوظ رکاوٹ۔ یہ لفظ اسی سورت میں پہلے بھی آیا تھا اور آپ کے سامنے عرض کیا تھا کہ ''حجر'' رکاوٹ کے معنی میں ہے، اور ''محجور'' اسی کی تاکید ہے، اور ان کے درمیان میں اللہ تعالیٰ بہت بڑی رکاوٹ بنادی۔ برزخ پردے کو کہتے ہیں، اور برزخ کا لفظ پیچھے سورۂ مؤمنون میں بھی آیا تھا، مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (سورۂ مؤمنون: ۱۰۰)۔ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا: اللہ وہ ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا، فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا: ای ذا نسب وذا صھر، پھر بنایا اس انسان کو نسب والا اور صہر والا۔ صہر کہتے ہیں سسرال کو۔ نسب والا بنایا اور سسرال والا بنایا۔ انسان کا تعلق دو طرح سے ہی ہوتا ہے، نسب حقیقتاً تو باپ کی طرف ہوا، باپ کا خاندان، اور عرفاً ماں کے خاندان کو بھی انسان اپنا نسب کہہ دیتا ہے، اور صہر ہوتا ہے جس کے ساتھ سسرالی تعلق ہوتا ہے، جہاں شادی ہوگئی، بیوی کی وساطت سے جو خاندان آپ کے ساتھ جڑتا ہے وہ آپ کا صہر ہے۔ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا: اور تیرا رب قدرت رکھنے والا ہے، وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ: اور عبادت کرتے ہیں یہ اللہ کے علاوہ ایسی چیزوں کی جو ان کو نفع نہیں دیتیں اور نہ ان کو نقصان دیتی ہیں۔ مَا چونکہ لفظاً مفرد ہے، اور مذکر ہے، اس لیے لا ینفع اور لا یضر میں ضمیر مفرد مذکر کی لوٹی، ایسی چیزوں کو پوجتے جو انہیں نفع نہیں دیتیں، اور انہیں کوئی نقصان نہیں دیتیں، یعنی عبادت کرنے کی صورت میں انہیں نفع نہیں پہنچاتیں، عبادت نہ کرنے کی صورت میں انہیں نقصان نہیں پہنچاتیں، مطلب یہ ہے کہ ان کے نفع اور نقصان پر وہ کسی قسم کی قدرت نہیں رکھتیں، وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا: ظہیر مددگار کو کہتے ہیں۔ اور کافر اپنے رب کے خلاف مددگار ہے، یعنی شیطان رب کا مخالف اور حریف ہے، اور یہ اس کا مددگار ہے۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا: اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر مبشر اور نذیر بنا کر۔ مبشر: بشارت دینے والے۔ نذیر: ڈرانے والے۔ قُلْ مَآ اَسْاَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ: آپ کہہ دیجئے کہ میں نہیں مانگتا تم سے اس تبلیغ پر کوئی اجرت، یعنی قرآن کریم کی تبلیغ جو کرتا ہوں، تمہیں پہنچاتا ہوں، تو میں اس پر کوئی اُجرت نہیں مانگتا۔ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا: مگر جو شخص چاہے کہ اختیار کرے اپنے رب کی طرف راستہ، اس چیز کا میں مطالبہ کرتا ہوں کہ تم میں سے جو چاہے اپنے رب کی طرف راستہ اختیار کرلے، اور آپ جانتے ہیں کہ یہ اُجرت نہیں ہے، اس میں فائدہ دوسرے کا ہی ہے۔ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ: تَوَكَّلْ امر کا صیغہ ہے۔

بھروسا کر اس پر جو زندہ ہے جو مرے گا نہیں۔ الْحَيّ: جو کہ دائماً زندہ ہے، جس کے لیے صفتِ حیات ثابت ہے، الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ: جو کہ مرے گا نہیں، جس کو موت نہیں آئے گی، الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ پر بھروسا کیجئے، یعنی اللہ تعالیٰ پر بھروسا کیجئے جس کی صفت ہے حی لا یموت، ایسا زندہ جس کو موت نہیں آئے گی، وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ: اور تسبیح بیان کیجئے اس کی حمد کے ساتھ۔ بِحَمْدِهٖ أي مُتَلَبِّسًا بِحَمْدِهٖ۔ وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا: كَفٰى بِهٖ ایسے ہے جیسے كفى بالله آجایا کرتا ہے، ''ہ'' ضمیر فاعل ہے، کافی ہے وہ اپنے بندوں کے گناہوں کی خبر رکھنے والا۔ خَبِيْرًا بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ یوں اس کا معنی بنے گا۔ كفى بالله أي كفى الله، کفی کے فاعل کے اوپر باء زائدہ آیا کرتی ہے۔ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ أَيَّامٍ: جس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو اور ان چیزوں کو جوان دونوں کے درمیان میں ہیں چھ دن میں، ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ: پھر اس نے قرار پکڑا عرش پر۔ اَلرَّحْمٰنُ: وہ رحمٰن ہے، یہ خبر ہے اور مبتدا یہاں محذوف ہے هُوَ، یعنی جس کے یہ حالات بیان کیے جارہے ہیں وہ رحمٰن ہے، فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا: أي فَسْئَلْ خَبِيْرًا بِهٖ، بِهٖ یہ خَبِيْرًا کے متعلق ہے۔ پس پوچھ تو اس کے متعلق خبر رکھنے والے سے، جو رحمٰن کی خبر رکھتا ہے، جس کو رحمٰن کے حالات معلوم ہیں اس سے پوچھ اس رحمٰن کی شان۔ وَإِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ: اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ سجدہ کرو رحمٰن کو، قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ: تو یہ کہتے ہیں کہ رحمٰن کیا ہوتا ہے؟ یہ مَا الرَّحْمٰنُ ایسے ہی ہے جیسے ہم کہتے ہیں الإنسان ما هو؟ تو وہ کہتے ہیں کہ رحمٰن کیا ہے؟ یعنی رحمٰن کیا ہوتا ہے؟ أَنَسْجُدُ لِمَا تَأْمُرُنَا: کیا ہم سجدہ کریں اس چیز کو جس کے متعلق تو ہمیں حکم دیتا ہے؟ جس کے متعلق تُو نے کہہ دیا ہم اس کو سجدہ کرنے لگ جائیں؟ وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا: اور زیادہ کرتی یہ بات ان کو از روئے نفرت کے، یہ بات ان کی نفرت کو بڑھاتی ہے۔

تفسیر

ماقبل سے ربط

پچھلے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اُممِ سابقہ کے واقعات بیان فرمائے تھے، اور ان واقعات سے تاریخی دلائل کے ساتھ توحید، رسالت، معاد کی صداقت کو پیش کیا تھا، اور سرورِ کائنات ﷺ کے لئے تسلی کا سامان مہیا کیا تھا، جس طرح سے قرآنِ کریم اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لئے عقلی دلائل دیتا ہے، اسی طرح سے تاریخی دلائل بھی ہوتے ہیں۔ اور واقعات یہ تاریخی دلائل کے درجے میں ہیں کہ دیکھو! فلاں وقت میں بھی ایک پیغمبر اسی طرح سے آئے تھے، ایک نبی آئے تھے، ایک رسول آئے تھے، انہوں نے آکر یہی تبلیغ کی تھی، یہ دلیل ہے اس بات کی کہ یہ نظریات صحیح ہیں یہ باتیں صحیح ہیں، یہ کوئی ایسی باتیں نہیں ہیں جو صرف اسی پیغمبر نے تمہارے سامنے کہیں ہوں، رسالت کا سلسلہ بھی قدیم ہے اور توحید کی دعوت اور تبلیغ بھی قدیم ہے، پہلے سے چلی آرہی ہے، یہ تاریخی دلائل ہوتے ہیں۔ اور پھر قوموں کی طرف سے رسولوں کے ساتھ جو معاملہ کیا جاتا ہے اس کا بیان سرورِ کائنات ﷺ کے لئے باعث تسلی ہے، آپ کے دل کو قوت پہنچی ہے کہ پہلے لوگوں کے ساتھ بھی ایسے ہوا تھا، اور ان کی عادت یہی ہے کہ جوان کو سمجھائے اور ان کے سامنے حق بات کہے، یہ لوگ اس کو پریشان کیا ہی کرتے ہیں۔ اور پھر نتیجہ سامنے آجانے کے بعد بشارت اور

انذار دونوں مضمون متحقق ہوجاتے ہیں کہ ماننے والوں کے سامنے کس طرح سے اچھا نتیجہ آیا، اور نہ ماننے والوں کو کس طرح سے تباہ وبرباد کر دیا گیا، یہ دنیوی عذاب اور دنیوی کامیابی، اِس کو بھی بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے، یہ بشارت اور انذار کا مضمون ہوتا ہے۔ اِس رکوع میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے آفاقی اور اَنفسی دلائل قائم کیے ہیں، اس کائنات میں اللہ کی قدرت جس طرح سے نمایاں ہے، جس میں ایک ایک چیز کے اندر انسان کے اوپر احسان کا پہلو بھی ہے وہ ذکر کیا ہے، احسانات جتلائے ہیں، اپنی قدرت کی وضاحت فرمائی ہے، اس کے ساتھ بھی توحید پر دلیل مہیا کرنی مقصود ہے، اور سرورِ کائنات ﷺ کو انہی دلائل کے ساتھ مسلح کیا جارہا ہے جس کے بعد کہا جارہا ہے کہ آپ انہی دلائل کے ساتھ ان لوگوں کے خلاف جہاد کیجئے۔ چونکہ یہ سورت مکی ہے اور مکہ معظمہ میں جہاد بالسیف اور جہاد بالسنان تو تھا نہیں، تلوار اور نیزے کی لڑائی تو تھی نہیں، وہاں اگر جہاد تھا تو اللہ تعالیٰ کی طرف یہی تبلیغ کی صورت میں تھا، اور یہ دلائل جو ہیں یہی اس جہاد کے ہتھیار ہیں۔ اور پھر حضور ﷺ کے لیے اس میں تسلی کا مضمون بھی ہے۔

سایہ اور دُھوپ میں قدرت کے دلائل

اَلَمْ تَرَاِلٰی رَبِّكَ كَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ: یہ آفاق کی طرف متوجہ کیا۔ ظل سے یہاں یہ سایہ بھی مراد ہوسکتا ہے جو آپ کا، دیواروں کا، درختوں کا بھی ہوتا ہے، صبح کو جس وقت سورج نکلنے لگتا ہے تو یہ سایہ بہت پھیلا ہوا ہوتا ہے، آہستہ آہستہ جیسے سورج اُونچا ہوتا چلا جاتا ہے، سایہ سمٹتا چلا جاتا ہے، حتیٰ کہ جب سورج سر پہ آجاتا ہے، استواء کی حالت ہوتی ہے تو بعض موسموں میں سایہ بالکل ختم ہوجاتا ہے، یا برائے نام رہ جاتا ہے، بعض چیزوں کا بالکل نیچے آجاتا ہے، جیسے کوئی لاٹھی وغیرہ کھڑی کی ہوئی ہو تو بعض علاقوں میں بعض موسموں میں سایہ بالکل ہی ختم ہوجاتا ہے، اور بعض میں کچھ باقی رہ جاتا ہے، پھر دوسرے وقت میں جب سورج غروب کی طرف آتا ہے تو یہ سایہ مشرق کی طرف پھیلنے لگ جاتا ہے۔ تو اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت نمایاں ہے اور احسان بھی۔ احسان تو اس طرح سے کہ انسان کی زندگی میں اس کے لئے جس طرح دُھوپ ضروری ہے اسی طرح سے سایہ بھی ضروری ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ہمیشہ سایہ ہی رکھتا جس طرح سے مثال کے طور پر فجر کا وقت ہے جس میں دُھوپ کا نام ونشان نہیں، اگر یہی موسم باقی رہے اور دُھوپ نہ آئے تو آپ جانتے ہیں کہ انسان کی زندگی اس میں بھی مشکل ہے، اور اگر دُھوپ ہی رہے سایہ میسر نہ آئے تو اس میں بھی مشکل ہے۔ آپ دیکھتے رہتے ہیں، کبھی آپ کو دُھوپ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، کبھی سائے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، سائے کے اثرات آپ کے بدن اور باقی کائنات پر اور پڑتے ہیں، دُھوپ کے اَثرات اور پڑتے ہیں۔ اگر ایک کیفیت ہی باقی رہتی تو زندگی میں لطف پیدا نہ ہوتا، تو اللہ تعالیٰ نے سورج کو ایسے طور پر بنایا کہ وہ چڑھتا ہے چھپتا ہے، آہستہ آہستہ حرکت کرتا ہوا چلتا ہے، اور پھر دنیا کی ان چیزوں کو اس طرح سے بنایا کہ سورج کی دُھوپ کے سامنے رکاوٹ پیدا کر کے سایہ مہیا کرتی ہیں، تو ہر ہر چیز میں اللہ کا انعام بھی ہے اور اللہ کی قدرت بھی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ سورج کی حرکت کو اس طرح سے نہ بناتا، ایک ہی جگہ وہ ساکن رہ جاتا، تو جہاں سایہ ہوتا وہاں سایہ ہی رہ جاتا اور جہاں دُھوپ ہوتی وہاں دُھوپ ہی رہ جاتی۔ یا سورج کے اثرات اس زمین تک نہ پہنچتے یا

سورج کی روشنی ایسے ہوتی کہ چیزیں اس کے سامنے رکاوٹ پیدا نہ کر سکتیں، تو انسان کی زندگی میں کتنی مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ تو یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت بھی ہے کہ اس نے کس طرح سے اس دنیا کے نظم کو چلا رکھا ہے اور آپ لوگوں کے لئے کس طرح سے راحت کا سامان بنا رکھا ہے، اس میں اللہ کا احسان بھی ہے۔

''ظل'' کا دُوسرا مفہوم

اور اگر ''ظل'' سے مراد رات کا سایہ لے لیا جائے تو بھی ٹھیک ہے (مظہری)، جیسا کہ سورۂ قصص (آیت ۷۱) میں آئے گا: اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ۔ تم بتاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ رات کو تمہارے اُوپر دائم کر دے، ہمیشہ اسی طرح سے تاریکی چڑھی رہے اور یہ سایہ چھایا رہے تو کون دوسرا معبود ہے؟ جو دِن کو تمہارے پاس لے آئے۔ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ اگر دِن کو دائم کر دے، دِن ہی رہے کسی وقت رات نہ آئے تو انسان کے لئے کتنی مشکلات پیدا ہو جائیں گی؟ تو کون دوسرا معبود ہے جو دِن کو ہٹا کے رات کو لا سکتا ہے؟ تو دِن اور رات کا نظم جو اللہ تعالیٰ نے بنایا اور اس کا تعلق رکھا ہے سورج کے ساتھ، اور اسی طرح زمین کی حرکت کے ساتھ یا سورج کی حرکت کے ساتھ، تو اس میں قدرت کے ساتھ ساتھ انسان کے اوپر احسان کا پہلو بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے کیسی راحت اور آرام کا انتظام فرمایا۔

''کیا دیکھا تو نے اپنے رَبّ کی طرف'' یعنی اپنے رَبّ کے تصرف کی طرف'' کہ اس نے کیسے سائے کو پھیلایا، اگر وہ چاہتا تو اس کو ساکن بنا دیتا'' یعنی سایہ ہی رہ جاتا دُھوپ آتی ہی نہ۔ ''پھر ہم نے سورج کو اس کے اوپر دلیل بنایا''، سورج کا چڑھنا یہ راہنمائی کرتا ہے جس سے نمایاں ہوتا ہے سایہ اور دُھوپ، تُعْرَفُ الْاَشْيَاءُ بِاَضْدَادِهَا، اگر دُھوپ نہ آئے تو سایہ معلوم نہیں ہوتا۔ ''پھر ہم اس کو آہستہ آہستہ اپنی طرف سمیٹ لیتے ہیں'' یہ وہی تصرف ہے جو میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا۔

رات اور نیند میں دلائلِ قدرت

اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے رات کو لباس بنایا، اور نیند کو راحت کی چیز بنایا۔ اب یہ رات ہمارے لیے پردہ پوشی کا باعث ہے، اور انسان کی اللہ تعالیٰ نے طبیعت ایسی بنائی کہ اس کو جتنا سکون تاریکی میں حاصل ہوتا ہے دِن کی روشنی میں اتنا سکون حاصل نہیں ہوتا۔ اس لئے فطری طور پر انسان رات کو سونا چاہتا ہے، دِن کو جاگنا جتنا آسان ہے رات کو جاگنا اتنا آسان نہیں ہے، رات آتی ہے تو ہر شخص لیٹنے کا تقاضا کرتا ہے آرام کا تقاضا کرتا ہے، اور تاریکی کے اندر نیند بھی سکون کی آتی ہے، اور یہ تاریکی انسان کے لئے پردہ پوشی کا باعث بھی بن جاتی ہے کہ انسان سویا ہوا ہو اور کپڑا اِدھر اُدھر ہو بھی جائے تو رات کی تاریکی اس کے لئے پردہ ہے۔ اور کتنے کام ہیں جو انسان تاریکی میں کرنا چاہتا ہے تو وہ رات کو کر لیتا ہے...... اور راحت و آرام جو نیند کی شکل میں حاصل ہوتی ہے وہ تو اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے، اگر کسی شخص کو یہ بیماری لگ جائے کہ اس کو نیند نہ آئے تو اس سے پوچھنا کہ دماغ کتنا پریشان رہتا ہے اور بدن کس طرح سے چور چور ہوا رہتا ہے، کبھی انسان کو راحت حاصل نہیں ہوتی اگر اچھی طرح سے نیند نہ آئے۔ دِن کو

آپ کام کاج کرتے ہیں تھک جاتے ہیں، جس وقت رات کو لیٹتے ہیں تو ایک قسم کے اَور حال ہو جاتے ہیں، صبح اٹھیں گے تو ایسے تروتازہ، تازہ دَم جیسے کسی قسم کا کوئی کام کیا ہی نہیں، آپ کی صلاحیتیں دوبارہ اسی طرح سے جوان ہو جاتی ہیں۔ اور یہی حال دماغی محنت کا ہے کہ دِن کو انسان سوچتا ہے مختلف چیزیں دیکھتا ہے کسی چیز کا فکر کرتا ہے پریشان ہوتا ہے، جب نیند آتی ہے تو دماغ کو ایک دفعہ ایسا سکون آ جاتا ہے کہ سارے خیالات ختم ہو جاتے ہیں اور جب انسان اٹھتا ہے تو پھر دماغ تروتازہ ہوتا ہے، دوباہ پھر اسی طرح سے آپ سوچنے اور دماغی کام کا آغاز کر دیتے ہیں...... یہ بہت بڑی نعمتیں ہیں اور بہت بڑے احسانات ہیں، لیکن چونکہ مفت میں ہر روز ملتے رہتے ہیں، اس لئے ہم کبھی اس کا احساس نہیں کرتے، ورنہ جس وقت یہ نعمت چھن جاتی ہے تو پھر پتا چلتا ہے، نیند نہ آئے تو پتا چلتا ہے کہ انسان کے لئے کتنی پریشانی کی بات ہے؟...... اللہ نے تمہارے لیے رات کو لباس بنا دیا، نیند کو راحت کی چیز بنا دیا، اور دِن کو اٹھنے کا وقت بنا دیا۔ رات ختم ہوتی ہے تو طبیعت میں خود ہی اٹھنے کا تقاضا ہوتا ہے، پھر اٹھ کے انسان دوبارہ اپنی نقل وحرکت شروع کر دیتا ہے۔

بارش اور ہواؤں میں دلائلِ قدرت

اور اسی طرح سے اللہ تعالیٰ بارش سے پہلے ہوائیں بھیجتا ہے جو لوگوں کو بشارت دیتی ہیں کہ بارش آنے والی ہے، پہلے ہوائیں چلتی ہیں جس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ بارش آ رہی ہے، تو بارش والی نعمت بھی حاصل ہوتی ہے اور ہواؤں کے چلنے سے جب بارش کے آنے کا پتا چلتا ہے تو ہم اپنے آپ کو سنبھال بھی لیتے ہیں، کوئی چیز باہر بھیگنے والی ہوتی ہے اس کو اٹھا کر رکھ لیا، پانی کے ساتھ کوئی نقصان ہونے والا ہوتا ہے تو اس کو سنبھال لیا، تو یہ ہوائیں پہلے آتی ہیں، خوش کر دیتی ہیں، اس کے بعد اللہ کی رحمت آتی ہے، رحمت سے بارش مراد ہے۔

لفظ ''سماء'' کے دو معنی

اور آسمان سے ہم نے پانی اتارا پاکیزہ۔ ''سماء'' کا لفظ قرآنِ کریم میں دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ سماء جس کی جمع سمٰوٰت آتی ہے، اس کا مصداق ایک تو وہ آسمان ہیں جن کی وضاحت سرورِ کائنات ﷺ نے فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے سات آسمان بنائے ہیں اوپر تلے، تو ان کا مصداق وہ بھی ہیں، جہاں تک فرشتوں کی رسائی ہے اور عام آدمی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا اس میں دروازے ہیں، دروازے کھلتے ہیں، دروازوں کے اوپر فرشتوں کے پہرے ہیں، اس قسم کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں، ایک آسمان ہے، پھر اس کے اوپر دوسرا ہے، پھر تیسرا ہے، چوتھا ہے، اس طرح سے سات آسمان، پھر اوپر اللہ کا عرش وکرسی، جو کچھ بھی ہے اللہ کے علم میں ہے۔ بہرحال آسمان وجودی چیزیں ہیں اور یہ قطعی عقیدہ ہے جس میں کسی قسم کا اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ آسمان ہیں اور ان کی تعداد سات ہے، نصوص کے اندر اس کا ذکر آیا ہوا ہے...... اور دوسرے اسی طرح ''سماء'' کا لفظ بولا جاتا ہے ہر اس چیز پر جو انسان سے اُوپر ہو، یہ فضا بھی سماء کا مصداق ہے، اس لئے قرآنِ کریم میں کہیں تو ذکر کیا گیا کہ ہم نے پانی بادلوں سے

اُتارا، ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ (سورۂ واقعہ:۶۹) مُزن: سفید بادل کو کہتے ہیں، اسی طرح سے سحاب کا ذکر بھی ہے،[1] کہ بادل سے پانی اترتا ہے، مُزن سے پانی اترتا ہے، اور یہاں آ گیا کہ آسمان سے پانی اتارا، اس قسم کے الفاظ بھی قرآنِ کریم میں متعدّد جگہ ہیں، تو اس سے معلوم ہو گیا کہ یہاں سماء سے مراد بادل ہے، تو انسان کے اوپر جو چیز سایہ اِفگن ہے، یہ فضا ہو گئی تو یہ فضا بھی سماء کہلاتی ہے۔ تو پانی کا نزول ظاہری طور پر بادل سے ہوتا ہے تو یہاں سماء کا مصداق بادل ہے۔ جیسے قرآنِ کریم کی دوسری آیات میں آ گیا، یہی وجہ ہے کہ جب بارش ہو رہی ہو اگر کوئی شخص ہوائی جہاز میں بیٹھ کے بادلوں کے اُوپر چلا جائے تو اُوپر بارش نہیں ہوتی، دُھوپ ہوتی ہے۔ اور یہ نظارہ آپ پہاڑی علاقوں میں بھی دیکھ سکتے ہیں، آپ مری کی طرف چلے جائیں اور اُونچے اُونچے پہاڑوں پہ چڑھیں گے تو بسا اوقات ایسا ہو گا کہ جب آپ نیچے اتریں گے تو بارش ہو رہی ہو گی لیکن جب اُوپر چڑھ جائیں گے تو نیچے آپ کو بادل معلوم ہوں گے اور اُوپر آپ دیکھیں گے تو دُھوپ نکلی ہوئی ہو گی، تو انسان اُوپر ہوتا ہے، بادل نیچے ہوتے ہیں، نیچے بارش ہو رہی ہوتی ہے، اُوپر بالکل ہی نہیں ہو رہی ہوتی۔ تو یہاں سماء سے وہی بادل مراد ہے۔ اُوپر کی جانب جو چیز آپ پر سایہ اِفگن ہے، جو آپ پر محیط ہے وہ بھی سماء کہلاتی ہے۔

بارش کے فوائد

اس پانی کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ بنجر علاقے کو آباد کرتے ہیں۔ یہ بھی آپ کے سامنے ہے کہ گرد اُڑ رہی ہوتی ہے، زمین پر خشکی چڑھی ہوئی ہوتی ہے، لیکن جب پانی اترتا ہے تو وہ علاقہ یکدم آباد ہو جاتا ہے، سبزہ نکل آتا ہے، یہ زمین کی زندگی ہے، اور چوپائے اور انسان بھی اس کو پیتے ہیں۔ اَنَاسِیَّ كَثِيْرًا کہہ دیا کہ بہت سارے انسانوں کو ہم وہ پانی پلاتے ہیں، چونکہ پیچھے بارش کا ذِکر ہے اور بہت سارے لوگ ایسے ہیں جن کے لئے پینے کا پانی بارش کے ذریعے ہی مہیا ہوتا ہے۔ اب اگرچہ شہری آبادیوں کے اندر نلکوں کے ذریعے سے، ٹیوب ویلوں کے ذریعے سے زمین کا پانی حاصل کر لیتے ہیں، اس لئے ان کو بظاہر بارش کی طرف اتنی احتیاج نہیں ہوتی جتنی دیہاتی لوگوں کو ہوتی ہے، اور اس زمانے میں تو زیادہ آبادی تھی ہی وہی جو کہ بارش کا پانی استعمال کرتے تھے اور اسی سے ساری ضرورتیں پوری کرتے تھے...... اور پھر اس بارش کو اللہ تعالیٰ پھیر پھیر کے اُتارتے ہیں، کہیں زیادہ اُتار دی کہیں کم اُتار دی، کبھی کسی علاقے میں، کبھی کسی علاقے میں، تاکہ ہر قسم کے فوائد لوگوں کو حاصل ہوتے رہیں۔

تصرفاتِ اِلٰہی کو ذِکر کرنے کا مقصد

اور اس کو دیکھ کر لوگوں کی چاہیے کہ نصیحت حاصل کریں۔ مقصد اللہ کا یہی ہے کہ اس قسم کے تصرفات کو دیکھیں، نصیحت حاصل کریں، اور اپنے خالق و مالک کو پہچانیں اور اس کی شکر گزاری کریں۔ لیکن پھر بھی حال یہ ہے کہ لوگ اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور پھر ناشکرے ہی رہتے ہیں۔ ان کو ظاہری اسباب کی طرف جوڑ دیں گے، اللہ کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا کہ جی!

---

(۱) وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ...الخ (النبأ:۱۴)، حَتّٰۤى اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا...الخ (الاعراف:۵۷)، اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا...الخ (النور:۴۳)، اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا...الخ (الروم:۴۸)

سمندر سے بخارات اُڑتے ہیں، بادل بن کر آجاتے ہیں، پانی برس جاتا ہے بس یہاں تک ہی نظر جاتی ہے، آگے جاتی ہی نہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت ہی نہیں کرتے کہ زمین کو بنانے والا کون؟ آسمان کو بنانے والا کون؟ بخارات آخر اُڑتے ہیں تو کس طرح سے اُڑتے ہیں؟ اور اللہ تعالیٰ کبھی کسی علاقے میں کبھی کسی علاقے میں بارش کی کمی بیشی جو کرتا رہتا ہے، تو عقل مند آدمی کا کام یہ ہے کہ ظاہری اسباب تک نہ رہ جائے بلکہ ان کے خالق تک رسائی حاصل کرے۔ اور یہی مقصد ہے یہاں ان کے بیان کرنے کا کہ اللہ تعالیٰ کو پہچانو اور اللہ تعالیٰ کو پہچان کے اس کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرو، لیکن لوگ ہیں کہ ناشکری کیے بغیر نہیں رہتے۔

تبلیغ کی تاکید

آگے حضور ﷺ کو تبلیغ پر ابھارا جارہا ہے کہ آپ تبلیغ کریں اور خوب اچھی طرح سے زور لگا کر کریں، اللہ تعالیٰ نے آپ کے حصے میں ہی یہ سارا کام رکھا ہے، اگر اللہ چاہتا تو ہر بستی میں علیحدہ علیحدہ ڈرانے والا بھیج دیتا لیکن اللہ نے آپ کے ذمے یہ کام لگایا، اور اس کے ذریعے سے آپ کے درجے بلند ہوں گے، اب ساری دنیا کے لئے نذیر ایک ہی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اور پیغمبر بن کے صرف آپ ہی آئے ہیں، اگر ہم چاہتے تو ہر ہر بستی میں اس وقت بھی بھیج سکتے تھے، اللہ تعالیٰ کو قدرت ہے، لیکن اب آپ اکیلے آگئے، اس لئے خوب کوشش کر کے تبلیغ کیجئے۔ اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ڈرانے والا بھیج دیتے۔ کافروں کا کہنا نہ مانیے، یہ جو آپ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ فلاں بات چھوڑ دو، فلاں بات چھوڑ دو، یا ہمارے بتوں کی تردید نہ کرو آپ ان کی باتوں میں نہ آئیں۔

تبلیغ کے جہادِ کبیر ہونے میں ایک عجیب نکتہ

اور اس قرآنِ کریم کے ذریعے سے آپ ان کے ساتھ جہادِ کبیر کیجئے، بڑا جہاد کیجئے، ان کے خلاف زور شور سے جہاد کیجئے، قرآنِ کریم کے دلائل بیان کر کے ان کے خیالات کی تردید کریں، یہ بھی ایک جہاد ہے۔ دیکھو! زبانی تبلیغ پر اور کُفر کی تردید پر اور باطل کی تردید کے لیے بھی ''جہاد'' کا لفظ بولا گیا، یہ جہادِ لسانی ہے جو کہ دلائل کے ساتھ ہوتا ہے، جو علماء کا حصہ ہے۔ اور پھر اس کو ''جہادِ کبیر'' کہا، ہمارے ایک بزرگ اس کو ''کبیر'' کہنے کا نکتہ بیان کیا کرتے تھے، تبلیغی جماعت میں کام کرتے تھے، ابو یونس مولانا عبدالعزیز صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، بعد میں آخر زمانے میں ٹنڈو اللہ یار میں رہے، وہیں ان کا انتقال ہوا، ان کی تقریر ابتدا ابتدا میں میں نے سنی تھی، وہ فرمایا کرتے تھے کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ نے اسے ''جہادِ کبیر'' کہا۔ جس کا مطلب یہ ہے جو تلوار کی لڑائی ہوگی وہ اس کے مقابلے میں ''جہادِ صغیر'' ہے، اس کو ''جہادِ کبیر'' کیوں کہا؟ کہتے ہیں، ایک لڑائی ہے بندوق کے ساتھ یا تلوار اور نیزے کے ساتھ، تم حق کی حمایت میں نکلے، دُوسرا باطل پرست، کافر، مشرک آدمی آپ کے مقابلے میں آ گیا، دونوں نے مقابلہ کیا، آپ کا وار اس پہ چل گیا، آپ نے اس کی گردن اُڑا دی، اپنے لئے آپ نے جنت خرید لی اور اس کو جہنم میں پہنچا دیا، اُس جہاد کا تو یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ جس وقت آپ حق کی حمایت میں کافر کے مقابلے میں نکلے، اور اس کے نتیجے میں آپ نے اس کافر کو قتل کر کے اس پہ غلبہ حاصل کر لیا تو خود تو اپنے لئے جنت حاصل کر لی اور اسے جہنم میں پہنچا دیا۔ اور اگر آپ تبلیغ کے لئے نکلیں گے اور قرآنِ کریم کی دلیل

کے ساتھ کسی کافر پہ فتح پائیں گے اور اس کو آپ کو مغلوب کرلیں گے، مغلوب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمہارے کہنے کی وجہ سے تمہارے بیان کرنے کی وجہ سے اس نے بھی کلمہ پڑھ لیا، تم نے اس پر فتح پالی، تم نے اس کو فتح کرلیا، وہ تمہارے سامنے مغلوب ہوگیا، تو تم بھی جنت میں گئے اور اس کو بھی اپنے ساتھ جنت میں لے گئے۔ اس لئے کہتے تھے تبلیغ والا جہاد دونوں فریقوں کو جنت میں لے جاتا ہے، تبلیغ کرنے والوں کو بھی اور ان کو بھی جن کو تبلیغ کی جاتی ہے، اور دوسرا جہاد ایسا ہے کہ جب میدان میں لڑائی ہوتی ہے تو ایک فریق اس میں جنتی ہوتا ہے اور مقابلے میں دوسرا فریق جو مرتا ہے وہ جہنم میں جاتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس تبلیغ کو ''جہادِ کبیر'' قرار دیا۔ یہ اچھا نکتہ ہے، پیارا نکتہ ہے۔

میٹھے اور کڑوے دریا کی پہلی تفسیر

آگے پھر وہی اللہ تعالیٰ کے تصرف کا ذِکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو دَریا چلائے ایک میٹھا اور ایک کڑوا۔ کڑوا دَریا تو متعین ہے سمندر، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے کہ اس نے سمندر کو کڑوا کردیا، آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ سمندر کے اندر کی مخلوق اس سے زیادہ ہے جتنی خشکی میں ہے، اور ویسے بھی زمین کے تین حصے سمندر کی زد میں ہیں، اور چوتھا حصہ ہے جس کے اوپر یہ آبادی ہے، اب وہ مخلوق اس میں پیدا ہوتی ہے مرتی ہے، اور اسی طرح دریاؤں میں سے ساری چیزیں بہتی ہوئی وہاں جاکے گرتی ہیں، تو اگر یہ پانی میٹھا ہوتا کڑوا نہ ہوتا تو اس میں بو پیدا ہوجاتی، یہ سڑ جاتا، اللہ تعالیٰ نے دو دَریا چلا دیے، جن میں سے ایک تو میٹھا اور خوشگوار ہے، اور دوسرا کڑوا ہے سخت تلخ، مِلْحٌ اُجَاجٌ، اُجاج: یہ ملح کی تاکید ہے، نمکین کڑوا۔ اور ان بحرین کا مصداق ہیں ایک تو سمندر جو کہ کڑوا ہے، اور میٹھے دریا یہ ہیں جو زمین کی سطح پہ بہتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے زمین پر ہی دونوں دریا چلائے، اور درمیان میں ایک رُکاوٹ پیدا کردی کہ سمندر اور دریا ل کے ساری زمین کو فتح نہیں کرسکتے، درمیان میں رُکاوٹ ہے، ان کی حدیں قائم ہیں، میٹھا علیحدہ ہے اور کڑوا علیحدہ ہے۔ یا تو اس سے یہی مراد ہے یعنی یہ ظاہری دریا اور سمندر، کہ ایک طرف اللہ نے میٹھے دریا چلا دیے، دوسری طرف ایک کڑوا دریا بنادیا۔ اور سمندر کو جو اللہ نے کڑوا بنایا ہے، یہ بات میں آپ کی خدمت میں عرض کررہا تھا کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا احسان ہے، کبھی آپ کراچی جائیں تو آپ سمندر کا پانی منہ میں ڈال کے دیکھیں گے کہ وہ بہت سخت نمکین اور کڑوا ہوتا ہے۔ میٹھے پانی کی یہ خاصیت ہے کہ اگر کچھ دیر تک ایک جگہ یہ ساکن رہ جائے تو اس میں بُو پیدا ہوجاتی ہے، یہ سڑ جاتا ہے، اور کوئی چیز اس میں مرجائے تو مرنے کے بعد وہ اور زیادہ بہت جلدی بد بُو پیدا کردیتی ہے، جیسے آپ تالابوں وغیرہ کو دیکھتے رہتے ہیں، لیکن کڑوے نمکین پانی میں بُو نہیں پیدا ہوتی، وہ سڑتا نہیں ہے، اور جتنی چیزیں اس میں پیدا ہوکے مرتی جاتی ہیں وہ بھی اسی میں حل ہوتی جاتی ہیں اور گھلتی جاتی ہیں، وہ اس میں کسی قسم کی بُو پیدا نہیں کرتیں۔ ورنہ اگر یہ سمندر سارے کا سارا میٹھا ہوتا تو اس میں اتنی بد بُو ہوتی کہ یہ جو باقی آبادی ہے اس کا جینا بھی مشکل ہوجاتا، تو یہ بھی اللہ کی حکمت ہے۔ اور دوسرے دریا میٹھے بنادیے، کیونکہ انسان اپنی ضرورت میٹھے پانی سے پوری کرتا ہے، پیاس بجھانے کے لیے میٹھا پانی کام آتا ہے، میٹھے سے مراد یہ ہے کہ کڑوا نہیں ہے، جیسے ہم کہتے ہیں کہ دنیاپور کا پانی کڑوا ہے، اور کہروڑپکا کا پانی میٹھا ہے، تو میٹھے کا یہ معنی نہیں ہوتا کہ یہ شربت ہے،

اس میں چینی ملی ہوئی ہے، مطلب یہ ہے کہ جس پانی میں کھاراپن نہیں ہوتا اور کڑواپن نہیں ہوتا تو لوگ کہتے ہیں کہ وہاں کا پانی میٹھا ہے۔ تو یہ دونوں مراد لے لئے جائیں تو بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کی دلیل ہیں۔

دُوسری تفسیر

ویسے زمین کے نیچے بھی پانی کی مختلف دھاریاں ہیں، جیسے میں نے عرض کیا کہ آپ چلتے جائیں، کہروڑ پکا سے کچھ دُور تک تو آپ کو زمین کا پانی میٹھا ملے گا، اور جب آپ دنیاپور کے علاقے میں پہنچیں گے تو نیچے کا پانی کڑوا ہو جائے گا، اب وہ کڑوا اور میٹھا دونوں زمین کے نیچے ہیں، لیکن ایک دوسرے پر تجاوز نہیں کرتے کہ خلط ملط ہو کے ایک جیسے ہو جائیں۔ یا آپ فیصل آباد جائیں تو ریلوے لائن جو شورکوٹ سے فیصل آباد کی طرف جاتی ہے تو اس لائن کے ساتھ ساتھ انتہائی کڑوا پانی ہے، یعنی جس وقت آپ اس کو منہ میں ڈالیں گے تو منہ انتہائی بدذائقہ ہو جاتا ہے، پینے کا نہیں ہے، اس میں ہانڈی نہیں پکتی، اس سے کپڑے نہیں دُھوئے جاتے، صابون نہیں نکلتا، دال وغیرہ میں ڈال دیا جائے تو دال نہیں گلتی، وہ پانی اس قسم کا ہے، لیکن اگر آپ تھوڑی دُور اِدھر کو ہٹیں گے تو سارا پانی ٹھیک ہے، تو نیچے بھی اللہ تعالیٰ نے کہیں کھارے پانی کی لہر دوڑا رکھی ہے، کہیں میٹھے پانی کی لہر دوڑا رکھی ہے......اور خود سمندر میں بھی اس طرح سے ہے، کہ پانی کی لہریں ہیں، سمندر میں بھی کسی جگہ میٹھا پانی ہے اور کسی جگہ کڑوا پانی ہے، یہ مچھلیاں پکڑنے والے پہچان لیا کرتے ہیں، میٹھے پانی کی مچھلی کا ذائقہ اور ہوتا ہے، کڑوے پانی کی مچھلی کا ذائقہ اور ہوتا ہے، تو یہ واقعہ ہے کہ سمندر کا پانی بعض جگہ میٹھا ہوتا ہے، بعض جگہ کڑوا ہوتا ہے، تو یوں بھی ہوتا رہتا ہے۔

اب پانی ایک سیال چیز ہے، لیکن اکٹھے ہونے کے بعد ایک دوسرے سے خلط نہیں ہوتے، میٹھا علیحدہ ہوتا ہے اور کڑوا علیحدہ ہوتا ہے۔ یہاں سے پانی لیں گے میٹھا ہوگا، اور اِدھر سے لیں گے تو کڑوا ہوگا، تو اللہ تعالیٰ نے درمیان کوئی ایسی رُکاوٹ پیدا کر رکھی ہے کہ ایک دوسرے پر یہ چڑھتے نہیں ہیں، اور ایک دوسرے میں خلط نہیں ہوتے، تو یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے، نمکین پانی کے فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں اور میٹھے پانی کے فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں۔

تفسیرِ عثمانی کا حوالہ

اور یہاں حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ بنگال کے بعض دریاؤں کا حال بھی لکھا ہے، کہتے ہیں کہ ''بیان القرآن میں دو معتبر بنگالی علماء کی شہادت نقل کی ہے کہ ''ارکان'' سے ''چاٹگام'' تک دریا کی شان یہ ہے کہ اس کی دو جانبیں بالکل الگ الگ نوعیت کے دو دریا نظر آتے ہیں، ایک کا پانی سفید ہے، ایک کا سیاہ۔ سیاہ میں سمندر کی طرح طوفانی تلاطم اور تموج ہوتا ہے اور سفید بالکل ساکن رہتا ہے، کشتی سفید میں چلتی ہے اور دونوں کے بیچ میں ایک دھاری سی برابر چلی گئی ہے جو دونوں کا ملتقی ہے (یعنی ایک ہی دریا کے دو حصے ہیں)۔ لوگ کہتے ہیں کہ سفید پانی میٹھا ہے اور سیاہ کڑوا۔ اور مجھ سے (یعنی شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ سے) ''باریسال'' کے بعض طلبہ نے بیان کیا کہ ضلع باریسال میں (یہ بنگال میں ہے) دو ندیاں ہیں جو ایک ہی دریا سے نکلی ہیں۔ ایک کا پانی کھاری بالکل کڑوا، اور ایک کا نہایت شیریں اور لذیذ ہے۔ یہاں گجرات میں راقم الحروف جس جگہ آج کل مقیم

ہے (یعنی ڈابھیل) سمندر تقریباً دس بارہ میل کے فاصلے پر ہے، ادھر کی ندیوں میں برابر مد و جزر ہوتا رہتا ہے۔ بکثرت ثقات نے بیان کیا کہ مد کے وقت جب سمندر کا پانی ندی میں آجاتا ہے تو میٹھے پانی کی سطح پر کھاری پانی بہت زور سے چڑھ جاتا ہے لیکن اس وقت بھی دونوں پانی مختلط نہیں ہوتے۔ اوپر کھاری رہتا ہے، نیچے میٹھا، جزر کے وقت اُوپر سے کھاری پانی اُتر جاتا ہے اور میٹھا جوں کا توں باقی رہ جاتا ہے واللہ اعلم۔ ان شواہد کو دیکھتے ہوئے آیت کا مطلب بالکل واضح ہے، یعنی خدا کی قدرت دیکھو کہ کھاری اور میٹھے دونوں دریاؤں کے پانی کہیں نہ کہیں مل جانے کے باوجود بھی کس طرح ایک دوسرے سے ممتاز رہتے ہیں۔ یا یہ مطلب ہو (جو پہلا مطلب میں نے آپ کے سامنے ذکر کیا کہ سمندر اور یہ دریا مراد ہیں جو زمین پہ چلتے ہیں، دوسرا مطلب یہی ذکر کر کیا ہے) کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں دریا الگ الگ اپنے اپنے مجریٰ میں چلائے اور دونوں کے بیچ میں بہت جگہ زمین حائل کر دی، اس طرح آزاد نہ چھوڑا کہ دونوں زور لگا کر درمیان سے زمین کو ہٹا دیتے اور اس کی ہستی کو تباہ کر دیتے، پھر دونوں میں ہر ایک کا جو مزہ ہے وہ اسی کے لیے لازم ہے۔ یہ نہیں کہ میٹھا دریا کھاری، یا کھاری میٹھا بن جائے۔ گویا باعتبار اوصاف کے ہر ایک دوسرے سے بالکل الگ رہنا چاہتا ہے'' (تفسیر عثمانی) تو اس آیت کا یہ مطلب ہوا۔

''خاندان'' بھی انسان کے لئے بہت بڑی نعمت ہے

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ: اللہ تعالیٰ نے انسان کو بھی پانی سے بنایا، پانی انسان کے لئے زندگی کا مادّہ ہے، اور اس کی بنیاد جو اُٹھائی جاتی ہے تو وہ بھی پانی کے ایک قطرے سے اُٹھائی جاتی ہے، پھر پیدا ہو جانے کے بعد دیکھو! اس کے تعلقات کس طرح سے ہو گئے؟ ایک طرف اس کا ''نسب'' ہے، دوسری طرف اس کا ''صہر'' ہے، باپ کا خاندان، ماں کا خاندان، اور پھر بیوی کے ساتھ تعلق کی بنا پر ایک مستقل خاندان انسان کے ساتھ جڑ جاتا ہے، اور یہ تینوں رشتے ہی انسان کے لئے دنیا کے اندر باعثِ راحت ہیں، باپ کا خاندان بھی انسان کے لیے باعثِ راحت، زندگی کی کتنی ضروریات اسی سے متعلق ہوتی ہیں، ماں کا خاندان، اور پھر بیوی کی وساطت سے جو خاندان ملا، جو آپ کا سسرال ہے، تو اس کے ساتھ بھی انسان کی کیا شان بنتی ہے، اور کس طرح سے انسان دنیا کے اندر قوت اور عزت حاصل کرتا ہے انہی رشتوں کی بنا پر، تو یہ اللہ کے بہت بڑے احسانات ہیں۔ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا: اور تیرا ربّ قدرت رکھنے والا ہے، جس طرح سے چاہتا ہے کسی چیز کو بنا دیتا ہے۔

مشرکین کی ضد

اب یہ دلائل تو تقاضا کرتے ہیں کہ صرف اللہ کی عبادت کی جائے جو ہر طرح سے قادر ہے مالک ہے، لیکن یہ لوگ توحید اختیار نہیں کرتے بلکہ شرک میں مبتلا ہیں، اور عبادت کرتے ہیں اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی جو نہ نفع دے سکتی ہیں نہ نقصان پہنچا سکتی ہیں، وہ نفع نقصان پر قادر نہیں ہیں، اور کافر اپنے ربّ کے خلاف مددگار ہے، یعنی شیطان ربّ کا حریف ہوا، اور یہ کافر اس کا مددگار ہے، اس کے ساتھ ملا ہوا ہے،

تسلی رسول اور اللہ کی طرف سے توکل اور ذکر کی تاکید

نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر مبشر اور نذیر بنا کر، اس لیے ان کا منوانا آپ کے ذمے نہیں، آپ ان کو اچھائی اختیار کرنے پر اچھے نتیجے کی بشارت دیں، برائی اختیار کرنے پر برے نتیجے سے ڈرائیں۔ آپ کا فرض تو اتنا ہی ہے...... اور انہیں صاف صاف کہہ دیں کہ میں اس تبلیغ پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا کہ تمہارے نہ ماننے کی بنا پر میرے کاروبار میں خلل آئے گا یا تم اس لیے میری بات نہیں مانتے کہ میں تم سے کوئی تاوان کا مطالبہ کرتا ہوں، ایسی بات نہیں۔ میرا تو مطالبہ ایک ہی ہے کہ جو چاہے اپنے رَبّ کی طرف راستہ اختیار کرلے...... اور یہ مخالفین جو مخالفت کرتے ہیں تو اس کی بھی آپ پروا نہ کیجئے، بلکہ اللہ کی ذات پہ بھروسا کیجئے جو کہ "حی" ہے اور "لا یموت" ہے، جو زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا، اس کو کبھی موت نہیں آئے گی، ان لوگوں کے معبودوں کی طرح نہیں کہ جو یا تو مرے ہوئے ہیں یا مرجائیں گے۔ آپ کا معبود ایسا ہے کہ جو زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا، کبھی اس کو موت نہیں آئے گی، اسی کے اوپر بھروسا کیجئے، اور صبح شام اسی کی تسبیح وتحمید کیجئے۔ یعنی توکل کی صفت اپنائیے اور اللہ کے ذکر میں مشغول رہیے کیونکہ اللہ کا ذکر دل کے لئے قوت کا باعث ہے، اطمینان کا باعث ہے۔ اور ان (کفار) کو اللہ تعالیٰ وقت پر پوچھ لے گا، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے گناہوں کی خبر رکھنے والا ہے۔

کائنات کی تخلیق اور "اِستواء علی العرش" کا مفہوم

آگے پھر اسی قدرت کا ذکر ہے کہ جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور ان کے درمیان والی چیزوں کو چھ دن میں۔ اس کا ذکر بار بار آپ کے سامنے آگیا کہ چھ دن سے وہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک جو دن ہیں وہی مراد ہیں (غرائب التفسیر)، اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (سورۂ حج: ۴۷) ایک دن اللہ کے نزدیک ہزار سال کے برابر ہے تمہارے شمار کے مطابق، مطلب یہ ہے کہ یہ مخلوقات کہیں دفعۃً پیدا نہیں ہوگئیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت اس کو آہستہ آہستہ تدریجاً اس کمال تک پہنچایا، جیسے کہ آپ حضرات اپنے وجود کو دیکھیے کہ جب آپ پیدا ہوئے تو آپ کی کیا پوزیشن تھی، اور اس حالت میں آپ پہنچے ہیں کوئی اٹھارہ سال میں پہنچا، کوئی انیس سال میں پہنچا، کوئی بیس سال میں پہنچا، یہ اللہ تعالیٰ تدریجاً کمال کی طرف لے جاتے ہیں، ایک پودا پیدا ہوتا ہے تو اپنی انتہا تک کوئی بیس سال میں پہنچتا ہے، کوئی پندرہ سال میں، کوئی دس سال میں، کوئی چھ مہینے میں، یہ تدریج ہے اور اللہ کی حکمت ہے، اسی طرح سے زمین آسمان اور سارا نظم اللہ تعالیٰ نے بااختیار ہونے کی حالت میں تدریجاً قائم کیا ہے، یہ نہیں کہ دفعۃً ہوگیا ہو۔ پھر اس ساری کائنات کو بنانے کے بعد خود فارغ ہو کے نہیں بیٹھ گیا، اور ان چیزوں کو اللہ نے اختیار نہیں دے دیا کہ اب بنائیں نے دیں، چلاؤ تم، جس طرح سے مشرکوں نے اختیارات بانٹ دیے، ایسا نہیں، اللہ تعالیٰ عرش کے اُوپر مستوی ہے، اور تخت نشین اس سلطنت کے اندر وہ خود ہی ہے، پیدا کرنے والا بھی وہی اور اس کائنات کے اندر حکومت بھی اسی کی، ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ: پھر اس نے عرش پہ قرار پکڑا، یعنی تخت نشین بھی اس کائنات کے اندر وہی ہے، حکومت اسی کی ہے۔ اور وہ رحمٰن ہے، مخلوق کے ساتھ اس کا معاملہ رحمت کا ہے، اس کی شان پوچھنی ہے تو کسی خبردار سے پوچھو جو حالات جانتا ہو، یہ جاہل کیا جانیں کہ رحمٰن کی کیا

شان ہے، اس لیے تو اینٹ پتھروں کو بھی اٹھا کے اللہ کے برابر ٹھہرا کے اس کی عبادت کرنی شروع کردی، یہ جاہل ہیں، یہ اس کی شان نہیں جانتے۔

''رحمٰن'' کے نام سے مشرکینِ مکہ کی نفرت

''اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو'' رحمٰن کا لفظ اصل میں مشرکین عرب میں کم مستعمل تھا، ''اللہ'' کا لفظ زیادہ مستعمل تھا، اس لیے سرورِ کائنات ﷺ جب اللہ تعالیٰ کا ذِکر کبھی رحمٰن کے لفظ سے کرتے تو یہ کہتے کہ دیکھو! ہمیں تو کہتا ہے کہ ایک کو پُوجو، اور خود ایک ''رحمٰن'' بنائے بیٹھا ہے اور ایک ''اللہ'' بنائے بیٹھا ہے، یہ بھی ایسے ہی ضد کرنے کے لئے وہ اِشکال کرتے تھے، ورنہ یہ نہیں کہ اس لفظ سے ناآشنا تھے، آشنا تو تھے لیکن یہ لفظ ان میں کثیر الاستعمال نہیں تھا، اس لیے سورۂ بنی اسرائیل کے آخر میں آیا تھا قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ کہ تم چاہے اللہ کو پُکارو، چاہے رحمٰن کو پُکارو، فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى اس کے اچھے اچھے نام ہیں، تو ناموں کے تعدّد سے مسمّٰی کا تعدّد نہیں لازم آیا کرتا، تو ذات ایک ہی ہے اس کے لئے نام اچھے اچھے ہیں، رحمٰن کہہ کے پُکارو تو بھی وہی بات ہے، اللہ کہہ کے پُکارو تو بھی وہی بات ہے، ''جب ان کو رحمٰن کے لئے سجدہ کرنے کا کہا جاتا ہے تو پوچھتے ہیں کہ رحمٰن کیا ہے؟'' یہ بھی اسی طرح سے ان کی کافرانہ ایک ضد کی بات تھی، اِستہزا کے طور پر کہتے ''کیا ہم ہر اس کو سجدہ کردیں جس کو تُو ہمیں کہتا ہے'' تیرے کہنے کی بنا پر ہم ایسے ہی سجدہ کرنے لگ جائیں؟'' اور یہ بات ان کی نفرت کو بڑھاتی ہے'' زَادَ کی ضمیر لوٹ جائے گی اس مطالبہ کی طرف کہ تم ''رحمٰن'' کی اطاعت اختیار کرو اور اس کو سجدہ کرو، یہ بات ان کی نفرت میں اضافہ کرتی ہے، زیادہ کرتی ہے ان کو از روئے نفرت کے۔ نفور، نفرت: بدکنا۔ ان کا بدکنا زیادہ ہوجاتا ہے اس بات کے ذریعے سے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ﴿۶۱﴾ وَهُوَ الَّذِيْ

برکت والا ہے جس نے بنایا آسمان میں بڑے بڑے ستاروں کو اور بنایا آسمان میں چراغ اور روشن چاند کو ﴿۶۱﴾ وہی ہے جس نے

جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿۶۲﴾

بنایا رات کو اور دِن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے، اس شخص کے لئے جو ارادہ کرے نصیحت حاصل کرنے کا، یا شکر گزاری کا ﴿۶۲﴾

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا

رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو چلتے ہیں زمین پر نرم چال، اور جب مخاطب ہوتے ہیں ان سے جاہل لوگ تو وہ کہتے ہیں

سَلٰمًا ﴿۶۳﴾ وَالَّذِیۡنَ یَبِیۡتُوۡنَ لِرَبِّہِمۡ سُجَّدًا وَّقِیَامًا ﴿۶۴﴾ وَ

سلامتی کی بات ﴿۶۳﴾ اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو رات گزارتے ہیں اپنے رَبّ کے لئے سجدہ کرتے ہوئے اور قیام کرتے ہوئے ﴿۶۴﴾ اور

الَّذِیۡنَ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَا اصۡرِفۡ عَنَّا عَذَابَ جَہَنَّمَ ٭ۖ اِنَّ عَذَابَہَا کَانَ غَرَامًا ﴿۶۵﴾

رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! دُور ہٹا دے ہم سے جہنّم کا عذاب، بے شک جہنّم کا عذاب چمٹنے والی چیز ہے ﴿۶۵﴾

اِنَّہَا سَآءَتۡ مُسۡتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿۶۶﴾ وَالَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَنۡفَقُوۡا لَمۡ یُسۡرِفُوۡا وَ

بے شک وہ جہنّم بُری ہے از روئے مستقر اور مقام کے ﴿۶۶﴾ اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں کہ جب خرچ کرتے ہیں تو اِسراف نہیں کرتے، اور

لَمۡ یَقۡتُرُوۡا وَکَانَ بَیۡنَ ذٰلِکَ قَوَامًا ﴿۶۷﴾ وَالَّذِیۡنَ لَا یَدۡعُوۡنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ

تنگی بھی نہیں کرتے، ان کا اِنفاق اس مذکور کے درمیان درمیان معتدل ہوتا ہے ﴿۶۷﴾ رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو اللہ کے ساتھ اِلٰہِ آخر کو

وَلَا یَقۡتُلُوۡنَ النَّفۡسَ الَّتِیۡ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالۡحَقِّ وَلَا یَزۡنُوۡنَ ۚ وَمَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ

نہیں پکارتے، اور نہیں قتل کرتے ایسے نفس کو جس کا قتل کرنا اللہ نے حرام ٹھہرایا، مگر حق کے ساتھ، اور وہ زِنا نہیں کرتے، جو یہ کام کرے گا

یَلۡقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾ ۙ یُّضٰعَفۡ لَہُ الۡعَذَابُ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ وَیَخۡلُدۡ فِیۡہٖ مُہَانًا ﴿۶۹﴾ ٭ۖ اِلَّا مَنۡ

وہ سزا سے ملاقات کرے گا ﴿۶۸﴾ بڑھایا جائے گا اس کے لئے عذاب قیامت کے دِن، ذلیل ہو کر اس عذاب میں پڑا رہے گا ﴿۶۹﴾ مگر جو کوئی شخص

تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِہِمۡ

توبہ کرلے، اپنی اس حالت سے باز آجائے، اور ایمان لے آئے اور نیک عمل کرے، پس یہی لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی بُرائیوں کو

حَسَنٰتٍ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۷۰﴾ وَمَنۡ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّہٗ یَتُوۡبُ

اچھائیوں سے بدل دے گا، اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ﴿۷۰﴾ اور جو کوئی توبہ کرے اور نیک عمل کرے پس بے شک وہ لوٹتا ہے

اِلَی اللّٰہِ مَتَابًا ﴿۷۱﴾ وَالَّذِیۡنَ لَا یَشۡہَدُوۡنَ الزُّوۡرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوۡا بِاللَّغۡوِ مَرُّوۡا

اللہ کی طرف لوٹنا ﴿۷۱﴾ جو جھوٹ کے موقع پہ حاضر نہیں ہوتے، اور جس وقت کسی لغو کے پاس سے گزرتے ہیں تو بزرگانہ انداز میں

کِرَامًا ﴿۷۲﴾ وَالَّذِیۡنَ اِذَا ذُکِّرُوۡا بِاٰیٰتِ رَبِّہِمۡ لَمۡ یَخِرُّوۡا عَلَیۡہَا

گزر جاتے ہیں ﴿۷۲﴾ اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں کہ جب ان کو ان کے رَبّ کی آیات کے ساتھ نصیحت کی جاتی ہے، تو نہیں گرتے وہ ان آیات پر

صُمًّا وَّعُمْيَانًا ﴿۷۳﴾ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا

بہرے اور اندھے ہو کر ﴿۷۳﴾ اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! عطا کر ہمیں ہماری بیویوں کی طرف سے

وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴿۷۴﴾ اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ

اور ہماری اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک، اور بنادے ہمیں متقین کے لئے امام ﴿۷۴﴾ یہی لوگ ہیں جو بدلہ دیے جائیں گے غرفہ

بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ﴿۷۵﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ط حَسُنَتْ

ان کے صبر کرنے کی وجہ سے، ڈالے جائیں گے وہ اس غرفہ میں تحیہ اور سلام ﴿۷۵﴾ ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اس جنت میں، اچھی ہے یہ جنت

مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿۷۶﴾ قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ ج فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ﴿۷۷﴾

از روئے ٹھکانے کے اور مقام کے ﴿۷۶﴾ آپ کہہ دیجیے: نہیں پروا کرے گا میرا رب تمہاری اگر تم کو بلانا نہ ہو، پس تحقیق تم نے تکذیب کر دی، پس عنقریب تمہاری یہ تکذیب تمہیں چمٹ کے رہے گی ﴿۷۷﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا: بروج، بُرج کی جمع ہے، بُرج قلعے کو بھی کہتے ہیں، جیسے کہ قرآنِ کریم میں ہی دوسری جگہ ہے، اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ (سورۂ نساء: ۷۸)، برج: مضبوط عمارت، قلعہ، اور یہ بڑے بڑے ستاروں کو بھی کہتے ہیں، دونوں طرح سے ہی یہاں ترجمہ کیا گیا ہے، ''برکت والا ہے جس نے بنایا آسمان میں بڑے بڑے ستاروں کو'' وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا: اور بنایا آسمان میں چراغ اور روشن چاند کو۔ سراج: چراغ کو کہتے ہیں، اور یہاں سراج سے سورج مراد ہے، قَمَرًا مُّنِيْرًا: اَنَارَ. يُنِيْرُ لازم بھی آتا ہے، متعدی بھی آتا ہے، متعدی ہوگا تو ''روشن کرنے والا، روشنی پھیلانے والا، نُور پھیلانے والا''، اور لازم ہوگا تو ''روشن چاند''، ''روشنی پھیلانے والا، نُور پھیلانے والا چاند بنایا'' وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً: خِلْفَةً: مُخْتَلِفَةً کے معنی میں ہے، ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے، ''وہی ہے جس نے بنایا رات کو اور دِن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے، ایک دوسرے سے اختلاف کرنے والے، مختلف ہونے والے''، لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ: اس شخص کے لئے جو ارادہ کرے نصیحت حاصل کرنے کا، اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا: یا ارادہ کرے شکر گزاری کا۔ خِلْفَةً کا مفہوم ایک دوسرے کے ساتھ پیچھے آنے والے، اور آپس میں اختلاف کرنے والے بھی، کہ کبھی رات آ رہی ہے کبھی دِن آ رہا ہے، ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے کا یہ بھی مفہوم ہے، یعنی جوادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا: رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو چلتے ہیں زمین پر، هَوْنًا: هون مصدر ہے، هَانَ يَهُوْنُ: نرم ہونا۔ اھون کا لفظ آپ عام طور پر استعمال کرتے رہتے ہیں ''یہ چیز اَھون ہے'' یعنی آسان ہے، ہلکی ہے۔ اور یہاں یہ مصدر یا تو مفعول مطلق واقع ہو رہا ہے اپنے موصوف

کے اعتبار سے، یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ مَشْیًا ذَا هَوْنٍ چلتے ہیں زمین پر نرم چال۔ اور یا هَیِّنِیْنَ کے معنی میں ہو کے یَمْشُوْنَ کی ضمیر سے حال واقع ہو جائے گا، زمین پہ چلتے ہیں اس حال میں کہ وہ نرمی کرنے والے ہوتے ہیں، یعنی ان کی چال میں نرمی ہوتی ہے، ان کی چال میں سختی اور تکبر نمایاں نہیں ہوتا۔ وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ: اور جب ان سے جاہل مخاطب ہوتے ہیں، جب خطاب کرتے ہیں ان سے جاہل۔ جاهلون سے یہاں بدتمیز قسم کے لوگ مراد ہیں، اجڈ اور بدتمیز قسم کے لوگ، جهل کا لفظ دو معنوں میں آیا کرتا ہے، ایک تو ''جہل'' ہے ''علم'' کے مقابلے میں، علم: جاننا، اور جهل: نہ جاننا۔ اور ایک ''جہل'' ہوا کرتا ہے ''حلم'' کے مقابلے میں، ''حلم'' ہو گیا بُردباری، سنجیدگی، اور ''جہل'' ہو گیا اشتعال انگیزی، کسی کی بات کو برداشت نہ کرنا، جلدی سے غصے میں آجانا، تو یہاں جهل سے ایسے ہی مراد ہے، یعنی ایسے لوگ جو سنجیدہ نہیں، بردبار نہیں، بات بات پر مشتعل ہونے والے ہیں، تیزی دکھانے والے ہیں، جاهلون کا مصداق یہاں یہ ہوگا، اسی لیے اس کا ترجمہ کیا گیا ہے غیر سنجیدہ لوگ، یا بدتمیز اور اجڈ قسم کے لوگ جب ان سے خطاب کرتے ہیں تو قَالُوْا سَلٰمًا: تو اللہ کے بندے کہہ دیتے ہیں: قَوْلًا ذَا سَلَامٍ، سلامتی والی بات، تو اللہ کے بندے سلامتی والی بات کہتے ہیں، یعنی رفعِ شر کی بات کہتے ہیں، ایسی بات کہتے ہیں جس میں کوئی لڑائی اور شر نہیں ہوتا، نرم بات کر کے درگزر کر جاتے ہیں، ''جب مخاطب ہوتے ہیں ان سے جاہل لوگ، جب بات کرتے ہیں ان سے جاہل لوگ تو وہ کہتے ہیں سلامتی کی بات، رفعِ شر کی بات''۔ یا اصل عبارت ہے: قَالُوْا نُسَلِّمُ عَلَيْكُمْ سَلَامًا، سلام دو طرح سے ہوا کرتا ہے، ایک ہے محبت کے اظہار کے لئے ملاقات کے وقت، دوستی کے اظہار کے لئے، جیسے ''السلام علیکم'' کہا جاتا ہے، اور ایک ہے جس کو ''سلامِ متارکت'' کہتے ہیں، جب کسی سے تعلق توڑنا ہو تو اس کو بھی کہتے ہیں: ''اچھا بھائی! تجھے سلام'' جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کلام میں بھی آیا تھا کہ جب ان کے باپ نے ان کے اوپر سختی کی تو انہوں نے کہا: سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ (سورۂ مریم: ۴۷) اچھا! تم پہ سلام ہو، یعنی یہ ''سلامِ متارکت'' ہے، میں جا رہا ہوں، تمہیں سلام ہو، تمہارے لیے میں اپنے رَبّ سے دُعا کرتا رہوں گا، اور آگے سورۂ قصص کے اندر بھی اسی طرح سے لفظ آئے گا وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۫ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۫ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ کہ جب کوئی بیہودہ بات ان کے سامنے آتی ہے، تو اس قسم کے لوگوں کو وہ کہہ دیتے ہیں کہ تمہارے لیے تمہارے عمل، ہمارے لیے ہمارے عمل، سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ، ہم جاہلوں سے اُلجھنا نہیں چاہتے، وہاں بھی یہی مفہوم ہے، اس سے پہلے یہ الفاظ ہیں: وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ کہ جب وہ لغو بات کو سنتے ہیں تو اس سے اعراض کر جاتے ہیں، اور لغو باتیں کرنے والوں سے کہہ دیتے ہیں کہ تمہارے لیے تمہارے عمل، ہمارے لیے ہمارے عمل، سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۫ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ تم پہ سلام ہو، ہم جاہلوں سے الجھنا نہیں چاہتے، یہ سلام ''سلامِ متارکت'' ہوتا ہے، تعلق توڑنے کے لئے آخری سلام بھی کر دیا جاتا ہے، مطلب یہ ہوا کہ بدتمیزوں کے مقابلے میں بدتمیزیاں نہیں کرتے، اگر کوئی اجڈ اور بدتمیز قسم کا آدمی ان سے اُلجھنا چاہتا ہے (یہاں خطاب جھگڑے اور شر کے لئے ہے) جیسے آپ بازار میں جاتے ہیں تو خواہ مخواہ بعض لوگوں کو عادت ہوتی ہے چھیڑ چھاڑ کرنے کی، تو یہاں خطاب سے ایسا ہی خطاب مراد ہے جس میں چھیڑ چھاڑ ہے، تو وہ ان کو سلام کر کے گزر جاتے ہیں، اور ان میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے، کہتے ہیں ہم جاہلوں سے اُلجھنا نہیں چاہتے۔ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا: اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو رات گزارتے ہیں اپنے رَبّ کے لئے سجدہ کرتے

ہوئے اور قیام کرتے ہوئے۔ سُجَّدًا: ساجد کی جمع ہے، اور قِيَامًا: قائم کی جمع ہے۔ سجدہ کرتے ہوئے اور قیام کرتے ہوئے رات گزارتے ہیں، مطلب یہ ہوا کہ عیش پرست لوگوں کی طرح وہ ساری رات سوتے نہیں رہتے، یا ساری رات کھیل تماشے میں مبتلا نہیں ہوتے، جیسے کہ غافل لوگوں کا کام ہوتا ہے کہ یا تو کھیل تماشے میں اپنا وقت گزار دیتے ہیں، اور یا یہ ہے کہ پھر آرام کے بستروں میں غفلت کے ساتھ سوئے رہتے ہیں۔ وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا: اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ: دور ہٹا دے ہم سے جہنم کا عذاب، اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا: بے شک اس جہنم کا عذاب چمٹنے والی چیز ہے۔ غرام کہتے ہیں چمٹنے والی چیز کو، یا غرام سے مراد ہلاکت، اور ہلاکت بھی وہ جب ایک دفعہ چمٹ جائے پھر چھوٹے نہ، پیچھا نہ چھوڑے، ''بے شک جہنم کا عذاب چمٹنے والی چیز ہے'' اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا: بے شک وہ جہنم بری ہے از روئے مستقر اور مقام کے۔ مستقر ہو گیا مستقل ٹھکانا، اور مقام ہو گیا عارضی طور پر قیام کرنے کی جگہ، یعنی وہ کسی کو مستقل ٹھکانے کے طور پر مل جائے تو بھی بری، اور اگر وہاں عارضی طور پر قیام ہو تو اس اعتبار سے بھی بری۔ وَالَّذِیْنَ اِذَاۤ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا: اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں کہ جب خرچ کرتے ہیں تو اسراف نہیں کرتے۔ اسراف کا معنی ہوتا ہے حد سے گزرنا، معصیت میں خرچ کیا جائے یہ بھی اسراف ہے، ضرورت سے زیادہ خرچ کیا جائے یہ بھی اسراف ہے، یعنی اپنے پیسوں کو ضائع نہیں کرتے بلاوجہ، ضرورت سے زیادہ خرچ نہیں کرتے، بے موقع خرچ نہیں کرتے، وَلَمْ یَقْتُرُوْا: اور تنگی بھی نہیں کرتے، جہاں خرچ کرنے کی ضرورت ہو وہاں بخل کریں ایسے بھی نہیں، جہاں شرعی طور پر خرچ کرنے کی اجازت ہے یا ترغیب ہے وہاں تنگی نہیں کرتے، اور بے موقع خرچ نہیں کرتے، ضرورت سے زیادہ خرچ نہیں کرتے، وَكَانَ بَیْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا: كَانَ کی ضمیر انفاق کی طرف لوٹ جائے گی۔ ان کا انفاق اس مذکور کے درمیان درمیان معتدل ہوتا ہے۔ ذٰلك کا اشارہ مذکور کی تاویل سے ہے یعنی بَیْنَ الْاِسْرَافِ وَالْقَتْرِ، كَانَ اِنْفَاقُهُمْ بَیْنَ الْاِسْرَافِ وَالْقَتْرِ قَوَامًا۔ قوام کے معنی معتدل، وسط۔ وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ: رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو اللہ کے ساتھ الٰہ آخر کو نہیں پکارتے، وَلَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ: اور نہیں قتل کرتے ایسے نفس کو جس کا قتل کرنا اللہ نے حرام ٹھہرایا، مگر حق کے ساتھ، تو حق کے ساتھ قتل کرتے ہیں، یعنی شریعت نے حق دے دیا، جس نے حرام ٹھہرایا تھا اسی نے حق دے دیا قتل کرنے کا، جس طرح سے مرتد کو قتل کیا جاتا ہے، یا قاتلِ عمد کو قتل کیا جاتا ہے، یا زانی محصن کو قتل کیا جاتا ہے، یہ قتل کرنا حق ہے، وَلَا یَزْنُوْنَ: اور وہ زنا نہیں کرتے، وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ: اور جو کوئی شخص یہ کام کرے گا جس کا ذکر پیچھے ہوا، یَلْقَ اَثَامًا: آثام کہتے ہیں گناہ کی سزا کو، آثام یہ ''وبال'' اور ''نکال'' کی طرح ہے لفظاً و معناً، وہ ''وبال'' سے ملاقات کرے گا، ''جو یہ کام کرے گا وہ سزا سے ملاقات کرے گا'' یعنی سزا میں پڑے گا، اس کو سزا ملے گی، یُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ: بڑھایا جائے گا اس کے لئے عذاب قیامت کے دن وَیَخْلُدْ فِیْهٖ مُهَانًا: مُهَانًا یہ اهانة سے اسم مفعول ہے، اَهَانَ: بے عزت کرنا۔ مُهان: بے عزت کیا ہوا۔ پڑا رہے گا اس عذاب میں بے عزت کیا ہوا، اس حال میں کہ وہ ذلیل کیا ہوا ہو گا، ذلیل ہو کر اس عذاب میں پڑا رہے گا۔ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا: مگر جو کوئی شخص توبہ کر لے، اپنی اس حالت سے باز آ جائے، اور ایمان لے آئے اور نیک عمل کرے، فَاُولٰٓئِكَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ: پس یہی لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی برائیوں کو اچھائیوں سے بدل دے گا، یعنی ایمان اور توبہ کی برکت سے، چونکہ پیچھے لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا

الْحَقِّ میں شرک کی نفی تھی، وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ میں مشرک بھی آ گیا، تو گویا جو شخص مشرک تھا، زانی تھا، قاتل تھا، جس وقت اس نے توبہ کر لی ایمان لے آیا اور اس نے نیک عمل کرنے شروع کر دیے، تو ان کی پچھلی غلطیاں اللہ تعالیٰ مٹا دے گا، اور ان کے نامۂ اعمال میں نیکی لکھنا شروع کر دے گا، اور کفر کے زمانے میں انسان اگر کوئی نیکی کرتا ہے تو وہ نہیں لکھی جاتی، وہ ضائع ہے، اور گناہ ہی گناہ لکھے جاتے ہیں، توبہ کرنے کی برکت سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو مٹا دیتے ہیں، اور اس کی جگہ نیکیاں لکھنا شروع کر دیتے ہیں، یا جب ایک ایک گناہ پر وہ توبہ کرے گا تو گناہ مٹتا جائے گا اور توبہ جو نیکی ہے وہ اس کی جگہ لکھی جائے گی، وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا: اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا: اور جو کوئی توبہ کرے اور نیک عمل کرے پس بے شک وہ لوٹتا ہے اللہ کی طرف لوٹنا، اس کا رجوع اللہ ہی کی طرف ہے، وہ شان و شوکت کے ساتھ اللہ کی طرف جائے گا جو توبہ کرتا ہے، اس کا لوٹنا اللہ ہی کی طرف ہے، تَابَ تَوْبَةً لوٹنے کو کہتے ہیں، فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ: پس وہ لوٹتا ہے اللہ کی طرف لوٹنا، یعنی اس کا لوٹنا اچھا ہے، اللہ کی طرف اس کا لوٹنا قابلِ قدر ہے۔ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ: زُور کہتے ہیں جھوٹ کو، اور اس کا مصداق ہو جائے گا ہر باطل کام۔ جو جھوٹ کے موقع پہ حاضر نہیں ہوتے نہیں حاضر ہوتے جھوٹ میں، یعنی جہاں کوئی باطل اور غلط چیز ہے وہاں حاضر نہیں ہوتے، اور لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ کا یہ ترجمہ بھی کیا گیا ہے کہ وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتے، وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ: اور جس وقت کسی لغو کے پاس سے گزرتے ہیں، کوئی کھیل ہے، تماشا ہے، بیہودہ کام ہو رہا ہے، جس طرح سے فاسق فاجر لوگ بازاروں میں بیٹھے ہوتے ہیں اور ایسی حرکتیں کرتے ہیں، یا بازیگر سے لوگ بیٹھے ہوتے ہیں اس قسم کی چیزوں میں لغو حرکتیں کر رہے ہوتے ہیں، جس میں دین و دُنیا کا کوئی فائدہ نہیں، تو جب وہ لغو کے پاس سے گزرتے ہیں تو مَرُّوْا كِرَامًا: كِرَامًا: کریم کی جمع ہے۔ تو بزرگانہ انداز میں گزر جاتے ہیں، سنجیدہ طور پر گزر جاتے ہیں، نہ تو ان کی تحقیر کرتے ہیں اور نہ ان میں دلچسپی لیتے ہیں، ایسے گزر جاتے ہیں جس طرح سے کوئی نجاست کا ڈھیر پڑا ہوا ہو، یا کوئی نجس بدبودار علاقہ ہے، اور کسی ضرورت کی بنا پر آپ کو وہاں سے گزرنا پڑ جائے تو آنکھ دبا کے، ناک دبا کے انسان وہاں سے جلدی سے گزرنے کی کوشش کرتا ہے، تو جس وقت وہ ایسے کاموں کے پاس سے گزرتے ہیں جو لغو ہیں، بیہودہ ہیں، کھیل تماشے کے اور غفلت عن اللہ کے کام ہیں، اللہ تعالیٰ سے غافل ہونے کے کام ہیں، تو اس طرح سے کریمانہ گزر جاتے ہیں، سنجیدہ طور پر گزر جاتے ہیں، بزرگانہ گزر جاتے ہیں، ان سے اُلجھتے بھی نہیں، ان میں دلچسپی بھی نہیں لیتے، ان کی تحقیر بھی نہیں کرتے، یعنی ان کے مقابلے میں تکبر کا اظہار نہیں کرتے، یوں گزر جاتے ہیں جیسے کوئی چیز دیکھی ہی نہیں، جیسے کہ نجس علاقے میں سے جہاں نجاستوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہوں، تو انسان اپنے آپ کو لاتعلق سا ظاہر کرتا ہوا گزرتا ہے، تو وہ بھی لغو کے پاس سے یوں گزر جاتے ہیں، وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ: اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں کہ جب ان کو ان کے رَبّ کی آیات کے ساتھ نصیحت کی جاتی ہے، لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا: تو نہیں گرتے وہ ان آیات پر بہرے اور اندھے ہو کر، صُمًّا اَصَمّ کی جمع ہے، عُمْيَان اَعْمٰى کی جمع ہے، یعنی جس طرح سے کافر، مشرک، اندھے، بہرے ہو کر ان آیات پر گرتے ہیں اور ان کی تکذیب کرنی شروع کر دیتے ہیں، تو رحمٰن کے بندے وہ ہیں کہ جب ان کو ان کے رَبّ کی آیات یاد دلائی جاتی ہیں تو سمجھداروں کی طرح، دانا بینا لوگوں کی طرح ان کو سنتے ہیں اور غور کرتے ہیں، اندھے بہرے ہو کے ان آیات پہ نہیں گرتے، ان آیات کی طرف متوجہ ہوتے

ہیں دانا بینا لوگوں کی طرح، جن کی عقلیں ٹھکانے ہوں، جن کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں، سمجھ دار لوگوں کی طرح وہ ان آیات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اندھوں بہروں کی طرح نہیں گرتے۔ وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ: اور رحمن کے بندے وہ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! عطا کر ہمیں، هَبْ امر کا صیغہ آ گیا، وَهَبَ یَهَبُ: ہبہ کرنا۔ عطا کر ہمیں ہماری بیویوں کی طرف سے اور ہماری اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک۔ قُرَّةَ اَعْیُنٍ: آنکھوں کی ٹھنڈک۔ ہمیں آنکھوں کی ٹھنڈک عطا کر، یعنی ان کے حالات اچھے ہوں، جنہیں دیکھ دیکھ کے ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں، ہماری بیویوں اور ہمارے بچوں کا ایسا حال کر دے کہ ان کو دیکھ دیکھ کے ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں، اور اللہ کے بندوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں ان کو نیک حالت میں دیکھ کے، اچھائی میں دیکھ کے، بُرائی میں دیکھ کے ان کو کڑھن ہوتی ہے، تکلیف ہوتی ہے، تو یہاں وہی نیکی مراد ہے، جیسے کہ اگلے الفاظ سے معلوم ہو رہا ہے، وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا: اور بنا دے ہمیں متقین کے لئے امام۔ اِمام سے پیشوا، سردار، مقتدیٰ مراد ہے، مطلب یہ ہے کہ تُو نے ہماری بیویوں اور ہماری اولاد پر ہمیں اِمام تو بنایا ہے، مقتدیٰ تو بنایا ہے، ہم ان کے پیش رَو تو ہیں، ان کے سردار تو ہیں، تو تُو ہماری بیویوں کو، اور ہمارے خاندان کے افراد کو متقی بنا دے تاکہ ہم متقیوں کے اِمام بنیں، یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ ہمیں اتنا اچھا کر دے کہ متقی لوگ بھی ہمیں دیکھ دیکھ کے ہماری اِقتدا کریں، دِینی قیادت ہمیں عطا فرما، دِینی اِمامت ہمیں عطا فرما، کہ لوگ ہماری طرف دیکھ دیکھ کے ہمارے پیچھے چلیں، اچھے لوگ بھی ہمارے پیچھے چلیں، دِینی قیادت کا مطالبہ کرنا ٹھیک ہے، کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہادی اور مہتدی بنائے، خود ہدایت یافتہ ہوؤ، اور آگے کسی دوسرے کے لئے ہدایت کا ذریعہ بنو، جس وقت آپ ہدایت کا ذریعہ بنیں گے تو جو لوگ آپ کے ذریعے سے ہدایت حاصل کریں گے آپ گویا کہ ان کے اِمام ہی ہیں، ان کے مقتدیٰ ہیں، اور یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ ہمارے اہل وعیال کی اِمامت تو آپ نے ہمیں دے دی، ہم وہاں سردار ہیں، ان کے پیش رو ہیں، تو تُو ان کو متقی بنا دے، تاکہ ہم متقیوں کے پیش رو بنیں، اگر ہمارے اہل وعیال میں فاسق فاجر لوگ ہوں گے تو ہم فاسق فاجروں کے سردار ہوں گے، اور اگر ہمارے اہل وعیال میں اچھے لوگ ہو جائیں گے تو ہم اچھے لوگوں کے سردار ہوں گے، تو ہمیں اچھے لوگوں کا سردار بنا، متقین کے لئے ہمیں اِمام بنا۔ اُولٰٓئِكَ یُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا: یہی لوگ ہیں جو بدلہ دیے جائیں گے غرفہ۔ غرفہ کہتے ہیں بالا خانے کو، بالا خانے کا لفظی معنی ہوتا ہے اُونچا گھر، تو بالا خانے کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ ایک نیچے مکان ہو اور ایک اس کے اُوپر مکان بنا ہوا ہو، تو ہم اسی کو ''بالا خانہ'' کہتے ہیں، ویسے بھی عالی شان عمارتیں، اُونچی عمارتیں ان کو بھی ''بالا خانے'' کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، ضروری نہیں کہ نیچے ایک منزل ہو اور اس کے اُوپر دوسری منزل ہو، بلکہ جو عالی شان عمارتیں ہوتی ہیں، بلند وبالا، ذی شان، ان کو بھی غرفہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ غرفہ یہاں مفرد ذکر کیا گیا، دوسری جگہ جمع ہے وَهُمْ فِی الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ (سورۂ سبا: ۳۷) وہ غرفات میں بے خوف رہنے والے ہوں گے، تو معلوم ہوگیا کہ یہاں بھی جمع ہی مراد ہے۔ اور ان غرفات کی تفصیل حدیث شریف میں آتی ہے، حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ غرفے عام اہلِ جنت کو یوں نظر آئیں گے جس طرح سے تم سر اُٹھا کے ستاروں کو دیکھتے ہو، اس طرح سے بلند وبالا چمکتے ہوئے نظر آئیں گے، یہ اُونچی عمارتیں، بلند شان والی، عالی شان یہ ''غرفہ'' کہلاتی ہیں، بِمَا صَبَرُوْا: ان کے صبر کرنے کی وجہ سے۔ جو یہ نیکیوں پر جمے رہے، مستقل مزاج رہے، ناسازگار حالات

انہوں نے برداشت کیے، کیونکہ جو صفتیں اوپر ذکر کی گئی ہیں ان کو اپنانے کے لئے بہت صبر اور استقامت کی ضرورت ہے، تو ان کے صبر کرنے کی وجہ سے یہ بدلہ دیے جائیں گے غرفہ۔ وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا: ڈالے جائیں گے وہ اس غرفہ میں تحیہ اور سلام۔ تحیہ دُعا کو کہتے ہیں، یہ اصل میں تَحْيِيَةٌ ہے، کسی کو زندگی کی دُعا دینا، یوں کہنا: حَيَّاكَ اللهُ، یہ لفظ پہلے بھی آیا تھا تحیۃ من اللہ۔ ''ڈالے جائیں گے وہ دُعا اور سلام'' ڈالے جائیں گے کا کیا مطلب؟ ان کو ہر طرف سے دُعا دی جائے گی اور سلام کہا جائے گا، ان کا استقبال کیا جائے گا دُعا اور سلام کے ساتھ، آگے بڑھ بڑھ کے فرشتے بھی انہیں سلام کہیں گے، حتیٰ کہ سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ (سورۂ یٰس: ۵۸) بھی ہوگا، رَبِّ رحیم کی طرف سے بھی ان کو سلام کہا جائے گا، آپس میں بھی ایک دوسرے کو سلام کہیں گے، ہر طرف سے سلامتی ہی سلامتی اور دُعا ہی دُعا ہوگی، اور اس میں بڑی عزت افزائی ہوتی ہے کہ انسان جدھر جائے آگے سے کوئی دُعائیں دینے والا ہو، سلام کہنے والا ہو، تو اس میں اکرام اور اعزاز ہے، خٰلِدِيْنَ فِيْهَا: ''هَا'' ضمیر غرفہ کی طرف لوٹ رہی ہے جس کا مصداق جنت ہے، ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اس جنت میں، اس غرفہ میں، حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا: اچھی ہے یہ جنت از روئے ٹھکانے کے اور مقام کے، جیسے وہاں آیا تھا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا، اس کے مقابلے میں آ گیا حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا، کسی کو مستقل رہنے کے لئے مل جائے تو بھی اچھی، اور عارضی طور پر کوئی اس میں چلا جائے تو بھی اچھی، لیکن آپ جانتے ہیں کہ انسان جنت میں جائے گا تو مستقل ہی جائے گا، مطلب یہ ہے کہ اتنی اچھی چیز ہے کہ اگر تھوڑا سا وقت ٹھہرنے کے لئے مل جائے تو بھی وہ اچھی ہے، جیسے جہنم کے بارے میں آیا تھا کہ تھوڑی سی دیر کے لئے بھی وہاں قیام ہو جائے تو بھی وہ بُری، اور مستقل قیام ہو تو بھی بُری۔ قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ: آپ کہہ دیجیے نہیں پروا کرے گا میرا رَبّ تمہاری، عَبَأَ پروا کرنے کے معنی میں۔ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ: اس کا ترجمہ دو طرح سے کیا گیا ہے۔ دُعا مصدر ہے اور اس کی اضافت کُمْ کی طرف یہ اضافت مفعول کی طرف ہے، مطلب یہ ہو گیا اگر تمہیں دعوت دینی نہ ہوتی، اگر تم کو بلانا نہ ہوتا اللہ تعالیٰ کے راستے کی طرف، تو اللہ تعالیٰ کو تمہاری کوئی پروا نہ ہوتی، یعنی میں جو تمہیں دعوت دے رہا ہوں اللہ کی طرف سے، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو تمہاری کوئی پروا ہے، اگر تمہیں دعوت دینی نہ ہوتی تو اللہ کو تمہاری کوئی پروا نہیں، تمہاری طرف اتنی توجہ یا اللہ کی باتیں تم تک پہنچانا یہ دعوت کے لئے ہے، اگر دعوت دینا مقصود نہ ہو تو تم تو اس قابل ہی نہیں کہ تمہیں اللہ کی بات سنائی جائے یا اللہ تمہاری طرف کوئی توجہ کرے، یہ توجہ محض ایک دعوت دینے کے لئے ہے جو تمہیں بلایا جا رہا ہے اور دینِ اسلام قبول کرنے کے لئے کہا جا رہا ہے، اگر یہ دعوت دینا نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ کو تمہاری کیا پروا ہے؟ کہ تمہیں خطاب کرے، تمہیں سمجھائے، تمہارے ساتھ باتیں کرے۔ اور یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ دُعاء مصدر ہے اور کُمْ فاعل ہے، اگر تمہارا پکارنا نہ ہو اللہ کو تو اللہ کو تمہاری کوئی پروا نہیں، اللہ تمہاری طرف متوجہ ہوگا تو تمہاری دُعا اور عبادت کی وجہ سے ہوگا، اگر تم اللہ کی عبادت نہ کرو اور اللہ کے سامنے اپنا دامن نہ پھیلاؤ تو اللہ کو تمہاری کوئی ضرورت نہیں، اللہ کو کیا پروا ہے، تو پھر دُعاء مصدر کی اضافت فاعل کی طرف ہو جائے گی، کہ اگر تمہارا پکارنا نہ ہو (اور دُعا عبادت کے معنی میں بھی آتا ہے جس طرح سے آپ آیات میں دیکھتے رہتے ہیں) اگر تمہارا عبادت کرنا نہ ہو، یا تمہارا اللہ کو پکارنا نہ ہو تو اللہ کو تمہاری کیا پروا ہے؟ اللہ تو تمہاری طرف متوجہ ہوگا تو تمہارے پکارنے کی وجہ سے ہوگا کہ تم اس کے سامنے دامن پھیلاؤ، یا تمہاری عبادت کی وجہ سے ہوگا کہ تم اس کی عبادت کرو، تب اللہ تمہاری طرف متوجہ

ہوگا، ورنہ اس کو کوئی پروا نہیں ہے۔ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ: پس تحقیق تم نے تکذیب کر دی اللہ کی، اللہ کے رسولوں کی، اللہ کی باتوں کی، اللہ کی دعوت کی تم نے تکذیب کر دی، فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا: تو يَكُوْنُ کی ضمیر تو تکذیب کی طرف ہی لوٹے گی، لیکن مراد ہو جائے گا تکذیب کا عذاب، فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا: پس عنقریب تمہاری یہ تکذیب تمہیں چمٹ کے رہے گی، لزام باب مفاعلہ کا مصدر ہے، لازم کے معنی میں، تمہاری یہ تکذیب تمہارے لیے لازم ہوگی، یعنی اس تکذیب کا وبال تمہارے ساتھ لازم ہوگا، یہ تمہارے گلے کا ہار بن کے رہے گی، گلے پڑے ہوئے یہ چھوٹے گی نہیں، فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا: پس عنقریب عذاب لازم ہوگا، یا عنقریب تمہاری یہ تکذیب تمہارے ساتھ لازم ہوگی، یعنی تکذیب کا وبال۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

پچھلے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے بہت سارے آثار آپ کے سامنے نمایاں کیے تھے اور اپنی آیات کی طرف متوجہ کیا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ لوگ توحید اختیار کرتے، لیکن یہ توحید اختیار نہیں کرتے، يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ میں ان کے شرک کا ذکر تھا، اور اس رَبِّ رحمٰن کی طرف جب ان کو متوجہ کیا جاتا اور یہ کہا جاتا کہ تم رَبِّ رحمٰن کو سجدہ کرو اس کی اطاعت قبول کرو، تو آگے سے وہ استہزا کرتے ہیں کہ رحمٰن کیا ہوتا ہے؟ کیا جس کو تُو کہے ہم اسی کو سجدہ کرنے لگ جائیں؟ پچھلی آیات کے اندر یہ بات آئی تھی، اور اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا کہ رحمٰن کی شان کسی خبر دار سے پوچھو جو رحمٰن کی خبر رکھنے والا ہے، اور سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ ہی اپنے حالات کو جاننے والے ہیں، تو اللہ تعالیٰ ہی اپنی شان کو نمایاں کرتے ہیں۔ اب اس رکوع کی پہلی آیت کا تعلق تو وہی آثار قدرت کے ساتھ ہے، اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے اچھے بندوں کی تعریف کی ہے، اور اچھے بندوں کی تعریف کرنے سے مقصد مؤمنین کو ترغیب دینا ہے کہ یہ صفتیں اپنائیں، اور کافروں کی مذمت ہے کہ ان کا اللہ کے بندوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، جب ان کے اندر یہ صفتیں نہیں پائی جاتیں تو یہ رحمٰن کے مقبول بندے نہیں ہیں، گویا کہ یہ ایک آئینہ سامنے رکھ دیا گیا کہ اللہ کے مقبول بندے کون سے ہوتے ہیں، تو جو سعادت مند ہیں وہ ان صفتوں کو اپنانے کی کوشش کریں گے تاکہ اللہ کے مقبول بندوں کی فہرست میں شامل ہو جائیں، اور کفار جو صرف مال اور دولت کی وجہ سے اپنے آپ کو سمجھتے تھے کہ ہم اللہ کے مقبول بندے ہیں، تو ان کے سامنے یہ بات آجائے گی کہ اللہ کے مقبول بندے وہ نہیں ہوتے جو اچھا کھاتے ہیں اچھا پیتے ہیں، اور ان کا لباس اچھا ہے ان کے مکانات اچھے ہیں، یہ اللہ کے بندوں کی کوئی علامات نہیں ہیں، اللہ کے بندے تو وہ ہیں جنہوں نے ایسی صفات اپنا رکھی ہیں، تو ان کے اس تکبر کی بھی تردید ہو جائے گی جو صرف مال و دولت کی وجہ سے اور دنیا کی شان و شوکت کی وجہ سے اپنے آپ کو سمجھتے تھے کہ ہم بھی اللہ کے مقبول بندے ہیں۔

ستارے آسمان میں جڑے ہوئے ہیں یا فضا میں معلق ہیں؟

پہلی آیت میں فرمایا ''برکت والا ہے وہ جس نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے بنائے'' برکت کا معنی آپ کے سامنے ذکر کر دیا گیا تھا خیر کثیر، اور تبارک کا معنی ہے کہ اللہ خیر کثیر کا منبع اور مرکز ہے، جس کو بھی کوئی خیر پہنچتی ہے اسی سے ہی پہنچتی ہے، وہ بہت برکت والا ہے، بہت خیر کثیر والا ہے، ''جس نے آسمان میں ستارے بنائے'' ستارے آسمان میں ہیں یا آسمان سے نیچے فضا میں ہیں، یہ جو آپ کو چاند سورج اور دوسرے ستارے نظر آ رہے ہیں یہ آسمان میں لگے ہوئے ہیں جس طرح سے انگوٹھی میں نگینہ لگا ہوا ہوتا ہے، یا یہ آسمان سے نیچے ہیں؟ یہ مسئلہ پرانے فلسفیوں میں مختلف فیہ تھا، عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پانچ سو سال پہلے یونان میں ایک حکیم فلسفی گزرا ہے فیثاغورث، تو فیثاغورث اس وقت کا بہت بڑا فلسفی تھا اور ہیئت کا بھی ماہر تھا، اس زمانے کے اعتبار سے انہوں نے آلات وغیرہ بھی بنائے ہوئے تھے، جس سے وہ اوپر والے حالات کا مطالعہ کرتے، جیسے آج کل خوردبینیں ہیں، دُوربینیں ہیں، اور اس قسم کے دوسرے آلات ہیں ستاروں کے حالات کو جاننے کے لئے، اس زمانے کے اعتبار سے ان کے پاس بھی تھے، عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پانچ سو سال پہلے یونان میں ہوا ہے، اس نے سب سے پہلے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ یہ چاند سورج ستارے یہ آسمان میں لگے ہوئے نہیں، جس طرح سے زیور میں نگینہ جڑا ہوا ہوتا ہے، بلکہ یہ آسمان سے نیچے فضا میں معلق ہیں، تو جس وقت یہ فضا میں معلق ہوئے تو فِی السَّمَآءِ کا مفہوم ہوگا فِیْ جِهَةِ السَّمَاءِ ''آسمان کی جانب جس نے ستارے بنائے''، یا کل آپ کی خدمت میں ذکر کیا گیا تھا کہ سماء کہتے ہیں ہر اوپر والی چیز کو، تو یہ فضاء خود سماء کا مصداق ہے، تو سماء سے سماوات سبعہ مراد نہیں ہوں گے، بلکہ جس طرح سے بادل کو سماء کہا گیا، اسی طرح سے آسمان سے نیچے اور زمین کے اوپر جو فضاء ہے یہ بھی سماء کہلاتی ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اس فضاء کے اندر، اوپر کی جانب میں، آسمان کی جہت میں ستارے بنائے، یہ تو فیثاغورث کا نظریہ تھا اس پر قرآنِ کریم کے الفاظ یوں چسپاں ہوتے ہیں...... اور اس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے ایک دوسرا فلسفی ہوا، یہ فلسفے کی کتابیں آپ پڑھیں گے تو ان کا ذکر ہماری کتابوں میں بھی آتا ہے، اس کا نام تھا بطلیموس، بطلیموس نے یہ نظریہ قائم کیا تھا کہ یہ چاند سورج اور ستارے آسمان میں اس طرح سے لگے ہوئے ہیں جس طرح سے زیور میں نگینے جڑے ہوئے ہوتے ہیں، بطلیموس کا نظریہ زیادہ قبول ہوا، اور فیثاغورث کا نظریہ دَب گیا، اور اس کا قائل اس دور میں پھر کوئی نہ رہا، یہی وجہ ہے کہ پرانے لوگ اپنی کتابوں میں ستاروں کا کچھ اس انداز سے تذکرہ کرتے ہیں گویا کہ یہ آسمان میں لگے ہوئے ہیں، اور آسمان حرکت کرتا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ ان ستاروں کی حرکت ہوتی ہے، لیکن عیسیٰ علیہ السلام کے تقریباً تیرہ سو سال بعد جدید فلسفی پیدا ہوئے، انہوں نے بطلیموس کے نظریے کی تردید کی اور فیثاغورث کے نظریے کی تائید کی، اس کے بعد سے پھر فیثاغورث کا نظریہ نمایاں ہونا شروع ہوا، حتیٰ کہ یہ دور آ گیا یعنی بیسویں عیسوی صدی، اور ہجری چودھویں صدی، جس میں آلاتِ جدیدہ کے ساتھ مشاہدے تک نوبت پہنچ گئی، اور ان لوگوں نے راکٹوں اور جہازوں کے ذریعے عالمِ بالا کا سفر کیا، فضا میں گئے، فضا کو عبور کیا، تو یہ چیز مشاہدے سے ثابت ہوگئی کہ یہ آسمان میں نگینے کی طرح جڑے ہوئے نہیں، اس لیے بطلیموس کا نظریہ غلط ہے اور فیثاغورث کا نظریہ صحیح

ہے..... قرآنِ کریم چونکہ کوئی ہیئت کی کتاب نہیں، اور نہ یہ کوئی فلسفے کی کتاب ہے، اس لیے ان چیزوں پہ قرآنِ کریم بحث نہیں کرتا، قرآنِ کریم تو اس کے آثار نمایاں کر کے لوگوں کو ان کے پیدا کرنے والے کی قدرت کی طرف متوجہ کرتا ہے، کہ یہ ہے اس کا پیدا کرنے والا، اور یہ اس کے آثار ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنا بڑا قادر اور کتنا بڑا محسن ہے، اس سے کوئی بحث نہیں کہ وہ آسمان میں لگے ہوئے ہیں یا آسمان سے نیچے ہیں، قرآنِ کریم کے الفاظ دونوں باتوں پہ صادق آسکتے ہیں، اگر مشاہدے کے ساتھ یہ ثابت ہوجائے کہ آسمان میں لگے ہوئے ہیں تو فِي السَّمَآءِ اپنے ظاہر پہ رہ جائے گا، اور اگر مشاہدے کے ساتھ یہ ثابت ہوجائے کہ آسمان میں نہیں، نیچے فضا میں ہیں، تو فِي السَّمَآءِ میں سماء سے مراد آسمان سے نیچے والی فضا ہوگی، جس طرح سے بادلوں کے لئے بھی یہ لفظ بولا گیا، تو قرآنِ کریم صراحتاً ان میں سے کسی کے حق میں نہیں، قطعی طور پر قرآنِ کریم نے یہ بات بیان نہیں کی کہ وہ آسمان میں جڑے ہوئے ہیں یا آسمان سے نیچے ہیں، دیکھنے والا چونکہ ان کو آسمان کی جانب دیکھتا ہے تو اس ظاہری مشاہدہ کا اعتبار کرتے ہوئے ان کو فِي السَّمَآءِ کہا گیا ہے، آگے دونوں باتیں ہوسکتی ہیں کہ آسمان میں لگے ہوئے ہوں یا آسمان سے نیچے فضا میں لٹک رہے ہوں، قرآنِ کریم ان دونوں مفہوموں میں سے کسی بات پر قطعیت کے ساتھ کوئی بیان نہیں کرتا، کیونکہ ان باتوں کی طرف متوجہ کرنا قرآنِ کریم کا موضوع نہیں ہے، ہم زمین پہ رہتے ہوئے جب آسمان کی طرف دیکھتے ہیں تو ہمیں ایسے ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آسمان میں ہیں، اسی کا اعتبار کرتے ہوئے اس کو فِي السَّمَآءِ سے تعبیر کردیا گیا، باقی! اس کے مفہوم دونوں طرح سے نکل سکتے ہیں، تو آج چونکہ مشاہدے سے ثابت ہوگیا کہ فیثاغورث کا نظریہ صحیح تھا، تو اس لیے ہم پر کوئی اِشکال نہیں، کیونکہ فِي السَّمَآءِ کا مفہوم یہ بھی ہے، کہ ہم دیکھتے ہیں اوپر کی جانب، اوپر کی جانب میں اللہ نے ستارے بنائے ہیں، تو جیسے بادل پر سماء کا لفظ بولا جاتا ہے اسی طرح سے اس فضاء پر جو آسمان سے نیچے زمین کے اوپر ہے اس پر بھی سماء کا لفظ بولا جاتا ہے۔ ''بڑے بڑے ستارے بنائے، یا بڑے بڑے قلعے بنائے'' جن میں فرشتے پہرہ دیتے ہیں، اور شیاطین کو اوپر نہیں جانے دیتے، آسمان کی حفاظت جن کے ذریعے سے اللہ نے فرمائی۔

اور سراج سے مراد سورج ہے، اس کو قرآنِ کریم میں کئی جگہ سراج سے تعبیر کیا گیا جیسے سِرَاجًا وَّهَّاجًا (سورۂ نبا)، نُور پھیلانے والا چراغ، جوش مارنے والا، گرمی پھیلانے والا چراغ، تو سورج میں چونکہ گرمی بھی ہے اور روشنی بھی ہے، اس لیے اس کو سراج سے تعبیر کیا، اور چاند کو مُّنِيْرًا کہہ دیا، نور پھیلانے والا روشنی پھیلانے والا، اس میں گرمی نہیں ہے۔

دِن اور رات کے خِلفہ ہونے کے دو مفہوم

اور آگے وہی دِن رات کا تصرف آگیا کہ اللہ تعالیٰ نے دِن رات کو ایک دوسرے کا خلیفہ بنایا، ایک جاتا ہے دوسرا آتا ہے، یا یہ مطلب ہے کہ ایک کو دوسرے کا بدل بنایا ہے، کوئی عمل دِن کو چھوٹ گیا تو رات کو کرلو، اور رات کو چھوٹ گیا تو دِن کو کرلو (ابن کثیر)، اس لیے حدیث شریف میں آتا ہے کہ اگر کسی کو کوئی وظیفہ رات کو پڑھنے کی عادت ہے اور کسی وجہ سے وہ نہیں پڑھ سکا تو دن کو اگر وہ پڑھ لے تو ایسے سمجھا جائے گا جیسے کہ رات کو پڑھا ہے،[1] سرورِ کائنات ﷺ تہجد پڑھا کرتے تھے، اور اگر کسی وجہ سے

---

(۱) تفسیر ابن کثیر عن ابن عباس موقوفًا

تلاوت ہوگئی، بیماری ہوئی، کسی وجہ سے صبح نہ اُٹھ سکتے تو دن کے وقت آپ بارہ رکعت پڑھ لیا کرتے تھے،[1] احادیث میں ذکر آتا ہے۔ تو ان کے خلیفہ ہونے کا یہ بھی معنی ہے، اور ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے ہیں یہ معنی بھی ہے۔ اور یہ ساری چیزیں جو بیان کی جارہی ہیں یہ ان لوگوں کے لئے ہیں جو نصیحت حاصل کرنا چاہیں، یا شکر گزاری کا ارادہ کریں، ان کے لئے ان باتوں میں بہت سامان موجود ہے۔

”عبادالرحمٰن“ کی صفات

آگے رحمٰن کے بندوں کی تعریف آگئی کہ یہ مشرک تو ایسے نالائق ہیں ناشکرے ہیں کہ یہ تو رحمٰن کے نام سے چڑتے ہیں، اور رحمٰن کے بندوں کی یہ صفات ہیں، رحمٰن کے پیارے بندے وہ ہیں جن کے اندر یہ صفتیں پائی جاتی ہیں:

۱- ان میں سے پہلے یہ ذکر کیا گیا کہ کوئی متکبر نہیں کیونکہ جو آدمی متکبر ہے اور اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے، تکبر کا اصل مفہوم ہوتا ہے حق کے مقابلے میں اکڑنا، جس کو حق قبول کرنے کی عادت نہیں ہوتی تو اس کی چال میں بھی یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ بہ تکلف وہ اکڑ کے چلتا ہے، سینہ تان کے، گردن اُٹھا کے، تو اس کی چال بھی بتاتی ہے کہ یہ شخص متکبر ہے اور کسی کی بات ماننے والا نہیں، یہ حق بات کے سامنے یہ سرافگندہ نہیں ہوتا، گردن نہیں جھکاتا، اس لیے یہاں چال کا ذکر کردیا، ورنہ یہاں سے مراد یہ ہے کہ بے تکلف چلتے ہیں، بہ تکلف اکڑ کر پاؤں زمین پر زور زور سے مار کے نہیں چلتے، بے تکلف چلتے ہیں، نرم چلنے کا یہ معنی نہیں کہ بیماروں کی طرح قدم گھسیٹ گھسیٹ کے چلتے ہیں، یہ مقصد نہیں ہے، کیونکہ سرورِ کائنات ﷺ کی جو چال حدیث شریف میں ذکر کی گئی ہے اس سے اس کی تائید نہیں ہوتی کہ بیماروں کی طرح پاؤں گھسیٹ گھسیٹ کے چلنا یہ کوئی فضیلت کی بات ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور ﷺ بہت قوت کے ساتھ چلتے تھے، قوت سے قدم اُٹھاتے تھے، اور اتنا تیز رفتار چلتے تھے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم کبھی حضور ﷺ کے ساتھ ہوتے تو ”اِنَّا لَنُجْهِدُ اَنْفُسَنَا وَاِنَّهٗ لَغَيْرُ مُكْتَرِثٍ“ کہ آپ ﷺ جس وقت چلتے اور ہم ساتھ ہوتے تو ہم تو اپنی جانوں کو مشقت میں ڈال دیتے آپ کے ساتھ چلنے کے لئے، اور آپ ایسے چلتے گویا کہ پرواہی نہیں ہے، بلاتکلف جارہے ہیں، اور جب چلتے تھے تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے زمین آپ کے لئے لپٹی جارہی ہے۔[2] تو سرورِ کائنات ﷺ تیز بھی چلتے تھے، قدم زور سے اُٹھاتے تھے، یہ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا کے خلاف نہیں ہے، مطلب اس کا یہ ہے کہ وہ منکسر المزاج ہیں، اور ان کی تواضع اور انکسار ان کی چال سے بھی نمایاں ہے، کہ لوگوں کی طرح تکلف کے ساتھ وہ اکڑتے نہیں، اور تن تن کے نہیں چلتے، کہ زمین کے اُوپر وہ پورا زور لگا کے چلیں، تکبر کے طور پر بڑائی ظاہر کرنے کے لئے وہ زمین کے اوپر زور زور سے پاؤں ماریں، ایسے نہیں ہیں، ورنہ اگر کوئی شخص ہو تو متکبر اور بظاہر وہ گردن جھکا کے نرم چال چلے تو یہ کوئی

---

(۱) مسلم ۲۵۶/۱ باب صلاۃ اللیل وعدد رکعات ... مشکوٰۃ ۱۱۱/۱ باب الوتر، فصل اول۔
(۲) ترمذی ۲۰۶/۲ باب صفۃ النبی۔ مشکوٰۃ ۵۱۸/۲ باب اسماء النبی وصفاتہ، فصل ثانی۔

قابلِ تعریف نہیں، مقصد اس سے یہی ہے کہ وہ منکسر المزاج ہیں متواضع ہیں، اور ان کی چال بلا تکلف ہے، متکبر لوگوں کی طرح اکڑ کے نہیں چلتے۔

۲- اور دُوسری بات یہ بتائی کہ اگر کوئی جاہل ان سے اُلجھنا چاہیں تو سلامتی کی بات کہہ کے گزر جاتے ہیں، لڑائی کو بڑھاتے نہیں ہیں، اگر کسی نے کوئی شر کی بات کہہ دی، کوئی بدتمیزی کی بات کردی، کوئی جاہل بدتمیز آدمی، کوئی اجڈ آدمی ان سے اُلجھنا چاہتا ہے تو رفعِ شر کی بات کہتے ہیں، سلام کر کے گزر جاتے ہیں، سلامتی کے ساتھ گزر جاتے ہیں، سلامتی کی بات کہتے ہیں جو رفعِ شر کی ہوتی ہے، ان کے مقابلے میں اُلجھتے نہیں، ان کی بدتمیزیوں کو برداشت کر جاتے ہیں، حلم اور برداشت کے ساتھ بات کو ٹال دیتے ہیں، بات کو بڑھاتے نہیں ہیں، یہ بھی ''عبادالرحمٰن'' کی عادت ہے۔

۳- اور تیسری بات یہ بتائی کہ وہ راتیں غفلت سے نہیں گزارتے، کھیل تماشے میں بیٹھے ہوئے، سینمے میں بیٹھے ہوئے، کھیل دیکھتے ہوئے رات گزاردیں، یا اس طرح سے کھاپی کے نرم گرم بستروں میں لیٹیں کہ ساری رات اسی طرح سے بستروں میں لیٹے لیٹے گزاردیں، ان کا یہ حال نہیں ہے، بلکہ وہ راتوں کو اللہ کی عبادت کرتے ہیں، کبھی اللہ کے سامنے قیام کرتے ہیں، کبھی اللہ کے سامنے سجدہ کرتے ہیں، تو مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد اگر کوئی شخص عشاء کے وقت تک جاگ لے اور عشاء کی نماز پڑھ لے، یا عشاء کے بعد کچھ نوافل پڑھ لے تو اس پر یہ بات صادق آتی ہے، لیکن کمال یہ ہے کہ صبح کے وقت اُٹھ کے انسان کچھ نوافل پڑھ لے، اس کی ترغیب قرآنِ کریم میں بھی ہے اور حدیث شریف میں تو بہت ہی زیادہ ہے، كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ۝ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ (سورۂ ذاریات: ۱۷) رات کو کم سوتے تھے، لوگوں کی طرح ساری ساری رات نہیں سوتے، اور سحر کہتے ہیں رات کے آخری چھٹے حصے کو، رات کے آخری حصے میں اُٹھ کے وہ اِستغفار کرتے، اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے۔ تو تہجد پڑھنے والوں پر بہت اچھے طریقے سے یہ آیت صادق آجائے گی۔

۴- اور اگلی بات یہ بتائی کہ پھر وہ تہجد پڑھ کے یا نوافل پڑھ کے یوں نہیں سمجھ لیتے کہ اب ہم نے جنت خرید لی، اپنی نیکی پر بھی ناز نہیں کرتے، بلکہ پھر بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے دُعائیں کرتے ہیں، کہ اے اللہ! ہم سے جہنم کا عذاب دُور ہٹادے، کیونکہ اس کا عذاب تو ہلاکت ہی ہلاکت ہے، بالکل چمٹ جانے والا ہے، جو جہنم میں جاپڑے گا جان نہیں چھوٹے گی، تو اللہ تعالیٰ سے یوں ڈرتے بھی ہیں، نیکیاں کر کے عبادتیں کر کے اللہ کے سامنے جہنم سے بچنے کے لئے دُعا بھی کرتے ہیں، کیونکہ جہنم سے بچنا یہ بھی اللہ کی رحمت کے ساتھ ہی ہوگا، اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔

۵- اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں کہ جب خرچ کرتے ہیں تو خرچ میں بھی ان کے ہاں اعتدال ہے، نہ تو فضول ضائع کرتے ہیں، نہ بے موقع خرچ کرتے ہیں، نہ ضرورت سے زیادہ خرچ کرتے ہیں، اور جہاں خرچ کرنے کی شرعی مصلحت ہو، وہاں بخل نہیں کرتے، اور جہاں شرعی مصلحت نہیں ہے وہاں خرچ نہیں کرتے، معصیت میں خرچ نہیں کرتے، ضرورت سے زیادہ خرچ نہیں کرتے، یہ بھی اچھے بندے کی علامت ہے، رحمٰن کے مقبول بندے وہ ہیں جو مالیات میں محتاط ہوتے ہیں، کیونکہ جو لوگ

اِسراف اور فضول خرچی میں واقع ہوجائیں پھر وہ اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کر سکتے، فضول خرچ آدمی کی تو اپنی ضرورتیں نہیں پوری ہوا کرتیں، کسی دوسرے کے ساتھ مروّت وہ کیسے کرے گا؟ اللہ کے نام پر، اپنے بھائیوں پر، اپنے اردگرد پڑوس والوں پر وہی شخص خرچ کرسکتا ہے کہ جس کو خود فضول خرچی کی عادت نہیں ہے، بقدرِ ضرورت خرچ کرتا ہے، تو لازماً اس کے پاس کچھ نہ کچھ بچے گا، تو اس پر اللہ کے راستے میں خرچ کرنا بھی آسان ہوجائے گا، اور اگر معیارِ زندگی کو اونچا کرنا شروع کردیا جائے اور خود اپنی عیش و عشرت میں انسان خرچ کرنا شروع کردے تو کتنی ہی آمدنی ہو وہ اپنے اِخراجات کے لئے بھی کافی نہیں ہوتی، اس لیے اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا موقع نہیں ملتا، تو اس میں بھی ان کو اعتدال ہے، ضرورت سے زیادہ خرچ نہیں کرتے، معصیت میں خرچ نہیں کرتے، اور جہاں مناسب موقع ہوتا ہے اس میں بخل نہیں کرتے، اس کے درمیان درمیان ان کا خرچ کرنا اعتدال کے ساتھ ہوتا ہے۔

۶- اور عقیدے کے درجے میں وہ موحد ہوتے ہیں، اللہ کے ساتھ کوئی اور اِلٰہ نہیں پکارتے، مشرک نہیں، شرک نہیں کرتے۔

۷- اور حقوق العباد میں محتاط ہیں کہ جن کے قتل کرنے کو اللہ نے حرام ٹھہرایا اس کو قتل نہیں کرتے، قاتل نہیں ہوتے، اور زِنا نہیں کرتے، اور جو کوئی یہ کام کرے گا یعنی اللہ کے ساتھ کسی اور کو پکارے، یا قتلِ نفس کرے، یا زِنا کرے تو وہ اس کے وبال سے ملاقات کرے گا، اس پر اس کا وبال پڑے گا۔ اور اِلَّا بِالْحَقِّ کی تفصیل آپ کے سامنے آگئی، کہ شرعی حق کے ساتھ قتل کرنا ٹھیک ہے، جیسے کہ قاتلِ عمد کو قتل کیا جاتا ہے، جس نے کسی دوسرے کو قتل کردیا، یا زانی محصن کو جان سے مار دیا جاتا ہے، اسی طرح سے مُرتد کو قتل کیا جاتا ہے، باغیوں کے ساتھ لڑائی لڑی جاتی ہے، وہ باتیں علیحدہ ہیں، وہ ساری کی ساری بِالْحَقِّ میں آجائیں گی، ''اس کے لئے عذاب بڑھایا جائے گا'' یعنی کُفر شرک، اور پھر یہ بداعمالیاں ساتھ ہوں گی تو جہنم میں اس کا عذاب زیادہ کیا جائے گا قیامت کے دِن، ''اور اس میں ذلیل ہوکے پڑا رہے گا'' ...... ''مگر جو توبہ کرلیں اور ایمان لے آئیں'' معلوم ہوگیا اوپر کی آیات مشرکین کے بارے میں ہیں کہ عذاب میں ڈالے جائیں گے اور ذلیل کر کے ڈالے جائیں گے۔ مؤمنین کو ایمان کی برکت سے اللہ تعالیٰ بخش دے تو بھی ٹھیک ہے، اور اگر جہنم میں جائیں گے تو ان کو ذلیل کرنے کے لئے جہنم میں نہیں ڈالا جائے گا بلکہ پاک صاف کرنے کے لئے ڈالا جائے گا، سزا تو اُنہیں بھی ہوگی لیکن اِن کی سزا میں اور اُن کی سزا میں فرق ہے، ایک آدمی کو سزا کے طور پر اس کے اوپر گرم پانی ڈالا جائے، اور ایک ماں بچے کو نہلانے کے لئے اور اس کی میل اتارنے کے لئے گرم پانی ڈالتی ہے، دونوں میں فرق ہوتا ہے، یہاں بھی بچہ چیختا تو ہے چلاتا بھی ہے، ساتھ ساتھ کبھی ایک اِدھر چپت لگادی، ایک اُدھر چپت لگادی، میل اُتارنے کے لئے خوب اچھی طرح سے رگڑتی ہیں، بچہ چیختا چلاتا بھی ہے، اس میں کوئی شک نہیں، اور دونوں کی بظاہر صورت ایک ہے، کہ جس کو قاری صاحب پیٹ رہے ہوں وہ بھی چیختا ہے اور جس کو ماں نہلاتے ہوئے چپت لگارہی ہو وہ بھی چیختا ہے، دونوں میں فرق ہوتا ہے، ایک کو جرم کی سزا دی جارہی ہے دوسرے کو صاف ستھرا کیا جارہا ہے، تو یہی نوعیت ہوگی کہ کافروں کو تو جہنم میں ڈالیں گے تو ان کے جرم کی سزا کے طور پر ان کو ذلیل کرنا مقصود ہوگا، اور مؤمنین اگر جہنم میں جائیں گے تو ان سے گناہوں کی میل اُتارنی مقصود ہوگی، تاکہ

پھر یہ پلنگ پہ بیٹھنے کے قابل ہو جائیں، اچھے کپڑے پہننے کے قابل ہو جائیں، ورنہ بچہ باہر کھیلتے کھیلتے اگر گرد آلود ہو جائے میلا کچیلا ہو جائے تو اس کو پھر کون پلنگ پہ بیٹھنے دیتا ہے، پہلے ماں گھسیٹ کے اس کو غسل خانے میں لے جائے گی، خوب رگڑ رگڑ کے صاف کرے گی، چیختا چلّاتا رہے گا، بعد میں اُٹھا کے پلنگ پہ بٹھائے گی، پیار بھی کرے گی، اچھے کپڑے بھی پہنا دے گی۔ تو ان کا جہنم میں جانا ذلیل کرنے کے لئے نہیں ہوگا، اس لیے مُهَانًا کا لفظ مشرکوں کافروں پر صادق آتا ہے، اور اس لیے توبہ کے ساتھ اِلَّا کا ذکر آ گیا...... ''جو توبہ کریں اور ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں تو اللہ تعالیٰ ان کی برائیوں کو اچھائیوں سے بدل دے گا'' ان کی برائیاں مٹ جائیں گی، آئندہ ان کے نامۂ اعمال میں نیکیاں لکھی جائیں گی، یا یہ ہے کہ جب ایک ایک گناہ کو مستحضر کر کے توبہ کی جاتی ہے تو گناہ مٹتا جاتا ہے، اس کی جگہ توبہ والی نیکی لکھی جاتی ہے، ''اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے'' ...... ''اور جو کوئی بھی توبہ کرے'' اوپر مشرکوں کا ذکر تھا یہاں عام آ گیا، ''جو کوئی توبہ کرے اور نیک عمل کرے وہ رجوع کرتا ہے اللہ کی طرف اچھی طرح سے رجوع کرنا، اور اس کے اس رجوع کرنے کی قدر کی جائے گی۔''

۸۔ اور اگلی صفت ''عبادالرحمٰن'' کی یہ ہوئی کہ وہ جھوٹ اور باطل میں حاضر نہیں ہوتے، یا جھوٹی گواہی نہیں دیتے، جہاں کوئی جھوٹ موٹ کی بات ہو رہی ہے اس قسم کا کوئی باطل کام ہو رہا ہے تو وہاں حاضر نہیں ہوتے، نہ جھوٹی گواہیاں دیتے ہیں۔ اور جب کسی لغو بیہودہ کام کے پاس سے گزرتے ہیں، کہیں کوئی بیہودہ حرکت ہو رہی ہے، جس طرح سے آپ لوگ بازار میں جاتے ہیں اور کوئی بازیگر قسم کے لوگ حلقہ لگائے بیٹھے ہوتے ہیں، اور آپ حضرات بھی وہاں کھڑے ہو کے دیکھنے لگ جاتے ہیں، یہ ''عبادالرحمٰن'' کی شان نہیں ہے، جہاں اس قسم کی کوئی لغو حرکت ہو رہی ہو لغو باتوں میں لوگ لگے ہوئے ہوں وہاں سے یوں گزر جاؤ گویا کہ ان سے تعلق ہی کوئی نہیں، ان کی طرف کوئی کسی قسم کی ہمیں رغبت ہی نہیں ہے، نہ ہر جگہ انسان اُلجھ ہی سکتا ہے، اب اگر ایک جگہ لوگ بیٹھے ہوئے تاش کھیل رہے ہیں، شطرنج کھیل رہے ہیں، تو ہم ان کے ساتھ اُلجھیں گے بھی نہیں، اُلجھنے کا بھی موقع نہیں ہے، لیکن وہاں کھڑے ہو کے دلچسپی سے دیکھنے لگ جائیں، یہ بھی ٹھیک نہیں ہے، وہاں پھر یہ ہوتا ہے کہ یوں گزر جاؤ جیسے ان لوگوں کے ساتھ ہمارا تعلق ہی کوئی نہیں، جیسے مثال میں نے دی کہ نجس علاقہ جس میں بدبوئیں اور گندگیاں پڑی ہوئی ہوتی ہیں، آپ اگر کسی مجبوری کی بنا پر اس علاقے میں سے گزرتے ہیں تو کیسے گزرتے ہیں؟ آنکھ بھی بچائیں گے کہ گندگی پہ نہ پڑے، ناک کو بھی بند کریں گے کہ اس کی بدبو دماغ میں نہ چڑھے، اور کوشش کریں گے جلدی جلدی لمبے لمبے قدم اُٹھا کے وہاں سے نکل جائیں، تو ایسے گندے ماحول میں سے اگر کبھی گزرنے کا موقع مل جائے تو انسان کو یوں ہی گزرنا چاہیے جس طرح سے نجس اور پلید مکان میں سے انسان گزر جاتا ہے، ''تو گزر جاتے ہیں اس لغوبات سے بزرگانہ، سنجیدہ طور پر'' نہ تو ان کی وجہ سے ان کے دل میں تکبر آتا ہے، نہ اس میں دلچسپی لیتے ہیں، نہ ان سے اُلجھتے ہیں۔

۹۔ اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں کہ جب ان کو رحمٰن کی باتیں یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ دانا بینا لوگوں کی طرح ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، کافروں مشرکوں کی طرح اندھے بہرے ہو کے ان پہ نہیں گرتے۔

۱۰۔ اور پھر رحمٰن کے بندے وہ ہوتے ہیں جو خود اچھے ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اہل وعیال کے اچھے ہونے کی بھی فکر

رکھتے ہیں، جیسے قرآنِ کریم میں حکم دیا گیا: قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (سورۂ تحریم) اپنے آپ کو بچاؤ اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچالو، تو جہاں اپنی فکر کرتے ہیں اپنے اہل وعیال کی بھی فکر کرتے ہیں، اور اہل وعیال کی فکر بھی کرتے ہیں، ان کو سمجھاتے بھی رہتے ہیں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی کرتے رہتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ سے دُعا بھی کرتے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں ہماری بیویوں کی طرف سے اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک نصیب فرما، اور نیک آدمی کی آنکھوں کی ٹھنڈک یہی ہے کہ ان کو اچھے حال میں دیکھے، نیک دیکھے تو نیک آدمی کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں، یعنی ہمارے اہل وعیال ایسے حال میں ہوں کہ جب ہم دیکھیں تو ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ ''اور ہمیں متقین کا افسر بنادے'' اِمام بنادے، مقتدیٰ بنادے، یعنی ہمارے بال بچوں کو نیک کرکے ہمیں نیکوں کا افسر بنا، نیکوں کا مقتدیٰ بنا، یعنی تُو نے ہمیں اپنے خاندان کا سربراہ تو بنایا ہی ہے، تو اگر یہ نیکوں کا خاندان ہوجائے گا تو ہم نیکوں کے سربراہ ہوجائیں گے۔

جن میں یہ صفتیں پائی جائیں گی انہیں اللہ تعالیٰ بدلے میں غرفہ دے گا، جنّت کے اعلیٰ مقام دے گا ان کے صبر کرنے کی وجہ سے، جس سے معلوم ہوگیا کہ ان صفتوں کے اُوپر جمنا بہت صبر اور اِستقامت چاہتا ہے، ان کے صبر کرنے کی وجہ سے ان کو غرفہ بدلے میں دیا جائے گا، اور ڈالے جائیں گے اس غرفہ میں تحیہ اور سلام، دُعا اور سلام ان کو دی جائے گی، لوگ ان کا استقبال کریں گے تحیہ اور سلام کے ساتھ، ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اس میں، حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا۔

کُفّار کو تنبیہ

اور آخری آیت یہ آگئی جس میں کافروں کو تنبیہ کردی گئی کہ یہ ہم تمہارے جو پیچھے پڑے ہوئے ہیں، میں جو تمہیں بار بار متوجہ کررہا ہوں تو اس لیے کررہا ہوں کہ تمہیں دعوت دینی مقصود ہے، ورنہ اللہ کو تمہاری کوئی پروانہیں، اگر تم اللہ کی طرف سے غافل ہو تو اللہ تعالیٰ صرف دعوت دینے کے لئے تمہاری طرف متوجہ ہے، میں جو تمہیں بار بار خطاب کررہا ہوں تو اس لیے کررہا ہوں کہ تمہیں اللہ کی طرف بلانا مقصود ہے، اگر یہ دعوت دینی مقصود نہ ہوتی تو اللہ کو تمہاری کوئی پروانہیں، یا یہ مطلب ہے کہ اگر تم اللہ کی عبادت کرو اور اللہ کو پکارو تو اللہ تعالیٰ تمہاری طرف متوجہ ہوگا، اگر تمہارا عبادت کرنا یا اللہ کو پکارنا نہ ہو تو اللہ کو تمہاری کوئی پروانہیں۔ ''تم نے تکذیب کی'' اللہ کی دعوت کی اللہ کی باتوں کی، تو یہ تکذیب تمہارے گلے پڑ کے رہے گی، یہ تکذیب تمہارے لیے لازم ہوگی، یعنی اس کا وبال تمہارے ساتھ چمٹ کے رہے گا، لازم ہو کے رہے گا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ
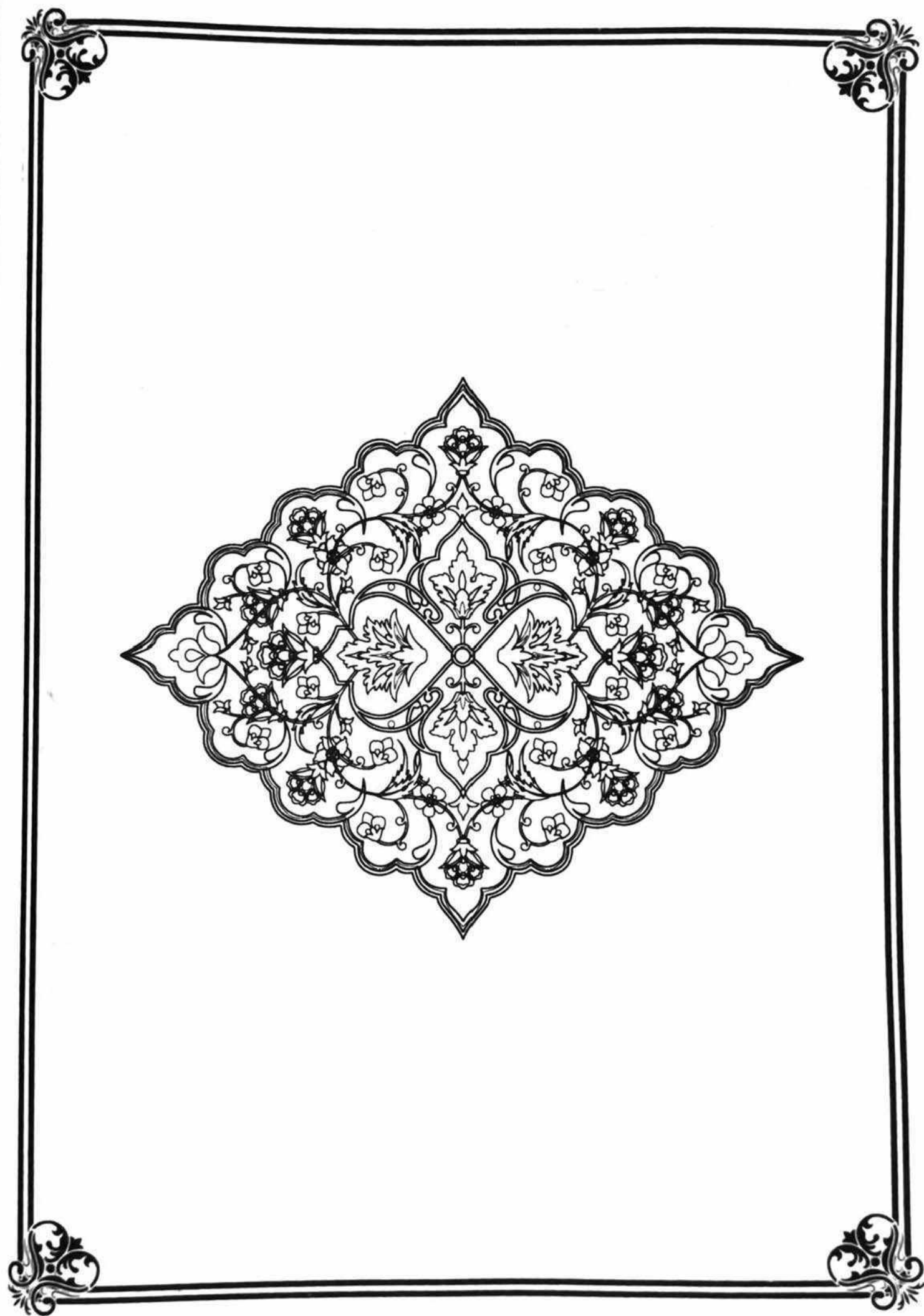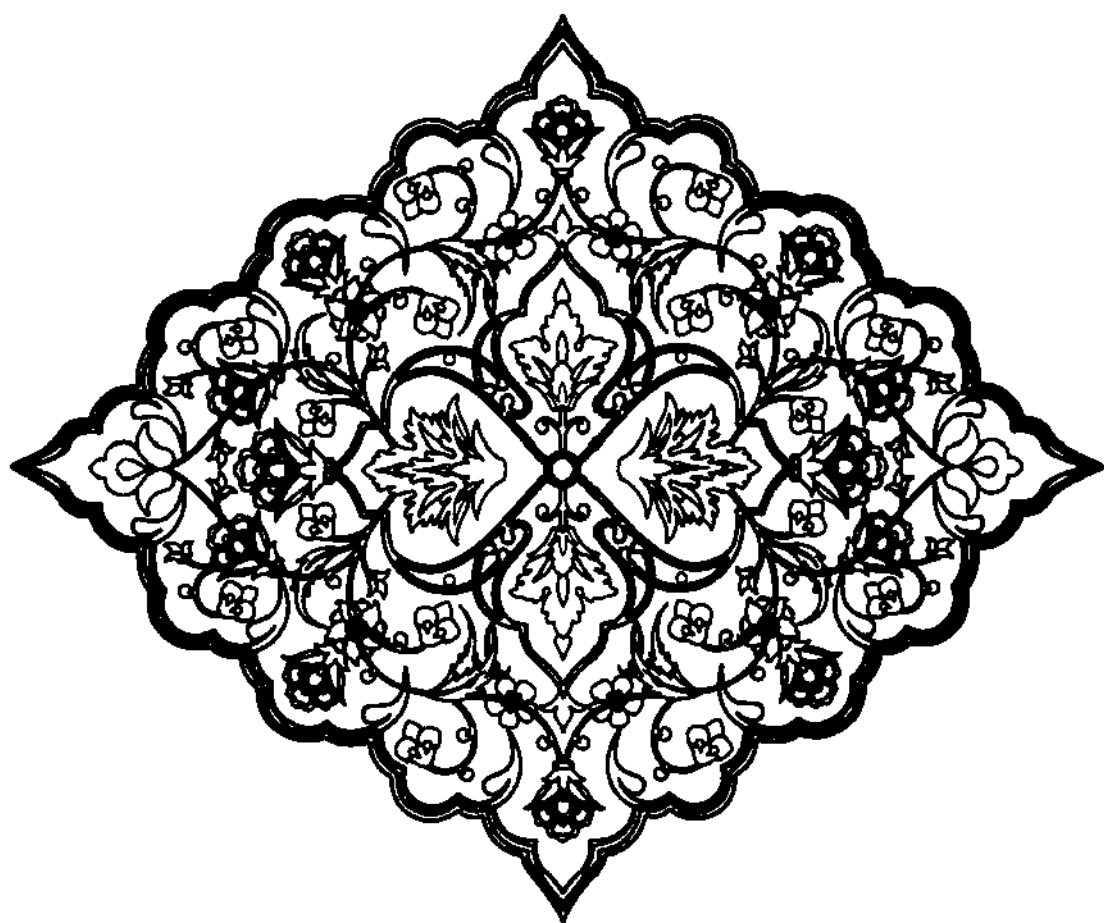
سورة الشعراء

آیاتھا ۲۲۷ ۲۶ سورۃ الشعرآء مکیۃ ۴۷ رکوعاتھا ۱۱

سورۂ شعراء مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی دوسو ستائیس آیتیں ہیں گیارہ رکوع ہیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

طٰسٓمٓ ﴿۱﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۲﴾ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا

طٰسٓمٓ ① یہ واضح کتاب کی آیتیں ہیں ② شاید کہ آپ ہلاک کرنے والے ہیں اپنے نفس کو اس سبب سے کہ وہ لوگ

مُؤْمِنِيْنَ ﴿۳﴾ اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا

ایمان لانے والے نہیں ③ اگر ہم چاہیں تو اتار دیں ان پر آسمان سے ایک نشانی، پس ہو جائیں ان کی گردنیں اس نشانی کی وجہ سے

خٰضِعِيْنَ ﴿۴﴾ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ ﴿۵﴾

جھکنے والی ④ نہیں آتی ان کے پاس کوئی تازہ بہ تازہ نصیحت رحمٰن کی طرف سے مگر یہ لوگ اس سے اعراض کرنے والے ہیں ⑤

فَقَدْ كَذَّبُوْا فَسَيَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۶﴾

پس تحقیق انہوں نے جھٹلایا، عنقریب ان کے پاس آجائیں گی خبریں اس چیز کی جس کے ساتھ یہ استہزا کرتے تھے ⑥

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ﴿۷﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً

کیا انہوں نے زمین کی طرف نہیں دیکھا؟ کتنی ہی عمدہ قسمیں ہم نے اس زمین کے اندر اگائیں ⑦ اس مذکور میں البتہ نشانی ہے

وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۸﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۹﴾

اور ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں ⑧ اور بے شک تیرا رب البتہ زبردست ہے رحم کرنے والا ہے ⑨

تفسیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ''شعراء'' کا لفظ اس سورت کے آخری رکوع میں آئے گا: وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ، وہیں سے یہ لفظ لے کے سورت کا نام رکھا گیا ہے، مکی سورت ہے۔

ماقبل سے ربط اور سورۂ شعراء کے مضامین

سورۂ فرقان میں گزشتہ اُمتوں کا ذکر اجمالاً آیا تھا، اور اس سورت میں تفصیل کے ساتھ ذکر آرہا ہے، اصل مقصد وہی اُصولِ ثلاثہ کا اثبات ہے، سرورِ کائنات ﷺ کی رسالت اور اثباتِ توحید اور اثباتِ معاد۔ انبیاء ﷺ کے واقعات ایک تاریخی حقیقت ہیں، ان کو بیان کر کے انہی اُصولوں کو ثابت کرنا مقصود ہے، اور واقعات کے ضمن میں ترغیب وترہیب ہوہی جایا کرتی ہے، اور انہی واقعات کے ضمن میں سرورِ کائنات ﷺ کے لئے تسلی بھی ہے، کہ جیسے معاملات آپ کے ساتھ چل رہے ہیں ان لوگوں کے، پہلے انبیاء ﷺ کے ساتھ بھی ایسے ہی تھے، یہی پہلو ہوتے ہیں ان واقعات میں جن کی وجہ سے قرآنِ کریم نے کثرت کے ساتھ ان واقعات کو دہرایا ہے، چونکہ یہ واقعات آپ کے سامنے سورۂ ہود میں بھی گزر گئے، اور خصوصیت کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ سورۂ طٰہٰ میں بھی مفصل گزرا ہے، اور دیگر سورتوں میں بھی کچھ کچھ اَجزا ان کے گزر گئے ہیں، اس لیے ان میں زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہوگی، لفظی ترجمے میں ہی مطلب واضح ہوتا چلا جائے گا، آسان ترین سورت ہے۔

عظمتِ قرآن

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ طٰسٓمّٓ یہ حروفِ مقطعات ہیں، اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ بِذٰلِكَ، ان حروف سے اللہ کی جو مراد ہے وہ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں، ان کا مفہوم بیان نہیں کیا جاتا اور ترجمہ نہیں کیا جاتا، اور بعض مفسرین اس کو سورت کا نام قرار دیتے ہیں، اس لیے وہ ترجمہ کریں گے کہ یہ طٰسٓمّٓ ہے، اور عام طور پر جمہور مفسرین اس کا کچھ ترجمہ نہیں کرتے، اس کو متشابہات میں شمار کرتے ہیں، تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ: یہ واضح کتاب کی آیتیں ہیں، کتاب کے ساتھ مبین کی صفت بار بار آتی رہتی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کتاب اپنے مفہوم میں واضح ہے، اپنی حقانیت پر خود ایک واضح دلیل ہے، اور اپنے مقاصد کو خوب اچھی طرح سے واضح کرنے والی ہے۔مبین: واضح کرنے والی، اور واضح، دونوں طرح سے اس کا ترجمہ ہوتا ہے، کیونکہ ''اَبَانَ'' لازم بھی ہے اور متعدی بھی ہے۔ اَبَانَ: واضح کرنا اور واضح ہونا۔ کتابِ مبین: واضح کرنے والی کتاب، جو اپنے مقاصد کو خوب اچھی طرح سے بیان کرتی ہے، یا واضح کتاب کہ جس میں کوئی اشکال یا کوئی الجھن نہیں۔

سرورِ کائنات ﷺ کا غم اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسلی

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ: اس قسم کے الفاظ آپ کے سامنے سورۂ کہف میں آئے تھے، شاید کہ آپ ہلاک کرنے والے ہیں اپنے نفس کو۔ بَخَعَ اصل کے اعتبار سے ذبح کرنے کو کہتے ہیں، گردن کاٹنا یہاں تک کہ اندر ایک سفید سی رگ ہوتی ہے، جس کو نُخاع بھی کہتے ہیں، حرام مغز کے ساتھ جس کو تعبیر کیا جاتا ہے، وہاں تک کاٹتے ہوئے چلے جانا، یہ بخع کا مفہوم ہوتا ہے (بیضاوی)، اس لیے ترجمہ اس کا ہوگیا کہ ''آپ اپنے آپ کو ہلاک کرنے والے ہیں اس سبب سے کہ وہ لوگ ایمان لانے والے نہیں'' یعنی آپ اتنا صدمہ کرتے ہیں، اتنا آپ گھلتے ہیں ان کے ایمان نہ لانے پر، تو ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے کہ آپ اپنے آپ کو

ہلاک ہی کردیں گے، اس سے آپ اندازہ کر لیجیے کہ سرورِ کائنات ﷺ کو لوگوں کے ایمان کی کتنی فکر ہوتی تھی، اور ایمان نہ لانے کی بنا پر آپ ﷺ کے دل پہ کتنا صدمہ ہوتا تھا، جیسا کہ حدیث شریف میں حضور ﷺ نے خود اپنے مقام کو ایک مثال کے ساتھ واضح فرمایا،[1] "مشکوۃ شریف" میں ہے، رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ میری مثال اس شخص جیسی ہے جس نے آگ جلائی ہو، اور آگ جلانے کا مقصد ہے کہ لوگ اس کی روشنی سے گرمی سے فائدہ حاصل کریں، لیکن یہ کیڑے مکوڑے پتنگے جو آگ میں گرا کرتے ہیں یہ کثرت سے آگئے، اور اس آگ میں گر رہے ہیں اور جل رہے ہیں، اور وہ شخص ایک ایک کو پکڑتا ہے، پکڑ پکڑ کے دُور ہٹاتا ہے، تاکہ یہ آگ میں نہ گریں، اسی طرح سے تم بھی جہنّم کی طرف گھسے جا رہے ہو، اور میں تمہیں کمر سے پکڑ پکڑ کے گھسیٹ گھسیٹ کے دُور ہٹا رہا ہوں، اور یہ کہہ رہا ہوں کہ تم آگ میں نہ گرو، اس مثال سے بھی حضور ﷺ نے اپنی اسی حیثیت کو واضح فرمایا کہ تم لوگ جس غلط راستے پہ چل رہے ہو یہ راستہ سیدھا جہنّم کو جاتا ہے، اور میں تمہیں گھسیٹ گھسیٹ کے دُور ہٹا رہا ہوں، تو اللہ کی مخلوق پر چونکہ اللہ کے نبی کو سب سے زیادہ رحم ہوتا ہے، تو یہ اسی بے چینی اور اسی غم کی تصویر ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں بیان فرمائی، کہ ایسے لگتا ہے کہ آپ تو اپنے آپ کو ہلاک ہی کرلیں گے، اور اس میں تسلی دینا مقصود ہے کہ آپ نے اپنا فرض ادا کر دیا، اب اگر یہ نادان لوگ اپنے نفع نقصان کی فکر نہیں کرتے تو آپ ان کے پیچھے اتنا غم نہ کیجیے۔

زبردستی ہدایت دینے پر اللہ قادر ہے، لیکن یہ اس کی حکمت نہیں ہے

اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ: اگر ہم چاہیں تو اُتار دیں ان پر آسمان سے ایک نشانی، پس ہو جائیں ان کی گردنیں اس نشانی کی وجہ سے جھکنے والی۔ خاضعین کا معنی جھکنے والی، اعناق کی اضافت چونکہ ھُم کی طرف ہوگئی جو کہ ذوی العقول ہے، تو خاضعین اسی اعتبار سے آگیا، مطلب یہ ہے کہ ہم نے دنیا میں انسان کو اختیار دے رکھا ہے کہ یہ سوچ سمجھ کے عقیدہ اختیار کرے، قدر اسی عقیدے کی ہے جو انسان اپنے اختیار کے ساتھ غور وفکر کر کے اختیار کرتا ہے، اور اگر ہم نے سب کو ایک ہی راستے پہ چلانا ہوتا اور زبردستی ان کو مؤمن بنانا ہوتا، تو ہم کوئی ایسی نشانی اُتار دیتے کہ ان کو جرأت نہ ہوتی اس کے خلاف کرنے کی، اور اس نشانی کے سامنے آنے کے ساتھ ان کی گردنیں جھک جاتیں، یعنی یہ اطاعت کو قبول کر لیتے، لیکن یہ ہماری مشیت نہیں، ہم نے اس دنیا کے اندر انسان کو مختار بنایا ہے، صاحبِ اختیار بنایا ہے، اس لیے ہم اس کو مجبور کر کے، مضطر کر کے ایمان کے راستے پر نہیں چلانا چاہتے، ورنہ ہمیں قدرت ہے کہ ہم ان کی گردنیں پکڑ کے ان کو سیدھے راستے پہ لگا دیں "اگر ہم چاہتے تو اُتار دیتے ان پر آسمان سے نشانی، پھر ہو جاتیں ان کی گردنیں اس نشانی کے لئے جھکنے والی۔"

مشرکین کا ہر نئی آنے والی نصیحت سے اِعراض

وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ: نہیں آتی ان کے پاس کوئی نصیحت رحمٰن کی طرف سے نئی

---

(۱) مسلم ۲/۲۴۸، باب شفقته صلى الله عليه وسلم على امته۔ مشکوۃ ۱/۲۸، باب الاعتصام، فصل اول، عن ابی ہریرۃ۔

اور تازہ۔ مُحْدَثٍ: نو بہ نو، تازہ بہ تازہ۔ یہ ذِکْرٍ کی صفت ہے۔رحمٰن کی طرف سے ان کے پاس کوئی تازہ بہ تازہ، نو بہ نو نصیحت نہیں آتی اِلَّا کَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ: مگر یہ لوگ اس سے اِعراض کرنے والے ہیں، یعنی اپنے اختیار کے ساتھ تو یہ مانتے نہیں، جو نشانی بھی ان کے پاس آرہی ہے، جو نصیحت ہم ان کو بھیجتے ہیں تازہ بہ تازہ، نو بہ نو، حالات کے مطابق، یہ اس سے منہ موڑ جاتے ہیں، اس کو یہ قبول نہیں کرتے، تو جب یہ خود اِعراض کرنے والے ہیں کسی نصیحت کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تو آپ کا فرض ادا ہو گیا، آپ اس فکر میں کیوں پڑتے ہیں۔

کلام اللہ حادث نہیں، بلکہ قدیم ہے

محدَث یہ لفظ اِحداث سے لیا گیا ہے، محدَث کہتے ہیں نئی چیز کو، اور یہاں اس کا لغوی مفہوم مراد ہے، کیونکہ قرآنِ کریم جب اُترتا تھا تو لوگوں کے سامنے جو نصیحت آتی تھی تو ان کے اعتبار سے وہ نئی ہوتی تھی، اور ایک ہے محدَث کا اِصطلاحی معنی، جو "قدیم" کے مقابلے میں آیا کرتا ہے، حادث محدَث۔ "قدیم" اس کو کہتے ہیں کہ جو ہمیشہ سے ہو اور ہمیشہ رہے، جس کے اوپر فنا نہ آئے، حادث اور محدث اس کو کہتے ہیں کہ جو پہلے نہیں تھا پھر ہو گیا، اور اس کے اوپر بعد میں بھی فنا آسکتی ہے، یہ ہے "حادث" اور "قدیم" کا فرق جو آپ سنا کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم اللہ کی کلام ہے، اور کلام متکلم کی صفت ہوتی ہے، تو جس طرح سے متکلم قدیم ہے، اسی طرح سے اس کی کلام بھی قدیم ہے، اس لیے اسلاف میں یہ مسئلہ زیرِ بحث آیا تھا کہ کلام اللہ حادث ہے یا قدیم ہے، یہ مسئلہ مختلف فیہ رہا ہے، معتزلہ کلام اللہ کو حادث کہتے تھے کہ یہ پہلے نہیں تھی بعد میں ہوئی، اور اہلِ سُنّت والجماعت کا مسلک تھا کہ اللہ کی کلام قدیم ہے، یہ ہمیشہ سے ہے ہمیشہ رہے گی، ہمارے سامنے ظہور کے اعتبار سے حادث ہے، حقیقت کے اعتبار سے قدیم ہے، تو اسی پر ہی حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے سزا پائی تھی، کیونکہ حکومت کا مسلک اس وقت معتزلہ کے مطابق تھا، اور اہلِ سُنّت والجماعت کا اس وقت سے اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کلام کو حادث کہنا کفر ہے، اور جو لوگ اس کو حادث قرار دیتے تھے تو کتنا صاف ستھرے الفاظ سے ان کا استدلال تھا کہ دیکھو محدَث کا لفظ یہاں بھی آیا ہوا ہے، اور سورۂ انبیاء کے شروع میں بھی یہی محدَث کا لفظ آیا ہوا ہے، تو صرف ایک لفظ کو دیکھ کے لغوی معنی کے طور پر اس کی جو مراد سمجھ میں آیا کرتی ہے اللہ کی مراد وہی نہیں ہوا کرتی، کتاب اللہ کی صحیح مراد وہی ہے جو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپ کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم سے اور اس کے بعد صحابہ کے شاگردوں سے، اور اسلاف صالحین سے جو چلی آرہی ہے مراد وہی صحیح ہوا کرتی ہے، چاہے آپ کو لفظ اس کے مطابق نظر آئیں چاہے اس کے مطابق نظر نہ آئیں، اس لیے ہمیشہ اسلاف کے طریقے کو دیکھ کے اس طریقے کو اپنانا اسی میں ہدایت ہے، اور اگر کوئی لغت کی کتاب لے کے بیٹھ جائے اور قرآنِ کریم کا ترجمہ دیکھ دیکھ کے مطلب سمجھنے لگے تو خواہ مخواہ گڑبڑ میں پڑے گا۔ اب اس لفظ محدث کو دیکھ کے وہ تو یہی عقیدہ بنالے گا کہ قرآن بھی محدث ہے، اور قرآن کو محدث کہنا اہلِ سُنّت والجماعت کے نزدیک کفر ہے، یوں عقیدے کی غلطی ہوتی ہے جو لوگ اسلاف کا واسطہ لیے بغیر قرآنِ کریم کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، تو عقیدہ یہی ہے کَلَامُ اللّٰهِ الْقَدِيْمُ، اللہ کی کلام قدیم ہے، اور اس کو جو محدَث کہا جا رہا ہے تو یہ لغوی مفہوم کے اعتبار سے ہے، کہ ہمارے سامنے جب ظاہر ہوتی ہے تو ہمیں

نئی نئی معلوم ہوتی ہے، تر وتازہ، تازہ بہ تازہ، نو بہ نو۔ جب نصیحت ان کے سامنے آتی ہے تو یہ اس سے اعراض کرنے والے ہیں ''نہیں آتی ان کے پاس کوئی تازہ بہ تازہ نصیحت رحمٰن کی طرف سے مگر اس سے یہ اعراض کرنے والے ہیں۔''

مشرکین کے لئے وعید

فَقَدْ كَذَّبُوْا: پس تحقیق انہوں نے اس نصیحت کو جھٹلایا، اللہ کی طرف سے جو نصیحت آتی ہے اس کی انہوں نے تکذیب کی، فَسَيَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ: جب آگے مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ کا لفظ آ گیا تو جھٹلانے کے اندر اِستہزا والا مفہوم بھی ہے، جیسا کہ اگلے الفاظ سے معلوم ہوا، تو انہوں نے اس نصیحت کو جھٹلایا اور اس کے ساتھ اِستہزا کیا، اس کا مذاق اڑایا۔ اَنْۢبٰٓؤُا: نَبَأٌ کی جمع ہے، ''نَبَأٌ'' خبر کو کہتے ہیں۔ ''جس چیز کے ساتھ یہ اِستہزا کرتے تھے اس کی خبریں ان کے پاس عنقریب آ جائیں گی'' خبر کے آجانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی حقیقت ان کے سامنے واضح ہو جائے گی، ''زیادہ دیر نہیں، عنقریب ان کے پاس آ جائیں گی خبریں اس چیز کی جس کے ساتھ یہ اِستہزا کرتے تھے۔'' جیسے کہتے ہیں ''یہ خبر تجھے پہنچ جائے گی'' خبر کے پہنچ جانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ واقعہ تیرے سامنے آ جائے گا، یعنی اس نصیحت میں چونکہ یہ بات بھی آتی تھی کہ اللہ کی طرف سے عذاب آئے گا اگر نہیں مانیں گے، تو وہ عذاب کا مذاق اڑاتے تھے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کوئی دیر نہیں ہے، اس کی حقیقت تمہارے سامنے نمایاں ہو جائے گی۔

اِحیائے ارض کے ذِکر سے مقصود

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الْاَرْضِ: واو کا معطوف علیہ اگر نکالنا ہو ''کیا یہ توحید کا انکار کرتے ہیں؟ شرک پہ اصرار کرتے ہیں؟ اور کیا انہوں نے زمین کی طرف نہیں دیکھا؟''، ''کیا یہ معاد کا انکار کرتے ہیں اور کیا انہوں نے زمین کی طرف نہیں دیکھا؟'' كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ: زوج قسم کو کہتے ہیں، اور کریم کے معنی مفید، نفع بخش، عمدہ۔ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ یہ كَمْ کی تمیز ہے۔ ''کتنی ہی عمدہ، نفع بخش قسمیں ہم نے اس زمین کے اندر اُگائیں'' اور یہ بارہا آپ کے سامنے ذکر کیا جا چکا کہ بنجر زمین میں نباتات اُگانا، اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے احسان کے پہلو بھی ہیں، قدرت کے پہلو بھی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر بھی یہ بات دلیل ہوتی ہے، بارہا قرآنِ کریم میں یہ بحث ہو چکی۔

سورت میں دوہرائی جانے والی آیت اور اس کا مفہوم

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً: اس مذکور میں البتہ نشانی ہے، یعنی جس میں غور فکر کر کے اپنے اختیار کے ساتھ یہ توحید کو سمجھ سکتے ہیں، اور اس کلام کی حقانیت کو سمجھ سکتے ہیں، دین کو قبول کر سکتے ہیں، اس میں نشانی ہے، ذٰلِكَ کا اشارہ مذکور کی طرف ہے۔ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ: ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں۔ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ: اور بے شک تیرا رَبّ البتہ زبردست ہے، کہ نہ ماننے والوں کو سزا دے سکتا ہے، جو شرک کا اِرتکاب کرتے ہیں اور ان نشانیوں کو دیکھ کے حقیقت نہیں سمجھتے ان پہ اللہ غالب ہے، سزا

دے سکتا ہے، لیکن الرَّحِيْمُ ہے کہ اس نے مہلت دے رکھی ہے اور ان کے لئے سمجھنے کا موقع مہیا کر رکھا ہے، یہ آیت جو اس رکوع کے آخر میں آئی ہے، اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ، اس آیت کو اس سورت کے اندر بار بار دوہرایا جائے گا، واقعہ بیان کیا جائے گا، اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ اسی بات کی طرف متوجہ کریں گے کہ سمجھنے والوں کے لئے اس میں نشانی موجود ہے لیکن ان میں سے اکثر مانتے نہیں، اور رَبّ عزیز رحیم ہے، کہ چاہے تو ان کو سزا دے سکتا ہے اس کو قدرت ہے، لیکن اس نے اپنے رحم کے طور پر یہ ایک مہلت دے رکھی ہے، تقریباً آٹھ دفعہ یہ آیت اس سورت کے اندر ہر ہر واقعے کے بعد دوہرائی جائے گی۔

وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰٓى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۰ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ؕ اَلَا يَتَّقُوْنَ ۝۱۱

اور جب آواز دی تیرے رَبّ نے موسیٰ علیہ السلام کو کہ جا تُو ظالم لوگوں کے پاس ⑩ یعنی فرعون کی قوم کے پاس، کیا وہ ڈرتے نہیں؟ ⑪

قَالَ رَبِّ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ۝۱۲ وَيَضِيْقُ صَدْرِیْ

موسیٰ علیہ السلام نے کہا اے میرے پروردگار! بے شک میں اندیشہ کرتا ہوں کہ وہ میری تکذیب کریں گے ⑫ اور میرا دل تنگ ہو جائے گا

وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِیْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ۝۱۳ وَلَهُمْ عَلَیَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ

اور میری زبان نہیں چلے گی، پس تُو پیغام بھیج ہارون کی طرف ⑬ اور ان کے لئے میرے ذمے ایک قصور بھی ہے، مجھے اندیشہ ہے کہ

يَّقْتُلُوْنِ ۝۱۴ قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَاۤ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ۝۱۵

وہ مجھے قتل کر دیں گے ⑭ اللہ نے فرمایا کہ ہرگز ایسے نہیں ہوگا، تم دونوں جاؤ میری نشانیوں کے ساتھ، ہم تمہارے ساتھ ہیں سننے والے ہیں ⑮

فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَاۤ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۶ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۝۱۷

تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، پس کہو بے شک ہم رَبّ العالمین کے بھیجے ہوئے ہیں ⑯ کہ چھوڑ دے تُو ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو ⑰

قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ۝۱۸ وَفَعَلْتَ

فرعون کہنے لگا: کیا ہم نے تجھے پالا نہیں اپنے اندر اس حال میں کہ تو بچہ تھا، اور تُو ٹھہرا رہا ہمارے اندر اپنی عمر کے کئی سال ⑱ اور تُو نے کیا تھا

فَعْلَتَكَ الَّتِیْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۱۹ قَالَ فَعَلْتُهَاۤ اِذًا وَّاَنَا مِنَ

اپنا وہ کام جو تُو نے کیا تھا، اور تُو ناشکروں میں سے ہے ⑲ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں نے وہ کام کیا تھا اس وقت، اور میں

الضَّآلِّيْنَ ﴿٢٠﴾ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّ

غلطی کرنے والوں میں سے تھا﴿۲۰﴾ پھر میں تم سے بھاگ گیا جب میں تم سے ڈرا، پھر میرے رب نے مجھے علم وحکمت ہبہ کیا، اور

جَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٢١﴾ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿٢٢﴾

مجھے مرسلین میں سے بنادیا﴿۲۱﴾ اور یہ احسان، جتلاتا ہے تُو اس احسان کو میرے پہ، اس سبب سے ہوا کہ تُو نے غلام بنایا بنی اسرائیل کو﴿۲۲﴾

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٣﴾ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا

فرعون نے کہا: رب العالمین کیا ہے؟﴿۲۳﴾ موسیٰ علیہ السلام نے کہا رب العالمین وہی ہے جو آسمانوں کا رب ہے زمین کا رب ہے اور جو کچھ ان کے

بَيْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ﴿٢٤﴾ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا

درمیان میں ہے اس کا رب ہے اگر تم یقین کرنے والے ہو﴿۲۴﴾ فرعون نے کہا ان لوگوں کو جو اس کے اردگرد بیٹھے ہوئے تھے: کیا

تَسْتَمِعُوْنَ ﴿٢٥﴾ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٢٦﴾

تم سنتے نہیں ہو؟﴿۲۵﴾ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: رب العالمین وہ ہے جو تمہارا بھی رب ہے، اور تمہارے پہلے گزرے ہوئے آباء کا بھی رب ہے﴿۲۶﴾

قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ﴿٢٧﴾ قَالَ

فرعون نے کہا کہ بے شک یہ تمہارا رسول جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے البتہ دیوانہ ہے﴿۲۷﴾ موسیٰ علیہ السلام کہنے لگے کہ رب العالمین وہ ہے جو

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿٢٨﴾ قَالَ لَىِٕنِ اتَّخَذْتَ

رب ہے مشرق اور مغرب کا، اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان میں ہے اس کا، اگر تم سوچتے ہو﴿۲۸﴾ فرعون نے کہا: اگر تُو نے بنایا

اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴿٢٩﴾ قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ

کوئی معبود میرے علاوہ تو البتہ ضرور کردوں گا میں تجھے قیدیوں میں سے﴿۲۹﴾ موسیٰ علیہ السلام کہنے لگے: کیا اگرچہ میں تیرے سامنے کوئی

بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ ﴿٣٠﴾ قَالَ فَاْتِ بِهٖٓ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٣١﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ

واضح دلیل ہی لے آؤں؟﴿۳۰﴾ فرعون کہنے لگا کہ وہ لے آ، اگر تُو سچوں میں سے ہے﴿۳۱﴾ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی ڈال دی، پس اچانک وہ

ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿٣٢﴾ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿٣٣﴾

کھلے طور پر اژدھا بن گیا﴿۳۲﴾ اور انہوں نے اپنا ہاتھ کھینچا پس اچانک وہ سفید تھا دیکھنے والوں کے لئے﴿۳۳﴾

تفسیر

موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کی طرف سے فرعون کے پاس جانے کا حکم

آگے شروع ہو رہا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ، جس کے اکثر اجزا آپ کے سامنے گزر گئے، جونئی بات آئے گی اس کی تفہیم کروں گا، وَ اِذْ نَادٰی رَبُّكَ مُوْسٰۤی: اور قابلِ ذکر ہے وہ وقت جبکہ تیرے رَبّ نے آواز دی موسیٰ علیہ السلام کو، اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ: اَن یہ نداء کی تفسیر ہے، کہ آ تُو ظالم لوگوں کے پاس، یعنی ظالم لوگوں کے پاس جاؤ، یہ ندا کوہِ طور پہ ہوئی تھی، ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ یعنی ''ظالم لوگوں کے پاس آؤ'' لفظی ترجمہ یوں ہی بنتا ہے، لیکن محاورے کے مطابق کلام یوں ہی ہوگی کہ ''جب آواز دی تیرے رَبّ نے موسیٰ کو کہ جا تو ظالم لوگوں کے پاس'' ہمارے محاورے کے طور پر ترجمہ یوں ہوگا، اور الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ سے کون مراد ہیں؟ قَوْمَ فِرْعَوْنَ۔ اَلَا یَتَّقُوْنَ: کیا وہ ڈرتے نہیں؟ یعنی جا کے ان کا حال دیکھ، کیا وہ ڈرتے نہیں اللہ کے غضب سے اللہ کے قہر سے، انہوں نے کیسی کیسی بدکرداریاں اور کیسی کیسی سرکشیاں شروع کر رکھی ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام کی ہارون علیہ السلام کو پیغمبر بنانے کی درخواست اور ایک اندیشے کا اِظہار

قَالَ رَبِّ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ: موسیٰ علیہ السلام نے کہا اے میرے پروردگار! بے شک میں اندیشہ کرتا ہوں کہ وہ میری تکذیب کریں گے، مجھے جاتے ہی جھوٹا کہہ دیں گے۔ یُکَذِّبُوْنِ میں ن کے نیچے جو کسرہ ہے وہ یائے متکلم پر دلالت کرتا ہے۔ وَ یَضِیْقُ صَدْرِیْ: اور میرا دل تنگ ہو جائے گا، وَ لَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ: اور میری زبان نہیں چلے گی، فَاَرْسِلْ اِلٰی هٰرُوْنَ: پس تو پیغام بھیج ہارون کی طرف، یعنی ہارون کو بھی رسول بنا دے، نبی بنا دے، جیسے کہ اس واقعے کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ طٰہٰ میں آئی، کہ جب وہ مجھے جاتے ہی جھٹلا دیں گے، میرا دل تنگ ہو جائے گا، فصاحت پہلے ہی میری زبان میں کم ہے، جیسے دُوسری جگہ ہے: وَاَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا (سورۂ قصص: ۳۴) ہارون مجھ سے زبان کے اعتبار سے زیادہ صاف ہے، اور میری زبان میں کچھ بندش ہے (جس کے ازالے کے لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے دُعا کی تھی: وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ ۝ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ) تو آپ ہارون کی طرف پیغام بھیج دیجیے، ان کو بھی نبی و رسول بنا دیجیے، جیسے وہاں مطالبہ کیا تھا کہ ان کو میرا وزیر بنا دیجیے: وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ ۝ هٰرُوْنَ اَخِی (سورۂ طٰہٰ: ۲۹) میرے گھر والوں میں سے ایک وزیر بنا دو، میرے بھائی ہارون کو۔ وَلَهُمْ عَلَیَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ: یہاں بھی ''ن'' کے نیچے کسرہ یائے متکلم پر دال ہے۔ ان کے لئے میرے ذِمّے ایک قصور بھی ہے، یعنی میں نے ان کا ایک قصور بھی کیا ہوا ہے، میں نے ان کا ایک گناہ بھی کیا ہوا ہے، گناہ سے یہاں قصور مراد ہے، فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ: مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے، یہ واقعہ آپ کے سامنے نہیں گزرا، اس کی تفصیل سورۂ قصص میں آ رہی ہے، یہ ذنب جس کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اشارہ کیا یہ ہے قتلِ قبطی کا، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام وہاں رہتے تھے تو ایک قبطی ان کے ہاتھوں سے اتفاقاً مارا گیا تھا، وہ اسرائیلی سے لڑ رہا تھا اور اسرائیلی نے ان کو بلایا اپنی مدد کے لئے، تو انہوں نے اس کو ڈانٹنے کے لئے ایک ہی مکا لگایا، اور مکے کا لگنا تھا کہ وہ

مر گیا، اور اس کو قتل کرنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقصود نہیں تھا، یہ اتفاقی بات ہے کہ ایسا واقعہ پیش آ گیا، اور پھر جب موسیٰ علیہ السلام کو پکڑ کا اندیشہ ہوا تھا تو وہاں سے بھاگ کے نکل گئے تھے اور مدین پہنچ گئے تھے، یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے سورۂ قصص میں آ رہا ہے، صرف اس ذنب کی تفصیل کے لئے میں نے مختصر سا اشارہ کر دیا۔ ''ان کے لئے میرے ذِمّے ایک گناہ ہے، ایک قصور ہے'' یعنی میں نے ان کا ایک قصور کیا ہوا ہے، فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ: مجھے اندیشہ ہے کہ جب میں جاؤں گا تو اسی قصور کو بہانہ بنا کر مجھے قتل کر دیں گے، کیونکہ قتل کرنے کا ہی تو اس وقت مشورہ ہوا تھا، جیسے ایک شخص نے آ کے موسیٰ علیہ السلام کو اطلاع دی تھی کہ یٰمُوْسٰۤى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّيْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ (سورۂ قصص: ۲۰) تیرے متعلق دربار میں یہ مشورے ہو رہے ہیں، درباری لوگ تیرے متعلق مشورے کر رہے ہیں کہ تجھے قتل کر دیں، تو یہاں سے چلا جا، میں تیرے لیے خیر خواہ ہوں، تجھے خیر خواہی سے اطلاع دے رہا ہوں، تو تب حضرت موسیٰ علیہ السلام وہاں سے چلے تھے۔ تو قتل کا مشورہ تو ہو رہا تھا، اب اگر میں جاؤں گا تو مجھے اسی جرم کا بہانا بنا کے قتل کر دیں گے، تو آپ جس طرح سے ان کو اپنا پیغام پہنچوانا چاہتے ہیں، تو شاید میں اس پہ قادر ہی نہ ہو سکوں، جاؤں اور اسی وقت مجھے قتل کر دیں۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام کو تسلی اور ہدایات

قَالَ كَلَّا: اللہ نے فرمایا کہ ایسا نہیں ہو سکتا، ان کی مجال نہیں کہ تجھے قتل کر دیں، كَلَّا، ردع کے لئے ہوا کرتا ہے، ایسے بالکل نہیں ہو سکتا، ہرگز ایسے نہیں ہوگا، ان کی مجال نہیں کہ تجھے قتل کر دیں، كَلَّا کے اندر جس طرح سے زور ہوتا ہے، یہ ردع کے لئے آتا ہے۔ فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَاۤ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ: تم دونوں جاؤ میری نشانیوں کے ساتھ، میں تمہارے ساتھ ہوں، اور سننے والا ہوں، جو کچھ تم کہو گے اور جو کچھ وہ کہیں گے سب باتیں سننے والا ہوں، میں تمہارے ساتھ ہوں یعنی میری نصرت اور مدد تمہارے ساتھ ہے، فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ: تم دونوں فرعون کے پاس آؤ۔ اَتٰى يَاْتِيْ: آنا۔ لیکن یہاں محاورے کے مطابق ترجمہ ہوگا جانا۔ ''تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ'' فَقُوْلَاۤ: پس دونوں کہو، اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ: بے شک ہم رب العالمین کے رسول ہیں، بھیجے ہوئے ہیں، ''رسول'' یہاں مفرد کا لفظ استعمال ہوا، اور غالباً سورۂ طٰہٰ میں اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ وہاں تثنیہ کا لفظ آیا تھا، تو بات ایک ہی ہے، چونکہ آپس میں ہر لحاظ سے اتحاد تھا، ظاہر کے اعتبار سے دو تھے حقیقت کے اعتبار سے ایک ہی تھے، کیونکہ اللہ کا پیغام ایک ہی لے کے گئے ہیں، اس لیے ان کو مفرد کے ساتھ بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے، تثنیہ کے ساتھ بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یا ''كُلُّ وَاحِدٍ'' کے اعتبار سے ''رسول'' کہہ دیا، کہ ہم میں سے ہر ایک ربّ العالمین کا رسول ہے۔ یا ''مدارک'' میں جیسے لکھا ہے کہ ''رسول'' کا لفظ ''مرسل'' کے معنی میں بھی ہوتا ہے، پھر تو اس کو تثنیہ جمع لائیں گے، اور ''رسول'' کا لفظ مصدر ''رسالت'' کے معنی میں بھی ہوتا ہے تو پھر واحد، جمع، تثنیہ کے لئے یہ مفرد ہی رہے گا، تو یوں بھی ہو سکتا ہے، بات ایک ہی ہے ''بے شک ہم ربّ العالمین کے بھیجے ہوئے ہیں'' کیا پیغام دے کے بھیجے ہوئے ہیں؟ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ: اَنْ تفسیر یہ آ گیا، کہ چھوڑ دے تو ہمارے ساتھ۔ بھیج دے تو ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو، یعنی بنی اسرائیل کو جو تو نے غلام بنا رکھا ہے ان کا راستہ چھوڑ دے، تاکہ میں ان کو ان کے علاقے میں

لے جاؤں، وہاں جا کے یہ آزادانہ زندگی گزاریں، تو اَن سے تفسیر ہوگئی، یعنی اللہ نے مجھے رسول بنا کے بھیجا ہے یہ پیغام دے کر کہ تو چھوڑ دے بنی اسرائیل کو، میرے ساتھ جانے دے، اَرْسِلْ مَعَنَا کا یہ معنی ہوگیا، ہمارے ساتھ جانے دے، ان کو آزاد کر دے، تا کہ ہم ان کو اپنے ساتھ لے جائیں، اور کہیں اپنی آزادانہ زندگی گزاریں۔

فرعون کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام پر دو اِعتراض

اب آگے درمیان میں واقعہ محذوف ہوگیا، کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے مطابق فرعون کے دربار میں گئے اور جا کے یہی پیغام سنایا، اپنی رِسالت کا اظہار کیا، تو جس وقت دربار میں جا کے کھڑے ہوئے اور جا کے فرعون سے خطاب کیا تو فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو پہچان لیا، اس لیے فوراً اس نے وہ بات یاد دلائی، کہنے لگا: اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ: کیا ہم نے تجھے پالا نہیں اپنے اندر اس حال میں کہ تُو بچہ تھا؟ ''ولید'' بچے کو کہتے ہیں۔ اَلَمْ نُرَبِّكَ: کیا ہم نے تیری تربیت نہیں کی؟ ہم نے تجھے پرورش نہیں کیا؟ اس حال میں کہ تو بچہ تھا، یعنی بچپن میں ہم نے تیری پرورش نہیں کی؟ وَلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ: اور تُو ٹھہرا رہا ہمارے اندر اپنی عمر سے چند سال، اپنی عمر کے کئی سال تُو نے ہمارے اندر ہی گزارے، یہ تو تربیت کا اور پالنے کا احسان جتلا دیا۔ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ: اور تُو نے کیا تھا اپنا وہ کام جو تُو نے کیا تھا، یعنی تُو نے وہ حرکت بھی کی تھی جو تجھے یاد ہوگی، وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ: اور تو ناشکروں میں سے ہے، یہاں کافرین کُفران، ناشکری کے معنی میں ہے، اور اس کام کی طرف اشارہ کر دیا اس کی عظمت کی بنا پر، کہ تجھے پتا ہی ہے تو کیا کر گیا تھا، بڑا ناشکرا ہے تو، کہ ہمارے گھر کا کھایا، ہمارے گھر تُو پلا، ہم نے تجھے اپنے گھر میں پرورش کیا، پھر تُو نے ہمارا ہی آدمی مار دیا، بڑا ناشکرا ہے۔ تو گویا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات سننے کے بعد فرعون نے دو باتیں یاد دِلائیں، ایک احسان جتلایا، اور ایک ان کو ان کا جرم یاد دِلایا، جس کا مطلب یہ ہوا کہ فرعون ساری باتیں سمجھ گیا، اور اس کے ذہن میں آگئیں کہ یہ وہی ہے جو ہمارے گھر میں رہتا تھا اور ہم نے اس کو پالا پوسا ہے، اور اس طرح سے اس کی تربیت کی ہے، یہ ساری کی ساری باتیں اس کے ذہن میں آگئیں، تو اس نے بطور احسان کے ذکر کر دیں، اور مقصد یہی تھا کہ ایک تو تُو ہمارے ہاتھوں کا پلا ہوا ہے، اور ہاتھوں کا پلا ہوا ہو کے تُو مجھے کہتا ہے کہ میرے تابع ہو جا اور میرے پہ ایمان لے آ، اور میں تیری بات مان لوں، تیرے پیچھے ہو جاؤں، چھوٹا ہو کے تُو بڑی بات کہتا ہے؟ اور پھر تو ہمارا مجرم بھی ہے، تو تجھے کیسے جراٴت ہوگئی ہمارے سامنے آ کے اس طرح سے بات کرنے کی؟ تجھے پتا ہی ہے جو کچھ تُو کر گیا تھا۔

موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے دونوں اِعتراضات کا جواب

تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان باتوں کے جواب میں کس طرح سے ایک حقیقت پسندی کا اظہار کیا، پہلے تو وہ بات آگئی کہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ حرکت ہوئی تھی کہ قبطی قتل ہوگیا، جس کو اس نے جتلایا کہ تُو نے بہت بڑا ایک کام کیا تھا، تجھے پتا ہی ہے تو کیا کر گیا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ یہ واقعہ ہے کہ میں نے کیا ہے، اب وہ فعل تو ذہن میں تھا ہی، اس کو ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں، فَعَلْتُهَا میں ''ھا'' ضمیر اس فَعْلَتَكَ کی طرف لوٹ گئی جس کا ذکر فرعون نے کیا، کہ میں نے کیا ہے وہ کام، لیکن اس وقت مجھ سے غلطی

ہوگئی تھی، یعنی میں اس کی کوئی تاویل نہیں کرتا، کچھ نہیں کہتا، اس وقت مجھ سے غلطی ہوگئی تھی، میں درستی سے اس وقت بھٹک گیا، یعنی میں نے اس کو قصداً نہیں مارا، غلطی ہوگئی تھی کہ ہٹانا مقصود تھا، اسے تھوڑی سی سزا دی، ایک مکی ماری اور اتفاقاً وہ مر گیا، اس کا تو آپ علیہ السلام نے اعتراف کرلیا، لیکن دیکھو! پھر اب سوچو! کہ اس وقت میں تم سے ڈر کے بھاگ گیا، جب مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ تم مجھے پکڑلو گے تو میں بھاگ گیا، اب اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت میں تمہارے سامنے آیا ہوں، حقیقت کے اعتبار سے یہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک بہت بڑا معجزہ ہے کہ اُس وقت فرعون سے ڈر کے بھاگے تھے، تو آج کون سی فوجیں ساتھ لے کے آئے ہیں فرعون کا مقابلہ کرنے کے لئے؟ آج کیوں نہیں ڈرے؟ معلوم ہوگیا کہ آج پیچھے سے جو حکم ہوا ہے، اور حفاظت کی ذمہ داری ہوگئی، اسی لیے آگئے ہیں؟ ورنہ موسیٰ تو وہی ہیں جو پہلے بھی تھے، اگر پہلے ڈر کے بھاگ گئے تھے تو آج کون سا وہ اپنا تحفظ لے کے آئے ہیں ظاہری صورت میں؟ یہ خود علامت ہے اس بات کی کہ آج کسی کے بھیجے ہوئے آئے ہیں، اور آج ان کو غیبی طور پہ تحفظ حاصل ہوگیا ہے، پہلی بات تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یوں کی، قَالَ فَعَلْتُهَآ: موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں نے وہ حرکت کی تھی، یہ ''ھا'' ضمیر فعلۃ کی طرف لوٹ رہی ہے جو فَعْلَتَكَ الَّتِىْ فَعَلْتَ میں ہے، میں نے وہ حرکت کی تھی، اِذًا: اس وقت، وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ: اور میں غلطی کرنے والوں میں سے تھا۔ ضَلَّ: سیدھے راستے سے بھٹک جانا۔ یعنی اس معاملے میں، قبطی کو سزا دینے کے بارے میں، اور اس کو مارنے کے بارے میں میں غلطی کر گیا تھا، مجھ سے غلطی ہوگئی، جس کا مطلب ہے کہ وہ قتل خطا تھا، میں نے جان بوجھ کے نہیں مارا تھا، فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ: پھر میں تم سے بھاگ گیا، لَمَّا خِفْتُكُمْ: جب میں تم سے ڈرا، جب مجھے تم سے اندیشہ ہوا تو میں بھاگ گیا، فَوَهَبَ لِىْ رَبِّىْ حُكْمًا: پھر میرے رَبّ نے مجھے علم و حکمت ہبہ کیا، وَّجَعَلَنِىْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ: اور مجھے مرسلین میں سے بنادیا، اب میں اس کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں، اور علم و حکمت کے دلائل کے ساتھ مسلح ہو کے آیا ہوں، یہ تو اس بات کا جواب ہوگیا، فَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِىْ فَعَلْتَ، اس میں تو انہوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا، اور یہ کہا کہ وہ نادانستہ ہوئی تھی، سمجھ بوجھ کے ساتھ نہیں ہوئی، بعد میں اللہ تعالیٰ نے مجھے سمجھ بوجھ دے دی، اور میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں، اور اس وقت میں ڈر کے بھاگ گیا تھا، آج اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں۔ اگلی بات! کہ تُو نے مجھے پالا، یعنی پہلے وہ قصور والی بات کی تفصیل کردی، اور احسان والی بات کا جواب اب دیا جارہا ہے وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَىَّ: یہ احسان، جتلاتا ہے تُو اس احسان کو میرے پہ، اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ: اس سبب سے ہوا کہ تُو نے غلام بنایا بنی اسرائیل کو۔ عَبَّدْتَّ تعبید سے ہے، تُو نے غلام بنایا بنی اسرائیل کو، اس کا مطلب سمجھئے......! کہ تُو یہ جو احسان جتلاتا ہے کہ تُو نے مجھے اپنے گھر میں پالا، تُو ذرا سوچ تو سہی کہ تجھے یہ موقع کیوں ملا کہ تُو مجھے پالے، اور میں تیرے گھر میں آ کے پرورش کروں، اس احسان کرنے کا موقع تجھے کیوں ملا؟ اس وجہ سے ملا کہ تُو نے میری ساری قوم کو غلام بنا رکھا ہے، اور ان کے اُوپر تیرا ظلم وستم جاری تھا، تُو بچوں کو قتل کرتا تھا، میرے ماں باپ نے خوف کے ساتھ مجھے دریا میں ڈال دیا، میں تیرے گھر پہنچ گیا، اگر تیرا ظلم وستم میری قوم پہ نہ ہوتا تو میں تیرے گھر کیوں پہنچتا؟ میری پرورش میرے ماں باپ کر لیتے، یعنی تیرا یہ احسان اس بات کی وجہ سے ہوا ہے کہ تُو نے میری قوم کو غلام بنا رکھا ہے، تو گویا کہ اس میں بھی تیری کوئی ایسی بات نہیں، بلکہ یہ بات تیرے ظلم کی نشاندہی کرتی ہے۔

یہ واقعہ یوں ہی ہوا تھا نا؟ جب ان کی ماں کو اندیشہ ہوا کہ جب انہیں موسیٰ علیہ السلام کا پتا چل جائے گا تو یہ قتل کردیں گے، تبھی تو انہوں نے دریا میں ڈالا تھا، جیسے سورۂ طٰہٰ کے اندر تفصیل آپ کے سامنے گزری، اگر تُو نے میری قوم پہ ظلم نہ کیا ہوا ہوتا، اور ان کو اس طرح سے غلام نہ بنایا ہوا ہوتا، تو تجھے یہ احسان کرنے کا موقع کیسے ملتا؟ تو یہ احسان تو تیرے ظلم کی نشاندہی ہے، کہ قوم کے اُوپر تیرا ظلم تھا، جس کے نتیجے میں میں تیرے گھر میں پہنچا، اور تیرے گھر میں میری پرورش ہوئی، یوں بھی اس کا مفہوم ادا کرسکتے ہیں، جیسا میں نے عرض کیا کہ ''یہ احسان، جتلاتا ہے تو اس کو میرے پہ، اس سبب سے ہوا کہ تُو نے غلام بنایا بنی اسرائیل کو'' یا یوں بھی ترجمہ کیا گیا ہے، اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ: یہ ''اَن'' مصدریہ ہے اور مابعد کو مصدر کی تاویل میں کردے گا، اور یہ عطف بیان ہے نِعْمَةٌ کے لئے، اب مفہوم یوں ہوگا ''یہ احسان ہے جو تُو جتلاتا ہے میرے اوپر؟ کہ تُو نے میری قوم کو غلام بنا رکھا ہے'' یعنی میری ساری قوم کو غلام بنا رکھا ہے، اُسی کے ضمن میں میں بھی تھا، تو یہ کوئی احسان ہے جو تُو میرے اُوپر جتلا رہا ہے؟ ایک قوم کی قوم تیری غلام ہے اور ظلم وستم کا نشانہ ہے، تو ان میں سے ایک بچہ اگر تیرے گھر آ بھی گیا تو یہ کون سی جتلانے کی بات ہے؟ اس کا جواب اس انداز سے دیا کہ تُو یہ نہ جتلا، یہ جتلانے کی بات نہیں، اس کے ضمن میں تو تیرا ظلم معلوم ہوتا ہے، تیری زیادتیاں معلوم ہوتی ہیں، کہ اسی غلام بنانے کے نتیجے میں یہ صورت پیش آئی کہ میں تیرے گھر میں آگیا، اور تُو نے مجھے پالا، اگر یہ صورت نہ ہوتی تو میرے ماں باپ مجھے پالتے، تو میں تیرے تک کیوں پہنچتا، ''یہ احسان ہے جو تُو میرے پہ جتلاتا ہے؟ کہ تُو نے ساری قوم کو غلام بنا رکھا ہے۔''

فرعون نے بات کا رُخ بدل دیا

قَالَ فِرْعَوْنُ: اب ان دو باتوں کا تو صاف صاف جواب مل گیا، اس پر تو فرعون کو آگے کچھ کہنے کی نوبت نہ آئی، یا کچھ کہہ نہ سکا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے رُعب اس کے اُوپر ایسا پڑا کہ جس کی بنا پر وہ ہاتھ بھی نہ اُٹھاسکا، اس لیے اب اس نے رُخ بدلا، کہتا ہے کہ تُو نے یوں جو کہا: رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، تو وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ: وہ رَبّ العالمین کیا ہے؟ مطلب اس کا یہ تھا کہ رَبِّ اَعلیٰ تو میں ہوں، اور تُو کس دوسرے کو رَبّ العالمین بنائے پھر رہا ہے؟ یہ مَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ وہی ہے جیسے آپ کہا کرتے ہیں: اَلْاِنْسَانُ مَا هُوَ، کہتا ہے رَبّ العالمین کیا ہے؟ جس کا تُو رسول بن کے آیا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام اللہ کی شان بیان کرتے چلے گئے، اور فرعون پریشان ومبہوت ہوتا گیا

تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آگے جواب دیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ رَبّ العالمین کی حقیقت واضح نہیں کی جایا کرتی، رَبّ العالمین اپنے تصرفات سے، اور اپنی شان سے، اور اپنی صفات سے پہچانا جاتا ہے، رَبّ العالمین وہی ہے جو کہ آسمانوں کا رَبّ ہے، زمین کا رَبّ ہے، مَا بَیْنَهُمَا کا رَبّ ہے، مَا بَیْنَهُمَا میں سورج چاند ستارے سارے ہی آگئے، اور کہتے ہیں کہ یہ مصری سورج کو پُوجا کرتے تھے، اور جو وقت کا بادشاہ ہوتا تھا اس کو وہ سورج کا قائم مقام سمجھتے تھے، جس کی بنا پر سورج کو ''رَبّ'' کہتے تھے، اور اس وقت کے بادشاہ کو ''رَبّ'' کہتے تھے، جس میں ذکر کردیا کہ رَبّ العالمین تو وہ ہے جو آسمانوں کا بھی مالک، زمین کا

بھی مالک، سورج، چاند، ستاروں، ہر چیز کا مالک ہے، میں اس کو رَبّ العالمین کہتا ہوں جس کا تُو بھی مملوک ہے، اور تیرا معبود سورج بھی مملوک ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس بات کی طرف اشارہ کیا، اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ: اگر تم یقین کرنے والے ہو تو یقین کرلو کہ رَبّ العالمین وہ ہے جس کے قبضے میں زمین بھی ہے، آسمان بھی ہے، اور مَا بَيْنَهُمَا بھی ہے۔ اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کردیا کہ تم جو اپنے آپ کو رَبّ کہتے ہو، ذرا سوچو تو سہی کہ مصر کی چند میل کی زمین ہے جس کے اوپر تیری حکومت چلتی ہے، آسمانوں پر تیرا زور نہیں، سورج کا مشرق ومغرب تیرے قبضے میں نہیں، اور مصر کی حدود سے باہر تُو کسی جگہ اپنا حکم نہیں چلا سکتا، تو رَبّ العالمین کس طرح سے ہوا؟ فرعون کہنے لگا ان لوگوں کو جو اس کے اردگرد بیٹھے تھے، قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗۤ: فرعون نے کہا ان لوگوں کو جو اس کے اردگرد بیٹھے ہوئے تھے: اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ: کیا تم سنتے نہیں ہو؟ یہ کیسی باتیں کرتا ہے، کہاں تک پہنچتا ہے، یہ آگے بڑھتا چلا جارہا ہے، کہ میں اس سے کچھ بات کرتا ہوں، یہ اوپر چاند، سورج، ستاروں تک پہنچ گیا، اور کہتا ہے کہ زمین آسمان کا بھی مالک کوئی دوسرا ہے جس کے قبضے میں یہ سارے ہیں، تم سنتے نہیں ہو یہ کیا کہتا ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے اس کی بات کی پروا کیے بغیر آگے ایک اور شان ذکر کردی، کہ تمہارا رَبّ اور تمہارے آباءِ اولین کا رَبّ وہ ہے رَبّ العالمین، یعنی باپ دادے کی خبر بھی لے لی، کہ رَبّ العالمین میں اس کو کہتا ہوں جو تمہارا بھی رَبّ ہے، جس کے قبضے میں تم ہو اور تمہارے آباء واجداد ہیں، تو جس میں اس بات کی طرف اشارہ کردیا کہ تم رَبّ کیسے ہو، تم تو بعد میں پیدا ہوئے، تمہارے آباء واجداد جو تم سے پہلے گزر گئے ان پر تمہارا کوئی زور نہیں، قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ: رَبّ العالمین وہ ہے جو تمہارا بھی رَبّ ہے، اور تمہارے پہلے گزرے ہوئے آباء کا بھی رَبّ ہے، قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْۤ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ: فرعون نے کہا یعنی انہی اپنے حواریوں کو جو اردگرد اکٹھے ہوکر بیٹھے ہوئے تھے، ان کو خطاب کرکے کہا کہ بے شک یہ تمہارا رسول جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے، البتہ دیوانہ ہے، یعنی اپنے دعوے کے اعتبار سے، یہ جو رسول بن کے آیا ہے، جو کہتا ہے کہ میں تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں، اس کی تو عقل ہی ٹھکانے معلوم نہیں ہوتی۔ باتیں کس طرح سے کرتا ہے؟ میرے سامنے کھڑا ہوا، کبھی میرے آباء کا ذکر کرتا ہے، کبھی کسی کا ذکر کرتا ہے، اس کو کوئی خوف وہراس نہیں، میرے سامنے اس طرح سے بول رہا ہے، تو معلوم ہوتا ہے اس کا دماغ ٹھکانے نہیں۔ جب بات کو پھیرنا ہو تو اسی طرح سے بات کی جایا کرتی ہے، تاکہ مخاطبین کا ذہن اُلجھ جائے، اب جواب تو پاس تھا نہیں، یہ تو کہہ نہیں سکتا تھا کہ آبائے اوّلین کا رَبّ بھی میں ہوں، یا آسمانوں کا رَبّ بھی میں ہوں، زمین کا رَبّ بھی میں ہوں، مَا بَيْنَهُمَا میں بھی میری حکومت چلتی ہے، یہ باتیں تو کہہ نہیں سکتا تھا...... جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقابلے میں نمرود مبہوت ہوگیا تھا، جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا کہ میرا رَبّ مشرق کی طرف سے سورج نکالتا ہے، تُو جو کہتا ہے کہ میں رَبّ ہوں تو تُو ذرا مغرب کی طرف سے نکال کے دکھا دے، تو پتا چل جائے گا کہ تیرا زور کہاں تک چلتا ہے! وہ آگے عاجز آ گیا، وہ کیا کہتا کہ میں نکال کے دکھاتا ہوں؟ وہ کہہ ہی نہیں سکتا تھا، سمجھتا تھا کہ میرے اندر یہ قدرت نہیں ہے۔ اسی طرح سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ان باتوں میں فرعون سمجھ تو رہا تھا کہ نہ میرا آسمانوں پہ کوئی حکم چلتا ہے، اور نہ ساری زمین پر چلتا ہے،

نہ مَابَيْنَهُمَا پہ چلتا ہے، نہ میرے پیدا ہونے سے پہلے جو میرے آباؤاجداد گزرے ہیں، ان پہ میرا کوئی حکم چلتا ہے، تو واقعہ ہے، یہ جو رَبّ العالمین کی تعریف کرتا ہے تو میں تو نہیں کہہ سکتا کہ میں ایسا ہوں، اب اس بات کو اُلجھانے کے لئے کبھی ان کو کہتا ہے کہ دیکھو! یہ کیسی باتیں کرتا ہے۔ کبھی کہتا ہے کہ میرے سامنے آ کر جو ایسی باتیں کرنے لگ گیا تو معلوم ہوتا ہے اس کی عقل ٹھکانے نہیں ہے، یہ جواب ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دلائل کا...... حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سے بڑھ کے ایک اور فقرہ چست کردیا، رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا، کہنے لگے: رَبّ العالمین وہ ہے جس کے قبضے میں مشرق ہے، جدھر سے سورج نکلتا ہے، جس کے قبضے میں مغرب ہے، جدھر سورج چھپتا ہے، اور مشرق ومغرب کے درمیان میں جو کچھ ہے وہ اس کا مالک ہے، رَبّ العالمین وہ ہے۔ اس میں بھی وہ سمجھتا تھا کہ نہ مشرق پہ میرا زور، نہ مغرب پہ میرا زور، نہ مَابَيْنَهُمَا پہ۔ سوائے اس کے کہ مصر کی چند میل سلطنت ہے جس کے اوپر میں بادشاہ بنا بیٹھا ہوں، باقی! مشرق مغرب سب میرے اختیار سے باہر ہیں۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہی کہا کہ رَبّ العالمین وہی ہے جو مشرق کا رَبّ، مغرب کا رَبّ، اور ان چیزوں کا جو ان کے درمیان میں ہیں، اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ اگر تم سوچتے ہو، یعنی اگر تم عقل سے کام لو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ جس کی رُبوبیت اتنی عام ہے اصل کے اعتبار سے رَبّ العالمین وہ ہے۔ چند گز زمین کے اوپر اگر کوئی بادشاہ بن کے بیٹھ گیا یہ ''رَبّ'' کہلانے کا حق دار نہیں، اگر تم عقل سے کام لو تو تمہیں یہ بات سمجھ میں آ جائے۔

فرعون کی طرف سے دھمکی

جب یہ باتیں ساری کی ساری ہوگئیں، اب وہ بات آ گئی، جیسے حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

چو حجت نہ ماند جفا جوی را ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ بپرخاش درہم کشد روی را[1]

کہ جب ظالم آدمی کے لئے، جفاجو کے لئے دلیل نہیں ہوتی، تو پھر وہ لڑائی کے لئے مکا نکال لیتا ہے۔ اب یہاں پھر وہی اقتدار کا نشہ، حکومت کا زور، اب فرعون اس کو اس طرح سے ظاہر کرتا ہے۔ قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ اگر تُو نے بنایا کوئی معبود میرے علاوہ، اگر میرے علاوہ تُو نے کوئی معبود قرار دیا، لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ: تو البتہ ضرور کردوں گا میں تجھے قیدیوں میں سے، مسجون یہ سجن سے لیا گیا ہے، ''سجن'' کا لفظ سورۂ یوسف میں آپ کے سامنے گزرا تھا، سجن: قید کو کہتے ہیں، اور مسجون اس کو کہتے ہیں جو قید کردیا گیا ہو۔ مطلب یہ ہوا کہ حکومت کی دھمکی آ گئی کہ اگر اس طرح سے کرو گے تو ہم تجھے باغی قرار دیں گے، جس طرح باغیوں کو سزا دی جاتی ہے کہ جیلوں میں ڈال دیا جاتے ہیں، وہاں وہ سڑسڑ کے مرجاتے ہیں، اسی طرح سے میں تجھے بھی جیل میں ڈال دوں گا۔ اب یہاں دلائل کا جواب قوت کا اظہار ہے، قوت کے اظہار کے ساتھ گویا کہ دلائل کا جواب دیا جا رہا۔

موسیٰ علیہ السلام کی طرف معجزات کا اظہار

حضرت موسیٰ علیہ السلام کہنے لگے اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ کیا پھر بھی تُو مجھے قید کردے گا؟ جیل میں ڈال دے گا؟ تُو میری بات

(۱) ''بوستان'' باب اوّل، حکایت حجاج بن یوسف

نہیں مانے گا؟ اگرچہ میں تیرے سامنے کوئی واضح دلیل ہی لے آؤں، کوئی واضح شئے تیرے سامنے لے آؤں پھر بھی تو ایسا کرے گا؟ قَالَ فَاْتِ بِہٖٓ تو فرعون کہنے لگا کہ وہ لے آ، وہ کیا شئے ہے تیرے پاس؟ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ اگر تو سچوں میں سے ہے۔ فَاَلْقٰى عَصَاهُ، موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی ڈال دی، فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ، پس اچانک وہ کھلے طور پر اژدھا بن گیا۔ ثعبان کہتے ہیں بڑے سانپ کو، مبین کا معنی واضح، جس میں کوئی تاویل کی گنجائش نہیں تھی کہ شاید یہ کوئی نظر بندی ہے، یہ ہے وہ ہے، بڑا سارا سانپ بن کے لہلہانے لگ گیا۔ اچانک یعنی دیکھتے ہی دیکھتے، آنکھوں کے سامنے ثعبان مبین ہو گیا۔ وَّنَزَعَ يَدَهٗ: جیسے دوسری جگہ ہے وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ (سورۂ طٰہٰ: ۲۲) اس طرح سے اپنے پہلو میں ملاتے تھے پھر یوں نکالتے، تو انہوں نے اپنا ہاتھ کھینچا یعنی اپنے پہلو سے فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ پس اچانک وہ سفید تھا دیکھنے والوں کے لئے، کھلی آنکھوں سے لوگ دیکھ رہے تھے کہ یہ تو اس طرح سے چمکنے لگ گیا جس طرح سے سورج اور چاند چمکتا ہے۔

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗٓ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ

فرعون نے کہا ان سرداروں کو جو اس کے اردگرد بیٹھے تھے: یہ تو کوئی بہت بڑا علم والا جادوگر ہے ﴿۳۴﴾ ارادہ کرتا ہے کہ نکال دے تمہیں تمہاری زمین سے

بِسِحْرِهٖ ۖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ فِي الْمَدَآئِنِ

اپنے جادو کے زور سے، پھر تم کیا مشورہ دیتے ہو؟ ﴿۳۵﴾ وہ کہنے لگے: اس کو ڈھیل دے دو اور اس کے بھائی کو، اور بھیج دو شہروں کے اندر

حٰشِرِيْنَ ﴿۳۶﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ﴿۳۷﴾ فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ

جمع کرنے والے ﴿۳۶﴾ لے آئیں وہ تیرے پاس ہر بڑے جادوگر علم والے کو ﴿۳۷﴾ پھر اکٹھے کر لئے گئے جادوگر ایک معلوم دن کے

مَّعْلُوْمٍ ﴿۳۸﴾ وَّقِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ﴿۳۹﴾ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ

معلوم وقت کے لئے ﴿۳۸﴾ اور لوگوں سے کہہ دیا گیا کہ کیا تم اکٹھے ہونے والے ہو؟ ﴿۳۹﴾ تاکہ ہم پیروی کریں جادوگروں کی، اگر

كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۰﴾ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ

وہ غلبہ پانے والے ہوئے ﴿۴۰﴾ پس جب آ گئے جادوگر کہنے لگے فرعون کو: کیا ہمارے لئے البتہ اجر ہوگا؟ اگر

كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۱﴾ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۲﴾ قَالَ لَهُمْ

ہم غلبہ پانے والے ہوئے ﴿۴۱﴾ فرعون نے کہا کہ ہاں! اور تم بے شک اس وقت البتہ مقربین میں سے بھی ہو جاؤ گے ﴿۴۲﴾ کہا ان کو

مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۴۳﴾ فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ وَقَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ

موسیٰ نے کہ ڈالو تم کیا ڈالنے والے ہو ﴿۴۳﴾ ڈال دیا انہوں نے اپنی رسیوں کو اور اپنی لاٹھیوں کو، اور کہنے لگے: فرعون کی عزّت کی قسم

اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِىَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿۴۵﴾

بے شک ہم ہی غالب آنے والے ہیں ﴿۴۴﴾ موسیٰ نے اپنی لاٹھی ڈال دی پس اچانک وہ لاٹھی نگلتی تھی اس چیز کو جو وہ بناتے تھے ﴿۴۵﴾

فَاُلْقِىَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۴۶﴾ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾

جادوگر ڈال دیے گئے اس حال میں کہ وہ سجدہ کرنے والے تھے ﴿۴۶﴾ اور یہ پکار اُٹھے کہ ہم ایمان لائے رَبّ العالمین پر ﴿۴۷﴾

رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۴۸﴾ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ

جو موسیٰ اور ہارون کا رَبّ ہے ﴿۴۸﴾ فرعون نے کہا: تم ایمان لے آئے ہو اس پر قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دیتا؟ بے شک یہ البتہ تمہارا بڑا ہے

الَّذِىْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۬ؕ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ

جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے، پس عنقریب تمہیں پتا چل جائے گا، البتہ ضرور کاٹوں گا میں تمہارے ہاتھوں کو اور پاؤں کو

خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۹﴾ قَالُوْا لَا ضَيْرَ ۫ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا

مختلف جانب سے، اور البتہ ضرور تم سب کو میں سُولی دُوں گا ﴿۴۹﴾ جادوگر کہنے لگے: کوئی حرج نہیں، ہم اپنے رَبّ کی طرف

مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۵۰﴾ اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ اَنْ كُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۱﴾

لوٹ کر چلے جائیں گے ﴿۵۰﴾ بے شک ہم اُمید رکھتے ہیں کہ بخش دے ہمیں ہمارا رَبّ ہماری غلطیاں، اس سبب سے کہ ہم (اس مجمع میں سے) سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں ﴿۵۱﴾

تفسیر

فرعون کی سیاسی چال

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗ: فرعون نے کہا ان سرداروں کو جو اس کے اردگرد بیٹھے تھے، ملأ سے وہی درباری لوگ مراد ہیں، اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ، اب یہ دُوسرا رُخ بدل لیا، کہ یہ تو کوئی بہت بڑا علم والا جادوگر ہے، یعنی رسالت اور نبوّت کا اقرار کرنے کی بجائے اب رُخ اِدھر کو بدل دیا، چونکہ اس زمانے میں جادوگر اس قسم کے کرتب دکھایا کرتے تھے، تو کہا کہ یہ تو علم والا جادوگر ہے۔ يُرِيْدُ اَنْ

یُّخۡرِجَكُمۡ مِّنۡ اَرۡضِكُمۡ: ارادہ کرتا ہے کہ نکال دے تمہیں تمہاری زمین سے بِسِحۡرِهٖ اپنے جادو کے زور سے فَمَاذَا تَاۡمُرُوۡنَ پھر تم کیا حکم دیتے ہو؟ کیا مشورہ دیتے ہو؟ اب اس کو ایک سیاسی چال بنالیا کہ موسیٰ علیہ السلام جو آئے ہیں، اب یہ انقلاب لانا چاہتے ہیں، بنی اسرائیل کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں، قبطیوں کو حکومت سے نکالنا چاہتے ہیں، یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ بہت بڑی سازش ہے، یہ تو حکومت کا تختہ اُلٹنا چاہتے ہیں، تو اپنی قوم کو بھڑکانے کے لئے اس نے یہ دوسرا ڈھنگ اختیار کیا۔ آپ جانتے ہیں کہ سیاسی لیڈر شاطر تو ہوتے ہی ہیں، قوم کے جذبات سے کھیلنے کے لئے کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑ دیا، اب یہ شوشہ چھوڑا کہ یہ تو حکومت پر قبضہ کرنا چاہتا ہے، تمہارا مُلک چھیننا چاہتا ہے، مقصد اس کا یہ تھا کہ کہیں یہ موسیٰ علیہ السلام کی باتوں سے متاثر ہو کر ان کے پیچھے لگ کے کہیں میرا تیا پانچا نہ کر دیں، اب ان کا ذہن سیاسی چال پہ ڈال دیا کہ یہ چاہتا ہے کہ نکال دے تمہیں تمہارے مُلک سے (ارض سے مُلکِ مصر مراد ہے) اپنے جادو کے زور سے۔ پس تم کیا حکم دیتے ہو؟ کیا مشورہ دیتے ہو؟ یہ ''رَبّ العالمین'' اب اپنی عقل چھوڑ بیٹھے ہیں، اور اپنے پاس بیٹھنے والوں سے مشورے پوچھتے ہیں! تمہارا کیا حکم ہے؟ تم کیا حکم دیتے ہو، میں اب کیا کروں؟ قَالُوۡۤا: وہ کہنے لگے: اَرۡجِهۡ: اس کو ڈھیل دے دے۔ اِرۡجَاء ڈھیل دینے کو کہتے ہیں، وَاَخَاهُ، اور اس کے بھائی کو، مہلت دے دو کچھ، وَابۡعَثۡ فِی الۡمَدَآئِنِ حٰشِرِیۡنَ: مدائن: مدینہ کی جمع ہے۔ اور شہروں کے اندر جمع کرنے والے بھیج دو، یَاۡتُوۡكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِیۡمٍ، لے آئیں وہ تیرے پاس ہر بڑے جادوگر علم والے کو، جو بہت بڑا جادوگر اور بڑے علم والا ہے وہ سب جادوگروں کو اکٹھا کر کے لے آئیں۔

مقابلہ طے ہوگیا اور تیاریاں شروع ہوگئیں

فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِیۡقَاتِ یَوۡمٍ مَّعۡلُوۡمٍ: یہ واقعے میں اختصار ہے، تفصیل آپ کے سامنے سورۂ طٰہٰ میں گزری۔ پھر اکٹھے کر لیے گئے جادوگر ایک معلوم دِن کے معلوم وقت کے لئے، کہ دِن بھی متعین ہوگیا، وقت بھی متعین ہوگیا۔ جیسے سورۂ طٰہٰ میں آیا تھا: یَوۡمُ الزِّیۡنَةِ، اور وقت: ضُحًی اور مَكَانًا سُوًی یہ تینوں باتیں آئی تھیں (آیت ۵۸،۵۹)، ایسی درمیانی سی جگہ جہاں ہر کوئی پہنچ سکے، اور جشن کا دِن، میلے کا دِن، اور چاشت کا وقت، یہ متعین ہوگیا۔ اس وقت کے لئے جادوگر اکٹھے کر لئے گئے، اور لوگوں میں بھی فرعون نے اعلانِ عام کر دیا، وَّقِیۡلَ لِلنَّاسِ لوگوں سے کہہ دیا گیا، هَلۡ اَنۡتُمۡ مُّجۡتَمِعُوۡنَ کیا تم اکٹھے ہونے والے ہو؟ یعنی تمہیں اکٹھے ہونا چاہیے: لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنۡ كَانُوۡا هُمُ الۡغٰلِبِیۡنَ، تاکہ ہم پیروی کریں جادوگروں کی اگر وہ غلبہ پانے والے ہوئے۔ لوگوں سے کہا بھائی! سب اکٹھے ہو کے آؤ، مُلک کو خطرہ پیش آگیا ہے، اور یہ ہمارے غلام ہم سے باغی ہو رہے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ حکومت میں انقلاب آجائے، اور مُلک تمہارے ہاتھوں سے نکل جائے، سارے اکٹھے ہو جاؤ، کیونکہ جادوگر جب مقابلہ کریں گے، تو وہ ایک ہے اور اِدھر اتنے ہوں گے، تو غالب گمان یہی ہے کہ غالب یہی آئیں گے، غلبہ پالیں گے، تو ہمیں پھر جادوگروں کی بات ماننی چاہیے، ہم اس کی بات نہیں مانیں گے، اور جادوگروں کی بات یہی ہوگی کہ فرعون ہی ٹھیک ہے، رَبِّ اَعلیٰ یہی ہے، تو اپنے طور پر وہ فتح کی اُمید پر ساری مخلوق کو اکٹھا کر کے لے آئے...... اعلان کر دیا گیا کہ مُلک کے دفاع کے لئے جمع ہو جاؤ، مُلک خطرے میں ہے، انقلاب آنے لگا ہے، یہ تمہارے غلام تختہ اُلٹ دیں گے، اور تمہیں مُلک سے باہر نکال دیں گے۔ اس طرح جذبات بھڑکا کے ان

سب کو اکٹھا کرلیا۔ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ: میں ترغیب کا پہلو ہے، کیا تم اکٹھے ہونے والے ہو؟ یعنی تمہیں اکٹھے ہونا چاہیے تاکہ ہم پیروی کریں جادوگروں کی اگر وہ غلبہ پانے والے ہوئے۔

جادوگروں کا مطالبہ اور فرعون کا ان کو طمع دلانا

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ: جب جادوگر آئے۔ اب دیکھو! پیشہ ور جادوگر اور نبی میں بنیادی طور پر یہ فرق ہے، نبی جس وقت تبلیغ کرنے کے لئے آتا ہے تو ساتھ یہ نعرہ لگاتا ہے کہ: لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا (سورۂ ہود: ۵۱، وغیرہ) میں تم سے کسی قسم کا اُجر نہیں مانگتا، میرا اُجر تو اللہ تعالیٰ کے ذِمّے ہے، تم میری بات سنو اور مانو، تمہارے فائدے کی بات ہے۔ لیکن یہ جو پیشہ ور جادوگر ہوتے ہیں، ان کا تو کام ہی یہی ہے کہ کوئی کرشمہ دکھایا، اور ہاتھ پھیلا کے لوگوں سے مانگ لیا۔ جیسے بازی گر کیا کرتے ہیں کوئی کام کیا اور کرنے کے بعد پھر ہاتھ پھیلا کے لوگوں سے مانگنے لگ گئے۔ اور فرعون نے جو ان کو جادوگر کہا تھا، کہ ان سے وہ ڈرتا ہے کہ یہ کہیں اس کی حکومت کا تختہ نہ اُلٹ دیں، یہ محض ایک سیاسی چال تھی، ورنہ وہ جانتا ہے کہ مُلک میں کتنے ہی جادوگر ہیں، کبھی وہ خواب بھی نہیں دیکھ سکتے حکومت کا تختہ اُلٹنے کا، بادشاہ کے دربار میں آ کے بادشاہ کو غلطیوں سے ٹوکنا تو کجا رہا، وہ ایک سپاہی سے آنکھ لڑانے کی جراَت نہیں کرتے، جادوگروں کی تو پوزیشن ہی یہی ہوتی ہے کہ حلقہ لگائیں گے، کرشمہ دکھائیں گے، لوگوں سے مانگ مانگ کے تو روٹی کھاتے ہیں، ان میں کہاں حوصلہ ہوتا ہے کہ وہ حکومت کا تختہ اُلٹ دیں؟ تو یہ جانتا ہوا پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو جادوگر کہتا ہے، تو یہ اس کی محض ایک سیاسی چال تھی۔

چنانچہ جادوگر آئے اور آتے ہی پہلے انہوں نے اپنا مطالبہ رکھ دیا کہ اگر ہم نے غلبہ پالیا تو ہمیں کچھ انعام بھی ملے گا؟ فرعون کی تو اب جان کو آئی ہوئی تھی، وہ کہتا ہے کہ انعام بھی ملے گا، اور ساتھ ساتھ تم میرے مقرب بھی بن جاؤ گے، دربار میں کرسی ملے گی۔ تو اس کا مطلب ہے کہ مال اور جاہ دونوں کی ان کو طمع دلائی کہ میری اس سے جان چھڑاؤ، اگر تم اس کے اوپر غلبہ پا گئے تو تمہارے لیے خزانوں کے منہ کھل جائیں گے، اور پھر تم درباری بھی ہو جاؤ گے، اور دربار میں تمہیں کرسی بھی ملے گی، یہ جاہ کی طمع دلا دی۔ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ: پس جب آ گئے جادوگر، کہنے لگے فرعون کو: کیا ہمارے لئے البتہ اُجر ہوگا اگر ہم غلبہ پانے والے ہوئے؟ قَالَ نَعَمْ: فرعون نے کہا کہ ہاں! وَاِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ: اور تم بے شک اس وقت البتہ مقربین میں سے بھی ہو جاؤ گے، یعنی دربار میں میرے مقرب بھی بن جاؤ گے۔

میدانِ مقابلہ

مقابلہ لگ گیا، معلوم یوں ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تقریریں جادوگر شہر میں سنتے رہے، کیونکہ یہ قاعدہ ہوتا ہے، جس طرح سے اگر دو مولویوں میں مناظرہ ہونا ہو اور مقابلہ ہونا ہو، تو ایک مولوی نے پہلے جو تقریر کی ہوئی ہے، تو دوسرا اس کی کیسٹیں منگوا کے سنتا ہے کہ یہ کیا دلائل دیتا ہے؟ کیا باتیں کرتا ہے؟ تاکہ جب مقابلے میں تقریر کی جائے تو اس کی باتوں کا جواب دیا جائے، چھپ چھپ کے ایک دوسرے کی تقریریں سنتے ہیں کہ اس کا کیا انداز ہے؟ کس طرح بیان کرتا ہے؟ یکدم تو ایک دوسرے

کے مقابلے میں نہیں آ جایا کرتے، تیاری کے اندر یہ بات بھی داخل ہے۔ اب وہ جادوگر کئی دن جو وہاں آ کے مصر میں ٹھہرے ہوں گے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وعظیں بھی سنی ہوں گی، لوگوں سے بھی پوچھا ہوگا، کہ یہ آخر کہتا کیا ہے؟ اور دوسری جگہ آپ کے سامنے آیا تھا کہ جب مدمقابل آ کے کھڑے ہوئے تھے، تو اس وقت بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک مؤثر وعظ کہی تھی، اور انہیں کہا تھا کہ دیکھو! حق کو حق کہنا، باطل کو باطل کہنا، اگر تم نے باطل کی حمایت کی اور حق کو جھٹلایا تو خطرہ ہے کہ اللہ کا عذاب تمہارے اُوپر آ جائے گا، وہاں میدان میں کھڑے ہو کے بھی وعظ کہی تھی۔ تو جادوگر سمجھ گئے کہ یہ کہتا کیا ہے؟ اس کا مطالبہ کیا ہے؟ کون سی اس کی باتیں ہیں؟ اور یہ کیا دِکھاتا ہے؟ اسی لئے تو وہ بھی مقابلہ کرنے کے لئے لاٹھیاں اور رسیاں لائے تھے، یہ مختلف باتیں مختلف سورتوں کے اندر گزری ہیں، جب انہوں نے نے آ کے دیکھا کہ یہ لاٹھی کو سانپ بناتا ہے تو وہ لاٹھیاں لائے، اور موسیٰ علیہ السلام کے پاس صرف لاٹھی تھی، وہ ساتھ رسیاں بھی لائے کہ جب یہ دو چیزیں پھینکی جائیں گی، تو لوگوں کو پتا چل جائے گا، کہ لو! اس نے تو صرف لاٹھی کا سانپ بنایا، انہوں نے رسیوں کو بھی سانپ بنا دیا، غلبہ نمایاں ہو جائے گا۔ تو سارے حالات انہوں نے سُن لئے تھے، اور دیکھ لئے تھے۔

اب جس وقت مقابلے میں آئے تو قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اَلْقُوْا مَاۤ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ڈالو تم کیا ڈالنے والے ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھ لیا ہوگا کہ یہ بھی ڈنڈے ہاتھ میں لئے کھڑے ہیں، فرمایا: ڈالو، کیا ڈالتے ہو! فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ: ڈال دیا انہوں نے اپنی رسیوں کو، اپنی لاٹھیوں کو، حبال حَبْل کی جمع ہے، حبل رَسّی کو کہتے ہیں۔ عِصِیّ عصا کی جمع ہے، عصا لاٹھی کو کہتے ہیں۔ انہوں نے اپنی رسیاں اور اپنی لاٹھیاں ڈال دیں، وَقَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ اور ساتھ یہ نعرہ لگا دیا۔ جس طرح سے کہ مقابلے میں عادت ہوتی ہے، ایک آدمی ایک کام کرتا ہے، تو اس کے حواری اردگرد کے لوگ ساتھ ایک نعرہ بھی لگا دیتے ہیں رُعب ڈالنے کے لیے، کہنے لگے: فرعون کی عزت کی قسم! بے شک ہم ہی غالب آنے والے ہیں۔ یہ ساتھ ہی انہوں نے قسم کھائی، اور قسم کھا کر آواز بلند کی، فرعون کی عزت کی قسم! بے شک ہم البتہ غلبہ پانے والے ہیں۔ فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ تو جب وہ ڈال کر فارغ ہو گئے، اور ان کے ڈالنے کا کیا اثر ہوا تھا؟ یہ بھی قرآنِ کریم میں دُوسری جگہ ذکر کیا گیا ہے: يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى (سورۂ طٰہٰ:۶۶) وہ رسیاں وغیرہ جو ڈالی تھیں، موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں یہ بات ڈالی جارہی تھی ان کے جادو کے اثر سے کہ یہ سب بھاگی پھر رہی ہیں۔ ایسا جادو کیا کہ موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں یوں آ رہا تھا کہ یہ سانپوں کی طرح بھاگی پھر رہی ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام کو اندیشہ کیوں ہوا؟

تبھی موسیٰ علیہ السلام کے دل میں اندیشہ ہوا تھا کہ اگر عوام کو بھی یہ یونہی بھاگتی ہوئی نظر آنے لگ گئیں، تو پھر عوام فرق کس طرح سے کریں گے کہ یہ حق ہے، اور یہ باطل ہے؟ یہی اندیشہ آیا تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں کہ میری لاٹھی بھی تو سانپ ہی بنے گی، سانپ کی طرح وہ چلے گی، اور یہ بھی اسی طرح سے چل رہی ہیں، یہ تو حق اور باطل مشتبہ ہو جائے گا، لوگوں کو پتا کس طرح سے چلے گا؟ یہ اندیشہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں آیا تھا، جب اللہ تعالیٰ نے کہا تھا: اندیشہ نہ کر، ڈال دے تُو، تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی

ڈال دی، فَإِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُوْنَ، پس اچانک وہ لاٹھی نگلتی تھی اس چیز کو جو وہ بناتے تھے، جو کچھ انہوں نے گھڑا تھا، تراشا تھا موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی سب کو نگل گئی۔

رسیوں اور لاٹھیوں کے نگلنے کی صورت کیا تھی؟

نگلنے کی یہ صورت بھی ہوسکتی ہے کہ رسیاں لاٹھیاں سب کچھ نگل گئی، اور یہ صورت بھی ہوسکتی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی میدان میں آئی تو موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی تو بن گئی سانپ، اور جادوگروں کی لاٹھیاں اور رسیاں لوگوں کو اسی طرح سے لاٹھیاں اور رسیاں نظر آنے لگ گئیں، جادو کے زور سے انہوں نے جو کچھ بنایا تھا سب ختم ہوگیا۔ لوگوں کو نظر آ گیا کہ دیکھو! یہ سانپ ہے اور وہ اسی طرح سے لاٹھیاں اور رسیاں پڑی ہیں۔ تفسیر میں دونوں قسم کی روایات موجود ہیں۔ یا تو یہ ہے کہ جس طرح سے بڑا سانپ چھوٹے سانپوں کو نگل جایا کرتا ہے، تو موسیٰ علیہ السلام کے سانپ نے جو منہ کھولا تو جو کچھ ادھر پھر رہا تھا، سب کچھ نگل لیا، یہ صورت بھی ہوسکتی ہے۔ یا یہ ہے کہ اس کا میدان میں آنا ہی تھا کہ جادوگروں کا تصرف ختم ہوگیا، اور ان کی رسیاں اور لاٹھیاں ویسے ہی پڑی نظر آرہی تھیں، اور موسیٰ علیہ السلام کا عصا سانپ کی شکل میں پھر رہا تھا۔ چنانچہ یہاں حاشیے میں شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے یہی لکھا ہے کہ ''شیخ اکبر نے لکھا ہے کہ خالی رسیاں اور لاٹھیاں رہ گئیں، جو سانپوں کی صورتیں انہوں نے بنائی تھیں موسیٰ علیہ السلام کا عصا ان کو نگل گیا'' یعنی صورتیں ختم ہوگئیں، یا پھر لاٹھیاں اور رسیاں جو پھر رہی تھیں، تو موسیٰ علیہ السلام کا عصا ان کو نگل گیا، دونوں باتیں لکھی ہیں۔

جادوگر اتنی جلدی متأثر کیوں ہوئے؟

فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ: اب یہ پہلے بھی آپ کے سامنے وضاحت کی تھی کہ عامی آدمی فرق کرسکے یا نہ کرسکے، لیکن صاحبِ فن فرق کر جایا کرتا ہے کہ یہ مسئلہ کس فن کا ہے؟ اب وہ جادوگر تو جانتے تھے کہ جادو کا اثر کس قسم کا ہوا کرتا ہے؟ موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی جب سانپ بنی، اس کے اثرات دیکھے تو وہ پہچان گئے کہ یہ جادو نہیں ہے، اس کا تعلق اس فن سے نہیں ہے، جو ہم جانتے ہیں، تو وہ فوراً پہچان گئے کہ ان کا تعلق کسی دوسری قوت سے ہے، چونکہ صاحبِ فن تھے اس لیے ان کو پرکھنے میں دیر ہی نہیں لگی، فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ: جادوگر ڈال دیے گئے اس حال میں کہ وہ سجدہ کرنے والے تھے، یعنی ان کے دل میں اس معجزے کی اتنی عظمت بیٹھی کہ ایسے تھا جیسے کسی نے پکڑ کے سجدے میں گرادیا، وہ قلبی کیفیت سے اس طرح مجبور ہوئے جیسے کسی نے پکڑ کے سجدے میں گرادیا، اور یہ پکار اٹھے جو ابھی کہہ رہے تھے: بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ إِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ، اب وہی کہتے ہیں: اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ، اب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چونکہ ''رَبِّ العالمین'' کا ذکر کیا تھا، تو انہوں نے بھی ایمان کا اظہار ''رَبِّ العالمین'' پہ کیا، لیکن اس میں یہ اندیشہ تھا کہ کہیں فرعون اپنے آپ کو ''رَبِّ العالمین'' نہ سمجھ بیٹھے، تو کہہ دیا کہ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ: ہم اس رَبِّ العالمین پہ ایمان لے آئے ہیں جو موسیٰ اور ہارون کا رَبّ ہے۔ لیجئے! وہ ساری کی ساری فوج جو مقابلے میں آئی تھی شکست کھا گئی۔

فرعون کی سیاسی چال ناکام ہوگئی

اب فرعون کے لیے اور جان کو بن گئی کہ لوگ تو اس لیے اکٹھے کئے تھے کہ تاکہ جادوگر غالب آجائیں گے تو ان کے اثرات ختم ہوجائیں گے اور کوئی ان کی بات مانے گا ہی نہیں، یہ اُلٹا حساب ہوگیا کہ جادوگر جب شکست کھا گئے تو لوگ سارے یکدم موسیٰ علیہ السلام سے متاثر ہوجائیں گے، اور میرا تو تختہ اُلٹا ہی اُلٹا، اب آگے پھر اس نے وہی سیاسی لیڈروں کی طرح دوسری چال چلی، کہتا ہے ہاں! پتا چل گیا، میری اجازت کے بغیر تم ایمان لے آئے ہو؟ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُستاذ ہے تم شاگرد ہو، اندر اندر سے تم سب نے مل کر میرے خلاف سازش کی ہے میری حکومت کو بدلنے کے لئے، اُستاذ کو پہلے بھیج دیا کہ جاکے چیلنج کرے گا، تم بعد میں آگئے، اور بھرے میدان میں شکست کھا کے تم نے لوگوں کے ذہنوں پر اثر ڈالا ہے، یہ اندر سے تمہاری سازش ہے، تو اس کو پھر سازش کو عنوان دے دیا۔

فرعون کی جادوگروں کو دھمکی

قَبۡلَ اَنۡ اٰذَنَ لَکُمۡ تم ایمان لے آئے ہو اس کے لئے قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دیتا یعنی یوں غصہ جھاڑا کہ اگر تمہیں اس دلیل کے جواب میں شکست ہو ہی رہی تھی، تو تم میرے سامنے آتے، مجھے آ کے کہتے کہ جی! بات یوں معلوم ہوتی ہے کہ یہ جادو نہیں ہے، یہ جو کچھ کہہ رہا ہے ٹھیک کہہ رہا ہے، میرے سے آ کے مشورہ کرتے، میں پھر تمہیں کہتا کہ ٹھیک ہے اگر تم دلیل سے شکست کھا گئے ہو تو چلو! ہم مل جل کے اس کو مان لیتے ہیں، میرے سے تو تم نے بات ہی نہیں کی، مجھ سے تو تم نے اجازت ہی نہیں لی، اور ایسے اپنے طور پر ہی مان لیا اعلان کر دیا، معلوم ہوگیا تم سب اندر سے ایک ہو، اگر تم اندر سے ایک نہ ہوتے تو شکست کھانے کے بعد میرے پاس آتے اور میرے سامنے حالات ذکر کرتے، پھر ہم اپنی شکست اکٹھی مانتے یا کوئی اور تدبیر اختیار کرتے، تو مجھ سے مشورہ کئے بغیر اور مجھ سے اجازت لئے بغیر تم نے جو ایمان کا اعلان کر دیا یہ نشاندہی ہے اس بات کی کہ اندر اندر سے تمہارا مشورہ ہے، کہ ایک جا کے پہلے یوں چیلنج کرے، دوسرے یوں مقابلے میں آئیں گے، مقابلے میں آنے کے بعد شکست کھا جائیں گے، یہ سب آپس میں تمہارا مشورہ ہے، یہ ملی بھگت ہے اور تم مجھے شکست دینا چاہتے ہو۔ قَالَ اٰمَنۡتُمۡ لَہٗ قَبۡلَ اَنۡ اٰذَنَ لَکُمۡ: تم ایمان لے آئے ہو اس پر قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دیتا، بے شک یہ البتہ تمہارا بڑا ہے، جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے، پس اب عنقریب تمہیں پتا چل جائے گا کہ میں تم سے کیا کرتا ہوں۔ لَاُقَطِّعَنَّ اَیۡدِیَکُمۡ وَاَرۡجُلَکُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ: البتہ ضرور کاٹوں گا میں تمہارے ہاتھوں کو اور پاؤں کو مختلف جانب سے، یعنی ایک طرف کا ہاتھ، ایک طرف کا پاؤں، جو اس زمانے میں حکومت کے باغی کی سزا تھی، تو میں اب اسی طرح سے تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹوں گا، وَّلَاُوصَلِّبَنَّکُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ: اور البتہ ضرور تم سب کو میں سُولی دوں گا، سُولی پہ لٹکا دوں گا۔

جادوگروں کا فرعون کو جواب

قَالُوۡا: وہ جادوگر کہنے لگے لَا ضَیۡرَ کوئی حرج نہیں، اب یہ دیکھئے! یہ مستقل معجزہ ہے موسیٰ علیہ السلام کا، کہ وہ جادوگر جو پیسے پیسے

کے لئے ہاتھ پھیلاتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہمیں انعام دینا اگر ہم جیت گئے، اور آج فرعون کو اور فرعون کی سلطنت کو ٹھوکریں مار رہے ہیں۔ ایمان کا یہی اثر ہوتا ہے کہ جب قلب کے اندر آ جاتا ہے، پھر دنیا کی کوئی قوت، کوئی طاقت، کوئی حرص، کوئی لالچ اس کو پھر شکست نہیں دے سکتا۔ اب موسیٰ علیہ السلام کی صحبت میں کلمہ پڑھا، اب یہ بن گئے موسیٰ علیہ السلام کے صحابی، حضور ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے حالات تو آپ دیکھتے رہتے ہیں کہ کلمہ پڑھنے کے بعد کیسی پہاڑوں کے برابر انہوں نے مصیبتیں برداشت کیں لیکن قدم نہیں ڈگمگائے، موسیٰ علیہ السلام کے صحابیوں کا بھی یہی حال ہوا، ابھی یہ فرعون کے سامنے دست گدائی دراز کیے ہوئے تھے اُجرت مانگنے کے لیے اور پیسہ پیسہ مانگنے کے لئے، اور یہ جاہ کی لالچ میں تھے، لیکن ابھی یہ ہوا کہ وہ کہتا ہے میں ہاتھ پاؤں کاٹوں گا، میں تمہیں سُولی چڑھاؤں گا، کہتے ہیں کوئی پروا نہیں، لَا ضَیْرَ: کیا نقصان ہے؟ اگر تو ہاتھ پاؤں کاٹ دے گا، سُولی چڑھا دے گا، تو کیا نقصان ہے اس میں؟ اِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ: ہم اپنے ربّ کی طرف لوٹ کے چلے جائیں گے، یعنی کلمہ پڑھتے ہی وہ معرفت کے کس درجے پہ چلے گئے، اللہ کے ساتھ ان کا تعلق کتنا مضبوط ہو گیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ باتیں انہوں نے پہلے سنی ہوئی تھیں، اب ایمان لانے کی دیر تھی، ایمان لائے اور ساری حقیقت منکشف ہو گئی۔ اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰیٰنَاۤ: بے شک ہم امید رکھتے ہیں کہ بخش دے ہمیں ہمارا ربّ ہماری غلطیاں۔ اَنْ كُنَّاۤ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِیْنَ: اس سبب سے کہ ہم اس مجمع میں سے سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں، ہم اول المؤمنین ہیں یعنی اس مجمع کے اعتبار سے، جتنا مجمع یہاں موجود ہے ان سب سے ہم پہلے ایمان لانے والے ہیں، ہم اللہ تعالیٰ سے امید رکھتے ہیں کہ وہ ہماری غلطیاں معاف کر دے گا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَاَوْحَیْنَاۤ اِلٰی مُوْسٰۤی اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْۤ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۵۲﴾ فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ

ہم نے وحی بھیجی موسیٰ کی طرف، کہ لے کر چل میرے بندوں کو رات کے وقت، بے شک تم پیچھا کئے جاؤ گے ﴿۵۲﴾ پھر فرعون نے بھیج دیا

فِی الْمَدَآئِنِ حٰشِرِیْنَ ﴿۵۳﴾ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِیْلُوْنَ ﴿۵۴﴾ وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ ﴿۵۵﴾

شہروں میں جمع کرنے والوں کو ﴿۵۳﴾ بے شک یہ لوگ البتہ جماعت ہیں چھوٹی سی ﴿۵۴﴾ اور بے شک یہ لوگ ہمیں البتہ غصہ چڑھانے والے ہیں ﴿۵۵﴾

وَاِنَّا لَجَمِیْعٌ حٰذِرُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ﴿۵۷﴾ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ

اور بے شک البتہ ہم سب خطرہ محسوس کرنے والے ہیں ﴿۵۶﴾ پھر ہم نے ان سب کو نکال دیا باغات سے اور چشموں سے ﴿۵۷﴾ اور خزانوں سے اور عمدہ

كَرِیْمٍ ﴿۵۸﴾ كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ﴿۵۹﴾ فَاَتْبَعُوْهُمْ

مقام سے ﴿۵۸﴾ ہم نے ایسے ہی کیا اور ان نعمتوں کا وارث بنا دیا ہم نے بنی اسرائیل کو ﴿۵۹﴾ فرعونیوں نے ان کا پیچھا کیا اس حال میں کہ وہ

مُّشْرِقِيْنَ ﴿۶۰﴾ فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ﴿۶۱﴾
روشنی کے وقت میں داخل ہونے والے تھے ﴿۶۰﴾ جب دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، موسیٰ کے ساتھیوں نے کہا کہ بے شک ہم تو پکڑے گئے ﴿۶۱﴾
قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ﴿۶۲﴾ فَاَوْحَیْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ
موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ہرگز نہیں، بے شک میرے ساتھ میرا رب ہے عنقریب مجھے وہ راستہ دکھائے گا ﴿۶۲﴾ پھر ہم نے حکم بھیجا موسیٰ کی طرف کہ مار تو
بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ؕ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِیْمِ ﴿۶۳﴾ وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِیْنَ ﴿۶۴﴾
اپنی لاٹھی سمندر پر، پس وہ سمندر پھٹ گیا، پس ہو گیا ہر ٹکڑا بڑے پہاڑ کی طرح ﴿۶۳﴾ اور ہم نے قریب کر دیا وہاں دوسروں کو بھی ﴿۶۴﴾
وَاَنْجَیْنَا مُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗۤ اَجْمَعِیْنَ ﴿۶۵﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِیْنَ ﴿۶۶﴾ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ
اور ہم نے نجات دی موسیٰ کو اور اس کے ساتھیوں کو سب کو ﴿۶۵﴾ پھر ہم نے دوسروں کو غرق کر دیا ﴿۶۶﴾ بے شک اس واقعے میں
لَاٰیَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۶۷﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴿۶۸﴾
البتہ نشانی ہے اور ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں ﴿۶۷﴾ بے شک تیرا ربّ البتہ زبردست ہے رحم کرنے والا ہے ﴿۶۸﴾

تفسیر

موسیٰ علیہ السلام کو ہجرت کا حکم

وَاَوْحَیْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى: ہم نے وحی بھیجی موسیٰ علیہ السلام کی طرف اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْٓ: سَرٰی یَسْرِی اور اَسْرٰی یُسْرِیْ دونوں کا معنی ہوتا ہے رات کو چلنا۔ اور آگے باء تعدیہ کی آگئی۔ میرے بندوں کو لے کے چل رات کے وقت۔ رات کا معنی لفظ اسراء میں ہے، جیسا کہ پندرھویں پارے کی ابتدائی آیت میں بھی یہی لفظ آیا تھا سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَیْلًا: جو رات کو رات لے گیا، آگے ''لَیْلًا'' کا لفظ بھی وہاں آیا ہوا ہے، ویسے سَرٰی یَسْرِی یہ خود رات کے وقت چلنے کے معنی میں ہوتا ہے۔ لے کے چل میرے بندوں کو رات کے وقت، اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ بے شک تم پیچھا کیے جاؤ گے یعنی دشمن تمہارے پیچھے آئے گا، یہ خبر اللہ تعالیٰ نے پہلے دے دی، فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِی الْمَدَآئِنِ حٰشِرِیْنَ: مدائن کا لفظ پہلے بھی گزرا، مدینہ کی جمع ہے۔ پھر فرعون نے بھیج دیا شہروں میں جمع کرنے والوں کو، اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِیْلُوْنَ: بے شک یہ لوگ البتہ جماعت ہیں چھوٹی سی، شرذمہ چھوٹی جماعت کو کہتے ہیں، یہ چھوٹی سی جماعت ہیں، وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ: اور بے شک یہ لوگ ہمیں البتہ غصہ چڑھانے والے ہیں۔ غائظون یہ غیظ سے لیا گیا ہے، دوسری جگہ قرآنِ کریم میں آئے گا: وَالْكٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ (سورۂ آل عمران: ۱۳۴) اور اسی طرح ہے: لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ (سورۂ فتح: ۲۹) یہ لفظ قرآنِ کریم میں کئی جگہ آیا ہوا ہے۔

فرعون نے اپنی ساری قوت وجمعیت اکٹھی کر لی

وَاِنَّا لَجَمِیْعٌ: اور بے شک ہم سب البتہ اکٹھے ہیں، حٰذِرُوْنَ: یہ حٰذِرُوْنَ یہ لفظ حذر سے لیا گیا ہے، حَذِرَ یَحْذَرُ ڈرنے کے معنی میں بھی ہوتا ہے، بچنے کے معنی میں بھی ہوتا ہے، اور حِذر احتیاط کو بھی کہتے ہیں، خُذُوْا حِذْرَكُمْ (سورۂ نساء: ۷۱) اپنی احتیاط اختیار کرو، بچاؤ اختیار کرو۔ تو اِنَّا لَجَمِیْعٌ حٰذِرُوْنَ کا مطلب یہ ہے کہ بے شک البتہ ہم سارے کے سارے ہی خطرہ محسوس کرنے والے ہیں، یہ ''حذر'' ڈرنے والا معنی ہوگیا۔ ہم سارے کے سارے محتاط ہیں، یہ ''حِذر'' جو بچاؤ کے معنی میں آتا ہے، یہ وہ مفہوم ہوجائے گا کہ ہم سارے کے سارے البتہ اپنی احتیاطی تدبیر کرنے والے ہیں، ہم سب نے اپنا بچاؤ کر رکھا ہے۔ یا مطلب یہ ہے کہ ہم سب خطرہ محسوس کر رہے ہیں کہ یہ لوگ کہیں نکل کے پھر باہر سے ہمارے خلاف کوئی دوسرا انقلاب نہ لے آئیں...... یہ ہے وہ واقعہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل کو لے کے راتوں رات نکل گئے تھے، اور فرعونیوں نے ان کا پیچھا کرنا چاہا تھا، تو فرعون نے مختلف شہروں کے اندر پیغام بھیج دیے کہ اکٹھے ہوجاؤ، فوجیں اپنی سمیٹ لیں، اکٹھی کرلیں، اور یہ پیغام دیا کہ یہ تھوڑے سے لوگ ہیں، اور ہمیں غصہ چڑھا رہے ہیں ایسی حرکتیں کر کے، اور ہم پوری طرح سے محتاط ہیں، اس لئے کوئی خطرے کی بات نہیں ہے، یا یہ ہے کہ ہم یہ خوف اور اندیشہ کرنے والے ہیں کہ اگر یہ لوگ ہمارے ہاتھوں سے نکل گئے، تو نکلنے کے بعد پھر کوئی قوت مجتمع کر کے پھر ہمارے ملک میں کوئی گڑبڑ نہ کریں، اس لئے ہمیں ان کا پیچھا کرنا چاہیے۔ تو اپنی قوم کی حوصلہ افزائی کے لئے یا وقت کی نزاکت کا احساس دلانے کے لئے فرعون نے اس قسم کی باتیں کیں، اور لوگوں میں یہ پیغام پھیلایا۔

یہاں چونکہ واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ نہیں آرہا، تو آگے حاصل یہ ہوگا کہ وہ لوگ اکٹھے ہوگئے، اور اس واقعے کی اہمیت کے پیش نظر فرعون نے خود قیادت کی، فرعون بھی ان فوجوں کے آگے آگے تھا، اور ساری کی ساری فوجیں پیچھے لگ گئیں، اور پیچھے لگنے کے بعد جو نتیجہ ہوا وہ دوسری جگہ مذکور ہے، اور یہاں بھی اشارہ موجود ہے کہ ان سب کو غرق کردیا گیا، اور بنی اسرائیل نجات پاگئے۔

''فرعونی'' نعمتوں سے محروم، اور ''بنی اسرائیل'' وارث بن گئے

تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل کا پیچھا کرنے کے لئے فرعونی جو نکلے تھے، تو ان کا نکلنا یہ تھا کہ فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ: پھر ہم نے ان سب کو نکال دیا باغات سے، اور چشموں سے، اور خزانوں سے، اور عمدہ مقام سے، یعنی ان کا نکلنا یہ ہوا کہ تمام نعمتوں سے محروم ہوگئے، باغات سے محروم ہوگئے، چشموں سے محروم ہوگئے، خزانوں سے محروم ہوگئے، ان کا اپنا ٹھکانا بڑا عمدہ ٹھکانا تھا، جس سے یہ فائدہ اُٹھا رہے تھے، اس سے بھی محروم ہوگئے۔ كَذٰلِكَ ۚ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ: كَذٰلِكَ کا معنی یہ ہے کہ ہم نے ایسے ہی کیا، اور ان نعمتوں کا وارث بنادیا ہم نے بنی اسرائیل کو، مصریوں کو محروم کردیا، فرعونیوں کو محروم کردیا، اور ان نعمتوں کا وارث بنادیا بنی اسرائیل کو۔ ھا ضمیر یہ پچھلی چیزوں کی طرف لوٹ رہی ہے جن جو: جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ۝ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِیْمٍ، کے عنوان کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

اَوْرَثْنٰهَا: کا یہاں یہ مطلب نہیں کہ فرعونی جو چیزیں چھوڑ کے گئے تھے، وہ ورثے کے طور پر بنی اسرائیل کو مل گئیں، کیونکہ یہ مفہوم تب صحیح ہوگا اگر یہ تاریخی طور پر ثابت ہوجائے کہ فرعونیوں کے غرق ہوجانے کے بعد اسرائیلی واپس مصر میں آ گئے تھے اور یہ ساری کی ساری چیزیں اسرائیلیوں نے آ کے سنبھال لیں، پھر یہ بات صحیح ہوگی کہ فرعونیوں کی چھوڑی ہوئی چیزیں اسرائیلیوں کو مل گئیں۔ لیکن تاریخی طور پر یہ بات ثابت نہیں ہے کہ اسرائیلی دوبارہ مصر میں گئے ہوں، اور جا کے مصر کی حکومت پہ قابض ہو گئے ہوں، بلکہ وہاں سے نکل کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں ان کو حکم ہوا تھا کہ جہاد کریں اور فلسطین کے علاقے پر قبضہ کریں، لیکن انہوں نے جہاد میں سستی اور کاہلی کی تھی اور انکار کر دیا تھا کہ ہم تو ان جبار لوگوں سے لڑنے کے لئے تیار نہیں: فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (سورۂ مائدہ: ۲۴) جیسے آپ کے سامنے سورۂ مائدہ میں یہ تفصیل گزری تھی، اس کی سزا میں اللہ تعالیٰ نے ان کو چالیس سال کے لئے صحرائے سینا میں محصور کر دیا، یہ صحرائے سینا جو آج کل بھی مصر کے قبضے میں ہے، جو اسرائیلیوں سے اب آزاد کروایا ہے، چھڑوایا ہے۔ تو یہی صحرائے سینا جس میں اسرائیلی چالیس سال تک دھکے کھاتے پھرتے رہے، پھر یوشع بن نون کی قیادت میں جہاد کیا، اور شام اور فلسطین کا علاقہ ان کے قبضے میں آیا، تو شام اور فلسطین کا علاقہ بھی چشموں والا علاقہ ہے، باغات کا علاقہ ہے، ہر قسم کی خوش حالی وہاں میسر ہوئی۔ تو اَوْرَثْنٰهَا کا معنی یہ ہوگا کہ ان نعمتوں سے مصریوں کو محروم کر دیا، اور یہ نعمتیں بنی اسرائیل کو دے دیں یعنی دوسرے علاقے میں، شام کے علاقے میں، فلسطین کے علاقے میں، یہ مصر والی ان کی متروکہ نعمتیں مراد نہیں ہیں۔ ہم نے ان نعمتوں کا وارث بنا دیا، اُن کو محروم کر دیا اور ان نعمتوں کا وارث ان کو بنا دیا۔ چونکہ شام اور فلسطین کا علاقہ جب فتح ہوگیا تو اسرائیلی وہاں آباد ہو گئے، تو پھر یہ جنّات اور عیون، اس قسم کی نعمتیں وہاں ان کو وافر مقدار میں مل گئیں۔

''فرعونی'' اور ''بنی اسرائیلیوں'' کا تقابل

فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِیْنَ: یہ تو درمیان میں ان کے انجام کی طرف اشارہ کر دیا تھا، آگے وہی واقعہ کا تتمہ ہے، فَاَتْبَعُوْهُمْ: فرعونیوں نے ان کا پیچھا کیا، مُّشْرِقِیْنَ: مشرقین اشراق، شَرَقَ: سورج کا نکلنا، تو اَشْرَقَ کا معنی سورج نکلنے کے وقت میں داخل ہونا، روشنی میں داخل ہونا، یہ بھی اس کا مفہوم ہے۔ تو ''مُّشْرِقِیْنَ'' کا مطلب یہ ہوگا اس حال میں کہ وہ لوگ روشنی کے وقت میں داخل ہونے والے تھے، یعنی سورج نکل رہا تھا، جب یہ فرعونی اسرائیلیوں کے پیچھے پہنچ گئے، وہ آگے آگے سفر کرتے جا رہے تھے اور یہ فوجوں کی فوجیں اکٹھے ہو کے چلے، چونکہ کوئی ایک دن کا واقعہ تو تھا نہیں، پتا نہیں کتنی منزلیں کرتے ہوئے موسیٰ علیہ السلام پہنچے تھے اس سمندر تک جس کو عبور کرنا تھا، اور اسی طرح سے یہ فرعون بھی اپنے ساز و سامان کے ساتھ، اپنی فوجوں کے ساتھ ان کے پیچھے لگا، آخر راتوں رات چلتے چلتے، وہی رات مراد نہیں، کئی راتیں جس طرح سے سفر میں لگتی ہیں، تو ایک رات سفر کرنے کے بعد جب سورج نکلنے والا تھا تو اس وقت یہ فرعونی ان کے پیچھے پہنچ گئے، فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ: تَرَآءَ یہ باب تفاعل ہے ایک دوسرے کے سامنے ہوجانا۔ رَاٰی: اس نے دیکھا۔ تَرَاءٰی یہ تَقَابَلَ کی طرح باب تفاعل آ گیا جس میں اشتراک اور تشارک ہوا کرتا ہے۔ جب ان دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، دونوں جماعتیں ایک دوسرے کے سامنے ہوگئیں۔

آگے موجیں، پیچھے فوجیں

قَالَ اَصۡحٰبُ مُوۡسٰۤی اِنَّا لَمُدۡرَکُوۡنَ: فرعونیوں پر جب اسرائیلیوں کی نظر پڑی، دونوں جماعتیں جب ایک دوسرے کے سامنے آگئیں، یعنی اسرائیلیوں نے پیچھے مڑ کے دیکھا تو فرعونیوں کی فوجیں نظر آ رہی تھیں، اور فرعونیوں کو (دِن کی روشنی چونکہ ہو رہی تھی تو اسرائیلی جاتے ہوئے نظر آ رہے تھے) پیچھا کرتے کرتے سورج نکلنے کے وقت یعنی صبح کے وقت وہ وہاں پہنچ گئے، تو دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا، دیکھنے کے بعد اسرائیلی گھبرا گئے، کیونکہ موقع ایسا تھا کہ آگے سمندر بھی آ گیا تھا، جیسے ہمارے مرحوم مولانا غلام اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کہا کرتے تھے کہ ''آگے سمندر کی موجیں، پیچھے فرعون کی فوجیں'' وہی بات ہوگئی کہ آگے ان کو موجیں مارتا سمندر نظر آ رہا ہے، اور پیچھے فرعون کی فوجیں نظر آ رہی ہیں، تو اب یہ گھبرا گئے، کہنے لگے: اِنَّا لَمُدۡرَکُوۡنَ، موسیٰ کے ساتھیوں نے کہا کہ بے شک ہم تو پکڑے گئے، یعنی اب آگے بھاگنے کا راستہ بھی کوئی نہیں، اور پیچھے فوجیں پہنچ گئیں، اب کدھر جائیں گے؟ یہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے گھبرا کے کہا کہ بے شک ہم البتہ پکڑ لیے گئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے قوم کو تسلی

اور اللہ کے نبی کو اللہ کے وعدے کے اُوپر کتنا پختہ یقین ہوتا ہے، وہ یہی لفظ ''کَلَّا'' سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ چاہے آگے سمندر ہے، چاہے پیچھے فرعون کی فوجیں اوپر چڑھ آئیں، لیکن کَلَّا: ہرگز ہم نہیں پکڑے جائیں گے، یہ ہم پہ قابو نہیں پا سکتے، چونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ تم ان کو لے کے چلو اور آگے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کامیابی کا وعدہ تھا، تو یہ فرعونی کیسے پکڑ سکتے ہیں؟ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی اسی پختگی کے ساتھ کہا: کَلَّا! ہرگز نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا کہ فرعونی ہمیں پکڑ لیں! اِنَّ مَعِیَ رَبِّیۡ سَیَہۡدِیۡنِ: بے شک میرے ساتھ میرا رَبّ ہے، عنقریب مجھے وہ راستہ دکھائے گا، ھَدٰی یَھۡدِیۡ راستہ دکھانے کے معنی میں ہے، مجھے ہدایت دے گا یعنی مجھے میری منزل تک پہنچائے گا، اور یہاں ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چاہے اپنے اکیلے کا کیا ہے، لیکن مقصود ہے قوم سمیت۔ کیونکہ موسیٰ علیہ السلام اکیلے نہیں جانا چاہتے تھے، نہ اکیلے کسی منزل پہ پہنچنا چاہتے تھے، بلکہ اپنی قوم کو ساتھ لے جانا چاہتے تھے، قائد اور راہنما چونکہ آپ تھے، تو نسبت آپ کی طرف ہوئی کہ اللہ میرے ساتھ ہے، مجھے ضرور منزل تک پہنچائے گا، میں اپنی قوم کو نجات دلاؤں گا، اور اپنی قوم کو لے کر ضرور کسی منزل پہ پہنچوں گا، اللہ کا میرے ساتھ وعدہ ہے۔

''مَعِیَ رَبِّیۡ'' میں قوم کی نفی مقصود نہیں...... غارِ ثور کا واقعہ اور غار کا محلِ وقوع

یہ بات ویسی ہے جیسا کہ ہجرت کی رات میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ دونوں غار میں جا کے بیٹھ گئے تھے، اِذۡ ھُمَا فِی الۡغَارِ (سورۂ توبہ: ۴۰) جو قرآن میں ذکر کیا ہے، اور پیچھے سے مشرک غار کے دہانے تک پہنچ گئے تھے، اب مشرک آس پاس کھڑے ہوئے باتیں کر رہے تھے، تو غار کا جو منہ ہے اس میں سے اُن کے قدم نظر آ رہے تھے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

کو... غار کی بناوٹ ہی کچھ ایسی ہے کہ وہ چٹان اس طرح سے ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت کے تحت، یوں جیسے کسی نے تراش کے رکھی ہو، بہت بڑی چٹان ہے اتنی بڑی، اتنی اونچی جیسے تمبو (شامیانہ) لگا ہوا ہوتا ہے، اُوپر سے اس کی ہیئت ایسی ہے، ایک طرف سے اندر کو گھسنے کا راستہ ہے، اور دوسری طرف پہاڑوں کے اوپر دوسری چٹان آئی ہوئی ہے، تو اتنا سا کچھ فصل ہے کہ وہاں اس طرف اگر پہاڑ پہ کوئی انسان کھڑا ہو تو اِدھر بیٹھنے والے کو اس کے قدم نظر آتے ہیں، اور اندر میں یہ حیثیت کہ جس طرح سے میں بیٹھا ہوں، یہ نیچی ہے اِدھر کی جانب، اور آگے کو پتھر سا پڑا ہوا ہے وہ اونچا ہے، تو جدھر نیچی جانب ہے وہاں انسان آسانی کے ساتھ بیٹھ سکتا ہے، اور اس کی اُونچائی پہ جا کے اُوپر جو آتا ہے تو پھر ذرا جھک کے بیٹھنا پڑتا ہے، پوری طرح سے انسان سر اٹھا کے بیٹھ نہیں سکتا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہاں سے راستہ تھا اندر گھسنے کا، یہاں سے اندر گھسے اور گھستے ہی اِدھر کو جو نچلی جانب تھی وہاں بیٹھ گئے، اور اِدھر کی جانب میں اس اُوپر والی چٹان میں اور نیچے والے پہاڑ میں کچھ فصل ہے، جس میں سے انسان اندر آ نہیں سکتا، کوئی ایک بالشت ہوگا یا اس سے ایک آدھ انچ زائد، جیسے پتھر پہ پتھر رکھا ہو تو اِدھر سے اور اُدھر سے ساتھ جڑا ہوا ہے، اور درمیان میں اتنا سا فصل ہے، یعنی اگر ہم چاہتے تو اس میں سے اندر نہیں آ سکتے تھے، لیکن ایک ملائیشیا کا تھا یا انڈونیشیا کا آدمی تھا وہ بہت چھوٹے چھوٹے قد کے اور پتلے پتلے سے ہیں تو ہم اندر بیٹھے ہوئے تھے، تو وہ اس چٹان کے اُوپر لیٹ کے اُس طرف سے بھی اندر گھس آیا، چونکہ قد اُس کا چھوٹا تھا اور ہلکا پھلکا تھا، اس علاقے کے لوگ ایسے ہی ہلکے پھلکے سے ہوتے ہیں...... وہاں اگر وہ مشرک کھڑے ہوں تو یہ یہاں نیچے بیٹھے ہوئے یوں دیکھیں گے تو ان (مشرکوں) کے پاؤں نظر آئیں گے، اور وہ اگر اُدھر سے نیچے ہو کے دیکھتے تو یہ اِدھر بیٹھے ہوئے نظر آ جاتے، اس لئے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یا رسول اللہ! اگر انہوں نے اپنے قدموں کو دیکھ لیا تو ہمیں دیکھ لیں گے، تو اس وقت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر کچھ خوف اور گھبراہٹ طاری ہوئی، کیونکہ آپ کو اپنی جان کی تو فکر نہیں تھی، یہ فکر تھی کہ کہیں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی تکلیف نہ پہنچ جائے، جن کی حفاظت کے لئے اور خدمت کے لیے وہ ظاہری سبب کے طور پر ساتھ دیے ہوئے تھے، تو کہنے لگے کہ اگر انہوں نے اپنے قدموں کی طرف دیکھ لیا تو ہمیں دیکھ لیں گے...... یہ ایسی بات ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے بھی ان حالات کو دیکھ کے کہا تھا کہ اِنَّا لَمُدۡرَكُوۡنَ کہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ اب ہم پکڑے جائیں گے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا تھا کہ ایسا نہیں ہو سکتا، ہمارے ساتھ ہمارا اللہ ہے۔ حدیث شریف میں جیسے الفاظ آئے: ''مَاظَنُّكَ بِاثۡنَيۡنِ اللهُ ثَالِثُهُمَا''(۱) اے ابو بکر! تیرا ان دو کے متعلق کیا خیال ہے جن کے ساتھ تیسرا اللہ ہے؟ اور قرآنِ کریم میں بھی یہ واقعہ ذکر کیا گیا اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (سورۂ توبہ: ۴۰) اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے، یہ پکڑ نہیں سکتے، لَا تَحۡزَنۡ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا: غم نہ کر، اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ تو گویا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو جیسے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے تسلی دی تھی، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو اسی طرح سے تسلی دی، لیکن یہ جمع اور واحد کے صیغے موقع محل کے مطابق آ جایا کرتے ہیں، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے

(۱) مشکوٰۃ ص ۵۳۰ ج ۲ باب فی المعجزات کی پہلی حدیث، بخاری ج ۲ ص ۶۷۲ کتاب التفسیر، سورۂ توبہ۔

صحابہ پر اعتماد تھا اس لیے ان کو اپنے ساتھ شریک کر کے جمع کا صیغہ ارشاد فرمایا، جبکہ موسیٰ علیہ السلام کو اسرائیلی قوم پر ان کی طرف سے بار بار عہد شکنی کی وجہ سے اعتماد نہ تھا اس لیے ان کو اپنے ساتھ شریک نہیں کیا اور مفرد کا صیغہ استعمال کیا۔ لیکن نصرتِ الٰہی کے اعتبار سے جمع و مفرد کے صیغے میں کوئی فرق نہیں، اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا: وہاں حضور ﷺ نے جمع کا صیغہ بولا ہے، اور یہاں اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ۔ تو حضور ﷺ کے ساتھ ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان دونوں کے ساتھ اللہ کی مدد۔ اور یہاں موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میرے ساتھ اللہ ہے، تو جب موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اللہ ہے، تو آپ کی قوم کے ساتھ بھی ہے۔ تو اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کو جو لئے جا رہے ہیں تو نبی گویا کہ قوم کا نمائندہ ہوتا ہے، تو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اللہ کی معیت اور نصرت جو تھی تو یوں سمجھو کہ ساری قوم کے ساتھ ہی تھی۔

''فرعونیوں'' کا انجام

فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى: پھر ہم نے حکم بھیجا موسیٰ کی طرف، اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ: اَنْ یہ اَوْحَیْنَا کے اندر جو معنی ہے اس کی تفسیر کے لئے آیا ہے۔ ہم نے حکم بھیجا اور اس حکم میں ہم نے یوں کہا کہ مار تو اپنی لاٹھی کو سمندر پر۔ فَانْفَلَقَ: یہاں بھی درمیان میں لفظ محذوف ہوں گے، کہ پھر موسیٰ علیہ السلام نے وہ لاٹھی سمندر پہ ماری، فَانْفَلَقَ: پس وہ سمندر پھٹ گیا، فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ: طود کہتے ہیں پہاڑ کو، پس ہو گیا ہر ٹکڑا بڑے پہاڑ کی طرح۔ دیکھئے! مثال کے طور پر پانی اگر اتنا گہرا ہو جیسے ہماری چھت اور یہ زمین ہے، تو جب درمیان سے پھٹ کر یوں راستہ بن جائے گا، تو اِدھر بھی پانی کھڑا ہوا یوں نظر آتا تھا جیسے پہاڑ ہے، اور اُدھر بھی یوں پانی کھڑا نظر آتا تھا جیسے پہاڑ ہے، اور درمیان میں راستہ بن گیا، جب درمیان میں راستہ بن گیا تو موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر اس سڑک پر سے چلتے ہوئے دوسرے کنارے پہ پہنچ گئے، اور ان کا دوسرے کنارے پہ پہنچنا تھا کہ پیچھے سے فرعون بھی آ گیا، اس نے جب دیکھا کہ راستہ بنا ہوا ہے، وہ تو چونکہ پیچھے لگا ہوا تھا دشمن کو پکڑنے کے لئے، اس نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ، اسی طرح سے اپنی قوم کو لے کے وہ بھی داخل ہو گیا، اِدھر اسرائیلی سارے کے سارے نکل گئے، اُدھر فرعونی سارے کے سارے داخل ہو گئے، جس وقت فرعونی سارے کے سارے داخل ہو گئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزے کے طور پر اللہ کی رحمت سے جو راستہ بنا تھا، وہ ختم ہو گیا، اور یہ پانی اور یہ پانی دونوں آپس میں مل گئے، جب آپس میں مل گئے تو فرعونی سارے کے سارے ڈوب گئے۔ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ: پس ہو گیا ہر ٹکڑا بڑے پہاڑ کی طرح۔ وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ: ہم نے قریب کر دیا وہاں دوسروں کو بھی۔ ان دوسروں سے مراد فرعون اور فرعون کے ساتھی ہیں۔ وَاَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ: اور ہم نے نجات دی موسیٰ کو اور ان کے ساتھیوں کو سب کو، سب کو ہم نے نجات دی، ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ: پھر ہم نے دوسروں کو غرق کر دیا، اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً: بے شک اس واقعہ میں البتہ نشانی ہے، سوچنے والے سوچ سکتے ہیں، عبرت حاصل کرنے والے عبرت حاصل کر سکتے ہیں۔ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ: اور ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں۔ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ: بے شک تیرا رب البتہ زبردست ہے رحم کرنے والا ہے۔ یہ آیت پہلے بھی گزر گئی، اور آئندہ بھی ہر واقعے کے آخر میں آئے گی۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ ۞ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ۞ قَالُوْا

ابراہیم کا واقعہ ان پر پڑھیے (۶۹) جب کہا ابراہیم نے اپنے باپ کو اور اپنی قوم کو: کیا ہیں یہ چیزیں جن کی تم پوجا کرتے ہو؟ (۷۰) انہوں نے کہا

نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ ۞ قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ۞

کہ ہم پُوجا کرتے ہیں بتوں کی پس ہیں ہم ان کے لئے جم کے بیٹھنے والے (۷۱) ابراہیم نے کہا: کیا یہ تمہاری باتیں سنتے ہیں؟ جس وقت تم ان کو پکارتے ہو (۷۲)

اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ۞ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ۞

یا تمہیں کوئی یہ نفع پہنچاتے ہیں یا کوئی نقصان دیتے ہیں؟ (۷۳) وہ کہنے لگے کہ پایا ہم نے اپنے آباء کو وہ ایسے ہی کرتے تھے (۷۴)

قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۞ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ۞ فَاِنَّهُمْ

ابراہیم نے کہا: بھلا بتلاؤ تم، جن چیزوں کی عبادت کرتے ہو (۷۵) تم اور تمہارے پُرانے آباؤ اجداد (۷۶) پس وہ سارے کے سارے

عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۞ الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ۞ وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ

میرے دشمن ہیں سوائے رَبّ العالمین کے (۷۷) جس نے مجھے پیدا کیا پس وہی مجھے راہ دکھاتا ہے (۷۸) اور جو مجھے کھانا کھلاتا ہے

وَيَسْقِيْنِ ۞ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۞ وَالَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ۞

اور جو مجھے پانی پلاتا ہے (۷۹) اور جس وقت میں بیمار ہو جاتا ہوں پس وہی مجھے شفا دیتا ہے (۸۰) اور جو مجھے مارے گا پھر وہ مجھے زندہ کرے گا (۸۱)

وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓئَتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ۞ رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّ

اور جس سے میں اُمید رکھتا ہوں کہ وہ بخشے گا میرے لیے میری غلطی جزا کے دِن (۸۲) اے میرے رَبّ! مجھے حکمت دے اور

اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۞ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۞ وَاجْعَلْنِيْ

ملادے مجھے اچھے لوگوں کے ساتھ (۸۳) اور کردے میرے لئے اچھا ذکر پچھلوں میں (۸۴) اور کردے مجھے

مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ۞ وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ۞ وَلَا

خوش حالی کے باغ کے ورثاء میں سے (۸۵) اور بخش دے میرے باپ کو بے شک وہ بھٹکے ہوئے لوگوں میں سے تھا (۸۶) اور نہ

تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ۞ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۞ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ

رُسوا کرنا مجھے جس دِن کہ لوگ اُٹھائے جائیں گے (۸۷) جس دن نفع نہیں دے گا مال اور نہ بیٹے (۸۸) ہاں جو شخص اللہ کے پاس

بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿٨٩﴾ وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿٩٠﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ ﴿٩١﴾

قلبِ سلیم لے کے آیا ﴿٨٩﴾ جنت قریب کردی جائے گی متقین کے لئے ﴿٩٠﴾ اور ظاہر کردی جائے گی جہنم گمراہوں کے لئے ﴿٩١﴾

وَقِيْلَ لَهُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿٩٢﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ

اور ان گمراہوں سے کہا جائے گا کہاں ہیں وہ چیزیں جن کو تم پوجا کرتے تھے ﴿٩٢﴾ اللہ کو چھوڑ کر، کیا وہ تمہاری مدد کریں گی، یا

يَنْتَصِرُوْنَ ﴿٩٣﴾ فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَالْغَاوٗنَ ﴿٩٤﴾ وَجُنُوْدُ اِبْلِيْسَ اَجْمَعُوْنَ ﴿٩٥﴾

وہ اپنے آپ کو بچالیں گی؟ ﴿٩٣﴾ منہ کے بل گرادیے جائیں گے اس جہنم میں وہ بھی اور گمراہ ہونے والے بھی ﴿٩٤﴾ اور ابلیس کے سارے لشکر ﴿٩٥﴾

قَالُوْا وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ﴿٩٦﴾ تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٩٧﴾ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ

کہیں گے وہ لوگ اس حال میں کہ آپس میں جھگڑتے ہوں گے ﴿٩٦﴾ اللہ کی قسم! بے شک ہم صریح گمراہی میں تھے ﴿٩٧﴾ جبکہ ہم تمہیں

بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٩٨﴾ وَمَاۤ اَضَلَّنَاۤ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٩٩﴾ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ﴿١٠٠﴾ وَلَا

رَبّ العالمین کے برابر ٹھہراتے تھے ﴿٩٨﴾ نہیں گمراہ کیا ہمیں مگر مجرم لوگوں نے ﴿٩٩﴾ نہیں ہے ہمارے لئے کوئی سفارش کرنے والا ﴿١٠٠﴾ اور نہ

صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ﴿١٠١﴾ فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٢﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

کوئی گرم جوش دوست ﴿١٠١﴾ کاش! کہ ہمارے لئے لوٹنا ہوتو ہم ہوجائیں ایمان لانے والوں میں سے ﴿١٠٢﴾ بے شک اس میں

لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٣﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿١٠٤﴾

البتہ نشانی ہے اور ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں ﴿١٠٣﴾ بے شک تیرا رَبّ البتہ زبردست ہے رحم کرنے والا ہے ﴿١٠٤﴾

تفسیر

ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ: "نبأ" واقعے کو کہتے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ ان پر تلاوت کیجئے، پڑھئے۔ اس میں بھی وہی رَدِّ شرک اور توحید اور اثباتِ معاد کا مضمون ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف چونکہ یہ لوگ اپنی نسبت بھی رکھتے تھے، اس لئے یہ واقعہ زیادہ مؤثر ہوسکتا ہے۔ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ: یہ واقعہ آپ کے سامنے سورۂ مریم میں اور دوسری آیات میں گزر گیا۔ قابلِ ذکر ہے وہ وقت جب کہا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو اور اپنی قوم کو: مَا تَعْبُدُوْنَ، یہ استفہام تحقیر کے لئے ہے، جیسے سورۂ انبیاء (آیت: ۵۲)

میں لفظ آیا تھا مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ: کیا ہیں یہ مورتیاں جن کے لئے تم جمے بیٹھے ہو؟، یہاں کوئی چیز پوچھنی مقصود نہیں ہے، یہ کیا چیز ہے جو تم لیے پھر رہے ہو، مطلب ہے کہ یہ کوئی قابل قدر چیز نہیں ہے۔ اس لئے وہاں بیان القرآن سے ترجمہ نقل کیا تھا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمہ کیا ''یہ کیا واہیات مورتیاں ہیں جن کے لئے تم جمے بیٹھے ہو؟'' ''واہیات'' کا لفظ اسی تحقیر کو ظاہر کرنے کے لئے ہے۔ تو یہاں بھی استفہام پوچھنے کے لئے نہیں بلکہ اِستخفاف اور تحقیر کے لئے ہے، کہ کیا ہیں یہ چیزیں جن کی تم پُوجا کرتے ہو؟ یعنی یہ کوئی پُوجنے کے قابل ہیں؟ ایسی نکمّی چیزیں جن کے تم پیچھے لگے ہو؟ قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا: اس جواب کا حاصل بھی یہ نہیں کہ انہوں نے نرمی سے بات کی ہوگی، بلکہ جس وقت دونوں جانبوں میں ضد ہو جایا کرتی ہے، ایک شخص کسی پہ نفرت کا اظہار کرتا ہے، تو دوسرا اُتنی پختگی کے ساتھ اس پہ اپنی اِستقامت ظاہر کرتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم پُوجا کرتے ہیں بتوں کی۔ فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ: پس ہیں ہم ان کے لئے جم کے بیٹھنے والے، ظَلَّ کہتے ہیں کسی کام کو دِن کے وقت کرنا۔ ظَلَّ زَيْدٌ رَاكِبًا یہ ''نحو'' کی کتابوں میں جو آپ پڑھا کرتے ہیں، زید دِن کے وقت سوار ہونے والا ہو گیا۔ جس کا حاصل ترجمہ ہوا کرتا ہے کہ زید نے دِن کے وقت سواری کی، فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ یہ چودھویں پارے میں آپ کے سامنے لفظ آئے تھے (سورۂ حجر: ۱۴)، وہاں ترجمہ یہی کیا گیا تھا کہ پھر وہ دِن دیہاڑے آسمان میں چڑھنے لگ جائیں۔ تو ظَلَّ کسی کام کے دِن کے وقت ہونے کے لئے بولا جاتا ہے۔ تو فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ، کا مطلب یہ ہے کہ ہم سارا دِن ان کے لئے جم کے بیٹھے رہتے ہیں، یعنی تُو ان سے نفرت کرتو کر، ٹھیک ہے ہم بتوں کو پُوجتے ہیں، اور سارا دِن ان کے لئے جم کے بیٹھتے ہیں، تیرے نفرت کرنے کی وجہ سے یا تیرے انکار کرنے کی وجہ سے ہم نے ان سے تعلق نہ توڑا ہے، نہ توڑیں گے، ہم ان کے لئے سارا سارا دِن جم کے بیٹھیں گے، یہ گویا کہ قوم کا آگے سے وہی شدت کے ساتھ ضد کا جواب ہے، ان لفظوں کی نوعیت یہی ہے، یہ کوئی سرسری گفتگو نہیں۔

سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کا قوم سے سوال اور قوم کا جواب

قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ: ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ کیا یہ تمہاری باتیں سنتے ہیں؟ جس وقت تم ان کو پکارتے ہو۔ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ یا تمہیں کوئی یہ نفع پہنچاتے ہیں؟ یا کوئی نقصان دیتے ہیں؟ ان کو کوئی نفع نقصان کا اختیار ہے؟ اِلٰہ تو وہ ہونا چاہیے، عبادت تو اس کی کرنی چاہیے، ماتھا تو اس کے سامنے ٹیکنا چاہیے، اپنے تذلّل کا اظہار تو وہاں کرنا چاہیے جس کو کم از کم علم اور قدرت تو ہو۔ کیا جن کے سامنے تم جھکتے ہو، اور ان کی عبادت کرتے ہو، ان کو کوئی علم اور قدرت ہے؟ یہ تمہاری بات سنتے ہیں؟ ان کو پتا چل جاتا ہے؟ کہ تم کیا کہتے ہو، اور ان کو پتا ہے؟ کہ تمہیں کس چیز کی ضرورت ہے، اور کیا نفع پہنچانے پر اور نقصان دینے پر قدرت رکھتے ہیں؟ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک بہت ہی واضح سا سوال ہے۔ قَالُوْا: وہ کہنے لگے کہ ہمیں نہیں پتا، قدرت رکھتے ہیں کہ نہیں رکھتے، سنتے ہیں کہ نہیں سنتے، ہم نے تو اپنے آباء کو ایسے کرتے دیکھا ہے، اور ایسے ہی ہم کرتے رہیں گے۔ یہی ہے وہ ضد کی انتہاء، بَلْ کا مطلب ہے اِضراب یعنی ہم نہیں جانتے کہ سنتے ہیں کہ نہیں سنتے، اور نفع نقصان کی قدرت رکھتے ہیں کہ نہیں رکھتے، بلکہ ہم نے تو اپنے آباء کو ایسے کرتے ہوئے پایا۔ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا: پایا ہم نے اپنے آباء کو، كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ: وہ ایسے ہی کرتے تھے۔

اللہ کے ساتھ بندے کا تعلق ایسا ہونا چاہیے

قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ: ابراہیم علیہ السلام نے کہا: بھلا بتلاؤ تم (یہ اس کا حاصل ترجمہ ہوتا ہے محاورے کے مطابق، یا: بھلا دیکھو تم۔ لفظی ترجمہ یوں بنتا ہے کہ کیا پھر دیکھا تم نے؟ جیسے ہم بھی گفتگو کرتے کرتے کہتے ہیں کہ دیکھو جی! بات ایسے ہے۔ یہ محاورۃً اَفَرَءَيْتُمْ کا لفظ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے، کیا پھر دیکھا تم نے؟ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ، جن چیزوں کی تم عبادت کرتے ہو اور تمہارے آباء بھی، اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ: تمہارے پُرانے آباء واجداد، فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ: پس وہ سارے کے سارے میرے دشمن ہیں، میں ان کو اپنا دوست نہیں سمجھتا، یہ میرے لئے باعث نقصان ہیں، اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ: سوائے رَبّ العالمین کے، میرا تعلق دوستی کا محبت کا رَبّ العالمین کے ساتھ ہے۔ الَّذِيْ خَلَقَنِيْ: جس کی اتنی قدرت اور اتنے انعامات ہیں۔ جس نے مجھے پیدا کیا فَهُوَ يَهْدِيْنِ: پس وہی مجھے ہدایت دیتا ہے میری مصلحتوں کی طرف، عقل سمجھ فطرت کے ذریعے سے میری مصلحت کے طریقے بتاتا ہے۔ پس وہی مجھے راہ دکھاتا ہے۔ وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ: اور جو مجھے کھانا کھلاتا ہے، وَيَسْقِيْنِ: اور جو مجھے پانی پلاتا ہے، وَاِذَا مَرِضْتُ: اور جس وقت میں بیمار ہوجاتا ہوں، فَهُوَ يَشْفِيْنِ: پس وہی مجھے شفا دیتا ہے۔ کھانے پینے کے لئے دینا بھی اسی کا کام، اور بیماروں کو شفا دینا بھی اسی کا کام۔ وَالَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ: اور جو مجھے مارے گا، ثُمَّ يُحْيِيْنِ: پھر وہ مجھے زندہ کرے گا۔ موت وحیات بھی اسی کے ہاتھ۔ وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓئَتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ: اور رَبّ العالمین وہ کہ میں اُمید رکھتا ہوں کہ وہ مجھے بخش دے گا میری غلطی، میری غلطیاں بخش دے گا جزا کے دِن، اسی سے مجھے مغفرت کی اُمید ہے کہ جب میں اس کے سامنے جاؤں گا، تو میری خطا کو وہ معاف کردے گا۔ وہ رَبّ العالمین کہ میں اُمید رکھتا ہوں کہ بخشے گا میرے لیے میری خطیہ، میری غلطی، میری تقصیر، جزا کے دِن۔ اب یہاں تک جس وقت بات پہنچی تو گفتگو کرتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا رجحان اللہ تعالیٰ کی مناجات کی طرف ہوگیا، اور اس مناجات کے ضمن میں بھی قوم کو سمجھانا مقصود ہے، اللہ تعالیٰ کو خطاب کرکے جو دُعا کر رہے ہیں اس دُعا میں بھی قوم کو سمجھانا مقصود ہے، کہ اللہ کے ساتھ بندے کے تعلق ایسا ہونا چاہیے، اور اللہ ہی ہے جو دنیا وآخرت میں انسان کی حاجت روائی کرتا ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کی دُعا اور اس کے ثمرات

اے میرے رَبّ! هَبْ لِيْ حُكْمًا: حکم سے حکمت مراد ہے، اور حکمت کا اصل مفہوم ہوا کرتا ہے علم وعمل کا کمال۔ اے میرے رب! مجھے علم وعمل کا کمال عطا فرما، مجھے حکمت اور دانش مندی دے۔ اور ملادے مجھے اچھے لوگوں کے ساتھ، یعنی دنیا اور آخرت میں مجھے اچھے لوگوں کی رفاقت نصیب فرما۔ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ: لسان زبان کو کہتے ہیں اور یہاں زبان بول کے ذکر مراد ہے، اور لسانِ صدق کے اندر اضافت موصوف کی صفت کی طرف ہے۔ جس طرح سے قَدَمَ صِدْقٍ کی ترکیب سورۂ یونس کی ابتدا میں گزری تھی۔ اور جیسے مَقْعَدِ صِدْقٍ کی ترکیب سورۂ قمر کے آخر میں آئے گی۔ اور اسی طرح سے: مُدْخَلَ صِدْقٍ اور مُخْرَجَ صِدْقٍ یہ ترکیب آپ کے سامنے سورۂ بنی اسرائیل (آیت ۸۰) میں گزری ہے۔ یہ ہے لِسَانَ صِدْقٍ۔ کردے میرے لئے اچھا ذکر پچھلوں میں، یعنی مجھے ایسے حالات نصیب فرما کہ پچھلے آنے والے میرا اچھا تذکرہ کریں۔ دنیا میں بھی اللہ

عزت دے، آخرت میں بھی اللہ عزت دے۔ میرے حالات اتنے اچھے کردے کہ پیچھے آنے والے میرا اچھا ذکر کریں، اور میری باتوں کو یاد کر کے ان کے اُوپر عمل کریں، تا کہ پچھلے آنے والے جب عمل کریں گے، تو مجھے بھی اس کا ثواب پہنچے گا...... تو اس قسم کی تمنا رکھنا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دین کا مقتدیٰ بنادے، ہماری باتوں کے ساتھ موجودہ لوگوں کو بھی ہدایت ہو، اور پچھلے لوگوں کو بھی ہدایت ہو، یہ تمنا اچھی تمنا ہے، کیونکہ یہ بھی دین کی ایک اشاعت ہے، اور اپنے لئے ثواب ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ دُعا جس طرح سے قبول فرمائی وہ آپ کے سامنے ہی ہے کہ بعد میں آنے والے سارے کے سارے انبیاء کرام علیہم السلام ملتِ ابراہیمی پر تھے، مشرک بھی ابراہیم علیہ السلام کو اپنا مقتدا سمجھتے تھے، اور مسلمان بھی مقتدا سمجھتے تھے، بلکہ غالباً میں نے آپ کی خدمت میں پہلے عرض کیا تھا کہ مولانا سرفراز صاحب صفدر زید مجدہم [1] نے ''گلدستۂ توحید'' کتاب جو لکھی ہے، اس میں (ص ۶۴ پر) لکھا ہے کہ ہندوؤں کا جو بڑا بت ہے جس کو ''برہما'' کہتے ہیں، جس کی یہ پُوجا کرتے ہیں، جس بُت کی طرف نسبت کی بنا پر ان کا مذہبی طبقہ ''برہمن'' کہلاتا ہے۔ ''برہمن'' ہندوؤں کا مذہبی طبقہ ہے، جو ہندوؤں کی کتابیں پڑھتا ہے اور مذہبی راہنمائی کرتا ہے، اس کو ''برہمن'' کہتے ہیں، اور ''برہمن''، ''برہما'' کی طرف نسبت کی بنا پر ہے، ان کا بڑا بت یہی ہے، تو وہ لکھتے ہیں کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ بت بھی حضرت ابراہیم کے نام پر ہے، ابراہیم کا نام بدل کر ان کی زبان میں ''برہما'' ہو گیا۔ جس طرح سے بعض الفاظ بگڑتے بنتے رہتے ہیں، کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے، اسی طرح سے ''برہما'' کا لفظ ابراہیم سے ہی لیا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ بڑی بڑی قومیں چاہے وہ مشرکین کی تھیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا مقتدیٰ ہی سمجھتے رہے، اللہ تعالیٰ نے اس طرح سے پچھلوں میں ان کا ذکرِ خیر باقی رکھا۔ کردے میرے لئے اچھا ذکر پچھلوں میں۔ وَاجْعَلْنِیْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِیْمِ: نعیم خوش حالی کو کہتے ہیں، جَنَّةِ النَّعِیْمِ: خوش حالی کا باغ۔ مجھے خوش حالی کے باغ۔ کے ورثاء میں سے کردے، یعنی مجھے جنت کا وارث بنا، آخرت میں مجھے جنت دے۔

ابراہیم علیہ السلام کا اپنے والد کے لئے دُعائے مغفرت کرنا اور اس کی حقیقت

وَاغْفِرْ لِاَبِیْۤ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّیْنَ: اور بخش دے میرے باپ کو، بے شک وہ بھٹکے ہوئے لوگوں میں سے تھا۔ اب یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لئے مغفرت کی دُعا کی۔ اگر تو زندگی میں کی تو پھر تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو ہدایت دے، اور ہدایت دے کے مغفرت کے قابل بنادے، یہ بھٹکا ہوا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام وعدہ کر آئے تھے کہ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّیْ (سورۂ مریم: ۴۷) یہ گویا کہ اسی وعدے کا ایفاء ہے، میرے باپ کو بخش دے وہ ''ضالین'' میں سے ہے، یعنی اس کو ایمان کی توفیق دے، ایمان کی توفیق دے کے اس کے لئے بخشش کا سامان کردے، وہ بھٹکے ہوئے لوگوں میں سے ہے...... اور اگر اس کی وفات کے بعد یہ دُعا مانگی تھی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے یہ حقیقت نمایاں نہیں ہوئی تھی کہ مشرک کے لیے دُعا کرنا

[1] شیخ محمد سرفراز خان صاحب صفدر رحمۃ اللہ علیہ اپنے دور کے امام اہل سنت والجماعت تھے، آپ کا فیض پوری دُنیا میں پھیلا، معتبر مفسر، محدث، فقیہ، محقق اور کتب کثیرہ کے مصنف تھے۔ ولادت: ۱۹۱۴ء۔ وفات: مئی ۲۰۰۹ء بمطابق جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ

جائز نہیں، اور میرے باپ کا خاتمہ شرک کی حالت میں ہوگیا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بات ان کے سامنے واضح کردی گئی تو پھر وہ لاتعلق ہوگئے، پھر انہوں نے دُعا چھوڑ دی، جیسا کہ آپ کے سامنے غالباً سورۂ براءت کے اندر آیا تھا: وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ (آیت: ۱۱۴) تو ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ کے لئے اِستغفار کرتے رہے تو وہ اس وعدے کی وجہ سے تھا جو وہ اپنے باپ سے کر آئے تھے، اور جب ان کے سامنے یہ بات واضح ہوگئی کہ وہ تو اللہ کا دشمن ہے یعنی اس کا خاتمہ کُفر پہ ہوا، اس کو ایمان نصیب نہیں ہوا، مرگیا، اب اس کے لیے دُعا نہیں کرنی چاہیے، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس سے لاتعلقی کا اعلان کردیا، اس کے بعد اس کے لئے دُعا نہیں کی۔

مشرک کے لئے دُعائے مغفرت جائز نہیں

اور مسئلہ واضح کردیا گیا مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْۤا اُولِيْ قُرْبٰى (سورۂ توبہ: ۱۱۳) مؤمنوں کے لئے مناسب ہی نہیں کہ مشرکین کے لئے استغفار کریں، اس لئے اگر کسی کا کوئی رشتہ دار کُفر کی حالت میں مرگیا ہو، شرک کی حالت میں مرگیا ہو، تو اس کے لئے اِستغفار کی دُعا درست نہیں ہے، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جو اِستغفار تھا، وہ اسی وجہ سے تھا، جب ان کے سامنے حقیقت نمایاں ہوگئی، تو پھر انہوں نے لاتعلقی کا اظہار کردیا۔

ابراہیم علیہ السلام کے والد کی قیامت کے روز حالت

وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ: اور اے میرے پروردگار! مجھے رُسوا نہ کرنا جس دِن کہ لوگ اُٹھائے جائیں گے۔ اس کا تعلق بھی ماقبل کے جملے کے ساتھ یوں نمایاں کیا جاسکتا ہے، کہ اے اللہ! میرے باپ کو بخش دے، وہ بھٹکے ہوؤں میں سے تھا، اور میرے باپ کو عذاب دے کے معذّب کرکے جہنّم میں پھینک کے مجھے رُسوا نہ کرنا۔ کیونکہ اپنے آباء اور اپنے رشتہ داروں کی اس قسم کی حالت انسان کے لئے بھی رُسوائی کا باعث بن جاتی ہے۔ تو مجھے رُسوا نہ کرنا جس دِن کہ لوگ اُٹھائے جائیں گے، بلکہ مجھے عزّت دینا، اور میرے یہ آباء، میرے یہ رشتہ دار، ان کی بھی مغفرت کردینا، چنانچہ حدیث شریف کی طرف دیکھتے ہوئے یہی معنی زیادہ راجح معلوم ہوتا ہے (آلوسی)۔ حدیث شریف میں آتا ہے، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ قیامت کے دِن ابراہیم اپنے باپ آزر کو دیکھیں گے، ملاقات ہوجائے گی، ''وَعَلٰى وَجْهِ آزَرَ قَتَرَةٌ وَغَبَرَةٌ''[1] کے الفاظ ہیں کہ اس کے اُوپر گرد و غبار، تاریکی، سیاہی جس طرح سے کافروں پہ ہوگی ویسے اس پہ ہوگی، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اسے کہیں گے کہ اے میرے اَبا! تجھے میں کہتا نہیں تھا کہ میری نافرمانی نہ کر، میری بات مان لے۔ تو آزر کہے گا کہ بیٹے! آج میں وعدہ کرتا ہوں کہ تیری نافرمانی نہیں کرنی۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ اُس وقت اِس وعدے کا کیا حاصل؟ تو پھر ابراہیم علیہ السلام اللہ کی طرف متوجہ ہوں گے، اور اللہ کے سامنے دُعا کریں گے کہ اے اللہ! تُو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تجھے رُسوا نہیں کروں گا، ''فَاَيُّ خِزْيٍ اَخْزٰى مِنْ اَبِي الْاَبْعَدِ'' یہ لفظ ہیں حدیث شریف

---

(۱) بخاری ج ۱ ص ۴۷۳ کتاب احادیث الانبیاء۔ باب قول اللہ واتخذ اللہ ابراھیم خلیلا مشکوٰۃ ج ۲ ص ۴۸۳ باب الحشر فصل اول۔

میں، کہ میرا باپ جو رحمت سے دُور ہے، اس سے بڑھ کر میری رُسوائی کیا ہوگی؟ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام قیامت کے میدان میں کہیں گے، تو اللہ تعالیٰ جواب دے گا کہ ابراہیم! میں نے جنّت کافروں پر حرام کردی ہے، کافر جنّت میں نہیں جائیں گے۔ باقی رہ گئی تیری رُسوائی کی بات (حاصل اس عبارت کا یہ ہے) تو رُسوائی دُور کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اس کو جنّت میں بھیج دیا جائے، ایسا تو ہوگا نہیں، میں نے کافروں پر جنّت کو حرام کردیا ہے۔ ہاں! ایسا ہوسکتا ہے کہ یہ پہچانا ہی نہ جائے کہ یہ ہے کون؟ اگر کسی شخص کا باپ یہاں بُری حالت میں پھر رہا ہو، اور کسی کو پتا ہے کہ یہ فلاں کا باپ ہے تو پھر تو اس کے لیے رُسوائی کی صورت بنے گی۔ اور اگر کسی کو پتا ہی نہیں کہ یہ کون ہے؟ پہچانا ہی نہ جائے، اس کو جاننے والا کوئی نہ ہو، یہ نسبت ہی معلوم نہیں کہ یہ فلاں کا باپ ہے، تو پھر اس کی رُسوائی اس کے لیے تو کوئی رُسوائی یا شرمساری کا باعث نہیں ہوتی۔ تو اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو متوجہ کریں گے کہ تیرے پاؤں کے نیچے کیا ہے؟ اور آزر کو بجو کی شکل میں مسخ کر کے بہت گندی حالت میں اس کے پاؤں سے پکڑ کے اُٹھا کے جہنّم میں پھینک دیا جائے گا...... جس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ انسانی شکل یہ باقی نہیں رہے گا، اور اس کی حالت ایسی ہوجائے گی کہ کوئی دیکھنے والا پہچان ہی نہیں سکے گا کہ یہ آزر ہے، اور اس کا ابراہیم کے ساتھ کوئی تعلق ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے نسبت اس کی یوں مخفی کردی جائے گی، جب اس طرح سے مخفی کردی جائے گی تو نہ کوئی پہچانے نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف اس کی نسبت ہو..... تو یہ بات واضح ہوگئی کہ اگر کوئی شخص ایمان کی دولت دنیا سے لے کر نہیں گیا، تو اس کا بیٹا اگر پیغمبر بھی ہو، پیغمبر چھوڑو! پیغمبروں کا باپ بھی ہو، اور بہت جلیل القدر مرتبہ رکھتا ہو، تو بھی وہ اپنے باپ کو اللہ کے عذاب سے چھڑا نہیں سکے گا، اگر باپ کے پاس ایمان کی دولت نہیں ہے، اس واقعے سے یہ حقیقت نمایاں ہوگئی، جیسا کہ آگے بھی یہ بات آرہی ہے کہ یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ...... اب بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ سے آگے اللہ کی کلام ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کلام پر گویا کہ بطور تتمے کے ہے کہ جس دِن کی رُسوائی سے حضرت ابراہیم علیہ السلام پناہ مانگ رہے ہیں کہ اے اللہ! مجھے یومِ دین کی رُسوائی سے بچانا، یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ کی رُسوائی سے بچانا، اس دِن میں یہ حالات ہوں گے...... اور اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کلام ہو اور اسی طرح سے دُعا میں شامل ہو، تو دُعا کے ضمن میں گویا کہ اپنی قوم کو یہ باتیں سنا کے ساتھ یہ تنبیہ بھی کر رہے ہیں کہ وہ دِن ایسا ہے جس کو میں یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ سے تعبیر کر رہا ہوں، کہ اس دِن نہ مال کام آئے گا نہ بیٹے کام آئیں گے۔

قیامت کے دِن مال اور اولاد کس کے کام آئے گی؟

یا پہلے قول کے مطابق اللہ تعالیٰ اس دِن کی وضاحت فرمارہے ہیں کہ وہ دِن ایسا ہے کہ نہیں نفع دے گا مال اور نہ بیٹے کسی شخص کو، مستثنیٰ متصل کے طور پر ترجمہ کیا جائے تو یوں ہوگا، مال اور بیٹے کسی شخص کو نفع نہیں دیں گے مگر اس شخص کو جو اللہ کے پاس قلب سلیم لے کے آئے، جو ایسا دل لے کر آئے جو کفر و شرک سے صاف ستھرا ہے، ایسے شخص کو تو مال اور اولاد نفع دے سکتی ہے۔ وہ کیسے؟ کہ انسان ایمان لے آیا، اس نے دنیا کے اندر رہتے ہوئے نیکی میں مال خرچ کیا تھا، یا دنیا کے اندر رہتے ہوئے اپنی اولاد

کو نیکی کے راستے پہ لگایا تھا، یہ دونوں باتیں اس کے لئے آخرت میں مفید ثابت ہو جائیں گی، جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ ولدِ صالح بھی انسان کے لیے صدقہ جاریہ ہے،[1] آپ اپنی اولاد کو نیکی سکھائیں، آپ کے والدین آپ کو نیکی سکھا رہے ہیں تو یہ ان کے لیے صدقۂ جاریہ ہے، مریں گے تو اولاد ان کے کام آئے گی جن کو وہ نیکی کے راستے پہ لگا کے گئے ہیں، اور اللہ کے راستے میں مال خرچ کر کے گئے ہیں تو آخرت میں کام آئے گا۔ تو جو پاک صاف دل لے کے اللہ کے پاس جائے اس کے لئے تو مال واولاد نافع ہوگی، اس کے علاوہ کسی دوسرے کے لئے نافع نہیں ہوگی۔ آزر کے پاس قلبِ سلیم نہیں تھا تو واقعہ یہ ہوا کہ ابراہیم جیسا صالح بیٹا بھی اس کے کام نہیں آیا۔ اور اسی طرح سے مشرک دنیا میں کتنا ہی مال خرچ کر لے یتیم پروری پر، مسکین پروری پر، خدمتِ خلق پر اور مسجدیں بنوا دے، جو چاہے کرے لیکن اگر خاتمہ ایمان پر نہیں ہوا تو یہ مال اس کے لئے کوئی نافع نہیں ہے...... اور اگر مستثنیٰ منقطع ہو جائے تو ترجمہ یوں ہو جائے گا کہ جس دِن نفع نہیں دے گا مال اور نہیں نفع دیں گے بیٹے، ہاں! جو شخص اللہ کے پاس قلبِ سلیم لے کے آیا، وہ اپنے قلبِ سلیم سے فائدہ اٹھائے گا، وہ شخص نجات پائے گا، بیٹے اور مال وہاں کوئی کام نہیں آئیں گے، بیٹوں کا ذکر اس لئے کر دیا، بیٹیوں کا ذکر اس لئے نہیں کیا کیونکہ دنیا کے اندر بھی کسی مشکل کے اندر اگر کوئی شخص مددگار ہوتا ہے تو بیٹے ہی ہوتے ہیں، بیٹیاں عموماً مشکلات میں کام نہیں آیا کرتیں، دنیا کے اندر ہاتھ بٹانے کے لئے مددگار بیٹوں کو ہی سمجھا جاتا ہے، اس لئے فرمایا کہ بیٹے کوئی نفع نہیں دیں گے۔

جنّت اور جہنّم کو نمایاں کر دیا جائے گا

وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ: اُزْلِفَتْ یہ وہی لفظ ہے جو وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ میں آپ کے سامنے آیا۔ اَزْلَفْنَا کا ہم نے ترجمہ کیا تھا، ہم نے قریب کر دیا۔ یہ اُزْلِفَتْ مجہول آ گیا۔ جنت قریب کر دی جائے گی متقین کے۔ جیسے کسی کے سامنے کوئی ہدیہ تحفہ پیش کیا جاتا ہے، گویا کہ جنت اس طرح سے قریب کر دی جائے گی متقین کے لئے۔ اور ظاہر کر دی جائے گی جہنم گمراہوں کے لئے، غٰوِيْنَ یہ غَوِیَ یَغْوٰی سے ہے بمعنی گمراہ ہونا۔ بُرِّزَتِ کا معنی ظاہر کر دی جائے گی، نمایاں کر دی جائے گی، کھلے آنکھوں وہ اس کو دیکھیں گے۔

مشرکین کے معبود اپنے آپ کو بھی نہیں بچا سکیں گے

وَقِيْلَ لَهُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ: ان گمراہوں سے کہا جائے گا کہاں ہیں وہ چیزیں جن کو تم پُوجا کرتے تھے، مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اللہ کو چھوڑ کر، هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ: کیا اس مصیبت میں وہ تمہاری مدد کریں گی، نصرۃ: مدد کرنا۔ انتصار: بدلہ لینا، یا اپنا بچاؤ کرنا جسے دفاع کرنا کہتے ہیں۔ کیا وہ تمہاری مدد کریں گی؟ یا وہ اپنے آپ کو بچا لیں گی؟ کیا وہ تمہاری مدد کرتی ہیں یا اپنے آپ کو بچاتی ہیں، اپنا دفاع کرتی ہیں؟ استفہام کا جواب خود ہی واضح ہے کہ نہیں، نہ وہ مدد کر سکتے ہیں، نہ وہ اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں، کوئی دفاع نہیں کر سکتے۔ فَكُبْكِبُوْا: كَبَّ مجرد سے آتا ہے جس کا معنی ہوتا ہے اُلٹا کر دینا۔ اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖٓ (سورۂ ملک: ۲۲) یہ وہی لفظ

---

(۱) اذا مات الانسان انقطع عنه عمله الا من ثلاثة من صدقة جارية او علم ينتفع به او ولد صالح يدعو له مسلم ج ۲ ص ۴۱ مشکوۃ ج ۱ ص ۳۲۔

ہے۔ کبّ: اُلٹا کرنا۔ اَکَبّ: منہ کے بل اُلٹا ہو جانا۔ کَبَبْتُہٗ فَاَکَبّ میں نے اس کو اُلٹا کیا پس وہ اُلٹا ہو گیا۔ اس لئے اَفَمَنْ یَّمْشِیْ مُکِبًّا عَلٰی وَجْهِهٖ کا معنی ہے کیا وہ شخص جو منہ کے بل گرتا ہوا چلتا ہے، وہاں ترجمہ یوں ہی کیا جائے گا، اور یہ کُبْکِبُوْا اوہی کبّ سے ہے، کبّ سے کَبْکَبَ رُباعی بنالیا۔ منہ کے بل گرادیے جائیں گے وہ اس جہنم میں وہ بھی اور دوسرے گمراہ ہونے والے بھی۔ یعنی وہ معبودین بھی اور وہ گمراہ ہونے والے بھی سب جہنم میں گرادیے گئے۔ اور کُبْکِبُوْا کی ضمیر لیڈروں کی طرف بھی جا سکتی ہے جن کے پیچھے لگ کے لوگ گمراہ ہوتے ہیں، ان کو بھی اور ان کے پیچھے لگ کے گمراہ ہونے والوں کو بھی سب کو اس جہنم میں منہ کے بل گرادیا جائے گا اوندھے ڈال دیے جائیں گے، وَجُنُوْدُ اِبْلِیْسَ اَجْمَعُوْنَ اور ابلیس کے سارے لشکر۔ جُنود جُند کی جمع ہے۔

جہنمیوں کا آپس میں جھگڑا

قَالُوْا وَهُمْ فِیْهَا یَخْتَصِمُوْنَ: کہیں گے وہ لوگ اس حال میں کہ آپس میں جھگڑتے ہوں گے۔ جس طرح سے جنتی آپس میں ملاقات کریں گے تو ایک دوسرے کو مبارک بادیں کہیں گے، سلام کہیں گے، دُعائیں دیں گے۔ جہنمیوں کی ملاقات جب آپس میں ہوگی تو آپس میں جھگڑیں گے، لڑیں گے، ایک دوسرے پہ لعنت کریں گے۔ کہیں گے اس حال میں کہ وہ اس جہنم میں جھگڑتے ہوں گے۔

مشرکین کے معبود درحقیقت شیاطین ہیں چاہے وہ نام کسی کا لیں

تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ اللہ کی قسم بے شک ہم صریح گمراہی میں تھے اِذْ نُسَوِّیْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ جبکہ ہم تمہیں ربّ العالمین کے برابر ٹھہراتے تھے۔ یہ گویا کہ عابدین معبودین کو کہیں گے جن کے پیچھے لگے ہوئے تھے، معبود اُن کے چاہے فرشتے ہوں، چاہے اپنے طور پر وہ انبیاء، اولیاء کو قرار دیتے ہوں، لیکن حقیقت میں ان کے معبود شیطان ہیں کیونکہ انبیاء، اولیاء وہ تو اپنی عبادت کی طرف نہیں بلاتے، شیطانوں نے ان کو ترغیب دی۔ تو پُوجا جن کی کر رہے ہیں وہ حقیقت میں سب شیطان ہیں۔ انبیاء، اولیاء اور فرشتے ان کے معبود نہیں ہیں۔ چاہے وہ اپنے طور پر انبیاء کا نام لیں، اولیاء کا نام لیں، فرشتوں کا نام لیں، لیکن فرشتے، اولیاء، انبیاء ان کے معبود نہیں۔ شیاطین نے اپنے آپ کو ان کا معبود بنایا لیکن نام ان کا لیا، یہی وجہ ہے کہ جتنے یہ پُوجے جا رہے ہیں ان سب کو اٹھا کے جہنم میں پھینک دیا جائے گا، اس سے مراد وہی شیاطین ہیں، چاہے انہوں نے نبیوں کا نام لیا، چاہے ولیوں کا نام لیا، چاہے کچھ ہو، حقیقت کے اعتبار سے ان کے معبود شیطان ہیں، جن کی وہ پُوجا کر رہے ہیں وہ سب طاغوت ہیں، ان کو جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ یہ ان کے اپنے رکھے ہوئے نام تھے، حقیقت کے اعتبار سے اس میں کوئی شخصیت نہیں ہے، جس قسم کے نام وہ لیتے ہیں اِنْ هِیَ اِلَّاۤ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْهَاۤ (سورۂ نجم: ۲۳) یہ نام ہی نام تم نے رکھ لئے، حقیقت ان میں کچھ نہیں۔ اگر ابراہیم کا بت بنا کے سامنے رکھ لیا تو ابراہیم نہیں ہے، ایک نام ہی نام ہے جو تم نے لیا۔ ولیوں کے، نبیوں کے بت اگر بنا لیے تو حقیقت کے اعتبار سے وہ نبی اور ولی نہیں ہیں، یہ نام ہیں جو تم نے رکھ لیے، اس لیے جن کو وہ پُوجا کریں گے ان سب کو ڈال دیا جائے گا، وہ حقیقت میں شیاطین ہی ہوں گے، اور شیاطین کو وہ خطاب کر کے کہیں گے کہ ہم تمہیں جب ربّ العالمین کے برابر ٹھہراتے تھے،

اللہ کی قسم ہم بہت صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے، ہم تو سمجھتے تھے کہ جیسے اختیارات اللہ کو ہیں، ویسے اختیارات تمہیں بھی ہیں، اس لئے ہم تمہارے سامنے جھکتے تھے، عبادت کرتے تھے، لیکن اب معلوم ہو گیا وہ تو صریح گمراہی تھی۔ وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ: نہیں گمراہ کیا ہمیں مگر مجرم لوگوں نے، یہاں سے لیڈر مراد ہیں، قیادت کرنے والے۔

جہنمیوں کی حسرت

فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ: یہ آپس میں حسرت کے طور پر کہیں گے کہ نہیں ہے ہمارے لئے کوئی سفارش کرنے والا۔ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ اور نہ کوئی گرم جوش دوست۔ حمیم اصل میں کہتے ہیں گرم کو، جیسے ماءِ حمیم: گرم پانی، اور صدیق حمیم ہوتا ہے وہ مخلص دوست جس کا دل گرمی کے ساتھ پگھلتا ہے، جس کے دل میں آپ کی محبت کی گرمی ہے، اسے ''صدیق حمیم'' کہا جاتا ہے، اس لئے حاصل ترجمہ کر دیا جاتا ہے مخلص دوست یا گرم جوش دوست، جس کے دل میں محبت کی گرمی ہو۔ صدیق کا معنی دوست، حمیم کا معنی گرم جوش، یا محبت کی گرمی رکھنے والا۔ اس کا حاصل ترجمہ ہوگا مخلص دوست۔ کوئی ہمارے لیے مخلص دوست نہیں جو ہمارے سامنے آ کے ہماری تکلیفوں پر دل سوزی ہی کر لے، کوئی دُکھ درد کا اظہار ہی کر لے، کوئی ہم سے کچھ دکھ ہی بٹا لے، ایسا دوست بھی کوئی نہیں۔ فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ: یہ ''لو'' تمنائیہ ہے کاش! کہ ہمارے لئے لوٹنا ہو تو ہم ہو جائیں ایمان لانے والوں میں سے، یعنی اب اگر لوٹنا ہو جائے تو ہم ایمان لانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً: بے شک اس بیان میں جو آپ کے سامنے دیا گیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وعظ میں، قوم کے ساتھ مناظرے میں، جو کچھ پیچھے ذکر کیا گیا اس میں البتہ نشانی ہے، اگر کوئی عبرت حاصل کرنا چاہے تو کر سکتا ہے، وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں، وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ: اور بے شک تیرا رَبّ البتہ زبردست ہے رحم کرنے والا ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ٰ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٠٥﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿١٠٦﴾ اِنِّيْ

نوح علیہ السلام کی قوم نے بھی رسولوں کو جھٹلایا (۱۰۵) جبکہ کہا ان کو ان کے بھائی نوح نے کیا تم ڈرتے نہیں ہو (۱۰۶) بے شک میں

لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿١٠٧﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١٠٨﴾ وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ

تمہارے لئے امانت دار رسول ہوں (۱۰۷) پس تم اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو (۱۰۸) اور اس تبلیغ پر میں تم سے کسی قسم کا اجر نہیں مانگتا،

اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٩﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١١٠﴾ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ

نہیں ہے میرا اجر مگر رَبّ العالمین کے ذمے (۱۰۹) پس تم اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو (۱۱۰) کہنے لگے: کیا ہم ایمان لے آئیں

لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴿١١١﴾ قَالَ وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١١٢﴾ اِنْ
تجھ پر؟ حالانکہ تیری پیروی کی ہے گھٹیا قسم کے لوگوں نے ﴿۱۱۱﴾ نوح نے کہا: نہیں ہے میرا علم ان کاموں کے ساتھ جو وہ کرتے ہیں ﴿۱۱۲﴾ نہیں ہے
حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّيْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ﴿١١٣﴾ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١١٤﴾ اِنْ اَنَا
ان کا حساب مگر میرے رَبّ کے ذِمّے، کاش کہ تم سمجھ جاؤ! ﴿۱۱۳﴾ اور نہیں ہوں میں دُور ہٹانے والا ان مؤمنین کو ﴿۱۱۴﴾ نہیں ہوں میں
اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿١١٥﴾ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ﴿١١٦﴾
مگر صریح طور پر ڈرانے والا ﴿۱۱۵﴾ وہ کہنے لگے: اے نوح! اگر تُو باز نہیں آئے گا تو تُو ہو جائے گا سنگسار کیے ہوؤں میں سے ﴿۱۱۶﴾
قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِيْ كَذَّبُوْنِ ﴿١١٧﴾ فَافْتَحْ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّنَجِّنِيْ وَمَنْ
نوح نے کہا: اے میرے رَبّ! میری قوم نے مجھے جھٹلایا ﴿۱۱۷﴾ میرے اور ان کے درمیان خوب فیصلہ کر دے، اور نجات دے مجھے اور
مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١١٨﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿١١٩﴾ ثُمَّ
ان مؤمنین کو جو میرے ساتھ ہیں ﴿۱۱۸﴾ پس ہم نے اس کو نجات دی اور جو لوگ اس کے ساتھ تھے بھری کشتی میں ﴿۱۱۹﴾ پھر
اَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبٰقِيْنَ ﴿١٢٠﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٢١﴾
ان کو بچانے کے بعد ہم نے باقیوں کو غرق کر دیا ﴿۱۲۰﴾ بے شک اس میں البتہ نشانی ہے، اور نہیں ہیں ان میں سے اکثر ایمان لانے والے ﴿۱۲۱﴾
وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿١٢٢﴾
بے شک تیرا رَبّ البتہ زبردست ہے رحم کرنے والا ہے ﴿۱۲۲﴾

تفسیر

قومِ نوح کا واقعہ

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ِۨالْمُرْسَلِيْنَ نوح علیہ السلام کی قوم نے بھی رسولوں کو جھٹلایا، جھٹلانے والے صرف نوح علیہ السلام کو تھے، لیکن چونکہ نوح علیہ السلام اور باقی پیغمبر سب کی تعلیم ایک ہی ہے، اور ایک ہی قسم کی بات سب نے کہی تو جنہوں نے نوح علیہ السلام کی نہیں مانی، گویا کہ انہوں نے کسی پیغمبر کی نہیں مانی، ایک رسول کی تکذیب سب کی تکذیب ہے۔ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ جبکہ کہا ان کو ان کے بھائی نوح علیہ السلام نے۔ نسبی بھائی تھے، قومی بھائی تھے، وطنی بھائی تھے، بھائیوں کی جیسے قسمیں ہیں، تو ان کے بھائی نوح علیہ السلام نے کہا اَلَا

تَتَّقُوْنَ کیا تم ڈرتے نہیں ہو۔ یہ ویسے لفظ ہے جس طرح سے پہلے آپ کے سامنے موسیٰ علیہ السلام کے بیان میں آیا تھا، اللہ تعالیٰ فرعونیوں کے متعلق کہتے ہیں کہ کیا وہ ڈرتے نہیں؟ (سورۂ شعراء:۱۱) ان کو اللہ کا قہر غضب یاد نہیں آتا؟ اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ: بے شک میں تمہارے لئے امانت دار رسول ہوں، امین رسول ہوں، خائن نہیں ہوں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بات مجھے بتائی جاتی ہے وہی صحیح صحیح میں تمہیں پہنچاتا ہوں، اس میں کسی قسم کی کوئی خیانت نہیں کرتا۔ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ: پس تم اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو۔

انبیاء علیہم السلام تبلیغ پر اُجرت نہیں مانگتے

وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ: اور اس تبلیغ پر، وعظ پر، دِین کے پہنچانے پر میں تم سے کوئی کسی قسم کا اُجر نہیں مانگتا۔ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ: نہیں ہے میرا اُجر مگر ربّ العالمین کے ذِمّے۔ یہ ان کے خلوص کی بات ہے، وہ ظاہر کرتے تھے کہ ہم کسی دُنیوی مفاد کی خاطر کوئی اپنی غرض کے لیے تمہیں نہیں سمجھا رہے، اس میں فائدہ تمہارا ہی ہے۔ یہ نہیں کہ ہم تم سے اس کا کوئی معاوضہ مانگیں گے یا کوئی اُجر مانگیں گے، ایسی کوئی بات نہیں، پس تم اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو۔

قوم کی طرف سے ایک بے بنیاد بہانہ

قَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ لَكَ: اب ان کے پاس کوئی بات، کوئی دلیل تو تھی نہیں۔ جیسے ''خوئے بدرا بہانہ بسیار'' عادت تو اپنی بُری ہوتی ہے اور بہانے انسان ہزار بنالیتا ہے۔ تو یہاں اور کوئی ان کے پاس بہانہ باقی نہیں رہا تو ایک یہ بہانہ بنالیا کہ جی! ہم تیری بات کس طرح سے مانیں، ہم تیرے پاس آ کے مجلس میں کس طرح سے بیٹھیں، تیرے پاس رذیل ذلیل کمینے گھٹیا درجے کے غریب غُربے بیٹھے ہوتے ہیں، جو کسی مقصد کے لئے کسی غرض کے لئے آپ کے پیچھے لگ گئے، ہم ان کے ساتھ آ کے کس طرح سے بیٹھ سکتے ہیں؟ ہم نہیں بیٹھ سکتے، ان کے اگلے لفظوں کا حاصل یہ ہے۔ جیسے مشرکینِ مکہ نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کچھ اس قسم کے جذبات کا اظہار کیا تھا۔ مطلب ان کا یہ تھا کہ ان کو نکال دے، یہ سارے کے سارے چلے جائیں، تو ہوسکتا ہے کہ ہم آپ کی مجلس میں آ جائیں۔ یہ ایک بہانہ ہوتا ہے کہ نہ یہ نکالیں گے، نہ ہم جائیں گے، یعنی عذر کرنے کے لئے ایک بات بنالی کہ ان کمینوں کے ساتھ، ان گھٹیا لوگوں کے پاس جا کے ہم نہیں بیٹھ سکتے، تیرے پیچھے لگنے والے تو سارے ارذل ہیں، کمینے ہیں، گھٹیا قسم کے لوگ ہیں، مزدور قسم کے، جن کے پاس کوئی اچھا لباس نہیں ہے، اچھا مکان نہیں، اچھی خوراک نہیں، دنیا کے اندر ان کو کوئی جاہ وجلال حاصل نہیں، تو ہم ان کے ساتھ مل کے کیسے جا کے بیٹھ سکتے ہیں؟۔ دنیاداروں اور متکبروں کا کچھ اس قسم کا ذہن ہوتا ہے۔ گویا کہ حق قبول کرنے والوں کی مسکنت، غربت اور دنیا کے اندر ان کا جاہ وجلال کا مالک نہ ہونا یہ بھی ان کے تکبر کی بناء پر ایک مانع ہوتا ہے کہ ہم اس طریقے کو کیسے قبول کرلیں؟ یہ تو ایسے لوگوں کا طریقہ ہے۔ ...... وہ کہنے لگے کیا ہم ایمان لے آئیں تجھ پر؟ حالانکہ تیری پیروی کی ہے ارزل لوگوں نے، گھٹیا قسم کے لوگوں نے۔ رذیل، کمینہ جسے کہہ دیتے ہیں ...... یہ جو آپ کہا کرتے ہیں کہ فلاں کمی ہے، یہ وہی غلط لفظ ہے جو لوگوں کی زبانوں پہ چڑھا ہوا ہے۔ کمی کا لفظ اصل میں کمین سے لیا گیا ہے، اور یہاں سے کمینہ کا لفظ بنتا ہے، گھٹیا

درجے کے لوگوں کے لئے جو کمی کا لفظ بولتے ہیں یہ اچھا لفظ نہیں ہے، محنت مزدوری کر کے اگر کوئی کماتا کھاتا ہے وہ تو باعزت ہے، اس کو آپ کمینہ اور گھٹیا کس طرح سے کہہ سکتے ہیں؟ اور کسی اچھے پیشے کی بنا پر فخر اور غرور کرنا، کسی دوسرے کے ادنیٰ پیشے کی بنا پر اس سے نفرت کرنا یہی تو تکبر ہے۔ اللہ کے ہاں مرتبہ کس کا بلند ہے، کس کا نہیں؟ وہ اللہ ہی جانتا ہے! جو شخص حلال کمانے کے لئے کوئی ذریعہ اختیار کیے ہوئے ہے، یہ اس کی شرافت ہے، اور وہ باعزت ہے، مزدوری ہے کوئی کس طرح سے کرلے، کوئی کس طرح سے کرلے۔

نوح علیہ السلام کی طرف سے دوٹوک جواب

قَالَ وَمَا عِلْمِیْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ: دیکھو! اس کا لفظی ترجمہ ہے، نوح علیہ السلام کہتے ہیں کہ نہیں ہے میرا علم ان کاموں کے ساتھ جو وہ کرتے ہیں، میں نہیں جانتا وہ کیا کچھ کرتے ہیں، اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ خاص علم کی نفی کرنا مقصود ہے کہ مجھے پتا نہیں کہ یہ کیا کام کرتے ہیں، پتا تو ہے، لیکن اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں اس کی پروا نہیں کرتا، میرے نزدیک یہ کوئی قابلِ قدر نہیں ہے کہ یہ کیا کرتے ہیں اور کیا نہیں کرتے۔ جیسے آپ کا کوئی دوست ہو، اور کوئی شخص آپ کے سامنے کہے کہ آپ نے اس سے دوستی کیوں لگا رکھی ہے؟ وہ تو ایسے کام کرتا ہے، ایسے کرتا ہے۔ تو آپ کو پتا بھی ہے کہ وہ ایسے کرتا ہے، آپ کہتے ہیں کہ مجھے کیا پتا، وہ کیا کرتا ہے؟ میں تو دیکھتا ہوں کہ جب مجھے ضرورت پیش آتی ہے، میرے کام آتا ہے، تو میں کیا جانوں وہ کیا کرتا ہے، مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہمارے نزدیک یہ چیزیں قابلِ توجہ نہیں، میں کیا جانوں وہ کیا کرتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ جو چاہے کریں مجھے کیا، ان کا کیا پیشہ ہے؟ کیا کردار ہے؟ دُنیا کے اندر کون سا ذریعہ معاش اختیار کیے ہوئے ہیں؟ مجھے اس کا کوئی پتا نہیں، یعنی میرا اس سے کوئی تعلق نہیں، میری اس طرف کوئی توجہ نہیں، میں تو دیکھتا ہوں کہ وہ ایمان لے آئے، اللہ کا نام لیتے ہیں، اللہ کے پیارے ہوگئے، ان کے کاموں کی ذمہ داری میرے پہ کوئی نہیں کہ وہ کیا کرتے ہیں کیا نہیں کرتے، میں تو اب ان کو اپنے پاس بٹھاؤں گا، میری مجلس میں بیٹھیں گے، تمہارے کہنے کی وجہ سے میں ان کو مجلس سے نہیں اٹھا سکتا، اگر میں نے ان کو مجلس سے اٹھا دیا تو اللہ تعالیٰ کے سامنے میں جواب دہ ہوں گا۔ تم ایمان لاتے ہو لاؤ نہیں ایمان لاتے نہ لاؤ، تمہارے لئے ان مساکین کو مجلس سے نہیں اٹھایا جاسکتا، یہ جواب کا حاصل ہے کہ مجھے کیا پتا وہ کیا کرتے ہیں، میں نہیں علم رکھتا ان کاموں کا جو وہ کرتے ہیں، یعنی یہاں ظاہر میں علم کی نفی کی جارہی ہے، لیکن اصل میں مقصود اس سے عدمِ توجہ ہے کہ میری کوئی توجہ نہیں ان کاموں کی طرف جو یہ کرتے ہیں۔ اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّیْ نہیں ہے ان کا حساب مگر میرے ربّ کے ذِمّے، دل میں مخلص ہیں یا نہیں، ان کی کیا غرض ہے، کسی مفاد کے لیے میرے پیچھے لگے ہیں، اس کا محاسبہ بھی میرے ذِمّے نہیں ہے، یہ بھی ربّ کے ذمے ہے، لَوْ تَشْعُرُوْنَ کاش! کہ تم اس بات کو سمجھ جاؤ۔ وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِیْنَ: اور میں ایمان لانے والوں کو دُور ہٹانے والا نہیں، کہ تم اس قسم کی باتیں کر کے کہو کہ میں ان کو دُور ہٹادوں، ایسا نہیں ہوسکتا۔ نہیں ہوں میں دور ہٹانے والا ان مؤمنین کو۔ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ نہیں ہوں میں مگر صریح طور پر ڈرانے والا، میرا مقصد ڈرانا ہے، تم مانتے ہو تو مانو نہیں مانتے تو یہ ذمہ داری میرے پہ نہیں۔

قوم کی طرف سے دھمکی

وہ کہنے لگے لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ یٰنُوْحُ: یہ بھی کوئی ایک دن کی گفتگو نہیں، نوسو، ساڑھے نوسو سال پہ پھیلی ہوئی داستان ہے، جیسے قرآنِ کریم کے دوسرے حصوں میں آپ کے سامنے تفصیل گزری، یہ تو خلاصہ سا ہے جو عنوان کے طور پر نقل کیا جا رہا ہے، ورنہ نوسو، ساڑھے نوسو سال کی کشمکش ہے حضرت نوح علیہ السلام کی اور ان کی قوم کی، کہنے لگے اے نوح! اگر تو نہیں باز آئے گا: لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِیْنَ: تو مرجومین میں سے ہوجائے گا، ان لوگوں میں سے ہوجائے گا جن کو سنگسار کردیا جاتا ہے، جن کو پتھر مار مار کے مار دیا جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ ہم تجھے بھی سنگسار کردیں گے، باز آ جا، ہروقت کے دھندے کو ختم کردے۔

نوح علیہ السلام کی دُعا اور قوم کا انجام

قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِیْ كَذَّبُوْنِ: جب ہر طرح سے نوح علیہ السلام تھک گئے، اور کوئی طریقہ نہیں چھوڑا جس سے سمجھایا جاسکتا، حضرت نوح علیہ السلام نے ان کو سمجھایا، اور جب پھر وہ لڑائی پہ ہی اتر آئے، تو نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ اُٹھائے کہ اے میرے رب! بے شک میری قوم نے مجھے جھٹلایا۔ فَافْتَحْ بَیْنِیْ وَبَیْنَهُمْ فَتْحًا: میرے اور ان کے درمیان خوب فیصلہ کردے۔ وَنَجِّنِیْ وَمَنْ مَّعِیَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ: اور مجھے نجات دے اور جو لوگ مؤمن میرے ساتھ ہیں انہیں نجات دے، مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ یہ مَنْ کا بیان ہے، مؤمنین جو میرے ساتھ انہیں نجات دے۔ فَاَنْجَیْنٰهُ: پس ہم نے اس کو نجات دی، اور جو لوگ اس کے ساتھ تھے بھری کشتی میں، ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبٰقِیْنَ: بَعْدُ کا مضاف الیہ محذوف ہے، الْبٰقِیْنَ یہ اَغْرَقْنَا کا مفعول ہے، ان کو بچا لینے کے بعد ہم نے باقیوں کو غرق کردیا۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً بے شک اس میں البتہ نشانی ہے، وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ: اور نہیں ہیں ان میں سے اکثر ایمان لانے والے۔ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ: اور بے شک تیرا رب البتہ زبردست ہے رحم کرنے والا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

كَذَّبَتْ عَادُ ۨالْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ اِنِّیْ لَكُمْ

عاد نے مرسلین کو جھٹلایا (۱۲۳) جب کہا ان کو ان کے بھائی ہود علیہ السلام نے: کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ (۱۲۴) بے شک میں تمہارے لئے

رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۱۲۵﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ﴿۱۲۶﴾ وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ

رسولِ امین ہوں (۱۲۵) پھر تم اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو (۱۲۶) نہیں سوال کرتا میں تم سے اس تبلیغ پر کسی اُجرت کا،

اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۲۷﴾ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِیْعٍ اٰیَةً تَعْبَثُوْنَ ﴿۱۲۸﴾

نہیں ہے میرا اجر مگر رب العالمین کے ذمے (۱۲۷) کیا تم بناتے ہو ہر اونچی جگہ پہ یادگار عبث حرکت کرتے ہوئے (۱۲۸)

وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ﴿۱۲۹﴾ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِیْنَ ﴿۱۳۰﴾

اور بناتے ہو تم بڑی بڑی عمارتیں شاید کہ تم نے ہمیشہ رہنا ہے ﴿۱۲۹﴾ اور جب تم گرفت کرتے ہو تو گرفت کرتے ہو اس حال میں کہ تم جبار ہو ﴿۱۳۰﴾

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ﴿۱۳۱﴾ وَاتَّقُوا الَّذِیْۤ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ اَمَدَّكُمْ

پس تم اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو ﴿۱۳۱﴾ ڈرو اس سے جس نے تمہیں امداد دی ان چیزوں کے ساتھ جن کو تم جانتے ہو ﴿۱۳۲﴾ مدد دی اس نے تمہیں

بِاَنْعَامٍ وَّبَنِیْنَ ﴿۱۳۳﴾ وَجَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ﴿۱۳۴﴾ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ

چوپایوں کے ساتھ اور بیٹوں کے ساتھ ﴿۱۳۳﴾ اور باغات اور چشموں کے ساتھ ﴿۱۳۴﴾ بے شک میں اندیشہ کرتا ہوں تم پر بڑے دن کے

عَظِیْمٍ ﴿۱۳۵﴾ قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَیْنَاۤ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِیْنَ ﴿۱۳۶﴾ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا

عذاب کا ﴿۱۳۵﴾ وہ کہنے لگے کہ ہم پر برابر ہے کہ تُو وعظ کہے یا واعظین میں سے نہ بنے ﴿۱۳۶﴾ نہیں ہے یہ مگر

خُلُقُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ﴿۱۳۸﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ

پہلوں کی عادت ﴿۱۳۷﴾ ہم عذاب دیے ہوئے نہیں ہیں ﴿۱۳۸﴾ پس انہوں نے ہود کو جھٹلایا، پھر ہم نے انہیں ہلاک کر دیا، بے شک اس میں

لَاٰیَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۳۹﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۴۰﴾

البتہ نشانی ہے اور نہیں ہیں ان میں سے اکثر ایمان لانے والے ﴿۱۳۹﴾ اور بے شک تیرا رَبّ البتہ زبردست ہے رحم کرنے والا ہے ﴿۱۴۰﴾

تفسیر

قومِ عاد کا واقعہ

كَذَّبَتْ عَادُ ۨالْمُرْسَلِیْنَ: عاد نے مرسلین کو جھٹلایا۔ سورۂ ہود میں یہ واقعہ مفصل آپ کے سامنے گزرا تھا کہ عاد کی طرف جو رسول بھیجے گئے تھے ان کا نام ہے ہود علیہ السلام، جیسا کہ اگلی آیت میں یہاں بھی مذکور ہے، اور ایک رسول کو جھٹلانا سب رسولوں کو جھٹلانا ہے، کیونکہ تعلیم سب کی ایک ہے۔ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ: اب یہ سب الفاظ بار بار گزر رہے ہوئے ہیں۔ جب کہا ان کو ان کے بھائی ہود علیہ السلام نے، کیا تم ڈرتے نہیں ہو اللہ کے قہر سے، اللہ کے عذاب سے؟، اور اَخُوْهُمْ جو کہا ان کے بھائی، تو یہ اُخوتِ نسبی بھی ہے، وطنی بھی ہے، اور اُخوتِ قومی بھی ہے۔ چونکہ انہی میں سے ہی تھے۔ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ: بے شک میں تمہارے لئے رسول امین ہوں، امانت دار ہوں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بات آتی ہے ویسے ہی تمہاری طرف پہنچاتا ہوں، اس میں کسی قسم کی خیانت نہیں کرتا، اور امانت ہر رسول کی صفت ہے۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ پھر تم اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو۔ اَطِیْعُوْنِ: اَیْ

اَطِیْعُوْنِ- وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ: یہ آیت بھی تمام انبیاء علیہم السلام کے واقعات میں ہے، پہلے بھی گزری۔نہیں سوال کرتا میں تم سے اس تبلیغ پر کسی اُجرت کا، اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ: ''اِن'' نافیہ ہے۔نہیں ہے میرا اُجر مگر ربّ العالمین کے ذمے۔

دولت کہاں خرچ کی جائے؟

اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِیْعٍ اٰیَةً تَعْبَثُوْنَ ۝ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ: قومِ عاد جس طرح سے کفر اور شرک میں مبتلا تھی، اور اللہ کے رسول ہود علیہ السلام نے ان کو توحید کی تعلیم دی، جیسا کہ تفصیل سورۂ ہود میں گزری، اسی طرح سے ان کے اندر ایک تمدّنی خرابی بھی تھی، ان کا تمدن برباد تھا، ایک دوسرے کے مقابلے میں مفاخرت اور بڑائی حاصل کرنے کے لئے وہ لوگ اُونچی اُونچی عمارتیں بڑے بڑے محلات اور یادگاریں بناتے۔اور آپ جانتے ہیں کہ جس قوم میں اس قسم کا مقابلہ شروع ہوجائے، تو اس کے حالات اچھے نہیں رہا کرتے، جس کو اللہ تعالیٰ کوئی دولت دے تو اصل مصرف تو دولت کا یہ ہے کہ انسان اس سے اپنی ضروریات پوری کرے، اور ضروریات پوری کرنے کے بعد اپنے محتاج اور مفلس بھائیوں کی امداد کرے، اور قومی ضرورتوں کے اندر اپنے سرمائے کو صرف کرے، اور اگر قومی ضرورتیں اسی طرح سے پڑی ہوں، ان کو پورا کرنے کے لئے سرمایہ نہیں، اور اپنے ہی جیسے، اپنے بھائی اپنی قوم کے وہ مسکین اور نانِ شبینہ کے محتاج ہوں، اور لوگ بنانے لگ جائیں بڑی بڑی کوٹھیاں، اور بڑے بڑے بنگلے، تو اس سے پھر تمدن کا توازن قائم نہیں رہا کرتا۔

بڑی بڑی عمارتوں پر پیسہ لگانا وَبال ہے

ابوداؤد شریف میں ایک واقعہ آتا ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت مدینہ منورہ میں تشریف لے گئے، تو وہاں چونکہ آپ نے ترغیب یہی دی تھی کہ ہر شخص اپنی کم سے کم ضرورت پوری کرکے، باقی سرمایہ اپنے بھائیوں پہ خرچ کرے، چونکہ آئے دِن مہاجرین آرہے تھے، جن کے پاس مکان نہیں تھا، جن کے پاس ضرورت کے مطابق لباس نہیں تھا، جن کے کھانے کا انتظام نہیں تھا، اور ان سب کی ضروریات بظاہر اہلِ مدینہ کے ذِمے ہی تھیں، اور اردگرد سب کفر کی راجدھانی تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک دِن مدینہ منورہ کے ایک طرف تشریف لے گئے تو وہاں ایک قبہ نما مکان بنا ہوا دیکھا، تو اتنا پوچھا کہ یہ کس کا ہے؟ تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے بتایا کہ فلاں (انصاری) شخص کا ہے، آپ تشریف لے گئے اور کوئی بات نہیں کی، دوسرے وقت میں وہ صاحبِ مکان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آتا ہے، اور آ کے سلام کرتا ہے، آپ اس سے اِعراض کرلیتے ہیں، سلام کا جواب نہیں دیتے، وہ سمجھا کہ شاید سنا نہیں ہوگا، وہ پھر سامنے ہو کے سلام کرتا ہے، تو آپ دوسری طرف کو منہ کرلیتے ہیں، سلام کا جواب نہیں دیتے، پھر اس شخص کو احساس ہوا کہ ناراضگی ہے، یہ عمداً اعراض ہے، یہ نہیں کہ سلام سنا نہیں، تو اپنے رفقاء سے پوچھتا ہے کہ میرا کوئی تذکرہ ہوا تھا مجلس میں؟ میری کوئی شکایت پہنچی ہے؟ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آج کچھ اوپرے اوپرے سے ہیں، مانوس نہیں ہیں۔تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے بتایا کہ اور تو ہمیں کوئی واقعہ معلوم نہیں، جدھر تیرا گھر ہے اُدھر تشریف لے گئے تھے، تیرا مکان دیکھ کے صرف اتنا پوچھا تھا کہ یہ کس کا ہے؟ بس اس پر کوئی بات نہیں فرمائی۔وہ سمجھ گیا کہ میرا مکان پسند نہیں آیا، جو باقی لوگوں سے ممتاز کر کے بنالیا گیا۔وہ گیا، جا کے اس نے اس

مکان کو بالکل ڈھا دیا، برباد کر دیا، اینٹ سے اینٹ بجا دی، اور پھر رسول اللہ ﷺ کو آ کے اطلاع نہیں دی، کسی دوسرے موقع پر آپ ﷺ ادھر پھر تشریف لے گئے اور پھر وہ قبہ نہ دیکھا، تو آپ ﷺ نے پوچھا کہ قبے کا کیا بنا؟ تو لوگوں نے بتایا کہ اس کا مالک آیا تھا، اس نے آ کے آپ کے اعراض کی شکایت کی، تو ہم نے واقعہ ذکر کیا تھا، تو اس نے آ کے اس کو گرا دیا۔ تو وہاں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "ہر عمارت انسان کے لئے وبال ہے سوائے اس کے جس کے بغیر چارہ نہیں"[1] تو گویا کہ حوصلہ شکنی کر دی۔ اگر ایک شخص اس طرح سے قبہ نما مکان بنالیتا، تو لوگوں میں ریس تو ہے ہی، اکثر و بیشتر لوگوں کے اندر ریس ہے، جس طرح سے دوسروں کو دیکھتے ہیں کہ ان کی شان و شوکت ہے تو پھر اپنے اندر بھی جوش پیدا ہوتا ہے کہ ہم بھی ایسے وقت گزاریں، پنجابی میں تو مثال مشہور ہے، آپ سنتے رہتے ہوں گے، لوگ کہتے ہیں کہ پڑوسی کا مقابلہ کرنا چاہیے، کسی طرح سے اس سے نیچے نہیں ہونا چاہیے، اگر پڑوسی کا منہ لال ہو تو اپنا تھپڑ مار مار کے کر لینا چاہیے۔ بہرحال یہ نہ ہو کہ پڑوسی کا منہ تو سُرخ ہے اور آپ کا پیلا ہے، اگر ویسے نہ ہو سکے تو تھپیڑے مار مار کے اپنا منہ سُرخ کرلو، تاکہ پڑوسی کے مقابلے میں پستی نہ ہو۔ تو جب اس طرح سے لوگوں کے اندر ریس کا اور مقابلے کا مادّہ ہو، اور ایک آدمی کو اچھا مکان بنانے کی اجازت دے دی جائے، یا اس کے بنائے ہوئے کو برداشت کر لیا جائے، تو دوسرے لوگ بھی پھر سرمایہ جمع کرنے کی کوشش کریں گے کہ ہم بھی ایسی کوٹھی اور ایسا محل بنالیں۔ اور یہ تعمیرات ایک ایسی چیز ہے کہ اس کی کوئی حد ہی نہیں، جتنی اچھی سے اچھی، جتنی اُونچی سے اونچی، جتنی فراخ سے فراخ آپ بنانا چاہیں تو بناتے چلیں جائیں۔ تو آپ کا سرمایہ تو سارا گارے اور مٹی میں مل گیا، آپ اپنے پڑوسیوں کی کیا خدمت کریں گے، اپنے گاؤں کی برادری کی کیا خدمت کریں گے، قومی ضرورتوں میں آپ سرمایہ کس طرح سے لگائیں گے، اس طرح سے قوم کا سرمایہ گارے اور مٹی میں ضائع ہونا شروع ہو جاتا ہے، اور باقی سارے کے سارے حالات خراب ہو جاتے ہیں، تو سرورِ کائنات ﷺ نے بار بار اس بات کی تلقین فرمائی کہ بس مکان بقدرِ ضرورت چاہیے جس میں انسان گزارہ کرلے، اور بڑے بڑے مکان بنانا یہ پیسے ضائع کرنے والی بات ہے۔

اس قوم کے اندر یہ مقابلہ بازی کا رواج تھا، ایک دوسرے کے مقابلے میں اُونچے اُونچے محلات بنانا، بڑی بڑی یادگاریں قائم کرنا، تو حضرت ہود علیہ السلام نے جہاں ان کے عقائد پر تنقید کی ہے اور ان کو کفر و شرک سے روکا ہے، اسی طرح سے اس تمدن کی خرابی کے اُوپر بھی متنبہ کیا ہے۔ رِیْع کہتے ہیں اُونچی جگہ کو، بلند مکان۔ اور مصانع یہ مَصْنَع کی جمع ہے۔ "مصنع" کا لفظ قلعہ، گڑھی، محل اور بڑی عمارت کے لئے بولا جاتا ہے، اور تَخْلُدُوْنَ: خُلُود سے ہے، ہمیشہ رہنا، اور تَعْبَثُوْنَ: عبث سے ہے، فضول حرکت کرنا۔ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ: کیا تم ہر بلند جگہ کے اوپر کوئی یادگار قائم کرتے ہو؟ یادگار بناتے ہو؟ یہاں "اٰیَۃً" نشانی سے یادگار مراد ہے، کیا تم بناتے ہو ہر اُونچی جگہ پر یادگار ایک عبث حرکت کرتے ہوئے جس کی تمہیں ضرورت بھی کوئی نہیں، اور اس طرح سے تم سرمایہ سارے کا سارا ادھر لگا رہے ہو؟ عبث حرکت کرتے ہوئے۔ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ اور بناتے ہو تم بڑے

---

(۱) مشکوٰۃ ۲/ ۴۴۱ کتاب الرقاق، فصل ثانی۔ ابوداؤد، ۲/ ۳۵۴، باب ما جاء فی البناء۔ اَمَا اِنَّ كُلَّ بِنَاءٍ وَبَالٌ عَلٰى صَاحِبِهٖ اِلَّا مَا لَا اِلَّا مَا لَا. يَعْنِيْ مَا لَا بُدَّ مِنْهُ.

بڑے قلعے، بڑے بڑے محلات، بڑی بڑی عمارتیں، لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ: شاید کہ تم نے ہمیشہ رہنا ہے، یعنی اتنی مضبوط مضبوط عمارتیں جو بنا رہے ہو، تو یہ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے ہمیشہ یہیں رہنا ہے، اس لئے مضبوط اور بڑی عمارت بنائیں تاکہ آنے والی نسلیں بھی اس میں کھپتی چلی جائیں، اور پھر اس میں شکست وریخت بھی نہ ہو، اور یہ ٹوٹے بھی نہ۔ تو آخرت سے غفلت اور اس طرح سے فضول سرمایہ خرچ کرنے پر حضرت ہود علیہ السلام نے ان الفاظ سے تنقید کی ہے۔ کیا بناتے ہو تم ہر جگہ اُونچی جگہ میں نشانی یعنی یادگار عبث حرکت کرتے ہوئے، فضول حرکت کرتے ہوئے، جس کی تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ بقدرِ ضرورت مکان بنایا جائے اس کی تو اجازت ہے، اور اختیار کرتے ہو تم بڑے بڑے محلات...... اور لَعَلَّكُمْ کو بعض مفسرین نے كَاَنَّكُمْ کے معنی میں کیا ہے،[1] گویا کہ تم نے ہمیشہ رہنا ہے، یعنی اس خیال سے تم بناتے ہو کہ گویا کہ ہمیشہ رہنا ہے۔

قومِ عاد کی اخلاقی سختی

وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ: یہ ان کے اخلاق کی سختی آ گئی، بدمعاملگی۔ بطش کہتے ہیں گرفت کرنے کو، قرآنِ کریم میں دوسری جگہ یہ لفظ آیا ہوا ہے يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى (سورۂ دخان: ۱۶)، اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ (سورۂ بروج: ۱۲)۔ اور جب تم گرفت کرتے ہو، تو گرفت کرتے ہو اس حال میں کہ تم جبار ہو، بہت سختی کرنے والے ہو، یعنی تمہارے معاملات میں اس قسم کی سختی اور تشدّد ہے کہ کسی سے لینا دینا اگر ہوتا ہے تو اس میں انتہائی درجے کے تشدّد سے پیش آتے ہو۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ تم اللہ سے ڈرو، یعنی تمہاری طبیعتوں میں رِقّت نہیں، نرمی نہیں، اور اپنے ہم جنسوں پر تمہیں کوئی شفقت نہیں، تمہارے معاملات میں انتہائی درجے کی سختی ہے۔ پس تم اللہ سے ڈرو، اور میرا کہنا مانو۔

قومِ عاد کو اللہ کے اِنعامات کی یاددہانی

وَاتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ: ڈرو اس سے جس نے تمہیں امداد دی ان چیزوں کے ساتھ جو تم جانتے ہو، اللہ نے کیسی کیسی نعمتیں تمہیں دے رکھی ہیں تمہیں پتا ہی ہے، تم اس سے ڈرو، یہ نعمتوں کا ذکر کر کے ترغیب ہے، جس طرح شکر کی ترغیب ہوا کرتی ہے۔ ڈرو تم اس سے جس نے تمہیں امداد دی ان چیزوں کے ساتھ جن کو تم جانتے ہو۔ بِمَا تَعْلَمُوْنَ کے اندر جو ابہام تھا آگے اس کی تفصیل آ گئی۔ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ: مدد دی اس نے تمہیں چوپایوں کے ساتھ اور بیٹوں کے ساتھ وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ: اور باغات اور چشموں کے ساتھ، اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ: بے شک میں اندیشہ کرتا ہوں تم پر بڑے دِن کے عذاب کا، یہ ترہیب ہے۔ کیسی کیسی نعمتیں اللہ نے تمہیں دی ہیں؟ تمہاری ضرورتیں پوری کیں، ہر قسم کے جانور دیے، اَنعام کے اندر بھیڑ، بکری، اونٹ، گائے اس قسم کے سارے مویشی جو گھروں میں ہوا کرتے ہیں، جن سے انسان اپنی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ اور بیٹوں کو انسان فخر سمجھتا ہے، اپنی زندگی کے اندر ان کو معاون بناتا ہے، بیٹیوں کا تذکرہ نہیں کیا، کیونکہ بیٹیاں خدمت گار ہونے کی بجائے زیادہ تر

---

(۱) قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ كَاَنَّكُمْ (بخاری، ۲/ ۷۰۲، کتاب التفسیر سورۃ الشعراء)

محروم ہوتی ہیں دنیاوی معاملات میں، لوگ بیٹوں کو ہی اپنا سہارا سمجھا کرتے ہیں، بیٹیوں کو سہارا نہیں سمجھتے۔ وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ: باغات اور چشمے۔ باغات جمع آ گئی، ہر قسم کے میوے، ہر قسم کے پھل فروٹ اللہ نے تمہیں دیے ہیں، اور پانی کی کمی نہیں۔ کیسی کیسی نعمتیں اللہ نے دی ہیں، اس کا شکر ادا کرو اور اس کی مخالفت سے بچو، کیونکہ منعم اور محسن کی شکر گزاری نعمتوں میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ اور اگر کفرانِ نعمت کیا جائے، ناشکری اختیار کی جائے تو نعمتیں چھن جایا کرتی ہیں لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ (سورۂ ابراہیم: ۷)۔

قومِ عاد کی ضد اور پھر ان کا انجام

قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ: وَعَظْتَ وعظ سے لیا گیا ہے، وعظ کہتے نصیحت کرنے کو، وَعَظَ يَعِظُ۔ مضارع بھی دوسری جگہ آیا ہوا ہے وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ (سورۂ لقمان: ۱۳)، جب لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا اس حال میں کہ وہ اس کو وعظ کہہ رہے تھے۔ ''وعظ'' کا معنی ہوا کرتا ہے کسی کے سامنے ایسی باتیں کرنا، جس کے ساتھ اس کے دل میں رقت پیدا ہو جائے، مَوْعِظَةٌ اس کا مصدر میمی بھی قرآنِ کریم میں آیا ہوا ہے (سورۂ بقرہ: ۶۶ وغیرہ)۔ نصیحت کرنا اس کا حاصل معنی ہے۔ وہ کہنے لگے کہ ہم پہ برابر ہے کہ تُو وعظ کہے یا واعظین میں سے نہ بنے، یہ لفظی ترجمہ ہے۔ اور اس میں اِستفہام تسویہ کے لئے ہے یعنی دونوں باتوں کو برابر قرار دینے کے لئے ہے، اِستفہام کے ساتھ ترجمہ نہیں کیا جائے گا۔ جیسے پہلے پارے میں آیا تھا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ (سورۂ بقرہ: ۶) ان لوگوں پہ برابر ہے کہ تو انہیں ڈرایا نہ ڈرا۔ اس کا ترجمہ یوں ہوگا، یہ ہمزہ تسویہ کے لئے ہے۔ فارسی میں جس طرح سے محاورہ آتا ہے، حضرتِ شیخ (سعدی رحمۃ اللہ علیہ) نے کہا ہے کہ:

چو آہنگ رفتن کند جان پاک — چہ برتخت مردن، چہ برروئے خاک

(''گلستاں'' باب ۱)

اب ''چہ'' بھی عام طور پر اِستفہام کے لئے آیا کرتا ہے، لیکن یہاں تسویہ کے لئے ہے کہ جب جانِ پاک نے جانے کا ارادہ کر لیا تو تخت پر مارنا اور خاک پہ مرنا دونوں برابر ہیں، کیا تخت پہ مرنا کیا خاک پہ مرنا، مطلب یہ ہے کہ دونوں برابر ہیں۔ یہاں بھی یہی بات ہے کہ تو وعظ کہہ یا نہ کہہ، واعظوں میں سے بن یا نہ بن، ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیا مطلب؟ جیسے آپ کی خدمت میں بارہا عرض کیا کہ قرآنِ کریم نے تو واقعے کو ایک عنوان کے طور پر نقل کر دیا، ورنہ اس ضمن میں بہت طویل کشاکشی ہوتی ہے، سالہا سال تک پیغمبر سمجھاتا ہے، بار بار انہیں سمجھاتا ہے، اور بُرے کاموں سے روکتا ہے، اور وہ جب نہیں سمجھتے تو یہ ایک قسم کا آخری فیصلہ ہوتا ہے قوم کا کہ بھائی! ہم تو تیری بات کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے، مرضی آئے تو کچھ کہہ مرضی آئے تو نہ کہہ، اب اس کے بعد پھر کسی کے کہنے کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے، یعنی ہمارے لئے تیرا بولنا نہ بولنا برابر ہے، تو مغز مار یا نہ مار، تو بول یا نہ بول، ہمیں بار بار کہہ یا نہ کہہ، ہمارے لئے برابر ہے۔ کیا مطلب؟ کہ ہم تیری باتوں کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے، نہ ہم تیری باتوں سے متاثر ہوتے ہیں، یہ گویا کہ قوم کی طرف سے آخری فیصلہ ہوتا ہے کہ ہم نہیں سننے کے، نہ ماننے کے، یہ ان کی طرف سے آخری فیصلہ

ہے، کہ ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا ہے، تو کہتا رہ یا نہ کہہ، نصیحت کر نہ کر، بول نہ بول، روک نہ روک، جو چاہے کر، ہم تیری باتوں کی پرواہی نہیں کرتے۔

اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِیْنَ: نہیں ہے یہ مگر پہلوں کی عادت، ہم نے سنا ہے کہ پہلے بھی کچھ اس قسم کے لوگ آتے تھے جو آزادانہ زندگی میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں، اور انسانوں کو اپنی خواہش کے مطابق رہنے نہیں دیتے، کبھی آخرت سے ڈراتے ہیں، کبھی اللہ کے عذاب سے ڈراتے ہیں، یہ پہلوں کی عادت چلی آ رہی ہے، اور تو بھی اسی طرح سے کر رہا ہے۔ نہیں ہے یہ مگر پہلوں کی عادت، جیسے دوسری جگہ عام طور پہ الفاظ آتے ہیں اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ (سورۂ انعام: ۲۵، وغیرہ) یہ بھی ایسے ہی ہے۔ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ہم عذاب دیے ہوئے نہیں ہیں، اللہ نے ہمیں خوش حالی دے رکھی ہے، کیسے عذاب آ جائے گا؟ یہ ہو ہی نہیں سکتا، نہیں ہیں ہم عذاب دیے ہوئے۔ فَكَذَّبُوْهُ: پس انہوں نے اس ہود علیہ السلام کو جھوٹا بتلایا، اس کی تکذیب کی، اور کہا کہ تو غلط کہتا ہے کہ ہمارا طریقہ غلط ہے، یا آخرت ہوگی، یا اللہ کا عذاب آئے گا، یا ان بتوں کو نہیں پوجنا چاہیے، تیری یہ باتیں ٹھیک نہیں ہیں۔ انہوں نے ہود علیہ السلام کو جھٹلایا۔ فَاَهْلَكْنٰهُمْ: پھر ہم نے انہیں ہلاک کر دیا، یہاں اُس ہلاکت کی تفصیل نہیں ہے کہ ان کو ہلاک کس طرح سے کیا تھا؟ دوسری جگہ ہے وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِیْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِیَةٍ ۝ سَخَّرَهَا عَلَیْهِمْ سَبْعَ لَیَالٍ وَّثَمٰنِیَةَ اَیَّامٍ (سورۂ حاقہ: پ ۲۹)، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اُوپر کوئی جھکڑ چلے تھے، آندھی تیز رفتار سے چلی تھی، تیز ہوا جس نے سب کچھ الٹ پلٹ کر کے رکھ دیا۔ سرکش قسم کی ہوا جو کسی سنبھالے میں نہیں آتی تھی، صرصر وہ ہوتی ہے جس کے چلنے کے ساتھ ساں ساں کی آواز پیدا ہوتی، صرصر کی آواز آتی ہے جب زور کے ساتھ آندھی چلتی ہے، تو یہ لفظ گویا کہ اسی کی ہیئت سے ہی ماخوذ ہے۔ اور سات راتیں اور آٹھ دِن تک وہ آندھی چلتی رہی، جس کے نتیجے میں قرآنِ کریم بیان کرتا ہے فَتَرَى الْقَوْمَ فِیْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِیَةٍ (سورۂ حاقہ) تُو دیکھتا ہے اس قوم کو کہ وہ اکھاڑ اکھاڑ کے پھینک دیے گئے ہیں، پچھاڑ دیے گئے۔ صرعیٰ صریع کی جمع ہے۔ اور گرے پڑے ہوئے ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے کھجور کے کھوکھلے تنے آندھی کے ساتھ گرتے ہیں، اس طرح سے اٹھا اٹھا کے پٹخ پٹخ کے مارے گئے، جو کہتے تھے، ہم سے زیادہ قوت والا کون ہے؟ اور کون ہمارے مقابلے میں آ سکتا ہے؟ تو وہ اللہ تعالیٰ کی ہوا کا مقابلہ نہیں کر سکے، مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (سورۂ حم سجدہ: ۱۵)، یہ انہی کا نعرہ تھا کہ ہم سے زیادہ قوت والا کون ہے۔ اور آج ان کا یہ علاقہ جس میں یہ قومِ عاد آباد تھی، ایک خوفناک قسم کا صحرا ہے جہاں آمدورفت بھی ممکن نہیں ہے، بڑے بڑے ریت کے ٹیلے ہیں، وہاں نہ کوئی آبادی ہے اور نہ وہاں آنا جانا ممکن ہے، اور وہ علاقہ ''ربعِ خالی'' کے نام سے مشہور ہے۔ فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ: پھر اس قومِ عاد نے ہود علیہ السلام کو جھٹلایا پھر ہم نے ان کو ہلاک کر دیا، ہلاک کرنے کی تفصیل آپ کی خدمت میں عرض کر دی گئی۔

آخر میں آیت وہی آ گئی جو ہر واقعے کے آخر میں آ رہی ہے، اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً: بے شک اس واقعے میں البتہ نشانی ہے، عبرت حاصل کرنے کی جگہ ہے، اگر کوئی دیکھے، اس کو سوچے، تو سوچ کے صحیح بات کو سمجھ سکتا ہے۔ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ اور نہیں ہیں ان میں سے اکثر ایمان لانے والے۔ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ: اور بے شک تیرا رب البتہ زبردست ہے رحم کرنے والا ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٤١﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿١٤٢﴾ اِنِّيْ لَكُمْ

ثمود نے رسولوں کو جھٹلایا (۱۴۱) جب کہا ان کو ان کے بھائی صالح نے: کیا تم ڈرتے نہیں ہو (۱۴۲) بے شک میں تمہارے لئے

رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿١٤٣﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١٤٤﴾ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ

امانت دار رسول ہوں (۱۴۳) تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو (۱۴۴) اور نہیں مانگتا میں تم سے اس تبلیغ پر کوئی اُجرت،

اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٤٥﴾ اَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَآ اٰمِنِيْنَ ﴿١٤٦﴾ فِيْ جَنّٰتٍ

نہیں ہے میرا اَجر مگر رَبّ العالمین کے ذِمّے (۱۴۵) کیا چھوڑ دیے جاؤ گے تم بے خوف ان نعمتوں میں جو یہاں موجود ہیں (۱۴۶) یعنی باغات میں

وَّعُيُوْنٍ ﴿١٤٧﴾ وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ﴿١٤٨﴾ وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا

اور چشموں میں (۱۴۷) اور کھیتیوں میں اور کھجوروں میں جن کے گچھے گھنے ہیں (۱۴۸) تراشتے ہو تم پہاڑوں کو ازروئے گھروں کے

فٰرِهِيْنَ ﴿١٤٩﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١٥٠﴾ وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿١٥١﴾ الَّذِيْنَ

اِتراتے ہوئے (۱۴۹) اللہ سے ڈرو اور میرا کہا مانو (۱۵۰) حد سے گزرنے والوں کے کہنے کی اطاعت نہ کرو (۱۵۱) جو کہ

يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿١٥٢﴾ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿١٥٣﴾

زمین میں فساد مچاتے ہیں اور حالات کو دُرست نہیں کرتے (۱۵۲) وہ کہنے لگے: اس کے سوا کچھ نہیں کہ تُو ان لوگوں میں سے جن پر سخت قسم کا جادو کر دیا جاتا ہے (۱۵۳)

مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۚ فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿١٥٤﴾ قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ

نہیں ہے تُو مگر انسان ہم جیسا ہی، لے آ کوئی نشانی اگر تو سچوں میں سے ہے (۱۵۴) صالح علیہ السلام نے کہا: یہ اُونٹنی ہے

لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿١٥٥﴾ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ

اس کے لئے پانی پینے کی باری ہے اور تمہارے لئے پانی پینے کی باری ہے معلوم دِن کی (۱۵۵) اور اس کو نہ چھونا کسی بُرائی کے ساتھ، پھر پکڑ لے گا تمہیں

عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿١٥٦﴾ فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ﴿١٥٧﴾ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ۭ اِنَّ فِيْ

بڑے دن کا عذاب (۱۵۶) انہوں نے اُس کی کونچیں کاٹ دیں پس ہو گئے وہ پچھتانے والے (۱۵۷) ان کو عذاب نے پکڑ لیا، بے شک

ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٥٨﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿١٥٩﴾

اس میں نشانی ہے، نہیں ہیں اکثر لوگ ایمان لانے والے (۱۵۸) اور بے شک تیرا رَبّ زبردست ہے رحم کرنے والا ہے (۱۵۹)

تفسیر

قومِ ثمود کا واقعہ

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ: ثمود نے رسولوں کو جھٹلایا۔ یہاں بھی وہی بات کہ ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح علیہ السلام پیغمبر بن کے آئے تھے، اور ایک کی تکذیب سب کی تکذیب ہے۔ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ: وہی الفاظ۔ جب کہا ان کو ان کے بھائی صالح علیہ السلام نے، کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ: بے شک میں تمہارے لئے امانت دار رسول ہوں، فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ: تم اللہ سے ڈرو، اور میری اطاعت کرو۔ وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ: اور نہیں مانگتا میں تم سے اس تبلیغ پر کوئی اُجرت، اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ: نہیں ہے میری اُجرت، نہیں ہے میرا اجر مگر ربّ العالمین کے ذِمے، اَتُتْرَكُوْنَ فِیْ مَا هٰهُنَاۤ کیا چھوڑ دیے جاؤ گے تم ان چیزوں میں جو یہاں موجود ہیں، یعنی جو نعمتیں یہاں موجود ہیں کیا تم ان میں چھوڑ دیے جاؤ گے بے خوف؟ کہ تم اسی طرح سے امن کے ساتھ عیش و عشرت میں مبتلا رہو گے، تمہارا کیا خیال ہے، تمہیں کوئی پوچھنے والا یا پکڑنے والا نہیں ہے؟ کیا چھوڑ دیے جاؤ گے تم بے خوف؟ کہ تم اس طرح سے بے خوف ہو کے اپنا وقت گزارتے رہو، اسی حالت میں تمہیں رہنے دیا جائے گا۔ فِیْ مَا هٰهُنَاۤ اس میں ابہام ہے، ان نعمتوں میں اس خوش حالی میں جو یہاں موجود ہے، جس کی تفصیل اگلی آیت میں آ گئی، فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ۙ وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِیْمٌ یہ فِیْ مَا هٰهُنَاۤ کا بیان ہے۔ ان نعمتوں میں جو یہاں موجود ہیں، یعنی باغات میں اور چشموں میں اور کھیتیوں میں اور کھجوروں میں طَلْعُهَا هَضِیْمٌ: طلع کہتے ہیں کھجور کے خوشے کو، اور هَضِیْمٌ کا معنی، یہ دیکھا ہوگا آپ نے جس وقت نیا نیا خوشہ نکلا کرتا ہے تو کھجوریں بالکل ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہیں جس طرح سے تہہ پہ تہہ لگی ہوئی ہوتی ہے، گتھم گتھا کے ساتھ بھی اس کا ترجمہ کیا گیا ہے، یعنی ایسی کھجوریں جن کے گچھے گتھم گتھا ہیں، جن کے گچھے گھنے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ گھسے ہوئے ہیں، یعنی جن میں کھجوریں بہت لگی ہوئی ہوتی ہیں۔

قومِ ثمود کی تعمیری مہارت

وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا فٰرِهِیْنَ: یہاں بھی وہی کفر و شرک کے ساتھ ساتھ، قوم جس قسم کی حرکتوں میں لگی ہوئی تھی، اور ان حرکتوں میں مبتلا ہونے کی وجہ سے وہ آخرت سے غافل تھے، ان میں سے ان کا ذوقِ تعمیرات بھی ہے۔ وہ (عاد والے) جس طرح سے باہر اُونچی اُونچی جگہوں پہ یادگاریں بناتے تھے، ان کی عادت تھی پہاڑوں کو تراش کر کر کے اندر اندر مکان بنایا کرتے تھے، اس میں ان کو اتنی مہارت حاصل تھی کہ آپ اینٹوں کے ساتھ اس طرح سے بہترین اور شان دار مکان نہیں بناتے جتنا وہ پہاڑوں کو تراش کر بنا لیا کرتے تھے...... مدینہ منورہ سے تبوک کو جائیں تو راستے میں وادی آتی ہے ''وادیٔ حجر'' اس کے اندر یہ قوم آباد تھی۔ مدینہ منورہ سے ترکوں نے جو ریلوے لائن بچھائی تھی اس ریلوے لائن پر اسٹیشن بھی ہے ''مدائن صالح'' کے نام سے، اور ان کی یادگاریں اب تک محفوظ ہیں، چونکہ وہ پہاڑ تراش کر کر کے بنائی گئی تھیں، تو ان کے ٹوٹنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، یعنی اب

ہزاروں سال گزر جانے کے بعد اس وقت تک ان کے وہ مکانات موجود ہیں، اور یادگار کے اندر اس علاقے کو رکھا ہوا ہے اور سیاح لوگ جاتے ہیں جا کے ان کو دیکھتے ہیں...... بعض جدید کتب میں ان کے مکانات کے فوٹو دیے ہوئے ہیں، کسی وقت آپ دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ سینکڑوں نہیں، ہزاروں سال گزر جانے کے بعد بھی آج ان کی پوزیشن کس طرح سے نمایاں ہیں، اور سرورِ کائنات ﷺ کے زمانے میں تو بہت ہی نمایاں ہوں گے، کیونکہ اس زمانے کو بھی چودہ سو سال گزر گئے ہیں، تو پتھروں کو تراش کر کر کے پہاڑوں کے اندر اندر وہ بہترین قسم کی عمارتیں بناتے تھے...... اور ادھر بھی آپ جائیں قبائلی علاقے میں، پشاور سے آگے طورخم کی طرف جاتے ہوئے بہت اونچے اونچے پہاڑ ہیں، تو وہاں بس میں بیٹھے ہوئے گزریں تو نظر آتا ہے کہ وہاں بھی پٹھان لوگ پہاڑوں کو تراش کے جس طرح سے ایک قدرتی غار ہوتی ہے تو قدرتی غار کی بجائے مصنوعی غار بنالی جاتی ہے، تو دروازے نظر آتے ہیں، پہاڑوں کے اندر لوگ رہتے ہیں۔ تو اب بھی لوگ بناتے ہیں لیکن جس قسم کا کمال انہیں حاصل تھا شاید ان کی نقالی یہ لوگ نہ کرسکتے ہوں۔

قومِ ثمود کا فخر وغرور

وَتَنۡحِتُوۡنَ مِنَ الۡجِبَالِ بُیُوۡتًا فٰرِهِیۡنَ: فارهین یہ لفظ لیا گیا ہے فراہت سے۔ فَرَاهَةٌ کہتے ہیں الکیس والنشاط (نسفی)، چستی چالاکی کو ہوشیاری کو، اور اسی طرح یہ لفظ خوشی کے لئے بولا جاتا ہے، تو یہاں ترجمہ دو طرح سے کیا گیا ہے۔ یا تو مَرِحِیۡنَ کے ساتھ کیا گیا ہے (مظہری)، یا پھر اس کا ترجمہ کیا گیا ہے حاذقین کے ساتھ (جلالین وغیرہ)۔ تراشتے ہو تم پہاڑوں کو از روئے گھروں کے مہارت دکھاتے ہوئے، بہت تجربے کے ساتھ، تجربہ کاری کے ساتھ۔ یا یہ ہے کہ اِتراتے ہوئے، فخر وتکبر کرتے ہوئے۔ دونوں طرح سے مفہوم واضح ہے، اور یہ دونوں صفتیں ان میں پائی جاتی تھیں، ہر کوئی نئی سے نئی کاریگری دکھاتا، نیا سے نیا تجربہ دکھاتا، اور اپنے تجربے کے ساتھ وہ یوں تراش کر کر کے مکان بناتے تھے، اور اس میں فخر اور اترانا بھی تھا۔ تراشتے ہو تم پہاڑوں کو از روئے گھروں کے یعنی پہاڑوں کو تراش تراش کے گھر بناتے ہو۔ نحت کہتے ہیں تراشنے کو، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعے میں یہ لفظ آیا تھا اَتَعۡبُدُوۡنَ مَا تَنۡحِتُوۡنَ (سورۂ صافات: ۹۵) کیا تم پوجتے ہو ان چیزوں کو جن کو خود تراشتے ہو، وہاں بھی یہی نحت کا لفظ تھا، تو فارهین کا معنی ہے ہوشیاری کے ساتھ، ہوشیار بنتے ہوئے، تجربہ کار بنتے ہوئے، یا مطلب ہے کہ اِتراتے ہوئے، فخر کرتے ہوئے۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیۡعُوۡنِ: اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو۔ وَلَا تُطِیۡعُوۡۤا اَمۡرَ الۡمُسۡرِفِیۡنَ: حد سے گزرنے والوں کے کہنے کی اطاعت نہ کرو، مسرفین سے ان کے لیڈر اور سردار مراد ہیں۔ الَّذِیۡنَ یُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا یُصۡلِحُوۡنَ: جو کہ زمین میں فساد مچاتے ہیں، اور حالات کو درست نہیں کرتے۔

قوم کا آخری فیصلہ

قَالُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مِنَ الۡمُسَحَّرِیۡنَ: یہاں بھی وہی بات، قوم کا آخری فیصلہ۔ وہ کہنے لگے اس کے سوا کچھ نہیں کہ تو مسحرین میں سے ہے۔ مُسَحَّر یہاں مسحور کے معنی میں ہے، لیکن باب تفعیل پر چلے جانے کی وجہ سے اس میں اور قوت اور شدت پیدا

ہوگئی۔مُسَحَّرٌ مَسْحُوْر: جس کے اوپر جادو کردیا گیا ہو۔تو ان لوگوں میں سے ہے جن کے اوپر کوئی سخت قسم کا جادو کردیا گیا،اور اس جادو کے اثر سے اس کا دماغ ٹھکانے نہیں رہا،اور اس قسم کی بہکی بہکی باتیں کرتا ہے،تو بھی انہی لوگوں میں سے ہے جس کی کسی نے جادو کر کے عقل ماردی ہو۔سورۂ ہود میں آپ کے سامنے یہ لفظ آئے تھے،کہ انہوں نے کہا تھا کہ اے صالح! تیرے متعلق تو ہمیں بڑی اُمیدیں تھیں کہ تُو ہونہار بچہ ہے،بڑا ہوگا،اپنے آباؤاجداد کا نام روشن کرے گا،قوم کو ترقی دلائے گا۔تو یہ کیا ہوگیا؟ تیرا دین تجھے اس بات سے روکتا ہے؟ کہ ہم یہ کریں،وہ کریں،اس قسم کی باتیں وہاں ذکر کی گئی تھیں،یعنی ہمیں تو تیرے متعلق بڑی توقعات تھیں،لیکن یہ تُو نے کیسی باتیں کرنی شروع کردیں کہ اپنے ہی آباؤاجداد کی تردید کرنے لگ گئے،انہی کو کافر و مشرک کہنے لگ گئے، انہی کو جہنمی کہنے لگ گئے،ان کے طریقے کو غلط بتانے لگ گئے۔اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ: اس کا حاصل ترجمہ یہ ہوجائے گا کہ تو دیوانوں میں سے ہے یعنی ان لوگوں میں سے ہے جن کے اوپر سخت قسم کا جادو کردیا جاتا ہے جس کے بعد ان کے حواس ٹھیک نہیں رہتے،مخبوط الحواس ہوجاتے ہیں۔مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا: نہیں ہے تو مگر انسان ہم جیسا ہی۔

ناقۂ صالح

فَاْتِ بِاٰیَۃٍ اِنْ کُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ: لے آ کوئی نشانی اگر تو سچوں میں سے ہے،ہمیں کوئی واضح نشانی دکھا اگر تو اپنے اس دعوے کے اندر سچا ہے۔تفصیل سورۂ ہود میں آئی تھی کہ معجزے کے طور پر اللہ تعالیٰ نے کسی چٹان میں سے ایک اونٹنی نکالی،اور اس اونٹنی کو نشانی قرار دیا حضرت صالح علیہ السلام کی صداقت پر،اور وہ اونٹنی کچھ عجیب الخلقت تھی،قد کے لحاظ سے بڑی تھی،جب وہ پانی پینے کے لئے جاتی تھی تو باقی جانور ڈرتے تھے،اور وہ پانی پینے کے لئے جاتی تو پانی سارا پی لیتی تھی،جس کی بنا پر قوم کے ساتھ کشاکشی شروع ہوگئی اس اونٹنی کے بارے میں،تو حضرت صالح علیہ السلام نے باریاں باندھ دیں کہ ایک دِن کنویں پہ یہ پانی پینے کے لیے جایا کرے گی تمہارے جانور نہ جائیں،اور ایک دِن تمہارے جانور جایا کریں گے یہ نہیں جائے گی۔اور یہ یاد رکھو!اب یہ نشانی اللہ کی طرف سے تمہاری مانگی ہوئی آئی ہے،اس کی بے ادبی نہ کرنا،اور اسے کسی بُرائی کے ساتھ نہ چھونا،اس کو تکلیف نہ پہنچانا،ورنہ اللہ کا عذاب آجائے گا۔لیکن وہ کہاں برداشت کرسکتے تھے کہ ایک دِن ان کے جانور پانی نہ پئیں،اور یہ اونٹنی جائے اور اکیلی پئیں۔

قومِ ثمود پر اللہ کا عذاب

اور اس طرح سے ان لوگوں نے تکلیف جو محسوس کی،تو آخر نتیجہ وہی نکلا کہ انہوں نے مشورہ کیا،مشورہ کر کے ان میں سے ایک آدمی اٹھا جو زیادہ جری سمجھا جاتا تھا،زیادہ خبیث النفس تھا،زیادہ دلیر تھا،اس نے اس اونٹنی کی کونچیں کاٹیں،اور اس طرح سے اس کو ہلاک کردیا،جب ہلاک کردیا تو پھر حضرت صالح علیہ السلام نے کہا تھا کہ اب تین دِن کے اندر اندر تم پہ عذاب آجائے گا،تو تین دِن کے بعد کوئی زلزلہ آیا،کوئی شور برپا ہوا،جس طرح سے صیحہ کا لفظ آیا ہے وَاَخَذَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الصَّیْحَۃُ (سورۂ ہود:۶۷) صیحہ کے بارے میں عام طور پر مفسرین کہتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام نے آکر چیخ ماری اور اس چیخ کے ساتھ ہی ان کے کلیجے پھٹ گئے،یہ بھی

لفظ صیحہ کی صرف تعبیر ہے، کسی صحیح حدیث کے اندر اس قسم کی بات نہیں آتی، لفظوں کی طرف دیکھ کے ایک تعبیر کی جاتی ہے۔ شور و غوغہ نے ان کو پکڑ لیا، صیحہ کا مصداق یہ بھی ہوتا ہے۔ اور رجفۃ بھی آیا ہے فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ (سورۂ اعراف: ۷۸) کہ نیچے سے زلزلہ آیا، اور اس قسم کی کوئی مصیبت آئی کہ ساری قوم شور و غوغہ کے اندر مبتلا ہوگئی اور اس کے بعد بھسم ہوگئی، جس طرح یہاں کوئی نام و نشان ہی نہیں تھا، سارے کے سارے اس طرح سے مر گئے۔ اس عذاب کی تفصیل بھی دوسری جگہ موجود ہے۔

هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ: یہ ناقہ ہے اس کے لئے پانی پینے کی باری ہے اور تمہارے لئے پانی پینے کی باری ہے معلوم دن کی، معلوم اور متعین دن کی باری تمہارے لئے، اسی طرح سے پانی پینے کی باری اس کے لئے، وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ اور اس کو نہ چھونا کسی برائی کے ساتھ یعنی اسے برائی نہ پہنچانا، فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ پھر پکڑ لے گا تمہیں بڑے دن کا عذاب، فَعَقَرُوْهَا انہوں نے اس کی کونچیں کاٹ دیں یعنی اس کو ہلاک کر دیا، فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ پس ہو گئے وہ پچھتانے والے، بعد میں جب اللہ کا عذاب آیا تو پھر پچھتانے لگے، لیکن:

اب پچھتائے کیا ہوت   جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

جب وقت گزر گیا تو اب پچھتانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہو گئے وہ پچھتانے والے، فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ان کو عذاب نے پکڑ لیا، اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً بے شک اس میں نشانی ہے وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ نہیں ہیں اکثر لوگ ایمان لانے والے، وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ اور بے شک تیرا رب زبردست ہے، رحم کرنے والا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ِۨالْمُرْسَلِيْنَ ۝١٦٠ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝١٦١

لُوط کی قوم نے بھی رسولوں کو جھٹلایا ۝١٦٠ جب کہا ان کو ان کے بھائی لُوط علیہ السلام نے: کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ ۝١٦١

اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝١٦٢ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝١٦٣ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ

بے شک میں تمہارے لئے امانت دار رسول ہوں ۝١٦٢ پس تم اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو ۝١٦٣ نہیں سوال کرتا میں تم سے اس تبلیغ پر

اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝١٦٤ اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ

کسی اُجرت کا، نہیں ہے میرا اَجر مگر رَبّ العالمین کے ذمے ۝١٦٤ سارے جہانوں میں سے کیا تم ہی مذکروں

الْعٰلَمِيْنَ ۝١٦٥ وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ

کے پاس آتے ہو؟ ۝١٦٥ چھوڑتے ہو تم ان بیویوں کو جو اللہ نے تمہارے لئے پیدا کی ہیں، بلکہ تم حد سے نکلنے

عٰدُوْنَ ﴿١٦٦﴾ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ ﴿١٦٧﴾ قَالَ اِنِّيْ

والے لوگ ہو ﴿١٦٦﴾ کہنے لگے: اگر تو باز نہیں آئے گا، اے لُوط! تو البتہ ہو جائے گا تُو نکالے ہوؤں میں سے ﴿١٦٧﴾ کہا لُوط نے: بے شک میں

لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِيْنَ ﴿١٦٨﴾ رَبِّ نَجِّنِيْ وَاَهْلِيْ مِمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٦٩﴾

تمہارے عمل سے بیزار لوگوں میں سے ہوں ﴿١٦٨﴾ اے میرے ربّ! نجات دے مجھے اور میرے اہل کو اس سے جو یہ کرتے ہیں ﴿١٦٩﴾

فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ﴿١٧٠﴾ اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ﴿١٧١﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا

ہم نے اس کو نجات دی اور اس کے گھر والوں کو سب کو ﴿١٧٠﴾ مگر ایک بڑھیا جو پیچھے رہنے والوں میں سے تھی ﴿١٧١﴾ پھر ہم نے

الْاٰخَرِيْنَ ﴿١٧٢﴾ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿١٧٣﴾ اِنَّ فِيْ

باقیوں کو نیست و نابود کر دیا ﴿١٧٢﴾ اور ہم نے اُن کے اُوپر ایک خاص قسم کی بارش برسائی، پس منذَرین کی بارش بہت بُری تھی ﴿١٧٣﴾ بے شک اس

ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٧٤﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿١٧٥﴾

واقعے میں البتہ نشانی ہے اور ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں ﴿١٧٤﴾ اور بے شک تیرا ربّ زبردست ہے رحمت والا ہے ﴿١٧٥﴾

تفسیر

قومِ لُوط کا واقعہ

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ِۨالْمُرْسَلِيْنَ: لُوط علیہ السلام کی قوم نے بھی رسولوں کو جھٹلایا، ایک کی تکذیب سب کی تکذیب ہے، واقعہ آپ کے سامنے کئی سورتوں میں مفصل گزر چکا ہے۔ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ جب کہا ان کو ان کے بھائی لُوط نے۔ یہ اُخوّتِ وطنی ہے، کیونکہ لُوط علیہ السلام ان کے قومی بھائی نہیں تھے یعنی نسبی بھائی نہیں تھے۔ یاد ہو گا آپ کو کہ لُوط علیہ السلام عراق کے علاقے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ہجرت کر کے آئے تھے، اور یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس طرح سے تبلیغ شروع کی تو یہ بھتیجے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے، تو ان کو اپنے قریب دوسرے مرکز میں جو بڑا شہر تھا سدوم، اور اس کے ملحق دوسری بستیاں تھیں، وہاں ان کو تبلیغ کے لئے بھیج دیا، یہ نسبی بھائی نہیں ہیں ان کے، تو اس لئے یہ اُخوّتِ وطنی ہے، ایک علاقے میں رہتے تھے، ساتھ ہی رہتے تھے، تو ایسے تھے جیسے ایک ہی قوم کے بن گئے، اور ایک ہی برادری ہو گئی، ورنہ نسبی طور پر ان کے ساتھ یہ شریک نہیں ہیں۔ اَلَا تَتَّقُوْنَ کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ: بے شک میں تمہارے لئے امانت دار رسول ہوں۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ: پس تم اللہ سے ڈرو، اور میرا کہنا مانو۔ وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ: نہیں سوال کرتا میں تم سے اس تبلیغ پر کسی اُجرت کا۔ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ: نہیں ہے میرا اجر مگر ربّ العالمین کے ذمے۔

قومِ لُوط کا اخلاقی فساد اور ایک اہم غلطی کی نشان دہی

اب یہ ان کا اخلاقی فساد ہے جس کو آگے ذکر کیا، جیسے پہلے دونوں قومیں آپ کے سامنے گزریں اُن میں تمدّنی فساد تھا، تو ان میں اخلاقی فساد ہے، کُفر و شرک سے ایک زائد چیز جس پر تنقید کی جارہی ہے، تفصیل بار ہا آپ کے سامنے ذکر کی گئی کہ ان میں اخلاقی فساد یہ تھا کہ یہ مَردوں کے ساتھ شہوت رانی کرتے تھے، عورتوں کی طرف ان کا رُجحان نہیں تھا، جس کے لئے بعد میں لوگوں نے لفظ ''لواطت'' بنالیا...... یہ لفظِ ''لواطت'' مُحْدَث ہے، قرآن وحدیث میں اس کا ذکر نہیں آتا، یہ لفظ اس فعل کے لیے بعد میں لوگوں کی نئی ایجاد ہے، حدیث شریف میں جہاں بھی اس کا ذکر آیا، تو اتنی لمبی ترکیب کے ساتھ حضور ﷺ اس کو ذکر کرتے ہیں کہ ''مَنْ عَمِلَ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ ''[1] جو قومِ لوط والا عمل کرے۔ وہاں ''لُوطی'' کا لفظ نہیں بولا گیا، یہ لفظ ''لواطت'' بعد میں بنایا گیا، یہ لفظ محدث ہے، اور یہ مذموم لفظ ہے، کریہہ لفظ ہے، اچھا لفظ نہیں ہے۔ اور جس نے بھی اس کو ایجاد کیا اس نے ظلم کیا ہے کہ حضرت لُوط علیہ السلام کے نام کو ہی اس کا ماخذ قرار دے دیا، حالانکہ لُوط علیہ السلام کے ساتھ اس فعل کی کیا نسبت؟ یہ فعل تو ان کی قوم کا ہے، لیکن ان کے نام کو ماخذ بنا کے اس سے لفظ بنالیا۔ اب کوئی شخص ''عیسوی'' کہلاسکتا ہے، ''یوسفی'' کہلاسکتا ہے، ''ابراہیمی'' کہلاسکتا ہے، ''نوحی'' کہلاسکتا ہے، ''داوٗدی'' کہلاسکتا ہے، ''ہودی'' کہلاسکتا ہے، ''صالحی'' کہلاسکتا ہے، ان انبیاء علیہم السلام کے نام کے ساتھ نسبت انسان کرسکتا ہے اور اس نسبت پر فخر بھی کرسکتا ہے، لیکن آج اس لفظ کے بن جانے کی وجہ سے کوئی شخص ''لُوطی'' نہیں کہلاسکتا، کہ اپنی نسبت لُوط علیہ السلام کی طرف کردے، کیونکہ جب ''لُوطی'' کا لفظ بولا جائے تو فوراً ذہن اسی خبیث فعل کی طرف جاتا ہے، اس لئے یہ لفظ بعد کی ایجاد ہے، سرورِ کائنات ﷺ کے کلام میں بھی کہیں موجود نہیں، جب بن گیا تو پھر (عربی) ادب میں بھی شامل ہوگیا، کلام میں بھی شامل ہوگیا، تو اَب فقہ کی کتابوں میں بھی آجاتا ہے، تفاسیر کی کتابوں میں بھی آجاتا ہے، لیکن یہ لفظ ہے بعد کا،[2] ......تو ان میں یہ اخلاقی بگاڑ تھا کہ شہوت رانی کے لئے مَرد، مَردوں کو تجویز کرتے تھے، جس کو آج آپ ''اَمرد پرستی'' سے تعبیر کرلیں، ''لونڈا بازی'' سے تعبیر کرلیں، یہی حرکت تھی ان لوگوں کے اندر، عورتوں کی طرف رغبت نہیں تھی، مَردوں کی طرف ان کا رُجحان تھا، تو اس اخلاقی زوال پر حضرت لُوط علیہ السلام نے ان کو متنبہ کیا۔

''اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ'' کا پہلا مفہوم

مِنَ الْعٰلَمِيْنَ کا ترجمہ دو طرح سے کیا گیا ہے، سارے جہانوں میں سے کیا تم ہی مذکروں کے پاس آتے ہو؟ یعنی یہ حرکت صرف تم میں ہی پائی جاتی ہے دنیا میں اور کسی کے اندر نہیں پائی جاتی، قرآنِ کریم نے جس طرح سے دوسری جگہ ذکر کیا ہے، مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (سورۂ اعراف: ۸۰) عالمین میں سے کوئی شخص بھی اس حرکت کے ساتھ تم سے سابق نہیں، پہلے کسی

---

(۱) مشکوٰۃ ۲/ ۳۱۲، کتاب الحدود، فصل ثانی۔ نیز دیکھئے: ترمذی ۲/ ۲۷۰، باب ما جاء فی حد اللوطی.

(۲) دیکھئے: ''خطباتِ حکیم الامت'' ۳/ ۱۷۴۔

نے بھی یہ حرکت نہیں کی سارے جہانوں میں سے، یہ حرکت تم نے ہی شروع کی ہے، یعنی یہی نہیں کہ تم اس عمل کے اندر مبتلا ہو، بلکہ اس عمل کے موجد بھی ہو، سارے جہانوں میں کوئی دوسرا شخص نہیں جس نے اس قسم کی حرکت کی ہو۔

قومِ لوط کا عمل ''فطرتِ حیوانی'' کے بھی خلاف ہے

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے تو انسان کے ساتھ باقی حیوان بھی ہیں جن کے اندر شہوت رکھی ہے اور اس شہوت کے نتیجے میں مذکر کا رُجحان مؤنث کی طرف ہے۔ یہ ایک حیوانی فطرت ہے مذکر کا رُجحان مؤنث کی طرف، اور اسی رُجحان میں ہی اللہ تعالیٰ کی حکمتیں ہیں، نسل پھیلتی ہے، آبادی ہوتی ہے، یہی حکمتیں ہیں کہ دونوں کو ایک دوسرے کی طرف راغب کر دیا، لیکن ساری حیوانی تاریخ اُٹھا کے دیکھو! کسی حیوان میں بھی نُر کا رُجحان آپ کو نُر کی طرف نہیں ملے گا کہ کوئی حیوان اپنی قضائے شہوت کے لئے نُر کو تجویز کر لے، ایسی آپ کو حیوان کی تاریخ میں کوئی چیز نہیں ملے گی۔ کتابوں میں لکھا ہوا دیکھا ہے واقعہ کا مشاہدہ ہمارا نہیں، یہ ''سیرت حلبیہ'' ہے اس میں ایک جگہ بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''قِيْلَ وَلَا يَعْمَلُ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ مِنَ الْحَيَوَانِ إِلَّا الْحِمَارُ وَالْخِنْزِيْرُ''[1] کہ حیوانات میں سے یہ لواطت کا فعل کسی میں نہیں پایا جاتا سوائے گدھے اور خنزیر کے۔ اب خنزیروں کے ریوڑ تو ہم نے اس طرح سے عام طور پر پھرتے ہوئے نہیں دیکھے، کہ یہ دیکھیں کہ یہ بھی آپس میں اس طرح سے مستیاں کرتے ہیں یا نہیں کرتے، لیکن گدھے تو ہمارے آس پاس بہت ہیں اور آپ حضرات بھی دیکھتے رہتے ہیں، لیکن میں نے اتنی طویل زندگی میں کبھی کسی گدھے کو گدھے کے ساتھ قضائے شہوت کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اور خنزیروں کا معاملہ ہماری آنکھوں کے سامنے نہیں ہے۔ تو اس لکھنے والے کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر کوئی واقعہ شاذ و نادر پیش آئے تو یہ گدھے اور خنزیر میں تو آتا ہے، باقی حیوانوں میں سے کسی حیوان کے اندر یہ واقعہ پیش نہیں آتا۔ نہ بکرا بکرے سے، نہ سنڈھا سنڈھے سے، نہ بیل بیل سے، اور نہ چھترا چھترے سے، یہ کوئی واقعہ پیش نہیں آتا۔ کبھی شاذ و نادر اگر کوئی بات پیش آ ہی جائے تو یہ صرف گدھوں میں اور خنزیروں میں ہی پیش آتی ہے، دوسرے حیوانوں کے اندر یہ سلسلہ نہیں پایا جاتا، جس سے معلوم یہ ہو گیا کہ یہ فعل حیوانی فطرت کا تقاضا نہیں ہے، یہ خالص شیطانی حرکت ہے۔

اس شیطانی فعل کا آغاز کیسے ہوا؟

اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کلام کے اندر ایک جگہ وعظ میں دیکھا کہ یہ حرکت پھر شروع کیسے ہوئی؟ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں تو کیا، حیوان کی فطرت میں بھی یہ بات نہیں ڈالی، کہ قضائے شہوت کے لئے نُر، نُر کی طرف متوجہ ہو، یہ تو حیوانی فطرت بھی نہیں ہے، تو یہ ان میں شروع کس طرح سے ہو گئی؟ جب اس قوم سے پہلے بھی یہ بات موجود نہیں تھی، انہوں نے اس کو کس طرح ایجاد کر لیا؟ تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کسی اسرائیلی روایت کے حوالے سے بیان فرماتے ہیں کہ یہ خالص شیطانیت ہے، اور شیطان کی تعلیم کے ساتھ ہی یہ فعل شروع ہوا۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص کا باغ تھا اور شیطان ایک خوبصورت لونڈے کی شکل میں اس

---

(۱) سیرۃ حلبیہ ج ۱ ص ۳۳۔ یہ قول محمد بن سیرین کا ہے دیکھئے: تفسیر قرطبی، سورۂ اعراف: ۸۰، اور انعام: ۱۴۵ کے تحت۔ تفسیر درمنثور، اعراف: ۸۰ کے تحت۔

باغ میں جاتا، اور باغ میں سے انگور توڑ کر کھانے لگ جاتا، باغ والے نے پکڑا، پکڑ کے اسے مارا، اور چھوڑ دیا۔ لیکن وہ باز نہیں آیا، دوسرے دن آ کے پھر اس نے ایسی حرکت کی، پھر اس نے پیٹا لیکن پھر وہ باز نہیں آیا، پھر اس طرح سے نقصان کرتا رہا، تو باغ والا اس کو روک روک کے اور مار مار کے عاجز آ گیا، اور وہ تھا کہ باز ہی نہیں آتا تھا، اس طرح سے نقصان کرتا رہا۔ آخر اس باغ والے نے پوچھا کہ بد بخت! تو کسی طرح سے رُک بھی سکتا ہے؟ وہ کہنے لگا: ہاں ایک کام کرو، تب میں رکوں گا۔ وہ کہنے لگا کہ وہ کیا کام ہے؟ تو اس نے یہ نشاندہی کی، اور اس باغ والے نے اس کے ساتھ یہ حرکت کرنی شروع کر دی، اس کو جو لطف اور مزہ آیا تو اس نے دوسروں کو بتانی شروع کر دی، اس طرح سے یہ بیماری ساری قوم کے اندر یوں پھیل گئی (خطبات حکیم الامت ج ۳ ص ۱۷۳)۔

تو یہ فعل خالص شیطان کی تعلیم کے ساتھ شروع ہوا، اور یہ خالص شیطانی فعل ہے، اس کا حیوانی فطرت کے ساتھ کوئی کسی قسم کا تعلق نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ یہ خالص شیطانی تعلیم ہے، اس لئے حضرت لُوط علیہ السلام کہتے ہیں کہ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ (سورۂ اعراف: ۸۰) سارے جہانوں میں سے اس حرکت پر تم سے کوئی بھی سبقت نہیں لے گیا، جس سے معلوم ہو گیا کہ موجد بھی یہی ہیں، اور پھر اس فعل کی یہ نحوست ہے کہ جن لوگوں کو اس فعل کی طرف رغبت ہو جایا کرتی ہے ان کو بیویوں اور عورتوں کی طرف کوئی رغبت نہیں ہوا کرتی، اور اس طرح سے ان کی نسل تباہ ہوتی ہے، اور سارے کا سارا معاملہ فساد کی طرف چلا جایا کرتا ہے۔

''اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِیْنَ'' کا دُوسرا مفہوم

ایک ترجمہ تو یہ ہوا کہ سارے جہانوں میں سے کیا تم ہی اس حرکت کا ارتکاب کرتے ہو، تم مذکروں کے پاس آتے ہو۔ اور دوسرا ترجمہ یوں بھی کیا گیا ہے کہ مِنَ الْعٰلَمِیْنَ کا تعلق الذُّكْرَانَ سے لگا دیجئے کہ سارے جہانوں میں سے مذکر ہی ہیں جن کے پاس تم آتے ہو، تمہیں قضائے شہوت کے لئے کوئی دوسری چیز (عورت) نہیں ملتی۔ سارے جہانوں میں سے مذکروں کے پاس ہی تم آتے ہو؟ اور جو اللہ نے تمہارے لیے تمہاری بیویاں پیدا کی ہیں ان کو تم چھوڑتے ہو؟ وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ: مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ، ''ما'' کا بیان ہے۔ چھوڑتے ہو تم ان بیویوں کو جو اللہ نے تمہارے لئے پیدا کی ہیں۔ اور لُوط علیہ السلام کے قصے میں سورۂ ہود کے اندر یہ تفصیل آئی تھی، جب وہ ان مہمانوں کو پکڑنے کے لئے آئے تھے، بار بار تقاضا کرتے تھے، تو حضرت لُوط علیہ السلام نے کہا تھا: هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِیْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ (سورۂ ہود: ۷۸)۔ اسی طرح سورۂ حجر میں آیا تھا: هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِیْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ (سورۂ حجر: ۷۱) کہ میری بیٹیاں جو تمہارے گھروں میں موجود ہیں یعنی تمہاری بیویاں (کیونکہ نبی ساری قوم کا باپ ہوتا ہے، تو گھروں میں جو بچیاں ہوتی ہیں، تو بزرگ ان کو اپنی بیٹیاں کہا کرتے ہیں) تو اگر تم نے یہ قضائے شہوت کا معاملہ کرنا ہی ہے تو میری بیٹیاں جو تمہارے گھروں میں ہیں، جاؤ تم جا کے ان کے ساتھ جائز طریقے سے قضائے شہوت کرو۔ وہ کہتے تھے کہ تجھے پتا ہے کہ ہمیں تیری بیٹیوں کی طرف کوئی رغبت نہیں۔ تو وہاں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب اس فعل کا جوش پیدا ہو جاتا ہے اور انسان اس فعل کا عادی ہو جاتا ہے تو پھر بیویوں سے بے رغبتی ہو جاتی ہے۔ تو یہاں بھی یہی ہے کہ تم چھوڑتے ہو ان بیویوں کو جو اللہ نے تمہارے

لئے پیدا کی ہیں، بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ: تمہاری یہ حرکت کسی ضرورت یا کسی دلیل پہ مبنی نہیں، بلکہ تم لوگ حد سے نکلنے والے ہو، تم حدِ انسانیت سے نکل گئے بلکہ حدِ حیوانیت سے نکل گئے، جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہ کسی حیوان کا فعل بھی نہیں ہے۔

اس شیطانی فعل کی سزا زِنا سے بھی سخت ہے

تو جب کوئی شخص اس فعل کے اندر مبتلا ہو تو اس کو خاص طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ اس سے بڑھ کر اس دنیا کے اندر شیطان کی اتباع کسی فعل میں نہیں جتنی اس فعل میں ہے، اس لئے شریعت نے اس فعل کی سزا بھی زنا کے مقابلے میں سخت رکھی ہے، کہ مرد کی طرف عورت کی رغبت یہ تو ایک طبعی چیز ہے، اگر کوئی شخص کسی عورت کی طرف رغبت کرتا ہے تو حیوانیت سے باہر نہیں ہے، حیوان کا تقاضا ہے کہ مذکر کی رغبت مؤنث کی طرف ہوتی ہے، ہاں البتہ اگر کسی قاعدے اور قانون کا پابند ہے تو انسانیت ہے، اگر کسی قاعدے قانون کا پابند نہیں تو حیوانیت سے باہر نہیں، کم از کم حیوان ہے، لیکن جب مذکر کا رجحان مذکر کی طرف ہو تو سمجھو کہ حیوانیت سے بھی گیا۔ تو سزا اس کی اس لئے سخت رکھی گئی زنا کی سزا کے مقابلے میں، کوئی کہتا ہے کہ ان کو زندہ جلا دینا چاہیے، کوئی کہتا ہے کہ ان کو دیوار گرا کے نیچے دبا دینا چاہیے، کوئی کہتا ہے کہ پہاڑ کی چوٹی پر لے جا کر اس کو سر کے بل گراؤ اور اس طرح سے گرا کر اس کو مار دیا جائے۔ بہرحال تعزیر ہے، اس پر حد متعین نہیں، تعزیر ہے اور وہ حاکم کی صوابدید پہ ہے، جس طرح سے چاہے ان کو دردناک طریقے سے قتل کر سکتا ہے۔ جیسے روایت میں آتا ہے کہ ''مَنْ وَجَدْتُّمُوْهُ يَعْمَلُ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ فَاقْتُلُوا الْفَاعِلَ وَالْمَفْعُوْلَ بِهٖ''[1] کہ جس کو تم دیکھو کہ وہ عملِ قومِ لُوط کرتا ہے تو فاعل اور مفعول بہ دونوں کو قتل کر دیا کرو۔ اب وہ قتل کی صورتیں ائمہ کے نزدیک مختلف ہیں، ائمہ ثلاثہ اور صاحبین رحمہم اللہ کے نزدیک ان کی سزا زِنا والی ہے، اور حضرت ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس کی سزا تعزیر ہے وہ حاکم کی صواب دید پر ہے، وہ جس طرح سے چاہے ان کو مروا دے۔ تو خلافِ فطرت فعل ہونے کی بنا پر اس کی سزا بھی سخت رکھی گئی۔ تو بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ کا یہ معنی ہے کہ تم ایسے لوگ ہو جو حدِ انسانیت سے بلکہ حدِ حیوانیت سے بھی نکل گئے۔

قوم کی دھمکی اور لُوط علیہ السلام کی دُعا

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ: بس آخر وہی دھمکی کہ اے لُوط! اگر تُو باز نہیں آئے گا ہمیں کہنے سننے سے، تو البتہ ہو جائے گا تُو نکالے ہوؤں میں سے، یعنی ہم تجھے بستی میں رہنے ہی نہیں دیں گے، ہم تجھے اپنی بستی سے نکال دیں گے۔ قَالَ اِنِّيْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِيْنَ: اَلْقَالِيْنَ قَلٰى يَقْلِيْ سے ہے، بےزار ہونا۔ بے شک میں تمہارے عمل سے بیزار لوگوں میں سے ہوں یعنی میں بہت بیزار ہوں۔ رَبِّ نَجِّنِيْ وَاَهْلِيْ مِمَّا يَعْمَلُوْنَ: آخر جب معاملہ حد سے بڑھ گیا تو حضرت لُوط علیہ السلام نے دُعا کی کہ اے میرے رَبّ! مجھے نجات دے اور میرے اہل کو ما یعملون کے وبال سے، یہاں وبال کا لفظ محذوف نکالیں گے مِنْ جَزَاءِ مَا يَعْمَلُوْنَ، یا من وبالِ ما یعملون، جو کچھ یہ کرتے ہیں یا اللہ! اب اس پر تیرا عذاب تو آئے گا، مجھے اس عذاب سے بچا لے۔ جو کچھ یہ کرتے ہیں مجھے اس سے نجات دے یعنی اس کے وبال اور اس کے عذاب سے مجھے نجات دے۔ فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ: ہم نے

---

(۱) مشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۱۲، کتاب الحدود، فصل ثانی۔ ترمذی ۲۷۰/۱ باب ما جاء فی حد اللوطی

اس کو نجات دی، اور اس کے گھر والوں کو، سب کو۔ اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ مگر ایک بڑھیا جو پیچھے رہنے والوں میں تھی، اس سے حضرت لُوط علیہ السلام کی بیوی مراد ہے، چونکہ یہ کافرہ اور مشرکہ تھی، اس کی ہمدردیاں انہی لوگوں کے ساتھ تھیں تو اس لئے وہ بھی اس عذاب کے اندر ہلاک ہوگئی۔ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ: ثُمَّ کا معنی ہے ان کے بچا لینے کے بعد ہم نے باقیوں کو نیست و نابود کر دیا۔ دَمَّرْ تَدْمِيْرًا یہ لفظ سورۂ فرقان میں بھی آیا تھا جس کا معنی آپ کے سامنے ذکر کیا گیا تھا کہ کسی چیز کو ایسے طور پر توڑ دینا کہ پھر اس کو جوڑا نہ جاسکے۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ بالکل ریزہ ریزہ کر دی، نیست و نابود کر دی، کسر الشیء علی وجہ لا یمکن اصلاحہ۔ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا: اس عذاب کی تفصیل بھی سورۂ ہود میں آئی تھی،[1] اور ہم نے ان کے اوپر ایک خاص قسم کی بارش برسائی، اس خاص قسم کی بارش سے مراد پتھروں کی بارش ہے، فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ: ان منذرین کی بارش بہت بری بارش تھی۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً: اس واقعے میں البتہ نشانی ہے اور ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں، اور بے شک تمہارا رَبّ زبردست ہے رحمت والا ہے۔

كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْئَيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۶﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ اِنِّيْ لَكُمْ

اصحابِ ایکہ نے رسولوں کو جھٹلایا ﴿۱۷۶﴾ جب کہا ان کو شعیب نے: کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ ﴿۱۷۷﴾ بے شک میں تمہارے لئے

رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۷۹﴾ وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ

امانت دار رسول ہوں ﴿۱۷۸﴾ پس اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو ﴿۱۷۹﴾ نہیں سوال کرتا میں تم سے اس تبلیغ پر کسی اَجر کا،

اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۰﴾ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ﴿۱۸۱﴾

نہیں ہے میرا اُجر مگر رَبّ العالمین کے ذِمّے ﴿۱۸۰﴾ کیل پورا پورا کیا کرو، اور خسارے میں ڈالنے والوں میں سے نہ بنو ﴿۱۸۱﴾

وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ﴿۱۸۲﴾ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ

اور وزن کیا کرو دُرست ترازو کے ساتھ ﴿۱۸۲﴾ اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم کرکے نہ دیا کرو، اور زمین کے اندر فساد

مُفْسِدِيْنَ ﴿۱۸۳﴾ وَاتَّقُوا الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۸۴﴾ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ

مچاتے ہوئے نہ پھرو ﴿۱۸۳﴾ اور ڈرو اس سے جس نے تمہیں پیدا کیا اور پہلی مخلوق کو پیدا کیا ﴿۱۸۴﴾ کہنے لگے: تُو تو

مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿۱۸۵﴾ وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۱۸۶﴾

ان لوگوں میں سے ہے جن پر سخت قسم کا جادو کر دیا جاتا ہے ﴿۱۸۵﴾ نہیں ہے تُو مگر انسان ہم جیسا ہی، بے شک ہم تجھے سمجھتے ہیں البتہ جھوٹوں میں سے ﴿۱۸۶﴾

---

(۱) فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ ۙ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ (ہود: ۸۲)

فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۷﴾ قَالَ رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَا

پس گرادے تُو ہم پر ٹکڑے آسمانوں سے اگر تُو سچوں میں سے ہے ﴿۱۸۷﴾ شعیب نے کہا: میرا رَبّ خوب جانتا ہے ان کاموں کو جو

تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۸۹﴾

تم کرتے ہو ﴿۱۸۸﴾ پس انہوں نے اس کو جھٹلایا، سائبان کے دن کے عذاب نے انہیں پکڑلیا، یہ بڑے دن کا عذاب تھا ﴿۱۸۹﴾

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۹۱﴾

بے شک اس میں البتہ نشانی ہے، اور نہیں ہیں ان کے اکثر ایمان لانے والے ﴿۱۹۰﴾ بے شک تیرا رَبّ البتہ زبردست ہے رحم کرنے والا ہے ﴿۱۹۱﴾

تفسیر

قومِ شعیب کا واقعہ

كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ: اَصحابِ اَیکہ نے مرسلین کو جھٹلایا۔ اَصحابِ اَیکہ یہ قومِ شعیب ہے، یہ اَصحابِ مدین بھی ہیں اور اَصحابِ اَیکہ بھی ہیں، یہ ایک ہی قوم ہیں۔ ایکہ کہتے ہیں جنگل کو، بَن کو، جہاں درخت بہت ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے جہاں قومِ شعیب آباد تھی، وہاں ان کے ساتھ کچھ جنگلات بھی تھے، اس لئے ان کو اَصحابِ ایکہ بھی کہا ہے اور اَصحابِ مدین بھی کہا ہے۔ جب کہا ان کو شعیب علیہ السلام نے کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ بے شک میں تمہارے لئے امانت دار رسول ہوں۔ پس اللہ سے ڈرو، اور میرا کہنا مانو۔ نہیں سوال کرتا میں تم سے اس تبلیغ پر کسی اَجر کا۔ اور نہیں ہے میرا اَجر مگر رَبّ العالمین کے ذِمے۔

قوم کی معاشی بدنظمی اور شعیب علیہ السلام کی نصیحت

اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ: یہ قوم معاشی بدنظمی کے اندر مبتلا تھی، ان کے اندر معاش کا فساد تھا، تاجر لوگ تھے اور انہوں نے یہ گڑبڑ کر رکھی تھی کہ کم ماپتے، کم تولتے، اور اس طرح سے اشیاء کے اندر ملاوٹ کرنا یہ بھی اسی کم ماپنے تولنے میں داخل ہے، کیونکہ اگر ایک چیز میں آپ نے ایک سیر کے اندر ایک پاؤ دوسری چیز ملادی، اب جو آپ سے خریدنے کے لئے آیا، مثال کے طور پر آج کل جس طرح سے دالوں میں دوسری چیزیں ملی ہوئی ہیں، اب آپ دیں گے تو صحیح تول کے، ایک سیر دیں گے، لیکن اس میں جو دوسری چیز ایک پاؤ ملی ہوئی ہے جو خریدار کے مطلب کی نہیں، تو یوں سمجھو کہ سیر کی بجائے آپ نے اس کو تین پاؤ دی ہے، تو ملاوٹ بھی اسی میں شامل ہے۔ یہ عملِ تطفیف یعنی گھٹانا، کم کرنا، دوسرے کا حق پورا ادا نہ کرنا، اس میں جس طرح سے کم تولنا ہے، کم ماپنا ہے، اسی طرح سے ملاوٹ بھی اسی فعل میں داخل ہے۔ اور تاجر لوگ جب اس بات پہ اتر آتے ہیں، تو آپ جانتے ہیں اس میں لوگوں کے حقوق بھی تلف ہوتے ہیں، بلکہ مضرِ صحت چیزوں کی ملاوٹ ہوجانے سے انسان کو دوسری طرح سے بھی نقصان پہنچتا ہے۔

تو یہ معاشی فساد ان لوگوں میں تھا، کم تولنے کا، کم ماپنے کا، ملاوٹ کرنے کا، جس کے اوپر ان کو حضرت شعیب علیہ السلام نے متوجہ کیا کہ اس طرح سے تم اپنی حلال کمائی کو بھی حرام کر رہے ہو۔ اَوْفُوا الْكَيْلَ: کیل پورا پورا کیا کرو۔ یہ کیل ہوتا تھا جیسے برتن کے ساتھ پیمائش کر کے کوئی چیز ڈالی جاتی ہے۔ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ: اور گھٹانے والوں میں سے نہ ہوؤ، دوسروں کو خسارے میں ڈالنے والوں میں سے نہ بنو، پورا پورا کیل کیا کرو۔ وَزِنُوْا: زِنُوْا، امر کا صیغہ ہے۔ اور وزن کیا کرو درست ترازو کے ساتھ۔ قسطاس سے ترازو مراد ہے، مستقیم کا معنی درست، یعنی ڈنڈی نہ مارا کرو، ترازو اس قسم کی بنائی جائے کہ دیکھنے والا سمجھے کہ پورا تول رہا ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے پلڑوں میں فرق ہوتا ہے، تو وہ قسطاسِ مستقیم نہیں ہے۔ ترازو مستقیم وہ ہوتی ہے جو بالکل صحیح طور پر ہو، جس کے دونوں پلڑے برابر ہوں، تو ان کے ساتھ ایسے طور پر تولو کہ وہ درست ہی رہے، اس میں ڈنڈی مارنے کی کوشش نہ کرو۔ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ: اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم کر کے نہ دیا کرو۔ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ: اور زمین کے اندر فساد مچاتے ہوئے نہ پھرو۔ وَاتَّقُوا الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ: اور ڈرو اس سے جس نے تمہیں پیدا کیا اور پہلی مخلوق کو پیدا کیا۔ جبلۃ: مخلوق کو کہتے ہیں۔

قوم کا جواب

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ: یہ لفظ بھی پہلے آپ کے سامنے آ گیا ہے، کہ تُو تو مُسَحَّرِین میں سے ہے، معلوم ہوتا ہے کسی نے جادو کر کے تیرے حواس ہی خراب کر دیے، تو مخبوط الحواس ہو گیا ہے۔ وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا نہیں ہے تو انسان مگر ہم جیسا۔ وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ: بے شک ہم تجھے سمجھتے ہیں البتہ جھوٹوں میں سے۔ فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ: كِسَفًا: كِسْفَةٌ کی جمع ہے بمعنی ٹکڑا۔ پس گرا دے تو ہم پر ٹکڑے آسمانوں سے۔ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ اگر تو سچوں میں سے ہے، یعنی عذاب لے آ، حاصل اس کا یہی ہے۔ یہ اصل میں شعیب علیہ السلام نے انہیں ڈراتے ہوئے کہا تھا کہ آسمان پھٹ جائے گا، تم عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے، لہٰذا اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ۔ تو آگے سے کہتے ہیں کہ گرا دے ہم پر آسمان اگر تُو سچا ہے، ٹوٹ پڑے ہم پہ آسمان۔ جس طرح سے ہم کہتے ہیں کہ زمین پھٹ جائے گی اللہ کے بندو! آسمان ٹوٹ جائے گا، اس طرح سے عذاب کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا، تو جواب میں وہ کہتے ہیں کہ ہم پر تو آسمان کے ٹکڑے گرا دے اگر تُو سچوں میں سے ہے۔

قومِ شعیب پر عذاب

قَالَ رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ: میرا رب خوب جانتا ہے ان کاموں کو جو تم کرتے ہو۔ فَكَذَّبُوْهُ پس انہوں نے اس کو جھٹلایا۔ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ: سائبان کے دن کے عذاب نے انہیں پکڑ لیا۔ ظلۃ: سائبان کو کہتے ہیں۔ سائبان کے دن کے عذاب نے پکڑ لیا، کیا مطلب؟ کہ وہ لوگ قحط سالی کے اندر مبتلا ہو گئے، گرمی شدید تھی، تو ایک دن بادل آیا، اور اس بادل کے نیچے ٹھنڈا سایہ تھا، تو اللہ تعالیٰ کو لوگوں کو سزا دینے کے لئے کوئی زیادہ اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی، لوگ بھاگ بھاگ کے آتے ہیں اللہ کے عذاب کی طرف۔

موت کا وقت اور جگہ معین ہے

جس طرح سے حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس شخص کے لئے جہاں مرنا مقدر کیا ہے انسان خود چل کے وہاں پہنچ جاتا ہے، اس علاقے میں اس کو کوئی نہ کوئی ضرورت پیش آجاتی ہے کہ اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے چل کے وہاں پہنچ جاتا ہے، وہاں جا کے اس کو موت آجاتی ہے۔[1] اس لئے لکھی ہوئی جگہ، مقدر جگہ ٹلتی نہیں۔ آپ دیکھتے ہی ہیں کہ یہ ایکسیڈنٹ میں جو لوگ مرتے ہیں، کرایہ دے دے کر وہاں پہنچتے ہیں، کوشش کر کے ٹکٹ خرید خرید کے پہنچتے ہیں، جہاں مرنا ہوتا ہے، آپ یہاں بیٹھے ہیں اور موت آپ کی سندھ میں لکھی ہوئی ہے، تو کوئی نہ کوئی کام اس قسم کا پیش آجائے گا کہ آپ اس علاقے میں خود پہنچ جائیں گے، وہاں جائیں گے اللہ کی تقدیر پوری ہو جائے گی۔

جیسے علامہ سیوطی ؒ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی مجلس میں لوگ بیٹھے ہوئے تھے، وہاں عزرائیل علیہ السلام بھی تھا، عزرائیل ایک آدمی کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہا تھا، جب اس آدمی کو پتا چلا کہ یہ عزرائیل تھا تو وہ ڈر گیا کہ یہ آج جو مجھے گھور گھور کے دیکھ رہا تھا تو آج خیر نہیں، اس نے سلیمان علیہ السلام کے سامنے شکایت کی کہ مجھے تو اس سے بڑا ڈر لگ رہا ہے، مجھے یہاں سے کہیں دُور پہنچا دو۔ سلیمان علیہ السلام نے پوچھا کہ کہاں جانا چاہتے ہو؟ تو کہتا ہے کہ جی! ہوا کو حکم دو، مجھے ہندوستان پہنچا دے، (روایت میں ''ہند'' کا لفظ ہی ہے، علامہ سیوطی نے ''شفاء الصدور فی احوال الموتی والقبور'' میں روایت لکھی ہے) سلیمان علیہ السلام نے ہوا کو حکم دیا، ہوا نے اس کو اُٹھایا، اور ہندوستان میں پھینک دیا، اور یہاں جس وقت پھینکا تو آتے ہی مر گیا۔ تو دوسرے وقت میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے عزرائیل سے پوچھا کہ تُو اس کو کیوں گھور گھور کے دیکھ رہا تھا؟ کیا بات ہوئی؟ بیچارہ تجھ سے ڈر رہا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ میں اس کو گھور گھور کے اس لئے دیکھ رہا تھا کہ اس کی موت کا وقت بالکل قریب آ گیا تھا اور حکم یہ ہے کہ اس کی جان ہندوستان میں نکالنی ہے، یہ پہنچے گا کیسے؟ میں اس لئے اس کو غور سے دیکھ رہا تھا کہ اس کے مرنے کا وقت قریب آیا ہوا ہے اور حکم یہ ہے کہ اس کی جان ہندوستان میں نکالنی ہے اور یہ یہاں بیٹھا ہوا ہے، تو آپ نے ہوا کو حکم دیا، یہ وہاں پہنچا تو وہاں میں نے اس کی جان نکال لی۔[2] تو مطلب یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو جگہ کسی کے مرنے کی مقدر ہے، انسان وہاں پہنچے گا، ہزار حیلہ کر کے پہنچے گا۔

تو اسی طرح سے وہ بادل آیا سائبان کی طرح، اور اس کے نیچے ٹھنڈا سایہ تھا، گرمی میں یہ لوگ تنگ آئے ہوئے تھے، تو سارے کے سارے گھروں سے نکل کر اس بادل کے سائے میں آ گئے، اس خیال سے کہ هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا (سورۂ احقاف: ۲۴) یہ ہم پر برسے گا، بارش آئے گی اور ہم بارش میں نہائیں گے، گرمی دُور ہو گی، اس خیال کے ساتھ وہ سارے کے سارے آ گئے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بادل سے بجائے پانی کے آگ برسی، اور اسی طرح سے ممکن ہے کہ کوئی زلزلہ بھی آیا ہو، اور ساری کی

---

(۱) مشکوۃ ص ۲۲ باب الایمان بالقدر فصل ثانی۔ ترمذی ۳۶/۲ باب ماجاء ان النفس تموت۔ ولفظہ: اذا قضی اللہ لعبد ان یموت بأرض جعل له اليها حاجة

(۲) شرح الصدور ص ۵۳ باب ماجاء فی ملك الموت مصنف ابن ابی شیبہ ۷۰/۷ باب کلام سلیمان۔ نیز تفسیر مظہری، نسفی وغیرہ سورہ لقمان کا آخر۔

ساری قوم وہیں تباہ ہوگئی۔ تو یَوْمِ الظُّلَّةِ کے عذاب میں یہی اشارہ ہے کہ بادل کی شکل میں یہ عذاب آیا تھا جس سے ان کے اوپر آگ برسی۔ پکڑ لیا ان کو سائبان کے دن کے عذاب نے، اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ: یہ بڑے دن کا عذاب تھا۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً: بے شک اس میں البتہ نشانی ہے اور نہیں ہیں ان کے اکثر ایمان لانے والے، بے شک تیرا ربّ البتہ زبردست ہے رحم کرنے والا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۹۲﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلْبِكَ

بے شک یہ قرآن البتہ اُتارا ہوا ہے ربّ العالمین کا ﴿۱۹۲﴾ اُترا اس قرآن کو لے کر امانت دار فرشتہ ﴿۱۹۳﴾ آپ کے دِل پر

لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹۵﴾ وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۹۶﴾

تاکہ ہو جائیں آپ ڈرانے والوں میں سے ﴿۱۹۴﴾ واضح عربی زبان میں ﴿۱۹۵﴾ اور بے شک یہ قرآن البتہ پہلے لوگوں کی کتابوں میں ہے ﴿۱۹۶﴾

اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۹۷﴾ وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ

کیا ان مشرکین مکہ کے لئے نشانی نہیں کہ جانتے ہیں اس قرآن کو علمائے بنی اسرائیل ﴿۱۹۷﴾ اگر ہم اُتار دیتے اس قرآن کو عجمیوں میں سے

الْاَعْجَمِيْنَ ﴿۱۹۸﴾ فَقَرَاَهٗ عَلَيْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِيْ

کسی پر ﴿۱۹۸﴾ پھر وہ عجمی ان پر اس قرآن کو پڑھتا، نہیں تھے یہ لوگ اس قرآن پر ایمان لانے والے ﴿۱۹۹﴾ ایسے ہی داخل کر دیا ہم نے اس تکذیب کو

قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۲۰۰﴾ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۲۰۱﴾

مجرمین کے قلوب میں ﴿۲۰۰﴾ نہیں ایمان لائیں گے اس قرآن پر جب تک کہ یہ دردناک عذاب کو نہ دیکھ لیں ﴿۲۰۱﴾

فَيَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾ فَيَقُوْلُوْا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

پھر وہ عذاب ان کے پاس آجائے اچانک اور ان کو پتا بھی نہ ہو ﴿۲۰۲﴾ پھر یہ کہیں گے کہ کیا ہم مہلت دیے ہوئے ہیں؟ ﴿۲۰۳﴾

اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۲۰۴﴾ اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ ﴿۲۰۵﴾ ثُمَّ جَآءَهُمْ

کیا پھر یہ ہمارے عذاب کو جلدی طلب کرتے ہیں؟ ﴿۲۰۴﴾ آپ بتلائیے، اگر ہم ان کو فائدہ پہنچادیں چند سال تک ﴿۲۰۵﴾ پھر آجائے ان کے پاس

مَّا كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾ مَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ ﴿۲۰۷﴾ وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ

وہ چیز جس کا یہ وعدہ دیے جاتے ہیں ﴿۲۰۶﴾ ان کو فائدہ پہنچایا جانا ان کے کچھ بھی کام نہیں آئے گا ﴿۲۰۷﴾ اور نہیں ہلاک کیا ہم نے کسی بستی کو

إِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ﴿۲۰۸﴾ ذِكْرٰى ۛ وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۲۰۹﴾ وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ

مگر اس بستی کے لئے ڈرانے والے تھے ﴿۲۰۸﴾ یاد دہانی کے لئے، اور ہم ظلم کرنے والے نہیں ہیں ﴿۲۰۹﴾ نہیں اُترے اس قرآن کو لے کر

الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۱۰﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۲۱۱﴾ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ

شیاطین ﴿۲۱۰﴾ اور نہیں مناسب ان کے لئے اس قرآن کو لانا، اور نہ وہ طاقت رکھتے ہیں ﴿۲۱۱﴾ بے شک وہ شیاطین سننے سے

لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴿۲۱۲﴾ فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ﴿۲۱۳﴾ وَاَنْذِرْ

البتہ دُور ہٹائے ہوئے ہیں ﴿۲۱۲﴾ پس نہ پکاریں آپ اللہ کے ساتھ کوئی اور اِلٰہ، پھر ہو جائیں گے آپ عذاب دیے ہوؤں میں سے ﴿۲۱۳﴾ اور ڈرائیں

عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۱۵﴾

اپنے قریبی رشتہ داروں کو ﴿۲۱۴﴾ پست کیجئے اپنا بازو ان لوگوں کے لئے جو آپ کی پیروی کریں مؤمنین میں سے ﴿۲۱۵﴾

فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ

پھر اگر یہ لوگ آپ کی نافرمانی کریں، تو آپ کہہ دیجئے کہ بے شک میں لاتعلق ہوں تمہارے عملوں سے ﴿۲۱۶﴾ اور بھروسا کیجئے زبردست،

الرَّحِيْمِ ﴿۲۱۷﴾ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿۲۱۸﴾ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ﴿۲۱۹﴾ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ

رحم کرنے والے پر ﴿۲۱۷﴾ جو دیکھتا ہے آپ کو جس وقت آپ قیام کرتے ہیں ﴿۲۱۸﴾ اور آپ کے چلنے پھرنے کو ساجدین میں ﴿۲۱۹﴾ بے شک وہ سننے والا ہے

الْعَلِيْمُ ﴿۲۲۰﴾ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۲۱﴾ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ

اور جاننے والا ہے ﴿۲۲۰﴾ کیا میں خبر دوں تمہیں کہ شیاطین کس پہ اُترتے ہیں؟ ﴿۲۲۱﴾ اُترتے ہیں ہر جھوٹے پر

اَثِيْمٍ ﴿۲۲۲﴾ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ﴿۲۲۳﴾ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾

اور گنہگار پر ﴿۲۲۲﴾ وہ جھوٹے اور گنہگار کان لگاتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں ﴿۲۲۳﴾ اور شعراء، ان کے پیچھے لگتے ہیں گمراہ لوگ ﴿۲۲۴﴾

اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿۲۲۵﴾ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۲۲۶﴾ اِلَّا

کیا تُو دیکھتا نہیں کہ بے شک وہ ہر وادی میں پریشان پھرتے ہیں ﴿۲۲۵﴾ اور بے شک یہ لوگ کہتے ہیں ایسی باتیں جو کرتے نہیں ﴿۲۲۶﴾ مگر

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا

وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں اور اللہ کا ذکر کثرت سے کرتے ہیں، اور بدلہ لیتے ہیں بعد اس کے کہ

ظُلِمُوْا ؕ وَ سَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْۤا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ ﴿۲۲۷﴾

ان پہ ظلم کیا گیا، اور عنقریب جان لیں گے وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا کہ کون سی لوٹنے کی جگہ وہ لوٹتے ہیں ﴿۲۲۷﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِیْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ: ''ہٗ'' ضمیر قرآنِ کریم کی طرف لوٹ رہی ہے۔ تنزیل مصدر ہے اور یہاں اسم مفعول کے معنی میں ہے۔ بے شک یہ قرآن البتہ اتارا ہوا ہے رَبُّ العالمین کا، مُنَزَّلُ ربِّ العالمین کے معنی میں ہو جائے گا۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ: اُترا اس قرآن کو لے کر امانت دار فرشتہ، رُوح سے رُوح القدس حضرت جبرائیل علیہ السلام مراد ہیں، عَلٰی قَلْبِكَ: آپ ﷺ کے دل پر، لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ: تاکہ ہو جائیں آپ ڈرانے والوں میں سے، بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ: واضح عربی زبان میں، وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ: اور بے شک یہ قرآن البتہ پہلے لوگوں کی کتابوں میں ہے، ''ہٗ'' ضمیر قرآن کی طرف لوٹ رہی ہے، زُبُرٌ، زَبُوْر کی جمع ہے۔ یعنی اس قرآنِ کریم کا ذکر پہلے لوگوں کی کتابوں میں ہے یا یہ ہے کہ اس قرآنِ کریم کے مضامین پہلے لوگوں کی کتابوں میں موجود ہیں (مظہری)، قرآنِ کریم نے توحید، رِسالت، معاد ان چیزوں کا تذکرہ کیا، اور انبیاء علیہم السلام جو پہلے گزرے ہیں ان کی کتابوں میں بھی یہ مضمون ہے۔ یا مطلب یہ ہے کہ اس قرآنِ کریم کا ذکر پہلے لوگوں کی کتابوں میں ہے یعنی انبیاء علیہم السلام کی کتابوں میں اس اُترنے والی کتاب کی پیش گوئی کی گئی ہے۔ اَوَلَمْ یَكُنْ لَّهُمْ اٰیَةً: لَهُمْ کی ضمیر مشرکینِ مکہ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ کیا ان مشرکینِ مکہ کے لئے نشانی نہیں کہ جانتے ہیں اس قرآنِ کریم کو علمائے بنی اسرائیل، یعنی علمائے بنی اسرائیل اس قرآن کو جانتے ہیں کہ یہ اُترنے والا تھا، اللہ کی طرف سے اس کی پہلے پیش گوئی کر دی گئی تھی، پچھلی کتابوں میں اس کا تذکرہ ہے، علمائے بنی اسرائیل اس بات کو جانتے ہیں۔ کیا ان مشرکینِ مکہ کے لئے یہ اس قرآنِ کریم کی صداقت کی نشانی نہیں ہے؟ جیسے بنی اسرائیل میں سے جو لوگ اسلام لے آئے تھے وہ تو صراحتاً برملا اقرار کرتے تھے، کہ اس نبی کا ذکر بھی پہلی کتابوں میں ہے اور اس قرآن کا ذکر بھی پہلی کتابوں میں ہے، اور جو ایمان نہیں لائے تھے اپنی نجی مجلسوں میں بسا اوقات وہ بھی اقرار کرتے تھے۔ وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰی بَعْضِ الْاَعْجَمِیْنَ: اگر ہم اتار دیتے اس قرآن کو عجمیوں میں سے کسی پر فَقَرَاَهٗ عَلَیْهِمْ پھر وہ عجمی ان پر اس قرآن کو پڑھتا مَا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِیْنَ نہیں تھے یہ لوگ اس قرآن پر ایمان لانے والے۔ عجم: غیر عرب کو کہتے ہیں۔ كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِیْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِیْنَ: ایسے ہی داخل کر دیا ہم نے اس تکذیب کو مجرمین کے قلوب میں۔ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ نہیں ایمان لائیں گے اس قرآن پر حَتّٰی یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ جب تک کہ یہ دردناک عذاب کو نہ دیکھ لیں۔ حتّٰی کے بعد مضارع آ جائے تو محاورۃً نفی کے ساتھ ترجمہ کیا جاتا ہے۔ فَیَاْتِیَهُمْ بَغْتَةً: پھر وہ عذاب ان کے پاس آ جائے اچانک۔ وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ اور ان کو پتا بھی نہ ہو۔ فَیَقُوْلُوْا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ: پھر یہ کہیں گے کہ کیا ہم مہلت دیے ہوئے ہیں؟ مُنْظَرُوْنَ یہ اِنظار سے ہے بمعنی ڈھیل دینا۔ اَفَبِعَذَابِنَا یَسْتَعْجِلُوْنَ: کیا پھر یہ ہمارے عذاب کو جلدی طلب کرتے ہیں، یعنی جس عذاب کے آنے کے بعد پھر یہ چیخیں گے کہ ہائے! ہمیں کچھ مہلت مل جائے، اب یہ اس عذاب کو جلدی طلب کر رہے ہیں؟ کیا پھر یہ ہمارے عذاب کا جلدی مطالبہ کر رہے ہیں۔ استعجال: کسی چیز کو جلدی طلب کرنا۔ ہمارے عذاب کے ساتھ یہ جلدی مچاتے

ہیں؟ ہمارے عذاب کو جلدی مانگتے ہیں؟ جس طرح سے چاہیں اس مفہوم کو ادا کر لیں۔ اَفَرَءَیْتَ: کیا پھر آپ نے دیکھا؟ یہ لفظ کلام میں محاورے کے طور پر ابتداءً بول دیا جایا کرتا ہے، یا ''آپ بتلایئے'' یہ بھی محاورۃً ترجمہ بھی کر دیا جاتا ہے۔ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ: اگر ہم ان کو فائدہ پہنچادیں چند سال تک ثُمَّ جَآءَهُمْ مَّا كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ: پھر آ جائے ان کے پاس وہ چیز جس کا یہ وعدہ دیے جاتے ہیں۔ مَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ: نہیں فائدہ دے گی ان کو وہ چیز جس کے ساتھ یہ فائدہ پہنچائے گئے۔ اغنی عنه: فائدہ پہنچانا، دُور ہٹانا، کام آنا۔ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ: اَیْ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ بِهٖ، وہ چیزیں جن کے ساتھ ان کو فائدہ پہنچایا گیا وہ چیزیں ان کے کچھ کام نہ آئیں گی، وہ چیزیں ان سے اللہ کے عذاب کو دُور نہیں ہٹا سکیں گی، اور اگر مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ میں ''مَا'' کو مصدریہ بنالیا جائے تو یوں ترجمہ ہوگا کہ ان لوگوں کو فائدہ پہنچایا جانا ان کے کچھ بھی کام نہیں آئے گا۔ یعنی اگر برسہا برس تک ہم انہیں فائدہ پہنچادیں، ان کو خوش حال کر دیں، لیکن جب اللہ کی گرفت میں آئیں گے تو جو ان کو خوش حالی دی گئی تھی جن چیزوں کے ساتھ ان کو فائدہ پہنچایا گیا تھا، وہ ان کے کچھ بھی کام نہیں آئیں گی، وہ خوش حالی ان کے کچھ بھی کام نہیں آئے گی جب اللہ کا عذاب آ جائے گا۔ وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ: اور نہیں ہلاک کیا ہم نے کسی بستی کو مگر اس بستی کے لئے ڈرانے والے تھے۔ ذِكْرٰى: یاددہانی کے لئے، یعنی ہماری عادت ہے کہ ہم کسی بستی کو ہلاک نہیں کرتے جب تک کہ ان کے لیے کوئی مُنْذِر نہ بھیج دیں، ڈرانے والا نہ بھیج دیں جو ان کو یاددہانی کرائے۔ وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ اور ہم ظلم کرنے والے نہیں ہیں۔

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ: نہیں اترے اس قرآن کو لے کر شیاطین۔ شیاطین شیطان کی جمع ہے۔ اس کتاب کو لے کر شیطان نہیں اترے۔ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ اور نہیں مناسب ان کے لئے اس قرآن کو لانا۔ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ اور نہ وہ طاقت رکھتے ہیں۔ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ بے شک وہ شیاطین سننے سے البتہ دور ہٹائے ہوئے ہیں، جدا کئے ہوئے ہیں، وہ تو اس وحی کو سن بھی نہیں سکتے۔ فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ پس نہ پکار تو۔ یہ خطاب بظاہر سرورِ کائنات ﷺ کو ہے اور مراد باقی لوگ ہیں۔ نہ پکاریں آپ اللہ کے ساتھ کوئی اور اِلٰہ۔ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ پھر ہو جائیں گے آپ عذاب دیے ہوؤں میں سے، یعنی اگر اللہ کے ساتھ کسی اور اِلٰہ کو پکارو گے تو معذب ہو جاؤ گے، اللہ کی طرف سے سزا ملے گی۔ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ: اور ڈرا اپنے قریبی رشتہ داروں کو، عشیرہ قبیلہ کو کہتے ہیں، اَقْرَبِيْن: جو سب سے زیادہ قرب رکھنے والے ہیں، آپ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرایئے۔ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ: مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ یہ ''من اتبعك'' کا بیان ہے۔ اور ''جناح'' کہتے ہیں اصل کے اعتبار سے پرندے کے ''پَر'' کو۔ اور پھر جب یہ لفظ انسان کے لئے بولا جائے تو اس سے مراد بازو ہو گئے، کیونکہ پرندے کے ''پَر'' ایسے ہی ہیں جیسے انسان کے بازو ہوتے ہیں۔ اور خَفْض پست کرنے کو کہتے ہیں۔ پست کر تو اپنا بازو ان لوگوں کے لئے جو تیری پیروی کریں مؤمنین میں سے۔ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ یہ ''مَنْ'' کا بیان ہے۔ جو مؤمن آپ کے متبع ہیں ان کے لئے اپنے بازوؤں کو پست کیجئے۔ اور خفضِ جناح یہ کنایہ ہوتا ہے کسی پر شفقت کرنے سے، آپ نے دیکھا ہوگا، گھروں میں آپ لوگ مرغیاں رکھتے ہیں، جس وقت مرغی کے بچے نکلے ہوئے ہوتے ہیں، تو وہ مرغی کے ساتھ ساتھ پھرا کرتے ہیں، اور جس وقت مرغی کوئی خطرہ محسوس کیا کرتی ہے، جیسے اوپر کوئی چیل آ گئی یا کوئی جانور آ گیا تو یوں اپنا پَر پھیلا کے بچوں کو نیچے لے کے ان کے اوپر یوں پَر کو پست کر لیا کرتی ہے،

اور بچوں کو چھپالیتی ہے۔ اور انسان جس وقت کسی دوسرے انسان پر شفقت کرتا ہے، محبت کرتا ہے، تو ایسے ہی ہوتا ہے کہ یوں بغل میں لیا، بغل میں لے کے یوں اس کے اوپر اپنا ہاتھ پست کرلیا، یہ محبت اور شفقت کی علامت ہوا کرتی ہے۔ تو اپنے متبع مؤمنین کے لئے اپنے بازو کو پست کیجئے، یعنی ان کے اوپر شفقت کیجئے، ان کے ساتھ نرمی سے پیش آیئے، تو خفضِ جناح کا یہاں یہی معنی ہے کہ محبت اور شفقت کیجئے، شفقت کے ساتھ پیش آیئے ان لوگوں سے جو آپ کے متبع ہیں یعنی مؤمنین۔ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ: پھر اگر یہ لوگ آپ کی نافرمانی کریں، فَقُلْ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ: تو آپ کہہ دیجئے کہ بے شک میں لاتعلق ہوں ان چیزوں سے جو تم کرتے ہو، میرا تمہارے عملوں سے کوئی تعلق نہیں۔ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ: اور بھروسا کیجئے، اعتماد کیجئے عزیز رحیم پر۔ عزیز کے معنی زبردست، غالب۔ رحیم کے معنی رحم کرنے والا۔

الَّذِیْ یَرٰىكَ حِیْنَ تَقُوْمُ ﴿۲۱۸﴾ وَتَقَلُّبَكَ فِی السّٰجِدِیْنَ: جو دیکھتا ہے آپ کو جس وقت کہ آپ اٹھتے ہیں، جس وقت کہ آپ قیام کرتے ہیں اور آپ کے چلنے پھرنے کو ساجدین میں۔ تَقَلُّب: حرکت کرنا، یا آنا جانا۔ سٰجِدِیْن سے یہاں نماز پڑھنے والے مراد ہیں۔ آپ کو دیکھتا ہے جس وقت کہ آپ اٹھتے ہیں تہجد کے لئے، آپ قیام کرتے ہیں، اور اسی طرح سے جس وقت آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دیکھنے کے لئے پھرتے ہیں کہ یہ نماز پڑھ رہے، تہجد پڑھ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ سے راز و نیاز کر رہے ہیں۔ جیسے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی، رات کو کبھی کبھی چکر لگایا کرتے تھے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دیکھا کرتے تھے کہ وہ کس حال میں ہیں؟ جیسے حدیث شریف میں واقعہ آتا ہے کہ ایک دفعہ آپ گزرے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بلند آواز سے قرآنِ کریم پڑھ رہے تھے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے تو وہ پست آواز میں آہستہ آہستہ قرآنِ کریم پڑھ رہے تھے، صبح کو جب دونوں حضرات تشریف لائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ آہستہ آہستہ کیوں پڑھ رہے تھے؟ وہ کہنے لگے کہ اَسْمَعْتُ مَنْ نَاجَیْتُ، یارسول اللہ! جس سے میں سرگوشی کر رہا تھا اسے میں سنا رہا تھا، کسی اور کو سنانے کی کیا ضرورت تھی۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اے عمر! میں نے سنا کہ تم رات کو بلند آواز سے پڑھ رہے تھے، انہوں نے کہا: اُوْقِظُ الْوَسْنَانَ وَاَطْرُدُ الشَّیْطَانَ، یارسول اللہ! میں بلند آواز کے ساتھ اس لئے تلاوت کر رہا تھا کہ میں سونے والوں کو جگاتا تھا، تاکہ میری آواز سن کے جو سوئے ہوئے ہوں وہ بھی جاگ اٹھیں، اور شیطان کو میں دفع کرتا تھا، میں جانتا تھا کہ اللہ کے قرآن کی آواز جہاں جائے گی تو شیطان وہاں سے بھاگے گا۔ تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو سمجھایا، ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تُو اپنی آواز کو کچھ اونچی کر۔ اور عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تُو اپنی آواز کو کچھ آہستہ کرلے، زیادہ اونچا نہ پڑھا کر۔(۱) کیونکہ تہجد میں قرآنِ کریم اگر کچھ جہراً پڑھا جائے تو اس میں قلب کے اوپر کچھ اچھا اثر پڑتا ہے اور حضورِ قلب زیادہ نصیب ہوتا ہے۔ تو اس طرح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم چلتے پھرتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات کو دیکھا کرتے تھے...... ایک دفعہ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ قرآن پڑھ رہے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بڑی دلچسپی کے ساتھ کھڑے سنتے رہے، اور بہت پسند فرمایا ان کے قرآن کو، اور بعد میں تعریف فرمائی: ''لَقَدْ اُوْتِیَ مِزْمَارًا مِنْ مَزَامِیْرِ اٰلِ دَاوٗدَ''(۲) کہ اس شخص

---

(۱) ترمذی ۱/ ۱۰۰ باب ما جاء فی قراءۃ اللیل۔ مشکوۃ ۱/ ۱۰۷ باب صلاۃ اللیل، فصل ثانی۔ ابو داود ۱/ ۱۸۸ باب فی رفع الصوت بالقراءۃ فی صلاۃ اللیل۔

(۲) نسائی رقم ۱۰۱۹ باب تزیین القرآن۔ نیز مسلم ۱/ ۲۶۸۔ بخاری ۲/ ۷۵۵۔ مشکوۃ ۲/ ۵۷۵ باب جامع المناقب۔

کو تو حضرت داؤد علیہ السلام کا جو ترنم تھا اس میں سے حصہ ملا ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بہت خوش آواز تھے ...... تو وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِیْنَ کا معنی یہ ہو جائے گا کہ آپ کا چلنا پھرنا نماز پڑھنے والوں میں یعنی تہجد کے وقت صحابہ کرام علیہم الرضوان جو نماز پڑھتے ہیں، اور آپ ان میں چلتے پھرتے ہیں ان کا حال دیکھنے کے لئے، تو اس وقت بھی اللہ آپ کو دیکھتا ہے۔ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ: بے شک وہ اللہ سننے والا ہے اور جاننے والا ہے۔

اور وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِیْنَ میں ساجدین سے بعض لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آباء بھی مراد لئے ہیں، پھر اس کا معنی یوں کیا کہ آپ کا ادل بدل ہونا ساجدین میں، کہ آدم علیہ السلام سے لے کر آپ مختلف آباء کی پشت میں جو ادل بدل ہوتے آئے ہیں اللہ تعالیٰ اس کو بھی جانتا ہے، اس وقت بھی آپ کو جانتا ہے جب آپ ایک اَب کی پشت سے دوسرے اَب کی طرف منتقل ہوتے تھے۔ اور ان کو ساجدین کے لفظ کے ساتھ تعبیر جو کیا تو ساجدین سے ''عابدین'' مراد ہیں، تو یہ معنی لے کر پھر بعض لوگوں نے یہاں سے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے آباء و اجداد کے ایمان پر اور ان کے مغفور ہونے پر بھی استدلال کیا۔ جیسے حضرت شیخ الاسلام لکھتے ہیں کہ (پہلا تو وہی معنی بیان کیا) ''یعنی جب تو تہجد کو اُٹھتا ہے اور متوسلین کی خبر لیتا ہے کہ خدا کی یاد میں ہیں یا غافل، یا تو جب نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے، اور جماعت کی نماز میں نقل و حرکت (رکوع سجود وغیرہ) کرتا ہے، اور مقتدیوں کی دیکھ بھال رکھتا ہے۔ اور بعض سلف نے کہا کہ ''ساجدین'' سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آباء مراد ہیں۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نُور کا ایک نبی کی صلب سے دوسرے نبی کی صلب تک منتقل ہونا اور آخر میں نبی ہو کر تشریف لانا۔ بلکہ بعض مفسرین نے اس لفظ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کے ایمان پر استدلال کیا ہے۔'' (تفسیر عثمانی) یہ مسئلہ آخر میں ذکر کرتا ہوں۔

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّیٰطِیْنُ: کیا میں خبر دوں تمہیں کہ شیاطین کس پہ اُترتے ہیں؟ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِیْمٍ: اُترتے ہیں ہر جھوٹے پر اور گنہگار پر۔ اَثِیْمٍ: گنہگار۔ اَفَّاكٍ: یہ لفظ اِفك سے لیا گیا ہے، اِفك بدترین قسم کے جھوٹ کو کہتے ہیں۔ تو افاك ہو جائے گا بہت زیادہ جھوٹ بولنے والا۔ بہت جھوٹے اور گنہگار پر اترتے ہیں۔ یُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وہ جھوٹے اور گنہگار کان لگاتے ہیں۔ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ: اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔ اَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ کا یہ مطلب ہے کہ یہ جو کہانت پیشہ لوگ ہیں، جو جنات سے غیب کی خبریں لے کے لوگوں کو سناتے ہیں، ان میں سے بعض کو تو یہ ملکہ ہوتا ہے کہ جنات وغیرہ کے ساتھ اپنا تعلق قائم کر لیتے ہیں اور کوئی جھوٹی موٹی باتیں وہ ان کو پہنچاتے ہیں، اور آگے اس میں اور جھوٹ ملا کر لوگوں کو پہنچاتے رہتے ہیں۔ اور بعض کو تو سرے سے یہ ملکہ ہوتا ہی نہیں، لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے یوں کان لگا کر بیٹھ جاتے ہیں جیسے غیب سے ان کو کوئی خبر پہنچ رہی ہو، پھر لوگوں کے سامنے اس کو ذکر کرتے ہیں، اکثر تو ان میں سے ویسے ہی جھوٹے ہوتے ہیں، ان کو ملکہ ہوتا ہی نہیں۔ اور جو یہ کہانت کا اور جنات وغیرہ کے ساتھ ربط قائم کرنے کا ملکہ رکھتے ہیں تو وہ بھی اکثر جھوٹ بولتے ہیں۔ جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ جن شیاطین ادھر اُدھر پھرتے رہتے ہیں، کہیں سے کوئی بات ملی، لے آئے، اپنے دوستوں کو پہنچا دیتے ہیں، پھر وہ دوست اس میں سو جھوٹ اور ملاتے ہیں، یوں خلط ملط کر کے لوگوں کو خبر سناتے ہیں، تو جو بات جنات نے سنی ہوتی ہے اتنی بات تو سچی نکل آتی ہے،

اور جو اس میں انہوں نے اپنی باتیں ملائی ہوتی ہیں وہ جھوٹی نکلتی ہیں،[1] تو ان کے اقوال بھی اکثر جھوٹے ہوتے ہیں اور ویسے ان میں سے لوگ بھی اکثر جھوٹے ہوتے ہیں کہ ان کا ارواح کے ساتھ کوئی ربط قائم ہے، یا جنات سے خبر لے لیتے ہیں، یہ لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے ایسی ہیئت اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اگر کسی کو ملکہ ہو بھی، جیسا کہ جاہلیت میں کہانت ایک مستقل پیشہ تھا تو ان کی اکثر باتیں غلط ہوتی ہیں، تو اَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ کے یہ دونوں مفہوم ہیں۔ یا تو یہ کہ کہانت کے پیشے کا دعویٰ کر کے ہی ان میں سے اکثر جھوٹے ہیں، ان کو یہ پیشہ حاصل ہی نہیں ہوتا، جنات کے ساتھ ان کا ربط ہے ہی نہیں۔ یا یہ ہے کہ ان کی باتیں اکثر جھوٹی نکلتی ہیں، یہ اکثر جھوٹ بولتے ہیں، کبھی کوئی بات ان میں سے سچی بھی نکل آتی ہے، جیسے حدیث شریف میں تفصیل موجود ہے۔

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ: اور شعراء، ان کے پیچھے لگتے ہیں گمراہ لوگ۔ شعراء شاعر کی جمع ہے۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ کیا تُو دیکھتا نہیں کہ بے شک وہ ہر وادی میں پریشان پھرتے ہیں۔ هَامَ يَهِيْمُ کا معنی ہوتا ہے منہ اٹھائے چل پڑنا، پتا نہیں ہے کہ کدھر کو جا رہے ہیں، کدھر کو نہیں جا رہے۔ هَائِم کہتے ہیں سرپھرے آدمی کو، جو اس طرح سے پریشان پھر رہا ہو، جدھر کو منہ ہوا اُدھر کو چل دیا۔ وادی سے یہاں خیالات کی وادی مراد ہے۔ یہ خیالات کی وادیوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں، شاعروں کا کام ہوتا ہے کہ جو خیال باندھ لیا، بس اسی کی طرف چل دیے۔ مبالغہ آمیزی، جھوٹی باتیں جوڑنا اور ان کو مُقَفّٰی عبارت کے اندر ادا کرنا، یہ شعراء کا کام ہوتا ہے، یہ حقیقت پسند نہیں ہوا کرتے، ان میں ملمع سازی زیادہ ہوتی ہے۔ کیا تُو دیکھتا نہیں کہ یہ ہر وادی میں سر مارتے پھرتے ہیں، پریشان پھرتے ہیں یعنی خیالات کی وادیوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ: اور بے شک یہ لوگ کہتے ہیں ایسی باتیں جو کرتے نہیں یعنی ان کا قول ان کے کردار کے مطابق نہیں ہوتا، یہ گفتار کے غازی ہوتے ہیں کردار کے غازی نہیں ہوتے، یہ بولتے ہیں ایسی باتیں جو کرتے نہیں یعنی ان کا قول ان کے فعل کے مطابق نہیں ہوتا۔ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: شعراء سے ان کو مستثنیٰ کر لیا گیا، سارے شاعر بُرے نہیں ہوتے، مگر جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں، وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا: اپنے شعروں میں اللہ کا ذکر کثرت سے کرتے ہیں۔ وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا: اور بدلہ لیتے ہیں مظلوم ہونے کے بعد، بعد اس کے کہ ان پہ ظلم کیا گیا، یعنی اگر کسی کی بُرائی میں شعر کہتے ہیں تو وہ بھی ایک قسم کا انتصار اور بدلہ ہوتا ہے۔ ابتداءً کسی کی غیبت یا کسی کی بُرائی شعروں میں نہیں کرتے، اور اگر ان کو بُرا بھلا کہا گیا تو جواباً کوئی کارروائی کرتے ہیں، جس طرح سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں جو شاعر تھے تو وہ مشرکین کی باتوں کا جواب وہ شعروں میں دیتے تھے، یہاں انہی کو مستثنیٰ کیا گیا ہے کہ وہ بُرے نہیں ہیں۔ بدلہ لیتے ہیں بعد اس کے کہ ان پہ ظلم کیا گیا، مظلوم ہونے کے بعد وہ بدلہ لیتے ہیں۔ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا: اور عنقریب جان لیں گے وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا، اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ: مُنْقَلَب ظرف کا صیغہ ہے، لوٹنے کی جگہ۔ کونسی لوٹنے کی جگہ وہ لوٹتے ہیں یعنی ان کا انجام کیا ہوتا ہے، لوٹ کے یہ کدھر جاتے ہیں، عنقریب ان ظالموں کو پتا چل جائے گا۔

---

(۱) بخاری ۱/۴۵۶ باب ذکر الملائکۃ۔ ۲/۶۸۲، کتاب التفسیر سورۃ الحجر۔ ۲/۷۰۸ سورۃ سبا۔ مشکوٰۃ ۲/۳۹۳ باب الکہانۃ

تفسیر

ماقبل سے ربط

آپ حضرات کو یاد ہوگا کہ شروع سورت میں سرورِ کائنات ﷺ کے لئے تسلی کا مضمون تھا اور آپ کی نبوّت اور رِسالت کا تذکرہ تھا، پھر آگے واقعات کثرت کے ساتھ بیان کیے گئے جن سے انہی مضامین کو ایک تاریخی شہادت کے ساتھ مؤکد کرنا تھا یہ واقعات کا سلسلہ ختم ہوا، تو اب آخری رکوع میں بھی حضور ﷺ کی نبوّت اور رِسالت کا ہی تذکرہ ہے، پہلی بات تو یہ کہی گئی ہے یہ قرآن رَبّ العالمین کا اُتارا ہوا ہے۔

آیاتِ بالا کا مقصد

قرآنِ کریم میں مختلف جگہ آپ نے پڑھا کہ مشرکین، سرورِ کائنات ﷺ کو ''کاہن'' کہتے تھے اور ''شاعر'' کہتے تھے۔ ''کاہن'' اسے کہا جاتا ہے کہ جو جنّات کے ساتھ رابطہ قائم کرکے کچھ خبریں معلوم کرتا ہو۔ اور ''شاعر'' وہ ہوتے ہیں جو خیال بندی کے ساتھ مضامین کو ادا کرتے ہیں اور ایک سادہ سی بات کو مزین کرکے ادا کردیتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کاہن ہیں، یا کہتے تھے کہ شاعر ہے، اس لئے یہ باتیں بنا بنا کے مزین کرکے سجا سجا کے لوگوں کے سامنے پیش کررہے ہیں، ہے یہ محض خیال بندیاں، باقی اس میں حقیقت کچھ نہیں ہے۔ تو قرآنِ کریم کو شعر کہتے تھے، یا کہانت کہتے تھے، تو اس رُکوع میں اِن کی تردید کرنا مقصود ہے۔

قرآن اللہ کی طرف سے مضبوط واسطے سے اُترا ہے

پہلے تو یہ بات کہی کہ یہ رَبّ العالمین کا اُتارا ہوا ہے، یہ شروع تو ہوا رَبّ العالمین سے، اور درمیان میں واسطہ جو حضور ﷺ کے پاس لے کے آیا وہ رُوح الامین ہے، امانت دار فرشتہ۔ ''امانت دار'' کا مطلب یہ ہے کہ بلاکم وکاست جیسا اللہ کی طرف سے چلا تھا ویسا ہی حضور ﷺ تک پہنچا دیا گیا، جیسے تیسویں پارے کے اندر سورۂ تکویر میں بھی اس کا ذِکر آئے گا یعنی جبرئیل کی تعریف کہ لانے والا ہے کن صفات کا مالک ہے: اِنَّهٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ كَرِيۡمٍ ۝ ذِىۡ قُوَّةٍ عِنۡدَ ذِى الۡعَرۡشِ مَكِيۡنٍ ۝ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيۡنٍ۔ تو گویا کہ جو راوی ہے یعنی واسطہ، اس کی تعدیل ذِکر کردی گئی، کہ وہ بہت ثقہ ہے اور بہت عادل ہے، جو درمیان میں واسطہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ سے بات چلی اور حضور ﷺ تک پہنچی، درمیان میں واسطہ رُوحِ امین ہے، جس کی صفات اور اس کی ثقاہت قرآنِ کریم میں دوسری جگہ ذِکر کردی گئی، اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جیسے راوی اور مروی عنہ کے درمیان میں ملاقات ضروری ہے تو ملاقات کا ذکر سورۂ نجم میں آئے گا۔ تو ملاقات بھی ہے، اور درمیان والا راوی ثقہ بھی ہے۔

قرآنِ کریم کی اصل حیثیت

اور پھر یہ قرآن اُترا اللہ کی جانب سے، لے کے آئے رُوح الامین، پہنچا کہاں؟ آپ کے قلبِ مبارک پر، قلبِ مبارک

کا ذکر اس لئے آ گیا کہ سرورِ کائنات ﷺ پر جس وقت وحی آنے لگتی تھی تو آپ کے اوپر ایک غشی کی سی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی، جس طرح سے ظاہری حواس معطل ہو جاتے ہیں، تو حضور ﷺ کا قلب براہِ راست اس وحی کو اخذ کرتا تھا، اور اس وحی کا نزول آپ کے قلب پر ہوتا تھا۔ تو مبارک قلب پر اُترا، اور لسانِ عربی میں اُترا، یعنی عربی زبان میں۔ اور اُترا اس لئے تا کہ آپ لوگوں کو ڈرائیں، جیسے سورۂ فرقان کے شروع میں آیا تھا لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا۔ یہ تو قرآنِ کریم کی اصل حیثیت بیان کر دی۔

قرآن کا ترجمہ قرآن نہیں

اور جب یہاں اس کو ''لسان عربی'' ذِکر کیا تو معلوم ہو گیا اگر قرآنِ کریم کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں کر دیا جائے، اُردو میں اس عبارت کو نقل کریں، فارسی میں نقل کریں، یا کسی دوسری زبان میں نقل کریں، وہ ''قرآن'' نہیں ہے، وہ قرآن کا ترجمہ ہے۔ اس کو ''قرآن'' نہیں کہہ سکتے، اس لئے یہ جو اُردو کے ترجمے چھپے پھرتے ہیں جن کو لوگ کہتے ہیں کہ ''یہ اُردو کا قرآن ہے'' تو ان کو ''قرآن'' کہنا غلط ہے، یہ ''قرآن'' نہیں ہے، قرآن کا ترجمہ ہے! یہی وجہ ہے کہ اس کو بے وضو ہاتھ لگایا جا سکتا ہے، جنبی اس کو پڑھ سکتا ہے، حائضہ عورت اس کو پڑھ سکتی ہے، اور نماز میں اس کی تلاوت نہیں ہو سکتی، اگر کوئی شخص نماز میں اس کو پڑھے گا تو اس نے قرآن نہیں پڑھا، قرآن کا ترجمہ پڑھا ہے، اور نماز میں چونکہ قرآن پڑھنا ضروری ہے اس لیے اس کی نماز ہوگی ہی نہیں۔ اور فقہ میں آپ نے پڑھا ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف جو قول منسوب کیا گیا ہے کہ وہ غیر عربی میں بھی پڑھنے کی اجازت دیتے ہیں تو یہ مرجوح قول ہے، اور اس سے حضرت ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا رُجوع ثابت ہے، اُمت کا متفق علیہ مسئلہ ہے کہ قرآنِ کریم عربی میں پڑھا جائے تو یہ قرآن ہے، اور اگر اس کو کسی دوسری زبان کے اندر پڑھا جائے تو یہ قرآن نہیں، قرآنِ کریم کا ترجمہ ہے، اس کے اَحکام قرآن والے نہیں ہیں۔

صرف ترجمہ چھاپنا کیوں جائز نہیں؟

اور بغیر الفاظِ قرآن کے قرآنِ کریم کا ترجمہ چھاپنا فقہاء کے نزدیک جائز بھی نہیں، کیونکہ اس سے تحریف کا راستہ کھلتا ہے، پہلی کتابیں محرف اس لئے ہو گئیں کہ ان کی اپنی اصل زبان باقی نہیں رہی، ترجمے رہ گئے، کسی نے ترجمہ کچھ کر دیا، کسی نے کچھ کر دیا، کہاں سے کہاں بات پہنچ گئی، اگر اصل الفاظ سامنے ہوں تو ترجمے کی غلطی نکالی جا سکتی ہے، اور اگر اصل الفاظ سامنے نہ ہوں تو ترجمے کی غلطی کون نکالے؟ تو اپنی اپنی تعبیر کے طور پر بات کو کہیں کا کہیں لے گئے، اس لئے قرآنِ کریم وہی ہے جو عربی میں ہو، یہ عربی مبین میں اُترا ہے، غیر عربی زبان کے اندر اس کو قرآن نہیں کہہ سکتے، حتیٰ کہ جو الفاظ قرآنِ کریم کے حضور ﷺ سے منقول ہیں اگر وہ بدل دیے جائیں، چاہے عربی میں بدلے جائیں، تو بھی وہ قرآن نہیں ہے۔ تو عربیٔ مبین جس وقت تک باقی ہوگی، واضح عربی، فصیح بلیغ جو اللہ تعالیٰ نے اُتاری ہے، اس وقت تک اس کے اُوپر قرآن کا لفظ صادق آئے گا۔

قرآن کا تذکرہ سابقہ کتب میں بھی موجود ہے

وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ: اب اس (قرآن) کے اوپر صداقت کی شہادت پیش کی، ویسے تو خود قرآنِ کریم ہی حجت ہے اپنے لئے، ''آفتاب آمد دلیلِ آفتاب'' سورج سورج ہے، اس کی دلیل خود اس کا اپنا وجود ہے، کوئی اور دلیل دینے کی ضرورت نہیں۔ تو اس کی فصاحت بلاغت اور جس طرح سے لوگوں کو چیلنج کر دیا گیا تھا، تو یہ خود دلیل ہے اس بات کی کہ یہ اللہ کی کلام ہے کسی بشر کی نہیں۔ لیکن اس کی صداقت کے لئے ایک یہ دلیل بھی ہے کہ اس کا ذکر پہلی کتابوں میں آیا ہوا ہے، اس کی پیش گوئی موجود ہے، اور پیش گوئی کے مطابق یہ آیا ہے، تو یہ بھی دلیل ہے، اور علمائے بنی اسرائیل اس کو جانتے ہیں، چنانچہ جو علمائے بنی اسرائیل ایمان لے آئے تھے، انہوں نے صراحت کے ساتھ اس کا اقرار کیا جیسے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور اس قسم کے دوسرے لوگ۔ تو کیا مشرکینِ مکہ کے لئے یہ نشانی کافی نہیں ہے؟ قرآن کی صداقت کے لیے، کہ اس کے اُترنے سے پہلے ہی اس کی پیش گوئی آئی ہوئی ہے۔

''اِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ'' کا دُوسرا مفہوم

یا مطلب یہ ہے کہ اس کے مضامین کوئی عجیب نہیں ہیں، کوئی نرالے نہیں ہیں، پہلی کتابوں میں بھی یہ مضامین آئے ہوئے ہیں، قرآنِ کریم نے توحید کا ذِکر کیا تو کون سی آسمانی کتاب توحید سے خالی ہے؟ قرآنِ کریم نے رِسالت کا مسئلہ ذِکر کیا تو ہر آسمانی کتاب اس رِسالت کے مسئلے کو ذکر کرتی ہے، اور قرآنِ کریم نے آخرت کا اور جنت دوزخ کا تعارف کرایا، تو جتنی پہلی کتابیں ہیں سب اس کا ذِکر کرتی ہیں۔ تو یہ مضامین پہلی کتابوں میں موجود ہیں، اور ان کو علمائے بنی اسرائیل جانتے ہیں، اس لئے کوئی نئی بات نہیں ہے، نہ نبی کا آنا نیا، اور نہ اس قسم کے عقیدے نئے ہیں۔

قرآن جیسا کلام کوئی نہیں بنا سکتا

اور وہ جو شبہ کرتے تھے کہ یہ خود بنایا ہوا ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر یہ قرآن ہم کسی عجمی پہ اُتار دیتے، اور کوئی عجمی اس قرآن کو پڑھ کر سناتا، جس پر یہ شبہ بھی نہ کیا جا سکتا کہ اس نے خود بنایا ہے، کیونکہ آپ تو عربی ہیں اس لئے ان کو یہ کہنے کی گنجائش نکل آئی، اگر کسی عجمی پہ ہم اُتار دیتے اور وہ عربی زبان پڑھ کے ان کو سناتا تو کوئی شبہ کی گنجائش نہ ہوتی کہ یہ اس کا بنایا ہوا ہے، اور یہ سمجھتے کہ اس کا بنایا ہوا نہیں، لیکن پھر بھی ایمان نہ لاتے، یہ تو ضدی ہیں۔ اب اگر عجمی پڑھ کے سنائے تو وہی بات ہے، عربی پڑھ کے سنائے تو وہی بات ہے، کیونکہ نہ اس قسم کی کلام بنانے پر کوئی عربی قادر، اور نہ کوئی عجمی قادر۔ جیسے آگے بھی آئے گا سورۂ حم میں[1] کہ اگر یہ عجمی زبان میں اُتار دیا جاتا تو کہتے کہ یہ عجیب بے جوڑ بات ہے کہ کتاب عجمی میں اور رسول عربی؟ پھر یہ یوں شبہ نکال لیتے کہ رسول تو عربی ہے اور اس کے اُوپر کتاب عجمی میں اُتری، یہ بھی کوئی جوڑ ہے؟ بہر حال ''خوئے بد را بہانہ بسیار'' جب ماننا ہی نہیں ہے، تو نہ ماننے کی صورت میں کوئی نہ کوئی وہ عذر تراشتے رہتے ہیں۔

---

(۱) وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ (پارہ ۲۴ سورۂ حم سجدہ: ۴۴)

حضور کے ﷺ لئے تسلی اور کافروں کے وعید

اگلا لفظ جو ہے (كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ) یہ حضور ﷺ کے لئے تسلی بھی ہے اور ان کے لئے وعید بھی ہے کہ یہ تکذیب اسی طرح سے لوگوں کے دلوں میں گھس گئی جس طرح سے پہلے لوگ جب تکذیب پہ اڑ جاتے تھے تو پھر کسی صورت میں باز نہیں آتے تھے۔ ہم نے اس تکذیب کو، اس جھٹلانے کو، اس ایمان نہ لانے کو مجرمین کے قلوب میں داخل کر دیا ہے، گھسیڑ دیا ہے، جس میں وجہ آ گئی مجرمین، یعنی ان کا جرم کرنا، جرم کرتے کرتے ان کے قلوب کی صلاحیت ختم ہو گئی، اب یہ عدم ایمان اور تکذیب ان کے دلوں کے اندر گھسی ہوئی ہے، یہ تکذیب اس وقت تک نہیں نکلے گی اور یہ ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ دردناک عذاب نہ دیکھ لیں، جو عذاب ان کے پاس اچانک آ جائے گا اور ان کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ آنے والا ہے، اچانک آنے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ علامت نمایاں نہیں، اور یہ نہیں سمجھتے کہ عذاب آنے والا ہے، جس طرح سے بعض قوموں کے تذکرے میں آیا کہ آندھی آ رہی تھی عذاب کی، اور وہ دیکھ کے سمجھ رہے تھے کہ یہ بادل ہے جو ہم پہ بارش برسانے کے لئے آیا ہے، جو ہمارے لئے زندگی کا باعث بنے گا، ہماری زمین سرسبز ہو گی، اور آ گیا فوراً عذاب۔ تو لَا يَشْعُرُوْنَ کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ علامت دیکھ کر بھی سمجھ نہیں رہے ہوں گے کہ عذاب آ رہا ہے، اور عذاب ان پہ آ جائے گا، پھر یہ چیخیں چلائیں گے کہ ہمیں کچھ مہلت مل جائے کہ ہم اپنے آپ کو سنبھال ہی لیں، تو آگے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس قسم کے عذاب کی یہ لوگ جلدی مچا رہے ہیں؟ کہ جس کے آنے کے بعد ان کے یہ حالات ہوں گے۔ اور اگر ہم ان کو چند سال تک خوش حالی دے ہی دیں، جس طرح سے اب دنیا میں ہم نے ان کو مہلت دے رکھی ہے، پھر جب اللہ کا عذاب آ جائے گا تو یہ خوش حالی ان کے کس کام آئے گی؟ یا جن چیزوں کے ساتھ ان کو فائدہ پہنچایا گیا ہے وہ چیزیں ان کے کس کام آئیں گی؟ اگلے الفاظ کا مفہوم یہی ہے کہ آپ دیکھیں کہ اگر ہم انہیں چند سال تک فائدہ پہنچا دیں پھر ان کے پاس وہ چیز آ جائے جس کا یہ وعدہ دیے جاتے ہیں یعنی عذاب، تو جو کچھ یہ خوش حالی دیے گئے، یا وہ چیزیں جن کے ساتھ ان کو فائدہ پہنچایا گیا یعنی سامانِ خوش حالی، وہ ان کے کیا کام آئے گا؟ کچھ بھی نہیں، مَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ: یہ سامانِ خوش حالی ان سے عذاب کو دور نہیں ہٹا سکے گا، ان کے کام نہیں آئے گا، انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا۔ اَغْنٰى عنهُ کا ترجمہ تینوں طرح سے کر دیا جاتا ہے کام آنا، فائدہ پہنچانا، دور ہٹانا، تینوں طرح سے مفہوم واضح ہو جاتا ہے...... اور اب ان کو جو مہلت دی گئی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اسی اپنی عادت کے مطابق دی ہے کہ پہلے جتنی بستیاں تباہ ہوئی ہیں ان سب میں اللہ تعالیٰ نے ڈرانے والے بھیجے تھے، جو ان کو یاددہانی کے لئے آئے تھے۔ ذِكْرٰى یعنی تذکیر کے لئے نصیحت کرنے کے لئے، ہم نے ان کے لئے ڈرانے والے بھیجے۔ نہیں ہلاک کیا ہم نے کسی بستی کو مگر ان بستیوں کے لئے ڈرانے والے تھے، نصیحت کرنے کے لیے...... اور ہم ظلم کرنے والے نہیں یعنی اگر ہم نہ سمجھاتے اور کسی منذر کو نہ بھیجتے اور ایسے ہی ان کو پکڑ لیتے تو ظاہری طور پر یہ ایک زیادتی معلوم ہوتی۔ لیکن ہم ایسی زیادتی بھی نہیں کرتے۔

قرآنِ کریم کہانت کی کتاب نہیں

اب آگے کہانت کی تردید آ گئی۔ کافر جو کہتے تھے کہ یہ کاہن ہیں اور ان کو کہانت حاصل ہے۔ کہانت کا مطلب یہ ہے

کہ ان کو جنات، شیاطین اس قسم کی باتیں پہنچاتے ہیں، جس طرح سے پُرانے زمانے میں کاہن باتیں لے کے ان کو اچھے الفاظ میں ادا کر دیا کرتے تھے۔ اس کی تردید کرنا مقصود ہے کہ یہ کہانت نہیں، یہ تو اللہ کی طرف سے اُتارا ہوا ہے۔ کہانت میں تو باتیں شیاطین کی وساطت سے آیا کرتی ہیں، تو شیطان ایسی بات کیسے لا سکتے ہیں جو سراسر ان کے مشن کے خلاف ہوں، شیطان تو گمراہی پھیلاتے ہیں اور یہ کتاب سراپا ہدایت ہے، تو اپنے خلاف اس قسم کی کتاب شیاطین نے کیسے بنالی، وہ تو ایسی باتیں لانے کی، بنانے کی طاقت ہی نہیں رکھتے۔ وہ تو وحی کی طرف اور ملأ اعلیٰ کی طرف کان ہی نہیں لگا سکتے، ان کو دُور ہٹایا ہوا ہے، پھر تم کس طرح سے سمجھتے ہو کہ یہ شیاطین کی وساطت سے اُترا ہے، شیاطین اس قسم کی باتیں نہیں لا سکتے، یہ تو ساری کی ساری کتاب شیاطین کی تردید میں ہے، تو اپنی تردید میں اور اپنے مشن کے خلاف وہ اس قسم کی باتیں کیسے لا سکتے ہیں؟ ان میں طاقت ہی نہیں کہ وہ اس قسم کی بات لے آئیں اور ملأ اعلیٰ کی طرف کان لگانے سے ان کو روکا ہوا ہے، تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ اس میں واسطہ کسی شیطان کا ہو...... جب یہ ثابت ہو گیا کہ یہ اللہ کی کتاب ہے، تو پھر آگے توحید کی تاکید آ گئی کہ اللہ کے ساتھ کسی اور الٰہ کو نہ پکارو، جو بھی کوئی پکارے گا معذب ہو جائے گا، یہاں خطاب حضور ﷺ کو ہے لیکن سُنانا باقیوں کو مقصود ہے۔

قریبی رشتہ داروں کو تبلیغ کی تاکید

اور پھر خصوصیت کے ساتھ تاکید کی گئی کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ، ان کا حق ہے کہ ان کو پہلے سمجھاؤ، اور جب قریبی رشتہ دار مان جائیں تو پھر دوسروں پر بھی اچھا اثر پڑتا ہے، اور قریبی رشتہ داروں کو ڈرانا ایک حق بھی ہے تاکہ وہ بھی عذاب سے بچ جائیں جہنم میں نہ جائیں، قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا (سورۂ تحریم: ۶) ہر انسان کے اوپر یہ حق ہے کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو سمجھائے اور ان کو جہنم سے بچانے کی کوشش کرے، باقی! اگر قریبی رشتہ دار نہ سمجھیں، نہ مانیں، اعراض کریں تو ان سے لاتعلقی کا اعلان کر دو۔

اہلِ ایمان پر شفقت کا حکم

اور جو بھی ایمان لے آئے اور آپ کی اتباع کرے اس سے محبت اور شفقت کرو، ان کی طرف اپنے بازو پھیلاؤ، اور ان کو اپنے بازو میں لے کے ان کے اوپر اپنا بازو جھکاؤ۔ یعنی قریبی رشتہ دار ٹھیک ہے کہ رشتہ دار ہیں، مان جائیں تو ٹھیک ہے، اور اگر نہیں مانتے تو ان سے لاتعلقی کا اعلان کر دو، فَقُلْ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ۔ اور آپ کی شفقت اور محبت جتنی ہے وہ متبعین مؤمنین پہ ہونی چاہیے، جو بھی ایمان لے آئے اس کی طرف اپنے بازو پھیلاؤ، اور اس کو گود میں لے کے اپنے بازو اس کے اوپر پست کرو یعنی نہایت شفقت کا معاملہ اس کے ساتھ کرو۔ جو رشتہ دار کافر ہوں قبول نہیں کرتے، ان کے مقابلے میں مؤمنین کو ترجیح دو، چاہے وہ غیر ہی ہوں۔ جیسے ہمارے شیخ (سعدی رحمہ اللہ) کہتے ہیں:

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد — فدائے یک تنِ بیگانہ کہ آشنا باشد[1]

(۱) "گلستان" باب دوم، حکایت نمبر ۴۲

اپنا ہزار رشتہ دار جو خدا سے بیگانہ ہے، ایک تن بیگانہ جو اللہ کو جاننے والا ہے، اس ہزار رشتہ دار کو اس کے اوپر قربان کیا جاسکتا ہے۔ تو یہاں بھی اسی طرح سے ہے کہ ان اُقربین سے براءت کا اعلان کردیجئے، اور محبت وشفقت کا اظہار مؤمنین کے ساتھ کیجئے۔

ہر حال میں اللہ پر بھروسا کریں

باقی! دیکھیے، جس وقت اقربین سے براءت کا اعلان کیا جائے گا تو اپنوں کو تو چھوڑ دیا، اور اپنوں کو چھوڑنے کے بعد آگے انجام کیا ہوگا؟ اس کی ابھی خبر نہیں کہ کیسے حالات آنے والے ہیں؟ اس میں انسان بسا اوقات گھبراتا ہے کہ اگر میں رشتہ داروں سے علیحدہ ہوگیا تو آگے زندگی کیسے گزاروں گا؟ میرا ماحول کس طرح سے بنے گا؟ مستقبل میں مجھے کوئی تکلیف تو پیش نہیں آئے گی؟ ہزار وسوسے انسان کے قلب میں آتے ہیں، تو ان وسوسوں کو دُور کرنے کے لئے کہہ دیا کہ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ آپ عزیز رحیم پر توکل کیجئے، بھروسا کیجئے۔ اپنوں کو چھوڑ کر، اپنوں سے براءت کا اعلان کر کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ جوڑ لیجئے، بھروسا اس پہ رکھیے، وہ ہر حال میں آپ کو جانتا ہے، آپ کی باتیں سنتا ہے، آپ کے حال کو دیکھتا ہے، اس لئے گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ یہ گویا کہ تقویت پہنچادی قلب کو، کہ رشتہ داروں سے علیحدگی اختیار کر کے آپ یہ نہ سمجھیں کہ زندگی میں کوئی تکلیف ہوگی، بھروسا کیجئے عزیز رحیم پر، جو دیکھتا ہے آپ کو جس وقت کہ آپ قیام کرتے ہیں اور اٹھتے ہیں اور آپ کا چلنا پھرنا ساجدین میں، نماز پڑھنے والوں میں، جیسے مضمون میں نے آپ کی خدمت میں عرض کردیا، (ایمانِ ابوین کا مسئلہ آخر میں عرض کرتا ہوں)، بے شک وہ سننے والا ہے جاننے والا ہے۔

شیاطین کن کے پاس آتے ہیں؟

یہ تو کہہ دیا کہ شیاطین اس قرآن کو لے کر نہیں آئے، آپ پر شیاطین نہیں آتے، نہ یہ ان کی شان کے لائق ہے، نہ وہ ایسا کرسکتے ہیں۔ ہاں! ہم بتادیں؟ کہ شیاطین کن پہ اُترا کرتے ہیں۔ شیاطین ان پر اُترتے ہیں جو اَفاک اور اَثیم ہوں، بدترین قسم کے جھوٹے اور گنہگار۔ واقعہ بھی ایسے ہی ہے کہ شیاطین کے ساتھ دوستی انہی کی ہوگی جن کی اپنی زندگی شیطانوں جیسی ہوگی، تو یہ جادوگر قسم کے لوگ جو کہ اَرواحِ خبیثہ سے تعلق رکھتے ہیں، اور کاہن قسم کے لوگ جو جنّات کے ساتھ ربط رکھتے ہیں، تو ان کا کام یہی ہے کہ جتنے گندے رہیں، جتنے بُرے کام کریں، جتنی بدزبانی کریں اتنی ان کو شیاطین سے مناسبت زیادہ ہوتی ہے۔ عملاً گندے ہوں گے، قولاً جھوٹے ہوں گے، بدزبان ہوں گے، اس قسم کے لوگوں پر شیاطین آیا کرتے ہیں، مناسبت ان کو ہے۔ لیکن تم اس نبی کو دیکھو! تو کتنا پاکیزہ کردار، کتنا سچا گفتار، ان کو کیا مناسبت؟ يُلْقُوْنَ السَّمْعَ: وہی گنہگار جھوٹے لوگ کان لگاتے ہیں شیاطین کی بات سننے کے لئے، اور اکثر ان میں جھوٹے ہوتے ہیں، اور اکثر کی باتیں جھوٹی ہوتی ہیں، کبھی ہوا کہ کوئی بات سچی نکل آئی، ورنہ اکثر وبیشتر یہ جھوٹ ہی بولتے ہیں، جیسے کاہنوں کا حال ہوتا ہے۔

حضور ﷺ کی شعراء کی صفات سے کوئی مناسبت ہی نہیں

اور باقی رہا کہ تم کہتے ہو کہ یہ شاعر ہیں۔ تو یہ شاعر بھی نہیں! شاعروں کی صفات میں بھی غور کرو، اور اس نبی کی صفات میں بھی غور کرو، تمہیں پتا چلے گا کہ دونوں کی آپس میں کوئی نسبت نہیں، شعراء کا حلقہ دیکھو! کہ شعراء کے اردگرد کیسے لوگ جمع ہوا کرتے ہیں، ان کے ساتھ مناسبت کن لوگوں کو ہوتی ہے، وہی ذہنی عیاش قسم کے لوگ، اوباش قسم کے جو باتیں کر لیں اور خوش ہولیں، عمل اور کردار کی ضرورت ہی نہیں محسوس کرتے، ذہن کے بھٹکے ہوئے لوگ شعراء کے اردگرد جمع ہوا کرتے ہیں۔ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ: یعنی کسی شاعر کے حلقے کو آپ دیکھ لیجئے، اور یہ شعراء جو زمانۂ جاہلیت کے تھے امرأ القیس وغیرہ، ان کو دیکھ لو، ان کا کیا کردار تھا، اور ان کے ماننے والے اور ان کے ساتھ محبت رکھنے والے کس قسم کے بدکردار لوگ تھے، ان کا حلقہ تو گمراہوں کا حلقہ ہوتا ہے.....
دوسری بات یہ ہے کہ وہ خیالات کے میدانوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں، کوئی ایک نظریہ ان کا نہیں ہوتا، کبھی کسی کی تعریف کرنے لگیں گے تو اس طرح سے تعریف کریں گے کہ معلوم ہوگا کہ اس جیسا دنیا میں کوئی پیدا ہی نہیں ہوا۔ جنہوں نے ''متنبی'' پڑھی ہے، انہوں نے دیکھا ہوگا متنبی کی تعریف کا تماشا، کہ جب متنبی کسی کی تعریف کرتا ہے تو کیسے کرتا ہے؟ اور جب اُسی کی مذمت کرنے لگ جائیں تو اتنا آگے نکل جائیں گے جس کا حد حساب کوئی نہیں، ان کا ٹھکانا ہی کوئی نہیں، کوئی متعین نشانہ ہی نہیں جس کے متعلق انہوں نے بات کرنی ہے، کبھی بہادری کے شعر کہنے لگیں گے تو پڑھنے والا سمجھے گا کہ شاید وہ کوئی رستم ہے، لیکن جب جا کے دیکھو گے تو چوہا مارنے کی بھی قوت نہیں ہے، اور اسی طرح جب سخاوت کے اور اپنی عشق بازی اور محبت کے واقعات سنانے لگیں گے تو ایسا معلوم ہوگا جیسے یہ واقعی کوئی وقت کے مجنوں ہیں، لیکن جس وقت ان کو جا کے دیکھو گے تو بالکل ہی خالی، نہ محبت میں کوئی مقام، نہ بہادری میں کوئی مقام، نہ سخاوت میں کوئی مقام، بس باتیں بناتے ہیں اور وقتی طور پر ذہن کو راحت اور لذت پہنچانے کے لئے ان کی کلام کام آتی ہے۔ اس لئے بے کار قسم کے لوگ ان کے اردگرد جمع ہوتے ہیں، اور آج بھی مشاعروں میں جا کے دیکھو، شعر کہنے والوں کو جا کے دیکھو، یہی نقشہ آپ کو نظر آ جائے گا، اور ان کا کردار ان کی گفتار کے مطابق نہیں ہوتا، یہ گفتار کے غازی ہوتے ہیں کردار کے غازی نہیں ہوتے، قوال ہوتے ہیں فعال نہیں ہوتے، عمل میں یہ بہت پیچھے ہوتے ہیں باتیں زیادہ بناتے ہیں۔ اور نبی کی ان صفات سے کیا مناسبت؟ یہاں تو ایک ایک بات سچی، جو کہیں وہی کر کے دکھائیں، قول اور عمل ایک ہی ہے...... اور اردگرد جمع ہونے والوں کی صفات کو دیکھو! بھلا شاعروں کے دوست ایسے ہوا کرتے ہیں؟ کیسے خدا ترس گروہ پیدا ہو گیا، کس طرح سے حقوق اللہ اور حقوق العباد کی رعایت رکھنے والے لوگ آ گئے، کس طرح سے ان کی زندگیوں میں پاکیزگی آ گئی، اپنی عزت کا احساس ہوا، دوسروں کی عزت کا خیال کرتے ہیں، کوئی عیاشی بدمعاشی ان لوگوں کے اندر موجود نہیں، تو کیا شاعروں کے متبعین ایسے ہوا کرتے ہیں؟ تو گویا کہ کسی آدمی کے اردگرد جو لوگ دوستی کے طور پر جمع ہوتے ہیں ان کا اچھا ہونا اس آدمی کے اچھا ہونے کی دلیل ہے، اور ان کا بُرا ہونا اس آدمی کے برا ہونے کی دلیل ہے۔ تو شاعروں کے دوستوں کو بھی دیکھو، اور اس کے دوستوں کو بھی دیکھو، تمہیں پتا چل جائے گا۔ اس لئے یہ شاعر بھی نہیں۔

اہلِ ایمان عملِ صالح والے شاعر مستثنیٰ ہیں

اب ان آیات میں جو شعراء کی مذمت آئی، تو اس میں سے مستثنیٰ کر لیا ان لوگوں کو جو کہ شعر ایمان اور عملِ صالح کے جذبے سے کہتے ہیں، اور اپنے شعروں کے اندر اللہ کا ذکر کثرت سے کرتے ہیں۔ جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے، یا بعض اولیاء اللہ بھی شاعر گزرے ہیں، جیسے مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ۔ اور ہمارا شیخ وہ تو آپ جانتے ہیں کہ بہت پیارا شاعر تھا یعنی شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ ''گلستان''، ''بوستان'' اس نے لکھی، وہ بھی شاعر تھے لیکن وہ اس قسم کے شاعر نہیں، بلکہ ان کے شعروں کے اندر اللہ کا ذکر کثرت سے ہے، نصیحتیں ہیں، وعظ ہے، حمد ہے، ثنا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف ہے، اچھے اچھے مضامین کو اچھے انداز میں ذکر کیا ہے۔ تو جو لوگ ایسے ہوں جو ایمان لاتے ہیں، نیک عمل کرتے ہیں، اللہ کا ذکر کثرت سے کرتے ہیں، اور اگر کسی کی مخالفت میں شعر کہیں، جیسے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ مشرکین کے خلاف کہتے تھے، تو مظلوم ہونے کے بعد بدلہ لیتے ہیں، ابتداءً کسی کے خلاف کوئی ایسی بات نہیں کہتے، کسی کے خلاف اِلزام تراشی یا بہتان بازی نہیں کرتے، ہاں البتہ اگر انہیں کوئی تکلیف پہنچا تا ہے تو اس کی تردید میں اگر وہ شعر کہیں تو اس میں وہ معذور ہیں، مظلوم ہونے کے بعد بدلہ لینے کی اجازت ہے۔

اور عنقریب جان لیں گے یہ ظالم لوگ کہ یہ کس منقلب میں مڑتے ہیں، کون سی جگہ ہے ان کے لوٹنے کی، کدھر کو لوٹ کے جاتے ہیں، ان کو پتا چل جائے گا کہ ان کا اُونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے، یہ آخر میں ایک تنبیہی فقرہ کہہ دیا گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کریمین کے اِیمان کے متعلّق لطیف بحث

درمیان میں ایک بات آئی تھی جو میں نے آپ کی خدمت میں عرض کی کہ بعض مفسرین نے اس آیت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کے ایمان پر اِستدلال کیا ہے وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ۔ یہ مسئلہ آ گیا ''ایمانِ اَبوین'' کا، اس بارے میں اتنا عرض ہے کہ قرآن اور حدیث میں یہ مسئلہ صراحت کے ساتھ نص کے درجے میں مذکور نہیں، اور علمائے اسلام کے اقوال اس بارے میں کچھ مختلف سے ہیں، سب سے زیادہ مفصل کلام اس مسئلے کے اُوپر علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے، اور متعدّد رسالے اس بارے میں لکھے ہیں، جن میں ثابت کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اُصول میں کوئی کافر نہیں، آپ کے والدین آباؤ اجداد آدم علیہ السلام تک جتنے ہیں وہ سارے کے سارے مغفور ہیں۔

''آزر'' اِبراہیم علیہ السلام کا باپ تھا یا چچا؟

لیکن اس میں سب سے بڑی رُکاوٹ حضرت ابراہیم علیہ السلام پہ جا کر آتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ آزر کے مشرک اور کافر ہونے کی قرآنِ کریم میں صراحت ہے، تو پھر یہ آباؤ اجداد تک سب کو مؤمن اور سب کو ناجی کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے؟ یہ اشکال درمیان میں آتا ہے۔ جو نصِ قرآن کے اندر آیا اور اَحادیث میں بھی ''آزر'' کو اِبراہیم علیہ السلام کا باپ قرار دے کر اس کو جہنمی قرار دیا گیا کہ اس کا انتقال کفر پر ہوا، اور قرآنِ کریم میں بھی متعدّد آیات آپ کے سامنے آ گئیں۔ اس لئے پھر ان لوگوں نے

تاریخی روایات کے ساتھ یا اسرائیلیات کے ساتھ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ''آزر'' حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چچا تھا باپ نہیں تھا، اوران کے باپ کا نام ''تارخ'' تاریخی روایات میں آتا ہے۔ بہرحال یہ بات اگر کھٹکتی ہے صراحت کے ساتھ تو یہاں جاکر کھٹکتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اُوپر جس باپ کا ذِکر ہے یعنی ''آزر''، وہ تومشرک ہے۔ بعض لوگوں نے اس بارے میں یہی مسلک اختیار کیا ہے کہ یہ باپ نہیں چچا ہے۔ لیکن امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو باپ ہی قرار دیا۔ اور ''رُوح المعانی'' والا ان کے پیچھے لگا کیونکہ صاحب روح المعانی، سیّد محمود آلوسی، مفتی بغداد، تُرک کے زمانے میں ہوئے، اوران کی تفسیر بہت اچھی اور قابلِ اعتماد تفسیر ہے، انہوں نے کہا ہے کہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ قلّتِ تتبع ہے، انہوں نے کوئی حوالہ جات زیادہ تلاش نہیں کئے، غور نہیں کیا، جو ''آزر'' کو حقیقی باپ قرار دے دیا، ورنہ وہ باپ نہیں چچا ہے۔ تو ''رُوح المعانی'' والے نے بھی یہی مسلک اختیار کیا ہے، اور علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے تو رِسالے لکھے ہیں۔

علّامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک

تو ''تفسیر مظہری'' میں قاضی ثناء اللہ صاحب رحمۃ اللہ نے مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ (سورۂ توبہ: ۱۱۳) اس آیت کے ضمن میں ان رِسالوں کا ذِکر کیا ہے، آخر میں وہ کہتے ہیں: ''لہٰذا اس آیت کو دلیل بنا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کو مشرک قرار دینا دُرست نہیں (یعنی یہی آیت جو سورت براءت میں آئی ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کو مؤمن ثابت کرنے کے لئے سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے چند رسائل لکھے ہیں، بلکہ آدم علیہ السلام تک آپ کے تمام آبا وَاجداد امہات کے ایمان کو ثابت کیا ہے، میں نے ان سب کا خلاصہ کرکے اس موضوع پر ایک رسالہ تقدیس آباء النبی صلی اللہ علیہ وسلم تالیف کردیا ہے۔'' یعنی یہ ''مالا بدمنہ'' والے قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ، وہ کہتے ہیں کہ ان رسالوں کا خلاصہ نکال کے میں نے ایک رسالہ لکھ دیا ہے ''تقدیس آباء النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' جس کا مطلب یہ ہوا کہ قاضی ثناء اللہ بھی اسی مسلک پہ ہیں۔

علّامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک اور ملّا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی سخت تردید

اور صاحبِ ''رُوح المعانی'' نے اسی (سورۂ شعراء والی) آیت کے اُوپر صرف ایک اشارہ کیا ہے، اسی آیت کو نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''وَاسْتُدِلَّ بِالْاٰيَةِ عَلٰى اِيْمَانِ اَبَوَيْهِ صلی اللہ علیہ وسلم كَمَا ذَهَبَ اِلَيْهِ كَثِيْرٌ مِّنْ اَجِلَّةِ اَهْلِ السُّنَّةِ'' اہلِ سنّت میں سے جلیل القدر علماء ادھر گئے ہیں یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کے ایمان کے اثبات کی طرف۔ اگلا لفظ بہت سخت ہے جو کہ ''رُوح المعانی'' والے نے لکھا ہے: ''وَاَنَا اَخْشَى الْكُفْرَ عَلٰى مَنْ يَّقُوْلُ فِيْهِمَا رضی اللہ تعالیٰ عنہما عَلٰى رَغْمِ اَنْفِ عَلِيِّ الْقَارِئِ'' کہتے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کے بارے میں زبان کھولتے ہیں، اور کوئی دوسری قسم کی بات کہتے ہیں، تو مجھے تو اس شخص پر کُفر کا اندیشہ ہے کہ کہیں وہی کافر ہو کر نہ مرے۔ اوران کو ''رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا'' کہہ کر ذِکر کیا، تو صاحبِ ''رُوح المعانی'' کا مسلک یہی ہے۔ اور آگے اشارہ کیا کہ علی قاری کی ضد کے باوجود، یعنی وہ چاہے ناک رگڑتا رہے، میں اس کی پروا نہیں کرتا۔ یہ علی القاری ہیں ہمارے شارحِ مشکوٰۃ، جنہیں ''ملّا علی قاری'' کہا جاتا ہے۔ انہوں نے ایک کتاب کے اندر صراحت کی ہے، اپنی قلم کے ساتھ یہ مسئلہ لکھا کہ

حضور ﷺ کے والدین کا خاتمہ کفر پر ہوا۔[1] تو یہ کہتے ہیں کہ ملا علی قاری چاہے اس بات پر ناراض ہی ہوجائے، چاہے وہ ناک رگڑے، لیکن میں اس کی بات ماننے کے لئے تیار نہیں، میں تو علی رغمہ یہ کہتا ہوں کہ جو ان کے بارے میں زبان کھولتا ہے، مجھے تو اس کے کفر کا ڈر ہے۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کی ٹانگ ٹوٹ گئی

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے جس وقت یہ مسئلہ لکھا، یہ آپ کے ہاں جو ''شرح عقائد'' پڑھائی جاتی ہے، اس کی ایک شرح ہے: ''نبراس''، اپنے کتب خانے میں موجود ہے، یہ کوٹ ادو کے ہیں، دو تین دفعہ میں بھی اس علاقے میں گیا ہوں، بہت پرانے بزرگ ہیں، ان کی کتاب ہے ''نبراس''، تو اس کے حاشیے میں لکھا ہے، اور خود انہوں نے بھی ایمان کا قول کیا ہے، تو حاشیے میں کہتے ہیں کہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے جس وقت یہ مسئلہ لکھا ہے تو ان کے استاد تھے ابن حجر مکی، ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے ملا علی قاریؒ کے متعلق خواب دیکھا، خواب میں دیکھتے ہیں کہ ملا علی قاریؒ ایک مکان کی چھت سے گرے اور ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی، جس وقت یہ گرے اور ان کی ٹانگ ٹوٹی تو کوئی شخص خواب میں کہہ رہا ہے: ''هٰذَا جَزَاءُ اِهَانَةِ وَالِدَيْ رَسُوْلِ اللهِ'' کہ یہ حضور ﷺ کے والدین کی اہانت کی بنا پر سزا ملی ہے، تو یہ تو تھا خواب ابن حجر مکی کا، لیکن اس کے بعد لکھتے ہیں: ''فَوَقَعَ كَمَا رَاٰى''[2] کہ جیسے انہوں نے خواب دیکھا تھا، واقعہ بھی ویسے ہی پیش آیا کہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کسی بلند جگہ سے گرے اور ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔

ٹانگ توڑ مسئلہ

میں جس وقت ''کبیر والے'' میں ہوتا تھا تو چونکہ ایک طبقہ ایسا ہے جن کو اصرار ہے کہ نعوذ باللہ! حضور ﷺ کے والدین کو کافر ثابت کیا جائے تا کہ حضور ﷺ کے مختار کل ہونے کی تردید ہوجائے، یعنی مختار کل کی تردید کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے کفر کو ثابت کر کے نعوذ باللہ! ثابت کیا جائے کہ وہ جہنمی ہیں، اور حضور ﷺ بچا نہیں سکیں گے۔ اس مسئلے پہ میں انہیں کہا کرتا ہوں کہ اس مسئلے پر تو ہمارا اتفاق ہے کہ حضور ﷺ مختار کل نہیں ہیں، اور اس کے لئے دوسری سینکڑوں دلیلیں ہیں، لیکن مہربانی کر کے اس دلیل پہ زیادہ زور نہ دو، یہ بات ادب کے خلاف ہے، جب بڑے بڑے علماء اس بات کی طرف گئے ہیں، تو پھر کیا ضرورت ہے کہ حضور ﷺ کے والدین کو ہی زیر بحث لایا جائے، اور ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ''نبراس'' سے نقل کر کے میں انہیں بتایا کرتا تھا کہ یہ ٹانگ توڑ مسئلہ ہے، اس لئے اس میں زبان زیادہ نہ کھولا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس مسئلے کی بنا پر آپ کی بھی ٹانگ ٹوٹ جائے۔

''ابوین کریمین'' کے متعلق علمائے دیوبند کا عقیدہ

بہر حال جہاں تک علمائے دیوبند کی بات ہے تو فتاویٰ کے اندر بھی لکھا ہوا ہے، اور ''فتح الملهم'' (ج ۲ ص ۵۳۲) کے

(۱) ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلے پر ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام ''ادلة معتقد ابی حنیفة فی ابوی الرسول صلی الله علیه وسلم'' ہے۔

(۲) النبراس ص ۳۱۶ طبع مکتبہ امدادیہ ملتان۔ مولفہ مولانا عبد العزیز پر ہاروی م ۱۲۳۹ھ۔

اندر علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی لکھا، اور فتاویٰ مولانا عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ (جلد اول، کتاب العقائد) کے اندر بھی لکھا ہوا ہے[1] کہ یہ حضرات سارے کے سارے یا تو خاموشی کی تلقین کرتے ہیں کہ اس مسئلے پہ بولنا نہیں چاہیے، کیونکہ ضروریاتِ دین میں سے یا عقائد میں سے تو کوئی بات ہے نہیں، اور اگر قول کیا جائے تو پھر ادب کا تقاضا یہی ہے کہ اِن روایات کا سہارا لے کر ایمان کا قول کیا جائے۔ اصل یہ ہے کہ خاموشی اختیار کی جائے، کیونکہ ایسی منقح فیصلہ شدہ بات ہمارے سامنے نہیں۔

''زمانۂ فترت'' کا حکم

ان حضرات کا زمانہ وہ ہے کہ جب اللہ کا کوئی نبی موجود نہیں تھا، جس کو ''فترت کا زمانہ'' کہتے ہیں، اور فترت کے زمانے میں اگر کوئی شخص صرف اللہ کی وحدانیت کا ہی قائل ہو تو بھی اس کی نجات کے لئے کافی ہے، جب انبیاء علیہم السلام کسی علاقے میں نہ آئے ہوں، تعلیمات ان کی مٹ جائیں، تو ایسے وقت میں اگر تھوڑی سی بھی حق کی جھلک اگر کسی کے قلب کے اندر ہو تو وہ بھی اس کی نجات کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین، آپ جانتے ہیں کہ دونوں ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ نبوت سے پہلے فوت ہو گئے تھے، والد تو آپ کی ولادت سے بھی پہلے فوت ہو گئے تھے، اور جس وقت ان (حضرت عبداللہ) کا انتقال ہوا تو ان کی عمر اٹھارہ سال تھی اور آپ ابھی بطنِ مادر میں تھے، اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ابھی چھ سال تھی جبکہ والدہ ماجدہ حضرت آمنہ بھی انتقال کر گئی تھیں۔ تو وہ زمانہ ایسا ہے کہ جس میں کسی نبی کی تعلیم موجود نہیں تھی کہ اگر حق کی جھلک ان کے قلب کے اندر تھوڑی سی بھی موجود ہو، تو نجات کے لئے کافی ہو سکتی ہے، فترت کے زمانے میں ایسے ہی ہوتا ہے۔

خلاصۂ کلام

بہر حال ہم اس بات پہ زور بھی نہیں دیتے کیونکہ یہ منصوص نہیں، لیکن ادب کا تقاضا یہی ہے کہ یا تو تذکرہ ہی نہ کیا جائے، خاموشی اختیار کی جائے، اس معاملے کو اللہ کے سپرد کر دیا جائے، اور اگر ذِکر کیا جائے تو پھر ان کی نجات کا ہی قول کرنا چاہیے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''شرح مشکوٰۃ'' میں بھی اس مسئلے کو بیان کیا ہے، ''باب زیارۃ القبور'' میں، اور ''رُوح المعانی'' میں یہ مسئلہ موجود ہے، اور ''تفسیر مظہری'' میں بھی یہ موجود ہے، اور ''مظہری'' ہی میں ذِکر آیا کہ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر متعدد رسالے لکھے ہیں، اور ان رسالوں کا خلاصہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے ''تقدیس آباء النبی'' کے عنوان سے لکھا، اور ''شرح عقائد'' کے حاشیے میں بھی اس مسئلے کی تفصیل موجود ہے۔ اس لئے میں نے آپ کو متوجہ کر دیا، کہ یہ ''رُوح المعانی'' والے کہتے ہیں کہ اگرچہ میں اس آیت کے دلیل ہونے کا قائل نہیں کہ اسی آیت سے ایمانِ ابوین ثابت ہے، جس طرح سے بعض لوگوں نے کہا۔ لیکن مسئلہ اپنی جگہ محقق ہے، میں اس آیت کی حجیت کا قائل نہیں کہ اسی آیت سے ہم ثابت کریں کہ وہ مؤمن ہیں۔ کیونکہ بڑے بڑے حضرات ادھر چلے گئے ہیں، اگرچہ بعض دوسرا قول کرنے والے بھی موجود ہیں، ہمارا مسلک یہی ہے کہ ہم اس بارے میں خاموشی اختیار کرتے ہیں، اس معاملے کو اللہ کے سپرد کرتے ہیں، لیکن اگر بات کریں گے تو ہمارا رُجحان ادھر ہی ہے کہ ہم بھی

---

(۱) مزید دیکھئے: امداد الاحکام ج ۱ ص ۳۴۰، تاج ۱ ص ۳۴۲، فتاویٰ رحیمیہ ج ۳ ص ۵۲، خیر الفتاویٰ ج ۱ ص ۳۲۲، آپ کے مسائل اور ان کا حل ج ۱ ص ۲۷۔

کہیں کہ حضور ﷺ کے ابوین، والدین ناجی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے ہاں مغفور ہیں، قول کریں گے تو یہی کریں گے، لیکن اس بات پہ زور نہیں دیتے، دوسری طرف ہم زیادہ سخت تنقید نہیں کرتے، خاموشی اختیار کریں تو سب سے زیادہ اَسلم ہے، اور اللہ کے سپرد کر دیں اس معاملے کو کہ حقیقتِ حال جو بھی وہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ قرآن اور حدیث کے اندر یہ مسئلہ صراحت اور قطعیت کے ساتھ نہیں آیا، اور نہ یہ اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے کہ ان کے متعلق یہ عقیدہ رکھو، بلکہ اختلاف ہے، بہت سارے علماء اُدھر گئے ہیں، بہت سوں کا قول یہ ہے، تو علمائے دیوبند ہمیشہ محتاط پہلو کو اختیار کیا کرتے ہیں، اور محتاط پہلو یہی ہے کہ خاموشی اختیار کی جائے اور اس معاملے کو اللہ کے سپرد کر دیا جائے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

سُورَةُ النَّمْلِ

اٰياتها ٩٣ ٢٧ سُوْرَةُ النَّمْلِ مَكِّيَّةٌ ٤٨ ركوعاتها ٧
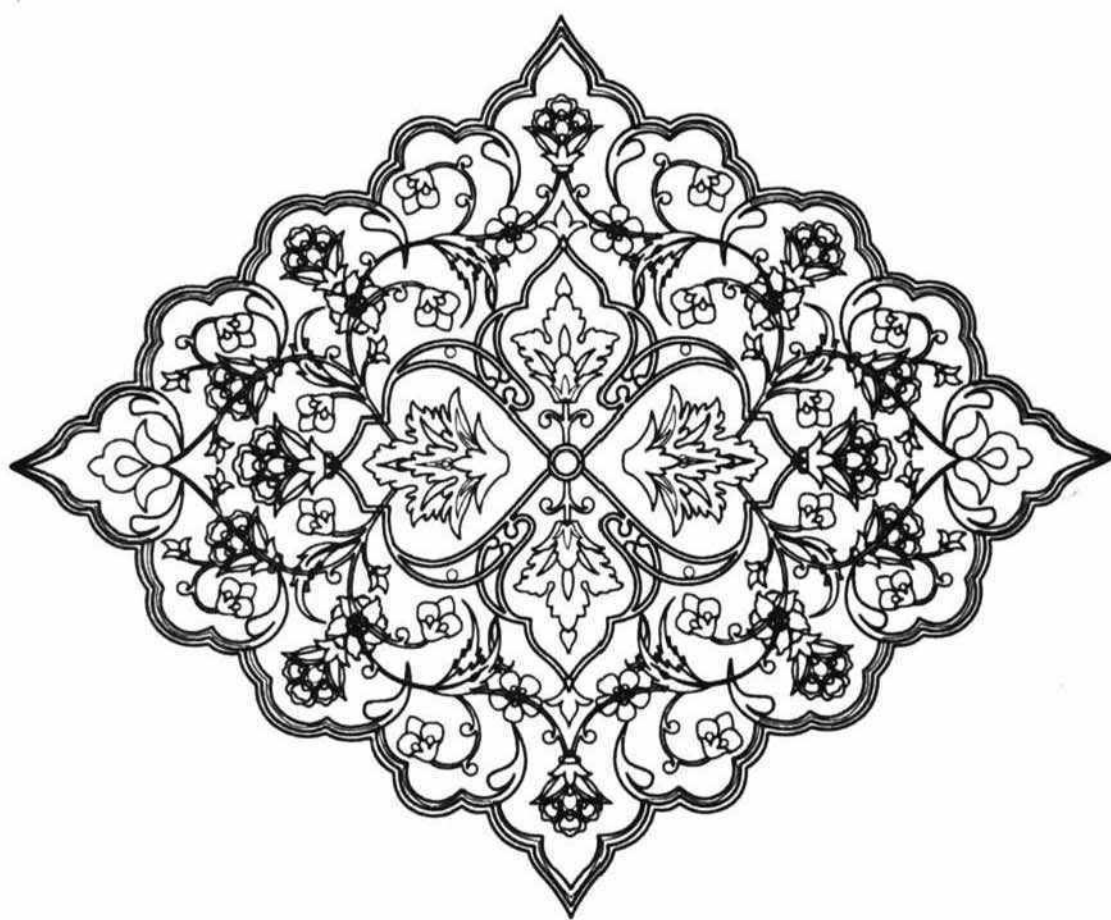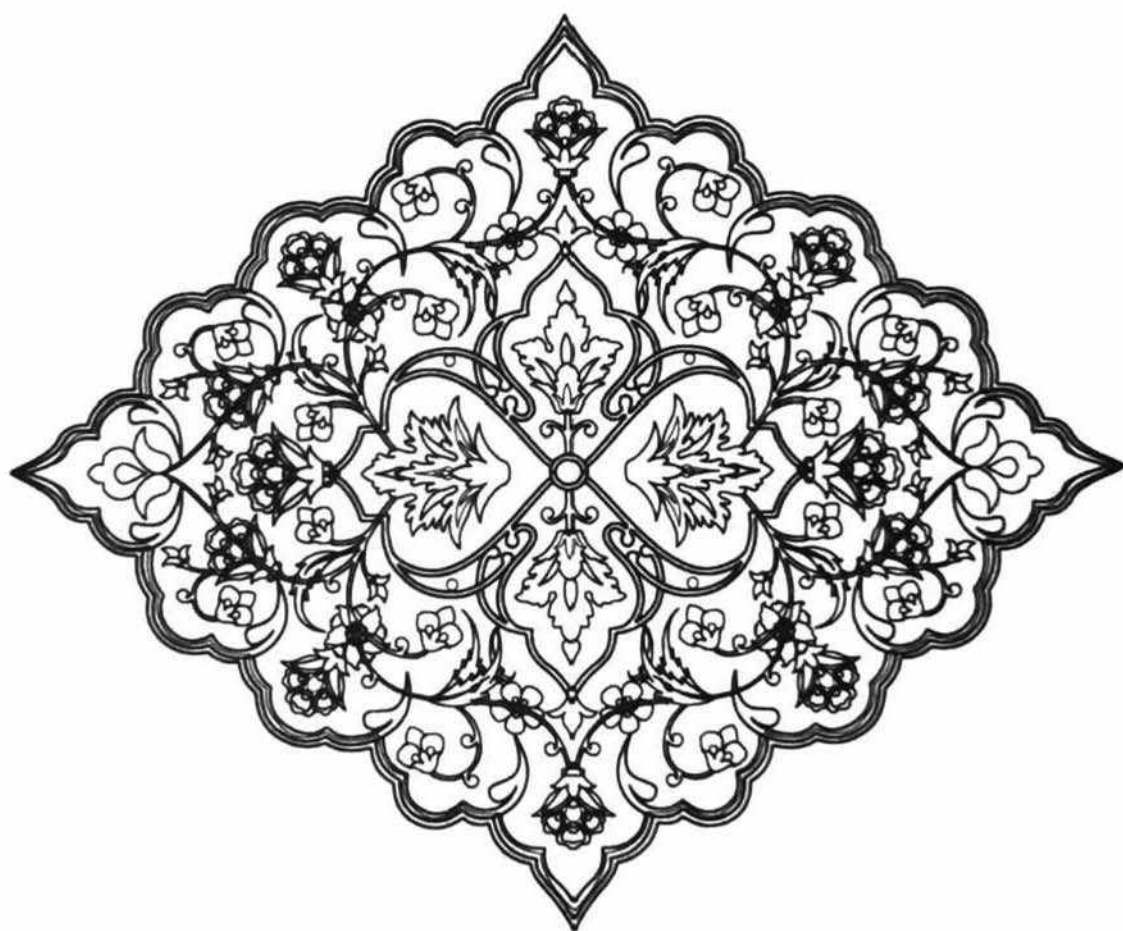
سورۂ نمل مکہ میں نازل ہوئی، اس میں ترانوے آیتیں اور سات رُکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے مہربان، نہایت رحم والا ہے

طٰسٓ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ① هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ② الَّذِيْنَ

طٰسٓ - یہ قرآن کی اور واضح کتاب کی آیتیں ہیں ① اس حال میں کہ یہ ہدایت دینے والی اور بشارت دینے والی ہیں مؤمنین کے لئے ② جو

يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ③ اِنَّ الَّذِيْنَ

قائم کرتے ہیں نماز کو اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں ③ بے شک وہ لوگ جو

لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ ④ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَهُمْ

آخرت پر ایمان نہیں لاتے، ہم نے مزین کیا ان کے لئے ان کے اعمال کو پس وہ بھٹکتے پھرتے ہیں ④ یہی لوگ ہیں کہ ان کے لئے

سُوْٓءُ الْعَذَابِ وَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ⑤ وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ

بُرا عذاب ہے اور یہ آخرت میں بھی سب سے زیادہ خسارہ پانے والے ہوں گے ⑤ بے شک تُو البتہ دیا جاتا ہے قرآن

لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ⑥ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖٓ اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا ۭ سَاٰتِيْكُمْ

حکیم علیم کی طرف سے ⑥ جب موسیٰ نے اپنے گھر والوں سے کہا: میں نے آگ محسوس کی ہے، عنقریب میں لاتا ہوں تمہارے پاس

مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِيْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ⑦ فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِيَ

اس آگ سے کوئی خبر، یا لاتا ہوں تمہارے پاس کوئی سلگایا ہوا شعلہ تاکہ تم سینکو ⑦ جب موسیٰ اس آگ کے پاس آئے تو آواز دیے گئے،

اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ⑧ يٰمُوْسٰٓى

کہ برکت دیا گیا وہ جو آگ میں ہے اور وہ جو آگ کے ارد گرد ہے، اللہ پاک ہے جو ربّ العالمین ہے ⑧ اے موسیٰ!

اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ⑨ وَاَلْقِ عَصَاكَ ۭ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا

بے شک بات یہ ہے کہ میں اللہ ہوں، زبردست، حکمت والا ⑨ تُو اپنی لاٹھی ڈال دے، جس وقت موسیٰ نے دیکھا اس لاٹھی کو کہ وہ حرکت کر رہی ہے گویا کہ

جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ؕ يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۫ اِنِّيْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۰﴾

وہ سانپ ہے تو بھاگے پیٹھ پھیر کر، اور اپنی ایڑیوں پر نہ لوٹے، اے موسیٰ! خوف نہ کر، بے شک میرے سامنے مرسلون ڈرا نہیں کرتے ﴿۱۰﴾

اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱﴾ وَاَدْخِلْ يَدَكَ

مگر وہ جو کوئی قصور کرلے پھر بدلے میں لے آئے وہ اچھائی کو برائی کے بعد، پس بے شک میں غفور رحیم ہوں ﴿۱۱﴾ اور داخل کر تو اپنے ہاتھ کو

فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۫ فِيْ تِسْعِ اٰيٰتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ ؕ

اپنے گریبان میں، نکلے گا سفید ہو کر بغیر کسی بیماری کے، یہ دو نشانیاں ان نو نشانیوں میں داخل ہیں جن کے ساتھ موسیٰ کو فرعون اور اس کی قوم کی طرف بھیجا گیا

اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۱۲﴾ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۳﴾

بے شک وہ نافرمان لوگ تھے ﴿۱۲﴾ جب ان فرعونیوں کے پاس ہماری نشانیاں آ گئیں اس حال میں کہ وہ روشن تھیں تو انہوں نے کہا یہ صریح جادو ہے ﴿۱۳﴾

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴﴾

اور ان فرعونیوں نے ان آیات کا انکار کر دیا حالانکہ ان نشانیوں کا یقین کر لیا ان کے دِلوں نے (انکار کیا) از روئے ظلم کے اور سرکشی کے، پھر تو دیکھ ان فسادیوں کا انجام کیا ہوا ﴿۱۴﴾

تفسیر

مضامینِ سورت اور ماقبل سے ربط

سورۂ نمل مکہ میں اُتری اور اس کی ۹۳ آیات ہیں اور سات رکوع ہیں۔ سورت کا نام ''نمل''، یہ آگے سلیمان علیہ السلام کا واقعہ آ رہا ہے جس میں چیونٹیوں کا ذِکر آئے گا، اور ''نمل'' چیونٹی کو کہتے ہیں تو یہ نام وہیں سے مأخوذ ہے۔ یہ مکی سورت ہے اور مکی سورتوں میں جس قسم کے مضامین ہوتے ہیں وہی اس میں ہیں۔ فروعی اَحکام ان میں ذکر نہیں کئے جاتے، بلکہ اُصول کا ذِکر ہوتا ہے۔ اس سورت کے اندر بھی اُصول کا ہی ذِکر ہے۔ اِبتدائی آیات: وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ، تک سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت ورِسالت کا ذِکر ہے، اور یہ آیات بالکل سورۂ بقرہ کی اِبتدائی آیات کے مشابہ ہیں، اور آگے پھر واقعات کا سلسلہ شروع ہوگا، سب سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ہوگا، اس کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کا ذِکر آئے گا، پھر آگے حضرت صالح علیہ السلام کا تذکرہ ہوگا، پھر آیاتِ توحید ہوں گی، اسی طرح سے مضمون آگے چلتا چلا جائے گا۔

قرآن کا تعارف

طٰسٓ: یہ حروف مقطعات میں سے ہے، اَللهُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ بِذٰلِكَ۔ ان حروف سے اللہ کی جو مراد ہے اللہ ہی بہتر جانتا

ہے، ہم بالتعیین اس کی مراد ذکر نہیں کر سکتے۔ اور بعض مفسرین اس کو سورت کا نام بتاتے ہیں۔ تِلۡكَ اٰيٰتُ الۡقُرۡاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيۡنٍ: قرآن اور کتابِ مبین، یہ دو لفظ استعمال کئے گئے۔ قرآن: پڑھنے کی چیز۔ کتاب: لکھنے کی چیز۔ تو یہ جو اللہ کی کتاب ہے، اس میں دونوں شانیں ہیں۔ یہ قرآن کی اور واضح کتاب کی آیتیں ہیں، یعنی یہ پڑھنے کی بھی ہیں اور لکھنے کی بھی ہیں۔ واضح ہونے کا مطلب کئی مرتبہ آپ کے سامنے ذکر کر دیا گیا، اپنے مقصد میں واضح ہے، ہر لحاظ سے روشن ہے، اپنی صداقت کی خود دلیل ہے، اپنے مقصد کو خود واضح کرتی ہے۔ هُدًى وَّبُشۡرٰى لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ: هُدًى یہ بھی مصدر ہے اور بُشۡرٰى بھی مصدر ہے۔ تو اس کو اٰيٰتُ سے حال بھی بنایا گیا ہے، یہ قرآن اور واضح کتاب کی آیتیں ہیں اس حال میں کہ یہ ہدایت دینے والی ہیں اور بشارت دینے والی ہیں مؤمنین کے لئے۔ اور ان دونوں کو آپ خبر بھی بنا سکتے ہیں (مظہری)۔ اب معنی یوں ہوگا "یہ قرآن کی آیات ہیں، یہ ہدایت اور بشریٰ ہیں مؤمنین کے لئے۔" لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ کا ذکر اس لیے کر دیا چونکہ اس ہدایت سے فائدہ یہی اٹھاتے ہیں، جیسے پہلے پارے کے شروع میں آیا تھا ذٰلِكَ الۡكِتٰبُ لَا رَيۡبَ ۛ فِيۡهِ ۛ هُدًى لِّلۡمُتَّقِيۡنَ، تو وہاں ذکر کیا تھا کہ لام انتفاع کے لئے ہے کہ متقین ہی اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اسی طرح سے یہاں بھی مؤمنین ہی چونکہ فائدہ اٹھاتے ہیں اس لئے یہاں مؤمنین کی تخصیص کر دی، ورنہ ہدایت تو یہ سب لوگوں کے لئے ہے، جیسے دوسری جگہ آیا ہے هُدًى لِّلنَّاسِ (سورہ بقرہ: ۱۸۵)۔

مؤمنین کی صفات

الَّذِيۡنَ يُقِيۡمُوۡنَ الصَّلٰوةَ: یہ مؤمنین کی صفات ذکر کر دیں، مؤمن وہ لوگ ہیں جن کے اندر یہ صفتیں پائی جاتی ہیں، جو قائم کرتے ہیں نماز کو اور وَيُؤۡتُوۡنَ الزَّكٰوةَ: دیتے ہیں زکوٰۃ۔ وَهُمۡ بِالۡاٰخِرَةِ هُمۡ يُوۡقِنُوۡنَ: اور وہ آخرت کا یقین کرتے ہیں، اِقامتِ صلوٰۃ یہ بدنی عبادت کا اصل الاصول ہے، اور ایتائے زکوٰۃ یہ مالی عبادت کا اصل الاصول ہے، اور آخرت کا یقین کرنا یہ عقائد میں سے ہے یعنی ان کے عقیدے بھی صحیح ہیں کہ آخرت کے قائل ہیں، اور بدنی عبادت بھی اللہ کی کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اور مالی عبادت بھی کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں۔

بدعملی کی اصل بنیاد آخرت پر عدم ایمان ہے

اِنَّ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ: بے شک وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے، زَيَّنَّا لَهُمۡ اَعۡمَالَهُمۡ فَهُمۡ يَعۡمَهُوۡنَ: ہم نے مزین کیا ان کے لئے ان کے اعمال کو پس وہ بھٹکتے پھرتے ہیں، یعنی آخرت پر عقیدہ نہیں، اس لئے جن برائیوں میں وہ لگے ہوئے ہیں، وہی برائیاں ان کو اچھی لگ رہی ہیں، جو اعمال انہوں نے اپنے لئے تجویز کئے ہوئے ہیں، وہی ان کو اچھے لگتے ہیں، انجام کی چونکہ فکر نہیں، اس لیے اپنی رغبت کے مطابق، خواہش کے مطابق انہی کاموں کو اچھا سمجھتے ہوئے انہی میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ تو معلوم ہو گیا کہ بدعملی کی اصل بنیاد آخرت کا یقین نہ کرنا ہے، اور اگر آخرت کا یقین کر لیا جائے تو پھر انسان کو نیکی کی توفیق ہو جاتی ہے، جب یہ فکر لگ جائے کہ میں نے اللہ تعالیٰ کے سامنے جا کر حساب دینا ہے۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ لَهُمۡ سُوۡٓءُ الۡعَذَابِ وَهُمۡ فِي الۡاٰخِرَةِ هُمُ

الْاَخْسَرُوْنَ: یہی لوگ ہیں کہ ان کے لئے بُرا عذاب ہے اور یہ آخرت میں بھی انتہائی خسارے میں ہوں گے، سب سے زیادہ خسارہ پانے والے یہی لوگ ہوں گے۔

آخرت کا ذکر چونکہ آگے آ گیا، توسُوْءُ الْعَذَاب سے دنیا کا عذاب بھی مراد لیا جا سکتا ہے، ان کے لئے دنیا میں بھی بدتر عذاب ہے، جس طرح کُفر کی وجہ سے اکثر و بیشتر لوگ دنیا کے اندر تکلیفوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔

دُنیا کی تکلیف کافر کے لئے عذاب اور مؤمن کے لئے تجارت ہے

دنیا کے اندر تکلیفیں عام طور پر مثلاً بخار ہو گیا، کوئی چوٹ لگ گئی، یا کوئی مالی نقصان ہو گیا، اولاد کی وجہ سے کوئی تکلیف ہو گئی، یہ سب انسانوں کو پہنچتی ہیں، چاہے کوئی مؤمن ہو، چاہے کوئی کافر ہو، لیکن کافر کے لئے یہ عذاب ہے اور مؤمن کے لئے رحمت ہے، کیونکہ مؤمن کو ان تکلیفوں کی بنا پر آخرت میں ثواب ملے گا تو یہ تو ایک تجارت ہے کہ یہاں کچھ تکلیف اٹھائی اور آخرت میں ثواب لے لیا، اور کافر کے لئے یہ سزا ہی سزا ہے کیونکہ آخرت میں اس کو ثواب تو ملنا نہیں...... دونوں باتوں کو اگر آپ مثال سے سمجھنا چاہیں تو اس طرح سے سمجھ لیجئے کہ ایک تو کاشتکار ہے جو گندم کے بونے کے وقت میں گھر سے گندم اٹھاتا ہے، اور لے جا کے کھیت میں بکھیر دیتا ہے، اس کے گھر سے بھی گندم گئی۔ اور ایک ہے کہ کسی کے گھر سے چور اٹھا کر لے جائیں، اب آپ جانتے ہیں کہ گندم تو اس کے گھر سے بھی گئی جس کے گھر سے چور اٹھا کے لے گئے، اور اس کے گھر سے بھی گئی جو جا کے کھیت میں بکھیر آیا، لیکن جو چور اٹھا کر لے گیا اس پر تو افسوس ہے، اور جو خود کھیت میں بکھیر آیا اس پر کوئی افسوس نہیں۔ فرق کی کیا وجہ؟ کہ انسان ظاہری طور پر سمجھتا ہے کہ جس کو چور اٹھا کے لے گیا وہ تو ہو گیا نقصان، وہ تو واپس لوٹ کے آنے والی نہیں، اس کا ہمیں کوئی نفع نہیں پہنچے گا، اور جس کو اپنے ہاتھوں سے لے جا کے کھیت میں بکھیر دیتا ہے تو اس میں اس لئے خوش ہے کہ دوسرے وقت میں ایک من کے چالیس من بن کے آ جائیں گے۔ معلوم ہو گیا کہ اگر جانے والی چیز زیادہ ہو کر واپس آ رہی ہو تو اس کے جانے پر افسوس نہیں ہوتا اور اس کا جانا باعث تکلیف نہیں ہوتا۔ تو اسی طرح سے سمجھ لیجئے کہ کافر کو جو تکلیف پہنچتی ہے، چاہے مالی تکلیف پہنچے، چاہے بدنی تکلیف پہنچے، چاہے اہل و عیال کے اعتبار سے، تو وہ تکلیف ہی تکلیف ہے، اس میں کوئی نفع کا پہلو نہیں ہے، اس لئے یہ تکالیف دنیا میں ان کے لئے عذاب ہیں۔ اور مؤمن کے لئے ایک قسم کی تجارت ہے کہ دنیا میں اگر وہ تکلیف برداشت کرتا ہے، تو یہ ظاہری صورت کے اعتبار سے تکلیف ہے ورنہ حقیقت کے اعتبار سے بہت نفع کی چیز ہے...... حدیث شریف میں آتا ہے سرور کائنات ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن جس وقت اہل مصائب کو وہ ثواب جو مصیبت کے وقت ملتا ہے وہ دیا جائے گا تو اہل عافیت جن کو دنیا کے اندر کوئی تکلیف نہیں پہنچی، ان کو دیکھ کر تمنا کریں گے کہ ہائے کاش! دنیا میں ہمارے چمڑے قینچیوں سے کاٹے جاتے تا کہ آج ہم بھی یہ ثواب حاصل کرتے،"[1] تو اس سے اندازہ کریں کہ مؤمن کے لئے مصیبت کتنی بڑی رحمت ہے۔ مانگنی نہیں چاہیے، یہ نعمت غیر مطلوبہ

---

(۱) مشکوٰۃ ۱۳۷/۱ باب عیادۃ المریض فصل ثانی۔ ترمذی ۶۶/۲ باب ما جاء فی ذھاب البصر لَوْ اَنَّ جُلُوْدَهُمْ كَانَتْ قُرِضَتْ فِي الدُّنْيَا بِالْمَقَارِيْضِ

ہے کیونکہ یہ نعمت ثواب تبھی بنتی ہے جب انسان اس کے اوپر صبر کرے، لیکن تکلیفوں پر صبر کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں، اس لئے مانگنی نہیں چاہیے، مانگنی تو عافیت ہی چاہیے، لیکن اگر تکلیف آ جائے تو اس کو اس نیت کے ساتھ برداشت کیجئے کہ یہ بھی ایک تجارت ہے، اللہ تعالیٰ آخرت میں ثواب دیں گے۔

اس لئے سُوْٓءُ الْعَذَابِ سے دنیا کا عذاب بھی مراد لیا جا سکتا ہے جو منکرین آخرت کو پہنچتا ہے، جس قسم کی تکلیف پہنچے وہ ان کے لیے عذاب ہی عذاب ہے۔ اور آخرت کا عذاب مراد لے لیں تو بھی ٹھیک ہے (آلوسی)۔ آخرت میں ان کا خسارہ نمایاں ہوجائے گا، یہ بات تو واضح ہی ہے۔ وَ اِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ: بے شک تو البتہ دیا جاتا ہے قرآن حکیم علیم کی طرف سے، یعنی یہ مانیں یا نہ مانیں، آپ کو یہ قرآن دیا گیا ہے جو مؤمنین کے لئے ہدایت اور بشریٰ ہے یہ حکیم علیم کی طرف سے مل رہا ہے، اس لئے یہ کتاب علم وحکمت سے پُر ہے، لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں یا نہ اٹھائیں، لوگ اس پر ایمان لائیں یا نہ لائیں۔

موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ

آگے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ شروع ہوگیا، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کو بھی اسی طرح سے حکیم علیم کی طرف سے کتاب ملی تھی، اور ان کو رسول بنایا گیا، فرعون کے مقابلے میں بھیجا گیا، اور یہی صورتحال سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آ رہی تھی، تو واقعات میں آپ کے لئے تثبیتِ قلب بھی ہے، آپ کے قلب کو قوت پہنچتی ہے، اور واقعات کے ساتھ ان اصول کی تائید بھی ہوتی ہے، بارہا آپ کی خدمت میں یہ بات وضاحت سے عرض کردی گئی...... اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖٓ: قابل ذکر ہے وہ وقت جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنے گھروالوں سے کہا۔ اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ نَارًا: میں نے آگ کو محسوس کی ہے۔ سَاٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ: عنقریب لاتا ہوں میں تمہارے پاس اس آگ سے کوئی خبر۔ اَوْ اٰتِيْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ: یا لاتا ہوں تمہارے پاس کوئی سلگا یا ہوا شعلہ۔ شہاب: شعلہ۔ قبس: سلگایا ہوا، جیسے لکڑی کے کنارے پر وہ سلگ رہا ہو۔ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ: تاکہ تم سینکو۔ اِصْطِلَاءٌ: گرمی حاصل کرنا، آگ سینکنا...... یہ واقعہ ہے اس وقت کا جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی بیوی کو مدین سے لے کر چلے تھے اور مصر کی طرف آ رہے تھے، راستے میں رات ہوگئی جس وقت کوہِ طور کے پاس تھے، اور سردی کا زمانہ تھا، اتفاق ایسا ہوا کہ راستہ بھی بھول گئے، ذہنی پریشانی ہوئی، طور کے اوپر اس طرح سے محسوس ہوا جیسے آگ جل رہی ہو، تو اپنے گھروالوں سے کہتے ہیں، ''گھروالوں'' سے ''بیوی'' مراد ہے جس طرح سے ہمارا بھی محاورہ ہے کہ جب ہم بیوی کا تذکرہ کرتے ہیں تو یوں کہتے ہیں کہ ''ہمارے گھروالوں کو یہ ہوگیا''، ''ہمارے گھروالوں کا یہ خیال ہے''، ''ہمارے گھروالے یہ کہتے ہیں''، کیونکہ اصل کے اعتبار سے ''اہلِ بیت'' کا مصداق ''بیوی'' ہوتی ہے، تو یہاں بھی ''بیوی'' مراد ہے۔ اور اٰتِيْكُمْ کے اندر جو جمع کی ضمیر ہے اور اسی طرح تَصْطَلُوْنَ کے اندر جو جمع کی ضمیر ہے، یہ محاورۃً واحد کو جمع کے ساتھ تعبیر کردیا کرتے ہیں، جیسے دوسری جگہ ہے رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ (سورۂ ہود: ۷۳)، وہاں بھی دیکھو! حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی سارہ مراد ہے، اور کُمْ ضمیر استعمال ہوئی ہے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کا تذکرہ آئے گا بائیسویں پارے کی ابتدا میں، وہاں بھی آخر میں یہی آئے گا اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ، وہاں بھی عَنْكُمْ: کُمْ کے ساتھ خطاب کیا گیا۔

اور ہمارے ہاں بھی محاورے میں جس وقت کوئی کلام ہوتی ہے تو واحد کو جمع کے ساتھ تعبیر کر دیتے ہیں۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی بیوی سے کہا تم تو یہیں ٹھہرو، اور وہاں آگ جلتی نظر آ رہی ہے، میں وہاں جاتا ہوں، دو باتوں میں سے ایک بات تو مل ہی جائے گی، یا دونوں ہی مل جائیں گی، یہ ''اَوْ'' منع خلو کے لئے ہے، یا تو وہاں کوئی آدمی ہوگا جو آگ جلائے بیٹھا ہوگا، تو اس سے میں راستہ پوچھ لوں گا، جیسے دوسری جگہ ہے: اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى (سورۂ طٰہٰ: ۱۰) کہ شاید میں وہاں کوئی راہنمائی حاصل کرلوں، آخر آگ جو جل رہی ہے تو وہاں کوئی جلانے والا ہوگا، اس سے راہنمائی حاصل کرلوں گا، راستہ پوچھ لوں گا۔ یا یہ ہے کہ میں وہاں سے تمہارے لئے آگ کا شعلہ لے آؤں گا، اور یہاں آ کر جلالیں گے اور آگ سینکیں گے اور سردی کی تکلیف دُور ہو جائے گی، اور دونوں مقصد بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس لئے اَوْ یہاں مَنعِ خُلُو کے لئے ہے کہ ایک بات تو ہو ہی جائے گی، یا راہنمائی حاصل ہو جائے گی، یا آگ لے آؤں گا، اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں فائدے حاصل ہو جائیں۔

موسیٰ علیہ السلام کا طور پر خیر مقدم

فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا: جب موسیٰ علیہ السلام اس آگ کے پاس آئے تو آواز دیے گئے یعنی ان کو ایک آواز محسوس ہوئی کہ برکت دیا گیا وہ جو آگ میں ہے اور وہ جو آگ کے اردگرد ہے۔ ''مَن'' لفظوں میں مفرد ہے اور معنیٰ جمع۔ یعنی جو بھی آگ میں ہیں اور آگ کے اردگرد ہیں، سب برکت دیے گئے، اس سے مراد فرشتے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں، مَنْ حَوْلَهَا جو آگ کے اردگرد ہیں، اس سے بھی فرشتے مراد ہو سکتے ہیں، اور موسیٰ علیہ السلام بھی مراد ہو سکتے ہیں، اور مَنْ فِي النَّارِ سے بھی فرشتے مراد ہیں جو وہاں ہوں گے، اللہ تعالیٰ ہر قسم کے واقعے کو ظاہر کرنے کے لئے چونکہ فرشتوں کو واسطہ بناتا ہے، تو وہاں ملائکہ کا وجود ہوگا، جس کی بنا پر ان کو کہا جا رہا ہے کہ وہ بھی برکت والے ہیں، جو اس کے اردگرد ہیں وہ بھی برکت والے ہیں۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مانوس کرنے کے لئے گویا کہ ویسے ہی فقرہ ہے جس طرح سے کوئی مہمان آئے تو ہم اس کے سامنے خوش آمدید، خیر مقدم، اھلاً وسھلاً، اس قسم کے لفظ بولتے ہیں۔ تو موسیٰ علیہ السلام کے سامنے یہ آواز آئی جس سے موسیٰ علیہ السلام مانوس ہوئے، چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں سے تھے اور بنی اسرائیل یہ انبیاء علیہم السلام کی اولاد ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ، اللہ تعالیٰ کی صفات، ملائکہ اور اس قسم کی چیزیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علم میں پہلے سے تھیں، اور پھر حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس دس سال رہ کے آ رہے تھے، اور حضرت شعیب علیہ السلام بھی پیغمبر تھے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہلے احساس نہیں ہوا ہوگا، جس وقت یہ آواز آئی تو سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ اللہ کی طرف سے کسی بات کا اظہار ہو رہا ہے۔

وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ: اللہ پاک ہے جو ربّ العالمین ہے، اس میں کسی قسم کا عیب نہیں۔ یہ تنزیہہ ساتھ ہی ذکر کردی تاکہ یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ آگ میں اللہ ہے، یا اللہ آگ کی شکل میں آ گیا، ان سب باتوں سے اللہ پاک ہے۔ تو اسی وقت ہی تنزیہ کا کلمہ آ گیا تاکہ اس بات سے اس قسم کا عقیدہ نہ اخذ کر لیا جائے کہ اللہ آگ کی شکل میں آ گیا یا آگ کے اندر اللہ موجود تھا، جس طرح مشرکین حلول کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ ہمارے ان معبودوں کے اندر اللہ حلول کرتا ہے، اس قسم کا کوئی عقیدہ نہ بنایا جائے،

اللہ جہت سے بھی پاک ہے، اور کسی چیز کے اندر حلول کرنے سے بھی پاک ہے، کوئی نقص اور عیب کی بات اللہ کی طرف منسوب نہیں کی جاسکتی۔ پاک ہے اللہ جو رَبّ العالمین ہے۔

درخت سے ''اَنَا اللہُ!'' کی آواز آئی

یٰمُوْسٰی: اب یہ آواز آئی خطاب کر کے، اور دوسری آیات میں آپ کے سامنے آیا تھا: نُوْدِیَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ (سورۂ قصص: ۳۰)، جس درخت کو آگ لگی ہوئی تھی ادھر سے آواز آئی، درخت سے آواز آئی: یٰمُوْسٰی اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ: ''ہٗ'' ضمیر شان ہے۔ اے موسیٰ! بے شک بات یہ ہے کہ میں اللہ ہوں زبردست، حکمت والا۔ اپنی طرف متوجہ کیا۔ اب یہ درخت سے جو آواز آئی تھی تو یہ آواز اللہ تعالیٰ کی تھی، جو سنی جارہی تھی درخت سے، محسوس ہورہی تھی درخت سے، یہ درخت خود نہیں کہہ رہا اَنَا اللہُ، بلکہ درخت کی طرف سے آواز آرہی ہے، اور یہ آواز اللہ کی ہے۔ بالکل بلاتشبیہ اگر آپ اس کو سمجھنا چاہیں تو ٹیلی فون کی مثال، کہ جس وقت آپ ٹیلی فون پکڑے بیٹھے ہوتے ہیں اور اس ٹیلی فون میں سے آواز آرہی ہوتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ ہاں جی! اَبا جی! کیا حکم ہے؟ اَبا جی! یہ بات یوں ہے، تو آپ اس ڈنڈے کو تو ''اَبا جی'' نہیں کہہ رہے ہوتے، نہ وہ مخاطب ہوتا ہے، اصل میں آواز دوسرے کی ہوتی ہے، سنی اس میں سے جارہی ہوتی ہے، تو آپ کا خطاب جو ہوگا، گفتگو جو ہوگی وہ اُس کے ساتھ ہے جس کی آواز ہے۔ تو یہاں بھی موسیٰ علیہ السلام کو وہ آواز درخت کی جانب سے محسوس ہوئی، لیکن درخت نہیں کہہ رہا تھا کہ اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ۔

لاٹھی پاس رکھنا سُنّتِ انبیاء ہے

وَاَلْقِ عَصَاكَ: واقعات کی چونکہ تفصیل دوسری جگہ موجود ہے، یہاں بالاختصار ذکر کیا جارہا ہے، پیچھے (سورۂ طٰہٰ میں) آیا تھا کہ اللہ نے پوچھا کہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟ تو موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا، اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے لاٹھی ڈالی۔ یہاں بالاختصار یوں ذکر کردیا: وَاَلْقِ عَصَاكَ: تُو اپنی لاٹھی ڈال دے، معلوم ہوگیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں لاٹھی تھی، اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ ہاتھ میں لاٹھی رکھنا تمام انبیاء علیہم السلام کی سُنّت ہے، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی لٹھیا کا ذِکر بھی احادیث میں آتا ہے۔ آپ کے ہاتھ میں کھونٹی ہوتی تھی، اُوپر سے مڑی ہوئی اور نیچے سے چھوٹا سا نیزہ لگا ہوا، جس کا مقصد ہوتا تھا، اگر نماز پڑھنی ہوئی تو اس کو بطور سترہ کے گاڑلیا، اور بھی کئی ساری ضرورتیں اس قسم کی سفر میں ہوجاتی ہیں، ویسے بھی ہاتھ میں ڈنڈا ہو تو انسان کچھ ادنیٰ سا مسلح ہوتا ہے، چھوٹی موٹی تکلیف کا دفعیہ اس سے کرسکتا ہے، آپ خالی ہاتھ ہوں اور کتی کا بچہ آپ کے سامنے آجائے اور آپ کی طرف منہ کر کے بھونکنے لگ جائے تو آپ گھبرا سے جائیں گے، اگر آپ کے ہاتھ میں ڈنڈا ہو تو اوّل تو وہ خود ہی ڈرے گا، اگر نہیں ڈرے گا تو پھر بھی آپ کے دل میں قوت ہوتی ہے کہ ہمارے ہاتھ میں ڈنڈا ہے۔ یہ قدرتی بات ہے کہ ہاتھ میں ڈنڈا ہو تو انسان کے دل میں قوت ہوتی ہے۔ تو مسلمان کو کچھ ادنیٰ سا مسلح رہنا چاہیے، جب بھی کسی طرف جائے تو ڈنڈا اس کے ہاتھ میں ہو، انبیائے کرام علیہم السلام رکھتے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا یہاں ذکر ہے، اور سلیمان علیہ السلام کے عصا کا ذکر سورۂ سبا (آیت ۱۴) میں آئے گا،

اور حضور ﷺ کے عصا کا ذکر احادیث میں موجود ہے، اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی سُنّت ہے کہ چلتے ہوئے خاص طور پر سفر وغیرہ پر جاتے ہوئے لاٹھی ہاتھ میں رکھیں۔

معجزۂ عصائے موسیٰ

وَاَلْقِ عَصَاكَ: تو اپنی لاٹھی ڈال دے۔ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ جس وقت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا اس لاٹھی کو کہ وہ حرکت کر رہی ہے، لہلہا رہی ہے، كَاَنَّهَا جَآنٌّ گویا کہ وہ ایک سانپ ہے۔ جَان کہتے ہیں اصل کے اعتبار سے پتلے سانپ کو جو چھوٹا ہوتا ہے اور دوسری جگہ ہے: فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ (سورۂ شعراء: ۳۲) تو ثعبان مبین کا ذکر آیا ہوا ہے، کہ بہت بڑا اژدہا بن گیا، دونوں باتیں اکٹھی ہوگئیں، یا تو پہلے وہ چھوٹا سا سانپ ہوگا، جتنی لاٹھی ہوگی اتنا سا نمایاں ہوگا، اور دیکھتے ہی دیکھتے بڑا بن گیا۔ اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ جثے کے اعتبار سے تو بڑا تھا لیکن حرکت اس طرح سے سریع کر رہا تھا جس طرح سے جان ہو اور چھوٹا سانپ ہو، کیونکہ بڑا سانپ جلدی حرکت نہیں کرسکتا، اس کی حرکت سست ہوتی ہے، اور چھوٹے سانپ میں حرکت زیادہ ہوا کرتی ہے۔ تو جانّ اس کو کہا جا رہا ہے اس کی حرکات کے اعتبار سے، اور جثے کے اعتبار سے وہ ثعبان تھا..... یا ابتدا اس کی جان سے ہوئی اور انتہا ثعبان پر ہوئی، کہ پہلے نمایاں ہوا چھوٹا سا، پھر آہستہ آہستہ بڑھ کے بہت بڑا ہوگیا (مظہری، سورۂ طٰہٰ)۔ وَلّٰى مُدْبِرًا: یہ ''لَمَّا'' کا جواب ہے، جب موسیٰ علیہ السلام نے اس لاٹھی کو دیکھا، لہلہاتی ہوئی گویا کہ وہ سانپ ہے، تو بھاگے پیٹھ پھیرتے ہوئے، پیٹھ پھیر کے بھاگ گئے یعنی جلدی سے، ان کے اوپر خوف ساطاری ہوگیا کہ یہ کیا ہوا؟ وَلَمْ يُعَقِّبْ: اس کا معنی ہے: لَمْ يَرْجِعْ عَلٰى عَقِبِهٖ (آلوسی)، اپنی ایڑیوں پہ نہ لوٹا یعنی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا، اس طرح سے بھاگے کہ پیچھے نہ مڑے۔ يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ: اللہ تعالیٰ کی طرف سے آواز آئی اے موسیٰ! خوف نہ کر۔ اِنِّيْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ: بے شک میں، میرے سامنے مرسلون ڈرا نہیں کرتے، یعنی مرسلون کو جب معجزہ دیا جائے، تو معجزہ تو ان کی تقویت کا سامان ہے، ایسی چیزوں سے ڈرنا نہیں چاہیے۔

اِلَّا مَنْ ظَلَمَ: مگر جو کوئی قصور کر بیٹھے، جس نے کسی ظلم کا ارتکاب کیا اسے ڈرنا چاہیے۔ لیکن اس کا بھی آگے ضابطہ بتا دیا کہ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ سُوْٓءٍ: یہ آگے نئے سرے سے کلام شروع ہوئی۔ اَیْ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ فَاِنَّهٗ يَخَافُ، جس نے کوئی قصور کیا ہو وہ ڈرتا ہے، اور آگے پھر نئے سرے سے کلام ہوگی: فَمَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: جو کوئی قصور کرلے، پھر اپنے اس قصور کو حُسن سے بدل دے، اچھی بات سے بدل دے، اس کی تلافی کرلے، پھر بدلے میں لے آئے وہ اچھائی کو برائی کے بعد، پس بے شک میں غفور رحیم ہوں۔ یہ بات اس لئے کہہ دی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہیں اپنا وہ قصور یاد نہ آجائے جو قبطی کے معاملے میں ہوا تھا، پھر کانپنے لگ جائیں گے کہ میں تو اللہ کے سامنے آگیا، اور میں تو قصور کیے بیٹھا ہوں، تو کہیں اس پہ گرفت نہ ہو جائے، تو ساتھ ہی تلقین کردی کہ ظلم کرنے والوں کو، زیادتی کرنے والوں کو، قصور کرنے والوں کو، ڈرنا چاہیے، لیکن جو شخص زیادتی کرنے کے بعد، ظلم کرنے کے بعد، اس برائی کے بعد اچھائی کرلے یعنی توبہ کرلے، اس کی تلافی کرلے تو میں غفور رحیم ہوں، میں بخش دیتا ہوں، رحم کردیتا ہوں، اس لئے وہ پچھلی بات کو یاد کر کے ڈرنے کی ضرورت نہیں، اس آیت کا یہ مفہوم ہوجائے گا۔ یہ تو ایک معجزہ ہوگیا۔

معجزۂ ید بیضاء

وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ: اور داخل کر تو اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں۔ جیب کہتے ہیں قمیص کے گریبان کو، کہ اندر سے کر کے یوں دبا، جیسے دوسری جگہ ہے: وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ (سورۂ طٰہٰ: ۲۲)، اپنے میں داخل کر کے پھر اس کو نکالو۔ داخل کر تو اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں، تَخْرُجْ بَيْضَآءَ نکلے گا وہ سفید ہو کر، مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ: بغیر کسی بیماری کے، یعنی بعض بیماریاں بھی ہیں جن میں چمڑا سفید ہو جاتا ہے جس کو برص کہتے ہیں، یہ کوئی بیماری نہیں ہوگی بلکہ معجزے کے طور پر چمک دار اور سفید ہو کے نکل آئے گا۔ فِيْ تِسْعِ اٰيٰتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ: یہ دونوں نشانیاں نو نشانیوں میں داخل ہیں جن کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور اس کی قوم کی طرف بھیجا گیا تھا۔ یا تقدیر عبارت ہے: اِذْهَبْ اِلٰى فرعون فِيْ تِسْعِ اٰيٰتٍ ان دو نشانیوں کو نو نشانیوں میں داخل کر کے تو فرعون کی طرف جا۔ یا پھر مُرْسَلًا اِلٰى فِرْعَوْنَ۔ دونوں طرح سے ترجمہ ہو سکتا ہے (آلوسی، نسفی)۔ یہ دو نشانیاں نو نشانیوں میں داخل ہیں جن کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور اس کی قوم کی طرف بھیجا گیا تھا، یا موسیٰ علیہ السلام سے کہا گیا کہ ان دو نشانیوں کو نو نشانیوں میں شامل کرو اور فرعون اور اس کی قوم کی طرف جاؤ۔ اور اُن نو نشانیوں کا مکمل طور پر ذکر سورۂ اعراف میں آیا تھا۔ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ: بے شک وہ نافرمان لوگ تھے۔

فرعونیوں نے یقین کے باوجود انکار کر دیا

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا: جب ان فرعونیوں کے پاس ہماری نشانیاں آ گئیں، مُبْصِرَةً: اس حال میں کہ وہ روشن تھیں واضح تھیں۔ اصل میں اَبْصَرَ کا معنی ہوتا ہے دیکھنا اور مُبْصِر کہتے ہیں دیکھنے والے کو۔ اور یہاں مبصر ان آیات کو کہا جا رہا ہے، کیونکہ وہ بصیرت حاصل کرنے کا ذریعہ تھیں اس لئے انہی کو مُبْصِرَةً کہہ دیا گیا، جو دانش مندی اور بصیرت حاصل کرنے کا ذریعہ تھیں، جن کی وجہ سے آنکھیں کھل جانی چاہئیں تھیں، دل روشن ہو جانا چاہیے تھا، ان نشانیوں کی حیثیت یہ تھی۔ اس حال میں کہ وہ واضح نشانیاں تھیں، روشن نشانیاں تھیں، یہ حاصل ترجمہ ہے۔ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ: تو انہوں نے کہا یہ تو صریح جادو ہے۔ وَجَحَدُوْا بِهَا ان فرعونیوں نے ان آیات کا انکار کر دیا، وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ حالانکہ ان نشانیوں کا یقین کر لیا ان کے دلوں نے۔ ان کے دل اندر اندر سے مانتے تھے کہ یہ جادو نہیں ہے، خاص طور پر ان جادوگروں کی تائید کر دینے کے بعد کہ یہ جادو نہیں ہے، اور موسیٰ علیہ السلام پہ ان کے ایمان لانے کے بعد تو یہ اتہام ختم ہو جانا چاہیے تھا، جب جادوگر جو کہ صاحب فن تھے اور بہت بڑے جادو کا علم رکھنے والے تھے، جب انہوں نے بھی ظاہر کر دیا کہ یہ جادو نہیں بلکہ یہ معجزہ ہے جو اللہ کی قدرت کے ساتھ سامنے آیا ہے، اس کے بعد تو یہ الزام ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن وہ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا اس کا انکار ہی کرتے رہے، از روئے ظلم کے اور سرکشی کے انہوں نے ان آیات کا انکار کیا حالانکہ ان کے دلوں نے اس بات کا یقین کر لیا تھا۔

ایمان کی تعریف

یہیں سے فقہاء نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ کوئی شخص اگر دِل میں یقین کرلے لیکن اُوپر سے انکار کرے، تو یہ ایمان معتبر نہیں، جب تک کہ اقرار باللسان نہ ہو، دل سے کسی بات کا یقین کرلینا کافی نہیں جب تک کہ زبان سے اقرار نہ کیا جائے۔ اور اگر دل سے کسی چیز کا یقین کرلیں اور اوپر سے انکار کرتے رہیں تو یہ کُفر بلکہ بدتر قسم کا کُفر ہے، یہ کُفرِ جحود ہے جیسے یہاں جَحَدُوْا سے اس کا ذکر کیا، تو یہ فرعونی کافر ہیں، حالانکہ ان کے دلوں میں یقین تھا کہ موسیٰ علیہ السلام واقعی اللہ کے پیغمبر ہیں اور یہ جو کچھ دکھا رہے ہیں یہ سب نشانیاں اللہ کی جانب سے ہیں، اس کے باوجود وہ کافر ٹھہرے۔ تو یہ علامت ہے اس بات کی کہ اقرار باللسان ضروری ہے، زبان کے ساتھ اس کا اظہار ضروری ہے، صرف دل میں یقین کرلینا کافی نہیں ہے۔ جیسے اگر کوئی شخص زبان سے اقرار کرے اور دل میں یقین نہ ہو تو یہ کُفرِ نفاق ہے۔ تو وہاں (نفاق میں) زبان سے اقرار ہوتا ہے دل سے انکار ہوتا ہے، اور یہاں دل میں یقین ہے، زبان سے انکار ہے، یہ بھی کُفر ہے، اس کو کُفرِ جُحُود کہتے ہیں۔ تو ایمان کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ انسان کے دل میں یقین ہو بلکہ زبان سے اس کا اقرار اور اظہار بھی ضروری ہے۔

انکار کیا انہوں نے ان آیات کا حالانکہ یقین کرلیا تھا ان آیات کا ان کے دلوں نے، ظُلْمًا وَّعُلُوًّا کا تعلق جَحَدُوْا کے ساتھ ہے، اسْتَيْقَنَتْهَاۤ کے ساتھ نہیں ہے۔ انکار کیا انہوں نے ان آیات کا ازروئے ظلم کے اور سرکشی کے۔ ان آیات کی حق تلفی کرتے ہوئے، اور سرکشی اور تکبر کرتے ہوئے، انہوں نے ان آیات کا انکار کیا۔ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ: پھر تو دیکھ ان فسادیوں کا انجام کیا ہوا۔ فَانْظُرْ کا خطاب ہر مخاطب کو ہے کہ دیکھو! ان فسادیوں کا انجام کیا ہوا۔ واقعہ ختم ہوا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ
البتہ تحقیق دیا ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم، اور ان دونوں نے کہا: سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے فضیلت دی ہمیں اپنے مؤمن
مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵﴾ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا
بندوں میں سے بہتوں پر ﴿۱۵﴾ اور سلیمان داؤد کے قائم مقام ہوئے، اور سلیمان علیہ السلام نے کہا: اے لوگو! ہم سکھا دیے گئے
مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۭ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾ وَحُشِرَ
پرندوں کی بولی اور ہمیں ہر چیز دی گئی، یہ اللہ تعالیٰ کا بہت کھلم کھلا فضل ہے ﴿۱۶﴾ اور جمع کیے گئے
لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَوْا
سلیمان علیہ السلام کے لئے ان کے لشکر، جنوں سے، انسانوں سے، اور پرندوں سے، پس وہ روکے جاتے تھے ﴿۱۷﴾ حتیٰ کہ جب آئے وہ

عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰۤاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ

چیونٹیوں کی وادی پر تو ایک چیونٹی نے کہا: اے چیونٹیو! داخل ہوجاؤ اپنے گھروں میں، نہ روند ڈالے تم کو سلیمان

وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ

اور اس کے لشکر، اور انہیں پتا بھی نہیں ہوگا ﴿۱۸﴾ مسکرائے سلیمان ہنستے ہوئے اس کے قول کی وجہ سے اور فرمایا: اے میرے رب!

اَوْزِعْنِيْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْۤ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا

مجھے اس بات کی توفیق دے کہ میں تیرے اس احسان کا شکر ادا کروں جو تُو نے میرے پہ اور میرے والدین پہ کیا ہے اور میں نیک عمل کروں

تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹﴾ وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ

جس کو تُو پسند کرے، اور داخل کر مجھے اپنی مہربانی کے ساتھ اپنے نیک بندوں میں ﴿۱۹﴾ اور سلیمان نے پرندوں کی خبر گیری کی، فرمایا کہ کیا ہوگیا مجھے

لَاۤ اَرَى الْهُدْهُدَ ۖ٘ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ ﴿۲۰﴾ لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاۡاَذْبَحَنَّهٗۤ

کہ میں نہیں دیکھتا ہدہد کو، یا ہے ہی وہ غائبین میں سے؟ ﴿۲۰﴾ میں البتہ ضرور عذاب دوں گا اس کو سخت عذاب یا البتہ اسے ذبح کر ڈالوں گا،

اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۱﴾ فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ

یا میرے پاس وہ واضح دلیل لے کر آئے ﴿۲۱﴾ ہدہد ٹھہرا تھوڑا سا، پھر کہا کہ میں نے احاطہ کیا ہے ایسی چیز کا جس کا آپ نے احاطہ نہیں کیا

وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ﴿۲۲﴾ اِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ

اور میں آپ کے پاس سبا سے ایک یقینی خبر لایا ہوں ﴿۲۲﴾ میں نے پایا ایک عورت کو جوان کی بادشاہی کرتی ہے اور دی گئی ہے وہ ہر چیز

وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۳﴾ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ

اور اس کے پاس بہت بڑا تخت ہے ﴿۲۳﴾ میں نے پایا اس عورت کو اور اس کی قوم کو کہ وہ سورج کو سجدہ کرتے ہیں اللہ کو چھوڑ کر اور

زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۲۴﴾ ۙ اَلَّا

شیطان نے ان کے لئے مزین کر دیا ان کے اعمال کو، پھر روک دیا ان کو سیدھے راستے سے، پس وہ ہدایت نہیں پاتے ﴿۲۴﴾ کہ وہ نہیں

يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ

سجدہ کرتے اللہ کو جو کہ نکالتا ہے آسمانوں میں اور زمین میں چھپی ہوئی چیزوں کو، اور وہ جانتا ہے ان چیزوں کو جن کو تم چھپاتے ہو

وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۲۵﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۶﴾ قَالَ سَنَنْظُرُ

اور جو تم ظاہر کرتے ہو ﴿۲۵﴾ وہ اللہ ہے، کوئی معبود نہیں مگر وہی، وہ بہت بڑے عرش کا مالک ہے ﴿۲۶﴾ سلیمان نے کہا: ہم عنقریب دیکھیں گے

اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۷﴾ اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ

کہ تُو نے سچ بولا ہے یا تُو جھوٹ بولنے والوں میں سے ہے ﴿۲۷﴾ میرا یہ خط لے جا پھر تُو اس کو ڈال دے ان کی طرف پھر ان سے ایک

عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۸﴾ قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْٓ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۹﴾

طرف کو ہٹ جا پھر دیکھنا کہ وہ کیا جواب لوٹاتے ہیں؟ ﴿۲۸﴾ ملکہ نے کہا کہ اے سردارو! بے شک میں، ڈالا گیا ہے میری طرف ایک باعزت خط ﴿۲۹﴾

اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۳۰﴾ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾

بے شک یہ خط سلیمان کی طرف سے ہے، اور وہ یہ ہے، شروع کرتا ہوں میں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے ﴿۳۰﴾ یہ کہ تم میرے مقابلے میں سرکشی اختیار نہ کرو اور آ جاؤ میرے پاس فرمانبردار بن کر ﴿۳۱﴾

تفسیر

داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کا تذکرہ

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ بنی اسرائیل میں جاری رہا، اسی سلسلے میں حضرت داؤد علیہ السلام آئے، تو اللہ نے ان کو نبوّت بھی دی اور بادشاہی بھی دی، اور حضرت داؤد علیہ السلام کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام آئے جن کو اللہ نے نبوّت بھی دی اور بادشاہی بھی دی، یہ بادشاہ نبی گزرے ہیں۔ البتہ تحقیق دیا ہم نے داؤد کو اور سلیمان کو علم۔ ''علم'' سے علمِ نبوّت، علمِ سیاست، علمِ شریعت سب مراد ہیں۔

ماقبل سے ربط

اور اب فرعون کا ذکر کرنے کے بعد ان دونوں کا ذکر آ گیا کہ فرعون کو تو صرف ایک مصر کی بادشاہت ملی تھی، وہ اسی بادشاہت میں متکبر ہو گیا، سرکش ہو گیا، اللہ کا ناشکرا ہو گیا، اللہ کی طرف سے جو اس کو یہ نعمت ملی تھی اس کے لیے سرکشی اور کُفر کا باعث بن گئی، لیکن جن لوگوں کا آخرت پر یقین ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو اگر اس قسم کی سلطنتیں دے بھی دیں تو وہ اُلٹا شکر کا ذریعہ بنتی ہیں، وہ مزید اطاعت اور فرماں برداری کی طرف جاتے ہیں، اور اللہ کے سامنے شکر کے طور پر جھکتے ہیں۔ ایک ہی چیز ہے، ایک شخص کے لئے کُفر میں ترقّی کا باعث بن گئی، اور ایک شخص کے لئے وہ فضیلت شکر حاصل کرنے کا باعث بن گئی۔

یہ دونوں نبی ہر وقت شکر گزار تھے

تو ان کو بھی بادشاہت ملی، لیکن چونکہ یہ اللہ کے نیک بندے تھے، یہ ہر ہر بات پہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں، آپ کے سامنے غالباً سورۂ سبا میں یہ آیت آئے گی اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ۭ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ (آیت ۱۳) اے آلِ داؤد! شکر کے طور پر تم نیک عمل کرو، میرے بندوں میں سے شکر گزار بہت کم ہیں۔ تو شکر ادا کرنے کی چونکہ خصوصیت کے ساتھ تاکید آئی تھی حضرت داؤد علیہ السلام کے گھرانے کو، تو آپ ان کے واقعات جہاں بھی پڑھیں گے ان میں ایک ایک بات کے اوپر ان کی زبان سے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ یوں اللہ کا شکر نمایاں ہوگا، یہاں بھی وہی بات ہے وَقَالَا، دونوں نے کہا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰي كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کا لفظی ترجمہ ہوتا ہے سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، لیکن یہی کلمہ شکر ہے "رَاْسُ الشُّکْرِ الحمدُ للہِ"[1] یعنی اللہ کی تعریف کرنا یہی شکر ادا کرنا ہے، اس لئے اس کا ترجمہ یوں کر دیا جائے "اللہ کا شکر ہے" تو بھی بات صحیح ہے۔ "سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں" یہ لفظی ترجمہ ہے۔ سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے فضیلت دی ہمیں اپنے مؤمن بندوں میں سے بہتوں پر، یعنی کافروں کے مقابلے میں تو فضیلت تو ہر مؤمن کو ہے، مؤمنین میں سے بہت سے بندوں پر اللہ نے ہمیں فضیلت دی، اللہ کا شکر ہے، ایسی ایسی نعمتیں ہمیں دیں جو اس کے عام مؤمن بندوں کو بھی نہیں ملیں۔

داؤد علیہ السلام کی وراثت سلیمان علیہ السلام کی طرف منتقل ہوئی

وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ: اور سلیمان داؤد کے قائم مقام ہوئے، یہاں وَرِثَ سے وراثت مالی مراد نہیں ہے، بلکہ نیابت مراد ہے نبوّت میں اور سلطنت میں، کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام کی اولاد تو بہت تھی، اور بھی بیٹے تھے، تو اگر یہاں وراثت مالی مراد ہوتی تو صرف ایک بیٹا ہی وارث نہیں ہوتا، سب وارث ہوا کرتے ہیں، اور انبیاء علیہم السلام کی مالی وراثت اس طرح سے تقسیم نہیں ہوا کرتی جس طرح سے ہماری مالی وراثت تقسیم ہوتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نَحْنُ مَعَاشِرُ الْاَنْبِيَاءِ لَا نُوْرَثُ، مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ"[2] ہم انبیاء کا گروہ دوسرے کو وارث نہیں بنایا کرتے، جو ہم چھوڑ جائیں سب صدقہ ہوتا ہے۔ دوسری حدیث میں جس طرح سے آتا ہے: "اِنَّ الْاَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوْا دِيْنَارًا وَّلَا دِرْهَمًا اِنَّمَا وَرَّثُوا الْعِلْمَ"[3] کہ انبیاء علیہم السلام درہم، دینار کی وراثت چھوڑ کے نہیں جایا کرتے، ان کی وراثت تو علم ہے، "فَمَنْ اَخَذَهٗ اَخَذَ بِحَظٍّ وَّافِرٍ" جس نے علم حاصل کر لیا اس نے بہت بڑا نصیبہ حاصل کر لیا، بہت بڑا حصہ حاصل کر لیا۔ تو یہاں بھی جو وراثت سلیمان علیہ السلام کی طرف منتقل ہوئی، یہ علم اور نبوّت کی وراثت ہے، مالی وراثت مراد نہیں ہے، اس لئے ترجمہ یوں کیا جائے گا "سلیمان قائم مقام ہوئے داؤد علیہ السلام کے، جانشین ہوئے داؤد علیہ السلام کے۔"

(۱) الامثال من الکتاب والسنۃ۔ حکیم ترمذی ۱/ ۱۵۸۔ نیز دیکھیں: مشکوٰۃ ۲۰۱/۱ باب ثواب التسبیح۔ ولفظہ الحمد رأس الشکر

(۲) مظہری، سورۂ نساء آیت ۱۳ کے تحت۔ نوٹ: سنن کبریٰ نسائی ج۶ ص۹۸ میں الفاظ یہ ہیں: اِنَّا مَعْشَرَ الْاَنْبِيَاءِ لَا نُوْرَثُ، مَا تَرَكْنَا فَهُوَ صَدَقَةٌ۔ اور معجم اوسط طبرانی ج۵ ص۲۶ وغیرہ پر بھی اسی طرح حدیث ہے۔ لیکن بخاری ۱/ ۴۳۵، مشکوٰۃ ۲/ ۵۵۰، اور عام کتب حدیث میں صرف اتنا حصہ ہے: لَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ

(۳) ابن ماجہ ص ۲۰۔ ترمذی ۲/ ۹۷، باب فی فضل الفقہ۔ ابوداؤد ۲/ ۱۵۷، باب الحث علی طلب العلم۔ مشکوٰۃ ۱/ ۳۴، کتاب العلم۔ نیز بخاری ص۱۶۔

سلیمان علیہ السلام کو تمام ضروریاتِ زندگی عطا کی گئیں

وَقَالَ: تو سلیمان علیہ السلام نے بھی یہی کہا یٰاَیُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ: منطق یہ مصدر میمی ہے، نطق کے معنی میں ہے۔ اے لوگو! ہم سکھا دیے گئے پرندوں کی بولی، وَاُوْتِیْنَا مِنْ كُلِّ شَیْءٍ: اور ہمیں ہر چیز دی گئی یعنی اس دور کے اعتبار سے ضروریاتِ زندگی میں جتنی چیزیں چاہئیں تھیں وہ سب مل گئیں، یہاں ''کُلّ'' اِستغراقی نہیں ہوتا کہ دنیا کی ہر چیز مل گئی، پھر آپ کہیں کہ چیزوں میں تو ہوائی جہاز بھی ہے، ٹینک بھی ہے، توپ بھی ہے، کیا یہ بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس تھیں، یہ کلام کے محاورے سے ناواقفیت کی بات ہے، جو اس قسم کی باتیں کرتے ہیں کہ جہاں ''کُلّ'' آ گیا تو کہہ دیا کل استغراقی ہے، یہ سب کچھ دے دیے گئے، یہ کُل استغراقی نہیں ہوتا، اس میں استغراق ہے لیکن عادی۔ اس زمانے کے اعتبار سے اچھی زندگی گزارنے کے لئے جن جن چیزوں کی ضرورت تھی وہ سب مل گئیں، جیسے ہم بھی اپنی کلام میں بسا اوقات یوں ہی کہا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سب کچھ دے رکھا ہے۔ اب ''سب کچھ'' کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم گدھے کے بھی مالک ہیں، گھوڑے کے بھی مالک ہیں، بس کے بھی مالک ہیں، کار کے بھی مالک ہیں۔ جب ہم کہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سب کچھ دے رکھا ہے تو کوئی کہے کہ کیوں جھوٹ بولتے ہو، بیسیوں چیزیں ایسی ہیں جو آپ کے پاس ہیں ہی نہیں، تو یہ مطلب نہیں ہوا کرتا، بلکہ سب کچھ دے رکھا ہے کا مطلب ہے کہ جن کی ہمیں ضرورت ہے، جس کے ساتھ ہماری زندگی آسانی سے گزر رہی ہے، یعنی کوئی ایسی چیز ہمارے ہاں مفقود نہیں کہ جس کے نہ ہونے کی وجہ سے ہم تکلیف میں مبتلا ہوں، جن چیزوں کی ہمیں ضرورت ہے اللہ نے سب دے دیں۔ اسی طرح اُس زمانے میں اچھی زندگی گزارنے کے لئے جن اشیاء کی ضرورت تھی اور سلطنت اور حکومت قائم رکھنے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت تھی وہ سب ان کو مل گئیں...... اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِیْنُ: یہ اللہ تعالیٰ کا بہت کھلم کھلا فضل ہے۔ دیکھو! یہ بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ہے، یوں کہنا کہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، اللہ کی مہربانی ہے، یہ بھی کلمہ شکر ہے۔ تو جیسے داؤد علیہ السلام ہر ہر بات پہ اللہ کا شکر ادا کرتے تھے، سلیمان علیہ السلام بھی اسی طرح سے تھے۔

سلیمان علیہ السلام ہر جان دار کی بولی سمجھتے تھے

پرندوں کی بولی سکھا دی گئی، یہاں پرندوں کا ذکر کر دیا، ورنہ کیڑے مکوڑے اور جتنی بھی مخلوق سب کی زبان حضرت سلیمان علیہ السلام سمجھتے تھے۔ کیونکہ جس طرح پرندے وغیرہ آپس میں بولتے ہیں اسی طرح سے دوسری چیزیں، چیونٹیاں یہ بھی ایک دوسرے سے بولتی ہیں، لیکن ہم اس کا شعور نہیں رکھتے۔ جیسے آگے حضرت سلیمان علیہ السلام کی چیونٹیوں کے ساتھ گفتگو ذکر کی جا رہی ہے کہ چیونٹی نے بات کی اور سلیمان علیہ السلام سمجھ گئے، تو یہ اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کو ایک معجزہ دیا تھا۔ یہ پرندے، آپ تو خیال کرتے ہیں کہ یہ ویسے ہی بیٹھے چوں چوں کر رہے ہیں، لیکن جب یہ اکٹھے بیٹھے ہوتے ہیں، تو اس وقت یہ آپس میں باتیں کرتے ہیں، اس لیے جب لڑ رہے ہوں تو ان کی آواز اور طرح کی ہوتی ہے، اور جب یہ محبت کے انداز میں بیٹھے ہوں تو ان کا بولنا اور انداز کا ہوتا ہے، یہ کتے بلے ان کی بھی آوازیں مختلف ہوتی ہیں، جب اپنے بچوں کے ساتھ پیار کرتے ہیں تو اور طرح سے انداز ہوتا ہے، اور جب آپس میں لڑتے ہیں تو انداز اور ہوتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی اپنا کچھ افہام تفہیم کرتے ہیں جس کو ہم نہیں سمجھتے...... یہ

آپ کی جو ریلوے لائن ہے اس پر ابھی تک ''تار'' کا سلسلہ ہے، (باقی لائنوں پر تو ٹیلی فون کا سلسلہ ہو گیا) تو کبھی اسٹیشن ماسٹر کے پاس آپ بیٹھے ہوں تو ٹِک ٹِک کی آواز آیا کرتی ہے، آپ وہاں بیٹھیں ہوں تو آپ ویسے سمجھیں گے جس طرح سے آپ کسی میز وغیرہ کو کھڑکاتے ہیں یہ بھی ایسے کھڑک رہا ہے۔ اور اسٹیشن ماسٹر جو اس فن سے واقف ہے وہ ساری گفتگو اسی ٹِک ٹِک سے سمجھ لیتا ہے، اور جب دوسرے کو سمجھانی ہوتی ہے تو بھی وہ اسی ٹک ٹک سے سمجھا دیتا ہے، اب عام طور پر تو یہ سلسلہ نہیں رہا، لیکن شارٹ لائنوں پر ابھی ہے، اپنی جو لائن ہے کھروڑ پکا والی، اس میں ٹیلی فون کا سلسلہ نہیں، اسٹیشنوں کا آپس میں رابطہ ''تار'' کے ذریعے سے ہوتا ہے، تو کبھی کسی اسٹیشن پہ بیٹھ کے دیکھیں، یہ آپس میں گفتگو کس طرح سے کرتے ہیں..... تو جیسے اس ٹک ٹک میں صاحبِ فن تو سمجھتا ہے کہ کیا لفظ آ رہے ہیں، اور دوسروں کو پتا نہیں چلتا، اسی طرح سے پرندوں کی یہ جو آوازیں ہیں ان میں بھی کوئی نہ کوئی بات ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے جن کو کشف دے دیا وہ سمجھ جاتے ہیں..... حدیث شریف میں آتا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ ایک دفعہ چلے جا رہے تھے ایک اونٹ آیا اور اس نے آ کے آپ کے سامنے زمین پر سر رکھا، یعنی ظاہراس طرح سے جیسے سجدہ کیا جاتا ہے، آ کے سر رکھا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کا مالک کون ہے؟ اس کو بلاؤ تو اس کے مالک کو بلایا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس اونٹ کو میرے پاس بیچ دو، وہ کہنے لگا کہ یا رسول اللہ! ہم آپ کو مفت میں ہی دے دیں لیکن ہمارا گزارہ صرف اسی پہ ہی ہے، اور کوئی ہمارا ذریعۂ معاش نہیں ہے، اسی کے ذریعے ہم کام کرتے ہیں، محنت کرتے ہیں، کچھ کماتے ہیں، کھاتے ہیں، مطلب یہ تھا کہ ہم اس کو بیچنا نہیں چاہتے، اگر گنجائش ہوتی تو ہم آپ کو ویسے ہی دے دیتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اگر یہ بات ہے تو پھر دیکھو! یہ اونٹ تمہاری شکایت کر رہا ہے، کہتا ہے کہ یہ مجھ سے کام بہت لیتے ہیں، کھانے کو کم دیتے ہیں، خیال رکھا کرو، ان کی برداشت سے زیادہ کام نہ لیا کرو، اور وقت پر ان کو پانی، چارہ دیا کرو۔[1] اب باقی صحابہ ؓ ساتھ تھے، کوئی بھی اس کی بات نہیں سمجھا، حضور ﷺ سمجھ گئے۔ تو ان کی باتیں تو ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ توفیق دے، کشف ہو، وہ سمجھ جاتے ہیں۔ اور سلیمان علیہ السلام کو یہ معجزہ دیا گیا تھا کہ یہ سب باتیں سمجھتے تھے۔ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ: ہمیں پرندوں کی بولی سمجھا دی گئی، اور ہم ہر چیز دے دیے گئے، یہ اللہ تعالیٰ کا فضل مبین ہے۔

سلیمان علیہ السلام کی حکومتی وسعت

وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ: دیکھو! اس میں جن کی صراحت آ گئی، معلوم ہو گیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت جنوں پر بھی تھی، پرندوں پر بھی تھی۔ جمع کیے گئے سلیمان علیہ السلام کے لئے ان کے لشکر جنوں سے، انسانوں سے، پرندوں سے۔ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ: پس وہ روکے جاتے تھے یعنی انتظام بحال کرنے کے لئے ان کو روکا جاتا تھا تاکہ پچھلوں کو ساتھ ملا لیا جائے، یہ کثرت کی طرف اشارہ ہے، وَزَعَ روکنے کو کہتے ہیں۔ پس وہ روکے جاتے تھے، یعنی اگلوں کو روکا جاتا تھا تاکہ پچھلوں کو ساتھ شامل کر لیا جائے، کثرت کے وقت میں ایسی نوبت پیش آیا کرتی ہے، تو جن بھی ان کے لشکروں میں تھے، انسان بھی تھے پرندے بھی تھے۔

---

(۱) مسند احمد، رقم ۱۷۵۶۵۔ مشکوٰۃ ۵۴۰/۲، باب المعجزات، فصل ثانی۔ فَاِنَّهٗ شَكَا كَثْرَةَ الْعَمَلِ وَقِلَّةَ الْعَلَفِ.

چیونٹیوں کا مثالی نظم ونسق

توکسی مہم پہ جا رہے ہوں گے، حَتّٰۤی اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰی وَادِ النَّمْلِ: حتیٰ کہ جب آئے وہ چیونٹیوں کی وادی پر، چیونٹیوں کی وادی سے مراد کوئی ایسی وادی ہے جہاں چیونٹیاں بہت کثرت سے تھیں، قَالَتْ نَمْلَةٌ یّٰۤاَیُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ: اب جس وقت حضرت سلیمان علیہ السلام کا لشکر اس وادی کے قریب پہنچا تو چیونٹی نے (یہ چیونٹی ان کی سردار منتظم، ناظم ہوگی، جیسے کہتے ہیں کہ چیونٹیوں میں باقاعدہ خاندان ہیں، ان کی زندگی بڑی منظم ہوتی ہے جب یہ غلے کو ذخیرہ کرتی ہیں، اور کھینچ کے لاتی ہیں، تو دیکھو! کس طرح سے قطار وار چلتی ہیں، اردگرد دوسری چیونٹیاں نگرانی کے طور پر ہوتی ہیں جو کوتاہی کرنے والے کو تنبیہ کرتی ہیں، پھر یہ جو غلہ کھینچ کے لے جاتی ہیں تو کہیں دیکھ لینا کہ چیونٹیوں نے جہاں غلہ اپنی جگہ میں اکٹھا کیا ہوا ہو، آپ اس کو نکالیں گے تو کوئی دانہ آپ کو صحیح سالم نہیں ملے گا، ہر دانہ ٹوٹا ہوا ہوتا ہے۔ کہتے ہیں یہ ان کا ایک انتظام ہے کہ دانے کو توڑ کے رکھتی ہیں تا کہ یہ اُگے نہیں اور پھر یہ ان کے لئے ناقابلِ استعمال نہ ہو جائے، گرمیوں میں ذخیرہ کر لیتی ہیں جو سردیوں میں کام آتا ہے، اور ہر دانے کو توڑ کر رکھتی ہیں۔ تو یہ سب اللہ تعالیٰ نے ان کو عقل وفہم دیا ہوا ہے۔ ان کے حالات کتابوں کے اندر عجیب وغریب لکھے ہوئے ہیں۔

سلیمان علیہ السلام چیونٹی کی گفتگو سن کر مسکرائے

بہر حال چیونٹی نے دیکھا تو اس نے اعلان کر دیا کہ سلیمان بمع لاؤ لشکر آ رہے ہیں، اگر چہ ان کا ارادہ تو نہیں ہوگا ہمیں مارنے کا، پاؤں کے نیچے روندنے کا، لیکن اتنے لشکر میں کیا پتا چلتا ہے، اس لئے تم سب میدان خالی کر دو اور اپنے بلوں میں گھس جاؤ، تا کہ لاعلمی میں کہیں وہ تمہیں روند نہ دیں، اس نے یہ اعلان کیا۔ ایک چیونٹی نے کہا۔ نملة یہ ''ۃ'' واحد کے لیے ہے، اور آگے نمل آ گیا جمع کے معنی میں۔ جیسے: تَمْرَةٌ اور تَمْرٌ میں آپ فرق کرتے ہیں۔ اے چیونٹیو! داخل ہو جاؤ اپنے گھروں میں۔ مَسٰكِنَكُمْ اپنے رہنے کی جگہ میں گھس جاؤ۔ لَا یَحْطِمَنَّكُمْ سُلَیْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ: نہ روند ڈالے تم کو سلیمان اور اس کے لشکر، وَهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ: اور انہیں پتا بھی نہیں ہوگا، اس میں یہ بات بتادی گئی کہ قصداً تو وہ ایسا نہیں کریں گے، کیونکہ قصداً بلاوجہ ایک چیونٹی کو مارنا بھی بُری بات ہے، آخر اس کی بھی جان ہے اور اس کو بھی زندہ رہنے کا حق ہے، بلاوجہ تو اس کو نہیں مارنا چاہیے، لیکن لاشعوری طور پر اگر پاؤں کے نیچے آ جائے اور روندی جائے تو پھر ایک علیحدہ بات ہے، اس میں انسان معذور ہے۔ جیسا کہ ''گلستان'' میں آپ نے شعر پڑھا ہوگا، حضرت شیخ (سعدی رحمہ اللہ) فرماتے ہیں:

زیر پایت گر بدانی حالِ مور ہمچو حالِ تست زیر پائے پیل[1]

کہ اگر تو یہ جاننا چاہے کہ تیرے پاؤں کے نیچے چیونٹی آ جائے تو اس کا کیا حال ہوتا ہے؟ تو یہ سمجھ لے کہ ویسے ہی حال ہوتا ہے جیسے تُو ہاتھی کے پاؤں کے نیچے آ جائے تو تیرا حال کیا ہوگا! اس لئے جان بوجھ کے تو کسی جان دار کو کوئی تکلیف نہیں پہنچانی چاہیے، ہاں! البتہ لاشعوری میں ایسا ہو جائے تو انسان گنہگار نہیں ہے، تو یہاں بھی اس نے یہی کہا کہ سلیمان اللہ کا نیک بندہ ہے، جان بوجھ کر تو نقصان

---

(۱) ''گلستان'' ص ۴۹، حکایت نمبر ۲۳، باب نمبر ۱۔

نہیں پہنچائیں گے، لیکن ان کو پتا بھی نہیں چلے گا اور تم پاؤں کے نیچے آ جاؤ گی، اس لئے میدان خود ہی خالی کردو۔ یہ چیونٹی نے اعلان کیا، سلیمان علیہ السلام نے سُن لیا اور اس کی بات سمجھ گئے، سمجھنے کے بعد پھر مسکرائے۔ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا: مسکرائے سلیمان ہنستے ہوئے، یعنی یہ مسکرانا ہنسنے کے قریب قریب تھا، یا اِبتدا مسکرانے سے ہوئی اور انتہا ضحک پر ہوئی (مظہری وغیرہ)۔ تبسم اور ضحک میں فرق تو آپ سمجھتے ہوں گے۔ تبسم تو صرف اتنا ہے کہ ہونٹ پھیل جائیں اور دانت ننگے ہو جائیں، یہ تبسم ہے جسے آپ مسکرانا کہتے ہیں۔ اور ضحک وہ ہوتا ہے جس میں تھوڑی سی آواز بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور قہقہہ وہ ہوتا ہے کہ جس میں انسان ڈھول کی طرح کھڑکتا ہے، "قہ قہ" یہ لفظ اسی آواز سے ماخوذ ہے۔ تو تبسم سے ابتدا ہوئی اور انتہا ضحک پر ہوئی، مسکرائے ہنستے ہوئے اس کے قول کی وجہ سے۔ وَقَالَ اور فرمایا۔ یہاں دیکھو! پھر وہی شکر کی طرف متوجہ ہو گئے، کہ اللہ تعالیٰ کا کتنا احسان ہے، دیکھو! چیونٹی کی بات بھی ہم نے سمجھ لی اور سُن لی۔ اور آپ جتنا چاہیں کان لگالیں، آپ کو چیونٹی کی آواز سمجھنی تو اپنی جگہ رہی، آپ کے کان میں بھی نہیں آتی، تو وادی میں داخل ہونے سے پہلے ہی چیونٹی نے دیکھ لیا سلیمان اور اس کے لشکر کو، وہیں بیٹھے اس نے اعلان کیا اور سلیمان علیہ السلام نے سن لیا۔

سلیمان علیہ السلام کا اِظہارِ تشکر

کہا کہ اے میرے رَبّ! اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ: اَوْزِعْنِیْٓ: وزع کا معنی آپ کے سامنے ذکر کیا تھا روکنا، منع کرنا، اَوْزِعْنِیْٓ کا مطلب یہ ہوگا کہ اے اللہ! مجھے روک کے رکھ اس بات پہ کہ میں تیرے اس احسان کا شکر ادا کروں، مجھے روک کے رکھ اس بات پر۔ اور حاصل ترجمہ اس کا یہ ہوگا کہ مجھے اس بات پر دوام عطا فرما، مجھے اس بات پر جما دے، مجھے اس بات کی توفیق دے کہ میں تیرے اس احسان کا شکر ادا کروں۔ اس لئے اس کا ترجمہ یوں ہی کر دیا جائے گا کہ اے اللہ! مجھے مداومت عطا فرما اس بات پہ، اور مجھے توفیق دے اس بات کی کہ میں شکر کروں تیرے احسان کا جو تُو نے میرے پہ کیا ہے اور میرے والدین پہ کیا ہے، اور مجھے توفیق دے اس بات کی کہ میں نیک عمل کروں جس کو تُو پسند کرے۔ "تُو پسند کرے" کا مطلب یہ ہے کہ تیرے ہاں قبول ہو، بسا اوقات ایک عمل کی ظاہری صورت اچھی ہوتی ہے لیکن کسی وجہ سے وہ اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوتا، تو اللہ تعالیٰ ہمیں ایسی نیکی کی توفیق دے جو اس کے ہاں قبول بھی ہو جائے۔ وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ: اور داخل کر تُو مجھے اپنی مہربانی کے ساتھ اپنے نیک بندوں میں، اپنے اچھے بندوں میں مجھے داخل کر دے اپنی مہربانی سے۔

"ہدہد" کا واقعہ

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ: تَفَقَّدَ: باب تفعّل ہے، اس کا معنی ہوتا ہے خبر گیری کرنا۔ یعنی کسی چیز کے بارے میں معلوم کیا جائے کہ موجود ہے یا نہیں، جس کو حاضری لینا کہتے ہیں، تفقدِ احوال کا معنی ہوتا ہے کسی کے حالات کی جستجو کرنا۔ تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے پرندوں کا تفقد کیا، یعنی ان کے احوال کی خبر گیری کی، دیکھنا چاہا کہ یہ کس حال میں ہیں موجود ہیں یا موجود نہیں؟ معلوم ہوتا ہے کہ انتظامی طور پر بعض ضرورتوں کے لیے پرندوں کو ساتھ قصداً لیا ہوا تھا۔ تو جس طرح سے لشکر کی حاضری لی جاتی ہے، تو پرندوں کی

حاضری لی، ان کے احوال کا تجسس کیا، معلوم کیا پرندوں کو، تفقد کا یہ معنی ہے، حاضری لی پرندوں کی، خبر لی پرندوں کی جس طرح سے چاہیں آپ اس کو ادا کر سکتے ہیں۔ تفقد احوال کا معنی ہوتا ہے کسی کے احوال کی خبر گیری کرنا، نگہبانی کرنا، نگہداشت کرنا۔ فَقَدَ یَفْقِدُ کا معنی ہوتا ہے کسی چیز کو گم کرنا مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ (سورۂ یوسف:۷۱)۔ اور تفقد ہوتا ہے گم شدہ چیز کو تلاش کرنا۔ تو تفقد کا ماخذ وہی ہے جو مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ کے اندر یہ لفظ گزرا تھا، پرندوں کی حاضری لی، یا پرندوں کی خبر لی۔ فَقَالَ مَالِیَ لَآ اَرَی الْهُدْهُدَ: سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ کیا ہو گیا مجھے، کہ میں نہیں دیکھتا ہدہد کو، اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِیْنَ: یا ہے ہی وہ غائبین میں سے، ان پرندوں میں سے ہے جو یہاں موجود نہیں، یعنی پرندوں کی جب حاضری لی گئی تو ہدہد بھی اس لشکر میں تھا، وہ نظر نہیں آیا، ''ہدہد'' جس کو کہتے ہیں ترکھان پکھو، یا ہمارے ہاں کہتے ہیں چکیرہ، جس کے اوپر بھی کلغی بنی ہوتی ہے، نیچے چونچ بھی تیز ہوتی ہے، اور یہ زمین میں چونچ کو اس طرح سے دبا کے اس میں سے کیڑا نکال کر کھاتا ہے، مٹی میں سے ہی اس کو اپنی خوراک نظر آ جاتی ہے، اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اتنی بصیرت دی ہے کہ یہ دیکھ لیتا ہے کہ اس جگہ زمین میں پانی قریب ہے، اور اس جگہ دُور ہے، اور حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے لشکر میں اس کو اس لئے رکھتے تھے، کہ جہاں کہیں ٹھہرتے اور وہاں پانی نکالنا ہوتا تو یہ نشاندہی کرتا کہ یہاں سے کھودو، پانی جلدی نکلے گا، تو کوئی ایسی ضرورت پیش آئی ہوگی، اس لیے پوچھا ہدہد کہاں ہے؟ اور وہ ہدہد صاحب اس وقت موجود نہیں تھے، کہیں غائب تھے۔ تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ مجھے نظر نہیں آ رہا، یا واقعی یہاں موجود نہیں ہے؟ یہ ہے حضرت سلیمان علیہ السلام کی کلام کا حاصل۔ جیسے ایک چیز موجود تو ہوتی ہے لیکن پس پردہ یا ادھر ادھر ہو جاتی ہے، یا وہ یہاں موجود ہی نہیں۔ لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِیْدًا: جب معلوم ہوا کہ وہ موجود ہی نہیں ہے، تو پھر فرمایا (جس طرح سے ایک شاہانہ دھمکی ہوتی ہے) میں البتہ ضرور عذاب دوں گا اس کو سخت عذاب، یا البتہ اسے ذبح کر ڈالوں گا۔ اَوْ لَیَاْتِیَنِّیْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ: یا میرے پاس وہ واضح دلیل لے کر آئے اپنی غیر حاضری کی، کہ وہ غیر حاضر کیوں تھا؟ یعنی یا تو وہ عذر پیش کرے کہ وہ غیر حاضر کیوں تھا، اگر تو اس نے اپنی غیر حاضری کی کوئی معقول وجہ بیان کر دی پھر تو سزا نہیں دوں گا۔ اور اگر اس نے کوئی معقول وجہ بیان نہ کی تو یا تو اسے سخت ماروں گا، یا سرے سے ذبح ہی کر ڈالوں گا۔

جانوروں کی سزا کے متعلّق اَحکام

اس پہ لکھا ہے مفسرین نے کہ معلوم ہو گیا کہ جانوروں کو بھی ان کے مفوضہ عمل پر کوتاہی کی بنا پر تنبیہ کی جا سکتی ہے (آلوسی)، جیسے گدھے پہ اینٹیں لاد کر آپ اس کو چلاتا کرتے ہیں، لیکن وہ گڑبڑ کرے تو اس کے ڈنڈا لگایا جا سکتا ہے، یا بیلوں کو جس طرح سے کاشت کار مارتے ہیں، اسی طرح دوسرے جانوروں کو کسی کی کوتاہی کی بنا پر بقدرِ ضرورت سزا دینا جائز ہے، اور بلاوجہ انہیں سزا نہیں دینی چاہیے، اگر کوئی کوتاہی کریں تو پھر اس پر ان کو تنبیہ کی جا سکتی ہے، اور اگر کوئی جانور موذی ہو تو موذی جانور کو ہلاک بھی کیا جا سکتا ہے، جس طرح سے چیونٹیاں بہت جمع ہو گئیں اور وہ کسی طرح سے بھی آپ کو چین نہیں لینے دیتیں، آپ کی کھانے کی چیز خراب کرتی ہیں، مکھیاں زیادہ ہو جاتی ہیں تو ان کو دوائی ڈال کر ختم کیا جا سکتا ہے، ان کی ایذا کے دفع کرنے کے لئے ان کو مارا جا سکتا

ہے۔ حدیث شریف کی شروح میں بھی ہے کہ جہاں پر بھڑ وغیرہ اکٹھے ہو جائیں وہ اگر کسی اور طریقے سے نہ جائیں تو ان کو دھواں دے کے یا آگ جلا کے بھگا دیا جائے یا اس طرح سے تلف کر دیا جائے تو ایذا دینے والی چیز کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ درست ہے۔(1)

''ہدہد'' کی غیر حاضری کی وجہ اور قومِ سبا کا مذہبی تعارف

فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ: غیر بعید سے بعید من الزمان یہاں مراد ہے۔ مکث کی ضمیر ھُدھُد کی طرف لوٹ گئی۔ ھُدھُد ٹھہرا تھوڑا سا یعنی زیادہ دیر نہیں، تھوڑی دیر ہی گزری۔ پھر ہدہد نے کہا کہ میں نے معلوم کیا ہے ایسی چیز کو، میں نے احاطہ کیا ہے ایسی چیز کا جس کا تُو نے احاطہ نہیں کیا۔ یعنی میں ایک ایسی چیز معلوم کر کے آیا ہوں جو آپ کو معلوم نہیں۔ مطلب اس کے کہنے کا یہ تھا کہ آپ چونکہ جہاد پر جا رہے ہیں تو میں آپ کے لئے ہی اردگرد کے حالات جاننے کے لئے گیا تھا تو ایک ایسی بات معلوم کر کے آیا ہوں جو آپ کو معلوم نہیں ہے۔ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ: اور میں آپ کے پاس سبا سے ایک یقینی خبر لایا ہوں۔ ''سبا'' اصل کے اعتبار سے تو ایک آدمی کا نام تھا، بعد میں اس کی اولاد کو ''سبا'' کہتے ہیں، پھر یہ ایک شہر میں آباد ہوئی تو اس شہر کو بھی ''سبا'' کہتے ہیں، یمن کے علاقے میں یہ ایک شہر تھا، وہاں سے ھُدھُد ان کے حالات دیکھ کے آیا، خبر لے کے آیا۔ لایا ہوں میں آپ کے پاس سبا سے ایک یقینی خبر۔ وہ کیا یقینی خبر ہے؟ اِنِّیْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ: میں نے پایا ایک عورت کو جو ان کی بادشاہی کرتی ہے، ان پہ حکومت کرتی ہے۔ وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ: اور دی گئی ہے وہ ہر چیز۔ یہ لفظ ویسے ہی ہے جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا تھا کہ ہمیں ہر چیز دے دی گئی۔ یعنی دنیا جہان کی راحت آرام کی چیز جو اس وقت ہے وہ سب اس عورت کے پاس موجود ہے۔ اور اس کے پاس ایک بہت بڑا عرش ہے یعنی تخت اس کا بہت بڑا ہے، یہ اس نے آ کے حالات ذکر کیے۔ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: میں نے پایا اس عورت کو اور اس کی قوم کو کہ وہ سورج کو سجدہ کرتے ہیں اللہ کو چھوڑ کے، سورج پرستی ان کا دین ہے۔ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ: اور شیطان نے ان کے لئے مزین کر دیا ان کے اعمال کو، پھر روک دیا شیطان نے ان کو سیدھے راستے سے فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ: پس وہ ہدایت نہیں پاتے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ ھُدھُد حضرت سلیمان علیہ السلام کی صحبت میں رہ کر سب توحید وغیرہ کو سمجھے ہوئے تھا، اس لئے ان کی سورج پرستی کو بھی سمجھ گیا، کہ یہ مشرک ہیں، سورج کو سجدہ کرتے ہیں، اور شیطان نے ان کے لئے ان کی کارروائیوں کو مزین کر رکھا ہے، اور وہ سیدھے راستے پر نہیں چلتے، شیطان نے ان کو روک رکھا ہے۔ اسی کی آگے یہ وضاحت ہے کہ اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ: اَلَّا میں ''اَن'' اور ''لَا'' علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اس کا ترجمہ یوں بھی کیا جا سکتا ہے: ''دَابُهُمْ اَلَّا يَسْجُدُوْا'' (آلوسی)، ان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اللہ کو سجدہ نہیں کرتے، ''بیان القرآن'' میں یہی ترکیب ذکر کی گئی ہے۔ اور اس ''اَن'' کو اگر تفسیر کے لئے بنا لیا جائے تو فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ کی بھی تفسیر بن سکتی ہے۔ شیطان نے ان کو سیدھے راستے سے روک رکھا ہے کہ وہ سجدہ نہیں کرتے اللہ تعالیٰ کو، تو یہ سیدھے راستے سے روکنے کی تفسیر ہے کہ وہ سجدہ نہیں کرتے، اور لَا يَهْتَدُوْنَ کے

(1) فتاوی محمودیہ ۱۸ / ۲۸۰ پر ہے ''اگر ان کی اذیت سے بغیر جلائے حفاظت نہیں ہو سکتی تو مجبوراً جلانا بھی درست ہے۔ مگر عموماً بغیر جلائے حفاظت کچھ دشوار نہیں۔ ایسی حالت میں جلانا سخت گناہ ہے۔''

ساتھ بھی اس کا تعلق لگایا جاسکتا ہے پھر "لا" کو زائدہ قرار دیا جائے گا، فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ اِلٰى اَنْ يَّسْجُدُوْا لِلّٰهِ (مظہری وغیرہ)، وہ راستہ نہیں پاتے اس بات کی طرف کہ اللہ کو سجدہ کریں جو کہ نکالتا ہے چھپی ہوئی چیز کو۔ الْخَبْءَ: یہ مصدر ہے مَخْبُوْءٌ کے معنی میں۔ جو چھپی ہوئی چیزوں کو نکالتا ہے اس اللہ کو سجدہ کرنے کی طرف یہ لوگ راستہ نہیں پاتے، ان کو یہ ہدایت نہیں۔ سورج کو پوجتے ہیں، سورج کو سجدہ کرتے ہیں، اور جو چھپی ہوئی حقیقتوں کو نمایاں کرتا ہے اللہ، اس کو سجدہ کرنے کی طرف یہ لوگ راہ نہیں پاتے یعنی مشرک ہیں، اللہ کو نہیں پوجتے، سورج کو پوجتے ہیں۔ جو نکالتا ہے چھپی ہوئی چیزوں کو فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جو چھپی ہوئی ہے آسمانوں میں اور زمین میں۔ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ: اور وہ جانتا ہے ان چیزوں کو جن کو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو۔ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ: وہ اللہ ہے، کوئی معبود نہیں مگر وہی، وہ بہت بڑے عرش کا مالک ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ ھُدھُد نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے اپنی غیر حاضری کی وجہ تفصیل کے ساتھ پیش کردی، حاصل اس کا یہی ہے کہ میں اگرچہ غیر حاضر تھا لیکن اپنے مقصد سے غافل نہیں تھا، چونکہ یہ سفر جہاد کا ہے، تو میں کافر قوموں کے حالات معلوم کرنے کے لئے یہاں سے غیر حاضر ہوا تھا، حتیٰ کہ یمن میں ملکۂ سبا کا حال دیکھ کے آیا ہوں، جس کے ساز و سامان کی تعریف کی تھی کہ دنیا کی ہر عیش و عشرت کا سامان اسے حاصل ہے اور اس کا تخت بہت بڑا ہے، تو خصوصیت کے ساتھ اس کا تخت ذکر کیا، کہتے ہیں کہ وہ بہت قیمتی اور بہت عجیب و غریب تھا۔ پھر آگے ان کا مسلک ذکر کیا کفر اور شرک کا، کہ وہ سورج کے پجاری ہیں، سورج کو سجدہ کرتے ہیں، شیطان نے ان کی راہ مار رکھی ہے، اور ان کے اس مسلک کا تعارف اس لئے کرایا تاکہ سلیمان علیہ السلام کو ان کے خلاف جہاد کی ترغیب ہو، اور آگے پھر اللہ تعالیٰ کی تعریف کی کہ وہ لوگ اللہ کو سجدہ نہیں کرتے جس کی یہ شان ہے اور اصل عرشِ عظیم کا مالک وہی ہے، اور اس کے عرشِ عظیم کے مقابلے میں دنیا کا کوئی عرش کوئی حیثیت نہیں رکھتا، تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہوئے بھی اس نے ربّ العرش العظیم کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا۔

انبیاء علیہم السلام عالم الغیب نہیں

معلوم یوں ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس قوم کے تفصیلی حالات معلوم نہیں تھے، اسی لئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے آگے یہ کہا: سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ: ہم عنقریب دیکھیں گے کہ تُو نے سچ بولا ہے یا تو جھوٹ بولنے والوں میں سے ہے۔ ہم ابھی تحقیق کر لیتے ہیں۔ یہ صریح دلیل ہے اس بات کی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو ملکۂ سبا کے حالات اتنے معلوم نہیں تھے، جتنے ھُدھُد نے آ کے ذکر کیے، تو یہ بھی دلیل ہے کہ انبیاء علیہم السلام تمام چیزوں کے جاننے والے نہیں ہوتے، ان کو علم غیب نہیں ہوتا، اور وہ کُل اشیاء کا علم نہیں رکھتے۔[1] اب اسی دنیا میں اسی زندگی میں جہاں حضرت سلیمان علیہ السلام کی بادشاہت ہے، ان کے مقابلے میں دوسری حکومت ہے، اور اس کے تفصیلی حالات حضرت سلیمان علیہ السلام کو معلوم نہیں ہیں۔

---

(۱) فَكَانَ فِيْ هٰذَا رَدٌّ عَلٰى مَنْ قَالَ: اِنَّ الْاَنْبِيَاءَ تَعْلَمُ الْغَيْبَ (قرطبی)

ملکۂ سبا کے نام سلیمان علیہ السلام کا خط

اب تحقیق کرنے کی صورت آگے یہ اختیار کی۔ اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ: کتاب سے خط مراد ہے۔ میرا یہ خط لے جا، (ذھب: جانا۔ اور باء تعدیہ کی آگئی) میرا یہ خط لے جا، پھر تو اس خط کو ڈال دے ان کی طرف یعنی ملکۂ سبا اور اس کے اَعوان، اَنصار، اَرکانِ سلطنت ان کے پاس جا کے یہ خط ڈال دے، ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ: پھر ان سے ایک طرف تُو ہٹ جا۔ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ: پھر تو دیکھنا کہ وہ کیا جواب لوٹاتے ہیں..... معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بھی پرندوں سے نامہ بری کا کام لیا جاتا تھا۔ کبوتروں سے تو نامہ بری کا کام بہت پُرانا ہے اور لوگ لیتے ہیں۔ تو ھُدھُد کے ذریعے سے حضرت سلیمان علیہ السلام نے خط بھیجا۔ جس کی صورت یہ ہوگی کہ اس کو چونچ میں پکڑ کر لے جا، جہاں اس کا دربار لگا ہوا ہوگا، وہاں جا کر اس کو ڈال دینا، اور پھر جس طرح سے مجلس کے آداب ہوتے ہیں کہ سر پہ کھڑے نہ رہنا، ایک طرف کو ہٹ کے کھڑے ہو جانا، پھر دیکھنا کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں، جس سے معلوم ہوا کہ ھُدھُد جہاں سلیمان علیہ السلام کی بات کو سمجھتا تھا، وہاں وہ ان لوگوں کی باتوں کو بھی سمجھتا تھا، اس لئے تو کہا کہ کھڑے ہو کے ذرا دیکھیو! کہ وہ کیا رَدِّ عمل ظاہر کرتے ہیں، اور پھر واپس آ کے اس کی رپورٹ دینا۔ تو ھُدھُد اسی ہدایت کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط لے گیا اور جہاں ان کا دربار لگا ہوا تھا وہاں جا کر اس خط کو ڈال دیا، ان لوگوں نے اس بات پہ تعجب نہیں کیا کہ یہ خط آ کیسے گیا، جس سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ پرندوں کے ذریعے خطوط کا بھیجنا اس وقت مروّج تھا، اور اس کو کوئی تعجب کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا، پُرانے زمانے میں اس قسم کا کام پرندوں سے لیا جاتا تھا، اس پر تو انہیں کوئی تعجب نہیں ہوا۔

ملکۂ سبا کی درباریوں سے مشاورت اور مضمونِ خط

البتہ جس وقت خط کھولا، اور اس کا مضمون پڑھا، تو مضمون سے وہ مرعوب ہو گئے، جس کا ذکر ملکۂ سبا آگے اپنے ارکان سے کر رہی ہے۔ قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا: ملأ کا لفظ بہت دفعہ آپ کے سامنے گزر گیا، یہ اَرکانِ سلطنت کو کہتے ہیں، مصاحبین کو کہتے ہیں، بڑے لوگ، درباری، جس طرح سے آج کل اَرکانِ پارلیمنٹ ہوتے ہیں، یعنی منتخب ارکان۔ تو ملکہ نے کہا کہ اے سردارو! اے درباریو! اے ارکانِ سلطنت! اِنِّيْۤ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ: بے شک میں، ڈالا گیا ہے میری طرف ایک باعزت خط، بڑا مکرم اور محترم خط ہے جو میری طرف آیا ہے۔ اُلْقِيَ اِلَيَّ: ڈالا گیا ہے میری طرف، یہ اسی بات کی طرف اشارہ ہے جیسے سلیمان علیہ السلام نے ھدھد سے کہا تھا: فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ، کہ وہاں جا کے ڈال دینا، تو اس کو پتا چل گیا کہ یہ خط میرے پاس ڈالا گیا ہے اور پرندے کی وساطت سے ڈالا گیا ہے۔ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ: بے شک یہ خط سلیمان علیہ السلام کی طرف سے ہے اور بے شک یہ خط اس مضمون پر مشتمل ہے، وہ خط یہ ہے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ: ''شروع کرتا ہوں میں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے، اور مقصد لکھنے سے یہ ہے کہ تم میرے مقابلے میں سرکشی اختیار نہ کرو، اور آ جاؤ میرے پاس فرماں بردار بن کے!'' یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے خط کا مضمون ہے۔

خط لکھنے کا اسلامی طریقہ

خط لکھنے کا جو اسلامی طریقہ ہے، اور سرورِ کائنات ﷺ کے خطوط جو احادیث میں منقول ہیں، ان میں یہ بات خاص طور پر ذکر کی گئی ہے کہ سب سے پہلے لکھنے والا اپنا نام لکھا کرتا ہے۔ حضور ﷺ نے کفار کی طرف، بادشاہوں کی طرف جو خطوط لکھے ہیں تو وہاں بھی یہی ہے: ''مِنْ محمدٍ عَبْدِاللهِ و رسولِه الی هِرَقْلَ عَظِیْمِ الرُّوْمِ ''[1] اسی انداز کے ساتھ خط لکھا کرتے تھے کہ پہلے اپنا ذکر کرتے اور بعد میں اس کا ذکر کرتے جدھر خط لکھا گیا ہے، عین سُنّت کے مطابق خط لکھنے کا طریقہ یہی ہے، انسان شروع میں اپنا نام ذکر کرے تاکہ خط دیکھتے ہی مرسل الیہ کو پتا چل جائے کہ خط لکھنے والا کون ہے، اس کو بعد میں تلاش نہ کرنا پڑے کہ یہ خط کس کی طرف سے آیا ہے۔

پہلے ''بسم اللہ'' لکھی جائے یا ''نام''؟

اور ''بسم اللہ'' کے بارے میں حضور ﷺ کے خطوط میں تو یہی ہے، کہ ''بسم اللہ'' پہلے لکھتے تھے اور ''من محمد عبدالله ورسوله الی فلاں'' بعد میں یہ عبارت لکھا کرتے تھے۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط جو نقل کیا گیا ہے، اس میں بلقیس کی نقل کے مطابق اِنَّهٗ مِنْ سُلَیْمٰنَ پہلے ہے اور بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ بعد میں ہے۔ لیکن یہ نقل ہے اس ملکہ کی جس کا نام روایات میں بلقیس آیا ہے، اور ہوسکتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے لکھا تو یوں ہو ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مِنْ سُلَیْمٰنَ اِلٰی مَلِکَۃِ سَبَاٍ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَیَّ وَاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ'' حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط بھی ایسے ہی ہو، لیکن اب وہ چونکہ اپنے ارا کین کو بتانا چاہتی ہے، تو اس لئے اس نے کاتب کا نام پہلے ذکر کردیا کہ یہ خط سلیمان کی طرف سے آیا ہے، اور اس میں مضمون یہ ہے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَیَّ وَاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ۔ تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنا نام تو ''بسم اللہ'' کے بعد ہی لکھا ہو لیکن وہ بتاتے وقت ذکر اس کو پہلے کرتی ہے...... اور ایسا بھی ممکن ہے کہ مِنْ سُلَیْمٰنَ پہلے ہو۔ اوپر عنوان دے دیا کہ ''یہ خط سلیمان کی طرف سے ہے ملکہ بلقیس کی طرف'' بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَیَّ وَاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ۔ اور یہ دونوں صورتیں ہمارے ہاں جائز ہیں، کہ کاتب اپنا نام پہلے لکھے ''بسم اللہ'' بعد میں لکھے۔ لیکن عین سُنّت کے مطابق صراحتاً بات یہی ہے کہ ''بسم اللہ'' پہلے ہو اور باقی جو بھی تحریر ہو وہ بعد میں آئے۔

سلیمان علیہ السلام کا خط کس زبان میں تھا؟

تو اس سے اس بات پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ یہ بسم اللہ کتنی پرانی ہے، یا تو یہی الفاظ سلیمان علیہ السلام کے تھے کیونکہ ملکہ تو عربی ہے، ان کی زبان تو عربی تھی، اور سلیمان علیہ السلام چونکہ شام اور فلسطین کے علاقے میں رہنے والے ہیں تو ان کی زبان عربی نہیں تھی، تو اس کو خط اس زبان میں لکھوایا ہو جو زبان وہ سمجھتی تھی، پھر تو خط کے یہی الفاظ ہوں گے۔ یا یہ ان کے خط کا ترجمہ ہے، دونوں باتیں ہی ہوسکتی ہیں۔ کیونکہ دوسرے کی طرف خط جو لکھا جاتا ہے تو ایسی زبان میں ہی لکھا جاتا ہے جس کو دوسرا سمجھے، چاہے لکھنے والے کی اپنی

---

(۱) بخاری ص ۵۔ مشکوۃ ۲/ ۳۴۰ باب الکتاب الی الکفار کی پہلی حدیث۔

زبان وہ نہ ہو، اور حضرت سلیمان عربی جانتے ہوں گے کیونکہ جب وہ پرندوں تک کی بولی جانتے تھے تو انسانوں کی زبان کیسے نہیں جانتے تھے، اس لئے خط عربی میں لکھا کہ ملکہ اسی زبان کو سمجھتی ہے۔ اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ خط اس زبان میں لکھا جو ان کے علاقے کی اپنی مروّج زبان تھی یعنی سریانی جو توراۃ کی زبان ہے اصل۔ اور بعد میں ملکہ نے اس کا ترجمہ کروایا ہو تو ترجمان کے ذریعے سے عبارت یہ بن گئی بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَیَّ وَاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ..... تو دونوں احتمال ہیں (آلوسی)۔

کافر کو خط لکھنے کے متعلّق اَحکام

اور اس خط سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اگر کوئی شخص کافر کی طرف بھی خط لکھتا ہے تو اس میں بھی ''بسم اللہ'' لکھی جاسکتی ہے، اور ''بسم اللہ'' قرآنِ کریم کی ایک آیت ہے، تو خط کے اندر کوئی آیت لکھ دینا اور مکتوب الیہ کافر ہو، اس کافر کے ہاتھ میں وہ کاغذ جائے گا جس میں قرآنِ کریم کی آیت لکھی ہوگی، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس لئے حضور ﷺ نے بھی کافر بادشاہوں کی طرف جو خطوط لکھے تھے، تو اس میں وہ آیت بھی ہے: یٰۤاَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍۭ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ یہ آیت جو سورۂ آلِ عمران (آیت ۶۴) میں ہے، یہ حضور ﷺ کے خطوط میں لکھی جاتی تھی، جس وقت آپ عیسائی بادشاہوں کو خط لکھتے تھے (حوالہ گزر چکا) تو وہ بے وضو ہوں گے، بغیر طہارت کے ہوں گے، کافر ہیں، تو ان کے ہاتھ میں اس قسم کا خط دینا یا اس قسم کا کاغذ دینا جس میں قرآنِ کریم کی آیت لکھی ہو، اس کی گنجائش ہے..... لیکن اب عام طور پر چونکہ خطوط وغیرہ کی بے ادبی ہوتی ہے، لوگ پڑھتے ہیں پڑھ کے ڈال دیتے ہیں، پھینک دیتے ہیں، اس لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ ایسے موقع پر جہاں اس کاغذ کے گرجانے یا پاؤں کے نیچے آجانے، اور اس طرح سے اس کی بے ادبی کا اندیشہ ہو تو قرآنِ کریم کی آیات نہ لکھی جائیں تو بہتر ہے، بسم اللہ بھی زبانی پڑھ لی جائے، کاغذ کے اوپر نہ لکھی جائے تاکہ کاغذ کے گرنے کی صورت میں پاؤں کے نیچے آکر بے ادبی نہ ہو، ویسے اگر آپ لکھیں، لکھ کے بھیجیں، تو یہ ذمہ داری دوسرے کی ہے کہ اس کو سنبھالے۔ آپ کے لئے لکھنا جائز ہے (دیکھئے: ''معارف القرآن'')۔

تو یہ خط کا ایک نمونہ ہے کہ انبیاء ﷩ خط لکھتے تھے، کتنا مختصر اور کتنا جامع۔ حضور ﷺ کے خطوط جو حدیث شریف میں ہیں وہ بھی ایسے ہی ہیں۔ ان میں اِدھر اُدھر کی باتیں نہیں، بس مقصد کی بات ہے۔ جیسے ''بخاری شریف'' (ص ۵) میں آتا ہے کہ ہرقل کو خط لکھا۔ اتنا ہی مضمون ہے اس کا ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ اِلٰی ھِرَقْلَ عَظِیْمِ الرُّوْمِ۔ سَلَامٌ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی۔ اَمَّا بَعْدُ۔ فَاِنِّیْ اَدْعُوْکَ بِدِعَایَۃِ الْاِسْلَامِ اَسْلِمْ تَسْلَمْ یُؤْتِکَ اللّٰہُ اَجْرَکَ مَرَّتَیْنِ فَاِنْ تَوَلَّیْتَ فَاِنَّ عَلَیْکَ اِثْمَ الْاَرِیْسِیِّیْنَ وَیٰۤاَھْلَ الْکِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَاءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَنْ لَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْھَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ'' مختصری بات ہے کہ میں تجھے اسلام کی دعوت دیتا ہوں، اسلام قبول کرلے، تو بچ جائے گا، تیری سلامتی اسی میں ہے، ورنہ تیری رعایا کی گمراہی کا گناہ بھی تیرے سر پر ہے، اور آگے پھر وہ اُصول ذکر کردیا کہ آؤ، توحید کے مسئلے پہ آپس میں اتفاق کرلیں، ہم ایک دوسرے کو ربّ نہ بنائیں، اور اگر تم نہیں مانتے تو ہماری طرف سے تو بات یُوں کہ ہم تو اللہ کے فرماں بردار ہیں۔ تو یہاں (سلیمان ؑ کا خط) بھی مختصر سا ہے ''سرکشی کرنے کی ضرورت نہیں، سیدھے

سیدھے فرماں بردار ہو کے آجاؤ!''بس مختصر سی بات۔اور جب کافر کو سلام لکھا جاتا ہے تو یوں ہی لکھا جاتا ہے: ''اَلسَّلَامُ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى''جو ہدایت کا متبع ہے اس پہ سلام، حضور ﷺ کافروں کو خط لکھتے تھے تو اسی طرح سے لکھا کرتے تھے۔

''مشورے'' کی اہمیت

یہ مضمون جس وقت پڑھ کے سُنایا تو اب وہ ملکہ اپنے ارا کین سے مشورہ کرتی ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صورت کہ بادشاہِ وقت اپنے ارا کین سے مشورہ کر کے کوئی معاملہ طے کرے،جس کو''شوریٰ'' کہتے ہیں، یہ طریقہ بھی پُرانا ہے۔اور آپ کے سامنے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں فرعون کا ذکر آیا تھا،اس نے بھی اپنے ارا کین سے مشورہ کیا، کہ اب میں کیا کروں، یہ شخص جو آ کے اس طرح سے باتیں کرتا ہے،تو انہوں نے کہا تھا کہ اس کو ڈھیل دے دے،اس کو مہلت دے دے،اس کے بھائی کو مہلت دے دے،جادوگر اکٹھے کر لے۔تو بادشاہ اپنے اردگرد اس قسم کے لوگوں کو جمع رکھا کرتے ہیں، جن سے مشکل مشکل معاملات میں مشورہ لیا جاتا ہے،مشورہ لینے کے بعد پھر آگے کام کیا جاتا ہے،اور اسلام نے تو بنیاد ہی اس بات پر رکھی ہے کہ مشورہ لے کر ہی کام کیا جائے۔حضور ﷺ کو بھی قرآنِ کریم میں یہی حکم دیا گیا ہے کہ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (سورۂ آلِ عمران:١٥٩) معاملات میں ان صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کرتے رہا کرو۔

قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْٓ اَمْرِيْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ﴿٣٢﴾

کہنے لگی کہ اے سردارو! بتاؤ مجھے میرے اس معاملے میں، نہیں ہوں میں قطعی طور پر طے کرنے والی کسی امر کو جب تک کہ تم موجود نہ ہوو ﴿٣٢﴾

قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ﴿٣٣﴾

وہ کہنے لگے کہ ہم قوت والے ہیں اور سخت لڑائی والے ہیں، اور معاملہ تیری طرف سپرد ہے، تُو غور کر، تو کیا حکم دیتی ہے ﴿٣٣﴾

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ

وہ کہنے لگی کہ بادشاہ جب داخل ہوتے ہیں کسی بستی میں تو اس کو فاسد کر دیتے ہیں اور کر دیتے ہیں اس بستی والوں میں سے عزت والوں کو ذلیل

وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿٣٤﴾ وَاِنِّيْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ

اور ایسے ہی یہ کریں گے ﴿٣٤﴾ اور میں بھیجنے والی ہوں ان کی طرف ایک ہدیہ پھر میں دیکھنے والی ہوں کہ بھیجے ہوئے لوگ کس چیز کو لے

الْمُرْسَلُوْنَ ﴿٣٥﴾ فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ ۫ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ

کر لوٹتے ہیں ﴿٣٥﴾ جب اس کا بھیجا ہوا سلیمان کے پاس آیا تو سلیمان نے کہا: کیا تم مجھے مدد دیتے ہو مال کے ساتھ؟ جو کچھ اللہ نے مجھے دیا ہے وہ بہتر ہے اس

اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ۝٣٦ اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ

سے جو اس نے تمہیں دیا ہے، بلکہ تم ہی اپنے ہدیہ کے ساتھ خوش ہوتے ہو ۝٣٦ لوٹ جا ان کی طرف، البتہ ہم ضرور لے کر آئیں گے ان کے پاس ایسے لشکر

لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝٣٧ قَالَ

کہ نہیں ہوگا ان کے لئے مقابلہ اُن لشکروں کا، اور البتہ ہم ضرور نکال دیں گے انہیں اس شہر سے اس حال میں کہ وہ ذلیل اور رُسوا ہوں گے ۝٣٧ سلیمان نے کہا:

يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ۝٣٨ قَالَ

اے درباریو! تم میں سے کون لے آئے گا میرے پاس اس کا تخت قبل اس کے کہ آ جائیں وہ میرے پاس فرمانبردار ہو کر ۝٣٨ جنوں میں

عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ

سے ایک قوی ہیکل جِن نے کہا: میں لے آؤں گا آپ کے پاس اس تخت کو قبل اس کے آپ اپنی جگہ سے اٹھیں اور میں اس کے اوپر

لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ۝٣٩ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ

قوت رکھنے والا ہوں، امانت دار ہوں ۝٣٩ کہا اس شخص نے جس کے پاس کتاب کا علم تھا، میں لے آؤں گا اس کو تیرے پاس قبل اس کے کہ تیری نگاہ

اِلَيْكَ طَرْفُكَ ۭ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ۣ لِيَبْلُوَنِيْٓ

لوٹے تیری طرف، جب دیکھا اس کو سلیمان نے اپنے سامنے قرار پکڑے ہوئے تو کہا یہ میرے رَبّ کے فضل سے ہے تاکہ مجھے آزمائے

ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ۭ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ

کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں، اور جو کوئی شکر کرے گا تو وہ شکر گزار ہوگا اپنے نفع کے لئے اور جو کوئی ناشکری کرے گا تو میرا رَب تو بے نیاز

كَرِيْمٌ ۝٤٠ قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ

ہے مکرم ہے ۝٤٠ سلیمان نے کہا کہ اس کو اجنبی بنا دو، ہم دیکھیں کہ وہ سیدھا راہ پاتی ہے یا ان لوگوں میں سے ہے جو

لَا يَهْتَدُوْنَ ۝٤١ فَلَمَّا جَاۗءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ۭ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَاُوْتِيْنَا

سیدھا راہ نہیں پاتے ۝٤١ جب وہ آ گئی تو اس سے پوچھا گیا: تیرا تخت ایسا ہی ہے؟ اس نے کہا: گویا کہ یہ وہی ہے اور ہم علم دے دیے

الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِيْنَ ۝٤٢ وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ

گئے اس واقعے کے پیش آنے سے پہلے ہی اور ہم فرماں بردار ہیں ۝٤٢ اور روکا اس عورت کو اس چیز نے جس کو پوجتی تھی وہ اللہ کے علاوہ

اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۴۳﴾ قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ

بے شک وہ کافر لوگوں میں سے تھی ﴿۴۳﴾ کہا گیا اس ملکہ کو کہ داخل ہو جا تُو محل میں، جس وقت اس نے اس محل کو دیکھا

حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ۭ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ۬

تو اس نے اس کو گہرا پانی سمجھا اور اپنی پنڈلیاں کھولیں، سلیمان نے کہا: یہ تو محل ہے جس کو جڑا گیا شیشوں سے،

قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۴﴾

کہنے لگی کہ اے میرے رَبّ! بے شک میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا، میں فرماں بردار ہوگئی سلیمان کے ساتھ اللہ کے لئے جو رَبّ العالمین ہے ﴿۴۴﴾

تفسیر

ملکۂ سبا کی اَراکین سے مشاورت

قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْۤ اَمْرِيْ: کہنے لگی کہ اے سردارو! اے اراکین! اے درباریو! بتلاؤ مجھے۔ اِفتاء: بات بتانا۔ یہ جو آپ فتویٰ دیا کرتے ہیں، وہ بھی حکم ظاہر کرنے کے معنی میں ہوتا ہے۔ اِستفتاء: پوچھنا، اور اِفتاء: بتانا، اور فتویٰ: اس حکم کو کہتے ہیں جو بتایا جاتا ہے۔ بتاؤ مجھے میرے اس معاملے میں۔ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا: نہیں ہوں میں قطعی طور پر طے کرنے والی کسی اَمر کو، جب تک کہ تم موجود نہ ہوؤ۔ یعنی میں ہمیشہ ہی تم سے مشورہ لیتی ہوں، جس وقت تک تم موجود نہ ہوؤ اس وقت تک میں کسی معاملے کا کوئی قطعی فیصلہ نہیں کرتی، میری عادت یہی ہے۔ یہ ان کی عزت افزائی کی جارہی ہے، حوصلہ افزائی کی جارہی ہے، تاکہ وہ پورے حوصلے کے ساتھ اس کو اپنا معاملہ سمجھ کے اپنی ذمہ داری سمجھ کے جواب دیں۔ ''نہیں ہوں میں قطع کرنے والی کسی امر کو'' لفظی معنی یہی ہے، یعنی میں قطعی فیصلہ نہیں کرتی کسی امر کا، حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ: جس وقت تک کہ تم میرے پاس موجود نہ ہوؤ۔ حتّٰی کے بعد مضارع کا ترجمہ نفی کے ساتھ ہمیشہ کرتا رہتا ہوں۔ یا یوں ترجمہ کرلیں کہ تمہارے میرے پاس حاضر ہونے تک میں کوئی معاملہ قطعی طور پہ طے نہیں کرتی۔

قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ: یہ ان اَراکینِ سلطنت کا مشورہ ہے۔ وہ کہنے لگے کہ ہم قوت والے ہیں اور سخت لڑائی والے ہیں اور معاملہ تیری طرف سپرد ہے، تُو غور کر، تُو کیا حکم دیتی ہے؟ تَاْمُرِيْنَ واحد مؤنث مخاطب کا صیغہ ہے۔ حاصل اس مشورے کا کیا ہوا؟ ان لفظوں میں انہوں نے یہ ذکر کیا کہ حضور! ہم تو آپ کے حکم کے بندے ہیں۔ باقی! جہاں تک سامانِ جنگ کا تعلق ہے، وہ بھی ہمارے پاس بہت ہے، اُولُوْا قُوَّةٍ: قوت کے اندر، آلاتِ جنگ کی طرف اشارہ ہے۔ اُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ: اور ہم لڑاکے بھی ہیں، بہادر بھی ہیں، بزدل تو ہم ہیں نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جناب کی مرضی اگر لڑنے کی ہو تو ہم تیار ہیں اور جنگ کی ہماری پوری تیاری ہے، ہمیں اس میں کوئی کسی قسم کا اشکال نہیں، باقی

آپ کی مرضی! جس طرح آپ چاہیں کریں، ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ ہم لڑنے مرنے کے لئے تیار ہیں، انہوں نے جو یہ دھمکی دی ہے کہ سیدھے سیدھے آجاؤ، سرکشی اختیار نہ کرو، تو یہ ایک قسم کا چیلنج ہے، یہ تو ایک اعلانِ جنگ ہے کہ تیرے تابع ہو کے آجاؤ، سر اُٹھانے کی کوشش نہ کرنا، فرماں بردار ہو کے آجاؤ، یہ تو ہمیں دبانے کی کوشش کی گئی ہے، اس لئے اگر اس میں لڑنے کی ضرورت ہے، تو ہم لڑائی کے لئے تیار ہیں۔

اُولُوْا قُوَّةٍ سے سامانِ جنگ کی طرف اشارہ ہو جائے گا، اور بَأْسٍ شَدِيْدٍ سے اپنی بہادری کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ لڑنے کے لئے دونوں باتوں کی ضرورت ہوتی ہے، سامان نہ ہو تو بھی انسان لڑ نہیں سکتا، سامان تو ہے لیکن فوج کے حوصلے پست ہیں، وہ فوج بھی لڑا نہیں کرتی، جس فوج میں دونوں صفتیں پائی جائیں کہ سامان جنگ بھی ہے اور لڑنے کا حوصلہ بھی ہے، وہاں پھر لڑائی آسان ہو جاتی ہے۔ تو انہوں نے دونوں باتیں کہیں کہ سامان بھی ہمارے پاس کافی ہے اور حوصلے بھی ہمارے بلند ہیں، ہم تو لڑنے مرنے کے لئے تیار ہیں باقی تو دیکھ لے، سوچ لے، جس طرح سے تو حکم دیتی ہے، ٹھیک ہے، اپنی طرف سے انہوں نے جاں نثاری کا ثبوت دے دیا۔

ملکہ سبا کا فراست پر مبنی فیصلہ

لیکن وہ کہنے لگی کہ لڑنا بظاہر مناسب نہیں ہے، معلوم ہوتا ہے کہ سمجھ دار عورت تھی، آخر اللہ تعالیٰ اگر کسی کو کوئی منصب دیتا ہے تو اس کے مطابق عقل و فہم بھی ہوتا ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ افواہیں اور کچھ ادھر ادھر کی باتیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی شان و شوکت کے متعلق پہلے سے سنے بیٹھی ہو، لیکن پورے حالات کی تحقیق اس کو بھی نہیں تھی، اس خط کو پڑھ کر اس کے اُوپر رُعب طاری ہو گیا، اور وہ سمجھی کہ یہ کوئی عام بادشاہوں کی طرح نہیں ہے، پہلے ہمیں جانچنا چاہیے کہ اس کا مزاج کیا ہے، جب تک ہمیں ان کی قوت کا اندازہ نہیں، اور ان کے مقصد کا پتا نہیں، اس وقت تک میدان میں کود آنا بہتر نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے وہ ہم سے زیادہ قوت والا ہو، اور ہمارے اوپر غلبہ پالے، اور بادشاہوں کی عادت ہے کہ جب وہ کسی علاقے کو فتح کیا کرتے ہیں، تو ان شہروں کو اُجاڑ دیتے ہیں، اور جو وہاں کا معزز طبقہ ہوتا ہے، صاحبِ حکومت ہوتے ہیں، ان کو وہ ذلیل کرتے ہیں۔ تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم خواہ مخواہ لڑائی میں چلے جائیں، اور وہ ہم پر غلبہ پالے، اور اسی طرح سے ہمارے علاقے کو اُجاڑے اور ہم سب کو ذلیل کرے، اس لئے ان کی قوت و طاقت کا اندازہ کیے بغیر اور ان کے مقصد کو سمجھے بغیر ہمیں میدانِ جنگ میں نہیں اُترنا چاہیے، ہاں! البتہ میں کچھ ہدیے بھیجتی ہوں، اور کچھ آدمی بھیجتی ہوں ہدیے دے کے، تو میں دیکھوں گی کہ وہ کیا جواب لاتے ہیں؟ اور وہاں کے حالات بھی معلوم ہو جائیں گے، جیسے سفراء وفد کی شکل میں بھیجے جاتے ہیں کہ جا کے ہدیے پیش کریں گے، اگر تو وہ ہمارے قیمتی ہدیے لے کر خوش ہو گیا تو معلوم ہو گا کہ دُنیادار بادشاہ ہے، تو ہم اس کو مال و دولت دے کر خوش کر کے آپس میں مصالحت کر لیں گے، لڑنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی، اور جو جائیں گے وہ جا کر حالات بھی دیکھ لیں گے، اور آکر بتادیں گے کہ اس میں قوت و طاقت کتنی ہے، اس کے بعد فیصلہ کیا جائے گا، پہلے یہ معلوم کیا جائے کہ اس شخص کا رجحان کیا ہے؟

سلیمان علیہ السلام نے ملکۂ سبا کے تحائف ٹھکرا دیے

چنانچہ اس نے ایک وفد بھیجا، اس میں بہت قیمتی قیمتی تحفے اور ہدیے بھیجے، حضرت سلیمان علیہ السلام کو پہلے اطلاع ہوگئی، انہوں نے بھی آگے اسی قسم کی شان وشوکت کا اظہار کیا، تو جب یہ وفد حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے گیا اور ہدیے پیش کئے، تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ ہدایا ٹھکرا دیے۔ فرمانے لگے '' مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں میرے پاس جو کچھ ہے وہ اس سے بہتر ہے۔'' مطلب یہ ہے کہ میں تو اللہ کا حکم پھیلانا چاہتا ہوں، کفر کو مٹانا اور دبانا چاہتا ہوں، یہ مال لے کر میں خوش نہیں ہوتا، اس قسم کے ہدیوں کے اوپر تمہیں ہی فخر ہوگا، تم ہی خوش ہوتے ہوگے، جاؤ، لے جاؤ اپنے ہدیے، اور انہیں کہو کہ یا تو انسان بن کے سیدھے تبع ہوکر آ جائیں، ورنہ پھر میں ایسا لشکر بھیجوں گا جس سے مقابلہ کرنے کی ان میں طاقت نہیں ہے، وہ جو بیٹھے اپنی جگہ بڑیں مارتے ہیں کہ ہم أُولُوْا قُوَّةٍ ہیں، أُولُوْا بَأْسٍ شَدِيْدٍ ہیں، جس وقت میرا لشکر آئے گا سب کس بل نکل جائیں گے۔

ملکۂ سبا کی نیازمندی

حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان کو دھمکا کے بھیج دیا اور ان کے ہدیے واپس کر دیے، جس سے ملکہ سمجھ گئی کہ یہ عام بادشاہوں کی طرح نہیں ہے، اس لئے اس کے ساتھ مقابلہ کرنا مناسب نہیں، مرعوب ہوگئی، اطاعت اور فرماں برداری کا اظہار کرنے کے لئے، نیازمندی کا اظہار کرنے کے لئے پروگرام بنایا کہ میں خود اس کے دربار میں جاؤں، اور جا کے اطاعت قبول کرلوں۔ تو وہاں سے وہ اپنے ارا کین کو ساتھ لے کر چلی، مقصد تھا کہ لڑے بغیر ہی ہم جا کے جس طرح سے ایک حکومت دوسرے کی تابع ہوجاتی ہے، کہ حکومت تو ان کی اپنی رہے لیکن جا کر اطاعت قبول کرلی، کہ ہم تمہارے مقابل نہیں ہیں، ہم تمہارے تابع ہیں، جو بھی اس قانون کے مطابق جزیہ خراج جو کچھ ہوگا، متعین کردیا جائے گا، اس طرح سے اطاعت کا اظہار کرنے کے لئے وہاں سے اس نے سفر شروع کیا۔

تختِ بلقیس کیسے آیا؟ اور کون لایا؟

جب اس نے سفر شروع کیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو پرندوں اور جنات کے ذریعے سے پہلے اطلاع ہوگئی کہ وہ آرہے ہیں، اور ان کی اکڑ پھکڑ جتنی تھی وہ دو دھمکیوں میں ہی نکل گئی، اور اب وہ فرماں برداری کا اظہار کرنے کے لئے آرہے ہیں، تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ چاہا کہ جہاں ادھر آ کے وہ دنیاوی شان وشوکت دیکھیں گے، تو ہم ان کے سامنے کوئی معجزہ ظاہر کریں، جس سے ان کو ہدایتِ حقیقی نصیب ہوجائے، معجزہ دیکھ کے وہ اور متأثر ہوں گے، تو آپ نے اپنے پاس بیٹھنے والوں کو کہا کہ اس کا جو بہت بڑا عرش ہے، جس کو اس نے بہت محفوظ رکھا ہوا ہے، بڑے پہروں میں ہے، کوئی شخص ہے جو اس کو وہاں سے اُٹھا کے لے آئے۔ چونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس جنات اور ہر قسم کی مخلوق تھی، تو ایک '' عفریت من الجن '' جنوں میں سے بہت طاقتور جن، جو بہت سرکش قسم کے ہوتے ہیں، وہ کہنے لگا جی! میں اس کو اُٹھا کے لاتا ہوں، اور آپ کے اس مجلس سے اُٹھنے سے پہلے پہلے، یعنی جو معہود

وقت ہے آپ کی مجلس کے ختم ہونے کا، اس وقت سے پہلے پہلے میں عرش کو لے آؤں گا، تخت کو اُٹھا لاؤں گا، قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ: اس کا معنی یہ ہے کہ آپ کے اُٹھنے سے پہلے، جب آپ کی مجلس برخاست ہوگی، جیسا کہ عام رواج ہے کہ ہم گیارہ بجے اُٹھتے ہیں، بارہ بجے اُٹھتے ہیں، جو وقت متعین ہے اُٹھنے کا، اس وقت سے پہلے پہلے میں تخت کو لے آؤں گا، اور مجھے قوت بھی حاصل ہے اور میں امانت دار بھی ہوں، اس تخت کا کوئی نقصان نہیں کروں گا۔ یہ اس عِفْرِیْتٌ مِّنَ الْجِنِّ نے پیش کش کی۔ لیکن ایک اور شخص جس کے متعلق قرآنِ کریم کہتا ہے کہ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ، اس کو اللہ کی کتاب کا علم حاصل تھا، اس سے مراد خود حضرت سلیمان علیہ السلام ہیں، یا حضرت سلیمان علیہ السلام کا کوئی صحابی ہے، جیسا کہ بعض روایات میں لکھا گیا ہے کہ آصف بن برخیا، یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا صحابی ہے، اس نے یہ پیش کش کی کہ مجلس کے اُٹھنے میں تو بہت وقت باقی ہے، مجھے اجازت دو تو میں آنکھ جھپکنے سے پہلے اس تخت کو لاتا ہوں۔ تو اگر تو اس سے حضرت سلیمان علیہ السلام مراد ہیں پھر تو یہ معجزہ ہوگا حضرت سلیمان علیہ السلام کا، کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ معجزہ ظاہر ہوگا، جس سے جنوں کو بھی شکست ہو جائے گی کہ وہ زیادہ سے زیادہ جلدی لا سکتے ہیں تو گھنٹوں میں لا سکتے ہیں، اور معجزے کے ساتھ وہ ایک آن میں آ گیا، اور اگر وہ آصف بن برخیا ہیں تو پھر یہ ''کرامت'' ہے، اور ''کرامت'' جو ہوتی ہے یہ بھی نبی کا معجزہ ہی ہوتا ہے، ولی کی کرامت اس کے نبی کا معجزہ ہے، کیونکہ ولی کو یہ شان اور عزت حاصل ہوئی اس نبی کی اطاعت کرنے کی بنا پر، تو اصل کے اعتبار سے یہ کمال بھی اسی نبی کی طرف منسوب ہوتا ہے جس کی اطاعت کرنے سے کسی ولی کو یہ نعمت حاصل ہوئی، تو یہ جو لانا تھا یہ بطور کرامت کے تھا...... اور ایسا بھی ہو سکتا ہے، جیسا کہ آپ کے سامنے سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ذکر کیا گیا تھا کہ سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں جادو کی کثرت تھی، لوگ جادو بھی جانتے تھے، اور اللہ تعالیٰ نے دو فرشتے اتارے تھے بابل میں ہاروت اور ماروت، جو لوگوں کو سکھاتے تھے، کیا سکھاتے تھے؟ وہاں تفصیل آپ کی خدمت میں عرض کی تھی کہ بعض مفسرین نے کہا کہ لوگوں کو جادو کے اصول بتاتے تھے کہ دیکھو! یہ جادو ہے یہ نہ کیا کرو، یہ جادو ہے یہ نہ کیا کرو۔ اس لئے لوگوں کو پہلے ہی کہہ دیتے تھے کہ ہم سے سیکھ کے کہیں اس کُفر میں مبتلا نہ ہو جانا۔ اور حضرت شیخنا الانور (کشمیری رحمہ اللہ) کے حوالے سے غالباً وہاں بات ذکر کی تھی کہ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ ہاروت ماروت دو فرشتے اللہ نے جو اُتارے تھے، یہ جادو سکھانے کے لئے نہیں۔[1] کیونکہ جادو کے اندر تو کُفریہ کلمات استعمال ہوتے تھے، شرکیہ کلمات استعمال ہوتے تھے، اَرواحِ خبیثہ کے ساتھ تعلق پیدا کر کے جادوگر کرشمے دکھاتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے دو فرشتے اُتارے ہاروت اور ماروت جو اُن کو صحیح تعویذ گنڈا سکھاتے تھے، کہ اللہ کے نام کو یوں پڑھا جائے تو یہ اثرات ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی کلام کے فلاں ٹکڑے کو پڑھا جائے تو یہ اثرات ظاہر ہوتے ہیں، جس طرح سے انبیاء علیہم السلام بھی دَم کرتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں بھی دَم کرنے کا سلسلہ تھا، کہ یہ پڑھ کے دَم کر دیا، یہ پڑھ کے دَم کر دیا، یعنی جائز الفاظ کے ساتھ، تو جادو کے مقابلے میں جائز الفاظ کے ساتھ تعویذ گنڈا سکھانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرشتے بھیجے تھے کہ وہ استعمال نہ کرو، اگر تم نے کرنا ہی

---

(۱) فیض الباری ج۶ ص۶۵، باب السحر. ومن ظن ان الملکین هاروت وماروت انزل علیهما السحر، فقد توهم من القرآن بذکر ما أنزل إلیهما السحر، وإلا فلا لفظ فی القرآن یدل علیه والذی اخبر به انه کان امرا انزل علیهم بعمل عمل السحر فی التفریق بین الزوجین.

ہے تو یہ استعمال کرو، لیکن اس میں بھی یہ تاکید کر دی کہ ان الفاظ کو، یا ان آیات کو، اللہ کی کلام کو غلط مقاصد کے تحت استعمال نہ کرنا، ورنہ تم برباد ہو جاؤ گے۔ کیونکہ یہی آیات جس طرح سے ہمارے تعویذ گنڈا کرنے والے استعمال کرتے ہیں، صحیح مقصد کے لئے بھی استعمال کی جا سکتی ہیں، مثال کے طور پر آیات حُب ہیں، اگر خاوند بیوی کے درمیان محبت پیدا کرنے کے لئے استعمال کی جائیں تو جائز مقصد ہے، اور یوں بھی ان کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ اولاد نافرمان ہے، والدین کی فرماں بردار نہیں ہے تو اولاد کو والدین کے تابع کر دیا جائے ان آیات کے ذریعے سے، تو یہ بھی ایک صحیح مقصد ہے، ان کو اچھے مقصد کے لیے استعمال کیا جائے تو اچھا ہے، اور اگر یہی آیاتِ حُب کوئی عشق بازی کے لئے، ناجائز تعلقات حاصل کرنے کے لئے استعمال کرنا شروع کر دے، تو یہی کفر کا ذریعہ بن جائیں گی، اس لئے انہیں کہا تھا کہ ہم تمہیں اللہ کے نام کی تاثیرات سکھاتے تو ہیں کہ یہ نام یوں پڑھو تو یہ اثر ظاہر ہوگا، یہ آیت یوں پڑھوں تو یہ اثر ظاہر ہوگا، لیکن یاد رکھو! کہ ہم سے سیکھ کے کافر نہ ہو جانا کہ تم وہی جادو والے فوائد اس سے حاصل کرنا شروع کر دو، تو ہوسکتا ہے کہ آصف بن برخیا اسی قسم کے عملیات کا علم جانتا ہو، ''اسمِ اعظم'' جانتا ہو، کہ اللہ کا نام فلاں طریقے سے لیا جائے تو اس کے یہ آثار ظاہر ہوتے ہیں، فلاں آیت کو پڑھا جائے تو اس کے یہ آثار ظاہر ہوتے ہیں، تو اس قسم کا کوئی وظیفہ پڑھ کے جیسے کہیں سے کسی انسان کو اٹھوا لیا جائے اور وہ غیبی طاقت کے تحت اس نام کی برکت سے اُٹھ کر آ جائے، اسی طرح سے یہ عمل کوئی ایسا تھا کہ جس کے پڑھنے کے ساتھ آنکھ جھپکتے ہی وہ تخت سامنے آ گیا، تو عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ سے یہ بھی مراد لیا جا سکتا ہے۔ یہ عملیات انبیاء ﷺ کی اُمت کو فرشتوں کی وساطت سے جادو کے مقابلے میں جائز طریقے سے سکھائے گئے تھے، تا کہ اس قسم کے فوائد یہ جائز طریقے سے حاصل کریں، لیکن ناجائز مقصد کے لئے ان کو استعمال نہ کریں۔ اس مسئلے کی تفصیل آپ کے سامنے اُن آیات میں ذکر کی گئی تھی، جو سورۂ بقرہ میں ہیں جن میں جادو کا ذکر آیا تھا اور سلیمان علیہ السلام کے زمانے کا ذکر ہے، وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ (سورۂ بقرہ: ۱۰۲)۔ تو ایسا بھی یہاں ہوسکتا ہے۔

بہرحال وہ تخت فوراً ایک آن میں پہنچ گیا، چاہے حضرت سلیمان علیہ السلام کے معجزے سے، چاہے آپ کے کسی صحابی کی کرامت سے، یا اس تصرف سے جو عملیات کے ذریعے سے ہوتا ہے، تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب وہ تخت اپنے سامنے پڑا ہوا دیکھا، تو پھر وہی اللہ کا شکر کیا، جیسا کہ ان کی عادت بار بار آپ کے سامنے ذکر کی جا رہی ہے کہ جب بھی کوئی نعمت آتی ہے تو اللہ کے شکر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، فخر نہیں کرتے تھے، یہ آلِ داؤد کی خاصیت تھی کہ ہر معاملے میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔

ملکۂ سبا کی عقل کا امتحان

اب ادھر وہ بھی پہنچنے والے ہو گئے، تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے چاہا کہ وہ یہ معجزہ بھی دیکھ لیں گے کہ ان کا تخت جو انتی حفاظت میں تھا وہ یہاں پہنچ گیا، اور ان کے آنے سے پہلے پہنچ گیا، اور اس کی عقل کا امتحان کرنے کے لئے فرمایا کہ اس میں کچھ تغیر کر دو، تغیر کا مطلب یہ ہے کہ یہ موتی یہاں سے اُکھیڑو، یہاں لگا دو۔ فلاں چیز کو یوں کر دو، تھوڑا بہت تغیر کر دو، تا کہ ہم دیکھیں کہ وہ

سمجھدار ہے یا نہیں، وہ یہ بات سمجھتی ہے کہ نہیں کہ یہ تخت میرا ہے، اس سے اس کی عقل کا اندازہ ہو جائے گا، تا کہ آگے پھر معاملہ اس کی عقل کے مطابق کیا جائے، اس مقصد کے لئے فرمایا: نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا: اس کے عرش کو کچھ اوپر کرو، کچھ بدل دو، چنانچہ اس میں بھی تبدیلی کر دی گئی، اتنے میں ملکۂ سبا اپنے ارکین کے ساتھ پہنچ گئی، جب وہ پہنچی تو اس نے باقی شان و شوکت دیکھی، اور اپنا وہ تخت پڑا ہوا بھی دیکھا، تو اس سے پوچھا گیا کہ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ تیرا تخت ایسا ہی ہے؟ وہ تھی سمجھدار، اس نے جواب دیا كَاَنَّهٗ هُوَ یعنی بعینہٖ تو یہ وہ معلوم نہیں ہوتا، گویا کہ وہی ہے، یعنی کچھ تغیر معلوم ہوتا ہے، باقی بالکل وہی ہے، تو اس کا جواب بالکل موقع کے مطابق تھا، جس سے معلوم ہو گیا کہ وہ سمجھدار تھی، تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے پھر اس کو کچھ ہدایت دی، وہ کہنے لگی کہ اب اس قسم کے تصرفات ہمارے سامنے ظاہر کرنے کی کیا ضرورت ہے، ہم تو آپ کے پاس آنے سے پہلے ہی سب کچھ سمجھ چکے تھے، ہمیں اللہ نے ہدایت دے دی ہے۔ تو آگے پھر انہوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے اسلام کا اظہار کیا، اور مسلمان ہو گئیں اور فرماں بردار ہو گئیں۔

ملکۂ سبا کی ذہنی شکست

لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان کو اور شان و شوکت دکھلانے کے لئے لائے تا کہ ان کو اپنے مال و دولت پر ناز نہ ہو، ایک یہ کام بھی کیا کہ ان کے آنے سے پہلے ایک محل بنوایا شیش محل، اور اس کا فرش شیشے کا لگوایا، اور اس فرش کے نیچے پانی بھروایا، جس طرح سے روایات میں ہے، اور اس میں مچھلیاں چھوڑ دیں، اور شیشہ اتنا شفاف تھا کہ جس وقت انسان آئے تو اس کو اندر پانی نظر آتا تھا، شیشے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا، تو جب وہ آئے، تو جیسے مہمان خانے میں معزز مہمانوں کو اُتارا جاتا ہے، تو انہیں کہا گیا کہ اس محل میں چلو، جب وہ ملکہ ادھر جانے لگی، تو وہ سمجھی کہ شاید راستے میں پانی ہے تو اس نے اپنے کپڑے اُوپر کو سمیٹے، جیسے پانی میں داخل ہونے کے لئے کوئی سمیٹا کرتا ہے، تو فوراً اس کو اطلاع دی گئی کہ نہیں، یہ پانی نہیں، یہ تو شیشہ ہے جس کو آپ نے پانی سمجھ لیا، اب اس قسم کے معاملات کے بعد آپ اندازہ کریں کہ وہ کتنی ذہنی شکست کھا گئی سلیمان علیہ السلام کے سامنے، کہ میں کس چیز پہ ناز کرتی ہوں، ان کے ہاں تو اس قسم کا ساز و سامان ہے، جس کو سمجھنے سے میں قاصر ہوں، بہرحال وہ یوں تابع ہو گئی اور آگے اس نے فرماں برداری کا اظہار کر دیا۔

واقعے کا تتمہ

پھر آگے روایات میں آتا ہے کہ اس ملکہ کو واپس کر دیا گیا تھا، اور یہ اسی طرح سے جا کے اپنی قوم کی بادشاہ بنی، لیکن مطیع حضرت سلیمان علیہ السلام کی رہی۔ اور اسرائیلی روایات کے اندر ذکر کیا گیا جن کی سند بھی کوئی ایسی قوی نہیں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کے ساتھ نکاح کر لیا تھا، بہرحال یہ اسرائیلی روایات ہیں، صحیح احادیث کے اندر اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

مقصدِ واقعہ

واقعہ یہاں جا کے ختم ہوا، اور اس میں ذکر یہی کرنا مقصود ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ نے کیسی شان و شوکت دی تھی

لیکن اس کے باوجود وہ شکر گزار تھے، وہ فرعون کی طرح نہیں تھے کہ وہ صرف مصر کی عارضی سی حکومت لے کر نافرمان اور سرکش ہو گیا تھا، جس کا ذکر آپ کے سامنے پچھلے رکوع میں آیا ہے۔

عورت کی سربراہی کی شرعی حیثیت

باقی رہی عورت کی بادشاہت، پہلے وہ بادشاہ تھی تو یہ مشرکوں کا فعل ہے، اور اگر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کو برقرار رکھا ہو، تو یہ شریعتِ اسرائیلی ہے، ہماری شریعت کا مسئلہ یہی ہے کہ اس قسم کے عہدے کے اوپر عورت کو متعین نہیں کیا جاسکتا، عورت کو بادشاہ بنانا، یا اسی طرح سے صدرِ مملکت بنانا ٹھیک نہیں ہے، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جب یہ ''خسرو پرویز'' ایران کا بادشاہ مرا ہے، تو ایران والوں نے کسریٰ کی بیٹی کو بادشاہ بنالیا تھا، جب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا: ''لَنْ يُّفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا اَمْرَهُمْ اِمْرَاَةً''(۱) وہ قوم کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتی جو اپنا معاملہ عورت کے سپرد کردے، اس لئے ہماری شریعت میں خلافتِ کبریٰ پر عورت کو متعین نہیں کیا جاسکتا، چھوٹے چھوٹے عہدوں پر عورت آسکتی ہے، ''امامت کبریٰ'' جسے کہتے ہیں کہ قوم ساری اس کے تابع ہوجائے، اور اس کو اپنے اُوپر حاکم اعلیٰ بنالیا جائے، ایسا عہدہ عورت کے سپرد نہیں کیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے حضرات نے جس وقت یہ ''فاطمہ جناح'' اُٹھی تھی ایوب کے مقابلے میں، تو ہمارے حضرات نے فاطمہ جناح کی تائید نہیں کی تھی، اس وقت یہی نقطہ زیرِ بحث تھا کہ حکومت کی سربراہی کے لئے عورت کو متعین کرنا یہ شرعی نقطۂ نظر سے ٹھیک نہیں ہے۔

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

یہ ہے واقعہ، ترجمہ دیکھئے...... قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً: وہ کہنے لگی کہ بادشاہ جس وقت کسی بستی میں داخل ہوا کرتے ہیں یعنی غالبانہ، فاتحانہ، یعنی جنگ کے نتیجے میں، یہ تو آج بھی دستور ہے، جب ایک قوم لڑکر دوسری کے اوپر فتح پاتی ہے تو پھر ان کے علاقوں کو بہت اُجاڑتی ہے۔ جب بادشاہ داخل ہوتے ہیں کسی شہر میں (یہاں فاتحانہ داخل ہونا مراد ہے) اَفْسَدُوْهَا: تو اس بستی کو فاسد کردیتے ہیں۔ وَجَعَلُوْا اَعِزَّةَ اَهْلِهَا اَذِلَّةً: اور کردیتے ہیں اس بستی کے رہنے والوں میں سے عزت والوں کو ذلیل۔ تو قاعدہ ہوتا ہے کہ جو برسرِ حکومت ہوتے ہیں پھر سب سے زیادہ سختی انہی پہ ہوا کرتی ہے، اس بستی کے عزت والوں کو ذلیل کردیتے ہیں، بادشاہوں کی یہ عادت ہے۔ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ: اور ایسے ہی یہ کریں گے...... حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ کے واقعات میں لکھا ہے کہ ایک شخص شاہ صاحب کے پاس آیا، کہنے لگا: شاہ صاحب! میں نے خواب دیکھا ہے (حضرت شاہ صاحب بہت بڑے مُعَبِّر تھے، تعبیرِ رُؤیا میں ان کو بڑا ملکہ تھا) کہتا ہے، میں نے دیکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر تشریف لائے، (اور بہت شاہانہ ٹھاٹھ کے ساتھ، آپ ایسی حالت میں تشریف لائے جس طرح کوئی بادشاہ ہوتا ہے)، تو شاہ صاحب نے خواب سنا، اور سنتے ہی کہا کہ جلدی جلدی جاؤ، اپنے اس مکان کو خالی کردو، اپنا سارا سامان نکال لو، وہ بھاگا ہوا گیا، گھر سے سارا سامان نکالا، نکالنے ہی تھا کہ مکان گر گیا۔ تو شاہ صاحب سے کسی نے پوچھا کہ آپ یہ بات کیسے سمجھ گئے؟ وہ کہنے لگے: جب اس

---

(۱) بخاری ج ۲ ص ۶۳۷ باب کتاب النبی الی کسریٰ۔ مشکوٰۃ ۳۲۱/۲، کتاب الامارۃ فصل اول کا آخر۔

نے میرے سامنے خواب بیان کیا تھا تو فوراً میرے دِل پہ یہ آیت وارد ہوئی: اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا، یہ آیت جو دِل میں آئی، تو معلوم ہوا کہ یہ اس مکان کے فاسد ہونے کی طرف اشارہ ہے، تو خواب کی تعبیر یہیں سے اخذ کرلی کہ حضور ﷺ کو (بادشاہوں کی طرح آتے ہوئے) جو دیکھا، تو کہتے ہیں کہ میرے دل میں فوراً یہ بات آئی، اور وہی بات نکلی۔[1] جَعَلُوْۤا اَعِزَّةَ اَهْلِهَاۤ اَذِلَّةً: اس بستی والوں میں سے عزیز لوگوں کو وہ ذلیل کردیتے ہیں، یعنی جو بڑے طبقے کے لوگ ہوتے ہیں آنے والی حکومت پھر ان کو ہی سب سے زیادہ دباتی ہے، تاکہ یہ بغاوت نہ کرسکیں، دوبارہ سر نہ اُٹھا سکیں۔ وَاِنِّيْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ: اور میں بھیجنے والی ہوں ان کی طرف ایک ہدیہ، فَنٰظِرَةٌۢ: پھر میں دیکھنے والی ہوں، بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ: کہ بھیجے ہوئے لوگ کس چیز کو لے کر لوٹتے ہیں؟ یعنی یہ وہاں سے کیا حالات لاتے ہیں؟ کیا جواب لاتے ہیں؟ جس سے اس بادشاہ کے مزاج کا پتا بھی چل جائے گا کہ سلیمان علیہ السلام کس مزاج کے ہیں؟ دُنیادار ہیں، کیا ہیں؟ اور وہاں کی شان وشوکت اور ان کے حالات کا بھی پتا چل جائے گا۔

فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ: جس وقت اس کا بھیجا ہوا سلیمان علیہ السلام کے پاس آیا، یعنی اس کے ''مرسلون'' آئے، جَآءَ کی ضمیر مذکور کی تاویل سے مفرد کی لوٹ گئی۔ اس کا وفد جب سلیمان علیہ السلام کے پاس آیا۔ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ: تو سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ کیا تم مجھے مدد دیتے ہو مال کے ساتھ؟ جو کچھ مجھے اللہ نے دے رکھا ہے بہتر ہے اس سے جو اللہ نے تمہیں دیا ہے، جو تمہارے پاس ہے اس کے مقابلے میں جو کچھ اللہ نے مجھے دیا ہے وہ بہتر ہے، مجھے تمہارے مال کی ضرورت نہیں، ہم تمہارے ان ہدیوں پہ خوش نہیں ہوتے بلکہ تم ہی اپنے ہدیہ کے ساتھ خوش ہوتے ہو، یہاں فرح سے فرحِ بطر مراد ہے، ایک فرح ہوتی ہے شکر کے طور پر، خوش ہونا اللہ کا فضل سمجھ کے، اور ایک فرح ہوتی ہے اِترانا اور اَکڑنا، جیسا کہ سورۂ قصص (آیت ۷۶) میں قارون کے قصے میں آئے گا: لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ: اس مال ودولت کے اُوپر اَکڑنہ، اِترانہ، اس اِترانے کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا۔ تو اپنے ہدیے پر تم ہی فخر کرتے ہو، تم ہی اِتراتے ہو، تم اس کو بہت اچھا سمجھتے ہو، بڑا قیمتی سمجھتے ہو، مجھے تو اس کی کوئی ضرورت نہیں، یوں کر کے اس کو ٹھکرا دیا۔ اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ: جو ان کے وفد کا لیڈر تھا، یہ اس کو خطاب ہے۔ لوٹ جا ان کی طرف، فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ: البتہ ضرور لے کے آئیں گے ہم ان کے پاس ایسے لشکر، لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا: قِبَل مقابلہ کے معنی میں ہے۔ نہیں ہوگا ان کے لیے مقابلہ لشکروں کا، وہ ان لشکروں کا مقابلہ نہیں کرسکیں گے، سامنا نہیں کرسکیں گے، وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَاۤ اَذِلَّةً: اور البتہ ضرور نکال دیں گے ہم انہیں اس شہر سے ذلیل کر کے۔ اَذِلَّةً: ذلیل کی جمع ہے۔ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ: اس حال میں کہ وہ صاغر ہوں گے، صاغر بھی ذلیل کو کہتے ہیں، یہاں یہ دو لفظ آگئے، جیسے ہم بھی دو لفظ بول دیا کرتے ہیں کہ ذلیل ورُسوا کر کے نکال دیں گے۔ تو یہ بھی اسی طرح سے ہے، صَغار ذِلّت کو کہتے ہیں۔ فرق یہاں یوں ہوجائے گا، کہ ایک تو ان کی حکومت ختم ہوجائے گی، ہمارے تابع ہوجائیں گے، یہ تو ان کا ذلیل ہونا ہے۔ اور آگے رُسوا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اپنے دلوں میں بھی کوئی حوصلہ نہیں رہے گا، اپنی نظر میں بھی وہ ذلیل ہوجائیں گے.... دیکھو! یہاں بھی دو درجے ہوا کرتے ہیں، ایک شخص دوسرے کو دبالیتا ہے، لیکن دبنے والے کا حوصلہ ختم نہیں ہوا، اس میں یہ توقع ہوتی ہے کہ پھر دوبارہ سر اُٹھائے گا، اور مقابلہ کرلے گا۔ اور ایک ہے کہ ایسے طور پر شکست دی کہ دوسرے کا حوصلہ ہی ختم ہوگیا، اب اس میں سکت ہی نہیں

---

(۱) دیکھئے ارواح ثلاثہ ص ۳۳، حکایت نمبر ۲۲۔

کہ وہ اٹھ کر آنکھ لڑا سکے۔ تو یہ دو لفظ بولنے کا مطلب یہ ہے کہ اس مقابلے میں آ کے وہ اتنے پس جائیں گے، کہ وہ ہم سے دوبارہ آنکھ ملانے کی اور لڑنے کی جرأت نہیں کریں گے۔ ہم ان کو وہاں سے نکال دیں گے اس حال میں کہ وہ ذلیل ہوں گے اور انتہا درجے کے رُسوا ہوں گے، ان کا حوصلہ ٹوٹ جائے گا، اپنی نظروں میں بھی وہ رُسوا ہو جائیں گے، ان میں کسی قسم کا حوصلہ باقی نہیں رہے گا، یہ دو درجے اس طرح سے نکل آئیں گے۔ ترجمہ آپ یوں کرلیں گے ''نکال دیں گے ہم انہیں اس شہر سے اس حال میں کہ وہ ذلیل ہوں گے اور رُسوا ہوں گے، رُسوا ہونے والے ہوں گے، خوار ہونے والے ہوں گے۔'' قَالَ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَؤُا اَیُّكُمْ یَاْتِیْنِیْ بِعَرْشِهَا: درمیان میں اس واقعے کو حذف کر دیا گیا کہ پھر یہ وفد واپس گیا، اس نے جا کے حالات سنائے، حالات سننے کے بعد پھر ملکہ نے ارادہ کرلیا کہ میں جا کے اطاعت کا اظہار کرآؤں اور اس کی ماتحت ہو جاؤں۔ تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے درباریوں سے کہا (ملأ سے یہاں درباری مراد ہیں)، کہ اے درباریو! تم میں سے کون لے آئے گا میرے پاس اس کا عرش قبل اس کے کہ آ جائیں وہ میرے پاس فرماں بردار ہو کے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ فرماں بردار ہو کے تو آ ہی رہے ہیں، ان کے آنے سے پہلے پہلے اس کا عرش کون لے آئے گا؟ قَالَ عِفْرِیْتٌ مِّنَ الْجِنِّ: جنوں میں سے ایک بہت قوی ہیکل بڑے جن نے کہا: اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ: میں لے آتا ہوں آپ کے پاس اس عرش کو قبل اس کے آپ اپنی اس جگہ سے اٹھیں، یعنی دربار کے برخاست ہونے سے پہلے پہلے میں اس تخت کو لے آؤں گا، جس وقت معمول ہے آپ کے اٹھنے کا اس اٹھنے سے پہلے پہلے میں لے آؤں گا۔ وَاِنِّیْ عَلَیْهِ لَقَوِیٌّ اَمِیْنٌ: اور میں اس تخت کے اوپر قوت رکھنے والا بھی ہوں، چاہے وہ بہت بڑا ہے لیکن میں قوت رکھتا ہوں، اٹھالاؤں گا، اور امانت دار ہوں، اس میں کوئی کسی قسم کی خیانت نہیں کروں گا۔ قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ: کہا اس شخص نے جس کے پاس کتاب کا علم تھا۔ اس کی تفصیل میں نے آپ کے سامنے کردی کہ خود سلیمان علیہ السلام مراد ہیں یا ان کا کوئی صحابی مراد ہے یا عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ: کتاب سے توراۃ مراد ہے کیونکہ اس وقت انبیاء علیہم السلام میں توراۃ ہی معمول تھی، علم سے مراد ہے علم عملیات، تصرفات کا علم کہ فلاں لفظ میں یہ تاثیر ہے، فلاں آیت میں یہ تاثیر ہے، یوں پڑھا جائے تو یہ ہوتا ہے، یہ بھی اس سے مراد ہو سکتا ہے، مطلب یہ ہے کہ مسلمان تھا، کتاب کا علم اس کو حاصل تھا، کہنے لگا کہ میں لاتا ہوں اس تخت کو تیرے پاس۔ اگر سلیمان مراد ہوں تو اٰتِیْكَ میں خطاب اس عفریت من الجن کو ہو جائے گا کہ تُو اتنی دیر کہتا ہے، میں تیری آنکھ جھپکنے سے پہلے پہلے لا دیتا ہوں، اس میں گویا کہ جنوں کا عجز ظاہر کرنا مقصود ہے۔ اور اگر یہ آصف بن برخیا صحابی ہے تو اٰتِیْكَ میں پھر خطاب سلیمان علیہ السلام کو ہے، میں لے آؤں گا اس کو تیرے پاس قبل اس کے تیری طرف تیری نگاہ لوٹے، یَّرْتَدَّ اِلَیْكَ طَرْفُكَ: طرف نگاہ کو کہتے ہیں۔ تیری طرف تیری نگاہ کے لوٹنے سے قبل۔ ارتدادِ طرف سے آنکھ جھپکنا مراد ہوتا ہے۔ یہ دیکھو! ہماری بینائی پھیلی ہوتی ہے، جب ہم آنکھ جھپکاتے ہیں تو گویا کہ وہ ہماری نظر ہماری طرف لوٹ آتی ہے، یہ حاصل ترجمہ ہے، آنکھ جھپکنے سے قبل میں اس کو تیرے پاس لے آؤں گا۔ چنانچہ وہ عرش پہنچ گیا۔ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ: جب دیکھا اس کو سلیمان علیہ السلام نے اپنے سامنے قرار پکڑے ہوئے، قَالَ: تو فوراً کہا، هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ: یہ میرے رَبّ کے فضل سے ہے۔ جیسے ذوالقرنین نے جب دیوار کو مکمل دیکھا تھا، اتنی بڑی عظیم الشان دیوار بن گئی تھی، تو کہا تھا: هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّیْ (سورۂ کہف:۹۸) تو یہ شکر گزار لوگوں کا کام ہوتا ہے، کہ جب کوئی کام ہو جائے تو وہ اس کے بعد اللہ کا شکر ادا

کرتے ہیں کہ اللہ کی رحمت سے ہوگیا، اللہ کے فضل سے ہوگیا۔ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ: یہ بھی میرے رَب کا فضل ہے، تا کہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں۔ اور جو کوئی شکر کرے گا فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ: تو وہ شکر گزار ہوگا اپنے نفع کے لئے۔ وَمَنْ كَفَرَ: اور جو کوئی ناشکری کرے گا فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ: میرا رَبّ تو بے نیاز ہے، کرم والا ہے۔ بے نیاز ہے، مکرم ہے۔ اس کو کیا ضرورت ہے کسی کی؟ ناشکری کرنے والے کا اپنا نقصان ہوگا۔ قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ اس کو اجنبی بنادو، اوپرا بنادو ملکہ کے لیے اس کے عرش کو، ہم دیکھیں کہ وہ سیدھا راہ پاتی ہے یا ان لوگوں میں سے ہے جو سیدھا راہ نہیں پاتے، یعنی وہ اس کے پہچاننے کا سیدھا راہ پائے گی یا نہیں پائے گی، اس سے اس کی عقل کا اندازہ ہوجائے گا۔ کیا وہ ہدایت پاتی اس کے پہچاننے کی طرف، اس کو سیدھا راہ ملتا ہے، یا ان لوگوں میں سے جو ایسی باتوں کو نہیں سمجھتے، تو عقل کا اندازہ اس طرح سے ہوجائے گا۔ فَلَمَّا جَآءَتْ: جب وہ آگئی، قِيْلَ: اس سے پوچھا گیا، اَهٰكَذَا عَرْشُكِ: تیرا عرش ایسا ہی ہے؟ قَالَتْ: اس نے کہا كَاَنَّهٗ هُوَ: گویا کہ یہ وہی ہے، یعنی پوری طرح سے تو نہیں، کچھ تبدیلی تو معلوم ہوتی ہے لیکن لگتا وہی ہے، تو جتنا سا تغیر آیا تھا اتنا سا اس نے كَاَنَّهٗ هُوَ میں ظاہر کردیا۔ وَاُوْتِيْنَا الْعِلْمَ اور ہم علم دے دیے گئے یعنی آپ کی شان و شوکت کا اور اس بات کا علم دے دیے گئے کہ آپ اللہ کے مقبول بندے ہیں، آپ دنیادار بادشاہوں میں سے نہیں ہیں، ہم علم دے دیے گئے اس واقعہ کے پیش آنے سے پہلے ہی، اور ہم فرماں بردار ہیں۔ وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ: اور روکا اس عورت کو اس چیز نے جس کو پُوجتی تھی وہ اللہ کے علاوہ، بے شک وہ کافر لوگوں میں سے تھی۔ کیا مطلب؟ کہ سمجھ دار ہونے کے باوجود اس وقت تک جو وہ ہدایت سے رکی رہی، تو اصل بات یہ تھی کہ اس کو شرک کی عادت پڑی ہوئی تھی، خاندانی طور پر وہ کافر لوگوں میں سے تھی، اور جس ماحول میں لوگ آنکھیں کھولا کرتے ہیں تو کم ہی ہوتے ہیں جو اپنے ماحول کے خلاف سوچتے ہیں، جیسا ماحول ہوتا ہے اسی کے مطابق ہی وہ ہوجایا کرتے ہیں۔ جن چیزوں کو وہ اللہ کے علاوہ پُوجتی تھی انہوں نے اس عورت کو روکے رکھا اس وقت تک اللہ کی عبادت کرنے سے، کیونکہ یہ کافر لوگوں میں سے تھی، یعنی ماحول کا اثر تھا، ورنہ وہ سمجھ دار تھی، جب اس کے سامنے حقیقت آئی تو وہ سمجھ گئی۔ یہ جو میں نے ترجمہ کیا ہے تو مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ کو ''صَدَّ'' کا فاعل بنایا ہے۔ جن چیزوں کو وہ پُوجتی تھی اللہ کے علاوہ انہوں نے اس عورت کو روکے رکھا صحیح طریقہ اختیار کرنے سے، توحید اختیار کرنے سے، بے شک وہ کافر لوگوں میں سے تھی، اور کافر لوگوں میں سے ہونے کی وجہ سے وہ اس ماحول کے خلاف سوچ ہی نہیں سکتی تھی، نہ وہ ماحول کے خلاف چل سکتی تھی، کیونکہ یکدم ماحول سے کٹ جانا یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ تو مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ یہ ''صَدَّ'' کا فاعل ہے۔ اور ایسا بھی ترجمہ ہوسکتا ہے کہ ''صَدَّ'' کی ضمیر حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف لوٹا لیجیے، سلیمان علیہ السلام نے روک دیا ان چیزوں سے جن کی وہ پُوجا کرتی تھی اللہ کے علاوہ (مظہری)، بے شک وہ کافر لوگوں میں سے تھی، یعنی کافر لوگوں میں سے تھی، جن چیزوں کی پُوجا کرتی تھی، آئندہ سلیمان علیہ السلام نے اس کو روک دیا، کہ اب ان کی پُوجا نہیں کرنی، سورج یا بُت جو کچھ بھی تھے۔ قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ: کہا گیا اس ملکہ کو کہ داخل ہوجا تو محل میں، ''صرح'' محل کو کہتے ہیں، یعنی جس طرح سے مہمان خانے میں کسی معزز مہمان کو اُتارا جاتا ہے، تو یہ محل حضرت سلیمان علیہ السلام نے بنوایا تھا۔ فَلَمَّا رَاَتْهُ: جس وقت اس نے اس محل کو دیکھا حَسِبَتْهُ لُجَّةً: تو اس نے اس کو گہرا پانی سمجھا۔ لُجَّة: پانی کے جمع ہونے کی جگہ، گہرے پانی کو کہتے

ہیں۔ یہ لفظ پیچھے سورۂ نور میں آپ کے سامنے آیا تھا فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ (سورۂ نور: ۴۰) بحر لُجّی: گہرے پانی والا سمندر۔ تولجہ: گہرا پانی۔ اس نے سمجھا اس کو گہرا پانی۔ وَكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا: اور اس نے اپنی پنڈلیاں کھولیں، یعنی جس طرح سے پانی میں داخل ہوتے وقت انسان کپڑا اُوپر اُٹھاتا ہے، تو اس نے وہ کپڑا اتنا اُٹھایا کہ اس کی پنڈلیاں ننگی ہوگئیں۔ قَالَ: سلیمان علیہ السلام نے کہا اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ: یہ تو محل ہے جس کو جڑا گیا ہے شیشوں سے۔ قواریر قارورہ کی جمع ہے، قارورہ شیشے کو کہتے ہیں۔ یہ قواریر کا لفظ سورۂ دہر میں آئے گا: قَوَارِيْرَاۡ۟ قَوَارِيْرَا مِنْ فِضَّةٍ۔ قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ: اس وقت پھر یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی ظاہری شان وشوکت، آپ کا معجزہ، آپ کے علم وحکمت کو دیکھنے کے بعد، اب اس نے ایمان کا اظہار کیا، کہنے لگی کہ اے میرے رَبّ! بے شک میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا، وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ: میں فرماں بردار ہوگئی سلیمان علیہ السلام کے ساتھ مل کر، مَعَ سُلَيْمٰنَ کا معنی ہے سلیمان علیہ السلام کی رفاقت اختیار کر کے، میں مسلمان ہوگئی سلیمان کے ساتھ اللہ کے لئے جو رَبّ العالمین ہے، یہ اس کے اسلام ظاہر کرنے کا کلمہ ہے کہ میں معیت اختیار کرتی ہوں سلیمان علیہ السلام کی یعنی مسلک میں اور مذہب میں، میں سلیمان علیہ السلام کے ساتھ شامل ہوتی ہوں۔ سلیمان علیہ السلام کے ساتھ شامل ہوکر، اس کی مصاحب بن کے، میں اللہ رَبّ العالمین کی فرماں بردار ہوگئی۔ یہ اس نے ایمان کا اظہار کر دیا۔

واقعۂ بلقیس کے تاریخی اجزا

آگے پھر بلقیس کا کیا ہوا؟ وہ اسرائیلی روایات میں ہے کہ واپس اس کو یمن میں بھیج دیا، اس کی بادشاہت وہاں اسی طرح سے رہی، یا وہ علاقہ براہِ راست سلیمان علیہ السلام نے اپنی حکومت میں شامل کرلیا اور بلقیس سے نکاح کرلیا، اسلامی صحیح روایات میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ اور ایسے ہی اس کے تخت کا کیا بنا؟ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کو واپس دے دیا تھا یا اپنے پاس رکھا، اس کا بھی کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ یوں تو نہیں کہا جاسکتا کہ اس کے کافر ہونے کے زمانے میں سلیمان علیہ السلام نے چونکہ یہ اُٹھوایا تھا اس لیے یہ مالِ غنیمت میں شامل ہوگیا، مالِ غنیمت کے بارے میں مسئلہ سابق اُمم میں یہی رہا ہے کہ انبیاء علیہم السلام جہاد میں بھی اگر کسی مال کو حاصل کریں تو اس کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ صحیح احادیث میں موجود ہے کہ مالِ غنیمت کو اکٹھا کرلیا جاتا تھا، اور اس کے بعد آسمان سے ایک آگ آتی تھی اور اس کو جلا جاتی تھی، اور یہ جہاد کے مقبول ہونے کی علامت ہوتی تھی۔ مالِ غنیمت کا حلال ہونا سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے، اس لئے جو یہ تخت اُٹھایا تھا تو اس کے ساتھ مالِ غنیمت والا معاملہ نہیں ہوسکتا، اوّل تو یہ جہاد میں حاصل نہیں ہوا، صرف اپنا معجزہ دکھانے کے لئے اُٹھوایا تھا، اگرچہ کافر کا مال تھا اور اس کو اُٹھالینا مباح ہو، لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام اس کو اپنے پاس رکھ کے استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ البتہ یہ صورت ہوگئی ہو کہ بلقیس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو بطور ہدیہ کے ہی دے دیا ہو ایسا ممکن ہے، یا اس معجزے کو دیکھنے کے بعد جب بلقیس مسلمان ہوگئی تو سلیمان علیہ السلام نے وہ تخت بلقیس کو واپس کردیا ہو یہ بھی عین ممکن ہے۔ بہرحال صحیح روایات میں یا تفسیری روایات میں اس تخت کے متعلق کوئی وضاحت نہیں ہے، مالِ غنیمت اس کو قرار نہیں دیا جاسکتا، مالِ غنیمت کی حلت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ فَرِیْقٰنِ

البتہ تحقیق ہم نے ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا، یہ پیغام دے کر کہ عبادت کرو تم اللہ کی، پس اچانک وہ دو گروہ ہو گئے

یَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ یٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّیِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِۚ لَوْلَا

آپس میں جھگڑتے تھے ﴿۴۵﴾ صالح نے کہا: اے میری قوم! کیوں جلدی طلب کرتے ہو تم بری حالت کو اچھی حالت سے پہلے، کیوں نہیں

تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۶﴾ قَالُوا اطَّیَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَؕ قَالَ

تم اللہ سے معافی مانگتے تاکہ تم رحم کئے جاؤ ﴿۴۶﴾ وہ کہنے لگے: ہم بدشگونی لیتے ہیں تیرے اور تیرے ساتھیوں کے ساتھ، صالح نے کہا

طٰٓىِٕرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَكَانَ فِی الْمَدِیْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ

تمہاری بری قسمت اللہ کے پاس ہے، بلکہ تم لوگ آزمائش میں ڈال دیے گئے ہو ﴿۴۷﴾ اور شہر میں نو اشخاص تھے جو

یُّفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ وَلَا یُصْلِحُوْنَ ﴿۴۸﴾ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَیِّتَنَّهٗ

فساد مچاتے تھے علاقے میں، اور اصلاح نہیں کرتے تھے ﴿۴۸﴾ وہ کہنے لگے کہ آپس میں مل کر اللہ کی قسم کھاؤ کہ البتہ ضرور ہم شب خون ماریں گے صالح

وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِیِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا

اور اس کے اہل پر پھر البتہ ضرور ہم کہہ دیں گے اس کے ولی کو کہ ہم اس کے اہل کے ہلاک ہونے کے وقت موجود نہیں تھے اور بے شک ہم

لَصٰدِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ فَانْظُرْ كَیْفَ

البتہ بالکل سچ کہہ رہے ہیں ﴿۴۹﴾ اور انہوں نے خفیہ تدبیر کی اور ہم نے بھی خفیہ تدبیر کی اور ان کو پتا ہی نہیں تھا ﴿۵۰﴾ پس تُو دیکھ ان کے مکر کا

كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۵۱﴾ فَتِلْكَ بُیُوْتُهُمْ خَاوِیَةًۢ

کیا انجام ہوا، بے شک ہم نے نیست و نابود کر دیا ان کو اور ان کی قوم کو سب کو ﴿۵۱﴾ پس یہ ان کے گھر خالی پڑے ہوئے ہیں

بِمَا ظَلَمُوْاؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاَنْجَیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ

بسبب ان کے ظلم کرنے کے، بے شک اس میں البتہ نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو جاننا چاہتے ہیں ﴿۵۲﴾ نجات دی ہم نے ان کو جو ایمان لائے

كَانُوْا یَتَّقُوْنَ ﴿۵۳﴾ وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ

اور وہ تقویٰ اختیار کرتے تھے ﴿۵۳﴾ اور (بھیجا ہم نے) لُوط کو جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم ارتکاب کرتے ہو بے حیائی کا، حالانکہ تم

تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۵۴﴾ اَئِنَّكُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الرِّجَالَ شَهۡوَةً مِّنۡ دُوۡنِ النِّسَآءِ ؕ بَلۡ اَنۡتُمۡ

سمجھ دار ہو﴿۵۴﴾ کیا بے شک تم البتہ آتے ہو مردوں کے پاس از روئے شہوت کے عورتوں کو چھوڑ کر، بلکہ تم

قَوۡمٌ تَجۡهَلُوۡنَ ﴿۵۵﴾ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوۡمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اَخۡرِجُوۡۤا اٰلَ لُوۡطٍ مِّنۡ

جذبات سے مغلوب ہوئے جا رہے ہو﴿۵۵﴾ نہیں تھا اس کی قوم کا جواب مگر یہی کہ انہوں نے کہا: نکال دو لُوط کے متعلقین کو اپنی

قَرۡيَتِكُمۡ ۚ اِنَّهُمۡ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوۡنَ ﴿۵۶﴾ فَاَنۡجَيۡنٰهُ وَاَهۡلَهٗۤ اِلَّا امۡرَاَتَهٗ ۫ قَدَّرۡنٰهَا

بستی سے، یہ لوگ بڑے صاف ستھرے ہیں﴿۵۶﴾ ہم نے نجات دی لُوط کو اور ان کے گھر والوں کو سوائے ان کی بیوی کے، ہم نے مقدر کیا اس کو

مِنَ الۡغٰبِرِيۡنَ ﴿۵۷﴾ وَاَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الۡمُنۡذَرِيۡنَ ﴿۵۸﴾

پیچھے رہ جانے والوں میں سے﴿۵۷﴾ اور ہم نے ان کے اوپر ایک خاص قسم کی بارش برسائی، پس ڈرائے ہوؤں کی بارش بہت بُری تھی﴿۵۸﴾

تفسیر

قومِ ثمود کا واقعہ

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰى ثَمُوۡدَ اَخَاهُمۡ صٰلِحًا: البتہ تحقیق ہم نے ثمود کی طرف اُن کے بھائی صالح کو بھیجا، اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ: یہ پیغام دے کر، اَن تفسیر یہ ہے، اَرسلنا کے اندر قول والا معنی ہے۔ عبادت کرو تم اللہ کی، فَاِذَا هُمۡ فَرِيۡقٰنِ: پس اچانک وہ دو گروہ ہو گئے يَخۡتَصِمُوۡنَ آپس میں جھگڑتے تھے...... پہلے آپ کے سامنے فرعون اور اس کی قوم کا قصہ ذکر کیا گیا، جن کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا گیا تھا، اور پھر حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کی شکر گزاری کے واقعات آئے، اور پچھلے رکوع میں ملکہ سبا کی سلامت روی کا ذکر تھا، اب پارے کے اختتام تک دو واقعات بالاجمال اور ذکر کئے جا رہے ہیں، ایک قوم ثمود کا اور ایک قوم لُوط کا۔ واقعات کی تفصیل چونکہ بار بار گزر چکی، اب اس میں مزید کچھ کہنے سننے کی تو گنجائش نہیں، یہاں جو باتیں نقل کی جا رہی ہیں ان کا حاصل یہی ہے کہ ثمود کی طرف حضرت صالح علیہ السلام کو جو انہی میں سے تھے، اللہ نے پیغمبر بنا کے بھیجا، تو جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کا پیغام سنایا تو وہ قبیلہ دو حصوں میں بٹ گیا، فریقان کے لفظ سے جس طرح سے معلوم ہوتا ہے کہ دو گروہ ہو گئے، ایک گروہ تھا حضرت صالح علیہ السلام پر ایمان لانے والا، اور دوسرا گروہ تھا اپنی اسی جاہلیت کی باتوں پر اَڑنے والا، یہ علیحدہ بات ہے کہ صالح علیہ السلام پر ایمان لانے والے کمزور لوگ تھے، جن کو قرآن نے دوسری جگہ مستضعفین کے ساتھ ذکر کیا،[1] اور مخالفت کرنے والے یہ اپنے وقت کے بڑے لوگ تھے، بہرحال ان میں پھوٹ پڑ گئی، دو گروہ بن گئے جن کا آپس میں جھگڑا ہوتا تھا، جیسا کہ ماننے والے اور نہ

---

(۱) قَالَ الۡمَلَاُ الَّذِيۡنَ اسۡتَكۡبَرُوۡا مِنۡ قَوۡمِهٖ لِلَّذِيۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا لِمَنۡ اٰمَنَ مِنۡهُمۡ اَتَعۡلَمُوۡنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرۡسَلٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ (الاعراف: ۷۵)

ماننے والے جب ایک مجلس میں بیٹھتے ہیں تو آپس میں بحث مباحثہ ہوجایا کرتا ہے، تو قومی سطح پر یہ بحث چل گئی۔ تو حضرت صالح علیہ السلام نے انبیاء علیہم السلام کی عادت کے مطابق ان کو عذاب سے ڈرایا کہ کفر و شرک اختیار نہ کرو۔ تو وہ لوگ آگے سے کہتے تھے کہ جس عذاب سے آپ ہمیں ڈراتے ہیں وہ عذاب ہمارے پاس لے آؤ۔ یہ الفاظ قرآنِ کریم میں گزرے، سورۂ اعراف کے اندر اس کی زیادہ تفصیل آئی تھی وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (سورۂ اعراف: ۷۷) جس طرح سے مشرک اور کافر قومیں اپنے انبیاء علیہم السلام سے کہتی ہیں۔ تو جب انہوں نے اپنے منہ سے عذاب مانگا تو حضرت صالح علیہ السلام نے پھر انہیں سمجھایا، قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ: سیئہ بُری حالت کو کہتے ہیں، یہاں اس سے عذاب مراد ہے، اور حسنہ اچھی حالت کو کہتے ہیں۔ اے میری قوم! کیوں جلدی طلب کرتے ہو تم عذاب کو حسنہ سے پہلے، یعنی حسنہ اختیار کرنے سے پہلے، اچھی حالت اختیار کرنے سے پہلے، یعنی تمہیں چاہیے کہ توبہ اور استغفار کر کے اچھی حالت اختیار کرو، ایمان لاؤ، نیکی اختیار کرو، تم وہ تو اختیار کرتے نہیں ہو، اور اللہ تعالیٰ سے عذاب مانگتے ہو، یہ اچھی بات نہیں ہے۔ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ: کیوں نہیں تم اللہ سے معافی مانگتے تاکہ تم رحم کیے جاؤ، یہی اس حسنہ کی تفصیل ہے یعنی تمہیں حسنہ والی زندگی اختیار کرنی چاہیے کہ اپنے پچھلے گناہوں سے توبہ کرو، استغفار کرو، تاکہ اللہ کی رحمت تم پر آئے، تم سیئہ کیوں مانگتے ہو، بُری حالت اپنے لئے کیوں مانگتے ہو۔

قومِ ثمود کی گستاخی اور صالح علیہ السلام کی طرف سے تفہیم

قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ: اطَّيَّرْنَا یہ اصل میں تھا تَطَيَّرْنَا۔ بعد میں ''تا'' کو ''ط'' کر کے ''ط'' کو ''ط'' میں اِدغام کر دیا: ''اطَّيَّرْنَا'' بن گیا۔ جیسے تَطَهَّرَ سے اِطَّهَّرَ بن جاتا ہے، اصل میں یہ باب تفعّل ہے، اور مادّہ اس کا طَيْر ہے۔ طائر: پرندہ، طار یطیر سے۔ اور جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ لوگ پرندوں کو اُڑا کر شگون لیا کرتے تھے، بعضے پرندے دائیں طرف اُڑ جاتے تو سمجھتے کہ اچھی بات ہے، اور بائیں طرف کو اُڑ جاتے تو سمجھتے کہ بُرا حال سامنے آئے گا، جسے کہتے ہیں فال لینا، شگون لینا، تو پرندوں کے ذریعے سے وہ شگون لیتے تھے، اور تطیر کا لفظ فال لینے، شگون لینے کے معنی میں ہے۔ لیکن ایک تفاؤل کا لفظ آتا ہے حدیث شریف میں، اور ایک تطیر کا۔ تطیر عموماً بدشگونی کے لئے بولا جاتا ہے اور تفاؤل اچھے شگون کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس لئے یہاں ترجمہ کیا گیا ہے کہ ان لوگوں نے کہا ہم تمہیں منحوس سمجھتے ہیں، ہم تم سے بدشگونی لیتے ہیں، یہ بات انہوں نے اس وقت کہی جب حضرت صالح علیہ السلام پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر مختلف مصیبتیں آئیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کے ساتھ مشرک قوموں کو جھنجھوڑا کرتے ہیں تاکہ وہ کچھ نرم ہوجائیں اور اللہ کی طرف متوجہ ہوجائیں، کچھ قحط پڑا، کچھ بارش بند ہوئی، یا قوم میں پہلے کفر و شرک کے وقت میں جو اتفاق تھا، حضرت صالح علیہ السلام کے آنے کے بعد آپس میں کچھ اختلاف ہوا اور پھوٹ پڑی۔ ان (تکلیفوں) سے وہ سمجھنے کی بجائے کہ حق کو قبول کر کے سب متفق ہوجائیں، اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار کریں، تاکہ وقت پہ بارش ہو، نباتات اچھی ہو، اور حالات اچھے ہوجائیں، اس طرح سے سمجھنے سوچنے کی بجائے وہ کہنے لگ گئے کہ جب سے صالح علیہ السلام آئے ہیں، اور انہوں نے ایسی باتیں کرنی شروع کر دی ہیں، تو ہم پر تو ان کی نحوست پڑی ہے، کہ

قوم میں گھر گھر میں فساد ہو گیا، آپس میں اختلاف ہو گیا، بارش نہیں ہوتی، بے برکتی ہو گئی، اس قسم کے حالات کو وہ حضرت صالح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کے سر پر تھوپتے تھے، یعنی سمجھنے کی بجائے وہ ان سے بدشگونی لینے لگ گئے، کہتے ہیں کہ تم منحوس ہو بے برکت ہو، جب سے تم اُٹھے ہو اس وقت سے ساری کی ساری قوم کا حال بگڑ گیا، پہلے لوگ اچھے تھے، یہاں تطیر کا یہ مفہوم ہے۔ اور یہ کسی کی بدبختی کی انتہا ہوا کرتی ہے کہ سمجھنے کی بجائے، سوچنے کی بجائے دوسروں کو الزام دینے لگ جائیں۔ کہنے لگے کہ ہم بدشگونی لیتے ہیں تیرے ساتھ اور تیرے ساتھیوں کے ساتھ، یعنی ہم منحوس سمجھتے ہیں تجھ کو اور تیرے ساتھیوں کو۔ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ: طائر: نصیبہ۔ صالح علیہ السلام نے کہا کہ تمہاری قسمت اللہ کے پاس ہے، یعنی تمہاری نحوست کا سبب جو تمہارا عمل ہے، وہ اللہ کے علم میں ہے، یہاں طائر کا یہ مفہوم ہے یعنی نحوست کا سبب یا تمہارا حصہ، یا تمہاری قسمت، اللہ کے علم میں ہے، کہ یہ جو حالات تمہارے اوپر تنگی کے آ رہے ہیں اس کا سبب تمہارا عمل ہے وہ اللہ کے علم میں ہے، یا جو سبب بھی تمہاری نحوست اور بے برکتی کا ہے وہ اللہ کے پاس ہے، ہمیں تم منحوس نہ ٹھہراؤ، تمہاری قسمت اللہ کے پاس ہے، تمہارا نصیبہ اللہ کے پاس ہے، یا تمہاری نحوست کا سبب اللہ کے علم میں ہے۔ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ: ہماری وجہ سے یہ نحوست تم پہ نہیں آئی بلکہ تم لوگ آزمائش میں ڈال دیے گئے ہو، اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہیں فتنے میں ڈال دیا گیا ہے، اور تمہیں چاہیے کہ اس آزمائش سے فائدہ اٹھاؤ، اپنی سرکشی کو چھوڑ دو، تکبر کو چھوڑ دو، اور اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ یہ اس جھگڑے کا ایک نمونہ ہے، جس قسم کی بحثیں ان کے اندر چلی ہوئی تھیں، یعنی ان نیکوں پر، حضرت صالح علیہ السلام پہ ایمان لانے والوں پر وہ لوگ اس قسم کی آوازیں کستے تھے، اور ان کی طرف سے یہ تفہیم کی جاتی تھی۔

صالح علیہ السلام کے قتل کا منصوبہ اور قوم پر عذاب

وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ: رھط بھی قوم اور قبیلے کے معنی میں ہوتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ ہود میں حضرت شعیب علیہ السلام کے قصے میں آیا تھا کہ لَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ (آیت:۹۱) اگر تیرا قبیلہ نہ ہوتا یعنی تیرے قبیلے کی ہمیں رعایت نہ ہوتی تو ہم تجھے رجم کر دیتے۔ تو یہاں بھی رھط قبیلے کے معنی میں ہے، اور معنی چونکہ یہ جمع ہے، اس لئے تِسْعَةُ کی یہ تمیز آ گیا، ورنہ تو آپ جانتے ہیں کہ تین سے لے کر نو تک عدد کی تمیز جمع مجرور ہوا کرتی ہے، جیسے: ثَلٰثَةُ رِجَالٍ، خَمْسَةُ رِجَالٍ۔ اور اس کے اندر چونکہ جمع والا معنی ہے اس لئے اس کو تِسْعَةُ کی تمیز بنا دیا گیا، اور مراد یہاں یہ ہوگی کہ شہر میں نو قبیلے تھے، عام طور پر مفسرین نے اس کا ترجمہ ''نو اشخاص'' کے ساتھ کیا ہے کہ نو اشخاص تھے، تو اصل یہ ہے کہ یہ نو اشخاص نو قبیلوں کے سردار تھے، نو خاندانوں کے سربراہ تھے۔ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ: جو زمین میں، علاقے میں فساد مچاتے تھے اور اصلاح نہیں کرتے تھے، حالات درست نہیں کرتے تھے، یعنی انتہائی درجے کے شریر اور مفسد قسم کے وہ نو سردار تھے، جن کے ساتھ نو جماعتیں تھیں، اس لیے ان کو رھط کے لفظ کے ساتھ تعبیر کر دیا۔ نو جماعتوں کے سردار ایسے تھے جو انتہائی مفسد اور غیر مصلح، یعنی علاقے میں فساد مچاتے تھے اور علاقے کے حالات کو ٹھیک نہیں کرتے تھے، ہر وقت ان کا مشغلہ شرارت پھیلانا ہوتا تھا، انہوں نے آپس میں بیٹھ کر مشورہ کیا، مشورے کا حاصل یہ تھا کہ یہ روز جو کشاکشی رہتی ہے اس کو ختم کر دیا جائے، حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی جو اللہ تعالیٰ نے بطور علامت کے ظاہر کی تھی اس سے بھی وہ

لوگ تنگ تھے، جیسے پہلے آپ کی خدمت میں ذکر کیا گیا کہ پانی کی ایک دن کی باری اس کی ہوتی تھی، اوراُن کے جانور پانی پہ نہیں جا سکتے تھے، یہ چیز وہ لوگ برداشت نہیں کررہے تھے، پہلے تو انہوں نے مشورہ کر کے ان میں سے ایک زیادہ بدبخت زیادہ جری اٹھا، جواُن میں سب سے بڑا سمجھا جاتا ہوگا، زیادہ قوت اور جوش والا سمجھا جاتا ہوگا، اس نے صالح علیہ السلام کی اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں اوراس کو ہلاک کر دیا، اب کشاکشی انتہا کو پہنچ گئی، اور حضرت صالح علیہ السلام کی طرف سے ان کو سُنا دیا گیا کہ تین دِن کے اندر اندر واب کوئی عذاب آئے گا، ادھر یہ لوگ بھی اشتعال میں تھے، وہ کہنے لگے: تین دِن کے بعد عذاب تو آئے گا جو آئے گا، تین دِن سے پہلے پہلے ان کا خاتمہ کر دو، اُونٹنی کو ہلاک کرنے کے بعد وہ صالح علیہ السلام اوران کے ساتھیوں کے قتل کرنے پہ آمادہ ہو گئے، لیکن قبائلی زندگی میں کسی قبیلے کے ایک فرد کو قتل کر دینا آسان نہیں ہوتا تھا، اس قبیلے کے ساتھ جنگ چھڑ جاتی، مدت دراز تک آپس میں کشاکشی رہا کرتی تھی، قبیلے والے اس بات کو اپنے لئے بہت بے عزتی اور توہین سمجھتے تھے کہ ہمارے شخص کو کوئی دوسرا ہلاک کر دے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ میں جس وقت یہی درسِ توحید شروع کیا تھا، تو باوجود اس بات کے کہ بنو ہاشم آپ کے ساتھ متفق نہیں تھے، اور آپس میں اختلاف تھا، وہ آپ کے ہم عقیدہ نہیں تھے، لیکن اس کے باوجود مشرکینِ مکہ کو آپ پر ہاتھ اُٹھانے کی اس لئے جرأت نہیں ہوتی تھی، کہ اگر ہم نے ان کو قتل کر دیا تو بنو ہاشم قصاص کا مطالبہ کریں گے، اور پھر شہر کے اندر پھر وہی خانہ جنگی ہو جائے گی، قبائلی جنگ کا پھر آغاز ہو جائے گا، اس لئے وہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے سے بچتے تھے، اور آخر کار جو مشورہ ہوا تھا وہ یہی تھا کہ ہر قبیلے کا ایک ایک آدمی شامل کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کیا جائے اور آپ کو قتل کر دیا جائے، کیونکہ پھر بنو ہاشم سارے قبائل کے ساتھ لڑنے کی طاقت نہیں رکھیں گے، زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ دیت لینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ تو سارے اکٹھے ہو کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ آور ہوئے تھے، جس موقع پر اللہ نے آپ کو صحیح سلامت نکالا اور ہجرت کا واقعہ پیش آیا، یہ سیرت کی کتابوں میں آپ پڑھتے رہتے ہیں اور وعظوں میں سنتے رہتے ہیں۔ تو اسی طرح ان نو نے بھی مل کر مشورہ کیا کہ علی الاعلان تو صالح پر ہاتھ اٹھانا مشکل ہے، کیونکہ جو اس کا خاندان ہے وہ قبائلی تعصب کی بنا پر اس کا ساتھ دے گا، اس طرح سے ہم اور زیادہ خانہ جنگی میں مبتلا ہو جائیں گے، تو طریقہ یہ اختیار کرو کہ رات کے وقت خفیہ طور پر حملہ کریں، ان کو بھی اور ان کے گھر والوں کو بھی سب کو قتل کر آئیں، کسی کو پتا نہ چلے، بعد میں جو اس کا ولی قصاص ہوگا، ولی سے یہاں ان کے خاندان کا فرد مراد ہے، یعنی ان کے خاندان کے لوگ جس وقت مطالبہ کریں گے کہ ہمارے قتل کا بدلہ دیا جائے تو ہم سارے کے سارے قسمیں کھا جائیں گے کہ ہمیں تو پتا ہی نہیں کس نے قتل کیا ہے؟ رات کے اندھیرے میں کوئی قتل کر گیا ہوگا، ہم اس طرح سے انکار کر دیں گے، جب آپس میں اتفاق ہو جائے گا، ثبوت کوئی ہوگا نہیں، تو پھر وہ کسی ایک پر الزام قائم کر کے مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ ان نو شریروں نے آپس میں مشورہ کیا کہ رات کے وقت شب خون مارو، اور صالح علیہ السلام اوران کی ساری جماعت کو ختم کر دو، اِدھر یہ تدبیر کررہے تھے، اور اُدھر اللہ تبارک و تعالیٰ نے بھی تدبیر کی حضرت صالح علیہ السلام کو بچانے کی، بالکل بعینہٖ اس قسم کے جملے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر ہجرت کے متعلق بھی اللہ نے بیان فرمائے (سورۂ انفال: ۳۰) کہ وہ بھی مکر وفریب میں مبتلا تھے تدبیر کررہے تھے، اور اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے، ان کی تدبیر ناکام رہ گئی، اللہ کی تدبیر کامیاب ہوئی

کہ اللہ اپنے رسول کو بچاتا ہے اور ان کے ماننے والوں کو بچاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف جب یہودیوں نے سازش کی تھی تو اللہ تعالیٰ نے وہاں بھی اسی قسم کے لفظ استعمال کئے وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ (آل عمران: ۵۴) انہوں نے بھی خفیہ تدبیریں کیں، اور اللہ نے بھی تدبیر کی، اور اللہ بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔ تو یہاں انہوں نے خفیہ تدبیریں حضرت صالح علیہ السلام کے خلاف کیں، تو اللہ تعالیٰ نے بھی تدبیر کی ان کو ہلاک کرنے کی، اور صالح علیہ السلام کو بچانے کی۔ آخر کامیاب تدبیر اللہ کی ہی رہی کہ یہ مشورے کرتے رہ گئے اور اللہ کی طرف سے عذاب آیا، یہ نو بھی اور باقی قوم بھی ساری کی ساری اللہ کے عذاب سے تباہ ہوگئی، حضرت صالح علیہ السلام اور ان کے ماننے والے نجات پا گئے۔

یہی قصہ آگے ذکر کیا گیا ہے: قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ: یہ نو کہنے لگے، جو بظاہر اشخاص تھے لیکن حقیقت میں یہ نو خاندان تھے۔ وہ کہنے لگے کہ آپس میں مل کے اللہ کی قسمیں کھاؤ، تَقَاسَمُوْا: اَمر کا صیغہ ہے (مظہری)۔ لَنُبَيِّتَنَّهٗ: بَيَّتَ: رات کے وقت حملہ کرنا، جس کو شب خون مارنا کہتے ہیں۔ البتہ ضرور ہم شب خون ماریں گے صالح پر اور اس کے اہل پر، ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ پھر البتہ ضرور ہم کہہ دیں گے اس کے ولی قصاص کو، جو اس کا متولی ہوگا، اس کے خاندان کا آدمی۔ البتہ ضرور کہیں گے ہم اس کے ولی کو، مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ: ہم اس کے اہل کے ہلاک ہونے کے وقت موجود نہیں تھے، ہم نے ان کے ہلاک ہونے کو نہیں دیکھا۔ مہلک یہ مصدر میمی ہے۔ صالح علیہ السلام کے اہل کی ہلاکت کے وقت ہم موجود نہیں تھے، یعنی جس وقت پوچھ گوچھ شروع ہوگی، تفتیش شروع ہوگی تو جس طرح سے باقی لوگ کہیں گے کہ ہمیں کوئی پتا نہیں، ہم بھی کہہ دیں گے کہ ہمیں کوئی پتا نہیں، کب یہ واقعہ پیش آیا، کس نے ایسی حرکت کی ہے، ہمیں کوئی پتا نہیں، یعنی تم یہ قسمیں کھاؤ کہ تم نے یوں کرنا ہے، رات کو حملہ کرنا ہے، انہیں قتل کرنا ہے، اور پھر ماننا نہیں، جس وقت کوئی پوچھے گا تو مکر جانا ہے۔ اس بات کے اوپر قسمیں کھا کر وہ آپس میں معاہدہ کر رہے تھے، یہ انہی کا قول ہے کہ آپس میں قسمیں کھاؤ، یعنی آپس میں اتفاق کرو اس بات پر کہ رات کو شب خون ماریں گے، اور حضرت صالح اور ان کے گھر والوں کو قتل کر آئیں گے، بعد میں جس وقت پوچھ گوچھ شروع ہوگی تو کسی نے ماننا نہیں ہے، سب یہی کہیں کہ ہمیں کوئی پتا نہیں، ہم اس کے اہل کے ہلاک ہونے کے وقت موجود نہیں تھے، ہم نے نہیں دیکھا، ہم نے مشاہدہ نہیں کیا، وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ اور بے شک ہم البتہ بالکل سچ کہہ رہے ہیں کہ ہمیں کوئی پتا نہیں، یعنی پروگرام بنا رہے ہیں کہ پوچھ گوچھ ہوگی تو اس وقت یوں کہنا ہے، ماننا بالکل نہیں ہے۔

لفظِ ’’مکر‘‘ کی توضیح

وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا: مکر کہتے ہیں خفیہ تدبیر کو، فی حد ذاتہ یہ اچھی بھی ہو سکتی ہے، بُری بھی ہو سکتی ہے، کسی اچھے مقصد کے لئے کی جائے گی اچھی ہوگی، کسی بُرے مقصد کے لئے کی جائے گی بُری ہوگی۔ ان کا چونکہ مقصد تھا اہلِ حق کو فنا کرنا یہ بُری تدبیر ہے، اور اللہ تعالیٰ کا مقصد تھا اہلِ حق کو بچانا یہ اچھی تدبیر ہے، اس لئے لفظ ’’مکر‘‘ میں کوئی بُرائی نہیں ہے، اس لئے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ ہمارے ہاں مکر عموماً بُرے عنوان کے طور پر ہی بولا جاتا ہے، جو بات خلافِ حقیقت ہوتی ہے اس کے

لئے بولتے ہیں، وہ اُردو کا "مکر" ہے، عربی میں اس کا معنی ہوتا ہے خفیہ تدبیر کرنا، اس کی اچھائی، برائی اس غرض وغایت کے تابع ہے جس غرض وغایت کے لئے وہ کی گئی ہے، اگر اچھے مقصد کے لئے کی گئی ہے تو یہ مکر اچھا ہے، اگر برے مقصد کے لئے کی گئی ہے تو یہ مکر برا ہے۔

مفسدین کی ہلاکت

انہوں نے خفیہ تدبیر کی اور ہم نے بھی خفیہ تدبیر کی، وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ اور ان کو پتا ہی نہیں تھا یعنی موت ان کے سر پر کھیل رہی تھی، ہم ان کی تباہی کا بندوبست کر رہے تھے، اور انہیں معلوم ہی نہیں، وہ سمجھتے تھے کہ ہم ایک ایسی سازش بنا رہے ہیں، اور ایسا پروگرام بنا رہے ہیں، کہ ہم ان کو فنا کر دیں گے اور خود اسی طرح سے دندناتے پھریں گے جیسے پہلے ہیں۔ اور جب ہم اقرار ہی نہیں کریں گے، قسمیں کھا جائیں گے تو ایسی صورت میں ہمیں کوئی پکڑ بھی نہیں سکے گا۔ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ اور ان کو پتا ہی نہیں تھا کہ ان کے ساتھ کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ: پس اے مخاطب! تو دیکھ ان کے مکر کا کیا انجام ہوا۔ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ: دَمَّرَ تَدْمِيْرًا یہ لفظ سورۂ فرقان (آیت ۳۶) میں بھی گزرا تھا، نیست و نابود کر دینا، کسی چیز کو ایسے طور پر توڑ پھوڑ دینا کہ جس کا بعد میں جوڑنا اور اصلاح کرنا ممکن نہ ہو، کسرُ الشیءِ علی وجہٍ لا یمکنُ اِصلاحُہ، بے شک ہم نے ان کو ہلاک کر ڈالا، نیست و نابود کر دیا اور ان کی قوم کو بھی سب کو۔

مشرکین کے لئے تباہ شدہ بستیاں سامانِ عبرت ہیں

فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةً: ہمارے اس بیان پر ان کے یہ خالی پڑے ہوئے، گرے ہوئے گھر یہی شاہد ہیں، جا کے دیکھ لو۔ تلك اِسم اشارہ ہے، مشرکینِ مکہ چونکہ شام کو جاتے تھے تو راستے میں یہ بستیاں آتی تھیں، جیسا کہ سورۂ شعراء میں تفصیل آپ کی خدمت میں عرض کی تھی کہ وہاں ان کے مکانات کے اب تک نشان باقی ہیں، آثارِ قدیمہ کے طور پر۔ اور بعض کتابوں میں ان مکانات کے فوٹو بھی دیے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک جب ان کے مکانات کا یہ حال ہے کہ ان کے نقشے وغیرہ اسی طرح سے کچھ باقی ہیں، تو سرورِ کائنات ﷺ کے زمانے میں تو بہت ہی نمایاں ہوں گے، اور یہ مشرکین پاس سے گزرتے تھے، انہیں معلوم تھا کہ یہاں ایک قوم آباد تھی، اور اس طرح سے یہ نیست و نابود ہوئی ہے، اس لیے ان کو کہا جا رہا ہے: تلك، جیسے یہ محسوس مبصر کی طرف اشارہ ہوتا ہے، یہی گھر ان کے خالی پڑے ہوئے ہیں، جا کے دیکھ لو، مکان کوئی گرے پڑے ہیں، کوئی خالی پڑے ہیں، خاویہ: خالیہ کے معنی میں بھی ہوتا ہے اور ساقطہ کے معنی بھی ہوتا ہے، كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ (سورۂ حاقہ)، وہاں بھی خاویہ کا لفظ ہے۔ تو یہی ان کے گھر خالی پڑے ہوئے ہیں، بِمَا ظَلَمُوْا: بسبب ان کے ظلم کرنے کے، ظلم سے مراد یہاں شرک اور شرک اپنے

نفس پر ظلم کرنا ہے، یعنی چونکہ ظالمانہ زندگی اپنائی تو اس کے نتیجے میں یہ حال ہوا۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ: یَعْلَمُوْنَ یہ علم سے لیا گیا ہے، کبھی فعل کو ارادۂ فعل کے لئے استعمال کرتے ہیں، تو یہاں وہی ارادۂ فعل والا معنی ہے۔ بے شک اس میں البتہ نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو جاننا چاہتے ہیں، جو علم حاصل کرنا چاہتے ہیں، تو ان کے لئے علم حاصل کرنے کی دلیل اسی واقعے میں موجود ہے، جس سے ان کو پتا چل جائے کہ شرک کا انجام بُرا ہوتا ہے، توحید کا انجام اچھا ہے۔ وَاَنْجَیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا یَتَّقُوْنَ: نجات دی ہم نے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور وہ تقویٰ اختیار کرتے تھے، اللہ سے ڈرتے تھے، پرہیزگاری اختیار کرتے تھے، تقویٰ کے اندر یہ ساری بات آ گئی، جو کُفر و شرک سے بچتے تھے، ہماری نافرمانی سے بچتے تھے، ہم نے ان کو نجات دی۔

کیا قومِ ثمود پر عذاب کا واقعہ اِتفاقی تھا؟

اب اس واقعے کو کوئی اتفاقی واقعہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جو اتفاقی واقعہ ہوتا ہے، جو کسی گناہ کی سزا کے طور پر نہ آیا ہو، اور اللہ تعالیٰ کے موعود عذاب کی صورت میں نہ آیا ہو، اس واقعے کا اثر یہ ہوا کرتا ہے کہ مثلاً جہاں زلزلہ آ جائے وہاں مکانات گرتے ہیں، اچھوں کے بھی گرتے ہیں، بُروں کے بھی گرتے ہیں، مکانوں کے اندر دَب کے اچھے بھی مرتے ہیں بُرے بھی مرتے ہیں، آخرت میں جا کے فرق ہوگا، جو اچھے ہوں گے ان کے لئے یہی عذاب اور یہی مصیبت اللہ تعالیٰ کے ہاں ثواب اور درجات کی بلندی کا ذریعہ بن جائے گی، اور جو بُرے لوگ مرے ہیں تو ان کے لئے تو یہ ایک سزا کی صورت ہے۔ آپ کے سامنے جب سیلاب آتا ہے تو اچھے لوگوں کی بھی فصلیں اُجڑتی ہیں، بُرے لوگوں کی بھی اُجڑتی ہیں۔ اچھے لوگوں کے مکانات بھی گرتے ہیں، بُرے لوگوں کے بھی مکانات گرتے ہیں۔ آندھی آتی ہے باغ اُجڑتے ہیں تو اچھوں کے بھی اُجڑتے ہیں بُروں کے بھی اُجڑتے ہیں۔ اگر کسی علاقے میں آگ لگ جائے تو جس طرح اچھے لوگوں کے نقصانات ہوتے ہیں، اَملاک جلتے ہیں، تو اسی طرح بُرے لوگوں کے بھی جلتے ہیں۔ یہ واقعات جو ہوتے ہیں اس کو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اتفاقی صورت ہے، اس کا نتیجہ آخرت میں جا کر معلوم ہوگا کہ مؤمنین کے حق میں کیا ہے اور کافروں کے حق میں کیا ہے؟...... لیکن یہاں تو چونکہ نبی کے بیان کے مطابق، یہ کافروں مشرکوں کے لیے عذاب موعود ہے، اللہ کے وعدے کے تحت آیا ہے، اس سے بالکل نمایاں فرق ہو جاتا تھا کہ اسی قوم میں بسنے والے، اسی آبادی میں رہنے والے، نیک لوگ بچ گئے، ان کا بال بھی بیکا نہ ہوا، اور کافر و مشرک جتنے تھے وہ سارے کے سارے مر گئے۔ تو کتنی واضح دلیل ہے کہ یہ واقعی کُفر و شرک کے عذاب کے طور پر آیا ہے، جو کفر و شرک میں مبتلا نہیں تھے وہ اس عذاب میں مبتلا نہیں ہوئے، اتنے شدید زلزلے میں اور اتنے شدید طوفان میں یہ بچ گئے باقی مر گئے، تو کافر و مؤمن کی عملاً تفریق ہو گئی، یہ عملاً تفریق ہو جانا واضح دلیل ہے اس بات کی کہ یہ ایسا واقعہ نہیں جیسے دنیا کے اندر عام زلزلے آ جایا کرتے ہیں، یا عام سیلاب آ جایا کرتے ہیں، یہ وہی عذاب موعود ہے جو کُفر و شرک کی سزا کے طور پر آیا، اس لئے جو لوگ کافر مشرک تھے وہ سارے کے سارے اس

عذاب میں مبتلا ہوئے، جو کافر مشرک نہیں تھے وہ سارے بچ گئے، اس لئے اس کو اتفاقی حادثہ قرار نہیں دیا جا سکتا، اگر اتفاقی حادثہ ہو تو اس میں کافر اور مؤمن کا فرق نہیں ہوتا، بلکہ سارے کے سارے اس کی لپیٹ میں آیا کرتے ہیں، یہ علیحدہ بات ہے کہ آخرت میں جا کے فرق ہو گا۔

قومِ لُوط کا واقعہ

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ: لوطًا: یہ اَرْسَلْنَا کا مفعول ہے۔ یہ واقعہ بھی بہت دفعہ گزر گیا۔ اور بھیجا ہم نے لُوط علیہ السلام کو، قابلِ ذکر ہے وہ وقت جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا: اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ: فاحشہ کا مصداق آپ کے سامنے بارہا گزر گیا، بے شرمی بے حیائی، اس کا مصداق ہے جس کو لوگ آج کل ''لواطت'' کہتے ہیں، مَردوں کے ساتھ شہوت رانی، اگلے لفظوں میں اس کی تفصیل ذکر کر دی گئی۔ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ: کیا تم ارتکاب کرتے ہو بے حیائی کا، بے غیرتی کا؟

وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ: تُبْصِرُوْنَ: اِبصار سے لیا گیا ہے۔ اَبْصَرَ دیکھنے کے معنی میں، دیکھنا آنکھوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے، دل کے ساتھ بھی ہوتا ہے، تو اَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ کا یہ معنی بھی ہے ''اور تم دیکھتے ہو کہ یہ بے حیائی ہے جس کا تم ارتکاب کر رہے ہو'' جس میں اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اس فعل کی بُرائی، یہ کوئی دلیل سے سمجھانے کی بات نہیں، یہ تو آنکھوں سے نظر آ رہی ہے کہ یہ بُرا فعل ہے۔ اتنی کھلی حقیقت، جیسے آنکھوں سے نظر آ رہی ہے، تُبْصِرُوْنَ کا یہ مفہوم ہو جائے گا، یعنی دیکھتے بھالتے ہوئے تم اس فاحشہ کا ارتکاب کرتے ہو، اس میں ان کی مذمت زیادہ ہے، اندھیرے میں انسان کا پاؤں کسی نجاست پر پڑ جائے، یا ایک انسان اندھا ہو اور اندھا ہونے کی صورت میں وہ کسی نجاست سے آلودہ ہو جائے تو اتنا قابلِ ملامت نہیں ہوتا۔ لیکن جب ایک روشنی ہے، آنکھوں کے سامنے ایک نجاست نظر آ رہی ہے، اور آنکھوں سے دیکھتا ہوا کوئی آدمی اس نجاست میں ہاتھ مارتا ہے یا اس کو کھاتا ہے، اب اس سے زیادہ اور اس کی بُرائی کیا ہو گی۔ تو وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ میں یہی بتایا جا رہا ہے کہ یہ فعل کوئی ایسا نہیں کہ جس کی بُرائی مخفی ہے، جس کو دلائل کے ساتھ سمجھانے کی ضرورت ہے، یہ تو آنکھوں سے نظر آ رہی ہے کہ فاحشہ ہے، فطرت کے خلاف ہے، قطعِ نسل کا ذریعہ ہے، اور اللہ تعالیٰ نے کسی حیوان میں بھی یہ سرشت نہیں رکھی، کھلی ہوئی بات ہے، پھر تم اس کا ارتکاب کرتے ہو؟ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ میں گویا اس فعل کی قباحت اور شناعت کو انتہائی درجے پہ پہنچا دیا گیا...... اور اگر اِبصار سے اِبصارِ قلب مراد لیا جائے، مُبْصِر کا معنی سمجھ دار، تو پھر وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ کا مطلب یہ ہو گا کہ تم ارتکاب کرتے ہو بے حیائی کا حالانکہ تم سمجھ دار لوگ ہو، باقی سب کاموں میں سمجھ دار ہو، کاروبار کرتے ہو، باقی سب چیزوں میں معلوم ہوتا ہے کہ تم بڑے عقل مند ہو، لیکن یہاں ارتکابِ فاحشہ کے اندر آکے تمہاری عقلیں کہاں چلی گئیں؟ تم اتنے بے عقل ہو گئے ہو؟ سمجھ دار ہوتے ہوئے اس قسم کی بے حیائی اور بے غیرتی کا ارتکاب کرتے ہو؟ یہ معنی بھی اس کا ہو سکتا ہے...... وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ میں اَبْصَرَ بالقلب اور اَبْصَرَ بالبصر دونوں مفہوم ہو سکتے ہیں۔ اس لئے

سمجھ داری کے ساتھ بھی ترجمہ کر سکتے ہیں جیسا کہ ''بیان القرآن'' میں کیا گیا ہے''حالانکہ تم سمجھ دار ہو''۔ اور آنکھوں سے دیکھنے بھی معنی کر سکتے ہیں، جس طرح سے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے کیا''اور تم دیکھتے ہو''۔ دیکھنے کے ساتھ ترجمہ حضرت شیخ الہند کا ہے، اور سمجھ دار ہونے کے ساتھ ترجمہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

جاہلانہ طریقہ

اَىِٕنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً: یہ اسی فاحشہ کی تفصیل ہے۔ کیا بے شک تم البتہ آتے ہو مردوں کے پاس ازروئے شہوت کے؟ مردوں کے پاس تم شہوت کے طور پر آتے ہو؟ مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ عورتوں کو چھوڑ کر، جو اللہ تعالیٰ نے ایک جائز طریقہ بنایا ہے، فطری طریقہ بنایا ہے قضائے شہوت کے لئے، جس میں صرف قضائے شہوت نہیں، حکمت بھی ہے کہ اس سے آگے نسل چلتی ہے، اولاد پیدا ہوتی ہے، تم اس فطری طریقے کو چھوڑ کر غیر فطری طریقہ اختیار کرتے ہو، بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ: بَلْ یہ اِضراب کے لئے ہوتا ہے۔ یعنی تمہارے پاس بھی اس کی کوئی معقول وجہ نہیں، تم اپنے اس فعل کی کوئی معقول توجیہ نہیں کر سکتے کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ بلکہ سراسر یہ تمہارا جاہلانہ فعل ہے۔ یہاں ''جہل'' کا لفظ آیا ہے، اور یہ بھی آپ کی خدمت میں کئی دفعہ عرض کیا کہ ''جہل'' کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے، ایک ''علم'' کے مقابلے میں، ایک ''حلم'' کے مقابلے میں۔ علم: جاننا، جہل: نہ جاننا۔ ''جاہل'' اس کو کہتے ہیں جو جانتا نہیں۔ اور ''حلم'' کا معنی ہوتا ہے بُردباری، برداشت، جذبات میں نہ آنا، اور ''جہل'' کا معنی ہوتا ہے جذبات سے مغلوب ہو جانا۔ تو یہاں جو تَجْهَلُوْنَ ہے یہ جذبات سے مغلوب ہونے کے معنی میں ہے، کہ تم جذبات سے مغلوب ہوئے جا رہے ہو، ورنہ تمہارے اس فعل کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے، تم بھی اس کی کوئی توجیہ نہیں کر سکتے سوائے اس کے تم جذبات سے مغلوب ہو، اپنے جذبات پہ تم کنٹرول نہیں کر سکتے، یہاں تَجْهَلُوْنَ کا یہ معنی ہے، ورنہ وہ جاہل نہیں تھے کہ ان کو پتا نہ ہو کہ یہ کوئی بُرا کام ہے۔ نہیں، سب کچھ سمجھتے ہو، جیسے وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ کے معنی میں آیا، تمہیں آنکھوں سے نظر آ رہا ہے کہ یہ بے حیائی کا کام ہے، اور یہ بھی سمجھتے ہو کہ خلافِ فطرت ہے، اور یہ بھی سمجھتے ہو کہ یہ مستقبل کے لئے، قوم اور نسل کے لئے انتہائی تباہ کن اور مُہلک ہے، لیکن اس کے باوجود جو کرتے چلے جا رہے ہو تو سوائے جہالت کے اور جذبات سے مغلوبیت کے اور کوئی وجہ نہیں ہے، یہ بَلْ کے لفظ سے سارا مضمون نکل آیا، تمہارے پاس تمہارے اس فعل کی کوئی عقلی دلیل، کوئی نقلی دلیل، کوئی صحیح حکمت نہیں ہے، کوئی مصلحت نہیں ہے، کوئی عذر نہیں ہے تمہارے پاس، بلکہ تم لوگ جذبات سے مغلوب ہو، عقل سے سوچتے نہیں، سمجھتے نہیں، بس جذبات کی مغلوبیت کے طور پر یہ حرکتیں کر رہے ہو۔

قومِ لُوط کا جواب

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ: بات تو وہی ہے کہ دلیل تو ان کے پاس کوئی تھی نہیں، کہ حضرت لُوط علیہ السلام کو کوئی جواب دیتے،

جذبات سے اتنے مغلوب تھے کہ بات مان نہیں سکتے تھے، اس حرکت کو چھوڑ نہیں سکتے تھے، پھر اگلا وہی جاہلوں والا طریقہ کہ جب دلیل سے مقابلہ نہ ہوتو قوت، پھر مکا نکال لیتے ہیں، یہ ایک طعن وتشنیع کا عنوان ہے، وہ ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ یہ کیا ہروقت ہمیں روکتے ٹوکتے رہتے ہیں، جب ان کی نظر میں ہم غنڈے ہیں، ہم بدمعاش ہیں، ہم لُچے ہیں، تو ان کو ہماری بستی میں رہنے کا کیا حق ہے؟ یعنی اپنے عمل کی اصلاح کی بجائے ان کے اوپر غصہ نکال رہے ہیں، کہ جب یہ پاک صاف ہیں، پاک صاف بن کے رہتے ہیں، ہم ان کو غنڈے نظر آتے ہیں، بدمعاش نظر آتے ہیں، لُچے نظر آتے ہیں، تو ان کا ہماری بستی سے کیا تعلق؟ انہیں نکال باہر کرو، ہروقت کا یہ بحث مباحثہ ختم ہو جائے، یعنی اپنے عمل کی اصلاح کرنے کی طرف وہ متوجہ نہیں، الٹا ان کے اوپر یہ غصہ ہے کہ ان کو باہر نکالو، یہ اپنے آپ کو بہت پاک صاف سمجھتے ہیں تو کسی پاک صاف جگہ پر جا کر رہیں، ہم لُچوں کے ساتھ ان کا کیا تعلق؟ یہ طعن وتشنیع والی بات ہے۔ جب ایک فاحشہ اور بے حیائی عام ہو جاتی ہے اور لوگ اس کے اندر عام طور پر ملوث ہو جاتے ہیں تو پھر منع کرنے والوں پہ بھی ان کو غصہ آیا کرتا ہے، کہ یہ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ اور یہ اس قوم کے اِنتہا کو پہنچ جانے کی علامت ہوتی ہے۔ ایک ہے کہ کم از کم بُرائی کو بُرائی سمجھیں، اور منع کرنے والوں کو کہیں کہ ہاں جی! بات تو تم ٹھیک کہتے ہو لیکن بس ہم میں کمزوری ہے، دُعا کرو، ہم بھی کوشش کرتے ہیں کہ ہماری کمزوری دُور ہو جائے، تو اس وقت تک اصلاح کی توقع ہوتی ہے، اور جب لوگ کہنے سننے والے کی ہی جان کے لاگو ہو جائیں، تو پھر اس وقت اصلاح کی توقع نہیں رہتی۔ نہیں تھا اس کی قوم کا جواب مگر یہی کہ انہوں نے کہا کہ نکال دو لُوط کے متعلقین کو، یعنی لُوط علیہ السلام اور ان کے متعلقین کو، اس میں اہل وعیال سب آ جاتے ہیں۔ نکال دو ان کو اپنی بستی سے، اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ: یہ تمسخر اور اِستہزا کے طور پر ہے۔ یہ لوگ بڑے صاف ستھرے ہیں، جب یہ صاف ستھرے ہیں، تم ہم گندوں کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں، ان کو باہر نکال دو، یہ جا کے کسی ایسی بستی میں رہیں جہاں پر سارے صوفیے بستے ہوں، اچھے لوگ ہوں، ہم سے ان کا کیا تعلق؟

قوم پر عذاب

فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ: ہم نے نجات دی لُوط علیہ السلام کو اور ان کے گھر والوں کو، اِلَّا امْرَاَتَهٗ: سوائے ان کی بیوی کے، قَدَّرْنٰهَا: ہم نے مقدر کیا اس کو، مِنَ الْغٰبِرِيْنَ: پیچھے رہ جانے والوں میں سے۔ وہ چونکہ کافرہ تھی اور اس کی ہمدردیاں اپنی قوم کے ساتھ تھیں، اس لئے وہ بھی اس عذاب میں برباد ہوئی۔ سورۂ تحریم میں صراحتاً اس کا ذکر آئے گا۔ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا: اور ہم نے ان کے اوپر ایک خاص قسم کی بارش برسائی۔ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ: پس ڈرائے ہوؤں کی بارش بہت بری بارش تھی، جو ہم نے ان کے اوپر برسائی۔ اور وہ بارش آپ کے سامنے ذکر ہوا تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ان پہ پتھر برسے اور زلزلہ آیا، ان کی بستیاں اکھیڑی گئیں، نچلا حصہ اوپر کر دیا گیا، اوپر کا حصہ نیچے کر دیا گیا، اس طرح سے دردناک عذاب کے ساتھ وہ لوگ تباہ کر دیے گئے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ؕ آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾

آپ کہہ دیجئے کہ سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، اور سلام اللہ کے ان بندوں پر جن کو اللہ نے چن لیا، کیا اللہ بہتر ہے یا وہ چیزیں جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں؟ ﴿۵۹﴾

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ

(کیا تمہارے معبود بہتر ہیں) یا وہ جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور اُتارا تمہارے لئے آسمان سے پانی پھر اُگایا ہم نے اس کے ذریعے

حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ هُمْ

سے پُر رونق باغات کو، تمہارے لئے ممکن ہی نہیں تھا کہ تم ان باغات کے درختوں کو اُگا لیتے، کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ بلکہ یہ

قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ﴿۶۰﴾ ؕ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّ

لوگ ہیں جو اعراض کرتے ہیں ﴿۶۰﴾ (کیا تمہارے معبود بہتر ہیں) یا وہ جس نے بنایا زمین کو ٹھہرنے کی جگہ، اور بنادیں اس کے درمیان میں نہریں اور

جَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ

اس زمین کے لئے بوجھل پہاڑ بنادیے، اور بنائی اس نے دو سمندروں کے درمیان میں رُکاوٹ، کیا اور معبود ہیں اللہ کے ساتھ؟ بلکہ ان میں سے اکثر ایسے ہیں

لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۱﴾ ؕ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ

جو جاننے کا ارادہ ہی نہیں کرتے ﴿۶۱﴾ (کیا تمہارے شرکاء بہتر ہیں) یا وہ جو جواب دیتا ہے مضطر کو جبکہ وہ اس کو پکارے اور دُور ہٹاتا ہے سختی کو

وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۶۲﴾ ؕ اَمَّنْ

اور بناتا ہے تمہیں زمین میں نائب، کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہیں؟ تم بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہو ﴿۶۲﴾ (کیا تمہارے شرکاء بہتر ہیں) یا وہ

يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ

جو تمہیں راستہ دکھاتا ہے خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں، اور جو بھیجتا ہے ہوائیں اس حال میں کہ بشارت دینے والی ہیں اس کی رحمت

رَحْمَتِهٖ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۳﴾ ؕ اَمَّنْ

سے پہلے، کیا اللہ کے ساتھ معبود ہیں؟ اللہ بلند ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں ﴿۶۳﴾ (کیا تمہارے معبود بہتر ہیں) یا وہ جو

يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ

ابتداءً پیدا کرتا ہے، پھر وہی اس خلق کا اعادہ کرتا ہے، اور جو تمہیں رزق دیتا ہے آسمان سے اور زمین سے، کیا اللہ کے ساتھ اور معبود بھی ہیں؟

قُلۡ هَاتُوۡا بُرۡهَانَكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۶۴﴾ قُلۡ لَّا يَعۡلَمُ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَ

آپ کہہ دیجئے کہ لے آؤ تم اپنی برہان اگر تم سچے ہو ﴿۶۴﴾ آپ کہہ دیجئے کہ نہیں جانتا غیب کو جو کوئی آسمانوں میں ہے اور جو

الۡاَرۡضِ الۡغَيۡبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَمَا يَشۡعُرُوۡنَ اَيَّانَ يُبۡعَثُوۡنَ ﴿۶۵﴾ بَلِ ادّٰرَكَ

زمین میں ہے مگر اللہ، اور ان کو پتا ہی نہیں کہ یہ کب اُٹھائے جائیں گے؟ ﴿۶۵﴾ بلکہ خلط ملط ہوگیا

عِلۡمُهُمۡ فِى الۡاٰخِرَةِ ۚ بَلۡ هُمۡ فِىۡ شَكٍّ مِّنۡهَا ۚ بَلۡ هُمۡ مِّنۡهَا عَمُوۡنَ ﴿۶۶﴾

ان کا علم آخرت کے بارے میں، بلکہ یہ اس کے متعلق شک میں ہیں، بلکہ یہ اس کی طرف سے اندھے ہیں ﴿۶۶﴾

تفسیر

''قُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ... الخ'' کو ماقبل اور مابعد دونوں کے ساتھ لگایا جاسکتا ہے

قُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ: آپ کہہ دیجئے، اللہ کا شکر ہے۔ ''الحمد للہ'' کا لفظی معنی ہے: سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔ اور اللہ کی تعریف کرنا، یہی اللہ کی شکر گزاری ہے، اس لئے ''رَاسُ الشکرِ الحمد للہ''[1] اصل شکر اللہ کی تعریف کرنا ہی ہے، تو الحمد للہ: کا ترجمہ اگر یوں کر دیا جائے کہ ''اللہ کا شکر ہے!'' تو یہ بات محاورے کے مطابق ہے۔ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيۡنَ اصۡطَفٰى: اور سلام اللہ کے ان بندوں پر جن کو اللہ نے چن لیا...... اس آیت کا تعلق اگر ماقبل کے ساتھ لگایا جائے تو پھر اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ ظالموں کو اللہ نے تباہ کیا، اور رسولوں کو اور ان کے ماننے والوں کو نجات دی، پچھلے واقعات میں یہ بات ظاہر ہوئی، اس پہ اللہ کا شکر ہے، کیونکہ ظالموں کو برباد کرنا یہ بھی اللہ کا احسان ہے باقی ماندہ آبادی کے لئے، جیسے قرآنِ کریم میں دوسری جگہ ہے فَقُطِعَ دَابِرُ الۡقَوۡمِ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا اور آگے ہے وَالۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ (سورۂ انعام: ۴۵) وہاں بھی یہ الفاظ آتے ہیں کہ ظالموں کی جڑ کاٹ دی گئی، اللہ کا شکر ہے جو رب العالمین ہے۔ تو ظالموں کو برباد کر دینا یہ باقی جہان پر اللہ کا احسان اور رحمت ہے، جس کے اوپر باقی لوگوں کو الحمد للہ کہنا چاہیے۔ اور آگے یہ بات ذکر کر دی گئی کہ اللہ کے جو بندے چُنے ہوئے ہیں سلامتی انہی پر ہی ہے، ''چُنے ہوئے'' کا مصداق انبیاء علیہم السلام بھی ہیں اور اسی طرح سے جن کو اللہ تعالیٰ ایمان کی توفیق دیتا ہے تو یہ مؤمن بندے بھی باقی مخلوق میں سے چُنے ہوئے ہوتے ہیں۔ سورۂ فاطر میں غالباً یہ آیت آئے گی: ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡكِتٰبَ الَّذِيۡنَ اصۡطَفَيۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا ۚ فَمِنۡهُمۡ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِهٖ ۚ وَمِنۡهُمۡ مُّقۡتَصِدٌ ۚ وَمِنۡهُمۡ سَابِقٌۢ بِالۡخَيۡرٰتِ (سورۂ فاطر: ۳۲) پھر ہم نے کتاب کا وارث بنا دیا ان لوگوں کو جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے چُن لیا۔ آگے پھر ان کی تین قسمیں آئیں گی کہ ان میں سے بعض سابق بالخیرات ہیں، بعض معتدل ہیں، بعض ظالم لنفسہ ہیں۔ تو مطلب یہ ہوا کہ مؤمنین کی آگے تین قسمیں ہیں، ایک اعلیٰ درجے کے، ایک متوسط درجے کے، اور ایک گنہگار قسم کے مؤمن۔

(۱) الاعتدال من الکتاب والسنۃ ۱/ ۱۵۸، حکمہ ترمذی۔ نیز دیکھیں: مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۰۱ باب ثواب التسبیح ولفظہ: الحمد راس الشکر

بہر حال مؤمنین بھی اللہ تعالیٰ کے چُنے ہوئے ہوتے ہیں۔ تو سلامتی انہی لوگوں کے لئے ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے چنا، انبیاء علیہم السلام اور ان کے تبعین۔ پچھلے واقعات کے بعد گویا کہ یہ تأثر ظاہر کیا گیا ہے کہ ظالموں کی بربادی اور اچھے لوگوں کی نجات، اس پہ اللہ کا شکر ہے۔ ماقبل کے ساتھ اس کا تعلق ہوگا تو اس کا مفہوم یہ ہو جائے گا۔

اور اگر اس کو مابعد کے ساتھ لگایا جائے تو پھر آگے وعظ آرہا ہے توحید کے متعلق، تو یہ الفاظ بطور خطبے کے ہیں، جس طرح کوئی اہم مضمون بیان کرنا ہو تو اس سے پہلے خطبہ پڑھا جاتا ہے تو اسی طرح یہ الفاظ بطور خطبے کے ہیں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى، اور آگے توحید کا وعظ شروع ہو گیا، کہ سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، جتنے کمالات ہیں وہ سب اللہ کے لئے ثابت ہیں، اور اللہ کے چنے ہوئے بندے انبیاء علیہم السلام، ان کے اوپر سلام ہو۔ آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ: یہاں سے توحید کا تذکرہ شروع ہوا۔ آٰللّٰهُ ہمزہ استفہام ہے۔ کیا اللہ بہتر ہے یا وہ چیزیں جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں؟ یہ استفہام ہے، جواب متعین ہے جس طرح سے آگے دلائل میں اشارہ کیا جا رہا ہے کہ اللہ کے مقابلے میں مَا يُشْرِكُوْنَ کوئی چیز نہیں ہے۔

بارش اور باغات میں دلائلِ قدرت و وحدانیت

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً: لفظی ترجمہ دیکھنے کی ضرورت ہے، باقی! اس قسم کی آیات اور اس قسم کے دلائل بار بار آپ کے سامنے گزر چکے، اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ: یہاں اسی طرح سے مضمون کی تتمیم کے لئے یوں محذوف نکالتے چلے جائیں گے، کیا تمہارے معبود بہتر ہیں یا وہ جس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو اور اتارا تمہارے لئے آسمان سے پانی۔ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ: حدائق حدیقہ کی جمع ہے، حدیقہ باغ کو کہتے ہیں، اور بَهْجَة رونق کو کہتے ہیں، حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ: رونق والے باغات، اور فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ میں متکلم کی طرف انتقال ہو گیا غائب سے، پہلے غائب کے صیغے کے ساتھ ذکر آرہا تھا، اب متکلم کے صیغے کے ساتھ آگیا، یہ التفات ہے۔ پھر اگایا ہم نے اس پانی کے ذریعے سے پُر رونق باغات کو۔ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا: تمہارے لئے ممکن ہی نہیں تھا کہ تم ان باغات کے درختوں کو اُگا لیتے، تم سے یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا، تمہاری لیے یہ بات ہے ہی نہیں، تمہاری قدرت میں نہیں، نہیں تھا تمہارے لیے کہ اُگا لیتے تم ان باغات کے درختوں کو، یعنی تمہارے لیے ممکن ہی نہیں تھا کہ تم ان باغات کے درختوں کو اُگا لیتے۔ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ: تو یہ زمین و آسمان کا پیدا کرنا، آسمان کی طرف سے پانی کا اُتارنا، اور اس کے ذریعے سے پُر رونق نباتات کا اُگانا، جس میں تم قدم قدم پر اپنا عجز محسوس کرتے ہو، اس میں ذرا غور کر کے بتاؤ، کہ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور شرکاء ہیں؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہیں؟ یعنی نہیں ہیں۔ یہ ساری کی ساری چیزیں اس بات پر دلالت کرنے والی ہیں کہ وہ پیدا کرنے والا اپنی صفاتِ کمالیہ میں یکتا ہے، کوئی دوسرا اس کے ساتھ شریک نہیں، اس قدرت میں اور اس خلق میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ: بل کا مطلب یہ ہے کہ یہ مشرک لوگ ان باتوں میں غور ہی نہیں کرتے، اللہ کی وحدانیت کو سمجھتے ہی نہیں، بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ: عَدَلَ يَعْدِلُ: برابر ٹھہرانے کے معنی میں بھی ہوتا ہے، جس طرح سے آپ کہتے ہیں عدل، تو عدل برابری کو کہتے ہیں، ان کے درمیان عدل کر دو یعنی ان کے حقوق میں برابری کر دو۔ اور اگر عُدُول سے لیا جائے تو یہ

اعراض کرنے کے معنی میں ہوتا ہے، یہاں دونوں طرح سے ہی ترجمہ کیا گیا ہے، بلکہ یہ لوگ ہیں جو اعراض کرتے ہیں، ان دلیلوں کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے، منہ موڑتے ہیں، یہ عُدول سے آ گیا اعراض کرنے کے معنی میں۔ یا۔ بلکہ یہ لوگ ہیں جو دوسروں کو اللہ کے برابر ٹھہراتے ہیں، اس طرح سے بھی ترجمہ کیا گیا۔

زمین اور پہاڑوں میں دلائلِ قدرت

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا: یہاں بھی اسی طرح سے آ گیا (یعنی عبارت محذوف ہے) کیا تمہارے معبود بہتر ہیں یا وہ جس نے بنایا زمین کو ٹھہرنے کی جگہ۔ قرار یہ مَقَرّ کے معنی میں ہے ذاتِ قرار۔ بنایا زمین کو ٹھہرنے کی جگہ۔ ایک ایک چیز میں بہت بہت تفصیل ہے اللہ کی قدرت کی، زمین ٹھہرنے کی جگہ بنا دی، نہ تو ایسی سخت ہے کہ اس کے اوپر آپ ٹھہر نہ سکیں، نہ یہ اتنی نرم ہے کہ اس کے اندر آپ دھنستے چلے جائیں، اور آپ کی ساری کی ساری ضروریات اللہ تعالیٰ نے اسی زمین سے پوری فرما دیں۔ ایک ایک چیز کی اگر تفصیل کی جائے تو وہ اللہ کی قدرت کی بہت ساری نشانیوں پر مشتمل ہے۔ وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا: اور بنا دیں اللہ تعالیٰ نے اس زمین کے درمیان میں نہریں۔ انہار: نهر کی جمع ہے، نهر: دریا، اور یہ ''نہریں'' جو آپ کہتے ہیں تو آپ کے عرف میں ''نہر'' چھوٹی ہوتی ہے، دریا بڑا ہوتا ہے، ویسے عربی میں اَنہار ان دریاؤں کو بھی کہتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث شریف میں دجلہ، فرات، نیل وغیرہ کو اَنہار کا مصداق قرار دیا گیا ہے،[1] بنائیں اس زمین کے درمیان میں نہریں۔ وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ: اور اس زمین کے لئے بوجھل پہاڑ بنا دیے۔ رَوَاسِيَ: رَاسِيَةٌ کی جمع، ثَوَابِت کے معنی میں، جمے رہنے والے پہاڑ۔ بنا دیے اس زمین کے لئے بوجھل پہاڑ۔ رَوَاسِيَ یہ صفت کا صیغہ ہے اور اس کا موصوف محذوف ہے جبال، اَیْ جِبَالًا رَوَاسِيَ۔

دریا اور سمندر میں دلائلِ قدرت

وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا: اور بنائی اس نے دو سمندروں کے درمیان میں، دو دریاؤں کے درمیان میں رُکاوٹ، یہ وہی ہے بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ (سورۂ رحمٰن: ۲۰) کہ ایک طرف کھاری سمندر بنا دیا اور دوسری طرف میٹھے دریا بہا دیے، اور درمیان میں اللہ نے رُکاوٹ پیدا کر دی کہ ایک دوسرے میں خلط نہیں ہوتے، انسان کی ضرورتیں دونوں طرح سے پوری ہوتی ہیں، بعض ضرورتیں نمکین سمندر سے پوری ہوتی ہیں اور بعض میٹھے دریاؤں سے پوری ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے دونوں علیحدہ علیحدہ بہا دیے۔ سورۂ فرقان کے اندر اس کی تفصیل آپ کے سامنے ذکر کی تھی کہ...... یا تو یہی زمین والے دریا میٹھے اور سمندر کڑوا، یہ دو مراد ہیں اور اللہ نے درمیان میں رکاوٹ بنا دی...... یا سمندر میں اسی طرح سے لہریں ہیں میٹھی اور کڑوی، جس طرح سے زمین کے نیچے جو پانی ہے تو کہیں لہر میٹھی ہے، کہیں لہر کڑوی چل رہی ہے، تو زمین کے نیچے بھی اسی طرح سے پانی کی لہریں ہیں میٹھی اور کڑوی ملی جلی، ایک دوسرے میں خلط نہیں ہوتیں، جیسے آپ دیکھتے ہیں کہ بعض علاقوں کا پانی کڑوا ہوتا ہے اور بعض کا میٹھا ہوتا ہے، تفصیل اس کی سورۂ فرقان میں آ گئی تھی۔ یہ بھی اسی طرح سے ایک ایک جزء اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں پر مشتمل ہے، اور اس میں اللہ کی قدرت اور

---

(۱) سَيْحَانُ وَجَيْحَانُ وَالْفُرَاتُ وَالنِّيلُ كُلٌّ مِنْ أَنْهَارِ الْجَنَّةِ (مسلم ۲/ ۳۸۰، کتاب الجنۃ۔ مشکوۃ ۲/ ۴۹۷ باب صفۃ الجنۃ فصل اول)

اللہ کا احسان نمایاں ہے۔ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ: کیا اور معبود ہیں اللہ کے ساتھ؟ یعنی نہیں، ان کو پیدا کرنے والا بنانے والا اللہ ہے، اللہ کے وجود پر بھی یہ چیزیں دال ہیں، اور اللہ کی وحدانیت پر بھی دال ہیں، اللہ کے ساتھ دوسرے کوئی آلہہ نہیں ہیں۔ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ: لَا يَعْلَمُوْنَ کو یہاں بھی آپ ارادۂ فعل کے معنی میں لے لیجئے۔ بلکہ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو جاننے کا ارادہ ہی نہیں کرتے، اس لئے ان دلائل میں غور ہی نہیں کرتے، ان کا ارادہ ہی نہیں ہے علم حاصل کرنے کا، ورنہ اگر غور کریں تو ان کو ایک ایک چیز میں اللہ تعالیٰ کی قدرت، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اللہ تعالیٰ کا احسان، اللہ تعالیٰ کا وجود بھی اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت بھی ان چیزوں سے سمجھ میں آسکتی ہے۔

اِجابتِ دُعا صرف اللہ کی شان ہے

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ: ''اَم'' اسی طرح سے آگیا جو ''اَمَّنْ'' خلق میں ہے۔ کیا تمہارے شرکاء بہتر ہیں یا وہ جو جواب دیتا ہے مضطر کو جبکہ مضطر اس کو پکارے۔ مضطر کہتے ہیں مجبور آدمی کو، جس کی ہر طرف سے آس ٹوٹ گئی اور اس کو کوئی دروازہ نظر نہیں آتا جہاں سے اس کی مشکل حل ہو، پھر وہ مجبور ہو کے، عاجز ہو کے اللہ کو پکارتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی پکار کو سنتا ہے، اس کو جواب دیتا ہے۔ پھر آگے جواب دینے کی صورتیں مختلف ہیں، مانگی ہوئی چیز دے دے، اس جیسی کوئی اور تکلیف ہٹا دے، آخرت میں ثواب کا ذخیرہ کرلے، بہرحال پکارا ہوا ضائع نہیں جاتا۔ اور پھر یہ قضیہ مہملہ کے طور پر ہے، یہ مشیت کے ساتھ مقید ہے کہ اللہ تعالیٰ قبول کرتا ہے جب چاہتا ہے، یہاں ذکر کرنے سے مقصد یہ ہے کہ اِجابتِ دُعا صرف اسی کی شان ہے، کوئی دوسرا نہیں، باقی! دُعا کو قبول کرنا، تو جیسے اس کی مشیت ہوگی، جیسے دوسری آیات میں تفصیل ذکر کی گئی۔ یا وہ بہتر ہے جو جواب دیتا ہے مضطر کو، بے کس کو، لاچار کو، جبکہ وہ بے کس اور لاچار اس کو پکارتا ہے، اور دُور ہٹاتا ہے وہ برائی کو، یعنی جس بُری حالت کے دُور ہٹانے کے لیے وہ لاچار اسے پکارتا ہے وہ اس کو دُور ہٹاتا ہے یعنی ''اِذَا شَاءَ، لِمَنْ شَاءَ'' مشیت کے ساتھ اس کو مقید کریں گے دوسری آیات کے قرینے سے۔ یہاں مقصد یہی ہے کہ یہ کام صرف وہی کرسکتا ہے جس کو علم اور قدرت پوری پوری حاصل ہے۔ اور علم اور قدرت اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کو ہے نہیں، جس کی بنا پر مضطر کی دُعا کو کوئی دُعا قبول نہیں کرسکتا سوائے اس کے، قبول وہی کرتا ہے جب بھی کرتا ہے، وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ: دُور ہٹاتا ہے وہ سختی کو، سوء سے سختی، بُری حالت مراد ہے۔ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ: اور بناتا ہے تمہیں زمین میں نائب۔ خُلَفَآءَ: خلیفہ کی جمع ہے۔ ایک کے چلے جانے کے بعد دوسرا جو نائب بنا کرتا ہے۔ تو جس کا مطلب یہ ہوگیا کہ شخصی تصرفات بھی اسی کے ہیں، قومی سطح پر بھی تصرفات اسی کے ہیں، ایک قوم مٹتی ہے دوسری قوم آ کے آباد ہوجاتی ہے۔ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ: کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہیں؟ نہیں۔ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ: تم بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہو۔

تاریکیوں میں راہنمائی کون کرتا ہے؟

اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ: ''اَم'' اسی طرح سے آگیا، (یعنی وہی عبارت یہاں بھی نکالیں گے)۔ کیا تمہارے

شرکاء بہتر ہیں یا وہ جو تمہیں راستہ دکھاتا ہے خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں۔ ظُلُمٰتِ: ظُلْمَۃٌ کی جمع۔ خشکی کی تاریکیوں میں اور سمندروں کی تاریکیوں میں۔ یعنی رات ہو جاتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ راستہ دکھاتا ہے ستاروں کے ذریعے سے، علامات کے ذریعے سے۔ جیسے سورۂ نحل میں آیا تھا وَعَلٰمٰتٍ ۚ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ (سورۂ نحل: ۱۶) ایسے ایسے نشان اللہ تعالیٰ نے قائم کردیے جن کے ذریعے سے تم راستہ معلوم کرتے ہوئے اپنی منزل تک پہنچ جاتے ہو، ورنہ جب سمندر میں اندھیرا چھا جائے، یا باہر بیابان میں اندھیرا چھا جائے، تو وہاں کیا چیز نظر آسکتی ہے، یہ سب اللہ تعالیٰ کے احسانات ہیں کہ اس نے علامات قائم کردیں، ستاروں کی روشنی دے دی، جس کے ساتھ آپ راستہ معلوم کرلیتے ہیں۔ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ: رحمت سے بارش مراد ہے، اور بُشْرًا: بشور یا بشیر کی جمع ہے، بشارت دینے والی ہیں۔ اور جو بھیجتا ہے ہوائیں اس حال میں کہ بشارت دینے والی ہیں اس کی رحمت سے پہلے، یعنی بارش سے پہلے بشارت دینے والی ہوائیں بھیجتا ہے۔ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ: کیا اللہ کے ساتھ معبود ہیں؟ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ: اللہ بلند ہے، بالاتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں، کوئی نسبت ہی نہیں ان چیزوں کی اللہ کے ساتھ جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں، اللہ کی شان بہت اونچی ہے۔ تَعٰلٰى علو والا ہے، اللہ تعالیٰ بلند شان والا ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں۔

''خالق''، ''رازِق'' صرف اللہ ہے!

اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ: تمہارے معبود بہتر ہیں یا وہ جو ابتداءً پیدا کرتا ہے، خلق کی ابتدا کرتا ہے، پیدا کرنے کی ابتدا کرتا ہے۔ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ پھر وہی اس خلق کا اعادہ کرتا ہے۔ پہلی بار پیدا کرنا بھی اسی کا کام، دوبارہ پیدا کرنا بھی اسی کا کام۔ يُعِيْدُهٗ کی ضمیر خلق کی طرف لوٹ گئی پھر وہ خلق کا اعادہ کرتا ہے۔ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ: اور جو تمہیں رزق دیتا ہے آسمان سے اور زمین سے، یعنی پیدا کرنے کے بعد تمہیں ایسے نہیں چھوڑ دیا کہ تمہاری ضروریات پوری نہ ہوں۔ ''رزق'' کے لفظ میں سب کچھ آجاتا ہے، تمام ضروریات آجاتی ہیں، روٹی، کپڑا، مکان، ہر چیز کو یہ لفظ حاوی ہے۔ پھر تمہیں رزق دیتا ہے آسمان سے اور زمین سے، یعنی تمہارے رزق کے اسباب کچھ آسمان کی طرف سے پیدا ہوتے ہیں، کچھ زمین کی طرف سے۔ زمین سے نباتات اُگتی ہے، آسمان کی طرف سے پانی برستا ہے، سورج سے گرمی اور روشنی آتی ہے، ستاروں کی روشنی پہنچتی ہے، چاند کی روشنی پہنچتی ہے، جس طرح سے جدید تحقیقات کا نتیجہ ہے کہ اس فصل کے پکنے میں ان سب چیزوں کا اثر ہے، ہواؤں کا چلنا، ستاروں کی روشنی کا پہنچنا، چاند کی روشنی کا پہنچنا، یہ پھولوں میں رنگت، پھلوں میں مٹھاس چاند کے ذریعے سے اللہ تبارک وتعالیٰ پیدا فرماتے ہیں، ظاہری طور پر اس کو ذریعہ بنادیا۔ اسی طرح سے بعض نباتات کا تعلق بعض ستاروں کے ساتھ ہے کہ ان کے طلوع ہونے کے زمانے میں وہ نباتات اُگتی ہے، یا عروج کو پہنچتی ہے، اور سورج کی روشنی اور گرمی تو ہر وقت ضرورت کی چیز ہے، تو یہ آسمان کی طرف سے تمہارے لئے رزق کے اسباب مہیا ہوتے ہیں، اسی طرح سے مختلف قسم کی ہواؤں کا چلنا، بادلوں کو لانا، پانی کا برسنا۔ دیکھو! یہ سب کائنات متحرک ہے، آپ لوگوں کو روزی مہیا کرنے کے لئے، سب خادموں کی طرح لگے ہوئے ہیں۔ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ: کیا اللہ کے ساتھ اور معبود بھی ہیں؟

''دلیل'' مثبت کے ذِمّے ہے

قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ: برھان دلیلِ قطعی کو کہتے ہیں، یعنی یہ تو ثابت ہی ہے، تم بھی مانتے ہو، ہم بھی مانتے ہیں کہ اللہ کا وجود تو ہے۔ جو بات دونوں کے نزدیک مسلّم ہے اس پر تو دلیل کا مطالبہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں کہ مشرک ہم سے کہیں کہ تم ثبوت دو کہ اللہ ہے، اللہ کو تو وہ بھی مانتے ہیں، چونکہ یہاں گفتگو مشرکینِ مکہ سے ہے۔ اب جو اللہ کے ساتھ اور ٹھہرائے وہ ہے مُثبِت، اور برھان مثبت کے ذمّے ہوتی ہے، جو زیادتی ثابت کرنا چاہتا ہے وہ دلیل دے، اس لیے ہمیشہ دلیل مثبت کے ذمّے ہوتی ہے موحد کے ذمّے نہیں، مشرک دلیل دے کہ اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا بھی ان کاموں میں شریک ہے، تو ہم اس دلیل کے اوپر گفتگو کریں گے کہ اس کی دلیل صحیح ہے یا غلط؟ جس کے بارے میں قرآنِ کریم بار بار یہ صراحت کرتا ہے کہ ان کے پاس نہ کوئی نقلی دلیل ہے نہ عقلی، نقلی دلیل سے بھی خالی ہیں عقلی دلیل سے بھی خالی ہیں، تو دعویٰ بلا دلیل کون سنتا ہے۔ باقی! اللہ تعالیٰ کے وجود پر یہ سب چیزیں دال ہیں، لیکن ہمیں ضرورت نہیں، کیونکہ مشرکین بھی اس بات کو مانتے ہیں..... اللہ کے وجود میں مشرکینِ مکہ کا کوئی اختلاف نہیں تھا، اور کسی مشرک قوم کا بھی اختلاف نہیں تھا، مشرک تو ہوتا ہی وہی ہے جو اللہ کو بھی مانے اور اللہ کے ساتھ دوسرے کو بھی مانے۔ اور ایسے کافر بددماغ کہ سرے سے اللہ کے وجود کے ہی قائل نہ ہوں، یہ گزشتہ صدیوں میں بہت نادر شاذ کالمعدوم والی بات ہے کہ کروڑوں میں سے کبھی کوئی ایک انسان اس قسم کا آ گیا جس کا دماغ بھیجے سے خالی ہو، کہ وہ کہے کہ اللہ کا وجود ہی نہیں، جو کچھ ہو رہا ہے یہ خود بخود ہی ہو رہا ہے..... انکارِ خداوالا معاملہ چودھویں صدی کی پیداوار ہے، جس طرح سے روسی تہذیب نے اس بات کو اُٹھایا، روس خدا کے وجود کا منکر ہے، یہ اللہ کے وجود کا ہی قائل نہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ خود بخود ہی ہوتا چلا جا رہا ہے، پچھلی صدیوں میں اس قسم کے لوگ ناپید تھے، کروڑوں میں کبھی کوئی ایک ہوا، جس کے دماغ میں خلل ہوا اس نے کوئی اس قسم کی بات کہہ دی، ورنہ جتنے آسمانی مذاہب ہیں وہ تو اللہ کو مانتے ہیں، اور وحدہٗ لاشریک مانتے ہیں، اور جتنی مشرک قومیں گزری ہیں وہ اللہ کو مانتی تھیں لیکن اس کے ساتھ اضافہ کرتے ہیں، اُن سے یہ گفتگو ہو رہی ہے کہ تمہارے پاس اس اضافے کی کیا دلیل ہے؟ باقی جتنی بات ہم کہتے ہیں وہ تو تمہارے نزدیک بھی مسلّم ہے..... جس طرح سے کسی عیسائی کے ساتھ اگر گفتگو ہو تو عیسائی کا دعویٰ ہے کہ خدا تین ہیں اور مسلمان کا دعویٰ ہے کہ خدا ایک ہے، اب وہ ایک کے متعلق دلیل مانگے کہ تیرے پاس کیا دلیل ہے کہ اللہ ایک ہے، تو یہ علمِ مناظرہ کے اُصول سے بات غلط ہے، ایک پہ دلیل نہیں مانگی جا سکتی کہ اللہ ایک ہے، کیونکہ جتنا ہم مانتے ہیں اتنا تو تُو بھی مانتا ہے تو دلیل کی کیا ضرورت؟ دیکھو! میں کہتا ہوں کہ آپ کی جیب میں ایک روپیہ ہے اور آپ کہتے ہیں نہیں، میری جیب میں تین روپے ہیں، تو آپ اس کی دلیل مجھ سے نہیں مانگ سکتے کہ میری جیب میں ایک روپیہ ہے، اس کی دلیل دو۔ جب تُو نے تین کا قول کر دیا تو ایک تو ہے ہی، اب آگے اس کے اوپر دو کا اگر آپ اضافہ کرتے ہیں تو اس اضافے کی دلیل چاہیے کہ دو اور ہونے کی کیا دلیل ہے؟..... اس لئے دلیل ہمیشہ مثبت کے ذمّے ہوتی ہے، منکر کے ذمّے نہیں ہوتی، ہم اضافے کے منکر ہیں اور وہ مثبت ہیں، اور قرآن بار بار کہتا ہے کہ انہیں کہو کہ دلیل لے آؤ، نہ ان کے پاس کوئی علمی دلیل ہے نہ عقلی دلیل ہے، نہ نقلی نہ عقلی، کچھ بھی

نہیں۔ اور یہاں بھی یہی بات ہے کہ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ: ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ کے ساتھ اس کا تعلق ہے۔ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہیں؟ ہم کہتے ہیں کہ نہیں، تم کہتے ہو کہ ہیں، اگر تمہاری یہ بات صحیح ہے تو بُرہان لے آؤ، کوئی دلیل پیش کرو، اور دلیل سے معاملہ خالی ہے، نہ عقل کے ساتھ اثبات کیا جاسکتا ہے کہ اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا بھی ان صفات میں شریک ہے، اور نہ کوئی نقل ہی پیش کی جاسکتی ہے کہ سابق لوگوں سے صحیح طور پر کوئی علمی دلیل چلی آ رہی ہو، یا اللہ تعالیٰ نے اُتاری ہو، مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ (سورۂ یوسف: ۴۰، سورۂ نجم: ۲۳) بار بار قرآن نے اعلان کیا کہ اللہ نے تو اس معاملے میں کوئی دلیل اُتاری ہی نہیں،[1] اللہ کی کتابیں بھی اس دلیل سے خالی ہیں، تو اس لئے بُرہان کا مطالبہ ان سے کیا جا رہا ہے، قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ: برھان کہتے ہیں دلیل قطعی کو، یقینی دلیل جس میں شبہ کی گنجائش نہ ہو۔ لے آؤ تم اپنی بُرہان اگر تم سچے ہو۔

''عالم الغیب'' صرف اللہ ہے

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ: جس طرح سے پیچھے قدرت کی نفی آ گئی کہ اللہ کے علاوہ کسی کو قدرت نہیں ان سب کاموں پہ جن کا ذکر کیا گیا۔ آگے علم کی نفی کی جا رہی ہے کہ اس کے علاوہ علم بھی کسی دوسرے کو نہیں۔ اور علم اور قدرت یہی دو صفتیں امہات صفات میں شامل ہیں کہ پہلے علم حاصل ہوا کرتا ہے پھر قدرت حاصل ہوتی ہے، تو اس کے بعد جا کے پھر انسان کام کرسکتا ہے، اور اگر علم کسی چیز کا نہیں تو بھی کچھ نہیں کرسکتا، اگر علم ہے قدرت نہیں تو بھی کچھ نہیں کرسکتا، تو علم اور قدرت دونوں چیزیں اللہ کے لئے ثابت ہیں کسی اور کے لئے نہیں۔ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ: آپ کہہ دیجئے نہیں جانتا غیب کو (اَلْغَيْبَ یہ لَا يَعْلَمُ کا مفعول ہے) نہیں جانتا غیب کو جو کوئی آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، چاہے آسمانوں میں رہنے والے ہوں یعنی فرشتے، یا زمین میں بسنے والے ہوں یعنی انسان اور جن، اور باقی مخلوق کے متعلق تو کیا ہی کہنا، ان میں سے غیب کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ کے، غَابَ يَغِيْبُ: چھپنا۔ غیب کا لفظ بول کے مراد ہوا کرتی ہے: پوشیدہ چیز۔ ''پوشیدہ چیز'' سے ایسی چیز مراد ہے جس کے اوپر ظاہر میں کوئی دلیل قائم نہیں، بغیر کسی دلیل کے، بغیر کسی کے بتانے کے جان لینا کسی چیز کو، یہ اللہ کا کام ہے کسی دوسرے کا کام نہیں ہے۔

کیا اِستدلال سے حاصل شُدہ علم، علمِ غیب ہے؟

ہاں! البتہ اللہ جتنا کسی کو بتانا چاہے اتنا بتاتا ہے، جس کے اوپر دلیل قائم کردے وہ چیز ظاہر ہوجاتی ہے۔ دلیل کے ساتھ کسی چیز کو سمجھا جائے، تو اللہ کے دلائل قائم کیے ہوئے ہیں، اللہ کے قرینے قائم ہیں، جس طرح سے ہواؤں کا رُخ دیکھ کر یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ بادل آئے گا، آندھی آئے گی، یا یہ جو اللہ تعالیٰ نے قرائن قائم کردیے زمین و آسمان کی حرکات کے کہ پہلے معلوم کر لیتے ہیں کہ فلاں وقت سورج گہن لگے گا، فلاں وقت میں چاند کو گہن لگے گا، یہ دلائل سے اخذ کی ہوئی بات ہے۔ یا اسی طرح قواعد کے ذریعے جاننا، جیسے طبیبوں نے قواعد تجربے کے ساتھ بنا لیے، اللہ تعالیٰ نے سمجھ دی، تو نبض کو دیکھ کے معلوم کر لیتے ہیں کہ

---

(۱) لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا (آل عمران: ۱۵۱، الاعراف: ۳۳، الحج: ۷۱)، لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا (الانعام: ۸۱)، مَا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ (الاعراف: ۷۱)

اس کے اندر کون سی بیماری ہے، کون سی تکلیف ہے، یا چہرے کی رنگت کو دیکھ کر استدلال کرلیا کہ اس کے اندر کیا کیفیت ہے؟ یا آنکھوں کی رنگت دیکھ کے اِستدلال کرلیا، یہ جو"اِستدلال" سے علم حاصل ہوتا ہے قرائن کے ساتھ، اس کو"علمِ غیب" نہیں کہتے...... غیب کا جاننا وہ ہوتا ہے کہ ایک چھپی ہوئی چیز ہے، وہ بغیر کسی کے بتائے، بغیر کسی قرینے اور دلیل کے، اِستدلال کے، اس کو سمجھا جائے، اس کو جانا جائے، یہ صرف اللہ کی شان ہے، کسی دوسرے کی نہیں۔ ہاں! البتہ اللہ اطلاع دیتا ہے، اور جتنا اللہ کسی کو بتلادے اتنا پتا چل جاتا ہے۔ اب خیال فرمائیے!...... یہ مبصرات ہیں، یعنی بعض چیزیں دیکھنے کی، اللہ تعالیٰ نے ان کے دیکھنے کا ذریعہ ہماری آنکھ کو بنادیا، آنکھ پیدا کردی، یہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے جو ہمیں مل گیا، اور اس عطیے کو اب ہم استعمال کرتے ہیں، کہ جب چاہیں ہم یوں کر کے آنکھ کھولتے ہیں، اور جو چیز ایک حد تک، چند حدود اور قیود کے اندر، مثلاً میں اس دیوار کے اِدھر دیکھ سکتا ہوں، پرلی طرف نہیں دیکھ سکتا، یا کھلے میدان میں بھی کھڑا ہوں تو ایک میل تک، پونے میل تک، سوا میل تک دیکھ سکتا ہوں، اس سے آگے نہیں دیکھ سکتا، چیز ایک خاص فاصلے پہ ہو تو دیکھ سکتا ہوں، آنکھ کے زیادہ قریب آجائے تو نہیں دیکھ سکتا، زیادہ دُور چلی جائے تو بھی نہیں دیکھ سکتا، یہ بہت ہی ناقص سی صفت ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں دیکھنے کے لئے دی ہے، جس کی بنا پر ہم بینا ہو گئے، ہم دیکھنے والے کہلاتے ہیں، ہم "بصیر" کہلاتے ہیں، یہ صفت ایک ناقص سی ہے، اور اللہ نے ہمیں دی ہے، اور اس کا منبع ہماری آنکھ کو بنادیا، تو ہم جب چاہیں یوں کر کے آنکھ کھولتے ہیں تو ایک ناقص سی بصارت ہمیں حاصل ہے جس سے ہم کچھ مبصرات معلوم کر لیتے ہیں، اور یہی صفت ہمارے کان کی ہے، تو یہ اللہ کا عطیہ ہے۔

نہ غیب کے اُصول کسی کے پاس ہیں، نہ ذرائعِ علم کسی کے اختیار میں ہیں

غیب کو جاننے کے لئے اللہ تعالیٰ کسی کو ایسا اصول دے دے، اس کی بھی نفی آئی ہے: وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ (سورۂ اَنعام:۵۹) غیب کے اُصول اللہ کے پاس ہیں، ہاں! البتہ اطلاع اللہ دیتا ہے، اُصول کسی کو نہیں دیا، "اُصول" کا مطلب یہ ہے کسی کو ایسی صفت دے دی کہ وہ جب چاہے اس کو استعمال کرے اور غیب کو معلوم کرلے، ایسی صفت بھی کسی کو نہیں دی۔ اطلاع کا ثبوت قرآنِ کریم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اپنے رسولوں میں سے غیب پہ مطلع کرتا ہے۔ مطلع کرنے کو آپ اس طرح سے سمجھ لیں کہ جیسے غیب کے اُوپر اطلاع پانے کا ایک ذریعہ خواب بھی ہے، غیب کے اوپر اطلاع پانے کا ایک ذریعہ وحی بھی ہے، اور اسی طرح غیب کے اوپر، چھپی ہوئی چیز کے اوپر اطلاع پانے کا ایک ذریعہ کشف بھی ہے، لیکن یہ ساری کی ساری چیزیں ایسی ہیں کہ کسی انسان کے بس میں نہیں کہ جب چاہے خواب دیکھ لے، جب چاہے وحی اُتار لے، اور جب چاہے اس کو کشف ہوجائے، اللہ تعالیٰ وقتی طور پر ایک جزوی واقعہ کی اطلاع وحی کے ذریعے سے بھی دیتا ہے، کشف کے ذریعے سے بھی معلوم ہوجاتی ہے، خواب کے ذریعے سے بھی آنے والے واقعات معلوم ہوجاتے ہیں، یا گزرے ہوئے واقعات معلوم ہوجاتے ہیں، لیکن یہ انسان کے اختیار میں نہیں، آپ کو بھی خواب آسکتا ہے کہ آج سے دس سال بعد میں ہونے والا واقعہ آج آپ کو خواب میں دکھادیا جائے، یا سو سال پہلے گزرا ہوا واقعہ جو آپ کے لئے ایک غائب چیز ہے، وہ آپ کو خواب میں دکھادیا جائے، ایسا ممکن ہے، لیکن کیا آپ

کے اختیار میں ہے کہ آپ جب چاہیں خواب دیکھ لیں؟ اسی طرح سے انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے سے اطلاع دیتا ہے، وحی کا اُترنا انبیاء علیہم السلام کے اختیار میں نہیں، خوابوں کے ذریعے سے اطلاع دیتا ہے لیکن خواب کا آنا کسی کے اختیار میں نہیں، اسی طرح سے کشف ہوجاتا ہے، کشف بھی ایک چیز ہے کہ دل کے سامنے سے پردے اٹھ جاتے ہیں اور آنے والی چیز معلوم ہوجاتی ہے، وہ بھی ایک جزوی چیز ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے منکشف کردیتا ہے، جب نہیں چاہتا نہیں ہوتی، تو یہ جو جزوی واقعات معلوم ہوتے ہیں، چاہے وہ کروڑوں کی تعداد تک پہنچ جائیں، اس کو اطلاع علی الغیب تو کہہ سکتے ہیں، اس سے علمِ غیب کی صفت حاصل نہیں ہوتی، ان چیزوں کی بنا پر کسی کو عالم الغیب نہیں کہا جاسکتا، یعنی ایسی استعداد اللہ تعالیٰ نے کسی کے قلب میں پیدا نہیں فرمائی کہ وہ جب چاہے جو چاہے جہاں سے چاہے جان لے، یہ صفت اللہ کا خاصہ ہے، اس لئے عطیے کے طور پر بھی ایسی صفت کسی کے پاس نہیں ہے کہ اس کے پاس اصل آگیا ہو، اصول آگیا ہو، کہ وہ جب چاہے اس سے غیب کی بات معلوم کرلے، اس قسم کی صفت کسی انسان میں اللہ نے قائم نہیں فرمائی، اطلاع کے ذریعے سے چاہے لاکھوں کروڑوں جزئیات بتادے، جزئیات کے لحاظ سے انبیاء علیہم السلام کا علم اللہ تعالیٰ کے علم کے بعد تمام کائنات سے زیادہ ہے، لیکن جہاں تک اصول کا تعلق ہے، غیب کے اصول اللہ نے کسی کو نہیں دیے، اور ان جزئیات کے جاننے کی وجہ سے کسی کو عالم الغیب نہیں کہا جاسکتا، اس صفت کے ساتھ موصوف نہیں کیا جاسکتا۔

غیب کی نسبت کو حضور ﷺ نے اپنی طرف گوارا نہیں کیا

حدیث شریف میں آتا ہے، ''مشکوٰۃ شریف'' میں ''کتاب النکاح'' میں روایت ہے، ویسے ''بخاری'' میں بھی ہے کہ شادی کے ایک موقع پر حضور ﷺ کسی کے گھر تشریف لے گئے، تو وہاں بچیاں کچھ شعر پڑھ رہی تھیں، عرب کے اندر چھوٹے بڑے سب شاعر ہوتے تھے، اور ان کو شعر پڑھنے کا بڑا ملکہ ہوتا تھا، اور ان کے آباء جو جنگِ بدر کے اندر شہید ہوئے تھے، ان کے متعلق وہ مرثیہ کہہ رہی تھیں، ان کے متعلق کوئی اچھی تعریفیں صفتیں بیان کررہی تھیں، جس کو ''نُدبہ'' کرنا کہتے ہیں، تو پڑھتے پڑھتے ان میں سے ایک بچی نے یہ کہہ دیا: ''فِیْنَا نَبِیٌّ یَعْلَمُ مَا فِیْ غَدٍ'' ہم میں ایک ایسا نبی موجود ہے جو آنے والے حالات کو جانتا ہے، اتنی اس نے بات کی، آپ ﷺ نے فوراً اس سے کہا: ''دَعِیْ هٰذِهٖ''[1] یہ بات چھوڑ دو، وہی باتیں کہو جو تم پہلے کہہ رہی تھی، یعنی جو کچھ کہنا ہے اپنے آباء کے متعلق کہو، لیکن یہ نہ کہو، اس بات کو چھوڑ دو۔ حضور ﷺ نے اس نسبت کو اپنی طرف گوارا ہی نہیں فرمایا، تو لہٰذا جزئیات اگر لاکھوں کروڑوں بھی معلوم ہوجائیں اس کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا کہ علم کی یہ صفت حاصل ہوگئی کہ جب چاہیں جو چاہیں جان لیں، یہ خاصہ اللہ کا ہے...... تو یہاں یہ صاف طور پر آگیا کہ آپ کہہ دیجئے کہ غیب کوئی نہیں جانتا، جو کوئی آسمانوں میں ہے اور جو کوئی زمین میں ہے، نہ کوئی فرشتہ اور نہ زمین میں بسنے والا کوئی نبی پیغمبر، ولی، یا مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے اندر جنات بھی آگئے، اور باقی مخلوق کے متعلق تو کسی نے کیا ہی کہنا ہے، یہ مخلوق بھی ساری کی ساری ایسی ہے جو غیب کو نہیں جانتی سوائے اللہ کے، غیب کو جاننا صرف اللہ کا کام ہے۔

---

(۱) بخاری ج ۲ ص ۷۷۳، باب ضرب الدف۔ ترمذی ۱/۲۰۷ باب ما جاء فی اعلان النکاح۔ مشکوٰۃ ۲/۲۷۱ باب اعلان النکاح کی پہلی حدیث

علمِ غیب کے متعلق حضرت شیخ الاسلامؒ کی تحقیق

اسی پر ہی حضرت شیخ الاسلام لکھتے ہیں ''شروع پارہ سے یہاں تک حق تعالیٰ کی قدرتِ تامہ اور رحمت عامہ اور رُبوبیتِ کاملہ کا بیان تھا، یعنی جب وہ ان صفات وشیون میں منفرد ہے تو اُلوہیت ومعبودیت میں بھی منفرد ہونا چاہیے، آیتِ حاضرہ میں اس کی اُلوہیت پر دوسری حیثیت سے اِستدلال کیا جارہا ہے، یعنی معبود وہ ہوگا جو قدرتِ تامہ کے ساتھ علم کامل اور محیط بھی رکھتا ہو، اور یہ وہ صفت ہے جو زمین وآسمان میں کسی مخلوق کو حاصل نہیں، اسی رَبّ العزت کے ساتھ مخصوص ہے۔ پس اس اعتبار سے بھی معبود ماننے کی مستحق اکیلی اس کی ذات ہوئی، کل مغیبات کا علم بجز خدا کے کسی کو حاصل نہیں، نہ کسی ایک غیب کا علم کسی شخص کو بالذات، بدوں عطائے الٰہی کے ہوسکتا ہے، اور نہ مفاتیحِ غیب (غیب کی کنجیاں جن کا ذکر سورۂ اَنعام میں گزر چکا) اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کو دی ہیں۔ ہاں! بعض بندوں کو، بعض غیوب پر باختیارِ خود مطلع کردیتا ہے، جس کی وجہ سے کہہ سکتے ہیں کہ فلاں شخص کو حق تعالیٰ نے غیب پر مطلع فرمادیا، یا غیب کی خبر دے دی، لیکن اتنی بات کی وجہ سے قرآن وسُنّت نے کسی جگہ ایسے شخص پر ''عالم الغیب'' یا ''فلَانٌ یَعْلَمُ الْغَیْبَ'' کا اطلاق نہیں کیا، بلکہ احادیث میں اس پر انکار کیا گیا ہے۔ کیونکہ بظاہر یہ الفاظ اِختصاصِ علمِ غیب بذاتِ باری کے خلاف موہم ہوتے ہیں، اس لئے علمائے محققین اجازت نہیں دیتے کہ اس طرح کے الفاظ کسی بندے پر اطلاق کئے جائیں گو لغۃً صحیح ہوں۔'' یعنی کسی ایک بات کے جاننے کی وجہ سے جب اللہ تعالیٰ دے دے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ غیب ہمیں بھی معلوم ہوگیا، لیکن اس بات کے باوجود آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ''اَنَا اَعْلَمُ الْغَیْبَ'' یا ''فُلَانٌ یَعْلَمُ الْغَیْبَ'' یا ''فلَانٌ عالمُ الغیب'' یہ لفظ استعمال نہیں کئے جاسکتے، یہ عرفِ شریعت کے خلاف ہے۔'' ''کسی کا یہ کہنا کہ اِنَّ اللہَ لَا یَعْلَمُ الْغَیْبَ، اللہ کو غیب کا علم نہیں گو اس کی مراد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے اعتبار سے کوئی چیز غیب ہی نہیں، سخت ناروا اور سوءِ ادب ہے۔'' یعنی اِصطلاحاتِ شریعت کو بدلا نہیں جاسکتا، اب کوئی شخص کہے کہ اللہ کے سامنے تو کوئی چیز پوشیدہ ہے ہی نہیں، اس لئے اللہ کو تو یہ کہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ غیب نہیں جانتا کیونکہ غیب تو اس کے نزدیک کوئی چیز ہے ہی نہیں، اس قسم کی تحریفات بھی لوگ کرتے ہیں عنوانات میں، کہ غیب جاننا تو کام ہی انسان کا ہے۔ اللہ کے نزدیک تو غیب ہے ہی کوئی نہیں کہ اللہ کے متعلق ہم کہیں کہ وہ غیب جانتا ہے، اس قسم کے عنوانات، یہ تحریفِ قرآن کے مترادف ہیں۔ حضرت شیخ الاسلام جس طرح سے یہ لفظ آگے بول رہے ہیں کہ کوئی شخص ''حق'' سے ''موت'' مراد لے لے اور یہ کہے کہ ''موت حق ہے!'' یہ واقعہ ہے۔ اور ''فتنے'' سے ''اولاد'' مراد لے، اور ''رحمت'' سے ''بارش'' مراد لے اور یہ کہے کہ ''اِنِّی اَکْرَہُ الْحَقَّ وَاُحِبُّ الْفِتْنَۃَ وَاَفِرُّ مِنَ الرَّحْمَۃِ'' یعنی ''میں حق کو بُرا سمجھتا ہوں، فتنے کو محبوب رکھتا ہوں، رحمت سے بھاگتا ہوں'' اب اگرچہ اس کی مراد اپنے الفاظ میں صحیح ہے کہ ''حق'' سے اس نے ''موت'' مراد لی تو ''اَکْرَہُ الْحَقَّ'' کا معنی ہوگیا، ''میں حق کو مکروہ جانتا ہوں'' یعنی ''موت کو مکروہ جانتا ہوں۔'' اور ''فتنے'' سے اس نے ''مال اور اولاد'' مراد لے لی، ''اُحِبُّ الْفِتْنَۃَ''، ''میں فتنے سے محبت رکھتا ہوں'' یعنی ''مال واولاد سے محبت رکھتا ہوں''، اور ''رحمت'' سے ''بارش'' مراد لے کے کہے کہ ''اَفِرُّ مِنَ الرَّحْمَۃِ''، ''میں رحمت سے بھاگتا ہوں'' تو آپ جانتے ہیں کہ یہ الفاظ سارے کے سارے

خلاف ادب ہیں اور اس قسم کے عنوانات اختیار کرنا ٹھیک نہیں،" یہ لفظ استعمال کرنا سخت مکروہ اور قبیح ہے حالانکہ باعتبار نیت اور مراد کے قبیح نہ تھا۔ اسی طرح سے "فلانٌ عالمُ الغیب" وغیرہ الفاظ کو سمجھ لو۔ اور واضح رہے کہ علم غیب سے ہماری مراد محض ظنون، تخمینات نہیں، اور نہ وہ علم جو قرائن و دلائل سے حاصل کیا جائے۔" اسی کی تفصیل میں نے آپ کی خدمت میں عرض کی ہے" بلکہ جس کے لیے کوئی دلیل اور قرینہ موجود نہ ہو وہ مراد ہے۔ سورۂ اَنعام واَعراف میں اس کے متعلق کسی قدر لکھا جا چکا ہے، وہاں مراجعت کرلی جائے۔" (تفسیر عثمانی)۔ تو یہی مضمون ہے جو آپ کی خدمت میں میں نے عرض کیا کہ کسی دلیل یا قرینے سے علم حاصل کرنا، اس کو "علم غیب" نہیں کہتے، یا جو تخمینے لگا لیتے ہیں لوگ، اندازے لگا لیتے ہیں، وہ بھی "علم غیب" نہیں، جس چیز کے جاننے کے لئے کوئی قرینہ نہیں، کوئی دلیل اللہ نے قائم نہیں کی، اس کا جاننا صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطلاع ہوتی رہتی ہے، جس میں کروڑہا جزئیات اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء ﷺ پر اور اپنے اپنے درجے کے مطابق اولیاء پر کشف کے ذریعے سے منکشف کر دیتے ہیں، لیکن اس کو "علم غیب" نہیں کہتے۔ وحی بھی اس کا ذریعہ ہے، کشف بھی اس کا ذریعہ ہے، خواب بھی اس کا ذریعہ ہے، لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی انسان کے اختیار میں نہیں، اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کو ایسا ملکہ نہیں دیا جس کو "مفاتح الغیب" سے تعبیر کر سکیں کہ انسان جب چاہے جو چاہے جان لے، یہ صفت اللہ کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہے، اس قسم کی صفات کا غیر کے لئے ثابت کرنا شرک ہے۔

"مشرک" شکوک وشبہات کا سہارا لیتے ہیں

وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ: اور ان کو پتا ہی نہیں کہ یہ کب اُٹھائے جائیں؟ یعنی اللہ کے علاوہ جو کچھ بھی آسمان اور زمین میں موجود ہیں وہ سارے کے سارے ایسے ہیں کہ ان کو پتا ہی نہیں کہ وہ کب اُٹھائے جائیں گے۔ قیامت کب آئے گی؟ کسی کو علم حاصل نہیں ہے۔ بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ: اِدّٰرَكَ اصل میں تَدَارَكَ تھا، اس کا معنی ہوتا ہے ایک دوسرے سے ملنا، اور جب مختلف چیزیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں تو گڈمڈی ہو جاتی ہیں، خلط ملط سی ہو جاتی ہیں، تو یہاں یہ کہا جا رہا ہے کہ بلکہ ان لوگوں کا علم آخرت کے بارے میں گڈمڈ ہو گیا، خلط ملط ہو گیا، کوئی حقیقت ان کے سامنے واضح نہیں، یعنی مشرکین کا ذہن اس قسم کا تھا کہ وہ آخرت کو ماننے کے لئے بھی تیار نہیں تھے، لیکن انکار کرنے کی بھی گنجائش نہیں تھی، جس طرح سے ایک تردد کی کیفیت پیدا ہوتی جاتی ہے، اور اس آخرت کے عقیدے سے بچنے کے لیے وہ شکوک وشبہات کا سہارا لیتے ہیں، اور دلائل حقہ سے آنکھیں بند کرتے ہیں، یعنی جو دلائل بیان کئے جائیں کسی چیز کو ثابت کرنے کے لئے اُن سے آنکھیں بند کرتے ہیں تو یہی کیفیت ان کی بیان کی گئی، کہ یہ لوگ آخرت کے قائل نہیں ہوتے بلکہ ان کا علم خلط ملط ہو گیا آخرت کے بارے میں، بلکہ یہ اس کے متعلق شک میں ہیں، یعنی شکوک وشبہات کا سہارا لے کر یہ اس کا انکار کرنا چاہتے ہیں، بلکہ یہ اس کی طرف سے بالکل ہی اندھے ہیں، جو دلائل اس آخرت کو ثابت کرتے ہیں، جو اس کے امکان کے دلائل ہیں، یہ ان سے آنکھیں بند کرتے ہیں۔ یہ مشرکین کے عقیدۂ آخرت کی

وضاحت ہے کہ ان کا علم فنا ہوگیا آخرت کے بارے میں، گڈمڈ ہوگیا، ان کو کوئی صحیح علم حاصل نہیں، کبھی ان کا ذہن ادھر کو متوجہ ہوتا ہے، کبھی اُدھر کو متوجہ ہوتا ہے جس طرح سے ایک متردّد شخص کی کیفیت ہوا کرتی ہے، جب ایک حقیقت کو نہ ماننے کی ٹھان لی جائے کہ ہم نے اس کو ماننا ہی نہیں، تو پھر انسان اس میں شکوک وشبہات پیدا کر کے اپنے دل کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرا درجہ یہ ہوا کرتا ہے جس کو یہاں ''شک'' کے ساتھ تعبیر کیا۔ اور پھر جس وقت آپ نے تہیہ کرلیا کہ میں نے اس کو ماننا نہیں ہے تو جو دلائل اس کو ثابت کریں گے، ان سے انسان آنکھیں بند کرتا ہے، ان سے اندھا بنتا ہے۔ تیسرے نمبر پہ اس کا ذکر آ گیا کہ'' بلکہ اس کی طرف سے اندھے ہیں۔''

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَآؤُنَآ اَىِٕنَّا لَمُخْرَجُوْنَ ۝۶۷ لَقَدْ

کہا ان لوگوں نے جنہوں نے کفر کیا: کیا جس وقت ہم مٹی ہوجائیں گے، اور ہمارے آباء بھی، کیا ہم نکالے جائیں گے ﴿۶۷﴾ البتہ تحقیق

وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۶۸ قُلْ

وعدہ کئے گئے اس بات کا ہم بھی اور ہمارے آباء بھی اس سے قبل، نہیں ہیں یہ مگر پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ﴿۶۸﴾ آپ کہہ دیجئے

سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ۝۶۹ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ

کہ زمین میں چلو پھرو پھر تم دیکھو کہ کیسا انجام ہوا جرم کرنے والوں کا ﴿۶۹﴾ آپ ان پہ غم نہ کیجئے

وَلَا تَكُنْ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ۝۷۰ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۷۱

اور تنگی میں نہ ہو جائیے ان کی تدبیروں سے ﴿۷۰﴾ اور یہ کہتے ہیں کہ کب ہوگا یہ وعدہ اگر تم سچے ہو ﴿۷۱﴾

قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝۷۲ وَاِنَّ رَبَّكَ

آپ کہہ دیجئے ہوسکتا ہے کہ جس عذاب کو تم جلدی طلب کررہے ہو اس کا بعض حصہ تمہارے پیچھے ہی آ لگا ہو ﴿۷۲﴾ بے شک تیرا رب

لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝۷۳ وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا

البتہ مہربانی والا ہے لوگوں پر لیکن ان میں سے اکثر شکر گزار نہیں ﴿۷۳﴾ اور بے شک تیرا رب البتہ جانتا ہے اُن باتوں کو

تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝۷۴ وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِيْ

جن کو ان کے سینے چھپاتے ہیں اور جن کو یہ ظاہر کرتے ہیں ﴿۷۴﴾ نہیں ہے کوئی چیز چھپنے والی آسمانوں میں اور زمین میں مگر

كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۷۵﴾ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ

وہ واضح کتاب میں ہے ⑮ بے شک یہ قرآن بیان کرتا ہے بنی اسرائیل پر اکثر وہ باتیں جن میں یہ لوگ

يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۷۶﴾ وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۷﴾ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ

اختلاف کرتے ہیں ⑯ بے شک یہ قرآن البتہ راہنمائی اور رحمت ہے مؤمنین کے لئے، بے شک تیرا رب البتہ فیصلہ کرے گا ان کے درمیان

بِحُكْمِهٖ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ﴿۷۸﴾ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ﴿۷۹﴾

اپنے حکم کے ساتھ، وہ زبردست ہے، علم والا ہے ⑱ پس آپ اللہ پہ بھروسا کیجئے، بے شک آپ صریح حق پر ہیں ⑲

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۸۰﴾ وَمَآ اَنْتَ

بے شک آپ نہیں سنا سکتے مردوں کو اور نہیں سنا سکتے بہروں کو پکار جب وہ بہرے پیٹھ پھیر کر جا رہے ہوں ⑳ اور نہیں ہیں آپ

بِهٰدِي الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ

اندھوں کو راستہ دکھانے والے، ان کی گمراہی سے بچا کر، نہیں سنا سکتے آپ مگر انہی کو جو ایمان لانے کا ارادہ رکھتے ہیں ہماری آیات پر، پھر وہ

مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ

فرماں بردار بنتے ہیں ㉑ اور جس وقت ان لوگوں پر قول واقع ہوجائے گا تو نکالیں گے ہم ان کے لئے ایک چوپایہ زمین سے،

تُكَلِّمُهُمْ ۙ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۸۲﴾

وہ ان لوگوں سے کلام کرے گا، کہ بے شک لوگ ہماری آیات پہ یقین نہیں لاتے تھے ㉒

تفسیر

کُفّار کی طرف سے اِنکارِ آخرت

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: اب یہی ہیں وہ دلائل جن کی بنا پر وہ شک پیدا کرتے تھے آخرت کے معاملے میں، بس اسی قسم کے توہمات ہیں۔ کہا ان لوگوں نے جنہوں نے کفر کیا، ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا: کیا جس وقت ہم مٹی ہو جائیں گے؟ وَاٰبَآؤُنَآ: اور ہمارے آباء بھی، اَئِنَّا لَمُخْرَجُوْنَ کیا ہم نکالے جائیں گے؟ یعنی ہمیں زمین سے دوبارہ نکالا جائے گا، پیدا کیا جائے گا؟ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ: البتہ تحقیق وعدہ کئے گئے اس بات کا ہم بھی اور ہمارے آباء بھی اس سے قبل۔ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ: نہیں

ہیں، یہ تو پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں جو منقول چلے آرہے ہیں یعنی اس قسم کی باتیں ہمارے آباء کے سامنے بھی لوگوں نے کی تھیں، ان کے ساتھ بھی یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ مرنے کے بعد تمہیں دوبارہ نکالا جائے گا لیکن آج تک ایسا ہوا تو نہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ باتیں ہی باتیں ہیں جو پہلوں سے چلی آرہی ہیں۔ یہ کافروں کی بات ہے، اس طرح سے وہ اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یوں شبہات پیدا کر کے کہ اگر یہ کوئی واقعہ ہوتا تو ہمارے آباء کے ساتھ جس طرح سے وعدہ کیا گیا ہے تو کم از کم کوئی واقعہ پیش تو آتا کہ ہم دیکھ لیتے۔

''منکرینِ آخرت'' کا انجام دیکھ کر عبرت حاصل کرو

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ: آپ انہیں کہہ دیجئے کہ زمین میں چلو پھرو پھر تم دیکھو کہ کیسا انجام ہوا جرم کرنے والوں کا، یعنی جنہوں نے آخرت کا انکار کیا وہ مجرم لوگ تھے اور ان مجرمین کا انجام کیسا ہوا، تم جا کے دیکھو، تو تمہیں پتا چلے کہ انکارِ آخرت انسان کو کہاں پہنچاتا ہے؟ یہ واقعہ ہے کہ انکارِ آخرت انسان کو مجرم بناتا ہے کیونکہ جب انسان اپنے ذہن پر یہ ذمہ داری ہی نہیں ڈالتا کہ کل کو میں نے کسی کے سامنے حساب کتاب دینا ہے، تو اپنے اخلاق کو اور دوسری چیزوں کو درست کرنے کی کیسے کوشش کرے گا۔ اُن لوگوں نے آخرت کو جھٹلایا، جس کے نتیجے میں مجرم بنے، آخر تباہ ہو گئے، تم زمین میں چلو پھرو، آنکھیں کھولو، تمہیں یہ بات سمجھ میں آجائے کہ آخرت کے انکار کے نتیجے میں بربادی ہے، تمہیں انکار نہیں کرنا چاہیے، یعنی تم اندھے بنے ہوئے ہو، زمین میں چلو پھرو، آنکھیں کھولنے سے کھلیں گی، ان واقعات سے استدلال کرو، کہ آخرت کا انکار کرنے والوں کا دنیا میں انجام کیا ہوا، وہی تاریخی واقعات دلائل کے طور پر جو ذکر کیے جاتے ہیں، تو مجرمین سے یہاں وہی مجرم مراد ہیں کہ جنہوں نے آخرت کا انکار کیا۔

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ: یہ حضور ﷺ کے لئے تسلی آگئی۔ آپ ان پہ غم نہ کیجئے۔ وَلَا تَكُنْ فِيْ ضَيْقٍ: ضیق: تنگی کو کہتے ہیں۔ اور تنگی میں نہ ہو جائیے، مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ: مکر کا لفظ پہلے بھی آیا ہے کہ مکر خفیہ تدبیر کرنے کو کہتے ہیں، ان کی تدبیروں سے، جس قسم کی حق کو جھٹلانے کے لئے، حق کے رد کے لیے، تردید کے لئے جو یہ مکر و فریب کر رہے ہیں، آپ اس کی طرف سے تنگی میں واقع نہ ہوں۔

عذاب میں مہلت بھی اللہ کا فضل ہے

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ: اور یہ کہتے ہیں کہ کب ہوگا یہ وعدہ اگر تم سچے ہو؟ ''وعدے'' سے مراد قیامت کا وعدہ بھی ہو سکتا ہے، اور کفر و شرک کے اوپر دنیا میں جو عذاب آتا ہے، حضور ﷺ اور انبیائے کرام علیہم السلام ڈراتے ہیں تو وہ وعدہ بھی ہو سکتا ہے۔ آپ کہہ دیجئے: عَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ: رَدِفَ: کسی چیز کے پیچھے سوار ہونا۔ ردیف پیچھے سوار ہونے والے کو کہتے ہیں۔ ''ل'' کے ساتھ بھی اس کا استعمال آتا ہے: رَدِفَ لَكُمْ۔ بغیر ''ل'' کے بھی آتا ہے: رَدِفَكُمْ۔ بَعْضُ الَّذِيْ تَسْتَعْجِلُوْنَ: اس سے وہ عذاب مراد ہے جس کو تم جلدی طلب کرتے ہو۔ عَسٰى کا معنی، ہو سکتا ہے، تمہیں کیا خبر، ایسا ممکن ہے کہ جس عذاب کو تم جلدی طلب کر رہے ہو اس کا بعض حصہ تمہارے پیچھے ہی آلگا ہو، بالکل قریب آگیا ہو تمہارے اوپر واقع ہونے کے لئے۔ اس لئے اگر تم

کُفر وشرک میں مبتلا رہے تو وہ آیا ہی آیا، اور اگر ایمان لے آئے تو بچ جاؤ گے۔ عَسٰی: اُمید ہے، ممکن ہے، قریب ہے، ایسا ہوسکتا ہے، کیا بعید ہے، یہ عَسٰی کا لفظ ایسے ہی استعمال ہوتا ہے جس طرح ہماری کلام میں یہ الفاظ ہیں" کیا بعید ہے، ایسا ممکن ہے، ہوسکتا ہے" کہ جس عذاب کو تم جلدی طلب کرر ہے ہو اس کا بعض حصہ تمہارے پیچھے ہی آ لگا ہو، یعنی بہت قریب آ گیا ہو، کہ اگر تم کُفر وشرک سے باز نہیں آؤ گے تو" عذاب کا بعض حصہ" کیونکہ کُل عذاب تو آخرت میں آئے گا، وہ جو عذاب مانگتے تھے تو کُل تو آئے گا آخرت میں ہی، اس کا کچھ حصہ تمہارے پیچھے ہی آ لگا ہو، قریب آ گیا ہو، یہ امکان ہے، ایسا ہوسکتا ہے، اس لئے تمہیں بے فکر نہیں ہونا چاہیے، اور جتنی مہلت اللہ نے دے رکھی ہے یہ اس کا فضل ہے۔ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ: بے شک تیرا رَبّ البتہ مہربانی والا ہے لوگوں پر۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ: لیکن ان میں سے اکثر شکر گزار نہیں، شکر ادا نہیں کرتے۔

کوئی چیز بھی اللہ سے مخفی نہیں

وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ: اور بے شک تیرا رَبّ البتہ جانتا ہے ان باتوں کو جن کو ان کے سینے چھپاتے ہیں اور جن کو ظاہر کرتے ہیں۔ تُكِنُّ چھپاتے ہیں۔ صُدُوْرُ صدر کی جمع۔ صدر بول کر دِل مراد ہوتا ہے، ان کے دِل کی گہرائیوں میں جو کُفر کے منصوبے ہیں، کُفر کے خیالات ہیں، وہ اللہ سے چھپے نہیں، ان کے جرائم کی تفصیل اللہ کے علم میں ہے، یہ بچ نہیں سکیں گے۔ وَمَا يُعْلِنُوْنَ: جن باتوں کو یہ لوگ ظاہر کرتے ہیں، اعلان: جو باتیں زبان پر آ گئیں۔ اور جو دِل میں چھپی ہوئی باتیں ہیں، وہ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ میں آ گئیں۔ نسبت سینے کی طرف ہو یا دِل کی طرف ہو دونوں محاورے ہماری زبان میں ہیں۔" دِل کے راز، سینے کے بھید" دونوں قسم کے لفظ ہم بولتے رہتے ہیں، دِل چونکہ سینے میں ہی ہے اس لئے راز کی نسبت سینے کی طرف بھی کی جاتی ہے، اور دِل کی طرف بھی کی جاتی ہے۔ ... ان کے خیالات کی کیا خصوصیت ہے کوئی چیز بھی اللہ سے مخفی نہیں، وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ: نہیں ہے کوئی چیز چھپنے والی آسمانوں میں اور زمین میں، اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ: مگر وہ واضح کتاب میں ہے۔" واضح کتاب" سے" لوحِ محفوظ" مراد ہے، تو سب کی سب دفتر میں درج ہیں،" لوحِ محفوظ" میں ہیں، یعنی اللہ کے علم میں بھی ہیں، اور اس کے بعد ان کا ذکر" لوحِ محفوظ" میں بھی ہے۔

حضور ﷺ کی نبوّت اور صداقتِ قرآن کی دلیل

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ: یہ حضور ﷺ کی نبوّت کی دلیل ہے اور اسی طرح قرآنِ کریم کی صداقت کی ایک دلیل ہے۔ مشرکینِ مکہ بھی جانتے تھے کہ بنی اسرائیل اہلِ کتاب ہیں، اور سرورِ کائنات ﷺ کے متعلق جانتے تھے کہ یہ اُمّی ہیں، تو قرآن ایک سادہ سی دلیل کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ دیکھو! علمائے بنی اسرائیل پر بہت سارے حقائق مخفی ہوگئے، ان میں آپس میں اختلافات پیدا ہوگئے، اور علماء کا جھگڑا اُٹھانا کسی اَن پڑھ کا کام نہیں ہے، اور یہ قرآن جو سرورِ کائنات ﷺ پیش کررہے ہیں یہ علمائے بنی اسرائیل کی بہت ساری مختلف فیہ چیزوں کے اندر فیصلہ دیتا ہے، تو اس سے آپ خود اندازہ کرسکتے ہیں کہ بھلا! یہ آپ کا بنایا ہوا کیسے ہوسکتا ہے، یہ اللہ کی کلام ہی ہوسکتی ہے جو علماء بنی اسرائیل کے جھگڑوں کو چکاتی ہے، اور ان کی بھی غلطیاں نکالتی

ہے، جب یہ اللہ کی کلام ہوئی تو اس اللہ کی کلام میں یہ بتایا گیا کہ مرنے کے بعد اُٹھنا بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا وقت بھی آئے گا تو پھر تمہیں اس بات کا یقین کر لینا چاہیے۔ تو گویا کہ یہ قرآنِ کریم کی حقانیت کی ایک دلیل بیان کر دی تاکہ قرآنِ کریم کو حق جاننے کی وجہ سے اور اللہ تعالیٰ کی کلام سمجھنے کی وجہ سے اُن عقائد کا اختیار کرنا آسان ہو جائے جن عقائد کی تلقین یہ کتاب کرتی ہے۔ بے شک یہ قرآن بیان کرتا ہے بنی اسرائیل پر اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ: جس چیز میں وہ لوگ اختلاف کرتے ہیں اس میں سے اکثر، اکثر وہ باتیں جن میں یہ لوگ اختلاف کرتے ہیں، یعنی ان کی جو آپس میں اختلافی باتیں تھیں، یا یہودیوں اور عیسائیوں کی آپس میں اختلافی باتیں تھیں، قرآنِ کریم نے ان کا فیصلہ کیا، بہت سارے مختلف فیہ مسئلے ان کے حل کر دیے، اور وہ وِرَاثَةً اہلِ علم میں چلے آ رہے ہیں، تو یہ دلیل ہے اس بات کی یہ کلام سرورِ کائنات ﷺ کی نہیں، ورنہ علماء کے فیصلے، اُلجھے ہوئے مقدمات، اُلجھے ہوئے مسئلے، ایک اَن پڑھ کس طرح سے طے کر سکتا ہے، بہر حال مختلف فیہ مسائل میں فیصلہ دینا اسی کا کام ہو سکتا ہے جو اختلاف کرنے والے کے مقابلے میں زیادہ علم رکھتا ہو۔ تو یہ دلیل ہے اس بات کی کہ قرآنِ کریم حضور ﷺ کا قول نہیں بلکہ یہ اللہ کا اُتارا ہوا ہے، تو جب یہ اللہ کا اُتارا ہوا ہے تو اس میں جو کچھ کہا جا رہا ہے اس کو سمجھو اور مانو۔ وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ: بے شک یہ قرآن البتہ راہنمائی ہے اور رحمت ہے مؤمنین کے لئے۔ یہ بھی کئی دفعہ آپ کی خدمت میں عرض کر دیا گیا کہ مؤمنین کا ذکر یہاں اِنتفاع کے لئے ہوتا ہے، چونکہ فائدہ یہی اُٹھاتے ہیں، ورنہ تو رحمةً للعالمین ہے، هُدًى للعالمين ہے، سب جہانوں کے لئے رحمت ہے، سب جہانوں کے لئے راہنمائی ہے، لیکن فائدہ صرف یہی اُٹھاتے ہیں۔

قیامت کے دن عملی فیصلہ ہوگا

اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ: بے شک تیرا رَبّ البتہ فیصلہ کرے گا ان کے درمیان اپنے حکم کے ساتھ، یعنی حکم قطعی آ جائے گا، اللہ تعالیٰ فیصلہ کر دے گا، یہاں قیامت کے دن کا فیصلہ مراد ہے، کیونکہ دلیل کا فیصلہ تو دنیا میں ہو جاتا ہے، باقی! عملاً حق اور باطل کو علیحدہ علیحدہ کر دیا جائے، اہلِ حق کو اہلِ باطل سے ممتاز کر دیا جائے، وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ (سورۂ یٰس:۵۹) یہ قیامت کے دن ہی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فیصلہ کرے گا ان کے درمیان اپنے حکم کے ساتھ، وہ زبردست ہے علم والا ہے۔

تسلّیٔ رسول ﷺ

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ: آپ اللہ پہ بھروسا کیجئے، یہ مخالفت کرنے والے آپ کا کچھ بگاڑ نہیں سکیں گے۔ اللہ پہ بھروسا کیجئے، بے شک آپ صریح حق پر ہیں، جب آپ حق پر ہیں تو اللہ کی حمایت آپ کے ساتھ ہی ہے، آپ کو اللہ پہ بھروسا رکھنا چاہیے، یہ لوگ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ: بے شک آپ نہیں سُنا سکتے موتی کو۔ موتی میت کی جمع ہے۔ اور نہیں سُنا سکتے بہروں کو پکار۔ ''صُمٌّ اَصَمُّ'' کی جمع ہے۔ جس وقت کہ وہ بہرے پشت پھیر کر جا رہے ہوں، اِذَا وَلَّوْا جس وقت وہ پیٹھ پھیریں، مُدْبِرِيْنَ یہ حال مؤکدہ ہے، اسی پیٹھ پھیرنے والے معنی کی تاکید ہے۔ جس وقت وہ بہرے پیٹھ پھیر کر جا رہے ہوں اس وقت آپ ان بہروں کو پکار نہیں سنا سکتے۔ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِي الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ: اور نہیں ہیں آپ اندھوں کو

راستہ دکھانے والے، عَنۡ ضَلٰلَتِهِمۡ: ان کی گمراہی سے بچا کر، یہ جو "عن" صلہ آ گیا "ھادی" کا۔ تو اس کے اندر بچانے والا معنی آ گیا۔ آپ ان کو ان کی گمراہی سے بچا کر سیدھا راستہ نہیں دکھا سکتے۔ اِنۡ تُسۡمِعُ اِلَّا مَنۡ يُّؤۡمِنُ بِاٰيٰتِنَا: نہیں سنا سکتے آپ مگر انہی کو جو ایمان لاتے ہیں ہماری آیات پر۔ فَهُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ: پھر وہ فرماں بردار ہیں۔ اور اِلَّا مَنۡ يُّؤۡمِنُ میں بھی اگر ارادۂ فعل والا معنی کر لیا جائے تو معنی یہ ہو جائے گا کہ نہیں سنا سکتے آپ مگر انہی لوگوں کو جو ایمان لانے کا ارادہ رکھتے ہیں ہماری آیات کے ساتھ، پھر وہ فرماں بردار بنتے ہیں، وہی لوگ فرماں برداری کرنے والے ہیں۔ جو ایمان لانے کا ارادہ کریں آپ تو انہی کو سنا سکتے ہیں۔

خروجِ دابہ

وَاِذَا وَقَعَ الۡقَوۡلُ عَلَيۡهِمۡ: اور جس وقت ان لوگوں پر قول واقع ہو جائے گا، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب قیامت واقع کرنے کا فیصلہ ہو جائے گا، کہ اب ان کا کام تمام کر دینا چاہیے۔ جس وقت قول ان پر واقع ہو جائے گا، اَخۡرَجۡنَا لَهُمۡ دَآبَّةً مِّنَ الۡاَرۡضِ: نکالیں گے ہم ان کے لئے چوپایہ زمین سے۔ "خروجِ دابہ" کو حدیث شریف میں علاماتِ قیامت میں ذکر کیا گیا ہے، جس وقت مغرب کی طرف سے سورج طلوع کرے گا، اسی وقت ہی زمین سے ایک عجیب الخلقت دابہ نکلے گا، اور ان نشانیوں کے ظاہر ہو جانے کے بعد ایمان لانے والوں کا ایمان معتبر نہیں ہوگا۔ اب وہ دابہ کہاں سے نکلے گا؟ کیسا ہوگا؟ اس کے بارے میں روایات بہت قسم کی ذکر کی گئی ہیں، لیکن ان میں سے صحیح معیار پر روایتیں بہت کم ہیں، بس یہ خاص علامت ہوگی قیامت کے قریب آنے کی کہ زمین سے کوئی عجیب الخلقت دابہ نکلے گا، اور ادھر مغرب سے سورج طلوع کرے گا، حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں باتیں بالکل ایک دوسرے کے پیچھے ہیں، طلوعِ شمس من المغرب ہو گیا تو متصل خروجِ دابہ ہوگا، خروجِ دابہ ہو گیا تو اس کے متصل طلوعِ شمس من المغرب ہوگا۔[1] اور یہ علامت متحقق ہو جانے کے بعد یوں سمجھیں کہ عالَم جان کنی میں مبتلا ہو جائے گا، اور اس کے بعد اگر کوئی گناہوں سے توبہ کرے گا، تو توبہ قبول نہیں، توبہ کا دروازہ بند، اور اگر کوئی کافر ایمان لانا چاہے گا تو ایمان قبول نہیں۔ کوئی خاص قسم کا دابہ زمین سے نکلے گا جس سے لوگوں کو سمجھ میں آ جائے گی کہ واقعی جو کچھ پہلے کہا جا رہا تھا وہ ٹھیک ہے، اور یہ دابہ بھی دلیل ہوگی اس بات کی کہ اب یہ عالَم فنا ہونے والا ہے، پھر ان علامات کو دیکھ کے لوگ مانیں گے، لیکن یہ ماننا معتبر نہیں ہوگا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ "کوہِ صفا"، یہ صفا پہاڑ جو مکہ معظمہ میں اَب مسجدِ حرام کے احاطے میں آیا ہوا ہے وہ پھٹے گا، اور اس میں سے یہ نکلے گا، عجیب الخلقت ہوگا،[2] اور یہ ایک ایسی نشانی ہوگی کہ جس کے بعد لوگوں کے لیے انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی، جیسے اللہ تعالیٰ نے صالح علیہ السلام کی اُونٹنی پتھر سے نکال دی تھی، اسی طرح سے یہ دابہ بھی پہاڑ سے نکلے گا۔ باقی اس کی کیا کیفیت ہوگی؟ تو جب وہ واقعہ پیش آئے گا تبھی پتا چلے گا۔ بہرحال علاماتِ قیامت میں سے ہے اور بڑی علامات میں سے ہے۔ نکالیں گے ہم ان کے لئے ایک دابہ زمین سے۔ تُكَلِّمُهُمۡ: وہ دابہ ان لوگوں سے کلام کرے گا۔ یا تُكَلِّمُهُمۡ سے مراد یہ ہے

(۱) مسلم ۲/ ۴۰۳، باب قصة الجساسة سے پہلے۔ مشکوٰۃ ۲/ ۴۷۲، باب العلامات بین یدی الساعة. وایهما ما کانت قبل صاحبها فالأخرى على أثرها قريبا.

(۲) عن حذیفة بن الیمان یقول: قال رسول الله ﷺ ...... وینشق الصفا مما یلی المسعى وتخرج الدابة من الصفا. (طبری)

کہ وہ دابہ ان کے سامنے شہادت دے گا۔ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ: اور یہ دابہ کا نکلنا اس وجہ سے ہوگا کہ بے شک لوگ ہماری آیات پہ یقین نہیں لاتے، تو پھر یہ بطور نشانی کے نکالا جائے گا، پھر اس کے نکلنے کے بعد لوگ ایمان لائیں گے، اور وہ ایمان معتبر نہیں ہوگا، یہ ترجمہ تو تب ہوگا جب ''اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ'' اللہ تعالیٰ کی کلام قرار دی جائے...... اور اگر اس کو دابہ کی کلام قرار دیا جائے تو یہ تُكَلِّمُهُمْ کا مفعول ہے کہ وہ دابہ لوگوں سے باتیں کرے گا کہ لوگ ہماری آیات پہ یقین نہیں لاتے تھے۔ ''ہماری'' سے مراد اللہ تعالیٰ کی، جس طرح سے حکومت کا ہر کارکن حکومت کی طرف معاملے کو منسوب کرتا ہوا کہتا ہے کہ ''ہمارا حکم یہ ہے''، ''ہماری تجویز یہ ہے'' بات اصل میں حکومت کی ہوتی ہے، بادشاہ کی ہوتی ہے، اسی طرح سے یہ بھی چونکہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہوگی، تو وہ اس بات کو اپنی طرف منسوب کر کے کہے گا کہ لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں لاتے تھے، اور اب میرے نکل آنے کے بعد یہ یقین لائیں بھی تو ان کا یقین لانا معتبر نہیں ہوگا...... باقی! سماع موتی کا مسئلہ رہ گیا، وہ سورت کے آخر میں ذکر کیا جائے گا۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۸۳﴾

اور جس دن ہم جمع کریں گے ہر امت میں سے ایک جماعت کو یعنی وہ لوگ جو ہماری آیات کو جھٹلاتے تھے پس وہ لوگ روکے جائیں گے ﴿۸۳﴾

حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْ قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّا ذَا كُنْتُمْ

حتیٰ کہ جب یہ مکذبین سامنے آجائیں گے، اللہ فرمائے گا: کیا تم نے جھٹلایا تھا میری آیات کو، اور نہیں احاطہ کیا تھا تم نے ان آیات کا از روئے علم کے، یا تم

تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿۸۵﴾ اَلَمْ يَرَوْا

کیا کیا کرتے تھے ﴿۸۴﴾ بات ان پر ثابت ہو جائے گی ان کے ظالم ہونے کی وجہ سے، پھر وہ بولیں گے بھی نہیں ﴿۸۵﴾ کیا نہیں دیکھا انہوں نے

اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ

کہ بے شک ہم نے بنایا رات کو تاکہ یہ اس میں آرام کریں، اور بنایا ہم نے دن کو روشن، بے شک اس میں البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے

يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۸۶﴾ وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ

جو ایمان لانا چاہیں ﴿۸۶﴾ جس دن کہ پھونک ماری جائے گی صور میں پس گھبرا جائیں گے وہ سب جو آسمانوں میں اور جو زمین میں ہیں

اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَتَرَى الْجِبَالَ

سوائے ان کے جن کے متعلق اللہ چاہے، اور سارے کے سارے آئیں گے اس اللہ کے پاس عاجزی کرتے ہوئے ﴿۸۷﴾ اور تو دیکھتا ہے پہاڑوں کو

تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ۚ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ اِنَّهٗ

سمجھتا ہے تو ان کو جمے ہوئے، اور یہ گزریں گے مثل گزرنے بادلوں کے، یہ کاریگری اللہ کی ہے جس نے ہر چیز کو مضبوط بنایا، بے شک وہ

خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ﴿٨٨﴾ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ

خبر رکھنے والا ہے ان کاموں کی جو تم کرتے ہو ﴿٨٨﴾ جو کوئی اچھائی لے کر آیا اس کے لئے اس اچھائی کے مقابلے میں بہتر اجر ہوگا، اور وہ لوگ اس دن گھبراہٹ سے

اٰمِنُوْنَ ﴿٨٩﴾ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا

بے خوف ہوں گے ﴿٨٩﴾ اور جو کوئی برا حال لے کر آئے گا، ان کے چہرے اُلٹے کر دیے جائیں گے جہنم میں، نہیں بدلہ دیے جاتے تم مگر اسی چیز کا

كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٩٠﴾ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِيْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ

جو تم کرتے تھے ﴿٩٠﴾ اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں حکم دیا گیا ہوں کہ میں عبادت کروں اس شہر کے رب کی جس نے اس شہر کو حرمت والا بنایا، اور اسی کے لئے

كُلُّ شَيْءٍ ۫ وَّاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿٩١﴾ وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى

ہر چیز ہے، اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں فرماں برداروں میں سے ہو جاؤں ﴿٩١﴾ اور یہ کہ میں قرآن کی تلاوت کروں، جو سیدھا راستہ پالے گا

فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿٩٢﴾

سوائے اس کے نہیں وہ ہدایت یافتہ ہوگا اپنے لئے ہی، اور جو کوئی بھٹک جائے گا تو آپ فرما دیجئے کہ میں تو ڈرانے والوں میں سے ہوں ﴿٩٢﴾

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا ۚ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٩٣﴾

اور آپ یہ بھی کہہ دیجئے کہ سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، عنقریب دکھائے گا اللہ تمہیں اپنی آیات پھر تم ان کو پہچان لو گے، تیرا رب غافل نہیں ان کاموں سے جو تم کرتے ہو ﴿٩٣﴾

تفسیر

قیامت کے دن کافروں کی حالت

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا: فوج جماعت کو کہتے ہیں، جس کی جمع افواج آتی ہے، جیسے سورۂ نصر میں ہے: وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا۔ اور جس دن ہم جمع کریں گے ہر اُمت میں سے ایک جماعت کو۔ مِمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا: یہ فَوْجًا کا بیان ہے۔ یعنی وہ لوگ جو ہماری آیات کو جھٹلاتے تھے۔ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ: پس وہ لوگ روکے جائیں گے، یہ يُوْزَعُوْنَ کا لفظ اسی

سورت میں آپ کے سامنے حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصے میں بھی آیا تھا وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ۔ اس کا ترجمہ دو طرح سے کر دیا جاتا ہے، وَزَعَ: روکنا، منع کرنا۔ اور اسی طرح سے وَزَعَ: ٹکڑے ٹکڑے کرنے کو بھی کہتے ہیں، جماعت بندی کرنا، صف بندی کرنا۔ وہاں بھی ترجمہ دو طرح سے کیا گیا ہے، اُن کو روکا جاتا تھا، یعنی کثرت کی وجہ سے اگلوں کو روکا جاتا تھا تاکہ پچھلوں کو ساتھ شامل کر لیا جائے، اس طرح سے انتظام بحال رہ جائے، یہ بھی کثرت کی طرف اشارہ ہوتا ہے، جب بڑا مجمع ہو تو پچھلوں کو ساتھ شامل کرنے کے لیے اگلوں کو روکا جاتا ہے تاکہ پچھلے بھی ساتھ شامل ہو جائیں، وہاں یہ ترجمہ بھی کیا گیا تھا، ''بیان القرآن'' میں یہی ترجمہ اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں بھی اسی طرح سے ترجمہ ہو جائے گا کہ اتنی کثرت سے ہوں گے کہ اگلوں کو روکا جائے گا تاکہ پچھلے ان کے ساتھ شامل ہو جائیں...... اور اگر درجہ بندی کے معنی میں لے لیا جائے تو وہاں بھی مفہوم اس طرح سے ہے کہ ان کی صف بندی کی جاتی تھی، درجہ بندی کی جاتی تھی، یعنی مختلف قسم کی جس طرح سے فوجوں میں جماعتیں ہوا کرتی ہیں، تو اس طرح سے ان کی جماعتیں بنائی جاتی تھیں حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر میں۔ تو یہاں بھی اسی طرح سے ہوگا کہ مکذبین کی وہ فوج اکٹھی کی جائے گی، پھر بعد میں اس کی درجہ بندی کی جائے گی، اس کے ٹکڑے ٹکڑے کئے جائیں گے، جو اعلیٰ درجے کے ہوں گے وہ جہنم کے سب سے اسفل درجے میں بھیجے جائیں گے، جو اس سے کم درجے کے ہوں گے ان کو اس سے کم عذاب ہوگا، تو جس طرح آپ کے سامنے قرآنِ کریم میں آیا تھا: لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ (سورۂ حجر: ۴۴) کہ جہنم کے سات دروازے ہیں یعنی اس کے مختلف درجے ہیں، مختلف دروازے ہیں، تو ان مکذبین کو اکٹھا کر کے، ان کو علیحدہ علیحدہ ٹکڑیوں کی صورت میں، ان کے اپنے حال کے مطابق مختلف درجات میں بھیجا جائے گا، پھر اس کا یہ مفہوم ہو جائے گا...... تو وہاں بھی دونوں ترجمے ہیں اور یہاں بھی یہ دونوں ترجمے ہو سکتے ہیں...... ہر اُمت سے ایک فوج اکٹھی کی جائے گی مکذبین کی، یعنی ہر اُمت میں سے ہماری آیات جھٹلانے والے جو ہوں گے ان کو علیحدہ کر لیا جائے گا، اور پھر ان کو روکا جائے گا یعنی اگلوں کو روکا جائے گا پچھلوں کو ساتھ شامل کرنے کے لئے، جیسا کہ انتظام کرنے کے لئے ایسی ضرورت پیش آتی ہے۔ یا ان کی مختلف جماعتیں بنائی جائیں گی، ان میں درجہ بندی کی جائے گی، ہر درجے کے کافر علیحدہ کر لیے جائیں گے، مکذب علیحدہ کر لیے جائیں گے، اور ان کی شان کے مطابق ان کو اس درجے کے عذاب میں بھیج دیا جائے گا۔

حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْ: حتیٰ کہ جب یہ مکذبین سارے کے سارے آجائیں گے۔ قَالَ: اللہ تعالیٰ فرمائے گا اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ: کیا تم نے جھٹلایا تھا میری آیات کو، وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا: اور نہیں احاطہ کیا تھا تم نے ان آیات کا از روئے علم کے، اَمَّاذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: اَمَّا یہ ''اَمْ'' اور ''مَا'' علیحدہ علیحدہ ہیں، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''بیان القرآن'' میں ''اَمْ'' کا بَل کے ساتھ ترجمہ کیا ہے، جس طرح سے ''اَمْ'' منقطعہ کا ترجمہ ہوا کرتا ہے۔ بلکہ تم کیا کیا کرتے تھے، یعنی یہ تکذیب کرتے تھے بلکہ اس کے علاوہ اور بھی تم کیا کیا کرتے تھے۔ اور اگر ''اَمْ'' کا ترجمہ ''یا'' کے ساتھ کیا جائے، جیسے اکثر مترجمین نے کیا ہے ''یا تم کیا کیا کرتے تھے'' یعنی تکذیب کرتے تھے بغیر ان کو احاطۂ علمی میں لانے کے، یا تم کیا کیا کرتے تھے، یہ ان سے استفہام کیا جائے گا، اور اس میں زجر و توبیخ مقصود ہے۔

وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا کا مطلب یہ ہوا کہ جب میری آیات تمہارے پاس آئیں، تم نے ان میں تدبر نہیں کیا، غور نہیں کیا،

ان کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی، بس تمہارے سامنے پیش کردی گئیں اور تم نے ان کو جھٹلا دیا، تم ان کو اپنے احاطۂ علمی میں نہیں لائے، ایک ہے کہ انسان پورے ''مَالَہٗ وَمَا عَلَیْہِ'' کو سمجھ لے، کسی بات کو اپنے علمی احاطے میں لے آئے، پھر جا کے کوئی بات کرے، تو کسی درجے میں کوئی گنجائش بھی ہوتی ہے، لیکن اگر یوں وہ تدبر کرنے کی کوشش کرتے، اللہ تعالیٰ کی آیات کا علمی احاطہ کرنے کی کوشش کرتے، تو ان کی حقانیت بھی ان کو سمجھ میں آجاتی، انہوں نے تو ان کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی، جاننے کی کوشش ہی نہیں کی، جب اللہ کے نبی نے ان کے سامنے آیات پیش کیں، بس انہوں نے جھٹلا دیا۔ یہی ان کو تنبیہ کی جارہی ہے ''کیا جھٹلایا تم نے میری آیات کو اور نہیں احاطہ کیا تم نے ان آیات کا از روئے علم کے'' یعنی تم ان کو اپنے علمی احاطے میں نہیں لائے، بلکہ نادانی کے ساتھ بغیر سوچے سمجھے بغیر غور وفکر کرنے کے تم نے جھٹلا دیا تھا، یا تم کیا کرتے تھے، یا یوں ترجمہ ہے کہ بلکہ تم اور کیا کچھ کرتے تھے۔ یہ استفہام بطور زجر اور توبیخ کے ہے، جس طرح سے ڈانٹنے کے لیے کہا جاتا ہے۔

وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ: بات ان پر ثابت ہوجائے گی، یہاں بات سے قولِ عذاب مراد ہے۔ بات ان پر ثابت ہوجائے گی یعنی عذاب کا قول ان کے اوپر ثابت ہوجائے گا ان کے ظالم ہونے کی وجہ سے۔ اور ظالم کا اعلیٰ مصداق مشرک ہوتا ہے اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (سورۂ لقمان: ۱۳) چونکہ وہ کفر اور شرک میں مبتلا تھے اس لئے قولِ عذاب ان کے اوپر ثابت ہوجائے گا۔ فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ: پھر وہ بولیں گے بھی نہیں، یعنی عذر معذرت کے لئے سامنے بول بھی نہیں سکیں گے، لا ینطقون کا یہاں یہ معنی ہے، کوئی عذر معذرت نہیں کرسکیں گے، بات ان پر ثابت ہوجائے گی کہ اپنی نادانی اور بیوقوفی کے ساتھ اللہ کی آیات کو جھٹلاتے رہے، توحید کی آیات کو سمجھا نہیں، توحید اختیار نہیں کی، شرک میں مبتلا رہے جس کی بنا پر اب قولِ عذاب ان کے اوپر ثابت ہوگیا، اب کوئی عذر معذرت نہیں کرسکیں گے۔

معاد کی دلیل میں دِن رات کا تذکرہ

اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ: اب یہی معاد کی دلیل کے طور پر ذکر کیا جارہا ہے دِن اور رات کو، قرآنِ کریم میں اکثر جگہ اللہ تعالیٰ نے بعث بعد الموت کے مسئلے کو ذکر کرتے ہوئے دِن رات کا ذِکر کیا ہے، مطلب یہ ہے کہ ایسی ایسی نشانیاں موجود تھیں کہ اگر ان میں غور کرتے تو بعث بعد الموت کا اِمکان اور اس کا وقوع ان کی سمجھ میں آجاتا، لیکن انہوں نے ان چیزوں میں غور ہی نہیں کیا۔ کیا نہیں دیکھا انہوں نے کہ بے شک ہم نے بنایا رات کو تاکہ یہ اس میں آرام کریں، وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا: اور بنایا ہم نے دِن کو روشن۔ فصاحت اور بلاغت کے تقاضے سے بعض الفاظ مقابلۃً آیات میں حذف کردیے جاتے ہیں، یہاں وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا آگیا تو اس کے مقابلے میں لیل کی جانب میں مُظْلِمًا کا لفظ آجائے گا۔ اور لیل کی جانب میں لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ آگیا تو نہار کی جانب میں لِيَعْمَلُوْا فِيْهِ کا مفہوم نکل آئے گا۔ مطلب یہ ہوا کہ ہم نے رات کو تاریک بنایا تاکہ لوگ اس میں آرام کریں، اور ہم نے دِن کو روشن بنایا تاکہ لوگ اس میں کام کریں، یہی دِن اور رات کے اندر حکمتوں میں سے ایک حکمت ہے۔ تاریکی میں۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ: بے شک اس میں البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لانا چاہیں یا ایمان لاتے ہیں۔ يُؤْمِنُوْنَ: ارادۂ فعل

کے معنی میں ہے، جو ایمان لانا چاہیں ان لوگوں کے لئے اس میں البتہ نشانیاں ہیں۔ نشانیاں کس چیز کی؟ اللہ کی قدرت کی، اللہ کی حکمت کی، اللہ کے خالق ہونے کی، جس میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات سمجھ میں آئیں گی۔ اور یہاں موقع محل چونکہ آگے پیچھے مبدء معاد کا ذکر کیا جا رہا ہے تو اس میں نشانیاں ہیں معاد کی، بعث بعد الموت کی۔ اگر آپ غور کریں، تو رات کے وقت ایسے ہوتا ہے جیسا کہ کائنات پہ موت طاری ہوگئی ہو، نیند یہ موت کے مشابہ ہے قرآن کریم میں دوسری جگہ مذکور ہے: اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا (سورۂ زمر: ۴۲) یہاں وفات کا ذکر دونوں اعتبار سے ہے: موت کے وقت بھی اللہ وفات دیتا ہے، نیند کے وقت بھی۔ موت کے وقت روح کا سلسلہ کلیتاً، ظاہراً، باطناً، بدن سے منقطع ہو جاتا ہے، اور نیند کے وقت ظاہراً منقطع ہوجاتا ہے، باطناً باقی ہوتا ہے، اس لئے اندر کی مشینری چل رہی ہوتی ہے، دل دھڑک رہا ہوتا ہے، معدہ، جگر اپنا کام کر رہے ہوتے ہیں، لیکن انسان کے ظاہری حواس معطل ہوجاتے ہیں، بہرحال کسی نہ کسی درجے میں ''توفی'' نیند میں بھی ہے، اور یہ انسان یوں پڑا ہوتا ہے جس طرح سے مردہ پڑا ہوا ہو، ویسے بھی لوگ کہا کرتے ہیں ''سویا مویا ایک برابر!'' ظاہری طور پر کوئی ہوش حواس نہیں ہوتے، اور بعد میں جس وقت انسان اٹھتا ہے تو اس طرح سے ہوتا ہے جیسے دوبارہ رُوح پڑ گئی، ساری قوتیں بحال ہوجاتی ہیں، سوئے ہوئے کی تو نہ ٹانگ اپنے بس میں ہوتی ہے، نہ بازو اپنے بس میں ہوتا ہے، ٹانگ کدھر کو جا رہی ہے، بازو کدھر کو جا رہے ہیں، اور جب انسان جاگتا ہے تو ساری قوتیں بحال ہوجاتی ہیں۔

تو یہ ایک ادنیٰ سا نمونہ ہے بعث بعد الموت کا، کہ اللہ تعالیٰ یونہی موت دے گا، بعد میں اسی طرح سے اٹھا دے گا، اس لئے سرور کائنات ﷺ جاگنے کے بعد جو دعا پڑھا کرتے تھے اس میں بھی یہی ہے: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَحْيَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ''[1] اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں دوبارہ زندگی دے دی موت دینے کے بعد۔ یہاں ''حیات وموت'' سے ''نیند اور جاگنا'' مراد ہے، اور اسی سے پھر فوراً ذہن منتقل ہوتا تھا، ''وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ'' اللہ ہی کی طرف اُٹھ کے جانا ہے اور اللہ کی طرف ہی جمع ہونا ہے۔ تو سوتے جاگتے اگر انسان ان کیفیات کو دیکھے تو اس کو بعث بعد الموت بڑے اچھے طریقے سے سمجھ میں آ سکتا ہے، سونا ''موت'' کی طرح ہے، یہ مخلوق جتنی بھی ہے حیوانات سب یوں ساکن صامت ہوجاتے ہیں جیسا کہ ان کے اوپر کوئی موت طاری ہوگئی ہو، اور دن کو سارے ہوشیار ہو کر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ صبح، شام، رات، دن آپ کو یہ نمونے دکھاتا ہے، تو اگر کوئی غور کرنا چاہے، ایمان لانا چاہے تو اس میں جہاں اللہ کی قدرت ہے، اللہ کا احسان ہے، اللہ کی حکمت ہے، وہاں انسان کو بعث بعد الموت کا عقیدہ بھی اس دن رات کے چکر سے اچھی طرح سمجھ میں آ سکتا ہے۔

نفخ فی الصور

وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ: جس دن کہ پھونک ماری جائے گی صور میں، فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ: پس گھبرا جائیں گے وہ سب جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں۔ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ: سوائے ان کے جن کے متعلق اللہ چاہے۔ وَكُلٌّ اَتَوْهُ

---

(۱) بخاری ۲/ ۹۳۴، باب ما یقول اذا نام۔ مشکوٰۃ ۱/ ۲۰۸، باب ما یقول عند الصباح والمساء والمنام

تفسیر: اور سارے کے سارے آئیں گے اس (اللہ) کے پاس عاجزی کرتے ہوئے، دبے دبائے، عاجزی کرتے ہوئے اللہ کے سامنے آئیں گے۔ نفخ فی الصور، قرآنِ کریم کی آیات اور احادیث کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صور میں نفخ دو دفعہ ہے، صور کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے کہ وہ قرن ہے، سینگ کی شکل کا، اور اس میں پھونک ماریں گے تو اس میں سے آواز نکلے گی،[1] آج کل تو قریب زمانے میں کہیں نظر سے نہیں گزرا، آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعضے ملنگوں کے پاس لمبے لمبے سینگ ہوتے ہیں، جب اس میں پھونک مارتے ہیں تو جس طرح بگل بجایا جاتا ہے، اس طرح سے اس میں سے آواز نکلتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ چونکہ حقائق کو انہی الفاظ میں ادا فرماتے ہیں جن کو انسان سمجھے، ویسے حقیقتِ حال تو جب وہ سامنے آئے پھر پتا چلے گا، اللہ بہتر جانتا ہے کہ اس کی حقیقت کیا ہے، لیکن اگر کوئی ایسا لفظ بول دیا جائے جو آپ کی لغات میں موجود نہیں، جس کا کوئی نمونہ آپ کے سامنے موجود نہیں تو آپ اس کو سمجھیں گے کیسے؟ تو اللہ کی طرف سے ایک اعلان ہوگا کہ اب کائنات ٹوٹ پھوٹ جائے اور فنا ہو جائے، اور اس اعلان کی صورت ایسی ہے جس طرح سے فوجوں میں اعلان کرنے کے لئے بگل بجا دیتے ہیں، اسی طرح سے اسرافیل علیہ السلام اس کے اوپر متعین ہیں، ان کے پاس وہ صور ہے، جو بھی اس کی شکل ہو وہ اللہ کے علم میں ہے، سمجھانے کے لیے کہہ دیا جاتا ہے کہ قرن کی طرح ہے، سینگ کی طرح ہے، اس میں جب پھونک ماریں گے، تو یہ اعلان ہوگا اس بات کا کہ اب فنا ہونے کا وقت آ گیا، اس میں پھر گھبراہٹ طاری ہو جائے گی تمام جاندار چیزوں پر، انسانوں پر، جنوں پر، فرشتوں پر، حیوانات پر، تو یہ بے ہوش ہو جائیں گے جس طرح فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ (سورۂ زمر: ۶۸) آیا ہے، تو صعق کا لفظ بھی آیا کہ بے ہوش ہو جائیں گے، پھر ان سب کے اوپر موت طاری ہو جائے گی ''سوائے ان کے جن کے متعلق اللہ چاہے'' اس سے مراد حاملینِ عرش اور یہ چار بڑے بڑے فرشتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے براہِ راست بغیر نفخ کے ان کو بھی موت دے دے گا، اور کائنات بھی ساری کی ساری ٹوٹ پھوٹ جائے گی، جیسے آگے آئے گا کہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے، آسمان پھٹ جائے گا، زمین ریزہ ریزہ ہو جائے گی، گویا کہ ساری کائنات کو اللہ تعالیٰ معدوم کر دیں گے۔

دونوں نفخوں کے درمیان فاصلہ

اور پھر کچھ وقت کے بعد، جس کے متعلق بعض روایات میں آیا ہے کہ دونوں نفخوں کے درمیان ''اَرْبَعُوْنَ'' کا فاصلہ ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ پوچھا گیا کہ ''اَرْبَعُوْنَ يَوْمًا؟'' فرمایا: میں کچھ نہیں کہتا! پھر پوچھا گیا: ''اَرْبَعُوْنَ شَهْرًا؟'' فرمایا کہ میں کچھ نہیں کہتا! پھر پوچھا گیا: ''اَرْبَعُوْنَ سَنَةً؟'' فرمایا: میں کچھ نہیں کہتا۔[2] مطلب ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ تھا کہ مجھے یہ تو یاد رہ گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چالیس کا عدد بیان فرمایا تھا، لیکن یہ نہیں یاد رہا کہ چالیس دن مراد ہیں، چالیس مہینے مراد ہیں، یا چالیس سال مراد ہیں، لیکن راجح دوسری روایات کو دیکھتے ہوئے چالیس سال ہیں۔ وہ چالیس سال کیا ہوں گے؟ وہ بھی اللہ کے علم میں

---

(۱) الصُّوْرُ قَرْنٌ يُنْفَخُ فِيْهِ (ابوداؤد ۲/ ، باب ذکر البعث والصور۔ مشکوٰۃ ۲/ ۴۸۲، باب النفخ فی الصور فصل ثانی)

(۲) بخاری ۲/ ۷۱۱، کتاب التفسیر سورۃ الزمر۔ ۲/ ۷۳۵۔ سورۃ النبا۔ مشکوٰۃ ۲/ ۴۸۱، باب النفخ فی الصور پہلی حدیث۔

ہے۔ کیونکہ جب آسمان بھی ٹوٹ گیا، زمین بھی ٹوٹ گئی، نہ چاند، نہ ستارے، کچھ بھی نہیں ہوگا، نہ ہی سورج ہوگا، تو طلوع غروب کا چکر ختم ہوجائے گا، جب طلوع وغروب کا چکر نہیں رہے گا تو اس سے جو حقیقتاً دن رات کے اعتبار سے مہینے اور سال بنا کرتے ہیں، یہ مراد نہیں، بس اتنی سی مدت مراد ہے جتنی اللہ کو منظور ہوگی، اب وہ سال ہمارے سال مراد ہیں جو تین سو ساٹھ دن کے ہوتے ہیں، یا وہ سال اللہ نزدیک ہے جو: كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (سورۂ حج: ۴۷) اس کا ایک دن ہمارے شمار کے اعتبار سے ہزار سال کے برابر ہے، اس لئے صحیح اندازہ دونوں نفخوں کی درمیان کی مدت کا اللہ کے علم میں ہے، ہم اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے کہ دونوں نفخوں کے درمیان میں کتنا فاصلہ ہوگا؟ عدد چالیس کا آیا ہے، پھر وہ دن، مہینے، سال، وہ بھی آخرت کے دن، مہینے، سال مراد ہیں جو اللہ کے علم میں ہیں، کیونکہ یہ حقیقتاً دن جو سورج کے طلوع اور غروب ہونے کے ساتھ بنتا ہے یہ تو وہاں ہوں گے نہیں، کیونکہ نہ زمین ہوگی نہ آسمان، نہ سورج نہ چاند، تو پھر یہ دن کس طرح سے موجود ہو سکتے ہیں۔

بعث بعد الموت

اس مدت کے بعد پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دوبارہ وہی صور پھونکا جائے گا تو یہ ساری کی ساری کائنات پھر بن جائے گی۔ اسی طرح یہ زمین ہوگی لیکن یہ ہوگی بالکل ہموار، کہ اس میں کوئی پہاڑ، کوئی گڑھا، کوئی نشیب وفراز نہیں ہوگا، کف دست میدان جس طرح سے ہوتا ہے، کہ سارے کھڑے ہوں تو سامنے نظر آئیں، آواز دی جائے تو سب کو پہنچے، اور پھر اس طرح سے آسمان بھی بن جائے گا، زمین بھی بن جائے گی اور سارے کے سارے انسان دوبارہ زندہ ہوجائیں گے، اس کے بعد پھر حساب وکتاب کا سلسلہ ہوگا، پھر اللہ تعالیٰ جن کو دوزخ میں بھیجنا ہے ان کو دوزخ میں بھیجیں گے، اور جنہوں نے جنت میں جانا ہے انہیں جنت میں بھیج دیں گے، تو یہ دوبارہ عود ہوگا اس خلق کا، اسی کو بعث بعد الموت کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور یہ ضروریاتِ دین میں سے ہے، قطعی عقائد میں سے ہے، جس کا انکار بھی کفر ہے، اور اس میں کسی قسم کی تاویل کرنا بھی کفر ہے۔ مرنے کے بعد حقیقتاً اسی طرح سے دوبارہ اُٹھیں گے، اُٹھنے کے بعد اللہ کے دربار میں پیش ہوں گے، پھر جزا سزا کا سلسلہ شروع ہوگا، یہ عقائدِ قطعیہ میں سے ہے، اس کا انکار بھی نہیں کیا جاسکتا، اور اس میں کسی قسم کی تاویل بھی نہیں کی جاسکتی۔ یہ تو دوبارہ نفخ ہوگا۔

نفخۂ اُولیٰ کے کچھ حالات

يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ: جس دن نفخ کیا جائے گا صور میں، صور میں پھونک ماری جائے گی، اس سے نفخۂ اُولیٰ مراد ہے، آسمان اور زمین میں جو ہیں سب گھبرا جائیں گے، اور اس گھبراہٹ کے نتیجے میں بے ہوشی طاری ہوگی، بے ہوشی کے بعد موت آجائے گی۔ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ: مگر جس کو اللہ چاہے، وہ بچ جائے گا، گھبراہٹ سے بچ جائے گا، بے ہوشی سے بچ جائے گا، موت سے بچ جائے گا، جن کے متعلق اللہ چاہے۔ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ: اور سارے کے سارے آئیں گے اس اللہ کے پاس عاجز ہوتے ہوئے یعنی گھبراہٹ کے وقت جس طرح سے دنیا میں انسانوں کی عادت ہوتی ہے کہ بھاگ جاتے ہیں، کہیں چھپنے کی کوشش کرتے ہیں، ایسا کوئی نہیں کرسکے گا، گھبراہٹ میں کہیں بھاگ نہیں سکیں گے، چھپ نہیں سکیں گے، بلکہ سارے کے سارے اللہ تعالیٰ کے سامنے

دبے دبائے ہوں گے، اللہ کے سامنے حاضر ہوں گے...... اور اگر اس سے نفخ ثانی ہی مراد لے لیا جائے تو پھر یہ گھبراہٹ حساب وکتاب کی گھبراہٹ ہے، اور اس وقت بھی اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا امن دے گا، لیکن یہاں راجح نفخۂ اُولیٰ ہی ہے، کیونکہ آگے پھر پہاڑوں وغیرہ کے ٹوٹنے پھوٹنے کا ذکر ہے...... ویسے نیک لوگ اس (نفخۂ ثانیہ والی) گھبراہٹ سے بھی محفوظ ہوں گے، جیسے دوسری جگہ ہے لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ (سورۂ انبیاء: ۱۰۳) تو اللہ تعالیٰ نیکوں کو فزعِ اکبر سے امن دیں گے، وہ نفخۂ ثانیہ کے بعد جب حساب وکتاب کا سلسلہ شروع ہوگا، تو سارے کے سارے لوگ گھبرائے ہوئے ہوں گے، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیکوں کو اس وقت امن ہوگا...... یہاں نفخۂ اُولیٰ ہی راجح ہے، چونکہ آگے پہاڑوں کا ذکر آ گیا۔

''وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً'' کے دو مفہوم

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً: اس کا ترجمہ بھی دو طرح سے کیا گیا ہے...... ایک تو حال کے ساتھ، اے مخاطب! تُو دیکھتا ہے پہاڑوں کو (یعنی اس وقت دنیا میں) تُو دیکھتا ہے پہاڑوں کو اور سمجھتا ہے تُو ان پہاڑوں کو جمے ہوئے، یعنی تیرا خیال ہے کہ بڑے ٹھوس ہیں، بڑے جامد ہیں، یہ اپنی جگہ سے ہل ہی نہیں سکتے، اور یہ اسی طرح سے جمے رہیں گے، تیرا خیال یہ ہے، یعنی اب اگر آپ پہاڑوں پہ نظر ڈالیں، تو کہیں گے کہ اتنے وزنی پہاڑ! اتنے ٹھوس! یہ کیسے ہل سکتے ہیں اپنی جگہ سے؟ یہ حال کے ساتھ ترجمہ ہوگیا، اے مخاطب! دیکھتا ہے تُو پہاڑوں کو یعنی اب دنیا میں، اور سمجھتا ہے تُو ان کو جمنے والے، اپنی جگہ ٹھہرنے والے، جمود حرکت کے مقابلے میں ہوتا ہے، وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ: اور وہ گزریں گے مثل گزرنے بادلوں کے، یعنی آج جو تمہیں یہ جمے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، تو ان کو سمجھتا ہے کہ جمنے والے ہیں، اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے، یہ اُس دن یوں ان کے پرخچے اُڑیں گے، اور یوں چلیں گے جس طرح سے بادل کی ٹکڑیاں ہوا کے دوش پر، کوئی ادھر کو جا رہی ہے، کوئی ادھر کو جا رہی ہے، جب نفخ ہوگا تو یہ بادلوں کی طرح اُڑ جائیں گے، اور گزریں گے۔ قرآنِ کریم میں مختلف آیات کے اندر پہاڑوں کا تذکرہ یونہی آیا ہے، یَنْسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا (سورۂ طٰہٰ: ۱۰۵)، وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ (سورۂ معارج: ۹) اس طرح سے اُڑیں گے جس طرح سے دھنکی ہوئی اُون اڑتی ہے، اللہ ان کو بکھیر دے گا، یہ اپنی جگہ جامد نہیں رہیں گے۔ گزریں گے مثل گزرنے بادلوں کے۔ ایک ترجمہ تو یوں ہوگیا، ''بیان القرآن'' میں یہی ترجمہ اختیار کیا گیا ہے...... اور ایک ترجمہ یہ ہے کہ یہ بھی اسی قیامت کے وقت کا حال ہے کہ جب نفخِ صور ہوگا تو پہاڑ اپنی جگہ سے اُڑیں گے، اور یوں گزریں گے جس طرح سے بادل گزرتے ہیں، لیکن تو ان کو دیکھے گا تو تو سمجھے گا کہ شاید یہ اپنی جگہ ٹکے ہوئے ہیں، بظاہر دیکھنے میں یوں معلوم ہوگا (عام تفاسیر)۔ یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے، جب ایک بہت بڑی چیز ہوا کرتی ہے، جس کے اوپر نیچے، آگے پیچھے انسان کو کچھ نظر نہ آئے، تو وہ حرکت بھی کر رہی ہو، تو اس کی حرکت محسوس نہیں ہوا کرتی، بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی جگہ ٹھہری ہوئی ہے، کیونکہ اس کی حرکت تب معلوم ہوگی جب کوئی کنارا نگا ہو، آپ کو یوں جاتا ہوا معلوم ہو۔ جب اس کا کوئی کنارا نگا نہیں ہوگا تو اس وقت وہ گزرتے ہوئے معلوم نہیں ہوں گے بلکہ ایسے ہوں گے جیسے اپنی جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں...... اس کی

مثال آپ یوں لے لیجئے کہ جب بادل کا کوئی تھوڑا سا ٹکڑا یا مختلف ٹکڑے آسمان پہ ہوتے ہیں تو اس وقت وہ آپ کو چلتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ایک طرف سے دوسری طرف کو جا رہے ہیں، یہ حرکت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور ایک ہے کہ گھٹا محیط ہوگئی، سارا آسمان ابر آلود ہوگیا، کسی طرف سے آسمان ننگا نہیں ہے، تو حرکت تو وہ اس وقت بھی کر رہے ہوتے ہیں لیکن آپ کو نظر نہیں آتے، آپ سمجھتے ہیں کہ اب یہ ساری کی ساری گھٹا ٹھہری ہوئی ہے، حرکت اس وقت بھی کر رہے ہوتے ہیں، البتہ حرکت کرتے کرتے جب آسمان کا کوئی کنارا ننگا ہو جاتا ہے، تب آپ کو پتا چلتا ہے کہ یہ تو چل رہے تھے، اور ہم سمجھے کہ کھڑے ہیں، گرد و غبار اگر اوپر اس طرح محیط ہو جائے تو انسان کو یونہی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ ٹھہری ہوئی ہے، حالانکہ وہ بھی حرکت کر رہی ہوتی ہے، اسی طرح سے بڑے بڑے پہاڑ آپ کو یوں معلوم ہوں گے کہ جس طرح سے اپنی جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں حالانکہ ریزہ ریزہ ہونے کے بعد یوں گزر رہے ہوں گے جس طرح سے بادل گزر رہے ہوں، تو اس ترجمے کے مطابق یہ حال قیامت کے دن کا ہی ہوگیا کہ تو ان پہاڑوں کو دیکھے گا یعنی نفخ کے وقت میں یہ گزر رہے ہوں گے بادلوں کی طرح گزرنا، اور تو سمجھے گا کہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ یہ ترجمہ بھی کیا گیا ہے، اور دونوں باتیں ہی اپنی جگہ واقعہ ہے کہ دنیا میں انسان ان کو دیکھتا ہے تو ایسے ہی معلوم ہوتا کہ یہ ہل نہیں سکتے لیکن قیامت کے دن یہ بادلوں کی طرح بھاگے پھریں گے، اُڑ جائیں گے۔ یا اس وقت دیکھیں گے تو بظاہر معلوم ہوگا کہ اپنی جگہ لگے ہوئے ہیں لیکن وہ بادلوں کی طرح گزریں گے۔

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ: صُنْعَ یہ مصدر ہے، اَیْ صَنَعَ اللّٰهُ صُنْعًا۔ یہ کاریگری اللہ کی ہے، یہ اللہ کا کرنا ہے، جس نے ہر چیز کو مضبوط بنایا، بناتے وقت وہ مضبوط بناتا ہے، جب اس کو توڑنا پھوڑنا چاہے گا تو توڑ پھوڑ بھی دے گا، یہ سب اللہ کی کاریگری ہے۔ اِنَّهٗ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ: بے شک وہ خبر رکھنے والا ہے ان کاموں کی جو تم کرتے ہو، یہ اس کا علمی احاطہ آگیا، اور قیامت کے حالات کے ساتھ چونکہ ہمارے افعال کا ہی زیادہ تعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اوپر جزا سزا دے گا، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تمہارے افعال میں سے کوئی فعل بھی اللہ سے مخفی نہیں۔ یہی بات یاد رکھنے کی ہے۔

نیک و بد کا انجام

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَیْرٌ مِّنْهَا: جو کوئی اچھائی لے کر آیا، اس کے لئے اس اچھائی کے مقابلے میں بہتر اجر ہوگا، یعنی اس اچھائی کا جتنا اجر ہونا چاہیے اس سے بھی بہتر اللہ تعالیٰ دے گا۔ حسنہ کا اول مصداق ایمان، اور اس کے بعد ہر نیکی ہے۔ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ یَّوْمَىِٕذٍ اٰمِنُوْنَ: اور وہ لوگ اس دن کی گھبراہٹ سے بے خوف ہوں گے یعنی جس وقت یہ جزا سزا کا سلسلہ، حساب و کتاب کا سلسلہ شروع ہونے لگے گا، تو جو ایمان لے کے آئیں گے، نیک اعمال لے کے آئیں گے، وہ اس دن کی گھبراہٹ سے بے خوف ہوں گے، ان کے اوپر گھبراہٹ طاری نہیں ہوگی، وہ مطمئن ہوں گے۔ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَةِ: اور جو کوئی برا حال لے کے آئے گا، برے حال کا اصل مصداق کفر ہے، اور اس کے بعد باقی معاصی جتنے بھی ہیں اپنے اپنے درجے کے مطابق، ان کے اوپر گھبراہٹ

طاری ہوگی۔ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ: ان کے چہرے اُلٹے کر دیے جائیں گے جہنم میں، یعنی ان کو منہ کے بل جہنم میں پھینک دیا جائے گا، جیسے ٹانگوں سے پکڑا، اور منہ کے بل اُٹھا کے کسی کو پھینک دیا جائے، ذلت کے ساتھ ان کو پھینک دیا جائے گا۔ اور پھر ساتھ یہ بھی کہا جائے گا: هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: نہیں بدلہ دیے جاتے تم مگر اسی چیز کا جو تم کرتے تھے، یعنی یہ جو کچھ تمہارے سامنے آرہا ہے یہ تمہارے اپنے کیے کا بدلہ ہے، کوئی نئی چیز نہیں ہے۔

مشرکینِ مکہ پر اللہ تعالیٰ کے اِحسانات اور اُن کی ناشکری

إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ: یہ سورت کا اختتام آ گیا جس میں سرورِ کائنات ﷺ اپنے دِین کو بطورِ خلاصے کے پیش فرماتے ہیں۔ إِنَّمَا أُمِرْتُ سے پہلے محاورۃً قُلْ کا لفظ ہم محذوف مانیں گے، گویا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور ﷺ کو کہا جارہا ہے کہ آپ یہ اعلان کر دیجئے، آپ فرمادیجئے، لوگوں کو کہہ دیجئے، سنادیجئے، اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں حکم دیا گیا ہوں کہ میں عبادت کروں اس شہر کے رَبّ کی جس نے اس شہر کو حُرمت والا بنایا۔ چونکہ یہ مکی سورت ہے تو مشرکین مکہ پر اللہ تعالیٰ کا جو احسان ہے اس کی طرف متوجہ کیا گیا، یہ بلدۃ الحرام، مکہ معظمہ جس کو اللہ تعالیٰ نے حُرمت والا بنایا، اس کے رَبّ کی میں عبادت کروں مجھے تو یہ حکم دیا گیا ہے، گویا کہ دعوے کے ساتھ دلیل بھی ہے، کہ جو اس شہر کا مالک ہے اس کی عبادت کروں کیونکہ اس نے اس شہر کو حُرمت والا بنایا، اور اس شہر کے حُرمت والا ہونے کی وجہ سے تم کتنے فائدے اُٹھارہے ہو، یعنی وہ زمانہ قبائلی جنگوں کا تھا، اور لوٹ مار ساری دُنیا میں تھی، کوئی قبیلہ اپنے کو محفوظ نہیں پاتا تھا، اگر کوئی شخص کوشش کر کے کسی شہر کو محرم قرار دیتا کہ دیکھو بھائی! اس میں لڑنا نہیں ہے، تو بھی مخلوق اس پر اتفاق نہ کرتی، خاص طور پر اس زمانے میں جبکہ قبائلی تعصب اور قبائلی لڑائیاں زوروں پر تھیں، تو یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے اس شہر کو محرم بنایا، حُرمت والا بنایا، چونکہ اللہ کا حُرمت والا بنایا ہوا تھا اس لئے لوگوں کے قلوب کے اندر یہ بات پڑی ہوئی تھی، جاہلیت کے زمانے میں، کفر و شرک کے زمانے بھی لوگ اس شہر کا احترام کرتے تھے، اور اس کی حدود میں آ کے کوئی کسی کو ترچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا، اگر اپنے باپ کے قاتل کو بھی اس میں دیکھ لیتے تو بھی وہاں اس پہ ہاتھ نہیں اُٹھاتے تھے، اتنی عزت اللہ تعالیٰ نے اس شہر کی لوگوں کے قلوب کے اندر ڈالی ہوئی تھی۔ تو جس کا یہ احسان ہے کہ اس نے اس بلدہ کو اس شہر کو محرم بنایا ہے مجھے تو حکم ہے کہ میں اسی کی عبادت کروں۔ تیسویں پارے میں سورۂ قریش میں بھی اسی قسم کی بات ہے: فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۝ الَّذِيْٓ أَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝ اس بیت کے رب کی عبادت کریں جس نے ان کو کھانے کے لئے دیا، جس نے ان کو خوف سے امن دیا، یہ بھی انہی فوائد کی طرف اشارہ ہے جو مشرکین مکہ اس بیت اللہ کی برکت سے اُٹھارہے تھے، بیت اللہ کے مجاور ہونے کی وجہ سے لوگ ان کو پیروں کی جگہ مانتے تھے، ان کا احترام کرتے تھے، اور اس احترام کی وجہ سے ان کے تجارتی سفر مامون و محفوظ تھے، لوگ ان سے تعرض نہیں کرتے تھے، تو تجارت کے ذریعے سے یہ روٹی کماتے، اللہ نے ان کو کھانے کے لئے

دیا، یہ اسی گھر کی برکت تھی، لوگ فاقے میں مرتے تھے، اُن کے تجارتی قافلے لوٹے جاتے تھے اور اُن کی جان خطرے میں ہوتی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اِن کو خوف سے بھی امن دیا، اور کھانے کو بھی دیا۔ یعنی اسی بیت کی برکت سے ان کے پاس رزق کی وسعت بھی تھی اور دُنیوی عزت بھی حاصل تھی۔ تو ان لوگوں کو چاہیے کہ اس رَبِّ بیت کی عبادت کریں۔ تو یہاں بھی وہی بلدۃ الحرام کو ذکر کیا کہ یہ شہر جس نے حُرمت والا بنایا اور اس حُرمت کی وجہ سے یہاں کے باشندے اس سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں، تو مجھے یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اسی رَبّ کی عبادت کروں، یعنی مشرکینِ مکہ کو اللہ تعالیٰ کے احسان کی طرف متوجہ کیا۔

وَلَهٗ كُلُّ شَيْءٍ: اور اسی کے لئے ہر چیز ہے، ہر چیز کا مالک وہی ہے۔ وَّاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ: اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں فرماں برداروں میں سے ہوجاؤں۔ وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ: اور مجھے یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ میں قرآن پڑھوں، اس کی تلاوت کروں، یعنی تمہیں پڑھ پڑھ کر سناؤں۔ جس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہوگیا کہ میں وہی ہوں جس کے متعلق تمہارے جدِّ اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُعا کی تھی: رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ (سورۂ بقرہ:۱۲۹) کہ اے اللہ! ان کے اندر ایک ایسا نبی بھی بھیجنا جو تیری آیتیں ان کو پڑھ پڑھ کر سنائے۔ تو مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں قرآن پڑھوں یعنی میں وہی ہوں جس کے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُعا کی تھی، اور میں اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرتا ہوں۔ مجھے یہ حکم بھی دیا گیا ہے۔

فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ: جو سیدھا راستہ حاصل کرے گا، ہدایت یافتہ ہوجائے گا، میرے اس قرآن کو سُن کر، میرے اس طرز کو دیکھ کر، جو کوئی سیدھا راستہ پالے گا، سوائے اس کے نہیں وہ ہدایت یافتہ ہوگا اپنے لئے ہی، یعنی اس کے ہدایت حاصل کرنے کا فائدہ اسے ہی پہنچے گا۔ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ: اور جو کوئی بھٹک جائے گا تو آپ فرمادیجئے کہ میں تو ڈرانے والوں میں سے ہوں، یعنی پیغمبروں رسولوں میں سے ہوں جو اللہ کی طرف سے ڈرانے کے لئے آیا کرتے ہیں، کسی کے بھٹکنے کا مجھے کوئی نقصان نہیں، میرا کام تو انذار ہے، میں تو مُنذِرین میں سے ہوں اور میں نے اپنا فرض ادا کردیا۔ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ: اور آپ یہ بھی کہہ دیجئے کہ سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، سب اچھی صفات اللہ ہی کے لئے ہیں، علم، حکمت، قدرت، جو کچھ ہے سب اللہ کے لیے ثابت ہے۔ سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا: عنقریب دکھائے گا اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی آیات پھر تم ان کو پہچان لوگے۔

قیامت کو سمجھانے کے لئے شخصی موت کی مثال

اور ''بیان القرآن'' میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ماقبل کے ساتھ ربط یوں دیا کہ پیچھے سے ذکر آ رہا تھا قیامت کا، اور جب بھی قیامت کا ذکر آتا ہے تو لوگ پوچھتے ہیں کہ وہ کب آئے گی؟ اور جب وقت نہ بتایا جائے تو اس میں شک کرتے ہیں، انکار کرتے ہیں۔ اور قرآنِ کریم میں بار بار اس بات کو واضح کیا گیا کہ کسی چیز کا وقت معلوم نہ ہونا، اس کے نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے، بسا اوقات کسی چیز کے وقت کا مخفی رکھنا ہی مصلحت ہوتا ہے، اس کو بالکل آپ اس طرح سے سمجھیں جس طرح سے شخصی موت

ہے، آپ نے بھی مرنا ہے، میں نے بھی مرنا ہے، لیکن ہم میں سے کسی کو اپنی موت کا وقت معلوم ہے؟ کوئی نہیں بتا سکتا کہ میں نے کب مرنا ہے، لیکن ہے یقینی، اب اگر کوئی شخص موت کا اس دلیل سے انکار کرے کہ بھائی! اگر موت حق ہے تو ہمیں ہمارے مرنے کا وقت بتاؤ، اور اگر ہمارے مرنے کا تم وقت نہیں بتا سکتے تو پھر یہ مرنا، مرنا، کیا ہمیں یاد دلا رہے ہو کہ تم نے مرنا ہے، اگر یہ کوئی واقعہ ہے تو ہمیں وقت بتاؤ، تو آپ جانتے ہیں کہ وقت نہیں بتایا جا سکتا، اللہ تعالیٰ نے اس شخصی موت کو مخفی رکھا ہے، اور اسی میں مصلحت ہے۔ یہ دنیا کی چہل پہل جو آپ کو نظر آ رہی ہے اور آپ کی ساری جدوجہد اس زندگی کے لیے جو نظر آ رہی ہے، تو یہ اسی پر ہی مبنی ہے کہ تمہیں اپنے مرنے کا وقت معلوم نہیں، اور اگر یہ وقت بتا دیا جاتا، تو چاہے آپ کے مرنے میں پندرہ سال ہی باقی ہیں، بیس سال ہی باقی ہیں، فکر آج سے پڑ جاتا، دن ہی شمار کرتے رہتے کہ اتنے دن باقی رہ گئے، اتنے دن باقی رہ گئے، اور جب وقت قریب آ جاتا تو سوائے رونے دھونے کے کوئی کام نہ ہوتا، مرنے سے پہلے ہی مر جاتے۔ اب آخر وقت تک انسان اس طرح سے جدوجہد کرتا ہے جیسے اس نے مرنا ہی نہیں، اس لئے وہ طویل جدوجہد میں لگا رہتا ہے، اور اگر موت بتا دی جائے تو زندگی کا سارے کا سارا نظم مختل ہو جاتا۔ لیکن اب شخصی موت کا پتا نہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ موت آنی ہی نہیں، روز مرہ آتی ہے آپ کے سامنے۔ تو اسی طرح سے قیامت آئے گی لیکن اس عالمی موت کی خبر اللہ نے بالتعیین نہیں دی، اتنا یقین ہے کہ آئے گی، اس میں شک کی گنجائش نہیں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے وقت کو مخفی رکھا ہے، اپنی حکمت اور مصلحت کے تحت۔ اس لئے حضور ﷺ اگر وقت نہ بتا سکیں تو اس سے انکار کی گنجائش نہیں۔

سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، اچھی اچھی صفات اسی کے لئے ہیں، علم اسی کا، قدرت اسی کی، حکمت اسی کی، باقی! قیامت کے واقعات تمہارے سامنے آ جائیں گے، اور قیامت کے واقعات جب آئیں گے پھر تم پہچان لو گے کہ یہ وہی باتیں ہیں جو میں بتایا کرتا تھا، جو اللہ کے قرآن میں ذکر کی گئی ہیں، یہ وہی واقعات ہیں تم ان کو پہچان لو گے، لیکن اس وقت پہچاننے کا فائدہ کوئی نہیں ہوگا۔ عنقریب اللہ تعالیٰ دکھائے گا تمہیں اپنی آیات، ''دکھانے'' کا مطلب یہ ہے کہ ان آیات کا وقوع تمہارے سامنے آ جائے گا، جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ جو کچھ اپنی کتاب میں بیان کر رہا ہے وہ نشانیاں تمہارے سامنے آ جائیں گی، یعنی واقعات نمایاں ہو جائیں گے، جب وہ واقعات تمہارے سامنے آ جائیں گے پھر تم پہچان لو گے کہ یہ وہی باتیں ہیں جو تمہیں پہلے بتائی جاتی تھیں، لیکن اس وقت ان کے پہچاننے پر پھر تم مانو گے ایمان لاؤ گے تو پھر اس کا فائدہ کوئی نہیں ہوگا۔

وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ: تیرا رب غافل نہیں ان کاموں سے جو تم کرتے ہو، اصل یاد رکھنے کی بات یہی ہے کہ تمہارے سب اعمال اللہ کے سامنے ہیں، اور انہی اعمال کے ساتھ جزا و سزا کا تعلق ہے، تم اپنے بچاؤ کی کوشش کرو، ایسے عمل کرو کہ جس کے نتیجے میں تمہیں راحت اور آرام ملے، اور اس قسم کی کمزور باتیں کہ چونکہ اس کا وقت معلوم نہیں اس لئے ہم اس کا عقیدہ نہیں رکھتے، اس قسم کی باتوں میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ غافل نہیں ہے، بے خبر نہیں ہے ان کاموں سے جو تم کرتے ہو۔

''سماعِ موتی'' پر مدلل و مفصل بحث

آج ''سماعِ موتی'' کے متعلق کچھ عرض کرنے کا خیال ہے۔ مقصد یہ ہے کہ آپ کے سامنے اپنا اور اپنے اکابر کا مسلک واضح کر دیا جائے، یہ کوئی مناظرہ نہیں ہے، طالبعلمانہ وضاحت ہے، اس لئے گفتگو مثبت انداز میں ہوگی، کسی کو الزام دینا مقصود نہیں۔ مسئلہ چونکہ اہم ہے، اس لئے مسئلے کی وضاحت کرنے سے قبل ایک دو باتیں آپ کی خدمت میں بطور اصول کے ذکر کرتا ہوں، اگر آپ ان کو ذہن نشین کر لیں گے، تو ان شاء اللہ العزیز! اس مسئلے میں بھی اور آئندہ بہت سے مسائل میں آپ کے لئے مفید رہیں گی۔

''حق'' قیامت تک سلسلہ وار موجود رہے گا

سب سے پہلی بات تو یہ یاد رکھئے! اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۚ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (سورۂ آل عمران: ۱۰۴) تم میں سے ایک جماعت موجود رہنی چاہیے جو خیر کی طرف لوگوں کو بلائے اور معروف کا حکم دے اور برائی سے روکے، یہ لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے، مختلف جماعتوں میں بٹ گئے، اور انہوں نے اختلاف کیا بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح دلائل آ گئے، یہی لوگ جو کہ واضح دلائل آنے کے بعد اختلاف کرتے ہیں ان کے لئے عذابِ عظیم ہے۔ یہ آیت میں نے آپ کے سامنے اس لئے تلاوت کی کہ بظاہر تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ہے کہ ایک جماعت ایسی موجود رہنی چاہیے، جس کے لئے عنوان ہے: اہلِ حق کی جماعت، اللہ والوں کی جماعت، جو لوگوں کو خیر کی طرف بلائے، بھلائی کا حکم دے، برائی سے روکے۔ اور سرورِ کائنات ﷺ نے پیش گوئی کے طور پر اس بات کو ذکر فرما دیا، صحیح روایات میں موجود ہے، آپ نے فرمایا کہ ''لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِيْ ظَاهِرِيْنَ عَلَى الْحَقِّ ''[1] یا بعض روایات میں جس طرح سے لفظ آتا ہے: ''قَائِمَةٌ عَلَى الْحَقِّ ''[2] کہ میری اُمت میں ایک طائفہ ایسا موجود رہے گا جو حق پہ قائم ہوگا، اور کوئی دور بھی اُس فرقے سے خالی نہیں ہو سکتا، اہلِ حق سے خالی نہیں ہو سکتا، پہلی اُمتیں تھیں جو اپنے نبی کے جانے کے بعد ساری کی ساری بھی گمراہ ہو گئیں، صحیح راستے سے بھٹک گئیں، تو اللہ تعالیٰ نے اور نبی بھیجا، جس نے ان کے سامنے حق راستے کو واضح کیا، لیکن سرورِ کائنات ﷺ کی اُمت چونکہ آخری اُمت ہے، سرورِ کائنات ﷺ خاتم النبیین ہیں، آپ کے بعد کسی دوسرے نبی نے تو آنا نہیں، اس لئے قیامت تک ''حق'' سلسلہ وار موجود رہے گا، کوئی دور ایسا نہیں آئے گا سرورِ کائنات ﷺ کے بعد کہ جس میں ''اہلِ حق'' کلیتاً مٹ جائیں، اور حضور ﷺ کی اُمت گمراہی پہ جمع ہو جائے، ایسا نہیں ہو سکتا۔ اور جس دن یہ نوبت آ گئی کہ

---

(۱) مسلم ۲/ ۱۴۳ باب قوله لا تزال طائفة۔ نیز بخاری ۱/ ۵۱۴ باب سوال المشرکین سے اگلا باب۔ مشکوۃ ۲/ ۵۸۳ کتاب الفتن فصل ثانی کا آخر

(۲) معجم کبیر ج ۱۹ ص ۳۸۶۔ نیز مسلم ج ۲ ص ۱۴۳۔ بخاری ۱/ ۵۱۴ ولفظهما: لا یزال من امتی امة قائمة بامر الله

"اہلِ حق" ختم ہوگئے اور پچھلی انسانی آبادی ساری کی ساری گمراہی پہ جمع ہوگئی اس دن قیامت آجائے گی، "حق" کا وجود تسلسل کے ساتھ چلا آرہا ہے۔

نظریۂ حق کا معیار کیا ہے؟

ایک طائفہ جس کو "مَا اَنَا عَلَیْهِ وَاَصْحَابِیْ"(۱) کے ساتھ ہم ذکر کرتے ہیں، وہ موجود رہے گا۔ اس لئے حق کو پہچاننے کے لئے یہ ایک معیار ہے کہ آپ یہ دیکھیں کہ سرورِ کائنات ﷺ سے لے کر اس وقت تک وہ گروہ جو "مَا اَنَا عَلَیْهِ وَاَصْحَابِیْ" کا امتیاز رکھتا ہے، اس کا نظریہ کیا چلا آرہا ہے؟ اگر کوئی نظریہ اس قسم کا ہے جس میں آپ کو تسلسل معلوم ہو تو سمجھ لیجئے کہ یہ حق ہے، اور اگر کوئی نظریہ اس قسم کا ہو کہ اس میں تسلسل نہیں ہے، حضور ﷺ کے بعد اُمت کے اندر وہ نظریہ نہیں تھا، کچھ مدت کے بعد لوگوں نے نکالا ہے چاہے اپنے طور پر وہ ہزار ہا دلائل اس کے اُوپر رکھتے ہوں، ہم اس نظریے کو حق کہنے کے لئے تیار نہیں، کیونکہ وہ حق نہیں ہو سکتا جو سرورِ کائنات ﷺ کے بعد اُمت کے اندر مسلسل نہیں آیا، یہ ان کی ایک اپنی ذہنی تحقیق ہے، اور ان کے اپنے اوہام اور خیالات کا مجموعہ ہے، ہم اس کو حق کہنے کے لئے تیار نہیں، ہم حق اسی کو کہیں گے کہ جس کا سلسلہ پچھلی اُمت کے اندر سرورِ کائنات ﷺ تک ملا دیا گیا ہو۔

برصغیر میں "اہلِ حق" طبقہ

حضور ﷺ کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا گروہ ہے، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ کا گروہ ہے، جن میں سے ائمۂ اربعہ رحمہم اللہ زیادہ ممتاز ہوئے، اور ان کے بعد انہی کے مقلدین میں اصحابِ فتاویٰ، بڑے بڑے محققین، اور ایسے ہی اولیاء اللہ، اصحابِ باطن کا گروہ جن کے اہلِ حق ہونے پر اہلِ سنّت والجماعت اتفاق کرتے آئے ہیں۔ اور پھر خصوصیت سے ہمارے ملک میں ہندوستان کے اندر حضرت مجدّد الف ثانی رحمہ اللہ اس گروہ کے سرخیل ہیں، اور انہی سے اہلِ حق کی جماعت زیادہ ممتاز ہوئی، حضرت مجدّد الف ثانی رحمہ اللہ کے بعد آپ کی اولاد میں ان کے جو جانشین ہوئے خواجہ محمد معصوم، خواجہ محمد سعید، یہ سلسلۂ مجدّدی چلتا رہا۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اور ان کی اولاد جو ہمارے اساتذہ میں سارے کے سارے شامل ہیں، شاہ عبدالعزیز صاحب محدّث دہلوی رحمہ اللہ، مولانا محمد اسحاق محدّث دہلوی رحمہ اللہ، شاہ عبدالغنی محدّث دہلوی رحمہ اللہ۔ اور آگے چل کر اس جماعت نے بہت ممتاز حیثیت اختیار کرلی، جس کے لئے عنوان ہم "علمائے دیوبند" کا اختیار کرتے ہیں، جس میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ یہ دونوں فرد اس گروہ کے سالار ہیں، اور اسی طرح سے دوسرے حضرات جن کی نسبت "دیوبند" کی طرف ہے اور اس مسلک کے ترجمان ہیں، حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری رحمہ اللہ، مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ، حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ، مولانا اعزاز علی صاحب رحمہ اللہ اور حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ۔ اور پاکستان بننے کے بعد اسی جماعت کے ممتاز افراد جو ادھر

---

(۱) مشکوٰۃ ص ۳۰ باب الاعتصام فصل ثانی۔ ترمذی ۲/ ۹۳ باب افتراق ھذہ الامۃ

پاکستان میں آئے، بزرگ بھی، اولیاء بھی، اور علماء بھی، حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ اور اسی طرح دیگر بزرگ مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ، مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا ادریس کاندھلوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔ یہ حضرات سارے کے سارے علمائے دیوبند کے ترجمان سمجھے جاتے ہیں۔ تو یہ اہلِ حق کی جماعت ممتاز چلی آرہی ہے، اور ہندوستان کے اندر ان افراد کو خصوصیت کے ساتھ ہم اپنے لیے مشعلِ حق مانتے ہیں، اور ان کو اپنا ہادی اور راہنما سمجھتے ہیں۔ یہی ہیں جن کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ''مَا اَنَا عَلَیْهِ وَاَصْحَابِیْ'' کا مصداق ہیں۔

''فہمِ قرآن وحدیث'' کس کا معتبر ہوگا؟

اس لئے آپ حضرات کو سب سے پہلے جو مسئلہ بھی پیش آجائے اس میں یہ دیکھنا چاہیے کہ اس جماعت کا نظریہ کیا ہے؟ جو کچھ ان لوگوں نے سمجھا جنہوں نے اپنی ساری کی ساری زندگیاں قرآن وحدیث کی تحقیق میں گزار دیں، وہی ہمارے لئے حق ہے، چاہے ہماری سمجھ میں اس کی دلیل آئے چاہے نہ آئے، قرآن وحدیث کا مطلب اگر ہم سمجھیں گے تو اسی جماعت کے ضمن میں سمجھیں گے، انہی کے فہم کے ساتھ سمجھیں گے، اگر ہمارا فہم ان کے مطابق ہے، تو ہمارا فہم ٹھیک ہے، اور اگر ہمارا فہم ان کے مطابق نہیں ہے، تو ہمارا فہم ٹھیک نہیں ہے، ان حضرات کی جو اجتماعی رائے ہے وہ ٹھیک ہے۔ چنانچہ یہی اُصول ہے جو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ''مکتوبات'' کے اندر بیان فرمایا، یہ صرف اصل کلی کے طور پر آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں، حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''اے نیک بخت! جو چیز ہم پر اور تم پر لازم ہے وہ کتاب وسُنّت کے مطابق عقائد کی اصلاح کرنا ہے، مگر اس طریق پر کہ علمائے اہلِ حق نے کتاب وسُنّت سے اس کو سمجھا ہے اور ان سے اخذ کیا ہے، کیونکہ ہمارا اور تمہارا سمجھنا اگر ان بزرگوں کے فہم کے مطابق نہ ہو تو اعتبار کے مقام سے ساقط ہے، کیونکہ ہر بدعتی اور گمراہ اپنے باطل اَحکام کو کتاب وسُنّت سے ہی سمجھتا ہے اور وہاں سے ہی اخذ کرتا ہے، حالانکہ اس کا یہ سمجھنا حق کی کسی چیز سے مستغنی نہیں کرتا۔'' یعنی جو شخص بھی کوئی نظریہ لے کر اُٹھتا ہے، وہ استدلال تو قرآن وحدیث سے ہی کرے گا، لیکن ہم اس کو اس طرح سمجھیں گے جس طرح اہلِ حق نے کتاب وسُنّت سے اس کو سمجھا ہے، اہلِ حق کا گروہ جو پہلے سے چلا آرہا ہے، جو انہوں نے سمجھا، وہی ہمارے لئے حجت ہے، ہم اسی کے مطابق ہی اس کو سمجھیں گے۔ تو یہ طریقہ ہے ہمارے نزدیک حق کے سمجھنے کا!

''بَیِّنَات'' آنے کے بعد اِختلاف کرنا اہلِ باطل کا کام ہے

اس بنیاد کے قائم کرنے کے بعد میں آپ کی خدمت میں یہ عرض کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو واضح دلائل کے آجانے کے بعد آپس میں اختلاف کریں ان کے لئے عذابِ عظیم ہے۔ یہ علامت ہے اس بات کی کہ اہلِ حق وہی گروہ ہوتا ہے جو واضح دلائل کے آنے کے بعد اختلاف نہیں کرتا، واضح دلائل وہ ہوا کرتے ہیں جن میں قطعیات کی شان ہوتی ہے، اور قطعیات کے آجانے کے بعد اختلاف کرنا اہلِ حق کا نشان نہیں ہے۔ اس لئے میں ہمیشہ آپ کی خدمت میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ علمائے حق میں کوئی مسئلہ اگر مختلف فیہ ہو، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں، اَئمہ مجتہدین رحمہم اللہ میں، اور بعد میں علمائے اُمت میں اگر کوئی مسئلہ مختلف فیہ ہو تو یہ

علامت ہوتی ہے کہ قرآن کے اندر اس مسئلے کے اُوپر "بیّنات" قائم نہیں ہیں، اگر یہ مسئلہ "بیّنات" کے تحت واضح ہوتا تو کم از کم صحابہ میں، ائمۂ مجتہدین میں، اور دُوسرے علمائے اُمت میں، مؤمنینِ کاملین میں یہ مسئلہ مختلف فیہ نہ ہوتا۔ "بیّنات" کے آجانے کے بعد اختلاف کرنا اہلِ باطل کا کام ہے، ان لوگوں کا کام ہے جن کے لئے آخرت میں عذابِ عظیم ہے۔ اہلِ حق "بیّنات" کے آنے کے بعد کبھی مسئلے میں اختلاف نہیں کر سکتے۔

مسائلِ اجتہادیہ میں اختلاف کی گنجائش ہوتی ہے

اور اگر اہلِ حق کے اندر کوئی مسئلہ مختلف فیہ ہو، تو اُصولی طور پر یہ بات طے شدہ ہے کہ آپ کو ماننا پڑے گا کہ اس مسئلے پہ "بیّنات" قائم نہیں ہیں، اور یہ مسئلہ مجتہد فیہ ہے۔ اور جو مسئلہ مجتہد فیہ ہو، "بیّنات" سے واضح نہ کیا گیا ہو، اس میں اختلاف کی گنجائش ہوتی ہے، اہلِ حق کی دو رائے ہو سکتی ہیں، یہ کہہ دیں، یا یہ کہہ دیں، اس میں کوئی جھگڑے کی بات نہیں۔ اور اس قسم کا مسئلہ جو کہ مجتہد فیہ ہو، جس میں اہلِ حق کی دو رائے ہوں، یہ مدارِ کفر وایمان نہیں ہوتا، بلکہ کوئی ان میں سے کوئی شق بھی اختیار کر لے، اس کو ہم کفر نہیں کہہ سکتے، اور دُوسرے کا اختیار کرنا ہم ایمان کے لئے شرط قرار نہیں دے سکتے۔

مثال سے وضاحت

یہ ایک بہت بڑی اُصولی بات ہے جو آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں۔ دیکھئے! نماز فرض ہے، اس کے اُوپر قرآنِ کریم میں "بیّنات" قائم ہیں، کوئی اختلاف نہیں اہلِ حق کا، سب کہتے ہیں کہ نماز فرض ہے، اب اگر یہاں کوئی اختلاف کرے اور کہے کہ نماز فرض نہیں، وہ کافر ہے۔ نماز پانچ وقت فرض ہے، احادیثِ متواترہ کے ساتھ، اُمت کے تعامل سے یہ مسئلہ قطعیات سے ثابت ہے، اور اس قطعی مسئلے کے اندر اہلِ حق کا کوئی اختلاف نہیں، اور اس مسئلے میں اگر کوئی اختلاف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ پانچ وقت کی فرض نہیں، تین وقت کی فرض ہے، یا دو وقت کی فرض ہے، تو یہ شخص کافر ہے۔ یہ "مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَهُمُ الۡبَيِّنٰتُ" اختلاف کرنے والوں میں شامل ہے، اہلِ حق کا اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں، ظہر کی رکعتیں چار ہیں، عصر کی چار ہیں، مغرب کی تین ہیں، عشاء کی چار ہیں، فجر کی دو ہیں، یہ سارے کے سارے مسئلے "بیّنات" سے ثابت ہیں، قطعیات سے ثابت ہیں، ان میں اہلِ حق کا کوئی اختلاف نہیں، اس لئے یہ تو ایمان کا مدار ہیں، ان کے مطابق عقیدہ رکھنا ضروری ہے، اگر کوئی شخص اس کے خلاف کہے گا تو یہ "مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَهُمُ الۡبَيِّنٰتُ" اختلاف کرنے والوں میں سے ہے، اس کے لئے عذابِ عظیم ہے، ہم اس کو کافر کہیں گے۔

لیکن......! نماز میں فاتحہ فرض ہے یا نہیں؟ رفع یدین کرنا ہے یا نہیں کرنا؟ آمین بالجہر ہے یا آمین بالسر؟ آپ جانتے ہیں کہ صحابہ کرام ؓ سے لے کر آج تک اس میں اہلِ حق کے دو گروہ چلے آ رہے ہیں، یہ علامت ہے اس بات کی کہ یہ مسئلہ مجتہد فیہ ہے، اس کے اُوپر ایمان کا مدار نہیں، اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ جو فاتحہ پڑھتے ہیں وہ کافر، تو یہ شخص بھی گمراہ۔ اور اگر کوئی شخص کہے کہ جو فاتحہ نہیں پڑھتے وہ کافر ہیں، تو شخص یہ بھی گمراہ ہے۔ وہ کافر نہیں ہوں گے، یہ کہنے والا گمراہ ہے۔ کیونکہ اس نے ایک ایسا راستہ اختیار کر لیا جو سرورِ کائنات ﷺ کے بعد اہلِ حق کا راستہ نہیں ہے، اہلِ حق کا راستہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ مجتہد فیہ ہے، اگر کسی کا اجتہاد، کسی

کی تحقیق اُدھر کو جاتی ہے تو اس کے لئے بھی گنجائش ہے، اِدھر کو جاتی ہے تو اس کے لئے بھی گنجائش ہے، زیادہ سے زیادہ کوئی شخص یہ قول کر سکتا ہے کہ ''بہتر یہ ہے''، ''اَولیٰ یہ ہے''، ''افضل یہ ہے''، دوسری شق کو بالکلیہ باطل قرار دینا اور اس مسئلے کو کفر وایمان کے لئے مدار ٹھہرالینا، یہ اہلِ حق کا کام نہیں ہے۔ قرآنِ کریم میں آ گیا کہ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ (سورۂ نساء: ۱۱۵)۔ ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد جو رسول کی مخالفت کرتا ہے، اور مؤمنین کے راستے کو چھوڑ کر کسی دوسرے راستے پہ چلتا ہے، ہم اس کو کرنے دیں گے جو کچھ وہ کرتا ہے، دُنیا میں ہم ان کے اُوپر کوئی جبر نہیں کریں گے، پھیر دیں گے ادھر کو جدھر کو پھرتا ہے، متولّی بنادیں گے اس کو اسی چیز کا جس کا متولّی بنتا ہے، بعد میں اُٹھا کے اس کو جہنم میں پھینک دیں گے، تو ''بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى'' اختلاف کرنا اہلِ حق کا کام نہیں ہے، اور مؤمنین کے راستے کی اِتباع یہ اہلِ حق کا کام ہے کہ پہلے سے مؤمنینِ کاملین جو طریق اختیار کئے ہوئے ہوں، اسی کی اتباع کرو، یہ ہدایت ہے، اور مؤمنین کے راستے کو چھوڑنا، یہی اللہ کے رسول کی مخالفت ہے۔

''مختلف فیہ مسائل'' مدارِ ایمان نہیں ہیں

یہ اُصول یاد رکھیے! جو مسئلہ مختلف فیہ ہو وہ مدارِ ایمان نہیں ہوتا، وہ ''بیّنات'' سے ثابت نہیں، یہ علامت ہے اس بات کی کہ اس کے اوپر ''بیّنات'' نہیں ہیں، اگر اس کے اُوپر ''بیّنات'' آئی ہوئی ہوتیں، تو کم از کم اہلِ حق اس میں اختلاف نہ کرتے، تو ''مختلف فیہ مسئلہ''، ''مجتہد فیہ'' ہوتا ہے، اور ''مجتہد فیہ'' مسئلے میں کسی مجتہد کو آپ ''خاطی'' تو کہہ سکتے ہیں، اور دُوسرے کو آپ ''اَولیٰ بالحق'' کہہ سکتے ہیں، کسی کی تحقیق کو ''افضل'' کہہ سکتے ہیں، لیکن اس مسئلے کو مدارِ ایمان نہیں ٹھہرا سکتے، کہ ایک شق اختیار کرنے والے کو آپ کہیں کہ کافر ہے۔ یا دُوسری شق اختیار کرنے والے کو کہو کہ مؤمن تو صرف یہی ہے۔ ''مجتہد فیہ مسائل'' کا یہ مطلب نہیں ہوا کرتا۔ ایک بات تو یہ آپ اپنے ذہن کے اندر رکھیں۔

(کسی سوال کے جواب میں فرمایا:)...... میں بار بار لفظ استعمال کر رہا ہوں کہ ''ما انا علیہ واصحابی'' جس گروہ کی شان ہے، ابتدا سے جو لوگ ''اہلِ سُنّت والجماعت'' کے عنوان کے ساتھ مشخّص ہیں ان کی بات کر رہا ہوں، اور جن کو اہلِ سُنّت والجماعت پہ اتفاق نہیں، انہوں نے اپنے کو اس سے خارج کر دیا، وہ تو ابتدا سے لے کے اس وقت تک مختلف فرقے آ رہے ہیں، معتزلہ ہوں یا خوارج ہوں، یہ ''ما انا علیہ واصحابی'' میں شامل نہیں ہیں، اور ہمیشہ ان کو اہلِ حق نے اپنے سے خارج قرار دیا، یہ وہی بھٹکے ہوئے راستے کے لوگ ہیں، میں جس گروہ پہ مدار رکھ رہا ہوں یہ وہ گروہ ہے جس کو ہم اہلِ سُنّت والجماعت کہتے ہیں، جو ''ما انا علیہ واصحابی'' کی شان رکھتا ہے، اس لیے معتزلہ، خوارج وغیرہ کا اختلاف اس میں کوئی اثر نہیں ڈالتا، وہ لوگ اسی گروہ کی دلیل کے ساتھ ہی گمراہ ہیں، وہ اہلِ حق میں شامل نہیں ہیں...... ایک بات تو یہ ہوگئی جو میں نے آپ کی خدمت میں عرض کر دی۔

''عالمِ برزخ'' اور ''عالمِ آخرت'' کو سمجھنے کے ذرائع

دوسری بات آپ یہ ذہن میں رکھیں کہ ''عالم'' مختلف ہیں، ایک وہ ہے جس کو ہم ''عالمِ دُنیا'' کہتے ہیں، جس میں اس

وقت ہم زندہ ہیں۔ اور ایک اس سے پہلے عالم تھا جہاں ہماری رُوحیں موجود تھیں (یعنی ''عالمِ ارواح'')۔ اور ایک مرنے کے بعد قیامت سے پہلے کا زمانہ ہے جس کو ''عالمِ برزخ'' کہا جاتا ہے۔ اور ایک مخلوق جب مجموعی طور پر اُٹھے گی، قبروں سے ان کو اُٹھایا جائے گا، جس کو ہم ''قیامت کا دن'' کہتے ہیں یعنی ''عالمِ آخرت''۔ یہ قطعیات کے ساتھ ثابت ہیں۔ مرنے کے بعد سے لے کر قیامت تک کا زمانہ ''برزخ کا زمانہ'' کہلاتا ہے۔ جس وقت انسان مر جاتا ہے تو ''عالمِ دُنیا'' اس کا ختم ہوگیا، ''عالمِ برزخ'' کی طرف وہ منتقل ہوگیا۔ تو جب وہ ''عالمِ برزخ'' کی طرف منتقل ہوگیا، تو اُس جہان کے حالات، اس دُنیا کے حالات کے اُوپر قیاس کر کے نہیں سمجھے جا سکتے، اس دُنیا کے حالات اور طرح کے ہیں اور مرنے کے بعد جس وقت ہم دوسرے عالم میں منتقل ہو جائیں گے وہاں کے حالات اور طرح کے ہیں، اور جب جی اُٹھیں گے، دوبارہ آخرت آئے گی، اس کے حالات اور طرح کے ہیں، وہاں کے حالات کو سمجھنے کے لئے یا تو اللہ تعالیٰ کی وحی چاہیے یا فراستِ صحیحہ جو کہ ''مقتبسہ من الوحی'' ہوتی ہے۔ جیسے کہ قرآنِ کریم میں آیت آئی: وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (سورۂ بقرہ: ۱۵۴) کہ جو اللہ کے راستے میں قتل کر دیے گئے، انہیں اموات نہ کہو۔ اور دُوسری جگہ آیا کہ: وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ يُرْزَقُوْنَ (سورۂ آل عمران: ۱۶۹) جو اللہ کے راستے میں قتل کر دیے گئے انہیں اموات نہ سمجھو، یعنی دِل سے بھی اموات نہ سمجھو، زبان سے بھی اموات نہ کہو۔ بَلْ اَحْيَاۗءٌ: بلکہ وہ زندہ ہیں، وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ: لیکن تمہیں شعور نہیں۔ یہاں قاضی ثناء اللہ پانی پتی صاحب رحمہ اللہ ''تفسیر مظہری'' میں لکھتے ہیں کہ ''شعور'' سے مراد وہ علم ہوتا ہے جس کو انسان اپنے حواس سے حاصل کرتا ہے، تو مطلب یہ ہوا کہ تم ان کی زندگی کو آنکھوں سے دیکھ کے معلوم نہیں کر سکتے، اپنے ہاتھوں کے ساتھ چھو کے معلوم نہیں کر سکتے، کانوں کے ساتھ سُن کے معلوم نہیں کر سکتے، یہ بات تمہارے شعور میں نہیں ہے، تو ان کی زندگی کا ادراک نہ حس کے ذریعے ہو سکتا ہے، نہ عقل کے ذریعے، بلکہ اس کے ادراک کے لیے یا وحی چاہیے، ''بل بالوحی او الفراسة الصحيحة المقتبسة من الوحی'' یا تو وحی کے ذریعے معلوم ہو سکتی ہے کہ اللہ بتا دے کہ ان کی زندگی کس قسم کی ہے اور برزخ میں ان کے اُوپر کیا حالات گزرتے ہیں، یا فراستِ صحیحہ کے ذریعے۔ ''فراستِ صحیحہ'' سے مراد یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحی کے مطابق عمل کرتے ہوئے اور مجاہدہ کرتے ہوئے انسان کی طبیعت میں ایک لطافت پیدا ہو جاتی ہے، جس کے ساتھ بعض اُمورِ غائبہ کے انکشافات ہونے لگ جاتے ہیں، جس کو ''کشف'' کے ساتھ یا ''الہام'' کے ساتھ تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ ''وحی'' قطعی ہوتی ہے اور ''کشف والہام'' ایک ظنی چیز ہے، جو صحیح بھی ہو سکتا ہے غلط بھی ہو سکتا ہے۔ بہر حال اگر کچھ نہ کچھ احساس کیا جا سکتا ہے تو وحی کے فیض سے کیا جا سکتا ہے، براہِ راست اللہ تعالیٰ اور اللہ تعالیٰ کا رسول واضح کر دے کہ حالات یہ گزرتے ہیں تو ٹھیک ہے، اور اگر اللہ اور رسول کی اتباع کرتے ہوئے کسی کو فراستِ صحیحہ حاصل ہو، اور صفائے باطن کے ساتھ اس کے سامنے کسی چیز کا انکشاف ہو جائے، یا اس کے قلب میں اللہ کی طرف سے کوئی بات ڈال دی جائے، تو اس کے ذریعے سے بھی کچھ حالات معلوم کئے جا سکتے ہیں، لیکن جو اللہ اور اللہ کے رسول کی زبان سے ''وحی'' کے ذریعے واضح ہوں گے، وہ قطعی ہوں گے، ان میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہوگی، اور اگر ''کشف'' کے ساتھ رُوحانی تعلق کی بنا پر، رُوحانی صفائی کی بنا پر کچھ حالات معلوم ہوں تو ظنی ہوتے ہیں۔ بہر حال اگر کچھ تدارک ہو سکتا ہے تو باطنی قوت کے ساتھ یا وحی کے

ذریعے سے، ہم اپنے حواسِ ظاہرہ کے ساتھ برزخ کے حالات کو معلوم نہیں کر سکتے...... اسی طرح سے آخرت کے حالات ہیں۔
اب وہاں کے حالات کو اگر سوچنا چاہیں کہ اتنی آگ ہوگی، اس کے اندر آدمی ڈالے جائیں گے، اور وہ جلیں گے بھی، لیکن مریں گے نہیں، یا ایسا پُل صراط ہوگا، یہ ہوگا، وہ ہوگا۔ عقلی دلائل کے ساتھ آپ اگر طے کرنا چاہیں گے تو انسان گمراہ ہو جاتا ہے کہ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا، اتنا باریک پُل ہوگا،[1] اور اتنا تیز پُل ہوگا، یہاں نہیں چل سکتے، تو وہاں کس طرح سے چلیں گے...... جیسے مشہور ہے کہ ایک مولوی صاحب پُل صراط کی تفصیل کر رہے تھے تو کوئی جاہل سامنے بیٹھا ہوا تھا، کہتا ہے: مولوی صاحب اتنا زور جو لگا رہے ہو، اس پُل کو ثابت کرنے کے لئے، سیدھا کیوں نہیں کہہ دیتے کہ جنت کے لئے راستہ ہی کوئی نہیں، یہ اتنا باریک پُل جو بنا دیا، تو اس پر سے کون گزر کے جائے گا، سیدھا کہہ دو کہ آگے راستہ ہی کوئی نہیں...... تو عقل کے ساتھ ان باتوں کو طے کرنے کی کوشش کرنا، یا اس دُنیا کے معاملات پر قیاس کر کے اُس عالم کے معاملات کو طے کرنا، یہ گمراہی کی بنیاد ہے۔ اللہ کی طرف سے وحی آ جانے کے بعد اور اللہ کے رسول کی طرف سے وضاحت آ جانے کے بعد اس کو قبول کر لینا، یہی ہدایت ہے۔ عقلی قیاسات کے ساتھ ان کو رَدّ کرنا، یا ڈھکوسلوں کے ساتھ ان کا مذاق اُڑانا گمراہی ہے، ہدایت نہیں ہے۔ یہ بات بھی آپ اُصولی طور پر ذہن میں رکھیے۔

''قبر'' اور'' عالمِ برزخ''

اب رہی یہ بات کہ یہ'' برزخ'' جو ہے، یہ تو ایک عالم ہے، مرنے کے بعد انسان عالم برزخ میں منتقل ہو گیا، باقی وہ برزخی حالات اس کے اُوپر کہاں طاری ہوتے ہیں؟ ظاہری طور پر ایک انسان کو زمین میں گڑھا کھود کر دفن کر دیا گیا جس کو ہم'' قبر'' کہتے ہیں۔'' قبر'' اور'' عالمِ برزخ'' ان دونوں کے درمیان میں کوئی منافات نہیں ہے،'' قبر'' یہ مُستقر ہے جہاں اس کے دھڑ کو دفن کر دیا گیا، اور'' عالمِ برزخ'' وہ وقت ہے جو کہ گزر رہا ہے۔ جو شخص'' قبر'' میں منتقل ہو گیا، وہ'' عالمِ برزخ'' میں ہے۔ اور اگر کسی شخص کو گڑھے والی'' قبر'' نصیب نہیں ہوئی، مثلاً دریا میں ڈوب گیا اس کو مچھلیاں کھا گئیں، یا قتل کر کے کسی نے باہر پھینک دیا اس کو پرندے کھا گئے، یا کسی نے اس کو جلا کے ذرّات ہوا میں بکھیر دیے، اس کو کوئی'' قبر'' نصیب نہیں ہوئی، اس کو ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ اس شخص کی گڑھے والی'' قبر'' نہیں لیکن'' عالمِ برزخ'' میں وہ ہے۔ اور جہاں بھی جا کے اس کے ذرّات ٹھہریں گے وہی اس کی'' قبر'' ہے۔ لیکن عام طور پر مسلمانوں کو چونکہ'' قبر'' میں دفن کیا جاتا ہے تو شریعت نے'' عالمِ برزخ'' کے حالات'' قبر'' کے عنوان سے بیان کئے ہیں۔

''برزخی حالات'' کا تعلق'' قبر'' سے ہے

جو شخص کسی جگہ دفن کر دیا گیا، اس کے لئے وہ مَقَرّ بن گیا، ٹھہرنے کی جگہ بن گیا، وہ اس کی'' قبر'' ہے، اور جس کو'' زمینی قبر'' میں دفن نہیں کیا گیا، اس کا جسم یا ذرّاتِ جسم جس شکل میں، جہاں قرار پکڑیں، وہ اس کی'' قبر'' ہے۔ لہٰذا موت کے بعد'' عالمِ برزخ'' میں'' قبر'' ہر انسان کے لئے ہے، خواہ وہ مدفون ہو یا مدفون نہ ہو، اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے راحت کے یا عذاب کے جو واقعات

---

(۱) وَهُوَ جِسْرٌ أَدَقُّ مِنَ الشَّعْرِ وَأَحَدُّ مِنَ السَّيْفِ. (مسند احمد رقم ۲۴۷۹۳۔ نیز مسلم ۱/ ۱۰۳ باب اثبات الشفاعة سے پہلے)۔

بھی گزرتے ہیں، وہ اسی ''قبر'' میں گزرتے ہیں جہاں اس کو دفن کیا ہوا ہے۔ اور یہاں جو حالات گزر رہے ہیں وہ ''برزخی حالات'' ہیں، یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ''چونکہ ''قبر'' کسی کو نصیب ہوتی ہے کسی کو نصیب نہیں ہوتی، لہٰذا ''برزخی حالات'' کا تعلق ان قبروں سے نہیں بلکہ ''عالمِ برزخ'' سے ہے!'' یہ بھی ایک مغالطہ ہے، بالکل ''عالمِ برزخ'' سے ہے، جو کچھ ہو رہا ہے وہ ''عالمِ برزخ'' میں گزر رہا ہے، لیکن ان حالات کا تعلق اسی گڑھے کے ساتھ ہے جس کے اندر کسی مُردے کو دفن کر دیا گیا، اور اگر اس کو دفن نہیں کیا گیا تو جہاں جہاں اس کے ذرّات بکھرے ہوئے ہیں، وہیں وہیں اس کے اُوپر وہ حالات طاری ہوں گے، ہمیں اس سے بحث نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو کس طرح سے تکلیف دیتا ہے، کس طرح سے راحت دیتا ہے، لیکن یہ بات نصوص سے ثابت ہے، احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے، کہ جس کو دفن کر دیا گیا ہو، اس کے ''برزخی حالات'' راحت کے یا آرام کے اسی ''قبر'' میں ہوتے ہیں، جو آپ کے سامنے ڈھیری بنی ہوتی ہے۔

''عذاب وثواب'' اور ''زیارتِ قبور'' کا تعلق انہی ''زمینی قبروں'' کے ساتھ ہے

حدیث شریف میں جو آتا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ ایک دفعہ خچر پر سوار ہو کر جا رہے تھے، تو خچر قبروں کو دیکھ کے بدکا، اور آپ ﷺ نے پوچھا کہ یہ کن کی قبریں ہیں؟ بتایا گیا کہ یہ شرک کے زمانے کے مَرے ہوئے لوگ ہیں، تو آپ ﷺ نے عذاب کا تذکرہ کیا،[1] تو انہی ڈھیریوں کو دیکھ کر خچر بدکا تھا، یہ نہیں کہ اس کے سامنے برزخ آ گیا تھا۔ تو ''عالمِ برزخ'' یہاں اور وہاں یہ اس قسم کی کوئی تفریق نہیں، وہ ہر جگہ سے ایک جیسا ہی ہے۔ اور اسی طرح سے سلام کہنے کا جو تعلق ہے، وہ انہی ڈھیریوں کے ساتھ ہے، زیارت کی جو ترغیب دی گئی ہے وہ انہی ڈھیریوں کے ساتھ ہے، اور اُمّت کے اندر اہلِ حق اولیاء مراقبے وغیرہ جو کچھ بھی کرتے آئے ہیں وہ انہی قبروں کے اُوپر ہی کرتے آتے ہیں، اور عذاب اور ثواب کا انکشاف جو ہوتا ہے اہلِ حق کو، وہ انہی قبروں میں ہوتا ہے۔ یہ اولیاء اللہ کے کثرت کے ساتھ واقعات ہیں۔ حدیث شریف میں ہی اگر آپ دیکھیں ''مشکوٰۃ شریف'' میں ''باب إثبات عذاب القبر'' میں جتنے بھی حالات ہیں، مثلاً حضور ﷺ نے دو چھڑیاں گڑوائی تھیں اور فرمایا کہ ان دو قبر والوں کو عذاب ہو رہا ہے۔[2] تو وہ انہی ڈھیریوں کے اُوپر گاڑی تھیں، اور انہی ڈھیریوں کے اندر عذاب کا انکشاف ہوا تھا۔ اور ایک صحابی (سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ) کے دفن کرنے کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ اس کے اُوپر قبر تنگ ہوگئی، اور کتنی دیر تک وہاں کھڑے اللہ کا ذکر کرتے رہے، ''سبحان اللہ، الحمد للہ'' صحابہ بھی کرتے رہے۔ تو بعد میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس کے اُوپر قبر تنگ ہوگئی تھی، ہمارے ذکر کی برکت سے اللہ نے اس کی قبر کشادہ کر دی۔[3] وہ بھی اسی ''قبر'' ہی کا قصہ ہے۔ اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا جو واقعہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ انہوں نے کہا تھا کہ مجھے دفن کرنے کے بعد تھوڑی دیر کھڑے رہنا تا کہ میں تم سے اُنس حاصل

---

(۱) مسلم ۳۸۶/۲، باب عرض مقعد المیت. مشکوٰۃ ۲۵/۱، باب اثبات عذاب القبر فصل اول۔

(۲) بخاری ۱۸۲/۱، باب الجرید علی القبر مشکوٰۃ ۴۲/۱، باب آداب الخلاء۔ فصل اول۔

(۳) مشکوٰۃ ص ۲۶، باب اثبات عذاب القبر فصل ثالث۔ مسند احمد، رقم: ۱۴۸۷۳۔

کروں، اور تاکہ مجھے پتا چل جائے کہ میں اللہ کے رسولوں کو کیا جواب دے کر لوٹتا ہوں؟[۱] تو دفن کرنے کے بعد کھڑا رہنا اسی ''قبر'' کے پاس ہی ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جو ''قبر'' کے پاس کھڑے ہو کر رویا کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ ''قبر'' آخرت کی منزلوں میں سے پہلی منزل ہے،[۲] اگر اس میں کوئی نجات پا گیا تو آگے آسانی ہی آسانی ہے، اور اگر اس میں کسی کو عذاب شروع ہو گیا تو، آگے اس کا معاملہ سخت سے سخت تر ہوتا چلا جائے گا۔ یہ سب انہیں ''قبروں'' کے واقعات ہیں۔ اس لئے جن بزرگوں کو کشف ہوتا ہے، جو ان ''قبروں'' سے کسی قسم کا استفادہ کرتے ہیں، یہ سارے کا سارا تعلق انہی گڑھوں کے ساتھ اور انہی ''قبروں'' کے ساتھ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ جس کی ''قبر'' بن گئی، جس کو کہیں لِٹا دیا گیا، ''عالم برزخ'' کے حالات اس پر انہی ''قبروں'' میں طاری ہوتے ہیں۔ تو یہ ''قبریں'' برزخ سے باہر نہیں۔ اور ان ''قبروں'' کی طرف عذاب اور ثواب کی نسبت کرنا، یہ کوئی برزخ کے خلاف نہیں۔ اور جن کو یہ ''قبر'' نصیب نہیں ہوتی، ان کے ''برزخی حالات'' جہاں ان کے ذرّات ہوتے ہیں، وہیں طاری ہوتے ہیں۔ بہر حال جو دفن ہو گئے ان کے حالات کا تعلق انہی ''قبروں'' کے ساتھ ہے، اہلِ دِل، اہلِ رُوحانیت جب مراقبہ کرتے ہیں تو یہیں جا کے کرتے ہیں، اور ان کو اِنکشافات یہیں سے ہوا کرتے ہیں، تو ''قبریں'' یہی ہیں جن کے اُوپر یہ حالات طاری ہوا کرتے ہیں۔

''سماعِ موتیٰ'' کے مسئلے کی دو حیثیتیں

یہ دو تین باتیں میں نے آپ کی خدمت میں عرض کر دیں۔ اب اگلی بات کہ موتیٰ (مُردوں) کے سماع کا مسئلہ! اس کی کیا حیثیت ہے؟ سماع کی دو حیثیتیں ہیں، ایک ہیں قرآنِ کریم کی وہ آیات جن میں مشرکین سے کہا گیا ہے کہ جن کو تم پکارتے ہو، وہ سنتے نہیں، اور وہ تمہاری دُعاؤں سے غافل ہیں، اور اگر بالفرض سُن بھی لیں تو تمہاری دُعا کو قبول نہیں کر سکتے۔ ایک تو آیات اس قسم کی ہیں جس طرح ۲۶ ویں پارے میں یہ آیت ہے: وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ (سورۂ اَحقاف:۵)، اور اسی طرح سے سورۂ یونس کے اندر یہ آیت ہے: فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ (آیت:۲۹)۔ یا اسی طرح سے سورۂ فاطر میں ہے کہ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ۚ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ (آیت:۱۴)۔ یہ آیات جن میں مشرکین کے حال پر تبصرہ کیا گیا ہے کہ جن کو تم پکارتے ہو وہ سنتے نہیں، اور اگر بالفرض سُن بھی لیں تو وہ تمہاری دُعا کو قبول نہیں کر سکتے، رَدِّ شرک کے طور پر یہ آیات آئی ہوئی ہیں۔

پہلی حیثیت: ''سماعِ موتیٰ لازم ودائم'' کا عقیدہ جو شرک ہے

اس بارے تو آپ یاد رکھئے! کہ اُمت میں سے اہلِ حق کا اس میں اختلاف نہیں کہ مشرکین جس سماع کے قائل تھے جس کی تردید کے طور پر یہ آیات آئی ہیں، وہ ہے سماع لازم ودائم، جو اُلوہیت کی خصوصیات میں سے ہے، یعنی یہ عقیدہ کہ جب پکارا جائے، جہاں سے پکارا جائے، جو کہا جائے، جس وقت کہا جائے، وہ سنتے ہیں۔ چاہے یہ عقیدہ کسی زندہ کے متعلق رکھا جائے، چاہے

(۱) مسلم ۱/۷۶، باب کون الاسلام یھدم ما قبلہ۔ مشکوٰۃ ۱/۱۴۹، باب دفن المیت، فصل ثالث۔

(۲) ترمذی ۲/۵۷، باب ما جاء فی ذکر الموت سے اگلا باب۔ مشکوٰۃ ص۲۶، باب اثبات عذاب القبر، فصل ثانی۔

کسی مُردہ کے متعلق، چاہے کسی جن کے متعلق ہو، چاہے کسی فرشتے کے متعلق، چاہے کسی پیر کے متعلق ہو، چاہے کسی پیغمبر کے متعلق، اللہ کے علاوہ جس کسی کے متعلق یہ عقیدہ رکھا جائے، یہ شرک ہے۔ اور مشرکین ایسے ہی سماع کے قائل تھے، اور ان آیات میں جو آپ کے سامنے پڑھی گئی ہیں، ان میں اسی قسم کے سماع کو رَدّ کیا گیا ہے کہ الٰہ وہ ہوتا ہے کہ جس کو جب پکارو، جس کام کے لئے پکارو، جہاں سے پکارو، جس وقت پکارو، وہ سنتا ہے، قُرب اور بُعد کا کوئی فرق نہیں، رات اور دِن کا کوئی فرق نہیں، جس وقت بھی پکارا جائے سنے، حاضر ناظر ہو، عالم الغیب ہو، اس کو قدرت حاصل ہو، تبھی جا کے اس کو پکارنے کا فائدہ ہے، اور وہ ہر کسی کی پکار کو سنتا بھی ہو، ایسی شان صرف اللہ کی ہے، اللہ کے علاوہ کسی پیر، پیغمبر یا جن، فرشتے کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا شرک ہے۔ اس لئے یہ آیات مشرکین کے عقیدے کے رَدّ کے طور پر جو آئی ہیں، ان کا مقصد ہے سماعِ لازم ودائم کی نفی کرنا، اور اس میں اہلِ حق کا کوئی اختلاف نہیں کہ جس کا یہ عقیدہ ہے وہ مشرک ہے۔ ایک درجہ تو یہ ہوا، کہ یہ عقیدہ رکھنا کہ ''جب پکاریں، جہاں سے پکاریں، جو کوئی پکارے، جو کچھ کہے وہ سنتا ہے'' یہ اُلوہیت کے لوازم میں سے ہے، جس کے متعلق آپ نے ایسا عقیدہ بنالیا گویا کہ آپ نے اس کو الٰہ قرار دے لیا، اور یہ عقیدہ شرک ہے، اور جس کے متعلق آپ نے یہ عقیدہ رکھا اس کو آپ نے اللہ کا شریک ٹھہرا دیا، اور قرآنِ کریم مشرکین کے عقیدے کی یہی وضاحت کرتا ہے کہ وہ اپنی ضروریات اور حاجات کے لیے ان کو پکارتے تھے وہ تو سنتے ہی نہیں، وہ تو ان کی دُعا سے غافل ہیں، اس میں زندہ مُردہ کا بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ آج عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں، اگر ان کو کوئی اس عقیدے سے پکارے کہ جہاں سے پکارا جائے، جب پکارا جائے، جو کہا جائے، وہ سنتے ہیں، تو وہ بھی مشرک ہے۔ فرعون جس وقت زندہ تھا، لوگ اس کو اپنا رَبّ سمجھتے تھے، اگر اس کی زندگی میں اس کے متعلق بھی لوگوں کا یہ عقیدہ تھا، تو یہ بھی شرک ہے، پھر سامنے کھڑے ہو کے بات کرنے، سننے، نہ سننے کی بات نہیں ہے، یعنی الٰہ وہ ہوتا ہے جو ہر جگہ سے سنے، ہر کسی کی سنے، ہر وقت سنے، یہ عقیدہ غیر اللہ کے متعلق شرک ہے۔

قرآنِ مجید کی مذکورہ آیات میں عقیدۂ مشرکین (سماعِ لازم ودائم) کی تردید ہے

اور ان آیات کے اندر اسی عقیدے کی تردید کی گئی ہے۔ ان آیات کا تعلق اس مسئلے کے ساتھ نہیں ہے جس میں اہلِ حق کا آگے جا کر کچھ اختلاف کا تذکرہ ہوگا۔ اس لئے یہ آیات جو آپ کے سامنے پڑھی گئیں، جو مسئلہ سماعِ موتیٰ کا اہلِ اسلام کے اندر چلتا ہے، اسلاف میں سے کسی شخص نے بھی کبھی بھی ان آیات سے اس مسئلے پہ استدلال نہیں کیا۔ میری یہ بات یاد رکھیں! جہاں بھی ''سماعِ موتیٰ'' کا مسئلہ ذِکر کیا جاتا ہے تفاسیر میں، یا شروحِ احادیث میں، اسلاف کی کتابوں میں، اُن میں ان آیات سے ''سماعِ موتیٰ'' کی نفی پر کبھی کسی نے استدلال نہیں کیا، کیونکہ ان آیات کا جو موضوع لہ ہے، جس مقصد کے لئے ان آیات کو چلایا گیا ہے، اس میں تو کسی کا کوئی اختلاف ہی نہیں، ان میں رَدّ کیا جا رہا ہے مشرکین کے عقیدے کو، اور مشرکین کا عقیدہ تھا سماعِ لازم ودائم، یعنی ہر وقت ان کو سماع حاصل ہے، لازمی حاصل ہے، جہاں سے پکارو، جب پکارو، جو کہو، وہ ہر کسی کی ہر بات ہر جگہ سے سنتے ہیں، یہ عقیدہ شرک ہے، اور جس کے متعلق یہ عقیدہ رکھا جائے تو اس کو شریک بنالیا گیا، اور عقیدہ رکھنے والا مشرک ہے، چاہے عقیدہ

کسی زندہ کے متعلق ہو، چاہے مُردے کے متعلق، چاہے جن کے متعلق، چاہے فرشتے کے متعلق، چاہے پیر کے متعلق، چاہے پیغمبر کے متعلق، کسی کے متعلق ہو، یہ شرک ہے۔ ان آیات کے مفہوم میں تو اختلاف کی گنجائش ہی نہیں۔

''سماعِ موتیٰ'' کی دُوسری حیثیت: ''سماع فی الجملہ'' جومختلف فیہ ہے

ایک دوسرا عقیدہ آ گیا، جس کو ہم ''سماعِ موتیٰ'' کے عنوان سے ذِکر کرتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ قریب سے، دُور سے نہیں، کسی کی بات سنے، کسی کی نہ سنے، کوئی بات سنے، کوئی بات نہ سنے، کیا اموات کے متعلق اس کا بھی کوئی ثبوت ہے یا نہیں؟ یہ ہے مسئلہ جو اصل کے اعتبار سے اہلِ اسلام میں مختلف فیہ ہے۔ اور اس مسئلے میں اُمت کا کیا موقف ہے؟ یہ آپ کے سامنے واضح کرنا مقصود ہے...... جب یہ مسئلہ تفاسیر میں یا شروحِ حدیث میں آتا ہے، تو استدلال صرف دو آیتوں سے کرتے ہیں۔ تیسری کوئی آیت اس مسئلے میں پیش نہیں کی جاتی۔ اس لئے آج کل لوگوں نے جو ''چہل آیتیں'' چھاپنی شروع کردی ہیں کہ چالیس آیتیں ہیں جو سماع کی نفی پر دلالت کرتی ہیں، یا ۷۰ آیتیں ہیں جو سماع کی نفی پر دلالت کرتی ہیں، یہ وہ بات ہے جس کا تسلسل اہلِ حق کے ساتھ نہیں، یہ اس زمانے کی ہی کوئی اختراع ہے۔ ورنہ دو آیتیں ہیں جن کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے، ایک یہی آیت جس کی آپ نے تلاوت کی: اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى، اور دُوسری آیت: مَاۤ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ (سورۂ فاطر: ۲۲)، شراحِ حدیث اور مفسرین ذِکر کرتے ہوئے ان دو ہی آیتوں کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔ پہلی آیت کا ترجمہ: ''تُو موتیٰ کو نہیں سنا سکتا!'' اس میں خطاب حضور ﷺ کو ہے۔ دُوسری آیت کا ترجمہ: ''تُو ان کو نہیں سنا سکتا جو قبروں میں ہیں!'' ان دو آیتوں کو سامنے رکھ کے اس مسئلے پہ بحث اُٹھائی جاتی ہے۔ باقی آیات جو مشرکین کے عقیدے کی تردید کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں، ان کے مفہوم پر اُمت کا اتفاق ہے...... اب یہ مسئلہ جس کا عنوان میں نے آپ کے سامنے رکھا کہ قریب سے، دُور سے نہیں، کسی کی سنیں، کسی کی نہ سنیں، اس کا آپ عنوان یہ بنالیں جس کو ہم ''سماع فی الجملہ'' کہتے ہیں، یعنی موجبہ کلیہ نہیں، موجبہ کلیہ مشرکین کا عقیدہ ہے، اور ایک ہے سالبہ کلیہ کہ ہم کہیں کہ بالکل کچھ بھی نہیں سنتے، چاہے قریب ہو کے کہو، سلام کہو، کچھ کہو، بالکل ہی نہیں سنتے، یہ سالبہ کلیہ ہے۔ اور ایک ہے جس کا عنوان میں ''سماع فی الجملہ'' کا رکھ رہا ہوں کہ قریب سے سنیں، دُور سے نہ سنیں، کسی کی سنیں، کسی کی نہ سنیں، اور کوئی بات سنیں، کوئی بات نہ سنیں۔ اس کو کہتے ہیں ''سماع فی الجملہ!''

''سماع فی الجملہ'' مدارِ ایمان نہیں

اب یہ مسئلہ جو ہے، اس کی اُمت کے اندر کیا نوعیت ہے؟ اس کی بنیاد میں آپ کے سامنے یہ اُٹھانا چاہتا ہوں کہ یہ مسئلہ اہلِ حق کے درمیان مختلف فیہ ہے، جس وقت ہم نے اس کو اہلِ حق کے درمیان مختلف فیہ کہہ دیا، تو پہلے اُصول کے تحت یہ مدارِ ایمان نہیں ہے، یہ مسئلہ مجتہد فیہ ہے، اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ ''اموات کے لئے سماع فی الجملہ بھی نہیں!'' تو اس کو کہنے کا حق ہے، لیکن یہ کہنے کا حق نہیں کہ ''جو سماع فی الجملہ کے قائل ہیں وہ مشرک ہیں!'' اگر یہ کہے گا تو یہ اہلِ حق کے مسلک کے خلاف ہے، اور اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ ''سماع فی الجملہ ہے!'' اس کو یہ تو کہنے کا حق ہے کہ ''سماع فی الجملہ ہے!'' لیکن اس کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ ''جو سماع

فی الجملہ کا قائل نہیں، وہ کافر ہے!'' یا کوئی کہے: ''جو سماع فی الجملہ کا قائل ہے وہ مشرک ہے!'' یہ دونوں باتیں اہل حق کے خلاف ہیں، اہلِ حق کا مسلک یہ ہے کہ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے، جب یہ مختلف فیہ ہے تو اس میں دونوں طرف رائے جاسکتی ہے کہ کسی کا خیال ہو کہ ''سماع فی الجملہ بھی نہیں ہے!'' اور کسی کا خیال ہو کہ ''سماع فی الجملہ ہے!'' اس میں اولیٰ، غیرِ اولیٰ کی بحث تو چل سکتی ہے، لیکن اس میں کُفر وشرک کی بحث نہیں اُٹھائی جاسکتی، اہلِ حق کے اندر یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔

اِنصاف کی بات!

اب اس بات کو بھی اگر کوئی شخص تسلیم کرلے کہ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے تو جھگڑا ختم ہوجاتا ہے، کیونکہ ہم نے ''سماعِ موتیٰ'' کی نفی کا بھی حق دے دیا کہ آپ کہہ سکتے ہیں کہ نہیں، اور یہ حق بھی دے دیا کہ تم کہہ دو ''سماع فی الجملہ ہے!'' ہم ان میں سے کسی کو کافر نہیں کہتے، قرآن وحدیث کا منکر نہیں کہتے، دونوں قسم کی رائے کی گنجائش ہے، اس میں اگر گفتگو کی جاسکتی ہے تو اس انداز سے کی جاسکتی ہے کہ ان میں سے اَولیٰ بالحق اور اَولیٰ بالدلائل کون سی چیز ہے؟ باقی! اس کو کُفر اور ایمان کا مدار قرار نہیں دیا جاسکتا، نہ انکار کرنے والوں کو ہم ''کافر'' کہہ سکتے ہیں، نہ قول کرنے والوں کو ہم ''مشرک'' کہہ سکتے ہیں، اس سے زیادہ انصاف کی بات آپ کے سامنے اور کوئی نہیں آسکتی!

''سماعِ موتیٰ'' کے عہدِ صحابہ سے مختلف فیہ ہونے پر حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا حوالہ

اب یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے، اس کے لیے میں آپ کے سامنے ایک دو نقول پیش کرتا ہوں..... ہمارے سید الطائفہ حضرت رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، وہ لکھتے ہیں، (وہ مسئلہ میں وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کرنا چاہتا جس کا انہوں نے عنوان اُٹھایا ہے، اگر موقع ہوا تو آخر میں ایک دو باتیں اس سلسلے میں کہہ دُوں گا، جو اختلافی مسئلہ آپ کی خدمت میں عرض کرنے لگا ہوں، اس کے متعلق اس میں یہ ثبوت ہے) کہتے ہیں کہ ''اِستمداد تین قسم کی ہے، ایک یہ کہ اہلِ قبور سے مدد چاہے، اسی کو سب فقہاء نے ناجائز لکھا ہے (کہ قبر والے کو جاکر کہے کہ ''تُو میرا یہ کام کردے، تُو میری مدد کر!'' اس کو سب فقہاء نے ناجائز لکھا ہے) دُوسرے یہ کہ کہے اے فلاں! (یعنی مُردے کو خطاب کرکے کہے کہ اے فلاں!) خدائے تعالیٰ سے دُعا کر کہ فلاں کام میرا پورا ہوجائے، یہ مبنی ہے اُوپر مسئلہ سماع، جو سماعِ موتیٰ کے قائل ہیں، ان کے نزدیک دُرست، دُوسروں کے نزدیک ناجائز، انبیاء علیہم السلام اس میں سے مستثنیٰ ہیں، کیونکہ ان کے سماع میں کسی کا اختلاف نہیں۔ تیسرے یہ کہ دُعا مانگے: ''الٰہی! بحرمتِ فلاں میرا کام پورا کردے'' یہ بالاتفاق جائز ہے''(۱) یعنی اس درمیان والی شق کے بارے میں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ کسی قبر والے کو جاکے کوئی کہے کہ ''تُو میرے لئے دُعا کر، اللہ تعالیٰ میرا فلاں کام پورا کردے!'' تو جو سماع کے قائل ہیں ان کے نزدیک اس طرح سے کہنا ٹھیک، اور جو سماع کے قائل نہیں ان کے نزدیک اس طرح سے کہنا ٹھیک نہیں، لیکن انبیاء علیہم السلام کے سماع میں کسی کا اختلاف نہیں، لہٰذا انبیاء علیہم السلام کی قبور کے پاس جاکر دُعا کی درخواست کرنا یہ ٹھیک ہے، کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے سماع میں کسی کا اختلاف نہیں۔

(۱) ''فتاویٰ رشیدیہ'' ص ۶۹ تا ص ۷۰، بعنوان ''زندوں کا مُردوں سے مانگنا''۔ نوٹ:- یہ تحریر مولانا محمد حسن مرادآبادی کی ہے، دستخط حضرت گنگوہی کے ہیں۔

اور ایک جگہ ''فتاویٰ رشیدیہ'' میں سوال ہے کہ سماعِ موتیٰ ثابت ہے یا نہیں؟ درصورت جواز یا عدمِ جواز قولِ راجح کیا ہے؟ اور تلقین بعد دفن ثابت ہے یا نہیں؟ جواب:- یہ مسئلہ عہدِ صحابہ سے مختلف فیہا ہے، (یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ہی اس مسئلے میں اختلاف چلا آ رہا ہے) اس کا فیصلہ کوئی نہیں کر سکتا، تلقین کرنا بعد دفن اس پر ہی مبنی ہے، جس پر عمل کرے دُرست ہے۔'' (یعنی مرنے کے بعد دفن کرنے کے بعد میّت کو تلقین کرنا کہ ''تُو یہ کہہ دے! تُو یوں جواب دے دے!'' اس طرح سے جو بات کی جاتی ہے۔ ''تلقینِ میّت'' کی کئی صورتیں ہیں، اس کی تفصیل کرنی مقصود نہیں، جو سماع کے قائل ہیں ان کے نزدیک تلقین دُرست ہے، جو سماع کے قائل نہیں ان کے نزدیک تلقین دُرست نہیں، جس پر عمل کرے دُرست ہے۔.......... اگلا سوال ہے کہ میّت قبر میں سنتی ہے یا نہیں؟ جواب:- اموات کے سننے میں علماء کا اختلاف ہے، بعض کے نزدیک سنتی ہیں، بعض کے نزدیک نہیں سنتیں۔[1]

تو حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی صراحت کے مطابق یہ مسئلہ عہدِ صحابہ سے لے کر اس وقت تک مختلف فیہ چلا آ رہا ہے۔ کم از کم دیوبند کی طرف نسبت رکھنے والے کے لئے اس حوالے کے بعد کسی دُوسری بحث کی گنجائش نہیں! جب یہ مسئلہ مختلف فیہ ہو گیا تو معلوم ہو گیا کہ اس مسئلے پر ''بیّنات'' قائم نہیں ہیں، اگر اس مسئلے پر ''بیّنات'' قائم ہوتیں تو کم از کم جن کو ہم اہلِ حق سمجھتے ہیں، وہ اس مسئلے میں اختلاف نہ کرتے، کیونکہ ''بیّنات'' کے آنے کے بعد اِختلاف کرنے والوں کے لئے عذابِ عظیم ہے۔

حضرت مولانا غلام اللہ خان رحمۃ اللہ علیہ کا حوالہ

اس سے زیادہ واضح کرنے کے لئے ایک بات آپ کی خدمت میں اور عرض کر دوں۔ یہ کتاب ہے میرے ہاتھ میں ''اقامۃ البرھان علیٰ ابطال وساوس ھدایۃ الحیران''، اس کا شانِ ورود یہ ہے، یعنی یہ کتاب جن حالات میں لکھی گئی کہ حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریروں کا ایک مجموعہ ہے جو حضرت مولانا غلام اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مرتب کیا ہوا ہے ''بُلغۃ الحیران'' اس میں کچھ عبارتیں ایسی آ گئیں جو اہلِ حق کے مسلک کے مطابق نہیں تھیں، اس کے اُوپر گرفت کی ہے مولانا عبدالشکور ترمذی، ساہیوال، ضلع سرگودھا والوں نے، اور اس کو ''ھدایت الحیران'' کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع کیا، وہ کتاب بھی میرے پاس ہے۔ پھر اس کے جواب میں راولپنڈی سے حضرت مولانا غلام اللہ صاحب کے مدرسے سے یہ کتاب شائع ہوئی، جس میں اپنے مسلک کی انہوں نے وضاحت کی ہے، اور ان عبارات کا جواب دیا کہ جو کچھ اس سے سمجھا گیا وہ ٹھیک نہیں، جیسا کہ اختلاف کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس کو مرتب کرنے والے ہیں ''سجاد بخاری'' لیکن اصل کے اعتبار سے یہ ساری باتیں حضرت مولانا غلام اللہ صاحب کی ہیں۔ حضرت مولانا غلام اللہ صاحب کو چونکہ کتابیں لکھنے کا زیادہ ملکہ نہیں تھا، تو مواد وہ دیتے تھے، مرتب یہ ''سجاد بخاری'' کرتا ہے، جو وہاں سے ایک ماہوار رسالہ نکلتا ہے ''تعلیم القرآن'' یہ ''سجاد بخاری'' اس کا ایڈیٹر ہے، اور اس ''بلغۃ الحیران'' کو بعد میں نئی ترتیب کے تحت جو شائع کیا ہے، حضرت مولانا غلام اللہ صاحب نے ''جواہر القرآن'' کے عنوان سے، وہ افادات مولانا حسین علی کے ہی قرار دیے گئے ہیں، وہ بھی اسی ''سجاد بخاری'' کی مرتب کردہ ہے، یعنی معلومات حضرت

---

(۱) ''فتاویٰ رشیدیہ'' ص ۱۰۸ مندرج ''تالیفاتِ رشیدیہ''۔

مولانا غلام اللہ صاحب کی اور اُردو وغیرہ، عبارت بنانا، ترتیب، جو کچھ ہے وہ سب ''سجاد بخاری'' کرتا تھا۔ اس لئے اس کتاب میں جو لکھا ہوا ہے، کم از کم یہ حضرت مولانا غلام اللہ صاحب ﷫ کے مسلک کی ترجمانی ہے، اور حضرت مولانا حسین علی صاحب ﷫ کی طرف نسبت رکھنے والے لوگوں کے مسلک کی بھی ترجمانی ہے جو کچھ اس کتاب میں لکھا ہوا ہے۔

اس کتاب (اقامة البرھان) کے صفحہ ۶۷ پر لکھا ہے کہ'' سماعِ موتیٰ کا مسئلہ زمانِ صحابہ سے مختلف فیہ چلا آ رہا ہے۔ یہ مسئلہ اِعتقاداتِ ضروریہ میں سے نہیں، جن کی نفی یا اِثبات پر کُفر و اسلام کا مدار ہے، بلکہ یہ ایک علمی اور تحقیقی بحث ہے، جس میں بحث وتمحیص اور نظر و تحقیق کی گنجائش ہے، اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے علماء کے درمیان اس مسئلے میں ہمیشہ دو رائے رہی ہیں، کچھ علماء کی یہ رائے رہی ہے کہ مُردے سنتے ہیں، جبکہ دُوسرے علماء نے اپنی تحقیق کی بنا پر سماعِ موتیٰ کی نفی کی ہے، علمائے کرام کی ان دونوں جماعتوں کے پاس دلائل ہیں، جن پر انہوں نے اپنی اپنی رائے اور تحقیق کی بنیادیں اُستوار کی ہیں، جو علماء سماعِ موتیٰ کی نفی کرتے ہیں ان کا اِستدلال ظواہرِ قرآن اور اَحادیثِ صحیحہ سے ہے، جبکہ قائلینِ سماع بھی صحیح احادیث سے اِستدلال کرتے ہیں۔'' اور لکھا ہے کہ'' یہی مسئلہ ہم نے ''جواہر القرآن'' صفحہ ۹۰۲ تا صفحہ ۹۰۵ تفسیر سورۂ رُوم میں بھی بیان کیا ہے۔'' تو گویا کہ ''جواہر القرآن'' جس کی نسبت مولانا حسین علی صاحب ﷫ کی طرف کی گئی، اور جس کو شائع کرنے والے، اور مرتب کروانے والے حضرت مولانا غلام اللہ صاحب ﷫ ہیں، انہوں نے بھی اس مسئلے کو مختلف فیہ قرار دیا ہے۔ اور جب مسئلے کو'' مختلف فیہ'' قرار دیا گیا، تو مسئلہ کتنا اَہون (آسان) ہوگیا کہ اس کے اوپر کُفر و ایمان کا مدار ہی نہیں، جب صحابہ ﷡ سے ہی یہ مسئلہ'' مختلف فیہ'' چلا آ رہا ہے، تو کس گروہ کو آپ کہیں گے کہ کافر ہے؟ کس گروہ کو آپ کہیں گے کہ مشرک ہے؟ اس لئے یہ یقین کرلیجئے کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ'' سماعِ موتیٰ کا قول شرک ہے، (یعنی اس سماعِ موتیٰ کا جو میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا) اور ایسا عقیدہ رکھنے والے مشرک ہیں'' وہ (مشرک کہنے والا) اہلِ حق میں سے نہیں ہے، اہلِ حق کی جماعت سے ان کا سلسلہ ٹوٹ گیا، ان کا رِشتہ منقطع ہوگیا، وہ اہلِ حق میں سے نہیں ہیں، حق بات یہی ہے جو علمائے حق کے اندر چلی آ رہی ہے کہ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے، اس میں بحث اگر کر سکتے ہو تو یوں تو کر سکتے ہو کہ'' بہتر شق کون سی ہے؟ اَولیٰ شق کون سی ہے؟ دلائل کے ساتھ زیادہ موافقت کون سی شق رکھتی ہے؟'' اس میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ'' فلاں نظریہ اختیار کرنے والا کافر ہے!''، یا'' فلاں نظریہ اختیار کرنے والا مشرک ہے!'' یہ بات غلط ہے!

اس لئے جماعت کا مسلک ظاہر کرنے کے لئے آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں کہ پہلے بنیادی طور پر تو مسلک میں یہ بات آ گئی کہ مسئلہ مختلف فیہ ہے، اس میں اگر بحث کی جائے گی تو اس انداز سے کی جائے گی کہ اَولیٰ کیا ہے؟ یا سماع کا قول کرنے والوں کے لئے بھی کچھ گنجائش ہے یا نہیں؟ یا سماع کا انکار کرنے والوں کے لئے بھی کچھ گنجائش ہے یا نہیں؟ ہمارے حضرات کی اکثریت کدھر گئی ہے؟

حضرت مولانا سرفراز خاں صفدر ﷫ کا حوالہ

اسی اختلاف کو مولانا سرفراز صاحب نے بھی ذِکر کیا ہے۔ مسئلہ تو یہیں ختم ہو جاتا ہے، جس وقت ہم اس مسئلے کو مختلف فیہ

کر کے ذکر کر دیں، اس کے بعد اس مسئلے میں چنداں بحث کی گنجائش رہتی ہی نہیں ہے۔ یہ لکھتے ہیں کہ ''حضرات صحابہ کرام ﷺ کے مبارک دور اور خیر القرون کے زمانے سے لے کر اس وقت تک یہ مسئلہ اختلافی چلا آ رہا ہے، کہ قبروں کے پاس اگر کوئی شخص اہلِ قبور کو سلام وغیرہ عرض کرے، تو مُردے سنتے ہیں یا نہیں؟ ایک گروہ سماعِ موتی کا قائل ہے، جس میں حضرات صحابہ کرام ﷺ کے علاوہ حضراتِ مالکیہ، شافعیہ، حنبلیہ کا جمِّ غفیر اور حضراتِ اَحناف کا معتد بہ طبقہ اور اکابر علمائے دیو بند کثر اللہ تعالیٰ جماعتہم کی اکثریت شامل ہے۔ غیر مقلدین حضرات کا اس مسئلے میں آپس میں خاصا اختلاف ہے۔ قاضی شوکانی، امیر یمانی، نواب صدیق حسن خان، اور مولانا وحید الزمان صاحب وغیرہ حضرات شدّ ومدّ کے ساتھ سماعِ موتی کے قائل ہیں۔ جبکہ غیر مقلدین حضرات کے شیخ الکل مولانا نذیر حسین صاحب دہلوی اور ان کے بیشتر تلامذہ اس کے منکر ہیں، ملاحظہ ہو: ''فتاوی نذیریہ وثنائیہ'' (سماع الموتی ص۷۸) تو اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ اَئمہٴ اَربعہ اور ان کے مقلدین کے اندر، صحابہ کرام ﷺ سے لے کے بعد میں ان سب حضرات کے اندر، حتیٰ کہ غیر مقلدوں میں بھی یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے، جماعتی حیثیت سے ان کے نزدیک بھی یہ مسئلہ متفق علیہ نہیں ہے۔

یہ تو بن گئی بنیاد! اور اس بنیاد کے بن جانے کے بعد مسئلہ بہت اَہوَن ہو گیا، کوئی جھگڑے کی بات باقی نہیں رہی، ہم قول کرنے والوں کو کچھ نہیں کہتے، قول نہ کرنے والوں کو کچھ نہیں کہتے، گنجائش دونوں طرف رکھتے ہیں۔

حضرت گنگوہی ﷫ کا مسلک (عدمِ سماع)

اب آگے رہی بات! کہ ہمارے حضرات کے نزدیک اَولیٰ کیا ہے؟ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ﷫ نے ''کوکب الدری''[1] میں اور ان کا ایک رسالہ ہے ''لطائف رشیدیہ'' جس میں ان کے کچھ مکتوبات چھپے ہوئے ہیں، دونوں کتابوں میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ﷫ کی طرف نسبت کر کے لکھا ہوا ہے (''کوکب الدری'' آپ کے قلم سے لکھی ہوئی نہیں، یہ ''تقریر ترمذی'' ہے جو حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب ﷫، جو شیخ الحدیث مولانا زکریا سہارنپوری ﷫ کے والد ہیں، ان کی ضبط کی ہوئی ہے، اور ''لطائف رشیدیہ'' میں آپ کا خط چھپا ہوا ہے جو آپ کے قلم کی تحریر ہے) ان دونوں میں اس مسئلے کو مختلف فیہ ذکر کرتے ہوئے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ﷫ فرماتے ہیں کہ ''میرے نزدیک اَصح عدمِ سماع ہے'' کہ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے، جس کا فیصلہ نہیں ہو سکتا، جس طرح سے ''فتاویٰ رشیدیہ'' میں سے آپ کو پڑھ کے سنایا گیا، لیکن اگر کوئی شخص اپنے امامِ مجتہد کی تقلید کرتا ہوا، کسی ایک شق کو راجح قرار دے، تو یہ ہو سکتا ہے۔ تو ابو حنیفہ ﷛ کی طرف انہوں نے نسبت یہ کی کہ ان کے نزدیک بھی عدمِ سماع ہے، اس لئے میں بھی اسی کو اَصح قرار دیتا ہوں۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ﷫ نے یہ لکھا ہے۔[2]

---

(۱) ج۲ ص۱۹۸، باب ما یقول اذا دخل المقابر کے تحت۔

(۲) ''لطائف رشیدیہ'' مندرج ''تالیفات رشیدیہ'' ص۶-۷، بعنوان ''مکتوب پنجم''، ولفظہ: ''الحاصل ارجح مذہب عدم سماع کا ہے''۔ الکوکب الدری ۲/۱۹۷، ابواب الجنائز، باب ما یقول الرجل اذا دخل المقابر، ولفظہ: فالظاہر انکار السماع وھو الأصح عندنا۔ نوٹ: واضح رہے کہ ''لطائف رشیدیہ'' میں اسی جگہ پر یہ بھی ہے: ''دوسری جانب بھی مذہب قوی ہے'' اور اسی طرح سماعِ انبیاء ﷺ حضرت کے نزدیک اجماعی ہے۔ جیسا کہ حوالہ گذر چکا۔

باقی! یہ بات کہ حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے اس مسئلے میں بات ثابت ہے یا نہیں؟ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے جس کا حوالہ دیا، اس کی کیا حقیقت ہے؟ وہ بھی میں آپ کی خدمت میں ابھی عرض کرتا ہوں۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک (سماع)

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے تو اَصح قرار دیا عدمِ سماع کو!......... اور ان کے ہی دستِ راست حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جن کو آپ ''بانیٔ دارالعلوم دیوبند'' کہتے ہیں، اور یہ دونوں ہی ہماری ایک دائیں آنکھ ایک بائیں آنکھ، اور دونوں ہی اس جماعت کی بنیاد ہیں، اِن (حضرت نانوتوی) کے نزدیک راجح سماع ہے، اور اس کے اُوپر ان کا مستقل ایک رسالہ ہے۔ یہ کتاب جو اس وقت میرے ہاتھ میں ہے یہ ہے ''سوانح قاسمی''، اس کو لکھنے والے ہیں مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ، اور اس کو شائع کرنے والا ہے ''دفتر دارالعلوم دیوبند''، اس لئے اس میں جو کچھ درج ہے، جو کچھ تحریر ہے، اس کی صحت کے اُوپر ہم شک نہیں کر سکتے، مولانا لکھتے ہیں کہ: ''اس زمانے میں لوگوں نے سماعِ موتی کے پُرانے مسئلے کو پھر نئے سرے سے زندہ کرنا چاہا تھا، (یعنی حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں) عام مسلمانوں کے قبری کاروبار کے ان قصوں کو دیکھ کر جن کے متعلق سیدنا الامام الکبیر کا یہ فقرہ نقل کر چکا ہوں کہ کس منہ سے ہندوؤں کو بُرا اور اپنے آپ کو بھلا کہہ سکتے ہیں، بعضوں نے چاہا کہ موتی کے سماع کا ہی انکار کر دیا جائے، مطلب ان لوگوں کا یہ تھا کہ بنیادی اَڈّے کو ہی اُڑا دیا جائے، نہ بانس رہے نہ بانسری بجے (کہ جب یہ ثابت کر دیں گے کہ سماع ہی نہیں ہے تو لوگ نہ قبروں پہ جائیں گے، نہ بزرگوں سے کوئی التجا کریں گے، نہ رہے بانس نہ بجے بانسری، اَڈّا ہی اُڑا دو، اس نظریے کے تحت لوگوں نے چاہا کہ سماع کا سرے سے انکار کر دیا جائے) پوچھنے والوں نے سیدالامام الکبیر سے بھی اس مسئلے کو دریافت کیا، حضرتِ والا نے چند اَوراق میں سوال کا جواب دیا ہے، اور ''جمالِ قاسمی'' نامی مجموعہ مکاتیب میں یہ جواب شریک ہے، حاصل یہی ہے کہ سماعِ موتی کا آپ نے انکار نہیں فرمایا، لکھا ہے کہ قبرستان سے گزرے تو سلام سے دریغ نہ کرے، اور من پڑے تو ہدیہ مناسب وقت بھی پیش کرے، ورنہ سخت بے مروّتی ہے جو یوں آنکھیں چرائے چلا جائے۔ خیر! یہ تو قول ہے۔ آپ کے تلمیذ سعید مولانا منصور علی خان صاحب نے اس باب میں آپ کے مسلک کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہوئے کہ بزرگوں کے مزار پر جایا کرتے، دُعا کر کے چلے آتے، آگے صراحتاً اپنی یہ شہادت قلمبند کی ہے کہ سماعِ اولیاء اللہ کے قائل تھے، اور قائل ہی نہیں بلکہ آگے لکھتے ہیں کہ اگر اکیلے کسی مزار پر جاتے اور دوسرا شخص وہاں موجود نہ ہوتا تو آواز سے عرض کرتے کہ آپ میرے واسطے دُعا کریں (''سوانح قاسمی'' ۲/۲۹)۔

اب سمجھ آگئی آپ کو ''فتاویٰ رشیدیہ'' والی عبارت! کہ ''فتاویٰ رشیدیہ'' میں لکھا تھا کہ بزرگوں کو جا کے یہ کہنا کہ ''میرے لئے اللہ تعالیٰ سے دُعا کرو'' یہ ان لوگوں کے نزدیک دُرست ہے جو سماعِ موتی کے قائل ہیں، اور جو سماعِ موتی کے قائل نہیں ہیں ان کے نزدیک دُرست نہیں، تو اس میں بھی جواز اور عدمِ جواز کے بجائے اَولیٰ اور غیرِ اَولیٰ کی بات ہو سکتی ہے، جب یہ مسئلہ پہلے سے مختلف فیہ چلا آ رہا ہے۔ تو حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ طرزِ عمل لکھا ہے ان کے ایک شاگرد نے، کہ جس وقت کسی مزار پر

ہوتے اور عوام سننے والے نہ ہوتے، جن کو آگے کوئی اور مغالطہ لگنے کا اندیشہ ہوتا، تو آپ سماعِ اولیاء کے قائل بھی تھے اور کسی مزار پر جاتے تو صاحبِ مزار کو یوں کہہ بھی دیا کرتے کہ آپ میرے لئے دُعا کریں۔ تو حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر کے مطابق جو لوگ سماع کے قائل ہیں ان کے لئے یہ کہنے کی گنجائش ہے۔

مولانا حسین علی رحمۃ اللہ علیہ اور کتاب ''فوائدِ عثمانیہ'' کا تعارف

اس کے ساتھ ہی ایک اور بات آپ کی خدمت میں عرض کردوں، ہمارے اس زمانے میں اس مسئلے کے اُوپر جو شدت اختیار کرنے والے لوگ ہیں، وہ اپنا انتساب مولانا حسین علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ رکھتے ہیں، اور مولانا حسین علی رحمۃ اللہ علیہ یہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں، اور یہ مُرید ہیں حضرت خواجہ محمد عثمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ موسیٰ زئی والوں کے، (آپ کو کچھ تعارف کرواؤں) اس علاقے میں رُوحانی فیض زیادہ تر موسیٰ زئی کی خانقاہ کا ہے، وہاں حضرت مولانا دوست محمد صاحب قندھاری مجدّدی رحمۃ اللہ علیہ آکر ٹھہرے، پھر ان کے خلیفہ ہیں خواجہ محمد عثمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ، اور ان کے آگے جانشین ہیں خواجہ سراج الدین رحمۃ اللہ علیہ، اور خواجہ سراج الدین رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ ہیں مولانا حسین علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، اور اسی طرح سے خانقاہ سراجیہ والے مولانا احمد خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ، یہ دونوں آپس میں پیر بھائی ہیں، مولانا حسین علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بھی خلافت خواجہ سراج الدین رحمۃ اللہ علیہ سے ہے اور مولانا احمد خان رحمۃ اللہ علیہ خانقاہ سراجیہ والوں کو بھی خلافت خواجہ سراج الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ہے۔ اور خواجہ سراج الدین جانشین ہیں خواجہ محمد عثمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے۔ اور مولانا حسین علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مُرید خواجہ محمد عثمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں، اور خلافت[1] خواجہ سراج الدین صاحب سے ہے۔ تو خواجہ محمد عثمان صاحب پیر ہوئے مولانا حسین علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے۔ اور خواجہ سراج الدین صاحب بھی پیر ہوئے مولانا حسین علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے۔ تو ان کے پیروں کے مسلک کی اگر میں نشاندہی کردوں تو اس کے بعد پھر کیا بات باقی رہ جائے گی! یہ کتاب میرے ہاتھ میں ہے ''فوائدِ عثمانیہ'' اس میں حضرت خواجہ محمد عثمان رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات، کرامات اور حالات ہیں، یہ کتاب مرتب کروائی ہے خواجہ سراج الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے، اور اس کے مصحح اور اس کے اُوپر نظرِ ثانی کرنے والے ہیں مولانا حسین علی صاحب واں بھچراں رحمۃ اللہ علیہ، آخر میں ان کے دستخط ہیں، میں عبارت پڑھ کے سنادوں۔ کتاب ختم تو ہورہی ہے ان دوشعروں پر۔ راقم الحروف (سیّد اکبر علی شاہ) مے گوید، قطعہ:

غلام نقشبنداں شو، اگر دُنیا و دِیں خواہی   سگ درگاہِ عثماں شو، اگر حق الیقیں خواہی

ترجمہ:- اگر دُنیا اور دِین تُو چاہتا ہے تو نقشبندیوں کا غلام ہوجا۔ اور اگر تُو حق الیقین چاہتا ہے تو درگاہِ عثمان کا کتا بن جا۔

مزارِ شاں بموسیٰ زئی بہارِ باغِ رضوان است   بیا و ہم زیارت کن چو فردوسِ بریں خواہی

ترجمہ:- ان کا مزار جو باغِ رضوان کی بہار ہے، وہ موسیٰ زئی میں ہے۔ اگر تُو فردوسِ بریں چاہتا ہے تو آ، اور ان کی زیارت کر۔

---

(۱) مولانا حسین علیؒ کو اگرچہ سلسلۂ نقشبندیہ میں خلافت خواجہ عثمانؒ سے تھی، لیکن دیگر سلاسل سمیت خلافتِ جامعہ واجازتِ مطلقہ خواجہ سراجؒ سے ملی (از تحفۂ سعدیہ ص ۸۳)۔

کتاب کا خاتمہ ان دوشعروں پر ہے اور آگے ہے:

''عبارتِ مصحح: بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ. وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی جَمِیْعِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِ کُلٍّ وَسَائِرِ الصَّالِحِیْنَ خُصُوْصًا عَلٰی جَمِیْعِ الصَّحَابَۃِ وَجَمِیْعِ الْاَوْلِیَاءِ الْمُقَرَّبِیْنَ. لَا سِیَّمَا سَادَاتِنَا رِضْوَانُ اللّٰہِ عَلَیْہِمْ اَجْمَعِیْنَ. اَللّٰھُمَّ قَدِّسْنَا بِسِرِّھِمِ الْاَقْدَسِ. اَمَّا بَعْدُ! فَیَقُوْلُ الْفَقِیْرُ الْحَقِیْرُ الْمَدْعُوُّ بِحُسَیْنِ عَلِیٍّ اِنِّیْ طَالَعْتُ ھٰذَا الْکِتَابَ مِنْ اَوَّلِہٖ اِلٰی اٰخِرِہٖ بِاَمْرِ سَیِّدِیْ وَمَوْلَائِیْ وَمُرْشِدِیْ حضرت سیدی محمد سراج الدین لَا زَالَ فُیُوْضَاتُہٗ عَلَیْنَا فَائِضَۃً وَنَفَعَنَا اللّٰہُ بِھٰذَا الْکِتٰبِ وَالنَّاظِرِیْنَ الْاٰخَرِیْنَ اٰمِیْن یَارَبَّ الْعَالَمِیْنَ''..........

یہ مولانا حسین علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی آخر میں تصحیح اور تصدیق ہے، اور ان کے دستخط ہیں۔

مولانا حسین علی رحمۃ اللہ علیہ کی تصدیق کے ساتھ ان کے پیروں کا واقعہ

یہ ان کے پیروں کی بات آ گئی۔ تو اس کتاب کے صفحہ ۱۲۷ پر حضرت کی ایک کرامت لکھی ہے، حاصل یہ ہے کہ ایک دن میاں غوث علی میوۂ آم، اور مولوی محمد عیسیٰ خان ولد مولوی حاجی قلندر خاں صاحب گنڈہ پور پتی خیل رئیس مڈی (ڈیرہ اسماعیل خان) کچھ میوے صاحب زادوں کے لئے لے کر آئے۔ حضرت قبلہ ما قلبی وروحی فداہ! نے اپنے صاحب زادوں محمد بہاؤ الدین اور محمد سیف الدین سے فرمایا کہ یہ صاحب تمہارے لئے میوے لائے ہیں۔ یہ دیکھو اگلی بات: ''پس شما را نیز باید کہ درحق ایشاں برمزار پُرانوار حضرت پیر ومُرشد ما، برّد اللہ مضجعہ الشریف ونوّر اللہ مرقدہ المنیف، دُعائے بارش باراں بکنید کہ زمینات ایشاں سیراب شوند۔'' صاحب زادوں سے فرمایا کہ یہ تمہارے لیے میوے لائے ہیں، تم بھی ان کے لئے حضرت کے مزار پُرانوار پہ جا کے (یعنی دوست محمد قندھاری رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر جا کے) ان کے لئے بارش کی دُعا کرو، کہ ان کی زمینیں سیراب ہو جائیں۔ ''پس ہر دو صاحب زادگان حسب الارشاد حضرت قبلہ برمزار شریف رفتہ دُعا خواستند۔'' ''دُعا خواستند'' کا معنی سمجھتے ہو؟ دُعا چاہی، دُعا کا مطالبہ کیا، جس کا بظاہر مطلب یہی ہے کہ حضرت خواجہ دوست محمد قندھاری رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ آپ دُعا کریں کہ اللہ بارش دے دے، جس طرح سے حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے عمل میں بات آئی تھی۔ تو یہ دُعا کی۔ ''واپس آمدہ پیش حضرت قبلہ نشستند۔'' یہ دُعا چاہ کے، آ کے حضرت کے سامنے بیٹھ گئے۔ ''حضرت قبلہ بصاحب زادگان مخاطب شدہ فرمودند۔'' حضرت قبلہ نے صاحب زادوں سے فرمایا کہ ''از مزار شریف چہ آگاہی شد؟'' تمہیں اس قبر سے کچھ اطلاع بھی ملی؟ ''حضرت چہ می فرمایند؟'' حضرت نے کچھ فرمایا ہے؟ اب اگلی بات سنیے! پتا چلے کہ بچوں کی بات کیسی ہوتی ہے؟ عقل مندوں کی کیسی ہوتی ہے؟ ''چونکہ ہر دو صاحب زادگان بسیار خورد سالہ بودہ'' وہ بہت چھوٹے تھے، ''فرمودند کہ بابا! حضرت مردہ اند، ہیچ جواب ندہند۔'' بچے کہنے لگے: جی! حضرت تو مَرے ہوئے ہیں، وہ کیا جواب دیں گے؟ یہ بچوں والی بات ہے، وہ بہت چھوٹی عمر کے تھے، کہ وہ تو مَرے ہوئے ہیں، کیا جواب دیں گے؟ اچھا! اب پیروں والی بات کیا ہے؟ ''پس بمجرد شنیدن ایں کلام از زبانِ صاحب زادگان'' صاحب زادوں کی زبان سے اس بات کو سنتے ہی ''حضرت قبلہ را بسیار جوش آمد وہر دو صاحب زادگان را فرمودند کہ حالاً باز بروید وبرمزار شریف دُعا

بکنید اِن شاء اللہ تعالیٰ حضرت جواب خواہند داد!'' حضرت قبلہ جوش میں آئے اور دونوں صاحب زادوں سے فرمایا: جاؤ دوبارہ، جا کے دُعا کرو، اِن شاء اللہ حضرت جواب ضرور دیں گے۔ ''حسب فرمودہ حضرت قبلہ باز صاحب زادگان بر مزار شریف رفتہ دُعا خواستند'' تو حضرت کے فرمان کے مطابق صاحب زادگان دوبارہ گئے، اور دُعا کی درخواست کی۔ ''پس آمدند باز حضرت قبلہ دریافت فرمودند کہ بگوئید حضرت چہ فرمودند؟'' اور واپس آ گئے، حضرت قبلہ نے دوبارہ پھر پوچھا کہ بتایئے حضرت نے کیا فرمایا؟ ''صاحب زادگان عرض نمودند کہ بابا حضرت کلاں می فرمایند کہ بارش باراں بسیار خواہد شد۔'' بچوں نے کہا کہ حضرت فرماتے ہیں کہ بارش بہت ہو جائے گی۔ ''پس بعد گذشتن یک روز ہر دو صاحبان از حضرت قبلہ رخصت گرفتہ بخانہ ہائے خویش روانہ شدند۔'' ایک آدھا دِن ٹھہر کے وہ چلے گئے، چلے جانے کے بعد کیا ہوتا ہے؟ ''پس بمجر د رسیدن بخانہ ہا امتحان کردند کہ در یک تاریخ بوقت واحد در ہر دو جا بر زمینات موافق فرمودہ صاحب زادگان بسیار بارش باراں باریدہ و سیرابی زمینات صاحبان موصوف حسب دلخواہ گردیدہ و زراعت بسیار روئیدہ کہ گاہی ایں چنیں عمدہ فصل نشدہ بود حالانکہ زمینات میاں غوث علی صاحب در موضع امبہ ڈاک خانہ وڑچھ، ضلع شاہ پور، و زمینات مولوی محمد عیسیٰ خان صاحب در موضع ندر بدر، تحصیل کلاچی، ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کہ فاصلہ و مسافت درمیان ہر دو جا تقریباً صد کروہ ہست بجز زمینات مذکورہ بالا ایں ہر دو صاحبان ممدوح دیگر ہیچ جا بارش باراں در آں وقت نشد۔'' یعنی جب یہ گھر گئے تو دیکھا کہ ایک ہی دِن میں ایک ہی وقت میں دونوں کی زمینوں میں بارش ہوئی، دونوں زمینوں کے درمیان میں سو کروہ کا فاصلہ ہے، اور کہتے ہیں کہ ان کے علاقے کے علاوہ اور کسی علاقے میں بارش نہیں ہوئی ....! عرض کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ قبر پہ جا کر دُعا کی درخواست کرنا، اور مرنے والوں کی ارواح کے ساتھ اس قسم کا رابطہ ہو کہ اس قسم کی معلومات کا حاصل ہو جانا، یہ حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پیروں کا بھی واقعہ ہے، جس کے اُوپر تصحیح حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔

''فتاویٰ دارالعلوم دیوبند'' سے ''مسئلۂ سماعِ موتیٰ'' کی وضاحت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور اس کے ضمن میں حضرت خواجہ محمد عثمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا تھا۔ اب ''فتاویٰ دارالعلوم دیوبند'' سے ایک عبارت نقل کر رہا ہوں، جس سے کم از کم دیوبند کے مسلک کی وضاحت ہو جائے گی۔ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کے پہلے مفتی ہیں، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے بھائی تھے، اور دارالعلوم میں جب دارالافتاء قائم ہوا تو پہلے مفتی یہ بنے۔ تو ''فتاویٰ دارالعلوم'' کا حوالہ یہ ہے..... ''سوال نمبر ۳۱۸۹: - بروئے مذہبِ اَحناف بزرگانِ دِین کے مزار پر جا کر یہ عرض کرنا کہ ''آپ مقبولِ خداوندی ہیں، آپ ہمارے لئے دُعا کر دیجئے کہ ہماری یہ مُراد پوری ہو جائے'' یہ جائز ہے یا نہیں؟ (یعنی بزرگوں کی قبروں پہ جا کے یہ کہنا کہ ہمارے لیے دُعا کرو)..... سوال نمبر ۳۱۹۰: - امام صاحب کے نزدیک بزرگانِ دِین بعد وفات زائرین کی باتیں سنتے ہیں یا نہیں؟ سوال نمبر ۳۱۹۱: - کیا یہ صحیح ہے کہ امامِ موصوف نے کسی شخص کو کسی قبر پر اہلِ قبر سے کچھ عرض و معروض

کرتے دیکھا اور کہا کہ تُو ایسے سے التجا کرتا ہے جو سُن بھی نہیں سکتا؟...... سوال نمبر ۱۹۲ ۳:- اگر کوئی آیت یا حدیث امام صاحب کے قول کی تائید کرتی ہو تو وہ بھی تحریر فرمائیے؟

ان چاروں سوالوں کو اکٹھا کرنے کے بعد حضرت مفتی صاحب یہ جواب دیتے ہیں کہ ''سماعِ موتیٰ میں اختلاف ہے، اور یہ اختلاف صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانے سے ہے، بہت سے ائمہ سماعِ موتیٰ کے قائل ہیں، اور حنفیہ کی کُتب میں بعض مسائل ایسے موجود ہیں جن سے عدمِ سماعِ موتیٰ معلوم ہوتا ہے، مگر امام صاحب سے کوئی تصریح اس بارے میں نقل نہیں کرتے، اور استدلال عدمِ سماع کا آیت: ''اِنَّكَ لَا تُسۡمِعُ الۡمَوۡتٰى'' سے کرتے ہیں، اور مجوّزین کا استدلال حدیث: ''مَا اَنۡتُمۡ بِاَسۡمَعَ مِنۡهُمۡ'' اور حدیث ''سماعِ قرعِ نعال'' سے ہے (ان دونوں کا ذکر آپ کے سامنے دلائل کے ضمن میں آئے گا) اور آیتِ مذکورہ کا یہ جواب دیتے ہیں کہ نفی سماعِ قبول کی ہے۔ غرض یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے، اور قولِ فیصل ہونا اس میں دُشوار ہے، پس عوام کو اس میں سکوت مناسب ہے، جبکہ علماء کو بھی اس میں تردد ہے، اور دلائل فریقین موجود ہیں، اور جبکہ سماعِ موتیٰ میں اختلاف ہوا تو اس میں بھی ہوا کہ بزرگانِ دین کے مزار پر اس طرح سے دُعا کرنا کہ ''تم اللہ تعالیٰ سے دُعا کرو کہ میری فلاں حاجت پوری ہو جائے'' یہ بھی مختلف فیہ ہوگا۔ لیکن اَحوط یہ ہے کہ اس طرح سے دُعا کرے کہ ''یا اللہ! اپنے اس نیک بندے کی برکت سے میری دُعا قبول فرما اور میری حاجت پوری فرما'' یعنی توسل سے، اسی کا ذِکر حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا کہ یہ بالاتفاق جائز ہے بحرمتِ فلاں یا ببرکتِ فلاں، اس طرح سے دُعا کرنا...... یہ جواب ہے حضرت عزیز الرحمٰن صاحب مفتیٔ اوّل دار العلوم دیوبند کا۔

اس فتویٰ سے یہ اُمور بصراحت معلوم ہوتے ہیں کہ:

۱۔ یہ مسئلہ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے تاہنوز اختلافی چلا آ رہا ہے (اس کی وضاحت آپ کے سامنے ہوگئی)۔

۲۔ اور فریقین کے پاس دلائل موجود ہیں۔ (اس کا تذکرہ بھی ابھی ہم آپ کے سامنے کرنے والے ہیں)۔

۳۔ فقہِ حنفی کی کُتب میں بعض مسائل سے عدمِ سماعِ موتیٰ معلوم ہوتا ہے۔

۴۔ لیکن حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے اس بارے میں کچھ منقول نہیں، (حضرت مفتی صاحب کے فتوے سے معلوم ہوا کہ صراحتاً حضرت امام صاحب سے روایت نہیں)، یعنی ''فتاویٰ غرائب'' کا جو حوالہ منکرینِ سماعِ موتیٰ حضرت امام صاحب کی طرف نسبت کرتے ہیں، وہ بے اصل ہے۔

۵۔ بزرگوں کے طفیل اور وسیلے سے دُعا مانگنا دُرست اور صحیح ہے، وغیرہ وغیرہ۔ (سماع الموتیٰ ص۸۸، از شیخ سرفراز صفدر رحمۃ اللہ علیہ)۔

''فتاویٰ دار العلوم'' کی جو عبارت میں نے آپ کو پڑھ کے سُنائی ہے، تو یہ ہے ''فتاویٰ دار العلوم'' مدلل مکمل، جلد پنجم، ص۴۲۱ (مطبوعہ دیوبند)، اس سے یہ عبارت آپ کو پڑھ کے سُنائی گئی۔ اس میں خصوصیت کے ساتھ یہ فقرہ قابلِ غور ہے ''مگر امام صاحب سے کوئی تصریح اس بارے میں منقول نہیں'' اس کی وضاحت آپ کے سامنے عرض کرتا ہوں۔

کیا میّت کا ''قَدِّمُونی'' کہنا دلالتِ حالی ہے؟

یہ میرے پاس ہے ''فیض الباری''، سید انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی، ''بخاری شریف'' کی شرح۔ اور آپ ان سے واقف ہی ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جتنا تبحر اور جتنا حافظہ ان کو دیا تھا کہ ہمارے حضرات کہا کرتے تھے کہ ''چلتا پھرتا کُتب خانہ ہیں'' تو اُن کی نظر نقول پر بہت وسیع تھی۔ ''بخاری شریف'' میں ''کتاب الجنائز'' کے اندر ایک روایت آتی ہے، جس کا ترجمۃ الباب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے رکھا ہے: ''باب قولِ الْمَيِّتِ وَهُوَ عَلَى الْجَنَازَةِ: قَدِّمُوْنِي''، اس روایت کا حاصل یہ ہے، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس وقت کوئی شخص مرجاتا ہے اور اس کے جنازے کو اُٹھایا جاتا ہے، اگر تو وہ اچھا ہوتا ہے، نیک ہوتا ہے، تو وہ اپنے اُٹھانے والوں کو کہتا ہے: ''قَدِّمُوْنِي! قَدِّمُوْنِي!'' مجھے جلدی لے چلو! جلدی لے چلو! اور اگر وہ بُرا ہوتا ہے، اور اس کو اپنے سامنے انجام بُرا نظر آ رہا ہوتا ہے، کیونکہ مرتے ہی آخرت کے حالات تو منکشف ہوجاتے ہیں، تو پھر وہ کہتا ہے: ''يَا وَيْلَهَا! أَيْنَ يَذْهَبُونَ بِهَا'' ہائے میری بربادی! مجھے کہاں لئے جا رہے ہیں۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اُس کی اِس کلام کو انسان کے علاوہ باقی ساری مخلوق سنتی ہے۔[1] یہ ہے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان۔

اس حدیث کی تشریح کے طور پر صرف اتنی بات کا درمیان میں اضافہ کردوں کہ میّت کا بولنا اور مخلوق کا سننا یہ اپنی حقیقت پر محمول ہے، جس وقت تک مجاز مراد لینے کا کوئی قرینہ نہ ہو، کسی کلام کو مجاز پر محمول نہیں کیا جایا کرتا۔ میری گفتگو ایک دوست سے ہوئی، تو وہ کہنے لگے کہ ''یہ جو ''قَالَتْ'' کا لفظ حدیث میں آیا ہے کہ میّت کہتی ہے، اس سے قولِ حالی مراد ہے، قولِ لسانی نہیں!''، ''قولِ حالی'' کا مطلب ہوتا ہے کہ اس کی حالت اس بات پر دلالت کرتی ہے، جس طرح سے آپ کہیں کہ:

ہر گیاہے کہ از زمیں مے روید وحدہٗ لا شریک لہ مے گوید

جو بھی گھاس کا پتا زمین سے اُگتا ہے وہ کہتا ہے: ''وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ'' اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اعلان کرتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اگر اس میں غور کریں گے تو یہاں سے اِستدلال کر کے آپ اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ اس کا پیدا کرنے والا ''وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ'' ہے، تو اس دلالتِ حالی کو بھی قول کے ساتھ تعبیر کردیا جاتا ہے، یہ ایک توجیہ ہے جو بعض حضرات کرتے ہیں اور میرے سامنے بھی اس دوست نے یہی توجیہ کی۔ تو میں نے کہا کہ آپ ذرا اس میں غور فرمائیں کہ قولِ حالی ہو تو وہاں مخاطب اس حالت سے ایک بات کو سمجھتا ہے، کانوں سے سنتا نہیں، اور جہاں قولِ لسانی ہو تو وہاں مخاطب کانوں سے سنتا ہے۔ چونکہ یہاں قَالَتْ کے بعد انسانوں کے علاوہ باقی مخلوق کے سننے کا ذکر ہے تو یہ قرینہ ہے کہ قالت سے قولِ لسانی مراد ہے۔ نیز جن وانس کے علاوہ باقی مخلوق کانوں سے سنتی ہے، مگر اِستدلال نہیں کرسکتی، اِستدلال صرف جن وانس کرتے ہیں، یہ بھی قرینہ ہے کہ قالت سے وہ قول مراد ہے جس پر سننا مرتب ہوتا ہے اور وہ قولِ لسانی ہے۔ اگر قولِ حالی مراد ہوتا تو پھر تو کلام یوں ہونی چاہیے تھی کہ اس کی اس بات کو جن اور اِنسان سمجھتے ہیں، باقی کوئی نہیں سمجھتا، جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ انسان نہیں سنتا، چرند پرند وغیرہ سنتے ہیں، معلوم

(۱) بخاری ۱/۱۷۶ باب قول المیت وھو علی الجنازۃ: قدمونی۔ مشکوٰۃ ۱/۱۴۴ باب المشی بالجنازۃ فصل اول۔

ہوگیا کہ یہ بات اِستدلال سے سمجھنے کی نہیں ہے، بلکہ اس کا کہنا اور باقیوں کا سننا حقیقت پر محمول ہے، یہ علیحدہ بات ہے کہ مرنے کے بعد چونکہ جہان بدل گیا، جیسے کل میں نے آپ کے سامنے وضاحت کی تھی، اب اُس جہان کی بات کو ہم اپنے اس جہان پر قیاس نہیں کرسکتے، یہ بات علم غیب سے متعلق ہوگئی، اب سرورِ کائنات ﷺ کے بیان فرمانے سے ہم مانیں گے تو یہ ہمارا ایمان بالغیب ہے۔

مذہب اِمامِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی

اسی روایت کے اُوپر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت شیخ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''وَاعْلَمْ اَنَّ مَسْئَلَةَ كَلَامِ الْمَيِّتِ وَسَمَاعِهٖ وَاحِدَةٌ'' آپ جان لیجئے کہ میّت کا بولنا اور اس کا سننا ایک ہی مسئلہ ہے، یعنی جن کے نزدیک میّت کا سماع ثابت ہے، ان کے نزدیک بولنا بھی ثابت ہے، اور جو سماع کا انکار کریں گے وہ بولنے کا بھی انکار کریں گے۔ یہی بات میں حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جملے کی تائید کے طور پر آپ کے سامنے نقل کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت کشمیری فرماتے ہیں: ''وَاَنْكَرَهَا حَنَفِيَّةُ الْعَصْرِ'' موجودہ زمانے کے حنفی اس سماع کا انکار کرتے ہیں۔ ''وَفِي رِسَالَةٍ غَيْرِ مَطْبُوْعَةٍ لِعَلِيِّ الْقَارِيْ اَنَّ اَحَدًا مِنْ اَئِمَّتِنَا لَمْ يَذْهَبْ اِلٰى اِنْكَارِهَا'' حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ ملّا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ (جو شارحِ مشکوٰۃ ہیں) کا ایک رسالہ میں نے دیکھا جو طبع نہیں ہوا، اس میں یہ موجود ہے کہ ہمارے ائمہ میں سے کوئی شخص بھی انکارِ سماعِ موتی کی طرف نہیں گیا۔ ''وَاِنَّمَا اسْتَنْبَطُوْهَا مِنْ مَسْئَلَةٍ فِيْ بَابِ الْاَيْمَانِ'' حنفیوں نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے قسموں والے مسئلے سے۔ مفتی عزیز الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کے فتوے میں بھی یہ بات آئی تھی کہ بعض مسائل ایسے ہیں جن سے عدمِ سماع معلوم ہوتا ہے، وہ مسائل یہی ہیں کہ فقہِ حنفی کے اندر مسئلہ آتا ہے کہ اگر کوئی شخص قسم کھالے کہ میں فلاں سے بات نہیں کروں گا اور وہ فلاں مرگیا، مرنے کے بعد اس کے جنازے کے پاس کھڑا ہوکر، یا اس کی قبر کے پاس کھڑے ہوکر، اس سے باتیں کرنے لگ جائے، تو ہماری فقہ میں لکھا ہے کہ وہ ''حانث'' نہیں ہوگا۔ اس سے لوگ سمجھے ہیں کہ ''حانث'' اس لئے نہیں ہوگا کہ وہ تو سنتا نہیں، اگر وہ اس کی باتیں سنتا تو پھر تو بات ہوگئی، اور اس کو ''حانث'' ہوجانا چاہیے تھا۔ ان مسائل سے لوگوں نے استنباط کیا ہے کہ حنفیوں کے نزدیک عدمِ سماع ہے، ورنہ ہمارے امام کی طرف سے اس بارے میں کوئی صراحتًا روایت نہیں ہے۔ لیکن حضرت (ملّا علی قاری) فرماتے ہیں کہ یہاں سے اِستدلال کمزور ہے، کیونکہ ''مَبْنَى الْاَيْمَانِ عَلَى الْعُرْفِ وَهُمْ لَا يُسَمُّوْنَهٗ كَلَامًا'' قسموں کا مدار تو عُرف پہ ہوتا ہے، عُرف میں چونکہ بولنا زندگی میں سمجھا جاتا ہے کہ ہم آپس میں گفتگو نہیں کریں گے، قسم کا حاصل یہ تھا، مرنے کے بعد جنازے کے پاس کھڑا ہوکے اگر کوئی شخص اسے خطاب کرلے اور بات کرلے، اس کو عُرفاً بات کرنا نہیں کہتے، جب اس کو عُرفاً آپس میں بولنا نہیں کہتے تو انسان ''حانث'' نہیں ہوگا، اس لئے ان مسائل سے اِستنباط کرکے جو بعض فقہائے اَحناف نے لکھ دیا کہ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ اَحناف کے نزدیک میّت سنتی نہیں ہے، تو یہ ایک اِستنباط ہے، اور استنباط کے طور پر اس کو امام صاحب کی طرف منسوب کردیا گیا۔ ورنہ ہمارے اماموں میں سے کسی اِمام سے بھی صراحتًا سماعِ موتی کے انکار کی روایت نہیں ہے۔[1]

---

(۱) فیض الباری ج ۳ ص ۱ ۴ باب قول المیت وهو علی الجنازة کے تحت۔

یہی بات حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے فتوے میں کہی، اور یہی بات حضرت شیخنا الانور یہاں کہتے ہیں جس سے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی اس بات کی بھی وضاحت ہوگئی کہ ''اگرچہ مسئلہ مختلف فیہ ہے لیکن اپنے امام مجتہد کی اقتدا میں اگر کوئی شخص ایک شق کو ترجیح دے دے تو ہوسکتا ہے، اور امام صاحب کی طرف منسوب عدمِ سماع ہے، جس کی بنا پر میں بھی عدمِ سماع کو اَصح کہتا ہوں'' یہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی کلام کا حاصل ہے، اس کی وضاحت بھی ان دونوں نقول کے تحت ہوگئی کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کا مدار بھی اسی مشہور بات پر ہی ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ سے عدمِ سماع منقول ہے، جس کے متعلق حضرت مفتی عزیز الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہہ دیا کہ یہ فقہاء کا اِستنباط ہے، ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت نہیں ہے، اور حضرت شیخ (کشمیری) نے بھی اس کی وضاحت کردی کہ یہ اِستنباط ہے، اور ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ سے صراحتاً روایت نہیں ہے، تو مسلکِ دیوبند کی وضاحت اس فتوے سے بھی ہوگئی۔

مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک: ''عدمِ سماع''

آپ کے سامنے میں بات یہ عرض کررہا تھا کہ ہمارے اکابرین کا کیا مسلک ہے؟ اس میں دونوں شقیں نقل کرتا آرہا ہوں، ہمارے علماء میں سے ایک عظیم المرتبت شخصیت گزری ہے حضرت مفتی کفایت اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی، یہ ''جمعیت علمائے ہند'' کے صدر بھی تھے، مدرسہ امینیہ میں صدر مدرّس تھے، شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے عزیز شاگردوں میں سے ہیں، وہ فتویٰ عدمِ سماع پر دیا کرتے تھے، گویا ان کے نزدیک راجح عدمِ سماع ہے۔(۱)

شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک: ''سماع فی الجملہ''

لیکن اس کے مقابلے میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں سے ہی شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ ''مسلم شریف'' کے شارح، اور قرآنِ کریم کے مفسر، ''فوائدِ عثمانی'' جن کی مرتب کی ہوئی ہے، یہ سماع فی الجملہ کے قائل ہیں، اور انہوں نے اپنی تفسیر کے اندر اس کی صراحت کی ہے، وہ آخر میں اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى آیت پر تبصرہ کرتا ہوا میں آپ کو پڑھ کے سناؤں گا۔

''جمہور علمائے دیوبند کا مسلک'' حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی

اور علمائے دیوبند میں سے ہی حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا جو مقام اور مرتبہ ہے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں، ساری جماعت ان کو ''حکیم الاُمت''، ''مجدد الملت'' کہتی ہے، تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اَولیٰ اسی کو قرار دیا ہے کہ سماع فی الجملہ ہے، ''بیان القرآن'' میں تو حضرت نے صرف اختلاف نقل کیا ہے کہ بعض یوں کہتے ہیں، بعض یوں کہتے ہیں، بعض آیات کے ظاہر سے استدلال کرکے نفی کرتے ہیں، بعض احادیث سے استدلال کرکے اِثبات کرتے ہیں، ان کو آیات میں کچھ تاویل کرنی پڑتی ہے۔ ان کو اَحادیث میں کچھ تاویل کرنی پڑتی، سورۂ نمل کے اندر ''بیان القرآن'' میں اسی آیت کے تحت صرف اُمت کا اختلاف نقل کردیا گیا، اور اس

(۱) دیکھئے: ''کفایت المفتی'' ج۱ ص۲۰۱۔ نوٹ:- یاد رہے کہ اس کے ساتھ متصل کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''ہاں میت کو قبر میں رکھنے کے بعد اس قدر حیات اس میں ڈالی جاتی ہے کہ وہ آرام یا تکلیف کو محسوس کرے۔''

سے مسئلہ حل ہوجاتا ہے، جیسے کل میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ اس مسئلے میں زور ہی نہیں رہتا جب اس میں اختلاف مان لیا جائے ...... تو کتاب ہے ''احکام القرآن'' کے متعلق، جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی نگرانی میں لکھوائی تھی، لکھنے والے ہیں کچھ حصے کو مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ، اور کچھ حصہ اس کا مرتب کیا ہے مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کراچی والے نے، جو کہ ''تفسیر معارف القرآن'' کے مؤلف ہیں، اس میں انہی آیتوں کے اُوپر جو مضمون مرتب کیا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے، تو اس کا نام رکھ دیا ''تکمیل الحبور بِسِمَاعِ اَهْلِ الْقُبُوْرِ'' یعنی یہ جو آیات ہیں: فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ۝ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ۭ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ (سورۂ روم) اس آیت پر جو تحریر مرتب کی اس کو مستقل رسالے کی شکل دے دی، اور ''تکمیل الحبور'' اس کا نام رکھ دیا، اسی کا حوالہ انہوں نے اپنی تفسیر میں دیا ہے کہ یہ مسئلہ چونکہ اہلِ علم کے سمجھنے کا ہے، تو ہم نے اس پر مستقل رسالہ لکھا ہے جو ''احکام القرآن'' میں لگا ہوا ہے، اہلِ علم وہاں مراجعت کرلیں۔ اور اپنی تفسیر میں صرف اختلاف نقل کر کے اس بات کو چھوڑ دیا ہے کہ یہ بات عوام کے لئے زیادہ مفید نہیں ہے۔ ہمارے حضرات اتنے محتاط ہیں۔ اور یہ چونکہ حضرت (تھانویؒ) کی نگرانی میں لکھی گئی، اس لئے اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے، لفظ بہ لفظ کی تائید حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے ہے۔

اس (تکمیل الحبور) میں پہلے تو وہی نقل کیا کہ ''وَاعْلَمْ اَنَّ مَسْئَلَةَ سَمَاعِ الْمَوْتٰى وَعَدَمِهٖ مِنَ الْمَسَائِلِ الَّتِيْ وَقَعَ الْخِلَافُ فِيْهِ بَيْنَ الصَّحَابَةِ'': یہ تو وہی اختلاف کا ذکر ہے، اس اختلاف کے بعد اپنے نزدیک جو راجح نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ''ذَكَرَ ابْنُ عَبْدِ الْبَرِّ اَنَّ الْاَكْثَرِيْنَ عَلٰى ذٰلِكَ یعنی سماعهم فی الجملة'' اکثریت علماء کی سماع فی الجملہ پر ہے۔ ''هُوَ الْحَقُّ الْحَقِيْقُ بِالْقَبُوْلِ وَهُوَ مُخْتَارُ مَشَائِخِنَا دَامَتْ بَرَكَاتُهُمْ'' یہی بات حق ہے، حقیق بالقبول ہے اور اسی پر ہمارے مشائخ ہیں دامت برکاتہم۔ تو گویا کہ انہوں نے بھی ''سماع فی الجملہ'' کو ہی حق اور حقیق بالقبول قرار دیا ہے۔ اور آیت کی جو تاویل کی ہے وہ آپ کے سامنے (آخر میں) دلائل کے ضمن میں آجائے گی، تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف بھی گویا کہ سماع فی الجملہ کی اُولویت کی نسبت ہے ...... یہ تو اس کتاب میں سے نقل کر رہا ہوں، ویسے جو حضرات، حضرت کے ملفوظات پڑھتے رہتے ہیں، یا حضرت کے مواعظ دیکھتے رہتے ہیں ان کے سامنے تو یہ بات مخفی ہے ہی نہیں کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سماع کے قائل ہیں۔ [1]

''مختلف فیہ سماعِ موتیٰ'' پر غیر متعلقہ آیات کو چسپاں کرنا خوارج کا طریقہ ہے

یہ تو مسلک کی بات تھی! ...... اب آگے آپ کے سامنے دلیل کا کچھ مختصر سا تذکرہ کرتا ہوں! ...... جو حضرات عدمِ سماع کے قائل ہیں وہ اپنی دلیل کے طور پر قرآنِ کریم سے صرف دو آیتیں پیش کرتے ہیں۔ کل میں نے آپ کی خدمت میں عرض کر دیا تھا کہ یہ لوگ جو ۴۰ آیتیں، ۶۰ آیتیں، ۷۰ آیتیں اکٹھی کیے پھر رہے ہیں کہ یہ عدمِ سماع کے اُوپر دلالت کرتی ہیں۔ جہاں تک ان چند سالوں میں متشددین کا تعلق ہے اس کو چھوڑ کے اس سے پہلے سماعِ موتیٰ کے اختلاف پر جتنی بھی تحریریں ہیں، تفاسیر کی شکل میں

---

(۱) ''ملفوظات حکیم الامت'': ج ۲۵ ص ۱۲۸، نیز ۲۳/ ۲۳۸، ۵/ ۲۱۶، ۶/ ۳۹۴، ۸/ ۲۸۴، ۱۸/ ۲۴۲، ۲۱/ ۲۶۔ ''خطبات حکیم الامت'': ۲۲/ ۳۹۸۔

ہیں، یا شرحِ حدیث کی شکل میں، ان آیات سے اس مختلف فیہ سماعِ موتیٰ کی نفی پر اِستدلال کسی نے نہیں کیا، کل بھی آپ کی خدمت میں یہ بات وضاحت سے عرض کی تھی، اس لئے وہ آیات جن میں مشرکین کی تردید کی گئی ہے، اور مشرکین کو کہا گیا ہے کہ جن کو تم پکارتے ہو، وہ تو سنتے ہی نہیں، اور تمہاری دُعاؤں سے غافل ہیں، ان آیات کا جو موضوع لہٗ اور مسوق لہٗ ہے وہ متفق علیہ ہے، کہ مشرکین کے عقیدے کی تردید ہے اور مشرکین سماعِ لازم دائم کے قائل تھے، اس لئے جو مختلف فیہ مسئلہ ہے ان آیات کا اس مسئلے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، اور کبھی بھی علماء نے اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے ان آیات سے اِستدلال ہی نہیں کیا، بلکہ مسلمانوں کے درمیان اس مختلف فیہ مسئلے کے اُوپر ان آیتوں کا پڑھنا ہی بے جا ہے۔ ''بخاری شریف'' میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول آتا ہے خارجیوں کے متعلق، ان کے اوپر انہوں نے جو تبصرہ کیا ہے، تو اس تبصرے کے اندر ایک بات یہ بھی آئی ہے کہ جو آیات مشرکین کے بارے میں اُتری تھیں، ان لوگوں (خارجیوں) نے اُٹھا اُٹھا کے مسلمانوں پر پڑھنی شروع کر دیں۔[1] اس لئے جن آیات میں مشرکین کا تذکرہ ہے اور مشرکین کے عقیدے کو رَدّ کیا گیا ہے، اور اہلِ ایمان، اہلِ اسلام اس مسئلے کے اندر اختلاف کر رہے ہیں، تو ان آیتوں کو یہاں نہیں پڑھا جا سکتا۔

''تقلیدِ مشرکین'' کی تردید والی آیات کو ''صحیح تقلید'' پر فِٹ کرنا سینہ زوری ہے

یہ ویسے ہی بات ہے جس طرح سے مشرکین اپنے آباء کی تقلید کرتے تھے تو قرآنِ کریم نے ان کا رَدّ کیا ہے، تو کچھ لوگ اس صحیح تقلید کی تردید کے لئے وہی آیات پڑھتے ہیں، حالانکہ وہ بات علیحدہ ہے، وہ بات علیحدہ ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ قرآنِ کریم نے تقلیدِ آباء کے اُوپر بار بار انکار کیا ہے، لیکن وہ آباء کون سے تھے؟ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْـًٔا وَّ لَا یَهْتَدُوْنَ (سورۂ بقرہ: ۱۷۰) جن کو نہ عقل، نہ ہدایت، تو قرآن یہی کہتا ہے کہ تم اپنے ان آباء کے پیچھے کیوں لگتے ہو جو بے عقلے، بے ہدایتے ہیں، تم بھی ان کے پیچھے لگ کر بے عقلے، بے ہدایتے بنتے ہو، قرآنِ کریم ان کی تردید کرتا ہے۔ اب یہ لوگ اگر مروّج تقلید پر ان آیتوں کو پڑھنا شروع کر دیں تو ان کی حماقت ہے، کیونکہ ہم جن کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، وہ آبائے علمی ہیں، اور اللہ کے فضل و کرم سے وہ ''لَا یَعْقِلُوْنَ لَا یَهْتَدُوْنَ'' نہیں ہیں، بلکہ وہ ''ورثۃ الأنبیاء'' ہیں، ''کأنبیاء بنی اسرائیل'' ہیں، ان کی اتباع اور ان کی اقتدا پر یہ آیتیں صادق نہیں آتیں، جو مشرکین اپنے آباء کی تقلید کرتے تھے تو قرآنِ کریم نے ان کے اُوپر انکار کیا ہے۔ جیسے وہ سینہ زوری ہے کہ ہماری اس اِتباع اور تقلید پر وہ آیات پڑھی جائیں جو اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے عقیدے کی تردید میں اُتاری تھیں، اور ان کے آباء کو ''لَا یَعْقِلُوْنَ لَا یَهْتَدُوْنَ'' قرار دے کر روکا تھا کہ ان بے عقلے، بے ہدایتے لوگوں کے پیچھے نہ لگو، اور یہ پڑھی جائیں اُن پر جو کہ اہلِ علم کے پیچھے لگتے ہیں، مجتہدین کی اِقتدا کرتے ہیں، ''ورثۃ الأنبیاء'' کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، جن کی شان میں یہ کہا جاتا ہے ''کأنبیاء بنی اسرائیل''، تو ان پر یہ آیتیں نہیں پڑھی جا سکتیں، ان پر اگر پڑھی جا سکتی ہے تو یہ پڑھی جا سکتی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے وعظ کہتے ہوئے کہا تھا: وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْۤ (سورۂ یوسف: ۳۸) میں تو اپنے آباء کے دین پہ چلتا ہوں، میں تو اپنے

---

(۱) ج ۲ ص ۱۰۲۴ باب قتل الخوارج وکان ابن عمر یراھم شرار خلق اللہ وقال: إنھم انطلقوا إلی آیات نزلت فی الکفار فجعلوھا علی المؤمنین

آباء کی ملت کی اتباع کرتا ہوں۔ تو جس طرح سے حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنا مسلک یہ ذکر کیا تھا: "وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَآءِیْ" ہمارا مسلک بھی یہی ہے۔ کیونکہ ہمارے آبائے علمی جن کے پیچھے ہم لگے ہوئے ہیں، وہ "کأنبیاء بنی اسرائیل" ہیں، اور ان کو حضور ﷺ نے "ورثة الأنبياء" قرار دیا ہے، اس لئے حضرت یوسف علیہ السلام والی آیت تو یہاں صادق آسکتی ہے، اور ہم فخر کے ساتھ کہتے ہیں: "وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَآءِیْ" لیکن وہ آیتیں جن میں مشرکین کے آباء کو "لَا یَعْقِلُوْنَ لَا یَهْتَدُوْنَ" قرار دیا گیا ہے، ان کو یہاں پڑھنا سینہ زوری ہے۔

اس لئے جو آیات مشرکین کے عقیدے کے طور پر آئی ہیں، اور ان میں مشرکین کے عقیدے کو رد کیا گیا ہے، ان آیات کو اہلِ اسلام کے اختلاف کے درمیان میں لانا، یہ بھی اسی طرح سے سینہ زوری ہے، کیونکہ اس سماع کا کوئی بھی قائل نہیں ہے جس سماع کے مشرک قائل تھے۔ دونوں موضوعوں کو علیحدہ علیحدہ کرلو، جس وقت دونوں کو علیحدہ علیحدہ کرلو گے تو آپ کو حل کرنا آسان ہوجائے گا، اور جب دونوں کو خلط رکھو گے، تو بات بگڑ جائے گی۔ اس کی وضاحت کل میں آپ کی خدمت میں کردی تھی کہ اس کے دو درجے ہیں۔

"منکرینِ سماع" کا مستدل آیات صرف دو ہیں، اور وہ بھی عبارۃ النص کے درجے میں نہیں

تو استدلال کرنے والے استدلال کرتے ہیں قرآنِ کریم کی ایک تو اسی آیت سے جو آپ نے تلاوت کی تھی: اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى۔ اور دوسرے اس آیت سے کہ: مَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ۔ بس یہ دو آیتیں سامنے آتی ہیں، ان دو آیات سے استدلال کس طرح ہے؟ اس کو بھی ذرا سمجھنا! بسا اوقات انسان سطحی نظر ڈالتا ہے تو کچھ اور بات ہوتی ہے، حقیقت کچھ اور ہوتی ہے...... استدلال کرنے والے یوں استدلال نہیں کرتے کہ ان آیات کا مسوق لہٗ یہی ہے، اور یہ آیات اسی مسئلے میں عبارۃ النص ہیں، کہ حضور ﷺ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تُو مُردوں کو نہیں سنا سکتا، یعنی جو سماع ہمارے نزدیک مختلف فیہ ہے اسی مسئلے کو بیان کرنے کے لئے یہ آیات آئی ہوں، حاشا وکلا!!! ان آیات کا یہ موقع محل نہیں ہے، اور استدلال کرنے والے یوں استدلال نہیں کرتے۔ یہ استدلال تب ہوسکتا اور ان آیات کا یہ مفہوم عبارت النص کے درجے میں تب مراد لیا جاسکتا جب حضور ﷺ وعظ کے شوق میں کسی قبرستان میں چلے گئے ہوں، اور وہاں جاکر کھڑے ہوکر مُردوں کو وعظ کہنے لگ گئے ہوں، اور اللہ نے فرمایا ہو کہ: لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى: چھوڑ دو اس کو، جاؤ اپنے گھر، تم مُردوں کو نہیں سنا سکتے۔ یا کہیں بہرے اکٹھے کرلیے ہوں اور ان کو اکٹھا کرنے کے بعد ان کو وعظ کہنی شروع کردی ہو اور اللہ نے فرمایا ہو، کیوں ایسی کوشش کرتے ہو، بہرے بھی سنا کرتے ہیں؟ یا اندھوں کو اکٹھا کرکے چاند دکھانا شروع کردیا ہو، اور اللہ تعالیٰ نے کہا ہو کہ تُو اندھوں کو نہیں دکھا سکتا۔ اگر تو ان آیات کا شانِ نزول یہ ہوتا پھر تو آپ کہہ سکتے تھے کہ ان آیات کا عبارۃ النص کے طور پر مطلب یہی ہے۔ تو کیا خیال ہے آپ کا؟ کہیں حضور ﷺ نے قبرستان میں مُردوں کو خطاب کرتے ہوئے وعظ کہی تھی؟ (نہیں!)۔ بہروں کو اکٹھا کرکے کبھی سنانے کی کوشش کی تھی؟ (نہیں!)۔ تو پھر سمجھ لیجئے! ان آیات کا عبارت النص مفہوم یہ نہیں ہے، یہ آیت اس مطلب کے بیان کرنے کے لئے نہیں اُتری کہ تُو ان مُردوں کو سنا نہیں سکتا، جو

واقعتاً قبر میں پڑے ہوئے ہیں، اور تُو ان کو سنانے کی کوشش کر رہا ہے، یہ مطلب نہیں ہے۔ ان آیات میں یہ کہا گیا ہے کہ تو موتیٰ کو نہیں سنا سکتا، بہروں کو نہیں سنا سکتا، خاص طور پر جب وہ پیٹھ پھیر کر جا رہے ہوں، اور تو اندھوں کو راستہ دکھا نہیں سکتا، یہی ہے نہ ان کا مضمون! یا ایک آیت میں کہہ دیا گیا کہ جو قبروں میں پڑے ہوئے ہیں تُو ان کو سنا نہیں سکتا۔

مذکورہ دو آیات کا عبارۃ النص کے طور پر مصداق کُفّار ہیں نہ کہ مُردے

موتیٰ سے حقیقتاً مُردے مراد ہیں، اور صم سے حقیقتاً بہرے مراد ہیں، اور اندھوں سے حقیقتاً اندھے مراد ہیں، ایسی بات نہیں ہے بلکہ ان تینوں لفظوں سے کُفّار مراد ہیں...... کیسے معلوم ہوا کہ کُفّار مراد ہیں؟ پہلا پارہ، سورۂ بقرہ، پہلا رکوع: اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ: جو کافر ہیں، ان کو ڈراؤ یا نہ ڈراؤ یہ برابر ہے، یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ آگے جا کر فرمایا: صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ (سورۂ بقرہ: ۱۸) یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ: یہ نہیں لوٹیں گے۔ تو اس آیت میں صُمٌّ کن کو کہا گیا؟ (کافروں کو)، کہ یہ کافر بہرے ہیں، یہ کافر گونگے ہیں، یہ کافر اندھے ہیں، تو ان گونگوں کو، ان بہروں کو، ان اندھوں کو اب کیا ڈراتے ہیں، یہ لوٹ کر نہیں آنے والے، یہ جس ڈگر پر چل رہے ہیں چلتے رہیں گے، آپ ان کو کیا آوازیں دے رہے ہیں، ان کو ڈرانا نہ ڈرانا برابر ہے۔ تو صُمٌّ سے کون مراد ہو گئے؟ (کافر)۔ بُكْمٌ سے کون مراد ہو گئے؟ (کافر)۔ عُمْیٌ سے کون مراد ہو گئے؟ (کافر)، تو یہ صراحت ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں کافروں کو "صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ" کہا ہے۔ جس طرح سے یہاں کہا کہ ڈراؤ یا نہ ڈراؤ، یہ ایمان نہیں لائیں گے، اسی بات کو اس آیت میں کہا کہ ان مُردوں کو، ان بہروں کو، ان اندھوں کو کیا سنا رہے ہو؟ ان کو آپ نہیں سنا سکتے، نہ ان کو آپ راستہ دکھا سکتے ہیں، اصل مفہوم تو آیت کا یہ ہے کہ یہ کافر مُردوں کی طرح ہو گئے، یہ کافر بہروں کی طرح ہو گئے، یہ کافر اندھوں کی طرح ہو گئے، ان کے سامنے آپ آوازیں دیتے رہیں، ان کو سناتے رہیں، یہ سننے والے نہیں، ان کو آپ نہیں سنا سکتے، تو گویا کہ کُفّار کو موتیٰ کے ساتھ، صم کے ساتھ اور عمی کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ موتیٰ، صم، عمی یہ ہیں مشبہ بہ، اور کُفّار ہیں مشبہ، اور یہاں حکم اصل کے اعتبار سے کُفّار کا بیان کرنا مقصود ہے، اور یہ آیت سرورِ کائنات ﷺ کی تسلی کے لئے ہے کہ آپ ان مُردوں کو نہیں سنا سکتے، ان بہروں کو نہیں سنا سکتے، ان اندھوں کو رستہ نہیں دکھا سکتے، آپ کا کام تو یہی ہے کہ آپ انہی کو سنا سکتے ہیں جو ایمان لانا چاہیں، جیسا کہ اگلے الفاظ ہیں: اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا۔ جیسے سورۂ بقرہ والی آیت قرینہ ہے کہ کافروں کو صم کہا گیا اور کافروں کو اندھے کہا گیا۔ اس طرح سے اس آیت کے اگلے الفاظ بھی قرینہ ہیں اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى، اور پھر: اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا کہ تُو نہیں سنا سکتا مگر مومنوں کو جو ایمان لاتے ہیں، ایمان لانا چاہتے ہیں، تو تُو انہی کو سنا سکتا ہے۔ اب اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى کا مقابلہ کیجئے اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ کے ساتھ، معلوم ہو گیا کہ جب مَنْ يُّؤْمِنُ سے مومنین مراد ہیں، تو موتیٰ سے کُفّار مراد ہیں، تو عبارت کا اصل موضوع لہٗ یہ ہے، کہ حضور ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ یہ مُردے اگر آپ کی بات نہیں سنتے، اور یہ بہرے اگر آپ کی بات نہیں سنتے، آپ ان کو سنانے کی کوشش کرتے ہیں، تو اس

پر آپ زیادہ غم نہ کیجئے، یہ مُردوں کی طرح ہو گئے، بہروں کی طرح ہو گئے، اندھوں کی طرح ہو گئے، یہ لوگ ماننے والے نہیں، اور لوٹنے والے نہیں ہیں، یہ ہے اس کا اصل مفہوم!

''منکرینِ سماع'' کا مذکورہ آیات سے طرزِ استدلال کیا ہے؟

اب جو لوگ اس آیت سے عدمِ سماعِ موتی پر اِستدلال کرتے ہیں، ان کے اِستدلال کا مدار اس بات پر ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے کافروں کو تشبیہ دی ہے موتی کے ساتھ، اتنی سطحی سی بات نہیں کہ بس چونکہ آ گیا، لا تسمع: تُو نہیں سُنا سکتا، موتی جمع ہے میت کی، ترجمہ ہو گیا کہ تُو مُردوں کو نہیں سُنا سکتا، تو پتا چل گیا کہ مُردے نہیں سنتے۔ اتنی سی بات نہیں ہے، اگر اتنی بات ہوتی تو صرف پڑھنے والا (مبتدی طالبِ علم) بھی جانتا ہے کہ ان لفظوں کا معنی یہ ہے، اور مَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ: صرف پڑھنے والا بھی جانتا ہے کہ ''مسمع'' کا معنی سُنانے والا۔ مَآ کا معنی نہیں۔ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ کا معنی جو قبروں میں ہیں، تو اس میں کون سی خفاء کی بات ہے کہ جس میں بڑے بڑے علماء آپس میں اُلجھے ہوئے ہیں کہ یہ مطلب یہاں سے نکلتا ہے کہ نہیں نکلتا، اگر بات اتنی ہی ہوتی تو اس میں کون سی جھگڑنے کی بات تھی؟

یہاں سے اِستدلال اس طرح سے ہے کہ یہاں کُفار کو مُردوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور جس وقت ایک چیز کو دُوسری چیز کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے تو مشبہ بہ کے اندر وہ معنی حقیقتاً ہوا کرتا ہے، جو مشبہ کے اندر بطور تشبیہ کے ثابت کیا جاتا ہے۔ آپ کہتے ہیں: ''زَیْدٌ کَالْاَسَدِ'' زید شیر کی طرح ہے، بہادری بیان کرنا چاہتے ہیں، تو بہادری شیر میں اصل ہے، تشبیہ کے طور پر آپ زید میں ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح سے معلوم ہو گیا کہ عدمِ اِسماع، موتی میں اصل ہے، اور کُفار کے لئے تشبیہاً ثابت کیا جا رہا ہے۔ یہ صفت کہ تُو ان کو سُنا نہیں سکتا، یا وہ سُن نہیں سکتے، یہ ان میں اصل ہے، حقیقتاً ہے، اور تشبیہ کے طور پر یہ بات کافروں میں ثابت کی جا رہی ہے کہ وہی موتی والی صفت کافروں میں ہے، تُو ان کو بھی نہیں سُنا سکتا۔ یہ مسئلہ تشبیہ سے اِستدلال ہے، اس عبارت کے موضوع لہٗ اور مسوق لہٗ سے استدلال نہیں ہے۔ بلکہ یوں ہے کہ تشبیہ دینا تب صادق آ سکتا ہے جس وقت مشبہ بہ کے اندر اس صفت کو حقیقتاً مانا جائے، جس طرح سے بہرا حقیقتاً نہیں سنتا، اس طرح سے میّت بھی حقیقتاً نہیں سنتی، اور جس طرح سے اندھا حقیقتاً نہیں دیکھتا اسی طرح سے کافروں کے لئے یہ معنیٰ ثابت ہو گیا کہ کافروں کو نظر نہیں آتا، کافر سنتے نہیں، کافروں کو تُو سُنا نہیں سکتا۔ بہرے کے لئے عدمِ سماع حقیقتاً ہے، اندھے کے لئے عدمِ بصر حقیقتاً ہے، تو اسی طرح سے موتی کے لئے بھی عدمِ سماع حقیقتاً ہوگا، یہ ہے اِستدلال، جس سے وہ لوگ کہتے ہیں کہ معلوم ہو گیا کہ موتی کے لیے عدمِ سماع حقیقتاً ہے۔ یہ مسئلہ تشبیہ سے لیا گیا ہے۔ اور بعینہٖ یہی تفصیل مَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ میں ہے کہ من فی القبور میں عدمِ سماع حقیقتاً ہے، اور کُفار کو ان کے ساتھ تشبیہ دے کے کہا جا رہا ہے کہ جیسے وہ نہیں سنتے، یہ بھی نہیں سنتے، تو سارے کے سارے استدلال کا مدار اس بات پر ہے۔ آپ حضرات کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اِستدلال کس طرح سے ہوا؟

مذکورہ دونوں آیات سے ''سماع'' کی نفی ثابت نہیں ہوتی

لیکن مجوّزین جو کہ سماع کے قائل ہیں، اور اکثریت قائل ہے، ائمۂ اربعہ کے مقلدین کی بھی، اور غیر مقلدین میں سے بھی اکثر قائل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اسی آیت میں اگر غور کیا جائے تو یہ آیت عدمِ سماع کی نہیں، یہ تو اُلٹا سماع کی دلیل ہے۔ وہ کس طرح سے؟ جس وقت تشبیہ کے طور پر کوئی چیز ذکر کی جایا کرتی ہے، تو وجہ تشبیہ وہ ہوتی ہے جو مشبہ اور مشبہ بہ دونوں میں موجود ہو...... یہ ایک علمی سی بات ہے، چونکہ اختلافی مسئلے میں باریکی تو ہوتی ہے، تبھی جا کے تو اختلاف پیدا ہوتا ہے، اگر باریکی نہ ہو تو اختلاف کیوں پیدا ہو؟ یہ ہرا جڈ آدمی اور جو بھی دو چار لفظ پڑھ لے ان کے بس کے مسئلے نہیں ہیں، ورنہ اتنے بڑے بڑے حضرات کا آپس میں اختلاف کیوں ہوتا؟ یہ تو اب جہالت کا دور آ گیا کہ اُردو کا ایک پمفلٹ لے کے، ایک صفحے کا مطالعہ کر کے محقق بن کے بیٹھ جاتے ہیں...... یہاں جو تشبیہ دی گئی ہے، تو ایک ہوا مشبہ اور ایک ہوا مشبہ بہ، تو یہ تشبیہ دُرست تب ہوا کرتی ہے جب وجہ تشبیہ دونوں میں موجود ہو، تبھی جا کے مسئلہ حل ہوا کرتا ہے، ہم کہتے ہیں ''زَيْدٌ كَالْاَسَد'' زید شیر کی طرح ہے۔ وجہ تشبیہ کیا ہے؟ بہادری۔ اب بہادری شیر میں بھی ہے اور بہادری زید میں بھی ہے، تبھی جا کے تشبیہ ٹھیک بیٹھتی ہے نا!...... اب یہاں کافروں کو تشبیہ دی جا رہی ہے موتیٰ کے ساتھ، صم کے ساتھ، اور عمی کے ساتھ۔ صم اور عمی کو تو چھوڑو، وہ تو جھگڑے کی بات نہیں ہے، موتیٰ کا لفظ لو، کافروں کو تشبیہ دی جا رہی ہے موتیٰ کے ساتھ کہ یہ مُردے ہیں، یعنی مُردوں کی طرح ہیں، یہاں وجہ تشبیہ کیا ہے؟ اگر وجہ تشبیہ آپ یہ قرار دیں کہ یہ واقعتاً سنتے نہیں، واقعتاً نہ سننا اگر وجہ تشبیہ ہو تو آپ انصاف سے بتائیے کہ مُردوں میں یہ بات موجود ہو تو ہو، لیکن کیا کافروں میں یہ بات موجود ہے؟ کہ حضور ﷺ وعظ کہتے ہوں اور کافروں کے کان میں سرے سے آواز ہی نہ جاتی ہو۔ اگر وجہ تشبیہ یہ ہو کہ کانوں تک آواز ہی نہیں جاتی، عدمِ سماع میں اگر تشبیہ دی جا رہی ہے، تو ہم بالفرض مان لیں کہ مُردوں تک آواز نہیں پہنچتی، لیکن جو مشبہ ہیں جن کا حکم بیان کرنا مقصود ہے، کیا ان میں یہ بات موجود ہے؟ کہ ان کے کان تک آواز نہیں پہنچتی، یا وہ سنتے تھے؟ (سنتے تھے) کافر سنتے تھے یا نہیں؟ (سنتے تھے) آپ کو یقین ہے کہ سنتے تھے؟ (جی!)۔ جب کافر سنتے تھے اور مُردے نہیں سنتے تو دونوں میں تشبیہ کیسے ہوگئی؟ کہا یہ جا رہا ہے کہ یہ کافر مُردوں کی طرح ہیں، تُو ان کو سنا نہیں سکتا۔ اب مُردوں کی طرح کس بات میں ہیں؟ اگر اس بات میں مُردوں کی طرح ہیں کہ مُردے نہیں سنتے، ان کے کان تک آواز نہیں جاتی، اور کافر بھی مُردوں کی طرح ہیں، ان کے کان تک بھی آواز نہیں جاتی، تو آپ خود ہی ذرا غور کر لیں کہ یہ وجہ تشبیہ صحیح ہو سکتی ہے؟ اور یہ وجہ تشبیہ مشبہ اور مشبہ بہ دونوں میں موجود ہے؟ اگر کوئی کہے کہ مُردے حقیقتاً نہیں سنتے، تو پھر اسے کہنا پڑے گا کہ کافروں کے کانوں میں بھی آواز نہیں جاتی تھی، تب تو وجہ تشبیہ دونوں میں موجود ہوگی۔ اور اگر واقعہ یہ ہے کہ کافر سنتے تھے تو پھر یہ وجہ تشبیہ دونوں میں موجود کیسے ہوئی؟ اس لئے اس (عدمِ سماع) کو وجہ تشبیہ قرار دینا بہتر نہیں ہے۔ بلکہ وجہ تشبیہ کیا ہے؟ اسی سے اس آیت کا جواب ہو جائے گا۔

آیات کی پہلی توجیہ: ''نفی سماعِ نافع وسماعِ قبول کی ہے''

ہمارے حضرات جو اموات کے سماع کے قائل ہیں، انہوں نے ان آیات کی تین توجیہات کی ہیں، جو عام شارحین نے،

عام مفسرین نے لکھی ہیں۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ آپ جتنی بھی علماء کی تحریرات اُٹھا کر دیکھیں جو بھی سماع کے قائل ہیں سب نے اس کا یہی جواب دیا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ وجہ تشبیہ ہے عدمِ انتفاع اور عدمِ سماعِ قبول۔اس بات سے قطع نظر کر لیجئے کہ مُردے سنتے ہیں یا نہیں۔لیکن یہ واقعہ ہے کہ مُردوں کے سامنے کوئی جا کر وعظ کہے تو فائدہ نہیں اُٹھا سکتے، کہ اپنے نظریات تبدیل کر لیں، اپنے عمل میں تبدیلی کر لیں، اپنے آپ کو دُرست کر لیں، توبہ کر لیں، اِستغفار کر لیں، کیا مُردے ایسا کر سکتے ہیں؟ (نہیں!)۔وعظ سے فائدہ نہ اُٹھانا یہ مُردوں میں پایا گیا، اور یہی وجہ تشبیہ کافروں میں ہے کہ آپ کے وعظ سے یہ فائدہ نہیں اُٹھا سکتے، اس لئے انتفاع اور سماعِ نافع یہ منفی ہے اور یہی وجہ تشبیہ ہے، کہ آپ ان کے سامنے وعظ کہتے ہیں، یہ تو مُردے ہیں، اگر کوئی شخص مُردوں کو جا کے سمجھانا چاہے تو مُردے اس سمجھانے سے کیا فائدہ اُٹھائیں گے، اسی طرح سے کافر بھی تمہارے سمجھانے سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتے، یہ نفی اِنتفاع اور سماعِ قبول کی ہے، کہ یہ سُن کے قبول نہیں کر سکتے، یہ فائدہ نہیں اُٹھا سکتے، ان کو مُردوں کی طرح سمجھو۔اس لئے مفسرین یہاں سے ''موتی القلوب'' مراد لے کر اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ان کے دِل مُردہ ہو چکے ہیں، جس طرح حقیقتاً مُردہ فائدہ نہیں اُٹھا سکتا، اپنے نظریات نہیں بدل سکتا، اپنے عمل کی دُرستی نہیں کر سکتا، اور اپنی اصلاح نہیں کر سکتا، آپ ان کے سامنے ہزار وعظ کہتے رہیں، آپ ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے، یہ آپ کے وعظ سے کوئی کسی قسم کا فائدہ نہیں اُٹھائیں گے، اور ایسے طور پر نہیں سنیں گے کہ سُن کر قبول کر لیں، اور اپنے نظریات میں تبدیلی کر لیں۔سماعِ نافع، سماعِ قبول، اور انتفاع کی نفی، یہ وجہ تشبیہ اگر قرار دی جائے تو واقعتاً دونوں فریقوں کے اندر موجود ہے...... یہ بات تو ہوگئی کہ نفع دونوں نہیں اُٹھاتے، نہ مُردے، نہ کافر۔اب حقیقتاً ان کے کان تک آواز پہنچتی ہے یا نہیں پہنچتی؟ اس مسئلے سے یہ آیت ساکت ہے، یہ مسئلہ اس آیت میں بیان کرنا مقصود نہیں ہے، اتنی بات متیقن ہے کہ جس طرح مُردے وعظ سُن کے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے، اسی طرح سے یہ کافر فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔جس طرح سے آپ اُن کو نہیں سمجھا سکتے، ان کافروں کو بھی نہیں سمجھا سکتے، اتنا مسئلہ متیقن ہوا، یہ بات مشبہ اور مشبہ بہ دونوں میں موجود ہے، لہٰذا کافروں کے کان تک تو واقعتاً آواز پہنچتی ہے، مُردوں کے کان تک بھی واقعتاً آواز پہنچتی ہے یا نہیں پہنچتی؟ اس بارے میں یہ آیت ساکت ہے، اس بارے میں یہ آیت کوئی فیصلہ نہیں دیتی، یہ مسئلہ مسکوت عنہ ہوا۔

حضرت شیخنا الانور رحمۃ اللہ علیہ نے[1] انہی آیات کے اُوپر تبصرہ کرتے ہوئے ان کا جواب دو طرح سے دیا ہے، جواب میں دو طریقے اختیار کیے ہیں، کہتے ہیں: یا تو یوں کہہ لو کہ جب ہم کہتے ہیں کہ یہ سنتے نہیں، تو اس کا مطلب ہے کہ یہ مانتے نہیں، اور تُو سُنا نہیں سکتا، اس کا مطلب ہے کہ تُو منوا نہیں سکتا، یہ مطلب بالکل محاورے کے مطابق ہے، کلامِ عرب میں بھی یہی محاورہ ہے، اور ہماری اُردو میں بھی یہی محاورہ ہے۔ چوبیسویں پارے میں آئے گا: فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ (سورۂ حم سجدہ: ۴) یہ کافر منہ موڑ جاتے ہیں، سنتے ہی نہیں، سماع کی نفی آ گئی۔ میں جس طرح آپ سے کہوں کہ ''میں نے بار بار تمہیں سمجھایا، لیکن تم سنتے ہی نہیں!'' اس کا کیا مطلب ہے کہ میں تمہیں ''بہرے'' کہہ رہا ہوں؟ کہ تمہارے کانوں میں آواز نہیں پہنچتی، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مانتے نہیں، قبول نہیں کرتے، اس کے مطابق عمل نہیں کرتے۔ ''میں نے اسے ہزار دفعہ کہا ہے، وہ میری ایک نہیں سنتا'' تو

---

(۱) فیض الباری ج ۳ ص ۴۲ باب قول المیت وھو علی الجنازۃ

اس سننے سے مُراد ہوتا ہے کہ وہ میری بات کو قبول نہیں کرتا...... جب اس سے مُراد یہ لے لیا جائے کہ تُو کافروں کو منوا نہیں سکتا، کافر تیری بات سُن کے مانیں گے نہیں، تو یہ بات یقینی ہے، مُردے بھی نہیں مانتے، مُردوں کو نہیں سمجھایا جا سکتا، اسی طرح کافروں کو بھی سمجھایا نہیں جا سکتا۔ تو اس سے سماعِ قبول مُراد لے لیا جائے، سماعِ نافع مُراد لے لیا جائے، تو نفی سماعِ نافع کی ہے، جو دونوں جہتوں کے درمیان مشترک ہے۔ کافروں میں بھی نفی ہے اور مُردوں میں بھی نفی ہے۔

اسی سے آپ کو وہ بات بھی سمجھ میں آ گئی جو ہم نے اِبتدا میں کہی تھی، کہ ''سماع فی الجملہ'' کا مطلب یہ ہے کہ کسی کی سنیں، کسی کی نہ سنیں، کوئی بات سنیں، کوئی نہ سنیں...... بالکل اس طرح سے دیکھئے اس بات کو کہ دنیا میں آپ لوگ زندہ ہیں، ہمارے سامنے بیٹھے ہیں، کبھی آپ درس گاہ میں بیٹھے ہوتے ہیں، اور اُستاذ تقریر کر رہا ہوتا ہے، لیکن آپ کا دھیان گھر کی طرف چلا گیا، سوچنے کسی اور چیز کو لگ گئے۔ اب بیٹھے درس گاہ میں ہیں، سامنے بیٹھے ہیں، اُستاذ ایک ہی آواز کے ساتھ تقریر کرتا چلا جا رہا ہے، لیکن وہ چند جملے، جس وقت آپ کا دھیان گھر کی طرف چلا گیا، وہ آپ نے سنے ہی نہیں۔ کچھ پتا نہیں ہوتا کہ اُستاذ کیا کہہ گیا؟ کیا نہیں کہہ گیا؟ منٹوں کی تقریر نکل گئی، بلکہ اگر آپ کسی اور طرف دھیان کر کے بیٹھ جائیں گے، تو سامنے بیٹھے زندہ، چند فٹ کے فاصلے پر گھنٹے کی تقریر بھی آپ نہیں سُن سکتے جب توجہ آپ کی دوسری طرف ہو جائے۔ تو زِندوں میں یہ ضابطہ ہے کہ جو قریب بیٹھا ہو وہ ضرور سنتا ہے؟

اور اسی طرح سے ایک آدمی آتا ہے، کسی بڑے آدمی کے پاس، وہ اس کو یوں کر کے دیکھتا ہے اور اس کو پہچانتا نہیں، یا اس کی قدر و قیمت نہیں، تو اپنے کام میں لگا رہتا ہے، اور وہ بیٹھا ہے، کہتا ہے کہ حضرت جی! میری بات تو سُن لو، وہ توجہ ہی نہیں کرتے، دوسری طرف لگے رہتے ہیں۔ اور ایک آدمی آتا ہے اور اس کی طرف دھیان جاتا ہے تو انسان سارا کام چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو کے بیٹھ جاتا ہے اور اس کی بات کو توجہ سے سنتا ہے۔ جب آپ کسی کو سفارشی بنانا چاہیں، تو آپ کہا کرتے ہیں کہ ''بھئی! میرے متعلق تو ان کو کہہ دینا، میں تو گیا تھا، میری تو وہ سنتا ہی نہیں، تیری سنتا ہے، میری تو سنتا ہی نہیں، تُو جب اس کو قصہ سنائے گا تو توجہ سے سُن لیں گے، اور اگر میں سُنانا چاہتا ہوں تو میری تو وہ سنتے ہی نہیں!'' تو یہ فرق بھی شخصیات کے اعتبار سے پڑ گیا۔

اسی طرح سے اموات کے بارے میں جو سماع کا قول کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ضابطہ کوئی نہیں کہ کب سنتے ہیں، کب نہیں سنتے؟ کون سی بات سنتے ہیں کون سی نہیں سنتے؟ کس کی سنتے ہیں، کس کی نہیں سنتے؟ ویسے یہ ہے کہ فی الجملہ ثابت ہے، اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے ان کی توجہ ادھر کر دیتا ہے، جو بات ان کو سُنانا چاہتا ہے وہ سُن لیتے ہیں، نہیں تو جن کی توجہ جدھر رُوحانیت کے طور پر ہوئی ہے وہ ادھر ہی ہے۔ اب یہ جو اولیاء اللہ کی قبروں پہ جاتے ہیں تو ان کا آپس میں ربط ہوتا ہے، یہ ایصالِ ثواب وغیرہ کر کے جب ان کو متوجہ کرتے ہیں، تو لاکھوں واقعات آپ کو اپنے اکابر کی کتابوں میں ملیں گے کہ ان کو متوجہ کر کے ان سے اِستفاضہ بھی ہوتا ہے، اور ان سے فائدہ بھی اُٹھا لیتے ہیں، اور ہم جیسے جائیں جن کا ان سے تعلق کوئی نہیں تو وہ ہماری طرف متوجہ کیوں ہوں؟ وہ اللہ کی طرف متوجہ پڑے رہتے ہیں۔ کس وقت سنتے ہیں کس وقت نہیں سنتے، یہ احوال کا فرق ہو سکتا ہے......

حضرت شیخ (کشمیری) کہتے ہیں کہ یا تو ان آیات کی یہ توجیہ کر لی جائے گی، کہ سماع سے سماعِ قبول، سماعِ نافع مُراد لے لیا جائے، تو

پھر یہ بات صحیح ہے کہ مُردے نہیں سنتے، یعنی وہ سُن کے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے، جیسے کافرنہیں سنتے کہ سُن کے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے، ان آیات میں مطلقاً آواز پہنچنے کی نفی نہیں ہے۔

آیات کی دُوسری توجیہ: ''نفی ظاہری اِحساس کے اعتبار سے ہے''

یا وہ کہتے ہیں کہ اس میں یہ توجیہ بھی ہوسکتی ہے[1] کہ قرآنِ کریم ہمارے سامنے جس وقت کسی بات کو نقل کرتا ہے، تو اس میں ہمارے ظاہری اِحساس کی رعایت رکھتا ہے، قرآنِ کریم میں آیا ہے: وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا (سورۂ یٰس: ۳۸)، سورج چلتا ہے۔ قرآنِ کریم نے یہ تعبیر اِختیار کی، کیوں؟ اس لئے کہ یہ سورج ہمیں چلتا ہوا نظر آتا ہے، ایسے لگتا ہے کہ جس طرح سے ہم تو ٹھہرے ہوئے ہیں، اور سورج چل رہا ہے، اب واقعہ کچھ بھی ہو، جس طرح سے آج کی جدید سائنس کہتی ہے کہ سورج ٹھہرا ہوا ہے، زمین گھوم رہی ہے، تو بھی یہ بات قرآنِ کریم کے محاورے کے خلاف نہیں ہے، کیونکہ قرآنِ کریم انسان سے بات کرتا ہے اس کے احساس کے مطابق، انسان کا احساس یہ ہے کہ سورج چل رہا ہے۔ اس لئے اگر آج کی ہیئت والے اعتراض کریں کہ جی! سورج کہاں چلتا ہے؟ سورج تو اپنی جگہ ٹھہرا ہوا ہے، آج ہیئت سے ثابت ہوگیا کہ زمین گھومتی ہے، تو بھی یہ قرآنِ کریم پہ اعتراض نہیں، کیونکہ قرآنِ کریم نے لوگوں کو سمجھانا ہے تو سمجھانے کے اندر ان کے احساس کو مدنظر رکھا ہے، ہم یہی دیکھتے ہیں، جاہل سے جاہل آدمی کہتا ہے کہ سورج چڑھ گیا، اتنا اُونچا ہوگیا، دوپہر میں آگیا، ڈھل گیا، چھپ گیا، یہ نسبت ہم سورج کی طرف کرتے ہیں۔ اس میں واقعہ کیا ہے؟ اس میں انسان کو اُلجھانا مقصود نہیں ہے..... بالکل اسی طرح سے ذُوالقرنین کا قصہ آپ کے سامنے گزرا، قرآنِ کریم کہتا ہے: وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَةٍ (سورۂ کہف: ۸۶) ذُوالقرنین نے اس سورج کو ایک کیچڑ والے چشمے میں ڈُوبتا ہوا پایا۔ تو کیا یہ واقعہ ہے؟ کسی سمندر میں، کسی دریا میں، کسی چشمے میں سورج جا کے ڈُوبتا ہے؟ ایسا نہیں، بلکہ وَجَدَهَا اس نے محسوس کیا، قرآنِ کریم نے وہی تعبیر اِختیار کرلی۔ جیسے سمندر کے کنارے پہ آپ کھڑے ہوں، جب سورج نیچے جاتا ہے، تو یوں لگتا ہے کہ جیسے سمندر میں اُتر رہا ہے۔ تو آپ کہہ سکتے ہیں ''سورج سمندر میں ڈُوب رہا ہے!'' حالانکہ واقعہ اس طرح سے نہیں ہے..... تعبیر قرآنِ کریم وہی کرتا ہے کہ جس کو عام آدمی اپنے احساس کے طور پر سمجھے، اسی طرح سے ظاہری عالم کے اعتبار سے ہمارا احساس یہی ہے کہ یہ مُردے بے جان پڑے ہوئے ہیں، یہ سنتے نہیں ہیں، اس لئے اس ظاہر حال کے اعتبار سے قرآنِ کریم نے کافروں کو مُردوں کے ساتھ تشبیہ دے کر یہ بات ذِکر کردی، اب دُوسرے عالم کے اعتبار سے واقعہ کیا ہے؟ اس جگہ اس کی پردہ کشائی کرنی مقصود نہیں ہے۔ مبنی الایمان علی العرف کا بھی یہی معنی تھا کہ ہم اپنے احساس کے طور پر سمجھتے ہیں کہ یہ ایسے پڑے ہوئے ہیں، سنتے کچھ نہیں ہیں۔

جس طرح سے (اب دُوسری بات بطورِ وضاحت کے عرض کروں) حدیث شریف میں آتا ہے، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے

(۱) دیکھئے: ''فیض الباری'' ج۲ ص۱۲۳ باب کراھة الصلاة فی المقابر. والشریعة قد تعتبر الحس ایضا واقعا ونوعا من نفس الامر اھ

فرمایا کہ اپنے گھروں میں بھی کچھ نماز پڑھا کرو، ''لَا تَتَّخِذُوْهَا قُبُوْرًا'' یہ ''بخاری شریف''[1] کی روایت ہے، بلکہ متفق علیہ ہے۔ ''مشکوۃ باب مواضع الصلاۃ'' میں بھی گزری، کہ اپنے گھروں کو قبریں نہ بناؤ۔ اس کے اور مطلب بھی ہیں، ایک مطلب اس کا یہی ہے کہ اگر تمہارے گھر نماز سے خالی ہوئے، ذکر، اذکار سے خالی ہوئے، تو یہ تو قبرستان کی طرح ہو جائیں گے۔ اس پر حضرت شیخ (کشمیریؒ) لکھتے ہیں کہ یہ بھی حدیث شریف میں ایک ظاہری تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ کیونکہ آپ وہاں جا کر دیکھیں گے، تو وہاں نہ کوئی نماز پڑھتا ہوا نظر آئے گا، نہ آپ کو وہاں کوئی تلاوت کرتا ہوا نظر آئے گا، اور نہ کوئی اور کچھ کرتا ہوا نظر آئے گا، ایسے ہی ہے جیسے ویران پڑے ہوئے ہیں۔ تو اگر تم اپنے گھروں کے اندر اللہ کا ذکر نہیں کرو گے، اور اللہ اللہ نہیں کرو گے، تلاوت نہیں کرو گے، نماز نہیں پڑھو گے، تو تمہارے گھر بھی ایسے ہو گئے جیسے قبرستان، اس ویرانے کے اعتبار سے گھروں کو قبرستان کے مشابہ قرار دے دیا گیا۔ حالانکہ حضرت شیخ کہتے ہیں کہ واقعہ کیا ہے؟ حقیقت کے اعتبار سے قبریں ویران نہیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ: ''لانّ المحقّق عندی انّ لا تعطّل فی القبور'' قبور میں تعطل نہیں ہے۔ ''بَلْ فِيْهَا قِرَاءَةُ الْقُرْاٰنِ وَالصَّلٰوةُ وَالْاَذَانُ وَغَيْرُهَا مِنَ الْعِبَادَاتِ'' بلکہ قبروں کے اندر تو مُردے قرآن بھی پڑھتے ہیں، نماز بھی پڑھتے ہیں، اذانیں بھی دیتے ہیں، اور عبادتیں بھی کرتے ہیں۔ ''وَالْاَفْعَالُ الْاُخَرُ اَيْضًا ثَابِتَةٌ عِنْدَ اَهْلِ الْكَشْفِ وَهُمْ اَدْرٰى بِهٖ فَلَنْ نُّنْكِرَهٗ'' بلکہ اور بھی بہت سارے کام کرتے ہیں جو اہلِ کشف کو معلوم ہیں ہم تو اس کا انکار نہیں کرتے۔[2] ارے! قرآن پڑھنے کی مثال تو آپ کے سامنے حدیث شریف میں بھی گزری، ''فضائلِ قرآن'' میں جہاں سورۂ مُلک کی فضیلت منقول ہے، وہاں ''مشکوۃ شریف'' میں روایت آتی ہے کہ ایک صحابی نے کہیں خیمہ لگایا، اس کو پتا نہیں تھا کہ یہاں قبر ہے، وہ خیمہ لگا کر بیٹھ گیا، جب بیٹھ گیا تو کیا سنتا ہے کہ زمین سے سورۂ تبارک الذی پڑھنے کی آواز آ رہی ہے، جیسے کوئی نیچے دبا ہوا پڑھ رہا ہے، اور اس صحابی نے سنی۔ اس نے یہ واقعہ دیکھا، حضور ﷺ کے پاس جا کر ذکر کیا، آپ نے فرمایا: ''هِيَ الْمُنْجِيَةُ'' یہ سورت تو نجات دِلانے والی ہے، عذابِ قبر سے نجات دِلاتی ہے،[3] اب وہاں منوں مٹی کے نیچے پڑا ہوا پڑھ رہا تھا، اور بطورِ کشف کے اس کے کان میں آواز آ گئی...... جیسے آج کہتے ہیں اتنے منوں مٹی میں پڑا ہوا کیسے سنتا ہے؟ ہم تمہیں دبا کے دیکھتے ہیں، تم بیٹھ کے سنو بھلا! آواز آتی ہے؟ میں نے کہا تھا کہ اُس عالم کے حالات کو یہاں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، اب وہ قرآن کا پڑھنا صحابی نے سُنا، حضور ﷺ کے سامنے ذِکر کیا، آپ نے تائید فرمائی۔

یہ تو حدیث شریف کی بات ہے۔ ملا علی قاری ؒ نے ایک بزرگ کی کرامت لکھی ہے اسی سلسلے میں کہ اللہ تعالیٰ نے اس قرآن کو جو سینوں میں محفوظ کیا ہے، تو سوتا جاگتا ہر طرح سے انسان اس کو پڑھتا ہے، اور یہ محفوظ رہتا ہے۔ تو ''مرقاۃ'' کے اندر ایک جگہ لکھتے ہیں کہ مُرید اپنے پیر کے ساتھ صبح صبح دور کیا کرتا تھا، دس دس آیتیں، جس طرح دور ہوتا ہے کہ پیر دس آیتیں پڑھتا، پھر

---

(۱) بخاری ج۱ ص۶۲ باب کراهیة الصلاۃ فی المقابر۔ مسلم ۱/۲۶۵، باب استحباب صلاۃ النافلہ فی بیتہ۔ مشکوۃ ص۶۹، باب المساجد ومواضع الصلاۃ، فصل اول کا آخر

(۲) فیض الباری ج۲ ص۶۲ باب کراهة الصلوۃ فی المقابر کے تحت۔

(۳) ترمذی ۲/۱۱۷ باب ما جاء فی سورۃ الملک۔ مشکوۃ ۱/۱۸۸، کتاب فضائل القرآن، فصل ثانی کا تقریباً آخر۔

مُرید دس آیتیں پڑھتا، اس طرح سے پڑھا کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ شیخ کی وفات ہوگئی، جب وفات ہوگئی تو اس کو قبر میں دفن کردیا گیا، تو مُرید گیا اپنے شیخ کی قبر کی زیارت کے لئے، وہاں بیٹھ کر اس نے تلاوت شروع کی، اس نے دس آیتیں پوری کیں اور ادھر سے شیخ نے پڑھنی شروع کردیں، کہتے ہیں اس نے وہ سنیں، اور سننے کے بعد پھر اس نے دس پڑھیں، پھر اس نے پڑھنی شروع کردیں، کہتے ہیں کہ کئی روز تک یہ سلسلہ جاری رہا پھر اس نے کسی کے سامنے اظہار کردیا پھر وہ سلسلہ بند ہوگیا۔ [1]

تو مطلب کہنے کا یہ ہے کہ جیسے وہاں قبور کے ساتھ گھروں کو ویرانے میں تشبیہ دے دی گئی ظاہری حالات کے اعتبار سے، ورنہ حقیقت میں تعطل نہیں، قبروں میں مُردے یہ سب کچھ کرتے ہیں، لیکن شریعت بسا اوقات ظاہری حالات کو دیکھتے ہوئے بات کو ذکر کردیا کرتی ہے..... تو ہم چونکہ اپنے ظاہری عالم کے اعتبار سے دیکھتے ہیں کہ مُردہ ایسے بے حس سا پڑا ہوا ہے، نہ اس میں کوئی سننے کی طاقت ہے، نہ کچھ اور کرنے کی طاقت ہے، تو قرآنِ کریم نے اس ظاہر کا اعتبار کرتے ہوئے کُفّار کو مُردوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ واقعہ کیا ہے؟ وہ سنتے ہیں یا نہیں سنتے؟ اس بات کو اس آیت کے اندر ذکر کرنا مقصود نہیں، اس کی پردہ کشائی مقصود نہیں ہے، جس طرح سے سورج کی طرف چلنے کی نسبت ہوگئی، اس سے بحث نہیں کہ واقعہ کیا ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ چل رہا ہے، اسی طرح سے اگر آپ مُردوں سے باتیں کریں گے تو آپ بظاہر یہی دیکھیں گے کہ کچھ بھی نہیں، نہ وہ سنتے ہیں نہ بولتے ہیں۔ اس ظاہر کی رعایت رکھتے ہوئے قرآنِ کریم نے یہ تشبیہ دے دی۔

آیات کی تیسری توجیہ: ’’نفی اِسماع کی ہے نہ کہ سماع کی‘‘

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ تیسری توجیہ جو ہمارے حضرات کرتے ہیں جو اموات کے سماع کے قائل ہیں، یہ توجیہ بھی عام شارحین اور عام مفسرین نے لکھی ہے کہ قرآنِ کریم میں نفی جو کی گئی ہے: اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى میں، یا: مَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ میں، اِسماع کی نفی ہے سمع کی نفی نہیں ہے، یعنی ظاہرِ آیت یہ کہتا ہے کہ تُو سُنا نہیں سکتا، تُو سُنانے والا نہیں ہے، اس میں اسماع کی نفی ہے کہ سُنانا تمہارے اختیار میں نہیں، سماع کی نفی نہیں ہے کہ وہ نہیں سنتے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم زندہ لوگ آپس میں ملاقاتیں کرتے ہیں، میں آپ کو ایک بات سُنانا چاہوں تو اس کے اسباب ظاہری طور پر اللہ تعالیٰ نے ہمارے اختیار میں رکھے ہیں کہ ہم ایک خاص فاصلے سے دوسرے کو متوجہ کرکے بات کریں تو اس کے کان تک پہنچتی ہے، وہ سنتا ہے۔ ظاہری اسباب کے طور پر ہم اس بارے میں مختار معلوم ہوتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کو اپنی بات سُنا لیتے ہیں، دوسرے کو متوجہ کرلینا، قریب جاکے بات کرلینا، خاص فاصلے سے کرلینا، یہ اسباب ہمارے اختیار میں ہیں۔ تو یہاں ہم کہیں گے کہ زندہ زندوں کو اپنی بات سُنا سکتا ہے، یعنی یہ سُنانا اس کے اختیار میں ہے، ظاہری اسباب اختیار میں ہیں۔ اور مُردوں کو سُنانا چونکہ ظاہری اسباب کے تحت تو ہے نہیں، ہمارے بس میں تو کچھ نہیں ہے، اور ظاہری طور پر ان میں تعطل نظر آتا ہے، تو یہاں یہ کہنا مقصود ہے کہ یہ سُنانا تمہارے اختیار میں نہیں، کہ تم جب چاہو مُردوں کو اپنی طرف متوجہ کرکے سُنالو، یہ اسباب تمہارے اختیار میں نہیں، یہ محض اللہ کی مشیت کے تابع ہے، وہ اگر چاہے

---

(۱) مرقاۃ المفاتیح ج ۸ باب التحذیر من الفتن کی پہلی حدیث کے تحت۔

تو سُنادے، نہ چاہے تو نہ سُنائے۔ ہمارے اختیار کی طرف دیکھتے ہوئے نفی کی گئی ہے کہ زندہ زندہ کو اپنی کلام سُنا سکتا ہے، بظاہر یہ اسباب ہمارے اختیار میں ہیں، مُردے کو سُنانا ہمارے اختیار میں نہیں، جس کی بنا پر نفی کردی گئی کہ آپ ان کو نہیں سُنا سکتے۔

اس کی مثال آپ یوں سمجھئے! کہ ایک کام ہوتا ہے ظاہری اسباب کے مطابق۔ جیسے ایک شخص دوسرے کو تلوار سے قتل کردیتا ہے اور وہ مر جاتا ہے، چونکہ تلوار کے ساتھ گردن کاٹ دینا مرنے کا ایک ظاہری سبب ہے، تو آپ جب بھی ذکر کریں گے تو یوں کریں گے کہ زید نے بکر کو قتل کردیا، زید نے بکر کو ماردیا، یہ موت کی نسبت آپ زید کی طرف کردیں گے، لیکن اگر قصہ یوں ہوا کہ اتفاقاً کنکری اُٹھا کر یوں ماری تھی اور اس قسم کی کنکری سے آدمی کبھی بھی مرتا نہیں ہے، لیکن اس کنکری کا لگنا تھا کہ وہ مر گیا، تو آپ جس وقت ذکر کریں گے تو یوں ہی کہیں گے کہ بھائی! اللہ کی طرف سے معاملہ پیش آ گیا، ورنہ کوئی ظاہری صورت تو تھی نہیں، اب یہاں نسبت آپ اللہ تعالیٰ کی طرف کریں گے، ظاہری سبب کی طرف نہیں کریں گے، کیونکہ یہ بات ظاہری اسباب کے خلاف ہے، قرآنِ کریم میں یہ محاورہ استعمال ہوا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (سورۂ انفال:۱۷) اب بدر کے میدان میں سرورِ کائنات ﷺ نے کُفار کی طرف ایک مٹھی کنکریوں کی بھر کر یوں پھینکی تھی، اور وہ مٹی کی مٹھی کافروں کی آنکھوں میں پڑ گئی، کافر اندھے ہوگئے، نظر آنا بند ہوگیا، آنکھیں ملنے لگ گئے، جس کی بنا پر مسلمانوں کو ان کے مارنے اور قتل کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ اب یہ ظاہری اسباب کے اعتبار سے کوئی بات نہیں ہے، کہ مٹھی بھر کر پھینکی جائے اور فوج کی فوج اندھی ہوجائے، اور ساری فوج کی آنکھوں میں مٹی پڑ جائے، یہ بات ظاہری اسباب کے مطابق نہیں ہے، یہ واقعہ محض اللہ کی قدرت کے ساتھ پیش آیا، اس لیے قرآن کہتا ہے: وَمَا رَمَيْتَ، دیکھو! اس میں رمی کی نفی آ گئی۔ تُو نے نہیں پھینکی۔ إِذْ رَمَيْتَ جب تُو نے پھینکی تھی۔ اب یہاں إِذْ رَمَيْتَ کے اندر تو اثبات ہے کہ تُو نے پھینکی تھی، اور مَا رَمَيْتَ کے اندر نفی کردی گئی کہ تُو نے نہیں پھینکی، وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى وہ تو اللہ تعالیٰ نے پھینکی تھی۔ اب اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ظاہری طور پر پھینکنے والے حضور ﷺ تھے، لیکن آثار کی طرف دیکھتے ہوئے کہ جو اس کے اُوپر مرتب ہوئے ہیں، یہ سرورِ کائنات ﷺ یا کسی انسان کے ہاتھ میں یہ قوت نہیں ہے کہ ایک مٹھی بھر مٹی ساری فوج کی آنکھوں میں پہنچادی جائے۔ یہ جو واقعہ پیش آیا اللہ کی قدرت سے پیش آیا۔ اس لئے إِذْ رَمَيْتَ میں رمی کا اثبات بھی ہے حضور ﷺ کے لئے۔ اور مَا رَمَيْتَ میں نفی بھی کردی گئی، اور اس کو اللہ کی طرف منسوب کردیا گیا۔ اسی طرح سے فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ (سورۂ انفال:۱۷) میدانِ بدر میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بے سروسامان ہونے کے باوجود بڑے بڑے ستر مشرک قتل کردیے۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ تم نے قتل نہیں کیے، وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ان کو تو اللہ نے قتل کیا ہے۔ کیا مطلب؟ کہ یہ فعل جو پیش آیا ہے تو ظاہری سبب کے طور پر کوئی ایسی بات نہیں، یوں سمجھو کہ براہِ راست اللہ کی قدرت کے ساتھ یہ بات پیش آئی ہے۔

اسی طرح اِسماع کی نفی کرنی مقصود ہے کہ مُردوں کو سُنانا ظاہری اسباب کے مطابق نہیں، جس کی بنا پر ہم یہ کہیں گے کہ تم نہیں سُنا سکتے، یہ اللہ کی مشیت کے تابع ہے، اللہ اپنی قدرت کے ساتھ سُنادے، یہ ہوسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے یا نہیں ہوسکتا؟ اس آیت کے اندر یہ بحث کرنی مقصود نہیں ہے، یہاں تو یہ کہہ دیا کہ اس کے اسباب تمہارے اختیار میں نہیں، جس طرح زندہ، زندہ کو سُنالیتا ہے، مُردوں کو سُنانا یہ اسباب کے تحت نہیں ہے۔

یہی توجیہ ہے جو حضرت شیخنا الانور رحمہ اللہ نے بھی اختیار کی ہے، اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے بھی اس آیت کی تقریر کرتے ہوئے یہی توجیہ کی ہے، میں عبارت پڑھتا ہوں، سورۂ رُوم کے حاشیے میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اسی قسم کی آیت سورۂ نمل کے آخر میں گزر چکی، اس پر ایک نظر ڈال لی جائے، (جو پہلے آپ کو پڑھ کے سنائی) مفسرین نے اس موقع پر سماعِ موتیٰ کی بحث چھیڑ دی ہے، اس مسئلے میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے عہد سے اختلاف چلا آتا ہے، اور دونوں جانب سے نصوصِ قرآن و حدیث پیش کی گئی ہیں، یہاں ایک بات سمجھ لو کہ یوں تو دُنیا میں کوئی کام اللہ کی مشیت اور ارادہ کے بدوں نہیں ہوسکتا، مگر جو کام اَسبابِ عادیہ کے دائرے میں رہ کر باختیارِ خود کرے، وہ اس کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ اور جو عام عادت کے خلاف غیر معمولی طریقے سے ہوجائے اسے براہِ راست حق تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ مثلاً کسی نے گولی مار کر کسی کو ہلاک کردیا تو یہ اس قاتل کا فعل کہلائے گا۔ اور فرض کیجئے کہ ایک مٹھی کنکریاں پھینکیں جس سے لشکر تباہ ہوگیا، تو اسے کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے تباہ کردیا، باوجودیکہ گولی سے ہلاک کرنا بھی اسی کی قدرت کا کام ہے، ورنہ اس کی مشیت کے بدون گولی یا گولہ کچھ بھی اثر نہیں کرسکتا۔ قرآنِ کریم میں دوسری جگہ فرمایا: فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (سورۂ انفال:۱۷) یہاں خارقِ عادت ہونے کی وجہ سے پیغمبر اور مسلمانوں سے قتل اور رَمی کی نفی کرکے براہِ راست اللہ کی طرف نسبت کی گئی۔ ٹھیک اسی طرح اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى کا مطلب سمجھو، یعنی تم یہ نہیں کرسکتے کہ کچھ بولو اور اپنی آواز مُردے کو سُنادو، کیونکہ یہ چیز ظاہری اور عادی اسباب کے خلاف ہے، البتہ حق تعالیٰ کی قدرت سے ظاہری اسباب کے خلاف تمہاری کوئی بات مُردہ سُن لے، اس کا انکار کوئی مؤمن نہیں کرسکتا''...... جو توجیہ آپ کی خدمت میں عرض کی ہے یہ تیسری توجیہ ہے، کہ اس میں نفی جو کی گئی ہے، یہ کی گئی ہے ظاہری سبب کے طور پر سنانے کی، کہ تم سنا نہیں سکتے...... اب آخر میں کہتے ہیں کہ ''اب نصوص سے جن باتوں کا اس غیر معمولی طریقے سے سننا ثابت ہوجائے گا، اسی حد تک ہم کو سماعِ موتیٰ کا قائل ہونا چاہیے، محض قیاس کرکے دوسری باتوں کو سماع کے تحت میں نہیں لاسکتے۔ بہرحال آیت میں اِسماع کی نفی سے مطلقاً سماع کی نفی نہیں ہوتی، واللہ اعلم''...... یہ تیسری توجیہ ہے جو ان آیات کی ذِکر کی جاتی ہے...... اور یہ ''فیض الباری'' سے جو میں نے آپ کے سامنے بحث نقل کی تھی اس کا حوالہ ذِکر کردوں، کبھی دیکھنا پڑے تو آسانی ہو، یہ جلد ثانی ہے، اور باب ہے ''قول المیت وھو علی الجنازۃ قدمونی''، اور اس کا صفحہ ہے: ۴۶۷، اور ۴۶۸۔ اور قبور کے حالات جو نقل کیے تھے کہ قبروں میں مُردے قراءت کرتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں، یہ بھی اسی جلد ثانی میں صفحہ ۴۶ کے اُوپر یہ بات مذکور ہے۔

''سماعِ موتیٰ'' کے ثبوت پر دلائل: تین قسم کی احادیث

یہ تو توجیہات تھیں جو ہم نے ان آیات کے متعلق کیں۔ تین طریقے اختیار کئے گئے ان آیات کا مطلب بیان کرنے کے لئے، ان لوگوں کی طرف سے جو کہ ''سماعِ موتیٰ فی الجملہ'' کے قائل ہیں...... اب آگے یہ بات کہ یہ حضرات جو سماعِ موتیٰ کے قائل ہیں یہ اپنا استدلال کس بات سے کرتے ہیں؟ اپنے مسلک کے لیے دلیل کس چیز سے دیتے ہیں؟ تو ان کے مستدلات زیادہ تر

روایات ہیں، احادیث کا ظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ سماع ہے۔ تین قسم کی حدیثیں ہیں جو کہ اس موقع پر یہ حضرات نقل کرتے ہیں۔

قسمِ اوّل: ''اَحادیثِ سلام'' اور علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ

ایک وہ روایات جن میں ذکر کیا گیا ہے کہ مرنے والوں کو سلام کہا جائے تو وہ سلام سنتے ہیں اور جواب دیتے ہیں، اس سے بھی سماع ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ (کشمیری رحمۃ اللہ علیہ) نے اسی بحث میں اپنی بحث کا مدار بھی اسی روایت کے اُوپر ٹھہرایا، کہتے ہیں کہ: ''وَالْاَحَادِیْثُ فِیْ سَمَاعِ الْاَمْوَاتِ قَدْ بَلَغَتْ مَبْلَغَ التَّوَاتُرِ'' سماعِ موتیٰ کے بارے میں حدیثیں تواتر کے مرتبے تک پہنچی ہوئی ہیں۔ اور آگے ایک حدیث کو نمونے کے طور پر ذِکر کرتے ہیں جس کی ابوعمرو (ابن عبدالبر) نے تصحیح کی ہے، ''اَنَّ اَحَدًا اِذَا سَلَّمَ عَلَی الْمَیِّتِ فَاِنَّهٗ یَرُدُّ عَلَیْهِ وَیَعْرِفُهٗ اِنْ کَانَ یَعْرِفُهٗ فِی الدُّنْیَا'' بالمعنی۔ جس وقت کوئی شخص میّت کو جا کر سلام کرتا ہے تو میّت اس کے سلام کا جواب بھی دیتی ہے، اور اس کو میّت پہچان بھی لیتی ہے اگر دُنیا میں جان پہچان ہو، یعنی اگر دُنیا میں جان پہچان ہو تو پہچان بھی لیتے ہیں اور سلام کا جواب بھی دیتے ہیں، اور اگر دُنیا کے اندر جان پہچان نہ ہو تو سلام کا جواب دیتے ہیں، پہچان میں نہیں آتے۔

علّامہ اِبنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ

یہ جو روایت نقل کی گئی سلام کہنے کی اور جواب ملنے کی، اسی پر ہی اس بحث کا مدار رکھا ہے ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے، یہ ''عمادالدین'' المعروف اِبنِ کثیر کی مشہور تفسیر ہے، وہ کہتے ہیں: ''وَالسَّلَفُ مُجْمِعُوْنَ عَلٰی هٰذَا وَقَدْ تَوَاتَرَتِ الْاٰثَارُ عَنْهُمْ'' سلف کا اس بات پر اِجماع ہے یعنی اتفاق ہے کہ اَموات سلام سنتے ہیں، اور بہت سارے آثار ان کی طرف سے متواتر آئے ہوئے ہیں۔ کس بات کے ساتھ متواتر آثار آئے ہوئے ہیں؟ ''بِاَنَّ الْمَیِّتَ یَعْرِفُ بِزِیَارَةِ الْحَیِّ لَهٗ وَیَسْتَبْشِرُ'' کہ زندہ آدمی جو میّت کی زیارت کے لئے آتا ہے، اس کو وہ پہچانتی ہے، اور وہ مرنے والا خوش ہوتا ہے۔ آگے یہی روایت نقل کی: ''قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: مَامِنْ رَجُلٍ یَزُوْرُ قَبْرَ اَخِیْهِ'' کوئی شخص نہیں جو اپنے بھائی کی قبر کی زیارت کرے، ''وَیَجْلِسُ عِنْدَهٗ'' اور اس کے پاس بیٹھ جائے، ''اِلَّا اسْتَاْنَسَ بِهٖ'' مگر مرنے والا اس سے اُنس حاصل کرتا ہے، ''وَرَدَّ عَلَیْهِ حَتّٰی یَقُوْمَ'' اور اس کے اوپر اس کے سلام کا جواب بھی دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ بیٹھنے والا زیارت کرنے والا اٹھ کے چلا جائے۔ ''وَرُوِیَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: اِذَا مَرَّ رَجُلٌ بِقَبْرٍ یَعْرِفُهٗ فَسَلَّمَ عَلَیْهِ رَدَّ عَلَیْهِ السَّلَامَ'' ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جس وقت کوئی شخص قبر کے پاس سے گزرتا ہے جس کو مرنے والا پہچانتا ہے، پھر وہ اس کو سلام کرتا ہے، تو مرنے والا اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔[1] آگے پھر ابنِ کثیر نے کثیر آثار نقل کیے ہیں، ان سب کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔ بہرحال ایک قسم تو روایات کی یہ ہے کہ جس میں سلام کہنے اور اس کے جواب ملنے کا ذِکر آیا ہوا ہے، اِجمالاً حضرت شیخ نے ذِکر کر دیا کہ روایات اس قسم کی بہت ہیں، ''بَلَغَتْ مَبْلَغَ التَّوَاتُرِ'' کے لفظ میں جو زور ہے، وہ آپ سمجھتے ہی ہیں۔

---

(۱) تفسیر ابن کثیر، سورۃ الروم، آیت ۵۲ کے تحت۔

قسمِ دوم: ''حدیثِ قرعِ نعال''

دوسری قسم کی روایات جو اس سلسلے میں مستدل کے طور پر پیش کی جاتی ہے، یہ وہ روایت ہے جو ''بابِ اِثْبَاتِ عَذَابِ الْقَبْرِ'' میں آتی ہے: ''عَنْ اَنَسٍ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا وُضِعَ فِیْ قَبْرِہٖ وَتَوَلّٰی عَنْهُ اَصْحَابُهٗ وَاِنَّهٗ لَيَسْمَعُ قَرْعَ نِعَالِهِمْ ''[1] جس وقت کسی مرنے والے کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے، اور اس کے دوست اس سے پیٹھ پھیر کے واپس آتے ہیں، تو وہ مرنے والا ان کے پاؤں کی آہٹ سنتا ہے۔ اس میں پاؤں کی آہٹ سننے کا ذِکر آ گیا...... اب یہ جو روایت ہے، اس میں ان کی طرف ''سمع'' کی نسبت ہے، کہ مرنے والا ان کے پاؤں کی آہٹ سنتا ہے، یہاں ''سنانے'' کی بات نہیں ہے، آہٹ سنتا ہے۔ اب اس روایت میں جو ''سمع'' کا ذِکر آیا تو اس کی تاویل وہ حضرات جو ''سمع'' کے قائل نہیں ہیں، وہ یہ کرتے ہیں کہ یہاں تو حضور ﷺ کا مقصد یہ ہے کہ فرشتے جلدی آ جاتے ہیں کہ اگر اس مرنے والے کی جگہ کوئی زندہ بیٹھا ہوتا، تو جانے والوں کے پاؤں کی آہٹ ابھی اس کے کان میں پہنچتی، اتنے میں فرشتے آ جاتے ہیں، یعنی جلدی کو بیان کرنے کے لئے یہ حضور ﷺ نے بیان فرمایا...... تو بہرحال جس طرح سے وہاں قرآنِ کریم کے ظاہر میں تاویل کی ضرورت ہے، تو جو مانعین ہیں وہ اس قسم کی روایتوں میں تاویل کرتے ہیں، ورنہ ظاہری الفاظ تو یہی ہیں، اور یہ روایت بھی ''بخاری'' کی ہے، بلکہ متفق علیہ ہے، یعنی ''مسلم شریف'' میں بھی یہ روایت موجود ہے، ''بخاری'' میں بھی ہے۔

ملّا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ

لیکن یہ شارحِ مشکوٰۃ حضرت ملّا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ، یہ ''مرقاۃ'' جلد اوّل ہے، صفحہ نمبر ۱۹۸ ہے، جہاں اس روایت کے اُوپر حضرت ملّا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بحث کی ہے۔ بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بعض لوگوں نے یہ توجیہ کی ہے کہ ''یَسْمَعُ صَوْتَهَا لَوْ كَانَ حَيًّا'' کہ اگر یہ زندہ ہوتا تو واپس جانے والوں کے پاؤں کی آہٹ سنتا، اتنے میں فرشتے آ جاتے ہیں یعنی یہی جلدی آنے کی طرف کنایہ ہے۔ تو یہ نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں: ''وَهُوَ ضَعِيْفٌ'' یہ توجیہ ضعیف ہے۔ ''اِذْ ثَبَتَ بِالْاَحَادِيْثِ اَنَّ الْمَيِّتَ يَعْلَمُ مَنْ يُّكَفِّنُهٗ وَمَنْ يُّصَلِّيْ عَلَيْهِ وَمَنْ يَّحْمِلُهٗ'' کیونکہ اَحادیث سے ثابت ہے کہ میّت جانتی ہے اس شخص کو جو اس کو کفن دیتا ہے، جو اس کے اُوپر نماز پڑھتا ہے، جو اس کو اُٹھاتا ہے۔ جب میّت کے لئے اس قسم کی حس ثابت ہے، تو اس روایت کو اپنے ظاہر پہ رکھنا چاہیے کہ مرنے والا ہی واپس جانے والوں کے پاؤں کی آہٹ سنتا ہے...... بہرحال توجیہ کرنے والوں نے وہ توجیہ کی جو میں نے آپ کی خدمت میں عرض کر دی۔ لیکن شارحین یہاں یہ کہتے ہیں کہ اس کو ظاہر پر ہی محمول رکھنا چاہیے، کیونکہ مرنے والے سے علم کی نفی نہیں، بلکہ علم اس کو حاصل ہے، حتیٰ کہ احادیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ وہ کفن دینے والوں کو، نماز پڑھنے والوں کو، اُٹھانے والوں کو بھی جانتا ہے...... جس طرح سے وہ باتیں بھی کرتا ہے جیسا کہ روایت آپ کی خدمت میں پہلے بھی عرض کی تھی کہ اگر اچھا ہوتا ہے تو اُٹھانے والوں کو کہتا ہے: ''قَدِّمُوْنِيْ، قَدِّمُوْنِيْ'' مجھے جلدی لے چلو، جلدی لے چلو۔ اور اگر وہ بُرا ہوتا ہے تو آنے والے حالات سے

---

(۱) مشکوٰۃ ۲۶/۱ باب اثبات عذاب القبر کی حدیث ۲۔ بخاری ۱۸۳/۱ باب ما جاء فی عذاب القبر۔ مسلم ۳۸۶/۲ باب عرض مقعد المیت۔

ڈرتا ہوا کہتا ہے کہ مجھے کہاں لیے جارہے ہو، مجھے کہاں لیے جارہے ہو، جس پر بحث کرتے ہوئے حضرت شیخ (کشمیری) نے مسئلے کی تفصیل کی کہ ''اِنَّ کَلَامَ الْمَیِّتِ وَسَمَاعَهٗ وَاحِدٌ'' کہ میت کا بولنا اور سننا ایک ہی مسئلہ ہے، جو قائل ہیں دونوں کے قائل ہیں، جو قائل نہیں ہیں دونوں کے قائل نہیں ہیں۔ تو دُوسری قسم کی روایات یہ ہیں جن کے اُوپر اِستدلال کا مدار رکھا گیا ہے۔

صاحبِ ''رُوح المعانی'' کا فیصلہ

اور اسی قسم کی روایتیں نقل کر کے صاحبِ ''رُوح المعانی'' نے بھی آخری فیصلہ یہی دیا (یہ مختصر سے حوالے صرف تعارف کے طور پر ذِکر کرنا مقصود ہیں) یہ سارے آثار کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ ''وَالْحَقُّ اَنَّ الْمَوْتٰی یَسْمَعُوْنَ فِی الْجُمْلَةِ''[1] ''رُوح المعانی'' والے نے بھی آخری فیصلہ یہی دیا ہے، تھوڑا سا آگے لکھا: ''وَھٰذا الوجهُ الذی یترجَّحُ عندی'' یعنی اس بحث کو نقل کرنے کے بعد ''سماع فی الجملہ'' کا قول کرتے ہوئے اسی کو راجح قرار دیا ہے۔

قسمِ سوم: ''حدیثِ قلیبِ بدر''

اور تیسری قسم کی روایات جو اس سلسلے میں ذِکر کرتے ہیں، وہ ہے غزوۂ بدر کی روایت۔ یہ ''بخاری شریف'' جلد ثانی ہے اور اس کے ۵۶۶ صفحے کے اُوپر یہ روایت موجود ہے، اور بھی متعدّد کتابوں میں ہے، ''مشکوٰۃ شریف'' میں بھی ہے کہ جس وقت بدر کے میدان میں مشرکین قتل ہوگئے تھے، تو بہت سارے مشرک حضور ﷺ نے ایک گڑھے کے اندر پھینکوا دیے تھے، تقریباً چوبیس لاشیں بڑے بڑے سرداروں کی ایک گڑھے میں ڈلوائی تھیں، اور پھر تین دِن تک آپ نے وہاں میدان میں قیام فرمایا، آپ کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ جب کہیں غلبہ پاتے، فتح پاتے تو تین دِن وہاں قیام فرماتے تھے، قیام فرمانے کے بعد چلتے، تو جب کوچ کا وقت آیا تو آپ نے حکم دیا، آپ کی سواری تیار کی گئی اور آپ چلے اور اس گڑھے کے کنارے کھڑے ہوگئے، جہاں مشرکین کی لاشیں ڈلوائی تھیں۔ وہاں گڑھے پر کھڑے ہو کے: ''فَجَعَلَ یُنَادِیْهِمْ بِاَسْمَائِهِمْ وَاَسْمَاءِ آبَائِهِمْ'' ان کو آوازیں دینے لگ گئے ان کے ناموں کے ساتھ اور ان کے آباء کے ناموں کے ساتھ۔ ''یَا فُلَانُ بْنَ فُلَانٍ! وَیَا فُلَانُ بْنَ فُلَانٍ! اَیَسُرُّکُمْ اَنَّکُمْ اَطَعْتُمُ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ'' او فلاں! فلاں کے بیٹے! کیا تمہیں یہ بات اب اچھی لگتی ہے کہ تم اللہ اور اللہ کے رسول کا کہنا مان لیتے؟ ''فَاِنَّا قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا، فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَا وَعَدَ رَبُّکُمْ حَقًّا؟'' ہمارے ساتھ جو ہمارے رَبّ نے وعدہ کیا تھا ہم نے اس کو سچا پایا، تمہارے ساتھ جو تمہارے رَبّ نے وعدہ کیا تھا تم نے اس کو سچا پایا یا نہیں؟ اس طرح سے حضور ﷺ باتیں کرنے لگ گئے ان مشرکین کے ساتھ جو اس گڑھے میں پھینکے ہوئے تھے۔ جب یہ باتیں ہو رہی تھیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی پاس کھڑے تھے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عادت تھی کہ جو اِشکال آجاتا، وہ روک نہیں سکتے تھے، فوراً کہہ دیتے۔ تو حضور ﷺ کو خطاب کر کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ''یارسول اللہ! مَا تُکَلِّمُ مِنْ اَجْسَادٍ لَا اَرْوَاحَ لَهَا'' یارسول اللہ! یہ کیا باتیں کر رہے ہو ایسے جسموں سے جن میں جان ہی نہیں ہے، جن میں رُوح ہی نہیں ہے۔ تو اِنکار کرنے والے اس سے زیادہ بات تو نہیں کہتے، وہ یہی تو کہتے ہیں کہ بے جان دھڑوں کو کیا خطاب

---

(۱) تفسیر روح المعانی، سورۃ الروم، آیت ۵۲ کے تحت۔

کرر ہے ہو؟ یہ تو بے جان ہیں، یہ کیا سُنیں گے؟ یہ بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کہہ دی کہ ظاہری طور پر یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ جب ان میں رُوحیں ہی نہیں ہیں، ان میں جان ہی نہیں ہے، تو ان سے بات کرنے کا اور سُنانے کا کیا مطلب؟...... جس طرح سے وہ واقعہ حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پیر کا جو نقل کیا تھا، وہاں بچوں نے کہا تھا کہ ”بابا! حضرت مُردہ اند ہیچ جواب ندہند!“ تو اِنکار کرنے والے یہی بات کہہ سکتے ہیں نا، اس سے زیادہ تو نہیں کہہ سکتے، کہ یہ تو مرے ہوئے ہیں، کیا جواب دیں گے؟ تو وہاں حضرت (خواجہ عثمان رحمۃ اللہ علیہ) نے تفصیل فرمائی تھی، واقعہ آپ کے سامنے آچکا۔ اور یہاں بھی زیادہ سے زیادہ اگر کہہ سکتے ہیں تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ ”مَا تُكَلِّمُ مِنْ أَجْسَادٍ لَا أَرْوَاحَ لَهَا“ آپ کیا باتیں کرر ہے ہیں ایسے جسموں سے جن میں رُوحیں ہی نہیں ہیں؟...... ”فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ!“ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قسم کھا کے فرمار ہے ہیں، قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے! ”مَا أَنْتُمْ بِأَسْمَعَ لِمَا أَقُولُ مِنْهُمْ“ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں تم ان کے مقابلے میں زیادہ نہیں سُن رہے،[1] مطلب یہ ہے کہ وہ بھی سُن رہے ہیں، تم بھی سُن رہے ہو، تم کوئی زیادہ نہیں سُن رہے، جیسے سماع تمہارے لئے ثابت ہے، ویسے ان کے لئے ثابت ہے، روایت کے الفاظ اتنے ہی ہیں۔ اب آگے توجیہ کرنے والے اس کی کیا توجیہ کرتے ہیں جو کہ قائل نہیں، کیونکہ جو قائل ہیں ان کو تو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں، کہ ظاہری طور پر الفاظ بالکل یہی بات ثابت کرتے ہیں، اور اس بات کو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھا کے بیان فرمایا کہ تم ان سے زیادہ نہیں سنتے، جیسے تم سُن رہے ہو وہ بھی سُن رہے ہیں۔ جو مانعین ہیں وہ اس کی کیا توجیہ کرتے ہیں؟ (دونوں قسم کی بات آپ کی خدمت میں عرض کررہا ہوں، کیونکہ دونوں باتوں کی گنجائش ہے) وہ کہتے ہیں کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے...... تو یاد رکھئے! یہ بھی ایک توجیہ ہے توجیہات میں سے، ورنہ روایت میں نہیں لکھا ہوا کہ یہ معجزہ ہے۔

سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث پر بحث

اور یہی روایت ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے پیش ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ نہیں! یہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کو غلطی لگ گئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہ فرمایا تھا کہ اب یہ جانتے ہیں کہ جو کچھ میں نے انہیں کہا تھا وہ صحیح تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کی نسبت ان کی طرف کی ہے، سمع کی نسبت نہیں کی، ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کو غلطی لگ گئی، قرآن میں آتا ہے: إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس روایت کو سننے کے بعد یہ توجیہ کی جو ”بخاری“ کے اگلے صفحے (ص:۵۶۷) کے اُوپر لکھی ہوئی ہے، وہ کہتی ہیں کہ یسمعون کی بجائے آپ نے یہ فرمایا تھا: ”إِنَّهُمُ الْآنَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّ مَا كُنْتُ أَقُولُ لَهُمْ حَقٌّ“ جو کچھ میں کہتا تھا وہ صحیح ہے، اب ان کو پتا لگ گیا ہے۔ تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اس روایت کو سُن کے اس کو ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کی غلطی قرار دیا، اور اپنی طرف سے توجیہ یہ کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم علم کا اثبات فرمانا چاہتے ہیں کہ ان کو پتا لگ گیا، وہ جان گئے، سمع کا اثبات نہیں کرنا چاہتے، کیونکہ قرآنِ کریم میں آگیا: إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ۔

---

(۱) مشکوٰۃ ۲/ ۳۴۵، باب حکم الاسراء، فصل اول۔ نیز ۲/ ۵۴۳، باب المعجزات کا آخر۔ بخاری ۲/ ۵۶۶، باب قتل ابی جهل۔ ۲/ ۵۷۴، باب تسمیة من سمی من اهل بدر سے پہلے۔ مسلم ۲/ ۳۸۷، باب عرض مقعد المیت کا آخر۔

حدیثِ عائشہ کا پہلا جواب: "حدیثِ ابنِ عمر راجح ہے"

اب یہاں شارحینِ حدیث نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے مسلک پر اور اس روایت پر مکمل بحث کی ہے۔ "فتح الباری" جلد نمبر ۷ صفحہ ۲۳۵، اور ۲۳۶ پر یہ مسئلہ مذکور ہے، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے "فتح الباری" میں اس پر پوری کلام کی ہے، اور اس کلام کا حاصل یہ ہے کہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے مقابلے میں ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کی بات راجح ہے۔ کیوں؟ کہ جس وقت یہ بات ہوئی تھی، اس وقت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا موجود نہیں تھیں۔ تو وہ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یعلمون فرمایا تھا، اور ان کے سماع کا ذکر نہیں کیا، اگرچہ جس وقت یہ واقعہ پیش آیا تھا وہاں ابنِ عمر رضی اللہ عنہ بھی موجود نہیں ہیں، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ موجود ہیں، وہ بھی یہی بات نقل کرتے ہیں (مسلم)۔ اور یہ روایت جو میں نے آپ کے سامنے پڑھی ہے ("بخاری" ۲/۵۶۶) یہ روایت نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہے، نہ ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کی ہے، بلکہ یہ روایت ہے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کی، اس میں سرے سے ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کا ذکر ہی نہیں، "ذَکَرَ لَنَا اَنَسُ ابْنُ مَالِكٍ عَنْ اَبِیْ طَلْحَةَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ اَمَرَ یَوْمَ بَدْرٍ بِاَرْبَعَةٍ وَّ عِشْرِیْنَ" (حوالہ مذکورہ)۔ تو محدثین نے اسی لئے ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کی روایت کو ترجیح دی کہ ان کے ساتھ دوسرے بھی موجود ہیں جو واقعے میں شریک تھے، اس لئے وہی صحیح الفاظ جانتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا بیان فرمائے تھے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کو قرآنِ کریم کی آیت کے متعارض سمجھتے ہوئے اپنی طرف سے توجیہ کی ہے، ورنہ بات وہی ہے جو ابنِ عمر رضی اللہ عنہ نے نقل کی، یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں...... اور یہیں پھر صاحب "فتح الباری" نے لکھا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رُجوع بھی ثابت ہے کہ انہوں نے سماع کا قول بھی کرلیا تھا۔ اور وہی بات حضرت مولانا سرفراز صاحب صفدر نے اپنی کتاب "سماعِ موتی" کے اندر بھی نقل کی ہے، اور "فتح الباری" کے اسی مقام میں وہ بات مذکور ہے۔ اور "عمدۃ القاری" میں حافظ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس بحث کو ذکر کیا ہے، اور انہوں نے بھی ترجیح اسی بات کو دی ہے کہ ابنِ عمر رضی اللہ عنہ نے جو کچھ نقل کیا وہ صحیح ہے، چونکہ دُوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کی روایات بھی اس کے مطابق ہیں، اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اپنے فہم کے طور پر جو بات کی تھی، وہ مرجوح ہے، وہ ان کے مقابلے میں ترجیح کے قابل نہیں ہے[1]...... بہرحال اس روایت کے اُوپر محدثین نے بحث کی ہے، مانعین اس کو معجزے پر محمول کرتے ہیں، یا قرآنِ کریم کے ساتھ متعارض قرار دے کر اس کی توجیہ کرتے ہیں جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کی ہے، لیکن سابقین علماء نے دونوں باتوں کو نقل کرتے ہوئے ترجیح ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کی بات کو دی ہے، کیونکہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی راوی ہیں، اور وہ دونوں خود صاحبِ واقعہ ہیں، جس وقت یہ واقعہ پیش آیا تھا اس وقت یہ دونوں موجود تھے، اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا موجود نہیں تھیں، لہٰذا ان کی توجیہ اس معاملے میں مرجوح ہے۔

دُوسرا جواب: "سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا رُجوع"

بلکہ یہاں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا رُجوع نقل کیا گیا ہے، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے رُجوع کے لئے بطور تائید کے

---

(۱) عمدۃ القاری ۸/۲۰۲، باب ماجاء فی عذاب القبر کے تحت۔ وَلٰكِنَّ الْجُمْهُوْرَ خَالَفُوْهَا فِیْ ذٰلِكَ وَقَبِلُوْا حَدِیْثَ ابْنِ عُمَرَ لِمُوَافَقَةِ مَنْ رَوَاهُ غَیْرَهٗ عَلَیْهِ الخ

ایک بات نقل کی جاسکتی ہے۔ ''مشکوٰۃ شریف'' میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا اپنے بھائی کی قبر پر جانا اور ان کو خطاب کر کے باتیں کرنا مذکور ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھائی تھے حضرت عبدالرحمٰن، حقیقی بھائی تھے، اور ان کا مکہ کے قریب انتقال ہوگیا تھا، اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا وہاں موجود نہیں تھیں۔ ''حُبْشِی'' ایک جگہ ہے، وہاں ان کا انتقال ہوا، وہاں سے لوگوں نے انہیں اُٹھایا، اور لے جا کر مکہ معظمہ میں دفن کر دیا، اور ان کے دفن ہونے کے بعد حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا مکہ معظمہ گئیں تو اپنے بھائی کی قبر پر بھی گئیں، یہ روایت ''مشکوٰۃ شریف'' کے ۱۴۹ صفحہ پر مذکور ہے، حدیث یہ ہے:

وَعَنِ ابْنِ اَبِیْ مُلَیْکَةَ قَالَ: لَمَّا تُوُفِّیَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ اَبِیْ بَکْرٍ بِالْحُبْشِیْ وَهُوَ مَوْضِعٌ فَحُمِلَ اِلٰی مَکَّةَ فَدُفِنَ بِهَا فَلَمَّا قَدِمَتْ عَائِشَةُ اَتَتْ قَبْرَ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ بَکْرٍ فَقَالَتْ: وَکُنَّا کَنَدْمَانَیْ جَذِیْمَةَ حِقْبَةً. مِنَ الدَّهْرِ حَتّٰی قِیْلَ لَنْ یَّتَصَدَّعَا. فَلَمَّا تَفَرَّقْنَا کَاَنِّیْ وَمَالِکًا. لِطُوْلِ اجْتِمَاعٍ لَمْ نَبِتْ لَیْلَةً مَعًا. (یہ دو شعر پڑھنے کے بعد) ثُمَّ قَالَتْ: وَاللّٰهِ! لَوْ حَضَرْتُكَ مَا دُفِنْتَ اِلَّا حَیْثُ مِتَّ وَلَوْ شَهِدْتُكَ مَا زُرْتُكَ۔ اگر میں موجود ہوتی تو تُو وہیں دفن کیا جاتا جہاں تیری وفات ہوئی ہے، اگر میں اس وقت تیرے پاس موجود ہوتی تو آج مجھے قبر پہ آنے کی ضرورت نہ پیش آتی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اپنے بھائی کی قبر پر جا کر ان کو خطاب کر کے یہ بات نقل کرتی ہیں۔ ''رواہ الترمذی'' یہ ترمذی شریف کی روایت ہے۔[1]

اور اسی طرح سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ایک اور بات بھی حدیث شریف میں آتی ہے، اس کی طرف دیکھتے ہوئے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے مسلک سے استدلال کرنے والوں کی خدمت میں ایک بات مؤدّباً عرض کی جاسکتی ہے۔ ''مشکوٰۃ شریف'' کا ۱۵۴ صفحہ ہے، ''باب زیارۃ القبور'' کی آخری روایت ہے: عَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا قَالَتْ: کُنْتُ اَدْخُلُ بَیْتِیَ الَّذِیْ فِیْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَاِنِّیْ وَاضِعٌ ثَوْبِیْ وَاَقُوْلُ اِنَّمَا هُوَ زَوْجِیْ وَاَبِیْ. فَلَمَّا دُفِنَ عُمَرُ مَعَهُمْ فَوَاللّٰهِ! مَا دَخَلْتُهُ اِلَّا وَاَنَا مَشْدُوْدَةٌ عَلَیَّ ثِیَابِیْ حَیَاءً مِنْ عُمَرَ. رواہ احمدُ۔ مطلب اس روایت کا یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا حُجرہ تھا جہاں سرورِ کائنات ﷺ کو دفن کیا گیا، اور آپ کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بھی وہیں دفن کیا گیا، اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی رہائش بھی وہیں تھی آخر وقت تک۔[2] وہ کہتی ہیں کہ میں اپنے اس حُجرے میں چلی جایا کرتی تھی، باقاعدہ پردے کا اہتمام نہیں کرتی تھی (گھر میں رہتے ہوئے جیسے عورت کا سر بھی ننگا ہوسکتا ہے، منہ بھی ننگا ہوسکتا ہے) تو میں حُجرے میں چلی جایا کرتی تھی اور میں یہ خیال کرتی تھی کہ کوئی بات نہیں، میرا خاوند ہے، اور میرا اَبّا ہے، جہاں دونوں کی قبریں موجود تھیں، اور جب وہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دفن کر دیا گیا تو میں وہاں داخل نہیں ہوتی ''اِلَّا وَاَنَا مَشْدُوْدَةٌ عَلَیَّ ثِیَابِیْ'' میں اُوپر اپنے کپڑے باندھ کے، لپیٹ کے تب حُجرے میں جاتی ہوں، عمر سے حیا کر کے۔ اب اس میں اگر اس بات کو تسلیم کیا جائے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے نزدیک اہلِ قبور کو علم ہے، تو بھی لفظوں میں

---

(۱) ترمذی ۲۰۳/۱ باب ما جاء فی الزیارۃ للقبور للنساء۔ مشکوٰۃ ۱۴۹/۱ باب دفن المیت، فصل ثالث۔

(۲) ''امداد الاحکام'' ج ۴ ص ۵۲۵ پر مولانا ظفر احمد عثمانی نے لکھا ہے: ''حضرت عمر کے دفن تک اور اس کے بعد بھی اسی حجرے میں رہتی تھیں اور ان کے گھر کے دو حصے کر دیے گئے تھے۔ ایک حصے میں قبریں تھیں، اور ایک حصے میں خود رہتی تھیں، اور دونوں حصوں کے درمیان ایک دیوار تھی۔''

گنجائش ہے، لیکن اگر کوئی شخص اس کو تسلیم نہ ہی کرے تو اتنا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان قبروں کے ساتھ جو کہ آپ کو ڈھیریوں کی شکل میں نظر آ رہی ہیں، ان کے ساتھ انسان کو وہی برتاؤ کرنا چاہیے جو کہ اَصحابِ قبور کے ساتھ ان کی زندگی میں تھا۔ اس لئے ادب کے ساتھ ان کے سامنے جانا، جس طرح سے فقہاء لکھتے ہیں،[1] اس طرح سے جا کر کھڑے ہونا جس طرح سے دُنیا میں اگر یہی آپ کا اُستاد، یہی آپ کا شیخ لیٹا ہوا ہوتا تو آپ کہاں کھڑے ہو کے ان کے ساتھ بات کرتے؟ تو اس طرح سے بات کرنا، وہاں جا کر مؤدب ہو جانا، اپنے بدن کے اُوپر اسی طرح سے تواضع اور انکسار کے آثار طاری کر لینا، یہ تو حضرت عائشہ صدیقہ ﷞ کے مسلک سے صراحتاً ثابت ہو گیا کہ قبروں کے ساتھ معاملہ وہی ہونا چاہیے جو کہ انسان زندگی میں اَصحابِ قبور کے ساتھ کرتا تھا، تو حضرت عائشہ صدیقہ ﷞ حضرت عمر ﷜ کی قبر کا لحاظ کرتی تھیں، جس کی بنا پر وہاں جاتی تھیں تو اپنے کو باپردہ کر کے جاتی تھیں، اور جس وقت تک حضرت عمر ﷜ دفن نہیں ہوئے تھے اس وقت تک کہتی تھیں کہ میرا اَبا ہے، میرا شوہر ہے، اس لئے اس وقت پردے کا خاص اہتمام نہیں کرتی تھیں۔ تو معلوم ہو گیا کہ ان قبور کے اندر جو لوگ دفن ہیں ان کا لحاظ مرنے کے بعد اس طرح سے ہوتا ہے، اور قبروں سے مُراد بھی یہی قبور ہیں جس طرح سے حضرت عائشہ صدیقہ ﷞ انہی قبور کے ساتھ یہ معاملہ کرتی تھیں۔ تو یہ حدیث ''مشکوٰۃ شریف'' ص ۱۵۴، باب زیارۃ القبور، روایت کو نقل کرنے کے بعد حوالہ دیا ہوا ہے: ''رواہ احمد''، مسندِ اَحمد کی یہ روایت ہے۔ بہرحال یہ خلاصہ ہے بحث کا، جو آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا۔

خلاصۂ بحث

تمام حوالوں سے حاصل یہ ہوا کہ یہ مسئلہ صحابہ کرام ﷡ سے مختلف فیہ ہے، لیکن کون سا مسئلہ؟ اس میں ذرا امتیاز کیجئے! میں نے سماع دو طرح سے نقل کر دیا ہے، ایک ہے وہ سماع جو مشرکین کا عقیدہ تھا جو کہ موجبہ کلیہ کے درجے میں ہے کہ ہر وقت سنتے ہیں، ہر جگہ سے سنتے ہیں، ہر کسی کی سنتے ہیں، ہر بات سنتے ہیں، یہ لوازمِ اُلوہیت میں سے ہے، یہ مشرکوں کا عقیدہ تھا، اور اس قسم کا عقیدہ جس کے متعلق بھی رکھا جائے شرک ہے، اور جس کے متعلق آپ یہ عقیدہ رکھیں گے اس کو آپ نے شریک ٹھہرا دیا، مشرکین کے عقائد پر بحث کرتے ہوئے قرآنِ کریم کی جتنی آیات ہیں وہ سب اس عقیدے کی تردید کے لئے ہیں، اور یہ عقیدہ مسلمانوں کے درمیان مختلف فیہ نہیں ہے، اس لئے کثیر آیات جو یہ لوگ پڑھتے ہیں کہ ان میں سماع کی نفی ہوتی ہے، تو ان آیات میں یہی مشرکین کے عقیدے کی تردید ہے، جس کو ''سماعِ لازمِ دائم'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، کیونکہ یہ لوازمِ اُلوہیت میں سے ہے، جس کے متعلق ایسا عقیدہ رکھ لیا جائے گویا کہ آپ نے اس کو اِلٰہ بنا لیا، اس لئے وہ ساری کی ساری آیات اسی کھاتے میں گئیں...... اور دُوسرا ''سماع فی الجملہ'' کہ قریب سے نہ کہ دُور سے، کسی کی سنے، کسی کی نہ سنے، کوئی بات سنے، کوئی نہ سنے، اس کی بھی تشریح میں نے آپ کے سامنے کی تھی کہ اصل میں قبور والوں کے ساتھ ربط پیدا کرنا، یہ بھی ہر کسی کا کام نہیں ہے۔ اَصحابِ قبور جس وقت آنے

---

(۱) ''مرقاۃ'' میں اس حدیث کے تحت طیبی کے حوالے سے لکھا ہے: ''فیہ أنّ احترام المیّت کاحترامہ حیّا''۔

والوں کو پہچانتے بھی ہیں، جس طرح سے ان آثار سے معلوم ہوتا ہے، تو آخر آنے والوں میں فرق ہوتا ہے، ایک آنے والا اہلِ محبت میں سے ہے، اہلِ تعلق میں سے ہے، اس کی طرف توجہ اور طرح سے ہوگی، اور ایک آنے والا اہلِ محبت میں سے نہیں ہے تو اس کی طرف توجہ اس طرح سے نہیں ہوگی۔

''اِستفاضہ من القبور'' اور ''المهند علی المفند'' کا تعارف

اسی طرح سے ایک صاحبِ رُوحانیت قبر پہ جاتا ہے، وہ جا کے اس صاحبِ قبر سے ربط پیدا کرلیتا ہے (یہ ایک بات اضافے کے طور پر ذِکر کردوں) اِستفاضہ من القبور، قبور والوں سے فیض حاصل کرنا، یا کسی قسم کا فائدہ اُٹھانا۔ یہ مستقل مسئلہ ہے جو ہمارے اکابر میں مسلَّم ہے۔

یہ کتاب میرے پاس پڑی ہے، ''المهند علی المفند'' یہ علمائے دیوبند کے عقیدے کے لئے ایک دستاویز ہے۔ شانِ ورود اس کا یہ ہے کہ احمد رضا خان صاحب بریلوی عرب میں تشریف لے گئے تھے، اور علمائے دیوبند کی عبارتیں توڑ مروڑ کر وہاں سے سب پہ کُفر کا فتویٰ لگوا کے آ گئے تھے، وہیں سے اس فتنے کی اِبتدا ہوئی ہے جو اکابر کی عبارتوں کے متعلق فتنے چل رہے ہیں، اس کتاب کا نام رکھا اس نے ''حسام الحرمین''، پھر جس وقت حرمین کے علماء کو پتا چلا کہ ہمیں تو مغالطہ دے دیا گیا، پھر انہوں نے تحقیقِ حال کے لئے کچھ سوالات لکھ کے بھیجے، تاکہ پتا چلے کہ علمائے دیوبند کا مسلک کیا ہے؟ تو ان کے جوابات لکھے تھے حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری ﷫ نے، اور ان جوابات کا مجموعہ ''المهند علی المفند'' کے نام سے شائع ہے، ''دِیوانے کے سر پر ہندی تلوار!'' اور ان جوابات کو لکھنے کے بعد اس وقت جتنے علمائے دیوبند موجود تھے، سب کے اس کے اُوپر دستخط ہیں۔ حتیٰ کہ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب ﷫ کے بھی جو کہ عدمِ سماع کا قول کرتے تھے، میں نے پہلے نقل کیا تھا، ان کے بھی اس دستاویز کے اُوپر دستخط ہیں۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ﷫ اور مولانا قاسم نانوتوی ﷫ یہ پہلے فوت ہوچکے تھے، اس لیے ان کے دستخط نہیں ہیں۔ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی ﷫ کے بیٹے مولانا مسعود احمد ﷫ کے دستخط ہیں، اور آپ کے خلفاء میں سے حضرت خلیل احمد صاحب سہارنپوری ﷫، حضرت رائے پوری ﷫، مولانا الیاس ﷫ یہ سارے حضرات، مفتی کفایت اللہ صاحب ﷫، حضرت شیخ الہند ﷫، مولانا اشرف علی تھانوی ﷫ جتنے موجود تھے، سب کے دستخط ہیں۔ پھر یہ دستاویز یہاں سے گئی تو حرمین شریفین کے کلیتاً علماء نے اس کے اُوپر دستخط کیے، پھر یہ شام میں گئی، مصر میں گئی، اور یہ تمام عربی ممالک کے علماء کے دستخط ہیں، جتنی یہ کتاب موٹی ہے اس سے زیادہ دستخطوں کی فہرست ہے، جو اس کے آخر میں لگی ہوئی ہے...... اس لئے یہ دستاویز ایسی ہے جس کو آپ پورے عالمِ اسلام کی دستاویز کہہ سکتے ہیں...... ان سوالوں میں سے ایک سوال جو علماء پہ کیا گیا، یہ بھی ہے کہ مشائخ کی رُوحانیت سے اہلِ سلوک کو نفع پہنچتا ہے یا نہیں؟ یہ سوال ہے، جس کے جواب کے طور پر حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری ﷫ نے لکھا: اب رہا مشائخ کی رُوحانیت سے اِستفادہ، اور ان کے سینوں اور قبروں سے باطنی فیوض پہنچنا! سو بے شک صحیح ہے، مگر اس

طریق سے جو اس کے اہل اور خواص کو معلوم ہے، نہ اس طرز سے جو عوام میں رائج ہے،[1] جو اہل ہیں، جن کو طریقہ معلوم ہے وہ ان سے اِستفادہ کر سکتے ہیں، اور ان کی رُوحوں سے ان کو فیض بھی ہوتا ہے، قبروں سے بھی وہ فیض حاصل کر سکتے ہیں۔

یہی مسئلہ ''فیض الباری'' جلد ثالث میں صفحہ ۴۳۴ پر حضرت (کشمیری رحمۃ اللہ علیہ) نے بھی ذِکر فرمایا۔ مولانا بدرعالم صاحب کہتے ہیں کہ ''قَدْ سَأَلْتُ عَنْهُ'' (یہ عبارت مولانا بدرعالم کی ہے جو ''فیض الباری'' کے جامع ہیں) کہ میں نے اپنے اُستاد (حضرت شیخنا الانور رحمۃ اللہ علیہ) سے پوچھا ''قَدْ سَأَلْتُ عَنْهُ مرةً عَنِ الْإِسْتِفَاضَةِ مِنْ اَهْلِ الْقُبُوْرِ'' میں نے ایک دفعہ اپنے اُستاذ سے یہ پوچھا کہ قبروں سے فیض بھی ہوتا ہے؟ فیض حاصل کیا جا سکتا ہے؟ ''هَلْ يَجُوْزُ ذَالِكَ ام لا، فَقَالَ لِيْ: اَمَّا الْمُحَدِّثُوْنَ فَلَا آرَاهُمْ يُجَوِّزُوْنَهٗ'' محدثین تو میرا خیال ہے اس کو جائز قرار نہیں دیتے۔ ''وَلٰكِنْ اُجِيْزُ اَنَا لِكَوْنِهٖ ثَابِتًا عِنْدَ اَرْبَابِ الْحَقَائِقِ'' لیکن میں جائز قرار دیتا ہوں، کیونکہ اَربابِ حقائق کے نزدیک یہ چیز ثابت ہے، ''غَيْرَ اَنَّهٗ يَنْبَغِيْ لِمَنْ كَانَ اَهْلًا لَهٗ'' البتہ جو اس کا اہل ہے وہی اس سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ ''وَاَمَّا مَنْ كَانَ مُنْغَمِسًا فِي الظُّلُمَاتِ فَلَا خَيْرَ لَهٗ فِيْهِ'' اور ہم جیسے جو ظلمات میں ڈُوبے ہوئے ہیں، ان کے لئے اس میں کوئی خیر نہیں ہے، وہ اس سے کیا فائدہ اُٹھائیں گے۔[2] تو جب یہ استفاضۃ من القبور تک کا قول ہمارے اکابر تک نے کیا ہوا ہے۔ بلکہ عالمِ اسلام کی دستاویز کے اندر بھی یہ مسئلہ مذکور ہے...... اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی اہل آدمی جب قبر پر جاکے بیٹھ کر مراقبہ کرتا ہے، اپنے طریقے کے مطابق صاحبِ قبر کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے تو صاحبِ قبر متوجہ بھی ہو جاتا ہے۔ اور اپنے اکابر کی جس وقت آپ کتابیں دیکھیں گے، اور واقعات دیکھیں گے، تو یہ بات آپ کے سامنے نمایاں ہوگی۔ تو اس بات کے سامنے آجانے کے بعد معاملہ اور بھی زیادہ صاف ہو جاتا ہے۔ اگر اس بات کو مان لیا جائے کہ قبروں سے اِستفادہ بھی ہوتا ہے تو سماعِ موتیٰ والی بات اور بھی زیادہ صاف ہو جاتی ہے۔ تو پھر اس بات کے مان لینے کے بعد سماع وغیرہ میں بھی اختلاف کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے؟ یہ خلاصہ ہے اس مسلک کا جو آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا۔

حالتِ بیداری میں قبر والوں کی زیارت ہو سکتی ہے یا نہیں؟

باقی! آگے اس کے تتمے کے طور پر اور باتیں بھی ذِکر کی جا سکتی ہیں، کہ بیداری کے اندر مَرنے والوں کی زیارت ہو سکتی ہے یا نہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہو سکتی ہے یا نہیں؟ یہ باتیں اسی مسئلے کے اُوپر متفرع ہیں اور اسی طرح سے چلتی رہتی ہیں۔ یہ ''فیض الباری'' جلد اوّل ہے اور اس کا صفحہ ۲۰۴ ہے۔ ''اِستفاضہ کی قسموں میں سے ایک یہ قسم ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیداری میں ربط پیدا ہو جاتا ہے، استفاضہ کیا جا سکتا ہے''...... لیکن اس کا یہ معنی نہیں کہ جو چاہو، جب چاہو، جو کوئی چاہے پوچھ لے۔ لوگ اعتراضات جو کیا کرتے ہیں تو اسی کلیہ کو سامنے رکھ کر کیا کرتے ہیں۔ یہ بات نہیں، بلکہ یہ ایک اتفاقی بات ہے، اللہ تعالیٰ

---

(۱) المهند على المفند۔ سوال نمبر ۱۱ کا آخر۔

(۲) فیض الباری ج ۳ ص ۱۸۸، کتاب الجهاد باب من استعان بالضعفاء کے تحت حاشیہ پر۔

کی طرف سے جس پہ عنایت ہو جائے، ظاہری اسباب کے خلاف بطور کرامت کے ایسا ہوتا رہتا ہے۔ تو کوئی بات معلوم ہو جائے، کوئی بات پوچھ لی جائے، اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بھی اِستفاضہ من القبور کی قسم ہے، اس مسئلے سے میرا ذہن ادھر منتقل ہوا، کہ ایک بات اس کے متعلق بھی عرض کردوں۔

حاصل تو یہ ہے کہ حضرت شیخ نے آخر میں جا کر یہ فیصلہ دیا ہے کہ ''فَالرُّؤْيَةُ يَقْظَةً مُتَحَقِّقَةٌ'' بیداری کے اندر بھی رُؤیت متحقق ہے، ''وَاِنْكَارُهَا جَهْلٌ'' اور اس کا اِنکار کرنا جہالت ہے۔ اور اس سے پہلے لکھتے ہیں کہ ''يُمْكِنُ عِنْدِيْ رُؤْيَتُهٗ ﷺ يَقْظَةً'' میرے نزدیک حضور ﷺ کو بیداری میں دیکھ لینا بھی ممکن ہے، ''لِمَنْ رَزَقَهُ اللهُ سُبْحَانَهٗ'' اس شخص کے لئے جس کو اللہ یہ نعمت دے دے، ''كَمَا نُقِلَ عَنِ السُّيُوْطِيِّ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰى اَنَّهٗ رَاٰهُ ﷺ اِثْنَيْنِ وَعِشْرِيْنَ مَرَّةً'' علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ کو بائیس دفعہ دیکھا، ''وَسَاَلَهٗ عَنْ اَحَادِيْثَ ثُمَّ صَحَّحَهَا بَعْدَ تَصْحِيْحِهٖ ﷺ'' اور انہوں نے کچھ حدیثوں کے متعلق پوچھا حضور ﷺ نے ان کو صحیح قرار دیا، تو علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی تصحیح کے بعد ان کی تصحیح کی ہے، یہ اِستفاضہ ہے، کہ فیض حاصل کیا۔ ''وَكَتَبَ اِلَيْهِ الشَّاذِلِيُّ يَسْتَشْفِعُ بِهٖ بِبَعْضِ حَاجَتِهٖ اِلٰى سُلْطَانِ الْوَقْتِ وَكَانَ يُوَقِّرُهٗ'' اور علامہ شاذلی نے علامہ سیوطی کو خط لکھا اور اپنی کسی ضرورت کے لئے انہوں نے سفارش چاہی سلطانِ وقت کی طرف، اور سلطانِ وقت علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی عزت کرتا تھا، اِمام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے سفارش کرنے سے انکار کر دیا، ''وَقَالَ: اِنِّيْ لَا اَفْعَلُ'' اور کہا: میں ایسا نہیں کر سکتا! ''وَذٰلِكَ لِاَنَّ فِيْهِ ضَرَرَ نَفْسِيْ وَضَرَرَ الْاُمَّةِ'' کیونکہ ایسا کرنے میں میرا بھی نقصان ہے اور اُمت کا بھی نقصان ہے، وہ نقصان کس طرح سے؟ ''لِاَنِّيْ اَزُوْرُهٗ ﷺ غَيْرَ مَرَّةٍ'' کہ میں بار بار حضور ﷺ کی زیارت کرتا ہوں، ''وَلَا اَعْرِفُ فِيْ نَفْسِيْ اَمْرًا غَيْرَ اَنِّيْ لَا اَذْهَبُ اِلٰى بَابِ الْمُلُوْكِ'' مجھے اپنے اندر کوئی شرف نظر نہیں آتا جس کی بنا پر میرے پہ یہ عنایت ہے، سوائے اس کے کہ میں بادشاہوں کے دروازے پر نہیں جاتا۔ تو اگر میں بادشاہوں کے دروازے پر چلا گیا تو کہیں یہ شرف مجھ سے ضائع نہ ہو جائے۔ ''فَلَوْ فَعَلْتُ اَمْكَنَ اَنْ اُحْرَمَ مِنْ زِيَارَتِهِ الْمُبَارَكَةِ فَاَنَا اَرْضٰى بِضَرَرِكَ الْيَسِيْرِ مِنْ ضَرَرِ الْاُمَّةِ الْكَثِيْرِ'' مجھے تیرا تھوڑا سا نقصان برداشت ہے، اُمت کا ضررِ کثیر برداشت نہیں ہے، کہ حضور ﷺ سے میں بعض علمی باتیں پوچھتا ہوں، جس میں اُمت کا فائدہ ہے۔

اس واقعے کو نقل کرنے کے بعد حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ دوسرا واقعہ نقل کرتے ہیں کہ ''وَالشَّعْرَانِيُّ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰى اَيْضًا كَتَبَ اَنَّهٗ رَاٰهُ ﷺ وَقَرَاَ عَلَيْهِ الْبُخَارِيَّ'' عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ انہوں نے حضور ﷺ کو بیداری میں دیکھا ہے، ''قَرَاَ عَلَيْهِ الْبُخَارِيَّ فِيْ ثَمَانِيَةِ رُفَقَةٍ مَعَهٗ'' اور عبدالوہاب شعرانی کہتے ہیں کہ میں نے آٹھ ساتھیوں کے ساتھ مل کر حضور ﷺ سے ''بخاری'' پڑھی ہے، کہتے ہیں کہ پھر بعد میں ان کے نام بھی علامہ شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھے ہیں کہ وہ کون کون تھے، ''وَكَانَ وَاحِدٌ مِنْهُمْ حَنَفِيًّا'' ان آٹھ میں سے کہتے ہیں کہ ایک ''حنفی'' بھی تھا حضور ﷺ سے ''بخاری'' پڑھنے والا۔ ''وَكَتَبَ الدُّعَاءَ الَّذِيْ قَرَاَهٗ عِنْدَ خَتْمِهٖ'' اور پھر امام شعرانی نے وہ دُعا بھی نقل کی ہے جو ''ختمِ بخاری'' پر سرورِ کائنات ﷺ نے فرمائی تھی۔

اس واقعے کو نقل کرنے کے بعد حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ ''فَالرُّؤْيَةُ يَقْظَةً مُتَحَقِّقَةٌ وَاِنْكَارُهَا جَهْلٌ'' بیداری میں زیارت ہوجانا محقق ہے اور اس کا انکار جہالت ہے۔(۱) تو انکار کرنے کی وجہ بھی مذکور ہوگئی کہ کوئی انکار کرے تو اس کا منشا جہالت ہے، کہ اس کے سامنے پورے حالات نہیں ہیں۔ تو سرورِ کائنات ﷺ کے ساتھ اس قسم کا ربط پیدا ہوجانا، یہ بھی ان واقعات کے ساتھ ثابت ہے، اور کوئی شرعی دلیل اس کے خلاف نہیں ہے، تو اسی طرح سے باقی اموات کے ساتھ، جو بزرگ دُنیا سے تشریف لے جاتے ہیں، ان کے ساتھ ربط پیدا کرکے، بعض اولیاء اللہ جو بعض حالات معلوم کرلیتے ہیں، یہ باتیں بھی انکار کے قابل نہیں۔ جس وقت آپ اپنے اکابر کی کتابیں پڑھیں گے تو کثرت کے ساتھ یہ بات آپ کے سامنے آئے گی۔ میں نے تو حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ سے اس قسم کے واقعات بہت سنے ہیں، اور کتابوں کے اندر تو بے شمار لکھے ہوئے ہیں۔

بیداری میں زیارت پر ایک دِلچسپ واقعہ

صرف ایک واقعے پر میں اس بات کو ختم کرتا ہوں۔ دیوبند سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے ''حکایت الاولیاء'' جس کا اصل نام ہے ''اَرواحِ ثلاثہ''۔ اس میں حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ نقل کیا ہوا ہے (طالبعلمانہ لطیفے کے طور پر عرض کروں) کہ ان کے شاگردوں کا آپس میں کچھ اختلاف سا تھا، اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس اختلاف سے کسی درجے دِلچسپی لیتے تھے، اور اس وقت اہتمام تھا مولانا رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کا، یہ مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں بھی جس یہی مہتمم ہوتے تھے، بہت صاحبِ نسبت آدمی تھے، مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی انہی کے خلیفہ تھے، نقشبندی خاندان سے یہ تعلق رکھتے ہیں، اور مولانا رفیع الدین خلیفہ ہیں حضرت شاہ عبدالغنی محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے، اور پھر مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کے خلیفہ تھے جو کہ دارالعلوم دیوبند کے پہلے مفتی ہیں...... تو ان (مولانا رفیع الدین) کے اہتمام کا زمانہ تھا، تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو ایک دِن انہوں نے بعد نمازِ فجر اپنے حجرے میں بُلایا، جس وقت حضرت شیخ تشریف لائے، تو مولانا (رفیع الدین) فرمانے لگے کہ بات بعد میں کروں گا، پہلے ذرا میرے بدن کو ہاتھ لگا کے دیکھو، سردی کا موسم تھا، کپڑے پہنے ہوئے تھے، جب دیکھا تو مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ پسینے سے شرابور تھے، اور فرمانے لگے کہ ابھی ابھی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ صاحب جسدِ عنصری کے ساتھ میرے پاس تشریف لائے تھے اور مجھے آکر کہہ گئے ہیں کہ ''محمود الحسن کو منع کردو کہ اس اختلاف میں دِلچسپی نہ لے!'' مولانا رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ نے جب یہ بات نقل کی تو مولانا محمود الحسن جو بعد میں ''شیخ الہند'' کے نام سے مشہور ہوئے، وہ کہنے لگے کہ جی! آپ کے سامنے توبہ کرتا ہوں کہ آئندہ اس اختلاف میں دِلچسپی نہ لوں گا۔(۲) تو اس طرح سے اللہ تبارک وتعالیٰ جانے والے

(۱) فیض الباری، باب اثم من کذب علی النبی ﷺ کی آخری حدیث کے تحت، جلد اوّل۔
(۲) ''ارواحِ ثلاثہ'' حکایت نمبر ۲۴۶، ص ۱۹۳، حضرت نانوتوی کی حکایات کے تحت۔

بزرگوں کی رُوحانیت سے پچھلے لوگوں کو فائدہ بھی پہنچاتے رہتے ہیں، ہمارے اکابر کی کتابوں میں بھی اس کا اثبات ہے، اس کا اِنکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن بات پھر وہی! کہ مسئلہ مختلف فیہ ہے، کوئی اِنکار کرے تو یہ کُفر نہیں، کوئی قول کرے تو یہ شرک نہیں، اس سے بڑھ کر انصاف کی بات اور کوئی نقل نہیں کی جاسکتی۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ○

عورتوں کا قبروں پر جانا کیسا ہے؟

سوال:- کیا عورتیں قبروں پر پردے کے ساتھ جاسکتی ہیں؟

جواب:- عورتوں کو قبروں پر جانا چاہیے یا نہیں جانا چاہیے؟ اس بارے میں اِمام ترمذی نے علماء کا کچھ اختلاف نقل کیا ہے، ایک روایت میں تو ہے کہ حضور ﷺ نے ان عورتوں پر لعنت فرمائی ہے جو قبروں کی زیارت کرنے کے لئے جاتی ہیں۔[1] اور دُوسری روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''کُنْتُ نَهَیْتُكُمْ عَنْ زِیَارَةِ الْقُبُوْرِ فَزُوْرُوْهَا'' کہ میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا اب زیارت کرلیا کرو۔[2] اس روایت کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ بعض علماء کے نزدیک عورتیں بھی اس میں شامل ہوگئیں، جس کی بنا پر ان کو بھی جانے کی اجازت ہے۔ لیکن منع کرنا چاہیے چونکہ یہ وہاں جا کے غلط قسم کی حرکتیں کرتی ہیں، جزع فزع کرتی ہیں۔ پھر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت جو آپ کو سُنائی گئی اس میں بھی قبر پر جانا ثابت ہے۔ اور باب زیارۃ القبور میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک روایت ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ سے پوچھا تھا کہ یا رسول اللہ! جس وقت میں قبروں کی زیارت کروں تو کیا دُعا پڑھوں تو آپ نے ان کو دُعا کی تلقین فرمائی۔[3] جس سے معلوم ہوگیا کہ قبر پر جانے کی اجازت بھی ہوگئی، اگر اجازت نہ ہوتی تو پھر آپ ان کو دُعا کی تلقین نہ فرماتے۔ یہ بات سمجھ آتی ہے کہ نہیں آتی؟ ...... عَنْهَا قَالَتْ: كَيْفَ اَقُوْلُ يَارَسُوْلَ اللهِ! تَعْنِيْ فِيْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ قَالَ: قُوْلِيْ: اَلسَّلَامُ عَلٰى اَهْلِ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَيَرْحَمُ اللهُ الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنَّا وَالْمُسْتَاْخِرِيْنَ وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللهُ بِكُمْ لَلَاحِقُوْنَ. رواه مسلم ...... ''عنها'' میں ''ھا'' ضمیر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف راجع ہے، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے قبروں پر جا کر دُعا پڑھنے کے متعلق پوچھا تھا کہ جب میں قبروں پہ جاؤں تو کیا کہوں؟ تو آپ ﷺ نے یہ دُعا تلقین فرمائی، جس سے معلوم ہوگیا کہ ان کو اجازت ہے۔

---

(۱) ترمذی ۲۰۳/۱ باب ماجاء فی کراھیۃ زیارۃ القبور للنساء۔ مشکوٰۃ ۱۵۴/۱ باب زیارۃ القبور فصل ثالث۔

(۲) مسلم ۳۱۴/۱، کتاب الجنائز کا آخر۔ مشکوٰۃ ۱۵۴/۱ باب زیارۃ القبور کی پہلی حدیث۔

(۳) حوالہ مذکورہ
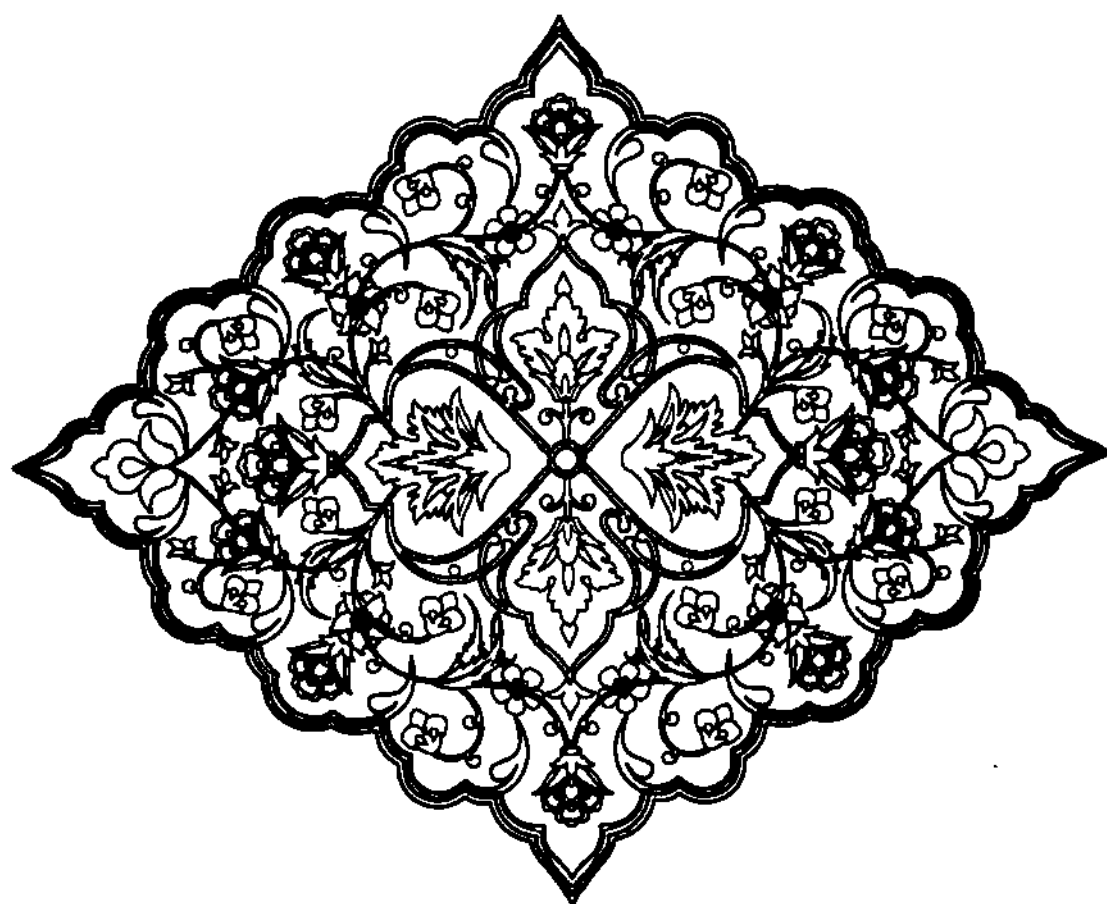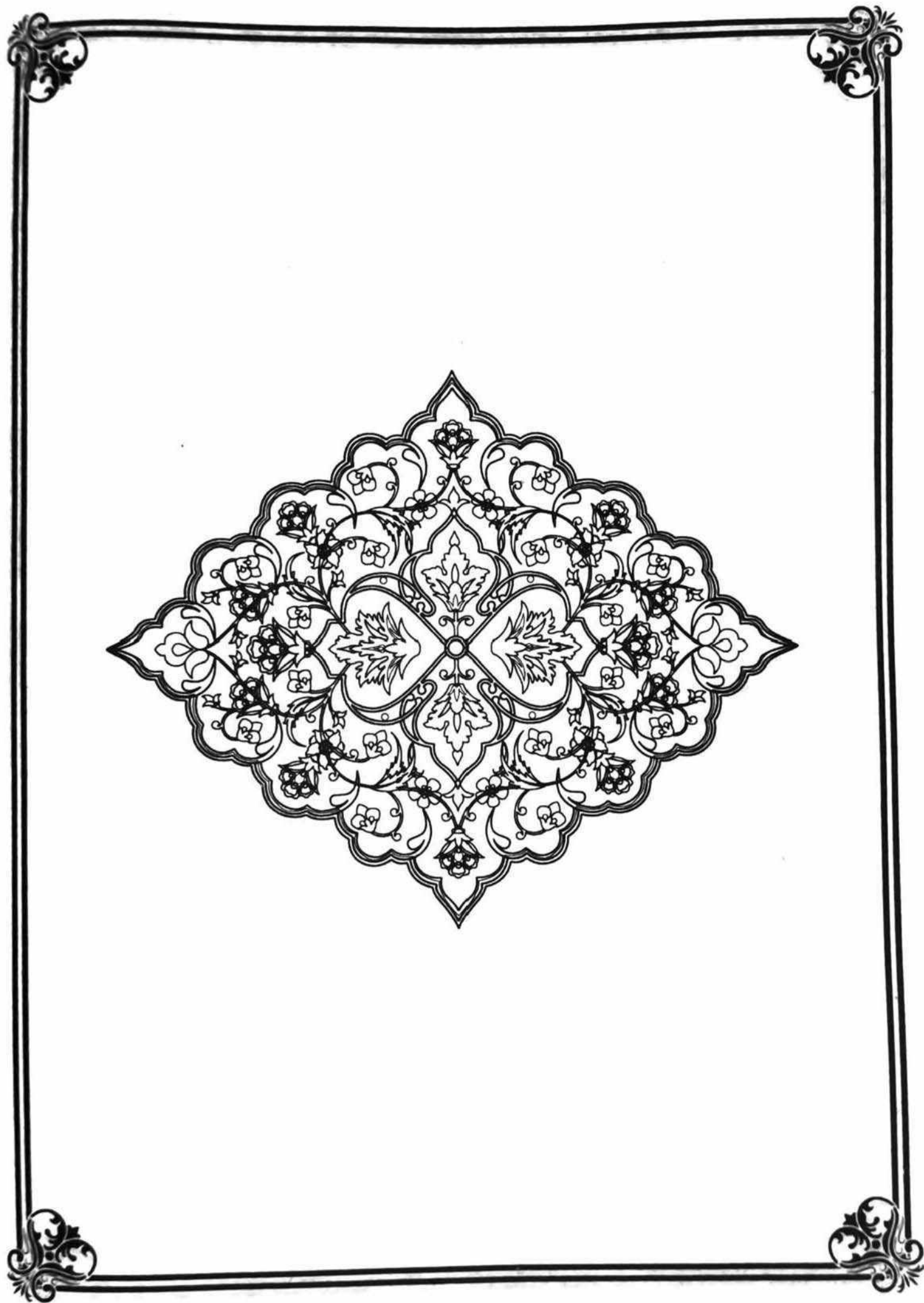
سُورَةُ القَصَصِ

اٰیاتها ۸۸ ۲۸ سُوْرَةُ الْقَصَصِ مَكِّيَّةٌ ۴۹ رکوعاتها ۹

سورۂ قصص مکہ میں نازل ہوئی، اس میں اٹھاسی آیتیں اور نو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

طٰسٓمّٓ ① تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ② نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ

طٰسٓمّٓ ① یہ واضح کتاب کی آیتیں ہیں ② تلاوت کرتے ہیں ہم آپ پر موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا کچھ واقعہ ٹھیک ٹھیک

لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ③ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا

ان لوگوں کے لئے جو ایمان لانا چاہتے ہیں ③ بے شک فرعون زمین میں سر چڑھا تھا، اور کر دیا تھا اس نے اس مُلک کے رہنے والوں کو مختلف جماعتیں،

يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ

ان میں سے ایک طائفہ کو وہ کمزور کرتا تھا، ذبح کرتا تھا ان کے بیٹوں کو اور زندہ چھوڑتا تھا ان کی عورتوں کو، بے شک وہ فرعون

الْمُفْسِدِيْنَ ④ وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً

فسادیوں میں سے تھا ④ اور ارادہ کرتے تھے ہم کہ احسان کریں ان لوگوں پر جو کمزور سمجھے جاتے تھے علاقے میں، اور کر دیں ہم انہیں امام

وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ⑤ۙ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ

اور کر دیں ہم انہیں وارث ⑤ اور ٹھکانا دیں ہم انہیں علاقے میں اور دِکھائیں فرعون کو اور ہامان کو

وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ⑥ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ

اور ان کے لشکروں کو اُن کمزوروں کی طرف سے وہ بات جس سے وہ ڈرتے تھے ⑥ ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف وحی کی کہ

اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ ۚ اِنَّا

تُو اس کو دودھ پلاتی رہ، پھر جب تُو اس پر اندیشہ کرے تو ڈال دے اس کو دریا میں، خوف نہ کرنا، غم نہ کرنا، بے شک ہم

رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ⑦ فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ

اس کو لوٹانے والے ہیں تیری طرف اور بنانے والے ہیں اس کو رسولوں میں سے ⑦ پس اُٹھالیا اس کو فرعون کے لوگوں نے تاکہ ہو جائے وہ ان کے لئے

عَدُوًّا وَّحَزَنًا ؕ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـِٕيْنَ ۝ وَقَالَتِ امْرَاَتُ

دشمن اور باعث غم، بے شک فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر خطا کار تھے⑧ فرعون کی بیوی نے کہا

فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ ؕ لَا تَقْتُلُوْهُ ۖ عَسٰۤى اَنْ يَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا

کہ میرے لئے اور تیرے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، اسے قتل نہ کرو، اُمید ہے کہ یہ ہمیں نفع دے گا، یا ہم اس کو بیٹا بنالیں گے

وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا ؕ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَاۤ اَنْ

اور ان کو کچھ پتا نہیں تھا⑨ موسیٰ علیہ السلام کی ماں کا دل خالی ہوگیا، قریب تھا کہ وہ ظاہر کردے اس واقعے کو اگر ہم نے

رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ

اس کے دل کو مضبوط نہ کیا ہوتا، تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہوجائے⑩ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے کہا ان کی بہن کو کہ تُو اس کے پیچھے پیچھے چل

فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ

پس وہ دیکھتی رہی موسیٰ کو دُور سے، اور لوگوں کو پتا ہی نہیں تھا⑪ اور ہم نے حرام ٹھہرادیں موسیٰ پر دُودھ پلانے والی عورتیں پہلے سے ہی

فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰۤى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ۝ فَرَدَدْنٰهُ

پھر اس بہن نے کہا: کیا میں تمہاری راہنمائی کروں ایسے گھر والوں پر جو اس کی کفالت کریں گے تمہارے لیے اور وہ اس کے لئے خیر خواہ ہوں گے⑫

اِلٰۤى اُمِّهٖ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

پس ہم نے لوٹا دیا اس کو اس کی ماں کی طرف تاکہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوجائیں اور وہ غمزدہ نہ ہو، اور تاکہ جان لے کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے، لیکن اکثر لوگوں کو علم نہیں ہے⑬

تفسیر

سورت کا تعارف اور شانِ نزول

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ سورۂ قصص مکہ میں اُتری، اس کی اٹھاسی آیات اور نو رکوع ہیں۔ مفسرین کے نزدیک یہ سورت "مکی" سورتوں میں سے آخری سورت ہے، سرورِ کائنات ﷺ جس وقت سفرِ ہجرت پہ نکل پڑے ہیں، تو راستے میں یہ سورت اُتری ہے، اس سورت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بہت تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اپنے شہر

سے نکلے، دوسرے شہر میں جا کر ٹھہرے، اور سفر کی مشقتیں اٹھائیں، پھر اللہ تعالیٰ نے نبوّت دی، فرعون کے مقابلے میں بھیجا، اور فرعون اپنے ساز و سامان کے باوجود شکست کھا گیا، اور موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ماننے والوں کو اللہ نے غلبہ دیا۔ یہی ہے رُوح اس واقعے کی جو نقل کیا جا رہا ہے، اور یہ سُنا کر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تسلی دِلانا مقصود ہے کہ انبیاء علیہم السلام اسی طرح سے اللہ کے راستے میں مشقتیں اُٹھایا کرتے ہیں، اور دشمنوں کے خطرے سے علاقے بھی چھوڑنے پڑتے ہیں۔ اور مشرکینِ مکہ جو وقت کے فرعون تھے، ان کے لئے بھی ایک قسم کی تنبیہ ہے کہ تم اس حق کو دبانے کے لئے چاہے کتنی کوشش کرلو، لیکن یہ حق غالب آ کے رہے گا۔ جس طرح سے فرعون نے بھی اس حق کو دبانے کے لئے اپنی پوری حکومت کی طاقتیں لگا دیں تھیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے مقابلے میں کسی کی تدبیر کام نہیں آیا کرتی، بلکہ سب تدبیریں دھری رہ جاتی ہیں۔ تو اسی قسم کے سبق دینے کے لئے قرآنِ کریم میں یہ سورت اُتاری گئی۔ چونکہ واقعہ آ رہا ہے موسیٰ علیہ السلام کا اور اس کے اکثر و بیشتر اَجزا پہلی سورتوں میں آپ کے سامنے مفصل گزر چکے ہیں، صرف شہر کے اندر ایک قبطی کے ساتھ اُلجھاؤ کا واقعہ اس میں نیا ہے، اور مدین کے اندر موسیٰ علیہ السلام پر جو حالات گزرے ہیں وہ اس سورت میں نئے آ رہے ہیں، باقی اکثر اَجزا آپ کے سامنے دُوسری سورتوں میں گزر چکے ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ

طٰسٓمّٓ: یہ حروف مقطعات ہیں، اَللهُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ بِذٰلِكَ، ان حروف سے اللہ کی جو مُراد ہے وہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ: یہ واضح کتاب کی آیتیں ہیں۔ کتاب کے ساتھ مبین کی صفت بار بار آتی رہتی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب ایسی ہے جو اپنے مدعا میں، اپنے مقصود میں، بالکل واضح ہے، اپنے مقصد کی بالکل وضاحت کرتی ہے، ہر بات کو کھول کھول کر بیان کرتی ہے۔ لفظ کتاب عربی کے اندر مذکر ہے اس لئے الْمُبِيْنِ اس کی صفت مذکر آئی۔ اُردو میں لفظ ''کتاب'' مؤنث استعمال ہوتا ہے اس لئے ہم نے ترجمہ کیا مؤنث کے ساتھ۔ یہ ایسی کتاب کی آیتیں ہیں جو اپنے مقصد کو، اپنے مدعا کو کھول کھول کے بیان کرتی ہے۔ نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَ فِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ: تلاوت کرتے ہیں ہم آپ پر پڑھتے ہیں ہم آپ پر موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا کچھ واقعہ۔ نَبَاٌ: خبرِ عظیم کو کہتے ہیں، واقعہ کے معنی میں۔ بِالْحَقِّ: ٹھیک ٹھیک، جو مصلحت پر مشتمل ہے۔ موسیٰ اور فرعون کے واقعے سے کچھ، یہ ''مِنْ'' تبعیضیہ ہے۔ ہم آپ پر موسیٰ علیہ السلام کا کچھ واقعہ ٹھیک ٹھیک بیان کرتے ہیں۔ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ: ان لوگوں کے فائدے کے لئے جو ایمان لانا چاہتے ہیں، یا جو ایمان لاتے ہیں۔ ایسے موقع پر فعل ارادۂ فعل کے لئے استعمال ہوتا ہے، آپ کے سامنے اکثر اسی طرح سے ترجمہ کرتا رہتا ہوں، کیونکہ ایسے واقعات سے فائدہ وہی لوگ اُٹھائیں گے جو ایمان لانے کا ارادہ رکھتے ہیں، اور جن کا سمجھنے کا ارادہ ہی نہیں وہ اس سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتے، اور اسی طرح سے جو ایمان لا چکے ہیں وہ اس واقعے سے فائدہ اُٹھائیں گے، اور جو کافر ہیں اور ان کو اپنے کُفر پر اطمینان ہے، وہ اس قسم کے واقعات سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ تو یہ ''ل'' نفع کے لئے ہے یعنی ان لوگوں کے نفع کے لئے، ان لوگوں کے فائدے کے واسطے جو ایمان لانا چاہتے ہیں یا جو ایمان لاتے ہیں، دونوں طرح سے ترجمہ ٹھیک ہے۔

''فرعون'' اہلِ مصر کی طبقاتی تقسیم کر کے مفسد ہو چکا تھا

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا: یہ گویا کہ اس واقعے کا خلاصہ ہے جو آگے نقل کیا جائے گا۔ بے شک فرعون زمین میں سرچڑھا تھا، عَلَا فِی الْاَرْضِ: زمین میں اُونچا ہو یا ہوا تھا، عالی تھا، بڑا بنا ہوا تھا، غالب تھا، وَجَعَلَ: اور کرلیا تھا اس نے اَهْلَهَا: ھا کی ضمیر ''ارض'' کی طرف لوٹ رہی ہے، اور ''ارض'' سے مراد ''اَرضِ مصر'' ہے، الْاَرْض کے اُوپر الف لام عہد کا ہے، تمام زمین پر وہ سرچڑھا نہیں تھا، نہ اس کی تمام زمین پر بادشاہت تھی، بلکہ ایک مخصوص علاقے پر بادشاہت تھی تو یہاں الْاَرْض سے وہی مُلک مراد ہے، اس کا اپنا مُلک مُلکِ مصر۔ بے شک فرعون بلند ہو یا ہوا تھا، اس نے بلندی اختیار کی ہوئی تھی اپنے مُلک میں، اور کردیا تھا اس نے اس مُلک کے رہنے والوں کو مختلف ٹکڑے۔ شِيَعًا: شِيْعَةٌ کی جمع ہے اور شِيْعَةٌ: جماعت کو کہتے ہیں۔ وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ (سورۂ صافات: ۸۳) نوح علیہ السلام کی جماعت سے ابراہیم بھی ہیں، یہ لفظ پہلے آپ کے سامنے آیا تھا۔[1] شِيْعَه اصل میں اس جماعت کو کہتے ہیں جو ایک نظریے پر متفق ہوگئی ہو، اور یہ جو آپ رافضیوں کو ''شیعہ'' کہتے ہیں تو یہ اصل کے اعتبار سے ''شیعۂ علی'' ہیں، ''علی کی جماعت''، جو اپنے گمان میں حُبِّ علی پہ اکٹھی ہوئی ہے، اس کا معنی بھی جماعت ہی ہے۔ شِيَعًا: مختلف جماعتیں بنادیا تھا، یعنی طبقات قائم کردیے، ایک طبقہ حکومت کے لوگوں کا تھا جو کہ ''قبطی'' کہلاتے تھے، جو وہاں کی بسنے والی اصل قوم تھی، اور دوسرا طبقہ تھا اسرائیلیوں کا جن کو ''سبطی'' کہتے ہیں، (بیان القرآن) جو اَسباطِ یعقوب میں سے ہیں، یہ دو طبقے بنادیے۔ جو طبقہ حکومت سے تعلق رکھتا تھا حکومت کا ہم قوم تھا، ان کو ہر قسم کی سہولتیں ہر قسم کی مراعات دے رکھی تھیں، اور جو طبقہ حکومت کی قوم میں سے نہیں تھا یعنی یہی بنی اسرائیل، ان کو ہر طرح سے دبا رکھا تھا، اور استنادبار کھا تھا کہ وہ چاہتے نہیں تھے کہ کسی طرح سے ان کے افراد زیادہ ہوجائیں، اور ان کو افرادی قوت زیادہ حاصل ہوجائے...... یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ان کے بچوں کو قتل کرنے کی سکیم بنائی تھی اسی سیاسی خطرے کے پیشِ نظر کہ کہیں یہ قوم زور پکڑ کر ہم پر غالب نہ آجائے، فرعون نے کوئی خواب دیکھا تھا، اس خواب کی تعبیر میں لوگوں نے یہی بتایا کہ بنی اسرائیل میں کوئی بچہ پیدا ہوگا، جو آپ کے تخت کو اُلٹ دے گا، اور حکومت کا زوال اس کے ہاتھوں پہ آئے گا، تو انہوں نے اس خطرے سے نمٹنے کے لئے یہ سکیم جاری کی تھی کہ اس قوم کو کمزور رکھا جائے، قوت نہ پکڑنے دی جائے، جس کی صورت یہی تھی کہ حکومت کے کسی عہدے پر ان کو فائز نہیں کیا جاتا تھا، تعلیم میں یہ پیچھے، مالیات میں یہ پیچھے، اور پھر جو بچے پیدا ہوتے ان کو قتل کرنے کا پروگرام بنالیا...... یہی تھی طبقاتی تقسیم جو فرعون نے ملک کے اندر کر رکھی تھی، حالانکہ جو مُلک کا بادشاہ ہوا کرتا ہے، اس کے لئے سب رعایا برابر ہوا کرتی ہے، اس کو عدل کے ساتھ معاملہ کرنا چاہیے، جتنے بھی مُلک کے باشندے ہیں، سب کے حقوق برابر ہیں، ہر ایک کو مراعات دینی چاہئیں، ہر ایک کو عزت و راحت کے ساتھ زندہ رہنے کا حق دینا چاہیے۔ لیکن اس ظالم نے یہ طبقات بنادیے تھے، اور طبقات اسی سیاسی خطرے کے پیشِ نظر کہ ایک طبقے کو وہ غالب رکھنا چاہتا تھا، دوسرے طبقے کو دبانا چاہتا تھا۔ کیا تھا اس نے ملک کے رہنے والوں کو مختلف جماعتیں۔ يَسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ: ان میں سے ایک طائفہ کو وہ

---

(۱) ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا (سورۂ مریم: ۶۹)، اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا (سورۂ انعام: ۱۵۹) وغیرہ۔

کمزور کرتا تھا، دبا کے رکھتا تھا۔ یُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ: یہ کمزور کرنے کی سکیم تھی کہ ذبح کرتا تھا ان کے بیٹوں کو۔ وَیَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ: اور زندہ چھوڑتا تھا ان کی عورتوں کو، یعنی کہ جو لڑکیاں پیدا ہوتی تھیں جو آگے جا کے عورتیں بننے والی تھیں ان کو زندہ چھوڑتے تھے، ایک تو ان سے کوئی سیاسی انقلاب کا خطرہ نہیں تھا، دوسرے آخر گھروں میں کام کاج کی ضرورت بھی تھی، وہ ان سے اپنے گھروں میں کام لیتے تھے، اس لئے لڑکیوں کو باقی رکھتے تھے اور لڑکوں کو قتل کرتے تھے۔ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ: بے شک وہ فرعون فسادیوں میں سے تھا، حالانکہ وقت کا حاکم مصلح ہونا چاہیے جو ملک کے حالات کو اور ملک کے باشندوں کے حالات کو ٹھیک کر کے رکھے، لیکن یہ مصلح نہیں بلکہ مفسد تھا، شریر لوگوں میں سے تھا، خرابی ڈالنے والوں میں سے تھا۔

کسی کی ''تدبیر'' اللہ کی ''تقدیر'' کا مقابلہ نہیں کرسکتی

وَنُرِیْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِی الْاَرْضِ: اب یہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر ہے فرعون کی تدبیر کے مقابلے میں۔ فرعون تو تدبیر کرتا تھا کہ ایک طائفہ کو کمزور کر کے رکھے۔ وَنُرِیْدُ اور ہم ارادہ کرتے تھے (یہ ماضی کا بیان ہے حال کے ساتھ) کہ احسان کریں ان لوگوں پر جن کو دبایا ہوا ہے زمین میں، جن کو کمزور کیا ہوا ہے زمین میں۔ زمین سے وہی علاقہ مراد ہے۔ ملک میں جن لوگوں کو کمزور کیا ہوا ہے ہم ان کے اوپر احسان کرنے کا ارادہ کرتے تھے۔ وَنَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِیْنَ: یہ بھی اسی طرح سے ''اَنْ'' کے نیچے داخل ہے۔ ہم ارادہ کرتے تھے کہ احسان کریں ان لوگوں پر جو کمزور قرار دیے ہوئے تھے ملکِ مصر میں، اور کردیں ہم ان کو ائمہ (اَىِٕمَّةً: امام کی جمع ہے) اور کردیں ہم ان کو وارث۔ یعنی ہم ان کو امام بنانے کا ارادہ کئے ہوئے تھے اور وارث بنانے کا ارادہ کئے ہوئے تھے۔ یہ اسی احسان کی تفصیل ہے جو اللہ تعالیٰ اس طائفہ کے اوپر کرنا چاہتا تھا۔ امام سے دینی امامت مراد ہے، جس طرح سے بنی اسرائیل کو آنے والے وقت میں دینی طور پر امامت حاصل ہوئی، تورات کے حامل ہوئے، علمی دنیا کی قیادت اور امامت انہی کے ہاتھ میں تھی۔ اور وارث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اس حکومت کو مٹا کے ان کو حکومت دینا چاہتا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد متصل یوشع بن نون نے فلسطین کا علاقہ فتح کیا، بیت المقدس وغیرہ کا علاقہ، وہاں ان کی حکومت قائم ہوئی، اور یہ حکومت چلتی آئی حتیٰ کہ سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں اس حکومت نے بہت عروج حاصل کیا کہ مصر اور اردگرد کی سب حکومتیں ان کے سامنے دب گئیں، اور ان کی باج گذار تھیں۔ تو اللہ تعالیٰ ان ظالموں اور مفسدین کو ختم کر کے ان کو وارث بنانا چاہتا تھا حکومت اور اقتدار کا، اور دینی طور پر ان کو امامت اور قیادت دینا چاہتا تھا، اللہ نے یہ ارادہ کرلیا..... اب ایک طرف اللہ کا ارادہ ہے اور دوسری طرف ان فرعونیوں کی تدبیر ہے اور سکیم ہے اپنے ملک اور اقتدار کو باقی رکھنے کے لئے، اب یہ انسانی تدبیر اور اللہ تعالیٰ کی تقدیر کی لڑائی ہے، دیکھو! نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ اور یہی بات بتائی جارہی ہے کہ اللہ کے ارادے کے سامنے کوئی چیز مانع نہیں ہوتی، وقت کا فرعون اپنے پورے ساز و سامان کے ساتھ بھی اگر اللہ کی تدبیر کا مقابلہ کرنا چاہے، تو اللہ کی تقدیر کا مقابلہ نہیں ہوا کرتا، یہ ایک قسم کا آپ کے سامنے نقشہ بنا دیا گیا کہ کیا کچھ ہونے والا ہے، اللہ کا ارادہ یہ ہے اور ان کا ارادہ یہ ہے۔ اور آگے قصے کے اندر یہ تفصیل بتادی جائے گی کہ ان کی تدبیر کس طرح سے ناکام ہوئی، اور اللہ کا ارادہ کس طرح سے کامیاب ہوا، فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ: اللہ تعالیٰ

ہی ہیں، تو یہ وارث ہو گئے حکومت کے اعتبار سے، اور امام بن گئے دینی اعتبار سے، آنے والے وقت میں اللہ تعالیٰ علمی قیادت، دینی سیادت وقیادت ان کو دینا چاہتا ہے، اور اسی طرح سے ان ظالموں کو مٹا کر حکومت اور اقتدار کا وارث بھی انہیں بنانا چاہتا ہے، اللہ نے یہ ارادہ کر لیا۔

فرعونیوں کو ہر وقت اپنے زوال کی فکر لگی رہتی تھی

وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ: یہ نُمَكِّنَ بھی اسی طرح "اَنْ" کے نیچے داخل ہے، نُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ، نُرِيْدُ اَنْ نَّجْعَلَ، نُرِيْدُ اَنْ نُّمَكِّنَ، ہم ارادہ کرتے تھے ان کو قدرت دینے کا علاقے میں۔ تمکین: جمادینا، ٹھکانا دینا۔ ہم ان کے لئے علاقے میں ٹھکانا دینے کا ارادہ کرتے تھے، اور یہ دکھا دینے کا ارادہ کرتے تھے فرعون کو اور ہامان کو اور ان کے لشکروں کو، ان بنی اسرائیل کی طرف سے، ان کمزوروں کی طرف سے مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ وہ چیز جس سے وہ ڈرتے تھے۔ ڈرتے کس چیز سے تھے؟ انقلاب سے، کہ ہمارا زوال آ جائے گا، ہمارا تختہ اُلٹ جائے گا، یہ خطرہ فرعون کو بھی تھا، فرعون کے کارکنوں کو بھی تھا، کارکنوں میں سے بہت بڑا کارکن "ہامان" تھا، جس طرح سے "وزیر اعظم" ہوا کرتا ہے، یہ "ہامان" فرعون کا وزیر اعظم تھا۔ اور جُنُوْدَهُمَا: ان کے لشکر۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کی بڑھتی ہوئی قوت کو دیکھ کر یہ سارے ہی خوف وہراس میں مبتلا تھے۔ فرعون خود جو بادشاہ تھا، اور اس کے کارکن اور اس کی کابینہ کے لوگ، اس طرح سے اس نے اپنی فوجوں کے لوگوں کو بھی چوکنا کر رکھا تھا کہ ان پہ نظر رکھا کرو، خطرہ ہے کہ کہیں یہ انقلاب نہ لے آئیں، تو جو خطرہ وہ محسوس کرتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کمزوروں کی طرف سے فرعون کو، ہامان کو اور ان کی فوجوں کو وہی دکھانا چاہتا تھا، چنانچہ دکھا دیا۔

اب صاف ترجمہ یوں ہو گیا "ارادہ کرتے تھے ہم کہ احسان کریں ان لوگوں پر جو کمزور سمجھے جاتے تھے علاقے میں، اور کر دیں ہم انہیں امام، اور کر دیں ہم انہیں وارث، اور ٹھکانا دیں ہم انہیں علاقے میں، اور دکھائیں فرعون کو، ہامان کو، اور ان دونوں کے لشکروں کو ان مستضعفین کی طرف سے وہ بات جس سے یہ ڈرتے تھے۔"

غیرِ انبیاء کے لئے بھی "وحی" کا اطلاق ہوتا ہے

وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوْسٰۤى: اب آگے واقعہ شروع ہو گیا، یعنی حکایت کا عنوان اوپر آ گیا، آگے جو حکایت ذکر کی جا رہی ہے اس کا عنوان یہ ہے کہ ہم دکھاتے ہیں کہ اللہ کا ارادہ کامیاب کس طرح سے ہوتا ہے! اور انسانوں کی تدبیریں ناکام کس طرح سے رہتی ہیں! اَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوْسٰۤى: ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی ماں کی طرف وحی کی۔ "وحی" سے یہاں دل میں بات ڈالنا مراد ہے، وہ "وحی" مراد نہیں جو وحی شریعت ہوا کرتی ہے، جو انبیاء پہ آتی ہے، "وحی" کے متعلق ذکر کیا تھا کہ اصل میں اس کا معنی ہے اشارہ سریعہ، جلدی سے کسی کو کوئی بات سمجھا دینا، اصل لغوی مفہوم اس کا یہ ہوتا ہے۔ اس وحی کا اطلاق آسمان پر بھی آیا ہے کہ ہم نے آسمان کی طرف وحی کی،[1] اور حیوانات کے متعلق بھی آیا ہے، جیسے: وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ (سورۂ نحل: ۶۸) شہد کی مکھی کو بھی اللہ نے وحی کی، تو غیرِ انبیاء

(۱) وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا (پارہ ۲۴ سورۂ حم سجدہ: ۱۲)۔

کے لئے بھی ''وحی'' کا اطلاق ہوتا ہے، جس طرح سے یہاں ہے اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى۔ یہ دِل میں ڈال دینا مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دِل کے اندر ایک بات ڈال دی، چونکہ بنی اسرائیل میں سے تھیں، علمی خاندان میں سے تھیں، انبیاء کی اولاد میں سے تھیں، تو دِل میں کسی درجے میں صفائی تو ہوتی ہی ہے۔

اُمِّ موسیٰ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسلی

تو بچہ پیدا ہوا، جہاں تک ممکن ہوا اس کو چھپا کے رکھا، پھر جس وقت یہ حالات پیدا ہو گئے کہ اب یہ ظاہر ہو ہی جائے گا، فرعونی اس کو پکڑ کے لے جائیں گے، تو دِل میں یہ بات آئی کہ اب اس کو اس طرح سے صندوق میں بند کر کے دریا میں ڈال دوں، اللہ کی طرف سے قلب میں اِلہام ہوا، اور اس خیال کے سامنے مغلوب ہو کر وہ ویسے ہی کرتی چلی گئیں جس طرح سے اللہ تعالیٰ کا منشا تھا۔ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی ماں کی طرف وحی کی، اَنْ اَرْضِعِيْهِ: کہ تُو اس کو دُودھ پلاتی رہ۔ اِرضاع: دُودھ پلانا۔ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ: پھر جب تُو اس پر اندیشہ کرے، تجھے اندیشہ ہو کہ اب فرعونی اس کو پکڑ کے لے جائیں گے، فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ: یہ حصہ آپ کے سامنے سورۂ طٰہٰ میں گزر چکا ہے۔ پھر ڈال دے اس موسیٰ علیہ السلام کو دریا میں۔ وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ: خوف نہ کرنا، حزن نہ کرنا۔ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ: بے شک ہم اس کو لوٹانے والے ہیں تیری طرف۔ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ: اور بنانے والے ہیں اس کو رسولوں میں سے۔ یہ تسلی دے دی جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل میں توکّل کا جذبہ پیدا ہوا...... خوف اور حزن یہ دو باتیں ہیں، ''خوف'' کہتے ہیں آنے والے حالات کے اعتبار سے جو خطرہ ہوتا ہے، ''حزن'' کہتے ہیں پیش آمدہ حالات سے جو ایک دُکھ طبیعت میں پیدا ہوتا ہے...... جدائی کا حزن، آئندہ اس کے ڈُوب جانے یا وفات پا جانے کا خطرہ، دونوں ہی تیرے دِل میں نہیں ہونے چاہئیں، جدائی کا بھی صدمہ نہ کرنا، اور آئندہ کے متعلق بھی خوف اور اندیشہ نہ کرنا، کہ دریا میں ڈال رہی ہوں، پتا نہیں کیا ہوگا، مچھلیاں کھا جائیں گی، ڈُوب جائے گا، یہ ہوگا، وہ ہوگا۔ نہیں! بلکہ دونوں باتوں سے مطمئن رہ...... ہم اس کو تیری طرف لوٹائیں گے، جدائی کا علاج یوں ہو جائے گا۔ اور ہم اس کو مرسلین میں سے بنانے والے ہیں، جس میں زندگی کی اور طویل عمر کی ضمانت دے دی، کیونکہ رسولوں میں سے تبھی بنیں گے جب طویل عمر کے ہوں گے، اس لئے مرنے کا بھی کوئی اندیشہ نہیں، جدائی بھی کوئی نہیں، ہم اس کو تیری طرف واپس لوٹا دیں گے، یہ جدائی عارضی سی جدائی ہے، یہ تیرے پاس واپس آ جائے گا، اور یہ ڈُوبے گا نہیں، مرے گا نہیں، اس کا کوئی خوف نہ کیجئے، اللہ تعالیٰ اس کو رسولوں میں سے بنانے والے ہیں، یہ بڑی عمر کے ہوں گے، طویل عمر پائیں گے، یہ دل کے اندر اللہ تعالیٰ نے اِلقاء کر دیا، اور ماں کو اس بارے میں اطمینان دِلا دیا۔

تابوت فرعونیوں نے پکڑ لیا

فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا: اب درمیان میں قصے کو حذف کر دیا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے ایسے ہی کیا، اپنے اس خیال کے سامنے مغلوب ہو کر دُودھ پلاتی رہی، اور جس وقت یہ خطرہ ہوا کہ اب یہ بچہ چھپائے چھپے گا نہیں، اب کسی طرح سے فرعونیوں کو پتا چل جائے گا، اور وہ اس کو پکڑ کے لے جائیں گے، تو پھر انہوں نے لکڑی کا صندوق بنایا، صندوق میں بچے کو رکھ

کے اللہ پر بھروسا کرتے ہوئے اس کو دریا میں چھوڑ دیا...... معلوم یوں ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کی بستی، اصل شہر سے کچھ باہر تھی، جس طرح سے آج کل بھی یہ جو نواب قسم کے لوگ ہیں، اپنی بستی جہاں بساتے ہیں، تو اپنے نوکروں خادموں کی بستی ذرا تھوڑی دور بسالیتے ہیں۔ آپ کے علاقے میں ہی نواب بہاولپور نے اپنے محلات جہاں بنائے ہوئے ہیں، وہ علاقے سے باہر ہیں، اور باقی دوسرا شہر ذرا فاصلے پر ہے، یہ ڈیرہ نواب میں جس طرح ہے۔ تو اسی طرح سے فرعون کی بستی جو تھی فرعون کے اپنے گھر اور محلات، وہ بھی دریا کے کنارے پر تھے، لیکن اس سے کچھ فاصلے پر بنی اسرائیل کے لوگ آباد ہوں گے۔ تو وہاں سے اس بستی سے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے موسیٰ علیہ السلام کو دریائے نیل میں چھوڑا، اور دریائے نیل ان کو پانی میں بہاتا ہوا لے گیا، سورۂ طٰہٰ میں لفظ آیا تھا: فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ (سورۂ طٰہٰ: ۳۹)۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تکوینی طور پر دریا کو حکم ہوا کہ اس کو کنارے پہ پھینکے، آگے بہا کے نہ لے جائے، تو جس وقت یہ کنارے پر لگا تو وہاں شاہی محلات قریب تھے، وہاں جو لوگ پھر رہے تھے، انہوں نے دیکھا کہ ایک تابوت کنارے پر آلگا ہے، تو اس کو پکڑ لیا گیا، جیسے ایک نئی چیز ہوتی ہے، تو لوگ اس کو دیکھنے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں، تابوت کھولا تو نہایت خوبصورت بچہ ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے محبوبیت دے دی

اور اللہ تعالیٰ نے تدبیر یہ کی اَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّىْ جیسے سورۂ طٰہٰ میں لفظ آئے تھے، کہ میں نے اپنی طرف سے تیرے پہ محبوبیت ڈال دی، اس لئے جو دیکھتا ہے اسے پیارآتا ہے، دشمنی کے جذبے نہیں آتے، نفرت نہیں آتی، بلکہ ہر دیکھنے والے کو پیار آتا ہے، اسی پیار کا نتیجہ تھا کہ فرعون کی بیوی فریفتہ ہوگئی، فرعون کی بیوی ''آسیہ'' بہت نیک دل عورت تھی، رحم دل عورت تھی، اس نے جب بچے کو دیکھا تو اس کے دل میں محبت آگئی، فرعون بھی وہیں موجود تھا، تو وہ فرعون کو بچہ دکھا کے کہتی ہے کہ یہ تو ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، ہم تو اس کو اپنے گھر میں رکھیں گے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یا تو ان کی اولاد تھی نہیں، یا اگر تھی تو لڑکیاں تھیں نرینہ اولاد نہیں تھی، لڑکا ان کے گھر میں کوئی نہیں تھا، اس لئے کہنے لگی: قُرَّتُ عَيْنٍ لِّىْ وَلَكَ: یہ میرے لئے اور تیرے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، یہ بڑا ہونہار بڑا شریف بچہ معلوم ہوتا ہے (چہرے پر آثار اللہ نے اس قسم کے ڈال دیے) یہ ہمیں فائدہ پہنچائے گا، اور اگر ہماری کوئی نرینہ اولاد نہ بھی ہوئی تو ہم اسی کو اپنا بیٹا بنالیں گے۔ یہ بات کر رہی ہے فرعون کی بیوی فرعون کے سامنے...... تو اللہ تعالیٰ اس واقعے کو آگے ان الفاظ میں ذکر کرتے ہیں۔ فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ۔ دریا میں ڈالنے اور دریا کے اس کو کنارے پر پہنچا دینے کا ذکر سورۂ طٰہٰ میں آگیا۔ فَالْتَقَطَهٗ: اِلتقاط: اُچک لینا، پکڑ لینا، کسی گری پڑی چیز کو اُٹھا لینا، جس طرح سے لُقطہ ہوا کرتا ہے۔ پس اُٹھا لیا اس کو فرعون کے لوگوں نے۔ ''آل'' سے اس خاندان کے لوگ مراد ہیں۔

فرعونیوں نے اپنا دُشمن اپنے ہاتھوں پالا

لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا: یہاں ''لام'' غایت کے لیے ہے، جس کو آپ ''لام عاقبت'' کہتے ہیں، ''شرح مائة عامل'' میں

آپ نے مثال پڑھی تھی: لَزِمَ الشَّرَّ لِلشَّقَاوَةِ۔ یہ ''لام'' لامِ عاقبت ہے، جس کا معنی ہوتا ہے کہ اس شخص نے بُرے کام کو لازم پکڑا، نتیجہ شقاوت نکلے گی، یہ بدبخت ہو جائے گا، ''لامِ عاقبت'' کا یہی معنی ہوا کرتا ہے کہ پچھلے کام کا نتیجہ یہ ہے۔ آلِ فرعون نے، فرعون کے گھر والوں نے، فرعون کے خاندان نے اس بچے کو اُٹھالیا، جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ یہ بچہ ان کے لئے دُشمن ہوگا اور باعث حزن ہوگا، یعنی انہوں نے تو یہ سمجھ کر پکڑا تھا کہ یہ ہمیں نفع دے گا، لیکن نتیجہ یہ نکلے گا کہ یہ ان کا دُشمن ہوگا اور ان کے لئے باعث غم ہوگا۔ اپنے ہاتھ سے اپنے دُشمن کو پالنے کے لئے انہوں نے اس بچے کو اُٹھالیا، یہ ہے حاصل ان الفاظ کا...... انہوں نے اس غرض سے نہیں پکڑا تھا کہ یہ ہمارا دُشمن ہوگا، نہیں! بلکہ نتیجہ یہ نکلے گا۔ گویا کہ اپنے دُشمن کو اپنے ہاتھ سے پالنے کے لئے یہ اس بچے کو اُٹھا کے لے آئے۔ یہ اگلی بات اللہ کی تقدیر ہے کہ آئندہ جا کے ان کے لئے دُشمن ہوگا، ورنہ انہوں نے اُٹھایا اس نیت سے نہیں ہوگا، بلکہ نتیجہ یہ نکلے گا۔ اپنے اس دُشمن کو جس سے ڈرتے تھے اپنے گھر میں لے آئے۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـِٕیْنَ: بے شک فرعون، ہامان اور ان کے لشکر خطا کار تھے، چُوک گئے اس معاملے میں، جو موسیٰ علیہ السلام کو پکڑ کے انہوں نے پالنا شروع کر دیا کہ حکومت کی سرپرستی میں ان کی پرورش شروع ہوگئی، یہ اپنی جگہ تو بڑے ہوشیار بنتے تھے، لیکن جیسے کہتے ہیں کہ ''چوں قضا آید طبیب ابلہ شود!'' جب تقدیر آتی ہے تو طبیب بھی اندھے ہو جاتے ہیں، ان کو کچھ سمجھ میں نہیں آتا، کچھ نظر نہیں آتا۔ سارا ظلم و ستم تو اسی بچے کے لئے کر رکھا تھا، کہ ایسا بچہ پیدا نہ ہو جائے، ایسا بچہ بڑھ نہ جائے جو حکومت میں انقلاب لے آئے، وہی بچہ جو تھا اس کو پکڑ کے اپنے گھر میں لے آئے، پالنے لگ گئے۔ بڑے چُوکے اس معاملے میں۔ یہاں خٰطِـِٕیْنَ سے یہی مراد ہے کہ اس معاملے میں وہ خطا کر گئے، اپنے مقصد سے چُوک گئے، اللہ نے ان کو اندھا کر دیا، ان کی سمجھ میں یہ بات آئی ہی نہیں۔ وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ: فرعون کی بیوی نے کہا: قُرَّتُ عَیْنٍ لِّیْ وَلَكَ: میرے لئے اور تیرے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، یعنی ہم اس کو دیکھ دیکھ کے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کریں گے، جس طرح سے محبوب بچہ ماں باپ کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک ہوتا ہی ہے۔ کلیجے کی ٹھنڈک، آنکھوں کی ٹھنڈک، دونوں محاورے استعمال ہوتے ہیں۔

لَا تَقْتُلُوْهُ: اسے قتل نہ کرو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آثار سے وہ پہچان تو گئے تھے کہ یہ بنی اسرائیل کا بچہ ہے، اور یہ بھی سمجھ گئے تھے کہ کسی نے اسی خوف وخطرے کی بنا پر اس کو دریا میں ڈال دیا ہے، اور اپنی تجویز کردہ سکیم کے تحت اس کو قتل کرنا چاہیے تھا، لیکن مشورہ یہ ہوا کہ اس کو قتل نہ کرو، اب سوال یہ ہے کہ پھر جو خطرہ تھا تو اس بچے کے متعلق انہوں نے خطرہ کیوں نہ محسوس کیا، کہ کہیں یہی بچہ نہ ہو جو انقلاب لے آئے، اصل میں ان کا مقصد یہ تھا کہ یہ تو بے سمجھ بچہ ہے، ہمارے گھر میں آجائے گا، ہمارے ہاں کھائے گا، پیئے گا، پلے گا، بڑھے گا، اسے پتا ہی نہیں ہوگا کہ میں بنی اسرائیل میں سے ہوں، اور پھر جب ہمارے احسان کے نیچے رہے گا، گھر کا پلا ہوا ہوگا تو ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں بنے گا، یہ چیز ان کے ذہن میں اسی طرح سے آئی۔ یعنی اپنے گھر میں پالنے کی وجہ سے وہ سمجھتے تھے کہ یہ ہمارے ساتھ دُشمنی نہیں کرے گا۔ لَا تَقْتُلُوْهُ: اسے قتل نہ کرو۔ عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ: اُمید ہے کہ یہ ہمیں نفع دے گا۔ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا: یا ہم اس کو بیٹا بنالیں گے، وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ: وہ یہ باتیں کر رہے تھے اور ان کو کچھ پتا نہیں تھا کہ ہونے

والا ہے کیا ہے؟ یہ حکومت کے اسباب کس طرح سے دھرے رہ جاتے ہیں، اللہ کی تقدیر کس طرح سے اپنا رنگ دکھاتی ہے! وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ: بے شعور رہے تھے انہیں پتا ہی نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔

اُمِّ موسیٰ کی بے قراری

وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا: اب موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے اس بچے کو دریا میں ڈال تو دیا، لیکن اب تصور کیجیے! کہ ایک ماں اپنے بچے کو، اپنے ہاتھوں، اپنے اس خیال سے مجبور ہو کر جو اس کے دِل میں ڈال دیا گیا تھا، بچے کو دریا میں بہا تو دیا، لیکن اس کے بعد اس پہ کیا گزری ہوگی؟ ہم تصور ہی کرتے ہیں تو ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، وہ تو ماں تھی۔ تو دریا میں چھوڑ تو دیا لیکن موسیٰ علیہ السلام کی بہن کو کہتی ہے (معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہن بڑی تھی)، اسے کہتی ہے کہ ذرا خیال رکھنا، دیکھنا کہ بچہ کدھر کو جا رہا ہے، یعنی جہاں تک ماں سے ہوسکا، بچے کا پیچھا کیا، اب اگر وہ تابوت کے ساتھ ساتھ چلتی، تو دوسروں کو محسوس ہو جاتا کہ یہ بچہ انہی کا ہے، دُور سے کھڑی ہوئی وہ بہن دیکھتی رہی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آبادی کچھ اس طرح سے تھی کہ اپنی آبادی کے کنارے پہ کھڑے ہو کے شاہی محلات کی طرف جاتے ہوئے اس نے دیکھ لیا، یا دُور دُور، پیچھے پیچھے چلتی رہی تاکہ دیکھے تابوت کدھر کو جاتا ہے، تو یہ نقشہ اس کی بہن دیکھ رہی تھی، آخر وہ تابوت پکڑا گیا، محل میں اس کو لے گئے، بچہ پسند آ گیا، رکھنے کی تجویز ہوگئی کہ اس کو قتل نہیں کیا۔

موسیٰ علیہ السلام کو دُودھ پلانے کا مسئلہ اور وعدۂ اِلٰہی کی تکمیل

اب آپ جانتے ہیں کہ بچہ آیا کرتا ہے تو سب سے پہلے اس کو دُودھ پلانے کی فکر ہوتی ہے، اب یہ فکر ہوئی کہ اس کو دُودھ کون پلائے؟ چونکہ اس زمانے میں عورتیں پرائے بچوں کو دُودھ پلاتی تھیں، جس طرح سے مُرْضِعَہ ہوتی ہیں، حضور ﷺ کے زمانے میں بھی ایسا رواج تھا۔ اب فوراً دُودھ والی عورتوں کو بلانا شروع کر دیا، ہر عورت تو دُودھ نہیں پلایا کرتی، صرف وہی عورت پلایا کرتی ہے جس کے گھر میں بچہ پیدا ہو یا ہوا ہو، عورت کا دُودھ بچے کے پیدا ہونے کے بعد ہی اُترتا ہے، تو جن عورتوں کے ہاں بچے تھے انہوں نے وہ عورتیں بلانی شروع کر دیں، جو عورت آتی ہے موسیٰ علیہ السلام کو پکڑتی ہے، پکڑ کے سینے سے لگانا چاہتی ہے، دُودھ ان کے منہ میں دینا چاہتی ہے، تو وہ دُودھ ہی نہیں لیتے...... یہ موسیٰ علیہ السلام کے محبوبانہ نخرے ہیں، اللہ تعالیٰ نے چونکہ محبوب بنا دیا، بھوک لگی ہوئی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے پابندی لگ گئی، خبردار! بالکل نہیں پینا، اب فرعونیوں نے نخرے تو اُٹھانے تھے، ایک عورت بلائی اس کا دُودھ نہیں لیتے، دُوسری بلائی اس کا دُودھ نہیں لیتے، جتنی عورتیں بلائی جا رہی ہیں اتنا فکر بڑھتا جا رہا ہے کہ کیا کریں گے، اب بچے سے محبت تو ہوگئی، اس کو آنکھوں کی ٹھنڈک تو بنا لیا۔ جب یہ چرچا ہوا کہ عورتیں اپنا دُودھ پیش کرنے کے لیے آتی ہیں لیکن بچہ قبول نہیں کرتا، تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ اسی آمدورفت کے سلسلے میں موسیٰ علیہ السلام کی بہن بھی انہی محلات میں چلی گئی،

جب دُوسری عورتوں کی آمدورفت شروع ہوئی اس بچے کو دیکھنے کے لئے، دُودھ پلانے کے لئے، تو اسی آمدورفت میں وہ بھی اندر چلی گئی۔ جب جا کے نقشہ دیکھا کہ یہ لوگ پریشان ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کسی کا دُودھ نہیں پیتے، اور جتنی دائیاں دُودھ پلانے والی مرضعہ ان کو معلوم تھیں انہوں نے بلالیں، اور پریشان بیٹھے ہیں کہ اب کیا کریں؟ اور کوئی عورت ان کے علم میں نہیں تھی جس کے دُودھ ہو اور وہ بچے کو پلائے، تب اس نے آگے بڑھ کر مشورہ دیا کہ ایک عورت مجھے بھی معلوم ہے، اگر کہو تو میں بلالاؤں، یہ مشورہ ایسے موقع پر دیا جب وہ پریشان ہیں کہ جتنی عورتیں ان کو معلوم تھیں جن کے دُودھ تھا وہ لا کے پیش کر چکے موسیٰ علیہ السلام دُودھ ہی نہیں لیتے، تو ایسے موقع پہ پریشانی تو ہوتی ہے۔ یہ شیشیوں کے ساتھ دُودھ پلانے کا اس وقت رواج نہیں تھا، بچوں کو دُودھ عورتیں ہی پلاتی تھیں، تو موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے درمیان میں یہ شوشہ چھوڑ دیا کہ ایک عورت مجھے بھی معلوم ہے، اور وہ اچھے خاندان کے لوگ ہیں، اگر کہو تو میں اسے بلالاؤں، تو انہیں کیا چاہیے تھا، انہوں نے کہا: جا! دوڑ کے لے آ! جا کے، تو موسیٰ علیہ السلام کی بہن گئی اور اپنی ماں کو بلالائی، موسیٰ علیہ السلام کو جب اس کے سامنے پیش کیا گیا تو موسیٰ علیہ السلام فوراً سینے سے چمٹ کے دُودھ پینے لگ گئے، تو اللہ تعالیٰ کا وہ وعدہ پورا ہوگیا کہ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَیْكِ ہم اس کو تیری طرف لوٹا دیں گے، یہ جدائی عارضی ہے، اللہ کی طرف سے یہ وعدہ پورا ہوگیا اور فرعونیوں کے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کہ بچے نے ایک عورت کا دُودھ قبول کرلیا، اب یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر اندر سے کیا ہے؟ یہ بچہ تو اللہ تعالیٰ کے وعدے کے تحت ماں کی گود میں چلا گیا۔ اب دُودھ پلانے کے لئے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ہی متعین ہوگئیں، اپنی گود میں پالا، دُودھ بھی پلاتی تھی، اور اُلٹا فرعون کے گھر سے وظیفہ بھی جاری ہوگیا، کیونکہ جب بچے کی خدمت کرنی تھی تو اس خدمت کے معاوضے میں وظیفہ بھی جاری ہوگیا، اس طرح اللہ تعالیٰ نے معاشی فائدہ بھی دے دیا۔ آگے یہی قصہ ہے۔

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا: موسیٰ علیہ السلام کی ماں کا دِل فارغ ہوگیا، یعنی صبر سے سکون سے دل خالی ہوگیا، اب سوائے موسیٰ علیہ السلام کے خیال اور فکر کے دل میں اور خیال ہی کوئی نہیں تھا۔ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِیْ بِهٖ: ''اِنْ'' یہ مُخَفَّفَه مِنَ الْمُثَقَّلَه ہے۔ قریب تھا کہ وہ ظاہر کردے اس واقعے کو۔ ''ظاہر کردے'' کا کیا معنی؟ کہ دریا میں چھوڑ دیا، جب وہ بے صبری سی ہوئی، دل کا سکون ختم ہوا، تو ایسے موقع پر عورت زاروقطار رونے لگ جاتی ہے، اور کوئی پوچھے تو کہتی کہ میرا بچہ تھا، دریا میں بہہ گیا، کیونکہ بے صبری کے اندر زبان پر بات آ ہی جاتی ہے۔ قریب تھا کہ وہ اس کو ظاہر کردے، لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا: اگر ہم نے اس کے دل کو مضبوط نہ کیا ہوتا، لیکن ہم نے چونکہ یہ تدبیر بتائی تھی، اور ہماری یہ تدبیر تھی تو ہم نے اس کے دل کو مضبوط کیا، لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ: تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہوجائے۔ اللہ نے اس کے دِل کو مضبوط کردیا تاکہ اس کو اللہ کے اس وعدے کے اوپر یقین ہو، ایمان لانے والوں میں سے ہوجائے کہ اللہ کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا، دِل میں جو پہلا خیال آیا تھا، اسی خیال پر وہ پھر جم گئی، اللہ نے اس کے دِل کو مضبوط کردیا۔ اگر نہ مضبوط کرتے ہم اس کے دِل کو، لِتَكُوْنَ کا معنی یہ ہے کہ ہم نے اس کے دِل کو مضبوط کردیا تاکہ وہ مؤمنین میں

سے ہو جائے۔ وَقَالَتْ لِأُخْتِهٖ قُصِّيْهِ: موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے کہا موسیٰ علیہ السلام کی بہن کو: تُو اس کے پیچھے پیچھے جا، اس کے حالات معلوم کر۔ قَصَّ يَقُصُّ قَصَصًا۔ قَصَّ اَثَرَهٗ: کسی کے نقش قدم پہ چلنا۔ سورۂ کہف (آیت ۶۴) میں لفظ آیا تھا: فَارْتَدَّا عَلٰى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا: وہ اپنے نقش قدم تلاش کرتے ہوئے پیچھے کو لوٹے۔ تو قُصِّيْهِ کا معنی ہے تُو اس کے پیچھے پیچھے چل، اس کے آثار دیکھ۔ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ: پس اس بہن نے دیکھا موسیٰ علیہ السلام کو...... عَنْ جُنُبٍ کا ترجمہ دو طرح سے کیا گیا ہے، اجنبیت سے یعنی موسیٰ علیہ السلام کی بہن ان کو اجنبیت سے دیکھتی رہی، تاکہ کسی کو یہ احساس نہ ہو کہ یہ اس کا بھائی ہے جس کو یہ دیکھ رہی ہے، جیسے ایک چیز بھی جا رہی ہو تو لوگ اجنبیت سے دیکھتے ہیں وہ بھی اسی طرح اجنبی سی بن کر نظر ڈالتی رہی۔ یا جُنُبٍ کا معنی ہے دُور سے۔ دونوں طرح سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ حضرتِ شیخ (الہند) نے ''اجنبی'' والا معنی کیا ہے، اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''دُور سے'' معنی کیا ہے۔ دیکھتی رہی اس موسیٰ کو اجنبی بن کر یا دُور سے۔ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ: اور لوگوں کو پتا ہی نہیں تھا کہ یہ لڑکی ادھر کو آنکھ اُٹھا اُٹھا کے کیوں دیکھتی ہے؟ کسی کو پتا نہیں تھا۔ وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ: حَرَّمْنَا کا لفظی معنی ہے کہ ہم نے حرام ٹھہرا دیں موسیٰ علیہ السلام پر دُودھ پلانے والی عورتیں پہلے سے ہی، اور یہ تحریم تکوینی ہے، یعنی موسیٰ علیہ السلام پر پابندی لگا دی، بندش ڈال دی کہ دُودھ پلانے والی عورتوں سے دُودھ نہیں پیتا، ممنوع کر دیا ہم نے موسیٰ علیہ السلام پر، یہ تکوینی تحریم ہے، یہ شرعی حکم کے طور پر نہیں کہ موسیٰ علیہ السلام اس وقت مکلّف ہو گئے تھے، اگر دُودھ پیتے تو حرام کا ارتکاب ہوتا، ایسی بات نہیں ہے، بلکہ تکوینی طور پر ان پہ پابندی لگ گئی۔ ہم نے حرام ٹھہرا دیا، ممنوع ٹھہرا دیا ان کے اوپر دُودھ پلانے والی عورتوں کو پہلے سے ہی۔ فَقَالَتْ: پھر اس بہن نے کہا: هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰۤى اَهْلِ بَيْتٍ: کیا میں تمہاری راہنمائی کروں ایسے گھر والوں پر يَّكْفُلُوْنَهٗ: جو اس کی کفالت کریں گے تمہارے لیے، وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ: اور وہ اس بچے کے لئے خیر خواہ ہوں گے، خیر خواہی کرنے والے ہیں۔ نٰصِحُوْنَ کا مطلب یہ ہے کہ ان کی طبیعت کچھ ایسی ہے کہ بڑی خیر خواہی سے، بڑی محبت سے اس بچے کو پالیں گے، ایسی عورت بھی مجھے معلوم ہے، بہت شریف سی عورت ہے، اگر بچہ اس کے سپرد کر دیا جائے تو بڑی خیر خواہی کے ساتھ اس بچے کو پالے گی، ایسے گھر والے ہیں، میں تمہاری راہنمائی کروں؟ جو تمہارے لیے اس بچے کی کفالت کریں گے اور وہ اس بچے کے لیے خیر خواہ ہوں گے یعنی محبت اور شفقت کے ساتھ اس کو پالیں گے۔ فَرَدَدْنٰهُ اِلٰۤى اُمِّهٖ: درمیان میں واقعہ محذوف ہے کہ انہوں نے بُلا کر لانے کی اجازت دے دی، بہن گئی، والدہ کو بُلا لائی، تو یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہو گیا، کہ ہم نے لوٹا دیا اس کو اس کی ماں کی طرف، كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا: تاکہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں، وَلَا تَحْزَنَ: اور وہ اس جدائی پر غمزدہ نہ ہو، نہ غم کرے۔ جو پیچھے آیا تھا: وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ، گویا کہ اس واقعے کے ساتھ وہ حزن ختم ہو گیا۔ تاکہ اس کی آنکھ ٹھنڈی ہو جائے، اور نہ غم کرے، اور تاکہ وہ عورت جان لے یعنی موسیٰ کی والدہ، اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ: اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ: لیکن اکثر لوگوں کو علم نہیں ہے، تو وہ اللہ کے وعدوں کو بھی ایسے سمجھتے ہیں، یعنی اس واقعے کے پیش آ جانے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کی ماں کے سامنے ایک واضح دلیل مہیا ہو گئی کہ واقعی اللہ نے جو وعدہ کیا تھا، میرے دل میں جو بات ڈالی تھی، وہ سچی تھی کہ یہ بچہ واپس آ گیا۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰۤى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى

اور جب موسیٰ علیہ السلام پہنچ گئے اپنی جوانی کو اور ہر طرح سے دُرست ہو گئے تو ہم نے ان کو حکمت اور علم دیا، اور ایسے ہی بدلہ دیا کرتے ہیں ہم

الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴﴾ وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ

محسنین کو ﴿۱۴﴾ اور موسیٰ شہر میں داخل ہوئے شہر والوں کی غفلت کے وقت، پایا موسیٰ علیہ السلام نے اس شہر میں دو آدمیوں کو

يَقْتَتِلٰنِ ۚ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِىْ مِنْ شِيْعَتِهٖ

جو آپس میں لڑتے تھے، یہ شخص موسیٰ کی جماعت میں سے تھا، اور یہ شخص موسیٰ علیہ السلام کے دشمنوں میں سے تھا، پھر مدد چاہی اس شخص نے جو موسیٰ کی جماعت

عَلَى الَّذِىْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ۚ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ

میں سے تھا اس شخص کے خلاف جو موسیٰ کے دشمنوں میں سے تھا، موسیٰ نے اس کے مکا مارا، اور اس پر موت طاری کر دی، موسیٰ نے کہا کہ یہ شیطان

الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّىْ ظَلَمْتُ نَفْسِىْ

کے عمل سے ہے، بے شک شیطان دشمن ہے گمراہ کرنے والا صریح طور پر ﴿۱۵﴾ موسیٰ نے کہا: اے میرے رَبّ! بے شک میں نے ظلم کیا اپنے آپ پر،

فَاغْفِرْ لِىْ فَغَفَرَ لَهٗ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶﴾ قَالَ رَبِّ بِمَاۤ

پس تُو مجھے بخش دے، پھر اللہ نے اسے بخش دیا، بے شک وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ﴿۱۶﴾ موسیٰ نے کہا: اے میرے رَبّ! بسبب اس کے

اَنْعَمْتَ عَلَىَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۷﴾ فَاَصْبَحَ فِى الْمَدِيْنَةِ خَآئِفًا

کہ تُو نے میرے پہ احسان کیا، ہرگز نہیں ہوں گا میں مددگار مجرموں کے لئے ﴿۱۷﴾ پھر صبح کی موسیٰ نے شہر میں ڈرتے ہوئے

يَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِى اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ يَسْتَصْرِخُهٗ ؕ قَالَ لَهٗ مُوْسٰۤى اِنَّكَ لَغَوِىٌّ

حالات کا انتظار کرتے ہوئے، پس اچانک وہ شخص جس نے مدد مانگی تھی موسیٰ سے کل، آج پھر مدد کا مطالبہ کر رہا تھا، کہا اس کو موسیٰ علیہ السلام نے: بے شک تُو البتہ صریح

مُّبِيْنٌ ﴿۱۸﴾ فَلَمَّاۤ اَنْ اَرَادَ اَنْ يَّبْطِشَ بِالَّذِىْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ يٰمُوْسٰۤى اَتُرِيْدُ اَنْ

گمراہ ہے ﴿۱۸﴾ پس جب ارادہ کیا موسیٰ علیہ السلام نے گرفت کرنے کا اس شخص پر جو دونوں کا دشمن تھا، تو اسرائیلی بول پڑا کہ اے موسیٰ! کیا تُو ارادہ کرتا ہے

تَقْتُلَنِىْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْاَمْسِ ۖ اِنْ تُرِيْدُ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِى الْاَرْضِ

کہ مجھے قتل کر دے جیسے قتل کیا تُو نے ایک نفس کل، نہیں ارادہ کرتا تُو مگر یہ کہ ہو جائے سرکش زمین میں،

وَمَا تُرِيدُ أَنْ تَكُونَ مِنَ الْمُصْلِحِينَ ﴿١٩﴾ وَجَاءَ رَجُلٌ مِّنْ أَقْصَا الْمَدِينَةِ يَسْعَىٰ

اور نہیں ارادہ کرتا تُو کہ ہوجائے اصلاح کرنے والوں میں سے ⑲ آیا ایک آدمی شہر کی دُور کی جانب سے دوڑتا ہوا،

قَالَ يَٰمُوسَىٰٓ إِنَّ الْمَلَأَ يَأْتَمِرُونَ بِكَ لِيَقْتُلُوكَ فَاخْرُجْ إِنِّي لَكَ مِنَ النَّٰصِحِينَ ﴿٢٠﴾

اس نے کہا: اے موسیٰ! بے شک سردار لوگ مشورہ کرتے ہیں تیرے متعلق تاکہ تجھے قتل کردیں، پس نکل جا تُو، بے شک میں تیرے لئے خیرخواہوں میں

فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ ۖ قَالَ رَبِّ نَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّٰلِمِينَ ﴿٢١﴾

سے ہوں ⑳ موسیٰ اس شہر سے نکل گئے ڈرتے ہوئے حالات کا انتظار کرتے ہوئے، کہا موسیٰ نے: اے میرے رَبّ! نجات دے مجھ کو ظالم لوگوں سے ㉑

تفسیر

موسیٰ علیہ السلام کس عمر میں علم وحکمت سے نوازے گئے؟

وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَاسْتَوَىٰ: اب اسی طرح سے فرعون کے محلات میں ان کی تربیت ہوتی رہی۔ اور جب موسیٰ علیہ السلام پہنچ گئے اپنی جوانی کو۔ اَشُدّ کہتے ہیں شدت اور قوت کی اِنتہا کو۔ بچہ کمزور ہوتا ہے، آہستہ آہستہ بڑھتا چلا جاتا ہے، قوت اس میں آتی چلی جاتی ہے، آخر ایک وقت آتا ہے جب یہ اپنے پورے عروج پہ چلا جاتا ہے، کہ اس کے بعد اس نے آگے بڑھنا نہیں ہوتا۔ کہتے ہیں کہ ۳۳ سال کی عمر تک انسان کی بدنی قوتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ تو ۳۳ سال تک انسان بھرپور جوان ہوجاتا ہے، اور اس کے آگے قوت بڑھتی نہیں ہے، چالیس سال تک پھر اس قوت میں ٹھہراؤ ہوتا ہے، چالیس سال کے بعد پھر ان قوتوں میں زوال شروع ہوجاتا ہے۔ تو ۳۳ سے لے کر ۴۰ سال تک کی عمر جو ہوتی ہے، یہ ہوتی ہے پوری بھرپور جوانی۔ تو اَشُدّ کا معنی یہ ہے کہ جب وہ پورے بھرپور جوان ہوگئے، ۳۳۔ ۳۴ سال کے ہوگئے۔ جب پہنچ گئے وہ اپنی شدت کو جوانی کو، قوت کی اِنتہا کو، وَاسْتَوَىٰ: اور ہر طرح سے درست ہوگئے، معتدل مزاج، عقل کے اعتبار سے، فہم کے اعتبار سے، طبیعت کے اعتبار سے، مستوی ٹھیک درست ہوگئے، یعنی دونوں باتوں کی طرف اشارہ کردیا کہ بدنی قوت بھی اِنتہا کو پہنچ گئے، اور عقل وفہم بھی ٹھیک ہوگیا، بچپن کے اثرات ختم ہوگئے، پوری طرح سے سنبھل گئے۔ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا: ہم نے ان کو حکمت اور علم دیا، یہ علم وحکمت نبوت سے پہلے کی ہے، نبوّت تو بعد میں ملتی ہے موسیٰ علیہ السلام کو، کیونکہ نبی اپنے وقت کا فہیم ہوتا ہے، اعقلُ النّاس ہوتا ہے، تو ہم نے اس کو علم وحکمت دی۔ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ: اور ہم محسنین کو ایسے ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔ جن کا کردار اچھا ہوتا ہے، جن کی طبیعت میں احسان ہوتا ہے، ہر کسی کے ساتھ بھلائی کرنے کا جذبہ ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ ان کے علم وحکمت میں اضافہ فرماتے ہیں۔ ایسے ہی بدلہ دیا کرتے ہیں ہم محسنین کو۔

موسیٰ علیہ السلام کا اُنس شروع سے اِسرائیلیوں کے ساتھ تھا

وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا: واقعے کا یہ جز بھی نیا ہے جو پہلے کسی سورت میں آپ کے سامنے نہیں گزرا۔ واقعات کی رَوِش سے معلوم یوں ہوتا ہے، کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ سمجھتے تھے کہ میں قبطیوں میں سے نہیں ہوں، بلکہ بنی اسرائیلیوں میں سے ہوں، یہ بات توان کو معلوم ہوگئی ہوگی، چرچا بھی ہوگا، جیسے میں نے اِبتداءً عرض کیا ہے کہ وہ بچہ جب بہتا ہوا آیا تھا، تو لوگوں کو یہ پتا تو چل گیا ہوگا کہ یہ بنی اسرائیل میں سے ہے، اور خوف وخطرے کے تحت ہی دریا میں بہایا گیا ہے، تو اس قسم کے تذکروں سے بھی بچوں کو معلوم ہو جاتا ہے، کہ میں اس قوم کا نہیں ہوں، بلکہ انہوں نے مجھے پکڑ کر پالا ہوا ہے، کچھ اللہ تعالیٰ نے جو فطرتِ سلیمہ دی تھی، عقل وفہم دیا تھا، اس کے ساتھ بھی وہ حالات کو سمجھتے تھے، قبطیوں کے ظلم کو بھی دیکھتے تھے، اور بنی اسرائیل کی مظلومیت بھی ان کی آنکھوں کے سامنے تھی، اور اپنی فطرت کی وجہ سے ہی ان کو ہمدردی مظلوموں کے ساتھ تھی، اور ان ظالموں کے ساتھ ان کو کوئی محبت اور اُنس نہیں تھا، اور ایسے معلوم ہوتا ہے کہ آئے دِن وہ مظلوموں کی حمایت میں کچھ بولتے رہتے ہوں گے، اور ظالموں کے اُوپر وہ کچھ روک ٹوک کرتے رہتے ہوں گے، جس کی بنا پر فرعونیوں کو، فرعون کے خاندان کو بھی معلوم تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی کچھ نہ کچھ ہمدردیاں ان کے ساتھ ہیں، اس قسم کے تذکرے آپس میں ہورہے تھے۔

موسیٰ علیہ السلام کا شہر میں گشت

توحضرت موسیٰ علیہ السلام حالات معلوم کرنے کے لئے کبھی کبھی شہر کے اندر گشت کرتے کہ لوگ کس طرح سے رہتے ہیں، کیا کچھ ہو رہا ہے، حالات کا جائزہ لیتے، تو ایک وقت ایسا تھا کہ جب لوگ غفلت میں تھے، یا تو رات کا وقت تھا، یا دوپہر کا وقت تھا کیونکہ دوپہر کو بھی لوگ عموماً اپنے اپنے کمروں میں گھس کے سوجاتے ہیں، اور باہر تقریباً سنسان ہو جاتا ہے، خاص طور پر گرمیوں کے موسم میں، عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا کا یہی معنی ہے کہ ایسے وقت میں جب عام لوگ غفلت میں تھے، زیادہ چلنا پھرنا نہیں تھا، گلیوں میں آمدورفت نہیں تھی، ایسے وقت میں موسیٰ علیہ السلام کہیں شہر میں چکر لگانے کے لئے نکلے، ہوسکتا ہے کہ اس بستی کی طرف گئے ہوں جو بنی اسرائیل کی تھی، اور جس عورت نے دُودھ پلایا تھا، چاہے لوگوں کو پتا نہ ہو کہ یہ موسیٰ علیہ السلام کی ماں ہے، لیکن موسیٰ علیہ السلام تو جانتے تھے، اور اس گھر میں پلے تھے، تو ان کو ملنے جلنے کے لئے اور ان کے حالات معلوم کرنے کے لئے بھی جاتے ہوں گے، اور کسی کو اِعتراض بھی نہیں ہوگا، چونکہ اس گھر میں دُودھ پیا تھا، اور اسی عورت نے ان کو پالا تھا، ماں کے درجے میں تھی، یعنی اگر لوگ حقیقی ماں نہ سمجھیں، تو مرضعہ تو تھی، تو ان کا حال چال دیکھنے کے لئے اِدھر آتے جاتے ہوں گے۔

قبطی کا قتل

جارہے تھے، تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک قبطی ایک اسرائیلی کے ساتھ اُلجھا ہوا ہے، دونوں آپس میں لڑ رہے ہیں، اور اسرائیلیوں کو بھی معلوم تھا کہ موسیٰ اگرچہ فرعون کے گھر میں رہتا ہے، لیکن اس کی ہمدردیاں مظلوموں کے ساتھ ہیں۔ آخر ۳۳۔۳۴

سال جو ہو گئے تھے رہتے ہوئے، تو حالات کچھ نہ کچھ معلوم ہوتے ہیں۔ اس اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی حمایت کے لئے بلایا کہ مجھے اس کے ظلم سے بچاؤ، یہ میرے اوپر زیادتی کر رہا ہے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام ادھر متوجہ ہوئے، دل تو ان کا پہلے ہی کڑھتا رہتا تھا قبطیوں کے ظلم پر، تو معلوم یوں ہوتا ہے کہ پہلے کچھ زبانی سمجھایا ہوگا، لیکن وہ قبطی آگے سے اکڑا، آخر وہ فرعون کی قوم کا تھا، اہلِ حکومت میں سے تھا، جب آگے سے اکڑا اور باز نہیں آیا، اور ہوسکتا ہے کہ وہ موسیٰ علیہ السلام پر بھی لپکا ہو، جیسا کہ اس قسم کے لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ چھڑانے والوں پر بھی ہاتھ اُٹھا لیتے ہیں، تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دفاع کے لئے، یا اس کو تنبیہ کے لئے، تادیب کے لئے ایک مکا رسید کر دیا، اور وہ مکا کہیں ایسا لگا کہ اس قبطی نے تو پانی نہیں مانگا، وہیں چت، تو مکے کا لگنا تھا قبطی مر گیا، جب وہ قبطی مر گیا تو موسیٰ علیہ السلام چونکہ بہت فہیم تو تھے ہی، عقل سلیم تھی، حالات کو سمجھتے تھے، فوراً چونک گئے، کہ یہ تو غلطی ہوگئی۔

موسیٰ علیہ السلام نے قبطی کے قتل کو غلطی کیوں کہا؟

اب چاہے قبطی کافر تھا اور وہ اسرائیلی مسلمان ہو، چونکہ اسرائیلی تو خاندانی طور پر نبوّت کا خاندان تھا، لیکن یہاں بحث یہ ہے کہ کوئی آپس میں جہاد کا اعلان تو تھا نہیں، کسی کافر کی جان اور مال اس وقت مباح ہوتا ہے جس وقت کہ آپس میں حرب جاری ہو، لڑائی جاری ہو، جہاد کی صورت ہو، اور جہاں آپس میں حرب نہیں بلکہ ایک ہی حکومت میں آپس میں لوگ مل جل کے رہتے ہیں تو ایک دوسرے کی جان مال میں تصرف کرنا جائز نہیں ہوتا، جس طرح سے آپ کے پڑوسی ملک ہندوستان میں کافر اور مسلمان دونوں ہی ایک حکومت کے تحت رہتے ہیں، چاہے حکومت ہندوؤں کی پاسداری کرتی ہو، مسلمانوں پر بعض معاملات میں زیادتی کرتی ہو، تو بھی کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ کسی ہندو کو کافر سمجھتے ہوئے مار دے، یا اس کے مال کو لوٹ لے، جان مال کا تحفظ جانبین میں ایک دوسرے کو حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح سے یہاں بھی اسرائیلی اور قبطی اکٹھے ایک حکومت میں رہتے تھے، چاہے وہ طبقے کے طور پر ظالم ہی ہوں، لیکن اس عملی معاہدے کے طور پر، اس عملی زندگی کے طور پر، دونوں کے ذِمّے تھا ایک دوسرے کے جان و مال کی حفاظت کرنا۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قتل کا ارادہ تو نہیں کیا تھا، لیکن آپ کے ایک مکے کے ساتھ جو نتیجہ نکل آیا، تو یہ بات اس معاشرتی ضوابط کے خلاف تھی، اس لئے اس کو غلطی قرار دیا، یہ ایک بات...... دوسری بات یہ ہے کہ آنے والے حالات کے اعتبار سے بھی یہ غلطی تھی کہ اگر یہ پتا چل گیا کہ اسرائیلی اور قبطی آپس میں لڑ رہے تھے اور میں نے قبطی کو مار دیا، اور لوگوں کو پتا تو ہے کہ میں بھی اسرائیلی ہوں، تو یہ طبقاتی جنگ چھڑ جائے گی، اور قبطی اسرائیلیوں پر مزید ظلم شروع کر دیں گے، اور اس طرح سے اسرائیلی بیچارے مزید قبطیوں سے پٹیں گے اور ان کے ہاتھوں قتل ہوں گے، جس طرح سے طبقاتی منافرت پھیل جانے کے بعد جب طبقاتی جنگ چھڑ جاتی ہے، آپس میں یہ فسادات جو ہوتے ہیں، آئے دن آپ خبریں پڑھتے رہتے ہیں ہندوستان کے متعلق، صحیح غلط جیسی خبریں آتی ہیں، مذہبی اختلاف کی بنا پر جنگ چھڑ جائے، یا کسی اور وجہ سے، جیسے پچھلے دنوں میں اچھوتوں کے ساتھ، ہریجنوں کے ساتھ بھی ہندوؤں کی لڑائیاں تھیں، تو ایک دوسرے کو پھر لوگ مارتے ہیں، فساد شروع ہو جاتا ہے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ فساد شروع نہیں کروانا چاہتے تھے، اور اس میں اپنی قوم کے لیے خطرہ محسوس کرتے تھے کہ قبطیوں کا ظلم بڑھ جائے گا اور اسرائیلی زیادہ نقصان

اُٹھائیں گے، اس لئے فوراً چونک اٹھے کہ یہ تو غلطی ہوگئی، اور فوراً اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ استغفار کی، چونکہ اہلِ نبوّت خاندان میں سے تھے، ان سب چیزوں کو جانتے سمجھتے تھے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دِل میں یہ بات ڈالی گئی کہ آپ کا یہ گناہ معاف ہوگیا، کیونکہ یہ آپ نے قصداً نہیں کیا، بلکہ بغیر قصد اور بغیر ارادے کے اصلاح کے جذبے سے تنبیہ کی تھی لیکن وہ مرگیا، اس لیے یہ حقیقتاً گناہ نہیں تھا۔ خیر! جو اسرائیلی تھا وہ بھی چھوٹ کر چلا گیا، موسیٰ علیہ السلام بھی چلے گئے، لیکن موسیٰ علیہ السلام کے دِل میں یہ خوف اور خطرہ رہا کہ اس واقعے کی بنا پر کہیں حالات خراب نہ ہو جائیں۔

اِسرائیلی کی دوبارہ شرارت

اگلے دِن حضرت موسیٰ علیہ السلام پھر حالات کی ٹوہ لگانے کے لئے (ترقّب: حالات کا جائزہ لینا، اندازہ کرنا کہ کیا ہو رہا ہے؟) حالات کا جائزہ لینے کے لیے، اور اس واقعے کی بنا پر دِل میں خوف اور خطرہ محسوس کرتے ہوئے کہ کہیں اس واقعے کے ساتھ طبقاتی کشمکش نہ چھڑ جائے، لوگ کہیں گے کہ کسی اسرائیلی نے مارا ہوگا، اور وہ انتقام لینے کے لیے اسرائیلیوں کو مارنا شروع کردیں، اس خوف اور خطرہ کو محسوس کرتے ہوئے حالات کا جائزہ لینے کے لیے باہر شہر میں آئے، جب آگے آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہی اسرائیلی پھر کسی قبطی کے ساتھ لڑ رہا ہے، اور موسیٰ علیہ السلام کل بھی اس کو لڑتا ہوا دیکھ چکے تھے، تو انہوں نے اندازہ کیا کہ ضروری نہیں کہ ہر دفعہ قبطی کا ہی ظلم ہو، قبطی کی ہی زیادتی ہو، یہ آدمی بھی شرارتی معلوم ہوتا ہے، جب دیکھو کسی نہ کسی کے ساتھ اُلجھا بیٹھا ہے، موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا تو اس نے موسیٰ علیہ السلام کو پھر متوجہ کیا، مدد کے لئے پکارا، اب موسیٰ علیہ السلام نے چاہا تو اس کو چھڑانا، لیکن زبان کے ساتھ تنبیہ اس اسرائیلی کو کی کہ تو بڑا شریر معلوم ہوتا ہے، بڑا گمراہ ہے، جب دیکھو کسی نہ کسی کے ساتھ لڑ رہا ہے، جب دیکھو کسی نہ کسی کے ساتھ اُلجھ رہا ہے، زبان سے تنبیہ کر رہے ہیں اسرائیلی کو، لیکن ہاتھ ڈالنے کا ارادہ کیا قبطی کو کہ پکڑ کے چھڑا دیں، یہ آپس میں جو اُلجھے ہوئے ہیں ان کو علیحدہ علیحدہ کر دیا جائے، زبان سے تنبیہ اسرائیلی کو ہو رہی ہے، ہاتھ بڑھ رہا ہے قبطی کو پکڑنے کے لیے، لیکن وہ بیوقوف اسرائیلی یہ سمجھا کہ جب ڈانٹ مجھے رہے ہیں، تو شاید آج میرے مکّا آیا، اور وہ مکّے کا نمونہ کل دیکھ چکا تھا، کہ جب یہ لگے تو پھر فرصت نہیں ملتی، اس لئے وہ ڈر گیا، ڈر کے اس بدبخت نے یہ راز ظاہر کر دیا۔ کہنے لگا کہ موسیٰ! مجھے بھی اسی طرح سے مارنا چاہتے ہو، جس طرح سے کل ایک آدمی قتل کر دیا، میں نے تجھے بلایا ہے کہ تُو ہماری صلح کرادے، اصلاح کر دے، تُو تو بڑا سرکش ہے کہ جب کوئی اس قسم کی بات ہوتی ہے تو ٹھکانے ہی لگا دیتا ہے۔ بس یہ بات اس اسرائیلی نے جو کہی، بحث تو شہر میں چل ہی رہی تھی کہ اس قبطی کو کس نے قتل کر دیا؟ تو یہ راز ظاہر ہوگیا اور معلوم ہوگیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس کو مارا ہے، تو فرعونیوں کو خطرہ پہلے ہی تھا کہ یہ بچہ کچھ اس طرح سے سر اُٹھاتا جا رہا ہے، کہیں یہ ہمارے لئے خطرہ نہ بن جائے۔

موسیٰ علیہ السلام کے قتل کا مشورہ اور موسیٰ علیہ السلام کو اِطلاع

جب یہ واقعہ پیش آ گیا تو پھر تجویزیں شروع ہوگئیں کہ اس کو قتل کر دادو، اور جب دربار کے اندر بیٹھے ہوئے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کروانے کی تجویز ہو رہی تھی، تو آخر آپ جانتے ہیں کہ جہاں ۳۲، ۳۳، ۳۵ سال موسیٰ علیہ السلام رہے تھے، وہاں دوستیاں اور

محبتیں، اور ایک دوسرے کے ساتھ تعلق ہو ہی جاتا ہے، تو فرعون کے دربار میں بھی بعضے لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خیر خواہ تھے، ان میں سے ایک آدمی جلدی سے چھپ چھپا کے مجلس سے اُٹھ کے آیا، آ کے موسیٰ علیہ السلام کو اطلاع دی کہ دیکھو! میں تمہارے ساتھ خیر خواہی کر رہا ہوں، یہ سردار لوگ، یہ اراکینِ سلطنت تیرے قتل کا مشورہ کر رہے ہیں، تُو یہاں سے نکل جا، تو اس نے آ کے موسیٰ علیہ السلام کو اطلاع دی، تو موسیٰ علیہ السلام بھی خطرہ محسوس کر رہے تھے، اس لیے وہیں شہر سے نکل پڑے، کدھر کو نکل پڑے؟ آگے کا کوئی پروگرام نہیں تھا، بس یہ خیال تھا کہ دوسرا مشہور شہر مدین ہے، جو مصر کی حدود سے باہر ہے اور قریب ہے، تو میں یہاں سے نکل کے وہاں چلا جاؤں، راستہ معلوم نہیں، زادِ راہ پاس نہیں، بس اللہ کے اُوپر بھروسا کرتے ہوئے وہاں سے نکلے اور مدین پہنچ گئے...... اور کہتے ہیں کہ وہاں سے مدین کا سفر آٹھ دِن کی مسافت کا تھا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس نہ کوئی سامان نہ کوئی زادِ راہ، اور نہ راستہ جاننے والے، اللہ پر بھروسا کرتے ہوئے وہاں سے نکلے اور مدین پہنچ گئے (مظہری)۔ آگے پھر مدین میں پہنچنے کے بعد جو واقعہ پیش آیا، وہ مذکور ہے۔

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

یہاں تک آیات کا ترجمہ دیکھ لیجئے، وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ: شہر میں داخل ہوئے، عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا شہر والوں کی غفلت کے وقت۔ فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ: پایا موسیٰ علیہ السلام نے اس شہر میں دو آدمیوں کو جو آپس میں لڑتے تھے۔ اقتتال: آپس میں لڑنا۔ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ: یہ شخص موسیٰ علیہ السلام کی جماعت سے تھا۔ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ: اور یہ شخص موسیٰ علیہ السلام کے دشمنوں میں سے تھا۔ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ: پھر مدد چاہی، غوث کا مطالبہ کیا، مدد کا مطالبہ کیا موسیٰ علیہ السلام سے اس شخص نے جو موسیٰ علیہ السلام کی جماعت میں سے تھا، عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ: اس شخص کے خلاف جو موسیٰ علیہ السلام کے دشمنوں میں سے تھا، یعنی اسرائیلی نے اس قبطی کے خلاف موسیٰ علیہ السلام سے مدد چاہی، فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى: موسیٰ علیہ السلام نے اس کے مکّا مارا۔ وَکز کہتے ہیں کہ اُنگلیاں اکٹھی کر کے یوں مٹھی بند کر کے کسی کو مارنا، جس کو ہمارے ہاں مکّا مارنا کہتے ہیں۔ فَقَضٰى عَلَيْهِ: اس پہ موت طاری کر دی، اس کا کام تمام کر دیا، قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ: موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ یہ شیطان کے عمل سے ہے، یعنی یہ شیطانی حرکت ہوگئی، یہ اچھی بات نہیں ہوئی، اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ: بے شک وہ شیطان دشمن ہے، گمراہ کرنے والا صریح طور پر، ظاہری دشمن ہے، جس طرح سے ہر گناہ کی نسبت شیطان کی طرف ہو جایا کرتی ہے، تو موسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنی لغزش کو شیطان کی طرف منسوب کیا۔ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ: موسیٰ علیہ السلام نے کہا اے میرے رَبّ! بے شک میں نے ظلم کیا اپنے آپ پر، کیونکہ ہر گناہ کرنا انسان کا اپنے نفس پر ہی ظلم ہے۔ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ: پس اے اللہ! تُو مجھے بخش دے۔ اے میرے رَبّ! تُو مجھے بخش دے۔ پھر اللہ نے اسے بخش دیا۔ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ: بے شک وہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے آئندہ کے لئے عہد کیا، جس طرح سے توبہ کا طریقہ ہے کہ پچھلے پہ ندامت کا اظہار ہو، آئندہ کے لئے عہد ہو کہ میں پھر ایسی حرکت نہیں کروں گا۔ قَالَ رَبِّ: تو موسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں کہ اے میرے رَبّ! بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ: بسبب اس کے

کہ تُو نے میرے پہ احسان کیا یعنی تیرے احسانات میرے پہ بہت ہیں، فَلَنْ اَکُوْنَ ظَہِیْرًا لِّلْمُجْرِمِیْنَ: ہرگز نہیں ہوں گا میں مددگار مجرموں کے لئے۔ مجرمین کے لفظ سے اشارہ اس بات کی طرف بھی معلوم ہوتا ہے کہ کچھ جرم اس اسرائیلی کا بھی ہوگا جو اس قبطی کے ساتھ لڑ رہا تھا، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں کہ ایسے لوگ جو خود جرم میں مبتلا ہوں اور دوسرے کو بہکا کے جرم میں شریک کرنا چاہیں، میں ایسے لوگوں کا مددگار نہیں ہوں گا۔ اور مجرمین سے شیاطین بھی مراد ہیں، کیونکہ وہ بھی جرم پر برانگیختہ کرنے والے ہیں۔ فَاَصْبَحَ فِی الْمَدِیْنَۃِ خَآئِفًا یَّتَرَقَّبُ: پھر صبح کی موسیٰ علیہ السلام نے شہر میں ڈرتے ہوئے حالات کا انتظار کرتے ہوئے، حالات کو ٹوہ لگاتے ہوئے۔ فَاِذَا الَّذِی اسْتَنْصَرَہٗ بِالْاَمْسِ: پس اچانک وہ شخص جس نے مدد مانگی تھی موسیٰ علیہ السلام سے کل، یَسْتَصْرِخُہٗ: وہ آج پھر مدد کا مطالبہ کر رہا تھا۔ استصراخ کا معنی ہوتا ہے کسی شخص کو بلند آواز سے پکار کر اپنی مدد کے لئے بلانا۔ قَالَ لَہٗ مُوْسٰی: موسیٰ علیہ السلام نے اس اسرائیلی سے کہا جو موسیٰ علیہ السلام کو مدد کے لئے بلا رہا تھا۔ کہا اس کو موسیٰ علیہ السلام نے: اِنَّکَ لَغَوِیٌّ مُّبِیْنٌ: بے شک تُو البتہ صریح گمراہ ہے، یعنی معلوم ہوتا ہے کہ تُو ہی شرارتی ہے، ہر روز کسی نہ کسی سے لڑتا ہے۔ فَلَمَّآ اَنْ اَرَادَ اَنْ یَّبْطِشَ بِالَّذِیْ ہُوَ عَدُوٌّ لَّہُمَا: پس جب ارادہ کیا موسیٰ علیہ السلام نے گرفت کرنے کا اس شخص پر جو کہ دونوں کا دشمن تھا، یعنی زبان سے تو اسرائیلی کو ڈانٹ رہے تھے، پکڑنا چاہا قبطی کو، قَالَ یٰمُوْسٰی: وہ اسرائیلی بول پڑا کہ اے موسیٰ! اَتُرِیْدُ اَنْ تَقْتُلَنِیْ: کیا تُو ارادہ کرتا ہے کہ تُو مجھے قتل کردے، کَمَا قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِالْاَمْسِ: جیسے قتل کیا تو نے ایک نفس کل، اِنْ تُرِیْدُ اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ جَبَّارًا فِی الْاَرْضِ: نہیں ارادہ کرتا تُو مگر یہ کہ ہوجائے سرکش زمین میں، مُلک میں، جبار: زور آور، سینہ زور۔ وَمَا تُرِیْدُ اَنْ تَکُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِیْنَ: اور نہیں ارادہ کرتا تُو کہ ہوجائے اصلاح کرنے والوں میں سے، یعنی تُو مصلحین میں سے نہیں بننا چاہتا بلکہ تُو جبار اور سینہ زور بن کر رہنا چاہتا ہے۔ وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِیْنَۃِ یَسْعٰی: آیا ایک آدمی شہر کی دُور کی جانب سے دوڑتا ہوا۔ اقصیٰ: دُور والی جانب۔ اس نے کہا: یٰمُوْسٰٓی اِنَّ الْمَلَاَ یَاْتَمِرُوْنَ بِکَ لِیَقْتُلُوْکَ: بے شک ارکان، سردار لوگ مشورہ کرتے ہیں تیرے متعلق تاکہ تجھے قتل کردیں، فَاخْرُجْ اِنِّیْ لَکَ مِنَ النّٰصِحِیْنَ: پس نکل جا تُو، بے شک میں تیرے لئے خیر خواہوں میں سے ہوں۔ فَخَرَجَ مِنْہَا خَآئِفًا یَّتَرَقَّبُ: موسیٰ علیہ السلام اس شہر سے نکل گئے ڈرتے ہوئے حالات کا انتظار کرتے ہوئے، کہ نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ ٹوہ لگاتے ہوئے۔ قَالَ رَبِّ نَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ: کہا موسیٰ علیہ السلام نے کہ اے میرے رَبّ! نجات دے مجھ کو ظالم لوگوں سے۔

وَلَمَّا تَوَجَّہَ تِلْقَآءَ مَدْیَنَ قَالَ عَسٰی رَبِّیْٓ اَنْ یَّہْدِیَنِیْ سَوَآءَ السَّبِیْلِ ﴿۲۲﴾

جس وقت متوجہ ہوئے موسیٰ علیہ السلام مدین کی طرف تو کہا: اُمید ہے کہ میرا رَبّ مجھے سیدھے راستے کی ہدایت کرے گا ﴿۲۲﴾

وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْیَنَ وَجَدَ عَلَیْہِ اُمَّۃً مِّنَ النَّاسِ یَسْقُوْنَ ۬ وَوَجَدَ مِنْ

جس وقت وارد ہوئے مدین کے پانی پر تو پایا اس پر لوگوں کی جماعت کو جو پانی پلا رہے تھے (جانوروں کو) اور پایا ان آدمیوں

دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ؕ قَالَتَا لَا نَسْقِيْ

کے پیچھے دوعورتوں کو جو اپنے جانوروں کو روکے کھڑی تھیں، موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا: تمہارا کیا واقعہ ہے؟ وہ کہنے لگیں: ہم پانی نہیں پلائیں گی

حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ سکتہ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ ﴿۲۳﴾ فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ

جس وقت تک چرواہے لوٹا کر نہ جائیں، اور ہمارا باپ بوڑھا ہے ﴿۲۳﴾ موسیٰ نے پانی پلا دیا ان دونوں کے لئے، پھر مڑ گئے سائے کی طرف

فَقَالَ رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ﴿۲۴﴾ فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا

اور کہا: اے میرے رَبّ! بے شک میں محتاج ہوں اس بھلائی کی طرف جو تُو میری طرف اُتار دے ﴿۲۴﴾ آئی موسیٰ کے پاس ان دوعورتوں میں سے ایک،

تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ ۫ قَالَتْ اِنَّ اَبِيْ يَدْعُوْكَ لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا ؕ فَلَمَّا

چلتی تھی شرماتی ہوئی، کہنے لگی کہ بے شک میرا باپ آپ کو بُلاتا ہے تاکہ آپ کو بدلہ دے ہمارے لئے پانی پلانے کا، جب

جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ۫ وقفۃ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ

موسیٰ علیہ السلام ان کے اَبّا (شعیب) کے پاس آئے اور واقعہ ان پر بیان کیا، تو شعیب نے کہا کہ خوف نہ کیجئے، آپ ظالم لوگوں سے

الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ۫ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ

نجات پا گئے ﴿۲۵﴾ ان دوعورتوں میں سے ایک نے کہا: اے اَبّا! اس کو اَجیر بنالو، بے شک جس کو بھی تُو اُجرت پر رکھے ان میں سے بہترین آدمی

الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ﴿۲۶﴾ قَالَ اِنِّيْٓ اُرِيْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ عَلٰٓى اَنْ

قوی امین ہوتا ہے ﴿۲۶﴾ شعیب نے کہا: میں ارادہ کرتا ہوں کہ نکاح کردوں تیرے ساتھ اپنی ان دو بچیوں میں سے ایک کا، اس شرط پر کہ

تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ ۚ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ۚ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اَشُقَّ

تُو میرے ہاں مزدوری کرے آٹھ سال، پس اگر تُو دس پورے کردے تو یہ تیری جانب سے ہے، اور میں تیرے اُوپر سختی کرنے کا

عَلَيْكَ ؕ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَ

ارادہ نہیں کرتا، عنقریب تو پائے گا مجھے اگر اللہ نے چاہا اچھے لوگوں میں سے ﴿۲۷﴾ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ یہ بات میرے اور آپ کے

بَيْنَكَ ؕ اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿۲۸﴾ ع

درمیان ہوگئی، ان دونوں مدّتوں میں سے جو مدّت میں پوری کردوں تو میرے پہ کوئی زیادتی نہیں، اللہ وکیل ہے اس بات پر جو ہم کہتے ہیں ﴿۲۸﴾

تفسیر

مدین کا سفر اور اِنتخابِ مدین کی وجہ

اس رُکوع میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مدین پہنچنے کے بعد جو واقعہ پیش آیا وہ مذکور ہے۔ حاصل اس واقعے کا یہی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکلے، ڈرتے ہوئے، حالات کا انتظار کرتے ہوئے کہ کیا نتیجہ سامنے آتا ہے، مدین کی راہ لے لی، کیونکہ مصر کی حدود کے باہر قریب ترین شہر جو موسیٰ علیہ السلام کو معلوم تھا یہ مدین تھا، اور مدین اصل کے اعتبار سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے کا نام ہے مدین بن ابراہیم علیہ السلام۔ پھر ان کی جو اولاد پھیلی اس اولاد کو بھی مدین کہتے تھے، قبیلہ مدین بن گیا، اور جس شہر کے اندر وہ آباد تھے، تو اس شہر کو بھی "مدین" کہتے ہیں (جلالین)۔ تو ابراہیمی ہونے کی وجہ سے ممکن ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ادھر رُجحان ہوا ہو[1] اور ویسے بھی حدودِ مصر سے باہر، فرعون کی سلطنت سے باہر، قریب ترین شہر یہی تھا۔

موسیٰ علیہ السلام مدین کے کنویں پر، اور دولڑکیوں سے سوال

چل پڑے، آٹھ دِن کی مسافت طے کی، طے کر کے وہاں پہنچ گئے، تو شہر سے باہر کوئی کنواں تھا، جس جگہ چرواہے اپنے جانوروں کو پانی پلایا کرتے تھے۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی وہیں پہنچ گئے جہاں کچھ انسان نظر آئے، جا کے ایک طرف کو بیٹھ گئے، کیا دیکھتے ہیں کہ دولڑکیاں ہیں، وہ اپنے جانوروں کو روکے کھڑی ہیں، یعنی جانور جس طرح سے پانی پینے کے لئے آگے کو بڑھتے ہیں، لیکن وہ اپنے جانوروں کو روک رہی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ واقعہ دیکھ کے خیال آیا کہ باقی جانور جتنے ہیں، ان کے ساتھ تو مرد ہیں، اور وہ پانی پلا رہے ہیں، تو یہ دولڑکیاں جو آئی ہوئی ہیں پانی پلانے کے لئے، تو ضرور کوئی واقعہ ہے، کہ ان کا کوئی بھائی نہیں، ان کا کوئی باپ نہیں، ان کا کوئی سرپرست نہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھی اس قسم کے کام مرد کیا کرتے تھے، عورتیں نہیں کیا کرتی تھیں، عورتیں مردوں کے ساتھ اس قسم کے کام کرنے میں شریک نہیں ہوتی تھیں، اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے ان کو عجیب محسوس کر کے سوال کیا کہ تمہارا کیا واقعہ ہے؟ تم کیوں آئی ہو؟ اور بکریوں کو یہاں کیوں روک کے کھڑی ہو؟

نئی تہذیب کی غلط رَوِش

اگر عام طور پر عورتوں کی عادت ہوتی مردوں کے شانہ بشانہ بننے کی، جس طرح سے آج نئی تہذیب والے کہتے ہیں کہ زندگی کی گاڑی میں دونوں کو برابر چلنا چاہیے، جس طرح سے مرد کماتا ہے، عورت بھی کمائے، مرد دُکانوں پہ کام کرتے ہیں تو عورتیں بھی دُکانوں پہ کام کریں، مرد دفتروں میں کام کرتے ہیں تو عورتیں بھی دفتروں میں کام کریں، اور جس طرح سے آج یہ سلسلہ جاری ہوگیا ہے کہ ہر اسٹیج پر عورتوں کو مردوں کے ساتھ شریک کیا جارہا ہے، یہ نئی تہذیب جس طرف اس انسانی آبادی کو لے گئی، معلوم ہوتا

---

(۱) ولم یکن فیہ سلطان فرعون ولذا توجہ لقربتہ. وقیل توجہ إلیہا لمعرفتہ بہ. وقیل لقرابتہ منہ علیہما السلام (آلوسی).

ہے کہ اُس زمانے میں یہ رواج نہیں تھا، ورنہ ان دولڑکیوں کا آنا، اور اپنے جانوروں کے پاس کھڑا ہونا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توجہ کو اپنی طرف مبذول نہ کرتا۔

لڑکیوں کا جواب اور موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے تعاون

تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے پوچھ لیا، تو وہ کہنے لگیں کہ ہمارا باپ بوڑھا ہے، وہ یہ کام کر نہیں سکتا، اور خود ہم مردوں میں آگے گھس کے جاکے پانی کھینچ کے اپنے جانوروں کو پلا نہیں سکتیں، اس سے بھی اس زمانے کی ایک حیا معلوم ہوتی ہے کہ مردوں کے اندر گھس کے جاکے، جس طرح سے مرد پانی کھینچ رہے تھے اپنے جانوروں کو پلانے کے لیے، وہ بھی آگے جاکے گھس کے اپنے جانوروں کو پانی پلالیتیں، ایسا نہیں کرتی تھیں، کہتی ہیں جب تک یہ چرواہے اپنے جانوروں کو واپس نہیں لے جائیں گے، اس وقت تک ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلائیں گی۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رحم آ گیا، کہ یہ ضعیف عورتیں بیچاری کھڑی ہیں، معلوم ہو گیا کہ گھر میں کوئی مرد کام کرنے والا نہیں ہے، تو شفقت علی الضعیف، کمزوروں کی حمایت یہ تو شرفاء کی طبیعت میں ویسے ہی ہوتی ہے، اور موسیٰ علیہ السلام تو ماشاء اللہ آنے والے وقت میں ایک اُولوالعزم پیغمبر بننے والے تھے، تو وہ ان ضعیفوں اور ناتوانوں کے اوپر رحم کیسے نہ کرتے، ان کو ایک طرف کر کے، ان کے جانور لئے اور ان مردوں کے اندر گھسے، جس طرح دوسرے پانی کھینچ کے پلا رہے تھے جانوروں کو، تو موسیٰ علیہ السلام نے بھی اسی طرح سے پانی کھینچا اور ان کے جانوروں کو پلا کے کہا کہ لے جاؤ۔

تو یہ لڑکیاں اپنی بکریوں کو لے کے جس وقت گھر پہنچیں تو ہو سکتا ہے کہ عام جس طرح سے عادت تھی جتنی دیر میں آنے کی، آج جلدی پہنچ گئیں، تو ان کے اَبا نے جو حضرت شعیب علیہ السلام تھے، جو اس بستی کی طرف پیغمبر بنائے گئے تھے، اَصح روایات کے اعتبار سے، اگرچہ اس میں اختلاف ہے کہ یہ شخص کون تھا، لیکن اَصح یہی ہے تفاسیر کے اندر، کہ یہ حضرت شعیب علیہ السلام تھے۔ انہوں نے پوچھ لیا کہ آج اتنی جلدی کیوں آ گئیں؟ تو انہوں نے سارا واقعہ ذِکر کر دیا۔

موسیٰ علیہ السلام کی دُعا اور اس کی قبولیت

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام آٹھ دِن سے بھوکے تھے، جیسے تفسیری روایات میں ہے کہ راستے میں جاتے ہوئے سوائے درخت کے پتوں کے ان کو کھانے کے لیے کوئی چیز نہیں ملی، پانی پلا کے ایک طرف کوئی درخت کا یا کوئی چٹان کا سایہ ہوگا، اس سائے میں بیٹھ گئے، جس طرح سے ایک مسافر غریب الدیار ہوا کرتا ہے۔ اور اس وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے دُعا کی: رَبِّ اِنِّیْ لِمَاۤ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ: یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعا ہے کہ اے اللہ! تو میری طرف جو خیر بھی اُتارے، میں محتاج ہوں، یعنی میری طرف کوئی خیر اُتار۔ ''خیر'' کا مصداق مال بھی ہو سکتا ہے، یہاں ''خیر'' کا مصداق ہے اپنی ضرورت کا کھانا۔ یا اللہ! میں محتاج ہوں اور جو کچھ بھی تُو میری طرف بھیج دے، میں ضرورت مند ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے سوال کیا، اور اس دُعا کی قبولیت بھی فوراً ہی ظاہر ہو گئی، کہ جب بچیوں نے جاکے ذِکر کیا کہ ایک مسافر ہے، جو اپنے علاقے کا رہنے والا تو ہے نہیں، وہ یوں آیا تھا، اس نے ہم سے یوں پوچھا، اور پھر ہم پر شفقت کرتے ہوئے ہماری مدد کی، کہ ان لوگوں میں جاکے گھس کے پانی کھینچ کے ہماری بکریوں کو پلا دیا، ہم لے کے

آ گئیں۔تو حضرت شعیب علیہ السلام بھی تو آخر اللہ کے پیغمبر تھے،تو ان کو جب پتا چلا کہ کوئی مسافر ہے،اور اس نے میری بچیوں پر اس طرح سے احسان کیا،تو ان میں سے ایک کو کہا کہ جاؤ،اس کو بُلا کے لے آؤ،تو ان میں سے ایک آئی،قرآنِ کریم اس کی چال کو یہاں نقل کرتا ہے: تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ: یعنی اس طرح سے بے حجابانہ دندناتی ہوئی جس طرح سے آج نوتہذیب یافتہ اُچھلتی پھرتی ہیں،اس طرح سے نہیں،بلکہ شرماتی ہوئی،حیا محسوس کرتی ہوئی،چل کے آئی،یعنی اس کی چال ڈھال سے معلوم ہوتا تھا کہ جس طرح سے کسی اجنبی کے ساتھ کوئی بات ضرورت کی بنا پر کرنی پڑ جائے،تو عورت کی ادا سے،آواز سے،ہر چیز سے حیا محسوس ہوتی ہے،تو اسی طرح سے حیا محسوس کرتی ہوئی وہ بچی آئی،اور آ کے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ میرے اَبا آپ کو بُلا رہے ہیں،چونکہ آپ نے ہماری بکریوں کو پانی پلایا ہے،تو میرے اَبا چاہتے ہیں کہ آپ کو اس عمل کا کوئی اُجر دیں،جزا دیں۔اس طرح سے کر کے اس نے موسیٰ علیہ السلام کو بُلایا،تو موسیٰ علیہ السلام پہلے ہی چاہتے تھے کہ کوئی مانوس مل جائے،کسی جگہ وقت گزارنے کا سہارا ہو جائے،ایسے موقع پر انسان ذرا سی واقفیت سے بھی فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے،تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اُٹھ کر ساتھ چل دیے۔

موسیٰ علیہ السلام کی اِحتیاط اور کمالِ حیا

تفسیری روایات میں ہی یہ بات ہے کہ جس وقت موسیٰ علیہ السلام ساتھ چلنے لگے،تو آپ نے اس بچی سے کہا کہ تُو میرے آگے نہ چل،پیچھے آجا،تا کہ چلتے وقت میری نظر بلاوجہ نہ پڑے،میں آگے آگے چلتا ہوں،تُو پیچھے پیچھے آ،پیچھے سے مجھے راستہ بتاتی آنا،کہ دائیں طرف جانا ہے،بائیں طرف جانا ہے،اس طرح سے موسیٰ علیہ السلام نے لڑکی کو پیچھے کیا،جیسا کہ طریقہ ہے...... ورنہ ادب تو یہ ہے کہ جب راستہ معلوم نہ ہو،چاہے اپنا بڑا ساتھ ہو،اُستاذ ہو،شیخ ہو،بلاوجہ لوگ تکلف میں پڑ جاتے ہیں،یہ مسئلہ لکھا ہوا ہے کہ اپنے بڑے کے ساتھ،کسی مکرم ومحترم کے ساتھ چلنا پڑ جائے،جیسے آپ اپنے اُستاذ کے ساتھ چل رہے،اپنے شیخ کے ساتھ چل رہے ہیں،یا کسی اور معزز ہستی کے ساتھ چل رہے ہیں،تو اگر آپ کو راستہ معلوم ہے اور اس کو راستہ معلوم نہیں،اجنبی جگہ ہے،تو آگے آگے چلنا چاہیے،تا کہ آپ چلتے جائیں تو وہ بھی بلاتکلف آپ کے پیچھے پیچھے چلتے آئیں،بار بار پوچھنا نہ پڑے،کہ دائیں جانا ہے،بائیں جانا ہے،کدھر کو جانا ہے۔اور اسی طرح رات کے وقت ادب یہ ہے کہ اپنے بڑے سے آگے چلو،کیونکہ ادب کا تقاضا ہوتا ہے راحت پہنچانا،اور آپ جانتے ہیں کہ راحت انہی دونوں باتوں میں ہے،رات کو آگے آگے چلو گے،تو کوئی گڑھا،کوئی کھڈا،کوئی اینٹ،کوئی کیچڑ،کوئی کانٹا جو کچھ بھی آئے گا آپ اس کو سنبھالتے چلے جائیں گے،اور آپ کا بڑا آپ کے پیچھے آرام کے ساتھ چلتا چلا آئے گا،اور اگر کوئی ایسی تکلیف دہ چیز ہوگی،تو اس کو آپ برداشت کریں گے۔اور دِن کو جس وقت راستہ معلوم نہ ہو،تو بھی آگے آگے چلو،تا کہ بار بار یہ پوچھنے کی زحمت نہ ہو کہ اب کدھر کو چلنا ہے،تو طریقہ تو یہ ہے...... اس ادب کے مطابق چاہیے تو یہ تھا کہ بچی آگے آگے چلتی،موسیٰ علیہ السلام پیچھے پیچھے چلتے،تا کہ وہ اپنے گھر کا راستہ لیتی،اور یہ پیچھے پیچھے پہنچ جاتے،لیکن یہاں یہ عارضہ آ گیا کہ پیچھے چلنے والا آدمی چونکہ آگے چلنے والے کو دیکھتا ہے کہ یہ کدھر کو چلتا ہے،تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طبیعت نے یہ برداشت نہ کیا کہ بلاوجہ ایک بچی کے اوپر نظر پڑے،اس لئے اسے کہا کہ تُو پیچھے پیچھے آ،میں آگے آگے چلتا ہوں،اور پیچھے سے مجھے راستہ بتاتی رہنا۔

شعیب علیہ السلام سے ملاقات اور ایک بچی کا شعیب علیہ السلام کو مشورہ

تو یوں جس وقت گئے، جا کے حضرت شعیب علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، انہوں نے واقعہ نقل کیا کہ یہ قصہ ہوا ہے، میں اس لئے آیا ہوں۔ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ: یہی لفظ ہے جس کی بنا پر اس سورت کا نام ''قصص'' رکھ دیا گیا۔ جب واقعہ بیان کیا تو حضرت شعیب علیہ السلام نے انہیں تسلی دی اور یہ کہا کہ تُو ظالموں سے نجات پا گیا، یعنی تُو نے جو دُعا کی تھی پچھلے رُکوع کے آخر میں جس طرح سے لفظ آئے تھے: رَبِّ نَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِينَ تو یہ دُعا بھی گویا کہ قبول ہوگئی۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے کہا کہ اب فکر کی کوئی بات نہیں، یہاں ان ظالموں کا کوئی زور نہیں چلتا، کیونکہ یہ علاقہ ان کی سلطنت سے باہر ہے۔ وہاں ٹھہر گئے، کھایا پیا ہوگا۔ اور اس کے بعد ایک لڑکی نے مشورہ دیا اپنے اَبا کو، کہ اَبا جی! کام کرنے کے لئے کسی خادم کی ضرورت تو گھر میں ہے ہی سہی، تو انہی سے بات کرلو، اگر یہ گھر میں کام کرلیا کریں، کیونکہ گھر میں کام کرنے کے لیے خادم یا ملازم جو بھی رکھا جائے اس میں دو صفتیں ہونی چاہئیں، ایک تو وہ قوت والا ہو کہ جو کام اس کے سپرد کیا جائے اس کو وہ کر سکے، دُوسرا امانت دار ہونا چاہیے، تو جب ملازم قوت والا بھی ہو، جو کام اس کے سپرد کیا گیا ہے اس کو کرنے کی اس میں طاقت ہے، اور دیانت دار اور امانت دار بھی ہے، تو اس سے بڑھ کے اچھا خادم اور کون سا ہوگا! تو انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کی قوت تو محسوس کرلی بکریوں کو پانی پلانے سے، کہتے ہیں کہ جو ڈول کئی کئی شخص مل کے کھینچتے تھے موسیٰ علیہ السلام نے اکیلے نے کھینچا، حالانکہ آٹھ دِن سے فاقے میں تھے، اور سفر میں تھے۔ دوسرا یہ ہے کہ انسان جس وقت نظر ڈالتا ہے، تو معلوم ہو جاتا ہے کہ جوان ہے، قوی الاعضاء ہے، قوت والا ہے، تو قوت کا اندازہ اس سے ہوگیا۔ امانت اور دیانت کا اندازہ بچی نے اس راستے والے سفر سے کیا، کہ جنہوں نے اتنا بھی برداشت نہیں کیا کہ ضرورت کی بنا پر نظر اُٹھے اور کسی پہ پڑے، تو اس سے زیادہ امانت دار اور دیانت دار آدمی کون ہوسکتا ہے؟ تو بچی نے یہ مشورہ دیا۔

کسی کو ملازم رکھنے کے لیے دو صفات دیکھنی چاہئیں

تو ملازم کے اندر یہ دو صفتیں دیکھی جایا کرتی ہیں کہ اس میں کام کی صلاحیت ہے اور دیانت اور امانت دار ہے۔ جب یہ دو صفتیں دیکھ کے کام کسی کے ذِمے لگایا جائے تو پھر کام ٹھیک ہوتے ہیں۔ اور اگر کام کسی ایسے آدمی کے ذِمے لگا دیا جائے جس میں صلاحیت ہی نہیں، سفارشوں کے ساتھ ہی دفتروں میں بٹھا دیا جائے، جیسے آج کل چلتا ہے تو بھی کام بگڑ جاتا ہے، کام نااہل کے سپرد کردیا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علاماتِ قیامت میں سے اس بات کو بیان کیا ہے کہ کام نااہلوں کے سپرد کردیا جائے،[1] اہلیت ہے نہیں اور کام سپرد کردیا، محض قریبی ہونے کی وجہ سے، دوست ہونے کی وجہ سے، سفارش کی وجہ سے، جیسے آج کل دفتروں میں بھرتی اکثر وبیشتر نااہل لوگوں کی ہے، بڑے افسروں کی اولاد ہیں، یا سفارشی ہیں یا رشوت دے کے عہدہ لے لیتے ہیں، کام کرنے کی صلاحیت ہوتی نہیں...... اور بسا اوقات صلاحیت تو ہوتی ہے، ڈگری بھی ہے، ڈپلومہ بھی ہے، سب کچھ ہی کیا ہوا ہے، لیکن دیانت امانت نہیں ہے کہ یہ خیال کریں کہ جس کام کی ہم تنخواہ لے رہیں ہم اس کام کو پورا کریں۔ کام چور ہیں، کام کرتے نہیں، خیانت

---

(۱) بخاری ج۱ ص۱۴ باب من سئل علما۔ مشکوٰۃ ج۲ ص۴۶۹ باب اشراط الساعة اذا وسد الأمر الی غیر اهله فانتظر الساعة

کرتے ہیں، بددیانتی کرتے ہیں، تو بھی کام بگڑ جاتا ہے۔ تو اگر ان دو باتوں کی رعایت رکھ لی جائے کہ کام کرنے کی صلاحیت ہو، اور پھر وہ کام کرنے والا دیانت دار، امانت دار بھی ہو، تو سارا نظم صحیح ہو جاتا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کا نکاح اور حق مہر کا تعین

تو یہ بچی نے مشورہ دیا، اَبا کو پسند آ گیا، تو انہوں نے پھر یہ سوچا، جب حالات پوچھ لیے، قَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ کے اندر سب کچھ آ گیا، موسیٰ علیہ السلام نے حالات بیان کئے تو حضرت شعیب علیہ السلام سمجھ گئے، کہ یہ بچہ ابراہیمی ہے، اچھے خاندان کا ہے، یعقوب علیہ السلام کی اولاد سے ہے، تو اپنا ہی ہم نسب ہوا، اور یہ بھی حضرت ابراہیم کی اولاد میں سے تھے، تو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کفو ہے، اور باتوں سے شرافت دیانت سب کچھ معلوم ہو گئی۔ تو یہ خیال ہوا کہ یہ دو بچیاں جو ہیں، ان میں سے کسی ایک کا نکاح اس کے ساتھ کردوں۔ تو گھر کا داماد بن جائے گا، گھر رہے گا اور کام بھی چلتا رہے گا۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہی گفتگو کی حضرت شعیب علیہ السلام نے، کہ میرا ارادہ یہ ہے کہ میں ان دو بچیوں میں سے ایک کا نکاح میں تیرے ساتھ کردوں، متعین تو نکاح کرتے وقت ہو جائیں گی، پہلے گفتگو یوں ہی ہو رہی ہے، کہ ان میں سے ایک کا نکاح تیرے ساتھ کردوں، لیکن اس نکاح کا مہر تیری طرف سے یہ ہوگا کہ آٹھ سال یا دس سال، جو تیری مرضی ہو، میرے گھر میں کام کر۔ اَنْ تَاْجُرَنِيْ: میرے گھر میں اُجیر بن کے رہ...... اس طرح سے نوکری کو مہر متعین کردینا یہ اُس شریعت میں جائز ہوگا، اور ہمارے ہاں بھی فقہ میں بعض جزئیات اس قسم کی ہیں کہ اگر بیوی کا کوئی کام ایسا ہو جو گھر سے باہر کیا جاتا ہو، جیسے اس کے جانور چرانے ہیں، یا اس کا کوئی کارخانہ ہے اس کا کوئی انتظام کرنا ہے، یا اس کا کوئی باغ ہے جس کی حفاظت یا خدمت کرنی ہے، اس خدمت کو اگر مہر کے طور پر متعین کردیا جائے تو ہمارے ہاں بھی درست ہے، کیونکہ اس خدمت کا معاوضہ جو مال آنا تھا گویا کہ وہ مہر بن گیا، اس قسم کی جزئیات ہمارے ہاں بھی ہیں، بہر حال لڑکی کی رضامندی کے ساتھ باپ کے گھر میں کام کرنا اگر منظور کرلیا جائے، اور اس مال کے اندر بچی کا حصہ بھی ہو، تو ایسی صورت میں مہر متعین کیا جاسکتا ہے۔ ....

تو مہر یہ متعین کردیا کہ آٹھ سال یا دس سال میرے گھر میں کام کر، تَاْجُرَنِيْ: اُجیر بن کے رہ میرے گھر میں، مزدور بن کے رہ، محنت کر، تو میں بچی کا نکاح کردُوں۔ اور ساتھ یہ بھی کہا کہ دیکھو! میں معاملات میں مشقت ڈالنے والا نہیں ہوں، میری طبیعت میں سختی نہیں ہے، جیسے دوسرے کو مطمئن کیا جاتا ہے، اِن شاء اللہ! جس وقت تیرا واسطہ مجھ سے پڑے گا، تو دیکھ لے گا کہ میں اچھے لوگوں میں سے ہوں۔ یہاں لفظ ''صالحین'' سے مراد خوش معاملہ ہے، ورنہ اپنی نیکی کا واسطہ معاملات میں نہیں دیا جایا کرتا کہ میرے ساتھ یہ معاملہ کرلو، تمہیں پتا ہونا چاہیے کہ میں تہجد پڑھتا ہوں، یا میرے ساتھ یہ معاملہ کرلو تمہیں پتا ہونا چاہیے کہ میں بڑا شریف آدمی ہوں، اور میں فلاں نیک کام بھی کرتا ہوں، معاملات کے اندر ان نیکیوں کا واسطہ نہیں دیا جایا کرتا، معاملات میں یہ آیا کرتا ہے کہ میں خوش معاملہ ہوں، میری طبیعت میں صالحیت ہے کہ میں اپنے ساتھ معاملہ کرنے والوں پہ تشدد نہیں کرتا، شرافت فی المعاملہ مراد ہے۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور کیا چاہیے تھا، وہ تو پہلے ہی اس قسم کے ٹھکانے کے متلاشی تھے، وہ کہنے لگے: ٹھیک ہے جی! مجھے منظور ہے، اور ان دونوں مدتوں میں سے آٹھ یا دس سال، جو میری مرضی ہوگی، میں پوری کروں گا، اور میرے اُوپر اس بارے میں

کسی قسم کا جبر نہ کیا جائے، اور جو کچھ ہم گفتگو کر رہے ہیں اس کے اُوپر اللہ گواہ ہے، تو اللہ کو گواہ کرلیا۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے ان دونوں بچیوں میں سے ایک بچی کا نکاح کر دیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وقت حضرت شعیب علیہ السلام کی خدمت میں آٹھ یا دس سال گزرا...... ان دونوں مدّتوں میں سے کون سی مدت موسیٰ علیہ السلام نے پوری کی؟ قرآنِ کریم میں صراحت نہیں ہے، تفسیری روایات میں ہے کہ دس سال ہی پوری کی، کیونکہ جس طرح سے شعیب علیہ السلام خوش معاملہ تھے، تو موسیٰ علیہ السلام بھی تو خوش معاملہ تھے، تو آٹھ سال تو لازم قرار دے دیے گئے تھے، اور دس سال مستحب تھے، کہ مرضی آئے تو پوری کردیں، تو ان کی طرف سے خوش معاملگی کا تقاضا یہی تھا کہ جو زیادہ مدت ذکر کی گئی ہے اسی کو پورا کریں، تو قرین قیاس یہی بات ہے کہ دس سال وہاں گزارے...... اور اسی طرح سے بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دس سال کے دوران میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دو بچیاں بھی ہوئیں، تو یہ خاندان بن گیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جو چار اَفراد پر مشتمل تھا...... تو دس سال گزرنے کے بعد اب موسیٰ علیہ السلام نے ارادہ کیا کہ میں دوبارہ مصر جاؤں، اور اپنے بہن بھائیوں اور ماں باپ کا حال دیکھوں، اور یہ جانا چونکہ ایک اجنبیت کے طور پر ہی تھا، تو ضروری نہیں کہ فرعون یا فرعونی پہچان لیں، یا ان کو پتا بھی چلے، جس طرح سے ایک مُلک کے آدمی دوسرے مُلک میں آتے جاتے رہتے ہیں، ضروری نہیں ہوتا کہ اہلِ حکومت کی گرفت میں آجائیں، چھپ چھپا کے جانے کا ارادہ تھا، کہ گھر والوں کے پاس جائیں گے، ان سے ان کا حال احوال معلوم کرلیں گے، اس طرح سے ان کا مدین سے سفر شروع ہوا، اس سفر کا قصہ آپ کے سامنے اگلے رُکوع میں آرہا ہے، اور وہ واقعہ بار بار آپ کے سامنے گزر گیا، پہلے اس رُکوع کا ترجمہ دیکھ لیجئے۔

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ: تِلْقَآءَ: طرف کے معنی میں ہے، یہ لفظ سورۂ یونس (آیت ۱۵) میں آیا تھا مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ، ''اپنی طرف سے'' وہاں ترجمہ یونہی کیا گیا تھا۔ وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ: جس وقت متوجہ ہوئے موسیٰ علیہ السلام مدین کی طرف، قَالَ عَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ: یہ بھی دُعا ہے، دِل کا جذبہ ہے، یعنی اللہ کے بھروسے پہ نکل پڑے، کوئی راہنما نہیں تھا، راستہ معلوم نہیں تھا، پہلے کبھی اس قسم کے سفر پر گئے نہیں تھے۔ اُمید ہے کہ میرا ربّ مجھے سیدھے راستے کی ہدایت کرے گا۔ یعنی اللہ مجھے سیدھے راستے پہ چلائے گا، جس کی بنا پر میں اپنی منزل پہ پہنچ جاؤں گا۔ وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ: جس وقت وارد ہوئے موسیٰ علیہ السلام مدین کے پانی پر۔ پانی سے وہی کنواں مراد ہے۔ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ: پایا موسیٰ علیہ السلام نے اس کنویں پر اس پانی پر لوگوں کی جماعت کو جو پانی پلا رہے تھے۔ سَقَا يَسْقِيْ: پانی پلانا۔ کس کو پلا رہے تھے؟ يَسْقُوْنَ کا مفعول محذوف ہے یعنی اپنے جانوروں کو۔ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ: اور پایا ان آدمیوں سے وَرے یعنی ایک جانب، ان آدمیوں کے پیچھے دو لڑکیوں کو، دو عورتوں کو۔ تَذُوْدٰنِ: جو اپنے جانوروں کو روکے کھڑی تھیں۔ تَذُوْدٰنِ: روکتی تھیں، یہاں بھی اس کا مفعول محذوف ہے یعنی اپنے جانوروں کو روکے کھڑی تھیں۔ پایا ان کے وَرے دو عورتوں کو جو روکتی تھیں یعنی اپنے جانوروں کو۔ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا:

موسیٰ علیہ السلام نے ان دونوں عورتوں سے پوچھا: تمہارا کیا واقعہ ہے؟ یعنی تم کیوں آئی ہو، تمہارا کوئی آدمی کیوں نہیں آیا جانوروں کو پانی پلانے کے لیے؟ قَالَتَا: وہ کہنے لگیں: لَا نَسْقِیْ حَتّٰى یُصْدِرَ الرِّعَآءُ: ہم پانی نہیں پلائیں گی جس وقت تک چرواہے لوٹا کر نہ لے جائیں یعنی اپنے جانوروں کو۔ یُصْدِرَ کا بھی یہاں مفعول محذوف ہے، رِعاء راعی کی جمع ہے۔ جب تک چرواہے لوٹا کے نہ لے جائیں ہم اس وقت تک پانی نہیں پلائیں گی۔ وَاَبُوْنَا شَیْخٌ کَبِیْرٌ: یہ اصل وجہ بتادی کہ ہمارا باپ بوڑھا ہے، وہ اس قسم کے کام کر نہیں سکتا۔ تو معلوم ہوگیا کہ بھائی کوئی تھا نہیں، گھر میں کوئی دوسرا آدمی بھی نہیں تھا کام کرنے والا۔ فَسَقٰى لَهُمَا: موسیٰ علیہ السلام نے پانی پلا دیا ان دونوں بچیوں کے لئے، یعنی دونوں بچیوں کے جانوروں کو پانی پلا دیا بچیوں کے نفع کے لیے، جس طرح سے ''لام'' نفع کے لئے ہوتا ہے۔ ثُمَّ تَوَلّٰۤى اِلَى الظِّلِّ: پھر سائے کی طرف مڑ کے بیٹھے، پھر مڑ گئے سائے کی طرف، پیٹھ پھیری سائے کی طرف یعنی وہاں کنویں سے ہٹ کے ایک جانب کوئی چٹان کا پہاڑ کا یا درخت کا کوئی سایہ تھا، تو سائے میں جا کے بیٹھ گئے، جس سے بظاہر معلوم یہ ہوتا ہے کہ گرمی کا موسم تھا، کیونکہ سائے میں بیٹھنے کی ضرورت انسان تبھی محسوس کیا کرتا ہے جب گرمی کا موسم ہو۔ پیٹھ پھیری مڑے سائے کی طرف۔ فَقَالَ: پھر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے، آخری سہارا وہی ہے، تو اللہ تعالیٰ کی جناب میں عرض کرتے ہیں کہ رَبِّ! اے میرے رَبّ! اِنِّیْ لِمَاۤ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ: اَیْ اِنِّی فقیرٌ۔ ''فقیر'' محتاج کو کہتے ہیں، بے شک میں محتاج ہوں اس چیز کے لئے جو تُو میری طرف اُتار دے۔ مِنْ خَیْرٍ: یہ ''ما'' کا بیان ہے، جو خیر تُو میری طرف اُتار دے، جو بھلائی جو اچھی چیز تُو میری طرف اُتار دے میں محتاج ہوں۔ فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا: آئی اس موسیٰ کے پاس ان دونوں عورتوں میں سے ایک عورت، هُمَا کی ضمیر امراتان کی طرف لوٹ رہی ہے۔ تَمْشِیْ عَلَى اسْتِحْیَآءٍ: چلتی تھی حیا پر، حیا محسوس کرتی ہوئی، شرماتی ہوئی، شرمیلے انداز سے چلتی ہوئی آئی۔ قَالَتْ کہنے لگی: اِنَّ اَبِیْ یَدْعُوْكَ لِیَجْزِیَكَ اَجْرَ مَا سَقَیْتَ لَنَا: یہ نقشہ سمجھ میں آگیا نا؟ کہ باحیا لڑکیاں بوقت ضرورت اگر کسی غیر مرد کے ساتھ بات کریں بھی تو ان کی ہر اَدا سے، ہر گفتار سے، رفتار سے حیا ٹپکا کرتی ہے، بات کریں گی تو آمنے سامنے رُو برو نہیں کریں گی، منہ دوسری طرف کو کرلیں گی، کپڑے کے ساتھ منہ ڈھانپنے کی کوشش کریں گی، تو اسی انداز سے (عَلَى اسْتِحْیَآءٍ کے اندر ساری بات آگئی) شرم محسوس کرتی ہوئی آئی، کہنے لگی کہ بے شک میرا باپ آپ کو بلاتا ہے، لِیَجْزِیَكَ تاکہ آپ کو بدلہ دے اَجْرَ مَا سَقَیْتَ لَنَا: ہمارے لئے پانی پلانے کا۔ اَجْرَ یہ مضاف ہوگیا، اور یَجْزِیْ کا مفعول ہے، تاکہ ہمارے لئے جو تُو نے پانی پلایا ہے (مَا سَقَیْتَ لَنَا میں ''ما'' مصدر ہے، تیرا پانی پلانا ہمارے لئے) اس پانی پلانے کا تجھے اَجر دے، اس لئے میرا باپ تجھے بلا رہا ہے، ''تاکہ دے تجھے اَجر اس بات کا کہ تُو نے ہمارے لئے پانی پلایا''، ''مَا'' مصدریہ ہے یعنی پانی پلانا تیرا ہمارے لئے، اس پانی پلانے کا اَجر تجھے دے اس لیے میرا اَبا تجھے بُلا رہا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَهٗ: جب موسیٰ علیہ السلام ان کے اَبا کے پاس آئے، اَبا کا یہاں نام مذکور نہیں ہے، تفسیری روایات میں ہے کہ اس سے شعیب علیہ السلام مراد ہیں۔ جس وقت موسیٰ علیہ السلام اس شخص کے پاس آگئے، ان بچیوں کے اَبا کے پاس، وَقَصَّ عَلَیْهِ الْقَصَصَ: اور سارا واقعہ سنایا، قَصَّ: بیان کیا۔ القصص: واقعہ۔ جیسے نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ سورۂ یوسف (آیت ۳) میں لفظ آیا تھا کہ ہم

آپ کے اوپر ایک بہترین واقعہ بیان کرتے ہیں۔ تو واقعہ ان کے اُوپر بیان کیا، قَالَ لَا تَخَفْ: تو شعیب علیہ السلام نے کہا، اس شخص نے جو ان بچیوں کا باپ تھا، اس نے کہا کہ خوف نہ کیجئے۔ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ: آپ ظالم لوگوں سے نجات پا گئے۔ آئندہ کوئی خوف وخطرہ نہیں ہے، یہ علاقہ فرعون کی سلطنت سے باہر ہے، یہاں وہ کچھ نہیں کرسکتا۔ قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا: ان دونوں عورتوں میں سے ایک نے کہا۔ یٰاَبَتِ: اے اَبا! اسْتَاْجِرْهُ اس کو اَجیر بنالو۔ استئجار: مزدور بنانا۔ اس کو اُجرت پہ رکھ لو، نوکر رکھ لو۔ اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ: بے شک جس کو بھی تُو اُجرت پہ رکھے اس میں سے بہترین آدمی قوی امین ہوتا ہے، جس کو بھی تُو اَجیر رکھے، جس کو بھی تُو نوکر رکھے، ان لوگوں میں سے بہترین القوی الامین ہے، یعنی جن کو آپ نوکر رکھنا چاہیں ان میں سے بہتر آدمی نوکری کے لئے وہ ہوتا ہے جو کہ قوی بھی ہو اور امین بھی ہو، کام کرنے کی قوت بھی رکھتا ہو، دیانت اور امانت بھی رکھتا ہو۔ قَالَ اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ: باپ کو یہ مشورہ پسند آ گیا۔ یہ ایک ہی مجلس کی ساری باتیں نہیں ہوا کرتیں، قرآنِ کریم نے تو عنوان نقل کرنا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام وہاں رہنے لگ گئے، اُٹھنے بیٹھنے لگ گئے، اس درمیان یہ مشورہ ہوگیا، یہ نہیں کہ وہاں گئے اور دو منٹ میں یہ بات ہوگئی، جیسے گھروں کے معاملات چلا کرتے ہیں یہ اسی طرح سے ہے کہ موسیٰ علیہ السلام ٹھہر گئے، اُٹھتے بیٹھتے رہے، ملتے جلتے رہے، حالات ایک دوسرے کے سامنے آ گئے۔ قَالَ اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ: شعیب علیہ السلام نے کہا کہ میں ارادہ کرتا ہوں کہ نکاح کردوں تیرے ساتھ۔ اِحْدَى ابْنَتَیَّ: اپنی ان دو بچیوں میں سے ایک بچی کا۔ عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِیْ: اس شرط پر کہ تُو میرے ہاں مزدوری کر، نوکر بن کے رہ۔ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ آٹھ سال۔ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا: پس اگر تُو دس پورے کردے تو، فَمِنْ عِنْدِكَ: یہ تیری جانب سے ہے، یعنی دو اختیاری، آٹھ لازمی۔ وَمَاۤ اُرِیْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَیْكَ: میں تیرے اُوپر کوئی سختی کرنے کا ارادہ نہیں کرتا، مطلب یہ ہے کہ میرے ہاں معاملات میں بڑی نرمی ہے، میں سختی نہیں کروں گا، سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ: عنقریب پائے گا تُو مجھے اگر اللہ نے چاہا (یہ ''ان شاء اللہ!'' تبرک کے طور پر ہے) پائے گا تُو مجھے اگر اللہ نے چاہا، اچھے لوگوں میں سے، یعنی میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کے معاملات اچھے ہوتے ہیں، ''صالحین'' سے صالح المعاملہ مُراد ہے، تُو دیکھ لے گا آئندہ ان شاء اللہ! میرے ہاں کوئی سختی نہیں ہے، میں اپنے نوکروں پر خادموں پر سختی نہیں کیا کرتا، تُو مجھے اچھے لوگوں میں سے پائے گا، جو خوش معاملہ ہوتے ہیں، قَالَ ذٰلِكَ بَیْنِیْ وَبَیْنَكَ: موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ یہ بات میرے اور آپ کے درمیان ہوگئی، یہ معاہدہ ہوگیا۔ اَیَّمَا الْاَجَلَیْنِ قَضَیْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَیَّ: ان دونوں مدّتوں میں جو مدّت میں پوری کردُوں تو میرے پہ کوئی زیادتی نہیں، یعنی آٹھ تو لازماً پوری ہوگی، باقی! دس میرے لئے اختیاری ہے، بعد میں مجھے اس بات پہ مجبور نہیں کیا جائے گا، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دس سال کی مدت ہی پوری کی ہے، بعض روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِیْلٌ: اللہ تعالیٰ وکیل ہے۔ وکیل یہاں گواہ کے معنی میں ہے۔ وکیل اصل میں ہوتا ہے مَوْكُوْلٌ اِلَیْهِ الْاَمْرُ جس کے معاملہ سپرد کردیا جائے، یہ جو عدالتوں میں وکیل ہوتے ہیں ان کا بھی یہی معنی ہوتا ہے کہ انسان مقدمہ ان کے سپرد کرکے بےفکر ہوجاتا ہے، تو اللہ کو وکیل بناؤ یعنی اپنے معاملات اللہ کے سپرد کردو، توکّل کا یہ معنی ہوتا ہے کہ اپنے معاملے میں اللہ کو وکیل بنادیا کہ اللہ جو کرے بس ہمیں منظور ہے۔ اللہ تعالیٰ وکیل ہے اس بات پر جو ہم کہتے ہیں، متعین کیا ہوا ہے، یعنی یہ بات ہم اللہ کے سپرد کرتے ہیں، گویا کہ اللہ گواہ ہے۔ تو اپنے معاہدے کے اوپر اللہ کو گواہ کرلیا۔

فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖۤ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ

پھر جب موسیٰ علیہ السلام نے مدت پوری کردی، اور اپنے گھر والوں کو لے کر چلے، تو محسوس کی انہوں نے طور کی جانب سے آگ، کہا

لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْۤ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ

اپنے گھر والوں کو کہ تم ٹھہرو، میں نے آگ دیکھی ہے، ہوسکتا ہے کہ میں لے آؤں تمہارے پاس وہاں سے کوئی خبر یا آگ کا انگارہ،

لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَلَمَّاۤ اَتٰىهَا نُوْدِیَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ

تاکہ تم تاپو ﴿۲۹﴾ جب موسیٰ علیہ السلام اس آگ کے پاس آئے تو آواز دیے گئے مبارک زمین کے ٹکڑے میں برکت والی وادی کے

الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ یّٰمُوْسٰۤى اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۳۰﴾ وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ

کنارے سے درخت سے، کہ اے موسیٰ! میں اللہ ہوں ربّ العالمین ﴿۳۰﴾ اپنی لاٹھی ڈال دے،

فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ یُعَقِّبْ ؕ یٰمُوْسٰۤى اَقْبِلْ

جس وقت دیکھا موسیٰ نے اس کو لہراتے ہوئے، گویا کہ وہ سانپ ہے، تو پیٹھ پھیر کر بھاگ پڑے، اور اپنی ایڑیوں کے بل نہیں لوٹے، اے موسیٰ!

وَلَا تَخَفْ ۫ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِیْنَ ﴿۳۱﴾ اُسْلُكْ یَدَكَ فِیْ جَیْبِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ

متوجہ ہوجاؤ اور خوف نہ کرو، آپ امن والے لوگوں میں سے ہیں ﴿۳۱﴾ ڈال تو اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں، نکلے گا یہ سفید چمکتا ہوا

غَیْرِ سُوْٓءٍ ۫ وَّاضْمُمْ اِلَیْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى

بغیر کسی بیاری کے، اپنے بازو کو اپنے ساتھ ملا لے خوف کی وجہ سے، یہ دو بڑی قوی دلیلیں آگئیں تیرے ربّ کی طرف سے،

فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ

فرعون اور اس کے ارکان کی طرف جانے کے لئے، بے شک یہ لوگ نافرمان ہیں ﴿۳۲﴾ موسیٰ نے کہا: اے میرے ربّ! میں نے ان میں سے ایک

نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ﴿۳۳﴾ وَاَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا

نفس کو قتل کیا ہوا ہے، میں اندیشہ کرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کردیں گے ﴿۳۳﴾ اور میرا بھائی ہارون وہ مجھ سے زیادہ صاف زبان والا ہے

فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً یُّصَدِّقُنِیْۤ ۫ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ ﴿۳۴﴾ قَالَ سَنَشُدُّ

اس کو میرے ساتھ بھیج دے بطور مدد کے، وہ میری تصدیق کرے گا، میں اندیشہ کرتا ہوں کہ وہ میری تکذیب کریں گے ﴿۳۴﴾ اللہ نے کہا کہ ہم ضرور مضبوط

عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا ۚ بِاٰيٰتِنَآ ۚ اَنْتُمَا وَ

کردیں گے تیرے بازو کو تیرے بھائی کے ساتھ، اور بنادیں گے ہم تمہارے لئے غلبہ، وہ لوگ تم دونوں تک پہنچ نہیں سکیں گے ہماری آیات کی برکت سے، تم

مَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ﴿٣٥﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا

اور وہ لوگ جو تمہاری اتباع کریں گے غلبہ پانے والے ہیں ﴿۳۵﴾ جب موسیٰ ان کے پاس گئے ہماری آیات واضح لے کر، وہ کہنے لگے، نہیں

سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَّمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿٣٦﴾ وَقَالَ مُوْسٰى رَبِّيْٓ اَعْلَمُ

ہے یہ مگر گھڑا ہوا جادو، اور نہیں سنی ہم نے یہ بات اپنے پہلے آباء میں ﴿۳۶﴾ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میرا رب خوب جانتا ہے

بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى مِنْ عِنْدِهٖ وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ

اس شخص کو جو ہدایت لے کر آیا اس کے پاس سے، اور اس کو جس کے لئے اس دُنیا کا اچھا انجام ہے، بے شک فلاح نہیں پائیں گے

الظّٰلِمُوْنَ ﴿٣٧﴾ وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۚ

ظالم لوگ ﴿۳۷﴾ فرعون کہنے لگا اے اراکین! میں تمہارے لیے اپنے علاوہ کوئی الٰہ نہیں جانتا،

فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ وَاِنِّيْ

اے ہامان میرے لئے آگ جلا مٹی پر، پھر بنا میرے لئے ایک محل، تاکہ میں جھانک آؤں موسیٰ کے الٰہ کی طرف، اور بے شک میں

لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿٣٨﴾ وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ

تو البتہ اس کو جھوٹوں میں سے سمجھتا ہوں ﴿۳۸﴾ تکبر کیا فرعون اور اس کے لشکروں نے زمین میں ناحق، اور وہ سمجھے کہ بے شک

اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ ﴿٣٩﴾ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ

وہ ہماری طرف لوٹ کر نہیں آئیں گے ﴿۳۹﴾ پھر پکڑ لیا ہم نے اس کو اور اس کے لشکروں کو، پھینک دیا ہم نے ان کو سمندر میں، دیکھ پھر، ظالموں

الظّٰلِمِيْنَ ﴿٤٠﴾ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿٤١﴾

کا کیا انجام ہوا ﴿۴۰﴾ ہم نے ان کو ایسے پیشوا بنایا تھا جو جہنّم کی طرف بُلاتے تھے، اور قیامت کے دن یہ مدد نہیں کئے جائیں گے ﴿۴۱﴾

وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ ﴿٤٢﴾

ہم نے ان کے پیچھے لگادی اس دُنیا میں لعنت، اور قیامت کے دن بھی وہ بُرائی بیان کئے ہوؤں میں سے ہوں گے ﴿۴۲﴾

تفسیر

موسیٰ علیہ السلام کی مصر کی طرف واپسی اور طور پہاڑ پر آگ کا نظر آنا

فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ: پھر جب موسیٰ علیہ السلام نے مدت پوری کر دی جو ٹھہرائی گئی تھی۔ وَسَارَ بِاَهْلِهٖٓ: اور اپنے گھر والوں کو لے کے چلے۔ اب یہ سفر ہے مدین سے پھر دوبارہ مصر کی طرف اپنے گھر والوں کی خبر لینے کے لئے، والدہ بہن بھائی، کہ ان کو دیکھیں، ملیں، اپنے وطن جائیں، دس سال گزر گئے، بڑی مدت ہے، پیچھے کا واقعہ بھی کسی حد تک فراموش ہو جاتا ہے، اور جب اس طرح سے چھپ چھپا کے آئیں گے، تو کسی کی توجہ بھی نہیں ہوگی۔ وَسَارَ بِاَهْلِهٖٓ: اپنے گھر والوں کو لے کر چلا۔ سَارَ یَسِیْرُ چلنے کے معنیٰ میں ہے۔ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا: محسوس کی موسیٰ علیہ السلام نے طور کی جانب سے آگ۔ راستے میں طور پہاڑ آیا اس کے او پر آگ نظر آئی، اٰنَسَ: معلوم کی۔ معلوم کی، دیکھی طور کی جانب سے آگ۔ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا: اب معلوم یوں ہوتا ہے کہ اس وقت راستے سے بھٹک گئے تھے، پتا نہیں چل رہا تھا کہ کدھر کو چلنا ہے، رات کا اندھیرا تھا اور کچھ سردی کا موسم بھی تھا۔ اب یہاں سردی کا موسم معلوم کس طرح سے ہوا؟ کہ وہ کہتے ہیں کہ میں آگ لاؤں تاکہ تم تاپو، سینکو۔ آگ کا تاپنا، آگ کا سینکنا، یہ سردی میں ہوتا ہے۔ جس طرح سے سائے کے اندر جا کر ٹھکانا لینا، بیٹھنا، یہ گرمی میں ہوتا ہے۔ تو یہ سفر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سردی میں تھا، اور وہ علاقہ ویسے بھی کچھ ٹھنڈا ہے۔ کہا اپنے گھر والوں کو کہ تم ٹھہرو! اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ نَارًا: میں نے آگ دیکھی ہے۔ لَّعَلِّیْٓ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ: ہوسکتا ہے کہ میں لے آؤں تمہارے پاس وہاں سے کوئی خبر۔ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ: یا آگ کا انگارہ۔ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ: تاکہ تم تاپو۔ اِصْطِلَاء: تاپنا، سینکنا۔ تاکہ تم آگ سینکو۔ یہاں لفظ آیا: اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ۔ اور پہلے لفظ آیا تھا: اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى (سورۂ طٰہٰ: ۱۰) یا مجھے آگ پر کوئی راہنمائی مل جائے، یعنی عادت یہی ہے کہ جہاں آگ جلتی ہوئی نظر آئے تو وہاں کوئی نہ کوئی لوگ ہوتے ہیں، وہاں موجود ہوں گے تو میں وہاں سے راستے کی خبر لے آؤں گا کہ راستہ کدھر کو ہے، راہنمائی حاصل کرلوں گا۔ اور ہوسکتا ہے کہ کوئی انگارہ بھی اٹھا لاؤں، تو یہاں جلا کے ہم آگ سینک لیں گے، دونوں فائدوں میں سے ایک تو ہو ہی جائے گا۔ اَوْ منع خُلُو کے لئے ہے، اور دونوں بھی ہوسکتے ہیں کہ راہنمائی بھی حاصل ہو جائے اور آگ بھی لے آؤں۔ فَلَمَّآ اَتٰىهَا: جب موسیٰ علیہ السلام اس آگ کے پاس آئے۔ نُوْدِیَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ: شَاطِئ: کنارے کو کہتے ہیں۔ الْوَادِ الْاَیْمَنِ: یُمن والی وادی، برکت والی وادی۔ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ: بقعہ: ٹکڑے کو کہتے ہیں، قطعہ، پلاٹ جس طرح سے ہوتا ہے۔ مِنَ الشَّجَرَةِ: درخت سے۔ آواز دیے گئے مبارک زمین کے ٹکڑے میں برکت والی وادی کے کنارے سے درخت سے۔ یعنی وہ جگہ بقعہ مبارکہ تھی، برکت والی تھی، اور جو وادی تھی وہ وادی بھی برکت والی تھی، اس کے کنارے سے درخت سے یعنی اس کے کنارے پہ درخت کھڑا تھا اور اس درخت سے وہ آواز آئی۔ کہتے ہیں کہ وہ درخت جس سے آواز آئی تھی وہ اس وقت تک موجود ہے اور سرسبز ہے۔ اور وہاں کے لوگ کہتے ہیں کہ کبھی کسی موسم میں بھی وہ درخت خشک نہیں ہوتا، اور وہاں یہودیوں کا معبد خانہ ہے، عبادت خانہ بنا ہوا ہے۔

''طور'' پر اللہ سے ہم کلامی اور نبوّت و معجزات کا ملنا

تو درخت سے آواز آئی: اَنْ يّٰمُوْسٰى: یہ ''اَنْ'' تفسیر یہ ہے، نُوْدِيَ کی تفسیر ہے، جس طرح آپ ''نحو'' میں پڑھتے ہیں نَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰاِبْرٰهِيْمُ، تو اسی طرح سے یہ ''اَنْ'' بھی تفسیر یہ ہے۔ يّٰمُوْسٰى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ: مضمون ایک ہی ہے، مختلف سورتوں میں مختلف الفاظ سے ادا کیا گیا ہے، دوسری جگہ الفاظ ہیں اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (سورۂ نمل:۹) کہیں کس طرح سے ذکر کر دیا، کہیں کس طرح سے، بات ایک ہی ہے۔ ''میں اللہ ہوں رَبّ العالمین۔'' یہ درخت سے آواز آئی، یہ درخت نہیں کہہ رہا، درخت سے آواز آ رہی ہے، آواز اللہ تعالیٰ کی ہے، جو محسوس ہوئی درخت سے...... جس طرح سے میں نے پہلے آپ کے سامنے مثال دی تھی کہ بولتا تو پیچھے سے آپ کا کوئی بھائی یا ابا ہے، اور آواز آتی ہے ٹیلیفون سے، اور بظاہر نکلتی ہے وہ یہیں سے، لیکن آپ سمجھتے ہیں، جس کی آواز ہوتی ہے آپ ساری ضمیریں اسی کی طرف لوٹاتے ہیں، اور خطاب کرتے ہیں تو اسی کو کرتے ہیں جس کی آواز ہوتی ہے، چاہے بظاہر آپ کے ہاتھ میں وہ ایک ڈنڈا سا ہوتا ہے...... تو اسی طرح درخت سے آواز آئی، اے موسیٰ! میں اللہ ہوں رَبّ العالمین۔ وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ: یہ واقعات گزر چکے ہیں، ان کی تفصیل کی اب چنداں ضرورت نہیں۔ اپنی لاٹھی ڈال دے۔ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ: اس کی تفصیل زیادہ آئی تھی سورۂ طٰہٰ میں۔ جس وقت دیکھا موسیٰ علیہ السلام نے اس لاٹھی کو کہ وہ تو لہلہا رہی ہے۔ تَهْتَزُّ: حرکت کر رہی ہے، جس طرح سے سانپ یوں سر اُٹھا لیتا ہے اور اس طرح سے لہلہاتا ہے، اسی طرح سے وہ لاٹھی کرنے لگ گئی، جب دیکھا موسیٰ علیہ السلام نے اس لاٹھی کو لہراتے ہوئے، كَاَنَّهَا جَآنٌّ: گویا کہ وہ سانپ ہے۔ وَّلّٰى مُدْبِرًا: تو پیٹھ پھیر کے بھاگ پڑے۔ وَّلّٰى: پیٹھ پھیری اور مُدْبِرًا: یہ حال مؤکدہ ہے، یعنی ادھر سے مڑے، پیٹھ پھیر کے بھاگ نکلے...... اس سے آپ اندازہ کیجئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پتا نہیں تھا کہ یہ لاٹھی سانپ بننے والی ہے، اگر یہ پہلے پتا ہوتا تو سانپ بننے پہ جلدی سے دہشت نہ طاری ہوتی، یہی فرق ہوتا ہے بنیادی طور پر جادو میں اور معجزے میں، جادوگر اگر کوئی کرتب سیکھتا ہے، تو با قاعدہ اس کے لئے مجاہدے اور ریاضتیں کرتا ہے، اور مجاہدے ریاضتیں کرنے کے بعد پھر کسی تصرف پہ قادر ہوتا ہے، جس طرح سے جادوگر لاٹھیوں کو سانپ بناتے تھے، رسیوں کو سانپ بناتے تھے، لیکن انہوں نے مجاہدے کر کر کے یہ حاصل کیا ہوتا ہے، اور جس وقت ان کا کرتب کامیاب ہوتا ہے، تصرف کرتے ہیں، وہ نمایاں ہو جاتا ہے تو ان کو خوشی ہوتی ہے کہ دیکھو! ہم جس کام کے لئے محنت کر رہے تھے وہ ہو گیا، ڈرنے اور دہشت زدہ ہونے کا سوال ہی نہیں، تو انبیاء علیہم السلام کو جو معجزہ دیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ ان کو پہلے پتا ہو۔ جھوٹے، فریب کار لوگ، جادوگر، کاہن، ان کے ذہن میں پہلے ایک سکیم ہوتی ہے کہ ہم یوں مجاہدہ کریں گے، یوں ریاضتیں کریں گے، یہ پڑھیں گے، اتنے دن تک پڑھیں گے، پھر یہ نتیجہ نکلے گا۔ ان کے ذہن میں تو ایک پلان ہوتا ہے، ایک منصوبہ ہوتا ہے، لیکن نبی کے ذہن میں کچھ بھی نہیں۔ وہ تو آگ لینے گئے تھے، جس طرح کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی دَین کا حال موسیٰ علیہ السلام سے پوچھو، کہ آگ لینے گئے تھے، پیغمبری مل گئی۔[1] وہ تو آگ لینے گئے تھے سینکنے کے لئے، یا راستہ پوچھنے گئے تھے کہ وہاں کوئی آدمی بیٹھا ہوگا اس سے پوچھیں گے کہ راستہ کدھر کو جا رہا ہے؟ اور

(۱) خدا کی دَین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال ... کہ آگ لینے کو جائیں، پیمبری مل جائے (دیکھیں تفسیر عثمانی: طٰہٰ آیت ۱۰ کے تحت) یہ شعر ''امین الدولہ'' کا ہے۔

وہاں آ گے یہ قصہ ہو گیا، تو ان کو کوئی پتا نہیں کہ میں لاٹھی ڈالوں گا تو کیا نتیجہ نکلے گا؟ اس لیے وہ جو یکدم سانپ بنی، تو ان پر دہشت سی طاری ہو گئی۔ وَلَمْ يُعَقِّبْ: اس کا معنی ہے: لَمْ يَرْجِعْ مُوْسٰى عَلٰى عَقِبِهٖ، موسیٰ علیہ السلام اپنی ایڑیوں کے بل واپس نہیں لوٹے، یعنی مڑ کے نہیں دیکھا، اس طرح سانپ سے دہشت زدہ ہو کے وہاں سے بھاگے، پھر اللہ تعالیٰ نے آواز دی: يٰمُوْسٰٓى اَقْبِلْ: آگے آ جاؤ، متوجہ ہو جاؤ، وَلَا تَخَفْ: خوف نہ کیجئے۔ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ: آپ امن والے لوگوں میں سے ہیں، بے خوف لوگوں میں سے ہیں، یہ تو آپ کو اسلحہ دیا جا رہا ہے اگلی جنگ جیتنے کے لئے، آپ کو مسلح کیا جا رہا ہے، یہ دوسروں کے لئے خوف کی بات ہے، آپ کے لئے کوئی خوف کی بات نہیں۔ اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ: ڈال تو اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں۔ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ: نکلے گا یہ سفید چمکتا ہوا بغیر کسی بیماری کے۔ یہ نہیں کہ جیسے بعض بیماریاں ہوتی ہیں، مثلاً برص کی، جس سے چمڑا بالکل سفید ہو جاتا ہے، یہ بیماری نہیں، یہ سفید چمکتا ہوا نکلے گا۔ وَّاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ: حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں یہ مطلب بیان کیا کہ جس طرح سے سانپ کو دیکھ کے ہیبت سی طاری ہوئی، تو سفید ہاتھ کو دیکھ کے طبیعت کچھ گھبرائے، تو اس کو دوبارہ گریبان میں ڈال لے، جس وقت دوبارہ یوں کرو گے تو ٹھیک ہو جائے گا۔ اپنے بازو کو اپنے ساتھ ملا لے خوف کی وجہ سے، یعنی اگر اس سے بھی کوئی وحشت معلوم ہو، جیسے لاٹھی کے بارے میں کہا تھا کہ اس کو پکڑ لو: سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى (سورۂ طٰہٰ: ۲۱) ہم اس کو پہلے جیسا کر دیں گے، اپنی پہلی حالت پہ لوٹ آئے گا۔ اسی طرح سے اپنے بازو کو اپنے ساتھ لگانا، وہ پہلی حالت پہ آ جائے گا...... اور بعض مفسرین نے یوں ذکر کیا کہ یہ آئندہ کے لئے خوف زائل کرنے کا ایک طریقہ بتایا جا رہا ہے کہ جب آگے جاؤ گے، فرعون سے گفتگو ہوگی، کہیں بھی کوئی وحشت اور دہشت معلوم ہو تو اپنے ہاتھ کو یوں کر کے (بازو کو پہلو کے ساتھ ملا کر) ذرا دبا لیا کرنا تو دل میں خوف نہیں آئے گا، یہ بھی سکون اور اطمینان کے حاصل کرنے کا ایک طریقہ بتا دیا۔ جیسے حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ یہاں لکھتے ہیں ''یعنی بازو کو پہلو سے ملا لو، سانپ وغیرہ کا ڈر جاتا رہے گا۔ شاید آگے کے لئے بھی خوف زائل کرنے کی یہ ترکیب بتلائی ہو۔'' ملا لینا اپنے بازو کو پہلو میں مِنَ الرَّهْبِ: خوف کی وجہ سے۔ اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کا حاصل یہ ہے کہ اس ہاتھ کی یہ کیفیت زائل کرنے کے لئے، یعنی اگر کوئی رعب، کوئی خوف، کوئی ہیبت معلوم ہو رہی ہے تو دوبارہ اس کو اپنے ساتھ ملا لو، ملانے کے بعد وہ پہلی حالت پہ آ جائے گا۔ جس طرح سے عصا کو پکڑیں، تو وہ پہلی حالت پہ آ جاتا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کے پاس دو مضبوط دلیلیں

فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ: یہ دو بڑی قوی دلیلیں آ گئیں تیرے رب کی طرف سے۔ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ىِٕهٖ: فرعون اور اس کے ارکان کی طرف جانے کے لئے۔ فرعون اور اس کے ارکان کی طرف یہ تیرے رب کی دو بڑی دلیلیں ہیں، یعنی یہ دو دلیلیں دے کر تجھے فرعون اور اس کے ارکان کی طرف بھیجا جا رہا ہے۔ ملأ: کا لفظ بارہا گزر گیا کہ ملأ سرداروں کو کہتے ہیں، مجلس کے اراکین کو کہتے ہیں۔ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ: بے شک یہ لوگ نافرمان ہیں، فسق و فجور میں مبتلا ہیں۔ ان کے پاس یہ دو دلیلیں لے کے جاؤ۔ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ: اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو واقعہ یاد آ گیا دیکھو! پہلے بھی مصر جا رہے تھے، اس

وقت ڈر نہیں، کیونکہ پہلے تو فرعون کے دربار میں جانا ہی نہیں تھا، جائیں گے اور جا کے اپنے گھر والوں سے گھل مل جائیں گے، ضروری نہیں کہ فرعون کو پتا چلے کہ باہر سے کوئی آدمی آیا ہے...... اب تو سیدھا فرعون کے پاس جانا ہے، جا کے اس سے بات کرنی ہے، اب یاد آ گیا کہ جی! میں تو وہاں سے یوں کر کے نکلا تھا، میرے ہاتھ سے تو ایک قبطی مارا گیا تھا، جس کے نتیجے میں وہ مجھے قتل کرنا چاہتے تھے، اب اگر میں سیدھا وہاں چلا گیا، تو ان کو پچھلا واقعہ یاد آ جائے گا، اور مجھے وہ قتل کر دیں گے، میں آپ کی بات پہنچا ہی نہ سکوں گا۔ اے میرے رب! میں نے ان میں سے ایک نفس کو قتل کیا ہوا ہے، فَاَخَافُ: میں اندیشہ کرتا ہوں۔ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ: کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔ اَيْ يقتلوني، ''ن'' کے نیچے کسرہ یائے متکلم پر دلالت کرتا ہے۔

ہارون علیہ السلام کو نبی بنانے کی درخواست اور اللہ کی طرف سے قبولیت

وَاَخِيْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا: اور میرا بھائی ہارون وہ مجھ سے زیادہ صاف زبان والا ہے، جس طرح سے پیچھے لفظ آیا تھا: وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ (سورۂ شعراء: ۱۳) میری زبان نہیں چلتی۔ اور وہ بڑی صاف زبان والا ہے، بڑا فصیح بلیغ ہے، جس سے معلوم ہو گیا کہ تقریر میں خطبے میں فصاحت بلاغت صاف گوئی ایک اچھی صفت ہے۔ میرا بھائی ہارون وہ مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہے، اس کی زبان زیادہ صاف ہے۔ فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْاً: اس کو میرے ساتھ بھیج دے بطور مدد کے۔ يُّصَدِّقُنِيْٓ: وہ میری تصدیق کرے گا، اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ: میں اندیشہ کرتا ہوں کہ وہ میری تکذیب کریں گے، فرعونی تکذیب کریں گے اور مجھے جھوٹا کہیں گے، بحث مباحثے کی نوبت آئے گی۔ اور بحث مباحثے میں، مناظرے میں، کوئی صاف زبان والا آدمی ہو تو زیادہ اچھی طرح سے بات کہہ لیتا ہے، دوسروں پہ غالب آ جاتا ہے، ورنہ میری تو زبان نہیں چلتی، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ میری تکذیب شروع کر دیں، میں آگے سے پورے طریقے سے بحث نہ کر سکوں، تو بہتر ہے کہ بطور مدد کے میرے ساتھ ہارون کو بھیج دو، وہ بڑا فصیح اللسان ہے۔ قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ: اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ہم ضرور مضبوط کر دیں گے تیرے بازو کو تیرے بھائی کے ساتھ۔ جس طرح ہم کہتے ہیں کہ ''اسے تیرا قوتِ بازو بنا دیں گے۔'' ضرور مضبوط کر دیں گے ہم تیرے بازو کو تیرے بھائی کے ذریعے سے۔

فرعون تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا

وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا: اور بنا دیں گے ہم تمہارے لئے غلبہ۔ سلطان تسلط اور غلبے کو کہتے ہیں یعنی میں تمہیں ایسی ہیبت اور ایسا رعب دوں گا کہ فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا: وہ لوگ تم دونوں تک پہنچ نہیں سکیں گے، نہیں پہنچیں گے وہ تم دونوں کی طرف۔ بِاٰيٰتِنَآ اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ: ہماری آیات کی برکت سے تم اور وہ لوگ جو تم دونوں کی اتباع کریں گے، غلبہ پانے والے ہیں۔ ان آیات کی برکت سے غلبہ تمہیں حاصل ہوگا...... یہاں دیکھئے!...... ''بِاٰيٰتِنَآ'' کے آگے پیچھے تین تین نقطے لگے ہوئے ہیں، میں نے بارہا آپ کی خدمت میں عرض کیا ہے کہ جہاں یہ اشارہ ہوتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ ترکیب کے لحاظ سے یہ ماقبل کے ساتھ بھی جڑ سکتا ہے، اور ترکیب کے لحاظ سے مابعد کے ساتھ بھی جڑ سکتا ہے۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا بِاٰيٰتِنَآ ہماری آیات کی برکت سے وہ تم تک پہنچ ہی نہ سکیں گے۔ اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ: تم اور تمہارے پیروی کرنے والے غالب آئیں گے، بات یوں بھی

ہو سکتی ہے...... اور یوں بھی ہو سکتا ہے کہ فَلَا یَصِلُوْنَ اِلَیْكُمَا یہاں بات کو ختم کر دیجئے۔ بِاٰیٰتِنَآ اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ۔ یعنی بِاٰیٰتِنَآ کی ترکیب دو طرح سے ہو سکتی ہے، اس کو ماقبل کے ساتھ جوڑ لیجئے تو وقف یہاں کریں فَلَا یَصِلُوْنَ اِلَیْكُمَا بِاٰیٰتِنَآ ہماری آیات کی برکت سے وہ تم دونوں تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ ''نہیں پہنچ سکیں گے'' یعنی نقصان پہنچانے کے لیے، تم پر ہاتھ نہیں ڈال سکیں گے۔ یہ تو بِاٰیٰتِنَآ ماقبل کے ساتھ لگ گیا۔ آگے ترجمہ یہ ہوگا کہ تم دونوں اور وہ لوگ جو تم دونوں کی اتباع کریں گے، غلبہ پانے والے ہیں...... اور اگر آپ چاہیں تو فَلَا یَصِلُوْنَ اِلَیْكُمَا وقف یہاں کرلیں، وہ تم دونوں تک نہیں پہنچ سکیں گے، نہیں پہنچیں گے۔ بِاٰیٰتِنَآ اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ہماری آیات کی برکت سے تم دونوں اور وہ لوگ جو تم دونوں کے متبع ہیں غلبہ پانے والے ہیں...... تو اس کی ترکیب دونوں طرح سے ہو سکتی ہے، چاہے اس کو ماقبل کے ساتھ جوڑ لیجئے، چاہے اس کو مابعد کے ساتھ جوڑ لیجئے۔

موسیٰ علیہ السلام کا پیغامِ توحید اور فرعونیوں کا انکار

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰی: جب موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس آ گئے، بِاٰیٰتِنَا بَیِّنٰتٍ ہماری آیات واضح واضح لے کر، قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًی: وہ کہنے لگے کہ نہیں ہے یہ مگر گھڑا ہوا جادو، سِحْرٌ: جادو۔ مُفْتَرًی: گھڑا ہوا۔ یہ تو ایسے تراشی ہوئی باتیں ہیں جس طرح سے جادو ہوا کرتا ہے۔ وَمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِیْٓ اٰبَآىِٕنَا الْاَوَّلِیْنَ: اور نہیں سنی ہم نے یہ بات اپنے پہلے آباء میں، کہ پہلے آباء میں سے کسی نے کہا ہو کہ اللہ ربّ العالمین بھی کوئی ہے، اور ہم سب اس کے بندے ہیں، مرنے کے بعد جی اٹھنا ہے، اور پیغمبر بھی آیا کرتے ہیں، یہ توحید کی باتیں، آخرت کی باتیں، ہم نے پہلے اپنے آباء واجداد میں کسی سے سنی ہی نہیں، یہ جتنی باتیں کر رہا ہے ساری کی ساری گھڑی ہوئی ہیں اور جادو کی سی باتیں ہیں۔ اور یہ جو معجزات کہہ رہا ہے تو یہ بھی جادو ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کا جواب

وَقَالَ مُوْسٰی رَبِّیْٓ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰی: موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میرا ربّ خوب جانتا ہے اس شخص کو جو ہدایت لے کے آیا۔ مِنْ عِنْدِهٖ: اللہ کے پاس سے، اس ربّ کے پاس سے۔ وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ: اور خوب جانتا ہے اس کو جس کے لئے اس دنیا کا اچھا انجام ہے (مظہری)۔ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ: بے شک ظالم لوگ فلاح نہیں پائیں گے، ظالم لوگ کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوں گے۔ موسیٰ علیہ السلام کہنے لگے کہ میں اللہ کے پاس سے ہدایت لے کے آیا ہوں اور اچھا انجام کس کا ہے؟ یا تم ہدایت یافتہ ہو اور اچھا انجام تمہارا ہے، یہ اللہ خوب جانتا ہے۔ بس! جو ظالم ہے وہ کامیاب نہیں ہوگا۔ آنے والے حالات کے اعتبار سے معلوم ہو گیا کہ فرعونی ظالم تھے، اور وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ موسیٰ علیہ السلام اللہ کی طرف سے ہدایت لے کے آئے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو کامیابی دی۔ قَالَ: کہا موسیٰ علیہ السلام نے، رَبِّیْٓ اَعْلَمُ: خوب جانتا ہے (اسم تفضیل کا صیغہ ہے) میرا ربّ خوب جانتا ہے اس شخص کو جو لے آیا ہدایت اللہ کے پاس سے، میرے ربّ کے پاس سے۔ اور میرا ربّ خوب جانتا ہے اس شخص کو جس کے لئے اس دنیا کا اچھا انجام ہے۔ اس دنیا کا اچھا انجام کس کے لیے ہے یہ بھی اللہ خوب جانتا ہے۔ اِنَّهٗ: ہٗ ضمیر شان ہے، بے شک بات یہ ہے لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ: ظالم لوگ فلاح نہیں پائیں گے۔

فرعون کی سیاسی چال

وَقَالَ فِرْعَوْنُ: فرعون نے کہا، یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرِیْ: موسیٰ علیہ السلام نے جب رب العالمین کا تعارف کرایا تھا، جس طرح سے پچھلی سورتوں میں آپ کے سامنے واقعہ گزرا۔ تو فرعون کو یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں میرے ارکانِ سلطنت اس سے متاثر نہ ہوجائیں، اور متاثر ہوگئے تو ابھی میری خدائی کا انکار ہوجائے گا، میں جو ''رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى'' کا نعرہ لگا رہا ہوں، تو اگر رَبّ العالمین انہوں نے کسی اور کو مان لیا پھر میرا تو کام خراب ہوگیا...... دیکھو! یہ سیاسی شاطر جو ہوا کرتے ہیں، ہمیشہ ایسے وقت میں عوام کو ذہنی گمراہی میں مبتلا کرتے ہیں، یہ فرعون کے قصے میں بڑی سیاست ہے، اب اس نے اپنے ارکانِ سلطنت کو مغالطہ دینے کے لئے کہا کہ بھئی! دیکھو یہ کہتا ہے کہ اِلٰہ کوئی اور ہے، صحیح بات ہے کہ مجھے تو اپنے علاوہ کوئی دُوسرا اِلٰہ معلوم نہیں، باقی! ایک یہ بات سامنے آگئی ہے، اس نے کہہ دیا ہے کہ کوئی اور بھی اِلٰہ ہے، ہم اس کی تحقیق کر لیتے ہیں...... تو جب کسی بات کو اُلجھانا ہو، تو اہلِ حکومت کا کام ہوتا ہے کہ تحقیقات کے لئے کمیشن بٹھا دیا جائے، اب وہ کمیشن تحقیق کرتا رہے گا، اتنی دیر تک لوگ چپ رہیں گے، کچھ وقت اس میں گزر جائے گا، اس کے دوران میں کوئی اور سیاسی چال آجائے گی، تحقیقات کے لیے ایک کمیشن متعین کردیا جی! فلاں جج کی سربراہی میں، اور تحقیق کرتے کرتے لوگوں کے جذبات ٹھنڈے ہوجاتے ہیں، اور اس درمیان میں حکومت اپنے آپ کو سنبھال لیتی ہے، اور قصہ ختم ہوجاتا ہے، جب بھی کسی کمیشن کو تحقیقات کے لئے بٹھایا جائے، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حکومت ٹال مٹول کرنا چاہتی ہے..... تو یہاں فرعون نے بالکل یہی چال اختیار کی، معلوم ہوتا ہے کہ یہ سیاسی چالیں بہت پُرانی ہیں، تو یہ بھی چونکہ اہلِ حکومت میں سے تھا، تو یہ کہنے لگا: بہت اچھا! کوئی بات نہیں، مجھے تو اپنے علاوہ کوئی اِلٰہ معلوم نہیں، یہ کہتا ہے کوئی اور بھی ہے، تو ہم تحقیقات کر لیتے ہیں، او ہامان! (وزیر اعظم کو بُلایا) ہامان! اینٹیں پکاؤ بھئی! بھٹہ لگاؤ، اینٹیں پکاؤ، پکانے کے بعد ایک اُونچا محل بناؤ، میں اس کے اُوپر چڑھوں گا، چڑھ کے اُوپر پھر میں دیکھ کے آؤں گا کہ کیا اُوپر کوئی اور خدا بھی ہے، یہاں تو مجھے کوئی اور نظر نہیں آتا، یہاں زمین پر تو مجھے کوئی اپنے علاوہ نظر نہیں آتا، ایک اُونچا محل، اُونچا منارہ بناؤ، اس کے اُوپر چڑھ کے میں جا کے اُوپر دیکھ آؤں گا۔ یہ (فرعون) یا تو بدحواس ہوگیا ہے، اس لئے اس قسم کی باتیں کرتا ہے، یا وہی کمیشن بٹھانے والی بات ہے، ذہنی طور پر لوگوں کو ایک چکر دینا ہے تاکہ لوگ مطمئن ہوجائیں کہ ہمارا فرعون ہمارا بادشاہ بڑا منصف ہے، کہ دیکھو! ایک بات سامنے آئی تھی اس کی تحقیق کرنا چاہتا ہے، تو ہامان کی ڈیوٹی لگادی، یوں اپنے مصاحبین کو چکر دیا، کہنے لگا کہ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ: اے میرے اراکین! ملأ: اراکین، دربار کے جو ساتھ معاونین ہوتے ہیں، جن کو اب اسمبلی کے ممبر، کابینہ کے اراکین کہہ سکتے ہیں۔ اے اراکین! مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرِیْ: میں تمہارے لیے اپنے علاوہ کوئی اِلٰہ نہیں جانتا، میرے علم میں تو ہے نہیں، فَاَوْقِدْ لِیْ یٰهَامٰنُ: اَوْقَدَ اِیقادًا: آگ جلانا، عَلَى الطِّیْنِ: طین کہتے ہیں کیچڑ کو، گیلی مٹی کو۔ اے ہامان! میرے لئے آگ جلا مٹی پر۔ مٹی پر آگ جلانے سے یہاں اینٹیں پکانا مراد ہے، آوا پکانا، جس کو ہم بھٹہ کہتے ہیں۔ اے ہامان! میرے لئے مٹی کے اُوپر آگ جلا یعنی اینٹیں پکا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں بھی اینٹیں پکا کے محل بنانے کی عادت تھی، یہ اینٹیں پکانے کا رواج پہلے کا ہے۔ چنانچہ پُرانے پُرانے

کھنڈرات جو نکلتے ہیں ہزار ہا سال پہلے کے، ان کے اندر بھی اینٹیں پختہ نکلتی ہیں، پُرانے مکان جس طرح سے چھوٹی چھوٹی اینٹوں کے ہوتے ہیں، شہروں کے اندر پُرانے مکانات آپ نے دیکھے ہوں گے، تو اس طرح سے پُرانے آثار جو نکلتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اینٹیں پکانے کا رواج بہت پُرانا ہے۔ فَاَوْقِدْ لِیْ یٰهَامٰنُ: اے ہامان! (یہ ہامان وہی وزیر ہے جس کا ذکر پہلے رُکوع میں آپ کی خدمت میں کیا تھا) اے ہامان! میرے لئے مٹی پر آگ جلا یعنی اینٹیں پکا۔ فَاجْعَلْ لِّیْ صَرْحًا: پھر میرے لئے ایک محل بنا۔ صرح کا لفظ سورۂ نمل میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصے میں بھی آیا تھا، جب سلیمان علیہ السلام نے کہا تھا کہ صرح میں داخل ہو جاؤ، اور جب داخل ہونے لگی تو اس نے محسوس کیا کہ شاید یہ کوئی گہرا پانی ہے۔ تو صرح محل کو کہتے ہیں۔ بنا میرے لئے محل۔ لَّعَلِّیْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓی اِلٰهِ مُوْسٰی: تا کہ میں جھانک آؤں موسیٰ علیہ السلام کے اِلٰہ کی طرف، تا کہ میں اطلاع پاؤں جھانکوں موسیٰ کے اِلٰہ کی طرف، یعنی میں اوپر چڑھوں اُوپر جا کے دیکھ کے آتا ہوں کہ کیا کوئی آسمانوں میں اور بھی ہے؟ وَاِنِّیْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ: اور بے شک میں تو البتہ اس کو جھوٹوں میں سے سمجھتا ہوں، کہ یہ غلط کہتا ہے جو کہتا ہے کہ رَبّ السمٰوٰت کوئی اور ہے، رَبّ العالمین کوئی اور ہے، مجھے تو معلوم نہیں، ویسے دیکھ لیتے ہیں، تحقیقات کر لیتے ہیں۔ اب کہاں پہلے کچی اینٹیں بنائی جائیں گی، پھر بھٹہ پکایا جائے گا، پھر محل بنے گا، پھر محل بنے گا تو کہیں فرعون صاحب اُوپر چڑھیں گے، تو یہ برسہا برس کے لئے ایک سکیم دے دی، کہ اگر یہ اس طرح سے لوگوں کو کہہ دیا کہ کوئی بات نہیں، تحقیقات کر لیتے ہیں، دیکھیں گے کیا نتیجہ نکلتا ہے، تو کئی سالوں کے لئے گویا کہ عوام کو چکر میں ڈال دیا، یہ ہے اس کا مقصد...... یا پھر وہ بدحواس ہو گیا، اس لیے بدحواسی میں ایسی باتیں کرنی شروع کر دیں، لیکن بدحواس ہونے کی بجائے یہ سیاسی چال زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

فرعونیوں کی طرف سے تکذیب اور ان کا انجام

وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُوْدُهٗ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ: متکبر ہو گیا فرعون، حق کو قبول نہ کیا۔ استکبار اصل میں یہ ہوتا ہے کہ حق کے سامنے نہ جھکنا۔ متکبر ہو گیا فرعون اور اس کے لشکر، تکبر کیا فرعون نے اور اس کے لشکر نے زمین میں ناحق۔ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَیْنَا لَا یُرْجَعُوْنَ: اور وہ سمجھے کہ بے شک وہ ہماری طرف لوٹ کے نہیں آئیں گے، ان کو ہمارے پاس آنے کا خیال نہیں تھا، اس لئے وہ تکبر کرتے تھے۔ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ: پھر پکڑ لیا ہم نے اس کو اور اس کے لشکروں کو۔ فَنَبَذْنٰهُمْ فِی الْیَمِّ: اٹھا کے دریا میں پھینک دیا، پھینک دیا ہم نے ان کو سمندر میں، دریا میں۔ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِیْنَ: دیکھ پھر ظالموں کا کیا انجام ہوا۔ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ اب ان ظالموں کا انجام دیکھ۔

تو یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سفرِ ہجرت کے لئے کتنا مطابق ہے، اور وقت کے فرعونوں کو کس طرح سے ذہنی تنبیہ کی، نتیجہ یہاں بھی وہی نکلا۔ اگر وہ اُٹھا کے سمندر میں پھینک دیے گئے تھے اور نام ونشان نہ رہا، تو ادھر یہ سارے کے سارے جتنے بڑے بڑے فرعون تھے، وہ بدر میں قتل ہوئے اور اُٹھا کے گڑھے میں پھینک دیے گئے، یہاں بھی ظالموں کا انجام سامنے آ گیا، وہاں بھی ظالموں کا انجام سامنے آ گیا۔

انبیاء علیہم السلام کے مکذبین جہنمیوں کے امام بنے

وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ: بنایا ہم نے ان فرعونیوں کو، یعنی فرعون کو، ہامان کو، اور ان کے لشکروں کو، ایسے امام جو کہ جہنم کی طرف بلاتے تھے۔ جہنم کی طرف بلانے کا معنی ہے کفر و شرک کی طرف بلانا، غلط کاموں کی طرف بلانا، کیونکہ یہی غلط کام کل کو آگ کی شکل میں سامنے آئیں گے۔ تو جو آدمی آپ کو غلط کام کی ترغیب دیتا ہے گویا کہ وہ جہنم میں جانے کی ترغیب دے رہا ہے۔ ہم نے ان کو ایسے پیشوا بنایا تھا جو جہنم کی طرف بلاتے تھے، وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ: قیامت کے دن یہ مدد نہیں کیے جائیں گے۔ وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً: ہم نے پیچھے لگا دی ان کے اس دنیا میں لعنت۔ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ: اور قیامت کے دن بھی وہ برائی بیان کئے ہوؤں میں سے ہوں گے، بدتر لوگوں میں سے ہوں گے۔ قبح کہتے ہیں برائی کو۔ مقبوح: جس کی برائی بیان کی گئی ہو۔ بدترین لوگوں میں سے ہوں گے، ان لوگوں میں سے ہوں گے جن کی برائی بیان کی جاتی ہو۔ ''لعنت'' کا معنی ہوتا ہے اللہ کی رحمت سے دُور کرنا۔ ہم نے ان کے پیچھے لعنت لگا دی یعنی ان کو ہر قسم کی رحمت سے دُور کر دیا۔ اور قیامت کے دن بھی یہ برائی بیان کیے ہوئے لوگوں میں سے ہوں گے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآىِٕرَ لِلنَّاسِ

البتہ تحقیق ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی بعد اس کے کہ ہم نے پہلی جماعتوں کو ہلاک کر دیا، وہ کتاب لوگوں کے لئے سامانِ بصیرت تھی

وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۳﴾ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ

اور ہدایت تھی اور رحمت تھی، تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں ﴿۴۳﴾ آپ طور پہاڑ کی غربی جانب میں نہیں تھے جس وقت ہم نے موسیٰ

اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ

کی طرف حکم بھیجا تھا، اور نہ آپ موجودین میں سے تھے ﴿۴۴﴾ لیکن ہم نے پیدا کیں بہت ساری جماعتیں، پھر دراز ہو گئیں

عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۙ وَلٰكِنَّا كُنَّا

ان پر عمریں، اور نہیں تھے آپ ٹھہرنے والے اہلِ مدین میں کہ پڑھتے ہو آپ ان پر ہماری آیتیں، لیکن ہم

مُرْسِلِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ

رسول بنا کر بھیجنے والے ہیں ﴿۴۵﴾ اور آپ طور کی جانب میں بھی نہیں تھے جس وقت ہم نے موسیٰ کو ندا دی تھی لیکن آپ کے رب کی رحمت کی وجہ سے

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝۴۶ وَلَوْلَآ

تا کہ آپ ڈرائیں ایسے لوگوں کو کہ نہیں آیا ان کے پاس کوئی ڈرانے والا آپ سے قبل، تا کہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں ۴۶ اگر یہ بات نہ ہوتی

اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا

کہ پہنچتی ان کو کوئی مصیبت ان اعمال کی وجہ سے جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجے ہیں پھر یہ کہتے اے ہمارے رب! کیوں نہ بھیجا تُو نے ہماری

رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۴۷ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا

طرف کوئی رسول، ہم تیری آیات کی اتباع کر لیتے اور مؤمنین میں سے ہو جاتے ۴۷ پھر جب ان کے پاس حق آ گیا ہماری جانب سے، تو یہ کہنے لگے

لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى ؕ اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۚ

کیوں نہیں دیا گیا یہ مثل اس چیز کے جو دیے گئے موسیٰ علیہ السلام، کیا انکار نہیں کیا ان لوگوں نے اس چیز کا جو دیے گئے تھے موسیٰ اس سے پہلے،

قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا ۫ وَقَالُوْٓا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ۝۴۸ قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ

کہا انہوں نے: یہ دو جادو ہیں جو آپس میں موافق ہو گئے، اور کہتے ہیں ہم تو ہر ایک کا انکار کرنے والے ہیں ۴۸ آپ کہہ دیجئے لے آؤ تم کوئی کتاب

اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۴۹ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ

اللہ کی جانب سے جو زیادہ ہدایت کا باعث ہو ان دونوں سے، میں اس کی اتباع کر لوں گا، اگر تم سچے ہو ۴۹ اگر یہ آپ کو جواب نہ دیں

فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ؕ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ

تو آپ یقین کر لیں کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ لوگ اپنی خواہشات کے متبع ہیں، اور کون زیادہ گمراہ ہے اس شخص سے جو اپنی خواہشات کا متبع ہو

بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۵۰ ع

اللہ کی طرف سے راہنمائی کے بغیر، اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو سیدھی راہ نہیں دیتا ۵۰

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ: لقد یہ تاکید کے لئے ہوتا ہے، اس کے ساتھ یہ کلام اتنی مؤکد ہو جایا کرتی ہے جس طرح سے قسم کھا کے کوئی بات کہی جائے، اس لئے ''لام'' دال بر قسم ہوتا ہے، لَقَدْ اٰتَيْنَا: البتہ تحقیق (یہ ترجمہ جو کرتے ہیں یہ بھی تاکید کا ہے) یہ پکی بات ہے، یقینی بات ہے کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی۔ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى: مَآ اَهْلَكْنَا میں ''ما'' مصدریہ ہے

اور الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰی: پہلی جماعتیں۔ پہلی جماعتوں کے ہلاک کرنے کے بعد، بعد اس کے کہ ہم نے پہلی جماعتوں کو ہلاک کر دیا۔ اور محاورے کے مطابق ترجمہ یوں ہوگا "پہلی جماعتوں کو ہلاک کرنے کے بعد" پہلی جماعتوں سے مراد ہوگئی قوم ثمود، قوم عاد، قومِ نوح، جو اللہ کی طرف سے عذاب کے ساتھ تباہ ہوئی تھیں۔ ہم نے ان کو ہلاک کیا، اور ان کو ہلاک کرنے کے بعد ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی۔ بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ: بَصَآئِرَ: بصیرت کی جمع ہے۔ بصیرت اصل کے اعتبار سے دل کی روشنی کو، دل کی سمجھ کو کہتے ہیں۔ وہ کتاب لوگوں کے لئے سامانِ بصیرت تھی، ایسے دلائل پر مشتمل تھی کہ جن میں غور کرنے کے ساتھ انسان کے دل کی صلاحیتیں اُجاگر ہوں، اور حق سمجھنے کی توفیق ہو۔ یہ مفہوم ہو جائے گا اس کا۔ وہ کتاب بصائر تھی لوگوں کے لئے یعنی دانش اور بینش کے حاصل کرنے کا ذریعہ تھی، اس کی ایک ایک آیت بصیرت افروز تھی۔ هُدًى: راہنمائی، یہ مصدر ہے۔ اس حال میں کہ وہ ہدایت تھی اور رحمت تھی، یعنی صحیح عقائد کے اختیار کرنے کی طرف راہنمائی کرتی تھی، اور جو شخص ان عقائد کو اختیار کر لیتا ان کے لئے باعثِ رحمت تھی...... تین لفظ جو آ گئے: بصائر، ھدی اور رحمت۔ بَصَآئِرَ کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ باتیں ایسی ہیں کہ جن میں غور کرنے کے ساتھ انسان کا عقل و فہم ٹھیک ہوتا ہے، اور هُدًى میں آ گیا کہ پھر وہ کتاب عقائد اور اچھے اعمال اختیار کرنے کے لئے راہنمائی ہے، اور رَحْمَةً ان سب کا نتیجہ ہے کہ جس وقت کوئی شخص اس سے راہنمائی حاصل کر لیتا ہے، تو دنیا و آخرت میں اسے اللہ تعالیٰ کی رحمت حاصل ہو جاتی ہے۔ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ: تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ: كُنْتَ کا خطاب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ جانب الغربی میں موصوف کی اضافت صفت کی طرف ہے۔ کوفی نحویوں کے نزدیک تو یہ بلا تاویل ہی جائز ہے، اور بصری نحوی اس اضافت کے قائل نہیں ہیں، اس لئے وہ غربی کا موصوف محذوف نکالیں گے، غالباً "کافیہ" کے سبق میں یہی مثال آپ کے سامنے گزری، تو عبارت ہو جائے گی: جانب الطور الغربی، الغربی کا موصوف نکال لیا جائے گا الطور) اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ: آپ طور پہاڑ کی غربی جانب میں نہیں تھے جس وقت ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف امر بھیجا تھا، ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف حکم بھیجا تھا اس وقت آپ جانب غربی میں نہیں تھے۔ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ: اور نہ آپ موجودین میں سے تھے، جو اس زمانے میں لوگ موجود تھے ان میں سے بھی نہیں تھے، یعنی خاص اس موقع پر بھی موجود نہیں تھے، اور اس زمانے میں جو لوگ موجود تھے ان میں سے بھی آپ نہیں تھے۔ وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا: لیکن ہم نے پیدا کیں بہت ساری جماعتیں۔ فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ: تطاول کا فاعل ہے العمر۔ ان پر ان کی عمریں دراز ہو گئیں۔ اس کے مفہوم کو مکمل کرنے کے لئے تھوڑا سا محذوف نکالنا پڑے گا یعنی آپ اس موقع پر موجود تو نہیں تھے، آپ کو یہ معلومات ہم نے وحی کے ذریعے سے دیں، اور وحی کے ذریعے سے یہ معلومات دینے کی وجہ یا ضرورت یہ پیش آئی کہ لوگوں پر عمریں دراز ہو گئیں، پہلی معلومات یہ گم کر بیٹھے، ان کے پاس ہدایت کا سامان نہیں تھا، تو ہم نے ان کو سامانِ ہدایت مہیا کرنے کے لئے آپ کو اطلاع دی، اور آپ پر وحی کی۔ یہ مفہوم ہو گیا اس آیت کا۔ لیکن پیدا کیا ہم نے بہت ساری جماعتوں کو، پھر دراز ہو گئیں ان پر عمریں۔ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ: ثَاوِيًا: ٹھہرنے والے۔ مثوی ٹھکانے کو کہا کرتے ہیں۔ نہیں تھے آپ ٹھہرنے والے، ٹھکانا لینے والے اہلِ مدین میں، تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا: کہ پڑھتے ہوں آپ ان پر ہماری آیتیں۔ وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ: لیکن

ہم رسول بنا کے بھیجنے والے ہیں، وَمَا كُنۡتَ بِجَانِبِ الطُّوۡرِ اِذۡ نَادَيۡنَا: اور آپ طور کی جانب میں بھی نہیں تھے جس وقت ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو ندا دی تھی، آواز دی تھی، وَلٰكِنۡ رَّحۡمَةً مِّنۡ رَّبِّكَ: لیکن ہم نے آپ کو نبی بنایا، آپ کی طرف وحی کی، آپ کے رب کی رحمت کی وجہ سے، لِتُنۡذِرَ قَوۡمًا مَّاۤ اَتٰهُمۡ مِّنۡ نَّذِيۡرٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ: تا کہ ڈرائیں آپ ایسے لوگوں کو کہ نہیں آیا ان کے پاس کوئی ڈرانے والا آپ سے قبل، لَعَلَّهُمۡ يَتَذَكَّرُوۡنَ: تا کہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔

تفسیر

واقعۂ موسیٰ علیہ السلام کا تتمہ

یہاں تک کا مضمون جو آپ کے سامنے آیات میں آیا، تو پہلی آیت میں تو یہ ذکر کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی، اور یہ کتاب کا ملنا یہ اس احسان کی تفصیل ہے، جس کا ذکر سورت کے شروع میں آیا تھا، کہ اللہ تعالیٰ نے مستضعفین پر احسان کرنے کا ارادہ کیا، اور یہ جو جبار فی الارض تھے فرعون جو کہ ''علا فی الارض'' کا مصداق بنا ہوا تھا، ان کو تباہ کر دیا۔ ان کو گرانے اور مستضعفین کو بڑھانے کا ہم نے جو ارادہ کیا تھا، احسان کرنے کا ارادہ کیا تھا، اس احسان کو اب سامنے لایا جا رہا ہے، کہ جو متکبرین تھے وہ تو سارے کے سارے ہو گئے ہلاک۔ جس طرح سے پچھلی متصل آیتوں میں آیا، فَاَخَذۡنٰهُ وَجُنُوۡدَهٗ فَنَبَذۡنٰهُمۡ فِى الۡيَمِّ: ان سب کو تو ہم نے دریا میں پھینک دیا، سمندر میں ڈبو دیا، اور اس کے بعد مستضعفین جو نجات پانے والے ہیں، ان پر اللہ کا احسان ہوا کہ ان کو کتاب دی گئی، جس سے ان کو ائمہ بننے کا گویا کہ سامان مہیا ہوا، یہ جو آیا تھا کہ ہم ان کو امام بنانے کا ارادہ کئے ہوئے ہیں، تو یہ کتاب ہے جس نے آ کے موسیٰ علیہ السلام اور ان کی اُمت کو اِمامت کا درجہ دیا، اور اس کتاب کی یہ صفتیں ہیں جو آپ کے سامنے ذکر کر دی گئیں، بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحۡمَةً۔ وہ بصیرت افروز کتاب تھی، اس کی ساری کی ساری باتیں ایسی تھیں جن میں غور کرنے کے ساتھ دل کی صلاحیت اجاگر ہوتی ہے، اور صحیح باتوں کی طرف وہ راہنمائی تھی، اور نتیجتاً وہ رحمت تھی کہ جب ان صحیح باتوں کو کوئی قبول کرے گا، ان کے مطابق عمل کرے گا، تو اللہ کی رحمت حاصل ہوگی۔ اور یہ کتاب موسیٰ علیہ السلام کو دی اس لیے تھی تا کہ لوگ نصیحت حاصل کریں...... یہاں تک تو تتمہ ہے اس واقعہ کا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا شروع ہوا تھا۔

مذکورہ واقعے کا بیان کرنا دلیلِ نبوّت ہے

اور یہ اگلی چند آیتیں جن کا ترجمہ آپ کے سامنے کیا گیا (وَمَا كُنۡتَ بِجَانِبِ الۡغَرۡبِىِّ الخ)، ان میں اسی واقعے کو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت اور رسالت کی دلیل بنایا گیا ہے۔ اور دلیل یہ اس طرح سے بن گئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم موسیٰ علیہ السلام کے واقعے کو بالکل صحیح صحیح ٹھیک ترتیب کے ساتھ بیان فرما رہے ہیں، اور تورات یا موسیٰ علیہ السلام کے متعلق تحریرات جو یہودیوں میں مروّج تھیں، ان کے اندر بھی یہ واقعہ اس طرح سے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہوا نہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مدرسے میں پڑھا نہیں، علمائے یہود کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم شاگرد نہیں رہے، تو یہ واقعہ آپ کو کیسے معلوم ہو گیا؟...... کسی خبر کے معلوم ہونے کی چند صورتیں ہوا کرتی ہیں، اگر تو وہ

کوئی عقلی چیز ہے تو عقل کے ساتھ سوچ کے انسان اس کو نکال لیتا ہے کہ یہ بات یوں ہوگی، آپ جانتے ہیں کہ کسی واقعے کو عقل کے ساتھ تو مرتب کیا نہیں جاسکتا، کہ پُرانے زمانے میں فرعون کیا تھا؟ اس کے حالات کیا تھے؟ موسیٰ علیہ السلام کس طرح سے آئے؟ کیا وعظ ہوئی؟ کیا نتیجہ نکلا؟ یہ باتیں عقل کے ساتھ جوڑنے کی تو ہیں نہیں۔ پھر دوسری بات یہ ہوتی ہے کہ اہلِ علم سے سنا ہو، سننے کے ساتھ بھی انسان واقعے کو معلوم کرلیتا ہے۔ یا یہ ہے کہ جس وقت یہ واقعہ پیش آرہا تھا تو اس وقت خود موجود ہو۔ یہ تین ذریعے ہیں کوئی بات معلوم کرنے کے۔ عقلیات میں معقولات میں عقل، اور جو منقول واقعات ہوا کرتے ہیں اس میں یا سمع یا مشاہدہ، کہ یا کسی سے سنا ہو یا پھر اس کا مشاہدہ کیا ہو۔ اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم میں ان میں سے کوئی بات بھی نہیں پائی جاتی تھی، عقل کے ساتھ تو جوڑا نہیں جاسکتا، تاریخی واقعے کو انسان کس طرح عقل کے ساتھ جوڑ لے، اور اہلِ کتاب سے سنا بھی نہیں، یہ واقعہ ہے کہ آپ نے کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی، پہلی کتابیں نہیں پڑھیں، اور اگر ان سے سنا ہی ہوتا اور ان کی کتابیں پڑھی ہی ہوتیں، تو پھر واقعہ آپ اسی طرح سے نقل کرتے جس طرح سے پہلی کتابوں میں موجود ہے، یہودیوں نے جس طرح سے نقل کیا، لیکن وہ توراۃ آج بھی موجود ہے، اس کو اُٹھا کے دیکھیں تو ان واقعات کے اندر وہ رُوح ہی نہیں ہے جس قسم کی انبیاء علیہم السلام کے واقعات میں ہوتی ہے۔ ان کتابوں میں واقعات کچھ بے ترتیب سے بے ڈھنگے سے نقل کئے ہوئے ہیں۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر ان کے نقل کیا ہوتا تو ویسے ہی نقل کرتے، جس طرح سے یہود میں مروّج تھا، جبکہ آپ نے یہود کے اندر مروّج واقعہ جو ان کے اندر چلا آرہا تھا، اس کے خلاف ایک اچھی ترتیب کے ساتھ سبق آموز طریقے سے اس کو واضح کیا، اور اس سے قطع نظر دنیا بھی جانتی تھی، یہی وجہ ہے کہ مشرکینِ مکہ بھی کوئی اس قسم کا ثبوت مہیا نہیں کرسکے، کہ یہ یہود سے لاکے سناتا ہے۔ ایسے تو کہتے تھے اِنَّمَا یُعَلِّمُہٗ بَشَرٌ (سورۃ نحل: ۱۰۳) کہ اس کو کوئی انسان سکھاتا ہے، لیکن وہ کون سا انسان تھا؟ اس کی عظمت لوگوں کے اُوپر کیوں نہ بیٹھی؟ اس کو وہ شہرت کیوں نہ حاصل ہوئی، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوگئی؟ تو اس قسم کا کوئی ثبوت وہ سامنے نہیں لاسکے، تو سمع بھی منفی ہے۔ اور آگے کہہ دیا کہ جب یہ واقعہ پیش آرہا تھا تو آپ اس وقت موجود بھی نہیں تھے، نہ تو جب توراۃ مل رہی تھی اس وقت آپ طور پہ تھے، نہ اس زمانے میں موجود لوگوں میں سے آپ ہیں، اور نہ ہی آپ مدین میں اُس وقت اس طرح سے شانِ رسالت کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے کہ لوگوں کے اُوپر آپ ہماری آیات پڑھتے ہوں، جو پیغمبرانہ شان اس وقت آپ کی ہے یہی شان آپ کی اُس وقت بھی ہو۔ تو بہرحال اہلِ مدین میں بھی آپ نہیں تھے۔ اور جب مدین سے سفر کرکے حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر کو جارہے تھے، جب ہم نے ان کو آواز دی: یٰمُوْسٰۤی اِنِّیْۤ اَنَا اللهُ (جس کا ذکر پیچھے آیات میں آیا تھا) تو آپ اس وقت بھی موجود نہیں تھے...... تو جو ذرائع ہوا کرتے ہیں کسی بات کو معلوم کرنے کے تو وہ آپ کے پاس تھے نہیں، پھر یہ معلومات آپ کو کس طرح سے حاصل ہوگئیں۔ تو معلومات حاصل ہونے کے لیے اثبات کیا گیا کہ ہم نے آپ کو رسول بنا کے بھیجا ہے، اللہ کی رحمت کے ساتھ آپ کی طرف وحی آئی ہے، اور وحی کرنے کی وجہ ان لوگوں کے اُوپر شفقت ہے کہ یہ ہدایت کا سامان گم کربیٹھے، ان کے پاس ہدایت کا کوئی سامان تھا نہیں...... اس لئے اس واقعے کا بیان کرنا بالیقین آپ کی نبوّت کی دلیل ہے، اور یہ نبوّت ان موجودہ لوگوں کے لئے باعثِ رحمت ہے، ان کو اس سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ اس واقعے (واقعۂ موسیٰ علیہ السلام) کے بیان کرنے کے بعد ان آیات کے اندر اس واقعے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت اور رِسالت کی دلیل

کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اب پھر دیکھیں، تا کہ یہ بات آپ کو اچھی طرح سے سمجھ میں آ جائے" آپ جانب غربی میں نہیں تھے جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف حکم بھیجا یعنی وہ طور جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی تھی وہ غربی جانب تھا تو آپ اس وقت وہاں موجود نہیں تھے۔ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ: اور اس وقت جو لوگ اس زمانے میں موجود تھے نہ آپ ان میں سے ہیں، یہ بھی نہیں کہ آپ خاص اس موقع پہ موجود نہیں تھے، تو چلو! اس زمانے میں ہی موجود ہوں، ایسی بات بھی نہیں...... آگے وجہ بیان کر دی آپ کی طرف وحی کرنے کی کہ ہم نے بہت ساری جماعتیں پیدا کیں، ان پر عمریں دراز ہو گئیں اور یہ معلومات گم کر بیٹھے...... اور آپ اہلِ مدین میں رہنے والے بھی نہیں تھے کہ آپ ان پر ہماری آیات پڑھتے ہوں، یہی پیغمبرانہ شان آپ کی ہو، اور اہلِ مدین کے حالات کو آپ جان رہے ہوں...... ان باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں، وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ: ہم ہی رسول بنا کر بھیجنے والے ہیں تو ہم نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ الخ: اور آپ طور کی جانب میں بھی نہیں تھے جس وقت ابتداءً ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو آواز دی تھی، جہاں ان کو پیغمبری ملی تھی۔

رسول بھیجنا اللہ کی رحمت ہے

وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ: اَیْ وَلٰكِنْ اَعْلَمْنَاكَ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ (نسفی)، اور مِنْ رَّبِّكَ یہ وضع المظهر موضع المضمر ہے۔ لیکن ہم نے آپ کو اطلاع دی آپ کے ربّ کی رحمت کی وجہ سے، یعنی ہم نے اپنی رحمت کی وجہ سے آپ کو یہ اطلاع دی، ہم نے آپ کو نبی بنایا ہم نے آپ کو اطلاع دی اپنی رحمت کی وجہ سے، رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ میں "رحمةً منّا" والا مفہوم ہے۔ لِتُنْذِرَ قَوْمًا: کیوں اطلاع کی، آپ کی طرف وحی کیوں بھیجی؟ تا کہ آپ ڈرائیں ان لوگوں کو جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا، اس سے مراد مشرکینِ مکہ ہیں کیونکہ مشرکینِ مکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد تھے، حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد ہزار ہا سال میں اس علاقے کے اندر کوئی پیغمبر مبعوث نہیں ہوا، تو ان لوگوں کو اس نعمتِ عظمیٰ کی قدر کرنی چاہیے تھی، یہ سب کچھ ہم نے اس لئے کیا تا کہ یہ نصیحت حاصل کریں۔

رسول بھیج کر اللہ نے حجّت تام کر دی

اور اگر ان کی بدکرداریوں پر ہم بغیر رسول بھیجنے کے عذاب بھیج دیتے تو بھی یہ کوئی زیادتی نہیں، کیونکہ یہ شرک کفر، ذاکازنی، بداخلاقیاں یہ تو ایسی چیزیں ہیں جن کا قبح عقل کے ساتھ معلوم ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی اللہ کی رحمت ہے کہ اس نے رسول کے ساتھ تنبیہ کرنے کے بغیر ہلاک نہیں کیا، اور اگر ہم رسول نہ بھیجتے اور اس طرح سے ان کو ہلاک کر دیتے، تو کسی نہ کسی درجے میں یہ لوگ عذر کرتے کہ اے اللہ! اگر تو کوئی سمجھانے والا بھیج دیتا تو ہم سمجھ ہی جاتے، اور اب ہم نے یہ حجّت بھی پوری کر دی، اس لئے ان لوگوں کو چاہیے کہ ہوشیار ہو جائیں اور اس نعمت سے فائدہ اٹھائیں، ورنہ اب عذاب کے آنے میں ظاہری طور پر بھی کوئی عذر باقی نہیں ہے...... اگلی آیت کے اندر یہ مضمون ذکر کیا گیا ہے۔

وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ: اگر یہ بات نہ ہوتی کہ پہنچتی ان کو کوئی مصیبت ان اعمال کی وجہ سے جو ان

کے ہاتھوں نے آگے بھیجے ہیں۔ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا: پھر یہ کہتے اے ہمارے رَبّ! لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا: کیوں نہ بھیجا تُو نے ہماری طرف کوئی رسول، فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ: ہم تیری آیات کی اتباع کر لیتے، وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ: اور مؤمنین میں سے ہو جاتے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ہم رسول نہ بھیجتے، بغیر رسول بھیجنے کے ان کو عذاب دے دیتے، لیکن چونکہ یہ بات ہو سکتی ہے کہ جب ان کے اُوپر کوئی مصیبت آئے ان کے کردار کی وجہ سے، تو پھر یہ یوں کہیں گے کہ اے اللہ! تُو نے ہماری طرف کوئی سمجھانے والا کیوں نہ بھیجا، اگر تُو کسی سمجھانے والے کو بھیج دیتا تو ہم تیری آیات کی اتباع کر لیتے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ہم رسول ہی نہ بھیجتے، ان کی بداعمالیوں کی بنا پر ان کو ویسے ہی ہلاک کر دیتے، لیکن بس اتنا سا ان کا لحاظ رکھا ہے کہ چلو! رسول بھیج کے متنبہ کر دیں، اب یہ آخری حجت جو تھی، وہ بھی ان کے اوپر پوری ہوگئی، اب بھی اگر نہیں سمجھیں گے، تو پھر آگے ان کے پاس کوئی عذر نہیں ہے۔

''قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا'' کے دو مفہوم

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى: پھر جب ان کے پاس حق آ گیا ہماری جانب سے تو یہ کہنے لگے، کیوں نہیں دیا گیا یہ مثل اس چیز کے جو دیے گئے موسیٰ علیہ السلام۔ اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ: کیا انکار نہیں کیا ان لوگوں نے اس بات کا جو دیے گئے تھے موسیٰ علیہ السلام اس سے پہلے۔ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا: کہا انہوں نے، یہ دو جادو ہیں جو آپس میں موافق ہو گئے ...... قَالُوْا کی ضمیر اگر مشرکینِ مکہ کی طرف لوٹائیں تو پھر معنی یہ ہو جائے گا کہ مشرکینِ مکہ کہتے ہیں کہ توراۃ اور قرآن یہ دونوں جادو ہیں جو ایک دوسرے کے معاون ہیں، توراۃ اس (قرآن) کی باتوں کی تصدیق کرتی ہے، قرآن اس (توراۃ) کی باتوں کی تصدیق کرتا ہے...... اور اگر قَالُوْا کی ضمیر فرعونیوں کی طرف لوٹائی جائے تو پھر سِحْرٰنِ ساحران کے معنی میں ہے تو پھر اس کا مصداق ہوں گے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام۔ ان فرعونیوں نے کہا تھا کہ یہ دو جادوگر ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں، ایک دوسرے کے مددگار ہیں، اور کہنے لگے ہم تو ہر ایک کا انکار کرنے والے ہیں، ہم نہ اس کو مانیں، نہ اس کو مانیں...... اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ حق ان کے پاس آ گیا قرآنِ کریم کی شکل میں، اور اس نبی کی دعوت کی صورت میں حق ان مشرکینِ مکہ کے سامنے آ گیا۔ جس وقت یہ حق آیا تو کشاکشی جو شروع ہوگئی تھی مشرکین اور مسلمانوں کے درمیان میں، تو یہود اس سلسلے میں مشرکین کو شہ دیتے تھے اور ان کی کچھ نہ کچھ حمایت کرتے تھے، بایں طور کہ مشرکین ان کے پاس آتے، اور آ کے ان کے سامنے تذکرہ کرتے، کیونکہ یہ سورت مکی ہے اور یہ حالات مکہ میں پیش آتے تھے، اور وہ چاہتے تھے کہ یہود چونکہ اہلِ علم ہیں تو ان سے کچھ شبہات لے کے مسلمانوں کے اندر پھیلائے جائیں، تاکہ مسلمان اس نبی کو چھوڑ دیں، جو ایمان لے آئے ہیں وہ برگشتہ ہو جائیں، یہ ساز باز ان کی، آنا جانا، سوالات، شروع ہو گئے تھے، مشرکین یہود سے سیکھ کے آ کے سوال کرتے تھے، تو ایسے ہی کوئی واقعہ پیش آیا ہو گا کہ بعض مشرکینِ مکہ نے یہود سے تذکرہ کیا کہ ہمارے ہاں ایک شخص ہے جو نبوّت کا دعویٰ کرتا ہے، یوں ہے، ووں ہے، تو یہود نے سکھا دیا کہ تم اسے کہو کہ اگر تو کوئی پیغمبر ہے تو ویسے معجزے کیوں نہیں دکھاتا، جیسے موسیٰ علیہ السلام نے دکھائے تھے، یا جس طرح سے موسیٰ علیہ السلام کو اکٹھی کتاب دے دی گئی تھی تو آپ مجموعی طور پر اکٹھی کتاب کیوں نہیں لے کر آئے، یہود کے سکھانے سے مشرکین

نے آ کے یہ شبہ حضور ﷺ کے سامنے نقل کیا، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب دیا جا رہا ہے کہ یہ بات تو تب کریں کہ انہوں نے پہلے موسیٰ علیہ السلام کو مان لیا ہو، اگر موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کو یہ تسلیم کر لیں، تو بھی بہت حد تک ان سے جھگڑا ختم ہو جائے، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کی کتاب میں سوائے ان چند احکام کے جن کو قرآن منسوخ کر رہا ہے، باقی ساری کی ساری باتیں وہی ہیں جو قرآنِ کریم میں ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی کتاب توحید پھیلاتی ہے، توحید کا درس دیتی ہے، اور آخرت کی تعلیم دیتی ہے، کہ مرنے کے بعد اُٹھنا ہے، جنت دوزخ جو کچھ بھی ہے، انبیاء ورسولوں کی باتیں، جتنی بھی آسمان کی طرف سے کتابیں آئی ہیں، سب میں باتیں ایک جیسی ہیں۔ تو جب یہ قرآن کو نہیں مانتے، تو یوں سمجھو کہ اس سے قبل یہ توراۃ کو بھی جھٹلائے بیٹھے ہیں، یہ نہیں کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو تسلیم کر لیا۔ اگر یہی بات ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جیسی کتاب آ جاتی یا موسیٰ علیہ السلام جیسے معجزات آ جاتے تو یہ مان لیں گے، تو انہوں نے پہلے موسیٰ علیہ السلام کو کیوں نہیں مان لیا۔ یہ مشرکینِ مکہ کو کہا جا رہا ہے کہ اگر وہی تمہارے نزدیک صداقت کی دلیل ہے تو تم اسے مان لو، اور جب تمہارے سامنے توراۃ پیش ہوتی ہے تو تم اس کی باتوں کو بھی ویسے ہی جادو سمجھتے ہو جس طرح سے قرآن کی باتوں کو جادو کہتے ہو، اور یہ کہتے ہو کہ جیسے وہ کتاب ویسے یہ، دونوں ایک دوسرے کی معاون ہیں۔ یعنی وہ زبان سے یہ بات کہتے ہوں یا ان کے حال سے یہ بات مترشح ہو، دونوں باتیں ہو سکتی ہیں، یعنی تم تو اس کو بھی جادو کہتے ہو، اگر توراۃ تمہارے سامنے پیش کر دی جائے تو تم اس کو بھی کہو گے کہ یہ بھی جادو ہے، اور توراۃ اور قرآن یہ دو جادو اکٹھے ہو گئے جو ایک دوسرے کے معاون ہیں، ہم تو نہ اس کو مانیں نہ اس کو مانیں۔ کیونکہ شرک کی تردید وہ کتاب بھی کرتی ہے یہ بھی کرتی ہے، آخرت کی تعلیم وہ کتاب بھی دیتی ہے یہ بھی دیتی ہے، اور انسانوں کا رسول ہونا وہ کتاب بھی بیان کرتی ہے یہ کتاب بھی بیان کرتی ہے، تو جب تم اِس (قرآن) کو جادو کہتے ہو تو یوں سمجھو! تم نے توراۃ کو بھی جادو کہہ دیا، اور جب اِس نبی کے معجزات کو تم ماننے کے لئے تیار نہیں تو موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو ماننے کے لئے بھی تیار نہیں، پھر تو اس آیت کا مفہوم یہ ہو جائے گا، اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى: یہ يَكْفُرُوْا کی ضمیر بھی لوٹ جائے گی مشرکینِ مکہ کی طرف، کیا ان مشرکینِ مکہ نے انکار نہیں کیا اس بات کا جو دیے گئے موسیٰ علیہ السلام اس سے قبل، یعنی کیا یہ اُن کی باتیں مانتے ہیں؟ اُن کی توراۃ کو تسلیم کرتے ہیں؟ اور ان پر یہ ایمان لاتے ہیں؟ ان کو یہ سچا سمجھتے ہیں؟ یعنی نہیں سمجھتے۔ اور حقیقت حال کے اعتبار سے بات کہی جا رہی ہے، کہ ان کے نزدیک تو توراۃ اور قرآن دونوں ہی جادو کی قسمیں ہیں، جو ایک دوسرے سے تعاون کر رہی ہیں۔

اور اگر معنی یوں کیا جائے۔ اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا: کا مطلب یہ ہے کہ انکار تو کیا فرعونیوں نے موسیٰ علیہ السلام کا، لیکن فرعونی اور یہ، دونوں چونکہ آپس میں تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ، حق کے منکر ہونے کے اعتبار سے ایک جیسے ہیں، تو جب ایک فریق اس کا انکار کر بیٹھا، تو یوں سمجھو کہ وہ انکار بھی انہی کا ہی ہے، تو یہ کہا جا رہا ہے، کیا اس سے پہلے اِن لوگوں نے یعنی ان جیسے لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام کا انکار نہیں کیا؟ موسیٰ علیہ السلام کے معجزات آئے تھے، موسیٰ علیہ السلام کی کتاب آئی تھی تو کیا ان (مشرکینِ مکہ) کی برادری کے لوگوں نے اس کو مان لیا تھا؟ تو جس طرح سے تم لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی یعنی تم جیسے لوگوں نے تمہارے ہم مشربوں نے، اسی طرح سے جب قرآن تمہارے سامنے آیا تم نے بھی اس کو نہیں مانا، انہوں نے بھی کہہ دیا تھا کہ موسیٰ اور ہارون دونوں جادوگر ہیں، ایک دوسرے

کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں، اسی طرح سے تم بھی اپنے پیغمبر کو کہتے ہو کہ یہ جادوگر ہے، یہ مشابہت کے طور پر پچھلوں کی بات موجودہ لوگوں کی طرف منسوب کردی جاتی ہے۔

بڑوں کے کاموں کو اپنی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے

جس طرح سے آج کے دور میں آپ دیکھتے ہیں کہ جس وقت بحثیں ہوتی ہیں اور آپ لوگ جس وقت وعظ کہتے ہیں، علمائے دیوبند کی طرف انتساب رکھنے والے، تو آپ یہ کہا کرتے ہیں کہ ''جس وقت اس ملک کے اوپر انگریز کا تسلط تھا، اور انگریز کی سرپرستی میں عیسائیت پھیلائی جارہی تھی، اس وقت ان کا مقابلہ کرنے والے ہم تھے، اور تم لوگ اس وقت بھی حکومت کے ٹوڈی تھے، تم لوگ اس وقت بھی حکومت سے وظیفے پاتے تھے، اور ہماری مخالفت کرتے تھے۔'' انداز یہی ہوتا ہے، یعنی ہم اپنے بزرگوں کے کارناموں کو اپنا کارنامہ قرار دیتے ہیں، اور ان کے جو اسلاف ہیں ان کے کارنامے ان کی طرف منسوب کرتے ہیں، تم نے اس وقت بھی جاسوسیاں کیں، تم نے اس وقت بھی حکومت کا تعاون کیا، اور اہلِ حق کی مخالفت کی، اور آج بھی ہم حق کی بات کہتے ہیں تو تم لوگ مخالفت کرتے ہو، تو ہمارے بزرگوں نے جو کام کیا تھا اس کو ہم اپنا کام سمجھتے ہیں، اور ان کے اسلاف نے جو کچھ کیا تھا ہم ان کے سر دھرتے ہیں...... بالکل یہی محاورہ قرآنِ کریم نے استعمال کیا سورۂ بقرہ کے اندر، بنی اسرائیل کے قصے سنا سنا کے موجودہ لوگوں کو الزام دیا کہ ''تم نے نبیوں کو قتل کیا، تم نے حق کی تکذیب کی، تم نے یہ کیا'' تو اسلاف کی باتیں اَخلاف کی طرف منسوب ہوا کرتی ہیں...... اسی طرح سے فرعونی گویا کہ موسیٰ علیہ السلام کے منکر اور موسیٰ علیہ السلام کے مکذب ہونے کے اعتبار سے مشرکین کے ہم مشرب ہیں، تو ان کو ہم مشرب قرار دے کے کہا جارہا ہے کہ جس طرح سے یہ منکر ہیں وہ بھی منکر تھے، تو یوں سمجھو کہ اِنہوں نے ہی انکار کیا، ضمیریں یوں لوٹائی جارہی ہیں، کیا ان لوگوں نے یعنی مشرکین مکہ نے اور ان کے ہم مشربوں نے انکار نہیں کیا؟ اس بات کا جو دیے گئے تھے موسیٰ علیہ السلام، اور کہا انہوں نے یعنی ان کے ہم مشربوں نے کہ یہ دو جادوگر ہیں (سحر ساحر کے معنی میں ہو جائے گا) یہ دو جادوگر ہیں جو دونوں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں، اور کہنے لگے کہ ہم تو سب کے منکر ہیں، نہ اُن کو مانیں، نہ اِن کو مانیں۔

مشرکینِ مکہ کو ایک اور انداز سے دعوتِ حق

قُلْ فَأْتُوا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ: یہ خطاب مشرکینِ مکہ کو ہے، مشرکین مکہ سے کہا جارہا ہے کہ دیکھو! تمہارے سامنے دو باتیں آگئیں، ایک کتاب موسیٰ علیہ السلام کی، اور ایک یہ قرآن آگیا، موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کو ماننے کے لئے بھی تم تیار نہیں، کیونکہ اگر ان کی کتاب کو مان لو تو معاملہ بہت قریب آجائے گا، آخرت کے قائل ہو جاؤ گے، توحید کے قائل ہو جاؤ گے، شرک سے باز آجاؤ گے، پھر ایک یہی بات رہ جائے گی کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد اگلے پیغمبر کو بھی مان لو، ایک ہی قدم ہے زیادہ تو نہیں ہے۔ جب تم اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں، اور پھر یہ قرآن اترا تو اس کو بھی ماننے کے لئے تیار نہیں، جو توراۃ سے بھی زیادہ

کامل واکمل طریقے سے آیا ہے، تحریف سے بچا ہوا ہے محفوظ ہے، تازہ بتازہ تمہاری طرف آ رہا ہے، تم اس کو بھی ماننے کے لئے تیار نہیں، تو یہ تمہاری ضد ہے۔ ہم تمہیں کہتے ہیں کہ اگر قرآن تمہارے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہے، اور توراۃ بھی قابلِ قبول نہیں ہے، تو تم ان دونوں کتابوں سے اچھی کتاب لے آؤ، ہم تسلیم کرلیں گے، ہم تو ضدی نہیں ہیں، تم لے آؤ ہمارے سامنے کوئی ایسی کتاب، توراۃ اور قرآن کے مقابلے میں تم کوئی زیادہ باعث ہدایت کتاب لے آؤ، اگر تم ایسی کتاب لے آؤ گے، ہم تسلیم کرلیں گے۔ یہ قضیہ شرطیہ متصلہ کے طور پر ہے جس میں مقدم اور تالی کے درمیان میں اتصال ہوتا ہے، باقی اس میں وقوعِ مقدم کی طرف اشارہ نہیں ہوا کرتا، کہ دل میں یہ اشکال آئے کہ واقعی اگر وہ کتاب لے آتے اور وہ اللہ کی کتاب نہ ہوتی تو حضور ﷺ اور آپ کے ماننے والے اس کی اتباع کیسے کر لیتے؟ اللہ کی کتاب کے غیر کی اتباع کیسے ہوتی؟ یہ محاورے سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے، شرطیہ کے اندر تو صرف اتصال ہوا کرتا ہے مقدم اور تالی میں، کہ اگر ایسا ہو گیا تو ایسا ہو جائے گا، باقی! مقدم کے وقوع کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہوتا۔[1] جس طرح سے آگے سورۂ زخرف میں اسی قسم کی ایک آیت آئے گی قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ (سورۂ زخرف:۸۱) اگر رحمٰن کا کوئی بیٹا ہوتا تو سب سے پہلے عبادت کرنے والا میں ہوں، اور ہے ہی نہیں تو عبادت کس کی کروں؟ اگر رحمٰن کا کوئی بیٹا ہوتا تو سب سے پہلے پُوجنے والا میں ہوتا، یہاں بھی مقدم اور تالی کے درمیان میں اتصال ہے، تو یہاں بھی یہی بات ہے کہ اگر تم کوئی ایسی کتاب لے آؤ جو توراۃ اور قرآن کے مقابلے میں زیادہ باعثِ ہدایت ہو، زیادہ اچھی باتیں اس کے اندر ہوں تو ہم اس کو تسلیم کرلیں گے، یہ صرف اپنا منصف ہونا بیان کرنا مقصود ہے کہ ہم میں تو کوئی ضد ہے نہیں، ہم تو کہتے ہیں کہ کوئی اچھی بات لاؤ، ہم تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن تم لاؤ گے کہاں سے؟ اس لئے توراۃ اور قرآن اللہ تعالیٰ کی کتابیں ہیں، ان کو تسلیم کرنا چاہیے، ان کا انکار کر کے تم کسی صورت میں بھی ہدایت یافتہ نہیں ہو سکتے۔ یہ مفہوم ہے اس کا۔ آپ کہہ دیجئے کہ لے آؤ تم کوئی کتاب اللہ کی جانب سے جو زیادہ ہدایت کی باعث ہو ان دونوں سے، اَهْدٰى ہو ان دونوں کے مقابلے میں، زیادہ ہدایت والی ہو ان دونوں کے مقابلے میں، اَتَّبِعْهُ میں اس کی اتباع کرلوں گا۔ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ: اگر تم سچے ہو۔

''متبعِ خواہشات'' بھٹکا ہوا ہوتا ہے

اور اگر یہ تمہاری بات نہ مانیں، کوئی اور کتاب اللہ کی جانب سے نہ لائیں، جو توراۃ اور قرآن کے مقابلے میں زیادہ ہدایت پر مشتمل ہو، اور یہ واقعہ ہے کہ نہیں لاسکیں گے۔ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ: اگر یہ تمہاری بات نہ مانیں پھر آپ یقین کر لیجئے کہ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ: یہ لوگ صرف اپنی خواہشات کے پیچھے چل رہے ہیں، اتباع کرتے ہیں یہ لوگ اپنی خواہشات کی۔ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ: اور کون زیادہ بھٹکا ہوا ہے اس شخص سے جو پیروی کرے اپنی خواہش کی اللہ کی جانب سے راہنمائی کے بغیر، اللہ کی جانب سے راہنمائی کو چھوڑ دے اور اپنے دلی خیالات کا متبع ہو، خواہشات کے پیچھے چلنے والا ہو، اس سے

---

(۱) صدق الشرطية وتعلق العلم به يقتضي لزوم التالي للمقدم في الواقع- ولا يقتضي وجود طرفيها فيه (مظهری: الطیف آیت ۸۰ کے تحت)

زیادہ بھٹکا ہوا کوئی نہیں ہوتا، سب سے زیادہ بھٹکا ہوا وہی آدمی ہے جو صرف اپنے خیالات اور اپنی خواہشات کے پیچھے چلتا ہے اور اللہ کی راہنمائی کی پرواہی نہیں کرتا۔ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا: اگر یہ قبول نہ کریں۔ لَكَ: اگر یہ آپ کو جواب نہ دیں آپ کے اس اس مطالبے کا تو آپ یقین کرلیں کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ لوگ اپنی خواہشات کے متبع ہیں، اور کون زیادہ گمراہ ہے اس شخص سے جو اپنی خواہشات کا متبع ہو اللہ کی طرف سے راہنمائی کے بغیر۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ: اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو سیدھی راہ نہیں دیتا۔ جس وقت تک ظالم ظلم نہ چھوڑے اور حق کو نہ پہچانے، حق پہچاننے اور حق کی اتباع کرنے کا جذبہ اس میں پیدا نہ ہو، اس وقت تک اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیا کرتا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نہیں ہدایت دیتا ظالم لوگوں کو۔

وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۱﴾ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ

پکی بات ہے کہ ہم نے اپنی بات ان کے لئے مسلسل بھیجی تاکہ وہ لوگ نصیحت حاصل کریں ﴿۵۱﴾ وہ لوگ جن کو ہم نے اپنی کتاب دی

قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ یُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاِذَا یُتْلٰى عَلَیْهِمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖۤ

اس قرآن سے پہلے وہ اس قرآن پر ایمان لاتے ہیں ﴿۵۲﴾ اور جب یہ قرآن ان پر پڑھا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پہ ایمان لے آئے،

اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِیْنَ ﴿۵۳﴾ اُولٰٓئِكَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ

بے شک یہ حق ہے ہمارے رب کی جانب سے، بے شک ہم اس سے قبل ہی ماننے والے ہیں ﴿۵۳﴾ یہی لوگ ہیں کہ دیے جائیں گے اپنا اجر

مَّرَّتَیْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَیَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ﴿۵۴﴾

دو مرتبہ بسبب اس کے کہ انہوں نے صبر کیا اور دُور ہٹاتے ہیں اچھائی کے ذریعے سے برائی کو اور جو چیز ہم نے ان کو دی اس میں سے خرچ کرتے ہیں ﴿۵۴﴾

وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ز

اور جب سنتے ہیں کوئی لغو بات تو اس سے اعراض کر جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال ہیں

سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ ز لَا نَبْتَغِی الْجٰهِلِیْنَ ﴿۵۵﴾ اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ

تم پر سلام ہو، ہم جاہلوں سے اُلجھنا نہیں چاہتے ﴿۵۵﴾ بے شک آپ ہدایت نہیں دے سکتے اس شخص کو جس کو تُو چاہے، لیکن اللہ تعالیٰ

یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ج وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ ﴿۵۶﴾ وَقَالُوْۤا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى

جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، اور وہ خوب جاننے والا ہے ہدایت پانے والوں کو ﴿۵۶﴾ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم اتباع کریں تیرے

مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ؕ اَوَ لَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا یُّجْبٰۤى اِلَیْهِ ثَمَرٰتُ

ساتھ ہدایت کی، تو ہم اُچک لئے جائیں گے اپنے علاقے سے، کیا ہم نے ان کو ٹھکانا نہیں دیا امن والے حرم میں، کھنچ کھنچ کر لائے جاتے ہیں اس حرم کی

كُلِّ شَیْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْیَةٍۭ

طرف ہر چیز کے ثمرات ہماری طرف سے رزق کے طور پر، لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے ﴿۵۷﴾ کتنی ہی بستیاں ہم نے ہلاک کر دیں جو

بَطِرَتْ مَعِیْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِیْلًا ؕ وَ كُنَّا نَحْنُ

اترائیں اپنی معیشت پر، پس یہ ہیں ان کے رہنے کی جگہیں، آباد نہیں ہوئیں یہ اُن کے بعد مگر تھوڑی سی، اور ہم ہی

الْوٰرِثِیْنَ ﴿۵۸﴾ وَ مَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى یَبْعَثَ فِیْۤ اُمِّهَا رَسُوْلًا یَّتْلُوْا عَلَیْهِمْ

پیچھے رہنے والے ہیں ﴿۵۸﴾ اور نہیں ہے تیرا رَبّ ہلاک کرنے والا بستیوں کو جب تک کہ نہ بھیج دے ان کے مرکز میں رسول جو پڑھے ان پر

اٰیٰتِنَا ۚ وَ مَا كُنَّا مُهْلِكِی الْقُرٰۤى اِلَّا وَ اَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَ مَاۤ اُوْتِیْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ

ہماری آیات، اور نہیں ہیں ہم ہلاک کرنے والے بستیوں کو مگر اس حال میں کہ ان کے اہل ظالم ہوتے ہیں ﴿۵۹﴾ جو کچھ بھی تم دیے گئے

فَمَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ زِیْنَتُهَا ۚ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰى ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۰﴾ ع

یہ دُنیوی زندگی کا سامان اور اس کی رونق ہے، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر ہے اور زیادہ باقی رہنے والی چیز ہے، کیا تم سوچتے نہیں ہو ﴿۶۰﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ: لَقَدْ تاکید کے لئے ہے، پکی بات ہے ہم نے پہنچایا ان کے لئے۔ وَصَّلَ یہ توصیل سے ہے، جس کا مادّہ وصل ہے، وَصَلَ یَصِلُ: ملنا ملانا، اور توصیل کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے اپنی بات ان کے لئے مسلسل بھیجی، پے در پے بھیجی۔ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ: تاکہ وہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ: وہ لوگ جن کو ہم نے اپنی کتاب دی مِنْ قَبْلِهٖ اس قرآنِ کریم کے آنے سے پہلے۔ هُمْ بِهٖ یُؤْمِنُوْنَ: وہ اس قرآن پر ایمان لاتے ہیں۔ وَاِذَا یُتْلٰى عَلَیْهِمْ: اور جب یہ قرآن اُن پہ پڑھا جاتا ہے۔ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖۤ: وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لے آئے۔ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَاۤ: بے شک یہ حق ہے ہمارے رَبّ کی جانب سے۔ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِیْنَ: بے شک ہم اس سے قبل ہی ماننے والے ہیں، مِنْ قَبْلِهٖ کا معنی یہ ہے کہ اس قرآن کے نزول سے قبل ہی ہم اسلام لانے والے ہیں، ماننے والے ہیں، یعنی اپنی کتاب کی پیش گوئیوں کے طور پر ہم پہلے ہی تسلیم کئے ہوئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس قسم کی کوئی کتاب اُترے گی، اور وہی کتاب آگئی۔ اسلام کا معنی ہوتا ہے فرماں بردار بننا، گردن بطاعت نہادن، کسی کی طاعت کے اندر اپنی گردن رکھ دینا۔ ہم اس سے پہلے ہی تسلیم کرنے والے ہیں،

فرماں بردار بننے والے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ: یہی لوگ ہیں کہ دیے جائیں گے اپنا اجر دو مرتبہ۔ بِمَا صَبَرُوْا بسبب اس کے کہ انہوں نے صبر کیا۔ "ما" مصدر یہ ہے یعنی ان کے صبر کے سبب سے، ان کے صبر کرنے کی وجہ سے، مستقل مزاج رہنے کی وجہ سے، جو حق انہیں معلوم ہوا تھا اس پر ڈٹے رہنے کی وجہ سے۔ وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ: اور دُور ہٹاتے ہیں (دَرَأَ يَدْرَأُ: دفع کرنا، دُور کرنا) دُور ہٹاتے ہیں اچھائی کے ذریعے سے برائی کو، دُور ہٹاتے ہیں حسنہ کے ذریعے سے سیئہ کو، برائی کا دفعیہ اچھائی کے ساتھ کرتے ہیں۔ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ: اور جو چیز ہم نے ان کو دی اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ: اور جب سنتے ہیں یہ لغو، کوئی بے ہودہ بات سنتے ہیں، اَعْرَضُوْا عَنْهُ تو اس سے اعراض کر جاتے ہیں، منہ موڑ جاتے ہیں۔ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ: اور کہتے ہیں کہ ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال ہیں، تمہارے عمل تمہارے ساتھ ہمارے عمل ہمارے ساتھ۔ یہ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ لغویات کرنے والے کو کہتے ہیں، ان کے سامنے جب کوئی لغو اور بیہودہ بات کرتا ہے تو ان کو یہ کہتے ہیں۔ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ: یہ سلام بھی "سلام متارکت" ہے، تعلق چھوڑنے والا۔ تم پہ سلام ہو۔ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ: اَلْجٰهِلِيْنَ کے اُوپر مضاف محذوف کر لیجئے تو مطلب واضح ہو جاتا ہے لَا نَبْتَغِي مُخَالَطَةَ الْجَاهِلِيْنَ (آلوسی)، ہم جاہلوں سے اُلجھنا نہیں چاہتے، نہیں چاہتے ہم جاہلوں سے اُلجھنا۔ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ: بے شک آپ ہدایت نہیں دے سکتے اس شخص کو جس کو تو چاہے۔ هَدٰى يَهْدِيْ کے دو معنی آیا کرتے ہیں۔ ایک راہنمائی کرنا، راہنمائی تو حضور ﷺ سب کی کرتے تھے۔ جیسے دوسری جگہ قرآن کریم میں موجود ہے وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (سورۂ شوریٰ:۵۲) کہ آپ صراط مستقیم کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔ اور ایک معنی ہے مقصد تک پہنچا دینا یعنی کسی کے قلب کے اندر ایمان ڈال دینا، جس کو آپ ایصال الی المطلوب سے تعبیر کرتے ہیں، یہ کام اللہ کا ہے۔ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ میں یہی بات ہے۔ بے شک تو ہدایت نہیں دے سکتا اس شخص کو جس کو تو چاہے۔ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ: لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ: اور وہ خوب جاننے والا ہے ہدایت پانے والوں کو۔

وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا: اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم اتباع کریں تیرے ساتھ ہدایت کی، تیرے ساتھ مل کے اگر اس ہدایت کو ہم مان لیں۔ مَعَكَ کا خطاب حضور ﷺ کو ہے۔ اگر ہم اتباع کریں ہدایت کی تیرے ساتھ، نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا: تو ہم اُچک لئے جائیں گے اپنے علاقے سے۔ خَطَفَ اُچک لینے کو کہتے ہیں۔ نُتَخَطَّفْ ہم اُچک لئے جائیں گے، یعنی لوگ ہمیں اُچک کے لے جائیں گے، "ارض" سے یہاں "ارضِ مکہ" مراد ہے یعنی اپنا علاقہ، اُچک لئے جائیں گے ہم اپنے علاقے سے، اپنے ملک سے۔ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا: کیا ہم نے ان کو ٹھکانا نہیں دیا امن والے حرم میں۔ يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ: کھینچ کھینچ کے لایا جاتا ہے اس حرم کی طرف ہر چیز کے ثمرات کو۔ ثمرات ثمرہ کی جمع ہے، پھل کو کہتے ہیں، اور "ثمرات" کا لفظ صرف درختوں کے میووں پر اور پھلوں پر ہی نہیں بولا جاتا۔ یہاں كُلِّ شَيْءٍ ہے، ہر چیز کے ثمرات۔ جس کی وجہ سے ہر قسم کی سبزیوں پر، ہر قسم کے پھلوں پر، ہر قسم کے غلوں پر، یہ لفظ بولا جا سکتا ہے۔ زمین کی پیداوار زمین کا "ثمرہ" کہلاتی ہے، بلکہ آج کل کے محاورے کے مطابق کارخانوں کی مصنوعات یہ کارخانوں کا ثمرہ ہیں۔ كُلِّ شَيْءٍ کے اندر یہ بھی داخل ہے۔ کارخانوں کی ہر قسم کی مصنوعات، ہر قسم کی نباتات، ہر قسم کی سبزیاں، ہر قسم کی پیداوار، یہ سب ثمرات کے اندر شامل ہیں۔ حرم کی طرف کھینچ کھینچ کر لائے

جاتے ہیں ہر قسم کی ثمرات۔ ہر چیز سے حاصل ہونے والی آمدنی گویا کہ "ثمرات" کا مصداق یہ ہوگیا، تو کارخانوں کی مصنوعات بھی اس میں داخل ہوں گی، جس طرح سے آج کل دنیا کے کناروں سے مختلف کارخانوں اور فیکٹریوں میں تیار شدہ مال، وہ بھی کھینچ کھینچ کر لایا جاتا ہے، ہر علاقے میں پیدا ہونے والے غلہ جات، سبزیاں، فروٹ۔ اس لیے کُلِّ شَیْءٍ کے اندر تعمیم ہے، ہر چیز کے ثمرات اس کی طرف کھینچ کھینچ کر لائے جاتے ہیں۔ رِزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا: ہماری طرف سے رزق کے طور پر یعنی اہل حرم کے لئے رزق مہیا کرنے کے واسطے ہر جگہ سے چیزیں لائی جاتی ہیں۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ: لیکن ان میں سے اکثر جانتے نہیں، ان میں سے اکثر کو علم نہیں۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا: کتنی ہی بستیاں ہم نے ہلاک کردیں۔ بَطِرَ: اکڑنا، اترانا۔ حدیث شریف میں جس طرح سے لفظ آتا ہے، حضور ﷺ نے تکبر کی تعریف فرمائی: "بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ"(۱) حق بات سے اکڑنا یعنی حق بات کو قبول کرنے سے اکڑنا۔ اور مَعِيْشَتَهَا یہ جو بظاہر بَطِرَتْ کا مفعول بن رہا ہے، تو بَطِرَتْ میں تضمین کرنی پڑے گی، کیونکہ "بَطِرَ" لازم ہے، اس کا مفعول بظاہر نہیں آئے گا، اس میں "كَفَرَتْ" والا معنی ہے (آلوسی)۔ جو اترائیں اپنی معیشت جو اللہ نے ان کو دے رکھی تھی اس کی ناشکری کی۔ یا بَطِرَتْ کے اُوپر حرفِ جار کو محذوف مانیے بَطِرَتْ بِمَعِيْشَتِهَا، (حاشية الشهاب على البيضاوي) اپنی معیشت کی وجہ سے وہ اکڑنے اور اِترانے لگ گئے۔ ناشکری والا معنی اس میں متضمن کرلیجئے پھر بھی مفہوم ٹھیک ہے، کتنی ہی بستیاں ہم نے ہلاک کردیں جو اِترائیں، تکبر میں آگئیں اور اپنی معیشت کی انہوں نے ناشکری کی، اللہ نے جو انہیں معیشت دے رکھی تھی اس کے وہ ناشکرے ہوگئے۔ یا اپنی معیشت کی وجہ سے اکڑے اور اِترائے۔ بطر کی نسبت قریہ کی طرف کردی گئی ہے اور اصل اہلِ قریہ مراد ہیں۔ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ: پس یہ ہیں ان کے رہنے کی جگہیں۔ مساکن مسکن کی جمع ہے، ٹھہرنے کی جگہ۔ تلك سے اشارہ کردیا، کیونکہ وہ بستیاں ان لوگوں کے نزدیک معروف تھیں۔ قومِ لُوط کی بستیاں، اسی طرح سے ثمود کی بستیاں ان کی تجارت گاہوں پر واقع تھیں۔ تو یہ اشارہ کردیا گویا کہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے۔ یہی ہیں ان کے مکانات، ٹھہرنے کی جگہیں۔ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ: آباد نہیں ہوئے وہ ان کے بعد، ان مساکن میں سکونت نہیں اختیار کی گئی ان کے بعد، اُجڑ گئے، ویران ہوگئے، ان کی کروفر ختم ہوگئی۔ اِلَّا قَلِيْلًا: اس کا یہ معنی بھی ہوسکتا ہے کہ وہ بستیاں جو برباد کی گئیں وہ آباد نہیں ہوئیں مگر ان میں سے تھوڑی سی، جس طرح سے سورۂ ہود میں ذکر کیا گیا مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ (سورۂ ہود: ۱۰۰) کہ ان میں سے بعض بستیاں تو اب بھی قائم ہیں، جس طرح سے فرعون کا شہر ہوگیا، اور بعضے دوسرے شہر کہ جن کے باشندے تباہ و برباد ہوگئے، لیکن وہ شہر پھر کسی درجے میں آباد بھی رہے، اور بعضی بالکل ہی ختم ہوگئیں، ان کا نام ونشان ختم ہوگیا۔ تو قَلِيْلًا کا یہ معنی بھی ہوسکتا ہے کہ ان میں سے کچھ مساکن آباد ہوئے، اور اکثر و بیشتر اسی طرح سے ویران رہ گئے، ان میں آبادی نہیں ہوئی (خازن، جلالین)...... اور قَلِيْلًا کا معنی "زَمَانًا قَلِيْلًا" بھی ہوسکتا ہے کہ نہیں آباد کئے گئے ان ہلاک ہونے والوں کے مساکن مگر کچھ وقت کے لئے آباد ہوئے۔ جیسے کوئی چرواہا، گڈریے، جانور چراتے

---

(۱) مسلم ۱/۶۵ باب تحریم الکبر۔ مشکوٰۃ ج ۲ ص ۴۳۳ باب الغضب فصل اوّل۔

ہوئے، یا کوئی سیاح قسم کے لوگ، یا کوئی مسافر چلتا ہوا تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر گیا، اتنی سی اس میں آبادی نظر آتی ہے، عارضی طور پر کچھ وقت کے لئے جانور چرانے والے اِدھر اُدھر سے کبھی وہاں ٹھکانا کر کے بیٹھ گئے، یا خانہ بدوش قسم کے لوگ کبھی وہاں پڑاؤ کرلیں، یا سیاح قسم کے لوگ وہاں کوئی سیاحت کرنے کے لیے چلے جائیں، جیسے آج کل آثارِ قدیمہ کی تحقیقات کے لیے لوگ جاتے ہیں تو وہاں جا کے کچھ دِن کے لیے ٹھہر بھی سکتے ہیں، اپنا کیمپ لگا لیتے ہیں، اور مسافر جاتا ہوا وہاں کوئی منزل کرلے، بس اتنے سے وقت کے لیے یہ آباد ہوتے ہیں، باقی عام طور پر وہ ویران پڑے ہیں تو قَلِیْلًا کا یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے (عام تفاسیر)۔

وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ: اور ہم ہی پیچھے رہنے والے ہیں، ہم وارثین میں سے ہیں یعنی وہ سارے کے سارے برباد ہوگئے تباہ ہوگئے، اور ہم ان کے وارث ہیں، پیچھے رہنے والے۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى: اور نہیں ہے تیرا ربّ ہلاک کرنے والا بستیوں کو حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا: جب تک کہ نہ بھیج دے (حتّٰی کہ بعد نفی کا ترجمہ کیا جاتا ہے) فِيْٓ اُمِّهَا میں ''ھا'' کی ضمیر قرٰی کی طرف لوٹ رہی ہے، اُمّ کہتے ہیں مرکز کو، تو اُمّ القرٰی کا معنی ہے بستیوں کا مرکز، اس سے مراد ہوتا ہے شہر، کیونکہ شہر جو ہوتا ہے وہ اردگرد کی ملحقہ بستیوں کے لئے ایک مرکز ہوتا ہے، ایسا تو ممکن ہے کہ ایک بستی میں ایک واقعہ پیش آجائے تو ساتھ والی بستی کو پتا نہ چلے، لیکن جو واقعہ شہر میں پیش آجائے وہ سارے علاقے میں مشہور ہوجاتا ہے، کیونکہ عادت یہی ہے جیسے صبح آپ دیکھتے ہیں کہ بستیوں سے لوگ اپنی ضروریات کے لئے شہر کی طرف آنا شروع ہوجاتے ہیں، اور شام کو واپس بستیوں کی طرف لوٹ جاتے ہیں، تو جو واقعہ شہر میں پیش آجائے، جس قسم کا کوئی حادثہ ہو، وہ بستیوں میں فوراً پہنچ جاتا ہے۔ اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اکثر و بیشتر اپنے انبیاء کو مرکزی مقامات میں بھیجا ہے، کہ یہاں کی تعلیمات میں اشاعت زیادہ ہوتی ہے...... تو جب تک ان بستیوں کے مرکز میں اللہ تعالیٰ رسول نہ بھیج دے اس وقت تک وہ بستیوں کو ہلاک نہیں کرتا نہیں ہے تیرا ربّ ہلاک کرنے والا بستیوں کو جب تک کہ نہ بھیج دے ان کے مرکز میں کوئی رسول۔ ''ان کے مرکز میں'' یہ حاصل ترجمہ کررہا ہوں۔ ''ان بستیوں کے مرکز میں'' یعنی ان بستیوں کا مرکزی شہر جس کی طرف وہ بستیاں منسوب ہوتی ہیں، جب تک ان کے مرکز میں رسول نہ بھیج دے۔ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا: ایسا رسول جو پڑھے ان پر ہماری آیات وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى: اور نہیں ہیں ہم ہلاک کرنے والے بستیوں کو، اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ: مگر اس حال میں کہ ان کے اہل ظالم ہوتے ہیں، جب تک ان بستیوں والے ظلم کا ارتکاب نہ کریں۔ کفر و شرک کا، حقوق العباد اور حقوق اللہ کی تلفی کا، اِتلاف کا جس وقت تک وہ ارتکاب نہ کریں، ظلم میں سب کچھ آجاتا ہے، جب ظالم ہوتے ہیں تب ہی ہلاک کرتے ہیں۔ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا: مِّنْ شَيْءٍ یہ ''ما'' کا بیان ہے۔ جو کچھ بھی تم دیے گئے یہ دُنیوی زندگی کا سامان ہے۔ متاع کہتے ہیں چندروزہ فائدہ اٹھانے والی چیز کو، دنیاوی زندگی کا سامان ہے۔ وَزِيْنَتُهَا: اور اسی دُنیوی زندگی کی رونق ہے۔ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى: اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر ہے اور زیادہ باقی رہنے والی چیز ہے، یعنی اپنی حیثیت میں دنیا کے سامان کے مقابلے میں بہتر بھی ہے، اور دَائِمًا اَبَدًا چونکہ حاصل ہوگا، اس لئے زیادہ دیر تک باقی رہنے والی چیز ہے۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ: کیا تم لوگ سوچتے نہیں ہو۔

تفسیر

ماقبل سے ربط

پچھلے رکوع کی ابتدا میں وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآىٕرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ: اس آیت میں توراۃ کا ذکر تھا، کہ اللہ تعالیٰ نے جو کتاب موسیٰ علیہ السلام کی اُمت کو دی تھی، وہ لوگوں کے لئے سرمایۂ بصیرت بھی تھی، ہدایت اور رحمت بھی تھی، اور دی اس لئے تھی تا کہ لوگ نصیحت حاصل کریں، انہوں نے اس کتاب کی بے قدری کی، نہ مانا، دُنیا و آخرت میں خسارے میں رہے۔ اب اس رُکوع میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے لئے کہا جا رہا ہے کہ وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ: ان کو بھی ہم نے یہ کتاب دی تھی تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں، اور ہم نے ان کے لئے بھی مسلسل بات پہنچائی، قرآنِ کریم تھوڑا تھوڑا کر کے اُتارا، مسلسل اُتارا، لگا تار اُتارا، تا کہ یہ نصیحت حاصل کریں۔ لَعَلَّهُمْ کی ضمیر قرآنِ کریم کے مخاطبین کی طرف ہے، جیسے پچھلے رکوع کے آخر میں کلام کا رجحان ان کی طرف ہی ہو گیا تھا فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ کہ اگر آپ کی یہ بات قبول نہیں کرتے، اس قرآنِ کریم سے کوئی اچھی کتاب لا کے پیش نہیں کرتے، اور اس کو بھی نہیں مانتے تو سمجھ لیجئے، کہ اپنی خواہشات کے بندے ہیں، خواہشات کے پیچھے چل رہے ہیں، اور جو اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کو قبول نہ کرے، خواہشات کے پیچھے چلے، اس سے زیادہ بھٹکا ہوا کوئی انسان نہیں ہوتا، اور ایسے ظالم لوگ سیدھا راستہ پانے میں بھی کامیاب نہیں ہوتے، جو اللہ کی راہنمائی سے فائدہ نہیں اٹھاتے بلکہ اپنی خواہشات پہ چلتے ہیں۔ انہیں اب یاددہانی کروائی جا رہی ہے کہ فائدہ اٹھاؤ، اللہ تعالیٰ نے تمہارے سامنے بات اتاری، تھوڑی تھوڑی کر کے، مسلسل، لگا تار، تا کہ تمہارے لئے سمجھنی آسان ہو، تمہاری نصیحت کے لئے یہ اتار دی۔

صداقتِ قرآن پر علمائے بنی اسرائیل کی شہادت

اب یہ جو قول اللہ تعالیٰ نے اُتارا قرآنِ کریم مشرکین کو سمجھانے کے لئے، جس طرح سے سورۂ شعراء کے آخر میں ایک آیت آئی تھی اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (سورۂ شعراء: ۱۹۷) کیا ان لوگوں کے لئے نشانی نہیں کہ اس قرآنِ کریم کو علمائے بنی اسرائیل بھی جانتے ہیں۔ علمائے بنی اسرائیل میں سے جو حق پرست تھے انہوں نے اس قرآن کو قبول کیا، شہادت دی کہ یہ وہی کتاب ہے جس کا ذکر توراۃ اور انجیل میں کیا گیا ہے، اور پیش گوئیاں موجود ہیں۔ نصاریٰ میں سے بھی ایسے اہلِ حق تھے، جیسے شاہِ نجاشی اور اس کے مصاحبین۔ یہود میں سے بھی ایسے اہلِ حق تھے، جس طرح سے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے ہم مسلک ساتھی، جنہوں نے اس کتاب کو قبول کیا، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو بطور شہادت کے پیش کیا، جیسے سورۂ رعد کی جو آخری آیت ہے: قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًاۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ، اس کے تحت روایات میں آتا ہے کہ عبداللہ بن سلام کہا کرتے تھے کہ اس سے مراد میں ہوں (درمنثور)، یعنی میں توراۃ کے جاننے والوں میں سے ہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ یہی کتاب ہے جس کا اللہ نے

وعدہ کیا ہے۔ تو جیسے جگہ بہ جگہ اللہ تعالیٰ نے علمائے بنی اسرائیل کی شہادت اس قرآنِ کریم کی حقانیت کے لئے پیش کی ہے، مشرکین کو سمجھانے کے لئے۔ تو یہاں بھی آگے جن کا ذکر آ رہا ہے یہ کچھ نصاریٰ تھے، عیسائی علماء تھے جو حبشہ سے آئے تھے، اور آ کے انہوں نے اس کتاب کو قبول کیا، ان کی جو کیفیات تھیں ان کو ذکر کر کے مشرکین کو سمجھایا جا رہا ہے کہ دیکھو! جن کو ہم نے کتاب دی تھی، جنہوں نے اُس کتاب کو سمجھا تھا، اُس کے اوپر صحیح طور پر ایمان لائے تھے، انہوں نے اس کتاب کو سن کے کس طرح سے قبول کیا؟ اور کس قسم کے اچھے جذبات کا اظہار کیا؟ تو گویا کہ ان علماء کے قبول کر لینے کو مشرکین کے سامنے رکھ کے کہا جا رہا ہے کہ اہلِ علم جب اس بات کی تصدیق کرتے ہیں تو تمہیں ان پر ہی اعتماد کر لینا چاہیے۔ اگلی آیتوں کا تعلق ماقبل کے ساتھ یہ ہے۔ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ: اس قرآن کے آنے سے پہلے جن کو ہم نے کتاب دی ہے۔ اس کتاب کا مصداق یہاں انجیل ہے، کیونکہ شانِ نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات ان لوگوں کے بارے میں اُتری ہیں جو نصرانی تھے، اہلِ انجیل تھے، اور قرآنِ کریم کی بات سن کے انہوں نے اس کو قبول کر لیا، عیسائی علماء (مظہری)۔ تو یہاں کتاب کا مصداق ہوگا ''انجیل''، موقع محل کے مطابق۔ اور دوسری جگہ کئی مقام پر اس کتاب سے ''توراۃ'' بھی مراد ہے، اور وہ جو عیسائی علماء تھے چونکہ وہ توراۃ کے حامل بھی تھے کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے والے موسیٰ علیہ السلام کو بھی مانتے تھے، اس لئے الْكِتٰبَ کا مصداق اگر توراۃ و انجیل سب کو قرار دے لیا جائے تو بھی گنجائش ہے۔ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ: وہ اس قرآن پر بھی ایمان لاتے ہیں۔ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ: اور جب ان پر یہ آیات پڑھی گئیں تو فوراً انہوں نے کہہ دیا کہ ہم ایمان لے آئے۔ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ یہ ہے مرکزی چیز جو بتانی مقصود ہے۔ کتاب کو سنتے ہی وہ پہچان گئے اور یہ نعرہ لگا دیا اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ کہ یہ حق بات ہے جو ہمارے رَبّ کی طرف سے آئی ہے۔ جیسے ساتویں پارے کی ابتدائی آیت میں ہے: وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ کہ جب انہوں نے اس مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ کو سنا تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے، مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ، اس حق کو پہچاننے کی وجہ سے۔ تو یہاں یہی بات ہے کہ جب انہوں نے بات سنی فوراً کہہ دیا: اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ، یہ حق ہمارے رَبّ کی طرف سے ہے، یعنی جس حق کے ہم منتظر تھے وہ ہمارے رَبّ کی طرف سے آ گیا۔ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ہم تو اس کے آنے سے پہلے ہی مانے بیٹھے تھے کہ ایک ایسی کتاب آنے والی ہے، تو گویا کہ ایک ایسی حقیقت تمہارے سامنے آ گئی جس کے ظاہر ہونے سے پہلے ہی ہمیں تسلیم تھا کہ ایسا ہونے والا ہے۔ تو حق پرست علماء نے تو اس کو اس طرح سے لپک کے لیا، جو ان کی امید کے مطابق ہی سامنے آئی۔ اس میں یہ بات واضح ہو گئی کہ توراۃ اور انجیل کو صحیح طور پر پڑھنے اور سمجھنے والے منتظر تھے کہ ایسی کتاب آنے والی ہے۔ تو جس وقت وہ کتاب ان کے سامنے آ گئی فوراً وہ پہچان گئے۔ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ میں یہی تاثر دیا جا رہا ہے کہ گویا کہ وہ اس کے آنے سے پہلے منتظر تھے کہ یہ کتاب آئے گی، اور انہوں نے کہا کہ اپنی کتاب کی پیش گوئیوں کے طور پر ہم تو آنے سے پہلے ہی اس کو قبول کئے بیٹھے تھے۔

اِسلام قبول کرنے والے اہلِ کتاب کے لیے دوہرا اَجر

اللہ تعالیٰ آگے ان کی تعریف کرتا ہے کہ یہی لوگ ہیں کہ جن کو ان کا اَجر دوہرا دیا جائے گا۔ مَّرَّتَيْنِ دو دو مرتبہ ان کا اجر دیا

جائے گا۔جیسا کہ احادیث کے اندر تفصیل ذکر کردی گئی، سرورِ کائنات ﷺ فرماتے ہیں کہ بعض لوگ ایسے ہیں کہ جن کو ان کے عمل پر دوہرا ثواب ملتا ہے، ان میں سے ایک وہ لوگ بھی ہیں جو اپنے پہلے نبی پر ایمان لائے، یعنی اہل کتاب، جو پہلے اپنے نبی پر ایمان لائے اور جب حضور ﷺ کی بات سامنے آئی تو آپ پر بھی ایمان لے آئے، قرآنِ کریم میں ان کے لئے دوہرے اجر کا وعدہ کیا گیا ہے۔ستائیسویں پارے کی آخری سورت سورۂ حدید کے آخری رُکوع میں (یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ یُؤْتِكُمْ كِفْلَیْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ)، اور حدیث شریف میں بھی ذکر ہے۔ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے نوازا جو پہلے انبیاء پر بھی ایمان لاتے تھے، اور حضور ﷺ کے تشریف لے آنے کے بعد آپ پر بھی ایمان لے آئے، ان کا ہر معاملے میں ثواب دوگنا ہے،[1] یہ ان کو فضیلت حاصل ہے۔یہی لوگ ہیں جن کو ان کا اجر دیا جائے گا دومرتبہ۔

دوہرے اَجر کی وجہ

بِمَا صَبَرُوْا: ان کے مستقل رہنے کی وجہ سے۔صبر کا معنی ہوتا ہے: استقلال، حَبْسُ النَّفْسِ عَلٰی مَا تَكْرَهُ، جو چیز نفس کو ناگوار ہے اس کے اُوپر اپنے نفس کو پابند کر کے رکھا جائے، اور یہ صبر و اِستقامت ہی ہے جس کی وجہ سے انسان حق کے اُوپر جمتا ہے، یعنی اس قرآنِ کریم کے آنے سے پہلے بھی انہوں نے حق کو قبول کیا اور حق کے بارے میں جتنی بھی رُکاوٹیں اور مشکلات آئیں انہوں نے برداشت کیں، اپنے نفس کو پابند رکھا۔اور جس وقت یہ حق ان کے سامنے قرآنِ کریم کی شکل میں آیا تو اس کو بھی قبول کرلیا، کوئی پروانہیں کہ لوگ ہماری مخالفت کریں گے، طعن و تشنیع کریں گے، ہمیں اِلزام دیں گے، ہمارے دُنیوی مفاد کو نقصان پہنچے گا۔انہوں نے اس حق کو بھی قبول کرلیا اور اس پر بھی صبر و اِستقامت دِکھائی، تو صبر والی صفت ہے جو اِنسان کو حق کے اُوپر جماتی ہے۔تو یہ صبر کرنے والے لوگ تھے، ان کے صبر کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کو ان کا اجر دوگنا دے گا۔

حق پرست اہلِ کتاب کی پہلی صفت

وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ: یہ لوگ بُرائی کو اچھائی سے دفع کرتے ہیں، یہ ان کی خوش خلقی کا ذکر ہے۔بُرائی سے مراد یہ ہے کہ لوگ ان کے ساتھ بُرائی کرتے ہیں، حق کو قبول کرلینے کی بنا پر ان کو طعنے دیتے ہیں، ملّت کے غدار، قوم کے غدار، اپنے آبائی دِین کے دُشمن، اس قسم کے طعن و تشنیع لوگ کرتے ہیں، تو یہ ان کی طعن و تشنیع کا جواب نرمی سے دیتے ہیں۔لوگ ان کو پتھر مارتے ہیں یہ آگے سے دُعائیں دیتے ہیں، وہ بدتمیزی کے ساتھ باتیں کرتے ہیں یہ آگے سے بھلی بات کر کے آگے سے گزر جاتے ہیں یَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ کا یہ مفہوم ہے، دفع کرتے ہیں بُرائی کو اچھائی کے ساتھ۔موقع محل کے مطابق اس کا ترجمہ یہی ہے۔۔۔۔ ورنہ عام طور پر اس کا مفہوم یوں بھی ہوجایا کرتا ہے، کہ اگر ان سے کوئی بُرا کام ہوجاتا ہے تو فوراً اس کے بعد اچھا کام کرلیتے ہیں تاکہ اس بُرائی کے اثر کو مٹادے، اور اگر یہ کسی انسان کے ساتھ کوئی بُرا سلوک کر بیٹھیں، تو فوراً اچھا سلوک کرتے ہیں، تاکہ اس

---

(۱) ثَلَاثَةٌ لَهُمْ اَجْرَانِ رَجُلٌ مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اٰمَنَ بِنَبِيِّهٖ وَاٰمَنَ بِمُحَمَّدٍ (بخاری ص ۲۰، باب تعلیم الرجل امته۔ نیز ۱/ ۴۲۲، ۴۹۰، ۲/ ۷۶۱، مشکوٰۃ ص ۱۲)

بُرے سلوک کا اثر ختم ہو جائے، حدیث شریف میں جہاں اس قسم کے جملے آتے ہیں تو اس میں یہ سارے مفہوم ہو سکتے ہیں..... لیکن یہاں خاص طور پر موقع محل یہ ہے کہ اس دینِ حق کے قبول کر لینے کی بنا پر لوگ ان کے ساتھ برا برتاؤ کرتے ہیں، طعن وتشنیع کرتے ہیں، بدزبانی کرتے ہیں، لیکن یہ ان کی بدزبانی کا جواب بدزبانی سے نہیں دیتے، بلکہ ان کی اس برائی کو اچھائی کے ساتھ ٹال دیتے ہیں۔

دُوسری صفت اور اس کے ذِکر کا مقصد

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ: اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اس صفت کو یہاں جو ذکر کیا جا رہا ہے تو ان کی خوش اخلاقی اور ان کے صبر وتحمل کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی بتائی جا رہی ہے کہ یہ دنیا کی محبت میں مبتلا نہیں، ورنہ اکثر وبیشتر جو لوگ حق سے محروم رہتے ہیں وہ حُبِ دنیا کی بنا پر محروم رہتے ہیں، ان کو یہ خیال ہوتا ہے اگر ہم نے یہ حق قبول کر لیا تو ہمارا یہ مفاد ختم ہو جائے گا، ہم نے یہ حق قبول کر لیا تو ہمیں یہ نقصان پہنچ جائے گا، اور اس باطل کے قبول کرنے میں ہمیں یہ مالی فوائد ہیں۔ تو وہ اللہ کے راستے میں اپنے مالی مفاد کی قربانی نہیں دے سکتے، اس لئے حق کو قبول کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ لیکن یہ جنہوں نے حق کو لبیک کہا ہے ان کی صفت یہ ہے کہ اللہ کے راستے میں قربانی دینا جانتے ہیں، جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے وہ اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں، جب خرچ کرتے ہیں تو ان کے دل کے اندر مال کی محبت نہیں، ذخیرہ اندوزی ان میں نہیں ہے، یہود کے اندر یہی بات تھی کہ وہ اللہ کے راستے میں اپنے مفاد کی قربانی نہیں دے سکتے تھے، اس لئے اکثر وبیشتر یہودی جو تھے اسی طرح سے دنیا پرستی کی بنا پر باطل پہ جمے رہ گئے، حق کو قبول نہیں کیا۔ تو جن کو اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی عادت ہوتی ہے، ان کو حق قبول کرنے کی توفیق بہت جلدی ہوتی ہے، کیونکہ حق کے قبول کرنے میں زیادہ تر رکاوٹ مالِ دنیا کی محبت ہوتی ہے..... آج بھی کتنے لوگ ہیں جو حق کو محض دنیا کے مفاد کے لئے چھوڑتے ہیں۔ جیسے ہمارے حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی ﷫ کہا کرتے تھے کہ اکثر وبیشتر نوکری اور چھوکری (لڑکی) کے شوق میں لوگ مرزائی ہوتے ہیں، اور اسی طرح سے مالی مفاد حاصل کرنے کے لئے لوگ عیسائی ہوتے ہیں، تو مال کی محبت اور دنیا کی محبت ہے جو انسان کو حق سے محروم کرتی ہے، حق کو قبول کرنے سے روکتی ہے، اور اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی عادت یہ علامت ہے اس بات کی کہ دل میں مال کی محبت نہیں ہے، جب مال کی محبت نہیں ہے تو مالی مفاد کی قربانی دینے میں وہ کوئی رکاوٹ محسوس نہیں کرتے۔

تیسری صفت

وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ یہ بھی گویا کہ يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ کی ایک قسم کی تفصیل ہے کہ اگر ان کے سامنے کوئی آدمی بے ہودہ بات کرتا ہے، کوئی لغو بات یہ سنتے ہیں تو اس سے منہ موڑ جاتے ہیں۔ یہ ہمیشہ قاعدہ ہوتا ہے، اگر آپ بھی کہیں اہلِ باطل میں پھنس جائیں تو اہلِ باطل آپ کو چھیڑنے کے لئے مختلف قسم کی باتیں کریں گے، طعن، تشنیع، مذاق اُڑانا۔ بس میں بیٹھے ہوئے بسا اوقات لوگ اس قسم کی باتیں چھیڑنے کی کوشش کرتے ہیں، مولوی کا مذاق اُڑانا شروع کر دیں گے تا کہ یہ لوگ ہمارے

ساتھ باتوں میں متوجہ ہوں، بحث مباحثہ چلے، کوئی وقت اچھا گزر جائے، وقت بازی کے لئے لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں، اور بعض کو ویسے ہی عادت ہوتی ہے چھیڑ چھاڑ کی، تو جب یہ لغو قسم کی بات سنتے ہیں تو اعراض کر جاتے ہیں، اور انہیں کہہ دیتے ہیں کہ بھئی! تمہارے لئے تمہارے عمل، ہمارے لئے ہمارے عمل۔ جو کچھ ہم نے اختیار کرلیا اس کی ذمہ داری ہم پہ ہے، جو کچھ تم اختیار کئے بیٹھے ہو اس کی ذمہ داری تم پہ ہے۔ سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ: تم پہ سلام ہو، یعنی ہمارا سلام لو، ہمارا پیچھا چھوڑ دو، یہ سلام ''سلامِ متارکت'' ہے۔ جس طرح سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں بھی آیا تھا۔ لَا نَبْتَغِی الْجٰهِلِیْنَ: یہ زبان سے کہنا ضروری نہیں ہوتا، یعنی اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ ہم جاہلوں سے اُلجھنا نہیں چاہتے، زبان سے کہتے ہیں کہ بھئی! سلام، اور عمل ان کا یہ بتاتا ہے کہ ان کا مطلب یہ ہے کہ لَا نَبْتَغِی الْجٰهِلِیْنَ ہم جاہلوں سے الجھنا نہیں چاہتے۔ کیونکہ زبان کے ساتھ اگر کہا جائے کہ تم جاہل ہو، ہم تم سے اُلجھنا نہیں چاہتے، بسا اوقات یہ بات اُلٹا اُلجھاؤ کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ زبان سے اگر یہ اظہار کیا جائے کہ بھئی! تم جاہل ہو، جو اس قسم کے اعتراضات کرتے ہو، جاہلوں کے ساتھ اُلجھنا ہمارا کام نہیں ہے، یہ بات اُلٹا ان کے ساتھ اُلجھاؤ کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اور یہاں مطلب یہ ہے کہ سلام کہہ کے گزر جاؤ، اور اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت کردو کہ جاہلوں سے اُلجھنا ہمارا کام نہیں ہے، ہم ان کے ساتھ اُلجھ کے اپنا وقت کیوں ضائع کریں...... تو یہ تعریف کی ان لوگوں کی جنہوں نے حق کو قبول کیا، اور ان کے ذکر سے مشرکین کے دماغ پہ یہ اثر ڈالنا مقصود ہے کہ دیکھو! جو پہلے سے کتاب کا علم رکھنے والے ہیں، اور وہ حق پرست ہیں، ان کے دل میں کوئی دنیا کی محبت نہیں، یہی قرآن جب ان کے سامنے پیش کیا گیا، تو وہ سمجھ گئے کہ یہ تو وہی کتاب ہے جس کے ہم منتظر تھے، اور پہلی کتابوں میں اس کا ذکر ہے، تو انہوں نے کس طرح سے لپک کے قبول کرلیا۔ اور آگے ان کے متعلق تعریفی کلمات ذکر کردیے گئے۔

شانِ نزول، اور ''ابوطالب'' کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمدردی کا ذکر

اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ: یہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک تسلی ہے۔ شانِ نزول میں مذکور ہے کہ ابوطالب، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا، جو ایک قسم کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سرپرست اور متولی تھے۔ آپ کی عمر آٹھ سال کی تھی جس وقت کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب فوت ہو گئے تھے، اور آٹھ سال کی عمر میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ابوطالب کی سرپرستی میں آگئے، ابوطالب نے اپنے اس بھتیجے کو اپنی اولاد کی طرح پالا، اور ہر قسم کی ان کی کفالت کی، جوان ہونے کے بعد اپنی سرپرستی میں ان کی شادی کروائی، کاروبار میں ان کو ساتھ شریک کیا، تجارتی سفر میں گئے۔ اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جب نبوّت کا اظہار کیا، سارے قریش دشمن ہو گئے تو ابوطالب آپ کے ہمدرد تھے، اور قریش کی مخالفتیں مول لیں، حتیٰ کہ جب وہ موقع آیا جب سارے مشرکین نے اتحاد کرلیا تھا، کہ ان کا بائیکاٹ کردیا جائے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہیں، تو تین سال تک ساری برادری نے بائیکاٹ کیا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ابوطالب بھی شریک تھے، جس کو آج کل کے محاورے میں آپ کہہ لیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں تین سال تک جیل بھی کاٹی، کیونکہ ایک علاقے میں محصور جو ہو گئے تو نہ کوئی خرید وفروخت کرے، نہ کوئی شادی بیاہ کرے، نہ کوئی ملے ملائے، نہ کوئی بولے، تو یہ حالات کوئی جیل سے کم ہیں؟ شعبِ ابی طالب کے اندر بند ہو کر رہ گئے، اپنے علاقے کے اندر کوئی ان کے ساتھ واسطہ نہیں ڈالتا

تھا، فقر و فاقہ مسکنت جو کچھ تھا سب برداشت کیا۔ تین سال تک اس مصیبت میں بھی حضور ﷺ کے ساتھ شریک رہے، اور اپنی اولاد میں سے جعفر رضی اللہ عنہ کو بھی کہا اسلام قبول کرنے کے لئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی مسلمان ہوئے، عقیل اس وقت مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ عقیل رضی اللہ عنہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی ہیں وہ پہلے مسلمان نہیں تھے، بعد میں مسلمان ہوئے ہیں۔ یہ ساری کی ساری مصیبتیں اُٹھائیں، اور نبوّت کے بعد بھی تقریباً دس یا گیارہ سال تک حضور ﷺ کا ساتھ انہوں نے دیا، نبوّت کے دسویں سال ابوطالب کا انتقال ہو گیا۔

آخری وقت میں ''ابوطالب'' کو حضور ﷺ کی طرف سے کلمے کی دعوت

اور جب ان کی وفات ہونے لگی ہے، اس وقت حضور ﷺ ان کے پاس گئے، کلمہ انہوں نے نہیں پڑھا تھا، مسلمان نہیں ہوئے تھے، کافر رہتے ہوئے حضور ﷺ کے ہمدرد تھے۔ مجلس میں بیٹھے ہیں، ابوجہل اور دوسرے بھی سارے کے سارے موجود تھے، حضور ﷺ بھی موجود تھے۔ آپ ﷺ انہیں کہہ رہے ہیں کہ چچا! میری بات مان لو، اور یہ کلمہ پڑھ لو، ایک دفعہ ہونٹ ہلا دو، اس کلمے کے ساتھ میں تمہارے ہونٹ ہلتے دیکھ لوں، تو میں اللہ کے سامنے آپ کی سفارش کر سکوں گا۔(۱) یہ ابوجہل وغیرہ دوسرے جتنے بیٹھے تھے، وہ دوسری طرف کو کھینچ رہے تھے کہ دیکھ ابوطالب! کہیں آخر وقت میں اپنے باپ عبدالمطلب کا دین نہ چھوڑ دینا، اُدھر سے وہ زور لگا رہے تھے، اِدھر سے حضور ﷺ ترغیب دے رہے تھے۔

''ابوطالب'' کا حضور ﷺ کو جواب

لیکن ابوطالب نے آخری آخری بات جو کہی، وہ یہ کہی کہ اے بھتیجے! میں یہ کلمہ پڑھ کے تیری آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا، اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ قریش کی عورتیں یہ کہیں گی کہ آخر وقت میں ابوطالب ڈر کے بھتیجے کا کلمہ پڑھ گیا، یہ قریش کی عورتیں طعنے دیں گی،(۲) تو گویا کہ ''اِخْتَرْتُ النَّارَ عَلَى الْعَارِ'' میں آگ تو برداشت کر سکتا ہوں، اس عار کو میں نہیں برداشت کر سکتا۔ ''وَاَنَا عَلٰی مِلَّةِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ''(۳) میں اپنے باپ عبدالمطلب کے طریقے پر ہی جا رہا ہوں، یہ آخری فیصلہ ابوطالب نے دے دیا، عار نہیں برداشت کر سکتا کہ عورتیں کہیں گی کہ آخر وقت میں جہنم سے ڈر گیا اور بھتیجے کا کلمہ پڑھ لیا، آگ برداشت کر سکتا ہوں۔ اس وقت پھر مایوس ہو کے سرورِ کائنات ﷺ وہاں سے اُٹھے ہیں روتے ہوئے، آنکھوں سے آنسو بہاتے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے پھر یہ تسلی دی کہ ہدایت دینا، کسی کے قلب میں ایمان ڈال دینا، یہ آپ ﷺ کے اختیار کی بات نہیں ہے، اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے کہ کون ہدایت پانے والے ہیں؟ کون اس قسم کی اہلیت، قابلیت رکھتے ہیں، جن کے قلب کے اندر ایمان ڈال دیا جائے۔ آپ ﷺ اس بارے میں زیادہ پریشان نہ ہوں۔

---

(۱) اَیْ عَمِّ قُلْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ كَلِمَةً اُحَاجُّ لَكَ بِهَا عِنْدَ اللهِ. (بخاری ۱/ ۵۴۸، باب قصة ابی طالب)

(۲) لَوْلَا اَنْ تُعَيِّرَنِيْ قُرَيْشٌ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا حَمَلَهٗ عَلٰى ذٰلِكَ الْجَزَعُ لَاَقْرَرْتُ بِهَا عَيْنَكَ. (مسلم ۱/ ۴۰، باب الدلیل علی صحة اسلام الخ) اور الایمان لابن مندہ رقم ۳۸، وغیرہ میں الفاظ ہیں: لَوْلَا اَنْ تُعَيِّرَنِيْ نِسَاءُ قُرَيْشٍ تَقُوْلُ: اِنَّهٗ حَمَلَهُ الخ۔ مظہری میں بھی یہی الفاظ ہیں۔ فیض الباری ۱/ ۱۲۶ پر ہے: فَاٰثَرَ النَّارَ عَلَى الْعَارِ

(۳) بخاری ۱/ ۱۸۱، باب اذا قال المشرك الخ۔ ۱/ ۵۴۸، باب قصة ابی طالب۔ مسلم ۱/ ۴۰، باب الدلیل علی صحة اسلام من حضرہ الموت

''ابوطالب'' کے متعلق اہلِ سُنّت والجماعت کا مسلک

اس لئے اہلِ سنت والجماعت کا مسلک یہی ہے، روایاتِ صحیحہ کے اندر آیا ہوا ہے کہ ابوطالب دُنیا سے بغیر ایمان کے گیا ہے، کُفر کی حالت میں اس کا خاتمہ ہوا۔ بخاری شریف کی حدیث میں آتا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا کہ جہنّم کے اندر جتنے لوگ ہوں گے ان سب میں سے کم عذاب ابوطالب کو ہوگا، کیونکہ اس نے سوائے اس کے کہ ایمان قبول نہیں کیا، باقی کوئی حضور ﷺ کے ساتھ عداوت نہیں کی، محبت میں وقت گزارا، خیر خواہی ہمدردی سب کچھ کی ہے، لیکن ایمان سے محروم رہا، تو جنّت میں تو نہیں جائے گا، جہنّم سے نکلے گا نہیں۔ لیکن حضور ﷺ اور آپ کی جماعت کے ساتھ حُسنِ سلوک کی برکت سے اتنا ہوگیا کہ جہنّم کے اندر اس کا عذاب اَخف اور اَھوَن ہے سارے جہنمیوں کے مقابلے میں، جس کی تفصیل یہ ذکر کی گئی کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس کے پاؤں میں صرف آگ کی دو جوتیاں ہوں گی۔ ایک روایت میں یہ لفظ ہیں کہ صرف ٹخنوں تک وہ آگ میں ہوگا، باقی سارا بدن اس کا آگ سے بچا ہوا ہوگا۔ لیکن پاؤں میں آگ کی جوتیاں، اس کا وہی مطلب ہے کہ ٹخنوں تک آگ میں۔ یعنی جب ٹخنوں تک آگ میں ہوگا تو ایسے سمجھو جیسے آگ کی جوتی پہنی ہوئی ہے۔ اس کے اثر سے اس کا دماغ اس طرح سے کھولتا ہوگا، جس طرح سے ہانڈی اُبلتی ہے، اور وہ یہ سمجھتا ہوگا کہ جتنا سخت عذاب مجھے ہے، شاید اتنا سخت عذاب کسی اور کو نہیں، یہ تفصیل احادیث میں موجود ہے۔[1] اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب ابوطالب مرے تھے، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جا کے حضور ﷺ کو اِطلاع دی ان لفظوں کے ساتھ کہ ''اِنَّ عَمَّكَ الضَّالَّ قَدْمَاتَ''[2] یارسول اللہ! آپ کا گمراہ چچا مر گیا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ جاؤ، جا کے اس کو مٹی میں چھپا دو، جس طرح سے دفن کرنے کی عادت ہے، یعنی اسلامی طریقے کے مطابق غسل، کفن، اس طرح سے تو نہیں کیا گیا، جو طریقہ اس زمانے میں تھا، اُٹھایا اور گڑھا کھود کے دفن کر دیا۔ نہ قبر کے اندر ان چیزوں (سُنّت طریقوں) کی رعایت، نہ کفن دفن میں۔ تو ان کی قبر اسی احاطے میں ہے جو ''جنت المعلیٰ'' کا پُرانا احاطہ ہے، حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی قبر بھی ادھر ہی ہے، اور اس جگہ کو حکومت نے محصور کر کے دیوار بنا کے پھاٹک لگا کے مقفل کیا ہوا ہے، چونکہ یہ رافضی شیعہ ابوطالب کے ایمان کے قائل ہیں، اور یہ وہاں جاتے تھے اور جا کے کچھ گڑ بڑ کرتے تھے، جس کی بنا پر حکومت نے اس حصے کو مقفل کر دیا ہے، وہاں کوئی بھی آ جا نہیں سکتا، ویسے پھاٹک میں سے اندر وہ قبور نظر آتی ہیں، اسی حلقے کے اندر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی قبر ہے اور حضور ﷺ کے صاحبزادے جو مکہ معظمہ میں فوت ہوئے ان کی قبریں بھی یہیں ہیں...... تو اس طرح سے ان کا خاتمہ کُفر پر ہوا ہے۔ تو یہ آیت حضور ﷺ کے لئے بطور تسلی کے اُتری ہے اِنَّكَ لَا تَهْدِىْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ کہ جس کو تُو چاہے اس کو ہدایت نہیں دے سکتا، کہ جس کے متعلق تُو

---

(۱) ذُكِرَ عِنْدَهُ عَمُّهُ اَبُو طَالِبٍ فَقَالَ لَعَلَّهُ تَنْفَعُهُ شَفَاعَتِىْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيُجْعَلُ فِىْ ضَحْضَاحٍ مِنَ النَّارِ يَبْلُغُ كَعْبَيْهِ يَغْلِىْ مِنْهُ اُمُّ دِمَاغِهٖ (بخاری ۹۷۱/۲)، اَهْوَنُ اَهْلِ النَّارِ عَذَابًا اَبُو طَالِبٍ وَهُوَ مُنْتَعِلٌ بِنَعْلَيْنِ يَغْلِىْ مِنْهُمَا دِمَاغُهٗ اِنَّ اَهْوَنَ اَهْلِ النَّارِ عَذَابًا مَنْ لَهٗ نَعْلَانِ وَشِرَاكَانِ مِنْ نَارٍ يَغْلِىْ مِنْهُمَا دِمَاغُهٗ كَمَا يَغْلِى الْمِرْجَلُ مَا يَرٰى اَنَّ اَحَدًا اَشَدُّ مِنْهُ عَذَابًا وَاِنَّهٗ لَاَهْوَنُهُمْ عَذَابًا (مسلم ۱۱۵/۱، باب شفاعۃ النبی لأبی طالب مشکوٰۃ ۵۰۲/۲، باب صفۃ النار)

(۲) معجم اوسط طبرانی، رقم ۵۴۹۰۔ نیز ابو داؤد ۱۰۲/۲، باب الرجل یموت لہ قرابۃ مشرک نسائی ۲۱۹/۱۔ ولفظھما: ان عمك الشیخ الضال قدمات

چاہے اس کے دل میں ایمان ڈال دے، یہ تیرا کام نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ اور وہی ہدایت یافتہ لوگوں کو خوب اچھی طرح سے جاننے والا ہے۔

''ابوطالب'' کے کُفر کو بِلاوجہ موضوعِ بحث نہیں بنانا چاہیے

''حضرت شاہ صاحب ''موضح القرآن'' میں لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے چچا (ابوطالب) کے واسطے بہت سعی کی کہ مرتے وقت کلمہ پڑھ لے، اس نے قبول نہ کیا۔ اس پر یہ آیت اُتری۔ (موضح) یعنی جس سے تم کو طبعی محبت ہو، یا دل چاہتا ہو کہ فلاں کو ہدایت ہوجائے، لازم نہیں کہ ایسا ضرور ہو کر رہے، آپ کا کام صرف راستہ بتانا ہے، آگے یہ کہ کون راستے پر چل کر منزلِ مقصود تک پہنچتا ہے، کون نہیں پہنچتا؟ یہ آپ کے قبضہ اختیار سے خارج ہے۔ اللہ کو اِختیار ہے، جسے چاہے قبولِ حق اور وصول الی المطلوب کی توفیق بخشے۔ (تنبیہ) جو کچھ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا احادیثِ صحیحہ میں موجود ہے۔ اس سے زائد اس مسئلے میں کلام کرنا اور ابوطالب کے ایمان وکُفر کو خاص موضوعِ بحث بنالینا غیر ضروری ہے، بہتر یہی ہے کہ اس قسم کی غیر ضروری اور پُرخطر مباحث میں کفِ لسان کیا جائے۔'' (تفسیر عثمانی)...... ''بیان القرآن'' میں بھی حضرت تھانوی ؒ نے بھی یہی بات لکھی ہے، اور حوالہ ''رُوح المعانی'' کا دیا ہے کہ ''رُوح المعانی'' والے کہتے ہیں کہ اگرچہ صحیح احادیث میں یہی مضمون آیا ہے جو اہلِ سُنّت والجماعت کا مسلک ہے، لیکن عام گفتگو کے اندر بِلاوجہ ابوطالب کا کُفر زیرِ بحث نہیں لانا چاہیے، کیونکہ یہ تو صحیح ہے کہ اس شخص کو ایمان نصیب نہیں ہوا، لیکن حضور ﷺ کے محبین میں سے تھا، اور آپ کے ساتھ اس نے بہت اچھا برتاؤ کیا ہے۔ تو بِلاوجہ کسی کا بُرائی کے ساتھ تذکرہ کرنا، خصوصاً ابوطالب کا بُرائی سے تذکرہ کرنا یہ ''علویوں'' کے لیے، اور ہوسکتا ہے سرورِ کائنات ﷺ کے لئے بھی ناگواری کا باعث ہوجائے، اس لئے اس موضوع پر بِلاضرورت زیادہ گفتگو مناسب نہیں۔ [1]

رُکوع کی اِبتدائی آیات (۵۱ تا ۵۶) کا خلاصہ

اس رُکوع کے شروع کی آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے مشرکینِ مکہ کی طرف اپنے قول کے مسلسل لگاتار اُتارنے کا ذِکر کیا تھا، اور ان لوگوں کو ایمان لانے کی ترغیب دی تھی۔ اور اس ترغیب کے ضمن میں ہی ان لوگوں کا تذکرہ کیا تھا جو اہلِ کتاب میں سے ایمان لائے، ان کی تعریف بھی تھی اور ان کی اچھی صفات کا اظہار بھی تھا...... اور آگے حضور ﷺ کو خطاب کر کے کہا گیا تھا کہ ان کو ہدایت دینا آپ ﷺ کے اختیار میں نہیں، اس لئے آپ ﷺ اپنی طرف سے دعوت دیتے رہیں، اس میں بھی ایک قسم کی سرزنش ہے مشرکین کے لئے، کہ جو دولت تمہاری طرف بھیجی جارہی ہے، تم ذرا خیال کرو کہ دُور دُور سے آکر لوگ اس سے فائدہ اُٹھارہے ہیں۔ چنانچہ یہ اہلِ کتاب جن کا ذِکر پچھلی آیات میں آیا ہوا ہے، مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ حبشہ سے کچھ لوگ آئے تھے، عیسائی تھے، نصرانی تھے، انہوں نے سُنا ان مسلمانوں سے جو یہاں سے حبشہ کی طرف ہجرت کر کے گئے تھے، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی

---

(۱) ثم انه على القول بعدم اسلامه لا ينبغي سبه والتكلم فيه بفضول الكلام فان ذلك مما يتاذى به العلويون بل لا يبعد ان يكون مما يتاذى به النبي (آلوسی)

قیادت میں، تو وہاں سے آئے، اور آ کے انہوں نے سرورِ کائنات ﷺ سے گفت وشنید کی، اور آپ ﷺ سے قرآنِ کریم سنا، اور سنتے ہی ایمان لے آئے، اور اس بات کا اظہار کیا کہ یہ تو بالکل ان پیش گوئیوں کے مطابق ہے، جو ہم نے اپنی کتابوں میں پڑھی ہیں، اور یہ واقعی اللہ کی طرف سے حق بات آئی ہے، اور ہم اس کے آنے سے پہلے ہی تسلیم کرنے والے تھے، اور ان کی اچھی صفات کا اظہار کیا گیا۔ تو دُور دُور سے آنے والے لوگ تو فائدہ اُٹھا رہے ہیں، اور یہ دولت تمہارے گھر میں آ رہی ہے، اور تم اس سے صرفِ نظر کیے ہوئے ہو۔ تو تنبیہ کا ایک طریقہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اُدھر سے اعراض کر کے حضور ﷺ سے کہا جا رہا ہے، کہ ان لوگوں کو راہِ راست پہ لانا آپ کے بس کی بات نہیں ہے، آپ ﷺ اپنی طرف سے کہتے رہیے۔ اللہ کو منظور ہوگا، جس کے اندر کوئی صلاحیت ہوگی، جو سمجھنا چاہے گا، تو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں ایمان ڈال دے گا، باقی آپ زبردستی کسی کو مؤمن نہیں بنا سکتے، خصوصیت کے ساتھ یہ ابوطالب کے متعلق بھی ہیں، جس طرح سے تفصیل آپ کی خدمت میں کل عرض کر دی گئی تھی۔

مشرکینِ مکہ کے لئے اِیمان سے رُکاوٹ کا تفصیلی پس منظر

اس دعوتِ ایمانی کے بعد مشرکینِ مکہ کی طرف سے ایمان لانے میں جو رُکاوٹ محسوس کی جاتی تھی، جس قسم کے شبہات میں وہ مبتلا تھے، اگلی آیات میں ان کا ازالہ کیا گیا ہے...... اس کو سمجھنے سے پہلے آپ یہ بات یاد رکھئے کہ مشرکینِ مکہ تمام اہلِ عرب کے نزدیک حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام ان دونوں شخصیات کا احترام عرب بھی کرتا تھا، اس نسبت کی بنا پر ان کا مقام وہ تھا جو آج کی اِصطلاح میں ''پیرزادوں'' کا اور ''شیخ زادوں'' کا ہوتا ہے، اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس گھر کی تعمیر کی تھی، بیت اللہ، اس کا احترام بھی سب عرب کے دل میں تھا، اور ہر سال یہ لوگ حج کرنے کے لئے آتے تھے، اور اس کے اردگرد کا علاقہ مسلّم طور پر تمام اہلِ عرب کے نزدیک حرم تھا، جس میں لڑنا، قتل وقتال کرنا وہ لوگ جاہلیت میں بھی حرام سمجھتے تھے، حتّٰی کہ اگر حرم کی حدود میں کسی شخص کو اپنے باپ کا بھی قاتل مل جاتا، تو وہ اس کے اُوپر کسی قسم کی دست درازی نہیں کرتا تھا، اور اس کے خلاف مشتعل نہیں ہوتا تھا، اتنا احترام اس جگہ کا اور اس بیت کا تمام عرب کے قلوب میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ڈالا ہوا تھا۔ تو یہ مشرکینِ مکہ اس گھر کے مجاور تھے، تو یہ ایک دوسری عظمت حاصل ہوگئی کہ جو بیت سب عرب کے نزدیک محترم ہے، یہ قوم جو تھی، مشرکینِ مکہ قریش یہ اس کے متولی سمجھے جاتے تھے اور اس کے مجاور تھے، یہ ایک مستقل وجۂ اِحترام تھی۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ مشرکینِ مکہ نے تمام عرب کے نزدیک اپنے تعلقات اُستوار کئے ہوئے تھے، اور ان تعلقات سے فائدہ اُٹھاتے تھے وہ اپنی تجارت میں، گرمیوں کے موسم میں یہ شام کی طرف تجارتی سفر کرتے، سردیوں کے موسم میں یمن کی طرف سفر کرتے، اور یہی تجارت ان کے لئے ذریعۂ گزران تھی، کیونکہ مکہ کے علاقے میں نباتات اور پیداوار نہیں ہے، ان کا گزارہ تجارت پر تھا، ساری دُنیا کا سامان یہاں سمٹ کے آتا تھا اور یہاں کی چیزیں بکتیں، اور یہ سامان اُٹھا اُٹھا کے شام اور یمن کے علاقے میں پہنچاتے...... باوجود اس بات کے کہ سارے عرب کے اندر غارت گری تھی، لوٹ مار تھی، ڈاکازنی تھی، لیکن ان مشرکینِ مکہ کا سب اِحترام کرتے تھے، ان کے قافلوں کے ساتھ کسی قسم کا تعرض نہیں کیا جاتا تھا، ایک تو وہی ان کی ''شیخ زادگی''

اور ''پیرزادگی'' اس کا باعث تھی، دوسرے بیت اللہ کے مجاور ہونے کی وجہ سے ان کا احترام تھا، اور تیسرے ان لوگوں نے باہر تعلقات اُستوار کر رکھے تھے، اور ان تعلقات کی نوعیت یہ تھی کہ ہر قبیلے کا ایک بُت انہوں نے بیت اللہ میں رکھا ہوا تھا، اور اس بُت کی وجہ سے وہ قبیلہ بھی یہاں آنے پہ مجبور تھا، آتے یہاں زیارت کے لئے، اور مشرکین چونکہ ان کے بُت کا بھی احترام کرتے تھے، اس لئے یوں بھی مذہبی طور پر ان لوگوں کو باہر احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، تو یہ تین سو ساٹھ بُت جو مشہور ہیں کہ انہوں نے بیت اللہ کے اردگرد رکھے ہوئے تھے،[1] وہ صرف قریش کے نہیں تھے، بلکہ اردگرد کے قبائل جس قسم کے بتوں کو پوجتے تھے وہ بُت بھی انہوں نے یہاں رکھے ہوئے تھے، تو گویا کہ مکہ معظمہ کو مذہبی مرکزیت حاصل تھی تمام قبائل کے نزدیک، اور قیادت اس کی مشرکینِ مکہ کر رہے تھے، ان کی اس وقت یہ پوزیشن تھی۔

تو جس وقت سرورِ کائنات ﷺ نے توحید کی آواز اٹھائی اور ان بتوں کی مخالفت کی، کہ اللہ کے علاوہ جتنے اِلٰہ بنا رکھے ہیں، ان سب کو چھوڑ دو اور صرف اللہ کو پوجو، تو مشرکینِ مکہ کے جو قائدین تھے، ابوجہل، ابولہب، اور اس قسم کے دوسرے لوگ جن کو قیادت حاصل تھی، وہ یہاں ایک مشکل محسوس کرنے لگ گئے، وہ کہنے لگے کہ یہ بات جو ہمارے سامنے کہی جارہی ہے اگر ہم اس کو قبول کرتے ہیں تو یہ ہمارے آباؤاجداد کے طریقے کے بھی خلاف ہے، ہم اپنے آباؤاجداد کو گمراہ یا جہنمی کس طرح سے تسلیم کرلیں؟ تو اس طریقے کے بھی خلاف ہے، اور دوسری بات یہ ہے کہ ہماری دُنیوی زندگی کے لئے بھی یہ موت کے مترادف ہے، اگر ہم نے توحید کا نعرہ بلند کیا، اور یہ مختلف قبیلوں کے بت ہم نے جو سنبھال رکھے ہیں جن کی بنا پر ہمیں سارے ملک میں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ہم ان بتوں کو توڑ دیں یہاں سے نکال دیں اور ان لوگوں کو گمراہ کہنا شروع کردیں، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یکدم سارا عرب ہمارے خلاف ہوجائے گا، اور ہمارے تجارتی راستے پُرامن نہیں رہیں گے، باہر ہم جائیں گے تو لوگ ہمیں لوٹ لیں گے، اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ مرکز میں رہتے ہوئے جب ہم سب قبائل کی مخالفت کریں گے تو سارے قبائل متحد ہو کے ہمیں اس مرکز سے نکال کے خود مرکز پہ غالب ہوجائیں، تو مکہ معظمہ پر وہ قابض ہوجائیں گے اور ہمیں اُٹھا کر باہر کردیں گے، ہم اکیلے سارے عرب کا مقابلہ کس طرح سے کریں گے؟ ...... یہ خطرات تھے جو وہ لوگ محسوس کرتے تھے کہ اس دعوت توحید کو قبول کرنے کے بعد ہماری زندگی کس طرح سے ہوگی؟ ہماری تو معیشت تباہ ہوجائے گی، تجارت برباد ہوجائے گی، اور خود ہمارا مرکز خطرے میں پڑ جائے گا، سب قبیلوں کے ساتھ ہم مخالفت مول لیں تو سارے قبیلے اتفاق کر کے آئیں اور اپنے لیے ان بتوں کو یہاں محفوظ کرلیں، اور ہم ان کی مخالفت کریں تو ہمیں یہاں سے نکال بھگائیں، اور مرکز پر وہ قبضہ کرلیں، یہ تو خطرہ ہی خطرہ ہے، ہم اس دعوت کو قبول کر کے ساری دنیا کی دشمنی مول نہیں لے سکتے۔ یہ خطرہ تھا جو اس زمانے کے قومی لیڈر محسوس کرتے تھے۔

بالکل اسی طرح سے، آپ حضرات چونکہ حالات سے واقف نہیں ہیں، تو آپ ان کے اس شبہ کی قیمت اور وزن کو محسوس نہیں کرسکے، آج بھی جو قوم کی قیادت کرنے والے لیڈر ہیں، ان کو جس وقت کہا جاتا ہے کہ تم اسلامی قانون کو کامل ومکمل طریقے

---

(۱) بخاری ج۱ ص۳۳۶، باب ھل تکسر الدنان. مسلم ۲/۱۰۴، باب فتح مکۃ آخر۔ وحول الکعبۃ ثلاث مائۃ وستون نصبا

سے اپناؤ، تو وہ بھی اسی قسم کی مشکلات محسوس کرتے ہیں کہ دُنیا میں رہنا ہے، باہر کے ملکوں کے ساتھ تعلقات ہیں، باہر لین دین ہے، ہم یکسر ساری چیز کو تبدیل کر کے رکھ دیں، تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ ہم ساری دُنیا سے کٹ کے رہ جائیں، تو دُنیا میں ہم زندہ کس طرح سے رہیں گے؟ آخر جو دُنیا کے اندر طور طریقہ اپنایا جارہا ہے جس طرز کے اُوپر دُنیا چل رہی ہے، ہم اس طرز پہ نہیں چلیں گے تو پھر اس دُنیا کے اندر ہمارا ٹھکانا کیا ہے؟ ہم وقت کس طرح سے گزاریں گے؟ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔

اور سرورِ کائنات ﷺ بار بار انہیں دعوت دیتے تھے، اور ان الفاظ کے ساتھ دعوت دیتے تھے کہ ''لا إله إلا الله'' پڑھ لو اس کے ساتھ تمہیں دنیا اور آخرت میں کامیابی ہوگی، یہ ایک ایسا کلمہ ہے کہ اگر تم اس کو قبول کر لو گے، سارا عرب بھی تمہارے تابع ہوجائے گا، اور عجم پر بھی حکومت تمہاری ہوگی۔[1] اور اُن لوگوں کی عقل یہاں تک نہیں پہنچتی تھی، وہ سمجھتے تھے کہ اس مشرکانہ زندگی کے اندر ہماری خوش حالی ہے، اور اگر ہم اس مشرکانہ زندگی کو چھوڑیں گے تو سارے عرب کے ساتھ تصادم ہوگا، تعلقات ٹوٹ جائیں گے، تجارت برباد ہوجائے گی، اور ہمارا یہ مرکز بھی محفوظ نہیں رہے گا، وہ اس توحید کے قبول کرنے کو اپنی موت سمجھتے تھے، اور سرورِ کائنات ﷺ ان کے سامنے یہ کہہ رہے تھے کہ اسی میں تمہاری زندگی ہے، اور اسی میں تمہاری برتری ہے، اگر اس کلمے کو تم قبول کر لو گے تو عرب وعجم سب تمہارے تابع ہوجائیں گے، اور تمہاری حکومت قائم ہوجائے گی...... یہ تھی ذہنی کشاکشی جو مشرکین کے ذہن میں پیدا ہوگئی تھی، اور وہ اس توحید کو قبول کرنے میں اس قسم کے خطرات محسوس کرتے تھے، اور اس وقت ان کو جو خوش حالی حاصل تھی اور راحت وآرام حاصل تھا اس کو وہ قربان نہیں کرنا چاہتے تھے۔

مشرکین کے شبہ کا اِزالہ

اب ان کے ذہن کے اندر کشاکشی کا یہ نقشہ بن گیا، تو اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے اس شبہ کو ان آیات میں زائل کرتے ہیں ...... پہلے تو ان کے شبہ کا ذکر ہے کہ وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم نے ہدایت کی اتباع کر لی، اگر ہم ہدایت کے متبع ہوگئے، یعنی جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں اگر ہم نے اس بات کو مان لیا، اگر ہم اتباع کریں ہدایت کی تیرے ساتھ مل کر، اس راہنمائی کی ہم اتباع کر لیں، نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا تو ہم تو اُچک لیے جائیں گے اپنے علاقے سے، ان کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں یہاں رہنے کون دے گا؟ ہم زندگی کس طرح سے گزاریں گے؟ تو اللہ تعالیٰ انہیں کہتے ہیں کہ تم ذرا سوچو تو سہی! کہ یہ علاقہ جس کو حرم کہا جاتا ہے، اور جس میں لوگ لڑنا حرام سمجھتے ہیں، ان کی فطرت کے اندر یہ بات پڑی ہوئی ہے کہ اس کا احترام کرتے ہیں، تو اس کا امن والا ہونا، اور اس کا حرم محترم ہونا، کیا یہ تمہاری تدبیروں یا تمہاری کوششوں کا نتیجہ ہے، یا اللہ نے بنایا ہے؟ اور اس بیت اللہ کی عظمت لوگوں کے دلوں میں ڈال دی گئی اور اس کی مجاورت کی وجہ سے لوگ تمہارا احترام کرتے ہیں تو یہ اللہ کی پیدا کردہ چیز ہے یا تمہاری تدبیروں کا نتیجہ ہے؟ کتنے بڑے افسوس کی بات ہے کہ جس اللہ نے یہ گھر بنایا، جس کا یہ گھر کہلاتا ہے، جس کی برکات تم حاصل کر رہے ہو، اور جس نے اس کو حرم آمن بنایا، اس کی بغاوت میں تم اپنی زندگی سمجھ رہے ہو، اور اس کی اطاعت میں اس کی عبادت

---

(۱) ترمذی ج ۲ ص ۱۵۸، کتاب التفسیر سورۃ ص۔ ولفظه: قَالَ إِنِّي أُرِيدُ مِنْهُمْ كَلِمَةً وَاحِدَةً تَدِينُ لَهُمْ بِهَا الْعَرَبُ وَتُؤَدِّي إِلَيْهِمُ الْعَجَمُ الْجِزْيَةَ

میں اور اس کی توحید اختیار کرنے میں تم اپنا زوال سمجھ رہے ہو؟ کتنی الٹی بات ہے...... چنانچہ آنے والے وقت نے بتا دیا کہ واقعی قریش نے اس کلمے کو قبول کیا تو ان کو ساری دنیا کے اندر برتری حاصل ہوئی، سو سال بھی نہیں گزرے تھے کہ یہاں سندھ تک ان کی حکومت ہوئی، اور بڑا حصہ دنیا کا جو تھا وہ سارا ان کے قبضہ میں آیا، سارا عرب بھی قبضے میں آ گیا، اور عجم پر بھی معتد بہ حکومت ان کی ہوئی۔ تو بات حضور ﷺ کی صحیح نکلی کہ اس کلمے کو قبول کرنے کی بنا پر تمہیں دنیا میں بھی برتری حاصل ہوگی...... اور جس قسم کی خدشہ مشرکین محسوس کرتے تھے وہ خدشہ غلط نکلا۔

جس رَبّ کا کھاتے ہو اسی کی عبادت کرو

تو یہاں اللہ تعالیٰ پہلے تو نہیں یہی کہتے ہیں اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا: کیا ہم نے ان کو ٹھکانا نہیں دیا امن والے حرم میں؟ يُجْبٰۤى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ: جس کی طرف ہر چیز کے ثمرات کھینچے جا رہے ہیں، کھینچ کھینچ کے لائے جا رہے ہیں، رزق کی وسعت یہ سب اس بیت کی وجہ سے ہے...... جیسا کہ تیسویں پارے میں ایک چھوٹی سی سورت ہے (سورۂ قریش) اس میں یہی نقشہ کھینچا گیا ہے، قریش کو یہاں ایمان کی دعوت دی گئی فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۝ الَّذِيْۤ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ: اس گھر کے رَبّ کی عبادت کرو جس نے تمہیں خوف سے امن دیا اور جس نے تمہیں بھوک سے کھانا دیا، تمہاری بھوک کے ازالے کے طور پر تمہیں کھانا دیا، اور تمہارے خوف کے ازالے کے طور پر تمہیں امن دیا، یہ اس رَبّ بیت کا عطیہ ہے، تمہیں چاہیے کہ اس رَبّ بیت کی عبادت کرو...... تو یہاں بھی وہی بات ہے کہ اس امن والے حرم میں تمہیں ٹھکانا دینے والے اللہ ہیں، اور تمہاری طرف رزق کھچا کھچا چلا آ رہا ہے یہ سب اللہ کی نعمت ہے، تو تم مشرک بن کے تو سمجھتے ہو کہ ہمیں کھانے کو نہیں ملے گا، اور توحید اختیار کرنے کی صورت میں سمجھتے ہو کہ ہم بھوکے مر جائیں گے؟

نئی تہذیب کے دلدادہ مشرکینِ مکہ کے ڈگر پر

یہ بھی ایک جاہلانہ ذہن ہے، جس طرح سے کبھی کبھی آپ حضرات کے سامنے بھی لوگ تذکرہ کرتے ہوں گے کہ سکولوں میں پڑھو، کالجوں میں پڑھو، اور تہذیبِ نو کا راستہ اختیار کرو، تم دنیا میں عزت کی زندگی گزارو گے، تمہیں کھانے کے لیے ملے گا، نوکریاں کرو گے، ملازمتیں کرو گے، تمہارا معیار زندگی اونچا ہوگا۔ یہ قرآن پڑھ کے اور یہ دین پڑھ کے کیا کرو گے؟، بھوکے مرو گے، کھاؤ گے کہاں سے؟ یہ شبہات آج بھی لوگ ڈالتے ہیں، ان جاہلوں کے دماغ میں یہ بات نہیں آتی کہ اگر رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے، اور بات کرنے والے مؤمن ہیں، اگر ان کا اللہ اور اللہ کے رسول پر ایمان ہے، تو ان سے ایک بات پوچھی جا سکتی ہے، اگر کوئی کافر اس قسم کی بات کہے تو ہم اسے کچھ نہیں کہہ سکتے، اس کے ساتھ بات کا انداز اور ہوگا، لیکن اگر کوئی اللہ پہ ایمان رکھنے والا اس قسم کی بات کرتا ہے، جس کا عقیدہ یہ ہے کہ عزت، ذلت، رزق، روزی، جو کچھ ہے سب اللہ کے ہاتھ میں ہے، تو ان سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ بھئی! کیا بات ہے؟ کہ اللہ سے باغیانہ زندگی اختیار کر کے تو تم سمجھتے ہو کہ عزت بھی ملے گی اور رزق بھی ملے گا۔ تو اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری اختیار کر کے کیا عزّت، رزق دونوں سے انسان محروم ہو جائے گا؟ پھر تمہارے ایمان کا مقام کیا رہا؟ کہ

اگر کوئی شخص دنیا کے لئے کھپے تو تم سمجھتے ہو کہ اس کی زندگی کامیاب ہے، اور اگر کوئی اللہ کے دین کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دے تو تم سمجھتے ہو کہ یہ زندگی ناکام ہے، تو مؤمن کے منہ سے یہ بات پھبتی نہیں ہے۔

عزّت صرف دِین میں ہے

تو واقعہ یہی ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو دِین کے لئے اور اللہ تعالیٰ کے لئے وقف کر دیتے ہیں، اپنی صلاحیتیں دین کے لئے صَرف کرتے ہیں، تو دُنیا میں بھی اللہ ان کو عزّت دیتا ہے۔ ان کی حکومت اگر ظاہری طور پر اس مُلک پر نہیں ہوتی اور ان کے ہاتھ میں تھانیدار کی طرح ڈنڈا نہیں ہوتا، یا دوسرے آفیسروں کی طرح ان کو قانونی طور پر اگر برتری حاصل نہیں ہوتی، تو واقعہ یہ ہے کہ دِلوں کے اُوپر حکومت انہی لوگوں کی ہوتی ہے، لوگ ان کی عزّت کرتے ہیں تو تہہ دل سے کرتے ہیں، ان کا احترام کرتے ہیں تو خلوص کے ساتھ کرتے ہیں، تھانیدار کا یا کسی افسر کا اگر احترام کرتے ہیں تو وہ احترام ان کے اس ڈنڈے کے خوف سے ہے یا اس قانون اور ان اختیارات کی وجہ سے ہے جو ان کو حاصل ہیں، کل کو یہ معزول ہو جائیں یا جس وقت یہ ریٹائرڈ ہو جاتے ہیں تو پھر دیکھو! ان کا وہ احترام باقی رہتا ہے؟ وزراء آتے ہیں تو لوگ کس طرح سے ان کے آگے پیچھے دُمیں ہلاتے پھرتے ہیں، لیکن اگلے دن اگر وزارت سے معزول ہو جاتے ہیں تو دُکانوں پر گاجریں مولیاں خریدتے پھرتے ہیں، کوئی ان کو سلام کرنے والا نہیں ہوتا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عزّت واحترام ان کا نہیں، ان کو جو عارضی طور پر اختیار حاصل ہوا اس کا ہے...... اور اس کی بجائے اہل اللہ کو جو اللہ تعالیٰ عزّت واحترام دیتے ہیں وہ بغیر کسی ظاہری خوف اور خطرے کے دیتے ہیں، اس لئے لوگ ان کی عزّت کرتے ہیں، ان کا احترام کرتے ہیں تو خلوص سے کرتے ہیں۔ تو صحیح معنی میں عزّت وہی ہے جو اللہ والوں کو اور اللہ کا نام لینے والوں کو اور اللہ کے دِین کا کام کرنے والوں کو نصیب ہوتی ہے، چاہے ان کی عزّت اور احترام کرنے والے گنتی کے لوگ ہوں، اور تھوڑے لوگ ہوں لیکن ہوں گے خلوص سے...... اور اِن کا احترام اس طرح سے ہے جس طرح سے بھری مجلس کے اندر یہیں کوئی سانپ نکل آئے تو آپ سب اُٹھ کے کھڑے ہو جائیں گے، اور سانپ یہ سمجھے کہ شاید یہ سارے کے سارے میرے احترام کی وجہ سے کھڑے ہو گئے ہیں، لیکن آپ جانتے ہیں کہ احترام کی وجہ سے نہیں، یہ خوف اور خطرے کی وجہ سے ہے، یہی وجہ ہے کہ ساتھ ساتھ جوتے کی تلاش بھی ہوتی ہے کہ کوئی موقع ملے تو اس کا سر کوٹیں۔ تو حکامِ وقت کے ساتھ انسان کے جذبات ایسے ہی ہوتے ہیں کہ ڈرتا ہوا ان کا احترام بھی کرتا ہے، لیکن ٹانگ کھینچنے کے لئے بھی تیار بیٹھا ہوتا ہے...... اور اس کی بجائے اللہ والوں کو جو عزّت ملتی ہے، وہ بالکل خلوص کے ساتھ لوگ ان کی عزّت کرتے ہیں اور ان کا احترام کرتے ہیں، تو صحیح معنی میں عزّت ہے دُنیا اور آخرت کی اگر ہے تو اللہ تعالیٰ کی طاعت اور عبادت میں ہے...... یہ مشرکانہ اور جاہلانہ ذہن ہے کہ انسان یہ سمجھے کہ ہمیں دُنیا کے اندر برتری، دُنیا کے اندر عزّت، دُنیا کے اندر وسعت، ہمیں اپنے غلط طریقے کی بنا پر حاصل ہے، اگر ہم صحیح طریقہ اختیار کریں گے تو ہماری یہ خوش حالی ختم ہو جائے گی، یہ مشرکانہ اور جاہلانہ ذہن ہے۔

تو اللہ تعالیٰ یہاں یہی کہتے ہیں کہ کیا ہم نے ان کو ٹھکانا نہیں دیا امن والے حرم میں؟ کھینچ کے لائے جاتے ہیں اس حرم

کی طرف ہر چیز کے ثمرات۔ اس کی تفصیل میں نے کل ترجمے کے ضمن میں کر دی تھی کہ ثمرات صرف درختوں کے پھلوں کو نہیں کہتے بلکہ ہر چیز کی آمدنی جو اس کے اوپر مرتب ہوتی ہے اس کو ثمرہ کہہ دیا جاتا ہے، اس لیے فیکٹریوں سے جو مصنوعات تیار ہو کے نکلتی ہیں وہ ان کے ثمرات ہیں، زمین سے جو غلہ جات اور سبزیاں پیدا ہوتی ہیں وہ اس کے ثمرات ہیں، اور ہر چیز اس حرم کی طرف کھینچ کھینچ کے لائی جارہی ہے، اس زمانے کے مطابق بھی یہی حال تھا اور آج بھی جا کے دیکھ لو یہی حال ہے کہ دُنیا کے ہر کونے سے ہر چیز وہاں پہنچتی ہے اور اللہ تعالیٰ وہاں کے رہنے والوں کو ہر طرح سے فراخی سے رزق دیتے ہیں...... کھینچ کے لائے جاتے ہیں اس کی طرف ہر چیز کے ثمرات ہماری طرف سے رزق کے طور پر، لیکن ان میں سے اکثر جانتے نہیں، یہ بے علمی کے طور پر سمجھتے ہیں کہ یہ خوش حالی ہمارے مشرکانہ طریقے کا نتیجہ ہے، حالانکہ علمی بات کون سی ہے، صحیح بات کون سی ہے جو علمی دلیل کے ساتھ ثابت ہے، وہ یہ ہے کہ یہ سب اللہ تبارک وتعالیٰ کا عطیہ ہے، ان کے مشرکانہ رویے یا ان کی تدبیروں کا یہ اثر نہیں ہے، وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ کا یہ مفہوم ہے، یعنی یہ بے علم ہیں، اس بات کو سمجھتے نہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ ہمارے طرزِ زندگی کا نتیجہ ہے کہ یہ سب کچھ ہو رہا ہے، اور ہمارے انہی عقائد کا اثر ہے، مشرکانہ زندگی کا نتیجہ ہے، یہ بات نہیں، یہ بے علمی والی بات ہے، علم والی بات یہی ہے کہ سب کچھ اللہ کا عطیہ ہے، تو اگر اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے یہ چیز مہیا کی ہے، امن والا حرم مہیا کیا ہے، ہر چیز کے ثمرات تمہیں پہنچائے جارہے ہیں رزق کے طور پر، تو توحید اختیار کرنے سے یہ نعمت چھن نہیں جائے گی۔

مشرکین کا دِماغ سیدھا کرنے کے لئے گزشتہ قوموں کی تباہی کا ذِکر

اگلی بات! (وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ الخ) کہ اگر اپنی اس خوش حالی پر تم نازاں ہو جو اس وقت خوش حالی تمہیں حاصل ہے، تو تم تاریخ سے آنکھیں بند نہ کرو، اور اس خطرے کو مول نہ لو۔ تم یہ سمجھتے ہو کہ جو کچھ ہمیں حاصل ہے یہ کسی طرح سے زائل ہونے والا نہیں۔ ذرا پیچھے مڑ کر دوسری قوموں کا حال دیکھ لو، وہ بھی اپنے اپنے وقت میں اسی طرح سے خوش حال تھیں، انہوں نے بھی اپنے اپنے وقت میں تجارت کے جال پھیلا رکھے تھے، لیکن جب اللہ کی آئی ہوئی بات انہوں نے قبول نہ کی تو ان کی یہ خوش حالی ان کے کسی کام نہ آئی، اللہ تعالیٰ نے انہیں برباد اور تباہ کر دیا...... باقی تمہیں یہ جو ڈھیل دی جارہی ہے یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک رحمت ہے، کہ اللہ کی عادت ہے کہ جب تک پوری طرح سے اِتمامِ حُجت نہ کرلیں، سمجھانے کے لئے رسول نہ بھیج دیں، اس وقت تک کسی قوم اور کسی بستی کو ہلاک نہیں کرتے، اور اب تم پہ اتمام حجت ہو گیا ہے، اب تاخیر کی گنجائش نہیں ہے، اگر نہیں سمجھو گے تو دوسری قوموں کی طرح تم بھی برباد کر دیے جاؤ گے...... تمہاری طرح اکڑنے والے اترانے والے بہت گزرے ہیں، اور ان کو بڑی خوش حالی حاصل تھی، لیکن جب انہوں نے باغیانہ زندگی نہیں چھوڑی، اور اللہ کے رسول کی بات پر کان نہیں دھرا تو وہ تباہ ہو گئے، گویا کہ یہ بھی ان کی تفہیم کی جارہی ہے تاریخی واقعات کی طرف متوجہ کر کے، جن کو وہ کسی درجے میں سنے بیٹھے تھے، اور اپنے تجارت کے سفروں میں ان بستیوں پر سے گزرتے تھے، ادھر متوجہ کیا ہے کہ اپنے وقت میں یہ لوگ بھی خوش حال تھے، اسی طرح سے انہوں نے بھی اپنے رزق کی فراوانی کے اسباب پیدا کئے ہوئے تھے، لیکن جب اللہ کی گرفت میں آئے تو یہ چیزیں ان کے کام نہ آئیں۔ وَكَمْ

اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۢ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا: کتنی ہی بستیاں ہم نے ہلاک کردیں جو اپنی معیشت پر اترا رہی تھیں۔ بطرت جو اکڑے اور اترائے اپنی معیشت پر، اپنی معیشت کے سبب سے، یا مطلب یہ ہے کہ اکڑے اور اترائے اور انہوں نے اپنی معیشت کی ناشکری کی، اللہ تعالیٰ نے جو معیشت ان کو دے رکھی تھی، کل عرض کیا تھا کہ بطرت کے اندر کفرت والا معنی اگر مضمن مان لیا جائے تو بھی مفہوم صحیح ہے، اور اگر معیشت کے اُوپر حرف جار مان لیا جائے ای بطرت فی معیشتها (نسفی) یا بمعیشتها کہ جو اپنی معیشت کے سبب سے اکڑنے اور اترانے لگ گئے تھے، تو بھی مفہوم صحیح ہے۔

فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ: تلك کے ساتھ اشارہ کیا جارہا ہے، یوں سمجھو کہ ان کے مساکن آنکھوں کے سامنے ہیں۔ یہی ہیں ان کے ٹھکانے جو ان کے بعد آباد نہیں ہوئے مگر تھوڑے سے۔ ''تھوڑے سے'' کا مطلب دو طرح سے آپ کی خدمت میں عرض کردیا تھا، کہ اکثر بستیاں تو ویران ہوگئیں وہاں کوئی آبادی نہ ہوئی، کوئی کوئی بستی آباد بھی ہے تھوڑی سی جیسے مِنْهَا قَآىِٕمٌ وَّ حَصِيْدٌ (سورۂ ہود: ۱۰۰) میں دو قسمیں ذکر کردی گئی تھیں کہ یہ بستیاں جو ہم نے برباد کی ہیں تو ان میں سے بعض تو بالکل ہی برباد ہوگئیں، اور بعض ان میں سے قائم بھی ہیں۔ یا قَلِيْلًا کا معنی یہ ہے کہ ان میں آبادی نہیں ہوئی مگر تھوڑے سے وقت کے لئے، اور یہ تھوڑا سا وقت ایسے ہی ہے جیسے کوئی قافلہ جارہا ہو تو وہاں اپنا پڑاؤ کرلے، یا کوئی سیاح قسم کے لوگ دیکھنے کے لئے جائیں، یا چرواہے اور گڈریے اپنے جانوروں کو چراتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے وہاں ٹھہر جائیں، بس اتنی سی وہاں آبادی ہوئی ہے، ورنہ سب گرد اُڑ رہی ہے، ان کا کروفر جتنا تھا سب ختم ہوگیا۔ یہ تاریخی واقعات کی طرف ان کو متوجہ کرکے ان کا دماغ سیدھا کیا جارہا ہے۔ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ: ہم ہی وارث ہیں یعنی وہ سارے برباد ہوگئے، پیچھے ہم ہی رہ گئے۔

مشرکین کو ڈھیل دینے کا مقصد اِتمامِ حجّت ہے

اور تمہیں برباد کیوں نہیں کیا جارہا؟ ڈھیل کیوں دی جارہی ہے؟ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمہارا طریقہ پسند ہے، بلکہ اللہ کی رحمت کی بنا پر تمہیں ڈھیل دی جارہی ہے، کہ ہماری عادت یہی ہے کہ جب تک ہم بستیوں کے مرکز میں رسول نہ بھیج دیں اور پوری طرح سے اِتمامِ حجت نہ کردیں اس وقت تک ہم کسی بستی پہ عذاب نہیں بھیجا کرتے، اسی عادت کے مطابق اب تمہارے پاس رسول آگیا، حق واضح کردیا گیا ہے، اب اگر نہیں مانو گے تو پھر تمہارا نمبر بھی لگا ہی لگا۔ وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى: اور نہیں ہے تیرا ربّ ہلاک کرنے والا بستیوں کو جب تک کہ نہ بھیج دے ان کے مرکز میں (امها کی ''ھا'' ضمیر قُریٰ کی طرف لوٹ گئی، اُمّ مرکز کو کہتے ہیں) جب تک نہ بھیج دے ان کے مرکز میں رسول جو تلاوت کرے ان پر ہماری آیتیں، اور نہیں ہیں ہم ہلاک کرنے والے بستیوں کو مگر اسی حال میں کہ وہ لوگ ظالم ہوں، جب وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کو تلف کرتے ہیں تو تبھی ان کے اوپر عذاب آیا کرتا ہے۔

دُنیا کی خاطر آخرت برباد نہ کرو

اگلی بات! (وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ الخ) وہ بھی اسی تفہیم کے انداز کی ہے اور ان کو یہ کہا جارہا ہے کہ دُنیوی ساز و سامان میں

مگن ہو کر آخرت سے غفلت نہ برتو، ہم تمہیں تمہارے نفع کی بات کہہ رہے ہیں، یہ تو آنکھوں کے سامنے ہے کہ دنیا کی زندگی چند روزہ ہے، اس میں تو ہمیشہ رہنے کے کوئی خواب ہی نہیں دیکھ سکتا کہ میں نے ہمیشہ رہنا ہے، اور اگر کوئی کہتا ہے کہ میں نے ہمیشہ رہنا ہے تو یہ اس کے دماغ کی خرابی ہے، جس کو کوئی دوسرا شخص تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ چندروزہ زندگی ہے، چندروزہ نفع ہے، اور اس کے مقابلے میں جو آخرت آنے والی ہے وہ بہت دراز زندگی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگی، کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے دنیا کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ توتم نادان نہ بنو، اس چندروزہ زندگی کے عیش وعشرت میں پڑ کے آخرت کو برباد نہ کرو، آخرت کی فکر کرو۔ اگلی زندگی اگر اچھی ہوگئی تو ٹھیک ہے...... ورنہ پھر وہی بات ہے کہ جس طرح سے ایک آدمی خواب میں دیکھتا ہے کہ وہ تختِ شاہی کے اُوپر پڑا ہوا ہے، ہر طرح سے اس کو عزت راحت اور آرام حاصل ہے، اور جس وقت آنکھ کھلتی ہے تو آنکھ کھلنے کے بعد دیکھتا ہے کہ جیل میں پڑا ہوا ہے، لوگ ڈنڈے لے کر اس کے سر پہ کھڑے ہوئے ہیں، ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف اس کو ہے۔ تو وہ خواب دیکھ کے کیا خوش ہوگا...... تو دنیاوی زندگی تو بالکل ایک خواب کی طرح ہے، آخرت کی زندگی کے مقابلے میں اتنی ہے جتنا کہ آپ اپنی زندگی میں ایک رات چند لمحے کوئی خواب دیکھ لیں۔ پھر خواب میں جو چند لمحے آپ کے گزرے ہیں اس کو تو پھر بھی آپ کی زندگی سے کوئی نہ کوئی نسبت ہے، کیونکہ وہ بھی محدود یہ بھی محدود، اگر ایک گھنٹہ بھی آپ نے خواب کی لذت لی ہے، تو آپ کی زندگی کا چلو سوواں حصہ نہیں تو ہزارواں حصہ ہوگا، ہزارواں نہیں تو لاکھواں حصہ ہوگا، اس سے زیادہ تو نہیں ہے، اگر آپ کی زندگی چند ہزار گھنٹے ہے، تو وہ جو ایک گھنٹہ آپ نے خواب میں لذت لی تھی، وہ ہزارواں حصہ ہوگیا، اور اگر آپ کی زندگی چند لاکھ گھنٹوں پر مشتمل ہے، تو ایک گھنٹہ جو آپ نے خواب میں لذت حاصل کی ہے، تو وہ لاکھواں حصہ ہوگیا، اس سے آگے تو آپ نہیں بڑھ سکتے۔ تو جس طرح سے خواب کی لذت اس زندگی کے مقابلے میں کوئی چیز نہیں، اسی طرح سے دنیاوی زندگی میں جو راحت و آرام آپ سمجھ رہے ہیں یہ بھی ایک قسم کا خواب ہے، مرو گے تو آنکھیں کھلیں گی، جس طرح سے حدیث شریف میں آتا ہے: ''اَلنَّاسُ نِیَامٌ فَاِذَا مَاتُوْا انْتَبَهُوْا''(۱) لوگ سوئے ہوئے ہیں، ان کی آنکھیں اس وقت کھلیں گی جس وقت یہ مرجائیں گے۔ موت کے ساتھ آنکھ کھلے گی پھر تمہیں پتا چلے گا کہ یہ دُنیوی زندگی تو ایک خواب تھا جو ہم نے دیکھا۔ تو اس لذت کے پیچھے پڑ کے، اس راحت کے پیچھے پڑ کے، تم اپنی آخرت خود کیوں برباد کرتے ہو؟ یہ بھی ایک تفہیم ہے۔ وَمَاۤ اُوْتِیْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَمَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَزِیْنَتُهَا جو کچھ بھی تم دیے گئے ہو (مِّنْ شَیْءٍ یہ مَاۤ کا بیان ہے) دُنیوی زندگی کا سامان ہے، اور اس کی زینت اور رونق ہے۔ اور جو اللہ کے پاس ہے وہ بہتر ہے اور زیادہ باقی رہنے والا ہے۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ کیا تم سوچتے نہیں؟

---

(۱) یہ قول حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے، دیکھیں: رُوح المعانی، سورۂ واقعہ کا آخر۔ نیز: المقاصد الحسنة للسخاوی، رقم: ۱۲۴۰۔ شرح الصدور للسیوطی، ص ۲۳ وغیرہ۔

اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

کیا پھر وہ شخص جس سے ہم اچھا وعدہ کرلیں پھر وہ اس وعدے کو ملنے والا ہو، کیا وہ اس کی طرح ہوسکتا ہے؟ جس کو ہم دُنیوی زندگی میں تھوڑا سا فائدہ پہنچائیں

ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ﴿۶۱﴾ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ

پھر وہ قیامت کے دِن گرفتار کیے ہوؤں میں سے ہو ﴿۶۱﴾ جس دِن اللہ انہیں آواز دے گا، پھر کہے گا: کہاں ہیں میرے وہ شرکاء

الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۶۲﴾ قَالَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ

جن کو تم میرے شرکاء سمجھا کرتے تھے ﴿۶۲﴾ کہیں گے وہ لوگ جن کے اُوپر بات ثابت ہوگئی کہ اے ہمارے رَبّ! یہی لوگ ہیں

الَّذِيْنَ اَغْوَيْنَا ۚ اَغْوَيْنٰهُمْ كَمَا غَوَيْنَا ۚ تَبَرَّاْنَآ اِلَيْكَ ۫ مَا كَانُوْٓا اِيَّانَا

جن کو ہم نے بہکایا، ہم نے ان کو بہکایا جیسا کہ ہم خود بہک گئے تھے، ہم تیری طرف بیزاری کا اظہار کرتے ہیں، یہ لوگ ہماری

يَعْبُدُوْنَ ﴿۶۳﴾ وَقِيْلَ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَ

عبادت نہیں کرتے تھے ﴿۶۳﴾ کہا جائے گا کہ بُلاؤ اپنے شرکاء کو، پس مشرکین ان کو پُکاریں گے، وہ شرکاء ان کو جواب نہیں دیں گے، اور

رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ ﴿۶۴﴾ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ مَاذَآ

یہ سب لوگ عذاب کو دیکھیں گے، کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ لوگ صحیح راستہ پالیتے ﴿۶۴﴾ جس دِن اللہ انہیں آواز دے گا پس کہے گا: تم نے

اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۶۵﴾ فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْۢبَآءُ يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۶۶﴾

رسولوں کو کیا جواب دیا؟ ﴿۶۵﴾ پس چھپ جائیں گی ان کے اُوپر خبریں اس دِن، پھر یہ آپس میں پوچھ گوچھ بھی نہیں کرسکیں گے ﴿۶۶﴾

فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ ﴿۶۷﴾ وَرَبُّكَ

لیکن جو شخص توبہ کرلے اور ایمان لے آئے اور نیک عمل کرے، تو توقع ہے کہ یہ فلاح پانے والے ہوں گے ﴿۶۷﴾ اور تیرا رَبّ

يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ ۗ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۗ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۸﴾

پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے اور پسند کرتا ہے، ان لوگوں کو اختیار نہیں، اللہ پاک ہے اور بلند ہے ان کے شریک ٹھہرانے سے ﴿۶۸﴾

وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۶۹﴾ وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۗ لَهُ

اور تیرا رَبّ جانتا ہے ان باتوں کو جن کو ان کے سینے چھپاتے ہیں اور جس کو یہ ظاہر کرتے ہیں ﴿۶۹﴾ وہی اللہ ہے، اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، اسی کے لئے

الْحَمْدُ فِي الْأُولَىٰ وَالْآخِرَةِ ۖ وَلَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٧٠﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ

حمد ہے دُنیا میں اور آخرت میں، اسی کے لئے حکم ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ﴿۷۰﴾ آپ کہہ دیجئے کہ بتلاؤ تم اگر

جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ اللَّيْلَ سَرْمَدًا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُمْ بِضِيَاءٍ ۖ

اللہ تم پر رات دائمی بنادے قیامت کے دن تک، تو کون ہے معبود اللہ کے علاوہ جو لے آئے گا تمہارے پاس روشنی؟

أَفَلَا تَسْمَعُونَ ﴿٧١﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا إِلَىٰ يَوْمِ

کیا تم سنتے نہیں ہو ﴿۷۱﴾ آپ کہہ دیجئے کہ بتلاؤ تم اگر اللہ تعالیٰ تم پر دِن کو دائمی بنادے قیامت کے

الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُونَ فِيهِ ۖ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ﴿٧٢﴾ وَمِنْ

دِن تک، تو کون معبود ہے اللہ کے علاوہ جو تمہارے پاس رات لے آئے گا، جس میں تم آرام کرو، کیا تم دیکھتے نہیں ﴿۷۲﴾ اور اپنی

رَحْمَتِهِ جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٧٣﴾

رحمت سے بنادیا اس نے تمہارے لئے دِن اور رات کو تا کہ تم اس میں آرام کرو اور تا کہ تم اس کا فضل تلاش کرو اور تا کہ تم شکرادا کرو ﴿۷۳﴾

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٧٤﴾ وَنَزَعْنَا مِنْ كُلِّ

اور جس دِن اللہ انہیں آواز دے گا، کہے گا: کہاں ہیں میرے وہ شرکاء جن کو تم شرکاء سمجھا کرتے تھے ﴿۷۴﴾ اور ہم ہر جماعت سے ایک

أُمَّةٍ شَهِيدًا فَقُلْنَا هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوا أَنَّ الْحَقَّ لِلَّهِ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٧٥﴾

گواہ نکال کھڑا کریں گے، پھر ہم کہیں گے: لے آؤ تم اپنی واضح دلیل، پس یہ سب لوگ جان لیں گے کہ حق سارے کا سارا اللہ ہی کے لئے ہے، اور گم ہو جائیں گی ان سے وہ سب باتیں جو یہ گھڑا کرتے تھے ﴿۷۵﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا: کیا پھر وہ شخص جس سے ہم اچھا وعدہ کرلیں۔ فَهُوَ لَاقِيْهِ: پھر وہ اس وعدے کو ملنے والا ہو۔ اس سے آخرت کی نجات آخرت کی کامیابی مراد ہے۔ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا: کیا اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جس کو ہم دُنیوی زندگی میں کچھ تھوڑا سا فائدہ پہنچائیں؟ ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ: پھر وہ قیامت کے دن محضرین میں سے ہو۔ محضر: حاضر کیا ہوا۔ یہاں سے گرفتار کر کے ذِلّت کے ساتھ حاضر کیے ہوئے لوگ مراد ہیں، جو گرفتار کر کے لائے ہوئے ہوتے ہیں، وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ: ینادی کی ضمیر اللہ کی طرف لوٹ رہی ہے، جس دِن اللہ تعالیٰ انہیں آواز دے

گا، فیقول: پھر کہے گا، اَیْنَ شُرَكَآءِیَ الَّذِیْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ: کہاں ہیں میرے وہ شرکاء جن کو تم میرے شرکاء سمجھا کرتے تھے۔ تَزْعُمُوْنَ کے دونوں مفعول محذوف ہیں اَیْ تَزْعُمُوْنَهُمْ شُرَكَآئِیْ جن کو تم گمان کیا کرتے تھے کہ وہ میرے شرکاء ہیں (مظہری)۔ قَالَ الَّذِیْنَ حَقَّ عَلَیْهِمُ الْقَوْلُ: کہیں گے وہ لوگ جن کے اوپر بات ثابت ہوگئی۔ بات سے مراد عذاب کی بات ہے، جن کے بارے میں عذاب طے شدہ ہے، اور ان کو بھی پتا چل گیا کہ ہمارے اوپر بات صادق آ گئی، ہم نے جہنم میں جانا ہے۔ کہیں گے وہ لوگ جن کے اُوپر بات ثابت ہوگئی، رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ الَّذِیْنَ اَغْوَیْنَا: غَوِیَ: گمراہ ہونا، اور اَغْوٰی گمراہ کرنا۔ اور اَغْوَیْنَا کا معنی ہے ہم نے گمراہ کیا۔ تو رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ الَّذِیْنَ اَغْوَیْنَا یہ شرکاء کا قول ہوگا، یعنی وہ شرکاء بول پڑیں گے۔ تو الَّذِیْنَ حَقَّ عَلَیْهِمُ الْقَوْلُ کا مصداق وہ شرکاء ہوجائیں گے، یعنی جس وقت اللہ تعالیٰ یہ سوال کرے گا کہ میرے شرکاء کہاں ہیں، جن کو تم میرے شرکاء سمجھا کرتے تھے۔ تو یہ سوال اگرچہ مشرکین سے ہے، لیکن وہ شرکاء شیاطین بھی چونکہ وہیں موجود ہوں گے، وہ سمجھیں گے کہ اب ہماری کمبختی بھی آئی، اس لئے فوراً بول پڑیں گے۔ کہیں گے کہ اے ہمارے رَبّ! یہی لوگ ہیں جن کو ہم نے بہکایا، یہ بات صحیح ہے، ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہم نے بہکایا۔ لیکن اَغْوَیْنٰهُمْ: ہم نے انہیں بہکایا، كَمَا غَوَیْنَا: اَیْ فَغَوَوْا كَمَا غَوَیْنَا۔ تو فَغَوَوْا یہ فعل درمیان میں نکالنا پڑے گا، تب جا کے اس آیت کا مضمون ٹھیک بنتا ہے (مظہری)۔ یہی لوگ ہیں جن کو ہم نے بہکایا، پھر یہ اپنے اختیار کے ساتھ بہک گئے، جس طرح سے ہم بھی اپنے اختیار سے بہکے تھے۔ اَغْوَیْنٰهُمْ كَمَا غَوَیْنَا: جس طرح سے ہم گمراہ ہوئے تھے، ہم نے ان کو بہکایا، اپنے اختیار کے ساتھ یہ بھی گمراہ ہوگئے۔ جیسے ہم پر کسی نے جبر نہیں کیا، ہم نے ان پر جبر نہیں کیا، اس لیے ان کی گمراہی کی ذمہ داری انہی پر ہی ہے، ہم پر نہیں، کیونکہ ہم نے تو صرف وسوسہ ڈالا تھا، ہم نے تو صرف کہا تھا، جس طرح اپنے اختیار کے ساتھ ہم غلط راستہ اختیار کئے بیٹھے تھے، انہوں نے بھی اپنے اختیار کے ساتھ ہی غلط راستہ اختیار کیا...... یہ بات ویسی ہے جس طرح سے سورۂ ابراہیم میں شیطان کا وعظ آپ کے سامنے آیا تھا، جب جہنمی اکٹھے ہو کے جائیں گے اس خطیبِ اعظم کے پاس جہنم میں، جا کر کہیں گے کہ تُو ہی ہوتا تھا سب سے زیادہ آگے بہکانے والا، آج تُو ہمارے کچھ کام آ سکتا ہے؟ وَقَالَ الشَّیْطٰنُ لَمَّا قُضِیَ الْاَمْرُ (آیت: ۲۲) جس وقت بات طے ہوجائے گی، تو شیطان کہے گا۔ شیطان کا خطبہ جو اس نے جہنم میں اپنے ماننے والوں کو دینا ہے، سورۂ ابراہیم میں گزرا ہے، وہاں اس نے یہی کہا ہے کہ میں نے تو تمہیں صرف ایک مشورہ دیا تھا، میں نے تمہارے ساتھ کچھ وعدے کیے تھے، کچھ اللہ نے بھی وعدے کئے تھے، یہ تمہاری بےوقوفی ہے کہ تم نے میرے وعدوں پہ اعتبار کرلیا جو کہ خلافِ واقع تھے، اور اللہ کے وعدوں کو چھوڑ دیا۔ وَمَا كَانَ لِیَ عَلَیْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِیْ: مجھے تمہارے اوپر کوئی زور تو حاصل نہیں تھا کہ زبردستی تمہیں آگے چلا لیا ہو، میں نے تو صرف ایک اشارہ کیا تھا، باقی اپنے اختیار کے ساتھ تم چلے ہو، آج نہ تم میرے کچھ کام آ سکتے ہو اور نہ میں تمہارے کچھ کام آ سکتا ہوں...... تو یہ بات ویسی ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے فوراً ہی کہہ دیں گے کہ یا اللہ! ہم نے ان کو بہکایا تو ہے، جس طرح سے ہم اپنے اختیار سے خود بہکے تھے، ہمارے اغوا کرنے کے بعد ہمارے بہکانے کے ساتھ اپنے اختیار سے یہ بہکے ہیں، اس لئے تَبَرَّاْنَاۤ اِلَیْكَ ہم تیری طرف بیزاری کا اظہار کرتے ہیں ان سے، ہم کہتے ہیں کہ ان کے گمراہ ہونے کی ذمہ داری ہم پہ نہیں ہے، ہم بیزار ہوتے ہیں آپ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے۔ مَا كَانُوْۤا اِیَّانَا یَعْبُدُوْنَ: یہ لوگ ہماری عبادت نہیں کرتے تھے، بلکہ یہ اپنے خیالات

کو اپنی شہوات کو پوجتے تھے، ہماری عبادت کرنے والے نہیں تھے۔ تو یہ ان شرکاء کا قول ہوگا جو کہ شیاطین کے درجے کے ہیں، خود
گمراہ ہیں، چونکہ وہ کہہ رہے ہیں کَمَا غَوَيْنَا اس لیے یہاں جن شرکاء کا تذکرہ آ رہا ہے یہ شرکاء اہلِ مکہ کے ہیں تو اہلِ مکہ کے شرکاء
جنات تھے، شیاطین تھے، باقی یہاں انبیاء ﷺ یا اولیائے کرام مذکور نہیں ہوسکتے، کیونکہ وہ اولیاء، انبیاء خود اپنے آپ کو کیسے کہیں
گے؟ کَمَا غَوَيْنَا۔ تو یہاں سے شیاطین مراد ہیں۔ ان کے شرکاء اگر انبیاء ملائکہ اولیاء وغیرہ تھے تو ان کا ذکر یہاں نہیں ہے۔ یہاں ان
کا ذکر ہے جو خود گمراہ ہیں اور دوسروں کو گمراہی میں ڈالنے والے ہیں، جیسے اللہ کے دربار میں وہ اقرار کر رہے ہیں، کہ ہم نے گمراہ کیا،
لیکن ہمارے گمراہ کرنے کے بعد گمراہ یہ خود اپنے اختیار سے ہوئے۔ جس طرح سے ہماری گمراہی کی ذمہ داری کسی دوسرے پہ نہیں
ہے، ہم پہ ہی ہے، ہم بھی اپنے اختیار کے ساتھ گمراہ ہوئے تھے، اسی طرح سے ہمارے اشارہ کرنے کے ساتھ، ہمارے بہکانے
کے ساتھ یہ بھی بہک گئے، بہکانا تو ہمارا کام ہے لیکن بہکنے کی ذمہ داری ہم پہ نہیں، بلکہ اپنے اختیار کے ساتھ انہوں نے راستہ اختیار
کیا ہے۔ تَبَرَّأْنَآ اِلَيْكَ: ہم تیری طرف تبری کرتے ہیں ان سے، ہم ان سے لاتعلقی کا اعلان کرتے ہیں آپ کی طرف، یہ ہماری پوجا
نہیں کرتے تھے، بلکہ یہ اپنے خیالات کو اپنی شہوات کو ہی پوجتے تھے۔ وَقِيْلَ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ: کہا جائے گا کہ بلاؤ اب اپنے شرکاء کو
جن کو تم سمجھتے تھے کہ ہمارے شفیع ہیں، ہمارے کارساز ہیں، ہمارے وقت پہ کام آنے والے ہیں۔ فَدَعَوْهُمْ مشرکین بدحواسی میں
انہیں پکاریں گے فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وہ شرکاء جواب نہیں دیں گے مشرکین کو وَرَاَوُا الْعَذَابَ اور یہ سب لوگ آنکھوں کے سامنے
عذاب کو دیکھیں گے۔ اس وقت یہ تمنا کریں گے لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ لوگ (یعنی ہم) صحیح راستہ پانے والوں
میں سے ہوتے، ہدایت یافتہ ہوتے۔ یہ ''لَوْ'' تمنائیہ ہے (مظہری) کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ لوگ راہ پانے والے ہوتے۔ وَيَوْمَ
يُنَادِيْهِمْ جس دن اللہ انہیں آواز دے گا فَيَقُوْلُ پس کہے گا۔ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ تم نے رسولوں کو کیا جواب دیا؟ میرے رسول
جو آئے تھے، انہوں نے آکے تمہیں راہِ حق کی طرف بلایا تھا، تو تم نے کیا جواب دیا؟ فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْۢبَآءُ گم ہو جائیں گی ان
کے اُوپر خبریں، یعنی کچھ نہیں بول سکیں گے، حواس باختہ ہو جائیں گے، ان کو کوئی جواب نہیں آئے گا، دُنیا میں رسولوں کے مقابلے
میں بہت حجت بازی کرتے تھے، لیکن وہاں بالکل سب خبریں پوشیدہ ہو جائیں گی۔ عَمِيَتْ چھپ جائیں گی ان کے اوپر خبریں
يَوْمَئِذٍ اس دن فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُوْنَ پھر یہ آپس میں پوچھ گوچھ بھی نہیں کرسکیں گے۔ فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا لیکن جو شخص توبہ
کرلے اور ایمان لے آئے، اور نیک عمل کرے۔ ان کی تو بدحالی آپ نے دیکھ لی جو شرک کا ارتکاب کرنے والے تھے، کہ کس
طرح سے ان کی آپس میں گڑبڑ ہوگی۔ اور جو ایمان لانے والے اور نیک عمل کرنے والے ہیں فَعَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ ان کے
متعلق یہ توقع ہے کہ یہ فلاح پانے والے ہوں گے، اور اللہ تعالیٰ کی کلام میں اپنے متعلق جب ''عَسٰی'' آتا ہے تو اس میں ایک
وعدے کا پہلو ہوتا ہے، یعنی ان لوگوں کو اپنے متعلق امیدوار رہنا چاہیے کہ یہ فلاح پانے والے ہیں۔ وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ:
اور تیرا رَبّ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے، اور پسند کرتا ہے جو چاہتا ہے، تو يَخْتَارُ کا تعلق احکام کے ساتھ ہے۔ خلق میں بھی اس کا کوئی
شریک نہیں، اسی طرح سے جو احکام وہ دینا چاہے جس حکم کو وہ پسند کرے وہی پسند کرتا ہے، کسی دوسرے کا کوئی حکم نہیں چلتا (عثمانی)،
جس طرح سے آگے وَلَهُ الْحُكْمُ آئے گا...... یا يَخْتَارُ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے، اور اپنی مخلوق میں سے

جس کو چاہتا ہے پسند کر لیتا ہے، اور اس کو شرف اور فضیلت بخش دیتا ہے (مظہری وغیرہ)، جس طرح سے فرشتوں میں سے فضیلت بخشی جبرائیل ومیکائیل، اسرافیل اور عزرائیل علیہم السلام ان چار فرشتوں کو۔ اور انسانوں میں فضیلت بخشی، مختار بنایا، انبیاء کو، رسولوں کو، اور رسولوں میں سے سب سے زیادہ مختار بنایا حضور ﷺ کو یعنی پسندیدہ بنایا، مختار بمعنی پسندیدہ، اور اسی طرح سے آسمانوں میں آسمان کے مختلف حصوں کو مختلف حصوں پر فضیلت دی، زمین کے مختلف حصوں کو مختلف حصوں پر فضیلت دی، تو یہ سارے کا سارا اللہ کا کام ہے جس چیز کو چاہے پسند کرے۔ یا اَحکام میں سے جس حکم کو چاہے پسند کرے، دونوں مطلب درست ہیں۔ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ جن کو یہ لوگ اختیار دیے بیٹھے ہیں پسند ناپسند کا، کہ جو یہ کہیں وہ ٹھیک ہے، جس کو یہ غلط کہیں وہ غلط ہے، اس قسم کا اختیار اور کسی کو نہیں، اَحکام دینا کسی اور کا کام نہیں ہے، اللہ کے علاوہ اگر کوئی دوسرا کوئی حکم دینا چاہے، کسی حکم کو پسند کرنا چاہے کہ فلاں چیز اچھی ہے، فلاں چیز اچھی نہیں ہے، کسی کو اختیار نہیں ہے۔ ان لوگوں کو اختیار نہیں ہے۔ خیرۃ اختیار کے معنی میں ہے۔ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ اللہ تعالیٰ پاک ہے اور بلند ہے ان کے شریک ٹھہرانے سے۔ وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ اور تیرا رب جانتا ہے ان باتوں کو جن کو ان کے سینے چھپاتے ہیں، وَمَا يُعْلِنُوْنَ اور جس کو یہ ظاہر کرتے ہیں۔ وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وہی اللہ ہے، اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ: اسی کے لئے حمد ہے دُنیا میں اور آخرت میں، تمام صفاتِ کمال اسی کے لیے ثابت ہیں دنیا میں اور آخرت میں۔ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ اسی کے لئے حکم ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا: آپ کہہ دیجئے کہ بتلاؤ تم، اگر اللہ تعالیٰ تم پر رات بنادے دائمی۔ سَرْمَدًا کے معنی دائمًا یعنی ہمیشہ رات ہی رہے اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ۔ اگر اللہ تعالیٰ تم پر رات دائمی بنادے قیامت کے دن تک، یعنی کبھی بھی دن نہ آئے، رات ہی رہے۔ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ: کون ہے معبود اللہ کے علاوہ جو لے آئے گا تمہارے پاس روشنی؟ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ: کیا تم سنتے نہیں ہو؟ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا: آپ کہہ دیجئے کہ بتلاؤ تم، اگر اللہ تعالیٰ تم پر دِن کو دائمی بنادے قیامت کے دن تک مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ: کون معبود ہے اللہ کے علاوہ جو تمہارے پاس رات لے آئے گا، تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ: جس میں تم آرام کرو۔ یہ رات کا فائدہ تو ذکر کر دیا، اور پیچھے دِن کے ذکر میں کوئی فائدہ ذکر نہیں کیا، کیونکہ وہ بات تو واضح ہے کہ دِن کی روشنی میں ہم کام کاج کرتے ہیں، سارے کام دِن کی روشنی میں ہوتے ہیں۔ تو وہاں مفہوم ایسے ہی ہوگا کہ کون ہے جو تمہارے پاس دِن لے آئے جس میں تم اپنے کام کاج کرو، اور دوسری ضروریات پوری کرو۔ تو مقابلۃً دِن کی طرف یہ بات واضح ہو جائے گی، اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ کیا تم دیکھتے نہیں۔ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ: اللہ کی رحمت سے ہے یہ بات کہ بنادیا اس نے تمہارے لئے رات اور دِن کو تاکہ تم اس میں آرام کرو، اور تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو۔ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ کا تعلق لیل کے ساتھ ہے، وَلِتَبْتَغُوْا کا تعلق نہار کے ساتھ ہے۔ اللہ کی رحمت سے ہے کہ اس نے کر دیا تمہارے لیے رات اور دِن کو تاکہ رات میں تم آرام کرو، تاکہ دِن میں تم اللہ کا رزق تلاش کرو۔ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ: تاکہ ان نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کرو۔ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ اور جس دِن اللہ تعالیٰ انہیں آواز دے گا، فَيَقُوْلُ کہے گا اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ: کہاں ہیں میرے وہ شرکاء جو تم سمجھا کرتے تھے، میرے شرکاء کہاں ہیں جن کو تم شرکاء سمجھا کرتے تھے، وَنَزَعْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا: اور ہم ہر جماعت

سے ایک شہید نکالیں گے۔ نَزَعَ: نکالنا۔ ''نکال کھڑا کریں گے'' اس طرح سے ہم اپنی زبان میں اس کو ادا کریں گے۔ ہر اُمت میں سے ایک گواہ نکال کھڑا کریں گے۔ اور اس شہید کا مصداق اس اُمت کا نبی ہے۔ فَقُلْنَا: پھر ہم کہیں گے هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ: لے آؤ تم اپنی واضح دلیل؟ برھان دلیلِ قطعی کو کہتے ہیں فَعَلِمُوْٓا: پس یہ سب لوگ جان لیں گے کہ اَنَّ الْحَقَّ لِلّٰهِ: کہ حق سارے کا سارا اللہ ہی کے لیے ہے وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ: اور گم ہوجائیں گی ان سے وہ سب باتیں جو یہ گھڑا کرتے تھے، جس قسم کی جو حُجت بازیاں کیا کرتے تھے، جو دلائل دیا کرتے تھے، وہ سب ان سے گم ہوجائیں گے۔

تفسیر

نتیجے کے اِعتبار سے اچھا کون؟

اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا: نتیجے کے اعتبار سے وہی لوگ اچھے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق آخرت کی کامیابی حاصل کرلیں، اور جو لوگ دنیا میں تو راحت و آرام میں رہیں پھر اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ گرفتار کیے ہوئے لائے جائیں، ذلت کی زندگی ان کو نصیب ہو تو کیا وہ اچھا آدمی ہے؟ کیا پھر وہ شخص کہ ہم نے وعدہ کیا ہم نے اس سے اچھا وعدہ، پھر وہ اس کو ملنے والا ہے یعنی وعدے سے ملاقات کرنے والا ہے، وعدے کے مطابق اس کو وہ چیز حاصل ہونے والی ہے جو ہم نے اس کے ساتھ اچھا وعدہ کیا۔ وہ اس شخص کی طرح ہے؟ جس کو ہم نے دُنیوی زندگی میں تھوڑا سا نفع پہنچایا پھر وہ قیامت کے دِن گرفتار کیے ہوؤں میں سے ہوگا، پکڑ کے لایا جائے گا جس طرح سے مجرم لایا جاتا ہے۔ تو کیا یہ دونوں برابر ہوسکتے ہیں؟ تو تم بھی اس طرح سے دُنیوی زندگی کے سامان کے اوپر ناز کرکے، فخر کرکے، اپنی آخرت کو برباد نہ کرو، آخرت کی ذلت کا استحضار کرو، اس کو سوچو۔

قیامت کے دِن مشرکین کے معبودانِ باطلہ لاتعلق ہوجائیں گے

اور دوسری بات ان کے ذہن میں یہ بھی آسکتی تھی کہ انہوں نے جو آلہہ بنا رکھے تھے ان کے متعلق وہ سمجھتے تھے کہ یہ ہمارے کارساز ہیں، اوّل تو آخرت ہوگی ہی کوئی نہیں، اور اگر بالفرض آ ہی گئی تو ہمارے یہی بڑے، ہمارے آباؤاجداد میں جو بڑے گزرے ہیں، یا جن کو ہم نے پُوجا ہے، جنّات ہوگئے، دوسرے ہوگئے، یہ اس وقت ہماری سفارش کریں گے، سفارش کرکے ہمیں بچالیں گے۔ اپنے ان نظریات کی بنا پر بھی وہ کچھ جَری تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول نہیں کرتے تھے، یہ سہارے انہوں نے تجویز کررکھے تھے...... تو اگلی آیات کا حاصل رُکوع کے آخر تک، جن کا ترجمہ کل آپ کی خدمت میں عرض کردیا گیا تھا، یہی بتلانا ہے کہ یہ تمہارے مشرکانہ نظریات بالکل باطل ہیں، اور ان کے اندر کوئی اصلیت نہیں، جن کو تم نے اپنے سہارے بنا رکھا ہے، نہ یہ دُنیا میں کام آنے کے ہیں، نہ آخرت میں کام آنے کے ہیں، بلکہ آخرت میں جس وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوؤ گے تو یہی لوگ تمہارے خلاف شہادتیں دیں گے، اور تم سے لاتعلقی کا اعلان کریں گے، اور کسی قسم کے کام نہیں آسکیں گے، اس بات کو بھی تم سوچو یہ سہارے جو تم نے بنالئے ہیں، ان کی پوزیشن ایسے ہی ہے۔ جیسے اگلی سورت سورۂ عنکبوت میں آئے گا، كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ۔

یہ تو ایسے سہارے ہیں جس طرح سے مکڑی کا جالا ہے، اِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ: اور تمام چیزوں سے کمزور مکڑی کا جالا ہوتا ہے، تمہارے سہارے بھی اسی طرح سے ہیں جیسے مکڑی کا جالا۔ اگلی آیات کا حاصل یہی ہے۔ آخرت میں مشرکین کے ساتھ جو کچھ ہونے والا ہے اور شرکاء اور مشرکین کی ذلت جو نمایاں ہونے والی ہے، اگلی آیات میں اس کا ذکر ہے۔ جس دن کہ اللہ تعالیٰ انہیں آواز دے گا پھر کہے گا کہ کہاں ہیں میرے وہ شرکاء جن کو تم شرکاء سمجھا کرتے تھے (تزعمون کا مفعول محذوف ہے) کہیں گے وہ لوگ جن پر بات ثابت ہوگئی، یہاں سے ان کے وہ شرکاء مراد ہیں، یعنی بظاہر اللہ تعالیٰ کی کلام کا رُجحان مشرکین کی طرف ہے لیکن بول پڑیں گے شرکاء، کیونکہ ان کو معلوم ہوگا کہ اب یہ بات ہم پر ہی آنے والی ہے، اور یہ مشرکین بات ہم پر ہی ڈالیں گے، تو وہ پہلے ہی بول پڑیں گے، کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار!، جن پہ بات ثابت ہوگئی یعنی جہنم میں جانے کی، عذاب والی بات جن پہ ثابت ہوگئی، وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب! یہی لوگ ہیں جن کو ہم نے بہکایا، بہکانے کا ہم اقرار کرتے ہیں، اَغْوَيْنٰهُمْ كَمَا غَوَيْنَا: اَیْ فغووا کما غوینا۔ ہم نے ان کو بہکایا پھر یہ بہک گئے جس طرح سے ہم بہکے۔ کیا مطلب؟ کہ جس طرح سے ہم اپنے اختیار کے ساتھ ایک غلط راستے پر چلے تھے، یہ بھی اپنے اختیار کے ساتھ چلے ہیں، ہمارا کام تو صرف ان کو اشارہ کرنا یا وسوسہ ڈالنا تھا، باقی! اس کو قبول کرنا غلطی میں پڑنا، یہ ان کے اپنے اختیار سے ہوا ہے۔ میں نے کل کے سبق میں بھی شیطان کی تقریر کا حوالہ دیا تھا، وہاں یہی تھا کہ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ میں نے تو تمہیں دعوت دی تھی، تم نے میری بات مان لی فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ مجھے کیا ملامت کرتے ہو؟ اپنے آپ پہ ملامت کرو، کہ ایک طرف اللہ کے وعدے تھے جو بالکل سچے تھے، ایک طرف میں تمہیں چکمے دیتا تھا وعدے کرتا تھا جو کہ بالکل جھوٹے تھے۔ تم نے اللہ کے وعدوں پر اعتماد نہیں کیا، میرے وعدوں کے پیچھے لگ گئے، تو لُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اپنے آپ پہ ملامت کرو، مجھے کیا ملامت کرتے ہو، میں نے تو صرف تمہیں بلایا تھا دعوت دی تھی، تم نے میری بات مان لی۔ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ مجھے تم پر کوئی تسلط تو حاصل نہیں تھا کہ زبردستی اس راستے پہ چلا دیا۔ تو وہاں شیطان اپنے ماننے والوں کو یوں آنکھیں دکھائے گا، اور اس طرح سے ان کے سامنے اپنی لاتعلقی کا اعلان کردے گا، ذمہ داری انہی پہ ڈال دے گا۔ تو یہاں بھی اسی طرح سے ذکر کیا گیا ہے، اَغْوَيْنٰهُمْ کا لفظ اس بات پہ دلالت کرتا ہے کہ یہاں شیاطین مراد ہیں، جنہوں نے واقعی انسانوں کو گمراہ کرنے میں حصہ لیا، وہ وہاں اعتراف کریں گے، یہاں اولیاء، انبیاء، فرشتے مراد نہیں ہوسکتے کیونکہ اولیاء، انبیاء، فرشتے کبھی بھی اغوا نہیں کرتے، اور کسی کو گمراہی کی تلقین نہیں کرتے، اس لئے یہاں ان کا یہ اقرار کرنا کہ ہم نے ان کو گمراہ کیا ہے، یہ علامت ہے کہ یہاں اولیاء، انبیاء، فرشتے مُراد نہیں ہیں، چاہے مشرکین کے معبودوں میں وہ بھی ہوں لیکن مشرکین مکہ زیادہ تر بہکے تھے تو شیطانوں کے ہاتھوں بہکے تھے، یہاں اولیاء، انبیاء، فرشتے مُراد نہیں لئے جاسکتے۔ تَبَرَّاْنَآ اِلَيْكَ ہم تیری طرف تبرّی کا اظہار کرتے ہیں ان سے، یعنی ان سے لاتعلقی کا اعلان کرتے ہیں تیری طرف متوجہ ہوتے ہوئے۔ مَا كَانُوْٓا اِيَّانَا يَعْبُدُوْنَ: یہ ہماری پُوجا نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے خیالات اپنے نفس اور اپنی شہوات کے پجاری تھے، اپنی خواہشات کی وجہ سے یہ گمراہ ہوئے۔

پھر ان سے کہا جائے گا کہ بُلاؤ اب ان شرکاء کو، مشرکین بدحواسی میں انہیں پکاریں گے، لیکن شرکاء انہیں کوئی جواب نہیں دیں گے، اور یہ سب مل جل کے عذاب کو دیکھ لیں گے، پھر ان کے دل میں تمنائیں اٹھیں گی کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ ہم دنیا میں سیدھے راستے پہ چلنے والے ہوتے۔ اور جس دن اللہ تعالیٰ انہیں آواز دے گا اور پوچھے گا کہ تم نے رسولوں کو کیا جواب دیا تھا، تو سب خبریں ان کے اوپر چھپ جائیں گی، واقعات ان سے مخفی ہو جائیں گے، کیا مطلب؟ کہ ان کو کچھ یاد نہیں آئے گا، کہ ہم کن کن دلیلوں کی بنا پر انبیاء سے اُلجھا کرتے تھے، اور کیا کیا ہم انبیاء کے جواب میں کہا کرتے تھے۔ اور ایک دوسرے سے سوال بھی نہیں کر سکیں گے، ایسی بدحواسی کا عالم ہوگا۔ ایسے وقت میں جس شخص نے دنیا میں توبہ کی ہوگی، ایمان لایا ہوگا، نیک عمل کئے ہوں گے، یہ لوگ کامیاب ہونے والوں ہیں۔ تو اَفَمَنْ وَّعَدْنٰہُ میں جس طرح سے اللہ نے دو گروہ دکھائے تھے کہ ایک گروہ کے ساتھ اللہ کا وعدہ اچھا ہے اور نتیجتاً وہ اس وعدے پہ پہنچے گا، اور دوسرا شخص دنیا میں عیش و عشرت کر گیا آخرت میں ذلیل ہوگا۔ تو آگے جا کے انہی کی کچھ تفصیل کر دی۔ وعدِ حسن اس کے ساتھ ہے جو دُنیا میں کُفر و شرک سے توبہ کر لے، ایمان لے آئے اور نیک عمل کرے، ان کے لیے یہ وعدہ ہے کہ وہ کامیاب لوگوں میں سے ہوں گے، ان کو اُمیدوار رہنا چاہیے کہ ان کو ہر قسم کی فلاح نصیب ہوگی۔ فلاح کا معنی ہوتا ہے کامیابی، یعنی اپنے مقصد میں کامیاب ہو جانا، آگے ان کو ان کا مقصد مل جائے گا، نجات، راحت، آرام، ہر قسم کی نعمت، یہ ان کا مقصد ہے اور یہ ان کو مل جائے گا۔

رَدِّ شرک اور اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کمال

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ: ان آیات کا تعلق بھی رَدِّ شرک کے ساتھ ہے۔ اللہ ہی خالق ہے جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، اور اللہ ہی پسند کرتا ہے جس کو چاہے جو مرتبہ دے دے یہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ یا مطلب یہ ہے کہ احکام میں سے جس حکم کو اللہ تعالیٰ پسند کرے وہی حکم دیتا ہے، کسی دوسرے کو حق نہیں پہنچتا کہ مخلوق کے لئے کسی طریقے کو پسند کر لے کہ یہ طرزِ زندگی اچھا ہے اور یہ طرزِ زندگی اچھا نہیں ہے، یہ اختیار کرنا اور پسند کرنا یہ بھی اللہ کا کام ہے، اور اپنی مخلوق میں سے کسی کو پسند کر لینا اور اس کو کوئی فضیلت دے دینا یہ بھی اللہ کے اختیار میں ہے۔ ان لوگوں کے لئے کوئی اختیار نہیں کہ خود کسی کو کوئی فضیلت دے دیں یا خود کوئی احکام جاری کر دیں، اللہ کے علاوہ کسی کے لئے کوئی اختیار نہیں، اللہ پاک ہے بلند و برتر ہے ان کے شریک ٹھہرانے سے۔ وَرَبُّكَ يَعْلَمُ: آگے آ گیا کہ علم میں بھی یکتا ہے۔ جس طرح سے خالق ہونے میں یکتا، آمر ہونے میں یکتا، اسی طرح سے علم میں بھی اس کا کوئی مقابل نہیں۔ تیرا رَبّ جانتا ہے اس چیز کو جس کو ان کے دل چھپاتے ہیں اور جس کو یہ لوگ ظاہر کرتے ہیں۔ وہی اللہ ہے، کوئی معبود نہیں اس کے علاوہ، اسی کے لئے حمد ہے دنیا اور آخرت میں، ہر قسم کے کمالات دنیا اور آخرت میں اسی کے لیے ثابت ہیں جس کی بنا پر دنیا اور آخرت میں تعریف کا مستحق وہی ہے، جیسے آخرت میں بھی جنتی جس وقت اپنی جگہ بیٹھیں گے، اللہ تعالیٰ کے احسانات کو یاد کریں گے، تو اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (سورۂ یونس: ۱۰) ان کی اس مجلس میں آخری آخری گفتگو یہی ہوگی کہ سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو رَبّ العالمین ہے۔ اور دنیا میں بھی سمجھ دار لوگ اسی طرح سے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کہتے ہیں، اللہ کا

شکر ادا کرتے ہیں، سب کمالات کی نسبت اسی کی طرف کرتے ہیں۔ وَلَهُ الْحُكْمُ: اسی کے لئے حکم ہے، حکم دینا کسی اور کے اختیار میں نہیں۔ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ: اسی کی طرف ہی تو سب لوٹائے جاؤ گے، اس کی سلطنت اتنی وسیع ہے کہ کوئی مجرم اس کی سلطنت سے نکل کر کسی طرف بھاگ نہیں سکتا، لے دے کے آئے گا اسی کے پاس۔

اللہ کی قدرت اور احسانات کا ذکر

آگے پھر اللہ تعالیٰ کی قدرت اور احسانات کا تذکرہ ہے۔ کہ آپ انہیں کہیے کہ تم بتلاؤ۔ اَرَءَيْتُمْ کیا دیکھا تم نے؟ محاورے کے طور پر یہ لفظ استعمال ہوا کرتا ہے، تو ترجمہ یوں کر دیا جاتا ہے کہ "بتلاؤ تم" اگر اللہ تعالیٰ تم پر رات بنادے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قیامت کے دن تک تو کون الٰہ ہے اللہ کے علاوہ جو تمہارے پاس روشنی لے آئے گا؟ کیا تم سنتے نہیں؟ آپ کہہ دیجئے کہ بتلاؤ تم، اگر اللہ تعالیٰ تم پر دن کو دائماً بنادے قیامت کے دن تک، قیامت کے دن تک دن ہی دن کرے، کون معبود ہے اللہ کے علاوہ جو تمہارے پاس رات کو لے آئے گا جس میں تم سکون اختیار کرلو، کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟ یہ اللہ کی رحمت ہے اس نے اپنی رحمت کی وجہ سے ہی تمہارے لئے رات اور دن بنادیے تاکہ تم رات میں سکون حاصل کرو اور تاکہ تم دن میں اللہ کا فضل تلاش کرو، اور تاکہ تم اللہ کے شکر گزار رہو۔

بروزِ قیامت مشرکین کی ذلت

وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ: اور جس دن اللہ تعالیٰ انہیں آواز دے گا، پھر کہے گا کہ کہاں ہیں میرے وہ شرکاء جن کو تم شرکاء سمجھا کرتے تھے۔ اور اٹھائیں گے ہر جماعت سے ایک گواہ، اس گواہ کا مصداق اس جماعت کا نبی ہے۔ نبی کو لائیں گے، جو اس امت کے خلاف شہادت دے گا، اور یہ کہے گا کہ میں نے تو انہیں سب کچھ پہنچایا لیکن انہوں نے مانا نہیں۔ نَزَعَ: کھینچنا۔ یعنی اس جماعت میں سے ہم ایک شہید نکال کھڑا کریں گے، یہ مفہوم ہوگا اس کا۔ پھر ہم کہیں گے کہ لے آؤ تم اپنی دلیل، یعنی ان مشرکین سے کہا جائے گا کہ تم اپنے طور طریقے کے صحیح ہونے کی کوئی دلیل لے آؤ۔ فَعَلِمُوْٓا: پھر ان کو اچھی طرح سے پتا چل جائے گا کہ حق اللہ ہی کے لئے ہے، اور گم ہو جائیں گی ان سے وہ سب باتیں جو وہ تراشا کرتے تھے، جس قسم کی دلیلیں دیا کرتے تھے، جو نظریات بنایا کرتے تھے وہ سب گم ہو جائیں گے، اور ان کے لئے کوئی کسی قسم کا نظریہ، کوئی طرز کوئی دلیل مفید ثابت نہیں ہو سکے گی۔

اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ۠ وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ
بے شک قارون موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے تھا، پھر وہ باغی ہو گیا ان کے خلاف، اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دیے کہ ان کی چابیاں
لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِى الْقُوَّةِ ۗ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ
البتہ تھکا دیتی تھیں قوت والی جماعت کو، (قابلِ ذکر ہے وہ وقت) جبکہ کہا قارون کو اس قوم نے کہ اترا مت، بے شک اللہ نہیں پسند کرتا

الْفَرِحِيْنَ ﴿۷۶﴾ وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا

اِترانے والوں کو ﴿۷۶﴾ اور جو کچھ اللہ نے تجھے دیا اس میں آخرت کا گھر تلاش کر، اور نہ فراموش کر تُو اپنا حصہ دنیا سے

وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ

اور احسان کر جس طرح سے اللہ نے تیری طرف احسان کیا، اور نہ طلب کر تُو فساد زمین میں، بے شک اللہ نہیں پسند کرتا

الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۷۷﴾ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ؕ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ

فساد کرنے والوں کو ﴿۷۷﴾ قارون نے کہا: سوائے اس کے نہیں کہ دیا گیا ہوں میں مال و دولت ایک علم کی بنا پر جو میرے پاس ہے، کیا اس کو معلوم نہیں

اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ

کہ بے شک اللہ نے ہلاک کر دیا اس سے قبل جماعتوں میں سے ایسے لوگوں کو جو زیادہ سخت تھے بمقابلہ اس کے از روئے قوت کے اور زیادہ تھے

جَمْعًا ؕ وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۷۸﴾ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ ؕ

از روئے جماعت کے، اور نہیں پوچھے جائیں گے اپنے گناہوں کے متعلق مجرم لوگ ﴿۷۸﴾ پس نکلا وہ قارون اپنی قوم پر اپنی زینت میں،

قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ

کہا ان لوگوں نے جو ارادہ کرتے تھے دُنیا کی زندگی کا: ہائے کاش! ہمارے لئے مثل اس چیز کے ہو جو دیا گیا قارون، بے شک یہ

لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴿۷۹﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ

البتہ بڑے نصیبے والا ہے ﴿۷۹﴾ اور کہا ان لوگوں نے جو علم دیے گئے: او! تمہارا ستیاناس ہو، اللہ کا ثواب بہتر ہے اس شخص کے لئے جو ایمان لائے

وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ﴿۸۰﴾ فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ ۗ فَمَا

اور نیک عمل کرے، نہیں دیے جاتے یہ خصلت مگر مستقل مزاج لوگ ﴿۸۰﴾ پھر ہم نے دھنسا دیا اس کو اور اس کی حویلی کو زمین میں، پس نہیں تھی

كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۗ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَاَصْبَحَ

اس کے لئے کوئی جماعت جو اس کی مدد کرتی اللہ کے علاوہ، اور نہ وہ خود بدلہ لینے والوں میں سے تھا ﴿۸۱﴾ ہو گئے

الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ

وہ لوگ جو کل اس جیسا ہونے کی تمنا کرتے تھے، کہنے لگ گئے: ارے! بات تو گویا یوں ہے کہ اللہ کشادہ کرتا ہے رزق جس کے لئے چاہتا ہے

مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ۚ لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ۭ وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۲﴾

اپنے بندوں میں سے اور تنگ کرتا ہے، اگر نہ ہوتا اللہ کا احسان ہم پر تو ہمیں بھی اسی کے ساتھ ہی دھنسا دیتا، ارے! بات تو یوں معلوم ہوتی ہے کہ کافر لوگ فلاح نہیں پا سکتے ﴿۸۲﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى: بے شک قارون موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے تھا، بلکہ اسرائیلی روایات میں مذکور ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا چچازاد بھائی تھا، خاندان بھی ایک، قوم بھی ایک اور یہ قریبی رشتہ داری۔ فَبَغٰى عَلَيْهِمْ: عَلَيْهِمْ کی ضمیر قوم کی طرف لوٹ گئی، چونکہ قوم معنیً جمع ہے۔ پھر وہ باغی ہو گیا ان کے خلاف، یا وہ ظلم کرنے لگ گیا ان پر۔ وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ: کنوز کنز کی جمع ہے، کنز کہتے ہیں اس دولت کو جو زمین میں گاڑ کے رکھی ہو، پرانے زمانے میں چونکہ بینک تو ہوتے نہیں تھے کہ بینکوں میں جمع کرا دیے جائیں، تو لوگ اکثر و بیشتر اپنا خزانہ زمین میں دبا کے رکھ دیتے تھے، جس کو ''دفینہ'' کہتے ہیں، یوں بنا لیا کرتے تھے، اس کا حاصل ترجمہ خزانہ ہی ہوتا ہے۔ مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ یہ مَآ مفعول بہ ثانی ہے اٰتَيْنٰهُ کا اور مِنَ الْكُنُوْزِ یہ ''ما'' کا بیان ہے (مظہری)، اس لئے مِنَ الْكُنُوْزِ کو ''ما'' کے ساتھ جوڑ کے ترجمہ کیا جائے گا۔ ہم نے اس کو اتنے خزانے دیے کہ ان کی چابیاں البتہ تھکا دیتی تھیں بوجھل کر دیتی تھیں قوت والی جماعت کو۔ عُصْبَة جماعت کو کہتے ہیں۔ اور اُولِي الْقُوَّةِ قوت والی۔ مَفَاتِحَهٗ یہ مفرد کی ضمیر لوٹ رہی ہے ''ما'' کے اعتبار سے، چاہے اس کا مصداق کنوز ہے۔ ہم نے اس کو دی تھی وہ چیز کہ بے شک اس چیز کی چابیاں البتہ تھکا دیتی تھیں قوت والی جماعت کو یعنی خزانے۔ ہم نے اس کو اتنے خزانے دیے تھے جن کی چابیاں ایک قوت والی جماعت کو بوجھل کر دیتی تھیں۔ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ: قابلِ ذکر ہے وہ وقت، یا یاد کیجئے اس وقت کو جبکہ کہا اس قارون کو اس کی قوم نے لَا تَفْرَحْ: فَرِحَ يَفْرَحُ خوش ہونا۔ لیکن ایک خوش ہونا ہوتا ہے بطور شکر کے، اور ایک خوش ہونا ہوتا ہے بطور تکبر کے، یہاں تکبر والی خوشی مراد ہے جس کو اُردو میں ''اترانا'' کہتے ہیں۔ اترامت، بے شک اللہ تعالیٰ اِترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ فخر اور تکبر کے طور پر کسی چیز پر پھولا نہ سمانا، یہ اِترانا ہوتا ہے۔ اور ایک ہے شکر کے طور پر۔ فرح بطر، فرح شکر دونوں طرح سے آتا ہے۔ وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ: الدَّارَ الْاٰخِرَةَ یہ ابْتَغِ کا مفعول ہے۔ طلب کر تو، تلاش کر تو آخرت کا گھر اس چیز میں جو اللہ نے تجھے دی، جو کچھ اللہ نے تجھے دیا اس میں آخرت کا گھر تلاش کر، یعنی اس مال و دولت کو آخرت کی آبادی کے لئے خرچ کر۔ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا: اور نہ فراموش کر تو اپنا حصہ دُنیا سے، یعنی اپنا حصہ دُنیا سے آخرت میں لے جانا فراموش نہ کر، کیونکہ مال و دولت میں انسان کا حصہ وہی ہے جس کو وہ آخرت میں منتقل کر دے، باقی جو کچھ جمع کر کے رکھتا ہے وہ تو پیچھے ورثہ کا حصہ ہے۔ جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ آدم زادہ کہتا ہے کہ میرا مال! میرا مال! حالانکہ اس کا مال تو وہی ہے جس سے اس نے دُنیا میں فائدہ اُٹھا لیا، جیسے پہن لیا تو اس کو بوسیدہ کر دیا، کھا لیا تو اس کو فنا کر دیا، اور جو اگلے جہان کے لئے

بھیج دیا وہ ہے اصل اس کا مال، جس کو وہ جمع کر کے رکھتا ہے۔[1] باقی دنیا میں جو کچھ اکٹھا کر کے رکھتا ہے، وہ تو ورثہ کا ہے، انسان مر جاتا ہے اور وہ مال دوسروں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ تو یہاں یہی معنی ہے کہ دُنیا میں سے اپنا حصہ آخرت میں لے جانا فراموش نہ کر، نہ بھول تو اپنے حصے کو دُنیا سے۔ وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ: اللہ کی مخلوق پر احسان کر (اَحْسِنْ کا مفعول محذوف ہے) اللہ کی مخلوق پر احسان کر جس طرح سے اللہ نے تیری طرف احسان کیا۔ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ: اور زمین میں فساد نہ مچا، فساد کو تلاش نہ کر، شرارت نہ مچا، نہ طلب کر تو فساد زمین میں۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ: بے شک اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو شرارت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ: کہا قارون نے، اس کے سوا کچھ نہیں کہ دیا گیا ہوں میں (اُوْتِيْتُهٗ کی "ہ" ضمیر کا مرجع مَآ ہے جو پیچھے گزرا ہے جس کا مصداق ہم نے خزانوں کو بنایا تھا) سوائے اس کے نہیں کہ دیا گیا ہوں میں مال و دولت علم پر جو میرے پاس ہے، میرے پاس ایک علم ہے اور اس علم کی بنا پر میں یہ مال و دولت دیا گیا ہوں...... (شروع میں یہ جو لفظ آیا تھا: اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ اس کا متعلق وہیں ہم نے محذوف نکال لیا تھا اُذْكُرْ، یا: لِيَذْكُرْ، یاد کیجئے اس وقت کو، یا قابلِ ذکر ہے وہ وقت جب قوم نے یہ کہا تھا۔ اور اگر آپ اس "اِذْ" کو اس "قَالَ" کے متعلق کرنا چاہیں، تو بھی بات ٹھیک ہے۔ قارون نے یہ بات کہی۔ کب کہی؟ جب قوم نے اس کو یہ نصیحت کی، اس طرح سے عبارت ساری کی ساری مسلسل ہو جائے گی)...... جب قوم نے یہ نصیحت کی تو قارون نے یہ بات کہی کہ مجھے تم کیا اللہ کے احسان یاد دِلاتے ہو؟ کیا! مجھے اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کے لیے کہتے ہو؟ یہ تو میں نے اپنی قابلیت سے کمایا ہے، یہ اللہ کا فضل نہیں ہے۔ دیا گیا ہوں میں یہ مال دولت علم کی بنا پر جو میرے پاس ہے۔ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ: کیا اس کو معلوم نہیں کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے ہلاک کر دیا اس سے قبل جماعتوں میں سے، مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا: ایسے لوگوں کو جو زیادہ سخت تھے بمقابلہ اس کے از روئے قوت کے اور زیادہ تھے از روئے جماعت کے۔ مِنَ الْقُرُوْنِ: یہ مَنْ کا بیان ہے۔ زیادہ تھے از روئے قوت کے، یعنی ان کے پاس قوت بھی زیادہ تھی، مالی قوت، بدنی قوت، اور جماعت بھی ان کے ساتھ زیادہ تھی ایسے لوگوں کو بھی اللہ نے ہلاک کر دیا۔ وَلَا يُسْئَلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ: اور نہیں پوچھے جائیں گے اپنے گناہوں کے متعلق مجرم لوگ، یعنی تحقیق کرنے کے لئے مجرموں سے پوچھنے کی ضرورت نہیں، ان کے جرموں کی فہرست اللہ کے علم میں پہلے ہی ہوتی ہے، مجرموں سے ان کے جرموں کے متعلق پوچھا بھی نہیں جائے گا، یعنی ان کے جرم خود ہی نمایاں ہوں گے، پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور اللہ کے علم میں سب کچھ ہے۔

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ: پس نکلا وہ قارون اپنی قوم پر اپنی زینت میں۔ فِيْ زِيْنَتِهٖ یہ خرج کی ضمیر سے حال واقع ہو رہا ہے اَيْ مُتَزَيِّنًا (نسفی)، خوب سج دھج کے ساتھ وہ اپنی قوم پہ نکلا، اپنا کر و فر دِکھانے کے لئے، اپنی شان و شوکت دِکھانے کے لئے مزین ہو کر، اپنی ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ اپنی قوم پہ نکلا۔ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا: کہا ان لوگوں نے جو ارادہ کرتے تھے دُنیا کی زندگی کا، يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ: ہائے کاش! ہمارے لئے مثل اس چیز کے ہو جو دیا گیا قارون۔ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ: بے شک یہ شخص البتہ بہت ہی خوش نصیب ہے، بڑے نصیبے والا ہے، یعنی اس کے اس ٹھاٹھ باٹھ کو دیکھ کے جن لوگوں کا ارادہ دُنیوی زندگی کا تھا

(۱) مسلم ۲/۴۰۷، کتاب الزهد۔ مشکوٰۃ ۲/۴۴۰، کتاب الرقاق فصل اول۔

وہ بول پڑے، اور یوں ان کے دِل سے یہ تمنا اُٹھنے لگ گئی کہ کاش! ہمیں بھی اس جیسی چیز دے دی جاتی جو قارون دیا گیا، بے شک وہ قارون البتہ بہت بڑے نصیبے والا ہے۔ حظ: حصہ، قسمت۔ بڑی قسمت والا ہے۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ: کہاان لوگوں نے جو علم دیے گئے، وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ: ویل: خرابی کو کہتے ہیں، اور یہ منصوب ہے فعل محذوف کی وجہ سے اور محاورۃً اس کا فعل لازماً محذوف ہوتا ہے اَلْزَمَكُمُ اللّٰهُ وَيْلَكُمْ (نسفی)، اللہ تعالیٰ تمہاری بربادی تمہاری خرابی تم کو لازم کردے، یہ ہوتا ہے اس کا مفہوم۔ اور اصل یہ بدُعا ہے ہلاکت کے لئے کہ تم پر بربادی پڑے، تم ہلاک ہوجاؤ۔ اور پھر یہ ویلکم کا لفظ محاورۃً تنبیہ کے لئے بھی آجاتا ہے، کسی کو تنبیہ کرنی ہو، تو ایسے موقع پر قطع نظر اس سے کہ یہ بدُعا ہے، ''ویل'' کا لفظ بول دیتے ہیں۔ جیسے ''ویلك'' آپ دیکھیں گے کلامِ عرب میں یہ لفظ اکثر تکیہ کلام کے طور پر، اگرچہ بدُعا کرنی مقصود نہیں ہوتی، پھر بھی یہ آجاتا ہے، اصل یہ بدُعا کے لئے ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری خرابی لازم کردے، چمٹادے اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری بربادی، لفظی مفہوم اس کا یہ ہے۔ اور یہاں یہ اہلِ علم جو کہیں گے، کہاان لوگوں نے جو علم دیے گئے: وَيْلَكُمْ: اس کا مفہوم ہمارے محاورے کے اعتبار سے حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے جو لفظ بولا ہے وہ زیادہ واضح ہے ''ارے! تمہارا ستیاناس ہو'' یہ ترجمہ ''بیان القرآن'' میں ہے۔ کہاان لوگوں نے جو علم دیے گئے: اوتمہارا ستیاناس ہو! اللہ کا ثواب بہتر ہے اس شخص کے لئے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے۔ وَلَا يُلَقّٰىهَآ: اور نہیں دیا جاتا، یہ ''ھا'' کی ضمیر خصلت کی طرف ہے یعنی یہ اہلِ علم والی خصلت، یہ اہلِ علم والی ذہنیت، جو دُنیاوی ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کے للچائے نہیں، ان کی رال نہیں ٹپکی، بلکہ ان کا دھیان ادھر چلا گیا کہ اللہ کی طرف سے جو نیکی کی بنا پر ثواب ملتا ہے وہ اس ٹھاٹھ باٹھ کے مقابلے میں بہتر ہے۔ نہیں دیے جاتے یہ خصلت مگر مستقل مزاج لوگ، صبر کرنے والے لوگ۔ فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ: خسف: زمین میں دھنسا دینا۔ پھر ہم نے دھنسا دیا اس کو اور اس کی حویلی کو۔ دار: اس کی حویلی، اس کی کوٹھی۔ الارض یہ خسفنا کا مفعول ہے۔ ہم نے اس کو اور اس کی حویلی کو زمین میں دھنسا دیا، اس کی کوٹھی کو زمین میں دھنسا دیا۔ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ: پس نہیں تھی اس کے لیے کوئی جماعت جو اس کی مدد کرتی۔ فِئَةٍ چونکہ معنیً جمع ہے، اس لئے يَنْصُرُوْنَ جمع کا صیغہ آگیا۔ نہیں تھی اس کے لئے کوئی جماعت جو اس کی مدد کرتی اللہ کے علاوہ، اور نہ وہ خود بدلہ لینے والوں میں سے تھا۔ وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ: ہوگئے وہ لوگ جو تمنا کرتے تھے اس کے مرتبے کی کل۔ اَمس: کل کو کہتے ہیں، لیکن یہاں گزشتہ زمانہ مراد ہے، کیونکہ ضروری نہیں کہ جس دِن یہ بات ہوئی تھی اس سے متصل پچھلے کل کے اندر انہوں نے یہ بات کہی ہو۔ گزشتہ زمانے میں جو لوگ اس جیسا ہونے کی تمنا کرتے تھے، جن کا ذِکر پیچھے آیا تھا: يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ۔ ہوگئے وہ لوگ جو کل یعنی گزشتہ زمانے میں اس جیسے ہونے کی تمنا کرتے تھے، کہنے لگ گئے: اَصْبَحَ يَقُوْلُوْنَ: اَصْبَحَ کا تعلق يَقُوْلُوْنَ کے ساتھ ہے، چونکہ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ یہ اَصْبَحَ کا فاعل (جو ترکیب میں اسم ہے) اسم ظاہر آگیا، اس لئے صیغہ مفرد کا ہے، اور يَقُوْلُوْنَ میں ضمیر ہے، اس لئے صیغہ جمع کا ہے۔ جو لوگ گزشتہ زمانے میں اس جیسا ہونے کی تمنا کرتے تھے وہ کہنے لگ گئے: وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ۚ لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ۭ وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ: ''وَيْ'' یہ لفظ بھی تعجب کے اظہار کے لئے ہے، جیسے ہم ''ہائے''، یا اس قسم کا لفظ بولتے ہیں ''او ہو! یہ تو بات یوں نکلی'' ہمارے محاورے میں اس قسم کا لفظ بولا جاتا ہے، کہ جب انسان اپنے نظریے اور اپنے خیال کے خلاف کسی حقیقت کو

دیکھتا ہے کہ ہم تو یوں سمجھ رہے تھے اور ظاہر ہو گیا اس کے خلاف، تو ایسے موقع پر ہائے ہائے، اوہو، اس قسم کے لفظ ہم بولا کرتے ہیں۔ تو ''وَیْ'' کا لفظ بھی اسی قسم کا ہے۔ وَیْکَاَنَّ: اب اس کا مفہوم یہ ہو گا ارے! یہ بات تو گویا یوں ہے، کہ اللہ کشادہ کرتا ہے رزق جس کے لئے چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے، اور تنگ کرتا ہے، یعنی ہم یہ سمجھے تھے کہ یہ قارون کی مقبولیت کی دلیل ہے، یہ تو بہت خوش قسمت ہے۔ رزق کی فراوانی کا مل جانا، مال و دولت کا مل جانا، ہم سمجھتے تھے کہ یہ تو حظِ عظیم ہے، بہت بڑا نصیب ہے۔ ارے! بات تو یوں نکلی کہ اللہ جس کے لئے چاہتا ہے رزق کو کشادہ کرتا ہے جس کے لئے چاہتا ہے تنگ کرتا ہے۔ رزق کشادہ مل جانا، یہ اللہ کے نزدیک مقبولیت کی علامت نہیں، اگر یہ مقبول ہوتا تو آج اللہ کے عذاب کی گرفت میں کیوں آ جاتا۔ یہ حیرت اور حیرانی کے ساتھ وہ لوگ جو کل اس کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے آج ان کی زبان کے اوپر یہ لفظ جاری ہو گئے، جو پچھلے زمانے میں اس کو دیکھ دیکھ کے للچار ہے تھے کہ کاش! ہم بھی ایسے ہوتے۔ ''ارے! گویا کہ بات یوں ہے'' یہ اس کا محاورے کے مطابق ترجمہ ہے۔ ارے! بات تو گویا کہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کشادہ کرتا ہے رزق جس کے لئے چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے، اور تنگ کرتا ہے۔ لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا: اگر نہ ہوتا اللہ کا احسان ہم پر تو ہمیں بھی اسی کے ساتھ ہی دھنسا دیتا، یعنی ہم نے اپنی طرف سے تو کوئی کمی نہیں کی، ہم تو چاہتے تھے کہ قارون جیسے بن جائیں، یہ تو اللہ کا احسان ہے کہ اس نے ہم پہ گرفت نہیں کی، ورنہ خواہش اور ارادے کے اعتبار سے، دل کی تڑپ کے اعتبار سے تو ہم بھی اس کے ساتھ ہی تھے۔ اگر نہ ہوتا اللہ کا احسان ہم پر تو ہمیں وہ دھنسا دیتا۔ وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ: ارے! بات تو یوں معلوم ہوتی ہے کہ کافر لوگ فلاح نہیں پا سکتے۔ وَیْ یہ تعجب کے اظہار کے لئے ہے۔ كَاَنَّ: ''گویا کہ'' کے معنی میں ہوتا ہی ہے۔ كَاَنَّ زَيْدًا اَسَدٌ گویا کہ زید شیر ہے۔

تفسیر

ماقبل سے ربط

پہلا رُکوع جو آپ نے تلاوت کیا، اس میں واقعہ ذِکر کیا گیا ہے قارون کا۔ قارون کے اس واقعے کو ماقبل کے ساتھ بہت واضح ربط ہے۔ کل کا سبق آپ کا جہاں سے شروع ہوا تھا وہ یہ تھا وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا، ذِکر کیا تھا کہ مشرکینِ مکہ ایمان لانے سے جو رُکاوٹیں محسوس کر رہے تھے، یہاں ان رُکاوٹوں کا ذِکر ہے، ان کے توہمات اور ان کا اِزالہ کیا گیا ہے۔ درمیان میں ان کے لئے ایک وعید تھی کہ اس وقت تم خوش حال ہو، اپنے آپ کو تم خوش حال سمجھتے ہو، اور اس خوش حالی کی بنا پر تم اکڑ رہے ہو، اور تمہیں ڈر یہ لگ رہا ہے کہ اگر تم نے اللہ کے اَحکام کو مان لیا تو تمہاری تجارت بند ہو جائے گی، تمہاری یہ مالی خوش حالی ختم ہو جائے گی، کاروبار کو نقصان پہنچے گا، سیادت اور قیادت جو تمہیں عرب کی حاصل ہے وہ ختم ہو جائے گی، اسی قسم کے توہمات تھے جو کل کے سبق میں آپ کے سامنے ذکر کیے گئے تھے، تو اپنی خوش حالی کے اُوپر اِترانا، اَکڑنا، فخر کرنا، غرور کرنا، اپنے مال دولت کی بنا پر اللہ کے حکم کو نہ ماننا، اور یہ خطرہ محسوس کرنا کہ اگر ہم مانیں گے تو ہماری دولت کو زوال آ جائے گا، یہی چیز تمہیں ہلاکت کی طرف لے جا رہی ہے، تمہارے یہ جذبات یہ خیالات اچھے نہیں ہیں، یہ بربادی کا باعث ہیں۔ اس کا نمونہ اِجمالی طور پر تو

ذکر کر دیا تھا، وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا کہ پچھلی تاریخ سے سبق لو، کتنے لوگ تھے جو اسی طرح سے خوش حال تھے اور اپنی معیشت کے اُوپر اکڑتے تھے، فخر و غرور کرتے تھے، لیکن ہم نے ان کا نام ونشان مٹا دیا، تو یہ تمہارا مال و دولت اللہ کے عذاب سے بچا نہیں سکے گا، جب اللہ کی طرف سے گرفت آجائے۔

مشرکینِ مکہ کی عبرت کے لئے ''قارون'' کا تذکرہ

وہ ایک اِجمالی حوالہ تھا، اب خصوصیت کے ساتھ ایک سیٹھ اور ایک سرمایہ دار کا واقعہ مشرکینِ مکہ کو سنایا جارہا ہے کہ آج تم اگر اپنی دولت کے اُوپر ناز کرتے ہو، تو اس دولت مند کا نتیجہ دیکھ لو جس نے موسیٰ علیہ السلام کے خلاف شرارت مچائی تھی، تو آخر اس کی دولت اور اس کی پارٹی اس کے کچھ کام نہ آئی۔ ''قارون'' کو آج کے محاورے میں ہم ''سیٹھ'' کہہ سکتے ہیں، یا بہت بڑا سرمایہ دار، یہ ایک یہودی سرمایہ دار کی مثال ہے۔ ''قارون'' کون تھا؟ یہ قرآنِ کریم نے واضح کر دیا کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے تھا، بلکہ روایات کے اندر واضح ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا چچازاد بھائی تھا، بنی اسرائیل میں سے تھا، موسیٰ علیہ السلام کا قریبی رشتہ دار تھا۔

قوم کے اَفراد کو قوم کے خلاف اِستعمال کرنا حکمرانوں کا پُرانا طریقہ ہے

لیکن قرآنِ کریم کی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے، کہ جس طرح بنی اسرائیل فرعونیوں کے غلام تھے۔ اُصولاً تو یہ بھی غلام تھا، لیکن یہ اہلِ حکومت کی عادت ہوتی ہے کہ غلام قوموں میں سے بعض افراد کو، جو قومی غدّار قسم کے ہوتے ہیں، ان کو منتخب کر لیتے ہیں، اور اپنے دربار میں ان کو جگہ دیتے ہیں، اور ان کے ذریعے سے پھر اس قوم کے اُوپر ظلم وستم کیا کرتے ہیں، قوم کے اَفراد کو قوم کے خلاف استعمال کرتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ یہ سیاسی لوگوں کا پُرانا طرز و طریق ہے۔ آپ کو اپنے ملک کے حالات معلوم ہیں کہ جس وقت انگریز کی یہاں حکومت تھی، تو انگریز اکیلا تو سارے کے سارے ملک کو قابو نہیں رکھ سکتا تھا، نہ اتنی بڑی قوم کو قابو کر سکتا تھا، پھر اس نے ہندوؤں میں سے بھی، سکھوں میں سے بھی، مسلمانوں میں سے بھی، وہ افراد چُن لئے جو تھے تو غلام قوم کے، لیکن ان کو اپنے ساتھ ملا لیا، اپنا وفادار بنا لیا، وفادار بنا کے ان کے اوپر عہدوں کے دروازے کھول دیے، بڑے بڑے عہدے ان کو دیے، جائیدادیں دیں، یہ بڑے بڑے نواب اور بڑے بڑے جاگیردار اس وقت تک جو ہندوستان پاکستان میں موجود ہیں، یہ سارے کے سارے انگریزوں کے وظیفہ خوار ہیں، اور یہ انگریزوں کے وفادار تھے، تو یہ صلے ان کو وفاداریوں کی بنا پر ملے ہوئے ہیں۔

''تحریکِ ریشمی رُومال'' کے غدّار کو انگریز کی طرف سے اِنعام

آپ اپنے حضرات کی کتابوں میں پڑھیں گے کہ حضرت مولانا عبیداللہ سندھی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، ان کے زمانے میں جو ایک ''ریشمی رُومال کی تحریک'' اُٹھی تھی، اس کے حالات آپ کتابوں میں دیکھیں گے، ایک ''ریشمی رُومال'' بنایا گیا تھا، اس کے اندر ایک پیغام تھا جو کہ اس کی بنتی کے اندر اس طرح سے داخل کیا گیا تھا کہ غور کرنے کے ساتھ وہ نظر آتا اور پڑھا جا سکتا تھا، ویسے انسان

سمجھتا ہے کہ یہ کپڑا ہے، اس طرح سے خفیہ طور پر وہ پیغام یہاں ہندوستان میں پہنچانا مقصود تھا، مولانا عبید اللہ سندھی ؒ نے ترکوں کے ساتھ مل کر افغانستان میں مل ملا کے انگریزوں کے خلاف ایک گٹھ جوڑ کیا تھا، مقصد یہ تھا کہ اندر سے عوام باغی ہو جائیں، اور باہر سے یہ طاقت حملہ کر دے، تو انگریز کو یہاں سے نکال باہر کریں گے، یہ بہت لمبا چوڑا پروگرام تھا، اور حضرت شیخ الہند ؒ اسی پروگرام کے سلسلے میں ہندوستان سے عرب میں گئے تھے، اور وہاں ترکوں کے ساتھ بھی گفتگو کرنی مقصود تھی، اور مولانا عبید اللہ حضرت شیخ الہند کے دست راست تھے، وہ افغانستان اور اِدھر اُدھر اسی سلسلے میں پھر رہے تھے، ایک خاص پیغام لکھ کر جو اپنے ہم نواؤں تک پہنچانا مقصود تھا جو اپنے کارکن تھے، اور انہی کے ذریعے سے آگے اس کی اشاعت کرنی تھی کہ ایک خاص موقع متعین کر کے ہندوستان کے عوام کو باغی کر دیا جائے، یہ اندر سے گڑ بڑ مچا دیں اور باہر سے یہ طاقت حملہ کر دے گی، تو پھر انگریز یہاں ٹھہر نہیں سکتا، انگریز یہاں سے نکل جائے گا، ملک آزاد ہو جائے گا۔ یہ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی ؒ نے اپنے ایک مصاحب کو دے کے بھیجا تھا، اور وہ بے ایمان ہو گیا، اس نے آ کے وہ چٹھی اور وہ پیغام یہاں حکومت کو پہنچا دیا اور نشان دہی کر دی۔ اب نام تو اس کا کتاب میں لکھا ہوا نہیں، اخباروں میں بھی آتا رہتا ہے کہ اس کو اس صلے میں ملتان کے علاقے میں بہت بڑی جاگیر ملی، گویا کہ ملتان کے علاقے کے زمین داروں میں سے کوئی زمین دار خاندان ایسا ہے جس کے مورثِ اعلیٰ نے یہ قومی غداری کی تھی، اور اس کے صلے میں اس کو مربعے ملے۔ اور اسی طرح سے جو بھی حکومت کی حمایت کرتا تھا، لوگوں کو جہاد سے روکتا، اور لوگوں کو حکومت کا فرماں بردار بنانے کی کوشش کرتا، تو حکومت ان کے اُوپر بڑی نوازشات کرتی اور بڑے انعامات دیتی تھی۔

مولانا محمد تھانوی ؒ نے انگریز کی پیشکش کیوں ٹھکرائی؟

اٹھارہ سو ستاون (۱۸۵۷ء) میں جس وقت اجتماعی طور پر ہندوستانیوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی تھی، اور جہاد شروع ہو گیا تھا، بہادر شاہ ظفر سے دوبارہ بادشاہی کا اعلان کروالیا تھا، تو تھانہ بھون ہمارے اکابر کا مرکز تھا، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب ؒ اس وقت ہندوستان میں تھے، تھانہ بھون میں رہتے تھے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی ؒ مولانا رشید احمد گنگوہی ؒ یہ سارے حاجی امداد اللہ کے ساتھ تھے، انہوں نے حاجی امداد اللہ ؒ کو اَمیرِ جہاد بنایا، اور ان کے ہاتھ کے اُوپر جہاد کی بیعت کر کے انگریز کے خلاف جہاد شروع کیا۔ تو جس وقت جہاد کا مشورہ ہو رہا تھا، اس وقت حاجی امداد اللہ صاحب ؒ کے ہی دوسرے پیر بھائی مولانا محمد تھانوی ؒ، وہ بھی تھانہ بھون کے تھے، انہوں نے اس کی مخالفت کی، کہنے لگے کہ یہ جہاد کا موقع نہیں ہے، ہمیں جہاد نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ ہمارے پاس اتنی قوت نہیں ہے کہ ہم انگریز کا مقابلہ کر سکیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اپنا قومی نقصان کر بیٹھیں، خلوص کے ساتھ انہوں نے مخالفت کی، یعنی یہ نہیں کہ اندر سے انگریز سے ملے ہوئے تھے۔ جس طرح سے ایک مسئلے میں اختلاف ہو جایا کرتا ہے کہ اس موقع پر ہمیں یوں کرنا چاہیے یا نہیں کرنا چاہیے؟ اسی طرح مولانا محمد تھانوی ؒ نے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب ؒ سے اختلاف کیا، وہ اس جہاد میں شریک نہیں ہوئے، وہ کہتے تھے وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ (سورۂ بقرہ: ۱۹۵) یہ تو اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے والی بات ہے، ہمارے پاس اتنی قوت نہیں ہے کہ جس کے ساتھ ہم مقابلہ

کریں، نتیجہ چاہے یہی نکلا کہ واقعی اس جہاد کے نتیجے میں انگریز غالب آیا اور اپنی قوم کو بہت نقصان پہنچا، لیکن اندر اندر تحریک آخر چلتی رہی، وہ ایک علیحدہ بات ہے، لیکن مولانا محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جس طرح سے محسوس کرتے تھے اس وقت واقعی انگریز کو غلبہ ہوا، ہم اس کے مقابلے میں کامیاب نہ ہوسکے، یہ اختلاف انہوں نے خلوص کے ساتھ کیا تھا، یہ نہیں کہ وہ اندر اندر سے انگریز سے ملے ہوئے تھے...... لیکن بتانا یہ چاہتا ہوں کہ جس وقت باہر کی حکومت آیا کرتی ہے، تو اس کے جذبات کس طرح سے ہوتے ہیں، کہ جو بھی اس کی حمایت کرے یا جس کی باتوں سے اس کی حمایت نکلتی ہو، اس کے اُوپر نوازشات ہوتی ہیں۔ جس وقت انگریز پوری طرح سے قابو پاگیا، تو پورے کے پورے بارہ گاؤں کا پروانہ انگریز نے مولانا محمد تھانویؒ کے نام بھیجا، اس اِنعام میں کہ آپ نے جہاد میں شرکت نہیں کی، اور لوگوں کو جہاد سے روکنے کی کوشش کی ہے، تو جس وقت بارہ گاؤں کا پروانہ مولانا محمد تھانویؒ کے پاس پہنچا، تو انہوں نے کاغذ پکڑا، اور پکڑ کر ان کے سامنے پھاڑ دیا، اور پھاڑ کے پھینک دیا اور کہا کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے یہ فتویٰ تمہاری حمایت میں دیا تھا؟ میرے تو علم کا تقاضا تھا، میری تو سمجھ میں بات اسی طرح سے آئی تھی۔ تو انگریز کا اِنعام قبول نہیں کیا، اور کاغذ پھاڑ کے پھینک دیا۔ بہرحال اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومتیں جو ہوا کرتی ہیں وہ غلام قوموں میں سے اس قسم کے افراد کو بڑا نوازتی ہیں۔

قارون کی پوزیشن بنی اسرائیل میں کیا تھی؟

تو قارون کی پوزیشن بھی بنی اسرائیل میں یہی تھی، کہ یہ بنی اسرائیل کے اندر سرمایہ دار کہاں سے بن گیا؟ جبکہ سارے کے سارے بنی اسرائیل غلام تھے، تو اس کے پاس اتنا سرمایہ کہاں سے آ گیا؟ تو اصل بات یہ ہے کہ یہ فرعون کا ہمنوا تھا، اور فرعون نے بنی اسرائیل میں سے اس کو چُنا ہوا تھا، اور اس کے ذریعے سے وہ بنی اسرائیل کے اُوپر ظلم کرتا تھا، اور اس کو اپنے ساتھ ملا رکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں کئی جگہ فرعون، ہامان، قارون تینوں کا اِکٹھا ذکر آتا ہے۔ فرعون کے بعد ہامان، یہ وزیرِ اعظم تھا، دُوسرا یہ قارون اس کا دست راست تھا۔ قرآن کریم میں دو تین جگہ قارون کا ذکر فرعون اور ہامان کے ساتھ آیا ہے۔[1] جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تھا بنی اسرائیل میں سے، لیکن قومی غدار ہونے کی حیثیت سے فرعون کے ساتھ ملا ہوا تھا، اور فرعون کے ساتھ مل کر بنی اسرائیل کی مخالفت کرتا تھا، اور فرعون کے اَحکام کو بنی اسرائیل کے اُوپر غالب کرتا، اور ان کے اوپر ظلم و ستم کا ذریعہ بنا ہوا تھا۔ اس طرح سے فرعون نے پھر اس کو جاگیریں دی ہوئی ہوں گی، جائیدادیں دی ہوئی ہوں گی، عہدے دیے ہوئے ہوں گے، خزانے سے اس کو مدد پہنچتی ہوگی، جس سے اس نے بہت بڑا سرمایہ اکٹھا کرلیا۔ لیکن تھا اسرائیلی، جس وقت اسرائیلی قوم نکلی تو ممکن ہے یہ بھی ساتھ ہی نکلا ہو قوم میں شامل ہونے کی بنا پر، چاہے دِل میں یہی ہو کہ کسی طرح سے قوم کے اندر پھوٹ ڈالے گا، جیسا کہ غداروں کا کام ہوتا ہے۔ بہرحال معلوم یہ ہوتا ہے کہ سامری کی طرح بنی اسرائیل میں شامل یہ رہا ہے۔

قارون کو زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم

فرعون کے غرق ہوجانے کے بعد جب موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اَحکام مل گئے، تو ان اَحکام میں سے ایک حکم

---

(۱) وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ (سورۃ العنکبوت: ۳۹)، اِلٰى فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَقَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ (سورۃ غافر: ۲۴)

زکوۃ بھی تھا۔ اب یہ بہت بڑا سرمایہ دار تھا، باقی قوم میں سے کسی کے پاس بھی اتنا سرمایہ نہیں تھا، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے زکوٰۃ دینے کے لئے کہا، اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کے لئے کہا، تو پہلے موسیٰ علیہ السلام نے کہا ہوگا، اللہ کی کتاب کے مطابق وعظ فرمائی ہوگی، پھر جس طرح سے قاعدہ ہے کہ باقی لوگ اس کو کہتے سنتے ہوں گے۔ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ قوم کے باقی افراد نے بھی کہا، کہ دیکھ! اللہ تعالیٰ نے تیرے پر احسان کیا ہے، تو اس میں سے مخلوق پر احسان کر، اور اس دولت سے آخرت کا گھر کما، اور دنیا سے اپنا نصیب آخرت میں لے جانے کو فراموش نہ کر، جتنا خرچ کرلے گا اللہ کے راستے میں اتنا تیرا حصہ آخرت میں پہنچ جائے گا، اور یہ بغاوت اور سرکشی اختیار نہ کر، یہ تیرے لئے اچھی بات نہیں ہے، موسیٰ علیہ السلام نے بھی سمجھایا ہوگا اور قوم نے بھی سمجھایا۔

قارون کا جواب اور سرمایہ داروں کی ذہنیت

اب آگے اصل سرمایہ دارانہ ذہنیت ظاہر ہو رہی ہے، اور سرمایہ دار ہوتا ہی وہ ہے جس کی ذہنیت ''قارون'' جیسی ہو، وہ آگے سے کہتا ہے کہ ہر روز کیا میرے پیچھے لگے رہتے ہو، ''اللہ نے تجھے دیا، اللہ نے تجھے دیا، اللہ نے احسان کیا'' کیا اللہ نے احسان کیا ہے، میں نے اپنی قابلیت سے کمایا ہے، میں تجارت کے طریقے جانتا ہوں، صنعت جانتا ہوں، میرے پاس یہ قابلیت ہے، یہ قابلیت ہے، میں نے اپنی قابلیت سے کمایا ہے، یہ میری محنت کی کمائی ہے۔ اور یہ کیا ہر روز کہتے رہتے ہو، ''اس میں سے غریبوں کا حصہ ہے، فقیروں کا حصہ ہے، اس میں سے تیری قوم کا حصہ ہے، تو اللہ کے نام پہ دے'' یہ تو میں نے اپنی قابلیت سے کمایا ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کے فضل اور احسان کی کون سی بات ہے؟ جو تم مجھ سے مطالبہ کرتے رہتے ہو۔ یہ ہے اصل سرمایہ دارانہ ذہن۔

مال کا حق اَدا کرنے والے مال دار ''سرمایہ دار'' نہیں ہیں

ورنہ شرعی طور پر جس کو مذموم ''سرمایہ دار'' کہتے ہیں یہ وہ نہیں ہوتا جس کے پاس پیسے ہوں۔ پیسے جتنے چاہے ہوں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما یہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، اور ان کی جائیدادوں کا حساب دیکھو حدیث کی کتابوں میں، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی جائیداد کا حساب جو ان کی وفات کے بعد لگایا گیا، ''بخاری شریف'' میں پورے ایک صفحے کی روایت ہے، پورا حساب درج ہے، چھ کروڑ کی مالیت تھی حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی جائیداد کی جب وہ فوت ہوئے، اور وصیت نکالنے کے بعد قرضے ادا کرنے کے بعد ایک ایک بیوی کو اُصول کے مطابق بتیسواں حصہ ملا تھا، کیونکہ چار بیویاں تھیں، آٹھواں حصہ چار پہ تقسیم ہوگا تو بتیسواں حصہ آئے گا، ایک ایک بیوی کے حصے میں بارہ بارہ لاکھ درہم آئے۔[1] تو اندازہ کریں کتنی دولت تھی، لیکن ان کو ہم آج کی اِصطلاح میں ''سرمایہ دار'' نہیں کہہ سکتے، کیونکہ ان لوگوں کا طریقہ یہ تھا کہ اس چیز کو اللہ کا عطیہ سمجھتے تھے، اس کے اوپر اللہ کا شکر ادا کرتے تھے، جہاں کوئی قومی ضرورت پیش آگئی، وہاں خرچ کرنے میں پیچھے نہیں رہتے تھے، جہاں کوئی شخصی ضرورت پیش آگئی اس کی مدد کرنے سے پیچھے نہیں ہٹتے تھے، زکوٰۃ دیتے تھے، صدقات دیتے تھے، غریب پروری

---

(۱) بخاری ۱/ ۴۴۲ باب برکۃ الغازی۔ ۵ کروڑ ۹۸ لاکھ درہم کل ترکہ تھا، یعنی تقریباً ایک کروڑ ۵۷ لاکھ تولہ چاندی۔ جو کہ ۷۰۰ روپے تولہ کے حساب سے تقریباً گیارہ ارب بنتے ہیں۔

کرتے تھے، مسکین پر شفقت کرتے تھے، تو یہ تو جتنی دولت آتی چلی جائے، اور آگے خرچ ہوتی چلی جائے، اس دولت مند کے نمبر بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ جس طرح سے بجلی ایک طرف سے میٹر میں داخل ہوتی ہے دوسری طرف سے نکلتی چلی جاتی ہے، آئی اور گئی، لیکن نمبر بڑھتا چلا جاتا ہے، اسی طرح سے ان لوگوں کے پاس ایک طرف سے دولت آتی، یہ کماتے، اور دوسری طرف کو نکالتے چلے جاتے، اور درجات ان کے بڑھتے چلے جاتے، یہ تو اللہ کا فضل ہے جس کو اللہ تعالیٰ دے دے، یہ دولت مؤمن کے لئے بہت کام کی چیز ہے، دُنیا میں بھی خوش حال اور آخرت میں بھی خوش حال، ان کو ''سرمایہ دار'' نہیں کہہ سکتے، یہ آج کل کی اصطلاح میں ''سیٹھ'' نہیں ہیں۔

''سرمایہ دار'' کون ہوتا ہے؟

''سرمایہ دار'' وہ ہوتا ہے جو کہتا ہے کہ میرا مال ہے، مین نے کمایا ہے، اس لئے میں اپنی مرضی کے مطابق خرچ کروں گا، اس میں کوئی غریبوں کا حصہ نہیں، کوئی قومی حصہ اس کے اندر نہیں، اس لئے آپ کسی قومی ضرورت کے لئے میرے پر رُعب نہیں ڈال سکتے، کسی شخصی ضرورت کے لیے میرے پہ رُعب نہیں ڈال سکتے، میں اپنے ہاتھ کی کمائی کسی کو کیوں دُوں؟ جس کا یہ ذہن ہو، یہ ہوتا ہے ''سرمایہ دار''، اور یہی سرمایہ دار انسانیت کے دشمن ہیں، معاشرہ برباد ہوتا ہے تو انہی کی وجہ سے ہوتا ہے، جرائم پرورش پاتے ہیں تو انہی کی وجہ سے پاتے ہیں۔

قارون کے اِردگرد ''کاسہ لیسوں'' کا مجمع

یہ ذہنی طور پر کشاکشی اس (قارون) کی موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اور بنی اسرائیل کے باقی افراد کے ساتھ شروع ہوگئی۔ تو ایسے موقع پر آپ جانتے ہیں کہ سرمایہ دار جو ہوتا ہے، اس کی پارٹی تو کچھ نہ کچھ بن ہی جاتی ہے، دولت مند آدمی کے پیچھے ''جھولی چوگ'' تو لگ ہی جایا کرتے ہیں، جن کو آج کل کی اِصطلاح میں آپ ''چمچے'' کہتے ہیں، پُرانی علمی اِصطلاح کے اندر ان کو ''کاسہ لیس'' اور ''پلیٹیں چاٹنے والے'' کہتے ہیں، ایسے لوگ جو ان کی پلیٹیں چاٹتے ہیں، برتن صاف کرتے ہیں، ''کاسہ لیس'' کا یہی معنی ہوتا ہے نا؟ پیالے چاٹنے والے، کہ سرمایہ دار کھائے گا، کھانے کے بعد پلیٹ میں کچھ لگا رہے گا، تو چاٹنے والے بہتیرے بیٹھے ہوتے ہیں۔ یہ چاٹو قسم کے لوگ، یہ جھولی چوگ، یہ چمچے، یہ ہر بات میں ہاں میں ہاں ملانا، اور ان کی شان و شوکت کو نمایاں کرنا، جس زمین دار کے پاس جائیں گے، آپ کو ایسے چمچے، کاسہ لیس مل جائیں گے، اور سرمایہ داروں کے پیچھے بھی اس قسم کے کمینوں کی فوج کی فوج ہوتی ہے۔

قارون کا موسیٰ علیہ السلام سے حسد

تو اس (قارون) نے بھی اپنی ایک پارٹی بنالی، اور اس حسد میں مبتلا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام یہ میرے بھائی ہیں، میرے چچازاد ہیں، ان کو قیادت نصیب ہوگئی، ساری قوم کے اُوپر یہ قابض ہیں، تو میں بھی آخر اسی خاندان کا ہوں، میرے پاس

سرمایہ بھی ہے، ان کے پاس سرمایہ نہیں ہے، تو لوگوں کو چاہیے کہ میرے پیچھے لگیں، تو یہ ذہنی کشاکشی ہے جو اس وقت شروع ہوئی...... اور پھر ایک عادت یاد رکھئے، اور مزاج انسانوں کا تقریباً پہلے سے ہمیشہ کے لیے ایک ہی جیسا ہوتا ہے، سرمایہ داروں پر جس وقت بھی اہلِ علم تنقید کریں، اور ان کی بُرائیوں کے اُوپر گرفت کریں، تو سرمایہ داروں کی عادت ہوتی ہے، کہ اپنی دولت کے بَل بوتے پر علماء کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لوگوں کے سامنے وہ اپنا ٹھاٹھ باٹھ ظاہر کریں گے، اور اہلِ علم کو جو اُن پر تنقید کرنے والے ہیں، ان کو کسی نہ کسی اعتبار سے ان کو بدنام کرنے کی کوشش کریں گے، تاکہ لوگوں کے دِل میں ان کی عزّت اور عظمت نہ رہے، اور لوگ ان کے پیچھے نہ لگیں، یہ ہمیشہ سرمایہ داروں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ اہلِ علم کا، حق گو آدمی کا ذکرِ خیر کبھی نہیں کریں گے، جب ذکر کریں گے ایسے انداز میں کریں گے کہ ان کی کمزوریاں نمایاں کرکے، ان پر ایسے طور پر تبصرے کہ لوگوں کے دل میں ان کی عزّت نہ ہو، نہ لوگوں کے دِل میں عزّت ہوگی، نہ لوگ ان کے پیچھے لگیں گے، اور نہ ہمارے اُوپر کوئی گرفت کرے گا۔

قارون کی موسیٰ علیہ السلام کے خلاف سازش

تو اسی طرح یہاں مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کشاکشی میں قارون نے یہ چاہا کہ موسیٰ علیہ السلام کو کسی طرح سے قوم میں رُسوا کیا جائے، اس طرح سے موسیٰ علیہ السلام پھر بولنے کے نہ رہیں، ان کی زبان بند ہو جائے۔ تو اس نے ایک عورت کو تیار کیا، کہ موسیٰ علیہ السلام جس وقت وعظ کہہ رہے ہوں گے (توراۃ میں یہ حکم آ چکا تھا کہ زانی کی سزا رجم ہے) تو مجمع میں کھڑے ہو کر پہلے ہم یہ مسئلہ پوچھیں گے کہ زانی کی کیا سزا ہے؟ اور بعد میں پھر موسیٰ علیہ السلام پہ تہمت لگا دیں گے اور تو اس کی تصدیق کر دینا کہ آپ نے میرے ساتھ زنا کیا ہے۔ یہ پروگرام اس نے بنایا۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا کہ جس وقت موسیٰ علیہ السلام وعظ کہہ رہے تھے، تو قارون نے اُٹھ کر ایسی بات کہہ دی، تہمت لگا دی، سورۂ اَحزاب کے آخری رُکوع میں بھی مفسرین نے کیا ہے،[1] یعنی یہ جو آیت ہے: لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا (سورۂ اَحزاب: ۶۹) اے ایمان والو! ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو تکلیف پہنچائی تھی، پھر جو کچھ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے متعلق کہا تھا اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کا بے گناہ ہونا نمایاں کر دیا، موسیٰ علیہ السلام کو بَری قرار دیا اللہ تعالیٰ نے اس بات سے جو انہوں نے کہی تھی۔ اس کے تحت دو واقعات نقل کئے جاتے ہیں، ایک وہاں نقل کریں گے، ایک یہ بھی نقل کرتے ہیں کہ اس قسم کی بدزبانی قارون نے موسیٰ علیہ السلام کے متعلق کی، اللہ نے اس کی صفائی دے دی، کہ جب یہ نوبت آئی تو موسیٰ علیہ السلام نے اس عورت کو مجمع میں اللہ کے غضب سے ڈرایا اور کہا کہ صحیح صحیح بات بتا دے کہ حقیقت کیا ہے؟ تو جب اللہ کے غضب اور عذاب سے ڈرایا اور اس عورت پر جو ہیبت طاری ہوئی تو اس نے صحیح بات کہہ دی، کہ مجھے یہ پٹی قارون نے پڑھائی ہے۔

قارون کی ہلاکت

سازش پکڑی گئی، قارون نے یہ جو حرکت کرنا چاہی تھی وہ بات پکڑی گئی، جب پکڑی گئی تو اس موقع پر پھر حضرت

(۱) دیکھئے: مصنف ابن ابی شیبہ ج ۷ ص ۵۴۴۔ تفسیر مظہری اسی آیت کے تحت۔ اور تفسیر نسفی بیضاوی وغیرہ میں آیت احزاب کا مصداق اسی واقعے کو بنایا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام نے قارون کے لئے بددُعا کی، کہ اس کے سمجھنے کی تو اب کوئی توقع نہیں رہی، اب یہ اور فساد برپا کرتا ہے اور یہاں تک اس کو جرأت ہوگئی۔ تو اس بددُعا کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے قارون کو بمع اس کے ساز و سامان کے اور بمع اس کی پارٹی کے زمین میں دھنسا دیا، زمین نے منہ کھولا اور اس کو نگل گئی، جس طرح سے کوئی زلزلہ آتا ہے، زمین پھٹتی ہے، عمارتوں کی عمارتیں زمین میں بیٹھ جاتی ہیں، اسی طرح سے قارون اپنے ساتھیوں سمیت غرق ہوگیا...... اب اس قسم کا واقعہ جو پیش آیا کرتا ہے کہ قوم ساری وہیں آباد، شہر آباد، سب کچھ ہے، اور ایک ہی شخص پر جو اس قسم کی واردات ہوتی ہے، یہ علامت ہوتی ہے اس بات کی کہ یہ اتفاقی واقعہ نہیں، بلکہ نبی کی بددُعا کے نتیجے میں اللہ کے عذاب کے طور پر یہ واقعہ پیش آیا ہے۔ ورنہ اگر یہ اتفاقی زلزلہ ہوتا، تو باقی قوم اس سے متاثر کیوں نہیں ہوئی؟ باقیوں پر اثر کیوں نہ پڑا؟ تو تب لوگوں کے سامنے یہ بات آئی کہ مال و دولت کتنا ہی ہوجائے، جب اللہ کی گرفت آتی ہے تو نہ مال بچا سکتا ہے، نہ اس کی پارٹی بچا سکتی ہے، یہ پیچھے کر چھے اس وقت کوئی کام نہیں آیا کرتے جس وقت اللہ تعالیٰ کی گرفت آجاتی ہے۔

قارونی ٹھاٹھ باٹھ

اب اس کی اس دنیاداری کو اور اس کے مال کو یہاں ظاہر کرنے کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے ایک جلوس کا ذکر بھی کیا ہے۔ جس طرح سے دُنیاداروں کی عادت ہے کہ اپنی شان ظاہر کرنے کے لئے شوکت ظاہر کرنے کے لیے اپنے مدِمقابل کو مرعوب کرنے کے لئے جلوس نکالا کرتے ہیں، اور اس میں اپنی خوب کثرت بھی ظاہر کرتے ہیں کہ ہمارے ساتھ کتنے لوگ ہیں، اور شان و شوکت بھی نمایاں کرتے ہیں۔ تو اسی طرح سے قارون نے بھی کہیں قوم کے اوپر اپنی زیب و زینت کا مظاہرہ کیا، اپنی پارٹی کو ساتھ لے کے فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِیْ زِیْنَتِهٖ جس کا مطلب یہ ہے کہ ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ، مزین ہوکے آراستہ ہوکے وہ اپنی قوم پہ نکلا، جس میں اس کی دولت کا مظاہرہ بھی تھا، اور اس کی قوت اور کثرت کا مظاہرہ بھی تھا، اور اس کے ساتھ جو لوگ تھے وہ بھی اس کے ساتھ ہوں گے، اپنی شان و شوکت کو قوم پہ ظاہر کرنے کے لیے نکلا...... تو جس وقت یوں کسی کا مظاہرہ ہوا کرتا ہے، تو آپ جب چاہیں دیکھ لیں، آج بھی کیفیت یہی ہے، کہ کوئی سیاسی جماعت اپنی قوت اور شدت کا مظاہرہ کرنے کے لئے کوئی ٹھاٹھ باٹھ دکھاتی ہے تو اس کا بھی کمزور لوگوں پہ اثر پڑتا ہے، کوئی دولت منداس طرح سے اپنی شان دِکھاتا ہے، جلوس نکالتا ہے، جیسے شادیوں کے موقع پہ ہوتا ہے، بارات کے موقع پہ ہوتا ہے، جلوس کی شکل اختیار کرتے ہیں، اچھے لباس میں، اچھے حالات میں، اپنی ٹھاٹھ بٹھانے کے لیے، تو اس وقت دیکھنے والوں کی رال بسا اوقات ٹپکنے لگ جاتی ہے، جو کمزور دِل کے لوگ ہوتے ہیں، جن کے سامنے صرف یہ دُنیا ہی ہے آخرت ہے ہی نہیں۔

قارونی ٹھاٹھ باٹھ کو دیکھ کر دُنیاداروں کا اور اہلِ علم کا طرزِ عمل

تو وہاں بھی ایسے ہی ہوا کہ قارون جس وقت نکلا اپنے ٹھاٹھ باٹھ میں، تو جو لوگ دنیادار تھے جن کے دل کے اندر دنیا کا

ارادہ تھا، وہ دیکھ کر کہنے لگے، ان کی رال ٹپکی، دل کے اندر حرص اور آز آیا، کہ ہائے کاش! ہمارے لئے بھی یہی مال دولت ہوتا جیسے قارون کے پاس ہے، یہ تو بڑا خوش نصیب آدمی ہے۔ جس طرح سے آج کوئی کاروالا آپ کے پاس سے گزرے، اور آپ پیدل جا رہے ہوں، اور وہ شوں کر کے مٹی اُڑاتا ہوا پاس سے گزر جائے، تو آپ کے دِل میں خیال آئے کہ کیا ہی اچھا ہوتا ہمارے پاس بھی کار ہوتی، ہم بھی اسی طرح سے چلتے! کسی کی کوٹھی کے پاس سے گزریں، تو آپ کے دِل میں یہ خیال آئے کہ کیسی اس کی کوٹھی ہے، کس طرح سے مزین ہے، کیسی کشادہ، کیسی باغیچے والی، ہمارے پاس بھی یہ ہوتی! تو یہ علامت ہے اس بات کی کہ آپ بھی دُنیادار ہیں، آپ کے دِل کے اندر دُنیا کی طلب ہے، دُنیادار ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ انسان کے پاس دُنیا ہو، جب دُنیا کی محبت قلب میں ہے اور دُنیا کی طلب قلب میں ہے، تو وہ شخص دُنیادار ہے، کسی دولت مند کو دیکھ کے اور کسی ٹھاٹھ باٹھ والے کو دیکھ کے یوں انسان کے دِل میں جذبات آنے لگ جائیں کہ ہم بھی ایسے ہوتے، یہ بڑا خوش نصیب آدمی ہے، تو یہ علامت ہے کہ انسان کے دل میں دُنیا کی محبت ہے۔ چنانچہ بعض لوگوں کے دِل میں اس قسم کا خیال آیا، اور انہوں نے اپنی زبانوں سے یوں اظہار کر دیا۔

آگے آ گئی علم والوں کی بات۔ اس قوم میں جو علم والے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صحبت میں منجھے ہوئے لوگ، اچھے لوگ، جن کی توجہ آخرت کی طرف تھی، جو دُنیا کے فنا کو خوب اچھی طرح سے سمجھے ہوئے تھے، انہوں نے ان کو کہا جو للچائی ہوئی نظر سے دیکھتے تھے: وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ: ویلکم کا ترجمہ جس طرح آپ کے سامنے کیا تھا، تمہارا ستیاناس ہو، تم اس کی ٹھاٹھ باٹھ کو دیکھ کر متاثر ہو رہے ہو؟ یہ کوئی چیز طلب کرنے کی نہیں، نیکی کے بدلے میں جو کچھ اللہ تعالیٰ آخرت میں دے گا وہ بہتر ہے، آخرت میں جو کچھ ملے گا وہ بہتر ہے، اس دُنیا کے اُوپر تم رال نہ ٹپکاؤ...... ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ذِکر کیا ہے الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ کے عنوان سے۔ یہ ہے آپ کو اصل میں سمجھانے کی بات۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جنہوں نے دوسروں کو منع کیا کہ اس کی زیب و زینت دیکھ کے تمہارے کے اندر حرص اور آز نہیں آنی چاہیے، ان کو اللہ تعالیٰ نے اُوْتُوا الْعِلْمَ کے ساتھ ذِکر کیا کہ یہ وہ لوگ تھے جو علم دیے گئے۔ اور پہلے گروہ کو اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا کے عنوان سے۔ یہاں سے فرق معلوم ہو گیا کہ صحیح معنوں میں اہلِ علم وہ ہوا کرتے ہیں جو دُنیاداروں کی ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کے کبھی حرص اور آز میں مبتلا نہیں ہوتے کہ ہائے کاش! ہم یوں ہوتے۔ حقیقتاً صحیح معنی میں علم والے وہ ہوا کرتے ہیں کہ جن کے سامنے ہمیشہ آخرت کا تصور ہوتا ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ پھٹے ہوئے کپڑے ہوں، کوئی حرج نہیں! خشک روٹی ہو، کوئی حرج نہیں! کوٹھیوں کی بجائے جھونپڑیوں میں رہ لیں گے، کوئی حرج نہیں! حرام طریقے کے ساتھ دولت کما کے عیش وعشرت کرنا، یہ ہمارا کام نہیں! ہمیں طریقہ وہ اختیار کرنا چاہیے جس سے آخرت آباد ہو۔ جس کا یہ جذبہ ہو، جو اس انداز سے سوچتا ہو، صحیح معنوں میں اہلِ علم میں سے وہ ہے۔ اور جس کے دِل میں یہ تمنا ہو کہ یار! ملنی چاہیے جس طرح سے بھی ملے۔ کیا ہے، دیکھو! فلاں جو تھا وہ قوم کا غدار ہو کے حکومت کے ساتھ مل گیا لیکن اس نے یوں کر لیا، اور فلاں شخص نے فلاں طریقہ اپنایا، لوگ کہتے ہیں غلط ہے، غلط ہے، لیکن اس کو ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی نصیب ہو گئی، جو دنیا کی عیش وعشرت کے لئے حرام حلال کی تمیز نہیں کرتے یہ دُنیادار ہوتے ہیں، یہ اہلِ علم میں سے نہیں ہیں۔

”علم“ کی دو قسمیں اور ان کی پہچان

تو اس سے آپ لوگ فرق کر سکتے ہیں کہ علم قلب کے اندر اثر انداز کب ہوتا ہے؟ جیسے حدیث شریف میں آتا ہے[1] کہ علم کی دو قسمیں ہیں: علمٌ علی اللسانِ وعلمٌ فی القلبِ، ایک علم زبان پہ ہوتا ہے، ایک علم قلب میں ہوتا ہے۔ اور جو علم قلب میں ہے، وہی علم نافع ہے۔ اور جو علم زبان پہ ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی حجت ہے بنی آدم پر، جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ بنی آدم کو پکڑے گا۔ اب آپ کے پاس علم ہے تو آپ فرق کریں کہ یہ علم علی اللسان ہے یا علم فی القلب ہے، تو اس کی علامت یہاں سے معلوم ہوتی ہے کہ علم فی القلب تب ہوگا جس وقت انسان آخرت کی طرف توجہ رکھے اور دُنیا کی ٹھاٹھ باٹھ کے اُوپر نہ مرے، اور دُنیاداروں کو دیکھ کے اس کو یہ خیال نہ آئے کہ یہ خوش نصیب ہیں، بلکہ دُنیادار جو اللہ کے نافرمان ہیں، حرام حلال کی تمیز نہیں کرتے، ان کو دیکھ کے آپ کو افسوس آئے کہ یہ کتنے بدنصیب ہیں کہ چند دِن کی عیش عشرت کی خاطر اپنی آخرت کو برباد کر رہے ہیں، ان کے بدنصیب ہونے کا خیال آئے، ان کے خوش نصیب ہونے کا خیال نہ آئے، تب تو علم آپ کے قلب پر اثر انداز ہے، اور اگر ان کو دیکھ کے یہ خیال آتا ہے کہ یہ بڑے خوش نصیب ہیں، ہم تو ان کے مقابلے میں کچھ نہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے دِل میں علم کی محبت نہیں، بلکہ دُنیا کی محبت ہے۔

وہ مال دار لوگ جو قابلِ رشک ہیں

ہاں! البتہ وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت دی، جیسے میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا، اس قسم کے مال دار لوگ بھی ہر زمانے میں ہوتے ہیں، جو حلال کماتے ہیں، حرام کی آمیزش نہیں کرتے، اور حلال کما کے دولت کو اکٹھا کرتے ہیں، لیکن قومی ضرورتوں میں، مذہبی ضرورتوں میں، اپنے اقارب رشتہ داروں میں، سب میں خرچ کرتے ہیں، اسلامی اور برادری کے حقوق ادا کرتے ہیں، اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی ان کو توفیق ہوتی ہے، اس قسم کے مال دولت والے کے سامنے آجانے کے بعد دِل میں خیال آنا کہ ہمارے پاس بھی دولت ہوتی، ہم بھی اللہ کے راستے میں یوں خرچ کرتے، یہ ٹھیک ہے...... جیسے حدیث شریف میں آتا ہے، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو آدمی ایسے ہیں کہ جن کے اُوپر رشک کرنا چاہیے، جن جیسے بننے کی تمنا کرنی چاہیے، ”لَا حَسَدَ اِلَّا فِی اثْنَتَیْنِ“ حسد نہیں مگر دو آدمیوں میں، ”حسد“ سے ”رشک“ مراد ہے، دو آدمیوں پر رشک کیا کرو جب وہ تمہارے سامنے آئیں، یعنی تمہارے دِل میں تمنا ہونی چاہیے کہ ہم ایسے ہوں، ”رَجُلٌ اٰتَاہُ اللّٰہُ مَالًا فَسَلَّطَہٗ عَلٰی ھَلَکَتِہٖ فِی الْحَقِّ“ ایک وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہے پھر اس کو حق پہ خرچ کرنے کی توفیق دی ہے، ایسے مال دار کو دیکھ کے اگر دِل میں خیال آئے کہ ہمارے پاس مال ہو تو ہم بھی اسی طرح سے اللہ کے راستے میں خرچ کریں، ایک تو یہ شخص، اور دُوسرا وہ آدمی کہ ”اٰتَاہُ اللّٰہُ حِکْمَۃً“: اللہ تعالیٰ نے علم دیا ہے، ”فَھُوَ یَقْضِیْ بِھَا وَیُعَلِّمُھَا“ وہ اس علم

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ ۸۲/۷، باب ما ذکر عن نبینا فی الزھد. مرفوعًا مرسلًا عن الحسن. مشکوٰۃ ۳۷/۱، کتاب العلم فصل ثالث، بحوالہ دارمی. موقوفاً علی الحسن. ولفظ الأول: اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ: عِلْمٌ فِی الْقَلْبِ فَذَاکَ الْعِلْمُ النَّافِعُ وَعِلْمٌ عَلَی اللِّسَانِ فَتِلْکَ حُجَّۃُ اللّٰہِ عَلٰی عِبَادِہٖ

کے مطابق فیصلے کرتا ہے، اور اس علم و حکمت کو پھیلاتا ہے۔[1] جب اس قسم کا کوئی آدمی سامنے آجائے، اہلِ علم، جو علم کی نشر و اشاعت کرتا ہے، تو تمہارے دِل میں یہ ہوس اُٹھنی چاہیے کہ کاش! ہم بھی ایسے ہوتے۔ ان جیسا بننے کی تمنا کی جاسکتی ہے، یہ اللہ کے نیک بندے ہیں، ان پر اللہ کا فضل ہے۔ باقی جو حلال حرام کی تمیز کیے بغیر دولت کو اکٹھا کرتے ہیں، اور عیش و عشرت میں دولت کو خرچ کرتے ہیں، ان کی طرف دیکھ کے اگر ان کے خوش نصیب ہونے کا خیال آئے، تو آپ دُنیادار ہیں، دِین دار نہیں ہیں۔ قرآنِ کریم کی یہ آیت یہی بتاتی ہے۔

قارون پر رشک کرنے والوں کی آنکھیں کھل گئیں

انہوں (اہلِ علم) نے متوجہ کیا، اور یہ کہا کہ اللہ کی طرف سے جو ثواب ملتا ہے وہ بہتر ہے، لیکن یہ اللہ کی طرف سے ثواب کن کو ملے گا، جو اِیمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے۔ اور جب پھر قارون پر بربادی آئی، تو اس کے بعد یہی لوگ جو کل اس جیسا بننے کی تمنا کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ کاش! ہمیں وہ چیز مل جائے جو قارون کو ملی ہے، بڑا خوش نصیب ہے، وہی پھر ہاتھ ملنے لگ گئے، آنکھیں کھل گئیں، کہنے لگے اوہو! ہم تو سمجھتے تھے کہ بڑا خوش نصیب ہے۔ وَيْكَاَنَّ ارے! بات تو یوں معلوم ہوتی ہے کہ رِزق کا فراوانی کے ساتھ مل جانا یہ کوئی خوش نصیبی کی دلیل نہیں۔ ہم تو سمجھتے تھے، یہ بڑا صاحبِ نصیب ہے، لیکن اب معلوم ہوا کہ رِزق کا کشادہ ہونا یہ تو کوئی خوش نصیبی نہیں، اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تحت جس کو چاہتا ہے کشادہ دیتا ہے، جس کے لیے چاہتا ہے رِزق تنگ کردیتا ہے۔ یہ تو اللہ کی طرف سے اپنی تقسیم ہے، تو کسی مال دار کو دیکھ کے سمجھ لینا کہ خوش نصیب ہے، یہ تو ہماری بڑی غلطی تھی۔ اور پھر اپنی اس تمنا کے اُوپر ان کو افسوس ہونے لگا کہ اللہ نے ہم پر بہت ہی احسان فرمایا کہ ہم پہ گرفت نہیں کی، ورنہ دِل کے اعتبار سے تو ہم بھی قارون کے ساتھی بن گئے تھے، جو دِل کے اندر اس قسم کی تمنائیں آرہی تھیں، اگر اللہ چاہتا تو ہمیں بھی قارون کے ساتھ اسی جرم میں دھنسا دیتا، لیکن اللہ کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں بچالیا، اگر اللہ کا احسان نہ ہوتا تو ہمیں بھی دھنسا دیتا کیونکہ ہم نے تمنا کی تھی قارون جیسے ہونے کی۔ تو پھر اس واقعے کو دیکھ کے ان لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں۔

قارون کا واقعہ ذِکر کرنے سے مقصود

اللہ تعالیٰ جو یہاں مشرکینِ مکہ کو یہ واقعہ سناتا ہے، تو اس لئے سناتا ہے کہ تم اتنے بڑے سیٹھ نہیں ہو جتنا بڑا قارون تھا، تمہیں اس قسم کی خوش حالی حاصل نہیں ہے جس قسم کی قارون کو حاصل تھی، وہ بھی اسی دولت کے ناز پہ موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کرتا تھا، اور ان کے خلاف پارٹی بنائے ہوئے تھا، لیکن جب اللہ کی گرفت آگئی تو نہ دولت اس کے کام آئی، نہ اس کی پارٹی اس کے کام آئی۔ تو جو بات قارون کو اس کی زندگی میں سمجھائی جارہی تھی، جب قارون کہتا تھا کہ مجھے یہ قابلیت کی بنا پر ملا ہے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو یہ بات کہی گئی تھی کہ اس کو پتا نہیں؟ پہلے کتنے لوگ تھے جو اس سے زیادہ قوت والے تھے، اس سے زیادہ کثرت والے

(1) بخاری ۱/ ۱۷۔ ۲/ ۱۱۵۷۔ مسلم ۱/ ۲۷۲ باب فضل من یقوم بالقرآن الخ۔ مشکوٰۃ ۱/ ۳۲، کتاب العلم، فصل اول۔

تھے، اللہ نے ان کو ہلاک کر دیا۔ اس کا مطلب بھی یہی تھا کہ پہلے بھی ایسے سرمایہ دار آئے تھے جو سمجھتے تھے کہ ہم نے اپنی قابلیت سے کمایا، اور اللہ کا فضل نہیں ہے۔ تو اگر اپنی قابلیت اور اپنی استعداد کے ساتھ کمایا ہوتا، تو چاہیے تھا کہ اس کے بچانے پر بھی قادر ہوتے، اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ اگر تم نے اپنی قابلیت سے کمایا ہوتا، یہ مال تمہارا ہے تو تم اس کو باقی رکھنے پر بھی قادر ہوتے، لیکن جب اللہ چھیننے پہ آ جائے تو کوئی روک نہیں سکتا، تو اسی طرح سے یہ سمجھو کہ دینا بھی اللہ کا کام ہے، کوئی شخص اپنی استعداد سے نہیں کمایا کرتا، اور اگر ظاہری طور پر استعداد ذریعہ بنتی ہے مثلاً ہاتھ سے آپ محنت کرتے ہیں، دماغ سے آپ سوچتے ہیں، اور اس استعداد کی بنا پر آپ کچھ کماتے ہیں تو سوچو کہ یہ استعداد کس کی دی ہوئی ہے؟ اگر اللہ تعالیٰ ماں کے بطن سے تمہیں پاگل پیدا کر دیتا، مجنون پیدا کر دیتا، تمہارے بھیجے کے اندر عقل نہ ڈالتا، تو کیا تم دنیا میں کوئی کام کر سکتے تھے؟ اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھوں کو اس طرح سے نہ بناتا، ان کو اپاہج کر دیتا، تمہارے ہاتھ بے طاقت ہوتے تو کیا تم ہاتھ کے ساتھ کوئی محنت کر سکتے تھے؟ اگر اللہ تعالیٰ ٹانگوں میں کوئی قوت نہ دیتا تو تم ٹانگوں کے ساتھ چل سکتے تھے؟ اللہ تعالیٰ تمہیں اندھا پیدا کر دیتا، گونگا پیدا کر دیتا، بہرا پیدا کر دیتا، کیا تم نے دنیا کے اندر اس قسم کے بچے نہیں دیکھے، جو ماں کے بطن سے آتے ہیں تو استعداد سے خالی ہوتے ہیں، اور اپنی زندگی کس طرح سے معذوری اور مجبوری کی گزارتے ہیں، تو اس لئے اگر کوئی شخص آنکھ سے کام لے کے کماتا ہے، دماغ سے کام لے کے کماتا ہے، ہاتھ سے کماتا ہے، اپنی باقی استعداد کو استعمال کرتا ہے تو استعداد بھی اللہ کی دی ہوئی ہے۔ اس لیے چاہے محنت آپ کرتے ہیں لیکن محنت کی توفیق اللہ کی جانب سے ہے، تو رزق جو بھی ملتا ہے سب اللہ کا عطیہ ہے، چاہے بظاہر محنت آپ ہی کریں۔ یہ ہے اصل میں اسلامی ذہنیت۔ تو اللہ تعالیٰ یہی اس کو کہتے ہیں کہ پہلے بھی لوگ تھے جن کے پاس بڑا سرمایہ تھا، لیکن جب وہ اکڑے تو اللہ نے ان سے سرمایہ بھی چھینا، وہ جماعت بھی ان کے کام نہ آئی، اگر یہ تمہاری اپنی قوت اور استعداد سے کمائی ہوئی چیز ہوتی تو اس کے بچانے پر بھی تم قادر ہوتے۔[1]

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ؕ

یہ آخرت کا گھر، قرار دیتے ہیں ہم اس کو ان لوگوں کے لئے جو نہیں ارادہ کرتے زمین میں بلندی کا اور نہ فساد کا،

وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝۸۳ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ

اور اچھا انجام متقین کے لئے ہوتا ہے ۝۸۳ جو کوئی اچھی بات لے کر آئے گا تو اس کے لئے اس سے بہتر ہوگی، جو کوئی بری حالت لے کر آئے گا

فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۸۴ اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ

پس نہیں بدلہ دیے جائیں گے وہ لوگ جنہوں نے برائیاں کیں مگر وہی جو وہ کرتے تھے ۝۸۴ بے شک وہ جس نے آپ پر قرآن

(۱) جمیہ ریکارڈنگ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے اسی پر اکتفاء کیا گیا ہے۔

عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ ؕ قُلْ رَّبِّیْۤ اَعْلَمُ مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى وَمَنْ هُوَ فِیْ

کو متعین کیا البتہ لوٹانے والا ہے آپ کو معاد کی طرف، آپ کہہ دیجئے میرا رب خوب جانتا ہے اس شخص کو جو ہدایت لے کر آیا اور اس شخص کو جو

ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۸۵﴾ وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْۤا اَنْ یُّلْقٰۤى اِلَیْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ

صریح گمراہی میں ہے ﴿۸۵﴾ اور تو اُمید نہیں رکھتا تھا کہ تیری طرف کتاب ڈالی جائے، مگر (یہ کتاب کا ملنا) تیرے رَبّ کی رحمت کی وجہ سے ہے

فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِیْرًا لِّلْكٰفِرِیْنَ ﴿۸۶﴾ وَلَا یَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰیٰتِ اللّٰهِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ

پس تُو کافروں کے لئے پشت پناہ نہ بننا ﴿۸۶﴾ ہرگز نہ روکیں آپ کو یہ مشرک لوگ اللہ کی آیات سے بعد اس کے کہ اُتار دی گئیں وہ

اِلَیْكَ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۸۷﴾ وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا

آپ کی طرف، اور آپ اپنے رَبّ کی طرف بلاتے رہیں اور مشرکوں میں سے نہ ہونا ﴿۸۷﴾ اور اللہ کے ساتھ کوئی دُوسرا اِلٰہ نہ پکارنا،

اٰخَرَ ۘ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۟ كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۸﴾

کوئی معبود نہیں مگر وہی، ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے، اسی کے لئے حکم ہے، اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ﴿۸۸﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِیْنَ لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا: یہ آخرت کا گھر، قرار دیتے ہیں ہم اس کو، بناتے ہیں ہم اس آخرت کے گھر کو ان لوگوں کے لئے جو زمین میں بلندی کا ارادہ نہیں کرتے، نہ فساد کا ارادہ کرتے ہیں۔ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ: اور اچھا انجام متقین کے لئے ہوتا ہے۔ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَیْرٌ مِّنْهَا: جو کوئی اچھی بات لے کے آئے گا تو اس کے لئے اس سے بہتر ہوگی، یعنی جتنی وہ اچھائی لے کے آئے گا اس سے بہتر اس کو جزا ملے گی۔ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَةِ: جو کوئی بُری حالت لے کے آئے گا۔ فَلَا یُجْزَى الَّذِیْنَ عَمِلُوا السَّیِّاٰتِ: پس نہیں بدلہ دیے جائیں گے وہ لوگ جنہوں نے بُرائیاں کیں اِلَّا مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ مگر وہی جو وہ کرتے تھے۔ اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ: بے شک وہ جس نے آپ پر قرآن متعین کیا، یعنی قرآن کی تبلیغ متعین کی، قرآن کی تلاوت متعین کی، قرآن کے اُوپر عمل کرنا متعین کیا۔ یعنی جس نے آپ پر قرآن کی ذمہ داری ڈالی ہے۔ یہ اس کا حاصل مفہوم نکل آئے گا۔ بے شک وہ جس نے تیرے اُوپر قرآن متعین کیا ہے۔ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ: البتہ لوٹانے والا ہے آپ کو معاد کی طرف۔ مَعَادٍ: ظرف کا صیغہ ہے عَادَ یَعُوْدُ سے، لوٹنا۔ معاد: لوٹنے کی جگہ، لوٹنے کا ٹھکانا۔ اس لئے ہم آخرت کو ''معاد'' کہتے ہیں۔ معاد کا معنی یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے ہم آئے، اللہ کی طرف لوٹ کے جائیں گے، اصل ٹھکانا ہمارا وہی ہے، معاد کا یہی مفہوم ہوتا ہے..... اب یہاں ''معاد'' سے کیا مراد ہے؟ تفسیروں میں دو باتیں لکھی ہیں۔ یا تو ''معاد'' سے مکہ معظمہ مراد ہے جو حضور ﷺ کا

اصل وطن ہے۔ یاد ہوگا! شروع سورت میں آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ یہ سورت ہجرت کے موقع پہ اُتری تھی، تو گویا کہ یہ وعدہ کیا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کے وطن کی طرف لوٹائے گا، آپ اسی طرح سے کامیاب اپنے وطن کی طرف آئیں گے، جس طرح سے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی گود سے موسیٰ علیہ السلام گئے تھے، لیکن اللہ نے وعدہ کرلیا تھا اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ ہم موسیٰ کو تیری طرف لوٹائیں گے۔ تو جس طرح اللہ کا وہ وعدہ سچا نکلا اسی طرح سے اللہ تعالیٰ یہ وعدہ کررہا ہے کہ آپ کو اپنے وطن کی طرف لوٹائے گا، اور یہ وعدہ سچا نکلا، آنے والی تاریخ نے بتادیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ اسی وطن میں آئے، اور کس شان وشوکت سے آئے، تو اللہ کا یہ وعدہ پورا ہوگیا۔ تو ''معاد'' سے مکہ معظمہ بھی مراد لیا گیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل وطن، تو گویا کہ یہ وعدہ ہے اسی قسم کا جس طرح سے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ سے کیا تھا اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ۔ تو اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ کرلیا کہ آپ کو آپ کے ٹھکانے کی طرف واپس لوٹائیں گے، اور پھر مکہ فتح ہوا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ ادھر آئے، یہ علیحدہ بات ہے کہ پھر اپنی مرضی کے ساتھ سکونت مدینہ منورہ رکھی، ورنہ وہ جگہ آپ کو واپس مل گئی تھی ...... یا ''معاد'' سے مطلقاً اچھا انجام مراد ہے، کہ آج اگرچہ آپ مغلوب نظر آتے ہیں، کافروں نے تنگ کرکے آپ کو آپ کے وطن سے نکال دیا، اور آپ بظاہر بے سہارا، مال ودولت سے خالی، اور مہاجر بن کے اپنے گھر سے نکل رہے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ آپ کا انجام بڑا اچھا کرے گا، دنیا اور آخرت میں آپ کو اچھے انجام کی طرف لوٹائے گا۔ اس عام مفہوم کے اندر پھر مکہ کی طرف لوٹنا بھی داخل ہوسکتا ہے، اور دنیا اور آخرت میں ہر کامیابی اس کا مصداق بن سکتی ہے۔

قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ: آپ کہہ دیجئے میرا رَبّ خوب جانتا ہے، مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى اس شخص کو جو ہدایت لے کے آیا، وَمَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ اور اس شخص کو جو کہ صریح گمراہی میں ہے۔ وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ: اور تو اُمید نہیں رکھتا تھا کہ تیری طرف کتاب اُتاری جائے، تیری طرف کتاب ڈالی جائے، تجھے تو توقع بھی نہیں تھی، کیونکہ جس شخص نے نبی بننا ہوتا ہے اس کو پہلے سے یہ تمنا اور خواہش نہیں ہوتی کہ مجھے نبی بنادیا جائے، نہ وہ اس راستے میں نبی بننے کے لئے کوئی محنت کیا کرتا ہے، کیونکہ یہ کسبی چیز تو ہے نہیں، بلکہ اللہ کی طرف سے موہبت اور عطیہ ہے، جو بغیر کسب کے ملتا ہے۔ جیسے اسی سورت میں تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام گئے تھے آگ لینے اور وہاں مل گئی پیغمبری، تو ان کو کیا پتا تھا کہ میں جو وہاں جارہا ہوں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے نبوت عطا ہوجائے گی، اسی طرح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی کوئی پتا نہیں تھا کہ مجھے کتاب ملنے والی ہے۔ آگے سورۂ شوریٰ کے آخر میں آئے گا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ تجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے؟ اور ایمان کیا ہوتا ہے؟ یہ تو اللہ نے آپ کو اپنی طرف سے فضل فرماکے ایک نُور دے دیا۔ تو اُمید ہی نہیں رکھتا تھا کہ تیری طرف کتاب ڈالی جائے اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ: مگر یہ کتاب کا ملنا تیرے رَبّ کی رحمت کی وجہ سے ہے، اٰتَيْنٰكَ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ: ہم نے یہ کتاب تجھے دی تیرے رَبّ کی طرف سے مہربانی کی وجہ سے۔ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ پس تو کافروں کے لئے پشت پناہ، مددگار نہ بننا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کافروں کی مرضی کے مطابق آپ کسی حکم کو چھپالیں، کسی حکم میں تبدیلی کردیں، اس قسم کی کوئی بات کرکے کافروں کے مددگار نہ بنیں۔ یہ بظاہر خطاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے، حقیقت میں ان کافروں کو مایوس کرنا مقصود ہے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مختلف حیلوں اور بہانوں سے اپنے ساتھ کرنا چاہتے تھے کہ آپ توحید کی وعظ چھوڑ دیں، شرک والے دِین کے حامی بن جائیں۔ جن کے دِلوں میں یہ تمنا تھی تو ان کو مایوس کرنا مقصود ہے کہ

اللہ تعالیٰ کی طرف سے شدت کے ساتھ منع کیا جارہا ہے کہ آپ کافروں کے لیے مددگار، ان کے لیے پشت پناہ نہ بنیں یعنی ان کی مرضی کے مطابق نہ چلیں، اوران کے کہنے کی بنا پر اللہ کے کسی حکم کو چھوڑیں نہیں، اور کسی حکم کے اندر تغیر تبدل نہ کریں۔ وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ اس کا بھی یہی مفہوم ہے۔ لَا يَصُدُّنَّ: جمع کا صیغہ ہے، مؤکد ہے۔ ہرگز نہ روکیں آپ کو یہ مشرک لوگ اللہ کے احکام سے اللہ کی آیات سے بعد اس کے کہ وہ تیری طرف اُتاردی گئیں۔ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ اپنے رَبّ کی طرف دعوت دیتا رہ۔ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ: اور مشرکوں میں سے نہ ہونا، اس جماعت میں کبھی شامل نہ ہونا۔ یہ تاکیدیں آپ کو کی جارہی ہیں، اور مایوس اُن کو کرنا مقصود ہے کہ اب اس سے کیا توقع رکھی جائے گی کہ یہ ہمارے ساتھ شامل ہوجائیں گے جب اللہ کی طرف سے ان کو بار بار اس قسم کی تاکید آرہی ہے۔ وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ: اور اللہ کے ساتھ کوئی اِلٰہ نہ پکارنا، نہ پکار تو اللہ کے ساتھ کوئی دُوسرا الٰہ۔ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: کوئی معبود نہیں مگر وہی۔ كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ: ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے، باقی رہنے والی اسی کی ذات ہے، باقی ہر چیز فانی ہے، باقی کے مقابلے میں فانی کے ساتھ کبھی نہ ہوجانا۔ لَهُ الْحُكْمُ اسی کے لئے حکم ہے۔ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ: اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ حکم دینے کا منصب بھی اسی کا ہی ہے اور آخر مرجع معاد بھی وہی ہے، سب نے لوٹ کے وہیں جانا ہے۔ تو یہ آخر میں توحید کی تاکید آ گئی، شرک کی مذمت آ گئی، جو حاصل ہے ہر سورت کا۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ قرآنِ کریم میں اسی مضمون کی تاکید فرماتے ہیں۔[1]

(۱) ریکارڈنگ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے اسی پر اکتفاء کیا گیا ہے

سُورَةُ العَنكَبُوت
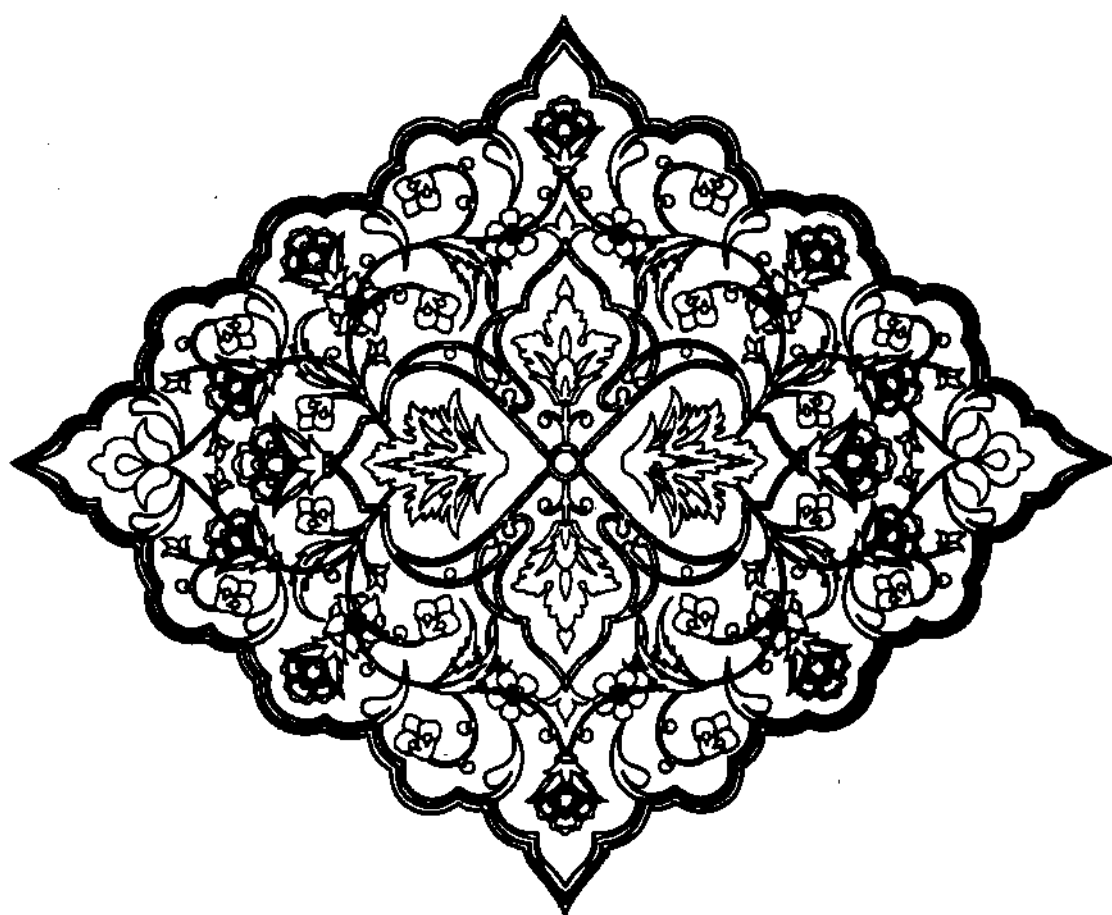
ایاتها ۶۹ | ۲۹ سُوْرَةُ الْعَنْكَبُوْتِ مَكِّيَّةٌ ۸۵ | رکوعاتها ۷

سورۂ عنکبوت مکہ میں نازل ہوئی، اس میں اُنہتر آیتیں اور سات رُکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

الٓمّٓ (۱) اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ (۲) وَلَقَدْ

الٓمّٓ (۱) کیا لوگوں نے سمجھ لیا کہ وہ چھوڑ دیے جائیں گے اتنی بات پر ہی کہ انہوں نے اٰمنّا کہہ دیا اور وہ آزمائے نہیں جائیں گے؟ (۲) البتہ تحقیق

فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ

آزمائش میں ڈالا ہم نے اُن لوگوں کو جو ان سے پہلے گزرے ہیں پھر البتہ ضرور جانے گا اللہ اُن لوگوں کو جو سچے ہیں اور البتہ ضرور جانے گا

الْكٰذِبِيْنَ (۳) اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ۭ سَاۗءَ مَا

اُن لوگوں کو جو جھوٹے ہیں (۳) کیا سمجھ لیا ان لوگوں نے جو کہ بُرے اعمال کرتے ہیں کہ وہ ہم سے بچ کر نکل جائیں گے؟ بہت بُرا

يَحْكُمُوْنَ (۴) مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاۗءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ۭ وَهُوَ السَّمِيْعُ

فیصلہ کرتے ہیں وہ (۴) جو شخص اللہ کی ملاقات کی اُمید رکھتا ہے تو بے شک اللہ کا وعدہ تو آنے والا ہے، اور وہ سننے والا ہے

الْعَلِيْمُ (۵) وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ

جاننے والا ہے (۵) جو کوئی اللہ کے راستے میں کوشش کرتا ہے تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ کوشش کرتا ہے اپنے لئے، اللہ تو بے نیاز ہے

الْعٰلَمِيْنَ (۶) وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ

سارے جہانوں سے (۶) وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں، ضرور دُور ہٹا دیں گے ہم ان سے اُن کی بُرائیاں اور

لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۷) وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۭ

البتہ ضرور دیں گے ہم ان کو بہترین بدلہ اس عمل کا جو وہ کرتے تھے (۷) اور تاکید کی ہم نے انسان کو اس کے والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی،

وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۭ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ

اگر وہ تیرے پہ زور ڈالیں تا کہ تُو میرے ساتھ شریک ٹھہرائے ایسی چیز کو جس کے متعلق تجھے کوئی علم نہیں، پھر ان کا کہنا نہیں ماننا، میری طرف تم

فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۸ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ

سب کا لوٹنا ہے، پھر میں تمہیں خبر دوں گا ان کاموں کی جو تم کیا کرتے تھے ⑧ وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں، ہم ضرور داخل کریں

فِي الصّٰلِحِيْنَ ۝۹ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ

گے ان کو اچھے لوگوں میں ⑨ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لے آئے، پھر جب ان کو ایذا دی جاتی ہے اللہ کے راستے میں، تو سمجھ لیتے

فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ۭ وَلَىِٕنْ جَاۗءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ۭ

ہیں لوگوں کے فتنے کو اللہ کے عذاب کی طرح، اور اگر آپ کے رب کی طرف سے کوئی مدد آ جائے تو البتہ ضرور کہیں گے کہ بے شک ہم تمہارے ساتھ ہیں

اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۰ وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ

کیا اللہ جانتا نہیں ان باتوں کو جو جہانوں کے دلوں میں ہیں؟ ⑩ البتہ ضرور جانے گا اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں اور ضرور جانے گا

الْمُنٰفِقِيْنَ ۝۱۱ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ

منافقین کو ⑪ کہا ان لوگوں نے جنہوں نے کفر کیا ان لوگوں کو جو ایمان لے آئے: تم ہمارے طریقے کی اتباع کرو، اور اٹھالیں گے ہم

خَطٰيٰكُمْ ۭ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝۱۲ وَلَيَحْمِلُنَّ

تمہارے گناہ، نہیں ہیں یہ اٹھانے والے ان کے گناہوں میں سے کچھ بھی، یہ جھوٹ بول رہے ہیں ⑫ البتہ ضرور اٹھائیں گے یہ لوگ

اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ۡ وَلَيُسْـَٔــلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝۱۳ۧ

اپنے بوجھ اور اپنے بوجھوں کے ساتھ اور بوجھ بھی، اور البتہ ضرور پوچھے جائیں گے قیامت کے دن ان باتوں کے متعلق جو یہ جھوٹی تراشا کرتے تھے ⑬

تفسیر

سورت کا تعارف اور اس کے مضامین

سورۂ عنکبوت مکہ میں نازل ہوئی اس کی ۶۹ آیتیں ہیں، ۷ رکوع ہیں۔ یہ سورت مکی زندگی کے آخر دور کی ہے، جس وقت مشرکین کی طرف سے ایمان قبول کرنے والوں پہ بہت تشدد ہو رہا تھا، اور اس کے نتیجے میں اہلِ ایمان اپنا علاقہ چھوڑ کر دوسرے علاقے کی طرف جانے کے لئے مجبور ہو رہے تھے۔ اس سورت میں زیادہ تر اہلِ ایمان کو مصیبتیں سہنے اور برداشت کرنے کے لئے برانگیختہ کیا گیا ہے اور ان مصیبتوں پر ان کو تسلی دی گئی ہے کہ اللہ کے راستے میں مصیبتیں اٹھانی ہی پڑتی ہیں، یہ تمہاری خصوصیت

نہیں، پہلے بھی جو لوگ ایمان لاتے تھے، کُفّار کی طرف سے ان کو ایسی ہی تکلیفیں پہنچائی جاتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کے وعدے پر اعتماد کرتے ہوئے یہ مصیبتیں برداشت کرو اور صبر کرو، ایک وقت آئے گا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے ہر قسم کے راستے کھول دے گا۔ سورت کے آخری حصے میں ہجرت کی ترغیب آئے گی، اور ہجرت کی مصیبتیں برداشت کرنے کے لئے کہا جائے گا، اور ابتدائی آیات بھی اسی مضمون پر مشتمل ہیں، درمیان میں اُمم سابقہ کے کچھ واقعات نقل کئے جائیں گے، ان سے بھی کچھ ایسے ہی مقصد ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سُنایا جائے گا کہ پہلے انبیاء علیہم السلام جو آئے تھے ان کے ساتھ کُفّار نے کیا معاملہ کیا، اور ان کے ماننے والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا، آخرانجام انہی کا اچھا ہوا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کی۔ اس سورت کا نام ماخوذ ہے ''کَمَثَلِ الْعَنْکَبُوْتِ'' سے، ''عنکبوت'' کا لفظ وہاں آ رہا ہے، وہیں سے سورت کا نام اختیار کیا گیا ہے۔

حروفِ مقطعات کے بارے میں تفصیل

الٓمّٓ: حروفِ مقطعات ہیں، اور یہ آپ کے سامنے کئی سورتوں میں گزر گئے۔ ان کو ''حروفِ مقطعات'' اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ جوڑ کر نہیں پڑھے جاتے، الگ الگ پڑھے جاتے ہیں، ''الف، لام، میم'' علیحدہ علیحدہ ان کو پڑھا جاتا ہے، جس طرح سے آپس میں ان کی ترکیب نہیں ہے، اس لئے ان کو ''مقطعات'' کہتے ہیں۔ اور یہ متشابہات میں داخل ہیں، اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِمُرَادِہٖ بِذٰلِکَ، ان حروف سے اللہ کی جو مراد ہے وہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے، اور بعض مفسرین اس کو سورت کا نام قرار دیتے ہیں کہ ''عنکبوت'' بھی اس کا نام ہے اور ''الٓمّٓ'' بھی اس کا نام ہے۔

قبولِ دِین کے بعد قربانیاں دینی پڑتی ہیں

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا: کیا لوگوں نے سمجھ لیا کہ وہ چھوڑ دیے جائیں گے اتنی بات پر ہی کہ انہوں نے اٰمَنَّا کہہ دیا۔ وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ: اور وہ آزمائے نہیں جائیں گے، آزمائش میں نہیں ڈالے جائیں گے۔ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ: البتہ تحقیق آزمائش میں ڈالا ہم نے ان لوگوں کو جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا: پھر البتہ ضرور جانے گا اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اپنے دعویٔ ایمان میں سچے ہیں۔ وَلَیَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِیْنَ: اور البتہ ضرور جانے گا ان لوگوں کو جو کہ اظہارِ ایمان میں جھوٹے ہیں...... یہ تمہیدی آیات ہیں، جس میں گویا کہ سورت کا عنوان متعین کر دیا گیا۔ ایمان قبول کر لینے کے بعد جس وقت کُفّار کی طرف سے سختیاں ہوتی تھیں، تو آخر انسان مصیبتوں اور سختیوں میں گھبراتا ہے۔ تو مصیبتوں کے سہنے اور برداشت کرنے کے لئے آمادہ کرتے ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایمان لا کر جنت حاصل کرنے کی تمنا، یہ کوئی ایسا سستا کام نہیں ہے کہ تم نے ''لا اِلٰہ اِلّا اللہ محمد رسول اللہ'' پڑھ لیا، تو بس ایک ٹھنڈی سڑک کے ذریعے تم اپنی منزل پہ پہنچ جاؤ گے، ایسی بات نہیں ہے، یہ بڑا کٹھن راستہ ہے، اور اللہ کا دِین قبول کر لینے کے بعد اس کے لیے انسان کو بہت کچھ قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ یہ نہ سمجھو کہ کلمہ پڑھ لیا، بس اب ہم چھوٹ گئے، دنیا میں بھی ہمارے لئے خوش حالی اور آخرت میں بھی ہمارے لئے خوش حالی، ایسے نہیں، پچھلی تاریخ اس بات پہ شاہد ہے کہ جن لوگوں نے بھی ایمان قبول کیا، اللہ نے ان کے اوپر مصائب ڈالے، مختلف قسم کی آزمائشوں کے اندر ان کو

ڈالا گیا، ہر طریقے سے ان کو جانچا گیا، جس سے مقصد یہ ہے کہ دنیا کے اندر بھی ظاہر ہو جائے..... یہ آپ کی خدمت میں پہلے بھی عرض کیا گیا تھا کہ اللہ کی طرف جب جاننے کی نسبت آئے ''تا کہ اللہ جان لے'' حالانکہ اللہ تعالیٰ تو ہر چیز کو اس کے ہونے سے پہلے ہی جانتا ہے، اس کا مطلب ہوتا ہے، نمایاں طور پر، ظاہر کر کے، تمہیں بھی پتا چل جائے کہ یہ دو قسمیں ہیں۔ تو یہاں ظاہر کرنا مقصود ہوا کرتا ہے، تا کہ اللہ تعالیٰ ظاہری طور پر جان لے، واقعہ سامنے آ جائے اور تمہیں بھی پتا چل جائے کہ کون تو اس ایمان لانے میں سچا ہے، اور کون ہے کہ جس نے صرف زبان سے کہہ دیا لیکن دل میں پوری طرح سے مخلص مؤمن نہیں، یہ جانچ پڑتال مصائب کے ذریعے سے ہوتی ہے، جتنا فتنہ ہوگا جتنے مصیبت میں مبتلا ہوں گے اتنا ہی خلوص نمایاں ہوتا ہے، کہ کون اس کلمہ پڑھنے کے اندر سچا ہے اور اس کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کے واسطے تیار ہے، اور کون جھوٹا ہے کہ زبان سے تو کہتا ہے لیکن جب اللہ کے نام پہ پٹنے کی نوبت آتی ہے تو پھر میدان چھوڑ کے بھاگ جاتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے، ایک دفعہ سرورِ کائنات ﷺ بیت اللہ کے سائے میں اپنی چادر سرہانے رکھ کے لیٹے ہوئے تھے، اتنے میں ایک صحابی (خباب بن اُرت رضی اللہ عنہ) آ گئے، وہ مشرکین کے ہاتھوں سے کچھ پریشان ہو کے آئے تھے، مشرکین نے انہیں پریشان کیا تھا، تکلیفیں پہنچائی تھیں، تو آ کے کہنے لگے کہ یارسول اللہ! ان مشرکین کے لئے بددُعا کیجئے، یہ تو ہم پہ بہت سختی کرتے ہیں، ہمیں بہت تکلیف پہنچاتے ہیں، یعنی اس کی باتوں سے معلوم ایسے ہوتا تھا جس طرح سے یہ کچھ گھبرایا ہوا ہے، مشرکین کی طرف سے تکالیف جو پہنچی ہیں تو اس سے ایک آدمی گھبرایا ہوا آتا ہے۔ تو حضور ﷺ اُٹھ کے بیٹھ گئے، فرمانے لگے کہ کیا سختیاں ہیں تم پہ، تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں ان کے اُوپر اس سے زیادہ زیادہ سختیاں ہوئیں، دو باتیں حضور ﷺ نے بیان فرمائیں کہ ایسا ہوتا تھا کہ ایک شخص ایمان قبول کرتا، اور کافر اس کو پکڑ لیتے، پکڑ لینے کے بعد اس کے سر کے اُوپر آری رکھ کے سر سے اس کو چیر دیتے دو ٹانگوں کے درمیان تک، آریوں کے ساتھ چیرا ان لوگوں کو جو ایمان لاتے تھے۔ اور کبھی ایسا ہوتا تھا کہ لوہے کی کنگھیاں، لوہے کے دندانے لے کے اس طرح سے زندہ انسان کے اُوپر سے ان کا چمڑا سارے کا سارا نوچ دیا جاتا تھا۔ یہ سختیاں بھی ان کو ایمان سے نہیں پھیر سکیں، اور تم ابھی گھبرا گئے؟ تم پر تو وہ سختیاں آئی ہی نہیں جو پہلے لوگوں پر آئی ہیں، آریوں کے ساتھ وہ چیرے گئے، لوہے کے ساتھ ان کے چمڑے نوچے گئے، تم جلدی مچا رہے ہو، ایک وقت آئے گا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں غلبہ دے گا، اور یہ ساری کی ساری مصیبتیں دُور ہو جائیں گی۔[1] اس قسم کے واقعات بیان کر کے حضور ﷺ اپنے ساتھیوں کا حوصلہ بڑھاتے تھے، کہ اس راستے میں یہ مصیبتیں سہنی پڑیں گی، برداشت کرنی پڑیں گی، صبر کرو، اللہ تعالیٰ کے وعدے پہ مطمئن رہو، اور امید رکھو کہ ایک دن یہ ساری کی ساری مصیبتیں ٹل جائیں گی۔

آزمائش کا مقصد

تو اس پہلی آیت کا حاصل یہ ہے کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ صرف ''اٰمَنَّا'' کہنے کے ساتھ ہی تم چھوڑ دیے جاؤ گے، اور تمہیں کامیابی

---

(۱) بخاری ۱/۵۱۰ باب علامات النبوۃ فی الاسلام- ۱/ ۵۴۳ باب ذکر مالقی النبی واصحابہ الخ مشکوۃ ۲/۵۲۵ باب علامات النبوۃ، فصل اول۔

کا سرٹیفکیٹ مل جائے گا، ایسا نہیں، آزمائے جاؤ گے، فتنوں میں ڈالے جاؤ گے، ہم نے پہلے لوگوں کو بھی اسی طرح سے آزمایا اور ان کو بھی مصیبتوں میں ڈالا، مقصد یہ ہے کہ تا کہ اللہ کا یہ علم لوگوں کے سامنے بھی ظاہر ہو جائے کہ ان میں بعض سچے ہیں اور بعض جھوٹے ہیں، سچے جو ہیں وہ ممتاز ہو جائیں، جھوٹے جو ہوتے ہیں وہ ان مصیبتوں کے اندر آ کے اپنا حوصلہ چھوڑ دیتے ہیں اور کافروں کی مرضی کے مطابق وہ پھسل جاتے ہیں، ان واقعات کے ذریعے سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے، تا کہ جان لے اللہ تعالیٰ ظاہری طور پر، یعنی یہ واقعہ پیش آیا ہوا اللہ تعالیٰ جان لے، ایک اللہ کا جاننا ہے کہ ایسا ہوگا، اور ایک اللہ کا جاننا ہے کہ ایسا ہو گیا، تو "ایسا ہو گیا" کے طور پر جاننا مقصود ہے، وہ واقعہ ظاہر ہونے کے بعد ہی ہوگا۔ پھر ضرور جانے گا اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو سچے ہیں یعنی اپنے دعویٰ ایمان میں سچے ہیں، اور البتہ ضرور جانے گا اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو کہ جھوٹے ہیں۔

"دودھ پینے والے مجنوں" اور "خون دینے والے مجنوں"

جن کو آپ وعظ میں کہا کرتے ہیں کہ "دودھ پینے والے مجنوں" اور "خون دینے والے مجنوں" ان کا پتا اسی وقت ہی چلا کرتا ہے کہ جس وقت ان سے خون دینے کا مطالبہ ہو، ورنہ تو ہر کوئی مجنوں ہے۔ جیسے واقعہ مشہور ہے "لیلیٰ مجنون" کے قصے میں، (عشق کی باتیں سمجھانے کے لئے اور محبت کے مسئلے حل کرنے کے لئے یہ امامِ مذہب ہیں، جس طرح سے ہر فن کے اندر اس فن کے امام کے اقوال اور احوال پیش کئے جاتے ہیں، تو عشقِ مجازی، عشقِ حقیقی کے لئے ایک آئینہ ہے، تو محبت کے کیا تقاضے ہوتے ہیں؟ عشق کے کیا تقاضے ہوتے ہیں؟ ان کو سمجھانے کے لئے انہی عشاق کے واقعات دلیل بنتے ہیں۔ تو یہ مجنوں جو تھا، اس کا نام تو اصل میں "قیس" ہے، "مجنون" کا معنی تو "دیوانہ" ہے، لیلیٰ کی محبت میں دیوانہ ہو گیا تھا، اور لیلیٰ کو بھی اس کا خیال تھا) تو یہ کہیں باہر جنگل میں ٹھہرا ہوا تھا، جس طرح سے واقعہ بیان کیا کرتے ہیں، تو لیلیٰ ہر روز دودھ بھیجا کرتی تھی، اور راستے میں ایک اور مصنوعی مجنوں بن کے بیٹھ گیا، اور جو خادمہ دودھ لے کر جاتی، اس سے لے کے وہ دودھ پیتا رہتا، اور آگے جو اصل مجنوں تھا وہاں تک وہ دودھ پہنچتا ہی نہیں تھا، کئی دن جو گزرے تو لیلیٰ نے سوچا کہ یہ کیا بات ہے؟ مجنوں کی طرف سے کوئی پیغام نہیں آرہا، یہ دودھ جاتا ہے، پی کے چپ کر کے وہ پیالہ واپس کر دیتا ہے، کوئی محبت کا پیغام، اس طرح سے تو کوئی بات نہیں ہوئی، اس کو شک پڑ گیا، تو اس نے اس دودھ لے جانے والی کو کہا کہ آج اس مجنوں کو کہنا کہ لیلیٰ کہہ رہی تھی کہ اس میں اپنا خون ڈال کے واپس کرو، تو جس وقت وہ دودھ لے کے گئی، دودھ دیا اور راستے والے مجنوں نے پی لیا، تو پھر اس نے مطالبہ کیا کہ لیلیٰ کہہ رہی تھی کہ اس پیالے میں اپنا خون ڈال کے بھیجنا، تو وہ کہتا ہے کہ "خون دینے والا آگے بیٹھا ہے، ہم تو دودھ پینے والے ہیں!" تو محبت کا دعویٰ کر کے صرف دودھ پینا ہی نہیں ہوتا، بسا اوقات خون بھی دینا پڑتا ہے، تب پتا چلا کرتا ہے کہ دودھ پینے والے کون ہیں؟ اور خون دینے والے کون ہیں؟ یہ واقعات اور مصائب جو ہوا کرتے ہیں، دوستیاں، یاریاں، ان کی پہچان انہی واقعات سے ہوتی ہے کہ کون وفادار ہے اور کون وفادار نہیں ہے؟ تو اگر اللہ کی دوستی کا دم بھرتے ہو، اللہ اور اللہ کے رسول کے ساتھ محبت لگاتے ہو، تو پھر ان کے لئے ماریں بھی کھانی پڑیں گی، تو اگر کسی طرف سے کوئی پریشانی پیش آتی ہے تو گھبرا کیوں جاتے ہو؟ اسی پر آمادہ کرنا مقصود ہے۔ اس آیت کا حاصل یہی ہے۔

ظالم کفّار کو اللہ کی طرف سے ڈانٹ

اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ: یہ ان تنگ کرنے والوں کو ذرا تھوڑی سی ڈانٹ پلائی ہے، جو ان اہلِ ایمان کو پریشان کرتے ہیں، مشرکین۔ کیا سمجھ لیا ان لوگوں نے جو کہ بُرے اعمال کرتے ہیں، یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ: جو بُری بُری حرکتیں کرتے ہیں، بُرے اعمال کے مرتکب ہوتے ہیں، کیا انہوں نے سمجھ لیا کہ وہ ہم سے چھوٹ کے بچ کے نکل جائیں گے؟ اَنْ یَّسْبِقُوْنَا: وہ ہم سے سبقت لے جائیں گے اور ہم سے پکڑے نہیں جائیں گے؟ سَآءَ مَا یَحْکُمُوْنَ: بہت بُرا فیصلہ کرتے ہیں وہ، یعنی اگر ان کا یہ خیال ہے کہ وہ اسی طرح سے گڑبڑ کرتے رہیں گے بُرائیاں کرتے رہیں گے بُری حرکتیں کرتے رہیں گے، ہم ان کو پکڑ نہیں سکیں گے، تو یہ ان کا خیال بہت بُرا خیال ہے، ایک دِن ہماری گرفت میں آ جائیں گے۔ یہ ان دشمنوں کو ذرا تھوڑی سی ڈانٹ پلائی ہے جو اہلِ ایمان کو پریشان کرتے تھے۔ السَّیِّاٰت: ای الاعمال السیئات اس کا موصوف الاعمال ہے، جو بُرے بُرے عمل کرتے ہیں، کیا انہوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم سے چھوٹ جائیں گے، ہم سے بچ کے نکل جائیں گے۔ ہم سے سبقت لے جانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم ان کو پکڑنا چاہیں، وہ آگے بھاگ جائیں، ایسا نہیں ہوگا، سَآءَ مَا یَحْکُمُوْنَ اگر ان کے دل میں یہ خیال ہے کہ ہم ایسے ہی کرتے رہیں گے، کوئی ہمیں پکڑنے والا نہیں تو یہ انہوں نے بہت بُرا فیصلہ کیا ہے۔

عاشقانِ خدا کے لئے سامانِ تسلی

مَنْ كَانَ یَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ: یہ پھر وہی ایمان والوں کے لئے ایک تسلی ہے۔ جو شخص اللہ کی ملاقات کی اُمید رکھتا ہے۔ آگے جزا اس کی محذوف ہے۔ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ اس جزا کے اوپر دال ہے (آلوسی)۔ معنی یوں ہوا، جو کوئی شخص اللہ کی ملاقات کی اُمید رکھتا ہے، اس کو اللہ کی رضا کے لئے تکلیفیں سہنی چاہئیں، اس کو مصیبتیں برداشت کرنی چاہئیں جو اللہ سے ملاقات کی اُمید رکھتا ہے۔ کیوں؟ کہ اللہ کا وعدہ تو آنے والا ہے، وعدے کے مطابق ملاقات ہو جائے گی، پھر جب اللہ تعالیٰ کے لئے ماریں کھائی ہوں گی، تو اللہ تعالیٰ اپنے راستے میں پٹنے والوں کو وہاں نوازیں گے۔ جن کو اللہ سے ملاقات کی اُمید ہے، جن کا یہ عقیدہ ہے کہ ہم اللہ سے ملنے والے ہیں، انہیں اللہ کے راستے میں تکلیفیں اُٹھانی چاہئیں، بے شک اللہ کا متعین کیا ہوا وقت البتہ آنے والا ہے...... وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ: اور وہ سننے والا ہے اور جاننے والا ہے۔ یہ ایک عاشق کے لئے بہت بڑی قوت کی بات ہوتی ہے کہ جس کے لئے ہم مصیبت اُٹھا رہے ہیں، اس کو سب کچھ پتا ہے کہ میرے راستے میں یہ پٹ رہے ہیں، اور اگر ہم اپنی زبان سے کوئی ہائے کہتے ہیں، تو وہ سنتا ہے کہ واقعی میری وجہ سے ان لوگوں کی چیخیں نکل رہی ہیں، اور عاشق کے لئے یہ ایک بہت بڑی تسلی کی بات ہوتی ہے کہ معشوق کو پتا ہو کہ میرے راستے میں یہ سب کچھ برداشت کر رہا ہے، تو یہاں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''سننے والا ہے جاننے والا ہے'' کسی کی کوئی بات اللہ سے مخفی نہیں، اور کسی کا کوئی حال اللہ سے مخفی نہیں۔

ایک اور انداز سے تثبیت بصورتِ تحریض

وَمَنۡ جَاهَدَ فَاِنَّمَا یُجَاهِدُ لِنَفۡسِهٖ: جَاهَدَ مُجَاهَدَۃً: اللہ کے راستے میں مشقت برداشت کرنا، جہاد کا بھی معنی ہوا کرتا ہے، مجاہدہ اور جہاد ایک ہی چیز ہے، باب مفاعلہ کا مصدر فِعال بھی آیا کرتا ہے، جیسے مقاتلہ، قتال، تو اسی طرح مجاہدہ، جہاد۔ جو کوئی اللہ کے راستے میں کوشش کرتا ہے، اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ کوشش کرتا ہے اپنے ہی لیے، تمہارا اپنا ہی اس میں فائدہ ہے، میرا تو اس میں کوئی فائدہ نہیں۔ میرے راستے میں اگر کوشش کرو گے میرے لئے اگر مصیبتیں برداشت کرو گے اس میں فائدہ تمہارا ہی ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِیٌّ عَنِ الۡعٰلَمِیۡنَ: اللہ تو غنی ہے، سارے جہانوں سے بے نیاز ہے، وہ کسی کا محتاج کسی کا ضرورت مند نہیں۔ یہ بھی برانگیختہ کرنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ ایک تسلی کا وہ انداز ہے کہ یہ آزمائش ہے، اس میں پورا اترنے کی کوشش کرو، اور اللہ سے تمہاری ملاقات ہونے والی ہے، یہ امید رکھو، اور وہ وقت قریب آ رہا ہے، پھر اللہ تعالیٰ تمہیں ان مصیبتوں پر بڑا اَجر دے گا۔ اور دوسرا طریقہ پختہ کرنے کا یہ ہوا کرتا ہے کہ مصیبتیں اگر اُٹھا رہے ہو تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے، اس میں تمہارا ہی تو فائدہ ہے، ہمارا تو فائدہ نہیں ہے، اگر مصیبتیں نہیں اُٹھاؤ گے اور دنیا کے اندر خوش حالی تلاش کرنا شروع کر دو گے تو اپنا نقصان کرو گے، ہمارا کیا نقصان ہے، اس لئے جتنی مشقت اُٹھاؤ جتنی مصیبت برداشت کرو، اس میں فائدہ تمہارا ہے۔ جو کوئی مشقت اُٹھاتا ہے سوائے اس کے نہیں کہ مشقت اُٹھاتا ہے اپنے نفس کے لئے، بے شک اللہ تعالیٰ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے، اللہ کو کسی کی ضرورت نہیں، بھلا! تم میرے راستے میں مصیبتیں اُٹھا کے میرے پہ احسان جتلاؤ، اس میں فائدہ تمہارا ہی ہے، جو کچھ کرتے ہو اپنے لئے ہی کرتے ہو۔

نیک مؤمنین کے لئے بشارت

وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُکَفِّرَنَّ عَنۡهُمۡ سَیِّاٰتِهِمۡ: وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں، ضرور دُور ہٹا دیں گے ہم ان سے ان کی بُرائیاں، یعنی ان سے چھوٹے موٹے جو گناہ ہو جاتے ہیں وہ سب ہم ایمان اور عمل صالح کی برکت سے دُور ہٹا دیں گے، کفر و شرک کے زمانے کی بُرائیاں ایمان کی برکت سے معاف ہو جائیں گی، اور آگے جب آپ کا قصد نیک عمل کرنے کا ہوگا، نیک اعمال آپ کریں گے، تو چھوٹے موٹے گناہ دنیا کے معاشرے کے اندر رہتے ہوئے آخر انسان کے ساتھ نفس ہے، ماحول کی مجبوریاں ہوتی ہیں، کہیں نہ کہیں انسان کا پاؤں پھسلتا ہے، لغزش ہوتی ہے، چھوٹے موٹے گناہ، اس طرح سے جس طرح آپ صاف کپڑے پہن کے بازار میں نکلیں تو کہیں سے کوئی چھینٹا پڑ گیا، کوئی گرد و غبار پڑ گیا، یہ چھوٹے موٹے گناہ سیئات بھی ہوا کرتے ہیں، وہ نیکی کی برکت سے اللہ تعالیٰ معاف کرتے رہتے ہیں۔ ان کی بُرائیاں ان سے ہم دُور ہٹا دیں گے، وَلَنَجۡزِیَنَّهُمۡ اَحۡسَنَ الَّذِیۡ کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ: اور البتہ ضرور دیں گے ہم ان کو بہترین بدلہ اس عمل کا جو وہ کیا کرتے تھے، یعنی جو عمل وہ کرتے تھے اس کا بہترین بدلہ ہم انہیں ضرور دیں گے۔ بہترین یوں ہو گیا کہ عمل کے برابر ہی نہیں بلکہ عمل سے بڑھ کر اس کا بدلہ دیا جائے گا۔

اللہ کے حکم کے خلاف والدین کے حکم کی حیثیت

اہلِ ایمان کے لئے جس قسم کے فتنے اور آزمائشیں پیش آ رہی تھیں، ان میں سے ایک عظیم فتنہ یہ تھا کہ اگر کوئی بچہ اسلام قبول کر لیتا تو اس کے ماں باپ اس کو اپنا حق یاد دِلا کے اس راستے سے روکنے کی کوشش کرتے، یہ بھی انسان کی زندگی میں ایک امتحان ہوتا ہے کہ آپ ایک نیکی کرنا چاہتے ہیں اور والدین اس نیکی سے روکتے ہیں۔ اس زمانے میں یہ چیز تھی کہ اگر کوئی لڑکا کوئی بچہ مسلمان ہو جاتا تو والدین ان کو اپنا حق جتلاتے کہ دیکھو! ہم تمہارے ماں باپ ہیں، ہمارا کہنا ماننا تم پہ فرض ہے، یہ کون سا دِین ہوا کہ تم ماں باپ کی نافرمانی کر رہے ہو، اگر ہم تمہارے ماں باپ ہیں اور ہمارا کہنا ماننا تم پر فرض ہے تو ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ اس دِین کو چھوڑ دو اور اپنے سابق دِین کو اپنے آباؤ اجداد کے دِین کو اختیار کرو۔ چنانچہ حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں ان کے ساتھ یہی واقعہ پیش آیا، یہ اپنی والدہ کے بہت خدمت گزار تھے، والدہ مشرکہ تھی، جس وقت اس کو پتا چلا کہ میرے بیٹے نے تو اپنا دِین چھوڑ دیا، دُوسرا دِین قبول کر لیا، تو اس نے اپنے بیٹے سے کہا کہ دیکھو! میں اپنا حق تمہیں معاف نہیں کروں گی، اور میں اس وقت تک کچھ نہیں کھاؤں گی جس وقت تک تُو اپنے سابق دِین کی طرف نہ آ جائے، اور نہ ہی کچھ پیوں گی۔ مطلب یہ تھا جس کو آج کل اپنی اصطلاح میں کہتے ہیں کہ احتجاجاً اس نے بھوک ہڑتال کر دی کہ میں بھوکی مر جاؤں گی، اور یہ رُسوائی ساری زندگی تیرے سر پہ رہ جائے گی کہ اس نے اپنی ماں کو بھوکا پیاسا مار دیا۔ یا پھر تُو میرا کہنا مان، اور اپنے اس دِین کو چھوڑ دے، اور سابق دِین کی طرف آ جا، یہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے ان کی والدہ نے مطالبہ کیا کہ میں بھوک ہڑتال کرتی ہوں (آج کل کی اصطلاح کے مطابق) یعنی کھاؤں گی نہیں، پیوں گی نہیں، جس وقت تک تُو اپنے اس دِین کو نہ چھوڑ دے، اور ایسے ہی مر جاؤں گی، اور زندگی بھر کے لیے تیرے سر پہ ایک رُسوائی آ جائے گی کہ اس شخص نے اپنی ماں کو بھوکا پیاسا مار دیا۔ اور یہ بہت بڑا امتحان تھا جو سعد ابنِ ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے سامنے آ گیا۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس بات کا تذکرہ ہوا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہدایت آ گئی کہ والدین کا حق واقعی انسان پہ بہت زیادہ ہے لیکن اللہ کے مقابلے میں کچھ نہیں۔[1] اللہ تعالیٰ کا حق والدین پہ بھی ہے، والدین کی اطاعت اس وقت تک کرو جس وقت تک کہ ان کا حکم اللہ کے حکم کے مطابق ہو، اللہ کی اطاعت کے تحت تحت والدین کی اطاعت ہے، اور اگر والدین کوئی اس قسم کا حکم دے دیں جو اللہ کے حکم کے خلاف ہے، اللہ کی عبادت اور اطاعت کے خلاف ہے تو تمہارے والدین اپنے خالق اور مالک کے باغی ہو گئے، تو تم اس کی اطاعت کرو جو ان کا بھی مالک ہے، یعنی تمہارے والدین بھی اس بات کے مکلف ہیں کہ اللہ کی اطاعت کریں، اور تم بھی مکلف ہو۔ اس اللہ نے ہی تو حکم دیا ہے کہ تم والدین کا کہنا مانو، اگر والدین اس اللہ سے باغی ہو جائیں گے تو پھر یہ اس بات کے حق دار نہیں ہیں کہ ہم ان کی اطاعت کریں، ہم نے اور ہمارے والدین نے مل کے اللہ کا کہنا ماننا ہے، والدین کا حکم اللہ کے اَحکام کے تحت ہو گا تو ہم مانیں گے، ورنہ یہ اللہ کے باغی ہیں اور جو اللہ کا باغی ہو ہم اس کا کہنا

---

(۱) مسلم ۲۸۱/۲ باب فی فضل سعد بن ابی وقاص۔ ترمذی ۱۵۴/۲ کتاب التفسیر سورۃ العنکبوت۔ نیز مظہری وغیرہ۔

نہیں مان سکتے۔حدیث شریف میں صاف طور پر اس بارے میں اعلان کر دیا گیا "لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ"[1] جہاں خالق کی نافرمانی پیش آجائے وہاں کسی مخلوق کا کہنا ماننا ٹھیک نہیں ہے، کیونکہ مخلوق جو بھی ہے، چاہے ہمارا باپ ہے، چاہے ہمارا اُستاذ ہے، چاہے ہمارا پیر ہے، اللہ کی مخلوق ہے، اور وہ مخلوق ہونے کے اعتبار سے مکلّف ہے کہ اللہ کی اطاعت کرے، اور اللہ نے ہمیں حکم دیا ہوا ہے کہ تم ان کا کہنا مانو۔ اور اگر وہ اللہ کے نافرمان ہو جائیں، اس راستے سے پھر جائیں، تو اللہ کے باغی ہو گئے، تو اگر وہ اپنے بڑے کے باغی ہیں، تو ہم چھوٹوں کو پھر اپنا مطیع کس طرح سے رکھ سکتے ہیں؟ ہم تو ان کے بھی بڑے کی اطاعت کریں گے۔ اس لئے ماں باپ کا حکم شریعت کے خلاف ہو تو ماننا جائز نہیں ہے، اور اس بارے میں بچہ نافرمان نہیں سمجھا جائے گا، بلکہ والدین کے اُوپر ڈبل جرم ہو گیا کہ ایک تو اللہ کی نافرمانی کر رہے ہیں، پھر دُوسروں کو اللہ کی نافرمانی کرنے پہ برانگیختہ کر رہے ہیں، اس بارے میں ماں باپ کا ڈبل جرم ہو گیا، ایسے وقت میں ماں باپ کی نہ مانو، بلکہ اس شخص کی مانو جو اللہ کی شریعت کے مطابق تمہیں بات بتاتا ہے۔ ان آیات میں یہ ہدایت دی گئی، گویا کہ اس فتنے سے بچنے کا ایک راستہ بتا دیا گیا کہ اس کی پروا نہ کرو کہ تمہارا باپ یہ کہتا ہے، تمہاری ماں یہ کہتی ہے..... چنانچہ سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے جا کے اپنی ماں سے صاف کہہ دیا کہ تُو زندہ رہ یا مر جا، کھا، یا نہ کھا، پی یا نہ پی، تیری مرضی، میں تو اس دِین کو چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ چنانچہ جس وقت وہ مایوس ہی ہو گئی تو مایوس ہونے کے بعد پھر اس نے کھانا پینا شروع کر دیا (مظہری)، وہ سمجھ گئی کہ اس احتجاج پہ کوئی اثر مرتب ہونے والا نہیں۔ تو اس فتنے کا حل ان آیتوں کے اندر بتایا گیا ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا: وصّٰی: تاکیدی حکم دینا۔ حُسْنًا سے مراد ہے: عَمَلًا ذَا حُسْنٍ، ہم نے انسان کو اپنے والدین کے متعلق اچھا برتاؤ کرنے کی تاکید کی ہے، یہ ہوا اس کا ترجمہ، تاکید کی ہم نے انسان کو اس کے والدین کے متعلق اچھا برتاؤ کرنے کی، یعنی ہم نے انسان کو تاکیدی حکم دیا ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ وہ اچھا برتاؤ کرے۔ یہ تو ایک بنیادی چیز ہے کہ والدین کی خدمت کرنی چاہیے، ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا چاہیے، ان کی بات ماننی چاہیے۔ **وَ اِنْ جَاهَدٰكَ:** اگر وہ تیرے پہ زور ڈالیں، تیرے خلاف جہاد کریں۔ جاهد مجاهدۃً وہی لفظ ہے۔ اگر وہ تیرے پہ زور ڈالیں۔ **لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ:** تاکہ تُو میرے ساتھ شریک ٹھہرائے ایسی چیز کو جس کے متعلق تجھے کوئی علم نہیں، بے دلیل کسی کو شریک ٹھہرائے، یہ قید واقع کے مطابق ہے کہ جس کو بھی شریک ٹھہرایا جائے گا، بے دلیل ہے۔ والدین کے پاس کوئی دلیل نہیں کہ فلاں شریک ہے، اس لیے اس کو مانو۔ اگر وہ تیرے پہ زور ڈالیں تاکہ تُو شریک ٹھہرائے میرے ساتھ ایسی چیز کو جس کے متعلق تیرے پاس کوئی علم نہیں، لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ نہیں تیرے لیے اس چیز کے متعلق کوئی علم، **فَلَا تُطِعْهُمَا:** پھر ان کا کہنا نہیں ماننا، پھر ان دونوں کی اطاعت نہ کر۔ **اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ:** میری طرف تم سب کا لوٹنا ہے، **فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ:** پھر میں خبر دوں گا تمہیں ان کاموں کی جو تم کیا کرتے تھے، تمہارے ماں باپ بھی میرے پاس آنے والے ہیں تم بھی میرے پاس آنے والے ہو، پھر ہر ایک کا کردار ہر ایک کا عمل اس کے سامنے آجائے گا۔ **فَلَا تُطِعْهُمَا:**

---

(۱) مشکوٰۃ ۳۲۱/۲، کتاب الامارۃ، فصل ثانی۔ نیز مسلم ۱۲۵/۲، باب وجوب طاعۃ الامراء۔ ولفظہ: لَا طَاعَةَ فِي مَعْصِيَةِ اللهِ

نہی آ گئی، کہ پھر ان دونوں کا کہنا نہ مانو، اور شرک کے حکم میں ہی ہے ہر وہ بات جو شریعت کے خلاف ہے، شریعت کے خلاف والدین کوئی بات کہیں تو بیٹے کے لئے قطعاً ان کی اطاعت جائز نہیں ہے۔

اِتباع ''علم'' کی ہے، ''نسل، نسب'' کی نہیں!

وہاں ماں باپ کو سمجھانا چاہیے۔ دیکھئے! یہی نمونہ بتایا اللہ تعالیٰ نے مشرکینِ مکہ کو بھی، کہ تم جو ''آباء، آباء'' لگائے رکھتے ہو کہ ہم اپنے آباء کے طریقے پہ چلیں گے، اور ادھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل اور اولاد ہونے پہ فخر کرتے ہو، کہ ہم ابراہیمی ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ تو ذرا ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کا یہ نمونہ بھی تو دیکھو کہ انہوں نے اپنے باپ کے ساتھ کیا برتاؤ کیا تھا؟ انہوں نے باپ کی تقلید کی تھی؟ باپ کی اتباع کی تھی؟ یا باپ کو سیدھا راستہ دکھایا تھا؟ سورۂ مریم کے اندر تفصیل آپ کے سامنے گزر گئی: یٰۤاَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ یَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِیْۤ (آیت: ۴۳) اے میرے باپ! میرے پاس علم آ گیا جو تیرے پاس نہیں ہے، تو تجھے میری اتباع کرنی چاہیے۔ جس سے معلوم ہو گیا کہ اتباع تو ''علم'' کی ہے، ''نسل، نسب'' کی نہیں۔ اگر باپ علم والا ہے تو تم اس کے پیچھے لگ جاؤ، اگر بیٹا علم والا ہے تو باپ کو چاہیے کہ بیٹے کے پیچھے لگ جائے۔ اتباع اصل کے اعتبار سے علم کی ہے، اگر باپ علم والا ہے تو اولاد کو چاہیے کہ باپ کے پیچھے چلے۔ اور اگر باپ جاہل ہے، بیٹا علم والا ہے تو باپ کو چاہیے کہ بیٹے سے پوچھ پوچھ کے چلے کہ یہ کام کس طرح سے کرنا ہے، کس طرح سے نہیں کرنا۔ جس طرح سے سورۂ لقمان میں آئے گا وَاتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ (سورۂ لقمان: ۱۵) اس شخص کے پیچھے لگ جاؤ جس کی توجہ میری طرف ہے، والدین کو چھوڑ کے ایسے شخص کے پیچھے لگ جاؤ جبکہ والدین تمہیں غلط راستے پہ چلنے کے لیے مجبور کریں، اگلی سورت میں تفصیل آئے گی...... اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ: تم سب کا لوٹنا میری طرف ہے، فَاُنَبِّئُكُمْ: میں تمہیں خبر دوں گا، بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: ان کاموں کی جو تم کیا کرتے تھے۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں، لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِی الصّٰلِحِیْنَ: البتہ ضرور داخل کریں گے ہم ان کو اچھے لوگوں میں، آخرت میں ان کا انجام اچھے لوگوں میں ہوگا۔

کچھ لوگ ''لوگوں کی تکلیف'' کو ''اللہ کے عذاب'' کی طرح سمجھتے ہیں

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ: مِنَ النَّاسِ میں ''مِنْ'' تبعیضیہ ہے۔ لوگوں میں سے بعض وہ ہے، لوگوں میں سے کوئی وہ ہے۔ مَن چونکہ لفظاً مفرد ہے تو مفرد کے طور پر ترجمہ کریں تو آپ کی مرضی۔ اور معناً چونکہ جمع ہے اس لئے جمع کے طور پر ترجمہ کرلیں تو آپ کی مرضی۔ بعضے بعضے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو یوں کہتے ہیں، جمع کے طور پر بھی کہہ سکتے ہیں۔ یا یوں کہہ لیں کہ لوگوں میں سے بعض ایسا آدمی ہوتا ہے جو کہتا ہے اٰمَنَّا بِاللّٰهِ کہ ہم اللہ پر ایمان لے آئے، زبان سے تو ایمان کا اقرار کرتے ہیں اعلان کرتے ہیں، فَاِذَاۤ اُوْذِیَ فِی اللّٰهِ: جب اللہ کے راستے میں اسے کوئی مصیبت تکلیف پہنچائی جاتی ہے، جب اس کو ایذا دی جاتی ہے اللہ کے راستے میں، جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ: تو لوگوں کے فتنے کو اللہ کے عذاب کی طرح سمجھ لیتا ہے۔ زبان سے تو اٰمَنَّا بِاللّٰهِ کہہ

دیتے ہیں لیکن جب ان کو لوگوں کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچتی ہے۔ فتنہ: آزمائش۔ آزمائش سے یہاں مراد ہے شرارت تکلیف مصیبت، وہ چونکہ ایک آزمائشی صورت ہے اس لئے اس کو ''فتنہ'' سے تعبیر کیا گیا۔ ''اس کو اللہ کے عذاب کی طرح سمجھ لیتے ہیں'' کیا مطلب؟ کہ اتنا گھبرا جاتے ہیں کہ جس طرح سے کوئی اللہ کی گرفت میں آ گیا جس سے چھوٹنے کی کوئی صورت ہی نہیں، اس طرح سے گھبرا جاتے ہیں۔ حالانکہ انسان کی طرف سے کتنی مصیبت کیوں نہ پہنچے وہ اللہ کے عذاب کی طرح نہیں۔ اللہ کے عذاب میں تو ایک دفعہ انسان پھنس گیا تو کوئی اس کو چھڑا نہیں سکتا، کوئی اس کو نکال نہیں سکتا۔ دنیا کے اندر کوئی شخص کتنی ہی مصیبت میں کیوں نہ آ جائے، اس مصیبت سے چھوٹنے کے ہزار راستے ہیں، اور اگر کوئی راستہ بھی نہیں تو مر کر چھوٹ جائے گا، یعنی کوئی دوست احباب تسلی بھی دے سکتے ہیں، دوست احباب چھڑا بھی سکتے ہیں، مدد بھی کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی راستہ بھی نہیں ہے مصیبت سے چھوٹنے کا تو موت تو ایک راستہ متعین ہے، کہ جب انسان مر جائے گا تو چھوٹ جائے گا۔ لیکن اللہ کا عذاب تو اس طرح سے نہیں۔ تو کتنی حماقت ہے کہ لوگوں کی طرف سے پیش آمدہ مصیبت کی بنا پر انسان کُفر اختیار کر کے اللہ کے عذاب کو مول لے لے، یہ تو پھر وہ مثال ہو جائے گی کہ چھوٹی چیز سے بچنے کے لئے بڑی چیز کو لے لیا۔ جس کا عربی میں محاورہ آپ بولا کرتے ہیں کہ ''فَرَّ مِنَ الْمَطَرِ وَقَامَ تَحْتَ الْمِيْزَابِ'' بارش سے بچنے کے لئے بھاگے، پرنالے کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ تو دنیا میں اگر کوئی شخص تمہیں کُفر اختیار کرنے کے لئے کہہ رہا ہے، اور پیٹ رہا ہے، تمہیں باندھ رکھا ہے، تمہیں تکلیف تکلیف پہنچا رہا ہے، ایک تو یہ مصیبت ہے، یہ مصیبت بدن تک ہی ہے، دل کو کوئی شخص مجبور نہیں کر سکتا، اور اس مصیبت سے چھوٹنے کے بیسیوں ذریعے ہیں، اگر بالکل ہی کسی طور پر بھی نہ چھوٹ سکو تو آخر مار کھاتے کھاتے مر جاؤ گے، مر کے چھوٹ جاؤ گے، مرنے کے بعد تو انسان انسان کو عذاب نہیں دے سکتا...... اور دوسری طرف کُفر اختیار کرنے کی بنا پر اللہ کا عذاب ہے، تو انسان ان دنیاوی مصیبتوں سے بچنے کے لئے کُفر اختیار کر لے، اور اللہ کی نافرمانی اختیار کر لے، تو دُنیا کی مصیبت سے بچا اور آخرت کا عذاب لے لیا، یہ کوئی نفع کا سودا نہیں، انسان کی مصیبت اللہ کے عذاب کی طرح نہیں، اللہ کا عذاب زیادہ سخت ہے، اس لئے اس عذاب سے بچنے کی کوشش کیا کرو، اور اس عذاب سے بچنے کے لئے اگر دنیا میں مصیبتیں برداشت کرنی پڑ جائیں تو حوصلہ رکھا کرو، دونوں عذابوں میں سے ایک عذاب اگر اختیار کرنا ہے، ایک آخرت کا عذاب، ایک دُنیا میں لوگوں کی طرف سے مصیبت، تو پھر لوگوں کی طرف سے مصیبت یہ اھون ہے اس کو برداشت کر لو، آخرت کا عذاب برداشت کا نہیں ہے۔ تو بعض لوگ وہ ہیں جو زبان سے تو امنا باللہ کہہ دیتے ہیں، پھر جب تکلیف پہنچائے جاتے ہیں اللہ کے راستے میں تو لوگوں کی مصیبت کو اللہ کے عذاب کی طرح سمجھ لیتے ہیں، یعنی ایسے حوصلہ چھوڑ دیتے ہیں بے دست و پا ہو جاتے ہیں گویا کہ اللہ کی طرف سے عذاب آ گیا جس سے چھوٹنے کی کوئی صورت ہی نہیں۔

منافقین کا طریقہ

وَلَىِٕنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ: اب اندر اندر سے تو ہو گئے کافر، مل گئے کافروں کے ساتھ ان مصیبتوں کی وجہ سے، ان

پریشانیوں کی وجہ سے۔اور جس وقت اللہ کی طرف سے کوئی مدد آ جاتی ہے، مسلمانوں کو غلبہ ہو گیا، پھر البتہ ضرور کہیں گے یہی لوگ، اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ بے شک ہم تو تمہارے ساتھ تھے۔ یہ کمزور لوگوں کا کام ہے کہ جدھر سے تکلیف پہنچی اُدھر ڈھیلے ہو گئے، اور جب دوسری طرف غلبہ نمایاں ہوا تو ان کے ساتھ مل کے کہہ دیا کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔جس طرح سے منافقین کا طریقہ ہوتا تھا۔ اور اگر آ گئی مدد تیرے رَبّ کی طرف سے، البتہ ضرور کہیں گے یہی لوگ کہ بے شک ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ کیا اللہ تعالیٰ جانتا نہیں ان باتوں کو جو جہانوں کے دلوں میں ہے۔صدور صدر کی جمع بمعنی سینہ، سینہ بول کے دل مراد ہوتا ہے۔جو تمام جہانوں کے لوگوں کے دلوں میں ہیں کیا اللہ تعالیٰ ان باتوں کو جانتا نہیں؟ تو وہ نہیں جانتا؟ کہ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ کہاں تک سچا ہے، جب لوگوں کی طرف سے ذرا مار پڑی تھی تو کس طرح یہ اسلام کی طرف سے بد دِل ہو گئے تھے اور کُفر کے ساتھ مانوس ہو گئے تھے۔کیا اللہ کو پتا نہیں؟ جو زبان سے کہہ کے دھوکا دینا چاہتے ہیں کہ ''اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ہم تو تمہارے ساتھ تھے۔''

وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ: البتہ ضرور جانے گا اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں، اور البتہ ضرور جانے گا منافقین کو، یعنی ان واقعات کے ذریعے سے منافقین اور مؤمنین کو اللہ ممتاز کرے گا، یہ دونوں گروہ ظاہری طور پر ممتاز ہو جائیں گے، اس لیے یہ واقعات اور یہ مصیبتیں انسانوں کے اُوپر بھیجی جاتی ہیں۔منافقین وہ جو زبان سے کہتے تھے: اٰمَنَّا بِاللّٰهِ اور مصیبتوں کے اندر آ کے ڈھیلے ہو جاتے ہیں اور دل دل سے ادھر کو پھر جاتے ہیں، پھر دوسرے وقت میں کہتے ہیں اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ، اس قسم کا کردار تبھی تو نمایاں ہوگا جب اللہ کی طرف سے آزمائش آئے گی، اور اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش نہ آئے تو آپ جانتے ہیں کہ ہر کوئی اپنی جگہ مخلص بنتا ہے۔

کُفّار کے بہکانے کا ایک اور طریقہ

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ: یہ بھی ایک فتنے کی نشاندہی ہے جو گمراہ کرنے کے لئے کافروں کی طرف سے مؤمنوں کے سامنے پیش آتا تھا۔اس کو یوں سمجھئے کہ بسا اوقات آپ کا کوئی بڑا، یا آپ کا کوئی دوست آپ کو ایک طریقے پہ چلانا چاہتا ہے، اور آپ ڈرتے ہیں کہ بھائی! یہ طریقہ تو ٹھیک نہیں، اس میں تو ہم خسارے میں رہ جائیں گے، نقصان میں رہ جائیں گے۔تو وہ آپ کا بزرگ یا آپ کا بڑا، دوست، آپ سے ہمدردی کرتا ہوا کہتا ہے کہ نہیں دیکھ! میں تجھ سے زیادہ تجربہ کار ہوں، میں دنیا اور زندگی کے نشیب و فراز کو جانتا ہوں، میرے کہنے کی بنا پر تو یہ کر لے، جو نقصان ہوگا اس کا ذمہ دار میں ہوں، چھوٹوں کے دماغ کے اوپر یہ زور ڈالا جاتا ہے کہ یہ راستہ اختیار کر لو، یوں کر لو، اور ذمہ دار ہم ہیں، اگر کسی قسم کا نقصان ہو گیا، آپ کو کوئی تکلیف پہنچی تو ہم ذمہ لیتے ہیں، تو ہم پر اعتماد کریں، ہم پر اعتماد کر کے ہمارے مشورے پہ چل پڑیں۔ یہ بھی بہکانے کا ایک طریقہ ہوتا ہے.....تو وہ بچے جو مسلمان ہو جاتے تھے، تو ان کے والدین ان کو یوں بھی کہتے، یا ان کے بڑے یا ان کے مخلص دوست جن کو وہ سمجھتے تھے کہ یہ ہمارے دوست ہیں، وہ کہتے تھے بھائی! کیوں خواہ مخواہ اپنا آبائی دِین چھوڑ رہے ہو، برادری سے علیحدہ ہو رہے ہو، گھروں میں فتنے ڈال رہے ہو، تم اسی طریقے پہ چلو، باقی یہ جو تم کہتے ہو کہ اللہ کا عذاب ہوگا، یوں ہوگا، کچھ نہیں

ہوگا، ہمیں پتا ہے، ہم اس بات کے ذمہ دار ہیں، اگر کوئی ایسی بات ہو ہی گئی تو تمہارے گناہ ہمارے سر، تمہارے گناہ ہم اُٹھالیں گے، اس طرح سے بہکانے کی کوشش کرتے۔ آپ اپنے حالات میں جس وقت غور کریں گے، تو معلوم ہوگا کہ کسی کو پیچھے لگانے کا ایک یہ طریقہ بھی ہوتا ہے، لوگ کہتے ہیں کہ آجاؤ، ہمارے ساتھ آجاؤ، بھئی! اگر کوئی نقصان ہوگیا تو ذمہ داری ہم پہ ہے۔

آخرت میں کوئی کسی کا بوجھ نہیں اُٹھا سکے گا

دنیا کے اندر تو انسان ذمہ داری لے سکتا ہے کہ میں آپ کو ایک تجارت کا طریقہ بتادوں اور ذمہ داری اٹھالوں کہ یہ نفع کا سودا ہے، لیکن آپ کو سو، دو سو، چار سو، پانچ سو نقصان ہوگیا تو میں اپنی جیب سے بھر دوں، کہ لے بھئی! تُو نے میرے کہنے کی وجہ سے یہ کام کیا تھا، اور تیرا نقصان ہوگیا تو اس کی تلافی میں کر دیتا ہوں، دنیا میں تو ایسا ہوتا ہے۔ لیکن آخرت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یوں نہیں ہوگا، کبھی ان کے بہکاوے میں نہ آنا یہ سمجھ کے کہ چلو! اگر عذاب ہوا تو ہماری جگہ یہ اٹھالیں گے، ایسا نہیں، ان کو مستقل دوہرا عذاب ہوگا، ایک خود گمراہ ہونے کا، اور ایک دوسروں کو گمراہ کرنے کا، لیکن جو بدکردار ہے اس کو اپنی سزا بھی بھگتنی پڑے گی، اس لئے ان بوڑھوں وڈوں کے پیچھے لگ کے کہیں یہ غلطی نہ کر بیٹھنا، کہ یہ تمہیں کہتے ہیں کہ تمہارے گناہ ہم اٹھالیں گے، تمہارے ذمے دار ہم ہیں، وہاں کوئی ذمہ داری نہیں اٹھائے گا، ایسا کہنے والوں پر تو دوہرا عذاب ہو جائے گا، باقی! جو ان کے پیچھے لگ کے بدکردار ہو گیا، آخرت میں عذاب سے چھوٹے گا وہ بھی نہیں۔ اس میں بھی بسا اوقات چھوٹے بڑوں کے ادب واحترام میں اور دباؤ میں آ کے دوسروں کے پیچھے لگ جاتے ہیں، کہ چلو بھائی! یہ کہہ جو رہا ہے، اور سمجھ دار ہے، عقل مند ہے، تجربہ کار ہے۔ چاہے ہمیں بات سمجھ میں نہیں آتی، چلو! ہم اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں، ذمہ داری جو لے رہا ہے، اگر کل کو کوئی گڑبڑ ہوگئی ہم انہیں ہی پکڑیں گے کہ بھئی! تم نے یوں کہا تھا، اب اس مصیبت سے ہمیں بچاؤ، اور جب انسان کوئی ذمہ داری اٹھایا کرتا ہے تو پھر ایسے موقع پر وہ کوشش کرتا ہے کہ میں اپنی ذمہ داری کو نبھاؤں، تو یہ مغالطہ دینے کی بھی کافر کوشش کرتے تھے ان لوگوں کو جو کہ ایمان لاتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ یہاں فرماتے ہیں کہ دیکھنا! کہیں اس مغالطے میں نہ آجانا، یہ بھی ایک فتنہ ہے جو ایمان سے روکنے کے لئے کافروں کی طرف سے پیش آرہا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: کہا ان لوگوں نے جنہوں نے کُفر کیا ان لوگوں کو جو ایمان لے آئے، اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا: تم ہمارے طریقے کی اتباع کرلو، وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ: اور اٹھالیں گے ہم تمہارے گناہ۔ اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ تمہارے طریقے پر چلنے سے ہمیں گناہ لازم آتا ہے تو تمہارا گناہ ہم اُٹھالیں گے، ذمہ داری ہم پہ رہی۔ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ: نہیں ہیں یہ اُٹھانے والے ان کے گناہوں میں سے کچھ بھی۔ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ: یہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ جب موقع آئے گا تو گناہ کرنے والوں کے گناہ انہی کے سر پر پڑیں گے جنہوں نے گناہ کیے ہیں، یہ جو کہتے ہیں کہ ہم اٹھالیں گے، یہ خلاف واقع بات ہے، بالکل نہیں اُٹھائیں گے، ایسا نہیں ہوگا، دنیا کے معاملات پر کہیں آخرت کے معاملات کو قیاس نہ کر لینا۔ وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ: البتہ ضرور اٹھائیں

گے یہ لوگ اپنے بوجھ، وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ: اور اپنے بوجھوں کے ساتھ اور بوجھ بھی، یعنی دوسروں کو گمراہ کرنے کے۔ ایسا کہنے والے بہکانے والے، ان پر تو دوہرا گناہ پڑ جائے گا، ایک اپنے کفر اور شرک کا، اور دوسروں کو بہکانے کا، لیکن جو گناہ کرنے والے ہیں چھوٹیں گے وہ بھی نہیں، اس لئے اس دھوکے میں بھی نہ آجائیو، تو یہ بھی ایک فتنہ ہے ان فتنوں میں سے جو مسلمانوں کے سامنے پیش آتا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں ہدایات دیدیں۔ وَلَيَحْمِلُنَّ: البتہ ضرور اٹھائیں گے وہ اپنے بوجھ اور اس کے علاوہ اور بوجھ اپنے بوجھوں کے ساتھ، وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ: اثقال ثقل کی جمع ہے، ثقل بوجھ کو کہتے ہیں۔ وَلَيُسْـَٔلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ: البتہ ضرور پوچھے جائیں گے قیامت کے دن، عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ: ان باتوں کے متعلق جو یہ جھوٹی تراشا کرتے تھے، جھوٹی باتیں جو بنایا کرتے تھے ان کے متعلق پوچھا جائے گا کہ یہ تم نے کیسے کہہ دیا تھا؟ کہ ہم تمہارے گناہ اٹھالیں گے۔ اس کا تمہارے پاس کیا ثبوت تھا؟ ان باتوں کے متعلق ان سے پوچھا جائے گا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ۭ

البتہ تحقیق بھیجا ہم نے نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف، پس ٹھہرے نوح ان میں ایک ہزار سال سوائے پچاس سال کے

فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَجَعَلْنٰهَآ

پھر ان کو طوفان نے پکڑ لیا اس حال میں کہ وہ ظالم تھے ﴿۱۴﴾ پھر ہم نے نجات دی نوح علیہ السلام کو اور کشتی والوں کو، اور ہم نے بنا دیا اس واقعے کو

اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۵﴾ وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ

جہان والوں کے لئے نشانی ﴿۱۵﴾ اور ہم نے ابراہیم کو بھیجا جبکہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا: اللہ کی عبادت کرو اور اسی سے ڈرو، یہ بہتر ہے

لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶﴾ اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ۭ

تمہارے لئے اگر تم جانو ﴿۱۶﴾ اس کے سوا کچھ نہیں کہ پوجتے ہو تم اللہ کے علاوہ بتوں کو، اور جھوٹی باتیں گھڑتے ہو،

اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ

جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے علاوہ وہ تمہارے لئے رزق کا کوئی اختیار نہیں رکھتے، اللہ ہی کے پاس رزق طلب کرو،

وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۭ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ

اسی کی عبادت کرو اور اسی کے شکر گزار رہو، اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ﴿۱۷﴾ اور اگر تم تکذیب کرتے ہو پس تحقیق جھٹلایا تم سے پہلے

مِنْ قَبْلِكُمْ ۗ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿١٨﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ

بھی مختلف جماعتوں نے، نہیں ہے رسول کے ذمے مگر صریح طور پر پہنچادینا ﴿۱۸﴾ کیا نہیں دیکھتے یہ کہ کیسے شروع کرتا ہے اللہ تعالیٰ

الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۗ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿١٩﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ

پیدا کرنے کو، پھر وہی اس خلق کو لوٹائے گا، بے شک یہ بات اللہ پر آسان ہے ﴿۱۹﴾ آپ کہہ دیجئے کہ چلو پھرو زمین میں

فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ

پھر دیکھو کیسے شروع کرتا ہے اللہ تعالیٰ پیدا کرنے کو، پھر اللہ ہی اُٹھائے گا دوسری مرتبہ اُٹھانا، بے شک اللہ ہر چیز کے اُوپر

قَدِيْرٌ ﴿٢٠﴾ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ ﴿٢١﴾ وَمَآ اَنْتُمْ

قدرت رکھنے والا ہے ﴿۲۰﴾ عذاب دے گا جس کو چاہے گا، رحم کرے گا جس پر چاہے گا، اور اسی کی طرف تم پھیرے جاؤ گے ﴿۲۱﴾ اور نہیں ہو تم

بِمُعْجِزِيْنَ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِى السَّمَآءِ ۡ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿٢٢﴾

عاجز کرنے والے زمین میں اور نہ آسمان میں، اور نہیں ہے تمہارے لئے اللہ کے علاوہ کوئی حمایتی اور نہ مددگار ﴿۲۲﴾

تفسیر

آگے واقعات کا سلسلہ شروع ہو گیا، اور اِن واقعات میں بھی یہی بات بتانی مقصود ہے کہ پہلے انبیاء علیہم السلام نے اور ان کے ماننے والوں نے کیسی کیسی مصیبتیں اُٹھائیں، اور پھر ان کے سامنے کیسا اچھا نتیجہ آیا؟ واقعات انسان کے دل کو بڑھانے والی چیز ہے اور واقعات سُن کے انسان کا حوصلہ بڑھتا ہے کہ واقعی اس میدان میں میں اکیلا نہیں ہوں جو میرے اوپر یہ مصیبتیں آرہی ہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا نام لینے والے پہلے بھی اسی طرح سے پریشان ہوئے، کافروں نے پریشان کیا۔ اور جنہوں نے مصیبتیں اُٹھائیں آخر کامیاب وہی رہے، ان واقعات سے یہ سبق ملتا ہے۔ بار بار گزر چکے ہیں، اس لئے ان کو سرسری طور پہ دیکھ لیجئے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی عمر، مدتِ تبلیغ، اور قوم کا انجام

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ: البتہ تحقیق بھیجا ہم نے نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف۔ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ: ٹھہرے نوح علیہ السلام ان میں ایک ہزار سال، اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا سوائے پچاس سال کے، استثناء ہوتا ہے تکلم بالباقی بعد الثنیا، ہزار میں سے پچاس نکال کے باقی کے اوپر لَبِثَ کا حکم ہے یعنی ساڑھے نو سو سال ٹھہرے، ہزار میں سے پچاس کم سال ٹھہرے، یعنی ساڑھے نو سو سال اس قوم میں حضرت نوح علیہ السلام ٹھہرے۔ مفسرین کہتے ہیں کہ یہ ٹھہرنا بحیثیت پیغمبر ہونے کے تھا، چالیس سال کی عمر میں اگر

پیغمبری ملی ہو، نبوّت کا اظہار ہوا ہو، ساڑھے نوسو سال مبلغ ہونے کی حیثیت سے ٹھہرے، تو کتنے سال ہو گئے؟ ۹۹۰۔ اور پھر آ گیا طوفان، طوفان کے بعد بھی حضرت نوح علیہ السلام کافی دیر تک زندہ رہے ہیں۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈیڑھ سو سال تک زندہ رہے ہیں، اگر وہ ڈیڑھ سو سال بھی ساتھ شامل کر لیا جائے، تو حضرت نوح علیہ السلام کی عمر ۱۱۴۰ سال بنتی ہے۔ اور اس زمانے میں لوگوں کی عمریں زیادہ زیادہ تھیں، تو ساڑھے نوسو سال حضرت نوح علیہ السلام نے کافروں میں تبلیغ کی، فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ: نتیجہ سامنے ہے۔ پھر ان کافروں کو طوفان نے پکڑ لیا، وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ: اس حال میں کہ ظالم تھے فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ: پھر ہم نے نوح علیہ السلام کو نجات دی اور کشتی والوں کو نجات دی، وَجَعَلْنٰهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ: اور ہم نے اس واقعے کو جہانوں کے لئے نشانی بنایا، جَعَلْنٰهَآ میں ''ھا'' ضمیر واقعہ کی طرف لوٹ رہی ہے (آلوسی وغیرہ)۔ نوح علیہ السلام کو جو واقعہ پیش آیا، مؤمنین کو اور کافرین کو جو واقعہ پیش آیا وہ لوگوں کے لئے ایک نشانی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ردِّ شرک

وَاِبْرٰهِيْمَ: اور ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو بھیجا۔ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ: قابلِ ذکر ہے وہ وقت جبکہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا۔ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ: اللہ کی عبادت کرو، اور اسی سے ڈرو۔ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ: یہ بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم جانو، اگر تمہیں کچھ علم ہے تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا: اس کے سوا کچھ نہیں کہ پُوجتے ہو تم اللہ کے علاوہ بتوں کو، اوثان وثن کی جمع ہے، وثن بت کو کہتے ہیں۔ عبادت کرتے ہو تم اللہ کے علاوہ بتوں کی۔ وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا: اور جھوٹی باتیں گھڑتے ہو۔ افك کہتے ہیں بدترین قسم کے جھوٹ کو۔ سورۂ نور کے اندر بھی یہی لفظ آیا تھا اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ (آیت:۱۱)، اور دوسری جگہ ہے: مِنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ۙ وَلَدَ اللّٰهُ (سورۂ صافات:۱۵۱) جھوٹ بکتے ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ کی اولاد ہے، اللہ نے کوئی بچا جنا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: جن کو تم پُوجتے ہو اللہ کے علاوہ، لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا: وہ تمہارے لئے رزق کا کوئی اختیار نہیں رکھتے، یعنی تم اس لئے پُوجتے ہو کہ تمہیں بارش دیتے ہیں، تمہیں روٹی دیتے ہیں، تمہارے لئے رزق کا سامان مہیا کرتے ہیں، بالکل غلط ہے، یہ کچھ اختیار نہیں رکھتے۔ نہیں مالک تمہارے لیے رزق کے، فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ: اللہ ہی کے پاس رزق طلب کرو۔ وَاعْبُدُوْهُ: اسی کی عبادت کرو، وَاشْكُرُوْا لَهٗ: اور اسی کے شکر گزار رہو۔ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ: اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ جو نعمت ملتی ہے اس کو بتوں کی طرف منسوب کر کے اللہ کی ناشکری نہ کرو، جو کچھ ہے، جو کچھ ملتا ہے سب اللہ کی جانب سے ہے، شکر گزاری بھی اسی کی کرو، اور جس چیز کی تمہیں ضرورت ہے وہ مانگو بھی اسی سے۔ وَاِنْ تُكَذِّبُوْا: اور اگر تم تکذیب کرتے ہو جھٹلاتے ہو، میری باتوں پہ ایمان نہیں لاتے، فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ: پس تحقیق جھٹلایا تم سے پہلے بھی مختلف جماعتوں نے۔ اُمم اُمت کی جمع ہے۔ قومِ نوح، قومِ عاد اور قومِ ثمود، یہ ساری حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے گزر چکی تھیں۔ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ: نہیں ہے رسول کے ذمے مگر بلاغِ مبین، صریح طور پر پہنچا دینا، کھول کھول کے پہنچا دینا، ہر بات کی وضاحت کر دینا۔

آخرت کی یاددہانی کے لیے کچھ آیاتِ قدرت

اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ: یہ درمیان میں آیات اللہ تعالیٰ کی طرف سے اضافہ ہے آخرت کی یاددہانی کے لئے، جو اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کلام کے اندر بات آئی کہ اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے، اس لوٹانے پر بھی مشرکین شک کرتے تھے۔ تو اس "لوٹائے جانے" کی وضاحت کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ آگے اپنی قدرت کی طرف اور اپنے انعامات کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ آئے گا۔ اور یہ آیات بھی آپ کے سامنے بارہا گزر چکیں۔ کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ کیسے اللہ تعالیٰ شروع کرتا ہے پیدا کرنے کو، مخلوق کی ابتداء کس طرح سے کرتا ہے؟ دیکھو! فصل اُگتی ہے، عروج پہ جاتی ہے، سوکھتی ہے، انسان پیدا ہوتے ہیں، مرتے ہیں۔ اس طرح سے پیدا کرنا، اور ایک چیز کو ختم کرنا دوسری کو لانا، یہ روزمرہ کے واقعات ہیں جن کو دیکھ کے یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اللہ کی قدرت کیسی ہے؟ کیا نہیں دیکھتے یہ کہ کیسے شروع کرتا ہے اللہ تعالیٰ پیدا کرنے کو، ثُمَّ يُعِيْدُهٗ: اس کا ترجمہ استقبال کے ساتھ کر لیجئے، پھر وہی اس خلق کو لوٹائے گا، اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ: بے شک یہ بات اللہ پر آسان ہے، یہ ابتداءً پیدا کرنا دوبارہ لوٹانا اللہ کے اُوپر آسان ہے، کوئی مشکل نہیں۔ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ: اور آپ کہہ دیجئے کہ چلو پھرو زمین میں، پھر دیکھو! کیسے شروع کرتا ہے اللہ تعالیٰ پیدا کرنے کو؟ پھر اللہ ہی پیدا کرے گا، اُٹھائے گا دوسری مرتبہ اُٹھانا، پھر پچھلا اُٹھانا دوبارہ اُٹھانا بھی اللہ تعالیٰ ہی کرے گا۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ: بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کے اُوپر قدرت رکھنے والا ہے۔

اللہ کے تصرفات میں کوئی دخل نہیں دے سکتا

يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ: عذاب دے گا جس کو چاہے گا، رحم کرے گا جس پر چاہے گا، اس کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ اللہ کے معاملات میں کسی دوسرے کو دخل نہیں، یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی کو عذاب دینا چاہے تو کوئی سفارش کر کے اس پر رحم کروادے، یا اللہ کسی کے اُوپر رحم کرنا چاہے تو کوئی شکایت کر کے اسے پکڑوادے، یہ بات نہیں، تو مَنْ يَّشَآءُ کا یہ معنی ہے۔ ورنہ یہ نہیں کہ وہاں قاعدہ قانون بھی کوئی نہیں ہے، جس کو چاہے پکڑ کر عذاب دے دے، جس پر چاہے رحم کرے، ایسا نہیں، پکڑنا بھی اللہ کے اپنے ضابطے اور قانون کے تحت ہے جو اس نے بنایا ہے، رحم کرنا بھی اللہ تعالیٰ کے ضابطے اور قانون کے تحت ہے جو اس نے بنایا ہے۔ یہ جو کہا "جس کو چاہے عذاب دے، جس پر چاہے رحم کرے"، رحم اسی پہ کرے گا جو اس کے قاعدے کے مطابق رحم کے لائق ہوگا، اور عذاب اسی کو دے گا جو اپنے کرتوتوں کی بنا پر عذاب کا مستحق ہوگا، یہ "جس کو چاہے گا" کا لفظ جو کہا جا رہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی دوسرے کا دخل نہیں۔ اللہ عذاب دینا چاہے کوئی دوسرا چھڑا لے ایسا نہیں ہو سکتا، اللہ رحم کرنا چاہے کوئی شکایت کر کے پکڑوادے ایسا نہیں ہو سکتا، اس بارے میں اللہ تعالیٰ خودمختار ہے، جس کو چاہے گا عذاب دے گا کوئی دوسرا رکاوٹ نہیں ڈال سکے گا، لیکن عذاب دینا کس کو چاہے گا؟ جو بداعمال ہوگا، اس کے قاعدے اور قانون کے مطابق عذاب کا مستحق ہوگا۔ جس پہ چاہے گا

رحم کرے گا کوئی شخص اس کی رحمت سے روک نہیں سکتا، باقی! رحم کس پہ کرے گا؟ جو اس کے قاعدے اور ضابطے کے مطابق رحمت کے لائق ہوگا۔ تو اس میں اللہ تعالیٰ کے اختیار کو ذکر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تصرفات میں کوئی دوسرا ٹانگ نہیں اڑا سکتا۔ وَاِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ اور اسی کی طرف تم پھیرے جاؤ گے۔ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ: اور نہیں ہو تم عاجز کرنے والے زمین میں اور نہ آسمان میں، نہ زمین میں کہیں چھپ سکتے ہو، نہ آسمان میں چڑھ کے کہیں گم ہو سکتے ہو۔ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ: اور نہیں ہے تمہارے لئے اللہ کے علاوہ کوئی یار، نہ کوئی مددگار۔ ولی: حمایت کرنے والا۔ نصیر: مدد کرنے والا۔ تمہارا کوئی حامی کوئی یار اور مددگار نہیں اللہ کے علاوہ۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَلِقَآئِهٖٓ اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ

اور وہ لوگ جنہوں نے انکار کیا اللہ کی آیات کا اور اس کی ملاقات کا، یہ لوگ مایوس ہیں میری رحمت سے، اور یہی لوگ ہیں کہ ان کے لئے

عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۳﴾ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ

عذاب الیم ہے ﴿۲۳﴾ پس نہیں تھا ان کی قوم کا جواب مگر یہی کہ قتل کردو اسے یا جلا دو اسے،

فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَقَالَ اِنَّمَا

پھر اللہ نے اُس کو آگ سے نجات دی، اس میں البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں ﴿۲۴﴾ اور ابراہیم نے فرمایا: اس کے سوا کچھ نہیں

اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ

کہ تم نے بت اختیار کیے ہیں اللہ کے علاوہ، دُنیوی زندگی میں آپس میں محبت کی وجہ سے، پھر قیامت کے دن تمہارا بعض بعض کا

بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۡ وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۵﴾

انکار کرے گا، اور تمہارا بعض بعض پہ لعنت کرے گا، تمہارا ٹھکانا جہنم ہے اور تمہارے لئے کوئی مددگار نہیں ﴿۲۵﴾

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۶﴾

ایمان لے آئے ابراہیم کے لئے لُوط، اور ابراہیم نے کہا: بے شک میں ہجرت کرنے والا ہوں اپنے رب کی طرف، بے شک وہ زبردست ہے حکمت والا ہے ﴿۲۶﴾

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ

اور ہم نے عطا کیا ابراہیم کو اسحاق اور یعقوب، اور کی ہم نے اس کی اولاد میں نبوت اور کتاب، اور دیا ہم نے اس کو اس کا اجر

فِي الدُّنْيَا ۚ وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ ﴿٢٧﴾ وَلُوطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ

دُنیا میں، اور بے شک وہ آخرت میں بھی اچھے لوگوں میں سے ہیں ﴿۲۷﴾ اور بھیجا ہم نے لُوط علیہ السلام کو جبکہ کہا انہوں نے اپنی قوم کو بے شک تم

الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِنَ الْعَالَمِينَ ﴿٢٨﴾ أَئِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ

آتے ہو بے حیائی کو، نہیں سبقت لے گیا تم سے اس بے حیائی کے ساتھ جہانوں میں سے کوئی بھی ﴿۲۸﴾ کیا تم آتے ہو مردوں کے پاس

وَتَقْطَعُونَ السَّبِيلَ ۙ وَتَأْتُونَ فِي نَادِيكُمُ الْمُنْكَرَ ۖ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا

اور قطع کرتے ہو راستے کو اور آتے ہو تم اپنی مجلس میں بُرائی پر، پس نہیں تھا جواب اس کی قوم کا مگر یہی کہ کہنے لگے:

ائْتِنَا بِعَذَابِ اللَّهِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿٢٩﴾ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِي عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِينَ ﴿٣٠﴾

لے آ تُو اللہ کا عذاب اگر تُو سچوں میں سے ہے ﴿۲۹﴾ لُوط علیہ السلام نے کہا: اے میرے رَبّ! میری مدد کر ان فسادی لوگوں پر ﴿۳۰﴾

تفسیر

وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ وَلِقَائِهِ: اور وہ لوگ جنہوں نے انکار کیا اللہ کی آیات کا اور اس کی ملاقات کا، أُولَٰئِكَ يَئِسُوا مِنْ رَحْمَتِي: یہ لوگ مایوس ہیں میری رحمت سے، یعنی جب اللہ کی طرف پھیرے جائیں گے تو نتیجہ آخر میں جا کے یہ نکلے گا۔ وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا اور اللہ کی ملاقات کا انکار کیا، اللہ کے احکام کے بھی منکر ہیں، اور اللہ کی ملاقات کے بھی منکر ہیں آخرت کا عقیدہ نہیں رکھتے، یہی لوگ ہیں جو میری رحمت سے مایوس ہیں۔ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ: اور یہی لوگ ہیں کہ ان کے لئے عذابِ الیم ہے۔ یہ درمیان میں آیت آ گئی تھی تذکیرِ آخرت کے لئے اور آخرت کا امکان ثابت کرنے کے لئے اللہ کی قدرت کی طرف متوجہ کیا، آگے وہی قصہ ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا۔

قومِ ابراہیم کا جاہلانہ رَدِّعمل اور اس کا انجام

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا اقْتُلُوهُ أَوْ حَرِّقُوهُ فَأَنْجَاهُ اللَّهُ مِنَ النَّارِ: اس کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ انبیاء میں گزر چکی ہے۔ ان کی قوم کا جواب نہیں تھا مگر یہی۔ کتنی دلیلوں کے ساتھ سمجھایا، ستاروں کے بارے میں گفتگو کی، پتھر کی مورتیوں کے بارے میں گفتگو کی، ان کے کردار پر تبصرہ کیا، ہر قسم کے معقول دلائل حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم کو سمجھانے کے لیے دیے مگر... نہیں تھا اس کی قوم کا جواب مگر یہی، یعنی اس کے علاوہ قوم کے پاس کوئی جواب ہی نہیں تھا، جاہلوں والا وہی ڈنڈا، وہی مکّا، کہ جب دلیل کا جواب دلیل سے نہ ہو، تو پھر لڑنے پہ آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی جواب نہیں تھا کہ قتل کروا دے، یا جلا دوا دے۔ پھر آخر مشورہ جلانے کا ہوا تھا جیسے سورۂ انبیاء میں تفصیل آئی۔ فَأَنْجَاهُ اللَّهُ مِنَ النَّارِ: پھر اللہ نے اس کو آگ سے نجات

دی۔ یہ واقعہ گزر چکا۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ: اس میں البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں، ایمان لانے والوں کے لئے نشانیاں ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیسی تکلیفیں اٹھائیں، کیسی مصیبتیں اٹھائیں، کافر اپنے زور میں آ کے اپنی سلطنت کے اعتماد پہ کس طرح سے انہیں تکلیف پہنچانا چاہتے تھے ہلاک کرنا چاہتے تھے، آخر اللہ کی رحمت نے ان کی دستگیری کس طرح سے کی، یہ سب اس واقعے میں نشانیاں ہے۔

''مَوَدَّةَ بَیْنِكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا'' کے دو مفہوم

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا: اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَیْنِكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ ثُمَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّ یَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۘ وَّ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ: اس کا ترجمہ ذرا دیکھ لیجئے! حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا، اس کے سوا کچھ نہیں کہ تم نے اللہ کے علاوہ اَوثان اختیار کئے ہیں۔ اوثان وَثَن کی جمع۔ تم نے بُت اختیار کئے ہیں، اللہ کے علاوہ تم نے بُت بنائے ہیں، بُت اختیار کیے ہیں۔ کیوں اختیار کئے ہیں، مَّوَدَّةَ بَیْنِكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا: دنیوی زندگی میں آپس میں محبت کی وجہ سے۔ ایک ترجمہ یوں ہے، دنیوی زندگی میں آپس میں محبت کی وجہ سے تم نے یہ بُت اختیار کئے ہیں، مطلب اس کلمہ ہے کہ معقول دلیل تو تمہارے پاس ہے نہیں، پچھلے اگلوں کی محبت میں آ کے اگلوں کے طریقے پہ چلتے چلے جارہے ہیں، بیٹے اپنے آباء کے ساتھ تعلق کی بنا پر، اپنے آباء کے ساتھ محبت کی بنا پر جو طریقہ انہوں نے اپنایا ہوا تھا وہی کرتے جارہے ہیں، یہ دنیوی زندگی میں محبت کی وجہ سے تم نے ان اوثان کو اختیار کرلیا، بتوں کو اختیار کرلیا، ورنہ معقول دلیل تو تمہارے پاس ہے نہیں۔ آج آپس میں تعلقات اور محبت کی وجہ سے تم اس گمراہی میں مبتلا ہو، کل کو ایک دوسرے پر لعنت کرو گے، پچھلے اگلوں پہ لعنت کریں گے، چھوٹے بڑوں پہ لعنت کریں گے، اور بڑے چھوٹوں پہ لعنت کریں گے، جس طرح سے قرآنِ کریم میں بارہا جہنم کے اندر ان لوگوں کے واقعات سنا دیے گئے، تابع اپنے متبوعین پہ لعنت کریں گے، یَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا کا نقشہ کئی جگہ آیات میں ظاہر کیا گیا، کہ آج تو تم تعلقات کی بنا پر اس بُت پرستی میں لگے ہوئے ہو، لیکن یہ تعلقات دنیوی زندگی کی حد تک ہی ہیں، اور کل کو جس وقت قیامت آ جائے گی، اکٹھے ہو گے، پھر چھوٹے بڑے سب ایک دوسرے پہ لعنت کریں گے، یہ محبتیں وصحبتیں سب ختم ہو جائیں گی۔ یہ تو ایک مفہوم ہو گیا کہ آپس میں دنیوی زندگی میں محبت کی وجہ سے تم نے ان اوثان کو اختیار کیا اللہ کے علاوہ، ان بتوں کو اختیار کیا ہے، تعلقات کی بنا پر، محبت کی بنا پر۔ پچھلے جو ہیں وہ اگلوں کے ساتھ تعلق اور محبت کی بنا پر اسی طریقے پہ چل رہے ہیں۔

یا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے، اس دوسرے مطلب کے لئے آپ اس بات کو ذہن میں رکھئے جو پچھلی سورت میں آپ کے سامنے ذکر کی تھی کہ مشرکینِ مکہ نے قبائل کے ساتھ تعلقات جوڑنے کے لئے ان کے بُت جو تھے وہ بیت اللہ میں اکٹھے کر رکھے تھے۔ تو قبائلی تعلقات کی بنا پر تم نے بُت پرستی کو اختیار کیا ہے، یعنی اس بُت پرستی کو آپس میں دنیوی زندگی میں محبت کا ذریعہ بنایا ہوا ہے، کہ ایک ہی طریقہ ہو سب کا تا کہ سب کی آپس میں محبت رہے، اگر ہم یہ بُت نہیں پُوجیں گے تو باقیوں سے تعلقات ٹوٹ جائیں

گے،قومی شیرازہ مجتمع رکھنے کے لئے اور آپس میں محبت قائم رکھنے کے لئے تم نے یہ بُت پرستی اختیار کی ہوئی ہے،ورنہ تمہارے پاس کوئی معقول دلیل نہیں ہے،تم یہ سمجھتے ہو کہ پھوٹ پڑتی ہے،کیا فائدہ؟،ہم یوں کریں گے دوسرا یوں کرے گا،آپس میں پھوٹ پڑ جائے گی۔سوائے اس کے نہیں کہ تم نے اللہ کے علاوہ بتوں کو آپس میں محبت کا ذریعہ بنا رکھا ہے، یہ مفہوم بھی اس کا ہوسکتا ہے،یعنی یہ اوثان تمہارے لئے محبت کا باعث بنے ہوئے ہیں،محبت کا سبب بنے ہوئے ہیں......ایک ہے محبت کی بنا پر تم نے ان کو اختیار کیا ہے۔ایک ہے کہ ان کو اختیار کرنا تمہارا آپس میں محبت اختیار کرنے کا ذریعہ بنا ہوا ہے،یعنی قومی شیرازہ بندی کے لئے تم نے اس طریقے کو اپنا رکھا ہے یہ خیال کرتے ہوئے کہ اگر ہم اس طریقے کو چھوڑیں گے تو قوم میں پھوٹ پڑتی ہے۔ جیسے مشرکینِ مکہ نے ان سب بتوں کو سنبھالا ہوا تھا،اس لیے تاکہ باقی قبائل کے ساتھ تعلقات اچھے رہیں، یہ قومی شیرازہ بندی جس طرح ہوتی ہے۔ یہ مفہوم بھی اس کا ہوسکتا ہے (آلوسی)۔''فوائدِ عثمانیہ'' میں اسی مفہوم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔سوائے اس کے نہیں کہ بنایا تم نے اللہ کے علاوہ بتوں کو آپس میں محبت کا ذریعہ دنیوی زندگی میں، یہ ترجمہ یوں ہوگا، پھر قیامت کے دن تمہارا بعض بعض کا انکار کرے گا، اور تمہارا بعض بعض پہ لعنت کرے گا۔وَمَاْوٰىكُمُ النَّارُ تمہارا ٹھکانا جہنم ہے، وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ: اور تمہارے لئے کوئی مددگار نہیں۔

ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت اور اہلِ ایمان کے لئے سبق

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ: ایمان لے آئے ابراہیم کے لئے لُوط علیہ السلام۔ یہ لُوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے ہیں،اور ابراہیم علیہ السلام نے کہا، اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ: دیکھو! اس میں سبق آ گیا صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے بھی، کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام قوم کے ہاتھوں سے تنگ آئے، اتنا تنگ آئے، اتنی مصیبتیں اٹھائیں کہ آخر وہ بھی علاقہ چھوڑنے کے لئے تیار ہوگئے۔ انہی واقعات میں یہ سبق ہیں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پڑھائے جارہے ہیں۔ کہا کہ بے شک میں ہجرت کرنے والا ہوں اپنے رَبّ کی طرف۔ اپنے رَبّ کی طرف ہجرت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی ایسے علاقے کی طرف جانے والا ہوں جہاں میں آزادانہ اپنے رَبّ کی عبادت کرلوں اور کوئی رُکاوٹ نہ پیش آئے۔''اللہ کی طرف ہجرت کرکے چلا گیا'' اس کا یہی معنی ہوتا ہے،اللہ کے راستے میں نکل گیا اور ایسی جگہ کی طرف چلا گیا جہاں بیٹھ کر اللہ کی عبادت آزادی سے کرلے۔ میں ہجرت کرنے والا ہوں اپنے رَبّ کی طرف، اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ: بے شک وہ زبردست ہے حکمت والا ہے۔

وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ: انہوں نے اپنی برادری چھوڑی، اپنا علاقہ چھوڑا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ اولاد دی، کتنے بڑے بڑے خاندان حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں ہوئے۔ ہم نے عطا کیا ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق اور یعقوب۔ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ: اور کی ہم نے اسی ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں نبوت اور کتاب، وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا: اور ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اس کا اجر دُنیا میں دیا۔ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ: اور بے شک وہ آخرت میں بھی اچھے لوگوں میں سے ہیں۔

قومِ لُوط کا واقعہ

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ: اور بھیجا ہم نے لُوط علیہ السلام کو جبکہ کہا انہوں نے اپنی قوم کو، بے شک تم آتے ہو بے حیائی کو، مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ: نہیں سبقت لے گیا تم سے اس بے حیائی کے ساتھ جہانوں میں سے کوئی بھی۔ دیکھو! اس میں کوئی لفظ نیا نہیں ہے، سارے واقعات آپ کے سامنے گزر گئے ہیں۔ قابلِ ذکر ہے وہ وقت جبکہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ بے شک تم اِرتکاب کرتے ہو بے حیائی کا۔ اِتیانِ فاحشہ، آتے ہو بے حیائی کو یعنی تم بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو۔ اور بے حیائی بھی ایسی کہ نہیں سبقت لے گیا اس بے حیائی کے ساتھ جہانوں میں سے کوئی بھی تم سے سبقت نہیں لے گیا، تم سے پہلے یہ حرکت کسی نے نہیں کی، تم نے قومی سطح پہ اس کو اپنایا۔ اور وہ کیا بے حیائی ہے؟ اگلے لفظوں میں اس کی تفصیل آ گئی۔ کیا تم آتے ہو مَردوں کے پاس۔ اِتیانِ رجال سے مُراد یہاں ہے قضائے شہوت کے لئے۔ کیا تم آتے ہو مَردوں کے پاس، اور قطع کرتے ہو راستے کو، اور آتے ہو تم اپنی مجلس میں بُرائی کو، ارتکاب کرتے ہوئے اپنی مجلس میں بُرائی کا۔ نادی مجلس کو کہتے ہیں، تَاْتُوْنَ فِیْ نَادِیْكُمُ الْمُنْكَرَ: آتے ہو تم اپنی مجلس میں بُرائی پر، یعنی مجلس میں بیٹھ کے تم رائی کا ارتکاب کرتے ہو۔ یہ تین باتیں آ گئیں۔ اِتیانِ رجال کا مفہوم تو آپ سمجھ گئے، مَردوں کے پاس آتے ہو یعنی قضائے شہوت کے لئے۔ دوسری بات ہے تَقْطَعُوْنَ السَّبِیْلَ: تم راستہ قطع کرتے ہو، ڈاکا زنی کی عادت ہے، آنے جانے والوں کو لوٹتے ہو، راستوں پہ بیٹھے رہتے ہو، جو کوئی گزرتا ہے سامان بھی لوٹ لیتے ہو، اور اگر کوئی اس قسم کا ہوتا ہے جس سے تم قضائے شہوت کر سکو تو ان پہ قبضے کر لیتے ہو، تَقْطَعُوْنَ السَّبِیْلَ کے اندر یہ آ جائے گا۔ اور بعض مفسرین نے ادھر اشارہ کیا کہ تَقْطَعُوْنَ السَّبِیْلَ سے مراد ہے کہ تم فطری راہ کو قطع کرتے ہو، یعنی یہ غلط راستہ تم نے اختیار کر لیا ہے۔ جو فطری راستہ ہے عورت کے ساتھ قضائے شہوت کا، آگے نسل بڑھانے کا جو فطری راستہ ہے، اس فطری راستے کو تم نے قطع کر دیا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آگے قوم برباد ہو جائے گی، تَقْطَعُوْنَ السَّبِیْلَ کا یہ معنی بھی کیا گیا ہے۔ یا تو ڈاکا زنی کرتے ہو، آتے جاتے مسافروں کو لوٹتے ہو اور ان کو پکڑ کے ان سے بدمعاشی کرتے ہو، یا یہ ہے کہ فطری طریقہ جو تھا قضائے شہوت کا تم نے اس کو قطع کر دیا۔ تیسری بات یہ کہی کہ تم مجلس میں بیٹھ کر بُرائیوں کا ارتکاب کرتے ہو۔ اس بُرائی سے کیا مراد ہے؟ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ یہ جرم قومی سطح پر شروع ہو گیا تھا، تو ایک دوسرے سے حجاب بھی نہیں کرتے تھے، مجلسوں کے اندر بیٹھ کے بھی اس طرح کی حرکتیں کرتے تھے ایک دوسرے کے سامنے، اور اس قسم کی حرکتوں کا تذکرہ بھی مجلس میں کرتے تھے۔ اب بھی اگر بدمعاشوں کا ایک گروہ اکٹھا ہو جائے، اور اس قسم کی حرکت پہ آمادہ ہو جائیں، تو ایک دوسرے سے حجاب کرنے کی کوشش نہیں کیا کرتے، اپنی مجلس کے اندر ہی بے غیرتی بے حیائی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اور اسی طرح ممکن ہے کہ مجلس میں بیٹھ کے، جس طرح سے آج کل مجلسیں ہوتی ہیں، تاش کھیلنے کی، لغویات کی، فضولیات کی، شراب نوشی کی، حرام خوری کی، نَادِیْكُمُ الْمُنْكَرَ کے اندر یہ ساری باتیں آ سکتی ہیں، مجلسوں میں بیٹھ کر تم منکر اور بُرائی کا ارتکاب کرتے ہو۔ ورنہ یہ وہی بات ہے کہ ایک دوسرے کے سامنے لگے رہتے ہو،

کوئی حجاب اور پردہ کرنے کی کوشش نہیں کرتے، اتنی حد تک تمہاری یہ برائی پھیل گئی ہے، اور تمہارے دل و دماغ کے اندر رچ گئی ہے اور اس سے نفرت نہیں رہی، کہ تم ایک دوسرے سے چھپانے کی بھی کوشش نہیں کرتے۔ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ: پس نہیں تھا جواب اس کی قوم کا مگر یہی کہ لے آ تو اللہ کا عذاب اگر تو سچوں میں سے ہے۔ اور یہی کسی قوم کی بدبختی ہوتی ہے کہ سمجھنے کی بجائے اتنی ڈھٹائی پہ آ جائے۔ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ: لوط علیہ السلام نے کہا: اے میرے رَبّ! میری مدد کر ان فسادی لوگوں پر۔

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۚ

اور جب آ گئے ہمارے فرشتے ابراہیم کے پاس بشارت لے کر، کہنے لگے کہ بے شک ہم ہلاک کرنے والے ہیں اس بستی والوں کو،

اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ۚ ﴿۳۱﴾ قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًا ۭ قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ

بے شک اس بستی کے رہنے والے ظالم ہیں ﴿۳۱﴾ ابراہیم نے کہا کہ اس بستی میں لُوط ہیں، فرشتے کہنے لگے کہ ہم خوب جانتے ہیں اس کو جو

فِيْهَا ۡ لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۤ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۳۲﴾ وَلَمَّآ اَنْ

اس بستی میں ہے، ہم البتہ ضرور نجات دیں گے اسے اور اس کے گھر والوں کو سوائے اس کی بیوی کے، وہ بیوی پیچھے رہنے والوں میں سے ہے ﴿۳۲﴾ اور جب

جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالُوْا لَا تَخَفْ وَلَا

ہمارے بھیجے ہوئے لُوط کے پاس آ گئے، تو لُوط ان کی وجہ سے غمزدہ ہو گئے اور ان کی وجہ سے دل تنگ ہوئے، اور فرشتوں نے کہا کہ تُو خوف نہ کر اور

تَحْزَنْ ۣ اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۳۳﴾ اِنَّا

حزن نہ کر، بے شک ہم نجات دینے والے ہیں تجھے اور تیرے گھر والوں کو سوائے تیری بیوی کے، وہ پیچھے رہنے والوں میں سے ہے ﴿۳۳﴾ ہم

مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَلَقَدْ

اس بستی والوں پر اُتارنے والے ہیں عذاب آسمان سے بسبب اس کے کہ یہ نافرمانی کیا کرتے تھے ﴿۳۴﴾ البتہ

تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۙ فَقَالَ

چھوڑی ہم نے اس بستی کی طرف سے نشانی واضح ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں ﴿۳۵﴾ اور مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا، کہا

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَارْجُوا الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۳۶﴾ فَكَذَّبُوْهُ

شعیب نے کہ اے میری قوم! عبادت کرو اللہ کی، پچھلے دن کی اُمید رکھو، زمین میں فساد مچاتے ہوئے مت پھرو ﴿۳۶﴾ انہوں نے شعیب کو جھٹلایا

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ﴿۳۷﴾ وَعَادًا وَّثَمُوْدَا۠ وَقَدْ تَّبَیَّنَ

پکڑ لیا ان کو زلزلے نے، پس ہو گئے یہ اپنے گھروں کے اندر اوندھے منہ گرے ہوئے ﴿۳۷﴾ ہم نے عاد و ثمود کو بھی برباد کیا، اور واضح ہے

لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ ۫ وَزَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِیْلِ وَ

(ان کا ہلاک ہونا) تمہارے لئے ان کے مکانات سے، شیطان نے ان کے لئے ان کے اعمال کو مزین کیا تھا، پس ان کو صحیح راستے سے روکا تھا اور وہ

كَانُوْا مُسْتَبْصِرِیْنَ ﴿۳۸﴾ وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ ۫ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰی بِالْبَیِّنٰتِ

سمجھدار لوگ تھے ﴿۳۸﴾ اور ہلاک کیا ہم نے قارون کو، فرعون کو، اور ہامان کو، البتہ تحقیق موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس واضح دلائل لے کر آئے تھے

فَاسْتَكْبَرُوْا فِی الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سٰبِقِیْنَ ﴿۳۹﴾ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ

یہ زمین میں متکبر ہو گئے اور یہ ہم سے چھوٹنے والے نہیں تھے ﴿۳۹﴾ ہم نے ان سب کو پکڑا ان کے گناہ کی وجہ سے، ان میں سے بعض

مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّیْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا

تو وہ ہیں جن کے اوپر ہم نے پتھر برسانے والی ہوا بھیجی، اور ان میں سے بعض وہ ہیں جن کو چیخ نے پکڑ لیا، اور ان میں سے بعض وہ ہیں جن کو ہم

بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْۤا

نے زمین میں دھنسا دیا، اور ان میں سے بعض وہ ہیں جن کو ہم نے پانی میں ڈبو دیا، اللہ نے ان پر کوئی زیادتی نہیں کی لیکن انہوں

اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ﴿۴۰﴾ مَثَلُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِیَآءَ كَمَثَلِ

نے اپنے آپ پر ظلم کیا ﴿۴۰﴾ مثال ان لوگوں کی جنہوں نے اللہ کے علاوہ کارساز اختیار کئے ہیں، مکڑی کی

الْعَنْكَبُوْتِ ۖۚ اِتَّخَذَتْ بَیْتًا ؕ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُیُوْتِ لَبَیْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ

طرح ہے، مکڑی نے گھر بنایا، اور تمام گھروں سے کمزور ترین گھر البتہ مکڑی کا گھر ہے، کیا ہی اچھا ہو

كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾ اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَیْءٍ ؕ وَهُوَ الْعَزِیْزُ

کہ یہ لوگ جان لیں ﴿۴۱﴾ بے شک اللہ ان سب چیزوں کو جانتا ہے جن کو یہ اللہ کے علاوہ پکارتے ہیں، اور اللہ زبردست ہے

الْحَكِیْمُ ﴿۴۲﴾ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا یَعْقِلُهَاۤ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴿۴۳﴾

حکمت والا ہے ﴿۴۲﴾ یہ مثالیں، بیان کرتے ہیں ہم ان کو لوگوں کے لئے، اور نہیں سمجھتے ان مثالوں کو مگر علم والے ﴿۴۳﴾

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۴۴

اللہ نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو حق کے ساتھ، بے شک اس میں البتہ نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو کہ ایمان لاتے ہیں ۝۴۴

تفسیر

قومِ لُوط کا انجام

اور جب آ گئے ہمارے فرشتے ابراہیم علیہ السلام کے پاس بشارت لے کر، کہنے لگے کہ بے شک ہم ہلاک کرنے والے ہیں اس بستی والوں کو، بے شک اس بستی کے رہنے والے ظالم ہیں۔ یہ واقعہ بھی سورۂ ہود میں گزر گیا، کہ پہلے فرشتے ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے تھے، حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت کی بشارت لے کے۔ اور وہیں پھر یہ تذکرہ بھی کیا۔ اور اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ سے لُوط علیہ السلام کی بستی مراد ہے۔ قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ اس بستی میں تو لُوط ہیں، اگر عذاب آ گیا تو انہیں بھی تکلیف پہنچے گی۔ قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا: فرشتے کہنے لگے کہ ہم خوب جانتے ہیں اس کو جو اس بستی میں ہے۔ لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ: ہم البتہ ضرور نجات دیں گے اسے اور اس کے گھر والوں کو سوائے اس کی بیوی کے كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ: وہ بیوی پیچھے رہنے والوں میں سے ہے، وہ ساتھ نجات نہیں پائے گی، وہ ہلاک ہونے والوں میں شامل رہے گی۔ وَلَمَّآ اَنْ جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا: اور جب ہمارے رسول بھیجے ہوئے لوط علیہ السلام کے پاس آ گئے، سِيْٓءَ بِهِمْ: لوط علیہ السلام ان کی وجہ سے غم زدہ ہو گئے، وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا: اور ان کی وجہ سے دل تنگ ہوئے، یہ دیکھ کر کہ یہ نوجوان ہیں، خوبرو ہیں، تو غم طاری ہو گیا، حالانکہ مہمان کو دیکھ کے انسان خوش ہوا کرتا ہے، اور یہاں ان کے غمزدہ ہونے کی وجہ یہی تھی کہ اب میں قوم کا مقابلہ کس طرح سے کروں گا؟ اگر انہیں پتا چل گیا کہ ایسے خوبرو لڑکے آئے ہیں، وہ تو مجھ سے چھیننے کی کوشش کریں گے، تو میں اپنے گھر میں اپنے سامنے مہمانوں کی بے عزتی کس طرح سے برداشت کروں گا؟ یہ وجہ ہے غم کی، ان کی وجہ سے دل تنگ ہوئے۔ وَقَالُوْا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ: اور فرشتوں نے کہا، جو آئے تھے کہ تو خوف نہ کر، اور حزن نہ کر، اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ: بے شک ہم تجھے نجات دینے والے ہیں اور تیرے گھر والوں کو سوائے تیری بیوی کے، وہ پیچھے رہنے والوں میں سے ہے۔ اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓي اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ: ہم اس بستی والوں پر اتارنے والے ہیں عذاب آسمان سے بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ: بسبب اس کے کہ یہ نافرمانی کرتے تھے۔ وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً: یہ آخری انجام آ گیا۔ البتہ چھوڑی ہم نے اس بستی کی طرف سے نشانی واضح لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ: ان لوگوں کے لئے جو کہ عقل رکھتے ہیں۔ نشانی واضح، یعنی مشرکینِ مکہ جب شام کی طرف جایا کرتے تھے تو لوط علیہ السلام کی تباہ شدہ بستیاں، ان کے آثار بھی اس وقت نمایاں تھے۔ عقل رکھنے والے ان آثار کو دیکھ کے سمجھ سکتے ہیں، کہ اللہ کی نافرمانی کا نتیجہ آخر کیا نکلا کرتا ہے۔

ماقبل سے ربط

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا: واقعات کی تفصیل آپ کے سامنے مختلف سورتوں میں گزری ہوئی ہے، یہ مختصر مختصر اشارے

ہیں ان واقعات کی طرف، اور ربط پیچھے سے چلا آ ہی رہا ہے، کہ اللہ تعالیٰ جس طرح سے اہل ایمان کو تسلی دے رہے ہیں کہ حق کے راستے میں مصیبتیں برداشت کرنی پڑا کرتی ہیں۔ پچھلی تاریخ اس بات پہ گواہ ہے کہ اللہ والوں کو کیا کیا مصیبتیں پیش آئیں، اور انہوں نے کس طرح سے صبر و استقامت سے برداشت کیں، اور نتیجہ کیسے اچھا نکلا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی تھی اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ اَنْ یَّسْبِقُوْنَا: کیا ان بدکرداروں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم سے چھوٹ جائیں گے، یہ بُری بُری حرکتیں کرنے والے یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم ان کو پکڑیں گے نہیں؟ اور جب ہم ان کو پکڑنے لگیں گے یہ ہم سے بھاگ کے آگے نکل جائیں گے؟ بہت بُرا سوچ رہے ہیں اگر یہ ایسا سوچ رہے ہیں۔ تو یہ ان بدکرداروں کے لئے تنبیہ تھی۔ تو ان واقعات کے اندر زیادہ نمایاں پہلو یہی ہے کہ ان بدکرداروں کو دکھایا جا رہا ہے کہ ذرا آنکھیں کھولو، اور پیچھے کی طرف مڑ کے دیکھو، تاریخ میں کیسے کیسے واقعات ہیں، اور اس قسم کی بُری حرکتیں کرنے والے، اہلِ حق کو پریشان اور تنگ کرنے والے، انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کرنے والے کیسے انجام سے دوچار ہوئے، یہ پہلو بھی ساتھ ساتھ چلا آ رہا ہے۔ تو پیچھے قوم لوط کا ذکر تھا، اب یہ مدین والے آ گئے۔

اہلِ مدین کو شعیب علیہ السلام کی نصیحت

وَاِلٰى مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا: مدین حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے کا نام ہے، مدین بن ابراہیم علیہ السلام جو حضرت ہاجرہ اور سارہ کے علاوہ تیسری بیوی جس کا نام ''قنطورا'' لکھا ہے، ان کے بطن سے تھے۔[1] پھر ان کی اولاد سے جو قبیلہ آگے بڑھا، پھلا پھولا اس کو بھی ''مدین'' ہی کہتے تھے۔ جو ان کا مرکزی شہر تھا، اس کا نام بھی ''مدین'' تھا۔ تو یہاں ''مدین'' سے قبیلہ مراد لے لیا جائے پھر تو کوئی محذوف ماننے کی ضرورت نہیں ''مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا''۔ اور اگر شہر مراد لیا جائے تو پھر ''اہل'' کا لفظ محذوف ماننا پڑے گا (آلوسی، اعراف: ۸۵)۔ مدین والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب علیہ السلام کو بھیجا۔ فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَارْجُوا الْیَوْمَ الْاٰخِرَ: وہی عام بات ہے جو انبیاء علیہم السلام اپنے مخاطبین سے پہلے کہا کرتے ہیں۔ کہا شعیب علیہ السلام نے کہ اے میری قوم! عبادت کرو اللہ کی، وَارْجُوا الْیَوْمَ الْاٰخِرَ: رَجاء: اُمید رکھنا۔ آخر دن کی اُمید رکھو، پچھلے دن کی اُمید رکھو، توقع رکھو آخری دن کی۔ اور یہ توقع جو ہے اس میں دونوں پہلو ہوا کرتے ہیں، جس وقت آپ کسی بات کی اُمید لگاتے ہیں، اچھی بات کی اُمید لگائیں تو اس میں خوشی کا پہلو ہوتا ہے، اور بُری بات کے سامنے آنے کی اُمید ہو تو اس میں خوف اور ہراس کا پہلو ہوتا ہے، تو یہاں خوف و ہراس والا پہلو ہے، اس لئے اس ''رجاء'' کے اندر خوف والا معنی ہے۔ حضرت شیخ (الہندؒ) تو ترجمہ کرتے ہیں، توقع رکھو پچھلے دن کی۔ اور ''بیان القرآن'' میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حاصل ترجمہ کیا کہ آخرت سے ڈرو، پچھلے دن سے ڈرو کہ انجام کیا سامنے آنے والا ہے۔ تو ڈرنے کا معنی اس لئے کیا گیا ہے کہ جب بُرے حالات کے متعلق توقع ہو تو خوف و ہراس کا باعث ہوتے ہیں۔ یوم آخر سے ڈرو۔ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ: مُفْسِدِیْنَ یہ حال مؤکدہ ہے۔ زمین میں فساد مچاتے ہوئے مت پھرو، یعنی ایسی حرکتیں نہ کرو جن کے ساتھ زمین میں فساد ہوتا ہے، فساد ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو عدل و انصاف کے خلاف ہو۔ تو آپ کے سامنے ان کے جو

---

(۱) تفسیر قرطبی، بقرہ، آیت ۱۳۲ کے تحت۔ فیض الباری ۴/ ۳۸۸، کتاب احادیث الأنبیاء، باب قول اللہ: والی مدین اخاھم شعیبا کے تحت۔

تفصیلی حالات گزرے ہیں، اس میں یہ بات آئی تھی کہ یہ قبیلہ کفر و شرک کے ساتھ ساتھ تجارت میں بددیانتی کا مرتکب تھا۔ کم تولنا، کم ماپنا، لوگوں کے حقوق غصب کرنا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ یہ عادت عدل و انصاف کو تباہ کرنے والی ہے، جب کوئی قوم اس عادت کو اپنائے گی تو یقیناً فساد ہی ہوگا، حالات خراب ہی ہوں گے، اس میں حالات سدھرا نہیں کرتے۔ تو زمین میں فساد مچاتے ہوئے مت پھرو۔

اہلِ مدین کی ضد اور انجام

فَكَذَّبُوْهُ: حاصل یہ ہے، کشاکشی چلتی رہی، حضرت شعیب علیہ السلام سمجھاتے رہے۔ تفصیل سورۂ اعراف میں ان کے واقعے کی زیادہ آئی تھی، اور پھر سورۂ ہود میں بھی ذکر آیا تھا۔ حاصل اور نتیجہ یہ ہے کہ فَكَذَّبُوْهُ وہ لوگ حضرت شعیب علیہ السلام کے سمجھانے سے سمجھے نہیں، انہوں نے حضرت شعیب علیہ السلام کی تکذیب کی، انہیں جھوٹا کہا کہ تم غلط کہتے ہو کہ ''ان باتوں کا انجام خراب نکلے گا، یا یہ جو طریقہ ہم نے دین کے طور پر اپنایا ہوا ہے یہ غلط ہے'' تمہاری یہ باتیں ٹھیک نہیں ہیں، فَكَذَّبُوْهُ: انہوں نے جھٹلایا حضرت شعیب علیہ السلام کو، فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ: پکڑ لیا ان کو رجفہ نے۔ رجفہ کا معنی زلزلہ، کپکپی۔ ان کو زلزلے نے پکڑ لیا۔ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ: پس ہو گئے یہ اپنے گھروں کے اندر اوندھے منہ گرے ہوئے۔ جَثَمَ جُثُوْمٌ: گھٹنوں کے بل گرنا۔ جاثمین جثوم سے ہے۔ ہو گئے یہ اپنے گھروں میں اوندھے گرے ہوئے، منہ کے بل گرے ہوئے، یہ اپنے گھروں میں اس طرح سے ہو گئے، مطلب یہ ہے کہ زلزلے میں آ کے تباہی ہو گئی، مکانات بھی گر گئے اور یہ خود بھی اس میں دب دبا کے، مر مرا گئے سارے۔

عاد و ثمود کا تذکرہ

وَعَادًا وَّثَمُوْدَا...... فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ کے اندر جس طرح سے ان کی ہلاکت کا ذکر ہوا، حاصل اس کا یہی ہے کہ ہم نے ان کو ہلاک کر دیا، تو عَادًا وَّثَمُوْدَا یہ بھی اَهْلَكْنَا محذوف کا ہی مفعول ہے (عام تفاسیر)، اَیْ اَهْلَكْنَا عَادًا وَّ ثَمُوْدَ، ہم نے عاد و ثمود کو بھی برباد کیا۔ وَقَدْ تَّبَیَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ: مساکن مسکن کی جمع۔ اور تَبَیَّنَ کا فاعل ہے ہلاکت جو ماقبل سے سمجھ میں آتی ہے۔ ان کا ہلاک ہونا تمہارے لئے ان کے مکانات سے واضح ہے۔ ان کے رہنے کی جگہ کو جا کر دیکھو، ان کی بستیوں کو دیکھو، وہاں سے یہ بات تمہیں نمایاں طور پر معلوم ہوگی کہ واقعی یہ قوم برباد ہوئی ہے۔ تَبَیَّنَ اِهْلَاكُهُمْ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ، ان کے رہنے کی جگہوں سے، ان کے مساکن سے، ان کی رہائش گاہوں سے، ان کے ٹھکانوں سے ان کی ہلاکت واضح ہے۔ وَزَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ: اور شیطان نے ان کے لیے ان کے اعمال کو مزین کیا تھا، فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِیْلِ: پس ان کو صحیح راستے سے روکا تھا۔ وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِیْنَ: اور وہ سمجھدار لوگ تھے۔ زَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ: جو کردار انہوں نے اختیار رکھا تھا، جو کارروائیاں وہ کرتے تھے وہ اپنے نزدیک ان کو بہت اچھا سمجھ رہے تھے، اور ان کے عقل و فہم کے اندر شیطان نے یہ بات ڈال دی تھی کہ یہ فائدے کے کام ہیں۔ مزین کرنے کا یہی معنی ہے کہ ان کو اپنے وہ کام اچھے لگ رہے تھے، دنیاوی مفاد اس میں تھا، کم تولتے، کم ماپتے، جب کسی سے لیتے تو زیادہ تولتے، دیتے تو کم دیتے، یہ کارروائیاں جو انہوں نے اختیار کر رکھی تھیں، اور اسی طرح سے بت پرستی کے کام جو وہ کر رہے تھے وہ

سب ان کو اچھے لگ رہے تھے۔ اور یہ سمجھایا جارہا ہے قرآنِ کریم کے مخاطبین کو کہ آج اگر تم اپنے کردار پہ خوش ہو کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں بڑی سمجھ داری سے کررہے ہیں، بڑی عقل مندی سے کررہے ہیں، اس میں قومی شیرازہ مجتمع ہے، اور ہر قسم کی عیش اور عشرت ہے، اسی قسم کے جذبات ان لوگوں کے بھی تھے، اور یہ سب تزئین شیطانی ہے کہ جس کام کا اچھا ہونا عقل ونقل کے ساتھ ثابت نہ ہو، اپنی خواہشات اور اپنی شہوات کے تحت انسان اس کو اچھا سمجھ رہا ہے، تو یہ تزئین شیطانی ہے۔ ان کی کارروائیوں کو ان کے اعمال کو شیطان نے ان کے لئے مزین کردیا تھا، اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ صحیح راستے سے شیطان نے انہیں روک دیا۔

عاد وثمود کی سمجھ داری صرف دُنیا کی حد تک رہی

وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ: بَصُرَ مجرد سے۔ اَبْصَرَ باب اِفعال۔ استبصار دیکھنے اور سمجھنے کے معنی میں۔ مُبْصِر آنکھوں سے دیکھنے والے کو بھی کہتے ہیں، اور جس دل میں روشنی ہو سمجھ دار ہو اسے بھی کہتے ہیں، تو اسی طرح سے مستبصر ہے۔ تو كَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ کا معنی ہے کہ سمجھ دار لوگ تھے، یعنی یہ نہیں کہ دیوانے تھے، پاگل تھے، ان کے بھیجوں میں عقل نہیں تھی۔ اگر ایسے ہوتے تو دنیا کے کاروبار کو کس طرح سے چلاتے؟ تجارت میں بڑے ہوشیار تھے، اور اپنی زندگی کے اندر وہ بڑے سمجھ دار تھے، لیکن شیطان کے پنجے میں آئے، دین کے راستے میں آ کے وہ بے عقل ہوگئے، ان کی عقلوں نے کام نہیں کیا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قوم کی قوم تباہی میں جاپڑی، بربادی کے کھڈ میں گرگئی...... اس آیت سے معلوم ہوا کہ صرف دنیوی طور پر ترقی کرلینا، تمدن اور معاشرت میں آگے نکل جانا، اچھے مکانات بنالینا، جس طرح سے کہ عاد وثمود کے قصے میں آپ کے سامنے آیا، مکانات بنانے میں، کوٹھیاں بنانے میں، محلات میں ان کی مثال پہلے نہیں تھی لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ (سورۂ فجر) شہروں میں ان جیسے پیدا ہی نہیں کیے گئے، ان کی مثل پیدا ہی نہیں کی گئی۔ اس طرح سے ان کو بڑے بڑے محلات بنانے کی، پہاڑ تراش تراش کے مکان بنانے کی عادت تھی، تمدن میں انہوں نے بہت ترقی کی تھی۔ اور اسی طرح سے تجارت میں مدین والے بہت آگے بڑھ گئے تھے، تو تجارت میں آگے نکل جانا، اچھے محلات اور کوٹھیاں بنالینا، معاشی طور پر خوش حال ہوجانا، یہی صرف سمجھ داری نہیں ہے۔ سمجھ داری یہ ہوتی ہے کہ انسان یہ دیکھے کہ نتیجہ اچھا کس کے سامنے آرہا ہے؟ اگر ایک وقت میں انسان خوش حال ہو، دوسرے وقت اللہ کی گرفت میں آجائے، اور اللہ کے عذاب میں آجائے، تو یہ سارا کمایا ہوا، سارا اکٹھا کیا ہوا کسی کام نہ آئے تو جو کچھ کیا تھا پھر اس کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ ہم تو بے عقلی سے غلط راستے کو صحیح راستہ سمجھ رہے تھے۔ تو ہمارے ہاں بھی آج کل جس طرح سے بعض لوگوں نے سائنس میں ترقی کر کے صنعت میں ترقی کر کے اپنی دنیا کو خوب آباد کیا ہوا ہے، اور ان کے شہروں میں اگر آپ جائیں، ان کے ملک میں جائیں، تو آپ کو ہر طرف خوش حالی ہی خوش حالی نظر آتی ہے۔ ان کی اس ترقی کو دیکھ کے، اور ان کارناموں کو دیکھ کے آپ کہیں گے کہ بڑے سمجھ دار لوگ ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں، اسی سمجھ داری کی وجہ سے سائنس سے انہوں نے کیسے کیسے رموز کائنات کے معلوم کیے، اور دنیا کے اندر کس قسم کی چیزیں ایجاد کردیں، ہر طرف رونق اور زیب وزینت پھیلی ہوئی ہے، لیکن جہاں دین کا معاملہ آتا ہے اس میں آ کے وہ بے عقل ثابت ہوتے ہیں کہ صرف ''ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا'' (سورۂ روم) کو تو دیکھتے ہیں، یہ نہیں جھانک سکتے کہ ان کے

پس پردہ کیا ہے؟ نتیجے کو نہیں دیکھتے۔ اس لئے ان کی یہ ترقی سمجھدار آدمی کے لیے جو دین کی سمجھ رکھتا ہے، جس کا اللہ کے ساتھ تعلق ہے، اس کو صحیح طور پر کامیابی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ صحیح کامیابی وہ ہوا کرتی ہے کہ جس کا نتیجہ اچھا نکلنے والا ہو۔ ورنہ ایسے ہی سمجھدار ہیں جیسے یہ مدین والے سمجھدار تھے، عاد و ثمود سمجھدار تھے، لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کی گرفت میں آئے اور دنیا بھی برباد ہوئی اور آخرت کا بھی دائمی عذاب سامنے آ گیا۔ اور یہ پگلا پن ہے کہ ان کی اس قسم کی ترقیوں کو دیکھ کے سمجھ لینا کہ انہی کا طریقہ ٹھیک ہے، اور جس راستے کے اوپر یہ چل رہے ہیں یہی ٹھیک ہے، جس طرح سے بعض اپنے آپ کو مسلمان کہلانے والے، ان کی ترقیوں کو دیکھ کر بھی کہتے تھے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہی اللہ کے نزدیک محبوب ہیں، یہی اللہ کے نزدیک مقبول ہیں، جن کو دنیا میں اس قسم کی خوش حالی نصیب ہو گئی۔ یہ صحیح بات نہیں ہے۔ تو ان کی سمجھداری اسی طرح سے ہے، قوم عاد اور قوم ثمود کی طرح، اصحاب مدین کی طرح جنہوں نے تمدن میں، معاشرت میں، معیشت میں بڑی ترقی کی تھی۔ لیکن اس ظاہری دنیا سے پچھلے دن کی طرف وہ جھانک نہیں سکے کہ اس کا نتیجہ کیا سامنے آنے والا ہے؟ تو ایسی سمجھداری کسی کام کی نہیں۔

''قارون وفرعون وہامان'' کے انجام کے ذکر سے مقصد

وَقَارُوْنَ وَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ: اور ہلاک کیا ہم نے قارون کو، فرعون کو اور ہامان کو۔ ان کے واقعات بھی تفصیلاً آپ کے سامنے آ گئے۔ ''قارون'' دولت میں بہت زیادہ ممتاز تھا، اٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ ابھی پچھلی سورت کے آخر میں آپ کے سامنے گزرا تھا، مال کے ڈھیر اس نے لگا رکھے تھے۔ اور ''فرعون'' یہ وقت کا تاج دار تھا، عہدے اور مرتبے میں اس کی مثال اس وقت موجود نہیں تھی، کیونکہ ظاہری طور پر کسی ملک کا بادشاہ بن جانا اس ملک میں سب سے بڑا جاہ ہوتا ہے، اور فرعون کو وہ حاصل تھا، اور مطلق العنان حاکم جس کے اُوپر کوئی کسی قسم کی پابندی لگانے والا موجود نہیں تھا، حکومت میں یہ سب سے آگے۔ اور ''ہامان'' اس کا وزیر اعظم تھا، ملازمت میں سب سے بڑا عہدہ اسی کا..... تو ایک سرمایہ دار کی مثال ذکر کر دی، اور ایک بادشاہ کی مثال ذکر کر دی جو مطلق العنان حکمران تھا، اور ایک ملازم کی مثال نقل کر دی جو اس کا بہت مقرب تھا، اور اس کا ملازم تھا، ان سب کو ہم نے ہلاک کر دیا..... یہ ساری مثالیں جو دی جا رہی ہیں تو ہر شخص اپنے آپ کو کسی نہ کسی شعبے میں داخل سمجھتا ہی ہے۔ اگر وہ ملازمت میں سب سے بڑا عہدیدار ہے تو اس کو ہامان کی ہلاکت سامنے رکھنی چاہیے، اگر وہ ملک کے اندر سب سے بڑا عہدیدار ہے جس طرح سے ''صدرِ مملکت'' ہوتا ہے، لیکن آج کل کے ''صدور'' کی مثال تو سامنے آ ہی نہیں سکتی، یہ تو پابند ہیں، قوم ان کے اوپر مسلط ہوتی ہے، قوم کے منتخب کیے ہوئے ہوتے ہیں، اور جب چاہے قوم ان کی ٹانگ گھسیٹ لے۔ اُس وقت کی جو بادشاہی تھی، وہ ایسی نہیں تھی، وہ بادشاہ کیا تھے؟ وہ تو ملک کے رہنے والوں کے لئے اپنے آپ کو خدا کی جگہ رکھتے تھے، اور ان کی رعایا ان کو ایسے ہی پُوجتی تھی جس طرح سے کہ اللہ کو پُوجا جاتا ہے، تو ان کی برتری اور ان کی ہیبت جس انداز کی تھی اس کا آپ اس وقت اندازہ نہیں کر سکتے۔

سوال:- ہامان کس طرح ہلاک ہوا؟

جواب:- فرعون کے ساتھ ہی!

سوال:-اور قارون؟

جواب:- قارون علیحدہ ہے، یہ تو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ علیحدہ ہو گیا تھا، واقعے کی تفصیل آپ کی خدمت میں عرض کی گئی تھی۔ ''ہامان'' تو برباد ہوا ہے فرعون کے ساتھ ہی، جہاں فرعون اور اس کے لشکروں کا ذکر آیا ہے تو اس کے ساتھ یہ چھپتے بھی تھے۔ اور ''قارون'' اسرائیلیوں کے ساتھ علیحدہ ہو گیا تھا، بنی اسرائیل میں سے تھا، لیکن فرعون کے ساتھ ملا ہوا تھا، جس کی بنا پر اس نے بہت مالی فوائد حاصل کیے ہوئے تھے، بنی اسرائیل میں اس کی مثال نہیں تھی دولت مندی کی..... تو اپنے آپ کو کسی نہ کسی شعبے میں انسان داخل سمجھتا ہی ہے، تو یہ مختلف مثالیں جو دی جا رہی ہیں اس لئے دی جا رہی ہیں کہ ان کو دیکھ کے انسان عبرت حاصل کرے۔

مذکورہ واقعات کے ذِکر کرنے سے مقصد

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰی بِالْبَیِّنٰتِ: البتہ تحقیق موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس واضح دلائل لے کر آئے تھے۔ فَاسْتَكْبَرُوْا فِی الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سٰبِقِیْنَ: یہ زمین میں متکبر ہو گئے، انہوں نے حق کو قبول نہ کیا، حق کے سامنے گردن نہ جھکائی، استکبار کا مطلب یہی ہوتا ہے، حق اور اہلِ حق کے سامنے یہ لوگ دبے نہیں، بلکہ اکڑ گئے۔ وَمَا كَانُوْا سٰبِقِیْنَ: یہ ہم سے چھوٹنے والے نہیں تھے..... اب اس کو جوڑ لیجئے اُس آیت کے ساتھ جو شروع سورت میں اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی تھی کہ یہ بدکرداریاں کرنے والے کیا یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم سے چھوٹ جائیں گے؟ چھوٹے تو ان کے بڑے بھی نہیں تھے تو انہوں نے کیا چھوٹنا ہے۔ کیا ان میں سے کوئی ہے جو ان جیسا ہو؟ نہ انہوں نے تمدن میں وہ ترقی کی جو عاد و ثمود نے کی ہوئی تھی، یہ ٹھیک ہے کہ اپنے آپ کو تجارت میں بڑا تاجر سمجھتے ہیں، لیکن تجارت میں ان کی وہ ترقیاں نہیں جو مدین کی تھیں، اور اگر یہ اپنی دولت پہ ناز کرتے ہیں تو اتنے بڑے دولت مند نہیں جیسے قارون تھا، اور ان کو ملک کے اندر اس قسم کا اقتدار حاصل نہیں جیسے فرعون اور ہامان کو حاصل تھا، تو چھوٹے تو یہ بھی نہیں، تو یہ جو ہمارے مخاطب ہیں یہ کس باغ کی مولی ہیں۔ سنا ہی ہوگا شعر آپ نے امین گیلانی کا، جس پر وہ بیچارہ دھر لیا گیا، یہ جو مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق کانفرنس ہوئی تھی تو اس میں اس نے نظم پڑھی تھی:

ہم نے اُلٹے تخت بہت فرعونوں کے — میرے مخاطب! تُو کس باغ کی مولی ہے؟

تو اسی طرح سے یہاں ہے کہ یہاں تو اتنے بڑے بڑے فرعون دھر لئے گئے، اور اتنے بڑے بڑے سرمایہ داروں کو سانس لینے کا موقع نہیں ملا، اور اتنی بڑی بڑی حویلیوں والے عاد و ثمود، اور اتنی بڑی بڑی تجارتوں والے اصحاب مدین، جب ہم پکڑنے پہ آ گئے تو یہ نہیں چھوٹ سکے، تو تم کس کھیت کی مولی ہو؟ جو اس وقت اپنے آپ کو اس غرور میں لئے ہوئے ہو، اس غرور میں مبتلا ہو، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرتے ہو..... تو اس (سورت کے شروع والے) فقرے کے ساتھ جڑ جانے کے بعد معلوم ہو گیا، کہ یہ سارے کے سارے واقعات اصل میں انہی (مشرکین مکہ) کو سنائے جا رہے ہیں کہ جب ہم پکڑنے پہ آئیں گے تم بھی چھوٹ نہیں سکو گے۔

انبیاء علیہم السلام کے مخالفین کا انجام

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ: یہ جن کا ذکر آیا ہم نے ان سب کو پکڑا ان کے گناہ کی وجہ سے۔ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِ حَاصِبًا: ان میں سے بعض تو وہ ہیں کہ جن کے اُوپر ہم نے حاصب بھیجی، حاصب اتنی زوردار آندھی جو کہ کنکر برساتی ہے، اس میں ہوا کے زور کی بنا پر پتھر اڑتے ہیں، کنکریاں برسانے والی، بربادی لانے والی ہوا۔ اس سے قوم لُوط مراد ہوسکتی ہے (عام تفاسیر)، اور اسی طرح سے عاد پر یونہی آندھی آئی تھی (آلوسی)، اور قومِ لُوط پر بھی پتھر ہی برسے تھے، ممکن ہے اس وقت وہاں بھی کوئی آندھی آئی ہو۔ تو حاصب: پتھر برسانے والی ہوا، یعنی اتنی تیز آندھی اور اتنی سخت آندھی جس میں پتھر اڑ اڑ کے آتے تھے...... وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّیْحَةُ: اور ان میں سے بعض وہ ہیں کہ جن کو صیحہ نے پکڑ لیا، صیحہ چیخ چنگھاڑ کو کہتے ہیں، صَاحَ یَصِیْحُ: چیخنا۔ قرآنِ کریم میں تو لفظ بھی آیا ہے...... اور مفسرین عام طور پر ذکر کردیا کرتے ہیں، کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے اور انہوں نے اتنی سخت جھڑک ماری اور چیخ ماری جس کے بعد ان کے کلیجے پھٹ گئے، یہ ایک تعبیر ہے صیحہ کی...... ورنہ رعد و برق اس کا مصداق ہوسکتا ہے، آسمان کی طرف سے کڑک، جس طرح سے بجلی چمکا کرتی ہے، اور طوفان آتا ہے...... یا جس وقت عذاب آیا، تو عذاب آنے کے ساتھ یہ لوگ چیخ و پکار میں لگ گئے، چیخ و پکار نے ان کو پکڑ لیا۔ وہ چیخ و پکار عذاب کا ایک عنوان ہے، یہ سب رونے دھونے میں لگ گئے، چیخ و پکار میں لگ گئے، چیخ و پکار نے ان کو پکڑ لیا، جو خوشیوں کے اندر مست تھے، ہر وقت ہنستے کھلکھلاتے تھے، اور ان کو عیش و عشرت سے فرصت نہیں تھی، جب ہمارا ذرا سا اشارہ ہوا، تو سب چیخیں مار رہے تھے، چیخیں نکل گئیں سب کی، چیخ و پکار نے ان کو پکڑ لیا۔ اس طرح سے بھی آپ اس لفظ کی تعبیر کرسکتے ہیں...... حاصل سب کا یہ ہے کہ ان پہ عذاب آیا، اور عذاب کی تعبیر صیحہ کے ساتھ ہے۔ جبرئیل علیہ السلام نے آکے زور سے جھڑک ماری ہو، اور ایک ہی جھڑک برداشت نہ کرسکے، ہوسکتا ہے۔ آسمان کی طرف سے کڑک، رعد و برق کا طوفان آیا ہو، ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ یا یہ ہے کہ جب اللہ کی طرف سے عذاب آیا تو پھر چیخیں نکل رہی تھیں سب کی، چیخ و پکار نے ان کو پکڑ لیا، تو یہ بھی ہوسکتا ہے۔ تو یہ لفظ صیحہ کی ایک تعبیر ہے جس طرح سے بھی آپ کرلیں، مراد عذاب ہے۔ پکڑ لیا ان کو چیخ و چنگھاڑ نے...... وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ: اور ان میں سے بعض وہ ہیں جن کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا، وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا: اور ان میں سے بعض وہ ہیں جن کو ہم نے پانی میں ڈبو دیا۔ تو ہر طرح سے عذاب آیا، کسی کے اُوپر آندھی آئی، کسی پہ زلزلہ آیا، کسی کے اُوپر کوئی اور رعد و برق کا طوفان آیا، کسی کو دریا میں غوطہ دے دیا گیا، کسی کو زمین میں دھنسا دیا گیا، زمین میں دھنسانے کی مثال آپ کے سامنے گزری قارون کی فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ ہم نے اس کو اس کے محل سمیت اس کی حویلی سمیت زمین میں دھنسا دیا، یہ لفظ آپ کے سامنے آئے تھے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیَظْلِمَهُمْ: یہ سب ہماری گرفت میں آئے۔ اللہ تعالیٰ ان کے اُوپر ظلم کرنے والا نہیں۔ نہیں ہے اللہ کہ ان کے اُوپر زیادتی کرے، اللہ نے ان کی کوئی حق تلفی نہیں کی، ان کے اوپر زیادتی نہیں کی۔ وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ: لیکن یہ لوگ اپنے ہی نفس پہ زیادتی کرنے والے تھے، اپنے حقوق انہوں نے خود تلف کئے، اللہ کی نافرمانی کی، اپنے آپ پہ ظلم کیا، اس کا نتیجہ بھگتا۔

مکڑی کی مثال کے ذریعے مشرکین کو ایک اور انداز سے تنبیہ

تو یہ واقعات بیان کرنے کے بعد اب مشرکین مکہ کو ایک اور انداز سے جھنجوڑا جارہا ہے کہ یہ تو تم نے دیکھ لیا کہ دولت نے قارون کو نہیں بچایا، یہ تم نے دیکھ لیا کہ اقتدار نے فرعون کو نہیں بچایا، اور یہ تم نے دیکھ لیا کہ بڑے بڑے منصب اور عہدے نے ہامان کو نہیں بچایا، بڑی بڑی حویلیوں نے اور بڑے بڑے قلعوں نے عاد وثمود کو نہیں بچایا، بڑی بڑی تجارتوں نے اہل مدین کو نہیں بچایا۔ کہیں اس مغالطے میں نہ رہ جائیو کہ تمہاری یہ پتھر کی مورتیاں، یا تمہارے یہ شرکاء، تمہارے یہ شفعاء وقت پہ کام آجائیں گے، یہ بھی کام آنے والے نہیں۔ ان کی بھی مثال سن لو۔ ان کی مثال بھی ایسی ہے جس طرح سے مکڑی کا جالا، جو ایک ہوا کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ یہ پہلے جو گزرے ہیں انہوں نے بھی اس قسم کے شرکاء شفعاء بنائے ہوئے تھے، کسی نے کسی کو سمجھا ہوا تھا کہ وقت پہ کام آئے گا، کسی نے کسی کو سمجھا ہوا تھا کہ وقت پہ کام آئے گا، جب اللہ کا عذاب آیا تو سارے اس طرح سے اڑ گئے، جس طرح سے آندھی کے مقابلے میں تارِ عنکبوت اڑتی ہے، مکڑی کا جالا جس طرح سے اڑتا ہے، جیسے مکان میں جالے لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ جتنے جانور اپنے لیے گھونسلہ بناتے ہیں یا گھر تعمیر کرتے ہیں ان سب گھروں سے کمزور ترین گھر مکڑی کا ہوتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں مثال اسی کی دی کہ یہ شرک کے سہارے جو لئے بیٹھے ہیں، مشرکین نے شفعاء جو بنا لیے ہیں یہ تو اس طرح سے ہے جیسے مکڑی اپنے لیے قلعہ تعمیر کرلیتی ہے اپنے خیال کے اعتبار سے، لیکن جب کوئی آفت آتی ہے تو ایک بچہ ایک تنکے کے ساتھ ہی سارے جالے کو اتار لیتا ہے اور اکٹھا کر لیتا ہے۔ اس طرح سے یہ غلط فہمیوں میں مبتلا نہ ہونا، یہ سہارے بھی کام آنے والے نہیں۔ آگے یہ بات کہی جارہی ہے، جیسے ان لوگوں کے کام نہیں آئے تمہارے بھی کام نہیں آئیں گے۔ یہ اعتماد بھی غلط ہے۔

مَثَلُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِیَآءَ: مثال ان لوگوں کی جنہوں نے اللہ کے علاوہ کارساز اختیار کیے ہیں، كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ: مکڑی کی طرح ہے، اِتَّخَذَتْ بَیْتًا: مکڑی نے گھر بنایا ہے۔ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُیُوْتِ لَبَیْتُ الْعَنْكَبُوْتِ: تمام گھروں سے کمزور ترین گھر البتہ مکڑی کا گھر ہے۔ یعنی جتنے پرندے بھی، جاندار کیڑے مکوڑے، جتنے بھی اپنے لئے کوئی رہنے کی جگہ بناتے ہیں ان سب میں سے کمزور ترین گھر مکڑی کا ہوتا ہے۔ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ: کیا ہی اچھا ہو کہ یہ لوگ جان لیں، ان کی سمجھ میں یہ بات آجائے کہ اللہ کے علاوہ کوئی دوسرے سہارے اسی طرح سے ہیں جیسے مکڑی کا جالا، وہ وقت پہ کام آنے والے نہیں۔ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ کیا ہی اچھا ہو کہ یہ اس بات کو جان لیں۔ جس طرح سے لَوْ تمنائیہ ہوا کرتا ہے۔ یا شرطیہ بنا کر یوں ترجمہ کرلیں کہ اگر یہ لوگ اس بات کو جان لیں سمجھ لیں تو اللہ کے علاوہ کسی دوسرے پہ اعتماد نہ کریں، ہر وقت اللہ سے ڈریں اور اللہ سے ہی پناہ طلب کریں۔

اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَیْءٍ: مِنْ شَیْءٍ یہ ما کا بیان ہے۔ جن چیزوں کو اللہ کے علاوہ یہ پکارتے ہیں، بے شک

اللہ تعالیٰ ان سب چیزوں کو خوب جانتا ہے، یعنی ان کی مثال جو اَوْهَنَ الْبُیُوْتِ کے ساتھ تعبیر کی گئی ہے، مکڑی کے جالے کے ساتھ ان کی مثال دی گئی ہے، تو کوئی یہ نہ کہے کہ یہ تو ان کی بہت تحقیر کردی گئی، ضرورت سے زیادہ ان کی تحقیر میں مبالغہ کردیا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نہیں، میں ان سب کی حقیقت جانتا ہوں، جب میں سب کی حقیقت جانتا ہوں تو جو مثال میں نے دی ہے یہی صحیح ہے۔ جیسے آپ بھی جب کسی جگہ زور ڈالتے ہیں تو کہتے ہیں "میں جانتا ہوں اچھی طرح سے اس کو، جو میں کہہ رہا ہوں صحیح کہہ رہا ہوں۔" تو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے ان چیزوں کو جن کو یہ اللہ کے علاوہ پکارتے ہیں، جب اللہ جانتا ہے تو اللہ نے حقیقت تمہارے سامنے نمایاں کردی کہ یہ وقت پہ کام آنے والی چیزیں نہیں۔ بے شک اللہ جانتا ہے ان چیزوں کو جن کو پکارتے ہیں یہ لوگ اللہ کے علاوہ۔ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ: اور اللہ زبردست ہے حکمت والا ہے۔

مثالوں کے ذِکر کرنے سے مقصود

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ: یہ مثالیں، بیان کرتے ہیں ہم ان کو لوگوں کے لئے، یعنی واضح کرتے ہیں، ضربِ مَثَل: بیان کرنا۔ ہم ان مثالوں کو لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں۔ وَمَا یَعْقِلُهَاۤ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ: اور نہیں سمجھتے ان مثالوں کو مگر علم والے۔ جن کو کچھ علم فہم ہوتا ہے جو عقل سے کام لیتے ہیں ان مثالوں کو وہی سمجھ سکتے ہیں۔ اور ان مثالوں کو سمجھنے کا وہی مطلب کہ جو بات ان کے ذریعے سے سمجھائی جارہی ہے وہ سمجھو، اللہ تعالیٰ نے شرک کی تردید کے لئے یہ مثال بیان کی ہے تو عقل والے کا کام ہے کہ ان مثالوں میں غور کرکے اس حقیقت کو سمجھے۔

آسمان وزمین کی تخلیق بے مقصد نہیں

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ: اللہ نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو حق کے ساتھ، مصلحت کے ساتھ، حکمت کے ساتھ۔ بے شک اس میں البتہ نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو کہ ایمان لاتے ہیں، ایمان لانے والوں کے لئے نشانی ہے۔ نشانی اس بات کی کہ جب خالق اللہ ہے سماوات والارض کا، اور زمین آسمان میں جو کچھ ہے، تو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ سب سے بڑا استدلال تو خلقُ السماواتِ والارضِ سے اس کی توحید پر ہے، اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (سورۂ آل عمران: ۱۹۰) عقل والوں کے لئے زمین وآسمان کے پیدا کرنے میں نشانیاں ہیں، اور ان نشانیوں میں سے بڑی نشانی تو یہی ہے کہ اس سے استدلال کرکے اللہ کی توحید کو سمجھو۔ اور دوسری نشانی اس میں یہ ہے کہ اس میں غور کرنے کے بعد انجام کو سوچو، کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو مصلحت اور حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے، یہ ایسے ہی کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں ہے، جس طرح سے بچے کھیلتے ہیں تو مٹی کے مکان بناتے ہیں، جب فارغ ہوتے ہیں تو کہتے ہیں "مبتھاں نال بنایا سی، تے پیراں نال ڈھایا سی!" تھوڑی دیر کے لئے دل بہلالیا، دل بہلانے کے بعد اس کھیل کو ختم کرکے چلتے

لگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو ایسے نہیں پیدا کیا کہ ایک کھیل تماشے کے طور پر پیدا کیا ہو، اور اس کا نتیجہ کوئی نکلنے والا نہیں۔ ایسا نہیں۔ اس میں بہت حکمت اور مصلحت ہے، اس کا نتیجہ نکلنے والا ہے۔ چنانچہ عقل مندوں کا یہ حال نقل کرتے ہوئے سورۂ آل عمران کے آخر میں یہ آیا تھا کہ وہ جب غور کرتے ہیں، سوچتے ہیں، تو سوچنے کے بعد اس نتیجے پہ پہنچتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا: اے اللہ! تو نے یہ مخلوق باطل پیدا نہیں کی، بلکہ بالحق پیدا کی ہے، باطل پیدا نہیں کی، سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ، وہ فوراً اس نتیجے پہ پہنچتے ہیں کہ اگر اس پیدا کرنے والے کے حقوق کو نہ پہچانا گیا، اور اس کی عبادت اور طاعت نہ کی گئی تو آخر نتیجہ جہنم ہے۔ تو وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پکار اٹھتے ہیں کہ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ اے اللہ! ہمیں جہنم کے عذاب سے بچانا۔ تو "بالحق" کے اندر یہ بات ہے کہ اس کا نتیجہ کوئی ضرور سامنے آنے والا ہے، اللہ نے اس کو بیکار پیدا نہیں کیا۔ یہ نہیں کہ دنیا کے اندر انسانوں کو پیدا کر دیا، یہ کھاتے پیتے رہیں، دولتیاں مارتے رہیں، ظالم عیش کرتے رہیں، مظلوم پٹتے رہیں، مرنے کے بعد سب برابر ہو جائیں گے، ایسی بات نہیں ہے۔ حق کے اندر یہ پہلو بھی ہے۔ یہاں توحید کا سبق ہے، اور جہاں ردّ شرک کا پہلو اس میں آتا ہے، تو اسی طرح سے آخرت کی طرف انتقال، یہ بھی اس کائنات سے ایک سبق حاصل کرنے کی بات ہے۔

نشانیوں سے فائدہ کون اُٹھاتے ہیں؟

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ: مؤمنین کا ذکر ایسے ہی کر دیا جس طرح سے پیچھے عالمون کا ہے، کہ فائدہ اُٹھانا انہی کا کام ہے، ورنہ نادان آدمی کے سامنے، جو علم وفہم سے کام نہیں لیتا، اس کے سامنے آپ دفتروں کے دفتر پھیلا دیں، گھنٹوں وعظ کہہ دیں، اس کے سامنے کوئی چیز نہیں ہے۔ اور علم فہم والوں کا کام ہوتا ہے کہ جب کوئی مثال سامنے آئے تو اس کو سنیں، سننے کے بعد اس کو سوچیں، سوچنے کے بعد اس سے نتیجہ اخذ کریں، اور اسی طرح سے فائدہ اٹھانا، غور کرنا، نتیجے پہ پہنچنا، یہ ان لوگوں کا کام ہے جو ایمان لا چکے ہیں، یا جو ایمان لانے کا ارادہ کرتے ہیں۔ مؤمنین کے اندر دونوں پہلو ہیں، ایمان لانے والے اس نشانی سے فائدہ اٹھاتے ہیں، یا وہ لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جو واقعی اس استدلال کے ساتھ ایمان لانا چاہتے ہیں، نیک نیت ہیں، غور وفکر کے بعد کسی صحیح نتیجے پہ پہنچنا چاہتے ہیں، تو ان کے لئے تو بے شمار نشانیاں اس مخلوق کے اندر موجود ہیں۔ اور اگر کسی نے ارادہ ہی کیا ہوا ہے کہ میں نے تو ماننا ہی نہیں، تو اس کے سامنے تو پھر زمین کیا، آسمان کیا، اور دوسرے جتنے بھی کام رہے ہیں، وہ سارے کے سارے بے نتیجہ ہیں۔

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ: پیدا کیا اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو مصلحت کے ساتھ حکمت کے ساتھ۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ: بے شک اس میں البتہ نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو کہ ایمان لاتے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ

پڑھیے آپ اس کتاب کو جو آپ کی طرف وحی کی گئی ہے اور نماز کو قائم رکھیے، بےشک نماز روکتی ہے

الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَلَا

بے حیائی اور برائی سے، البتہ اللہ کا ذکر بڑی چیز ہے، اللہ جانتا ہے ان کاموں کو جو تم کرتے ہو ﴿۴۵﴾ جھگڑا

تُجَادِلُوْۤا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ۖۗ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْۤا

نہ کیا کرو اہلِ کتاب کے ساتھ مگر اس طریقے سے جو بہتر ہے، مگر وہ لوگ جو ان میں سے ظالم ہیں، اور تم کہو کہ

اٰمَنَّا بِالَّذِیْۤ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَاُنْزِلَ اِلَیْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ

ایمان لے آئے ہم اس چیز پر جو ہماری طرف اُتاری گئی اور جو تمہاری طرف اُتاری گئی، ہمارا معبود اور تمہارا معبود ایک ہی ہے اور ہم

لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ

اس کے لئے فرماں بردار ہیں ﴿۴۶﴾ اور ایسے ہی اُتاری ہم نے آپ کی طرف کتاب، پھر وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی

یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَمِنْ هٰۤؤُلَآءِ مَنْ یُّؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَمَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا

وہ اس کتاب پر بھی ایمان لاتے ہیں، اور ان مشرکین میں سے بھی بعض ہیں جو اس پر ایمان لاتے ہیں، اور نہیں انکار کرتے ہماری آیات کا مگر

الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِیَمِیْنِكَ اِذًا

کافر لوگ ﴿۴۷﴾ نہیں پڑھتے تھے آپ اس کتاب سے پہلے کوئی کتاب، اور نہیں لکھتے تھے آپ کتاب کو اپنے دائیں ہاتھ سے، تب

لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۴۸﴾ بَلْ هُوَ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَمَا

شک کرتے یہ باطل پرست ﴿۴۸﴾ بلکہ یہ واضح آیات ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جو علم دیے گئے، اور نہیں

یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَقَالُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ

انکار کرتے ہماری آیات کا مگر ظالم لوگ ﴿۴۹﴾ اور انہوں نے کہا: کیوں نہیں اُتاری گئیں اس پر نشانیاں اس کے رب کی طرف سے؟ آپ کہہ دیجئے

اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَاۤ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۵۰﴾ اَوَلَمْ یَكْفِهِمْ اَنَّاۤ اَنْزَلْنَا

اس کے سوا کچھ نہیں کہ معجزات اللہ کے قبضے میں ہیں، میں تو ڈرانے والا ہوں واضح طور پر ﴿۵۰﴾ کیا ان کے لئے کافی نہیں کہ ہم نے آپ پر

عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ يُتۡلٰى عَلَيۡهِمۡ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَرَحۡمَةً وَّذِكۡرٰى لِقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ۠ ﴿۵۱﴾

کتاب اُتاری جو ان پر پڑھی جاتی ہے، بے شک اس میں البتہ رحمت اور نصیحت ہے ان لوگوں کے لئے جو کہ یقین لاتے ہیں ﴿۵۱﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ۔ اُتۡلُ مَاۤ اُوۡحِىَ اِلَيۡكَ مِنَ الۡكِتٰبِ: مِنَ الۡكِتٰبِ: یہ ''ما'' کا بیان ہے۔ اُتۡلُ: اَمر کا صیغہ ہے تلاوۃ سے۔ پڑھئے آپ اس کتاب کو جو آپ کی طرف وحی کی گئی ہے۔ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ: اور نماز کو قائم رکھئے۔ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنۡهٰى عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡكَرِ: بے شک نماز روکتی ہے بے حیائی اور بُرائی سے۔ منکر: بُرا کام۔ فحشاء: بے حیائی۔ بے حیائی سے اور بُرے کام سے۔ وَلَذِكۡرُ اللّٰهِ اَكۡبَرُ: البتہ اللہ کا ذکر بڑی چیز ہے، وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ مَا تَصۡنَعُوۡنَ: اللہ جانتا ہے ان کاموں کو جو تم کرتے ہو۔ وَلَا تُجَادِلُوۡۤا اَهۡلَ الۡكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ: جدال نہ کیا کرو، جھگڑا نہ کیا کرو اہل کتاب کے ساتھ مگر اس طریقے سے جو بہتر ہے، مگر احسن طریقے سے۔ جدال مجادلہ: بحث مباحثہ۔ اہلِ کتاب سے جدال نہ کیا کرو مگر اس طریقے سے جو کہ بہتر ہے۔ اِلَّا الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡهُمۡ: مگر وہ لوگ جو ان میں سے ظالم ہیں۔ اس اِستثنا کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ جو ان میں سے ظالم ہیں، شرارتی ہیں، ان کا مقصد ہی تمہیں پریشان کرنا ہے، تو ان کا جواب تو تم ترکی بہ ترکی دے سکتے ہو، جو انداز انہوں نے اختیار کیا ہے وہی انداز تم اختیار کرلو۔ باقی! جو اُن میں ظالم اور شریر نہیں ہیں ان کے ساتھ بحث مباحثے کی نوبت آجائے تو بہت اچھا انداز اختیار کرو۔ اور یا یہ مطلب ہوسکتا ہے کہ مستثنیٰ کو منقطع کرلیجئے، مگر جو ان میں سے ظالم ہیں ان سے بحث مباحثہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں، ان سے اعراض کر جایا کرو، یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے۔ وَقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا بِالَّذِىۡۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡنَا: اور تم کہو کہ ایمان لے آئے ہم اس چیز پر جو ہماری طرف اُتاری گئی، وَاُنۡزِلَ اِلَيۡكُمۡ: اور جو تمہاری طرف اُتاری گئی، وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمۡ وَاحِدٌ: ہمارا معبود اور تمہارا معبود ایک ہی ہے، وَّنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ: ہم اس کے لئے فرمانبردار ہیں، اپنے آپ کو اس کے حکم پر مطیع کرنے والے ہیں، اسلام کا معنی ہوتا ہے گردن بطاعت نہادن۔ وَكَذٰلِكَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ: اور ایسے ہی اُتاری ہم نے آپ کی طرف کتاب۔ فَالَّذِيۡنَ اٰتَيۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ: پھر وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی يُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ: وہ اس کتاب پر بھی ایمان لاتے ہیں، وَمِنۡ هٰٓؤُلَآءِ مَنۡ يُّؤۡمِنُ بِهٖ: هٰٓؤُلَآءِ کا اشارہ مشرکینِ مکہ کی طرف ہے، اہلِ عرب۔ اور ان میں سے بھی بعض ہیں جو اس پہ ایمان لاتے ہیں۔ وَمَا يَجۡحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا الۡكٰفِرُوۡنَ: اور نہیں انکار کرتے ہماری آیات کا مگر کافر لوگ۔ وَمَا كُنۡتَ تَتۡلُوۡا مِنۡ قَبۡلِهٖ مِنۡ كِتٰبٍ: نہیں پڑھتے تھے آپ اس کتاب سے پہلے کوئی کتاب، یعنی یہ کتاب قرآن کریم جو آپ پر اُتاری گئی ہے اس کے اُترنے سے پہلے آپ کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے۔ وَلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيۡنِكَ: اور نہ آپ کسی کتاب کو اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ نہیں لکھتے تھے آپ کتاب کو اپنے دائیں ہاتھ سے۔ اِذًا لَّارۡتَابَ الۡمُبۡطِلُوۡنَ: اِذًا: تب، یعنی اگر آپ کو پڑھنے لکھنے کی عادت ہوتی، اِذًا کا یہ مطلب ہے، تب شک کرتے یہ باطل پرست۔ جب آپ کو پہلے لکھنے پڑھنے کی عادت ہی نہیں، تو پھر اتنی عظیم الشان کتاب آپ ان کے سامنے جو لے آئے ہیں تو اب تو اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے ان

لوگوں کے لیے۔ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ: بلکہ یہ کتاب واضح آیتیں ہیں، فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ: ان لوگوں کے دلوں میں۔ صدور صدر کی جمع، صدر سینے کو کہتے ہیں، سینہ بول کے دل مراد لیا جا سکتا ہے، علوم کی نسبت سینے کی طرف بھی ہوتی ہے دل کی طرف بھی ہوتی ہے، بلکہ یہ واضح آیات ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جو علم دیے گئے۔ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ: اور نہیں انکار کرتے ہماری آیات کا مگر ظالم لوگ۔ وَقَالُوْا: اور انہوں نے کہا، لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ: کیوں نہیں اُتاری گئیں اس کے اوپر نشانیاں اس کے رَبّ کی طرف سے؟ قُلْ آپ کہہ دیجئے اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ: اس کے سوا کچھ نہیں کہ آیات اللہ کے پاس ہیں، ''آیات'' سے معجزات مراد ہیں۔ معجزات اللہ کے قبضے میں ہیں، یعنی جب چاہے اتارے جب چاہے نہ اتارے۔

تفسیر

ماقبل سے ربط

شروع سورت سے گفتگو چلی آ رہی ہے مشرکین کے ساتھ۔ اور مؤمنوں کو حق کے اوپر ثابت قدم رکھنے کے لئے بہت ساری باتیں سنائی گئیں، اور ضمن میں کافروں کے لئے اور مشرکین کے لئے تنبیہ تھی، مثالوں کے ساتھ بھی اس بات کو واضح کیا گیا، تاریخی حقائق بھی پیش کئے گئے، اور جس قسم کی باتوں کے ساتھ مشرکین اہل ایمان کو پھسلانا چاہتے تھے ان کی وضاحت بھی ہو گئی۔ اب یہاں سرورِ کائنات ﷺ کو خطاب کر کے حکم دیا جا رہا ہے کہ جو کتاب آپ کی طرف وحی کی گئی آپ اس کی تلاوت کرتے رہیں، یہ تلاوت کرنا ہے بطور تبلیغ کے، یعنی لوگوں کو وہ پڑھ پڑھ سناتے رہیں۔ یہ قولی تبلیغ ہے۔ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ یہ فعلی تربیت ہے۔ اور آپ نماز کو قائم رکھیں۔ کتاب پڑھ پڑھ کے سنائیں اور نماز قائم رکھیں۔ اللہ کی کتاب کے ساتھ تبلیغ کریں اور اپنے عمل کے ساتھ بھی لوگوں کے سامنے نمونہ پیش کریں اللہ کی عبادت کا، جس میں سے اعلیٰ اور افضل چیز نماز ہے۔ اس کو قائم رکھئے۔ بے شک نماز روکتی ہے بے حیائی سے اور بُرے کاموں سے۔ اور اللہ کا ذکر بڑی چیز ہے۔ اللہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔

پہلا حکم: تلاوتِ قرآنِ کریم، اور تلاوت کی دو حیثیتیں

پہلا حکم تو دیا گیا تلاوت کے متعلق، اور خطاب سرورِ کائنات ﷺ کو ہے، لیکن نبی چونکہ امت کی طرف سے ایک نمائندہ ہوتا ہے، اس لئے جو حکم نبی کو خطاب کر کے دیا جائے، وہ امت کے لئے بھی ہوتا ہے۔ تو جب سرورِ کائنات ﷺ کو اللہ کی کتاب کی تلاوت کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے، تو آپ کی امت بھی اس بات کی مکلف ہے کہ اللہ کی کتاب کی تلاوت کرے، بطور تبلیغ کے بھی جو یہاں اصل مقصود ہے، لوگوں کو کتاب پڑھ پڑھ کے سناؤ، سناتے چلے جاؤ، یہ سنیں یا نہ سنیں، توجہ کریں یا نہ کریں، آپ کا فرض ہے کہ آپ پڑھ کے سناتے چلے جائیں۔ جیسا کہ سرورِ کائنات ﷺ کی عادت شریف یہی تھی کہ چاہے دوسرے شور مچائیں، لغو حرکتیں کریں، اور اعراض کریں، لیکن آپ نے اپنے اس فرض کو کسی حال میں بھی چھوڑا نہیں، اس بات کو بھی نہیں دیکھا کہ یہ مانتے ہیں یا نہیں، ہر وقت اللہ تعالیٰ کے کلام کو لوگوں کے سامنے پڑھ پڑھ کر سناتے رہتے تھے ..... اور اس کے علاوہ بطور ذکر کے اور بطور

عبادت کے اللہ کی کتاب کی تلاوت، یہ بھی مطلوب ہے۔سرورِ کائنات ﷺ بھی کثرت کے ساتھ تلاوت فرماتے تھے،خصوصیت کے ساتھ رات کونوافل میں۔فرضوں کے اندر بھی اس کتاب کو پڑھاجاتا ہے،لیکن فرضوں میں پڑھنے کا موقع کم ہوتا ہے،جماعت کی شکل میں نماز پڑھنی ہوتی ہے اس لئے تھوڑی تلاوت ہوتی ہے۔نوافل کی شکل میں رات کو حضور ﷺ بہت کثرت کے ساتھ تلاوت فرمایا کرتے تھے،رات کا کتنا کتنا حصہ قیام فرماتے تھے،بسااوقات ایک ایک رکعت میں سورۂ بقرہ،سورۂ آل عمران، سورۂ نساء اور سورۂ مائدہ (ہر رکعت میں ایک سورت) پڑھ دیا کرتے تھے۔جیسا کہ روایات میں آتا ہے۔[1] تو معلوم ہوگیا کہ اللہ کی کتاب کو پڑھنا بطورِ تبلیغ کے بھی ہے، یہ بھی فرض ہے۔اور اللہ تعالیٰ کی کتاب کی تلاوت کرنا یہ بھی بہت بڑی سعادت ہے،جس کے ساتھ انسان کے دل میں صلاحیتیں اُجاگر ہوتی ہیں،اور انسان کے سامنے راستہ واضح ہوتا ہے۔

بغیر سمجھے تلاوت بھی سعادت ہے

اگر اللہ تعالیٰ کسی کو کتاب کا فہم دے دے، سمجھ دے دے،اور وہ پڑھتا بھی جائے اور سمجھتا بھی جائے،تو یہ نورٌ علیٰ نور ہے۔اور اگر سمجھ نہ ہو،ویسے ہی الفاظ بطور تبرک کے تلاوت کئے جائیں تو یہ بھی بہت بڑی سعادت ہے اور سعادت کی کنجی ہے،اس کو بھی فضول اور مہمل نہیں سمجھنا چاہیے جس طرح سے کہ آج کل مغرب زدہ لوگوں کا ذہن ہے،وہ کہتے ہیں کہ ''الفاظ کے رٹنے کا کیا فائدہ؟ جب یہ سمجھ میں نہیں آتے تو ان کے اس طرح سے پڑھنے کا کیا فائدہ؟ وقت ضائع کرتے ہیں'' یہ بات غلط ہے،گمراہی ہے۔اللہ کی یہ کتاب دنیا کی باقی تمام کتابوں سے ممتاز ہے،کہ باقی جتنی بھی کتابیں ہیں،چاہے وہ اللہ کی طرف سے اتریں،چاہے وہ انسانوں کی لکھی ہوئی ہیں،ان کے الفاظ مقصود نہیں ہوتے،ان کے معانی مقصود ہوتے ہیں،کہ ان الفاظ میں سمجھایا کیا جارہا ہے؟ اور بات کیا کہی جارہی ہے؟ اس لئے اگر وہ بات سمجھ میں آئے تو پڑھنے کا فائدہ ہے،اور اگر سمجھ میں نہ آئے تو پڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ہم کہتے ہیں کہ ہدایہ اولین ہے،فقہ کی کتاب ہے،لیکن اگر اس کا کوئی مطلب نہیں سمجھتا تو پڑھنے میں ثواب کوئی نہیں،ایسے ہی آپ عبارت پڑھتے چلے جائیں،کوئی ثواب نہیں ہے۔''قدوری'' ہے،اس کی اگر آپ ایسے ہی عبارت پڑھتے چلے جائیں گے،کوئی ثواب نہیں ہے۔اسی طرح سے انسانوں کی لکھی ہوئی کتابیں،کہ کوئی کتاب ہو،اُردو میں ہے، فارسی میں ہے،اگر اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا تو اس کے پڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ ان کتابوں سے مقصود معانی ہوتے ہیں،ان کا مفہوم ہوتا ہے، الفاظ مقصود نہیں ہیں۔توراۃ کی یہی پوزیشن ہے،اِنجیل کی یہی پوزیشن ہے کہ ان کا پڑھنا سمجھنے کے لئے ہے کہ اس میں کہا کیا جارہا ہے؟ ان کے الفاظ کی نوعیت یہ نہیں کہ وہ الفاظ منزل من اللہ ہیں،اور ان الفاظ کو باقی رکھنا مقصود ہے،اور ان کے ساتھ بھی احکام متعلق ہیں،ایسی بات نہیں۔اس لئے اگر اُردو میں لکھی ہوئی توراۃ آپ کے پاس ہے،انجیل اُردو میں لکھی ہوئی ہے،تو وہ عیسائی اس اُردو میں پڑھنے کو یونہی سمجھتے ہیں جیسا کہ انجیل پڑھ لی۔فارسی میں توراۃ لکھی ہوئی ہو،تو فارسی میں توراۃ پڑھنے کو یہودی یونہی سمجھتے

(۱) ابو داؤد ۱/ ۱۲۷ باب ما یقول الرجل فی رکوعه۔ مشکوۃ ۱/ ۱۰۷ باب صلاۃ اللیل۔نوٹ: مسلم ۱/ ۲۶۴ پر ایک ہی رکعت میں بقرہ،نساء،آل عمران پڑھنے کا ذکر بھی ہے۔

ہیں کہ جیسے یہ شخص توراۃ پڑھ رہا ہے۔ یہ اللہ کی کتاب (قرآن) ممتاز ہے کہ اس کے الفاظ اللہ کی جانب سے اُترے ہیں، اوران الفاظ کا باقی رکھنا بھی مطلوب ہے۔

الفاظِ قرآن کے مقصود ہونے پر دلیل

جس کے لئے واضح دلیل کتاب اللہ میں سے ہی یہ ہے کہ جس آیت کا حکم منسوخ کر دیا گیا، اور اس کے الفاظ منسوخ نہیں کئے گئے، الفاظ باقی ہوں، وہ بالکل اللہ کی کتاب ہی ہے، اور اس کا پڑھنا ویسے ہی عبادت ہے، حالانکہ اس کا حکم سرے سے مطلوب ہی نہیں۔ اگر ان الفاظ سے صرف معانی اور حکم کا بیان کرنا ہی مقصود ہوتا، اور بغیر سمجھے ان کے پڑھنے کا کوئی فائدہ نہ ہوتا تو کم از کم وہ آیات کتاب اللہ سے نکال دی جاتیں کہ جن کا حکم سرے سے منسوخ ہو گیا ہے، اور ان کے اوپر اب عمل کرنے کا مطالبہ ہی نہیں۔ ان کو باقی رکھنے کا کیا فائدہ؟ یہ علامت ہے اس بات کی کہ یہ کتاب اپنی لفظی حیثیت میں بھی قابلِ اعتبار ہے اور قابلِ تعظیم ہے، اس کے الفاظ بھی مقصود ہیں، اس لئے اس کے الفاظ کی تلاوت یہ کتاب اللہ کی تلاوت کہلاتی ہے، اور اگر کوئی اس کا معنی یا ترجمہ پڑھنے کی کوشش کرے تو مسلمان اس کو کتاب اللہ کا پڑھنا نہیں کہتے۔ اگر کوئی شخص نماز میں فاتحہ کی بجائے فاتحہ کا ترجمہ پڑھنا شروع کر دے، اور سورت ملانے کی بجائے قرآنِ کریم کی آیات کا ترجمہ کرنا شروع کر دے، تو ہم کہتے ہیں نماز نہیں ہوتی، اس نے قرآن نہیں پڑھا، ہمارے ہاں تو قرآن پڑھنا نام ہی الفاظ پڑھنے کا ہے۔

بغیر سمجھے تلاوت کے ثواب پر ایک اور دلیل

اس لیے سرورِ کائنات ﷺ نے جو بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب پڑھنے پر ایک ایک حرف پر دس دس نیکیاں ملتی ہیں۔ اور پھر ساتھ فرمایا کہ میں یہ نہیں کہتا کہ الٓمّٓ ایک حرف ہے۔ بلکہ ''الف'' علیحدہ حرف ہے، ''لام'' علیحدہ حرف ہے، ''میم'' علیحدہ حرف ہے۔[1] تو جس وقت کوئی شخص الٓمّٓ کہتا ہے تو اس نے تین حرف پڑھ لیے، تو اس کو تیس نیکیاں مل جائیں گی۔ یہ نیکیوں کا ملنا الفاظ کی تلاوت پر ہے، چاہے معنی سمجھے یا نہ سمجھے۔ اس بات کو بیان کرتے ہوئے حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے ایک بڑی اچھی بات بیان فرمائی[2] کہ دیکھو! حضور ﷺ نے مثال کے لئے الٓمّٓ اس لفظ کو منتخب کیا، اور اس کے متعلق کہا کہ تیس نیکیاں ملتی ہیں، اور یہ ساری دنیا جانتی ہے کہ الٓمّٓ یہ جو حروف ہیں جو سورت کے شروع میں پڑھے جاتے ہیں، یہ مقطعات ہیں اور ان کا معنی کوئی نہیں جانتا کہ ان لفظوں سے اللہ کی مراد کیا ہے؟ اگر مراد اور معنی سمجھے بغیر پڑھنا ثواب نہ ہوتا، تو کم از کم الٓمّٓ پڑھنے پر تو نیکی نہ ملتی، کیونکہ اس کو تو جو پڑھے گا اس کی مراد تو سمجھ نہیں سکتا، اس کی مراد تو حضور ﷺ کی طرف سے واضح ہی نہیں کی گئی، اس لئے کوئی عالم پڑھے، کوئی فاضل پڑھے، کوئی شیخ الحدیث پڑھے، کوئی محدث پڑھے، کوئی مفسر پڑھے، وہ ان لفظوں کو بغیر معنی جانے کے پڑھے گا۔ تو جب بغیر معنی کے جانے پڑھے گا، اور حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کے اوپر تیس نیکیاں ملتی ہیں، یہ واضح

(۱) ترمذی ۲/ ۱۱۹، باب ما جاء فی من قرء حرفا۔ مشکوٰۃ ۱/ ۱۸۶، کتاب فضائل القرآن، فصل ثانی۔

(۲) دیکھئے: ''خطبات حکیم الامت'' ج ۱ ص ۲۰۔

دلیل ہے اس بات کی کہ نیکیوں کے ملنے کا تعلق معنی جاننے کے ساتھ نہیں ہے، ورنہ حضور ﷺ مثال کوئی اور دے دیتے جس کا ترجمہ سمجھ میں آتا، اس کا تو ترجمہ سمجھ میں نہیں آتا، آپ کے سامنے جب یہ لفظ آتے ہیں تو یونہی کہا کرتے ہیں: اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ بِذٰلِكَ، ان حروف سے اللہ کی کیا مراد ہے، وہ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں۔ تو معلوم ہو گیا کہ الٓمّٓ پہ ترجمہ نہ سمجھنے کے باوجود تیس نیکیاں مل گئیں، تو یہ الفاظ اور حروف کی تلاوت پر مدار ہے اس بات کا۔ اس لئے ترجمہ نہ بھی آتا ہو، تو جو لوگ پڑھتے ہیں، گھروں میں عورتیں پڑھتی ہیں، بوڑھے پڑھتے ہیں، جو ترجمہ نہیں سمجھتے، بہت بڑی سعادت ہے، بہت بڑی نیکی ہے، اور اس کی ترغیب دینی چاہیے۔

ہوشیار باش!

اور ان دجالوں سے اور ان فتنہ پردازوں سے ہمیشہ اپنے ذہن کو بچا کے رکھنا چاہیے جو اس قسم کے مغالطے دے کے دنیا کو روکتے ہیں۔ اصل کے اعتبار سے یہ کتاب اللہ کے دشمن ہیں، ان کو کتاب اللہ کی اشاعت اور کتاب اللہ کی تلاوت سے دشمنی ہے۔ ورنہ اگر یوں روکنا شروع کر دیا جائے، تو کتنے آدمی ہیں جو کہ کتاب اللہ کا مفہوم سمجھتے ہیں، اس کا مطلب ہے کہ پڑھنا پھر انہی کے لئے رہ گیا۔ جیسے ہندوؤں کا ایک خاص طبقہ اپنی کتاب پڑھتا ہے باقیوں کو کوئی واسطہ نہیں۔ اب سارے کے سارے لوگ تو ترجمہ وتفسیر جاننے سے رہے، تو اس کا مطلب ہے کہ ان سب کو تلاوت کرنے سے روک دیا جائے؟ تو کتاب اللہ کی جو اتنی اشاعت ہے، اتنی کثرت سے جو اس کی تلاوت ہوتی ہے، وہ سب ختم ہو جائے گی۔ اس مغالطے میں نہ خود آئیں، نہ کسی دوسرے کو آنے دیں۔ الفاظ کی تلاوت یہ مستقل ایک سعادت ہے، اور اس کے ساتھ دنیا اور آخرت کے فضائل اللہ تعالیٰ کے ہاں سے نصیب ہوتے ہیں، اور مختلف قسم کی برکات انسان کو نصیب ہوتی ہیں، لفظوں کی تلاوت بھی بیکار نہیں۔ اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ: اس میں دونوں حیثیتیں ہیں، تبلیغ کے لئے بھی پڑھو، لوگوں کو سمجھانے کے لئے بھی اس کی تلاوت کرو، لیکن اسی طرح سے بغیر تبلیغ کی نیت کے، حضور ﷺ رات کی خلوت میں تنہائی میں جس وقت اس کتاب کو پڑھتے تھے تو اس وقت کوئی تبلیغ تو مقصود نہیں ہوتی تھی، وہ محض بطور عبادت کے ہے، نماز میں پڑھا جائے تو یہ بہت بڑی سعادت، اور اگر نماز میں نہ ہو تو بیٹھ کے پڑھیں، زبانی یاد ہے تو زبانی پڑھیں، دیکھ کے پڑھنا ہو تو دیکھ کے پڑھیں، یہ چیز باعث برکت ہے، بلکہ مسلمان کو چاہیے کہ اپنے دن کی زندگی کی ابتدا، اپنے اعمال کی ابتدا صبح اُٹھ کے نماز پڑھ کے اللہ تعالیٰ کی کتاب کی تلاوت سے ہونی چاہیے، سارا دن اس کی خیر و برکت باقی رہتی ہے۔

دُوسرا حکم: اِقامتِ صلوٰۃ

دُوسرا حکم دیا کہ نماز کو قائم کیجئے۔ یہ حکم تو اہم ہے ہی، کتنی آیات ہیں جن کے اندر اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دیا گیا ہے۔ اور یہاں نماز کی یہ صفت ذکر کی گئی، یہ شان ذکر کی گئی اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ: نماز فحشاء اور منکر سے روکتی ہے۔ معاشرے کو برباد کرنے والی دو ہی چیزیں ہوتی ہیں فحشاء اور منکر۔ ''فحشاء'' سے مراد وہ گناہ ہوتے ہیں جن کا تعلق بے حیائی سے ہے، یہ شہوانی گناہ ہو گئے، شہوت کے زور سے جس قسم کی معصیت انسان کرتا ہے، جس قسم کی حرکتیں کرتا ہے، چاہے وہ نظر بازی ہے، چاہے وہ دست درازی ہے، جو مقدمات بنتے ہیں زنا کے اور بدکاری کے، سب ''فحشاء'' کا مصداق ہیں، اس کا

مصداق سارے ایسے گناہ ہو جائیں گے جن کا مبنیٰ شہوت ہے۔اور''منکر'' یہ عام ہو گیا،''منکر'' اسے کہتے ہیں کہ جس کے اُوپر عقل، شریعت، صالح عرف انکار کرے، نہ اس کو کوئی شریفانہ عرف برداشت کرتا ہے، نہ عقل برداشت کرتی ہے، نہ شریعت برداشت کرتی ہے وہ سب کام''منکر'' ہوتے ہیں۔تو جتنی بھی معصیات ہیں، جتنے بھی گناہ ہیں، وہ سارے کے سارے فحشاء اور منکر کے دائرے میں آجاتے ہیں۔جس طرح سے سورۂ نحل میں گزرا تھا اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَ اِیْتَآیِٔ ذِی الْقُرْبٰی وَ یَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ (سورۂ نحل:۹۰) اللہ بھی فحشاء اور منکر سے روکتا ہے، وہاں بھی فحشاء اور منکر کا لفظ آیا ہوا ہے، اسی طرح سے نماز بھی روکتی ہے۔

نماز''مؤثر بالخاصہ'' بھی ہے اور''مؤثر بالکیفیۃ'' بھی

اب رہی یہ بات کہ نماز کس طرح سے روکتی ہے؟ نماز کے روکنے کی دو صورتیں ہیں۔یا یہ روکنا بالخاصہ ہے، یا بالکیفیت ہے۔جس طرح سے بعض دوائیاں ہوا کرتی ہیں جو کسی مرض کے لئے مفید ہوں تو ان کے لئے مرض میں مفید ہونا بظاہر سمجھ میں آتا ہے کہ یہ مرض سردی کی تھی، دوا گرم لے لی، گرمی نے آکے سردی کو زائل کر دیا، یہ ہے جو اپنی کیفیت کے اعتبار سے دوا مفید ہے، سمجھ میں آتی ہے۔آپ کو خشکی تھی، آپ نے کوئی تر چیز کھالی، تو تر چیز کے کھانے کے ساتھ خشکی دور ہوگئی...... اور ایک ہوتا ہے کہ وجہ معلوم نہیں ہوتی، اور یہ نسبت درمیان میں سمجھ نہیں آتی، لیکن یہ چیز استعمال کرنے کے ساتھ فائدہ ہوتا ہے، اس کو کہتے ہیں کہ اس کا خاصہ یہ ہے، تجربے کے ساتھ معلوم ہو گیا کہ یہ مفید ہے، اگرچہ دونوں کے درمیان میں ربط نہ دیا جاسکے کہ کیوں مفید ہے؟ اس کو مفید بالخاصہ کہتے ہیں، مؤثر بالخاصہ کہتے ہیں۔مثلاً مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے، تجربے سے ثابت ہے کہ جس وقت آپ لوہے کو مقناطیس کے قریب کریں گے، مقناطیس اُسے کھینچ لے گا۔باقی یہ کیوں کھینچتا ہے؟ اس کی کیا وجہ ہے؟ سمجھ میں آئے یا نہ آئے، تجربے کے ساتھ ثابت ہے کہ ایسا ہوتا ہے۔چاند کے طلوع کرنے کے ساتھ سمندر میں تلاطم پیدا ہوتا ہے، جیسے جیسے چاند بڑھتا جاتا ہے، اس کی روشنی بڑھتی جاتی ہے، سمندر کے اندر لہریں زیادہ اٹھنی شروع ہو جاتی ہیں، تجربہ ہے کہ ایسا ہوتا ہے، باقی یہ ہے کہ چاند کا اثر سمندر پہ کیوں پڑتا ہے؟ معلوم ہو یا نہ ہو، واقعہ ایسے ہی ہے۔ربط اس میں آپ دے سکیں یا نہ دے سکیں مشاہدہ ایسے ہی ہے، جب چاہیں جاکے دیکھ لیں۔جن راتوں میں چاند نہیں ہوتا ان دنوں میں سمندر میں اتنا تلاطم نہیں ہوتا، جب چاند بڑھا ہوا ہو تو سمندر میں تلاطم زیادہ ہوتا ہے، اس طرح سے جس طرح سے پانی ناچتا ہے۔تو یہ چیزیں ہوتی ہیں جن کی خاصیت معلوم ہوگئی، اگرچہ دونوں باتوں کے درمیان ربط نہ دیا جاسکے کہ اس کی کیا وجوہ ہیں؟ جیسے اطباء کہتے ہیں کہ عودِ صلیب ایک لکڑی ہے، وہ گلے میں لٹکائی جائے، تو مقوی قلب ہے، ایک تو ہے کہ کھانے کے ساتھ قوت پہنچی، اور ایک ہے کہ گلے میں لٹکانے کے ساتھ ہی مقویٔ قلب ہوگئی، اب ان دونوں چیزوں کا آپس ربط کیا ہے، وجہ کیا ہے، تجربے کے ساتھ معلوم ہے، لیکن ضروری نہیں کہ ہم ربط بھی پیدا کر سکیں کہ اس سے یہ اثرات ہیں، اس سے یہ شعاعیں چھوٹتی ہیں، یا قلب پہ یوں اثر انداز ہوتی ہیں، وجہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے، ہوتا اسی طرح سے ہے۔

اسی طرح سے نماز یہ بھی بالخاصہ برائیوں سے روکتی ہے کہ اگر کوئی شخص خلوص کے ساتھ نماز کے آداب کی رعایت رکھتا ہوا، پابندی اوقات کے ساتھ نماز پڑھتا رہے، تو تجربہ یہی ہے کہ برائیاں اس سے چھوٹ جاتی ہیں، اچھائیاں اس میں پیدا ہو جاتی ہیں، وقت پر پڑھتا رہے، آداب کی رعایت رکھے، اور توجہ کے ساتھ پڑھے تو یہ ایک روحانی غذا ہے کہ جس کے ساتھ روحانی صحت حاصل ہوتی ہے، بیماریاں دور ہوتی ہیں، چاہے آپ اس کی وجہ سمجھیں یا نہ سمجھیں لیکن واقعہ اسی طرح سے ہے۔ اور اگر کسی شخص کو آپ نماز پڑھتا ہوا دیکھیں، اور اس کے باوجود وہ برائیاں نہیں چھوڑتا تو اس سے نماز پر شبہ نہیں ہو سکتا، ہم یہ کہیں گے یا تو اس کی نیت صحیح نہیں، ریاکاری کے طور پر پڑھتا ہے، یا پھر یہ ہے کہ جس طرح سے ایک اچھی غذا کھانے کے ساتھ ساتھ انسان کو کسی نہ کسی درجے میں کچھ پرہیز بھی کرنا پڑتا ہے، کہ اس غذا کو ہضم ہونے کا موقع دے، جزوِ بدن ہونے کا موقع دے، یہ اس طرح سے نہیں کرتا۔ اب ایک آدمی اچھی سے اچھی غذا کھاتا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے دسترخوان پہ بہترین سے بہترین کھانے ہیں، لیکن کھانے کے بعد وہ قے کر دیتا ہے، وہ کھانے کے بعد ساتھ ہی کوئی اس قسم کی چیز کھا لیتا ہے جو غذا کے اثرات کو ختم کر دیتی ہے، تو اس میں اب غذا کا قصور نہیں بنائیں گے، اس کے طرزِ عمل کی غلطی ہے کہ اس نے غذا ایسے طور پر استعمال کی کہ وہ جزوِ بدن نہیں بنتی۔ اسی طرح سے نماز تو اپنی جگہ مفید ہے، لیکن ساتھ ہی اس شخص کے اندر میں کوئی ایسی خرابی ہے، اس کے باطن میں کوئی ایسا نقص ہے، ریاکاری کے طور پر پڑھتا ہے، بدنیتی کے طور پر پڑھتا ہے، یا اللہ کی عبادت کے تصور کے طور پر نہیں پڑھتا، ایک عادت کے طور پر ظاہرداری کے طور پر ادا کرتا ہے، تو یہ دوا بے اثر ہو جائے گی، چاہے آپ اس کو کتنا ہی استعمال کرتے جائیں۔ اس میں نماز پر اعتراض نہیں ہوگا، پڑھنے والے کے اندر کوئی خلل تلاش کیا جائے گا، کہ کیا وجہ ہے؟ اس میں کیا خرابی ہے؟ جس کی بنا پر یہ غذا اس کو قوت نہیں پہنچا رہی، اور اس کا جزوِ بدن نہیں بن رہی۔ جس وقت تک اس خرابی کو دور نہیں کیا جائے گا، اس وقت تک یہ غذا یہ دوا مریض کے لئے مفید نہیں ہو سکتی، کوئی نہ کوئی بدپرہیزی اس میں ایسی ہے کہ جس کا زائل کرنا اس نماز کے اثر انداز ہونے کے لئے ضروری ہے۔ تو ایسا ہوتا ہے کہ مریض اچھی سے اچھی دوا کھاتا ہے، لیکن مفید نہیں ہوتی، تو اس میں دوا کے اثر میں فرق نہیں ہوتا، لیکن مریض کے اندر کوئی اس قسم کی چیز ہوتی ہے جو اس دوا کو اثر نہیں ڈالنے دیتی، تو اس کا ازالہ ضروری ہے، وہ چاہے نیت میں فساد ہے، ریاکاری ہے، ظاہرداری ہے، توجہ کے ساتھ نہیں پڑھتا، طہارت اچھی طرح سے نہیں کرتا، اوقات کی رعایت نہیں رکھتا، اس قسم کی خرابیاں ہوں گی جن کی بنا پر نماز کی روحانیت ختم ہو جاتی ہے۔

اور اگر اس کو مؤثر بالکیفیت مانا جائے، تو بات بالکل ہی واضح ہے کہ نماز روکتی ہے یعنی دلالت حال کے ساتھ۔ ایک آدمی نماز پڑھتا ہے، پانچ وقت اللہ کے دربار میں حاضری دیتا ہے، اور اس حاضری دینے سے پہلے یہ تیاری کرتا ہے حاضر ہونے کی، وضو کرتا ہے، پاک کپڑے پہنتا ہے، بدن کو پاک کرتا ہے، گھر سے چلتا ہے، مسجد میں آتا ہے، کچھ وقت مسجد میں گزارتا ہے، نماز پڑھتا ہے، چوبیس گھنٹے کو دیکھو! پانچ حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے، کہ وقفے وقفے سے آپ کو بلایا جاتا ہے کہ آیئے! اللہ کے دربار کی طرف اور اللہ کی عبادت کیجئے۔ اب ایک آدمی چوبیس گھنٹے میں پانچ دفعہ جب یہ تیاری کرے، تو اس کو شروع سے لے کے آخر تک یہ تصور رہو گا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں، اور اللہ کے حکم کے تحت ہی یہ کام کر رہا ہوں، وضو کر رہا ہوں، کپڑے پاک پہن رہا ہوں، اور ہر

وقت اللہ کے علم کا اس کو تصور ہے...... ورنہ دیکھئے!...... اگر آپ نے وضو کیا ہے، ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ نے وضو کر لیا، لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ باوضو ہیں، دیکھنے کے باوجود ہم آپ کو باوضو نہیں کہہ سکتے، ایک آدمی ٹونٹیوں پہ آپ کے سامنے بیٹھ کے وضو کرتا ہے، اور وضو کر کے وہ اٹھا، تو کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ آدمی باوضو ہے۔ نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس نے تھوڑی سی ہوا خارج کر دی ہو، تو آپ نے کوئی سونگھ تو نہیں لی۔ آپ کو کیا پتا؟ اب اگر وہ اپنے وضو کو بچائے ہوئے ہے تو صرف ایک اللہ کے علم کی رعایت رکھتے ہوئے بچائے ہوئے ہے، ورنہ انسان تو نہیں پہچان سکتا کہ اس کا وضو ہے یا ٹوٹ گیا۔ آپ نے جو کپڑے پہن رکھے ہیں، یہ پاک ہیں جن میں آپ نماز پڑھنے کے لئے جا رہے ہیں، تو یہ آپ کو ہی پتا ہے، کسی دوسرے کو تو پتا نہیں ہے۔ تو اگر واقعی آپ نے نماز کی رعایت رکھتے ہوئے کپڑے پاک رکھے ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اللہ کے علم کا تصور کئے ہوئے ہیں، کہ اگر میرا کپڑا ناپاک ہوگا، کسی انسان کو پتا ہو یا پتا نہ ہو، لیکن اللہ کو تو پتا ہے، آپ اس جذبے کے تحت کپڑا پاک رکھیں گے۔ بدن آپ کا پاک ہے یا نہیں، آپ نے استنجاء صحیح کیا ہے یا نہیں، کسی کو کیا پتا؟...... اور پھر جس وقت آپ مسجد میں آتے ہیں، تو کھڑے ہو کے نیت آپ نے صحیح کی ہے یا نہیں کی؟ تکبیر تحریمہ بھی کہی کہ نہیں کہی؟ اور آپ نماز کے اندر تسبیحات بھی پڑھتے ہیں کہ نہیں پڑھتے؟ کسی کو کیا علم؟ یہ سب کچھ آپ ایک اللہ کے تصور پہ کرتے ہیں، اور اللہ کے علم کی بنا پر کرتے ہیں۔ ورنہ نیت باندھ لیں، اور کھڑے ہو کر غزلیں گنگنانی شروع کر دیں، کسی کو کیا پتا؟ نماز میں تسبیحات پڑھنے کی بجائے قراءت کرنے کی بجائے تم اپنے شعر پڑھتے رہو، کسی کے علم میں کیا ہے؟ تو پھر اللہ کے سامنے کھڑے ہونا، نیت صاف کرنا، تسبیحات پڑھنا یہ محض اللہ کے علم کو سامنے رکھتے ہوئے ہے کہ اللہ جانتا ہے...... اور پھر ایک ایک بات آپ کو بندگی یاد دلاتی ہے کہ آپ اللہ کے بندے ہیں۔ کس طرح سے آپ دربار کی طرف جاتے ہیں؟ جس طرح سے کوئی شخص اپنے مولیٰ مالک کے دربار میں جایا کرتا ہے، بن کے، سنور کے، صاف ستھرا ہو کے۔ پھر ہاتھ باندھ کے آپ اس کے سامنے اطاعت کا زبان سے اقرار کرتے ہیں، اور عمل سے بھی اظہار کرتے ہیں...... تو جو شخص چوبیس گھنٹے میں پانچ دفعہ اس طرح سے دربار میں حاضری دیتا ہے، اور اپنے مولیٰ اور مالک کے علم کا تصور کرتے ہوئے، اس کے اپنے اوپر قادر ہونے کا تصور کرتے ہوئے اس کے سامنے ناک رگڑتا ہے، اگر وہ ان باتوں کی طرف دھیان رکھے تو کیا اس کی ایک ایک حرکت اس کو یاد نہیں دلاتی؟ کہ اپنے آقا کی باہر نکل کے بھی نافرمانی نہ کرنا۔ جس کا تو بندہ ہے، جس کے سامنے تو جا کے ہاتھ باندھ کے کھڑا ہوتا ہے، جیسے یہاں اس کے علم کا تو لحاظ رکھتا ہے کہ اپنا وضو باقی رکھے ہوئے ہے، کپڑے پاک رکھے ہوئے ہے، بدن کو تُو نے پاک رکھا ہے، نیت تیری ٹھیک ہے، تسبیحات تو پڑھتا ہے۔ بسا اوقات خلوت میں انسان نماز پڑھتا ہے تو سوائے اللہ کی ذات کے انسان کے سامنے کیا ہوتا ہے؟ ایک ایک چیز یاد دلاتی ہے کہ تُو کسی کا بندہ ہے، اور تیرے اُوپر وہ قادر ہے، تیری ایک ایک حرکت کو وہ جانتا ہے، جس کے سامنے تو ناک رگڑ رہا ہے۔ مسجد سے نکل کے جب تو باہر آئے گا، تو باہر بھی وہی خدا ہے، باہر بھی وہی اللہ ہے، اب اس کا علم اور قدرت ختم نہیں ہو گیا، تیرے احوال کو جانتا بھی ہے، اور تیرے اُوپر پوری طرح سے قادر بھی ہے۔ تو جیسے مسجد کے اندر تُو اس کے سامنے بندہ بنا ہوا تھا، اسی طرح سے مسجد کے باہر بھی تو بندہ بن کے رہ۔ تو جب یہ تصور انسان کرے گا نماز کے متعلق، پھر اس کی اداؤں اور اس کے اندر جتنی تسبیحات اور اقوال ادا کیے جاتے ہیں جب ان کو سوچے گا، تو سوچنے کے بعد ایک ایک قول اور

ایک ایک حرکت اس بات پہ دلالت کرتی ہے کہ اللہ کی نافرمانی نہ کرو۔ اس اللہ نے جن کاموں سے منع کیا ہے ان کا ارتکاب نہ کرو۔ اس طرح سے نماز بالکیفیت بھی روکتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص نماز پڑھتا ہے اور پھر برائیوں کا ارتکاب بھی کرتا ہے، تو اس کا مطلب ہے کہ قدم قدم پر نماز اسے آواز دے رہی ہے، کہ جس کے سامنے ناک رگڑ کے آیا ہے، اب اس کی نافرمانی نہ کر۔ یہ ایک علیحدہ بات ہے کہ نماز روکے اور انسان نہ رکے۔ روکنا اور چیز ہے، رک جانا اور چیز ہے۔ نہی اور چیز ہے، اِنتہا (رک جانا) اور چیز ہے۔ اللہ روکتا ہے لیکن اللہ کے روکنے کے باوجود آپ نہیں رکتے، تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اللہ روکتا نہیں ہے۔ اسی طرح سے نماز بھی روکتی ہے لیکن نماز کے روکنے سے آدمی نہ رکے تو اس میں آدمی کا قصور ہے، نماز تو اپنی جگہ پکار پکار کے کہہ رہی ہے کہ جس اللہ کے سامنے ناک رگڑ رہے ہو، اس اللہ کی نافرمانی نہ کرو، تو جیسے اللہ روکتا ہے اور اس کے روکنے پر بندوں کا رک جانا کوئی ضروری نہیں۔ رکنا، نہ رکنا، بندے کی اپنی سعادت اور شقاوت ہے۔ کہ اللہ کے حکم پر کان دھرے، کان دھرنے کے بعد اللہ کا حکم سمجھے، پھر اس سے باز آجائے۔ اسی طرح سے نماز روکتی ہے، اور اس کی آواز کو سننا سمجھنا، اس سے دلالت حال کے طور پر ان باتوں کو سمجھنا، یہ نیک بختوں کا کام ہے جو نماز کے بعد پھر اس بات کو سمجھتے ہوئے برائیوں سے رک جاتے ہیں۔ ورنہ نماز روکتی رہے اور تم اس کی آواز پر کان نہ دھرو، تو قصور تمہارا ہے۔[1] بہرحال اس بارے میں کوئی اشکال نہیں کہ نماز واقعی بے حیائی اور منکر کے کاموں سے روکتی ہے، کہ آدمی نمازی ہو اور پھر بے حیائی کا مرتکب ہو، پانچ وقت اللہ کے دربار میں ناک رگڑتا ہو، باہر نکل کر اللہ کے خلاف بغاوت کرتا ہو، یہ بات آپس میں ڈھکتی نہیں، ان کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں ہے، یہ بات اچھی نہیں لگتی۔ اس طرح سے نماز روکتی ہے۔

تیسرا حکم: ذِکر اللہ

وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ: اللہ کا ذِکر بڑی چیز ہے۔ اس کا کیا مطلب؟ ''بیان القرآن'' میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تو یوں کہا کہ نماز کے علاوہ اور بھی جتنے اللہ کے اَحکام ہیں وہ سب ماننے چاہئیں، کیونکہ قولاً فعلاً وہ سب ''ذِکر'' ہیں، اور اللہ کا ذِکر بہت بڑی چیز ہے۔ ہر وقت انسان اللہ کو یاد رکھے، اور اللہ کے احکام کی اطاعت کرے، کیونکہ اللہ کے احکام کی اطاعت کرنا یہی اصل کے اعتبار سے اللہ کا ذِکر ہے، اللہ اُسے یاد ہے جو ہر وقت اللہ کے احکام کی رعایت رکھتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص زبان سے تو ''اللہ، اللہ'' کرتا رہے، اور عمل اس کا اللہ کی نافرمانی میں جاتا ہو، تو ہم یونہی کہیں گے کہ اس کو خدا یاد نہیں، اگر اس کو خدا یاد ہوتا اگر اس کو اللہ یاد ہوتا تو یہ اس کی نافرمانی نہ کرتا۔ تو اصل ذِکر یہی ہے کہ انسان قولاً عملاً اللہ کی اطاعت کرے۔ تو اللہ کی اطاعت کرو قولاً بھی فعلاً بھی، کیونکہ اللہ کی اطاعت قولاً ہو یا فعلاً ہو وہ ذِکر ہے، اور اللہ کا ذِکر بڑی چیز ہے...... اور روایات حدیث کی طرف دیکھ کے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی اللہ کا ذِکر تمام اعمال میں افضل ہے، حدیث شریف میں جس طرح سے آتا ہے۔ نماز بھی ذِکر کا فرد ہے، روزہ بھی ذِکر کا فرد ہے، جتنی عبادات ہیں سب ذِکر کا فرد ہیں، تو اصل فضیلت جو ہے وہ اللہ کو یاد رکھنے کی ہے، زبان سے یاد کیجئے، دل میں دھیان رکھیے، زبان سے ذِکر کی فضیلت بھی ہے، ''سُبْحَانَ اللّٰهِ. اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ. لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ. اَللّٰهُ اَكْبَرُ'' ان کلمات کے ادا کرنے کی فضیلت بہت آتی ہے

---

(۱) دیکھئے: ''تفسیر عثمانی'' یہی مقام۔ ''معارف القرآن'' بقرہ، آیت ۱۵۳ کے تحت۔

حدیث شریف میں، اسی طرح ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ''، ان کلمات کی حضور ﷺ نے تلقین فرمائی۔ اور اسی طرح سے زبان پہ لفظ ''اللہ، اللہ، اللہ'' بطور یاد کے جاری کرنا، یہ اُمت میں متفق علیہ طور پر ''اللہ کی یاد'' کہلاتی ہے۔ اور یہ زبان سے الفاظ کا ادا کرنا واقعی قلب میں قوت پیدا کرتا ہے، اور قلب میں اللہ کی یاد دہانی آتی ہے، ذِکرِ لسانی، ذِکرِ قلبی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ حضور ﷺ سے کسی نے پوچھا تھا کہ یا رسول اللہ! مجھے افضل عمل بتا دیجئے تو آپ ﷺ نے فرمایا ''لَا يَزَالُ لِسَانُكَ رَطْبًا مِنْ ذِكْرِ اللهِ''[1] اللہ کی یاد سے تیری زبان ہمیشہ تر رہا کرے۔

عاشق اللہ کے نام سے بھی لطف محسوس کرتا ہے

اللہ کی محبت کا تقاضا بھی ہے کہ اس کا نام اپنی زبان سے ادا کیا جائے، اس کی عظمت کا تقاضا بھی ہے کہ اس کا نام جپا جائے۔ جن کے ساتھ محبت ہوجایا کرتی ہے، آپ محاورہ پڑھتے رہتے ہیں عربی کا ''مَنْ اَحَبَّ شَيْئًا اَكْثَرَ ذِكْرَهٗ'' جو کسی چیز سے محبت رکھتا ہے تو اس کو یاد بہت کیا کرتا ہے۔ اس کا نام لینے میں، اس کی باتیں کرنے میں، انسان کو لطف اور لذت آتی ہے۔ مولانا رُومی ؒ نے مثنوی کے اندر ایک واقعہ بیان کیا کہ:

دید مجنوں را یکے صحرا نورد — در بیابان غمش بنشستہ فرد

کسی نے مجنوں کو دیکھا کہ وہ جنگل کو اختیار کئے ہوئے تھا، بیابان میں بیٹھا تھا، اور غم کی حالت، جیسے اس کے اوپر طاری تھی ہر وقت، لیلیٰ کے عشق کی وجہ سے۔ تو مولانا فرماتے ہیں کہ دیکھنے والے نے کیا دیکھا؟:

ریگ کاغذ بود وانگشتاں قلم — مے کند بہرِ کسے نامہ رقم

کہ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے ریت کو اس نے کاغذ کی طرح رکھا ہوا ہے، اور اس کے اُوپر انگلی سے کچھ لکھ رہا ہے جیسے کسی کے نام خط لکھ رہا ہو

گفت اے مجنوں شیدا چیست ایں — مے نویسی نامہ بہرِ کیست ایں

پوچھنے والے نے پوچھا کہ مجنوں! یہ کیا کر رہے ہو؟ یہ خط کس کے لئے لکھ رہے ہو؟ کس کے نام یہ خط لکھ رہے ہو؟ اس نے اسی انداز میں پوچھا جیسے مجنوں کا حال تھا۔

گفت مشقِ نامِ لیلیٰ مے کنم — خاطرِ خود را تسلی مے کنم

وہ کہتا ہے، خط کس کو لکھنا ہے! لیلیٰ، لیلیٰ، لیلیٰ لکھ کے اپنے دِل کو تسلی دے رہا ہوں۔[2] میں نے عرض کیا تھا نا، کہ عشقِ حقیقی کو سمجھنے کے لئے ہی عشقِ مجازی ہی کی مثالیں ہوتی ہیں۔ تو واقعہ یہ ہے کہ جب کسی کے دل کو کسی کے ساتھ تعلق ہوجاتا ہے، پھر اس کا نام لینے میں لطف آتا ہے۔ جو شخص اللہ سے تعلق رکھتا ہے اللہ سے محبت رکھتا ہے تو اُس کو اللہ کا نام لینے میں لطف بھی آنا چاہیے۔ تو

(۱) الزھد لابن المبارک، رقم ۹۳۵۔ نیز دیکھیں: ترمذی ۲/۱۷۵، ابواب الدعوات، باب ما جاء فی فضل الذکر۔ مشکوٰۃ ۱/۱۹۸، باب ذکر اللہ، فصل ثالث۔

(۲) ''ملفوظات حکیم الامت'' ج ۲۸ ص ۳۸۹۔ یہ اشعار مولانا رُومیؒ کے تو نہیں ملے۔ البتہ مولانا جامیؒ کی کتاب ''سلامان وابسال'' حکایت ۱۲ میں موجود ہیں۔

دل کا اطمینان اسی سے میسر آتا ہے، ایمان کی چاشنی اسی سے نصیب ہوتی ہے...... تو اللہ کا ذکر کثرت سے کیا جائے، تسبیح کی صورت میں، تحمید کی صورت میں، تہلیل کی صورت میں، تلاوتِ کتاب کی صورت میں، اور اسی طرح سے زبان سے جس طرح اولیاء اللہ میں مروج ہے، کہ اللہ کا نام بار بار جپنا، اللہ اللہ یہ بھی اپنے اثرات سے خالی نہیں، تمام دنیا کے اولیاء اللہ کا تجربہ یہی ہے۔

''وَلَذِکْرُ اللّٰهِ اَکْبَرُ'' کا ایک اور مفہوم

اور ''وَلَذِکْرُ اللّٰهِ اَکْبَرُ'' کا ایک اور مطلب بھی ذکر کیا گیا ہے ''اللہ کا یاد کرنا انسان کو، یہ بہت بڑی بات ہے'' یہ ترغیب دینی مقصود ہے، کہ تم اللہ کی کتاب پڑھو، اور اللہ کی نماز پڑھو، تو جس وقت تم اللہ کو یاد کرو گے، اللہ تمہیں یاد کرے گا، اور اللہ کا کسی بندے کو یاد کرنا بندے کے لئے بہت بڑی نعمت ہے، بہت بڑی چیز ہے۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ میں آپ کے سامنے آیا تھا کہ فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ (سورۂ بقرہ: ۱۵۲) تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ اور حدیث شریف میں بھی آتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، جس وقت میرا بندہ مجھے تنہائی میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے تنہائی میں یاد کرتا ہوں تو میں بھی اس کو تنہائی میں یاد کرتا ہوں۔ اور اگر کسی جماعت کے اندر بیٹھ کے میرا تذکرہ کرتا ہے، تو میں اس سے بہتر جماعت کے اندر اس کا ذکر کرتا ہوں، مَلأِ اعلیٰ میں اس کا ذکر کرتا ہوں۔[1] تو دنیا کے اندر آپ اللہ کو یاد کیجئے، اللہ تعالیٰ آپ کا ذکر وہاں کرے گا، اور اس ذکر کے اُوپر ثواب دے گا، اس کے اوپر آپ کو جزا دے گا۔ تو یہ اللہ کی یاد جو ہے بندے کے لئے، کہ بندہ اللہ کو یاد کرے، اللہ بندے کو یاد کرے، بہت بڑی سعادت ہے جو بندے کو نصیب ہوتی ہے۔ تو اللہ کی یاد حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ تم اللہ کو یاد کرو۔ تو گویا کہ ذکر اللہ میں ''اللہ'' ذکر کا فاعل ہو گیا (یعنی اضافت فاعل کی طرف ہے)، اور مفعول اِس (ذکر) کا بندہ ہے (آلوسی)۔ اللہ کا یاد کرنا بندے کو یہ بہت بڑی بات ہے، باقی نعمتوں کے مقابلے میں یہ بہت بڑی نعمت ہے کہ کسی بندے کو اللہ یاد کرے۔ اور اللہ یاد کرے کسی کو، اس کی صورت وہی ہے کہ تم یہاں اللہ کو یاد کرو فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ (سورۂ بقرہ: ۱۵۲) تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا، یہ مطلب بھی اس کا ہو سکتا ہے...... وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ: اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ اس کو عام کر کے ذکر کر دیا، پہلے اگرچہ خطاب خاص تھا، تو جس میں ترغیب کا پہلو بھی ہے اور ترہیب کا پہلو بھی ہے، کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ جانتا ہے، اچھے کام کرو گے تو اللہ سے وہ بھی مخفی نہیں، بُرے کرو گے تو وہ بھی مخفی نہیں۔

مشرکینِ مکہ اور اہلِ کتاب سے گفتگو کا انداز جُدا جُدا ہے

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ: اب یہاں ذکر آ گیا اہلِ کتاب کے ساتھ جدال کا، اور پیچھے جتنی کلام چلی آ رہی ہے وہ ساری کی ساری مشرکین کے سنانے کے لئے تھی، تنبیہات جتنی کی جا رہی تھیں مشرکین کے لئے تھیں، جیسا کہ تفصیل آپ کے سامنے آ گئی۔ جس دور میں یہ سورت اُتری ہے اس دور میں اہلِ کتاب کے ساتھ بھی کسی نہ کسی درجے میں کشاکشی شروع ہو گئی تھی، اسلام کی آواز دور تک پہنچ گئی تھی، مشرکینِ مکہ جاتے اہلِ کتاب کے پاس، اور اہلِ کتاب سے مختلف قسم کے شبہات لے

(۱) بخاری ۲/۱۱۰۱، باب قول اللہ: ویحذرکم اللہ نفسہ۔ مشکوٰۃ ۱/۱۹۶، باب ذکر اللہ، فصل اول۔

کے آتے ، اور آ کے مسلمانوں میں پھیلاتے تھے۔ اس لئے مکی سورتوں میں بھی اہلِ کتاب کے متعلق کچھ ہدایات دے دی گئیں کہ اگر اہلِ کتاب سے گفتگو کا موقع ملے، تو وہاں گفتگو کا انداز وہ نہیں جو مشرکینِ مکہ کے ساتھ ہے، وہاں گفتگو کا انداز اور ہے۔ پھر خصوصیت کے ساتھ اسی رُکوع کے بعد دوسرے رُکوع میں مضمون آرہا ہے ہجرت کا یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَةٌ، وہاں سے ہجرت کا مضمون شروع ہو رہا ہے، اور اس وقت ہجرت کر کے لوگ جو جارہے تھے، وہ جارہے تھے حبش کی جانب۔ یہ تفصیل آپ کے سامنے آچکی۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ بہت بڑا قافلہ لے کر گئے تھے۔ اور اس کے بعد بھی جو مؤمن مشرکوں کے ہاتھ سے تنگ آتا تو ہجرت کر کے وہ حبش کی طرف ہی چلا جاتا تھا، اور حبش میں اس وقت نجاشی کی حکومت تھی، جس کا نام حدیث شریف میں اَصْحَمَہ آتا ہے (بخاری ۱/۱۷۸) جو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی گفتگو سن کے مسلمان بھی ہو گیا تھا، اور یہی نجاشی ہے جب فوت ہوا، تو حضور ﷺ نے مدینہ منورہ میں اس کا جنازہ پڑھا تھا، جس پر یہ بحث چلتی ہے فقہاء کے درمیان، کہ غائبانہ نمازِ جنازہ جائز ہے یا نہیں؟ اَحناف کے نزدیک دُرست نہیں ہے، وہ خیر مسئلے کی تفصیل حدیث شریف میں آئے گی، بہر حال اس نجاشی کا جنازہ حضور ﷺ نے پڑھا تھا، اور یہ پہلے نصرانی، عیسائی تھا، اور وہاں حبش میں حکومت عیسائیوں کی تھی، تو جس وقت مسلمان وہاں جاتے تو وہاں ان کو واسطہ مشرکینِ مکہ جیسے لوگوں کے ساتھ نہیں تھا، بلکہ اہلِ کتاب کے ساتھ تھا۔ اس لئے یہاں سمجھایا جارہا ہے کہ اگر کسی اہلِ کتاب سے گفتگو کا واسطہ پڑ جائے تو اس کے ساتھ تم نے گفتگو کا انداز کیا اختیار کرنا ہے؟ حاصل اس کا یہ ہے کہ اہلِ کتاب میں اور تم میں بہت ساری قدریں مشترک ہیں، بہت ساری چیزیں مشترک ہیں، جیسے آپ کو معلوم ہے کہ جتنے بھی انبیاء علیہم السلام آئے ہیں، وہ توحید کے معلم تھے، توحید کے مبلغ تھے، اس لئے اہلِ کتاب اصولاً توحید کے مدعی ہیں، رسالت کو یہ مانتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے رسول آئے، اللہ کی کتابوں کو یہ مانتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے کتابیں اترتی رہیں، جنت و دوزخ ان کے عقیدے میں ہے، یہ ساری کی ساری چیزیں اہلِ کتاب مانتے ہیں، یہ ایسے مسلمات ہیں جو ہمارے اور ان کے درمیان مشترک ہیں۔ فرق کہاں سے پڑ گیا؟ فرق یہاں سے آکے پڑتا ہے کہ وہ اپنے نبی کے بعد کسی دوسرے کو نبی ماننے کے لئے تیار نہیں، اور اپنی کتاب کے بعد جو دوسری کتاب اتری ہے اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اس لئے ان کے ساتھ گفتگو اس انداز میں کرنی ہے کہ دیکھو! جو کتاب تم پہ اتری ہم تو اس کو مانتے ہیں، ''ہم مانتے ہیں'' کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے اندر تو یہ ضد نہیں ہے کہ یہ عرب میں کیوں نہیں اُتری؟ قریشیوں پہ کیوں نہیں اُتری؟ اس لیے ہم نہ تو وطنی عصبیت میں مبتلا ہیں، نہ نسلی عصبیت میں مبتلا ہیں۔ اور جو پیغمبر تمہارے ہیں ان کو تو ہم نے مان لیا، کیونکہ ہمارا تو انصاف یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو کتاب آئے ہم اس کو بھی تسلیم کرتے ہیں، اور اللہ کی طرف سے جو پیغمبر آئے ہم اس کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ جن انبیاء پہ تمہارا ایمان ہے ان پہ ہمارا بھی ایمان، جو کتابیں تم مانتے ہو ان کو ہم بھی مانتے ہیں، جن کو رسول تم سمجھتے ہو ہم بھی سمجھتے ہیں، تو یہ ہیں مسلمات، ان مسلمات کو سامنے رکھ کے مختلف فیہ مسئلے کا فیصلہ کرنا چاہیے، کہ کیا اس توراۃ اور انجیل کے علاوہ کوئی دوسری کتاب اگر اللہ کی طرف سے آتی ہے تو تسلیم کرنی ہے یا نہیں کرنی؟ ان انبیاء کے سلسلے میں اس کے بعد کوئی دوسرا پیغمبر آتا ہے تو اس کو تسلیم کرنا ہے کہ نہیں کرنا؟ اگر تمہارا اپنی کتابوں پر صحیح ایمان ہے تو ان کتابوں کا تقاضا یہ ہے کہ تم اس کو بھی

مانو۔جس طرح سے ہم نے اِس کتاب کو مانا تو اس کتاب کے تقاضے سے ہم نے پچھلے انبیاء کو بھی مانا، اور پچھلی کتابوں کو بھی مانا۔اس طرح سے مثبت انداز کے ساتھ ان کو سمجھانے کی کوشش کرنا، تو جھگڑا کم ہوگا، بات سمجھ میں جلدی آئے گی۔

مبلغ کو چاہیے کہ مخاطبین کو مدِ نظر رکھ کر گفتگو کرے

مبلغ آدمی کا کام یہی ہوا کرتا ہے، وہ ہر جگہ ایک ہی انداز میں لاٹھی نہیں چلایا کرتا، بلکہ دیکھا جایا کرتا ہے کہ مخاطب کیسے لوگ ہیں؟ اگر تو مخاطب ہیں ہی شریر شرارتی، جن کا مقصد سوائے شرارت کے کچھ نہیں، ان کو تو شرمسار کرنے کی کوشش کرو، ان کی خامیاں واضح کر کے انہیں نادم کرو۔جس طرح سے مدینہ منورہ میں جانے کے بعد اہلِ کتاب جو نہیں مانتے تھے، تو قرآنِ کریم نے کثرت کے ساتھ ان کی بددیانتیاں اور ان کی خیانتیں ظاہر کی ہیں، تاکہ یہ لوگ ذلیل ہوجائیں اور لوگوں کے دل میں ان کی کوئی عزت نہ رہے، اور ان کی باتوں کا لوگ اعتبار نہ کریں، مخالف کے ضد میں آجانے کے بعد تو پھر انداز یہ ہوتا ہے کہ ان کو شرمسار کرو، رُسوا کرو، ان کے حقیقی عیوب ان کے سامنے نمایاں کرو، تاکہ انہیں پتا چلے کہ ہم غلط ہیں۔اور اگر وہ نہ سمجھیں تو کم از کم دوسرے لوگ ان کا اعتبار نہ کریں، شریروں کے ساتھ تو گفتگو اس انداز سے ہوا کرتی ہے۔اور اگر کوئی شخص طالب حق بن کے آیا، یا خالی الذہن ہے، تو وہاں گفتگو کا انداز اور ہونا چاہیے، وہاں تو کوشش کرو کہ اس کے دل کے دروازے کو کھول کے ہم دل میں اُتریں، اور اگر ہم ایسا انداز اختیار کرلیں کہ وہ پہلے ہی اپنے دل کے دروازے بند کر کے بیٹھ جائے، تو پھر وہ ہماری گفتگو سے متأثر نہیں ہوگا۔ ہر جگہ ایک ہی انداز اختیار نہیں کیا کرتے۔

اہلِ کتاب کے ساتھ مسلّمات سے گفتگو شروع کرنی چاہیے

تو اس لئے سمجھایا کہ اہلِ کتاب سے مسلمات سے بات کو شروع کرنا۔جیسے حضور ﷺ نے جتنے خطوط لکھے ہیں اہلِ کتاب کو، وہاں یہی کہا کرتے تھے، یہ آیت لکھا کرتے یٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ الخ (سورۂ آل عمران: ۶۴) آجاؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مسلّم ہے، (بخاری ص ۵) اس مسلّم بات کو بنیاد بنا کے آگے مختلف فیہ مسئلوں کا فیصلہ کرلیتے ہیں۔اس بات پہ تمہارا بھی دعویٰ ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرتے ہو، ہمارا بھی دعویٰ ہے کہ ہم اللہ کی عبادت کرتے ہیں، توحید کے مدّعی تم بھی ہو ہم بھی ہیں، اللہ کی طرف سے اُتری ہوئی کتابوں کو تم بھی مانتے ہو ہم بھی مانتے ہیں۔آؤ! توراۃ انجیل کو سامنے لے آؤ، اور ان مسلمات قواعد کلیہ کو سامنے رکھ لو، اور دیکھ لو، جو حقیقت ثابت ہوتی ہے اس کو تسلیم کرلو۔یہ جھگڑے کو مٹانے کا ایک اچھا طریقہ ہوتا ہے۔

دلائلِ نبوّت

پھر اہلِ کتاب کو اس بات کی طرف متوجہ کیا جارہا ہے کہ دیکھو! یہ نبی جن کے اوپر یہ کتاب اتری، پہلے یہ کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے کہ انہوں نے کسی مدرسے میں داخل ہو کے کوئی نصاب پڑھا ہو، کوئی کتابیں پڑھی ہوں، اس لئے گزشتہ تاریخ سے بھی

واقف، انبیاء علیہم السلام کے حالات سے بھی واقف۔ کوئی ان کو لکھنے پڑھنے کی عادت نہیں، کبھی انہوں نے اپنے ہاتھ سے کوئی خط تک نہیں لکھا، تو پھر دیکھو! کس طرح سے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کو (تم تو سمجھتے ہو، یہ مشرکین نہیں سمجھتے تو تم تو سمجھتے ہو) کہ کس طرح سے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کو کس طرح سے نکھار کے سامنے رکھ دیا، اور آخرت کے حالات کس طرح سے کھولے، گزشتہ اُمتوں کی تاریخ کس انداز سے بیان کی۔ اگر ان باتوں کے اوپر غور کرو گے تو تمہیں پتا چل جائے گا کہ واقعی یہ من جانب اللہ سب کچھ بتایا گیا ہے۔
اگر آپ کو پہلے کوئی لکھنے پڑھنے کی عادت ہوتی، یا مطالعہ کرتے، کوئی تحقیقات کی عادت ہوتی تو باطل پرست لوگ شبہ ڈال سکتے تھے کہ شاید اس نے پچھلی کتابوں سے مطالعہ کر کر کے یہ باتیں نکال لیں جو ہمارے سامنے یہ پیش کرتے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی کسی نے کوئی رسالہ پڑھتے نہیں دیکھا، کوئی پمفلٹ پڑھتے نہیں دیکھا، کبھی کوئی مضمون لکھتے نہیں دیکھا، تو پھر یکدم اس قسم کی عظیم الشان کتاب کس طرح سے لے کے آ گئے؟ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ ان کو جو کچھ دیا جا رہا ہے، اللہ کی جانب سے دیا جا رہا ہے۔ تو اہل کتاب کو اس انداز سے سمجھایا...... اگلی آیات (وَلَا تُجَادِلُوۡۤا اَهۡلَ الۡكِتٰبِ الخ) میں یہی مضمون ہے۔ جھگڑا نہ کیا کرو اہل کتاب کے ساتھ مگر اچھے طریقے سے، اِلَّا بِالَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ مگر ایسے طریقے سے جو کہ اچھا ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہیں۔

''مبلغ'' کی حیثیت ''طبیب'' کی ہے، لیکن...!

اس (اِلَّا الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡهُمۡ) کا مطلب میں نے آپ کی خدمت میں دو طرح سے عرض کیا۔ سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہیں، کہ ان کے ساتھ اگر ترکی بہ ترکی جواب دینا پڑے تو گنجائش ہے۔ ان کو چپ کرانے کے لئے، اور ان کو شکست دینے کے لئے اگر کبھی تشدد آمیز گفتگو بھی کرنی پڑ جائے تو شریروں کے مقابلے میں گنجائش ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے، جس طرح سے ایک آدمی صرف مناظرہ باز ہے، اس کے ساتھ پھر مناظرانہ انداز میں گفتگو ہوتی ہے، اگر ایک پہلوان آیا اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لئے تو اس کے مقابلے میں پھر طاقت کا مظاہرہ ویسے ہی ہونا چاہیے، وہاں اس کے علاوہ کچھ مقصود نہیں ہوتا کہ کندھا لگاؤ۔ پہلوانوں کی لڑائی تو ایسے ہوتی ہے، ہر ایک کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کندھا لگاؤ، گراؤ جس طرح سے گرتا ہے۔ تو مبلغ آدمی پہلوان نہیں ہوتا، مبلغ آدمی کی گفتگو تو حکیمانہ ہوتی ہے، جس طرح ایک مریض سامنے آ جانے کے بعد ایک طبیب اپنا ذہن لڑاتا ہے کہ میں اس کے مرض کو کیسے زائل کر سکتا ہوں؟ مریض کم سے کم تکلیف اٹھا کے کس طرح صحت مند ہو سکتا ہے؟ آپ نے کبھی دیکھا نہیں ہوگا ہسپتالوں میں ڈاکٹروں کے پاس، کسی بچے کو لے کر جائیں، تو جس وقت ڈاکٹر ٹیکہ لگانے لگتا ہے، یا اس کے زخم کو کاٹتا ہے، یا اس کے چیرا دیتا ہے، جراحی کرتا ہے، تو بچہ ڈاکٹر کو گالیاں دینے لگ جاتا ہے، بُرا بھلا کہتا ہے، بسا اوقات ہاتھ اُٹھا کے منہ پہ مارتا ہے، شور مچاتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر ہنستا رہتا ہے، اس کو پتا ہے کہ یہ مریض ہے؟ اور اس کو پتا نہیں کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں، چاہے وقتی طور پر اس کے لئے باعثِ تکلیف ہے لیکن اس میں اسی کی صحت ہے۔ اس بچے کو نادان سمجھتا ہوا، اس مریض کو طبعی طور پر مجبور سمجھتا ہوا ڈاکٹر ہنس کے ٹال دیتا ہے۔ تو مبلغ کی شان یہی ہوا کرتی ہے کہ اپنے سامنے آنے والے کو یوں سمجھے جیسے مریض ہے، اور پوری

ذہن سوزی کے ساتھ، دِل سوزی کے ساتھ، اس کے مرض کے اِزالے کی فکر کرے۔ مبلغ کی کیفیت ایک حکیم اور طبیب جیسی ہوتی ہے، مبلغ پہلوان نہیں ہوتا جو صرف دوسرے کو کندھا لگانے کا ہی جذبہ رکھتا ہے۔ پہلوانی نہیں دکھانی چاہیے، حکیمانہ اور مصلحانہ گفتگو ہونی چاہیے...... ہاں! البتہ کوئی اگر پہلوان ہی بن کر سامنے آئے تو پھر اس کو چت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْھُمْ میں یہ بات آ گئی کہ بسا اوقات شرافت اور نرمی انسان کی کمزوری کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔ یہ نہیں۔ اگر دوسرا ظالم ہے تو اس ظالم کی گردن توڑنے کے لئے پھر تمہیں تشدّد کرنے کی بھی اجازت ہے۔

''اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْھُمْ'' کا ایک اور مفہوم

یا مطلب یہ ہوگا کہ اہلِ کتاب کے ساتھ اچھے طریقے سے بحث مباحثہ کیا کرو، جس میں مباحثہ کرنے کی تلقین ہے، اچھے طریقے سے کرو، لیکن جو ان میں سے شریر ہیں جو محض شرارت ہی پھیلانا چاہتے ہیں، ان سے واسطہ نہ رکھا کرو، ان سے اعراض کر جایا کرو، ان کی باتوں کی طرف توجہ ہی نہ دیا کرو۔ موقع محل کے مطابق یہ بات بھی صحیح ہے، شریروں کے ساتھ تو اُلجھنے میں کوئی فائدہ نہیں، وقت ضائع کرنے والی بات ہے، یہ اگر شور مچاتے ہیں تو توجہ ہی نہ کرو، اعراض کر جاؤ۔ موقع محل کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے، اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِکِیْنَ (سورۂ اَنعام:۱۰۶۔ وغیرہ) اِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْہُ۔ لَا نَبْتَغِی الْجٰھِلِیْنَ (سورۂ قصص:۵۵) اس قسم کے اوقات بھی آتے ہیں کہ جب انسان جاہلوں کے ساتھ نہ اُلجھنے میں مصلحت سمجھتا ہے تو پھر وہاں اُلجھنا نہیں چاہیے۔

مسلّمات کے ذریعے اہلِ کتاب کو دعوت

وَقُوْلُوْٓا: اور ان سے یہ کہو، (یہ دیکھو! یہ مسلمات سے گفتگو کی اِبتدا ہو رہی ہے) انہیں کہو کہ ہم ایمان لے آئے اس چیز پر جو تمہاری طرف اتاری گئی۔ پہلے تو اپنے ایمان کا اظہار کرو تا کہ یہ بات سامنے آئے کہ ہم متعصب نہیں ہیں، ہمارے اندر نہ نسلی تعصب ہے نہ وطنی تعصب ہے۔ جو کتاب بھی اُتری، کہیں اُتری، کسی زبان میں اُتری، لسانی تعصب نہیں، وطنی تعصب نہیں، نسلی تعصب نہیں۔ ہم نے مان لیا اس چیز کو جو ہماری طرف اُتاری گئی، اور جو تمہاری طرف اُتاری گئی۔ وَاِلٰھُنَا وَاِلٰھُکُمْ وَاحِدٌ: یہ بات بھی حقیقت ہے کہ ہمارا اور تمہارا اِلٰہ بھی ایک ہی ہے۔ وَنَحْنُ لَہٗ مُسْلِمُوْنَ، میں انہیں ایک دعوت ہے، کہ جس طرح ہم نے اس اِلٰہ کے سامنے اس کے احکام کے سامنے گردن رکھ دی، تمہیں چاہیے کہ تم بھی اس اِلٰہ کے سامنے اپنی گردن جھکا دو۔ تو یہ ثابت کرنا رہ جائے گا کہ کیا اللہ کا حکم آیا ہوا ہے کہ آنے والے نبی کو ماننا ہے؟ کیا تمہاری کتابوں کے اندر یہ حقیقت نمایاں ہے کہ ایک اور کتاب بھی آنے والی ہے؟ اگر یہ چیز نمایاں ہے، تو تمہیں بھی اپنے اِلٰہ کے حکم کے سامنے گردن جھکا دینی چاہیے، جس طرح سے کہ ہم نے جھکا دی۔ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ ثابت ہو جائے کہ اللہ کا حکم ہے، کسی زبان میں آیا ہو، کسی جگہ آیا ہو، کسی پہ آیا ہو، ہم تو مانتے ہیں، وَنَحْنُ لَہٗ مُسْلِمُوْنَ کے اندر یہ بات کہہ دی گئی، ہم اس کے لیے فرماں بردار ہیں، یعنی تمہیں بھی اس کی فرماں برداری اختیار کرنی چاہیے، کہ جب دلیل کے ساتھ ثابت ہو جائے کہ اللہ کا حکم یہ ہے تو پھر تعصب چھوڑ دو۔ [1]

---

(۱) اس کی کچھ تفصیل اگلے درس میں دیکھیں۔

اہلِ کتاب کی دو قسمیں

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ: جس طرح سے پہلے انبیاء پر ہم نے کتاب اُتاری تھی، اس طرح سے ہم نے آپ کی طرف بھی کتاب اُتاری۔ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ: پھر وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی ہے، یعنی جن کو کتاب کا فہم ملا، جنہوں نے کتاب سے فائدہ اُٹھایا۔ معروف کے صیغے کے ساتھ جب بھی ایتاءِ کتاب کا ذکر آتا ہے، تو اس سے مراد ہوتے ہیں منصف قسم کے لوگ جنہوں نے واقعی اس کتاب کو لیا ہے۔[1] اور جو اس کے مصداق ہوں جو ہمارے شیخ (سعدی ﷫) کہتے ہیں: ''چار پائے بر و کتابے چند'' یعنی کُتب بردار گدھے، جو مثال اہلِ کتاب کی اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ دی ہے: مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا (سورۂ جمعہ:۵) جن پہ ہم نے کتاب کا بوجھ ڈالا تھا اور انہوں نے اس بوجھ کو برداشت نہیں کیا، اس کے اوپر عمل نہیں کیا، ان کی مثال تو ایسے ہے جیسا کہ گدھا کتابیں اُٹھائے ہوئے ہو۔ جو کتب بردار گدھے ہیں وہ تو واقعی اس بات کو نہیں سمجھیں گے۔ لیکن جنہوں نے کتاب کو کتاب ہونے کی حیثیت میں قبول کیا ہے، منصف قسم کے ہیں، یقیناً جب نئی کتاب سامنے آئی انہوں نے اس کو تسلیم کر لیا۔ ''پھر وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی ایمان لاتے ہیں اس پر۔ اور ان موجودہ لوگوں میں سے بھی بعض ہیں جو اس پہ ایمان لاتے ہیں۔ نہیں انکار کرتے ہماری آیات کا مگر کافر لوگ'' جن کا کافر رہنے کا ہی ارادہ ہے، جن کی فطرت اور سرشت میں انکار ہی انکار ہے، وہی انکار کرتے ہیں۔ ورنہ جو منصف ہیں وہ انکار نہیں کر سکتے، جو پہلی کتابوں پہ صحیح ایمان رکھتے ہیں وہ انکار نہیں کر سکتے، یا جن کا ایمان لانے کا ارادہ ہے وہ انکار نہیں کر سکتے۔ انکار وہی کریں گے جو کُفر میں پکے ہیں، کُفر پہ اَڑے ہوئے ہیں، جن کا ایمان لانے کا ارادہ ہی نہیں ہے۔ تو گویا کہ ان کا اپنی کتابوں پہ بھی ایمان نہیں۔

آپ ﷺ کا اُمّی ہونا دلیلِ نبوّت ہے

(وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ الخ) ''آپ اس سے قبل کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے'' یہ وہی دلیل جس کی وضاحت آپ کے سامنے کر دی گئی۔ اور یہ ایک ایسی نمایاں حقیقت ہے جس میں کوئی شک شبہ کی گنجائش ہی نہیں۔ آخر ایک انسان جب بنتا ہے تو اس کے ماحول کے اس کے اُوپر اثرات ہوا کرتے ہیں۔ کوئی نمایاں شخصیت آپ لیں گے تو آپ یہ سوچ سکتے ہیں کہ اس نے یہ علوّ، یہ بلندی، یہ مرتبہ کیسے حاصل کیا؟ ایک کامیاب مدرّس آپ کے سامنے آتا ہے، تو آپ دیکھیں گے کہ اس نے کہاں پڑھا؟ کس اُستاد سے پڑھا؟ کتنی دیر ہو گئی پڑھاتے ہوئے؟ پھر آپ کی سمجھ میں آ جائے گا کہ یہ اتنا کامیاب مدرّس کیسے بن گیا؟ ایک سیاسی لیڈر آپ کے سامنے آتا ہے، اس کی شخصیت سے آپ متاثر ہیں، تو آپ اس کے ارد گرد وہ سب اسباب تلاش کر سکتے ہیں کہ جس کی وجہ سے یہ شخصیت بنی، کس گھر میں پیدا ہوا؟ کن کی صحبت میں رہا؟ کون کون سے سیاسی میدان ہیں جن میں اس نے کام کیا؟ اس لیے اتنا سمجھدار ہو گیا، اتنا بڑا لیڈر بن گیا، آپ اس کے اجزائے ترکیبی اس کے ماحول میں تلاش کر لیتے ہیں۔ لیکن کیا حضور ﷺ جس شان کے ساتھ لوگوں کے سامنے نمایاں ہوئے، آپ کی شخصیت کو بنانے والے اجزائے ترکیبی بھی تلاش کئے جا سکتے ہیں؟ اتنے

(۱) تفسیر راغب اصفہانی، بحر محیط، روح المعانی وغیرہ، سورۃ البقرۃ، آیت ۱۲۱ کے تحت۔

بڑے علم وحکمت کے خزانے آپ نے لُٹائے، تو جمع آپ نے کہاں سے کیے ہیں؟ کوئی شخص نشان دہی کرسکتا ہے؟ نہیں کرسکتا! تو پھر اس میں کیا شک رہ گئی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہ راست یہ علوم دیے گئے ہیں۔ گویا کہ آپ کا اُمّی ہونا، اور اُمّی ہونے کے بعد اس قسم کی کتاب کا لوگوں کے سامنے پیش کر دینا یہ آپ کی صداقت اور نبوت کی سب سے واضح دلیل ہے۔ آگے اسی دلیل کی طرف متوجہ کیا جارہا ہے۔ ''آپ اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے، اور نہ آپ نے کسی کتاب کو اپنے دائیں ہاتھ کے ساتھ لکھا، اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ: یعنی اگر آپ ﷺ نے ایسا کیا ہوتا، تب یہ باطل پرست لوگ کوئی شک کرتے، اب تو اتنی بھی شک کی گنجائش نہیں رہی۔

قرآن میں نشانیاں ہی نشانیاں ہیں

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ: بلکہ یہ کتاب واضح واضح آیتیں ہیں، نشانیاں ہیں ان لوگوں کے دلوں میں جو علم دیے گئے، جن کو کوئی علم اور فہم ہے ان کے دل میں تو یہ کتاب نشانیوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ یہ کتاب جتنی بھی ہے اپنی مختلف باتوں کے اعتبار سے ایک ایک نشانی ہے آپ کی صداقت کی، اہل علم کے سینوں میں اہل علم کے دل میں، یعنی جب اس کتاب کو دیکھیں گے تو ان کا دل ان کا سینہ دلائل سے بھر جاتا ہے، جو اس کتاب کی صداقت کے اُوپر دلالت کرتے ہیں۔ ''بلکہ یہ نشانیاں ہیں واضح واضح ان لوگوں کے دلوں میں جو کہ علم دیے گئے۔ اور نہیں انکار کرتے ہماری آیات کا مگر ظالم لوگ''، جو ظلم پہ کمربستہ ہیں وہی انکار کرتے ہیں۔

کُفّار کی طرف سے منہ مانگے معجزے کا مطالبہ اور اس کا جواب

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ: یہ بات اہلِ کتاب کی بھی ہوسکتی ہے، مشرکینِ مکہ کی بھی ہوسکتی ہے۔ کہتے ہیں کہ کیوں نہیں اُتاری جاتیں اس کے اوپر نشانیاں ان کے ربّ کی جانب سے؟ مشرکینِ مکہ مراد ہوں تو بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ اہلِ کتاب سے سیکھ کے آتے تھے۔ اس بات کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ نے جس وقت نبوّت کا اظہار کیا اور اس کا چرچا ہوا تو مشرکینِ مکہ اہلِ کتاب کے پاس جایا کرتے تھے، یہ پوچھنے کے لئے کہ تم تو اس قسم کی باتیں جانتے ہو، تو یہ جو موجودہ شخص ہے مدّعیٔ نبوّت، اس کے متعلق ہمیں کوئی بات بتاؤ جس سے ہم ان کو تنگ کریں، یا جس سے ان کا امتحان لیں، ان کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ تو اہلِ کتاب سادگی کے ساتھ ایک شبہ ان کے دل میں ڈال دیتے۔ وہ کہتے کہ ہم زیادہ تو جانتے نہیں، البتہ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ پہلے نبی جو آئے ہیں جیسے عیسیٰ علیہ السلام ہیں، ان کو معجزہ ملا تھا، کوڑھیوں کو اچھا کرتے تھے، اندھوں کو سوا کھا کرتے تھے، مُردوں کو زندہ کرتے تھے۔ یا موسیٰ علیہ السلام ہیں، ان کو معجزہ ملا کہ وہ عصا پھینکتے تھے سانپ بن جاتا تھا، ہاتھ دکھاتے تھے یدِ بیضاء ہو جاتا تھا، چمکنے لگ جاتا تھا۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل ملی تو اکٹھی کتاب کی شکل میں ملی، موسیٰ علیہ السلام کو تورات ملی تو اکٹھی کتاب کی شکل میں ملی، یہ جس کے متعلق تم باتیں کرتے ہو، اس میں تو ہمیں کوئی ایسی نشانیاں نظر نہیں آتیں۔ وہ یوں کر کے سادگی کے ساتھ مشرکینِ مکہ کو بہکاتے۔ اور تو ہم کچھ کہہ نہیں سکتے، لیکن اس قسم کی نشانیاں تو اس میں پائی نہیں جاتیں۔ تو مشرکین یہی سبق یاد کر لیتے، وہ آ کے حضور ﷺ کے سامنے ڈھنڈورا پیٹتے، کہ اگر آپ نبی ہیں، اور پہلے نبیوں کا نام لیتے ہیں تو جس قسم کے معجزات پہلے نبیوں کو ملے تھے، وہ آپ کو کیوں نہیں

ملے؟ اِس کو آپ کی تکذیب کا ایک ذریعہ بنالیتے۔ اس لئے یہ اعتراض اہلِ کتاب کی طرف سے بھی ہوسکتا ہے، اور اہلِ کتاب سے سیکھ کے مشرکینِ مکہ بھی یہ بات کرتے تھے...... یہاں اللہ تعالیٰ اس کا جواب دیتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ کیوں نہیں اتاری گئیں اس کے اوپر نشانیاں اس کے رَبّ کی طرف سے؟ تو آپ اپنا منصب واضح کردیجئے کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ معجزات اللہ کے قبضے میں ہیں، میں نے نبی ہونے کا اظہار کیا ہے، دعویٰ کیا ہے، خدا ہونے کا نہیں۔ منہ مانگے معجزات دکھانا یہ اللہ کا کام ہے، میرا کام نہیں ہے۔ میں تو صاف صاف کہتا ہوں اِنَّمَآ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ: میں تو کھول کھول کے بیان کرنے والا ہوں، ڈرانے والا ہوں واضح طور پر، تمہیں آنے والے خطرات سے آگاہ کرتا ہوں۔ نبی کا اصل منصب یہی ہوتا ہے۔ باقی! معجزات کیسے آئیں، کیسے نہ آئیں، یہ اللہ کے قبضے میں ہے، اور اللہ مصلحت جانتا ہے کہ کون سا معجزہ اُتارنا چاہیے یا نہیں۔

حضور ﷺ کو دائمی علمی معجزہ عطا کیا گیا

اور تم ان معجزات کو کہتے ہو جو وقتی معجزے ہیں، عملی معجزے، کہ نبی گئے تو ساتھ ہی معجزات بھی ختم ہوگئے۔ لیکن جو معجزہ مجھے دیا گیا ہے وہ تو کبھی ختم ہونے والا نہیں، اور یہ معجزہ تمام معجزوں کے مقابلے میں افضل ہے۔ وہ یہی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اَوَلَمْ یَکْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ یُتْلٰی عَلَیْهِمْ: کیا ان کے لئے آپ کی نبوت پر دلالت کرنے کے اعتبار سے کافی نہیں کہ ہم نے آپ پر ایک کتاب اُتاری جو ان کے اُوپر پڑھی جارہی ہے، یہ کتاب اللہ والا معجزہ کیا ان کے لئے کافی نہیں ہے؟ یعنی یہ تو سب سے عالی معجزہ ہے، انبیائے سابقین جتنے بھی گزرے ہیں، اب آج آپ ان کا معجزہ نہیں دکھا سکتے، کتاب میں لکھا ہوا تو دکھا سکتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام عصا کو سانپ بناتے تھے۔ لیکن آج کوئی کہے کہ دِکھاؤ ہمیں، تو آپ دِکھا نہیں سکتے۔ اور سرورِ کائنات ﷺ کو جو علمی معجزہ دِیا گیا، یہ کتاب دی گئی، قیامت تک اسی طرح سے روشن ہے اور واضح طور پر موجود ہے، اور جو چاہے اس میں غور کرکے آپ کی نبوّت اور رِسالت کو سمجھ سکتا ہے۔ اس لئے حدیث شریف میں آتا ہے حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو کوئی نہ کوئی ایسا معجزہ دیا جس جیسی چیز کے اُوپر بشر ایمان لاتا ہے، اور جو مجھے دیا گیا وہ اللہ کی وحی ہے، اس لئے میں اُمید رکھتا ہوں کہ میرے ماننے والے سب سے زیادہ ہوں گے،[1] کیونکہ یہ معجزہ قائم دائم ہے۔ اور عملی معجزے! جب نبی گیا تو ساتھ معجزہ بھی ختم ہوگیا۔ آج عیسائی اندھے کو سوانکھا کرکے نہیں دِکھا سکتے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزے کی طرح، کوڑھی کو چنگا کرکے نہیں دِکھا سکتے، اور اسی طرح سے مُردے کو زِندہ کرکے نہیں دِکھا سکتے۔ معجزات برحق ہیں، تھے، لیکن اب ان کی نمائش نہیں کی جاسکتی۔ اور سرورِ کائنات ﷺ کا معجزہ، کتاب! یہ اسی طرح سے چمک دمک کے ساتھ باقی ہے جیسے پہلے تھا..... کیا ان کے لئے کافی نہیں کہ ہم نے آپ پر کتاب اُتاری جو ان پر پڑھی جاتی ہے۔ بے شک اس میں البتہ رحمت ہے، اور ذِکریٰ ہے ان لوگوں کے لئے جو کہ یقین لاتے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

---

(۱) بخاری ۲/۷۴۴، کتاب فضائل القرآن کا پہلا باب۔ مشکوۃ ۲/۵۱۱، باب فضائل سید المرسلین، فصل اول۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِىْ وَبَيْنَكُمْ شَهِيْدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَالَّذِيْنَ

آپ کہہ دیجئے کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ کافی ہے، جانتا ہے ان چیزوں کو جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں، اور جو لوگ

اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ

باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کا انکار کرتے ہیں، یہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں ﴿۵۲﴾ جلدی طلب کرتے ہیں آپ سے

بِالْعَذَابِ ۗ وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ ۗ وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا

عذاب، اگر نہ ہوتا وقت متعین کیا ہوا البتہ عذاب ان کے پاس آ جاتا، البتہ ضرور آئے گا وہ عذاب ان کے پاس اچانک اور ان کو

يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۳﴾ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۗ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ ۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ ۙ

پتا بھی نہیں ہوگا ﴿۵۳﴾ آپ سے عذاب جلدی طلب کرتے ہیں، بے شک جہنم البتہ گھیرنے والی ہے کافروں کو ﴿۵۴﴾

يَوْمَ يَغْشٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ

جس دن کہ ڈھانپ لے گا انہیں عذاب ان کے اُوپر سے اور ان کے قدموں کے نیچے سے، اور کہے گا اللہ تعالیٰ: مزہ چکھو ان کاموں کا

تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۵﴾ يٰعِبَادِىَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِىْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّاىَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾

جو تم کیا کرتے تھے ﴿۵۵﴾ اے میرے بندو! جو ایمان لے آئے ہو، میری زمین بہت کشادہ ہے، پس تم میری ہی عبادت کرو ﴿۵۶﴾

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۫ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

ہر نفس موت کا مزہ چکھنے والا ہے پھر تم سب ہماری طرف ہی لوٹائے جاؤ گے ﴿۵۷﴾ جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں

لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۗ

البتہ ضرور ٹھکانا دیں گے ہم ان کو جنت سے بالا خانوں میں، جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی، ہمیشہ اس میں رہنے والے ہوں گے،

نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۵۸﴾ ۖ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ

عمل کرنے والوں کا اجر بہت اچھا ہے ﴿۵۸﴾ جو صبر کرتے ہیں اور اپنے رَبّ کے اُوپر بھروسا کرتے ہیں ﴿۵۹﴾ اور کتنے ہی

دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۰﴾ وَلَئِنْ

جان دار ہیں کہ وہ اپنے رزق کو اُٹھائے نہیں پھرتے، اللہ ان کو رزق دیتا ہے اور تمہیں بھی، وہ سننے والا جاننے والا ہے ﴿۶۰﴾ اگر تو

سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى

ان سے پوچھے: کس نے پیدا کیا آسمانوں کواور زمین کو؟ اور کس نے کام میں لگایا سورج کواور چاند کو؟ البتہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے! پھر یہ کہاں

يُؤْفَكُوْنَ ۝۶۱ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ

پلٹے جارہے ہیں ۝۶۱ اللہ کشادہ کرتا ہے رزق جس کے لئے چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے، اور تنگ کرتا ہے اس کے لیے، بے شک اللہ

بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۶۲ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ

ہر چیز کے متعلق علم رکھنے والا ہے ۝۶۲ اور اگر تُو ان سے پوچھے کہ کس نے اُتارا آسمان سے پانی کو؟ پھر آباد کیا اس کے ذریعے سے زمین کو

مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۭ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝۶۳

اس کے بنجر ہونے کے بعد البتہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے! آپ کہہ دیجئے سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں بلکہ ان میں سے اکثر عقل نہیں رکھتے ۝۶۳

تفسیر

سابقہ کُتبِ آسمانی پر ایمان لانے کی حیثیت

کل کے سبق میں آپ کے سامنے یہ بات آئی تھی قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ: اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ میں توراۃ اور انجیل کا ذکر تھا، کہ ہم اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں جس طرح سے قرآنِ کریم پر ہمارا ایمان ہے، تو یہ مسئلہ پہلے آپ کے سامنے واضح کیا جاچکا ہے کہ ہمارا توراۃ اور اِنجیل پر اِیمان ہے، بایں معنی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتاری ہوئی کتابیں ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے سچے پیغمبروں پر اُتریں، اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اُتارا، وہ بالکل صحیح اور سچ ہے۔ اور یہ جو موجودہ توراۃ و اِنجیل ہیں، ان پر بھی ہمارا ایمان اسی حیثیت سے ہے۔ باقی جو کچھ اس میں درج ہے، ان میں سے ایک ایک بات کی ہم تصدیق کریں، ایسا نہیں۔ کیونکہ حضور ﷺ کے زمانے میں بھی یہ کتابیں محرف ہوگئی تھیں، اور اس کے بعد آج تک ان میں تحریفات کا سلسلہ جاری ہے۔ تو جو کچھ اس میں لکھا ہوا ہے، اس کے متعلق ہمارے سامنے کوئی گارنٹی نہیں کہ یہ سب کچھ اللہ کی جانب سے ہے۔ اتنا ہمارا ایمان ہے کہ توراۃ اللہ نے اُتاری، بچی کتاب ہے۔ اِنجیل اللہ نے اُتاری، بچی کتاب ہے۔ جو کچھ اللہ کی طرف سے اُترا، اس پر ہم ایمان لاتے ہیں۔ سرورِ کائنات ﷺ کے زمانے میں یہود مدینہ منورہ کے آس پاس جو آباد تھے، وہ توراۃ کو اپنی زبان میں پڑھتے تھے، بعد میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے عربی میں اس کا ترجمہ کیا کرتے تھے، تو حضور ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہی تلقین کررکھی تھی کہ ''لَا تُصَدِّقُوْا اَهْلَ الْكِتَابِ وَلَا تُكَذِّبُوْهُمْ وَقُوْلُوْا: اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ''[1] یہود کوئی بات بیان کریں کہ یہ بات ہماری توراۃ میں ہے، یا

(۱) بخاری ۲/۶۴۴، کتاب التفسیر، پارہ اول کا آخر۔ نیز ۲/۱۱۲۵، باب مایجوز من تفسیر التوراۃ۔ مشکوٰۃ ۱/۲۸، باب الاعتصام، فصل اول۔

اللہ نے ہماری کتاب توراۃ کے اندر یہ بات بیان فرمائی، تو نہ ان کی تصدیق کیا کرو، نہ ان کی تکذیب کیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ بات ان کی اپنی تراشیدہ ہو، اور تم عقیدہ بنالو کہ واقعی اللہ کی جانب سے ہے، کیونکہ تمہیں براہِ راست اس سے واقفیت نہیں، اور ایسا نہ ہو کہ بات اللہ کی جانب سے ہو، اور تم ان کی تکذیب کردو کہ یہ تمہاری اپنی بنائی ہوئی ہے۔ تو بہرحال جس وقت تصدیق نہیں ہے، پوری طرح حالات کی تحقیق نہیں تو نہ تکذیب کرنی چاہیے نہ تصدیق کرنی چاہیے۔ اسی طرح سے موجودہ کتابوں میں جو مندرجات ہیں ہم ان پر اس حیثیت سے ایمان لاتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے جو آیا ہم اس کو مانتے ہیں۔ باقی! اس تحریف نے آ کے چونکہ حق اور باطل کو خلط کر دیا، اس لئے اس کے اندر جتنی باتیں درج ہیں ان میں سے ہر ایک کو ہم اللہ کی جانب سے نہیں سمجھتے، نہ ہم تکذیب کرتے ہیں۔ ان کے اُوپر ایمان کی یہی حیثیت ہے۔

خلاصۂ آیات

یہ آیات جو آج پڑھی گئیں، قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ شَهِيْدًا: آپ کہہ دیجئے کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ کافی ہے۔ بِاللّٰهِ کے اُوپر "ب" زائدہ ہے، اور اللہ، كَفٰى کا فاعل ہے۔ میرے اور تمہارے درمیان اللہ کافی ہے ازروئے گواہ ہونے کے۔ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: جانتا ہے ان چیزوں کو جو کہ آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں، وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ: جو لوگ باطل پر ایمان لاتے ہیں وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ: اللہ کا انکار کرتے ہیں، اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ: یہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں، وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ: جلدی طلب کرتے ہیں آپ سے عذاب۔ وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى: اگر نہ ہوتا وقت متعین کیا ہوا، لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ: البتہ عذاب ان کے پاس آ جاتا، وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ: البتہ ضرور آئے گا وہ عذاب ان کے پاس اچانک اور ان کو پتا بھی نہیں ہوگا، ان کو شعور بھی نہیں ہوگا، ان کو خبر بھی نہیں ہوگی، يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ: آپ سے عذاب جلدی طلب کرتے ہیں وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ: بے شک جہنم البتہ گھیرنے والی ہے کافروں کو، يَوْمَ يَغْشٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ: جس دن کہ ڈھانپ لے گا انہیں عذاب ان کے اُوپر سے وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ: اور ان کے قدموں کے نیچے سے۔ وَيَقُوْلُ: اور کہے گا اللہ تعالیٰ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: مزہ چکھو اُن کاموں کا جو تم کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کی جو آیات ہیں ان کا تعلق ماقبل کے مضمون کے ساتھ ہی ہے اور يٰعِبَادِيَ سے آگے نیا مضمون شروع ہو رہا ہے۔

دلیلِ نبوّت کا تتمہ

بحث چلی آ رہی تھی کہ مشرکین ہوں یا اہلِ کتاب، سرورِ کائنات ﷺ سے معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ ان کے اُوپر اس قسم کے معجزے کیوں نہ اُترے جس قسم کے پہلے انبیاء پہ اُترے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ کیا آپ کی نبوت پر دلالت کرنے کے لئے یہ بات کافی نہیں کہ ہم نے آپ پر کتاب اتار دی جو ان پہ پڑھی جاتی ہے، اور وہ سراپا رحمت ہے اور یاددہانی ہے ایمان لانے والوں کے لئے۔ تو یہ ایک بہت بڑا معجزہ ہے، سمجھنے والوں کے لئے یہی کافی ہے..... اسی کا تتمہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو کتاب اُتار کے گواہی دے دی کہ میں اللہ کا رسول ہوں، اب تم مانو یا نہ مانو۔ اللہ کے گواہ ہونے کا یہی معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب

اُتار کے گواہی دے دی۔ میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے، کہ میں صحیح کہہ رہا ہوں اور تم میری تکذیب کرتے ہو تو غلط ہو، اس بات پہ اللہ گواہ ہے۔ اللہ کی گواہی یہی ہے جو اس نے کتاب اُتار دی، جو آپ ﷺ کی نبوت کے لئے کافی دلیل ہے۔

کُفّار کو تنبیہ

اللہ کے علمِ محیط کا ذکر کر دیا، وہ زمین آسمان کی سب چیزوں کو جانتا ہے، اس لئے تمہاری تکذیب اور ایذا رسانی، تمہاری حرکتیں، وہ بھی اللہ سے مخفی نہیں۔ آگے وہ فیصلہ ذکر کر دیا کہ جو باطل پہ ایمان لاتے ہیں، اور اللہ کا انکار کرتے ہیں، وہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں۔ اللہ کا انکار کرتے ہیں یعنی اللہ کی بیان کردہ باتوں کا انکار کرتے ہیں، باطل پر ایمان لاتے ہیں یعنی کُفر اور شرک کے اندر مبتلا ہیں، شرکاء کو مانتے ہیں، غلط باتوں کو تسلیم کئے ہوئے ہیں، اور اللہ کی باتوں کا انکار کرتے ہیں، یہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں۔

کُفّار کی طرف سے عذاب کا مطالبہ اور اس کا جواب

جب دلیل کے اعتبار سے کوئی بات ان کے پاس نہ ہوتی، تو آخر وہ یہی کہا کرتے تھے، بارہا آیات کے اندر گزرا ہے، کہ اگر سچے ہو تو اس عذاب کو لے آؤ جس کی دھمکی ہمیں دیتے ہو۔ بہت ساری آیات کے اندر اس بات کا ذکر کیا گیا کہ حضور ﷺ کو زچ کرنے کے لئے، تنگ کرنے کے لئے، آخر کار وہ اسی بات پہ آ جایا کرتے تھے، کہ ہم تو مانتے نہیں ہیں، باقی جس عذاب سے تم ڈراتے ہو، اگر سچے ہو تو عذاب لے آؤ۔ اللہ تعالیٰ یہاں انہیں یہی سمجھاتا ہے کہ یہ عذاب کو جلدی طلب کرتے ہیں۔ ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ عذاب کے سامنے رکاوٹ کوئی ایسی نہیں کہ ان کا کوئی پاس لحاظ ہے، یا ان کی شوکت ان کی ہیبت سے عذاب رکا ہوا ہے، یا اللہ تعالیٰ کو کسی تیاری کی ضرورت ہے، ایسی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت ایک وقت متعین کر رکھا ہے، اگر اللہ کی حکمت کے تحت وہ وقت متعین نہ ہوتا تو ان کے اعمال تو اس قسم کے ہیں کہ جلدی عذاب آ جاتا، اور ان کے مطالبے پر فوراً ہی عذاب بھیج دیا جاتا، لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت سے ایک وقت متعین ہے، جب وہ وقت آئے گا اس وقت ان کے پاس عذاب آ جائے گا، ان کو جلدی نہیں مچانی چاہیے۔ اور جب آئے گا تو پھر اچانک آئے گا، جس کے پہلے آثار بھی نمایاں نہیں ہوں گے، اچانک آنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پہلے اس کے کوئی آثار نمایاں نہیں۔ اچانک آ دبوچے گا اور ان کو خبر بھی نہیں ہوگی۔

یہی اعمال قیامت کے دِن نعمت یا عذاب کی شکل میں آ جائیں گے

دوبارہ پھر اسی چیز کو بطور تعجب کے ذکر کیا جا رہا ہے کہ یہ عذاب جلدی طلب کرتے ہیں، اور یہ یوں سمجھتے ہیں کہ شاید عذاب دُور ہے۔ عذاب دُور نہیں، جہنم ان کافروں کو گھیرے ہوئے ہے، اب بھی یہ جہنم کے احاطے میں ہیں۔ آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا تھا، حضرت شیخنا الانور ﷫ نے یہ بات بہت وضاحت کے ساتھ "فیض الباری" میں بیان فرمائی ہے کہ جہنم کا عذاب اور جنت کی نعمتیں، یہ دنیا میں کئے ہوئے اعمال کی ہی شکلیں ہیں۔ انسان بُرا عمل کرتا ہے تو وہ ایک عذاب کی صورت ہے، اچھا عمل

کرتا ہے تو ثواب کی صورت ہے۔ قرآنِ کریم میں آتا ہے کہ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا (سورۂ کہف: ۴۹) جو کچھ انہوں نے کیا اسی کو حاضر پائیں گے۔ اچھائیاں اللہ کی نعمتوں کی شکل میں آ جائیں گی، بُرائیاں عذاب کی شکل میں آ جائیں گی۔ تو تمہاری بدکرداریاں جس طرح سے تمہارے اوپر محیط ہیں، یوں سمجھو کہ تم جہنم کے عذاب کے احاطے میں ہو۔ یہی تمہارے اعمال عذاب کی شکل میں تم پہ آ جائیں گے۔ اس وقت بھی تم جہنم کے گھیرے میں ہو، جہنم سے نکلے ہوئے نہیں۔ بس دیر اسی بات کی ہے کہ یہ جہان اُلٹا، پلٹا کھایا، اس دنیا سے آخرت کی طرف جائیں گے تو تمہیں پتا چل جائے گا کہ اندر جو کُفر ہے وہ بھی تمہارے اندر آگ ہی آگ ہے، اور باہر مشرکانہ جتنی تمہاری حرکتیں ہیں وہ ساری کی ساری عذاب کی ہی شکلیں ہیں۔ تو تم خود دیکھ لو گے کہ کس طرح سے تم اللہ کے عذاب کے اندر گھرے ہوئے ہو۔ تو اللہ کا عذاب کوئی دُور نہیں، اس اِمہال سے، اس مہلت سے، اس تاخیر سے فائدہ اُٹھاؤ، اور اپنے انجام کی فکر کرو، اس مصیبت کو جلدی طلب نہ کرو، عذاب تم سے کوئی دُور نہیں ہے...... تعجب کے طور پر یہ بات دوبارہ نقل کی جا رہی ہے "جلدی طلب کرتے ہیں آپ سے عذاب، اور بے شک جہنم البتہ گھیرنے والی ہے کافروں کو۔ جس دن عذاب انہیں ڈھانپ لے گا اُوپر سے، یعنی اوپر سے بھی عذاب ہوگا، اور پاؤں کے نیچے سے بھی عذاب ہوگا۔" جس وقت کسی چیز کو آگ میں ڈال دیا جائے تو اُوپر نیچے چاروں طرف آگ ہی آگ ہوتی ہے۔ "پھر اللہ کہے گا کہ اپنے کیے ہوئے اعمال کا مزہ چکھو" یہ جو کچھ تمہارے سامنے آ رہا ہے یہ تمہارے اپنے اعمال ہی ہیں۔

ہجرت میں پیش آنے والی پہلی رُکاوٹ اور اس کا حل

آگے مضمون آ گیا ہجرت کا۔ جیسا کہ شروع سورت میں ذکر کیا گیا تھا، کہ کافروں کی طرف سے مسلمانوں کو بہت تکلیفیں پہنچائی جا رہی تھیں، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ہر لحاظ سے مطمئن کیا، صبر واستقامت کی تلقین کی، کہ اللہ کی راہ میں مشکلات برداشت کرو، انجام تمہارا ہی اچھا ہے۔ یہ اسی سلسلے کی بات ہے کہ کافروں سے تنگ آ کر اگر وطن چھوڑنا پڑ جائے تو وطن کی قربانی دے دینی چاہیے، لیکن اللہ تعالیٰ کی عبادت کو اور اس کی اطاعت کو اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اگلی آیات میں یہی مضمون ذکر کیا گیا ہے۔ اور جس وقت وطن چھوڑنا پڑے اور انسان یہ دیکھ لے کہ اس وطن میں رہتے ہوئے ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت نہیں کر سکتے، تو انسان کے سامنے جس قسم کی مشکلات سامنے آتی ہیں وہ دو ہی قسم کی ہیں...... ایک مشکل تو یہ آتی ہے کہ اگر میں اپنے اس وطن کو چھوڑ جاؤں، تو یہاں اقارب ہیں رشتہ دار ہیں، بسا اوقات والدین بھی چھوڑنے پڑتے ہیں، بیوی بچے بھی چھوڑنے پڑتے ہیں، بھائی چارہ سارا ہی چھوٹ جاتا ہے۔ جب آدمی وطن سے بے وطن ہوتا ہے، اپنی جائیداد، اپنے مکانات اور جتنی بھی چیزیں انسان نے دنیا کے اندر بنا رکھی ہیں، وہ سب چھوٹتی ہیں۔ تو دل کے اُوپر ایک اثر ہوتا ہے کہ میں ان سب کو چھوڑ کے جو جا رہا ہوں تو یہ بظاہر ایک خسارہ سا معلوم ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک چیز انسان کے دل میں آتی ہے جو بسا اوقات انسان کو ہجرت کرنے سے مانع ہو جاتی ہے۔ ایمان بچانا ہے تو یہ چیزیں چھوڑنی پڑ رہی ہیں، اور ان کا چھوڑنا بسا اوقات گراں ہوتا ہے، پھر انسان سوچنے لگ جاتا ہے کہ میں ان چیزوں پر ایمان کو قربان کروں، یا ایمان کے اُوپر ان چیزوں کو قربان کروں؟ تو اللہ تعالیٰ انسان کے ذہن میں

ایک بات ڈالتے ہیں، اس طرزِ فکر کی تلقین کرتے ہیں، جس کے بعد ایمان پر ان چیزوں کا قربان کرنا آسان ہو جائے گا، تو جب اللہ کے دربار میں آپ جائیں گے تو ایسا ایمان لے کے جائیں گے جس کے اُوپر وطن کو، قوم کو، اقارب کو، رشتہ داروں کو آپ نے قربان کیا ہے، ایسی شکل میں نہ جائیں کہ ایمان کو ان چیزوں پہ قربان کر دیا ہو...... اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر تمہارے دل میں یہ خدشہ آئے تو ایک بات سوچ لیا کرو، بالکل ہی پیش پا افتادہ حقیقت ہے کہ ایک دن آخر مرنا ہے، موت کا تصور کرو، سارے عقدے حل ہو جاتے ہیں، کہ جس وقت موت آئے گی، مرنے کے بعد تم نے ماں باپ کو بھی چھوڑ دینا ہے، بہن بھائیوں کو بھی چھوڑ دینا ہے، رشتہ داروں کو اور اقارب کو بھی چھوڑ دینا ہے، اور یہ جائیداد اور یہ محلات جو کچھ جمع کر رکھا ہے سب چھوٹ جائے گا۔ تو اتنا تو تمہیں یقین ہے، اگر اس بات کو سوچو گے، کہ ایک دن اس نے چھوٹنا ضرور ہے، یہ ہمیشہ رہنے والی چیز تو ہے نہیں، آج اپنے اختیار کے ساتھ چھوڑ دو گے، قربانی دو گے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر و ثواب حاصل کر لو گے۔ ورنہ تم اس بات کی کیا ضمانت دیتے ہو کہ یہ ہمیشہ تمہارے پاس رہیں گی، کوئی گارنٹی ہے اس بات کی؟ چھوٹنی تو ہے۔ آج اللہ کے لئے نہیں چھوڑو گے کل کو مر کے چھوٹ جائیں گی۔ تو جو چیز بہر حال چھوٹنے والی ہے، تو بہتر ہے کہ اس کو اپنے اختیار سے چھوڑ دو اللہ کے لیے تا کہ آخرت میں جا کے تم اجر و ثواب کے مستحق ہو جاؤ۔ یہ بات ذہن میں ڈالی، یعنی موت کا تصور۔ رشتہ داروں سے علیحدگی اور اپنے وطن سے علیحدگی پر جرأت حاصل کرنے کے لئے، اور اس کے اُوپر اپنے دل کو جمانے کے لئے موت کا تصور ہی ایک نسخہ بتایا، اس سے ہجرت آسان ہو گی، یوں سوچ لیا کرو کہ چھوٹنا تو انہوں نے ہے ہی، یہ کوئی ہمیشہ رہنے والی چیز تو ہے نہیں، اگر آج نہیں تو کل موت کے ذریعے سے چھوٹ جائیں گی، تو بہتر ہے کہ اپنے اختیار سے چھوڑ دی جائیں، تا کہ اللہ کے نام پر جب ہم ان چیزوں کی قربانی دیں گے، تو اللہ کے ہاں اجر و ثواب ہو گا۔

دُوسری رُکاوٹ اور اس کا حل

اور دوسری بات جو انسان کے لئے رُکاوٹ پیدا کرتی ہے، وہ یہ ہوتی ہے کہ یہاں تو ہم نے کوئی نہ کوئی ذریعۂ رزق بنایا ہوا ہے، ہماری دُکان ہے جس سے ہمیں رزق حاصل ہو رہا ہے، زمین ہے جس سے ہم کما کے کھا رہے ہیں، کوئی صنعت ہے، کوئی حرفت ہے، آخر جہاں انسان رہتا ہے اس نے اپنا رزق حاصل کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ وسائل اکٹھے کر رکھے ہوتے ہیں۔ اور جب اللہ کے نام پر اس علاقے کو آپ چھوڑیں گے اس کی قربانی دیں گے، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر کھائیں گے کہاں سے؟ جو ہمارے رزق حاصل ہونے کے ذرائع ہیں وہ تو سارے کے سارے یہاں رہ جائیں گے، پھر ہم کھائیں گے کہاں سے؟ بھوکے مریں گے، کہاں چلے جائیں گے۔ یہ بھی انسان کے دل میں خیال آتا ہے جس کی بنا پر وہ ہجرت سے رُکتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس جگہ اس خیال کو بھی دُور کر دیا کہ تم ذرا سوچو، اپنے چاروں طرف نظر دوڑاؤ، اللہ کی مخلوق کے اندر کتنے ہی پرندے، کتنے ہی حیوانات کتنی ہی جاندار چیزیں ایسی ہیں جو رزق کی محتاج ہیں، کھائے پیے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتیں، یہ پرندے، درند، چرند جتنے بھی جانور پھرتے ہیں یہ سارے رزق کے محتاج ہیں، اور یہ کھائے پیئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ ذرا نظر دوڑا کے دیکھو! ان میں سے کتنے تمہیں نظر آتے ہیں جو اپنے رزق کو ساتھ ساتھ لیے پھرتے ہیں، جو اپنے لیے رزق کا ذخیرہ رکھتے ہیں، کتنے ہیں؟ تو اگر اللہ تعالیٰ ان

پرندوں کو دیتا ہے، ان جانوروں کو دیتا ہے، کیڑے مکوڑوں کو دیتا ہے، درندا اور چرندکو دیتا ہے، اگر اللہ کی مخلوق کے اندر سُور پلتے ہیں، کتے پلتے ہیں، بندر پلتے ہیں جو اپنے کندھوں کے اُوپر اپنا رزق اُٹھائے نہیں پھرتے، تم اللہ کے نام پہ قربانی دینے والے یہ سوچتے ہو کہ ہم بھوکے مرجائیں گے؟ جو اللہ ان سب کو دیتا ہے وہ تمہیں بھی دے گا، اللہ کے اوپر بھروسا رکھو، اور اللہ کے راستے کی مشکلات کو برداشت کرو، رزق سے بھوکے نہیں مروگے۔

اَسبابِ رِزق پر اللہ کا قبضہ ہے!

رِزق کے جتنے اسباب ہیں وہ سب اللہ کے اختیار میں ہیں۔ اگلی آیات میں یہ ذِکر آئے گا، رِزق کہاں سے حاصل ہوتا ہے؟ بارش نہ ہو، قحط پڑ جائے، تو زمین سے کہاں سے رِزق آجائے گا؟ اور سورج اور چاند کا نظم ونسق جتنا ہے وہ سب رِزق کے حاصل ہونے کے ذرائع ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آسمان میرا، زمین میری، بارش برسانا میرے اختیار میں، چاند سورج میرے قبضے میں، یہ ساری نقل وحرکت جتنی ہورہی ہے سب میری، جب اَسبابِ رِزق میرے قبضے میں ہیں، تو اگر یہاں رہتے ہوئے دے سکتا ہوں تو دوسرے علاقے میں چلے جاؤ گے، وہاں بھی دُوں گا۔ ان اسباب کے اُوپر کسی دوسرے کا تصرف نہیں ہے کہ تم یہ سمجھو کہ اگر ہم یہاں باطل پرستوں کے ساتھ رہیں گے ان کی بات مانیں گے تو روٹی ملے گی۔ اگر ان کی بات نہیں مانیں گے، ان کو چھوڑ کے علیحدہ ہوجائیں گے تو ہمیں روٹی نہیں ملے گی، اس وہم کو بھی اپنے دماغ سے نکال دو۔ رزق کی تقسیم براہِ راست اللہ کے ہاتھ میں ہے، جس کو چاہے کشادہ دے دے، جس کو چاہے تنگ کردے، اس میں کسی علاقے کا یا کسی ظاہری سبب کا دخل نہیں ہے، یہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی قدرت کی بات ہے، اس لئے اگر میرے بھروسے پر تم اس جگہ کو چھوڑ دوگے جہاں تم کُفر پر مجبور ہورہے ہو، اور عبادت تم اچھی طرح سے نہیں کرسکتے، تو رزق کی تنگی سے بھی ڈرو نہیں، رِزق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

مکہ سے ہجرت کا حکم منسوخ ہوگیا، لیکن مطلق ہجرت کا حکم اب بھی ہے

تو یہ دو ہی شبہ ہیں جو انسان کے دل میں اس موقع پر پیدا ہوتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات کے اندر ان کا اِزالہ فرمایا ہے، کیونکہ اس زمانے میں ہجرت فرض تھی، جو شخص بھی ایمان لاتا اس کو اپنا علاقہ چھوڑنا پڑتا تھا، ہجرت کرنی پڑتی تھی، خاص طور پر جب حضور ﷺ مدینہ منورہ منتقل ہوگئے، پھر تو ہجرت ایسے تھی جیسے ''اِقرار باللسان''۔ اور جب مکہ فتح ہوگیا تو پھر آپ ﷺ نے فرمادیا ''لَا ھِجْرَۃَ بَعْدَ الْفَتْحِ''[1] مکہ فتح ہونے کے بعد اَب مکہ سے ہجرت کی ضرورت نہیں رہی، اب وہ بھی دارالاسلام بن گیا۔ اور ہجرت اس وقت تک بھی باقی ہے، اگر کوئی علاقہ ایسا ہو، کوئی شہر ہے، کوئی دیہات ہے، کہ جہاں حالات اس قسم کے ناسازگار ہوگئے کہ آپ اچھے طریقے سے زندگی نہیں گزار سکتے، کُفر میں مبتلا ہونے پہ مجبور ہیں، شرک پہ آپ کو مجبور کیا جارہا ہے، یا فسق وفجور پہ مجبور کیا جارہا ہے، یا بدعات پر آپ کو مجبور کیا جارہا ہے، سُنّت کے خلاف چلنے پر آپ کو مجبور کیا جارہا ہے، تو درجہ بدرجہ جس قسم کی بُرائی کے لیے آپ مجبور ہیں اتنی ہی تاکید ہے اس علاقے کو چھوڑنے کے لئے۔ کسی ایسے علاقے کی طرف چلے جاؤ جہاں اسلام کے

(۱) بخاری ۱/۳۹۰ باب فضل الجهاد والسير۔ ۱/۴۳۳ باب لا هجرة بعد الفتح مشکوٰۃ ۲/۳۳۱، کتاب الجہاد، فصل اول کا آخر۔

مطابق اور سُنّت کے مطابق آپ اپنی زندگی گزار سکیں۔ جس قسم کی، کفر کی، شرک کی، فسق کی، بدعت کی بات ہوگی اسی کے مطابق ہی ہجرت کی تاکید ہوگی۔

خلاصۂ آیات

یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا: کتنا پیارا خطاب ہے: یٰعِبَادِیَ، اے میرے بندو! جو ایمان لے آئے ہو، اے میرے مؤمن بندو! ایمان لانے والے میرے بندو! اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَةٌ: میری زمین بہت کشادہ ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ اگر یہاں سے گئے تو آخر جائیں گے کہاں؟ جگہ کہاں ملے گی؟ میری زمین بہت وسیع ہے۔ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ: پس تم میری ہی عبادت کرو، اس بات پہ تو پکے ہوجاؤ کہ عبادت میری کرنی ہے۔ وطن قربان ہوتا ہے تو وطن قربان کر دو، قوم چھوٹتی ہے تو قوم چھوڑ دو، علاقہ چھوٹتا ہے تو علاقہ چھوڑ دو، میری ہی عبادت کرنی ہے، جہاں اس کے اسباب مہیا ہوگئے وہیں ٹھہرنا ہے، اور جہاں اللہ کی عبادت میں رکاوٹ پڑتی ہے، اس علاقے میں ہم نہیں ٹھہریں گے۔ تمہارا مقصد یہی ہے کہ عبادت صرف میری کرنی ہے، علاقے کی پابندی نہیں ہے، کسی وطن کی پابندی نہیں ہے۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ: ہر نفس موت کا مزہ چکھنے والا ہے۔ ثُمَّ اِلَیْنَا تُرْجَعُوْنَ: پھر تم سب ہماری طرف ہی لوٹائے جاؤ گے۔ جب ہمارے پاس آؤ گے تو ہم دیکھیں گے کہ تم نے ایمان کے لئے وطن کی قربانی دی، قوم کی قربانی دی، ایمان لے کے میرے پاس آگئے، یا تم نے قوم اور وطن پہ ایمان کو قربان کر دیا۔ جب ہماری طرف آؤ گے تو ساری بات سامنے آجائے گی۔ ترغیب یہ ہے کہ میری طرف جب آنا ہے تو میری مرضی پر چلو، اور میری مرضی اس میں ہے کہ عبادت صرف میری ہو، وطن کی قربانی دے دو، قوم کی قربانی دے دو۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں۔ اور نیک عمل میں ہجرت بھی آگئی، لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا: اگر یہاں مکان، محلات تمہارے چھوٹ ہی جائیں گے، یہاں کوٹھیاں تمہاری چھوٹتی ہیں یا مکانات چھوٹتے ہیں، البتہ ضرور ٹھکانا دیں گے ہم ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں جنّت سے بالاخانوں میں۔ غُرَفًا غُرْفَةٌ کی جمع ہے، غرفہ بالاخانے کو کہتے ہیں۔ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ: جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی۔ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا: ہمیشہ اس میں رہنے والے ہوں گے نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ: عمل کرنے والوں کا اجر بہت اچھا ہے، اور یہ عمل کرنے والے یہی ہیں جو صبر کرتے ہیں، اللہ کے راستے میں مشکلات برداشت کرتے ہیں وَعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ: اور اپنے رَبّ کے اُوپر بھروسا کرتے ہیں، وہی خطرات سے ڈر کر اللہ کی اطاعت اور عبادت کو نہیں چھوڑتے۔ توکل کا معنی یہ ہوا کرتا ہے، اللہ پہ بھروسا کرتے ہیں اور اس قسم کے خطرات سے ڈر کر اللہ کی عبادت کو نہیں چھوڑتے، ان کا بھروسا اللہ پہ ہے۔ ''جو مشکلات برداشت کرتے ہیں'' صبر کا مفہوم بارہا آپ کی خدمت میں عرض کیا جاچکا۔ وَكَاَیِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا: کتنے ہی زمین پہ چلنے پھرنے والے ہیں۔ دَآبَّة: مَا یَدِبُّ عَلَی الْاَرْضِ زمین پہ جو چلتے ہیں، ہر جان دار چیز کو یہ لفظ شامل ہے، چاہے وہ چوپایہ ہو، دو پایہ ہو، بغیر پائے کے ہو، جو بھی ہیں زمین پہ رینگنے والے چلنے والے سب اس میں شامل ہیں۔ کتنے ہی دواب ہیں، کتنی ہی جاندار چیزیں ہیں، لَا تَحْمِلُ رِزْقَهَا کہ وہ اپنے رزق

کو اُٹھائے نہیں پھرتے۔ اور ''حملِ رزق'' کا یہ معنی بھی ہوتا ہے کہ اُٹھا کے نہیں رکھتے، ذخیرہ نہیں کرتے، یہ مفہوم بھی ہے بعض تراجم میں، کتنے ہی دواب ہیں جو اپنے لیے رزق کا کوئی ذخیرہ نہیں کرتے، صبح گھر سے بھوکے نکلتے ہیں اپنے گھونسلے سے اپنے بلوں سے، شام کو پیٹ بھر کے واپس آجاتے ہیں۔ جیسے حدیث شریف میں آتا ہے ''تَغْدُوْ خِمَاصًا وَتَرُوْحُ بِطَانًا''(۱) کہ صبح کو نکلتے ہیں تو ان کے معدے خالی ہوتے ہیں، پوٹے خالی ہوتے ہیں۔ شام کو آتے ہیں تو بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ تمہارے سامنے نقشے ہیں، چڑیاں آپ شمار نہیں کر سکتے، لاکھوں کروڑوں کتنی ہیں، اور اس طرح سے دوسرے پرندے جو ہوا کے اندر اڑتے پھرتے ہیں، اور کیڑے مکوڑے ان کی تو کیا ہی حد ہے، جن کی تعداد بھی آپ نہیں جانتے، کوئی بھی نہیں جانتا، کروڑوں ہیں، اربوں ہیں، کتنے ہیں، کوئی نہیں شمار کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ سب کو دیتا ہے، یہ کوئی اپنے لیے رزق کا ذخیرہ کر کے تو نہیں رکھتے، تازہ بہ تازہ روزی اللہ انہیں دیتا ہے، یہ اپنے رزق کو اُٹھائے تو نہیں پھرتے۔ اَللّٰهُ یَرْزُقُهَا وَاِیَّاكُمْ: اللہ ان کو رزق دیتا ہے اور تمہیں بھی دیتا ہے۔ تو جس طرح یہ پلتے ہیں، اسی طرح سے تم بھی پلو گے وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ: وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ: یہ آگئے اسبابِ رزق۔ ان سے پوچھو کہ یہ اسباب رزق کن کے قبضے میں ہیں؟ اس کو توحید کی دلیل کے طور پر کہہ لیجیے، یہ بات تو ہے ہی، ہر جگہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس مخلوق کی طرف متوجہ کرتے ہیں، توحید کی دلیل کے طور پر، شرک کے رَدّ کے لئے۔ لیکن یہاں ماقبل کے ساتھ ان آیات کو یوں بھی جوڑا جا سکتا ہے، ان آیات کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسبابِ رزق پہ قابض ہے، جب سارے کے سارے اسباب اسی کے قبضے میں ہیں تو ملے گا اسے ہی جسے اللہ دے گا، ورنہ زمینوں والے بھی بھوکے مر سکتے ہیں، صنعت والے بھی بھوکے رہ سکتے ہیں، اس میں تو کوئی ایسی بات نہیں۔ اگر تُو ان سے پوچھے کس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو؟ اور کس نے کام میں لگایا سورج کو اور چاند کو؟ البتہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ فَاَنّٰى یُؤْفَكُوْنَ: پھر یہ کہاں پلٹے جا رہے ہیں؟ ان کا ذہن سیدھا کیوں نہیں ہوتا؟ ان کا طرزِ فکر ٹھیک کیوں نہیں ہوتا؟ کہاں یہ اُلٹے جا رہے ہیں؟ اللہ کشادہ کرتا ہے رزق جس کے لئے چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے، اور تنگ کرتا ہے اس کے لیے۔ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ: اللہ ہر چیز کے متعلق علم رکھنے والا ہے، لہٰذا اپنے علم وحکمت کے تحت جس کو چاہے کشادہ رزق دے دے، جس کے لیے چاہے رزق کو تنگ کر دے، یہ اللہ تعالیٰ کے علم وحکمت پر ہے، انسان کی کوشش اور ان اسبابِ ظاہر پر اس کا مدار نہیں ہے۔ کسی کے لئے حکمت اسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اُسے کم رزق دے، اسے کم دیتا ہے، کسی کے لئے مصلحت اسی میں ہے کہ اللہ اُسے کشادہ رزق دے، تو اُسے کشادہ دے دیتا ہے۔ تم جتنا چاہو ہاتھ پیر مار لو، تنگ رزق کشادہ نہیں ہوتا، کسی کا کشادہ رزق کسی کے رُکاوٹ ڈالنے سے تنگ نہیں ہوتا۔ وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً: اور اگر تو ان سے پوچھے کہ کس نے اتارا آسمان سے پانی کو؟، پھر آباد کیا اس کے ذریعے سے زمین کو اس کے بنجر، ویران ہو جانے کے بعد۔ موتِ ارض: اس کا بنجر ہو جانا۔ اور حیاتِ ارض: اس کا آباد ہو جانا۔ کس نے زندہ کیا زمین کو اس کے مرنے کے بعد؟ لفظی معنی یوں بنتا ہے۔ لیکن زمین کی موت

(۱) ترمذی ۲/۶۰ باب ما جاء فی الزهادة فی الدنیا۔ مشکوٰة ۲/۴۵۵ باب التوکل، فصل ثانی۔

وحیات کے لئے ہماری زبان میں لفظ یوں ہیں، زمین کو بنجر ہوجانے کے بعد آباد کس نے کیا اس پانی کے ذریعے سے؟ البتہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ آپ کہہ دیجئے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ: سارے مقدمات تو لوگ مانتے ہیں پھر نتیجے کے پتا نہیں کیوں منکر ہیں؟ یہ سارے مقدمات تو مانے ہوئے ہیں، ہر چیز کی تصدیق کرنے کے لئے بیٹھے ہیں، لیکن نتیجہ پتا نہیں کیوں نہیں مانتے؟ سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ: بلکہ ان میں سے اکثر عقل نہیں رکھتے۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ

اور دُنیوی زندگی تو لہو ولعب ہے، اور بے شک آخرت البتہ وہی زندگی ہے، کیا ہی اچھا ہو کہ

كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۴﴾ فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا

لوگ جان لیں ﴿۶۴﴾ جب یہ سوار ہوتے ہیں کشتی میں تو پکارتے ہیں اللہ کو اس حال میں کہ خالص کرنے والے ہوتے ہیں اس کے لئے عقیدہ، جب

نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۵﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ

اللہ انہیں نجات دے دیتا ہے خشکی کی طرف، اچانک وہ شرک کرنے لگ جاتے ہیں ﴿۶۵﴾ نتیجہ یہ ہے کہ ناشکری کرتے ہیں اس چیز کی

اٰتَيْنٰهُمْ ۚۙ وَلِيَتَمَتَّعُوْا ۥ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا

جو ہم نے ان کو دی، ان کو چاہیے کہ فائدہ اُٹھالیں، عنقریب ان کو پتا چل جائے گا ﴿۶۶﴾ کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ بنایا ہم نے حرم

اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ؕ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ ﴿۶۷﴾

امن والا، اور لوگ اُچکے جا رہے ہیں ان کے اردگرد سے، کیا یہ غلط باتوں پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں؟ ﴿۶۷﴾

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ ؕ

کون بڑا ظالم ہے اس سے جو اللہ پر جھوٹ گھڑے، یا حق کو جھٹلائے جب وہ حق اس کے پاس آجائے،

اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۸﴾ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ

کیا جہنم میں کافروں کا ٹھکانا نہیں ﴿۶۸﴾ جو لوگ ہمارے راستے میں جہاد کرتے ہیں، البتہ ضرور ہدایت دیں گے ہم ان کو اپنے راستوں کی،

وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۶۹﴾

بے شک اللہ تعالیٰ محسنین کے ساتھ ہے ﴿۶۹﴾

تفسیر

دُنیاوی زندگی کھیل تماشا ہے

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ: اس دنیا کی محبت میں آ کے آخرت کو برباد نہ کرو۔ دنیا اور آخرت کا اگر مقابلہ کرو تو تمہیں ایسے پتا چلے گا کہ جس طرح سے ایک حقیقی زندگی ہے اور ایک کھیل تماشا ہے۔ جس طرح سے ڈرامہ نہیں ہوا کرتا؟ ڈرامے میں کوئی بادشاہ بن گیا، کوئی وزیر بن گیا، کوئی کچھ بن گیا، کوئی کچھ بن گیا، اپنے آپ کو انسان یونہی نمایاں کرتا ہے، جس طرح سے کہ وہ بہت بڑا ہے، لیکن تھوڑی دیر کے بعد کھیل ختم، اور سارے کا سارا قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ تو دُنیوی زندگی تو آخرت کے مقابلے میں کھیل تماشا ہے، اس کی کوئی حیثیت نہیں، حقیقی زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔ بہت نادان ہیں لوگ جو چند روزہ دُنیوی زندگی کے لئے اپنی آخرت کو برباد کر لیتے ہیں، اور اسی تماشے میں مشغول ہو کے اپنی حقیقت سے غافل ہو جاتے ہیں۔ بے شک دُنیوی زندگی تو لہو ولعب ہے...... لہو ولعب یہ دونوں لفظ قریب قریب ہیں۔ لہو کہا جاتا ہے اس اعتبار سے کہ انسان مفید چیز سے غافل ہو جائے، اور لعب ہوتا ہے اس اعتبار سے کہ کسی غیر نافع چیز کی طرف متوجہ ہو جائے، غیر مفید چیز کی طرف توجہ یہ لعب ہے، اور نافع چیز سے غفلت یہ لہو ہے۔ تو بالکل جس طرح سے بچے کسی کھیل کود میں لگے ہوئے ہوتے ہیں، کسی تماشے میں لگے ہوئے ہوتے ہیں، تو ایک لغو حرکت ہے جس کا کوئی نتیجہ سامنے آنے والا نہیں، اور وہ مستقبل کے لیے کوئی مفید نہیں، اور کھیل تماشے میں لگ کے اپنے مفید کاموں سے محروم ہو جائیں، مثلاً آپ پڑھیں نہیں، مطالعہ نہ کریں، تکرار نہ کریں، اور ہر وقت یہی کھیل کود میں لگے رہیں، تو سوائے اس کے کہ آپ اپنے مستقبل کو برباد کرتے ہیں، کیا ہوگا؟ کچھ بھی نہیں، اس کا کوئی پائیدار نتیجہ نکلنے والا نہیں...... وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَيَوَانُ: اور بے شک آخرت البتہ وہی زندگی ہے، یہ لفظی معنی یوں ہی بنا یعنی آخرت کی زندگی حقیقت میں زندگی ہے، جس کو آخرت میں زندگی آرام کی مل گئی وہی حقیقت میں زندگی ہے، باقی! دنیا تو چند روزہ ہے، جس طرح سے کھیل تماشا ہوتا ہے۔ ہوتا ہے، اور گزر جاتا ہے۔ اب اس کو کسی دلیل سے سمجھانے کی ضرورت نہیں، صبح شام رات دن آپ کے سامنے یہ کھیل ختم ہوتے ہیں۔ بچپن میں لوگ مرتے ہیں، جوانی میں مرتے ہیں، بڑھاپے میں مرتے ہیں، سارے کا سارا کاروبار دھرا رہ جاتا ہے، آنکھیں بند ہوئیں اور سب کچھ چھوٹ گیا، ایسے ہی تھا جیسے کھیل میں بیٹھے تھے، ڈرامہ ختم ہوا، اُٹھ کے چل دیے، اتنی سی حیثیت ہے، آنکھوں کے سامنے ہے۔ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ: کیا ہی اچھا ہو کہ لوگ جان لیں۔ آخرت اور دنیا کا تناسب اگر ان کو سمجھ میں آ جائے تو یہ بہت ساری بُرائیوں سے بچ جائیں، اور ان کا طرزِ زندگی بدل جائے۔

''شرک'' فطرت کے بھی خلاف ہے

فَاِذَا رَكِبُوْا فِی الْفُلْكِ: یہ وہی رَدِّ شرک ہے۔ مشرکین کو متوجہ کیا جا رہا ہے، کہ فطرت کی آواز یہی ہے کہ اللہ پہ اعتماد کرو۔ اور جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر دوسری چیزوں پہ اعتماد کرنے لگ جاتے ہیں یہ فطرت کے بھی خلاف ہے۔ دیکھو! جب انسان خطرات میں گھرتا

ہے اس وقت سارے سہارے چھوٹ جاتے ہیں، تو یہ مشرک بھی پھر اللہ کو پکارنے لگ جاتے ہیں۔ معلوم ہوگیا کہ کارساز حقیقی، رازق، رزق دینے والا، ہر قسم کی عیش وعشرت دینے والا، وہ اللہ ہی ہے، کوئی دوسرا نہیں ہے۔ فَاِذَا رَكِبُوْا فِی الْفُلْكِ: جب یہ سوار ہوتے ہیں کشتی میں دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ: تو پکارتے ہیں اللہ کو اس حال میں کہ خالص کرنے والے ہیں اس کے لئے عقیدہ۔ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ: جب اللہ انہیں نجات دے دیتا ہے خشکی کی طرف، اِذَا هُمْ یُشْرِكُوْنَ: اچانک وہ شرک کرنے لگ جاتے ہیں، نجات پا جانے کے بعد پھر شرک کرنے لگ جاتے ہیں۔ یہ شکایت انسان کی قرآنِ کریم کی متعدد آیات میں کی گئی ہے۔ کہ مشکلات میں گھرنے کے بعد تو پھر یہ توجہ اللہ کی طرف کرتا ہے، اور جب یہ مشکلات سے چھوٹ جاتا ہے پھر وہی کفر وشرک کے اندر جتلا ہوجاتا ہے...... لِیَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَیْنٰهُمْ: لِیَكْفُرُوْا کے اُوپر ''ل'' لامِ عاقبت ہے (آلوسی)۔ ''لامِ عاقبت'' کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اس کردار کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ ناشکری کرتے ہیں ان چیزوں کی جو ہم نے انہیں دی ہیں۔ ہم نے انہیں نجات دی، ہم نے ان کے لیے ساز گار ہوا مہیا کی، بعد میں آ کے جب یہ شرک کرنے لگ گئے اور دوسروں کی طرف ان نعمتوں کی نسبت کرنے لگ جاتے ہیں تو یہ ناشکرے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ ناشکری کرتے ہیں اس چیز کی جو ہم نے انہیں دی...... وَلِیَتَمَتَّعُوْا: یہ وعید ہے اور یہ ''ل'' لامِ اَمر ہے۔ ان کو چاہیے کہ چند دِن مزے اُڑا لیں، کھا پی لیں چند روز، اللہ تعالیٰ کا کھا پی کے ناشکری کرتے ہیں تو چند روز مزے اُڑا لیں۔ فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ: ان کو عنقریب پتا چل جائے گا۔ لِیَتَمَتَّعُوْا: ان کو چاہیے کہ چند مزے اُڑا لیں، کھا پی لیں، فائدہ اُٹھا لیں۔ عنقریب ان کو پتا چل جائے گا۔

مشرکین کے ایک شبہ کا ازالہ

آگے پھر اسی شبہ کا ازالہ ہے جس طرح سے پچھلی سورت کے آخر میں کہا گیا تھا۔ مشرکینِ مکہ ایمان لاتے ہوئے ڈرتے کہ اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا (سورۂ قصص: ۵۷) کہتے تھے کہ اگر ہم نے آپ کے ساتھ مل کے اس دِین کو قبول کرلیا تو اردگرد کے لوگ تو ہمیں اُچک کے لے جائیں گے، ہماری جان خطرے میں پڑ جائے گی، ہمارے اسفار خطرے میں پڑ جائیں گے۔ اُسی کا ازالہ یہاں کیا جا رہا ہے۔ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا: کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ بنایا ہم نے حرم امن والا، وَیُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ: اور لوگ اُچکے جا رہے ہیں ان کے اردگرد سے۔ دُنیا میں فساد برپا ہے، مار دھاڑ ہے، لیکن یہ حرم امن والا ہے، یہاں کوئی کسی قسم کی گڑبڑ نہیں، سب کے جان مال محفوظ ہیں۔ اَفَبِالْبَاطِلِ یُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ یَكْفُرُوْنَ: کیا یہ غلط باتوں پہ ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں؟ اگر تم کفر وشرک میں مبتلا ہوتے ہوئے اس حرم کے اندر امن والے ہو تو کیا ایمان لے آنے کے بعد تمہاری جان خطرے میں پڑ جائے گی؟ جو اللہ کفر وشرک میں تمہیں امن دیے ہوئے ہے تو جب تم اس کا نام لینے لگ جاؤ گے شرک کو چھوڑ دو گے تو پھر وہ تمہاری حفاظت چھوڑ دے گا؟...... ''حرمِ آمن'' کی تفصیل پہلے ہو چکی، کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی فطرت میں یہ بات ڈالی ہوئی تھی، کہ کافر ہونے کے باوجود، مشرک ہونے کے باوجود، جاہل ہونے کے باوجود، مکہ معظمہ کی حدود کے اندر وہ کسی قسم کی گڑبڑ نہیں کرتے تھے۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی الخ: کون بڑا ظالم ہے اس سے جو اللہ کے اوپر جھوٹ

گھڑے، یا حق کو جھٹلائے جب وہ حق اس کے پاس آ جائے۔ جب یہ ساری کی ساری باتیں ان کے سامنے نمایاں کر دی گئیں، اس کے بعد بھی اگر وہ اللہ کے لیے شرکاء کا قول کرتے ہیں تو جھوٹ گھڑتے ہیں، اور جب حق بات ان کے سامنے کہی گئی تو اس کی تکذیب کرتے ہیں تو اس سے بڑھ کے ظالم کوئی نہیں ہوتا جو حق بات کی تکذیب کرے اور اللہ کے متعلق جھوٹی باتیں گھڑے، اَلَیْسَ فِیْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِیْنَ: کیا جہنم میں کافروں کا ٹھکانا نہیں؟ یعنی یقیناً ہے! یہ جتنے بھی کافر ہیں جو حقیقت کو جھٹلاتے ہیں، ان سب کا ٹھکانا جہنم میں ہے۔ مَثْوٰی: ٹھکانا۔

جہاد کی حقیقت، اَقسام اور فوائد

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا: جو لوگ ہمارے راستے میں جہاد کرتے ہیں، البتہ ضرور ہدایت دیں گے ہم ان کو اپنے راستوں کی۔ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ: اور اللہ تعالیٰ محسنین کے ساتھ ہے۔ اس آیت میں اسی پہلے مضمون کو دوہرا دیا گیا جو سورت کے شروع میں آیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی معیت اور نصرت احسان کی وجہ سے انسان کو حاصل ہوتی ہے۔ اور ہمارے راستے میں جہاد کرنے والوں کے لئے ہم راستے کھول دیتے ہیں۔ جہاد کا معنی ذکر کیا تھا آپ کی خدمت میں، کہ حق کو غالب کرنے کے لئے اور باطل کو مغلوب کرنے کے لئے جو کوشش بھی کی جائے وہ جہاد ہے۔ کافر رکاوٹ ڈالتے ہیں تو کافروں کے ساتھ لڑنا اور ان کا مقابلہ کرنا یہ بھی جہاد ہے۔ اور انسان کا اپنا نفس اور اس کی خواہشات اگر حق قبول کرنے کے درمیان میں رُکاوٹ ڈالتے ہیں تو ان کو پامال کرنا اور حق کو قبول کرنا یہ جہاد بالنفس ہے، جس کو صوفیہ کی اِصطلاح میں ''جہادِ اکبر'' کہا جاتا ہے، کیونکہ غصے میں آ کے دوسرے کے ساتھ لڑ پڑنا، مار دھاڑ کرنا بہت آسان ہے، اپنی خواہشات کو کچلنا بہت مشکل ہے۔ تو یہ (مذکورہ آیت میں) جہاد دونوں صورتوں کو شامل ہے۔ اپنے ساتھ جہاد کرتے ہیں یعنی اپنی خواہشات کو دباتے ہیں، ہمارے اَحکام کو اپنے اُوپر طاری کرتے ہیں، اور اگر کوئی نفس اور کوئی کسی قسم کی غلط تمنا دل میں آتی ہے تو اُسے دبا لیتے ہیں، جو یہ جہاد کریں یعنی جہاد بالنفس، اور اسی طرح سے خارجی جہاد، جو کفار کے مقابلے میں ہوتا ہے، ہم ان کے لئے اپنے راستوں کی ہدایت دیں گے، ہدایت سُبُل دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، آخرت میں جنت کے راستے ان کے سامنے واضح ہوں گے، دنیا کے اندر کامیابی کے راستے واضح ہوں گے۔ تو گویا کہ دنیا کے اندر کامیابی کے راستے بھی جہد و جہاد، کوشش کرنے کے ساتھ اور مشکلات برداشت کرنے کے ساتھ، یہ راستے کشادہ ہوں گے، جس طرح سے کہ اسلام کی تاریخ شاہد ہے کہ حضور ﷺ کے ساتھ مل کر صحابہ کرام ؓ نے جہاد کیا تو اللہ تعالیٰ نے دنیا کے اندر بھی کامیابی کے راستے کھول دیے۔ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ: اور اللہ تعالیٰ کی معیت اور نصرت انسان کو اگر حاصل ہوسکتی ہے تو صفت احسان کے ساتھ حاصل ہوسکتی ہے۔ اَحْسَنَ اِحْسَانًا، ہر کام کو اچھی طرح سے کرنا، یہ مطلب ہوتا ہے احسان کا۔ اور احسان فی العبادت یہ ہے، جبرائیل علیہ السلام نے حضور ﷺ سے پوچھا تھا کہ ''مَا الْاِحْسَانُ؟'' تو آپ نے فرمایا کہ ''اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ یَرَاكَ''[1] کہ اللہ کی عبادت ایسے طور پر کرو گویا کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم نہیں دیکھ رہے تو وہ تو دیکھ

(۱) بخاری، ص ۱۲، باب سوال جبریل۔ مشکوٰۃ کی دوسری حدیث۔

ہی رہا ہے، بہر حال تم اللہ کے سامنے ہو۔ تو اللہ کی عبادت اس طرح سے کرنا گویا کہ اللہ کو دیکھ رہے ہیں، تو جس وقت اللہ سامنے ہو، یا یہ تصور غالب ہو کہ اللہ ہمیں دیکھ رہا ہے، تو اس میں ریا نہیں ہوگی، اور کوئی کسی قسم کی خرابی نہیں ہوگی، ٹھیک ٹھیک عبادت کریں گے، اور خلوص کے ساتھ کریں گے۔ جس وقت کوئی شخص اس خلوص کی صفت کو اپنا تا ہے تو پھر اللہ کی معیت حاصل ہو جاتی ہے، اور اللہ کی معیت حاصل ہو جانے کے بعد آپ جانتے ہیں کہ ہر قسم کے طریقے سازگار ہو جاتے ہیں، پھر کسی کی مخالفت اور کسی کی دشمنی انسان کو کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکتی۔ اگر ساری خدائی بھی مخالف ہو جائے لیکن اللہ تعالیٰ کی معیت انسان کو حاصل ہو جائے تو ایسی صورت میں پھر کامیابی ہی کامیابی ہوتی ہے۔

تو جیسے ابتدائے سورت کے اندر اللہ کے راستے میں جہاد کرنے کی، قربانیاں دینے کی ترغیب دی گئی تھی، تو آخر میں پھر وہی ترغیب دے دی کہ اگر دُنیا اور آخرت میں کامیابی چاہتے ہو تو اللہ کے راستے میں جہاد کرو، اپنے نفس کے ساتھ بھی اور کافروں کے ساتھ بھی۔ اور اللہ کی معیت اگر حاصل کرنا چاہتے ہو تو صفت احسان اپناؤ۔ وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا: وہ لوگ جو ہمارے راستے میں جہاد کرتے ہیں، البتہ ضرور ہدایت دیں گے ہم انہیں اپنے راستوں کی، وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ: بے شک اللہ تعالیٰ محسنین کے ساتھ ہے۔

کیا غم ہے اگر ساری خدائی ہو مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے
توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے
(مولانا محمد علی جوہرؒ)

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۸۰﴾ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

سورۃ الروم
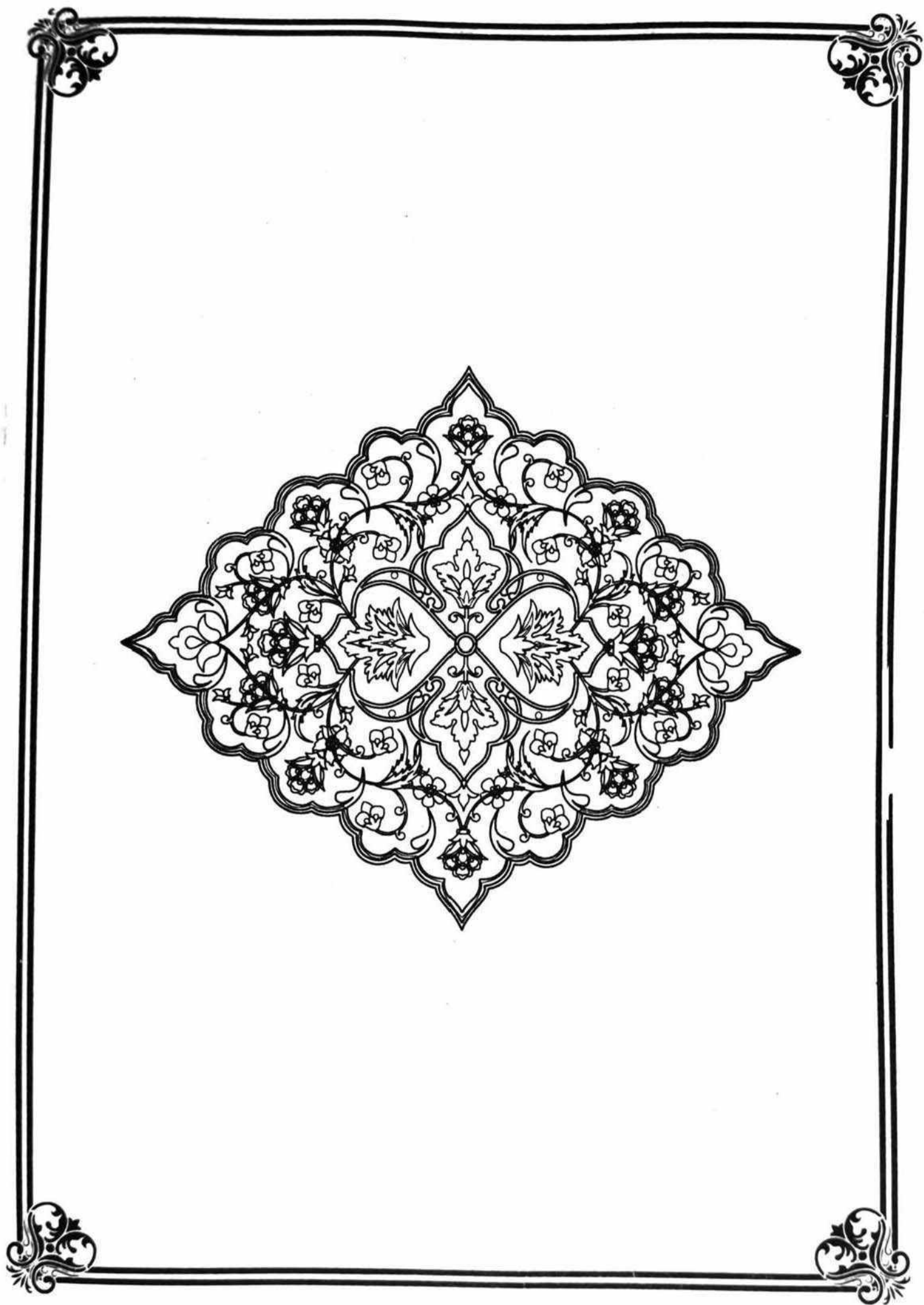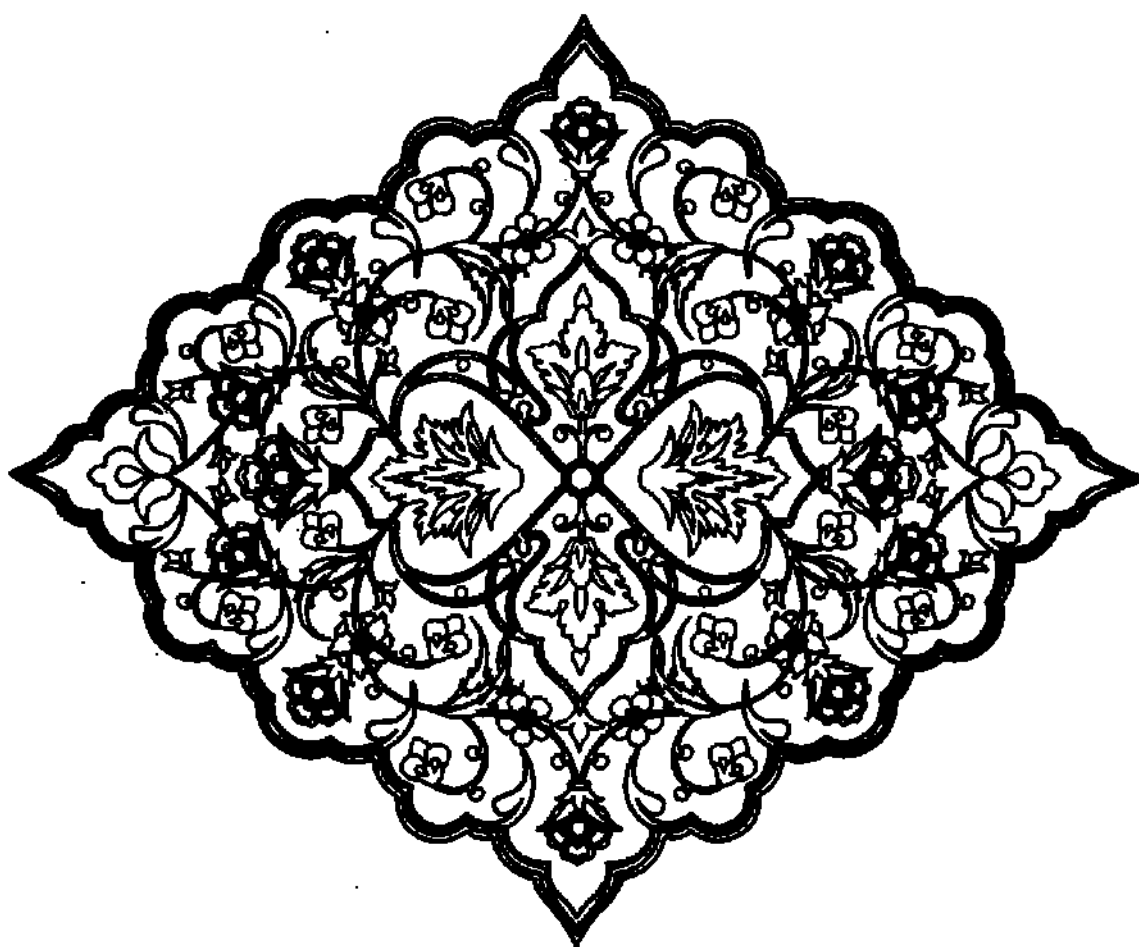
آیاتھا ۶۰ — ۳۰ سُوْرَةُ الرُّوْمِ مَكِّيَّةٌ ۸۴ — رکوعاتھا ۶

سورۂ رُوم مکہ میں نازل ہوئی اس میں ساٹھ آیتیں اور چھ رُکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓمّٓ ۞ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۞ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۞

الٓمّٓ ① رُومی مغلوب ہوگئے ② قریب والے علاقے میں، اور وہ رُومی اپنے مغلوب ہوجانے کے بعد عنقریب غالب آئیں گے ③

فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ؕ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ؕ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۞

چند سالوں میں، اللہ ہی کے لئے ہے حکم پہلے بھی اور بعد میں بھی، اور اس دِن مؤمن خوش ہوں گے ④

بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۞ وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخْلِفُ

اللہ کی مدد کی وجہ سے، اللہ جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے، اور وہ زبردست ہے رحم کرنے والا ہے ⑤ اللہ نے پختہ وعدہ کیا ہے، اللہ اپنے

اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۞ يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚۖ

وعدے کے خلاف نہیں کیا کرتا، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ⑥ جانتے ہیں یہ لوگ دنیوی زندگی کے ظاہر کو،

وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۞ اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۗ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ

اور وہ آخرت سے غافل ہیں ⑦ کیا ان لوگوں نے اپنے دِلوں میں سوچا نہیں؟ کہ نہیں پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو

وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ

اور زمین کو اور ان چیزوں کو جو اِن کے درمیان میں ہیں مگر حکمت کے ساتھ اور ایک وقت معین کے ساتھ، اور بے شک لوگوں میں سے بہت سے

بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ۞ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ

اپنے رَبّ کی ملاقات کا انکار کرنے والے ہیں ⑧ کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں پھر یہ دیکھتے کیسا انجام تھا

الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَآ

ان لوگوں کا جو ان سے پہلے گزرے ہیں، وہ لوگ اِن سے زیادہ سخت تھے از روئے قوت کے اور جوتا انہوں نے زمین کو اور آباد کیا زمین کو

اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ؕ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ

ان کے زمین کو آباد کرنے سے زیادہ، اوران کے پاس ان کے رسول آئے واضح دلائل لے کر، پس نہیں تھا اللہ کہ ان کے اُوپر ظلم کرے لیکن وہ

كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ؕ﴿۹﴾ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰى اَنْ

وہی اپنے نفسوں کے اُوپر ظلم کرتے تھے ﴿۹﴾ پھر بُرا انجام ہوا ان لوگوں کا جنہوں نے بُرے کام کئے، اس سبب سے کہ

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۰﴾

انہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلایا اور وہ اللہ کی آیات کے ساتھ اِستہزا کرتے تھے ﴿۱۰﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سورۂ رُوم مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ساٹھ آیتیں ہیں چھ رُکوع ہیں۔ الٓمّٓ: حروفِ مقطعات ہیں، اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ بِذٰلِكَ، ان حروف سے اللہ کی جو مراد ہے وہ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں۔ غُلِبَتِ الرُّوْمُ رُومی مغلوب ہوگئے، یہ چونکہ جمع ہے، اس لئے جماعت کی تاویل سے غُلِبَتْ مؤنث کا صیغہ استعمال ہوا۔ رُومی مغلوب ہوگئے۔ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ: قریب والے علاقے میں، اَدْنَى الْاَرْضِ: قریبی علاقہ۔ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ: غَلَبِهِمْ میں مصدر کی اضافت مفعول کی طرف ہے (جلالین)، اور وہ رُومی اپنے مغلوب ہوجانے کے بعد عنقریب غالب آئیں گے۔ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ: چند سالوں میں۔ بِضْعٌ کا اطلاق ''تین'' سے ''نو'' تک ہوتا ہے، یعنی دہائی کے اندر اندر، چند سالوں میں۔ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ: اللہ ہی کے لئے ہے حکم۔ قَبْلُ کا مضاف الیہ بھی محذوف منوی اور بَعْدُ کا مضاف الیہ بھی محذوف منوی ہے، اس لئے یہ مبنی علی الضم ہیں، اور مِن جارہ آنے کے باوجود ان کے اُوپر جر نہیں آئی۔ ان کے مغلوب ہونے سے پہلے اور ان کے مغلوب ہونے کے بعد سارا اِختیار اللہ ہی کو ہے، اللہ ہی کے لیے ہے اَمر، اللہ کے ہاتھ میں ہے ہر کام، سب کام اللہ کے قبضے میں ہیں، ان کے مغلوب ہوتے سے پہلے بھی اور ان کے مغلوب ہونے کے بعد بھی۔ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ بِنَصْرِ اللّٰهِ جس دِن ایسا ہوگا، یوم اذ کان کذا، یعنی جس دِن رُومی غلبہ پائیں گے، مؤمن خوش ہوں گے اللہ کی مدد کی وجہ سے۔ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ: اللہ تعالیٰ جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے۔ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ: اور وہ زبردست ہے رحم کرنے والا ہے، وَعْدَ اللّٰهِ: اَیْ وَعَدَ اللّٰهُ وَعْدًا، تو یہ مفعولِ مطلق ہے جس کا عامل محذوف ہے۔ اللہ نے پختہ وعدہ کیا ہے۔ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ: اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کیا کرتا۔ اِخلاف فی الوعد کا مطلب ہوتا ہے کہ وعدے کے مطابق کام نہ کرنا، وعدہ پورا کام نہ کرنا۔ اللہ تعالیٰ وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ: لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔ يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا: جانتے ہیں یہ لوگ دنیوی زندگی کے ظاہر کو، دنیوی زندگی کی ظاہری سطح کو جانتے ہیں۔ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ: اور وہ آخرت سے غافل ہیں، بے خبر ہیں، پچھلی زندگی سے بے خبر ہیں۔ اور هُمْ کا تکرار تاکید

کے لئے ہے۔ یہی لوگ پچھلی زندگی سے بے خبر ہیں۔ اَوَلَمْ یَتَفَكَّرُوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ: کیا ان لوگوں نے اپنے دلوں میں سوچا نہیں؟ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ: نہیں پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو، اور زمین کو، اور ان چیزوں کو جو ان دونوں کے درمیان میں ہیں، مگر حکمت کے ساتھ، مصلحت کے ساتھ، حق کے مطابق۔ عبث نہیں پیدا کیا۔ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى: اور ایک وقت معین کے ساتھ، اَجَلٍ مُّسَمًّى بھی اِلَّا کے تحت ہے۔ نہیں پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو اور ان چیزوں کو جو ان کے درمیان میں ہیں مگر حکمت کے ساتھ اور ایک وقت معین کے ساتھ۔ وَاِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ: اور بے شک لوگوں میں سے بہت سے اپنے رَبّ کی ملاقات کا انکار کرنے والے ہیں۔ اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ: واؤ کا معطوف علیہ اگر محذوف نکالنا ہو، اَقَعَدُوْا فِیْ بُیُوْتِهِمْ وَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ، کیا یہ لوگ اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے ہیں زمین میں چلے پھرے نہیں؟ فَیَنْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ: پھر یہ دیکھتے کیسا انجام تھا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے گزرے ہیں؟ كَانُوْۤا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً: وہ لوگ ان سے زیادہ سخت تھے از روئے قوت کے، وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ: اِثَارَةُ الارض اصل میں زمین کے باہنے کو کہتے ہیں، یہ جس طرح سے کھیتی کرنے کے لئے زمین کو جوتا کرتے ہیں، تو اَثَارُوا الْاَرْضَ کا معنی ہوگا، جوتا انہوں نے زمین کو۔ وَعَمَرُوْهَاۤ: اور آباد کیا انہوں نے زمین کو اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا: ان کے زمین کو آباد کرنے سے زیادہ۔ اس میں ما مصدر یہ ہے۔ ان کے زمین کو آباد کرنے سے زیادہ انہوں نے زمین کو آباد کیا۔ وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ: اور ان کے پاس ان کے رسول آئے واضح دلائل لے کر، فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیَظْلِمَهُمْ: پس نہیں تھا اللہ کہ ان کے اُوپر ظلم کرے، اللہ ان کے اُوپر ظلم کرنے والا نہیں تھا، وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ: لیکن وہی اپنے نفسوں کے اوپر ظلم کرتے تھے، ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِیْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰى: عَاقِبَةَ چونکہ منصوب آ گیا، یہ علامت ہے اس بات کی کہ یہ كَانَ کی خبر ہے، اس لئے السُّوْٓاٰى تقدیراً مرفوع ہو جائے گا، اور یہ كَانَ کا اسم ہے۔ سُوءیٰ یہ مؤنث ہے اَسْوَاُ کی۔ جس طرح سے اَفْضَل کی مؤنث فُضْلٰی آیا کرتی ہے۔ سُوْاٰى: بُری چیز۔ پھر بُرا انجام ہوا ان لوگوں کا جنہوں نے بُرے کام کئے، اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا یَسْتَهْزِءُوْنَ: اس سبب سے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلایا اور وہ اللہ کی آیات کے ساتھ اِستہزا کرتے تھے۔

تفسیر

فارس و رُوم کے مابین جنگ

الٓمّٓ ۚ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِیْۤ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ: یہ سورت کی اِبتدائی آیات ایک عظیم الشان پیش گوئی پر مشتمل ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ کی ولادت ۵۷۰ عیسوی میں ہوئی، یعنی جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کو ۵۷۰ سال ہو چکے تھے، اس وقت سرورِ کائنات ﷺ کی ولادت ہوئی۔ اور ۶۱۰ میں آپ ﷺ نے اپنی نبوّت کا اعلان فرمایا، ۴۰ سال بعد (تفسیر عثمانی)۔ یہ جو زمانہ ہے، اس زمانے میں دُنیا دو بلاکوں میں بٹی ہوئی تھی، بالکل اس طرح سے جس طرح سے آج ہے۔ آج دنیا دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے، ایک بلاک کی قیادت امریکا کے ہاتھ میں ہے، ان پہ برتری امریکا کو حاصل ہے۔ اور دُوسرے بلاک کی قیادت رُوس کو حاصل ہے، اور ان کے اُوپر برتری رُوس کی ہے۔ آج دنیا میں جو بھی کشاکشی چل رہی

ہے، وہ امریکہ اور رُوس کے درمیان میں ہے۔ اُس وقت دو بلاک تھے، ایک رُوم کا، ایک فارس کا۔ رُوم کا بادشاہ قیصر کہلاتا تھا، اور فارس کا بادشاہ کسریٰ کہلاتا تھا۔ تو قیصر اور کسریٰ، ان کی کشاکشی کا وہ دور ہے۔ اور باقی دنیا میں ان کے مقابلے میں کوئی معتدبہ حکومت نہیں تھی، یوں سمجھو کہ ساری دنیا کے اوپر اقتدار انہی دو قوتوں کا تھا، کچھ حصے پہ قیصر کا اور کچھ حصے پہ کسریٰ کا، کچھ علاقے رُوم کے زیرِ اثر تھے اور کچھ فارس کے زیرِ اثر تھے۔ آپس میں لڑائیاں ہوتیں، کبھی وہ ان کو دبا لیتے، کبھی وہ دبا لیتے۔ تقریباً ۶۱۴ عیسوی میں فارس اور رُوم کی لڑائی ہوئی شام کے علاقے میں، ''بصریٰ'' اور ''اَذرُعات'' یہ دو آبادیاں ہیں، ان کے قریب لڑائی ہوئی اہلِ فارس کی اہلِ رُوم کے ساتھ، یہ لڑائی فیصلہ کن ثابت ہوئی، فارسیوں نے رُومیوں کو بہت بدتر قسم کی شکست دی، رُومیوں کی کمر توڑ دی، یہ سارے علاقے ان سے چھین لئے، حتیٰ کہ قیصر اپنے دارالسلطنت قسطنطنیہ میں محصور ہو گیا، اور ان کا دارالخلافہ جو تھا وہ بھی خطرے میں پڑ گیا، (یہ قسطنطنیہ وہی ہے جو آج کل ترکی کا دارالخلافہ ہے، جس کو آج کل ''استنبول'' کہتے ہیں، پُرانا شہر اَب بھی ''قسطنطنیہ'' کہلاتا ہے، نئی آبادی ''استنبول'' کہلاتی ہے، یہ ترکی کا جو دارالخلافہ ہے یہی اس وقت رُومیوں کا دارالخلافہ تھا، آج یہ مسلمانوں کے قبضے میں ہے) بہت بُری طرح سے رُومی مغلوب ہوئے، اور ظاہری حالات اس قسم کے تھے کہ اب یہ سنبھل نہیں سکتے، فارس میں پرویز کیخسرو ثانی کا دور تھا، تو گویا کہ پرویز نے رُومیوں کو شکست دی، اور ان کے اُوپر مکمل غلبہ حاصل کر لیا۔

مذکورہ جنگ کے اَثرات مشرکینِ مکہ اور مسلمانوں پر

جب یہ دو قوتیں آپس میں لڑتی اور ٹکراتی تھیں تو آخر خبریں تو ہر جگہ جاتی ہیں، تو مکہ معظمہ میں بھی ان کے حالات پہنچتے۔ تو ''رُومی'' اہلِ کتاب تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام لینے والے، آخرت کے قائل، فرشتوں کے قائل، توحید کے مدعی، چاہے حقیقت میں موحد تھے یا نہیں، لیکن توحید کے مدعی تھے، بظاہر بتوں کو نہیں پوجتے تھے، شرک ان کا مسلک نہیں تھا، دعویٰ ان کا توحید ہے، اور اہلِ کتاب ہیں، آسمان کی طرف سے کتاب نازل ہونے کے قائل تھے۔ اور یہ جو ''فارسی'' ہیں یہ تھے آتش پرست، مشرک۔ تو ایک طرف وہ لوگ تھے جو کہ اپنی زبان سے توحید کا دعویٰ کرتے، رسولوں کے قائل، کتاب کے قائل۔ دوسری طرف مشرک تھے۔ قدرتی طور پر مکہ معظمہ میں جب یہ خبریں آتیں تو مشرکین کی ہمدردیاں اہلِ فارس کے ساتھ تھیں، اور مسلمانوں کی دلچسپیاں رُوم کے ساتھ تھیں، اہلِ کتاب کے ساتھ مناسبت ہونے کی وجہ سے، چونکہ یہ اپنے نظریات کے اعتبار سے مسلمانوں کی طرف اَقرب تھے، فرق جا کے پڑتا تو یہیں پڑتا تھا کہ حضور ﷺ پر اگر ایمان لے آتے تو معاملہ ٹھیک تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام تک وہ پیغمبروں کو مانتے تھے، کتاب کو مانتے تھے، آخرت کے قائل تھے، مدعیٔ توحید تھے، تو مسلمانوں کو مناسبت اہلِ کتاب سے تھی۔ جس وقت رُومیوں کے کچھ فتح کے آثار نمایاں ہوتے تو مسلمان خوش ہوتے، مشرکین کو غم ہوتا۔ اور جس وقت فارسی غلبہ پاتے، تو مشرکین خوش ہوتے تھے، اور مسلمانوں کو صدمہ ہوتا تھا اسی مناسبت کی بنا پر۔

فارس کا غلبہ اور مشرکین کا جشن

تو جس وقت یہ خبر آئی کہ فارسیوں نے رُومیوں کو بہت بدتر قسم کی شکست دے دی، تو مشرکین نے بھی جشن منایا، خوشی

منائی۔ اور مسلمانوں کے اُوپر طعن وتشنیع شروع کردی، کہ لو اتم تو کہتے تھے کہ یہ شرک غلط ہے، شرک کے اُوپر اللہ کی لعنت ہے، اور توحید کا نظریہ صحیح ہے، اور آخرت کا عقیدہ ٹھیک ہے، اور کامیاب وہی لوگ ہوں گے جو آخرت کے قائل ہیں، جو توحید کے قائل ہیں۔ تو دیکھ لیا؟ توحید والے پٹ گئے مشرکوں کے ہاتھوں، جن کو تم "مشرک" کہتے ہو۔ تو یہ علامت ہے اس بات کی تمہاری باتیں ساری غلط ہیں، اگر اللہ کی نصرت انہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو آخرت کے قائل ہیں، جو اللہ کی کتابوں کو مانتے ہیں، نبیوں کو مانتے ہیں، تو یہ نبیوں کو ماننے والے کیوں پٹ گئے؟ اور یہ جن کو تم "مشرک" کہتے ہو، آتش پرست، یہ کیوں فتح پا گئے؟ اس طرح سے مشرکین نے خوشیاں منائیں، اور مسلمانوں کے اُوپر زبانِ طعن دراز کی۔

اللہ کی طرف سے رُومیوں کے غلبے کی پیش گوئی

عین اس موقع پر جب مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان مکہ معظمہ کے اندر یہ کشاکشی جاری تھی بحث ومباحثہ جاری تھا تو اس وقت یہ آیات اُتریں۔ تو قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے بالکل ظاہری حالات کے خلاف یعنی اس وقت ظاہری حالات کے اعتبار سے توقع ہی نہیں کی جاسکتی تھی کہ رُومی دوبارہ اُٹھ سکتے ہیں، اہلِ فارس نے ان کی اتنی کمر توڑ دی تھی، اور اس طرح سے ان کو نیست ونابود کردیا تھا، علاقے ان کے چھین لئے تھے، عین اس موقع پر یہ پیش گوئی کردی کہ رُومی مغلوب ہوگئے اس میں کوئی شک نہیں، قریب والے علاقے میں، جو مکہ سے قریب تھا، شام کی حدود ساتھ لگتی ہیں، بُصریٰ اور اذرُعات کے علاقے مکہ معظمہ سے قریب ہیں۔ قریب والے علاقے میں رُومی مغلوب ہوگئے ہیں لیکن یہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غلبہ پائیں گے۔ اور کتنی مدت میں غلبہ پائیں گے؟ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ: چند سال کے اندر اندر۔ یہ پیش گوئی قرآنِ کریم نے کردی۔ اور بِضْع کا لفظ "تین" سے لے کے "نو" تک بولا جاتا ہے۔ تو مطلب یہ ہے کہ دس سال کے اندر اندر، "تین" سے لے کے "نو" سال تک، اس پہلی دہائی میں ہی، یہ رُومی دوبارہ اہلِ فارس پہ غالب آجائیں گے۔ یہ پیش گوئی ظاہری حالات کے بالکل خلاف تھی، یعنی دنیا کے حالات جس قسم کے ہوا کرتے ہیں، ظاہری اسباب کو اگر دیکھا جائے تو اس میں توقع نہیں تھی کہ رُومی اُٹھیں گے اور اتنی جلدی؟

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور اُبیّ بن خلف کی آپس میں شرط

مسلمانوں نے ان آیات کو جس وقت پڑھا، مشرکین کو سنایا تو مشرکین نے آگے استہزا اُڑایا، حتیٰ کہ اُبیّ ابن خلف مشرک تھا، اس کی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بحث ہوگئی، تو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا کہ شرط لگالو، اگر رُومیوں نے غلبہ نہ پایا تو میں دس اُونٹ دُوں گا، اگر غلبہ پالیا تو تُو دس اونٹ دے گا۔ پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تین سال مدت متعین کی، اور دس دس اُونٹ کی شرط لگائی، اُبیّ ابن خلف نے مان لی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکے ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ذکر کیا کہ بات یوں ہوگئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے تو تین سال نہیں کہا تھا، قرآنِ کریم میں لفظ "بِضْع" کا آیا ہے۔ اور تم جانتے ہو کہ "بِضْع" "تین" سے لے کے "نو" تک بولا جاتا ہے، تو آپ نے ادنیٰ مدت کیوں متعین کرلی؟ جاؤ، جاکے شرط میں اُونٹ بڑھادو، اور مدت میں اضافہ کردو۔ "بِضْع" کے لفظ پر ہی شرط ہو کہ "نو" سال کے اندر اندر یہ رُومی اگر غلبہ نہ پائیں تو ہم ہارے اور تم جیتے۔ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے

جاکے دوبارہ بات کی اور سوسواُونٹ متعین کیا (مظہری)۔اور لفظ ''بضع'' پہ شرط لگ گئی، ''بضع'' کا مطلب وہی کہ ''تین'' سے لے کے ''نو'' تک۔

''جوا'' پہلے جائز تھا

یہ اس طرح سے شرط لگانا قمار میں داخل ہے جس کو ''جوا'' کہتے ہیں، اور اس وقت اس قسم کے معاملات ابھی حرام نہیں ہوئے تھے، احکام نہیں آئے تھے۔ جس طرح سے شراب حلال تھی، اس طرح سے جوا بھی حلال تھا۔ یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ (سورۂ بقرہ:۲۱۹) میں لفظ آپ کے سامنے گزرا ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ ان میں منافع بھی ہیں، لیکن ان کا نقصان زیادہ ہے منافع کے مقابلے میں۔ یہ پہلی آیت ہے جو آئی تھی، جس میں کچھ قباحت بیان کردی تھی۔ پوری طرح سے حرمت تو سورۂ مائدہ والی آیت میں آئی ہے۔ مدینہ منورہ میں جانے کے بعد غزوۂ اُحد میں شریک ہونے تک بھی شراب حلال تھی، اسی طرح سے ''میسر'' اور ''جوا'' بھی حلال تھا۔ اب اس قسم کی شرط لگانا جس میں جیت اور ہار کے ساتھ لینا دینا ہو، یہ حرام ہے۔ ایک طرف سے تو متعین کیا جاسکتا ہے کہ اگر ایسا نہ ہوا، تو میں آپ کو دس روپے دُوں گا۔ مقابل بھی اگر اس طرح سے کہہ دے کہ اگر ایسا ہوگیا تو میں دُوں گا، پھر یہ ''قمار'' ہے، پھر جائز نہیں ہے۔ اس لئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب شرط لگائی تھی تو یہ وہ دور ہے جب ''قمار'' اور ''جوا'' جائز تھا، یہ احکام ابھی نہیں آئے تھے۔

تو یہ شرط بھی لگ گئی۔ اسی کشاکشی میں مسلمان ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں آگئے۔ کہتے ہیں کہ جب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہجرت کر کے آنے لگے، تو چونکہ اُبَیّ ابن خلف سے شرط لگی ہوئی تھی تو اس نے کہا، بھئی! تم چلے جاؤ گے، تو یہ میری شرط کا ذمہ دار کون ہے جو میں نے لگائی ہوئی ہے؟ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بڑے لڑکے عبدالرحمٰن یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حقیقی بھائی ہیں، یہ اس وقت مسلمان نہیں ہوئے تھے، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کو ضامن ٹھہرایا تھا، کہ اگر بات اس طرح سے نہ ہوئی، تو سو اُونٹ اس سے لے لینا۔ اس نے بھی ضمان قبول کرلی۔ تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہجرت کر کے آگئے (آلوسی)۔

پیش گوئی پوری ہوئی اور مسلمانوں کو دو خوشیاں اکٹھی مل گئیں

مدینہ منورہ میں آنے کے بعد عین اس دِن جس دِن بدر کے اندر مشرکین کی پٹائی ہوئی، اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مشرکین مکہ کے مقابلے میں فیصلہ کن فتح دی۔ ادھر اسی تاریخ میں اور انہی دِنوں میں رُوم اور فارس کی دوبارہ لڑائی ہوئی، اور رُومیوں نے فارسیوں کو شکست دے کے اپنے علاقے واپس لے لیے، اس لڑائی کا نتیجہ بھی اسی وقت سامنے آیا جبکہ یہاں مشرکین اور مسلمین آپس میں ٹکرائے ہوئے تھے۔ ایک فتح مسلمانوں کو براہِ راست ہوئی کہ بدر میں مشرکین نے شکست کھائی۔ اور دُوسری فتح مسلمانوں کو اس بات کے اعتبار سے ہوئی کہ قرآنِ کریم نے جو پیش گوئی کی تھی وہ بالکل صحیح نکلی، اور بالکل عین موقع کے مطابق اتنی مدت کے اندر اندر رُومی دوبارہ غالب آگئے۔ قیصر نے فوجوں کو دوبارہ منظم کیا، اپنی اندرونی خرابیوں کو دُور کیا، اور اللہ تعالیٰ کے لئے

نذر مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے فتح دے دے اور میں اپنے علاقے واپس لوں تو میں بیت المقدس تک پیدل جاؤں گا، کیونکہ بیت المقدس پر بھی فارسیوں کا قبضہ ہو گیا تھا، اور ان کی جو مقدس ترین صلیب تھی جس کو یہ اپنے لیے باعثِ برکت سمجھتے تھے، وہ بھی فارسی اُٹھا کے لے گئے تھے، بیت المقدس کو بھی لوٹ لیا گیا تھا۔ یہی وہ موقع ہے کہ جس وقت وہ قیصر پھر پیدل آیا بیت المقدس میں شکرانہ ادا کرنے کے لئے، تو اِدھر سے دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کا خط لے کر گئے تھے، اور "ہرقل" سے وہاں ملاقات ہوئی تھی، تو "ہرقل" نے ابوسفیان کو بُلایا تھا اور حالات پوچھے تھے، وہ اسی سلسلے میں آیا ہوا تھا، بیت المقدس میں شکریہ ادا کرنے کے لیے، شکرانے کے نفل پڑھنے کے لئے، اپنے مسلک کے مطابق جو بھی ان کا مسلک تھا۔ بہرحال یہ دو خوشیاں مسلمانوں کے لئے اکٹھی ہو گئیں، تو جو پیش گوئی قرآنِ کریم نے کی تھی وہ لفظ بہ لفظ پوری ہو گئی۔

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیت گئے

اب یہاں آپ سمجھتے ہیں کہ خوشی تو سب مسلمانوں کو ہوئی کہ جو بات انہوں (مسلمانوں) نے کی تھی وہ ٹھیک نکلی، اور ادھر واقعتاً اللہ کی نصرت مسلمانوں کو حاصل ہوئی اور مشرکین کے اُوپر بھی فتح حاصل ہو گئی۔ لیکن اس خوشی میں خوش ہونے کا سب سے زیادہ موقع حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لئے تھا کہ ان کی جو شرط لگائی ہوئی تھی وہ بھی ان کے حق میں آ گئی۔ چنانچہ اُبی ابن خلف تو مر چکا تھا، اس کی پچھلی اولاد نے اس ہارنے کی بنا پر سو اُونٹ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اَدا کیے۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سو اُونٹ لے کے حضور ﷺ کے پاس گئے، تو آپ نے فرمایا کہ یہ صدقہ کر دو، یعنی اس شرط کے مطابق اگرچہ اس وقت تک حرمت نہیں آئی، شرط کے مطابق جو رقم حاصل ہوئی حضور ﷺ نے اس کو صدقہ کروا دیا، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس کو اپنے استعمال میں نہیں لائے۔

کافر صرف ظاہرِ دُنیا کو جانتے ہیں

تو یہ قرآنِ کریم کی صریح پیش گوئیاں جن کو ہم بطور حقانیت کے پیش کر سکتے ہیں، کہ دیکھو! جیسے کہا گیا تھا ویسے ہوا، وہ ایک نمونہ ان آیات میں دِکھایا جا رہا ہے، اسی کو نمونہ بنا کے آگے کہا جا رہا ہے کہ اسی طرح سے اللہ کا وعدہ یوں سمجھ لیجئے کہ جو دنیا کے بعد آخرت آنے والی ہے، وہ اسی طرح سے یقینی ہے۔ اور یہ لوگ جو صرف دنیا کے ظاہر کو جانتے ہیں، ان کا علم دنیا کی ظاہری سطح تک ہے، اتنا جانتے ہیں کہ تجارت کس طرح سے کرنی ہے، اتنا جانتے ہیں کہ یہ چیزیں کس طرح سے بنانی ہیں، اور دنیا کے اندر مکانات، کوٹھیاں، محلات کس طرح بنانے ہیں، اچھے سے اچھا کپڑا کس طرح سے بنانا ہے، کھانے پینے کا انتظام کس طرح سے کرنا ہے، یہ دنیا کا ظاہری پہلو ہے، ان لوگوں کا علم یہاں تک ہی ہے، اور یہ جھانک کے دیکھتے نہیں کہ اس دنیا کا نتیجہ بھی نکلنے والا ہے جس کو آخرت کہتے ہیں، اور آخرت جس وقت آئے گی وہاں جا کے فیصلہ ایمان اور عملِ صالح کی بنا پر ہونا ہے۔ یہاں کی بالادستی، یہاں کی قوت اور شوکت وہاں کام نہیں آئے گی، اسی طرح سے مشرکین نے اگر آخرت کے لئے کچھ سہارے تجویز کر رکھے ہیں، تو یہ سہارے بھی آخرت میں کچھ کام نہیں آئیں گے، آگے پھر کلام آخرت کی طرف منتقل ہو جائے گی، یہ حاصل ہے ان آیات کا۔

پہلی سات آیات پر ایک نظر دوبارہ!

ترجمہ پہلے ہوگیا، اب دوبارہ پھر ترجمہ کرتا ہوں، غُلِبَتِ الرُّوْمُ: رُومی مغلوب ہوگئے، فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ: قریبی علاقے میں۔ یہ تو اس واقعے کا بیان ہوگیا۔ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ: یہ پیش گوئی ہوگئی۔ غَلَبِهِمْ میں مصدر مفعول کی طرف مضاف ہے۔ اور اپنے مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب آجائیں گے۔ مدت متعین ہوگئی، فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ: چند سال کے اندر اندر۔ بِضْع کا لفظ ''تین'' سے ''نو'' تک بولا جاتا ہے۔ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ: اللہ ہی کے لئے ہے اَمر، یعنی ہر اَمر اللہ کے قبضے میں ہے، پہلے بھی اور پیچھے بھی۔ پہلے اور پیچھے سے مراد ہے کہ ان کے مغلوب ہونے سے پہلے بھی اختیار اللہ کا تھا، اس نے اپنی حکمت اور مصلحت کے تحت رُومیوں کو مغلوب کیا، ان کی اپنی باطنی کمزوریاں تھیں، ان کے اخلاق کی کمزوری تھی، کردار کی کمزوری تھی، جس کی بنا پر وہ شکست کھا گئے۔ اللہ تعالیٰ کے فیصلے حکمت کے مطابق ہوتے ہیں۔ پہلے پیچھے سب اختیار اللہ کا ہے۔ وَيَوْمَئِذٍ یعنی يَوْمَ اِذْ كَانَ كَذَا، جب یہ رُومیوں کا غلبہ نمایاں ہوگا، جس دن ایسا ہوگا یعنی رُومی غلبہ پائیں گے، خوش ہوں گے مؤمن اللہ تعالیٰ کی مدد کی وجہ سے۔ اب اس مدد کا یہاں پیش گوئی کے تحت جو ظاہری مطلب سمجھ میں آتا ہے، وہ مدد یہی ہے کہ رُومی جس وقت غلبہ پاجائیں گے، گویا کہ اللہ نے مؤمنوں کی بھی مدد کردی، مشرکوں کے مقابلے میں ان کی بات صحیح نکل آئی، ان کو باتوں میں غلبہ حاصل ہوجائے گا۔ لیکن در پردہ دُوسری نصرت کی طرف بھی اشارہ تھا جو اس موقع پہ ظاہر ہوئی، کہ مشرک اور مسلمان آپس میں بدر کے میدان میں ٹکرائے، تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غلبہ دیا، تو یہ بھی نصرت ہے۔ ایک خوشی مؤمنین کو اُس نصرت کی وجہ سے تھی، دوسری خوشی یہ ہوگئی کہ مؤمنین کی بات مشرکین کے مقابلے میں غالب آگئی...... تو یہاں اَلْمُؤْمِنُوْنَ کا اعلیٰ مصداق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، کیونکہ جتنی خوشی ان کو ہوسکتی ہے اس بات کی، دوسروں کو نہیں ہوسکتی، کیونکہ انہوں نے مشرکین کے ساتھ شرط بھی لگائی تھی، تو مؤمنون میں سے اعلیٰ فرد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آگئے۔

اللہ مدد کرتا ہے جس کی چاہتا ہے، وہ زبردست ہے رحم کرنے والا ہے۔ ''جس کی چاہتا ہے'' اس کا مفہوم آپ کی خدمت میں کئی دفعہ عرض کیا، کہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ مدد کرنا چاہے تو کوئی رُکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ باقی! اللہ کی مشیت کہ اللہ مدد کس کی کرنا چاہتا ہے؟ وہ اس کی اپنی حکمت کے تقاضے ہیں، جہاں اس کے علم وحکمت کے مطابق بات ہوتی ہے کہ مدد کرے، وہاں کرے گا۔ اور جہاں اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ان کو مغلوب کردیا جائے، تو مغلوب کردے گا، کوئی رُکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ اللہ جس کی چاہے مدد کرتا ہے، اور وہ زبردست ہے، رحم کرنے والا ہے...... وَعْدَ اللّٰهِ: وَعَدَ اللّٰهُ وَعْدًا، اللہ نے یہ پختہ وعدہ کیا، اور اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کیا کرتا، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے وعدے کی نوعیت نہیں سمجھتے، وہ یہی سمجھتے ہیں کہ ظاہری اسباب جس کے موافق ہوں، نتیجہ اسی کے حق میں نکلا کرتا ہے۔ ایسی بات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق بات ہوجایا کرتی ہے چاہے ظاہری اسباب اس کے لئے سازگار ہوں چاہے سازگار نہ ہوں۔ اکثر لوگ اس بات کو جانتے نہیں، وہ ظاہری اسباب پر ہی مدار رکھتے ہیں۔ جیسے کہ اگلے الفاظ میں آگیا کہ یہ لوگ صرف دنیا کے ظاہر کو جانتے ہیں، دنیوی زندگی کی کے

ظاہر کو، ظاہری سطح کو۔ اور ظاہری سطح میں اسباب اور مسببات کا سلسلہ ہی ہے، تو دنیا میں جانتے ہیں کہ خوش حال وہ ہوگا جس کے قبضے میں تجارت ہے، خوش حال وہ ہوگا جس کے قبضے میں یہ ہے، یہ ظاہری اسباب ہیں، ان اسباب کے مطابق نتائج کا اخذ کرنا چونکہ اللہ کی عادت کے تحت ہے، تو یہ لوگ صرف اسی بات کو سمجھتے ہیں۔ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ: اور پچھلی زندگی سے، دنیوی زندگی کے بعد جو دوسری آئے گی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا: دنیا کا لفظ آپ سمجھتے ہیں، یہ ادنیٰ کا مونث ہے، قریب والی زندگی، جو ہمارے قریب ہے، اس کو کہتے ہیں دنیوی زندگی۔ اور پچھلی زندگی جو اس زندگی کے گزرنے کے بعد بطور نتیجے کے آئے گی اس سے یہ لوگ بے خبر ہیں۔ آخرۃ: پیچھے آنے والی۔ دُنیا: قریب کو کہتے ہیں۔ ایک یہ زندگی ہے جو اس وقت ہمارے قریب ہے، جس میں ہم ہیں، یہ "حیاتِ دُنیا" ہے، اور جو اس کے بعد بطور نتیجے کے اس کے پیچھے دوسری زندگی آرہی ہے، وہ "حیاتِ آخرہ" ہے۔

"آخرت" کو سمجھنے کے لئے کائنات میں غور کرنے کی دعوت

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا: اب یہ کلام منتقل ہوگئی آخرت کی طرف، چونکہ آخرت کا ذکر آگیا، کہ یہ کافر لوگ مشرک لوگ صرف دنیا کے ظاہر کو سمجھتے ہیں، آخرت سے غافل ہیں، تو اسی سے آگے کلام منتقل ہوگئی۔ کیا ان لوگوں نے اپنے دلوں میں سوچا نہیں؟ اپنے دلوں میں غور نہیں کرتے؟ اگر کائنات کے آثار دیکھ کے یہ اپنے دلوں پر غور کریں تو یہ بات ان کو سمجھ آسکتی ہے۔ کیا انہوں نے اپنے دلوں میں سوچا نہیں؟ کہ نہیں پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو اور زمین کو اور ان چیزوں کو جو ان کے درمیان میں ہیں مگر حکمت اور مصلحت کے ساتھ۔ اگر آخرت آنے والی نہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بے سود کھیل ہے، یہ زمین آسمان اور اس قسم کی جتنی کائنات بنائی ہے، ان کا اگر کوئی پیچھے نتیجہ نکلنے والا نہیں، تو پھر ان کے پیدا کرنے کا فائدہ کیا ہوا؟ یہ اللہ کی حکمت کا تقاضا ہے کہ اس کے بعد اس کا نتیجہ بھی ظاہر ہو۔ بہت دفعہ اس کی تفصیل آپ کے سامنے آچکی۔ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى: اور پیدا کیا اجل مسمّٰی کے ساتھ، ایک وقتِ معین تک ہی، دائماً ابداً رہنے والی چیزیں نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا کیا ہے تو ایک وقتِ معین تک کے لئے پیدا کیا ہے۔ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ الخ: لیکن لوگوں میں سے بہت سے لوگ اپنے ربّ کی ملاقات کا البتہ انکار کرنے والے ہیں، وہ اس دنیا میں غور کرکے آخرت کو سمجھتے نہیں۔

تاریخی واقعات سے سبق حاصل کرو!

اب آگے تاریخی حقیقت کی طرف متوجہ کیا جارہا ہے، کہ تاریخی واقعات میں غور کریں تو بھی بات کچھ سمجھ میں آتی ہے کہ تم جیسے لوگ جو آخرت کے منکر تھے، دنیا کے اندر بڑے خوش حال تھے، بہت انہوں نے دنیا کو آباد کیا، زمین کو باہتے تھے، جوتتے تھے، نباتات باغات ان کے پاس خوب تھے، قوت شوکت بھی بہت تھی، لیکن جب وہ اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آئے تو یہ چیزیں ان کے کام نہ آسکیں، اس لئے تمہیں چاہیے کہ ان تاریخی واقعات سے سبق حاصل کرو...... کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں؟ کہ دیکھتے، کیسا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے گزرے ہیں، زیادہ سخت تھے ان سے از روئے قوت کے، قوت وشوکت ان کو

زیادہ حاصل تھی۔ وَّ اَثَارُوا الْاَرْضَ اور انہوں نے جوتا زمین کو، وَ عَمَرُوْهَآ اور آباد کیا اس زمین کو اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا: ان کے آباد کرنے سے بھی زیادہ، ''ما عمروھا'' میں ''ما'' مصدریہ ہے، ان کے زمین کو آباد کرنے کے مقابلے میں زیادہ۔ وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ: اور ان کے پاس ان کے رسول آئے واضح دلائل لے کر، فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ: یہ آگے نتیجہ ہے۔ واضح دلائل لے کے آئے لیکن یہ اندھے بنے رہے، اور دلائل سے ان کی آنکھیں نہیں کھلیں، اور وہ جس ڈگر پہ چل رہے تھے اسی پہ چلتے چلے گئے، جس قسم کی عیاشی بدمعاشی میں لگے ہوئے تھے رسولوں کے سمجھانے کے باوجود سمجھے نہیں۔ پھر نتیجہ یہ ہوا کہ برباد ہو گئے، اور اس بربادی میں اللہ تعالیٰ نے ان پہ کوئی زیادتی نہیں کی، وہی اپنے نفسوں پہ ظلم کرتے تھے، ایسے کردار کا یہی نتیجہ نکلنا تھا۔ اور مشرکین کو متوجہ کیا جا رہا ہے کہ اب ان واقعات کے آئینے میں اپنا منہ بھی دیکھ لو، تم بھی اپنی قوت اور شوکت پہ ناز نہ کرو، تم سے زیادہ قوت اور شوکت والے پہلے تھے، رسول ان کے پاس بھی واضح دلائل لے کے آئے، جس طرح سے تمہارے پاس یہ رسول واضح دلائل لے کے آیا ہے۔ اگر تم نہیں سمجھو گے تو اپنے کردار کے نتیجے میں تم بھی برباد ہو جاؤ گے۔ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰى: السُّوْأٰى یہ ''کَانَ'' کا اسم ہے۔ پھر بُرا انجام ہوا ان لوگوں کا جنہوں نے بُرے کام کئے تھے اس سبب سے کہ انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا اور وہ اللہ کی آیات کے ساتھ استہزا کرتے تھے۔

اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ⑪ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ

اللہ ابتداءً پیدا کرتا ہے مخلوق کو پھر وہی اس کو لوٹائے گا، پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ⑪ اور جس دن قیامت قائم ہوگی

يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ⑫ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا وَكَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ

مجرم مایوس ہو جائیں گے ⑫ اور نہیں ہوں گے ان کے لئے ان کے شرکاء میں سے سفارش کرنے والے، اور یہ اپنے شرکاء کا

كٰفِرِيْنَ ⑬ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ⑭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

انکار کرنے والے ہوں گے ⑬ اور جس دن قیامت قائم ہوگی اس دن یہ لوگ علیحدہ علیحدہ ہو جائیں گے ⑭ جو لوگ ایمان لائے

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ⑮ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا

اور انہوں نے نیک عمل کئے پس وہ لوگ باغ میں خوش کئے جائیں گے ⑮ اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا

وَلِقَآئِ الْاٰخِرَةِ فَاُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ⑯ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ

اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا، پس یہ لوگ عذاب میں حاضر کئے ہوئے ہوں گے ⑯ اللہ کی تسبیح بیان کرو جس وقت کہ

تُمْسُوْنَ وَحِیْنَ تُصْبِحُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَلَهُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

تم شام کرتے ہو اور جس وقت تم صبح کے وقت میں داخل ہوتے ہو ﴿۱۷﴾ اسی کے لئے تعریف ہے آسمانوں میں اور زمین میں

وَعَشِیًّا وَّحِیْنَ تُظْهِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَیُخْرِجُ الْمَیِّتَ

اور (تسبیح بیان کرو) عشاء کے وقت اور ظہر کے وقت ﴿۱۸﴾ نکالتا ہے وہ زندہ کو میّت سے اور نکالتا ہے میّت کو

مِنَ الْحَیِّ وَیُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴿۱۹﴾

زندہ سے، اور زمین کے بنجر ہو جانے کے بعد وہی زمین کو زندہ کرتا ہے، اسی طرح تم نکال لیے جاؤ گے ﴿۱۹﴾

تفسیر

قیامت پر دلیل

اَللّٰهُ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ: اللہ ابتداءً پیدا کرتا ہے مخلوق کو، پھر وہی اس کو لوٹائے گا۔ بَدَا یَبْدَاُ: شروع کرنا۔ اللہ تعالیٰ شروع کرتا ہے پیدا کرنے کو، پھر وہی اس خلق کا اعادہ کرے گا۔ اصل تو سمجھانا ہے ثُمَّ یُعِیْدُهٗ کو، اور یَبْدَؤُا الْخَلْقَ یہ یوں سمجھئے کہ بطور دلیل کے ہے۔ اللہ تعالیٰ اس مخلوق کو لوٹائے گا، لوٹانے کی دلیل یہ ہے کہ ابتداءً بھی پیدا وہی کرتا ہے، جب ابتداءً پیدا کرتا ہے تو دوبارہ پیدا کرنا اس کے لئے کوئی مشکل نہیں۔ ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ: پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

شرکاء بھی کچھ کام نہ آئیں گے

وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ: اور جس دن قیامت قائم ہوگی، مجرم مایوس ہو جائیں گے، چھوٹنے کی ان کو کوئی اُمید نہیں رہے گی۔ اَبْلَسَ اِبْلَاس: مایوس ہو جانا، حوصلہ ٹوٹ جانا۔ وَلَمْ یَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا: جس طرح پہلے کہا تھا کہ دنیوی قوت، شوکت، خوش حالی، یہ اللہ کی گرفت سے نہیں بچاتی۔ تو اسی طرح سے اب شرکاء بھی نہیں بچا سکیں گے جب اللہ کے ہاں پیشی ہوگی، شرکاء کچھ کام نہیں آئیں گے۔ نہیں ہوں گے ان کے لئے ان کے شرکاء میں سے شفعاء۔ شفعاء شفیع کی جمع ہے، سفارش کرنے والے۔ کیونکہ یہ یہی کہا کرتے تھے کہ ہمارے یہ شرکاء ہمارے سفارشی ہیں، اللہ تعالیٰ سے کہہ سُن کے ہمارا کام کروا دیتے ہیں، اوّل تو آخرت ہوگی ہی نہیں، اگر ہوگی تو یہی ہمارے کام آ جائیں گے، ہمیں چھڑا لیں گے۔ تو فرمایا کہ ان کے شرکاء سے ان کے لئے کوئی شفعا نہیں ہوں گے۔

آیات میں تعارض اور اس کا حل

وَكَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِیْنَ: اور یہ اپنے شرکاء کا انکار کرنے والے ہوں گے، یعنی یہ خود بھی منکر ہو جائیں گے۔ قیامت

میں مختلف حالات طاری ہوں گے، کبھی تو اپنے شرکاء کو پکاریں گے، جب اللہ کہے گا کہ بلاؤ انہیں وہ تمہاری مدد کریں، یہ بلائیں گے لیکن وہ جواب ہی نہیں دیں گے۔ کبھی وہ کہیں گے وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ (سورۂ انعام: ۲۳) کہ اللہ کی قسم ہم تو مشرک تھے ہی نہیں۔ سرے سے انکار ہی کردیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ موقع محل کے مطابق بات بنانے کی کوشش کریں گے لیکن آخرت اب بات بنانے کا وقت نہیں ہے، بلکہ حقائق کے ساتھ دوچار ہونے کا وقت ہے۔ پوری حقیقت سامنے آ کے رہے گی، بات بنائے بنے گی نہیں، کبھی وہ سمجھیں گے کہ شاید انکار کرنے سے جان چھوٹ جائے تو وہ منکر ہی ہوجائیں گے۔ اور کبھی بدحواسی میں کہیں گے کہ یہی ہیں جن کو ہم پکارا کرتے تھے۔ اللہ کہے گا کہ بلاؤ انہیں، تمہاری مدد کریں، تو ان کو آوازیں دینے لگ جائیں گے، وہ آگے سے جواب ہی نہیں دیں گے۔ یہ مختلف قسم کے حالات ان کے اُوپر طاری ہوں گے۔ ''اور یہ اپنے شرکاء کا انکار کرنے والے ہوجائیں گے۔''

قیامت کے دِن لوگوں کی تقسیم

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ: اور جس دِن قیامت قائم ہوگی اُس دِن یہ لوگ علیحدہ علیحدہ فرقہ فرقہ ہوجائیں گے، جدا جدا ہوجائیں گے۔ دنیا کے اندر تو اب خلط ملط ہیں، ایک ہی آبادی میں اہلِ حق بھی رہتے ہیں، اہلِ باطل بھی رہتے ہیں، مؤمن بھی رہتے ہیں، کافر بھی رہتے ہیں، یہاں کی تکلیف کے اندر مؤمن کافر سب برابر میں شریک ہوجاتے ہیں، دنیا کے اندر واقعات جس قسم کے ہوتے ہیں۔ لیکن وہاں جا کے ہر گروہ کو علیحدہ علیحدہ کردیا جائے گا، جیسے سورۂ یٰسٓ میں لفظ آپ کے سامنے آئے گا وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ (آیت: ۵۹) اے مجرمو! اب ممتاز ہوجاؤ، علیحدہ ہوجاؤ، اب مؤمنوں کے ساتھ خلط ہو کے نہ رہو، ٹکڑے علیحدہ کرلیے جائیں گے۔

مؤمنین اور کُفّار کا اَنجام

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: جو فرقہ اس کا مصداق ہوگا۔ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے، فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ: پس وہ لوگ باغ میں خوش کیے جائیں گے۔ حَبْرَةٌ: سَرَّةٌ کے معنی میں، سُرور خوشی کو کہتے ہیں۔ ''خوش کیے جائیں گے'' اس لفظ میں سب نعمتیں آگئیں، یعنی ان کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جائے گا، جس برتاؤ سے انہیں خوشی ہوگی، اور آپ جانتے ہیں کہ خوشی تبھی ہوا کرتی ہے جب انسان کی ہر مرضی پوری ہوتی چلی جائے، ہر مشیت پوری ہوتی چلی جائے، اس لئے اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ (سورۂ نحل: ۳۱) ان کو وہی کچھ ملے گا جو وہ چاہیں گے۔ جب اپنی ہر خواہش پوری ہوتی چلی جائے گی، تو خوشی کی تکمیل ہوجائے گی۔ یہ تو ایک فرقے کا بیان ہوگیا۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: اور وہ لوگ (اَمَّا تفصیل کے لئے ہوتا ہے پیچھے جو يَتَفَرَّقُوْنَ میں مختلف فرقوں کا ذکر آیا تھا تو اب آگے اسی کی تفصیل ہے) اور وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا، وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا: ہماری آیات کو جھٹلایا اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا۔ فَاُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ: پس یہ لوگ عذاب میں حاضر کیے ہوئے ہوں گے۔ اِحضار: حاضر کرنا۔ اس میں ذِلت کا مفہوم ہے، جس طرح سے کسی مجرم کو پکڑ کے لایا جاتا ہے، جکڑ کے لایا جاتا ہے، جیل میں ڈال دیا جاتا ہے، تو مُحْضَرُوْنَ کے اندر یہی مفہوم ہے۔

قیامت کے ساتھ تسبیح کے ذِکر کا مقصد

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَحِیْنَ تُصْبِحُوْنَ: جس اللہ نے دنیا پیدا کی، اور جو اللہ اس دنیا کا نتیجہ سامنے لائے گا، اچھے عمل کرنے والوں کو اچھی جزا دے گا، بُرے عمل کرنے والوں کو سزا دے گا، ایسے اللہ کی تسبیح وتحمید کرنی چاہیے۔ کیونکہ اگر اس دنیا کے اندر اسی طرح سے لوگوں کو چھوڑ دیا جائے، تو یہاں تو بسا اوقات ظالم آدمی خوش حال ہے، کافر اور بدکار آدمی اچھا کھاتا اور پیتا ہے، اور جو اچھے اُصولوں پہ چلنے والے نیک لوگ ہیں بسا اوقات دنیا میں وہ تکلیفوں میں رہتے ہیں، تو اگر آخرت نہ آتی تو پھر تو مطلب یہ ہوگا کہ ظلم ستم جتنا کرو، کھاؤ پیو چاہے دوسرے کا گوشت کھا کے پیٹ بھرو، جتنا ظلم کرو گے اتنا ہی خوش حال رہو گے، تو پھر تو یہ معاملہ عدل وانصاف والا نہیں ہے، پھر تو دنیا میں انسان سے زیادہ بے کار اور بے نتیجہ مخلوق کوئی نہیں۔ اس لئے جو اللہ تعالیٰ اس قسم کا نتیجہ سامنے لائے گا، ہر شخص کو اس کے مناسبِ حال جزا سزا دے گا، اس اللہ کی تسبیح تحمید کرنی چاہیے، (اس لیے) اگلی آیات میں تسبیح تحمید کا ذِکر ہے۔

تسبیح کے خاص اوقات میں حکمت اور پانچ نمازوں کی طرف اِشارہ

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ: یہ بھی مفعول مطلق ہے فعل محذوف کا سَبِّحُوْا سُبْحَانًا یہ سبحان مصدر ہے۔ اللہ کی تسبیح بیان کرو، اللہ کی پاکی بیان کرو۔ حِیْنَ تُمْسُوْنَ: تُمْسُوْنَ: اَمْسٰی سے لیا گیا ہے۔ جس وقت کہ تم شام کرتے ہو۔ وَحِیْنَ تُصْبِحُوْنَ: اور جس وقت تم صبح کے وقت میں داخل ہوتے ہو، وَلَهُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: اسی کے لئے تعریف ہے آسمانوں میں اور زمین میں۔ یہ درمیان میں جملہ معترضہ ہے۔ وَعَشِیًّا اس کا تعلق حِیْنَ تُصْبِحُوْنَ کے ساتھ ہے، جیسے وہ ظرف ہے، تو عَشِیًّا یہ بھی ظرف ہے۔ اَمْسٰی یُمْسِیْ اِمساءً یہ تو شام کا وقت ہوتا ہے، سورج کے غروب ہونے سے پہلے۔ اور عَشِی یہ زوال سے لے غروب تک کے لیے بھی بولا جاتا ہے اور رات کے ابتدائی حصے کے لیے بھی بولا جاتا ہے، اس لیے عَشِیًّا کا ترجمہ اگر کر دیا جائے "عشاء کے وقت" تو وہ بھی ٹھیک ہے۔ اور اَمسٰی کے اندر آ جائیں گی عصر اور مغرب۔ اور ظہر کا ذِکر آگے صراحتاً آ رہا ہے، وَحِیْنَ تُظْهِرُوْنَ: اَظْهَرَ اَیْ دَخَلَ فِیْ وَقْتِ الظَّهِیْرَةِ، ظہیرہ کا وقت ہوتا ہے اِستوائے شمس کے زوال کے بعد، جس کو ہم "ظہر کا وقت" کہتے ہیں۔ تو اب اس کا مطلب یہ ہو جائے گا کہ تُصْبِحُوْنَ کے اندر تو فجر کی نماز آ گئی، یہ صبح کا وقت بھی اللہ کی تسبیح کا وقت ہے، اور تُمْسُوْنَ یہ مَساء کا لفظ آ گیا، مَساء شام کو کہتے ہیں، اس میں عصر کا وقت آ جائے گا، اور عَشِیًّا سے مراد رات کا اِبتدائی حصہ لے لیں تو اس میں مغرب اور عشاء آ جائیں گی، کیونکہ مغرب یہ بھی رات کے بالکل اِبتدائی حصے میں ہے، اور عشاء بھی رات کا اِبتدائی حصہ ہی ہے، تُظْهِرُوْنَ میں ظہر کی نماز آ جائے گی۔ تو پانچوں نمازوں کے اوقات کی طرف اشارہ اس آیت میں موجود ہے، یہ ہیں خاص اوقات جن میں اللہ کی تسبیح بیان کی جاتی ہے، اور نماز پڑھنا یہ اللہ کی تسبیح کی اعلیٰ شان ہے، زبان سے بھی، بدن سے بھی، قلب سے بھی، ہر طرح سے انسان اللہ کا شکر ادا کرتا ہے، اور اللہ کے پاک ہونے کی شہادت دیتا ہے کہ جس کا یہ تصرف کائنات میں چل رہا ہے، وہ ہر قسم کے عیب سے پاک ہے۔ اور ان اوقات کو

تسبیح کے لئے خصوصیت سے ذکر کیا، کیونکہ یہ وقت ایسے ہیں جن میں خاص تصرف نمایاں ہوتا ہے۔ رات کی تاریکی ختم ہوتی ہے صبح کا اُجالا آنے لگتا ہے، اور اسی طرح سے سورج چلتا ہوا عروج پہ جاتا ہے تو پھر اس پہ زوال کا وقت شروع ہوتا ہے، اور اس طرح سے غروب ہونے کے بعد پھر دوبارہ رات آنے لگتی ہے، تو جس میں کائنات کے اندر یہ عظیم تغیرات نمایاں ہوتے ہیں تو ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ نے تسبیح کی طرف متوجہ کیا ہے۔

پوری کائنات میں تسبیح گونج رہی ہے!

اور درمیان میں یہ آیت آ گئی وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: اس میں یہ بتا دیا کہ اللہ کی حمد میں ساری کائنات شریک ہے۔ زمین آسمان سب میں اللہ تعالیٰ کی حمد کے ترانے گائے جاتے ہیں، تو جو لوگ اللہ کی حمد وثناء کریں گے تو گویا کہ ان کی سُر بھی باقی سروں کے ساتھ مل گئی۔ اور جو اللہ کی حمد وثناء کو چھوڑ کے غیروں کے ترانے گاتے ہیں، تو ان کی آواز کائنات کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔ ساری کائنات تو شہادت دیتی ہے اللہ کی تسبیح اور تحمید کی، وہ تو اللہ کی تعریف کرتی ہے، اور یہ غیروں کے گن گانے لگ جائیں، اور دوسروں کے ترانے پڑھنے لگ جائیں تو یہ بے جوڑ بات ہے، اس لئے کائنات کے ساتھ سازگار اسی شخص کا نظریہ اور عقیدہ اور عمل ہے جو اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتحمید کرتا ہے، کیونکہ باقی کائنات بھی ساری کی ساری اللہ کی ہی تسبیح وتحمید کرتی ہے...... تو اس آیت میں گویا کہ پانچوں نمازوں کے اوقات موجود ہیں۔

اِثباتِ قیامت کے لیے دلائلِ قدرت کا ذِکر

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ: نکالتا ہے وہ زندہ کو میّت سے، اور نکالتا ہے میّت کو زندہ سے، میّت: مرا ہوا۔ یعنی جاندار کو بے جان سے نکالتا ہے اور بے جان کو جاندار سے نکالتا ہے، یہ بھی اللہ تعالیٰ کا تصرف ہے، یہ بھی آپ دیکھتے رہتے ہیں، جس طرح سے مرغی زندہ ہے اس میں سے انڈا بے جان نکل آیا، پھر انڈا بے جان ہے اس میں سے زندہ بچہ نکل آیا۔ اور انسان سے پانی کا قطرۂ بے جان ٹپکتا ہے، اسی قطرے کو بنیاد بنا کے اللہ تعالیٰ آگے جان دار بنا دیتے ہیں، تو صبح وشام رات دن اللہ تعالیٰ کے یہ تصرفات سامنے ہیں، اور تصرفات کی طرف متوجہ اس لئے کیا جا رہا ہے تا کہ انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا سمجھ میں آ جائے کہ اللہ کی قدرت سے کوئی چیز بعید نہیں۔ جیسے مشرک کہتے تھے، بوسیدہ ہڈیوں میں دوبارہ جان کیسے پڑ جائے گی؟ تو بے جان چیزوں کے اندر تو جان صبح شام تمہارے سامنے پڑتی ہے، تو ہڈیاں بھی تو بے جان ہی ہوں گی، تو اگر ان میں دوبارہ جان ڈالنی پڑ جائے تو اللہ تعالیٰ کے لئے یہ بات کیا مشکل ہے؟ یعنی یہی ہے نا؟ کہ وہ بے جان ہو گئیں، ان سے جان چلی گئی، بوسیدہ ہو گئیں، تو کہتے تھے مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ (سورۂ یٰسٓ: ۷۸) ان کو کون زندہ کرے گا جب یہ بوسیدہ ہو جائیں گی؟ تو بے جان چیزوں میں جان ڈال دینا، بے جان چیزوں سے جاندار کو نکال لینا، یہ کام تو تمہاری آنکھوں کے سامنے صبح شام ہوتا ہے...... اور اسی طرح سے دیکھی

الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا: زمین کے بنجر ہوجانے کے بعد وہی زمین کو زندہ کرتا ہے۔ اِحیائے ارض: زمین کا آباد کرنا، اور موتِ ارض: زمین کا بنجر ہوجانا۔ ''زمین کے مرنے کے بعد زمین کو زندہ کرتا ہے'' یہ قصہ بھی صبح شام آپ کے سامنے ہے۔ اور اس سے آگے تمہیں یہ بات سمجھ لینی چاہیے وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ: اسی طرح سے تم زمین سے نکال لیے جاؤ گے، یعنی مرنے کے بعد تم پیوندِ خاک ہوگئے، زمین کے اندر دفن ہوگئے، تو جس طرح سے اللہ تعالیٰ زمین کے مُردہ ہونے کے بعد اس کو آباد کرتا ہے، مُردہ چیزوں کے اندر جان ڈالتا ہے، تو اسی طرح سے تم نکال لئے جاؤ گے۔ تو ''وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ'' اصل میں یہ سمجھانا مقصود ہے۔

آیاتِ فضیلت

یہ جو تین آیتیں ہیں فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ سے لے کے وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ تک، ان تین آیتوں کے متعلق بھی حدیث شریف میں بہت فضیلت آئی ہے۔ سرورِ کائنات ﷺ نے صبح شام ان کو پڑھنے کی ترغیب دی ہے، اور فرمایا کہ جو شخص صبح ان کو پڑھ لے، تو دِن میں اگر عبادت میں کوئی کسی قسم کی کمی رہ جائے گی تو اللہ تعالیٰ ان آیات کی برکت سے اس کو پورا فرما دیتے ہیں، اور رات کو پڑھ لے تو رات کی عبادت میں اگر کسی قسم کی کوئی کمی ہو، تو اللہ تعالیٰ ان آیات کی برکت سے اس کمی کو پورا فرما دیتے ہیں۔[1] گویا کہ بارہ گھنٹے تک انسان کے ذاکر اور شاغل ہونے کے لئے ان تین آیات کی تلاوت کافی ہوجاتی ہے۔ جس طرح سے سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتوں کی فضیلت آتی ہے کہ رات کو اگر پڑھ لی جائیں تو انسان کے وِرد وظائف کے لئے یہ کافی ہوجاتی ہیں، اٰمَنَ الرَّسُوْلُ سے لے کے آخر تک۔[2] اور اسی قسم کی فضیلت سورۂ حشر کی آخری تین آیات کی بھی آتی ہے تین دفعہ ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ'' پڑھنے کے بعد وہ آیات پڑھی جائیں: هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سے آخر تک، تو حضور ﷺ نے فرمایا ستر ہزار فرشتے اس شخص کے لئے دُعا کرتے ہیں، جو شام کو پڑھ لے صبح تک اس کے لیے دُعا کرتے ہیں، صبح پڑھ لے تو شام تک اس کے لئے دُعا کرتے ہیں، اور اس دِن انسان اگر مرجائے تو شہادت والا درجہ اس کو حاصل ہوتا ہے۔[3] تو یہ بعض بعض آیات بہت فضیلت والی ہیں، ان میں سے یہ تین آیتیں بھی ہیں، ان کو صبح شام اپنے وِرد میں شامل کرلینا چاہیے۔ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ سے لے کر وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ تک۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

---

(۱) ابوداؤد ۲/۳۳۲ باب ما یقول اذا اصبح۔ مشکوٰۃ ۱/۲۱۰ باب ما یقول عند الصباح والمساء والمنام۔

(۲) بخاری ۲/۷۴۹، باب فضل البقرۃ۔ نیز ۲/۵۷۲۔ مشکوٰۃ ۱/۱۸۵، کتاب فضائل القرآن، فصل اول۔ مَنْ قَرَأَ بِالْاٰيَتَيْنِ مِنْ اٰخِرِ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ فِيْ لَيْلَةٍ كَفَتَاهُ۔

(۳) ترمذی ۲/۱۲۰ باب ما جاء کیف کانت قراءۃ النبی سے پہلے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَاۤ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ۝۲۰ وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ

اللہ کی نشانیوں سے ہے یہ بات کہ اس نے تمہیں پیدا کیا مٹی سے، پس اچانک تم انسان ہو پھیلے پڑے ہو ۝۲۰ اور اللہ کی نشانیوں میں سے ہے

اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً

کہ پیدا کیا اس نے تمہارے لئے تمہارے ہی نفسوں سے بیویوں کو، تا کہ تم سکون حاصل کرو ان کے ساتھ، اور اللہ نے تمہارے درمیان محبت اور شفقت

وَّرَحْمَةً ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۲۱ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

بنا دی، بے شک اس میں البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور کرتے ہیں ۝۲۱ اور اللہ کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا

وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ۝۲۲ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ

اور تمہاری زبانوں کا اختلاف اور تمہارے رنگوں کا اختلاف، بے شک اس میں البتہ نشانیاں ہیں جاننے والوں کے لئے ۝۲۲ اور اللہ کی نشانیوں میں سے ہے

مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ۝۲۳

تمہارا سونا رات میں اور دن میں اور تمہارا اللہ کے فضل کو تلاش کرنا، بے شک اس میں البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو سنتے ہیں ۝۲۳

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ

اور اللہ کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہیں دکھاتا ہے بجلی اس حال میں کہ تم ڈرنے والے ہوتے ہو اور اُمید رکھنے والے ہوتے ہو، اور اُتارتا ہے

مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ

آسمان سے پانی، پھر آباد کرتا ہے اس پانی کے ذریعے سے زمین کو اس کے بنجر ہو جانے کے بعد، بے شک اس میں البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں

يَّعْقِلُوْنَ ۝۲۴ وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ؕ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ

کے لئے جو سوچتے ہیں ۝۲۴ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے کہ ٹھہرا ہوا ہے آسمان اور زمین اس کے حکم کے ساتھ، پھر جس وقت تمہیں بلائے گا

دَعْوَةً ۖ مِّنَ الْاَرْضِ ۖ اِذَاۤ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ۝۲۵ وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ

ایک مرتبہ بلانا زمین سے، اچانک تم نکل آؤ گے ۝۲۵ اسی کے لئے ہے جو کوئی آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے

كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۝۲۶ وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ

سب کے سب اسی کی اطاعت کرنے والے ہیں ۝۲۶ وہی ہے جو ابتداءً پیدا کرتا ہے، وہی خلق کا اعادہ کرے گا، اور اعادہ زیادہ آسان ہے

عَلَیْهِ ؕ وَ لَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ﴿۲۷﴾

اس پر، اور اسی کے لئے سب سے اعلیٰ شان ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور وہ زبردست ہے حکمت والا ہے ﴿۲۷﴾

تفسیر

ماقبل سے ربط اور رُکوع کا مضمون

پچھلے رُکوع کی ابتدا میں اَللّٰهُ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے معاد کا تذکرہ کیا تھا، خصوصیت کے ساتھ آخرت کا بیان تھا، اور آخرت میں ان کے شرکاء کا کام نہ آنے کا ذکر کیا گیا تھا، یعنی اللہ تعالیٰ آخرت میں فیصلہ عدل وانصاف کے مطابق فرمائیں گے، اس کے فیصلوں پر کوئی اثر انداز نہیں ہوسکے گا۔ اور پھر دو فریق، ایک آخرت کے قائل اور اس کی تیاری کرنے والے، جو ایمان اور عمل صالح کے ساتھ مزین ہوجائیں گے، ان کا اچھا انجام ذکر کیا تھا۔ اور جو آخرت کا انکار کرنے والے ہیں، اللہ کی باتوں کا انکار کرنے والے ہیں، ان کا برا انجام ذکر کیا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتحمید کی ترغیب تھی...... اگلا رُکوع سارا ہی تقریباً اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں پر مشتمل ہے، جس کے ساتھ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کافر جو سمجھتے تھے اور مشرکوں کا عام طور پر جو قول نقل کیا گیا کہ ہڈیوں کے بوسیدہ ہوجانے کے بعد ان میں جان کیسے ڈالی جائے گی؟ اللہ تعالیٰ کے ان افعال اور ان تصرفات کی طرف دیکھتے ہوئے یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجانی چاہیے۔ اس لئے جہاں بھی آخرت کا تذکرہ آتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کی آیات ہی ذِکر فرمایا کرتے ہیں۔ اور ان آیات کے اندر احسان کا پہلو بھی ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت کی طرف ترغیب دیتا ہے۔ اس لئے مسلسل ان آیات کا ذکر آئے گا...... اور آخر میں جاکے پھر اس بات کو دوہرایا جائے گا وَهُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَیْهِ...... اور اسی طرح سے اگلے رُکوع میں بھی ایسا ہی مضمون ہے، اُس کے آخر میں بھی یہی بات دوہرائی جائے گی...... تو خصوصیت کے ساتھ اس بات پہ زور دیا جارہا ہے کہ آخرت کا عقیدہ اختیار کرو، جس وقت تک کوئی شخص مرنے کے بعد اللہ کے سامنے پیشی کا عقیدہ اختیار نہیں کرے گا، اس وقت تک اس کے عمل کی اس کے عقائد کی اصلاح نہیں ہوسکتی۔ انجام کا فکر ہو، کسی کے سامنے حساب وکتاب دینے کا عقیدہ ہو، تب انسان اپنے آپ کو سدھارنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اگر آخرت کا عقیدہ نہ ہو، تو پھر دنیا میں عیش وعشرت، مزے اڑانا، لطف اُٹھانا، یہی چیزیں ہوا کرتی ہیں، کہ مرنا ہے مرنے کے بعد مٹی ہوجانا ہے، کسی نے پوچھنا نہیں، چند دِن کی زندگی ہے، اس لئے جو عیش اُڑا سکتے ہیں اُڑا لیں، پھر انسان کی زندگی اس نہج سے جایا کرتی ہے۔ اس لیے قرآنِ کریم میں توحید کے ساتھ ساتھ معاد کا تذکرہ بہت اہمیت کے ساتھ کیا گیا...... اور پھر آخرت کے بے معنی کرنے کے لئے ایک نظریہ یہ ہوسکتا تھا کہ وہاں سفارشی ہیں، وہاں شفعاء ہیں، وہ ہمیں چھڑالیں گے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے بھی ایسے ہوں گے نعوذ باللہ! جس طرح سے پاکستان کی عدالتوں کے ہیں، کہ جو کوئی پیسے دے دے وہ غلط فیصلہ کروالے، جو کوئی سفارشی لے جائے وہ غلط فیصلہ کروالے، تو پھر اس ''یومِ حساب'' کا مطلب کیا ہوا؟ اللہ تعالیٰ

کا دربار اس طرح سے نہیں، نہ وہاں پیسوں سے کام نکلے گا، زمین وآسمان کے درمیان والا حصّہ بھرا ہوا سونے کا اگر پیش کرو تو بھی تم سے لے کے تمہیں چھوڑا نہیں جائے گا، اور کوئی سفارشی اور کوئی شفاعت کرنے والا نہیں ہوگا، وہاں اللہ تعالیٰ کے جو بھی فیصلے ہوں گے سب عدل وانصاف پہ مبنی ہوں گے۔ خصوصیت کے ساتھ اس پہلو کو نمایاں کیا جارہا ہے۔ وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ پچھلے رُکوع کا اختتام بھی اسی بات پر ہی تھا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ بے جان چیزوں میں جان ڈالتا ہے اسی طرح سے تم بھی زمین سے نکل آؤ گے، اللہ تعالیٰ تمہیں بھی نکال لے گا۔

قدرتِ الٰہی کی پہلی نشانی: ”مٹی سے اِنسان کی اِبتدا“

وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَكُمْ اللہ کی نشانیوں سے ہے یہ بات کہ اس نے تمہیں پیدا کیا مٹی سے، ثُمَّ اِذَاۤ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ: پس اچانک تم انسان ہو، پھیلے پڑے ہو۔ یہ بھی اللہ نے اپنی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی کو ذکر کیا کہ تمہاری اِبتدا مٹی سے ہے۔ مٹی سے اِبتدا کس طرح سے؟ یہ باتیں بارہا آپ کی خدمت میں آچکیں۔ یا تو آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے براہِ راست مٹی سے بنایا تھا۔ باقی عنصر بھی اس میں تھے، پانی کی آمیزش تھی، آگ، ہوا، سب کچھ ہی ہوتا ہے، لیکن زیادہ تر غلبہ مٹی والے عنصر کا ہے۔ تو وہاں سے ہماری نسل چلی، تو ہماری اِبتدا براہِ راست مٹی سے ہی ہوئی۔ یا مٹی سے اِبتدا اس طرح سے ہے کہ آج کل انسان کی بنیاد رکھی جاتی ہے پانی کے ایک قطرے پہ، جس کو ”نطفہ“ کہتے ہیں، مَنی کا قطرہ۔ اور یہ تیار ہوتا ہے غذا سے، اور غذا ماخوذ ہے زمین سے، مٹی سے، تو اَب بھی ہماری اِبتدا مٹی سے ہی ہے، اسی زمین سے نباتات پیدا ہوتی ہے، غذائیں حاصل ہوتی ہیں، انسان ان کو کھاتا ہے، مرد بھی کھاتا ہے، عورت بھی کھاتی ہے، اور اسی سے وہ مادہ تیار ہوتا ہے جس پر انسان کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ اس لئے اِبتدا مٹی سے ہے، اور اس کے بعد ظاہری طور پر پانی کی ایک بوند کی شکل میں انسان کو اُٹھایا جاتا ہے، اس لئے دوسری جگہ ہے اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ (سورۂ یٰسٓ: ۷۷) تو نطفے سے بھی اس کی بنیاد ذکر کی گئی، اور آگے پھر اسی طرح سے مراتب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ثُمَّ اِذَاۤ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ: کہ تم دیکھو تو سہی کہ اِبتدا تو تمہاری ایسی چیز سے ہے جو ساکن ہے، ساکت ہے، جامد ہے، اس میں کوئی کسی قسم کی حرکت نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے تصرف کے تحت تمہیں ایسا بنایا کہ تم انسان بن کے پھیلے پھر رہے ہو۔ کیا نسبت ہے انسان کی اس زندگی میں اور مٹی میں؟ تو جس اللہ کی قدرت مٹی سے تمہیں یوں اُٹھا سکتی ہے، تو مارنے کے بعد دوبارہ زندگی ڈالنا اس کے لئے کیا مشکل ہے! پھر اچانک تم انسان ہو پھیلے پڑے ہو۔

دُوسری نشانی: ”عورت کی تخلیق“

وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا: اور اللہ کی نشانیوں میں سے ہے کہ پیدا کیا اس نے تمہارے لئے تمہارے ہی نفسوں سے بیویوں کو۔ مِنْ اَنْفُسِكُمْ سے مراد ہے: تمہاری جنس سے۔ جیسے تم ہو تو تمہاری ہی جنس سے تمہاری بیویاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے تمہارے نفسوں سے تمہاری بیویاں بنائیں، تمہاری جنس سے تمہاری بیویاں بنائیں۔ عورت انسان کی جنس سے ہی ہے۔ اس کی تخلیق اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت کے تحت، جیسا کہ سورۂ نساء کی ابتدا میں ذکر کیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے آدم علیہ السلام کو

بنایا، پھر آدم سے آدم کے جوڑے کو بنایا، بیوی کو، یعنی حوّاء۔ کس طرح سے بنایا؟ جمہور کا قول یہی ہے کہ آدم علیہ السلام کے بدن کی پسلی سے اللہ تعالیٰ نے ایک مادّہ لیا، اور اس پر حوّاء کی تخلیق کی بنیاد رکھی۔[1] اس لئے حدیث شریف میں آتا ہے کہ عورت چونکہ ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے، تو اس کی طبیعت میں بھی کچھ نہ کچھ کجی ہوتی ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ تم اپنی بیویوں کی اس کجی کو برداشت کرتے ہوئے ان سے فائدہ اُٹھایا کرو، یہ بالکل سیدھی نہیں ہوسکتی، اس کی طبیعت میں پوری طرح سے اعتدال نہیں آسکتا، اگر زیادہ سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو یہ ٹوٹ جائے گی، اس کو توڑ دو گے۔ اور توڑنا یہ ہے کہ گھر سے نکال دو گے، طلاق دے دو گے۔[2] اس روایت میں بھی یہی بیان کیا گیا ہے، اور جمہور کا قول بھی یہی ہے۔ اگرچہ بعض مفسرین نے یوں بھی ذِکر کیا کہ سورۂ نساء میں جو آیا کہ اللہ تعالیٰ نے اسی نفس سے اس کے لئے اس کی بیوی بنائی، وہاں بھی معنی یہی ہے کہ اس کی جنس سے بنائی، باقی تخلیق اس کی بھی مستقل ہے، جس طرح آدم علیہ السلام کی تخلیق مستقل ہے۔ اور اس آیت کو بطور قرینے کے پیش کرتے ہیں کہ دیکھو اللہ تعالیٰ کہتا ہے خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا، وہاں جس طرح سے خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا ہے تو یہاں بھی خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نفسوں سے تمہاری بیویاں بنائیں، تو جیسے یہاں جنس والا معنی ہے تو وہاں بھی جنس والا معنی ہے۔ بعض مفسرین نے یوں ذِکر کیا۔ بہر حال جو صورت بھی ہو، دونوں طرح سے اللہ تعالیٰ کو قدرت ہے، جیسے آدم علیہ السلام کو براہِ راست پیدا کیا، حوّا کو بھی براہِ راست پیدا کر دیا ہو، یا آدم علیہ السلام کی پسلی سے ہی، جیسا کہ جمہور کا قول ہے، اور یہی راجح ہے کہ آدم علیہ السلام کی پسلی سے تھوڑا سا مادّہ لے کے، جس طرح سے عام انسانوں کی بنیاد آدمی سے خارج کئے ہوئے پانی کے ایک قطرے پہ رکھی جاتی ہے، تو حوّا کی بنیاد اسی طرح سے آدم علیہ السلام کی پسلی سے ماخوذ ایک مادّے پہ رکھ دی۔

عورت کی تخلیق کی حکمت

اور بعد میں سلسلہ جو ہے تخلیق کا اس طرح سے ہے جیسے پیدائش ہوتی ہے، لڑکوں کی پیدائش بھی ہوتی ہے لڑکیوں کی پیدائش بھی ہوتی ہے، یہی آپس میں خاوند بیوی بنتے ہیں۔ اور اس میں یہ بات بھی ذکر کی جارہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو جوڑا بنایا، ایک چیز کے مقابلے میں دوسری چیز ہے، جس کو بار بار آپ کے سامنے نمایاں کیا جاتا ہے، مرد کے مقابلے میں عورت بنادی، اللہ کی حکمت کا تقاضا یہی ہے۔ اور پھر ان میں اختلاف بھی ہے، بدن کے لحاظ سے، ان کی بناوٹ میں، صلاحیتوں میں اختلاف ہے، لیکن اختلاف کے باوجود ان میں سازگاری ہے، اللہ تعالیٰ نے آپس میں اُنس محبت اور جوڑ لگادیا، اور اس سازگاری کے نتیجے میں کیا اچھے اچھے نتائج نکلتے ہیں، زندگی میں سکون آرام راحت، اور انسان کی زندگی پُرلطف ہوجاتی ہے، یوں ہوتا ہے جس طرح سے گاڑی کے دو پہیے ٹھیک ہوگئے تو گاڑی ٹھیک چلتی ہے۔ تو خاوند بیوی کا جوڑ جب لگ جاتا ہے، تو سکون محبت راحت آرام، آگے نسل کی افزائش، یہ سارے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ تو اختلاف پیدا کرنے کے بعد آپس میں اتحاد پیدا کردیا، سازگاری پیدا

(۱) اَلَّذِيْ عَلَيْهِ الْاَكْثَرُوْنَ اَنَّهٗ لَمَّا خَلَقَ اللهُ اٰدَمَ اَلْقٰى عَلَيْهِ النَّوْمَ. ثُمَّ خَلَقَ حَوَّاءَ مِنْ ضِلْعٍ مِنْ اَضْلَاعِهِ الْيُسْرٰى. (تفسیر رازی، سورۂ نساء کی ابتدا)

(۲) مسلم ۱/۴۷۵، باب الوصیۃ بالنساء۔ مشکوٰۃ ۲/۲۸۰، باب عشرۃ النساء کی ابتداء۔ نیز دیکھیں: بخاری ۱/۴۶۹، کتاب الانبیاء کا پہلا باب، باب خلق آدم۔

کردی۔ یہ علامت ہے اس بات کی کہ جو مرد کا خالق بھی وہی ہے جو عورت کا خالق ہے، اگر مرد کا خالق اور ہوتا، عورت کا خالق اور ہوتا، تو ان میں اختلاف ہی اختلاف نمایاں ہوتا، دونوں میں سازگاری نہ ہو سکتی۔ تو یہ اختلاف میں اتحاد، علامت ہے کہ دونوں کا خالق ایک ہی ہے...... بالکل اسی طرح سے اللہ تعالیٰ جگہ بہ جگہ آپ کو دکھاتے ہیں، کہ آسمان اور زمین یہ دو علیحدہ علیحدہ مخلوقات ہیں۔ باوجود اس بات کے کہ آسمان اور ہے، زمین اور ہے، دونوں میں اختلاف ہے، اور اختلاف کے باوجود پھر اللہ تعالیٰ نے ان میں اتحاد کس طرح سے کیا؟ آسمان کی طرف سے بارش آتی ہے، زمین اس کو قبول کرتی ہے۔ آسمان کی طرف سے سورج کی حرارت اور روشنی آتی ہے، زمین اس کے اثرات قبول کرتی ہے، چاند ستاروں کے اثرات پڑتے ہیں، تو دونوں کا اس طرح آپس میں رابطہ قائم ہونے کے بعد، اللہ تعالیٰ نے کیا کیا نعمتوں کے دریا بہا دیے، اور کس طرح سے وافر مقدار کے ساتھ زمین کے اندر نعمتیں اُجاگر ہوتی ہیں، یہ زمین اور آسمان میں سازگاری کی دلیل ہے، اگر زمین کا خالق اور ہوتا، آسمان کا خالق اور ہوتا، تو ان کے اندر یہ سازگاری نظر نہ آتی۔ یہ جگہ بجگہ اللہ تعالیٰ مثالیں پیش کرتے ہیں کہ کائنات میں دیکھو، دو مختلف چیزیں ہیں پھر ان کا آپس میں کس طرح سے اتحاد ہے، آگ اور پانی ہے، ہوا ہے مٹی ہے، یہ بظاہر دیکھنے میں مختلف چیزیں نظر آتی ہیں، لیکن ایک دوسرے کا اثر قبول کرنے کے بعد کتنے شاندار نتائج نکلتے ہیں۔ تو یہاں وہی اختلاف کے ساتھ اتحاد دکھایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے تمہارے نفسوں سے یعنی تمہاری ہی جنس سے تمہاری بیویاں بنائیں۔

خاوند بیوی کی محبّت کی اہمیت

لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا: تاکہ تم سکون حاصل کرو ان بیویوں کے ساتھ، یہ تمہارے لئے سکون اور راحت کا ذریعہ ہیں۔ وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً: اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے درمیان محبت اور شفقت بنا دی، دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت ڈال دی، دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ہمدرد بنا دیا۔ رحمت: ہمدردی۔ تو یہ دلوں کے اندر محبت اور آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی زوجین میں جتنی زیادہ ہوگی، اتنا ہی گھر کے اندر سکون اور راحت ہوتی ہے۔ اور بدقسمتی کے ساتھ اگر جوڑا ایسا ہو کہ جن کی آپس مودّت اور رحمت نہ ہو، تو ان کی زندگی میں سکون بھی کوئی نہیں ہوتا۔ اس لئے بیوی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ساتھ اگر ایسی مل جائے کہ جس کے ساتھ مودّت اور رحمت والی کیفیت پیدا ہو جائے تو پھر زندگی میں سکون ہی سکون ہوتا ہے، تو اصل میں بیویوں کی تخلیق اس لئے ہوئی تاکہ مرد کے لئے باعثِ سکون بنیں۔ مودّت اور رحمت کے اندر وہ سارا تعلق جو خاوند اور بیوی کا ہوتا ہے، وہ آ گیا۔ محبت بھی ہوتی ہے، آپس میں اُنس بھی ہوتا ہے، دونوں آپس میں مل کے سکون اور اطمینان حاصل کرتے ہیں، ہمدردی بھی ہوتی ہے۔ جوانی میں عموماً مودّت اور محبت کا غلبہ ہوتا ہے، جیسے جیسے آگے تعلق بڑھتا جاتا ہے، عمر ڈھلتی چلی جاتی ہے، آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ آخر ایک ایسا دور بھی آتا ہے کہ جب محبت کے تقاضے تو تقریباً ختم ہو جاتے ہیں، لیکن ہمدردی اپنے عروج پہ پہنچ جاتی ہے۔ تو یہی چیز ہے مودّت اور رحمت، جو زندگی بھر کے لئے خاوند اور بیوی کو اپنے لیے سازگار رکھتی ہے، اور اسی کے ساتھ ہی زندگی کے اندر سکون پیدا ہوتا ہے۔ تو بیوی کی محبت اللہ تعالیٰ کی ایک رحمت ہے، جس کے ساتھ

انسان کے اطمینان اور سکون کا سامان حاصل ہوتا ہے، اور بیوی کے ساتھ جتنی محبت ہوگی، اتنی ہی اخلاق کی پاکیزگی اور اتنی راحت ہوگی۔ اس لئے خاوند اور بیوی کی محبت بہت مطلوب ہے، اور جو لوگ خاوند اور بیوی کے درمیان پھوٹ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی بہت سخت مذمت آتی ہے، شیطان کا محبوب ترین مشغلہ یہی ذکر کیا گیا ہے خاوند اور بیوی کے درمیان پھوٹ ڈالنا۔ اور فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ (سورۂ بقرہ: ۱۰۲) یہود کا بھی یہی ذکر کیا گیا تھا کہ جب ان میں اخلاقی گراوٹ ہوئی، جادو سیکھ کے انہوں نے خاوندوں اور بیویوں کے درمیان میں پھوٹ ڈالنی شروع کردی۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ: بے شک اس میں البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو کہ غور کرتے ہیں۔

تیسری نشانی: ''زبان اور رنگ کا اِختلاف''

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: اور اللہ کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا۔ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ: تمہاری زبانوں کا اختلاف اور تمہارے رنگوں کا اختلاف۔ زبانوں کے اختلاف سے، یا تو لب ولہجہ کا اختلاف مراد ہے۔ ایک ہی لغات بولنے والے، ایک ہی قسم کی بولی بولنے والے، ان کے بھی لب ولہجے میں فرق ہے، ایک کا لب ولہجہ دوسرے کے ساتھ ملتا نہیں۔ یا ''اختلافِ اَلسنۃ'' سے زبانوں کا اختلاف مراد ہے کہ کوئی پنجابی بولتا ہے، کوئی اُردو بولتا ہے، کوئی سندھی، کوئی پشتو، کوئی انگریزی، دنیا میں کتنی ہی زبانیں ہیں، ایک باپ کی اولاد پھیلی تو پھیلنے کے ساتھ ساتھ زبانوں کا اختلاف بھی اللہ کی قدرت کے ساتھ کتنا نمایاں ہوگیا۔ وَاَلْوَانِكُمْ: اور تمہارے رنگوں کا اختلاف۔ کوئی کالا ہے، کوئی سفید ہے، کوئی پیلا ہے، کوئی سرخ ہے، کتنے رنگ ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں کچھ اس قسم کی خصوصیات رنگ کے اعتبار سے، لب ولہجے کے اعتبار سے رکھ دیں، کہ اَربہا انسان پیدا ہوئے اور پیدا ہوتے چلے جائیں گے، اگر آپ دنیا کا چکر لگائیں تو آپ ایک شکل کے، ایک لب ولہجے کے، ایک رنگ کے دو انسان تلاش نہیں کرسکتے، یعنی دو انسان اس قسم کے ہوں کہ ان میں کوئی کسی قسم کا امتیاز نہ ہو، پہچانے نہ جاسکیں کہ یہ کون ہے اور یہ کون ہے، ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ شکل وصورت، لب ولہجہ، زبان، آواز، قد کی بناوٹ، نقش ونگار میں اللہ تعالیٰ اختلاف ڈال کے ہر انسان کو دوسرے سے مختلف کردیتا ہے۔ اب اندازہ کریں چہرے میں یہی تو دو چار نقش ہیں، ناک ہوگیا، ہونٹ ہوگئے، رخسارے ہوگئے، آنکھیں ہوگئیں۔ اب چار پانچ چیزیں ہیں، تو ان میں اگر انسان عقل کے ساتھ سوچے تو کتنی تصویریں بنائی جاسکتی ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہزاروں نہیں، لاکھوں نہیں، کروڑوں نہیں، اربوں صورتیں بنتی چلی جاتی ہیں، اور ایک صورت ''مِنْ كُلِّ الْوُجُوْہِ'' دوسرے کے ساتھ مشابہ نہیں۔ کتنی بڑی قدرت ہے اللہ تعالیٰ کی! اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ: بے شک اس میں بھی البتہ نشانیاں ہیں جاننے والوں کے لئے۔ علم والے لوگ ان سے بھی استدلال کرسکتے ہیں کہ دیکھو! اللہ کی کیسی قدرت ہے کہ کیسے کیسے لب ولہجے مختلف، رنگ مختلف، یہ نقشہ اگر دیکھنا ہو تو حج کے موقع پر بہت خوب نظر آتا ہے، دنیا کے ہر حصے سے لوگ آئے ہوئے ہوتے ہیں، مختلف قد، مختلف قامتیں، مختلف رنگ، مختلف زبانیں، بود وباش علیحدہ علیحدہ، اور اس کے باوجود سارے ایک مقصد کے لئے متحد اور مشترک بھی نظر آتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نقطہ ایسا اجتماعی ہے جس کے اُوپر یہ سارے اکٹھے ہیں۔ تو

آدم علیہ السلام کی اولاد میں اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے اختلافات پیدا کر دیے یہ بھی اس کی قدرت کی نشانی ہے، لیکن ان کو سمجھتے وہی ہیں جن کو کوئی علم ہوتا ہے، کوئی عقل سمجھ ہوتی ہے۔

چوتھی نشانی: ''رات دِن کا نظام''

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ مَنَامُکُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّہَارِ: اور اللہ کی نشانیوں میں سے ہے (منام مصدر میمی ہے بمعنی سونا) تمہارا سونا رات میں اور دِن میں۔ وَابْتِغَآؤُکُمْ مِّنْ فَضْلِہٖ: اور تمہارا تلاش کرنا اللہ کے فضل کو۔ یہاں دو باتیں اکٹھی کر دیں، رات اور دِن میں سونا اور تمہارا اللہ کے فضل کو تلاش کرنا۔ عام طور پر آیات کے اندر سونے اور سکون حاصل کرنے کا ذکر لیل کے ساتھ آیا ہے، اور کام کرنے کا ذکر نہار کے ساتھ آیا ہے، لیکن یہاں دونوں کو اکٹھا کر دیا۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ سونا صرف رات کے ساتھ ہی خاص نہیں بلکہ انسان دِن کو بھی سوتا ہے، چاہے کمی بیشی کا فرق ہے۔ اور اسی طرح سے رزق کے لئے کوشش کرنا، رزق تلاش کرنا ہمیشہ دِن کو نہیں ہوتا، رات کو بھی کام کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے دِن ہو یا رات ہو، اس میں سونا بھی ہے، اور کام کرنا بھی ہے، کمی بیشی کا فرق ہے۔ اگرچہ رات اصل وضع کی گئی ہے آرام کے لئے، لیکن انسان بسا اوقات اپنی معاشی ضروریات کے لئے رات کو کام بھی کرتا ہے۔ اور دِن اصل وضع کیا گیا ہے نقل وحرکت کے لئے، رزق کی جستجو کے لئے، لیکن بسا اوقات انسان دِن کو آرام بھی کرتا ہے، اور سو بھی لیتا ہے۔ اس لئے دونوں کو اکٹھا کر کے ذکر کر دیا گیا۔ ''اللہ کی نشانیوں میں سے ہے تمہارا سونا دِن میں اور رات میں، اور تمہارا تلاش کرنا اللہ کے فضل کو۔ بے شک اس میں البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو کہ سنتے ہیں''۔ ''سنتے ہیں'' کا یہ مطلب نہیں کہ بہرے نہیں ہیں، مطلب یہ ہے کہ جن کو اللہ کی اور اللہ کے پیغمبر کی باتیں توجہ سے سننے کی عادت ہے، وہی ان نشانیوں سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ اور جو اندھوں بہروں کی طرح ایسے ہی ڈنگروں (جانوروں) کی طرح اپنا وقت گزارنا ہی جانتے ہیں، سوچتے ہی نہیں کہ اللہ نے رات کیوں بنائی؟ دِن کیوں بنایا؟ رات میں کیا فوائد ہیں، دِن میں کیا فوائد ہیں؟ اس میں اللہ نے ہم پر کیا کیا احسان کئے ہیں؟ انہوں نے ان باتوں کو کیا سمجھنا ہے! تفکر ہے، علم ہے، سمع ہے، یہ سب چیزیں ذکر کی جا رہی ہیں، یہی ہیں جن سے انسان اللہ تعالیٰ کی آیات کو سُن کے فائدہ اُٹھاتا ہے۔

پانچویں نشانی: ''بارش کا نظام''

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ یُرِیْکُمُ الْبَرْقَ: اور اللہ کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہیں دکھاتا ہے برق، بجلی، چمک جو بادلوں میں پیدا ہوتی ہے۔ خَوْفًا وَّطَمَعًا: اس حال میں کہ تم ڈرنے والے ہوتے ہو اور اُمید رکھنے والے ہوتے ہو، ڈر بھی لگتا ہے کہ کہیں طوفان نہ آ جائے، اور ایسے واقعات بھی ہوتے ہیں، بجلی گرتی ہے اور اس سے نقصان ہو جاتا ہے، عمارتیں گر جاتی ہیں، انسان مر جاتے ہیں، اور اسی طرح سے بجلی چمکتی ہوئی، بادل گڑکتا ہوا آتا ہے، تو باد و باراں کا طوفان بھی اس میں آ جاتا ہے، آندھی آ گئی، بارش بے انتہا آ گئی، جس سے آبادیاں اُجڑ جاتی ہیں۔ اور اُمید بھی لگی ہوئی ہوتی ہے کہ بارش ہوگی، زمین سرسبز ہوگی، غلہ پیدا ہوگا، سبزیاں پیدا ہوں

گی، درخت پیدا ہوں گے، گھاس پیدا ہوگی، جس سے جانور فائدہ اُٹھائیں گے، انسان فائدہ اُٹھائیں گے، یہ اُمید بھی لگی ہوئی ہوتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ دِکھاتا ہے تمہیں بجلی اس حال میں کہ تم ڈرنے والے ہوتے ہو اور اُمید رکھنے والے ہوتے ہو۔ وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً: اور اُتارتا ہے آسمان سے پانی۔ فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا: پھر آباد کرتا ہے اس پانی کے ذریعے سے زمین کو اس کے بنجر ہوجانے کے بعد۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ: بے شک اس میں البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو کہ سوچتے ہیں۔ خاص طور پر اِحیائے ارض، یہ تو بہت واضح علامت ہے معاد کے لئے۔ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کے لئے اس علامت کا بہت ذِکر کیا جاتا ہے۔

چھٹی نشانی: ''آسمان وزمین''

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ: اللہ کی نشانیوں میں سے ہے کہ ٹھہرا ہوا ہے آسمان اور زمین اس کے حکم کے ساتھ۔ اس کو بھی بیان اس لئے کیا جارہا ہے کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ آسمان جس طرح سے ہے یہ بھی اپنے طور پر کھڑا ہے، اور یونہی کھڑا رہے گا۔ زمین بھی جس طرح سے بنی ہوئی ہے، ایسے ہی رہ جائے گی۔ جس طرح سے مشرک اور کافر پہاڑوں کے متعلق پوچھتے تھے کہ اتنے بڑے بڑے پہاڑ اور اتنے مضبوط پہاڑ، ان کا کیا ہوگا؟ اور جب انہیں بتایا جاتا کہ یہ بھی ریزہ ریزہ ہوکے اُڑ جائیں گے، تو تعجب کرتے کہ اتنے سخت پہاڑ اور اتنے بڑے بڑے! یہ بھی ریزہ ریزہ ہوجائیں گے؟ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس آسمان اور زمین کو بھی یوں نہ سمجھو کہ یہ خود بخود یوں قائم ہیں اور ایسے ہی قائم رہیں گے، بلکہ اللہ کے قائم کرنے کے ساتھ یہ قائم ہوئے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ یہ تھمے ہوئے ہیں۔ اور جب اللہ کا حکم ہوجائے گا تو یہ سارے ٹوٹ پھوٹ جائیں گے، زمین وآسمان آپس میں ریزہ ریزہ ہوجائیں گے، یہ کرے جتنے بھی ہیں سب آپس میں ٹکرا جائیں گے ریزہ ریزہ ہوجائیں گے۔ ان کو صرف اللہ نے اپنی قدرت کے تحت تھام رکھا ہے۔ ستارے ہیں، وہ اپنے اپنے محور میں حرکت کررہے ہیں، اپنے اپنے مدار میں گھوم رہے ہیں، زمین ہے وہ اپنی جگہ ہے، آسمان اپنی جگہ ہے۔ اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے کہ ٹھہرا ہوا ہے، قائم ہے آسمان اور زمین اللہ کے حکم کے ساتھ۔

معاد کا تذکرہ

ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً ۖ مِّنَ الْاَرْضِ: پھر جس وقت تمہیں بُلائے گا ایک مرتبہ بُلانا زمین سے۔ اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ: اچانک تم نکل آؤ گے۔ ایسی قدرت والے کے سامنے کیا مشکل ہے؟ مرو گے، مرنے کے بعد پیوندِ خاک ہوجاؤ گے، اللہ ایک ہی آواز دے گا، ایک ہی دفعہ بُلائے گا تم سب نکل کے کھڑے ہوجاؤ گے۔ دیر ہی کیا لگے گی؟ وہ صورِ اسرافیلی ہے، ایک دفعہ صور پھونکا جائے گا، سب زمین سے نکل آئیں گے، کوئی زیادہ اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دَعْوَةً: فَعْلَةٌ لِلْمَرَّةِ: ایک مرتبہ بُلانا۔ بُلائے تمہیں ایک مرتبہ بُلانا زمین سے اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ اچانک تم نکل آؤ گے۔

دلیلِ معاد

وَلَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: اسی کے لئے ہے جو کوئی آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے۔ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ سب کے سب اسی کی اطاعت کرنے والے ہیں۔ قُنوت: اطاعت۔ جیسے آگے بھی لفظ آئے گا وَمَنْ یَّقْنُتْ مِنْكُنَّ (پ ۲۲) جو تم عورتوں میں سے اللہ کی مطیع اور فرماں بردار ہو۔ سارے کے سارے اسی اللہ کی اطاعت کرنے والے ہیں، تکوینی طور پر سارے ہی مطیع ہیں، اللہ کا حکم تکوینی آجائے تو اللہ تعالیٰ کے ''کُن'' کے بعد ''فیکون'' اس کے اوپر فوراً مرتب ہوجاتا ہے۔ ''ہوجا! ہوگیا!'' اس قسم کے اَحکام میں جن کو تکوینی اَحکام کہا جاتا ہے ان میں ساری کائنات تابع ہے...... آگے پھر وہی بات آگئی: وَهُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ: وہی ہے جو پیدا کرنے کی اِبتدا کرتا ہے، وہی پیدا کرنے کا اعادہ کرے گا، وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَیْهِ: انسانی محاورے کے مطابق اعادہ اِبتداءً پیدا کرنے کے مقابلے میں آسان ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَیْهِ اعادہ تو زیادہ آسان ہے اللہ پر اِبتدا سے، یعنی انسانی عرف کے مطابق پہلی دفعہ کام کرنا مشکل ہوتا ہے، جب ایک دفعہ کرلیا تو دوبارہ وہ کام کرنا کیا مشکل ہے؟ آسان ہے۔ تو اَهْوَنُ ہمارے اعتبار سے کہا جارہا ہے، ہمارے محاورے کے مطابق۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کے لئے تو جیسے پہلی دفعہ پیدا کرنا، ویسے دوسری دفعہ پیدا کرنا، نہ پہلی دفعہ میں کوئی مشکل پیش آئی، نہ دوبارہ پیدا کرنے میں کوئی مشکل پیش آئے گی۔ یہ تو آپ کو سمجھانے کے لئے کہا جارہا ہے۔ اَفَعَیِیْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ (سورۂ قٓ:۱۵) کیا ہم پہلی دفعہ پیدا کرکے کوئی تھک گئے؟ لَمْ یَعْیَ بِخَلْقِهِنَّ (سورۂ اَحقاف: ۳۳) اللہ تعالیٰ ان زمین وآسمان کو پیدا کرکے تھکا نہیں۔ مَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ (سورۂ قٓ: ۳۸) ہمیں کوئی تھکاوٹ نہیں ہوئی، کہ تم سمجھتے ہو کہ دوبارہ ہم یہ کام نہیں کرسکیں گے۔ وَهُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ: وہی ہے جو اِبتداءً پیدا کرتا ہے، لفظی معنی ہے جو شروع کرتا ہے پیدا کرنے کو، خلق کی اِبتدا کرتا ہے، وہی خلق کا اِعادہ کرے گا، اور اِعادہ اس پر آسان ہے بمقابلہ اِبتدا کے، یعنی ہمارے انسانی محاورے کے مطابق، ورنہ اللہ کے لئے دونوں کام برابر ہیں۔ وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی: اسی کے لئے سب سے اعلیٰ شان ہے۔ الْمَثَلُ صفت اور شان کے معنی میں ہے، اسی کے لئے سب سے اعلیٰ شان ہے آسمانوں میں اور زمین میں۔ اور وہ زبردست ہے، رحم کرنے والا ہے۔

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ؕ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِیْ مَا
بیان کی اللہ نے مثال تمہارے ہی نفسوں سے، کیا ہیں تمہارے لئے تمہارے مملوکوں میں سے کوئی شرکاء؟ اس مال میں جو
رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِیْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِیْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ
ہم نے تمہیں دیا، پھر تم اس میں برابر ہوجاؤ، لحاظ رکھو تم ان کا جیسے تم لحاظ رکھتے ہو اپنے لوگوں کا، ایسے ہی تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں ہم

الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾ بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ فَمَنْ

نشانیاں ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں ﴿۲۸﴾ بلکہ پیچھے لگ گئے ظالم لوگ اپنی خواہشات کے بغیر کسی دلیل کے، پس کون

يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ۭ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ

ہدایت دے سکتا ہے ایسے آدمی کو جس کو اللہ بھٹکا دے، اور ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا ﴿۲۹﴾ پس تُو سیدھا رکھ اپنا چہرہ دِین کے لئے

حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ

اس حال میں کہ تُو مخلص ہے، اتباع کیجئے اللہ تعالیٰ کی تراش کی جس پہ اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا، اللہ کی خلق کو تبدیل نہیں کرنا چاہیے، یہی

الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڎ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَ

سیدھا دِین ہے لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں ﴿۳۰﴾ ہو جاؤ تم اللہ کی طرف رُجوع کرنے والے، اور اسی سے ڈرو، اور

اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۳۱﴾ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ

نماز کو قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہوؤ ﴿۳۱﴾ یعنی ان لوگوں میں سے جنہوں نے اپنے دِین کے ٹکڑے کر لیے

وَكَانُوْا شِيَعًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَاِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ

اور وہ مختلف گروہ ہو گئے، اور ہر گروہ ان خیالات پر جو اس کے پاس ہیں خوش ہے ﴿۳۲﴾ جب پہنچتی ہے لوگوں کو تکلیف، پکارتے ہیں اپنے رَبّ کو

مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَآ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ

اس حال میں کہ اسی کی طرف رُجوع کرنے والے ہوتے ہیں، پھر جب اللہ چکھا دیتا ہے ان کو اپنی طرف سے رحمت تو اچانک ان میں سے ایک فریق

بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۭ فَتَمَتَّعُوْا ۣ فَسَوْفَ

اپنے رَبّ کے ساتھ شریک ٹھہرانے لگ جاتا ہے ﴿۳۳﴾ نتیجہ یہ ہے کہ یہ ناشکرے ہیں ان نعمتوں کے جو ہم نے انہیں دیں، پس تم مزے اُڑا لو، پھر

تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾ اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ

عنقریب تم جان لوگے ﴿۳۴﴾ کیا اُتاری ہے ہم نے ان کے اُوپر کوئی دلیل؟ پس وہ بولتی ہو ان چیزوں کے ساتھ جن کو یہ اللہ کے ساتھ

يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا ۭ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ

شریک ٹھہرا رہے ہیں ﴿۳۵﴾ جس وقت ہم انسانوں کو رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو یہ اس پر اترانے لگ جاتے ہیں، اور اگر پہنچ جاتی ہے انہیں کوئی بُری

بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ ۝٣٦ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ

حالت بسبب اُن اعمال کے جوان کے ہاتھوں نے آگے بھیجے، اچانک یہ مایوس ہوجاتے ہیں ۝٣٦ کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ اللہ کشادہ کرتا ہے رزق

لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝٣٧ فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى

جس کے لئے چاہتا ہے اور تنگ کرتا ہے، بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں ۝٣٧ قرابت والے کو دیا کرو

حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۡ

اس کا حق اور مسکین کو اور مسافر کو دیا کرو، یہ بہتر ہے ان لوگوں کے لئے جو اللہ کی رضا چاہتے ہیں،

وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝٣٨ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا

یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں ۝٣٨ جو مال تم دیتے ہو تاکہ وہ بڑھ جائے لوگوں کے مالوں میں، وہ اللہ کے

يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ۝٣٩

نزدیک نہیں بڑھتا، جو تم زکوٰۃ دیتے ہو ارادہ کرتے ہوئے اللہ کی رضا کا، یہی لوگ اپنے مال کو بڑھانے والے ہیں ۝٣٩

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ۭ هَلْ مِنْ شُرَكَاۗىِٕكُمْ

اللہ وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا پھر اسی نے تمہیں رزق دیا پھر وہ تمہیں موت دے گا پھر وہ تمہیں زندہ کرے گا، کیا تمہارے شرکاء

مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝٤٠ۧ

میں سے کوئی ہے جو ان کاموں میں سے کچھ بھی کرتا ہو؟ اللہ پاک ہے اور بلند و برتر ہے ان چیزوں سے جن کو لوگ شریک ٹھہراتے ہیں ۝٤٠

تفسیر

ردِّ شرک کے لئے ایک فطری مثال

معاد کے تذکرے کے بعد ردِّ شرک اور اثباتِ توحید ہے، ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ: بیان کی اللہ نے مثال تمہارے نفوں سے، هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَاۗءَ کیا تمہارے لئے تمہارے غلاموں میں سے شرکاء ہیں؟ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ: وہ چیزیں جن کے مالک ہیں تمہارے دائیں ہاتھ۔ ملکِ یمین: یہاں مملوکین کے ساتھ اس کا ترجمہ کیجئے، شرکاء شریک کی جمع ہے۔ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ اس چیز میں جو ہم نے تمہیں دی، فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَاۗءٌ پھر اس میں تم برابر ہو۔ تَخَافُوْنَهُمْ: اندیشہ کرتے ہو تم ان کا، لحاظ

کرتے ہوتم ان کا۔خوف یہاں لحاظ والے معنی میں ہے۔ کَخِیفَتِکُمْ اَنْفُسَکُمْ مثل خوف کرنے تمہارا اپنے لوگوں سے، کَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ: ایسے ہی تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں ہم نشانیاں ان لوگوں کے لئے جو کہ عقل رکھتے ہیں، جو سوچتے ہیں۔

اس مثال کو توجہ سے سنیے!...... رد شرک کے لئے اللہ تعالیٰ ایک فطری سی دلیل دیتے ہیں جو انسان کے اپنے دل میں موجود ہے، اگر اپنے حالات میں خیال کرے دھیان کرے تو اس کو یہ توحید سمجھ میں آ سکتی ہے، اور شرک کی مذمت بھی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تمہارے پاس کچھ غلام بھی ہیں، کیونکہ اُس دور میں گھروں میں غلام ہوتے تھے۔ اگر دیکھو، تو وہ انسان ہیں، تمہارے بھائی ہیں، بنی آدم میں سے ہیں، لیکن ایک عارضی حالات کے تحت وہ تمہارے مملوک ہو گئے۔ تمہارے مملوک جو تمہارے گھروں میں موجود ہیں جو کچھ مال دولت ہم نے تمہیں دیا ہے، تم ان کو ان مالوں کے اندر اپنا شریک سمجھتے ہو؟ کیا ایسا ہوتا ہے کہ تم ان کو اپنے برابر ٹھہرا لو؟ اور ان کا اسی طرح سے لحاظ کرو جس طرح سے تم اپنے آزاد لوگوں کا لحاظ کرتے ہو؟ کاروبار میں جس طرح شرکت ہوا کرتی ہے، دو بھائی آپس میں شرکت کے طور پر کاروبار کرتے ہیں، یا چار آدمی دوستی کی وجہ سے آپس میں شرکت کے طور پر کاروبار کرتے ہیں، تو ہر ایک دوسرے کا لحاظ رکھتا ہے، اس کی مرضی کے خلاف تصرف نہیں کرتا، اس سے پوچھ کے کام کرتا ہے، ایسا کام نہیں کرتا جس سے دوسرے کو ناگواری ہو، برابر کے شرکاء ہوتے ہیں، تو ہر کوئی دوسرے کا لحاظ رکھتا ہے، جب آزاد مل کے کاروبار کریں۔ لیکن کیا تم نے کبھی اپنے غلاموں کو بھی یہ حیثیت دی ہے؟ کہ ان کو اپنے مال میں جائیداد میں رزق میں برابر کا شریک سمجھو، اور ان کا اسی طرح لحاظ کرو جس طرح سے تم اپنے آزاد بھائیوں کا لحاظ کرتے ہو۔ کیا ایسا ہے؟ بات واضح ہے کہ بالکل نہیں ہے۔ غلام تو کسی چیز کا مالک ہوتا ہی نہیں، اس کا اس قسم کا کوئی حق ہے ہی نہیں کہ آپ اس کا لحاظ کریں، اس سے پوچھ پوچھ کے کام کریں، وہ آپ کی مرضی کے خلاف کوئی تصرف نہیں کر سکتا، جتنی آپ اجازت دیں گے اتنا وہ کام کر سکتا ہے۔ جتنی اجازت نہیں دیں گے، نہیں کر سکتا، اور ملکیت کی صفت اس میں ہوتی ہی نہیں کہ وہ کسی چیز کا مالک بن سکے، جس طرح سے فقہ میں آپ پڑھتے ہیں۔ اور یہی اس وقت بھی عرف تھا کہ غلام کو کسی چیز کا مالک نہیں سمجھا جاتا، وہ تو اپنے مولیٰ کا تابع ہے، جو وہ کہے گا یہ کرے گا، جو نہیں کہے گا نہیں کرے گا...... تو جس وقت تمہارے مملوک تمہارے شریک نہیں، اور تم ان کا اس طرح سے لحاظ نہیں کرتے جس طرح سے کہ اپنے برابر کے دوسرے آزاد لوگوں کا لحاظ کیا جاتا ہے، اپنی جائیداد میں اپنے مال میں ان کا تم کوئی حق نہیں سمجھتے، تو اللہ کے مملوک کو اللہ کے برابر تم کس طرح سے ٹھہرا رہے ہو؟ اور اللہ کے ذمے یہ بات کس طرح سے لگا رہے ہو؟ کہ اللہ ان کا لحاظ رکھتا ہے، تم تو اپنے مملوکوں کا لحاظ رکھتے نہیں، ان کو برابر کا سمجھتے نہیں، تمہارے رزق کے اندر وہ تو برابر کے شریک نہیں، تو اللہ کی مخلوق کو اللہ کے ساتھ تم نے کس طرح سے شریک ٹھہرا لیا؟...... اسی سے سمجھ لو کہ مالک اور مملوک میں فرق ہے، اور تمہاری ملکیت تو برائے نام اور عارضی ہے، اور اللہ تعالیٰ تو حقیقت کے اعتبار سے خالق بھی ہے اور مالک بھی، اور سارے کے سارے اسی کے مخلوق اور اسی کے مملوک۔ پھر خاص طور پر جن بتوں کو تم تراش کے ان کے متعلق نظریہ رکھتے ہو کہ یہ بھی اللہ کے شریک ہیں، یہ تو مخلوق در مخلوق ہوئے، تم بھی اللہ کی مخلوق، اور یہ چیزیں بھی تمہاری بنائی ہوئی، فرشتے اللہ کی مخلوق، انبیاء اللہ کی مخلوق، جتنی دوسری چیزیں ہیں، جنات وغیرہ سب اللہ کی مخلوق ہیں، تو اس مخلوق کو تم اللہ کے ساتھ شریک کس طرح ٹھہراتے ہو؟ تمہاری عقل کیا کہتی

ہے؟ اپنے معاملات میں تو تم اپنے مملوکوں کو شریک سمجھتے نہیں، ان کو تو برابر کے حقوق دیتے نہیں، ان کا تو اس طرح سے لحاظ رکھتے نہیں، جس طرح سے برابر کے آزاد لوگوں کا رکھا جاتا ہے، تو اللہ کی مخلوق اور مملوک کو تم اللہ کے برابر کس طرح سے قرار دیتے ہو؟ جیسے بیٹیوں والے نظریے کی تردید کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے کئی آیات کے اندر بیان کیا ہے نا، ان کی عقل سے اپیل کی کہ تم سوچو تو سہی، جس نسبت کو تم اپنے لئے گوارا نہیں کرتے، تم اللہ کی طرف اُس نسبت کو کیوں گوارا کرتے ہو؟ اپنے لئے تو تم بیٹیاں پسند نہیں کرتے، اللہ کی طرف بیٹیوں کی نسبت کرتے ہو؟ اسی طرح سے یہاں ہے کہ اپنے مملوکوں کو تو تم اپنا شریک بنا نہیں سکتے، اور ان کو شریک سمجھتے ہی نہیں، تو اللہ کی مخلوق کو اللہ کا شریک کس طرح سے بناتے ہو؟ یہ ایک فطری دلیل ہے جس کے ساتھ شرک کی مذمت نمایاں کی جارہی ہے۔

ترجمہ دیکھئے...... بیان کی اللہ نے مثال تمہارے ہی نفسوں سے، یعنی یہ ایسی مثال ہے جو تمہارے اپنے حالات سے ماخوذ ہے۔ ''کیا ہیں تمہارے لئے تمہارے مملوکوں میں سے کوئی شرکاء؟'' یہ ''مملوکوں میں سے'' یہ میں نے ما ملکت ایمانکم کا اکٹھا ترجمہ کر دیا۔ لفظی ترجمہ ہے کہ وہ چیزیں جن کے مالک ہیں تمہارے دائیں ہاتھ...... کیا تمہارے مملوکوں میں سے کوئی شرکاء ہیں اس مال میں جو ہم نے تمہیں دیا؟ پھر تم اور وہ اس مال میں برابر ہو جاؤ، لحاظ رکھو تم ان مملوکوں کا جس طرح سے کہ تم لحاظ رکھتے ہو اپنے لوگوں کا، یعنی آزاد لوگ جو تمہارے مملوک نہیں، اگر تمہارے ساتھ شرکاء ہوں، تو جیسے تم ان کا لحاظ رکھتے ہو، تو ان مملوکوں کا بھی تم اس طرح سے لحاظ رکھتے ہو، کیا کوئی ایسی بات ہے؟ تمہارے لئے کوئی ایسے شرکاء تمہارے مملوکوں میں سے ہیں؟ کہ ہمارے دیے ہوئے رزق میں وہ تمہارے شریک ہوں، پھر تم ان کا اسی طرح سے لحاظ رکھو جیسا کہ آزاد لوگوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ یہ اِستفہامِ انکاری ہے یعنی کوئی نہیں۔ مملوک شریک نہیں ہوا کرتے، اور کوئی شخص اپنے مملوکوں کا اس طرح سے لحاظ نہیں رکھا کرتا جس طرح سے آزاد لوگوں کا رکھتا ہے۔ تو جب تمہارے مملوک تمہارے شریک نہیں، تو میرے مملوک میرے شریک کس طرح سے ہو گئے؟ میرے متعلق تم یہ کیسے سوچتے ہو؟ کہ میں ان کا ایسا لحاظ رکھتا ہوں کہ ان سے پوچھ پوچھ کے کام کرتا ہوں، ان کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا۔ یہ تو تمہارے اپنے دلوں کے حالات کے اعتبار سے ایک مثال ہے کہ اگر اس میں غور کرو تو تمہیں سمجھ میں آ سکتا ہے کہ مملوک کا مقام یہ نہیں ہوتا کہ وہ شریک ہو، اور مملوک کا مقام یہ نہیں ہوتا کہ اس کا لحاظ یوں رکھا جائے۔ اس لئے تم جن کو شرکاء سمجھتے ہو، وہ سارے میرے مملوک ہیں، وہ سارے میری مخلوق ہیں، وہ میری کسی چیز میں شریک نہیں، اور نہ میں کوئی فیصلہ کرتے وقت ان کا لحاظ کرتا ہوں کہ ان سے پوچھ پوچھ کے کام کروں، اور ان کی مرضی کے بغیر کوئی تصرف نہ کروں، ان کا یہ مقام نہیں ہے۔ تم اگر اپنے دلوں میں غور کرو، تو تمہیں یہ مثال سمجھ میں آ سکتی ہے۔ ایسے ہی کھول کھول کے بیان کرتے ہیں ہم نشانیاں ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں۔

مشرک بغیر دلیل کے خواہشات کے پیچھے لگ گئے

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ: بَل اضراب کے لئے ہوتا ہے، پیچھے لفظ آیا کہ یہ نشانیاں ان لوگوں کے لئے ہیں

جوعقل رکھتے ہیں۔اب یہاں آ گیا کہ یہ سوچتے نہیں مَا عَقَلُوْا وَمَا اتَّبَعُوا الْحَقَّ یہ نہیں سوچتے اور یہ حق بات کی اتباع نہیں کرتے بلکہ پیچھے لگ گئے ظالم لوگ اپنی خواہشات کے بغیر کسی دلیل کے۔علم سے یہاں دلیل اور اِستدلال مراد ہے۔بغیر کسی دلیل کے اور بغیر کسی علم کے اپنی خواہشات کے پیچھے لگ گئے۔اَلَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا، یہ ان کا مقام واضح ہو گیا، کہ یہی ظالم لوگ ہیں جو عقل کا تقاضا پورا نہیں کرتے،علم کا تقاضا پورا نہیں کرتے،اللہ اور اللہ کے رسول کے حقوق نہیں پہچانتے،ہر چیز کو تلف کر رہے ہیں، یہ مشرک لوگ اپنی خواہشات کے پیچھے لگ گئے،بغیر کسی علم کے،بغیر کسی علمی دلیل کے۔

ہدایت زبردستی نہیں ملتی

فَمَنْ یَّھْدِیْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰہُ: پس کون شخص ہدایت دے سکتا ہے؟ ایسے آدمی کو جس کو اللہ بھٹکا دے۔اللہ کے بھٹکانے کا مطلب یہ ہے کہ جو اللہ کے قانون کی زد میں آ کے راستے سے بھٹک گیا۔کیونکہ اللہ کی عادت یہ ہے کہ جب کوئی آدمی غلط راستے پہ چلنے لگتا ہے تو اللہ تعالیٰ زبردستی اس کو سیدھے راستے پہ نہیں چلاتا،تو وہ قانون کی زد میں آ گیا، جب کوئی غلط راستہ اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لیے وہی توفیق ہو جاتی ہے۔تو اللہ کے قانون کی زد میں آ کے جو گمراہی میں جا پڑا،تو کوئی شخص زبردستی اس کو سیدھے راستے پر نہیں چلا سکتا۔

اِستقامت کا حکم

فَاَقِمْ وَجْھَكَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا: پس تو سیدھا رکھ اپنا چہرہ دین کے لئے اس حال میں کہ تو مخلص ہے۔''حنیف'' کہتے ہیں جو اَدیانِ باطلہ سے ہٹ کر دینِ حق کی طرف متوجہ ہونے والا ہو،یعنی یہ مشرک اگر اِتباع نہیں کرتے تو نہ کریں۔اور''اَقِمْ'' کا خطاب ہے سرورِ کائنات ﷺ کو،سُنانا مقصود ہے باقیوں کو، کیونکہ نبی اُمت کی طرف سے وکیل ہوتا ہے۔جب اس کو اَحکام دیے جاتے ہیں تو وہ اُمت کے لئے بھی ہوتے ہیں۔کافر اگر شہوات کے پیچھے لگ گئے،خواہشات کے پیچھے لگ گئے،تو لگے رہیں، آپ تو اپنے آپ کو دینِ حق کا تابع رکھئے۔حنیف: جو ادیانِ باطلہ سے ہٹ کر دینِ حق کی طرف متوجہ ہونے والا ہے۔سیدھا رکھ تو اپنے چہرے کو اخلاص کے ساتھ(یہ''حنیفًا'' کا مفہوم ہے)،مخلص بن کر اپنے چہرے کو سیدھا رکھ دین کے لئے۔

''فطرتُ اللّٰہ'' کا مصداق

فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا ۭ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ: فِطْرَتَ اللّٰہِ یہ منصوب ہے فعل محذوف کی وجہ سے اِتَّبِعْ فِطْرَتَ اللّٰہِ۔ یا اِلْزَمْ فِطْرَتَ اللّٰہِ۔فَطَرَ: پھاڑنا، چیرنا۔اِنْفَطَرَ: پھٹنا۔قرآن کریم میں یہ لفظ بھی ہے، اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ(سورۂ انفطار) جب آسمان پھٹ جائے گا۔دوسری جگہ ہے فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ(سورۂ اَنعام:۷۹) تو پیدا کرنا، پھاڑنا اس کا مفہوم ہے۔اور فطرت یہ فِعْلَۃٌ کے وزن پر ہے۔اَلْفِعْلَۃُ لِلْحَالَۃِ آپ پڑھتے رہتے ہیں، یہ ہیئت اور حالت کے بیان کرنے کے لئے ہوتا ہے۔تو ''فطرت اللہ'' سے مراد اللہ کی ایک خاص تراش، اللہ کا ایک خاص طریقے سے پیدا کرنا، اور مراد اس سے ہے جو اللہ نے انسان کی

صلاحیت اور انسان کی طبیعت کے اندر حق کو قبول کرنے کی قابلیت رکھی ہے، یہاں فطرت اللہ سے وہ مراد ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ کی فطرت کی، اللہ تعالیٰ کی تراش کی اتباع کیجئے، جس خاص ہیئت پہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے، اس کی ہیئت اور اس کی قلبی استعداد اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ اپنے مالک کو پہچانے، خالق کو پہچانے اور اس کے احکام کی اتباع کرے اور اس کا شکر گزار رہے۔ یہ انسان کی پیدائش اور اس کی خلقت کا تقاضا ہے، اللہ تعالیٰ نے اسی استعداد پر اسی قابلیت پر انسان کو پیدا کیا ہے، اور اس قابلیت اور اس استعداد کو خراب نہیں کرنا چاہیے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے "كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ"[1] یہاں فطرت سے وہی فطرتِ صحیحہ اور اچھی استعداد مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر بچے کو اچھی استعداد پہ پیدا کرتا ہے کہ اگر باہر کے غلط اثرات اس کے اُوپر نہ پڑیں تو وہ ہمیشہ سیدھے راستے پر چلے، اس کی طبیعت کا تقاضا یہی ہے کہ خالق مالک محسن کو پہچانے اور اس کی اطاعت کرے۔ لیکن باہر کا ماحول انسان کی اس فطرت کو خراب کر کے غلط راستے پہ ڈال دیتا ہے۔ اَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ یہودیوں کے ماحول میں بچہ پیدا ہو گیا تو یہودیوں والے طریقے پہ چل پڑا۔ يُنَصِّرَانِهٖ یا اس کے والدین اس کو نصرانی بنا دیتے ہیں، اس ماحول میں پیدا ہو گیا تو اپنی استعداد اس نے ادھر کو استعمال کر لی۔ اچھی قابلیت اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے لئے رکھی ہے، لیکن غلط اثرات کو قبول کر کے انسان اسے غلط راستے پہ ڈال دیتا ہے...... اتباع کیجئے اللہ تعالیٰ کی تراش کی، اللہ تعالیٰ کی خلقت کی، جس کیفیت اور ہیئت پہ اللہ نے انسان کو پیدا کیا اس کی اتباع کیجئے، اسی کو لازم پکڑیے جس پہ اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا۔

"لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ" کے دو مفہوم

اللہ کی خلق کو تبدیل نہیں کرنا چاہیے۔ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ یہ صورۃً نفی ہے، معنیً نہی ہے، یعنی اللہ کی خلق کو بدلو نہیں، جو اللہ نے تمہارے اندر اچھی استعداد اچھی فطرت رکھی ہے اسی کے مطابق چلو، اس لئے "دِین" کو "دِینِ فطرت" کہا جاتا ہے کہ انسان کی خلقت، انسان کی پیدائش، انسان کے حالات، اسی دِین کا تقاضا کرتے ہیں، یعنی جتنے بھی احکام شریعت میں دیے جاتے ہیں، وہ انسان کی طبیعت کے تقاضے کے خلاف نہیں ہیں، بشرطیکہ غلط اثرات کے تحت اس نے اپنی طبیعت کو بگاڑا ہوا نہ ہو۔ جو کچھ کہا جا رہا ہے یہ انسان کی قابلیت اور استعداد کے مطابق کہا جا رہا ہے، اور باہر کے اثرات انسان کے اُوپر نہ پڑے ہوئے ہوں تو نہایت خوشی کے ساتھ اس راستے پر انسان چلتا ہے، جس راستے پر اللہ تعالیٰ اُس کو چلانا چاہتا ہے، اور یہ استعداد ہر انسان میں ہے، اس کے لئے کوئی کسی قسم کی تبدیلی نہیں، حتّٰی کہ اگر کوئی کُفر بھی اختیار کر لے تو بھی اس میں حق قبول کرنے کی استعداد موجود ہوتی ہے۔ کٹر سے کٹر مشرک ہو تو بھی اس میں حق کو قبول کرنے کی استعداد موجود ہوتی ہے، اس لئے لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ کا یہ معنی بھی کر سکتے ہیں کہ اللہ کی خلق تبدیلی نہیں یعنی آخر وقت تک اللہ کی خلق اسی طرح سے قائم ہے، یہ علیحدہ بات ہے کہ انسان اپنی عادت بگاڑ لے، ورنہ حق قبول کرنے کی استعداد آخر وقت تک قائم رہتی ہے۔ جب انسان اس کے تقاضے کے خلاف چلتا رہے، چلتا رہے، تو عادت پختہ ہو گئی، جس کے مقابلے میں وہ استعداد مغلوب ہو جاتی ہے، ورنہ موجود ہر وقت رہتی ہے۔ اور اگر حق قبول کرنے کی استعداد ہی انسان میں

---

(۱) بخاری ۱/۱۸۵ باب ما قیل فی اولاد المشرکین۔ نیز بخاری ۱/۱۸۱ مشکوٰۃ ص ۲۱ پر ہے ما من مَوْلُوْدٍ اِلَّا يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ۔

نہ ہو تو اس کو حق قبول کرنے کے لئے مکلف کیسے کیا جاسکتا ہے؟ یہ تو ایسی چیز کی تکلیف ہو جائے گی کہ جس کو انسان کر ہی نہیں سکتا......
لازم پکڑیے اللہ کی دی ہوئی اِستعداد کو، اتباع کیجئے اللہ کی فطرت کا جس فطرت پر اللہ نے انسان کو پیدا کیا۔ اور اللہ کی خلق کے لئے تبدیلی نہیں، یعنی وہ ہر انسان میں موجود ہوتی ہے۔ یا مطلب یہ ہے کہ اس کو تبدیل کرنا نہیں چاہیے، خراب کرنا نہیں چاہیے۔ بلکہ دل کی آواز سنو، اپنے حالات میں غور کرو گے، تو تمہیں اپنے باطن سے ہی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ واقعی اللہ تعالیٰ نے طبیعت کے اندر جو بات ڈال دی یہی دین حق ہے۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ: یہی سیدھا دین ہے، فطرت کے تقاضے کے مطابق چلنا یہی سیدھا دین ہے، اس لئے دینِ اسلام کو "دینِ فطرت" کہا جاتا ہے، اس میں کوئی ایسا مطالبہ نہیں جو اِنسان کی قابلیت یا اس کی اِستعداد یا اس کی برداشت سے باہر ہو، وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ: لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

دِینِ فطرت کو چھوڑ کر مختلف گروہ نہ بنو

مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ یہ حال واقع ہو رہا ہے۔ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ میں چونکہ معنی جمع کا ہے، تو اَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ یہ مفہوم ہو جائے گا۔ اس حال میں کہ تم رجوع کرنے والے ہو اللہ کی طرف، اور اسی سے ڈرو، اور نماز کو قائم کرو، اور مشرکوں میں سے نہ بنو، یہی دِینِ فطرت کا تقاضا ہے، یہی دِینِ قیم ہے، یہی دِینِ فطرت ہے۔ اور یوں بھی کہہ سکتے ہیں: كُوْنُوْا مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ، اس کے نصب کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے۔ ہو جاؤ تم اللہ کی طرف رجوع کرنے والے، اور اسی سے ڈرو۔ یا اِلْزَمُوْا فِطْرَتَ اللّٰهِ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ۔ اللہ کی فطرت کو لازم پکڑو اس حال میں کہ تم اللہ کی طرف توجہ کرنے والے ہو، اور اسی سے ڈرو، نماز کو قائم کرو، اور مشرکوں میں سے نہ ہو (مظہری)۔ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ: یہ مشرکین کا بیان ہے۔ نہ ہو مشرکوں میں سے یعنی ان لوگوں میں سے جنہوں نے اپنے دِین کے ٹکڑے ٹکڑے کر لیے۔ وَكَانُوْا شِيَعًا اور وہ مختلف گروہ ہو گئے۔ شِيَعًا کا لفظ پہلے بھی گزر اتھا، شِيْعَةٌ کی جمع ہے۔ شیعہ اس جماعت کو کہا جاتا ہے جو کسی ایک نظریے پر یا کسی ایک مقتدیٰ پر متفق ہو گئی ہو۔ جیسے "شیعۂ علی"، یہ اپنے آپ کو جو شیعہ کہتے ہیں اصل کے اعتبار سے "شیعۂ علی" ہیں جو علی رضی اللہ عنہ کی اِقتدا پر اپنے زعم میں متحد ہو گئے، اور ان کو اپنا اِمام بنا کے ایک جماعت متشکل کر لی، یہ شیعہ ہیں...... یعنی دِینِ فطرت کے انہوں نے ٹکڑے ٹکڑے کر لیے، اپنی خواہشات کی آمیزش کر کے مختلف گروہ بن گئے، اور ہر گروہ ان خیالات پر جو ان کے پاس ہیں خوش ہے، ہر گروہ نے جو بھی نظریات اختیار کر لئے، جو خیالات بنا لئے، اسی کے اُوپر مست ہے، کہتا ہے بس یہی ٹھیک ہے، ان لوگوں سے نہ ہو، بلکہ دِینِ فطرت پہ نگاہ رکھو، اور اللہ تعالیٰ اس فطرت کی جو تفصیل تمہارے سامنے کرتا ہے، اس دِینِ قیم کی جو تفصیل کرتا ہے اس کی اتباع کرو۔ مختلف ٹکڑے ہونے والوں میں سے نہ ہو جاؤ، ورنہ تو جس کو بھی دیکھو گے اپنے خیالات پہ سارے ہی خوش ہیں، لیکن اس خوشی کا اعتبار کوئی نہیں۔ کیونکہ انہوں نے اس دِینِ فطرت میں تفریق ڈالی ہے، وہ مختلف گروہ ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ جو تفصیل سامنے بیان کرتا ہے اصل چیز یہی ہے، اِتباع تم اس کی کرو۔

"شرک" خلافِ فطرت ہے

آگے پھر وہی فطرت کی آواز بتائی جا رہی ہے کہ "توحید" فطرت ہے، اور "شرک" فطرت کے خلاف ہے، اس لئے

جب تک تو انسان کے لئے حالات سازگار ہیں، یہ غافل ہوتا ہے، غفلت کے نتیجے میں شرک میں پڑ گیا۔ اور جہاں اللہ کی طرف سے کوئی آفت مصیبت آتی ہے، ظاہری سہارے چھوٹ جاتے ہیں، اور انسان چوکنا ہوتا ہے تو پھر سوائے اللہ کے کسی دوسرے کو نہیں پکارتا، معلوم ہو گیا کہ توحید اصل چیز ہے، جب باہر کے سارے سہارے ختم ہو جاتے ہیں پھر انسان اسی اللہ کو پکارتا ہے، اسی کے ساتھ اپنا تعلق نمایاں کرتا ہے۔ اور جب تک دنیا کے اندر عیش و عشرت ہے، غفلت میں پڑا ہوا ہے، تو اس وقت تک شرک میں مبتلا ہے۔ تو توحید یہ فطرت کی آواز ہے، شرک فطرت کے خلاف ہے۔ جب پہنچتی ہے انسانوں کو تکلیف دَعَوْا رَبَّہُمْ پکارتے ہیں اپنے رَبّ کو اس حال میں کہ اسی کی طرف رجوع کرنے والے ہوتے ہیں، ثُمَّ اِذَآ اَذَاقَہُمْ مِّنْہُ رَحْمَۃً: پھر جب اللہ چکھا دیتا ہے ان انسانوں کو اپنی طرف سے رحمت، خوش حالی آ جاتی ہے۔ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْہُمْ بِرَبِّہِمْ یُشْرِکُوْنَ: اچانک ایک فریق ان میں سے اپنے رَبّ کے ساتھ شریک ٹھہرانے لگ جاتا ہے۔

لِیَکْفُرُوْا بِمَآ اٰتَیْنٰہُمْ: یہ ''لام'' لامِ عاقبت ہے (مظہری)۔ اسی قسم کی آیت سورۂ عنکبوت کے آخر میں بھی گزری تھی، یعنی ان کے اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ ناشکرے ہیں اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کے جو اللہ نے انہیں دی ہیں، دیتا اللہ ہے اور پھر یہ غفلت میں پڑ کے ان کی نسبت دوسروں کی طرف کرنے لگ جاتے ہیں، تو ''لام'' لامِ عاقبت ہے، ان کے اس کردار کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ ناشکرے ہیں ان چیزوں کے جو ہم نے انہیں دیں۔ فَتَمَتَّعُوْا: وہاں آیا تھا لِیَتَمَتَّعُوْا، ان لوگوں کو چاہیے کہ مزے اُڑا لیں، اور فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ وہاں غائب کا صیغہ آیا تھا کیونکہ لِیَتَمَتَّعُوْا غائب کا صیغہ تھا، ان لوگوں کو چاہیے کہ کچھ روز مزے اُڑا لیں، عنقریب ان کو پتا چل جائے گا۔ یہاں خطاب کا صیغہ ہے فَتَمَتَّعُوْا: پس تم کچھ دن مزے اُڑا لو۔ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ: پھر تم عنقریب جان لوگے۔

''شرک'' پر کوئی نقلی دلیل بھی نہیں

اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَیْہِمْ سُلْطٰنًا فَہُوَ یَتَکَلَّمُ بِمَا کَانُوْا بِہٖ یُشْرِکُوْنَ: فطرت کی آواز تو شرک نہیں ہے، فطرت کی آواز تو توحید ہے، یہی وجہ ہے کہ جب انسان کسی مصیبت میں آتا ہے تو پھر اس کا دل صاف ہو جاتا ہے، تو کیا ان کے پاس کوئی نقلی دلیل موجود ہے؟ جو ان کے مشرک ہونے کا جواز ثابت کر رہی ہو۔ دلیل کا بولنا یہ ہوتا ہے، ثابت کرنا۔ جیسے کہتے ہیں ''یہ دلیل بول بول کے یہ کہہ رہی ہے'' یعنی اس پر دلالت کر رہی ہے، یہ بیان کرنے کے معنی میں ہے۔ کیا ہم نے ان کے اُوپر کوئی واضح دلیل اتاری ہے جو بیان کرتی ہو جو بول رہی ہو اس چیز کے ساتھ جس کو یہ اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرا رہے ہیں، یعنی ان کے مستحقِ عبادت ہونے کے متعلق وہ کوئی دلالت کر رہی ہے، کیا ہم نے کوئی دلیل اُتاری ہے؟ نقلی دلیل ان کے پاس نہیں، فطری اور عقلی دلیل ان کے پاس نہیں، تو پھر یہ شرک کیوں کرتے ہیں؟ کیا اتاری ہم نے ان کے اُوپر کوئی دلیل، پس وہ بیان کرتی ہو بولتی ہو اس چیز کے ساتھ، بِمَا کَانُوْا بِہٖ یُشْرِکُوْنَ ان کے مشرک ہونے کا جواز ثابت کرتی ہو۔ یا ان چیزوں کے مستحق عبادت ہونے کو بیان کرتی ہو، جن کو یہ اللہ کا شریک ٹھہرا رہے ہیں، ''ما'' موصولہ بھی ہو سکتا ہے، مصدریہ بھی ہو سکتا ہے (نسفی)۔ اللہ کے ساتھ ان کے شریک ٹھہرانے کا جواز ثابت کرتی ہو، یا اُن کے مستحقِ عبادت ہونے کو بیان کرتی ہو جن کو یہ اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔

ناشکروں کا طرزِ عمل

وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا: جس وقت ہم انسانوں کو خوش حالی دے دیتے ہیں، اپنی رحمت اور مہربانی کا مزہ چکھاتے ہیں، تو یہ اترانے لگ جاتے ہیں اس رحمت کے ساتھ، اکڑنے لگ جاتے ہیں، فخر وغرور میں آ جاتے ہیں، یعنی شکر کی کیفیت ان پہ طاری نہیں ہوتی۔ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ: اور جب پہنچ جاتی ہے انہیں کوئی بُری حالت بسبب ان اعمال کے جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجے۔ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ اچانک یہ مایوس ہوجاتے ہیں، پھر ان میں صبر نہیں رہتا۔ کامل انسان وہی ہوتا ہے جو نعمت کے حاصل ہونے کے وقت شکرگزار ہو، اور کسی تکلیف کے پہنچ جانے کے وقت صبر کرے۔ اِن کو نہ شکر حاصل ہے نہ صبر حاصل ہے، اللہ کی طرف سے خوش حالی ملتی ہے تو پھر یہ اکڑتے ہیں خوب گردن اُٹھا اُٹھا کے چلتے ہیں، ایسے سمجھتے ہیں جیسے ہم نے اپنی قابلیت اور اپنی کوشش سے سب کچھ کر کرا لیا، اور اگر اللہ کی طرف سے کوئی آزمائش آ جاتی ہے یا کوئی تکلیف آ جاتی ہے انہی کے اعمال کے نتیجے میں، تو پھر ان پہ مایوسی طاری ہوجاتی ہے اور ان میں صبر کی کیفیت نہیں رہتی۔

شکرگزاری کا تقاضا

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ: کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں؟ کہ اللہ تعالیٰ کشادہ کرتا ہے رزق جس کے لئے چاہتا ہے، اور تنگ کرتا ہے، بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو کہ ایمان لاتے ہیں۔ رزق کی کشادگی رزق کی تنگی اللہ کے اختیار میں ہے، اس لئے اگر رزق کشادہ ہوجائے تو اترانا نہیں چاہیے، اور اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کبھی کوئی تنگی آ جائے تو مایوس نہیں ہونا چاہیے، یوں سمجھنا چاہیے کہ اللہ کے علم وحکمت کا تقاضا یہی ہے۔ تو رزق کا کشادہ ہوجانا یہ کوئی اکڑنے کی بات نہیں، اور تنگی میں واقع ہوجانا یہ کوئی مایوسی کی بات نہیں، اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت کو ہمیشہ سامنے رکھو، رزق کشادہ ہو تو شکر ادا کرو، اور اگر کسی وجہ سے آزمائش میں آ جاؤ، کوئی تنگی پیدا ہوجائے تو صبر کے ساتھ وقت گزارنا چاہیے، اور یہ سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہمارے لئے اسی میں حکمت اور مصلحت ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ کل کے سبق میں آخری دو آیتیں وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا الخ: اس میں ذکر کیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب انسانوں کو رحمت ملتی ہے تو اس کے ساتھ اترانے لگ جاتے ہیں، اور النَّاس سے کافر لوگ مراد ہیں جن کو اللہ کی رحمت کے اوپر شکر کرنا نہیں آتا۔ اور جب کوئی بُری حالت پہنچتی ہے یعنی ان کی مرضی کے خلاف کوئی حالت پیش آ جاتی ہے تو بالکل مایوس ہوجاتے ہیں۔ تو رحمت پر شکر نہیں، اور کوئی تکلیف پہنچے تو اس کے اوپر صبر نہیں، یہ اللہ تعالیٰ سے لاتعلقی کی علامت ہے۔ اور رحمت میں جتنی چیزیں آتی ہیں ان میں بظاہر وسعت رزق بھی ہے، اور مرضی کے خلاف جو چیز انسان کو پہنچتی ہے اس میں بظاہر رزق کی تنگی بھی ہے، اس لیے آگے متصل اس کا ذکر کر دیا کہ رزق کی کشادگی یہ بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت ہے، اگر حاصل ہوجائے تو اس پہ اللہ کا شکر ادا کرو۔ اور اگر رزق کی تنگی آ جائے جو تمہاری مرضی کے خلاف ہے، تم بظاہر اپنے خیال کے مطابق اس کو سیئہ سمجھتے ہو، یہ بھی اللہ کی مشیت کے تحت ہے، اگر اللہ تعالیٰ کبھی آزمائش کے طور پر یہ ڈال ہی دے تو صبر کیا کرو، یہ سب کچھ تنگی

کشادگی جو کچھ ہے وہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت ہی آتی ہے۔ کشادگی ہو جائے تو اس پہ اکڑنے اترانے لگ جانا، تنگی ہو جائے تو بالکل ہی رونے لگ جانا اور جزع فزع میں مبتلا ہو جانا، ناشکرا ہو جانا، آئندہ کے لیے اللہ کی رحمت سے مایوس ہو جانا، یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ مؤمن لوگوں کے لیے اس بات میں بھی نشانی ہے۔

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

فَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰى حَقَّهٗ: قربیٰ یہ قرابت کے معنی میں مصدر ہے۔ قرابت والے کو دیا کرو اس کا حق۔ وَالْمِسْكِيْنَ اور مسکین کو دیا کرو، وَابْنَ السَّبِيْلِ اور مسافر کو دیا کرو۔ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ: یہ بہتر ہے ان لوگوں کے لئے جو اللہ کی رضا چاہتے ہیں، ''اللہ کے چہرے کا ارادہ رکھتے ہیں'' یعنی اللہ کی رضا چاہتے ہیں، یہ چاہتے ہیں کہ اللہ ان کی طرف متوجہ رہے۔ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا: رَبَا يَرْبُوْ: بڑھنا پھولنا۔ اس لئے رَبوۃ کہتے ہیں ٹیلے کو، وَاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ سورۂ مؤمنون کے اندر لفظ آیا تھا (آیت: ۵۰)۔ اور رِبوا، سُود اور بیاج کو کہتے ہیں، مال کے مقابلے میں مال پر اِنسان جو بڑھوتری لیتا ہے۔ اسی طرح سے وہ مال جو کسی دوسرے کو سُود کے طور پر دیا ہو، اس کو بھی ''رِبا'' سے تعبیر کر دیتے ہیں، کیونکہ وہ ''رِبائے شرعی'' حاصل ہونے کا ذریعہ بنتا ہے، جس کو شریعت میں ''رِبا'' کہا جاتا ہے، اس ''رِبا'' کے حاصل ہونے کا جو مال ذریعہ بنے اس کو بھی ''رِبا'' سے تعبیر کر دیا جاتا ہے، جو بڑھنے کے لئے دیا جائے۔ مثلاً ایک ہزار روپیہ دیا، اور گیارہ سو روپیہ لینا کر لیا۔ تو اصل کے اعتبار سے تو ''رِبا'' کا مصداق وہ سو روپیہ ہے جو آپ نے اضافہ لیا ہزار پر ہزار کے مقابلے میں، اور یہ ہزار روپے جو آپ نے قرض دیا ہے چونکہ یہ اس بڑھوتری کا ذریعہ بنا، تو مآل کے اعتبار سے، یا اس کے نتیجے کے اعتبار سے اس ہزار کو بھی ''رِبا'' کہہ دیا جاتا ہے، تو یہاں ''ربٰوا'' سے مراد وہی مال ہے جو دوسرے کو دیا جائے۔ جو مال تم دیتے ہو لِيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ تاکہ وہ بڑھ جائے لوگوں کے مالوں میں، زیادہ ہو جائے وہ لوگوں کے مالوں میں، فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ وہ اللہ کے نزدیک بڑھتا نہیں، وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ: اور جو زکوٰۃ تم دیتے ہو، تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ: اللہ کی رضا چاہتے ہوئے۔ تُرِيْدُوْنَ یہ اٰتَيْتُمْ کی ضمیر سے حال واقع ہے۔ جو زکوٰۃ تم دیتے ہو یعنی صدقہ خیرات کے طور پر جو مال دیتے ہو، ارادہ کرتے ہوئے اللہ کی رضا کا۔ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ: یہی لوگ اپنے مال کو بڑھانے والے ہیں۔ اَضْعَفَ: دوگنا کر دینا۔ یہاں مطلقاً بڑھانا مراد ہے۔

''بخل'' مال داری کا، اور ''صدقہ'' غربت کا سبب نہیں

یہ دو آیتیں بھی ماقبل والی آیت سے متعلق ہیں، کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ بات ذکر کی کہ رزق کی کشادگی اور رزق کی تنگی یہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس عقیدے کے اختیار کر لینے پر انسان کا عمل نہ تو بخل والا چاہیے نہ حرص والا چاہیے، اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ میں مال کو جوڑ جوڑ کے رکھنا شروع کر دوں تو میں کسی وقت میں مال دار ہو جاؤں گا، یہ بات بھی غلط ہے، حقوقِ واجبہ ہی اَدا نہ کرے، یعنی اللہ تعالیٰ نے جو حقوق ذمے لگائے ہیں وہ بھی اَدا نہ کرے، اگر اس کا یہ نظریہ ہے کہ میں جوڑ جوڑ کے رکھوں تو زیادہ مال دار ہو جاؤں گا، یہ بات بھی غلط ہے۔ ایسے واقعات بے شمار آپ کے سامنے پیش آتے ہیں کہ ایک آدمی تھوڑا تھوڑا مال جوڑتا ہے، اور

جس وقت کتنا ہی جمع ہو جاتا ہے، تو یکدم ہی کوئی چور اُٹھا کے لے جاتے ہیں، آگ لگ جاتی ہے جل جاتا ہے، کسی حادثے کا شکار ہو کے ضائع ہو جاتا ہے......جس کے متعلق محاورہ ہے کہ ''بندہ جوڑے پلی پلی، رام لڑھائے کپا'' یہ پرانی اُردو میں ایک محاورہ چلتا ہے۔''پلی'' کہتے ہیں جس کے ساتھ پیپے سے تیل نکالتے ہیں، ایک دفعہ نکالا تو وہ ایک پلی ہوتی ہے۔اور''کپا'' کہتے ہیں جو بڑا سارا بنا کے رکھ لیا۔تو''بندہ جوڑے پلی پلی'' بندہ تو پلی پلی جوڑتا ہے، پلی پلی جوڑ کے اس نے کپا بھر لیا۔''رام لڑھائے کپا''،''رام'' کہتے ہیں''اللہ'' کو، کہ وہ ایک دفعہ کپا ہی لڑھا دیتا ہے،تو ایسا ہوتا ہے کہ بھرا بھرایا کپا ایک ہی دفعہ گیا۔تو جوڑ جوڑ کر رکھنے سے کوئی آدمی سرمایہ دار نہیں بن جایا کرتا، یہ بھی اللہ کی حکمت کے تحت ہے۔ بسا اوقات آپ جمع کریں گے،لوگوں پر ظلم کریں گے،لوگوں کے حقوق تلف کریں گے، اکٹھا کریں گے،لیکن وہ ایک ہی دفعہ ضائع ہو جائے گا۔اور اسی طرح سے کسی شخص کے دل میں یہ خیال آئے کہ اگر میں خرچ کروں گا،مسکینوں کو دوں گا، مسافروں کو دُوں گاؤں، اہلِ قرابت کا حق ادا کروں گا،تو میں محتاج ہو جاؤں گا، میرے رزق میں تنگی آجائے گی، یہ بات بھی غلط ہے۔ جتنا دو گے اللہ تبارک وتعالیٰ اسی طرح سے آپ کو دیتا رہے گا۔ نہ خرچ کرنے کے ساتھ تنگی آیا کرتی ہے، نہ کسی کے حقوق تلف کرنے اور جوڑنے کے ساتھ کوئی آدمی کشادہ رزق والا ہوا کرتا ہے۔رزق کی کشادگی، رزق کی تنگی یہ سب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ بسا اوقات ایک آدمی خوب دیتا ہے، رشتہ داروں کو دیتا ہے، مسکینوں کو دیتا ہے، مسافروں کو دیتا ہے، ایک طرف سے نکلتا چلا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ دوسری طرف سے اتنا ہی دیتا چلا جاتا ہے، اور بسا اوقات دینا بند کر دیا جائے تو پیچھے سے آمد بھی بند ہو جاتی ہے۔ جیسے کنواں ہے، کنویں سے پانی نکالتے چلے جاؤ، تازہ آتا چلا جائے گا۔اگر نکالنا بند کر دو تو ایک حد پہ آ کے ٹھہر جائے گا، بلکہ کھڑا کھڑا پانی خراب ہو جاتا ہے۔اسی طرح سے حقوق تلف کر کے جو مال اکٹھا کیا جائے گا، وہ مختلف قسم کی مصیبتوں کا ذریعہ بن جاتا ہے، کسی مقدمے میں پھنس جاؤ گے تو رشوت میں چلا جائے گا، وکیلوں کی فیسوں میں چلا جائے گا۔کسی بیماری میں مبتلا ہو جاؤ گے، ڈاکٹروں کی فیسوں میں اور دوائیوں میں چلا جائے گا۔کوئی اور کسی قسم کا حادثہ ہو گیا تو اس میں چلا جائے گا۔آخر وہ مختلف قسم کی مصیبتوں کا ذریعہ بن سکتا ہے اگر حقوق تلف کر کے انسان مال کو جمع کرنے کی کوشش کرے......تو یہاں جس وقت یہ ذکر آیا کہ رزق کی کشادگی اور رزق کی تنگی یہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے،تو ساتھ یہ بات کہہ دی کہ رشتہ دار کو اس کا حق دیا کرو، اور مسکین کو بھی دیا کرو، اور مسافر کو بھی۔

مستحقین کو صدقہ ان کا حق سمجھ کر دو

یہاں بھی حَقَّهٗ ہی ہے۔ان کا حق بھی دیا کرو،حق کا لفظ استعمال کر کے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ مال دار کے مال میں ان لوگوں کا بھی حق ہے، یہ اس طرح سے اُدا کرنا چاہیے گویا کہ ہم حق ادا کر رہے ہیں، یہ نہیں کہ کوئی احسان کر رہے ہیں، کسی کے حق ادا کرنے کو احسان نہیں کہتے، وہ تو آپ کے ذمہ لازم ہے۔اسی طرح سے آپ کے مال میں جو مسکینوں کا حق متعین ہے، مسافر کا حق متعین ہے، اور اس طرح سے رشتہ دار کا حق متعین ہے،تو اس کو حق کی ادائیگی کے جذبے کے طور پر دیا کرو، یہ کوئی احسان کرنے والی بات نہیں ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ اگر احسان جتلاؤ گے تو دیا ہوا ضائع ہو جاتا ہے، اس کے اوپر کوئی کسی قسم کا ثواب ہی

مرتب نہیں ہوتا...... اسلامی ذہن یہی ہے کہ ایک آدمی مال کماتا ہے، تو یہ نہ سمجھے کہ میرا ہے چونکہ میں نے کمایا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت آپ کے کمائے ہوئے مال میں بعض ایسے لوگوں کے حقوق لگائے ہیں جو بظاہر کمانے پر قادر نہیں، یا کسی وجہ سے وہ محتاج ہوئے ہوئے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کی آزمائش کے لئے رزق رسانی کے ذرائع مختلف رکھے ہیں، کسی کو اِستعداد دے دی، صلاحیت دے دی، وہ خود محنت کر کے کما لے۔ اور کسی کو اگر صلاحیت اور اسباب سے محروم کیا ہے تو اس کا رزق دوسرے کے مال میں متعین کر دیا۔ وہ دینا ایسے ہی ہے جیسے کہ اس کا حق تھا جو اس کی طرف آیا ہوا ہے، اور اَدا کرنا ضروری ہے، اور جب آپ ادا کریں گے اللہ آپ کو اس کا اَجر دے گا، اس طرح سے آپ کے بھی درجے بلند ہوتے چلے جائیں گے...... تو رزق کی کشادگی اور تنگی کا ذکر کرنے کے ساتھ یہ بات اس لئے کہہ دی، کہ جب یہ رزق کی کشادگی اور تنگی اللہ کی حکمت پر ہے، تو دینے سے تم محتاج نہیں ہو جاؤ گے، اور روک کے رکھنے کے ساتھ تم سرمایہ دار نہیں بن جاؤ گے...... ''دیا کرو قرابت والے کو اس کا حق یعنی اپنے رشتہ داروں کا حق اَدا کیا کرو، اور مسکین کو دِیا کرو اس کا حق، اور مسافر کو دِیا کرو اس کا حق۔ یہ بہتر ہے ان لوگوں کے لئے جو اللہ کی رضا چاہتے ہیں، اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں'' کہ جو رزق کے حاصل ہو جانے کے بعد اس کے اوپر خزانے کے سانپ بن کے نہیں بیٹھ جاتے، اور ان کو جمع کرنے کی فکر نہیں ہوتی، بلکہ حقوق کے ادا کرنے کی فکر ہوتی ہے، ان پہ اللہ راضی بھی ہوتا ہے، اور حقیقتاً کامیابی انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔

سُود کی حوصلہ شکنی اور صدقے کی ترغیب

اور جو ''رِبا'' کے طور پر مال دیا جائے...... دیکھو! مکہ معظمہ میں رہتے ہوئے سود حرام نہیں تھا، یہ رِبوی معاملات چلتے تھے، مدینہ منورہ میں جانے کے بعد بھی اِبتدا اِبتدا میں یہ حلال رہا ہے، معاملات اس طرح سے چلتے تھے، اور اس کی حرمت کا اعلان بہت بعد میں ہوا ہے، پھر اس کے اُوپر بہت شدّت کے ساتھ وعید آئی، اور یہ کہا گیا کہ جو سُود لیتے ہیں، باز نہیں آتے، ان کو اللہ کی طرف سے اِعلانِ جنگ سُن لینا چاہیے، سورۂ بقرہ کے آخر میں یہ مضمون آیا تھا، صدقہ خیرات کا ذِکر آیا تھا، قرض دینے کا ذِکر آیا تھا، درمیان میں اس ''رِبا'' کا ذِکر آیا تھا، سورۂ بقرہ کے آخر میں۔ اِبتدا اِبتدا کے اندر یہ درست تھا، یہ معاملہ چلتا تھا، لوگوں کے ساتھ لین دین رَبوی بھی تھا، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اس کی حوصلہ شکنی کی ہے، صدقہ خیرات کی ترغیب دی ہے...... صراحتاً یہ آیت حرمتِ رِبا کے اُوپر دلالت نہیں کرتی، لیکن اس کی مذمت اس سے نکلتی ہے، حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ اب ایک تو دینا ہے کسی مسکین کو، کسی محتاج کو، زکوٰۃ اور صدقہ خیرات کے طور پر۔ اور ایک دینا ہے رِبا کے طور پر کہ یہ پیسے لے جائے گا اور اس کے مال میں جا کے ہمارا مال بڑھتا جائے گا، بڑھ کے واپس آ جائے گا، تو جو مال اس جذبے کے تحت دیا جائے کہ دوسرا لے کے جائے اور وہاں جا کے مال کا اضافہ ہو، اور ہماری طرف وہ مال بڑھ کے واپس آئے جس کو ''سُود'' کہا جاتا ہے، یہ اللہ کے نزدیک بڑھنے والی بات نہیں یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ (سورۂ بقرہ: ۲۷۶) جیسے وہاں لفظ آئے تھے کہ رِبا کو تو اللہ مٹا دیتا ہے، اس سے تو بے برکتی ہو جاتی ہے، یعنی جس

طرح سے کوئی جانور پرائے کھیت میں چر کے پلتا ہے، اس کی تو مثال وہ ہوتی ہے، یہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا، اللہ کے نزدیک اس میں بے برکتی ہوجاتی ہے۔ اس کی پوری مذمت سورۂ بقرہ کے آخر میں آئی تھی۔

ہاں! البتہ جو تم صدقہ خیرات کے طور پر دیتے ہو بظاہر یہ سمجھتے ہو کہ تم نے اپنے پاس سے اس مال کو نکال دیا، لیکن اللہ کے نزدیک تمہارا یہ مال بہت بڑھ رہا ہے، اس کی وجہ سے تمہارے لئے ذخیرہ جمع ہو رہا ہے، دنیا میں بھی اس کی برکات نصیب ہوں گی، آخرت میں بھی نصیب ہوں گی۔ جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ اگر کوئی شخص خلوص کے ساتھ اللہ کے راستے میں ایک کھجور خیرات کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرماتے ہیں، قبول فرمانے کے بعد اس کو بڑھاتے ہیں۔ حضور ﷺ نے مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ جس طرح سے تم اپنی گھوڑی کے بچے کو پالتے ہو، اور دن بدن اس میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، ''کما یُرَبّی احدُکم فَلُوَّہٗ'' اسی طرح سے اللہ تعالیٰ اس کھجور کو بڑھاتے جاتے ہیں، بڑھاتے جاتے ہیں، حتیٰ کہ وہ اُحد پہاڑ کے برابر ہوجاتی ہے۔[1] اب ایک کھجور بڑھتے بڑھتے اُحد پہاڑ کے برابر ہوجائے، تو ذرا اُحد پہاڑ کے برابر کھجوروں کو وزن کر کے دیکھو، بھلا! کتنی کھجوریں چڑھیں گی؟ تو یہ کوئی حد نہیں کہ دس پہ جا کے بند ہوجائے، دس گنا بڑھ جائے، سات سو گنا بڑھ جائے، جس کا ذکر قرآنِ کریم میں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اتنا بڑھاتا ہے کہ آپ کے شمار میں نہیں آئے گا۔ کہاں ایک کھجور اور کہاں اُحد پہاڑ؟ اگر اُحد پہاڑ کو تراش تراش کے کھجوروں کے برابر بنایا جائے، تو بھی کروڑوں اربوں بن جائیں گی، اور اگر وزن کیا جائے تو پوچھنا ہی کیا، تو اللہ تعالیٰ اس میں اتنا اضافہ فرمادیتے ہیں۔ تو دُنیا اور آخرت میں آپ کا وہ مال بڑھے گا، آپ کے لئے فوائد کا ذریعہ بنتا ہے، اس لئے کوئی محتاج آپ کے پاس آجائے تو درمیانہ درجہ ہے قرض دے دینا، کہ جتنا دیا اتنا ہی واپس لے لو۔ اعلیٰ درجہ ہے صدقہ خیرات کے طور پر دے دینا۔ اور سب سے بدتر درجہ ہے کہ اس کی محتاجی اور اس کی مسکینی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے دیے ہوئے مال کے مقابلے میں زیادہ لینا، ایک محتاج قرض دار آپ کے پاس آگیا اور آپ اُسے سو روپیہ دیں اور ایک سو دس روپے لیں، تو آپ نے دس روپے کا اس کی محتاجی سے فائدہ اُٹھایا۔ یہ بہت ظلم و ستم والی ذہنیت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں اس کی حوصلہ شکنی کی ہے کہ اس مال کو یوں نہ سمجھا کرو کہ وہ بڑھ جاتا ہے، اللہ کے نزدیک بڑھتا نہیں ہے۔ ہاں البتہ جو تم زکوٰۃ اور صدقہ خیرات کے طور پر دیتے ہو، یہ اللہ کے نزدیک بڑھتا ہے۔

''وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا'' کا دُوسرا مفہوم اور ''نیوتہ'' کا شرعی حکم

ایک مطلب تو اس کا یہ ہوا جو آپ کی خدمت میں اَدا کر دیا گیا۔ اور حکیم الاُمّت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ نے یہاں اس کا مفہوم دوسرا بیان کیا ہے۔ کہ مکہ معظمہ میں چونکہ ''ربا'' کی حرمت تو آئی نہیں تھی، اس لئے یہاں لغوی مفہوم اس کا مراد ہے، اور اس سے مراد لیا کہ لوگ جو کسی دوسرے کو ہدیہ دیتے ہیں، تحفہ دیتے ہیں، اور دل میں ارادہ یہ ہوتا ہے کہ

---

(۱) ابن کثیر، سورۃ البقرۃ: ۲۷۶/ نیز بخاری ۱/ ۱۸۹ باب الصدقۃ من کسب طیب. مشکوٰۃ ۱/ ۱۶۷ باب فضل الصدقۃ۔ نوٹ: آخری دو میں اُحد کی بجائے جبل کا لفظ ہے

دوسرے وقت میں زیادہ ہو کے واپس آئے گا، اس کی مذمت کرنی مقصود ہے، اگر چہ وہ شرعاً حرام نہیں، لیکن یہ خست اور کمینہ پن ہے، اور گھٹیا ذہنیت ہے کہ انسان کسی کو اس نیت کے ساتھ دے کہ دوسرے وقت زیادہ وصول ہوگا۔ اور اس کی مثال حضرت نے تفسیر کے اندر ہی ذکر فرمائی جس کو ''نوتہ'' کہتے ہیں یا ''نیوتہ'' کہتے ہیں یا بعض زبانوں میں ''نیندرہ'' کہتے ہیں جو شادی بیاہ کے موقع پر دیا کرتے ہیں، اور وہاں یہی اُصول چلتا ہے کہ اگر پانچ دیے تو خیال ہوتا ہے کہ دوسرے وقت میں دس ہو کے واپس آئیں گے، دس دیے تو دوسرے وقت میں بیس ہو کے واپس آئیں گے، اور اگر کوئی شخص جتنا لیا اتنا ہی واپس کر دے تو لوگ سمجھا کرتے ہیں کہ آئندہ کے لئے اس نے لین دین کا دروازہ بند کر دیا۔ تو اس قسم کا ذہن جو چلتا ہے رُسوم کے اندر کہ کسی کو ہدیہ دیا جائے تو ساتھ ذہن ہو کہ زیادہ ہو کے واپس آئے گا، اللہ فرماتے ہیں یہ کوئی اضافے والی بات نہیں، اس مال میں بے برکتی ہوتی ہے۔ انسان کو اخلاقِ عالیہ کا مظاہرہ کرنا چاہیے کہ جب کسی کو دو تو اس نیت سے دو کہ ضرورت مند تھا، ہم نے اس کی امداد کر دی، یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ کسی دوسرے وقت میں زیادہ ہو کے واپس آئے گا...... بالکل اس طرح سے ہے جس طرح سے سورۂ مدثر میں اللہ تعالیٰ نے سرورِ کائنات ﷺ کو وحی کے ذریعے سے جو ابتدائی باتیں بتائی تھیں، ان میں ایک لفظ یہ بھی آیا تھا وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ احسان نہ کیا کر ، یادہ طلب کرتا ہوا......

سوال:- کیا نیوتا جائز ہے؟

جواب:- جواز اور عدمِ جواز سے بحث نہیں، یعنی اس میں اس کی مذمت کرنی مقصود ہے، وہ مسئلہ علیحدہ ہے کہ آج کل جو نیندرہ دیتے ہیں کسی دوسرے کو، چونکہ اس میں قرض والا معنی ہے اور بلا ضرورت دوسرے کو دیا جاتا ہے، اور ذہن یہی ہوتا ہے کہ دوسرے وقت میں پیسہ واپس آئے گا، پھر واپس کرنے کا کوئی اُصول نہیں کہ جس نے دیا اسی کو دیا جائے، آگے اس کے بیٹے کی طرف ادا کر دیا جاتا ہے، بیٹی کی طرف ادا کر دیا جاتا ہے، تو یہ لینے دینے کا کوئی حساب نہیں رہتا، اس لئے یہ رسم غلط ہے، ہمارے بزرگ اس رسم سے روکتے ہیں۔ اگر دل چاہے، محبت کے ساتھ کسی کو ہدیہ دو، تو اس سے قطع نظر کر کے دو کہ کل کو یہ بھی مجھے دے گا، تو پھر وہ ہدیہ محبت کا باعث بنا کرتا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ آپ کو بھی اخلاق کا جواب اخلاق سے دینا چاہیے، کہ ایک وقت اگر آپ کو کسی نے ہدیہ دیا ہے، تو دوسرے وقت میں آپ بھی دے دیں، لیکن ذہنی طور پر حساب نہ ہو، برہمنوں کی طرح یا مہاجنوں کی طرح کہ چار آنے کا دیا تھا، سوا چار آنے ہو کے واپس آئے، یہ نہیں، اس کی مذمت ہے...... یہاں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کو اسی مفہوم پر محمول کیا ہے۔ ''جو تم دیتے ہو 'رِبا' یعنی وہ مال جو بڑھنے کے جذبے سے دیا گیا، یہاں اس کو 'رِبوٰا' کہا گیا ہے، تاکہ بڑھے وہ لوگوں کے مالوں میں وہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا۔ اور جو تم زکوٰۃ دیتے ہو اللہ کی رضا کا ارادہ کرتے ہوئے، پس یہی لوگ بڑھانے والے ہیں، یہ اپنے مال کو کئی کئی گنا بڑھا لیتے ہیں''...... دونوں مفہوم آپ کے سامنے آ گئے۔

رَدِّ شرک و اِثباتِ معاد

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ: شروع سورت سے آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ کچھ کچھ فاصلے کے بعد

اللہ تعالیٰ وہی احیاء بعد الموت کا ذکر فرماتے ہیں، یہاں پھر وہی بات آگئی کہ پچھلی سب تفصیل سے تمہارے سامنے یہ بات واضح ہوگئی کہ "اللہ وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا پھر اسی نے تمہیں رزق دیا، پھر وہ تمہیں موت دے گا، پھر وہ تمہیں زندہ کرے گا" یہ تصرفات جتنے بھی ہیں سب اللہ کے ہی ہیں۔ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ: یہ استفہام ہے۔کیا تمہارے شرکاء میں سے کوئی ہے جو ان کاموں میں سے کچھ بھی کرتا ہو؟ تمہیں پیدا کرتا ہو، تمہارے لئے رزق کے اسباب مہیا کرتا ہو، تمہیں موت دیتا ہو، موت کے بعد زندہ کرتا ہو، کوئی شرکاء میں سے ہے جو ان میں سے کوئی کام بھی کرتا ہو؟ یعنی کچھ بھی نہیں۔ پیدا کرنا اللہ کے اختیار میں، روزی اسی کے اختیار میں، زندگی اسی کے اختیار میں، موت اسی کے اختیار میں، ان شرکاء کے پلے کچھ نہیں۔ سُبْحٰنَهٗ: اللہ پاک ہے۔ شرک ایک عیب ہے جس کو لوگ اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، اللہ پاک ہے۔ وَتَعٰلٰى: اور بلند و برتر ہے، عَمَّا يُشْرِكُوْنَ: ان چیزوں سے جن کو لوگ شریک ٹھہراتے ہیں، یا ان کے شریک ٹھہرانے سے۔ "ما" موصولہ ہو تو مطلب ہوگا کہ ان چیزوں سے جن کو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں اللہ کی شان بہت اونچی ہے، یہ شریک کس طرح سے ہوسکتے ہیں۔ یا "مَا" مصدریہ ہے کہ ان کے شریک ٹھہرانے سے اللہ تعالیٰ بلند اور برتر ہے۔ شرک والے عیب سے اللہ پاک ہے۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ
فساد ظاہر ہوگیا خشکی میں اور سمندر میں ان کاموں کی وجہ سے جو لوگ کرتے ہیں، تاکہ چکھائے اللہ ان کو مزہ بعض ان کاموں کا جو
عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
انہوں نے کئے تاکہ یہ لوگ لوٹیں ۝ آپ کہہ دیجئے کہ چلو پھرو زمین میں، پھر دیکھو کیسا انجام ہوا
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّشْرِكِيْنَ ۝ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ
ان لوگوں کا جو اس سے پہلے ہوئے ہیں، ان میں سے اکثر مشرک تھے ۝ قائم رکھئے اپنے آپ کو مضبوط دین کے لئے،
مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ يَوْمَئِذٍ يَّصَّدَّعُوْنَ ۝ مَنْ كَفَرَ
قبل اس کے کہ آجائے ایسا دن جس کے لئے لوٹنا نہیں اللہ کی جانب سے، اس دن لوگ متفرق ہوجائیں گے ۝ جو شخص کفر اختیار کرے گا
فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ ۝ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ
تو اس کا کفر اسی پر پڑے گا، اور جو شخص نیک کام کرے گا سو ایسے لوگ اپنی ہی جانوں کے لئے راہ ہموار کر رہے ہیں ۝ تاکہ جزا دے

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْكٰفِرِیْنَ ۝۴۵ وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ

اپنے فضل سے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے، بلاشبہ وہ کفر کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا ۝۴۵ اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے

اَنْ یُّرْسِلَ الرِّیَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِیُذِیْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَلِتَجْرِیَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَ

کہ وہ ہواؤں کو بھیجتا ہے جو خوشخبری دیتی ہیں تاکہ تمہیں اپنی رحمت کا مزہ چکھائے اور تاکہ کشتیاں اس کے حکم سے جاری ہوں اور

لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۴۶ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا

تاکہ تم اس کے فضل کو تلاش کرو اور تاکہ تم شکر ادا کرو ۝۴۶ اور بلاشبہ ہم نے آپ سے پہلے رسولوں کو بھیجا

اِلٰی قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا ؕ وَكَانَ حَقًّا

ان کی قوم کی طرف، سو وہ ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے، پھر ہم نے ان لوگوں سے انتقام لیا جنہوں نے جرم کئے، اور حق ہے

عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝۴۷ اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُهٗ

ہم پر مؤمنین کی مدد کرنا ۝۴۷ اللہ وہی ہے جو بھیجتا ہے ہوائیں، پس وہ ہوائیں بادل کو اُٹھالاتی ہیں، پھر اللہ تعالیٰ اس بادل کو پھیلاتا ہے

فِی السَّمَآءِ كَیْفَ یَشَآءُ وَیَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَی الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَآ

آسمان میں جس طرح سے چاہتا ہے، اور اس بادل کو علیحدہ علیحدہ ٹکڑے کر دیتا ہے، پھر تو دیکھتا ہے بارش کو نکلتی ہے اس بادل سے، پھر جب

اَصَابَ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اِذَا هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ۝۴۸ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ

پہنچا دیتا ہے اللہ تعالیٰ یہ بارش جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے اچانک وہ خوش ہوتے ہیں ۝۴۸ اور بے شک تھے وہ لوگ بارش

اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِیْنَ ۝۴۹ فَانْظُرْ اِلٰۤی اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَیْفَ یُحْیِ

کے اُترنے سے پہلے البتہ مایوس ۝۴۹ اللہ کی رحمت کے آثار کی طرف دیکھو، کیسے اس نے آباد کر دیا

الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْیِ الْمَوْتٰی ۚ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝۵۰ وَ

زمین کو اس کے بنجر ہونے کے بعد، بے شک وہی زندہ کرے گا مُردوں کو، اور وہ ہر چیز کے اُوپر قدرت رکھنے والا ہے ۝۵۰ اور

لَئِنْ اَرْسَلْنَا رِیْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا مِنْ بَعْدِهٖ یَكْفُرُوْنَ ۝۵۱ فَاِنَّكَ لَا

اگر ہم بھیجتے ہیں ہوا پھر دیکھتے ہیں وہ اپنی اُس کھیتی کو زرد تو پھر وہ اس کے بعد البتہ ناشکرے ہو جاتے ہیں ۝۵۱ بے شک آپ نہیں

تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ
سُنا سکتے مُردوں کو اور نہیں سُنا سکتے بہروں کو پکار جبکہ وہ پیٹھ پھیر کر جانے والے ہوں ﴿۵۲﴾ اور نہیں ہیں آپ ہدایت دینے والے
الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۵۳﴾
اندھوں کو ان کی گمراہی سے بچا کر، نہیں سُناتے آپ مگر انہی کو جو ایمان لاتے ہیں ہماری آیات پر پھر وہ فرماں بردار ہوتے ہیں ﴿۵۳﴾

تفسیر

عالمگیر فساد کا سبب بُرے اعمال ہی ہوتے ہیں!

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ: ''بَرّ'' خشکی کو کہتے ہیں، خشک علاقے کو۔ اور ''بحر'' پانی والے علاقے کو کہتے ہیں۔ تو جس طرح صبح شام، دِن رات کا لفظ بول کر سارے اوقات مراد لے لئے جاتے ہیں، اسی طرح سے یہاں بھی ''خشکی'' اور ''تری'' یہ دو لفظ بول کر ساری دُنیا مراد ہے..... فساد ظاہر ہو گیا خشکی میں اور سمندر میں ان کاموں کی وجہ سے جو لوگ کرتے ہیں، لوگوں کے کسب کی وجہ سے خشکی اور تری میں فساد ظاہر ہو گیا۔ نہ خشکی میں امن ہے، نہ سمندر میں امن ہے۔ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا: تاکہ چکھائے اللہ تعالیٰ ان کو مزہ بعض ان کاموں کا جو انہوں نے کئے، لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ تاکہ یہ لوگ لوٹیں، اللہ کی طرف رُجوع کرلیں۔ ان کے عملی فساد کی وجہ سے مصیبتیں آتی ہیں، خشکی میں آتی ہیں، سمندروں میں آتی ہیں۔ اور ان میں بھی مقصد ایک تنبیہ ہوتی ہے تاکہ لوگ اپنی بدکرداری سے باز آجائیں، اور اللہ کی طرف رُجوع کرلیں..... عالمگیر مصیبتیں جو آتی ہیں وہ اکثر و بیشتر لوگوں کے بُرے اعمال کے نتیجے میں ہی ہیں، جس طرح سے کہ آج دیکھ رہے ہو، نہ سمندروں میں امن ہے، نہ فضا میں امن ہے، نہ خشکی میں امن ہے، سمندر میں بھی جنگ کی تیاریاں اور ایک دوسرے کو مارنے کے لئے کس طرح سے لوگ آبدوزیں بنا رہے ہیں، اور کیسے کیسے خطرناک ہتھیار بنا رہے ہیں۔ اور اسی طرح سے ہوا میں گولہ باری ہوتی ہے، ہوائی جہاز بھی گولوں کے ساتھ اُڑائے جاتے ہیں، اور خشکی کے اُوپر بھی کس طرح سے فساد ہے۔ تو یہ خشکی تری ہر جگہ پہ فساد لوگوں کے اعمال کی وجہ سے ظاہر ہو رہا ہے، اور عقل مند لوگ ان واقعات سے متنبہ ہوتے ہیں اور اللہ کی طرف رُجوع کرتے ہیں، اور جن کے دل میں یہ استعداد نہیں، وہ اللہ کی طرف رُجوع ہونے کی بجائے فساد میں اور کوشش کرتے چلے جاتے ہیں۔ دیکھ ہی رہے ہو، آج دنیا میں جس طرح سے ہو رہا ہے، اب تو خشکی، تری اور اس طرح سے فضا کوئی چیز بھی محفوظ نہیں۔ تو جس وقت بھی ان بدکرداروں کی آپس میں چھڑ گئی، اور یہ ایک دوسرے کو گرانے، اور ایک دوسرے کا کندھا لگانے کے جذبے سے میدان میں اُچھل پڑے، تو آگ ہی آگ برسے گی، سمندروں میں بھی آگ، خشکی میں بھی آگ، اور فضا میں بھی آگ۔ جہاں لڑائی ہوتی ہے وہاں دیکھ لو، یہی حال ہوتا ہے۔ اس زمانے میں بھی ایسے ہی تھا۔

''شخصی مصیبت'' کے سبب میں تفصیل ہے

اور یہ جو شخصی تکلیفیں ہوا کرتی ہیں، ان میں دونوں پہلو ہوتے ہیں۔ کبھی بدعملی کے نتیجے میں سزا ہوتی ہے، اور کبھی اللہ کی طرف سے آزمائش یا درجات کی بلندی ہوتی ہے۔ اس لئے شخصی مصیبت میں یہ فیصلہ فوراً نہیں کیا جاسکتا، کہ یہ شخص جو بیمار ہوا ہے، یا اس پر یہ مصیبت آئی ہے، یہ کوئی بدکردار ہے، کسی گناہ کے نتیجے میں آئی ہے، یا اللہ کی طرف سے آزمائش ہے، اور اس کے درجے بلند کرنے کے لئے آئی ہے، یہاں دونوں پہلو ہوتے ہیں، اور یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس کی مثال آپ یوں سمجھئے کہ ایک آدمی کا ہاتھ کلائی سے کٹا ہوا آپ کے سامنے آیا۔ ہاتھ کٹا ہوا ہے، صورت ایک ہے، اب یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس نے چوری کی تھی اور کسی شرعی حکومت کے اندر پکڑا گیا، اور اس چوری کے نتیجے میں اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا، تو بھی ہاتھ کی شکل یہی ہوگی۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہاتھ کے اُوپر کوئی زخم ایسا ہوگیا، کینسر ہوگیا، ناسور ہوگیا، اندیشہ ہے کہ اگر یہ اسی طرح رہا تو باقی بازو بھی گل جائے گا، اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے۔ اب جس وقت آپ دیکھیں گے تو شکل دونوں کی ایک جیسی ہوگی کہ ہاتھ یہاں سے کٹا ہوا ہے۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ ایک کٹنا اس کے عمل کی سزا ہے، اور دوسرا کٹنا اس کے لئے رحمت ہے کہ اگر یہ نہ کٹتا تو بیماری آگے سرایت کرتی، اور نقصان زیادہ ہوجاتا۔ صورت دونوں کی ایک جیسی ہے، لیکن حقیقت اور معنی میں بڑا فرق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک آدمی جو بیمار ہے، وہ ہاتھ کٹواتا ہے تو ڈاکٹر کو فیس بھی ادا کرتا ہے، اور کٹنے کے بعد جب یہ دیکھتا ہے کہ مرض زائل ہوگیا، آئندہ کے لیے صحت حاصل ہوگئی، باقی بدن محفوظ ہوگیا، تو اللہ کا شکر بھی ادا کرتا ہے۔ اور بخلاف اس کے کہ جو چور پکڑا گیا، اور اس کا ہاتھ کاٹا گیا، زندگی بھر کے لئے ندامت اور شرمساری کے ساتھ اس کا سر جھکا رہتا ہے۔ تو ظاہری طور پر تکلیف ایک ہی قسم کی ہوا کرتی ہے، لیکن نیکوں کے لئے اس کی حیثیت اور ہے، بُروں کے لئے حیثیت اور ہے۔

''مصیبت'' کے عذاب یا راحت ہونے کی پہچان

اور یہ فرق کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کسی عمل کی سزا اسے ملی ہے، یا اس کے درجات کی بلندی ہے، یا گناہوں کا کفّارہ ہے، یا آخرت میں اللہ تعالیٰ اس کو کوئی زیادہ اِنعام دینا چاہتے ہیں، یہ مصیبت کس طرح سے آئی ہے؟ علامات کے طور پر بزرگوں نے یہ بات ذکر کی ہے کہ جس بیماری پر انسان جزع فزع کی طرف متوجہ ہوجائے اور اللہ تعالیٰ کی طرف اس کا رُجحان یا رُجوع نہ ہو، یا اس تکلیف میں اور زیادہ جری ہوجائے، زیادہ معاصی کی طرف متوجہ ہوجائے، جس طرح سے لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے تو لوگ اللہ کا شکوہ شکایت کرنے لگ جاتے ہیں، پھر اور زیادہ گناہوں کا ذریعہ بنالیتے ہیں، اس قسم کی مصیبت یہ علامت ہوتی ہے کہ یہ کسی گناہ کی سزا ہے۔ اور جس تکلیف کے آنے کے بعد انسان توبہ اِستغفار کی طرف متوجہ ہوجائے، اور قلب اس کا اللہ کی طرف راجع ہوجائے، یہ علامت ہوتی ہے کہ اللہ کی طرف سے یہ مصیبت اس کے لئے رحمت ہے، نتیجہ اس کے حق میں اچھا نکلے گا۔ اور ایسے ہی جس تکلیف پر قلب میں پریشانی زیادہ آئے، یہ علامت ہوتی ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے بطورِ سزا کے ہے۔ اور اگر اِنسان کے قلب کے اندر اطمینان ہے، صبر کی سی کیفیت ہے، تو یہ علامت ہوتی ہے کہ اللہ کی طرف سے کسی اور آزمائش کے

تحت یہ مصیبت آئی ہے۔ شخصی مصیبتیں انبیاء علیہم السلام پر بھی آتی ہیں، اولیاء پر بھی آتی ہیں، معصوم بچوں پر بھی آتی ہیں، نیکوں پر بھی آتی ہیں، بُروں پر بھی آتی ہیں۔ شخصی مصیبتوں میں جلدی سے فیصلہ نہیں کرنا چاہیے کہ اس شخص کو کسی کردار کی بنا پر سزا ملی ہے۔ ہاں! البتہ جماعتی تکلیفیں جو ہوا کرتی ہیں، عالمگیر، اکثر و بیشتر اس میں لوگوں کا کردار دخل انداز ہوتا ہے۔ جیسے اُحد کی جنگ میں مسلمانوں کو شکست ہوئی، اس میں اللہ تعالیٰ نے بہت ساری حکمتیں بیان فرمائی ہیں، لیکن اس کی نسبت بھی بعض مَا كَسَبُوْا کی طرف ہی کی ہے،[1] کیونکہ جماعت کے کچھ افراد اگر غلطی کرتے ہیں تو سزا سب کو بھگتنی پڑتی ہے۔ جہاں جماعتی معاملہ ہوا کرتا ہے تو وہاں پھر شخصی کردار کو نہیں دیکھا جایا کرتا، وہاں جماعتی کردار کو دیکھا کرتے ہیں۔ تو جماعت میں کچھ آدمی ایسے تھے جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی پابندی نہیں کی، وہ مورچہ چھوڑ دیا، جس کے نتیجے میں شکست ہوگئی۔ تو اس کی نسبت اللہ تعالیٰ نے بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا کی طرف ہی کی ہے۔ تو اسی طرح سے بڑی بڑی عالمگیر مصیبتیں جو آتی ہیں تو اکثر و بیشتر ان میں انسانوں کی آبادیوں کے کردار کا دخل ہوتا ہے۔ شخصی تکلیفوں میں اس طرح سے ہوتا ہے کہ کبھی وہ رحمت ہوتی ہیں، کبھی آزمائش ہوتی ہیں، اور کبھی انسان کی کسی غلطی کی سزا کے طور پر ہوتی ہیں...... ظاہر ہوگیا فساد خشکی میں اور تری میں ان اعمال کی وجہ سے جو لوگوں کے ہاتھ کرتے ہیں، لوگوں کے کسب کی وجہ سے، ان عملوں کی وجہ سے جو لوگوں نے کیے (اَیْدِی کی طرف کام کی نسبت ہو جاتی ہے۔ کسبِ ید: ہاتھ کی کمائی) تاکہ چکھائے اللہ تعالیٰ مزہ ان کو بعض ان اعمال کا جو انہوں نے کئے، اور تاکہ یہ لوگ رُجوع کریں۔

گزشتہ اُمم کے اَنجام کی طرف اِشارہ

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ: اللہ کی انہی تنبیہات کا اگر نقشہ دیکھنا ہے تو زمین میں چلو پھرو، زمین کے اُوپر پھیلے ہوئے کھنڈرات تمہیں بتادیں گے کہ واقعی اللہ تعالیٰ کی طرف سے، جس وقت لوگوں کا کردار فاسد ہوتا ہے تو ان کی زندگی کے ظاہری حالات خراب کردیے جاتے ہیں، ان کے اوپر مصیبت اور آفت آجاتی ہے۔ ان کو آپ کھنڈرات کی زبان سے سُن لیجئے۔ آپ کہہ دیجئے کہ چلو پھرو زمین میں، فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلُ: کیسا انجام ہوا ان لوگوں کا جو اِس سے پہلے ہوئے ہیں، كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّشْرِكِيْنَ: ان میں سے اکثر مشرک تھے۔

”قیامت“ کا کچھ حال

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ: یہ مضمون پہلے بھی آیا تھا۔ تو جب یہ بات آپ کے سامنے نمایاں ہوگئی کہ کُفر شرک بدکرداری کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب آتا ہے، تو یہ بُری بات ہے، عذاب کو لانے والی ہے، تو آپ اپنے آپ کو دِینِ قیم کے لیے سیدھا رکھئے۔ سیدھا رکھئے اپنے چہرے کو، قائم رکھ اپنے چہرے کو مضبوط دِین کے لئے، سیدھے دِین کے لیے۔ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ قبل اس کے کہ آجائے ایسا دِن لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ يَوْمَئِذٍ يَّصَّدَّعُوْنَ: جس کے لئے لوٹانا نہیں اللہ کی جانب سے،[2] اس دِن

---

(۱) اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا (سورۃ آل عمران: ۱۵۵)

(۲) ریکارڈنگ مس نہ ہونے کی وجہ سے یہاں سے چند آیات کی وضاحت ''انوار البیان'' سے ماخوذ ہے۔

لوگ متفرق یعنی جُدا جُدا ہو جائیں گے، نیک اعمال والے الگ اور بُرے اعمال والے الگ ہوں گے۔ مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ جو شخص کُفر اختیار کرے گا تو اس کا کُفر اسی پر پڑے گا۔ اور جو شخص نیک کام کرے گا سو ایسے لوگ اپنی ہی جانوں کے لئے راہ ہموار کر رہے ہیں، تا کہ اللہ ان لوگوں کو اپنے فضل سے جزا دے جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے، بلاشبہ وہ کُفر اختیار کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْ فَضْلِهٖ: تا کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اپنے فضل سے جزا دے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فضل سے کافر محروم ہوں گے، اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ: بلاشبہ اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔ جب دنیا میں کافر اللہ کی ذات پر ایمان نہ لایا، اس کے انعامات کا شکریہ اَدا نہ کیا اور مزید یہ کہا کہ دوسروں کو اس کی عبادت میں شریک کر لیا تو قیامت کے دِن اس کی سزا پائیں گے، ایمان لاتے تو اللہ کے محبوب ہوتے، اب انہیں کُفر کی سزا دی جائے گی اور دوزخ میں داخل ہوں گے۔

دلائلِ قدرت

وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرٰتٍ...... وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ۝ ان آیات میں اوّل تو ہواؤں کا ذکر فرمایا جن کے چلنے سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ بارش آنے والی ہے، یہ ہوائیں بارش آنے سے پہلے بارش کی خوشخبری دے دیتی ہیں۔ پھر جب بارش ہو جاتی ہے انسان ان کے منافع سے مستفید ہوتے ہیں، منافع میں سے یہ بھی ہے کہ ان کے ذریعے بادبانی کشتیاں چلتی ہیں۔ جب ان کشتیوں میں سوار ہو کر سفر کرتے ہیں تو ان سفروں میں اللہ تعالیٰ کا رزق بھی تلاش کرتے ہیں، تجارت کے لیے بھی مال لاتے ہیں اور آل اولاد کے کھانے پینے کے لیے بھی، ان سب چیزوں میں اللہ تعالیٰ کے انعامات بھی ہیں اور اس کی قدرت کے دلائل بھی ہیں، ان دلائل کے ذریعہ اسے پہچانیں اور اس کی جو نعمتیں ہیں ان کا شکر ادا کریں۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ہم نے آپ سے پہلے بہت سے رسول بھیجے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا، واضح دلائل پیش کیے لیکن جنہیں ماننا نہ تھا انہوں نے نہ مانا، انہوں نے رسولوں کو جھٹلایا اور کُفر پر جمے رہے ان کے جرم کی وجہ سے ہم نے انتقام لے لیا۔ وہ انتقام یہ تھا کہ یہ مجرمین ہلاک ہوئے اور اہل ایمان عذاب سے محفوظ رہے۔ جو لوگ آپ ﷺ کی مخالفت کر رہے ہیں وہ بھی مجرم ہیں ان سے بھی انتقام لیا جائے گا۔ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ: اور اہلِ ایمان کی مدد کرنا ہمارے ذمہ ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے ایک قاعدہ کلیہ بیان فرما دیا اور یہ وعدہ فرمایا کہ جس طرح ہم نے گزشتہ زمانوں میں مؤمنین کی مدد کی ہے اسی طرح آئندہ بھی مؤمنین کی مدد ہوتی رہے گی البتہ مدد میں حکمت کے موافق دیر بھی لگ جاتی ہے جیسا کہ انبیائے سابقین کی اُمتوں کے ساتھ ہوا ہے لہٰذا اہلِ ایمان کو نا اُمید اور اُداس نہ ہونا چاہیے اور یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ دنیا ہی میں مدد ہو جائے۔ سب سے بڑی مدد یہ ہے کہ موت کے بعد انسان دوزخ سے بچ جائے اور جنّت میں چلا جائے۔ دنیا میں جو صبر شکر کے ساتھ زندگی گزاری اور نیک اعمال کیے یہ جنّت میں داخل ہونے کا ذریعہ بنیں گے۔ [1]

---

(۱) اس سے آگے حضرت حکیم العصر کی تفسیر ہے۔

اس کی تفسیر میں حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ اگر دُنیا کے اندر غلبہ نمایاں نہیں ہوگا تو آخرت میں لازماً ہوجائے گا، بہرحال غلبہ نمایاں ہو کے رہے گا۔ کُفر مٹنے والی چیز ہے، اگرچہ عارضی طور پر اس کو غلبہ ہوجائے لیکن وہ عارضی غلبہ اس کا کوئی پائیدار نہیں ہوتا۔ آخر ایمان غالب آئے گا۔

''اِثباتِ معاد'' کے لیے ''اِحیائے اَرض'' کا ذِکر

اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ: اللہ وہی ہے جو بھیجتا ہے ہوائیں، فَتُثِيْرُ سَحَابًا: اَثَارَ يُثِيْرُ اُٹھانا، اُبھارنا۔ پس وہ ہوائیں بادلوں کو اُٹھالاتی ہیں۔ فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ: پھر اللہ تعالیٰ اس بادل کو پھیلاتا ہے آسمان میں، كَيْفَ يَشَآءُ: جس طرح سے چاہتا ہے۔ سماء سے فضا مراد ہے، اوپر والا حصہ۔ فضا میں اس بادل کو پھیلاتا ہے جس طرح سے چاہتا ہے۔ وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا: كِسَفًا یہ كِسْفَةٌ کی جمع ہے، کسفة ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس بادل کو علیحدہ علیحدہ ٹکڑے کر دیتا ہے، کبھی تو فضا بادل سے بھرپور ہوتی ہے، جس طرح سے گھٹا چھائی ہوئی ہوتی ہے وہ کیفیت ہوجاتی ہے، کبھی بادل مختلف ٹکڑیوں میں بٹ جاتا ہے۔ فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ: پھر تو دیکھتا ہے بارش کو، نکلتی ہے وہ اس بادل میں سے۔ بادل میں سے بارش برستی ہے۔ ودق: موٹے موٹے قطروں والی بارش۔ یہی لفظ سورۂ نور (آیت: ۴۳) میں بھی آیا تھا۔ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ: پھر جب پہنچا دیتا ہے اللہ تعالیٰ یہ بارش جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے۔ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ: اچانک وہ خوش ہوجاتے ہیں۔ وہی مُبَشِّرٰتٍ ہوائیں جو تھیں، جو بشارت انہوں نے دی تھی وہ خوشی حاصل ہوجاتی ہے، تو بندے بارش ہونے کے ساتھ خوش ہوجاتے ہیں۔ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ: یہ ''اِنْ'' مُخففه مِنَ الْمُثَقَّله ہے، ''اِنْ'' شرطیہ نہیں۔ اور بے شک تھے وہ لوگ اس سے قبل، بارش کے اُترنے سے پہلے البتہ مایوس۔ یعنی بارش کو دیر ہو رہی ہو، تو بارش کے اُترنے سے قبل ان لوگوں پر مایوسی طاری تھی، پھر جب بارش ہوتی ہے تو سارے خوش ہوجاتے ہیں۔ فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ: پھر وہی بات لوٹ کے آگئی، شروع سورت سے جس طرح سے چلی آرہی ہے۔ رَحْمَتِ اللّٰهِ سے بارش مراد ہے، اور اٰثٰرِ سے نباتات جو بارش کے نتیجے میں اُگتی ہے، وہ مراد ہے۔ اللہ کی رحمت کے آثار کی طرف دیکھو! كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا کیسے اس نے آباد کردیا زمین کو اس کے بنجر ہونے کے بعد۔ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى: یہی جو زمین کو بنجر ہونے کے بعد آباد کرتا ہے وہی زندہ کرے گا مُردوں کو، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ: اور وہ ہر چیز کے اُوپر قدرت رکھنے والا ہے۔ یعنی تھوڑے تھوڑے وقفے کے ساتھ اسی مضمون کا اعادہ ہو رہا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل آخرت کی یاددہانی کروانی مقصود ہے، اور آخرت کے متعلق جو انسانوں میں غفلت ہے اسی کو دُور کیا جارہا ہے۔

ناشکروں کی تلوّن مزاجی

وَلَئِنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا: اور اگر ہم ہوا بھیج دیں، یہاں ہوا سے مراد ہے ایسی ہوا جو انسان کو نقصان پہنچانے والی ہے، جس میں عذاب اور تکلیف والا معنی ہے۔ قرآنِ کریم میں ''رِیاح'' کا لفظ جہاں بھی آیا اس سے اللہ کی رحمت کی ہوائیں مراد ہوتی ہیں، جمع کے صیغے کے ساتھ جہاں بھی آیا ہے، بابرکت ہوائیں مراد ہیں۔ اور مفرد کے طور پر جب اس کو ذکر کیا جاتا ہے، تو اکثر و بیشتر اس

میں عذاب والا معنی ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں دوسری جگہ موجود ہے اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمُ الرِّیْحَ الْعَقِیْمَ (سورۂ ذاریات: ۴۱) کہ ہم نے ان کے اُوپر بے برکت ہوا بھیجی۔ وَلَىِٕنْ اَرْسَلْنَا رِیْحًا: اور اگر ہم بھیجتے ہیں ہوا۔ فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا: ''ہٗ'' ضمیر یہاں کھیتی کی طرف لوٹ رہی ہے، جو اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ کے تحت مذکور ہے، جیسے میں نے عرض کیا کہ اٰثٰر سے بارش کے آثار مراد ہیں، بارش سے جس قسم کے آثار ظاہر ہوئے، یہ وہی نباتات ہیں۔ پھر دیکھتے ہیں وہ اپنی اس کھیتی کو زرد، اس ہوا کے نتیجے میں، جیسے سخت سرد ہوا چلی، پالا پڑا، جس سے کھیتی خشک ہوگئی، یا کوئی زیادہ تیز لُو چلی اور اس نے فصل کو خشک کر دیا۔ دیکھتے ہیں اس کو زرد، لَّظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ یَكْفُرُوْنَ: پھر وہ اس کے بعد البتہ ناشکرے ہوجاتے ہیں، یعنی پچھلی سب نعمتیں ان کو بھول جاتی ہیں۔ کبھی ایک دفعہ بھی کھیتی خشک ہوجائے اور اس کے اندر کوئی ایسے آثار پیدا ہوجائیں خراب ہونے کے، تو فوراً ناشکرے ہوجاتے ہیں، کھایا پیا یاد ہی نہیں رہتا، پہلی عیش وعشرت سب ختم۔ تو یہ ہے ان میں تلوّن مزاجی کہ منٹ میں خوش اور منٹ میں ناشکرے۔ ذرا حالات اچھے ہوجاتے ہیں، تو کودنے اُچھلنے لگ جاتے ہیں، خوشی کے مارے دندناتے ہیں ناچتے ہیں، اور ذرا مرضی کے خلاف بات آجاتی ہے، تو آس توڑ کے بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ ان کے متلوّن مزاج ہونے کی علامت ہے۔

مسئلہ ''سماعِ موتیٰ''

فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى: تو یہ لوگ اگر آپ کے سمجھائے سمجھتے نہیں، تو ان مُردوں کو جو روحانی طور پر مُردہ ہیں، قلبی طور پر مُردہ ہیں، ضمیر کے مُردہ لوگ ہیں، ان کو سنانا منوانا آپ کے بس کی بات نہیں ہے۔ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ: اور نہ آپ سنا سکتے ہیں بہروں کو، گویا کہ یہ مُردہ بھی ہیں، بہرے بھی ہیں، اندھے بھی ہیں۔ نہ یہ آنکھوں سے کام لیتے ہیں، نہ کانوں سے کام لیتے ہیں اور نہ یہ اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔ مُردہ ہوگئے عقل کے اعتبار سے، ضمیر کے اعتبار سے، قلوب کے اعتبار سے، روحانی اعتبار سے۔ تو یہاں موتیٰ سے، صُمّ سے، عُمْی سے، کافر مراد ہیں۔ حقیقتاً صُم، یا حقیقتاً اندھے، یا حقیقتاً موتیٰ مراد نہیں ہیں۔ اس لئے قرآنِ کریم میں یہ مسئلہ ذکر نہیں کیا گیا کہ مُردے سنتے ہیں یا نہیں سنتے۔ یہ ذکر کیا گیا ہے کہ آپ کافروں کو سنوا منوا نہیں سکتے۔ حقیقتاً مُردوں کی کیا بات ہے؟ وہ مکمل تفصیل آپ کے سامنے سورۂ نمل میں آچکی، یعنی جن کا یہ حال ہے کہ منٹ میں کچھ اور منٹ میں کچھ، یہ تو مُردوں کی طرح ہیں، ان کو تو سنوا منوا نہیں سکتا، یہ تیرے بس کی بات نہیں ہے۔ ''بے شک تُو نہیں سُنا سکتا مُردوں کو اور نہیں سُنا سکتا تو بہروں کو پکار'' اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِیْنَ: جبکہ وہ پیٹھ پھیر کے جانے والے ہوں۔ وَمَاۤ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْیِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ: اور نہیں ہیں آپ ہدایت دینے والے ہیں اندھوں کو ان کی گمراہی سے بچا کر۔ عَنْ یہ دلالت کرتا ہے کہ یہاں ہدایت کے اندر حذف والا معنی ہے (آلوسی، نمل: ۸۱)۔ گمراہی سے بچا کر آپ ان کو سیدھے راستے پر نہیں چلا سکتے۔ تو ''فَاِنَّكَ'' میں ''ف'' جس طرح سے بتاتی ہے، ماقبل کے مضمون پہ یہ تفریع ہے کہ یہ لوگ جن کے یہ حالات ہیں، یہ تو مُردوں کی طرح ہیں، بہروں کی طرح ہیں، اندھوں کی طرح ہیں، ان کو سیدھے راستے پہ لے آنا آپ کے بس کی بات نہیں۔

اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ یُّؤْمِنُ: نہیں سناتے آپ مگر مؤمنوں کو ہی۔ جو ایمان لاتے ہیں وہ آپ کی باتیں توجہ سے سنتے ہیں، آپ

ان کو سنا لیتے ہیں منوا لیتے ہیں، یا جو ایمان لانے کا ارادہ رکھتے ہیں، تو یہ مقابلہ ہے مَنْ یُّؤْمِنُ کا موتی کے ساتھ۔ فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى - اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ یُّؤْمِنُ: یہ بھی قرینہ ہے اس بات کا کہ "موتی" سے کافر مراد ہیں، جیسے ایک دوسرا واضح قرینہ آپ کے سامنے پہلے پارے سے ذکر کیا تھا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ (سورۂ بقرہ:۶) یہ ان کے عدم تاثر کی بات ہے، کہ ڈرا، یا نہ ڈرا، وہ لوٹیں گے نہیں۔ پھر آگے جا کے لفظ ہے کافروں منافقوں کا ذکر کرنے کے بعد کہ یہ بالکل صم ہیں، بکم ہیں، عمی ہیں۔ تو بالیقین وہاں کفار مراد ہیں، وہی جن کے متعلق کہا کہ لَا یُؤْمِنُوْنَ، یہ مانیں گے نہیں۔ تو انہی کو بہرہ کہا جا رہا ہے، انہی کو اندھا کہا جا رہا ہے، اور انہی کو گونگے کہا جا رہا ہے۔ اسی طرح سے یہاں انہی کو مُردہ کہا جا رہا ہے، انہی کو بہرے کہا جا رہا ہے، اور انہی کو اندھے کہا جا رہا ہے۔ اور ان کے مقابلے میں جو مؤمن ہیں وہ زندہ ہیں اور سننے والے ہیں اور دیکھنے والے ہیں، وہ آپ کی باتوں سے متاثر ہوتے ہیں، آپ انہی کو سنا سکتے ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔ فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ: پھر وہ فرماں بردار ہوتے ہیں، جن کے اندر ایمان کا فرماں برداری کا جذبہ ہے بھی آپ کی بات کو سنیں گے، بھی آپ کی بات کو مانیں گے۔

اس لئے حقیقتاً مُردوں کا کیا درجہ ہے؟ قرآنِ کریم میں یہ مسکوت عنہ ہے، میں نے آپ کے سامنے تفصیل کی تھی، عبارۃ النص کے طور پر کسی آیت میں یہ ذکر نہیں کیا گیا کہ مُردے سنتے نہیں ہیں۔ ثابت کرنے والے قرائن سے ثابت کرتے ہیں، جو سماع ثابت کرتے ہیں ان کے پاس بھی قرائن ہیں، جو انکار کرتے ہیں ان کے پاس بھی قرائن ہیں۔ لیکن سماع کونسا؟ مسلمانوں والا۔ سماع دو قسم کا ہے، ایک کافروں مشرکوں والا جو اپنے آلہہ کے متعلق خیال کرتے تھے کہ وہ ہر وقت سنتے ہیں، ہر جگہ سے سنتے ہیں، ہر بات سنتے ہیں، ہر کسی کی سنتے ہیں۔ مشرکین جو اپنے آلہہ کے متعلق اس قسم کا خیال رکھتے تھے، یہ سماع شرک ہے۔ اور جس کے متعلق ایسے سماع کا عقیدہ بنایا جائے، اس کو آپ نے اللہ کا شریک بنالیا۔ مشرکین کے عقیدے کی تردید کرتے ہوئے جو آیات آئی ہیں، ان میں اسی سماع کی تردید ہے جس کو ہم سماع لازم اور دائم سے تعبیر کرتے ہیں۔ جو مسلمانوں میں مختلف فیہ ہے، وہ ایسا نہیں ہے، اس کو "سماع فی الجملہ" کہا جاتا ہے، اس کے لئے قرائن دونوں طرف ہیں، بعض اس کا قول کرتے ہیں، بعض نہیں کرتے۔ یہ تفصیل آپ کے سامنے سورۂ نمل میں کر دی گئی تھی۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضَعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضَعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ
اللہ وہ ہے جس نے تمہیں کمزوری سے پیدا کیا پھر اللہ اس ضعف کے بعد قوت بنا دیتا ہے، پھر قوت کے بعد
بَعْدِ قُوَّةٍ ضَعْفًا وَّشَيْبَةً ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ ۝۵۴ وَيَوْمَ
کمزوری اور بڑھاپا کر دیتا ہے، اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے پیدا کرتا رہتا ہے، اور علم اور قدرت اسی کے لئے ہے ۝۵۴ جس دن

تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ كَذٰلِكَ كَانُوْا

قیامت قائم ہوگی مجرم قسمیں کھائیں گے کہ نہیں ٹھہرے وہ ایک گھڑی کے علاوہ، اسی طرح سے وہ

يُؤْفَكُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ

دُنیا میں پلٹے جاتے تھے ﴿۵۵﴾ کہیں گے وہ لوگ جو علم اور ایمان دیے گئے کہ بے شک ٹھہرے ہو تم اللہ کے لکھے ہوئے کے مطابق

اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَيَوْمَئِذٍ لَّا

یوم بعث تک، یہ بعث کا دِن آ گیا، لیکن تم (دُنیا میں) جانتے نہیں تھے ﴿۵۶﴾ پس اس دِن نہیں

يَنْفَعُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ

ظالموں کو ان کی معذرت فائدہ نہیں دے گی، اور ان سے توبہ کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا ﴿۵۷﴾ البتہ تحقیق بیان کیا ہم نے لوگوں کے نفع

فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰيَةٍ لَّيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

کے لئے اس قرآن میں ہر قسم کی مثال کو، اگر آپ ان کے پاس کوئی نشانی لے آئیں البتہ ضرور کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا،

اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ ﴿۵۸﴾ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۹﴾

نہیں ہو تم مگر باطل پرست ﴿۵۸﴾ اسی طرح سے مُہر کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے دِلوں پر جو علم نہیں رکھتے ﴿۵۹﴾

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۶۰﴾

صبر کیجئے، اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے، جو اللہ کے وعدے پر یقین نہیں لاتے وہ آپ کا استخفاف نہ کریں ﴿۶۰﴾

دو کمزوریوں کے درمیان تھوڑی سی قوّت پر ناز!!

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضَعْفٍ: اللہ وہ ہے جس نے تمہیں کمزوری سے پیدا کیا، یعنی تمہاری ابتدا کمزوری سے ہے، پانی کا قطرہ، بوند، جہاں سے انسان کی بنیاد اُٹھی، کیا قوت، طاقت ہے اس میں۔ پھر اسی طرح سے پیدا ہونے کے بعد بچپن کا زمانہ انتہائی کمزوری کا زمانہ ہوتا ہے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ اس ضعف کے بعد قوت بنا دیتا ہے، تمہیں جوانی آ جاتی ہے، اور پھر قوت کے بعد کمزوری اور بڑھاپا کر دیتا ہے۔ تو تمہاری قوت اور جوانی یہ دو کمزوریوں کے درمیان میں گھری ہوئی ہے، اِدھر بھی کمزوری، اُدھر بھی کمزوری، درمیان میں چند دِن کے لئے قوت اور طاقت آ گئی۔ تو بڑے افسوس کی بات ہے کہ انسان نہ اپنے آگے کو یاد رکھے، نہ پیچھے کو یاد رکھے، چند دِن کی جوانی اور طاقت پہ اکڑے، اور کہے کہ مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً، اس سے زیادہ حماقت کیا ہے؟ نہ ماضی یاد، نہ مستقبل یاد،

کل تم کیا تھے، اور کل کو کیا ہو جاؤ گے، تمہیں یاد ہی نہیں۔ چند دِن کی جوانی اور چند دِن کی قوت کے اُوپر اتنا اکڑنے اور اِترانے لگ گئے؟ بچپن کا زمانہ یاد کرو، کیا قوت اور طاقت تھی؟ پھر بڑھاپے کا نقشہ دیکھ لیا کرو، کہ نہ گھٹنے کام دیں، نہ آنکھیں کام دیں، نہ ہاتھ کام دیں، نہ کمر سیدھی ہو، بچوں کی طرح پھر انسان کے اُوپر ضعف طاری ہو جاتا ہے۔ دو ضعفوں کے درمیان میں گھری ہوئی قوت پہ کوئی ناز والی بات نہیں ہے، اِترانے اور اکڑنے کی بات نہیں۔ اور خود تمہارے اُوپر جو کیفیتیں طاری ہوتی ہیں، یہ خود دلیل ہے کہ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ: اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے پیدا کرتا رہتا ہے، وَهُوَ الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ: علم وقدرت اللہ کے لئے ثابت ہے، اِردگرد بھی اس کے آثار پھیلے ہوئے ہیں، جیسے بہت کثرت کے ساتھ اس سورت کے اندر نشانیوں کی طرف متوجہ کردیا گیا۔ مِنْ اٰیٰتِهٖ۔ مِنْ اٰیٰتِهٖ کتنی جگہ ذِکر آیا۔ اور اگر زیادہ نہیں تو اپنی طرف ہی توجہ کرو، اور اپنے بچپن سے لے کے بڑھاپے تک کے حالات دیکھو، تو خود بخود پتا چل جائے گا یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ۚ وَهُوَ الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ کہ اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا رہتا ہے اور علم وقدرت اسی کے لئے ہے۔ شَیْبَةً اصل میں کہتے ہیں شَابَ یَشِیْبُ: بالوں کا سفید ہو جانا۔ چونکہ عادۃً یہ بڑھاپے میں ہی جا کے ہوتے ہیں، اس لئے شَیْبَةً کا ترجمہ بڑھاپے سے کردیا جاتا ہے۔ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا سورۂ مریم کی اِبتدا میں آیا تھا کہ میرا سر سفیدی سے بھڑک اُٹھا۔ تو شیب اصل میں بالوں کے سفید ہونے کو کہتے ہیں۔

قیامت کے دِن کافروں کی حیرانی اور بے بسی

وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ: جس دِن قیامت قائم ہوگی، یُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ: مجرم قسمیں کھائیں گے، مَا لَبِثُوْا غَیْرَ سَاعَةٍ: نہیں ٹھہرے وہ ایک گھڑی کے علاوہ۔ کَذٰلِكَ كَانُوْا یُؤْفَكُوْنَ: اسی طرح سے وہ دنیا میں پلٹے دیے جاتے تھے۔ نہ حقیقت کا اِدراک یہاں صحیح کیا، نہ دنیا میں کیا، یعنی دنیا میں اور برزخ میں اتنا زمانہ گزرا ہوگا، اور یہ سمجھیں گے کہ ایک گھڑی ہے۔ اور قسمیں کھا کھا کے کہیں گے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ بھی ان کی بدحواسی ہے، دنیا میں جو آرام کا وقت گزرا وہ ایک لحظہ معلوم ہوگا جس کو سمجھتے تھے کہ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ (سورۂ ابراہیم: ۴۴) ہمارے لئے زوال ہے ہی نہیں۔ وہاں جا کے ایسے معلوم ہوگا جیسے ایک گھڑی گزری ہے۔ اور قیامت کی سختیوں کے مقابلے میں برزخ بھی ان کے لئے باعثِ راحت تھی، تو راحت کا زمانہ جو ہوتا ہے مصیبت میں مبتلا ہونے کے بعد ایسے لگتا ہے جیسے ایک گھنٹے میں گزر گیا۔ قسمیں کھا کھا کے کہیں گے۔ یہاں ان کا حال بیان کرکے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ عیش وعشرت کا زمانہ بہت کم ہے، وہاں قسمیں کھاؤ گے کہ وہ تو ایک ساعت کی طرح تھا، اور آگے بڑی طویل زندگی آنے والی ہے، تو یہاں کی عیش وآرام کے متعلق جو فکر کرتے ہو، اگلی فکر بھی کرو...... دنیا کے اندر بھی ایسے ہی چکرائے ہوئے تھے، ایسے ہی پلٹے دیے جاتے تھے، کہ بات کو صحیح سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے تھے، اور یہاں بھی ان کا اِدراک صحیح نہیں۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِیْمَانَ: جب وہ کافر قسمیں کھا کھا کے کہیں گے کہ ہم تو بہت تھوڑی دیر ٹھہرے، تو وہ لوگ جن کو علم دیا گیا اور ایمان دیا گیا، ان کے حواس وہاں بھی صحیح ہوں گے۔ کہیں گے وہ لوگ جو علم دیے گئے اور ایمان دیے گئے، لَقَدْ لَبِثْتُمْ

فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ: كِتٰبِ اللّٰهِ: اللہ کی کتاب، اللہ کا نوشتہ، اللہ کی تحریر۔ بے شک ٹھہرے ہو تم اللہ کے لکھے ہوئے کے مطابق یوم بعث تک، تم تو قیامت تک ٹھہرے ہو۔ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ: یہ بعث کا دن آ گیا۔ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ: لیکن تم دنیا میں جانتے نہیں تھے کہ ایک بعث کا دن بھی آنے والا ہے۔ یہ آ گیا بعث کا دن، جس میں آج تم اٹھ کھڑے ہوئے ہو یہی بعث کا دن ہے، فَيَوْمَئِذٍ لَّا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ: پس جس دن یہ بعث کا دن ہوگا نہیں نفع دے گا ان لوگوں کو جنہوں نے ظلم کیا ان کا معذرت کرنا، ظالموں کو ان کی معذرت فائدہ نہیں دے گی۔ ظالموں سے مراد بدکردار کافر، مشرک اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (سورۂ لقمان: ۱۳)۔ جس دن ایسا ہوگا یعنی جس دن اٹھ کھڑے ہوں گے، قیامت کا دن آ جائے گا، اس دن ظالموں کو عذر کرنا کوئی نفع نہیں دے گا، وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ: اِسْتِعْتَاب اس کا ماخذ ہے عتاب۔ عتاب کہتے ہیں غصے کو۔ اِعتاب باب افعال سے ہو تو ازالۂ عتاب کے معنی میں ہے۔ استعتاب ہو تو اس کا معنی ہے ازالہ عتاب کا مطالبہ کرنا۔ ان کی معذرت انہیں کوئی فائدہ نہیں دے گی، اور نہ ان سے یہ مطالبہ کیا جائے گا کہ اللہ کی ناراضگی کو آج زائل کروالو۔ غصے کے زائل کروانے کا بھی ان سے مطالبہ نہیں کیا جائے گا؛ انہیں یہ نہیں کہا جائے گا کہ تم توبہ کر کے، معافی مانگ کے، آج اس غصے کو زائل کرلو، ایسا موقع بھی ان کو نہیں دیا جائے گا۔ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ کا یہ معنی ہے۔ جس کا حاصل ترجمہ کر دیا جاتا ہے کہ ان سے توبہ کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا، توبہ کا موقع نہیں دیا جائے گا۔ اصل مفہوم اس کا یہی ہے، کہ ان سے راضی کرنے کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا، کہ تم اب اللہ کو راضی کرلو، ان کو یہ موقع نہیں دیا جائے گا۔ اس لئے حضرت شیخ (الہندؒ) ترجمہ کرتے ہیں: ''نہ ان سے کوئی منانا چاہے'' یعنی ان سے یہ نہیں چاہا جائے گا کہ تم اب اللہ کو منالو۔ عذر معذرت بھی کوئی کام نہ آئے گی اور منوانے کا موقع بھی نہیں دیا جائے گا۔

کافروں کے دِل پر مُہر لگ چکی ہے

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ: البتہ تحقیق بیان کیا ہم نے لوگوں کے نفع کے لئے اس قرآن میں ہر قسم کی مثال کو۔ وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰيَةٍ اگر آپ ان کے پاس کوئی نشانی لے آئیں، لَّيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا: البتہ ضرور کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ: نہیں ہو تم مگر باطل پرست۔ ''تم'' سے مراد رسول بھی، رسول کے ماننے والے بھی، کافر کہیں گے سب مبطل ہو، باطل کا ارتکاب کرنے والے ہو۔ اس نشانی کو جادو کہیں گے، لانے والوں کو جادوگر کہیں گے۔ ماننے والوں کو جادوگر کا متبع کہیں گے۔ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ: اسی طرح سے مُہر کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے دلوں پر جو علم نہیں رکھتے، بے علموں کے دل ایسے ہی سخت ہو جاتے ہیں اور پھر وہ کسی چیز سے متاثر نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ مہر کر دیتا ہے یعنی ان کی بدکرداری کے نتیجے میں آہستہ آہستہ ان کی استعداد مغلوب ہو جاتی ہے، تاثر نہیں رہتا۔ چونکہ خالق ہر کیفیت کا ایک اللہ ہے، اس لئے نسبت اس کی طرف کر دی جاتی ہے۔ یہ حاصل ہے ساری سورت کا، کہ اللہ نے بہت آیات بیان کر دیں، لیکن یہ لوگ متاثر جو نہیں ہوتے تو یوں سمجھو کہ ان کے دل پہ مُہر لگی ہوئی ہے۔

اللہ کی طرف سے ہدایات

فَاصْبِرْ: آپ حالات کا مقابلہ کرتے رہیے، مستقل مزاج رہیے، گھبرانے کی بات نہیں ہے، صبر کیجئے۔ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ: اللہ کا وعدہ سچا ہے، جس کی بیسیوں مثالیں اسی سورت کے اندر ہی ذکر کردی گئیں، خاص طور پر رُومیوں والا واقعہ تو بہت ہی واضح مثال ہے اللہ کے وعدے کے سچے ہونے کی۔ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ: جو اللہ کے وعدے پر یقین نہیں لاتے وہ آپ کا استخفاف نہ کریں۔ اِستخفاف کا معنی ہوتا ہے کسی کو ہلکا بنالینا، ہلکا سمجھ لینا، باتیں کرکے، ہنسی مذاق کرکے، باتوں باتوں میں اُسے اڑا دینا، بے برداشت کردینا، یہ استخفاف کا معنی ہوتا ہے۔ بے برداشت نہ کرنے پائیں آپ کو وہ لوگ جو یقین نہیں کرتے، یعنی ہنسی مذاق کے ساتھ آپ کے قدم نہ اکھیڑ دیں، بے برداشت نہ کردیں۔ آپ اللہ کے وعدے پر یقین رکھئے، اللہ کا وعدہ سچا ہے، اور جو یقین نہیں لاتے وہ آپ کو بے برداشت نہ کرنے پائیں، جو وعدے آپ سے کئے گئے ہیں کہ ایک دِن کُفر مغلوب ہوگا، مؤمنین غالب ہوں گے، دنیا اور آخرت میں کامیابی ایمان والوں کے لئے ہے، کافر خسارے میں رہیں گے، یہ سب اللہ کے وعدے سچے ہیں، وقت پر آپ کے سامنے ظاہر ہوجائیں گے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

سورۃ لقمٰن
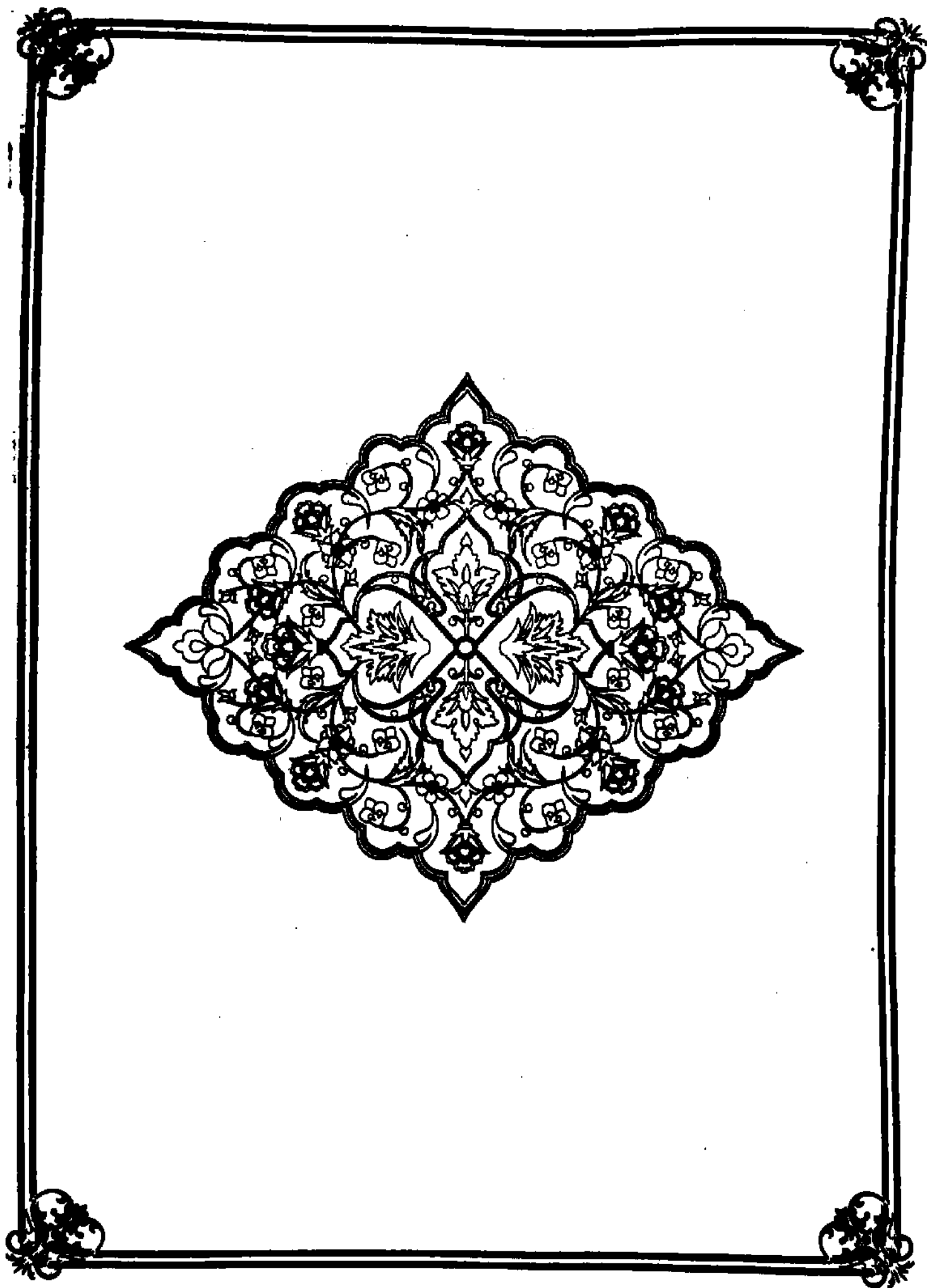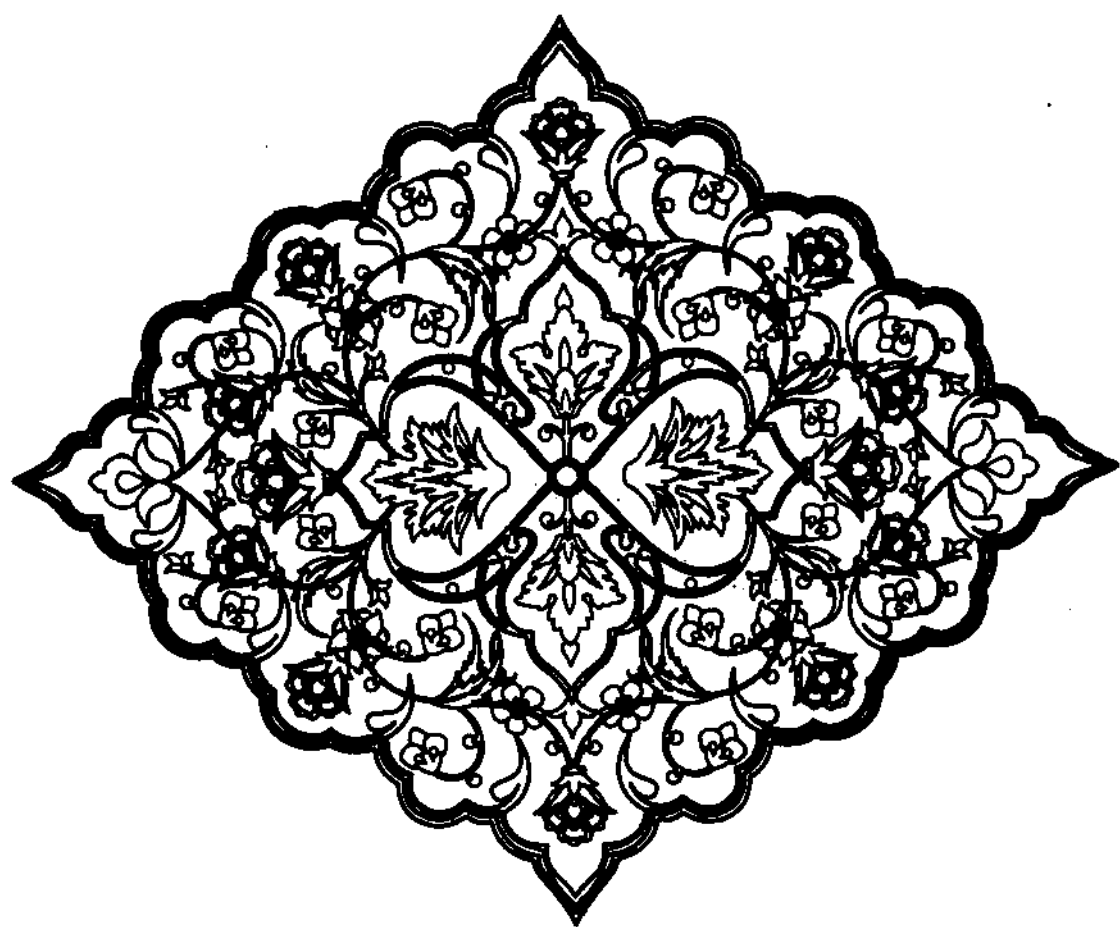
آیاتها ۳۴ ۳۱ سُوْرَةُ لُقْمٰنَ مَكِّيَّةٌ ۵۷ رکوعاتها ۴

سورۂ لقمان مکہ میں نازل ہوئی اس میں چونتیس آیتیں اور چار رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓمّٓ ۝۱ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۝۲ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ۝۳ الَّذِيْنَ

الٓمّٓ ① یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں ② اس حال میں کہ یہ ہدایت اور رحمت ہے محسنین کے لئے ③ جو

يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۴ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى

نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور آخرت کے ساتھ یقین لاتے ہیں ④ یہی لوگ اس ہدایت پر ہیں

مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۵ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ

جو ان کے ربّ کی طرف سے ہے، یہی لوگ ہیں فلاح پانے والے ⑤ لوگوں میں سے بعض وہ ہے جو خریدتا ہے غفلت میں ڈالنے والی بات کو

لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۚ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۶

تاکہ بھٹکائے اللہ کے راستے سے بغیر علم کے اور تاکہ بنائے اس (اللہ کے راستے) کو ہنسی مذاق، ان کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہے ⑥

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْٓ اُذُنَيْهِ وَقْرًا ۚ

اور جب اس پر ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں تو پیٹھ پھیرتا ہے وہ تکبّر کرتا ہوا، گویا کہ اس نے ان آیات کو سنا ہی نہیں، گویا کہ اس کے کانوں میں بوجھ ہے

فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۷ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتُ

پس آپ اس کو خبر دے دیجئے دردناک عذاب کی ⑦ جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں ان کے لئے خوش حالی کے

النَّعِيْمِ ۝۸ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۹ خَلَقَ

باغات ہیں ⑧ ہمیشہ رہنے والے ہوں گے ان میں، اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے، وہ زبردست ہے حکمت والا ہے ⑨ پیدا کیا اللہ نے

السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ

آسمانوں کو بغیر ستونوں کے، دیکھتے ہو تم ان آسمانوں کو، اور ڈالے اللہ نے زمین میں بوجھل پہاڑ تاکہ نہ مائل ہو جائے وہ تمہارے ساتھ

وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۚ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ۝۱۰
پھیلایا اللہ نے زمین میں ہر قسم کے دابہ کو، اور اُتارا ہم نے آسمان سے پانی، پھر اُگایا ہم نے زمین کے اندر ہر مفید قسم کو ۱۰
هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۱۱
یہ تو اللہ کی مخلوق ہے، پس دکھاؤ تم مجھے، کیا پیدا کیا ان لوگوں نے جن کو اللہ کے علاوہ تم پوجتے ہو، بلکہ ظالم لوگ صریح گمراہی میں ہیں ۱۱

سورت کا تعارف اور ماقبل سے ربط

سورۂ لقمان مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۳۴ آیتیں ہیں ۴ رُکوع ہیں۔ سورت مکی ہے اس لئے مکی سورتوں کی طرح اس میں بھی اُصولِ دِین کا تذکرہ ہے، پچھلی سورتوں میں توحید اور اثباتِ معاد خصوصیت کے ساتھ کیا گیا، اور اُس میں زیادہ تر آفاقی دلائل بیان کیے گئے تھے، اللہ تعالیٰ کی قدرت کی بہت ساری آیات پچھلی سورت میں مذکور ہوئیں۔ اِس سورت میں خصوصیت کے ساتھ ذکر آ رہا ہے لقمان کے وعظ کا، جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ توحید صرف یہی نہیں کہ انبیاء علیہم السلام نے اس کی تعلیم دی بلکہ مُسلّم عقلاء اور صاحب حکمت لوگ بھی اسی عقیدے پر تھے، اور اسی عقیدے کی تلقین کرتے تھے۔ تو حضرت لقمان کا ذِکر خصوصیت کے ساتھ اس سورت میں کیا ہے۔ ابتدائی آیات بالکل سورۂ بقرہ کے ساتھ ملتی جلتی ہیں، ان کی زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں، ترجمہ دیکھئے۔

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

الٓمّٓ: حروفِ مقطعات ہیں، اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِمُرَادِہٖ بِذٰلِکَ، ان حروف سے اللہ کی جو مراد ہے وہ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں۔ اور بعض حضرات اس الٓمّٓ کو سورت کا نام بتایا کرتے ہیں۔ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ: یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں۔ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ: رَحْمَةً منصوب ہے، یہ قرینہ ہے کہ هُدًى بھی منصوب ہی ہے، اگرچہ هُدًى کے اُوپر اِعراب تقدیری ہے، تو یہ حال واقع ہوجائیں گے اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ سے، کیونکہ تِلْكَ کے اندر اُشِيْرُ فعل والا معنی ہے، عامل اس میں ہوجائے گا معنیٔ فعل جو تلك سے سمجھ میں آ رہا ہے۔ اس حال میں کہ یہ ہدایت اور رحمت ہے محسنین کے لئے، کتاب یا کتاب کی آیات، جو بھی کہہ لیں، یہ ہدایت ہیں، راہنمائی کا ذریعہ ہیں، اور اللہ کی رحمت کے حاصل ہونے کا ذریعہ ہیں۔ مُحْسِنِيْنَ محسن کی جمع آ گئی۔ محسن یہ اِحسان سے لیا گیا ہے۔ اَحْسَنَ اِحْسَانًا: ہر کام کو اچھی طرح سے کرنا۔ تو محسنین وہ ہیں جن کو ہم نیکوکار، خوب کار کے ساتھ تعبیر کر سکتے ہیں، جو ہر کام کو حُسن وخوبی کے ساتھ کرنے والے ہیں وہی لوگ اس سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ اور جو بدکردار ہیں، جن کا بدی کی طرف ہی رُجحان ہے، اچھائی کی طرف ان کا رُجحان ہی نہیں، وہ اس کتاب سے فائدہ نہیں اُٹھائیں گے۔ نیکوکاروں کے لئے یہ ہدایت اور رحمت ہے، یعنی اِبتداءً یہ راہنمائی ہے، اور جب کوئی شخص اس راہنمائی سے فائدہ اُٹھائے گا تو اللہ کی رحمت اس کو حاصل ہوجائے گی۔ آگے محسنین کی کچھ صفات ذکر کی جا رہی ہیں کہ نیک کار، خوب کار کون لوگ ہوا کرتے ہیں؟ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ

الزَّكٰوةَ: جو نماز قائم کرتے ہیں، اِقامتِ صلوٰۃ کی تفسیر بار ہا ہوگئی۔ اور جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ زکوٰۃ سے مراد نفلی صدقات بھی ہو سکتے ہیں، کیونکہ مکہ معظمہ میں اس نظم کے تحت زکوٰۃ نہ لی جاتی تھی نہ دی جاتی تھی، یہ سارے کا سارا نظم مدینہ منورہ میں جا کے قائم ہوا، مقادیر متعین کیے گئے، زکوٰۃ کے وصول کرنے کا انتظام کیا گیا۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ فرضیت زکوٰۃ کی مکہ معظمہ میں ہی ہوگئی تھی لیکن لوگ اپنے طور پر اپنے مال میں سے خرچ کرتے رہتے، کوئی اندازہ کہ کس مال میں سے کتنی ادا کرنی ہے، یہ مکہ معظمہ میں نہیں تھا، یہ سارے کا سارا نظم مدینہ منورہ میں جا کے قائم ہوا، اس لئے صدقہ خیرات جتنی کسی کو توفیق ہوجاتی اپنے طور پہ کرلیتا، یعنی مال میں سے کچھ خرچ کرنا فرض تو ہوگیا تھا، اگرچہ یہ تفصیل مکہ معظمہ میں نہیں کی گئی تھی جو مدینہ منورہ میں کی گئی...... بدنی عبادت آ گئی اِقامتِ صلوٰۃ میں، مالی عبادت آ گئی اِیتائے زکوٰۃ میں۔ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ: خصوصیت کے ساتھ یہ بات ذکر کی جارہی ہے کہ محسنین وہی ہوتے ہیں جو آخرت کے ساتھ یقین لاتے ہیں، کیونکہ آخرت کا یقین ہوگا، اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کا، اعمال کے محاسبے کا ڈر ہوگا، تو ہی جا کے انسان اچھا کردار اختیار کرتا ہے۔ اور اگر خیال یہی ہو کہ مرنے کے بعد مٹی ہوجاتا ہے، اور کوئی ہمیں پوچھنے والا نہیں، کسی کے سامنے ہم نے حساب کتاب نہیں دینا، تو پھر انسان متبع شہوات ہوجاتا ہے کہ یہاں مزے کی زندگی گزار لو، عیش اُڑالو جس طرح سے بھی ہوسکے۔ پھر اس کے عمل میں، کردار میں کسی صورت میں بھی حُسن اور خوبی نہیں آسکتی، اچھائی بُرائی کا اس کے سامنے معیار یہی ہوگا کہ اپنی خواہش کس طرح پوری ہوتی ہے، جس سے اپنی خواہش پوری ہوتی ہے وہ اچھا کام ہے، وہ کرے گا۔ اور جس سے اپنی خواہش پوری نہیں ہوتی، اس کو چھوڑ دے گا۔ اگر آخرت کا عقیدہ نہ ہو تو پھر انسان متبع شہوات ہوجاتا ہے۔ عمل کے اندر خوبی پیدا ہوتی ہے آخرت کے عقیدے سے۔ آخرت کے ساتھ وہ یقین کرتے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ: یہی جو اِقامتِ صلوٰۃ کرتے ہیں، اِیتائے زکوٰۃ کو انہوں نے اپنایا ہے، اور آخرت کا عقیدہ رکھتے ہیں، یہی لوگ اس ہدایت پر ہیں جو ان کے رَبّ کی طرف سے ہے۔ مِّنْ رَّبِّهِمْ یہ هُدًى سے تعلق رکھتا ہے (یعنی جار مجرور هُدًى کی صفت ہے۔ ناقل) جو ہدایت ان کے رَبّ کی طرف سے آئی ہے یہ لوگ اس ہدایت پہ قائم ہیں۔ تو گویا کہ کتاب آپ کو یہی ہدایت دیتی ہے کہ نماز پڑھو، زکوٰۃ دو، آخرت کا یقین رکھو، جس شخص نے کتاب سے یہ فائدہ اُٹھالیا اس کو اللہ کی طرف سے ہدایت حاصل ہوگئی، اور یہی لوگ ہیں کامیاب ہونے والے، جو اس کتاب سے ہدایت حاصل کرکے بدنی طور پر اور مالی طور پر اللہ کی عبادت کرتے ہیں، اپنے عقیدے کو درست کرتے ہیں، یہی لوگ ہیں فلاح پانے والے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ: حدیث تو بات ہوگئی۔ اور لہو ولعب یہ لفظ تو کئی دفعہ قرآنِ کریم میں آیا ہے، کھیل کود کے معنی میں ہے۔ اور اَلْهَا يُلْهِيْ اِلْهَاءً ماضی مضارع دونوں ہی قرآنِ کریم میں مستعمل ہیں،[1] غفلت میں ڈالنا، يُلْهِهِمُ الْاَمَلُ (سورۂ حجر: ۳)، اَلْهٰى ماضی کا صیغہ آیا ہوا ہے: اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ: ایک دوسرے کے مقابلے میں کثرت پیدا کرنے کے جذبے نے تمہیں غفلت میں ڈال دیا۔ تو ''لہو'' اس چیز کو کہتے ہیں جو غفلت میں ڈالنے کا باعث بن جائے۔ لَهْوَ الْحَدِيْثِ میں اضافت ایسے ہی ہے جس طرح سے زخرف القول میں ہے یعنی صفت کی اضافت موصوف کی طرف۔ وہاں ترجمہ کیا گیا تھا: اَلْقَوْلُ الْمُزَخْرَفُ، مزین

(۱) لَا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (النور: ۳۷)، يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (سورۃ المنافقون)

بات، ملمع شدہ بات، جس میں حقیقت کچھ اور ہو، چمک کچھ اور ہو، ظاہر اور ہو، حقیقت کچھ اور ہو، اس کو ''زخرف القول'' کہتے ہیں۔ اَلْقَوْلُ الْمُزَخْرَفُ سجائی ہوئی بات، ملمع کی ہوئی بات۔ اور اسی طرح سے لَهْوَ الْحَدِيْثِ کا معنی ہو جائے گا، الحدیث الملھی: غفلت میں ڈالنے والی بات، الاحادیث الملھیۃ: غفلت میں ڈالنے والی باتیں، جمع کے طور پر اس کو یوں تعبیر کر دیں گے۔ تو یہ اضافت ہو جائے گی صفت کی موصوف کی طرف۔ اور مفسرین نے اضافت مِنْ بھی بنائی ہے (عام تفاسیر)، آئی لھوٌ من الحدیث۔ کیونکہ ''لھو'' صرف بات ہی نہیں ہوتی، بعضے کام بھی ''لھو'' کا مصداق ہوتے ہیں۔ تو مِنَ الْحَدِيْثِ بیان بن جائے گا اس کا، کہ یہاں ''لھو'' سے مراد حدیث ہے یعنی بات، یوں بھی اس کی تعبیر کی گئی ہے، کیونکہ بعضے کام بھی ہوتے ہیں جو غفلت کا باعث بنتے ہیں، اور بعضے باتیں بھی ہوتی ہیں جو غفلت کا باعث بنتی ہیں۔ تو یہاں ''لھو'' کا مصداق بات کو بنا دیا گیا (نسفی وغیرہ)۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ: مَنْ چونکہ لفظاً مفرد ہے، اس لئے يَشْتَرِيْ مفرد کا صیغہ آیا۔ ''اشتراء'' کا معنی خریدنا۔ بیع شراء یہ لفظ آپ سنتے رہتے ہیں۔ اور ایک چیز کو چھوڑ کر دوسری چیز کے اختیار کرنے کے لئے بھی ''اشتراء'' کا لفظ بولا جاتا ہے، اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى (سورۂ بقرہ: ۱۶) جنہوں نے ہدایت کو چھوڑ کے گمراہی کو اختیار کر لیا، دنیا کو چھوڑ کے آخرت کو اختیار کر لیا، تو ایسے موقع پر بھی اشتراء کا لفظ بولتے ہیں۔ تو خریداری یعنی بیع شراء حقیقتاً ہو، یا مطلقاً ایک چیز چھوڑ کے دوسری چیز لی جائے تو یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ: ''لوگوں میں سے بعض وہ ہیں'' اگر جمع کے طور پر ترجمہ کرنا چاہیں، ورنہ مفرد کے طور پر کرنا چاہیں تو بھی ٹھیک ہے۔ لوگوں میں سے بعض وہ ہے جو خریدتا ہے غفلت میں ڈالنے والی بات کو۔ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ: تاکہ بھٹکائے اللہ کے راستے سے بغیر علم کے، وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا: هَا ضمیر سَبِيْل کی طرف لوٹ رہی ہے، لفظ سَبِيْل قرآنِ کریم میں مذکر مؤنث دونوں طرح سے استعمال ہوا ہے۔[1] اور تاکہ بنائے اُس اللہ کے راستے کو ہنسی مذاق۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ: ان کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا: اور جب اس پر ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں، وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا: پیٹھ پھیرتا ہے وہ تکبر کرتا ہوا۔ كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا گویا کہ اس نے ان آیات کو سنا ہی نہیں، كَاَنَّ فِيْٓ اُذُنَيْهِ وَقْرًا: وقر کہتے ہیں بوجھ کو، یہ کانوں میں جو ثقل پیدا ہو جاتا ہے۔ گویا کہ اس کے کانوں میں ثقل ہے، بہرا پن ہے۔ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ: پس آپ اس کو خبر دے دیجئے دردناک عذاب کی۔

تفسیر

شانِ نزول

اس آیت (وَمِنَ النَّاسِ الخ) کے شانِ نزول میں یہ لکھا گیا ہے کہ مکہ معظمہ میں ایک شخص ''نضر بن حارث'' تھا۔ اور یہ مکہ کی ممتاز شخصیات میں سے ہے ''ابوجہل'' کی طرح، اور سرورِ کائنات ﷺ کے ساتھ بہت عداوت رکھتا تھا، اسلام کی مخالفت میں پیش پیش تھا، تاجر تھا، تجارت کے لئے باہر جایا کرتا تھا۔ جب یہ ایران کی طرف اور فارس کی طرف سفر کرتا تو وہاں سے رستم،

(۱) وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا (الاعراف: ۱۴۶)، ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ (عبس: ۲۰)، قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ (یوسف: ۱۰۸)، وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ (الانعام: ۵۵)

اسفند یار، شاہانِ ایران کے قصے کہانیاں، وہ کتابیں جن کے اندر یہ چیزیں لکھی ہوئی ہوتیں، جس طرح سے آج کل یہ ناول ہیں، اُس زمانے میں بھی ایسے قصے کہانیوں کا رواج تھا، تو یہ وہاں سے ایسی کتابیں خرید کے لاتا، اور پھر اس کا مقصد یہ ہوتا کہ مکہ معظمہ میں مجلس لگاتا، اور لوگوں کو ترغیب دیتا کہ یہ محمد ﷺ (ان کے اپنے کہنے کے مطابق کہ) یہ محمد بن عبداللہ تمہیں عاد و ثمود کے قصے سناتا ہے اور خواہ مخواہ ڈراتا رہتا ہے، نماز پڑھو، زکوٰۃ دو، اور یہ کرو، وہ کرو۔ آؤ! میں تمہیں اس سے بھی زیادہ لذیذ لذیذ حکایتیں سناتا ہوں، آوارہ قسم کے لوگ اکٹھے ہوجاتے۔ تو حضور ﷺ قرآنِ کریم سناتے، اور وہ یہ قصے کہانیاں سناتا، اس طرح لوگوں کو قرآنِ کریم سننے سے روکتا تھا۔ اور ایک گانے والی لونڈی کہیں سے لایا، بہت خوش آواز، بڑی اچھی گویا تھی، اور اس قسم کی مجلسیں لگاتا جس طرح سے میلے لگا کرتے ہیں، وہاں لوگوں کو اکٹھا کرتا، مقصد اس کا یہ ہوتا تاکہ لوگ حضور ﷺ کی طرف نہ جائیں، ان کا وقت ادھر مصروف کردیا جائے، یوں اللہ کے راستے سے وہ روکنا چاہتا تھا (تفسیر آلوسی)۔ تو آیت کے شانِ نزول کے اعتبار سے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ کا مصداق وہی ہے، اس لئے یہاں اگر اشتراء کو حقیقت پر رکھ لیا جائے، خریدنے کے معنی میں، تو یہ واقعے کے مطابق ہے (آلوسی)، وہ خرید کے لاتا تھا غفلت میں ڈالنے والی باتیں، اور مقصد اس کا ہوتا تھا اللہ کے راستے سے روکنا، اُس کی اس آیت میں مذمت کی گئی ہے۔

مباح اور ممنوع کھیل کی تفصیل

لیکن آپ جانتے ہیں کہ آیت اسی مورد پر بند نہیں ہوا کرتی جو اس کا شانِ نزول ہوتا ہے، جو واقعہ بھی اس قسم کا ہو اس پر یہ صادق آسکتی ہے۔ اس لئے ایسی باتیں اور اسی کے حکم میں ہے ہر وہ چیز جس میں مشغول ہونے کے ساتھ اللہ کے ذکر سے غفلت ہوتی ہو، وہ سب اس کا مصداق ہوسکتا ہے۔ اس لئے یہ ناول، فضول قسم کے قصے کہانیاں پڑھنا جن میں مشغول ہونے کی بنا پر انسان قرآنِ کریم کی تلاوت سے رہ جائے، دل و دماغ کے اوپر غفلت طاری ہو، نیکی کی طرف رُجحان نہ ہو، بُرائی کی ترغیب ہو، یا اس قسم کی چیزیں خریدنا، وہ سب اس آیت کے تحت ممنوع ہوجائیں گی...... اگر تو وہ باتیں خریدی اس لئے جائیں، لائی اس لئے جائیں، تاکہ لوگوں کو ایمان سے برگشتہ کیا جائے تو پھر تو آپ جانتے ہیں کہ یہ کُفر ہی ہے...... اور اگر وہ باتیں اس لئے لائی جاتی ہیں کہ کُفر کی ترغیب دینا تو اگرچہ مقصود نہیں، لیکن اس میں مشغول ہونے کے ساتھ دینی کاموں سے غفلت ہوتی ہے، جس طرح سے لوگ تاش کھیلنے لگ جاتے ہیں، اور اس قسم کی چیزوں میں لگ جاتے ہیں، چاہے اس پہ پیسوں کی بازی نہ لگائیں۔ یعنی اگر اس کے اوپر پیسوں کی بازی لگائیں، تو یہ جُوا اور قمار ہے، تو یہ تو پھر نص قطعی کے ساتھ حرام ہے۔ اور اگر پیسوں کی بازی نہ لگائی جائے، جیت ہار نہ ہو، ویسے ہی اس کو مشغلے کے طور پر اختیار کریں، اور اتنا مشغول ہوجائیں کہ نماز کے اوقات بھی یاد نہیں، دوسرے ضروری کام سے بھی غفلت ہوجائے، پھر ان میں اِشتغال حرام ہوتا ہے...... اور اگر دین کے کاموں سے غفلت نہ ہو اگرچہ اس میں کوئی معتد بہ فائدہ نہیں، اس قسم کی کھیل مباح ہے، یعنی کسی وقت میں دل بہلالیا جائے، لیکن دین کے کسی کام سے غفلت نہ ہو، نماز کا خیال رکھا جائے، دوسرے کاموں کا خیال رکھا جائے، اگرچہ کوئی معتد بہ فائدہ بھی مدنظر نہیں، ایسی صورت میں وہ کھیل مباح ہوگی

......اور اگر اس میں کوئی معتد بہ فائدہ مدنظر ہو تو پھر اس میں ثواب بھی ہوسکتا ہے۔ جیسے ایک شخص دین کا کام کرتے کرتے تھک گیا، پڑھتے پڑھاتے دماغ تھک گیا، بدن میں تھکاوٹ ہوگئی، تو دل بہلانے کے لئے تاکہ طبیعت میں بشاشت آ جائے، سستی اتارنے کے لئے، صحت کی حفاظت کے لئے، تاکہ اس صحت کو پھر دین کے کام میں لایا جائے، اس کے تحت اگر کوئی کھیل کھیلی جاتی ہے تو اس میں ثواب بھی ہوسکتا ہے، جبکہ نیت یہ ہو...... یہی وجہ ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ نے[1] اس زمانے کے اعتبار سے فرمایا کہ ہر وہ چیز جس کے ساتھ انسان دل بہلاتا ہے، باطل ہے، بیکار ہے، اس میں کوئی فائدہ نہیں سوائے تین چیزوں کے، تین چیزوں کو مستثنیٰ فرمایا۔ ۱- انسان کا اپنے تیروں کے ساتھ کھیلنا، تیراندازی کرنا، ایک دوسرے کے مقابلے میں تیر چلانا، جس طرح سے اس وقت رواج تھا، آج جس طرح سے آپ فٹبال کھیلتے ہیں اور ایک دوسرے کو شکست دینے کی کوشش کرتے ہیں، تو اس وقت مقابلہ تیراندازی میں ہوتا تھا، تو فرمایا یہ کھیل مفید ہے۔ ۲- اور اسی طرح سے کوئی شخص اپنے گھوڑے کو سدھاتا ہے، گھڑ دوڑ کرتا ہے، گھوڑے بھگاتا ہے، شہ سواری کی مشق کرتا ہے، تو فرمایا یہ کھیل بھی مفید ہے۔ ۳- یا اپنی بیوی کے ساتھ دل بہلانا گھر میں جا کے۔ ان تین کو مستثنیٰ فرمایا۔ کیونکہ تیراندازی کے ساتھ کھیلنا، اور شہ سواری کی مشق کرنا، یہ دونوں ہی اس وقت جہاد کے مقدمات میں سے تھے کہ جب تیر چلائیں گے کہ کس کا تیر دُور جاتا ہے، کس کا تیر نشانے پہ لگتا ہے، تو یہ چیز بھی بعد میں جہاد میں کام آئے گی۔ اسی طرح گھوڑے دوڑانا، ایک دوسرے کے مقابلے میں شہ سواری کی مشق کرنا، یہ بھی جہاد میں کام آنے والی چیز ہے۔ اور بیوی کے ساتھ دل بہلانا، یہ بیسیوں اخلاقی بیماریوں کا علاج ہے اور تحفظ ہے کہ گھر میں انسان بیٹھے، گھر میں اپنا دل بہلائے۔ تو تین چیزوں کا ذکر فرمایا، لیکن اسی کے حکم میں ہے ہر وہ چیز جس میں کوئی معتد بہ فائدہ ہے، آج کل تیراندازی نہیں، گھڑ سواری نہیں، تو صحت کی حفاظت کے لئے اگر کوئی کھیل کھیلی جائے وہ بالکل ٹھیک ہے، جبکہ نیت یہ ہو کہ قوت حاصل ہوگی، تو ہم اپنی اس صحت کو اپنی اس قوت کو دین کی خدمت میں صَرف کریں گے، تو پھر اس کی حوصلہ افزائی کی جاسکتی ہے، بلکہ بسا اوقات یہ ضروری ہو جاتی ہے، زیادہ بیٹھے رہنے سے سستی طاری ہو جائے، معدہ خراب ہو جائے، صحت خراب ہو جائے، پھر انسان نہ پڑھنے کا نہ پڑھانے کا۔ ایسے موقع میں ترغیب دی جائے گی کہ ضرور کسی طرف چلو پھرو، بھاگو دوڑو، تاکہ صحت اچھی ہو جائے...... لیکن ہر وہ کھیل جس میں مشغول ہونے کے ساتھ اللہ کے ذکر سے غفلت طاری ہو، اور دین کے کاموں میں خلل پڑتا ہو، تو وہ ساری کی ساری اس آیت کے تحت ممنوع ہیں۔ آج کل اس کے حکم میں ہی ٹیلی ویژن ہوگیا، یہ ٹیپ ریکارڈر پہ گانے سننا وغیرہ، یہ سب اسی حکم میں ہیں...... اب یہ ٹیلی ویژن، ریڈیو، ٹیپ ریکارڈ، فی حد ذاتہٖ ان میں قباحت نہیں ہے، ان کا اچھا بُرا ہونا استعمال کے تابع ہے۔ اگر کوئی شخص ٹیلی ویژن اس لئے خریدتا ہے کہ اس پہ فلمیں دیکھا کریں گے، ناچ گانا دیکھیں گے، تو پھر وہ بالکل مَنْ یَّشْتَرِیْ لَھْوَ الْحَدِیْثِ کا مصداق ہے، کیونکہ ایسے لوگ جس وقت ڈرامے دیکھنے کے لئے فلمیں دیکھنے کے لئے بیٹھتے ہیں تو نماز وغیرہ کی کوئی خبر ہی نہیں رہتی، غفلت اس طرح سے طاری ہوتی ہے کہ دن بدن انسان دین سے دُور ہوتا چلا جاتا ہے۔ تو اس لئے ریڈیو خریدنا گانے سننے

---

(۱) ترمذی ج ۱ ص ۲۹۳ باب ما جاء فی فضل الرمی۔ مشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۳۷ باب اعداد آلۃ الجہاد، فصل ثانی کی پہلی حدیث۔

کے لئے، ٹیلی ویژن خریدنا، ٹیپ ریکارڈ جس طرح سے لوگ ہر وقت بجاتے ہیں، گانے سنتے ہیں، یہ سب اس میں داخل ہے اور حرام ہے۔ نہ خریدنا جائز، نہ ان کا دیکھنا جائز۔ لیکن ان چیزوں میں فائدے کا پہلو بھی ہے۔ ریڈیو میں صرف خبریں سنیے، کسی اچھے آدمی کی وعظ تقریر ہو وہ سنیے، ٹیپ ریکارڈ میں اسی طرح سے اچھی باتیں محفوظ کر کے ان کو سنیے، اور ٹیلی ویژن میں بھی کوئی اچھا پروگرام ہو تو اس کو اگر دیکھا جائے اس نیت سے اگر رکھیں گے، اور باقی! نماز کے اوقات کا خیال رکھیں گے، دُوسرے دینی مہمات کا خیال رکھیں گے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ فی حد ذاتہٖ یہ چیزیں مباح ہیں، استعمال کے تحت آ کے یہ چیزیں پھر قبیح ہوجاتی ہیں...... تو نضر بن حارث کا تو مقصد ہی تھا کہ لوگ حضور ﷺ کی خدمت میں نہ جائیں، ان قصے کہانیوں میں لگے رہیں، مجلسیں لگی رہیں ناچ کی، رنگ کی، کھانے کی، پینے کی۔ اور اس طرح سے لوگوں کو مشغول رکھا جائے، تو یہ صریح کُفر تھا جس کا اس نے ارتکاب کیا۔ تو اس پر یہ وعید سنائی گئی کہ ایسے شخص کو دردناک عذاب کی بشارت دے دیجئے، خبر دے دیجئے...... لوگوں میں سے بعض وہ ہے، کوئی کوئی آدمی ایسا ہے، جس طرح سے ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں کہ ''بعضے لوگ یوں کرتے ہیں۔''

بوقتِ نزول آیات کا مصداق واضح ہوتا تھا

تو ''مَنْ'' لفظوں میں مفرد ہے معناً جمع ہے، جو بھی ایسا ہوگا وہ اس کا مصداق بن جائے گا۔ اور ایسے لفظ! جب نام نہیں لیا جاتا تو موقع محل کے مطابق وہ متعین ہوتے ہیں۔ اس لئے قرآنِ کریم کی تفسیر ان لوگوں (زمانہ نبوی کے لوگوں) کے لئے آسان تھی۔ حضور ﷺ صرف آیات پڑھ کے سناتے تھے، لوگ فوراً مطلب سمجھ جاتے تھے، اور ہمارے لئے مشکل ہوجاتا ہے کہ یہ ضمیر کدھر لوٹتی ہے؟ کون تھا؟ کیا خرید کے لاتا تھا؟ کس طرح سے تھا؟ جس وقت تک یہ واقعہ ذکر نہ کیا جائے، اس وقت تک آیت کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔ ورنہ ان لوگوں کے لئے اس میں کوئی دُشواری نہیں تھی جن کے سامنے یہ واقعات پیش آتے تھے، وہ فوراً سمجھ جاتے تھے کہ مَنْ یَّشْتَرِیْ کا مصداق کون ہے؟ اور لَهْوَ الْحَدِيْثِ کا مصداق کیا ہے؟ ان کے سامنے بات نمایاں تھی۔

تماش بینوں کا طرزِ عمل اور انجام

لوگوں میں سے بعض وہ ہے جو خریدتا ہے غفلت میں ڈالنے والی بات لَهْوَ الْحَدِيْثِ کا معنی یوں ہوجائے گا، کھیل کی بات، غفلت میں ڈالنے والی بات، تاکہ بھٹکا دے اللہ کے راستے سے بغیر علم کے۔ ہے جاہل، کوئی اور دلیل تو ہے نہیں، کھیل تماشے میں لگا کے لوگوں کو بھٹکانا چاہتا ہے، اور اللہ کے راستے کا ہنسی مذاق بنائے اُڑائے، جس طرح سے جو تماشے کے شیدائی ہوتے ہیں اور فلمی دُنیا کے چسکاری لوگ جتنے بھی ہیں، ان کے سامنے نیکی کی بات آئے تو اس کا مذاق بھی اُڑاتے ہیں، یہ تو قاعدہ ہے کہ جب انسان غفلت کی طرف جائے گا، کھیل تماشے میں لگے گا، تو اس کو نیکی کی باتیں اچھی نہیں لگیں گی، ان کا وہ مذاق اُڑائے گا۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ: چونکہ مَن کے اندر جمع کا معنی تھا، تو معنیٰ اس کا مصداق جمع ہے، اس لئے اُولٰٓئِكَ کہا اور جمع سے تعبیر کردیا گیا۔ یہی لوگ ہیں کہ ان کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ جب غفلت میں پڑیں گے، تو دوسری طرف سے بات چھوٹ جائے گی کہ اللہ کی

آیات سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے۔" جب اس پر اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو تکبر کے ساتھ پیٹھ پھیر کے چل دیتا ہے، گویا کہ اس نے ان آیات کو سنا ہی نہیں، گویا کہ وہ بہرا ہے"۔ جس طرح سے قرآنِ کریم میں دوسری جگہ کافروں کو "صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ" کہا گیا، یہاں وہی بات ہے، ایسے گزر جاتا ہے گویا کہ سنا ہی نہیں۔ اس کے کانوں میں ثقل ہے، یہ بہرا ہے۔ خبر دے دو اس کو دردناک عذاب کی۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: یہ وہ لوگ آ گئے جو غفلت میں نہیں پڑتے، قصے کہانیوں میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتے، ناولوں میں گھنٹے کے گھنٹے برباد نہیں کرتے، فلمیں دیکھتے ہوئے اپنے وقت کو ضائع نہیں کرتے۔ ان کے مقابلے میں۔ کیونکہ "لھو الحدیث" کا مصداق یہ سب چیزیں ہیں۔ جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں ان کے لئے خوش حالی کے باغات ہیں، ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اس میں۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے اَیْ وَعَدَ اللّٰهُ وَعْدًا حَقًّا۔ وہ زبردست ہے اور حکمت والا ہے۔

دلائلِ قدرت اور رَدِّ شرک

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا: یہ آیت ایسے ہی ہے جیسے بہ لفظہٖ آپ کے سامنے سورۂ رعد کی ابتدا میں آئی تھی۔ پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو بغیر ستونوں کے۔ تَرَوْنَهَا: "ھا" کی ضمیر اگر عَمَدٍ کی طرف لوٹائی جائے تو تَرَوْنَهَا صفت بن جائے گا عَمَدٍ کی۔ اور غیر اس کے اوپر داخل ہو جائے گا۔ بغیر ایسے ستونوں کے جن کو تم دیکھتے ہو، یعنی بغیر ستونِ مرئیہ کے، ایسے ستونوں کے ساتھ اللہ نے پیدا کیا جو تمہیں نظر نہیں آتے۔ غیر کے ساتھ نفی کا معنی پیدا ہو گیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قدرت کے ستون تو بنائے ہیں لیکن وہ مرئی نہیں ہیں، دیکھے نہیں آتے۔ یا تَرَوْنَهَا کی ضمیر سمٰوٰت کی طرف لوٹا لو، تو یہ علیحدہ بات ہو جائے گی۔ پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو بغیر ستونوں کے، دیکھتے ہو تم ان آسمانوں کو (مظہری، نسفی، آلوسی)۔ وَاَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ: اور ڈالے اللہ تعالیٰ نے زمین میں بوجھل پہاڑ۔ رواسی راسیۃٌ کی جمع ہے۔ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ: اَیْ لِئَلَّا تَمِیْدَ بِكُمْ تاکہ تمہیں لے کے ایک طرف کو مائل نہ ہو جائے، تاکہ نہ مائل ہو جائے تمہارے ساتھ، جھک نہ جائے کسی ایک طرف کو۔ وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ: پھیلایا اللہ تعالیٰ نے زمین میں ہر قسم کے دابہ کو۔ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً: اور اتارا ہم نے آسمان سے پانی۔ فَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِیْمٍ: پھر اُگایا ہم نے زمین کے اندر ہر مفید قسم کو، ہر فائدہ مند قسم کو، مختلف قسمیں جو فائدہ پہنچانے والی ہیں۔ هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ: یہ تو اللہ کی مخلوق ہے جس کی طرف ہم نے نشاندہی کی۔ آسمان، زمین، پہاڑ، ہر قسم کے دواب، پانی کا اُتارنا، نباتات کا اُگانا، یہ تو اللہ کی مخلوق ہے، اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزیں ہیں۔ فَاَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهٖ: پس دکھاؤ تم مجھے، کیا پیدا کیا ان لوگوں نے جن کو اللہ کے علاوہ تم نے بنا رکھا ہے۔ اللہ کے علاوہ جن کو تم شرکاء قرار دیتے ہو، اللہ کے علاوہ جن کو پوجتے ہو، انہوں نے کیا پیدا کیا ہے؟ ذرا دکھاؤ تو سہی۔ تو جب وہ خالق نہیں، تو کسی اعتبار سے وہ مستحقِ عبادت بھی نہیں۔ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ: بل کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کو یہ دکھا سکیں، بلکہ ظالم لوگ صریح گمراہی میں ہیں، بلا وجہ ہی ان کو خالق کے برابر ٹھہرائے ہوئے ہیں، اور جس طرح

سے خالق کی عبادت اور طاعت کی جاتی ہے اسی طرح سے ان کی کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ظالم لوگ صریح گمراہی میں ہیں۔

ظالم: مشرک۔ جس طرح سے آگے آرہا ہے اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ۔ اور اصل میں ظلم کا معنی ہوتا ہے کسی کا حق تلف کرنا ''وضع الشیء فی غیر محلہ'' جہاں اس کا حق ہے وہاں نہ رکھا جائے، کسی دوسری جگہ میں رکھ دیا جائے۔ تو اللہ تعالیٰ کے حقوق کو تلف کرنا، خصوصیت سے جو حق توحید والا ہے، اس کو تلف کرنا بہت بڑا ظلم ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ

پکی بات ہے کہ ہم نے لقمان کو حکمت دی تھی، کہ تو اللہ کا شکر ادا کر، اور جو بھی شکر ادا کرے گا سوائے اس کے نہیں وہ اپنے نفع کے لئے کرے گا، اور

مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ⑫ وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ

جو کوئی ناشکری کرے تو بے شک اللہ بے نیاز ہے تعریف کیا ہوا ہے ⑫ جب لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا اس حال میں کہ وہ اسے نصیحت کر رہا تھا

يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ⑬ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ

اے بیٹا! اللہ کے ساتھ شریک نہ ٹھہرا، بے شک شرک البتہ ظلم عظیم ہے ⑬ ہم نے انسان کو تاکید کی ہے اس کے والدین کے متعلق،

حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ؕ

اُٹھایا اس کو اس کی ماں نے کمزوری پر کمزوری برداشت کرتے ہوئے، اور اس کا جدا کرنا دو سال میں ہے، کہ شکر ادا کر میرا بھی اور اپنے والدین کا بھی،

اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ⑭ وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا

میری طرف ہی لوٹنا ہے ⑭ اگر وہ تجھے مجبور کریں کہ تو میرے ساتھ شریک ٹھہرا ایسی چیز کو جس کے متعلق تجھے کوئی علم نہیں، تو پھر ان دونوں کا کہنا نہیں ماننا

وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ۫ وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ

لیکن دنیا میں ان کے ساتھ اچھا ساتھ دیجیو، اور اتباع کر اس شخص کی جس کا میری طرف رُجحان ہے، پھر میری طرف تم سب کا لوٹنا ہے،

فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ⑮ يٰبُنَيَّ اِنَّهَاۤ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ

پھر میں تمہیں بتاؤں گا، تم کیا عمل کرتے تھے ⑮ بیٹا! بات اصل یہ ہے کہ اگر کوئی عمل رائی کے دانے کے برابر ہو،

فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ

پھر وہ کسی چٹان کے اندر ہو، یا آسمانوں میں ہو یا زمین میں ہو، اللہ تعالیٰ اس عمل کو لے آئے گا، بے شک اللہ تعالیٰ باریک بین،

خَبِيْرٌ ⑯ يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ
خبر رکھنے والا ہے ⑯ بیٹا! نماز کو قائم کیا کر، اچھائی کا حکم دیا کر، اور برائی سے روکا کر،اور جو تکلیف پہنچے اس پہ
اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ⑰ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي
صبر کیا کر، یہ ہمت کے کاموں میں سے ہے ⑰ اور نہ پھیرا کر تو اپنا رخسارہ لوگوں کے لئے، زمین کے اُوپر اکڑتا
الْاَرْضِ مَرَحًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ⑱ وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ
ہوا نہ چلا کر، بے شک اللہ تعالیٰ نہیں پسند کرتا ہر اکڑنے والے فخر کرنے والے کو ⑱ اور اپنے چلنے میں میانہ روی اختیار کر،
وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۭ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ⑲
اور اپنی آواز کو بھی پست کیا کر، بے شک آوازوں میں سے بھدی آواز البتہ گدھے کی آواز ہے ⑲

تفسیر

حضرت لقمان کا تعارف

آگے آ گیا حضرت لقمان کا قصہ! لقمان کے بارے میں اس بات پر تو تقریباً اتفاق ہی ہے کہ یہ نبی نہیں، بلکہ کوئی معروف عقل مند اور صاحبِ حکمت انسان گزرے ہیں، اللہ والے تھے، اللہ کے مقبول بندے تھے، صاحبِ حکمت تھے، دانش مند تھے، علم وعمل کی اللہ نے توفیق دی ہوئی تھی، تقریباً اس بات پہ اتفاق ہے کہ یہ نبی نہیں ہیں۔ اس لئے یہاں یہ واقعہ ذکر کیا جارہا ہے، تو یہ ظاہر کرنے کے لئے ذکر کیا جارہا ہے کہ جو دُنیا کے اندر مسلّم عقلاء گزرے ہیں، وہ بھی شرک کو بُرا سمجھتے تھے، اور توحید کی تلقین کرتے تھے...... باقی یہ کون تھے؟ کہاں کے رہنے والے تھے؟ کس زمانے میں ہوئے ہیں؟ اس بارے میں لوگوں کی تحقیق ایک نہیں ہے۔ بعض حضرات نے ذکر کیا ہے کہ یہ حبشی غلام تھے۔ جس طرح سے ہمارے شیخ (سعدی رحمۃ اللہ علیہ) نے ''بوستان'' میں بھی ذکر کیا ہے ''شنیدم کہ لقمان سیاہ فام بود۔''(۱) میں نے سُنا ہے کہ لقمان سیاہ فام تھے، ''سیاہ فام''، ''حبشی'' کو کہتے ہیں، تو یہ حبشی تھے اور حبشی غلام تھے۔ اس قسم کے واقعات ان کے ذکر کئے گئے ہیں جو وہ اپنے آقا کی اطاعت میں، اپنے مولیٰ کی خدمت میں سرانجام دیتے تھے...... حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے وعظ کے اندر ایک جگہ حضرت لقمان کا قصہ بیان فرمایا ہوا ہے وہ بھی اسی بات پر مبنی ہے کہ یہ کسی کے غلام تھے۔ ایک باغ میں یہ کام کیا کرتے تھے، ان کا آقا آیا، اور اس نے کہا کہ ایک ککڑی لاؤ (ککڑی جس کو آپ ''تر'' کہتے ہیں، اس علاقے میں جن کو ''پابیاں'' کہتے ہیں) تو ککڑی منگائی۔ اور آپ نے دیکھا ہوگا کہ ککڑی اگر کڑوی ہو، تو

(۱) ''بوستان'' باب چہارم۔ حکایت لقمان حکیم۔ نوٹ: اکثر کا قول یہی ہے (تفسیر عثمانی)۔ نیز دیکھئے: درمنثور، سورۂ لقمان۔

انتہائی کڑوی ہوتی ہے۔اس لئے کھانے کے لئے جب لی جاتی ہے تو لوگ توڑ توڑ کے چکھ کے دیکھا کرتے ہیں کہ کڑوی تو نہیں، اور اتنی کڑوی اور بدمزہ ہوتی ہے کہ اس کا نگلنا مشکل ہوجاتا ہے۔اور جو کڑوی نہیں ہوتی وہ اچھی ہوتی ہے، لوگ کھاتے ہیں۔تو ککڑی منگائی، اس نے چھیلی، چھیل کے خود کھانے سے قبل اس نے اپنے خادم پہ شفقت کرتے ہوئے اس کی ایک قاش ایک لقمان کو دے دی، لقمان اس کو کھا گئے، چہرے پر ذرا بھی ناگواری ظاہر نہیں ہونے دی، تو مالک نے بھی سمجھا ہوگا کہ ٹھیک ہے، جس وقت اس نے منہ میں رکھی تو وہ انتہائی کڑوی تھی۔تو مالک لقمان سے پوچھتا ہے کہ جب یہ کڑوی تھی تُو نے کیوں کھائی؟ تو لقمان کہنے لگے کہ جی! جس کے ہاتھ سے بارہا میٹھی چیزیں لے کے کھائی ہیں، اگر ایک دفعہ کڑوی مل جائے تو کیا اس کو تھوک دیا جائے؟ یہ تو بڑی ناشکری ہے کہ جس کے ہاتھوں بار بار میٹھی چیزیں لے کے کھائیں، تو اگر کبھی کڑوی مل جائے تو اس کو بھی برداشت کرنا چاہیے۔کیسی حکمت کی بات ہے۔[1] جیسے ہمارے شیخ (سعدیؒ) ایسے ہی واقعہ نقل کرنے کے بعد، یعنی یہ واقعہ نہیں، کوئی اور واقعہ نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں:

آں را کہ بجائے تست ہر دم کرمے عذرش بنہ ار کند بعمرے ستمے[2]

کہ جس شخص کے تیرے اُوپر ہر وقت احسانات ہیں، تیرے ساتھ ہر وقت کرم اور مہربانی سے پیش آتا ہے، تو اگر کسی وقت نادانستہ کسی وجہ سے طبیعت کے خلاف بھی معاملہ پیش آجائے، تو اس کو برداشت کرلینا چاہیے۔یہ کیسی ناشکری ہے کہ جس کو پنجابی میں کہتے ہیں کہ ''میٹھا میٹھا ہپ اور کڑواکڑوا تھو'' کہ میٹھا ملتا جائے تو اس کو نگلتے چلے جاؤ، اور کڑوا آگیا تو اس کو تھوک دو۔ایسا نہیں، کبھی کڑوا بھی برداشت کرنا پڑجاتا ہے۔تو یہ بھی ایک شکر گزاری ہے کہ اگر کسی کے احسانات ہیں تو اگر خلافِ طبیعت معاملہ پیش آجائے تو اس کو بھی برداشت کرلینا چاہیے۔تو یہ ان کی حکمت اور دانش مندی کی ایک بات ہے...... اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ عربی تھے اور اپنی قوم کے سردار تھے، اور یہ نصیحتیں جو اپنے بیٹے کو کی ہیں، ایسے ہی کی ہیں جس طرح سے کہ اپنے بیٹے کو سرداری کے لئے لائق اور فائق بنایا جارہا ہے، کہ اس قسم کی صفات ہونی چاہئیں، تب جاکے انسان اپنی برادری، اپنی قوم، اپنے قبیلے کی قیادت کرسکتا ہے، بعض نے یوں بھی ذکر کیا ہے۔کسی نے ان کی نسبت یمن کی طرف کی ہے (حقانی)۔اور زمانے کے بارے میں زیادہ تر روایات یہی ہیں کہ داؤد علیہ السلام کے زمانے کے آس پاس ہی یہ ہوئے ہیں (آلوسی، جلالین)۔بہرحال معروف شخصیت ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ کریم میں ان کا ذِکر کرکے ان کی شان کو بہت بڑھا دیا۔حدیث شریف میں کئی روایات میں ان کا ذِکر آیا ہوا ہے، حضور ﷺ نے ان کا ذِکر کیا ہے (درِمنثور)۔اور عرب کے اندر پُرانے شعراء بھی ان کا ذِکر کرتے ہیں۔مطلب یہ ہے کہ وہ ایسے معروف آدمی تھے کہ ان کے علم کی باتیں، حکمت کی باتیں لوگ بطور ضرب المثل کے نقل کیا کرتے تھے۔تو یہاں ان کا حال بیان کرکے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ دیکھو! عقل مند لوگوں کا کام یہ ہوتا ہے کہ اپنی اولاد کو توحید کا درس دیتے ہیں، اور اچھے کاموں کی تلقین کرتے ہیں۔اور تم کیسے لوگ ہو؟ اگر تمہارے بچوں میں سے کوئی بچہ اسلام اختیار کرتا ہے، توحید اختیار کرتا ہے تو تم اس کو باندھ کے مار پیٹ کرنی شروع کردیتے ہو۔جس طرح سے سورۂ عنکبوت میں آپ کے سامنے تفصیل ذکر کی گئی تھی کہ اگر کوئی بچہ مسلمان ہوجاتا تو ماں باپ

---

(۱) دیکھیں: ''ملفوظات حکیم الامت'' ج ۳ ص ۲۶۔ج ۲۴ ص ۲۹۸۔ج ۲۸، ۲۷ ص ۲۶۵۔''خطبات حکیم الامت'' ۲۳/ ۱۹۱۔۳۰/ ۲۹۴۔

(۲) ''گلستان'' باب اوّل، حکایت نمبر ۲۵۔

اس کے اُوپر تشدد کرتے تھے، اور اپنے حق جتا جتا کر اس کو متوجہ کرتے تھے کہ شرک اختیار کر۔ سورۂ عنکبوت کی ابتدا میں سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی ماں کا ذکر کیا گیا تھا۔ تو یہ واقعہ بیان کر کے ان کو متاثر کرنا مقصود ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِکْمَۃَ اَنِ اشْکُرْ لِلّٰہِ: لَقَدْ تاکید کے لئے ہے۔ پکی بات ہے کہ ہم نے لقمان کو حکمت دی تھی۔ ''حکمت'' کا ذکر پہلے بھی آپ کے سامنے آیا تھا، دانش مندی اور علم صحیح، اور اس کے مطابق عمل کی توفیق، سمجھ داری، تفقہ فی الدین، یہ سب ''حکمت'' کا مصداق ہوتے ہیں۔ ہم نے اس کو دانش مندی دی تھی، عقل مندی دی تھی۔

شکر کی حقیقت اور صورتیں

اَنِ اشْکُرْ لِلّٰہِ: یہ کہتے ہوئے کہ تو اللہ کا شکر ادا کر۔ یہ ''اَنْ'' تفسیر ہو جائے گا قولِ محذوف کی۔ یا اس حکمت میں ایک یہ بات بھی تھی کہ تو اللہ کا شکر ادا کر، یعنی شکر والا کام یہ بھی حکمت کی بات ہے کہ جس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھایا جائے، جس کے احسانات سے فائدہ اٹھایا جائے، اس کی قدر کی جائے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ شکر زبان سے بھی ہوتا ہے کہ اسی کا ترانہ گاؤ جس نے تم پہ احسان کیا، قلب سے بھی ہوتا ہے کہ اسی کی عظمت قلب میں ہو جس نے تم پہ احسان کیا، اعضاء سے بھی ہوتا ہے کہ اس کی فرماں برداری کرو۔ شکر کی تینوں قسمیں آپ کے سامنے آتی رہتی ہیں۔ اور اصل مفہوم شکر کا یہ ہوا کرتا ہے کہ احساس ہو کہ واقعی یہ جو کچھ مجھے ملا ہوا ہے یہ اللہ کا دیا ہوا ہے، اس میں میرا کوئی ذاتی کمال نہیں۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک دفعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا ''یا اللہ! تیری نعمتیں تو ان گنت ہیں، ان کا شکر کس طرح سے ادا کیا جائے؟ اور اگر کبھی توفیق شکر کی ہو ہی جائے، تو یہ بھی تو مستقل تیری ایک نعمت ہے کہ شکر کی توفیق ہوگئی، پھر اس کا بھی آگے شکر ادا کریں، یہ تو تسلسل ہے۔ تو تیرے شکر سے کوئی شخص عہدہ برآ ہو بھی سکتا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ موسیٰ! جو بندہ یہ سمجھ لے کہ اس کے پاس جو نعمت ہے وہ میری ہی دی ہوئی ہے، بس اس نے میرا شکر ادا کر دیا۔[1] یہ بات کہنے کو معمولی ہے کہ انسان اپنا کمال نہ سمجھے بلکہ نعمت کو اللہ کی طرف نسبت کرے، لیکن حقیقت میں بہت مشکل ہے۔ جب کسی کو کوئی کمال حاصل ہوتا ہے تو انسان اکڑتا ہے، گردن اُونچی ہوتی ہے، یہ سمجھ کے کہ یہ میرا کمال ہے۔ اور جس شخص کے دل میں یہ ہے کہ سب کچھ اللہ کا ہی دیا ہوا ہے، تو اس میں تواضع پیدا ہوگی، انکسار ہوگا، کبھی وہ اکڑا اور اترایا نہیں کرتا، اور کبھی اپنا حق نہیں جتلاتا۔

شکر کا فائدہ اور ناشکری کا نقصان

اللہ کا شکر ادا کیجئے، وَمَنْ یَّشْکُرْ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِہٖ: اور جو بھی اللہ کا شکر ادا کرے گا سوائے اس کے نہیں کہ اپنے نفع کے لئے کرے گا، فائدہ اسی کا ہے، آخرت میں بھی فائدہ ہے کہ آخرت میں شکر گزاروں کے لئے بہت کچھ ہے، اور دنیا میں بھی فائدہ ہے لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ (سورۂ ابراہیم: ۷) اگر تم شکر ادا کرو گے، میں تمہیں زیادہ دُوں گا، شکر کے ساتھ نعمت میں زیادتی ہوتی ہے۔ وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ: اور جو کوئی ناشکری کرے (یہاں شکر کے مقابلے میں کُفر ہے) اور جو کوئی شکری کرے تو اللہ کا کوئی

(۱) تفسیر مظہری، سورۃ البقرۃ، آیت ۱۵۲ کے تحت۔ بحوالہ بغوی۔

نقصان نہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے تعریف کیا ہوا ہے۔ ''تعریف کیا ہوا'' کا مطلب یہ ہے کہ اس کے لئے ہر کمال ثابت ہے، وہ اِستکمال بالغیر نہیں کرتا کہ کسی غیر کی تعریف کرنے کے ساتھ اس کی شان بڑھے، یا اس کو کوئی کمال حاصل ہو، اس کے کمال کا کوئی اعتراف کرے تو اسے کمال حاصل ہو، ایسی بات نہیں ہے۔ وہ بے نیاز ہے، تعریف کیا ہوا ہے، ہر قسم کا کمال اس کے لئے ذاتی طور پہ ثابت ہے۔

حضرت لقمان کی پہلی نصیحت: رَدِّ شرک

وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ: قابلِ ذِکر ہے وہ وقت جب لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا اس حال میں کہ لقمان اپنے بیٹے کو وعظ کہہ رہا تھا، نصیحت کر رہا تھا، اے بیٹا! شرک نہ کر، اللہ کے ساتھ شریک نہ ٹھہرا، اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ: بے شک شرک البتہ ظلم عظیم ہے۔ بیٹے کو شرک سے روک رہے ہیں۔ اب یہاں مفسرین لکھتے ہیں یہ نہیں معلوم کہ بیٹا ان کا کون تھا؟ کیسا تھا؟ کیا وہ مشرک تھا اور اس کو سمجھا رہے ہیں؟ یا جس طرح سے موحد کو بھی توحید پر مزید پختہ کرنے کے لئے، جیسے مسلمانوں میں وعظ کہتے ہوئے ہم کہتے ہیں کہ شرک نہ کرو، شرک اچھی بات نہیں ہے، تو یہ بھی اپنے بیٹے کو یونہی سمجھا رہے ہیں۔ اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مشرک ہو اور اس کو راہِ راست پہ لانا چاہتے ہوں، دونوں احتمال ہیں۔ کیونکہ ان کے بیٹے کی تفصیل معلوم نہیں، کہ اس کا کیا نام تھا؟ اس کے کیسے احوال تھے؟ یہ کہیں مذکور نہیں ہے۔ ''جب اپنے بیٹے کو کہہ رہے تھے اس حال میں کہ اسے نصیحت کر رہے تھے، کہ اے میرے بیٹے! اللہ کے ساتھ شریک نہ ٹھہرا، بے شک شرک ظلم عظیم ہے۔''

والدین کی اطاعت کی تاکید

اب آگے وعظ آرہی ہے حضرت لقمان کی۔ درمیان میں اللہ تعالیٰ نے والدین کا حق ذکر کر دیا۔ یہ درمیان میں جملہ معترضہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں اور پچھلی کتابوں میں بھی جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید کی تعلیم دی ہے تو ساتھ ہی والدین کی شکر گزاری کی طرف بھی متوجہ کیا ہے۔ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (سورۂ اسراء: ۲۳)۔ اب لقمان نے بھی والدین کے ادب کی تعلیم تو دینی تھی لیکن چونکہ یہ اپنا ایک ذاتی مسئلہ بن جاتا ہے، اور اپنے بیٹے کو سمجھا رہے ہیں، اس لئے ممکن ہے کہ لقمان نے اس نصیحت میں والدین کا حق نہ یاد دلایا ہو، تو اس خلاء کو اللہ تعالیٰ نے پُر کر دیا کہ باپ نے بیٹے کو اللہ کا حق یاد دِلایا، اللہ تعالیٰ بیٹے کو ماں باپ کا حق یاد دلاتے ہیں۔ بہر حال یہ درمیان میں والدین کے حق کی یاددہانی ہوگئی، اور اس کے بعد پھر حضرت لقمان کی وعظ آرہی ہے۔ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ: یہ براہِ راست اللہ کی طرف سے ہے، یہ لقمان کی زبان سے نہیں۔ ہم نے انسان کو تاکید کی ہے اس کے والدین کے متعلق۔ وَصّٰی تَوْصِيَةً: تاکیدی حکم دینا۔ ہم نے تاکید کی انسان کو اس کے والدین کے متعلق۔ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ: وَهن کمزوری کو کہتے ہیں، وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ: کمزوری پر کمزوری برداشت کرتے ہوئے۔ اٹھایا اس انسان کو اس کی ماں نے کمزوری پر کمزوری برداشت کرتے ہوئے۔ ''کمزوری پر کمزوری'' جیسے حمل کی ابتدا میں کمزوری کم ہوتی

ہے، جیسے بڑھتا جاتا ہے کمزوری زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ یا ایک کمزوری جو حمل کے وقت میں ہوئی، دوسری کمزوری اور تکلیف جو وضع کے وقت میں ہوئی، جب بچے کو وضع کیا جاتا ہے۔ تو وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ میں مسلسل کمزوریوں کی طرف اشارہ ہے، کمزوریوں پہ کمزوریاں برداشت کرتے ہوئے اس کی ماں نے اس کو اُٹھایا۔ وَّ فِصٰلُهٗ فِیْ عَامَیْنِ: اور اس کا جدا کرنا دو سال میں ہے، یہ دُودھ چھڑانے کی طرف اشارہ ہے، چونکہ عادۃً بچہ دو سال میں دُودھ چھوڑ دیتا ہے۔ باقی یہ ہے کہ شرعاً جائز کتنی مدّت ہے؟ دو سال پہ چھڑانا ضروری ہے یا دو سال کے بعد بھی پلایا جاسکتا ہے؟ اس کی تفصیل فقہ میں موجود ہے۔ اکثر ائمہ کا قول اور ہمارے صاحبین کا بلکہ فقہِ حنفی میں مفتیٰ بہ یہی ہے کہ دو سال پہ بچے کا دُودھ چھڑا دینا چاہیے۔ اَنِ اشْكُرْ لِیْ وَ لِوَالِدَیْكَ: ہم نے انسان کو اس کے والدین کے متعلق تاکید کی ہے، یہ کہتے ہوئے کہ میرا بھی شکر ادا کر، اور اپنے والدین کا بھی شکر ادا کر۔ تو شکر کا لفظ والدین کے لئے استعمال کیا گیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے بعد اس دنیا میں سب سے زیادہ احسان انسان پر والدین کے ہوتے ہیں۔

والدہ کا حق والد سے زیادہ ہے

اور یہاں والدہ کا ذکر آیا وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّ فِصٰلُهٗ فِیْ عَامَیْنِ یہ مسلسل تکلیف ہے جو والدہ اٹھاتی ہے۔ باپ کی تکلیف اور قسم کی ہے جو بچوں کے لئے اُٹھاتا ہے، لیکن جتنی مشقت والدہ اُٹھاتی ہے اتنا بظاہر والد نہیں اُٹھاتا۔ حمل کے زمانے کی تکلیف، وضع کی تکلیف، دُودھ پلانے کے زمانے کی تکلیف، اس کا پیشاب پاخانہ برداشت کرنا، اس کو نہلانا دُھلانا، کپڑے پہنانا، سلانا، یہ ہر وقت کی خدمت گزاری والدہ کے ذِمّے ہوتی ہے۔ اس لئے حدیث شریف میں والدہ کے حق کو والد کے حق کے مقابلے میں زائد قرار دیا گیا۔ حضور ﷺ سے کسی نے پوچھا تھا کہ میں کس کے ساتھ اچھا سلوک کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اپنی ماں کے ساتھ! اس نے کہا: پھر؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اپنی ماں کے ساتھ! اس نے کہا: پھر؟ فرمایا: اپنی ماں کے ساتھ! جب اس نے چوتھی دفعہ پوچھا تو فرمایا: اپنے باپ کے ساتھ![1] جس کا مطلب یہ ہے کہ ماں کا حق تین دفعہ ذکر کیا، باپ کا حق ایک دفعہ ذکر کیا۔ تو جہاں تک خدمت اور احسان کا تعلق ہے اس میں ماں مقدم ہے، ماں کی خدمت زیادہ ہونی چاہیے۔ اِلَیَّ الْمَصِیْرُ میری طرف ہی لوٹنا ہے۔

شریعت کے خلاف والدین کی اِطاعت نہیں

تو والدین کا حق تو ہم نے یاد دِلایا، لیکن ایک بات یاد رکھئے! والدین کا حق اللہ تعالیٰ کے حق کے بعد ہے، ''لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ''[2] اگر والدین بھی اللہ کی نافرمانی کے لئے کہیں تو وہاں پھر ان کا حق نہیں ہے۔ اگر وہ اپنے خالق کا حق نہیں پہچانتے تو وہ بھی حق سے محروم ہو جائیں گے، کہ وہ اولاد پر اپنا حق بھی نہیں جتا سکتے۔ اس لئے فرمایا کہ وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ بِیْ: اگر وہ تجھے مجبور کریں، تیرے پہ زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ شریک ٹھہرا، مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ: ایسی چیز کو جس کے متعلق تجھے

---

(۱) بخاری ۸۸۳/۲، باب من احق الناس۔ مشکوۃ ۴۱۸/۲، باب البر والصلۃ کی پہلی حدیث۔

(۲) مشکوۃ ۳۲۱/۲، کتاب الامارۃ، فصل ثانی۔ نیز: مسلم ۱۲۵/۲، باب وجوب طاعۃ الامراء۔ ولفظہ: لَا طَاعَةَ فِیْ مَعْصِیَةِ اللهِ۔

کوئی علم نہیں، یہ قید اتفاقی ہے کیونکہ کوئی شریک نہیں ہے، کسی شریک کے متعلق کوئی دلیل نہیں پیش کی جاسکتی کہ کوئی اللہ کا شریک ہے۔ اگر وہ تیرے پہ زور ڈالیں کہ تو شریک ٹھہرا میرے ساتھ ایسی چیز کو جس کے لئے تیرے پاس کوئی علم نہیں، فَلَا تُطِعْهُمَا: تو پھر ان دونوں کا کہنا نہیں ماننا، پھر والدین کی بات نہ مانیو۔

مشرک والدین کے ساتھ بھی اچھے برتاؤ کا حکم

وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا: لیکن دُنیا میں ان کے ساتھ ہمیشہ اچھا ساتھ دیجیو، مصاحبۃ: ساتھ دینا۔ ساتھ دوان کا دنیا میں اچھے طریقے سے، یعنی مشرک ہونے کے باوجود بھی والدین کی خدمت بچوں کے ذمے ضروری ہے۔ اس لئے اگر مسلک کا اختلاف ہو تو مسلک کے اختلاف میں والدین کا حق ساقط نہیں ہوجاتا، بات اگرچہ نہیں مانی جائے گی، ان کے کہنے کے مطابق ہم گناہ کو اختیار نہیں کریں گے، گمراہی کو اختیار نہیں کریں گے، باقی اگر وہ گمراہ ہیں، کافر ہیں، مشرک ہیں، تو بھی دنیا کے اندر ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا چاہیے، ان کے نان نفقے کا خیال رکھو، بدنی خدمت کی ضرورت ہے، کرو، لیکن بات نہیں ماننی۔ وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ: ایسے موقع پر اتباع کرو ایسے شخص کی جس کا میری طرف رجحان ہے، جو میری طرف رجوع کئے ہوئے ہے اس کے پیچھے لگ جاؤ۔ والدین کو چھوڑ دو، نظریے اور عقیدے کے اعتبار سے اتباع اسی کی کرو جس کا میری طرف رُجحان ہے۔ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ: پھر میری طرف تم سب کا لوٹنا ہے، فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: پھر میں تمہیں بتاؤں گا، تم کیا عمل کرتے تھے، اس وقت سب حقیقت سامنے ہوجائے گی، تو وہاں والدین کو ان کے نظریے اور عقیدے پر جزا و سزا ہوگی، تمہیں تمہارے نظریے اور عقیدے پہ ہوگی، اس لئے والدین کی اتباع میں شرک کرنا جائز نہیں ہے، خدمت ان کی خوب کرو۔

حضرت لقمان کی مزید نصائح

آگے پھر حضرت لقمان علیہ السلام کا وعظ آ گیا۔ يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ: اس میں اللہ تعالیٰ کے علم کے احاطے کو ذکر کیا جارہا ہے، کیونکہ ہر وقت یہ سمجھنا کہ ہم اللہ کے سامنے ہیں، ہمارا کوئی عمل اللہ سے مخفی نہیں، یہ بھی انسان کے اعمال کو درست کرنے والی بات ہے، جب بھی انسان گناہ پر جرأت کیا کرتا ہے، تو اس طرح سے کرتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ کسی کو پتا نہیں چلے گا، بات مخفی رہ جائے گی۔ گناہ کا جذبہ اخفاء پہ مبنی ہے، اس لئے حضور ﷺ سے کسی نے پوچھا تھا کہ یارسول اللہ! گناہ کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "مَا حَاكَ فِيْ نَفْسِكَ وَكَرِهْتَ اَنْ يَّطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ"[1] گناہ وہ چیز ہے جو دِل میں تردّد پیدا کردے۔ یہ بھی دیکھ لینا، جب بھی آپ کسی بُرے کام کی طرف متوجہ ہوں گے، تو دل پہلے ٹھک ٹھک کرتا ہے، یہ باطنی طور پہ تنبیہ ہے کہ یہ ٹھیک نہیں۔ اور دُوسری علامت ذکر فرمائی کہ اس بات پر لوگوں کا مطلع ہوجانا تجھے پسند نہ ہو، یعنی تو اس کو چھپانا چاہے، تو یہ چاہے کہ کہیں کسی کو پتا نہ چل جائے۔ بس! جس بارے میں تیرے دِل میں یہ آئے کہ کہیں کسی کو پتا نہ چل جائے، سمجھ لے وہ بُرا کام ہے...... تصوّف میں بھی اللہ تعالیٰ کے علم کا استحضار بہت اعلیٰ مراقبہ ہے، اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى (سورۂ علق: ۱۴) اس آیت کا جو مراقبہ کراتے

---

(۱) مسلم ۲/ ۳۱۴ باب تفسیر البر والاثم۔ مشکوٰۃ ۲/ ۴۳۱ باب الرفق والحیاء۔

ہیں،تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر وقت یہ استحضار ہے کہ ہمارا کوئی عمل، ہمارا کوئی خلق، کسی قسم کا کردار مخفی نہیں، اللہ ہر وقت جانتا ہے، ہر وقت ہم اس کے سامنے ہیں، یہ علمِ الٰہی کا اِستحضار اخلاق اور اعمال کو دُرست کرنے والی بات ہے۔ تو حضرت لقمان بیٹے کو یہی بات یاد دِلاتے ہیں: يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ: لفظ مثقال میں دو قراء تیں ہیں، ایک نصب کے ساتھ ہے، اس صورت میں اِنَّهَآ کی ''ھا'' ضمیر خصلت کی طرف راجع ہے اور تَكُ میں ''ھا'' ضمیر کا مرجع بھی خصلت ہے اور یہ ضمیر تَكُ کا اسم ہے اور مثقال اس کی خبر ہے۔ اور دُوسری قراءت مثقال کے رفع کے ساتھ ہے، اس صورت میں اِنَّهَآ کی ''ھا'' ضمیر ضمیر قصہ ہے، اور تَكُ فعل تام ہے، اور مثقال تَكُ کا فاعل ہے، اور تَكُ مؤنث کا صیغہ فاعل کے مضاف الیہ کا اعتبار کرتے ہوئے لایا گیا ہے۔ تو لقمان کہتے ہیں کہ بیٹا! بات اصل یہ ہے کہ اگر خصلت رائی کے دانے کے برابر بھی ہو، کوئی عمل رائی کے دانے کے برابر ہو، اتنا سا یعنی بالکل چھوٹا، رائی کا دانہ دانوں میں سے بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ: پھر وہ کسی چٹان کے اندر ہو، چٹانوں میں گھس کے کہیں کرلو، جن میں کوئی روشن دان نہیں۔ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ: یا آسمانوں میں ہو جو مکان کے اعتبار سے بہت دُور ہے، یا زمین میں ہو جہاں تاریکی ہی تاریکی ہے۔ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ: اللہ تعالیٰ اس خصلت کو اس عمل کو لے آئے گا، اللہ سے مخفی نہیں ہے۔ اس لئے جہاں بھی کرو، یہ سمجھ کے کیا کرو کہ ایک دِن اس عمل نے ظاہر ہونا ہے، اللہ کے علم میں ہے۔ پہاڑوں میں چھپے ہوئے ہو تو یہی سمجھو، بلندیوں پہ چڑھ جاؤ تو یہی سمجھو، زمین میں گھس جاؤ تو یہی سمجھو، تہہ خانوں میں جا کے کام کرو تو بھی یہی سمجھو کہ اللہ تعالیٰ اس عمل کو لائے گا اور یہ ظاہر ہو جائے گا۔

نیکی اور گناہ کے اَثرات نمایاں ہوجاتے ہیں

چنانچہ حدیث شریف میں سرورِ کائنات ﷺ ریاکاری سے روکتے ہوئے کہ انسان کو دکھلاوا نہیں کرنا چاہیے، یہی بات فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی چٹان میں گھس کے عمل کرے، چاہے اچھا ہو یا بُرا ہو، جس کا کوئی روشن دان نہیں اور کوئی اس کو دیکھنے والا نہیں، تو اللہ تعالیٰ اس عمل کو بھی ظاہر کردیں گے۔[1] حدیث شریف میں یہ لفظ آتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسے انسان کو ایک چادر پہنا دیتے ہیں، جس کے ذریعے وہ پہچانا جاتا ہے۔[2] مطلب یہ ہے کہ گناہ کو چھپانے کی کوشش نہ کرو، وہ ظاہر ہو کے رہے گا۔ نیکی کو ظاہر کرنے کی کوشش نہ کرو، وہ خود بخود ظاہر ہوجائے گی۔ تو تم اپنی نیت کے ساتھ اپنے عمل کو کیوں برباد کرتے ہو۔ ''چادر پہنایا جاتا ہے انسان جس کے ذریعے سے پہچانا جاتا ہے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اوپر آثار طاری ہوجاتے ہیں۔ آپ سوچ لیجئے! جن کو آپ سمجھتے ہیں کہ یہ بُرے ہیں، بُرے کام کرتے ہیں، بُری حرکتیں کرتے ہیں، بدمعاش ہیں، آپ کے دِل میں ان کے متعلق یہ جو خیال آتا ہے، تو ان کو بدمعاشی کرتے ہوئے آپ نے دیکھا نہیں ہوتا، وہ بدمعاشی چھپ کے کرتے ہیں، گناہ علیحدگی میں کرتے

---

(۱) لَوْ اَنَّ رَجُلًا عَمِلَ عَمَلًا فِيْ صَخْرَةٍ لَا بَابَ لَهَا وَلَا كُوَّةَ خَرَجَ عَمَلُهٗ اِلَى النَّاسِ كَائِنًا مَا كَانَ. مشکوٰۃ ۴۵۶/۲، باب الریاء، فصل ثالث۔ شعب الایمان، رقم ۶۵۴۱۔

(۲) مَنْ كَانَتْ لَهٗ سَرِيْرَةٌ صَالِحَةٌ اَوْ سَيِّئَةٌ اَظْهَرَ اللّٰهُ مِنْهَا رِدَاءً يُعْرَفُ بِهٖ. مشکوٰۃ ۴۵۶/۲، باب الریاء، فصل ثالث۔ شعب الایمان، رقم ۶۵۴۳۔

ہیں،لیکن ان کے چہروں پر، ان کے بدن پر، ایسے اثرات طاری ہوجاتے ہیں کہ دیکھنے والا آدمی سمجھتا ہے کہ یہ بدمعاش ہے، دیکھنے والے کے دل میں ان کی کبھی عزت نہیں آسکتی۔اور اسی طرح سے کوئی آدمی چھپ چھپ کے رات کو نوافل پڑھتا ہے، تہجد پڑھتا ہے، اللہ اللہ کرتا ہے، تو اس کے چہرے پر اس کے بدن پر ایسے اثرات آجاتے ہیں کہ جب بھی کوئی شخص اس کے اوپر نظر ڈالتا ہے تو اس کے دل پہ اثر پڑتا ہے کہ یہ آدمی نیک ہے۔تو چھپ کے بُرائی کرنے والوں کی بُرائی نمایاں ہوتی ہے کہ لوگوں کے قلوب پر اثر پڑتا ہے،لوگوں کی آنکھوں میں اس قسم کے آثار آجاتے ہیں کہ انسان پہچان لیتا ہے جس طرح سے کہا کرتے ہیں:

مے تواں نہفتن عشق ز مردم لیکن زردیٔ رنگِ رخ و خشکیٔ لب را چہ علاج؟

کہ عشق بازی کو لوگوں سے چھپا سکتے ہو،لیکن یہ جو چہرے زرد زرد ہوجاتے ہیں، ہونٹ خشک ہوجاتے ہیں، اس کو کہاں لے جاؤ گے؟ تو اس قسم کے آثار ظاہر ہوجاتے ہیں۔اسی طرح جو نیکی کرنے والے ہوتے ہیں، عبادت گزار ہوتے ہیں، تو ان کے چہرے کے اوپر اس قسم کے نورانی اثرات آجاتے ہیں کہ جن کو دیکھنے والا سمجھتا ہے کہ واقعی یہ اللہ سے ڈرنے والا آدمی ہے۔اس لیے نیکی کا دِکھلاوا کرنے کی ضرورت نہیں، نیکی اللہ خود ظاہر کردے گا۔بُرائی کو چھپانے کی ضرورت نہیں، بُرائی ظاہر ہوکے رہے گی۔

''اگر وہ خصلت، وہ کام رائی کے دانے کے برابر ہوا، پھر وہ چٹان میں ہوا، یا آسمانوں میں یا زمین میں، اللہ اُس کو لے آئے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ باریک بین، خبر رکھنے والا ہے۔''

اَمر بالمعروف، نہی عن المنکر کا فائدہ

يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ: یہ بنیادی چیز آگئی عقیدے کی تصحیح کے بعد۔ بیٹا! نماز کو قائم کیا کر۔ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ: اچھائی کا حکم دیا کر، وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ: یعنی نیک ہونے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی نیک بنانے کی کوشش کرو۔صرف یہی نہیں کہ تم نیکی کو اختیار کرو، بلکہ نیکی کے مبلغ بنو۔ یہ نہیں کہ بُرائی کو ترک کردو، بلکہ بُرائی کو مٹانے کا جذبہ لاؤ، تب جاکے انسان میں پختگی آتی ہے۔اگر ایک آدمی صرف نیکی کرتا ہے، نیکی کے لئے کہتا نہیں، تو اس میں نیکی کا جذبہ کمزور ہوجائے گا۔جب دوسروں کو نیکی کے لئے کہے گا، تو اپنا جذبہ مضبوط ہوتا ہے۔اور ایک آدمی بُرائی کو چھوڑے ہوئے ہے،لیکن بُرائی سے کراہت نہیں کرتا، دوسروں کو روکتا نہیں ہے، تو بُرائی سے بچنے کا جذبہ کمزور ہوجائے گا۔جب دوسروں کو بھی روکے گا، تو اپنا جذبہ بھی مضبوط ہوتا ہے۔''نیکی کا حکم دو اور بُرائی سے روکو۔''

تکلیف پر صبر کا حکم

وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ: جو تکلیف پہنچے اس پہ صبر کیا کر۔عام تکلیف کے متعلق بھی، کیونکہ دنیا میں رہتے ہوئے مرضی کے خلاف واقعات پیش آتے ہیں، تو ان کو برداشت کیا کرو۔اور اسی طرح سے امر بالمعروف، نہی عن المنکر میں بھی اگر کسی دشمن کی طرف سے، مخالف کی طرف سے، کوئی طعن تشنیع کوئی تکلیف کی بات ہوجائے تو اس کو بھی برداشت کیا کرو۔جب دوسروں کو کہو سنو گے تو بسا اوقات مقابلے میں کچھ باتیں بھی سُننی پڑجاتی ہیں، تو اگر ایسی کوئی بات آجائے، جو تکلیف پہنچ جائے، (تکلیف ہر وہ بات ہوتی ہے جو اپنی مرضی کے خلاف سامنے آجائے) اس کے اوپر صبر کیا کر۔ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ:مِنَ الْاُمُوْرِ الْمَعْزُوْمَةِ (آلوسی)

یہ ان کاموں میں سے ہے جن کا قصد کیا جاتا ہے، یہ کوئی ڈھیلے ڈھالے ارادے سے کرنے کے کام نہیں، پختہ عزم ہو تب یہ کام ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے "یہ ہمت کے کاموں میں سے ہیں۔" ان کاموں میں سے ہیں جن کے لئے انسان کو ہمت کرنی پڑتی ہے۔ وہ کام جن کے لیے عزم کیا جاتا ہے، پختگی اور ہمت کے ساتھ جو کام کئے جاتے ہیں یہ ان کاموں میں سے ہیں۔ یعنی امر بالمعروف اور صبر اور اقامتِ صلوٰۃ یہ سب چیزیں ہمت کے کاموں میں سے ہیں (آلوسی)۔

ملاقات کے آداب

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ: خد رُخسارے کو کہتے ہیں، اور صعر ایک بیماری ہے جو اُونٹ میں ہوتی ہے جس کے ساتھ اس کی گردن یوں مڑ جاتی ہے، جس طرح سے آدمی کو لقوہ ہو جائے تو اس کا جبڑا ایک طرف کو مڑ جاتا ہے (آلوسی)۔ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ کا معنی ہوگا، اپنا رُخسارہ نہ پھیرا کر لوگوں کے لئے یعنی اگر کوئی تیرے سامنے بات کرنے کے لیے آئے تو اس کی طرف رُخ کر کے توجہ سے بات کیا کر، متکبروں کی طرح منہ یوں نہ کر لیا کر سامنے کوئی آدمی آ جائے تو۔ منہ پھیرا نہ کر، اعراض نہ کیا کر۔ جب یوں کریں گے تو گویا کہ رخسارہ اس کے سامنے آ جائے گا۔ تو کسی کے لیے رخسارہ پھیرنے کا مطلب یہ ہے کہ منہ دوسری طرف کو کر لیا، جس طرح سے متکبرین کی عادت ہوتی ہے کہ کوئی بات کرنے کے لیے جائے تو اس کی طرف توجہ کر کے بات نہیں سنتے، بلکہ منہ دوسری طرف کو کر لیتے ہیں۔ "لوگوں کے لئے اپنے چہرے کو پھیرا نہ کر"۔ اور حضرتِ شیخ (الہندؒ) نے ترجمہ کیا کہ "گال مت پھلا لوگوں کی طرف"، گالیں پھلانا یہ بھی متکبرانہ برتاؤ کرنے کی طرف اشارہ ہے، فاخرانہ طور پر بات کرنا، جس طرح سے اونٹ بڑبڑایا کرتا ہے بھی گال پھلاتا ہے۔ "نہ پھیرا کر تو اپنا رخسارہ لوگوں کے لئے" یعنی اعراض نہ کیا کر، ان کی طرف توجہ کر کے ان کی بات کو سنا کر۔

زمین پر چلنے کا اَدب، اور تکبّر کی مذمّت

وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا: زمین کے اوپر اکڑتا ہوا نہ چلا کر۔ تیری چال بھی متواضعانہ ہونی چاہیے يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا (سورۂ فرقان: ۶۳) کے اندر جس طرح سے تفصیل ذکر کی تھی کہ اس کا یہ معنی بھی نہیں کہ بیماروں کی طرح چلو، بلکہ جس طرح سے ایک انسان کی عادت ہوتی ہے سادگی کے ساتھ۔ تیز چلنے کی ضرورت ہے تو تیز چلنا بھی ممنوع نہیں لیکن اس میں بے تکلفی ہونی چاہیے کہ نہ بھاگو اچھلو کودو، نہ اتراؤ، نہ بیماروں کی طرح چلو۔ متوسط چال جس طرح سے ہوتی ہے اسی طرح چلو۔ زمین میں اتراتے ہوئے نہ چلا کرو، تمہاری چال ڈھال سے بھی تواضع نمایاں ہو۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ: بے شک اللہ تعالیٰ نہیں پسند کرتا ہر اکڑنے والے فخر کرنے والے کو۔ اس لئے اکڑنا فخر کرنا انسان کی عزت میں اضافہ نہیں کرتا۔ جو چیز اللہ کو پسند نہیں وہ مخلوق پر بھی اچھا اثر نہیں ڈالا کرتی۔ تواضع اللہ کو پسند ہے، تو تواضع انسانوں کے دلوں پر بھی اچھا اثر ڈالتی ہے، متواضع کی عزت ہر انسان کے دل میں آتی ہے۔ اور فخر و غرور اللہ کو پسند نہیں، تو مخلوق پر بھی اس کا غلط اثر پڑتا ہے۔ اس لئے جو شخص اکڑتا ہے، اِتراتا ہے، فخر کرتا ہے، تو سامنے کوئی برا کہے یا نہ کہے، پیچھے سارے کے سارے اس کو برا کہتے ہیں، لوگوں کی نظر کے اندر کوئی عزت نہیں ہوتی، دلوں کے

اندر کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِكَ: اپنے چلنے میں میانہ روی اختیار کر۔ جس طرح سے پہلے ذکر کر دیا کہ نہ بھاگو دوڑو، اور نہ سست ہو کر چلو، بلکہ میانہ روی اور اعتدال رفتار میں ہونا چاہیے۔

آواز پست رکھنے کا حکم

وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ: اور اپنی آواز کو بھی پست کیا کر۔ زیادہ ہر وقت چیخنا چلانا شور مچانا، یہ بھی کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ پست کرنے سے یہی روکنا مقصود ہے کہ شور نہ کیا کرو، چلّا چلّا کے، گلے پھاڑ پھاڑ کے نہ بولا کرو، اپنا گلا پھاڑنا اور دوسرے کے کان پھاڑنا کوئی اچھی بات نہیں۔ اس سے نفرت دلانے کے لئے آگے کہا کہ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ: آوازوں میں سے بدتر آواز گدھے کی آواز ہے۔ اوپری آواز جو انسان کے کانوں میں نفرت پیدا کرتی ہے۔ اور گدھا ہی ایک ایسا جانور ہے کہ جب بولتا ہے تو خوب زور لگاتا ہے، سانس باہر کو نکالتا ہوا بھی، اندر کو کھینچتا ہوا بھی۔ تو جب کوئی شخص بلاوجہ اسی طرح سے چیخے گا چلائے گا، تو اس کی آواز بھی یوں ہی بھدی ہو جاتی ہے، سننے والوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔ اس لئے بات سنجیدگی کے ساتھ کیا کرو، بلاوجہ آواز اُونچی نکالنے کی ضرورت نہیں، نہ اتنی پست ہی کرو کہ دوسرا سمجھ نہ سکے۔ مطلب یہ ہے کہ موقع محل کے مطابق ہو، اگر آپ کسی مجمع کے اندر وعظ کہہ رہے ہیں اور آواز اُونچی کرنے کی ضرورت ہے، تو اُونچی کرو۔ لیکن بلاضرورت چیخنا چلّانا، یہ اچھی بات نہیں، یہ تو گدھے کی طرح ہینگنا ہوا، تو انسان ہو کے گدھوں جیسی حرکت کیوں کرے۔ اپنی بات اسی انداز سے کرو جس سے کہ گزارہ ہو جائے۔ وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِكَ: اپنی چال کے اندر میانہ روی اختیار کر۔ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ: یہ گفتار اور رفتار دونوں کا ذکر آ گیا۔ اور اپنی آواز کو پست کیا کر، اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ: بے شک آوازوں میں سے اوپری اور بھدی آواز البتہ گدھے کی آواز ہے۔ حمیر حمار کی جمع ہے۔ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِیْرَ (سورۂ نحل: ۸) جس طرح سے قرآنِ کریم میں آیا ہوا ہے۔ بغال بغل کی جمع ہے۔ حمیر حمار کی جمع ہے۔ گدھوں کی آواز تمام آوازوں میں سے اوپری اور بھدی آواز ہے۔ تو چیخنا چلّانا یہ کوئی خوبی کی بات نہیں، بلکہ بسا اوقات انسان کی آواز ایسی بھدی ہو جاتی ہے جس طرح سے کہ گدھے کی آواز ہوتی ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْكُمْ
کیا تم نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ نے مسخر کر دیا تمہارے لیے ان چیزوں کو جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، اور کامل کیا تم پر
نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ۭ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ
اپنی نعمتوں کو اس حال میں کہ وہ ظاہر ہیں اور چھپی ہوئی ہیں، اور لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو جھگڑتے ہیں اللہ کے بارے میں بغیر علم کے

وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝۲۰ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ

اور بغیر ہدایت کے اور بغیر روشن کتاب کے ۝۲۰ اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ تم اتباع کرو اس چیز کی جس کو اللہ نے اُتارا، وہ کہتے ہیں بلکہ

نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝۲۱

ہم پیروی کریں گے اسی طریقے کی جس پر ہم نے اپنے آباء کو پایا، کیا اگرچہ شیطان بلاتا ہو ان کے آباء کو آگ کے عذاب کی طرف ۝۲۱

وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗٓ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ؕ وَاِلَى

اور جو سپرد کر دے اپنی ذات اللہ کی طرف اس حال میں کہ وہ محسن بھی ہو پس تحقیق تھام لیا اس نے مضبوط حلقے کو، اور

اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝۲۲ وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ ؕ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ

اللہ ہی کی طرف انجام ہے تمام کاموں کا ۝۲۲ اور جو شخص کفر کرے تو اس کا کفر آپ کو غم میں نہ ڈالے، ہماری طرف ہی ان سب کا لوٹنا ہے

فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۲۳ نُمَتِّعُهُمْ قَلِيْلًا

پھر ہم انہیں خبر دیں گے ان کاموں کی جو انہوں نے کئے، بے شک اللہ جاننے والا ہے سینوں کی باتوں کو ۝۲۳ ہم انہیں تھوڑا سا فائدہ پہنچائیں گے

ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيْظٍ ۝۲۴ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ

پھر ہم ان کو کھینچ کے لے جائیں گے سخت عذاب کی طرف ۝۲۴ اگر تو ان سے پوچھے کہ کس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو، تو البتہ ضرور کہیں گے کہ

اللّٰهُ ؕ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۲۵ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ

اللہ نے، آپ کہہ دیجئے، سب خوبیاں اللہ کے لئے ہیں بلکہ ان میں سے اکثر جانتے ہی نہیں ۝۲۵ اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝۲۶ وَلَوْ اَنَّ مَا فِى الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ

بے شک اللہ ہی بے نیاز ہے تعریف کیا ہوا ہے ۝۲۶ اگر وہ سب درخت جو زمین میں ہیں قلمیں بن جائیں اور سمندر،

يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۲۷

مدد دیں اس کو اس سمندر کے علاوہ سات سمندر اور، تو اللہ کے کلمات ختم نہیں ہوں گے، بے شک اللہ غالب ہے حکمت والا ہے ۝۲۷

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝۲۸ اَلَمْ تَرَ

نہیں ہے تمہیں پیدا کرنا اور نہ تمہیں اُٹھانا مگر ایک ہی نفس کی طرح، بے شک اللہ سننے والا ہے دیکھنے والا ہے ۝۲۸ کیا تُو نے دیکھا نہیں

اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۫

کہ بے شک اللہ تعالیٰ داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں، اور کام میں لگا رکھا ہے سورج کو اور چاند کو

كُلٌّ يَّجْرِيْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿٢٩﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ

ہر کوئی چلتا ہے اپنے وقتِ معین تک، بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کی خبر رکھنے والا ہے ﴿٢٩﴾ یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے

وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿٣٠﴾ ع

اور وہ سب چیزیں جن کو یہ پکارتے ہیں اللہ کے علاوہ وہ باطل ہیں، اور یہ اس سبب سے ہے کہ اللہ ہی بلندی اور کبریائی والا ہے ﴿٣٠﴾

اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِيُرِيَكُمْ مِّنْ اٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّ

کیا تُو نے دیکھا نہیں کہ بے شک کشتی چلتی ہے سمندر میں اللہ کے احسان کے ساتھ تا کہ دکھائے وہ تمہیں اپنی قدرت کی آیات کا کچھ حصہ، بے شک

فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿٣١﴾ وَاِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ

اس میں البتہ نشانیاں ہیں ہر صابر شاکر کے لئے ﴿٣١﴾ اور جب ڈھانپ لیتی ہیں ان کو موجیں سائبانوں کی طرح، تو پکارتے ہیں اللہ کو

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ

اس حال میں کہ خالص کرنے والے ہوتے ہیں اس کے لئے دین کو، پھر جب اللہ انہیں نجات دے دیتا ہے خشکی کی طرف تو ان میں سے بعض

مُّقْتَصِدٌ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ ﴿٣٢﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا

اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہیں اور نہیں انکار کرتا ہماری آیات کا مگر وہی شخص جو غدار ہے ناشکرا ہے ﴿٣٢﴾ اے لوگو! اپنے رَبّ سے ڈرو اور

يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ ۫ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ

اس دن سے بھی ڈرو کہ نہیں ادا کرے گا کوئی والد اپنی اولاد کی طرف سے، اور نہ کوئی جنا ہوا اپنے والد کی طرف سے کچھ، بے شک

وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ٚ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿٣٣﴾

اللہ کا وعدہ سچا ہے، دنیوی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے، اور کوئی دھوکے باز بھی تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے اللہ کے معاملے میں ﴿٣٣﴾

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ؕ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ

بے شک اللہ اسی کے پاس ہے قیامت کا علم، اور وہی بارش اُتارتا ہے، اور وہی جانتا ہے جو کچھ رحموں میں ہے، کوئی نفس نہیں جانتا

مَاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴿۳۴﴾

کہ وہ کل کو کیا کرے گا، اور نہیں جانتا کوئی نفس کہ وہ کس علاقے میں مرے گا، بے شک اللہ تعالیٰ علم رکھنے والا ہے اور خبر رکھنے والا ہے ﴿۳۴﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اَلَمْ تَرَوْا: کیا تم نے دیکھا نہیں۔ مضارع کے اوپر "لم" داخل ہو جائے تو ماضی کے معنی میں ہوتا ہے۔ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ: کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے مسخر کر دیا تمہارے لئے ان چیزوں کو جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں۔ سَخَّرَ تسخیر: تابع کر دینا، کسی کی خدمت میں لگا دینا۔ یہاں مفہوم یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نفع کے لئے مسخر کیا، کام میں لگایا، تابع کیا ان چیزوں کو جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں۔ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ: اَسْبَغَ: کامل کیا۔ قرآنِ کریم میں دوسری جگہ لفظ ہے سٰبِغٰتٍ (سورۂ سبا:۱۱) کاملات کے معنی میں۔ کامل کیا تم پر اپنی نعمتوں کو۔ نِعَمٌ نِعْمَةٌ کی جمع ہے۔ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً: اس حال میں کہ وہ ظاہر ہیں اور چھپی ہوئی ہیں یعنی ظاہری نعمتوں کو بھی اور باطنی نعمتوں کو بھی۔ ظاہری نعمتیں وہ ہیں جو ہمارے حواس کی گرفت میں آتی ہیں، جن کو ہم ظاہر میں دیکھتے ہیں اپنی آنکھوں کے ساتھ۔ اور باطنی وہ ہیں جو عقلی استدلال کے ساتھ معلوم ہوتی ہیں۔ ظاہری باطنی، نمایاں اور چھپی ہوئی نعمتیں اللہ تعالیٰ نے تم پر پوری کیں۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ: اور لوگوں میں سے بعض وہ ہے جو جھگڑتا ہے اللہ کے بارے میں بغیر علم کے اور بغیر ہدیٰ کے اور بغیر کتابِ منیر کے۔ بِغَيْرِ عِلْمٍ کے اندر جو نفی کا معنی معلوم ہوا، یہ هُدًى اور كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ کے اُوپر جو "لا" ہے، یہ اسی نفی کی تاکید ہے۔ اور یہ تینوں لفظ آپ کے سامنے سورۂ حج میں آئے تھے۔ فرق بیان کر دیا گیا تھا کہ علم سے مراد ہے علم بدیہی، علم ضروری، جو انسان کو طبعی طور پر ہی حاصل ہوتا ہے۔ اور هُدًى سے مراد ہو جائے گا وہ علم جو کہ عقلی استدلال سے حاصل ہوتا ہے۔ اور کتاب منیر سے مراد ہو جائے گا وہ علم جو کہ نقل سے حاصل ہوتا ہے۔ تو اب اس آیت کا حاصل یہ ہوا کہ نہ تو اس کو کوئی واقفیت ہے اپنے طور پر، اور نہ ہی اس کے پاس کوئی عقلی دلیل ہے، اور نہ اس کے پاس کوئی نقلی دلیل ہے۔ تو کتابِ منیر: روشن کتاب، یا روشنی پھیلانے والی کتاب، اس سے نقلی دلیل مراد ہو گئی۔ هُدًى: راہنمائی، یہاں عقل کی راہنمائی مراد لیں گے تاکہ کتابِ منیر کے ساتھ اس کا مقابلہ نمایاں ہو جائے۔ اور علم سے مطلقاً واقفیت مراد ہے جو طبعی طور پر، علم ضروری کے طور پر، علم بدیہی کے طور پر انسان کو حاصل ہوتی ہے۔ "اللہ کے بارے میں جھگڑا کرتا ہے بغیر کسی واقفیت کے، اور بغیر کسی عقلی دلیل کے، اور بغیر کسی نقلی دلیل کے۔" وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ: اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ تم اتباع کرو اس چیز کی جس کو اللہ نے اتارا۔ قَالُوْا: وہ کہتے ہیں بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا: بَلْ اضراب کے لئے ہے کہ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کی ہم اتباع نہیں کریں گے، مطلب ان کا یہ ہے کہ جس کو تم مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قرار دیتے ہو۔ بلکہ ہم پیروی کریں گے اسی طریقے کی جس کے اوپر ہم نے اپنے آباء کو پایا۔ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ

یَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِیْرِ: کیا وہ اپنے آباء کی پیروی کرتے رہیں گے؟ اگرچہ شیطان بلاتا ہوان کے آباء کو عذابِ سعیر کی طرف، آگ کے عذاب کی طرف۔ اگرچہ شیطان ان کے آباء کو جہنم کے عذاب کی طرف بلا کے لے جا رہا ہو، تو کیا پھر بھی یہ اپنے آباء کے پیچھے لگتے رہیں گے۔ وَمَنْ یُّسْلِمْ وَجْهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ: اور جو کوئی سپرد کر دے اپنی ذات اللہ کی طرف، اپنے چہرے کو اللہ کا تابع کر دے۔ چہرے کی طرف نسبت ہے، مراد ساری ذات ہے۔ جو اپنے آپ کو تابع کر دے اللہ کے اس حال میں کہ وہ محسن بھی ہو۔ محسن سے اس کے دل کے اخلاص کی طرف اشارہ ہے۔ اچھے طریقے سے دل کے خلوص کے ساتھ اخلاص کے ساتھ اپنے آپ کو اللہ کے تابع کر دے، اللہ کے حکم کے تابع کر دے۔ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى: عروہ کہتے ہیں حلقہ یا کڑا، جس طرح سے کوئی رَسّی ہو، اور رَسّی کے اندر ایک حلقہ لگا لیا جائے، ہاتھ ڈال کے سہارا لینے کے لئے۔ الْوُثْقٰى کہتے ہیں مضبوط کو۔ یہ اوثق کی مؤنث ہے۔ عروۂ وثقیٰ: مضبوط حلقہ، مضبوط کڑا۔ استمساك: تھام لینا۔ پس تحقیق تھام لیا اس نے ایک مضبوط کڑے کو مضبوط حلقے کو، یعنی اس کو ایک بہت مضبوط سہارا مل گیا، جب آدمی کسی رسی کو پکڑ لے، اس کے حلقے میں ہاتھ ڈال لے، تو گویا کہ وہ گرنے سے بچ گیا۔ اور وہ رَسّی مضبوط ہے، ٹوٹے گی نہیں، کوئی شخص اپنی غفلت کے ساتھ چھوڑ دے تو علیحدہ بات ہے۔ چھوٹ سکتی ہے، ٹوٹے گی نہیں۔ اس کو ایسا سہارا مل گیا جس کے بعد وہ کسی خطرے میں گرے گا نہیں۔ تحقیق تھام لیا اس نے ایک مضبوط کڑے کو۔ وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ: اللہ ہی کی طرف انجام ہے تمام کاموں کا یعنی انجام کار سارے کام اللہ کے سپرد ہونے والے ہیں۔ وَمَنْ كَفَرَ فَلَا یَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ: اور جو شخص کفر کرے، اس کا کفر آپ کو غم میں نہ ڈالے۔ اِلَیْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا: ہماری طرف ہی ان سب کا لوٹنا ہے، پھر ہم انہیں خبر دیں گے ان کاموں کی جو انہوں نے کئے۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ: بے شک اللہ تعالیٰ علم رکھنے والا ہے دلوں کی باتوں کا، بے شک اللہ جاننے والا ہے سینوں کی باتوں کو۔ بأقوالِ ذاتِ الصدور۔ صدور صدر کی جمع ہوگئی، صدر سینے کو کہتے ہیں۔ دل کا راز، سینے کا بھید دونوں طرح سے یہ لفظ استعمال ہوتا رہتا ہے، تو اس لیے صدور بول کر قلوب ہی مراد ہیں۔ نُمَتِّعُهُمْ قَلِیْلًا ہم انہیں تھوڑا سا فائدہ پہنچائیں گے۔ ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ اِلٰى عَذَابٍ غَلِیْظٍ: پھر ہم ان کو کھینچ کے لے جائیں گے سخت عذاب کی طرف۔ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ: اگر تو ان سے پوچھے کہ کس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو۔ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ تو البتہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے، قُلِ آپ کہہ دیجئے الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ سب خوبیاں اللہ کے لئے ہیں۔ تو یہ مقدمہ جس وقت تسلیم کرتے ہیں، اللہ کا شکر ہے کہ اس بات کو انہوں نے تسلیم کر لیا جس کا نتیجہ توحید ہے، لیکن وہ اس میں غور کر کے توحید کو حاصل نہیں کرتے، بلکہ ان میں سے اکثر جانتے ہی نہیں، بے علم ہیں، اس قسم کے مقدمات کی بھی تفصیل نہیں جانتے اور ان میں غور نہیں کرتے، تدبر نہیں کرتے۔ بلکہ ان میں سے اکثر سمجھ نہیں رکھتے۔ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے۔ بے شک اللہ ہی غنی ہے اور حمید ہے۔ غنی: بے نیاز، جو کسی کا محتاج نہیں۔ حمید محمود کے معنی میں، تعریف کیا ہوا۔ یعنی سارے کمالات اس کے لئے ذاتی طور پہ ثابت ہیں، وہ محمود ہے، حمد کیا ہوا ہے، کسی کا محتاج نہیں۔ وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ

شَجَرَۃٍ اَقْلَامٌ: مِنْ شَجَرَۃٍ یہ مَا کا بیان ہے۔ اَقْلَامٌ یہ قلم کی جمع ہوگئی، جس کے ذریعے سے لکھا جاتا ہے۔ اگر وہ سب درخت جو زمین میں ہیں قلمیں بن جائیں۔ وَّالْبَحْرُ یَمُدُّہٗ مِنْۢ بَعْدِہٖ سَبْعَۃُ اَبْحُرٍ: اب قلم کا ذکر آ گیا تو اس کے مقابلے میں لفظ نکلے گا'' اور سمندر سیاہی بن جائے۔'' اور سمندر، مدد دے اس کو اس سمندر کے علاوہ سات سمندر اور، اس سمندر کے مددگار سات سمندر اور بنا دیے جائیں۔ مَّا نَفِدَتْ کَلِمٰتُ اللّٰہِ: تو یہ قلم اور سیاہی کا ذکر آ گیا، جس کا مطلب یہ ہوا کہ ان قلموں کے ساتھ اس سیاہی سے لکھنا شروع کریں تو اللہ کے کلمات ختم نہیں ہوں گے، سمندروں کی سیاہی ختم ہو جائے گی، اللہ تعالیٰ کی باتیں ختم نہیں ہوں گی۔ کَلِمٰتُ اللّٰہِ سے مراد اللہ کی آیات جو اس کی قدرت پر دلالت کرتی ہیں، اللہ کے تصرفات، اللہ کے افعال اور اس کی ذاتی صفات۔ اگر ان کو کوئی لکھنا شروع کرے، تو یہ سیاہیاں ختم ہو جائیں گی، قلمیں گھس جائیں گی، لکھنے والے ختم ہو جائیں گے، اللہ کی باتیں ختم نہیں ہو سکتیں۔ مَا خَلْقُکُمْ وَلَا بَعْثُکُمْ اِلَّا کَنَفْسٍ وَّاحِدَۃٍ: نہیں ہے تمہیں پیدا کرنا اور نہ تمہیں اٹھانا مگر ایک ہی نفس کی طرح، تمہارا پیدا کرنا اور مارنے کے بعد دوبارہ اُٹھانا نہیں ہے مگر ایک ہی نفس کی طرح، اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ: بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا ہے اور دیکھنے والا ہے۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُوْلِجُ الخ: کیا تو نے دیکھا نہیں کہ بے شک اللہ تعالیٰ داخل کرتا ہے رات کو دن میں، اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں، اور کام میں لگا رکھا ہے اس نے سورج کو اور چاند کو، مسخر کیا کام میں لگایا سورج کو اور چاند کو، ہر کوئی چلتا ہے اپنے وقت معین تک، اور بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کی خبر رکھنے والا ہے۔ ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْحَقُّ: اور یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے۔ اس قسم کی آیت بھی سورۂ حج میں گزری تھی، یعنی اللہ تعالیٰ کے باکمال اور ہر قسم کے کمال پر ذاتی طور پر متصف ہونے کی وجہ سے یہ تصرفات ظاہر ہو رہے ہیں۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی حق ہے، اور وہ سب چیزیں جن کو یہ پکارتے ہیں اللہ کے علاوہ، سب لچر اور باطل ہیں، اور یہ اس سبب سے ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی بلندی اور کبریائی والا ہے۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْکَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰہِ: کیا تُو نے دیکھا نہیں کہ بے شک کشتیاں (فلک کا لفظ واحد جمع دونوں کے لئے بولا جاتا ہے) بے شک کشتی چلتی ہے سمندر میں اللہ کے احسان کے ساتھ۔ '' کشتیاں چلتی ہیں'' جمع کے طور پر بھی ترجمہ کر سکتے ہیں، پھر تَجْرِیْ میں واحد کی ضمیر باعتبار جماعت کے لوٹ جائے گی۔ کشتیاں چلتی ہیں سمندر میں اللہ کے احسان سے تاکہ دکھائے وہ تمہیں اپنی قدرت کی آیات کا کچھ حصہ، بعض آیات دکھائے۔ سمندر کا اس طرح سے ہونا، کشتی کا اس میں نہ ڈوبنا، ہوا کے ساتھ چلنا، رزق کا ذریعہ بننا، یہ سب اللہ تعالیٰ کے احسانات بھی ہیں، اس کی قدرت کی آیات بھی ہیں۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوْرٍ: بے شک اس میں البتہ نشانیاں ہیں ہر صابر شاکر کے لئے۔ صَبَّارٍ: صبر کرنے والا۔ شَکُوْرٍ: شکر گزار۔ مراد کامل مؤمن، جن کی صفت ہے صبر و شکر۔ صبر و شکر کا خلق جنہوں نے حاصل کر لیا ان کے لئے اس میں نشانیاں ہیں۔ اور جو صابر نہیں، کوئی تکلیف پیش آ جائے اس کو برداشت نہیں کرتا، اور شکر گزار نہیں کہ اللہ کی نعمت آ جائے تو اس سے متاثر نہیں ہوتا۔ تو انہوں نے کیا سمجھنا ہے ان نشانیوں سے؟ وَاِذَا غَشِیَھُمْ مَّوْجٌ کَالظُّلَلِ: اور جب ڈھانپ لیتی ہے ان کو موج۔ موج کا لفظ تمر کی طرح ہے، تَمْرٌ تَمْرَۃٌ جس طرح سے واحد اور جمع میں فرق کیا کرتے ہو۔ یہاں بھی موج اور مَوْجَۃٌ۔

جس وقت ڈھانپ لیتی ہیں ان کو موجیں سائبانوں کی طرح۔ ظُلَل ظُلَّة کی جمع ہے، اس طرح سے اُوپر چڑھ آتی ہیں جس طرح سے سائبان ہوتا ہے، بادلوں کی طرح اُوپر محیط ہو جاتی ہیں۔ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ: پکارتے ہیں اللہ کو اس حال میں کہ خالص کرنے والے ہوتے ہیں اس کے لئے اپنے دین کو، طریقے کو، عقیدے کو۔ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ: پھر جب اللہ انہیں نجات دے دیتا ہے خشکی کی طرف فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ: اقتصاد کا معنی درمیانی چال چلنا، عدل کا راستہ اختیار کر لینا۔ مطلب یہ ہے کہ یہاں پھر وہ کفر و شرک سے بچتے ہیں، سیدھے راستے پر چلنے والے ہیں۔ یہاں مقتصد سے موحد مراد ہے۔ ان میں سے بعض ہوتے ہیں جو اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہیں، اور اعتدال کی راہ توحید کی راہ ہے، اور مقابلے میں بات محذوف نکل آئی کہ بعض وہ ہیں جو خشکی میں آ کے پھر شرک کرنے لگ جاتے ہیں۔ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ: اور نہیں انکار کرتا ہماری آیات کا، اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ: خَتَّار یہ لفظ ختر سے لیا گیا ہے، ختر کہتے ہیں بدترین قسم کی غداری کو، یہ لفظ وفاء کے مقابلے میں آیا کرتا ہے، ختار ہوگا غدار کے معنی میں جو اپنی زبان پر اپنے عہد پر قائم نہیں رہتا۔ ''مگر وہی شخص جو کہ غدار ہے، ناشکرا ہے''، جس کو اپنی کی ہوئی باتیں یاد نہیں رہتیں، اپنے عہد و پیمان یاد نہیں رہتے، وہی ہماری آیات کا انکار کرتا ہے۔ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ: اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو۔ رَبّ کا ذکر کیا۔ جو تمہیں کھانے کو دیتا ہے، تمہیں پالتا ہے، جس نے پیدا کیا، رَبّ میں سارے مفہوم ہیں، تو یہاں ڈرنا اس قسم کا ڈرنا نہیں جس طرح سے انسان درندے سے یا سانپ سے ڈرتا ہے، بلکہ عظمت کا ڈرنا، جس طرح سے شاگرد استاد سے ڈرتا ہے، مرید پیر سے ڈرتا ہے، بچے اپنے ماں باپ سے ڈرتے ہیں، تو یہ عظمت کا ڈرنا ہوتا ہے۔ تو یہاں بھی وہی تقویٰ مراد ہے جو اللہ کی عظمت کی بنا پر ہو کہ اس کی مخالفت سے انسان بچے۔ وَاخْشَوْا يَوْمًا: اور اندیشہ رکھو اس دن کا، اس دن سے بھی ڈرو، لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ: نہیں ادا کرے گا کوئی والد اپنی اولاد کی طرف سے یعنی کسی مطالبے کو۔ اگر اولاد پکڑی گئی اور ان پر کوئی مطالبہ ہوا کہ تم نے فلاں کام کیوں نہیں کیا، تو والد ان کی جگہ اس مطالبے کو پورا نہیں کرے گا۔ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـًٔا: اور نہ کوئی جنا ہوا یعنی بیٹا ادا کرنے والا ہوگا اپنے والد کی طرف سے کچھ، یعنی باپ پکڑا گیا اور اس پر کوئی مطالبہ ہو گیا تو بیٹا اس کے مطالبے کو پورا کر کے چھڑا نہیں سکتا۔ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ: اللہ کا وعدہ سچا ہے، اس کو ایسے ہی نہ سمجھ لینا۔ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا: دنیوی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے۔ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ: غین کے فتح کے ساتھ صفت کا صیغہ ہے، دھوکا دینے والا۔ اور غُرور غین کے ضمہ کے ساتھ مصدر ہوتا ہے۔ اور فتح کے ساتھ صبور شکور کی طرح صفت کا صیغہ ہے، دھوکے باز۔ ''اور کوئی دھوکے باز بھی تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے اللہ کے معاملے میں اللہ کے بارے میں'' شیطان یہ دھوکا نہ دے کہ اللہ غفور رحیم ہے، کوئی بات نہیں، مزے اڑا لو، اللہ بخش دے گا، آخر عمر میں جا کے توبہ استغفار کر لیں گے، کیا ضرور ہے کہ ابھی صوفی بن کے بیٹھ جائیں، اس قسم کے دھوکے میں نہ پڑ جائیو کسی دھوکے باز کی وجہ سے۔ ''اللہ کے بارے میں تمہیں کوئی دھوکا دینے والا دھوکے میں نہ ڈال دے''۔ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ: بے شک اللہ، اسی کے پاس ہے قیامت کا علم، کہ کب آئے گی۔ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ: اور وہی بارش اُتارتا ہے۔ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ: اور وہی جانتا ہے کہ رحموں میں کیا ہے، جانتا ہے

اس چیز کو جو رحموں میں ہے۔ الْاَرْحَامِ رحم کی جمع۔ یعنی مادہ کے رحم میں کیا چیز ہے؟ لڑکا ہے، لڑکی ہے؟ کامل پیدا ہوگا؟ ناقص پیدا ہوگا؟ ذہین ہوگا؟ کند ذہن ہوگا؟ بینا ہوگا؟ اندھا ہوگا؟ لنگڑا لولا ہوگا؟ صحیح سالم ہوگا؟ یہ اللہ ہی جانتا ہے جو کچھ رحموں میں ہے۔ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا: کوئی نفس نہیں جانتا کہ وہ کل کو کیا کرے گا۔ غَدًا: آنے والا کل۔ آنے والے کل میں کیا کرے گا، کسی نفس کو پتا نہیں۔ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ: اور نہیں جانتا کوئی نفس کہ وہ کس علاقے میں مرے گا، اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ: بے شک اللہ تعالیٰ علم رکھنے والا ہے اور خبر رکھنے والا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

شروع سورت میں اللہ تعالیٰ نے کافروں کا ذکر بھی کیا تھا، مفلحین مؤمنین کا ذِکر بھی کیا تھا، اور معاد اور توحید کا تذکرہ بھی تھا، اور اسی سلسلے میں حضرت لقمان علیہ السلام کی وعظ نقل کی گئی تھی، اس میں بھی خصوصیت کے ساتھ یہی دو باتیں ذِکر کی گئی تھیں کہ شرک سے بچو، توحید اختیار کرو، اور اللہ کے علم کا ہمیشہ اِستحضار رکھو کہ جو کچھ ہم کرتے ہیں، اللہ جانتا ہے، اور اللہ ان کو لائے گا۔ لانے کا مطلب یہی ہے کہ اس کا کیا ہوا اس کے سامنے آئے گا، اور اس کے مطابق اس کو جزا سزا دی جائے گی...... یہاں سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی آیات جو دلائل کے درجے کی ہیں ذکر فرمائیں، جو توحید پر بھی دلالت کرتی ہیں، اور اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کے ان تصرفات اور قدرت کے افعال کو دیکھ کے معاد کا سمجھنا بھی آسان ہو جائے گا۔ درمیان میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کچھ تسلی کا مضمون ہے، جیسا کہ ترجمے سے آپ کے سامنے یہ سب باتیں آ گئیں۔

توحید و معاد کو سمجھانے کے لئے آیاتِ قدرت اور اِنعاماتِ اِلٰہیہ کا ذِکر

حاصل یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ متوجہ فرماتے ہیں کہ دیکھو! آسمانوں میں جو کچھ ہے، زمین میں جو کچھ ہے، میں نے تمہارے نفع کے لئے مسخر کیا، یعنی اپنی قدرت سے ان کو تابع کیا، کام پر لگا دیا، ان سب کے فوائد تمہیں پہنچتے ہیں، سورج سے فائدہ تم اُٹھاتے ہو، چاند سے فائدہ اُٹھاتے ہو، زمین میں کتنی چیزیں ہیں جن سے فائدہ اُٹھاتے ہو، یہ ساری کی ساری کائنات تمہارے نفع کے لئے اللہ نے بنا دی...... اور غور کرو! کتنی نعمتیں ہیں جو اللہ نے تمہارے اُوپر کامل کیں، کچھ ظاہر بھی ہیں، کچھ باطن بھی۔ ظاہر وہی جن کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، کانوں سے سنتے ہیں، ہاتھ سے چھوتے ہیں، جن کا احساس ہمیں اپنے حواس کے ساتھ ہو جاتا ہے، یہ ظاہری نعمتیں ہیں۔ اور اپنی ہی باطنی نعمتیں کہ اللہ نے ہمارے باطن کے اندر کس قسم کی اِستعدادیں رکھیں، کیسی کیسی قابلیتیں رکھیں، اور ہمارے دل میں دماغ میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی کتنی نعمتیں ہیں جن سے ہم فائدہ اُٹھاتے ہیں یہ بھی، اور اسی طرح سے کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے، اسبابِ غیبیہ جس قسم کے اللہ تعالیٰ پیدا فرماتے رہتے ہیں، جن سے ہم فائدہ اُٹھاتے ہیں، پھر ان کی ہم تفصیلات بھی

نہیں جانتے۔ہم تو ظاہر میں دیکھ رہے ہیں کہ اللہ نے احسان فرمادیا، روٹی پکی ہوئی ہمارے سامنے آ گئی اور ہم نے کھالی، یہ ایک ظاہری چیز ہے جو آ گئی، لیکن اس روٹی کے تیار کرنے کے اندر کیا کیا اللہ تبارک وتعالیٰ نے کام کئے ہیں، کس قسم کے افعال پیدا ہوئے، اسباب ظاہر ہوئے، جن کے ساتھ یہ روٹی تیار ہو کے آپ کے سامنے آئی ہے، ذرا غور کرو! تو ایک روٹی کی تفصیل میں آپ کو یوں معلوم ہوگا، جیسے کائنات سمٹی ہوئی ہے، بادلوں کا اثر اس میں، آسمان کے ستاروں سیاروں کا اثر اس میں، موسموں کا اثر اس میں، اور زمین کا اثر اس میں، کتنے قسم کے گیس اور کتنے قسم کے اجزاء جب اکٹھے ہوتے ہیں تو پھر جا کے کوئی نباتات بنتی ہے۔ اس میں لوہے کو بھی دخل ہوا، کہ لوہے کے ساتھ یہ چیز حاصل ہوئی۔ آگ کو بھی دخل ہوا، پانی کو بھی دخل ہوا، ہوا کو بھی دخل ہوا، کتنی چیزیں ہیں جو ساری کی ساری اکٹھی ہوتی ہیں تو اکٹھی ہونے کے بعد ایک کھانے کی چیز مرتب ہو کے آپ کے سامنے آتی ہے، یہ ساری کی ساری تفصیل آپ کی آنکھوں کے سامنے نہیں، یہ باطنی نعمتیں ہیں جو اللہ نے عطا فرمائیں۔ پانی کا قطرہ آپ کو پینے کے لئے ملتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کو کس کس طرح آپ تک پہنچایا ہے؟ کیسے اس کو پیدا کرتا ہے؟ یہ تفصیل آپ نہیں جانتے۔ اور جتنا بھی کوئی تفصیل کو جانے، اس کے پیچھے اور تفصیل موجود ہے۔ یہ سب باطنی نعمتیں ہیں۔ اسی طرح غیبی مخلوق کو اللہ نے ہماری خدمت کے لئے لگادیا، فرشتے متعین ہیں، ہماری حفاظت کرتے ہیں، ہر قسم کے اسبابِ راحت کے مہیا کرتے ہیں، یہ باطنی نعمتیں ہیں، جن کو ہم اپنے حواسِ خمسہ کے ساتھ معلوم نہیں کرسکتے۔

مشرکین کی جاہلانہ گفتگو

تو اللہ تعالیٰ تو نعمتیں دیتا ہے، اللہ تعالیٰ نے کائنات ساری کی ساری تمہارے کام میں لگادی۔ لیکن پھر بھی بعضے لوگ بے علمی کے ساتھ، بے عقلی کے ساتھ، اور بغیر کسی نقلی دلیل کے، پھر اللہ کے بارے میں جھگڑا کرتے ہیں، یہ ہمیں فلاں نے دیا، یہ فلاں نے دیا، اللہ نے اپنا اختیار فلاں کو دے دیا۔ بے عقلی کے ساتھ، بے علمی کے ساتھ، نہ کوئی واقفیت، نہ کوئی کتاب جس سے اِستدلال کریں، کچھ بھی نہیں، جہالت کے اندر اس قسم کی باتیں کرتے ہیں، بنیاد سراسر جہالت پہ ہے۔ اور جب انہیں متوجہ کیا جاتا ہے کہ اللہ نے جو کچھ اُتارا اس کو مانو، کتنی سیدھی سی بات ہے۔ ثبوت اس کا مہیا ہونا چاہیے کہ یہ بات اللہ نے اُتاری ہے، تو اللہ کی اُتاری ہوئی بات کو تسلیم کرلینا چاہیے۔ تو وہ اللہ کی اُتاری ہوئی بات کے مقابلے میں اپنے آباء کے طریقے کو ترجیح دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اسی طریقے پہ چلیں گے جس طریقے پر ہم نے اپنے آباء کو پایا، اس سے ہمیں بحث نہیں کہ وہ اللہ کا اُتارا ہوا ہے یا نہیں اُتارا ہوا، وہ اپنی طرف سے دعویٰ یہی کرتے تھے (یہ تعمیم میں اس لئے کر رہا ہوں کہ ان کی طرف سے دعویٰ یہی تھا کہ وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا (سورۂ اعراف: ۲۸) یہ حکم بھی اللہ نے ہمیں دیا ہے۔ لَوْشَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا (سورۂ انعام: ۱۴۸) اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے اور ہمارے آباء بھی شرک نہ کرتے۔ یہ جاہلیت کی باتیں ہیں، ثبوت ان کے پاس کوئی نہیں تھا (یہ جو کہتے تھے) "اللہ نے حکم دیا ہے" تو اللہ کہتا ہے بتاؤ! کہاں دیا ہے حکم؟ کیا تم اس وقت موجود تھے جب اللہ نے کہا تھا؟ یا اللہ تعالیٰ نے کوئی کتاب اُتاری جس سے تم اِستدلال کرتے ہو؟ آخر دو ہی باتیں ہیں معلوم ہونے کی، یا تو مشاہدے کا دعویٰ کرو کہ ہمارے سامنے

اللہ نے کہا تھا کہ یوں کرنا، یہ مشاہدے کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتے۔ یا اللہ نے کوئی کتاب اتاری ہے، تو وہاں سے کوئی دلیل لے آؤ۔ تو جب نہ تم مشاہدے کا دعویٰ کرتے ہو، نہ اللہ کی اُتاری ہوئی کتابوں میں سے تمہارے پاس کوئی دلیل ہے، تو پھر تم یہ کیسے کہتے ہو کہ اللہ نے یہ حکم دیا اور اللہ یہی چاہتا ہے۔ تو یہ جاہلیت کی بات تھی، جس کی بنیاد کسی بات پہ نہیں ہے سوائے جاہلیت کے۔

''لَا یَعْقِلُوْنَ'' اور ''لَا یَهْتَدُوْنَ'' کی تقلید

تو اب اس قسم کا طریقہ اگر آباء کا ہو اللہ کے اتارے ہوئے طریقے کے مقابلے میں، تو اس کی اتباع کرنا سراسر جہالت ہے، یہ نجات دلانے والی نہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تمہارے آباء تو لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَهْتَدُوْنَ تھے (سورۂ بقرہ: ۱۷۰) ان کو نہ عقل تھی نہ ہدایت، نہ وہ نقلی علم رکھتے تھے، نہ عقلی علم رکھتے تھے، تو ان کے پیچھے لگنا کیا معنی رکھتا ہے؟ شیطان انہیں جہنم کی طرف بلا رہا تھا، وہ بھی جہنم کی طرف گئے، اور تم بھی ان کے پیچھے لگ کے جہنم کی طرف چلے جاؤ گے۔

غیر مقلدین کا جاہلانہ اِستدلال

تو یہاں جس تقلیدِ آباء سے روکا جا رہا ہے، یہ ایسی تقلیدِ آباء ہے جن کو شیطان بُلا بُلا کے جہنم کی طرف لے کر گیا، جو ''لَا یَعْقِلُوْنَ لَا یَهْتَدُوْنَ'' کا مصداق ہیں۔ یہ آپ کی خدمت میں بارہا عرض کر چکا کہ تقلیدِ آئمہ کے متعلق بھی بعضے جاہل یہ آیت پڑھنے لگ جاتے ہیں۔ علماء کے پیچھے لگنے کے بارے میں بھی جاہل بسا اوقات اس آیت سے استدلال کرنے لگ جاتے ہیں۔ یہ غیر مقلد قسم کے لوگ، غیر مقلد کیا، گمراہ قسم کے لوگ، ورنہ غیر مقلدوں میں بھی تو علماء کے پیچھے ان کے عوام لگتے ہیں، ہر شخص تو پوری طرح سے قرآن و حدیث کا واقف نہیں ہوتا، وہ بھی اپنے علماء سے پوچھ پوچھ کے چلتے ہیں، اصل تو گمراہ لوگ جو ہیں وہ ان باتوں کے ذریعے سے اپنے پیچھے چلانا چاہتے ہیں، دوسروں کے پیچھے سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ ورنہ جو اس قسم کی باتیں کرتے ہیں، وہ لوگوں کو کہتے ہیں کہ ہمارے پیچھے لگو، اور اپنے پیچھے لگنے کی وجہ وہ یہی بیان کرتے ہیں کہ ہماری بات علم پر مبنی ہے۔ تو جب وہ اپنے لیے علم کا دعویٰ کر کے پیچھے چلنے کی تلقین کرتے ہیں، تو جس کے پاس بھی علم ہوگا وہ دوسروں کو پیچھے چلا سکتا ہے۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا یٰٓاَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ یَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِیْٓ (سورۂ مریم: ۴۳) میرے پاس علم آ گیا ہے جو آپ کے پاس نہیں ہے، تو میرے پیچھے لگو۔ معلوم ہو گیا کہ جس کے پاس علم ہو، اس کے پیچھے تو لگنا چاہیے۔ اور یہاں جو منع کیا جا رہا ہے، روکا جا رہا ہے، مذمت کی جا رہی ہے، یہ ان آباء کی تقلید سے روکا جا رہا ہے جو شیطان کے پجاری تھے شیطان کے پیچھے لگ کے جہنم میں جا گرے، تم ان کی اتباع کرو گے تو تم بھی ان کے پیچھے جہنم میں جاؤ گے۔

ائمۂ اِسلام کی تقلید ممنوع نہیں

اور یہ علمائے حق اور ائمۂ کرام، جن کی باتیں ہم لیتے ہیں، وہ اس لئے لیتے ہیں کہ وہ ''مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ'' کو ہم تک پہنچانے کا ذریعہ ہیں، ہم ان کی باتوں کو اللہ تعالیٰ کی باتیں قرار دے کر لیتے ہیں کہ یہ اللہ کی باتیں ہمیں بتاتے ہیں، اپنی طرف سے کچھ نہیں

کہتے۔ جو اللہ نے اُتارا ہے ہم تک پہنچانے کا یہ سبب بنے ہیں، ذریعہ بنے ہیں، ہم ان پر اعتماد کرتے ہیں، وہ اللہ کی باتیں سمجھ کے ہمیں پہنچاتے ہیں، تو اللہ کی بات کے مقابلے میں ہم ان کی بات نہیں مانتے، بلکہ اللہ کے ترجمان قرار دیتے ہوئے ہم ان کی بات کو مانتے ہیں، جن کی ہر بات علمی عقلی دلیل کے ساتھ مدلل ہے۔ تو ایسے آباء کے پیچھے لگنے کی ممانعت نہیں۔

آباء دو قسم کے ہوتے ہیں

جیسے آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ آباء دو قسم کے ہو گئے۔ علم و ہدایت والے آباء، ان کی اتباع تو قرآن کریم سے ثابت ہے، یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے پوچھا تھا مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِیْ میرے بعد تم کس چیز کی پوجا کرو گے، بیٹوں نے کہا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآىٕكَ (سورۂ بقرہ: ۱۳۳) ہم اسی کو پوجیں گے جس کو تو پوجتا ہے، تیرے آباء پوجتے رہے، تیرے بزرگ، بڑے پوجتے رہے۔ وہاں بھی آباء کی طرف نسبت آ گئی کہ ہم خدا اسی کو کہیں گے جس کو خدا تو کہتا ہے، جس کو تیرے آباء کہتے رہے، آباء میں حضرت اسحاق علیہ السلام آ گئے، ابراہیم علیہ السلام آ گئے۔ اور آباء چونکہ بڑوں کے معنی میں ہے، تو اسماعیل علیہ السلام بھی اس میں داخل ہیں، مطلب یہ ہے کہ یہ حضرات جس کو اِلٰہ قرار دے کے اس کی پوجا کرتے تھے، ہم بھی اسی کی پوجا کریں گے۔ یوسف علیہ السلام نے جیل میں وعظ کہتے ہوئے کیا کہا تھا، وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْۤ (سورۂ یوسف: ۳۸) کہ میں نے تو اپنے آباء کی ملت کی اتباع کی ہے، میں تو اپنے آباء کے طریقے پہ چلتا ہوں۔ چونکہ وہ آباء اللہ کے نبی، اہل علم، اہل عقل تھے، اس لئے ان کی اتباع کمال ہے۔ جیسے دوسری جگہ فرمایا کہ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْــٴًـا وَّ لَا یَهْتَدُوْنَ (سورۂ بقرہ: ۱۷۰) تو یہاں لفظ آ گیا، اَوَلَوْ كَانَ الشَّیْطٰنُ یَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِیْرِ مطلب ایک ہی ہے، کہ اگرچہ شیطان ان کے آباء کو عذابِ سعیر کی طرف بلا کے لے جا رہا ہو تو پھر بھی اپنے آباء کے پیچھے چلیں گے؟ اور اگر چلیں گے تو اسی طرح سے یہ بھی شیطان کے متبع بن جائیں گے، یہ بھی جہنم میں جا گریں گے۔ تو آباء کے طریقے کے پیچھے نہیں چلنا چاہیے، بلکہ اللہ کے احکام کی اتباع کرنی چاہیے...... وَمَنْ یُّسْلِمْ وَجْهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ: جو شخص اپنے آپ کو اللہ کی طرف متوجہ کر دے اخلاص کے ساتھ، وَهُوَ مُحْسِنٌ نفاق نہ ہو کہ اُوپر اُوپر سے تو کہتا ہے کہ میں مسلمان ہو گیا اَسْلَمْتُ، ایسا نہیں بلکہ دل کے خلوص کے ساتھ ہو، تو اس نے ایک مضبوط سہارا تھام لیا۔ یہ تقلید آباء کوئی سہارا نہیں آخرت کے عذاب سے چھوٹنے کے لیے، بلکہ یہ تو آخرت میں عذاب میں مبتلا ہونے کا ذریعہ بن جائے گی۔ ہاں! البتہ اللہ تعالیٰ کی طرف اپنے آپ کو جھکا دینا، اللہ کے حکم کے تابع کرنا اخلاص کے ساتھ، یہ مضبوط سہارا ہے جس کے ذریعے سے انسان آخرت کے عذاب سے بچے گا۔ اور تمام کاموں کا انجام اللہ ہی کی طرف ہونے والا ہے، کسی دوسرے کا کوئی اختیار نہیں۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور کفار کو وعید

اگلے الفاظ (وَمَنْ كَفَرَ فَلَا یَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ الخ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بطور تسلی کے ہیں، کہ جو کوئی کفر کرے تو آپ اس کے پیچھے زیادہ غم نہ کیجئے، اس کے کفر کا نقصان اسے ہی ہوگا، یہ ہمارے پاس آنے والے ہیں، ہم ان کو سب بتا دیں گے جو وہ کام کرتے رہے ہیں، اور اللہ سے کوئی بات مخفی نہیں، وہ تو دلوں کی باتیں بھی جانتا ہے۔ اور یہاں کی عیش میں بھی مبتلا ہو کے بھی وہ دھوکے میں نہ

پڑیں، یہ عیش بھی ہمیشہ رہنے والی نہیں، ہم انہیں تھوڑا سا فائدہ پہنچائیں گے۔ قلیل، مقدار کے اعتبار سے بھی ہے، آخرت اس کے مقابلے میں بہت کثیر ہے مقدار کے لحاظ سے بھی، اللہ تعالیٰ نے اسے ملک کبیر قرار دیا، وَاِذَا رَاَیْتَ ثَمَّ رَاَیْتَ نَعِیْمًا وَّمُلْکًا کَبِیْرًا (سورۂ دہر: ۲۰) بہت خوش حالی، بہت بڑی سلطنت اور بہت بڑا ملک ہوگا۔ تو مقدار کے لحاظ سے بھی آخرت زیادہ ہے، اور وقت کے لحاظ سے بھی دنیا کا زمانہ قلیل ہے، اور آخرت کا زمانہ بہت طویل ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ ہم ان کو تھوڑا سا فائدہ پہنچائیں گے، وقت کے اعتبار سے بھی، اور کیت کے اعتبار سے بھی۔ پھر ان کو مضطر کر دیں گے عذابِ غلیظ کی طرف، پھر یہ کھچے کھچے جائیں گے، پھر ہم انہیں مجبور کر کے لے جائیں گے عذابِ غلیظ کی طرف، سخت عذاب کی طرف۔

اللہ کی وحدانیت کے دلائل

آگے پھر وہی توحید کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے، اور بار بار قرآنِ کریم میں یہ سوال آیا کہ اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں کو اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟ تو فوراً کہہ دیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا۔ تو آپ کہیں کہ جب خالق اس کو مانتے ہو، تو پھر مالک بھی وہی ہے، پھر اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کیوں کرتے ہو؟ اکثر بے علم ہیں، سوچتے نہیں، سمجھ نہیں رکھتے، اس بات کے تسلیم کر لینے کے بعد تو پھر انکار کی گنجائش ہی نہیں، کہ حاکم بھی اللہ ہے، حکم بھی صرف اسی کا چلے گا، کسی دوسرے کا نہیں چلے گا۔ اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے، اور وہ غنی ہے کسی کا محتاج نہیں، اور حمید ہے ہر قسم کے کمالات اس کے لئے ثابت ہیں۔ اور اس کے مقابلے میں تم جس کو بھی دیکھو، وہ سب محتاج ہیں۔ مخلوق اور محتاج یہ دونوں لفظ تقریباً مترادف ہیں۔ مخلوق کا تو معنی ہی یہی ہے کہ کسی نے پیدا کیا تو پیدا ہو گئے، اپنے طور پر یہ بننے والے نہیں، تو احتیاج تو ابتدا سے ہی شروع ہو گیا۔ اور اس کے بعد پھر ان کا باقی رہنا وہ بھی کسی کے رکھنے کے ساتھ، فنا ہو جانا کسی کے فنا کرنے کے ساتھ، ہر چیز میں احتیاج ہی احتیاج نمایاں ہے۔ اِلٰہ تو وہ ہے، عبادت تو اس کی کرنی چاہیے، جس میں کسی پہلو سے احتیاج نہیں، اور نہ وہ کسی دوسرے کی طرف سے کمال حاصل کرتا ہے، بلکہ وہ خود ذاتی طور پر صفتایا ہوا ہے، کمالات والا ہے، اس کے لئے ہر قسم کا کمال ثابت ہے، کسی سے وہ کمال حاصل نہیں کرتا۔ تو اس کا غنی حمید ہونا یہی اس کی وحدانیت کی دلیل ہے۔ اللہ کے علاوہ جس کو دیکھو گے تمہیں محتاج نظر آئے گا ...... جیسے اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ عیسائیوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ عیسیٰ اور ان کی والدہ جن کو تم اِلٰہ بنائے بیٹھے ہو کَانَا یَاْکُلٰنِ الطَّعَامَ (سورۂ مائدہ: ۷۵) وہ تو روٹی کھایا کرتے تھے۔ روٹی کھانے والا آدمی دیکھ لو! کتنا محتاج ہے؟ روٹی اس کو مہیا ہوگی، تو کتنی چیزوں سے وہ فائدہ اُٹھاتا ہے، کتنی چیزوں کا وہ محتاج ہے، تب جا کے اس کو روٹی میسر آتی ہے۔ تو کَانَا یَاْکُلٰنِ الطَّعَامَ اس کے محتاج ہونے کی دلیل ہے، روٹی کے محتاج تھے، روٹی کھاتے تھے، تو وہ خدا کس طرح سے ہو گئے؟ تو غنی اور حمید کے اندر وہی وحدانیت کی دلیل ہے۔

اللہ تعالیٰ کے کمالات غیر متناہی ہیں

اور آگے آ گیا کہ وہ اتنا کمالات والا ہے، جیسے حمید کے اندر کہا گیا کہ کمالات اس کے لئے ثابت ہیں کہ اگر یہ دنیا کے

سارے کے سارے درخت قلمیں بنالی جائیں، یعنی ان کو کاٹ کے اتنا اتنا بناؤ، جتنی قلم ہوا کرتی ہے، تو ایک درخت سے ہزاروں قلمیں نکلیں گی، اور ساری دنیا کے درختوں کا کیا اندازہ ہے، اور پھر لکھنے کے لیے سیاہی سمندر ہو، اور پھر اکیلا سمندر نہیں، بلکہ سات سمندر اس جیسے اور اس کی مدد کے طور پر لگادیں، لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّیْ (سورۂ کہف:۱۰۹) یہ سمندر ختم ہوجائیں گے اللہ کے کلمات ختم ہونے سے پہلے۔ اللہ کی باتیں ختم نہیں ہوں گی، یعنی وہ باتیں جو اللہ کے کمالات پہ دلالت کرنے والی ہیں، اور اللہ کے تصرفات، اللہ کے افعال، اللہ کے کمالات لکھتے لکھتے سیاہی ختم ہوجائے گی، قلمیں گھس جائیں گی، سارے فرشتے، سارے جن، سارے انسان لکھنے والے ختم ہوجائیں گے، اللہ کے کمالات ختم نہیں ہوسکتے۔ یہ کوئی مبالغہ نہیں، واقعہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اللہ تعالیٰ کے افعال، تصرفات، اس کا خلق، اس کی تدبیر، جتنی سمندر میں نمایاں ہے، جتنے اس نے حیوانات پیدا کئے، کس طرح سے پیدا کئے؟ ان حیوانات میں کیا فوائد ہیں؟ وہ کیا کیا کام آتے ہیں؟ سمندر کس طرح سے بنا؟ اور اس کے پانی کی کیا تاثیر ہے؟ اس میں کیا کچھ ہے؟ اگر لکھنا شروع کردیں، تو سمندر کی سیاہی تو سمندر کے اندر جو اللہ کے کمالات نمایاں ہیں وہی نہیں لکھ سکے گی...... آج سائنس کی اتنی ترقی کے باوجود، باقی کائنات کو تو چھوڑو، یہ زمین جو ہر وقت ہمارے پاؤں کے نیچے ہے لوگ اس کے اندر غور کر رہے ہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی کیا کیا چیزیں رکھی ہوئی ہیں، یا یہ زمین کن چیزوں کا مجموعہ ہے، جب سے دنیا بنی آج تک اس کے متعلق تحقیقات جاری ہیں، نئی سے نئی چیز نکلتی چلی آرہی ہے، کسی زمانے میں مٹی کا تیل نہیں تھا، پھر مٹی کا تیل نکل آیا، کسی زمانے میں گیس نہیں تھا پھر اس میں سے گیس نکل آیا، اور اس میں سونا چاندی پیتل، پتا نہیں کتنی دھاتیں ہیں؟ آئے دن کھدائی کرنے کے ساتھ نئی سے نئی چیز نکلتی چلی جارہی ہے۔ یعنی اس ترقی کے دور میں بھی کوئی سائنس دان یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ ہم نے زمین کو ہی چھان لیا کہ اس کے اندر کیا کچھ ہے؟ یہی دعویٰ بھی نہیں کرسکتا، اسی لئے آئے دن تحقیقات جاری ہیں، پہاڑوں میں، صحراؤں میں، اور دوسرے میدانوں میں، سمندر کی تہوں میں عجیب وغریب قسم کی چیزیں نکل رہی ہیں، سمندر سے نکل رہی ہیں، خشکی سے نکل رہی ہیں، آئے دن نئی سے نئی نباتات ظاہر ہورہی ہے، اگر ان چیزوں کی تفصیلات کی طرف انسان جائے، تو واقعہ یہ ہے کہ ان کی کوئی انتہا نہیں۔ اَر بہا انسان سارے کے سارے لگ جائیں، اور فرشتے ساتھ شامل ہوجائیں، جنات ہوجائیں، تو اللہ تعالیٰ کی باتوں کی اِنتہا نہیں ہے...... کسی اور طرف آپ کیوں دیکھتے ہیں؟ اپنے وجود کی طرف ہی آپ دیکھ لو، طب اور ڈاکٹری میں انسان کے اس ظاہری بدن پہ بحث ہے، اگر وہی کتابیں اکٹھی کی جائیں جو انسان کے بدن کے اجزا کی تشریح کے طور پر ہی لکھی گئی ہیں، جن کے متعلق آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ حرف آخر ہے، ایک آنکھ کے متعلق ہی طب اور ڈاکٹری کی کتابیں اُٹھا کے دیکھو! دفتروں کے دفتر بھرے پڑے ہیں، دِل اور دماغ کے متعلق جتنا کچھ لکھا جاچکا یہ بہت کم ہے اس کے مقابلے میں جتنا اور لکھا جائے گا، یا لکھا جاسکتا ہے، تو ایک انسان کے بارے میں معلومات کسی اِنتہا کو نہیں پہنچتیں، طبی طور پر اور ڈاکٹری طور پر جو صرف ایک ظاہر بدن کے اُوپر بحث کرتے ہیں، اس کی کوئی اِنتہا ہی نہیں، آئے دِن ترقی ہوتی چلی جارہی ہے، اور اس کے جو باطنی کمالات ہیں ان کا تو کہنا ہی کیا۔ بہر حال یہ کوئی مبالغہ نہیں، اللہ تعالیٰ کی ذات، کمالات لامتناہی ہیں، اور لامتناہی کا معنی ہوتا ہے کہ جو کسی حد پہ ختم ہونے والے نہیں۔ اس لئے سات سمندر کیا، اگر سو سمندر بھی ہوں تو ناکافی ہوجائیں گے، اللہ تعالیٰ کے کمالات ختم نہیں ہوسکتے، متناہی چیز تو

گرفت میں آتی ہے، سمندر متناہی ہیں۔ اور غیر متناہی چیز کی تو حد ہوتی کوئی نہیں، لا متناہی تو ہوتا ہی وہی ہے جس کی حد ہی کوئی نہیں، سمندر ختم ہو جائیں گے، سب کچھ ہو جائے گا، لیکن اللہ کے کمالات ختم نہیں ہوں گے۔ تو اتنے کمالات والا ہے، عزیز ہے، حکیم ہے، تو اس کے ساتھ تم کسی دوسرے کو شریک کس طرح سے کرتے ہو؟

اِثباتِ معاد کے لئے تصرفاتِ الٰہیہ کا ذِکر

قدرت کو ذکر کر کے کمالات کو ذکر کر کے پھر کلام منتقل ہوگئی آخرت کی طرف، کہ توحید کے ساتھ ساتھ معاد کا مضمون قرآنِ کریم میں ملا جلا آتا ہے..... تمہیں یہ مشکل معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مارنے کے بعد اُٹھائے گا کیسے؟ جیسے مشرکوں کو بھی اشکال ہوتا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ کہتے ہیں، تمہارا پیدا کرنا، تمہیں مار کے اُٹھانا، میرے لئے تو ایسے ہی ہے جیسے ایک جان کا مسئلہ ہے، جیسے ایک انسان کو پیدا کر دیا، ایسے اربوں کو پیدا کر دیا۔ جیسے ایک کو مار کے اٹھانا ہے ایسے سب کو اُٹھانا ہے، میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ سننے والا ہے دیکھنے والا ہے، اس کے سامنے ہر چیز نمایاں ہے، قدرت بھی ہر قسم کی اسی کے لئے ہے، اس کے لئے کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ آگے پھر اللہ کے تصرفات دیکھ لو، اللہ داخل کرتا ہے رات کو دِن میں، داخل کرتا ہے دِن کو رات میں۔ اس کی تفصیل بھی کئی دفعہ آپ کے سامنے ہو چکی۔ اور کام میں لگا دیا اس نے سورج کو اور چاند کو، ان میں سے ہر کوئی چلتا ہے ایک وقتِ معین کی طرف۔ اللہ تعالیٰ خبر رکھنے والا ہے تمام کاموں کی جو تم کرتے ہو۔ اور یہ اسی وجہ سے ہے کہ اللہ حق ہے، ثابت ہے، مالکِ حقیقی ہے۔ اور جن چیزوں کو یہ پکارتے ہیں اللہ کو چھوڑ کر سب لچر ہیں، باطل ہیں، جن کے اندر کوئی حقیقت نہیں۔ اور یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی علی اور کبیر ہے۔

آیاتِ قدرت

(اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ الخ)...... آگے بھی وہی آیاتِ قدرت ہیں۔ اے مخاطب! تو دیکھتا نہیں؟ کہ کشتیاں چلتی ہیں سمندر میں۔ اللہ تعالیٰ نے اس احسان کی طرف اور اس قدرت کی طرف کہ لکڑی کیسی بنائی؟ پانی کیسا بنایا؟ ہوا کے ذریعے سے کیسے چلتی ہیں؟ ایک طرف سے دوسری طرف پہنچنا، رزق حاصل ہونے کا ذریعہ بننا، یہ سب فوائد ہیں اس میں۔ دیکھتا نہیں؟ کہ کشتیاں چلتی ہیں سمندر میں اللہ کے احسان کے ساتھ تا کہ اللہ تعالیٰ اپنی نشانیاں تمہیں دکھائے، اس میں نشانیاں ہیں صابر شاکر لوگوں کے لئے، یعنی جو مؤمن کامل ہیں، جن کا تدبر تفکر صحیح ہے، وہی اس سے نشانیاں اخذ کر کے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو اللہ کی توحید کو حاصل کرتے ہیں۔ اور جب ان کو موجیں ڈھانپ لیتی ہیں، یعنی امن چین میں کشتیاں چل رہی ہیں، تو ان کو غفلت ہوتی ہے۔ اور جب ان کے اُوپر موجیں طاری ہو جاتی ہیں، جیسا کہ سائبان، بہت بڑی بڑی موجیں اُٹھتی ہیں پہاڑوں کی طرح، جیسے سورۂ ہود میں ذِکر آیا تھا،(۱) جب سائبانوں کی طرح موجیں ان کو ڈھانپ لیتی ہیں پھر یہ اللہ کو پکارتے ہیں، خالص کرنے والے ہوتے ہیں عقیدے کو۔ اور جن کو شریک ٹھہراتے ہیں، سب کو بھول جاتے ہیں تَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ (سورۂ انعام: ۴۱)، اس وقت سمجھتے ہیں کہ ان بڑی مصیبتوں سے

(۱) اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ یَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ (سورۂ نور: ۴۰)، نیز: وَهِیَ تَجْرِیْ بِهِمْ فِیْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ (سورۂ ہود: ۴۲)

نجات دِلانا صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے، یہ جو ہم نے تراش کے رکھے ہوئے ہیں، یا جن کو ہم نے پکارا اور پوجا ہے، وہ ایسے وقت میں کام آنے والے نہیں۔ اور پھر جب اللہ ان کو نجات دے دیتا ہے خشکی کی طرف، تو بعضے ہیں جو معتدل رہ جاتے ہیں، سیدھے راستے پہ چلنے والے ہوتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ بعضے وہ ہیں جو پھر آ کے شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ہماری آیات کا انکار نہیں کرتا مگر ہر غدار، جس کو اپنی باتیں یاد نہیں رہتیں، عہد کئے ہوئے معاہدے کیے ہوئے یاد نہیں رہتے۔ اور ناشکرا، جو اللہ کے احسانات کو بھول جاتا ہے، وہی ہماری آیات کا انکار کر سکتا ہے۔

قیامت کے دِن کون کس کے کام آسکے گا؟

(یٰاَیُّهَا النَّاسُ الخ)...... آگے پھر معاد کی طرف متوجہ کر دیا۔ اپنے رَبّ سے ڈرو، اس کی نافرمانی سے بچو، اور اس دِن کا بھی اندیشہ کرو، جو دِن ایک آنے والا ہے، جس میں باپ بیٹے کے، بیٹا باپ کے کوئی کام نہیں آئے گا۔ باپ سے کوئی مطالبہ ہو گیا تو بیٹا ادا نہیں کرے گا، بیٹے سے کوئی مطالبہ ہو گیا تو باپ ادا نہیں کرے گا، اور یہ نہ سمجھ لینا کہ ایسے ہی باتیں کی جا رہی ہیں جن میں واقعہ کچھ نہیں۔ نہیں۔ اللہ کا وعدہ بالکل سچا ہے، اور ایسے ہو کے رہے گا۔ مرو گے، اٹھو گے، اللہ کے سامنے پیش ہو گے، اور وہاں پھر نفسی نفسی ہوگی، اور کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا، اس لئے اپنی فکر کرو۔

''کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا'' دوسری آیات کی طرف دیکھتے ہوئے مطلب یہ ہے کہ جب دنیا سے ایمان لے کر نہیں گئے، کُفر کی حالت میں گئے ہیں، بات انہی کو سمجھانی مقصود ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ اگر کوئی شخص کُفر کے ساتھ دنیا سے چلا گیا، تو اس کے کام کوئی نہیں آئے گا، نہ باپ، نہ بیٹا۔ ہاں! البتہ اگر باپ بھی مؤمن ہے، بیٹا بھی مؤمن ہے، تو دوسری آیات میں تفصیل موجود ہے، پھر اللہ تعالیٰ ایمان کی برکت سے کسی کو سفارش کا حق دے گا، کسی کے توسل کے ساتھ اللہ تعالیٰ درجات بلند کرے گا۔ باپ کا درجہ اُونچا ہے، اللہ اولاد کو اس کے ساتھ ملا دے گا۔ اولاد آگے نکل گئی، اللہ باپ کو ان کے ساتھ ملا دے گا۔ خاوند کی وجہ سے بیوی کے درجات بلند ہوں گے، بیوی کی وجہ سے خاوند کے درجات بلند ہوں گے۔ استاد شاگرد کے کام آئیں گے، پیر مرید کے کام آئیں گے۔ لیکن یہ اس وقت جب دونوں میں سے ہر ایک کے پاس اپنا ایمان ہو۔ اعمال کی کمی بیشی یہ تعلقات کی بناء پر ٹھیک ہو سکتی ہے۔ قرآنِ کریم کی دوسری آیات اور حدیث شریف کی روایات کو دیکھتے ہوئے یہ بات واضح ہے کہ مر جانے کے بعد صالح اولاد پیچھے دُعا کرتی ہے، فائدہ پہنچتا ہے۔ اس کے پیچھے صدقہ خیرات کرتے ہیں، فائدہ پہنچتا ہے۔ تو ایمان کی دولت حاصل ہو جانے کے بعد پھر تو ایک دوسرے سے فائدہ اُٹھائیں گے، اور اگر ایمان کی دولت نہیں تو کوئی کسی کے کام آنے والا نہیں۔ باقی آیات کی طرف دیکھتے ہوئے یہ ساتھ تشریح کرنی پڑے گی۔ ورنہ ایک دوسرے سے فائدہ یہ نصوصِ صریحہ صحیحہ کے اندر آیا ہوا ہے۔ البتہ اگر کوئی کافر ہوا پھر کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ کو چھڑا نہیں سکیں گے، نوح علیہ السلام اپنے بیٹے کو چھڑا نہیں سکیں گے، نوح علیہ السلام اور لوط علیہ السلام اپنی بیوی کے کچھ کام نہیں آسکیں گے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کافر چچوں کے کام نہیں آسکیں گے، یہ سارے واقعات جو قرآن کریم میں ذکر کئے گئے ہیں، اس لئے تو ذکر کیے گئے ہیں۔

دُنیا کے دھوکے میں نہ آنا

اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ: اللہ کا وعدہ سچا ہے، ایسے ہی ہوگا جس طرح سے تمہیں کہا جا رہا ہے۔ دنیوی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے۔ یہاں کھاتے ہو، پیتے ہو، سوتے ہو، عیش آرام کرتے ہو، تو اس دھوکے میں نہ پڑیو، کہ ہمیشہ ایسے ہی رہنا ہے، بلکہ اس کو سوچا کرو کہ یہ فانی ہے، اس عیش وعشرت میں مبتلا ہو کے آخرت سے غافل نہ ہو جاؤ۔ اور نہ تمہیں کوئی دھوکا دینے والا اللہ کے معاملے میں دھوکے میں ڈال دے، کوئی کہے کہ اللہ غفور رحیم ہے، معاف کر دے گا، کوئی بات نہیں، ابھی مزے اڑا لو، آخر وقت میں سنبھل جائیں گے، پھر توبہ کر لیں گے، اس قسم کے دھوکے میں نہ آئیو، بسا اوقات انسان توبہ کے اعتماد پہ گناہ میں مبتلا ہوتا ہے، توبہ کرنے کا موقع ہی نہیں آتا کہ پہلے ہی موت آ جاتی ہے، پھر کیا کرو گے، کچھ پتا ہے؟

پانچ چیزوں کے علم کا اِحاطہ ذِکر کرنے سے مقصود اِثباتِ قیامت ہے

آگے پانچ چیزوں کا تذکرہ ہے، کہ ان کا علم اللہ کے پاس ہے، اللہ کا علم ان پہ محیط ہے۔ یہاں ان کے ذِکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مغیبات تو بے انتہا ہیں، جن کو اللہ جانتا ہے، کوئی دوسرا نہیں جانتا۔ لیکن یہ چار پانچ قسم کی چیزیں ایسی ہیں جو ہر وقت ہمارے سے تعلق رکھتی ہیں، اور انسان متوجہ ہوتا ہے، ان چیزوں کے جاننے کی طرف اس کو رغبت ہوتی ہے۔ قیامت کا ذِکر تو اس لئے ہے کہ جس وقت بھی آخرت کا ذکر آتا تھا، مشرک پوچھتے تھے، کب ہوگی؟ قیامت کے متعلق تو وہ پوچھتے تھے، اس لیے ہر وقت مشرکین کے ذہن میں سوال اُٹھتا تھا کہ یہ جو کہا جا رہا ہے کہ سب نے اکٹھے ہی جی اُٹھنا ہے، مرنے کے بعد اُٹھنا ہے، تو کب ہوگی؟ قیامت کے علم کے لیے تو وہ متلاشی تھے، ہر وقت سوال اُٹھاتے تھے۔ بتایا جا رہا ہے کہ اس کا علم بھی اللہ کے پاس ہے...... اور اس بات کو پختہ کرنے کے لئے کہ بعض چیزیں اللہ کے علم میں ہیں تمہارے علم میں نہیں، لیکن تم دیکھتے ہو کہ وہ ہو کے رہتی ہیں، اس لئے اگر تمہیں کسی چیز کا بالتعیین علم نہ ہو، تو وہ چیز واقع میں بھی نہ ہو، تو یہ تو بالکل حقیقت کے خلاف ہے۔ اسی طرح سے اگر اللہ نے تمہیں قیامت کا علم تعیین کے ساتھ نہیں دیا تو اس کا یہ معنی نہیں کہ قیامت ہے ہی نہیں...... یہ ایسے ہی ہے، بارش کو دیکھو، کسی کو پتا نہیں کب ہوگی؟ کتنی ہوگی؟ اور اس کے اترنے کے لئے کیا کیا اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اسباب پیدا ہوتے ہیں؟ کس علاقے میں ہوگی؟ کتنی ہوگی؟ کب ہوگی؟ یقینی علم اس کا کسی کو نہیں۔ لوگ اپنے قواعد کے ساتھ کچھ انکل پچو چلاتے ہیں، کبھی صحیح نکل آتی ہے، کبھی غلط۔ وہ ظنی سی بات ہوتی ہے، یقین کی کوئی بات نہیں...... اور ویسے بھی اسباب اور علامات میں غور کر کے جو علم حاصل کیا جائے وہ علم غیب نہیں ہوتا۔ طبیب اگر نبض دیکھ کے باطن کے حالات معلوم کرتا ہے کہ گرمی ہے، سردی ہے، خشکی ہے، قبض ہے، کیا ہے، کیا نہیں ہے، تو یہ علم غیب نہیں، کیونکہ یہ تو ایک علامت ہے جس کے ذریعے سے پہچانا۔ تو علامتوں کے ذریعے سے پہچاننا، یہ علم غیب نہیں۔ علم غیب وہ ہوتا ہے جس کو کسی ظاہری ذریعے سے حاصل نہ کیا جائے، خود بخود ہو۔ اب بارش کے بارے میں کسی کو قطعی علم نہیں، آثار اور علامات سے کچھ پہچانتے ہیں، کبھی صحیح، کبھی غلط۔ پاکستان میں تو آپ نے بیسیوں دفعہ دیکھا ہوگا۔ آج اخبار میں آئے گا یا ریڈیو پر محکمۂ موسمیات کی طرف سے اعلان ہوگا کہ کل کو موسم خشک رہے گا، اور دھڑا دھڑ بارش ہو جاتی ہے۔ اور ان کی

پیش گوئی ہوتی ہے کہ کل کو فلاں فلاں جگہ بارش ہونے کا اِمکان ہے، تو سارا دن سورج چمکتا رہتا ہے، دُھوپ ہی نکلی رہتی ہے، یہ تو آئے دن کے واقعات ہیں۔ حالانکہ کروڑ ہا روپے حکومت محکمۂ موسمیات پہ خرچ کرتی ہے، لیکن ان کے نتائج بالکل ظنی، کبھی صحیح، کبھی غلط۔ بارش ہوتی تو ہے، اور ایک خاص مقدار میں ہوتی ہے لیکن پہلے کسی کو پتا نہیں، تو نہ پتا ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا واقعہ بھی کوئی نہیں...... اسی طرح سے جب کسی کی بیوی حاملہ ہو جائے تو انسان سوچتا ہے، اس کا شوق ہے کہ پتا چلے کہ لڑکا ہوگا، لڑکی ہوگی، کامل ہوگا، ناقص ہوگا، خوبصورت ہوگا، بدصورت ہوگا، ذہین ہوگا، کند ذہن ہوگا؟ انسان کے دل میں سوالات اُٹھتے ہیں، لیکن ہزار جتن کر لو کیسے جان سکتے ہو۔ تو تمہیں معلوم نہیں لیکن واقعہ ہے...... اور اسی طرح سے آپ اپنے مستقبل کے متعلق سوچتے ہیں کہ ہم یہ کریں گے وہ کریں گے، بڑے بڑے منصوبے انسان بناتا ہے، لیکن بالکل پہلے قدم پہ فیل ہو جاتا ہے۔ افراد کی زندگی میں بھی آئے دن ناکامیاں اپنے اِرادوں اور خواہشات کے خلاف ہوتی رہتی ہیں۔ اور حکومتوں کی سطح پر بھی، حکومت منصوبے بناتی ہے، اس سال اتنی گندم پیدا ہوگی، اس سال اتنے چاول پیدا ہوں گے، اس سال ہم اس میں خود کفیل ہو جائیں گے، لیکن ذرا سا موسم کا ہیر پھیر سب منصوبوں کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ تو جن چیزوں کے تم جاننے کے مشتاق ہو، وہ تم معلوم نہیں کر سکتے، لیکن اس کے باوجود تم سمجھتے ہو کہ ہوگا ایسے ہی، واقعات ہوتے ہیں اور تمہیں پتا نہیں...... اور اپنی زندگی کے متعلق انسان سوچتا ہے کہ ہم نے کہاں مرنا ہے، یہ خیال آتا ہے، باوجود اس بات کہ معلوم ہے کہ ہم یہاں رہتے ہیں، یہاں ہمارا آنا جانا ہے، لیکن اس کے باوجود پتا نہیں کہ مرنا کہاں ہے، ایک آدمی کسی تقریب میں، بیاہ شادی میں شرکت کرنے کے لئے اچھا لباس پہن کے خوشی کے ساتھ نکلتا ہے، آئے دن اخبار میں پڑھتے رہتے ہو، بھری ہوئی برات کی بسیں ٹکر کھا کے مر جاتی ہیں، گئے تھے خوشیاں منانے لیکن لاش واپس آ جاتی ہے، جہاں کوئی جگہ متعین ہوتی ہے وہیں جا کے انسان مرتا ہے، کوئی نہ کوئی ضرورت ایسی سامنے آ جاتی ہے کہ انسان اُدھر کو چلا جاتا ہے۔ مرتے ہو، جگہ کا پتا نہیں، تو پتا نہ ہونے کی بنا پر تم انکار کر دو کہ ہم نے مرنا ہی نہیں، یہ کون سی عقل مندی ہے۔

تو یہ روزمرہ کے اردگرد پھیلے ہوئے واقعات ہیں جن کی طرف تمہاری توجہ بھی ہوتی ہے اور تم ان کو جاننے سے عاجز ہو، تو اسی طرح سے تم قیامت کے متعلق سمجھ لو، کہ اگر تمہیں پتا نہیں ہے کہ قیامت کب آئے گی؟ اللہ تعالیٰ نے تعیین نہیں بتلائی، تو اس کا یہ مطلب کیسے ہے کہ ہوگی ہی نہیں؟ تو یہ چونکہ روزمرہ کی باتیں ہیں جدھر انسان متوجہ ہوتا ہے، تو ان چیزوں کو ذکر کر دیا، ورنہ اللہ تعالیٰ کی مغیبات تو لامتناہی ہیں، جن کو انسان کیسے جان سکتا ہے۔ ہاں! البتہ اللہ تعالیٰ انبیاء کو بتا دیتا ہے، اپنے اَحکام اپنی مرضیات کی اطلاع دیتا ہے، واقعاتِ کونیہ جو دنیا میں ہونے والے ہیں ان کی اطلاع دے دیتا ہے، جس طرح سے غلبۂ روم کا ذکر آپ کے سامنے آیا تھا، اس قسم کی پیش گوئیاں وحی کے ذریعے معلوم ہو جائیں تو قطعی ہیں، کسی ولی کو الہام ہو دل میں بات ڈال دی جائے تو ظنی ہے، صحیح بھی ہو سکتی ہے غلط بھی۔ خواب کے ذریعے سے آنے والے واقعات کا پتا چل جاتا ہے، یہ بھی ظنی ہے، صحیح بھی ہو سکتا ہے غلط بھی، اور بھی اس قسم کی چیزیں جتنی ہیں، یہ جزوی طور پر کسی کو پتا بھی چلتا ہے تو وحی ایک ذریعہ قطعی ہے، جو اللہ بتا دے وہ یقیناً معلوم ہو جائے گا۔ باقی جتنی بھی چیزیں ہیں، چاہے تم علامات سے پہچانو، نجوم سے پہچانو، کہانت سے پہچانو، جفر سے، رمل سے، دست شناسی سے، جو ذریعہ بھی ہے سب ظنیات ہیں، کبھی یہ اٹکل صحیح بھی نکلے گی کبھی غلط بھی ہو جائے گی۔ اور ایسے ہی خواب اور

الہام، یہ ساری کی ساری چیزیں ظنی ہیں۔ تو اللہ کسی بات کا انکشاف کردے تو ہو جاتا ہے، پتا چل جائے گا کہ فلاں آدمی اتنے دن کے بعد مر جائے گا، ایسے ہو سکتا ہے کہ کسی کے دل میں آ جائے کہ فلاں جگہ مر جائے گا، لیکن ظنی چیزیں ہیں، کبھی صحیح، کبھی غلط۔ ان چیزوں کے اُصول پر اللہ کا قبضہ ہے۔ ... اور پانچ چیزیں خصوصیت سے اس لیے ذکر کر دیں کہ ان کی طرف ہر وقت انسان کی توجہ ہے۔ قیامت کے متعلق تو سوالات اُٹھتے تھے، باقی چیزیں ایسی ہیں جو اپنی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں، اور انسان کے دل میں شوق ہے کہ میں ان باتوں کو جانوں۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جیسے ان چیزوں کے اُوپر قبضہ اللہ کا ہے، بس اسی طرح سے تم سمجھو کہ قیامت کی تفصیلات اور اس کی تعیین بھی اللہ جانتا ہے۔ لیکن اس کو دلیل بنا لینا کہ چونکہ ہمیں تعیین معلوم نہیں، اس لئے یہ ہوگی بھی نہیں، یہ بات غلط ہے۔ ''اللہ ہی کے پاس ہے قیامت کا علم، وہی اُتارتا ہے بارش۔'' یہاں اگرچہ فعل کا ذکر ہے، لیکن اس کو بھی چونکہ علم کے سلسلے میں لایا جا رہا ہے، تو مطلب یہ ہے کہ اُتارتا بھی وہی ہے اور اُتارنے کی تفصیلات بھی وہی جانتا ہے۔ بارش کیسے پیدا ہوئی؟ اس کے لیے کیا اسباب بنے؟ کہاں پڑے گی؟ کتنی اُترے گی؟ کس علاقے میں اُترے گی؟ سب اللہ جانتا ہے۔ ''اور جانتا ہے اس چیز کو جو کہ رحموں میں ہے۔'' ماں کے رحم میں جو کچھ ہے، لڑکا ہے، لڑکی ہے، ناقص ہے، کامل ہے، اور اسی طرح سے اس کی باطنی استعدادیں، خوب صورت ہے، بدصورت ہے، ذہین ہے، بلید ہے، یہ سب اللہ جانتا ہے۔ ''اور کوئی نفس نہیں جانتا کہ کل کو کیا کرے گا؟'' مستقبل کے متعلق اپنے طور پر منصوبے سوچتے ہو، لیکن پہلے قدم پر ہی ناکام ہو جاتے ہو، تمہارا علم تو اتنا ناقص، نہ ماضی پہ محیط، نہ مستقبل کے لیے۔ ''اور کوئی نفس نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا؟ کس علاقے میں جا کے مرے گا؟'' مرنا تو یقیناً ہے اور کہیں زمین پہ ہی مرنا ہے، لیکن کوئی پتا نہیں کہاں مریں گے؟ ''بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے، اور خبر رکھنے والا ہے'' علم اور خبر سب اللہ ہی کا خاصہ ہے، جتنا علم ظاہر کر دے اتنا کسی کو پتا چلے گا، ورنہ کسی چیز کا پتا نہیں چلتا۔ تو اُصول جتنے بھی ہیں سب اللہ کے قبضے میں ہیں، جزئیات پہ اطلاع اللہ تعالیٰ مختلف ذرائع سے دیتا ہے، لیکن ان ذرائع میں سے ایک ذریعہ قطعی ہے یعنی وحی، باقی سارے کے سارے ظنی ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ

سُورَةُ السَّجْدَةِ

اٰياتها ٣٠　٣٢ سُوْرَةُ السَّجْدَةِ مَكِّيَّةٌ ٧٥　رکوعاتها ٣
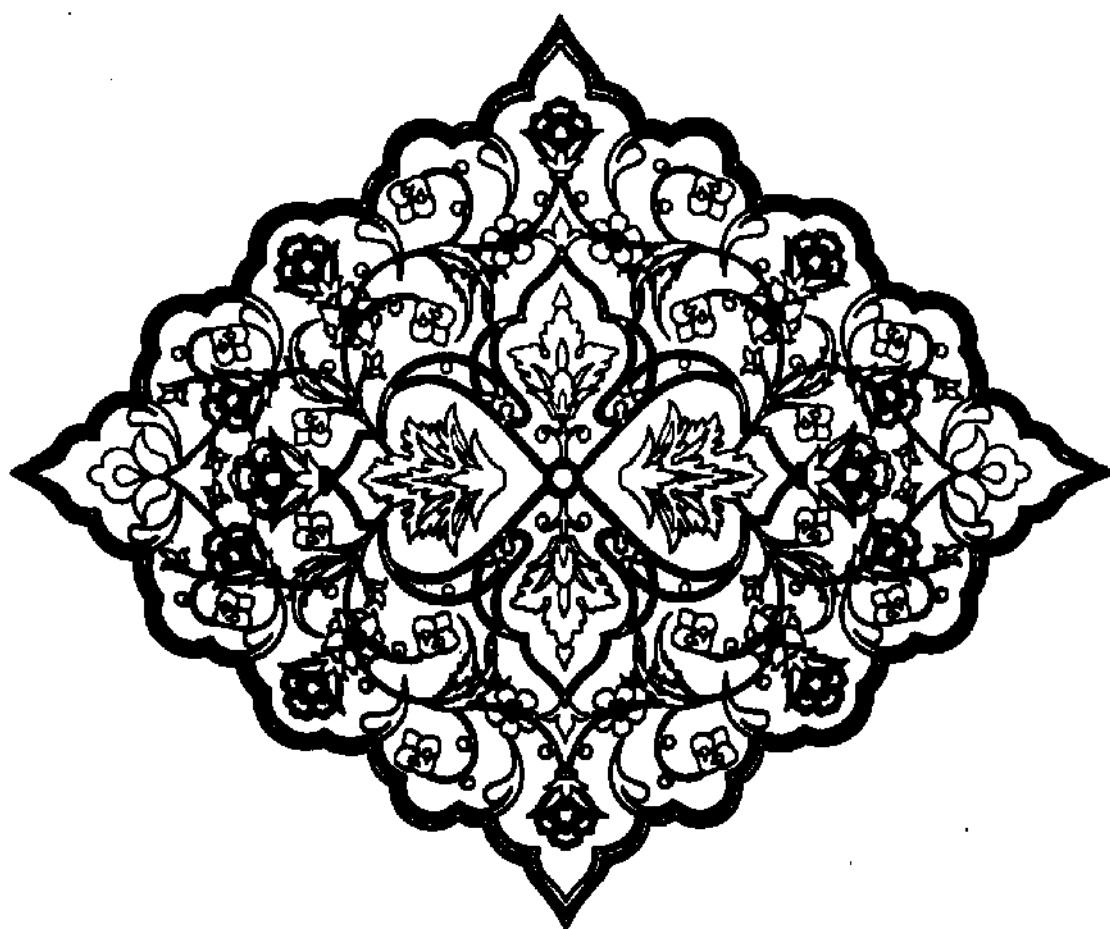
سورۂ سجدہ مکہ میں نازل ہوئی، اور اس کی تیس آیتیں ہیں، تین رُکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

الٓمّٓ ① تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ② اَمْ يَقُوْلُوْنَ

الٓمّٓ ① یہ ربّ العالمین کی طرف سے اُتاری ہوئی کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں ② کیا یہ مشرک لوگ کہتے ہیں کہ اس رسول

افْتَرٰىهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ

نے اس کتاب کو خود گھڑلیا، بلکہ یہ کتاب حق ہے، تیرے ربّ کی طرف سے، تاکہ آپ ڈرائیں ایسے لوگوں کو کہ نہیں آیا اُن کے پاس کوئی ڈرانے والا

مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ③ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا

آپ سے قبل، تاکہ وہ راہ پالیں ③ اللہ وہ ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو، اور ان چیزوں کو جو ان دو کے درمیان ہیں

فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۗ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ۗ

چھ دِنوں میں، پھر قرار پکڑا اس نے عرش پر، نہیں ہے تمہارے لیے اس کے علاوہ کوئی یار نہ کوئی سفارش کرنے والا،

اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ④ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ

کیا تم لوگ نصیحت حاصل نہیں کرتے؟ ④ تدبیر کرتا ہے امر کی آسمان سے زمین تک، پھر چڑھے گا وہ امر اللہ کی طرف، ایسے دِن میں

كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ⑤ ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ

جس کا اندازہ ہزار سال کے برابر ہے، اس چیز سے جو تم شمار کرتے ہو ⑤ یہی اللہ جاننے والا ہے غیب کو اور شہادت کو، زبردست ہے

الرَّحِيْمُ ⑥ الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۚ ⑦

رحم کرنے والا ہے ⑥ اچھا بنایا اس نے ہر اس چیز کو جس کو اس نے پیدا کیا، اور شروع کیا انسان کے پیدا کرنے کو مٹی سے ⑦

ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۚ ⑧ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ

پھر کیا اس انسان کی نسل کو ایک خلاصے سے جو کہ بے قدر پانی ہے ⑧ پھر اس کو دُرست کیا اور اس میں اپنی رُوح پھونکی

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۚ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ۝٩ وَقَالُوٓا

اور بنائے تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دِل، بہت کم تم شکر ادا کرتے ہو ۝٩ مشرکوں نے کہا

ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ ءَاِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ۚ بَلْ هُم بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ

کیا جس وقت ہم زمین میں گم ہوجائیں گے، کیا بے شک ہم نئے سرے سے پیدا کئے ہوئے ہوں گے؟ بلکہ یہ لوگ اپنے رَبّ کی ملاقات

كَافِرُونَ ۝١٠ قُلْ يَتَوَفَّاكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ ۝١١

کے منکر ہیں ۝١٠ آپ کہہ دیجئے کہ وفات دیتا ہے تمہیں موت کا فرشتہ جو تم پہ متعین کیا گیا ہے، پھر تم اپنے رَبّ کی طرف لوٹائے جاؤ گے ۝١١

وَلَوْ تَرَىٰٓ إِذِ الْمُجْرِمُونَ نَاكِسُوا رُءُوسِهِمْ عِندَ رَبِّهِمْ رَبَّنَآ أَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا

اگر دیکھے تو جبکہ مجرم لوگ اپنے سروں کو جھکانے والے ہوں گے اپنے رَبّ کے سامنے، اے ہمارے رَبّ! ہم نے دیکھ لیا اور سُن لیا،

فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا إِنَّا مُوقِنُونَ ۝١٢ وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدَاهَا وَ

پس تو ہمیں لوٹادے، ہم اچھے کام کریں گے، بے شک ہم یقین کرنے والے ہیں ۝١٢ اگر ہم چاہتے تو دے دیتے ہر نفس کو اس کی ہدایت،

لَٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ۝١٣ فَذُوقُوا

لیکن ثابت ہوگئی بات میری طرف سے کہ البتہ ضرور بھروں گا میں جہنم جنوں اور انسانوں سے سب سے ۝١٣ مزا چکھو

بِمَا نَسِيتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَآ إِنَّا نَسِينَاكُمْ ۖ وَذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنتُمْ

اپنے اِس دِن کی ملاقات کے بھول جانے کا، ہم تمہیں بھول گئے، اور مزا چکھو ہمیشگی کے عذاب کا ان کاموں کی وجہ سے جو تم

تَعْمَلُونَ ۝١٤ إِنَّمَا يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا الَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِهَا خَرُّوا

کیا کرتے تھے ۝١٤ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایمان لاتے ہیں ہماری آیات پر وہ لوگ کہ جب نصیحت کئے جاتے ہیں ان آیات کے ساتھ تو گر پڑتے ہیں

سُجَّدًا وَسَبَّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ۩ ۝١٥ تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ

سجدہ کرتے ہوئے، اور پاکی بیان کرتے ہیں اپنے رَبّ کی حمد کے ساتھ، اور وہ تکبر نہیں کرتے ۝١٥ جُدا رہتے ہیں ان کے پہلو

الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ۝١٦

بستروں سے، پُکارتے ہیں وہ اپنے رَبّ کو ڈرتے ہوئے اور اُمید کرتے ہوئے، اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا اس میں سے خرچ کرتے ہیں ۝١٦

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۷﴾

نہیں جانتا کوئی نفس جو کچھ چھپایا گیا ان کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک سے، بطور جزا کے ان کاموں کی یہ جو کرتے ہیں ﴿۱۷﴾

اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ۭ لَا يَسْتَوٗنَ ﴿۱۸﴾ اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

کیا پھر وہ شخص جو مومن ہو اس شخص کی طرح ہے جو نافرمان ہو؟ دونوں برابر نہیں ہوں گے ﴿۱۸﴾ جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک

الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰى ۡ نُزُلًاۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ

عمل کرتے ہیں ان کے لئے رہنے کے باغات ہیں بطور مہمانی کے بسبب ان کاموں کے جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۱۹﴾ اور جو لوگ

فَسَقُوْا فَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَقِيْلَ

نافرمان ہو گئے پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے، جب ارادہ کریں گے اس جہنم سے نکلنے کا تو اس میں لوٹا دیے جائیں گے، اور کہا جائے گا

لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ

انہیں، چکھو جہنم کا عذاب جس کی تم تکذیب کیا کرتے تھے ﴿۲۰﴾ البتہ ضرور چکھائیں گے ہم ان لوگوں کو قریبی عذاب

الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ

بڑے عذاب سے پہلے، تاکہ یہ رجوع کریں ﴿۲۱﴾ کون بڑا ظالم ہے اس سے جو نصیحت کیا جائے

بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا ۭ اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا

اپنے ربّ کی آیات کے ساتھ پھر ان سے اعراض کرے، بے شک ہم مجرموں سے انتقام لینے والے ہیں ﴿۲۲﴾ البتہ تحقیق ہم نے

مُوْسَى الْكِتٰبَ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَاۗىِٕهٖ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ

موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی، پس نہ ہو تو شک میں اس کتاب کے ملنے سے، اور ہم نے موسیٰ کی کتاب کو ہدایت بنایا بنی

اِسْرَاۗءِيْلَ ﴿۲۳﴾ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ڛ وَكَانُوْا

اسرائیل کے لئے ﴿۲۳﴾ اور بنائے ہم نے بنی اسرائیل میں سے امام جو راہنمائی کرتے ہیں ہمارے حکم کے مطابق جب انہوں نے صبر کیا اور

بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۲۴﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ

ہماری آیات پر یقین لاتے تھے ﴿۲۴﴾ بے شک تیرا ربّ فیصلہ کرے گا اُن کے درمیان قیامت کے دن ان باتوں میں جن میں

یَخْتَلِفُوْنَ ﴿۲۵﴾ اَوَلَمْ یَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ یَمْشُوْنَ فِیْ
یہ اختلاف کرتے ہیں ﴿۲۵﴾ کیا یہ بات ان کو ہدایت نہیں دیتی کہ ہم نے اِن سے پہلے کتنی ہی جماعتوں کو ہلاک کر دیا، جن کے ٹھکانوں میں
مَسٰكِنِهِمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ ؕ اَفَلَا یَسْمَعُوْنَ ﴿۲۶﴾ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ
یہ چلتے پھرتے ہیں، بے شک اس میں البتہ نشانیاں ہیں، کیا یہ سنتے نہیں؟ ﴿۲۶﴾ کیا یہ دیکھتے نہیں، بے شک ہم چلاتے ہیں پانی چٹیل
الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَاَنْفُسُهُمْ ؕ اَفَلَا یُبْصِرُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَ
زمین کی طرف، پھر ہم اس کے ذریعے سے کھیتی نکالتے ہیں، اس کھیتی سے کھاتے ہیں ان کے چوپائے اور یہ خود، کیا پھر یہ دیکھتے نہیں؟ ﴿۲۷﴾ اور
یَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۲۸﴾ قُلْ یَوْمَ الْفَتْحِ لَا یَنْفَعُ الَّذِیْنَ
یہ کہتے ہیں کہ یہ فیصلہ کب ہوگا؟ اگر تم سچے ہو ﴿۲۸﴾ آپ کہہ دیجئے کہ فیصلے کے دِن نہیں نفع دے گا ان لوگوں کو جنہوں نے
كَفَرُوْۤا اِیْمَانُهُمْ وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ ﴿۳۰﴾
کفر کیا ان کا ایمان لانا، اور نہ وہ مہلت دیے جائیں گے ﴿۲۹﴾ آپ ان سے اعراض کر جائیے اور انتظار کیجئے، یہ لوگ بھی انتظار کرنے والے ہیں ﴿۳۰﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ الٓمّٓ حروف مقطعات، اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ بِذٰلِكَ، اِن حروف سے جو اللہ کی مراد ہے وہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ لَا رَیْبَ فِیْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ: تنزیل مصدر ہے اور اس کی اضافت مفعول کی طرف ہے۔ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ یہ تنزیل سے متعلق ہے (آلوسی)۔ یہ رَبّ العالمین کی طرف سے اُتاری ہوئی کتاب ہے، لَا رَیْبَ فِیْهِ: اس میں کوئی شک نہیں، تردّد نہیں۔ "ہ" ضمیر کتاب کی طرف لوٹ رہی ہے۔ لیکن شک کا تعلق چونکہ نسبت سے ہوتا ہے، اس لئے یہاں مطلب یہ ہوگا کہ اس کتاب کے رَبّ العالمین کی طرف سے ہونے میں کوئی تردّد اور شک نہیں، یعنی بالیقین یہ رَبّ العالمین کی طرف سے ہے۔ جیسے کہ سورۂ بقرہ کی ابتدا میں بھی یہی الفاظ آئے تھے۔ من جانب اللہ ہونے میں کوئی کسی قسم کا تردّد نہیں ہے، یقینی بات ہے۔ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ: کیا یہ مشرک لوگ کہتے ہیں کہ اس رسول نے اس کتاب کو خود گھڑ لیا؟ افتراء کا معنی ہوتا ہے جھوٹ موٹ کسی چیز کو بنالینا۔ بَلْ هُوَ الْحَقُّ: اس کی گھڑی ہوئی نہیں، بلکہ یہ کتاب حق ہے واقع کے مطابق ہے تیرے رَبّ کی طرف سے۔ تا کہ آپ ڈرائیں ایسے لوگوں کو کہ نہیں آیا ان کے پاس کوئی ڈرانے والا آپ سے قبل، تا کہ وہ راہ پالیں۔ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ: اللہ وہ ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو، اور ان چیزوں کو جو ان دو کے درمیان میں ہیں، چھ دنوں میں۔ پھر قرار پکڑا اس نے عرش پر، نہیں ہے تمہارے لئے اس کے علاوہ کوئی یار، نہ کوئی سفارش کرنے والا۔ ولی کا معنی یار مددگار۔ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ: کیا تم

لوگ نصیحت حاصل نہیں کرتے؟ ان باتوں کی طرف دھیان نہیں کرتے؟ تذکُّر: نصیحت حاصل کرنا، دھیان کرنا۔ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ: تدبیر کرتا ہے امر کی آسمان سے زمین تک، یعنی ایسا امر جو آسمان سے زمین تک ہے اس کی تدبیر اللہ کرتا ہے۔ آسمان کی طرف سے اِبتدا اور اِنتہا زمین کی طرف، جو اُمور بھی اُترتے ہیں، جو کام بھی ہوتے ہیں، سب کا انتظام وتدبیر اللہ کرتا ہے۔ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ: پھر وہ اَمر اس اللہ کی طرف عروج کرے گا، چڑھ جائے گا، اللہ کی خدمت میں پیش ہوگا۔ پھر چڑھے گا وہ اَمر اللہ کی طرف ایسے دِن میں جس کا اندازہ ہزار سال کے برابر ہے تمہارے شمار سے، مِّمَّا تَعُدُّوْنَ جو تم شمار کرتے ہو اس سے ہزار سال کا اندازہ ہے وہ دِن۔ اَلْفَ سَنَةٍ: ہزار سال۔ عَدَّ یَعُدُّ: شمار کرنا۔ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ: اس چیز سے جو تم شمار کرتے ہو۔ یعنی تمہارے شمار کے اعتبار سے ہزار سال جو بنتا ہے تو اس کا اندازہ ہے وہ دن۔ ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَیْبِ: یہی اللہ جاننے والا ہے غیب کو اور شہادت کو۔ زبردست ہے رحم کرنے والا ہے۔ اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ: اچھا بنایا اس نے ہر اُس چیز کو جس کو اس نے پیدا کیا۔ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ: اور شروع کیا انسان کے پیدا کرنے کو مٹی سے، ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ: سُلٰلَةٍ خلاصے کو کہتے ہیں۔ مِنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ یہ اس سُلالہ کا بیان ہے۔ مَآءٍ: پانی۔ مَّهِیْنٍ: ذلیل، بےقدر۔ پھر کیا اس انسان کی نسل کو ایک خلاصے سے جو کہ بےقدر پانی ہے۔ سُلالہ جو کہ ماء مهین ہے اس سے پھر انسان کی نسل کو بنایا۔ ثُمَّ سَوّٰىهُ: پھر اس کو درست کیا یعنی اس کے اعضا ٹھیک کئے، تسویۃ الاعضاء۔ وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ: اور اس انسان میں اپنی رُوح پھونکی، اپنی طرف سے رُوح پھونکی۔ یہ اضافت تشریف کے لئے ہے، جیسے نَاقَةُ اللهِ، بیتُ اللہ میں یہ اضافتیں ہیں، اسی طرح یہ بھی تشریف ہے۔ پھر اپنی طرف سے ایک رُوح پھونکی۔ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ: اور بنائے تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل، قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ: بہت کم تم شکرادا کرتے ہو۔ وَقَالُوْٓا: اور یہ مشرک کہتے ہیں، یا ان مشرکوں نے کہا، (ماضی مضارع دونوں طرح سے ترجمہ ہوتا ہے) ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ: کیا جس وقت ہم زمین میں گم ہوجائیں گے، خلط ملط ہوجائیں گے، رل مل جائیں گے، ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ: کیا بےشک ہم نئے سرے سے پیدا کئے ہوئے ہوں گے؟ خلق جدید میں ہوں گے؟ نئی پیدائش میں ہوں گے؟ بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ: بلکہ یہ لوگ اپنے رَبّ کی ملاقات کے منکر ہیں۔ یعنی یہ اِستفہام اور ان کا پوچھنا تردّد کی بنا پر ہی نہیں، بلکہ سرے سے یہ منکر ہیں۔ قُلْ یَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ: آپ کہہ دیجئے کہ وفات دیتا ہے تمہیں موت کا فرشتہ، الَّذِیْ وُكِّلَ بِكُمْ: جو تم پہ متعین کیا گیا ہے، ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ: پھر تم اپنے رَبّ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ: اگر دیکھے تو جبکہ مجرم لوگ اپنے سروں کو جھکانے والے ہوں گے اپنے رَبّ کے سامنے، نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ میں اضافت ہے۔ اصل میں نَاكِسُوْنَ تھا، ''نون'' اضافت کی بنا پر گر گیا۔ رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا: یہ ان کا قول ہے۔ کہتے ہوں گے، اے ہمارے رَبّ! اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا: ہم نے دیکھ لیا اور سُن لیا، فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا: پس تو ہمیں لوٹادے، ہم اچھے کام کریں گے۔ اِنَّا مُوْقِنُوْنَ: بےشک ہم یقین کرنے والے ہیں۔ وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَیْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا: اگر ہم چاہتے تو دے دیتے ہر نفس کو اس کی ہدایت۔ وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّیْ: لیکن ثابت ہوگئی بات میری طرف سے، لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ: البتہ ضرور بھروں گا میں جہنم جنوں اور انسانوں سے سب سے، سب کو اکٹھا کرکے۔ یہ اَجْمَعِیْنَ مجموعے کی تاکید ہے، یعنی مجموعی طور پر انسانوں اور جنوں سے میں جہنم کو بھروں گا۔ فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِیْتُمْ لِقَآءَ یَوْمِكُمْ هٰذَا: اَیْ فیقال لھم، پھر کہا جائے

گا، مزہ چکھو (مَا نَسِیْتُمْ میں 'ما'' مصدریہ ہے) اپنے اس دن کی ملاقات کے بھول جانے کا، اس دن کی ملاقات کو جو تم بھلائے بیٹھے تھے اس کا مزہ چکھو۔ بھلانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو یاد نہیں رکھا، اس کی پروا نہیں کی، کسی چیز کو نظر انداز کر دینا یہ بھی بھلانا ہوتا ہے۔ تم نے جو اس دن کی ملاقات کو نظر انداز کر رکھا تھا، اس کو یاد نہیں رکھا، اس کو بھولے ہوئے تھے، اس کا مزہ چکھو۔ اِنَّا نَسِیْنٰکُمْ: ہم تمہیں بھول گئے، یعنی ہم نے تمہیں نظر انداز کر دیا، اب ہم تمہارا خیال نہیں کریں گے۔ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ: اور مزا چکھو ہیشگی کے عذاب کا، بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: ان کاموں کی وجہ سے جو تم کیا کرتے تھے۔ اِنَّمَا یُؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا الخ: اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایمان لاتے ہیں ہماری آیات پر وہ لوگ کہ جب نصیحت کیے جاتے ہیں ان آیات کے ساتھ، تو گر پڑتے ہیں سجدہ کرتے ہوئے، اور پاکی بیان کرتے ہیں اپنے رَبّ کی حمد کے ساتھ، پاکی بیان کرتے ہیں اپنے رَبّ کی اس حال میں کہ متلبس ہوتے ہیں اس کی حمد کے ساتھ، یعنی حمد بھی بیان کرتے ہیں اور تسبیح بھی۔ دونوں لفظوں کے درمیان فرق آپ جانتے ہی ہیں، ''تسبیح'' کا معنی ہوتا ہے تنزیہ کہ اللہ تعالیٰ کو نقص اور عیب سے پاک قرار دینا، کوئی نقص کی صفت اس کے لئے ثابت نہیں۔ اور ''حمد'' کا معنی ہوتا ہے کمالات کے ساتھ موصوف قرار دینا۔ یعنی وہ اپنے رَبّ کو ہر عیب سے پاک قرار دیتے ہیں، اور ہر کمال اپنے رَبّ کے لئے ثابت کرتے ہیں۔ اور وہ تکبر نہیں کرتے، حق بات جب اُن کے سامنے آتی ہے فوراً قبول کر لیتے ہیں۔ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ: جُدا رہتے ہیں ان کے پہلو مضاجع سے۔ مضاجع مَضْجَع کی جمع، لیٹنے کی جگہ، بستر۔ ان کے پہلو ان کے بستروں سے جُدا رہتے ہیں۔ تَتَجَافٰى: جُدا ہونا۔ جُدا رہتے ہیں اُن کے پہلو اُن کے بستروں سے۔ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا: پکارتے ہیں وہ اپنے رَبّ کو ڈرتے ہوئے اور اُمید کرتے ہوئے۔ وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ: اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا اُس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ: نہیں جانتا کوئی نفس جو کچھ چھپایا گیا ان کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک سے، قُرَّةِ اَعْیُنٍ: آنکھوں کی ٹھنڈک، یعنی ایسا سامان جس سے ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی۔ جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ان کے لیے مخفی رکھا گیا ہے اُس کو کوئی نہیں جانتا، جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ: بطور جزا کے ان کاموں کی جو یہ کرتے ہیں۔ اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا: کیا پھر وہ شخص جو کہ ایمان لے آئے اس شخص کی طرح ہے جو کہ نافرمان ہو؟ لَا یَسْتَوٗنَ: دونوں برابر نہیں ہوں گے۔ لَا یَسْتَوٗنَ: جمع کا صیغہ آ گیا افراد کے اعتبار سے۔ مؤمنین کے افراد اور فاسقین کے افراد برابر نہیں ہوں گے۔ اَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا: تفصیل آگے یہ ہے کہ جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں اُن کے لئے رہنے کے باغات ہیں۔ جَنّٰتُ الْمَاْوٰى: ٹھکانے کے باغات۔ یعنی ان کا ٹھکانا باغات میں ہوگا۔ رہنے کے باغات ہیں۔ نُزُلًۢا بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ: بطور مہمانی کے۔ نزیل مہمان کو کہتے ہیں۔ اور جو آنے والے مہمان کے سامنے اکرام اور اعزاز کے ساتھ کھانا پیش کیا جاتا ہے اُسے نزل کہتے ہیں۔ بطور مہمانی کے بسبب اُن کاموں کے جو وہ کیا کرتے تھے۔ اور جو لوگ نافرمان ہو گئے پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَاۤ: جب ارادہ کریں گے اس جہنم سے نکلنے کا، اُعِیْدُوْا فِیْهَا: تو اس میں لوٹا دیے جائیں گے، وَ قِیْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ: اور کہا جائے گا انہیں، چکھو جہنم کا عذاب جس کی تم تکذیب کیا کرتے تھے۔ وَ لَنُذِیْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ: البتہ ضرور چکھائیں گے ہم ان لوگوں کو قریبی عذاب بڑے عذاب سے پہلے۔ عذاب ادنیٰ: تھوڑا عذاب یا قریب والا عذاب جو دُنیا میں پیش آئے گا۔

عذابِ اَدنیٰ سے مراد یہ دُنیا میں پیش آنے والی مصیبتیں ہیں۔ بڑے عذاب کے پیش آنے سے پہلے ہم ان کو ادنیٰ عذاب چکھائیں گے، جس طرح سے مشرکینِ مکہ کے لئے اَدنیٰ عذاب بدر میں ہوا، یا دُوسرے قحط وغیرہ مسلط ہوا، دُنیا کے اندر جو تکلیفیں آتی ہیں یہ عذابِ ادنیٰ ہے،"بڑے عذاب سے پہلے، تاکہ یہ رُجوع کریں۔ کون بڑا ظالم ہے اس سے جو نصیحت کیا جائے اپنے رَبّ کی آیات کے ساتھ پھر ان سے اِعراض کرے۔ بے شک ہم مجرموں سے انتقام لینے والے ہیں"۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ: البتہ تحقیق ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی۔ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ: "ہٖ" ضمیر ظاہر یہی ہے کہ کتاب کی طرف لوٹ رہی ہے۔ نہ ہو تو تردّد میں، نہ ہو تو شک میں اس کتاب کے ملنے سے، یعنی جس طرح سے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب ملی اسی طرح سے آپ کو بھی کتاب ملی۔ آپ کو اس میں کوئی کسی قسم کا تردّد نہیں ہونا چاہیے۔ جیسے دوسری جگہ آیا ہے وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ (سورۂ نمل:۶) تو حکیم علیم کی طرف سے قرآن دیا گیا۔ اور بعض مفسرین نے لِّقَآئِهٖ کی ضمیر موسیٰ علیہ السلام کی طرف بھی لوٹائی ہے، موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات کے بارے میں آپ کسی تردّد میں نہ رہیں، یعنی آپ کی ملاقات موسیٰ علیہ السلام سے صحیح ملاقات ہوئی ہے، وہ کوئی شک اور شبہ کی بات نہیں۔ جیسے لیلۃ المعراج میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات ہوئی تھی، روایات میں تذکرہ آتا ہے، موسیٰ علیہ السلام کو قبر شریف میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔[1] پھر بیت المقدس میں بھی ملاقات ہوئی، اور آسمان پر تو بار بار ہوئی۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے پچاس نمازوں کا تحفہ لے کے آئے تھے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بار بار مشورہ دیا کہ آپ کی اُمت پچاس نمازیں نہیں پڑھ سکے گی، میں بنی اسرائیل کو خوب اچھی طرح سے آزما چکا ہوں۔ جایئے! جا کے تخفیف کا سوال کیجئے۔ تو بار بار یہ مشورہ دیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم بار بار تشریف لے گئے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ان روایات میں ثابت ہے۔[2] دونوں طرح سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات کے بارے میں تردّد میں نہ ہو جایئے۔ یا اس کتاب کے ملنے کے بارے میں، کہ یہ کتاب آپ کو بھی ملی ہے جس طرح سے موسیٰ علیہ السلام کو ملی تھی۔ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ: اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کو ہدایت بنایا بنی اسرائیل کے لئے۔ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا: اور بنائے ہم نے بنی اسرائیل میں سے اِمام جو راہنمائی کرتے تھے ہمارے حکم کے مطابق۔ لَمَّا صَبَرُوْا: جبکہ انہوں نے مشکلات برداشت کیں، جب انہوں نے صبر کیا، وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ: اور ہماری آیات پر یقین لاتے تھے۔ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ الخ: بے شک تیرا رَبّ فیصلہ کرے گا ان کے درمیان قیامت کے دِن اُن باتوں میں جن میں یہ اختلاف کرتے ہیں۔ اَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ: كَمْ اَهْلَكْنَا الخ، یہ "يَهْدِ" کا فاعل ہے۔ کتنی ہی جماعتیں ہم نے اِن سے قبل ہلاک کر دیں، یہ لوگ ان کے مساکن میں، ان کے رہنے کی جگہوں میں چلتے پھرتے ہیں، کیا یہ بات ان لوگوں کے لئے ہدایت کا باعث نہیں؟ یہ بات ان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتی؟ ان کے لیے ہدایت کا باعث نہیں بنتی کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی ہی جماعتوں کو ہلاک کر دیا جن کے ٹھکانوں میں یہ چلتے پھرتے ہیں۔ بے شک اس میں البتہ نشانیاں ہیں۔ اَفَلَا يَسْمَعُوْنَ: کیا یہ سنتے نہیں؟ یہ باتیں ان کے کانوں میں نہیں آتیں؟ "سننا" سے مراد توجہ کے ساتھ سننا ہے جس کے اُوپر قبول

(۱) مسلم ۲۶۸/۲ باب من فضائل موسیٰ۔ ولفظہ: مَرَرْتُ عَلٰى مُوْسٰى لَيْلَةَ اُسْرِيَ بِيْ عِنْدَ الْكَثِيْبِ الْاَحْمَرِ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّيْ فِيْ قَبْرِهٖ۔

(۲) بخاری ۴۵۶/۱ باب ذکر الملائکۃ۔ ۵۴۹/۱ باب المعراج، وغیرہ۔

کرنا مرتب ہو جائے۔ ورنہ ان واقعات کو سنتے تو تھے۔ کیا یہ سنتے نہیں یہ واقعات؟ ہم نے کتنی جماعتیں ان سے پہلے ہلاک کر دیں، جن کے ٹھکانوں میں یہ چلتے پھرتے ہیں، یہ بات اِن کے لئے ہدایت کا باعث نہیں بنتی؟ اَوَلَمْ یَرَوْا: کیا یہ دیکھتے نہیں؟ اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ: جرز کا لفظ سورۂ کہف میں بھی آیا تھا۔ ارضِ جرز ہوتی ہے چٹیل زمین، جس کے اُوپر نباتات نہ ہو، جُرِزَ نباتُہٗ جس کی نباتات ختم کردی گئی ہو، کاٹ دی گئی ہو۔ بے شک ہم چلاتے ہیں پانی چٹیل زمین کی طرف۔ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا: پھر ہم اس کے ذریعے سے کھیتی نکالتے ہیں، تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَاَنْفُسُهُمْ: اس کھیتی سے کھاتے ہیں ان کے چوپائے اور یہ خود، اَفَلَا یُبْصِرُوْنَ: کیا پھر یہ دیکھتے نہیں؟ ''چلاتے ہیں پانی'' یا تو بادلوں کی صورت میں، جیسے بادل کے متعلق دوسری جگہ ہے سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ (سورۂ اعراف: ۵۷) بادل کو چلا کے لے جاتے ہیں بنجر علاقے کی طرف۔ یا چلانا زمین کے نیچے سے جس طرح سے پانی کی لہریں بہتی ہیں، چشموں کی صورت میں، اور نہروں کی شکل میں اللہ تعالیٰ پانی پہنچاتے ہیں، زمین کے اوپر بھی چلاتے ہیں، پہاڑوں پہ بارش کی بہت کثرت کے ساتھ، وہ پانی چلا کے اِدھر لے آئے۔ ورنہ جتنا پانی ہماری زمین کو ضرورت ہوتی ہے، اگر براہِ راست آسمان سے برسے تو یہ کچے علاقے اتنی بارش نہیں برداشت کر سکتے۔ تو یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ بارش ہوتی ہے پتھریلے علاقے میں، جہاں زیادہ بارش برسنے کے ساتھ علاقے کا نقصان نہیں ہوتا۔ پھر ان پانیوں کو نالیوں کے ذریعے، نہروں کے ذریعے، دریاؤں کے ذریعے ایسے علاقوں کی طرف پہنچایا جاتا ہے، جہاں پھر وہ آبپاشی کے کام آتے ہیں، اور اس طرح سے کھیتی پیدا ہوتی ہے۔ زمین کے نیچے سے بھی پانی بہتا ہے، یہ جو آپ ٹیوب ویل اور نلکے اور کنوؤں کے ذریعے سے نکالتے ہیں۔ اور زمین کی سطح کے اُوپر بھی بہتا ہے۔ تو نَسُوْقُ الْمَآءَ ان سب صورتوں کو شامل ہے۔ وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی هٰذَا الْفَتْحُ: اور یہ کہتے ہیں کہ یہ فیصلہ کب ہوگا؟ اگر تم سچے ہو۔ آپ کہہ دیجئے کہ فیصلے کے دِن نہیں نفع دے گا اُن لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا، اُن کا ایمان لانا۔ جو آج کفر کر رہے ہیں فیصلے کے دِن وہ ایمان لائیں گے تو اُن کا ایمان ان کو کوئی نفع نہیں دے گا، اور نہ وہ مہلت دیے جائیں گے۔ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانْتَظِرْ: آپ ان سے اِعراض کر جائیے، اور اِنتظار کیجئے اَنجام کا۔ اور یہ لوگ بھی انتظار کرنے والے ہیں۔

تفسیر

سورت کا تعارف اور فضیلت

سورۂ سجدہ، ''الم تنزیل السجدۃ'' اتنا لمبا اس کا نام آتا ہے۔[1] اور یہ سورت بھی قرآنِ کریم کی ان چند سورتوں میں سے ہے جن کی فضیلت خصوصیت کے ساتھ روایات میں بیان کی گئی۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سورت کو بھی ''مُنْجِیَةٌ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ'' قرار دیا ہے، عذابِ قبر سے بچانے والی سورت ہے۔ یہ بھی اور سورۂ تبارک الذی بھی دونوں کی فضیلت ایک جیسی آتی ہے۔ اگر کوئی شخص اس کو پڑھنے کا عادی ہو (جیسے حدیث شریف میں واقعہ آتا ہے) تو برزخ میں یہ سورت عذاب سے تحفظ کرے گی، آ کے پڑھنے والے کو چھپا لے گی، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے سفارش کرے گی، اور یہ کہے گی کہ اے اللہ! اگر تو میں تیری کتاب میں سے

(۱) بخاری ۱/۱۴۶، باب سجدة تنزيل السجدة.

ہوں تو میری سفارش قبول کر، یہ شخص مجھ سے محبت رکھتا تھا، مجھے پڑھا کرتا تھا، اس کو عذاب سے بچا۔ اور اگر میں تیری کتاب میں سے نہیں ہوں، تو مجھے اپنی کتاب سے خارج کر دے۔[1] یہی لفظ حدیث شریف میں آتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس طرح سے اللہ تعالیٰ کے سامنے اِصرار کر کے اپنے پڑھنے والوں کو عذابِ قبر سے بچائے گی۔ اور ''ترمذی شریف'' میں ہے، سرورِ کائنات ﷺ کی عادتِ شریفہ تھی کہ سوتے وقت اِن دونوں سورتوں کی تلاوت فرمایا کرتے تھے، الٓمّٓ تنزیل السجدۃ کی، اور سورۂ تَبٰرَکَ الَّذِیْ، جس کو سورۂ مُلک کہتے ہیں۔[2] اُس کی بھی تیس آیتیں ہیں اور اِس کی بھی تیس آیتیں ہیں۔ اور ان دونوں سورتوں کی فضیلت حدیث شریف میں ایک جیسی منقول ہے۔ اکابر کی طرف سے جو وظائف چلے آتے ہیں ان میں یہ بھی داخل ہے کہ انسان سوتے وقت دونوں سورتیں، یا کم از کم ان میں سے ایک سورت کے پڑھنے کی عادت ضرور ڈال لے، سورۂ تَبٰرَکَ الَّذِیْ یا سورۂ الٓمّٓ تنزیل السجدۃ۔ اوّل تو دونوں پڑھیں، حضور ﷺ دونوں ہی پڑھا کرتے تھے، اور اگر دونوں نہ پڑھ سکیں تو کم از کم ایک کی عادت ضرور ڈال لینی چاہیے۔

اِبتدائی آیات کا مضمون اور سورت کا مقصد

سورت چونکہ مکی ہے تو مضمون تو اس میں اسی طرح ہے، یعنی اُصول کا بیان۔ سب سے پہلے تو اللہ تعالیٰ نے سرورِ کائنات ﷺ کی رِسالت کا تذکرہ بایں معنی کیا کہ یہ کتاب جو تمہارے سامنے پیش کی جارہی ہے، یہ رَبّ العالمین کی طرف سے اُتری ہوئی ہے، اور اِس کے رَبّ العالمین کی طرف سے ہونے میں کوئی کسی قسم کا تردّد اور شک نہیں ہے، تو جب یہ کتاب اللہ کی ہوئی تو جس پر یہ اُتر رہی ہے وہ اللہ کا رسول ہوا، تو آپ کی رسالت ثابت ہوگئی۔ تو کتاب کی عظمت بھی اس میں نکل آئی، اور جس کے اُوپر یہ کتاب اُتاری جارہی ہے اس کی عظمت بھی نکل آئی، اس کا مقام بھی واضح ہوگیا۔ پھر یہ لوگ عام طور پر جو کہتے تھے ''بَلِ افْتَرٰىهُ'' کا لفظ جس طرح سے قرآنِ کریم میں کئی جگہ آیا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ باتیں رسول نے خود بنالیں، یہ خود تراش کر کر کے لاتا ہے، جھوٹ بولتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے آئی ہیں۔ تو وہی ان کا اعتراض نقل کیا ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس رسول نے اس کتاب کو خود گھڑلیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ بات اِن کی غلط ہے، یہ گھڑی ہوئی بات نہیں، یہ تیرے رَبّ کی طرف سے حق ہے۔ یہ خطاب حضور ﷺ کو ہے، بات کہی جارہی ہے آپ کو خطاب کر کے، سنانی دوسروں کو مقصود ہے، کہ واقعے کے مطابق ہے، حقیقی کتاب ہے، تیرے رَبّ کی طرف سے آئی ہے۔ اور آئی انہی لوگوں کے فائدے کے لئے ہے، اِس میں اللہ کا کوئی فائدہ نہیں، آپ پر یہ کتاب آئی، اس لیے تا کہ ایسے لوگوں کو آپ ڈرائیں جن کے پاس پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا۔ ان کو تو چاہیے تھا کہ اس کی قدر کرتے، حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد عرب میں ان لوگوں کے اندر کسی پیغمبر کا آنا معلوم نہیں۔ اگر چہ توحید کے متعلق باتیں تو ان میں

---

(۱) وعن خالد بن معدان قال اقرؤوا المنجية وهي الٓمّٓ تنزيل فان بلغني ان رجلا الخ (مشکوۃ ۱/ ۱۸۹، کتاب فضائل القرآن. فصل ثالث) نوٹ: خالد بن معدان تابعی ہیں۔ ''شرح طیبی'' میں لکھا ہے کہ یہ حضور ﷺ کا کلام بھی ہوسکتا ہے، اور خود راوی یعنی خالد بن معدان کا کلام بھی ہوسکتا ہے (مرقاۃ)۔

(۲) كَانَ لَا يَنَامُ حَتّٰى يَقْرَاَ الٓمّٓ تَنْزِيْلُ وَتَبٰرَكَ الَّذِىْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ (ترمذی ۲/ ۱۱۷، باب ما جاء فی سورة الملک مشکوۃ ۱/ ۱۸۸، کتاب فضائل القرآن، فصل ثانی)

چلی آتی تھیں، حتیٰ کہ حضور ﷺ کی بعثت سے پہلے اہلِ مکہ میں بھی بعضے لوگ ایسے تھے جو توحید کو اختیار کئے ہوئے تھے، مشرک نہیں تھے۔ جیسے ورقہ بن نوفل جن کا ذِکر آتا ہے، اور اِسی طرح سے زید بن عمرو بن نفیل جن کے بیٹے سعید عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، یہ سب لوگ حضور ﷺ کے آنے سے پہلے موحد تھے، بتوں کے ذبیحے نہیں کھاتے تھے، بتوں کو سجدہ نہیں کرتے تھے، اور اپنے آپ کو ملتِ ابراہیمی پر قرار دیتے تھے۔ تو یہ توحید کا تذکرہ تو تھا، اس لئے ان کے پاس یہ عذر نہیں کہ ان کا شرک بھی معاف ہوجائے۔ شرک پر تو گرفت ہوگی، چونکہ توحید کا تذکرہ چلا آرہا تھا۔ لیکن اتنی تفصیل کے ساتھ اتنی وضاحت کے ساتھ سمجھانے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے آباء قریبہ میں کوئی رسول نہیں آیا تھا، اِردگرد رسول آئے، اس قوم میں نہیں آیا تھا، تو ان کو چاہیے تھا کہ اس آنے والے کی قدر کرتے، تو کتاب اِس لئے اُتاری گئی تاکہ آپ ڈرائیں ان لوگوں کو جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی نذیر نہیں آیا کوئی ڈرانے والا نہیں آیا، تاکہ یہ سیدھی راہ معلوم کرلیں، اِس مقصد کے لئے اِس کتاب کو اُتارا گیا۔ اب وہ سیدھی راہ کیا ہے؟ جس کی یہ کتاب راہنمائی کرتی ہے، اور اِن کو کیا سمجھانے کی ضرورت ہے؟ وہ مسئلہ ہے توحید اور معاد کا۔ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا تذکرہ تو آہی گیا کہ آپ اللہ کی طرف سے نذیر ہیں، آپ پر کتاب اُتاری گئی، اس سے تو آپ کی حیثیت متعین ہوگئی، تو آپ کی رسالت کے متعلق عقیدہ صحیح ہوگیا کہ آپ رسول ہیں اور یہ کتاب من جانب اللہ ہے۔ اور اِس کتاب کے اعظم مقاصد میں سے ہے لوگوں کو توحید کی اور معاد کی تعلیم دینا، تو آگے آنے والی آیات جتنی ہیں اِن میں یہ دو ہی مسئلے ذکر کئے گئے ہیں، ایک توحید اور ایک معاد۔

آسمان وزمین کی تخلیق

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ: یہ توحید کا تذکرہ ہے، اور بار بار آپ کے سامنے اِس قسم کی آیات گزر چکیں۔ اللہ نے اپنے خالق ہونے کا ذِکر فرمایا، کہ زمین آسمان اور ان کے درمیان جو کچھ ہے، سب کا خالق اللہ ہے۔ اللہ نے ان کو چھ دِن میں پیدا فرمایا، وہ دِن جو اللہ کے علم میں ہیں، یہ ہمارے دِن مراد نہیں، کیونکہ زمین آسمان پیدا ہونے سے پہلے سورج چاند نہیں تھے، اور یہ زمین کی حرکت اس طرح سے نہیں تھی، یہ موجودہ دِن تو ان کی حرکت سے پیدا ہوتے ہیں۔ باقی! اللہ کے ہاں دِن کا کتنا اندازہ ہے؟ وہ ہم نہیں جانتے، ہم بیان نہیں کرسکتے، مقصد یہ ہے کہ چھ دِن کے اندازے میں اللہ نے ان کو پیدا فرمایا، آہستہ آہستہ اپنی تدبیر کے تحت، یہ نہیں کہ خود بخود دفعۃً آنِ واحد میں یہ چیز موجود ہوگئی، ایسا نہیں ہے۔ جس طرح سے اللہ تعالیٰ اب بھی چیزیں بناتا ہے تدبیر کے تحت، اور اس کے اُوپر ایک وقت خرچ ہوتا ہے۔ مثلاً آپ کا جتنا وجود ہے جو آپ اس وقت لئے بیٹھے ہیں، کسی کا اٹھارہ سال میں تیار ہوا، کسی کا بیس سال میں۔ درخت پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے، کوئی دو سال میں، کوئی چار سال میں، کوئی دس سال میں۔ اسی طرح سے یہ کائنات بھی اللہ تعالیٰ نے تدریجاً پیدا فرمائی اپنی حکمت کے تحت۔

''اِستواء علی العرش'' کا مفہوم

اور پھر ان کو پیدا کرکے، یہ نہیں کہ خود لاتعلق ہوگیا، بلکہ اس میں تخت نشین بھی خود ہوا، بادشاہت بھی اسی کی ہے۔ پیدا کرنے والا بھی خود، اور تخت نشین بھی خود۔ تخت نشین ہونے کا یہ مفہوم کہ فرماں روائی اسی کی ہے، حکمرانی اسی کی ہے، یہ معنی متعین

ہے۔ باقی عرش کی کیا شکل وصورت ہے، اس کے اُوپر اللہ کا قرار پکڑنا کس طرح سے ہے؟ یہ متشابہات میں ہے، جس کی ہم مثال نہیں دے سکتے۔ باقی اس کا انجام اور مآل یہی ہے کہ حکمرانی اللہ کی ہے، بادشاہت اسی کی ہے، فرماں روائی اسی کی ہے، اس کائنات کے اندر کوئی دوسرا حکمران نہیں، فرماں روا نہیں، کوئی صاحبِ سلطنت نہیں، اس کائنات کو پیدا کرنے کے بعد اس میں تخت نشین وہ خود ہے، حکومت اسی کی ہے۔

شفاعتِ قہری کی تردید

اور پھر وہ اپنے علم قدرت حکمت کے تحت فیصلے فرماتا ہے، کسی کے کہنے سننے کی کوئی گنجائش نہیں، کہ اللہ تعالیٰ سے کہہ کے کوئی فیصلہ اس کی حکمت کے خلاف کروالے، یا اللہ تعالیٰ کے ضابطے کے خلاف اور اس کے قانونِ عدل کے خلاف کسی کی سفارش چل جائے، ایسا کوئی نہیں۔ یہ مشرکین جس قسم کے شفعاء بنائے بیٹھے ہیں، شفاعتِ قہری کے جو قائل ہیں کہ ''اللہ ان کی موڑتا نہیں، جو اللہ کو کہیں اللہ مانتا ہے!'' اس قسم کا شفیع کوئی نہیں ہے۔ اور جب اللہ پکڑے تو کوئی اس سے چھڑانے والا نہیں، کسی کا زور نہیں چلتا اللہ کے سامنے، اور نہ کوئی کہہ سن کے اللہ تعالیٰ کی حکمت اور عدل کے خلاف فیصلہ کرواسکتا ہے۔ اس کا جو فیصلہ ہوتا ہے حکمت اور عدل کے مطابق ہوتا ہے۔ تو یہاں اسی قسم کے شفیع کی نفی کرنی مقصود ہے جس قسم کا شفیع مشرکین مانتے تھے۔ وہ شفاعتِ قہری اور جبری کے قائل تھے کہ یہ کہہ دیں تو اللہ موڑ نہیں سکتا، اللہ اسی طرح سے ہی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میرے دربار میں ایسی کسی کی حیثیت نہیں ہے۔ ''نہیں ہے تمہارے لئے اللہ کے علاوہ کوئی مددگار اور نہ کوئی سفارشی''۔ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ: کیا تم یہ باتیں یاد نہیں رکھتے؟ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ میں تو اپنی حکمرانی کو بیان کیا تھا، يُدَبِّرُ الْاَمْرَ میں گویا کہ عملاً ان احکام کی تنفیذ کا ذکر کیا، کہ آسمان سے لے کے زمین تک جتنے اُمور جاری ہوتے ہیں سب اللہ کی تدبیر کے تحت جاری ہوتے ہیں۔ یہ عملی حکومت ہے، کہ جتنے اُمور ہوتے ہیں سب اللہ کی تدبیر سے جاری ہوتے ہیں، لوٹ پوٹ کے ہر چیز اللہ کے سامنے پیش ہوگی۔

قیامت کے دِن کی لمبائی کے متعلق دو آیات میں تعارض اور اس کا حل

اور اللہ کے سامنے پیش ہوگی ایسے دِن میں کہ تمہارے اندازے کے مطابق، تمہارے شمار کیے ہوئے سالوں کے مطابق اس کی مقدار ایک ہزار سال ہے۔ اور یہ لفظ بھی ہمارے اعتبار سے متشابہات میں سے ہے، کہ اللہ کے ہاں ایک دِن ہمارے ہزار سال کے شمار کے مطابق کس طرح سے ہوگیا؟ قرآنِ کریم میں دُوسری جگہ ذِکر کیا: فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ (سورۂ معارج:۴) سورۂ معارج میں آئے گا، پچاس ہزار سال کے برابر اس کا اندازہ ہے۔ یہاں ہزار سال کے برابر ذِکر کردیا گیا..... تو سمجھنے کے لئے تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ مراد قیامت کا دِن ہے، اور قیامت کے دِن میں احوال مختلف ہوں گے۔ یہ کوئی زیادہ بعید بات نہیں، ہر چیز کی جھلک انسان اس دُنیا کے اندر اپنے حالات میں غور کرنے کے بعد سمجھ سکتا ہے، ایک ہی وقت ہوتا ہے، ایک ہی دن جس میں آپ جارہے ہیں، ایک انسان انتہائی خوشی کے حالات میں ہے، جس وقت سورج غروب ہونے لگتا ہے تو وہ کہتا ہے بھائی نہیں، دن کس طرح سے مکمل گیا، چٹکیوں میں گزر گیا، دیر ہی نہیں لگی۔ اور ایک آدمی کسی پریشانی میں مبتلا ہوتا ہے، وہ یوں سمجھتا

ہے کہ جیسے دِن گزر ہی نہیں رہا،تھوڑی دیر کے بعد گھڑی دیکھے گا تو اس کو ایسے معلوم ہوگا کہ جیسے سوئیاں اپنی جگہ کھڑی ہیں اور گھنٹہ ہی پورا نہیں ہو رہا۔اس سے معلوم ہو گیا کہ انسان کے اپنے تأثر اور اپنی کیفیات کے تحت وقت لمبا بھی ہوتا ہے، چھوٹا بھی ہوتا ہے:

مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اُڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جُدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

(علامہ اقبال،''بانگِ درا'')

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ فرق پڑتا رہتا ہے۔اِسی طرح سے قیامت کے دِن مختلف حالات ہوں گے۔مؤمنین کے بارے میں سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یارسول اللہ! اتنا لمبا دِن ہوگا،اس دِن میں کون صبر کرسکے گا؟ یہ تو بہت مشکل ہوگی،تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مؤمنین کے لئے تو اس طرح گزر جائے گا،جس طرح سے نماز کا وقت گزر جاتا ہے۔[1] اور بعضے لوگ جو پریشانی میں ہوں گے ان کے لئے وہ ایسے ہوگا گویا کہ ایک دِن ہزار برس کے برابر ہوگیا،اور بعضے جو زیادہ پریشانی میں ہوں گے ان کو ایسے لگے گا جیسے یہ پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔تو اِنسان کی اپنی کیفیات کے تحت اس میں لمبائی اور چھوٹائی پیدا ہوجائے گی۔جو خوش حال ہوں گے ان کو ایسے لگے گا جیسے نماز کا وقت گزر گیا،اور دوسروں کو کسی کو ہزار سال کے برابر لگے گا،کسی کو پچاس ہزار سال کے برابر لگے گا......اور واقع کے اعتبار سے بھی دُنیا میں بھی دِن ایک جیسے نہیں ہیں،کسی جگہ چھ مہینے کا دِن ہے،کسی جگہ کتنا لمبا ہوتا ہے،کسی جگہ چھوٹا،کسی جگہ لمبا،اس طرح سے دِنوں میں فرق پڑ جانا کہ کسی جگہ دِن کی لمبائی زیادہ ہو،کسی جگہ کم ہو۔یا احساس کے اعتبار سے فرق پڑ جانا کہ کسی کو وقت زیادہ لمبا لگے کسی کو چھوٹا لگے،یہ ہماری اپنی کیفیات اور دُنیا کے احوال اِس کے اُوپر دلالت کرتے ہیں۔اِس لئے اللہ کے علم میں ہی ہے کہ ہزار سال کی لمبائی،پچاس ہزار سال کی لمبائی،کس کیفیت اور کس حالت کے تحت ہوگی؟ بہرحال ہم اس بات پہ ایمان لاتے ہیں،اور ان دونوں طریقوں سے ہم اس بات کو حل کرسکتے ہیں کہ یا تو انسانوں کی کیفیات کے اعتبار سے وقت کی لمبائی اور چھوٹائی میں فرق ہوگا۔اور یا جس طرح سے دُنیا میں کسی جگہ دِن لمبا ہوتا ہے،کسی جگہ چھوٹا ہوتا ہے،تو ہوسکتا ہے کہ قیامت میں بھی اِسی طرح سے کچھ احوال ہوں۔بہرحال مثالیں دونوں قسم کی موجود ہیں...... ہاں! البتہ اس میں یہ اشارہ ضرور نکلے گا،کہ تم یہ نہ جلدی مچایا کرو کہ اگر تمہارے کہنے کے مطابق عذاب نہ آئے،تو تم کہو کہ اتنی دیر گزر گئی،عذاب کیوں نہیں آرہا؟ تمہارا ہزار سال،اللہ کا ایک دِن۔تو اللہ کے ہاں جو فیصلہ ہوتا ہے،یوں سمجھو کہ اسی دِن ہی ہوگیا،اور تم سمجھتے ہو کہ دیر ہورہی ہے۔اور جب پکڑے جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ کا پیمانہ اور ہے،تمہارا پیمانہ اور ہے۔اِس لئے مشرکینِ مکہ تقریباً پانچ سو سال شرک کے اندر مبتلا رہے،تو یوں سمجھو کہ اللہ کے حساب میں تو آدھا دِن ہی گزرا۔قوموں کے فیصلے جو ہوا کرتے ہیں،وہ ان دنوں کے حساب سے نہیں ہوا کرتے،قوموں کی تاریخ میں سو سال بھی ایسے ہوتا ہے،جیسے دس دِن گزر رہے ہیں۔اس لئے اپنے حساب سے یوں نہ سوچا کرو کہ اتنی مدت ہوگئی،اتنی دیر ہوگئی۔یہ دیر تمہارے حساب سے ہے،اللہ

---

(۱) والذی نفسی بیدہ انہ لیخفف علی المؤمن حتی یکون اھون علیہ من الصلاۃ المکتوبۃ یصلیھا فی الدنیا (مشکوٰۃ ۲/ ۴۸۷ باب الحساب)

کے حساب سے کوئی دیر نہیں ہے...... آگے علم کو ذکر فرمایا، کیونکہ اللہ کے علم کا احاطہ یہ بھی توحید کی بنیاد ہے۔ وہی غیب اور شہادت کو جاننے والا ہے، زبردست، رحم کرنے والا ہے۔

مجموعۂ عالم کے اعتبار سے ہر چیز میں حُسن ہے

جس نے اچھا بنایا ہر اُس چیز کو جس کو پیدا کیا، جو بھی چیز اللہ نے پیدا کی حُسن کے ساتھ ہی پیدا کی، یعنی اللہ کے خلق کے اعتبار سے ہر چیز خوبصورت ہے، یہ علیحدہ بات ہے کہ دُنیا میں ہمارے اعتبار سے بعض چیزوں کے اندر شر کا پہلو ہو جائے، یا ہمارے کسب کے اعتبار سے بعض چیزیں بُری ہو جائیں، وہ ہماری نسبت سے ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ نے جو چیز پیدا کی، حکمت کے تحت پیدا کی، فائدے کے تحت پیدا کی، اور ہر چیز اپنی اپنی حیثیت کے مطابق حُسن کو لیے ہوئے ہے۔ دُنیا کے اندر جتنی چیزیں اللہ نے پیدا فرمائی ہیں، سب حکمت کے تحت ہیں، اور ان کا پتا اس وقت چلتا ہے جب کوئی چیز دُنیا سے ناپید ہو جائے، تو نکمّی سے نکمّی چیز کے بغیر بھی انسان کی زندگی مشکل ہو جاتی ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ بظاہر آپ کو بعض چیزیں ایسے معلوم ہوں گی کہ اچھی نہیں ہیں، آپ اِن کو اچھا نہیں سمجھتے، لیکن مجموعۂ عالم کے اعتبار سے اور اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کرتے ہوئے پُر حکمت ہے اور حُسن کو لئے ہوئے ہے..... اِس کو اگر مثال سے سمجھنا چاہیں تو یوں سمجھئے کہ ایک بادشاہ محل بنواتا ہے، بہت خوبصورت بہت عالی شان، اب جہاں خوبصورت عالی شان محل بنایا جاتا ہے تو اس میں پیشاب پاخانہ کرنے کے لئے بیت الخلا بھی بناتے ہیں، اور گندے پانی کے بہنے کے لئے نالیاں بھی بناتے ہیں۔ اگر صاف ستھرے پانی کی نالیاں اس میں بچھائی جاتی ہیں تو گندے پانی کے بہنے کے لئے بھی نالیاں بچھائی جاتی ہیں۔ اب ایک شخص صرف بیت الخلا کو جا کے دیکھے اور کہے کہ اتنے خوبصورت محل میں اس بیت الخلا کی کیا ضرورت تھی؟ تو بیت الخلا کو تھوڑی دیر کے لئے بند کر دیجئے، پھر جب اس میں آپ رہائش اختیار کریں گے، اور جب پیشاب کا تقاضا ہوگا، پاخانے کا تقاضا ہوگا، تو آپ کو پلنگ پر بیٹھے ہوئے چین نہیں آئے گی، دوڑو گے بیت الخلا کی طرف، پھر اگر بیت الخلا نہ ملے، تو پھر آپ کہیں گے، یہ کیا محل ہے؟ اس میں تو پیشاب کرنے کی جگہ ہی نہیں۔ تب آپ کو پتا چلے گا کہ یہ بیت الخلا کتنا ضروری ہے۔ یہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ محل کے اندر مطبخ ضروری، جتنا محل کے اندر نشست گاہ بیٹھنے کی جگہ ضروری، سونے کی جگہ ضروری، نہانے کی جگہ ضروری، اسی طرح سے بیت الخلا بھی ضروری۔ تو محل مکمل وہی سمجھا جاتا ہے کہ جس میں گندی نالیاں بھی ہوں، جس میں بیت الخلا بھی ہو، اور جس کے کچھ حصے فرش وغیرہ سے مزین بھی ہوں، تکمیل اُس کی تب ہوتی ہے۔ اسی طرح سے چاہے آپ کو کوئی چیز دیکھنے میں کتنی ہی بُری کیوں نہ لگے، لیکن مجموعۂ عالم میں وہ اسی طرح سے حکمت کے تحت ضروری ہے جس طرح سے آپ کے گھر کے اندر بیت الخلا ضروری ہے۔ اس کے بغیر مجموعۂ عالم پوری طرح سے آراستہ اور مزین نہیں ہوتا، حکمت کا تقاضا اسی طرح سے ہے..... مثلاً آپ ایک بیماری کو ہی لیجئے، یہ بھی اللہ نے پیدا کی، تمہارے اعتبار سے یہ باعث تکلیف ہے، تم کہو گے کہ اللہ نے بیماریاں کیوں پیدا کر دیں، لیکن مجموعۂ عالم کے اعتبار سے اس میں جتنی حکمت ہیں کہ آپ کیا سمجھتے ہیں؟ شخصی طور پر بھی اس میں حکمتیں ہیں، اور مجموعۂ عالم کے اعتبار سے بھی حکمتیں ہیں، کہ ذرا آپ تصوّر کر کے دیکھیں کہ اسی بیماری کی برکت سے کتنے انسان

امن و عافیت سے بیٹھے روٹی کھا رہے ہیں۔ بیماری نہ ہو تو ڈاکٹروں کا طبقہ کدھر جائے؟ حکیموں کا طبقہ کدھر جائے؟ اور یہ کتنے میڈیکل اسٹور ہیں جو دوائیاں بیچ بیچ کے گزارہ کرتے ہیں؟ کتنی فرمیں اور کمپنیاں ہیں جو دوائیاں بنا کے گزارہ کرتی ہیں؟ کتنے کسان اور مزدور ہیں، جو اِن کو بوتے ہیں اور زمین سے ان کی کاشت کرتے ہیں۔ یہ سارے کے سارے سلسلے پر اگر آپ نظر پھیلائیں گے تو یوں معلوم ہوگا کہ اگر بیماری ختم ہوجائے تو آدھی دُنیا بے کار ہو کے بیٹھ جائے گی۔ اور اسی طرح باقی چیزیں ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے کچھ اس قسم کی چیزیں پیدا کردیں جن کے ساتھ دُنیا کا نظم چل رہا ہے۔ ایک چیز بھی اگر ان میں سے کھسکالی جائے تو دُنیا کا یہ نظم اس طرح سے نہیں رہ سکتا جس طرح سے آپ کو نظر آرہا ہے۔ اس لئے اللہ کے پیدا کرنے کے اعتبار سے ہر چیز میں حُسن ہے، کوئی چیز حُسن سے خالی نہیں۔ چاہے آپ کی نسبت، یا آپ کے کسب اور کردار کی وجہ سے اس میں کوئی شر کا پہلو پیدا ہوجائے، اللہ کی تخلیق کے اعتبار سے اس میں حُسن ہی حُسن اور حکمت ہی حکمت ہے۔ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ۔

اِثباتِ معاد کے لئے تخلیقِ اوّل کا ذِکر

اور پھر خصوصیت کے ساتھ انسان کو اُس کا اپنا نقشہ دِکھایا۔ انسان کا پیدا کرنا شروع تو مٹی سے کیا، آدم علیہ السلام کو براہِ راست مٹی سے بنایا، پھر اُس کی نسل کو ایک سُلالہ یعنی خلاصے سے بنایا جو کہ ایک بے قدر پانی ہے، یہ غذاؤں کا خلاصہ ہے، پھر اس کے اعضا سارے کے سارے ٹھیک کیے، اعضا ٹھیک کرنے کے بعد اس وقت تک جماد بے جان پڑا ہوا ہے، پھر اس میں رُوح ڈال دی، رُوح ڈالنے کے بعد کان سننے لگ گئے، آنکھیں دیکھنے لگ گئیں، دِل دھڑکنے لگ گیا، اور سوچنے لگ گیا، یکدم ایک بے جان چیز کیسی مخلوق بن گئی، یہ ساری چیزیں اگر دیکھو تو تم ہر وقت اللہ کے شکر گزار رہو۔ لیکن تم شکر نہیں کرتے، قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ تم بہت کم شکر گزار ہو۔ یہ تو پیدا کرنا ہوگیا۔ پیدا کرنے کو اگر یاد رکھتے تو معاد کے بارے میں اِشکال نہ ہوتا، اس چیز کو سوچتے نہیں، اب آگے یوں کہتے ہیں کہ جب ہم مر کے مٹی میں مل جائیں گے تو کیا پھر ہم دوبارہ زندہ کردیے جائیں گے؟ تو ان بے وقوفوں سے پوچھو کہ پہلے بھی تو تمہیں مٹی سے ہی بنایا تھا، پہلے بھی تو تم مٹی میں ملے ہوئے تھے، اسی میں سے غذا نکالی، غذا میں سے خلاصہ نکالا، خون اور نطفہ تیار ہو کے آگے انسان بنا۔ جس طرح سے پہلے اللہ تعالیٰ نے تمہارے اَجزا مٹی سے اکٹھے کر لئے، تو مٹی میں گم ہوجانے کے بعد دوبارہ اکٹھا کرنا اس کے لیے کیا مشکل؟ اب آپ گوشت کھاتے ہیں، دُودھ پیتے ہیں، سبزیاں فروٹ کھاتے ہیں، تو آپ کا بدن بنتا چلا جارہا ہے۔ تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ باغات میں، حیوانات میں، اور ہر جگہ تمہارے ذرّات بکھرے ہوئے ہیں، جو خوراک کی شکل میں آرہے ہیں اور تمہارے بدن کے ساتھ پیوست ہوتے چلے جاتے ہیں، کہاں سے پانی آتا ہے جو تم پیتے ہو؟ کہاں سے دوائیاں آتی ہیں جو تم کھاتے ہو؟ کہاں کہاں سے فروٹ آتے ہیں؟ کہاں کہاں سے گوشت آتا ہے؟ اور اس جانور نے جس کا آپ گوشت کھا رہے ہیں، کہاں کہاں کے گھاس تنکے چنے تھے کھائے تھے؟ تو وہ سب ذرات اس میں اکٹھے ہو کے تمہارے وجود میں پیوست ہوتے چلے جارہے ہیں، تمہارا بدن بنتا چلا جارہا ہے۔ تو پہلے بھی تو تم مٹی میں ملے ہوئے تھے، وہ سب اکٹھے کر کے اللہ نے وجود بنادیا۔ تو دوبارہ گم ہوجاؤ گے تو پیدا کرنا کیا مشکل؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ اپنے رَبّ کی ملاقات کے منکر ہیں، اِس لئے اِس انکار

کے لئے مختلف قسم کے بہانے تلاش کرتے ہیں دِل کو تسلی دینے کے لئے، کہ ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں گی، ذرّہ ذرّہ ہو جائیں گے، مٹی میں رل مل جائیں گی، تو کون پیدا کرے گا؟ اگر ان کو اپنے رَبّ کی ملاقات کا یقین ہو، تو باقی سب باتیں ایسے ہی ٹھیک ہو جائیں۔

قیامت کے دِن کافروں کا حال

اب تو اِس قسم کی باتیں کرتے ہیں، جب اللہ کے سامنے پیشی ہوگی پھر ان کے اُوپر یہ کیفیت طاری ہوگی، پھر منتیں کریں گے، سماجتیں کریں گے، کہ ہمیں دوبارہ لوٹا دیا جائے، ہمیں سب یقین آ گیا، پھر ہم اچھے عمل کر کے آئیں گے، اِس لئے فرمایا کہ اے مخاطب! اگر تُو دیکھے (توی کا خطاب ہر سننے والے کو ہے) جب مجرمین اپنا سر جھکائے کھڑے ہوں گے اپنے رَبّ کے سامنے، کہہ رہے ہوں گے کہ یا اللہ! اب ہمیں ہر حقیقت نظر آ گئی، اب ہم نے ہر بات اچھی طرح سے سُن لی۔ دُنیا میں تو رسول ہمیں دِکھانے کی کوشش کرتے تھے، ہم دیکھتے نہیں تھے، سنانے کی کوشش کرتے تھے، ہم سنتے نہیں تھے۔ اب ہم نے سب کچھ دیکھ سُن لیا، اب ہمیں لوٹا دے ہم اچھے عمل کریں گے، ہمیں یقین آ گیا، ہم یقین کرنے والے ہیں۔

زبردستی اِیمان پر لانا اللہ کی حکمت نہیں ہے

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایمان وہی معتبر ہے جو دُنیا میں اپنے اختیار کے ساتھ لایا جائے۔ اگر زبردستی سب لوگوں کو مؤمن بنانا ہوتا، تو پھر کیا تھا، ہم دُنیا کے اندر ہر کسی کو اس کی ہدایت دے دیتے۔ لیکن ہم نے تو اختیار پہ چھوڑ دیا تا کہ لوگ اپنے ہوش وعقل کے ساتھ سمجھیں، سمجھ کے اچھا راستہ اختیار کریں۔ اگر ہم چاہتے کہ لوگ ایک ہی طریقے پر ہوں تو ہمارے لئے کیا رُکاوٹ تھی، ہم ہر شخص کو اس کی ہدایت دے دیتے۔ لیکن ہماری حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کو اِختیار دیا جائے، تا کہ جنّت بھی آباد ہو، جہنّم بھی آباد ہو۔ جیسے کہ حافظ شیرازی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

در کارخانۂ عشق از کُفر ناگزیر است   دوزخ کرا بسوزد گر بولہب نہ باشد[1]

تو اللہ تعالیٰ نے جنّت میں اپنی مہر (رحمت) کی شان دِکھانی ہے، اور جہنّم میں اپنے قہر کی شان دِکھانی ہے، اس لئے اِنسان کو مختار کر کے چھوڑ دیا، اپنی مرضی کے ساتھ جو چاہے راستہ اختیار کرلے۔ ’’اگر ہم چاہتے تو ہر نفس کو اس کی ہدایت دے دیتے لیکن میری طرف سے یہ بات ثابت شدہ ہے کہ میں جنوں اور انسانوں کو اکٹھا کر کے جہنّم کو بھروں گا!‘‘ اس کے بھرنے کا ذکر حدیث شریف میں آتا ہے۔ اور پھر کہا جائے گا کہ تم نے جو اس دِن کی ملاقات کو نظر انداز کر دیا تھا، آج مزہ چکھو اس نظر انداز کرنے کا، بھولنے کا۔ ہم نے تمہیں نظر انداز کر دیا، یہاں نسیان کی نسبت جو اللہ کی طرف کی جارہی ہے، وہ نظر انداز کرنے کے معنی میں ہے۔ اور آپ بھی کہا کرتے ہیں، جب کوئی دوست کسی موقع پر آپ کو یاد نہ رکھے، بُلائے نہ، آپ کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کرے، تو آپ کہتے ہیں ہمیں تو آپ نے بھلا ہی دیا۔ وہ کہے کہ بھلایا کہاں؟ میں تو ہر روز تیرا نام جپتا ہوں، اور پندرہ دفعہ تیرا نام لیتا ہوں۔ لیکن جب معاملہ اچھا نہ کیا جائے، تو اس کو بھلا دینا ہی کہتے ہیں، نظر انداز کر دینا یہ بھلا دینا ہوتا ہے، ’’ہمیشگی کا عذاب چکھو!‘‘

---

(۱) تفسیر عثمانی، سورہ ہود، آیت ۱۱۹ کے تحت۔

اہلِ ایمان کی صفات

اور ایمان تو وہی لوگ لاتے ہیں کہ جن کے اندر یہ صفتیں پائی جاتی ہیں۔ اللہ کی آیات کو دھیان سے سنیں، اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جائیں تو ان کی عظمت محسوس کرتے ہوئے اللہ کے سامنے جھک جائیں، اور اپنے رَبّ کو تمام عیبوں سے پاک جانیں، تمام کمالات کے ساتھ موصوف جانیں، اور ان میں تکبّر نہ ہو۔ تکبّر ہوتا ہی یہ ہے کہ انسان حق کے سامنے اکڑ جائے، نفسانیت میں آجائے۔ حق بات سامنے آجائے تو اس کے سامنے سر جھکا دیا جائے اور اس کو قبول کرلیا جائے، یہ ہے تواضع۔ اور جو متکبر ہیں وہ فائدہ نہیں اُٹھایا کرتے، فائدہ وہ اُٹھاتے ہیں جن میں تکبّر نہیں۔ اور پھر وہ اپنی بندگی کا احساس رکھتے ہیں، جب لوگ لیٹ جاتے ہیں، آرام کے ساتھ سوئے ہوئے ہوتے ہیں تو ان کے پہلو اپنے بستروں سے جُدا رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کو پُکارتے ہیں، اُمید رکھتے ہوئے بھی خوف رکھتے ہوئے بھی۔

پہلو اُن کے بستروں سے جُدا رہتے ہیں، اس کا مصداق حدیث شریف میں دو چیزوں کو ذِکر کیا گیا ہے۔ اعلیٰ مصداق تو اس کا تہجد ہے، کہ جب ساری مخلوق سوئی ہوتی ہے آرام کے ساتھ، اس وقت یہ اُٹھتے ہیں، اپنے پہلو بستروں سے جُدا کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں، دُعائیں کرتے ہیں اللہ سے اُمید رکھتے ہوئے بھی اور ڈرتے ہوئے بھی۔ حدیث شریف میں آتا ہے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب میدانِ قیامت میں سارے کے سارے لوگ جمع ہوں گے تو آواز دی جائے گی: اَیْنَ الَّذِیْنَ کَانَتْ تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا؟ کہاں ہیں وہ لوگ جن کے پہلو بستروں سے جُدا رہا کرتے تھے، اور ڈرتے ہوئے اور اُمید رکھتے ہوئے اپنے رَبّ کو پُکارا کرتے تھے۔ تو وہ اُٹھ کے کھڑے ہوجائیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: وَھُمْ قلیلٌ! ہوں گے بہت تھوڑے سے، جن کو یہ توفیق ہوتی ہوگی کہ جب سونے کا وقت ہے، تو اس وقت یہ جاگتے ہیں اور اپنے اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ تھوڑے سے ہوں گے۔ اور انہیں کہہ دیا جائے گا کہ جاؤ جنت میں بغیر حساب کے۔[1] تو وہاں متھجدین، تہجد گزار مراد ہیں...... باقی اس کا مصداق ایک یہ بھی ذِکر کیا گیا ہے کہ عرب میں عام عادت تھی، دِن کو چونکہ محنت مشقّت کرتے تھے، تو رات کو سورج کے غروب ہونے کے بعد کھاپی کے جلدی سوجایا کرتے تھے، تو عشاء کی انتظار کے لئے جو لوگ جاگتے رہیں، مغرب اور عشاء کے درمیان میں نماز کے انتظار میں جو لوگ جاگتے رہتے ہیں، ان کو بھی اس کا مصداق بنایا گیا (آلوسی) کہ جو عشاء تک سوتے نہیں، بلکہ اللہ کی یاد میں لگے رہتے ہیں، عام لوگوں کی طرح لیٹتے نہیں ہیں، کیونکہ اس وقت رواج تھا کہ لوگ مغرب کے بعد ہی جلدی لیٹ جایا کرتے تھے، دِن کو محنت مشقّت کرتے، رات آتی تو اپنا کھاپی کے لیٹ جاتے۔ اور عشاء کی نماز حضور صلی اللہ علیہ وسلم دیر سے پڑھا کرتے تھے، تو جو لوگ عشاء کی نماز کے انتظار کے لیے جاگتے ہیں، اور اس وقت میں اللہ کی یاد میں لگے رہتے ہیں، تو وہ بھی اس آیت کا مصداق ہیں...... اور یہ انفاق، اللہ کے راستے میں خرچ کرنا، نماز پڑھنا،

---

(۱) الزھد لھناد رقم ۱۷٦۔ نیز مشکوٰۃ ۲/ ۴۸۷، باب الحساب کا آخر۔ شعب الایمان رقم ۲۹۷۳۔ نوٹ: آخری دو میں "یدعون ربھم خوفا وطمعا" نہیں ہے۔

خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر کردیا۔ آگے ان کا انعام مذکور ہے کہ اللہ نے ان کے لئے کیا کچھ مخفی کر رکھا ہے، کسی کو کیا خبر۔ کیا کیا راحت کا سامان، آنکھوں کی ٹھنڈک اللہ نے ان کے لیے مخفی کی ہے، ان کے عمل کے بدلے کے طور پر۔

وقوعِ قیامت کی ایک حکمت

آگے پھر ایک حکمت کی طرف اشارہ کیا کہ اگر مَر کے سب برابر ہو جائیں گے، تو اِس کا معنی یہ ہے کہ مؤمن اور فاسق سب برابر؟ ایک ساری زندگی بدمعاشی کرتا رہے، عیاشی کرتا رہے، لذتیں اُڑاتا رہے، وہ بھی مَرنے کے بعد مٹی ہوگیا۔ اور ایک آدمی اللہ کی یاد میں رات کو سوتا نہیں، دِن کو روزے رکھتا ہے، جو کماتا ہے اللہ کے راستے میں خرچ کرتا ہے، تو مَرنے کے بعد وہ بھی مٹی ہوگیا۔ دونوں کا انجام برابر ہوگیا، پھر یہ کیا حکمت ہوئی اللہ کی؟ مؤمن اور فاسق کسی صورت میں ایک نہیں ہو سکتے، دونوں کے انجام میں بڑا فرق ہے۔ اگر مَر کر مٹی ہونا ہوا اور دوبارہ اُٹھنا نہ ہو تو پھر تو انجام کے اعتبار سے مؤمن اور فاسق برابر۔ پھر تو وہی بات ٹھیک ہوگی کہ ''بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست!'' جب دوبارہ نہیں آنا تو جو عیش ہوتی ہے کرلو۔ یہاں یہ بات نہیں، بلکہ مؤمن اور فاسق برابر نہیں ہیں۔ مؤمنوں کا انجام یہ ہوگا کہ ان کو ٹھکانے کے باغات ملیں گے، رہنے کے باغات ملیں گے، مہمانی کے طور پر ان عملوں کے سبب سے جو وہ کیا کرتے تھے۔ اور جو فاسق نافرمان ہیں ان کا ٹھکانا جہنم ہے، اور جب وہ جلیں گے، تو بے تابی کے ساتھ بھاگیں گے دروازوں کی طرف باہر نکلنے کے لئے، اگرچہ نکل نہ سکیں گے، نہ ہی نکلنے کی گنجائش ہوگی، لیکن جس طرح سے ایک آدمی مضطر ہوتا ہے، مجبور ہوتا ہے، عذاب سے بھاگتا ہے، ان کو پھر دھکے دے کے واپس لوٹا دیا جائے گا، اور کہا جائے گا کہ اس آگ کا مزہ چکھو جس کی تم تکذیب کیا کرتے تھے۔ ان کا انجام یہ ہو رہا ہے۔

دُنیا کے مصائب میں نیک و بد کا فرق

یہ تو آخرت کے عذاب ہیں۔ باقی! دُنیا میں بھی اللہ تعالیٰ تھوڑا تھوڑا عذاب چکھاتا ہے بڑے عذاب سے پہلے تاکہ لوگ عبرت حاصل کریں، اور اللہ کی طرف رُجوع کرلیں۔ تو دُنیا میں جو مصائب آتے ہیں تکلیفیں آتی ہیں، کافروں کے لئے خصوصیت سے یہ عذابِ اَدنیٰ کا مصداق ہیں۔ مؤمنین کے لئے، صالحین کے لئے بھی یہ تکلیفیں آتی ہیں، لیکن ان کے لئے رحمت کا باعث ہیں، گناہ معاف ہوتے ہیں، درجات کی بلندی ہوتی ہے۔ کافروں کے نہ گناہ معاف ہوں، نہ درجات کی بلندی ہو، اس لیے ان کے لئے اس میں حیثیت عذاب ہی عذاب کی ہوتی ہے۔

اور کون بڑا ظالم ہے اس شخص سے جس کو اللہ کی آیات کے ساتھ نصیحت کی جائے، اور وہ منہ موڑ جائے یہ بہت بڑے ظالم ہیں، اور بدترقسم کے مجرم ہیں۔ اور ہم اِن مجرموں سے انتقام لیں گے، ایسے ہی ان کو کھلی چھٹی نہیں دی جائے گی۔

اِسرائیلی اِمامت سے محروم، اور اُمّتِ محمد اِمامت پر فائز!

آگے حضور ﷺ پر اُتری ہوئی کتاب کے حوالے سے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کو بھی ذِکر کردیا، کہ جیسے آپ کو کتاب دی، اسی

طرح سے موسیٰ علیہ السلام کو بھی کتاب دی تھی، وہ بھی ہدایت تھی بنی اسرائیل کے لئے۔ جن لوگوں نے اس ہدایت سے فائدہ اُٹھایا اللہ کے راستے میں مصیبتیں جھیلیں، اور اس کتاب کی باتوں کے اُوپر یقین لائے، اللہ نے ان کو امامت کا درجہ دیا۔ اور ایک وقت تھا جب بنی اسرائیل دُنیا میں اِمامت کے درجے پہ فائز تھے۔ اسی طرح سے ہم نے آپ کو بھی کتاب دی، اس کتاب کے ملنے میں آپ کو کوئی شک اور تردّد نہیں ہونا چاہیے، جیسے لَا رَیْبَ فِیْہِ پہلے آیا ہے، یہ رَبّ العالمین کی طرف سے ہے۔ تو اگر آپ کی اُمت بھی اس کی باتوں پہ یقین لائے گی، اور اس پر عمل کرنے میں صبر واستقامت دکھائے گی، اللہ تعالیٰ آنے والے وقت میں ان کو بھی امامت دے گا۔ تو گویا کہ توراۃ کے چھوڑنے والے، اس کی خاطر صبر واستقامت نہ کرنے والے، اور یقین میں کمی لانے والے، وہ امامت سے محروم ہوگئے۔ اور اب جو آپ کو کتاب دی جارہی ہے، اگر لوگ اس پر عمل کرتے ہوئے صبر واستقامت دکھائیں گے، اس کی باتوں پہ یقین لائیں گے، تو آگے اِمامت اِن کو مل جائے گی۔

گزشتہ قوموں کا انجام

آگے اسی قسم کی تنبیہ ہے، اللہ تعالیٰ تاریخی واقعات کو ذِکر کرکے تاریخ کا حوالہ دے کے تنبیہ کرتے ہیں کہ اس سے پہلے کتنی قوموں کو کتنی جماعتوں کو ہم نے ہلاک کردیا؟ اُن کے ٹھکانوں کے اندر یہ چلتے پھرتے ہیں، کیا یہ بات ان کے لئے ہدایت کا باعث نہیں؟ یہ تازیانہ ہے، تنبیہ ہے۔ ان کو چاہیے کہ ان قوموں کے انجام سے سبق حاصل کریں۔

''اِثباتِ معاد'' کے لئے ''اِحیائے اَرض'' کا ذِکر

اور آگے وہی قدرت دکھائی۔ خاص طور پر اس کا تعلق اِحیائے موتی کے ساتھ ہے کہ زمین بنجر ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ پانی چلاتے ہیں، لاتے ہیں، یہی بنجر زمین کس طرح سے سرسبز شاداب ہوجاتی ہے۔ بارہا آپ کے سامنے آچکا کہ اِحیائے اَرض کو اللہ تعالیٰ معاد کے لئے ایک نمونے کے طور پر پیش فرمایا کرتے ہیں، کہ بے جان چیز کو زِندہ کردینا اللہ کے لیے کیا مشکل ہے؟ تم روز دیکھتے ہو کہ بنجر اور ویران زمین پڑی ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ اس کی طرف پانی بھیجتے ہیں، پانی کے ساتھ یہ پھر دوبارہ زندہ ہوجاتی ہے۔ آگے اس کی یاددہانی کروائی، کیا یہ دیکھتے نہیں؟ کہ ہم چلاتے ہیں پانی زمین کی طرف، ایسی زمین جو بنجر ہے، ویران ہے، جس کے اُوپر کوئی نباتات نہیں۔ پھر ہم اُسی پانی کے ذریعے سے کھیتی نکالتے ہیں، جس میں سے ان کے چوپائے بھی کھاتے ہیں، اور یہ خود بھی کھاتے ہیں۔ کیا ان کو نظر نہیں آتا؟

شکوۂ اِلٰہی

آگے ان کا وہی شکوہ ہے کہ اتنا سمجھانے کے باوجود پھر کہتے ہیں کہ یہ فیصلہ کب ہوگا؟ یہ پیچھے جو ذِکر آیا تھا، اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اس پر یہ سوال کرتے ہیں۔ تو آپ کہہ دیجئے کہ جلدی نہ مچاؤ، جس دن فیصلے کا دِن آجائے گا، پھر تم ایمان لاؤ گے، اور یہ ایمان لانا تمہارے لئے کوئی نافع نہیں ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایمان وہی نافع ہے جو سمجھ کر سوچ کر تدبر سے اور

اپنے عقل واختیار سے لایا جائے۔ آنکھوں کے سامنے ایک حقیقت آگئی، سامنے حقیقت دیکھنے کے بعد اگر کوئی مانتا ہے تو نہ ماننے کے برابر ہے۔ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ: آپ ان سے اعراض کر جائیے، یعنی ان کے باتوں کی پروانہ کیا کیجئے، انجام کے منتظر رہیے، اور یہ بھی انتظار کرنے والے ہیں۔

''موت'' عدمِ محض نہیں، بلکہ رُوح محفوظ ہے

قُلْ یَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ میں یہ بات آگئی کہ انہیں کہہ دیجئے کہ تمہیں ملک الموت وفات دیتا ہے۔ اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ موت عدمِ محض نہیں ہے کہ تم مر کے مٹی میں مل جاؤ گے، کچھ بھی نہیں رہے گا۔ بلکہ تمہاری رُوح باقی ہے، ملک الموت وصول کر کے لے جاتا ہے۔ جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے پہلے نفخِ رُوح کیا تھا تمہاری مٹی سے ذرّات اکٹھے کر کے، وہی رُوح جو فرشتہ وصول کر کے لے گیا، اللہ تعالیٰ دوبارہ اسی بدن میں جوڑ دے گا۔ پہلے بھی تو پہلے تمہارے بدن کو مٹی سے بنایا گیا، پھر اس میں نفخِ رُوح کی گئی۔ وہی جو تمہاری رُوح ہے وہ ختم نہیں ہوگی۔ ''موت'' کو مشرکین جس طرح سے سمجھتے تھے کہ یہ عدمِ محض ہے، ''موت'' عدمِ محض نہیں ہے، بلکہ فرشتہ ایک چیز وصول کر کے لے جاتا ہے، وہ اِسی طرح سے محفوظ ہے، جو اللہ کی طرف سے نفخِ رُوح ہوا تھا، وہ رُوح محفوظ ہے۔ دوبارہ اِسی طرح سے اللہ تعالیٰ ذرّات کو اکٹھا کر کے جیسے پہلے نفخِ رُوح کیا تھا، اِسی طرح سے اس رُوح کو دوبارہ داخل کر دے گا..... تو ملک الموت کی طرف ''توفّی'' کی نسبت کی گئی ہے ظاہر کے اعتبار سے، ورنہ موت دینا اللہ کا کام ہے۔ البتہ موت دینے کیلئے ذریعہ ملک الموت بنتا ہے..... ''ملک الموت'' سے عزرائیل علیہ السلام مراد ہیں۔ یہ ہیں اس شعبے کے سربراہ۔ باقی اِن کے معاونین اور بہت فرشتے ہیں، صرف یہی اکیلا نہیں، بلکہ اس کا پورے کا پورا شعبہ ہے جو ان کے ساتھ تعاون کرتا ہے، اس لیے کسی جگہ ملائکہ جمع کا صیغہ آیا ہے، یہاں ''ملک الموت'' مفرد کا صیغہ آیا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ
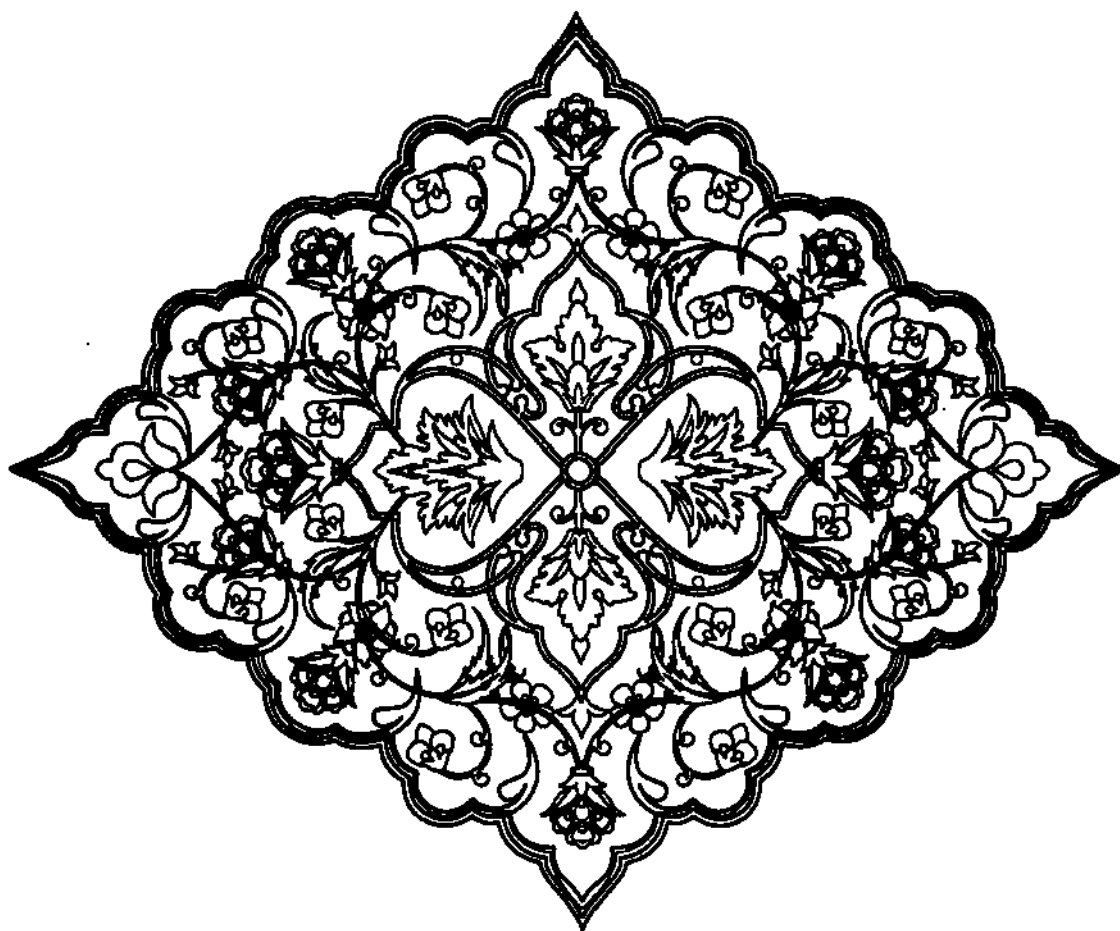
سورة الاحزاب
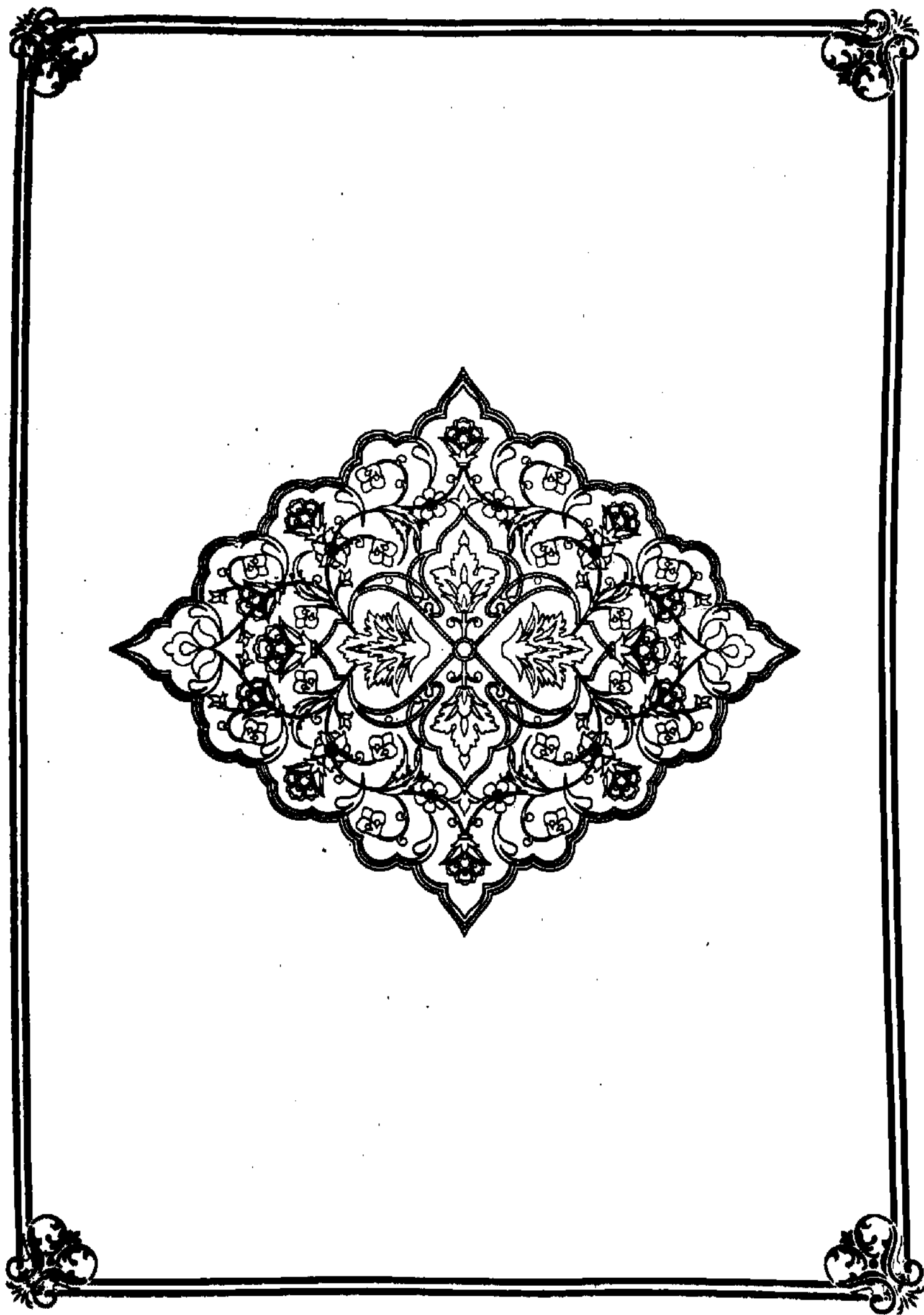
اٰیاتھا ۷۳ — ۳۳ سُوْرَةُ الْاَحْزَابِ مَدَنِیَّةٌ ۹۰ — رکوعاتھا ۹

سورۂ احزاب مدینہ منورہ میں نازل ہوئی اس کی ۷۳ آیتیں ہیں، ۹ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَ لَا تُطِعِ الْكٰفِرِیْنَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ۙ۝۱

اے نبی! اللہ سے ڈرو، کافروں اور منافقوں کی اطاعت نہ کرو، بے شک اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے ①

وَّ اتَّبِعْ مَا یُوْحٰۤى اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ۙ۝۲

اتباع کیجئے اس چیز کی جو آپ کی طرف وحی کی جاتی ہے آپ کے رب کی جانب سے۔ بے شک اللہ خبر رکھنے والے ہیں ان کاموں کی جو تم کرتے ہو ②

وَّ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِیْلًا ۝۳ مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَیْنِ فِیْ جَوْفِهٖ ۚ

اور اللہ پر بھروسا کیجئے، اللہ کافی کارساز ہے ③ نہیں بنائے اللہ تعالیٰ نے کسی آدمی کے لئے دو دل اس کے سینے میں،

وَ مَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔیْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ وَ مَا جَعَلَ اَدْعِیَآءَكُمْ

اللہ تعالیٰ نے تمہاری بیویوں کو جن سے تم ظہار کرتے ہو تمہاری مائیں نہیں بنایا، اور نہ اللہ نے تمہارے منہ بولوں کو تمہارے

اَبْنَآءَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ یَقُوْلُ الْحَقَّ وَ هُوَ یَهْدِی السَّبِیْلَ ۝۴

بیٹے بنایا، یہ تمہاری بات ہے تمہارے اپنے مونہوں سے، اور اللہ حق کہتا ہے، اور وہ سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے ④

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْۤا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِی

پکارا کرو ان کو ان کے آباء کی طرف نسبت کر کے، یہ بات زیادہ انصاف کی بات ہے اللہ کے نزدیک، پھر اگر تم ان کے آباء کو نہ جانو پھر وہ تمہارے

الدِّیْنِ وَ مَوَالِیْكُمْ ؕ وَ لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ فِیْمَاۤ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ وَ لٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ

بھائی ہیں دین میں، اور تمہارے دوست ہیں، کوئی گناہ نہیں تم پر اس چیز میں جس میں تم خطا کر جاؤ، لیکن جس چیز پر قصد کریں گے

قُلُوْبُكُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝۵ اَلنَّبِیُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ

تمہارے دل (اس پر اللہ گرفت کرے گا) اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ⑤ نبی مومنوں پر زیادہ حق رکھنے والا ہے بمقابلہ

اَنۡفُسِهِمۡ وَاَزۡوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمۡ ؕ وَاُولُوا الۡاَرۡحَامِ بَعۡضُهُمۡ اَوۡلٰى بِبَعۡضٍ فِىۡ كِتٰبِ اللّٰهِ

ان کے نفسوں کے، اور اس کی بیویاں مؤمنین کی مائیں ہیں، اور رشتہ دار بعض زیادہ تعلق رکھنے والے ہیں بعض کے ساتھ، اللہ کے قانون میں

مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَالۡمُهٰجِرِيۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ تَفۡعَلُوۡۤا اِلٰٓى اَوۡلِيٰٓئِكُمۡ مَّعۡرُوۡفًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ

بمقابلہ مؤمنین اور مہاجرین کے، مگر یہ کہ تم کرو اپنے دوستوں کی طرف کوئی احسان، یہ بات

فِى الۡكِتٰبِ مَسۡطُوۡرًا ۝۶ وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيۡثَاقَهُمۡ وَمِنۡكَ وَمِنۡ نُّوۡحٍ وَّاِبۡرٰهِيۡمَ

کتاب میں لکھی ہوئی ہے ۶ اور یاد کیجئے کہ جس وقت لیا ہم نے نبیوں سے ان کا پختہ عہد، اور آپ سے اور نوح علیہ السلام سے اور ابراہیم علیہ السلام سے

وَمُوۡسٰى وَعِيۡسَى ابۡنِ مَرۡيَمَ ۖ وَاَخَذۡنَا مِنۡهُمۡ مِّيۡثَاقًا غَلِيۡظًا ۝۷ لِّيَسۡـَٔلَ

اور موسیٰ علیہ السلام سے اور مریم کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام سے، اور ہم نے ان سب سے پختہ عہد لیا ۷ تاکہ سوال کرے اللہ تعالیٰ

الصّٰدِقِيۡنَ عَنۡ صِدۡقِهِمۡ ۚ وَاَعَدَّ لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَذَابًا اَلِيۡمًا ۝۸

سچوں سے ان کی سچائی کے متعلق، اور تیار کیا اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لئے دردناک عذاب ۸

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ۔ يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ اتَّقِ اللّٰهَ: اے نبی! اللہ سے ڈرو۔ وَلَا تُطِعِ الۡكٰفِرِيۡنَ وَالۡمُنٰفِقِيۡنَ: کافروں اور منافقوں کی اطاعت نہ کرو۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا: بے شک اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے۔ وَّاتَّبِعۡ مَا يُوۡحٰۤى اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ: اتباع کیجئے پیروی کیجئے اس چیز کی جو آپ کی طرف وحی کی جاتی ہے آپ کے ربّ کی جانب سے۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرًا: بے شک اللہ تعالیٰ خبر رکھنے والے ہیں ان کاموں کی جو تم کرتے ہو۔ وَّتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ: اور اللہ پر بھروسا کیجئے، وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيۡلًا: اللہ کارساز کافی ہے، باللہ یہ فاعل ہے کفی کا، اور اس کے اوپر باء زائدہ ہے۔ مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنۡ قَلۡبَيۡنِ فِىۡ جَوۡفِهٖ: نہیں بنائے اللہ تعالیٰ نے کسی آدمی کے لئے دو دل اس کے سینے میں۔ جوف اندر کے حصے کو کہتے ہیں، کھوکھلی چیز کا اندر کا حصہ جوف کہلاتا ہے، جیسے جَوۡفِ فَمٍ منہ کے اندر کا حصہ، یہ بھی جوف ہے۔ جَوۡفِ اَنۡفٍ: ناک کے اندر کا حصہ، وہ بھی جوف ہے۔ تو یہاں جوف سے پیٹ ہی مراد نہیں، بلکہ انسان اندر سے جو کھوکھلا ہے، تو اس کھوکھلے حصے کو جوف سے تعبیر کیا گیا۔ اور دل چونکہ سینے میں ہوتا ہے پیٹ میں نہیں ہوتا، اس لئے یہاں ترجمہ یہ ہوگا کہ کسی کے سینے میں اللہ تعالیٰ نے دو دل نہیں بنائے۔ یا مطلقاً ''اندر'' کے ساتھ ترجمہ کیجئے، کسی کے اندر اللہ تعالیٰ نے دو دل نہیں بنائے۔ وَمَا جَعَلَ اَزۡوَاجَكُمُ الّٰٓـئِىۡ تُظٰهِرُوۡنَ مِنۡهُنَّ اُمَّهٰتِكُمۡ: اَزۡوَاجَكُمۡ یہ جَعَلَ کا پہلا مفعول ہے اور اُمَّهٰتِكُمۡ دوسرا مفعول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہاری بیویوں کو جن سے تم ظہار کرتے ہو، تمہاری مائیں نہیں بنایا۔ وَمَا جَعَلَ اَدۡعِيَآءَكُمۡ

اَبْنَآءَكُمْ: اَدْعِيَآءَ یہ دَعِیّ کی جمع ہے، منہ سے بولا ہوا، پکارا ہوا۔ اور نہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے منہ بولوں کو تمہارے بیٹے بنایا، اَبْنَآءَكُمْ یہ دوسرا مفعول ہے، یعنی تم منہ سے بول کے کسی کو بیٹا کہہ دو تو وہ حقیقتاً بیٹا نہیں ہے۔ نہیں بنایا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لے پالکوں کو، منہ بولوں کو تمہارے بیٹے۔ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ: یہ بات ہے تمہاری تمہارے اپنے مونہوں سے وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ: اور اللہ حق کہتا ہے وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ: اور وہ سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے، سیدھے راستے کی ہدایت کرتا ہے، اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ: پکارا کرو اُن کو ان کے آباء کی طرف نسبت کر کے۔ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ: یہ بات زیادہ انصاف کی بات ہے اللہ کے نزدیک، فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْۤا اٰبَآءَهُمْ: پھر اگر تم ان کے آباء کو نہ جانو، ان کے آباء تمہیں معلوم نہ ہوں، فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ: پھر وہ تمہارے بھائی ہیں دین میں، وَمَوَالِيْكُمْ: اور تمہارے دوست ہیں۔ موالی مولیٰ کی جمع ہے۔ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَاۤ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ: کوئی گناہ نہیں تم پر اس چیز میں جس کے ساتھ تم خطا کر جاؤ۔ آگے "بہ" کی ضمیر ہے۔ اس لئے "ما" کو مصدریہ بنانے کی ضرورت نہیں، موصولہ ہی رہے گا۔ جس چیز کے ساتھ تم خطا کر جاؤ، یعنی زبان پر لفظ نادانستہ جاری ہو جائے، چونکہ پہلے سے عادت پکی ہوئی ہے، تو اس پر تو کوئی گناہ نہیں۔ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ: لیکن جس چیز کا قصد کریں گے تمہارے دل، اس پہ اللہ گرفت کرے گا، اس پہ جُناح ہے۔ خطاءً کوئی لفظ منہ سے نکل جائے تو اس پہ جناح نہیں۔ اور جس کو تمہارے دل قصد کر کے کہیں زبان سے نکالیں اس کے اوپر گرفت ہوگی، وہ گناہ ہے۔ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا: اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ: نبی مؤمنین کے ساتھ اولیٰ ہے۔ اولیٰ یہ وَلِیٌّ سے لیا گیا ہے۔ ولی قریب ہونے کو کہتے ہیں۔ یہاں اَحق مراد ہے۔ مؤمنوں پر زیادہ حق رکھنے والا ہے بمقابلہ ان کے نفسوں کے۔ وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ: اور اس کی بیویاں مؤمنین کی مائیں ہیں، وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ: ارحام رِحم کی جمع ہے۔ اور رشتہ دار بعض زیادہ تعلق رکھنے والے ہیں بعض کے ساتھ۔ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ: اللہ کے قانون میں، اللہ کی کتاب میں، اللہ کی تحریر میں، مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ: زیادہ تعلق رکھنے والے ہیں بعض بعض کے ساتھ بمقابلہ مؤمنین اور مہاجرین کے، اِلَّاۤ اَنْ تَفْعَلُوْۤا اِلٰۤى اَوْلِيٰٓئِكُمْ مَّعْرُوْفًا: مگر یہ کہ کرو تم اپنے دوستوں کی طرف کوئی احسان۔ کوئی معروف برتاؤ کرو، اس میں کوئی حرج نہیں۔ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا: یہ بات کتاب میں لکھی ہوئی ہے، لوحِ محفوظ میں لکھی ہوئی ہے، اسی کے مطابق یہ اُتاری گئی ہے، یہ اللہ کا قانون ہے۔ وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ: اور یاد کیجئے کہ جس وقت لیا ہم نے نبیوں سے ان کا پختہ عہد، وَمِنْكَ اور آپ سے وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ: اور نوح علیہ السلام سے اور ابراہیم علیہ السلام سے اور موسیٰ علیہ السلام سے اور مریم کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام سے۔ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا: اور ہم نے اِن سب سے پختہ عہد لیا۔ لِّيَسْـَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ: تاکہ سوال کرے اللہ تعالیٰ سچوں سے ان کی سچائی کے متعلق۔ وَاَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا: اور تیار کیا اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لئے دردناک عذاب۔

تفسیر

سورۂ اَحزاب میں بیان کردہ مضامین

اَحزاب یہ حِزب کی جمع ہے، حزب کہتے ہیں گروہ کو، اور یہ لفظ آگے آ رہا ہے جہاں سے اس سورت کا نام اختیار کیا گیا

یَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ یَذْھَبُوْا۔ مدینہ منورہ میں اُتری، ۷۳ آیتیں ہیں، نو رُکوع ہیں۔ اس سورت میں مرکزی چیز سرورِ کائنات ﷺ کی منصوریت، محبوبیت اور عظمت کو بیان کرنا مقصود ہے۔ اور جو واقعات یا دوسرے اَحکام ذکر کیے جائیں گے وہ سب اسی سے ہی متعلق ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ اس میں واقعہ نقل کیا جا رہا ہے سرورِ کائنات ﷺ کے ساتھ زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح کا۔ سورۂ نور میں جس طرح سے آپ کے سامنے آیا تھا، کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے متعلق کسی نے ایک بات بنائی، اور منافقین نے اُس کو پروپیگنڈے کا ذریعہ بنایا، مسلمانوں کے اندر انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اِسی طرح سے یہ واقعہ بھی ایک اہم ہے، جس کے اُوپر لوگوں کی بہت زبانیں کھلیں، اور اِس کو اِعتراض کا ذریعہ بنایا گیا، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کی پوری پوری وضاحت فرمائی، اور مسلمانوں کو خصوصیت کے ساتھ تاکید کی کہ اللہ کے نبی کی عظمت تمہارے دِل میں بہت ہونی چاہیے، اور آپ کے کسی کام پر، کسی فعل پر اعتراض کرنے میں جلدی نہ کیا کرو۔ اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک آپ کی منصوریت واضح کرنے کے لئے خصوصیت کے ساتھ غزوۂ اَحزاب کا واقعہ تفصیل سے بیان کیا جا رہا ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کی نصرت خاص طور پر نمایاں ہے۔

حضور ﷺ کو وصفی عنوان سے خطاب کرنے کا مقصد

پہلے خطاب ہے حضور ﷺ کو لفظ ''نبی'' کے ساتھ۔ اور یہ بھی سرورِ کائنات ﷺ کی خصوصیت ہے کہ قرآنِ کریم میں کسی جگہ بھی آپ کو نام لے کے خطاب نہیں کیا گیا۔ ''یا محمد'' کہہ کر، یا ''یا احمد'' کہہ کر خطاب نہیں کیا گیا۔ جب بھی خطاب کیا گیا تو کسی وصفی عنوان کے ساتھ ہی کیا گیا، یٰٓاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ، یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ، یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ، یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ۔ باقی انبیاء علیہم السلام کو یانوح، یاابراھیم، یاموسیٰ، اس طرح سے خطاب باقی انبیاء علیہم السلام کو موجود ہے۔ سرورِ کائنات ﷺ کو نام لے کے اللہ تعالیٰ نے خطاب نہیں فرمایا۔ اس میں بھی آپ کی ایک عظمت نمایاں ہے۔ اور عام حالات میں بھی جس طرح سورۂ نور کے آخری رُکوع میں ذکر کیا گیا تھا، سرورِ کائنات ﷺ کو نام لے کے خطاب کرنا، یہ ادب کے خلاف ہی قرار دیا گیا۔ اس لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی حضور ﷺ کو ''یا محمد'' کہہ کے نہیں بُلاتے تھے۔ ''یا رسول اللہ'' کہہ کے بُلاتے تھے، ''یا نبی اللہ'' کہہ کے بُلاتے تھے۔ تو ''یا محمد'' کے ساتھ ندا کرنا حضور ﷺ کے ادب کے خلاف ہے۔ مسئلہ اسی طرح سے ہے۔ یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ: اے نبی! اس میں عظمت کے ساتھ ساتھ سرورِ کائنات ﷺ کو اپنے منصب کی یاد دہانی بھی ہے، کیونکہ تاکید اس میں یہ کرنا مقصود ہے کہ اللہ کی طرف سے جو اُترے بِلَا خَوْفِ لَوْمَةِ لَائِمٍ پہنچاتے جائیے، کسی کی مخالفت، کسی کی ملامت کی کوئی پروانہ کیجئے۔ اِس بات کے اُوپر خصوصیت سے زور دیا جائے گا اس سورت میں۔ اللہ سے ڈرتے رہیے، اللہ کے حکم کی مخالفت نہ ہونے پائے۔

کُفّار و منافقین سے چوکنا رہنے کی ہدایت

وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِیْنَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ: کافروں اور منافقوں کی اطاعت نہ کیجئے۔ کافر کوئی مشورہ دیں جو اللہ کے حکم کے خلاف ہو وہ بھی نہ مانیے، اور منافق جو کہ دوستی کے پردے میں آتے ہیں اور آکے اس قسم کے مشورے دینے لگ جاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہیں ان کی بات بھی نہ مانیے۔ کافر اور منافق دونوں کی عداوت حضور ﷺ کے ساتھ، ایک گروہ کی علی الاعلان اور ایک

گروہ کی در پردہ، اس کے واقعات بھی سورت میں بیان ہوں گے۔ منافقین نے بھی بہت پریشان کیا تھا بعض معاملات میں حضور ﷺ کو، جس کی بنا پر ان کو بھی ڈانٹ ڈپٹ کی جائے گی۔ اور یہ خطاب جو آپ کو کیا جا رہا ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اندیشہ تھا کہ کہیں آپ کافروں منافقوں کی بات نہ مان لیں، بلکہ اس تاکید کے ساتھ کافروں اور منافقوں کو بے آس کرنا مقصود ہوتا ہے کہ وہ اُمید نہ لگائیں کہ ہم کوئی اپنی بات منوا سکتے ہیں۔ جب وہ دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ان کو بار بار اس بات کی تاکید کی جا رہی ہے کہ ان کی بات نہیں ماننی، اس طرح سے ان کا دِل ٹوٹ جائے گا، اور اس کے ضمن میں اصل میں ڈانٹ ان کافروں کے لئے ہے۔ اور سرورِ کائنات ﷺ کو خطاب کر کے جب یہ بات کہی جائے گی تو مؤمنین کے لئے بھی اس میں ایک تاکید کا پہلو ہے کہ جب حضور ﷺ کو منع کر دیا گیا کہ کافروں اور منافقوں کی اطاعت نہیں کرنی، تو پھر دوسروں کے لئے کیا گنجائش رہ جائے گی۔ تو مؤمنین کو بھی محتاط رہنا چاہیے کہ کافروں اور منافقوں کی بات خصوصیت کے ساتھ دِینی معاملات میں، جس میں یہ اندیشہ ہے کہ دوستی کے پردے میں یہ کوئی غلط بات کہہ دیں گے، یہ اللہ کے حکم کے خلاف کوئی بات کروالیں گے، تو چوکنے رہنا چاہیے ان کی بات ماننی نہیں چاہیے۔ ''اے نبی! اللہ سے ڈرتے رہیے اور کافروں اور منافقوں کی اطاعت نہ کیجئے، بے شک اللہ تعالیٰ علم رکھنے والا ہے حکمت والا ہے۔''

کافر منافق آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے

وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ: کافروں کی بات تو ماننی ہی نہیں۔ اطاعت کیجئے، اتباع کیجئے، اسی چیز کی جو آپ کی طرف وحی کی جا رہی ہے آپ کے رَبّ کی جانب سے، آپ کے رَبّ کی طرف سے جو کچھ آپ کو بطور وحی کے بھیجا جا رہا ہے اسی کی آپ اتباع کریں۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا: آگے تَعْمَلُوْنَ کا صیغہ آ گیا، جس سے معلوم ہو گیا کہ خطاب اگرچہ بظاہر حضور ﷺ کو ہے، لیکن سنانا سب کو مقصود ہے۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کی خبر رکھنے والا ہے۔ وَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ کافروں کی پروا نہ کریں، منافقوں کی پروا نہ کریں، اللہ پہ بھروسا کریں، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہوئے اس کے وحی کیے ہوئے احکام کو مانتے ہوئے یہ خیال نہ کیجئے کہ لوگوں سے تعلقات ٹوٹیں گے، لوگ مخالفت کر کے ہمیں کوئی نقصان پہنچا دیں گے، بلکہ اللہ پہ بھروسا کیجئے، اللہ تعالیٰ کارساز کافی ہے۔ وکیل اسے کہا جاتا ہے کہ معاملہ جس کے سپرد کر کے انسان بےفکر ہو جائے۔ بس اپنا مقصد بنالیجئے اللہ کی اطاعت، اور باقی امور کو سپرد کر دیجئے اللہ کے، وہی آپ کے لئے کافی ہے، اللہ تعالیٰ جس وقت آپ کا ناصر ہوگا، مددگار ہوگا، تو یہ کافر منافق آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اس لئے اللہ کے احکام کے مطابق عمل کرنے میں کوئی کسی قسم کی رکاوٹ محسوس نہ کریں، اللہ پہ بھروسا کریں، اللہ تعالیٰ کارساز کافی ہے۔

''ظہار'' کا مفہوم اور حکم

آگے تردید کی جا رہی ہے ان چند رسموں کی جو کہ کافروں مشرکوں کے اندر موجود تھیں، اس جہالت کے معاشرے کی

اصلاح کے طور پر چند ایک احکام دیے جا رہے ہیں، جن میں سے یہاں دو کا ذکر آ رہا ہے۔ پہلی بات تو زمانۂ جاہلیت میں یہ تھی کہ اگر کوئی شخص غصے میں اپنی بیوی کو اپنی ماں کی طرح قرار دے دے، ان میں یہ بات مروّج تھی، کہ ناراض ہو کے جس وقت بیوی سے کوئی قطع تعلق کرنا چاہتا تو جس طرح سے لفظ ''طلاق'' مروّج تھا عرب میں، یہ جاہلیت کے زمانے میں بھی لوگ لفظ ''طلاق'' استعمال کرتے تھے، اِسی طرح سے یہ لفظ بھی ان میں مروّج تھا کہ اپنی بیوی کو کوئی خطاب کر کے کہہ دے ''اَنْتِ عَلَيَّ كَظَهْرِ اُمِّي'' جو فقہ میں آپ پڑھتے رہتے ہیں، یعنی ''تُو میرے پہ ایسے ہی ہے جیسے میرے لیے میری ماں کی پشت!'' اور ماں کی پشت حرام ہے، تو اِسی طرح سے بیوی کو بھی اپنے اُوپر حرام ٹھہرا لیتے، ماں کے ساتھ تشبیہ دے کر یا ماں کے کسی ایسے عضو کے ساتھ تشبیہ دے کے جس کی طرف دیکھنا اس کے لئے حرام ہو۔ عام طور پر چونکہ ''كَظَهْرِ اُمِّي'' کا لفظ استعمال ہوتا تھا، اس لئے اِس مسئلے کو ''ظِہار'' کے عنوان سے ذکر کیا جاتا ہے۔ اگر غصے میں آ کے کوئی اس طرح سے کہہ دیتا تو اس کو وہ یوں سمجھتے تھے کہ حرمتِ مغلظہ آ گئی، جو کسی طرح سے اب اُٹھ نہیں سکتی، یہ ایسے ہی ہو گئی جیسے کسی شخص کے لئے اس کی ماں ہے، اور نکاح بھی ٹوٹ گیا، اور آئندہ کے لئے تعلقات بحال رہنے کی کوئی صورت نہیں۔ تو شریعت نے اس پر بھی اصلاح کی کہ تم یہ جو سمجھ لیتے ہو کہ بیوی کو ماں کہنے سے وہ ماں کی طرح ہو گئی۔ ماں انسان کی وہی ہے جس نے اس کو جنا ہے، اور کسی کو منہ سے ماں کہہ دیا جائے تو وہ ماں نہیں بن جایا کرتی۔ ہاں! البتہ بیوی کو اس طرح سے کہنا نہیں چاہیے، یہ قول منکر وزُور ہے، جس طرح سے سورۂ مجادلہ کے اندر آئے گا۔ یہ قولِ منکر ہے، بُری بات ہے۔ زُور ہے، جھوٹ بولتے ہو جو تم اپنی بیویوں کو ماں کہتے ہو۔ تو جب یہ قولِ منکر اور قولِ زُور ہے، تو یہ کہنا جائز نہیں ہے۔ اور اگر کوئی شخص اس طرح سے کہہ لے تو اس کے اُوپر سرزنش ہے، تنبیہ ہے، کہ وقتی طور پر تنبیہ کے لئے اس بیوی کو اس کے اُوپر حرام کر دیا گیا، لیکن یہ حُرمت مؤبدہ نہیں ہے۔ ایک سزا بھگت لیجئے، کفارہ دے دیجئے، پھر وہ بیوی اسی طرح سے حلال ہو جائے گی۔ یہ طلاق بھی نہیں کہ جس کے ساتھ نکاح ٹوٹ جائے۔ یہ تنبیہ کے طور پر اس کو عارضی طور پر حرام کر دیا جاتا ہے، جس وقت انسان کفارہ ادا کر دے تو کفارہ ادا کرنے کے بعد پھر وہ حُرمت ختم ہو جاتی ہے۔ کفارۂ ظِہار کی فقہ میں آپ نے تفصیل پڑھی، اور قرآنِ کریم میں سورۂ مجادلہ کے پہلے رُکوع میں یہ بات تفصیل سے آ رہی ہے، کفارۂ ظِہار کے طور پر یا غلام آزاد کرنا پڑتا ہے یا دو مہینوں کے روزے رکھنے پڑتے ہیں یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا پڑتا ہے۔ اس طرح سے وہ خاوند بیوی دوبارہ پھر سابق زندگی والے تعلق کو بحال کر سکتے ہیں، اور وہ حُرمت ختم ہو جاتی ہے۔ ایک تو جاہلیت کی اس رسم کو ختم کیا گیا۔ یہاں اجمالاً ذِکر ہے اور سورۂ مجادلہ کے پہلے رُکوع میں اس کی تفصیل آئے گی۔

''متبنّیٰ'' کا شرعی حکم

اور دوسری بات جاہلیت میں یہ تھی کہ جس کو وہ اپنے منہ سے ''بیٹا'' کہہ دیتے، تو اس کو یوں سمجھ لیتے جس طرح سے یہ حقیقی بیٹا ہے، وارث بھی اسی طرح سے ہوتا تھا جس طرح سے حقیقی بیٹا وارث ہے، اور جس طرح سے حقیقی بیٹے کی بیوی حرام ہے اسی طرح

سے اس منہ بولے بیٹے کی بیوی کو بھی حرام سمجھتے تھے، کہ اگر وہ منہ بولا بیٹا اپنی بیوی کو طلاق بھی دے دے یا وہ منہ بولا بیٹا مرجائے اور اس کی بیوی بیوہ ہوجائے تو یہ شخص اس کے ساتھ شادی نہیں کرتا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ ایک غیر حقیقی رشتے کو حقیقی رشتے کی طرح قرار دے لینا، اس سے شریعت کے بہت سے اَحکام پہ اثر پڑتا ہے، خصوصیت کے ساتھ یہ میراث کا مسئلہ ہے، اسی طرح رحم، رشتہ داری کے دوسرے حقوق کہ حقیقی اولاد کے حقوق تلف ہوں گے، اگر دُوسرے کو وراثت دے دی جائے، اور بھی کئی اَحکام اس پہ مرتب ہوتے ہیں، اس کی بیوی سے پردہ ہے یا نہیں؟ بیوی حلال ہے یا نہیں؟ وہ غیر محرم ہے یا محرَم ہے؟ اس کے اُوپر چونکہ بہت سارے اَحکام مرتب ہوتے ہیں تو شریعت نے اس کی بھی اصلاح کی۔ اور یہ ظاہر کیا کہ جس کو منہ سے بیٹا کہہ دیا جائے، وہ حقیقی بیٹا نہیں ہوتا۔ جب وہ حقیقی بیٹا نہیں، تو حقیقی بیٹے والے اس پہ اَحکام بھی نہیں لگیں گے، وراثت اُسے نہیں ملے گی، اور اس کی بیوی تمہارے لیے اس طرح سے نہیں جس طرح سے اپنے بیٹے کی بیوی ہوتی ہے، وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ (سورۂ نساء: ۲۳) کے تحت جس کی حُرمت کا ذِکر آیا تھا۔ بلکہ یہ ایک اجنبی شخص ہے تو جس طرح کسی اجنبی شخص کے فوت ہوجانے کے بعد یا اس کی طرف سے طلاق ہوجانے کے بعد اس کی بیوی سے نکاح کیا جاسکتا ہے، تو اس سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ اور اسی کو زیادہ تفصیل کے ساتھ پیش کیا جائے گا اسی سورت کے اگلے حصے میں۔

اِبتدائی آیات کا پس منظر اور ''زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ'' کا واقعہ

کیونکہ واقعہ یہ پیش آیا تھا کہ سرورِ کائنات ﷺ کے اِظہارِ نبوت سے پہلے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک غلام تھے، جو اصل کے اعتبار سے تو ''زید بن حارثہ'' تھے، آزاد قبیلے کے ہیں، شریف خاندان کے ہیں، کسی دُوسرے قبیلے نے ان کے قبیلے پر حملہ کیا، شب خون مارا، وہاں سے ان کو پکڑ لائے اور غلام بنالیا، لا کے بیچ دیا، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اس کو اپنے لئے حاصل کرلیا، کسی کے ذِمے لگایا تھا کہ کوئی ہونہار غلام میرے لیے خرید کے لانا، اور وہ ان کو خرید کے لے آیا، تو یہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے غلام تھے۔ پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے حضور ﷺ کو یہ ہبہ کردیے، تو آپ کے غلام بن گئے۔ تو کسی سفر میں یہ شام کی طرف جارہے تھے، ان کا اپنے قبیلے پر گزر ہوا، قبیلے والوں نے انہیں پہچان لیا، وہ بھی بہت تلاش میں تھے اور ان کے والدین بڑے پریشان تھے کہ بچہ کدھر چلا گیا؟ تو پھر ان کو پتا چل گیا کہ یہ قریش میں کسی کے غلام ہیں، سرورِ کائنات ﷺ کے اظہارِ نبوّت سے پہلے کا واقعہ ہے، تو زید کے باپ، چچا اور بھائی مکہ معظمہ میں ان کو لینے کے لئے آئے، سرورِ کائنات ﷺ سے ملے، اور صورتِ حال واضح کی کہ یہ حقیقت میں غلام نہیں بلکہ عربی النسل ہے، شریف خاندان کا ہے، اور اس طرح سے دُشمن پکڑ لائے تھے، جس کی بنا پر یہ زبردستی غلام بنالیا گیا، تو آپ اس کو ہمارے سپرد کردیں، اس کا کوئی معاوضہ لینا چاہیں تو لے لیں۔ آپ ﷺ تو اس سے بہت محبت کرتے تھے، ویسے بھی آپ کا اخلاق عالی تھا، پھر یہ خادم گھر میں موجود تھا، خوبصورت ہونہار بچہ تھا، تو بہت شفقت کے ساتھ حضور ﷺ پیش آتے تھے، اور وہ بھی حضور ﷺ کے اخلاق سے اتنے متاثر تھے کہ جب یہ واقعہ پیش آیا، تو حضور ﷺ نے زید کو بُلایا، بُلا کے فرمایا، دیکھو! یہ تمہارے باپ ہیں، یہ تمہارے چچا ہیں، یہ تمہارے بھائی ہیں، تمہیں لینے کے لئے آئے ہیں، اگر جانا

چاہتے ہو تو میری طرف سے اجازت ہے، چلے جاؤ۔ اور اُن کو بھی کہا کہ اس سے پوچھ لو، اگر جانا چاہتا ہے تو میری طرف سے اجازت ہے، اسے لے جاؤ۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کا دامن پکڑ لیا، اور یہ کہا کہ میں تو آپ کو چھوڑ کے بالکل نہیں جاؤں گا۔ چچا نے ملامت کی، بھائی نے ملامت کی، کہ اے زید! آزادی پر غلامی کو ترجیح دیتے ہو؟ تمہارا اپنا خاندان ہے، تمہارا اپنا گھر ہے، وہاں جاؤ گے، آرام سے رہو گے، عزت سے رہو گے، یہاں تم غلام ہو۔ وہ کہنے لگے: کچھ ہو، میں ان کو چھوڑ کے نہیں جاتا! زید نے جواب دے دیا، جب اس کی طرف سے جاں نثاری کا اظہار ہوا، تو سرورِ کائنات ﷺ نے ان کے باپ، چچا اور بھائی کو خوش کرنے کے لئے اور اپنی طرف سے ایک احسان فرمایا کہ ان کے سامنے سیّدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو آزاد کر دیا، آزاد کرنے کے بعد کہہ دیا کہ اب یہ میرا بیٹا ہے، میں اس کو بیٹا بنا کے رکھوں گا، اس زمانے کے رواج کے تحت، یہ ایسے ہی ہو گیا گویا کہ حقیقی بیٹا ہے، چنانچہ اس دِن سے ان کی ''اِبنِ حارثہ'' والی نسبت ختم ہوگئی، اور ''زید بن محمد'' کہلانے لگ گئے (آلوسی)۔ چچا اور بھائی بھی خوش ہو کے چلے گئے، کہ چلو بچہ غلامی سے چھوٹا، اگر آرام کے ساتھ شریف خاندان میں بیٹوں کی طرح رہے گا تو کوئی حرج نہیں۔ تو یہ ''زید بن محمد'' مشہور ہو گئے۔ پھر حضور ﷺ نے اپنی پھوپھی زاد بہن زینب کے ساتھ ان کا نکاح کیا۔ حالات آگے آئیں گے کہ زینب چونکہ ہاشمی خاندان کی تھیں، یہ بہت عالی خاندان ہے، اور زید کے اُوپر غلامی کا دھبا لگ چکا تھا۔ جب حضور ﷺ نے زینب کو یہ مشورہ دیا تھا کہ تُو زید سے نکاح کر لے۔ تو زینب اور اس کے بھائی عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ آمادہ نہیں تھے۔ سرورِ کائنات ﷺ نے حکماً نکاح کروایا، جب حکم دیا تو وہ مان گئے، پھر کوئی عذر باقی نہ رہا، واقعے کی تفصیل آپ کے سامنے آ رہی ہے، لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ خاوند بیوی کی آپس میں نہ بنی، جب نہ بنی تو زید اس کو طلاق دینے کے لئے تیار ہو گئے، جب زید نے طلاق دے دی تو حضور ﷺ نے زینب کی دِلداری اسی میں محسوس کی کہ اب میں اس سے نکاح کر لوں۔ اور اس سے اس رسمِ جاہلیت کا خاتمہ کرنا بھی مقصود تھا کہ لوگوں نے اس کو جو حقیقی بیٹے کی طرح سمجھا ہوا ہے، یہ ٹھیک نہیں، بلکہ یہ اجنبی ہے۔ منہ سے اگر کسی کو ''بیٹا'' کہہ دیا جائے تو وہ ''بیٹا'' نہیں بن جایا کرتا، تو اس رسمِ جاہلیت کی تردید بھی مقصود تھی، زینب کی دِلجوئی بھی مقصود تھی ...... اس کے اُوپر یہ اندیشہ تھا کہ کافر شور مچائیں گے، منافق شور مچائیں گے، ایک فتنہ کھڑا ہو جائے گا، چونکہ یہ بات عرب معاشرے کے بالکل خلاف تھی، اور اس کی اصلاح کرنی ضروری تھی کہ ایک حق چیز ہے اس کو نمایاں کرنا، اور ایک باطل رسم کی تردید کرنا یہ منصبِ رِسالت کے تحت ضروری تھا۔ اس لیے اللہ کی طرف سے یہ حکم آیا اور خبر دے دی گئی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہ اس کا نکاح آپ کے ساتھ کر دیا گیا، اور جس وقت یہ نکاح ہو گیا تو لوگوں کی طرف سے جو اِعتراضات ہوئے ان کو اُٹھانے کے لئے، لوگوں کے سامنے حقیقت واضح کرنے کے لئے، اس سورت کے اندر تفصیلی واقعہ بیان کیا گیا۔ اس لئے اِبتدا سے ہی تاکید چلی آ رہی ہے کہ کافروں کی پروا نہ کیجئے، منافقوں کی پروا نہ کیجئے، جو حکم آپ کو بھیجا جا رہا ہے اس کو خوب اچھی طرح سے نمایاں کیجئے اور اس کی اتباع کیجئے، اللہ پہ بھروسا کیجئے، کوئی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، اور جو حکم بھی آئے اس کو خوب اچھی طرح سے کھول کے بیان کریں۔ جیسے پہلے بھی آپ کے سامنے آیا تھا یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ (سورۂ مائدہ: ۶۷) جو بھی اُتارا جائے اس کو لوگوں کے سامنے واضح کرو۔ اسی قسم کی تاکید اس

سورت میں بھی دی جارہی ہے کہ کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، کسی کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں...... تو یہ جو مُتَبَنّٰی بنانے والی رسم تھی، اس کی تردید ان الفاظ میں کی گئی، جس کی تمہید یہ ہے جو آپ کے سامنے ذکر کی جارہی ہے کہ جس کو تم ''ماں'' کہہ دو، وہ تمہاری ''ماں'' نہیں بن جاتی، اسی طرح سے جس کو تم ''بیٹا'' کہہ دو، وہ تمہارا ''بیٹا'' نہیں بن جاتا۔

شفقۃً کسی کو ''بیٹا'' کہنا اب بھی جائز ہے

اب بیوی کو ''ماں'' کہنا ٹھیک نہیں، اس لیے پرائی اولاد کو اپنا ''بیٹا'' بنانا ٹھیک نہیں، لیکن شفقت اور محبت کے ساتھ اگر ''بیٹا'' کہا جائے، تو اس کا جواز ہے، لیکن اس پہ بیٹے والے اَحکام نہیں لگا کرتے۔ ''ترمذی شریف'' میں مستقل ترجمۃ الباب آتا ہے اسی عنوان پر کہ کسی شخص کا دوسرے کے بیٹے کو ''بیٹا'' کہہ کے بُلانا، اور روایت بیان کی کہ حضور ﷺ حضرت انس رضی اللہ عنہ کو ''یَابُنَیَّ''، ''بیٹا'' کہہ کے بُلایا کرتے تھے۔[1] جس سے معلوم ہوگیا کہ شفقت اور محبت کے ساتھ ''بیٹا'' کہا جاسکتا ہے، لیکن اس کو حقیقی بیٹوں کی طرح قرار دے لینا اور اس کے اُوپر وہی اَحکام لگا دینا یہ ٹھیک نہیں، یہ رسمِ جاہلیت ختم کردی گئی۔ اس وقت سے پھر ان کی نسبت ''ابنِ محمد'' والی ختم ہوگئی، دوبارہ ''ابنِ حارثہ'' والی نسبت آگئی، اب ان کو ''زید بن حارثہ'' کہا جاتا ہے، ''زید بن محمد'' نہیں کہا جاتا۔

دورِ جاہلیت کی باتوں کا رَدّ!

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ: یہ ایک تمہیدی فقرہ ہے۔ اللہ نے کسی آدمی کے سینے میں دو دِل نہیں بنائے۔ یہ ایک واقعہ ہے، لوگ جاہلیت میں یہ بھی کہا کرتے تھے، جو زیادہ ہوشیار ہو، زیادہ بہادر ہو، چوکنا ہو، کہتے تھے کہ اس کے دو دِل ہیں۔ یا بسا اوقات کوئی دوغلا آدمی ہوتا اس کو بھی کہتے کہ اس کے دو دِل ہیں۔ تو یہ کہہ دیا گیا کہ جیسے یہ تمہاری منہ بولی بات ہے، حقیقت نہیں ہے، دِل ایک ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح سے ''ماں'' بھی ایک ہی ہے، اور ''حقیقی باپ'' بھی ایک ہی ہوتا ہے، کسی بچے کے دو باپ نہیں بن سکتے، کسی شخص کی دو مائیں نہیں بن سکتیں۔ جیسے تم اپنے منہ سے یہ کہہ دیتے ہو، اور خلافِ واقعہ ہے، یہ ایک محسوس چیز ہے جس آدمی کے متعلق تم یہ کہو کہ اس کے دو دِل ہیں، تو اس کا آپریشن کر کے دیکھ لو، دِل ایک ہی نکلے گا۔ تو واقعہ یہی ہے کہ دِل ایک ہے، اور تم کسی کے دو دِل کہنا شروع کردو، تو وہ دو نہیں بن جایا کرتے۔ اسی طرح سے والدہ بھی ایک ہی ہوتی ہے، اور ایسے ہی باپ بھی ایک ہی ہوتا ہے۔ نہیں بنائے اللہ تعالیٰ نے کسی آدمی کے لئے اس کے اندر دو دِل...... اور نہیں بنایا تمہاری ان بیویوں کو جن سے تم ''ظہار'' کرلیتے ہو (''ظہار'' کا معنی یہ ہے کہ کسی کا اپنی بیوی کو یہ کہہ دینا: ''اَنْتِ عَلَیَّ کَظَھْرِ اُمِّیْ'' کہ تُو میرے لیے ایسے ہی ہے جیسے میری ماں کی پشت) نہیں بنایا تمہاری ان بیویوں کو جن سے تم ظہار کرلیتے ہو تمہاری مائیں، اور نہیں بنایا تمہارے منہ بولوں کو تمہارے بیٹے، اَدْعِيَآءَكُمْ جن کو لے کے تم پال لیتے ہو، اپنے منہ سے ''بیٹا'' کہہ دیتے ہو تو اللہ تعالیٰ نے وہ تمہارے ''بیٹے'' نہیں بنائے۔

---

(۱) ترمذی ۲/۱۱۰، کتاب الادب، باب ماجاء فی یابنی۔ نیز مشکوٰۃ ص ۳۰ باب الاعتصام فصل ثانی۔

ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ یہ تمہاری بات ہے تمہارے اپنے مونہوں سے، مونہوں سے نکال دی، واقعے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ پہلی بات جو تھی وہ بطورِ مثال کے دے دی گئی کہ جس طرح سے تم اپنے منہ سے یوں کہہ دیتے ہو کہ فلانے کے دو دل ہیں، حالانکہ واقعہ نہیں ہے، مشاہدہ کر سکتے ہو کہ دِل ایک ہی ہوتا ہے، اِسی طرح سے بیویوں کو "ماں" کہنے سے وہ "ماں" نہیں بن جاتیں، اور پرائے بچوں کو "بیٹا" کہنے سے وہ "بیٹے" نہیں بن جاتے۔ تم اپنے منہ سے کہتے رہتے ہو، واقعہ کوئی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ سچی بات کہتا ہے اور وہی سیدھا راستہ بتاتا ہے، تو سچی بات اور سیدھا راستہ یہی ہے کہ بیوی "ماں" نہیں بن سکتی، اسی طرح سے "منہ بولا بیٹا"، "بیٹا" نہیں ہو سکتا۔

نسب تبدیل کرنے پر وعید

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ: "ظہار" کے اَحکام تو آگے سورۂ مجادلہ میں آئیں گے۔ اور یہاں منہ بولے بیٹوں کے متعلق تاکید کی جارہی ہے کہ ان کو ان کے آباء کی طرف نسبت کر کے بُلایا کرو، جب بھی پکارنا پڑے تو ان کو ان کے آباء کی طرف نسبت کر کے پکارا کرو۔ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ: یہ اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف کی بات ہے، بلکہ حدیث شریف میں تفصیل کر دی گئی کہ دوسرے کی طرف نسبت انسان کے لئے حرام ہے، حضور ﷺ نے فرمایا: "مَنِ ادَّعٰی اِلٰی غَیْرِ اَبِیْهِ فَالْجَنَّةُ عَلَیْهِ حَرَامٌ"(۱) اگر کوئی شخص اپنے غیرِ اَب کی طرف منسوب ہو جائے، اپنا نسب نامہ دُوسرا ظاہر کرے اصل نسب نامے کو چھپا کے، تو یہ حرام ہے اور ایسے شخص کے اُوپر حضور ﷺ نے فرمایا کہ جنت بھی حرام ہے، یہ کبیرہ گناہ ہے کہ اپنے نسب کو بدل دیا جائے اور اپنے نسب کو چھوڑ کے کسی دوسرے کی طرف نسبت قائم کر لی جائے۔

فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ: اور اگر تمہیں ان کے آباء معلوم نہ ہوں۔ جس طرح سے کوئی غلام آیا ہوا تھا، آپ نے اس کو بیٹا بنا لیا، جانتے نہیں کہ اس کا اصل باپ کون ہے؟ اگر تمہیں ان کے آباء معلوم نہ ہوں، تو پھر وہ تمہارے دِینی بھائی ہیں، تمہارے دوست ہیں، انہیں دوست کہہ کے بُلاؤ، بھائی کہہ کے بُلاؤ، بہر حال وہ بیٹے نہیں ہیں۔ موالی مولیٰ کی جمع ہے۔ تمہارے دِینی بھائی ہیں، اور تمہارے دوست ہیں۔ اب چونکہ عادت پڑی ہوئی تھی "زید بن محمد" کہنے کی، برس ہا برس تک نام اسی طرح سے لیا جا رہا تھا، تو آپ جانتے ہیں کہ زبان پر چڑھی ہوئی جو بات ہوتی ہے اس کو اُتارنا آسان نہیں ہوتا، اب اگر غلطی سے کوئی آواز دیتے وقت "زید بن محمد" کہہ دے تو اس پہ گناہ نہیں ہے، اگر دفعتاً نکل گیا، خطاءً نکل گیا۔ ہاں! البتہ دِل کے ساتھ قصد کر کے، ارادہ کر کے اگر اب اس نسبت کے ساتھ پکارو گے تو یہ گناہ ہے، اس پہ اللہ تعالیٰ پکڑے گا۔ اتنی سی تخفیف کر دی کہ اگر خطاءً منہ سے کوئی ایسا لفظ نکل جائے تو کوئی بات نہیں، وہ معاف ہے، لیکن قصد کے ساتھ ایسا نہ کہنا۔ "نہیں تم پر گناہ اس چیز میں جس کے ساتھ تم خطا کر جاؤ، چُوک جاؤ۔ لیکن جس چیز کا قصد کریں گے تمہارے دِل، اس کے اُوپر گناہ ہوگا، اور اس کے اُوپر گرفت ہوگی۔" قصد اور ارادے کے

---

(۱) بخاری ۱۰۰۱/۲ باب من ادعی الی غیر ابیہ۔ مشکوٰۃ ۲۸۷/۲ باب اللعان، فصل اول۔

ساتھ آئندہ ان کی نسبت دوسرے اب کی طرف نہیں کرنی، بلکہ حقیقی آباء کی طرف نسبت کرو۔ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ اس لئے اگر قصد کے ساتھ بھی کبھی کہہ بیٹھو، تو توبہ کرو، توبہ کے بعد اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور مغفرت کی وجہ سے تمہیں معاف کردے گا۔ یہ بات یہاں ختم کردی گئی، اور اس کی تفصیل آگے آرہی ہے، جہاں حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح کا قصہ آئے گا۔

آپ ﷺ کا حق مؤمن پر اس کی جان سے بھی زیادہ ہے!

اب مسلمانوں کو، دوسرے لوگوں کو متوجہ کیا جارہا ہے، کہ حضور ﷺ کے حقوق کی رعایت رکھا کرو۔ آپ ﷺ کا حق تمہارے اُوپر بہت زیادہ ہے، کوئی بات عظمت کے خلاف نہ ہونے پائے۔ اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ: نبی مؤمنوں کے زیادہ قریب ہے بمقابلہ ان کے نفسوں کے۔ ان کے نفس بھی ان کے اتنے قریب نہیں، جتنا نبی قریب ہے۔ یہاں قریب ہونا باعتبار حقوق کے ہے۔ جتنا نبی کا حق ہے مؤمن کے اُوپر، اتنا اس کی اپنی جان کا بھی حق نہیں، اپنا بھی حق اتنا نہیں، اور باقیوں کا تو کیا ہی کہہ سکتے ہیں۔ اور اس احق ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ''مؤمنین'' یہ جو وصف عنوانی ہے یہ جن لوگوں کے اُوپر صادق آتا ہے، آپ جانتے ہیں اس وصف عنوانی کے صادق آنے کے لئے واسطہ بنے ہیں سرورِ کائنات ﷺ۔ مثلاً زید، عمرو، بکر، ان کے اُوپر ''مؤمنین'' کا لفظ صادق آتا ہے، ہم سب پر ''مؤمنین'' کا لفظ صادق آتا ہے، تو یہ وصف عنوانی جو ہمارے اُوپر صادق آتی ہے تو بواسطہ رسول اللہ ﷺ، ہم نے ایمان کو حاصل کیا حضور ﷺ کی وساطت سے۔ اس لئے جب ہم اپنے مؤمن ہونے کا تصور کریں گے تو پہلا تصور ہمیں حضور ﷺ کا آئے گا۔ اس لیے مؤمن ہونے کی حیثیت میں آپ ﷺ کا حق ہم پر ہمارے اپنے حقوق سے بھی زیادہ ہے، اور اپنے والدین کے حقوق سے بھی زیادہ ہے، حضور ﷺ کا حق ان سب سے مقدم ہے، اس لئے اپنی کوئی خواہش جو حضور ﷺ کی اطاعت کے خلاف ہو، حقِ محبت کے خلاف ہو، اس پر بھی عمل کرنا جائز نہیں۔ والدین کا کوئی حکم جو حضور ﷺ کے حکم کے خلاف ہو یا آپ کے حقِ عظمت یا حقِ اطاعت کے خلاف ہو، وہ ماننا بھی جائز نہیں۔ تو اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ سے یہ بات نکل آئے گی۔ حدیث شریف میں آتا ہے سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ ''لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ''[1] تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہوسکتا، جب تک کہ اس کی خواہشات میرے لائے ہوئے طریقے کے تابع نہ ہوجائیں۔ اس میں اسی حقِ اطاعت کی طرف اشارہ کیا کہ تم اب اپنی خواہشات پر اگر چلو گے تو یہ بات ایمان کے منافی ہے۔ اپنی خواہشات کو میرے لائے ہوئے طریقے کے تابع کرو، میرے حکم کے تابع کرو، تب جا کے تم مؤمن کہلانے کے حق دار ہو۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگیا کہ حضور ﷺ کا حقِ اطاعت ہمارے اپنے حق سے بھی زیادہ ہے کہ ہم اپنی خواہش پر عمل نہیں کرسکیں گے، اپنی خواہشات کو بھی حضور ﷺ کے لائے ہوئے احکام کے تابع کیجئے، صاف بات آگئی، جب تک اپنی خواہشات کو حضور ﷺ کے لائے ہوئے طریقے کے تابع نہیں کردو گے، اس وقت تک تم مؤمن نہیں۔ تو حضور ﷺ کے اَحکام کے خلاف اپنی خواہشات پہ چلنا، یہ بھی ایمان

(۱) مشکوٰۃ ۱/ ۳۰ باب الاعتصام فصل ثانی۔ بحوالہ شرح السنۃ۔

کے منافی ہے۔اور یوں ہی فرمایا: ''لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّلَدِهٖ وَوَالِدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ''[1] او کما قال علیہ الصلاۃ والسلام، کہ جس وقت تک مجھے اپنی اولاد کے مقابلے میں، اپنے والدین کے مقابلے میں، اور سب لوگوں کے مقابلے میں زیادہ محبوب نہیں رکھو گے، اُس وقت تک بھی تم مؤمن نہیں...... اور یہاں محبت وہی اطاعت والی محبت ہے جس کو محبت عقلی کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔لہٰذا اولاد کا حق بھی مغلوب ہو گیا، والدین کا حق بھی مغلوب ہو گیا، اور وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ کے اندر یہ بات واضح کر دی گئی کہ کوئی شخص بھی ایسا نہیں کہ جس کے ساتھ محبت سرورِ کائنات ﷺ کے مقابلے میں زیادہ رکھی جائے، اگر کسی سے محبت رکھو گے تو تم مؤمن نہیں۔اور یہاں محبت عقلی مراد ہے جس کو اطاعت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔تو اللہ کے رسول کے حکم کے مقابلے میں اولاد کی فرمائش کا پورا کرنا، والدین کی فرمائش کا پورا کرنا، یا لوگوں میں سے کسی کی فرمائش کا پورا کرنا، یہ ایمانی صفت کے تقاضے کے خلاف ہے۔اس لئے مؤمن ہونے کی حیثیت سے تمہارے سب سے زیادہ قریب، سب سے زیادہ احق، تمہارے ساتھ تعلق رکھنے والے سرورِ کائنات ﷺ ہیں۔ان کے مقابلے میں کسی کا تمہارے ساتھ زیادہ تعلق نہیں، اور کوئی بھی تم سے اطاعت حاصل کرنے کا حق دار نہیں۔اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ میں یہ بات کہہ دی گئی۔اور احادیث کے اندر اسی کی تفصیل بتا دی گئی۔مِنْ اَنْفُسِهِمْ تمہاری اپنی جانوں سے بھی زیادہ حق رکھتے ہیں، مؤمنین کی جانوں سے بھی زیادہ مؤمنین پہ حق رکھتے ہیں۔

اَزواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کو ''مائیں'' کس حیثیت سے کہا گیا؟

وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ: یہ دوسری عظمت نمایاں کر دی گئی کہ نبی کی بیویاں مؤمنین کے لئے ''مائیں'' ہیں۔اس لئے نبی کی کسی بیوی کے متعلق کوئی بات کرنا، دِل میں کوئی خیال لانا، یہ ایسے ہی ہے جس طرح سے کوئی شخص اپنی ''ماں'' کے متعلق سوچے۔''ماں'' کی شان میں گستاخی نہیں کی جاسکتی، ''ماں'' کی بے ادبی نہیں کی جاسکتی، تو حضور ﷺ کی ازواج کا بھی ایسے ہی احترام ہے جس طرح سے ''ماں'' کا۔تو جب بیویاں ''ماں'' کی طرح ہوئیں تو حضور ﷺ ''باپ'' کی طرح ہو گئے۔اور یہ اُبوّت رُوحانی ہے، جس طرح سے حضور ﷺ کی بیویوں کو جو ''ماں'' کہا جا رہا ہے، یہ ادب واحترام کے اعتبار سے ہے، لیکن حقیقتاً ''مائیں'' یہ بھی نہیں بنتیں، اس لئے ان سے پردہ تھا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے وہ پردہ کرتی تھیں، اور دُوسرے اَحکام بھی وہی تھے جو غیر محرموں کے ہوا کرتے ہیں۔تو ادب اور احترام کے اعتبار سے ان کو ''مائیں'' قرار دیا جا رہا ہے۔البتہ آگے صراحتاً آ جائے گا کہ حضور ﷺ کی وفات کے بعد ان کے ساتھ کسی اُمتی کا نکاح نہیں ہوسکتا، وَلَاۤ اَنْ تَنْكِحُوْۤا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا (سورۂ احزاب: ۵۳) ہمیشہ کے لئے، دائماً یہ حکم جاری کر دیا گیا کہ حضور ﷺ کے بعد ان عورتوں کے ساتھ کوئی شخص نکاح نہیں کرسکتا، نکاح اُن کا حرام ہے، وہ مستقل حکم آ گیا۔اور یہاں جو ''ماں'' کہا جا رہا ہے یہ ادب واحترام کے اعتبار سے ہے، تو حضور ﷺ ''باپ'' کی طرح ہو گئے، اس میں بھی عظمت نمایاں ہے۔

---

(۱) مسلم ۱/۴۹، باب وجوب محبۃ رسول اللہ۔نیز بخاری ص ۷، باب حب الرسول۔مشکوٰۃ ص ۱۲، کتاب الایمان، فصل اول۔بخاری، مشکوٰۃ میں والد کا ذکر پہلے ہے۔

وراثتی حق صرف حقیقی رشتہ داروں کا ہے

البتہ جہاں تک وراثت کا تعلق ہے، یہاں اولویت جو ذکر کی جا رہی ہے، تعلق جو ذکر کیا جا رہا ہے اس کا وراثت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ رشتے دار زیادہ قریب ہیں ایک دوسرے کے اللہ کے قانون میں بمقابلہ مؤمنین اور مہاجرین کے۔ یہ ساتھ ہی قانون نافذ کر دیا گیا۔ مدینہ منورہ میں جانے کے بعد حضور ﷺ نے وقتی مصلحت کے طور پر "بھائی چارہ" قائم کر دیا تھا لوگوں کے درمیان صفتِ ایمانی کی بنا پر، کہ مؤمن مؤمن کا بھائی ہے، اس کو وارث قرار دے دیا گیا۔ اگر کسی کا قریبی رشتہ دار کافر ہے، وہ وارث نہیں۔ اور اگر قریبی رشتہ دار بھی مؤمن ہے تو جس طرح وہ وارث ہے، اسی طرح سے دوسرا مؤمن جس کو بھائی بنا دیا گیا، وہ بھی وارث ہے۔ انصار اور مہاجرین کی آپس میں "مواخات" کرا دی تھی کہ ایک آدمی کے تین بھائی حقیقی ہیں، چوتھا بھائی ان کے ساتھ مہاجر لگا دیا گیا، تو جب وراثت تقسیم ہوتی تو ایسے ہوتی جیسے کہ سارے حقیقی ہیں، مہاجر انصاری کا وارث تھا، انصاری مہاجر کا وارث تھا، "مواخات" قائم کر دی تھی۔ لیکن کچھ دیر کے بعد پھر اس قانون کو ختم کر دیا گیا، کہ وراثتی حق حقیقی رشتہ داروں کا ہے، انہی کا آپس میں تعلق ہے، باقی! مؤمنین مہاجرین وہ تمہارے دوست ہیں، وصیت کے طور پر اگر کسی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا چاہتے ہو تو کر سکتے ہو، باقی! وراثت میں حق نہیں ہے۔ سورۂ اَنفال کے آخر میں بھی آیت آئی تھی، اس میں بھی مسئلے کی وضاحت کر دی گئی تھی، اور اس جگہ بھی اس آیت کا یہی مفہوم ہے، رشتہ دار بعض زیادہ لائق ہیں بعض کے ساتھ، زیادہ تعلق رکھنے والے ہیں بعض کے ساتھ۔ یہاں قرب مراد ہے باعتبار وراثت کے، جیسا کہ مفسرین نے تصریح کی ہے۔ اللہ کے قانون میں بمقابلہ مؤمنین اور مہاجرین کے۔ اب ایمانی رشتے کی بنا پر وراثت نہیں آئے گی، یعنی اگر حقیقی رشتہ دار نہیں، صرف مؤمن ہونے کی بنا پر بھائی ہے، یا مہاجر ہونے کی بنا پر بھائی ہے، جس کو کسی انصاری کے ساتھ جوڑ دیا گیا، ایسے طور پر وراثت نہیں ہوگی۔ اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِكُمْ مَّعْرُوْفًا: ہاں! البتہ یہ تمہارے اولیاء ہیں، تمہارے دوست ہیں، اگر ان کے ساتھ کوئی اچھا برتاؤ کرنا چاہو تو کر سکتے ہو، جس کی صورت یہی ہے کہ وصیت کر جاؤ، زندگی میں ہدیہ تحفہ دیدو، یا وصیت کر جاؤ کہ میرے مرنے کے بعد میرے مال میں سے میرے فلانے دوست کو، فلانے دینی بھائی کو اتنا دے دینا، یہ کر سکتے ہو۔ باقی! وراثت نہیں ہے، كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا: کتاب میں یہ بات لکھی ہوئی ہے، لوحِ محفوظ میں، وہی اللہ تعالیٰ نے اپنی اس کتاب میں اتاری۔

"میثاقِ انبیاء"

آگے پھر اَخذِ میثاق کا ذکر ہے، جس میں پھر تبلیغ کی تاکید ہے۔ یاد کیجئے جبکہ ہم نے نبیوں سے ایک میثاق لیا تھا، آپ سے بھی، نوح سے بھی، ابراہیم، موسیٰ عیسیٰ علیہم السلام، سب سے میثاق لیا تھا۔ اور یہ "میثاق" ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے، جو عام "میثاق" کے علاوہ ہے۔ ایک "میثاق" تو عام بنی آدم سے لیا تھا، جس کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ اعراف (آیت: ۱۷۲) میں آئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے سب بنی آدم کو خطاب کر کے پوچھا: "اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ؟" تو ہم سب نے کہا تھا: بَلٰی۔ یہ تو ایک عمومی میثاق ہے جو

بنی آدم سے لیا گیا۔ اور حدیث شریف میں جس طرح سے آتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام بھی اس مجمع میں موجود تھے۔ اس عام میثاق کے بعد ''خُصُّوا بِمِیْثَاقٍ آخَرَ'' ان کو پھر ایک اور میثاق کے ساتھ خاص کیا گیا۔(1) وہ میثاق یہی تھا کہ جب تم دنیا میں جاؤ گے، میں تم پر کتاب اُتاروں گا، اس کتاب کی اتباع کرنا، اس کی آگے تبلیغ کرنا، اور تمہاری موجودگی میں کوئی دوسرا رسول آجائے تو اس کی تائید کرنا، اس کی نصرت کرنا، یہ تفصیل بھی آپ کے سامنے آئی تھی۔ اور اس میں چونکہ تبیینِ حق کا مسئلہ بھی تھا کہ جو کچھ تم پر اُتارا جائے وہ لوگوں تک پہنچانا ہوگا، خود بھی اتباع کرنی ہوگی اور دوسروں تک بھی پہنچانا ہوگا، تو وہ میثاق یہاں ذکر کیا جارہا ہے، تا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تبلیغ کے لئے زیادہ اہمیت کے ساتھ برانگیختہ کیا جاسکے۔ یاد کیجئے جب ہم نے نبیوں سے ان کا میثاق لیا آپ سے بھی اور خصوصیت سے بڑے بڑے رسول ذکر کردیے، جو اولوالعزم من الرسل مشہور ہیں، نوح علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام۔ اور ہم نے ان سب سے پختہ عہد لیا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ صادقین سے ان کے صدق کے متعلق پوچھے گا، اور ان کو ان کے صدق کی جزا دے گا۔ اور انکار کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے عذابِ الیم تیار کیا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا

اے ایمان والو! یاد کرو اللہ کے احسان کو جو تم پر ہوا، جبکہ آئے تھے تمہارے پاس لشکر پھر ہم نے ان کے اُوپر

عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۚ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۝٩ اِذْ

ہوا بھیج دی، اور ایسے لشکر بھیج دیے جن کو تم نے نہیں دیکھا، اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو دیکھنے والے تھے ⑨ جبکہ

جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ

آگئے وہ لوگ تمہارے اُوپر سے اور تمہارے نیچے سے اور جبکہ آنکھیں ٹیڑھی ہوگئیں اور قلوب حلقوں کو

الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝١٠ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا

پہنچ گئے، اور تم اللہ کے متعلق مختلف قسم کے گمان کررہے تھے ⑩ اس موقع پر آزمائش میں ڈالے گئے مؤمن، اور زلزلے میں ڈالے گئے

زِلْزَالًا شَدِيْدًا ۝١١ وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا

سخت زلزلے میں ڈالنا ⑪ اور جب کہہ رہے تھے منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری تھی، نہیں وعدہ کیا ہمارے ساتھ

(1) مشکوٰۃ ۱/ ۲۴، باب الایمان بالقدر کا آخر۔ مسند احمد، رقم: ۲۱۲۳۲۔

اللّٰهُ وَرَسُولُهٗۤ اِلَّا غُرُوۡرًا ﴿۱۲﴾ وَاِذۡ قَالَتۡ طَّآئِفَةٌ مِّنۡهُمۡ يٰۤاَهۡلَ يَثۡرِبَ لَا مُقَامَ

اللہ اور اس کے رسول نے مگر دھوکا دینے کا ⑫ اور جب انہی (منافقین) میں سے ایک گروہ نے کہا تھا اے یثرب والو! نہیں ہے ٹھہرنا

لَكُمۡ فَارۡجِعُوۡا ۚ وَيَسۡتَاۡذِنُ فَرِيۡقٌ مِّنۡهُمُ النَّبِىَّ يَقُوۡلُوۡنَ اِنَّ بُيُوۡتَنَا عَوۡرَةٌ ۛ وَمَا

تمہارے لیے، پس تم واپس لوٹ جاؤ، اور ان میں سے ایک فریق حضور ﷺ سے اجازت طلب کرتا تھا، کہتے تھے ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں، اور نہیں

هِىَ بِعَوۡرَةٍ ۛۚ اِنۡ يُّرِيۡدُوۡنَ اِلَّا فِرَارًا ﴿۱۳﴾ وَلَوۡ دُخِلَتۡ عَلَيۡهِمۡ مِّنۡ اَقۡطَارِهَا ثُمَّ

ہیں وہ گھر غیر محفوظ، نہیں، ارادہ کرتے یہ لوگ مگر بھاگنے کا ⑬ اگر دُخول ہو جائے ان کے اُوپر مدینہ کی جوانب سے، پھر

سُئِلُوا الۡفِتۡنَةَ لَاٰتَوۡهَا وَمَا تَلَبَّثُوۡا بِهَاۤ اِلَّا يَسِيۡرًا ﴿۱۴﴾ وَلَقَدۡ كَانُوۡا عَاهَدُوا

ان سے فتنے کا سوال کیا جائے تو یہ اس فتنہ میں شامل ہو جائیں گے، اور نہیں ٹھہریں گے گھروں میں مگر تھوڑا سا ⑭ البتہ تحقیق ان لوگوں نے معاہدہ کیا تھا

اللّٰهَ مِنۡ قَبۡلُ لَا يُوَلُّوۡنَ الۡاَدۡبَارَ ؕ وَكَانَ عَهۡدُ اللّٰهِ مَسۡـُٔوۡلًا ﴿۱۵﴾ قُلۡ لَّنۡ يَّنۡفَعَكُمُ

اللہ کے ساتھ اس سے قبل کہ یہ پیٹھ نہیں پھیریں گے، اور اللہ کے ساتھ کیا ہوا عہد پوچھا جائے گا ⑮ آپ انہیں کہہ دیجئے کہ بھاگنا تمہیں ہرگز

الۡفِرَارُ اِنۡ فَرَرۡتُمۡ مِّنَ الۡمَوۡتِ اَوِ الۡقَتۡلِ وَاِذًا لَّا تُمَتَّعُوۡنَ اِلَّا قَلِيۡلًا ﴿۱۶﴾ قُلۡ مَنۡ

نفع نہیں دے گا، اگر تم بھاگنا چاہو موت سے یا قتل سے، اور اس وقت تم نہیں فائدہ پہنچائے جاؤ گے مگر تھوڑا سا ⑯ اور آپ کہہ دیجئے کون

ذَا الَّذِىۡ يَعۡصِمُكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ اِنۡ اَرَادَ بِكُمۡ سُوۡٓءًا اَوۡ اَرَادَ بِكُمۡ رَحۡمَةً ؕ وَلَا

ہے جو بچائے گا تمہیں اللہ سے اگر اللہ تمہارے متعلق بُرائی کا ارادہ کر لے، یا ارادہ کر لے اللہ تمہارے ساتھ رحمت کا، اور نہیں

يَجِدُوۡنَ لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيۡرًا ﴿۱۷﴾ قَدۡ يَعۡلَمُ اللّٰهُ الۡمُعَوِّقِيۡنَ

پائیں گے یہ اللہ کے علاوہ کوئی یار اور نہ کوئی مددگار ⑰ تحقیق جانتا ہے اللہ ان لوگوں کو جو روکنے والے ہیں

مِنۡكُمۡ وَالۡقَآئِلِيۡنَ لِاِخۡوَانِهِمۡ هَلُمَّ اِلَيۡنَا ۚ وَلَا يَاۡتُوۡنَ الۡبَاۡسَ اِلَّا قَلِيۡلًا ۙ﴿۱۸﴾

تم میں سے، اور کہنے والے ہیں اپنے بھائیوں کو کہ آجاؤ ہماری طرف، اور نہیں آتے وہ لڑائی میں مگر بہت کم ⑱

اَشِحَّةً عَلَيۡكُمۡ ۖۚ فَاِذَا جَآءَ الۡخَوۡفُ رَاَيۡتَهُمۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَيۡكَ تَدُوۡرُ اَعۡيُنُهُمۡ

تم پر بخل کرتے ہوئے، پھر جب کوئی خوف آجاتا ہے تو دیکھتا ہے تو ان کو کہ جھانکتے ہیں تیری طرف، چکرا رہی ہیں ان کی آنکھیں

كَالَّذِي يُغْشَى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۚ فَإِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوكُم بِأَلْسِنَةٍ حِدَادٍ

مثل اس شخص کے جس کے اُوپر موت کی غشی طاری کردی گئی ہو، جب خوف چلا جاتا ہے تو پھر تمہارے اُوپر باتیں بناتے ہیں تیز تیز زبانوں کے ساتھ

أَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ ۚ أُولَٰئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوا فَأَحْبَطَ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى

مال کے اُوپر حرص کرتے ہوئے، یہ لوگ مؤمن نہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال ضائع کر دیے، اور یہ بات اللہ پر

اللَّهِ يَسِيرًا ﴿١٩﴾ يَحْسَبُونَ الْأَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوا ۖ وَإِن يَأْتِ الْأَحْزَابُ يَوَدُّوا لَوْ

آسان ہے ⑲ سمجھتے ہیں لشکروں کے متعلق کہ نہیں گئے، اور اگر یہ لشکر آ جائیں تو چاہیں گے یہ لوگ کہ

أَنَّهُم بَادُونَ فِي الْأَعْرَابِ يَسْأَلُونَ عَنْ أَنبَائِكُمْ ۖ وَلَوْ كَانُوا فِيكُم مَّا قَاتَلُوا إِلَّا قَلِيلًا ﴿٢٠﴾

وہ اَعراب میں جانے والے ہوتے، تمہاری خبریں پوچھتے رہتے، اور اگر یہ تمہارے اندر موجود ہوتے تو نہ لڑتے مگر تھوڑا سا ⑳

لَّقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ

البتہ تمہارے لئے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے یعنی اُس کے لئے جو کہ اللہ اور یوم آخر کی اُمید رکھتا ہے

وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ﴿٢١﴾ وَلَمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ قَالُوا هَٰذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ

اور اللہ کو بہت یاد کرتا ہے ㉑ جب مؤمنین نے ان لشکروں کو دیکھا تو کہنے لگے یہ تو وہی ہے جس کے متعلق اللہ نے اور اللہ کے رسول

وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ ۚ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا ﴿٢٢﴾ مِّنَ

نے ہم سے وعدہ کیا، اللہ اور اُس کے رسول نے سچ کہا، اور اس چیز نے نہ زیادہ کیا مؤمنین کو مگر از روئے ایمان کے اور از روئے تسلیم کے ㉒ مؤمنین میں

الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ ۖ فَمِنْهُم مَّن قَضَىٰ نَحْبَهُ

کچھ آدمی ایسے ہیں کہ سچ کر دکھایا انہوں نے اس چیز کو جس پر اللہ کے ساتھ انہوں نے معاہدہ کیا تھا، پھر ان سے بعض وہ ہیں جنہوں نے اپنی نذر پوری کر دی،

وَمِنْهُم مَّن يَنتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا ﴿٢٣﴾ لِّيَجْزِيَ اللَّهُ الصَّادِقِينَ بِصِدْقِهِمْ وَ

اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو کہ منتظر ہیں اور انہوں نے کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں کی ㉓ تا کہ بدلہ دے اللہ صادقین کو ان کے صدق کا اور

يُعَذِّبَ الْمُنَافِقِينَ إِن شَاءَ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿٢٤﴾

تا کہ عذاب دے منافقین کو اگر چاہے، اور چاہے تو ان کو توبہ کی توفیق دے، بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ㉔

وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ۭ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۭ

اللہ تعالیٰ نے لوٹا دیا کافروں کو ان کے غصے کے ساتھ ہی، وہ کسی خیر کو حاصل نہ کر سکے، اور اللہ تعالیٰ کافی ہو گیا مؤمنین کے لئے لڑائی سے،

وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ۝۲۵ وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ

اللہ تعالیٰ زبردست ہے، غلبے والا ہے ۲۵ اُتارا اللہ تعالیٰ نے ان اہل کتاب کو جنہوں نے اُن کی مدد کی تھی، (اُتارا) اُن کے قلعوں سے،

وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ۝۲۶ وَاَوْرَثَكُمْ

اور ان کے دِلوں میں رُعب ڈال دیا، ایک فریق کو تم قتل کرتے تھے اور ایک فریق کو تم قید کرتے تھے ۲۶ اور اللہ نے تمہیں وارث بنا دیا

اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ۝۲۷

اُن کے علاقے کا اور اُن کے گھروں کا اور ان کے مالوں کا اور ایسے علاقے کا بھی جس کو تم نے روندا نہیں، اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ۲۷

تفسیر

ماقبل سے ربط

یہاں سے واقعہ شروع ہو رہا ہے غزوۂ اُحزاب کا جس کا دُوسرا نام ''غزوۂ خندق'' ہے۔ شروع سورت میں ذکر کیا گیا تھا کہ اللہ پر بھروسا کیجیے، کافروں منافقوں کی پروانہ کیجیے، اسی مضمون کو مؤکد کرنے کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ واقعات کے ساتھ بات واضح فرماتے ہیں کہ جب اللہ پر بھروسا ہوتا ہے، تو اللہ تعالیٰ مشکل وقت میں کس طرح سے کارسازی فرماتے ہیں۔ یہ واقعہ ایک بہت واضح ثبوت ہے سرورِ کائنات ﷺ کی منصوریت کا۔

غزوۂ اُحزاب کا پس منظر

حاصل اِس واقعہ کا یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں سرورِ کائنات ﷺ کے تشریف لے جانے کے بعد، پہلے غزوۂ بدر پیش آیا، جس میں مشرکینِ مکہ کو بہت بدتر قسم کی شکست ہوئی۔ اور اس کے بعد غزوۂ اُحد پیش آیا، جس میں مسلمانوں کو بظاہر شکست ہوئی، اور بہت نقصان ہوا۔ اور اس کے آس پاس ہی یہود کے قبائل کے ساتھ مسلمانوں کا اُلجھاؤ ہوا۔ بنی قینقاع یہود کا قبیلہ تھا، اس کو وہاں سے جلاوطن کیا گیا۔ اور پھر یہ بنونضیر دُوسرا قبیلہ تھا، ان کے ساتھ اُلجھاؤ ہوا، تو ان کو بھی وہاں سے جلاوطن کیا گیا۔ یہود کا صرف ایک قبیلہ بنوقریظہ مدینہ منورہ میں رہ گیا تھا۔ بنونضیر کا جو سردار تھا ''حیی بن اخطب''، جس کی بیٹی اُم المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا غزوۂ خیبر کے بعد حضور ﷺ کے نکاح میں آئیں۔ یہ بنونضیر کا سردار تھا، یہ لوگ مدینہ منورہ سے جلاوطن کر دیے گئے تھے، تو انتقام کے جذبے سے یہ یہودیوں کے سرداروں کو لے کر مکہ معظمہ میں پہنچا ابوسفیان کے پاس، اور انہیں برانگیختہ کیا کہ مدینہ منورہ پر حملہ کرو، ہم

تمہارے ساتھ ہیں، مسلمانوں سے انتقام لو۔ مشرکین مکہ پہلے ہی آپ جانتے ہیں کہ عداوت میں انتہا کو پہنچے ہوئے تھے، اور مسلمانوں کو مٹانے کے لئے نیست و نابود کرنے کے لیے ہر وقت پر تولتے تھے۔ انہوں نے بھی اس موقع کو غنیمت جانا، یہ بھی آمادہ ہو گئے، تیار ہو گئے، تو پھر یہی یہودی سردار دوسرے قبائل کے پاس بھی گئے، غطفان، فزارہ، اشجع، بنو کنانہ، بنو مرۃ، یہ مختلف قبیلے تھے یہ بھی ساتھ تیار ہو گئے، اس طرح عرب کے تمام مشہور مشہور قبائل بمع یہودیوں کے مسلمانوں کے خلاف متحد ہو گئے، اسلام کے خلاف یہ ایک متحدہ محاذ بن گیا۔ تقریباً بارہ ہزار کا لشکر تیار کر کے مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کا انہوں نے پروگرام بنایا۔ اور یہ واقعہ تقریباً پانچ ہجری کا ہے، شوال کے مہینے میں۔

حضور ﷺ کی صحابہ سے مشاورت اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا مشورہ

سرور کائنات ﷺ کو اطلاع ہوئی کہ یہ سارا عرب ایک متحدہ کمان کے ساتھ ہی مسلمانوں کو نشانہ بنانا چاہتا ہے، تو آپ ﷺ نے اس سلسلے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا، کیونکہ اتنی بڑی فوج کے ساتھ، اور پورے ملک کی مجموعی قوت کے ساتھ، میدان میں نکل کر لڑنا بظاہر مشکل تھا۔ اس لئے فیصلہ یہ ہوا کہ دفاعی جنگ لڑی جائے، مطلب یہ ہے کہ صرف اپنے بچاؤ کی تدبیر کی جائے، دفاع کا یہی معنی ہوا کرتا ہے۔ اس موقع پر حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ جو یہود کی غلامی سے آزاد ہو گئے تھے، انہوں نے مشورہ دیا کہ جس وقت کسی شہر کے دفاع کی ضرورت پیش آ جائے، تو اہلِ فارس ''خندق'' کھود دیا کرتے ہیں۔ ''خندق'' کا معنی ہوتا ہے کہ جدھر سے دشمن کے آنے کی توقع ہے ادھر ایک بہت بڑا گڑھا کھود دیا جائے۔ چونکہ اس وقت لوگ پیدل آتے تھے، گھوڑوں پہ آتے تھے، اونٹوں پہ آتے تھے، تو یہ بڑی ''خندق'' کو، بڑے گڑھے کو عبور کرنا ان کے لیے مشکل ہوتا تھا۔ تو ایسی صورت میں دوسری طرف سے تھوڑی سی بھی مزاحمت ہو جائے تو وہ لوگ شہر پر حملہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ تو حضور ﷺ نے سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا یہ مشورہ قبول کر لیا، اور خندق کھودنے کی تیاری ہو گئی۔ ایک جانب مدینہ منورہ کی جدھر بنو قریظہ آباد تھے، یہ محفوظ تھی بایں معنی کہ یہ قبیلہ مسلمانوں کے ساتھ معاہد تھا۔ ان کا مسلمانوں کے ساتھ جنگی معاہدہ تھا، ان سے خطرہ بھی نہیں تھا، بلکہ یہ توقع تھی کہ اِدھر سے اگر مشرکینِ مکہ حملہ کریں گے تو یہ لوگ دفاع کریں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اُدھر باغات اتنی کثرت کے ساتھ تھے، کہ کسی بڑی فوج کا وہاں سے عبور کرنا اور آنا یہ بھی بظاہر مشکل تھا، اس لیے اُس طرف تو ''خندق'' کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ دوسری جانب سلع پہاڑ کے کنارے سے لے کر ساڑھے تین میل کا فاصلہ پہاڑوں کے درمیان میں ایسا تھا کہ جہاں سے وہ لشکر حملہ آور ہو سکتا تھا، وہیں ''خندق'' کھودنے کا منصوبہ بنا لیا گیا۔

''خندق'' کھودنے کا منظر!

ساڑھے تین میل لمبی، تقریباً پانچ گز چوڑی، اور پانچ گز گہری، یہ ''خندق'' کھودی گئی۔ تین ہزار صحابہ رضی اللہ عنہم اس میں شریک ہوئے، سرورِ کائنات ﷺ خود بھی شریک ہوئے، سخت سردی کا موسم تھا، فقر و فاقہ تھا، بھوک برداشت کی، سردی برداشت کی، دِن رات ایک کر کے یہ ''خندق'' کھود لی گئی، دس دس آدمیوں کے حصے میں دس دس گز تقریباً لگائی گئی، اور اس طرح سے اپنے

اپنے حصے کی سب نے کھودی۔تو ''خندق'' کا جو حصہ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے حصے میں آیا تھا،کھودتے کھودتے نیچے ایک سخت چٹان آگئی،حدیث شریف میں واقعہ آتا ہے،بہت کوشش کی گئی اس کو توڑنے کی،وہ سخت پتھر تھا،بڑا پتھر تھا،صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کو توڑنے میں کامیاب نہ ہوئے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی گئی،آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اُترتا ہوں! کیونکہ آپ بھی برابر کام کر رہے تھے،اسی طرح سے مٹی اُٹھا رہے تھے جس طرح سے باقی صحابہ رضی اللہ عنہم اُٹھا رہے تھے۔حضرت براء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سارا بدن اتنا گرد آلود تھا کہ بدن کے بال بھی مٹی میں چھپے ہوئے تھے،نظر نہیں آتے تھے، باقی صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ ہی مٹی اُٹھا رہے تھے،تو ''خندق'' میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُتر گئے،اور کدال لی جو کہ پتھر کو توڑنے کے لئے ہوتی ہے،ایک لگائی،تو تیسرا حصہ پتھر کا ٹوٹا،اور پتھر پر جس وقت زور کے ساتھ کوئی لوہے کی چیز لگائی جائے تو شعلہ نکلا کرتا ہے،تو ایک روشنی نکلی،تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اس روشنی میں کسریٰ کے محلات دکھا دیے گئے ہیں،اور میری اُمت ان کو فتح کرے گی۔ دوسری دفعہ ضرب لگائی تو پھر اسی طرح سے ایک روشنی نکلی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے قیصر کے محلات دکھا دیے گئے ہیں،اور میری اُمت ان کو بھی فتح کرے گی۔یہ بشارت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو سنائی اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے چوٹ لگانے سے وہ چٹان جو تھی جیسے حدیث شریف میں آتا ہے،وہ بہتی ہوئی ریت بن گئی،جس طرح سے پھسلتی ہوئی ریت ہوتی ہے اس طرح سے وہ چورا چورا ہوگئی (مظہری)۔

سیّدنا جابر رضی اللہ عنہ کی دعوت کا واقعہ اور ظہورِ معجزہ

اور یہ ''خندق'' کی کھدائی کا ہی موقع ہے، جب جابر رضی اللہ عنہ کی دعوت کا واقعہ پیش آیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بہت فاقہ کے آثار انہوں نے دیکھے،تو گھر جا کے اپنی بیوی سے پوچھا کہ اگر تیرے پاس کچھ ہے تو بتا، میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پہ بہت فاقے کی حالت دیکھی ہے،تو گھر میں ایک بکری کا چھوٹا سا بچہ تھا،وہ ذبح کیا گیا،ایک صاع کے قریب (یعنی پونے چار سیر کے قریب) جَو پیسے گئے،اور آ کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی کہ یا رسول اللہ! ہم نے تھوڑا سا کھانا تیار کیا ہے،آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھ چند ساتھیوں کو لے کے تشریف لے آئیے۔تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سارے خندق والوں میں اعلان کر دیا کہ جابر کی دعوت ہے،چلو سارے ہی چلو! تو وہ تھوڑا سا کھانا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزے سے ساری فوج کے لئے کافی ہوگیا۔صحاح کے اندر یہ واقعہ آتا ہے۔یہ معجزہ بھی اسی موقع پر ہی ظاہر ہوا تھا۔[1]

کُفّار کا پڑاؤ

مشرکین نے جب آ کر مدینہ منورہ کے اِردگرد خندق دیکھی،تو ان کے لئے یہ ایک نئی چیز تھی،انہوں نے یہ نمونہ کبھی دیکھا ہی نہیں تھا،اب اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا کہ انہوں نے باہر پڑاؤ ڈال لیا،شہر کا محاصرہ کر لیا،اب ایک طرف یہ بارہ ہزار کا لشکر

---

(۱) بخاری ۵۸۹/۲ باب غزوۃ الخندق۔مشکوۃ ۵۳۲/۲ باب فی المعجزات فصل اول۔

پڑا ہوا ہے، دوسری طرف مسلمان تھے۔ تو یہی دفاع ہوتا رہا، کہیں کہیں کوئی سنگ باری، پتھر اُٹھا کے کسی کے مار دیا، دُور سے تیر چلا دیا، بس اس قسم کی کشاکشی رہی، آمنے سامنے جنگ لڑنے کی نوبت نہیں آئی۔

سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی دُعا

اسی دوران میں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ یہ زخمی ہوئے، ان کے بازو پہ تیر لگا ہے، اور بازو کی رگ کٹ گئی۔ انہوں نے دُعا کی تھی کہ یا اللہ! اگر تو مشرکین کے ساتھ اور لڑائیاں باقی ہوں تو مجھے زندہ رکھ، میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب مشغلہ اس قوم کے ساتھ لڑنا ہے جنہوں نے تیرے رسول کو نکالا۔ اور اگر یہ لڑائی ختم ہو چکی ہے تو پھر مجھے اسی سے شہادت دے دے (ابن کثیر۔ مظہری)۔ البتہ انہوں نے اتنی خواہش کی تھی جیسے واقعہ کے آگے آ رہا ہے، کہ بنو قریظہ نے چونکہ غداری کی تھی تو انہوں نے خواہش کی تھی کہ ان کا انجام دیکھنے تک میں زندہ رہوں۔[1] تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ اسی موقع پہ زخمی ہوئے ہیں۔

منافقین کی فتنہ انگیزی

باہر جب اتنا بڑا لشکر پڑا ہوا تھا، تو مسلمانوں کو ہر وقت چوکنا رہنا پڑتا تھا، ایسے وقت میں مخلصین اور منافقین کے جذبات بہت نمایاں ہوا کرتے ہیں، تو جن کے دِلوں میں کمزوری تھی بیماری تھی وہ مختلف قسم کی باتیں بناتے ''لو جی! وعدے تو ہو رہے تھے کہ شام فتح ہو جائے گا، وعدے تو ہمارے ساتھ کئے تھے کہ فارس فتح ہو جائے گا، رُوم پہ ہم غلبہ پا جائیں گے۔ اور حال یہ ہو رہا ہے کہ پیشاب پاخانے کے لئے گھر سے نکلنے کی گنجائش نہیں'' (نسفی)۔ اس طرح سے وہ زبانیں چلاتے، اور لوگوں کے اندر بددِلی پھیلاتے۔

بنو قریظہ کی غداری اور مسلمانوں کے لئے آزمائش

تو یہ قصہ جاری تھا کہ یہی ''حیی بن اخطب'' چند سرداروں کو لے کر بنو قریظہ کے پاس پہنچا، اور بنو قریظہ کو بہکایا، اور وہ بھی اپنا معاہدہ مسلمانوں کے ساتھ توڑ کے اس محاذ میں شریک ہو گئے، تو جب یہ اطلاع ملی مسلمانوں کو، کہ بنو قریظہ نے بھی معاہدہ توڑ دیا، اب حالات انتہائی سنگین ہو گئے۔ کیونکہ جس جانب کو محفوظ سمجھا جا رہا تھا وہ بھی محفوظ نہ رہی، اب ادھر سے بھی دشمنوں کے آنے کا اندیشہ ہو گیا۔ تو یہی موقع ہے جس کا نقشہ قرآنِ کریم نے کھینچا، زَاغَتِ الْاَبْصَارُ: آنکھیں ٹیڑھی ہو گئیں، بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ: کلیجے منہ کو آ گئے، یعنی بالکل خطرناک حالات ہو گئے جس کی تعبیر ہمارے ہاں بھی یہی ہوتی ہے، کہ نگاہیں پھٹ گئیں، آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، اور کلیجہ اس طرح سے دھڑکنے لگا، گویا کہ وہ باہر نکلنا چاہتا ہے، ''کلیجہ منہ کو آنا'' یہ ہمارے ہاں بھی محاورہ ہے۔ اور سخت زلزلے میں مسلمان ڈال دیے گئے، آزمائش میں ڈال دیے گئے، تو یہ وہی موقع ہے جب بنو قریظہ نے غداری کی تھی۔ چونکہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اس دفاع میں مشغول تھے تو یہی ایک جنگ ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریباً چار نمازیں قضا ہوئی ہیں، جیسا کہ

---

(۱) اَللّٰهُمَّ لَا تُخْرِجْ نَفْسِيْ حَتّٰى تُقِرَّ عَيْنِيْ مِنْ بَنِيْ قُرَيْظَةَ فَاسْتَمْسَكَ عِرْقُهٗ فَمَا قَطَرَ قَطْرَةً حَتّٰى الخ۔ (ترمذی، ۱/۲۸۷ باب ما جاء فی النزول علی الحکم)

احادیث میں آتا ہے۔[1] یعنی اتنی فرصت نہیں ملی کہ نماز ادا کرلی جائے، تو آپ کی نمازیں بھی اس میں قضا ہوئیں، پھر ایک مہینے[2] کے بعد اللہ تعالیٰ کی مدد آئی، ایک مہینے تک خوب اچھی طرح سے مسلمانوں کو آزمایا گیا۔

متحدہ محاذ کو توڑنے کے لئے نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ کی جنگی چال

ایک مہینے کے بعد اللہ کی مدد آئی کہ اس متحدہ محاذ میں اختلاف واقع ہوگیا، پھوٹ پڑگئی۔ اور پھوٹ پڑنے کی صورت یہ ہوئی تھی کہ اشجع قبیلہ (غطفان کی شاخ) جو کہ اسی محاذ میں شریک تھا، ان میں سے ایک شخص ہیں نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ، ان کے دل میں اللہ تعالیٰ نے ایمان ڈالا، وہ آکے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مسلمان ہوگئے۔ اور پھر انہوں نے یہ تدبیر بتائی کہ یا رسول اللہ! میرا اسلام ابھی لوگوں پہ ظاہر نہیں ہوا، لوگ مجھے اپنے میں شامل سمجھتے ہیں، تو میں اس سلسلے میں کیا خدمت سرانجام دے سکتا ہوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر ہوسکتا ہے تو اپنے قبیلے کو واپس لے جاؤ، کسی طریقے سے ان کے اندر پھوٹ ڈال دو، یہ چھوڑ کے چلے جائیں۔ وہ کہنے لگے: اچھا! میں پھر اتنی سی اجازت چاہتا ہوں کہ کسی مصلحت کے طور پر اگر مجھے کوئی بات کہنی پڑ جائے جو کچھ خلافِ واقع ہو، تو اس کی اجازت ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اجازت ہے، جنگ تو اسی طرح سے چلتی ہے، اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ۔ جنگ تو چال بازی کا ہی نام ہے، تو چال بازی سے جنگیں جیتی جاتی ہیں، غداری جائز نہیں ہے، چال بازی تو دشمنوں کے ساتھ ہوتی ہے، جسے ''سیاسی چال'' کہتے ہیں۔ تو نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہٹ کر بنوقریظہ کے پاس پہنچے، بنوقریظہ سے بھی ان کے تعلقات تھے، بنوقریظہ سمجھتے تھے کہ اشجع قبیلہ بھی آیا ہوا ہے، اسی فوج میں شامل ہے، تو بیٹھے بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں، باتیں کرنے کے بعد یہ تذکرہ آیا بنوقریظہ نے کہا کہ ہم نے بھی مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ توڑ دیا اور ہم بھی جنگ میں شریک ہوگئے ہیں۔ تو نعیم بن مسعودؓ نے کہا کہ یہ تو تم نے میرے خیال میں عقل مندی نہیں کی، کیونکہ باقی جتنے قبائل آئے ہوئے ہیں، وہ تو بہت دُور دراز علاقے کے ہیں، اگر بالفرض مدینہ کو فتح نہ کرسکے یا شکست کھا گئے، وہ تو اپنے علاقوں میں چلے جائیں گے، اور تم تو بیٹھے مدینہ منورہ میں ہو، پھر تم اکیلے مسلمانوں کا مقابلہ کس طرح سے کرلو گے؟ پھر تمہارا مال، جان محفوظ نہیں رہے گا۔ اس لئے میرے نزدیک بہتر صورت یہ ہے کہ آپ مشرکینِ مکہ سے مطالبہ کریں کہ اپنے پچاس[3] سردار وہ یہاں تمہارے پاس ٹھہرائیں بطورِ ضمانت کے، تاکہ اگر آپ لوگوں پر کوئی خطرہ آجائے، تو وہ اپنے سرداروں کو بچانے کے لئے تمہاری مدد کرنے کی ضرورت محسوس کریں۔ اگر وہ لوگ آپ کے پاس اپنے پچاس آدمی ٹھہرانے پر آمادہ نہ ہوں، تو سمجھ لینا کہ انہوں نے تم لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر اپنا مطلب نکالا ہے، تمہارے ساتھ ان کو ہمدردی کوئی نہیں۔ یہ بات ان کے ذہن میں ڈال دی، اور بنوقریظہ کی سمجھ میں بھی یہ بات آگئی کہ واقعی اگر یہ دُور دراز چلے گئے، تو ہماری مدد کو تو آئیں گے نہیں، ہم اکیلے مسلمانوں کے ہاتھوں پِٹ جائیں گے۔ وہاں سے وہ (نعیم) اُٹھا اور اِدھر اُدھر سے راستہ بدل کے ابوسفیان اور دوسرے سرداروں کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں جا کے بیٹھے، گفتگو ہوئی، جنگی حالات پہ تبصرہ ہوا، جس طرح

---

(۱) ترمذی ۱/۴۳ باب ما جاء فی الرجل تفوته الصلوات۔ اِنَّ الْمُشْرِكِيْنَ شَغَلُوْا رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ اَرْبَعِ صَلَوَاتٍ يَوْمَ الْخَنْدَقِ۔

(۲) ''سیرت مصطفیٰ'' میں ایک قول لکھا ہے کہ محاصرہ پندرہ دن رہا، اور دُوسرا قول لکھا ہے کہ چوبیس دن رہا۔

(۳) عام کتبِ تفسیر میں بغیر عدد کے صرف ''چند اشراف'' کا ذکر ہے، البتہ ''درمنثور'' سورۂ حشر کے تحت لکھا ہے: فَاَرْسَلَتْ اِلَيْهِمُ الْيَهُوْدُ اَنْ اَرْسِلُوْا اِلَيْنَا بِخَمْسِيْنَ

سے لوگ کیا کرتے ہیں، تو بنوقریظہ کی غداری کا ذکر بھی آیا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ شریک ہو گئے ہیں، انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ توڑ دیا ہے، تو نعیم بن مسعود کہنے لگے کہ دیکھو بھئی! میرے نزدیک بنوقریظہ کوئی قابلِ اعتماد لوگ نہیں ہیں، اس لئے ان کی باتوں میں نہ آنا، میرا خیال ہے کہ انہوں نے اندر ہی اندر مسلمانوں سے سازش کر لی ہے۔ بظاہر یہ تمہارے ساتھ مل گئے ہیں لیکن اندر اندر سے یہ مسلمانوں کے ساتھ ہیں، اور انہوں نے پچاس آدمی زندہ پکڑوانے کا وعدہ کیا ہے، کہ تمہارے پچاس سردار زندہ مسلمانوں کو گرفتار کروائیں گے۔ اتنا سا وہاں شوشہ چھوڑ دیا، شوشہ چھوڑ کے اپنا راستہ لے کے چلے آئے۔

جنگی چال کامیاب ہوگئی اور لشکرِ کُفّار کے قدم اُکھڑ گئے

اتنے میں بنوقریظہ کا مطالبہ آ گیا کہ بھائی! ہم تمہارے ساتھ شریک تو ہیں، لیکن ضمانت کے طور پر پچاس آدمی ہمارے پاس بھیجو، تاکہ ہم پر اگر کوئی خطرہ آجائے تو کم از کم اپنے آدمیوں کو بچانے کے لئے تم ہماری مدد تو کرو گے، جب بنوقریظہ کا اس طرح سے مطالبہ آیا تو وہ لوگ سمجھ گئے کہ نعیم جو بات کہہ کے گیا ہے وہ ٹھیک ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اندر اندر سے مسلمانوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں، اور ہمارے آدمی زِندہ پکڑوانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے صاف جواب دے دیا کہ ہم تو اس طرح سے نہیں کر سکتے، جب انہوں نے جواب دے دیا تو بنوقریظہ سمجھ گئے کہ واقعی ٹھیک ہے، انہوں نے ہمیں ساتھ ملا کے مطلب ہی نکالا ہے، باقی! ہمارے ساتھ ہمدردی کوئی نہیں ہے، تو یوں آپس میں پھوٹ پڑ گئی (مظہری)۔ اور آپ جانتے ہیں کہ جب فوج کے اندر پھوٹ پڑ جائے تو پھر دِلوں میں قوت نہیں رہا کرتی۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت یہ ہوئی، کہ رات کو سخت آندھی آئی، سردی کا زمانہ تھا، بہت سخت آندھی، جس سے ان کے خیمے اُکھڑ گئے، برتن ان کے اُلٹ پلٹ ہو گئے، سواریوں کے جانور تتر بتر ہو گئے، اس آندھی نے آ کے ان کا نظم نسق سارا خراب کر دیا۔ تو ابوسفیان نے اعلان کر دیا کہ واپس چلیں، واپسی کا اعلان ہو گیا، ایک مہینہ محاصرہ رکھنے کے بعد بغیر کسی مقصد کو حاصل کئے وہ لوگ واپس چلے گئے۔

غزوۂ خندق کُفّار کا آخری اِقدام تھا

جب یہ واپس گئے ہیں تو حضور ﷺ نے فرمایا: ''بس یہ ان کا آخری اِقدام تھا، اس کے بعد یہ ہم پر چڑھائی کر کے نہیں آئیں گے، اب جب جائیں گے ہم ہی جائیں گے۔''[1] چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ اس کے بعد مشرکین کو یا یہود کو مسلمانوں پر اِقدام کا موقع نہیں ملا، بلکہ حضور ﷺ نے پھر سفر کئے، خیبر فتح کیا، مکہ معظمہ فتح کیا، حُنین کی لڑائی ہوئی، اس طرح سے سارے کا سارا عرب حضور ﷺ کی زندگی میں ہی فتح ہو گیا۔ اس کے بعد دوبارہ اِقدامی جنگ مشرکین نہیں لڑ سکے۔ بعد میں اِقدام ہوا تو مسلمانوں کی طرف سے ہی ہوا۔

بنوقریظہ کی طرف پیش قدمی

جب اس غزوے سے فارغ ہوئے، حضور ﷺ گھر تشریف لے آئے، غسل فرما رہے تھے کہ اتنے میں جبریل علیہ السلام

---

(۱) بخاری ۵۹۰/۲ باب غزوۃ الخندق۔ مشکوۃ ۵۳۲/۲ باب فی المعجزات، فصل اول، الآن نغزوهم ولا يغزوننا نحن نسير إليهم.

آگئے، اور کہنے لگے کہ آپ نے تو ہتھیار اُتار دیے، ہم نے تو ہتھیار نہیں اُتارے! جس کا مطلب تھا کہ لڑائی ابھی باقی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ کدھر کا اِشارہ ہے؟ تو انہوں نے بنوقریظہ کی طرف اشارہ کیا کہ ان پہ چڑھائی کریں۔ آپ ﷺ نے فوراً اعلان کر دیا کہ عصر کی نماز بنوقریظہ کے ہاں جا کے پڑھنی ہے۔ حضور ﷺ خود بھی ہتھیار پہن کر روانہ ہوگئے، اور جیسے جیسے اطلاع ہوتی چلی گئی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی پہنچتے چلے گئے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کا اِجتہادی اِختلاف

یہی موقع ہے جس میں یہ واقعہ پیش آیا کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم گھروں سے کچھ دیر سے نکلے، جیسے کچھ تیاری کرنے میں دیر ہوجایا کرتی ہے، اور مسجدِ نبوی کے آس پاس سے بنوقریظہ کا علاقہ کوئی تین، ساڑھے تین میل تھا، اتفاق ایسا ہوا کہ راستے میں نماز کا وقت ہوگیا تو صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت میں آپس میں اختلاف ہوا کہ ہمیں نماز پڑھ لینی چاہیے یا نہیں بعض حضرات نے فرمایا کہ نہیں، حضور ﷺ نے اعلان کیا ہے کہ نماز بنوقریظہ میں جا کے پڑھنی ہے، اب چاہے نماز قضا ہوجائے، ہم تو وہاں جا کے پڑھیں گے، راستے میں نہیں پڑھتے۔ دوسرے کہنے لگے کہ نہیں، بلکہ حضور ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ جلدی آنا، اتنی جلدی آنا کہ عصر کے وقت وہاں پہنچ جانا، اور وہاں نماز پڑھ لینا، یہ مطلب تو نہیں تھا کہ اگر وقت راستے میں بھی ہوجائے، تو بھی نماز نہیں پڑھنی۔ اس لئے بعض لوگوں نے راستے میں نماز پڑھ لی۔ جس طرح آپ سے کہا جائے کہ ظہر کی نماز فلاں جگہ جا کے پڑھنی ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جلدی جاؤ، تا کہ ظہر کے وقت وہاں پہنچ جاؤ، اور وہاں نماز پڑھ لینا، یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ اگر کسی وجہ سے دیر ہوگئی، تو تم راستے میں نماز ہی نہ پڑھنا۔ تو یہ اِختلافِ رائے ہوا اِجتہاد کے طور پر، سرورِ کائنات ﷺ کے اس جملے کی تشریح کے طور پر، کہ آپ ﷺ کا کیا مقصد ہے؟ اور ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ دو جماعتیں ہوگئیں۔ بعض نے نماز راستے میں پڑھی، بعض نے نہیں پڑھی۔ حضور ﷺ کے سامنے جب یہ واقعہ پیش آیا تو آپ ﷺ نے کسی کو بھی تنبیہ نہیں فرمائی۔[1] جس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اپنے فہم کے طور پر جو مطلب کسی نے سمجھا، اس پر عمل کرنا اس کے لئے جائز تھا۔ یہی ہوتا ہے ''مجتہدین'' کا مقام کہ حضور ﷺ کے الفاظ کو سامنے رکھ کے، یا قرآنِ کریم کی آیت کو سامنے رکھ کے غور وخوض کرتے ہیں، جو مطلب جس کی سمجھ میں آتا ہے نیک نیتی کے ساتھ، اس کے مطابق اگر وہ عمل کرتا ہے، تو اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے کوئی ملامت نہیں ہے۔

بنوقریظہ کا محاصرہ اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے فیصلے کے مطابق ان کا قلع قمع

بنوقریظہ میں پہنچ گئے، وہاں جا کے ان کا محاصرہ کر لیا، وہ بے یار و مددگار تھے، باہر ان کا کوئی مددگار نہیں تھا، وہ اپنے قلعوں میں بند ہوگئے، پچیس دن تک ان کے قلعوں کا محاصرہ رہا ہے، پچیس دن تک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور حضور ﷺ ان کا محاصرہ کر کے بیٹھے رہے، آخر وہ تنگ آگئے، جب تنگ آگئے تو انہوں نے مصالحت کی پیش کش کی، اور یہ کہا کہ ہم سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو فیصل بناتے

(۱) بخاری ۱/۱۲۹ باب صلاۃ الطالب والمطلوب۔ نیز ۲/۵۹۱ باب مرجع النبی من الاحزاب۔ مسلم ۲/۹۶ باب المبادرۃ بالغزو۔ نوٹ: مسلم میں ظہر کا ذکر ہے۔

ہیں، وہ ہمارا جو فیصلہ کر دیں گے ہمیں منظور ہے۔ وہی سعد جنہوں نے خندق کے موقع پہ دُعا کی تھی کہ ''یا اللہ! بنو قریظہ کا انجام دیکھنے تک مجھے زندہ رکھنا!'' انہوں نے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے فیصلے کو کیوں قبول کر لیا؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ جاہلیت کے زمانے میں یہود کے قبیلے بنو قریظہ اور بنو نضیر، اور اِدھر مشرکینِ مدینہ جو تھے اوس اور خزرج، ان کی آپس میں لڑائیاں ہوتیں۔ بنو نضیر خزرج کے معاہد تھے اور بنو قریظہ اوس کے معاہد تھے، جس وقت بنو نضیر پہ وقت آیا تھا تو خزرج کا رئیس عبداللہ بن اُبیّ ابنِ سلول رئیس المنافقین نے سفارش کر کے بنو نضیر کو بچا لیا تھا، جس کی بنا پر قتل کرنے کی نوبت نہیں آئی بلکہ وہ جلاوطن ہو گئے تھے۔ یہ تو منافق تھا، اس کی تو ہمدردیاں اندر اندر یہودیوں کے ساتھ تھیں، اس نے تو یہودیوں کو بچانے کی کوشش کی۔ اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ تو مخلص مسلمان تھے، لیکن یہود یہ سمجھ رہے تھے کہ جیسے عبداللہ بن اُبیّ نے بنو نضیر کی جان بچوا دی تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ محفوظ ہو گئے تھے، اس طرح سے ہم سعد کو فیصل بنا لیتے ہیں، کیونکہ سعد اوس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے، اور اوس والے ہمارے معاہد ہیں، اس کی سفارش کے ساتھ ہم بھی بچ جائیں گے، یہ بھی ہمیں تحفظ دے دے گا۔ لیکن وہ تو غصے سے بھرے بیٹھے تھے کہ انہوں نے عین موقع پر مسلمانوں کو دھوکا دیا اور پریشان کیا ہے۔ جب انہوں نے سعد کو فیصل مان لیا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تسلیم کر لیا۔ یہ زخمی حالت میں تھے، ان کو بلایا گیا، اور کہا گیا کہ یہ آپ کے فیصلے پر قلعوں سے اُتر رہے ہیں، اس لئے آپ جو مناسب سمجھیں فیصلہ فرما دیں۔ تو سعد کہنے لگے کہ میں فیصلہ یہ دیتا ہوں کہ ان کے جو نوجوان لڑاکے ہیں، جو لڑنے کے قابل ہیں، ان کو تو قتل کر دیا جائے، اور بوڑھے، بچے، عورتیں باقی سب کو غلام بنا لیا جائے۔ سعد نے یہ فیصلہ دیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بالکل صحیح فیصلہ ہے، اور اللہ کی منشا کے مطابق ہے، فرشتے کے القاء کے مطابق ہے یہ فیصلہ۔ آٹھ سو نوجوان تھے ان میں جو اس محاذ میں لڑائی کے لئے شریک ہوئے تھے، ان آٹھ سو کو قتل کر دیا گیا۔[1] اور بوڑھے، بچے، عورتیں جتنے تھے ان سب کو غلام بنا لیا گیا، اور ان کے باغات اور جائیدادیں جتنی بھی تھیں، وہ سب کی سب مسلمانوں کے قبضے میں آ گئیں، اس طرح سے بنو قریظہ کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

تو غزوۂ بنی قریظہ اور غزوۂ اَحزاب یہ دونوں چونکہ ایک ہی موقع پہ پیش آئے ہیں، تو بنو قریظہ کی لڑائی تتمہ ہے گویا کہ غزوۂ اَحزاب کا۔ تو یہ دو رُکوع جو آپ کے سامنے آ رہے ہیں، جن میں یہ واقعہ ذکر کیا گیا ہے، تو ان کی آخری تین آیتوں میں غزوۂ بنو قریظہ کی طرف اشارہ ہے۔ اب ترجمہ دیکھیں گے تو ساتھ ساتھ مطلب سمجھ میں آتا چلا جائے گا۔

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ: اے ایمان والو! یاد کرو اللہ کے احسان کو جو تم پر ہوا۔ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ: جبکہ آئے تھے تمہارے پاس لشکر۔ جنود جُند کی جمع ہے، جند لشکر کو کہتے ہیں۔ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا: پھر ہم نے ان کے اُوپر ہوا بھیج دی۔ وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا: اور ایسے لشکر بھیج دیے جن کو تم نے نہیں دیکھا، اس سے فرشتے مراد ہیں۔ ہوا کا ذِکر میں نے آپ کی خدمت

(۱) سیرت حلبیہ (مترجم)، ج ۴ ص ۴۰۵۔ تاریخ ابن کثیر (مترجم) ۲/۵۱۸۔ نوٹ: ایک قول کے مطابق مقتولین کی تعداد ۴۰۰ تھی۔

میں کر دیا کہ آندھی آئی تھی جس نے آ کے ان کا سارے کا سارا نظم تتر بتر کر دیا تھا۔ بھیجا ہم نے ان کے اُوپر ہوا کو اور ایسے لشکروں کو جن کو تم نے نہیں دیکھا۔ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا: اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو دیکھنے والے تھے، کہ تم کس طرح سے مشقت اُٹھا رہے تھے، کس طرح سے جانفشانی دکھا رہے تھے، یا منافقین کس قسم کی حرکتیں کر تے تھے، کسی کا کوئی عمل اللہ سے مخفی نہیں تھا۔ اللہ دیکھنے والا تھا ان کاموں کو جو تم کر تے تھے۔ اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ: جبکہ آ گئے وہ لوگ (یعنی تمہارے مخالفین اور تمہارے دشمن) تمہارے اُوپر سے۔ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ: اور تمہارے نیچے سے۔ فوق اور اسفل کا مطلب یہ ہے کہ مدینہ منورہ کی ایک جانب اُونچی ہے، اور دوسری جانب نیچی ہے۔ جدھر بنوقریظہ ہیں وہ اسفل جانب ہے، اور جدھر سے مشرکین آئے تھے وہ اعلیٰ جانب ہے، فوق جانب ہے، بلند علاقہ ہے۔ تو مِنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ کا مطلب یہ ہے کہ دونوں طرف سے دشمن آ گئے، فوقانی جانب سے بھی آ گئے جدھر سے اُونچائی ہے، اور دوسری طرف سے بھی آ گئے جدھر کا علاقہ کچھ نیچا ہے۔ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ: اور جبکہ آنکھیں ٹیڑھی ہو گئیں، وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ: اور قلوب حلقوں کو پہنچ گئے۔ حناجر حَنْجَرَةٌ کی جمع ہے، حنجرہ حلق کو کہتے ہیں۔ یعنی دل اس طرح سے دھڑک رہے تھے گویا کہ دھڑکتے دھڑکتے گلوں کے قریب آ گئے تھے باہر نکلنے کے لئے۔ عربی کے اندر محاورہ ہے قلوب کے حناجر کو پہنچنے کا۔ اور ہماری اُردو میں محاورہ ہے '' کلیجہ منہ کو آنا''۔ تمہارے دل حلقوں کے قریب پہنچ گئے تھے، یعنی دھڑکتے دھڑکتے ایسے تھا جیسے حلق سے باہر نکلنا چاہتے ہیں۔ ہم اس کا ترجمہ کریں گے کہ '' کلیجے منہ کو آ گئے!'' ہماری زبان کے مطابق اس کا محاورہ یوں ہوگا۔ اور پہنچ گئے تھے قلوب حناجر کو، پہنچ گئے تھے دل گلوں کے پاس، یعنی باہر نکلنا چاہتے تھے اس طرح سے دھڑک رہے تھے۔ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا: اور تم اللہ کے متعلق مختلف قسم کے گمان کر رہے تھے۔ مصیبت اور پریشانی کے وقت میں جیسے گمان آتے ہیں، پتا نہیں اللہ کی نصرت کب آئے گی؟ معلوم نہیں، کیا نتیجہ نکلے گا؟ کیا ہوگا؟ اور ہو سکتا ہے کہ اس قسم کے گمان کرنے والے ضعیف الایمان یا منافقین ہوں، لیکن جب جماعت کے اندر چند افراد ہو تے ہیں، تو بسا اوقات نسبت جماعت کی طرف کر دی جاتی ہے۔ یعنی تم میں بعض لوگ تھے جو اللہ تعالیٰ کے متعلق مختلف قسم کے گمان کر رہے تھے۔ اور اگر سب مؤمنوں کی طرف نسبت ہو تو یہ غیر اختیاری خیالات ہیں جن کے اندر کوئی کسی قسم کا گناہ نہیں ہوتا۔ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ: اس موقع پر آزمائش میں ڈالے گئے مؤمن۔ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا: اور سخت زلزلے میں ڈالے گئے، ان کو سخت جھنجوڑا گیا، بڑا شدید امتحان ہوا ان کا۔ جب یہ صورتِ حال پیش ہو گئی تھی کہ اُوپر سے، نیچے سے، ہر طرف سے دشمن ہی دشمن ہو گئے، زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا: زلزلے میں ڈالے گئے سخت زلزلے میں ڈالنا، یعنی جس کو آپ کہہ سکتے ہیں کہ سخت جھنجھوڑے گئے۔

وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ: اور جب کہہ رہے تھے منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری تھی، وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ یا تو یہ عطف بیان ہے، منافقون کا بیان ہے، کہ وہی ہیں جن کے دلوں میں رُعب ہے، حبِ دنیا کا رُعب تھا، بزدلی تھی، بخل تھا۔ یا منافقون سے مراد تو وہی ہو گئے جن کی اندر ہی اندر ہمدردیاں کافروں کے ساتھ تھیں، دل میں کُفر چھپایا

ہوا تھا۔ اور وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ یہ اضافہ آ گیا کہ جن کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف کینہ اور حسد کا رُعب تھا۔ کیونکہ بعضے منافق تو محض اپنے دلوں کی کمزوری کی بنا پر منافق تھے، اور بعضے لوگ ایسے تھے جن کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف کینہ اور حسد کی بیماری تھی، وہ مسلمانوں کو پھلتا پھولتا دیکھ نہیں سکتے تھے، اس لئے ان کی ہمدردیاں کافروں کے ساتھ تھیں، تو اس عنوان کے تحت وہ آ جائیں گے۔ ''جب کہتے تھے منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے'' مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا: نہیں وعدہ کیا ہمارے ساتھ اللہ نے اور اس کے رسول نے مگر دھوکہ۔ اِلَّا وَعْدَ غُرُوْرٍ مگر دھوکا دینے کا وعدہ (آلوسی)۔ مطلب یہ ہے کہ یوں بددلی پھیلاتے تھے کہ وعدے جو ہیں کہ اسلام غالب آئے گا، رُوم اور فارس فتح ہو جائیں گے۔ معلوم ہوتا ہے محض دھوکا دیا گیا تھا ہمیں براہیختہ کرنے کے لئے، ہمارے حوصلے بلند کرنے کے لئے۔ ورنہ یہ کوئی حال ہے؟ اب یہ تو سارے کے سارے آ گئے ہیں، سب مسلمانوں کو کچا چبا جائیں گے۔ اس طرح سے اپنا دل بھی چھوڑے ہوئے تھے، اور دوسروں کے اندر بھی اس قسم کی باتیں پھیلاتے تھے۔ وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰۤاَهْلَ يَثْرِبَ: اور جب انہی منافقین میں سے ایک گروہ نے کہا تھا: اے یثرب والو! ''یثرب'' یہ مدینہ منورہ کا پُرانا نام ہے، اس شہر کا جاہلیت والا نام ''یثرب'' ہے، اور جب سرورِ کائنات ﷺ تشریف لے گئے تو پھر اس کا نام ''مدینۃ النبی'' ہو گیا، اور بعد میں مشہور ہوتے ہوئے ''نبی'' کا لفظ بھی چھوٹ گیا، تو اب ''مدینہ''، ''مدینہ منورہ'' کہا جاتا ہے۔ ''مدینہ'' مطلقاً شہر کو کہتے ہیں۔ گویا کہ اب اس کی حیثیت ایسی ہو گئی کہ مسلمانوں کی نگاہ میں اس شہر کے مقابلے میں دُوسرا کوئی شہر ہی نہیں ہے۔ جب ''مدینہ'' کہا جائے تو اس کا مصداق وہی ہوتا ہے، اصل یہ ''مدینۃ النبی'' ہے۔ اے یثرب والو! لَا مُقَامَ لَكُمْ: تمہارے ٹھہرنے کا کوئی موقع نہیں ہے، نہیں ہے قیام تمہارے لئے، فَارْجِعُوْا: پس تم واپس لوٹ جاؤ۔ یہ منافق یوں بددلی پھیلاتے تھے کہ یہاں محاذ پر ٹھہرنے کا کوئی موقع نہیں، یہاں تو مرنا ہی مرنا ہے، اتنی بڑی فوج کا مقابلہ کس طرح سے کریں گے، چلو، گھروں میں جا کے بیٹھو۔ جب تم جنگ میں شریک نہیں ہو گے، تو ہو سکتا ہے کہ جب یہ فوج غالب آ جائے گی، تو ہمیں کچھ نہیں کہے گی جو لڑائی میں شریک نہیں ہوئے، تو اپنی جان مال بچانے کا طریقہ یہی ہے کہ اس کو چھوڑ کے اپنے گھروں میں چلو۔ یوں ایک دوسرے کو کہہ رہے تھے، اے یثرب والو! نہیں ہے تمہارے لئے ٹھہرنا یعنی یہاں ٹھہرنے کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے، واپس لوٹ جاؤ۔

وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ: اور ان میں سے ایک فریق حضور ﷺ سے اجازت طلب کرتا تھا، یعنی بعضے تو ویسے ہی بھاگ رہے تھے، اور بعضے بہانے بنا رہے تھے۔ جنہوں نے کوئی ظاہری طور پر رکھ رکھاؤ کیا، وہ بہانے بنا رہے تھے۔ بہانے کیا؟ کہ جی! ہمارے تو گھر خطرے میں ہیں، وہاں تو کوئی حفاظت کا سامان نہیں، ایسا نہ ہو کہ کوئی چور آ گھسیں، ایسا نہ ہو کہ کسی طرف سے دشمن آ جائیں، ہمارے مال کو لوٹ کے لے جائیں، ہماری عورتوں بچوں کو نقصان پہنچائیں، ہمیں اجازت دو، ہم ذرا گھر کی نگرانی کر آئیں، اس طرح سے بہانے گھڑتے تھے۔ ''اجازت طلب کرتا تھا ان میں سے ایک فریق حضور ﷺ سے'' کہتے تھے اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ: عورۃ کہتے ہیں غیر محفوظ چیز کو، جو قابل ستر ہو، جس کی حفاظت کرنی چاہیے، جس کو چھپانا چاہیے۔ اس لئے ''عورۃ'' کا

لفظ بول کر ''عیب'' مراد ہوتا ہے، ''عیب'' بھی قابلِ ستر چیز ہے، انسان اس کو چھپانا چاہتا ہے، ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ اور یہ ''عورت'' کا لفظ آپ استعمال کرتے ہیں، عَوْرَۃُ الرَّجُلِ مَابَیْنَ السُّرَّۃِ اِلَی الرُّکْبَۃِ، ناف سے لے کر گھٹنے تک انسان کے جو بدن کا حصہ ہے یہ بھی ''عورت'' کہلاتا ہے کہ یہ قابلِ ستر ہے، قابلِ حفاظت ہے، اس کا ننگا ہونا انسان کو پسند نہیں ہے، انسان اس کی حفاظت کرنا چاہتا ہے۔ تو عورۃ کا معنی ہو گیا غیر محفوظ، قابلِ حفاظت۔ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں، اس لئے ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم ان کی کچھ نگرانی کر آئیں، کچھ بندوبست کر آئیں۔ وَمَا ھِیَ بِعَوْرَۃٍ: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ گھر غیر محفوظ نہیں تھے۔ باقی! جس طرح سے سارے شہر والے تھے ویسے وہ تھے۔ حضور ﷺ نے عورتوں کے بچوں کے تحفظ کا انتظام کیا ہوا تھا۔ ان کو ایک جگہ اکٹھا کر کے ان پہ بھی نگرانی لگائی ہوئی تھی، سارے انتظامات کئے ہوئے تھے، تو جیسے باقی لوگ تھے ویسے وہ تھے۔ ''نہیں ہیں وہ گھر غیر محفوظ۔'' اِنْ یُّرِیْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا: نہیں ارادہ کرتے یہ لوگ مگر بھاگنے کا، یہ بھاگنے کے لئے اس قسم کے بہانے بناتے ہیں، ورنہ گھر غیر محفوظ نہیں تھے۔ وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَیْھِمْ مِّنْ اَقْطَارِھَا: یہ ان کی نفسیات کو واضح کیا ہے کہ یہاں سے تو بھاگنا چاہتے ہیں۔ اگر دخول ہو جائے ان کے اُوپر مدینہ کے جوانب سے، اقطار جوانب کے معنی میں، یعنی فوجیں اندر آگھسیں، مشرک آجائیں۔ اگر ان کے اُوپر دخول ہو جائے مدینہ کی جوانب سے۔ ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَۃَ: پھر ان سے فتنے کا سوال کیا جائے یعنی شرارت کا، انہیں کہا جائے کہ نکلو ہمارے ساتھ، مسلمانوں کے خلاف شرارت پھیلاؤ، ان کے ساتھ لڑائی لڑو۔ یا فتنے سے مراد یہ ہے کہ گمراہی کا سوال کیا جائے، انہیں کہا جائے کہ ایمان سے توبہ کرو، اور کُفر اختیار کرو، ہمارے ساتھ شریک ہو جاؤ، اسلام کو چھوڑ دو، اس قسم کا مطالبہ اگر ان سے کیا جائے۔ لَاٰتَوْھَا: تو یہ اس فتنے میں شامل ہو جائیں گے۔ وَمَا تَلَبَّثُوْا بِھَآ اِلَّا یَسِیْرًا: نہیں ٹھہریں گے گھروں میں مگر تھوڑا سا۔ فوراً ان کے ساتھ شریک ہو جائیں گے۔ اس وقت ان کے گھر محفوظ ہو جائیں گے؟ اب جو کہتے ہیں کہ غیر محفوظ ہیں۔ اس لئے گھروں کا ان کو فکر نہیں، اصل یہ ہے کہ اندر سے دِل چھوڑے ہوئے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا مقابلہ کرنے کی قوت نہیں ہے طاقت نہیں ہے، گھروں میں چلو تاکہ ہم اس زد میں نہ آجائیں۔ اور یہی فوجیں اگر مدینہ میں آگھسیں اور ان سے مطالبہ کیا کہ ہمارے ساتھ نکلو اور مسلمانوں کے خلاف لڑو، فوراً تیار ہو جائیں گے۔ ''اور اپنے گھر میں نہیں ٹھہریں گے مگر تھوڑا سا''۔ تھوڑا سا کا مصداق اتنی دیر ہے جتنی دیر ان کو تیاری کرنے میں وقت لگے گا۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی بیماری ظاہر کر دی گئی کہ گھروں کا بہانہ کر کے بھاگنا چاہتے ہیں، اور مسلمانوں کے ساتھ ان کو کوئی ہمدردی نہیں۔ ورنہ ایسی کوئی خطرے کی بات نہیں، جس طرح سے باقی لوگوں کے گھر ہیں ویسے ہی ان کے ہیں۔

وَلَقَدْ کَانُوْا عَاھَدُوا اللّٰہَ مِنْ قَبْلُ: البتہ تحقیق ان لوگوں نے معاہدہ کیا تھا اللہ کے ساتھ اس سے قبل، لَا یُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ کہ یہ پیٹھ نہیں پھیریں گے، وَکَانَ عَھْدُ اللّٰہِ مَسْئُوْلًا: اور اللہ کے ساتھ کیا ہوا عہد پوچھا جائے گا۔ عہد مسئول ہے یعنی جو اللہ سے عہد کیا تھا اس کے متعلق پوچھا جائے گا کہ وہ پورا کیا یا نہیں کیا؟ منافقین نے بھی اللہ سے عہد کیا تھا، کس وقت کیا تھا؟ یا تو جب ظاہری طور پر وہ اسلام قبول کرتے تھے، اور حضور ﷺ کے ہاتھ پہ بیعت کرتے تھے، تو اس وقت بھی اللہ کے نام پر سب کچھ قربان کرنے کا ایک

عہد ہے، کہ ہم اللہ اور اللہ کے رسول کی مرضی کو مقدم رکھیں گے، یہ تو ایک عمومی عہد ہے۔ اور ویسے بھی ان منافقین کی عادت تھی کہ پیچھے جو موقع جہاد کا آیا تھا، بدر ہو گیا، اُحد ہو گیا، اس قسم کی لڑائیاں ہوئیں، تو شریک تو اس میں ہوئے نہیں، وہاں سے بھی جان بچائی، لیکن مجلس میں بیٹھ کے ڈینگیں مارتے تھے، کہ ہم مجبور تھے، وہاں جا نہیں سکے، ورنہ اگر کوئی ایسا موقع آیا جس میں ہمیں شرکت کا موقع ملا، تو دیکھ لو گے کہ ہم کس طرح سے لڑتے ہیں، کس طرح سے جان لڑاتے ہیں، اس قسم کی وہ پھوتیں مارا کرتے تھے مجلس میں بیٹھ کے۔ تو یہ بھی ایک قسم کا عہد ہی ہے جو وہ کرتے تھے کہ اگر کوئی موقع آیا جس میں ہماری شرکت ہو گئی تو ہم وہاں میدان نہیں چھوڑیں گے۔ ہم بھی اسی طرح سے جانبازی دکھائیں گے، جس طرح سے دوسرے لوگوں نے دکھائی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ اس قسم کے عہد کرتے تھے، ان کے متعلق پوچھا جائے گا۔

قُلْ لَّنْ یَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ: آپ انہیں کہہ دیجئے کہ بھاگنا تمہیں ہرگز نفع نہیں دے گا۔ یہاں سے جو تم بھاگنا چاہتے ہو، مختلف حیلے کر کے، بھاگنے سے تمہاری جان کوئی بچ نہیں جائے گی۔ ہرگز نہیں نفع دے گا تمہیں بھاگنا، اگر تم بھاگنا چاہو موت سے یا قتل سے۔ وَاِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِیْلًا: اور اس وقت تم نہیں فائدہ پہنچائے جاؤ گے مگر تھوڑا سا۔ تھوڑا سا سے مراد وہی زندگی کے ایام۔ یعنی یہاں سے بھاگ جاؤ گے، موت سے ڈرتے ہوئے، قتل سے ڈرتے ہوئے، تو تمہیں کوئی عمرِ نوح نہیں مل جائے گی، قیامت تک تم زندہ نہیں رہو گے، وہی قلیل مدت ہے۔ تو یہاں ٹھہرے رہو گے تو بھی اتنی زندگی ہے، گھروں میں بھاگ جاؤ گے تو بھی اتنی زندگی ہے۔ یہاں کھڑے ہو کے اللہ کے راستے میں جان دے دو گے تو یہ باعزت موت ہے، گھروں میں چلے جاؤ گے مر تو پھر بھی جانا ہے وقت پر، لیکن ذلت کی موت ہو گی۔ ''نہیں فائدہ پہنچائے جائیں گے یہ لوگ مگر تھوڑا سا''۔ اور آپ کہہ دیجئے کہ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَعْصِمُكُمْ مِّنَ اللّٰهِ کون ہے جو بچائے گا تمہیں اللہ سے؟ اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْٓءًا: اگر اللہ تعالیٰ تمہارے متعلق سوء کا ارادہ کرلے۔ سوء: بُرائی۔ تمہیں کوئی تکلیف پہنچانے کا ارادہ کرلے تو تمہیں کون بچا سکتا ہے۔ نہ تم بھاگنے سے بچ سکتے ہو نہ کوئی دوسرا بچا سکتا ہے۔ اَوْ اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً: یا ارادہ کرلے اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ رحمت کا۔ پچھلے الفاظ کے قرینے سے یہاں کچھ عبارت محذوف ہو گی۔ اگر اللہ تمہیں کوئی بُری حالت پہنچانا چاہے، تو تمہیں کوئی بچا نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ تم پہ رحم کرنا چاہے، تو اس کی رحمت کو کوئی روک نہیں سکتا۔ دوست تمہیں اللہ کی طرف سے کسی بُرائی سے نہیں بچا سکتے، دشمن تمہیں اللہ کی رحمت سے محروم نہیں کر سکتے، یہ فیصلے تو براہِ راست اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں۔ ''اور نہیں پائیں گے یہ اللہ کے علاوہ کوئی یار اور نہ کوئی مددگار''۔

قَدْ یَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِیْنَ مِنْكُمْ: تحقیق جانتا ہے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو روکنے والے ہیں تم میں سے، تعویق روکنے کو کہتے ہیں، جو روکتے ہیں کہ اس لڑائی میں نہ جاؤ، وَالْقَآئِلِیْنَ لِاِخْوَانِهِمْ: اور کہنے والے ہیں اپنے بھائیوں کو هَلُمَّ اِلَیْنَا: آجاؤ ہماری طرف۔ وَلَا یَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِیْلًا: نہیں آتے وہ لڑائی میں مگر بہت کم۔ صرف دکھلاوا دینے کے لئے، تاکہ لوگ کہیں کہ ہاں یہ بھی ہمارے ساتھ شریک ہیں، کبھی کبھی شکل دکھا جاتے ہیں، لڑائی میں نہیں آتے، اور باقیوں کو بھی ترغیب دیتے ہیں، کہ ادھر آجاؤ! محاذ پہ

جانے کی ضرورت نہیں، وہاں خطرہ ہے۔ یہ جو خفیہ طور پر لوگوں کو ترغیب دیتے تھے اپنی جان بچانے کی، اس آیت میں ان کی طرف اشارہ کر دیا۔ اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ: اَشِحَّةً: یہ شحیح کی جمع ہے۔ اور شحیح یہ لفظ شح سے لیا گیا ہے۔ شح کا معنی حرص بھی ہوتا ہے اور بخل بھی۔ اور بخل اور حرص یہ دونوں ہی قریب قریب ہیں، ان کی جڑ ایک ہی ہے حُبِ مال۔ حبِ مال جس وقت دل میں آ جاتی ہے تو انسان کوشش یہ کیا کرتا ہے کہ جو میرے پاس پیسے ہیں خرچ نہ ہوں، یہ بخل ہے۔ اور جب دل میں مال کی محبت ہوتی ہے تو خواہش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ مال حاصل ہو، یہ حرص ہے۔ مال کے ساتھ محبت ہو تو دو قسم کے آثار ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ انسان کہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مال حاصل ہو، یہ حرص ہے۔ اور جو حاصل ہو گیا وہ خرچ نہ ہو، یہ بخل ہے۔ اس لئے شح کا لفظ دونوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (سورۂ حشر:۹) جو نفس کے شح سے بچا لئے گئے، حرص اور بخل سے بچا لئے گئے، وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ تو شحیح کا معنی بخیل بھی ہوتا ہے، حریص بھی ہوتا ہے۔ اور یہاں یہ لفظ دو جگہ آیا ہے۔ پہلا اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ اور دوسرا آ رہا ہے اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ۔ پہلے میں معنی بخل کے ساتھ کیا گیا ہے، اور دوسرے میں حرص کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ پاس میں لڑائی میں نہیں آتے مگر تھوڑا سا، تمہارے خلاف بخل کرتے ہوئے، یعنی تمہارے حق میں یہ اپنی جان مال کی قربانی نہیں دینا چاہتے، ان کے دِلوں میں بخل ہے، بخل کرتے ہوئے یہ نہیں آتے۔ اور بخل کا معنی یہ بھی ہوسکتا ہے تمہارے حق میں بخل کرتے ہوئے کہ وہ دکھلاوا اس لیے کرنے کے لئے آتے ہیں کہ اگر بالفرض مسلمانوں کو فتح ہوگئی تو مالِ غنیمت کہیں اکیلے مسلمان ہی نہ لے جائیں، یہ مال سارا ان کے حصے میں نہ آ جائے۔ ہم ذرا ذرا جایا کریں، نام لکھوایا کریں اور شکل دکھایا کریں تاکہ ہم بعد میں کہہ سکیں کہ ہم بھی اس میں شریک تھے۔ دونوں طرح سے اس کا مفہوم ذکر کیا جا سکتا ہے۔ فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ: پھر جب کوئی خوف آ جاتا ہے تو دیکھتا ہے ان منافقین کو جو باتیں بناتے ہیں، دیکھتا ہے تو ان کو کہ جھانکتے ہیں تیری طرف، تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ: ان کی آنکھیں چکرا رہی ہیں، ان کی آنکھیں گھوم رہی ہیں۔ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ: اس شخص کی طرح جس کے اُوپر موت کی غشی طاری کر دی گئی ہو، یعنی خوف آ جائے تو پھر اس طرح سے دہشت زدہ ہو کے آپ کی طرف دیکھتے ہیں، جیسا کہ موت کی غشی ان کے اُوپر طاری ہو رہی ہے۔ "دیکھتا ہے تو ان کو کہ جھانکتے ہیں تیری طرف، چکرا رہی ہیں ان کی آنکھیں مثل اس شخص کے جس کے اُوپر موت کی غشی طاری کر دی گئی ہو۔" فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ: جب خوف چلا جاتا ہے، سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ: حداد حدید کی جمع، تیز۔ اَلْسِنَة لسان کی جمع، زبان۔ سلق کا معنی ہوتا ہے چرب زبانی، یعنی بہت تیز بولنا، تیز گفتگو کرنا۔ پھر تمہارے اوپر باتیں بناتے ہیں تیز تیز زبانوں کے ساتھ، جس طرح کہتے ہیں "چڑ چڑ بولتے ہیں"۔ خوف کے دُور ہوجانے کے بعد پھر ان کی چرب زبانی دیکھنے کی ہوتی ہے کہ کس طرح سے بولتے ہیں، بڑی تیز زبانوں کے ساتھ، مال کے اُوپر حرص کرتے ہوئے۔ خوف کے چلے جانے کے بعد جب فتح حاصل ہوجاتی ہے پھر مال کے حرص میں، لالچ میں، بڑی باتیں بناتے ہیں، چڑھ چڑھ کے آتے ہیں، یوں کہتے ہیں کہ فتح تو ہماری وجہ سے ہوئی، ہم کس سے کم رہے، ہم بھی تو فلاں جگہ تھے، ہم نے یہ

مدد کی، یوں باتیں کرتے ہیں تا کہ مالِ غنیمت میں سے حصہ ملے۔ خیر سے یہاں مال مراد ہے، اور اَشِحَّۃً عَلَی الْخَیْرِ کا معنی، مال کے اُوپر حرص کرتے ہوئے۔ اُولٰٓئِكَ لَمْ یُؤْمِنُوْا یہ لوگ مؤمن نہیں۔ فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ: اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال ضائع کردیے۔ یعنی ظاہری طور پر اگر کوئی نیکی کا کام کرتے بھی ہیں تو اللہ نے اس عمل کو ضائع کردیا، اس کے اُوپر کوئی ثواب مرتب نہیں ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف ظاہرِ عمل کا اعتبار نہیں ہوتا، بلکہ اللہ تو حقیقت کو دیکھا کرتے ہیں کہ کس جذبے کے تحت کیا گیا۔ جو عمل مال کے حرص میں کیا گیا، یا دنیاداری کے طور پر کیا گیا ہو، اللہ کے ہاں اس عمل کی کوئی قدر نہیں، ظاہری طور پر وہ کتنا ہی اچھا عمل کیوں نہ ہو، جہاد ہے، ہجرت ہے، حج ہے، کچھ بھی ہو۔ اور جو اللہ کی رضاجوئی کے لئے کیا گیا ہے، اللہ کے ہاں عمل وہی قابلِ اعتبار ہے۔ ''ان کے اعمال اللہ نے ضائع کردیے''، وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرًا: اور اللہ پہ یہ بات آسان ہے، کیونکہ اللہ کسی کے عمل کا محتاج نہیں کہ کسی کا عمل ضائع کرنے کے ساتھ اللہ کا کوئی نقصان ہوجائے گا۔

آگے بھی ان کی اسی بزدلی کا ذکر ہے، یَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ یَذْهَبُوْا: یعنی فوجوں کے ہٹ جانے کے بعد، لشکروں کے چلے جانے کے بعد بھی ابھی ان کے دل مطمئن نہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ فوجیں ابھی گئی نہیں، یہیں کہیں آس پاس بیٹھی ہوں گی، پھر کہیں حملہ نہ ہوجائے، اس طرح سے خوف کے ساتھ یہ دھڑکتے ہیں۔ سمجھتے ہیں فوجوں کو (احزاب حزب کی جمع ہے، سورت کا نام اسی سے ماخوذ ہے، حزب لشکر کو کہتے ہیں) لشکروں کے متعلق سمجھتے ہیں کہ گئے نہیں۔ وَاِنْ یَّاْتِ الْاَحْزَابُ: اور اگر یہ لشکر آجائیں، بالفرض دوبارہ حملہ ہوجائے۔ یَوَدُّوْا لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِی الْاَعْرَابِ: چاہیں گے یہ لوگ کہ وہ اعراب میں جانے والے ہوتے۔ بَدْوٌ کہتے ہیں جنگل کو۔ اور بادی ہوتا ہے جنگل کی طرف جانے والا۔ یعنی پھر ان کے دلوں میں یہ خواہش ہوتی کہ کاش! وہ گاؤں میں جانے والے ہوتے، جنگل کی طرف جانے والے ہوتے۔ یَسْاَلُوْنَ عَنْ اَنْۢبَآئِكُمْ: تمہاری خبریں وہیں بیٹھے پوچھتے رہتے۔ وَلَوْ كَانُوْا فِیْكُمْ مَّا قٰتَلُوْٓا اِلَّا قَلِیْلًا: اور اگر یہ تمہارے اندر موجود ہوتے تو نہ لڑتے مگر تھوڑا سا، وہی برائے نام، یعنی فوجیں چلی گئیں تو بھی ان کے دل دھڑک رہے ہیں کہ ابھی گئی نہیں۔ اور اگر بالفرض دوبارہ ان کو اطلاع مل جائے کہ فوجیں آرہی ہیں، تو پھر ان کا دل یہ چاہے گا کہ کاش! ہم جنگلوں میں، دیہاتوں میں ہوتے، مدینہ میں نہ ہوتے، وہیں بیٹھے حالات پوچھتے رہتے کہ کیا گزری؟ کیا ہوا؟ کون فتح پا گیا؟ کون شکست کھا گیا؟ دور بیٹھے ہم خبریں سنتے رہتے۔ اور اگر یہ دوبارہ حملہ ہونے کی صورت میں مدینہ منورہ میں موجود ہوں، تو یہ لڑائی میں حصہ نہیں لیں گے، مگر برائے نام۔ برائے نام اس لئے تا کہ ظاہر ہو کہ ہم بھی لڑائی میں شریک ہیں اور دوسرے وقت میں مطالبہ کرسکیں۔ اَعراب بھی جنگل کو کہتے ہیں یعنی دیہات کو، اور اَعرابی کہتے ہیں جو باہر رہنے والے لوگ ہوا کرتے ہیں، جن کو ''بدوی'' کہا جاتا ہے۔ تو بَادُوْنَ فِی الْاَعْرَابِ: باہر جانے والے ہوتے دیہات میں۔ یوں اس کا ترجمہ کیا جاسکتا ہے۔ یَسْاَلُوْنَ عَنْ اَنْۢبَآئِكُمْ: پوچھتے رہتے تمہاری خبریں۔ اور اگر تمہارے اندر موجود ہوتے تو نہ لڑتے مگر تھوڑا سا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ: اب آگے ان کو ملامت کی جارہی ہے کہ تم حضور ﷺ کو نہیں دیکھتے کہ اس جہاد

میں کیسے مشقت اُٹھار ہے ہیں؟ کس طرح سے جانبازی کرر ہے ہیں؟ اچھے لوگوں کے لئے تو حضور ﷺ کی ذات نمونہ ہے، کہ جب آپ دین کے لئے یوں کھپے ہوئے ہیں، تو باقیوں کو بھی اسی طرح سے کرنا چاہیے..... یہاں اگرچہ ایک خاص موقع پر نمونہ پیش کرنا مقصود ہے، کہ حضور ﷺ نے جہاد کے لئے، کافروں کے دفاع کے لئے، کس طرح سے جان کی بازی لگا رکھی ہے۔ تو تمہیں چاہیے کہ ان کی طرف دیکھ دیکھ کے تم اپنا حوصلہ بلند کرو۔ لیکن بعد میں لفظوں کے عموم کے ساتھ، حضور ﷺ کی پوری زندگی ایک اُسوۂ حسنہ ہے مؤمنین کے لیے، ہر معاملے میں حضور ﷺ کی زندگی اچھا نمونہ ہے۔ اُسوۃ: نمونہ جس کی اِقتدا کی جائے۔ اُسوۃ حسنہ: اچھا نمونہ۔ یہاں اگرچہ جہاد کا مسئلہ مذکور ہے کہ اس موقع پر حضور ﷺ کا طرزِ عمل کتنا اچھا نمونہ ہے تمہارے لئے، کہ دین کی خاطر، اللہ کے راستے میں، کافروں کے مقابلے میں، کس طرح سے حضور ﷺ جانبازی دکھا رہے ہیں، کس طرح سے اپنے راحت اور آرام کو چھوڑے ہوئے ہیں، تو تمہارے لیے اچھا نمونہ ہیں کہ تم بھی اسی طرح سے کرو۔ جو مؤمن مخلص ہیں وہ تو اسی طرح سے کرتے ہیں۔ منافقین کو ملامت کی جارہی ہے..... لیکن پھر لفظوں کے عموم کے ساتھ حضور ﷺ کی زندگی میں اُسوۂ حسنہ ہر کسی کے لئے زندگی کے ہر شعبے میں موجود ہے۔ اتباعِ سُنّت کے لئے ہمیشہ اس آیت کو پیش کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی زندگی کو مسلمانوں کے لئے ایک اچھا نمونہ قرار دیا۔ اگر کوئی اچھی زندگی گزارنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ حضور ﷺ کے طرزِ عمل کو اختیار کرے۔ لفظوں کے عموم کے ساتھ پھر ساری زندگی اُسوۂ حسنہ قرار پاجائے گی۔ اگرچہ یہاں موقع محل کے مطابق جہاد میں حضور ﷺ کے کردار کو اُسوۂ حسنہ کے طور پر پیش کیا جارہا ہے..... ''البتہ تمہارے لئے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے، تمہارے لئے یعنی ان لوگوں کے لئے جو کہ اللہ اور یومِ آخر کی اُمید رکھتے ہیں'' جو اللہ سے ڈرتے ہیں، یومِ آخر کا خوف رکھتے ہیں، یا اللہ سے ملاقات کی اُمید ہے اور انہیں آخرت کے دِن کی بھی اُمید ہے۔ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا: اور اللہ کو بہت یاد کرتا ہے، جو شخص اللہ سے ملنے کی اُمید رکھتا ہے، یومِ آخر کی اُمید رکھتا ہے، اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتا ہے، یہ علامت ہے مؤمن کامل ہونے کی۔ اور مؤمن کامل کے لئے حضور ﷺ کی ذات میں بہترین نمونہ ہے۔

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ: جب دیکھا مؤمنین نے احزاب کو۔ منافقین کے جذبات تو آپ نے دیکھ لئے، لیکن جب مؤمنین نے ان ٹولوں کو، ان گروہوں کو، ان لشکروں کو دیکھا، کہنے لگے، هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مومنوں کا ایمان تازہ ہوگیا۔ کہنے لگے یہ تو وہی ہیں جن کے متعلق اللہ نے اور اللہ کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا، اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا۔ یعنی اللہ نے اور اللہ کے رسول نے اطلاع دی تھی کہ یوں یہ کافر آئیں گے، اس طرح سے مقابلہ ہوگا، تمہاری آزمائش ہوگی، یہ تو واقعی وہی آزمائش پیش آگئی، اللہ اور اللہ کے رسول نے سچ کہا۔ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا: ان لشکروں کے آنے نے یا لشکروں پر نظر پڑنے نے نہ زیادہ کیا ان مؤمنین کو مگر ازروئے ایمان کے اور تسلیم کے، یعنی ان کا جوشِ ایمان بڑھا، انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی باتوں کو اور اچھی طرح سے مانا، مؤمنین اس امتحان میں آ کے اور نکھر گئے، جیسا کہ واقعات کی نوعیت ہے، جب سختی کے

واقعات پیش آیا کرتے ہیں، تو منافقین کا نفاق کھلتا ہے، وہ زیادہ سے زیادہ کمزور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور جو مخلصین مؤمنین ہوا کرتے ہیں ان کا ایمان زیادہ نکھرتا ہے، وہ اور قوی ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس لشکروں کے دیکھنے نے نہ زیادہ کیا انہیں مگر ازروئے ایمان وتسلیم کے۔ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ: مؤمنین میں کچھ آدمی ایسے ہیں، صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَیْهِ: سچ کر دکھایا انہوں نے اس چیز کو جس پر اللہ کے ساتھ انہوں نے معاہدہ کیا تھا۔ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ: پھر ان میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے اپنی نذر پوری کردی۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّنْتَظِرُ: اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو کہ منتظر ہیں وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِیْلًا: اور انہوں نے اس معاہدے میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں کی۔ یہ مؤمنین مخلصین کی تعریف ہے کہ بعضے مؤمن تو ایسے ہیں کہ جب موقع آتا ہے لڑتے ہیں، اگرچہ زبان کے ساتھ انہوں نے کوئی کسی قسم کی لاف زنی یا اس قسم کی کوئی بات بہادری کے اظہار کے لیے نہیں کی، ان کا یہاں ذکر نہیں، وہ تو ہیں ہی۔ بعضے وہ ہیں جنہوں نے اللہ سے وعدہ کیا تھا، اس میں خاص طور پر انس بن نضر رضی اللہ عنہ کا ذکر ہے، جو بدر میں شریک نہیں ہوسکے تھے، تو انہوں نے کہا تھا کہ اب اگر کوئی موقع آیا، تو میں خوب جانبازی دکھاؤں گا، چنانچہ اُحد کے موقع پر انہوں نے خوب جانبازی دکھائی، اور وہیں میدان میں یہ شہید ہوئے، اَسّی (۸۰) سے زائد زخم ان کے بدن کے اُوپر تھے۔(1) تو بعضوں نے تو جو معاہدہ کیا تھا اپنی نذر پوری کردی، اپنی جان دے دی۔ اور بعضے وہ ہیں جنہوں نے معاہدہ کیا اور منتظر ہیں کہ کب ان کی جان جائے، بہادری دکھا رہے ہیں، جب شہادت کا موقع ہوگا، اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا تو جان پیش کردیں گے۔ مطلب یہ ہوا کہ مؤمنین دو قسم کے ہوگئے۔ بعضے تو وہ ہیں جنہوں نے معاہدہ کیا یعنی اس قسم کی بات زبان سے نکالی، اور بعض نے نہیں نکالی۔ دونوں ہی میدان میں جم کے جہاد کررہے ہیں۔ اور پھر ان میں سے بعض وہ تھے جنہوں نے اپنی نذر پوری کردی کہ اللہ کے راستے میں جان دے دی، اور بعض منتظر ہیں، جس طرح سے سر ہتھیلی پہ رکھے ہوئے ہیں، ہروقت میدان میں ڈٹے ہوئے ہیں، کہ جب اللہ تعالیٰ قبول کرلے گا ہماری جان حاضر ہے، وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِیْلًا: انہوں نے اپنی بات میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں کی۔ لِیَجْزِیَ اللّٰهُ الصّٰدِقِیْنَ بِصِدْقِهِمْ: فَعَلَ مَا فَعَلَ اس کا فعل یوں محذوف نکال لیا جائے گا۔ یہ واقعات اللہ نے بھیجے، کیا اللہ نے جو کچھ کیا تا کہ بدلہ دے صادقین کو ان کے صدق کا، اور تا کہ عذاب دے منافقین کو اگر چاہے، اور چاہے تو ان کو توبہ کی توفیق دے، ان کے اوپر توجہ کرلے۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا: بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِغَیْظِهِمْ: اللہ تعالیٰ نے لوٹا دیا کافروں کو ان کے غصے کے ساتھ ہی۔ جس طرح سے دانت پیستے ہوئے آئے تھے کہ ہم مسلمانوں کو کچا چبا جائیں گے، اسی طرح سے جلتے بھنتے ہوئے واپس چلے گئے، مسلمانوں کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ اللہ تعالیٰ نے لوٹا دیا کافروں کو ان کے غصے کے ساتھ، لَمْ یَنَالُوْا خَیْرًا: وہ کسی خیر کو حاصل نہ کرسکے، وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ الْقِتَالَ: اور اللہ تعالیٰ کافی ہوگیا مؤمنوں کے لیے لڑائی سے، مؤمنوں کو لڑنا بھی نہ پڑا، اللہ ہی کافی ہوگیا، وَكَانَ اللّٰهُ قَوِیًّا عَزِیْزًا: اللہ تعالیٰ زبردست ہے غلبے والا ہے۔

اگلی آیت میں ذکر آگیا وہی بنو قریظہ کا۔ وَاَنْزَلَ الَّذِیْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَیَاصِیْهِمْ: صَیَاصِیْ یہ صِیْصِیَةٌ کی

(1) بخاری ۱/ ۳۹۳، کتاب الجهاد، باب قول الله من المؤمنين رجال۔

جمع ہے، اور صِیْصِیَۃٌ کا اصل معنی ہے: کل ما یمتنع بہ، ہر وہ چیز جس کے ساتھ بچاؤ کیا جائے (آلوسی)، جیسے گائے اور ہرن کے سینگ اور مرغ کا پنجہ، اور اسی طرح قلعہ جس کے اندر انسان محصور ہو کر سمجھتا ہے کہ اب میں محفوظ ہو گیا، اس کو بھی صیصیۃ سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ تو یہاں صَیَاصِیْ قلعے اور محلات کے معنی میں ہے۔ اتارا اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جنہوں نے ان آنے والوں کی مدد کی تھی۔ ھُمْ ضمیر لوٹ گئی جو باہر سے لشکر آئے تھے ان کی طرف۔ مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ یہ الَّذِیْنَ ظَاھَرُوْ کا بیان ہے۔ اتارا اللہ تعالیٰ نے ان اہلِ کتاب کو جنہوں نے ان کی مدد کی تھی، اتارا ان کے قلعوں سے، یہ بھی قلعوں سے اترنے پہ مجبور ہو گئے۔ وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِھِمُ الرُّعْبَ: اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رُعب ڈال دیا۔ فَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ: ایک فریق کو تم قتل کرتے تھے، وَتَاْسِرُوْنَ فَرِیْقًا: اور ایک فریق کو تم قید کرتے تھے۔ جیسے تفصیل آپ کے سامنے آ گئی کہ بعض کو قتل کر دیا گیا، اور بعض کو قید کر لیا گیا۔ وَاَوْرَثَکُمْ اَرْضَھُمْ وَدِیَارَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ: اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں وارث بنا دیا ان کے علاقے کا اور ان کے گھروں کا اور ان کے مالوں کا۔ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْھَا: اور اللہ نے وارث بنایا تمہیں ایسے علاقے کا بھی جس کو تم نے ابھی روندا نہیں، وہاں تک ابھی تمہارے قدم نہیں پہنچے۔ یہ آنے والی فتوحات کی طرف اشارہ کر دیا، شام کا علاقہ، رُوم کا علاقہ، فارس کا علاقہ، یہ مراد ہو گیا۔ وارث بنایا تمہیں ایسے علاقے کا جس کو تم نے روندا نہیں۔ وَکَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرًا: اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کے اُوپر قدرت رکھنے والا ہے۔ اس لئے فتوحات تمہیں دے دینا، علاقے فتح کروا دینا، اللہ کے لئے کوئی مشکل نہیں۔

سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُکَ وَاَتُوْبُ اِلَیْکَ

یٰۤاَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِکَ اِنْ کُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا وَزِیْنَتَھَا فَتَعَالَیْنَ
اے نبی! اپنی بیویوں کو کہہ دیجئے کہ اگر تم ارادہ کرتی ہو دُنیوی زندگی کا اور اس کی زیب وزینت کا پس تم سب آؤ،
اُمَتِّعْکُنَّ وَاُسَرِّحْکُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا ﴿۲۸﴾ وَاِنْ کُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَ
میں تمہیں فائدہ پہنچاؤں، اور تم سب کو رُخصت کر دُوں اچھی طرح سے رُخصت کرنا ﴿۲۸﴾ اور اگر تم ارادہ کرتی ہو اللہ اور اُس کے رسول کا اور
الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ فَاِنَّ اللّٰہَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْکُنَّ اَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۲۹﴾ یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ مَنْ
دارِ آخرت کا پس بے شک اللہ نے تیار کیا ہے ان عورتوں کے لئے جو تم میں سے نیکوکار ہیں بہت بڑا اَجر ﴿۲۹﴾ اے نبی کی بیویو! جو
یَّاْتِ مِنْکُنَّ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ یُّضٰعَفْ لَھَا الْعَذَابُ ضِعْفَیْنِ ؕ وَکَانَ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرًا ﴿۳۰﴾
تم میں سے ارتکاب کرے گی صریح بے حیائی کا، بڑھایا جائے گا اُس کے لئے عذاب دوگنا، اور یہ بات اللہ پر آسان ہے ﴿۳۰﴾

وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ ۙ

اور جوکوئی مطیع رہے گی تم میں سے اللہ اور اللہ کے رسول کے لئے، اور نیک عمل کرے گی، دیں گے ہم اس کو اس کا اَجر دوگنا، اور

اَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ

تیار کیا ہم نے اس عورت کے لئے باعزّت رزق ﴿۳۱﴾ اے نبی کی بیویو! تم عورتوں میں سے کسی کی طرح نہیں ہو اگر

اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا

تم تقویٰ اختیار کرو، بات کرنے میں نرمی اختیار نہ کرو، پھر طمع لگائے گا وہ شخص جس کے دِل میں بیماری ہے، اور کہو تم اچھی

مَّعْرُوْفًا ﴿۳۲﴾ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ

بات ﴿۳۲﴾ قرار پکڑو اپنے گھروں میں اور ظاہر نہ ہوؤ مثل ظاہر ہونے جاہلیتِ اُولیٰ کے، اور نماز

الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ

قائم کرو اور زکوٰۃ دیتی رہو، اللہ اور اس کے رسول کی اِطاعت کرو، سوائے اس کے نہیں کہ اِرادہ کرتا ہے اللہ کہ دُور ہٹا دے تم سے

الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ﴿۳۳﴾ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ

پلیدی کو اے نبی کے گھر والو! اور پاک کرے تمہیں اچھی طرح سے پاک کرنا ﴿۳۳﴾ اللہ کی آیات اور حکمت کی باتیں جو تمہارے

مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ﴿۳۴﴾

گھروں میں پڑھی جاتی ہیں ان کو یاد کرو، بےشک اللہ تعالیٰ باریک بین، خبر رکھنے والا ہے ﴿۳۴﴾

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَ

بےشک اسلام لانے والے مَرد اور اِسلام لانے والی عورتیں، ایمان والے مَرد اور ایمان والی عورتیں، فرماں برداری اختیار کرنے والے مَرد اور

الْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَ

فرماں برداری اختیار کرنے والی عورتیں، سچے مَرد اور سچی عورتیں، صبر کرنے والے مَرد اور صبر کرنے والی عورتیں، خشوع اختیار کرنے والے مَرد اور

الْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ

خشوع اختیار کرنے والی عورتیں، صدقہ دینے والے مَرد اور صدقہ دینے والی عورتیں، روزہ رکھنے والے مَرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں،

وَالْحٰفِظِیْنَ	فُرُوْجَهُمْ	وَالْحٰفِظٰتِ	وَالذّٰكِرِیْنَ	اللّٰهَ	كَثِیْرًا	وَّ

اپنی فرجوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور اپنی فرجوں کی حفاظت کرنے والی عورتیں، اللہ کو بہت یاد کرنے والے مرد اور

الذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۳۵﴾

اللہ کو یاد کرنے والی عورتیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے بخشش اور اجرِ عظیم تیار کیا ہے ﴿۳۵﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ: اے نبی! اپنی بیویوں کو کہہ دیجئے۔ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا: اگر تم سب عورتیں ارادہ کرتی ہو دُنیوی زندگی کا، وَزِیْنَتَهَا: اور دُنیوی زندگی کی زیب وزینت، رونق کا، فَتَعَالَیْنَ جمع مؤنث کا صیغہ ہے۔ پس تم سب عورتیں آؤ۔ اُمَتِّعْكُنَّ میں تمہیں فائدہ پہنچاؤں، وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا: اور میں تم سب کو رخصت کردوں اچھی طرح سے رخصت کرنا۔ تعالین یہ اَمر کا صیغہ ہے، تَعَالٰی یَتَعَالٰی اصل میں یہ اُوپر چڑھنے کو کہتے ہیں، بلندی کی طرف جانا۔ ایک شخص بلندی پہ ہو اور دوسرا شخص پستی میں ہو، تو اس کو بلاتا ہے تعالَ کہہ کے، اُوپر چڑھ آ، بلندی کی طرف آ جا۔ پھر بعد میں اس کو بلندی کے معنی سے خالی کر کے مطلقاً بلانے کے لیے یہ لفظ استعمال کرتے ہیں۔ تو یہاں یہ لفظ متوجہ کرنے کے لئے ہے، اور یہ لفظ پہلے آل عمران میں گزرا تھا تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ (سورۂ آل عمران: ۶۴) پس تم آ جاؤ سب عورتیں، میں تمہیں فائدہ پہنچاؤں، اور میں تمہیں رُخصت کردوں رُخصت کرنا اچھی طرح سے۔ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ: اور اگر تم سب عورتیں ارادہ کرتی ہو اللہ کا اور اس کے رسول کا، وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ: اور پچھلے گھر کا، دارِ آخرت کا، فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِیْمًا: پس بے شک اللہ تعالیٰ نے تیار کیا ان عورتیں کے لئے جو تم میں سے محسنٰت کا مصداق ہیں اَجْرًا عَظِیْمًا بہت بڑا اجر۔ محسنٰت یہ مُحْسِنَةٌ کی جمع ہوگئی۔ یہ لفظ اَحْسَنَ سے لیا گیا ہے۔ اور اَحْسَنَ کا معنی ہوتا ہے ہر کام کو اچھی طرح سے کرنا۔ تم میں سے جو نیکوکار عورتیں ہیں، ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے اجرِ عظیم تیار کیا ہے۔ یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ مَنْ یَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ: اے نبی کی بیویو! جو تم میں سے ارتکاب کرے گی صریح بے حیائی کا۔ فاحشہ: بے حیائی کا کام۔ مُبَیِّنَةٍ کا معنی واضح۔ اور "اَتٰی یَاْتِیْ" آنا، لیکن باء تعدیہ کی آ گئی، لانے کے معنی میں۔ جو لائے گی تم میں سے صریح بے حیائی کو، یعنی جو تم میں سے صریح بے حیائی کا ارتکاب کرے گی۔ یُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَیْنِ: بڑھایا جائے گا اس کے لئے عذاب دوگنا، دومثل اس کو عذاب دیا جائے گا، وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرًا: اور یہ بات اللہ پر آسان ہے۔ وَمَنْ یَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ: اور جو کوئی اطاعت کرے گی تم میں سے، مطیع رہے گی اللہ اور اللہ کے رسول کے لئے، وَتَعْمَلْ صَالِحًا: اور نیک عمل کرے گی، نُّؤْتِهَاۤ اَجْرَهَا مَرَّتَیْنِ: دیں گے ہم اس کو اس کا اجر دوگنا، دومرتبہ ہم اجر دیں گے۔ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِیْمًا: اور تیار کیا ہم نے اس عورت کے لئے باعزت رزق، باعزت روزی ہم نے اس کے لئے تیار کی۔ یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ: اے نبی کی بیویو! لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ: تم عورتوں میں سے کسی کی طرح نہیں ہو، اِنِ اتَّقَیْتُنَّ: اگر تم تقویٰ اختیار کرو فَلَا تَخْضَعْنَ

بِالْقَوْلِ: بات کرنے میں خضوع اختیار نہ کیا کرو، نرمی اختیار نہ کیا کرو، لچک نہ پیدا کیا کرو، فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ: پھر اُمید کرے گا، طمع لگائے گا وہ شخص جس کے دِل میں بیماری ہے، وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا: اور کہو تم اچھی بات، اچھی بات کہا کرو، وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ: قَرْنَ یہ اصل میں اِقْرَرْنَ تھا، عام صرفی قاعدے کے خلاف راء کا فتح نقل کر کے ماقبل کو دے دیا، اور ایک راء کو اجتماعِ ساکنین کی بنا پر ساقط کر دیا، اور پھر شروع میں ہمزہ وصل کی بھی ضرورت نہ رہی، اس طرح سے قَرْنَ بن گیا۔ قرار پکڑو اپنے گھروں میں۔ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى: اور ظاہر نہ ہو مثل ظاہر ہونے جاہلیتِ اُولیٰ کے، جس طرح سے قدیمی جاہلیت چلی آرہی ہے، اور عورتیں اس میں اپنے زیب و زینت کے ساتھ نمایاں ہوتی پھرتی ہیں، ظاہر ہوتی پھرتی ہیں، تم اس طرح سے ظہور اختیار نہ کرو۔ یہ لفظ سورۂ نور میں آیا تھا، غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِیْنَةٍ (سورۂ نور: ۶۰)، اس حال میں کہ اپنی زینت کو ظاہر کرنے والی نہ ہوں۔ تَبَرُّج ظاہر ہونے کو کہتے ہیں۔ وہاں چونکہ بِزِیْنَةٍ کے ساتھ ب تعدیہ کی آئی ہوئی ہے، اس لئے ظاہر کرنے کے ساتھ معنی کر دیا تھا۔ وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ: اور نماز قائم کرو، وَاٰتِیْنَ الزَّكٰوةَ: اور زکوٰۃ دیتی رہو، وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ: اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرو۔ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ: اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے کہ لے جائے تم سے پلیدی کو اے بیت والو! اے گھر والو! وَیُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا: اور تمہیں صاف ستھرا کر دے اچھی طرح سے صاف ستھرا کرنا۔ اللہ تعالیٰ تم سے یعنی اہلِ بیت سے رجس کو دُور کرنا چاہتا ہے اور تمہیں اچھی طرح سے صاف ستھرا کرنا چاہتا ہے۔ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ یہاں خطاب عَنْكُمْ کے ساتھ آ گیا، حالانکہ پیچھے تو خطاب چلا آرہا ہے ازواجِ مطہرات کو، تو عورتوں کو کُمْ کے ساتھ خطاب کرنا یہ عرب میں ہے۔ جیسے ہمارے ہاں بھی عورت کا تذکرہ کرتے ہوئے بسا اوقات جب کسی کے ساتھ بات کرنی ہو کبھی جمع کی ضمیر لوٹا دیتے ہیں، کبھی ایسے انداز میں بات کرتے ہیں جس طرح سے کسی مذکر سے بات ہو رہی ہوتی ہے، عرب میں بھی اسی طرح سے ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعے میں پہلے آپ کے سامنے گزرا، قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا: امْكُثُوْٓا: موسیٰ علیہ السلام نے جس وقت اپنے گھر والوں سے کہا کہ تم یہیں ٹھہرو، اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ نَارًا (سورۂ قصص: ۲۹)، تو وہاں اُمْکُثُوْا جمع مذکر کا صیغہ آیا ہوا ہے۔ اور اسی طرح سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعے میں سورۂ ہود (آیت ۷۳) میں آپ کے سامنے گزرا تھا رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَیْكُمْ اَهْلَ الْبَیْتِ حالانکہ پیچھے ذِکر حضرت سارہ کا چلا آرہا ہے۔ اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ہیں تم پر اے گھر والو! وہاں مخاطب حضرت سارہ ہیں، اور وہاں بھی کُمْ کی ضمیر لوٹی ہوئی ہے۔ تو اصل میں یہ فضیلت جو یہاں بیان کرنی مقصود ہے، اس میں چونکہ بیویاں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کو بھی ساتھ شامل کرنا مقصود ہے، جو بھی آپ کے خاندان میں شامل ہیں، اس لئے تَغْلِیْبًا جمع مذکر کا لفظ بولا گیا (نسفی)۔ ورنہ یہاں اصل کے اعتبار سے یہ فضیلت ازواجِ مطہرات کی ہے، جس طرح سے پیچھے سے خطاب انہی کو چلا آرہا ہے۔ ''سوائے اس کے نہیں کہ ارادہ کرتا ہے اللہ کہ دُور ہٹا دے تم سے رِجس کو، اے نبی کے گھر والو! اور پاک کرے تمہیں اچھی طرح سے پاک کرنا'' وَاذْكُرْنَ مَا یُتْلٰى فِیْ بُیُوْتِكُنَّ: مِنْ اٰیٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ: یہ مَا یُتْلٰى میں جو 'ما' ہے، اس کا بیان ہے۔ اللہ کی آیات جو تمہارے گھروں میں پڑھی جاتی ہیں ان کا ذکر کرو، انہیں یاد کرو، اور حکمت کو یاد کرو، اٰیٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ یہ دونوں مَا یُتْلٰى کے تحت داخل ہیں۔ حکمت: دانش مندی کی باتیں، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، گویا کہ حدیث حکمت کا مصداق ہو جائے گی۔ اٰیٰتِ اللّٰهِ کا مصداق اللہ تعالیٰ کی آیات ہو جائیں گی۔

قرآن وحدیث کی باتیں جوتمہارے گھروں میں پڑھی جاتی ہیں انہیں یادرکھا کرو۔ یہ ہوجائے گا اس آیت کا مفہوم۔ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰهِ کا مصداق قرآن کریم ہوجائے گا، اور حکمت سے مراد حضور ﷺ کی باتیں ہوجائیں گی، جس کو آج ہم حدیث یا سُنّت کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں۔ کتاب وسُنّت کی باتیں جوتمہارے گھروں میں پڑھی جاتی ہیں انہیں یاد کرو۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا: بے شک اللہ تعالیٰ باریک بین، خبر رکھنے والا ہے۔ اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ الخ: بے شک اسلام لانے والے مرد اور اسلام لانے والی عورتیں، ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں، فرماں برداری اختیار کرنے والے مرد اور فرماں برداری اختیار کرنے والی عورتیں، سچے مرد اور سچی عورتیں، صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں، خشوع اختیار کرنے والے مرد اور خشوع اختیار کرنے والی عورتیں، صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں، روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں، اور اپنی فروج کی حفاظت کرنے والے مرد، یعنی باعفت، باحیا جو اپنی فرج کی حفاظت کرتے ہیں۔ اپنی فرجوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور اپنی فرجوں کی حفاظت کرنے والی عورتیں، اللہ کو بہت یاد کرنے والے مرد اور اللہ کو یاد کرنے والی عورتیں، اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا: اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے بخشش اور اجر عظیم تیار کیا ہے۔

تفسیر

ماقبل سے ربط

شروع سورت میں آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا تھا، کہ اس سورت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے سرورِ کائنات ﷺ کی محبوبیت، منصوریت، اور آپ کی خدمت کے آداب کو زیادہ تر بیان کیا ہے۔ اور خصوصیت کے ساتھ حضور ﷺ کو تکلیف پہنچانے سے روکنا مقصود ہے، کہ آپ کے ساتھ کوئی اس قسم کا معاملہ نہ کیا جائے جس سے آپ کو تکلیف پہنچے۔ غزوۂ اَحزاب میں جس قسم کی منصوریت اور محبوبیت نمایاں ہوئی وہ تو آپ کے سامنے آچکا، یہاں ذکر کیا جارہا ہے سرورِ کائنات ﷺ کی اَزواجِ مطہرات کے ایک واقعہ کا۔

مسلمانوں میں مالی خوش حالی

صحیح روایات میں یوں مذکور ہے کہ جس وقت غزوۂ اَحزاب ہوگیا، اس کے بعد بنوقریظہ بھی شکست کھا گئے، اور اس سے قبل یہاں سے بنونضیر نکال دیے گئے تھے، خیبر ابھی فتح نہیں ہوا تھا، خیبر سے پہلے کی بات ہے، تو یہ باغات یہودیوں کے بہت زیادہ تھے جو مسلمانوں کے قبضے میں آگئے، اور ان کے قبضے میں آجانے کے بعد عام طور پر مسلمانوں میں خوش حالی ہوگئی۔ اور پہلے جو تنگ دستی چلی آرہی تھی وہ کسی درجے میں زائل ہوگئی، شدت کا وقت گزر گیا۔

گزراوقات میں اُسوۂ رسولِ اکرم ﷺ

اور سرورِ کائنات ﷺ نے گھر کے اندر جو معیشت رکھی ہوئی تھی، وہ بہت ہی ادنیٰ درجے کی تھی۔ اپنے آپ کو آپ بالکل

مساکین کی سطح پہ رکھتے تھے۔ جیسا کہ حضرت عائشہ صدیقہ ؓ فرماتی ہیں کہ ہم تین تین چاند دیکھ لیتی تھیں، اور گھر کے اندر آگ جلانے کی نوبت نہیں آتی تھی۔[1] اور تین چاند دو مہینوں میں دیکھے جاتے ہیں، پہلا چاند دیکھا، مہینہ ختم ہوا پھر دوسرا چاند دیکھا دوسرا مہینہ شروع ہوا، پھر تیسرا چاند دیکھا دو مہینے پورے ہو گئے۔ تو ''شہرین متتابعین'' کا ذکر بھی ہے، اور تین تین چاندوں کا ذکر بھی ہے۔ تو گھر میں آگ جلانے کی نوبت نہیں آتی تھی، بس کھجور اور پانی پہ گزارہ ہوتا تھا، یا کسی طرف سے کبھی کوئی تھوڑا سا دودھ بطور ہدیے کے آجاتا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے گھر کے اندر بہت مسکنت رکھی ہوئی تھی، فاقہ مستی کے ساتھ وقت گزرتا تھا۔ تو ازواجِ مطہرات آخر وہ بھی انسان ہیں، اِردگرد جس وقت انہوں نے دیکھا کہ عام خوش حالی ہو گئی، تو انہوں نے حضور ﷺ سے مطالبہ کیا کہ ہمارے نفقے کے اندر بھی وسعت کر دی جائے۔ آپ نے انہیں کچھ سمجھایا ہوگا لیکن معلوم یوں ہوتا ہے کہ ان کی طرف سے کسی درجے میں اِصرار ہوا۔ تو جب یہ اِصرار ہوا، تو حضور ﷺ کی حکمت یہ تھی کہ گھر کے اندر خوش حالی نہ آئے۔ کیونکہ حُبِ دُنیا ایک ایسی چیز ہے جو بہت سے مفاسد میں اور خرابیوں میں مبتلا کرتی ہے۔ اور اسلام کا خاص مزاج یہ ہے کہ یہ دُنیا کی محبت سے بچاتا ہے، آخرت کی ترغیب دیتا ہے۔ اور نبی کا ہر ہر کام، ہر عمل، ہر قول، ہر فعل اُسوہ ہے۔ آپ کی ذات بھی اور آپ کے گھر میں جس قسم کے معاملات ہیں وہ بھی اُمت کے لئے ایک نمونہ بننے والے تھے۔ تو اگر نبی کے گھر میں وسعت آجائے، خوش حالی ہو جائے، اور عیش وعشرت کے ساتھ وقت گزرنے لگ جائے، تو لوگ تو پھر اس عیش وعشرت کو سُنّتِ نبوی کہہ کر اپنائیں گے، اور اس عیش وعشرت کی طرف ان کی ایک دوڑ لگ جائے گی۔ تو حضور ﷺ چاہتے تھے کہ کم از کم میرا عملی نمونہ، یعنی اگرچہ دوسروں کے لئے جواز ہے کہ اچھا کھائیں اچھا پہنیں، لیکن کم از کم میرا عملی نمونہ لوگوں کے سامنے یہ ہو کہ وقت سادگی کے ساتھ گزارا جائے۔ اس طرح سے گزارا جائے جس طرح سے ایک راہ چلتا مسافر ہوتا ہے، اس کے سامنے ایک منزل ہوتی ہے، وہ تکلیفیں شدتیں برداشت کرتا ہوا اپنی منزل کو پالیتا ہے۔ تو دُنیا کی زندگی کے متعلق تصور یہی ہو کہ ہم بھی ایک سفر سے گزر رہے ہیں، اور اس میں زیادہ عیش وآرام کی طرف متوجہ ہونا، راحت اور آرام کی طرف متوجہ ہونا، یہ منزل کو کھوٹا کر دیتا ہے۔ اور اپنے مقصد کو پانے میں انسان اچھی طرح سے کامیاب نہیں ہوتا۔ اس لئے دُنیا کی محبت سے بچتے ہوئے، عیش وعشرت سے بچتے ہوئے اس دُنیوی زندگی کو گزارا جائے، آپ ﷺ لوگوں کے سامنے یہی نمونہ چھوڑنا چاہتے تھے، اس لئے اَزواجِ مطہرات کا یہ مطالبہ حضور ﷺ کو ناگوار گزرا، کیونکہ آپ چاہتے تھے کہ اپنے گھر والوں میں بھی وہی معیار رکھیں۔

آپ ﷺ نے اپنی لختِ جگر کے لئے سادگی کا معیار پسند کیا

عام طور پر آپ سنتے رہتے ہیں، اور صحیح روایات میں موجود ہے کہ آپ کی ایک ہی بیٹی حیات تھیں، حضرت فاطمہ ؓ،

(۱) بخاری ۱/۳۴۹، کتاب الهبة کا پہلا باب۔ اِنْ كُنَّا لَنَنْظُرُ إِلَى الْهِلَالِ ثُمَّ الْهِلَالِ ثَلَاثَةَ أَهِلَّةٍ فِي شَهْرَيْنِ وَمَا أُوقِدَتْ فِي أَبْيَاتِ رَسُولِ اللهِ ﷺ نَارٌ قَالَ: قُلْتُ: يَا خَالَةُ! فَمَا كَانَ يُعَيِّشُكُمْ، قَالَتْ: الْأَسْوَدَانِ التَّمْرُ وَالْمَاءُ إِلَّا أَنَّهُ قَدْ كَانَ لِرَسُولِ اللهِ ﷺ جِيرَانٌ مِنَ الْأَنْصَارِ وَكَانَتْ لَهُمْ مَنَائِحُ فَكَانُوا يُرْسِلُونَ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ مِنْ أَلْبَانِهَا فَيَسْقِينَاهُ.

باقی تین بیٹیاں فوت ہوگئی تھیں حضرت زینب ﷞، حضرت رُقیہ ﷞، حضرت اُمِ کلثوم ﷞، یہ پہلے فوت ہوگئی تھیں، آخر میں ایک ہی بیٹی باقی رہ گئی تھیں، بچے جتنے ہوئے تھے وہ بھی فوت ہوگئے۔ اب جو ایک بیٹی تھی، وہ انتہائی عزیز اور انتہائی پیاری تھی۔ اولاد میں سے جب ایک ہی باقی رہ جائے تو ایک طبعی بات ہے کہ اس کے ساتھ ویسے بھی محبت بہت ہوتی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِّنِّيْ'' فاطمہ تو میرا ٹکڑا ہے! ''مَنْ اٰذَاهَا فَقَدْ اٰذَانِيْ'' جس نے اس کو تکلیف پہنچائی اُس نے مجھے تکلیف پہنچائی۔[1] آپ ان کی بہت دِلداری فرماتے تھے، لیکن ان کے گھر میں بھی آپ نے اسی طرح سے مسکنت اور فقر کو باقی رکھا، کبھی اپنی بیٹی کو دُوسری عورتوں کے مقابلے میں کسی معاملے میں ترجیح نہیں دی، بلکہ دوسری عورتوں کو ترجیح دیتے تھے۔ حضرت فاطمہ ﷞ چکی اپنے ہاتھ سے پیستی تھیں، تو اس مشقت اور تکلیف کی شکایت لے کے ایک دفعہ حضور ﷺ کے گھر میں گئیں، سُنا تھا کہ کوئی خدام آئے ہیں، کوئی غلام آئے ہیں، تو ان میں سے کوئی غلام مل جائے، کوئی خادم مل جائے، تاکہ میں گھر کے کام سے کچھ چھٹکارا پا جاؤں۔ حضور ﷺ گھر میں موجود نہیں تھے، تو حضرت عائشہ صدیقہ ﷞ اپنی اَمّاں کے پاس ذِکر کر کے آگئیں۔ جب حضور ﷺ تشریف لائے تو حضرت عائشہ ﷞ نے ذِکر کیا کہ فاطمہ ﷞ آئی تھیں، اور وہ یوں اپنی تکلیف کا اِظہار کر رہی تھیں کہ چکی پیسنے میں مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے، تو مجھے کوئی خادم مہیا کر دیا جائے، تو جو غلام آئے ہیں ان میں سے کوئی خادم ان کو دے دیا جائے۔ جب یہ بات حضور ﷺ نے سنی تو عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر حضرت فاطمہ ﷞ کے گھر تشریف لے گئے۔ حضرت علی ﷜ فرماتے ہیں کہ ہم اپنے بستروں میں لیٹ چکے تھے، حضور ﷺ تشریف لائے تو ہم اُٹھنے لگے، آپ نے فرمایا: لیٹے رہو۔ تو آپ ﷺ آ کے اسی طرح سے ہمارے درمیان میں رضائی میں، کمبل میں، جو بھی کپڑا تھا، لحاف میں، قدم پھیلا کے بیٹھ گئے۔ اور بیٹھ کر تذکرہ شروع کیا، حضرت فاطمہ ﷞ کا مطالبہ ذِکر کیا کہ تُو غلام کی طلب کے لئے گئی تھی۔ تو میں تمہیں ایک ایسی بات نہ بتادوں جو تمہارے لیے خادم کے مقابلے میں بہت اچھی ہے، وہ کہنے لگیں: جی! ضرور فرمائیے۔ فرمایا کہ جب سونے لگو تو ۳۳ دفعہ ''سُبحان الله''، ۳۳ دفعہ ''الحمدلله''، ۳۴ دفعہ ''الله اكبر'' پڑھ لیا کرو، یہ تمہارے لیے خادم کے مقابلے میں بہت اچھی چیز ہے۔[2] تو حضرت فاطمہ ﷞ اور حضرت علی ﷜ نے یہ عادت ہی بنالی تسبیح پڑھنے کی۔ اللہ کے ذِکر کی طرف ان کو متوجہ کر دیا اور خادم نہیں دیا، صرف اس لئے کہ ایسا نہ ہو کہ میں اپنی بیٹی کو خوش حال کر دُوں، اور عام اُمّت میں کوئی گھر بھی اگر شدّت میں ہو، تو کہیں گے کہ دیکھو! یہ اپنے گھر میں اس طرح سے کر رہے ہیں، اور اپنوں کو یوں ترجیح دے رہے ہیں، دوسرے ضرورت مند موجود ہیں ان کی ضرورت کا خیال ہی نہیں کرتے۔ اس لیے حضور ﷺ نے اپنی لختِ جگر اور انتہائی عزیز اور پیاری بیٹی کو بھی خادم مہیا نہیں کیا، صرف اس وجہ سے تاکہ ان کا معیار بھی سادہ رہے..... ایک دفعہ سفر سے تشریف لائے، حضرت فاطمہ ﷞ کے گھر میں گئے، تو دیکھا کہ کپڑا بطورِ دیوار گیری کے لٹکایا ہوا تھا زیب و زینت کے

(۱) فضائل الصحابة لابن حنبل، رقم ۱۳۲۴۔ نیز دیکھیں: بخاری ۱/ ۵۳۲، باب مناقب فاطمة۔ مشکوٰۃ ۲/ ۵۶۸، باب مناقب اهل بيت. واللفظ مختلف.

(۲) بخاری ۱/ ۴۳۹، باب الدليل على ان الخمس الخ۔ ۲/ ۸۰۸، باب خادم المرأة. مسلم ۲/ ۳۵۱، باب التسبيح اول النهار. مشکوٰۃ ۱/ ۲۰۹، باب ما يقول عند الصباح

طور پر۔ تو گھر میں جانے سے انکار کر دیا، جس وقت تک اس کو اُتار نہیں دیا گیا۔[1] تو سادگی کو پسند فرمایا اپنے گھروں میں بھی اور اپنی اولاد کے لئے بھی۔ حضور ﷺ اُمت کے سامنے یہی نمونہ پیش کرنا چاہتے تھے۔

''آیاتِ تخییر'' کا نزول

اس لئے بیویوں کا مطالبہ ناگوار گزرا، تو آپ ﷺ نے ایک مہینے کے لئے بیویوں کے ساتھ تعلق چھوڑ دیا، جس کو ''ایلاء'' کہتے ہیں، قسم کھالی کہ میں بیویوں کے پاس نہیں جاؤں گا۔ ایک مہینے کا ''اِیلاء'' کرلیا، اور بیویوں سے علیحدگی اختیار کرلی، اور ایک بالاخانے میں مقیم ہوگئے۔ لمبے لمبے واقعات ہیں اس دور کے جو حدیث شریف میں آتے ہیں۔ مہینہ جس وقت پورا ہونے کو تھا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ آیات اُتریں، جن میں اللہ تعالیٰ نے بالکل صاف طریقے سے فرمادیا کہ اپنی بیویوں سے کہہ دو، کہ نبی کے گھر میں رہنا ہے تو اِسی معیار پہ رہنا پڑے گا، جس معیار پہ وہ رکھتے ہیں، شدّت اُٹھاؤ، صبر کرو، جس طرح سے وقت گزرے گزارو، اور اگر تمہارا ارادہ زیب وزینت اختیار کرنے کا ہے، دُنیا کی عیش تم چاہتی ہو، تو انہیں اختیار دے دو، اگر یہ دُنیا کو پسند کرتی ہیں، دُنیا کی زیب وزینت کو پسند کرتی ہیں، تو انہیں کچھ دے دِلا کے رُخصت کردو، یعنی ان سب بیویوں کو طلاق دے دو، جائیں جا کے جہاں ان کو عیش ملتی ہے، وہاں عیش کریں، نبی کے گھر میں عیش وعشرت نہیں ہوسکتی، یہاں اسی طرح سے صبر وشکر کے ساتھ وقت گزارنا پڑے گا۔ یہ ہیں آیاتِ تخییر۔

اَزواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کا متفقہ جواب

چنانچہ جب یہ آیات اُتری ہیں تو سرورِ کائنات ﷺ سب سے پہلے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے، اور جا کے یہ کہا کہ عائشہ! میں تجھ سے ایک بات کرنے لگا ہوں، جواب دینے میں جلدی نہ کرنا، کیونکہ یہ نوعمر تھیں، چھوٹی عمر کی تھیں، خیال تھا کہ اگر جلدی سے منہ سے نکل گیا کہ اچھا! ہم تو زیب وزینت چاہتے ہیں، تو طلاق ہوجائے گی، ''تخییر'' کا تو مطلب یہی ہوتا ہے، اور سرورِ کائنات ﷺ نہیں چاہتے تھے کہ ان بیویوں میں سے کسی بیوی کی آخرت برباد ہو، اور وہ طالبِ دُنیا قرار دے دی جائے، اور دُنیا کی طلب میں نبی کی مصاحبت کو چھوڑ جائے۔ اس لئے آپ ﷺ نے اِحتیاطاً فرمایا کہ دیکھو! میں ایک بات کرنے لگا ہوں، جواب دینے میں جلدی نہ کرنا، بلکہ اپنے والدین سے مشورہ کرلینا۔ اس کے بعد پھر یہ آیات پڑھیں، تو حضور ﷺ نے جو کہا کہ والدین سے مشورہ کرلینا، مقصد یہ تھا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تو کسی صورت میں اجازت نہیں دیں گے کہ تو دُنیا اختیار کرلے، اس طرح ذہن پر ذرا پابندی لگ جائے گی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جس وقت یہ آیات سنیں، تو آیات کوسُن کر فرمانے لگیں، یارسول اللہ! کیا میں آپ کے بارے میں اپنے والدین سے مشورہ کروں؟ میں تو اللہ اور اللہ کے رسول کو چاہتی ہوں، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے یہی جواب دیا۔ اور اس کے بعد جس بیوی کے پاس بھی گئے، آپ ﷺ نے جا کر یہ آیات تلاوت کیں، تلاوت کرنے کے بعد ہر بیوی نے یہی جواب دیا کہ ہم تو اللہ اور اللہ کے رسول کو چاہتی ہیں۔

---

(۱) بخاری ۱/۳۵۶ باب ھدیۃ ما یکرہ لبسھا۔ ابوداؤد ۲/۲۱۲ باب اتخاذ الستور۔ مشکوٰۃ ۲/۳۸۳ باب الترجل فصل ثانی۔

اَزواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کا جنّتی ہونا قطعی ہے

تو جب سب بیویوں کی طرف سے یہی جواب مل گیا، تو اب قرآنِ کریم کی آیات کی روشنی میں یہ بات سامنے آگئی کہ اللہ تعالیٰ نے دو باتوں کا اختیار دیا تھا کہ دُنیا کی زیب و زینت چاہتی ہو، تو نبی کے گھر سے رُخصت ہو جاؤ، نبی تمہیں رُخصت کر دیتا ہے، لیکن اگر تم اللہ اور اللہ کے رسول کو چاہتی ہو، اور ان کے ساتھ نباہ کرنا چاہتی ہو، ان کی فرماں بردار بن کے رہنا چاہتی ہو، تو اللہ تعالیٰ تمہیں آخرت میں دوہرا اَجر دے گا۔ جب دو باتوں میں اختیار دے دیا گیا، اور انہوں نے آخرت کو اِختیار کر لیا، اللہ اور اللہ کے رسول کو اِختیار کر لیا، تو یہ آیات قطعی طور پر دلالت کرتی ہیں اس بات پر کہ آخرت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں نجات یافتہ ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو اَجرِ عظیم ملے گا، اور رِزقِ کریم ملے گا۔ اِس لئے اَزواجِ مطہرات کا جنّتی ہونا ان آیات کے تحت قطعی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ جب دو باتوں میں اختیار دے دیا گیا، اس کے بعد جب انہوں نے ایک شق کو اِختیار کر لیا تو اُسی کا حکم لگ جائے گا...... جیسے ایک عورت تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئی، وہ بیمار تھی، اس کو مرگی کی بیماری پڑتی تھی، بے ہوش ہو جاتی تھی، آ کے اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دُعا کا مطالبہ کیا، کہ دُعا کیجئے اللہ تعالیٰ مجھے صحت دے دے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دیکھو! دو باتیں ہیں، اگر کہو تو میں تمہارے لیے دُعا کرتا ہوں اور تمہاری بیماری دُور ہو جائے گی، اور اگر چاہو تو صبر کیے رکھو، اللہ تعالیٰ آخرت میں تمہیں جنّت دے گا۔ یہ دو باتوں میں اختیار دے دیا، تو وہ عورت کہنے لگی کہ جی! میں صبر ہی کرتی ہوں۔ جب اس نے صبر کو اِختیار کر لیا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وعدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ جنّت دے گا۔ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس عورت کو جنّتی عورت کہا کرتے تھے، اور یہ کہا کرتے تھے کہ جس نے جنّتی عورت دیکھنی ہو تو یہ دیکھ لے۔[1] کیونکہ جب دو باتوں کا اِختیار دیا گیا اور اس نے ایک بات کو اِختیار کر لیا، تو اس کے تحت جو وعدہ تھا وہ پورا ہو گا...... یہاں بھی بیویوں کو دو باتوں کا اختیار دیا گیا کہ تم دُنیا کی زیب و زینت چاہتی ہو، تو یہاں سے چلی جاؤ۔ اور اگر تم اللہ اور اللہ کے رسول کو چاہتی ہو، تو ایسی صورت میں پھر آخرت میں اللہ تعالیٰ تمہیں اَجرِ عظیم دے گا، اور رِزقِ کریم دے گا۔ تو انہوں نے آخرت کو اِختیار کیا، اللہ اور اللہ کے رسول کو اِختیار کیا، دُنیا کی زیب و زینت کو اِختیار نہیں کیا۔ اب اس تخییر کے تحت آخرت میں ان کو اَجرِ عظیم ملے گا، اور رِزقِ کریم ملے گا اللہ کے وعدے کے تحت، اور باقیوں کے مقابلے میں زیادہ ملے گا۔ اس لئے ان آیات کے تحت اَزواجِ مطہرات کا جنّتی ہونا قطعی معلوم ہوتا ہے، اور یہی اُمّت کا مسلک ہے کہ اَزواجِ مطہرات، اُمہات المؤمنین جنّتی ہیں آخرت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوں گی۔

حضرت سودۃ رضی اللہ عنہا کے متعلق ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ فرما لیا ان کو طلاق دینے کا۔ تو حضرت سودۃ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ یا رسول اللہ! مجھے طلاق نہ دیجئے، میں اپنے حقوق معاف کرتی ہوں، اور اپنی باری بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو دیتی ہوں، میں یہ چاہتی ہوں کہ آخرت میں آپ کی بیوی بن کے اُٹھوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مطالبے کو پورا فرما لیا، اور ان کو طلاق نہیں دی۔[2] جس

(۱) بخاری ۲/ ۸۴۴ باب فضل من یصرع من الریح۔ مشکوۃ ۱/ ۱۳۷ باب عیادۃ المریض، فصل ثالث۔

(۲) ترمذی ۲/ ۱۳۴، کتاب التفسیر، سورۃ النساء کی تفسیر کے آخر میں۔ مشکوۃ ۲/ ۲۸۰، باب القسم، فصل ثالث۔ نیز: ابن کثیر۔ سورۃ النساء: ۱۲۸۔ نسفی والوسی الأحزاب: ۵۱۔

سے معلوم ہوگیا کہ آخرت میں بھی حضرت سودہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کی بیوی ہوں گی، اِسی تمنا کے تحت انہوں نے اپنے حقوق معاف کئے تھے۔ تو اسی طرح سے باقی اَزواجِ مطہرات جتنی ہیں وہ سب حضور ﷺ کے ساتھ ہوں گی، جنتی ہیں، اور باقی عورتوں کے مقابلے میں ان کے درجات اُونچے ہیں۔ ان آیات کی روشنی میں اَزواجِ مطہرات کا یہ مقام واضح ہوجاتا ہے۔

''آیاتِ تخییر'' کی وضاحت

اب آیات کو دیکھئے...... اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دو۔ یہ ''تخییر'' ہے جس طرح سے کسی کو اِختیار دیا جاتا ہے، اور جب کسی کو اِختیار دے دیا جائے پھر آگے وہ کہہ دے کہ میں اس شق کو اِختیار کرتی ہوں، تو وہی واقع ہوجاتی ہے۔ طلاق کا کسی کو اِختیار دے دیں جب وہ کہہ دے کہ میں اپنے آپ کو اِختیار کرتی ہوں، طلاق کو اِختیار کرتی ہوں، تو طلاق واقع ہوجاتی ہے۔ آپ اپنی بیویوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تم دُنیوی زندگی اور اس کی زیب وزینت کا ارادہ رکھتی ہو، تو آجاؤ، میں تمہیں فائدہ پہنچادوں۔ اس فائدہ پہنچانے سے یا تو عدّت کا نفقہ مراد ہے، یا جس طرح سے فقہ کے اندر آپ پڑھتے ہیں کہ کسی عورت کو رُخصت کرتے وقت ایک جوڑا دے دیا جائے، وہ جوڑا مراد ہے جس کو ''متعہ'' کے لفظ کے ساتھ ہی فقہ میں تعبیر کیا جاتا ہے۔ ''اور پھر میں تمہیں اچھی طرح سے رُخصت کردوں'' اچھی طرح سے رُخصت کرنے کا معنی کہ جو شرعی طریقہ ہے رُخصت کرنے کا یعنی طلاق دینا، میں اس طرح سے تمہیں طلاق دے کے روانہ کردیتا ہوں، جاؤ، جہاں تمہیں عیش وعشرت ملتی ہے وہاں جا کے عیش وعشرت اختیار کرلو۔ اور اگر تم اللہ اور اللہ کے رسول کا ارادہ رکھتی ہو، اور دارِ آخرت کو چاہتی ہو، آخرت کا تمہارا اِرادہ ہے، تو پھر جو عورتیں تم میں سے نیکوکار ہوں گی، صفتِ اِحسان کو اَپنائیں گی، خلوص کے ساتھ اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرتی رہیں گی، جیسا کہ اِحسان کا مفہوم ہے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے اَجرِ عظیم تیار کیا ہے۔ یہ دو شقیں آگئیں اور ان دو شقوں میں سے انہوں نے اس دوسری شق کو اِختیار کیا کہ ہم تو اللہ اور اللہ کے رسول اور دارِ آخرت کو چاہتی ہیں۔ تو جب انہوں نے اِس شق کو اِختیار کرلیا، تو اللہ تعالیٰ کے وعدے کے تحت اَجرِ عظیم ان کو ملے گا، رِزقِ کریم ملے گا، جس طرح سے آگے ذِکر کیا گیا۔ آگے ان کو پھر اور آداب ذِکر کئے جارہے ہیں۔

اَزواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کو ان کے منصب کی یاددہانی

یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ مَنْ یَّاْتِ مِنْکُنَّ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ: ان کو ان کا منصب یاد دلایا جارہا ہے، کہ تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو، جس طرح سے آگے الفاظ آرہے ہیں، تم ہو حضور ﷺ کی بیویاں، خصوصیت ہے تمہاری حضور ﷺ کے ساتھ، اگر تم کوئی ایسا طریقہ اختیار کرو، جو آپ ﷺ کے لئے باعثِ تکلیف ہے، تو اس میں بمقابلہ دوسرے لوگوں کے اللہ کی طرف سے عذاب بھی زیادہ آئے گا، کیونکہ دوسرے لوگ اتنی تکلیف نہیں پہنچا سکتے، جتنی مقربین کی کج روی تکلیف پہنچاتی ہے۔ اور اگر تم ٹھیک رہو گی تو باقیوں کے مقابلے میں ثواب بھی زیادہ ملے گا۔

''فَاحِشَه مُبَيِّنَه'' کا مصداق

یہاں جو فاحشہ مبینہ کا لفظ آیا ہے، تو اس سے مراد ہے ایسا معاملہ جو حضور ﷺ کے لئے باعثِ تکلیف ہو۔ ایذائے نبی اس فاحشہ مبینہ کا مصداق ہے۔ یہاں سے زِنا یا بدکاری کی طرف اشارہ نہیں، کیونکہ زِنا اور بدکاری جو ہوا کرتی ہے وہ مُبَيِّنَة کا مصداق نہیں ہوتی، کھلم کھلا نہیں اختیار کی جایا کرتی۔ تو یہاں سے ایسا معاملہ مراد ہے جو حضور ﷺ کے لئے باعثِ ایذا ہو۔ اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو عورت بھی کھلی بے حیائی اختیار کرے گی، اس بے حیائی سے مراد ہے کہ ایسا کام کرے گی جو حضور ﷺ کے لئے باعثِ تکلیف ہو، اس کے لئے عذاب دوگنا بڑھایا جائے گا۔ ضعف: مثل کو کہتے ہیں، ضعفین: مثلین ہو گیا۔ ''اور یہ سزا دینا اللہ پہ آسان ہے'' کسی کی وجاہت کسی کا خاندان کوئی مانع نہیں، اللہ تعالیٰ جو سزا دینا چاہے دے سکتا ہے۔ ''اور جو تم میں سے اللہ اور اللہ کے رسول کی مطیع رہے گی'' قنوت: اطاعت اختیار کرنا ''اور اچھے کام کرتی رہے گی ہم اس کو اَجر دیں گے مرّتین'' جس طرح سے پیچھے سزا دوگنی ہے، اسی طرح سے ثواب بھی دوگنا ملے گا۔ جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ اہلِ کتاب میں سے جو شخص حضور ﷺ پر ایمان لائے تو اللہ تعالیٰ اس کو دوگنا اَجر دیں گے۔ ایک غلام جو اپنے آقا کی خدمت بھی کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے اَحکام کی بجا آوری بھی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو بھی دوگنا ثواب دیں گے۔[1] اسی طرح ان بیویوں کی بھی یہ خصوصیت ہوئی، کہ اگر یہ نیک ہوں گی، تو نیکی کی صورت میں اللہ تعالیٰ انہیں اَجر بھی دوگنا دے گا۔ ''اور ہم نے تیار کیا اس کے لئے رِزقِ کریم'' اب آنے والے واقعات اس بات پہ شاہد ہیں کہ ازواجِ مطہرات نے پھر یہی طریقِ زندگی اپنایا کہ اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کی، اور کوئی بات اس قسم کی نہیں کی جو اللہ اور اللہ کے رسول کے لئے باعثِ تکلیف ہو۔ اس لئے وہ سب سے زیادہ اَجر پائیں گی، اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے رِزقِ کریم تیار کر رکھا ہے۔

دُنیا کی افضل ترین عورتیں

''اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں میں سے کسی کی طرح نہیں ہو'' بلکہ تمہیں جو نبی کی زوجیت کا شرف حاصل ہے اس کے اعتبار سے تم سب سے ممتاز ہو۔ یہاں یہی شرف ذِکر کرنا مقصود ہے، باقی یہ مسئلہ کہ دُنیا کی عورتوں میں سے افضل ترین عورتیں کون سے ہیں؟ روایات کی طرف دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے، سرورِ کائنات ﷺ نے حضرت مریم کا ذکر کیا، یعنی مریم بنت عمران، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ، اور اسی طرح سے آسیہ امراۃ فرعون کا ذِکر کیا، یعنی فرعون کی بیوی آسیہ، پچھلی اُمتوں میں سے تو ان دو کی فضیلت روایات میں بہت آئی ہے۔ اور اِس اُمت میں سے تین عورتوں کی فضیلت خصوصیت سے نمایاں کی گئی ہے، حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا، حضور ﷺ کی پہلی بیوی، حضرت فاطمہ و دیگر اولاد کی والدہ۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا۔ تو یہ پانچ عورتیں ہیں جن کا نام بنام روایات میں ذِکر آتا ہے، ان کی اَفضلیت کا۔ تو ان پانچ کے متعلق تو یہ عقیدہ ہے کہ دُنیا کی عورتوں میں سے افضل ہیں۔ باقی ان میں سے زیادہ فضیلت کس کو حاصل ہے؟ علی الاطلاق اَفضلیت کس کے لیے ہے؟ اس

(۱) بخاری ۱/۲۰ باب تعلیم الرجل امتہ۔ مشکوۃ ۱/۱۲، کتاب الایمان، فصل اول۔ ولفظ الحدیث: ثَلَاثَةٌ لَهُمْ أَجْرَانِ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ الخ

کی تعیین مشکل ہے، روایات کی طرف دیکھتے ہوئے یہ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ دُنیا کی عورتوں میں سے یہ پانچ عورتیں سب سے زیادہ افضل ہیں۔ اور ان پانچ کے بعد پھر مجموعی طور پر اَزواجِ مطہرات ہیں، تو گویا کہ اَزواجِ مطہرات میں سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ممتاز ہیں، اور آپ کی اولاد میں سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت نمایاں ہے، اور پہلی عورتوں میں سے حضرت مریم اور حضرت آسیہ کی فضیلت نمایاں ہے۔[1] باقی کلی فضیلت کسی ایک عورت کے لئے ذکر نہیں کی جاسکتی، اس کے لیے ترجیح مشکل ہے۔ تو یہ پانچ عورتیں اور اَزواجِ مطہرات، یہ دُنیا کی سب عورتوں سے زیادہ ممتاز ہیں، بمع حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے۔ ''تم دُنیا کی عورتوں میں سے کسی کی طرح نہیں ہو، اگر تم تقویٰ اختیار کرو، تقوے کا معنی ہی یہی ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول کے اَحکام کی اطاعت کرتی رہو گی تو تم سب عورتوں سے ممتاز ہو، اس لئے آئندہ بھی ان باتوں کا خیال رکھو۔

عورتوں کے لئے اَجنبی سے گفتگو کرنے کا طریقہ

یہ اگرچہ اَحکام دیے جارہے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اَزواج کو خطاب کر کے، لیکن باقی عورتوں کے متعلق بھی اسی طرح سے ہے۔ محارِم کے ساتھ ملنے کی، بات کرنے کی تو اِجازت ہے ہی، یہ اَزواج کو بھی تھی اور عام عورتوں کو بھی ہوتی ہے، جب پردے کا حکم آگیا تو غیر محرَم کے ساتھ ملنا ممنوع ہوگیا، لیکن غیر محرَم دروازے پر آکے کوئی چیز مانگ لے، کوئی بات پوچھ لے بتادے، اتنی اجازت ہے۔ قرآنِ کریم میں خود صراحتاً آئے گا: وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ (سورۂ اَحزاب: ۵۳) کہ ان سے اگر کوئی چیز مانگنی پڑ جائے، کوئی لینی پڑ جائے، کچھ پوچھنا ہو تو پردے کے پیچھے کھڑے ہو کے پوچھ لیا کرو، تو اَزواجِ مطہرات کے ساتھ بھی بات کرنے کی اجازت دے دی، یہ بات صراحت کے ساتھ آگے آرہی ہے۔ تو اجنبی آدمی کے ساتھ پردے میں کھڑے ہو کے بات کرنا ممنوع نہیں ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اَزواجِ مطہرات سے مسائل پوچھا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور دیگر اَزواج یہ جواب بھی دیا کرتی تھیں، علمی باتیں بھی ہوتی تھیں۔ کوئی اور ضرورت پیش آئے کچھ لینا دینا ہو تو وہ بات پردے کے پیچھے کھڑے ہو کے ہو سکتی ہے۔ لیکن اس میں ایک یہ ادب سکھا دیا کہ جب کسی اجنبی کے ساتھ بات کرنے کی نوبت آئے تو اپنی گفتگو کے اندر لچک پیدا نہ کرو، جس طرح سے عورتوں کی آواز میں ویسے لچک ہوتی ہے، نرمی ہوتی ہے، اور اگر کوئی عورت اور زیادہ ادب اور محبت کے ساتھ بولے گی تو آواز میں اور بھی زیادہ لچک ہو جائے گی، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر کسی کے قلب کے اندر ذرا بھی کوئی بُرا خیال ہو تو پھر اس کا دِل زیادہ متوجہ ہو جاتا ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ اتنی محبت اور پیار کے ساتھ جو بات کر رہے ہیں، تو شاید کچھ آگے گفتگو کرنے کی گنجائش ہے، اس طمع کو قطع کرنے کے لئے تاکہ کسی کے دِل میں اس قسم کا خیال نہ آئے، یہ ہدایت دی جارہی ہے کہ نرمی کے ساتھ، خشوع خضوع کے ساتھ نہ بولا کرو۔ بات اچھی کہو، قاعدے کے مطابق، یہ نہیں کہ بات کوئی ایسی کہہ دی جائے جو مناسب

---

(۱) حَسْبُكَ مِنْ نِسَاءِ الْعَالَمِيْنَ مَرْيَمُ ابْنَةُ عِمْرَانَ وَخَدِيْجَةُ بِنْتُ خُوَيْلِدٍ وَفَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ وَآسِيَةُ امْرَأَةُ فِرْعَوْنَ. (ترمذی ۲/ ۲۲۷ باب فضل خدیجہ. مشکوٰۃ ۲/ ۵۷۳، باب مناقب ازواج النبی) لَمْ يَكْمُلْ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَرْيَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ وَآسِيَةُ امْرَأَةُ فِرْعَوْنَ وَفَضْلُ عَائِشَةَ عَلَى النِّسَاءِ كَفَضْلِ الثَّرِيْدِ عَلَى سَائِرِ الطَّعَامِ. (بخاری ۱/ ۵۳۲، مشکوٰۃ ۲/ ۵۰۹ باب بدء الخلق)

نہیں ہے۔قول معروف کہو، جس قسم کی بات مطلوب ہے ویسی کہو، لیکن لب ولہجہ کچھ اس قسم کا رکھو کہ جس میں دوسرا شخص آگے بات بڑھانے کی اُمید نہ لگائے۔ اس لئے عورت کا اجنبی سے بات کرتے ہوئے کچھ اکھڑ مزاج سا ہونا اور کرخت لہجے کے ساتھ بولنا عفت کے قاعدے کے زیادہ مطابق ہے اور قابلِ تعریف ہے۔ اور اگر وہ زیادہ اخلاق دِکھائے آنے والے کو، اور بہت ہی زیادہ ادب اور اخلاق کے ساتھ بولے، تو اس میں ہوسکتا ہے کہ کسی کے قلب کے اندر کوئی میلان پیدا ہو جائے جو عفت کے قاعدے کے خلاف ہے۔ اس لئے یہ بات بتائی جارہی ہے کہ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ بات کرنے میں خضوع نہ اختیار کیا کرو، یعنی لچک وغیرہ اس میں نہ ہو، نرمی نہ ہو، بلکہ بات ہو تو ذرا کسی درجے میں خشونت کو لئے ہوئے ہو، اور کچھ کرخت لب ولہجہ ہو، کہ بات تو مطلب کی کہہ دی، جو ضرورت کے مطابق جواب تھا وہ تو دے دیا، قولِ معروف، عرف کے مطابق جواب تو دے دیا، لیکن گفتگو میں آواز میں کسی قسم کی لچک پیدا نہ ہونے پائے۔ ''پھر اُمید کرلے گا وہ شخص جس کے قلب میں بیماری ہے''، ''بیماری'' سے یہاں ''شہوت کی بیماری'' مراد ہے کہ اگر کسی کے قلب کے اندر کوئی فساد ہوا، تو اگر تم نرمی سے گفتگو کروگی، تمہاری گفتگو کے اندر کوئی لچک آئے گی تو خواہ مخواہ دِل کے اندر ایک اُمید ہو جاتی ہے، اس اُمید کو ختم کرنے کے لئے کہا جارہا ہے کہ بات کا جواب ہمیشہ ذرا کرخت لہجے سے دیا کرو، اس میں نرمی اور نزاکت نہیں ہونی چاہیے۔

عورتوں کے لئے گھر سے باہر نکلنے کے متعلّق اَحکام

وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ: ویسے عام حالات میں گھروں میں قرار پکڑو، باہر چلا پھرا نہ کرو، جس طرح سے جاہلیتِ اُولیٰ میں عورتوں کی عادت تھی کہ بَن سنور کر باہر نکلتی تھیں، جاتی تھیں۔ اب اس طریقے کو چھوڑ دینا چاہیے، یہ قدیمی جاہلیت اب ختم ہوگئی، اب اگر کوئی اس قسم کا طریقہ اختیار کرے گا تو یہ ''جاہلیتِ جدیدہ'' ہے، جس طرح سے آج کل عورتیں زیب وزینت کے ساتھ باہر نکلتی ہیں، تو یہ ''جاہلیتِ جدیدہ'' ہے، ان اَحکام کے آجانے کے بعد۔ اور ان اَحکام کے آنے سے پہلے جو جاہلیت تھی وہ ''جاہلیتِ قدیمہ'' ہے، اُسے ''جاہلیتِ اُولیٰ'' کے ساتھ تعبیر کیا گیا۔ تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ بِلاضرورت گھر سے نہ نکلا کرو، اور جب کسی ضرورت کی بنا پر نکلنے کی نوبت آئے تو زیب وزینت کا اظہار نہیں ہونا چاہیے۔ ازواجِ مطہرات بھی پردے کے ساتھ چادر اوڑھ کے اپنی ضرورت کے لئے دِن کو بھی رات کو بھی باہر نکلا کرتی تھیں۔ جس وقت یہ پردے کا حکم آگیا تو ایک دفعہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا اپنی چادر اوڑھ کر گھر سے کسی کام کے لئے نکلیں، راستے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ملاقات ہوگئی، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس معاملے میں بہت سخت تھے، اور پردے کے بارے میں پہلے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے رہتے تھے کہ اپنی بیویوں کو پردے کا حکم دو، ہر قسم کے لوگ آتے رہتے ہیں، میں اس کو مناسب نہیں سمجھتا، ابھی پردے کا حکم نہیں آیا تھا اس وقت کی بات ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے بعد میں پردے کا حکم بھیج دیا، تو حضرت سودہ رضی اللہ عنہا جو تھیں، باقی بیویوں کے مقابلے میں، ان کی جسامت زیادہ تھی، قدآور تھیں، تو چلتے وقت عورت پہچانی جاتی ہے کہ فلاں عورت جارہی ہے، لباس سے قد قامت سے پتا چل جاتا ہے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آواز دی اور کہا کہ سودہ! ہم تجھے پہچان رہے ہیں، تُو پہچانی جارہی ہے۔ مطلب یہ تھا کہ تجھے ایسے وقت میں نکلنا نہیں چاہیے۔ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا اسی وقت واپس

آ گئیں، جب واپس آ گئیں تو حضور ﷺ حضرت عائشہ ؓ کے گھر میں تھے، کھانا کھا رہے تھے، اور ایک ہڈی آپ کے ہاتھ میں تھی، جس سے گوشت نوچ نوچ کے کھا رہے تھے، آتے ہی حضرت سودہ ؓ نے ذکر کیا کہ دیکھو! میں اپنی ضرورت کے لئے باہر گئی تھی اور حضرت عمر نے یوں کہا۔ تو آپ ﷺ پر اسی وقت ہی وحی کے آثار طاری ہوئے، اور اس کیفیت کے زائل ہونے کے بعد آپ نے فرمایا کہ ''اُذِنَ لَكُنَّ اَنْ تَخْرُجْنَ لِحَاجَتِكُنَّ'' کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہیں اس بارے میں اجازت دے دی گئی کہ تم اپنی ضرورت کی بنا پر باہر جا سکتی ہو۔[1] اس لئے اگر جسامت سے، لباس سے کوئی عورت پہچانی بھی جائے تو یہ پردے کے خلاف نہیں ہے، مقصد یہ ہے کہ زیب وزینت کا اظہار نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ حج کے لئے بھی ازواجِ مطہرات تشریف لے گئیں، اس قسم کے کاموں کے لئے شرعی مصلحت کے تحت عبادت کے طور پر اگر گھر سے نکلنا پڑے تو بھی نکل سکتی ہیں۔ یعنی بلا ضرورت عام طور پر جس طرح سے سیر سپاٹے کے لئے عادت ہوتی ہے، جاہلیتِ اُولیٰ میں جس طرح سے تھی کہ زیب وزینت کا اظہار کرتی پھرتی تھیں، شاپنگ کرتی پھر رہی ہیں، خرید وفروخت کرتی پھر رہی ہیں، یہ چیز پردہ آ جانے کے بعد پھر ممنوع ہوگئی۔ تو وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ کا معنی ہے اپنے گھروں میں قرار پکڑو، یعنی بغیر کسی طبعی یا شرعی ضرورت کے باہر نہ نکلا نہ کرو، اپنے والدین کو ملنے کے لئے جانا، اقارب، رشتہ داروں کو ملنے کے لئے جانا، کسی کے گھر میں تعزیت کے لئے جانا، کسی کی بیمار پُرسی کے لئے جانا، جس طرح سے کہ عام معاشرے میں رہتے ہوئے باتیں ہوا کرتی ہیں، تو یہ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ کے خلاف نہیں ہے۔ ان مصلحتوں کے تحت وہ باہر نکل سکتی ہیں، ضرورت کے تحت نکل سکتی ہیں، مطلب یہ ہے کہ عام حالات میں گھروں میں بیٹھو، مردوں کی طرح بلا وجہ باہر نکلنا، چلنا پھرنا مناسب نہیں۔ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى: جاہلیتِ اُولیٰ کی طرح تم ظاہر نہ ہوتی پھرو، اپنی زیب وزینت کو ظاہر نہ کرتی پھرو۔ ''جاہلیتِ اُولیٰ'' وہی ہے جو حضور ﷺ کے ان اَحکام کو بیان کرنے سے پہلے تھی، اور آپ کے اَحکام بیان کرنے کے بعد اگر کوئی یہ طرز اپنائے گا تو اس کو ''جاہلیتِ جدیدہ'' یا ''جاہلیتِ اُخریٰ'' کے ساتھ تعبیر کریں گے، جس طرح سے آج کل جو کچھ ہو رہا ہے یہ ''جاہلیتِ اُخریٰ'' ہے...... وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ: نماز قائم رکھو، وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ: زکوٰۃ دیتی رہو، وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ: اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرو۔ ان کی پابندی کیجئے، یہ اَحکام جو تمہیں دیے جا رہے ہیں تمہاری مصلحت کے لئے دیے جا رہے ہیں۔

''اہلِ بیت'' کا اَوّلین مصداق ''اَزواج'' اور پھر ''اولاد'' ہے

(اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ الخ) اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ ''نبی کے گھر والے''، جن کا اَوّلین مصداق ''اَزواجِ مطہرات'' ہیں، اور دوسرے نمبر پر مصداق آ گے'' آل اولاد'' ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ان کے اُوپر کوئی کسی قسم کی آلودگی نہ ہو، معصیت کی آلودگی ان پر نہ آئے، اور بالکل صاف ستھرے اخلاق کے حامل ہوں، اللہ تعالیٰ یہ اِرادہ کیے ہوئے ہیں، یہ اِرادہ شرعی ہے یعنی جس وقت تمہیں یہ احکام دیے جا رہے ہیں تو مقصود یہ ہے کہ تمہیں صاف ستھرا کیا جائے، تمہارے اُوپر کوئی کسی قسم کی معصیت کی

(۱) بخاری ۲/۷۰۷، کتاب التفسیر، سورۃ الأحزاب، باب قول اللہ: لا تدخلوا الخ. ۲/۷۸۸، باب خروج النساء لحوائجهن. مسلم ۲/۲۱۵، باب اباحة الخروج للنساء.

آلودگی نہ آئے۔ کُمْ کے ساتھ خطاب کردیا تاکہ ازواج سے آگے کچھ عام ہوجائے، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ نے ایک دفعہ اپنی چادر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو داخل کیا، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو داخل کیا، حسن وحسین رضی اللہ عنہما کو داخل کیا۔ داخل کرنے کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا: یا اللہ! یہ میرے اہلِ بیت ہیں، ان سے رِجس دُور کردے۔ یہ حدیث ''حدیثِ کساء'' کے ساتھ مشہور ہے۔ اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا وہاں موجود تھیں، وہ چادر میں داخل ہونے لگیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اَنْتِ عَلٰی خَیْرٍ'' ''تُو خیر پہ ہے۔''[1] یہ جواب دیا۔

اب یہی واقعہ ہے، جس سے شیعہ حضرات شور مچاتے ہیں کہ ''اہلِ بیت'' یہی ہیں جن کو حضور ﷺ نے چادر میں داخل کیا تھا، اور جن کو چادر میں داخل نہیں کیا وہ ''اہلِ بیت'' میں داخل نہیں ہیں۔ یہ بات غلط ہے۔ قرآنِ کریم سے صراحتاً تبادراً ثابت یہ ہوتا ہے کہ اصل مصداق ''اہلِ بیت'' کا اَزواجِ نبی ہیں۔ حدیث شریف سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ لوگ بھی شامل ہیں۔ تو اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا کو اس لئے داخل نہیں کیا، کہہ دیا ''تم تو خیر پر ہو'' کہ قرآنِ کریم میں صراحتاً تمہارا تذکرہ آگیا۔ اور یہ لوگ چونکہ قرآنِ کریم کے الفاظ میں تبادراً شامل نہیں ہیں، تو ایسی صورت میں ان کو چادر کے اندر لپیٹ کے دُعا کر کے شامل کردیا گیا، کہ جس طرح سے اَزواجِ مطہرات شامل ہیں، اسی طرح حضور ﷺ کی آل اولاد، داماد بھی شامل ہیں۔ تو اَحادیث میں کچھ تعمیم آگئی، قرآنِ کریم میں صراحتاً ''اہلِ بیت'' کا لفظ ''اَزواجِ مطہرات'' کے لیے استعمال ہوا ہے۔ تو کُمْ کے خطاب کی ایک توجیہ یہ بھی کی جاسکتی ہے، کہ تاکہ بیویوں سے کچھ آگے خاندان کی طرف یہ بات عام ہوجائے، جس میں آپ کے نواسے، آپ کا داماد یہ بھی شامل ہوں گے۔ ورنہ یہ نہیں کہ ''اہلِ بیت'' کا مصداق حضور ﷺ کی ''اَزواج'' نہیں ہیں۔ ''اہلِ بیت'' کا تو لفظی معنی ''گھر والے''، اور آپ بھی جانتے ہیں کہ عُرفاً ''گھر والی'' کسے کہا جاتا ہے! جس وقت گفتگو میں عام طور پر لفظ بولے جاتے ہیں کہ ''میری گھر والی یہاں نہیں ہے''، یا ''آپ کے گھر والے کہاں چلے گئے؟'' تو اس کا مصداق کون ہوتا ہے؟ ''بیوی'' ہی مراد لی جاتی ہے۔ تو ''اہلِ بیت'' کا معنی، ''بیت'' کہتے ہیں اس کوٹھے کو جس میں انسان رات گزارتا ہے، یہ تو آپ لغوی طور پر ہی جانتے ہیں۔ تو ''اہلِ بیت'' اصل کے اعتبار سے وہ ہوں گے جو حضور ﷺ کے ساتھ، یا کسی شخص کے ساتھ، رات کو کسی مکان میں رہتے ہیں۔ تو اَوّلین مصداق اس کا ''بیوی'' ہوتی ہے، اور باقی بعد میں ہیں۔ بہرحال حدیث کی روشنی میں دوسروں کو بھی ساتھ شامل کرلیا گیا۔ قرآنِ کریم میں یہ جو لفظ ہے، مابعد اور ماقبل کی طرف دیکھتے ہوئے اَوّلاً اس کا مصداق حضور ﷺ کی ''اَزواج'' ہیں۔

اَزواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے لئے مزید کچھ اَحکام

آگے پھر اَحکام دیے جارہے ہیں، صراحتاً بیویوں کو خطاب کر کے، وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ: یہ ان کا مشغلہ بتادیا کہ گھروں میں تم نے بیٹھ کے کیا کرنا ہے؟ اللہ کی آیات یاد کرو، حضور ﷺ کے اقوال اور آپ کے فرمان یاد کرو،

---

(۱) ترمذی ۱۵۶/۲، کتاب التفسیر، سورۃ الأحزاب۔ ۲۱۹/۲، باب مناقب اہل بیت۔ ۲۲۶/۲، باب ما جاء فی فضل فاطمة۔ مسند احمد، رقم ۱۶۹۸۸۔ نیز: ابن کثیر وغیرہ۔

ان پر عمل بھی کرو، اور ان کی اشاعت بھی کرو۔ چنانچہ حضور ﷺ کی داخلی زندگی کا جتنا علم ہے، اور جتنے واقعات ہیں، یہ آپ کا جو اُسوہ ہے، وہ بیویوں کی وساطت سے سامنے آیا ہے۔ وہی حکمت کا مصداق ہے۔ تو قرآن کریم کی آیات اور حضور ﷺ کے اقوال کو خوب یاد کرو، اور انہی کا تذکرہ کیا کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ باریک بین ہے خبر رکھنے والا ہے۔

اَجرِ عظیم کے مستحق مرد و عورت کی صفات

آگے عمومی طور پر سب عورتوں کا مردوں کے برابر ذکر کر دیا گیا، کہ ان صفات کی حامل جو عورتیں ہوں گی اور ان صفات کے حامل جو مرد ہوں گے، اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے اَجرِ عظیم تیار کیا ہے۔ پہلی صفت تو اِسلام والی ذکر کی گئی۔ ''اسلام'' بھی مطلقاً گردن بطاعت نہادن، کسی کی اطاعت میں گردن رکھ دینے کو کہتے ہیں۔ جو مرد اِسلام قبول کرنے والے ہیں، جو عورتیں اِسلام قبول کرنے والی ہیں۔ آگے ایمان والی صفت آ گئی، اس کے بعد قنوت والی صفت آ گئی، قنوت بھی مطلقاً اِطاعت کو کہتے ہیں۔ آگے صدق والی صفت آ گئی، صدق بھی عام ہوتا ہے، صدق فی القول، صدق فی الفعل، بات سچی کہی جائے جو واقع کے مطابق ہو، اور عمل سچائی کے مطابق کیا جائے، اور جس طرح سے زبان سے بات کہی جائے اسی کے مطابق کردار ہو، اس کو کہتے ہیں یہ ارادے کا سچا ہے، یہ فعل کا سچا ہے، یہ قول کا سچا ہے، تو صدق بھی عام ہے۔ اور صبر کا مفہوم کئی دفعہ ذکر کیا گیا، آگے صبر والی صفت آ گئی۔ خشوع: عاجزی اختیار کرنا، اللہ کے سامنے دَبنا، اسی کا اثر یہ ہوگا کہ بندوں کے سامنے بھی انسان تواضع سے پیش آئے گا۔ اور آگے صدقہ کرنے کا ذکر آ گیا، صدقہ کرنے والے مرد اور صدقہ کرنے والی عورتیں۔ اس کے بعد روزہ رکھنے کا ذکر آ گیا، روزہ رکھنے والے مرد روزہ رکھنے والی عورتیں۔ آگے عفت کا ذِکر آ گیا کہ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، مرد ہوں یا عورتیں، یعنی زِنا یا اس جیسی کوئی حرکت نہیں کرتیں، اپنی عفت کی حفاظت کرنے والی ہیں، عفیف ہیں، اپنی فرجوں کی حفاظت کرنے والے مرد، اور حفاظت کرنے والی عورتیں۔ اور آخر میں ایک صفت ذِکر کر دی گئی جو سب کے لئے جامع ہے، اللہ کو کثرت کے ساتھ یاد کرنے والے مرد اور کثرت سے یاد کرنے والی عورتیں، ذِکر اللہ کثرت کے ساتھ کرنے سے باقی سب صفات کا حاصل کرنا بھی آسان ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے بخشش تیار کی ہے اور اَجرِ عظیم تیار کیا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ
نہیں ہے کسی مؤمن مرد کے لئے اور نہ کسی مؤمنہ عورت کے لئے جس وقت فیصلہ کر دے اللہ اور اُس کا رسول کسی اَمر کا، یہ کہ ہو اُن کے لئے
الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۞ وَ
اختیار ان کے معاملے میں، اور جو کوئی نافرمانی کرے اللہ کی اور اُس کے رسول کی پس تحقیق وہ بھٹک گیا بھٹکنا بہت کھلم کھلا ۞ اور

إِذْ تَقُولُ لِلَّذِيٓ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ

جب آپ کہہ رہے تھے اس شخص کو جس پر اللہ نے اِنعام کیا اور جس پر آپ نے اِنعام کیا، کہ روک رکھ اپنے پاس اپنی بیوی کو

وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ أَحَقُّ أَنْ

اور اللہ سے ڈر، اور چھپاتے تھے آپ اپنے دِل میں وہ چیز جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا، اور آپ لوگوں سے اندیشہ کرتے تھے اور اللہ زیادہ حق رکھتا ہے

تَخْشَاهُ ۖ فَلَمَّا قَضَىٰ زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَاكَهَا لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ

اس بات کا کہ آپ اسی سے ڈریں، جس وقت زید نے اس کی طرف سے حاجت پوری کرلی، ہم نے اس عورت کا نکاح آپ سے کردیا تا کہ مؤمنین پر

حَرَجٌ فِيٓ أَزْوَاجِ أَدْعِيَآئِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۚ وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُولًا ﴿۳۷﴾

تنگی نہ رہے اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں، جس وقت وہ اَدعیاء ان سے اپنی حاجت پوری کرلیں، اور اللہ کا حکم ہو کے رہتا ہے ﴿۳۷﴾

مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهُ ۖ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا

نہیں ہے نبی پر کوئی حرج اس چیز میں جو اللہ نے اس کے لئے متعین کردی، یہی طریقہ ہے اللہ کا ان لوگوں کے بارے میں

مِنْ قَبْلُ ۚ وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا ﴿۳۸﴾ الَّذِينَ يُبَلِّغُونَ رِسَالَاتِ اللّٰهِ

جو اس سے پہلے گزرے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کا حکم ٹھہرایا ہوا ہے ﴿۳۸﴾ (وہ انبیاء) جو پہنچاتے ہیں اللہ کے پیغامات

وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللّٰهَ ۗ وَكَفَىٰ بِاللّٰهِ حَسِيبًا ﴿۳۹﴾ مَا كَانَ

اور اسی سے ڈرتے ہیں، اور نہیں ڈرتے کسی سے سوائے اللہ کے، اور اللہ تعالیٰ حساب لینے والا کافی ہے ﴿۳۹﴾ نہیں ہیں

مُحَمَّدٌ أَبَآ أَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِنْ رَّسُولَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ

محمد ﷺ تم مردوں میں سے کسی کے باپ، لیکن اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کے خاتم ہیں، اور اللہ تعالیٰ ہر

شَيْءٍ عَلِيمًا ﴿۴۰﴾ يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيرًا ﴿۴۱﴾ وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً

چیز کو جاننے والا ہے ﴿۴۰﴾ اے ایمان والو! یاد کیا کرو اللہ کو یاد کرنا بہت زیادہ ﴿۴۱﴾ اور اُسی کی تسبیح بیان کیا کرو صبح

وَأَصِيلًا ﴿۴۲﴾ هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَآئِكَتُهُ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى

شام ﴿۴۲﴾ وہ اللہ صلوٰۃ بھیجتا ہے تم پر اور اس کے فرشتے، تا کہ نکالے وہ اللہ تمہیں تاریکیوں سے

النُّوْرِ ؕ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ﴿۴۳﴾ تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ۖ وَاَعَدَّ لَهُمْ

نُور کی طرف، اور اللہ تعالیٰ مؤمنوں پر رحم کرنے والا ہے ﴿۴۳﴾ مؤمنوں کی دُعا جس دن کہ وہ اللہ سے ملیں گے سلام ہوگی، اور اللہ نے ان کے لئے اجر کریم

اَجْرًا كَرِيْمًا ﴿۴۴﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۴۵﴾ وَّدَاعِيًا

تیار کیا ہے ﴿۴۴﴾ اے نبی! بے شک بھیجا ہم نے آپ کو اس حال میں کہ آپ گواہ ہیں، بشارت دینے والے ہیں، ڈرانے والے ہیں ﴿۴۵﴾ اور بلانے والے ہیں

اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿۴۶﴾ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا ﴿۴۷﴾

اللہ کی طرف اللہ کے حکم سے، اور روشن چراغ ہیں ﴿۴۶﴾ اور مؤمنین کو بشارت دے دیجئے کہ ان کے لئے اللہ کی طرف سے بہت بڑا فضل ہے ﴿۴۷﴾

وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۴۸﴾

کافروں اور منافقوں کا کہنا نہ مانیے، اور چھوڑ دیں ان کے ستانے کو، اور اللہ پر بھروسا کیجئے، اللہ تعالیٰ کافی کارساز ہے ﴿۴۸﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ: نہیں ہے کسی مؤمن مَرد کے لئے اور نہ کسی مؤمنہ عورت کے لئے جس وقت فیصلہ کردے اللہ اور اس کا رسول کسی امر کا، یہ کہ ہو ان کے لیے اختیار ان کے معاملے میں۔ خِيَرَةٌ اختیار کے معنی میں ہے۔ مِنْ اَمْرِهِمْ کی ضمیر مؤمن و مؤمنہ کی جماعت کی طرف لوٹ گئی، یعنی مؤمنین کے لئے خواہ وہ مَرد ہو خواہ وہ عورت ہو، اختیار باقی نہیں رہتا اپنے کسی معاملے میں جس وقت کہ اللہ اور اللہ کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کردے۔ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ: اور جو کوئی نافرمانی کرے اللہ کی اور اس کے رسول کی، فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا: پس تحقیق وہ بھٹک گیا بھٹکنا بہت کھلم کھلا۔ وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْۤ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ: قابلِ ذِکر ہے وہ وقت جب آپ کہہ رہے تھے اس شخص کو جس کے اُوپر اللہ نے اِنعام کیا، وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ اور آپ نے اس پر اِنعام کیا اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ: روک رکھ اپنے پاس اپنی بیوی کو، وَاتَّقِ اللّٰهَ: اور اللہ سے ڈر، وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ: اور چھپاتے تھے آپ اپنے دِل میں وہ چیز جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا۔ مُبْدِيْ: اَبْدٰى يُبْدِيْ اِبْدَاء: ظاہر کرنا۔ وَتَخْشَى النَّاسَ: اور آپ لوگوں سے اندیشہ کرتے تھے، وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ: اور اللہ زیادہ حق رکھتا ہے اس بات کا کہ آپ اسی سے ڈریں، فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا: زیدٌ سے وہی ''زید بن حارثہ'' مُراد ہیں، اور وطر حاجت کو کہتے ہیں۔ ''قضائے وطر'' کا معنی ہوتا ہے اپنی حاجت پوری کرلی، یعنی کوئی تعلق نہ رکھا، جی بھر گیا۔ پس جس وقت زید نے اس سے اپنی حاجت پوری کرلی، یعنی اس سے لاتعلق ہوگئے، تعلق توڑلیا۔ اور حاجت پوری کرنے میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ طلاق ہونے کے بعد عدّت بھی گزر گئی، کیونکہ عدّت کے زمانے میں بھی خاوند کا کچھ نہ کچھ تعلق کسی نہ کسی نہج سے بیوی سے ہوتا ہے۔ جس وقت زید نے اس کی طرف سے حاجت پوری کرلی، یعنی اس سے لاتعلق ہوگئے، زَوَّجْنٰكَهَا: ہم نے اس عورت کا نکاح

آپ سے کردیا، لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ: تاکہ نہ ہو مومنوں کے اوپر کوئی تنگی فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ: اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں۔ اَدْعِيَاء، دَعِيٌّ کی جمع ہے، پہلے رکوع میں بھی یہ لفظ آیا تھا، وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ۔ تاکہ مومنین پر تنگی نہ رہے اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں، اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا: جس وقت کہ وہ ادعیاء ان سے اپنی حاجت پوری کرلیں، یعنی ان سے لاتعلق ہوجائیں۔ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا: اور اللہ کا حکم ہو کے رہتا ہے، اللہ کا حکم مفعول ہے، کیا ہوا ہے، یعنی اللہ کا حکم ہو کے رہتا ہے، اللہ کا حکم اس قابل ہے کہ اس کو کیا جائے۔ مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ: نہیں ہے نبی پر کوئی حرج، کوئی تنگی، فِيْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ: اس چیز میں جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے متعین کردی۔ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ: یہی طریقہ ہے اللہ تعالیٰ کا ان لوگوں کے بارے میں جو اس سے پہلے گزرے ہیں۔ اَلَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ سے پہلے انبیاء علیہم السلام مراد ہیں۔ سُنَّةَ اللّٰهِ یہ منصوب ہے فعل محذوف کی وجہ سے سَنَّ اللّٰهُ سُنَّةً یعنی پہلے انبیاء کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ نے یہی طریقہ جاری کیا ہے۔ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا: اور اللہ تعالیٰ کا حکم اندازہ کیا ہوا ہے، ٹھہرایا ہوا ہے۔ قدرًا مقدورًا کا معنی: اندازہ کیا ہوا۔ ہر وقت کے متعلق اللہ کا حکم اندازہ کیا ہوا ہے۔ کون سا حکم کس وقت واقع ہونے والا ہے۔ اَلَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ: یہ بات اَلَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ کے ساتھ لگتی ہے جس سے انبیاء علیہم السلام مراد ہیں۔ وہ انبیاء علیہم السلام جو پہنچاتے ہیں اللہ کا پیغامات۔ رِسٰلٰتٌ: رسالہ کی جمع ہے۔ جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں۔ وَيَخْشَوْنَهٗ: اور اسی سے ڈرتے ہیں، وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ: اور نہیں ڈرتے کسی سے سوائے اللہ کے، وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا: اور اللہ تعالیٰ حساب لینے والا کافی ہے۔ اور حَسِيْبًا کا معنی بعض روایات میں ناصر اور کفالت کرنے والا بھی ذکر کیا گیا ہے، اللہ مددگار کافی ہے، اللہ کفیل کافی ہے۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ: نہیں ہیں محمد ﷺ تم مردوں میں سے کسی کے باپ۔ رجال رجل کی جمع ہے، اور رجل بالغ لڑکے کو کہتے ہیں۔ تم مردوں میں سے کسی کا باپ نہیں، وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ: لیکن اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کے "خاتم" ہیں، یعنی نبیوں کے منتہا پر ہیں جن کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں۔ خاتم "ت" کے فتح کے ساتھ ہو یا "ت" کے کسرہ کے ساتھ ہو، دونوں کا معنی ایک ہی ہوتا ہے۔ سب سے پیچھے، آخر میں میں جو چیز ہوتی ہے اس کو "خاتم" کہتے ہیں۔ یہ جو مُہر لگائی جاتی ہے تو مُہر کو بھی "خاتم" اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کے ساتھ تحریر کو ختم کیا جاتا ہے، تحریر ختم ہوجاتی ہے تو اس کے بعد مُہر لگائی جاتی ہے۔ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا: اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ: اے ایمان والو! یاد کیا کرو اللہ کو یاد کرنا بہت زیادہ۔ وَسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا: اور اسی کی تسبیح بیان کیا کرو صبح وشام۔ اصیل: شام ہوگیا۔ بکرۃ: صبح ہوگیا۔ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ: وہ اللہ صلوٰۃ بھیجتا ہے تم پر اور اس کے فرشتے۔ صلوٰۃ: دُعا کو کہتے ہیں، یعنی فرشتے رحمت کی دُعا کرتے ہیں، اور اللہ براہِ راست رحمت بھیجتا ہے۔ "صلوٰۃ" کا لفظ مشترک طور پر دونوں کی طرف منسوب کیا گیا۔ وہ "صلوٰۃ" بھیجتا ہے تم پر اور اس کے فرشتے۔ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ: تاکہ نکالے وہ اللہ تمہیں تاریکیوں سے نُور کی طرف۔ کُفر کی تاریکیوں سے فسق وفجور کی تاریکیوں سے نُور کی طرف، ضلالت اور کُفر کی تاریکیوں سے نُورِ ایمان کی طرف لے آئے۔ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا: اور اللہ تعالیٰ مومنوں پر رحم کرنے والا ہے۔ تَحِيَّتُهُمْ: تحیہ: سلام کہنا، یہ اصل میں ہے تَحْيِيَة، کسی کو یوں کہنا: حَيَّاكَ اللّٰه، اللہ تعالیٰ آپ کو

زندہ رکھے، اور تَحِيَّتُهُمْ یہ مصدر کی اضافت مفعول کی طرف ہے۔ مؤمنوں کی دُعا جس دن کہ مؤمن اللہ سے ملیں گے سلام ہوگی، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو سلام بطور دُعا کے کہا جائے گا، بطور تحیہ کے۔ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا: اے نبی! بے شک ہم نے بھیجا آپ کو گواہ بنا کر اور مبشر بنا کر، اور نذیر بنا کر، یعنی اس حال میں کہ آپ گواہی دینے والے ہیں، بشارت دینے والے ہیں، ڈرانے والے ہیں۔ وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ: اور بلانے والے ہیں اللہ کی طرف اللہ کے حکم سے، وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا: اور اس حال میں کہ آپ روشن چراغ ہیں۔ سراج: چراغ۔ منیر: روشن۔ آپ روشن چراغ ہیں، نُور پھیلانے والے۔ اَنَارَ يُنِيْرُ: لازم بھی آتا ہے، متعدی بھی۔ نُور پھیلانے والا، نُورانی، روشن، دونوں معنی اس کے آسکتے ہیں۔ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا: اور مؤمنین کو بشارت دے دیجئے کہ ان کے لئے اللہ کی طرف سے بہت بڑا فضل ہے۔ وَ لَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ: کافروں اور منافقوں کا کہنا نہ مانئے، ان کی پروانہ کیجئے، لَا تُطِعْ اطاعت نہ کر کافروں کی اور منافقوں کی۔ وَ دَعْ اَذٰىهُمْ: اور ان کی تکلیف کو چھوڑ دے، یعنی ان کے تکلیف پہنچانے کی بھی پروانہ کر۔ چھوڑ دے ان کے ستانے کو، یعنی اگر وہ ستاتے بھی ہیں تو ان کی پرواہ نہ کیجئے۔ وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ: اور اللہ کے اُوپر بھروسا کیجئے۔ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا: اللہ تعالیٰ کافی کارساز ہے، کافی ہے اللہ از روئے کارساز ہونے کے۔

تفسیر

زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ

یہ آیات آپ کے سامنے جو پڑھی گئیں، ان کا تعلق ہے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کرنے، پھر طلاق ہوجانے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کرنے کے واقعات سے۔ یاد ہوگا! شروع سورت میں ذکر کیا گیا تھا، کہ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اصل کے اعتبار سے تو یہ معزّز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، یہ بنوکلب میں سے ہیں، اور کسی دشمن نے حملہ کیا تھا تو اس لُوٹ مار کے اندر یہ بھی پکڑے گئے اور غلام بنالیے گئے۔ پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے (حکیم بن حزام) انہیں خرید لائے تھے، اور یہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آگئے۔ جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا، تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دیے۔ خوبصورت بھی تھے، بہت صلاحیتوں والے تھے، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے ساتھ بہت محبت تھی، اور ان کو بہت شفقت کے ساتھ رکھا، اور اتنی شفقت فرمائی کہ یہ اپنے ماں باپ سے بھی زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مانوس ہوگئے، غلامی کے دور میں ہی۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ نے اپنی آزادی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن پر قربان کر دیا

بعد میں ان کے ماں باپ کو پتا چلا، خاندان قبیلے کو پتا چلا کہ ہمارا لڑکا مکہ معظمہ میں کسی کا غلام ہے، تو وہ لینے کے لئے

آئے، ان کا باپ، چچا اور بھائی آیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اختیار دے دیا زید کو، کہ اگر ان کے ساتھ جانا چاہتا ہے تو چلا جائے، اور اگر نہیں جانا چاہتا تو میں زبردستی نہیں بھیجتا۔ تو جب زید رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دے دیا کہ میں تو نہیں جاؤں گا، آپ ﷺ کو میں کسی صورت میں چھوڑ نہیں سکتا۔ یہ قربانی تھی زید کی، گویا کہ اپنے خاندان کو قربان کر رہا ہے، اپنی آزادی کو قربان کر رہا ہے، اور اپنے بہن بھائیوں کو قربان کر دیا، اور سرورِ کائنات ﷺ کے دامن کے ساتھ چمٹے رہنے کو انہوں نے ترجیح دے دی۔

حضور ﷺ کی زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ پر نوازشات

تو اس ایثار اور قربانی کے صلے میں حضور ﷺ نے بھی ان کو نوازا، کہ ان کے سامنے ان کو آزاد کیا، آزاد کرنے کے بعد ان کو اپنے لیے بیٹا قرار دے دیا۔ چنانچہ اس دن کے بعد لوگ ان کو ''زید بن حارثہ'' کی بجائے ''زید بن محمد'' کہنے لگ گئے۔ جب حضور ﷺ نے نبوت کا اظہار فرمایا، تو آپ جانتے ہیں کہ عورتوں میں سے سب سے پہلے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا ایمان لائی تھیں۔ اور چھوٹی عمر کے بچوں میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سب سے پہلے ایمان لائے تھے، اور یہ (حضرت علی رضی اللہ عنہ) بھی آپ ﷺ کی کفالت میں تھے، آپ کے پاس ہی رہا کرتے تھے۔ اور اسی طرح سے جو لوگ غلام کہلاتے تھے، موالی کہلاتے تھے، ان میں سے سب سے پہلے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ایمان لائے تھے، یہ بھی موالی میں سے شمار ہوتے تھے، کیونکہ پہلے غلام تھے بعد میں آزاد کیے گئے۔ اور بڑی عمر کے لوگوں میں سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سب سے پہلے ایمان لائے تھے۔ تو زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ یہ ''سابقین'' میں سے ہیں، سب سے پہلے ایمان لانے والے لوگوں میں سے۔ تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کے ساتھ ان کی اُنس اور محبت کس انداز کی تھی، تو آپ ﷺ نے ان کی ناز برداری کرتے ہوئے ہی اپنی پھوپھی زاد بہن زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا جو بنواَسد قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں، یعنی ان کی والدہ جو تھیں، اُمیمہ بنت عبدالمطلب وہ تو قریشی ہاشمی تھیں، لیکن زینب کے جو والد تھے ''جحش'' یہ بنواَسد میں سے تھے، اور وہ بھی قریشی ہیں، اگرچہ ہاشمی نہیں۔ تو یہ اس خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، جو مکہ معظمہ میں بہت شریف خاندان سمجھا جاتا تھا۔ تو آپ نے پیغام دیا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے نکاح کے لئے زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے بھائی عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو، انہوں نے اس بارے میں کچھ ہچکچاہٹ محسوس کی، کیونکہ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اگرچہ اب حضور ﷺ کی طرف نسبت رکھتے تھے، اور اصل کے اعتبار سے بنوکلب میں سے تھے، جو ایک اچھا معزز قبیلہ ہے، لیکن ان کے اُوپر غلامی کا داغ لگ چکا تھا، اور غلامی سے وہ آزاد ہوئے تھے، اس لئے انہوں نے زید رضی اللہ عنہ کو زینب رضی اللہ عنہا کے لئے کفو نہ سمجھا، اور سرورِ کائنات ﷺ کچھ مصلحت سمجھ رہے تھے کہ اگر ایسا ہو جائے تو بعض جاہلیت کی چیزوں کا خاتمہ ہو جائے گا کہ بلاوجہ کی نسب میں جو مفاخرت ہے اس میں کچھ کمی آجائے گی، کچھ اس میں شرعی مصلحتیں تھیں، اور زید کے ساتھ جو آپ ﷺ کا تعلق تھا، اس کی بنا پر آپ یہی چاہتے تھے کہ اس کا نکاح معزز شریف خاندان میں ہو۔ جب تک آپ نے بطور مشورے کے بات ذکر کی تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا اور ان کے بھائی اس بارے میں متردد رہے، لیکن جب آپ نے اصرار فرمایا اور ان کو پتا چل گیا کہ حضور ﷺ کی طرف سے یہ ایک حکم ہے، تو پھر انہوں نے اپنی رضا کا اظہار کر دیا۔

رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کے بعد مؤمن کو اِختیار نہیں رہتا!

جیسا کہ قرآنِ کریم کی یہاں پہلی آیت میں ذکر کیا گیا، مسلمانوں کے لئے ہدایت دی گئی، کہ اللہ اور اللہ کے رسول کے فیصلے کے بعد کسی شخص کو اپنے معاملے میں کوئی اختیار باقی نہیں رہتا، کیونکہ اللہ کے رسول کے بارے میں اسی سورت میں ذکر کیا گیا اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ: نبی کا اختیار لوگوں کے نفسوں پر ان کے اپنے مقابلے میں بھی زیادہ چلتا ہے۔ مؤمنین کو اپنے نفسوں پر اتنا اِختیار نہیں جتنا نبی کو اِختیار ہے، تو جس طرح انسان اپنے نفس پر اِختیار رکھتا ہے کہ کہاں نکاح کرے، کہاں نہ کرے؟ نبی کا حکم آجانے کے بعد یہ اس سے بالاتر اِختیار اِستعمال ہوگیا، تو اپنا اِختیار ختم ہوجائے گا۔

''مشورۂ نبوی'' کی حیثیت اور حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ

ہاں البتہ جب تک بطور مشورے کے بات کہی جائے اور حتمی حکم نہ ہو، تو پھر دوسرے کو اختلاف کرنے کی بھی گنجائش ہوتی ہے۔ واقعہ مشہور ہے کہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا جن کو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے خرید کے آزاد کیا تھا، یہ مغیث رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں اپنی غلامی کے زمانے میں، جس وقت یہ آزاد ہوگئیں تو حضور ﷺ نے ان کو اختیار دیا تھا کہ اب تُو چاہے اپنے پہلے خاوند کے پاس رہ، چاہے نہ رہ، جس کو ہم ''فقہ'' کی اِصطلاح میں ''خیارِ عتق'' کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں کہ اگر کوئی عورت باندی ہونے کے زمانے میں کسی کے نکاح میں ہو، بعد میں اگر وہ آزاد ہوجائے تو اس کو پہلا نکاح باقی رکھنے نہ رکھنے کا اختیار ہوتا ہے، اس کو ''خیارِ عتق'' کہتے ہیں۔ بریرہ رضی اللہ عنہا کو آپ ﷺ نے اِختیار دے دیا تو بریرۃ رضی اللہ عنہا نے اپنے آپ کو مغیث سے علیحدہ کرنے کا فیصلہ کرلیا، تو مغیث رضی اللہ عنہ کو چونکہ بریرہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ بہت محبت تھی، وہ اس کے پیچھے پیچھے گلیوں میں روتا پھرتا تھا، تو حضور ﷺ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے کہا کہ عباس! دیکھو، مغیث کو کتنی محبت ہے بریرہ کے ساتھ، اور بریرہ کو کتنا بغض ہے مغیث کے ساتھ۔ تو پھر آپ ﷺ نے بریرہ رضی اللہ عنہا کو کہا تھا کہ اے بریرہ! اچھی بات ہے کہ تُو اس کی طرف رُجوع کرلے۔ تو بریرہ رضی اللہ عنہا کہنے لگی کہ یا رسول اللہ! یہ حکم ہے یا مشورہ؟ آپ ﷺ نے فرمایا: مشورہ ہے! وہ کہنے لگی: مجھے کوئی ضرورت نہیں![1] اس سے فرق معلوم ہوگیا کہ جو چیز بطور مشورے کے کہی جائے، اس کا قبول کرنا نہ کرنا دوسرے کے اختیار میں ہوتا ہے۔ اور اگر حکم دے دیا جائے، تو پھر کوئی عذر باقی نہیں رہتا، پھر ویسا کرنا ہی پڑے گا۔ اور حضور ﷺ اگر بریرہ رضی اللہ عنہا کو حکم دے دیتے اور بریرہ رضی اللہ عنہا اس نکاح کو باقی رکھ لیتی، مغیث کی طرف ہی رُجوع کرلیتی، تو اس کا مطلب تھا کہ ''خیارِ عتق'' والا مسئلہ ختم ہوگیا، پھر وہ ''خیارِ عتق'' والا مسئلہ تو نہ رہتا۔ اس لئے حضور ﷺ نے مشورہ دیا کہ اچھی بات ہے کہ تُو اسی کی طرف ہی رُجوع کرلے، تو وہ کہنے لگی مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ اور آپ ﷺ نے اس پر کوئی انکار نہیں فرمایا، معلوم ہوگیا کہ مشورے سے تو اِختلاف کیا جاسکتا ہے، حکم سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا۔ اور بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس قسم کے واقعات آتے ہیں کہ جہاں حضور ﷺ ایک چیز کو بطور مشورے کے ذکر کرتے ہیں، تو دُوسرا آگے سے اختلاف کرسکتا ہے،

(۱) بخاری ۲/ ۷۹۵ بباب شفاعۃ النبی فی زوج بریرۃ۔ مشکوٰۃ ۲/ ۲۷۶ بباب المباشرۃ سے اگلا باب، فصل اول۔

اپنی رائے پیش کرسکتا ہے۔ اور کئی جگہ حضور ﷺ نے صحابہ ؓ کی رائے کو اپنی رائے کے مقابلے میں قبول فرمایا۔ مشورے کی حیثیت اور ہوتی ہے، حکم کی حیثیت اور ہوتی ہے۔ تو جب انہوں نے سمجھا کہ یہ تو حکم کے درجے میں بات ہے، تو انہوں نے تسلیم کرلیا اور آپ ﷺ نے نکاح کروادیا۔

سیّدہ زینب ؓ اور حضرت زید ؓ کی طبیعتوں میں کشاکشی

نکاح ہوجانے کے بعد زوجین کی آپس میں موافقت نہ ہوئی۔ حضرت زید ؓ اپنی جگہ ایک معزز خاندان کے تھے، حساس تھے، خوددار تھے، لیکن حضرت زینب ؓ کے ذہن کے اندر ایک برتری تھی زید ؓ کے مقابلے میں، تو آپس میں طبیعتوں میں کچھ کشاکشی سی رہتی تھی، بدمزگی سی رہتی تھی۔ اور ممکن ہے کہ منافق قسم کے لوگ حضرت زینب ؓ کو یہ طعن بھی دیتے ہوں، کہ یہ کیا ہوا؟ تُو اتنے معزز خاندان کی تھی، اور ایک آزاد شدہ غلام کے نکاح میں تُو چلی گئی، اس میں تو تیری توہین ہے۔ جس طرح سے عورتوں کی عادت ہوتی ہے، تو بعضے منافق قسم کے لوگ اس طرح سے زبان درازی کرتے ہوں۔ آخر زینب ؓ بھی انسان تھیں، تو ان باتوں سے متاثر ہوسکتی ہیں، کہ یہ نکاح میرے لئے معاشرے میں عزت کا باعث نہیں ہے، بلکہ لوگ میرے اُوپر یہ عیب لگاتے ہیں کہ میں ایک آزاد کردہ غلام کے نکاح میں چلی گئی۔ تو طبیعتوں میں کچھ بُعد رہا، مزاج میں موافقت نہ ہوئی۔ تو حضرت زید ؓ بار بار حضور ﷺ کے سامنے آتے تھے اور حضرت زینب ؓ کی اسی ناموافقت کی شکایت کرتے تھے۔ تو زینب ؓ کو بھی تنگی تھی، زید ؓ بھی اپنے آپ کو تنگی میں محسوس کرتے تھے، لیکن حضور ﷺ بار بار یہ سمجھاتے تھے کہ اللہ سے ڈرو، ایک دوسرے کے حقوق ادا کرو، اور اپنی بیوی کو روک کے رکھو، اس کو طلاق نہ دینا۔

سیّدہ زینب ؓ کے متعلق حضور ﷺ کے سامنے مصلحتیں

لیکن حالات کچھ اس انداز کے ہوگئے کہ حضور ﷺ کو اندازہ ہوگیا کہ اب ان کی نبھے گی نہیں، جب نبھے گی نہیں تو پھر حضور ﷺ کے دل میں خیال آیا کہ ایک تو یہ نکاح ہوا حضور ﷺ کے حکم کے تحت تھا، ان لوگوں کی ناپسندیدگی کے باوجود، کہ پہلے وہ پسند نہیں کرتے تھے لیکن حضور ﷺ نے کہہ کے نکاح کروایا۔ اور پھر زینب ؓ تھی بھی اپنی، پھوپھی زاد بہن، اور پھر یہ زینب ؓ کی بھی حیثیت عرفی کو بھی نقصان پہنچتا طلاق ہوجانے کی صورت میں، لوگ اور زبان درازی کرتے، کہ لو! پہلے تو ایک آزاد کردہ غلام کے ساتھ نکاح ہوا تھا، اور اب اس کو یوں کہیں گے کہ یہ غلام کی مطلقہ ہے، تو اس کی حیثیت کو اور بھی زیادہ نقصان پہنچے گا، تو یہ ایک چیز درمیان میں آگئی۔ تو حضور ﷺ کا خیال یہ تھا کہ اگر ایسی نوبت آگئی، اور زید کا نباہ اس کے ساتھ نہ ہوا، اور طلاق تک نوبت پہنچ گئی تو میں زینب سے نکاح کرلوں گا، زینب کی دلجوئی اسی صورت میں ہوسکتی ہے، اور لوگوں کے دل میں جو زینب کی بے قدری ہوگی کہ اس کو مطلقہ قرار دیں گے، اور غلام کی مطلقہ قرار دیں گے، اور معاشرے کے اندر اس کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جائے گا، تو جب وہ میرے نکاح میں آجائے گی تو اس کی حیثیت بحال ہوجائے گی۔ اس قسم کی مصلحتیں حضور ﷺ کے سامنے تھیں۔

''نکاحِ زینب'' سے قبل حضور ﷺ کے دِل میں خدشات

تو دل میں خیال تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اندیشہ بھی تھا کہ جاہلیت میں بہت پکی رسم یہ چلی آ رہی تھی کہ ''منہ بولے بیٹے'' کو ایسے ہی سمجھتے تھے جیسے ''حقیقی بیٹا'' ہوتا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ حقیقی بیٹے کی بیوی حرام ہوتی ہے، اس سے نکاح نہیں ہوسکتا، اور جاہلیت میں دستور یہی چلا آ رہا تھا۔ تو آپ کو اندیشہ یہ ہوا کہ اگر میں نے یہ نکاح کر لیا تو یکدم یہ پروپیگنڈا ہو جائے گا کہ لوجی! اپنے منہ بولے بیٹے کی بیوی کے ساتھ نکاح کر لیا۔ اب اگرچہ یہ بات واضح کر دی گئی کہ یہ نسبت ٹھیک نہیں ہے، نسبت باپ کی طرف ہونی چاہیے، جیسے ابتدا میں یہ آیتیں آئیں۔ اور یہ خلافِ فطرت چیز ہے کہ کسی دوسرے خاندان کے بچے کو صرف منہ سے کہنے کی بنا پر اس خاندان میں شامل کر لیا جائے، وارث قرار دے دیں اور محرمات کا سلسلہ اسی اُصول سے ہو جائے۔ جیسے اِبتدائے سورت میں آپ کے سامنے ذِکر کیا گیا تھا۔ یہ بات کتنی شرعی مصلحتوں کے خلاف تھی، اور دِینِ فطرت اس خلافِ فطرت حرکت کو برداشت نہیں کرسکتا، اس کو ختم کرنا تھا، لیکن جب ایک بات معاشرے کے اندر اتنے پختہ طریقے سے رائج ہوئی ہوئی ہوتو اس کا یکدم بدلنا مشکل ہوتا ہے، تو یہ پروپیگنڈا، یہ شور، یہ شورش جو یکدم برپا ہوگی کہ لوجی! بیٹے کی بیوی سے نکاح کر لیا۔ تو اس قسم کے حالات سے آپ کی طبیعت میں خطرہ بھی آتا تھا، کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ دِینی مصلحت کے خلاف بات ہو جائے، یا کوئی نقصان واقع ہو جائے، یہ آپ کو اندیشہ بھی تھا لوگوں کے پروپیگنڈے سے، یہ دل کی ایک کیفیت تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں ادا کیا، کہ آپ دل میں ایک بات چھپاتے تھے، جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا۔

دِینی مسئلے میں خارجی مصلحت کی رعایت کب رکھی جائے؟

تو اللہ تعالیٰ نے پھر بعد میں جو حکم بھیجا، وہ اس لئے بھیجا کہ اس میں دِینی مصلحت زیادہ ہے، لوگوں کے پروپیگنڈے کا خیال نہیں کرنا چاہیے۔ کسی دِینی مسئلے میں اِقدام کرتے وقت خارجی مصلحت کی رعایت کرنا، اس کے لئے واقعات مختلف ہیں حدیث شریف میں، کہیں یہ ہے کہ مصلحت کی رعایت رکھتے ہوئے ایک دِینی ضرورت کو چھوڑ دیا گیا، اور کہیں یہ ہے کہ اس مصلحت کی رعایت نہیں کی گئی، بلکہ اس دِینی کام کو کر لیا گیا۔ یہ دو باتیں واقعات کے تحت حدیث شریف میں آتی ہیں...... تو اصل فیصلہ اس میں یہ ہے کہ اگر تو وہ دِینی ضرورت اہم ہو جس کے ساتھ کوئی حلال حرام کا تعلق ہے، اگر وہ کام نہ کیا گیا تو لوگوں کے درمیان حرام حلال خلط ہو کے رہ جائے گا، ایسی صورت میں تو لوگوں کے پروپیگنڈے کی پروا نہیں کی جاتی، وہ کام کر لیا جاتا ہے۔ جیسا کہ یہاں حضور ﷺ کے ساتھ زینب ؓ کا نکاح جو ہوگا، تو اس کے ساتھ اصل حیثیت واضح ہو جائے گی کہ منہ بولا بیٹا بیٹا نہیں ہوتا، اس کے ساتھ تعلق محرمات کا نہیں ہے، وہ وارث نہیں ہوتا، یہ تو بہت سارے حلال اور حرام کو واضح کرنے کا مسئلہ ہے، اور یہ ایک خلافِ فطرت بات ہے کہ کسی اور کے بچے کو اُٹھا کے اپنے خاندان میں شامل کر لیا جائے۔ یہاں تو لوگوں کے پروپیگنڈے کی پروا نہیں کی گئی، بلکہ اللہ کی طرف سے تاکید آ گئی کہ کوئی اندیشہ نہ کرو، انبیاء ﷩ دِین کی بات ظاہر کرنے سے کسی سے نہیں ڈرا کرتے، صرف اللہ سے ڈرتے ہیں، جو حکم آ جائے اس کو واضح طور پر بیان کرنا چاہیے۔ قولاً کہنے کا حکم ہے تو قولاً کہو، فعلاً کرنے کا حکم ہے، تو

فعلاً کریں، تاکہ لوگوں کے سامنے دِین صاف ستھرا ہو کے آ جائے، اور کوئی کسی قسم کا خفا نہ رہے۔ انبیاء ﷺ کی تاریخ کا حوالہ دے دیا کہ وہ لوگوں کے پروپیگنڈے کی پرواہ نہیں کیا کرتے، حق کے ظاہر کرنے میں ان کے سامنے کتنے ہی روڑے اٹکائے جائیں، وہ ہر روڑے کو کیا، چٹانوں کو بھی توڑتے ہوئے راستے کو صاف کرتے ہیں، یہاں تو یہ تاکید آ گئی...... اور دوسرا واقعہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہ ؓ کے سامنے ذکر کیا، کہ یہ بیت اللہ کی عمارت جو مشرکین کے زمانے کی بنی ہوئی ہے، یہ صحیح نہیں ہے۔ انہوں نے ابراہیمی بنیادوں کے اُوپر یہ عمارت نہیں بنائی، بلکہ ابراہیمی بنیاد لمبی تھی، اور اس میں دو دروازے تھے، ایک طرف سے داخل ہونے کا اور دوسری طرف سے نکلنے کا، زمین کے برابر ہموار تھے، اور ان مشرکین نے کچھ حصہ چھوڑ دیا، یہ جو آپ نقشوں میں دیکھا کرتے ہیں، ''حطیم'' جسے کہتے ہیں، جس کے اُوپر سے طواف کیا جاتا ہے، ایک دائرہ سا بنا ہوا ہوتا ہے دِیوار کا، فوٹوؤں میں آپ نے دیکھا ہوگا، اس ''حطیم'' کے حصے کے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ بیت اللہ کا حصہ ہے،[1] لیکن مشرکین نے اس کو باہر نکال دیا، اور دروازہ بھی اُونچا رکھ دیا، اور ایک ہی رکھا تا کہ ہر کوئی اندر نہ جا سکے، جس کو یہ اجازت دیں وہی اندر جائے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ عمارت صحیح نہیں ہے جو مشرکین نے بنائی، یہ بنائے ابراہیمی پر نہیں ہے، یہ دو کونے تو بنائے ابراہیمی پر ہیں، ایک حجرِ اَسود والا اور ایک اس کا بالمقابل، یہ دوسرے دو کونے بنائے ابراہیمی پر نہیں ہیں۔ اور پھر ساتھ ہی یہ فرمایا کہ تیری قوم نئی نئی مسلمان ہوئی ہے، ان نومسلموں کا مجھے اندیشہ ہے کہ اگر میں نے بیت اللہ کو گرایا، تو یہ فتنے میں نہ پڑ جائیں، ورنہ میں اس کو ڈھا کر ابراہیمی بنیادوں کے اُوپر اُستوار کر دیتا۔ بخاری شریف میں روایت ہے۔[2] اب یہاں حضور ﷺ نے لوگوں کی مصلحت کی رعایت رکھی کہ میں اگر ایسا اقدام کروں، تو کہیں ایسا نہ ہو کہ نومسلم بدک جائیں کہ دیکھو جی! یہ اچھے نبی آئے ہیں کہ انہوں نے بیت اللہ کو ڈھانا شروع کر دیا، تو لوگوں کے دلوں میں وسوسے آئیں گے، اور خواہ مخواہ ایک بدظنی پیدا ہو جائے گی۔ تو یہاں ان کی رعایت رکھی اور آپ نے بیت اللہ کی عمارت کو نہیں گرایا۔ کیونکہ بیت اللہ کی عمارت چھوٹی ہو یا بڑی ہو، اس سے کسی خاص مسئلے کے اُوپر اثر نہیں پڑتا، کوئی حلال حرام خلط ملط نہیں ہوتا۔ بیت اللہ تو، اگر سرے سے پتھر نہ بھی لگے ہوتے، تو بھی وہ جگہ قبلہ ہے، چنانچہ اگر کسی وقت وہ عمارت خدانخواستہ گر جائے تو بھی ہم ادھر منہ کر کے نماز پڑھیں گے، عمارت کا ہونا نہ ہونا اس مسئلے میں برابر ہے، تو یہاں چونکہ ایسی کوئی اہم ضرورت نہیں تھی، تو آپ نے لوگوں کی مصلحت کی رعایت رکھی اور بیت اللہ کی عمارت کو نہیں ڈھایا۔ لیکن یہ ''مُتَبَنّٰی'' والا مسئلہ جو تھا، اس سے تو بہت حلال اور حرام آپس میں خلط ملط ہوتے تھے، تو یہاں لوگوں کے پروپیگنڈے کی رعایت نہیں رکھی گئی، بلکہ اللہ کی طرف سے حکم آ گیا کہ ایسے کر گزرو۔

''زَوَّجْنٰکَهَا'' کے دو مفہوم

چنانچہ جب حضرت زید ؓ نے طلاق دے دی اور عدّت گزر گئی، تو اللہ کی طرف سے اطلاع آ گئی کہ ہم نے اس کا نکاح

(۱) ترمذی ۱/ ۱۷۷ باب ما جاء فی الصلاۃ فی الحجر۔ ولفظہ: فَاِنَّمَا هُوَ قِطْعَةٌ مِّنَ الْبَيْتِ وَلٰكِنَّ قَوْمَكِ اسْتَقْصَرُوْهُ حِيْنَ بَنَوُا الْكَعْبَةَ فَاَخْرَجُوْهُ مِنَ الْبَيْتِ.

(۲) بخاری ۱/ ۲۴ باب من ترک بعض الاختیار ۔ ۱/ ۲۱۵ باب فضل مکۃ وبنیانہا

آپ کے ساتھ کردیا۔ زَوَّجْنٰكَهَا کا لفظ جو آئے گا کہ ہم نے اس کا نکاح آپ کے ساتھ کردیا۔ اس لفظ کی مراد میں مفسرین کی دونوں رائے ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دے دیا کہ ہماری طرف سے نکاح ہوگیا آپ بھی ظاہری طور پر کرلیں، جس طریقے سے شریعت میں ہوا کرتا ہے، یعنی ایجاب وقبول ہو۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ظاہری طور پر حضور ﷺ نے اسی طرح سے ایجاب وقبول کے طور پر نکاح کیا۔ اور دوسری رائے یہ ہے کہ جب اللہ کی طرف سے نکاح کی اطلاع آگئی کہ ہم نے نکاح کردیا تو دُنیا میں نکاح پڑھنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، حضور ﷺ نے زینب رضی اللہ عنہا کو اپنے گھر بلالیا، اس لئے حضرت زینب رضی اللہ عنہا فخر کیا کرتی تھیں باقی ازواج کے ساتھ، کہ تمہارے نکاح تمہارے ماں باپ نے، بہن بھائیوں نے کیے ہیں، اور میرا نکاح اللہ تعالیٰ نے عرش پہ کیا ہے۔[1] لیکن راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ زَوَّجْنٰكَهَا سے اللہ تعالیٰ نے فیصلے کی اطلاع دی ہے، اور آپ ﷺ نے ظاہری طور پر اسی طرح سے ایجاب وقبول کیا، مہر ادا کیا، جس طرح سے عام طور پر نکاح ہوا کرتا ہے۔ بہر حال لوگوں کا پروپیگنڈا ہوا، لیکن اس کو ان آیات کے ذریعے سے صاف کردیا گیا، کہ ادعیا یعنی منہ بولے بیٹے حقیقی بیٹے نہیں ہوتے، یہ غیر محرم ہیں، اور ان کی بیویاں اسی طرح سے حلال ہیں جس طرح سے کسی پرائے لڑکے کی بیوی کے ساتھ نکاح کیا جاسکتا ہے، طلاق وغیرہ ہوجانے کے بعد۔ منہ بولے بیٹے اپنے بیٹے کے حکم میں نہیں ہیں۔

''آیتِ ختمِ نبوّت'' کا ماقبل کے ساتھ ربط

تو یہ آیات جو آپ کے سامنے پڑھی گئیں، پہلے ان کے اندر یہ واقعہ اور اَحکام ذکر کئے ہیں۔ اور آخر میں فیصلے کے طور پر پھر ایک بات ذکر کردی کہ حضور ﷺ زید رضی اللہ عنہ کے باپ نہیں ہیں، بلکہ تم میں سے کسی مرد کے بھی باپ نہیں ہیں۔ کیونکہ آپ کے لڑکے جو ہوئے تھے حضرت قاسم رضی اللہ عنہ ہیں، طیب رضی اللہ عنہ ہیں، طاہر رضی اللہ عنہ ہیں، عبداللہ رضی اللہ عنہ ہیں، یہ چار نام آتے ہیں آپ کے بیٹوں کے، اور ایک ابراہیم رضی اللہ عنہ جو ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے تھے۔ اور پہلے بچے سارے کے سارے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے تھے، ان میں سے کوئی بھی بلوغ کی عمر کو نہیں پہنچا۔ ''قاسم'' یقینی ایک بچے ہیں، ''طاہر، طیب، عبداللہ'' کے بارے میں روایات مختلف ہیں، کہ ''طاہر، طیب'' ایک کا ہی نام تھا، اور ''عبداللہ'' بھی اسے کہتے تھے، یا یہ مختلف بچے ہیں، بہر حال بچوں کے بارے میں تعداد مختلف ہے کہ تین یا چار یا پانچ تھے۔[2] ''ابراہیم'' بھی یقینی ہیں جو حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا قبطیہ کے بطن سے ہوئے، ''قاسم'' بھی یقینی ہیں جن کی بنا پر آپ کی کنیت ''ابوالقاسم'' ہوئی۔ اور ''طیب، طاہر، عبداللہ'' یہ علیحدہ ہیں یا ایک ہی بچے کے لئے مختلف نام استعمال ہوتے تھے، تو بچے آپ کے تین تھے یا چار، لیکن جو بھی ہوئے بہر حال وہ بچپن میں چھوٹی عمر کے اندر ہی فوت ہوگئے، ان میں سے بلوغ کی عمر کو کوئی نہیں پہنچا...... اور یہ کہہ دیا گیا کہ حضور ﷺ حقیقی باپ تو تم میں سے کسی کے نہیں، البتہ رُوحانی باپ سب کے ہیں۔ جس طرح وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ بیویوں کو مائیں قرار دے دیا گیا، کہ نبی کی بیویاں ایمان والوں کی مائیں ہیں، اس لئے ہم ان کو

---

(۱) بخاری ۲/۱۱۰۴، باب وکان عرشه علی الماء ولفظه: فَكَانَتْ زَيْنَبُ تَفْخَرُ عَلَى أَزْوَاجِ النَّبِيِّ ﷺ تَقُولُ زَوَّجَكُنَّ أَهَالِيكُنَّ وَزَوَّجَنِي اللهُ مِنْ فَوْقِ سَبْعِ سَمَوَاتٍ.

(۲) ''سیرت مصطفیٰ'' ۳/۳۳۶ پر ہے کہ: جمہور کے نزدیک کل صاحبزادے تین تھے: قاسم، عبداللہ، ابراہیم۔ اور ''قاسم'' اور ''عبداللہ'' کا دوسرا نام ''طیب'' اور ''طاہر'' تھا۔

"اُمّ المؤمنین" کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں۔ رُوحانی اُبوّت کو ذکر کرتے ہوئے آپ کا رسول اللہ ہونا اور نبی ہونا ذکر کر دیا گیا۔ اور نبی بھی اس شان کے کہ آپ پر نبوّت ختم کردی گئی، کہ اس کے بعد دُوسرا کوئی نبی آنے والا نہیں، قیامت تک کے لئے نبوّت کا دروازہ بند ہو گیا۔ "خاتم النّبیین" کے لفظ کے اندر یہ بات ظاہر کردی گئی کہ اللہ کے رسول ہیں، نبی ہیں، اپنی اُمّت کے لئے رُوحانی باپ ہیں، اور اعلیٰ درجے کے کہ آپ کے بعد دُوسرا کوئی نبی آنے والا نہیں۔ تو "خاتم النّبیین" کا لفظ بھی اس آیت کے اندر صراحتاً آ گیا۔ اُس (ماکان محمد... الخ) آیت کا ماقبل کے ساتھ یہ تعلق ہے کہ یہ نفی کردی گئی کہ صرف زید ہی نہیں، تم میں سے کسی مرد کے ساتھ بھی حضور ﷺ کا تعلق اُبوّت کا نہیں ہے۔ ہاں! البتہ رُوحانی اُبوّت ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور رسول بھی اعلیٰ درجے کے، اور سب رسولوں کے اور نبیوں کے خاتمے پر۔

"نہیں ہے کسی مؤمن مرد کے لئے، نہ کسی مؤمن عورت کے لئے، جب اللہ اور اس کا رسول کسی امر کا فیصلہ کر دے، کہ ان کے لئے اختیار باقی رہے اپنے معاملے سے۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے، وہ بہت صریح طور پر بھٹک گیا۔ قابلِ ذکر ہے وہ وقت جب آپ کہہ رہے تھے اس شخص کو جس کے اُوپر اللہ نے انعام کیا، اور آپ ﷺ نے بھی اس پہ انعام کیا۔"

حضرت زید رضی اللہ عنہ اللہ اور رسول کے منظورِ نظر

اس میں حضرت زید رضی اللہ عنہ کے متعلق جو منافقین نے اور دوسروں نے غلام یا آزاد کردہ غلام کہہ کے ان کی حیثیت کو نقصان پہنچانا چاہا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں ان کی حیثیت بھی بحال کردی، کہ زید کوئی معمولی آدمی نہیں، بلکہ اللہ اور اللہ کے رسول کا منظورِ نظر ہے، اللہ نے بھی اس کے اُوپر اِنعام کیا، اور اللہ کے رسول نے بھی ان کے اُوپر اِنعام کیا۔ چنانچہ حضور ﷺ نے بہت روایات میں زید رضی اللہ عنہ کے متعلق بہت محبت کا اظہار کیا۔ ان کے بیٹے اُسامہ رضی اللہ عنہ وہ تو "حِبُّ رسولِ الله" کے نام سے مشہور تھے، رسول اللہ کے محبوب۔ اور بہت ساری جنگی مہموں میں حضرت زید رضی اللہ عنہ کو امیر بنا کے بھیجا گیا، اور ایک دفعہ اپنی عدم موجودگی میں مدینہ منورہ کا بھی ان کو اَمیر بنایا، اور مختلف مواقع میں ان کو "اَحبّ الناس" اپنے لیے قرار دیا، کہ سب لوگوں سے میرے لئے زیادہ محبوب ہے۔[1] یہ محبت کا اظہار کر کے، تعلق کا اظہار کر کے، ان کی حیثیت کو اُونچا کیا۔ اور یہاں اللہ تعالیٰ نے بھی ان کی حیثیت کو اُونچا کیا۔ یہ تو اللہ کی طرف سے بھی اِنعام یافتہ ہیں، اور اللہ کے رسول کی طرف سے بھی اِنعام یافتہ ہیں۔ اللہ اور اللہ کے رسول کے منظورِ نظر ہیں...... اللہ کا اِنعام کس طرح؟ ویسے تو اللہ کے اِنعامات سب اِنسانوں پر ہی ہیں، لیکن بعض پر خصوصیت سے ہوتے ہیں۔ اب خیال کیجئے! کہ جس طرح سے حضرت یوسف علیہ السلام پہ اللہ تعالیٰ نے اِنعام کیا، کہ ظاہری طور پر وہ بھائیوں کے ہاتھ آئے، بھائیوں نے ان کو گھر سے ایک قسم کا نکالا، اپنے باپ کو بہکا کر لے گئے، سختیاں کیں، کنویں میں ڈال دیا، غلام بنا کے بیچ دیا، لیکن یہی ذریعہ بنا حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے حکومتِ مصر تک پہنچنے کا، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو وہ شان دی جس کا ذکر آپ کے سامنے سورۂ یوسف میں آ چکا، بظاہر یہ سختیاں تھیں لیکن حقیقت کے اعتبار سے ترقی کی سیڑھیاں تھیں۔ بالکل اسی طرح سے کہاں بنوکلب کا

---

(۱) قرطبی۔ سورۃ الأحزاب، آیت ۵۷ کے تحت۔

قبیلہ، اور کہاں حضور ﷺ کی ذات۔ اگر یہ اپنے قبیلے میں ہی رہتے، اور لوٹ مار میں پکڑے نہ جاتے، غلام نہ بنائے جاتے، اور بازاروں کے اندر نہ بکتے، تو یہ رسول اللہ ﷺ کے دامن کے ساتھ وابستہ کس طرح سے ہوتے، اور حضور ﷺ کے اہلِ بیت میں یہ کس طرح سے شامل ہوتے؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ انعام فرمایا کہ اس راستے سے ان کو حضور ﷺ تک پہنچایا، اور پہنچانے کے بعد ان کو ایمان کی توفیق دے دی...... اور حضور ﷺ کا انعام تو واضح ہی ہے، آپ کی شفقتیں اور آپ کی مہربانیاں، کہ پالا بچوں کی طرح، شادی کی اپنے بیٹوں کی طرح، گھر کے اندر رکھا، آزاد کیا، یہ سارے کے سارے حضور ﷺ کے انعامات ہیں...... ان کو ذکر کر کے حضرت زید رضی اللہ عنہ کی حیثیت کو بحال کیا جا رہا ہے، جس طرح سے حضور ﷺ نے زینب رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کر کے زینب رضی اللہ عنہا کی حیثیت کو بحال کیا۔

تو یہ منظورِ نظر ہیں اللہ اور اللہ کے رسول کے، ”آپ انہیں کہہ رہے تھے کہ اپنی بیوی کو روک کے رکھ“، یعنی طلاق نہ دے۔ ”اللہ سے ڈر!“ اور موافقت کرنے کی کوشش کر، ایک دوسرے کے حقوق کو ادا کرو۔ ”اور دِل میں آپ ایک ایسی بات چھپاتے تھے جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا۔“ ظاہر کرنے والا اسی بات کو جیسے آگے آ گیا کہ ”نکاح کر دیا“ دِل میں آپ ﷺ اسی بات کو چھپائے ہوئے تھے، اور لوگوں سے اندیشہ یہی تھا کہ یہ پروپیگنڈا کہیں پھر دِینی مصلحت کے خلاف نہ کوئی بات ہو جائے، اگر ایسا اقدام ہو جائے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی فتنے کی صورت پیدا ہو جائے، اور دِین کے لئے کوئی نقصان دہ بات ہو، یہی اندیشہ تھا۔ ”اللہ زیادہ حق رکھتا ہے اس بات کا کہ اس سے اندیشہ کیا جائے“ لہٰذا ان مصلحتوں کو چھوڑ دو، اور یہ جو نکاح کی خبر آپ کو دی جارہی ہے، اس نکاح کو اپنا لیجئے۔ ”پس جس وقت زید نے اس سے اپنی حاجت پوری کر لی“ یعنی لاتعلق ہو گئے، کوئی حاجت اور تعلق اس کے ساتھ نہ رہا، عدت بھی گزر گئی، ”ہم نے اس عورت کا نکاح آپ سے کر دیا۔“

”قرآن“ میں نام صرف ایک صحابی کا ہے

دیکھو! زید رضی اللہ عنہ پر اللہ تعالیٰ کا کیسا کرم ہے کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت میں سے نام صرف زید رضی اللہ عنہ کا ہی قرآنِ کریم میں آیا ہے، کسی اور صحابی کا نام قرآنِ کریم میں نہیں ہے۔ یہ بھی ایک شرف ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کو دیا۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نام نہیں، عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا نہیں، عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا نہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نہیں، کسی کا نہیں۔ نام کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ذِکر کیا ہے تو صرف اس زید رضی اللہ عنہ کو کیا ہے۔ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا، اس کے علاوہ کسی صحابی کا نام قرآنِ کریم میں نہیں آیا۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ان کے اُوپر بہت بڑا انعام اور بہت بڑا شرف ہے، ان کے نام کو قرآنِ کریم کا جزء بنا لیا گیا۔

ہم نے اس کا نکاح کر دیا، تاکہ یہ مسئلہ واضح ہو جائے کہ منہ بولے بیٹے کی بیوی سے نکاح ہو سکتا ہے جس وقت کہ وہ منہ بولا بیٹا اس کو طلاق دے دے، اور اس کی عدّت گزر جائے، یعنی اس کی بیوی محارِم میں شامل نہیں ہے، محرمات میں شامل نہیں ہے، بلکہ محلّلات میں شامل ہیں، دیکھو! کتنا بڑا مسئلہ ہے جس کو واضح کرنا مقصود ہے ”تاکہ لوگوں پر حرج باقی نہ رہے اپنے منہ بولے

بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں جبکہ وہ ان سے حاجت پوری کرلیں، اور اللہ تعالیٰ کا اَمر ہو کے رہتا ہے" وَكَانَ أَمْرُ اللهِ مَفْعُولًا: یعنی اللہ کا جو حکم بھی ہے وہ کیا جاتا ہے، وہ فعل کے درجے میں آتا ہے، واقع ہو کے رہتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام اللہ کا حکم بجالانے میں کسی کی پروانہیں کرتے

اورنہیں ہے نبی پر کوئی حرج اس چیز میں جو اللہ نے اس کے لئے متعین کردی۔ اللہ نے جو اس کے لیے متعین کردی اس کے کرنے میں نبی پر بھی کوئی حرج نہیں، وہ کرنی چاہیے، یہی طریقہ رہا ہے اللہ تعالیٰ کا پہلے انبیاء کے بارے میں، اور اللہ تعالیٰ کے امر کا اندازہ کیا ہوا ہے ہر وقت کے ساتھ، اللہ تعالیٰ کا اَمر مقدر ہے ٹھہرایا ہوا ہے، اندازہ کیا ہوا ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام کی شان یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اَحکامات کو پہنچاتے ہیں تبلیغ کرتے ہیں۔ اگر قولاً تبلیغ ہے تو قولاً کرتے ہیں، فعلاً ضروری ہو تو فعلاً کرتے ہیں، اور کسی کا اندیشہ نہیں کیا کرتے سوائے اللہ کے، اللہ سے ہی ڈرتے ہیں اور اللہ کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرا کرتے۔ دِین کے معاملات میں تمام انبیاء علیہم السلام کی تاریخ اس بات کے اوپر شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم پہنچانے میں وہ کسی کی پروانہیں کیا کرتے، جو اللہ کی طرف سے حکم آجائے اس کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ہی حسیب کافی ہے۔ محاسب: حساب لینے والا کافی ہے، یا ناصر اور مددگار کافی ہے۔

"عقیدۂ ختمِ نبوّت" کی اہمیت اور دلائل

آگے وہ بات اُصولی درجے میں واضح کردی گئی کہ ایک زید رضی اللہ عنہ تو کیا، تم بالغ مَردوں میں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے باپ نہیں، اُبوّت منفی کردی، جب باپ نہیں تو کوئی بیٹا بھی نہیں، تو اس لئے زید رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹا قرار دینا کسی طرح سے بھی صحیح نہیں ہے۔ اور آپ کے جو بچے اولاد میں سے مذکر تھے وہ نابالغی میں فوت ہوگئے، رجل کی عمر کو پہنچا ہی کوئی نہیں۔ لیکن اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کے خاتم ہیں، نبیوں کو ختم کرنے والے ہیں، نبیوں کے آخر میں ہیں۔

"ختمِ نبوّت" کا مسئلہ بھی عام طور پر اسی آیت کے ضمن میں ذِکر کرتے ہیں۔ اب اس میں کوئی خفاء نہیں ہے، سرورِکائنات صلی اللہ علیہ وسلم "خاتم النّبیین" ہیں، قطعی طور پر ثابت، تواتر کے ساتھ ثابت، اِجماعِ اُمّت کے ساتھ ثابت، بالاتفاق اس کے خلاف کہنے والا، یا عقیدہ رکھنے والا کافر ہے، جس میں کوئی اِشتباہ نہیں۔ کوئی یہ سمجھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی آسکتا ہے، نبوّت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم نہیں ہوئی، یہ بھی غلط۔ اور اگر کوئی شخص نبوّت کا دعویٰ کرے تو وہ بھی گمراہ اور کافر ہے۔ تو جو کسی نبی کو ماننے والا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد، اس کے کُفر میں اُمّت کا کوئی کسی قسم کا اختلاف نہیں، اِنعقادِ خلافت کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا سب سے پہلے اِجماع اسی مسئلے پہ ہوا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخری حصوں میں ہی مسیلمہ کذّاب نے نبوّت کا دعویٰ کردیا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سب سے پہلے مہم اسی مسیلمہ کذّاب کے خلاف ہوئی۔ اور اس مہم کے اندر بہت سارے صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہوئے۔ بہرحال اس بات پہ اُمّت کا اتفاق ہوگیا، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شخص کے لئے برداشت نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اپنے

لئے "نبی" کا لفظ استعمال کرے۔ نہ نبی، نہ رسول، نہ ظلی، نہ بروزی، جس قسم کی اصطلاحات مرزائیوں نے نکال لی ہیں، وہ سب کی سب ان کی خانہ زاد چیزیں ہیں، اوران کی کوئی گنجائش نہیں، نبوّت ہر لحاظ سے ختم ہوگئی۔

پہلے انبیاء علیہم السلام جو آئے بنی اسرائیل میں، اور حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر بنی اسرائیل سے پہلے بھی جو انبیاء آئے، سب کا قاعدہ اور قانون یہی رہا ہے کہ ان میں سے کسی نے اپنے لئے "خاتم الانبیاء" کا لفظ استعمال نہیں کیا، نہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے کسی کو "خاتم الانبیاء" کہا۔ بلکہ ہر نبی آنے والے نبیوں کی پیش گوئی کرتا چلا گیا، اور ان پر ایمان لانے کی تاکید کرتا چلا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اسے طرح سے، حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے تو انہوں نے بھی اپنے بعد آنے والی نبی کی بشارت دی: مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ: یہ سورۂ صف کے اندر موجود ہے، اور آج تک توراۃ کے اندر اس قسم کی پیش گوئیاں موجود ہیں جن کا مصداق سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی دوسرے کو قرار نہیں دیا جاسکتا۔ تو سارے ہی انبیاء علیہم السلام کی تاریخ میں صرف سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کے متعلق اللہ کی کتاب میں "خاتم النّبیین" کا لفظ آیا، اور جنہوں نے اپنے متعلق "خاتم النّبیین" کا لفظ استعمال کیا، "لَا رَسُوْلَ بَعْدِيْ"[1] اور "لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ"[2] اس قسم کے الفاظ احادیث میں کثرت کے ساتھ آئے ہیں۔ اور قصرِ نبوّت کی تکمیل کا آپ نے بہت اچھے انداز میں ذکر فرمایا، کہ نبوّت کو ایک محل سے تشبیہ دی کہ ہر نبی آتا گیا اور گویا کہ ایک ایک اینٹ کی طرح سیٹ ہوتا چلا گیا۔ ایک ہی اینٹ باقی تھی جس کے بعد محل مکمل ہوگیا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہی آخری اینٹ میں ہوں۔[3] "خُتِمَ بِيَ النَّبِيُّوْنَ"[4] میرے ساتھ نبی ختم کردیے گئے۔ اب قصرِ نبوّت میں کسی قسم کے اضافے کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔

"عقیدۂ نزولِ عیسیٰ"، "عقیدۂ ختمِ نبوّت" کے منافی نہیں

اور مطلب اس کا یہ ہے کہ آپ کے بعد کوئی نیا نبی نہیں آئے گا۔ باقی پہلے انبیاء علیہم السلام جو زندہ ہیں وہ اگر موجود ہوں تو یہ آپ کی ختمِ نبوّت کے منافی نہیں۔ اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے اور اس وقت بھی ان کی نبوّت کی صفت سلب نہیں ہوگی، وہ نبی ہی ہوں گے، لیکن عیسیٰ علیہ السلام کا آنا جو کہ مجمع علیہ ہے، اور یہ عقیدہ بھی ضروریاتِ دین میں شامل ہے، کہ عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پہ اُٹھائے گئے، اور ایک وقت میں نازل ہوں گے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے مطابق فیصلہ کریں گے، یہ عقیدہ ضروریاتِ دین میں شامل ہے، اس عقیدے کے اندر بھی شبہ اور شک کرنے والا آدمی کافر ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آنا متواترات سے ثابت ہے،

---

(۱) ترمذی ۲/ ۵۳ باب ذھبت النبوۃ وبقیت المبشرات.

(۲) بخاری ۱/۴۹۱، باب ما ذکر عن بنی اسرائیل. مسلم ۲/۱۲۶، باب وجوب الوفاء۔ ۲/۲۷۸، باب فضائل علی. مشکوٰۃ ۲/۳۲۰، کتاب الامارۃ ۲/۴۶۵، ۵۱۳

(۳) بخاری ۱/۵۰۱ باب خاتم النبیین. مسلم ۲/۲۴۸ باب ذکر کونه خاتم النبیین. مشکوٰۃ ۲/۵۱۱ باب فضائل سید المرسلین ﷺ

(۴) مسلم ۱/۱۹۹، کتاب المساجد. مشکوٰۃ ۲/ ۵۱۲ باب فضائل سید المرسلین ﷺ

اور اس کو ضروریات دین میں شمار کیا جاتا ہے۔ تو وہ چونکہ حضور ﷺ سے پہلے پیدا شدہ ہیں، اور نبوّت کی صفت کے ساتھ موصوف ہو چکے ہیں، اس لئے ان کا آنا "ختم نبوّت" کے منافی نہیں ہے۔

حضرت محمد ﷺ کے مکمل دین کا محفوظ ہونا دلیلِ ختم نبوّت ہے

اور اس ختم نبوّت کے لئے ہی ایک دلیل بہت واضح ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ کا لایا ہوا دین پوری طرح محفوظ، اللہ کی کتاب میں کوئی کسی قسم کا اختلاف نہیں کیا گیا، اور کوئی شوشے کا فرق نہیں ڈالا جا سکا۔ پہلے انبیاء علیہم السلام آتے تھے، اللہ کی طرف سے ان پہ کتابیں بھی اُترتی تھیں، چونکہ بعد میں اور نبیوں نے بھی آنا ہوتا تھا، اس لئے ان کتابوں کی حفاظت اس طرح سے نہیں کی گئی، جس طرح سے قرآن کی کی گئی۔ اب آپ کے بعد چونکہ کسی نبی نے نہیں آنا تھا، اس لئے آپ کا لایا ہوا دین صاف ستھرا، کامل مکمل موجود ہے، کتاب بھی محفوظ ہے، جس کی بنا پر کسی اور کے آنے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل کی سیاست انبیاء علیہم السلام کے ہاتھ میں ہوتی تھی، میرے بعد اب نبی تو کوئی ہوگا نہیں، خلفاء ہوں گے، اور وہی اب دین کی اصلاح کا کام کریں گے۔[1] تو علماء "وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاء" ہیں، یہ ذمہ داری اُمت کے اُوپر ڈال دی گئی۔ سرورِ کائنات ﷺ کے بعد کسی نبی کے آنے کی ضرورت بھی باقی نہ رہی، چونکہ دین میں کوئی کسی قسم کا اشتباہ نہیں ہے۔ بہر حال یہ عقیدہ قطعی ہے، اور اس کے اندر کوئی شک کی گنجائش نہیں۔ "خاتم النّبیین" کا لفظ یہاں جو آیا تو اتنی سی وضاحت آپ کے سامنے مسئلے کی کر دی گئی۔ تو یہاں مرزائیوں نے چونکہ اس مسئلے میں فتنہ اُٹھایا، تو اس پر بہت کتابیں لکھی گئیں، بہت مناظرے، بہت بحث و مباحثے ہوتے رہتے ہیں، اور آپ بھی سنتے رہتے ہیں، کتابیں بھی اس سلسلے میں بے شمار ہیں۔

وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا: اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے، کوئی چیز اس سے مخفی نہیں، علم اس کا تام ہے، وہ زینب رضی اللہ عنہا کو بھی جانتے ہیں، زید رضی اللہ عنہ کو بھی جانتے ہیں، منہ بولے بیٹوں کی حیثیت کو بھی جانتے ہیں، سرورِ کائنات ﷺ کے مقام کو بھی جانتے ہیں، اس لئے جو واضح بیان دے دیا گیا، یہی صحیح اور یہی قابلِ اعتماد ہے، اس کے خلاف کسی کے کہنے سننے کی گنجائش نہیں رہی۔

"ذِکرُ اللہ" کا حکم، مصداق اور فوائد و ثمرات

آگے مؤمنین کو تاکید کی جا رہی ہے اللہ کے ذکر کی، عبادت کی۔ کیونکہ مخالفانہ پروپیگنڈے میں انسان کے دل کو تسکین اور اطمینان دلانے والی چیز بھی اللہ کی یاد ہی ہے۔ اے مؤمنو! اللہ کا ذکر کثرت سے کیا کرو، اور صبح و شام اس کی تسبیح بیان کیا کرو۔ نماز بھی اللہ کا ذکر ہے، تلاوت بھی اللہ کا ذکر ہے، نیکی کا جو کام کیا جائے اللہ کو یاد رکھتے ہوئے اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے، وہ بھی ذکر میں شامل ہے۔ اور "سبحان اللہ الحمد للہ لا إلٰہ إلا اللہ واللہ اکبر"، یہ کلمات بھی ذکر میں شامل ہیں، "لَا يَزَالُ لِسَانُكَ رَطْبًا مِنْ ذِكْرِ اللّٰهِ"[2] تیری زبان اللہ کے ذکر کے ساتھ ہمیشہ تر رہے، تو اس سے یہی تسبیح تحمید وغیرہ مراد ہے۔ عملاً بھی اللہ کو یاد کرو کہ اللہ

---

(۱) صحیح البخاری ج۱ ص۴۹۱ باب ما ذکر عن بنی اسرائیل۔ مسلم ۲/۱۲۶ باب وجوب الوفاء۔ مشکوٰۃ ۲/۳۲۰، کتاب الامارۃ، فصل اول۔

(۲) ترمذی ۲/۱۷۵، ابواب الدعوات، باب ما جاء فی فضل الذکر۔ مشکوٰۃ ۱/۱۹۸ باب ذکر اللہ، فصل ثالث۔

کی اطاعت کرو۔ قولاً بھی یاد کرو کہ زبان پر قرآنِ کریم کی تلاوت ہو، یا تسبیح، تکبیر کے الفاظ ہوں۔ نہ اس کا کوئی وقت متعین ہے، نہ اس کے لئے کوئی دوسری شرط ہے۔ باوضو، بے وضو، بیٹھے ہوئے، لیٹے ہوئے، چلتے پھرتے، جس طرح سے بھی ہو اللہ کو یاد کرتے رہیں، جتنا اللہ کو یاد کریں گے اتنا دل کو اطمینان ہوگا اور دل نُورانی ہوگا، اللہ تعالیٰ کی اطاعت آسان ہوگی۔ اور نمازیں بھی اسی میں ہیں۔

''اللہ تعالیٰ بھی توجہ فرماتا ہے تم سب پر اور اس کے فرشتے بھی'' توجہ اپنی اپنی، یہاں ''صلوٰۃ'' معنی مشترک کے طور پر سب کی طرف منسوب ہے، اللہ تم پہ رحمت نازل کرتا ہے اور اس کے فرشتے بھی، لیکن اللہ کا رحمت نازل کرنا حقیقتاً، اور فرشتوں کا ذریعہ بننا کہ فرشتے دُعا کرتے ہیں مؤمنین کے لئے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اُوپر رحمت فرمائے۔ اور مقصد یہ ہے تاکہ تمہیں کفر، شرک، فسق، فجور اور شہوات کی ظلمات سے نکال کے اللہ نُور کی طرف لے جائے۔ اللہ کے رحمت نازل کرنے کا اثر یہ ہے کہ دن بدن قلب نُورانی ہوتا چلا جائے گا، ظلمت سے چھوٹتے چلے جاؤ گے۔ اور یہ اللہ کی رحمت آئے گی کثرت ذکر پر ہی، جتنا اللہ کو یاد کرو گے اتنا ہی اللہ کی رحمت آئے گی اتنا ہی قلب نُورانی ہوگا۔ ''اور اللہ مؤمنوں کے اُوپر رحم کرنے والا ہے'' دُنیا کے اندر بھی اللہ صلوٰۃ وسلام نازل کرتا ہے، اور آخرت میں بھی جب مؤمنین کی ملاقات اللہ سے ہوگی، تو اللہ انہیں ''سلام'' کے لفظ کے ساتھ گویا کہ ''تحیہ'' پیش کرے گا۔ اب چونکہ ''تحیہ'' کا لفظ ''سلام'' کی جگہ بولا جاتا ہے، آپس میں تحیہ: ایک دوسرے کو ''السلام علیکم'' کہنا۔ تو جس وقت یہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جائیں گے، تو آپس میں مؤمنین بھی ''السلام علیکم'' کہیں گے، اور فرشتے بھی مؤمنین کو ''السلام علیکم'' کہیں گے، اور سَلٰمٌ قَوۡلًا مِّنۡ رَّبٍّ رَّحِیۡمٍ (سورۂ یٰس: ۵۸) اللہ کی طرف سے بھی سلام کہا جائے گا۔ ان کو جو دُعا دی جائے گی جس دن کہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات ہوگی، وہ سلام ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے اَجرِ کریم تیار کیا ہے۔

''منصبِ نبوّت'' کی وضاحت

اور آگے حضور ﷺ کے مرتبے اور منصب کو واضح کیا جارہا ہے کہ ہم نے آپ کو بھیجا ہے، آپ جو تشریف لائے ہیں تو آپ کی حیثیت شاھد کی ہے، مبشر کی ہے، نذیر کی ہے، داعی کی ہے، سراج منیر کی ہے۔ ''شاھد'' کا معنی ہوتا ہے گواہی دینے والا، اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ نبی گواہ ہوتا ہے مخلوق پر اللہ کی طرف سے اس کے اَحکام بیان کرنے کے لئے، وہ گواہی دیتا ہے کہ یہ چیز اللہ کو پسند ہے یہ چیز اللہ کو پسند نہیں، یہ اطاعت ہے یہ معصیت ہے، یہ کرو یہ نہ کرو، اَحکام کا بیان کرنا اور اللہ تعالیٰ کی مرضیات کے اُوپر شہادت دینا، یہ نبی کا منصب ہے۔ کوئی دوسرا آدمی جو کہ نبی نہیں، یہ بیان کرنے کا مجاز نہیں ہے کہ فلاں چیز اللہ کو پسند ہے، فلاں چیز اللہ کو پسند نہیں۔ یہ منصبِ نبوّت ہے کہ وہ اس بات پہ گواہی دے کہ یہ کام اچھا ہے جو اللہ کو پسند ہے، اور یہ کام بُرا ہے جو اللہ کو پسند نہیں، یہ نبی کا منصب ہے۔

''بدعت'' کی اِیجاد ''شرک فی النبوّت'' ہے!

نبی کی بیان کردہ باتوں میں سے اجتہاد اور استنباط کے ساتھ تو آگے بات نکالی جاسکتی ہے، لیکن جب نبی کی کوئی بات

بطورِ دلیل کے پیش نہ کی جائے، اور اپنے طور پر کوئی کام اچھا یا برا قرار دے دیا جائے، جس کو ہم ''بدعت'' کہتے ہیں، تو یہ گویا کہ ''شرک فی النبوت'' ہے، کہ نبی کے منصب کے اُوپر کوئی شخص قبضہ کرلے، کہ یہ منصب تو نبی کا ہے کہ گواہی دے، بتائے، کہ فلاں کام اچھا ہے، فلاں کام اچھا نہیں، فلاں پہ اللہ ثواب دے گا، فلاں پہ عذاب دے گا۔ اگر کوئی آدمی اللہ کی مرضیات یا اس کی ناپسندیدہ باتوں کو اپنی طرف سے واضح کرنے کی کوشش کرتا ہے تو گویا کہ اپنے آپ کو منصبِ نبوّت پہ لے جارہا ہے۔ اس لئے ''بدعت'' کی بہت زیادہ مذمت آئی۔ جس طرح سے ایک ''شرک فی التوحید'' ہے، تو ''بدعت'' کی ایجاد ''شرک فی النبوت'' ہے!

''شاہد، مبشر، نذیر، داعی، سراجِ منیر''

اور ''شاہد'' کا یہ معنی بھی ہے کہ قیامت کے دِن گواہی دیں گے اپنی اُمت کے حق ہونے پر، جس وقت کہ آپ کی اُمت دوسری اُمتوں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کے ہاں پیش ہوگی بطور گواہ کے، انبیاء علیہم السلام کے حق میں ہم گواہی دیں گے، تو ہمارے متعلق حضور ﷺ کی گواہی ہوگی کہ یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں (عام تفاسیر)۔ بشارت دینے والے ہیں اچھائی اختیار کرنے والوں کو۔ ڈرانے والے ہیں بُرائی اختیار کرنے والوں کو۔ اللہ کی طرف اللہ کے حکم کے ساتھ بلانے والے ہیں۔ سراجِ منیر ہیں، روشن چراغ ہیں، جو خود روشن ہیں، دوسروں تک روشنی کو پھیلاتے ہیں۔ سراجِ منیر: سراج کا لفظ سورج کے لئے بھی بولا گیا ہے، ''آفتابِ نبوّت'' حضرت قاری محمد طیب صاحب[1] کی کتاب بھی ہے، وہ اسی لفظ کی تشریح کے طور پر لکھی گئی ہے۔ تو سراجِ منیر: روشن چراغ، یا چمکتا ہوا سورج، روشن سورج۔ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ: اور مؤمنین کو بشارت دے دیجئے کہ ان کے لئے اللہ کی طرف سے فضلِ کبیر ہے۔ اور کافروں اور منافقوں کی بات نہ مانیے یعنی ان کی پروانہ کیجئے۔ اگر وہ کوئی بات کہتے ہیں، چاہے اعتراض کی صورت میں، چاہے مشورے کی صورت میں، جو اللہ کے حکم کے خلاف ہو اس کی آپ بالکل پروانہ کیجئے۔ اور ان کی تکلیف کی بھی پروانہ کیجئے، اگر وہ کوئی ایذا کا معاملہ کرتے ہیں، تو اس کو چھوڑیے۔ چھوڑنے کا معنی ہوتا ہے نظر انداز کردیجئے۔ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ: اللہ پہ بھروسا کیجئے۔ وَكَفٰى بِاللهِ وَكِيْلًا: اللہ تعالیٰ کارساز کافی ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ
اے ایمان والو! جس وقت نکاح کرو تم ایمان والی عورتوں سے پھر تم انہیں طلاق دے دو قبل اس کے کہ
تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ
تم ان سے مس کرو، پس نہیں ہے تمہارے لئے ان کے ذِمے کوئی عدت جس کو تم شمار کرو، پس تم انہیں فائدہ پہنچایا کرو، اور انہیں رُخصت کردیا کرو

(۱) خاندانِ قاسمی کے عظیم چشم و چراغ تھے، نصف صدی سے زائد عرصہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم رہے۔ وفات: ۶ رشوال ۱۴۰۳ھ بمطابق ۱۷ جولائی ۱۹۸۳ء۔

سَرَاحًا جَمِيلًا ﴿٤٩﴾ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ اللَّاتِي آتَيْتَ

اچھی طرح سے رخصت کرنا ﴿۴۹﴾ اے نبی! بے شک ہم نے حلال کر دیا آپ کے لئے آپ کی ان بیویوں کو جن کو آپ نے ان کے

أُجُورَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ وَبَنَاتِ عَمِّكَ وَبَنَاتِ

مہر دے دیے ہیں، اور (ہم نے حلال کر دیا) آپ کی باندیوں کو اس مال میں سے جو اللہ نے آپ پر لوٹایا، اور آپ کی چچا کی بیٹیوں کو اور آپ کی

عَمَّاتِكَ وَبَنَاتِ خَالِكَ وَبَنَاتِ خَالَاتِكَ اللَّاتِي هَاجَرْنَ مَعَكَ ۡ وَ

پھوپھی کی بیٹیوں کو اور آپ کے ماموں کی بیٹیوں کو اور آپ کی خالاؤں کی بیٹیوں کو، جنہوں نے ہجرت کی ہے آپ کے ساتھ، اور (ہم نے حلال

امْرَأَةً مُؤْمِنَةً إِنْ وَهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ إِنْ أَرَادَ النَّبِيُّ أَنْ يَسْتَنْكِحَهَا ۚ خَالِصَةً

کیا) ایمان والی عورت کو اگر وہ اپنے نفس کو ہبہ کرے نبی کے لئے، اگر ارادہ کرے نبی کہ اس سے نکاح کر لے، (یہ احکام) خاص

لَكَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ۗ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِي أَزْوَاجِهِمْ وَمَا

آپ کے لئے ہیں مومنین کے علاوہ، تحقیق جانا ہم نے ان احکام کو جو متعین کیے ہیں ہم نے مومنین پر ان کی بیویوں کے بارے میں اور

مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُونَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا

ان کی باندیوں کے بارے میں، (یہ احکام خاص طور پر آپ کے لئے اس لئے دیے گئے) تاکہ آپ پر کوئی تنگی نہ ہو اور اللہ بخشنے والا ہے

رَحِيمًا ﴿٥٠﴾ تُرْجِي مَنْ تَشَاءُ مِنْهُنَّ وَتُؤْوِي إِلَيْكَ مَنْ تَشَاءُ ۖ وَمَنِ ابْتَغَيْتَ

رحم کرنے والا ہے ﴿۵۰﴾ آپ مؤخر کر دیں جس کو چاہیں ان عورتوں میں سے اور آپ ٹھکانا دیں اپنی طرف جس کو چاہیں، اور جس عورت کو آپ طلب کر لیں

مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ ۚ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ تَقَرَّ أَعْيُنُهُنَّ

ان عورتوں میں سے جن کو آپ نے علیحدہ کر دیا ہے تو بھی آپ پر کوئی گناہ نہیں، یہ بات زیادہ قریب ہے اس کے کہ ٹھنڈی ہو جائیں ان کی آنکھیں

وَلَا يَحْزَنَّ وَيَرْضَيْنَ بِمَا آتَيْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا فِي قُلُوبِكُمْ ۚ وَكَانَ

اور وہ غمزدہ نہ ہوں، اور سب کی سب راضی ہو جائیں اس چیز کے ساتھ جو آپ انہیں دے دیں، اللہ جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، اور

اللَّهُ عَلِيمًا حَلِيمًا ﴿٥١﴾ لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ

اللہ علم والا ہے حلم والا ہے ﴿۵۱﴾ نہیں حلال تیرے لئے عورتیں ان کے علاوہ، اور نہیں حلال آپ کے لئے کہ آپ بدلیں ان بیویوں کے علاوہ

أَزْوَاجٍ وَّلَوْ أَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ إِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيبًا ﴿۵۲﴾

اور بیویوں کو، اگرچہ اُن کا حُسن آپ کو اچھا ہی لگے، مگر آپ کی باندیاں، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کے اُوپر نگہبان ہے

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا: اے ایمان والو! إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ: جس وقت نکاح کرو تم ایمان والی عورتوں سے ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ: پھر تم انہیں طلاق دے دو، مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوْهُنَّ: قبل اس کے کہ تم ان سے مس کرو، فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا: پس نہیں ہے تمہارے لیے ان عورتوں کے ذمے کوئی عدت جس کو تم شمار کرو۔ فَمَتِّعُوْهُنَّ: پس تم انہیں فائدہ پہنچایا کرو، وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا: اور انہیں رُخصت کردیا کرو اچھی طرح سے رُخصت کرنا۔ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ: اے نبی! بے شک ہم نے حلال کردیا آپ کے لیے آپ کی ان بیویوں کو جن کو آپ نے ان کے مہر دے دیے ہیں۔ اجور اجر کی جمع ہے، یہاں مہر مراد ہے۔ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ: اور حلال کردیا ہم نے آپ کے لئے آپ کی باندیوں کو، یعنی ان عورتوں کو جن کا مالک ہے آپ کا دایاں ہاتھ، ملکِ یمین، مملوکہ، مِمَّا أَفَاءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ: آپ کی مملوکہ باندیاں جو اس مال میں سے ہیں، جو اللہ نے آپ پر لوٹایا، جو آپ کو بطور "فئ" کے یا بطور غنیمت کے دیا۔ "مالِ فئ"، "مالِ غنیمت" عام طور پر اس کا مصداق ایک ہی ہوتا ہے۔ ویسے فقہاء کی اِصطلاح میں تھوڑا سا فرق ہے کہ "مالِ فئ" اس کو کہتے ہیں جو کافروں سے بغیر جنگ کے یا بطور مصالحت کے حاصل ہوجائے، لڑائی کی نوبت نہ آئی ہو۔ اور "مالِ غنیمت" وہ ہوتا ہے جو لڑائی کے نتیجے میں حاصل ہو۔ اور کبھی "غنیمت" کے لفظ کو بھی عام استعمال کرلیا جاتا ہے، دونوں قسم کے مالوں پر بولا جاتا ہے۔ اسی طرح سے "مالِ فئ" بھی دونوں قسم کے مالوں پر بولا جاتا ہے، جو کافروں کی طرف سے حاصل ہوا، چاہے لڑائی کے ساتھ حاصل ہوا ہو، چاہے مصالحت کے طور پر بغیر لڑائی کے حاصل ہوا ہو۔ "جو مال اللہ نے آپ پر لوٹایا" یعنی بطورِ فئ کے آپ کو دیا۔ وَبَنَاتِ عَمِّكَ: اور ہم نے حلال کیا آپ کے لیے آپ کی چچے کی بیٹیوں کو، وَبَنَاتِ عَمَّاتِكَ: اور آپ کی پھوپھی کی بیٹیوں کو، وَبَنَاتِ خَالِكَ: اور آپ کے ماموں کی بیٹیوں کو، وَبَنَاتِ خَالَاتِكَ: آپ کی خالاؤں کی بیٹیوں کو۔ خالات خالہ کی جمع، جو والدہ کی بہن ہوتی ہے۔ تو عم اور عمة یہ باپ کا خاندان ہے، خال اور خالہ یہ ماں کا خاندان ہے۔ باپ کے خاندان کی لڑکیاں، اور ماں کے خاندان کی لڑکیاں ہم نے آپ کے لئے حلال کی ہیں۔ لیکن اس شرط کے ساتھ، اللَّاتِي هَاجَرْنَ مَعَكَ وہ بیٹیاں جنہوں نے ہجرت کی ہے آپ کے ساتھ۔ آپ کے ساتھ ہجرت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مہاجر ہونے کی صفت میں وہ شریک ہیں۔ وقت کی قید نہیں کہ آپ کی رفاقت میں انہوں نے ہجرت کی ہو۔ جو ہجرت کرکے آپ کے ساتھ مہاجر ہونے میں شریک ہوگئیں ان عورتوں کے ساتھ آپ شادی کرسکتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ جنہوں نے ہجرت نہیں کی، چاہے وہ آپ کے باپ کے خاندان کی ہیں، یا آپ کی ماں کے خاندان کی ہیں، وہ آپ کے لئے حلال نہیں، وَامْرَأَةً مُّؤْمِنَةً: اور حلال کیا ہم نے آپ کے لئے ایمان والی عورت کو، إِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ إِنْ أَرَادَ النَّبِيُّ أَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا: اگر وہ اپنے نفس کا ہبہ کرے نبی کے لئے، اگر نبی چاہے اس سے نکاح کرنا۔ اپنے نفس کو ہبہ کردے نبی کے لیے، یعنی بغیر مہر کے اپنے آپ کو نبی کے تصرف میں

دے، اگر نبی اس سے نکاح کرنا چاہے تو نکاح کرنا حلال ہے، اِنْ اَرَادَ النَّبِیُّ اَنْ یَّسْتَنْكِحَهَا: اگر ارادہ کرے نبی کہ اس سے نکاح کرلے۔ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ: یہ اَحکام جو دیے گئے ہیں یہ خالص آپ کے لئے ہیں مؤمنین کے علاوہ۔ خَالِصَةً: مصدر ہونے کے طور پر خلوص کے معنی میں مفعول مطلق ہے، یعنی خَلَصَ لَكَ خُلُوْصًا یہ مفہوم ہے اس کا، اس حال میں کہ یہ اَحکام آپ کے ساتھ خاص ہیں، خالص ہیں آپ کے لئے، خاص ہیں آپ کے لیے مؤمنین کے علاوہ، قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَیْهِمْ فِیْٓ اَزْوَاجِهِمْ: تحقیق جانا ہم نے ان اَحکام کو جو متعین کیے ہیں ہم نے مؤمنین پر ان کی بیویوں کے بارے میں، اور ان کی باندیوں کے بارے میں، وَمَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ: مؤمنین کی باندیاں، لفظی ترجمہ یہ ہے کہ وہ عورتیں جن کے مالک ہیں ان کے دائیں ہاتھ۔ لِكَیْلَا یَكُوْنَ عَلَیْكَ حَرَجٌ: اور یہ اَحکام خاص طور پر آپ کے لئے اس لئے دیے گئے تاکہ آپ پر کوئی تنگی نہ ہو۔ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا: اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے۔

تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ: تُرْجِیْ: یہ لفظ اِرجاء سے ہے، اِرجاء کا معنی مؤخر کردینا، ڈھیل دے دینا۔ اَرْجِهْ وَاَخَاهُ: یہ لفظ پہلے بھی آیا تھا (سورۂ اَعراف:۱۱۱)، وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ سورۂ براءت کے اندر بھی یہ لفظ آیا تھا (آیت:۱۰۶)۔ آپ مؤخر کردیں جس کو چاہیں ان عورتوں میں سے، پرے ہٹادیں۔ وَتُـْٔوِیْٓ اِلَیْكَ مَنْ تَشَآءُ: تُـْٔوِیْ: اٰوٰی یُؤْوِیْ اِیْوَاء: ٹھکانا دینا۔ اور آپ ٹھکانا دیں اپنی طرف ان عورتوں میں سے جس کو چاہیں۔ وَمَنِ ابْتَغَیْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ: اور جس عورت کو آپ طلب کرلیں (مَنْ سے یہاں وہی عورت مراد ہے) جس عورت کو آپ طلب کرلیں ان عورتوں میں سے جن کو آپ نے علیحدہ کردیا ہے جدا کردیا ہے، فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكَ: تو بھی آپ پر کوئی گناہ نہیں۔ ذٰلِكَ اَدْنٰٓی اَنْ تَقَرَّ اَعْیُنُهُنَّ: یہ بات زیادہ قریب ہے اس کے کہ ٹھنڈی ہوجائیں ان عورتوں کی آنکھیں۔ قَرَّ: آنکھوں کا ٹھنڈا ہونا۔ قرۃ العین: آنکھوں کی ٹھنڈک۔ الٓمّٓ تنزیل سجدہ کے اندر یہ لفظ آیا تھا: مِنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ (سورۂ الم سجدہ:۱۷)، اور: كَیْ تَقَرَّ عَیْنُهَا (سورۂ طٰہٰ:۴۰)، یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے قصے میں بھی آیا تھا کہ ہم نے آپ کو اس کی طرف لوٹادیا تاکہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوجائیں۔ یہ زیادہ قریب ہے اس کے کہ ٹھنڈی ہوجائیں ان کی آنکھیں۔ وَلَا یَحْزَنَّ: اور وہ عورتیں غمزدہ نہ ہوں وَیَرْضَیْنَ: اور وہ راضی ہوجائیں، بِمَآ اٰتَیْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ: اس چیز کے ساتھ جو آپ ان عورتوں کو دے دیں۔ كُلُّهُنَّ: وہ سب کی سب عورتیں۔ وہ سب کی سب عورتیں راضی ہوجائیں اس چیز کے ساتھ جو آپ انہیں دے دیں۔ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ: اللہ جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَلِیْمًا: اور اللہ تعالیٰ علم والا ہے حلم والا ہے۔ لَا یَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ: نہیں حلال تیرے لئے عورتیں ان کے علاوہ۔ مِنْۢ بَعْدُ کا ترجمہ دو طرح سے کیا گیا ہے، یا تو موجودہ بیویوں کے علاوہ اور کوئی عورت حلال نہیں، اس لئے جو آپ کے نکاح میں آچکیں وہی ہیں، ان کے علاوہ آپ کسی اور سے نکاح نہیں کرسکتے، موجودہ بیویوں کی تعداد پہ کام بس ہوگیا، آگے کسی اور عورت سے نکاح کرنے کی اجازت نہیں، یہ مطلب بھی بعض مفسرین نے لیا ہے (عام تفاسیر)۔ یا مِنْۢ بَعْدُ کا معنی ہے کہ ان عورتوں کے علاوہ جو ذکر کی گئی ہیں ان شرطوں کے علاوہ کسی عورت کے ساتھ نکاح کرنا جائز نہیں، یعنی آپ اور نکاح تو کرسکتے ہیں لیکن ان اصناف کے علاوہ کسی اور سے نہیں کرسکتے جن کا ذکر آپ کے سامنے پہلے آگیا، کہ اگر آپ اور نکاح کرنا چاہیں تو نکاح کرنا جائز ہے لیکن ان پابندیوں کی رعایت رکھیں کہ باپ کے خاندان کی ہو، ماں کے خاندان کی

ہو، تو اس کا مہاجر ہونا ضروری ہے۔ اور اگر ماں باپ کے خاندان میں سے نہ ہو تو پھر مہاجر ہونا ضروری نہیں، البتہ مؤمن ہونا سب عورتوں میں شرط ہے، کہ باقی مؤمنین کے لئے جس طرح سے اہلِ کتاب میں سے کسی سے شادی کر لینا ٹھیک ہے، نبی کے لئے یہ ٹھیک نہیں۔ تو مِنۢ بَعْدُ کا مطلب یہ ہوگا کہ ان اصناف کے علاوہ، جو صنفیں عورت کی ذکر کر دی گئی ہیں ان کے علاوہ کسی اور کے ساتھ شادی کرنا جائز نہیں ہے (ابن کثیر)۔ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ: اور نہ یہ بات حلال ہے کہ بدل لیں آپ ان عورتوں کے علاوہ اور بیویوں کو، وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ: اگرچہ دوسری عورتوں کا حُسن آپ کو اچھا ہی لگے، اگرچہ اور عورتیں آپ کو پسند ہی ہوں، ان بیویوں کے ساتھ اور عورتوں کو آپ بدل نہیں سکتے، یعنی تبدیلی کی نیت کے ساتھ آپ موجودہ بیویوں میں سے کسی بیوی کو طلاق نہیں دے سکتے۔ تبدل کی نیت نہ ہو، طلاق دے دیں، یہ جائز ہے۔ لیکن اس خیال سے کہ ان میں سے کسی کو چھوڑ دوں اور کسی اور سے نکاح کرلوں، تبدل کی نیت سے ان کو طلاق نہ دیجئے۔ ''اور نہیں حلال آپ کے لئے کہ آپ بدلیں ان بیویوں کے علاوہ اور بیویوں کو، اگرچہ ان کا حُسن آپ کو اچھا ہی لگے۔'' اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ: مگر آپ کی باندیاں، وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں، کہ ان کو آپ علیحدہ بھی کر سکتے ہیں، ان کو آپ بدل بھی سکتے ہیں، بیچ بھی سکتے ہیں۔ مگر وہ عورتیں جن کا مالک ہے آپ کا دائیں ہاتھ، یعنی باندیاں اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا: اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کے اوپر نگہبان ہے۔

تفسیر

مطلقہ عورت کے مہر کے متعلق اَحکام

یہ آیات جو آپ کے سامنے پڑھی گئیں، ترجمے سے آپ کے سامنے یہ حقیقت آ گئی کہ اس میں عورتوں کے کچھ نکاح کے اور طلاق کے احکام ذکر کیے گئے ہیں، اور ان کے یہاں ذکر کرنے کا موقع یہ ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ نے جس وقت حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا، اُس سے پہلے آپ کے نکاح میں چار بیویاں موجود تھیں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، حضرت سودہ بنتِ زمعہ رضی اللہ عنہا، حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا اور حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا، اور یہ چاروں بیویاں ہی قریشی ہیں اور آپ کے خاندان سے ہیں، یعنی قریشی ہونے کے اعتبار سے آپ کے ساتھ نسب میں شریک تھیں۔ اور یہ پانچویں عورت آئی حضرت زینب بنتِ جحش رضی اللہ عنہا جن کی تفصیل آپ کے سامنے پچھلی آیات میں آئی۔ اور اس سے قبل مسلمانوں کے اُوپر عام طور پر پابندی لگ چکی تھی کہ چار سے زیادہ نکاح کر نہیں سکتے، جیسا کہ سورۂ نساء کے اندر آپ کے سامنے تفصیل گزری۔ جس وقت یہ حکم نازل ہوا کہ زیادہ سے زیادہ چار عورتیں رکھی جا سکتی ہیں، تو جن لوگوں کے نکاح میں پہلے سے زائد عورتیں موجود تھیں، سرورِ کائنات ﷺ نے حکم دیا کہ چار سے زائد کو چھوڑ دو، جتنی بیویاں ہیں ان میں سے چار کو اپنے لیے رکھ لو جو پسند ہیں، اور ان کے علاوہ جو ہیں ان کو چھوڑ دو۔

تو وہ جو زائد تھیں، اگر تو نکاح میں آنے کے بعد ان کے ساتھ خلوتِ صحیحہ بھی ہو چکی تھی پھر تو ان کے اُوپر عدّت بھی آئے گی، اور مہر دینا تو بہرحال ضروری۔ اور اگر بعض عورتیں ایسی تھیں کہ جن کے ساتھ نکاح ہی ہوا تھا اور خلوت کا موقع نہیں آیا، تو ان کو علیحدہ کر دیا جائے گا، اور ان کے اُوپر عدّت بھی نہیں ہے۔ اور مہر کے مسئلے کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ بقرہ میں آ چکی، کہ اگر مہر

متعین کیا گیا ہو اور خلوتِ صحیحہ سے پہلے طلاق ہو جائے۔ خلوتِ صحیحہ پر مدار ہے، حقیقتاً جماع کی نوبت آئی ہو یا نہ آئی ہو۔ یہاں جو "مس" کا لفظ آیا ہے مس حقیقی ہو یا مس حکمی ہو۔ "مس حقیقی" تو ہوتا ہے کہ باقاعدہ جمع ہونے کی نوبت آ گئی، اور "مس حکمی" ہوتا ہے کہ خلوت نصیب ہو گئی ہو، خلوتِ صحیحہ۔ "خلوتِ صحیحہ" اس کو کہتے ہیں کہ خاوند اگر اس عورت سے فائدہ اُٹھانا چاہتا تو کوئی مانع نہیں تھا، ایسی خلوت کے میسر آ جانے کے بعد بھی مہر پورا دینا پڑتا ہے۔ اور اگر ایسی خلوت میسر نہیں آئی اور مہر نکاح میں متعین ہوا تھا تو پھر آدھا مہر دینا ضروری ہوتا ہے۔ اور اگر خلوت بھی میسر نہیں آئی اور مہر بھی نکاح میں متعین نہیں کیا گیا تھا تو ایسی عورت کو "متعہ" دیا جاتا ہے، جو "فقہ" کے اندر آپ پڑھتے ہیں، یعنی کچھ فائدہ پہنچانا، یہ اس کا لفظی معنی ہے، جس کا مصداق ذکر کیا گیا ہے کپڑوں کا جوڑا۔ کپڑے بمع بڑی چادر کے جو بطور پردے کے پہنی جاتی ہے...... کیونکہ اس زمانے میں عورتیں یہ برقعے نہیں اوڑھا کرتی تھیں، یہ برقعے کی بناوٹ بعد کی ہے۔ اس زمانے میں صرف بڑی چادر لے لیا کرتی تھیں، جس سے اُوپر والا بدن چھپا لیا جاتا، اور صرف تھوڑا سا چہرہ ننگا ہوتا تاکہ چلنے کی ضرورت اس سے پوری ہو جائے، باقی بدن کو چادر کے ساتھ ڈھانپ لیا جاتا تھا، جس کو "جلباب" کہتے ہیں، جلابیب کا لفظ اسی سورت میں آئے گا، تو "جلباب" کہتے ہیں، بڑی چادر کو جس کے ساتھ بدن ڈھانپ لیا جائے۔ تو صحابہ کرام ﷺ کے زمانے میں پردہ چادر کے ساتھ ہی ہوتا تھا، اور یہ بعد میں کئی صورتیں بن گئیں، سہولت کے لیے برقعے کی مختلف شکلیں اختیار کر لی گئیں، ورنہ صحابہ کرام ﷺ کے زمانے میں سلا ہوا برقع نہیں ہوا کرتا تھا...... تو یہ کپڑوں کا جوڑا اور بڑی چادر عورت کو دے کے رُخصت کر دیا جائے، یہ "متعہ" اس کے لئے واجب ہے۔ اور باقی مطلقات عورتیں جتنی ہوتی ہیں، جن کے ساتھ خلوت ہو چکی، اور جن کا مہر متعین تھا ان کے لئے "متعہ" مستحب ہے۔ خیر! یہ تفصیل آپ کے سامنے سورۂ بقرہ میں گزر بھی گئی، اور فقہ میں بھی آپ پڑھتے رہتے ہیں۔ تو یہ موقع محل کے مطابق ہدایات دی گئیں کہ جب بعض عورتوں کو جدا کرنے کی نوبت آ رہی ہے، تو جن کے ساتھ خلوت ہو چکی ہے ان کو تو مہر پورا دو، اور ان کے لئے "متعہ" مستحب ہے۔ اور جن کے لیے خلوت کا موقع نہیں آیا، ان کے لیے اگر مہر متعین ہے تو نصف مہر۔ اور اگر مہر متعین نہیں ہے تو ان کو کپڑوں کا جوڑا دے کر رُخصت کر دیا جاتا ہے۔ یہ ہدایات دی گئیں۔

اَحکامِ نکاح میں حضور ﷺ کی خصوصیات

اب آپ جانتے ہیں کہ سرورِ کائنات ﷺ کے لئے یہ پانچواں نکاح اللہ کی حکمت کے تحت تجویز ہوا، جیسا کہ تفصیل آپ کے سامنے آئی۔ اب اگر اس میں یہ صورت اختیار کی جاتی کہ اگر آپ پانچواں نکاح کرنا چاہتے ہیں تو پہلی چار میں سے کسی ایک کو طلاق دیں، تو یہ بھی مصلحت کے خلاف تھا۔ اور منافقین اور دوسرے لوگوں نے اس موقع پر زبان درازی کی، یا دوسرے ان کے دل میں آئے، یا دوسرے مخلصین کے دل میں بھی وسوسے ڈالنے کی کوشش کی گئی، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس عین موقع پر حضور ﷺ کی خصوصیات کو نمایاں کر دیا، کہ وہ چار کی پابندی جو کی گئی ہے یہ عام مؤمنین کے لئے ہے، حضور ﷺ کے لئے چار عورتوں کی پابندی نہیں، آپ ﷺ جن سے نکاح کر چکے ہیں وہ بھی آپ کے لیے ٹھیک ٹھاک، ان میں سے کسی کو چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے، اور اگر مزید بھی نکاح کرنا چاہیں تو آپ کے لئے اجازت ہے لیکن ان قیدوں اور ان پابندیوں کے ساتھ جو آپ کے سامنے ان آیات

میں ذکر کی جارہی ہیں۔ تو حضور ﷺ کی خصوصیت ہے باجماعِ اُمت، کہ آپ کے لئے چار عورتوں سے زیادہ عورتیں بھی جائز ہیں۔ چنانچہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح میں آجانے کے بعد پھر بھی آپ ﷺ نے متعدد نکاح کیے ہیں، حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا، حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا، حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا، اور حضرت اُمِ حبیبہ رضی اللہ عنہا، یہ ساری کی ساری بعد میں حضور ﷺ کے نکاح میں آئی ہیں، تو آپ ﷺ نے اس کے بعد بھی متعدد نکاح کیے ہیں، جس وقت آپ کی وفات ہوئی اس وقت آپ کے نکاح میں نو عورتیں موجود تھیں، جن میں سے ایک حضرت سودہ رضی اللہ عنہا تھیں، یہ اپنی باری نہیں لیا کرتی تھیں، آٹھ عورتوں کو باقاعدہ آپ باری دیتے تھے۔ "نو" تک نکاح اس وقت تھے آپ ﷺ کے جس وقت آپ ﷺ کی وفات ہوئی ہے۔ اس لئے ان آیات میں حضور ﷺ کی خصوصیات کو نمایاں کیا جارہا ہے تاکہ زینب رضی اللہ عنہا کے ساتھ جو نکاح کیا گیا اور پانچویں نمبر پر کیا گیا، یہ کسی کے لئے باعثِ اعتراض نہ ہو۔ منافقین اس قسم کے اگر وسوسے پھیلاتے ہیں یا کوئی پروپیگنڈا کرتے ہیں، یا آنے والے وقت میں کوئی کسی قسم کا اعتراض کرے تو قرآن کریم کے اندر اس مسئلے کو صاف کر دیا گیا...... اور کچھ اور خصوصیات بھی واضح کر دی گئیں، جس طرح سے کوئی مسلمان بغیر مہر کے نکاح نہیں کر سکتا، مہر دینا ضروری ہے۔ حضور ﷺ کے لئے مہر کی پابندی کو بھی اُٹھا دیا تھا، آگے آپ کے سامنے آرہا ہے۔ باقی مؤمنین کے لئے باری کا دینا فرض ہے کہ اگر چند بیویاں ہیں ایک سے زائد بیویاں نکاح میں ہیں تو باری فرض ہے، کہ ایک رات اِس کے پاس گزاری ہے، تو ایک رات اُس کے پاس بھی گزاری جائے لیکن حضور ﷺ سے باری کی پابندی بھی اُٹھا دی گئی۔ تو باری کی پابندی تو اُٹھا دی گئی لیکن روایات شاہد ہیں کہ آخر وقت تک آپ ﷺ نے اس باری کی رعایت رکھی ہے۔ ہاں! البتہ مرضِ وفات میں، جس وقت آپ بیمار ہو گئے تھے تو باقی بیویوں سے اجازت لے کر پھر آپ ﷺ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں ٹھہر گئے، اور باقی عورتوں نے خوشی کے ساتھ اجازت دے دی تھی کہ آپ ﷺ جہاں ٹھہرنا چاہیں، ٹھہر جائیں، تو رسول اللہ ﷺ نے ٹھہرنے کے لئے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے گھر کو منتخب کر لیا تھا پسند فرمالیا تھا، وہیں آپ کی وفات ہوئی اور وہیں آپ دفن ہوئے...... تو یہ خصوصیات ہیں جو ان آیات کے اندر ذکر کی جارہی ہیں۔ پہلے تو عام مؤمنین کے لئے مسئلہ ذکر کر دیا۔ تو یہ نکاح اور طلاق کے مسئلے جو یہاں درمیان میں آگئے، تو ماقبل مابعد کے ساتھ اس کا گویا کہ ربط یہ ہے کہ چونکہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کے طلاق دینے کے بعد حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کی نوبت آئی، اسی تقریب کے ساتھ نکاح اور طلاق کے مسئلے شروع ہو رہے ہیں، تاکہ حضور ﷺ کی خصوصیت کو نمایاں کر دیا جائے، اور آپ ﷺ کے متعلق کوئی کسی قسم کا وسوسہ اللہ کے اَحکام کی خلاف ورزی کا، یا دوسرا کوئی وسوسہ نہ آئے۔

پہلی خصوصیت: "چار سے زائد نکاح کی اِجازت"

پہلے تو عام مؤمنین کے لئے حکم ہے کہ اے ایمان والو! جب تم مؤمن عورتوں سے نکاح کرو پھر تم انہیں طلاق دے دو قبل اس کے کہ تم انہیں مس کرو۔ اس "مس" کے متعلق ذکر کر دیا ہے کہ "مَس" چھونے کو کہتے ہیں، یہ کنایہ ہے وطی سے۔ اور یہ "مس"

حقیقتاً ہو، یا حکماً ہو،''حقیقتاً مس'' یہ ہوتا ہے کہ باقاعدہ ملنے کی نوبت آگئی، اور حکماً یہ ہوتا ہے کہ خلوتِ صحیحہ ہوگئی۔ اور مؤمنات کا ذکر بھی اتفاقی ہے واقعے کے اعتبار سے، ورنہ اگر کسی مؤمن کے گھر میں اہلِ کتاب عورتوں میں سے کوئی عورت ہو تو اس کا حکم بھی یہی ہے۔ مہر اس کو پورا دینا پڑتا ہے اگر وطی کی نوبت آگئی ہو، یا خلوتِ صحیحہ کی نوبت آگئی ہو۔ اور اگر قبل از خلوت اس کو طلاق دے دی جائے تو آدھا مہر دینا پڑتا ہے اگر مہر متعین ہو۔ اگر مہر متعین نہ ہوا اور طلاق قبل الدخول ہو جائے تو یہی فائدہ پہنچایا جاتا ہے کہ کپڑے کا جوڑا دینا ضروری ہے۔ تو مؤمنات کا ذکر اتفاقی ہے، اور ''مس'' عام ہے حقیقتاً ہو یا حکماً، حکماً: خلوتِ صحیحہ یعنی اس طرح سے علیحدگی نصیب ہو جائے مرد اور عورت کو کہ اگر مرد اس سے فائدہ اُٹھانا چاہے تو کوئی مانع اور رُکاوٹ موجود نہ ہو، اس کو کہتے ہیں خلوتِ صحیحہ۔

''تمہارے لئے ان عورتوں کے ذِمّے کوئی عدت نہیں، جس کو تم شمار کرو، انہیں فائدہ پہنچادیا کرو اور اچھے طریقے سے رُخصت کردیا کرو'' یعنی کسی مجبوری کی بنا پر طلاق دینی پڑگئی، تو آپس میں اس کو عداوت کا ذریعہ نہ بناؤ، یہ علیحدگی بھی اچھے طریقے سے اختیار کرو۔ ایسا ہوتا ہے کہ جوڑ لگا لیکن نباہ نہیں ہوا، نکاح ہوگیا نباہ نہ ہوا تو اس کو آگے عداوت کا ذریعہ نہ بنالیں، نکاح کو ختم کریں، اچھی طرح سے اس کو رُخصت کردیں..... آگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اَحکام آگئے، یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِیْۤ اٰتَیْتَ اُجُوْرَهُنَّ: ہم نے آپ کے لئے حلال کردیا ان عورتوں کو جن کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم مہر دے چکے ہیں، یعنی زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح پانچواں ہوا، اس سے قبل چار عورتیں جن کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کیا تھا اور ان کے مہر ادا کردیے گئے تھے وہ آپ کے لئے حلال ہیں، ان میں سے کسی کو علیحدہ کرنا ضروری نہیں، جیسا کہ عام مؤمنین کے لیے اگر ایسی نوبت آجائے، پانچویں نکاح کی صورت ہو، تو پہلی چار میں سے کسی ایک کو چھوڑنا پڑے گا۔ آپ کے لئے یہ بات نہیں ہے، آپ کے نکاح میں جو عورتیں پہلے آچکی ہیں وہ آپ کے لئے حلال ہیں۔ اور اٰتَیْتَ اُجُوْرَهُنَّ: یہ بھی ایک واقعہ کا بیان ہے، کہ ان عورتوں کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح ہوا تھا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مہر بھی دے چکے تھے۔ وَمَا مَلَكَتْ یَمِیْنُكَ مِمَّاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَیْكَ: اور مالِ غنیمت میں سے جو باندی آپ رکھنا چاہیں وہ باندی بھی آپ کے لئے حلال ہے، اس میں مؤمنہ ہونے کی قید نہیں ہے۔ مؤمنہ، غیر مؤمنہ دونوں صورت میں باندی آپ کے پاس آسکتی ہے، اگرچہ واقع کے لحاظ سے آپ کے پاس مؤمنہ ہی رہی ہیں، غیر مؤمنہ نہیں رہیں، تو اس میں مؤمنات کی قید نہیں ہے۔ جیسے ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی باندی تھیں اور انہی کے بطن سے صاحبزادہ حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے، تو مَا مَلَكَتْ یَمِیْنُكَ: حلال کیا ہم نے آپ کے لیے آپ کی باندیوں کو اس مال میں سے جو اللہ نے آپ کے اُوپر لوٹایا ہے، جس کا مالک بن جائے آپ کا دایاں ہاتھ اس مال میں سے جو اللہ نے آپ کو بطور ''فَیْ'' کے دیا۔ اور حلال کیا ہم نے آپ کے چچے کی بیٹیوں کو، اور پھوپھیوں کی بیٹیوں کو، یہ باپ کے خاندان کی عورتیں ہوگئیں۔ اور ماموں کی بیٹیوں کو اور خالات کی بیٹیوں کو، یہ ماں کا خاندان ہوگیا، لیکن ان کے ساتھ قید یہ لگادی: الّٰتِیْ هَاجَرْنَ مَعَكَ: جن عورتوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہے، یعنی جو مہاجر ہونے کی صفت میں آپ کے ساتھ شریک ہیں، ان کے ساتھ آپ نکاح کرسکتے ہیں۔ اور اگر ہیں وہ آپ کے باپ کے خاندان کی یا ماں کے خاندان کی، لیکن انہوں نے ہجرت نہیں کی، ان عورتوں کے ساتھ نکاح کرنا آپ کے لئے حلال نہیں۔ تو یہاں وسعت بھی دے دی اور ساتھ ایک پابندی بھی

لگادی۔ اُمِّ ہانی رضی اللہ عنہا ابو طالب کی لڑکی ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بہن ہیں، ان کا بیان آتا ہے کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے حلال نہیں تھی[1] کیونکہ میں نے ہجرت نہیں کی تھی۔ فتح مکہ کے موقع پر انہوں نے اسلام قبول کیا، اور یہ طلقاء میں سے ہیں۔ جب مکہ فتح ہوا ہے اسی وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر گئے تھے، وہیں جا کے غسل کیا تھا، وہیں جا کر صلوٰۃِ ضحیٰ پڑھی تھی، روایات میں ذکر آتا ہے۔[2] یہ آپ کی چچا زاد بہن ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حقیقی بہن، ابو طالب کی لڑکی، تو ان کا بیان ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ باپ کے خاندان کی لڑکیاں جنہوں نے ہجرت نہیں کی، وہ حلال نہیں ہیں، اسی آیت کے مطابق جس طرح سے یہاں ذکر کر دیا گیا...... اور یہ قید جو لگادی گئی اس میں بھی آپ کی ایک رعایت ہے، کیونکہ خاندان کی بچیاں جو ہوا کرتی ہیں، تو ان میں ایک قسم کا ناز بھی ہوتا ہے اور اپنے ذہن کے اندر ان کو ایک برتری بھی ہوتی ہے، تو جب ہجرت کر لیں گی، ہجرت کی مشقتیں اُٹھائیں گی تو تہذیبِ اَخلاق بھی ہو جائے گی، اور پھر یہ علامت بھی ہوگی کہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے اتنی محبت ہے کہ اپنے خاندان کی پروا نہیں کی، اپنے وطن کی پروا نہیں کی۔ یہ ایک محبت کی علامت ہے کہ اسلام کے لئے اور آپ کے تعلق کی بنا پر سب کچھ قربان کر کے آگئیں، ایسی لڑکی اگر آپ کے نکاح میں آئے گی تو آپ کے لئے باعثِ راحت بنے گی اور ناموافقت کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔ اس لئے یہ قید بھی آپ کے آرام کے لئے اور آپ کی سہولت کے لئے لگائی گئی۔ چنانچہ اُمِّ حبیبہ رضی اللہ عنہا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حقیقی بہن، ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی لڑکی، یہ آپ کے باپ کے خاندان کی ہیں، کیونکہ عبد مناف پہ جا کے بنو اُمیہ بنو ہاشم کے ساتھ اکٹھے ہو جاتے ہیں، تین چار پشتوں پر۔ تو یہ مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے حبش میں چلی گئی تھیں اپنے شوہر کے ساتھ، اور وہاں جا کے ان کا شوہر مرتد ہو گیا تھا، عیسائی ہو گیا تھا، اور وہ اسی حالت میں پھر مرا ہے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر ان کے لئے نکاح کا پیغام بھیجا ان کی دلجوئی کے لئے، شاہ نجاشی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کا نکاح کروایا، اور مہر بھی شاہ نجاشی نے ادا کیا، اور بعد میں ان کو مدینہ منورہ پہنچا دیا گیا۔ تو یہ باپ کے خاندان میں سے تھیں، اور مہاجرہ تھیں، اور ان کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کیا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حقیقی بہن ہیں، اس لئے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے ماموں لگے، ''خال المؤمنین''، ''خال المسلمین'' کیونکہ اُمِّ حبیبہ رضی اللہ عنہا جس وقت ہماری ''اَمّاں'' ہوئیں، تو ان کے بھائی ہمارے ''ماموں'' ہیں، تو یہ شرف بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو حاصل ہے۔

دُوسری خصوصیت: ''مہر کا عدمِ وجوب''

وَامْرَاَۃً مُّؤْمِنَۃً اِنْ وَّھَبَتْ نَفْسَھَا: یہ بھی ایک خصوصیت آگئی کہ عام مؤمنین کے لیے اگر کوئی عورت اپنے آپ کو بلا مہر نکاح میں دینا چاہے تو جائز نہیں ہے، مہر ضروری ہے، اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِکُمْ (سورۂ نساء: ۲۴) جس طرح سے قرآنِ کریم میں آتا ہے۔ مال خرچ کر کے عورت کو طلب کیجئے۔ تو مہر لازمی ہے اگرچہ نکاح کے انعقاد کے لئے شرط نہیں، اگر مجلسِ نکاح میں مہر کا ذکر نہ ہو نکاح پھر بھی ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ اگر کوئی شخص نفی بھی کر دے کہ میں مہر نہیں دوں گا، نکاح پھر بھی ہو جاتا ہے، پھر مہرِ مثل دینا ضروری ہوتا

(۱) فَلَمْ اَکُنْ اَحِلُّ لَہٗ لِاَنِّیْ لَمْ اُھَاجِرْ کُنْتُ مِنَ الطُّلَقَاءِ (ترمذی ۱۵۶/۲، کتاب التفسیر۔ سورۃ الأحزاب)

(۲) بخاری ۱۴۹/۱، باب من تطوع فی السفر۔ مشکوۃ ۱۱۵/۱، باب صلوۃ الضحیٰ کی پہلی حدیث۔

ہے۔"مہرِ مثل" سے مراد ہوتا ہے عورت کے خاندان کی لڑکیوں کا عام طور پر مہر کتنا ہے، اتنا مہر اس کو بھی دے دیا جائے گا۔ تو کوئی نکاح مہر سے خالی نہیں ہوسکتا، لیکن حضور ﷺ کی یہ خصوصیت ہے کہ کوئی عورت آپ کے نکاح میں آنا چاہے، اور اپنے آپ کو ہبہ کردے، آپ کی ملکیت میں دے دے، بغیر کسی قسم کے مہر کے تو آپ کا اس کو اپنی ملکیت میں نکاح میں لے لینا ٹھیک ہے۔ باقی ایسی عورت کون سی تھی؟ اس میں مفسرین کا کچھ اختلاف ہے، بعض مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ اس کا مصداق حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا ہیں (مظہری)۔ یہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی خالہ ہیں، خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی بھی خالہ ہیں، اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی وساطت سے ان کا نکاح حضور ﷺ کے ساتھ "عمرۃ القضاء" کے موقع پر ہوا ہے۔ حدیبیہ والے واقعے کے بعد اگلے سال حضور ﷺ عمرہ کرنے کے لئے گئے تھے، تو اس موقع پر حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا۔ تو بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ تھیں۔ ایسی پیش کش تو بہت عورتوں کی طرف سے تھی، جو حضور ﷺ کے نکاح میں آنا چاہتی تھیں اور بغیر کسی قسم کے معاوضے کے، لیکن ہر فرمائش تو نہیں پوری کی جاسکتی، اس لئے یہ ساتھ لگا دیا کہ اِنْ اَرَادَ النَّبِیُّ اَنْ یَّسْتَنْکِحَهَا صرف کوئی عورت اپنے آپ کو پیش کردے تو اس سے ضروری نہیں کہ نبی اس کو قبول کرے، اگر چاہیں نکاح کرنا تو اس کو نکاح میں لاسکتے ہیں۔ اور یہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا ہیں جن کو حضور ﷺ نے قبول کیا، اور اس نکاح میں زیادہ تر دخل ہے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی سفارش کا۔[1] بہر حال حضور ﷺ پر یہ ضروری نہیں قرار دیا گیا کہ آپ کے نکاح میں مہر ضروری ہے۔ تو مہر دینا ضروری نہیں، اگر کوئی عورت بغیر مہر کے نکاح کرنا چاہے تو کرسکتی ہے۔ یہ بھی خصوصیت آگئی۔

اور یہ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ: اسی خصوصیت کی طرف اشارہ ہے، کہ یہ احکام جو دیے جارہے ہیں کہ چار سے زیادہ شادیاں کی جاسکتی ہیں، بغیر مہر کے کی جاسکتی ہیں، یہ ساری کی ساری صورتیں آپ کے ساتھ خاص ہیں، باقی مؤمنین کے لئے نہیں۔ اور باقی مؤمنین کے لئے ہم نے جو احکام متعین کیے ہیں بیویوں کے بارے میں، باندیوں کے بارے میں، تو وہ ہم جانتے ہیں، ہمارے علم میں ہے ان کے ذمے جو کچھ لگایا گیا ہے۔ اور یہ جو آپ کے لئے وسعت پیدا کی جارہی ہے لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ: تا کہ آپ پر کوئی کسی قسم کی تنگی نہ ہو اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، یعنی آپ کی راحت کے لئے یہ وسعت دی جارہی ہے۔

تیسری خصوصیت: "باری کا عدمِ وجوب"

آگے ایک مزید خصوصیت آگئی وہی باری والی۔ شرعی طور پر یہ مسئلہ ہے کہ ایک سے زائد بیویاں اگر ہوں تو ان کے درمیان میں عدل فرض ہے، برابری کرنا فرض ہے، ان کی حیثیت کے مطابق۔ جس طرح سے "فقہ" میں تفصیل ہے۔ نفقہ بھی دیا جائے، ان کی ضروریات بھی پوری کی جائیں، لیکن ساتھ ساتھ ان کے پاس وقت گزارنا بھی ضروری ہے برابری کے ساتھ، ایک رات اگر آپ ایک بیوی کے پاس ہیں تو دوسری رات دوسری بیوی کے پاس گزاریں، ایک ہفتہ ایک بیوی کے پاس رہیں تو ایک ہفتہ دوسری کے پاس ٹھہریں، پندرہ دن یا جو آپ باری متعین کرلیں، ایک مہینہ ایک کے پاس تو ایک مہینہ دوسری کے پاس، اس طرح سے عدل فرض ہے، اس کی تاکید احادیث میں بھی ہے اور قرآنِ کریم میں سورۂ نساء کے اندر اس کے متعلق احکام دے دیے

(۱) "سیرت سرورِ کونین" ۲/۳۶۶، از: مولانا عاشق الٰہی بلند شہری۔

گئے ہیں۔ حضور ﷺ سے اس باری کو ساقط کر دیا گیا، کہ آپ کے ذمے ضروری نہیں کہ آپ ان کو باری دیں، جس کو چاہیں آپ اپنے پاس بلائیں، جس کو چاہیں پرے ہٹالیں، اور پھر جتنی دیر تک پرے ہٹائے رکھیں، آپ کی مرضی۔ لیکن جس کو آپ نے علیحدہ کر دیا، اپنے پاس اس کو باری نہیں دی، پھر اس کو بلانا چاہیں تو بھی کوئی پابندی نہیں ہے، یہ آپ کے اختیار میں ہے، جس طرح سے چاہیں بیویوں کے ساتھ معاملہ کریں۔ لیکن اس رُخصت کے باوجود حضور ﷺ نے کبھی بھی اس عدل کے خلاف نہیں کیا، اور برابری کرتے تھے، حتیٰ کہ یہاں تک برابری کرتے تھے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "اَللّٰھُمَّ ھٰذَا قَسْمِیْ فِیْ مَا اَمْلِکُ فَلَا تَلُمْنِیْ فِیْ مَا تَمْلِکُ وَلَا اَمْلِکُ "(۱) یعنی برابری کرنے کے بعد دُعا کیا کرتے تھے کہ یا اللہ! جو میرے اختیار میں ہے، وہ تو میں نے ان کے درمیان میں تقسیم کر دیا، نفقہ تقسیم کر دیا، وقت تقسیم کر دیا، لیکن بعض چیزیں تیرے اختیار میں ہیں، میرے اختیار میں نہیں ہیں، ان کے بارے میں میرے پہ ملامت نہ کرنا، اگر میں ان میں برابری نہ کر سکوں۔ اور اس سے اشارہ ہے قلبی میلان کی طرف کہ دِل میں محبت کسی کی زیادہ ہو کسی کی کم ہو، یہ تیرے بس کی بات ہے، میرے بس کی نہیں ہے۔ اس لئے اگر اس میں برابری نہ ہو، تو تو ملامت نہ کرنا، یعنی ان الفاظ سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کا دِل یہ چاہتا تھا کہ محبت اور میلانِ قلبی میں بھی برابری ہو، لیکن چونکہ یہ انسان کے بس کی بات نہیں، کسی کی طرف کم میلان ہو کسی کی طرف زیادہ ہو، یہ ہوتا رہتا ہے۔ ایک ہی طرف جس طرح سے چاہے میلان پیدا کر لے، یہ انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ تو اس لئے دُعا فرماتے تھے کہ یا اللہ! یہ تیرے بس کی بات ہے میرے بس کی بات نہیں ہے، طبعی محبت انسان کے لیے اختیاری نہیں ہے۔ لیکن اس دُعا سے یہ اشارہ ضرور نکلتا ہے کہ آپ کا دِل چاہتا تھا کہ قلبی تعلق بھی سب کے ساتھ برابر ہو، لیکن یہاں آ کے پھر انسان کے اِختیارات ختم ہو جاتے ہیں۔ اتنی آپ نے برابری کی، اور آخر وقت تک۔ صرف مرضِ وفات باقی بیویوں سے اجازت لے کے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں قیام کیا تھا۔ تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ: جس کو چاہیں آپ ان عورتوں میں سے پیچھے ہٹا دیں اسے مؤخر کر دیں، وَتُـْٔوِیْٓ اِلَیْکَ مَنْ تَشَآءُ: جس کو چاہیں آپ اپنی طرف ٹھکانا دیں۔ اور وَمَنِ ابْتَغَیْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ: جن عورتوں کو آپ علیحدہ کر دیں یعنی ان کو باری نہیں دی، ان میں سے پھر کسی عورت کو آپ طلب کرنا چاہیں، فَلَا جُنَاحَ عَلَیْکَ: تو بھی آپ پہ گناہ نہیں ہے۔

حضور ﷺ کے حق میں باری کے عدمِ وجوب کی حکمت

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ جو ہم نے حکم نازل کر دیا کہ آپ کے ذِمّے کوئی باری نہیں، اس میں ایک تو آپ کے لئے وسعت ہوگئی، اور دوسرا اس میں ان عورتوں کا بھی فائدہ ہے، کہ جو کچھ آپ ان کے ساتھ برتاؤ کریں گے، جو کچھ آپ انہیں دیں گے، وہ خوش رہیں گی، اور ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی۔ بظاہر معلوم یوں ہوتا ہے کہ عورتوں کو تو اس میں نقصان ہے، ان کی آنکھیں ٹھنڈی کس طرح سے ہوں گی؟ لیکن اگر آپ غور فرمائیں تو مطلب واضح ہے۔ خاوند اور بیوی کے درمیان میں جو رنجش کی صورتیں پیدا ہوا کرتی ہیں، اس میں زیادہ تر دخل اس بات کا ہوا کرتا ہے کہ عورت یہ سمجھتی ہے کہ میرا حق ہے خاوند کے ذِمّے جو خاوند

(۱) ترمذی ۲۱۷/۱ باب ما جاء فی التسویۃ بین الضرائر۔ مشکوۃ ۲۷۹/۲ باب القسم فصل ثانی۔

ادا نہیں کرتا، استحقاق کی بنا پر آپس میں رنجش آتی ہے۔ اختلاف یہی ہوتا ہے کہ میرا حق ہے، یہ ادا کیوں نہیں کرتا۔ تو مطالبۂ حقوق کی صورت پیدا ہو جانے کے بعد آپس میں کشاکشی ہوتی ہے۔ اور اگر کسی شخص کے ذہن میں یہ ڈال دیا جائے کہ "تیرا تو حق ہی کوئی نہیں!" اس لئے وہ تھوڑا دے دیں، زیادہ دے دیں، جیسا برتاؤ کریں، ان کا فضل ہی فضل، ان کا کرم ہی کرم ہے، تو پھر جو بھی برتاؤ ہوگا انسان اس کے اُوپر شکریہ ادا کرتا ہے۔ اگر آپ حق سمجھیں کہ ہمارا حق دوسرے کے ذِمے ہے اور مطالبۂ حقوق کی نوبت آ جائے، یقیناً کشاکشی ہو جائے گی، اور اگر آپ کے ذہن میں یہ ہے کہ ہمارا تو حق ہی کوئی نہیں، تو کشاکشی کی نوبت ہی نہیں آسکتی۔ تو اس لئے ان عورتوں کے ذہن میں یہ بات ڈال دی گئی کہ اللہ کے رسول کے ذِمّے تمہارا کوئی حق نہیں ہے، وہ جو چاہیں تمہیں دیں، جو چاہیں نہ دیں۔ اور تمہیں اپنے پاس بُلائیں، ٹھکانا دیں نہ دیں، یہ ان کی اپنی مرضی پہ ہے۔ جب یہ بات ان کے ذہن میں آ جائے گی تو شکایت کی نوبت نہیں آسکتی...... چنانچہ نفقے کے بارے میں بھی پیچھے معاملہ صاف کر دیا گیا کہ عورتوں کو کہہ دیا گیا کہ تمہیں کوئی حق نہیں کہ تم وسعت کے ساتھ نفقہ طلب کرو۔ اس لئے فقر فاقہ مسکنت جو کچھ بھی اللہ کے رسول کے گھر میں پیش آئے ٹھیک ہے، جو تھوڑا بہت مل گیا، اسی پر ہی شکریہ ادا کرو۔ یہ ہے ان کے آنکھوں کے ٹھنڈے ہونے کی صورت۔ جب ان حقوق ختم کر دیے گئے تو رسول اللہ ﷺ سے نہ مطالبۂ حقوق ہوگا، نہ آپس میں کشاکشی ہوگی، تو ان کے لئے بھی آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ہے تاکہ ان کو غم نہ ہو، کوئی صدمہ نہ ہو، بلکہ منتظر رہیں، کہ جو برتاؤ ہو جائے بس وہی ان کا فضل ہی فضل اور کرم ہی کرم ہے، شکایت کی نوبت نہیں آئے گی۔ اور حضور ﷺ کے لئے بھی وسعت ہوگئی۔

حضور ﷺ نے باری کی قانونی رُخصت سے فائدہ نہیں اُٹھایا

تو یہ قانونی طور پر ایک بات نازل کر دی گئی، لیکن حضور ﷺ نے اس قانون سے فائدہ نہیں اُٹھایا، یہ رعایت جو دی گئی ہے اس سے عملاً فائدہ نہیں اُٹھایا، بلکہ اپنے آپ کو انہی قواعد کا پابند رکھا ہے، جو عامہ مؤمنین کے لئے دیے گئے تھے، کہ باری دیتے تھے، نفقے کا خیال کرتے تھے، جتنی آپ کے پاس حیثیت تھی اس کے مطابق اپنی بیویوں کی رعایت رکھتے تھے، بہت اچھی طرح سے پیش آتے تھے۔ فرمایا کہ تم میں سے اچھا آدمی وہی ہے جو اپنی بیوی کے حق میں اچھا ہو، اور میں تم سب سے اپنی بیویوں کے حق میں اچھا ہوں۔[1] کیونکہ وہ زمانہ ایسا تھا کہ لوگ اپنی بیویوں کے حقوق تلف کرتے تھے، ان کے اُوپر ظلم وستم کرتے تھے، ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی آیات کے تحت، جیسا کہ قرآنِ کریم میں بہت ساری آیات میں ان کا ذِکر آیا، روایات میں بھی آیا، تو آپ ﷺ اس طرح سے عورتوں کی حیثیت کو نمایاں کرتے تھے، عورتوں کے ساتھ محبت کا اظہار بھی آپ نے بہت کیا، اور ان کے ساتھ اچھے برتاؤ کی تاکید بھی بار بار کی، اور آپ کی زندگی بھی عملی نمونہ تھی۔ تو یہ محض ایک قانونی درجے کی بات ہوگئی جس کی بنا پر جھگڑے کی نوبت نہ آئے، آپس میں شکوے شکایت کی نوبت نہ آئے، ورنہ حضور ﷺ نے اس وسعت سے فائدہ نہیں اُٹھایا، آپ ﷺ ان کو با قاعدہ باری دیتے رہے ہیں۔

---

(۱) ترمذی ۲/۲۲۸، باب فضل ازواج النبی۔ مشکوۃ ۲/۲۸۱، باب عشرۃ النساء، فصل ثانی۔ ولفظ الحدیث: خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهٖ وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي

''مؤخر کردیں آپ جس کو چاہیں ان عورتوں میں سے، اور ٹھکانا دے دیں اپنی طرف جس کو چاہیں'' وَمَنْ عَزَلْتَ: جن عورتوں کو آپ نے علیحدہ کر دیا ان میں سے جس کو آپ طلب کریں، تو آپ پر کوئی گناہ نہیں۔ یہ بات زیادہ قریب ہے اس کے کہ ٹھنڈی ہوں گی ان عورتوں کی آنکھیں، اور یہ غمزدہ نہیں ہوں گی، اور راضی ہوجائیں گی یہ سب اس چیز کے ساتھ جو آپ ان کو دے دیں۔ اسی پر یہ راضی رہیں گے، ان کو کوئی صدمہ نہیں ہوگا، حزن نہیں ہوگا، اور ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی، شکوہ شکایت کی نوبت نہیں آئے گی۔ ''اللہ تعالیٰ جانتا ہے ان باتوں کو جو تمہارے قلوب میں ہیں۔'' یہ عام طور پر ذکر کر دیا، جس میں ایک یہ مقصد بھی ہے جیسے ''بیان القرآن'' میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے واضح فرمایا کہ عام مسلمین اس بارے میں حضور ﷺ پر کوئی رشک یا حسد کی نگاہ نہ ڈالیں کہ آپ کے لئے اتنی مراعات کر دی گئیں، ہمارے لئے کیوں نہیں ہیں، دِل کے اندر اس قسم کے وسوسے نہیں آنے چاہئیں، اگر ایسی کوئی بات آئے گی تو اللہ کے علم میں ہے۔ بیویوں کو بھی تاکید ہوگئی کہ حضور ﷺ کے متعلق اچھے جذبات رکھیں، کوئی شکوہ شکایت نہ کی نوبت نہ آئے، دل کے اندر اس قسم کی بات آئے گی تو اللہ تعالیٰ سے وہ مخفی نہیں ہے، ''اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے بُردبار ہے۔'' بردبار ہونے کا ذکر اس لئے کر دیا جاتا ہے کہ علم تو ہے کہ تمہارے دِلوں کے اندر کوئی غلط بات آئی، لیکن ضروری نہیں کہ اس کے اُوپر فوراً گرفت کر لی جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ حلیم بھی ہے، بُردبار ہونے کی وجہ سے تاخیر کر دی جاتی ہے۔

''لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ'' کے دو مفہوم

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ: آپ کے لئے عورتیں حلال نہیں، مِنْۢ بَعْدُ: ان کے بعد، جو عورتیں آپ کے نکاح میں آگئیں ان کے بعد اور عورتیں آپ کے لیے حلال نہیں، ایک مطلب یہ ہے، بعض مفسرین نے یہی ذکر کیا، اور اس کا مطلب پھر یہ ہوگا کہ جب حضور ﷺ نے اپنی بیویوں کو اختیار دیا تھا، جیسا کہ آپ کے سامنے پچھلے پارے کے اِختتام پر آیا تھا، اور بیویوں نے رسول اللہ ﷺ کو اِختیار کیا، دُنیا کی زیب وزینت کو لات ماردی کہ ہمیں دُنیا کی زیب وزینت نہیں چاہیے، ہم تو اللہ، اللہ کے رسول اور دارِ آخرت کو چاہتی ہیں۔ تو جب انہوں نے پابند کر لیا اپنے آپ کو حضور ﷺ کے ساتھ، تو حضور ﷺ کو بھی ان عورتوں کے ساتھ پابند کر دیا گیا، کہ آپ ﷺ بھی انہی کے ساتھ گزارہ کریں، ان کے علاوہ کسی اور عورت سے آپ شادی نہ کریں، ان مفسرین کے مطابق اس آیت کا مطلب یہ ہوگا، گویا کہ ان کے اس ایثار اور اس جذبے کی قدر یہ کی گئی کہ رسول اللہ ﷺ کو بھی پابند کر دیا گیا کہ ان کے علاوہ کسی اور کے ساتھ نکاح نہ کریں۔ ایک رائے مفسرین کی یہ ہے (عام تفاسیر)۔

اور دُوسری رائے یہی ہے کہ مِنْۢ بَعْدُ کا مطلب یہ ہے کہ اَصناف مذکورہ، عورتوں کی جو قسمیں ذِکر کر دی گئی ہیں ان کے علاوہ آپ کسی اور سے نکاح نہ کریں، آپ کے لئے حلال نہیں۔ اس لئے اگر باپ کے خاندان میں شادی کرنا چاہتے ہیں تو اس کے ساتھ مہاجر ہونے کا اور مؤمنہ ہونے کا لحاظ رکھیں، والدہ کے خاندان میں شادی کرنا چاہیں تو آپ کے لیے حلال ہے لیکن مہاجرہ، مؤمنہ ہونے کی رعایت رکھی جائے، تو مِنْۢ بَعْدُ کا مطلب یہ ہوگا کہ اَصناف مذکورہ کے علاوہ کوئی دوسری عورت آپ کے لئے حلال نہیں۔ تو یہ نو کی پابندی نہیں، اس سے زیادہ بھی آپ نکاح کر سکتے ہیں، لیکن ان قیود کی رعایت رکھنی ضروری ہے (ابنِ کثیر وغیرہ)۔

''اور یہ بھی آپ کے لئے حلال نہیں کہ ان بیویوں کو کسی اور بیوی کے ساتھ بدلیں''، یعنی اس نیت کے ساتھ طلاق دیں کہ میں اس کی جگہ فلاں عورت کو لے لوں، اس جذبے کے تحت طلاق دینی دُرست نہیں ہے۔ تبدل کی نیت کے ساتھ طلاق دینی دُرست نہیں، اور بغیر نیتِ تبدل کے اگر آپ طلاق دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں۔ جس طرح سے بعض روایات میں مذکور ہے کہ ایک دفعہ حضور ﷺ نے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دینے کا ارادہ فرمایا تھا۔[1] تو وہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان بیویوں کو طلاق دینا حضور ﷺ کے لئے جائز تھا، لیکن تبدل کی نیت سے نہیں۔ ''اگرچہ دوسری عورتیں آپ کو کتنی ہی اچھی لگیں'' ان کا حُسن آپ کو پسند ہو، اچھی لگیں، کیونکہ یہ تو ایک طبعی چیز ہے کہ خوبصورت چیز کی طرف میلان ہوتا ہے، جتنا انسان کے حواس صحیح ہوں گے، جتنا ذوق اچھا ہوگا، جتنی اچھی چیز ہوگی، اس کی طرف میلان ہوتا ہے، لیکن میلان ہونے کے باوجود کسی عورت کے پسند آنے کے باوجود بھی آپ ان بیویوں میں سے کسی کے بدلے میں اس کو نہیں لے سکتے۔ ہاں! البتہ اگر وہ ان قیود کے تحت آتی ہے ان شرطوں کے تحت آتی ہے، تو آپ نئے سرے سے نکاح کر سکتے ہیں۔ تبدل کی اجازت نہیں ہے، نکاح کرنے کی اجازت ہے، مزید نکاح کیا جا سکتا ہے، جس طرح سے مفسرین کی دُوسری رائے ذکر کی۔ ''نہیں حلال آپ کے لئے کہ آپ بدلیں ان کے ساتھ اور بیویوں کو، اگرچہ ان کا حُسن آپ کو اچھا ہی لگے'' اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ: لیکن اس ضابطے سے آپ کی باندی مستثنیٰ ہے، اس کے متعلق یہ بات نہیں ہے، اس کو بدل بھی سکتے ہیں، بیچ بھی سکتے ہیں، چھوڑ بھی سکتے ہیں، باندیوں کے متعلق یہ پابندیاں نہیں ہیں۔ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا: اللہ تعالیٰ ہر چیز کے اوپر نگہبان ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّاۤ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ
اے ایمان والو! نبی کے گھر میں داخل نہ ہوا کرو، مگر یہ کہ تم کو اجازت دی جائے کھانے کی طرف، نہ
نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ ۙ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا
انتظار کرنے والے ہو تم اس کے پکنے کا، لیکن جس وقت تم بلائے جاؤ تو داخل ہو جایا کرو، پھر جب تم کھا چکو تو منتشر ہو جایا کرو، اور نہ
مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ ۫ وَاللّٰهُ لَا
بیٹھے رہا کرو اس حال میں کہ تم اُنس پکڑنے والے ہو بات کے ساتھ، بے شک یہ بات نبی کو تکلیف دیتی ہے پھر وہ تم سے شرماتے ہیں، اور اللہ

(۱) ترمذی ۲/ ۱۳۴، کتاب التفسیر، سورۃ المائدۃ سے تھوڑا سا پہلے۔

يَسۡتَحۡيٖ مِنَ الۡحَقِّ‌ؕ وَاِذَا سَاَلۡتُمُوۡهُنَّ مَتَاعًا فَسۡـَٔـلُوۡهُنَّ مِنۡ وَّرَآءِ حِجَابٍ‌ؕ

حق بات سے نہیں شرماتا، اور جس وقت تم سوال کرو ان عورتوں سے کسی سامان کا تو مانگا کرو ان سے پردے کے پیچھے سے،

ذٰ لِكُمۡ اَطۡهَرُ لِقُلُوۡبِكُمۡ وَقُلُوۡبِهِنَّ‌ؕ وَمَا كَانَ لَـكُمۡ اَنۡ تُؤۡذُوۡا رَسُوۡلَ

یہ بات زیادہ پاکیزگی کا باعث ہے تمہارے دلوں کے لئے اور ان عورتوں کے دلوں کے لئے، اور نہیں ہے جائز تمہارے لئے کہ تم تکلیف پہنچاؤ اللہ کے

اللّٰهِ وَلَاۤ اَنۡ تَـنۡكِحُوۡۤا اَزۡوَاجَهٗ مِنۡۢ بَعۡدِهٖۤ اَبَدًا‌ ؕ اِنَّ ذٰ لِكُمۡ كَانَ عِنۡدَ اللّٰهِ عَظِيۡمًا ۞ اِنۡ

رسول کو اور نہ یہ کہ تم نکاح کرو اس کی بیویوں کے ساتھ اس کے بعد کبھی بھی، بے شک یہ بات اللہ کے نزدیک بہت بڑی ہے ۞ اگر

تُبۡدُوۡا شَيۡــًٔـا اَوۡ تُخۡفُوۡهُ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمًا ۞ لَا جُنَاحَ عَلَيۡهِنَّ فِىۡۤ

تم ظاہر کرو کسی چیز کو یا تم اس کو چھپاؤ پس بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے ۞ نہیں ہے کوئی گناہ ان عورتوں پر

اٰبَآئِهِنَّ وَلَاۤ اَبۡنَآئِهِنَّ وَلَاۤ اِخۡوَانِهِنَّ وَلَاۤ اَبۡنَآءِ اِخۡوَانِهِنَّ

ان کے آباء کے بارے میں اور نہ ان کے بیٹوں کے بارے میں اور نہ ان کے بھائیوں کے بارے میں، اور نہ ان کے بھائیوں کے بیٹوں کے بارے میں

وَلَاۤ اَبۡنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَلَا نِسَآئِهِنَّ وَلَا مَا مَلَـكَتۡ اَيۡمَانُهُنَّ‌ ۚ

اور نہ بہنوں کے بیٹوں کے بارے میں اور نہ اپنی ملنے جلنے والی عورتوں کے بارے میں اور نہ ان کے بارے میں جن کے مالک ہیں ان کے دائیں ہاتھ،

وَاتَّقِيۡنَ اللّٰهَ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدًا ۞ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوۡنَ

اور تم اللہ سے ڈرتی رہو، بے شک اللہ ہر چیز کا مشاہدہ کرنے والا ہے ۞ بے شک اللہ اور اُس کے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں

عَلَى النَّبِىِّ‌ ؕ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا صَلُّوۡا عَلَيۡهِ وَسَلِّمُوۡا تَسۡلِيۡمًا ۞ اِنَّ الَّذِيۡنَ

نبی پر، اے ایمان والو! تم بھی اس نبی کے اُوپر رحمت بھیجو اور سلام پیش کرو ۞ بے شک وہ لوگ جو

يُؤۡذُوۡنَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمۡ عَذَابًا

اللہ اور اللہ کے رسول کو تکلیف پہنچاتے ہیں اللہ نے اُن کے اُوپر لعنت کی دُنیا اور آخرت میں، اور ان کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب

مُّهِيۡنًا ۞ وَالَّذِيۡنَ يُؤۡذُوۡنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ بِغَيۡرِ مَا اكۡتَسَبُوۡا فَقَدِ

تیار کیا ۞ اور وہ لوگ جو کہ تکلیف پہنچاتے ہیں ایمان والے مردوں کو اور ایمان والی عورتوں کو بغیر کسی ایسے کام کے جو انہوں نے کیا ہو، پس تحقیق

احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۵۸﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ

انہوں نے اُٹھایا بہتان اور صریح گناہ ﴿۵۸﴾ اے نبی! کہہ دو اپنی بیویوں سے اور اپنی بیٹیوں سے اور مؤمنوں کی عورتوں سے

يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ؕ وَكَانَ

قریب کرلیا کریں اپنے اُوپر سے اپنی چادروں کو، یہ زیادہ قریب ہے اس بات کے کہ وہ پہچانی جائیں گی پھر وہ تکلیف نہیں پہنچائی جائیں گی، اور

اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۵۹﴾ لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ

اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے ﴿۵۹﴾ اگر نہیں باز آئیں گے منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے

وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ

اور وہ لوگ جو مدینہ میں جھوٹی افواہیں پھیلانے والے ہیں، ہم آپ کو ان پر برانگیختہ کردیں گے، پھر یہ آپ کے ساتھ نہیں رہ سکیں گے

فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۰﴾ مَّلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا

مدینہ میں مگر بہت تھوڑا وقت ﴿۶۰﴾ اس حال میں کہ وہ لعنت کئے ہوئے ہوں گے جہاں کہیں پائے جائیں گے پکڑ لئے جائیں گے اور خوب اچھی طرح

تَقْتِيْلًا ﴿۶۱﴾ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿۶۲﴾

سے قتل کئے جائیں گے ﴿۶۱﴾ اللہ کا طریقہ ہے ان لوگوں کے بارے میں جو پہلے گزرے ہیں، اور نہیں پائیں گے آپ اللہ کے طریقے کے لئے کوئی تبدیلی ﴿۶۲﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق بعض الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: اے ایمان والو! لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ: نبی کے گھر میں داخل نہ ہوا کرو اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ: مگر یہ کہ تم کو اجازت دی جائے کھانے کی طرف، غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ: نہ انتظار کرنے والے ہو تم اس کھانے کے پکنے کا، وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ: لیکن جس وقت تم بُلائے جاؤ، فَادْخُلُوْا: تو داخل ہوجایا کرو۔ فَاِذَا طَعِمْتُمْ: پھر جس وقت تم کھانے سے فارغ ہوجاؤ، فَانْتَشِرُوْا: تو منتشر ہوجایا کرو۔ جب تم کھا چکو تو منتشر ہوجایا کرو۔ وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ: اَیْ لَا تَجْلِسُوْا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ (تفسیر ابن عباس)۔ استیناس: اُنس پکڑنا، دِل لگانا۔ باتوں کے ساتھ دِل لگا کر بیٹھے نہ رہا کرو، نہ بیٹھے رہا کرو اس حال میں کہ تم دِل لگانے والے ہو بات کے ساتھ۔ باتوں میں جی لگا کر نہ بیٹھے رہا کرو۔ "لَا تَجْلِسُوْا" محذوف ہے اور مُسْتَاْنِسِيْنَ اس کی ضمیر سے حال واقع ہوجائے گا۔ نہ بیٹھا کرو تم اس حال میں کہ تم اُنس پکڑنے والے ہو بات کے ساتھ۔ اور حاصل یہی ہے کہ باتوں میں دِل لگا کے نہ بیٹھ جایا کرو۔ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ: بے شک یہ بات نبی کو تکلیف دیتی ہے فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ پھر وہ تم سے شرماتے ہیں، وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ: اور اللہ تعالیٰ حق بات سے نہیں شرماتا۔ استحیاء کے اندر یہاں لحاظ رکھنے والا معنی ہے۔ یعنی

وہ تمہارا لحاظ رکھتے ہیں، تمہیں کچھ کہتے نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ حق بات سے کسی کا لحاظ نہیں رکھتا۔ وَ اِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ: اور جس وقت تم سوال کروان عورتوں سے، مَتَاعًا کسی سامان کا، فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ: تو مانگا کروان سے پردے کے پیچھے سے، ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَ قُلُوْبِهِنَّ: یہ بات زیادہ پاکیزگی کا باعث ہے تمہارے دلوں کے لئے، اور ان عورتوں کے لئے، وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا: اور نہیں ہے تمہارے لئے کہ تم تکلیف پہنچاؤ اللہ کے رسول کو، اور نہ یہ بات تمہارے لئے جائز ہے کہ تم نکاح کرو اس کی بیویوں سے ساتھ اس نبی کے بعد کبھی بھی، اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا: بے شک یہ بات اللہ کے نزدیک بہت بڑی ہے۔ ذٰلِكُمْ سے مراد ایذائے نبی یا سرورِ کائنات ﷺ کی وفات کے بعد آپ کی بیویوں سے نکاح کرنا۔ تم اس کو ہلکی چیز نہ سمجھو، اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑی بات ہے۔ اِنْ تُبْدُوْا شَيْـًٔا اَوْ تُخْفُوْهُ: اور اگر تم ظاہر کرو کسی چیز کو یا تم اس کو چھپاؤ، فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا: پس بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْٓ اٰبَآئِهِنَّ: نہیں کوئی گناہ ان عورتوں پر ان کے آباء کے بارے میں، یعنی اپنے باپوں کے سامنے وہ آسکتی ہیں، ان سے کوئی حجاب نہیں۔ نہیں کوئی گناہ ان عورتوں پر ان کے آباء کے بارے میں اور نہ ان کے بیٹوں کے بارے میں، اور نہ ان کے بھائیوں کے بارے میں، اور نہ ان کے بھائیوں کے بیٹوں کے بارے میں یعنی بھتیجوں کے بارے میں، اور نہ بہنوں کے بیٹوں کے بارے میں یعنی بھانجوں کے بارے میں، وَلَا نِسَآئِهِنَّ: اور نہ اپنی ملنے جلنے والی عورتوں کے بارے میں، وَلَا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ: اور نہ ان کے بارے میں جن کے مالک ہیں ان کے دائیں ہاتھ، وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ: اور تم اللہ سے ڈرتی رہو، یہ خطاب عورتوں کو ہے۔ اے عورتو! تم اللہ سے ڈرتی رہو! اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا: بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کے اُوپر حاضر ہے، نگہبان ہے، ہر چیز کو دیکھنے والا ہے، مشاہدہ کرنے والا ہے، ہر چیز اللہ کے سامنے ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ: بے شک اللہ اور اس کے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں نبی پر۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا: اے ایمان والو! تم بھی اس نبی کے اُوپر رحمت بھیجو اور سلام پیش کرو۔ ایک دفعہ درود شریف پڑھ لیجئے! ''اللّٰهم صلِّ وسلِّمْ وبارِكْ على سيّدِنا محمدٍ وآلِه وصَحْبِه كما تُحِبُّ وَتَرْضى عددَ مَا تُحِبُّ وَتَرْضى'' اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ: بے شک وہ لوگ جو اللہ اور اللہ کے رسول کو تکلیف پہنچاتے ہیں، لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ: اللہ تعالیٰ نے اُن کے اوپر لعنت کی دنیا اور آخرت میں، وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا: اور ان کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کیا، وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ: اور وہ لوگ جو کہ تکلیف پہنچاتے ہیں ایمان والے مردوں کو اور ایمان والی عورتوں کو، بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا بغیر کسی ایسے کام کے جو انہوں نے کیا ہو، فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا: پس تحقیق انہوں نے اُٹھایا بہتان اور صریح گناہ، یعنی یہ بہتان اور صریح گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ: اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دو، اور اپنی بیٹیوں سے کہہ دو، اور مؤمنوں کی عورتوں سے کہہ دو۔ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ: جلابیب جلباب کی جمع ہے۔ جلباب لمبی چادر کو کہتے ہیں، بڑی چادر کو جس کے اندر بدن چھپایا جاتا ہے۔ اَدْنٰى يُدْنِيْ اِدناء قریب کرنے کو کہتے ہیں۔ تو يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ قریب کر لیا کریں اپنے اُوپر سے اپنی چادروں کو، لفظی معنی یہ بنتا ہے۔ اور مطلب اس کا یہ ہے کہ وہ جلابیب جس کو یہ سر سے لے کر پاؤں تک اوڑھتی ہیں، ان کو اپنے چہروں کے اُوپر قریب کر لیا کریں، آگے کو وہ لٹکالی، جس کو ہمارے ہاں گھونگٹ نکالنا کہتے ہیں۔ اپنی چادریں سر پر سے اپنے

چہرے کی طرف قریب کرلیا کریں، یعنی چہروں پر لٹکالیا کریں۔ ذٰلِكَ اَدۡنٰۤی اَنۡ یُّعۡرَفۡنَ فَلَا یُؤۡذَیۡنَ: یہ زیادہ قریب ہے اس بات کے کہ وہ پہچانی جائیں گی پھر وہ تکلیف نہیں پہنچائی جائیں گی۔ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا: اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے۔

لَئِنۡ لَّمۡ یَنۡتَهِ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَالَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ: اگر نہیں باز آئیں گے منافق۔ نہی یَنۡهٰی: روکنا۔ اِنۡتَهٰی یَنۡتَهِیۡ: رُکنا۔ اگر نہیں باز آئیں گے منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے، وَّالۡمُرۡجِفُوۡنَ فِی الۡمَدِیۡنَةِ: مرجفون یہ لفظ ارجاف سے لیا گیا ہے، اور اَرۡجَفَ اِرۡجَافًا کا معنی ہوتا ہے: دہشت پھیلانا یعنی دہشت انگیز خبریں پھیلانا، افواہیں اُڑانا جس سے لوگوں کے اندر دہشت وحشت پھیلے۔ اگر یہ دہشت پھیلانے والے، مدینہ منورہ میں جھوٹی باتیں پھیلانے والے باز نہیں آئیں گے، یہ بھی لَمۡ یَنۡتَهِ کا فاعل ہے۔ الۡمُنٰفِقُوۡنَ بھی فاعل ہے، اور الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ بھی فاعل ہے، الۡمُرۡجِفُوۡنَ فِی الۡمَدِیۡنَةِ بھی لَمۡ یَنۡتَهِ کا فاعل ہے۔ اگر نہیں باز آئیں گے منافق اور وہ لوگ جن کے دِلوں میں بیماری ہے، اور وہ لوگ جو کہ مدینہ میں جھوٹی افواہیں پھیلانے والے ہیں، لَنُغۡرِیَنَّكَ بِهِمۡ: لَنُغۡرِیَنَّكَ یہ لفظ اغراء سے لیا گیا ہے، اَغۡرٰی یُغۡرِیۡ: برانگیختہ کرنا، اُکسانا، بھڑکانا۔ ہم آپ کو ان پر برانگیختہ کردیں گے، اُکسادیں گے۔ کیا مطلب؟ کہ اس وقت تک تو ہم صفح اور عفو کی تلقین کر رہے ہیں کہ ان سے درگزر کرو، انہیں معاف کردو، ان کے ساتھ نرمی کا معاملہ اختیار کرو۔ پھر ہم آپ کو ان کے اُوپر مسلط کردیں گے، سختی کرنے کے لئے کہہ دیں گے۔ ثُمَّ لَا یُجَاوِرُوۡنَكَ فِیۡهَاۤ: یُجَاوِرُوۡنَكَ: یہ مجاورت سے ہے، جَاوَرَ مُجَاوَرَةً: کسی کے پڑوس میں رہنا۔ پھر یہ آپ کے ساتھ نہیں رہ سکیں گے مدینہ میں، اِلَّا قَلِیۡلًا: مگر بہت تھوڑا وقت۔ مَّلۡعُوۡنِیۡنَ: اس حال میں کہ وہ لعنت کئے ہوئے ہوں گے، پھٹکارے ہوئے ہوں گے، اَیۡنَمَا ثُقِفُوۡۤا: جہاں کہیں پائے جائیں گے اُخِذُوۡا: پکڑ لئے جائیں گے، وَقُتِّلُوۡا تَقۡتِیۡلًا: اور خوب اچھی طرح سے قتل کئے جائیں گے۔ قَتَّلَ باب تفعیل ہے جو مبالغہ پر دلالت کرتا ہے۔ سُنَّةَ اللّٰهِ فِی الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلُ: اللہ تعالیٰ کا طریقہ ہے ان لوگوں کے بارے میں جو پہلے گزرے ہیں۔ وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبۡدِیۡلًا: اور نہیں پائیں گے آپ اللہ کے طریقے کے لئے کوئی تبدیلی۔

ماقبل سے ربط

شروع سورت سے یہ مضمون مشترکہ چلا آرہا ہے، کہ سرورِ کائنات ﷺ کے آداب بیان کئے جارہے ہیں، آپ کی محبوبیت، منصوریت کو نمایاں کیا جارہا ہے، اور خصوصیت سے یہ تاکید کی جارہی ہے ہر کسی کو، کہ نبی ﷺ کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ نہ کریں جو ان کے لئے باعثِ تکلیف ہو، یا آپ کے لئے اُذیت کا باعث ہو۔ یہ آیات جو آپ کے سامنے پڑھی گئیں ان کا تعلق بھی اسی مضمون سے ہے۔

شانِ نزول

ان آیات کے شانِ نزول میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ جب سرورِ کائنات ﷺ نے زینب رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کیا، جن کا واقعہ

اسی سورت میں آپ کے سامنے گزرا۔ اس نکاح کے بعد آپ نے ولیمہ کی دعوت کی، اور بہت اہتمام کے ساتھ کی تھی، اتنے اہتمام کے ساتھ کسی بیوی کا ولیمہ نہیں کیا جتنے اہتمام کے ساتھ ان کا ولیمہ کیا تھا، کیونکہ جن حالات میں نکاح ہوا تھا، تو ضرورت بھی تھی کہ ان کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی کی جائے، اور اس نکاح کی تشہیر کی جائے، تاکہ وہ رسم بد دُنیا سے مٹ جائے، جو اپنے متبنّیٰ کے بارے میں جاہلیت سے چلی آرہی تھی۔ تو حضور ﷺ نے دعوت جو کی، تو لوگوں کو بلایا۔ اس وقت تک پردے کا حکم نہیں آیا تھا۔ لوگ حضور ﷺ کے گھر میں آجایا کرتے تھے، گھر آکے بیٹھ جاتے، تو اس موقع پر بھی کچھ لوگ آئے، اور آکے گھر میں بیٹھ گئے۔ کھانا کھانے کے بعد وہیں بیٹھ کے جس طرح سے ایک مجلس لگ جاتی ہے، کھانے سے فارغ ہونے کے بعد آپس میں باتیں کرنے لگ گئے۔ سرورِ کائنات ﷺ خلوت چاہتے تھے کہ اب یہ قصہ ختم ہو، یہ لوگ اُٹھ کے چلے جائیں، لیکن ان کی اِدھر توجہ نہ ہوئی۔ آپ ﷺ گھر سے باہر تشریف لے گئے، کہ شاید میرے جانے کی وجہ سے یہ لوگ اُٹھ کے چلے جائیں گے۔ بیویوں کے حجروں کے سامنے گئے، جا کے ان کا حال چال پوچھا، ''السلام علیکم'' کہا، انہیں دُعا دی، اور بیویوں نے بھی آگے سے دُعا دی، جس طرح سے حضور ﷺ کی عادتِ شریفہ تھی، پھر بعد میں آئے تو دیکھا تو ابھی بھی چند آدمی بیٹھے تھے، اور وہ اُٹھ کے نہیں گئے۔ آپ ﷺ پھر کو باہر تشریف لے گئے، حضرت اَنس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھے اس سے بڑی تکلیف پہنچ رہی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کس طرح سے بے چین پھر رہے ہیں، اور یہ لوگ سمجھ نہیں رہے۔ پھر ان کو خیال آگیا ہوگا تو پھر وہ اُٹھ کے چلے گئے، تو حضرت اَنس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے جا کے بتایا کہ یارسول اللہ! وہ لوگ اُٹھ کے چلے گئے ہیں، تو آپ ﷺ گھر میں تشریف لائے۔ تو جس وقت گھر میں داخل ہوئے ہیں، تو اس وقت یہ آیات اُتریں، اور حضور ﷺ نے پھر مجھے بھی اندر نہیں آنے دیا، بلکہ میرے سامنے پردہ کھینچ لیا، ایک پاؤں اندر تھا اور ایک باہر تھا، میں آپ کے پیچھے تھا، اور اسی وقت رسول اللہ ﷺ نے پردہ کھینچ دیا، اور یہ آیات آگئیں جن میں بیویوں کو لوگوں سے پردہ کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ بخاری شریف کے اندر یہ قصہ متعدد روایات میں ذکر کیا گیا ہے۔[1] حاصل ان کا یہی ہے جو میں نے آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ تو پہلی آیات کے اندر یہی مضمون ذکر کیا گیا۔

حضور ﷺ کے گھر کے آداب

پہلے تو یہ کہہ دیا گیا کہ اے ایمان والو! نبی کے گھروں میں جایا نہ کرو، جس طرح سے پہلے لوگ عادت کے طور پر چلے جاتے تھے، اب اجازت ہو تو جاؤ، ورنہ جاؤ ہی نہ۔ اور اگر تمہیں کسی دعوت کے موقع پر کھانے کے لیے بلایا جائے تو جاؤ، بغیر بلائے جایا نہ کرو، اور اگر دعوت تمہاری کر دی جائے تو پھر یہ طریقہ اختیار نہ کرنا کہ چونکہ دعوت دے دی گئی، بلا لیا گیا تو جا کے قبل از وقت ہی بیٹھ جاؤ، اور کھانے کے پکنے کا انتظار کرو، کیونکہ اس میں بھی صاحبِ خانہ کو تکلیف ہوتی ہے۔ بلکہ ایسے موقع پر جاؤ کہ جس وقت کھانا تیار ہو گیا ہو، اور تمہیں جا کے انتظار نہ کرنا پڑے۔ اور پھر کھانا کھانے کے بعد وہاں دِل لگا کے نہ بیٹھ جایا کرو، کہ باتیں کرنے لگ گئے، آپس میں مجلس لگالی، بلکہ کھانا کھاتے ہی منتشر ہو جایا کرو۔ تمہارا قبل اَز وقت چلے جانا اور جا کے وہاں انتظار میں بیٹھنا، یا

---

(۱) بخاری ۲/۷۰۶، ۲/۷۷۶، ۲/۹۳۲، ۲/۹۳۸۔

کھانا کھا کے وہاں بیٹھے رہنا اور مکان کو خالی نہ کرنا، یہ بات نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے ناگواری کا باعث ہے، آپ کے لئے باعثِ تکلیف ہے۔ لیکن ان کی یہ خوش اخلاقی ہے، ان کی یہ مروّت ہے، ان کی طبیعت میں تمہارا لحاظ ہے کہ تمہیں وہ کچھ کہتے نہیں، خود تکلیف برداشت کر لیتے ہیں۔ جس طرح سے آپ نے دیکھا ہوگا کہ کوئی مہمان اگر آیا ہوا ہو، تو اس کی کوئی بات ناگوار گزرے تو صاحبِ خانہ برداشت کرتا ہے، کہتا نہیں، کہ یہ مہمان ہے، اب اس کو کیا کہیں؟ خود ہی خیال کر لے گا! لیکن اللہ تعالیٰ تو لحاظ نہیں کرتا کسی کا، وہ تو مصلحت کے مطابق جو بات ہوتی ہے اس کو ظاہر کر دیتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دے دیا، اور اللہ کے حکم کے آ جانے کی وجہ سے اب نبی بھی اس اظہار پر مجبور ہے، انہوں نے بھی اللہ کی آیات سنائیں، تو مسئلہ واضح ہو گیا۔ تو حضور ﷺ کو جو ان کے بیٹھے رہنے سے تکلیف ہوئی تھی، تو اللہ تعالیٰ نے یہاں اس کو نمایاں کیا ہے کہ خوش اخلاقی کی بنا پر وہ تمہیں کچھ کہتے نہیں، ورنہ تمہارا یوں بیٹھنا، یا قبل از وقت چلے جانا، وہاں مجلس لگانا، ان کو ناگوار گزرتا ہے۔

منافقین کی شرارتوں کا سدِّ باب

پھر عمومی طور پر آگے تاکید کر دی کہ کوئی بات بھی تمہاری طرف سے ایسی نہیں ہونی چاہیے جو ان کے لئے باعثِ تکلیف ہو، اور نہ ہی تمہارے لئے یہ جائز ہے کہ ان کی وفات کے بعد ان کی بیویوں سے کبھی بھی نکاح کرو۔ یہ بھی پابندی لگا دی گئی۔ اصل میں مؤمنینِ مخلصین کے دل میں تو حضور ﷺ کی اَزواج کا اسی طرح سے احترام تھا جس طرح سے کہ ماؤں کا ہوتا ہے، ''اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ'' یہ لفظ پہلے آپ کے سامنے آ چکے ہیں کہ ''نبی کی بیویاں مؤمنین کی مائیں ہیں۔'' معاشرے میں ہر شخص کی حیثیت ایک نہیں ہوتی، مدینہ منورہ میں اس وقت منافقین بھی تھے، اور ''منافق'' کہتے ہی اس کو ہیں جس نے دل کے اندر کفر چھپا رکھا ہو، اور ان منافقوں کے دل میں حضور ﷺ کی کوئی عزت، عظمت نہیں تھی، اور وہ حسد میں مبتلا تھے، ہر وقت کسی ایسی بات کے متلاشی رہتے تھے جس کے ساتھ مؤمنین کو بدنام کیا جا سکے یا حضور ﷺ کے خلاف کوئی فتنہ اُٹھایا جا سکے، سورۂ نور میں آپ کے سامنے تفصیل ذکر کی تھی کہ ذرا سی بات منافقوں کے ہاتھ میں آئی، اور انہوں نے کس طرح سے اس کو فتنہ بنا دیا۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ دل کا بغض وہ ظاہر کرتے ہیں کسی نہ کسی ذریعے سے، ذرا سی کوئی کمزوری ہاتھ میں آ جائے شور مچا دیتے ہیں، مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کو جو عزت حاصل ہوتی جا رہی ہے، اس کو زوال آ جائے، اور ہم پر جو ہر روز احکام ٹھونستے رہتے ہیں تو وہ ان کی جرأت نہ رہے، جب یہ بدنام ہو جائیں گے، خود ان کے گھروں میں اس قسم کے فتنے پیش آ جائیں گے تو ہمیں یہ روک ٹوک نہیں سکیں گے۔ شرارتی لوگوں کی یہ عادت ہوا کرتی ہے، کسی کو باعزت نہیں دیکھ سکتے، کسی کو بڑھتا ہوا نہیں دیکھ سکتے، تو ہر وقت اس کے خلاف کسی نہ کسی فتنے کے متلاشی رہتے ہیں، کبھی کوئی خبر غلط اُڑا دی، کبھی کوئی خبر غلط اُڑا دی، اس طرح سے پریشانیاں پیش کرتے رہتے ہیں...... آج بھی معاشرے کے اندر اس قسم کے لوگ ہوتے ہیں، ظاہری طور پر پیر کے مُرید سارے کے سارے ایک حیثیت میں نہیں ہوتے، کوئی عزت اور عظمت محسوس کرنے والے ہوتے ہیں، کوئی ایسے ہی دیکھا دیکھی ساتھ لگ جاتے ہیں ان کے دل میں وہ عظمت نہیں ہوتی۔ جو مخلص قسم کے مُرید ہوتے ہیں ان کے دلوں میں تو اپنے شیخ کے گھر والوں کا احترام بھی ہوتا ہے، اور جو دیکھا دیکھی ساتھ

لگے ہوئے ہوتے ہیں، یا کسی مصلحت کے طور پر اس بھیڑ میں شامل ہو جاتے ہیں، ان کے دِلوں میں کوئی احترام نہیں ہوتا ...... یہی قصہ ہوتا ہے اساتذہ کے متعلق، اساتذہ کے گھر والوں کے متعلق طلبہ کا، جو نیک بخت ہوتے ہیں وہ اُستاذ کی عزّت بھی محسوس کرتے ہیں، گھر کے افراد کی عزّت بھی محسوس کرتے ہیں، اور ان کی ازواج کو ماؤں کی طرح سمجھتے ہیں، اس قسم کے جو طلبہ ہوتے ہیں ان کے دِلوں میں عزّت واحترام ہوگا، دوسری قسم کے لوگ ہوتے ہیں کہ ان کے دِل میں نہ اُستاذ کی کوئی عزّت، نہ اس کے گھر کے افراد کی عزّت، وہ غلط سوچ بھی سکتے ہیں، اور کسی وقت ان کی طبیعت میں کوئی شرارت بھی آسکتی ہے..... تو جیسے آج آپ دیکھتے ہیں کہ حالات مختلف ہوا کرتے ہیں تو اسی قسم کے حالات منافقین کے بھی تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ایک عمومی حکم دے کے ان فتنوں کا سدِّباب کیا ہے، کہ یہ منافق حضور ﷺ کو پریشان کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً ایسے ہی گھر میں جا گھستے، اور وہاں جاکے بیٹھ کے باتیں کرنے لگ جاتے، اور کبھی ایسا ہوتا کہ کھانے کا وقت ہوتا تو اس سے پہلے جاکے بیٹھ جاتے، کہ کھانا پکے گا تو کھائیں گے، بن بُلائے چلے جاتے۔ بُلائے ہوئے جاتے، تو جلدی سے اس جگہ کو نہ چھوڑتے، چونکہ دِل میں کوئی عزّت واحترام تو ہوتا نہیں تھا تو پریشانی کا باعث بنتے، اور آئے دِن اس قسم کے فتنوں کے متلاشی رہتے تھے کہ کوئی بات ہاتھ آئے تو ہم اس کو مشہور کریں جس سے حضور ﷺ کی عزّت کو نقصان پہنچے، دِل کے اندر کُفر جو تھا۔ تو ان سب فتنوں کو بند کرنے کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ عمومی اَحکام دے دیے، مخلصین بھی اس کی پابندی کریں، اور دوسرے بھی پابندی کریں گے، تو کسی شخص کے لئے کوئی فتنہ اُٹھانے کی گنجائش نہیں رہے گی۔ یہ ہے پس منظر ان آیات کا...... اور مدینہ منوّرہ میں اس وقت بعضے غیر مسلم بھی تھے، اور باندیاں بھی تھیں۔ مسلمان عورتیں جس وقت اپنی ضرورت کے لئے باہر جاتیں، کیونکہ پردے کے اَحکام آجانے کے بعد بھی اپنی ضرورت کے لئے باہر نکلنا ناجائز نہیں ہے، جیسے کہ سورۂ نُور میں اس کی تفصیل آچکی، اور پہلے بیویوں کا قصہ جو آیا تھا ﴿وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ﴾ وہاں بھی کچھ تفصیل عرض کی تھی کہ ضرورت کے تحت اَزواجِ مطہرات بھی باہر نکل سکتی تھیں، دُوسرے شرفاء کی عورتیں بھی باہر نکلتی تھیں۔ تو منافقین جن میں بعضے اوباش غنڈے ہوتے، دِل کے اندر ان کے شرارت ہوتی، شہوت پرستی کی مرض ہوتی، وہ آوازیں کستے، کبھی کسی کو چھیڑتے، اور بہانہ کسی وقت یہ بناتے کہ ہم نے سمجھا تھا کہ یہ فلاں کی باندی ہے، فلاں کی لونڈی ہے، ہم تو اس سے بات کرنے لگے تھے، کسی کی کوئی بات پوچھنے لگے تھے، کوئی حال پوچھنے لگے تھے، اس قسم کے بہانے بنا کے آئے دِن کوئی نہ کوئی شرارت کھڑی کیے رکھتے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کا سدِّباب بھی کیا، کہ پہلے تو شرفاء آزاد عورتوں اور باندیوں میں امتیاز پیدا کر دیا۔ باندیاں جو ہیں آپ جانتے ہیں کہ ان کے لئے پردے کی وہ تاکید نہیں جو آزاد عورتوں کے لئے ہے۔ ان کو کام کاج کے لیے باہر نکلنا ہوتا ہے، اپنے آقا کی خدمت کے لئے بھی۔ تو ان کا چہرہ چھپانا ضروری نہیں، بلکہ وہ غیر مَردوں کے سامنے بدن کے وہ حصے ظاہر کرسکتی ہیں، جس قسم کے حصے آزاد عورت اپنے محارِم کے سامنے ظاہر کرسکتی ہے۔ گھٹنے سے نیچے پاؤں تک، ان کا یہ حصہ ستر نہیں ہے، بازو ستر نہیں ہیں، سر، گلا، یہ حصہ بھی ستر نہیں ہے، کام کاج کے لئے جب عورتوں کو نکلنا پڑتا ہے تو بدن کے یہ حصے کھلے رہتے ہیں۔ اور آزاد عورتوں کو جب پابند کر دیا گیا کہ باہر نکلو تو تمہارے بدن کا کوئی حصہ نظر نہ آئے، چادریں اپنے اُوپر ڈال لو۔ تو پہلے تو یہی فرق آ گیا، کہ وہ اوباش اس قسم کی آزاد عورتوں کو چھیڑنے کی جرأت نہیں کریں گے، وہ سمجھیں گے کہ یہ کسی معزز گھرانے کی ہے، تو اس کو چھیڑیں گے نہیں، اتنا انسداد تو

اس طرح سے ہو جائے گا...... باقی! باندیوں کو اگر اس طرح سے پردے کا پابند کر دیا جاتا تو ان مصلحتوں میں خلل پڑ جاتا جو ان کی خدمت گزاری سے متعلق ہیں۔ تو باندیوں کو یہ تاکید تو نہیں کی گئی بلکہ باندیوں کے مسئلے میں ان اوباشوں کو جھڑک دیا گیا، کہ تم باز آجاؤ، اگر اس طرح سے باز نہیں آؤ گے تو اس وقت تک تمہارے ساتھ جو صفح اور درگزر کا معاملہ رہا ہے، وہ درگزر کا معاملہ ختم ہو جائے گا، اور ہم اپنے رسول کو تم پر مسلط کر دیں گے، تمہارے خلاف برانگیختہ کر دیں گے۔ پھر یاد رکھو! پھٹکارے ہوئے ٹھہرو گے، جتنی دیر تک ٹھہرو گے۔ اور زیادہ دیر نہیں گزرے گی کہ تم پکڑ لیے جاؤ گے، اور تم اپنے کیفرِ کردار کو پہنچا دیے جاؤ گے، سزا دیے جاؤ گے، قتل کر دیے جاؤ گے۔ اس طرح سے ان منافقین کو دھمکا دیا۔ مطلب یہ تھا کہ اگر تم ان ہدایات کی پابندی نہیں کرو گے، تو تمہارا چھپا ہوا کفر ظاہر ہو جائے گا جب علی الاعلان ان احکام کی خلاف ورزی کرو گے، اور کفر کے ظاہر ہو جانے کے بعد تمہارا درجہ پھر عام کافرین جیسا ہو گا۔ جس طرح سے باقی کافروں کی پکڑ دھکڑ ہوتی ہے، اس طرح سے تمہاری پکڑ دھکڑ بھی ہو جائے گی۔ یا تم ایمان ظاہر کیے ہوئے ہو، جب علی الاعلان اس کی مخالفت کرو گے تو تمہارا درجہ مرتدین والا ہو جائے گا، اور مرتدوں کا حکم بھی ہے کہ ان کو پکڑا جاتا ہے، پکڑنے کے بعد قتل کر دیا جاتا ہے۔ تو پھر تم یہاں امن چین کے ساتھ نہیں رہ سکو گے۔ اس طرح سے ان اوباشوں کو جھڑک کے یہ انتظام مکمل کر دیا گیا۔ تو یہ آیات ساری کی ساری، ان کا تعلق پردے کے ساتھ ہے اور عورتوں کے ان مسائل کے ساتھ ہے۔

''دُرود شریف'' کے فضائل اور مختصر اَحکام

درمیان میں سرورِ کائنات ﷺ کی عظمت کو نمایاں کرنے کے لئے صلوٰۃ وسلام کا ذکر آ گیا، کہ یہ تو اتنی عظیم الشان ہستی ہیں کہ اللہ اور اللہ کے فرشتے بھی ان کے اُوپر صلوٰۃ بھیجتے ہیں، ان کے لیے صلوٰۃ وسلام بھیجتے ہیں، اللہ کا صلوٰۃ وسلام بھیجنا رحمت نازل کرنے کے معنی میں، فرشتوں کا دُعا کرنے کے معنی میں، اور مؤمنین کو تاکید کی گئی کہ تم بھی صلوٰۃ وسلام بھیجا کرو، کیونکہ اس میں حضور ﷺ کی عظمت نمایاں ہوتی ہے، اور جو کثرت کے ساتھ حضور ﷺ پر صلوٰۃ وسلام بھیجے گا، تو دل میں محبت بھی آئے گی، عظمت بھی آئے گی، اور نفاق کا مرض بھی ختم ہو گا۔ منافقین جو حضور ﷺ کی عظمت دل میں محسوس نہیں کرتے تھے تو مسلمانوں کو چاہیے کہ اس عظمت کو نمایاں کریں، اور کثرت کے ساتھ صلوٰۃ وسلام بھیجا کریں۔ درمیان میں یہ آیت آ گئی حضور ﷺ کی اس حیثیت کو نمایاں کرنے کے لئے...... باقی! صلوٰۃ وسلام کے اَحکام ''فقہ'' میں آپ سنتے پڑھتے رہتے ہیں۔ چونکہ اَمر کا صیغہ آ گیا اس لئے زندگی میں ایک دفعہ حضور ﷺ پر صلوٰۃ وسلام پڑھنا فرض ہے، اور جہاں حضور ﷺ کا ذکر آ جائے اس مجلس میں ایک دفعہ صلوٰۃ وسلام پڑھنا واجب ہے، اور پھر جتنی دفعہ آپ کا نام نامی آئے، تو ساتھ صلوٰۃ وسلام کا ذکر کرنا، یہ مستحب ہے، اور کثرت بہرحال مطلوب ہے، یعنی ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے ایک دفعہ دُرود پڑھنا واجب ہے جب آپ کا نام آئے، اور پھر بار بار اگر نام آئے، جس طرح سے سبق میں، خاص طور پر حدیث شریف کے سبق میں کثرت کے ساتھ نام آتا رہتا ہے، تو اگر کوئی شخص ہر دفعہ دُرود شریف پڑھتا ہے تو یہ اس کی نیک بختی ہے۔ ورنہ ہر دفعہ پڑھنا واجب نہیں رہتا، بلکہ ایک مجلس کے اندر جتنی دفعہ آپ ﷺ کا نام آئے تو یہ

تداخل ہوجاتا ہے، ایک دفعہ پڑھا ہوا دُرود شریف کافی ہوجاتا ہے۔ دُرود شریف کے فضائل اور تاکید جس قسم کی آئی ہے اس کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں، عام معروف بات ہے، وعظوں میں بھی سنتے رہتے ہو، کتابوں میں بھی پڑھتے رہتے ہو..... تو صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا یہ دو صیغے آجانے کی وجہ سے، چونکہ یہ اَمر کے صیغے ہیں تو صلوٰۃ وسلام ایک دفعہ زندگی میں پڑھنا فرض ہے۔ نماز کے اندر ہمارے ہاں دُرود شریف پڑھنا سُنّتِ مؤکدہ ہے، حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ نماز میں بھی فرض ہے، اگر صلوٰۃ وسلام نہ پڑھا جائے تو نماز نہیں ہوتی۔ ہمارے ہاں یہ سُنّتِ مؤکدہ ہے کہ اگر نہ پڑھا جائے تو نماز میں نقص آتا ہے، نماز بہرحال ہوجاتی ہے..... اور ''صلوٰۃ'' اور ''سلام'' یہ دو لفظ آگئے تو حدیث شریف میں آتا ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا، جس وقت کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تشہد کی تعلیم دے چکے تھے، تشہد میں ''السلام علیك ایھا النبی ورحمة الله وبرکاته'' یہ لفظ آگئے۔ تو کسی نے پوچھا کہ یارسول اللہ! سلام کا طریقہ تو ہمیں آگیا، صلوٰۃ کا کیا طریقہ ہے؟ کہ آپ پر صلوٰۃ کس طرح سے بھیجی جائے؟ تو آپ نے جواب میں وہی دُرود بیان فرمایا جس کو آپ ''دُرودِ ابراہیمی'' کہتے ہیں، اور نماز کے اندر پڑھا کرتے ہیں: ''اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰی اِبْرَاهِيْمَ ...اِلخ'' تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم فرمایا..... یہ پڑھا جائے تو یہ بھی افضل ہے، نماز کے اندر تو دُرود یہی پڑھنا چاہیے، کیونکہ ''سلام'' کا لفظ پہلے آگیا، باقی! ''صلوٰۃ'' اور ''برکت'' اس ''دُرودِ ابراہیمی'' میں آجائے گی، ''رحمت'' اور ''برکت'' بھی نماز میں آگئی۔ اور خارجِ صلوٰۃ اگر آپ دُرود شریف پڑھنا چاہیں کثرت کے ساتھ، تو اس میں اِسی ''دُرودِ ابراہیمی'' کا پڑھنا ضروری نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس ''دُرود شریف'' میں ''صلوٰۃ'' اور ''برکت'' کا ذِکر تو ہے، ''سلام'' کا ذِکر نہیں ہے، اور قرآنِ کریم کی آیت کے اندر صَلُّوْا، وَسَلِّمُوْا دو صیغے آئے ہوئے ہیں، اس لئے اکابر کا معمول یہی ہے کہ وظیفے کے طور پر جو دُرود شریف پڑھا جاتا ہے تو اس میں دُرود شریف ایسا اختیار کیا جاتا ہے، کہ جس میں ''صلوٰۃ'' کا ذِکر بھی ہو، ''سلام'' کا ذِکر بھی ہو، ''برکت'' کا ذِکر بھی ہو، آل اور اَصحاب کا ذِکر بھی ہو۔ معمول کے طور پر اگر پڑھنا ہو، وظیفے کے طور پر، تو ایسے صیغے استعمال کئے جاتے ہیں: ''اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ'' مختصر سا ہے، اور اس میں دیکھو! ''آل، اَصحاب'' کا ذِکر بھی آگیا، ''صلوٰۃ، سلام، برکت'' کا ذِکر بھی آگیا۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مُریدوں کو اس دُرود شریف کی تلقین کیا کرتے تھے، جو میں آپ کے سامنے پڑھا کرتا ہوں: ''اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ عَلٰی سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ كَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی عَدَدَ مَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی'' اور محدثین جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیتے ہیں، حدیث شریف میں آپ دیکھیں گے کہ ایک ایک روایت میں اگر دو دو دفعہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آجائے، تو ''صلی اللہ علیہ وسلم'' وہ یوں کہتے ہیں۔ تو ''صلوٰۃ'' اور ''سلام'' کا اس میں بھی ذِکر آگیا۔ بہرحال یہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا، جس کو ہم ''دُرودِ ابراہیمی'' کہتے ہیں یہ ضروری نہیں، لازم نہیں۔ حدیث شریف میں بھی اور متعدد صیغے آئے ہیں، ان میں سے جو بھی استعمال کرلیا جائے اس سے دُرود شریف کی فضیلت حاصل ہوجاتی ہے..... تو ''صلوٰۃ وسلام'' اگر آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھیجیں گے تو اس میں آپ کی ضرورت زیادہ ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتنی ضرورت نہیں، کیونکہ آپ پر تو اللہ بھی اور اللہ کے فرشتے بھی ''صلوٰۃ وسلام'' بھیجتے ہیں، ان کو آپ کے ''صلوٰۃ وسلام'' نہ بھیجنے سے

کیا کمی آئے گی، جب اللہ اور اللہ کے فرشتے بھی بھیجتے ہیں۔ تو آپ ﷺ پر ''صلوٰۃ وسلام'' بھیجنا ہمارے لئے مفید ہے، کہ اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی رحمت ہم پہ نازل ہوتی ہے، جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص ایک دفعہ میرے پہ صلوٰۃ بھیجے، اللہ کی دس رحمتیں اس کے اُوپر نازل ہوتی ہیں۔[1] تو اس کثرتِ دُرود شریف کے اندر فائدہ ہمارا ہے۔ تو قلب کے اندر حضور ﷺ کی محبت پیدا کرنے کے لیے، دل سے نفاق ختم کرنے کے لئے، اور حضور ﷺ کی عظمت قلب کے اندر پیدا کرنے کے لئے کثرتِ دُرود شریف مطلوب ہے، اکابر اُمت ہمیشہ اس بات کی تاکید کرتے رہتے ہیں۔ وظیفے کے طور پر اختیار کرنا ہو تو ایسے صیغے اختیار کرنے چاہئیں جن میں صلوٰۃ، سلام، برکت، آل واَصحاب کا ذکر ہو۔ جو صیغے حدیث شریف میں آئے ہوئے ہیں ان میں سے کوئی لے لیجئے، یا حدیث شریف میں نہ بھی آیا ہو، الفاظ کی ترتیب ایسی ہو، جیسا کہ دُرود شریف کے متعلق بہت ساری کتابیں لکھی گئی ہیں، ان کے پڑھنے کے ساتھ وہ فضیلت حاصل ہوجاتی ہے۔ نماز میں ترجیح ''دُرودِ ابراہیمی'' کو ہے، کیونکہ ''سلام'' کا ذکر پہلے آجاتا ہے: ''السلام علیك ایها النبی ورحمة الله وبرکاته'' اور ''صلوٰۃ'' اور ''برکت'' کا ذکر اس میں دوبارہ آجائے گا۔ تو صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا دونوں کا تقاضا پورا ہوجاتا ہے۔ اور خارجِ صلوٰۃ میں اگر آپ ''دُرودِ ابراہیمی'' پڑھیں گے تو اس میں چونکہ ''سلام'' کا لفظ نہیں ہے، اس لئے اس میں اتنی سی کمی رہ جاتی ہے کہ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا پر عمل نہیں ہوتا، چاہے صَلُّوْا پر عمل ہوجاتا ہے، اس لیے خارجِ صلوٰۃ میں وظیفے کے طور پر ایسے صیغے اختیار کیے جاتے ہیں کہ جس میں ''سلام'' کا ذکر بھی ہو۔

خلاصۂ آیات

ترجمہ پھر دیکھ لیجئے..... ''اے ایمان والو! داخل نہ ہوا کرو نبی کے گھر میں'' یعنی بغیر اجازت کے تو جایا ہی نہ کرو، آج سے پابندی لگ گئی، ''مگر یہ کہ تمہیں اجازت دی جائے ایسے کھانے کی طرف آنے کی۔'' جس طرح سے کوئی دعوت وغیرہ ہے، تمہیں بلایا گیا، یعنی کھانے کی طرف نہ ہو، ویسے بھی اگر کوئی شخص جائے، جا کے اجازت لے، اور حضور ﷺ اجازت دے دیں، تو اندر جانا چاہیے، بغیر اجازت نہیں جانا چاہیے۔ خاص طور پر اگر کوئی دعوت کا موقع ہو اور تمہیں کھانے کی طرف آنے کی اجازت دے دی جائے، تو ایسے وقت میں جایا کرو کہ تمہیں کھانے کے پکنے کا انتظار نہ کرنا پڑے، اِنٰىهُ سے پکنا مراد ہے۔ نٰظِرِیْنَ سے منتظرین مراد ہے غَیْرَ مُنْتَظِرِیْنَ اِنٰىهُ اس کھانے کے پکنے کا انتظار کرنے والے نہ ہو۔'' اور جس وقت تمہیں بُلا لیا جائے تو داخل ہوجایا کرو۔ اور پھر کھانے سے فارغ ہو کے فوراً منتشر ہوجایا کرو، باتوں کے ساتھ دِل لگا کے نہ بیٹھا کرو۔'' وَلَا مُسْتَاْنِسِیْنَ لِحَدِیْثٍ: اَیْ لَا تَجْلِسُوْا مُسْتَاْنِسِیْنَ لِحَدِیْثٍ۔ یہ بات یعنی تمہارا قبل از وقت جا کے وہاں انتظار کرنا، یا کھانے سے فارغ ہو کے وہاں جم کے بیٹھ رہنا باتیں کرنا، یہ چیز نبی کے لئے باعثِ تکلیف ہے، پھر وہ تمہارا لحاظ کرتا ہے، تمہیں خود کہتا نہیں کہ چلے جاؤ۔ اللہ تعالیٰ حق بات سے لحاظ نہیں کرتا کسی کا بھی۔ اور جب پردہ ہوگیا، گھر جانے کی اجازت نہیں، تو اب اگر کوئی چیز لینی ہو، کوئی بات پوچھنی ہو، تو پردے کے پیچھے کھڑے ہو کے پوچھ سکتے ہو، بات کرنے کی ممانعت نہیں ہے، بوقتِ ضرورت پردے میں کھڑے ہو کے کوئی بات پوچھ بھی سکتے

---

(۱) مسلم ۱/۱۷۵ باب الصلوۃ علی النبی بعد التشهد۔ مشکوۃ ۱/۸۶ باب الصلوۃ علی النبی۔ ولفظه: مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ وَاحِدَةً صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ عَشْرًا

ہو، کوئی چیز لینی ہے تو لے بھی سکتے ہو، دینی ہے تو دے بھی سکتے ہو۔" جب ان سے سوال کرو تم کسی چیز کا" متاع: سامان کو کہتے ہیں، جو استعمال کرنے کی چیز ہوا کرتی ہے،" تو مانگا کرو ان سے پردے کے پیچھے سے۔" تو صحابہ کرام ؓ ازواجِ مطہرات ؓ سے مسئلہ پوچھنے کے لئے جاتے تھے، تو بھی پردے کے پیچھے کھڑے ہو کے پوچھ لیتے تھے۔ اسی طرح سے کوئی ہدیہ دینا ہے، کوئی چیز اندر سے پکڑنی ہے، تو پردے میں کھڑے ہو کے بات کی جاسکتی ہے، چیز لی جاسکتی ہے اور دی جاسکتی ہے، سامنے نہیں جانا چاہیے۔ "یہی چیز زیادہ پاکیزگی کا باعث ہے تمہارے دلوں کے لئے اور ان عورتوں کے دلوں کے لئے" بروقت آمنے سامنے جانا اچھا نہیں، کیونکہ آخر انسان ہیں، انسان کا دِل ہے، کبھی وسوسہ آجاتا ہے، تو جتنا دُور رہو گے اجنبی عورتوں سے، اتنا ہی اچھا ہے۔

دِل اِنسان کی زندگی کا مرکزی نقطہ ہے

یہاں دیکھئے! قصہ ہے ازواجِ مطہرات ؓ کا، جن سے زیادہ پاکیزہ عورتیں دُنیا میں نہیں ہوسکتیں، اور اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت کی ذمہ داری لی، جیسے پیچھے اہلِ بیت کا ذِکر آیا تھا: اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا۔ اور مخاطب ہیں بظاہر صحابہ کرام ؓ، اگرچہ تنبیہ منافقین کو کرنی مقصود ہے لیکن پابندی لگاتے ہوئے عنوان عام رکھا ہے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ نکلتا ہے کہ چاہے آدمی کتنا ہی نیک کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، لیکن اپنے قلب کی بروقت نگرانی رکھنی چاہیے۔ معلوم نہیں ہوتا کہ قلب کے اندر غلط قسم کا وسوسہ کب آجائے گا؟ دِل ایک چیز ہی ایسی ہے۔ اللہ چونکہ اس دل کے بنانے والے ہیں، وہی اس کے حالات کو جانتے ہیں، تو دِل کی صفائی کا اہتمام اللہ تبارک وتعالیٰ نے پوری طرح سے آپ کو سکھادیا، کہ اپنے قلب کو محفوظ رکھنے کے لئے ایسی جگہوں سے دُور رہو، ایسے حالات سے اپنے آپ کو دُور رکھو، جن کی وجہ سے دِل کے اندر کوئی کسی قسم کی گڑبڑ ہوسکتی ہے۔ اور آج موجودہ تہذیب میں دِل کی کوئی حیثیت نہیں، کپڑوں کو صاف رکھنے کی تو کوشش کریں گے کہ اِستری ہو، شکن ٹوٹا ہوا نہ ہو، کوئی داغ دھبا نہ ہو، لیکن قلب جو کہ انسان کی زندگی کا ایک بالکل مرکزی نقطہ ہے اور سارے کے سارے حالات کا مدار اسی پر ہے، تو یہ جتنا چاہے آلودہ ہوتا رہے، جس قسم کے اس میں وسوسے آتے رہیں، بُرے خیالات آتے رہیں، ان کے ہاں یہ بات زیرِ بحث ہی نہیں ہے۔ اور شریعت نے سب سے زیادہ قلب کی حفاظت کے اُوپر ہی زور دیا، حدیث شریف میں آتا ہے: "اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً" بدن کے اندر ایک ٹکڑا ہے، "اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ"، جس وقت وہ دُرست ہوجائے تو سارا بدن دُرست ہوجاتا ہے، "وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ" اگر وہ فاسد ہوجائے تو سارا بدن فاسد ہوجاتا ہے، "اَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ!" اور وہ مضغہ قلب ہے۔[1] اس لئے متوجہ کیا گیا کہ قلب کی اصلاح پر ہی مدار ہے بدن کی اصلاح کا۔ دِل اچھا ہے تو آپ کے سارے اعضا سے کام اچھے ہوں گے، اور دِل خراب ہوگیا تو بدن کے باقی اعضا اچھے کام نہیں کرسکتے۔ تو اتنا اہتمام کیا گیا ہے قلوب کو وساوس سے بچانے کا، کہ بلاضرورت اجنبی عورتوں کے سامنے ہی نہ جاؤ۔ "یہ پاکیزگی کا باعث ہے تمہارے دِلوں کے لئے اور ان کے دِلوں کے لئے۔ تمہارے لئے یہ مناسب ہی نہیں کہ تم اللہ کے رسول کو تکلیف دو، اور نہ تمہارے لئے یہ مناسب ہے کہ تم ان کی بیویوں

---

(۱) بخاری ۱۳/۱ باب فضل من استبرأ لدینہ۔ مشکوٰۃ ۲۴۱/۱ باب الکسب وطلب الحلال

سے نکاح کرو کبھی بھی ان کے بعد۔ اور یہ بات اللہ کے نزدیک بہت بڑی ہے۔ اگر دل میں کوئی خیال لاؤ گے، ظاہر کرو گے، یا چھپاؤ گے، اللہ تعالیٰ سے چھپا ہوا نہیں، اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔''

کن سے پردہ نہیں ہے؟

آگے وہی ہدایات آ گئیں جو سورۂ نور میں دی گئی تھیں کہ پردہ اجنبیوں سے ہے اپنوں سے نہیں، اس لئے باپ دادا، اسی کے حکم میں ہے چچا، ماموں، ان سے بھی پردہ نہیں ہے۔ اور اپنے بیٹے، بیٹوں کے بیٹے، پوتے، نواسے، سب اس میں آ جاتے، ان سے پردہ نہیں ہے۔ اور بھائیوں سے نہیں ہے، اور بھائیوں کے بیٹوں سے نہیں ہے جن کو ہم ''بھتیجے'' کہتے ہیں، بہنوں کے بیٹوں سے پردہ نہیں جن کو ہم ''بھانجے'' کہتے ہیں۔ اور نِسَآئِهِنَّ سے مراد ہوتا ہے عام ملنے جلنے والی عورتیں۔ اجنبی عورتیں جن کے حالات معلوم نہ ہوں وہاں احتیاط ہی چاہیے، آج کل جو فتنے گھروں میں پیش آتے ہیں ان میں بسا اوقات وہ عورتیں بھی دخیل ہوتی ہیں جو ایسے ہی گھروں میں گھسی پھرتی ہیں، اِدھر کے راز اُدھر پہنچا، اُدھر کے اِدھر پہنچا، جن عورتوں کے اخلاق پر ان کے حالات پر اعتماد نہ ہو، ان کے ساتھ معاملہ اجنبی مردوں جیسا کرنا چاہیے۔ ہاں! البتہ جو اپنے محلے کی آنے جانے والی ہیں، جن کے ہم حالات جانتے ہیں، ان کے آنے جانے میں اور ان کے سامنے بے حجاب ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہاں تک احتیاط کی گئی ہے تاکہ فتنہ کسی طرف سے نہ گھسے۔ تو بعض آوارہ قسم کی عورتیں ہوتی ہیں جو لوگوں کے گھروں میں جاتی ہیں، اور وہ ذریعہ بن جاتی ہیں ان کی لڑکیوں کے ساتھ رابطے قائم کرنے کا، اور گھر کے حالات دوسروں تک پہنچانے کا، تو ایسی عورتوں کو بھی گھروں میں گھسنے نہیں دینا چاہیے جن کے اخلاق پر اعتماد نہیں ہے۔ ''اپنی عورتوں'' سے یہی مراد ہے یعنی مسلمان عورتیں یا وہ عورتیں جن کو ہم جانتے ہیں جن کے حالات معلوم ہیں، وہ بھی اگر گھر میں آئیں جائیں اور ان کے سامنے حجاب نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہی لفظ سورۂ نور میں بھی آیا تھا۔

غلام اور نوکروں سے پردے کے اَحکامات

اور ایسے ہی مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ: اس میں جمہور کے نزدیک غلام داخل ہیں، اپنے زرخرید غلام، وہ اگر گھروں میں آئیں جائیں تو ان سے بھی حجاب نہیں، کیونکہ ضرورت کی بنا پر کام کاج کے لیے وہ آتے جاتے ہیں۔ لیکن اَحناف ﷭ کے نزدیک اس کا مصداق باندیاں ہیں، اور ''غلام'' اجنبی کے حکم میں ہے۔ اَحناف ﷭ کے نزدیک غلام سے بھی پردہ ہے، لیکن باقی ائمہ کے نزدیک غلام سے پردہ نہیں ہے...... اور یاد رکھئے کہ ''نوکر'' اس حکم میں نہیں! ''غلام'' کی حیثیت اور ہوتی ہے، وہ ہر طرح سے پسا، دبا ہوا ہوتا ہے اپنے آقا کے سامنے، اس میں یہ جرأت نہیں ہوتی کہ آنکھ لڑائے، یا اس طرح سے آنکھ اُٹھا کے دیکھے۔ اس لئے وہاں تو فتنے سے حفاظت ہے کسی درجے میں، لیکن ''نوکروں'' میں تو یہ بات نہیں ہوا کرتی، ان کے متعلق تو عام طور پر مشہور ہے کہ یہ آتے ہیں ملازم بن کے، جاتے ہیں داماد بن کے۔ اس لئے ''نوکروں'' پر یہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا، ان کو اس طرح سے بے حجابانہ نہیں آنے دینا چاہیے۔ ہاں! البتہ اتنا بوڑھا ہے جس میں عورتوں کی طرف کوئی رغبت نہیں اور فتنے کی کوئی گنجائش نہیں، جس طرح سے کہ چھوٹا بچہ، تو ان کے لئے گنجائش ہے۔ ''نوکروں'' کا درجہ یہ نہیں ہوا کرتا۔ ''غلاموں'' میں بات اور تھی، کیونکہ وہ ہر طرح سے نیچے دبے ہوئے

ہوتے ہیں، ان کے اُوپر رُعب اتنا ہوتا ہے کہ جرأت نہیں کر سکتے کسی کی طرف آنکھ اُٹھانے کی، لیکن ''نوکر'' اس طرح سے نہیں ہوا کرتے..... وَاتَّقِيْنَ اللهَ: میں عورتوں کو تاکید کردی کہ وہ اللہ سے ڈرتی رہیں، انہیں بھی تقویٰ اختیار کرنا چاہیے، خاص طور پر اَزواجِ مطہرات کے لئے تاکید ہوگئی، کیونکہ ان کے تقوے پر ہی مدار رکھا گیا تھا دُنیا کی عورتوں کے مقابلے میں ممتاز ہونے کا، پیچھے جس طرح سے آیا تھا: يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ: وہاں ذِکر کیا گیا تھا، تو تقویٰ ہی ان کی برتری کا باعث ہے، تو ان کو خصوصیت سے تاکید کی جارہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو دیکھنے والا ہے، ہر چیز اس کے سامنے ہے۔ شَهِيد: مشاہدہ کرنے والا، گواہ، حاضر، شہید کے سب مفہوم ہوا کرتے ہیں۔ ہر چیز کے اُوپر اللہ تعالیٰ گواہ ہے یعنی ہر چیز کا مشاہدہ کرنے والا ہے، ہر چیز اللہ کے سامنے ہے۔

منافقین کو دھمکی اور عظمتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

آگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا اہتمام آگیا، کہ بے شک اللہ اور اس کے فرشتے دُرود بھیجتے ہیں نبی پر، اور اے ایمان والو! تم بھی دُرود بھیجا کرو اس پر، اور سلام بھیجا کرو سلام بھیجنا۔ اس کی تفصیل آپ کے سامنے آگئی۔

اب آگے منافقین کو دھمکایا جارہا ہے۔ ''بے شک وہ لوگ جو اللہ اور اللہ کے رسول کو تکلیف پہنچاتے ہیں'' اللہ کا ذِکر تبرکاً ہے، اللہ کے نبی کو تکلیف پہنچانا ایسے ہی ہے جیسے اللہ کو تکلیف پہنچادی۔ اور یہ عنوان حدیث شریف میں بھی ذِکر کیا گیا ہے، کسی چیز میں اہتمام پیدا کرنے کے لئے اس کی نسبت اللہ کی طرف بھی کردی جاتی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ذِکر کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''مَنْ اَحَبَّهُمْ فَقَدْ اَحَبَّنِيْ[1] وَمَنْ اٰذَاهُمْ فَقَدْ اٰذَانِيْ وَمَنْ اٰذَانِيْ فَقَدْ اٰذَى اللهَ'' جس نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو تکلیف پہنچائی اس نے مجھے تکلیف پہنچائی، جس نے مجھے تکلیف پہنچائی اس نے اللہ کو تکلیف پہنچائی۔ تو معلوم ہوگیا کہ اِیذا کا معاملہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ کرنا، یہ ایسے ہی ہے جیسے اللہ اور اللہ کے رسول کو تکلیف پہنچائی جائے۔ تو تکلیف تو اللہ کے رسول کو ہوگی، وہ ایسے ہی ہے جیسے کسی نے اللہ کو تکلیف پہنچادی۔ تو اللہ کی طرف تکلیف پہنچانے کی نسبت کی جاسکتی ہے جیسے اس کے شان کے لائق ہے، چاہے اس میں کوئی تاویل کی جائے، لیکن تکلیف کا یہ مفہوم کہ کسی کے برتاؤ سے ہمارے اندر کبیدگی پیدا ہوجائے، ہم بے چینی میں ہوجائیں، یہ کیفیت اللہ پر صادق نہیں آتی۔ جو بھی اس کی شان کے لائق ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے، ناراضگی کا باعث جو چیز بنتی ہے وہی باعث ایذا ہے۔ جیسے کتاب الایمان میں روایت آتی ہے ''يُؤْذِيْنِي ابْنُ اٰدَمَ يَسُبُّ الدَّهْرَ''[2] ابنِ آدم مجھے تکلیف پہنچاتا ہے، جس وقت کسی مصیبت کے پیش آنے کے وقت وہ زمانے کو گالیاں دینے لگ جاتا ہے، تو اِیذا کی نسبت اللہ کی طرف بھی کی جاتی ہے۔ ''جو تکلیف پہنچاتے ہیں اللہ کو اور اس کے رسول کو، اُن کے اُوپر اللہ نے لعنت کی دُنیا اور آخرت میں۔'' دُنیا میں بھی پھٹکارے گئے، اور آخرت میں بھی اللہ کی رحمت سے محروم ہوں گے۔'' اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کیا ہے۔'' اور اسی

---

(۱) الشریعۃ للآجری رقم ۱۱۳۳۔ الریاض النضرۃ ۱/ ۲۲۔ نیز: ترمذی ۲/ ۲۲۵ باب فیمن سب اصحاب النبی ﷺ۔ ولفظہ: من احبہم فبحبی احبہم

(۲) بخاری ۲/ ۷۱۵، کتاب التفسیر، سورۃ الجاثیۃ۔ مسلم ۲/ ۲۳۷ باب النہی عن سب الدہر۔ مشکوٰۃ ص ۱۳۔

طرح سے جو مؤمنین کو تکلیف پہنچاتے ہیں اور مؤمنات کو، جیسے میں نے عرض کیا کہ منافقین آئے دن کوئی نہ کوئی فتنہ اُٹھاتے رہتے تھے، غلط باتیں کسی کی طرف منسوب کر کے ان کو بے عزت کرنے کی کوشش کرنا، پریشان کرنا، یہ منافقین کا شیوہ تھا؛ "جو لوگ تکلیف پہنچاتے ہیں مؤمنین کو اور مؤمنات کو بغیر ان کاموں کے جو انہوں نے کئے ہوں" انہوں نے کوئی غلطی کی نہیں ہوتی اور خواہ مخواہ منسوب کر کے پریشان کرنے کی کوشش کرتے ہیں، "تو انہوں نے بہتان اور اِثْمًا مُّبِیْنًا کا ارتکاب کیا" یہ بہتان تراش ہیں، اور اِثم مبین کو اُٹھانے والے ہیں۔ اور بہتان اور اِثم مبین کا بدلہ ان کو ملے گا۔

آزاد عورتوں کو پردے کی تاکید اور منافقین کو دھمکی

اب آگے اَزواجِ مطہرات کے ساتھ ساتھ عام عورتوں کے لئے بھی ہدایت آ گئی منافق اوباش اور بدکرداروں کے فتنے سے محفوظ رکھنے کے لئے، کہ اوّل تو عورتیں گھر سے نکلیں نہ، وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ میں جس طرح سے آیا تھا، اور اگر باہر نکلیں تو اپنی پوری احتیاط سے نکلیں تاکہ آزاد عورت اور باندی کے درمیان میں امتیاز ہو۔ اس امتیاز کی بنا پر آزاد عورتیں تو ویسے فتنے سے محفوظ ہو جائیں گی، کوئی جرأت نہیں کرے گا چھیڑنے کی۔ اور باندیوں کے لئے پھر دوسرا انتظام ہو گیا۔ "اے نبی! کہہ دے اپنی بیویوں کو اور اپنی بیٹیوں کو، اور مؤمنوں کی عورتوں کو، قریب کر لیا کریں اپنے اُوپر اپنی چادروں کا کچھ حصہ۔" تو جلابیب، جلباب جیسے آپ کے سامنے تفصیل عرض کی تھی کہ اس زمانے میں پردے کا ذریعہ یہی بڑی چادر ہوا کرتی تھی، وہی چادر سر کے اُوپر سے چہرے کی طرف قریب کر لیا کریں، جس طرح سے لٹکا کے گھونگٹ نکال لیا جاتا ہے۔ "یہ زیادہ قریب ہے اس بات کے کہ پہچانی جائیں گی، پھر منافقوں کی طرف سے تکلیف نہیں پہنچائی جائیں گی" یہ امتیاز خود حفاظت کا ذریعہ بنے گا...... یعنی اب بھی عام طور پر یہ شریر قسم کے لوگ ایسی لڑکیوں کو چھیڑنے کی کوشش کیا کرتے ہیں، جن کو بے سہارا سمجھتے ہیں۔ لیکن جن کے متعلق پتا ہو کہ یہ بڑے گھرانے کی ہیں اور اس حرکت کی بنا پر ہم پر کوئی مصیبت مسلط ہو جائے گی تو وہاں لوگ چھیڑ چھاڑ نہیں کرتے۔ تو چھیڑ چھاڑ ایسی جگہ کرنے کی کوشش کیا کرتے ہیں جن کو سمجھتے ہیں کہ ان کے ورثاء کسی قسم کی انتقامی کارروائی نہیں کر سکتے۔ تو جب گھر والوں کی عظمت ہوتی ہے یا ان کے سرپرستوں کی ہیبت ہوا کرتی ہے تو پھر لوگ چھیڑتے نہیں...... تو شرفاء اور اَحرار عورتیں تو اس طرح سے ممتاز ہو جائیں گی، یوں بچ جائیں گی۔ اور باندیوں کو نکلنا پڑے گا، تو ان کے ساتھ اگر کوئی چھیڑ چھاڑ کرے گا، تو آگے ان کو دھمکا دیا کہ یاد رکھو! ایسی پٹائی ہو گی کہ پھر تمہیں کہیں ٹھکانا نہیں ملے گا۔ وہ قانونی شق اختیار کر لی گئی۔ "یہ زیادہ قریب ہے کہ وہ پہچانی جائیں گی پھر تکلیف نہیں پہنچائی جائیں گی"۔ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا کا مطلب یہ ہے کہ اپنے طور پر تو پورا اہتمام کرو اپنے بدن کو چھپانے کا، زیب وزینت کے چھپانے کا، باہر ضرورت کی بنا پر بھی نکلو تو چھپ چھپا کر نکلو، لیکن اگر کسی قسم کی کوتاہی ہو ہی جائے بلا اختیار جس سے انسان عاجز ہے، اگر کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہو ہی جاتی ہے، تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے، اپنی طرف سے کوشش پوری ہونی چاہیے۔ "اگر نہیں باز آئیں گے منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے" اس بیماری سے حسد بھی مراد ہو سکتا ہے، شہوت پرستی

کی بیماری بھی مراد ہوسکتی ہے کہ جو ہر قسم کی شہوانی حرکتیں کرتے پھرتے ہیں ہر وقت، اگر یہ لوگ باز نہیں آئیں گے،'' اور وہ لوگ جو مدینہ میں غلط افواہیں اُڑا اُڑا کر لوگوں میں دہشت پھیلاتے ہیں، اگر یہ لوگ باز نہیں آئیں گے تو ہم آپ کو ان کے اُوپر مسلط کر دیں گے، آپ کو ان کے خلاف اُکسا دیں گے، بھڑکا دیں گے'' یعنی اس وقت تک جو عفو اور صلح کا ہم سبق دیتے رہے ہیں کہ ان سے درگزر کرو، ان سے نرمی کا معاملہ کرو، یہ ختم ہو جائے گا، ہم آپ کو ان کے اُوپر مسلط کر دیں گے۔'' پھر یہ آپ کے ساتھ نہیں رہ سکیں گے مدینہ میں مگر تھوڑا وقت۔'' اور اس میں بھی ملعونین ہوں گے، ان کے اُوپر لعنت پھٹکار ہوگی، بے عزت ہوں گے، ذلیل ہوں گے، کوئی ان کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھے گا۔ اور جہاں بھی پائے جائیں گے پکڑ لیے جائیں گے اور اچھی طرح سے قتل کر دیے جائیں گے۔

اللہ کا طریقہ بدل نہیں سکتا!

اور یہی طریقہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے پہلے بھی اوباشوں اور بدمعاشوں کی سرکوبی کے لئے اختیار کیا، پہلے بھی اسی طرح سے ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی، اور سرزنش کی گئی۔ اور اللہ جو بھی طریقہ تجویز کرے کوئی انسان اس کو بدل نہیں سکتا، یعنی کسی انسان کی طرف سے اللہ کے قاعدوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ کوئی انسان اس بات کا مجاز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قاعدے کو تبدیل کر دے۔'' یہ اللہ کا طریقہ ہے ان لوگوں کے بارے میں جو اس سے پہلے گزرے ہیں، اور ہر گز نہیں پائے گا تو اللہ کے طریقے کے لئے تبدیلی۔''

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

يَسْـَٔلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ
لوگ آپ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس قیامت کا علم اللہ کے پاس ہے، اور آپ کو کیا پتا شاید
السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا ۝۶۳ اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ۝۶۴
قیامت قریب ہی ہو۶۳ بے شک اللہ تعالیٰ نے کافروں پر لعنت کی اور ان کے لئے آگ کو تیار کیا۶۴
خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝۶۵ يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي
ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اُس میں، نہیں پائیں گے کوئی یار نہ کوئی مددگار۶۵ جس دن کہ اُلٹ پلٹ کئے جائیں گے ان کے چہرے
النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ۝۶۶ وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا
آگ میں، کہیں گے یہ لوگ ہائے کاش! ہم کہنا مانتے اللہ کا اور رسول کا۶۶ اور کہیں گے اے ہمارے رب! بے شک ہم نے کہنا مانا

سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا ﴿٦٧﴾ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَ

اپنے سرداروں کا اور اپنے وڈیروں کا، پس انہوں نے ہمیں راستے سے بھٹکا دیا ﴿٦٧﴾ اے ہمارے ربّ! ان کو دوگنا عذاب دے اور

الْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا ﴿٦٨﴾ يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ اٰذَوْا مُوسٰى

ان کے اُوپر بڑی لعنت کر ﴿٦٨﴾ اے ایمان والو! نہ ہو جاؤ اُن لوگوں کی طرح جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو تکلیف پہنچائی

فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوا ۚ وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيهًا ﴿٦٩﴾ يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اتَّقُوا

پھر اللہ نے بری قرار دیا موسیٰ کو اس بات سے جو انہوں نے کہی تھی، اور موسیٰ اللہ کے نزدیک ذی وجاہت ہیں ﴿٦٩﴾ اے ایمان والو! اللہ

اللّٰهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ﴿٧٠﴾ يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَمَنْ

سے ڈرو اور دُرست بات کہا کرو ﴿٧٠﴾ اللہ دُرست کر دے گا تمہارے لئے تمہارے اعمال کو، اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا، اور جو کوئی

يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ﴿٧١﴾ إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ

شخص اطاعت کرے اللہ کی اور اُس کے رسول کی پس تحقیق کامیاب ہو گیا وہ بڑا کامیاب ہونا ﴿٧١﴾ بے شک ہم نے پیش کیا امانت کو، آسمانوں پر

وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ۖ

اور زمین پر اور پہاڑوں پر، پھر انہوں نے انکار کر دیا اس امانت کو اُٹھانے سے، اور اس سے ڈر گئے، اور اس کو اِنسان نے اُٹھا لیا

إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ﴿٧٢﴾ لِيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِينَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِينَ

بے شک انسان ظالم ہے، جاہل ہے ﴿٧٢﴾ نتیجہ یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ عذاب دے گا منافق مردوں کو اور منافق عورتوں کو اور مشرک مردوں کو

وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿٧٣﴾

اور مشرک عورتوں کو، اور اللہ توجہ فرمائے گا مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں پر، اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے ﴿٧٣﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ۔ يَسْئَلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ: لوگ آپ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہیں، قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ: آپ کہہ دیجئے کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس قیامت کا علم اللہ کے پاس ہے، قیامت کے علم سے مراد اس کے وقت کی تعیین کا علم ہے۔ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُونُ قَرِيبًا: آپ کو کون سی چیز اطلاع دیتی ہے؟ شاید کہ قیامت قریب ہو۔ جس کا حاصل ترجمہ

یوں ہو جائے گا کہ آپ کو کیا پتا؟ شاید قیامت قریب ہی ہو! اَدۡرٰی یُدۡرِیۡ: بتلانا۔ دَرٰی یَدۡرِیۡ: جاننا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الۡكٰفِرِيۡنَ: بے شک اللہ تعالیٰ نے کافروں پر لعنت کی اور ان کے لئے آگ کو تیار کیا۔ سعیر کہتے ہیں بھڑکنے والی آگ کو، دہکتی آگ۔ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَاۤ اَبَدًا: ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اس میں، لَا يَجِدُوۡنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيۡرًا: نہیں پائیں گے کوئی یار نہ کوئی مددگار، نہ کوئی حمایتی ملے گا نہ مددگار۔ يَوۡمَ تُقَلَّبُ وُجُوۡهُهُمۡ فِى النَّارِ: جس دن کہ اُلٹ پلٹ کئے جائیں گے ان کے چہرے آگ میں۔ قَلَّبَ تَقۡلِيۡبًا: اُلٹ پلٹ کرنا، اس کا مفہوم ہوا کرتا ہے کہ جس طرح سے کوئی شخص کوئلوں کے اُوپر کوئی چیز بھونتا ہے، گوشت کا ٹکڑا آپ کوئلوں پر بھوننا چاہیں، تو بھوننے والے کی عادت ہوتی ہے کہ کبھی اِس پہلو سے رکھتا ہے، کبھی اِس پہلو سے رکھتا ہے، یہ ہے اُلٹ پلٹ کرنا۔ تو اس لیے اس دِن ان کے چہروں کو آگ کے اُوپر بھونا جائے گا، اُلٹ پلٹ کیا جائے گا۔ یا ٹانگوں سے پکڑ کے جب گھسیٹے جائیں گے جہنم میں۔ جب کسی شخص کو ٹانگوں سے پکڑ کے گھسیٹا جائے، تو اس کا بھی چہرہ کبھی یوں ہوتا ہے، کبھی یوں ہوتا ہے۔ جب ان کے چہرے اُلٹ پلٹ کیے جائیں ان کے چہرے آگ میں، يَقُوۡلُوۡنَ: کہیں گے یہ لوگ، يٰلَيۡتَنَاۤ اَطَعۡنَا اللّٰهَ وَاَطَعۡنَا الرَّسُوۡلَا: يٰلَيۡتَنَاۤ: یہ تمنی ہے، ہائے کاش! ہم کہنا مانتے اللہ کا، اور ہم کہنا مانتے رسول کا، کیا ہی اچھا ہوتا کہ ہم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے۔ وَقَالُوۡا رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعۡنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا: اور کہیں گے وہ لوگ: اے ہمارے رَبّ! بے شک ہم نے کہنا مانا اپنے سرداروں کا، اور اپنے وڈیروں کا۔ كُبَرَآءَ: کبیر کی جمع ہے، سادۃٌ یہ سید کی جمع ہے۔ تو سادۃ اور کبراء دونوں کا مصداق ایک ہی ہیں قوم کے سردار، قوم کے وڈیرے (مظہری)۔ اور اگر فرق کرنا ہو تو یوں کر سکتے ہیں کہ سَادَتَنَا سے مراد ہو جائیں گے جن کو دُنیوی عظمت حاصل تھی، اور كُبَرَآءَ سے مراد ہو جائیں گے جن کو مذہبی طور پہ بڑائی حاصل تھی۔ کیونکہ کُفر ہو، شرک ہو، کسی قسم کا مسلک ہو، تو اس مسلک کے ترجمان ہوا ہی کرتے ہیں، تو كُبَرَآءَ سے وہ پیشوا مراد ہو جائیں گے، دِینی پیشوا (نسفی)، فَاَضَلُّوۡنَا السَّبِيۡلَا: پس انہوں نے ہمیں راستے سے بھٹکا دیا، رَبَّنَاۤ اٰتِهِمۡ ضِعۡفَيۡنِ مِنَ الۡعَذَابِ: اے ہمارے رَبّ! اِن کو دو گنا عذاب دے، ضِعۡفَيۡنِ: مثلین کے معنی میں۔ وَالۡعَنۡهُمۡ لَعۡنًا كَبِيۡرًا: اور ان کے اُوپر بڑی لعنت کر۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَكُوۡنُوۡا كَالَّذِيۡنَ اٰذَوۡا مُوۡسٰى: اے ایمان والو! نہ ہو جاؤ ان لوگوں کی طرح جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو تکلیف پہنچائی، فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوۡا: پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں بری قرار دیا موسیٰ علیہ السلام کو اس بات سے جو انہوں نے کہی تھی، موسیٰ علیہ السلام کا دامن اللہ نے صاف کر دیا، بے عیب قرار دیا موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اس بات سے جو انہوں نے کہی تھی۔ وَكَانَ عِنۡدَ اللّٰهِ وَجِيۡهًا: اور موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نزدیک ذِی وجاہت ہیں، آبرو والے ہیں۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو، وَقُوۡلُوۡا قَوۡلًا سَدِيۡدًا: اور دُرست بات کہا کرو۔ قولِ سدید: سیدھی بات، دُرست بات، یعنی جو دِل کی صحیح ترجمان ہو۔ جیسے زبان سے اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کا دعویٰ کرتے ہو تو قلب میں بھی یہی جذبات ہونے چاہئیں، تبھی وہ بات سیدھی ہے۔ منافقوں کی بات ٹیڑھی ہے کہ دل میں کچھ ہے زبان سے کچھ کہتے ہیں، یا مطلب یہ ہے کہ زبان سے جو کہو، اس کے مطابق عمل بھی کر کے دکھاؤ تبھی وہ بات دُرست ہوا کرتی ہے۔ صحیح بات کہو، دُرست بات کہو۔ يُّصۡلِحۡ لَكُمۡ اَعۡمَالَكُمۡ: یہ جوابِ اَمر آ گیا، یعنی اگر تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو گے، اللہ سے ڈرو گے، اور سیدھی بات کہو گے، تو اللہ تعالیٰ دُرست کر دے گا تمہارے لئے تمہارے اعمال کو،

تمہارے اعمال کی اصلاح کر دے گا۔ وَیَغۡفِرۡ لَكُمۡ ذُنُوۡبَكُمۡ: اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا، وَمَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ: اور جو کوئی شخص اطاعت کرے اللہ کی اور اس کے رسول کی، فَقَدۡ فَازَ فَوۡزًا عَظِیۡمًا: پس تحقیق کامیاب ہو گیا وہ بڑا کامیاب ہونا، اس نے بڑی کامیابی حاصل کر لی۔ اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَالۡجِبَالِ: بے شک ہم نے پیش کیا امانت کو آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر، فَاَبَیۡنَ اَنۡ یَّحۡمِلۡنَہَا: پھر انہوں نے انکار کر دیا اس امانت کو اٹھانے سے۔ اَبَیۡنَ کی ضمیر ان سب کی طرف لوٹ گئی، وَاَشۡفَقۡنَ مِنۡہَا اور اس امانت سے ڈر گئے، وَحَمَلَہَا الۡاِنۡسَانُ: اس امانت کو انسان نے اُٹھالیا، اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوۡمًا جَہُوۡلًا: بے شک انسان ظلوم جھول ہے۔ ظلوم یہ ظالم کا مبالغہ ہے، اور جھول یہ جاھل کا مبالغہ ہے۔ بے شک وہ انسان ظالم ہے، جاہل ہے۔ ظالم ہونے سے اس کے بدکردار ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے، عملی زندگی خراب ہے۔ اور جاہل ہونے سے اس کے بے علم ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے، کہ علمی زندگی خراب ہے۔ نہ صحیح علم حاصل کیا، نہ صحیح کام کیا۔ لِّیُعَذِّبَ اللّٰہُ الۡمُنٰفِقِیۡنَ وَالۡمُنٰفِقٰتِ: یہ "لام" لام عاقبت ہے۔ اس حملِ امانت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ عذاب دے گا منافق مردوں کو اور منافق عورتوں کو، اور مشرک مردوں کو اور مشرک عورتوں کو۔ وَیَتُوۡبَ اللّٰہُ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ: اور نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ توجہ فرمائے گا، مہربانی کرے گا (تاب علیہ: اللہ کا متوجہ ہونا، جس میں درجات دینے کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے، اور کوتاہیوں کے معاف کرنے کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے، اللہ کی توجہ میں دونوں باتیں آجائیں گی) اللہ متوجہ ہوگا اُن لوگوں پر جو ایمان لانے والے ہیں، ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتوں پر۔ وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا: اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر

ماقبل سے ربط

سورۂ اَحزاب اِختتام کو پہنچ رہی ہے، واقعات کے ضمن میں بہت سارے اَحکام دیے گئے، اور جگہ بہ جگہ آخرت کے عذاب سے ڈرایا بھی گیا، آخرت کے عذاب کا ذکر بھی آیا، جس طرح سے پچھلے رُکوع میں آیا تھا: اِنَّ الَّذِیۡنَ یُؤۡذُوۡنَ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ لَعَنَہُمُ اللّٰہُ فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃِ وَاَعَدَّ لَہُمۡ عَذَابًا مُّہِیۡنًا۔ ان آیات کے ربط کے طور پر مفسرین یونہی ذکر کرتے ہیں کہ منافق قسم کے لوگ حضور ﷺ کو بایں طور بھی تکلیف پہنچاتے تھے، کہ آپ سے ایسے ہی سوالات کرتے جن سے محض آپ کو پریشان کرنا مقصود ہوتا تھا۔ بار بار پوچھتے کہ جی! قیامت کا تذکرہ تو آپ بہت کرتے ہیں، کہ آخرت میں عذاب ہوگا، تو وہ آئے گی کب؟ اس کا وقت بتائیے! قیامت کے حالات تو حضور ﷺ نے بہت بتائے، قیامت میں کیا کچھ ہوگا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے گا، مر کے دوبارہ جی اُٹھنا، اور اُٹھنے کے بعد پھر میدانِ قیامت میں جو واقعات پیش آئیں گے، اور اس کے بعد جنت اور دوزخ کے بے شمار واقعات سرورِ کائنات ﷺ نے بتائے ہیں، تو قیامت کی تفصیل تو ذکر کر دی، لیکن اس کے وقت کی تعیین اللہ تعالیٰ نے مخفی رکھی ہے، یہ اس کی حکمت کا تقاضا ہے، لیکن کسی چیز کا مخفی ہونا، اس کے وقت کی تعیین کا نہ ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہوا کرتی کہ وہ آئے گی ہی نہیں۔

قیامت کو سمجھانے کے لئے ''شخصی موت'' کی مثال

بالکل ایک ''شخصی موت'' ہے، ایک ''عالمی موت'' ہے۔ قیامت ایک ''عالمی موت'' ہے، اور ''شخصی موت'' بھی ہم لوگوں کو پیش آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت اس ''شخصی موت'' کے وقت کو بھی مبہم رکھا ہے، پوشیدہ رکھا ہے۔ کسی کو پتا نہیں کہ انسان کب مرجائے گا؟ کہاں مرے گا؟ جس طرح سے سورۂ لقمان کے آخر میں آیا تھا۔ لیکن وقت معلوم نہ ہونے کی وجہ سے کوئی شخص اپنی موت سے بے فکر نہیں، اور ہر وقت یہ خطرہ ہے کہ معلوم نہیں کب آجائے؟ اور یونہی کہا جاتا ہے کہ ''موت کی گھڑی سر پہ کھڑی ہے'' اس لئے ہر وقت موت سے ڈرو، جس کے آنے کا پتا نہیں کہ کب آجائے تو اس کو قریب ہی سمجھنا چاہیے، وہ کوئی دُور نہیں ہے، آنے والی چیز جس کے وقت کی تعیین بھی نہ ہو کہ کب آجائے تو وہ سامنے ہی ہے، قریب ہی ہے۔ تو جس طرح سے ''شخصی موت'' سے بے فکری نہیں، اس دلیل کے ساتھ کہ وہ کب آئے گی؟ اسی طرح سے ''عالمی موت'' سے بھی بے فکری نہیں، کہ وہ کب آئے گی؟ اگرچہ اس کا وقت اللہ نے اپنی حکمت کے تحت ہمارے سامنے متعین نہیں کیا۔

کُفّار تو تکذیب کے لئے یوں کرتے تھے اور بعض لوگ پریشان کرنے کے لئے بھی اس قسم کے سوال کرتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ ذکر فرمایا جس میں ایک قسم کی تنبیہ بھی ہوجائے گی، کہ یہ نہ پوچھو کہ آئے گی کب؟ جب آئے گی اُس وقت کافروں اور منافقوں کا حال یہ ہوگا، فکر اس کی کیجئے، اُس وقت چھوٹنے کی کوئی گنجائش نہیں نکلے گی۔ اور یہ حماقت ہے کہ آنے والے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے انسان تیاری نہ کرے، اور اس وجہ سے سستی کرے کہ چونکہ آنے کا وقت معلوم نہیں کہ کب آئے گا، لہٰذا بے فکری ہے، یہ کوئی عقل مندی نہیں۔ تو ان آیات میں پہلے یہی تفہیم کی گئی ہے...... لوگ آپ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ اس کے وقت کی تعیین کا علم اللہ کے پاس ہے، یہ اللہ نے کسی کو نہیں بتایا، اور اسی میں حکمت ہے۔ جس طرح سے ''شخصی موت'' کو مخفی رکھنے میں حکمت ہے، اسی طرح سے ''عالمی موت'' کو مخفی رکھنے میں بھی حکمت ہے۔ اور عِلْمُهَا سے مراد وقت کی تعیین، ورنہ اس کے حالات جزئیات بے شمار اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں بھی بیان کئے، اور سرورِ کائنات ﷺ نے بھی پوری تفصیلات بیان کردیں، روایات میں جس طرح سے آتی ہیں۔ قیامت کے حالات مخفی نہیں، حالات تو ہمارے سامنے ہیں، لیکن اس کے وقت کی تعیین مخفی ہے۔ وَمَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِیْبًا: اس میں یہی تنبیہ کی گئی کہ جس طرح سے موت ہر وقت سر پر کھڑی ہے، جب اس کا وقت معلوم نہیں تو تم ہر وقت یہ خطرہ محسوس کرتے ہو کہ شاید ابھی آجائے۔ تو جب قیامت کا وقت نہیں بتایا گیا، تو اس کو بھی یونہی سمجھو کہ قریب ہے۔ آنے والی قریب ہی ہوا کرتی ہے، اس کو دُور نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ یوں سمجھو کہ سامنے ہے۔ اور پھر ایک تو ''قیامتِ کبریٰ'' ہے جس میں ساری دُنیا ختم ہوجائے گی۔ اور ایک انسان کی ''شخصی قیامت'' ہے، وہ مرنے کے ساتھ ہی ایک قسم کی شروع ہوجاتی ہے، سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا، حدیث شریف میں آتا ہے: ''مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِیَامَتُهٗ''[1] جو شخص مرگیا اُس کی تو قیامت آہی گئی۔ تو اس لحاظ تمہیں قیامت کو قریب سمجھنا چاہیے، اسے دُور سمجھ کے بے فکر نہ ہوو۔

(۱) تفسیر کبیر، بحرمحیط، سورۂ انعام، آیت ۳۱ کے تحت۔ لیکن باسند ان الفاظ سے حدیث نہیں ملی۔ ''مشکوٰۃ'' میں باب ہے: ''قرب الساعة وان من مات فقد قامت قیامته''۔

قیامت کے دِن کافروں کا حال

آگے پھر وہی کافروں وغیرہ کے لیے وعید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کافروں پہ لعنت کی، اور ان کے لئے بھڑکنے والی آگ تیار کی، ہمیشہ اس میں رہیں گے، اور جس وقت اس میں واقع ہو جائیں گے تو ان کو کوئی یار کوئی مددگار نہیں ملے گا جو اس مصیبت سے نجات دلا دے۔ تو فکر اس کی کرنی چاہیے کہ جس وقت گرفت ہو جائے گی چھوٹ نہیں سکو گے، وقت معلوم نہ ہونے کی وجہ سے بےفکری یہ عقل مندی نہیں ہے۔ آگ ان کے لئے تیار ہے اور ان کے چہروں کو آگ پہ بھونا جائے گا، جس طرح سے کوئی شخص گوشت کو بھونتے وقت اس کو اُلٹ پلٹ کرتا ہے، تو ان کے چہرے آگ میں اُلٹ پلٹ کئے جائیں گے۔ اُس وقت پھر یہ کہیں گے کہ کیا ہی اچھا ہوتا، ہم اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کر لیتے۔ آج موقع ہے اطاعت کرنے کا، آج مختلف حیلوں بہانوں کے ساتھ بات کو ٹالتے ہیں، اور جب جہنم میں جا پڑیں گے پھر تمنائیں کریں گے، پھر کچھ بات بنے گی نہیں۔ اور آج اپنے لیڈروں کے پیچھے لگ کے یہ مختلف قسم کی شرارتیں کرتے ہیں، اللہ کے اور اللہ کے رسول کی بات کی پروا نہیں کرتے، اور قیامت کے دِن اپنے انہی لیڈروں کے اُوپر یہ لعنت بھیجیں گے، جو ان کو اللہ اور اللہ کے رسول کے خلاف اُکساتے ہیں، اور ان کی مخالفت کے لیے بہکاتے ہیں۔ تو یہاں سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا سے ایسے ہی لیڈر مراد ہیں جو اللہ کے اَحکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں، اور دوسروں کو بھی اللہ اور اللہ کے رسول کی مخالفت کے لئے برانگیختہ کرتے ہیں، گمراہ قسم کے پیشوا، گمراہ قسم کے لیڈر۔ وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا: کہیں گے کہ اے ہمارے ربّ! بے شک ہم نے اطاعت کی اپنے سرداروں کی اور اپنے وڈیروں کی اپنے بڑوں کی۔ دو لفظ ہیں۔ مصداق یا تو وہی قبیلے کے چوہدری، بڑے۔ یا ایک سے دُنیوی سردار مراد لے لیجئے اور ایک سے مذہبی پیشوا مراد لے لیجئے۔ ہم اپنے ان بڑوں کے پیچھے لگے اور اپنے انہی پیروں، فقیروں کے پیچھے لگے جو خود جاہل تھے، جنہوں نے اللہ کے اَحکام نہ معلوم کیے، نہ ہمیں صحیح بتائے۔ ہم ان کے پیچھے لگے رہے، انہوں نے ہمیں سیدھے راستے سے بھٹکا دیا۔ آج ان کے پیچھے جان دینے کے لیے تیار ہیں، کل کو ذمہ داری انہی کے سر ڈالیں گے کہ شاید اسی طرح سے جان چھوٹ جائے۔ اور پھر یہ کہیں گے کہ اے اللہ! ان کو ہم سے دُگنا عذاب دے، یہ غصہ ظاہر کرنے کی ایک بات ہے۔ سورۂ اَعراف (آیت:۳۸) میں اس کی تفصیل آئی تھی، غصہ ظاہر کریں گے کہ اگر ہمیں عذاب میں ڈال ہی دیا گیا کہ ہم نے اپنی عقل سے کام نہ لیا، اللہ اور اس کے رسول کی باتیں نہ سنیں اور ان کے پیچھے لگے رہے۔ ہم نے بھی غلطی کی، لیکن بڑے غلط کار تو یہ ہیں جنہوں نے ہمیں بہکایا، ان کو دُگنا عذاب دیجئے، اور ان کے اُوپر بڑی لعنت کیجئے۔ تو یہ باتیں جو ظاہر کی جا رہی ہیں اس لیے ظاہر کی جا رہی ہیں کہ اپنی عقل اور ہوش کے ساتھ سیدھا راستہ معلوم کر کے چلو، اندھا دھند کسی کے پیچھے لگ جانا، خاص طور پر ایسے شخص کے جو اللہ اور اللہ کے رسول کی باتوں کا نہ علم رکھتا ہے نہ ان کے مطابق ہدایت دیتا ہے، ان لوگوں کی اطاعت اور ان کی اتباع آخرت میں کام نہیں آئے گی، بلکہ وہاں جا کے ایک دُوسرے کے اُوپر لعنت بھیجو گے، لیکن ان کے اُوپر پھٹکار کا پڑنا، یا دُگنا عذاب کا ملنا تمہیں نجات نہیں دِلائے گا، تم بھی عذاب میں

پڑے رہو گے، جیسے پیچھے ذکر آیا تھا: لِكُلٍّ ضِعْفٌ (سورۂ اعراف: ۳۸) ہر کسی کے لیے دُگنا دگنا عذاب ہے، ہر کوئی اپنے کردار کی ذمہ داری خود اُٹھائے گا، اور اس کے عملوں کا وبال اسی پہ آئے گا۔

اِسرائیلیوں کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام کو اِیذا رسانی کا ذِکر اور اس کا مقصد

آخری رُکوع میں پھر ایک کلیت کے درجے میں مسلمانوں کو تاکید کر دی گئی، آپ کی خدمت میں تفصیل کے ساتھ آچکا اس سورت کے ضمن میں کہ اس میں زیادہ تر زور اسی بات پہ دیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے اپنے نبی کے لیے کوئی تکلیف دِہ معاملہ نہیں ہونا چاہیے، عنوان عام رکھا گیا، اور اصل کے اعتبار سے تنبیہ منافقین کو کرنی مقصود تھی جن کی طرف سے ایسے معاملات سامنے آیا کرتے تھے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے مؤمنو! ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو تکلیفیں پہنچائیں، ان سے مراد ہیں یہود، یہ موسیٰ علیہ السلام کو تکلیفیں پہنچاتے تھے، سورۂ صف کے اندر لفظ آئے گا: یٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِیْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ: اے میری قوم! تم مجھے کیوں تکلیف پہنچاتے ہو حالانکہ تم جانتے ہو، میں اللہ کا رسول ہوں تمہاری طرف۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے بہت تکلیفیں اُٹھائیں اپنی قوم کی طرف سے، جس کا نقصان قوم کو ہی پہنچا، اللہ تعالیٰ کے اَحکام جس وقت پیغمبر بیان کر رہے ہیں اور اُمت اس کو خوش دِلی کے ساتھ قبول نہ کرے، آگے سے حیل وحجت کرنے لگ جائے تو نبی کے لیے یہ بات بھی باعثِ تکلیف ہوتی ہے، اور یہود کی طرف سے یہ تو ہوتا ہی تھا، اللہ تعالیٰ کی طرف جو حکم سامنے آتا وہ حیل وحجت کرنے لگ جاتے تھے، قرآنِ کریم میں کتنے واقعات ذکر کیے گئے آپ کے سامنے، ذبحِ بقرہ کا واقعہ آیا تھا، اور اسی طرح سے من وسلویٰ کے موقع پہ ان کی طرف سے کیا بات چیت ہوئی، سورۂ بقرہ میں اس کی تفصیل آئی، اور پھر اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ (سورۂ اعراف: ۱۳۹) بُت بنانے کی درخواست کر دی، اور پھر موسیٰ علیہ السلام کے طور پہ جانے کے بعد عجل کو پُوجنا شروع کر دیا، بچھڑے کو پُوجنے لگ گئے، اور جس وقت جہاد کا حکم آیا تو وہاں بھی جواب دے دیا کہ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (سورۂ مائدہ: ۲۴) یہ باتیں آپ جانتے ہیں کہ نبی کے لیے بہت تکلیف دِہ ہیں، کہ جب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حکم آیا آگے سے وہ حیل وحجت کرنے لگ جاتے۔ اور طور پر جس وقت تورات ملی تھی تو اس کے بعد آکے موسیٰ علیہ السلام نے جب ذِکر کیا تو وہ کہنے لگے کہ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً (سورۂ بقرہ: ۵۵) ہم تو ایمان نہیں لاتے جب تک کہ تو ہمیں کھلم کھلا اللہ کو نہ دِکھادے۔ یہ ساری باتیں باعثِ تکلیف ہیں......

لیکن مفسرین نے یہاں دو واقعے بھی خصوصیت کے طور پر لکھے ہیں۔ ایک کا ذِکر تو تفاسیر میں ہی ہے، اور ایک کا ذِکر صحیح اَحادیث میں ہے، ''بخاری شریف'' میں بھی ہے، دُوسری کتابوں میں بھی ہے...... تفاسیر میں جس واقعے کا ذِکر کیا گیا ہے وہ ہے کہ قارون نے ایک عورت کو بہکا کے موسیٰ علیہ السلام پہ تہمت لگوائی تھی، جس کے نتیجے میں قارون کو غرق کر دیا گیا، سورۂ قصص میں اس کی تفصیل آپ کی خدمت میں عرض کی گئی تھی، کہ جب موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے حکم دیا گیا تھا کہ تو اس دولت کو اللہ کے راستے میں خرچ کر، تو سرمایہ دار جو دُنیا کی محبت میں مبتلا ہوتے ہیں ان کے لیے یہ بات بہت باعثِ تکلیف ہوتی ہے، تو پھر وہ اپنی عزت بھی بچانا چاہتے ہیں، سرمایہ بھی بچانا چاہتے ہیں، تو پھر عام طور پر ان کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے وعظ کہنے والوں کو بدنام کرو، رُسوا کرو، تاکہ لوگوں کے

دِل میں ان کی عزت نہ رہے، اور آئے دِن ہمیں جو کہتے رہتے ہیں تو ان کو کہنے کی جرأت نہ ہو۔ اسی جذبے کے تحت موسیٰ علیہ السلام پر اس نے تہمت لگوائی ایک عورت سے، کہ میرے ساتھ یہ مبتلا ہیں، مقصد یہ تھا کہ جب موسیٰ علیہ السلام یوں رُسوا ہو جائیں گے تو لوگ ان پہ اعتماد چھوڑ دیں گے، اور پھر ان کی باتوں کی وجہ سے لوگ ہمیں بُرا نہیں سمجھیں گے، ہم اپنی کمزوریوں پر یوں پردہ ڈال لیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بے گناہ ثابت کیا، وہی عورت جو تھی اس نے اقرار کرلیا اور بتایا کہ مجھے قارون نے بہکایا ہے، جب موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے عذاب سے ڈرایا تو وہ عورت مان گئی، کہ اس بات کے لیے مجھے قارون نے بہکایا ہے، تو جس کے نتیجے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر بددُعا کی اور قارون بمع اپنی حویلی کے، بمع اپنی کوٹھی کے غرق ہو گیا۔ تو یہ بھی ایک تکلیف دِہ بات تھی جو موسیٰ علیہ السلام کے لیے کی گئی، خواہ مخواہ کی تہمت بازی، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بَری ثابت کیا کہ ان کے اندر یہ کوئی کسی قسم کا عیب نہیں، موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نزدیک آبرو والے تھے، وجاہت والے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی عزت آبرو کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچنے دیا...... اور ایک واقعہ احادیث کے اندر بیان کیا گیا ہے کہ اسرائیلیوں کی عادت تھی کہ آپس میں ایک دوسرے کے سامنے بلاتکلف ننگے بھی ہو جاتے تھے، ننگے نہاتے بھی رہتے تھے، معلوم یہ ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک سترِ عورت کا کوئی خاص اہتمام نہیں تھا۔ واقعات کے ضمن میں آپ کے سامنے یہ بات بارہا آئی کہ مشرکینِ مکہ بھی سترِ عورت کا کوئی اہتمام نہیں کرتے تھے، کپڑے اُتار کے ننگے طواف کر لیتے تھے، ایک دُوسرے کے سامنے ننگا ہونا، ایک دُوسرے کے سامنے پیشاب کے لئے بیٹھ جانا، یہ ان کے نزدیک کوئی عیب نہیں تھا۔ تو اسرائیلی بھی کوئی خاص اہتمام نہیں کرتے تھے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بہت باحیا تھے، بہت پردے والے تھے، وہ کسی کے سامنے ننگے نہایا نہیں کرتے تھے، ہمیشہ چھپ کے پردے سے نہاتے۔ تو اسرائیلی شرارتی تو تھے ہی، کوئی نہ کوئی نئی بات نکال لینا، یہ ان کا روزمرّہ کا کام تھا۔ آپس میں باتیں کرنے لگ گئے کہ موسیٰ علیہ السلام جو ہمارے سامنے اپنے بدن کو ظاہر نہیں کرتا، معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کوئی عیب ہے۔ پھر عیب کیا ہے؟ وہ بھی اپنے طور پر ہی قیاس آرائی شروع کر دی کہ یا تو ان کو بَرص ہے، بَرص وہ جو سفید سفید دھبے، داغ پڑ جایا کرتے ہیں، تو ان کے بدن کے اندرونی حصے پر یا تو برص ہے، یا پھر ان کے خصیتین پھولے ہوئے ہیں، ان کو اُدرۃ ہے، "اُدرۃ" اس بیماری کو کہتے ہیں جس میں خصیتین میں ہوا بھر جاتی ہے، ورم آ جاتا ہے۔ اس قسم کی قیاس آرائیاں انہوں نے شروع کر دیں۔ آپ جانتے ہیں کہ نبی کے متعلق اس قسم کے خیالات کا قلوب کے اندر آنا، یہ ان کی عظمت کے منافی ہے، اور اگر اس قسم کی بات لوگوں کے دِل میں بیٹھ جائے تو عظمت قائم نہیں رہتی۔ رُوحانی عیب کسی کا کسی کے دِل میں آ جائے کہ فلاں بدکردار ہے اس میں کوئی گناہ کی بات پائی جاتی ہے، تو بھی عظمت نہیں رہا کرتی، جیسا کہ قارون والی بات میں ہوا۔ اور اگر بدن کے اندر بھی اس قسم کے نقص کی نشان دہی ہو جائے، کہ لوگ یہ سوچنے لگ جائیں معلوم نہیں، یہ کیسا ہے؟ اس کے بدن کا یہ حصہ ایسا ہے، یا ان کو کوئی اس قسم کی قابلِ نفرت بیماری ہے اس لئے ہمارے سامنے یہ اپنے بدن کو ظاہر نہیں کرتے، تو یہ بات بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عظمت کے منافی تھی، اور اس قسم کے تذکرے موسیٰ علیہ السلام کے لئے باعثِ تکلیف تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہاں بھی موسیٰ علیہ السلام کو بَری کرنا چاہا کہ ان کے اندر کوئی کسی قسم کا عیب نہیں، بلکہ اللہ نے ان کو جس طرح سے رُوحانی کمال دیا ہے، بدنی طور پر بھی خوبصورت ہیں۔ تو سرورِ کائنات ﷺ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی عادت کے مطابق کسی چشمے پر پردے میں نہا رہے تھے، پہاڑی

علاقوں میں ایسے ہی ہوتا ہے کہ یہ پہاڑ ہے، ادھر چشمہ ہے، پردہ ہے، اور دُوسری طرف پتا نہیں ہوتا کہ کیا ہو رہا ہے۔ کپڑے اُتار کر ایک پتھر پر رکھ دیے، اور وہ پتھر باذنِ اللہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کپڑے لے کے بھاگ گیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے جس وقت دیکھا کہ پتھر پہ میرے کپڑے تھے، پتھر بھاگ گیا، تو میں کپڑے کہاں سے لُوں گا؟ تو انہوں نے اپنی لاٹھی لی وہ بھی پتھر کے پیچھے بھاگے ''ثَوْبِیْ یَا حَجَرُ! ثَوْبِیْ یَا حَجَرُ!'' اے پتھر! میرے کپڑے دے دے، اے پتھر! میرے کپڑے دے دے۔ یوں کہتے ہوئے پیچھے بھاگے۔ تو پہاڑوں میں تو خاص طور پر بہت ہی آسان سی بات ہے کہ اِدھر آپ پردے میں نہا رہے ہیں، اور گھاٹی سے دُوسری طرف لوگ بیٹھے ہوں، یا جس طرح سے یہ آپ کے ہاں کھیتوں میں کھالے ہوتے ہیں، کسی جگہ کوئی پردہ ہو تو وہاں انسان نہانے لگ جائے، اور دوسری طرف لوگ بیٹھے ہوں۔ موسیٰ علیہ السلام کو معلوم نہیں تھا۔ اب موسیٰ علیہ السلام تو بے تحاشا اس کے پیچھے بھاگے (جَمَحَ کا لفظ آتا ہے، جمح کا معنی ہوتا ہے بے تحاشا کسی کے پیچھے بھاگ نکلنا) اس خیال سے کہ میرے کپڑے لے گیا۔ اور وہ پتھر چکر کاٹ کے دُوسری طرف کو ہوا، اور موسیٰ علیہ السلام اس کے پیچھے، تو آگے اسرائیلیوں کا ایک گروہ بیٹھا ہوا تھا، اور انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو ننگے بدن دیکھ لیا، وہاں جا کے پتھر ٹھہر گیا۔ جس وقت انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو ننگے بدن دیکھ لیا تو انہوں نے یقین کر لیا کہ موسیٰ علیہ السلام تو بہت خوبصورت ہیں، ہم نے ایسے ہی ان کے خلاف پروپیگنڈا کر رکھا ہے۔ تو وہاں پر موسیٰ علیہ السلام نے اپنے کپڑے لئے اور پہنے، اور غصے کے ساتھ تین چار ڈنڈے لگائے اس پتھر کے، وہی لاٹھی جو آپ کے ہاتھ میں تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اتنے زور سے لگائے کہ پتھر کے اُوپر نشان پڑ گئے۔ تو یہ واقعہ بھی حدیث شریف میں ذِکر کیا گیا،[1] کیونکہ جب اس قسم کا پروپیگنڈا کرتے تھے، اگر موسیٰ علیہ السلام اپنی زبان سے کہتے کہ میرے اندر کوئی عیب نہیں، تم غلط سمجھتے ہو، تو وہ کہاں اعتبار کرنے کو تھے؟ وہ تو دِین کی باتیں نہیں مانتے تھے، جلدی جلدی یہ کہتے تھے کہ یہ جو تُو کہہ رہا ہے کہ میں اللہ سے مل کر آیا ہوں، جس وقت تک تو ہمیں اللہ نہ ملا دے، اور دِکھا نہ دے، ہم اعتبار نہیں کرتے۔ اَڑیل قوم تھی، تو اس بات کا تو اعتبار نہیں کرتے ہوں گے، اور موسیٰ علیہ السلام نے صفائی کئی جگہ دی بھی ہوگی، اور اپنے اختیار کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے سامنے ننگے ہو جاتے تو یہ ایک شریعت کے خلاف بات تھی، ادب کے خلاف تھی۔ اگر سترِ عورت فرض نہ بھی ہوتا تو بھی یہ ادب اور حیا کے خلاف بات ہے، تو اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ موسیٰ علیہ السلام پر بھی کوئی اِلزام نہ ہو، اور بات بھی صاف ہو جائے۔ اب موسیٰ علیہ السلام اس خیال سے پتھر کے پیچھے بھاگے کہ اگر میں نے کپڑے نہ لئے تو آخر کہاں سے لوں گا، میں ننگا کدھر جاؤں گا۔ اور یہ معلوم نہیں تھا کہ آگے لوگ ہیں، تو اپنے کپڑے لینے کے لئے جب وہاں سے نکلے تو آگے لوگ تھے۔ تو موسیٰ علیہ السلام کے اِختیار کے بغیر ہی لوگوں نے ان کو دیکھ لیا، اور جس قسم کی چہ مہ گوئیاں لوگ کرتے تھے وہ ختم ہو گئیں۔ اس طرح سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بَری الذمہ کر دیا۔ جو عیب منسوب کرتے تھے موسیٰ علیہ السلام کی طرف، اس سے بَری ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک موسیٰ علیہ السلام وجیہ تھے، باوجاہت تھے، آبرو والے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کی صفائی کا اہتمام کیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بھی قرآنِ کریم میں ''وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ'' کا لفظ آیا ہے (سورۂ آلِ عمران: ۴۵) تو ان پر جو

(۱) مشکوٰۃ ۲/ ۵۰۷، باب بدء الخلق فصل اول۔ بخاری ۱/ ۴۸۳، باب حدیث الخضر سے اگلا باب۔ مسلم ۲/ ۲۶۶، باب فضائل موسیٰ۔

لوگوں نے الزام لگایا، یا ان کی ماں پر الزام لگایا، اللہ تعالیٰ نے ان آبرو کی رعایت رکھتے ہوئے اس کی صفائی بھی کتاب میں دی ہے۔ یہاں یہ کہا جا رہا ہے کہ یہودی جس طرح سے اپنے نبیوں کو تکلیفیں پہنچاتے رہے، تم اپنے نبی کا ہر طرح سے خیال رکھو، کوئی بات ایسی نہ کرو جس میں حضور ﷺ کے لیے کوئی ایذا کا پہلو ہو۔

''تقویٰ'' اور ''زبان کی حفاظت'' کا اِصلاحِ اَعمال پر اَثر

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو'' یہ ایک عمومی نصیحت ہے۔ ''اور بات ہمیشہ دُرست کہا کرو'' یعنی دل کے عقیدے کے مطابق، اور جو زبان سے کہو اس کے مطابق عمل کرو، غلط بات منہ سے نہ کہو، جھوٹ نہ بولو۔ تو اگر تقویٰ اختیار کرو گے اور دُرست بولنے کی عادت ڈال لو گے، تو ''اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو دُرست کردے گا۔'' تو گویا کہ ''تقویٰ'' اور ''زبان کی حفاظت'' یہ دونوں ہی اصلاحِ اعمال کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص یہ چاہتا ہے کہ میرے عمل دُرست ہو جائیں تو اسے زبان کی حفاظت بھی کرنی چاہیے، اور عمومی طور پر تقویٰ بھی اختیار کرنا چاہیے۔ زبان کی بے احتیاطی باقی اعمال کے اندر خلل ڈالتی ہے، ایک آدمی اگر جھوٹ بولنے کی عادت ڈال لے تو جھوٹ بولنا یہ ایک زبان کا فعل ہے لیکن یہ عادت ایک ایسی ہے کہ جس کے پردے میں ہر عیب چھپ جاتا ہے، جھوٹ بولنے کا عادی جھوٹ کے پردے میں سب کچھ کر سکتا ہے، اور اس کی ساری عملی زندگی برباد ہو جائے گی۔ چوری کرے گا، اس کو پتا ہے کہ اگر مجھ سے کسی نے پوچھا تو میں نے ماننا ہی نہیں، میں جھوٹ بول دوں گا کہ میں نے نہیں کی، اور کوئی زنا، یا بدمعاشی کرے گا تو اسی پردے میں کرتا ہے کہ اگر کسی نے پوچھ ہی لیا تو میں نے انکار کر دینا ہے، میں نے ماننا ہی نہیں، اور اگر کوئی شخص اس بات کا اِلتزام کرلے کہ میں نے سچ بولنا ہے، کبھی جھوٹ نہیں بولوں گا تو اس سے بُری عادتیں خود بخود چھوٹ جاتی ہیں، کیونکہ گناہ اکثر و بیشتر انسان چھپا کے کرتا ہے تاکہ کسی کو پتا نہ چلے، لیکن اگر کسی نے پوچھ لیا، پھر اگر سچ بول دیا تو گناہ ظاہر ہو جائے گا اور ایسے وقت میں پھر رُسوائی ہوگی، تو سچ بولنے والا آدمی کبھی در پردہ بھی گناہ نہیں کرتا اس خیال سے کہ اگر کسی نے مجھ سے پوچھ لیا تو میں کیا جواب دُوں گا۔ تو سچ بولنے کی عادت، بہت ساری نیکیوں کا ذریعہ بن جاتی ہے، جس طرح سے حدیث شریف میں آیا: ''عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ فَإِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي إِلَى الْبِرِّ'' سچائی کو لازم پکڑو کیونکہ سچائی انسان کو نیکی کی طرف لے جاتی ہے، اچھے اعمال کی طرف لے جاتی ہے۔ اس کی یہی وجہ ہے کہ سچ بولنے کے اگر آپ عادی ہو جائیں تو کوئی عیب آپ اختیار نہیں کر سکتے، گناہ اختیار نہیں کر سکتے کہ کسی کے پوچھنے پر سچ بتا دیا تو رُسوائی ہوگی، یہی تصور انسان کو گناہ سے روک لیتا ہے۔ اور جھوٹ جو ہے یہ ''يَهْدِي إِلَى الْفُجُوْرِ''(۱) یہ تو فسق و فجور کی طرف لے جاتا ہے، جھوٹ بولنے کی عادت ڈال لو تو ہر گناہ کر لو گے، اس خیال سے کہ اگر کوئی پوچھے گا تو ہم انکار کر دیں گے، پھر گناہ کرنے پر جرأت ہو جاتی ہے۔ اس لیے فرمایا کہ بات دُرست کہا کرو، تو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال ٹھیک کردے گا۔ اور جو کوئی تھوڑی بہت کوتاہی انسانی لغزش کے طور پر ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ وہ گناہ معاف کردے گا۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اس نے بہت بڑی کامیابی حاصل کرلی۔

---

(۱) مسلم ۲/ ۳۲۶ باب قبح الکذب۔ مشکوٰۃ ۲/ ۴۱۲ باب حفظ اللسان۔

اَمانت کا مصداق اور تکوینی واختیاری اَحکام کی تقسیم

آگے بھی اِجمالی طور پر اَحکام کی اطاعت کی تاکید کرنا مقصود ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے ایک امانت آسانوں پر زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی، انہوں نے اس امانت کو اُٹھانے سے انکار کردیا، اور اس امانت سے ڈر گئے۔ یہ امانت کیا چیز ہے؟ جو اللہ تعالیٰ نے اس مخلوق پر پیش کی اور انہوں نے اس کو قبول نہیں کیا، یہ امانت ہے ''بالاختیار اللہ کی اطاعت''۔ مقصد یہ تھا کہ ان کے سامنے یہ چیز پیش کی گئی کہ ہم تمہیں اختیار دے دیں گے کام کرنے نہ کرنے کا، اس کے بعد ہم تم پر یہ ذمہ داری ڈالیں گے کہ میرے اَحکام کو تم نے اپنے اختیار کے ساتھ ماننا اور کرنا ہے، اگر اس کے مطابق عمل کرو گے تو تمہیں جزا ملے گی، عمل نہیں کرو گے تو سزا ہوگی، جب ان کے سامنے یہ تفصیلات بیان کی گئیں تو وہ عذاب سے ڈر گئے اور اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے انکار کردیا، کہ انعام تو معلوم نہیں ملے گا یا نہیں ملے گا، اور اگر سزا ہوگئی تو کیا کریں گے، تو انہوں نے اس امانت کو اپنے ذِمّے نہیں لیا۔ امانت سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کے اَحکام کو بالاختیار پورا کرنا...... ایک ہیں تکوینی اَحکام، وہ تو زمین آسمان پہاڑ سب پہ نازل ہوتے ہیں، اور سب اطاعت کرتے ہیں، اس میں تو مجال ہی نہیں انکار کرنے کی۔ اور ایک ہیں اختیاری اَحکام، کہ تمہیں یہ قدرت دے دی جائے کہ تم ایسا کرو یا نہ کرو، اور اس کے بعد پھر تمہیں حکم دیا جائے گا کہ کرو۔ کرنے کا بھی اختیار، اور نہ کرنے کا بھی اختیار، بالاختیار اطاعت، تو اس کو مخلوق نے قبول کرنے سے انکار کردیا، کہ ہم ثواب کی لالچ میں اپنے آپ کو عذاب کے خطرے میں نہیں ڈالتے۔ اور اللہ تعالیٰ نے جب اس امانت کو انسان کے سامنے پیش کیا تو انسان نے قبول کرلیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کو استعداد دی کہ اپنے اختیار کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اَحکام کو قبول کرے، دل کے اندر ایمان کا جذبہ ڈالا، اور پھر عہدِ اَلست کے ساتھ اس کو اجاگر کیا، اور دُنیا میں آنے کے بعد اپنی کتابوں کے ساتھ اور اپنے انبیاء ﷺ کے ذریعے سے یاددہانی کروائی۔ تو یہ امانت جو قبول کی تو اس میں دونوں پہلو ہیں، اگر اس امانت کی حفاظت کرو گے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی بالاختیار اطاعت کرو گے تو آخرت کا ثواب ہے، اور اگر اس امانت کو ضائع کردو گے، وہ تخمِ ایمانی جو تمہاری فطرت میں ڈالا گیا ہے اگر اس کی نگہداشت نہ کی اور اس کی حفاظت نہ کی اور اس کو ضائع کردیا تو پھر آخرت میں عذاب ہوگا۔ تو یہ دونوں پہلو انسان کے سامنے ہیں، اپنے اختیار کے ساتھ اطاعت کرے گا تو ثواب لے لے گا، اور اپنے اختیار کے ساتھ نافرمانی کی طرف جائے گا تو عذاب مل جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اِختیار دے دیا، ارادہ دے دیا، اور اس کو اس میدان کے اندر اُتار دیا۔ اب یہی یاد دلایا جارہا ہے کہ جو امانت تم نے اپنے ذِمّے لی تھی اب اس کی نگہداشت کرو، اور اللہ تعالیٰ کے اَحکام کی اطاعت کرو۔

''ظالم'' اور ''جاہل'' کے دو مفہوم

آگے جو لفظ ہے کہ انسان ظالم اور جاہل ہے، اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا، اس کا دو طرح سے مطلب ذکر کیا گیا ہے۔ ظالم اصل کے اعتبار سے اس کو کہتے ہیں کہ جس میں عدل کی صلاحیت ہو پھر عدل نہ کرے، اور جاہل اس کو کہتے ہیں کہ جس میں علم حاصل کرنے کی صلاحیت ہو اور علم حاصل نہ کرے۔ مثلاً آپ اس دیوار کو جاہل نہیں کہہ سکتے، کیونکہ اس کی طرف علم منسوب نہیں ہوتا۔

بھینس، بکری کو آپ جاھل نہیں کہہ سکتے کیونکہ ان کی طرف علم منسوب نہیں۔ جاھل اسے کہیں گے کہ جس میں علم حاصل کرنے کی استعداد ہے اور پھر اس نے علم حاصل نہیں کیا۔ اور ظالم اس کو کہیں گے کہ جس میں عدل کرنے کی صلاحیت ہے پھر اس نے عدل نہیں کیا۔ تو گویا کہ ان دو لفظوں میں اللہ تعالیٰ نے انسان کے اختیار کو واضح کیا ہے کہ انسان ظالم ہے، جاہل ہے، یعنی اس میں عدل کرنے کی صلاحیت بھی ہے اور عدل نہ کرنے کی صلاحیت بھی ہے، اور جاہل ہے کہ اس میں علم حاصل کرنے کی صلاحیت بھی ہے، اور علم نہ حاصل کرنے کا بھی اس کو اختیار ہے۔ تو یہ دو صفتیں اس کے اندر جو پائی گئی تھیں، یہی باعث بنیں اس امانت کو اُٹھانے کا، کہ اپنے اختیار کے ساتھ یہ عدل و انصاف کرے، اپنے اختیار کے ساتھ یہ علم حاصل کرے۔ تو یہ ظلوم وجہول والی صفت باعث بنی انسان کے لئے اس امانت کو برداشت کرنے کا، کہ اگرچہ اس وقت یہ عدل سے خالی تھا لیکن عدل کرنے کی اس میں صلاحیت تھی، اس وقت علم سے خالی تھا لیکن علم حاصل کرنے کی اس میں صلاحیت ہے، یوں بھی بعض مفسرین نے ان لفظوں کو بیان کیا ہے...... اور یا یہ موجودہ انسان کی شکایت ہے کہ امانت اُٹھائی بھی انسان نے، پہاڑوں نے انکار کر دیا، زمین نے انکار کر دیا، آسمانوں نے انکار کر دیا، آگے بڑھ کے یہ ذمہ داری قبول بھی اس نے کی، اور اب انسان ہی ظالم اور جاہل ہے، اور یہ پھر ہوگا قضیہ مہملہ، سب افراد کے اُوپر حکم لگانا مقصود نہیں، فی الجملہ اَفراد پر حکم لگانا مقصود ہے، کہ چاہیے تو یہ تھا کہ جب اپنے شوق کے ساتھ اپنے اختیار سے اس امانت کو قبول کیا، تو سارے ہی عادل ہوتے، سارے ہی منصف ہوتے، اور سارے ہی اللہ کے احکام کا علم حاصل کرتے۔ لیکن ذمہ داری قبول کرلی، ذِمّے داری قبول کرنے کے بعد اب نہ تو اللہ کے احکام کا علم حاصل کرتے ہیں، اور نہ اللہ کے اَحکام کے مطابق عمل کرتے ہیں، اس لئے انسان ظالم، جاہل ہے، اس کے لئے ظالم، جاہل ہونا مناسب نہیں۔ جو ذمہ داری اس نے اپنے ذِمّے لی ہے، جو امانت اس نے سنبھالی ہے، اس کو ادا کرنے کے لئے چاہیے کہ علمِ صحیح حاصل کرے، اور اس کے مطابق کردار بھی اختیار کرے۔ پھر یہ فی الجملہ انسانوں پر حکم لگانا مقصود ہے، سب افراد کا یہ حکم نہیں، کیونکہ انبیاء ﷩، اولیاء، علماء، صلحاء، وہ ظلوم اور جہول کا مصداق نہیں ہوں گے۔ اس کا مصداق پھر وہی افراد ہیں جو نہ صحیح علم حاصل کرتے ہیں نہ علم کے مطابق عمل کرتے ہیں، فی الجملہ افرادِ انسانی کے اوپر یہ حکم لگ جائے گا، جوانہی پر صادق آئے گا جو کہ واقعتاً ظالم اور جاہل ہیں، اور جو ظالم اور جاہل نہیں ہیں ان پر یہ حکم نہیں لگے گا۔ اور شکایت کا پہلو اس میں یہ ہوگیا کہ امانت ذِمّے لی تھی، لیکن بعد میں نہ اس کی تفصیلات معلوم کیں، نہ اس کے مطابق عمل کیا۔

اور نتیجہ اس امانت کی سپردگی کا کیا ہوگا؟ نتیجہ یہ ہوگا کہ بعضے اس کی حفاظت کریں گے، بعضے نہیں کریں گے، جیسے ظلوم وجہول کے اندر آگیا۔ تو پھر اللہ تعالیٰ منافق مرد، منافق عورتیں، مشرک مرد، مشرک عورتیں، ان سب کو عذاب دے گا۔ یہی ہیں جنہوں نے امانت کو ضائع کر دیا، کلیۃً ضائع کر دیا کہ کُفر اختیار کرلیا شرک اختیار کرلیا، یا یہ دوغلا پن اختیار کرلیا کہ دل میں کُفر ہے اُوپر چاہے ایمان کا اظہار کر دیا، دونوں صورتوں میں یہ عذاب میں داخل ہوں گے۔ اور جو اس امانت کی رعایت رکھیں گے کہ ایمان لائیں گے مرد ہوں یا عورتیں ہوں، یہ ایمان کی نگہداشت کی طرف اشارہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کے اُوپر توجہ فرمائے گا، ان کے نیک عمل کا ثواب دے گا۔ اور وہ غفور رحیم ہے کہ اگر نادانستہ کوئی کوتاہی ہوجائے، جس طرح سے ایک انسان میں سہو ہے نسیان ہے، مختلف

حالات کے اعتبار سے لغزش ہو جاتی ہے لیکن نیت کے اعتبار سے وہ نیک ہو، جذبہ اس کے اندر امانت کی حفاظت کا ہو، تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے اور اس کے گناہ معاف کر دے گا۔

آیتِ بالا کی تفسیر شیخ الاسلام ؒ کے قلم سے

اس آیت کی تفسیر میں حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب ؒ کی کلام تھوڑی سی سنئے۔ ظلوم وجہول پر لکھتے ہیں:

''یعنی ستم کر دیے، جو بوجھ آسمان زمین اور پہاڑوں سے نہ اُٹھ سکتا تھا، اس نادان نے اپنے نازک کندھوں پر اُٹھالیا، آسماں بارِ امانت نتوانست کشید، قرعہ فال بنامِ من دیوانہ زدند۔ حضرت شاہ صاحب ؒ لکھتے ہیں ''یعنی اپنی جان پر ترس نہ کھایا۔ امانت کیا ہے؟ پرائی چیز رکھنی اپنی خواہش کو روک کر۔ آسمانوں وزمین وغیرہ میں اپنی خواہش کچھ نہیں ہے، یا ہے تو وہی ہے جس پر قائم ہیں۔ انسان میں خواہش اور ہے، اور حکم اس کے خلاف ہے۔ اس پرائی چیز یعنی حکم کو برخلاف اپنے جی کے تھامنا بڑا زور چاہتا ہے، اس کا انجام یہ ہے کہ منکروں کو قصور پر پکڑا جائے، اور ماننے والوں کا قصور معاف کیا جائے۔ اب بھی یہی حکم ہے، کسی کی امانت کوئی جان کر ضائع کر دے تو بدلہ دینا پڑے گا، اور بے اختیار ضائع ہو جائے، تو بدلہ نہیں۔'' (جیسے غفور رحیم میں اشارہ کر دیا) اصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی ایک خاص امانت مخلوق کی کسی نوع میں رکھنے کا ارادہ کیا، جو اس امانت کو اگر چاہے تو اپنی سعی اور کسب اور قوتِ بازو سے محفوظ رکھ سکے اور ترقی دے سکے تاکہ اس سلسلے میں اللہ کی ہر قسم کی شئون وصفات کا ظہور ہو۔ مثلاً اس نوع کے جو افراد امانت کو پوری طرح محفوظ رکھیں اور ترقی دیں، ان پر انعام واکرام کیا جائے، جو غفلت یا شرارت سے ضائع کر دیں ان کو سزا دی جائے، اور جو لوگ اس بارے میں قدرے کوتاہی کریں اُن سے عفو اور درگزر کا معاملہ ہو۔ میرے خیال میں یہ امانت ایمان وہدایت کا ایک تخم ہے، جو قلوبِ بنی آدم میں بکھیرا گیا، جس کو مابہ التکلیف بھی کہہ سکتے ہیں، ''لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَّا اَمَانَةَ لَهٗ'' اسی کی نگہداشت اور تر دد کرنے سے ایمان کا درخت اُگتا ہے، گویا بنی آدم کے قلوب اللہ کی زمینیں ہیں، اور بیج بھی اسی نے ڈال دیا ہے، بارش برسانے کے لئے رحمت کے بادل بھی اسی نے بھیجے، جن کے سینوں سے وحیِ الٰہی کی بارش ہوئی۔ آدمی کا فرض یہ ہے کہ ایمان کے اس بیج کو جو امانتِ الٰہیہ ہے، ضائع نہ ہونے دے، بلکہ پوری سعی وجہد اور تر دد وتفقد سے اس کی پرورش کرے، مبادا غلطی یا غفلت سے بجائے درخت اُگنے کے بیج بھی سوخت ہو جائے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے حضرت حذیفہ ؓ کی اس حدیث میں: ''اَنَّ الْاَمَانَةَ نَزَلَتْ مِنَ السَّمَآءِ فِیْ جَذْرِ قُلُوْبِ الرِّجَالِ ثُمَّ عَلِمُوْا مِنَ الْقُرْاٰنِ'' یہ امانت وہی تخم ہدایت ہے جو اللہ کی طرف سے قلوبِ رجال میں تہہ نشین کیا گیا، پھر علومِ قرآن وسُنّت کی بارش ہوئی، جس سے اگر ٹھیک طور پر انتفاع کیا جائے تو ایمان کا پودا اُگے، بڑھے، پھولے، پھلے اور آدمی کو اس کے ثمرۂ شیریں سے لذت اندوز ہونے کا موقع ملے۔ اور اگر انتفاع میں کوتاہی کی جائے تو اسی قدر درخت کے اُگنے، پھولنے اور پھلنے میں نقصان رہے، یا بالکل غفلت برتی جائے تو سرے سے تخم ہی برباد ہو جائے۔ یہ امانت تھی جو اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان اور پہاڑوں کو دِکھلائی، مگر کس میں اِستعداد تھی؟ جو اس امانتِ عظیمہ کو اُٹھانے کا حوصلہ کرتا! ہر ایک نے بہ لسانِ حال یا بہ زبان قال ناقابلِ برداشت ذمہ داریوں سے ڈر کے انکار کر دیا کہ ہم سے یہ بار نہ اُٹھ سکے گا! خود سوچ

لو کہ بجز انسان کے کون سی مخلوق ہے جو اپنے کسب ومحنت سے اس تخمِ ایمان کی حفاظت وپرورش کرکے ایمان کا شجر بارآور حاصل کر سکے۔ فی الحقیقت اس عظیم الشان امانت کا حق ادا کرسکنا اور ایک افتادہ زمین کو جس میں مالک نے تخم ریزی کردی تھی، خون پسینہ ایک کرکے باغ وبہار بنالینا، اسی ظلوم وجہول انسان کا حصّہ ہوسکتا ہے جس کے پاس زمین قابل موجود ہے اور محنت وتردّد کرکے کسی چیز کو بڑھانے کی قدرت اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا فرمائی ہے۔ ظلوم وجھول، ظالم وجاھل کا مبالغہ ہے۔ ظالم وجاھل وہ کہلاتا ہے جو بالفعل عدل اور علم سے خالی ہو، مگر استعداد اور صلاحیت ان صفات کے حصول کی رکھتا ہو۔ پس جو مخلوق بدء فطرت سے علم وعدل کے ساتھ متصف ہے اور ایک لحہ کے لیے بھی یہ اوصاف اس سے جدا نہیں ہوئے، مثلاً ملائکۃ اللہ، یا جو مخلوق ان چیزوں کے حاصل کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتی، مثلاً: زمین، آسمان، پہاڑ، وغیرہ، ظاہر ہے کہ دونوں اس اَمانتِ الٰہیہ کے حامل نہیں بن سکتے۔ بے شک انسان کے سوا جن ایک نوع ہے جس میں فی الجملہ استعداد اس کے تحمّل کی پائی جاتی ہے، اسی لیے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ میں دونوں کو جمع کیا گیا۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ اَدائے حقِ اَمانت کی استعداد ان میں اتنی ضعیف تھی کہ حملِ اَمانت کے مقام میں چنداں قابلِ ذکر اور درخورِ اعتنا نہیں سمجھے گئے۔ گویا وہ اس معاملے میں انسان کے تابع قرار دیے گئے، جن کا نام مستقل طور پر لینے کی ضرورت نہیں۔'' (تفسیر عثمانی)

جذبۂ اِطاعت جنوں کی بہ نسبت اِنسانوں میں زیادہ ہے

اس تحریر میں ایک بات آپ کے سامنے اور آگئی، کہ انسان کے ساتھ جن بھی اس حملِ امانت میں شریک ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کا صراحتاً یہاں ذکر نہیں کیا، کیونکہ جس طرح سے کمال انسان میں ہے اس امانت کی حفاظت کا، اور اپنے اختیار کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اَحکام کو قبول کرنے کا، جنوں میں یہ استعداد اتنی قوی نہیں۔ اس لیے جنوں میں زیادہ تر شرارتی ہیں اور نافرمان ہیں، اور اِنسانوں میں اکثر لوگ اللہ کی اطاعت وفرماں برداری کرنے والے ہیں، جتنی اطاعت اور فرماں برداری انسانوں میں ہے اتنی جنوں میں نہیں۔ ملائکہ چونکہ مخالفت نہیں کرسکتے اس لئے بااختیار وہاں بھی اطاعت کا سوال نہیں ہے۔ اور باقی مخلوقوں میں اس طرح سے اختیار اور ارادہ نہیں جس کی بنا پر اُن کو بھی امانت سپرد نہیں کی گئی۔ اور ایک انسان ہی ہے جس میں ارادہ تھا، اور علم حاصل کرنے کی صلاحیت تھی، اس کے مطابق عمل کرنے کی صلاحیت تھی، تو اللہ تعالیٰ نے یہ امانت اس کے سپرد کی۔ تو ''ظلوم'' اور ''جھول'' کا لفظ یہاں جو ذکر کیا گیا تو اس میں اس کی صفات کی طرف بھی اشارہ ہے، جیسے دونوں مطلب میں نے ذکر کردیے کہ اس سے اختیار نکلتا ہے۔ اور اس میں شکایت کا پہلو بھی ہوسکتا ہے کہ امانت ذمے لینے کے بعد چاہیے تھا کہ اُس کی علمی تفصیلات حاصل کرتا، جاہل نہ رہتا۔ اور پھر اس کے مطابق عمل کرتا، ظالم نہ ہوتا، اپنے کردار کے اعتبار سے۔ لیکن انسان ایسا نہیں، بلکہ یہ ظالم اور جاہل ہے، یعنی اس کے بعض افراد۔ قضیہ مہملہ کے طور پر فی الجملہ اَفرادِ انسانی پر یہ حکم لگ جائے گا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ
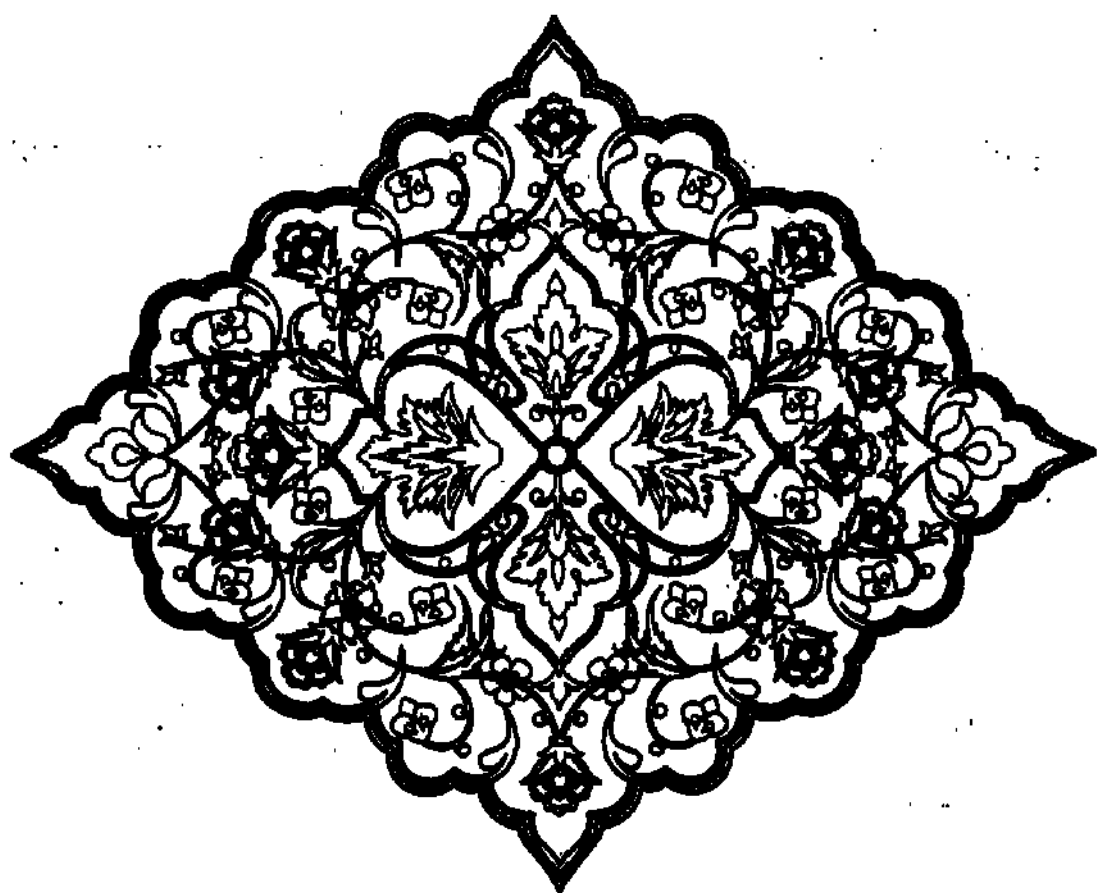
سُورَةُ سَبَإٍ

اٰیاتھا ۵۴ ۳۴ سُوۡرَۃُ سَبَاٍ مَّکِّیَّۃٌ ۵۸ رکوعاتھا ۶

سورۂ سبا مکہ میں نازل ہوئی اس میں ۵۴ آیتیں ہیں اور ۶ رُکوع ہیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ وَلَہُ الۡحَمۡدُ فِی الۡاٰخِرَۃِ ؕ وَ

سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس کے لئے وہ سب چیزیں ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، اور اُسی کے لئے تعریف ہے آخرت میں اور

ہُوَ الۡحَکِیۡمُ الۡخَبِیۡرُ ﴿۱﴾ یَعۡلَمُ مَا یَلِجُ فِی الۡاَرۡضِ وَمَا یَخۡرُجُ مِنۡہَا وَمَا یَنۡزِلُ

وہ حکمت والا ہے، خبر والا ہے ① جانتا ہے وہ ان چیزوں کو جو داخل ہوتی ہیں زمین میں اور جو چیزیں نکلتی ہیں زمین سے، اور جو چیزیں اُترتی ہیں

مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعۡرُجُ فِیۡہَا ؕ وَہُوَ الرَّحِیۡمُ الۡغَفُوۡرُ ﴿۲﴾ وَقَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا

آسمان سے اور جو چڑھتی ہیں آسمان میں، اور وہ رحم کرنے والا ہے بخشنے والا ہے ② اور کہا ان لوگوں نے جنہوں نے کُفر کیا کہ

لَا تَاۡتِیۡنَا السَّاعَۃُ ؕ قُلۡ بَلٰی وَرَبِّیۡ لَتَاۡتِیَنَّکُمۡ ۙ عٰلِمِ الۡغَیۡبِ ۚ لَا یَعۡزُبُ

ہمارے پاس قیامت نہیں آئے گی، آپ کہہ دیجئے کیوں نہیں، میرے رَبّ کی قسم! جو غیب کو جاننے والا ہے، البتہ ضرور آئے گی تمہارے پاس، نہیں چھپتا

عَنۡہُ مِثۡقَالُ ذَرَّۃٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الۡاَرۡضِ وَلَاۤ اَصۡغَرُ مِنۡ ذٰلِکَ وَلَاۤ اَکۡبَرُ اِلَّا

اس سے ذرّے کا وزن آسمانوں میں نہ زمین میں اور نہ اس سے چھوٹی اور نہ اس سے بڑی چیز مگر

فِیۡ کِتٰبٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۳﴾ۙ لِّیَجۡزِیَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ

واضح کتاب میں ہے ③ تاکہ بدلہ دے اللہ تعالیٰ ان کو جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے، ان کے لئے

مَّغۡفِرَۃٌ وَّرِزۡقٌ کَرِیۡمٌ ﴿۴﴾ وَالَّذِیۡنَ سَعَوۡ فِیۡۤ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیۡنَ اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ عَذَابٌ

بخشش ہے اور باعزّت روزی ہے ④ اور وہ لوگ جو ہماری آیات میں کوشش کرتے ہیں اس حال میں کہ ہرانے والے ہیں، ان کے لئے

مِّنۡ رِّجۡزٍ اَلِیۡمٌ ﴿۵﴾ وَیَرَی الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ

سختی کا دردناک عذاب ہے ⑤ اور سمجھتے ہیں وہ لوگ جو علم دیے گئے کہ جو کچھ اُتارا گیا تیری طرف تیرے رَبّ کی جانب سے

هُوَ الْحَقَّ ۙ وَيَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝٦ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ

وہ حق ہے، اور وہ راہنمائی کرتا ہے عزیز حمید کے راستے کی طرف ⑥ اور کہا ان لوگوں نے جنہوں نے کفر کیا، کیا

نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ

راہنمائی کریں ہم تمہاری ایسے آدمی پر جو تمہیں خبر دیتا ہے جس وقت تم ریزہ ریزہ کردیے جاؤ گے پوری طرح سے ریزہ کیا جانا، بے شک تم البتہ نئی

جَدِيْدٍ ۝٧ اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ بَلِ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ

پیدائش میں ہو گے ⑦ کیا اس نے اللہ پر جھوٹ گھڑا ہے یا اس کو جنون ہے؟ بلکہ وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے

فِي الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِيْدِ ۝٨ اَفَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِّنَ

عذاب میں ہیں اور دُور کی گمراہی میں ہیں ⑧ کیا پھر یہ دیکھتے نہیں اس چیز کی طرف جو ان کے سامنے ہے اور جو اُن کے پیچھے ہے یعنی

السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ

آسمان اور زمین، اگر ہم چاہیں تو دھنسا دیں ان کو زمین میں، یا گرادیں ان کے اُوپر آسمان

السَّمَاۗءِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ۝٩ ع

کے ٹکڑے، بے شک اس میں البتہ نشانی ہے ہر بندے کے لئے جو (اللہ کی طرف) رُجوع کرنے والا ہے ⑨

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ۭ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ۚ وَاَلَنَّا

البتہ تحقیق ہم نے داؤد کو اپنی طرف سے فضیلت دی تھی، اے پہاڑو! لوٹاؤ داؤد کے ساتھ، اور (حکم دیا ہم نے) پرندوں کو، اور ہم نے نرم کردیا

لَهُ الْحَدِيْدَ ۝١٠ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝١١

داؤد کے لئے لوہے کو ⑩ کہ بنا کامل کامل زرہیں اور جوڑنے میں اندازہ رکھ، اور نیک عمل کرو، بے شک میں جو کچھ تم کرتے ہو دیکھنے والا ہوں ⑪

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ

اور (مسخر کیا ہم نے) سلیمان کے لئے ہوا کو، اس کا صبح کو چلنا بھی ایک مہینے کی مسافت ہوتی تھی اور اس کا شام کو چلنا بھی ایک مہینے کی مسافت ہوتی تھی،

وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ ۭ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ

اور ہم نے بہادیا ان کے لئے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ، اور (مسخر کیا ہم نے اس کے لئے) جنوں میں سے ان کو جو کام کرتے تھے اُس کے سامنے

بِاِذْنِ رَبِّهٖ ؕ وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴿۱۲﴾ يَعْمَلُوْنَ

اس کے رَبّ کے حکم سے، جوان میں کجی اختیار کرے ہمارے حکم سے، چکھائیں گے ہم اس کو آگ کے عذاب کا مزہ ﴿۱۲﴾ وہ جِنّات بناتے تھے

لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ؕ اِعْمَلُوْٓا

سلیمان کے لئے جو سلیمان چاہتے، یعنی بڑی بڑی عمارتیں، تصویریں، تالابوں کی طرح پیالے، اور جمی رہنے والی ہانڈیاں، اے داؤد کے گھر

اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ؕ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ﴿۱۳﴾ فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا

والو! عمل کرو شکر کے طور پر، میرے بندوں میں سے شکر گزار تھوڑے ہیں ﴿۱۳﴾ پھر جس وقت ہم نے اس پر موت طاری کی، نہیں

دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ ۚ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ

راہنمائی کی ان جنوں کی سلیمان کی موت پر مگر دیمک نے جو کھاتی تھی سلیمان کی لاٹھی کو، جس وقت سلیمان گر گئے تو جنوں کو پتا چل گیا کہ

لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ﴿۱۴﴾ لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ

اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو نہ ٹھہرتے ذلیل کرنے والے عذاب میں ﴿۱۴﴾ البتہ تحقیق سبا کے لئے

مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ ۬ؕ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ

ان کے مسکن میں نشانی تھی، دو باغ دائیں اور بائیں طرف، کھاؤ تم اپنے رَبّ کے رِزق کو اور اس کا شکر ادا کرو،

بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ ﴿۱۵﴾ فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ

پاکیزہ علاقہ ہے اور بخشنے والا رَبّ ہے ﴿۱۵﴾ پس انہوں نے اِعراض کیا، ہم نے بند کا سیلاب ان کے اُوپر بھیج دیا

وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ وَّشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ

اور دیے ہم نے ان کو ان کے دو باغوں کے بدلے دو باغ کڑوے کسیلے میوے والے اور جھاؤ والے اور بیریوں میں سے کچھ

قَلِيْلٍ ﴿۱۶﴾ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ؕ وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ ﴿۱۷﴾ وَجَعَلْنَا

تھوڑی سی ﴿۱۶﴾ یہ بدلہ دیا ہم نے اُن کو ان کی ناشکری کی وجہ سے، اور نہیں بدلہ دیتے ہم مگر ناشکرے کو ﴿۱۷﴾ اور ہم نے

بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّقَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ ؕ

اُن کے درمیان اور اُن بستیوں کے درمیان جن میں ہم نے برکت دی بستیاں بنائیں نمایاں بستیاں، اور چلنے کا اندازہ کیا ہم نے ان بستیوں میں،

سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا اٰمِنِيْنَ ﴿۱۸﴾ فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا

چلو ان بستیوں میں راتوں کو اور دِنوں کو بے خوف ہو کر ﴿۱۸﴾ پھر وہ کہنے لگے کہ اے ہمارے رَبّ! دُوری کر دے ہمارے سفروں کے درمیان

وَظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ

اور انہوں نے اپنے نفسوں پہ ظلم کیا، پھر ہم نے ان کو افسانے بنا دیا، اور ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا پوری طرح سے، اس میں البتہ نشانیاں ہیں ہر

صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۱۹﴾ وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا

صابر شاکر کے لئے ﴿۱۹﴾ البتہ تحقیق ان پر ابلیس نے اپنے گمان کو سچا کر دِکھایا، پس وہ سارے کے سارے اس ابلیس کے پیچھے لگ گئے مگر

فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَمَا كَانَ لَهٗ عَلَيْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يُّؤْمِنُ

مومنین کا ایک گروہ ﴿۲۰﴾ اور نہیں تھا اس ابلیس کے لئے ان پر کوئی تسلط مگر اس لئے تا کہ ہم ظاہری طور پر جان لیں آخرت پر ایمان لانے

بِالْاٰخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِيْ شَكٍّ ۭ وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿۲۱﴾

والوں کو ان لوگوں سے جُدا کر کے جو اس آخرت کی طرف سے شک میں پڑے ہوئے ہیں، اور تیرا رَبّ ہر چیز کے اُوپر نگہبان ہے ﴿۲۱﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اس سورت کا نام اس واقعے سے ماخوذ ہے جو دُوسرے رُکوع میں آرہا ہے: لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ: سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔ اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ یہ رأس الشکر ہے، اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لئے بھی یہ کلمہ استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا ترجمہ یوں بھی کیا جا سکتا ہے، اُس اللہ کا شکر ہے جس کے لئے وہ سب چیزیں ہیں جو آسمان میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، وَلَهُ الْحَمْدُ فِي الْاٰخِرَةِ: اور اسی کے لئے تعریف ہے آخرت میں، وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ: اور وہ حکمت والا ہے خبر والا ہے۔ یعنی دُنیا میں بھی سب تعریفیں اسی کے لئے ہیں، اور آخرت میں بھی سب تعریفیں اسی کے لئے ہیں۔ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ: جانتا ہے وہ ان چیزوں کو جو داخل ہوتی ہیں زمین میں، وَلَجَ يَلِجُ وُلُوْجًا: داخل ہونا۔ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا: اور جو چیزیں نکلتی ہیں زمین سے۔ وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ: اور جانتا ہے اُن چیزوں کو جو اُترتی ہیں آسمان سے، وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا: اور جو چیزیں چڑھتی ہیں آسمان میں۔ يَعْرُجُ وغیرہ مفرد کے صیغے ہیں مَا کے لفظ کے اعتبار سے۔ وَهُوَ الرَّحِيْمُ الْغَفُوْرُ: اور وہ رحم کرنے والا ہے، بخشنے والا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ: کافروں نے کہا، کہا ان لوگوں نے جنہوں نے کُفر کیا، ہمارے پاس قیامت نہیں آئے گی۔ قُلْ بَلٰى: آپ کہہ دیجئے کیوں نہیں آئے گی؟ وَرَبِّيْ: میرے رَبّ کی قسم، لَتَاْتِيَنَّكُمْ: البتہ ضرور آئے گی تمہارے پاس،

عٰلِمِ الْغَيْبِ: یہ وَرَبِّیْ میں جو ربّ کا لفظ آیا ہے عٰلِمِ الْغَيْبِ اس کی صفت ہے۔ میرا ربّ غیب کو جاننے والا ہے، میرے رَبّ غیب کو جاننے والے کی قسم، البتہ ضرور آئے گی۔ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ: نہیں چھپتا اس میرے رَبّ سے ذرے کا وزن، ذَرَّةٍ: "ۃ" وحدت کی ہے، اور اصل کے اعتبار سے یہ چیونٹی کے بچے کو کہتے ہیں، ذَرٌّ اس کی جمع آ جائے گی، "تَمْرٌ وَتَمْرَةٌ" والا فرق۔ اور روشن دان میں سے سورج کی شعاع اندر آ رہی ہو تو اس میں جو باریک باریک چیزیں نظر آیا کرتی ہیں وہ بھی ذرات کا مصداق ہیں، دُھوپ کی شعاع میں جو نظر آتی ہیں ویسے نہیں نظر آیا کرتیں۔ تو یہ ذرّہ برابر چیز بھی نہیں چھپتی اس میرے رَبّ سے آسمانوں میں نہ زمین میں، وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ: اور نہ اس سے چھوٹی اور نہ اس سے بڑی، اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ: مگر واضح کتاب میں ہے۔ کتاب مبین سے "لوحِ محفوظ" مراد ہے جس میں اللہ کے علم کی تعبیر ہے۔ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: یہ لَتَاْتِيَنَّكُمْ سے متعلق ہے۔ البتہ ضرور آئے گی وہ قیامت تمہارے پاس تاکہ بدلہ دے اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو جو ایمان لائے، اور انہوں نے نیک عمل کیے، اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ: ان کے لئے بخشش ہے اور باعزّت روزی ہے۔ وَالَّذِيْنَ سَعَوْ فِیْٓ اٰيٰتِنَا: اور وہ لوگ جو ہماری آیات میں کوشش کرتے ہیں، مُعٰجِزِيْنَ: اس حال میں کہ وہ ہرانے والے ہیں، عاجز کرنے والے ہیں، یعنی اُن کی کوشش یہ ہے کہ ہماری آیات کو باطل کر دیں، اور ہمارے انبیاء کو اور اولیاء کو جو اللہ کی آیات پیش کرنے والے ہیں، اُن کو اپنے مقابلے میں عاجز کر دیں۔ وہ لوگ جو کوشش کرتے ہیں ہماری آیات میں اس حال میں کہ ہرانے والے ہیں، اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ: اَلِيْمٌ یہ مرفوع ہے اور یہ صفت ہے عَذَابٌ کی۔ دوسری قراءت اس میں اليمٍ بھی ہے، تو پھر یہ رِجْزٍ کی صفت ہو جائے گی۔ رِجز سختی کو کہتے ہیں، عذاب تکلیف کو کہتے ہیں، تو عذاب اليم من رجز، مِنْ رِّجْزٍ یہ عذاب اليم کا بیان ہے (مظہری)۔ ان کے لئے سختی کا دردناک عذاب ہے، ان کے لیے دردناک عذاب ہے یعنی سختی، جس طرح سے چاہیں آپ اس کو بیان کر سکتے ہیں۔ اور اگر یہ اليم، رجز کی صفت ہوتی ہے جس طرح سے دوسری قراءت ہے، ہماری قراءت میں اليم رفع کے ساتھ ہے اور یہ عذاب کی صفت ہے، تو اگر جر کے ساتھ ہو پھر معنی ہوگا "ان کے لیے عذاب ہے یعنی درد پہنچانے والی سختی" پھر درد پہنچانے والی، یہ رجز کی صفت بن جائے گی، لیکن ہماری قراءت میں ایسے نہیں، ہمارے ہاں اليم عذاب کی صفت ہے، عذابٌ اليمٌ من رِجزٍ، سختی کا دردناک عذاب ہے۔ وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ: یہ یَرٰی رُویتِ قلبی سے ہے۔ اور سمجھتے ہیں وہ لوگ جو علم دیے گئے، الَّذِیْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ: یہ دو مفعول ہیں، سمجھتے ہیں وہ لوگ جو علم دیے گئے کہ جو کچھ اُتارا گیا تیری طرف تیرے رَبّ کی جانب سے وہ حق ہے۔ وَيَهْدِیْٓ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ: اور وہ راہنمائی کرتا ہے عزیز حمید کے راستے کی طرف۔ يَهْدِیْ کی ضمیر الَّذِیْٓ اُنْزِلَ کی طرف چلی گئی۔ جو کچھ تیری طرف اتارا گیا وہ راہنمائی کرتا ہے عزیز حمید کے راستے کی طرف، یعنی اللہ کے راستے کی طرف جو عزیز حمید ہے۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: اور کہا کافروں نے، کہا ان لوگوں نے جنہوں نے کفر کیا، هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ: کیا راہنمائی کریں ہم تمہاری ایسے آدمی پر جو تمہیں خبر دیتا ہے، اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ: جس وقت تم ریزہ ریزہ کر دیے جاؤ گے پوری پوری طرح سے ریزہ کیا جانا، اِنَّكُمْ لَفِیْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ: بے شک تم البتہ نئی پیدائش میں ہو گے۔ جو تمہیں یہ خبر دیتا ہے کہ ریزہ ریزہ ہو جانے کے بعد تم دوبارہ پیدا کیے جاؤ گے، نئی پیدائش میں آ جاؤ گے، کیا ہم تمہیں ایسا آدمی بتائیں؟ کیا راہنمائی کریں ہم تمہاری ایسے آدمی پر جو

خبر دیتا ہے تمہیں، جب تم ریزہ ریزہ کردیے جاؤ گے پوری طرح سے ریزہ ریزہ کیا جانا، بے شک تم البتہ خلق جدید میں ہو گے۔ اَفْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ: اَفْتَرٰی یہ اصل میں تھا اِفْتَرٰی، ہمزہ وصلی گر گیا۔ کیا اس نے اللہ پہ جھوٹ گھڑا ہے، یا اس کو جنون ہے؟ بَلِ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِيْدِ: بلکہ وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے، عذاب میں ہیں اور دُور کی گمراہی میں ہیں۔ بہت دُور گمراہی میں جا پڑے، یعنی یہ شخص جو یوں کہتا ہے وہ نہ مفتری ہے نہ مجنون ہے بلکہ جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے وہی عذاب میں ہیں اور دُور کی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ اَفَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ: کیا پھر یہ دیکھتے نہیں اس چیز کی طرف جو ان کے سامنے ہے، اور جو ان کے پیچھے ہے یعنی آسمان اور زمین، آسمان اور زمین جو ان کے سامنے ہے اور ان کے پیچھے ہے کیا یہ اس کی طرف دیکھتے نہیں۔ اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْاَرْضَ: اگر ہم چاہیں تو دھنسا دیں ہم ان کو زمین میں، اَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ: یا گرا دیں ان کے اوپر آسمان کے ٹکڑے۔ كِسَفًا كِسفة کی جمع ہے، قِطعة کے وزن پر۔ قِطعة کی جمع جیسے قِطَعٌ آجاتی ہے، اسی طرح سے كِسفة کی جمع كِسَف ہے۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ: بے شک اس میں البتہ نشانی ہے ہر بندے کے لئے جو اللہ کی طرف رُجوع کرنے والا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا: البتہ تحقیق، یعنی یہ پکی بات ہے کہ ہم نے داؤد علیہ السلام کو اپنی طرف سے فضیلت دی تھی۔ يٰجِبَالُ: اے پہاڑو! اَوِّبِيْ: یہ تاویب سے ہے، اس کا مادّہ اوب ہے، لوٹانا۔ مآب لوٹنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ اور اس میں خطاب پہاڑوں کو ہے۔ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ: اے پہاڑو! لوٹا دو داؤد علیہ السلام کے ساتھ۔ وَالطَّيْرَ: اور حکم دیا ہم نے پرندوں کو، اَیْ وَاَمَرْنَا الطیرَ (خازن)۔ اَوِّبِيْ کا مفعول یہاں محذوف ہے، کیا بات لوٹاؤ؟، اَوِّبِي التَّسْبِيْحَ مَعَ دَاوٗدَ (نسفی)، داؤد علیہ السلام کے ساتھ اللہ کی تسبیح تحمید کو لوٹاؤ۔ لوٹانے کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ داؤد علیہ السلام پڑھتے ہیں اُن کی آواز کے ساتھ آواز ملا کر تم بھی وہی بات دوہراؤ۔ بالکل اس کی ظاہری مثال آپ یوں لے لیں، جس طرح سے آپ کسی گنبد میں کھڑے ہو کے جو بولیں تو گنبد کی طرف سے وہی آواز آتی ہے، گویا کہ گنبد آپ کی آواز کو لوٹا رہا ہے، پہاڑوں میں خاص طور پر یہ چیز نمایاں ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص ایک آواز دے تو دوسری طرف سے وہ آواز لوٹتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ایک طرف لاؤڈ سپیکر لگا ہوا ہو، دوسری طرف اُونچی عمارت ہو، تو عمارت کے ساتھ ٹکرا کے آواز لوٹتی ہے جس کو آوازِ بازگشت کہتے ہیں، یہ تو عام چیز ہے۔ لیکن پہاڑوں کو جو حکم دیا گیا تھا آواز لوٹانے کا، وہ آوازِ بازگشت کے طور پر نہیں، بلکہ باقاعدہ اختیاری تسبیح جس طرح سے پڑھتے ہیں، حضرت داؤد علیہ السلام کے معجزے کے طور پر پہاڑ بھی اسی طرح سے ساتھ تسبیح پڑھتے تھے، جو حمد وثناء کے بول حضرت داؤد علیہ السلام بولتے، تو یہ پہاڑ اور پرندے جو حضرت داؤد کے اردگرد ہوتے، اسی طرح سے اس بات کو دوہراتے تھے۔ تو اَوِّبِيْ مَعَهٗ کا یہ معنی ہے۔ لوٹاؤ تسبیح اور تحمید، اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کے بول جو حضرت داؤد بولتے ہیں ان کو لوٹاؤ داؤد علیہ السلام کے ساتھ۔ وَالطَّيْرَ: اور ہم نے پرندوں کو بھی حکم دیا۔ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ: اور ہم نے نرم کر دیا داؤد علیہ السلام کے لئے لوہے کو۔ اَلَانَ يُلِيْنُ: نرم کرنا۔ لَانَ يَلِيْنُ مجرد سے ہو تو نرم ہونا۔ ہم نے نرم کر دیا داؤد علیہ السلام کے لیے لوہے کو، اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ: یعنی یہ کہتے ہوئے، یا ہم نے حکم دیا، اور سابغات یہ کاملات کے معنی میں ہے، سَبَغَ سُبُوغًا: کامل ہونا، اَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً (سورۂ لقمان: ۲۰) سٰبِغٰتٍ یہ صفت ہے ''دُروع'' کی، کامل کامل زرہیں۔ بنا تو کامل زرہیں۔ ''زرہ'' کہتے ہیں جو لڑائی میں لوہے کا لباس پہنا جاتا ہے۔

پہلے یہ ایسے ہی ہوتا تھا جس طرح سے لوہے کی ایک تختی سینے کے اوپر جوڑ لی جائے، آج کل عجائب گھروں میں جو پُرانے زمانے کی زرہوں کے نمونے رکھے ہوئے ہیں ان میں دونوں قسم کی زرہیں ہیں، بعض ایسے ہی تختی کی صورت میں ہوتی ہیں، پیتل کی پگھلا کر، یا سٹیل وغیرہ کی پگھلا کر بنائی ہوئی، وہ یوں چڑھا لیتے ہیں جس طرح سے لوہے کا ایک تختہ ہوتا ہے۔ اور ایک زرہیں ہوتی ہیں حلقہ دار، جو زنجیری کے طور پر بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ تو یہ حلقہ دار زرہیں حضرت داؤد علیہ السلام سے شروع ہوئیں، یہ صنعت داؤدی ہے۔ بنایئے کامل کامل زرہیں، وَقَدِّرْ فِي السَّرْدِ: سرد کا معنی ہوتا ہے بننا۔ اور اس بننے میں اندازہ رکھ، جوڑنے میں اندازہ رکھ۔ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا: اور داؤد علیہ السلام کے ساتھ ان کے دیگر گھر کے افراد کو شامل کر کے حکم آ گیا۔ اور نیک عمل کرو۔ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ: بے شک میں جو کچھ تم کرتے ہو، دیکھنے والا ہوں۔ وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ: اور مسخر کیا ہم نے سلیمان علیہ السلام کے لئے ہوا کو، غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ: شَهْرٌ اَيْ مسيرةُ شهرٍ، مضاف محذوف ہے (عام تفاسیر)۔ اُس کا صبح کو چلنا بھی ایک مہینے کی مسافت ہوتی تھی، اور اُس کا شام کو چلنا بھی ایک مہینے کی مسافت ہوتی تھی۔ صبح شام یعنی آدھے دن میں وہ ہوا اتنا سفر طے کر لیتی تھی جتنا عام کوئی گھوڑے یا اونٹ پر سفر کرنے والا ایک مہینے میں سفر طے کرتا ہے۔ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ: سالَ يَسيلُ: بہنا، اور، اَسالَ يُسيلُ: بہانا۔ اور ہم نے بہادیا اس کے لئے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ۔ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ: اَيْ وَسَخَّرْنَا من الجن من يعمل (نسفی)، اور مسخر کیا ہم نے اس کے لئے جنوں میں سے ان کو جو کام کرتے تھے اس کے سامنے اس کے رَبّ کے حکم سے۔ وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا: زاغَ يزيغُ: کجی اختیار کرنا۔ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (سورۂ صف) جس وقت وہ ٹیڑھے اللہ نے ان کے دِل اور ٹیڑھے کر دیے۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا (سورۂ آل عمران: ۸) اے ہمارے رَبّ! ہمارے دِلوں کو ٹیڑھا نہ کر۔ تو ''زاغ'' مجرد سے ہو تو کج ہونے کے معنی میں ہے، ''ازاغ'' کج کرنے کے معنی میں۔ جو اُن میں سے کجی اختیار کرے ہمارے حکم سے، نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ: چکھائیں گے ہم اُس کو آگ کے عذاب کا مزہ۔ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ: وہ جنّات کرتے تھے اس سلیمان علیہ السلام کے لئے، بناتے تھے سلیمان کے لیے مَا يَشَآءُ: جو سلیمان علیہ السلام چاہتے، مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ: مِن بیانیہ ہے۔ محاریب محراب کی جمع ہے، محراب بڑی بڑی عمارتوں کو کہتے ہیں، محلات۔ محراب اصل میں حرب سے لیا گیا ہے، ''حرب'' لڑنے کو کہتے ہیں، مسجد کا محراب یہ بھی وہی ہے کہ شیطان کے ساتھ جنگ کرنے کی جگہ ہے۔ اور اُونچے اُونچے محلات، قیمتی عمارتیں ان کو بھی ''محراب'' کہتے ہیں کیونکہ ان کا مالک ان کے دفاع میں دوسروں سے لڑتا ہے۔ تَمَاثِيْلَ تمثال کی جمع ہے، تصاویر۔ جِفان جَفنَة کی جمع، پیالہ۔ الجوابِ جابیہ کی جمع ہے، تالاب کو کہتے ہیں۔ قُدور قِدر کی جمع ہے، ہانڈی۔ راسیات: جمی رہنے والی، ثوابت کے معنی میں۔ رواسی کا لفظ جس طرح سے جبال کی صفت آیا ہے، جَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ (سورۂ مرسلات: ۲۷) وہ بھی راسیہ کی جمع ہے۔ تو راسیات بھی اسی کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہوتا ہے ایک جگہ ٹھہری رہنے والی۔ پہاڑ ایک جگہ جمے ہوئے۔ تو قدور راسیات کا معنی ہوگا کہ اتنی بڑی بڑی دیگیں جو ایک جگہ ٹھہری رہتی تھیں، وہاں سے ہلائی نہیں جا سکتی تھیں۔ بناتے تھے اس سلیمان کے لیے جو سلیمان چاہتا اُونچی اُونچی عمارتوں سے، تصویروں سے اور تالابوں جیسے پیالوں سے اور جمی رہنے والی دیگوں سے۔ ان چیزوں سے جو چیزیں سلیمان چاہتے وہ ان کے لیے بناتے تھے، اور مِن بیانیہ کے طور پر ترجمہ کریں تو ''بناتے تھے سلیمان کے لیے جو سلیمان چاہتے یعنی بڑی بڑی عمارتیں، تصویریں، تالابوں کی طرح

پیالے اور جمی رہنے والی ہانڈیاں، دیگیں۔''اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا: اے داؤد علیہ السلام کے گھر والو! عمل کرو شکر کے طور پر۔ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ: میرے بندوں میں سے شکر گزار تھوڑے ہیں۔ فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ: پھر جس وقت ہم نے اُس پر موت طاری کی، مَادَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ: دَآبَّةُ الْاَرْضِ سے دیمک مراد ہے۔ نہیں راہنمائی کی ان جنوں کی سلیمان علیہ السلام کی موت پر مگر دیمک نے، تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ: جو کھاتی تھی سلیمان علیہ السلام کی لاٹھی کو۔ نَسَأ دُور ہٹانے کو کہتے ہیں، مِنْسَاۃ: دُور ہٹانے کا آلہ۔ جو اس کی لاٹھی کو کھاتی تھی۔ فَلَمَّا خَرَّ: جس وقت سلیمان علیہ السلام گر گئے، تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ: جنوں کو پتا چل گیا، جنوں کے سامنے یہ بات واضح ہوگئی، جنوں نے واضح طور پر معلوم کرلیا، کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے، مَالَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ: نہ ٹھہرتے ذلیل کرنے والے عذاب میں۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ: البتہ تحقیق سبا کے لئے ان کے مسکن میں نشانی تھی۔ مسکن: رہنے کی جگہ، رہائشی علاقہ۔ یہاں مسکن سے رہائشی علاقہ مراد ہے۔ اور ''سبا'' اصل کے اعتبار سے تو ایک آدمی کا نام تھا، پھر اُس کی اولاد جو پھیلی، اور وہ قبیلہ جو بنا تو وہ بھی ''سبا'' ہی کہلاتا تھا۔ یمن میں یہ لوگ آباد تھے۔ البتہ تحقیق سبا کے لئے اُن کی رہائش گاہ میں، ان کے علاقے میں جہاں ان کی سکونت تھی، نشانی تھی۔ نشانی کیا تھی؟ آگے اس کا بیان آ گیا، جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّ شِمَالٍ: دو باغ دائیں اور بائیں طرف۔ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ: کھاؤ تم اپنے رَبّ کے رزق کو، وَاشْكُرُوْا لَهٗ: اور اُس کا شکر ادا کرو۔ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ: پاکیزہ علاقہ ہے اور بخشنے والا رَبّ ہے۔ بلدۃ: شہر، مراد علاقہ ہے۔ پاکیزہ، زرخیز، سرسبز و شاداب، طیبہ کا یہاں یہ معنی ہے۔ فَاَعْرَضُوْا: پس انہوں نے اِعراض کیا، فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ: عرِم کہتے ہیں ''بند'' کو۔ یہی دو پہاڑوں کے درمیان میں جو ''بند'' باندھ دیا جاتا ہے۔ ہم نے بند کا سیلاب اُن کے اُوپر بھیج دیا، یعنی دو پہاڑوں کے درمیان جو انہوں نے بند باندھا ہوا تھا، جس میں پانی جمع رہتا تھا، وہ بند ٹوٹ گیا، سیلاب آ گیا۔ وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ: اور دیے ہم نے ان کو ان کے دو باغوں کے بدلے دو باغ، ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ: اُکل کہتے ہیں میوے کو، خمط کہتے ہیں کسالے کو، کڑوا کسیلا۔ کڑوے کسیلے میوے والے، وَّاَثْلٍ: اور جھاؤ والے، اثل یہ بھی ایک درخت ہے جس کو عربی میں طرفاء بھی کہتے ہیں، اور اُردو میں اس کے لیے جھاؤ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس پہ کوئی پھل نہیں لگتا، ایسے ہی جنگلی سا درخت ہوتا ہے۔ وَّشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ: قَلِيْلٍ یہ شَيْءٍ کی صفت ہے۔ اور کچھ بیریاں، سِدر بیری کو کہتے ہیں۔ بیریوں میں سے کچھ تھوڑی سی۔ ان کے باغوں کے بدلے میں ان چیزوں کے باغ انہیں مل گئے۔ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا: یہ بدلہ دیا ہم نے اُن کو ان کی ناشکری کی وجہ سے، وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ: اور نہیں بدلہ دیتے ہم مگر ناشکرے کو۔ کفور مبالغے کا صیغہ ہے، ناشکری کرنے والا۔ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً: الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا سے شام کا علاقہ مراد ہے۔ اور ہم نے اُن کے درمیان اور ان بستیوں کے درمیان جن میں ہم نے برکت دی بستیاں بنائیں نمایاں، یعنی سڑک پر چلتے ہوئے وہ نظر آتی تھیں، ظاہرہ کا یہاں یہی معنی ہے۔ ظاہر قسم کی بستیاں، جس وقت وہ سڑک پر سفر کرتے تو دائیں بائیں مختلف بستیاں ان کو نظر آتی تھیں۔ وَّقَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ: اور ہم نے ان بستیوں کے اندر چلنے کو مقدر کیا، چلنے کا اندازہ کیا ہم نے ان بستیوں میں۔ سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا اٰمِنِيْنَ: چلو ان بستیوں میں راتوں کو، دِنوں کو، بے خوف ہو کر۔ فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا: پھر وہ کہنے لگے کہ

اے ہمارے رَبّ! دُوری کردے ہمارے سفروں کے درمیان، وَظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ: اور انہوں نے اپنے نفسوں پہ ظلم کیا۔ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ: پھر بنادیا ہم نے اُن کو قصے کہانیاں، ہم نے ان کو افسانے بنادیا، وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ: اور اُن کو منتشر کردیا، متفرق کردیا، ٹکڑے ٹکڑے کردیا ہم نے ان کو پوری طرح سے ٹکڑے ٹکڑے کرنا۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ: اس میں البتہ نشانیاں ہے ہر صابر شاکر کے لئے۔

وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ: لَقَدْ تاکید کے لیے۔ البتہ تحقیق اُن پر ابلیس نے اپنے گمان کو سچا پایا، یا سچا کر دکھایا، دونوں طرح سے ترجمہ کیا جاسکتا ہے، فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ: پس وہ سارے کے سارے اس ابلیس کے پیچھے لگ گئے مگر مؤمنین کا گروہ۔ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ یہ فَرِيْقًا کا بیان ہے، یعنی مؤمنین کے گروہ کو چھوڑ کے باقی سارے کے سارے ہی اس ابلیس کے پیچھے لگ گئے۔ اور جس ''ظن'' کا یہاں حوالہ دیا ہے کہ ابلیس نے ان کے اُوپر اپنے ''ظن'' کو سچا پایا، اس کا ذکر آپ کے سامنے تفصیل سے سورۂ اَعراف میں آیا تھا، جہاں اس نے کہا تھا، میں ان کے آگے پیچھے دائیں بائیں ہر طرف سے ان کے اُوپر تصرف کروں گا، وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ (سورۂ اَعراف: ۱۷) بنی آدم میں سے اکثر کو تو شکرگزار نہیں پائے گا۔ تو اس کا گمان ان کے بارے میں ٹھیک نکلا، کہ ان میں سے اکثر ناشکرے ہو گئے، شکرگزار ان میں سے بہت کم تھے، وہی چند جو ایمان والے بن گئے۔ یا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے اس گمان کو سچا کر دکھایا کہ اس نے پوری طرح سے اپنا زور لگایا، جیسے اس نے کہا تھا واقعی اس نے بہتوں کو گمراہ کرلیا، بہتے ناشکرے ہو گئے، شکرگزار کم تھے۔ وَمَا كَانَ لَهٗ عَلَيْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ: اور نہیں تھا اس ابلیس کے لئے ان پر کوئی تسلط، کوئی غلبہ، اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِيْ شَكٍّ: مگر اس لئے تاکہ ہم ظاہری طور پہ جان لیں جو ایمان لاتا ہے آخرت پر، اور جان لیں اس شخص کو جو اُس آخرت کی طرف سے شک میں ہے، یعنی ان دونوں کے درمیان میں امتیاز کرلیں، اس لئے ہم نے اتنی سی مہلت ابلیس کو دی، اور اتنا تصرف اُن کے اُوپر تھا کہ بہکا سکتا تھا، اِغوا کرسکتا تھا، باقی! زبردستی کسی کو گمراہ نہیں کرسکتا۔ ''نہیں تھا ابلیس کے لئے ان پر کوئی کسی قسم کا تسلط مگر صرف اس لیے تاکہ ظاہری طور پر جان لیں ہم (یہ آپ کے سامنے بار بار ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ جس وقت اپنے علم کو اس طرح سے ذکر کرتے ہیں جس کے بعد ''مِن'' آیا ہوا ہو تو اس میں امتیاز والا معنی ہوتا ہے) تاکہ ہم ظاہری طور پر جان لیں آخرت پر ایمان لانے والوں کو اُن لوگوں سے جدا کرکے جو اس آخرت کی طرف سے شک میں پڑے ہوئے ہیں، یعنی ان کے بارے میں اللہ کا علم ظاہر ہوجائے، لوگوں کو بھی پتا چل جائے کہ یہ مؤمن ہیں یہ کافر ہیں۔ وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ: اور تیرا رَبّ ہر چیز کے اوپر حفیظ ہے، نگہبان ہے۔

تفسیر

سورۂ سبا کے مضامین

سورۂ سبا مکی ہے اور اس میں مضامین ویسے ہی ہیں جس قسم کے مکی سورتوں میں ہوا کرتے ہیں، یعنی اُصول کا تذکرہ۔ اور

خصوصیت کے ساتھ اِثباتِ قیامت اور اِثباتِ توحید اس سورت میں مذکور ہے۔ یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ مرنے کے بعد اُٹھنا ہے اور اللہ کے سامنے حساب دینا ہے، اور یہ ایک بنیاد ہے انسان کے کردار کے لیے کہ اگر کوئی شخص یہ عقیدہ اختیار کرلے کہ میں نے اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے، اور مجھے نیک عملوں کی اچھی جزا ملے گی، اور برے عملوں کی سزا ملے گی تو پھر انسان سوچ سمجھ کے زندگی گزارتا ہے، لااُبالی پن کے ساتھ زندگی نہیں گزارتا۔ آخرت کا عقیدہ اگر دل میں ہو تو انسان کی عملی زندگی میں ایک انقلاب آجاتا ہے۔ اور اگر آخرت کا عقیدہ نہ ہو تو پھر انسان یہ سوچتا ہے کہ جس چیز میں دنیا کا مفاد ہو، وہی کام کیا جائے۔ پھر اپنی خواہشات کو انسان پورا کرتا ہے۔ اور توحید کا اثبات کیا گیا، اور زیادہ تر پہلو جو اس میں اختیار کیا گیا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ذکر کر کے شکر کی تلقین ہے، کہ جس کا کھاتے ہو اس کے شکر ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اسی کی عبادت کرو، اور اس کی توحید اختیار کرو۔ اسی کے اِردگرد ہی ساری سورت کا مضمون گھوم رہا ہے۔ اور اس شکرگزاری پر برانگیختہ کرنے کے لئے دوسرے رکوع میں دو واقعے ذکر کئے گئے ہیں، ایک حضرت سلیمان علیہ السلام اور داؤد علیہ السلام کا، یہ ہے شکرگزاروں کا تذکرہ۔ اور دُوسرا قومِ سبا کا، یہ ہے ناشکروں کا تذکرہ۔ اور دونوں کا انجام سامنے دکھایا کہ دیکھو! سلیمان علیہ السلام اور داؤد علیہ السلام ان کو بھی عظیم الشان سلطنت ملی تھی، ایسی سلطنت کہ جس کی مثال موجود نہیں تھی، اور نہ بعد میں کسی کو ایسی سلطنت ملی۔ لیکن وہ کس طرح سے شکرگزار تھے، سب کچھ اللہ کی طرف سے سمجھتے تھے، اور اللہ کی طرف سے نعمتوں کے ملنے پر ہر وقت شکرگزار، اور عبادت گزار رہتے تھے۔ اور ان کے مقابلے میں دوسری قوم کا تذکرہ کردیا "سبا"، جو اپنی خوش حالی پر اِترا گئے، اللہ کے ناشکرے ہوگئے، تو اس ناشکری کی سزا ان کو اس دنیا میں بھی ملی، اور آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ ان کو عذاب دے گا۔ واقعات کے ساتھ چونکہ حقیقت زیادہ نمایاں ہوجایا کرتی ہے، اس لئے قرآنِ کریم میں کسی اُصول کو بیان کرنے کے بعد عموماً اُس کی تفصیل واقعات کے ساتھ ذکر کی جاتی ہے۔

پہلے شکر کی تلقین ہے، کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جو کچھ زمین میں ہے جو کچھ آسمان میں ہے، جس کے لئے یہ ہے اُسی کے لئے شکر ہے۔ اور وہ ہے اللہ کی ذات۔ سب تعریفیں اُسی کے لئے ہیں، اور آخرت میں بھی شکر اسی کے لئے ہے۔ قرآنِ کریم میں بہت ساری آیات میں جنتیوں کا قول نقل کیا گیا، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (سورۂ یونس:۱۰)، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا (سورۂ اعراف:۴۳)، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا (سورۂ زُمر:۷۴)، یہ سب اللہ کا شکر ہے جو جنتی ادا کریں گے۔ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ: اور وہ حکمت والا ہے، خبر رکھنے والا ہے۔

اِثباتِ آخرت کے ساتھ علم وقدرت کا ذِکر

آگے علم کا اِحاطہ ذکر کیا۔ بارہا آپ کے سامنے یہ حقیقت نمایاں ہوئی کہ جب بھی آخرت کا اثبات کیا جاتا ہے، تو اللہ اپنی قدرت اور علم کو ذکر فرماتے ہیں۔ کیونکہ جو لوگ آخرت کا انکار کرتے تھے، ان کا یہی خیال تھا کہ ہم ذرّات کی شکل میں تبدیل ہوجائیں گے، زمین کے اندر گم ہوجائیں گے، پھر دوبارہ ہمیں کس طرح سے زندہ کیا جائے گا؟ ہڈیاں بوسیدہ ہوجائیں گی۔ جس کا

تعلق اصل میں قدرت اور علم میں شک کے ساتھ ہے، کہ اگر اللہ کی قدرت اور علم کا پوری طرح سے عقیدہ ہو جائے، تو پھر اس بارے میں کوئی شک نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ ذرّات بکھر جانے کے باوجود، اللہ کو علم ہے کہ کہاں کہاں آپ کے ذرّات بکھرے ہیں؟ تو ان باتوں کا مطلب یہی ہے کہ ان کو اللہ کی قدرت اور علم کے اندر شک تھا۔ اس لیے جب بھی اثباتِ آخرت کیا جائے، تو اللہ تعالیٰ ان دو صفتوں کو نمایاں کرتے ہیں، ایک علم کو اور ایک قدرت کو۔ یہاں وہی علم کا احاطہ مذکور ہے، کہ جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے، وہ بھی اللہ جانتا ہے۔ اور جو کچھ زمین سے نکلتا ہے، وہ بھی اللہ جانتا ہے۔ آسمان سے جو کچھ اُترتا ہے، وہ بھی اللہ جانتا ہے۔ اور جو کچھ آسمان پر چڑھتا ہے، وہ بھی اللہ جانتا ہے۔ اور وہ رحیم وغفور ہے، یعنی احاطے کے ساتھ ساتھ رحمت ومغفرت یہ بھی اس کی صفت ہے۔ اپنے بندے پر رحم کرتا ہے، اور اس کی غلطیوں کو معاف کرتا ہے۔ آسمان کی طرف سے اُترنے والی چیزیں، جس طرح سے بارش اُترتی ہے، رزق اُترتا ہے، اللہ کی وحی آتی ہے، فرشتے آتے ہیں۔ آسمان کی طرف چڑھنے والی چیزیں، انسانوں کے اعمال اُوپر جاتے ہیں، اَرواح اُوپر جاتی ہیں، فرشتے اُوپر جاتے ہیں۔ یہ سب چیزیں اللہ کے علم میں ہیں۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کافر کہتے ہیں قیامت نہیں آئے گی، تو ان کا عنوان ہی کافروں والا ذکر کیا کہ جو اللہ تعالیٰ کا کھاتے ہیں اور انتہائی درجے کے ناشکرے ہیں، کھانے کے باوجود اللہ کے علم کو پہچانتے نہیں۔ کیونکہ کُفر، یہ بھی ایک ناشکری ہے۔ تو ''قیامت نہیں آئے گی'' یہ کہنا کافروں کا کام ہے۔ اس لیے جو آخرت کا منکر ہے وہ اسی طرح کافر ہے، جس طرح کوئی اللہ کی ذات کا منکر ہو۔ آپ کہہ دیجئے کیوں نہیں آئے گی، میرے رَبّ کی قسم! جو کہ عالم الغیب ہے ضرور آئے گی۔ اور اللہ کی صفتوں میں سے ''عالم الغیب'' کو ذکر کیا، تو یہ وہی بات کہ علمی احاطے کو ذکر کرنا مقصود ہے۔ کہ تم چاہے ذرّات کی شکل میں منتشر ہو جاؤ، تو بھی اللہ کے علم سے باہر نہیں۔ جیسے تفصیل آگے آرہی ہے، کہ ذرّہ برابر چیز بھی اللہ سے نہیں چھپتی، نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں۔ نہ اس سے کوئی چھوٹی چیز ہے، نہ بڑی چیز ہے، مگر سب کتابِ مبین میں ہے، اللہ کے دفتر کے اندر اس کا ذکر ہے۔

قیامِ قیامت کا مقصد

اور آئے گی کیوں؟ اس کا مقصد یہ ہے تاکہ اللہ تعالیٰ مؤمنوں کو بدلہ دے، اُن کے لئے مغفرت اور رزقِ کریم اللہ نے تیار کر رکھا ہے۔ اور جو لوگ ہماری آیات کو باطل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ہمارے انبیاء علیہم السلام کو شکست دینے کے لئے کوشش کر رہے ہیں، اُن کے لئے سختی کا دردناک عذاب ہے۔ تو ان دونوں کا نتیجہ سامنے آئے گا، اور قیامت اس لئے آئے گی۔ اور اگر قیامت نہ آئے تو پھر نیک اور بد سب برابر ہو گئے۔ مرنے کے بعد ایسا نہیں ہوگا۔ اللہ کی حکمت کا یہ تقاضا نہیں ہے۔ اور جو علم دیے گئے، وہ اس بات کو سمجھتے ہیں، چاہے وہ اہل کتاب میں سے ہوں، کیونکہ اہلِ کتاب بھی آخرت کے قائل تھے، انبیاء علیہم السلام جتنے بھی آئے ہیں، انہوں نے آخرت کا تذکرہ کیا ہے۔ اس لئے پہلے نبی جتنے بھی تھے اُن کی کتابوں میں آخرت کا ذکر اسی طرح سے ہے

جس طرح سے قرآنِ کریم میں ہے۔ آج بھی توراۃ وانجیل جو آپ کے سامنے موجود ہے، اُس کے اندر بھی آخرت کا، جنت کا، دوزخ کا، اسی طرح سے تذکرہ ہے، جس طرح سے ہمارے قرآنِ کریم میں ذکر کیا گیا۔ اور جن کو علم دیا گیا، جن کو سمجھنے کی اللہ نے توفیق دی، وہ بھی اس بات کو جانتے ہیں۔ سمجھتے ہیں وہ لوگ جو اس بات کا علم دیے گئے کہ جو کچھ آپ کی طرف اتارا گیا، آپ کے رَبّ کی طرف سے، وہ حق ہے۔ اور یہ راہنمائی کرتا ہے اللہ کے راستے کی طرف، جو کہ زبردست ہے، اور تعریف کیا ہوا ہے۔

تذکرۂ آخرت پر کافروں کا اِستہزا

اور رسول جس وقت آخرت کا تذکرہ کرتا ہے، تو کافر اس کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ حضور ﷺ جس وقت آخرت کی تلقین کرتے، تو کافر ایک دوسرے کو کہتے ''آؤ تمہیں ایسا آدمی دکھائیں جو کیسی عجیب عجیب باتیں کرتا ہے'' (یہ بطور تحقیر کے ہے)، کہتا ہے کہ مرنے کے بعد تم دوبارہ اُٹھو گے۔ اب دو باتوں میں سے ایک بات ہے، یا تو یہ جھوٹ بولتا ہے کہ مجھے اللہ نے رسول بنایا۔ اور ایسی باتیں جن کو عقل نہیں مانتی، اللہ کی طرف سے بتاتا ہے۔ یا تو اس بات میں یہ جھوٹا ہے۔ یا پھر اس کا دماغ خراب ہو گیا، مجنون ہے، دیوانہ ہے۔ تو جیسے دیوانوں کی باتوں کا کوئی مطلب نہیں ہوا کرتا، ایسے بڑبڑاتے رہتے ہیں، تو یہ بھی دیوانے کی ایک بڑ ہے۔ اس طرح سے یہ تحقیر کرتے ہیں اللہ کے رسولوں کی، اور اس آخرت کے بیان کو جھوٹ قرار دیتے ہیں۔

منکرینِ آخرت کو جواب

تو یہ رسول نہ تو مفتری علی اللہ ہیں، اور نہ اس کو کسی قسم کا جنون ہے، بلکہ یہ آخرت کے منکر لوگ خود ہی عذاب میں اور دُور کی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان کی قسمت خراب ہے۔ یوں سمجھو کہ یہ عذاب میں چلے گئے۔ کیونکہ اِن کا کردار ایسا ہے، کہ نتیجہ یہی سامنے آنے والا ہے۔ ورنہ اِن کو چاہیے تھا کہ آگے پیچھے نظر دوڑاتے، ان کو زمین آسمان نظر آرہا ہے، تو یہ کتنی بڑی اللہ کی قدرت ہے، جس نے زمین وآسمان کو پیدا کر دیا، کیا وہ ان کے پیدا کرنے پر قادر نہیں؟ اور جس نے ان کو پہلے پیدا کر دیا، کیا وہ ان کو دوبارہ پیدا نہیں کرسکتا؟ زمین وآسمان کے خلق کی طرف متوجہ کیا جیسے دُوسری جگہ ہے: لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ: یہ زمین وآسمان کا پیدا کرنا ان کے پیدا کرنے کے مقابلے میں زیادہ مشکل ہے، تو جب اللہ آسمان وزمین کو پیدا کرنے پر قادر ہے تو ان کو پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔ جیسے سورۂ یٰس کے آخر میں آئے گا: اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ: جس نے زمین وآسمان کو پیدا کر دیا، کیا وہ ان جیسوں کے پیدا کرنے پر قادر نہیں؟ یعنی یقیناً قادر ہے۔ تو آگے پیچھے زمین وآسمان نظر آرہا ہے، اگر یہ اُن کو دیکھتے تو یہ ان کو نعمتیں حاصل ہونے کا ذریعہ ہیں۔ اور اگر اللہ چاہے تو انہی کو ان کافروں کے عذاب کا ذریعہ بنا دے، آسمان کے ٹکڑے اُن پر ٹوٹ کر گر پڑیں، تو یہی آسمان تباہی کا باعث بن جائے گا۔ اور اگر اللہ چاہے تو یہی زمین جو ان کے لئے عیش وآرام کا ذریعہ بنی ہوئی ہے، تو اسی کے اندر ہی ان کو دھنسا دے، یہی زمین اُن کو نگل جائے۔ اور ایسے واقعات بھی ہیں، زلزلہ آتا ہے، تو شہروں کے شہر غرق ہو جاتے ہیں۔ تو ہر وقت یہ اللہ کی قدرت کے تحت ہیں۔ اور اللہ کی نعمتوں سے

فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ اگر چاہیں تو اپنے آگے پیچھے دیکھ کر بھی اللہ کی قدرت کو سمجھ سکتے ہیں۔ ''کیا یہ نہیں دیکھتے ؟ اس چیز کی طرف جو ان کے آگے ہے اور پیچھے ہے۔ یعنی آسمان وزمین، اگر ہم چاہیں تو اُن کو زمین میں دھنسادیں، یا آسمان کے ٹکڑے گرادیں، اس میں البتہ نشانی ہے اس بندے کے لئے جو اللہ کی طرف رُجوع کرنے والا ہو۔''

سیدنا داوٗد علیہ السلام کا تعارف اوران کے معجزات

آگے وہ واقعات آگئے۔ اور حضرت داوٗد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کا واقعہ پہلے آپ کے سامنے گزر چکا ہے، سورۂ نمل میں بھی اور سورۂ انبیاء میں بھی۔ البتہ تحقیق داوٗد علیہ السلام کو ہم نے فضیلت دی۔ یہ نبی بھی تھے اور بادشاہ بھی تھے اور اللہ تعالیٰ کے عبادت گزار بندے تھے۔ بادشاہت میں آکر یہ اِترائے نہیں، تکبر میں نہیں آئے۔ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''كَانَ اَعْبَدَ الْبَشَرِ'' حضرت داوٗد علیہ السلام انسانوں میں سے سب سے زیادہ عبادت گزار بندے تھے۔[1] اپنے گھر والوں پر انہوں نے اوقات کو تقسیم کر رکھا تھا۔ کہتے ہیں کہ حضرتِ داوٗد علیہ السلام کا مصلیٰ کسی وقت بھی خالی نہیں رہتا تھا، کوئی نہ کوئی شخص اُس پر اللہ کے ذِکر میں مصروف رہتا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا معمول ذِکر کیا، کہ آدھی رات تک یہ سوتے تھے۔ اور پھر اس کے بعد ثلث شب (رات کا تہائی حصہ) عبادت کرتے تھے، آخری چھٹے حصے میں پھر سوجاتے، تاکہ تھکاوٹ اُتر جائے۔ کیونکہ دِن کو مملکت کے کام انجام دینے ہوتے تھے، اور اسی کو افضل طریقہ قرار دیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے، رات کو عبادت کرنے کے لئے۔ یہ تو ان کا نماز کا معمول تھا رات میں۔ اور روزے کا معمول یہ تھا کہ ایک دِن روزہ رکھا کرتے تھے، اور ایک دِن چھوڑا کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقے کو بھی افضل قرار دیا۔[2] یوں شکرگزار تھے، باوجود بادشاہت مل جانے کے۔ پھر یہ بھی اللہ نے اُن کو ایک معجزہ دیا تھا کہ جس وقت زَبور پڑھتے (زَبور چونکہ شعروں کی شکل میں ہے) اور حضرت داوٗد علیہ السلام بہت خوش آواز تھے، ویسے تو انبیاء علیہم السلام سارے خوش آواز ہوتے ہیں، جس طرح سے احادیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نبیوں کو حُسنِ صورت اور حُسنِ صوت دونوں دیتا ہے۔ اور خصوصیت کے ساتھ جس طرح سے حضرت یوسف علیہ السلام کے حُسن کا ذِکر ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوبصورتی کا ذِکر ہے، اسی طرح سے روایات میں داوٗد علیہ السلام کی خوش آوازی کا ذِکر ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ یہ بھی بہت خوش آواز تھے، یہ بھی ترنّم کے ساتھ قرآنِ کریم پڑھا کرتے تھے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ اُن کو قرآنِ کریم پڑھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا اس کو تو آلِ داوٗد جیسا لب ولہجہ ملا ہے۔[3] تو جس وقت داوٗد علیہ السلام زَبور پڑھتے ترنّم کے ساتھ، خوش آوازی سے، تو پرندے بھی اِردگرد اکٹھے ہوجایا کرتے، آس پاس جو پہاڑ ہوتے وہ بھی جُھوم اُٹھتے، اور باقاعدہ ان سے بھی اس قسم کی آواز پیدا ہوتی۔ تو گویا کہ اللہ کی حمد وثنا یہ سارے مل کر گاتے۔ ''ہم نے کہہ دیا تھا اے پہاڑو! لوٹا ؤ تسبیح کو،

---

(۱) ترمذی ۲/۱۸۷، باب ماجاء فی عقد التسبیح بالید. مشکوٰۃ ۱/۲۲۰ باب جامع الدعاء، فصل ثالث۔

(۲) اَحَبُّ الصِّيَامِ اِلَى اللهِ صِيَامُ دَاوٗدَ كَانَ يَصُوْمُ يَوْمًا وَيُفْطِرُ يَوْمًا وَاَحَبُّ الصَّلَاةِ اِلَى اللهِ صَلَاةُ دَاوٗدَ كَانَ يَنَامُ ...الخ (بخاری ۱/۳۸۶، باب احب الصلاۃ)

(۳) لَوْ رَاَيْتَنِيْ وَاَنَا اَسْتَمِعُ لِقِرَاءَتِكَ الْبَارِحَةَ لَقَدْ اُوْتِيْتَ مِزْمَارًا مِنْ مَزَامِيْرِ آلِ دَاوٗدَ (مسلم ۱/۲۶۸، باب استحباب تحسین الصوت۔ بخاری ۲/۷۵۵)

تحمید کو، داؤد علیہ السلام کے ساتھ مل کر۔ اور ہم نے پرندوں کو بھی حکم دیا۔ اور پھر ہم نے اس کے لئے لوہا نرم کر دیا" یہ معجزہ ہے لوہے کو نرم کرنے کا۔ ایک طریقہ ہے بھٹیوں میں پگھلا کر پھر سانچوں میں ڈال کر جما لیا، ٹھنڈا ہو جاتا ہے تو جم جاتا ہے۔ یہ بھی اسباب کے تحت لوہے کو نرم کر لینا۔ اور حضرت داؤد علیہ السلام کو معجزے کے طور پر یہ چیز حاصل تھی، ان کے ہاتھ میں جا کر لوہا اس طرح سے ہو جاتا تھا جس طرح سے موم ہے، تو وہ اپنی مرضی کے مطابق اس کی تاریں کھینچتے، اس کے بعد اس کی زرہیں بناتے، یہ سامانِ جنگ گویا کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے ایجاد کیا۔ زرہیں جو تھیں وہ تختیوں کی شکل میں ہوتی تھیں۔ داؤد علیہ السلام کے زمانے سے یہ حلقہ دار زرہیں شروع ہوئیں۔

بعض جدید مفسرین کا نظریہ

بعض مفسرین جو جدید قسم کے ہیں،(۱) اور وہ معجزات کو زیادہ سے زیادہ اسباب عادیہ کے قریب کرنے کے عادی ہیں، وہ یونہی کہتے ہیں کہ یہ لوہا پگھلانا اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام پر منکشف کیا، اور انہوں نے اس قسم کی صنعت ایجاد کی کہ جس کے ساتھ لوہے کو آسانی سے پگھلایا جاتا تھا، اور پگھلانے کے بعد پھر اس کو جس طرح سے چاہتے جس سانچے میں چاہتے ڈھال لیتے۔ یہ حضرات یوں کہتے ہیں۔ لیکن عام طور پر ہمارے مفسرینِ قدماء وہ سب یہی کہتے ہیں کہ یہ لوہا نرم ہو گیا تھا بطور معجزے کے۔ "اور ہم نے یہ حکم دیا کہ کامل کامل زرہیں بناؤ، اور ان کے بننے میں ٹھیک ٹھیک اندازہ رکھو" گویا کہ سب کچھ اللہ نے سکھایا "اور نیک عمل کرتے رہو" اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ معجزے دیئے ہیں، اور اس قسم کے فضائل دیے ہیں، تو نیک عمل سے کبھی غفلت نہ ہو۔ اِعْمَلُوْا یہ جمع کا صیغہ ہے۔ کیونکہ اس میں آلِ داؤد علیہ السلام کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ میں تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہوں۔

سلیمان علیہ السلام کے معجزات

اور سلیمان علیہ السلام داؤد علیہ السلام کے بیٹے ہیں، جیسا کہ سورۂ نمل میں تفصیل آئی تھی۔ اُن کے لئے ہم نے ہوا کو مسخر کر دیا۔ یہاں بھی اسی طرح سے جدید قسم کے مفسر کہتے ہیں کہ ہوا کو مسخر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام کو ایسا طریقہ بتلا دیا گیا، کہ جس کے ساتھ انہوں نے سمندری جہازوں پر، بادبان بنائے۔ اور ان بادبانوں کے ذریعے جہاز حرکت کرتے تھے، سفر کرتے تھے۔ تو یہ طریقہ سلیمان علیہ السلام پر منکشف ہوا، انہوں نے اچھے طریقے سے ہوا سے فائدہ اُٹھایا۔ یعنی ان جدید مفسرین نے اس کو عام حالات کی طرف منتقل کر دیا کہ جس طرح سے آج بادبانی کشتیاں چلتی ہیں ہوا کے زور سے، تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسی صنعت کو ترقی دی کہ سمندری جہاز بنائے، جو ہوا کے زور پر چلتے تھے، لیکن یہ کہنا درست نہیں! بلکہ آج لوگ ہوا میں اُڑتے ہیں، اور اسباب کے تحت اُڑتے ہیں، کہ باقاعدہ مشینری بنائی جاتی ہے، جہاز بنایا جاتا ہے، اس میں بیٹھتے ہیں تو جس طرح سے آج ہوا پر اُڑتے ہیں لوگ اسباب کے تحت، تو بلا اسباب اس قسم کی چیز وہ "معجزہ" کہلاتی ہے۔ تو سلیمان علیہ السلام کو یہ معجزہ دیا گیا تھا کہ ایک تخت تھا، اُس پر بیٹھ جاتے، ہوا کو حکم دیتے، ہوا اُن کو اُڑا کے جہاں وہ چاہتے لے جاتی، تو بغیر اسباب کے یہ کام ہو گیا، یہ معجزہ ہے۔ اور اسباب کے تحت

---

(۱) دیکھئے: "تدبر قرآن" سورۂ انبیاء، آیات: ۸۰-۸۱ کے تحت، از "امین احسن اصلاحی" وغیرہ۔

کیا جائے، تو یہ معجزہ نہیں۔ تو اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو معجزے کے طور پر ایسی چیزیں دیتا ہے کہ جس کو باقی مخلوق اسباب کے تحت کر سکتی ہے، بلا اَسباب نہیں کر سکتی۔

اور ہم نے اُن کے لئے تانبے کا چشمہ جاری کر دیا۔ جس طرح سے حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے لوہا نرم ہوا تھا، تو اُن کے لئے یہ تانبا جاری ہو گیا، تو آپ دیکھتے ہیں کہ تانبے کے ذریعے بہت سی اشیاء بنتی ہیں۔ تو سلیمان علیہ السلام نے بھی اس سے بہت فائدہ اُٹھایا، تو یہ بھی وہی اللہ کی طرف سے معجزہ تھا کہ چشمہ بہہ نکلا تانبے کا۔ اور یہاں بھی جدید مفسرین وہی بات لکھتے ہیں کہ تانبے کی کان دریافت ہوئی اور پھر یہ پگھلانے کا طریقہ ان پر منکشف ہوا، اور انہوں نے خوب اس سے فائدہ اُٹھایا۔ لیکن ہم اس کو بھی معجزے پر محمول کرتے ہیں۔ اور اسی طرح سے جنوں کو مسخر کر دیا گیا، جن بھی تابع ہو گئے محض اللہ کے حکم سے۔ آج جس طرح سے عامل لوگ جن مسخر کرتے ہیں، وظیفے پڑھ پڑھ کے، یہ طریقہ نہیں تھا، بلکہ اللہ کی طرف سے یہ تھا کہ جن سارے کے سارے تابع تھے، اور ان کے سامنے کام کرتے تھے، اور اللہ کی طرف سے جنوں کو دھمکا بھی دیا گیا تھا، کہ جو ہمارے حکم سے یعنی سلیمان علیہ السلام کے حکم سے سرکشی اختیار کرے گا، ہم آخرت میں اُس کو عذاب دیں گے۔ تو سلیمان علیہ السلام جو چاہتے، وہ جن بناتے، بڑے بڑے مکان بناتے، تصویریں بناتے۔

''تصاویر'' کے متعلق اَحکامات

تصویریں اگر بے جان چیزوں کی ہوں جس طرح سے درختوں کی ہیں، وہ بھی ٹھیک ہے، اس میں تو کوئی شک وشبہ ہے ہی نہیں۔ لیکن عام طور پر مفسرین نے لکھا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں جنات جان دار تصویریں بھی بنایا کرتے تھے۔ اور اس شریعت میں یہ حرام نہیں تھیں، ہماری شریعت میں حرام کر دی گئیں۔ اب جاندار کی تصویر بنانا، چاہے وہ مجسمے کی شکل میں ہو، لکڑی کی بنائی جائے، پیتل کی بنائی جائے، مٹی کی بنائی جائے، یا یہ پلاسٹک کی بڑی بڑی چیزیں جو لوگ بناتے ہیں، یہ سب حرام ہیں۔ اور چاہے وہ کاغذ پر بطور رنگ کے بنائی جائے، جس طرح سے فوٹو کھینچا جاتا ہے، تو یہ بھی حرام ہے۔ جیسے ''مدارک'' میں لکھا ہے کہ انہوں نے سلیمان علیہ السلام کے لئے دو شیر بنائے، اور شیروں کے اُوپر سلیمان علیہ السلام کے لئے بیٹھنے کی کرسی بنائی، اور کرسی کے اُوپر دو بازوں کی شکل کے دو پرندے بنائے۔ سلیمان علیہ السلام جس وقت آتے کرسی پر بیٹھنے کا ارادہ کرتے تو شیر بیٹھ جاتے تھے، جب سلیمان علیہ السلام اُس پر بیٹھ جاتے، تو شیر اُٹھ کے کھڑے ہو جاتے تھے، اور اُوپر جو باز بنے ہوئے تھے وہ سایہ کرتے۔ آٹومیٹک یہ سب کچھ ہوتا۔ اس قسم کی چیزیں جنات بناتے تھے سلیمان علیہ السلام کے لئے۔ تو جان دار کی تصویریں اس شریعت میں جائز تھیں، لیکن ہماری شریعت میں جائز نہیں ہیں۔

اور بڑی بڑی پراتیں، بڑے بڑے پیالے بناتے تھے، اور اتنی بڑی بڑی دیگیں جو ہلانے سے بھی نہیں ہلتی تھیں، جو ایک جگہ پر رکھی رہتیں، اور ان میں کھانا تیار ہوتا رہتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاں خیرات بہت ہوتی تھی، اور لوگوں کو کھلانے پلانے کے لئے بہت کھانا تیار ہوتا تھا، تبھی تو اتنی بڑی دیگوں کی ضرورت تھی۔ اپنے لئے یا اپنے گھر کے لئے تو

اتنے بڑے بڑے برتنوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور اللہ کی طرف سے حکم بھی تھا کہ اے آلِ داؤد علیہ السلام شکر کرو۔ میرے بندوں میں سے شکر گزار کم ہیں۔ تو سلیمان علیہ السلام بھی ایسے تھے۔ جیسے سلیمان علیہ السلام و داؤد علیہ السلام کا ذکر سورۂ نمل میں گزرا کہ بات بات پر اللہ کا شکر ادا کرتے تھے۔ تو یہ تو ان کا ذکر کیا کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے بادشاہت دی تھی، بادشاہت کے باوجود وہ اللہ کے سامنے اکڑے نہیں، بلکہ اس کے شکر گزار بندے بن گئے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کا واقعہ

آگے سلیمان علیہ السلام کی وفات کا قصہ ذکر کیا۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے بیت المقدس کی تعمیر شروع کرائی تھی، اور اس پر انہوں نے جنوں کو مقرر کیا، اور جس وقت یہ تعمیر شروع کروائی تو ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ سلیمان علیہ السلام کی موت کا وقت آ گیا۔ جب موت کا وقت آ گیا، تو موت کا وقت تو ایسا ہے، جو ٹلتا نہیں۔ پھر یہ خیال آیا کہ میری اگر اس طرح سے وفات ہو گئی، تو یہ کام تو درمیان میں رہ جائے گا، جنات چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ تو سلیمان علیہ السلام پہلے بھی کئی کئی مہینے خلوت میں رہتے تھے، اور اللہ کی عبادت کرتے تھے، تو سلیمان علیہ السلام نے یہی تدبیر اختیار کی، کہ کوئی شیشے کا مکان تھا، جس میں وہ پہلے بھی رہتے رہتے، کہ باہر والوں کو نظر آتے رہتے، اس کمرے میں داخل ہو گئے، اور اپنی لاٹھی کے سہارے سے کھڑے ہو گئے، جس طرح سے وہ اللہ کی یاد میں کھڑے ہوا کرتے تھے، تو اسی حالت میں ان کی رُوح قبض ہو گئی، اور وفات ہو گئی، اور وہ وہاں ویسے ہی کھڑے رہے، اور باہر جنات یہ سمجھتے رہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام زندہ ہیں، اور وہ اپنے کام میں مگن رہے، اِدھر وہ کام بیت المقدس کا مکمل ہوا، اور اُدھر ظاہری سبب یہ پیش آیا کہ جس لاٹھی کے سہارے حضرت سلیمان علیہ السلام کھڑے تھے، اس کو دیمک لگ گئی اور دیمک لگنے کی وجہ سے وہ گر گئی، اور اس کے گرنے سے حضرت سلیمان علیہ السلام بھی گر گئے، جب گر گئے تب جنوں کو پتا چلا کہ ان کی تو وفات ہو گئی تھی، اور اندازہ کیا گیا، تو مفسرین نے جس طرح سے لکھا ہے کہ سال ہو گیا تھا ان کی وفات ہوئی کو۔ تو جنوں کے سامنے یہ بات آ گئی وہ جو لوگوں کے سامنے دعویٰ کیا کرتے تھے کہ ہم غیب جانتے ہیں، تو حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت میں دو فائدے ہوئے، اس طرح سے وفات پانے میں۔ ایک تو وہ کام مکمل ہو گیا، دوسرے لوگوں کے سامنے اس گمراہی سے بچاؤ کی بات آ گئی، لوگوں کو بھی پتا چل گیا کہ یہ جن کچھ نہیں جانتے، اور یہ ان کا عالم الغیب ہونے کا دعویٰ بالکل غلط ہے، فَلَمَّا قَضَيْنَا: جب ہم نے ان پر موت طاری کی، تو نہیں راہنمائی کی ان جنوں کی سلیمان علیہ السلام کی موت پر، مگر دیمک کے کیڑے نے، جو کھاتا تھا اس کی لاٹھی کو۔ پس جب سلیمان علیہ السلام گر گئے، تو جنوں کو پتا چل گیا کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے، تو اس ذلیل کرنے والے عذاب میں نہ ٹھہرے رہتے۔

''قومِ سبا'' کا تفصیلی واقعہ اور ان کا انجام

لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ: آپ کے سامنے عرض کر دیا گیا تھا کہ شکر گزاروں کے تذکرے کے بعد یہ ناشکروں کا تذکرہ ہے۔ ''سبا'' یہ ایک شخص کا نام ہے، پھر اس کی اولاد میں وسعت ہوئی تو وہ قوم بن گئی، اور وہی ''سبا'' کہلاتی تھی، یمن کے علاقے

میں یہ آباد تھے۔ مَأْرِب ایک شہر ہے، وہ ان کا مرکزی شہر تھا۔ سورۂ نمل میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعے میں وہ ملکہ بلقیس کا ذکر جو آیا تھا، وہ بھی اس قوم سے تعلق رکھتی تھی۔ جس جگہ یہ آباد تھے، وہاں کوئی پہاڑی علاقہ ہے، اور پہاڑوں پر بارش ہوتی ہے، اور پھر ندی نالوں کے ذریعے سے نشیب کی طرف چلا جایا کرتا ہے، تو پھر لوگ پہاڑوں کے درمیان میں بند باندھ کر اس پانی کو روکتے ہیں، اور پھر اس کو استعمال کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح سے قومِ سبا نے بھی دو پہاڑوں کے درمیان میں بند باندھا ہوا تھا، اور اس میں پانی برسات کے موسم میں جمع ہو جاتا، پھر اس پانی کو تقسیم کیا ہوا تھا انہوں نے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھی اس طریقے کی ترقی تھی، پھر انہوں نے اپنے علاقے میں مختلف نہریں جاری کیں، اور وہ علاقہ سارے کا سارا سرسبز وشاداب ہو گیا۔ اتنا سرسبز وشاداب علاقہ تھا کہ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ دو باغ تھے اس علاقے کے دائیں بائیں، دو باغ کا مطلب یہ ہے کہ ان کے شہر کے دائیں بائیں باغات کی اتنی کثرت تھی کہ پتا چلتا کہ ایک باغ اِدھر کو چلا گیا اس سرے تک، اور ایک باغ اُدھر کو چلا گیا اس سرے تک۔ اور پھر اس علاقے میں سے تجارتی شاہراہ گزرتی تھی، جس میں بین الاقوامی تجارت ہوتی تھی۔ اس طرح سے یہ لوگ بے انتہا خوش حال ہو گئے، حتیٰ کہ اگر کوئی مسافر وہاں سے گزر رہا ہوتا، اور پہلے سے اگر اس میں جوئیں موجود ہوتیں، تو یہاں سے جب گزرتا تھا، تو اس علاقے کی آب وہوا کے عمدہ ہونے کی وجہ سے وہ جوئیں بھی مرجاتی تھیں۔ اور پھلوں کی اتنی کثرت تھی کہ اگر کوئی عورت اپنے سر پر ٹوکرا خالی رکھ کے چلتی، تو اس کو کہیں سے پھل توڑنے کی ضرورت نہ پیش آتی، اُوپر سے پھل گر گر کے خود بخود اس کا ٹوکرا بھر جاتا، اتنی وسعت اللہ نے انہیں دے رکھی تھی۔ اللہ کی طرف سے عادت کے مطابق ان کے پاس بھی انبیاء آئے، مفسرین نے لکھا ہے تقریباً اس قوم کی طرف تیرہ نبی آئے ہیں (مظہری)۔ اور وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے آئے ہوں گے، کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد حضور ﷺ کے درمیان تو کوئی نبی آیا نہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد حضور ﷺ ہی مبعوث ہوئے ہیں۔ باقی! انبیاء علیہم السلام کے نائبین ہر علاقے میں جاتے تھے، لوگوں کو اللہ سے ڈراتے تھے۔ اس قوم کو بھی تلقین کی گئی کہ وہ اللہ کا شکر ادا کریں، اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اُٹھائیں، اور اسی کی عبادت کریں۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے امتحان دو قسم کا آتا ہے، کبھی تو کوئی مصیبت بھیج کر آزمایا جاتا ہے، کہ بندے صبر کرتے ہیں یا نہیں؟ اور کبھی خوش حالی دے کر آزمایا جاتا ہے، کہ بندے شکر ادا کرتے ہیں یا نہیں؟ تو تجربہ ایسا ہی ہے، حالات یہی بتاتے ہیں، کہ شکر والا اِمتحان زیادہ سخت ہے بمقابلہ صبر والے اِمتحان کے۔ مصیبت اور تکلیف میں صبر تو لوگ کر لیتے ہیں کچھ نہ کچھ، لیکن جس وقت کھانے پینے کو وسعت سے مل جائے، اور دُنیا کی عیش ملی ہوئی ہو، اس وقت شکر کی طرف توجہ بہت کم ہوتی ہے۔ اس میں زیادہ پھسلتے ہیں۔ اس لیے سرمایہ دار لوگ اللہ کو بھول جاتے ہیں، آخرت کو یاد نہیں رکھتے، اسی طرح سے یہ قوم بھی اپنی خوش حالی میں مست ہو گئی، انہوں نے بھی اللہ کی ناشکری شروع کر دی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دو قسم کی خوش حالی انہیں دی تھی، ایک تو باغات کی وسعت تھی، دُوسرا وہاں سے شام تک ایک شاہراہ تھی جس پر تجارتی قافلے آتے جاتے تھے۔ چونکہ تجارت کثرت سے ہوتی تھی، اس لیے یہ سڑک بڑی آباد ہو گئی۔ ان کو جو مستی سوجھی، تو یہ کہنے لگے کہ سفر کا کوئی مزہ نہیں

آتا، کوئی اس میں مقابلے کی نوبت نہیں آتی، کوئی خوف وخطرہ نہیں ہوتا، غریب امیر سب ایک ہی طرح سے سفر کرتے ہیں، دُور دُور منزلیں ہوں، راستوں میں خطرات پیش آئیں، پھر پتا چلے کہ ہماری کیا ٹھاٹھ باٹھ ہے، حفاظت کا عملہ ساتھ ہو، کہیں کھانے کو ملے، کہیں نہ ملے، پھر جن کے پاس وسعت ہے، وہ کھائیں پئیں، دوسرے لوگ تنگ ہوں۔ تو یہ تماشا دیکھنے کو ان کا جی چاہنے لگ گیا، اس لیے ان کے دلوں میں یہ خواہشیں اُبھر رہی تھیں کہ رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا: ہمارے سفروں کے درمیان دُوریاں کردے، یہ قریب قریب منزل جو بن گئی، سفر کا تو کوئی مزہ نہیں آتا، یہ تو ایسے ہے جیسے آدمی گھر ہی بیٹھا ہو۔ تو اس امن وامان پر بھی انہوں نے ناشکری کی، اور جو رزق کی وسعت اللہ نے دے رکھی تھی، اُس پر بھی ناشکری کی۔ تو پھر اللہ کی طرف سے ڈھیل تو دی جاتی ہے، جیسے کہتے ہیں "دیر گیر وسخت گیر" کہ اللہ تعالیٰ پکڑتا تو دیر سے ہے، لیکن جب پکڑتا ہے تو پکڑ بہت سخت ہوتی ہے۔ تو اس قوم پر بھی اس طرح سے پکڑ آئی، کہ جو سامان اُن کے لیے خوش عیشی کا تھا، وہی اُن کے لئے مصیبت بن گیا، وہی بند جو باندھا تھا، جس کے پیچھے پانی روکا ہوا تھا، دو پہاڑوں کے درمیان، وہ بند ہی ٹوٹ گیا۔ بند جو ٹوٹا تو اس کے ٹوٹنے کے ساتھ پانی کا سیلاب بڑا سخت آیا، اور اُس کے ساتھ اُن کی بستیاں بھی اُجڑ گئیں، ان کے باغ بھی اُجڑ گئے۔ پھر اس میں چونکہ عذاب کا پہلو بھی تھا، تو وہ پانی کچھ ایسا زہریلا ہو گیا کہ جہاں جہاں سے گزرا اس نے زمین کو نباتات کے قابل نہیں چھوڑا، کچھ ایسی مٹی کی تہہ زمین پر جم گئی، کہ پھل والے درخت سارے کے سارے ختم ہو گئے، اور وہاں صرف جھاڑیاں رہ گئیں، جس طرح سے جنگلوں میں اُگا کرتی ہیں۔ آبادیاں اُجڑ گئیں۔ اور دوسری طرف سے تجارت کا راستہ بھی تبدیل ہو گیا۔ اس طرح سے یہ قوم منتشر ہو گئی، تتر بتر ہو گئی، ٹکڑے ٹکڑے کر دی گئی۔

تو اللہ تعالیٰ یہ واقعہ مشرکین کو سناتے ہیں، کہ کھاتے پیتے اللہ کا شکر ادا کیا جائے، تب تو مزید اللہ تعالیٰ نعمت دیتے رہتے ہیں۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں کھا کے، اللہ کے سامنے انسان اکڑنے لگ جائے، ناشکری کرنے لگ جائے، تو اللہ تعالیٰ کے لئے یہ آباد شہر اُجاڑنے اور قوموں کو برباد کرنا مشکل نہیں ہے۔ پچھلی تاریخ سے سبق حاصل کرو۔ تو شکر گزاروں کے تذکرے کے بعد قومِ سبا جو کہ ایک ناشکری قوم تھی، یہ واقعہ مشرکینِ مکہ کو سنایا۔

آیات کا خلاصہ

نظر ڈال لیجئے ترجمے پر۔ سبا کے لئے اُن کے مسکن میں نشانی تھی، اللہ کی قدرت کی، اللہ کی رحمت کی۔ مسکن سے ان کا رہائشی علاقہ مراد ہے۔ دو باغ تھے دائیں بائیں، یعنی وہ جو شاہراہ تھی اُس کی دائیں طرف بھی باغ تھا، بائیں طرف بھی باغ تھا، چونکہ ان باغات کے اندر تسلسل تھا۔ اس لئے وہ متعدد باغات ایک ہی باغ کی طرح تھے۔ یعنی یوں سمجھو کہ سارا علاقہ ہی باغ بن گیا تھا۔ اللہ کی طرف سے ان کو حکم تھا، کہ اللہ کے رزق کو کھاؤ، اور اُس کا شکر ادا کرو، تمہارا علاقہ بڑا عمدہ ہے، زرخیز ہے، شاداب ہے، پھر ربّ بڑا غفور ہے، بخشنے والا ہے۔ اس لیے اگر تم اپنے طور پر اللہ کی اطاعت اور عبادت کی کوشش کرو گے، تو اگر کوتاہی ہو جائے گی، تو اللہ معاف بھی کر دیں گے۔ تو اللہ کا غفور ہونا، یہ مستقل اطاعت کی دعوت ہے۔ مہربان ربّ، بخشنے والا، جو غلطیوں پر جلدی

پکڑتا نہیں، بلکہ معاف کرتا ہے۔ انہوں نے اِعراض کیا، اللہ کی عبادت نہ کی۔ تو ہم نے اُن کے اُوپر عرم کا سیلاب بھیج دیا۔ عرم بند کو کہتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ جب بند ٹوٹ جائے تو پھر کیا حالت ہوتی ہے۔ تو انہوں نے جو پانی جمع کیا ہوا تھا، جب وہ بند ٹوٹا، تو وہ سب کچھ بہا کر لے گیا۔ تو جو بند اُن کے لئے خوش حالی کا باعث تھا، جب انہوں نے اللہ کی ناشکری کی، تو وہی عذاب کا ذریعہ بن گیا۔ توسیل العرم: بند کا سیلاب۔ ہم نے اُن کے اُوپر بند کا سیلاب بھیج دیا۔ اور اُن کے دو باغوں کے بدلے میں، ہم نے دو باغ دیئے۔ یعنی پہلے جو باغ تھے وہ اُجڑ گئے، اُن کے بعد دو باغ کون سے آئے؟ جو کہ کڑوے میوے والے تھے، اور جھاؤ کا درخت اور کچھ بیری۔ اور یہ بیری بھی وہ نہیں جس کے پھل میں لطافت ہوتی ہے، بلکہ جنگلی بیری۔ جھاڑی جس میں کانٹے زیادہ ہوتے ہیں، پھل کم ہوتا ہے۔ اور جو پھل ہوتا ہے، اس میں بھی لطافت نہیں ہوتی۔ اُن کی ناشکری کی وجہ سے ہم نے ان کو یہ بدلہ دیا، اور ہم بدلہ نہیں دیا کرتے مگر ناشکروں کو۔ یہ تو باغوں کا ذکر تھا۔ اور آگے آ گیا کہ ہم نے ان کے درمیان اور ان بستیوں کے درمیان، جن میں ہم نے برکت دی تھی، اس سے ''شام'' کا علاقہ مراد ہے۔ تو ہم نے ان کے درمیان اور ان بستیوں کے درمیان بستیاں بنائی تھیں۔ بالکل نمایاں، سڑک کے کنارے، تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بستیاں تھیں۔ اور ان کے اندر ہم نے چلنے کا اندازہ کیا تھا، کہ ایک جگہ سے چل کے دُوسری جگہ آدمی ایسے وقت میں پہنچ جائے، جو آرام کا یا کھانے پینے کی وقت ہوتا ہے۔ اور پھر ہم نے انہیں کہا تھا کہ ان میں چلو، راتوں کو چلو، دِنوں کو چلو، امن وامان کے ساتھ۔ تو وہ کہنے لگے اے ہمارے ربّ! ہمارے سفروں میں دُوری کر دے، یعنی دُور دُور منزلیں ہوں راستے میں کہیں پانی نہ ملے، خوف ہو خطرہ ہو، تا کہ کوئی شان تو نمایاں ہو کہ اسباب کس کو مہیا ہیں، جس کو اَسباب مہیا نہیں ہیں وہ بدحالی سے سفر کرے۔ دُوری کر دے ہمارے سفروں کے درمیان اور انہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا، تو پھر نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے ان کو قصے کہانیاں بنا دیا، ان کے نام ونشان مٹ گئے، شان وشوکت ختم ہوگئی۔ اب تاریخ میں ان کا قصہ پڑھ سکتے ہو، باقی! ان کی کوئی چیز باقی نہ رہی۔ اور متفرق کر دیا ان کو پوری طرح سے متفرق کر دینا۔ علاقہ ہی اُجڑ گیا، جدھر جس کا منہ ہوا، اُٹھ کر چلا گیا۔ اس میں البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو کہ صبر کرنے والے شکر کرنے والے ہیں۔ ابلیس نے اُن کے اُوپر اپنے خیال کو سچا پایا۔ جو اُس نے اللہ تعالیٰ کے سامنے ظاہر کیا تھا، کہ تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہیں پائے گا۔ ابلیس کو اُن کے اُوپر کوئی ایسا تسلط حاصل نہیں تھا، کہ زبردستی ان کو گمراہ کر لیتا۔ ہاں! البتہ گمراہ کرنے کے لئے ہم نے اس کو مہلت دی ہے۔ اور وہ مہلت کیوں دی ہے؟ تا کہ ہم جان لیں کہ مؤمنین کون ہیں؟ پھر آخرت پر کون ایمان لاتا ہے؟ یہ جان لیں ہم ان لوگوں سے جدا کر کے جو اس آخرت کی طرف سے شک میں ہیں۔ ''عَلِمَ'' کا صلہ جب ''مِنْ'' آ گیا تو اس میں امتیاز والا معنی پیدا ہو گیا۔ تو ''علم'' سے یہاں ''علم کا ظہور'' مراد ہے۔ اور تیرا ربّ ہر چیز پر نگہبان ہے، ہر چیز اس کے سامنے ہے۔ اس نے اپنی حکمت کے ساتھ شیطان کو اتنی سی مہلت دی ہے، جس کی بنا پر وہ لوگوں کو بہکاتا ہے، اور اس سے دونوں گروہ سامنے ممتاز ہو کر آ جاتے ہیں۔ (۱)

(۱) اس سے آگے سورت کے آخر تک ریکارڈنگ محفوظ نہ ہونے کی وجہ سے ترجمہ تفسیر ''انوار البیان'' سے ماخوذ ہے۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي

آپ فرمادیجئے کہ اللہ کے سوا تم نے جنہیں معبود سمجھ رکھا ہے انہیں پکارو، وہ ایک ذرّے کے برابر بھی اختیار نہیں رکھتے

السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ

نہ آسمانوں میں نہ زمین میں، اور ان دونوں میں ان کا کچھ ساجھا نہیں اور ان میں سے کوئی اللہ کا

ظَهِيْرٍ ﴿۲۲﴾ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ؕ حَتّٰٓى اِذَا فُزِّعَ عَنْ

مددگار نہیں ﴿۲۲﴾ اور اس کے پاس سفارش کام نہیں دے سکتی سوائے اس کے جس کے لئے اجازت دی ہو، یہاں تک کہ جب گھبراہٹ دُور ہو جاتی ہے

قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿۲۳﴾ قُلْ مَنْ

ان کے دِلوں سے تو کہتے ہیں کہ تمہارے رَبّ نے کیا فرمایا؟ جواب میں کہتے ہیں کہ حق ہی فرمایا، اور وہ برتر ہے بڑا ہے ﴿۲۳﴾ آپ فرمادیجئے کہ کون

يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ

تمہیں رزق دیتا ہے آسمانوں سے اور زمین سے؟ آپ فرمادیجئے کہ اللہ، اور بے شک ہم یا تم ضرور راہِ راست پر ہیں یا

ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾ قُلْ لَّا تُسْــَٔلُوْنَ عَمَّآ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْــَٔلُ عَمَّا

صریح گمراہی میں ہیں ﴿۲۴﴾ آپ فرمادیجئے ہم نے جو جرم کئے تم سے اس کی باز پرس نہ ہوگی اور ہم سے اُن کاموں کے بارے میں سوال نہ ہوگا جو

تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ؕ وَهُوَ الْفَتَّاحُ

تم کرتے ہو ﴿۲۵﴾ آپ فرمادیجئے کہ ہمارا رَبّ ہم سب کو جمع کرے گا پھر ہمارے درمیان ٹھیک فیصلہ فرمائے گا، اور وہ بڑا فیصلہ فرمانے والا ہے

الْعَلِيْمُ ﴿۲۶﴾ قُلْ اَرُوْنِيَ الَّذِيْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَآءَ كَلَّا ؕ بَلْ هُوَ اللّٰهُ

خوب جاننے والا ہے ﴿۲۶﴾ آپ فرمادیجئے مجھے دکھاؤ وہ لوگ جنہیں تم نے شریک بنا کر اللہ کے ساتھ ملا رکھا ہے، ہرگز نہیں، بلکہ وہ اللہ ہے

الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۷﴾ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ

زبردست ہے حکمت والا ہے ﴿۲۷﴾ اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر سارے انسانوں کے لئے بشیر ونذیر بنا کر لیکن

اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۹﴾

بہت سے لوگ نہیں جانتے ﴿۲۸﴾ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب ہوگا اگر تم سچے ہو ﴿۲۹﴾

قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ ؏ ﴿۳۰﴾

آپ فرمادیجئے کہ تمہارے لیے ایک خاص دِن کا وعدہ ہے، اس سے ایک ساعت نہ پیچھے ہٹ سکتے ہو اور نہ آگے بڑھ سکتے ہو ﴿۳۰﴾

تفسیر

پہلی دونوں آیتوں میں مشرکین کی تردید فرمائی ہے، ارشاد فرمایا کہ اللہ کے سوا تم نے جنہیں معبود بنا رکھا ہے اور یہ سمجھ رہے ہو کہ وہ خدائی میں دخیل ہیں۔ ذرا انہیں اپنی کسی حاجت کے لئے پکار دو تو سہی، تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ ذرہ برابر بھی کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتے، نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں۔ اور یہ بھی سمجھ لو کہ آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں تمہارے تجویز کئے ہوئے معبودوں کی کوئی شرکت نہیں ہے، اور ان میں سے کوئی بھی اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کا مددگار نہیں ہے، نہ ایجادِ عالم میں ان کا کوئی دخل ہے، نہ اس کے باقی رکھنے میں، نہ تصرفات میں۔

کُفّار کے عقیدۂ شفاعت کی تردید

اور یہ بھی سمجھ لو کہ اللہ جل شانہٗ کی بارگاہِ عالی میں کسی کے لئے کوئی شفاعت کام نہیں دے سکتی۔ تم لوگ جو یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے تجویز کردہ معبود اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سفارش کر دیں گے، تو تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ کیونکہ ان میں بہت سے تو بے جان ہیں، وہ شفاعت کو کیا جانیں، ان میں اس کی قابلیت ہی نہیں۔ اور ملائکہ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت عُزیر علیہ السلام کی سفارش کی بھی کوئی اُمید نہ رکھو، جن کو تم نے معبود بنایا ہے، اور سفارش کرنے والا سمجھا ہوا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس شخص کے بارے میں اجازت دی جائے گی، مقبولانِ بارگاہِ الٰہی اسی کے لئے سفارش کر سکیں گے۔ اور مشرکین اور کافروں کے لئے اجازت نہ ہوگی۔ لہٰذا تم جو اُن کی شفاعت کے امیدوار ہو، تمہاری یہ اُمید بھی غلط ہے۔ سورۂ انبیاء میں فرشتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ (سورۂ انبیاء: ۲۸) اور وہ اسی کے لئے سفارش کریں گے جس کے لئے اللہ کی مرضی ہوگی اور وہ اس کی ہیبت سے ڈرتے ہیں۔ حَتّٰٓى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ: اس میں فرشتوں کی گھبراہٹ، خوف اور خشیت کا تذکرہ فرمایا۔ مطلب یہ ہے کہ فرشتے، جنہیں معبود تجویز کر کے ان کی شفاعت کی اُمید لیے بیٹھے ہو، ان کا اپنا یہ حال ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کام کا حکم ہوتا ہے، تو ہیبت کے مارے گھبرا اُٹھتے ہیں، شدت ہیبت کی وجہ سے ان کی حالت دگرگوں ہو جاتی ہے، جب فرمانِ عالی ہو جاتا ہے اور ہیبت کی کیفیت دُور ہو جاتی ہے تو آپس میں دریافت کرتے ہیں کہ تمہارے رَبّ نے کیا حکم فرمایا، پھر بعض بعض سے کہتے ہیں کہ تمہارے رَبّ نے حق ہی فرمایا۔ جہاں ہیبت کا یہ عالم ہے وہاں شفاعت کی کیا مجال ہو سکتی ہے۔ ملائکہ مقربین گھبراتے ہیں اور خوف زدہ ہوتے ہیں تو بُت اور شیاطین کس شمار میں ہیں؟ اسی سے سمجھ لیا جائے! وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ: وہ بلند ہے بڑا ہے۔ اس کی بارگاہ میں وہی شفاعت کر سکتا ہے، جسے شفاعت کی اجازت ہو، اِسی کے لئے شفاعت کر سکتا ہے جس کے لئے شفاعت کی اجازت ہو۔ مشرکوں کی حماقت دیکھو! کہ خود ہی اللہ تعالیٰ کے لئے شریک تجویز کیے اور خود ہی یہ تجویز کر لیا کہ وہ ہماری سفارش کریں گے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب آسمان میں اللہ تعالیٰ کا کوئی فیصلہ ہوتا ہے تو فرشتے اس کے فرمان کی وجہ سے بطور تواضع وانقیاد اپنے پروں کو مارتے ہیں، جس سے ایسی آواز پیدا ہوتی ہے کہ گویا چکنے پتھر پر زنجیر کھینچی جارہی ہے، پھر جب اُن کے دلوں سے گھبراہٹ دُور ہو جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ تمہارے رَبّ نے کیا فرمایا؟ پھر آپس میں جواب دیتے ہیں کہ وہ برتر ہے بڑا ہے (بخاری ۷۰۶/۲)۔

دلائلِ قدرت

قُلْ مَنْ یَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: آگے پھر توحید کا اثبات ہے۔ اوّل تو یہ فرمایا کہ تم یہ بتاؤ کہ آسمانوں سے اور زمین سے تمہیں کون روزی دیتا ہے؟ آسمان سے پانی برستا ہے، اور زمین سے درخت نکلتے ہیں، اور کھیتیاں پیدا ہوتی ہیں، بتاؤ! یہ کس کی قدرت کا مظاہرہ ہے؟ اور ان چیزوں کو کس نے پیدا کیا؟ جواب اُن کے نزدیک بھی متعین ہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت اور مشیت وارادہ سے ہوتا ہے۔ اگر وہ جواب نہ دیں یا دیر سے جواب دیں تو آپ ہی فرما دیجئے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی مشیت اور قدرت سے ہے۔

منکرین کو دعوتِ فکر

وَاِنَّآ اَوْ اِیَّاكُمْ لَعَلٰی هُدًى اَوْ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ: اور بے شک ہم یا تم ضرور راہِ راست پر ہیں یا صریح گمراہی میں ہیں۔ یہ بطور تلطف کے فرمایا اور فکر کی دعوت دی۔ اور مطلب یہ ہے کہ ہم تو توحید کی دعوت دیتے ہیں، اور تم توحید کے منکر ہو، اور ظاہر ہے کہ دونوں باتیں درست نہیں ہوسکتیں۔ اور یہ سمجھ لو کہ جو ہدایت پر ہے موت کے بعد اسی کی خیر ہوگی، اور اسی کو انعامات ملیں گے۔ اور جو گمراہ ہوگا وہ عذاب میں مبتلا ہوگا۔ اب تمہیں فکرمند ہونا چاہیے اور غور کرنا چاہیے، کہ ہم ہدایت پر ہیں یا تم ہو، اور ہم گمراہی پر ہیں یا تم ہو۔ ہم نے تو غور کرلیا ہے، دلائل سے دین توحید کو سمجھ لیا ہے۔ اور تم کو بھی اس کی دعوت دی ہے، اب تم اپنی خیرخواہی کے لئے غور وفکر کرلو، ہم نے جو دلائل دیئے ہیں ان میں غور کرلو۔ ہمیں بھی مرنا ہے، تمہیں بھی مرنا ہے۔ اگر موت کے بعد یہ ظاہر ہوا کہ تم بُرائی پر تھے، تو وہاں دوزخ کے عذاب میں مبتلا ہوگے، جہاں سے واپس ہونے اور نکلنے کا امکان ہی نہیں، عذابِ دائمی میں رہنا پڑے گا، اس وقت کا پچھتاوا اور غور کرنا کام نہ دے گا۔ لہٰذا اسی دُنیا میں سمجھ لو، غور وفکر کرلو، اور مان لو، آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ توحید والے ممکن ہے گمراہی پر ہوں، بلکہ مخاطب کو قریب کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ قُلْ لَّا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّآ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْـَٔلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ: آپ فرما دیجئے! ہم نے جو جرم کیے تم سے ان کا سوال نہ ہوگا، اور جو تم کام کرتے ہو ہم سے ان کی پرسش نہ ہوگی۔ ہر فریق کا الگ الگ معاملہ ہے۔ اہلِ توحید بخشے جائیں گے اور کُفر وشرک والے عذاب میں داخل ہوں گے۔ گو تمہارے اعمال کے بارے میں ہم سے سوال نہ ہوگا، لیکن کسی عوض کا مطالبہ کیے بغیر تمہاری خیرخواہی کے لئے تمہیں حق کی دعوت دے رہے ہیں۔ اب تم خود اپنی فکر کرلو۔ قُلْ یَجْمَعُ بَیْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ یَفْتَحُ بَیْنَنَا بِالْحَقِّ: آپ فرما دیجئے کہ ہمارا رَبّ ہم سب کو جمع کرے گا، پھر ہمارے درمیان

ٹھیک ٹھیک فیصلہ فرمائے گا۔ جب قیامت کے دن توحید والوں کے لئے اِنعام واِکرام کا اور مشرکین وکافرین کے لئے عذاب کا فیصلہ ہوگا اس وقت تمہیں اپنی گمراہی کا پتا چل جائے گا۔ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ: اور وہ بڑا فیصلہ فرمانے والا ہے، اور خوب جاننے والا ہے۔ چونکہ ہر ہر شخص کا ہر ہر عمل اسے معلوم ہے اور ہر ایک کے عقیدوں کا بھی اسے پتا ہے، اس لیے اس کے سارے فیصلے حق ہوں گے اور حقیقت کے مطابق ہوں گے۔ قُلْ اَرُوْنِيَ الَّذِيْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَآءَ: آپ فرمادیجئے مجھے دکھادو وہ لوگ جنہیں تم نے شریک بنا کر اللہ کے ساتھ ملا رکھا ہے، یعنی تم نے جو باطل معبود بنا رکھے ہیں اور انہیں مستحق عبادت سمجھ کر خدائی کا درجہ دے رکھا ہے، ذرا مجھے دِکھادو وہ کون ہیں یعنی وہ تو خود مخلوق ہیں، اس لائق کہاں ہیں کہ اُلوہیت میں شریک ہوں۔ کوئی دلیل اور حُجت ہے تو سامنے لاؤ۔ كَلَّا: ایسا ہرگز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک ہو، تمہاری بیوقوفی ہے جو تم نے اس کے لئے شریک تجویز کر رکھے ہیں۔ بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ بلکہ وہی اللہ ہے یعنی معبود برحق ہے زبردست ہے حکمت والا ہے۔

سرورِ کائنات ﷺ کے خصوصی اِمتیازات اور فضائل

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ: اس آیت کریمہ میں نبی اُمّی سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت عامہ کا ذکر ہے۔ چونکہ آپ کی بعثت عامہ ہے، اس لئے ہر بشر کے لئے آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول ہیں۔ آپ کا دامن پکڑے بغیر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو راضی نہیں کرسکتا، خواہ کتنی ہی عبادت کرتا ہو۔ جو ہدایت اللہ کے یہاں معتبر ہے وہ خاتم النبیین رسول الانس والجان کی اتباع میں مرکوز ہے اور منحصر ہے۔ سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت عامہ کا دیگر مواضع میں بھی قرآنِ مجید میں تذکرہ فرمایا ہے۔ سورۂ اَعراف میں فرمایا: قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (سورۂ اَعراف:۱۵۸)، آپ فرمادیجئے کہ اے لوگو! بلاشبہ میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں، جس کے لئے بادشاہت ہے آسمانوں کی اور زمین کی، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ کرتا ہے اور موت دیتا ہے، سو ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر، جو نبی اُمّی ہے جو ایمان لاتا ہے اللہ پر اور اُس کے کلمات پر۔ اور اس کی اتباع کرو تا کہ تم ہدایت پا جاؤ۔

سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کو جو اللہ تعالیٰ شانہٗ نے خصوصی امتیازات اور فضائل عطا فرمائے، اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ کی بعثت عام ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے پانچ وہ چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئیں: ۱۔رُعب کے ذریعے میری مدد کی گئی، ایک ماہ کی مسافت تک دشمن مجھ سے ڈرتے ہیں۔ ۲۔پوری زمین میرے لیے سجدہ گاہ اور پاک کرنے والی بنائی گئی (کہ مسجد کے علاوہ بھی ہر پاک جگہ نماز ہوجاتی ہے، پانی نہ ہونے کی صورت میں تیمم سے حدثِ اَصغر اور حدثِ اَکبر دُور ہوجاتے ہیں) سو میری اُمت کے جس شخص کو جہاں بھی نماز کا وقت ہوجائے نماز پڑھ لے۔ ۳۔میرے لئے غنیمت کے مال حلال کردیئے گئے اور مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال نہیں کئے گئے۔ ۴۔اور مجھے شفاعت عطا کی گئی (یعنی شفاعت کبریٰ) جو قیامت کے دن ساری مخلوق کے لئے ہوگی۔ ۵۔اور مجھ سے پہلے نبی خاص

کہ اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا اور میں عامۃً تمام انسانوں کی طرف مبعوث ہوا ہوں۔[1] آپ نے یہ بھی فرمایا: ''وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ! لَا يَسْمَعُ بِي أَحَدٌ مِنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ يَهُودِيٌّ وَلَا نَصْرَانِيٌّ ثُمَّ يَمُوتُ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِالَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَّا كَانَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ'' قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے! اس اُمت میں جس کسی کو بھی میری بعثت کا علم ہو، خواہ یہودی ہو، خواہ نصرانی ہو پھر وہ اس حالت میں جائے کہ میں جو دین لے کر بھیجا گیا ہوں اس کو نہ مانا، تو وہ ضرور دوزخ والوں میں سے ہوگا۔[2] سورۂ آلِ عمران میں فرمایا: إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ (سورۂ آل عمران:۱۹) بے شک دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔ اور فرمایا: وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (سورۂ آل عمران:۸۵) اور جو شخص اسلام کے علاوہ کسی دُوسرے دین کو چاہے گا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں تباہ کار لوگوں میں سے ہوگا۔ جب سے آپ ﷺ کی بعثت ہوئی ہے یہودی، نصرانی، فرقۂ صائبین اور ہر قوم اور ہر اہلِ مذہب کے لئے معیارِ نجات صرف سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اور کسی قسم کا کوئی ایمان معتبر نہیں۔ صرف یہی ایمان معتبر ہے کہ آنحضرت ﷺ پر ایمان لائے اور آپ نے جو کچھ بتایا ہے، اس کو دِل سے مانے اور تسلیم کرے۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ: قیامت کے منکرین وقوعِ قیامت کا انکار کرتے ہوئے یوں بھی کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب پورا ہوگا؟ اور قیامت کس دن آئے گی؟ مقصود اُن کا یہ تھا کہ قیامت آنے والی ہوتی تو آجاتی۔ اور اگر آنے میں دیر ہے تو اس کی تاریخ بتادو۔ مقصد یہ تھا کہ نہ تو اب تک قیامت آئی ہے، نہ آنے کی تاریخ بتاتے ہو۔ معلوم ہوا کہ یہ محض باتیں ہی باتیں ہیں۔ ان کے جواب میں فرمایا کہ تمہارے لیے ایک خاص دن مقرر ہے، وہ اسی دن آئے گا۔ نہ اس سے پیچھے ہٹ سکتے ہو، نہ آگے بڑھ سکتے ہو۔ اپنے مقررہ وقت پر آہی جائے گی۔ تمہیں تاریخ نہ بتائی جائے، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا وقوع ہی نہیں ہوگا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ۭ وَلَوْ

اور کافروں نے کہا کہ ہم ہرگز اس قرآن پر اور اس سے پہلے جو کتابیں تھیں ان پر ایمان نہ لائیں گے، اور اگر

تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ښ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ

آپ اس وقت کی حالت دیکھ لیں جبکہ یہ ظالم لوگ اپنے رَبّ کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے، ہر ایک دوسرے پر ڈال رہا ہوگا

الْقَوْلَ ۚ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا

بات کو، نیچے درجے والے لوگ بڑے لوگوں سے کہیں گے اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور

(۱) بخاری ۱/۴۸، کتاب التیمم کی پہلی حدیث۔ مشکوٰۃ ۲/۵۱۲، باب فضائل سید المرسلین۔

(۲) مسلم ۱/۸۶، باب وجوب الایمان برسالۃ نبینا۔ مشکوٰۃ ص ۱۲، کتاب الایمان، فصل اول۔

مُؤْمِنِيْنَ ۝۳۱ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ

ایمان لائے ہوتے ۝۳۱ بڑے لوگ چھوٹے درجے کے لوگوں سے کہیں گے: کیا ہم نے تمہیں روک دیا تھا

عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ ۝۳۲ وَقَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا

ہدایت سے بعد اس کے کہ تمہارے پاس ہدایت آگئی تھی؟ بلکہ بات یہ ہے کہ تم مجرم تھے ۝۳۲ اور نیچے درجے والے کہیں گے

لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَ

اُن لوگوں سے جو بڑے تھے: بلکہ رات دِن تمہاری مکاری نے روکا تھا جبکہ تم ہمیں حکم دیتے تھے کہ ہم اللہ کے ساتھ کفر کریں اور

نَجْعَلَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ۭ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۭ وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِيْٓ

اس کے لیے شریک قرار دیں، اور جب وہ عذاب کو دیکھیں گے تو ندامت کو چھپالیں گے، اور ہم طوق ڈال دیں گے

اَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۳۳ وَمَآ اَرْسَلْنَا

کافروں کی گردنوں میں، انہیں صرف انہی کاموں کا بدلہ دیا جائے گا جو وہ کیا کرتے تھے ۝۳۳ اور ہم نے نہیں بھیجا

فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝۳۴ وَ

کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا مگر ہوا یہ کہ ان کے خوش حال لوگوں نے کہا کہ بلاشبہ تم جو کچھ دے کر بھیجے گئے ہو ہم اسے نہیں مانتے ۝۳۴ اور

قَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ۝۳۵ قُلْ اِنَّ رَبِّيْ

انہوں نے کہا کہ ہمارے اموال و اولاد تم سے زیادہ ہیں اور ہمیں عذاب ہونے والا نہیں ہے ۝۳۵ آپ فرما دیجئے کہ بلاشبہ میرا رب

يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۳۶

جس کے لئے چاہے روزی کو فراخ کر دیتا ہے اور جس کے لئے چاہے تنگ کر دیتا ہے لیکن بہت سے لوگ نہیں جانتے ۝۳۶

عذاب کی وجہ سے کافروں کی بدحالی اور ایک دوسرے پر جرم کو ٹالنے کی گفتگو

ان آیات میں قیامت کے دِن کا ایک منظر بیان فرمایا ہے، جو کافروں کے آپس کے سوال و جواب سے متعلق ہے، وہاں سبھی چھوٹے بڑے موجود ہوں گے، کفر کی سزا سامنے ہوگی، دوزخ کا داخلہ یقینی ہو چکا ہوگا، ان میں سے جو لوگ دُنیا میں چھوٹے یعنی کم درجے کے لوگ تھے وہ اپنے بڑوں سے (جن کی دُنیا میں بات مانتے تھے) کہیں گے کہ تم نے ہی ہمیں برباد کیا، اگر تم نہ

ہوتے تو ہم اللہ کے نبیوں پر اور اُس کی کتابوں پر ایمان لے آتے، اور آج کے دن پر بھی ایمان لاتے۔ ان کے بڑے کہیں گے کہ اپنا قصور ہمارے سر کیوں ڈال رہے ہو، اپنی کرنی ہمارے ذمہ کیوں لگاتے ہو؟ کیا ہم نے تمہیں ہدایت سے روکا تھا؟ جب تمہارے پاس ہدایت آگئی، تو ہم نے کوئی زبردستی نہیں کی تھی اور کسی جبر واکراہ سے کام لے کر تمہیں ایمان سے نہیں روکا تھا۔ ایسا تو نہیں ہوا کہ تم نے ایمان قبول کرنے کا ارادہ کیا ہو، اور ہم نے تمہیں جبر واکراہ کے ساتھ روک دیا ہو۔ اپنی آئی ہم پر کیوں لگاتے ہو؟ بات یہ ہے کہ تم خود ہی مجرم ہو۔ یہ جواب سُن کر چھوٹے بڑوں سے کہیں گے کہ تم نے تلوار لے کر جبر واکراہ کے ساتھ تو ہمیں ایمان سے نہیں روکا، لیکن رات دن تم مکاری کرتے تھے اور ایسی تدبیریں کرتے تھے کہ ہم ایمان نہ لائیں اور کُفر پر جمے رہیں، تا کہ تمہاری جماعت سے نہ نکلیں۔ تم ہمیں حکم دیتے تھے کہ ہم اللہ کے ساتھ کُفر کریں اور اللہ کے لئے شریک تجویز کریں، تمہاری یہ محنتیں اور تدبیریں اپنا کام کر گئیں، اور ہم کُفر پر جمے رہے، اور موت آنے تک کُفر ہی پر رہے، تمہاری ان حرکتوں کی وجہ سے آج ہم اس مصیبت میں پھنسے ہیں۔ دونوں فریق چھوٹے اور بڑے جب عذاب دیکھیں گے، تو نادم وپشیمان ہوں گے۔ لیکن ندامت کا اظہار نہ کریں گے اپنے دلوں ہی میں پشیمان ہوتے رہیں گے، لیکن پشیمانی کچھ فائدہ نہ دے گی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے جائیں گے اور اسی حالت میں دوزخ میں داخل کر دیئے جائیں گے، اور ہر ایک کو اپنے کیے کا بدلہ ملے گا۔ ایسا نہ ہوگا کہ بغیر کسی جرم کے سزا مل جائے، یا جرم سے زیادہ سزا دے دی جائے۔

کافروں کا دولت پر گھمنڈ اور اس کی تردید

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ: اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے جس کسی بھی بستی میں کوئی ڈرانے والا یعنی اپنا کوئی رسول بھیجا تو وہاں کے خوش حال لوگوں نے، جنہیں مال اور دولت پر گھمنڈ تھا، اور رزق کی وسعت اور نعمت کثیرہ میں مست تھے، یوں کہا کہ تم لوگ جو دین لے کر آئے ہو ہم اسے نہیں مانتے، مال کے غرور نے اُنہیں نبیوں پر ایمان لانے سے روکا، اور کہنے لگے کہ ہم ہی اللہ کے مقبول بندے ہیں، اگر ہم سے اللہ ناراض ہوتا تو ہمیں زیادہ مال اور زیادہ اولاد سے کیوں نوازتا، مال اور اولاد میں ہم تم سے بڑھ کر ہیں، جب دُنیا میں ہمارا یہ حال ہے تو آخرت میں بھی ہمارا حال اچھا ہی رہے گا۔ نہ یہاں تکلیف ہے نہ وہاں عذاب ہوگا۔ اوّل تو وہ قیامت کے قائل ہی نہ تھے، لیکن بطور فرض وتقدیر انہوں نے کہا کہ اگر قیامت آ ہی گئی، تو ہم وہاں بھی عذاب سے محفوظ رہیں گے۔ ان کی تردید میں فرمایا: قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ آپ فرما دیجئے کہ میرا رَبّ جس کے لئے چاہے رزق فراخ کر دیتا ہے، اور جس کے لئے چاہے تنگ کر دیتا ہے۔ دُنیا میں رزق کا زیادہ ہونا اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہونے کی دلیل نہیں، جیسا کہ رزق کا تنگ ہونا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں نامقبول ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ وہ اپنی حکمت کے مطابق کبھی نافرمان کی روزی وسیع فرما دیتا ہے، اور فرماں برداروں کی روزی تنگ فرما دیتا ہے۔ اور اس کا عکس بھی ہوتا رہتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اکثر لوگ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کو نہیں جانتے، اور یہ بھی نہیں جانتے کہ رزق کی فراخی اللہ تعالیٰ کے ہاں معزز ہونے کی، اور رزق کی تنگی اللہ تعالیٰ کے ہاں ذلیل ہونے کی دلیل نہیں ہے۔

وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓى اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ

اور تمہارے اموال اور اولاد ایسے نہیں ہیں جو تمہیں ہمارا مقترب بنادیں مگر ہاں! جو ایمان لائے اور نیک عمل

صَالِحًا ۡ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ﴿۳۷﴾

کرے سو ان لوگوں کے لئے ان کے اعمال کی وجہ سے ایسا صلہ ہے جو بڑھا چڑھا کر دیا جائے گا اور وہ بالا خانوں میں امن وچین سے ہوں گے ﴿۳۷﴾

وَالَّذِيْنَ يَسْعَوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿۳۸﴾ قُلْ

اور جو لوگ ہماری آیتوں کے بارے میں ہرانے کی کوشش کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو عذاب میں حاضر کیے جائیں گے ﴿۳۸﴾ آپ فرمادیجئے کہ

اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۭ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ

میرا رب اپنے بندوں میں سے جس کے لئے چاہے روزی کو فراخ کردیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگ کردیتا ہے، اور جو بھی کوئی چیز خرچ کروگے

فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۳۹﴾ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ

سو وہ اس کے بعد اس کا عوض دے گا، اور وہ سب سے بہتر روزی دینے والا ہے ﴿۳۹﴾ اور جس دن اللہ ان سب کو جمع فرمائے گا پھر فرشتوں سے

لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ﴿۴۰﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ

فرمائے گا: کیا یہ لوگ تمہاری عبادت کرتے تھے؟ ﴿۴۰﴾ فرشتے عرض کریں گے کہ آپ پاک ہیں! آپ ہمارے ولی ہیں!

دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾ فَالْيَوْمَ

ان سے ہمارا کچھ تعلق نہیں، بلکہ یہ لوگ جنّات کی عبادت کرتے تھے، ان میں سے اکثر ان پر ایمان لائے ہوئے تھے ﴿۴۱﴾ سو آج

لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّلَا ضَرًّا ۭ وَنَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ

تم میں سے بعض بعض کے لیے کسی نفع یا ضرر کا مالک نہیں، اور ہم ظالموں سے کہیں گے کہ دوزخ کا عذاب چکھ لو

النَّارِ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ

جسے تم جھٹلایا کرتے تھے ﴿۴۲﴾ اور جب ان پر ہماری آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ شخص تو

اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ ۚ وَقَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّآ

یہی چاہتا ہے کہ تم لوگوں کو ان چیزوں سے روک دے جن کی تمہارے باپ دادے عبادت کیا کرتے تھے، اور انہوں نے کہا کہ یہ تو محض ایک

اِفْكٌ مُّفْتَرًى ؕ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ
تراشا ہوا جھوٹ ہے، اور کافروں نے حق کے بارے میں کہا جب حق ان کے پاس آ گیا کہ یہ محض ایک جادو ہے
مُّبِيْنٌ ﴿۴۳﴾ وَمَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا وَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ
کھلا ہوا ﴿۴۳﴾ اور ہم نے انہیں کتابیں نہیں دی تھیں جن کو وہ پڑھتے پڑھاتے ہوں اور ہم نے آپ سے پہلے ان کی طرف کوئی ڈرانے
نَّذِيْرٍ ﴿۴۴﴾ وَكَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۙ وَمَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَآ اٰتَيْنٰهُمْ
والا نہیں بھیجا ﴿۴۴﴾ اور تکذیب کی ان لوگوں نے جو ان سے پہلے تھے، اور جو کچھ ہم نے اُن کو دیا تھا یہ لوگ اُس کے دسویں حصے کو بھی نہیں پہنچے،
فَكَذَّبُوْا رُسُلِيْ ۫ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۴۵﴾
سو انہوں نے میرے رسولوں کو جھٹلایا، سو کیسا ہوا میرا عذاب؟ ﴿۴۵﴾

تفسیر

عند اللہ مقرب ہونے کی علامت اور مؤمن و کافر کا انجام

یہاں ایک قاعدہ کلیہ بیان فرمایا: وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ ارشاد فرمایا کہ تمہارے اموال اور اولاد تمہیں ہمارا مقرب بنانے والے نہیں ہیں۔ جو کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ چونکہ میرے پاس مال اولاد زیادہ ہے، اس لئے اللہ کا مقرب ہوں، اور اپنے اعمال کو نہیں دیکھتا وہ شخص احمق ہے اور گمراہ ہے۔ اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا: اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ مقرب ہے جو ایمان لایا اور اعمالِ صالحہ میں لگا۔ جو مؤمن بندے ہوں گے اور ایمان کے ساتھ اعمالِ صالحہ میں بھی لگے ہوں گے، ان کے ایمان اور اعمال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں بڑھ چڑھ کر بدلہ دیا جائے گا، جس میں نیکی کا ثواب کم از کم دس گنا ہوگا، اور یہ حضرات جنت کے بالاخانوں میں امن و چین کے ساتھ رہیں گے۔ آگے مخالفین کی سزا کا تذکرہ ہے، وَالَّذِيْنَ يَسْعَوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا اور جو لوگ ہماری آیتوں کے بارے میں ہرانے کی کوشش کرتے ہیں یعنی ہماری آیتوں میں طعن کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ انکار کر کے کہیں نکل جائیں گے، اور (العیاذ باللہ!) اللہ کو ہرا دیں گے، اور اس کی قدرت اور گرفت سے باہر ہو جائیں گے، یہ لوگ عذاب میں حاضر کر دیئے جائیں گے۔ یہ اُن لوگوں کے لئے وعید ہے، جو اللہ تعالیٰ کی آیات سُن کر تکذیب بھی کرتے تھے، اُن کا مذاق بھی اُڑاتے تھے، اور طعن و تشنیع بھی کرتے تھے اور یوں سمجھتے تھے کہ ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ انہیں واضح طور پر بتا دیا کہ تم پکڑے جاؤ گے، عذاب میں حاضر کیے جاؤ گے، بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔

''فی سبیل اللہ'' خرچ کرنے کی برکات

قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ: اس میں اہلِ ایمان کو فی سبیل اللہ خرچ کرنے کی ترغیب بھی ہے، جو کچھ لللہ فی اللہ خرچ کریں گے اس کا بدلہ دیئے جانے کا وعدہ بھی ہے۔ جو شخص اللہ کی رضا کے لئے خرچ کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے بہت کچھ ملتا ہے، دُنیا میں بھی صلہ دیا جاتا ہے، اور آخرت میں تو بہت زیادہ دیا جائے گا، وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ اللہ تعالیٰ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔ حقیقی رزّاق تو وہی ہے۔ عربی کے محاورات میں غیر اللہ کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے کہتے ہیں کہ ''رَزَقَ الأمِيرُ الجندي'' اسی لیے مفسرین نے خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ کا یہ ترجمہ کیا ہے کہ رزق پہنچانے والوں میں دوسرے سے بہتر ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب بھی صبح ہوتی ہے، دو فرشتے نازل ہوتے ہیں، ایک کہتا ہے: اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا، اے اللہ! خرچ کرنے والے کو اس کے بعد اور مال دے۔ اور دوسرا کہتا ہے: اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا۔ اے اللہ! روک رکھنے والے کا مال تلف فرمادے۔[1] نیز حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ صدقہ کرنے سے کبھی مال میں کمی نہیں ہوتی۔ اور جس کسی بندے نے کسی کو معاف کر دیا، تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی عزّت بڑھا دے گا۔ اور جو شخص اللہ کے لیے تواضع اختیار کرے تو اللہ اس کو بلند فرمائے گا۔[2]

قیامت کے دِن معبودانِ باطلہ کام نہ آئیں گے

قیامت کے دِن اللہ تعالیٰ سب کو جمع فرمائے گا ان میں غیر اللہ کی عبادت کرنے والے بھی ہوں گے، ان میں وہ لوگ بھی موجود ہوں گے، جو دُنیا میں فرشتوں کی عبادت کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے سوال فرمائیں گے کہ کیا یہ لوگ تمہاری عبادت کرتے تھے؟ یہ سوال مشرکین کی سرزنش کرنے اور ان کی گمراہی ظاہر کرنے کے لیے ہوگا۔ فرشتے عرض کریں گے کہ سُبْحٰنَكَ: آپ پاک ہیں، آپ کا کوئی شریک نہیں۔ اَنْتَ وَلِيُّنَا: آپ ہمارے ولی ہیں، مِنْ دُوْنِهِمْ: ان سے ہمارا کوئی تعلق نہیں، اور نہ ہم نے انہیں شرک پر ڈالا، نہ ہم ان کے اس عمل سے راضی ہیں، بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ: بلکہ بات یہ ہے کہ یہ لوگ جنّات کی یعنی شیاطین کی پرستش کرتے تھے۔ شیاطین جو ڈراؤنی صورتیں بنا بنا کر ان کے سامنے آتے تھے، اُن کی شکلیں اور مورتیاں بنا کر پُوجا کرتے تھے۔ اور دُوسروں کی عبادت بھی اسی لیے کرتے تھے کہ شیاطین انہیں اس کا حکم دیتے تھے، فرماں برداری کے اعتبار سے یہ بھی شیاطین کی عبادت ہوئی۔ شیاطین ہی کی بات مانتے ہوئے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسرے معبود تجویز کیے اور ان کی عبادت کی۔ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ: ان میں اکثر شیاطین پر ہی ایمان لائے، یعنی ان ہی کے معتقد تھے، ان ہی کی بات مانتے تھے۔ چونکہ مشرکین غیر اللہ کی عبادت اس عقیدے سے بھی کرتے تھے کہ وہ آخرت میں سفارش کریں گے اور عذاب سے بچیں

---

(۱) بخاری ۱/۱۹۴ باب فاما من اعطی۔ مسلم ۱/۳۲۵ باب بیان اسم الصدقۃ۔ مشکوٰۃ ۱/۱۶۴ باب الانفاق فصل اول۔

(۲) مسلم ۲/۳۲۱ باب استحباب العفو والتواضع۔ مشکوٰۃ ۱/۱۶۷ باب فضل الصدقۃ فصل اول۔

گے، اس لیے اُن کی تردید کرتے ہوئے فرمایا: فَالْیَوْمَ لَا یَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّلَا ضَرًّا: سو آج تم میں سے بعض بعض کے کسی نفع یا ضرر کا مالک نہیں۔ لہٰذا غیر اللہ کی عبادت کر کے جو اُمیدیں باندھ رکھی تھیں، وہ سب جھوٹی نکلیں۔ اور اپنے بنائے ہوئے خیال سب باطل نکلے۔ وَنَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّتِیْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ اور ظالموں سے کہیں گے کہ دوزخ کے عذاب کو چکھ لو جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔

مشرکین کی مکذّبانہ گفتگو

اس کے بعد مشرکین کی تکذیب والی باتیں نقل فرمائیں، وَاِذَا تُتْلٰى عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ اور جب ان کو ہماری آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ شخص جو قرآن کی تلاوت کرتا ہے، یہ تو بس ایک ایسا ہی آدمی ہے جو تمہیں ان چیزوں سے روکتا ہے، جن کو تمہارے باپ دادے پُوجتے تھے۔ اور دوسری بات یہ کہتے تھے کہ یہ تو ایک تراشا ہوا جھوٹ ہے۔ اور تیسری بات یہ کہتے تھے کہ محمد (رسول اللہ ﷺ) جو کچھ سناتے ہیں، یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔ ان کے بارے میں فرمایا: وَمَآ اٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ یَّدْرُسُوْنَهَا وَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلَیْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِیْرٍ: اور ہم نے انہیں کتابیں نہیں دی تھیں، جن کو پڑھتے پڑھاتے ہوں، اور ہم نے پہلے ان کی طرف کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا تھا۔ لہٰذا انہیں اللہ کی اس نعمت کی قدر کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس نے اُن کی طرف نبی کو مبعوث فرمایا، اور نبی بھی وہ ہے جو انہیں میں سے ہے۔ اس سے پہلے تو قسم کھا کھا کر کہتے تھے: لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِیْرٌ لَّیَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ (سورۂ فاطر: ۴۲) اگر ہمارے پاس کوئی ڈرانے والا آجائے تو ہم دوسری اُمتوں کے مقابلے میں ہر اُمت سے زیادہ ہدایت قبول کرنے والے ہوں گے۔ ان لوگوں نے وعدہ پورا نہ کیا اور اُلٹے تکذیب پر اُتر آئے، اور نبی کریم ﷺ کے بارے میں نازیبا کلمات کہنے لگے۔

گزشتہ اُمتیں باوجود کثرتِ اَموال کے ہلاک کر دی گئیں

اس کے بعد مشرکین مکہ کے لئے وعید فرمائی: وَكَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۙ وَمَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَآ اٰتَیْنٰهُمْ: ان لوگوں نے جھٹلایا جو اُن سے پہلے تھے، اور حال یہ ہے کہ اُن لوگوں کو جو کچھ ہم نے دیا تھا یہ لوگ اس کے دسویں حصے کو بھی نہیں پہنچے۔ فَكَذَّبُوْا رُسُلِیْ ۫ فَكَیْفَ كَانَ نَكِیْرِ: سو اُن لوگوں نے میرے رسولوں کو جھٹلایا، سو کیسا تھا میرا عذاب! مطلب ہے کہ سابقہ اُمتیں تکذیب کی وجہ سے ہلاک ہوئی ہیں، اُن کے پاس تو حکومتیں بھی تھیں، اموال بھی بہت تھے، طرح طرح کے سامان بھی اُن کے پاس تھے، قلعے تھے، بڑے بڑے مکانات تھے، اور اُن کی عمریں بھی بڑی تھیں، انہیں اُن پر گھمنڈ بھی تھا۔ یہ لوگ تکذیب پر اَڑے ہوئے ہیں اور عناد پر جمے ہوئے ہیں، ان کے پاس تو اُن نعمتوں کا دسواں حصّہ بھی نہیں ہے، جو ہم نے گزشتہ اُمتوں کو دی تھیں۔ اُن لوگوں کے احوال انہیں معلوم ہیں، اَسفار میں جاتے ہیں، تو ان کے نشانات دیکھتے ہیں، تکذیب رسل کی وجہ سے ہلاک کر دیئے گئے۔ انہیں بھی اپنا انجام سوچ لینا چاہیے، جبکہ اُن کے سامنے ان کی اہمیت کچھ بھی نہیں۔

قُلْ إِنَّمَآ أَعِظُكُم بِوَاحِدَةٍ ۖ أَن تَقُومُوا لِلَّهِ مَثْنَىٰ وَفُرَادَىٰ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا

آپ فرمادیجئے کہ میں تمہیں ایک ہی بات کی نصیحت کرتا ہوں، وہ یہ کہ تم اللہ کے لئے کھڑے ہوجاؤ دو دو اور ایک ایک پھر تم سوچو

مَا بِصَاحِبِكُم مِّن جِنَّةٍ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا نَذِيرٌ لَّكُم بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيدٍ ﴿٤٦﴾

تمہارے ساتھی کو کوئی دیوانگی نہیں ہے، وہ تو ایک سخت عذاب کے آنے سے پہلے تمہیں ڈرانے والا ہے ﴿۴۶﴾

قُلْ مَا سَأَلْتُكُم مِّنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ ۖ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ

آپ فرمادیجئے کہ میں نے جو کچھ تم سے معاوضہ کا سوال کیا ہو سو وہ تمہارے لیے ہی ہے میرا اجر تو صرف اللہ پر ہے، اور وہ ہر چیز پر

شَهِيدٌ ﴿٤٧﴾ قُلْ إِنَّ رَبِّي يَقْذِفُ بِالْحَقِّ ۚ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ﴿٤٨﴾ قُلْ

اطلاع رکھنے والا ہے ﴿۴۷﴾ آپ فرمادیجئے کہ بے شک میرا رب حق کو غالب کردیتا ہے وہ پوری طرح غیبوں کا جاننے والا ہے ﴿۴۸﴾ آپ فرمادیجئے

جَاءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ ﴿٤٩﴾ قُلْ إِن ضَلَلْتُ فَإِنَّمَا أَضِلُّ عَلَىٰ نَفْسِي ۖ

کہ حق آگیا اور اور باطل نہ کرنے کا رہا نہ دھرنے کا ﴿۴۹﴾ آپ فرمادیجئے کہ اگر میں گمراہ ہوجاؤں تو میری گمراہی مجھ ہی پر پڑے گی

وَإِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوحِي إِلَيَّ رَبِّي ۚ إِنَّهُ سَمِيعٌ قَرِيبٌ ﴿٥٠﴾ وَلَوْ تَرَىٰ

اور اگر میں ہدایت پر رہوں تو اسی وحی کی بدولت جو میرا رب میرے پاس بھیج رہا ہے، بے شک وہ سننے والا ہے قریب ہے ﴿۵۰﴾ اور اگر اُس وقت کو آپ دیکھیں

إِذْ فَزِعُوا فَلَا فَوْتَ وَأُخِذُوا مِن مَّكَانٍ قَرِيبٍ ﴿٥١﴾ وَقَالُوا آمَنَّا بِهِ

جب یہ لوگ گھبرا جائیں گے پھر چھوٹنے کی کوئی صورت نہ ہوگی اور قریب ہی جگہ سے پکڑ لیے جائیں گے ﴿۵۱﴾ اور کہیں گے کہ ہم اس پر ایمان لائے

وَأَنَّىٰ لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِن مَّكَانٍ بَعِيدٍ ﴿٥٢﴾ وَقَدْ كَفَرُوا بِهِ مِن قَبْلُ ۖ وَيَقْذِفُونَ

اور اتنی دُور جگہ سے ان کے ہاتھ آنا کہاں ممکن ہے ﴿۵۲﴾ حالانکہ وہ اس سے پہلے اس کا انکار کرچکے ہیں، اور پھینکا کرتے ہیں

بِالْغَيْبِ مِن مَّكَانٍ بَعِيدٍ ﴿٥٣﴾ وَحِيلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُونَ كَمَا

بے تحقیق باتیں دُور ہی سے ﴿۵۳﴾ اور اُن کے اور اُن کی آرزوؤں کے درمیان آڑ کردی جائے گی جیسا کہ

فُعِلَ بِأَشْيَاعِهِم مِّن قَبْلُ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا فِي شَكٍّ مُّرِيبٍ ﴿٥٤﴾

اُن سے پہلے اُن کے ہم مشربوں کے ساتھ کیا گیا، بلاشبہ وہ تردد میں ڈالنے والے شک میں تھے ﴿۵۴﴾

منکرین کو غور وفکر کی دعوت

رسول اللہ ﷺ کے اولین مخاطبین جو آپ کی تکذیب کرتے تھے، وہ آپ کو دیوانگی کی طرف منسوب کرتے تھے۔ اللہ جل شانہ نے کہا کہ آپ ان سے فرمادیجئے کہ میں تمہیں صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں، یہ نصیحت محض تمہاری ہمدردی کے لیے ہے، تم دو دو آدمی مل کر یا علیحدہ علیحدہ تنہائیوں میں سوچو، اور غور وفکر کرو۔ تمہارا یہ سوچنا صرف اللہ کی رضا کے لیے ہو، اس میں نفسانیت اور تعصب کا دخل نہ ہو۔ تم لوگ یہ سوچ لو کہ جو شخص یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ میں نبی ہوں اور تمہیں توحید کی دعوت دے رہا ہے، وہ دیوانہ نہیں ہے۔ اس کے احوال دیکھ لو اور ان کی بات سن لو، وہ جو قرآن سناتا ہے اسے سنو، اور یہ بھی سمجھ لو کہ باوجود چیلنج کے تم اس جیسا بنا کر نہیں لا سکتے۔ اگر تم غور وفکر کرو گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ دعوت دینے والا شخص دیوانہ نہیں ہے، وہ تو تم کو ایک سخت عذاب کے آنے سے پہلے ڈراتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے چند باتوں کا حکم

پھر اللہ تعالیٰ نے چند باتوں کا حکم دیا...... کہ آپ ان لوگوں سے کہہ دیں کہ تم یہ بتاؤ کہ میں نے تم سے کوئی معاوضہ تو طلب نہیں کیا۔ اگر میں نے تم سے معاوضہ کا کوئی سوال کیا ہو، تو وہ مجھے نہیں چاہیے، وہ تم ہی رکھو، میرا اجر وثواب تو صرف اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے، اس نے مجھ سے ثواب دینے کا وعدہ فرمایا ہے، وہ مجھے عطا فرمائے گا۔ اور یہ بھی سمجھ لو کہ وہ ہر چیز پر اطلاع رکھنے والا ہے۔ جو میری محنتیں ہیں ان کا بھی اسے علم ہے، اور جو تمہاری حرکتیں ہیں وہ ان سے بھی باخبر ہے...... آپ کہہ دیں کہ میرا رب حق کو غالب فرمادیتا ہے۔ میں جو حق لے کر آیا ہوں وہ غالب ہو کر رہے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ، تم اپنی مغلوبیت کو سوچ لو۔ وہ علام الغیوب ہے، اسے پہلے سے سب کچھ معلوم ہے...... اور آپ فرمادیجئے کہ حق آ گیا اور باطل کسی کام کا نہ رہا۔ یعنی اس کا ذکر فکر ختم ہو گیا۔ فتح مکہ کے دن رسول اللہ ﷺ نے آیت کریمہ: جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (سورۂ اسراء: ۸۱) اور یہ آیت: جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ تلاوت فرمائی تھی۔ [1] کیونکہ اس وقت بالکل اس کا مظاہرہ ہو گیا تھا کہ حق ظاہر ہوا، اور باطل چلتا بنا...... آپ ان لوگوں سے فرمادیجئے کہ اگر میں گمراہ ہو جاؤں تو اس کا وبال مجھ ہی پر ہوگا۔ میں جو دین لایا ہوں وہ حق ہے جو اس کا منکر ہوگا گمراہ ہوگا۔ بالفرض! اگر میں بھی اس دین کو چھوڑ دوں، تو میں بھی گمراہ ہو جاؤں گا، اور مجھ پر اس کا الزام پڑے گا۔ اس میں نام اپنا ہے اور سنانا اُن کو مقصود ہے، یہ علیٰ اُسلوب الحکیم ہے۔ یعنی میں تو اسی راہ پر ہوں، تم اس کے منکر ہو، لہٰذا تم گمراہ ہو، اس کا وبال تم پر پڑے گا۔ اور اگر میں ہدایت پر ہوں تو اس قرآن کی بدولت ہوں جس کی وحی میرا رب میری طرف بھیج رہا ہے، یہ بھی علیٰ اُسلوب الحکیم

---

(۱) بخاری ۲/۶۸۶، کتاب التفسیر، سورۃ الاسراء، باب قل جاء الحق۔ مسلم ۲/ ۱۰۲، باب فتح مکۃ کا آخر۔

ہے، مطلب یہ ہے کہ تم ہدایت چاہو تو تمہیں بھی اسی راہ پر آنا پڑے گا۔ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ بے شک تیرا رَبّ سننے والا ہے، بہت نزدیک ہے۔ میری باتیں بھی سنتا ہے اور تمہاری باتیں بھی۔

آخری آیتوں میں منکرین کے لئے وعید ہے، فرمایا: وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ فَزِعُوْا: اور اگر آپ اس وقت کو دیکھیں جب یہ لوگ گھبرا جائیں گے تو پھر چھوٹنے کی کوئی صورت نہ ہوگی، اور قریبی جگہ سے پکڑ لیے جائیں گے، اور کہیں گے کہ ہم ایمان لائے۔ اور اتنی دُور سے اُن کے ہاتھ آنا کہاں ممکن ہے، حالانکہ وہ اس سے پہلے اس کا انکار کر چکے ہیں، اور دُور ہی دُور سے بے تحقیق باتیں پھینکا کرتے ہیں، اور ان کے اور ان کی آرزوں کے درمیان آڑ کر دی جائے گی۔ بلاشبہ وہ تردّد میں ڈالنے والے شک میں تھے۔

سورۃ فاطر
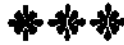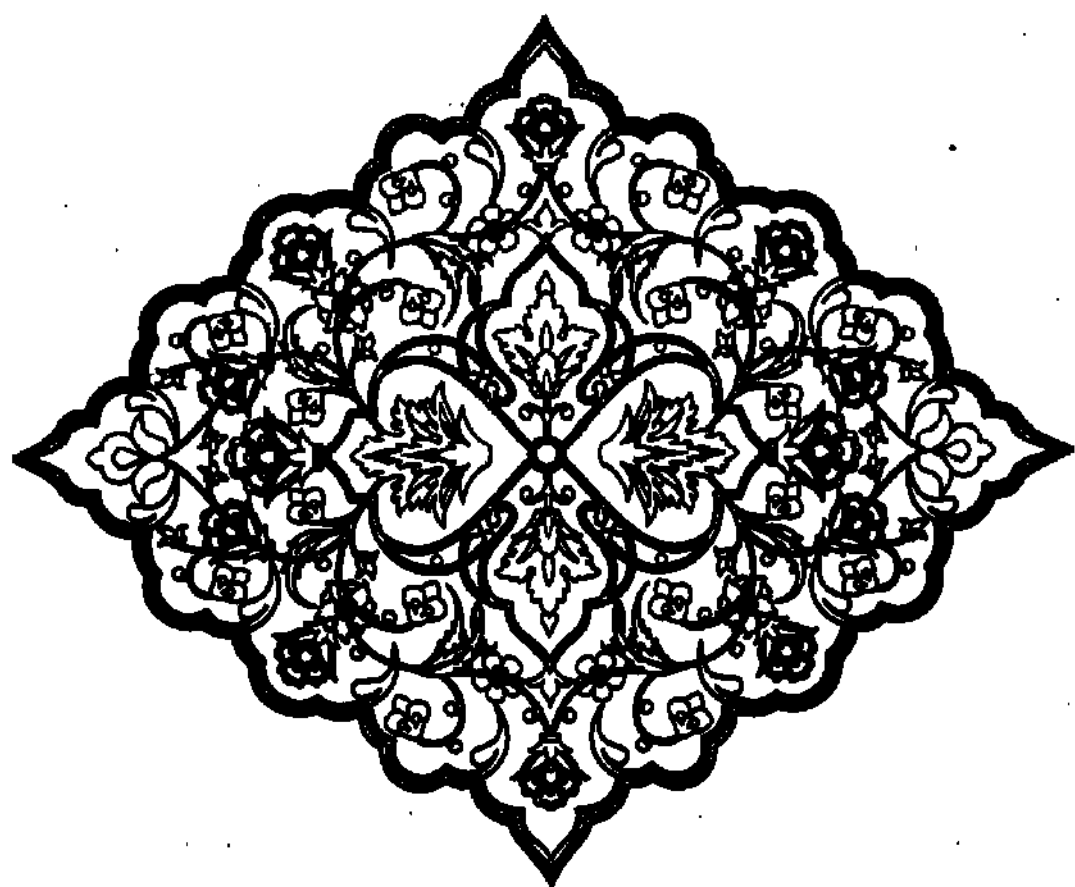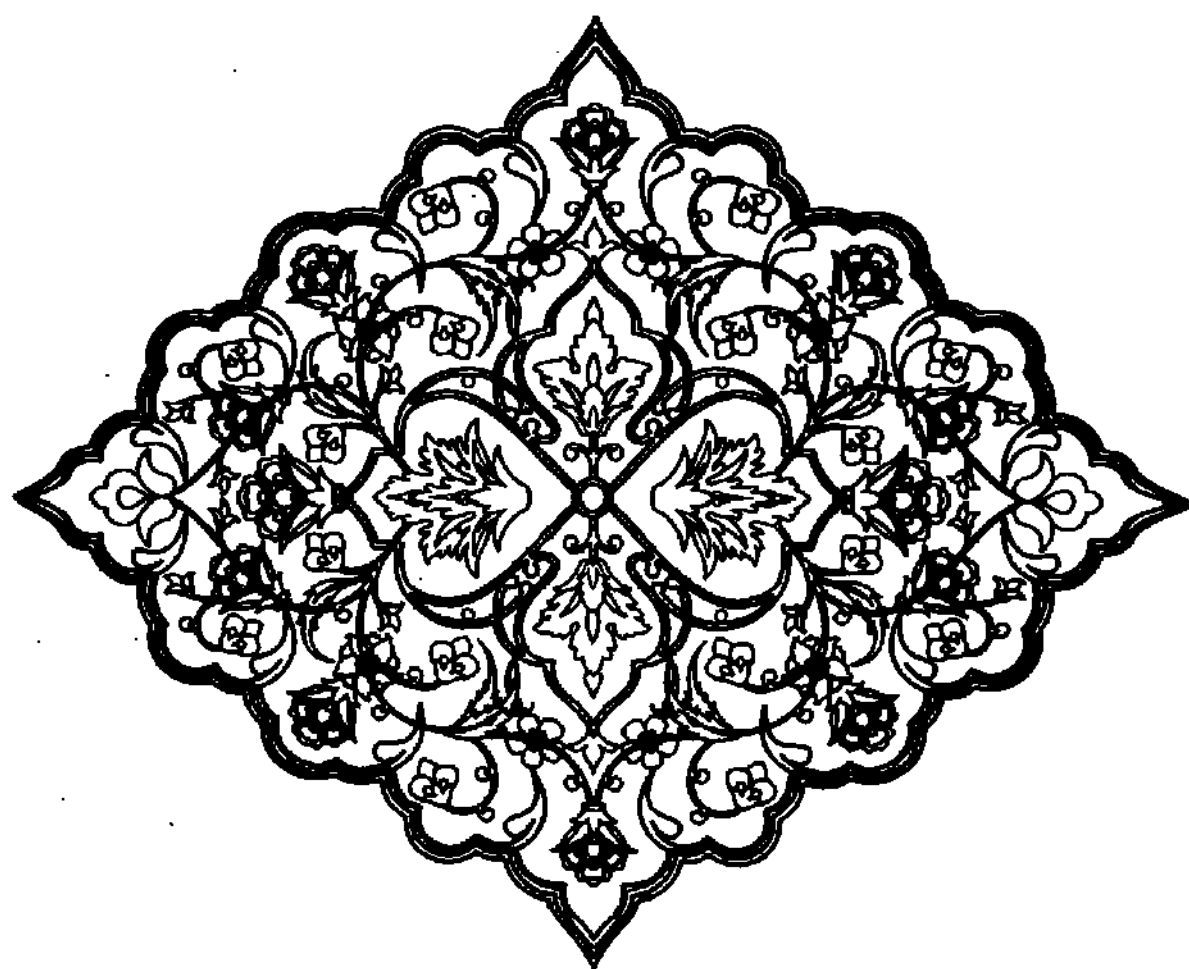
(نوٹ:- پوری سورۂ ''فاطر'' کا ترجمہ وتفسیر ریکارڈنگ محفوظ نہ ہونے کی وجہ سے ''انوار البیان'' سے ماخوذ ہے۔)

آیاتھا ۴۵ ۳۵ سُوْرَةُ فَاطِرٍ مَّكِّيَّةٌ ۴۳ رکوعاتھا ۵

سورۂ فاطر مکہ میں نازل ہوئی، اوراس کی پینتالیس آیتیں ہیں، پانچ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى

سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو آسمانوں اور زمین کا پیدا فرمانے والا ہے، وہ فرشتوں کو پیغام رساں بنانے والا ہے، جن کے دو دو

وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ؕ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ① مَا

اور تین تین اور چار چار بازو ہیں، وہ پیدائش میں جو چاہے زیادہ کردیتا ہے، بلاشبہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے ① جو بھی کوئی

يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْ

رحمت اللہ انسانوں کے لئے کھول دے تو اس کو کوئی روکنے والا نہیں، اور جس کو وہ بند کردے سو اس کا کوئی جاری کرنے والا نہیں

بَعْدِهٖ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ② يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ؕ

اس کے بعد، اور وہ غالب ہے حکیم ہے ② اے لوگو! اللہ کی نعمت کو یاد کرو جو تم پر ہے،

هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۫ فَاَنّٰى

کیا اللہ کے سوا کوئی پیدا کرنے والا ہے جو تمہیں آسمان وزمین سے رزق دیتا ہو؟ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، سو تم کہاں

تُؤْفَكُوْنَ ③ وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ

اُلٹے جارہے ہو؟ ③ اور اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو آپ سے پہلے بہت سے پیغمبر جھٹلائے جاچکے ہیں، اور اللہ ہی کی طرف

تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ④ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ

سب اُمور لوٹائے جائیں گے ④ اے لوگو! بلاشبہ اللہ کا وعدہ حق ہے، سو تمہیں ہرگز دُنیا والی زندگی دھوکے میں نہ ڈالے

الدُّنْيَا ۗ وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِاللَّهِ الْغَرُورُ ۝ إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا ۚ
اور تمہیں اللہ کا نام لے کر دھوکا باز ہرگز دھوکے میں نہ ڈالے ۝ بلاشبہ شیطان تمہارا دشمن ہے سوتم اُسے اپنا دشمن سمجھتے رہو
إِنَّمَا يَدْعُو حِزْبَهُ لِيَكُونُوا مِنْ أَصْحَابِ السَّعِيرِ ۝ الَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ
وہ اپنے گروہ کو اسی لیے بلاتا ہے تاکہ وہ دوزخیوں میں سے ہوجائیں ۝ جن لوگوں نے کفر کیا اُن کے لیے
عَذَابٌ شَدِيدٌ ۖ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ ۝
سخت عذاب ہے، اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے اُن کے لیے مغفرت اور اَجرِ کبیر ہے ۝

اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق و مالک ہے

یہاں سے سورۂ فاطر شروع ہو رہی ہے جس کا دُوسرا نام ''سورۃ الملائکہ'' بھی ہے۔ سورۃ الفاتحہ، سورۃ الکہف، اور سورہ سبأ کی طرح یہ سورت بھی اللہ تعالیٰ کی تعریف سے شروع ہے۔ فرمایا کہ سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو آسمانوں کا اور زمین کا پیدا فرمانے والا ہے۔ اس کی مخلوق میں فرشتے بھی ہیں، ان فرشتوں کو بھی اس نے پیدا فرمایا، اور کاموں پر مقرر فرمایا۔ ان کاموں میں سے ایک یہ کام ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اور اس کے نبیوں کے درمیان پیغام رسانی کا کام کرتے رہے ہیں۔ ان کی تخلیق بھی دوسری مخلوق سے علیحدہ ہے۔ ان کے جو بازو ہیں، وہ دو دو بھی ہیں، تین تین بھی ہیں، اور چار چار بھی۔ فرشتے ان بازوؤں کے ساتھ جاتے اور آتے ہیں، چڑھتے اور اُترتے ہیں۔ اور صرف چار بازوؤں پر ہی منحصر نہیں ہے، اس سے زیادہ بازوؤں کا بھی ''صحیح بخاری'' میں ذکر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو دوبار اصلی صورت میں دیکھا، جن کے چھ سو بازو تھے۔[1] یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ: اللہ تعالیٰ پیدائش میں جو چاہے زیادہ فرمادیتا ہے۔ اور یہ زیادتی کمیت اور کیفیت دونوں میں ہوتی ہے۔ مخلوق میں جو کمی بیشی نظر آتی ہے، اجسام میں بھی ہے اور اوصاف میں بھی، یہ سب محض اللہ تعالیٰ کی تخلیق سے ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ: بلاشبہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اللہ تعالیٰ کی شانِ رحمت

اس کے بعد اللہ تعالیٰ شانہٗ کی شانِ رحمت کو بیان فرمایا، اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جو بھی کوئی رحمت کھول دے یعنی لوگوں پر فرمائے تو اس رحمت کو کوئی روکنے والا نہیں۔ جس شخص پر بھی جس طرح کی نعمت اللہ تعالیٰ بھیجنا چاہے، اسے اس پر پوری پوری قدرت ہے۔ کسی بھی مخلوق کی مجال نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو روک دے۔ بعض چھوٹے درجہ کے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوتی ہے، وہ بڑھتے اور ترقی کرتے چلے جاتے ہیں، جلنے والے ان سے جلتے ہیں، حسد کرنے والے ان سے حسد کرتے ہیں، لیکن کچھ

---

(۱) بخاری ۲/ ۷۲۰، کتاب التفسیر، سورۃ النجم۔ مشکوٰۃ ۲/ ۵۱۱، باب رؤیۃ اللہ، فصل ثالث۔

کر نہیں سکتے، اللہ تعالیٰ کی رحمت برابر جاری رہتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کو جس سے روک لے کسی میں طاقت نہیں کہ اس کو جاری رکھ دے۔ وہ غالب ہے، جس کو چاہے دے، جس سے جو چاہے چھین لے۔ وہ غالب بھی ہے اور حکیم بھی ہے، جس کو جو کچھ وہ دیتا ہے جس سے واپس لیتا ہے، یہ سب کچھ حکمت کے مطابق ہوتا ہے۔

پھر فرمایا کہ اے لوگو......! اللہ تعالیٰ نے تم پر جو انعام فرمایا ہے اور جو نعمتیں دی ہیں، ان کو یاد کرو۔ نعمتوں کو یاد کرنے میں ان کا شکر کرنا بھی شامل ہے۔ جب نعمتوں کو یاد کریں گے اور غور کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں فلاں فلاں نعمتیں دی ہیں، جان بھی، اولاد بھی عنایت فرمائی، مال بھی دیا اور حسن و جمال بھی، علمی و عملی کمال بھی، اور جاہ و اقتدار بھی، تو اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری کی طرف طبیعت چلے گی، اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف ذہن، دل اور دماغ متوجہ ہوگا۔

یہ بھی فرمایا کہ تم غور کرلو......! کیا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور پیدا کرنے والا ہے، جو تمہیں آسمان وزمین سے رزق دیتا ہو۔ غور کروگے تو سمجھ میں آجائے گا، اور یقینی طور پر یہ بات دل میں بیٹھ جائے گی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی پیدا کرنے والا نہیں ہے۔ اور اس کے علاوہ کوئی بھی نہیں ہے، جو تمہیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہو۔ اللہ تعالیٰ ہی آسمان سے بارش برساتا ہے، اور زمین میں اس نے غلے میوے اور کھانے پینے کی بہت سی چیزیں پیدا فرمائی ہیں۔ یہ سب چیزیں اس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ جب اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، تو کہاں اُلٹے پھرے جا رہے ہو، کہ اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو معبود بنا رکھا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو تسلی

اثباتِ توحید کے بعد رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی کہ آپ کے مخالفین آپ کو جھٹلاتے ہیں، تو آپ رنجیدہ نہ ہوں۔ آپ نے اپنا کام پورا کرلیا، حجت تمام کردی۔ آپ سے پہلے بھی انبیائے کرام علیہم السلام کو جھٹلایا گیا، انہوں نے صبر کیا، آپ بھی صبر کیجئے۔ سب اُمور اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہوں گے، اور کافرین ومنکرین کو عذاب دے گا۔

منکرین کو تنبیہ

اس کے بعد توحید اور رسالت کے منکرین سے خطاب فرمایا کہ اے لوگو......! اللہ تعالیٰ کا جو وعدہ ہے کہ قیامت قائم ہوگی اور ایمان اور کُفر کا بدلہ دیا جائے گا، یہ وعدہ حق ہے اور پورا ہو کر رہے گا۔ تمہیں دُنیا والی زندگی دھوکے میں نہ ڈالے، جس کا ہرا بھرا ہونا تمہیں اپنی طرف کھینچتا ہے، اور آخرت کے ماننے سے اور آخرت میں نفع دینے والے کاموں سے روکتا ہے۔ ایک طرف تو دُنیا کی سرسبزی ہے، دوسری طرف شیطان تمہارے پیچھے لگا ہوا ہے، اس سے چوکنے اور ہوشیار رہو۔ وہ تمہارا دشمن ہے، اُسے دشمن ہی سمجھو، وہ تمہیں دھوکہ نہ دے۔ اس کے دھوکہ دینے کے جتنے طریقے ہیں، اُن میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نام لے کر دھوکا دیتا ہے، اور یہ سمجھاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑا مہربان ہے، ابھی تو بہت بڑی زندگی پڑی ہے، رنگ رلیوں میں رہو، اور بدمستیاں کرو، آخر میں توبہ کرلینا۔ حالانکہ بندہ کو یہ معلوم نہیں کہ کتنی زندگی باقی ہے۔ موت اچانک آجاتی ہے اور بغیر ایمان کے اور بغیر توبہ کے مرجاتے ہیں۔ شیطان دشمن ہے اگر ہم نے اس کی بات مانی، تو وہ پٹک دے گا۔ دشمن کو دشمن ہی سمجھتے رہو، وہ

ہر وقت دشمنی میں لگا ہوا ہے، اپنی جماعت کو دوزخ ہی کی طرف بلاتا ہے، اور اپنا بناتا ہے۔ لہٰذا انسانوں کو بہت ہی بیدار مغزی کے ساتھ زندگی گزارنا لازم ہے۔

اس کے بعد اہلِ کفر کا عذاب اور اہلِ ایمان کا ثواب بیان فرمایا۔ ارشاد فرمایا کہ جن لوگوں نے کفر کیا اُن کے لیے سخت عذاب ہے اور جو لوگ ایمان لائے اور اعمالِ صالحہ میں مشغول ہوئے، اُن کے لیے مغفرت ہے اور بڑا اَجر ہے۔

أَفَمَنْ زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ فَرَآهُ حَسَنًا ۖ فَإِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي

سو کیا جس شخص کے لئے اس کا عملِ بد اچھا کر کے رکھ دیا گیا ہو، سو اُس نے اس کو اچھا سمجھا ہو، بے شک اللہ گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے

مَنْ يَشَاءُ ۖ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا

جس کو چاہتا ہے، سو اُن پر حسرتیں کرنے کی وجہ سے آپ کی جان نہ جاتی رہے، بلاشبہ اللہ خوب جانتا ہے جو کام

يَصْنَعُونَ ﴿٨﴾ وَاللَّهُ الَّذِي أَرْسَلَ الرِّيَاحَ فَتُثِيرُ سَحَابًا فَسُقْنَاهُ إِلَىٰ بَلَدٍ مَيِّتٍ

یہ لوگ کرتے ہیں (۸) اور اللہ وہ ہے جس نے ہواؤں کو بھیج دیا جو اُٹھاتی ہیں بادل کو پھر ہم نے اسے ایسے قطعۂ زمین کی طرف ہانک دیا جو خشک تھا

فَأَحْيَيْنَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ كَذَٰلِكَ النُّشُورُ ﴿٩﴾ مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ

پھر ہم نے اُس کے ذریعے زمین کو زندہ کر دیا اس کی موت کے بعد، اسی طرح جی اُٹھنا ہوگا (۹) جو شخص عزت حاصل کرنا چاہے

فَلِلَّهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا ۚ إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ ۚ

تو ساری عزت اللہ ہی کے لئے ہے، اچھے کلمات اُس کی طرف پہنچتے ہیں اور نیک عمل کو وہ بلند کر دیتا ہے،

وَالَّذِينَ يَمْكُرُونَ السَّيِّئَاتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۖ وَمَكْرُ أُولَٰئِكَ هُوَ يَبُورُ ﴿١٠﴾

اور جو لوگ بُری تدبیریں کرتے ہیں اُن کے لئے سخت عذاب ہے اور ان کی تدبیر برباد ہوگی (۱۰)

وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ أَزْوَاجًا ۚ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنْثَىٰ

اور اللہ نے تم کو مٹی سے پیدا فرمایا، پھر نطفے سے، پھر اس نے تمہیں جوڑے جوڑے بنایا، اور جس کسی عورت کو حمل رہ جاتا ہے

وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهِ ۚ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُعَمَّرٍ وَلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهِ إِلَّا فِي

اور جو کوئی عورت جنتی ہے تو یہ سب اُس کے علم میں ہوتا ہے، اور جس کسی عمر والے کی عمر زیادہ کی جاتی ہے اور جس کی عمر کم کر دی جاتی ہے وہ سب

كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۱۱﴾ وَمَا يَسْتَوِى الْبَحْرٰنِ ۖ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ

کتاب میں ہے، بلاشبہ یہ اللہ پر آسان ہے ﴿۱۱﴾ اور دو سمندر برابر نہیں، یہ میٹھا ہے پیاس بجھانے والا،

سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ؕ وَمِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا وَّ

آسان ہے اس کا پینا، اور یہ شور ہے کڑوا، اور ہر ایک میں سے تم تازہ گوشت کھاتے ہو، اور

تَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ فِيْهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ

نکالتے ہو زیور جسے تم پہنتے ہو، اور اے مخاطب! تو کشتیوں کو دیکھتا ہے کہ وہ پانی کو پھاڑتی ہوئی چلی جاتی ہیں تاکہ تم اس کے فضل سے تلاش کرو

وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲﴾ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ ۙ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ

اور تاکہ تم شکر ادا کرو ﴿۱۲﴾ وہ رات کو دِن میں داخل کرتا ہے اور دِن کو رات میں اور اُس نے سورج کو

وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَّجْرِىْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ

اور چاند کو مسخر فرمایا، ہر ایک مقررہ وقت کے لئے چلتا ہے، یہ اللہ ربّ ہے تمہارا، اسی کا ملک ہے، اور اس کے سوا تم جن لوگوں کو

مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ﴿۱۳﴾ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا

پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے برابر بھی اختیار نہیں رکھتے ﴿۱۳﴾ اگر تم ان کو پکارو تو تمہاری پکار نہیں سنیں گے اور اگر وہ سن لیں

مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ؕ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ؕ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ﴿۱۴﴾

تو تمہاری بات نہ مانیں گے، اور قیامت کے دِن وہ تمہارے شرک سے منکر ہو جائیں گے، اور خبر رکھنے والے کے برابر تجھے کوئی نہیں بتا سکتا ﴿۱۴﴾

نیک و بد برابر نہیں ہو سکتے!

یہاں پہلی آیت میں یہ بتایا کہ بہت سے لوگ برے عمل کرتے ہیں، کفر اختیار کیے ہوئے ہیں، اور شیطان نے اور ان کے ماحول نے اور ان کے نفوس نے کفر ہی کو، اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہی کو، ان کے سامنے اچھا کر کے پیش کیا ہے۔ جس کی وجہ سے کفر کو اور برے اعمال کو اچھا سمجھتے ہیں، اور ایمان سے اور اعمال صالحہ سے بچتے ہیں، اور ان کو قبیح جانتے ہیں۔ ارشاد فرمایا ''کیا ایسا شخص جس کے لیے برے اعمال کو مزین بنا دیا گیا ہو اور اس نے برے اعمال ہی کو اچھا سمجھ لیا ہو، کیا یہ شخص اور وہ آدمی دونوں برابر ہو سکتے ہیں جو برے اعمال کو برا جانتا ہو، اور اچھے اعمال کو اچھا سمجھ کر اپنی زندگی میں اختیار کیے ہوئے ہو۔'' یہ استفہام انکاری ہے، مطلب یہ ہے کہ جس کے لیے برے اعمال کو اچھا بنا کر پیش کر دیا گیا، اور اس نے برے عمل کو اچھا سمجھ لیا، یہ شخص اور اس کا

مقابل شخص جو برے اعمال کو برا اور اچھے اعمال کو اچھا سمجھتا ہو، دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ فَإِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ: پس اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

حضور ﷺ کو تسلی

فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ: سوان پر حسرتیں کرنے کی وجہ سے آپ کی جان نہ جاتی رہے، رسول اللہ ﷺ کو اس بات کی بڑی حرص تھی کہ ساری اُمت دعوت مسلمان ہو جائے لیکن مخاطبین کی طرف سے تکذیب تھی اور عناد تھا اور اس سے آپ کو رنج ہوتا تھا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان لوگوں پر افسوس کر کے آپ کی جان نہ جاتی رہے، جیسا کہ سورۃ الشعراء میں فرمایا: لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (شعراء: ۲) کیا ایسا ہونے کو ہے کہ آپ اپنی جان کو اس وجہ سے ہلاک کر دیں کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔

پھر فرمایا: إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَصْنَعُونَ: بلاشبہ اللہ کو ان کے کاموں کا خوب علم ہے، وہ اپنے علم و حکمت کے مطابق بدلہ دے گا۔

اللہ تعالیٰ کی شانِ رزّاقیت

دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کی شانِ رزّاقیت بیان فرمائی، اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہواؤں کو بھیجتا ہے، یہ ہوائیں بادلوں کو اُن کی جگہوں سے ہٹاتی ہیں، پھر ان بادلوں کو اللہ تعالیٰ مردہ یعنی خشک زمین کی طرف بھیج دیتا ہے، وہ وہاں جاکر پانی برساتے ہیں جس سے خشک زمین زندہ ہو جاتی ہے۔ گھاس پھونس پیدا ہوتا ہے، جو مویشیوں کے کام آتا ہے۔ انسان اپنی ضرورت کی پیداوار کے لئے زمین میں بیج ڈالے ہوئے ہوتے ہیں، بارش ہونے سے کھیتیاں نکلتی ہیں، اور بقدر ضرورت بلند ہوتی ہیں، چھوٹی بڑی بالیاں نکلتی ہیں، جن میں دانے ہوتے ہیں، یہ دانے پکتے ہیں پھر کھیتی کاٹی جاتی ہے، بھوسہ اور دانہ الگ الگ کیا جاتا ہے، پھر دانوں کو پیس کر پکاتے ہیں اور کھاتے ہیں۔ آیت کے ختم پر جو "كَذَٰلِكَ النُّشُورُ" ہے اس میں ایک مزید فائدہ کی طرف اشارہ فرما دیا، اور وہ یہ کہ جس طرح اللہ تعالیٰ مردہ زمین کو زندہ فرماتا ہے، اسی طرح تم لوگ دوبارہ زندہ ہو کر قبروں سے نکلو گے۔

سب عزتیں اللہ کے لئے ہیں

لوگ دُنیا میں عزت چاہتے ہیں، اُن کا خیال ہے کہ بڑے بن کر رہیں، اور اس کے ذریعے دُنیاوی مصائب اور مشکلات سے بھی بچنا چاہتے ہیں۔ اس بارے میں غیر اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، بتوں کی پرستش کرتے ہیں اور مخلوق کو راضی کرنے کے لئے ایسے اعمال کرتے ہیں جن سے خالقِ کائنات جل شانہٗ راضی نہیں ہیں۔ ایسے لوگوں کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا: فَلِلَّهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا یعنی جسے عزت چاہیے تو وہ اللہ تعالیٰ سے مانگے۔ وہ عزیز ہے اور ساری عزت اسی کے لیے ہے، اپنی مخلوق میں جس کو چاہے عزت دے سکتا ہے، اور جس کی عزت چاہے کم کر سکتا ہے اور ختم کر سکتا ہے، لہٰذا اللہ ہی کی فرماں برداری کرے اور اسی سے سب کچھ مانگے۔

بعض حضرات نے لفظ عِزَّةٌ کا ترجمہ غلبہ سے کیا ہے، یہ بھی دُرست ہے اور حقیقت میں اللہ ہی سب پر غالب ہے، اور جسے چاہے غلبہ دے سکتا ہے۔ ایک مرتبہ منافقین رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جہاد میں چلے گئے، وہاں آپس میں کہنے لگے لَئِن رَّجَعْنَا

اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ: اگر ہم مدینہ واپس ہو گئے تو جو عزت والا ہے، وہ ذلت والے کو نکال دے گا۔ مطلب یہ تھا کہ ہم پردیسی مہاجرین کو مدینہ سے نکال دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ اور اللہ ہی کے لیے عزت ہے اور اس کے رسول کے لئے اور مؤمنین کے لئے، لیکن منافقین نہیں جانتے۔ اور سورۃ النساء میں فرمایا ہے: بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۝ منافقین کو خوشخبری سنا دیجئے کہ ان کے واسطے بڑی دردناک سزا ہے۔ جن کی حالت یہ ہے کہ کافروں کو دوست بناتے ہیں، مسلمانوں کو چھوڑ کر، کیا ان کے پاس معزز رہنا چاہتے ہیں، سو اعزاز تو سارا اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہے۔

ان آیات میں اُن سب لوگوں کو تنبیہ ہے جو اللہ کے دشمنوں کو راضی کرنے کے لیے حکومت اور سیاست اور معیشت، خوراک، پوشاک، وضع قطع اور شکل وصورت میں کافروں کی مشابہت اور ان کے طور طریق اختیار کرتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح سے ہم باعزت سمجھے جائیں گے۔ حالانکہ عزت ایمان اور اعمالِ صالحہ میں ہے، اور ساری عزت اللہ ہی کے لیے ہے، اللہ جسے چاہے گا عزت دے گا اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی میں کوئی عزت نہیں ہے۔ دُنیا میں اگر کسی کافر، فاسق کو کوئی عزت حاصل ہے، تو بے حقیقت ہے، اور ذرا سی دیر کے لیے ہے۔

حقیقی عزت کن کو ملتی ہے؟

پھر فرمایا: اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ: اور اچھے کلمات اس کی طرف پہنچتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ ان کو قبول فرماتا ہے۔ اچھے کلمات کلمہ توحید اور تمام اَذکارِ اِلٰہیہ کو شامل ہیں۔ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ: اور نیک عمل انہیں بلند کردیتا ہے۔ نیک سے اعمالِ صالحہ ظاہرہ وباطنہ مراد ہیں۔ تصدیقِ قلبی یعنی ایمان تو ہر عمل کے مقبول ہونے کی شرط ہی ہے، دوسرے اعمالِ صالحہ کا بھی کلماتِ طیبات کی مقبولیت میں دخل ہے۔ اور جن لوگوں کے اعمال واَذکار عنداللہ مقبول ہوتے ہیں، حقیقی عزت اُنہیں کو ملتی ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ: اور جو لوگ بُری تدبیریں کرتے ہیں ان کے لئے بُرا عذاب ہے، اس میں اُن لوگوں کے لئے وعید ہے جو رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کرتے تھے اور آپ کی دعوت کو روکنے کے لیے مشورے کرتے تھے، ایک مرتبہ وہ لوگ جمع ہو کر یہ مشورہ کرنے لگے کہ آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے......؟ آپ کو قید کردیا جائے یا قتل کردیا جائے یا مکہ معظمہ سے نکال دیا جائے جسے سورۂ اَنفال کی آیت کریمہ وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ (انفال: ۳۰) میں بیان فرمایا ہے۔ وَمَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَ يَبُوْرُ: اور اُن لوگوں کی تدبیریں برباد ہوں گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، آپ کے خلاف تدبیریں کرنے والے غزوۂ بدر میں مقتول ہوئے۔ اور اللہ تعالیٰ نے مستقل یہ تکوینی قانون بنا دیا، وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ (فاطر: ۴۳) اور بُری تدبیروں کا وبال اُنہیں لوگوں پر پڑتا ہے جو ایسی تدبیریں کرتے ہیں، ہر صاحبِ عقل وفہم کو یہ نکتہ سمجھ لینا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کی شانِ خالقیت کا بیان

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی شانِ خالقیت بیان فرمائی، وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں مٹی سے پیدا فرمایا، یعنی ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کا پتلا مٹی سے بنایا، پھر اس میں رُوح پھونکی۔ ان کی تخلیق میں ان کی ساری اولاد کی تخلیق تھی، اس لیے ان کی ساری اولاد کے بارے میں فرمایا کہ مٹی سے تمہاری پیدائش فرمائی۔ پھر چونکہ سلسلۂ توالد و تناسل نطفے کے ذریعے ہوتا رہا اور ہوتا ہے۔ اس لئے ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ بھی فرمایا یعنی مٹی سے تمہاری تخلیق فرمائی، اس کے بعد تمہاری پیدائش کا سلسلہ اس طرح جاری فرمایا کہ مرد کا نطفہ عورت کے رحم میں جاتا ہے، پھر اس سے انسان پیدا ہوتا ہے۔ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا پھر تمہیں جوڑے بنا دیا، یعنی مرد بھی پیدا فرمائے اور عورتیں بھی، جو ایک دوسرے کی زوجیت میں آتے ہیں، عورت سے اولاد پیدا ہوتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی صفت علم بیان فرمائی کہ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ جس عورت کو حمل قرار پاجاتا ہے اور جو بھی کوئی عورت بچہ جنتی ہے، وہ سب اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتا ہے۔ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖۤ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ اور جس کسی عمر والے کی عمر زیادہ کی جاتی ہے، اور جس کی عمر کم کردی جاتی ہے، وہ سب لوحِ محفوظ میں ہے۔ یعنی جس کسی کی عمر زیادہ مقرر کی گئی، اور جس کی عمر دوسروں کے مقابلے میں کم کی گئی، یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی لوحِ محفوظ میں لکھ دیا ہے۔ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ: بلاشبہ یہ اللہ پر آسان ہے۔

سمندروں کی تخلیق اور فوائد

سمندر بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔ بعض سمندر میٹھے پانی کے ہیں ان کا پانی پیو تو خوب میٹھا اور شیریں ہوتا ہے جو پیاس کو بجھاتا ہے، اور آسانی کے ساتھ گلے میں اُتر جاتا ہے۔ اور بعض سمندر ایسے ہیں کہ ان کا پانی بہت زیادہ نمکین اور شور ہے، وہ پیا ہی نہیں جاسکتا، نہ گلے سے اُترتا ہے، نہ اُس سے پیاس بجھتی ہے۔ بعض دریاؤں میں شیرینی اور مٹھاس اور بعض میں یہ نمکینی اور کڑواپن، سب اللہ تعالیٰ کی تخلیق سے ہے۔ دونوں سمندر برابر نہیں، اور میٹھے سمندر کا میٹھاپن اور کڑوے سمندر کا کڑواپن محض اللہ تعالیٰ کی تخلیق سے ہے۔..... ان سمندروں سے انسانوں کو بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ ان سے تازہ تازہ گوشت کھاتے ہیں یعنی مچھلیوں کا شکار کرتے ہیں، پھر انہیں پکا کر اور تل کر کھاتے ہیں۔ بعض حضرات نے مچھلی کے ساتھ پرندوں کا بھی ذکر فرمایا ہے..... دریاؤں کا ایک نفع یہ بتایا کہ تم ان میں سے زیور نکالتے ہو، اور اُن کو پہنتے ہو، اس سے موتی اور سیپی وغیرہ مراد ہے۔ ان کے پہننے اور استعمال کے طریقے مختلف علاقوں میں مختلف پائے جاتے ہیں..... اس کے بعد کشتیوں کا تذکرہ فرمایا کہ اے مخاطب! تو دیکھتا ہے سمندر میں کشتیاں چلتی ہیں، جو پانی کو پھاڑتی ہوئی جاتی ہیں، ان کشتیوں کا چلنا بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اور بہت بڑی نعمت ہے۔ ان کے ذریعے دُور دراز ملکوں کے سفر ہوتے ہیں، ایک برِاعظم سے دوسرے برِاعظم تک مال پہنچایا جاتا ہے، اور طرح طرح کے منافع حاصل ہوتے ہیں۔ جو اَموال اور اَثقال باہر سے کشتیوں سے لائے جاتے ہیں اس میں

بہت سی ایسی چیزیں ہوتی ہیں جو کھانے پینے اور دیگر ضروریات میں استعمال ہوتی ہیں۔ اسی کو فرمایا کہ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ تاکہ تم اللہ کے فضل کو تلاش کرو۔ اور جب اس کی نعمتیں استعمال کرو تو اس کا شکر بھی ادا کرو آخر میں اسی کی یاددہانی فرمائی وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔

چاند اور سورج کی تسخیر

پھر فرمایا: اللہ دِن میں رات کو، اور رات میں دِن کو داخل فرماتا ہے۔ کبھی یہ کم ہوکر وہ بڑھ جاتا ہے، اور کبھی وہ کم ہوتا ہے تو یہ بڑھ جاتا ہے۔ اور چاند اور سورج کو بھی اس نے مسخر فرمایا ہے۔ یعنی ہر ایک کو اس سے متعلقہ کام میں لگادیا ہے۔ ان کی روزانہ کی جو حرکات مقرر فرمائی ہیں، اور ان کے لیے جو مدار معین فرمایا ہے، وہ اس کے خلاف نہیں چل سکتے۔ ان کی یہ رفتار لِاَجَلٍ مُّسَمًّى یعنی مقررہ مدت تک اسی طرح جاری رہے گی، جس طرح اللہ نے مقرر فرمادی۔ اور مقرر مدت سے یوم قیامت مراد ہے۔ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ یہ ذات پاک جس کی مخلوقات اور مصنوعات کا اوپر تذکرہ ہوا، یہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، وہ تمہارا ربّ ہے، اسی کے لیے مُلک ہے۔

معبودانِ باطلہ کی بے بسی کا عالم

وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ: اور جن لوگوں کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے برابر بھی اختیار نہیں رکھتے۔ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ جن لوگوں کی اللہ تعالیٰ کے علاوہ تم عبادت کرتے ہو، اُن کی بے بسی اور عاجزی کا یہ حال ہے کہ اگر تم ان کو پکارو تو وہ تمہاری پکار سُن بھی نہ سکیں گے، وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ اور اگر بالفرض تمہاری بات سُن بھی لیں تو تمہاری بات نہ مانیں یعنی تمہاری پکار تمہارے کچھ بھی کام نہ آئی، نہ جواب میں ہاں کہیں، نہ اُسی وقت کوئی مدد کرسکیں نہ بعد میں۔ یہ تو رہی دُنیا کی حالت۔ اور رہا آخرت کا معاملہ، سو سمجھ لو کہ تم نے جو اُن کی مدد کا خیال جما رکھا ہے یہ خیال غلط ہے، وہ تو وہاں تم سے بیزار ہوجائیں گے، اور تم جو انہیں اللہ کا شریک بناتے ہو اس کے وہ منکر ہوجائیں گے۔ اسی کو یہاں فرمایا: وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ اور قیامت کے دِن وہ تمہارے شرک سے منکر ہوجائیں گے۔ سورۃ النحل میں فرمایا: وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ ۚ فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ (نحل:۸۶) اور جب مشرک لوگ اپنے شریکوں کو دیکھیں گے تو کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار...... یہ ہمارے شریک ہیں، آپ کو چھوڑ کر ہم ان کی پُوجا کرتے تھے، سو وہ اُن کی طرف کلام کو متوجہ کریں گے کہ تم جھوٹے ہو۔ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ: اور اے مخاطب! تجھے خبر رکھنے والے کے برابر کوئی نہیں بتائے گا۔ علیم و خبیر جل مجدہٗ نے تجھے بتایا ہے۔ جسے سب کچھ علم ہے اس نے جو کچھ بتایا ہے، اس کو مان لے، اسی میں تیرا بھلا ہے۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۱۵﴾ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ

اے لوگو! تم سب اللہ کے محتاج ہو اور اللہ غنی ہے تعریف کا مستحق ہے ﴿۱۵﴾ اگر وہ چاہے تو تمہیں ختم کردے

وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿۱۷﴾ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ

اور نئی مخلوق پیدا فرمادے ﴿۱۶﴾ اور یہ اللہ پر کچھ مشکل نہیں ﴿۱۷﴾ اور کوئی بوجھ اُٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا

وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۭ اِنَّمَا

اور اگر کوئی بوجھ والا اپنا بوجھ اُٹھانے کے لئے بلائے گا تو اس میں سے کچھ بھی نہیں اُٹھایا جائے گا اگرچہ قرابت دار ہی ہو، آپ صرف

تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۭ وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا

انہی لوگوں کو ڈراتے ہیں جو بن دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور انہوں نے نماز قائم کی، اور جو شخص پاکیزہ بنا تو وہ

يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾ وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ﴿۱۹﴾ وَلَا

اپنی جان کے لئے پاکیزگی اختیار کرتا ہے، اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے ﴿۱۸﴾ اور نابینا اور دیکھنے والا برابر نہیں ﴿۱۹﴾ اور نہ

الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ ﴿۲۰﴾ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ ﴿۲۱﴾ وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَلَا

اندھیریاں اور روشنی برابر ہے ﴿۲۰﴾ اور نہ سایہ اور دھوپ برابر ہے ﴿۲۱﴾ اور نہ زندہ اور

الْاَمْوَاتُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴿۲۲﴾ اِنْ اَنْتَ

مُردہ برابر ہیں، بلاشبہ اللہ جسے چاہتا ہے سنوا دیتا ہے، اور آپ اُن لوگوں کو سنانے والے نہیں ہیں جو قبروں میں ہیں ﴿۲۲﴾ آپ صرف

اِلَّا نَذِيْرٌ ﴿۲۳﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۭ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا

ڈرانے والے ہیں ﴿۲۳﴾ بے شک ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے بشیر اور نذیر بنا کر، اور کوئی بھی اُمت ایسی نہیں ہے جس میں ڈرانے والا

نَذِيْرٌ ﴿۲۴﴾ وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ

نہ گزرا ہو ﴿۲۴﴾ اور اگر وہ آپ کو جھٹلاتے ہیں تو ان سے پہلے جو لوگ تھے وہ بھی جھٹلا چکے ہیں، اُن کے پاس ان کے پیغمبر کھلے ہوئے معجزات

وَبِالزُّبُرِ وَبِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اَخَذْتُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۲۶﴾

اور صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے ﴿۲۵﴾ پھر میں نے اُن لوگوں کو پکڑ لیا جنہوں نے کفر کیا سو میرا عذاب کیسا ہوا ﴿۲۶﴾

یہ پورے ایک رُکوع کا ترجمہ ہے، جس میں بہت سے اُمور پر تنبیہ فرمائی ہے اور متعدد نصیحتیں فرمائی۔

ہر چیز اللہ کی محتاج ہے

یہاں یہ فرمایا کہ اے لوگو! تم سب اللہ ہی کے محتاج ہو۔ اللہ تعالیٰ غنی ہے جسے کسی چیز کی حاجت نہیں ہے۔ کوئی بھی ایمان لانے والا، اس کی عبادت کرنے والا، یہ نہ سمجھے کہ اُسے میری حاجت اور ضرورت ہے، بلکہ یہ سمجھ کر اس کی عبادت کرے کہ مجھے اسے راضی کرنے کی حاجت ہے، وہ غنی ہے، بے نیاز ہے اور ہر تعریف کا مستحق ہے، وہ ہر عیب سے پاک ہے اور صفاتِ جلیلہ سے متصف ہے۔

ہر چیز کا اِختیارِ کامل اللہ کے پاس ہے

یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو پورا پورا اِختیار ہے کہ وہ تمہیں باقی رکھے زندہ رہنے دے، اور اگر چاہے تو تمہیں بالکل نیست و نابود کردے۔ تمہیں پیدا فرمانے کے بعد اس کی قدرت اور صفت خالقیت اسی طرح باقی ہے، جیسے پہلے تھی۔ وہ تمہیں ختم کر کے دوسری مخلوق پیدا فرمانے پر، اور دُنیا میں بسانے پر پوری پوری قدرت رکھتا ہے۔ تمہیں ختم کرنا اور دوسری مخلوق پیدا کرنا اس کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں۔

قیامت کے دِن کوئی کسی کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہر ایک کو اپنا اپنا بوجھ اُٹھانا ہے، قیامت کے دِن کوئی جان کسی دُوسری جان کا بوجھ نہ اُٹھائے گی۔ وہاں بڑے بڑے بوجھل انسان حاضر ہوں گے، گناہوں سے لدے ہوئے ہوں گے، اگر کوئی شخص کسی سے یوں کہے کہ آ، میرا کچھ بوجھ اُٹھالے، تو اس کا ذرا سا بوجھ بھی کوئی نہ اُٹھائے گا۔ اگر کوئی شخص اپنے کسی قریبی رشتہ دار سے کہے گا کہ تم میرے بوجھ میں شریک ہو جاؤ، تو وہ بھی صاف انکار کردے گا۔ سورۂ عبس میں فرمایا: يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ۝ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ ۝ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ۝ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ ۝ جس دِن آدمی بھاگے گا اپنے بھائی سے اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی سے اور اپنے بیٹوں سے۔ ان میں سے ہر شخص کا حال جدا ہوگا، جو دوسرے سے بے نیاز کردے گا۔

نصیحت سے فائدہ کون اُٹھاتے ہیں؟

آگے یہ فرمایا کہ آپ انہی لوگوں کو ڈراتے رہیں جو اپنے رَبّ سے ڈرتے ہیں، اور نماز قائم کرتے ہیں۔ یعنی جو اہلِ ایمان ہیں اور ایمان کی ذمہ داریاں پوری کرتے ہیں، وہی آپ کے ڈرانے سے منتفع ہوتے ہیں۔ ڈراتے تو آپ سب ہی کو ہیں، لیکن ڈرانے کا فائدہ انہی لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جن کے دِلوں میں اللہ کا ڈر ہے، اور جو نماز میں لگے رہتے ہیں۔ ہر قسم کی عبادت اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے ادا کی جاتی ہے، لیکن چونکہ نماز میں بہت سی خصوصیات ہیں، جو صرف خوف و خشیت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں، اس لیے نماز کا خصوصی تذکرہ فرمایا۔

جو پاکیزہ ہوگا اپنا فائدہ کرے گا

پاکیزہ ہونا، گناہوں سے بچ کر رہنا، ظاہری باطنی عیوب سے محفوظ رہنا، اس میں کوئی شخص کسی پر احسان نہ دھرے، جو شخص پاکیزہ ہوگا وہ اپنی ہی جان کے لیے پاکیزگی اختیار کرے گا، یعنی اس کا صلہ پائے گا۔ اور سب کو اللہ تعالیٰ کی طرف پہنچنا ہے اور ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ ملنا ہے۔

مؤمن و کافر برابر نہیں

اندھا اور دیکھنے والا برابر نہیں۔ یہاں ''اندھے'' سے مراد ''کافر''، اور ''دیکھنے والے'' سے ''مؤمن'' مراد ہے۔ اور اندھیریاں اور روشنی برابر نہیں یعنی حق اور باطل برابر نہیں ہو سکتے، اور سایہ اور گرمی برابر نہیں یعنی ثواب و عقاب برابر نہیں ہو سکتے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اس سے جنت اور دوزخ مراد ہیں۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ زندہ اور مردہ برابر نہیں ہو سکتے، ''زندوں'' سے ''اہلِ ایمان'' اور ''مُردوں'' سے ''کافر'' مراد ہیں۔ اہلِ ایمان جنت میں اور اہلِ کفر دوزخ میں ہوں گے۔ اس کے بعد فرمایا کہ بلاشبہ اللہ جس کو چاہے سُنا دے، یعنی ہدایت کی بات سُنا کر سننے والے کے لیے سبب ہدایت بنا دیتا ہے۔ پھر فرمایا کہ جو لوگ قبروں میں ہیں آپ انہیں نہیں سُنا سکتے، یعنی جنہیں کفر پر اصرار ہے انہوں نے اپنا حال ایسا بنا لیا ہے جیسے قبروں میں۔ قبروں میں جو لوگ چلے گئے آپ انہیں نہیں سُنا سکتے، اور یہ لوگ بھی آپ کی باتیں سُن کر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ سماعِ موتیٰ کے بارے میں ضروری تحقیق سورۂ نمل (رکوع:۶) میں گزر چکی ہے۔ حقیقی سُنانے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے، وہ جب چاہے جس کو چاہے سُنائے، اس میں کوئی اشکال ہی نہیں۔

اللہ نے ہر علاقے میں ڈرانے والا بھیجا ہے

فرمایا کہ ہم نے آپ کو حق دے کر بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ اور یہ بھی فرمایا کہ جتنی بھی اُمتیں گزری ہیں، اُن میں کوئی نہ کوئی ڈرانے والا ضرور گزرا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون رہا ہے کہ بستیوں میں پیغامبر بھیجے جو حق پہنچانے والے ہوتے تھے، وہ خوب اچھی طرح واضح طور پر حق اور ناحق بتا دیتے تھے، توحید کی دعوت دیتے تھے اور شرک سے روکتے تھے، جب لوگ سرکشی پر اُتر آتے تو انہیں عذاب میں مبتلا کر دیا جاتا تھا۔ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا: وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (آیت:۱۵) اور ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں جب تک کوئی رسول نہ بھیج دیں۔ اور سورۂ قصص میں فرمایا ہے: وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ (آیت:۵۹) اور آپ کا رب بستیوں کو ہلاک نہیں کیا کرتا جب تک کہ اُن کے صدر مقام میں کسی پیغمبر کو نہ بھیج دے۔ اور ہم بستیوں کو ہلاک نہیں کرتے مگر اس حالت میں کہ وہاں کے باشندے ظالم ہوں۔ لہٰذا جتنی بھی اُمتیں گزری ہیں اُن سب میں ڈرانے والا ضرور پہنچا، اس نے تبلیغ کی اور حق کی دعوت دی، ضروری نہیں ہے کہ جو مبلغ اور داعی پہنچا ہو وہ نبی ہی ہو۔ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام نے جو اپنے نمائندے اور قاصد بھیجے، آیت کا

مفہوم اُن کو بھی شامل ہے۔ یہاں اتنی بات سمجھ لینا چاہیے کہ اس وقت دُنیا میں جو قومیں ''مذہبی'' کہلاتی ہیں، وہ کسی ایک شخص کی طرف اپنی نسبت کرتی ہیں اُن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت و رسالت تو قرآن مجید سے ثابت ہے، ان کی نبوت و رسالت پر ایمان لانا فرض ہے۔

البتہ ان حضرات کی شریعت منسوخ ہے، اور ہر فرد و بشر پر فرض ہے کہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے علاوہ جو دُوسری مذہبی قومیں اپنے جن اکابر کی طرف منسوب ہیں، اُن کے بارے میں یہ یقین کر لینا کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے نبی تھے، اور اس بارے میں الفاظ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْرٌ سے استدلال کرنا صحیح نہیں۔ کیونکہ قرآنِ کریم میں ان کا نام نہیں لیا گیا، اور کسی سند کے ساتھ ان لوگوں کا نبی و رسول ہونا ثابت نہیں ہے۔ کسی کو متعین کر کے نبی و رسول ماننے کے لیے دلیلِ شرعی کی ضرورت ہے، جو یہاں مفقود ہے۔ ان لوگوں کی صحیح تاریخ بھی معلوم نہیں ہے، اور اُن کے جو قصے مشہور ہیں اُن کے پیشِ نظر یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ لوگ نبی نہیں ہو سکتے، بلکہ ان میں سے بعض کی تصویریں اور مورتیاں جو اُن کے ماننے والوں میں رواج پائے ہوئے ہیں وہ تو ننگی تصویریں ہیں، اللہ تعالیٰ کا کوئی نبی ننگا نہیں ہو سکتا، خوب سمجھ لیا جائے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی

فرمایا کہ اگر یہ لوگ آپ کی تکذیب کریں تو یہ کوئی تعجب کرنے اور رنجیدہ ہونے کی بات نہیں ہے، کیونکہ آپ سے پہلے بھی انبیائے کرام علیہم السلام آ چکے ہیں، اُن کی اُمتوں نے انہیں جھٹلایا، حالانکہ وہ حضرات اُن کے پاس کھلی کھلی دلیلیں لے کر پہنچے، صحیفے لے کر آئے، بڑی کتابیں بھی لائے جیسے توراۃ، انجیل وغیرہ، لیکن جنہیں ماننا نہ تھا اُنہوں نے نہ مانا۔ اگر یہ لوگ آپ پر ایمان نہیں لاتے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

مخالفین کو تنبیہ

فرمایا کہ میں نے کافروں کو پکڑ لیا، یعنی ان کو عذاب دے دیا۔ اور مزید فرمایا: فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ کہ غور کر لو، میرا عذاب کیسا تھا! اس میں مخاطبین کو تنبیہ ہے کہ پہلی اُمتوں پر تکذیب کی وجہ سے عذاب آتا رہا ہے، یہ عذاب عبرتناک تھا، اس کے بارے میں ان مخاطبین کو کچھ نہ کچھ علم بھی ہے۔ لہٰذا عبرت حاصل کریں اور غور کریں کہ ان کا کیا انجام ہوا، اور یہ کہ یہی انجام ہمارا بھی ہو سکتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ؕ
اے مخاطب! کیا تجھے علم نہیں کہ اللہ نے آسمان سے پانی اُتارا، پھر ہم نے اس کے ذریعے پھل نکالے جن کے رنگ مختلف ہیں،

وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ۝۲۷ وَمِنَ

اور پہاڑوں کے مختلف حصے ہیں سفید ہیں اور سُرخ ہیں، ان کے رنگ مختلف ہیں، اور ان میں گہرے سیاہ رنگ والے بھی ہیں ۝۲۷ اور

النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ

اِنسانوں میں اور چوپایوں میں اور جانوروں میں ایسے ہیں جن کے رنگ مختلف ہیں اسی طرح، اللہ سے وہی بندے ڈرتے ہیں

عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ۝۲۸ اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَ

جو علم والے ہیں، بے شک اللہ تعالیٰ غلبے والا ہے بخشنے والا ہے ۝۲۸ بلاشبہ جو لوگ اللہ کی کتاب کو پڑھتے ہیں اور

اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ

انہوں نے نماز کو قائم کیا اور ہم نے جو کچھ انہیں عطا فرمایا اس میں سے خرچ کیا چھپکے سے اور ظاہری طور پر، یہ لوگ ایسی تجارت کی اُمید رکھتے ہیں جو کبھی

تَبُوْرَ ۝۲۹ ۙ لِيُوَفِّيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ۝۳۰ وَ

ہلاک نہ ہوگی ۝۲۹ تاکہ اُن کا رَب اُنہیں پورے اَجر عطا فرمادے اور اپنے فضل سے اور زیادہ دے، بلاشبہ وہ خوب بخشنے والا ہے بہت قدر دان ہے ۝۳۰ اور

الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

یہ کتاب جو ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی ہے بالکل حق ہے جو اُن کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے جو اس سے پہلے تھیں، بلاشبہ اللہ

بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ۝۳۱ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ

اپنے بندوں کی پوری خبر رکھنے والا ہے، خوب دیکھنے والا ہے ۝۳۱ پھر ہم نے ان لوگوں کو کتاب کا وارث بنایا جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے چُن لیا،

فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ

سو اُن میں سے بعض وہ ہیں جو اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں، اور اُن میں سے بعض وہ ہیں جو درمیانے درجے والے ہیں، اور ان میں سے بعض وہ ہیں

سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ۝۳۲ ؕ جَنّٰتُ عَدْنٍ

جو باذن اللہ بھلائی کے کاموں میں آگے بڑھنے والے ہیں، یہ اللہ کا بڑا فضل ہے ۝۳۲ وہ ہمیشہ رہنے کے باغات ہیں

يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ۝۳۳

جن میں یہ لوگ داخل ہوں گے، اس میں اُنہیں سونے کے کنگن اور موتی، زیور کے طور پہنائے جائیں گے، اور اس میں ان کا لباس ریشم کا ہوگا ۝۳۳

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ۭ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُۨ ﴿۳۴﴾ الَّذِيْٓ

اور وہ کہیں گے کہ سب تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جس نے ہم سے غم کو دور فرمادیا، بلاشبہ ہمارا رب بڑا بخشنے والا ہے خوب قدردان ہے ﴿۳۴﴾ جس نے

اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ ﴿۳۵﴾

ہمیں اپنے فضل سے رہنے کی جگہ میں نازل فرمادیا، ہمیں اس میں نہ کوئی تکلیف پہنچے گی اور نہ ہمیں اس میں کوئی تھکن پہنچے گی ﴿۳۵﴾

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ

اور جن لوگوں نے کفر کیا اُن کے لیے دوزخ کی آگ ہے، نہ تو اُن کی قضا آئے گی کہ وہ مرہی جائیں، اور نہ اُن سے اس کا عذاب

مِّنْ عَذَابِهَا ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ ﴿۳۶﴾ وَهُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا ۚ رَبَّنَآ

ہلکا کیا جائے گا، ہر کافر کو ہم ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں ﴿۳۶﴾ اور وہ لوگ دوزخ میں چلائیں گے کہ اے ہمارے رب!

اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ۭ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ

ہمیں دوزخ سے نکال لیے ہم اُن اعمال کے علاوہ دُوسرے عمل کریں گے جو کیا کرتے تھے، کیا ہم نے تمہیں اتنی عمر نہیں دی تھی جس میں وہ شخص

فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَاۗءَكُمُ النَّذِيْرُ ۭ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴿۳۷﴾

سمجھ سکتا تھا جو سمجھنا چاہتا، اور تمہارے پاس ڈرانے والا آیا تھا، سو تم چکھ لو، سو ظالموں کے لئے کوئی بھی مددگار نہیں ﴿۳۷﴾

بعض علوی اور بعض سفلی اِنعامات کا ذِکر

یہ متعدد آیات ہیں۔ پہلی دو آیتوں میں بعض علوی اور بعض سفلی انعامات کا تذکرہ فرمایا جو اللہ تعالیٰ شانہٗ کی قدرتِ قاہرہ پر دلالت کرتے ہیں...... اول تو یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی نازل فرمایا، اس پانی کے جہاں بہت سے فائدے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے بہت سے درخت نکال دیئے، پھر ان درختوں پر پھل لگادیئے، ان پھلوں کے اقسام بھی بہت ہیں، اور الوان یعنی رنگ بھی، مزے بھی مختلف ہیں اور ہر قسم میں مختلف قسمیں ہیں ...... اور دوسری بات یہ بتائی کہ پہاڑوں کے مختلف حصے ہیں، اُن کے رنگ بھی مختلف ہیں، بعض سفید ہیں، اور بعض بالکل سیاہ ہیں، پہاڑوں سے بنی آدم کو مختلف قسم کے منافع حاصل ہوتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ''جُدَدٌ'' کی تفسیر معلوم کی گئی تو فرمایا کہ اس سے پہاڑوں کے راستے مراد ہیں، بنی آدم پہاڑوں پر چڑھتے ہیں، ان کے راستوں میں سفر کرتے ہیں، منافع حاصل کرتے ہیں۔ غرابیب جمع ہے غِربیب کی، جو بہت زیادہ سیاہ ہو عربی میں اسے ''غِربِیب'' کہا جاتا ہے، اور سُودٌ اَسْوَدُ کی جمع ہے، جو سیاہ کے معنی میں آتا ہے، دونوں لفظوں کو ملا کر مبالغے کا معنی پیدا ہوجاتا ہے۔ اسی لیے اُوپر گہرے سیاہ رنگ والے کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ تفسیر ''رُوح المعانی''

کے مصنف رحمہ اللہ فرماتے ہیں: عرب کے کلام میں الاسود کے ساتھ غربیب کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے، اس طرح کہ غربیب اسود کی صفت بنتا ہے، یا تاکید لفظی، چنانچہ کہتے ہیں: اسودُ غِربیبٌ، جیسا کہ کہا جاتا ہے: اَبْیَضُ یَقَقٌ، بہت ہی سفید اور اَصْفَرُ فَاقِعٌ: زرد خالص۔ اور اَحْمَرُ قَانٍ: بہت ہی سرخ۔

بارش اور پھلوں اور پہاڑوں کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا کہ انسانوں میں اور چوپایوں میں اور جانوروں میں بھی مختلف اقسام کی چیزیں ہیں، ان کی اقسام بھی مختلف ہیں اور انواع بھی اور رنگتیں بھی۔ اس سب میں اللہ تعالیٰ کی صفت تخلیق کا مظاہرہ بھی ہے، اور انسانوں پر انعامات بھی ہیں۔ انسان جانوروں سے اور جانور انسانوں سے مستفید اور متمتع ہوتے ہیں۔

اللہ سے ڈرنے والے علم والے ہوتے ہیں: اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا: اللہ سے علم والے ہی ڈرتے ہیں، جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے علم دیا ہے، خواہ علم الآفاق ہو، خواہ علم الانفس، خواہ علم المصنوعات ہو، خواہ علم الکتاب، یہی لوگ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔ کیونکہ علم ذریعۂ معرفت ہے، جسے جتنی معرفت حاصل ہوگی، اسی قدر اپنے خالق و مالک سے ڈرے گا، اور معاصی سے باز رہے گا۔ ہاں! اگر کوئی شخص علم ہوتے ہوئے بھی اپنے نفس کا اِتباع کرے، تو وہ گمراہ ہی رہے گا۔ کما قال اللہ تعالیٰ: اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـھَہٗ ھَوٰىہُ وَاَضَلَّہُ اللّٰہُ عَلٰی عِلْمٍ (الجاثیۃ: ۲۳) رسول اللہ ﷺ سب سے بڑے عالم بھی تھے اور سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے بھی تھے، آپ نے فرمایا: "اَمَا وَاللّٰہِ! اِنِّی لَاَخْشَاکُمْ لِلّٰہِ وَاَتْقَاکُمْ لَہٗ" خبردار! اللہ کی قسم! میں تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں اور سب سے زیادہ پرہیزگار ہوں۔[1] آیت کے آخر میں فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ: بلاشبہ اللہ عزت والا ہے خوب بخشنے والا ہے۔

صالحین کے اَجر وثواب کا ذکر

اس کے بعد نیک بندوں کی تعریف فرمائی اور ان کے اَجر وثواب کا تذکرہ فرمایا کہ جو اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور پوشیدہ اور ظاہری طور پر ہمارے دیئے ہوئے مال سے خرچ کرتے ہیں، یہ لوگ ایسی تجارت کے اُمیدوار ہیں جو کبھی بھی ہلاک نہ ہوگی۔ اُن کی عبادتوں کے اُجور اللہ تعالیٰ انہیں پورے پورے عطا فرمائے گا، (جانی عبادتیں ہوں یا مالی)، اور انہیں اپنے فضل سے مزید عطا فرمائے گا۔ وہ بہت بخشنے والا بھی ہے، کمی کوتاہی کو معاف فرمادے گا، اور وہ بڑا قدردان بھی ہے۔ ہر نیکی کا اجر کم از کم دس گنا کر کے عطا فرمائے گا۔ اس تجارت میں لگنے میں نفع عظیم ہے، جس کے تباہ ہونے کا خطرہ نہیں اور نقصان کا اندیشہ نہیں۔

قرآن اور اَصحابِ قرآن

اس کے بعد قرآن مجید کے بارے میں فرمایا کہ ہم نے جو کچھ آپ کو وحی بھیجی ہے، وہ حق ہے، اُن کتابوں کی تصدیق

---

(۱) بخاری ۷۵۷/۲، باب الترغیب فی النکاح. مشکوٰۃ ص ۲۷، باب الاعتصام، فصل اول۔ نوٹ:- بخاری ص ۷ پر حدیث ہے: اِنَّ اَتْقَاکُمْ وَاَعْلَمَکُمْ بِاللّٰہِ اَنَا۔

کرنے والی ہے، جو اس سے پہلے نازل ہوئی تھیں۔ بلاشبہ اللہ اپنے بندوں کی پوری طرح خبر رکھنے والا ہے، پوری طرح دیکھنے والا ہے۔ اس کے بعد اُن بندوں کا تذکرہ فرمایا جنہیں اللہ تعالیٰ نے کتاب عطا فرمائی، اُن کے بارے میں لفظ: اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا، فرمایا جس میں یہ بتادیا کہ جسے اللہ تعالیٰ کی کتاب مل گئی وہ اللہ کا برگزیدہ بندہ ہے، (خواہ عمل کے اعتبار سے اس نے اپنی حیثیت گرا رکھی ہو)۔ حدیث شریف میں ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ نے حفظِ قرآن کی نعمت عطا فرمادی پھر اس نے کسی شخص کے بارے میں یہ خیال کیا کہ اسے مجھ سے افضل چیز عطا کی گئی ہے تو اس نے سب سے بڑی نعمت کو حقیر جانا۔[1]

پھر ان کی تین قسمیں بتائیں کہ ان میں بعض وہ ہیں جو اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں یعنی گناہوں میں مشغول رہتے ہیں اور بعض وہ ہیں جو متوسط درجے کے لوگ ہیں، اور بعض وہ ہیں جو باذن اللہ نیکیوں میں آگے بڑھے ہوئے ہیں، یہ وہ حضرات ہیں جو گناہوں سے بھی بچتے ہیں اور فرائض و واجبات کے علاوہ دوسرے نیک کاموں کا بھی اہتمام کرتے ہیں۔

ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ: یہ اللہ کا بڑا فضل ہے۔ معلوم ہوا کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عطا فرمائی ہے، اُن میں جو لوگ گنہگار ہیں ان کا بھی اکرام کرنا چاہیے، ان کے گناہوں پر نظر نہ کریں، بلکہ اللہ کے فضل کو دیکھیں، اس نے انہیں اپنی کتاب دے کر فضل کبیر سے نوازا ہے۔ ''سننِ ترمذی'' میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ تینوں قسم کے لوگ ایک ہی مرتبے میں ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کے نوازے ہوئے ہیں اور یہ سب جنّت میں ہوں گے۔[2] حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آیتِ بالا منبر پر پڑھی اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کیا: ''سَابِقُنَا سَابِقٌ. مُقْتَصِدُنَا نَاجٍ. وَظَالِمُنَا مَغْفُوْرٌ لَّهٗ'' یعنی ہم میں سے جو آگے بڑھنے والے ہیں وہ (اَجر و ثواب اور رفعِ درجات میں) آگے بڑھنے والے ہیں اور جو متوسط طبقے کے ہیں وہ نجات پانے والے ہیں اور جو ظالم ہیں اُن کی مغفرت ہو جائے گی (تفسیر بغوی)۔

''سابق بالخیرات'' بلاحساب جنّت میں داخل ہوں گے

اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اور یوں فرمایا کہ جو سابق بالخیرات ہوگا وہ بلاحساب جنّت میں داخل ہوگا، اور جو متوسط درجے کے ہوں گے، اُن سے ہلکا سا حساب لیا جائے گا۔ اور جو اپنی جان پر ظلم کرنے والے ہوں گے، انہیں حساب کے مقام پر روک لیا جائے گا، یہاں تک کہ انہیں رنج لاحق ہو جائے گا پھر جنّت میں داخل کر دیئے جائیں گے۔ اس کے بعد یہ آیت تلاوت فرمائی: وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (تفسیر بغوی)۔

جنتیوں کی نعمتوں کا ذِکر

اس کے بعد جنتیوں کی نعمتوں کا تذکرہ فرمایا کہ یہ لوگ ہمیشہ رہنے کے باغیچوں میں ہوں گے، جن میں انہیں سونے اور موتیوں کے کنگن پہنائے جائیں گے اور ان کا لباس ریشم کا ہوگا۔ یہ مضمون سورۂ حج (رکوع نمبر: ۳) میں بھی گزر چکا ہے۔ یہاں یہ

---

(۱) تفسیر الدر المنثور، سورۃ البقرۃ، آیت: ۲۶۹ کے تحت۔ بحوالہ: طبرانی، حاکم، بیہقی۔ فیض القدیر شرح الجامع الصغیر ج ۶ ص ۷۵
(۲) ترمذی ۲/ ۱۵۸، کتاب التفسیر، سورۃ الملائکۃ (سورۃ فاطر)۔ مشکوٰۃ ۲۰۸/۱، باب الاستغفار سے اگلا باب، فصل ثالث۔

اشکال نہ کیا جائے کہ زیور تو عورتوں پر اچھا لگتا ہے، مردوں کو کیا زیب دے گا؟ بات یہ ہے کہ ہر جگہ کا ایک مزاج اور رواج ہوتا ہے، اہلِ جنّت کا یہ مزاج ہوگا کہ مرد بھی رغبت سے زیور پہنیں گے، جیسا کہ دُنیا میں بھی راجہ اور بادشاہ پہنتے رہے ہیں۔ شریعتِ اسلامیہ میں مردوں کو زیور پہننا منع ہے، لیکن وہاں ان کے لیے حلال بھی ہوگا اور ان کو مرغوب بھی ہوگا، جو اللہ تعالیٰ کا اِنعام ہوگا۔ اسی طرح ریشم کو سمجھ لیا جائے کہ مردوں کے لیے اس کا لباس پہننا اس دُنیا میں جائز نہیں ہے، لیکن جنّتی مردوں کو وہاں ریشم کا لباس عطا کیا جائے گا۔ متعدّد صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ جو شخص دُنیا میں ریشم کا لباس پہنے گا آخرت میں ریشم کا لباس نہیں پہنے گا۔[1]

اہلِ جنّت کے کلماتِ شُکر

اس کے بعد اہلِ جنّت کے شکر گزاری کے کلمات نقل فرمائے: وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ اور وہ لوگ کہیں گے کہ اللہ کے لیے سب تعریف ہے جس نے ہم سے غم کو دُور فرمادیا۔ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ بلاشبہ ہمارا رَبّ بہت بخشنے والا ہے، اس نے ہمارے گناہوں کو اور لغزشوں کو بخش دیا، شَكُوْرٌ بڑا قدر دان ہے، ہماری نیکیوں کی قدردانی فرمائی، اور وہ وہ نعمتیں عطا فرمائیں جن کے ہم بالکل مستحق نہ تھے۔ الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ جس نے ہمیں اپنے فضل سے رہنے کی جگہ میں اُتار دیا۔ اس میں یہ بتایا کہ جنّت رہنے کی جگہ ہے جس کے بارے میں فرمایا ہے: لَا یَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا (الکہف:۱۰۸) کہ جنّتی وہاں سے کہیں اور منتقل ہونا نہ چاہیں گے۔ اور تعریضاً یہ بھی بتادیا کہ دُنیا رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ جو جنّت میں پہنچا، اس نے صحیح ٹھکانا پکڑا جہاں سے کہیں اور جانا ہی نہیں اور نہ اس سے کوئی اچھی جگہ ہے، جہاں جانے کا خیال آئے۔ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّلَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ: ہمیں یہاں کوئی دُکھ نہیں پہنچے گی، اور نہ ہمیں یہاں کوئی تھکن محسوس ہوگی، وہاں آرام ہی آرام ہے، کسی طرح کی کمائی کوئی حاجت نہیں۔ اس لیے نہ محنت ہوگی نہ مشقت، نہ دُکھ ہوگی نہ تھکن سے واسطہ پڑے گا۔ سورۂ حجر میں فرمایا: لَا یَمَسُّهُمْ فِیْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِیْنَ (آیت:۴۸) نہ انہیں وہاں تکلیف پہنچے گی اور نہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔

اہلِ کُفر کی سزا

اہلِ ایمان کا اِنعام واکرام بیان فرمانے کے بعد اہلِ کُفر کی سزا بیان فرمائی، اور ان کے لئے دوزخ کی آگ میں داخل ہونے اور اس میں ہمیشہ رہنے کا تذکرہ فرمایا۔ نہ تو ان کے بارے میں یہ فیصلہ ہوگا کہ مرجائیں اور نہ اُن کا عذاب ہلکا کیا جائے گا۔ كَذٰلِكَ نَجْزِیْ كُلَّ كَفُوْرٍ: اسی طرح ہم ہر کافر کو جزا دیتے ہیں۔ مزید فرمایا کہ جب اہلِ کُفر دوزخ میں مبتلائے عذاب ہوں گے تو وہاں چیخیں اور چلّائیں گے اور بارگاہِ خداوندی میں درخواست پیش کریں گے کہ ہمیں اس سے نکال دیجئے۔ ہم پہلے جو عمل کیا کرتے تھے اب ان کے علاوہ عمل کریں گے، یعنی آپ کے حکم کے مطابق چلیں گے۔ اللہ جل شانہٗ کا ارشاد ہوگا: کیا ہم نے تمہیں اتنی عمر نہیں دی

(۱) بخاری ۲/ ۸۶۷ باب لبس الحریر۔ مشکوٰۃ ۲/ ۳۷۳، کتاب اللباس، فصل اول۔

تھی جس میں نصیحت حاصل کرنے والا نصیحت حاصل کر لیتا؟ اور تمہارے پاس ڈرانے والا بھی آیا تھا، نہ تو تم نے اپنی عمر کو نیکیوں میں لگایا، اور نہ ہماری طرف سے بھیجے ہوئے رسول اور نبی کی بات مانی، جس نے تمہیں سمجھایا اور اُس مصیبت سے ڈرایا جس میں تم آج مبتلا ہو، لہٰذا اب عذاب چکھو، اور ظالموں کے لئے کوئی مددگار نہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اُس شخص کے لئے کوئی عذر باقی نہیں رکھا جس کی عمر میں اتنی ڈھیل دے دی کہ ساٹھ سال تک پہنچا دیا۔[1] اور حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن ایک پکارنے والا یوں پکارے گا کہ ساٹھ سال کی عمر والے کہاں ہیں؟ (پھر فرمایا) یہی وہ عمر ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اَوَلَمۡ نُعَمِّرۡكُمۡ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيۡهِ مَنۡ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيۡرُ۔[2]

اِنَّ اللّٰهَ عٰلِمُ غَيۡبِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ؕ اِنَّهٗ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۳۸﴾ هُوَ

بلاشبہ اللہ آسمانوں کے اور زمین کے غیب کا جاننے والا ہے، بلاشبہ وہ دِلوں کی باتوں کا جاننے والا ہے ﴿۳۸﴾ وہی ہے

الَّذِىۡ جَعَلَـكُمۡ خَلٰٓئِفَ فِى الۡاَرۡضِ‌ؕ فَمَنۡ كَفَرَ فَعَلَيۡهِ كُفۡرُهٗ‌ؕ وَلَا يَزِيۡدُ الۡكٰفِرِيۡنَ

جس نے تمہیں زمین میں پہلے لوگوں کے بعد آباد فرمایا، سو جو شخص کُفر اختیار کرے اس کا کفر اُسی پر ہے، اور کافروں کے لئے ان کا کُفر

كُفۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ اِلَّا مَقۡتًا‌ۚ وَلَا يَزِيۡدُ الۡكٰفِرِيۡنَ كُفۡرُهُمۡ اِلَّا خَسَارًا ﴿۳۹﴾ قُلۡ

اُن کے رَبّ کے نزدیک ناراضگی ہی کو بڑھاتا ہے، اور کافروں کے لئے اُن کا کُفر صرف خسارے ہی میں اضافہ کرتا ہے ﴿۳۹﴾ آپ فرما دیجئے

اَرَءَيۡتُمۡ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِيۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ‌ؕ اَرُوۡنِىۡ مَاذَا خَلَقُوۡا مِنَ

کہ تم جنہیں اللہ کے سوا پکارتے ہو اُن کا حال بتاؤ، مجھے دکھاؤ انہوں نے زمین کا کون سا حصہ

الۡاَرۡضِ اَمۡ لَهُمۡ شِرۡكٌ فِى السَّمٰوٰتِ‌ۚ اَمۡ اٰتَيۡنٰهُمۡ كِتٰبًا فَهُمۡ عَلٰى بَيِّنَتٍ مِّنۡهُ‌ۚ بَلۡ

پیدا کیا؟ کیا آسمانوں میں ان کا کوئی ساجھا ہے؟ کیا ہم نے انہیں کوئی کتاب دی ہے کہ یہ اس کی دلیل پر قائم ہوں؟ بلکہ

اِنۡ يَّعِدُ الظّٰلِمُوۡنَ بَعۡضُهُمۡ بَعۡضًا اِلَّا غُرُوۡرًا ﴿۴۰﴾ اِنَّ اللّٰهَ يُمۡسِكُ السَّمٰوٰتِ

بات یہ ہے کہ ظالم لوگ ایک دُوسرے کو صرف دھوکے کی باتوں کا وعدہ کرتے ہیں ﴿۴۰﴾ بلاشبہ اللہ آسمانوں کو

---

(۱) بخاری ۲/۹۵۰، باب من بلغ ستین سنة۔ مشکوٰۃ ۲/۴۵۰، باب الامل والحرص اَعۡذَرَ اللّٰهُ اِلٰى امۡرِئٍ اَخَّرَ اَجَلَهٗ حَتّٰى بَلَّغَهٗ سِتِّيۡنَ سَنَةً
(۲) مشکوٰۃ ۲/۴۵۱، باب استحباب المال والعمر، فصل ثالث۔ بحوالہ بیہقی۔

وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ وَلَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اِنَّهٗ

اور زمین کو روکے ہوئے ہے کہ وہ ٹل نہ جائیں اور اگر وہ ٹل جائیں تو اُس کے سوا ان دونوں کو کوئی بھی تھامنے والا نہیں، بلاشبہ وہ

كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۱﴾ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ

حلیم ہے، غفور ہے ﴿۴۱﴾ اور اُن لوگوں نے مضبوطی کے ساتھ اللہ کی قسم کھائی کہ اگر ہمارے پاس کوئی ڈرانے والا آجائے

لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا

تو دُوسری اُمتوں کے مقابلے میں ہر ایک سے زیادہ ہدایت پانے والے ہوں گے، پھر جب اُن کے پاس ڈرانے والا آ گیا تو اُن کی نفرت

نُفُوْرَا ۙ﴿۴۲﴾ اسْتِكْبَارًا فِى الْاَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ؕ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا

زیادہ ہوگئی ﴿۴۲﴾ زمین میں تکبر کرنے اور بُری تدبیریں اختیار کرنے کی وجہ سے، اور بُری تدبیر کا وبال اُسی پر ہے

بِاَهْلِهٖ ؕ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ

جو یہ کام کرے، سو کیا وہ پُرانے لوگوں کے دستور کا انتظار کر رہے ہیں؟ سو آپ ہرگز اللہ کے دستور میں

تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ﴿۴۳﴾ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا

تبدیلی نہ پائیں گے اور آپ ہرگز اللہ کے دستور میں منتقل ہونا نہ پائیں گے ﴿۴۳﴾ کیا وہ لوگ زمین میں نہیں چلے پھرے تا کہ دیکھ لیتے

كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَكَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ

کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جو اُن سے پہلے تھے، اور وہ اُن سے قوت میں بڑھے ہوئے تھے، اور

لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى الْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا ﴿۴۴﴾

آسمانوں میں اور زمین میں اللہ کو کوئی چیز عاجز نہیں کر سکتی، بلاشبہ وہ جاننے والا ہے قدرت والا ہے ﴿۴۴﴾

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ

اور اگر اللہ لوگوں کے اعمال کی وجہ سے ان کا مواخذہ فرمائے تو زمین کی پشت پر کسی ایک چلنے پھرنے والے کو بھی نہ چھوڑے، اور لیکن

يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ﴿۴۵﴾

وہ ایک میعادِ مقررہ تک مہلت دے رہا ہے، سو جب اُن کی مقررہ میعاد آجائے گی تو اللہ اپنے بندوں کو دیکھنے والا ہے ﴿۴۵﴾

صفاتِ الٰہی اور کُفّار کی بدحالی کا ذِکر

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم وقدرت کو بیان فرمایا ہے اور مشرکوں اور کافروں کی گمراہی اور بدحالی بیان فرمائی ہے۔اوّل تو یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو آسمانوں کی اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کا علم ہے یعنی جو چیزیں مخلوق کے علم سے غائب ہیں، وہ ان سب کو پوری طرح جانتا ہے۔دوم یہ فرمایا کہ وہ دِلوں کی باتوں کو جانتا ہے۔سوم یہ فرمایا کہ تم لوگوں کو اس نے زمین میں خلیفہ بنایا ہے یعنی تم سے پہلے جو لوگ زمین میں رہتے اور بستے تھے اُن کے بعد تمہیں بسادیا۔سارے انسانوں پر لازم ہے کہ اس کا شکر ادا کریں۔اس کی ذات وصفات پر، اس کے نبیوں اور کتابوں پر ایمان لائیں، لیکن اکثر لوگ کُفر اختیار کیے ہوئے ہیں۔فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ سو جو شخص کُفر اختیار کرے گا اس کے کُفر کا وبال اسی پر ہے۔وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا مَقْتًا: اور کافروں کا کُفر انہی کے حق میں مضر ہے، جس کا سب سے بڑا ضرر یہ ہے کہ ان کا رَبّ ان سے ناراض ہے۔اور جیسے جیسے یہ لوگ کُفر میں آگے بڑھتے ہیں برابر پروردگارِ عالم جل مجدہٗ کی ناراضگی بڑھتی چلی جاتی ہے۔کافر خواہ یہ سمجھتے ہوں کہ ہم بڑے نفع میں ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کا کُفر اُن کے لئے خسارہ میں اضافہ کا باعث بنتا چلا جارہا ہے۔

رَدِّ شرک

پھر فرمایا کہ یہ جو لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے شریک بنارکھے ہیں، جن کی پُوجا کرتے ہیں اور جن کو پکارتے ہیں، ان کے بارے میں ان سے دریافت کیجئے، کہ ان کا کیا حال ہے۔انہیں جو تم نے معبود بنایا ہے ان میں کون سی صفت دیکھ رکھی ہے، جس کی وجہ سے وہ مستحق عبادت سمجھے گئے۔انہوں نے زمین کا کون سا حصّہ پیدا کیا ہے؟ کیا آسمانوں میں ان کا کچھ ساجھا ہے؟ اس میں سے کوئی بات نہیں ہے۔زمین اللہ کی ہے جس پر رہتے سہتے ہو، آسمان اللہ کے ہیں جن کے نیچے زندگی گزارتے ہو، یہ سب کچھ جانتے ہوئے غیروں کی عبادت کرنا کون سی سمجھداری ہے۔اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰى بَيِّنَتٍ مِّنْهُ: کیا ہم نے انہیں کوئی کتاب دی ہے جس کی دلیل پر یہ لوگ قائم ہیں۔یہ استفہامِ انکاری ہے، مطلب یہ ہے کہ ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے جس کی رُو سے شرک اختیار کرنے کو دُرست سمجھتے ہیں۔بَلْ اِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا: شرک کے دُرست ہونے کی ان کے پاس کوئی دلیل نہیں، بلکہ بات یہ ہے کہ ظالم لوگ آپس میں ایک دوسرے سے دھوکے کی باتوں کا وعدہ کرتے ہیں یعنی ایک دوسرے کو شرک پر جماتے ہیں، اور توحید پر نہیں آنے دیتے، اور شرک میں فائدہ بتابتا کر ایک دوسرے کو دھوکا دیتے ہیں، اور یوں کہتے ہیں کہ یہ باطل معبود ہماری سفارش کریں گے۔

اللہ تعالیٰ کی قدرتِ قاہرہ

اس کے بعد اللہ جل شانہٗ کی قدرتِ قاہرہ ایک اور طریقے پر بیان فرمائی، اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں کو اور زمینوں کو تھامے ہوئے ہے، ان کی جو جگہ مقرر ہے وہاں سے نہیں ٹل سکتے، اپنے محور ہی میں رہتے ہیں۔اور اگر بالفرض اپنی مقررہ جگہ کو چھوڑ

دیں تو اس کے علاوہ کوئی ان کو تھام نہیں سکتا۔ آسمان وزمین اسی کی مخلوق ہیں، اسی نے اُن کی جگہ مقرر فرمائی ہے، کسی کو ان میں ذرا سے تصرف کا بھی اختیار نہیں ہے۔ وہی اُن کی حفاظت فرماتا ہے، وہی ان کا مالک ہے، ان میں جو چیزیں ہیں وہ ان کا بھی خالق ومالک ہے۔ پھر اس کے علاوہ دُوسرا کوئی مستحق عبادت کیسے ہوسکتا ہے؟ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا: بے شک وہ حلیم ہے (عذاب دینے میں جلدی نہیں فرماتا)، غفور بھی ہے، سب کچھ معاف کرنے والا ہے۔

آسمان وزمین کے تھامنے کی تشریح میں یہ جوعرض کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے جو اُن کی جگہ مقرر فرمادی ہے اُس کے علاوہ دُوسری جگہ منتقل نہیں ہوسکتے، اس معنی کو لینے سے آسمان اور زمین کی حرکت کے بارے میں کوئی اشکال نہیں رہتا، وہ اسی جگہ میں رہتے ہوئے حرکت کرتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے مقرر فرمائی ہے۔ دونوں حرکت کرتے ہوں یا ایک متحرک ہو، حسب ما یقول اصحاب الفلسفة القدیمة والجدیدة۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کی مقرر فرمودہ حد میں رہتے ہیں۔

مشرکین کا سارا تکبر دھرارہ گیا

قریشِ مکہ مشرک تھے، تجارت کے لئے شام جایا کرتے تھے، وہاں نصاریٰ کی حکومت تھی، اور یہودیوں کا بھی انہیں کچھ علم تھا۔ جب انہیں یہ پتا چلا کہ ان دونوں قوموں نے اللہ کے پیغمبروں کی تکذیب کی ہے، تو کہنے لگے کہ یہود ونصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو، ان کے پاس اللہ کے رسول آئے تو انہیں جھٹلا دیا، ہم اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ اگر ہمارے پاس کوئی رسول آ گیا، تو ان لوگوں سے بڑھ کر ہدایت پر ہوں گے۔ یہ بات انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے کہی تھی، پھر جب آپ کی بعثت ہوئی تو نہ صرف یہ کہ آپ کی تکذیب کی بلکہ آپ کی تکذیب اور تنفر ہی کو اختیار کرلیا۔ اور نفرت اختیار کرنے کا باعث یہ تھا کہ ایمان قبول کرنے کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے، جو سراسر تکبر تھا۔ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے خلاف بُری بُری تدبیریں کرتے تھے، پھر جو تدبیریں کیں وہ خود اُلٹی اُنہیں کے گلے پڑیں۔ جن حضرات کو اسلام سے روکتے تھے ان کے روکنے میں کامیاب نہ ہوئے۔ اور یہ روکنے والے غزوۂ بدر میں مقتول ہوئے اور سارا تکبر دھرارہ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے بطور قاعدہ کلیہ اس کو یوں بیان فرمایا: وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ: اور بُری تدبیروں کا وبال ان تدبیر والوں ہی پر پڑتا ہے۔ یہ تکوینی قانون ہے کہ جو شخص کسی کو دُکھ دینے کی تدبیریں کرے گا وہ خود اسی پر پڑے گی۔ عموماً ایسا دیکھا جاتا رہا ہے، اور اس کے بارے میں یہ جملہ مشہور ہو گیا ہے: ''مَنْ حَفَرَ بِئْرًا لِاَخِيْهِ وَقَعَ فِيْهَا'' جو شخص اپنے بھائی کے لئے کنواں کھودے وہ خود اسی میں گرے گا۔

اللہ تعالیٰ کا دستور

فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ: سو کیا وہ پُرانے لوگوں کے دستور کا انتظار کررہے ہیں، فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا: سو آپ ہرگز اللہ کے دستور میں تبدیلی نہ پائیں گے، وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا: اور آپ ہرگز اللہ کے دستور میں منتقل ہونا نہ پائیں گے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا یہ دستور ہے کہ کافروں پر عذاب ہوگا، خواہ دنیا وآخرت دونوں میں ہو، خواہ صرف آخرت میں ہو۔ اور یہ بھی دستور ہے کہ جو عذاب کا مستحق ہو اسی کو عذاب ہوتا ہے۔ ایسا نہیں کہ انہیں چھوڑ کر کسی دوسری قوم کو عذاب ہوجائے، جو مستحق عذاب

نہ ہو۔ ان کا ڈھنگ اور طریقہ کار ایسا ہے، جیسے عذاب کے منتظر ہوں۔ اور وجہ اس کی عناد اور باطل پر اصرار ہے۔ چونکہ عذاب میں مبتلا ہونے کا یقین نہیں، اس لیے عذاب کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ انتظار کرنے سے عذاب سے حفاظت نہ ہو جائے گی، آنے والا عذاب آ کر رہے گا۔

مشرکینِ مکہ سے زیادہ طاقتور ہلاک ہو گئے

مکہ والے تجارت کے لیے شام کے اَسفار میں جایا کرتے تھے۔ راستے میں قومِ ثمود کی بربادشدہ بستیاں پڑتی تھیں، اور حضرت لُوط علیہ السلام کی قوم کی بستی (سدوم) کے پاس سے بھی گزر ہوتا تھا۔ اس لیے انہیں یاد دہانی فرمائی، اور فرمایا کہ کیا یہ لوگ زمین میں نہیں چلے پھرے، تا کہ ان لوگوں کا انجام دیکھ لیتے جواُن سے پہلے تھے۔ یعنی جن قوموں پر عذاب آیا اور ہلاک کیے گئے، ان کا حال انہیں معلوم ہے، اور ان کی آبادیوں کے نشان دیکھتے ہوئے گزرتے ہیں، پھر بھی عبرت حاصل نہیں کرتے۔ اور عبرت کے لئے مزید بات یہ ہے کہ وہ لوگ ان سے قوت میں بڑھے ہوئے تھے، جب وہ ہلاک کر دیے گئے تو ان کی حیثیت ہی کیا ہے! وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ: اور اللہ تعالیٰ کو پوری قدرت ہے جو چاہے کرے، اور جسے چاہے عذاب دے، آسمانوں اور زمین میں اسے کوئی چیز عاجز نہیں کر سکتی، اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا: بلاشبہ وہ بڑے علم والا ہے، بڑی قدرت والا ہے۔ کوئی شخص یا کوئی جماعت یہ نہ سمجھے کہ اسے ہمارے کرتوتوں کا علم نہیں ہے، اور یہ بھی نہ سمجھے کہ وہ عذاب دینے پر قدرت نہیں رکھتا۔ وہ تو ہر چیز پر قادر ہے، اس کی گرفت سے بچ کر کوئی کہیں نہیں جا سکتا۔

اللہ تعالیٰ کا حلم

سورت کے ختم پر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ عذاب دینے میں جلدی نہیں فرماتا۔ دُنیا میں لوگوں کا حال یہ ہے کہ اپنے کُفر کی وجہ سے بربادی کے مستحق ہیں، اگر اللہ تعالیٰ ان کا مؤاخذہ فرمائے تو زمین پر کسی چلنے پھرنے والے کو نہ چھوڑے، لیکن اس کے یہاں تاخیر ہے اور ڈھیل ہے، اُس نے جو اجل اور میعاد مقرر فرما رکھی ہے، جب وہ آئے گی تو عذاب آ جائے گا۔ اور کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ کتنے کافر گزر گئے، اور کتنوں نے بدعملی کر لی، اُن سب کی فہرست کہاں ہے اور ہر ایک کا مؤاخذہ کیسے ہوگا؟ جو شخص ایسا خیال کرتا ہے یہ اس کی جہالت کی بات ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ شانہٗ اپنے ہر ہر بندے کو دیکھتا ہے، اور سب کچھ اس کے علم میں ہے۔ جب مقررہ میعاد آ جائے گی اپنے علم کے مطابق سزا دے دے گا، اسی کو فرمایا: فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا: سو جب اُن کی اجل آ جائے گی، تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ اپنے بندوں کو دیکھنے والا ہے۔

ایک اِشکال کا جواب

یہاں جو یہ اشکال ہوتا ہے کہ زمین کے باشندوں میں سب کی ہلاکت ہوگی تو اہلِ ایمان کو بھی شامل ہوگی، وہ ہلاکت میں کیوں شریک کیے جائیں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تکوینی قانون کے مطابق ہلاک تو سبھی ہوں گے، لیکن قیامت کے

دِن اپنے اپنے اعمال کے مطابق اُٹھائے جائیں گے، اہلِ کُفر دوزخ میں اور اہلِ ایمان جنّت میں جائیں گے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر عذاب نازل فرماتا ہے تو جو بھی لوگ وہاں موجود ہوں ان سب کو عذاب پہنچ جاتا ہے، پھر اپنے اپنے اعمال کے مطابق قیامت کے دِن اُٹھائے جائیں گے۔[1] حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک لشکر کعبہ شریف پر حملہ کرنے کے لیے آئے گا، جب وہ میدان میں ہوں گے، تو اوّل سے آخر تک سب کو زمین میں دھنسا دیا جائے گا۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اوّل سے آخر تک سب کو کیسے دھنسا دیا جائے گا، حالانکہ ان میں وہ لوگ بھی ہوں گے، جو خرید و فروخت کے لئے نکلے ہوں گے، اور وہ لوگ بھی ہوں گے جو اُن میں شامل نہ ہوں گے؟ آپ نے فرمایا کہ دھنسائے تو جائیں گے سب ہی، پھر اپنی اپنی نیت پر اُٹھائیں جائیں گے۔[2] کہیں لکھا تو نہیں دیکھا لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت کے پیشِ نظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ ایمان کے لئے یہ ہلاکت باعثِ اَجر و ثواب ہوگی۔ اور محض ایمان و اَعمالِ صالحہ پر جو اَجر ملتا ہے، اس مجموعی عذاب میں شامل کیے جانے کی وجہ سے مزید اَجر ملے گا، اور اس تکلیف کو مستقل ثواب کا سبب بنا دیا جائے گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

(۱) بخاری ۲/ ۱۰۵۳، باب اذا انزل اللہ بقوم عذابًا۔ مشکوٰۃ ۲/ ۴۵۷، باب البکاء والخوف، فصل اول۔

(۲) بخاری ۱/ ۲۸۴، باب ما ذکر فی الأسواق۔ مشکوٰۃ ۱/ ۲۳۸، باب حرم مکۃ، فصل اول۔

سورۃ یٰسٓ

آیاتها ۸۳ ۳۶ سورۃ یٰسٓ مکیۃ ۴۱ رکوعاتها ۵
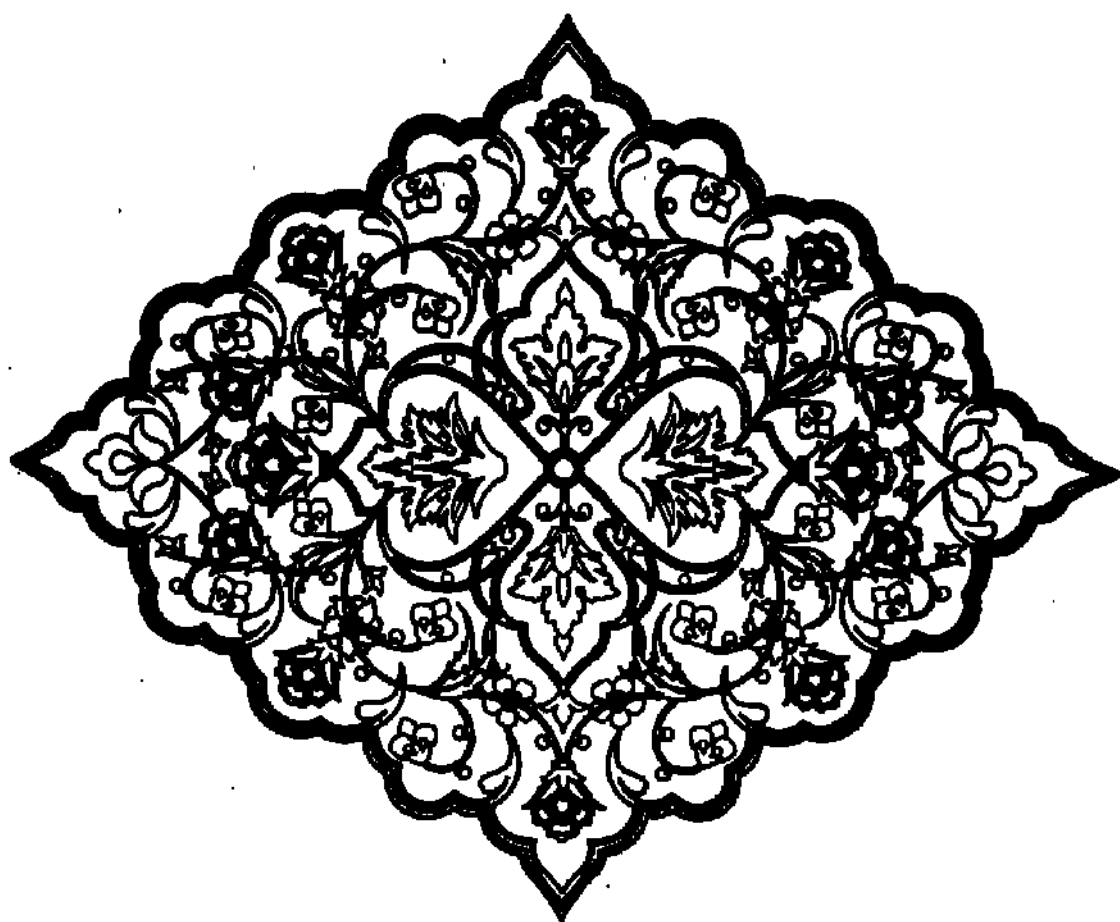
سورۂ یٰس مکہ میں نازل ہوئی، اس میں تراسی آیات اور پانچ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

يٰسٓ ۞ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۞ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۞ عَلٰى صِرَاطٍ

یٰس① قسم ہے قرآنِ حکیم کی② بلاشبہ آپ پیغمبروں میں سے ہیں③ سیدھے راستے پر ہیں④

مُّسْتَقِيْمٍ ۞ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۞ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ

یہ قرآن ایسی ذات کی طرف سے نازل کیا گیا ہے جو زبردست ہے رحم والا ہے⑤ تاکہ آپ ایسے لوگوں کو ڈرائیں جن کے باپ دادوں کو نہیں ڈرایا گیا

فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۞ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۞ اِنَّا جَعَلْنَا

سو وہ غافل ہیں⑥ البتہ یہ بات واقعی ہے کہ ان میں سے اکثر لوگوں پر بات ثابت ہو چکی ہے سو وہ ایمان نہ لائیں گے⑦ بلاشبہ ہم نے

فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ۞ وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ

اُن کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے ہیں پھر وہ ٹھوڑیوں تک ہیں سو وہ اُوپر ہی کو رہ گئے ہیں⑧ اور ہم نے اُن کے

اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۞ وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ

آگے آڑ بنا دی اور اُن کے پیچھے آڑ بنا دی سو ہم نے اُن کو گھیر دیا لہٰذا وہ نہیں دیکھ سکتے⑨ اور ان کے حق میں بات برابر ہے

ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۞ اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَ

آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، ایمان نہیں لائیں گے⑩ آپ اُسی شخص کو ڈرا سکتے ہیں جو نصیحت کا اتباع کرے اور

خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ۚ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ ۞ اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ

بن دیکھے رحمٰن سے ڈرے، سو آپ اُسے مغفرت کی اور اجرِ کریم کی خوش خبری سنا دیجئے⑪ بے شک ہم مُردوں کو زندہ کرتے ہیں،

الْمَوْتٰى وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ۗ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ۞

اور اُن لوگوں نے جو آگے بھیجا اسے اور اُن کے نشانوں کو لکھ لیتے ہیں، اور ہر چیز کو ہم نے ایک واضح کتاب میں پوری طرح لکھ دیا⑫

آپ ﷺ صراطِ مستقیم پر ہیں

[1]لفظ یٰسٓ متشابہات میں سے ہے جس کا معنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ منکرین جو آنحضرت ﷺ کی رسالت کا انکار کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم کی قسم کھا کر اُن کی تردید فرمائی، اور فرمایا: اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ بلاشبہ آپ پیغمبروں میں سے ہیں، اور مزید فرمایا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ کہ آپ سیدھے راستہ پر ہیں، آپ کے دشمن جو آپ کے بارے میں غلط باتیں کہتے ہیں۔ اور آپ جس راہ پر ہیں یعنی توحید اور عبودیت للہ، اس سے جو مخاطبین بدکتے ہیں، اُن کا خیال نہ کیجئے۔ اللہ تعالیٰ کی گواہی کافی ہے کہ آپ صراطِ مستقیم پر ہیں...... جو لوگ آپ کی رسالت کے منکر تھے اور قرآنِ کریم کو بھی اللہ تعالیٰ کی کتاب نہیں مانتے تھے اُن لوگوں کی تردید کرتے ہوئے فرمایا: تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ اس میں مصدر مفعول مطلق ہے جو نَزَّلَ محذوف کی وجہ سے منصوب ہے۔ ارشاد فرمایا کہ یہ قرآن ایسی ذاتِ پاک کی طرف سے اُتارا گیا ہے، جو زبردست ہے رحم فرمانے والا ہے۔ اَلْعَزِيْزِ فرما کر یہ بتادیا کہ منکرین چین سے نہ بیٹھیں، نڈر نہ ہوں۔ جس نے یہ قرآن نازل فرمایا ہے وہ باعزت ہے غلبہ والا ہے اور انکار پر سزا دینے پر پوری طرح قدرت رکھتا ہے۔ اور الرَّحِيْمِ فرما کر یہ بتادیا کہ گرفت میں جو دیر لگ رہی ہے، وہ اُس کی شانِ رحمت کا مظاہرہ ہے۔ اس دیر لگنے سے یہ نہ سمجھیں کہ عذاب میں مبتلا ہونا ہی نہیں ہے۔

اوّلین مخاطبین

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ: آپ ﷺ کو جو نبوّت سے نوازا گیا ہے اور آپ پر قرآن مجید نازل کیا گیا ہے، یہ اس لیے ہے کہ آپ اُن لوگوں کو ڈرائیں جن کے باپ دادوں کو نہیں ڈرایا گیا۔ یعنی آپ کے اوّلین مخاطب اہلِ مکہ ہیں، ماضی قریب میں اُن کے پاس کوئی نبی نہیں آیا، جو اُنہیں ڈراتا۔ یوں تو یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں، انہوں نے انہیں دینِ حق کی تبلیغ کی تھی، توحید سمجھائی تھی، شرک سے بچنے کی تاکید کی تھی، لیکن بعد میں یہ لوگ کُفر اور شرک پر لگ گئے۔ یہ اس وقت ہے جب ''ما'' نافیہ ہو، جیسا کہ ظاہر ہے۔ اور ابنِ عطیہ نے کہا ہو سکتا ہے کہ ''ما'' مصدر یہ ہو کہ مصدر مؤکد کی صفت ہو یعنی تاکہ آپ قوم کو ڈرائیں جیسا کہ ان کے دور کے آباء کو رسولوں نے ڈرایا۔ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ: سو یہ لوگ غافل ہیں، ان کے باپ دادوں کو ڈرانے کے لئے کوئی نبی نہیں بھیجا گیا، لہٰذا وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ اب آپ ان کو ڈرایئے اور سمجھایئے۔

آپ ﷺ کو تسلی

پھر فرمایا: لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ: جب رسول اللہ ﷺ اہلِ مکہ کو تبلیغ کرتے تھے تو وہ آپ کی تکذیب کرتے تھے، اور آپ کی بات نہیں مانتے تھے۔ اس سے آپ کو رنج ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دی کہ ان میں سے اکثر پر بات ثابت ہو چکی ہے، یعنی ان کے بارے میں یہ طے ہو چکا ہے کہ عذاب میں جائیں گے، تکوینی طور پر یہ بات طے شدہ ہے کہ اکثر ایمان نہیں لائیں گے، لہٰذا آپ کارِ رسالت انجام دیں اور ان کے انکار اور عناد سے دلگیر نہ ہوں۔

---

(۱) شروع سورت سے آیت ۷۶ تک ریکارڈنگ محفوظ نہ ہونے کی وجہ سے ترجمہ و تفسیر ''انوار البیان'' سے لیا گیا ہے۔

منکرین کا انجام

اس کے بعد منکرین کے ایک عذاب کا تذکرہ فرمایا: اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ: کہ ہم اُن کی گردنوں میں طوق ڈال دیں گے یہ طوق ٹھوڑیوں تک ہیں (اور ہاتھ بھی اوپر ہی ان طوقوں میں بندھے ہوئے ہوں گے)۔لہٰذا ان لوگوں کی کیفیت ایسی ہو جائے گی کہ اُن کے سر اوپر ہی کو اُٹھے ہوئے رہ جائیں گے، نیچے کو نہ جھکا سکیں گے۔علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بعض حضرات سے آیت کا یہ مفہوم نقل کیا ہے اور بتایا ہے کہ اہلِ کُفر کے ساتھ یہ معاملہ دوزخ میں ہوگا، اور سورۂ مؤمن کی آیتِ کریمہ: اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ ۭ يُسْحَبُوْنَ (سورۂ مؤمن:۷۱) سے اِستدلال کیا ہے۔ بظاہر یہ رائے ٹھیک ہے اس میں مجاز اور تمثیل کا ارتکاب نہیں کرنا پڑتا۔

شانِ نزول

اور صاحب ''رُوح المعانی'' نے بحوالہ ''دلائل النبوۃ'' حضرت اِبنِ عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دِن (مسجد میں) بلند آواز سے قرآنِ مجید پڑھ رہے تھے، قریشِ مکہ کو اس سے تکلیف ہوئی، وہ لوگ جمع ہو کر آپ کے قریب آئے تا کہ آپ کو پکڑ لیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے خود اُن کی پکڑ ہوگئی، اُن لوگوں کے ہاتھ گردنوں تک پہنچ کر جام ہو گئے، اور نظر آنا بھی بند ہو گیا۔ جب یہ حال ہوا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم آپ کو اللہ تعالیٰ اور رشتہ داری کے واسطے دیتے ہیں، دُعا کیجئے کہ ہماری مصیبت دُور ہو جائے، آپ نے اُن کے لئے دُعا کر دی جس سے اُن کی وہ حالت ختم ہوگئی، اور يٰسٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ سے لے کر اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ تک آیات نازل ہوئیں، لیکن اُن میں سے ایک شخص بھی ایمان نہ لایا..... اس قصے میں یہ تصریح ہے کہ جب اُن لوگوں نے آپ کو پکڑنے کا ارادہ کیا، تو اُن کی یہ حالت ہوئی کہ اُن کے ہاتھ گردنوں سے چپک کر رہ گئے۔ اگر دُنیا میں بھی ایسا واقعہ ہوا ہو جو حضرت اِبنِ عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اور آخرت میں اس سے بڑھ کر ہو جائے تو اس میں کوئی منافاۃ نہیں ہے۔

صاحب ''رُوح المعانی'' نے ایک یہ قصہ بھی لکھا ہے کہ ایک دِن ابوجہل نے پتھر اُٹھایا تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کرے، آپ نماز پڑھ رہے تھے، ابوجہل کا ہاتھ گردن تک اُٹھا، اور وہیں جا کر چپک گیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے پاس آیا، کیا دیکھتے ہیں کہ پتھر اس کے ہاتھ میں اور اس کا ہاتھ گردن سے چپکا ہوا ہے۔ اُن لوگوں نے بڑی محنت اور مشقت سے اس کا ہاتھ گردن سے چھڑایا، پھر اس پتھر کو بنی مخزوم کے آدمی نے لے لیا۔ جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی آنکھ کی روشنی ختم کر دی، اور وہ واپس لوٹا تو اس کے ساتھی اسے نظر نہ آ رہے تھے، انہوں نے آواز دے کر اسے اپنے پاس بُلا لیا۔ اب تیسرا شخص اُٹھا اس نے پتھر لیا اور یوں کہتا ہوا چلا کہ میں اُن کا سر پھوڑوں گا، تھوڑا سا چلا کہ فوراً ایڑیوں کے بل پیچھے لوٹا، یہاں تک کہ گدی کے بل گر پڑا، کسی نے کہا: ارے تجھے کیا ہوا؟ کہنے لگا کہ بہت بڑا حادثہ ہو گیا، وہ یہ کہ میں جب اُن کے قریب گیا تو دیکھتا ہوں کہ وہاں ایک بہت بڑا اُونٹ ہے، ایسا اُونٹ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا، یہ اُونٹ میرے اور اُن کے درمیان حائل ہو گیا۔ پھر بتوں کی قسم کھا کر کہا: اگر میں اُن کے قریب چلا جاتا تو یہ اُونٹ مجھے کھائے بغیر نہ چھوڑتا!

یہ قصہ لکھ کر صاحب ''رُوح المعانی'' لکھتے ہیں کہ اگر اس قصے کو سبب نزول مانا جائے، تو طوق ڈالنا اور آگے پیچھے آڑ بن جانا یہ سب اِستعارہ ہوگا۔ یعنی وہ تینوں حملہ کرنے والے پیچھے ہٹ گئے اور حملہ نہ کر سکے، ایسے بے بس ہو گئے جیسے کسی کا ہاتھ گردن سے بندھ جائے اور آنکھوں کی روشنی چلی جائے۔

اس کے بعد فرمایا کہ ان لوگوں کے لیے ڈرانا اور نہ ڈرانا برابر ہے، ان کو ایمان لانا نہیں ہے۔ یعنی یہ لوگ آپ کے اِنذار کا اثر نہ لیں گے، جو لوگ اِنذار کا اثر لیتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کا نصیحت قبول کرنے کا مزاج ہے، جو حق بات سنتے ہیں اور فکر کرتے ہیں اور وضوحِ حق کے بعد حق کو مان لیتے ہیں۔ هذا على احد القولين۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ سے مؤمنین مراد ہیں اور سویؤیدہ مابعدہ۔ جو بن دیکھے رحمٰن سے ڈرتے ہیں، وہ رحمٰن کو رحمٰن بھی مانتے ہیں لیکن ساتھ ہی نافرمانی اور تقصیر اور کوتاہی کے سبب سے اس کی گرفت سے بھی ڈرتے ہیں، فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّ اَجْرٍ كَرِيْمٍ: سو اس شخص کو مغفرت اور اَجرِ کریم کی بشارت دے دو۔ اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى: بلاشبہ ہم مُردوں کو زندہ کریں گے اور ہم اُن کے آثار کو یعنی اچھے اور بُرے اعمال کو لکھ رہے ہیں جو وہ آگے بھیج رہے ہیں۔ اور ہم نے ہر چیز کو واضح کتاب یعنی لوحِ محفوظ میں پوری طرح محفوظ کر دیا ہے۔

اچھے اعمال صدقۂ جاریہ اور بُرے اعمال وَبالِ جان

لفظ اٰثَارَهُمْ: اچھے بُرے تمام اعمال کو شامل ہے، اور ''اعمال'' کی بجائے ''آثار'' کا لفظ لانے میں یہ نکتہ ہے کہ جس کسی نے کوئی ایسا عمل کیا (اچھا ہو یا بُرا) جس کا اِتباع بعد کے آنے والے لوگ کرتے ہیں، اور جس سے نفع حاصل کرتے رہے ہیں وہ بھی اس کے عموم میں دخل ہو جائے۔ جو اپنی نماز خود پڑھی یا قرآنِ مجید کی تلاوت کی اس کا ثواب تو ملتا ہی ہے، لیکن اگر کسی کو نماز سکھادی، قرآن مجید پڑھا دیا، نماز پڑھنے والوں کے لئے مسجد بنا دی، کوئی دینی کتاب لکھ دی، تو یہ سب ''آثار'' میں شامل ہے، جب تک فیض جاری رہے گا ثواب بھی ملتا رہے گا۔ یہی حال معصیتوں، بدعتوں اور بُری رُسوم کے جاری کرنے کا ہے! جس کسی نے یہ چیزیں جاری کر دیں، بعد میں عمل کرنے والوں کے گناہوں میں ان کا جاری کرنے والا بھی شریک رہے گا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک اُن چیزوں میں جو مؤمن کو موت کے بعد پہنچتی ہیں (یعنی اُس کا عمل اور اس کی نیکیاں) اُن میں ایک تو علم ہے، جسے اس نے حاصل کیا اور پھیلایا۔ اور دُوسری چیز اولادِ صالحہ ہے، جسے چھوڑ گیا، یا قرآن ورثہ میں چھوڑ گیا، یا مسافر خانہ تعمیر کر گیا، یا نہر جاری کر گیا، یا اپنے مال سے زندگی میں اور تندرستی کے زمانے میں ایسا صدقہ نکال گیا جو مرنے کے بعد اس کو پہنچتا ہے۔[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے کہ جس کسی نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ جاری کیا تو اسے اس کا ثواب ملے گا، اور اس کے بعد جو لوگ اس پر عمل کریں گے اُسے اُن کے عمل کا بھی ثواب ملے گا، اور اُن کے ثواب میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ اور جس شخص نے اسلام میں کوئی بُرا طریقہ جاری کیا، اُسے اس کا گناہ ملے گا، اور اس کے بعد جو لوگ اس طریقے

(۱) ابن ماجہ ص ۲۲، باب ثواب معلم الناس۔ مشکوٰۃ ۱/ ۳۶، کتاب العلم فصل ثالث۔

پر عمل کریں گے اُن کے عمل کا گناہ بھی اُسے ملے گا، اوران لوگوں کے گناہوں میں سے کچھ کمی نہ کی جائے گی۔[1] بعض حضرات نے اٰثَارَهُمْ کے عموم میں مساجد کو جانے آنے کے نشان ہائے قدم کو بھی شمار کیا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ مسجدِ نبوی کے آس پاس جگہیں خالی ہوگئیں، تو قبیلۂ بنوسلمہ نے ارادہ کیا کہ اپنے دُور والے گھر کو چھوڑ کر مسجدِ نبوی کے قریب آباد ہوجائیں، رسول اللہ ﷺ کو اُن کے اس ارادے کی خبر ملی، تو ارشاد فرمایا کہ اے بنی سلمہ! تم اپنے گھروں ہی میں ٹھہرے رہو، تمہارے قدموں کے نشان لکھے جاتے ہیں۔[2]

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۳﴾ اِذْ اَرْسَلْنَآ

اور آپ ان کے سامنے بستی والوں کا قصہ بیان کیجیے جبکہ اُن کے پاس رسول آئے ﴿۱۳﴾ جبکہ ہم نے بھیجا

اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ

اُن کے پاس دو پیامبروں کو، سوانہوں نے جھٹلایا پھر ہم نے تیسرے رسول کے ذریعے اُن کو تقویت دے دی، ان تینوں نے کہا کہ ہم

اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ﴿۱۴﴾ قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ ۙ

تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں ﴿۱۴﴾ اُن لوگوں نے کہا کہ تم تو ہماری ہی طرح کے آدمی ہو اور رحمٰن نے کچھ بھی نازل نہیں کیا،

اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ﴿۱۵﴾ قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَ

تم تو جھوٹ بول رہے ہو ﴿۱۵﴾ انہوں نے کہا: ہمارا ربّ جانتا ہے بلاشبہ یہ بات واقعی ہے کہ ہم تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں ﴿۱۶﴾ اور

مَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا

ہماری ذمہ داری صرف یہی ہے کہ کھول کر بات پہنچادیں ﴿۱۷﴾ ان لوگوں نے کہا کہ بے شک ہم تو تمہیں منحوس سمجھتے ہیں، اگر تم باز نہ آئے

لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸﴾ قَالُوْا طَآئِرُكُمْ

تو ہم تمہیں پتھر مار مار کر ہلاک کردیں گے اور ہماری طرف سے تمہیں ضرور ضرور دردناک تکلیف پہنچے گی ﴿۱۸﴾ انہوں نے کہا کہ تمہاری نحوست

مَّعَكُمْ ؕ اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۱۹﴾

تمہارے ساتھ ہے، کیا اس بات کو تم نے نحوست سمجھ لیا کہ تم کو نصیحت کی گئی؟ بلکہ بات یہ ہے کہ تم حد سے بڑھ جانے والے لوگ ہو ﴿۱۹﴾

(۱) مسلم ۳۲۷/۱، باب الحث علی الصدقه. مشکوٰۃ ص ۳۳، کتاب العلم فصل اول۔

(۲) مسلم ۲۳۵/۱، باب فضل الصلوٰۃ المکتوبۃ... الخ. مشکوٰۃ ۳۲۷/۱، باب المساجد فصل اول۔

وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِیْنَةِ رَجُلٌ یَّسْعٰی قَالَ یٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۲۰﴾

اور ایک شخص اُس شہر کے دُور والے مقام سے دوڑتا ہوا آیا، اس نے کہا کہ اے میری قوم! ان فرستادہ آدمیوں کا اتباع کرو ﴿۲۰﴾

اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا یَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۱﴾

ایسے لوگوں کی راہ پر چلو جو تم سے کسی اُجرت کا سوال نہیں کرتے اور وہ خود راہِ ہدایت پر ہیں ﴿۲۱﴾

وَمَا لِیَ لَاۤ اَعْبُدُ الَّذِیْ فَطَرَنِیْ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۲﴾

اور میرے پاس کون سا عذر ہے کہ میں اس کی عبادت نہ کروں جس نے مجھے پیدا فرمایا اور تم سب کو اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے ﴿۲۲﴾

ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً اِنْ یُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْـًٔا وَّ

کیا میں اُس کے سوا ایسے معبود مان لوں کہ اگر رحمٰن مجھے کوئی ضرر پہنچانا چاہے تو ان کی سفارش مجھے ذرا بھی کام نہ دے اور

لَا یُنْقِذُوْنِ ﴿۲۳﴾ اِنِّیْۤ اِذًا لَّفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۲۴﴾ اِنِّیْۤ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ﴿۲۵﴾

نہ وہ مجھے بچا سکیں ﴿۲۳﴾ اگر میں ایسا کروں تو صریح گمراہی میں جا پڑوں گا ﴿۲۴﴾ بے شک میں تمہارے رَبّ پر ایمان لا چکا، سو تم میری بات سنو ﴿۲۵﴾

قِیْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ قَالَ یٰلَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ بِمَا غَفَرَ لِیْ رَبِّیْ وَجَعَلَنِیْ

اس سے کہا گیا کہ جنت میں داخل ہو جا! وہ کہنے لگا کہ کاش! میری قوم کو یہ بات معلوم ہو جاتی ﴿۲۶﴾ کہ میرے پروردگار نے مجھے بخش دیا اور مجھے

مِنَ الْمُكْرَمِیْنَ ﴿۲۷﴾ وَمَاۤ اَنْزَلْنَا عَلٰی قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا

باعزّت بندوں میں شامل فرما دیا ﴿۲۷﴾ اور ہم نے اس کے بعد اُس کی قوم پر آسمان سے کوئی لشکر نازل نہیں کیا اور نہ ہم

مُنْزِلِیْنَ ﴿۲۸﴾ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَیْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ﴿۲۹﴾ یٰحَسْرَةً عَلَی الْعِبَادِ

اُتارنے والے تھے ﴿۲۸﴾ نہیں تھی مگر ایک چیخ، سو وہ بجھ کر رہ گئے ﴿۲۹﴾ افسوس ہے بندوں کے حال پر!

مَا یَاْتِیْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۰﴾ اَلَمْ یَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ

جب اُن کے پاس کوئی رسول آیا تو اُنہوں نے ضرور اُس کا مذاق بنایا ﴿۳۰﴾ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم اُن سے پہلے بہت سی

مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَیْهِمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَ اِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِیْعٌ لَّدَیْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴿۳۲﴾

اُمتیں ہلاک کر چکے ہیں، بے شک وہ ان کی طرف واپس نہیں ہوں گے ﴿۳۱﴾ اور یہ سب مجتمع طور پر ہمارے پاس ضرور حاضر ہوں گے ﴿۳۲﴾

تفسیر

اہلِ انطاکیہ اور تین پیغمبروں کا واقعہ

ان آیات میں ایک واقعے کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اور وہ یہ کہ ایک بستی (جس کا نام مفسرین نے "انطاکیہ" بتایا ہے) میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے دو فرستادہ گئے۔ مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ دونوں نبی نہیں تھے، لیکن اللہ تعالیٰ کے رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بھیجے ہوئے آدمی تھے، جو انہوں نے اپنے حواریین میں سے بھیجے تھے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے ایک رسول نے انہیں بھیجا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف نسبت فرمائی، اور اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَیْهِمُ، فرمایا۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ حضرات مستقل نبی تھے۔ پہلے دو حضرات تشریف لے گئے، اور انہوں نے بستی والوں سے کہا کہ ہم تمہاری طرف بھیجے ہوئے ہیں، ہماری بات سنو، دِینِ اسلام قبول کرو اور توحید پر آؤ۔ یہ بات سُن کر بستی والوں نے انہیں جھٹلا دیا، اور کہا کہ تم لوگ اللہ کے رسول نہیں ہو۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک تیسرے آدمی کو بھیجا، جس کے ذریعے پہلے دو آدمیوں کی تائید کرنا مقصود تھا، اب ان تینوں نے مل کر یہی بات کہی کہ ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں، تم ایمان لاؤ، توحید کو قبول کرو۔ بستی والوں نے کہا کہ تم کو کیسے اللہ کا فرستادہ مانیں؟ تم تو ہمارے ہی جیسے ہو، تم میں ایسی کون سی فضیلت کی بات ہے جس کی وجہ سے تم اللہ تعالیٰ کے پیغمبر بنائے گئے؟ تمہارا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی ہے، ہم اسے نہیں مانتے، ہمارے نزدیک تو رحمٰن نے تم پر کچھ بھی نازل نہیں فرمایا، تم جو یہ دعویٰ کر رہے ہو کہ ہم اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے ہیں، یہ جھوٹ ہے! اُن تینوں حضرات نے کہا کہ تم مانو، یا نہ مانو، ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم ضرور ضرور تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں، تمہارے ماننے نہ ماننے سے ہمارے کام پر کچھ اثر نہیں پڑتا، ہم نتیجے کے مکلف نہیں ہیں، ہماری ذمہ داری صرف اتنی ہے کہ خوب اچھی طرح واضح طور پر بیان کریں، ماننا، نہ ماننا، یہ تمہارا کام ہے۔ بستی والے کہنے لگے کہ تمہارا آنا تو ہمارے لیے منحوس ہو گیا، ایک تو تمہارے آنے سے ہمارے اندر دو فرقے ہو گئے کوئی تمہارا مخالف اور منکر ہے، اور کوئی تمہارا موافق ہے۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ اُن لوگوں کے انکار کی وجہ سے بطورِ عذاب بعض چیزوں کا وقوع ہو گیا تھا، اس کو انہوں نے نحوست بتایا۔ گاؤں والوں نے مزید کہا کہ تم اپنی باتیں بس کرو، اگر باز نہ آئے تو تمہاری خیر نہیں، اگر تم نے اپنی باتیں نہ چھوڑیں تو ہم پتھروں سے مار مار کر ختم کر دیں گے، اور اس کے علاوہ بھی ہم تمہیں سخت تکلیف پہنچائیں گے۔ اُن تینوں حضرات نے کہا کہ تم نحوست کو ہماری طرف منسوب کر رہے ہو، تمہاری نحوست تمہارے ساتھ ہے، نہ تم کُفر پر جمے رہتے، نہ پھوٹ پڑتی، نہ کوئی اور تکلیف آتی، کرتوت تمہارے ہیں، اور ان کا نتیجہ ہمارے ذمے لگا رہے ہو، ہم نے تو اتنا ہی کیا ہے کہ تمہیں توحید کی دعوت دی ہے اور ایمان قبول کرنے کو کہا ہے، اس میں کون سی ایسی بات ہے جسے نحوست کا سبب بنا لیا جائے؟ صاحب "روح المعانی" فرماتے ہیں: کیا اس لیے کہ تمہیں اس چیز کی وعظ و نصیحت کی گئی ہے جس میں تمہاری کامیابی ہے، تم نحوست کی فال

لیتے ہو۔ یا یہ کہ تم ہمیں دھمکیاں دیتے ہو۔ یا اسی جیسی کوئی اور عبارت محذوف ہو سکتی ہے۔ اور فعلِ محذوف مضارع بھی مانا جا سکتا ہے، اور اگر چاہو تو ماضی مان لو جیسے تطیرون کی جگہ تطیر تم۔ ان تینوں حضرات نے آخر میں فرمایا: بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ: بلکہ بات یہ ہے کہ تم حد سے آگے بڑھ جانے والے ہو، تمہارا حد سے آگے بڑھنا یعنی کُفر پر جمے رہنا، ان چیزوں کا سبب ہے جنہیں ہماری آمد کی نحوست بتا رہے ہو۔

یاد رہے کہ اسلام میں ''نحوست'' کوئی چیز نہیں ہے، تینوں حضرات نے جو یہ فرمایا کہ ''تمہاری نحوست تمہارے ساتھ ہے'' یہ ان کے جواب میں علی سبیل المشاکلہ فرمایا۔ کُفر کی وجہ سے جو اُن لوگوں کی کچھ گرفت ہوئی تھی، اسے انہوں نے نحوست بتا دیا، تینوں حضرات نے ان کے الفاظ ان پر لوٹا دیئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''اَلطِّیَرَۃُ شِرْکٌ'' یعنی بدشگونی شرک ہے۔[1]

تینوں پیغمبروں کی تصدیق کرنے والا خوش قسمت

تینوں حضرات بستی والوں کو ہدایت دے رہے تھے، اور وہ لوگ ان حضرات سے اُلجھ رہے تھے، اور یوں کہہ رہے تھے کہ تمہارا آنا ہمارے لیے نحوست کا سبب ہے۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک شخص اس بستی کی ایک جانب سے جو بہت دُور تھی، دوڑتا ہوا وہاں پہنچ گیا، اُس نے تینوں حضرات کی تائید کی اور بستی والوں سے کہا کہ اے میری قوم! یہ حضرات ٹھیک فرما رہے ہیں، یہ واقعی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں، تم ان کی بات مان لو اور ان کا اتباع کرو، یہ حضرات ایک تو اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے ہیں، دُوسرے تم سے کسی معاوضے کا سوال نہیں کرتے، تیسرے یہ خود ہدایت پر ہیں، ان کا عمل ان کے قول کے مطابق ہے، لہٰذا ان کی اتباع تم پر لازم ہے۔

یہ باتیں کہہ کر اُس شخص نے اُن لوگوں کو عبادتِ خداوندی کی دعوت دی، اور اپنے اُوپر بات رکھ کر کہا کہ کیا وجہ ہے کہ میں اُس ذات پاک کی عبادت نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا! اس میں یہ بتا دیا کہ جس نے پیدا کیا وہی عبادت کا مستحق ہے۔ جب پیدا فرمانا اِستحقاقِ عبودیت کی دلیل ہوا، تو ضروری ہے کہ تم بھی اللہ ہی کی عبادت کرو، میں بھی اسی کی عبادت کروں۔ اسی لیے آخر میں وَاِلَیْهِ اُرْجَعُ: ''اور میں اُسی کی طرف لوٹایا جاؤں گا'' نہیں کہا، بلکہ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ: ''اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے'' کہا۔ جب اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے جس نے پیدا کیا، تو اس کی عبادت چھوڑنا، یا دُوسروں کو اس کی عبادت میں شریک کرنا، یہ تو بالکل ہی حماقت اور بیوقوفی کی بات ہے۔ چونکہ اس بستی کے لوگ مشرک تھے، اس لیے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے اس شخص نے مزید کہا: ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً: کیا میں اپنے پیدا کرنے والے کے علاوہ دُوسرے معبود تجویز کرلوں؟ یہ جو تم نے اُس کے سوا معبود بنا رکھے ہیں، وہ تو بالکل ہی بے حقیقت ہیں، اگر رحمٰن تبارک وتعالیٰ مجھے کوئی ضرر پہنچانا چاہے، تو یہ اُس کی بارگاہ میں سفارش کرکے میری کوئی مدد نہیں کر سکتے، اور نہ خود مجھے اس ضرر سے چھڑا سکتے ہیں۔ یعنی نہ تو یہ شفاعت کے اہل ہیں، اور نہ خود ان میں کوئی قوت اور طاقت ہے، اگر رحمٰن جل مجدہٗ کو چھوڑ کر دُوسرے معبود بنالوں، تو میں کھلی گمراہی میں پڑ جاؤں گا۔ یہ سب باتیں اس دُور سے آنے والے

(۱) ابوداؤد ۲/۱۹۰، باب فی الطیرۃ۔ مشکوٰۃ ۲/۳۹۲، باب الفال والطیرۃ، فصل ثانی۔

آدمی نے اپنے اُوپر رکھ کر کہیں، اور انہیں بتادیا کہ تم لوگ مشرک ہو، کھلی گمراہی میں ہو، اور خالق جل مجدہٗ کے علاوہ جن کی تم عبادت کرتے ہو وہ تمہیں کچھ بھی نفع نہیں پہنچا سکتے۔

''توحید'' کا کھل کر اِعلان!

اس کے بعد اس شخص نے اپنے دینِ توحید کا کھل کر اِعلان کردیا کہ اِنِّیۡۤ اٰمَنۡتُ بِرَبِّکُمۡ فَاسۡمَعُوۡنِ: بلاشک وشبہ میں تمہارے رَبّ پر اِیمان لے آیا، تم میرے اس اعلان کو سُن لو! اس اِعلان میں ''بِرَبِّیْ'' نہیں کہا گیا بلکہ ''بِرَبِّکُمْ'' کہا، جس میں انہیں تنبیہ کردی اور یہ بتادیا کہ جو تمہارا رَبّ ہے، وہی مستحقِ عبادت ہے۔ دُوسرے یہ بتایا کہ تم اسی کی طرف واپس جاؤ گے۔ تیسرے یہ بتایا کہ تم نے جو اس کے علاوہ معبود بنا رکھے ہیں بے حقیقت ہیں۔ چوتھے یہ بتایا کہ تم کھلی ہوئی گمراہی میں ہو۔ اور پانچویں یہ بتادیا کہ میں نے یہی دِین اختیار کیا ہے کہ صرف اسی کی عبادت کروں، تم بھی یہ دِین اختیار کرلو۔

مصدِّقِ انبیاء کی شہادت اور جنّت میں گفتگو

''معالم التنزیل'' میں لکھا ہے کہ جب اس شخص نے یہ باتیں کہیں، تو وہ لوگ یکبار ہی اُس پر پل پڑے اور اُسے قتل کردیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اسے پاؤں سے اتنا روندا کہ اس کی آنتیں نکل پڑیں۔ قِیۡلَ ادۡخُلِ الۡجَنَّۃَ: اللہ تعالیٰ نے اُس کو اِیمان اور دعوتِ توحید اور شہادت کا اِنعام دیا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان ہوا کہ جنّت میں داخل ہوجا۔ قَالَ یٰلَیۡتَ قَوۡمِیۡ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۶﴾ بِمَا غَفَرَ لِیۡ رَبِّیۡ وَ جَعَلَنِیۡ مِنَ الۡمُکۡرَمِیۡنَ: جنّت میں داخل ہوکر اس شخص نے کہا: کیا اچھا ہوتا کہ میری قوم کو اس کا پتا چل جاتا، جو میرے رَبّ نے میری مغفرت فرمائی، اور جو مجھے معزز بندوں میں شامل فرمایا۔ یہ بات اُس نے آرزو کے طور پر کہی کہ میری قوم کو اللہ کے اِنعام واِکرام کا پتا چل جاتا تو وہ بھی مسلمان ہوجاتے۔

انطاکیہ والوں پر اللہ کا عذاب

''معالم التنزیل'' میں یہ بھی لکھا ہے کہ جب بستی والوں نے اس آدمی کو قتل کردیا، جو بستی کے آخر والے حصے سے آیا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے اُن پر عذاب بھیج دیا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام کو اُن کے ہلاک کرنے کا حکم دیا، انہوں نے وہاں زور سے ایک چیخ ماری جس کی وجہ سے وہ سب لقمۂ اَجل بن گئے۔ ان لوگوں کی ہلاکت کے بارے میں فرمایا: وَ مَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلٰی قَوۡمِہٖ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ مِنۡ جُنۡدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ مَا کُنَّا مُنۡزِلِیۡنَ ﴿۲۸﴾ اِنۡ کَانَتۡ اِلَّا صَیۡحَۃً وَّاحِدَۃً فَاِذَا ہُمۡ خٰمِدُوۡنَ: اور ہم نے اس شخص کی قوم پر اس کے بعد آسمان سے کوئی لشکر نازل نہیں کیا، اور ہم لشکر نازل کرنے والے نہ تھے، وہ تو صرف ایک چیخ تھی، سو اچانک وہ بجھ کر رہ گئے۔ یعنی مذکورہ بستی والے جو ہلاک کیے گئے، اُن کی ہلاکت کے لیے ہمیں کوئی لشکر اور جماعتِ کبیرہ بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی، بس ایک چیخ ہی کے ذریعے ہلاک کردیئے گئے۔ اس میں عبرت ہے دُوسرے منکرین ومکذّبین کے لئے، کوئی فرد یا جماعت یہ نہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے انتقام نہیں لے سکتا، اگر وہ انتقام لینا چاہے گا تو العیاذ باللہ! اسے دُشواری نہ ہوگی، نہ اُسے کوئی لشکر بھیجنا پڑے گا، وہ تو قادرِ مطلق ہے، اُس

کے صرف ''کُن'' کے خطاب سے سب کچھ ہو جاتا ہے۔ جو چیخ بھیجی اس کی بھی ضرورت نہ تھی، لیکن حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ انہیں ایک چیخ کے ذریعے ہلاک کر دیا جائے، ایک چیخ آئی اور یہ لوگ بجھے ہوئے رہ گئے، بڑے غرور اور طمطراق میں بھرے ہوئے تھے، نہ خود رہے، نہ جماعت رہی، نہ غرور رہا، بالکل ایسے ہو گئے جیسے آگ کسی لکڑی کو بجھا کر راکھ بنا دے۔

قِیْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ: جو فرمایا ہے، اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ بلا حساب کتاب جنّت میں داخل ہوں گے، اس شخص کو اُنہیں میں شامل فرما دیا۔ اور اسے مزید یہ فضیلت دی کہ وقوعِ قیامت کا انتظار نہیں کیا گیا، ابھی سے جنّت میں داخل کر دیا گیا، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یہ کوئی بعید نہیں ہے۔ کما قال النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم: ''لَقَدْ رَاَیْتُ رَجُلًا یَتَقَلَّبُ فِی الْجَنَّةِ فِی شَجَرَةٍ قَطَعَهَا مِنْ ظَهْرِ الطَّرِیْقِ کَانَتْ تُؤْذِی النَّاسَ'' جیسا کہ حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ میں نے جنّت میں ایک آدمی کو آزادی سے پھرتے دیکھا جس نے راستے سے لوگوں کو تکلیف دینے والا درخت کاٹا۔[1] اور بعض حضرات نے ''قِیْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ'' کا مطلب یہ لیا ہے کہ اس سے محض بشارت دینا مقصود ہے، اور جنّت کا داخلہ قیامت کے دِن اپنے وقت پر ہوگا۔ اگر یہ قول مراد لیا جائے تو ''قَالَ یٰلَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ'' کا مطلب یہ لیا جائے گا کہ موت کے بعد ہی برزخ میں جو حُسنِ سلوک ہوا، اسی سے متاثر ہو کر اس نے یہ بات کہی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اور ''وَمَا کُنَّا مُنْزِلِیْنَ'' کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ بستی کے ہلاک کرنے کے لئے ہم فرشتوں کو اُتارنے والے نہیں تھے، کیونکہ ہمیشہ تعذیب اور ہلاکت کے لئے فرشتے نہیں آتے، اللہ تعالیٰ کبھی فرشتوں کو اُتار دیتے ہیں، جیسا کہ غزوۂ بدر میں فرشتے نازل کیے گئے، اور کبھی نہیں اُتارتے، مختلف طریقوں سے ہلاک کیا گیا۔ صاحبِ ''رُوح المعانی'' فرماتے ہیں: ظاہر یہ ہے کہ اس ''لشکر'' سے مراد ''فرشتوں کا لشکر'' ہے، یعنی ہم نے ان کے ہلاک کرنے کے لیے آسمان سے فرشتے نہیں اُتارے، اور نہ ہی ہم فرشتے اُتارنے والے تھے کہ ہماری حکمت میں ان کی ہلاکت کے لئے فرشتوں کا اُتارنا صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ ہم نے ہر چیز کے لئے سبب مقرر کیا ہے، جیسا کہ بعض قوموں کو ہم نے پتھر برسا کر ہلاک کیا، بعض کو چیخ سے، بعض کو زمین میں دھنسا کر، بعض کو پانی میں غرق کر کے ہلاک کیا، فرشتے نہیں اُتارے، لیکن اب یہ تیری قوم میں تیری مدد کے لیے فرشتوں کا اُترنا تیری خصوصیات میں سے ہے۔ اور ہم نے ان کے لئے ایک فرشتے کی چیخ کو کافی کر دیا، فرشتے نے چیخ ماری اور یہ سب ہلاک ہو گئے۔ یعنی اس آدمی سے خطاب کر کے یہ کہا گیا۔

یٰحَسْرَةً عَلَی الْعِبَادِ: افسوس ہے بندوں کے حال پر!'' بیان القرآن'' میں لفظِ ''حسرت'' کا ترجمہ افسوس سے کیا ہے۔ لفظِ ''حسرت'' وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں کوئی نفع مند چیز فوت ہو جائے اور اس پر ندامت اور شرمندگی ہونے لگے۔ چونکہ ذاتِ باری تعالیٰ کے لئے اصلی معنی میں ''حسرت'' ہونا محال ہے، اس لیے ''افسوس'' سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ لیکن احقر کو اس میں بھی اشکال ہے کیونکہ ''افسوس'' سے بھی اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک بُلند و بَرتر ہے۔ صاحبِ ''رُوح المعانی'' نے اس موقع پر متعدد اقوال

---

(۱) مسلم ۲/۳۲۸، باب فضل ازالۃ الاذی عن الطریق۔ مشکوۃ ۱/۱۶۸، باب فضل الصدقۃ، فصل اول۔

نقل کیے ہیں کہ حسرت کرنے والے کون ہیں؟ اور''العباد'' کون ہیں؟ جن پر حسرت کی گئی۔ پھر ایک قول یہ لکھا گیا ہے:''وجوز ان یکون التحسر منه سبحانه وتعالیٰ مجازًا علی استعظام ماجنوه علی انفسهم ''(اور ہو سکتا ہے یہ حسرت اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجاز ہو ان کے جرم کی بڑائی کو ظاہر کرنے کے لئے) پھر چند سطر کے بعد لکھا:''وقیل "یا" للنداء والمنادی محذوف و"حسرة" مفعول مطلق لفعل مضمر "وعلی العباد" متعلق بذلك الفعل ای: یاھؤلاءِ تحسروا حسرة علی العباد''بعض نے کہا ہے:''یا'' نداء کے لیے ہے اور منادی محذوف ہے، اور''حسرۃ'' فعلِ محذوف کا مفعولِ مطلق ہے، اور''علی العباد'' اسی فعلِ محذوف کا متعلق ہے۔ یعنی:''اے لوگو! ان بندوں پر خوب حسرت کرو'' یعنی منادی محذوف ہے اور مطلب یہ ہے کہ''اے لوگو! بندوں کے حال پر حسرت کرو، اُن کے پاس جب بھی کوئی رسول آیا انہوں نے اس کا مذاق اُڑایا اور اپنی آخرت برباد کی۔''صاحب''روح المعانی'' نے اخیر میں لکھا ہے:''ولعل الاوفق للمقام المتبادر الی الافهام انّ المراد نداء حسرة کل من یاتی منه التحسر ففیه من المبالغة مافیه'': اور مقام کے زیادہ موافق ذہن کو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس سے مراد حسرت کی دعوت ہے ہر اس آدمی کو جو حسرت کر سکتا ہے، ایسی صورت میں اس میں مبالغہ ہے۔ یعنی مقام کے مناسب یہ مطلب زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہر وہ شخص جو حسرت کرنے کا اہل ہے، اُن لوگوں کے حال پر حسرت کرے، جنہوں نے نبیوں کو جھٹلایا اور اُن کا مذاق بنایا۔

ہلاک شدہ بستیوں سے عبرت حاصل کرو!

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ: کیا اُن لوگوں (یعنی اہلِ مکہ) نے اس کو نہیں دیکھا کہ ہم نے ان سے پہلے بہت سی اُمتیں ہلاک کر دیں (جن کا انہیں علم ہے اور اقرار ہے) اسفار میں جاتے ہیں تو ہلاک شدہ قوموں کے کھنڈر دیکھتے ہیں، اگر غور کرتے تو جھٹلانے اور نبیوں کا مذاق بنانے سے بچتے، اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ: یہ ہلاک شدگان ان کی طرف لوٹنے والے نہیں ہیں، یعنی جنہیں ہلاک کیا گیا وہ ختم ہو گئے، دُنیا سے چلے گئے، اب انہیں واپس آنا نہیں ہے۔ جو کچھ محل تعمیر کیے، عمارتیں بنائیں، مال جمع کیا سب کچھ دھرا رہ گیا، نہ پہلی زندگی میں ان چیزوں نے ان کی جان بچائی، نہ واپس آ کر ان سے منتفع اور مستفید ہو سکتے ہیں۔ وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ: اور یہ سب لوگ مجتمع طور پر ہمارے رُوبرو حاضر کیے جائیں گے۔ یعنی جو لوگ کُفر کی وجہ سے ہلاک کیے گئے، اُن کا جو دُنیا میں ہلاک کیا جانا اور عذاب دیا جانا ہے اسی پر بس نہیں ہے، مزید عذاب آخرت میں دیا جائے گا جو دائمی ہوگا، جو لوگ بھی ہلاک کیے جائیں گے، وہ سب مجتمع طور پر ہمارے رُوبرو حاضر ہوں گے، حجتیں قائم ہوں گی، پھر دائمی عذاب کی جگہ یعنی دوزخ میں جائیں گے۔

''قصۂ انطاکیہ'' سے حاصل شدہ فوائد

تین حضرات مذکورہ بستی میں دعوت اور تبلیغ کے کام کے لیے گئے، اُن کے بارے میں بیان فرمایا کہ پہلے دو حضرات کو بھیجا تھا، پھر تیسرا شخص بھی اُن کی تقویت کے لیے بھیج دیا۔ اس سے جماعتی طور پر دعوت و تبلیغ کا کام کرنے کا ایک طریقہ معلوم ہوا۔ یوں تو ایک شخص تنہا بھی اپنی بساط کے موافق جتنا چاہے کر سکتا ہے، اور بعض مرتبہ مخاطبین کی بدسلوکی کی وجہ سے اُسے بہت زیادہ

ثواب بھی مل سکتا ہے، لیکن جماعت بن کر لوگوں کے پاس جانے اور انہیں حق کی تبلیغ کرنے اور ایمان اور ایمانیات کی دعوت دینے کے لئے نکل کر لوگوں کے پاس پہنچنے سے بعض مرتبہ نفع زیادہ ہوتا ہے، اور فی نفسہٖ یہ طریقہ بہت مفید ہے۔ قصہ بالا سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو حضرات دینی دعوت کے لیے کہیں جائیں، تو مقامی لوگوں کو بھی اُن کی تائید میں کھڑا ہونا چاہیے جیسا کہ مذکورہ بستی کے دُور دراز حصے سے آ کر ایک شخص نے اَصحابِ ثلاثہ کی تائید کی، اس سے دعوت دینے والے حضرات کو تقویت ہوتی ہے۔

ان حضرات کے قصے سے دو باتیں اور مزید معلوم ہوئیں، اوّل یہ کہ دُور دراز سے جو شخص آیا اس نے خطاب کی ابتدا کرتے ہوئے "یٰقَوْمِ!" کہا، پھر یوں کہا: اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا یَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا کہ اے میری قوم! تم اُن لوگوں کی اتباع کرو جو کسی معاوضے یا اُجرت کا سوال نہیں کرتے، وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ: اور وہ لوگ خود بھی ہدایت پر ہیں۔ معلوم ہوا کہ جو لوگ دعوت کا کام کہیں لے کر جائیں، وہ بغیر کسی دُنیاوی غرض کے دعوت کے کام کے لیے نکلیں، اور جن لوگوں کے پاس پہنچیں، اُن سے کسی قسم کا ذرا سا بھی کوئی لالچ نہ رکھیں، نہ دعوت وضیافت کا، نہ روٹی پانی کا، نہ بوریا اور بستر کا، اپنا خرچہ خود ہی کریں۔ حضراتِ انبیاء کرام علیہم السلام کا یہ خاص وصف تھا کہ وہ اپنے دعوت کے کام کا ثواب صرف اللہ تعالیٰ سے چاہتے تھے، مخاطبین سے ذرا سی بھی نہ اُمید رکھتے تھے، نہ اُن سے کچھ طلب کرتے تھے، اِن حضرات کا فرمانا یہ تھا: وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (سورۂ شعراء:۱۰۹) اور میں تم سے توحید کی دعوت پر کوئی اُجرت طلب نہیں کرتا، میرا اَجر صرف اللہ کے ذِمّے ہے۔ سورۂ سبا میں ہے: قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ (سورۂ سبا:۴۷) آپ فرما دیجئے کہ میں نے جو کچھ کوئی عوض تم سے طلب کیا ہو، تو وہ تمہارے ہی لیے ہے، میرا اَجر صرف اللہ پر ہے۔ سورۂ ص کے آخر میں فرمایا: قُلْ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِیْنَ ﴿۸۶﴾ آپ فرما دیجئے کہ میں تم سے اپنے دعوت کے کام پر کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتا اور میں بناوٹ کرنے والوں میں سے نہیں ہوں ...... دُوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ جو لوگ ہدایت کی دعوت دیں وہ خود بھی ہدایت یافتہ ہوں، اگر خود بھی ہدایت پر ہوں گے تو مخاطبین اُن کی بات کا اثر جلدی لیں گے، اور ان میں سے کوئی شخص یوں نہ کہہ سکے گا کہ "نکلے ہو دُوسروں کو بتانے، اور دِینی اعتبار سے تمہارا اپنا حال پتلا ہے!" داعیٔ حق کو مخاطبین سے بات کرنے کا اُسلوب بھی ایسا اختیار کرنا چاہیے، جسے اُن کے کان خوشی سے سُن لیں اور قلوب گوارا کر لیں۔ مذکورہ بالا بستی کا جو شخص دُور سے دوڑا ہوا آیا تھا، ایک تو بستی والوں کا "یٰقَوْمِ!" کہہ کر اپنایا، اور یہ بتایا کہ تم اور میں ایک ہی قوم کے افراد ہیں، اُن کے ذہنوں کو قریب کرنے کے لیے یہ بتایا کہ میں تمہیں میں سے ہوں۔

پھر یہ صاحب جب اَصحابِ ثلاثہ (تینوں فرستادوں) کی تائید سے فارغ ہوئے تو اپنے اُوپر رکھ کر یوں کہا: وَمَا لِیَ لَاۤ اَعْبُدُ الَّذِیْ فَطَرَنِیْ اور کیا ہوا کہ میں اس ذات کی عبادت نہ کروں جس نے مجھے پیدا فرمایا۔ وہ شخص خود تو ہدایت یافتہ تھا، موحد تھا، اور جو مخاطب تھے وہ مشرک تھے، لیکن بات کرنے میں متکلم کا صیغہ استعمال کیا کہ مجھے کیا ہوا جو میں اپنے خالق کی عبادت نہ کروں، حالانکہ بظاہر یوں کہنا چاہیے تھا: "وَمَا لَكُمْ لَا تَعْبُدُوْنَ الَّذِیْ فَطَرَكُمْ" کہ تمہیں کیا ہوا کہ اس ذات کی عبادت نہیں کرتے جس نے تمہیں پیدا کیا، خطاب اُن سے کیا، بات اپنے اُوپر رکھی، اور توحید کی دلیل بھی بتادی اور شرک کی تردید بھی کردی کہ جس نے پیدا کیا ہے صرف وہی مستحقِ عبادت ہے، اور اس کی عبادت میں کسی کو شریک کرنا کسی بھی طرح دُرست نہیں ہے، کیونکہ اس کی

صفتِ خالقیت میں کوئی بھی شریک نہیں۔اور چونکہ اصل تبلیغ مخاطبین ہی کو کرنی تھی اس لیے آخر میں ''وَاِلَیْہِ اُرْجَعُ ''نہیں کہا کہ '' میں اُس کی طرف لوٹایا جاؤں گا'' بلکہ وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ: کہا کہ ''تم اُس کی طرف لوٹائے جاؤ گے'' اب تم سمجھ لو کہ تمہارا کیا حال بنے گا، شرک کی پاداش میں سزا بھگتنا ہے تو تم جانو۔

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے صاحب موصوف نے کہا: اِنِّیْٓ اِذًا لَّفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ اگر میں اپنے خالق کے علاوہ کسی اور کی عبادت کرنے لگوں تو کھلی ہوئی گمراہی میں پڑ جاؤں گا۔ یہ بات بھی اپنے اُوپر رکھ کر کہی، اور مخاطبین کو بتادیا کہ دیکھو! تم مشرک ہو، اور کھلی ہوئی گمراہی میں ہو۔ آخر میں کہا: اِنِّیْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّکُمْ فَاسْمَعُوْنِ: بلاشبہ میں تو تمہارے رَبّ پر ایمان لے آیا، سو تم میری بات سنو۔ اس میں اپنے ایمان کا واضح طور پر اعلان کردیا، اور اس میں بھی ان کو ایمان کی دعوت دے دی۔ ''اٰمَنْتُ بِرَبِّیْ'' کے بجائے اٰمَنْتُ بِرَبِّکُمْ: کہا اور یہ بتادیا کہ جو تمہارا پروردگار ہے، اسی پر ایمان لانا اور اسی کی عبادت کرنا لازم ہے۔ پرورش تو کرے خالق اور مالک، جس میں اس کا کوئی شریک نہیں، اور عبادت دُوسروں کی جائے، یہ تو ہلاکت اور ضلالت کی بات ہے۔ بات یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی رضا کے لیے دعوت وارشاد کا کام کرتے ہیں، ناصح اور امین ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کے قلوب میں اس کا طریقہ ڈال دیتے ہیں اور اُن کی زبانیں حُسنِ اُسلوب، حُسنِ اَداء، اور عمدہ سلیقے سے متصف ہوجاتی ہے، ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ!

وَاٰیَۃٌ لَّھُمُ الْاَرْضُ الْمَیْتَۃُ ۚۖ اَحْیَیْنٰھَا وَاَخْرَجْنَا مِنْھَا حَبًّا فَمِنْہُ یَاْکُلُوْنَ ﴿۳۳﴾

اور ان لوگوں کے لئے ایک نشانی مُردہ زمین ہے، ہم نے اُسے زندہ کیا اور ہم نے اُس سے غلے نکالے، سو وہ اس میں سے کھاتے ہیں ﴿۳۳﴾

وَجَعَلْنَا فِیْھَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِیْھَا مِنَ الْعُیُوْنِ ﴿۳۴﴾ لِیَاْکُلُوْا

اور ہم نے اس میں کھجوروں کے اور انگوروں کے باغ پیدا کئے اور ہم نے اُس میں چشمے جاری کردیئے ﴿۳۴﴾ تاکہ وہ اس کے پھلوں

مِنْ ثَمَرِہٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْہُ اَیْدِیْھِمْ ؕ اَفَلَا یَشْکُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ

سے کھائیں اور اسے اُن کے ہاتھوں نے نہیں بنایا، سو کیا وہ شکر ادا نہیں کرتے ﴿۳۵﴾ پاک ہے وہ ذات جس نے زمین سے پیدا ہونے والی

الْاَزْوَاجَ کُلَّھَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِھِمْ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَاٰیَۃٌ لَّھُمُ

چیزوں سے ہر قسم کی چیزیں پیدا فرمائیں اور ان لوگوں کی جانوں میں سے اور اُن چیزوں میں سے جنہیں یہ لوگ نہیں جانتے ﴿۳۶﴾ اور ان کے لئے نشانی

الَّیْلُ ۚۖ نَسْلَخُ مِنْہُ النَّھَارَ فَاِذَا ھُمْ مُّظْلِمُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ

رات ہے، ہم اس سے دِن کو کھینچ لیتے ہیں سو وہ اچانک اندھیرے میں رہ جاتے ہیں ﴿۳۷﴾ اور سورج چلتا ہے

لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿۳۸﴾ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ

اپنے ٹھکانے کی طرف، یہ اس کا مقرر کیا ہوا ہے جو زبردست ہے علم والا ہے ﴿۳۸﴾ اور اس نے چاند کے لئے منزلیں مقرر کر دیں، یہاں تک کہ

كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ﴿۳۹﴾ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ

وہ کھجور کی ٹہنی کی طرح رہ جاتا ہے ﴿۳۹﴾ نہ تو سورج کی مجال ہے کہ چاند کو پکڑ لے اور نہ رات دن سے آگے بڑھ کر

النَّهَارِ ؕ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴿۴۰﴾ وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ

پہلے آسکتی ہے اور سب ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں ﴿۴۰﴾ اور ان لوگوں کے لئے ایک نشانی یہ ہے کہ ہم نے ان کی اولاد کو بھری ہوئی

الْمَشْحُوْنِ ۙ ﴿۴۱﴾ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ

کشتی میں سوار کیا ﴿۴۱﴾ اور ہم نے ان کے لئے کشتی جیسی چیزیں پیدا کیں جن پر یہ لوگ سوار ہوتے ہیں ﴿۴۲﴾ اور اگر ہم چاہیں تو انہیں ڈبو دیں

فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ ۙ ﴿۴۳﴾ اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَمَتَاعًا

سو ان کی کوئی بھی فریاد رسی کرنے والا نہ ہو اور نہ انہیں چھٹکارا دیا جائے ﴿۴۳﴾ مگر یہ کہ ہماری مہربانی ہو جائے اور ایک وقت مقررہ تک فائدہ دینا

اِلٰى حِيْنٍ ﴿۴۴﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ

منظور ہو ﴿۴۴﴾ اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ تم اس سے ڈرو جو تمہارے آگے ہے اور جو پیچھے ہے تاکہ تم پر

تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَ

رحم کیا جائے ﴿۴۵﴾ اور اُن کے رب کی نشانیوں میں سے جو نشانی بھی اُن کے پاس آتی ہے اس کی طرف سے اعراض کرنے والے بن جاتے ہیں ﴿۴۶﴾ اور

اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا

جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اُس میں سے خرچ کرو جو اللہ نے تمہیں دیا ہے تو کافر لوگ اہلِ ایمان سے کہتے ہیں

اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗۤ ۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۷﴾ وَيَقُوْلُوْنَ

کہ کیا ہم لوگ اُن لوگوں کو کھلائیں جنہیں اللہ چاہے تو کھلا دے، بات یہی ہے کہ تم کھلی ہوئی گمراہی میں ہو ﴿۴۷﴾ اور وہ کہتے ہیں کہ

مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۸﴾ مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ

یہ وعدہ کب ہوگا اگر تم سچے ہو؟ ﴿۴۸﴾ وہ لوگ بس ایک سخت آواز کے انتظار میں ہیں جو اُن کو پکڑ لے

وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ ﴿۴۹﴾ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۰﴾

اور وہ آپس میں جھگڑ رہے ہوں ﴿۴۹﴾ سو نہ تو وہ کوئی وصیت کر سکیں گے اور نہ اپنے گھروں کے پاس لوٹ کر جا سکیں گے ﴿۵۰﴾

تفسیر

دلائلِ قدرت

اللہ تعالیٰ کی قدرت کے مظاہرے تو بہت ہیں اور کثیر تعداد میں ایسی چیزیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کے کمالِ قدرت پر دلالت کرتی ہیں، اللہ کی نشانیاں ہیں۔ انہیں نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ زمین مردہ ہوجاتی ہے اس میں کوئی سبزہ اور گھاس پھونس باقی نہیں رہتا، پھر اللہ جل شانہٗ پانی برسا دیتے ہیں اور اس پانی کے ذریعے زمین کو زندہ فرما دیتے ہیں، پانی برسا زمین زندہ ہوگئی، کسانوں نے بیج ڈالا تو کھیتی ظاہر ہوگئی، آگے بڑھی، بالیاں نکلیں، اُن میں دانے پیدا ہوئے، پھر وہ پک گئے، کاٹی گئیں، غلے نکلے، پھر لوگوں نے ان کو غذا بنایا، یہ تو سلسلہ کھیتی کا ہے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں بہت سارے باغ بھی پیدا فرمائے ہیں، اُن میں مختلف قسم کے درختوں کے باغ ہیں۔ آیتِ بالا میں انگوروں اور کھجوروں کے باغوں کا تذکرہ فرمایا۔ ''کھجور'' اور ''انگور'' یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتیں ہیں، ان میں بڑی غذائیت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے چشمے بھی پیدا فرما دیئے ہیں، جن کا پانی میٹھا ہوتا ہے بارش نہ ہو تو ان چشموں سے کھیتوں کو اور باغوں کو سیراب کر دیا جاتا ہے۔ جس طرح کھیتوں سے پیدا ہونے والے غلوں سے خوراک حاصل کرتے ہیں، اسی طرح درختوں کے پھل بھی غذائیت کا کام دیتے ہیں، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ان کے میوہ جات بھی بنائے جاتے ہیں۔ کھیتوں اور باغوں کا تذکرہ فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا: وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ کہ یہ جو چیزیں ہم نے پیدا کی ہیں انہیں ان کے ہاتھوں نے پیدا نہیں کیا، یہ سب چیزیں ہماری ہی بنائی ہوئی ہیں، ان نعمتوں کا شکر کرنا لازم ہے، اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ: کیا پھر بھی شکر ادا نہیں کرتے؟

سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا: یعنی زمین سے جو بھی چیزیں پیدا ہوتی ہیں سب اُس ذات نے پیدا فرمائی ہیں، جو بالکل بے عیب ہے، ہر نقص اور ہر کوتاہی سے پاک ہے۔ یہ چیزیں جو زمین کی پیداوار ہیں، ان میں طرح طرح کے انواع واقسام ہیں اور خود انسانوں کی جانوں میں بھی ازواج ہیں، یعنی کچھ مذکر ہیں اور کچھ مونث ہیں۔ اپنی جانوں کو اور زمین کی پیداوار کو تو لوگ جانتے ہیں ان کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے جو برّ و بحر میں پھیلی ہوئی ہیں، درندے ہیں، چرندے ہیں، دریائی جانور ہیں، ان میں بھی مختلف قسم کے انواع واقسام ہیں۔ انسان ہل چلانے اور بیج ڈالنے اور ٹریکٹر چلانے کی کوشش تو کر لیتے ہیں لیکن پیدا فرمانا، زمین سے نکالنا، بڑھانا، پھل پھول کے لائق بنانا، دانہ نکالنا، پھر ثمرات ظاہر ہونا، یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت اور تخلیق اور ایجاد سے ہے۔

''آیاتِ علویہ'' کا ذکر

''آیاتِ سفلیہ'' بیان فرمانے کے بعد ''آیاتِ علویہ'' کا بیان شروع ہو رہا ہے۔ رات اور دن کا تعلق چونکہ سورج کے طلوع اور غروب سے ہے، اس لئے اِن دونوں کو بھی ''آیاتِ علویہ'' میں ذکر فرمادیا۔ ارشاد فرمایا کہ لوگوں کے لیے رات بھی ایک نشانی ہے، رات کے آنے جانے سے بھی اپنے خالق کو پہچان سکتے ہیں۔ سب کو معلوم ہے کہ رات کے آنے جانے میں صرف اللہ تعالیٰ کے حکمِ تکوینی کو دخل ہے۔ فرمایا: نَسۡلَخُ مِنۡهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمۡ مُّظۡلِمُوۡنَ ہم اس سے دن کو کھینچ لیتے ہیں، سو وہ اچانک اندھیرے میں رہ جاتے ہیں۔ یعنی جس جگہ روشنی ہوتی ہے اور دن ہوتا ہے اس جگہ سے ہم روشنی کو کھینچ دیتے ہیں، جب روشنی ختم ہو جاتی ہے تو دن ختم ہو جاتا ہے اور رات آجاتی ہے، دن گیا رات آئی اور لوگوں پر اندھیرا چھا گیا، اب ان میں سے کسی میں بھی یہ طاقت نہیں ہے کہ رات کو ختم کر کے دن کی روشنی لے آئے، جس نے رات کو پیدا فرمایا، وہی دن کو پیدا فرماتا ہے۔

''سورج'' اپنے محوَر پر چلنے میں اللہ کا پابند ہے

وَالشَّمۡسُ تَجۡرِیۡ لِمُسۡتَقَرٍّ لَّهَا: اور سورج اپنے ٹھکانے کی طرف چلتا ہے۔ سورج بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے، اس کا وجود مستقل نشانی ہے، اور اس کی روشنی مستقل نشانی ہے، پھر اس کا اپنے ٹھکانے کے لئے چلنا یہ بھی مستقل نشانی ہے، اس کی رفتار اور اس کے محوَر پر چلنا، اِدھر اُدھر نہ ہونا، یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرتِ قاہرہ کی نشانی ہے۔ ذٰلِكَ تَقۡدِیۡرُ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ یہ اس کا مقرر کیا ہوا ہے جو زبردست ہے علم والا ہے۔ سورج پابند ہے کہ اپنے محوَر پر چلے اور اسی رفتار پر چلے جو اس کی رفتار مقرر ہے، گرمیوں کے زمانے میں سورج خطِ استوا پر چلتا ہے، اور سردیوں میں ہٹ جاتا ہے اور دُوسرا محوَر اختیار کر لیتا ہے، اس کا جو راستہ خالق جل مجدہٗ کی طرف سے طے کر دیا گیا ہے، اُس کے خلاف نہیں چل سکتا۔

سورج کے ''مستقر'' یعنی ٹھکانے کا کیا مطلب ہے؟ بعض لوگوں نے بلا وجہ اس کو مجاز پر محمول کیا ہے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اس کا یہ مطلب ہے کہ ایک سال سے دُوسرے سال کے ختم تک اس کا جو دور ہے، اسی حد متعین کا نام ''مستقر'' ہے۔ اور بعض حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ ''لام'' تعلیلیہ ہے، اور مطلب یہ ہے کہ چونکہ اسے اپنے مستقر کے مشارق اور مغارب پر پہنچنا ہے، اس لیے چلتا رہتا ہے، اس کی ایک حد مقرر ہے، وہاں تک پہنچنے اور پھر آگے بڑھنے کو ''مستقر'' فرمایا۔ اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ بارہ برجوں میں مخصوص طریقہ پر ٹھہرنا، اور پھر آگے بڑھنا یہ مستقر میں پہنچنا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ ''مستقر'' اسم زمان ہے، اور مطلب یہ ہے کہ اس کے مسلسل چلتے رہنے کا جو ایک وقت مقرر ہے، اُس وقت تک چلتا رہے گا، اور جب قیامت قائم ہوگی تو اس کی رفتار ختم ہو جائے گی۔

''سورج'' کا سجدہ کرنا

ان سب باتوں کی بنیاد محض احتمالات ہیں، صحیح بات وہ ہے جو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے

ایک دن مجھ سے سورج چھپ جانے کے بعد فرمایا، کیا تم جانتے ہو یہ کہاں جاتا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول ہی خوب جانتے ہیں! اس پر آپ نے ارشاد فرمایا کہ بے شک یہ چلتے چلتے عرش کے نیچے پہنچ کر سجدہ کرتا ہے، اور حسب عادت مشرق سے طلوع ہونے کی اجازت چاہتا ہے، اور اسے اجازت دے دی جاتی ہے، اور ایسا بھی ہونے والا ہے کہ ایک روز یہ سجدہ کرے گا اور اس کا سجدہ قبول نہ ہوگا، اور مشرق سے طلوع ہونے کی اجازت چاہے گا تو اجازت نہ دی جائے گی، اور کہا جائے کہ جہاں سے آیا ہے وہیں واپس لوٹ جا۔ چنانچہ سورج واپس ہو کر مغرب کی جانب سے طلوع ہوگا۔ پھر فرمایا کہ وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا کا یہی مطلب ہے کہ اپنے مقررہ ٹھکانے تک جا کر مشرق سے نکلتا ہے، اور فرمایا کہ اس کا ٹھکانا عرش کے نیچے ہے۔[1] حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ سورج چلتا ہے، اپنے مستقر پر جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتا ہے، آگے بڑھنے اور طلوع ہونے کی اجازت مانگتا ہے، جب اجازت ملتی ہے تو وہ آگے بڑھتا ہے اور طلوع ہوتا ہے۔ ایک وہ وقت بھی آئے گا، جب وہ آگے بڑھنے کی اجازت طلب کرے گا، تو اجازت نہ دی جائے گی، اور واپس پیچھے لوٹنے کا حکم ہوگا۔ چنانچہ وہ واپس پیچھے لوٹ جائے گا۔ یہاں لوگوں نے یہ اشکال کیا ہے کہ آلاتِ رصدیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حرکت کسی وقت بھی ختم نہیں ہوتی برابر چلتا رہتا ہے۔ اس کا اصل جواب تو یہ ہے کہ حدیث شریف کی تصریح کے بعد اس کے خلاف کوئی قول معتبر نہیں! پھر کیا یہ ضروری ہے کہ پورے عالم کا ہر ہر جگہ کا طلوع اور غروب مراد ہو؟ ممکن ہے کہ خاص مدینہ منورہ اور اس کے محاذی نقطۂ غروب والے مقامات کا غروب مراد ہو، اور یہ سجدے والا سکون ایسا خفیف ہو جس کا آلاتِ رصدیہ سے ادراک نہ ہوتا ہو۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ اس سے ''حرکتِ سنویہ'' بھی مراد ہو سکتی ہے، یعنی ہر سال کے ختم پر وہ اپنے مستقر پر جاتا ہے پھر سجدہ کرتا ہے اور طلوع ہونے کی اجازت لیتا ہے، لیکن یہ اُس مفہوم کے خلاف ہے جو حدیث شریف سے متبادر ہوتا ہے۔

فائدہ:- سورج کا چلنا تو آیت کریمہ سے ثابت ہوا، جس کا انکار کفر ہے۔ رہی یہ بات کہ زمین چلتی ہے یا نہیں؟ اس کے بارے میں قرآنِ مجید ساکت ہے، اور سورہ نمل میں جو اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا (سورۂ نمل: ۶۱) فرمایا ہے، اس سے قطعی طور پر زمین کے عدم تحرک پر واضح دلالت نہیں ہے، کیونکہ ''قَرَارًا'' کا ایک یہ معنی بتایا گیا ہے کہ وہ اس طرح حرکت نہیں کرتی کہ اس پر انسانوں کا رہنا مشکل ہو جائے۔ جیسے سورہ لقمان میں وَاَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ میں بیان فرمایا ہے۔

''چاند'' کی منازل

یہ بتانے کے بعد کہ آفتاب کا اپنے مستقر تک جانا اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانی ہے، چاند کے بارے میں فرمایا: وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ: اور ہم نے چاند کی منزلیں مقرر کیں یہاں تک کہ وہ کھجور کی پرانی ٹہنی کی طرح رہ جاتا ہے، یعنی جس طرح کھجور کی پرانی ٹہنی ٹیڑھی ہو جاتی ہے اسی طرح مہینے کے اول میں اور آخر میں نظر کے سامنے بظاہر خم دار نظر آتا ہے، چاند کی جو منزلیں اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہیں ترتیب کے ساتھ انہیں میں چلتا رہتا ہے۔

---

(۱) بخاری ۱/ ۴۵۳۔ نیز ۲/ ۷۰۹۔ مسلم ۱/ ۸۸۔ مشکوٰۃ ۲/ ۴۷۲، باب العلامات بین یدی الساعۃ

''سورج''، ''چاند'' کو نہیں پکڑ سکتا!

اس کے بعد چاند اور سورج کی رفتار اور رات دِن کی آمد کے نظام بے مثال کو بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَ لَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ کہ نہ سورج کی یہ مجال ہے کہ چاند کو جا کر پکڑ لے، اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آفتاب رات کو محو نہیں کر سکتا، جو چاند کے منوّر ہونے کا وقت ہے۔ اور دِن کا جتنا وقت مقرر ہے اُس وقت کے ختم ہونے سے پہلے رات نہیں آسکتی۔ رات آگے بڑھ کر دِن کا کچھ حصّہ اپنے اندر لے لے، اور مقررہ نظام کے خلاف دِن گھٹ جائے اور رات بڑھ جائے، ایسا کوئی اختیار نہ رات کو ہے، نہ دِن کو ہے۔ وَ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ: اور سب ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں، ''فلک'' گول چیز کو کہتے ہیں، جس کا ترجمہ ''دائرے'' سے کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ چاند اور سورج کی حرکت مستدیر ہے۔

''کشتی کی سواری'' اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے!

ان آیات میں کشتی کی سواری کا ذِکر ہے۔ کشتیوں کا دریاؤں میں چلنا (مطلق ''کشتی'' ہر چھوٹے بڑے جہاز کو شامل ہے) انسانوں کا ان پر سوار ہونا، اور سامان لادنا، ایک برّاعظم سے دوسرے برّاعظم تک سفر کرنا، اس میں اللہ تعالیٰ کا اِنعامِ عظیم بھی ہے، اور قدرتِ قاہرہ پر دلالت بھی ہے۔ کشتی کی سواری کے ساتھ یوں بھی فرمادیا: وَ خَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا یَرْكَبُوْنَ: اور ہم نے ان کے لیے کشتی جیسی ایسی چیزیں پیدا فرمائیں جن پر یہ لوگ سوار ہوتے ہیں۔ یہ سواریاں گھوڑے، خچر اور گدھے ہیں جن کا سورۂ نحل میں ذکر ہے: وَّ الْخَیْلَ وَ الْبِغَالَ وَ الْحَمِیْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَ زِیْنَةً۔ اور اَب تو ریل گاڑی اور پٹرول سے چلنے والی گاڑیاں اور ہوائی جہاز بھی سواریوں کا کام دے رہے ہیں، اور بوجھ بھی لے جاتے ہیں۔ سورۂ نحل میں ان نئی سواریوں کی بلکہ ان کے بعد جو سواریاں پیدا ہوں گی اُن کے بارے میں پیشین گوئی فرمادی: وَ یَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (آیت:۸) اور اللہ وہ چیزیں پیدا فرمائے گا جو تم نہیں جانتے۔ مزید فرمایا کہ یہ لوگ جو جہازوں اور کشتیوں میں امن وامان کے ساتھ سفر کرتے ہیں، یہ امن وامان سے رکھنا اور ڈوبنے سے حفاظت کرنا ہمارا ہی اِنعام ہے۔ وَ اِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِیْخَ لَهُمْ: اور اگر ہم چاہیں تو انہیں غرق کر دیں پھر انہیں کوئی فریادرس نہ ملے، وَ لَا هُمْ یُنْقَذُوْنَ: اور نہ انہیں خلاصی دی جائے۔ اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَ مَتَاعًا اِلٰى حِیْنٍ مگر یہ کہ ہماری مہربانی ہو جائے اور ایک وقتِ معین تک انہیں فائدہ دینا منظور ہو۔ اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے محفوظ فرماتا ہے اور وقتِ معین تک فائدہ پہنچاتا ہے۔

اِعراض کرنے والوں کی محرومی

پھر فرمایا: وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا بَیْنَ اَیْدِیْكُمْ وَ مَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ: اور جب مکذّبین ومنکرین سے کہا جاتا ہے کہ تم اس عذاب سے ڈرو جو تمہارے سامنے ہے (یعنی غرق کیا جانا، یا زمین میں دھنسایا جانا، یا مقتول ہونا وغیرہ) اور اُس عذاب سے ڈرو جو

تمہارے پیچھے ہے یعنی آخرت میں آنے والا ہے۔تمہارا یہ ڈرنا تم پر رحمت کا سبب بن جائے گا،تو وہ لوگ نصیحت پر کان نہیں دھرتے اوراس سے اِعراض کرتے ہیں۔

مالی اِنعامات

یہ تو ان کا معاملہ عقیدۂ توحید کے ساتھ ہوا، جسے وہ قبول کرنے کو تیار نہیں! آگے مالی اِنعامات ہوتے ہوئے جو کنجوسی اور ناشکری کرتے تھے اُس کا تذکرہ فرمایا کہ جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے تمہیں دیا ہے اُس میں سے مسکینوں اور حاجت مندوں پر خرچ کرو،تو خرچ کرنے کی بجائے شرارت سے اور مذاق اُڑانے کی نیت سے کافروں نے یوں کہا''کیا ہم اُن لوگوں کو کھلائیں جو تمہارے ساتھ ایمان قبول کر چکے ہیں، اللہ چاہے تو انہیں کھلا دے'' اُن کا مطلب یہ تھا کہ تم کہتے ہو کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی رزق دینے والا ہے،تو بس وہی انہیں رزق دے دے گا۔اُن لوگوں نے یہ بھی کہا کہ تم جو ہمیں خرچ کرنے کو کہہ رہے ہو، یہ کھلی ہوئی گمراہی ہے۔کُفّار بھی یہ بات مانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہی رزق دینے والا ہے اور کھلانے والا ہے،لیکن اس بات کو انہوں نے بطور طنز کے ذِکر کیا، اور مقصد ان کا یہ تھا کہ تم تو یوں کہتے ہو کہ جسے اللہ تعالیٰ چاہے کھلا دے تو اپنے قول کے مطابق اللہ تعالیٰ ہی سے مانگ لو اور انہیں کھلا دو۔

وقوعِ قیامت کے یقینی ہونے کا بیان

توحید کے دلائل اور منکرین کے اِعراض کا بیان فرمانے کے بعد وقوعِ قیامت کے یقینی ہونے کا اور منکرین کے اِستبعاد کا تذکرہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ: اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب ہوگا اگر تم سچے ہو؟ یعنی تم جو یوں کہتے ہو کہ قیامت آئے گی، ہمارے خیال میں یہ تمہاری باتیں ہی باتیں ہیں،آنی ہوتی تو کب کی آچکی ہوتی،اس کے واقع ہونے کی جو تم خبر دے رہے ہو، اگر تم اس خبر میں سچے ہو،تو وقت طے کر دو، کہ قیامت فلاں وقت آئے گی۔یہ بات کہنے سے ان کا مقصود وقوعِ قیامت کا انکار کرنا تھا۔اس انکار کو انہوں نے استفہامِ انکاری کے پیرائے میں بیان کیا، اللہ جل شانہٗ نے فرمایا: مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ: یہ لوگ جو قیامت کا انکار کر رہے ہیں، ان کے انکار کرنے سے قیامت کا آنا رُک نہیں جائے گا،بس یہ لوگ ایک چیخ کے انتظار میں ہیں جو اِنہیں پکڑ لے گی،اور اس وقت یہ لوگ آپس میں جھگڑ رہے ہوں گے، اس وقت جو جہاں ہوگا، وہیں دھرا رہ جائے گا،اور وہیں مرجائے گا،اس وقت نہ کوئی وصیت کر سکیں گے، اور نہ اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ سکیں گے۔یہ نفخۂ اُولیٰ یعنی پہلی بار صور پھونکنے کے وقت ہوگا۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ قَالُوْا يٰوَيْلَنَا
اور صور پھونکا جائے گا سو وہ سب یکایک قبروں سے نکل کر اپنے رَبّ کی طرف جلدی جلدی چلنے لگیں گے ﴿۵۱﴾ وہ کہیں گے کہ ہائے ہماری کم بختی

مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَ صَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۲﴾ اِنْ

ہمیں کس نے ہماری لیٹنے کی جگہ سے اُٹھادیا، یہ وہی ہے جس کا رحمٰن نے وعدہ فرمایا اور پیغمبروں نے سچی خبر دی ﴿۵۲﴾ بس

كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴿۵۳﴾ فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ

وہ ایک چیخ ہوگی سو وہ سب ہمارے پاس حاضر کردیئے جائیں گے ﴿۵۳﴾ سو اُس دن کسی جان پر ذرا سا بھی

نَفْسٌ شَيْـًٔا وَّلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۴﴾ اِنَّ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِيْ

ظلم نہ ہوگا اور تمہیں صرف انہی کاموں کا بدلہ ملے گا جو تم کرتے تھے ﴿۵۴﴾ بلاشبہ آج جنت والے اپنے

شُغُلٍ فٰكِهُوْنَ ﴿۵۵﴾ هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلٰلٍ عَلَى الْاَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوْنَ ﴿۵۶﴾ لَهُمْ

مشغلوں میں خوش ہوں گے ﴿۵۵﴾ وہ اوراُن کی بیویاں سایوں میں ہوں گے، مسہریوں پر تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے ﴿۵۶﴾ اُن کے لئے

فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ ﴿۵۷﴾ سَلٰمٌ ۣ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ﴿۵۸﴾ وَامْتَازُوا

اس میں میوے ہوں گے اور جو کچھ طلب کریں گے انہیں وہ ملے گا ﴿۵۷﴾ مہربان رب کی طرف سے اُن پر سلام ہوگا ﴿۵۸﴾ اور اے مجرمو!

الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۹﴾ اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ

آج علیحدہ ہوجاؤ ﴿۵۹﴾ اے بنی آدم! کیا میں نے تمہیں تاکید نہیں کی تھی کہ شیطان کی عبادت مت کرنا،

اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۶۰﴾ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۶۱﴾ وَلَقَدْ

بلاشبہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے ﴿۶۰﴾ اور میری عبادت کرنا، یہ سیدھا راستہ ہے ﴿۶۱﴾ اور یہ واقعی بات ہے کہ

اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا ؕ اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۲﴾ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ كُنْتُمْ

شیطان نے تم میں سے کثیر مخلوق کو گمراہ کر دیا، کیا تم سمجھ نہیں رکھتے تھے؟ ﴿۶۲﴾ یہ جہنم ہے جس کا

تُوْعَدُوْنَ ﴿۶۳﴾ اِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۶۴﴾ اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ

تم سے وعدہ کیا جاتا تھا ﴿۶۳﴾ آج تم اس میں داخل ہوجاؤ اپنے کفر کی وجہ سے ﴿۶۴﴾ آج ہم اُن کے مونہوں پر مُہر لگادیں گے

وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۶۵﴾ وَلَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا

اور ہم سے اُن کے ہاتھ کلام کریں گے اور اُن کے پاؤں اس کی گواہی دیں گے جو کچھ وہ کیا کرتے تھے ﴿۶۵﴾ اور اگر ہم چاہتے تو مٹا دیتے

عَلٰٓى اَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰى يُبْصِرُوْنَ ﴿۶۶﴾ وَلَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى

اُن کی آنکھوں کو، سو وہ راستے کی طرف دوڑتے پھرتے، سو اُن کو کہاں نظر آتا؟ ﴿۶۶﴾ اور اگر ہم چاہتے تو انہیں مسخ کر دیتے

مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِيًّا وَّلَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۶۷﴾

اُن کی جگہ پر، اس طرح پر کہ وہ جہاں ہیں وہی رہ جاتے جس کی وجہ سے یہ نہ آگے چل سکتے اور نہ پیچھے کو لوٹ سکتے ﴿۶۷﴾

تفسیر

نفخِ صور کے وقت حیرانی اور پریشانی

مزید فرمایا: وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ: اور صور میں پھونکا جائے گا تو وہ اچانک قبروں سے نکل کر اپنے رَبّ کی طرف، یعنی حساب کی جگہ کے لئے جلدی جلدی چلنے لگیں گے۔ قبروں سے اُٹھنے والے جن کو اللہ تعالیٰ امن و امان نہ دے، گھبراہٹ سے محفوظ نہ فرمائے، وہ کہیں گے: يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا: ہائے ہماری کم بختی! ہمیں لیٹنے کی جگہ سے کس نے اُٹھا دیا؟ فرشتے جواب میں کہیں گے: هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ: یہ وہی قیامت کا دِن ہے جس کا رحمٰن نے وعدہ فرمایا تھا اور پیغمبروں نے سچی خبر دی تھی۔ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ: بس وہ نفخۂ ثانیہ ایک زور کی آواز ہوگی، جس سے یکایک سب جمع ہو کر ہمارے پاس حاضر کیے جائیں گے۔ یہ جمع ہونا حساب کتاب کے لیے ہوگا، حساب ہونے پر جس کو جو سزا ملے گی اس میں کسی جان پر کچھ ظلم نہ ہوگا، نہ کسی کی کوئی نیکی کم کی جائے گی جو لائقِ ثواب ہو، اور نہ کسی کے گناہوں میں کسی نہ کردہ گناہ کا اضافہ ہوگا۔ سورۂ کہف میں فرمایا: وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۗ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا (آیت: ۴۹) اور انہوں نے جو عمل کیے تھے ان کو حاضر پائیں گے اور آپ کا رَبّ کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔

جنّت کی نعمتوں کا ذِکر

ان آیات میں اہلِ جنّت کی بعض نعمتوں کا تذکرہ فرمایا۔ اوّل تو یہ فرمایا کہ یہ لوگ اپنے اپنے مشغلوں میں خوش ہوں گے۔ صاحبِ ''روح المعانی'' لکھتے ہیں: ''والمراد به ما هم فيه من النعيم الذي شغلهم عن كل ما يخطر بالبال'' یعنی ''شغل'' سے وہاں کی نعمتوں میں مشغول رہنا مراد ہے، وہاں کی نعمتیں ہر اس چیز کے تصور سے بے پرواہ کر دیں گی، جن کا تصور آ سکتا ہو۔ ''فٰكِهُوْنَ'' کا ایک ترجمہ تو وہی ہے جو اُوپر لکھا گیا ہے، یعنی ''وہ اپنی نعمتوں میں خوش ہوں گے'' اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اس سے تمتع اور تلذذ مراد ہے، اور مطلب یہ ہے کہ ان کے پاس میوے موجود ہوں گے جن میں سے کھایا کریں گے۔ پھر فرمایا کہ اہلِ جنّت اور ان کی بیویاں سایوں میں ہوں گے، جہاں ناگواری ذرا نہ ہوگی۔ ''اَرَآئِكَ'' یعنی مسہریوں پر ہوں گے۔ یہ

اَرِیْکَةٌ کی جمع ہے، اریکہ مسہری کو کہتے ہیں۔ مُتَّکِـُٔوْنَ: تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے۔ سورۂ واقعہ میں فرمایا: عَلٰی سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ ﴿﴾ مُّتَّكِـِٕیْنَ عَلَیْهَا مُتَقٰبِلِیْنَ وہ لوگ سونے کے تاروں سے بنے ہوئے تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے۔ مزید فرمایا: لَهُمْ فِیْهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُمْ مَّا یَدَّعُوْنَ: اس میں ان کے لیے میوے ہوں گے اور جو کچھ طلب کریں گے انہیں وہ ملے گا۔ اس میں یہ بتادیا کہ اہلِ جنّت کی جن نعمتوں کا صریح طور پر تذکرہ کردیا گیا ہے، صرف انہی نعمتوں میں انحصار نہیں ہے، وہ لوگ وہاں جو کچھ بھی طلب کریں گے، سب کچھ حاضر کردیا جائے گا۔ سورۂ زُخرف (آیت نمبر ۷۱) میں فرمایا: وَفِیْهَا مَا تَشْتَهِیْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْیُنُ: اور اس میں وہ چیزیں ملیں گی جن کی ان کے نفسوں کو خواہش ہوگی اور جن سے آنکھوں کو لذّت ہوگی۔ اور ان سب سے بڑھ کر یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلام آئے گا جسے سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ فرما کر بتایا ہے۔ کیا کہنے ان بندوں کے جن کے لئے ان کے رَبّ کا سلام آئے! حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس کے درمیان کہ اہلِ جنّت اپنی نعمتوں میں ہوں گے، اچانک ایک نُور کی چمک ہوگی، اُوپر کو اپنے سَر اُٹھائیں گے، تو دیکھیں گے کہ رَبّ جل شانہٗ نے ان پر توجہ فرمائی ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہوگا: ''اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ یَا اَهْلَ الْجَنَّةِ''۔[1]

اہلِ دوزخ کی تباہی و بربادی

اہلِ جنّت کا اِکرام اور اِنعام بیان فرمانے کے بعد اہلِ دوزخ کی تباہی اور بربادی کو بیان فرمایا جو قیامت کے دِن ان کے سامنے آئے گی۔ اوّل تو یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ان سے خطاب ہوگا کہ ''اے مجرمو! آج تم علیحدہ ہوجاؤ'' دُنیا میں تم اہلِ ایمان کے ساتھ ملے جلے رہتے تھے، اور قبروں سے نکل کر بھی میدانِ حشر میں اکٹھے جمع ہوئے ہو، اب تم ان سے علیحدہ ہوجاؤ، کیونکہ ان کو جنّت میں جانا ہے، اور تم کو دوزخ میں جانا ہے۔ یہ آیت بہت زیادہ فکرمند بنانے والی ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ایک مرتبہ پوری رات نفل نماز میں کھڑے رہے، اور اسی آیتِ مبارکہ کو پڑھتے رہے۔ اس میں فکر کی بات یہ ہے کہ جس وقت یہ حکم ہوگا اس وقت میں کن لوگوں میں ہوں گا؟ مجرمین میں ہوں گا یا مؤمنین میں؟ کافروں سے یہ خطاب بھی ہوگا: اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَیْكُمْ: اے آدم کی اولاد! کیا میں نے تمہیں یہ تاکید نہیں کی تھی کہ شیطان کی عبادت مت کرنا۔ یعنی اس کی فرماں برداری مت کرنا اور اس کے کہنے کے مطابق عمل نہ کرنا، بے شک وہ تمہارا کھلا ہوا دُشمن ہے، اور تمہیں تاکید کی تھی کہ میری عبادت کرنا، یہ سیدھا راستہ ہے۔ تم اس سیدھے راستہ سے ہٹ گئے، وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ: اور یہ بات واقعی ہے کہ شیطان نے تم میں سے کثیر مخلوق کو گمراہ کردیا، کیا تم سمجھ نہیں رکھتے تھے، اب اس گمراہی کا بدلہ ملے گا، هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ: یہ جہنّم ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، اِصْلَوْهَا الْیَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ: آج اس میں داخل ہوجاؤ اس وجہ سے کہ تم کُفر کرتے تھے۔

---

(۱) ابن ماجہ ص ۱۷، باب فیما انکرت الجہمیة۔ مشکوۃ ۲/ ۵۰۲، باب رؤیة اللہ، فصل ثالث۔

مجرمین کے خلاف ان کے اَعضا کی گواہی

کافروں کی سزا بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا: اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰۤى اَفْوَاهِهِمْ ہم آج کے دن ان کے مونہوں پر مُہر لگا دیں گے، وَتُكَلِّمُنَاۤ اَيْدِيْهِمْ: اور ہم سے ان کے ہاتھ کلام کریں گے، وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ: اور ان کے پاؤں ان کاموں کی گواہی دیں گے جو وہ کیا کرتے تھے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ مجرمین کی زبانوں پر مُہر لگا دی جائے گی، اور ہاتھ پاؤں ان کے اعمالِ بد کی گواہی دیں گے۔ اور سورۃ النور (آیت: ۲۴) میں فرمایا: يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اعمالِ بد کی گواہی زبان بھی دے گی۔ اس میں کوئی تعارض نہیں ہے، کیونکہ قیامت کے دن احوال مختلف ہوں گے، کسی وقت ہاتھ پاؤں بلکہ ان کے چمڑے تک ان کے خلاف گواہی دے دیں گے اور زبان نہ بول سکے گی۔ اور جب زبان کھول دی جائے گی تو زبان سے بھی اپنی نافرمانی کے اقراری ہو جائیں گے۔

اس کے بعد فرمایا: وَلَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰۤى اَعْيُنِهِمْ اگر ہم چاہیں تو ان کی آنکھوں کو ختم کر دیں، پھر وہ راستے کی طرف دوڑیں، سو ان کو کہاں نظر آئے، وَلَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ اور اگر ہم چاہیں تو ان کی جگہوں پر ہی ان کی صورتوں کو مسخ کر دیں، تو انہیں نہ گزرنے کی طاقت رہے نہ واپس ہو سکیں۔ ان دو آیتوں میں یہ بتایا کہ ہم دُنیا میں بھی سزا دینے پر قدرت رکھتے ہیں، اور ان سزاؤں کی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہم ان کی آنکھوں کو ختم کر دیں یعنی چہرے کو سپاٹ بنا دیں، آنکھیں باقی ہی نہ رہیں، آگے بڑھنا چاہیں تو کچھ بھی نظر نہ آئے۔ اسی طرح ہم ان ہی کی جگہ رکھتے ہوئے انہیں مسخ بھی کر سکتے ہیں، یعنی ان کی صورتیں بدل سکتے ہیں، جیسے گزشتہ اُمتوں میں سے بعض لوگ بندر اور خنزیر بنا دیئے گئے، جب جانور ہی بن جائیں تو جہاں تھے، وہیں رہ جائیں، نہ آگے بڑھ سکیں، نہ پیچھے ہٹ سکیں، جو مقاصدِ دُنیا دیہ لے کر نکلے تھے، ان کا ہوش ہی نہ رہے گا۔

وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ؕ اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ ۝۶۸ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ
اور ہم جس کی عمر دراز کر دیتے ہیں اُس کو خلق میں اُلٹا کر دیتے ہیں، کیا یہ سوچتے نہیں؟ ۶۸ ہم نے اس پیغمبر کو شعر کی تعلیم نہیں دی، اور نہ یہ
لَهٗ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۝۶۹ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى
اس کے لئے مناسب ہی ہے، یہ تو ایک یاددہانی ہے اور واضح قرآن ہے ۶۹ تا کہ وہ ڈرائے اس شخص کو جو زندہ ہے اور تا کہ ثابت ہو جائے بات
الْكٰفِرِيْنَ ۝۷۰ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَاۤ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا
کافروں پر ۷۰ کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں؟ بے شک ہم نے پیدا کیے ان کے لئے چوپائے اُن چیزوں میں سے جن کو ہمارے ہاتھوں نے بنایا، پس یہ لوگ اُن

مٰلِكُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا

چوپایوں مالک ہیں ﴿۷۱﴾ اور ہم نے تابع کر دیا ان چوپایوں کو ان لوگوں کے لیے، ان چوپایوں میں سے ان کے لئے سواریاں ہیں اور ان میں

يَاْكُلُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ۖ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾ وَاتَّخَذُوْا مِنْ

سے بعض کو یہ کھاتے ہیں ﴿۷۲﴾ اور ان کے لئے ان چوپایوں کے اندر بہت نفع ہیں اور پینے کی چیزیں ہیں، کیا یہ شکر ادا نہیں کرتے ﴿۷۳﴾ اللہ کے علاوہ

دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۷۴﴾ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ ۙ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ

انہوں نے اور معبود بنا رکھے ہیں، تا کہ یہ لوگ مدد کیے جائیں ﴿۷۴﴾ وہ ان کی مدد کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، اور وہ ان کے لئے لشکر ہوں گے

مُّحْضَرُوْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۶﴾

حاضر کیے ہوئے ﴿۷۵﴾ ان کی بات آپ کو غم میں نہ ڈالے، بے شک ہم جانتے ہیں ان باتوں کو جن کو یہ چھپاتے ہیں اور جن کو یہ ظاہر کرتے ہیں ﴿۷۶﴾

اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۷﴾ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا

کیا انسان نے دیکھا نہیں، بے شک ہم نے اس کو ایک بوند سے پیدا کیا، پس اچانک وہ کھلم کھلا جھگڑنے والا ہے ﴿۷۷﴾ ہمارے لیے مثال بیان کرتا ہے

وَّنَسِیَ خَلْقَهٗ ۖ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِيْمٌ ﴿۷۸﴾ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِیْٓ

اور اپنے پیدا کیے جانے کو بھول گیا، کہتا ہے کہ کون زندہ کرے گا ہڈیوں کو اس حال میں کہ وہ بوسیدہ ہوں گی؟ ﴿۷۸﴾ آپ کہہ دیجئے زندہ کرے گا ان کو وہی

اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۖ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۹﴾ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ

جس نے ان کو پیدا کیا پہلی مرتبہ، وہ ہر طرح سے پیدا کرنا جانتا ہے ﴿۷۹﴾ جس نے بنایا تمہارے لیے سبز درخت سے

الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ﴿۸۰﴾ اَوَلَيْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ

آگ کو، پس اچانک تم اس سے آگ جلاتے ہو ﴿۸۰﴾ جس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو کیا وہ

الْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ۟ؕ بَلٰی ۗ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۱﴾

قادر نہیں؟ اس بات پر کہ ان جیسے پیدا کر دے؟ کیوں نہیں! وہ تو بہت پیدا کرنے والا اور علم رکھنے والا ہے ﴿۸۱﴾

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۸۲﴾ فَسُبْحٰنَ

اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس کا حکم جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کہہ دیتا ہے اس چیز کو: ''ہو جا!'' پس وہ ہو جاتی ہے ﴿۸۲﴾ پاک ہے

اَلَّذِیْ بِیَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَیْءٍ وَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾
وہ جس کے ہاتھ میں ہے ہر چیز کا اختیار، اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ﴿۸۳﴾

تفسیر

(۱) وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِی الْخَلْقِ: جس شخص کو ہم عمر دے دیتے ہیں، یعنی جس کی عمر دراز کر دیتے ہیں، نُنَكِّسْهُ فِی الْخَلْقِ: ہم اُس کو خلق میں اُلٹا کر دیتے ہیں۔ تنکیس: اُلٹا کرنا۔ ایک ترقی ہوتی ہے اَدنیٰ سے اَعلیٰ کی طرف، اور تنکیس ہے اَعلیٰ سے اَدنیٰ کی طرف، جس طرح سے بچپن میں ہم نزول سے عروج کی طرف جاتے ہیں، تو تیں صلاحیتیں بڑھتی چلی جاتی ہیں، عمر دراز ہو جاتی ہے تو وہی قوتیں گھٹنی شروع ہو جاتی ہیں۔ تو ہر قوت انسان کی زائل ہو جانے کے بعد، جیسے بچپن میں انسان ہوتا ہے، بڑھاپے میں جا کر ایسے ہو جاتا ہے، ہر عضو انسان کا جواب دے دیتا ہے، ''ارذل العمر'' میں جس وقت انسان پہنچ جاتا ہے تو اپنی کوئی ضرورت خود پوری نہیں کر سکتا، انسان کے اعضا جتنے بھی ہیں، وہ بھی انسان کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، جیسے بچے کی ہر ضرورت دُوسرے کو پوری کرنی پڑتی ہے، تو بڑھاپے میں بھی ایسے ہی ہے۔ ''ہم اُس کو خلق میں اُلٹا کر دیتے ہیں'' پیدائش میں اس کو زوال کی طرف لے جاتے ہیں۔ تنکیس: اُلٹا کرنا۔ یعنی اَعلیٰ سے اَدنیٰ کی طرف رُجحان ہو گیا، جس طرح سے اِبتدا میں اَدنیٰ سے اَعلیٰ کی طرف ہوتا ہے۔ اَفَلَا یَعْقِلُوْنَ: کیا یہ سوچتے نہیں؟ یعنی ان کے سامنے ان کو قوتیں عطا ہوتی ہیں، اور ان کے سامنے وہ قوتیں چھینی جاتی ہیں، تو اس سے یہ ہماری قدرت کو نہیں سمجھتے؟ اسی طرح سے اگر ہم یکدم ان کو اَپاہج کر دیں، ان کی ٹانگیں واپس لے لیں تو لے سکتے ہیں، جیسے انفرادی طور پر تو آپ کے سامنے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں، ایک اچھا بھلا چلتا پھرتا انسان ہوتا ہے، کسی ایکسیڈنٹ میں دونوں ٹانگیں بے کار ہو جاتی ہیں، چلتے پھرتے انسان پہ فالج گرتا ہے اور ٹانگیں اور ہاتھ بے کار ہو جاتے ہیں، اور دفعۃً ایسی صورتِ حال پیش آ جاتی ہے کہ دونوں آنکھیں پھوٹ جاتی ہیں، موتیا اُتر آتا ہے، کچھ بھی نظر نہیں آتا، تو اللہ تعالیٰ دیتا بھی ہے، اللہ لیتا بھی ہے، ان واقعات کے اُوپر اگر نظر ڈالو تو اللہ تعالیٰ کے شکر کی توفیق ہوگی۔ یہاں تک یہ مضمون ختم ہوا۔

آخری رُکوع کے مضامین پر ایک نظر

اب یہ آخری آیات سورت کا اختتام ہے، اس میں اُنہی مضامین کو جو کہ اِبتدا میں ذِکر کیے گئے تھے، دُوسرے عنوان سے دوہرایا جا رہا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ سورت شروع ہوئی تھی تو سب سے پہلے سرورِ کائنات ﷺ کی رِسالت کا تذکرہ آیا تھا: اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ۔ اور پھر اس کے بعد ذِکر کیا گیا تھا کہ آپ کا اِنذار اُنہی کو مفید ہوگا جو کہ رحمٰن سے بن دیکھے ڈرتے ہیں، اور جن کے گلوں کے اندر خاندانی روایات کے طوق پڑے ہوئے ہیں، جو اپنے ماضی کے کردار پر مطمئن ہیں، مستقبل میں تمنائیں لگائے

(۱) اس کے بعد حضرت حکیم العصر ﷫ کی تفسیر ہے۔

بیٹھے ہیں، ان کے آگے پیچھے دیواریں حائل ہیں، نہ صحیح طور پر یہ ماضی کو سوچیں، نہ مستقبل کو سوچیں، اور اپنی اَنا کے طوق ان کے گلے میں ہیں، خاندانی روایات کے پابند ہیں، تو یہ لوگ فائدہ نہیں اُٹھائیں گے۔ پہلے رُکوع کے اندر یہ مضمون ذکر کیا گیا تھا۔ تو یہاں بھی اب اِبتدا میں سرورِ کائنات ﷺ کی رِسالت کا تذکرہ ہے اس عنوان سے کہ آپ کی رِسالت کا اِنکار کرتے ہوئے، وہ لوگ کبھی آپ کو ساحر کہتے تھے، کبھی آپ کو شاعر کہتے تھے، تو اُن کی تردید کی جارہی ہے، اور آپ پر جو کتاب اُتری، قرآنِ حکیم، جس کا ذکر پہلے آیا تھا اُسی کی حقانیت مذکور ہے، ساتھ یہ ذِکر کیا جارہا ہے کہ اس سے فائدہ وہی لوگ اُٹھائیں گے جو کہ زِندہ ہیں، مُردہ لوگ فائدہ نہیں اُٹھاسکتے۔ اور ''حی'' سے مراد وہی شخص ہے جس کے اندر صلاحیتیں ہیں، اس نے اپنی صلاحیتوں کو بیکار نہیں کیا۔ اور وہاں (شروع میں) بھی اسی طرح سے آیا تھا کہ اِن کے لیے برابر ہے کہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، گویا کہ اِن کی صلاحیتیں ختم ہوچکی ہیں، اور مُردوں کو نہیں سمجھایا جاسکتا، مُردوں کو نہیں جگایا جاسکتا، جو زِندہ ہیں، جن کی صلاحیتیں بیدار ہیں، وہی فائدہ اُٹھائیں گے، وہ بات بھی یہاں آگئی...... پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے اِنعامات ذِکر کر کے پھر توحید کی طرف متوجہ کیا اور شرک کی تردید کی، اور: اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ، میں جاکے پھر معاد کے مسئلے کو ذِکر کیا، یہ تینوں باتیں مختلف عنوان کے تحت پھر دوہرائی جارہی ہیں۔

حضور ﷺ پر شاعر ہونے کے اِلزام کی تردید

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ: ہم نے اس پیغمبر کو شعر کی تعلیم نہیں دی، وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ: اور نہ یہ تعلیم شعر اس کے لیے مناسب ہی ہے، شعر کی تعلیم اس کے لیے مناسب بھی نہیں، شعر گوئی پیغمبر کی شان نہیں ہے، ہم نے اس کو شعر نہیں سکھائے۔ وہ لوگ حضور ﷺ کو ''شاعر'' کہتے تھے، اور اس قرآنِ کریم کو وہ ''شاعرانہ کلام'' قرار دیتے تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ مشرک بھی ایک الزام کے اُوپر کسی صورت میں پکے نہیں رہ سکتے تھے، کبھی ''ساحر'' کہتے، اور قرآن کو ''سحر'' قرار دیتے۔ کبھی حضور ﷺ کو ''شاعر'' کہتے اور قرآن کو ''شعر'' قرار دیتے، لیکن ان کی اپنی طبیعت بھی جمتی نہیں تھی، کیونکہ ''شعر'' تو ایک کلامِ موزون ہوتا ہے، جس میں قافیے کی رعایت ہوتی ہے، اور اُس کے اوزان متعین ہیں، گھر گھر وہاں شاعر موجود تھے، بچیاں تک شاعر تھیں، اُن کو پتا تھا کہ ''شعر'' اِس وزن پر ہوتا ہے، اس کے اتنے اوزان ہیں، یوں یہ کہے جاتے ہیں، یہ کلامِ موزون ہیں، قرآنِ کریم میں ایک خصوصیت اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے جس کی بنا پر اس کے اِعجاز کی شان نمایاں ہے، شعر کے اندر ایک لطف ہوتا ہے اور اس میں ایک تاثیر ہے اور وہ لطف اور تاثیر ہوتی ہے الفاظ کے ایک خاص وزن پر ادا کرنے کی وجہ سے، ایک ہی طرح سے مصرع اُٹھایا جاتا ہے، اور ایک ہی انداز میں ختم کیا جاتا ہے، تو یہ کلام کی موزونیت اس میں لذّت پیدا کرتی ہے، اور اُس کے اوزان ان کے نزدیک معلوم اور متعین تھے، شعر کتنی قسم کا ہوتا ہے؟ کن کن وزنوں پہ آتا ہے؟ جب وہ قرآنِ کریم کو دیکھتے تو اس میں وہ اوزانِ متعینہ تو تھے نہیں جو کہ شعروں کے ہوتے ہیں، تو اُن کو تردّد ہوتا کہ یہ شعر نہیں۔ لیکن جب کلام کی موزونیت کو دیکھتے کہ اس میں واقعی الفاظ کا تناسب اس طرح سے رکھا گیا ہے کہ آپ جس طرح ترنّم کے ساتھ قرآنِ کریم کو پڑھ سکتے ہیں، کوئی دُوسری کلام نثر کی شکل میں ہو تو آپ اس کو اس طرح ترنّم سے نہیں

پڑھ سکتے۔اس کے الفاظ کی نشست ایسی ہے کہ وہ لذت وہ سُرور جو کہ شعروں میں آتا ہے تو اس کے پڑھنے میں وہ لذت اور سُرور موجود ہے، اس لیے کبھی وہ کہتے تھے ''شعر'' ہے، لیکن پھر جس وقت دیکھتے، کہتے: شعر تو نہیں ہے، یہ تو کوئی اور ہی جادو ہے جس کے اندر اس قسم کے اثرات بھر دیے گئے ہیں...... تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نبی کے لئے ''شعر گوئی'' مناسب نہیں اور نہ ہم نے اس کو شعر کی تعلیم ہی دی ہے، کیونکہ شاعروں کی خصوصیت آپ کے سامنے سورۂ شعراء کے اندر ذکر کردی گئی تھی کہ وہ محض خیالی باتیں ہوتی ہیں، جذبات پر اثر ڈالنے والی، جذبات کو بھڑکانے والی، کوئی بنیادی چیز جو تعمیر کے درجے کی ہو، تربیت کے درجے کی ہو، وہ شاعروں کی کلام میں نہیں ہوتی۔ اور شاعر ہمیشہ گفتار کے غازی ہوتے ہیں، کردار کے غازی نہیں ہوتے۔ باتیں تو یہ خوب بناتے ہیں، خیالات کی بندش تو خوب کرتے ہیں، لیکن جہاں عمل اور کردار کا موقع ہوتا ہے، وہاں یہ سب سے زیادہ سست ہوتے ہیں، باتیں زیادہ بنانے والے واقعہ یہی ہے کہ وہ کام کرنے میں اور عمل کے اندر بہت سست ہوتے ہیں۔اس قسم کی چیزیں نبی کی شان کے لائق نہیں، اس لیے قرآنِ کریم کو ''شعر'' کہنا ٹھیک نہیں ہے، نہ یہ شعر ہے، نہ ہم نے آپ کو شعر سکھائے، نہ آپ کے لیے یہ مناسب ہیں۔ تو عرب میں شاعر گھر گھر موجود تھے، ہر شخص شعر گوئی کرتا تھا، لیکن حضور ﷺ نے نہ نبوّت کے اظہار سے پہلے، نہ نبوّت کے اظہار کے بعد، کوئی شعر گوئی نہیں کی، نہ کوئی نظم لکھی، نہ کوئی قصیدہ پڑھا۔ اور کسی شاعر کے کہے ہوئے شعر کو اگر آپ نے کبھی مثال کے طور پر پڑھا بھی ہے، تو آپ سے صحیح وہ پڑھا ہی نہیں گیا، اس کے بھی اوزان ٹوٹ جایا کرتے تھے، لفظ آگے پیچھے ہوجاتا تھا، کیونکہ یہ شعر گوئی، دُوسرے کے شعر پڑھنا، اس میں بھی کسی نہ کسی مناسبت کا دخل ہوتا ہے...... جیسے میں نے آپ کو غالباً یہ واقعہ سنایا تھا، ہمارے حضرت مولانا عبدالخالق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو شعروں سے بالکل مناسبت نہیں تھی، اور اگر کوئی شعر پڑھتے بھی، تو اس کا وزن محفوظ نہیں رکھ سکتے تھے، لفظ آگے پیچھے ہوجاتے۔ ہمارے دورے کے سال میں سارے سال میں غالباً انہوں نے ایک ہی شعر پڑھا، کسی مسئلے پر حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دلائل کا جواب دے رہے تھے، اور اپنے دلائل ذکر کررہے تھے، تو یہ بتارہے تھے کہ اگر ہم پر یہ اِلزام ہے کہ ہم اس حدیث کی مخالفت کرتے ہیں تو تم کتنی حدیثوں کی مخالفت کرتے ہو، تمہیں یاد نہیں؟ اس مضمون کو اَدا کرتے ہوئے وہ شعر پڑھتے ہیں کہ:

> ہم آہ بھی کرتے ہیں تو بدنام ہوجاتے ہیں وہ قتل بھی کرتے ہیں تو کوئی پوچھنے والا نہیں

تو یہ شعر جو تھا، وہ بھی گویا کہ بگاڑ دیا۔ اسی طرح سے حضور ﷺ اگر کسی شاعر کا شعر اپنی زبان سے نقل بھی فرماتے تو روایات میں آتا ہے کہ اس میں کوئی نہ کوئی لفظ اس طرح سے آگے پیچھے ہوجاتا کہ اس کا وزن محفوظ نہیں رہتا تھا۔ خود تو آپ نے شعر کیا کہنے تھے!

قرآن تو ایک نصیحت ہے، لیکن فائدہ زندہ ہی اُٹھاتے ہیں

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ: جو کچھ آپ پیش کرتے ہیں یہ شعر نہیں، شعروں کا مجموعہ نہیں ہے، یہ تو ایک یاددہانی ہے، ایک نصیحت کی بات ہے، اور یہ واضح قرآن ہے، واضح کتاب ہے جو اللہ کی مرضیات کو نمایاں کرتا ہے۔ ''مبین'' کا معنی واضح کرنے

والی۔سورت کے شروع میں وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ میں جس طرح قرآن کریم کا ذکر آیا تھا تو یہاں بھی آ گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شعر گوئی کی نفی کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کا اثبات بھی آ گیا۔اور مقصد کیا ہے؟ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا: ینذر کی ضمیر قرآن مبین کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے۔تا کہ ڈرائے یہ نبی، تا کہ ڈرائے یہ قرآن اس شخص کو جو کہ زندہ ہے۔معلوم ہو گیا کہ انذار سے فائدہ اُٹھانا زِندوں کا کام ہے، مُردے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔یہاں ''زندوں'' سے مُراد جن کی صلاحیتیں ابھی باقی ہیں حق سمجھنے کی، حق کے مطابق عمل کرنے صلاحیت جن میں باقی ہے۔اور جو یہ صلاحیتیں ختم کر دیتے ہیں وہ مُردہ ہیں، وہ زندہ نہیں ہیں۔اس لیے آپ مُردوں کو نہیں سُنا سکتے، من فی القبور کو نہیں سُنا سکتے، موتی کو نہیں سُنا سکتے، یہ الفاظ سارے کے سارے بول کر کافر ہی مراد لیے گئے ہیں، جیسا کہ آیات آپ کے سامنے گزر گئیں، اور یہاں بھی ''حی'' کے مقابلے میں کافرین کا ذکر آ رہا ہے، وَيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ: اور تا کہ ثابت ہو جائے بات کافروں پر، اُن کے اُوپر اتمامِ حُجّت ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اُس کے اِنعامات

آگے پھر اللہ تعالیٰ اپنی قدرت اور اِنعام کو ذِکر کر کے توحید کی طرف متوجہ کرتے ہیں، وہاں (شروع میں) آیات آئی تھیں: وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ، کے اندر یہ چیزیں ذِکر کی گئی تھیں، یہاں دُوسرے انداز سے آ گئیں۔اَوَلَمْ يَرَوْا: کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں؟ اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ: بے شک ہم نے پیدا کیا ان کے لئے اُن چیزوں میں سے جن کو ہمارے ہاتھوں نے بنایا، اَنْعَامًا یہ خَلَقْنَا کا مفعول ہے، ہم نے پیدا کیے ان کے لیے چوپائے ان چیزوں میں سے جن کو ہمارے ہمارے ہاتھوں نے بنایا، فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ: پس یہ لوگ اُن چوپایوں کے مالک ہیں۔یعنی پیدا ہم نے کیے، مالک اِن کو بنا دیا، کتنا بڑا ہمارا انعام ہے، حالانکہ ان کے بنانے میں ان کے پیدا کرنے میں ان کے ہاتھوں کا کوئی دخل نہیں، یہ سب ہماری قدرت کے ہاتھوں سے بنے ہیں، مالک یہ بن گئے، ہم نے ان کو مالک بنا دیا۔وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ: ذَلَّلَ تذلیل: تابع کر دینا۔اور ہم نے تابع کر دیا ان چوپایوں کو اِن لوگوں کے لیے، ان لوگوں کے لیے ہم نے ان چوپایوں کو تابع کر دیا، ان کے سامنے اُن کو عاجز کر دیا۔فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ: اُن چوپایوں میں سے اِن کے لیے سوار ہونے کی چیز ہے۔رَکوب مرکوب کے معنی میں ہے، ان چوپایوں میں سے اِن کے لیے سواریاں ہیں، مرکوب ہیں جن کے اُوپر یہ سواری کرتے ہیں، وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ: ان میں سے یہ کھاتے ہیں، بعض کو یہ کھاتے ہیں، تو کھانے کے کام بھی آ گئے، سواری کے کام بھی آ گئے۔اَنعام کا مصداق خصوصیت کے ساتھ ہوتے ہیں یہ جانور جو ہم گھروں میں پالتے ہیں: اُونٹ، گائے، بیل، بھینس، بھیڑ، بکری، یہ اَنعام کا مصداق ہیں، تو ان میں سے بعض سواری کا کام بھی دیتے ہیں، جس طرح سے اُونٹ ہو گئے، اور یہ کھانے کے کام بھی آتے ہیں جس طرح سے بھیڑ، بکری یہ صرف کھانے کا کام دیتے ہیں، اور گائے، بیل، بھینس ان سے لوگ مختلف کام لیتے ہیں، بار برداری بھی کرتے ہیں، جس طرح سے آپ دیکھتے ہیں چھکڑوں کی صورت میں، اگرچہ ان کے اُوپر کوئی چیز لادنے کی عادت نہیں ہے، لیکن یہ چھکڑوں کی صورت میں بار برداری کرتے ہیں، تو ان چوپایوں میں بعض ہماری سواری کے کام آتے ہیں، بعضے کھانے کے کام آتے ہیں۔وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ: اور ان لوگوں کے لیے ان چوپایوں کے اندر بہت نفع ہیں۔منافع منفعت کی جمع، اس میں عموم آ گیا، ان کے بالوں سے نفع اُٹھاتے ہو، ان کے چمڑے سے نفع اُٹھاتے ہو، ان کی ہڈیوں سے نفع

اُٹھاتے ہو، حتیٰ کہ ان کے بول و براز، گوبر اور پیشاب سے نفع اُٹھاتے ہو، یعنی ان کی کوئی چیز بھی بے کار نہیں ہے، ہر چیز سے ہم نفع اُٹھاتے ہیں، مینگنیاں، گوبر، لید جو کچھ بھی ہے ہر چیز انسانوں کے کام آتی ہے، وہ بھی ان کے فائدے کی چیز ہے۔ وَمَشَارِبُ: یہ مشرب کی جمع ہے، مشرب مشروب کے معنی میں ہے۔ اور ان کے لیے ان چوپایوں میں مشروب ہیں، پینے کی چیز ہے، براہِ راست پینے کی چیز دُودھ، اور پھر دُودھ سے آگے کتنے مشروبات انسان تیار کرتا ہے، لسی ہے، دہی ہے، اور آج کل کے ماحول میں چائے ہے، یہ ساری چیزیں دُودھ سے تیار ہوتی ہیں، تو مشروب عام ہو گئے، ان حیوانات سے پینے کی چیزیں ملتی ہیں، انسان اپنی لذت کے لیے مختلف چیزیں تیار کر لیتا ہے۔ اَفَلَا یَشْکُرُوْنَ: کیا یہ اللہ کی ان نعمتوں کو دیکھ کے شکر نہیں ادا کرتے؟ اور اللہ کا شکر یہی ہے کہ ان نعمتوں کو اللہ کی طرف منسوب کیا جائے، اور اسی کی اطاعت اور عبادت کی جائے جس کے یہ احسانات ہیں۔

رَدِّ شرک

''توحید'' شکر کے اَدا کرنے کا ایک ذریعہ ہے، اور ''شرک'' اِنتہائی درجے کی ناشکری ہے۔ اس لیے آگے ''شرک'' کی تردید کر دی، وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً: اٰلِهَةً: اِلٰہ کی جمع۔ اللہ کے علاوہ انہوں نے اور آلہہ بنا رکھے ہیں، معبود بنا رکھے ہیں، لَعَلَّهُمْ یُنْصَرُوْنَ: تاکہ یہ لوگ مدد کیے جائیں، یعنی آڑے وقت میں وہ کام آئیں، اس لیے ان لوگوں نے اپنے کارساز آلہہ اور بنالیے۔ یہاں نصرت کا ذِکر ہے، اس لئے ان کے اندر مفہوم کارسازی کا ہے، سورۂ مریم کے اندر لفظ آیا تھا لِیَکُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا (سورۂ مریم:۸۱) کہ اس لیے معبود اختیار کیے ہیں تاکہ یہ ان کے لیے عزّت اور غلبے کا باعث بنیں۔ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ نَصْرَهُمْ یہ تو سب بے بس ہیں جن کو بھی انہوں نے آلہہ بنایا، چاہے فرشتوں کو، چاہے جنوں کو، چاہے انسانوں کو، اچھوں کو، بُروں کو جس کو بھی آلہہ بنایا، وہ ان کی مدد کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ یہ مضمون بھی آپ کے سامنے سورۂ فاطر میں خصوصیت کے ساتھ تفصیل سے آ گیا۔ مدد کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ: اور وہ ان کے لیے لشکر ہوں گے حاضر کیے ہوئے، یعنی ان کے معبود لشکروں کی صورت میں ان کے سامنے حاضر کئے جائیں گے قیامت کے دِن، جو ان کے خلاف شہادت دیں گے، ان کے خلاف بیان دیں گے، فائدہ تو انہوں نے کیا پہنچانا ہے...... آگے پھر حضور ﷺ کے لیے تسلی آ گئی جس طرح سے ابتدائی آیات میں بھی تھی، فَلَا یَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ: ان کی بات آپ کو غم میں نہ ڈالے، جو باتیں بھی کرتے ہیں، جس قسم کی آپ کے متعلق کرتے ہیں، قرآنِ کریم کے متعلق کرتے ہیں، ان پر آپ غمگین نہ ہوں، اِنَّا نَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ: بے شک ہم جانتے ہیں ان باتوں کو جن کو یہ چھپاتے ہیں، جن کو یہ ظاہر کرتے ہیں، ان کی ڈھکی چھپی، ظاہر، سب باتیں ہمارے سامنے ہیں، ہم ان سے محاسبہ کر لیں گے، آپ غمزدہ نہ ہوں۔

اِثباتِ معاد، منکرین کا شبہ اور اس کا جواب

اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ: اب یہ آگے معاد کا بیان ہے، جی اُٹھنے کا۔ یہی تین عقیدے ہیں بنیادی طور پر، جن کی وضاحت مکی سورتوں میں زیادہ تر کی جاتی ہے۔ کیا انسان نے دیکھا نہیں؟ بے شک ہم نے اس کو ایک بوند سے پیدا کیا۔ نَطَفَ ٹپکانے کو کہتے ہیں، نُطفہ: اتنی مقدار جو ایک دفعہ ٹپکائی جائے۔ ہم نے اس کو ایک بوند سے پیدا کیا، فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ: پس اچانک

وہ انسان صریح طور پر جھگڑنے والا ہے، کھلم کھلا جھگڑنے والا ہے۔ جھگڑنے والا ہے وہ اللہ کے رسول سے، جس وقت اُن کے سامنے ذکر کیا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد تم نے دوبارہ اُٹھنا ہے تو آگے سے جھگڑا کرتے ہیں۔ اور جھگڑے کی یہی صورت ہے جو یہاں بیان کر دی گئی، وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ: ہمارے لیے مثال بیان کرتا ہے، اور اپنے خلق کو بھول گیا۔ اپنے پیدا کیے جانے کو بھول گیا، مصدر کی اضافت مفعول کی طرف ہے۔ ہمارے لیے مثال بیان کرتا ہے، یہ مثال بیان کرنا کبھی کسی حقیقت کو سمجھانے کے لیے ہوتا ہے، کبھی کسی کی پھبتی اُڑانے کے لیے ہوتا ہے، یہ ہماری بات کی پھبتیاں اُڑاتا ہے، کیا کہتا ہے؟ کہ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ: یہ ہے جو وہ مثال بیان کرتا ہے مذاق اڑانے کے لیے، پھبتی کسنے کے لیے، اور یہ پھبتی کسنا مذاق اُڑانا انہی لوگوں کا کام ہے جو اپنی خلقت کو بھول گئے، اگر وہ ذرا پیچھے مڑ کے دیکھیں تو انہیں پتا چلے کہ پانی کے قطرے سے جس نے بنیاد اُٹھائی ہے اور اس نے گوشت بنایا، ہڈیاں بنائیں، ہڈیوں کے اُوپر گوشت چڑھایا، کس طرح سے باریک سے باریک، حساس سے حساس ترمشینیں انسان کے اندر لگا دیں، تو کیا وہ یہی ہڈیاں بوسیدہ ہو جانے کے بعد دوبارہ زندہ نہیں کر سکتا؟ اگر اپنی خلقت کو کوئی شخص سمجھے، پیدا کیے جانے کو کوئی شخص سمجھتا ہے، اس کو اعادہ کا انکار کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں، پہلے بھی تو ہڈیاں نہیں تھیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کر دیں، گوشت نہیں تھا اور بنا دیا...... اور یہ بھی تو ساری کائنات میں سے مختلف ذرّات اکٹھے کر کے جوڑے ہیں۔ انسان غذا کھاتا ہے، غذا کہاں کہاں سے آتی ہے؟ اور اس غذا سے خون تیار ہوا، اسی غذا سے نطفہ تیار ہوتا ہے، اسی غذا سے ماں کا حیض کا خون تیار ہوتا ہے، تو خون میں، نطفے میں جو خوراک آپ نے کھائی ہے وہ سارے اجزا اکٹھے ہیں، تو ان بکھرے ہوئے اجزا کو اکٹھا کر کے ایک وجود بنایا، پھر زندگی کے اندر پیدا ہونے کے بعد آپ دُودھ پیتے ہیں، پھل کھاتے ہیں، دوائیاں کھاتے ہیں، سبزیاں کھاتے ہیں، غلہ جات کھاتے ہیں، کہاں کہاں آپ کے ذرّات بکھرے ہوئے ہیں جو اللہ تعالیٰ اکٹھے کر کر کے آپ کے وجود میں جوڑتا جا رہا ہے، اور یہ وجود آپ کا بن گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے بکھرے ہوئے اجزا کو پہلے اکٹھا کر کے آپ کو اتنا جو بنایا ہے تو ایک دفعہ پھر اگر آپ کے اجزا بکھر جائیں گے تو دوبارہ اکٹھا کرنا کیا مشکل ہے۔ آپ کہیں اسی طرح گھڑے گھڑائے تو نہیں آ گئے، اللہ تعالیٰ نے غذاؤں کے ساتھ دواؤں کے ساتھ اور دُوسری چیزوں کے ساتھ، یہ مختلف بکھرے ہوئے اجزا اکٹھے کیے ہیں جس کے انسان کا یہ وجود بنا۔ تو مرنے کے بعد اگر بکھر جائیں گے تو دوبارہ اکٹھا کرنا اس کے لیے کیا مشکل ہے؟...... اگر کسی شخص کو اپنے پیدا کیے جانے کی تفصیل معلوم ہو تو اس کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کے متعلق شک کرنے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اس لیے یہاں کہا جا رہا ہے کہ اپنے پیدا کیے جانے کو بھول گیا، اور ہم پہ مثالیں کستا ہے، ہماری پھبتیاں اُڑاتا ہے، کہتا ہے کہ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ کون زندہ کرے گا ہڈیوں کو اس حال میں کہ وہ بوسیدہ ہوں گی؟ ہڈیاں بوسیدہ ہو جانے کے بعد ان کو کون زندہ کرے گا؟ یعنی کوئی نہیں زندہ کر سکتا! قُلْ: آپ جواب میں کہہ دیجئے، يُحْيِيْهَا: زندہ کرے گا ان ہڈیوں کو الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ: وہی جس نے ان کو پیدا کیا، اَوَّلَ مَرَّةٍ پہلی مرتبہ، جس نے ان کو پہلی مرتبہ پیدا کیا وہی ان کو زندہ کرے گا، وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ: وہ ہر طرح سے پیدا کرنا جانتا ہے۔ ابتداءً پیدا کرنا بھی جانتا ہے، انتہاءً پیدا کرنا بھی جانتا ہے۔ جب یہ بالکل موجود نہیں تھیں تو اللہ نے ہڈیاں بنا دیں، ہڈیاں بن جانے کے بعد بوسیدہ ہو جائیں گی تو بھی ان میں تر و تازگی آ جائے گی۔

اثباتِ معاد کے لئے ایک اور مثال

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا: یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی ایک دوسری مثال دے دی۔ وہ ہر طرح سے پیدا کرنا جانتا ہے جس نے بنایا تمہارے لیے سبز درخت سے آگ کو، فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ: پس اچانک تم اس شجرِ اخضر سے آگ جلاتے ہو۔ یہ بھی اللہ نے اپنی ایک قدرت بیان کی جو بالکل آنکھوں کے سامنے ہے، اس کی وضاحت دو طرح سے کی گئی ہے...... کہتے ہیں کہ عرب میں دو درخت ہیں، ایک کا نام ''مرخ'' لکھا ہے، اور ایک کا ''عفار''، یہ دو قسم کے درخت تھے، بالکل سرسبز۔ آپ دیکھتے ہیں کہ جو چیز سرسبز ہوتی ہے وہ پانی سے بھری ہوئی ہوتی ہے، اس لیے آپ اس کو رگڑ کے یوں نچوڑیں تو اس میں سے پانی ٹپکتا ہے، جو بھی تر چیز ہو اس میں پانی ہوتا ہے۔ وہ گیلے درختوں کی دو شاخیں توڑتے، توڑنے کے بعد اُن کو آپس میں اگر ان کو رگڑا جائے تو جس طرح سے چقماق کے دو پتھر آپس میں ٹکراتے ہیں تو آگ کا شعلہ پیدا ہوتا ہے، اسی طرح سے وہ سبز شاخیں رگڑ کھا کے آگ چھوڑتی تھیں جس سے وہ لوگ آگ جلاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ دیکھو! پانی اور آگ تم ان کو آپس میں متضاد سمجھتے ہو، لیکن پانی میں سے ہی آگ نکل رہی ہے۔ اللہ کی قدرت تمہیں اس میں نظر نہیں آرہی؟ گیلا درخت، سرسبز درخت بالکل پانی کا مجموعہ ہے، اور اسی میں سے تم آگ نکالتے ہو، تو ایک ضد سے دُوسری ضد پیدا ہوگئی، نیست سے ہست کرنا اللہ کا کام ہے، اس لیے موت کے بعد حیات اور حیات کے بعد موت یہ کوئی بڑی مشکل بات نہیں۔ پانی اور آگ کا آپس میں کیا جوڑ ہے؟ لیکن تم پانی میں سے آگ نکالتے ہو...... یہ تو اس زمانے کی بات تھی لیکن آج تو پانی میں سے آگ نکلنا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ کہتے ہیں کہ سب سے زیادہ آگ کا ذخیرہ ہے ہی پانی میں، آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ بجلی پانی سے پیدا ہوتی ہے، اس لیے جن دنوں میں دریاؤں میں پانی گھٹ جاتا ہے، بجلی کم ہو جاتی ہے، یہ صبح شام جو آپ کی بجلی بند ہوتی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ آج کل بجلی کی پیداوار کم ہے، اور جب دریاؤں میں پانی آتا ہے اس وقت بجلی زیادہ ہوتی ہے۔ تو پانی سے بجلی اخذ کرتے ہیں، اور بجلی آگ ہی آگ ہے۔ تو آج تو سب سے بڑا آگ کا ذخیرہ پانی سے ہی نکل رہا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ ایک ضد سے دُوسری ضد کو نکال لے، اس میں کون سی بات ہے؟ تمہاری آنکھوں کے سامنے مثالیں ہیں، تم ان کو سمجھتے نہیں ہو؟ سبز درخت سے آگ نکالتے ہو، کیا یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی دلیل نہیں؟...... اور اگر متعین درخت مراد نہ لیے جائیں اور یہی درخت مراد ہوں جو ہمارے سامنے ہیں سرسبز، پھر اس کو دو وقتوں پہ محمول کر دیا جائے گا کہ یہی لکڑی ایک وقت پانی کا ذخیرہ ہے، اور دوسرے وقت میں اسی میں سے جب یہ آپ کے چولہوں میں جلتی ہے تو دیکھو! کس طرح سے آگ نکل رہی ہے۔ تو ایک محل میں ایک وقت میں پانی، دوسرے وقت میں آگ، یہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے۔ تو اسی طرح سے ایک محل میں ایک وقت میں موت آجائے، اسی محل میں دوسرے وقت میں حیات آجائے، تو کیا یہ مثالیں تمہارے سمجھنے کے لئے کافی نہیں؟ یہی گیلی لکڑی اس میں پانی ہے، اور تھوڑے دنوں کے بعد آپ اس کو چولہے میں جلاتے ہیں، اسی میں سے آگ نکلتی ہے۔ ''اللہ وہ ہے جس نے بنایا تمہارے لیے سبز درخت سے آگ کو، پس اچانک تم اس درخت سے آگ جلاتے ہو'' سورۂ واقعہ میں بھی آئے گا اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ کیا تم نے کبھی خیال کیا، یہ آگ جو تم جلاتے

ہو، ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَاۤ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ: اس کے درخت جن سے تم آگ جلاتے ہو، تم نے پیدا کیے یا ہم نے پیدا کیے؟ تو وہاں بھی شجرۂ نار کا ذکر آئے گا، آگ کے درخت جن سے تم آگ نکالتے ہو، یا جن کو جلا کر تم ان سے آگ حاصل کرتے ہو۔

ایک چیز کو دوبارہ بنانا کون سی مشکل بات ہے

اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ: یہ دوسری طرح سے بات سمجھادی، کہ یہ تو تم جانتے ہو کہ آسمان ہم نے بنایا، زمین ہم نے بنائی۔ اس لیے مشرکینِ مکہ سے جب پوچھا جاتا تھا کہ آسمان کس نے پیدا کیا؟ زمین کس نے پیدا کی؟ تو اقرار کرتے تھے کہ اللہ نے پیدا کیا۔ پھر اللہ کہتے ہیں کہ عقل کے اندھو! تم یہ تو مانتے ہو کہ آسمان اللہ نے بنالیا، زمین اللہ نے بنالی، تو جو زمین بنانے پہ قادر ہے، وہ تم جیسے دوبارہ پیدا کرنے پہ قادر نہیں؟ اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ (سورۂ ق:۱۵) کیا ہم پہلی مرتبہ پیدا کر کے تھک گئے؟ جو زمین آسمان پیدا کر کے نہیں تھکا لَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ (سورۂ احقاف:۳۳) تو ایک دفعہ تمہیں پیدا کیا، پیدا کرنے کے بعد مارا، دوبارہ پیدا کرنا تو زیادہ آسان ہوتا ہے، وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ (سورۂ روم:۲۷) دوبارہ پیدا کرنا تو زیادہ آسان ہوتا ہے یعنی تمہارے نزدیک بھی، پہلی دفعہ کام کرنا مشکل ہوتا ہے، وہی کام دوبارہ کرنا پڑ جائے تو وہ آسان ہوتا ہے۔ تو پھر یہ بات تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی؟ تم اس بات کا کیوں انکار کرتے ہو؟ کہ مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھایا نہیں جائے گا۔ قرآنِ کریم نے اس عقیدے پر سب سے زیادہ زور دیا ہے، کیونکہ آخرت کا عقیدہ ایک ایسا ہے جو انسان کے قول فعل کے اندر تناسب پیدا کرتا ہے، جب یہ پتا ہو کہ ہم نے جی اُٹھنے کے بعد اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے اور اپنے اعمال کا حساب کتاب دینا ہے، تو پھر انسان اپنی ہر چیز کے اندر تناسب رکھتا ہے، اور سوچ سمجھ کے کام کرتا ہے، سوچ سمجھ کے بات کرتا ہے۔ کیا جس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو، وہ قادر نہیں؟ بِقٰدِرٍ: لیس کی خبر ہے، لَيْسَ بِقٰدِرٍ۔ جس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو کیا وہ قادر نہیں اس بات پر کہ ان جیسے پیدا کر دے۔ بَلٰى: کیوں نہیں، وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ: وہ تو بہت پیدا کرنے والا، اور علم رکھنے والا ہے۔ اس لیے پیدا کر سکتا ہے، کرے گا، تو انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

پھر پیدا کرنے کے لیے اللہ کو زیادہ اہتمام کی ضرورت نہیں، نہ کوئی میٹریل اکٹھا کرنا ہے، نہ کوئی کاریگر بلانے ہیں، نہ کوئی کارخانہ چلانا ہے، وہاں تو ارادے کی دیر ہے، اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيْئًا: اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس کا حکم جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے، اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ: کہہ دیتا ہے اس چیز کو کُنْ: ہو جا۔ فَيَكُوْنُ پس وہ ہو جاتی ہے۔ وہ تو ''کن فیکونی'' قوتوں کا مالک ہے، جب کسی طرف اللہ کا ارادہ متوجہ ہوا کہ یہ چیز ہو جائے، فوراً ہو جاتی ہے، دیر ہی نہیں لگتی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ: ہر قسم کے عیب سے عجز سے پاک ہے وہ جس کے ہاتھ میں ہے ہر چیز کا اختیار، ہر چیز کی ملکیت ہر چیز کا اختیار اسی کے ہاتھ میں ہے۔ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ: اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ